فی ظلال القرآن

پارہ ۲۰ تا ۲۶

جلد پنجم

سید قطب شہید

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

ادارہ منشورات اسلامی

بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور

تفسیر	-------	فی ظلال القرآن
مصنف	-------	سید قطب شہیدؒ
مترجم	-------	سید معروف شاہ شیرازی
ناشر	-------	سید عارف شیرازی
جلد پنجم	-------	پارہ ۲۰ تا ۲۶
تعداد	-------	۱۰۰۰
مطبع	-------	رضا پرنٹرز لاہور
ھدیہ	-------	۳۷۵ روپے
اشاعت اول	-------	فروری ۱۹۹۷ء
اشاعت دوم	-------	دسمبر ۱۹۹۷ء

---○○○---

عرض ناشر

شہید اسلام سید قطب ؒ۔ سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک دور میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب ۱۹۰۳ء میں مصر کے ایک صوبہ "اسیوط" کے ایک گاؤں "موشاء" میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم "تجہیزیہ دارالعلوم" نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دارالعلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہوکر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۳ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۳ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشرو اشاعت کے اخبار "الاخوان المسلمون" کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطب ؒ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست ۱۹۶۴ء میں مرحوم عبدالسلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا' اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب' اور تحریک اسلامی' ان کا خاص موضوع رہا۔

تفسیر فی ظلال القرآن ۔ مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی' جس نے عرب کی کایا پلٹ دی تھی' کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیا علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی۔ آپ صلعم کے بعد بھی یہ تحریک زندہ ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی موشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان کہا جا سکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے' الفاظ اور معنی کا دریا ہے۔ جس میں تحقیقی' علمی' وجدانی' اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیاں میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور دیتے ہوئے اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص' روح ایمان' عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پندرہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ

جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مترجم سید معروف شاہ شیرازی ۔ سید معروف شاہ شیرازی ۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں ھروڑی میں پیدا ہوئے' ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں حاصل کی' حصول علم کا شوق بچپن ہی سے انتہائی زیادہ تھا جس کی وجہ سے سرحد اور پنجاب کے مختلف دینی مدارس اور معروف علماء کرام سے تعلیم حاصل کرتے رہے' پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں منشی فاضل اور ۱۹۵۳ء میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور اگلے ہی سال مشہور دینی درس گاہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے دورہ حدیث کر کے سند فراغت حاصل کی' جبکہ ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا' اور بعد میں ۱۹۶۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔

درس نظامی پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۵ تا ۱۹۶۵ گورنمنٹ ہائی سکول بٹل میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے لیکن بعد میں اس پیشہ کو ترک کر کے تصنیف و تالیف اور صحافت کے شعبہ سے منسلک ہو گئے۔ ایک سال تک ماہنامہ تعلیم القرآن راولپنڈی کے ایڈیٹر رہنے کے بعد اپنا رسالہ ''اسوہ'' راولپنڈی سے نکالنا شروع کیا لیکن بعد میں کراچی منتقل ہونے کی وجہ سے کراچی سے ''اسوہ ڈائجسٹ'' کے نام سے یہی رسالہ شائع کرتے رہے۔

اس دوران ادارہ معارف اسلامی کراچی میں ریسرچ اسکالر کے طور پر کام کرتے ہوئے مختلف عربی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جو ''اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو'' ''اسلام میں جرم و سزا'' (دو حصے) ''حسن البناء شہید کی یادداشتیں'' اور ''نشانات راہ'' کے ناموں سے شائع ہوئیں۔

لیکن ۱۹۷۰ء میں ناسازی طبع کی بناء پر کراچی سے آبائی علاقہ میں منتقل ہو گئے اور وہاں ضلع مانسہرہ کی تحصیل بٹگرام میں وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۹۲ء تک اسی پیشہ سے منسلک رہے۔ پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس دوران ''سیرت القرآن'' حصہ اول دوم ''اسلامی انقلاب کا منہاج'' ''اسلام اور جمہوریت ججوں اور جرنیلوں کے زیر سایہ'' ''مدارس عربیہ اور اسلامی انقلاب'' ''سید مودودی کے فکری کام کا ایک جائزہ'' ''جماعت اسلامی انصاف کے دروازے پر'' اور انگریزی کی کتاب ''The Shape Of Basic Organs in Islamic State'' ادارہ منشورات اسلامی منصورہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔ گزشتہ ۲۹ سال میں دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ سید قطب شہید کی تفسیر فی ظلال القرآن کے اردو ترجمے کا کام بھی جاری رہا جو اکتوبر ۱۹۹۵ء میں مکمل ہوا۔

سید معروف شاہ شیرازی دوران تعلیم ہی سید مودودی ؒ سے متعارف ہوئے اور اکثر عصری مجالس میں حاضر رہتے تھے' تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ مولانا مودودی ؒ کے ساتھ بھی رہے' جبکہ مولانا مودودی ؒ اکثر انہیں مسکین شاہ صاحب کے نام سے یاد فرماتے تھے' ۱۹۶۲ء میں جماعت اسلامی کے رکن بنے اور ہمیشہ تحریکی سرگرمیوں میں مصروف رہے' قومی اتحاد کی تحریک کے دوران ہری پور جیل میں بھی رہے۔ موصوف آج کل انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے شعبہ شریعہ اکیڈمی میں بطور کنسلٹنٹ خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ نائب امیر جماعت اسلامی ضلع مانسہرہ کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں اور جماعت اسلامی صوبہ سرحد کی شوری کے بھی منتخب رکن ہیں۔

فی ظلال القرآن کے ترجمہ کے بعد موصوف اپنی زیر تکمیل کتب ''حرمت سود'' ''تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل'' ''کتاب نکاح'' ''تحریکات اسلامیہ'' ''غربت اسلام کی نظر میں'' ''مغلیہ دور حکومت میں سرحد کے صوفیاء کرام کا کردار'' کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

فی ظلال القرآن کی پانچویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس سلسلہ کی آخری جلد شائع کرنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین ثم آمین (سید عارف شیرازی)

جلد پنجم

سورۃ النمل ۔ ۲۷	-------	آیات ۶۰ ۔۔ تا ۔۔ ۹۳
سورۃ القصص ۔ ۲۸	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸۸
سورۃ العنکبوت ۔ ۲۹	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۶۹
سورۃ الروم ۔ ۳۰	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۶۰
سورۃ لقمان ۔ ۳۱	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۳۴
سورۃ السجدہ ۔ ۳۲	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۳۰
سورۃ الاحزاب ۔ ۳۳	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۷۳
سورۃ سبا ۔ ۳۴	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵۴
سورۃ فاطر ۔ ۳۵	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۴۵
سورۃ یٰسین ۔ ۳۶	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸۳
سورۃ الصّٰفّٰت ۔ ۳۷	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۱۸۲
سورۃ ص ۔ ۳۸	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸۸
سورۃ الزمر ۔ ۳۹	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۷۵
سورۃ المومن ۔ ۴۰	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸۵
سورۃ حم سجدہ ۔ ۴۱	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵۴
سورۃ الشوریٰ ۔ ۴۲	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵۳
سورۃ الزخرف ۔ ۴۳	-------	آیات ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸۹

سورۃ الدخان ۔ ۴۴ ------- آیات ۱۔تا۔۔۵۹

سورۃ الجاثیۃ ۔۴۵ ------- آیات ۱۔تا۔۔۳۷

سورۃ الاحقاف ۔۴۶ ------- آیات ۱۔تا۔۔۳۵

سورۃ محمد ۔ ۴۷ ------- آیات ۱۔تا۔۔۳۸

سورۃ الفتح ۔۴۸ ------- آیات ۱۔تا۔۔۲۹

سورۃ الحجرات ۔۴۹ ------- آیات ۱۔تا۔۔۱۸

سورۃ ق ۔ ۵۰ ------- آیات ۱۔تا۔۔۴۵

نوٹ الذّٰریٰت ۔۵۱ آیات ۱۔تا۔۔۳۰ جلد ششم میں ملاحظہ فرمائیں ۔

---ooo---

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست جلد پنجم

پارہ نمبر۔ ۲۰------- سورہ النمل ۔ ۲۷

درس نمبر۱۷۵ ایک نظر میں ۱۶
درس نمبر۱۷۵ تشریح آیات ۶۰-- تا-- ۹۳ .... ۱۸

سورہ القصص ۔ ۲۸

سورۃ القصص ایک نظر میں ۴۹
درس نمبر۱۷۶ تشریح آیات ۱-- تا-- ۴۳ .... ۵۳
درس نمبر۱۷۷ تشریح آیات ۴۴-- تا-- ۷۵ .... ۹۵
درس نمبر۱۷۸ ایک نظر میں ۱۲۰
درس نمبر۱۷۸ تشریح آیات ۷۶-- تا-- ۸۴ .... ۱۲۱
درس نمبر۱۷۹ تشریح آیات ۸۵-- تا-- ۸۸ .... ۱۳۰

سورہ العنکبوت ۔ ۲۹

سورہ العنکبوت ایک نظر میں ۱۳۶
درس نمبر۱۸۰ تشریح آیات ۱-- تا-- ۱۳ .... ۱۴۰
درس نمبر۱۸۱ ایک نظر میں ۱۵۱
درس نمبر۱۸۱ تشریح آیات ۱۴-- تا-- ۴۴ .... ۱۵۳

پارہ نمبر۔ ۲۱

درس نمبر ۱۸۲ ایک نظر میں ۱۷۷
درس نمبر ۱۸۲ تشریح آیات ۴۵ -- تا -- ۶۹ .... ۱۷۹

سورہ الروم ۔ ۳۰

سورہ روم ایک نظر میں ۱۹۷
درس نمبر ۱۸۳ تشریح آیات ۱ -- تا -- ۳۲ .... ۲۰۰
درس نمبر ۱۸۴ ایک نظر میں ۲۲۵
درس نمبر ۱۸۴ تشریح آیات ۳۳ -- تا -- ۶۰ .... ۲۲۶

سورہ لقمان ۔ ۳۱

سورۃ لقمان ایک نظر میں ۲۴۵
درس نمبر ۱۸۵ تشریح آیات ۱ -- تا -- ۱۹ .... ۲۵۴
درس نمبر ۱۸۶ تشریح آیات ۲۰ -- تا -- ۳۴ .... ۲۶۹

سورہ السجدہ ۔ ۳۲

سورۃ السجدہ ایک نظر میں ۲۸۶
درس نمبر ۱۸۷ تشریح آیات ۱ -- تا -- ۳۰ .... ۲۹۰

سورہ الاحزاب ۔ ۳۳

سورۃ الاحزاب ایک نظر میں ۳۱۳
درس نمبر ۱۸۸ تشریح آیات ۱ -- تا -- ۸ .... ۳۲۲
درس نمبر ۱۸۹ ایک نظر میں ۳۳۸
درس نمبر ۱۸۹ تشریح آیات ۹ -- تا -- ۲۷ .... ۳۴۶

پارہ نمبر۔ ۲۲

درس نمبر ۱۹۰ تشریح آیات ۲۸ -- تا -- ۳۵ .... ۳۷۰

درس نمبر۱۹۱ ایک نظرمیں ۳۸۷
درس نمبر۱۹۱ تشریح آیات ۳۶-- تا-- ۴۸ .... ۳۸۸
درس نمبر۱۹۲ ایک نظرمیں ۴۰۳
درس نمبر۱۹۲ تشریح آیات ۴۹-- تا-- ۶۲ .... ۴۰۴
درس نمبر۱۹۳ ایک نظرمیں ۴۱۶
درس نمبر۱۹۳ تشریح آیات ۶۳-- تا-- ۷۳ .... ۴۱۷

سورہ السباء ۔ ۳۴

سورۃ السباء ایک نظرمیں ۴۲۶
درس نمبر۱۹۴ تشریح آیات ۱-- تا-- ۹ .... ۴۳۵
درس نمبر۱۹۵ ایک نظرمیں ۴۴۴
درس نمبر۱۹۵ تشریح آیات ۱۰-- تا-- ۲۱ .... ۴۴۵
درس نمبر۱۹۶ ایک نظرمیں ۴۵۶
درس نمبر۱۹۶ تشریح آیات ۲۲-- تا-- ۲۷ .... ۴۵۷
درس نمبر۱۹۷ ایک نظرمیں ۴۶۳
درس نمبر۱۹۷ تشریح آیات ۲۸-- تا-- ۴۲ .... ۴۶۴
درس نمبر۱۹۸ ایک نظرمیں ۴۷۳
درس نمبر۱۹۸ تشریح آیات ۴۳-- تا-- ۵۴ .... ۴۷۴

سورہ فاطر ۔ ۳۵

سورۃ فاطر ایک نظرمیں ۴۸۳
درس نمبر۱۹۹ تشریح آیات ۱-- تا-- ۳ .... ۴۸۷
درس نمبر۲۰۰ ایک نظرمیں ۴۹۷
درس نمبر۲۰۰ تشریح آیات ۴-- تا-- ۸ .... ۴۹۸
درس نمبر۲۰۱ ایک نظرمیں ۵۰۳
درس نمبر۲۰۱ تشریح آیات ۹-- تا-- ۱۴ .... ۵۰۴

درس نمبر۲۰۲ ایک نظر میں ۵۱۶
درس نمبر۲۰۲ تشریح آیات ۱۵-- تا-- ۲۶ .... ۵۱۷
درس نمبر۲۰۳ ایک نظر میں ۵۲۴
درس نمبر۲۰۳ تشریح آیات ۲۷-- تا-- ۳۸ .... ۵۲۵
درس نمبر۲۰۴ ایک نظر میں ۵۳۳
درس نمبر۲۰۴ تشریح آیات ۳۹-- تا-- ۴۵ .... ۵۳۴

سورہ یٰسین ـ ۳۶

سورہ یٰسین ایک نظر میں ۵۴۴
درس نمبر۲۰۵ تشریح آیات ۱-- تا-- ۲۹ .... ۵۴۹

پارہ نمبر- ۲۳

درس نمبر۲۰۶ ایک نظر میں ۵۶۵
درس نمبر۲۰۶ تشریح آیات ۳۰-- تا-- ۶۸ .... ۵۶۶
درس نمبر۲۰۷ تشریح آیات ۶۹-- تا-- ۸۳ .... ۵۸۳

سورہ الصّٰفّٰت ـ ۳۷

سورہ الصّٰفّٰت ایک نظر میں ۵۹۲
درس نمبر۲۰۸ تشریح آیات ۱-- تا-- ۶۸ .... ۵۹۷
درس نمبر۲۰۹ تشریح آیات ۶۹-- تا-- ۱۴۸ .... ۶۱۱
درس نمبر۲۱۰ ایک نظر میں ۶۳۰
درس نمبر۲۱۰ تشریح آیات ۱۴۹-- تا-- ۱۸۲ .... ۶۳۱

سورہ ص ـ ۳۸

سورہ ص ایک نظر میں ۶۳۹
درس نمبر۲۱۱ تشریح آیات ۱-- تا-- ۱۶ .... ۶۴۴
درس نمبر۲۱۲ تشریح آیات ۱۷-- تا-- ۴۸ .... ۶۵۸

درس نمبر ۲۱۳ تشریح آیات ۴۹-- تا-- ۶۴ .... ۶۷۴
درس نمبر ۲۱۴ تشریح آیات ۶۵-- تا-- ۸۸ .... ۶۷۸

سورہ الزمر۔۳۹

سورۃ الزمر ایک نظر میں ۶۸۸
درس نمبر ۲۱۵ تشریح آیات ۱-- تا-- ۷ .... ۶۹۵
درس نمبر ۲۱۶ ایک نظر میں ۷۰۵
درس نمبر ۲۱۶ تشریح آیات ۸-- تا-- ۱۰ .... ۷۰۶
درس نمبر ۲۱۷ ایک نظر میں ۷۱۱
درس نمبر ۲۱۷ تشریح آیات ۱۱-- تا-- ۲۰ .... ۷۱۲
درس نمبر ۲۱۸ ایک نظر میں ۷۱۶
درس نمبر ۲۱۸ تشریح آیات ۲۱-- تا-- ۲۹ .... ۷۱۷

پارہ نمبر۔ ۲۴

درس نمبر ۲۱۹ ایک نظر میں ۷۲۴
درس نمبر ۲۱۹ تشریح آیات ۳۰-- تا-- ۳۵ .... ۷۲۵
درس نمبر ۲۲۰ ایک نظر میں ۷۲۹
درس نمبر ۲۲۰ تشریح آیات ۳۶-- تا-- ۵۲ .... ۷۳۰
درس نمبر ۲۲۱ ایک نظر میں ۷۴۱
درس نمبر ۲۲۱ تشریح آیات ۵۳-- تا-- ۶۱ .... ۷۴۲
درس نمبر ۲۲۲ ایک نظر میں ۷۴۶
درس نمبر ۲۲۲ تشریح آیات ۶۲-- تا-- ۷۵ .... ۷۴۷

سورہ المومن ۔ ۴۰

سورہ المومن ایک نظر میں ۷۵۴
درس نمبر ۲۲۳ تشریح آیات ۱-- تا-- ۲۰ .... ۷۶۱

درس نمبر۲۲۴ ایک نظر میں ۷۷۵
درس نمبر۲۲۴ تشریح آیات ۲۱-- تا-- ۵۵ .... ۷۷۶
درس نمبر۲۲۵ ایک نظر میں ۸۰۰
درس نمبر۲۲۵ تشریح آیات ۵۶-- تا-- ۷۷ .... ۸۰۱
درس نمبر۲۲۶ ایک نظر میں ۸۱۸
درس نمبر۲۲۶ تشریح آیات ۷۸-- تا-- ۸۵ .... ۸۱۹

سورہ حم السجدہ۔۴۱

سورہ حم السجدہ ایک نظر میں ۸۲۷
درس نمبر۲۲۷ تشریح آیات ۱-- تا-- ۳۶ .... ۸۳۴

پارہ نمبر۔ ۲۵

درس نمبر۲۲۸ ایک نظر میں ۸۶۲
درس نمبر۲۲۸ تشریح آیات ۳۷-- تا-- ۵۴ .... ۸۶۳

سورہ الشوریٰ ۔ ۴۲

سورہ الشوریٰ ایک نظر میں ۸۸۱
درس نمبر۲۲۹ تشریح آیات ۱-- تا-- ۲۴ .... ۸۸۸
درس نمبر۲۳۰ ایک نظر میں ۹۱۸
درس نمبر۲۳۰ تشریح آیات ۲۵-- تا-- ۵۳ .... ۹۱۹

سورہ الزخرف ۔ ۴۳

سورہ الزخرف ایک نظر میں ۹۴۶
درس نمبر۲۳۱ تشریح آیات ۱-- تا-- ۲۵ .... ۹۵۲
درس نمبر۲۳۲ ایک نظر میں ۹۶۶
درس نمبر۲۳۲ تشریح آیات ۲۶-- تا-- ۵۶ .... ۹۶۷

درس نمبر ۲۲۳ ایک نظر میں ۹۸۸
درس نمبر ۲۲۳ تشریح آیات ۵۷-- تا-- ۸۹ .... ۹۸۹

سورہ الدخان ـ ۴۴

سورہ الدخان ایک نظر میں ۱۰۰۶
درس نمبر ۲۲۴ تشریح آیات ۱-- تا-- ۵۹ .... ۱۰۰۹

سورہ الجاثیۃ ـ ۴۵

سورۃ الجاثیۃ ایک نظر میں ۱۰۳۲
درس نمبر ۲۲۵ تشریح آیات ۱-- تا-- ۲۳ .... ۱۰۳۸
درس نمبر ۲۲۶ ایک نظر میں ۱۰۵۶
درس نمبر ۲۲۶ تشریح آیات ۲۴-- تا-- ۳۷ .... ۱۰۵۸

پارہ نمبر- ۲۶-------- سورہ الاحقاف ـ ۴۶

سورہ الاحقاف ایک نظر میں ۱۰۶۴
درس نمبر ۲۲۷ تشریح آیات ۱-- تا-- ۱۴ .... ۱۰۷۰
درس نمبر ۲۲۸ ایک نظر میں ۱۰۸۵
درس نمبر ۲۲۸ تشریح آیات ۱۵-- تا-- ۲۰ .... ۱۰۸۶
درس نمبر ۲۲۹ ایک نظر میں ۱۰۹۵
درس نمبر ۲۲۹ تشریح آیات ۲۱-- تا-- ۲۸ .... ۱۰۹۶
درس نمبر ۲۴۰ ایک نظر میں ۱۱۰۳
درس نمبر ۲۴۰ تشریح آیات ۲۹-- تا-- ۳۵ .... ۱۱۰۴

سورہ محمد ـ ۴۷

سورۃ محمد ایک نظر میں ۱۱۱۸
درس نمبر ۲۴۱ تشریح آیات ۱-- تا-- ۱۵ .... ۱۱۲۵
درس نمبر ۲۴۲ ایک نظر میں ۱۱۴۸

درس نمبر ۲۴۲ تشریح آیات ۱۶-- تا-- ۳۱ .... ۱۱۴۹
درس نمبر ۲۴۳ ایک نظر میں ۱۱۶۱
درس نمبر ۲۴۳ تشریح آیات ۳۲-- تا-- ۳۸ .... ۱۱۶۲

سورہ الفتح ـ ۴۸

سورۃ الفتح ایک نظر میں ۱۱۷۱
درس نمبر ۲۴۴ تشریح آیات ۱-- تا-- ۱۷ .... ۱۱۸۸
درس نمبر ۲۴۵ ایک نظر میں ۱۲۰۶
درس نمبر ۲۴۵ تشریح آیات ۱۸-- تا-- ۲۹ .... ۱۲۰۷

سورہ الحجرات ـ ۴۹

سورۃ الحجرات ایک نظر میں ۱۲۲۵
درس نمبر ۲۴۶ تشریح آیات ۱-- تا-- ۱۸ .... ۱۲۳۱

سورہ ق ـ ۵۰

سورۃ ق ایک نظر میں ۱۲۶۱
درس نمبر ۲۴۷ ایک نظر میں ۱۲۶۳
درس نمبر ۲۴۷ تشریح آیات ۱-- تا-- ۱۵ .... ۱۲۶۴
درس نمبر ۲۴۸ ایک نظر میں ۱۲۷۳
درس نمبر ۲۴۸ تشریح آیات ۱۶-- تا-- ۳۵ .... ۱۲۷۴
درس نمبر ۲۴۹ ایک نظر میں ۱۲۸۲
درس نمبر ۲۴۹ تشریح آیات ۳۶-- تا-- ۴۵ .... ۱۲۸۳

سورہ الذریت ـ ۵۱

سورۃ الذریت آیات ۱ تا ۳۰ جلد ششم میں ملاحظہ فرمائیں۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ----- ۲۰

سورۃ النمل ـ ۲۷

آیات ۵۹ --- تا --- ۹۳

سورۃ القصص ـ ۲۸

آیات ۱ --- تا --- ۸۸

سورۃ العنکبوت ـ ۲۹

آیات ۱ --- تا --- ۴۴

درس نمبر ۱۷۵ ایک نظر میں

یہ سبق سورۂ نمل کا خاتمہ ہے ۔ درمیان میں حضرت موسیٰ ' حضرت داؤد ' حضرت سلیمان ' حضرت صالح اور حضرت لوط علیہم السلام کے قصص سے مختصر کڑیاں لائی گئیں ۔ یہ خاتمہ سورت کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ اسی طرح سورت کے مضمون اور موضوع کے ساتھ بھی مربوط ہے ۔ اس سورت میں قصص انبیاء میں سے جو کڑیاں لائی گئی ہیں وہ بھی سورت کے آغاز ' اختتام اور موضوع و مضمون کے ساتھ مربوط ہیں ۔ ہر قصہ اس مقصد کو ثابت کرتا ہے جو اس سورت کے پیش نظر ہے ۔

یہ سبق اللہ کی حمد کے ساتھ شروع ہوتا ہے ۔ اور ان بندگان خدا پر سلامتی بھیجی جاتی ہے جو برگزیدہ ہیں ۔ ان میں وہ انبیاء و رسل شامل ہیں جن کے قصے اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں ۔ اس حمد و سلام کے بعد پھر اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدے کا بیان شروع ہوتا ہے ۔ اس میں اس کائنات کے دلائل توحید نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے وجدانی دلائل ' بعض غیبی امور اور علامات قیامت اور پھر مشاہد قیامت اور پھر حشر و نشر کے ہولناک لمحات بیان کیے گئے ہیں ۔ جن کے اندر زمین و آسمان کی تمام مخلوق خوفزدہ ہوگی الا وہ شخص کہ جسے اللہ بچالے ۔

--- ○○○---

اس سبق میں انسان کو نفس انسانی اور اس کائنات کے کچھ مشاہدات کرائے جاتے ہیں ۔ کوئی انسان ان مشاہدات اور ان دلائل کا انکار نہیں کر سکتا ۔ اور کوئی شخص بھی ان کی کوئی تشریح اس کے سوا نہیں کر سکتا کہ ایک واحد خالق ذات موجود ہے جو نہایت مدبر اور صاحب قدرت ہے ۔

یہ مشاہدات مسلسل اور نہایت موثر ضربات کی شکل میں آتے ہیں اور انسان پر حجت تمام کرتے ہیں ' اس کے شعور کو جگاتے ہیں 'مسلسل سوالات ہیں جن کا جواب حقیقی یہی ہے کہ اللہ ۔ کون ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا؟ کون ہے جس نے آسمانوں سے پانی اتارا جس کے ذریعہ ہم نے تروتازہ باغات پیدا کیے؟ کون ہے جس نے اس زمین کو ٹھہرا رکھا ہے؟ کون ہے جس نے زمین کے اندر دریا بہائے؟ کون ہے جس نے زمین میں اونچے اونچے پہاڑ کھڑے کیے؟ کون ہے جس نے دو دریاؤں اور سمندروں کے درمیان پردے کھڑے کیے ۔ کون ہے جو ایک مضطرب شخص کی پکار سنتا ہے اور اس کی تکلیف دور کرتا ہے؟ کون ہے جو تمہیں زمین کے اندر اقتدار دے کر خلیفہ بناتا ہے؟ یہ بحر و بر کی ظلمات میں تمہیں راہ دکھانے والا کون ہے؟ پھر اپنی رحمت (بارش) سے قبل ٹھنڈی ہوا کون بھیجتا ہے؟ کون ہے جس نے یہ تخلیق کی اور پھر دوبارہ تخلیق کرے گا؟ کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سوالات مسلسل آتے ہیں اور ہر سوال کے بعد پھر ان کو جھنجھوڑا جاتا ہے کہ آیا ہے کوئی الہ اللہ کے سوا؟ چنانچہ کوئی معقول شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ کوئی الہ اللہ کے ساتھ اور بھی ہے ۔ کوئی ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن اس کے باوجود ان کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ اللہ کے

سوا اور معبودوں کی بندگی کرتے ہیں۔

یہ ضربات جو براہ راست انسان کے دل پر پڑتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ اس کائنات کی کھلی کتاب کے صفحات ہیں اور یہ ان کا شعوری وجدان ہے جسے وہ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ پھر بھی آخرت کی تکذیب کرتے ہیں اور آخرت کے معاملے میں یہ لوگ نہایت التباس کا شکار ہیں۔ چنانچہ ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ امم سابقہ نے بھی اسی طرح تکذیب کی تھی تو اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا تھا۔

یہاں سے بات پھر حشر و نشر کے ہولناک مناظر کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ دیکھیے ہر لمحے میں قارئین پھر دنیا کے اندر آ جاتے ہیں اور دوبارہ مشاہد قیامت نہایت ہی خوفناک انداز میں آتے ہیں۔ یوں انسانی دلوں کو ہلا مارا جاتا ہے اور ان کو خوب جھنجھوڑا جاتا ہے۔

اس سبق کے آخر میں ایک زبردست چوٹ لگائی جاتی ہے، جس طرح کوئی آخری بات کرتا ہے اور خوفناک نتائج سے خبردار کر کے اور آخری وارننگ دے کر اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپؐ اب ان مزاح کرنے والوں اور آخرت کا انکار کرنے والوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ آپؐ نے ان کو دلائل تکوینی کی طرف بھی متوجہ کر دیا۔ قیامت کے ہولناک مناظر بھی پیش کر دیئے۔ پس اب چھوڑ دیئے جائیں یہ لوگ تاکہ وہ اپنے فطری انجام تک پہنچ جائیں۔ کیونکہ انہوں نے اس انجام کو اپنے لیے خود پسند کیا ہے اور ان کو بتا دیا جاتا ہے کہ رسولؐ کے ذمہ جو کام ہے وہ تو محدود اور متعین ہے۔ اور رسول کے پاس جو ذرائع ہیں وہ محدود ہیں کیونکہ ڈرانے کے بعد اختیار ان کا ہے کہ وہ راہ راست کو اختیار کریں یا نہ۔

إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ وَّأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۹۱) وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْاٰنَ فَمَنِ اهْتَدٰى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُنْذِرِينَ (۹۲) (۲۷: ۹۱ - ۹۲) "اے نبیؐ کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ میں تو بس خبردار کرنے والا ہوں"۔

اور یہ سبق اسی مضمون پر ختم ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کا آغاز ہوا تھا۔ یعنی صرف اللہ کی حمد جس کا وہ اہل ہے۔ ان لوگوں کو اللہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو ان کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور جو ان کے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے خواہ ظاہر ہوں یا باطن۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ

(۲۷: ۹۳) "ان سے کہو تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ وہ عنقریب تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لو گے اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے' ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو"۔

درس نمبر ۱۷۵ تشریح آیات

۶۰ --- تا --- ۹۳

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی آللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِكُوْنَ

(۲۷: ۵۹) ''(اے نبیؐ) کہو، حمد ہے اللہ کے لیے اور سلام اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے برگزیدہ کیا۔ (ان سے پوچھو) اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک بنا رہے ہیں؟''

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کلمات سکھاتا ہے ہیں جن کے ساتھ ہر مومن کو اپنے کلام کا آغاز کرنا چاہئے۔ ہر مومن کو اپنی تقریر، اپنی تبلیغ اور اپنے مباحثے اور مکالے کا آغاز ان کلمات سے کرنا چاہئے اور اپنے کلام کا خاتمہ بھی ایسے ہی کلمات پر ہونا چاہئے۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَیُرِیْكُمْ ''کہو سب تعریف اللہ کے لیے ہے عنقریب وہ تمہیں دکھائے گا...''۔ اللہ نے اپنے بندوں پر جو انعامات کیے ہیں ان کی وجہ سے اللہ مستحق ہے کہ وہ اس کی تعریفیں کرتے رہیں اور اللہ کی نعمتوں میں سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو صحیح راہ دکھائی۔ وہ نظام بتلایا جس کے مطابق انسانوں نے زندگی گزارنی ہے۔ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی (۲۷: ۵۹) ''اور سلام اس کے ان بندوں کے لیے جنہیں اس نے برگزیدہ کیا''۔ یعنی اپنی رسالت کے لیے دعوت کے لیے اور اسلامی نظام زندگی کی تبلیغ اور اقامت کے لیے۔

اس افتتاح کے بعد اب مشرکین پر حملے شروع ہوتے ہیں اور ان کو خوب ضربات لگائی جاتی ہیں۔ ان دلوں کو جھنجوڑا جاتا ہے جو آیات الٰہیہ کا انکار کرتے ہیں۔ آغاز ایسے سوال سے کیا جاتا ہے جس کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ اس سوال کے ذریعے ان پر تنقید کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ ٹھہراتے ہیں۔ آللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِكُوْنَ

(۲۷: ۵۹) ''اللہ بہتر ہے یا وہ معبود جنہیں یہ لوگ اس کا شریک بناتے ہیں''۔

یہ جن لوگوں کو شریک بناتے ہیں وہ بت ہیں یا آستانے ہیں یا ملائکہ ہیں اور یا جن ہیں اور یہ سب چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں یا ان کے علاوہ کسی اور مخلوق کو یہ شریک کرتے ہیں۔ بہرحال ان کے معبودان باطل کسی حالت میں اللہ کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے، چہ جائیکہ وہ اللہ سے بہتر ہو جائیں۔ کوئی عقلمند آدمی ان معبودوں اور اللہ کے درمیان کوئی موازنہ نہیں کر سکتا۔ یہ سوال اپنے ان الفاظ میں گویا ان کے ساتھ ایک خوبصورت مزاح ہے اور ایک طرح کی تہدید اور توبیخ بھی ہے کیونکہ کوئی شخص اس قسم کا سوال سنجیدگی سے نہیں کر سکتا۔ نہ اس سوال کا جواب طلب کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ جواب کے انتظار سے بھی پہلے دوسرا سوال کر دیا جاتا ہے اور یہ سوال انسانوں کے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات کے بارے میں ہے 'جس کی بوقلمونیوں کو وہ رات دن مشاہدہ کرتے ہیں۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَأَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾

"بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ وہ خوشنما باغ اگائے جن کے درختوں کا اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ (نہیں) بلکہ یہی لوگ راہ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں"۔

زمین و آسمان ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو ہمارے ارد گرد قائم ہے۔کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا۔اور نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جن الہوں کو وہ پکارتا ہے ان میں سے کسی نے ان کو پیدا کیا ہے 'کیونکہ یہ لوگ تو اصنام و اوثان اور ملائکہ و شیاطین اور شجر و حجر کے پوجنے والے تھے یا پھر شمس و قمر کے پجاری تھے۔لہٰذا یہ بات بدیہی ہے کہ ان چیزوں نے اس کائنات کو پیدا نہیں کیا' بلکہ مشرکین میں ایسے بیوقوف بھی نہ تھے جو یہ دعویٰ کرتے ہوں کہ یہ کائنات خود اپنے وجود کی وجہ سے قائم ہے۔بذات خود خالق و مخلوق ہے۔اس قسم کے کم عقل صرف ہمارے ترقی یافتہ دور ہی میں پیدا ہوئے۔لہٰذا صرف یہ بات ان کے لیے کافی تھی کہ ان کو اس کائنات کی طرف متوجہ کر دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ ذرا اس کے بارے میں غور و فکر کرو۔محض یہ توجہ ہی کافی دلیل ہے' رد شرک کے لیے اور مشرکین کو لاجواب کرنے کے لیے۔اور یہ سوال انسان' ایک سوچنے والے انسان کے سامنے ہمیشہ قائم رہتا ہے کیونکہ اس کائنات کی تخلیق ایسی ہے کہ اسے کسی ذات نے ایک منصوبے اور ارادے سے پیدا کیا ہے۔اس کے اندر کسی مدبر کی تدبیر صاف نظر آتی ہے۔اس کے اصولوں کے اندر اس قدر ہم آہنگی ہے کہ یہ محض اتفاقی مخلوق معلوم نہیں ہوتی۔صرف معمولی غور کرنے ہی سے انسان اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کی خالق کوئی عظیم قوت ہے۔یہ واحد قوت ہے اور اس کی تخلیق کے آثار بتاتے ہیں کہ وہ وحدہ لاشریک ہے اور اس نے اس کائنات کو ایک زبردست منصوبے کے ساتھ بنایا ہے۔اس کائنات کے اصولوں اور اس کے قوانین میں وحدت اور تناسق پایا جاتا ہے۔لہٰذا اس کا خالق بھی ایک ہے اور وہ ایسا خالق ہے کہ اس کا ارادہ اس کائنات کی ہر چھوٹی اور بڑی چیز میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔

ذرا سوالات پر دوبارہ غور کریں۔"بھلا وہ کون ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا؟"۔"وہ کون ہے جس نے تمہارے لیے پانی برسایا؟"۔"وہ کون ہے جس نے تمہارے لیے یہ رنگ برنگے در ـ ـئے؟"۔"کیا تم ایسے درخت اگا سکتے ہو؟"۔

پانی آسمانوں سے بارش کے ذریعہ اترتا ہے ـ کوئی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا ـ اور کسی کے پاس اس کے حقیقی اسباب کے لیے اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ ایک خالق کائنات ہے جو اس کائنات کی تدبیر کر رہا ہے ـ وہی ہے جس نے اس کائنات اور اس کے اس فطری نظام کو جاری کیا ہے ـ اور اس کے جاری کردہ اس قانون قدرت کے مطابق ایک خاص مقدار میں بارش نازل ہوتی ہے ـ پھر اس بارش کے ذریعہ اس کرۂ ارض پر اس انداز اور مقدار کے مطابق زندگی پائی جاتی ہے لہٰذا یہ سب کچھ محض اتفاق کے طور پر نہیں ہوتا بلکہ یہ اتفاقات ایک خاص پیچیدہ ترتیب کے مطابق ہوتے ہیں ـ نہایت ہی طے شدہ اور مضبوط تسلسل کے ساتھ ـ جس میں زندہ مخلوق کی تمام ضروریات کو ملحوظ رکھا گیا ہے ـ خصوصاً انسان کی تو تمام ضروریات کے مطابق اس کائنات کو بنایا گیا ہے ـ اس کی تخلیق میں انسانوں کی ضروریات کو مخصوص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے ـ قرآن کہتا ہے :

وَ اَنْزَلَ لَكُمْ (۲۷ : ۶۰) "اور اس نے تمہارے لیے نازل کیا ہے" ـ قرآن کریم اس طرف بار بار اشارہ کرتا ہے کہ نازل ہونے والے اس پانی کے اندر زندہ کرنے والے اثرات ہیں ـ اس کے اندر انسان کے وجود' اس کی ضروریات اور اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے ـ قرآن انسانوں کو ان زندہ آثار کی طرف متوجہ کرتا ہے ـ جو ان کے سامنے زندہ موجود ہیں لیکن یہ لوگ ان سے غافل ہیں ـ

فَاَنْبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ (۲۷ : ۶۰) "پھر اس کے ذریعہ ہم نے وہ خوشنما باغ اگائے" ـ یعنی تروتازہ اور خوبصورت' زندہ اور خوش منظر باغ اگائے ـ باغات کو دیکھ کر انسان کے دلوں میں زندگی' خوشی اور نشاط کی لہر دوڑ جاتی ہے ـ اس حسن و جمال اور تروتازگی پر غور کرنے سے مردہ دل بھی زندہ ہو سکتے ہیں ـ پانی سے پیدا ہونے والے اس حسن و جمال کے آثار پر غور کر کے ایک زندہ دل دماغ والا انسان صانع کائنات تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور اس کی تسبیح و تمجید کر سکتا ہے ـ میں کہتا ہوں کہ ایک خوبصورت چیز کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کے تمام ماہرین فن بھی جمع ہو جائیں تو وہ ایک خوبصورت پھول بھی پیدا نہیں کر سکتے ـ اس کے اندر رنگوں کی لہریں اور امتزاج' اس کے خطوط' اس کی پتیوں کی ترتیب و تنظیم صرف ایک پھول کے اندر تخلیق و فن کا وہ کمال ہے جو معجز ہے ـ انسان کے قدیم اور جدید ترقی یافتہ فن کے اندر اس کی کوئی مثال نہیں ہے ـ رہی پورے درخت کے اندر قوت نامیہ تو یہ ایک عظیم راز ہے ـ پھر درخت کے اندر سے اس کی نسل کا تسلسل یہ وہ راز ہیں جو انسان کے لیے تو معجزہ ہیں ـ

مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا (۲۷ : ۶۰) "جن کے درختوں کا اگانا تمہارے لیے ممکن نہ تھا" ـ اور زندگی تو ابھی تک علماء کے نزدیک ایک راز ہی ہے ـ خواہ نباتات کی ہو یا حیوانات کی ـ آج تک کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ زندگی کس طرح وجود میں آ گئی یا زندہ انسان کے جسم' حیوانات کے اجسام اور درختوں کے اجسام کے اندر پائے جانے والے میٹریل کے ساتھ کس طرح وابستہ ہو گئی ـ لہٰذا زندگی کی اس تخلیق کا مقصد کہیں اور تلاش کرنا ہو گا ـ نباتات کی زندگی' اور اس کے آثار اور باغ و راغ کو پیش کر کے اور انسانی عقل کو دعوت غور و فکر دے کر اور انسان

کے قوائے مدرکہ کو تحریک دے کر اب قارئین کے سامنے ایک سوال رکھا جاتا ہے ۔

ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (۲۷ : ۶۰) "کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ بھی ہے"۔کون ہے جو اس سوال کے جواب میں ہاں کہہ سکتا ہے ۔ اقرار اور یقین اور نفی شرک کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے لیکن ایسے واضح حالات میں بھی لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ پھر بھی عجیب موقف اختیار کرتے ہیں اور وہ ایسے خالق کائنات کے ساتھ اپنے نام نہاد معبودوں کو الٰہ سمجھتے ہیں' ان کی بندگی کرتے ہیں'

بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ (۲۷ : ۶۰) "بلکہ یہ لوگ راہ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں"۔
یعدلون کا معنی یا تو یہ ہے کہ یہ برابر کرتے ہیں یعنی یہ لوگ ایسے خدا کو جو خالق کائنات اور موجد حیات ہے ۔ ان معبودوں کے برابر کرتے ہیں جن کو وہ الٰہ سمجھتے ہیں اور یا اس کے معنی ہیں عدل عن الحق یعنی یہ لوگ سچے راستے سے ایک طرف ہو کر چلتے ہیں حالانکہ حق کا راستہ بالکل واضح ہے ۔ یعنی اللہ کے ساتھ دیگر الہوں کو شریک کر کے وہ سچائی کے راستے سے ہٹ گئے جبکہ اللہ وحدہ خالق ہے ۔ دونوں مفہوموں کے اعتبار سے ان کا موقف قابل تعجب ہے جو کسی عقلمند آدمی کے لائق نہیں ہے ۔
اب ان کو ایک دوسری کائناتی حقیقت کی طرف منتقل کیا جاتا ہے ۔جس طرح پہلے تخلیق حیات اور اس کے مظاہر کی طرف متوجہ کیا گیا تھا۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۶۱﴾

"اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں' بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں"۔
اس کائنات کی پہلی حقیقت اور اس کے بارے میں پہلا سوال جو انسانی ذہن میں پیدا ہوتا ہے ۔ وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کیسے ہوئی ۔ پھر جب ہم کرۂ ارض پر ہیں' تو اس زمین کا اپنی موجودہ ہیئت پر وجود میں آنا ہمارے لیے ایک اہم سوال ہے ۔ پھر یہ کہ اس زمین کو زندگی کا مستقر اور سکون کی جگہ بنایا گیا ہے ۔ زمین کو ایسا بنایا گیا ہے کہ اس کے اندر زندگی وجود پا سکتی ہے' یہاں اسے سکون ملتا ہے اور نشوونما کے اسباب ملتے ہیں ۔ اگر اس زمین کی موجودہ شکل یہ نہ ہوتی اور شمس و قمر کے مقابلے میں اس کے موجودہ فاصلے نہ ہوتے یا اس کا حجم وہ نہ ہوتا جو ہے یا اس کے عناصر اور اس

کی فضا میں جو عناصر ہیں وہ نہ ہوتے' یا زمین کی حرکت اپنے محور کے اردگرد ذرا تیز ہوتی یا سورج کے اردگرد اس کی گردش موجودہ گردش سے زیادہ تیز ہوتی یا چاند کی گردش زمین کے گرد تیز ہوتی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے حالات جو محض اتفاق سے وجود میں نہیں آئے۔ بلکہ ایک مکمل ترتیب اور ہم آہنگی کے ساتھ وجود میں لائے گئے ہیں۔ اگر ان حالات میں سے کسی چیز میں کوئی ادنیٰ سا تغیر بھی آ جائے تو یہ زمین ''قرار'' نہ ہوتی اور نہ اس میں انسان یا کوئی اور چیز زندہ رہ سکتی۔

یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم کے پہلے مخاطب اللہ کے اس قول سے وہ باتیں نہ سمجھتے ہوں جو ہم سمجھتے ہیں : اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا (۲۷ : ۶۱) ''کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا''۔ لیکن اس قدر وہ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ یہ زمین زندگی کے لیے ایک جائے قرار ہے اور اس کے اوپر زندگی کو ممکن بنایا گیا ہے۔ وہ اس حقیقت کو ذرا اجمال کے ساتھ سمجھتے تھے اور ہم ذرا مزید تفصیلات کے ساتھ سمجھتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی مشرک بھی یہ دعویٰ نہ کر سکتا تھا کہ ان کے الٰہوں میں سے کوئی الٰہ تخلیق زمین میں اللہ کے ساتھ شریک ہے۔ پس اس آیت سے ان کے لیے یہ بات کافی تھی اور اس آیت کے معنی کے اندر علم کی وسعت کے ساتھ ساتھ اب تفصیلات کی وسعت پیدا ہو گئی اور ہوتی رہے گی۔ یہ قرآن کریم کے انداز بیان اور طرز استدلال کا معجزہ ہے کہ اس سے سائنسی اعتبار سے پسماندہ سوسائٹی بھی اسی قدر استفادہ کرتی تھی جس طرح زمانوں بعد' آج کے ترقی یافتہ لوگ کرتے ہیں۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا (۲۷ : ۶۱) ''کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے''۔ زمین کے اوپر اللہ نے جو دریا چلا رکھے ہیں وہ دراصل زندگی کے شریان ہیں۔ یہ اس کرۂ ارض کی بلندیوں سے مشرق' مغرب' شمال اور جنوب کی سمتوں میں چلتے ہیں۔ اور اپنے ساتھ سرسبزی شادابی اور نشوونما لاتے ہیں۔ ان کی تشکیل ان پانیوں سے ہوتی ہے جن کو اللہ تعالیٰ زمین میں جمع فرماتا ہے' ہر علاقے کے طبعی حالات کے مطابق' جس ذات نے اس زمین کو پیدا کیا' اس نے اس کے منصوبے میں بادلوں کی تشکیل' بارش کا نظام اور دریاؤں کا بہاؤ رکھا۔ کوئی ہے جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس نظام کی تشکیل میں خالق کائنات کے سوا کوئی اور بھی شریک ہے۔ کیا ہم نہیں دیکھتے کہ اس کرۂ ارض پر بڑے بڑے دریا بہہ رہے ہیں۔ یہ سوال ایک حقیقی سوال ہے کہ آخر کون ہے جس نے ان دریاؤں کو یوں چلایا اور بہایا۔ کیا ہے کوئی الٰہ اللہ کے ساتھ؟

وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ (۲۷ : ۶۱) ''اور اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں''۔ رواسی کے معنی اونچے پہاڑ کے ہیں۔ یہ اپنی جگہ جمے ہوئے اور زمین پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اور اکثر اوقات ان پہاڑوں ہی سے نہریں نکلتی ہیں۔ جہاں سے بارشوں کے پانی نکل کر دریاؤں کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر ان دریاؤں کی وجہ سے پہاڑی علاقوں میں شگاف اور گہرائیاں پیدا ہو کر وادیاں بن جاتی ہیں اور اونچے مقامات سے یہ دریا قوت کے ساتھ نشیبی علاقوں کی طرف چلتے ہیں۔

یہاں انداز بیان میں اونچے اور جمے ہوئے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ندیاں اور دریا دکھائے گئے ہیں۔

قرآن کی تصویر کشی کے اندر یہ طرز اداعام ہے کہ وہ ایک ہی آیت میں باہم متضاد مناظر و معانی پیش کرتا ہے ۔ یہاں بھی چلتے دریاؤں کے بعد کھڑے پہاڑ دکھائے گئے ہیں ۔

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا (۲۷ : ۶۱) "اور پانی کے دو سمندروں کے درمیان پردے حائل کر دیئے" ۔ ایک سمندر سخت نمکین کھارا اور دوسرا میٹھا اور خوشگوار ۔ دونوں کو بحرین کہا گیا ۔ بطور تغلب کیونکہ دونوں کا مشترکہ مادہ پانی ہے اور دونوں کے درمیان پردہ ایک طبعی پردہ ہوتا ہے ۔ اس طرح کہ سمندر کا پانی دریا کے پانی کے ساتھ ملتا نہیں ۔ اس طرح اسے کھارا نہیں بنا دیتا ۔ اس کی تفصیلات یوں ہیں کہ دریاؤں کی سطح سمندر کی سطح سے قدرے اونچی ہوتی ہے ۔ جب دریاؤں کا پانی سمندر میں گرتا ہے تو اس پانی کی سطح سمندر کی سطح سے اونچی ہوتی ہے ۔ یہ دریا پھر سمندر کی سطح کے اوپر دور تک چلتا رہتا ہے ۔ سمندر اس کو خراب نہیں کرتا ۔ اب اگر دریا کا یہ پانی سمندر کے پانی سے نیچے بھی ہو جائے تو وہ آپس میں ملتے نہیں ۔ اس وجہ سے کہ سمندر کا پانی دریا کے پانی کی نسبت زیادہ کثیف ہوتا ہے ۔ اس فرق کی وجہ سے دونوں پانی ایک دوسرے کے ساتھ ملتے نہیں' جدا ہی بہتے ہیں ۔ یہ ہے اللہ کی سنت اپنی اس کائنات کے اندر اور اس معجزانہ انداز میں اللہ نے اپنی اس کائنات کو بنایا ہے ۔۔۔۔ لہذا سوال یہ ہے کہ یہ معجزانہ کام کس نے کیا ۔ اللہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے ؟ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (۲۷ : ۶۱) اگر کوئی اللہ کے سوا کسی اور کی بابت ایسا دعویٰ کر سکتا ہے 'تو وہ سامنے آئے ۔ اگر نہیں تو اس کائنات کے یہ عجوبے اور یہ منصوبے دلیل ناطق ہیں کہ اس کا ایک خالق ہے اور وہ ایک ہی ہے ۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۷ : ۶۱) "بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں" ۔
یہاں بھی علم کا ذکر کیا کہ "بے علم نتوان خدا را شناخت" ۔ اور جس طرح اس سورت کے خلاصہ میں اور پارۂ سابق میں ہم نے بتایا تھا کہ اس سورت کا محور ہی علم ہے ۔ پوری سورت میں علم کی اہمیت پر زور دیا گیا ۔
اب روئے سخن مشاہد کائنات سے خود انسان کی نفسیاتی دنیا کی وادیوں کی طرف پھر جاتا ہے ۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

"کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے ؟ اور (کون ہے جو) تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے ؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (یہ کام کرنے والا) ہے ؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو" ۔
اب ان کے وجدان کو چھوا جاتا ہے ۔ ان کے نفس کے اندر موجود خلجانات کو چھیڑا جاتا ہے اور ان کی زندگی کے عملی حالات اور اہم واقعات کے دوران ان کے نفس کی کیفیات ان کے سامنے رکھی جاتی ہیں ۔ سمندر کے سفر میں جو لوگ نہایت ہی مشکل حالات میں گھر جاتے ہیں اور جہاں ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں اور بظاہر مدد کو پہنچنے والا کوئی نہیں

رہتا۔ صرف اللہ کی مدد کی امید ہوتی ہے اور تمام سہارے ختم ہو جاتے ہیں۔ انسان ہر طرف نظر دوڑاتا ہے اور کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ زمین کی کوئی قوت ان کی مدد کو نہیں پہنچ رہی ہوتی۔ انسان اپنے خیال میں جن قوتوں کے سہارے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ وہ سب قوتیں ایک ایک کر کے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ ہر وہ قوت جس سے کچھ بھی توقع تھی وہ جواب دے دیتی ہے۔ ایسے مایوس کن حالات میں پھر انسان کی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔ انسان اس قوت کی طرف متوجہ ہوتا ہے ' جو صحیح قوت ہوتی ہے۔ اب انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے حالانکہ اس سے قبل انسان اپنے نارمل حالات میں اللہ کو بھولا ہوا تھا۔ کیونکہ اب تو اللہ ہی ہے جو کسی مجبور شخص کو امداد دیتا ہے جب وہ بے سہارا ہو کر اسے پکارتا ہے اور یہ اللہ ہی ہے جو پھر اس کو مشکلات سے نکالتا ہے۔ امن و سلامتی عطا کرتا ہے اور اس مشکل سے نکالتا ہے۔

جب لوگ امن و عافیت اور خوشحالی میں ہوتے ہیں تو وہ غفلت میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ وہ ذلت باری کو بھول جاتے ہیں۔ پھر وہ زمین کی قوتوں میں کسی قوت سے نصرت و امداد طلب کرتے ہیں۔ لیکن جب سختی آتی ہے اور انتہائی کرب کے حالات میں وہ گھر جاتے ہیں تو اس وقت غفلت کے پردے اتر جاتے ہیں اور اس وقت وہ گڑگڑا کر اپنے رب کی طرف لوٹتے ہیں۔ اگرچہ وہ غافل تھے اور ہٹ دھرمی کرنے والے تھے۔

قرآن کریم منکرین اور ہٹ دھرمی کرنے والوں کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جو خود ان کی فطرت میں ہے۔ یہ بات قرآن کریم ایسے ماحول میں ان کے سامنے پیش کرتا ہے جس میں زمین و آسمان کی تخلیق ' آسمانوں سے پانی کا نزول ' زمین کے اوپر تر و تازہ باغ و راغ کی پیدائش ' اس کرۂ ارض کا قرار ' اس کے اوپر پہاڑوں کا نصب کرنا اس کے اندر دریاؤں اور نالوں کا چلانا اور بہانا اور سمندر کے اندر دو قسم کے پانیوں کے پردے حائل کرنے کے مناظر پیش کیے گئے ہیں اور پھر سمندر میں ایک مضطرب اور کربناک صورت حال پیش کر کے سمجھایا گیا کہ ایسے حالات میں تو کوئی شخص بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں پکارتا اور یہ بھی مذکورہ بالا کائناتی خالق کی طرح ایک حقیقت ہے۔ وہ حقائق کائناتی تھے اور اس کا تعلق انسان کی نفسیاتی دنیا سے ہے۔

اب ان کی نفسیات کی دنیا سے بھی باہر لا کر ' اللہ تعالیٰ ان کو ان کی زندگی کے ایک عملی حال کی طرف لاتا ہے۔

وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ (۲۷ : ۶۲) "اور تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے"۔ وہ کون ہے جس نے یہاں انسان کو پیدا کیا ' پوری مخلوقات پر فضیلت بخشی۔ اس کے بعد پھر ایک کے بعد دوسرے کو اس زمین کا اقتدار دیتا رہا۔ کسی کو زوال ہوا اور دوسرے نے کمال حاصل کیا۔ یہ گرا اور وہ اٹھا۔

کیا یہ اللہ ہی نہیں ہے کہ جس نے قوانین قدرت کے مطابق تمہیں اس زمین پر زندگی بخشی اور پھر تمہیں ایسی قوتیں عطا کیں جن کی وجہ سے تم اس کرۂ ارض پر اللہ کی خلافت کے مستحق قرار پائے اور پھر تمہیں اس عظیم منصب کے لیے یہاں تیار کیا۔ زمین کو تمہارے لیے جائے قرار بنایا۔ اور اس کی ہر چیز کو تمہاری زندگی کے لیے ممد و معاون اور ہم آہنگ بنایا کہ زمین کی ہر چیز تمہارے لیے ممد حیات بن گئی اور اگر ایسا ہوتا کہ زمین کے اہم عناصر میں سے ایک عنصر غائب کر دیا جائے تو تمام انسان کیا تمام زندہ چیزیں ایک دم میں ختم ہو کر رہ جائیں۔ اور آئندہ کے لیے بھی یہاں کسی چیز کا وجود محال ہو جائے۔

سب سے آخر میں یہ بات ہے کہ اللہ ہے وہ ذات جس نے موت و حیات کو پیدا کیا اور ایک نسل کے بعد دوسرے لوگوں کو اٹھایا۔ اگر اللہ اگلی نسلوں کو اسی طرح قائم رکھتا اور آنے والی نسلیں پیدا ہوتی چلی جاتیں تو اس کرۂ ارض پر تل دھرنے کی جگہ ہی نہ ہوتی۔ زندگی کا یہ دھارا بہت ہی سست ہوتا۔ انسانی سوچ نہایت سست رفتار ہوتی۔ کیونکہ تازہ تازہ نسلیں وجود میں آنے کے ساتھ تازہ افکار اور تازہ خیالات بھی آتے ہیں۔ لوگ نئے نئے تجربے کرتے ہیں اور زندگی کی جدوجہد میں نئی نئی کوششیں کرتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے نئے نئے طریقے دریافت کرتے ہیں اور اب تو صورت یہ ہے کہ پرانے اور نئے لوگوں کی جنگ صرف فکر و شعور کے میدان میں ہوتی ہے۔ اور اگر سابقہ لوگ بھی سب کے سب زندہ ہوتے تو پرانے اور نئے لوگوں کے درمیان جسمانی تصادم بھی ہوتا۔ اور زندگی کی گاڑی آگے بڑھنے کے بجائے باہم تضادات اور تصادمات کا شکار ہو جاتی۔

یہ تمام نفسیاتی حقائق ہیں جس طرح اس سے قبل بیان کیے جانے والے آفاقی حقائق تھے۔ کون ہے جس نے یہ حقائق پیدا کیے، تمہیں خلیفہ بنایا۔ کوئی ہے اللہ کے سوا؟ ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ (۲۷ : ۶۲) "کیا اللہ کے ساتھ ہے کوئی اور الہ"۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ حقائق کو بھول جاتے ہیں جب سمندر کی مشکلات سے نکلتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ان کی فطرت بھی سو جاتی ہے اور یہ غافل ہو جاتے ہیں حالانکہ خود ان کے نفس اور ان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں حقائق موجود ہیں۔

قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ (۲۷ : ۶۲) "تم لوگ کم ہی سوچتے ہو"۔ اگر انسان حقائق کو یاد رکھے، اور ان پر مسلسل غور کرتا رہے، تو وہ ہمیشہ اللہ کے ساتھ جڑا رہے اور فطرت کی پکار کو سنتا رہے۔ وہ کبھی اپنے رب سے غافل نہ ہو اور کبھی اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔

اس کے بعد لوگوں کی زندگی سے بعض اور حقائق پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق اس کرۂ ارض پر لوگوں کی سرگرمیوں سے ہے اور ان کے ان مشاہدات سے ہے جو ہر وقت دہرائے جاتے ہیں۔

اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَؕ۝۶۳

"اور وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوشخبری لے کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (یہ کام کرتا) ہے؟ بہت بالا و برتر ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

سب لوگ بحری سفر کرتے ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جو قرآن مجید کے مخاطب اول تھے۔ یہ لوگ بحر و بر کے راستوں میں سفر کرتے ہیں اور انہوں نے بحر و بر کی تاریکیوں میں اپنے تجربات اور علم کے مطابق سفر کیے اور کرتے ہیں۔ ان

سفروں میں وہ صحیح راستے معلوم کر لیتے ہیں ' وہ کون ہے جو ان سفروں میں انسان کو سیدھے راستے بتاتا ہے؟ کس نے انسانوں کو یہ عقل و خرد عطا کیا جس کے ذریعے وہ ان راستوں کا ادراک کرتے ہیں ۔ ستاروں کے علوم کس نے دیئے ' پھر آلات دریافت کرنے کی قوت کس نے دی ۔ اور تجربات و نشانات کس نے بتائے؟ وہ کون ذات ہے جس نے انسانی فطرت اور فطرت کائنات کے اندر ہم آہنگی پیدا کی ۔ اور انسان کے لیے فطرت کائنات تک پہنچنے کی راہ ہموار کی ۔ کون ہے جس نے کانوں کے ذریعے انسانوں کو آوازیں معلوم کرنے کی طاقت دی ۔ کون ہے جس نے آنکھ کے ذریعے انسان کو دور تک مشاہدے کی طاقت دی ۔ اور کون ہے جس نے حواس خمسہ کے ذریعے انسان کو تمام محسوسات معلوم کرنے کی توفیق دی؟ پھر انسان کو عقل کی طاقت دی جس کے ذریعے انسان حواس سے بھی زیادہ لطیف مدرکات معلوم کرتا ہے ۔ پھر حواس کے تجربات سے نتائج اخذ کرنے اور وجدان اور الہام کے ذریعہ حقائق اخذ کرنے کی قوتیں دیں ۔ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (۲۷ : ۶۳) "کیا ہے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ" ۔

وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ (۲۷ : ۶۳) "اور کون ہے جو اپنی رحمت کے آگے ہواؤں کو خوشخبری دے کر بھیجتا ہے" ۔ یہ ہوائیں جن کے فلکی اسباب کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جائے گا لیکن یہ وہ ہیں جو روز اول سے اللہ نے اس کرۂ ارض کے ساتھ پیدا کی ہیں ۔ اور جس طرح یہ چلتی ہیں روز اول سے ان کے لیے یہی منصوبہ ہے کہ یہ ایک جگہ سے بادلوں کو اپنی دوش پر لے کر چلتی ہیں اور انسانوں کو اس چیز کی خوشخبری دیتی ہیں جو ممد حیات ہے یعنی پانی ۔

سوال یہ ہے کہ یہ ہوائیں ' یہ بادل اور یہ بارش کا نظام اپنی موجودہ شکل میں کس نے تخلیق کیا؟ اور پھر ہوائیں ' ٹھنڈی ہوائیں ' بادلوں اور بارش سے قبل کون بھیجتا ہے ۔

ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (۲۷ : ۶۳) "کیا ہے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ" ۔

تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۲۷ : ۶۳) "بہت بلند اور بالا ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں" ۔

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾

"اور وہ کون ہے جو خلق کی ابتدا کرتا اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں حصہ دار) ہے؟ کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو" ۔

اس کائنات و مخلوقات کا آغاز ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کوئی نہیں کر سکتا ۔ نہ تخلیق کائنات کے مسئلے کو

اللہ وحدہ کے وجود کو تسلیم کیے بغیر حل کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کائنات کا وجود ہی اس بات کو مستلزم ہے کہ اللہ موجود ہے۔ دنیا میں جن لوگوں نے اس کائنات کے وجود کے مسئلے کو وجود باری تسلیم کرنے کے بغیر حل کرنے کی سعی کی ہے، در آں حالیکہ اس کائنات کے وجود ہی میں ایک مصمم ارادہ اور ایک قصد اور ایک منصوبہ نظر آتا ہے تو ایسے لوگ مسئلہ کائنات کے حل کرنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ اور اللہ کی وحدانیت اس لیے ثابت ہوتی ہے کہ اس کائنات کے تمام آثار کے اندر وحدت نظر آتی ہے، اس کی تدبیر ایک ہے، تقدیر ایک ہے اور اس پوری کائنات کی اسکیم میں ایک ایسا ربط اور ہم آہنگی ہے کہ اس کا ایک ہی خالق تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔

یہ تو تھا آغاز، رہا یہ معاملہ کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کی تخلیق کا دوبارہ اعادہ کرے گا تو اس بارے میں تمام کفار اور مشرکین کو خلجان تھا۔ لیکن جو شخص اس کائنات کے آغاز کے بارے میں اس نتیجے تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ ایک صاحب ارادہ وتدبیر ذات کی تخلیق ہے اور وہ اس کائنات کے اندر پائی جانے والی وحدت اور ربط کی وجہ سے ایک ہے تو اس کے لیے یہ تسلیم کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہوتی کہ وہ ذات اسے دوبارہ پیدا کرے گی تاکہ اس دنیا میں آنے والے لوگ اپنے اعمال کی جزا پوری کی پوری وہاں پائیں گے کیونکہ اس دنیا میں اچھے برے عمل پر انسان کو اگرچہ جزاء وسزا ملتی ہے مگر وہ پوری جزاء و سزا نہیں ہوتی۔ لہٰذا مکمل مکافات عمل کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا جہاں ہو جس میں مکمل جزاء وسزا ہو۔ اس کے بغیر اس دنیا کی زندگی کی تکمیل ممکن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ایک آنے والی زندگی کی تصدیق ضروری ہے جس میں مکمل ہم آہنگی، مکمل کمال نصیب ہو۔ سوال یہ ہے کہ مکافات عمل کے اصول کے مطابق جزاء وسزا اس جہاں میں کیوں نہ ہوئی۔ تو یہ ان حکمتوں کی وجہ سے جن کو خالق کائنات ہی خوب جانتا ہے۔ کیونکہ اپنی مخلوق کے تمام راز خالق ہی کے پاس ہیں۔ اور یہ وہ غائبانہ راز ہیں جن کی اطلاع اللہ نے انسان کو نہیں دی۔

یہی اصول ہے جس کے مطابق اس آیت میں سوال کیا گیا ہے کہ کس نے ابتداء اس کائنات کو پیدا کیا اور کون ہے جو دوبارہ پیدا کرے گا؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی ہے کہ کوئی نہیں ہے۔

ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (٢٧ : ٦٤) "کیا ہے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ"۔

رزق دینے کا تعلق، آغاز تخلیق سے بھی متعلق ہے اور اعادۂ تخلیق سے بھی وابستہ ہے۔ اللہ کے بندوں کے رزق کا انتظام بالکل ظاہر و باہر ہے۔ نباتات کی شکل میں اور حیوانات کی شکل میں۔ پانی اور ہوا، کھانے پینے اور سانس لینے کے لیے ضروری ہیں۔ زمین کے معدنی ذخائر اور دھاتیں بھی انسانوں کے لیے مفید اور ضروری ہیں، جن میں مقناطیسی قوت اور بجلی کی قوت بہت ہی اہم ہے۔ اس کائنات کے اندر اللہ نے انسانی زندگی کے لیے اس کے علاوہ اور بھی بے حد و حساب ایسی قوتیں رکھی ہیں جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں لیکن انسان کو ابھی تک ان کے بارے میں علم نہیں ہے۔ وقفے وقفے سے اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے بارے میں بتاتا جاتا ہے۔

آسمانوں سے انسان کو کس طرح رزق فراہم ہوتا ہے؟ دنیا میں انسان کو آسمانوں سے روشنی فراہم ہوتی ہے، حرارت فراہم ہوتی ہے، بارش فراہم ہوتی اور تمام دوسری چیزیں جن کا مرکز آسمانوں میں ہے اور قیامت میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو جو درجات بلند اور جو انعامات دے گا وہ بھی معنوی اعتبار سے ایک آسمانی رزق ہے کیونکہ قرآن بھی آسمان ارتفاع اور

بلندی سے آتا ہے اور بلندی کے لیے آتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے تخلیق اور اعادۂ تخلیق کے بعد اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ اللہ اپنی مخلوق کو آسمانوں سے رزق فراہم کرتا ہے۔اس لیے کہ آغاز تخلیق کے ساتھ زمین کے ارزاق کا واضح تعلق ہے۔تمام مخلوق زمین کے ارزاق کی وجہ سے زندہ ہیں۔اور آخرت کے ساتھ ان ارزاق کا تعلق یوں ہے کہ آخرت کی زندگی میں جزاء و سزا اسی دنیا کی زندگی پر موقوف ہے۔اور آسمانوں کے رزق کا تعلق بھی آغاز تخلیق سے واضح ہے۔دنیا میں حیات انسانی کے لیے آسمانوں کے ارزاق اور سامان زیست کی ضرورت ہے اور آخرت میں یہ انعامات انسان کے جَزَاءً وِّفَاقًا "پوری پوری جزا" کی صورت میں ہوں گے۔لہٰذا آغاز تخلیق اور زمین و آسمان کے ارزاق سے اس کا تعلق واضح ہے اور کلام الٰہی باہم حیرت انگیز انداز میں مربوط ہے۔

آغاز تخلیق اور اعادۂ تخلیق تو در حقیقت پیش پاافتادہ حقائق ہیں۔اسی طرح زمین و آسمان سے انسانوں اور تمام مخلوقات کے لیے رزق کا سامان بھی دراصل معلوم حقائق ہیں لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ان حقائق پر غور نہیں کرتے۔اس لیے قرآن نہایت زوردار اور تحدی یعنی چیلنج کے انداز میں ان کو اس طرح متوجہ کرتا ہے۔

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۷ : ۶۴) "کہو 'لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو"۔

بے شک اس وقت بھی مخالفین اس قسم کی کوئی دلیل لانے سے عاجز رہے اور آج تک کوئی اس قسم کی کوئی دلیل نہیں لا سکا۔یہ ہے نظریاتی مباحث میں قرآن کا انداز کلام۔قرآن کریم کائنات کے مناظر و مشاہد پیش کرتا ہے۔انسانی نفس کے اندر موجود حقائق کو پیش کرتا ہے۔اس طرح قرآن جو منطق پیش کرتا ہے اس کا دائرہ اس پوری کائنات تک وسیع ہوتا ہے۔انسانی فکرونظر کو پوری کائنات میں گھماتا ہے۔انسان کی فطرت کو صیقل کرتا ہے تاکہ انسانی دماغ اور انسانی فطرت خود کسی نتیجے تک پہنچ سکیں جو واضح اور سادہ ہو۔اور انسانی شعور پرجوش ہو اور اس کی وجدانی قوت اچھی طرح کام کر رہی ہو' کیونکہ دلائل تو خود انسانی نفس اور انسانی فطرت میں موجود ہیں لیکن غفلت اور نسیان کی وجہ سے انسان ان کی طرف توجہ نہیں کرتا۔اور کفر اور انکار ان دلائل پر پردے ڈال دیتے ہیں۔چنانچہ ان وجدانی اور کائناتی دلائل سے اور اپنی اس فطری منطق کے بل بوتے پر قرآن کریم انسان کو اس کائنات اور نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے عظیم حقائق تک پہنچاتا ہے۔یہ حقائق اس طرح واضح ہو جاتے ہیں کہ ان میں وہ شکوک و شبہات نہیں رہتے جو کسی خشک منطق استدلال سے بذریعہ صغریٰ وکبریٰ ثابت کیے جاتے ہیں۔اس لیے کہ یہ کتابی منطق ہم تک یونانی ثقافت کے ذریعے آئی ہے اور ہمارے علم الکلام کا حصہ بن گئی حالانکہ اس کا انداز قرآنی نہ تھا۔اس نے ہمیں قرآنی منطق سے دور کر دیا۔

انفس و آفاق کی وادیوں میں سیر کرتے ہوئے اور عقیدۂ توحید اور نفی شرک کو وجدانی طور پر ثابت کرنے کے بعد' اب قرآن کریم ہمیں اس وادی میں لے جاتا ہے جو عالم غیب کے اندر مستور ہے اور جس کے حالات صرف وہ خالق اور مدبر ہی بتا سکتا ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے یعنی یہ کہ موت کے بعد کیا ہو گا۔آخرت کس طرح ہو گی کیونکہ یہ اللہ کے غیوب میں سے ایک غیب ہے۔اور قرآنی منطق' وجدانی ہدایت اور انسانی فطرت اس کے وقوع کی شہادت دیتی ہیں اور انسان علم و ادراک کے ذریعہ اس بات کے تعین سے قاصر ہیں کہ یہ گھڑی کب آئے گی؟

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ
اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝۶۵ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۣ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۣ بَلْ
هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝۶۶ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا
لَمُخْرَجُوْنَ ۝۶۷ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ
الْاَوَّلِيْنَ ۝۶۸ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝۶۹
وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝۷۰ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا
الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۷۱ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ
تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝۷۲ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۷۳
وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝۷۴ وَمَا مِنْ غَاۗىِٕبَةٍ فِي
السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۷۵

۵
ع ۸
۱

"ان سے کہو' اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور وہ (تمہارے معبود تو یہ بھی) نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے ـ بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے' بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں' بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں ـ یہ منکرین کہتے ہیں "کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائے گا؟ یہ خبریں ہم کو بھی بہت دی گئی ہیں اور پہلے ہمارے آباؤ اجداد کو بھی دی جاتی رہی ہیں' مگر یہ بس افسانے ہی افسانے ہیں جو اگلے وقتوں سے سنتے چلے رہے ہیں" ـ کہو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہو چکا ہے ـ اے نبیؐ' ان کے حال پر رنج نہ کرو اور نہ ان کی چالوں پر دل تنگ ہو ـ ـ ـ وہ کہتے ہیں کہ "یہ دھمکی کب پوری ہو گی اگر تم سچے ہو؟" کہو کیا عجب کہ جس عذاب کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو' اس کا ایک حصہ تمہارے قریب ہی آ لگا ہو ـ حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ـ بلاشبہ تیرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں ـ آسمان و زمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی موجود نہ ہو" ـ

غیب پر ایمان لانا' موت کے بعد اٹھایا جانا اور پوری زندگی کے اعمال کا حساب و کتاب دینا اسلامی عقائد کے اندر ایک بنیادی عنصر ہے ـ اسلامی زاویہ سے زندگی کا کوئی نظام ان عقائد کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا ـ لہٰذا ہر مسلمان پر لازم

ہے کہ وہ آنے والے جہان پر ایمان لائے 'جہاں اعمال کی مکمل جزاء و سزا ہو اور عمل اور اس کی اجرت کے درمیان مکمل توازن ہو۔ یہ عقیدہ انسان کے دل میں جاگزیں ہو' انسانی نفس اس کے بارے میں حساس ہو' اور اس دنیا میں انسان کی تمام سرگرمیاں اس عقیدے پر قائم ہوں کہ اس نے آخرت میں اپنی زندگی کا پورا حساب و کتاب دینا ہے۔

انسانیت نے اپنی طویل تاریخ میں عقیدۂ آخرت کے بارے میں مختلف رسولوں کے مقابلے میں عجیب و غریب موقف اختیار کیے' حالانکہ یہ عقیدہ بہت ہی سادہ ہے اور بادی النظر میں بہت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی رسول آیا اور اس نے لوگوں کو عقیدۂ آخرت کی طرف متوجہ کیا تو لوگوں نے اس دعوت کو بہت ہی عجیب و غریب سمجھا۔ حالانکہ یہ کائنات موجود تھی' اس کے اوپر یہ رنگا رنگ حیات موجود تھی' وہ خود موجود تھے کیا ان معجزات کو پہلی مرتبہ صادر کرنا اور پیدا کرنا مشکل تھا یا دوسری مرتبہ ان کو دہرانا مشکل تھا؟ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ انسانوں نے آخرت کے بارے میں ڈرانے والوں کی دعوت سے منہ موڑا۔ وہ اس دعوت کے بارے میں بکواس کرتے رہے۔ اور کفر و انکار میں بڑھتے ہی چلے گئے۔

قیام قیامت ایک غیب ہے جسے صرف اللہ جانتا ہے' اور اس کے بارے میں علم صرف اللہ کو ہے۔ کفار نے ہمیشہ نبیوں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ قیامت کے وقوع کے وقت کا تعین کر دیں۔ جب یہ تعین نہ ہوا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا اور اسے محض پرانے وقتوں کی ایک کہانی سمجھا کہ یہ ایک بات ہے جو پرانے وقتوں سے کہی جا رہی ہے لیکن ابھی تک واقع نہیں ہوئی۔

یہاں پہلے یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارا علم آخرت کے بارے میں محدود ہے اور آخرت کا وقوع ان غیبی امور میں سے ایک ہے جن کا انسان کو علم نہیں ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (٦٥) بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ (٦٦)

(٢٧: ٦٥ - ٦٦) "ان سے کہو' اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا اور وہ (تمہارے معبود تو یہ بھی) نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے۔ بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان لوگوں سے گم ہو گیا ہے' بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں' بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں"۔

ابتدائے تخلیق سے انسان کو اس خفیہ غیب کا سامنا ہے۔ انسانی علم ایک حد سے آگے نہیں جا سکتا۔ غیب کے آگے جو پردے لٹک رہے ہیں ان سے وہ آگے نہیں جھانک سکتا۔ یہ مغیبات میں سے صرف اسی قدر علم حاصل کر سکتا ہے جس قدر اللہ تعالیٰ اسے توفیق دیتا ہے اور انسان کے لیے بھلائی اسی میں ہے کہ اللہ نے اسے مستقبل کے علوم غیبیہ سے محروم رکھا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس میں انسان کے لیے کوئی خیر دیکھتا تو وہ ضرور اسے عالم غیب کے بارے میں پورا علم عطا کر دیتا۔

اللہ نے انسان کو اس قدر قوت اور استعداد دی ہے جس کے ذریعے وہ اس دنیا میں اپنے فرائض بحیثیت خلیفۃ اللہ فی الارض پورے کر سکے۔ یہ فرائض کوئی معمولی فرائض نہیں ہیں۔ اس سے آگے اللہ نے انسان کو مزید غیبی قوتیں نہیں

دیں ـ اگر انسان کو ایسی قوت دے دی جاتی جس کے ذریعہ وہ مستقبل کے پردوں کو چاک کر کے معلومات حاصل کر سکتا تو اس کے ذریعہ اس کی ان قوتوں میں کوئی اضافہ ممکن نہ تھا ـ جن کے ذریعہ وہ یہاں بطور خلیفہ کام کر رہا ہے ـ بلکہ واقعات مستقبل کے سامنے پردوں کا نصب کرنا ہی دراصل اس شوق علم کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے ـ یوں وہ اپنے طور پر غیوب مستقبل کے لیے نقب زنی کرنے اور کھوج لگانے کی سعی کرتا رہتا ہے ـ اس طرح وہ زمین کے اندر پوشیدہ رازوں کو ڈھونڈتا ہے ـ وہ سمندر کے سینے کو چیرتا ہے ـ وہ آسمان کی فضاؤں میں دور تک دوڑتا ہے ـ وہ اس کائنات کے پوشیدہ رازوں کا انکشاف کرتا ہے ـ اور انسانوں کے لیے بھلائی کے جو راز ہیں ' ان کو وہ دریافت کرتا رہتا ہے ـ وہ زمین سے مواد اور عناصر کی تحلیل کرتا ہے ـ اس کی ترکیب اور شکل و صورت میں کیمیاوی عمل کرتا ہے اور زندگی کی انواع و اقسام اور طرز و طریقوں میں تبدیلیاں لاتا ہے ـ اور اس طرح اس زمین کی تعمیر و ترقی میں نہایت ہی اہم کردار ادا کر رہا ہے اور جن ذمہ داریوں کے ساتھ اللہ نے انسان کو منصب خلافت دیا تھا انہیں پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کر رہا ہے ـ

صرف انسان ہی کو علوم غیبیہ سے محروم نہیں کیا گیا ـ زمین و آسمان میں جس قدر مخلوق بھی ہے اسے محروم کیا گیا ہے ' خواہ ملائکہ ہیں یا جن ہیں یا دوسری کوئی مخلوق ہے جو اللہ کے علم میں ہے ـ ان سب کو علم غیب نہیں دیا گیا اس لیے کہ ان کو اس کی ضرورت ہی نہ تھی ـ اس لیے تمام غیبی علوم اور واقع ہونے والے حوادث کا علم صرف اللہ کو ہے ـ

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (۲۷ : ۶۵) ”کہو ' آسمان اور زمین میں کوئی بھی غیب کا علم نہیں رکھتا ' اللہ کے سوا “ یہ ایک قطعی نص ہے ' اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی شخص علم غیب کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ اس سلسلے میں اوہام و خرافات پر یقین کرنے کی کوئی گنجائش رہتی ہے ـ

غیب کی عمومی نفی کے بعد اب قیام قیامت کی خصوصی نفی کی جاتی ہے ـ کیونکہ عقیدۂ توحید کے بعد اہل شرک کے ساتھ مسلمانوں کا بڑا نزاع یہی تھا ـ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (۲۷ : ۶۵) ”اور وہ تو نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے “ ـ یعنی وہ لوگ جن کی پوجا تم کرتے ہو ' ان کو تو قیامت کا شعور تک نہیں ہے ـ جب ان کو قیامت کا شعور ہی نہیں تو علم کیسے ہو گا تو قیام قیامت ان مغیبات میں سے ہے جن کا علم زمین و آسمان میں کسی کو نہیں ہے بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم ہی بہت محدود ہے ـ

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ (۲۷ : ۶۶) ”بلکہ آخرت کا تو علم ہی ان سے گم ہو گیا ہے “ ـ یہ اپنے حدود میں بہت دور چلا گیا ہے اور لوگوں کا اس تک پہنچنا دور رہ گیا ہے ـ اور اس کے اور ان کے درمیان پردے حائل ہو گئے ہیں ـ

بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْهَا (۲۷ : ۶۶) ”بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں “ ـ ان لوگوں کو اس قیامت کے آنے کا یقین نہیں ہے ـ یہ تو دور کی بات ہے کہ ان کو اس کے آنے کے وقت کا کوئی علم ہو یا اس کے وقوع کے بارے میں وہ انتظار کر رہے ہیں ـ

بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْهَا (۲۷ : ۶۶) "بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں"۔ ان لوگوں کو اس قیامت کے آنے کا یقین نہیں ہے ۔ یہ تو دور کی بات ہے کہ ان کو اس کے آنے کے وقت کا کوئی علم ہو یا اس کے وقوع کے بارے میں وہ انتظار کر رہے ہیں۔

بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُونَ (۲۷ : ۶۶) "بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں"۔ یعنی وہ تو اس کے بارے میں اندھے ہیں ۔ قیامت کے حوالے سے ان کو کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی ۔ نہ اس کی نوعیت کے بارے میں وہ کچھ یاد کریں گے ۔ ان کی یہ دوری پہلی اور دوسری دوری سے بھی زیادہ ہے ۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَءِذَا كُنَّا تُرَابًا وَآبَاؤُنَا أَئِنَّا لَمُخْرَجُونَ (۲۷ : ۶۷) "یہ منکر کہتے ہیں کیا جب ہم اور ہمارے باپ دادا مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں واقعی قبروں سے نکالا جائے گا"۔ کفار کے سامنے یہی عقیدہ تھا کہ جب ہم مرجائیں گے اور قبروں میں ہمارے جسم مٹی ہو جائیں گے اور بکھر جائیں گے ۔ جیسا کہ یہ مشاہدہ ہے کہ تمام مردے دفنائے جانے کے کچھ عرصہ بعد اسی طرح ہوتے ہیں ۔ شاذ و نادر ہی جسم محفوظ رہتے ہیں ۔ جب ہم بھی ایسے ہو جائیں گے اور ہمارے آباؤ اجداد بھی ایسے ہو جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ نکالا جائے گا' زندہ کیا جائے گا جبکہ ہمارے اجسام کے ذرے مٹی میں مل چکے ہوں گے ۔ یہ تو بڑی مستبعد بات ہے ۔ وہ یہ بات کرتے ہیں اور مادہ کے بارے میں ان کا جو تصور ہے وہ ان کے لیے حیات اخروی کے تصور کو مشکل بنا رہا ہے لیکن وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ان کو پہلے بھی پیدا کیا گیا اور اس پیدائش سے قبل وہ کچھ بھی نہ تھے ۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ اس کے جسم میں جو خلیے اور جو ذرات ہیں اور جن سے ان کی زندگی کا یہ ہیکل بنا ہوا ہے ۔ یہ کہاں کہاں سے جمع ہوئے' یہ زمین کے اطراف اور سمندر کی گہرائیوں میں بکھرے ہوئے تھے اور یا اس کائنات کی فضاؤں میں اڑ رہے تھے ۔ زمین میں سے مٹی لی گئی' ہواؤں سے ذرات لیے گئے' پانی کے ذرات کہاں کہاں سے کس کس بادل نے اٹھا کر لائے' اور بعض ذرات تو سورج سے آئے ۔ پھر جو بدستور بذریعہ تنفس' نباتات نیز' حیوانات کے دودھ اور گوشت' پھر بخارات کے ذریعہ جسم میں داخل ہوتے ہیں' پینے کے ذریعے جو چیزیں جسم کا حصہ بنتی ہیں ۔ پھر سورج کی گرمی سے جو جسم اثر لیتا ہے ۔ یہ سب متفرق چیزیں جن کی تعداد تو صرف اللہ جانتا ہے ۔ یہ سب چیزیں انسانی جسم میں جمع ہو جاتی ہیں اور یہ انسان اس چھوٹے سے خوردبینی انڈے سے یہاں تک پہنچتا ہے' اور یہ انڈا رحم مادر کی دیواروں کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اور بڑا ہو کر' مر کر کفن کے اندر یہ سب اجزاء جمع ہوتے ہیں ۔ یہ تو ہے اس کی پہلی تخلیق ۔ تو اس میں کیا تعجب ہے کہ اس مخلوق کو اللہ قبر سے دوبارہ اٹھا لے ۔ لیکن وہ لوگ یہ بات بہرحال کرتے تھے اور اس قسم کے لوگوں میں سے بعض آج بھی موجود ہیں جو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں ۔ وہ یہ باتیں کرتے تھے اور اس کے بعد مزید مزاح اور ناپسندیدگی کے اظہار کے لیے وہ یہ کہتے تھے ۔

لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِن قَبْلُ إِنْ هٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (۲۷ : ۶۸)

"یہ خبریں ہم کو بھی دی گئی ہیں اور اس سے قبل ہمارے آباؤ اجداد کو بھی دی گئی ہیں لیکن یہ بس افسانے ہی افسانے ہیں جو اگلے وقتوں سے ہم سنتے چلے آرہے ہیں"۔

---ooo---

یہ لوگ جانتے تھے کہ ان سے پہلے بھی' رسولوں نے ان کے آبا کو اسی طرح قیامت سے ڈرایا ہے اور حساب و کتاب اور حشر و نشر کی بات کی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے لیے عقیدۂ آخرت بالکل ایک نیا عقیدہ نہ تھا۔ یہ نہ تھا کہ وہ بعث بعد الموت کے معنی ہی نہ سمجھتے ہوں بلکہ ان کا اعتراض یہ تھا کہ صدیوں سے یہ وعدے کیے جا رہے ہیں ان کا تحقق نہیں ہوا۔ چنانچہ اس بنا پر وہ اس عقیدے کا مذاق اڑاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ یہ پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں اور حضرت محمدؐ ان کو نقل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے غافل تھے کہ قیام قیامت کے لیے تو ایک وقت مقرر ہے۔ وہ نہ کسی کی جلد بازی کی وجہ سے جلدی آ سکتا ہے اور نہ کسی کی غفلت کی وجہ سے موخر ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک معلوم اور مقرر وقت پر ہو گا اور اس کا علم زمین و آسمان دونوں کی مخلوقات سے خفیہ رکھا گیا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے یہی کہا' جب انہوں نے آپؐ سے قیامت کے بارے میں پوچھا

ما المسئو ل عنها باعلم من السائل "اس کے بارے میں پوچھے جانے والا پوچھنے والے سے زیادہ علم نہیں رکھتا"۔

یہاں ان لوگوں کو ان لوگوں کی قتل گاہوں کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے' جو ان سے قبل ہلاک کیے گئے' جنہوں نے سچائی کا انکار کیا اور قرآن میں یہاں ان کو مجرمین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قُلْ سِيرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ (۲۷:۶۹) "کہو' ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ مجرمین کا کیا انجام ہو چکا ہے"۔ یہاں' اس ہدایت 'سیر فی الارض کے ذریعہ ان کی سوچ کے حدود کو وسیع کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انسانیت کی کوئی سوسائٹی بھی شجرۂ انسانیت سے مقطوع نہیں ہوتی۔ انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو سنن رکھے ہیں وہ سب کے لیے اٹل ہیں۔ اس سے قبل انسانی سوسائٹیوں کے مجرمین کو جو حالات درپیش ہوئے' بعد میں آنے والے بھی لازماً ان جیسے حالات ہی سے دوچار ہوں گے۔ کیونکہ اللہ کے سنن اٹل ہوتے ہیں' وہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ اور زمین میں چلنے پھرنے سے نفس انسانی کی اطلاعات کا دائرہ بہت ہی وسیع ہو جاتا ہے۔ انسان کا دماغ روشن ہو جاتا ہے اور سیر فی الارض کے دوران انسان پر ایسے لمحات آتے ہیں کہ انسان کا ضمیر روشن ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم انسانوں کو اس کائنات کے اٹل اصولوں اور سنن کی طرف بار بار متوجہ کرتا ہے۔ اور انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ ان سنن یا بالفاظ دیگر سلسلہ علت و معلول پر ذرا غور کرو' اس کی کڑیوں کو دیکھتے چلے جاؤ' تاکہ تمہاری زندگی انسانیت کی مجموعی زندگی سے وابستہ اور متصل رہے اور تمہاری سوچ کی حدود وسعت اختیار کریں۔ تمہاری سوچ محدود' تنگ اور زندگی کے دھارے سے منقطع نہ ہو۔

ان توجہات کے بعد اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان لوگوں سے اپنے ہاتھ جھاڑ دیں۔ ان کو چھوڑ دیں کہ وہ جس انجام سے دوچار ہوتے ہوں ہو جائیں۔ جس طرح تاریخ میں ان سے قبل بھی ایسے مجرمین ایسے ہی انجام سے دوچار ہوئے۔ اور یہ لوگ تحریک اسلامی کے خلاف جو مکاریاں کر رہے ہیں' کو کوئی نقصان نہ دے سکیں گی۔ نیز از روئے ہمدردی ان کے لیے پریشان بھی نہ ہوں کیونکہ آپ نے تبلیغ اور رہنمائی کا حق ادا کر دیا ہے اور ان

کو خوب سمجھا دیا ہے ۔

وَ لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ وَ لَا تَكُنْ فِیْ ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْكُرُوْنَ (۲۷ : ۷۰) "اے نبیؐ ان کے حال پر رنج نہ کرو' اور نہ ان کی چالوں پر دل تنگ ہو"۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس قدر حساس تھے اور آپ کو اپنی قوم کے برے انجام کے بارے میں کس قدر فکرمندی تھی۔ کیونکہ آپ جانتے تھے کہ جن اقوام نے تکذیب کی ان کا حشر کیا ہوا۔ اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے' اس وقت ان لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مکاری کے جال بن رکھے تھے۔ اور وہ مسلمانوں' دعوت اسلامی کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکنا چاہتے تھے اور حضورؐ اس کے بارے میں بہت ہی فکرمند تھے۔

بعث بعد الموت کے بارے میں ان کے جو خیالات تھے ان کے مزید نمونے یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ دنیا اور آخرت میں ان کو جس برے انجام سے ڈرایا جاتا تھا' وہ اس کے ساتھ مزاح کرتے تھے اور کہتے تھے۔

وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۷ : ۷۱) "وہ کہتے ہیں یہ دھمکی کب پوری ہوگی اگر تم سچے ہو"۔ یہ وہ تب کہتے تھے جب کبھی ان کو امم سابقہ کی طرح کے برے انجام سے ڈرایا جاتا تھا' جن کی بستیوں پر سے وہ رات دن گزرتے تھے مثلاً حضرت لوط کی قوم کی بستی سدوم' اور حجر میں ثمود کے آثار اور احقاف کے علاقے میں قوم عاد کے آثار اور قوم سبا کے کھنڈرات جو سیل العرم کے بعد تباہ ہوئے۔ تو یہ لوگ کہتے تھے کہ جن باتوں سے ہمیں ڈراتے ہو' متعین طور پر بتاؤ وہ عذاب کب آئے گا۔ اگر سچے ہو تو بتاؤ کہ وہ کیسا عذاب ہوگا اور کب ہوگا۔

یہاں پھر اس کا جواب بھی ویسے ہی حقارت آمیز انداز میں' نہایت ہی اختصار کے ساتھ دے دیا جاتا ہے۔

قُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۲۷ : ۷۲) "کہو کیا عجیب ہے کہ جس عذاب کی تم جلدی مچا رہے ہو اس کا ایک حصہ تمہارے قریب ہی آ لگا ہو"۔ اس طرح اللہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دل میں عذاب اور ہلاکت کے تصور سے خوف پیدا کرتے ہیں۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ یہ عذاب تمہارے اسی طرح قریب ہو اور تمہارے ساتھ لگا ہوا ہو جس طرح اونٹ پر سوار شخص کے پیچھے بیٹھا ہوا دوسرا شخص اس کے بالکل قریب ہوتا ہے۔ اور تمہیں اس کا شعور نہ ہو۔ اور اپنی غفلت اور نادانی کی وجہ سے جلدی کر رہے ہو۔ حالانکہ وہ تمہارے پیچھے بیٹھا ہوا ہے اور اچانک تمہیں پکڑ لے گا۔ ردیف کی طرف سے اس طرح اچانک پکڑے جانے سے انسان کا پورا جسم کانپ اٹھتا ہے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ یہ عذاب تمہیں پکڑ لے۔ اس حال میں کہ تم مزاح کر رہے ہو۔

کون جانتا ہے کہ مستقبل میں اور اگلے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ کیونکہ مستقبل کا غیب تو مستور ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیان پردے حائل ہیں۔ کسی کو کیا معلوم کہ پردوں کے پیچھے کیا ہے۔ بعض اوقات چند قدموں کے فاصلے پر ایک خوفناک صورت حالات ہوتی ہے۔ عقلمند شخص تو ہروقت چوکنا رہتا ہے' ڈرتا ہے اور ہروقت اور ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار رہتا ہے کہ کوئی صورت بھی پیش آسکتی ہے۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَشْكُرُوْنَ (۲۷ : ۷۳)

"حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب تو لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے"۔ اور اللہ کا فضل تو ظاہر و

باہر ہے کہ اللہ لوگوں کو مہلت دیئے جا رہا ہے اور ان سے عذاب کو موخر کر رہا ہے ۔ حالانکہ وہ قصور وار اور گناہ گار ہیں اور گناہوں پر اصرار کر رہے ہیں ۔ یہ اس لیے کہ ان کی اصلاح کی امید ابھی باقی ہے اور عذاب کو موخر کرنا تو اللہ کا فضل ہے ۔ اس کا شکر ادا کرنا چاہئے لیکن اکثر لوگ شکر ادا کرنے کے بجائے الٹا مزاح کرتے ہیں ۔ اور اپنی گمراہی میں بغیر سوچے سمجھے بڑھے چلے جا رہے ہیں ۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ (۲۷ : ۷۴) "بلاشبہ تیرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں" ۔ اللہ ان پر عذاب نہیں لاتا اور اسے موخر کرتا چلا جاتا ہے ۔ اس کے باوجود کہ وہ خوب جانتا ہے کہ اپنے سینوں میں یہ لوگ کیا چھپائے ہوئے ہیں اور کیا وہ ظاہر کر رہے ہیں ۔

اس سبق کا خاتمہ اس بات پر ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی شے اللہ سے غائب اور پوشیدہ نہیں ہے ۔

وَ مَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۲۷ : ۷۵) "آسمان اور زمین کی کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے جو ایک واضح کتاب میں لکھی ہوئی نہ ہو" ۔ فکر و خیال اب زمین و آسمان کے وسیع میدان میں چلا جاتا ہے ۔ زمین و آسمان کے اندر چھپے ہوئے بھید تو بے شمار ہیں ۔ بے شمار راز' بے شمار قوتیں' بے شمار عجوبے' سب کے سب اللہ کے علم و ناموس کے پابند ۔ کوئی چیز بھی علم الہی سے چھپی ہوئی نہیں ہے ۔ اور نہ وہ بنسبت علم الہی غائب ہے ۔ یہ حاضر و غائب تو انسانی علم کی تقسیم ہے ۔ اس سورت کی تذکیر تو علم پر ہے ۔ پوری سورت میں علم کی طرف اشارات ہیں اور اس سبق کے اختتام پر یہ آخری اشارہ ہے ۔

اللہ کے علم مطلق کے حوالے سے یہاں علم الہی نے کس طرح قرآن کریم میں فیصلہ کن اور دو ٹوک باتیں سامنے لا کر بنی اسرائیل کے وہ مسائل حل کر دیئے جس میں وہ صدیوں سے مختلف فیہ تھے ۔ یہ قرآن اللہ کے علم کا ایک حصہ اور نمونہ ہے ۔ اور اللہ کے فضل میں سے ایک فضل ہے ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک گونہ تسلی ہے کہ آپ ان لوگوں کو اللہ کے اس آخری فیصلے کی طرف بلاتے رہیں ۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾ وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَ مَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

"یہ واقعہ ہے کہ یہ قرآن بنی اسرائیل کو اکثر ان باتوں کی حقیقت بتاتا ہے جن میں وہ اختلاف رکھتے ہیں اور یہ ہدایت اور رحمت ہے' ایمان لانے والوں کے لیے ۔ یقیناً (اسی طرح) تیرا رب ان لوگوں کے درمیان بھی اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہ زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے ۔پس اے نبی اللہ پر بھروسہ کرو' یقیناً تم صریح حق پر ہو ۔ تم مردوں کو نہیں سنا سکتے' نہ ان بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو' جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں' اور نہ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو ۔ تم تو اپنی بات انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں"۔

نصاریٰ کے درمیان حضرت عیسیٰ اور آپ کی والدہ کے بارے میں شدید اختلاف رائے تھا ۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰ محض ایک انسان تھے ۔ بعض کہتے تھے اللہ نے ان کے بارے میں باپ' بیٹے اور روح القدس کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں دراصل وہ اللہ نے ذات باری کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ تو اس گروہ کے نزدیک اللہ تین اقانیم سے مرکب ہے ۔ اب' ابن اور روح القدس ۔ ابن چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے تو اللہ' جو صورت رب میں تھے' وہ روح القدس کی صورت میں اترے اور حضرت مریم میں ایک انسان کی شکل اختیار کر گئے ۔ اور یہ اللہ پھر مریم سے بصورت انسان پیدا ہوئے ۔ ایک جماعت نے کہا کہ ابن ازلی نہیں ہے' جس طرح باپ ازلی ہے ۔ ہاں وہ عالم سے قبل پیدا کر دہ ہے ۔ لہٰذا وہ رب سے کم درجے کا ہے اور رب کے تابع فرمان ہے ۔ بعض لوگوں نے کہا کہ روح القدس اقنوم نہیں ہے اور نیقیا کی مجلس منعقدہ ۳۲۵ نے یہ فیصلہ کیا اور قسطنطنیہ کی مجلس ۳۸۱ نے اس کی توثیق کی کہ ابن اور روح القدس باپ کے برابر ہیں اور یہ بھی لاہوت کی وحدت کا حصہ ہیں ۔ یہ بیٹے بھی ازل ہی میں پیدا ہوئے تھے جبکہ روح القدس رب سے نکلے ہیں ۔ اور طیطلہ کی مجلس منعقدہ ۵۸۹ نے یہ فیصلہ کیا کہ روح القدس ابن سے نکلا ہے ۔ اس نکتے پر مشرقی اور مغربی کنیسہ کے درمیان افتراق پیدا ہو گیا جو آج تک نکتہ اختلاف ہے ۔ قرآن کریم جب نازل ہوا تو اس نے ایک فیصلہ کن بات کر دی کہ وہ ایک کلمہ ہے جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور اللہ کی طرف سے روح ہے ۔ اور وہ بشر ہیں ۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۴۳:۵۹) "نہیں ہے وہ مگر ایک بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ایک مثال بنا دیا" ۔ یہ تھی وہ فیصلہ کن بات جس میں ان کے درمیان اختلاف رائے تھا ۔

اسی طرح بنی اسرائیل کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سولی پر چڑھائے جانے کے مسئلے میں بھی اختلاف ہوا ۔ بعض کا عقیدہ یہ تھا کہ آپ کو سولی پر چڑھایا گیا ۔ آپ فوت ہو گئے اور دفن کر دیئے گئے اور تین دنوں کے بعد آپ اپنی قبر سے نکلے اور آسمانوں کی طرف اٹھا لیے گئے ۔ بعض کا عقیدہ یہ تھا کہ آپ کے حواریوں میں سے ایک شخص یہوذا کو حضرت مسیح کے مشابہ بنا دیا گیا اور اس کو سولی دے دی گئی اس لیے کہ اس شخص نے حضرت مسیح کے ساتھ خیانت کی تھی اور حکومت کو آپ کی نشاندہی کی تھی اور آپ گرفتار ہو گئے تھے ۔ بعض کا عقیدہ یہ تھا کہ آپ کے ایک حواری شمعون کو آپ کا مشابہ بنا دیا گیا اور وہ گرفتار ہوئے ۔ قرآن کریم نے اصل بات بتا دی وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴:۱۵۷) "انہوں نے اسے قتل نہیں کیا اور نہ سولی پر چڑھایا' لیکن ان کو شبہ میں ڈال دیا گیا" ۔ اور دوسری

جگہ قرآن مجید نے فرمایا:

یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ (۳:۵۵) "اے عیسیٰ میں تمہیں واپس لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں پاک کرنے والا ہوں"۔ یہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں فیصلہ کن بات تھی۔

اس سے قبل یہودیوں نے بھی تورات کی شریعت کو بدل دیا تھا۔ کئی احکام میں تحریفات کر دی گئی تھیں۔ قرآن مجید آیا تو اصل شریعت بتا دی۔

وَکَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَا اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ "تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ"۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کی تاریخ اور ان کے انبیاء کے بارے میں حقائق بتائے۔ اور ان حقائق میں سے ان قصے اور کہانیوں اور افسانوں کو علیحدہ کر کے صاف کر دیا جو ان حقائق کے ساتھ انہوں نے ناحق ملا دیئے تھے۔ یہ افسانے ایسے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی نبی بھی معصوم اور پاک ہو کر نہیں نکل سکتا تھا۔ ان کے افسانوں کے چند نمونے مشہور ہیں۔ انہوں نے ابراہیم علیہ السلام پر الزام لگایا کہ انہوں نے ابومالک شاہ فلسطین اور فرعون شاہ مصر کے سامنے اپنی بیوی کو بہن کہہ کر پیش کیا۔ اور ان کے کہنے کے مطابق حضرت ابراہیم ان کی نظروں میں مقام بلند حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور حضرت یعقوبؑ جن کا نام اسرائیل تھا، انہوں نے خود اپنے باپ اسحاق سے، حضرت ابراہیم کی برکات حیلہ سازی، جھوٹ اور چوری کے طور پر حاصل کیں۔ جبکہ یہ تبرکات ان کے بڑے بھائی عیصو کی ملکیت تھیں۔ اور حضرت لوط کے بارے میں ان کی روایات یہ ہیں کہ ان کی دو بیٹیوں نے ان کو شراب میں مدہوش کر کے ان کے ساتھ ہم بستری کی تاکہ اس طرح ان کے بطن سے نرینہ اولاد پیدا ہو اور ان کی میراث اوروں کے پاس نہ چلی جائے اور جس طرح ان لڑکیوں نے چاہا ایسا ہی ہوا۔ اور داؤد نے اپنے محل میں ایک خوبصورت عورت کو دیکھا اور معلوم ہوا کہ وہ ان کے فوجی کی بیوی ہے۔ پھر اس فوجی کو انہوں نے ایک ہلاکت آفرین مہم میں بھیجا تاکہ وہ بیوی کو حاصل کر سکیں۔ اور سلیمان بعل کی عبادت کی طرف مائل ہو گئے۔ محض اپنی عورتوں میں سے ایک عورت کو خوش کرنے کے لیے، کیونکہ ان کو اس کے ساتھ محبت تھی اور وہ اس کے مطالبے کو رد نہ کر سکتے تھے۔ یہ تھے ان کے الزامات اپنے پیغمبروں پر۔

اور جب قرآن کریم نازل ہوا تو اللہ نے تمام پیغمبروں کی صفائی بیان کی اور ان اوہام اور افسانوں کو پیغمبروں کی سیرتوں سے نکال دیا۔ کیونکہ یہ اوہام یہود و نصاریٰ نے خود اپنی کتابوں کے اندر داخل کر دیئے تھے۔ خصوصاً قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی ذات کے ساتھ منسوب تمام غلط باتوں کی نفی کی اور وہ صحیح تعلیمات بیان کر دیں جو اللہ کی طرف سے تھیں۔ اس مفہوم میں اس قرآن کو سابقہ کتب کے لیے مہیمن کہا گیا ہے کہ وہ

سابقہ کتب کے اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے اور تمام اختلافی اور جدلیاتی ملکوتی مسائل میں فیصلہ کن بات کرتا ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۲۷:۷۷) "اور یہ ہدایت و رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے"۔ یہ وہ ہدایت ہے جو اہل ایمان کو ضلالت اور اختلاف سے بچاتا ہے۔ ان کو ایک منہاج حیات دیتا ہے۔ زندگی کی راہ میں ان کے ساتھ معاونت کرتا ہے اور ان کو ایسی تعلیمات اور نظریات دیتا ہے جو اس پوری کائنات میں موجود سنن الہیہ سے ہم آہنگ ہیں۔ اور یہ قرآن ہدایت کے ساتھ رحمت بھی ہے۔ انسانوں کو شک' بے چینی اور پریشانی اور بے یقینی سے نجات دیتا ہے۔ اور انسان کو ایسے کچے نظریات سے بچاتا ہے جو آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ پائے چوبیں رکھتے ہیں اور اپنے حال پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اس کی تعلیمات انسان کو مطمئن کر کے اللہ کے جوار رحمت اور بارگاہ سکون تک پہنچاتی ہیں۔ اس طرح انسان اپنے ماحول' اپنی سوسائٹی اور خود اپنے افکار کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور آشتی کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور آخرت میں اللہ کی رضامندی اور عظیم ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔

انسانی نفس کی تربیت اور از سرنو قوانین فطرت کے مطابق اس کی تشکیل و تصقیل کے معاملے میں قرآنی طریق کار ایک منفرد طریق کار ہے۔ اس طریق کار کے مطابق انسان اپنی زندگی ان قوانین فطرت کے مطابق گزارتا ہے جو خود اس کائنات میں بھی جاری و ساری ہیں اور اس طرح انسان کی زندگی نہایت سکون کے ساتھ 'فطری انداز میں گزرتی ہے۔ اس میں کوئی تکلف اور بناوٹ نہیں ہوتی۔ اسلامی منہاج تربیت کے نتیجے میں انسان اپنی زندگی کی گہرائیوں تک میں اطمینان محسوس کرتا ہے اور یہ بہت بڑی دولت ہوتی ہے۔ اور یہ اطمینان ات اس وجہ سے حاصل ہوتا ہے کہ اسلامی نظام تربیت کے مطابق انسان کی زندگی قوانین فطرت کے ساتھ متصادم نہیں ہوتی اور نہ انسان قوانین فطرت اور ان کے مطابق چلنے والی اس کائنات سے متصادم ہوتا ہے' نہ انسانی اخلاقیات ان قوانین فطرت سے متصادم ہوتی ہیں۔ بشرطیکہ انسان قوانین فطرت اور نوامیس کو اچھی طرح معلوم کر سکے اور وہ مقامات معلوم کر لے جہاں انسانی شخصیت اور اس کائنات کے درمیان باہم اتصال ہوتا ہے۔ اور انسان اس نتیجے تک پہنچ جائے کہ انسانی فطرت اور کائناتی فطرت اور اسلامی نظام زندگی کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ وہ باہم متناسب اور ہم آہنگ ہیں۔ یہ ہے وہ عظیم سلامتی جو انسانی شخصیت' اور انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی اس عظیم کائنات کے درمیان قائم ہوتی ہے اور اس سلامتی کے نتیجے میں انسانی سوسائٹی نہایت ہی پرسکون زندگی بسر کرتی ہے۔ اور یہ ہے وہ رحمت جس کی طرف قرآن کریم اشارہ کرتا ہے۔ یہ رحمت الہیہ کا وسیع تر مفہوم ہے۔

ان اشارات کے بعد کہ قرآن کریم بنی اسرائیل کے بیشتر نظریاتی مسائل کو حل کرتا ہے' ان کے اختلافات کو دور کرتا ہے اور اہل ایمان کو ایک فطری نظام زندگی دے کر ان کو عظیم سکون اور سلامتی عطا کرتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دیتا ہے کہ آپ کی قوم آپ کے ساتھ ناحق مجادلہ کر رہی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی عنقریب اللہ کر دے گا۔ ایسا فیصلہ جسے کوئی رد نہ کر سکے گا۔ کیونکہ اللہ کے فیصلے حقائق اور صحیح علم پر مبنی ہوتے ہیں۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ (۲۷:۷۹) "پس اے نبیؐ' اللہ پر بھروسہ رکھو یقیناً تم صریح حق پر ہو"۔ اللہ تعالیٰ نے حق کی نصرت کرنا' حق کو غالب کرنا' اپنے اوپر اسی طرح لازم قرار دیا ہے جس

طرح اس کائنات میں اللہ کے دوسرے چلنے والے قوانین لازمی اور اٹل ہیں ۔ یہ قوانین رکتے نہیں' اسی طرح حق بھی غالب آتا ہے لیکن اللہ کی بعض پوشیدہ حکمتوں کی وجہ سے کبھی کبھار یہ غلبہ دیر سے آتا ہے اور ان حکمتوں کو اللہ ہی جانتا ہے ۔ کچھ مقاصد ہوتے جن کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے لیکن یہ سنت پوری ہو کر رہتی ہیں اور آخر کار حق کو غلبہ نصیب ہوتا ہے ۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی ۔ انسان کا ایمان اس وقت تک پورا اور مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس سنت کے اٹل ہونے پر ایمان نہ لائے ۔ مطلب یہ ہے کہ حق کی کامیابی کے لیے اللہ کے ہاں ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور اس سے قبل یہ کامیابی نہیں آ سکتی ۔ انسان اگر جلدی کرتے ہیں تو یہ اس کی غلطی ہو گی ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے بڑی مشکلات درپیش تھیں' بات بات پر وہ جھگڑتے تھے 'کٹ حجتی اور ہٹ دھرمی کرتے تھے ۔ محض عناد کی وجہ سے بادی النظر چیزوں کو بھی نہ مانتے تھے ۔ حضورؐ کی جدوجہد اور نہایت ہی واضح بیان و تبلیغ کے بعد بھی وہ کفر پر اصرار کر رہے تھے ۔ قرآن کریم کے بار بار کے خطاب کو نظرانداز کر رہے تھے ۔ ان سب باتوں پر آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپؐ نے تو تبلیغ کا حق ادا کر دیا ہے 'کوئی قصور نہیں کیا ہے' لیکن بات کو وہ لوگ سنتے ہیں جو زندہ ہوں اور ان کے کانوں کے پردے حساس ہوں ۔ مردے تو کبھی سنا نہیں کرتے ۔ مردوں کا دماغ مر چکا ہوتا ہے اور وہ غور و فکر سے عاری ہو جاتے ہیں ۔ اس لیے مردے نہ ایمان لاتے ہیں اور نہ سنتے ہیں ۔ بس آپ کی قوم کے دل و دماغ مر چکے ہیں ۔ لہٰذا ان کو سنانا اب نہ سنانے کے برابر ہو گیا ہے ۔ ہدایت پر آنے کی ان کے سامنے کوئی سبیل باقی نہیں ہے ۔ اب چھوڑ دیں ان کو اپنی گمراہی اور سرکشی اور بے راہ روی پر ۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ (۸۰) وَ مَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ

(۸۱) (۲۷: ۸۰ – ۸۱) "تم مردوں کو نہیں سنا سکتے' نہ ان بہروں تک اپنی پکار پہنچا سکتے ہو' جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں' اور نہ اندھوں کو راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہو ۔ تم تو اپنی بات انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں" ۔

قرآن کریم نے نہایت ہی عجیب انداز میں ان لوگوں کی نظریاتی اور نفسیاتی حالت کی تصویر کشی کی ہے ۔ چنانچہ غیر محسوس معانی کو محسوس شکل دے دی ہے ۔ قلبی جمود' روح کی مردنی' کند ذہنی اور شعور کی گراوٹ کو یوں بیان کیا ہے کہ گویا یہ لوگ مردے ہیں اور بہرے ہیں اور رسول ان کو پکار رہا ہے ۔ یہ نہیں سنتے' نہ جواب دیتے ہیں ۔ کیونکہ مردے نہ سنتے ہیں' نہ ان کو شعور ہوتا ہے اور نہ جواب دے سکتے ہیں ۔ ایک دوسری محسوس صورت یوں ہے کہ ایک شخص بہرا ہے ۔ بالکل نہیں سنتا اور پکار والے کی طرف اس کا رخ بھی نہیں ہے ۔ بلکہ وہ مخالف سمت پر جا رہا ہے ۔ ایسے شخص کو لاکھ پکارو وہ نہ سنے گا ۔ کبھی قرآن ان کو اس شکل میں لاتا ہے جس طرح اندھا ہوتا ہے ۔ ایک اندھا شخص راہ راست پر کیسے جا سکتا ہے ۔ جب اسے اگلے قدم پر کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی ۔ ان آیات میں ان تمام صورتوں کو نہایت ہی مجسم و مشخص صورت میں پیش کر دیا گیا ہے ۔

اب ان مردوں' بہروں اور اندھوں کے مقابلے میں اہل ایمان ہیں ۔ یہ زندہ ہیں' یہ سنتے ہیں' یہ دیکھتے ہیں ۔

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲۷ : ۸۱) "آپ اپنی بات انہی کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں اور پھر فرماں بردار بن جاتے ہیں"۔ یعنی جن لوگوں کے اندر زندگی' قوت سامعہ اور قوت باصرہ ہے ۔ آپ انہی کو سنا سکتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کو سنائیں ۔ یہ علامات زندگی ہیں اور شعور زندہ لوگوں میں ہوتا ہے ۔ سننے والے اور دیکھنے والے ہی دعوت کو قبول کر سکتے ہیں اور یہ اہل ایمان ہی ہیں جن کے اندر حیات' سماعت اور بصارت پائی جاتی ہے ۔ ان لوگوں پر رسول اللہؐ نے کام کیا ۔ انہوں نے دعوت کو قبول کیا اور سر تسلیم خم کر دیا ۔

اسلام بہت ہی سادہ اور قریب الفہم دین ہے ۔ فطرت سلیم کے بہت ہی قریب ہے ۔ قلب سلیم اور فطرت سلیم دعوت اسلامی کو پاتے ہی قبول کرتے ہیں اور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں ۔ وہ پھر قیل و قال اور جدل و جدال میں نہیں پڑتے ۔ یہی تصویر ہے اہل ایمان کی اور ایسے ہی لوگوں کو دعوت دینا چاہئے ۔ ایسے لوگ دعوت کو سنتے ہی اس کی طرف لپکتے ہیں اور فوراً ایمان لاتے ہیں ۔ مردوں کو اپنی جگہ پر چھوڑ کر داعی کو ایسے لوگوں تک پہنچنا چاہئے جو قبولیت کے لیے تیار ہوں ۔

اب علامات قیامت کے موضوع پر اور قیامت کے بعض مناظر کی طرف بات نکلتی ہے ۔ اور اس کے بعد اس سورت پر آخری تبصرہ ہو گا ۔ ایک ایسا دابۃ الارض جو ان لوگوں کے ساتھ ہمکلام ہو گا' جو اللہ کی تکوینی آیات کو نہیں مانتے ۔ اس کے بعد حشر و نشر کا منظر جہاں یہ تکذیب کرنے والے اور جدل و جدال کرنے والے نہایت ہی خاموشی کے ساتھ چپ چاپ کھڑے ہوں گے ۔ پھر یہاں دنیا کی آیات و نشانات مثلاً گردش لیل و نہار کے مناظر کی طرف بھی انسان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آیا ان سے بڑا معجزہ بھی کوئی ہو سکتا ہے ۔ لیکن لوگ ان سے غافل ہیں ۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ جب صور پھونکا جائے گا تو یہ لوگ عظیم جزع و فزع میں مبتلا ہوں گے اور چیخ و پکار کریں گے مگر بے فائدہ ۔ جب پہاڑ چل پڑیں گے اور یہ فضائے کائنات میں بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے ۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اس جزع و فزع اور خوف و ہراس سے متاثر نہ ہوں گے اور بالکل مطمئن کھڑے ہوں گے اور کچھ دوسرے نہایت ہی دہشت زدہ سرنگوں ہوں گے ۔ اور اسی حالت میں جہنم کے اندر گرا دیئے جائیں گے ۔

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ۝ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَيَوْمَ

۶ ۱۶ع ۲

يُنفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَن شَاءَ اللّٰهُ ۚ وَكُلٌّ أَتَوْهُ دٰخِرِينَ ﴿٨٧﴾ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۚ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ ﴿٨٨﴾ مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا وَهُم مِّن فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ ﴿٨٩﴾ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٩٠﴾

"اور جب ہماری بات پوری ہونے کا وقت ان پر آ پہنچے گا تو ہم ان کے لیے ایک جانور زمین سے نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے' اور ذرا تصور کرو اس دن کا جب ہم ہر امت میں سے ایک فوج کی فوج ان لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے' پھر ان کو (ان کی اقسام کے لحاظ سے درجہ بدرجہ) مرتب کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب سب آ جائیں گے' تو (ان کا رب ان سے) پوچھے گا کہ "تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا؟ اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے؟" اور ان کے ظلم کی وجہ سے عذاب کا وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا' تب وہ کچھ بھی نہ بول سکیں گے۔ کیا ان کو سجھائی نہ دیتا تھا کہ ہم نے رات ان کے لیے سکون حاصل کرنے کو بنائی تھی اور دن کو روشن کیا تھا؟ اس میں بہت نشانیاں تھیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے تھے۔ اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہول کھا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں --- سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ اس ہول سے بچانا چاہے گا --- اور سب کان دبائے اس کے حضور حاضر ہو جائیں گے۔ آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں' مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے' یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہو گا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو۔ جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اسے اس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے' اور جو برائی لیے ہوئے آئے گا' ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے۔ کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو؟"

زمین سے جانور نکالنے کا ذکر بعض احادیث میں آتا ہے۔ لیکن ان صحیح روایات میں اس جانور کی تفصیلات و صفات نہیں ہیں۔ جن روایات میں اس جانور کی کچھ صفات بیان ہوئی ہیں۔ وہ حد صحت تک پہنچی ہوئی نہیں ہیں' لہٰذا ہم یہاں ان صفات سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ کسی جانور کا طول اگر ساٹھ گز ہو یا اس کا روئیں والا ہونا' یا داڑھی والا ہونا' یا اس کا سر بیل جیسا ہونا' یا اس کی آنکھیں خنزیر جیسی ہونا' یا اس کے کان ہاتھی جیسے ہونا یا اس کے سینگ بارہ سنگے یا اس کی گردن آہو کی طرح ہونا اور اس کا سینہ شیر کی طرح ہونا اور اس کا رنگ چیتے کی طرح ہونا اور اس کے دونوں پہلو بلی کی طرح ہونا اور اس کی دم دنبے کی طرح ہونا' اس کے پاؤں اونٹ کی طرح ہونا اور پروں اور کھروں والا ہونا کوئی اہم بات نہیں ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جن میں مفسرین پریشان ہوئے۔

بس ہمیں چاہئے کہ قرآنی نص اور صحیح احادیث پر اکتفاء کریں اور یہ عقیدہ رکھیں کہ علامات قیامت میں سے ایک یہ ہے کہ اس قسم کا جانور نکلے گا اور یہ اس وقت ہو گا جب توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اس وقت جو لوگ ہوں گے ان پر فیصلہ اٹل ہو جائے گا اور اب ان کے لیے توبہ کرنے کا کوئی موقعہ نہ ہو گا۔ بس اب جو لوگ جس حالت اور جس عقیدے پر ہوں گے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اس وقت یہ جانور نکلے گا۔ یہ ان کے ساتھ بات کرے گا جبکہ عموماً جانور بات نہیں کرتے یا ہم لوگ ان کی باتوں کو نہیں سمجھتے۔ لیکن آج سب لوگ اس جانور کی بات سمجھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ یہ وہ معجزہ ہے جسے قیامت سے قبل آنا تھا۔ اس سے قبل وہ آیات الٰہیہ پر ایمان نہ لاتے تھے۔ نہ ان کی تصدیق کرتے تھے اور نہ قیامت کی تصدیق کرتے تھے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ سورت نمل میں ایسے مشاہدات و عجائبات کا ذکر ہے مثلاً حشرات الارض کی آپس میں گفتگو' طیور کی گفتگو' جنوں کی گفتگو' اور سلیمان علیہ السلام کا ان کی گفتگو سمجھنا۔ اسی ضمن میں دابۃ الارض اور لوگوں کے ساتھ اس کی گفتگو' مضمون کلام کی ہم آہنگی کا اظہار ہے۔ اس طرح قرآن کریم ہر سورت میں مناظر' مثالیں اور مضامین و مفاہیم و معانی بھی باہم متناسب اور ہم آہنگ لے کر آتا ہے۔ (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی)

اب علامت قیامت دَآبَۃَ الْاَرْضِ کے بیان کے بعد' بات خود مناظر قیامت میں داخل ہوتی ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (۲۷ : ۸۳)

"اور ذرا تصور کرو اس دن کا جب ہم ہر امت میں سے ایک فوج کی فوج ان لوگوں کی گھیر لائیں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے پھر ان کو مرتب کیا جائے گا"۔ تمام لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ اللہ کی مرضی یوں اس لیے ہوئی کہ وہ مکذبین کے موقف کو واضح کر دے۔ يُوْزَعُوْنَ کے معنی ہیں کہ ان سب کو ایک نظم کے ساتھ چلایا جائے گا' ان کا اپنا کوئی اختیار و ارادہ نہ ہو گا اور نہ وہ اپنی مرضی سے کسی طرح جا سکیں گے۔

حَتّٰى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

(۲۷ : ۸۴) "یہاں تک کہ جب سب آ جائیں گے تو وہ پوچھے گا: تم نے میری آیات کو جھٹلا دیا حالانکہ تم نے ان کا علمی احاطہ نہ کیا تھا؟ اگر یہ نہیں تو اور تم کیا کر رہے تھے؟" پہلا سوال تو ان کو شرمندہ کرنے اور ملامت کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ بات تو معلوم و معروف تھی کہ انہوں نے تکذیب کی تھی۔ رہا دوسرا سوال تو وہ ان کی زندگی پر ایک بھرپور طنز ہے۔ اور اس انداز خطاب کے نظائر ہر زبان میں موجود ہوتے ہیں۔ کیا تم نے تکذیب کی یا تم کیا کرتے تھے؟ کیونکہ بظاہر تمہاری زندگی کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا۔ یعنی تکذیب کے علاوہ تمہاری زندگی کا اور تو کوئی عمل معلوم نہیں ہے جبکہ تمہیں تکذیب نہ کرنا چاہئے تھی۔ ایسے سوالات کا جواب ظاہر ہوتا ہے اس لیے جواب نہیں دیا جاتا اور مخاطب خاموش رہتا ہے۔ گویا اس سوال ہی کی وجہ سے مخاطب گنگ ہو جاتا ہے اور اس سے کوئی جواب بن نہیں پاتا۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ (۲۷ : ۸۵) "اور ان کے ظلم کی وجہ سے عذاب کا وعدہ ان پر پورا ہو جائے گا تب وہ کچھ بھی بول نہ سکیں گے"۔ یعنی دنیا میں ظلم اور شرک کرنے کی وجہ سے ان

پر فیصلہ برحق ہو گیا اور اب وہ بیکار' لاجواب اور خاموش کھڑے ہیں اور یہ اس وقت ہو گا جب دابۃ الارض بات کرے گا اور لوگ بات نہ کر سکیں گے ۔ قرآن کے معجزاتی انداز کا یہ ایک پہلو ہے کہ وہ کلام کے اندر ایک حسین معنوی تقابل پیدا کرتا ہے کہ جانور بات کر رہا ہے' اس کے منہ میں زبان ہے اور یہ انسان ہو کر بھی لاکلام ہیں ۔ پھر یہاں مشاہد دنیا اور مشاہد قیامت کے درمیان بھی ایک امتزاج اور تقابل ہے ۔ کبھی دنیا کا منظر سامنے آتا ہے اور کبھی آخرت کا کیونکہ خروج دابہ دنیا کے آخری ایام میں ہو گا ۔ اور یوں فضا میں گہرا تاثر قائم ہو جاتا ہے ۔

یہاں پہلے قیامت کا منظر ہے کہ مکذبین وہاں مبہوت اور لاجواب کھڑے ہیں ۔ پھر بات دنیا کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور ان کے وجدان اور شعور کو بیدار کیا جاتا ہے اور دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ذرا اس نظام کائنات پر غور تو کریں کہ اللہ العالمین کس قدر عظیم قدرت والا ہے کہ تمہارے لیے وہ تمام اسباب حیات مہیا کرتا ہے ۔ تمہارے لیے دنیا میں راحت اور آرام کے اسباب مہیا کرتا ہے ۔ اس نے پوری کائنات کو اس طرح سازگار بنایا ہے کہ اس کے اندر تمہاری زندگی نہایت خوش و خرم گزر رہی ہے ۔ یہ کائنات اور اس کی قوتیں مد حیات ہیں 'مضر حیات نہیں ہیں ۔ وہ حیات انسانی کے لیے معاون ہیں ۔ اس کے ساتھ بر سر پیکار نہیں ہیں ۔

اَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّیْلَ لِیَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۲۷ : ۸۶) "کیا ان کو سجھائی نہ دیتا تھا کہ ہم نے رات ان کے لیے سکون حاصل کرنے کو بنائی تھی اور دن کو روشن کیا تھا؟ اس میں بہت نشانیاں تھیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے تھے" ۔ رات کا منظر بالکل پرسکون اور خاموش ہے اور دن روشن اور گویا ہے ۔ اور یہ منظر اس قابل ہیں کہ انسان کے اندر ایک ایسا شعور اور وجدان پیدا کریں جو اسے اللہ سے ملا دے ۔ جو رات اور دن کو گردش میں لانے والا ہے ۔ رات اور دن کا منظر تو دراصل دو کائناتی شواہد ہیں اور ان لوگوں کے لیے کافی ہیں جو ایمان لانا چاہیں لیکن وہ ایمان نہیں لاتے ۔

اگر رات نہ ہوتی تو تمام زمانہ دن پر مشتمل ہوتا اور اس کرۂ ارض پر حیات ممکن نہ ہوتی اور اسی طرح اگر مسلسل رات ہوتی تو بھی زندگی ممکن نہ ہوتی بلکہ اگر رات اور دن اپنے موجودہ وقت سے دس گنا بھی طویل ہوتے تب بھی اس کرۂ ارض پر زندگی محال ہو جاتی ۔ سورج تمام نباتات کو جلا ڈالتا ۔ اور رات تمام چیزوں کو منجمد کر کے رکھ دیتی ۔ لہٰذا گردش لیل و نہار بھی انسانوں کے لیے ذریعہ حیات ہے لیکن لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لاتے ۔

اب گردش لیل و نہار کے ان دونوں دلائل و معجزات کے منظر سے بات چشم زدن میں قیامت کے مناظر کی طرف چلی جاتی ہے ۔ ایک لمحہ پہلے انسان اس کرۂ ارض پر خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے کہ صور پھونک دیا گیا ۔ زمین و آسمانوں کے درمیان ایک بھونچال سا آ گیا ۔ تمام مخلوقات الا ماشاء اللہ خوفزدہ ہو گئی ۔ پہاڑ اپنی جگہ سے چلنے لگے' حالانکہ وہ سکون و قرار کی علامت تھے ۔ پھر اس دن لوگوں کے انجام سامنے آ گئے ۔ کسی کا انجام امن و عافیت ہوا اور کسی کا جزع و فزع اور اوندھے منہ آگ میں گرائے جانے تک پہنچا ۔

وَیَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ

وَكُلٌّ أَتَوْهُ دَاخِرِينَ (۸۷) وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ (۸۸) مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْهَا وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ (۸۹) وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۹۰)(۲۷: ۸۷ – ۹۰) ”اور کیا گزرے گی اس روز جب کہ صور پھونکا جائے گا اور ہول کھا جائیں گے وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں --- سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ اس ہول سے بچانا چاہے گا --- اور سب کان دبائے اس کے حضور حاضر ہو جائیں گے ۔ آج تو پہاڑوں کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوب جمے ہوئے ہیں 'مگر اس وقت یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے ' یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہو گا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا ہے ۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم لوگ کیا کرتے ہو ۔ جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اسے اس سے زیادہ بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے ' اور جو برائی لیے ہوئے آئے گا ' ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے ۔ کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو؟“

صور وہ نرسنگھا ہے 'جس میں قیامت کے دن پھونکا جائے گا ۔ اور یہ وہ آواز ہو گی جس سے زمین و آسمان کی تمام مخلوق خوفزدہ ہو جائے گی ۔ الا یہ کہ کسی کو اللہ اس سے مامون و محفوظ کر دے ۔ کہا گیا ہے کہ شہداء اس سے محفوظ ہوں گے ۔ تمام زندہ مخلوق بیہوش ہو جائے گی یا مر جائے گی ۔

اس کے بعد دوسری بار پھونکا جائے گا تو تمام لوگ یکدم جی اٹھیں گے ۔ وَكُلٌّ أَتَوْهُ دَاخِرِينَ (۲۷: ۸۷) ”اور سب کان دبا کر اس کے حضور حاضر ہوں گے“ ۔ یعنی نہایت مطیع فرمان ' سرخم کیے ہوئے ہوں گے ۔ اس خوف و ہراس کے ساتھ ہی افلاک کا موجودہ نظام خلل پذیر ہو جائے گا اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے ۔ تمام مدار ختم ہوں گے ۔ اور پہاڑ بادلوں کی طرح چل پڑیں گے اور بکھر جائیں گے ۔ جس طرح لوگ مشوش ہوں گے اسی طرح پہاڑ بھی مشوش ہوں گے ۔ ذی حیات اور جمادات سب میں انتشار ہو گا 'گویا پہاڑ بھی خوفزدہ ہو جائیں گے اور حیران و پریشان دوڑتے پھریں گے ۔ اور پریشان و بے قرار ہوں گے ۔ زندہ چیزوں کی طرح ان کی حرکت کی نہ سمت ہو گی نہ کوئی قرار ہو گا ۔

صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (۲۷: ۸۸) ”یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا“ ۔ سبحان اللہ 'اس کی کاریگری کی خوبصورتی اور کمال تو اس کی تمام مصنوعات سے عیاں ہے ۔ اس کا ہر کام صحیح وقت پر ہوتا ہے ' اس میں کوئی نقص 'کوئی بخت و اتفاق 'کوئی بغاوت نہیں ہے نہ اس میں اللہ نے کوئی چیز بھلا دی ہے ۔ اس نے جو چیز بھی بنائی ہے اس کے مالہ و ما علیہ کو مکمل کیا ۔ ہر چیز بامقصد بنائی ۔ ہر چھوٹی اور بڑی چیز ایک اندازے سے رکھی ۔ منصوبے اور مقاصد کے مطابق اور اس کے اندر اس قدر گہری حکمت اور دقیق منصوبہ بندی ہے کہ

سرچکرا جاتے ہیں۔ مزید تفصیلات دیکھیے سورۃ الفرقان کی آیت خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ کی تفسیر میں۔

اَنَّهٗ خَبِيْرٌ بِمَا تَفْعَلُوْنَ (۲۷ : ۸۸) "وہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو"۔ اور یہ ہے یوم الحساب، ان کاموں کا جو تم دنیا میں کرتے رہے ہو۔ اور اس دن کو اس ذات نے مقرر کیا ہے جس کی قدرت کا کرشمہ یہ پوری کائنات ہے۔ اللہ اسے اپنے وقت پر لایا ہے۔ اس میں ایک گھنٹے کی تقدیم و تاخیر ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور ہر چیز نے اس کی حکمت کے مطابق اپنا کردار ادا کرنا ہے تاکہ عمل اور مکافات عمل کی خدائی اسکیم اپنے انجام کو پہنچے۔ عمل پہلی زندگی میں ہو اور اس کا اجر و ثواب دوسری زندگی میں۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ (۲۷ : ۸۸) "یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہو گا جس نے ہر چیز کو حکمت کے ساتھ استوار کیا۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو"۔ اس خوفزدہ کرنے والے ہولناک دن میں، وہ لوگ جنہوں نے دنیا کی زندگی میں اچھے کام کیے، نہایت ہی امن و سکون میں ہوں گے۔ اور اس امن و سکون کے علاوہ ان کو جو اجر اور بدلہ ملے گا وہ بہت ہی بڑا ہو گا اور کافی و شافی ہو گا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَىِٕذٍ اٰمِنُوْنَ (۲۷ : ۸۹) "جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اسے اس سے بہتر صلہ ملے گا اور ایسے لوگ اس دن کے ہول سے محفوظ ہوں گے"۔ قیامت کے دن کے ہول سے پر امن رہنا ہی ہمارے حقیر اعمال کی پوری جزاء ہے۔ اس کے بعد جو انعامات و اکرامات ملیں گے وہ گویا انعام اور پنشن ہے۔ اس لیے کہ اہل تقویٰ دنیا میں بھی اللہ سے ڈرتے رہتے تھے لیکن دنیا میں اللہ کے خوف اور تقویٰ کے ساتھ آخرت کے ہول کو جمع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ اللہ نے اہل تقویٰ کو اس سے مستثنیٰ کیا۔ اس دن جو مخلوق بھی زمین و آسمانوں میں ہے وہ اس ہول کا شکار ہو گی ماسوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ نے بچا لیا اور یہ متقین ہوں گے۔

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ (۲۷ : ۹۰) "اور جو برائی لیے ہوئے آئے گا ایسے سب لوگ اوندھے منہ آگ میں پھینکے جائیں گے"۔ یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہے کہ لوگوں کو لا لا کر جہنم کے دہانے سے اوندھے منہ اس کے اندر گرایا جا رہا ہو گا اور اس پر مزید ان کو زجر و توبیخ بھی کی جا رہی ہو گی۔

هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۷ : ۹۰) "کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو"۔ اس سے قبل دنیا میں انہوں نے ہدایت سے منہ موڑا اور انکار کیا۔ اس لیے یہاں ان کو بطور سزا منہ کے بل آگ میں گرایا جا رہا ہے کیونکہ ان کے سامنے سچائی نہایت ہی واضح ہو کر اور کھل کر آ گئی تھی۔ اور اس طرح واضح تھی جس طرح رات اور دن واضح تھے مگر انہوں نے منہ موڑا۔

--- OOO ---

اب سورت کے آخر میں آخری ضربات ہیں۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ آپ اپنی دعوت کا خلاصہ بیان کریں۔ اپنے منہاج کار کی وضاحت کر دیں۔ طریقہ دعوت بتا دیں اور تبلیغ کر دینے اور خدا کا پیغام پہنچا دینے کے بعد اب ان کو اس انجام کے حوالے کر دیں۔ جو اللہ نے ان لوگوں کے لیے پسند فرمایا ہے اس لیے کہ انہوں نے خود

لیے اسے چنا ہے ۔ اور بات کا خاتمہ بھی اسی حمد و ثنا پر ہوتا ہے جس کے ساتھ آغاز ہوا تھا ۔

إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٩١﴾ وَأَنْ أَتْلُوَا الْقُرْآنَ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَقُلْ إِنَّمَآ أَنَا مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿٩٢﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾

۷ ۱۱ ع

۳ ”(اے نبیؐ ان سے کہو) ”مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر (مکہ) کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے ۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلم بن کر رہوں اور یہ قرآن پڑھ کر سناؤں“ ۔ اب جو ہدایت اختیار کرے گا وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ ”میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں“ ۔ ان سے کہو ’تعریف اللہ ہی کے لیے ہے‘ عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لو گے ’اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے ’ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو“ ۔

اہل عرب مکہ مکرمہ کو بیت الحرام اور حرم کو قابل احترام سمجھتے تھے اور مکہ مکرمہ اور حرم شریف کے اس احترام پر ان کی قیادت و سیادت قائم تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس اللہ کو وحدہ لاشریک نہ سمجھتے تھے جس نے اس شہر اور کعبہ کو احترام دے کر ان کو عزت بخشی تھی ۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ان کے نظریہ کو اس طرح درست فرماتے ہیں جس طرح نظریہ کو درست کرنا چاہیے ۔ وہ اعلان فرماتے ہیں کہ لوگو مجھے سب سے پہلے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے رب کی بندگی کروں جس نے اس شہر کو محترم بنایا ہے ۔ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے ۔ اللہ کی الوہیت کا پورا تصور یہاں یہ دیا جاتا ہے کہ وہ اس شہر کا مالک ہے اور اس شہر کے علاوہ بھی ہر چیز اس کی ملکیت ہے ۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ مجھے سب سے پہلے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں بھی سر تسلیم خم کر دینے والا بندہ ’مسلم بن جاؤں ۔ اس طرح کہ اس تسلیم و رضا میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو ۔ ایسا ہی مسلم وہ گروہ ہے جس پر پوری انسانی تاریخ میں دعوت اسلامی کا مدار رہا ہے ۔ جو پورے موحد اور پوری طرح سر تسلیم خم کرنے والے رہے ہیں ۔

یہ تو تھے دعوت اسلامی کے بنیادی عناصر ۔ رہا اس دعوت کا وسیلہ اور اس کا ذریعہ تو وہ تلاوت قرآن ہے ۔

وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ (۲۷ : ۹۲) ”اور یہ کہ قرآن پڑھ کر سناؤں“ ۔ قرآن دراصل دعوت اسلامی کی کتاب اول ہے ۔ یہ ہمارا دستور ہے اور ہماری کامیابی اور فلاح کا وسیلہ ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اس قرآن کے ذریعے جہاد فرمائیں بمقابلہ کفار ۔ انسانی عقل اور انسانی روح کی تربیت کے لیے اس کے اندر بہت کچھ ہے ۔ یہ نفس انسانی کے ہر پہلو کو لیتا ہے ۔ یہ انسانی شعور کے تمام طریقوں کو آزماتا ہے ۔ اس کے اندر ایسی قوت ہے کہ وہ خشک دلوں کے اندر زلزلہ پیدا کر دیتا ہے ۔ وہ انسان کے دل و دماغ کو اس قدر جھنجھوڑتا ہے کہ انہیں بے قرار کر دیتا ہے ۔

دعوت اسلامی کے لیے تو قرآن کافی و شافی ہے ـ اس کے ساتھ جہاد و قتال کو تو محض اس لیے فرض کیا گیا ہے کہ اہل ایمان کو فتنوں اور دشمنوں کے شر سے بچایا جا سکے ـ اور پوری دنیا میں قرآن کی دعوت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو ـ اور جہاد کا دوسرا مقصد ایسی قوت کا حصول ہے جس کے ذریعے شریعت بے قانون کو نافذ کیا جا سکے ـ رہی دعوت اسلامی تو اس کا ذریعہ اور وسیلہ صرف کتاب اللہ ہے ـ وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ (۲۷ : ۹۲) "مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کریم کی تلاوت کروں"ـ

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَ مَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ

(۲۷ : ۹۲) "اب جو ہدایت اختیار کرے گا، وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ میں بس خبردار کر دینے والا ہوں"ـ اس آیت میں انفرادی ذمہ داری کا اصول بیان کیا گیا ہے ـ یعنی ہدایت و ضلالت کی راہ اپنانے میں ہر شخص خود ذمہ دار ہے ـ اس انفرادی ذمہ داری کے اصول کے اندر یہ اصول کارفرما ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان بہت ہی محترم ہے ـ اور اسلام احترام آدمیت کو بہت اہمیت دیتا ہے ـ اسلام انسانوں کو حیوانوں کی طرح ہانک کر اسلام کے دائرے میں جبراً داخل نہیں کرتا ـ اسلام دعوت اسلامی کو قرآن کی شکل میں انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے ـ ان کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ـ یہ دعوت لوگوں کے دلوں پر اثر کرتی ہے ـ یہ ہے اسلام کا گہرا، عمدہ اور عمیق طریق کار ـ یہ انسانی فطرت کو اس کی گہرائیوں سے لیتا ہے جس طرح قرآن نے انسانی نفوس کی تربیت کے لیے نہایت ہی فطری منہاج اپنایا ہے ـ

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (۲۷ : ۹۳) "ان سے کہو تعریف اللہ ہی کے لیے ہے"ـ اللہ کے کمالات اور کاریگریوں سے پہلے اللہ کی تعریف ـ

سَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا (۲۷ : ۹۳) "عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انہیں پہچان لو گے"ـ اللہ نے بالکل سچ کہا، اللہ کے بندے ہر دن انفس و آفاق میں اللہ کی آیات و نشانات کو دیکھتے ہیں اور اللہ نے اس کائنات میں جو اسرار و رموز ودیعت کیے ہیں، آئے دن ان کے بارے میں انکشافات ہوتے رہتے ہیں ـ

وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲۷ : ۹۳) "اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو"ـ یہ وہ آخری ضرب ہے جو انسانی عقل و خرد کی تاروں پر اس سورت کے آخر میں لگائی جاتی ہے ـ نہایت ہی میٹھے، خوبصورت اشاراتی اور پھر نہایت ہی دو ٹوک اور خوفناک انداز بیان میں ـ اس کے بعد لوگوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اب وہ جو چاہیں کریں لیکن ان کو اس تنبیہہ کے ساتھ آزاد چھوڑا جاتا ہے ـ

وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲۷ : ۹۳) "اور تیرا رب بے خبر نہیں ہے ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو"ـ

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ------ ۲۰

سورۃ القصص ـ ۲۸

آیات ۱--- تا--- ۸۸

سورۂ قصص ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے ۔ یہ اس وقت نازل ہوئی جب مسلمان مکہ میں ایک کمزور اور قلیل جماعت کی شکل میں تھے جبکہ مشرکین مکہ شان و شوکت اور قوت و دبدبہ کے مالک تھے ۔ ان کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار تھا ۔ چنانچہ اس سورت کے پیش نظر یہ بتانا ہے کہ حقیقی قوت کیا ہے اور حقیقی اقدار کیا ہیں ۔ یہ بتاتی ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک ہی حقیقی قوت کام کر رہی ہے ۔ یہ اللہ کی قوت ہے اور اس کائنات میں ایک ہی اعلیٰ قدر ہے اور وہ ایمانی قدر ہے ۔ لہٰذا جس شخص کی پشت پر اللہ کی قوت ہو' اسے کوئی ڈر نہیں ہے ۔ اگرچہ بظاہر وہ قوت کے سرچشموں سے محروم اور خالی نظر آتا ہو اور جس شخص کے مخالف محاذ میں اللہ کی قوت کام کر رہی ہو' وہ کبھی بھی امن و سکون حاصل نہیں کر سکتا ۔ اگرچہ دنیا کی پوری قوتیں اس کی پشتیبان ہوں اور جس شخص نے ایمان کی دولت کو پا لیا تو اس نے گویا تمام بھلائیوں کو پا لیا اور جس شخص نے اس متاع کو گم کر دیا تو وہ گویا مفلس ہو گیا ۔ اب کوئی چیز اسے فائدہ نہ دے سکے گی ۔

یہی وجہ ہے کہ سورت کے آغاز میں فرعون و کلیم کی کشمکش کو لایا گیا ہے ۔ قارون اور اس کی مفلس قوم کا تذکرہ آخر میں آتا ہے ۔ حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش میں حکومت و اقتدار کی جابرانہ اور سرکش قوت کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے جو عظیم قوت ہے اور پوری قوم پر اس کی نظر ہے اور سخت احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی ہیں ۔ اس عظیم قوت کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک چھوٹے شیرخوار بچے کی شکل میں سامنے آتے ہیں ۔ جس کے پاس کوئی قوت اور طاقت نہیں ہے ۔ بلکہ اس کے زندہ بچنے کے لیے جائے پناہ بھی نہیں ہے ۔ زمین پر فرعون کو مکمل برتری حاصل ہے ۔ اس نے اپنی قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے ۔ Divide & Rule کے اصول کے مطابق ان گروہوں میں سے بنی اسرائیل کو خوب دبا کر رکھا ہے ۔ ان کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی ذبح کر دیتا ہے ۔ ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھا جاتا ہے ۔ یہ فرعون بنی اسرائیل سے ڈرتا ہے ۔ ان کی گردنوں پر سوار ہے اور اس نے ان کو غلام بنا رکھا ہے ۔ لیکن فرعون کی یہ عظیم قوت' اس کی یہ جباری و قہاری اور اس کی تمام احتیاطی تدابیر اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں ۔ وہ اپنی ان تمام قوتوں اور احتیاطوں کے باوجود موسیٰ علیہ السلام جیسے ایک ناتواں بچے کو بھی نہیں پکڑ سکتا ۔ اس لیے کہ عالم بالا کی عظیم اور حقیقی قوت اس کی نگران ہے ۔ اللہ کی عنایات اسے ہر قدم پر بچائے چلی جا رہی ہیں ۔ تمام حملے خود بخود پسپا ہو رہے ہیں ۔ فرعون اور اس کی قوتوں کی آنکھیں اندھی ہو رہی ہیں ۔ فرعون اور اس کی قوتیں اس سے مصروف اور غافل نظر آتی ہیں اور یہ لاچار بچہ خود فرعون کی کفالت میں جا پہنچتا ہے ۔

بلکہ اس کی بیوی اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے ۔ فرعون کے ہاتھ بندھ جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ کے قتل سے ہاتھ روک لیتا ہے اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے لیے وہ مصیبت فراہم کرتا ہے جس سے وہ رات ۔ ۔ ۔ دن خائف ہے ۔

دوسرے قصے میں دولت کی قدر و قیمت کو پیش کیا گیا ہے ۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ علم کی قدر و قیمت کیا

ہے - یہ دولت انسانوں کو حقیر سمجھتی ہے - قارون زیب و زینت کے ساتھ نکلا - لوگوں کو بھی معلوم تھا کہ وہ بہت مالدار ہے' اس قدر کہ قوی لوگوں کی ایک جماعت اس کے خزانوں کی چابیاں بھی بمشکل اٹھاتی تھی - پھر قارون کو علم بھی دیا گیا تھا وہ اپنے علم پر فخر کرتا تھا - اس کا یہ خیال تھا کہ وہ اس علم کے ذریعے مالدار بن گیا ہے لیکن قارون کی قوم میں سے جن لوگوں کو صحیح علم دیا گیا تھا' قارون کے خزانے اور قارون کی آرائش و زیبائش انہیں بہکا نہ سکی بلکہ وہ لوگ ایسے تھے جن کی نظریں رضائے الٰہی کے بلند مقاصد پر لگی ہوئی تھیں - وہ جانتے تھے کہ رضائے الٰہی کا حصول بہت ہی بلند مقصد ہے لیکن اس قصے میں دست قدرت سامنے آتا ہے - اس کا محل اس کی دولت سمیت زمین میں دھنس جاتا ہے - اس کا علم اور اس کی دولت اسے بالکل کوئی فائدہ نہیں دیتے - دست قدرت کی یہ مداخلت براہ راست اور کھلی مداخلت ہے - دست قدرت نے اس سے قبل فرعون کے معاملے میں ایسی ہی مداخلت کی تھی - فرعون کو غرق کر دیا گیا تھا اور وہ اور اس کے لشکری غرق ہونے والوں میں سے ہو گئے تھے -

فرعون نے بنی اسرائیل پر دست درازی کی - اور اپنی حکومتی قوت اور اقتدار اعلیٰ کے بل بوتے پر ان پر مظالم ڈھائے اور قارون نے بھی اپنی قوم پر ظلم کیا اور اپنے علم اور دولت کے بل بوتے پر لوگوں کا استحصال کیا - انجام فرعون و قارون دونوں کا ایک ہی ہوا - یہ اور اس کا محل زمین میں دھنس گئے اور وہ اور اس کی فوجیں سمندر کی نذر ہوئیں - اور زمین کی قوتوں میں سے کوئی قوت ان کی مدد کو نہ پہنچ سکی - دست قدرت نے علانیہ دونوں جگہ مداخلت کی - یوں اللہ نے ظلم اور فساد کے لیے حدود متعین کر دیئے لیکن دست قدرت نے یہ کام اس وقت کیا جب لوگ سرکشی اور فساد فی الارض کا دفعیہ کرنے سے عاجز آ گئے -

ان دونوں واقعات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب شر خالص ہو کر چھا جائے' اور فساد ہر طرف ظاہر ہو جائے' بھلائی کی راہیں مسدود ہو جائیں اور اصلاح اور نیکی کا پروگرام ناکام ہو جائے اور امن و امان ختم ہو جائے اور لوگ مال و دولت کے فتنے میں مبتلا ہوں تو پھر اللہ کی قدرت چیلنج کر کے سامنے آتی ہے - وہ پس پردہ نہیں ہوتی بلکہ کھل کر سامنے آتی ہے - کیونکہ انسانی قوتیں اس وقت شر و فساد کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ جاتی ہیں - [1]

---

(1) سورت طٰہٰ میں بنی اسرائیل کے موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا تھا "جب تک بنی اسرائیل ذلت کو قبول کرتے ہوئے فرعون کو غلامی کا خراج ادا کرتے رہے اس وقت تک دست قدرت ان کی امداد کے لیے متحرک نہیں ہوا اور ان کے حق میں کوئی آسمانی امداد نہیں آئی کیونکہ وہ ذلت' مسکنت اور خوف کی وجہ سے فرعون کی غلامی پر راضی ہو گئے تھے لیکن جب اہل ایمان نے حضرت موسیٰ پر ایمان لا کر بغیر جھجک کے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا - اور اسی سلسلے میں وہ ہر قسم کی تکالیف اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے - اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ سر اٹھا کے چلیں گے - اور فرعون جیسے قہار و جبار حکمران کے سامنے کلمہ حق کہیں گے' بے باکی کے ساتھ اور سختی سے پہلوتہی نہ کرتے ہوئے' تو پھر اس وقت دست قدرت نے مداخلت کی اور ان کے لیے میدانی نصرت تب آئی جب انہوں نے روحانی اور نظریاتی اعتبار سے برتری حاصل کر لی" - یہاں جو کچھ میں نے کہا ہے - یہاں کے سیاق کلام کے مطابق زیادہ صحیح ہے اگرچہ سورت طٰہٰ میں جو کچھ کہا گیا' وہ بھی اپنی جگہ معمولی لفظی تغیر کے ساتھ درست ہے - ابتدائی اسباب یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچانے کے تو دست قدرت نے تیار کیے لیکن میدان میں عملاً نصرت تب ہی نصیب ہوئی' جب اہل ایمان نے فرعون کے سامنے جہاراً اور اعلاناً کلمہ حق کہہ دیا' باوجود اس کی قہاری و جباری کے' پس دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں - (سید قطب)

قصص کے درمیان قرآن کریم پھیر پھیر کر مشرکین کو سمجھاتا ہے ۔ کبھی تو کہا جاتا ہے کہ اس کائنات میں جو نشانیاں تم ظاہر و باہر دیکھتے ہو ' ان سے نصیحت حاصل کرو ' پھر اقوام سابقہ کی ہلاکتوں کے قصص اور واقعات بھی ان کے سامنے رکھے جاتے ہیں ۔ پھر قیامت کے مناظر میں سے پر تاثیر مناظر بھی سامنے لائے جاتے ہیں ۔ غرض ان تمام طریقوں سے وہ نصیحت ان کے ذہن نشین کی جاتی ہے جو ان قصص سے نکلتی ہے ۔ نہایت ہی مربوط انداز میں تاکید اً بتایا جاتا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں سنت الہیہ ایک ہی جیسی رہی ہے ' اٹل رہی ہے اور تمام نتائج سنت الہیہ کے مطابق نمودار ہوتے ہیں ۔ مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے ۔

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (۲۸ : ۵۷) "اگر ہم تمہارے ساتھ ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے" ۔ چنانچہ ہدایت نہ قبول کرنے کا عذر وہ یہ کرتے تھے کہ اگر ہم نے اسلام قبول کر لیا تو لوگ ہمیں اپنے گھروں اور اراضی سے نکال دیں گے ۔ اگر انہوں نے ان قدیم نظریات کو ترک کر دیا جن کی وجہ سے عربوں نے ان کی سیادت کو قبول کر لیا تھا اور جن کی وجہ سے لوگ ان کا اور بیت الحرام کا احترام کرتے تھے تو ان کا یہ مقام جاتا رہے گا ۔

ان لوگوں کے ان خدشات کو ختم کرنے کے لیے اللہ نے اس سورت میں فرعون اور موسیٰ کا قصہ بیان کیا اور ان کو سمجھایا کہ امن و امان کا مرجع اور سرچشمہ کہاں ہے ۔ اور ڈرنا کس سے چاہئے ۔ چنانچہ بتایا گیا کہ امن تو اللہ کے ہاں نصیب ہو گا ۔ اگرچہ کسی انسان کو ان اسباب امن و اطمینان میں سے کوئی سبب حاصل نہ ہو جو لوگوں کے ہاں متعارف ہیں اور خوف و ہراس اس میں ہے کہ انسان امن و اطمینان کے اس حقیقی سرچشمے سے کٹ جائے ۔ اگرچہ لوگوں کے ہاں متعارف امن و سکون کے رسائل موجود ہوں ۔ اس حقیقت کو دوسرے پیرائے میں بیان کرنے کے لیے قارون کا قصہ بھی بیان کر دیا کہ امن و سکون دولت سے بھی نصیب نہیں ہوتا ۔ لہٰذا نہایت تاکید کے ساتھ ان قصص میں اس حقیقت کو ثابت کیا گیا ۔

اور ان کے اس قول پر یہ تبصرہ کیا گیا ۔

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۸ : ۵۷) "کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پر امن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں ' ہماری طرف سے ' رزق کے طور پر ' مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں" ۔ اللہ تعالیٰ اہل مکہ کو یاد دہانی فرماتا ہے ہیں کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے ان کو خوف سے نجات دی اور امن و امان عطا کیا اور پورے حرم کو ان کے لیے پر امن بنا دیا ۔ یہ اللہ وہی ہے جو ان کے لیے ' اس امن کو دوام بخشتا ہے یا امن ان سے سلب کر لیتا ہے ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ان کو سرکشی اور ناشکری کے انجام سے ڈراتا ہے ۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۲۸ : ۵۸) "اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی

معیشت پر اتراتے تھے ' سو دیکھ لو ' وہ ان کے مسکن پر پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے ' آخر کار ہم ہی وارث ہو کے رہے''۔

اللہ تعالیٰ ان کو ان کے انجام بد سے ڈراتا ہے کہ رسول کے بھیجنے کے بعد اب ان کے عذرات ختم ہو گئے ہیں۔ اب اگر تم لوگ پھر بھی تکذیب کرو گے تو ڈرانے والوں کے بعد اقوام سابقہ کا جو انجام ہوا وہ تمہارا بھی ہو گا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۲۸ : ۵۹) ''اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے''۔

اس کے بعد ان کے سامنے قیامت کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ جب ان کے شرکاء کھلے بندوں ان سے اپنی برات کا اظہار کر دیں گے۔ اس منظر میں اللہ تعالیٰ ان کے سامنے آخرت کے عذاب کی تصویر کشی کرتا ہے جبکہ اس سے قبل بتا دیا گیا کہ دنیا میں بدکاروں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے اور یہ کہ دنیا میں امن و سلامتی کے حصول کا طریقہ کیا ہے۔

اس سورت کا خاتمہ ایک وعدے پر ہوتا ہے۔ یہ وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ قرآن کے تقاضے پورے کرتے ہوئے آپ کو اس زمین سے نکالا جا رہا ہے۔ لیکن آخر کار اللہ آپ کو آپ کے اسی شہر کی طرف لوٹائے گا اور شرک اور شرک والوں پر آپ کو غلبہ نصیب ہو گا۔ اے پیغمبر آپ سوچتے نہیں کہ آپ کو اللہ نے رسالت سے نوازا حالانکہ آپ کو یہ امید بھی نہ تھی کہ آپ رسول بھی بن سکتے ہیں۔ یہی اللہ ہے جو آپ کو آپ کے اس شہر کی طرف لوٹا دے گا جس سے مشرکین نکال رہے ہیں۔ آپ جلد ہی امن اور کامرانی کے ساتھ اس شہر میں داخل ہوں گے۔ اس سورت کے اندر جو قصص لائے گئے ہیں وہ ان حقائق کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس شہر سے نکالا گیا تھا آپ پھر وہاں پر امن طور پر لوٹ گئے تھے۔ اس کے بعد آپ پوری قوم بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلا کر مصر سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرعون اور اس کا لشکر عظیم غرق ہو گیا اور موسیٰ اور ان کی قوم موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں معجزانہ طور پر نجات پا گئی۔

یہ وعدہ ہوتا ہے اس پر سورت کے مضامین ختم ہوتے ہیں۔ اور دل و دماغ کی تاروں پر آخری ضرب یوں لگتی ہے۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸ : ۸۸) ''اور اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو ' اس کے سوا کوئی معبود نہیں ' ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے۔ فرمانروائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو''۔

یہ ہے اس سورت کا موضوع۔ اس کی فضا اور اس کا پرتو۔ ہمیں چاہئے کہ اس کے چار اسباق کو ایک ایک کر کے لیں۔ یعنی حضرت موسیٰ کا قصہ اور اس پر تبصرہ قارون کا قصہ اور اس پر زبردست ڈراوا۔

درس نمبر ۱۷۶ تشریح آیات

۱--- تا--- ۴۳

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾

"ط ۔ س ۔ م ' یہ کتاب مبین کی آیات ہیں"۔ سورت کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ حروف تہجی سے آغاز کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت ایسے ہی حروف سے مرکب ہے ' لیکن عام حروف تہجی سے مرکب یہ کتاب ایک بلند مرتبہ اور معجزانہ کتاب ہے۔ ان ہی حروف سے بننے والی دوسری کتابوں اور اس کتاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ کتاب عام لوگوں ہی کی زبان میں ہے ' عام لوگ فانی ہیں لیکن یہ کتاب لازوال ہے۔ اور یہ

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۲۸ : ۲) "یہ کتاب مبین کی آیات ہیں"۔ لہذا یہ کتاب مبین کسی انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے کیونکہ اگر انسان کی بنائی ہوئی ہوتی تو دوسرے انسان بھی ایسی کتاب بنا کر لے آتے جبکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان ایسی کتاب نہیں لا سکے۔ لہذا ثابت ہوا کہ یہ وحی من جانب اللہ ہے اور اس سے اس کی فصاحت و بلاغت اور معجزانہ شان بالکل واضح ہے۔ پھر اس کے اندر جو مضامین ہیں وہ چھوٹے بڑے معاملے میں سچائی کی چھاپ لیے ہوئے ہیں۔

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳﴾

"ہم موسیٰ اور فرعون کا کچھ حال ٹھیک ٹھیک تمہیں سناتے ہیں ' ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے جو ایمان لائیں"۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے آ رہی جو ایمان لانے والے ہوتے ہیں ' یہ ان کی تربیت کرتی ہے ' ان کو اٹھاتی ہے اور ان کے لیے منہاج حیات وضع کرتی ہے۔ راستہ بتاتی ہے۔ یہ قصص بھی ایسے ہی اہل ایمان کے لیے لائے جا رہے ہیں اور ایسے ہی

لوگ ان سے نفع اٹھاتے ہیں۔

اس کتاب کی یہ تلاوت براہ راست اللہ کی طرف سے ہے' یہ اللہ کی عنایات میں سے ایک عنایت ہے ۔ اور اہل ایمان کے لیے اس کا اہتمام کیا جارہا ہے ۔ یہ کتاب اہل ایمان کو بتاتی ہے کہ وہ نہایت ہی بلند مرتبہ اور قیمتی لوگ ہیں اور اللہ کے نزدیک وہ مرتبہ بلند رکھتے ہیں ۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر یہ کتاب ان کے لیے تلاوت کرتا ہے اور ان کے لیے یہ کتاب ان کی صفت ایمان کی وجہ سے تلاوت کی جارہی ہے ۔

لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۲۸ : ۳) "ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے جو ایمان لائیں"۔

اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے' یہاں قصے کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے آغاز یعنی آپ کی ولادت سے ہوتا ہے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ کئی سورتوں میں آیا ہے لیکن آپ کی ولادت کے واقعات کا بیان صرف اس سورت میں اس انداز سے ہے کیونکہ آپ کی سیرت کا پہلا دور یعنی آپ کی ولادت اور وہ حالات جن میں ولادت ہوئی بے بسی کا دور تھا ولادت ہوتے ہی آپ بے بس تھے ۔ آپ کی قوم بھی بے بس تھی ۔ فرعون کی غلامی میں یہ لوگ بندھے ہوئے تھے' ذلیل و خوار تھے اور یہی ذلت و مسکنت یہاں اس سورت کا حقیقی موضوع ہے ۔ ایسے مشکل حالات میں صاف صاف نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچانے کے لیے دست قدرت واضح طور پر سرگرم ہے ۔ جو تدابیر اختیار کی گئیں وہ بالکل ظاہر ہیں ۔ ایسے حالات میں جبکہ ظلم زیادتی اور سرکشی کے خلاف تمام انسانی قوتیں عاجز آ گئی ہیں ۔ دست قدرت اس عظیم قوت پر ایسی ضرب لگاتی ہے جس کی کوئی آواز نہیں ہے ۔ اس طرح مستضعفین کی نصرت کا آغاز ایسے حالات میں ہوتا ہے کہ ان کے پاس حالات کو بدلنے کا کوئی چارہ ہی نہیں رہتا ۔ قوم بنی اسرائیل کو سخت ترین عذاب اور ظلم اور تشدد کا نشانہ بنایا جارہا تھا اور ان کے پاس بچاؤ کی کوئی ظاہری سبیل نہیں ہے ۔ کچھ ایسی ہی صورت حال تھی جس سے مکہ میں مٹھی بھر ایمان والے دوچار تھے ۔ مکہ کے اہل ایمان کو بھی اس طرح دست قدرت کی غیبی امداد کی ضرورت تھی اور مکہ میں تشدد کرنے والوں کو ضرورت تھی کہ ان کو متنبہ کیا جائے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے ۔

دوسری سورتوں میں اکثر اوقات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا آغاز رسالت کے سپرد کیے جانے کے واقعات سے ہوتا ہے ۔ کسی جگہ اس قصے کا آغاز ولادت موسیٰ کے واقعات سے نہیں ہوا ۔ دوسرے مقامات پر جب ہم دیکھتے ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک قوی مومن کی طرح ایک سرکش مقتدر اعلیٰ کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہیں اور یہ قوت ایمانی غالب آتی ہے اور ظلم اور سرکشی سرنگوں ہوتی ہے لیکن یہاں یہ مفہوم بتانا مقصود نہیں ہے ۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ شر جب ننگا ہو کر اپنے عروج تک جا پہنچتا ہے تو اس کے اس عروج کے اندر سے اس کی خرابی کا سامان نمودار ہوتا ہے ۔ شر اور ظلم جب کھل کر سامنے آجاتے ہیں تو پھر ان کی شکست و ریخت کا سامان قدرتی طور پر فراہم ہوتا ہے ۔ کسی بیرونی دفاع کی ضرورت نہیں رہتی ۔ شر کے خاتمے کے قدرتی عوامل شروع ہو جاتے ہیں اور دست قدرت خود اس کا دفعیہ کرتا ہے اور مظلوم اور پسے ہوئے طبقات کو ظلم کی چکی سے نجات دے دی جاتی ہے ۔ پھر کیا ہوتا ہے' خیر پھلتا اور پھولتا ہے ۔ اس کی تربیت ہوتی ہے اور اہل خیر وقت کے امام بن جاتے ہیں اور تمام اقتدار ان کے ہاتھ میں آجاتا ہے اور

وہ اس کے وارث ہو جاتے ہیں۔

یہی وہ حکمت ہے جس کے لیے سورۂ قصص میں قصہ موسیٰ کو لایا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں اس قصے کی وہ کڑی لی گئی ہے جو پوری طرح اس مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔ قرآن کریم میں قصص جہاں جہاں بھی لائے گئے ہیں' ہر جگہ ان سے ایک مخصوص غرض سامنے آتی ہے۔ لوگوں کی 'ایک زاویہ سے' تربیت مقصود ہوتی ہے اور کچھ معانی' کچھ حکمتیں اور کچھ اصول ان کو بتانے مقصود ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس مقصد کے لیے قصہ لایا جاتا ہے' وہ نہایت ہی ہم آہنگی کے ساتھ اور مربوط طریقے سے ذہنوں میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ حقائق پرو دیئے جاتے ہیں اور قلب و نظر کی تعمیر صحیح خطوط پر ہوتی ہے۔

یہاں اس قصے کی جو کڑیاں لائی گئی ہیں' مثلاً ولادت موسیٰ علیہ السلام' وہ سخت حالات جن میں آپ کی ولادت ہوئی' ان حالات میں جس معجزانہ انداز میں اللہ نے آپ کو بچانے کی تدابیر کیں' پھر آپ کی پرورش کا معجزانہ انتظام اور آپ کو جوانی' علم اور حکمت کا عطا ہونا' قبطی کا قتل ہونا' فرعون اور اس کے سرداروں کا آپ کے خلاف مشورت کرنا' حضرت موسیٰ کا مصر سے مدین کی طرف بھاگنا' وہاں شادی کرنا' خدمت گزاری کی مدت پوری کرنا' پھر طور پر آپ کا ندائے ربی سننا اور منصب رسالت پانا' پھر آپ کا فرعون اور اس کے سرداروں کے سامنے فریضہ تبلیغ رسالت پورا کرنا۔ ان کی جانب سے تکذیب' حضرت ہارون کو بحیثیت معاون نبی متعین کرنا اور آخری انجام کہ فرعون کی غرقابی۔ یہ سب امور نہایت ہی تیزی کے ساتھ سین پر آتے ہیں۔

یہاں قصے کی دو کڑیوں کو قدرے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ان کو قرآن کریم میں پہلی بار لایا گیا ہے اور ان دونوں کے ذریعے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ اللہ کس طرح کھل کر ظلم کے خلاف اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ فرعون کی تمام قوتیں اور مکاریاں فیل ہو جاتی ہیں۔ تمام احتیاطی تدابیر بے اثر ہو جاتی ہیں اور اللہ کے فیصلے نافذ ہو کر رہتے ہیں۔

وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ (۲۸ : ۶) "اور ان سے فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انہیں ڈر تھا"۔

جس طرح پورے قرآن میں قرآن کریم کا انداز بیان قصص ہوتا ہے۔ قصہ فرعون و کلیم کو بھی یہاں مناظر کی شکل میں لایا گیا ہے۔ ان مناظر کے درمیان ان کڑیوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جن کو انسان کی قوت متخیلہ خود بخود نظروں کے سامنے لے آتی ہے' لہٰذا دو مناظر کے درمیان جو کڑیاں ترک کر دی جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں انسان لاعلم نہیں رہتا' بلکہ انسان کی قوت متخیلہ پردہ خیال پر ان واقعات کو لے آتی ہے۔ یوں ظاہری اسکرین کے ساتھ ساتھ پردہ خیال پر بھی مناظر آتے اور جاتے رہتے ہیں۔

اس قصے کا پہلا حصہ پانچ مناظر' دوسرا نو مناظر' تیسرا حصہ چار مناظر پر مشتمل ہے۔ اور ان مناظر اور ٹکڑوں کے درمیان ایک خلا ہے' کہیں یہ گیپ بڑا ہے اور کہیں چھوٹا ہے۔ جس طرح پردہ گرتا ہے اور منظر آنکھوں سے غائب ہو جاتا ہے اور خیال کی اسکرین پر مناظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

قصہ کے آغاز سے بھی پہلے اس فضا کی تصویر کشی کی جاتی ہے جس کے اندر واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ وہ حالات

جن میں یہ قصہ واقع ہوا اور وہ مقاصد جن کے لیے دست قدرت نے یہ واقعات رونما کیے اور پھر وہ مقاصد جن کے لیے یہاں اس قصے کو دہرایا جا رہا ہے ۔ یہ بھی قرآن کا ایک اسلوب ہے جو وہ قصہ پیش کرتے وقت اختیار کرتا ہے ۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴﴾ وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵﴾ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ﴿۶﴾

"واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا ۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا' اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا ۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا ۔ اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انہیں ڈر تھا" ۔

یہ ہے وہ اسٹیج جس پر یہ واقعات رونما ہو رہے ہیں ۔ اس ماحول کو وہ ذات بیان کر رہی ہے جو ان واقعات کو رونما کرا رہی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیتی ہے کہ ہم نے کیوں ایسا کیا اور یہ بھی صراحت کی کہ یہ ہم ہیں جو ایسا کر رہے ہیں یہ اور اس لیے کر رہے ہیں ۔ "واقعات ۔ قصہ" کے آغاز ہی میں صاف صاف بتا دیا جاتا ہے ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں ۔ قصے کا ہدف واضح طور پر ہمارے سامنے رکھ دیا جاتا ہے ۔ چنانچہ اس عجیب انداز میں یہاں اس قصے کا آغاز ہوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انداز اس کتاب کے عجائبات میں سے ہے ۔

یہاں فراعنہ مصر میں سے اس فرعون کا نام نہیں لیا جاتا جس کے عہد میں یہ واقعات رونما ہوئے کیونکہ واقعات کا خالص تاریخی پہلو متعین کرنا مقاصد قرآن میں سے نہیں ہے ۔ نہ اس سے اس علم و حکمت میں کوئی اضافہ ہوتا ہے جو قرآن کریم اہل ایمان کو سکھانا چاہتا ہے ۔ یہ کافی ہے کہ حضرت یوسف کے زمانہ مصر کے بعد یہ واقعات رونما ہوئے کیونکہ حضرت یوسف کے والدین اور بھائیوں کی مصر منتقلی کے ساتھ بنی اسرائیل کی مصر منتقلی شروع ہوئی اور یہاں وہ پھلے پھولے ۔

حضرت یوسف کے دور کے بعد سرکش فرعون نے مصر کا اقتدار اعلیٰ حاصل کیا ۔ یہ بڑا جبار و قہار تھا ۔ اس نے مصر میں طبقاتی نظام جاری کر دیا تھا ۔ ہر طبقے کے فرائض متعین کر دیئے تھے اور بنی اسرائیل پر اس دور میں بے حد مظالم ہو رہے تھے ۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے عقائد و نظریات مصریوں کے عقائد و نظریات سے بالکل جدا تھے ۔ بنی اسرائیل اپنے دادا

حضرت ابراہیم کے دین پر تھے ۔ اگرچہ ان کے عقائد میں تغیر و انحراف واقع ہو گیا تھا لیکن دین کا بنیادی ڈھانچہ وہی تھا ۔ وہ عقیدۂ توحید کے قائل تھے ۔ فرعون کی الوہیت کے منکر تھے ۔ اس طرح فراعنہ جن بتوں کی پرستش کرتے تھے ۔ بنی اسرائیل ان کے قائل نہ تھے ۔

فرعون کو یہ خوف لاحق تھا کہ بنی اسرائیل مصر میں 'اپنے خیالات کی وجہ سے اس کے تاج و تخت کے لیے خطرہ ہیں ۔ وہ مصر سے ان کو یکلخت نکال بھی نہ سکتا تھا ۔ کیونکہ وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے نیز اس صورت میں فرعون کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر اس قدر عظیم آبادی کو یکبارگی مصر سے نکال دیا جائے تو وہ دشمن مجاور اقوام سے مل کر مصر پر حملہ آور ہو جائیں گے ۔ اس لیے اس نے اس قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے نہایت ہی وحشیانہ طریقہ نکالا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ۔ یہ لوگ نہ فرعون کو مانتے ہیں اور نہ اس کی خدائی کے قائل ہیں 'اس لیے اس نے اس قوم کو سخت ترین مشقت کے سپرد کر دیا ' ان کو ہر طرح ذلیل کر کے رکھا ' اور ان پر قسم قسم کے مصائب ڈھانے لگا ۔ آخر کار اس نے یہ انتہائی فیصلہ کیا کہ ان کے تمام پیدا ہونے والے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے تاکہ ان کی آبادی میں اضافہ بالکل ختم ہو جائے ۔ مرد زیادہ نہ ہوں اس طرح ان کی عورتوں کی کثرت اور مردوں کی کمی کی وجہ سے ان کی قوت ٹوٹ جائے گی اور یہ لوگ اس سخت عذاب اور ظلم کی وجہ سے دبا کر بھی رکھے جا سکیں گے ۔

روایات میں آتا ہے کہ اس نے تمام حاملہ عورتوں کے لیے دائیاں مقرر کر رکھی تھیں جو ہر پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں فوراً رپورٹ کرتی تھیں اور اور بچے کو فوراً ٹھکانے لگا دیا جاتا تھا ۔ اور اس سنگدلانہ منصوبے پر عمل کرنے میں کوئی رو رعایت نہ برتی جاتی تھی ۔ فرعون کا یہ اس قدر ظالمانہ منصوبہ تھا کہ بے گناہ بچوں کو یوں ذبح کرنے کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔

ان حالات میں حضرت موسیٰ کا قصہ یوں ان کی ولادت سے شروع ہوتا ہے ۔ جیسا کہ قرآن میں ہے :

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸ : ۴) "واقعہ یہ ہے کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا ۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا ۔ اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا ۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا" ۔

لیکن اللہ کا ارادہ اور منصوبہ فرعون کے منصوبے سے مختلف تھا ۔ اللہ کا فیصلہ سرکش فرعون کے فیصلے سے جدا تھا ۔ ہمیشہ یوں ہوتا ہے کہ ظالم اور سرکش اپنی قوت اور تدابیر پر مست ہوتے ہیں ' وہ اللہ کے فیصلوں اور قدرتوں کو بھلا دیتے ہیں ۔ وہ یوں سوچتے ہیں کہ یہ لوگ جو سوچیں گے نتائج ویسے ہی ہوں گے ۔ یہ لوگ اپنے دشمنوں کے لیے ان کا انجام خود متعین کرتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ حالات کے نتائج ان کے اندازوں کے مطابق ہی ہوں گے ۔

اللہ یہاں اپنے ارادے کا اعلان کرتا ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں ہماری تقدیر یہ ہے ۔ یہاں فرعون ' ہامان اور ان کے لشکروں کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ تم جو تدابیر اختیار کر رہے ہو وہ تمہارے لیے مفید مطلب نہ ہوں گی ۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ (٥) وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ (٦) (٢٨: ٥ — ٦) "اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انہیں ڈر تھا" ـ یہ کمزور لوگ جن کو اس سرکش نے پوری طرح غلام بنا رکھا تھا' ان کے حالات میں اپنی مرضی سے تصرف کرتا تھا' ان کو سخت سے سخت سزائیں دیتا تھا' ان کے لڑکوں کو ذبح کرتا تھا ـ اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑتا تھا ـ اس تشدد اور ظلم و ستم کے باوجود وہ اپنی ذات اور اپنے اقتدار کے بارے میں ان عوام سے سخت خائف تھا ـ چنانچہ اس نے ان کے خلاف خفیہ پولیس قائم کر رکھی تھی اور ان کے ہاں جو بچہ بھی پیدا ہوتا اسے رپورٹ مل جاتی اور وہ اسے مذبح خانے کو بھیج دیتا ـ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک قصاب تھا ـ یہ مفلوک الحال مستضعفین تھے جن پر اللہ بے پناہ فضل و کرم کرنے والا تھا ـ ان کو اللہ وقت کا امام بنانا چاہتا تھا ـ دنیا کی قیادت ان کے حوالے کرنے والا تھا ـ ان کو غلامی اور اطاعت کے درجے سے نکال کر قائدانہ رول دینا چاہتا تھا کہ وہ زمین پر اقتدار کے مالک بن جائیں ـ (بعد میں جب وہ اس کے مستحق بنے تو ایسا ہی ہوا لیکن یہ استحقاق ایمان و صلاح کی بنیاد پر تھا) ـ وہ ثابت قدم اور قوت و شوکت کے مالک بن جائیں اور ان کے ہاتھوں وہ خطرات واقعات بن جائیں جو ان سے فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو لاحق تھے اور جن کے خلاف وہ ممکن حد تک احتیاطی تدابیر اختیار کیے ہوئے تھے لیکن ان کو یہ شعور نہ تھا کہ دست قدرت سے کیا ظاہر ہونے والا ہے ـ

غرض واقعات قصہ کے بیان سے بھی پہلے یہاں مقاصد قصہ بیان کر دیے جاتے ہیں ـ موجودہ صورت حالات کو بھی قارئین کے سامنے رکھا جاتا ہے اور جو ہونے والا ہے اس کی جھلکی بھی دکھائی جاتی ہے تاکہ دونوں قوتیں باہم بالمقابل ہوں ـ ایک طرف فرعون کا ظاہری کر و فر ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جو کچھ چاہے' کر سکتا ہے اور دوسری طرف اللہ کی وہ عظیم حقیقی قوت ہے جس کے مقابلے میں انسانی قوتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے ـ اس کی قوت کے سامنے سب قوتیں ضعیف' لاغر اور نیست و نابود ہونے والی ہیں ـ

اس قصے کے بارے میں یہ اعلان اس سے قبل ہو جاتا ہے کہ اس کے مناظر کا آغاز کیا جائے جبکہ لوگ واقعات قصہ کے منتظر بیٹھے ہیں ـ ان کو انتظار ہے کہ اس کا انجام کیا ہو گا ـ اور جس طرح اعلان کیا گیا ہے یہ مستضعفین کس طرح اس عظیم قوت کو پاش پاش کر کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو جائیں گے؟

یوں یہ قصہ زندگی سے بھرپور ہے ـ یوں نظر آتا ہے کہ شاید اسے قرآن کریم میں سورۂ قصص میں پہلی بار لایا گیا اور یوں نظر آتا ہے کہ اس کے مناظر اب پیش ہو رہے ہیں ـ یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے جو پہلے گزر چکا ہے ـ گویا واقعات اب پیش ہو رہے ہیں ـ یہ قرآن کریم کا منفرد انداز بیان ہے کہ وہ تاریخی نہیں بلکہ تمثیلی انداز میں قصص کو بیان کرتا ہے ـ

---ooo---

اس قصے کا آغاز ہوتا ہے ' اس چیلنج کے بعد دست قدرت کے تصرفات کھلے کھلے اسکرین پر نظر آتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی ولادت ہوتی ہے اور جن حالات میں ہوتی ہے وہ بیان کر دیئے گئے ہیں۔ ولادت کے ساتھ ہی یہ خطرہ لاحق ہے کہ ان کی ولادت کی رپورٹ ہو جائے اور وہ فوراً موت کے منہ میں چلے جائیں ' ان کی گردن پر چھری چل پڑے اور ان کا سر زمین پر جا گرے۔

ان کی والدہ سخت پریشان ہے۔ اسے ان کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ہر آن یہ خطرہ ہے کہ ان جلادوں کو اطلاع ہو جائے۔ وہ جب سوچتی ہے کہ اس معصوم کی گردن پر چھری چل رہی ہے تو وہ کانپ اٹھتی ہے ' یہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس بچے کو اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے پاس اس کے بچانے کی کوئی قوت نہیں ہے۔ وہ اسے چھپا بھی نہیں سکتی۔ وہ اس کی فطری آواز ' رونے کی آواز کو بھی نہیں دبا سکتی۔ کوئی حیلہ اور وسیلہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ وہ اکیلی ہے ' عاجز ہے اور مسکین ہے۔

اس نازک موقعہ پر دست قدرت حرکت میں آتا ہے۔ اس حیران و پریشان ماں کا رابطہ عظیم قوت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اسے اس حالت خوف میں ہدایت مل جاتی ہے کہ وہ کیا کرے۔ اسے یوں حکم دیا جاتا ہے۔

وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَ لَا تَخَافِیْ وَ لَا تَحْزَنِیْ ۚ

"ہم نے موسیٰ کی ماں کو اشارہ کیا کہ "اس کو دودھ پلا ' پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف اور غم نہ کر"۔

کیا شان کبریائی ہے ' اللہ کی عظیم قدرت قابل دید ہے! حکم ہوتا ہے ' موسیٰ کی ماں اسے دودھ پلاؤ ' اسے پالتی رہو ' اپنی حفاظت میں رکھو۔ اور جب بھی تم خطرہ محسوس کرو ' اسے دریا میں ڈال دو ' بے خطر ہو کر اسے موجوں کے سپرد کر دو ' اگرچہ اس وقت وہ دودھ پی رہا ہو اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔

وَ لَا تَخَافِیْ وَ لَا تَحْزَنِیْ (۲۸ : ۷) "کچھ خوف اور غم نہ کر"۔ وہاں دریا میں یہ اللہ کی نگرانی میں ہو گا۔ ایسی قوت کی نگرانی میں کہ امن و سلامتی اسی کے جوار رحمت میں دستیاب ہے۔ اس کی قوت کی نگرانی میں کسی کے لیے کوئی ڈر رہتا ہی نہیں۔ یہ وہی ہاتھ ہے جو آگ کو گلزار بنا دیتا ہے۔ آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیتا ہے۔ جو سمندر کو جائے پناہ بنانے والا ہے جس کو یہ ہاتھ پناہ دے دے اس کو فرعون جیسا جابر بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا بلکہ زمین کا کوئی جبار و قہار بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝

"ہم اسے تیرے ہی پاس لے آئیں گے اور اس کو پیغمبروں میں شامل کریں گے"۔ میں رب ذوالجلال تمہارے

ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تمہارے ہاتھوں میں لوٹا دیا جائے گا' اس کی زندگی کے لئے کوئی خطرہ نہ رہے گا اور مزید خوشخبری یہ ہے کہ وہ نبیوں میں سے ہو گا اور اللہ سے زیادہ سچا وعدہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟

یہ اس قصے کا پہلا منظر ہے۔ایک ماں ہے جو حیران و پریشان ہے۔اسے خوف لاحق ہے کہ اس کے بچے کو قتل کر دیا جائے گا۔اس قتل کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اس لیے وہ اس تصور ہی سے بے تاب ہو جاتی ہے کہ اسے عالم بالا سے ہدایات ملتی ہیں' اسے خوشخبری دے دی جاتی ہے۔وہ مطمئن ہو جاتی ہے اور اسے سکون ملتا ہے۔ ڈرے اور سہمے ہوئے اس دل پر ایسا اثر ہوتا ہے جس طرح حضرت ابراہیم کے لیے آگ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی تھی۔سیاق کلام میں اس کی تفصیلات نہیں ہیں کہ ام موسیٰ کو یہ ہدایات کس طرح ملیں اور کس طرح انہوں نے ان پر عمل کیا۔پس پردہ گر جاتا ہے اور جب پردہ اٹھتا ہے تو ہماری نظروں کے سامنے ایک دوسرا منظر ہے۔

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ

"آخر کار فرعون کے گھر والوں نے اسے (دریا سے) نکال لیا"۔کیا یہی امن تھا؟ کیا یہی وعدہ تھا؟ اور کیا یہی فرعون تک بشارت تھی؟ کیا اہل فرعون کے علاوہ کسی اور سے اس بیچاری کو کوئی ڈر تھا؟ ڈر تو یہی تھا کہ اس کے حالات سے ظالم فرعونی خبردار نہ ہو جائیں۔ڈر تو صرف یہ تھا کہ یہ بچہ فرعون کے ہاتھ نہ لگ جائے۔دیکھئے قدرت خداوندی کا کرشمہ کہ یہ بچہ ان کے ہاتھ میں محفوظ ہے۔

ہاں 'یہی کچھ تھا' یہ دست قدرت کا کھلا چیلنج ہے اور نہایت ہی کھلا چیلنج ہے۔فرعون اور ہامان کی عظیم سیاسی اور مالی قوت کو چیلنج ہے۔یہ عظیم قوت رات دن بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے لڑکوں کا پیچھا کر رہی ہے۔ان کو ڈر ہے کہ ان کا اقتدار' ان کا تخت' بلکہ خود ان کی ذات کو ان لوگوں سے خطرہ ہے۔فرعونیوں نے خفیہ سروس اور خفیہ ایجنسیوں کا جال پھیلا رکھا تھا' وہ ایک ایک گھر پر نظر رکھتے تھے کہ کوئی بچہ بچ کر نہ نکل جائے۔لیکن خالق حقیقی ان کی ان سرگرمیوں کا دفعیہ بغیر کسی قیل و قال' بغیر کسی خفیہ سروس کے خود ان کے ہاتھوں سے کر رہا ہے۔خود ان سے اس بچے کی پرورش کرا رہا ہے۔یہ کون سا بچہ ہے؟ اس بچے کے ہاتھوں ان کی اس عظیم قوت کو پاش پاش ہونا ہے۔یہ بغیر سہارے' بغیر کسی ظاہری تدبیر کے' عاجزی اور ناتوانی کی انتہائی شدید کمزوری کے حالات میں ان کے ہاتھوں میں ہے اور یہ بیچاری ماں اسے ان کے حوالے کر رہی ہے۔ایسے حالات میں کہ یہ بچہ اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔یہ خود اس بچے کو فرعون کے مضبوط قلعوں تک پہنچا دیتی ہے۔اس ظالم کو اس بچے کی تلاش بھی نہیں کرنا پڑتی۔جس طرح وہ ہر پیدا ہونے والے بچے کی تلاش رات دن جاری رکھتے تھے۔جس کے ہاں بھی بچہ پیدا ہوتا' سرکار وہاں پہنچ جاتی۔

دست قدرت نہایت ہی چیلنج کے انداز میں اپنے منصوبے کا صاف صاف اعلان کر دیتا ہے۔

لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ

"تاکہ وہ ان کا دشمن اور ان کے لیے سبب رنج بنے"۔یہ بچہ ان کے لیے ایک ایسا دشمن بن جائے جو ان کی قوت

کو چیلنج کرے اور ان کے لیے پریشانی کا باعث بن جائے ۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ ﴿٨﴾

"واقعی فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر (اپنی تدبیر میں) بڑے غلط کار تھے" ۔ وہ کس طرح ان کا دشمن بنے گا اور کس طرح باعث تشویش ہو گا حالانکہ وہ ان کے ہاتھ میں ہے اور بے بس ہے ۔ اس کے پاس کوئی قوت نہیں ہے ۔ اس کے پاس کوئی ظاہری ذریعہ اور تدبیر بھی نہیں ہے ۔ سیاق کلام اس کا جواب خود دیتا ہے ۔

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٩﴾

"فرعون کی بیوی نے (اس سے) کہا "یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے ' اسے قتل نہ کرو ' کیا عجب کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا ہی بنالیں ۔ اور وہ (انجام سے) بے خبر تھے" ۔

یہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا کہ اس نے حضرت موسیٰ کو فرعون کے حصن حصین میں داخل کر دیا ' پھر فرعون کی بیوی کے دل میں ان کی محبت ڈال دی اور یوں محبت کے مہین اور شفاف پردے میں حضرت موسیٰ کو محفوظ فرما دیا ۔ حضرت موسیٰ کی حفاظت نہ اسلحہ سے کی گئی اور نہ مال و متاع کے ذریعے کی گئی ۔ اللہ نے فرعون کی بیوی کے دل میں اس کی محبت ڈال دی ۔ اس طرح فرعون کی سختی ' اس کی سنگدلی اور اس کی تمام احتیاطی تدابیر دھری کی دھری رہ گئیں ۔ اور اللہ کے لیے یہ مشکل نہ تھا کہ وہ اس ضعیف بچے کو محبت کے ان مہین پردوں کے سوا بھی بچالے ' لیکن یہ اس کی ایک شان ہے ۔

قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوهُ (۲۸ : ۹) "یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے ' اسے قتل نہ کرو" ۔ اس عورت کے سوا وہ سب کے لیے دشمن اور موجب پریشانی بننے والا ہے اور اسی کے ہاتھوں فرعون اور اس کا لشکر غرق ہونے والا ہے جبکہ ان کی سوچ یہ تھی :

عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا (۲۸ : ۹) "عجب ہے کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو ' یا ہم اسے بیٹا بنالیں" ۔

حالانکہ اس بچے کے ساتھ ان کا وہ انجام بندھا ہوا ہے جس سے وہ ایک طویل عرصہ سے ڈر رہے تھے اور جس کے خلاف وہ احتیاطی تدابیر اختیار کر رہے تھے ۔ لیکن انہیں کیا خبر تھی ۔

وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ (۲۸ : ۹) "وہ انجام سے بے خبر تھے" ۔ قدرت ان کے ساتھ مذاق کر رہی تھی ۔ یہاں آکر یہ دوسرا منظر بھی ختم ہو جاتا ہے ۔ پردہ گرتا ہے ۔

یہ تو تھے حالات حضرت موسیٰ کے۔ ان کی غم زدہ ماں کی حالت کیا تھی؟ اس کی بے تابیوں کا کیا عالم تھا؟

وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰی فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰﴾ وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّیْهِ ٘ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱﴾

"ادھر موسیٰ کی ماں کا دل اڑا جا رہا تھا' وہ اس کا راز فاش کر بیٹھتی' اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھا دیتے تاکہ وہ (ہمارے وعدے پر) ایمان لانے والوں میں سے ہو۔ اس نے بچے کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جائے۔ چنانچہ وہ الگ سے اس کو اس طرح دیکھتی رہی کہ (دشمنوں کو) اس کا پتہ نہ چلا"۔

اس نے عالم بالا کی طرف سے اشارہ پایا اور اپنے بچے کو دریا کی موجوں کے نذر کر دیا۔ لیکن اب وہ کہاں جا رہا ہے اس کا کیا انجام ہونے والا ہے؟ وہ دل میں سوچتی رہی۔ کس طرح اس کے لیے ممکن ہوا کہ وہ اپنے جگر گوشے کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دے۔ کس طرح اس سے یہ ہو سکا جبکہ اس سے قبل کوئی ماں ایسا نہ کر سکی تھی۔ اس حالت خوف میں کیا یہی سلامتی کا راستہ تھا؟ کیونکر یہ ممکن ہوا کہ اس نے آواز غیب پر اس طرح لبیک کہہ دیا؟

قرآن کریم اس بیچاری کی دلی کیفیات کی تصویر کشی عجیب انداز میں کرتا ہے۔ یہ دل خالی اور فارغ ہے۔ نہ اس میں عقل ہے' نہ اسے کچھ سمجھ میں آ رہا ہے' نہ کوئی سوچ ہے اور نہ کوئی تدبیر ہے۔

اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ (۲۸ : ۱۰) "قریب تھا کہ وہ راز فاش کر بیٹھتی"۔ اور وہ مجنونہ کی طرح چیخ اٹھتی کہ میں نے اسے رکھا ہے' میں نے اسے رکھا ہے' تمام لوگوں کو خبر ہو جاتی اور قریب تھا کہ وہ پکار اٹھتی کہ میں نے اسے دریا برد کیا ہے اور ایک غیبی آواز پر میں نے ایسا کیا ہے۔

لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا (۲۸ : ۱۰) "اگر ہم اس کی ڈھارس نہ بندھا دیتے"۔ اس کے دل کو سخت نہ کر دیتے' اس کے اندر قوت برداشت نہ پیدا کر دیتے۔ اور اسے چیخ و پکار اور آہ و فغاں سے روک نہ دیتے تو وہ اس راز کو فاش کر دیتی۔

لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۲۸ : ۱۰) "تاکہ وہ ایمان لانے والوں میں سے ہو"۔ اسے اللہ کے وعدے کا پورا یقین ہو جائے' اور اللہ کی راہ میں ابتلا پر صبر کرنے اور اس پر جمے رہنے کا مقام مل جائے' اور وہ راہ ہدایت پر چلنے والی بن جائے۔

لیکن ام موسیٰ پھر بھی بتقاضائے فطرت انسانی تجسس سے نہ رکی۔ اپنی سی کوشش اس نے کی۔

وَ قَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ (۲۸ : ۱۱) ''اس نے بچے کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے جاؤ''۔ ذرا دیکھتی جاؤ کہ کیا ہوتا ہے۔ دیکھو کہ یہ زندہ رہتا ہے؟ اگر رہتا ہے تو کیونکر رہتا ہے۔ اسے مچھلیاں کھا جاتی ہیں یا خشکی کے درندے کھا جاتے ہیں۔ کہاں ڈوبتا ہے اور کہاں رکتا ہے؟

بہن نے نہایت ہی خفیہ انداز میں نہایت ہی احتیاط کے ساتھ اس کا پیچھا کیا۔ راستوں اور بازاروں میں اس کی خبریں تلاش کرتی رہی۔ آخر کار اس کو معلوم ہو گیا کہ دست قدرت نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس نے دور سے دیکھ لیا کہ فرعون کے نوکروں نے اسے دریا سے پکڑ لیا ہے۔ بچہ دودھ نہیں پی رہا ہے اور نوکر اس کے لیے دودھ پلانے والی کی تلاش میں ہیں۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور ہم نے بچے پر پہلے ہی دودھ پلانے والیوں کی چھاتیاں حرام کر رکھی تھیں۔ (یہ حالت دیکھ کر) اس لڑکی نے ان سے کہا ''میں تمہیں ایسے گھر کا پتہ بتاؤں جس کے لوگ اس کی پرورش کا ذمہ لیں اور خیر خواہی کے ساتھ اسے رکھیں''۔

قدرت الٰہیہ کے اس عجوبے پر غور کیجئے' اسے پیدا کیا گیا ہے اور اس کو پالا گیا ہے اس لیے کہ فرعون اور اس کی قوم کے لیے باعث ہلاکت ہو' لیکن تدبیریوں ہے کہ وہ خود اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں' اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں' اس کے لیے دودھ پلانے والی کو تلاش کرتے ہیں۔ دست قدرت اس پر تمام پلانے والیوں کا دودھ حرام کر دیتا ہے۔ دودھ پلانے والیاں دودھ پیش کرتی ہیں اور وہ پستان منہ میں نہیں لیتا۔ انہیں یہ خوف لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ مر ہی نہ جائے۔ اس کی بہن دور سے یہ منظر دیکھتی ہے۔ قدرت اس کے لیے بات کرنے کے مواقع پیدا کر دیتی ہے۔ وہ آگے بڑھ کر پیشکش کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ کیا میں تمہیں ایک ایسی عورت کا پتہ دے دوں جو اس کی اچھی طرح تربیت کرے اور وہ اس کے لیے خیر خواہ بھی ہو؟ وہ خوشی خوشی اس پیشکش کو منظور کر لیتے ہیں۔ وہ امید کرتے ہیں کہ اگر یہ بچہ اس عورت کا دودھ لے لے' اور اس طرح موت سے بچ جائے تو بہت ہی اچھا ہو کیونکہ یہ بہت ہی پیارا بچہ ہے۔

اب یہاں یہ چوتھا منظر بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اب ہم اس کڑی کے پانچویں اور آخری منظر کے سامنے ہیں۔ یہ بچہ اب اپنی بے تاب ماں کی گود میں ہے۔ اس کو سکون مل گیا ہے۔ شاہی بچے کو دودھ پلانے کی وجہ سے ایک بلند مقام بھی مل گیا ہے۔ فرعون اور اس کی بیوی دونوں اس بچے کا خیال رکھتے ہیں' خوف کے سائے اس کے اردگرد منڈلاتے ہیں لیکن وہ نہایت ہی پر سکون زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ ہیں دست قدرت کی صنعت کاریاں۔ قدرت کے اس عجوبے کی پہلی کڑی یہاں اختتام کو پہنچی ہے۔

---ooo---

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۠ (۱۳) الربع

ع ۱ ۱۲ ۴

”اس طرح ہم موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس پلٹا لائے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا تھا' مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے“۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے ان مناظر کے بعد اب سیاق کلام کے اندر کئی سالوں کا وقفہ ہے۔ قصے کا اگلا حصہ آپ کے شباب کے زمانے سے متعلق ہے۔ جب حضرت موسیٰ کو دودھ پلانے کے لیے ان کی ماں کے حوالے کر دیا گیا تو اس کے بعد کیا حالات پیش آئے' اس کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ قصر فرعون کے اندر آپ کے شب و روز کیسے رہے اور یہ کہ زمانہ رضاعت کے اختتام کے بعد اپنی ماں کے ساتھ اس کا رابطہ کیسے تھا۔ یہ کہ بلوغ اور شباب کے بعد قصر شاہی میں آپ کا مقام و مرتبہ کیا تھا۔ آپ کا عقیدہ کیا تھا۔ بہرحال وہ فرعون اور اس کے کاہنوں کے درمیان باری تعالیٰ کی نگرانی میں تیار ہو رہے تھے تاکہ وہ اپنا فریضہ ادا کریں۔ اس طویل وقفے کے بعد پھر یہ حالات پیش آئے۔ بہرحال شباب اور بلوغ تک پہنچنے کے ساتھ ہی آپ کی علمی اور روحانی تربیت مکمل ہوئی۔ اللہ نے آپ کو علم و حکمت عطا کیا اور یہ تھی جزا نیک لوگوں کی۔

وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰۤى اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (۱۴)

”جب موسیٰ اپنی پوری جوانی کو پہنچ گیا اور اس کی نشوونما مکمل ہوگئی تو ہم نے اسے حکم اور علم عطا کیا' ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں“۔

”بلوغ اشد“ کے معنی ہیں جب آپ کی جسمانی قوتیں مکمل ہوگئیں اور استواء کا مفہوم ہے جسمانی اور عقلی اعتبار سے پختگی تک پہنچنا۔ یہ درجہ بالعموم تیس سال کی عمر میں حاصل ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس عرصے تک حضرت موسیٰ کیا فرعون کے قصر شاہی ہی میں رہے؟ اور فرعون اور اس کی بیوی کے لے پالک اور متبنیٰ رہے یا یہ ان سے علیحدہ ہوگئے اور انہوں نے قصر شاہی کو چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ شاہی محلات کے گندے اور سڑے ہوئے ماحول میں کسی ایسے شخص کا رہنا ممکن ہی نہیں جس کی روح پاک و صاف ہو اور جس سے مستقبل میں نبوت کا کام لیا جانا ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کی ماں نے ان کو یہ بات بتا دی ہوگی کہ ان کی شناخت کیا ہے۔ ان کی قوم کیا ہے اور ان کا دین کیا ہے اور اس کے بعد جب وہ دیکھ رہے ہوں گے کہ ان کی قوم پر کس قدر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں' ان کو کس قدر ذلیل و خوار کر کے رکھا جا رہا ہے اور معاشرے کے اندر ایک ہمہ گیر فساد برپا ہے اور ہر طرف ظلم و تشدد کا دور دورہ ہے۔

لیکن ہمارے پاس ان کی اس زندگی کے بارے میں کوئی مستند ذریعہ علم نہیں ہے۔ البتہ بعد میں آنے والے واقعات کی

بنیاد پر انسان ان کی اس زندگی کے بارے میں قیاس کر سکتا ہے ۔ بعد میں ہم اس پر تبصرہ کریں گے ۔ یہاں اس پر غور کرنا ہے کہ علم و حکمت عطا کرنے کے بعد اللہ نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے ۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ (۲۸ : ۱۴) "ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں" ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پاکیزگی اور احسان کی زندگی اپنا لی تھی اور یہ علم و حکمت جزائے احسان تھا ۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۫ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۫ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ۝

"(ایک روز) وہ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا جبکہ اہل شہر غفلت میں تھے ۔ وہاں اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں ۔ ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا ۔ اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف اسے مدد کے لیے پکارا ۔ موسیٰ نے اس کو ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا ۔ (یہ حرکت سرزد ہوتے ہی) موسیٰ نے کہا "یہ شیطان کی کارفرمائی ہے ' وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کن ہے" ۔ پھر وہ کہنے لگا "اے میرے رب ' میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا ' میری مغفرت فرما دے" ۔ چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی ' وہ غفور و رحیم ہے ۔ موسیٰ نے عہد کیا کہ "اے میرے رب ' یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے ' اس کے بعد اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا" ۔

"وہ شہر میں داخل ہوا" اور شہر سے مراد دارالخلافہ ہے ' جس طرح کہ اس وقت وہ تھا ۔ سوال یہ ہے کہ وہ کہاں سے آئے اور شہر میں داخل ہوئے ۔ کیا یہ عین الشمس کے قصر شاہی سے نکل کر آئے یا یہ کہ انہوں نے شاہی محل اور دارالحکومت کو چھوڑ دیا تھا اور کسی اور جگہ رہائش اختیار کر لی تھی اور وہ شہر میں اس وقت داخل ہوئے جب لوگ غافل تھے یعنی دوپہر کا وقت تھا یا لوگوں کے آرام کا وقت تھا ۔

جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں ۔

فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ

شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ (۲۸ : ۱۵) ”وہاں اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا۔اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف اسے مدد کے لیے پکارا“۔ ان میں سے ایک قبطی تھا۔کہا جاتا ہے کہ یہ فرعونی کے مصاحبین میں سے تھا' بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ شاہی محل کا باورچی تھا اور دوسرا اسرائیلی تھا۔یہ دونوں آپس میں لڑ رہے تھے۔تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدد کے لیے پکارا کیونکہ قبطی دونوں کا دشمن تھا۔یہ کیسے ہوا؟ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ ایک عام اسرائیلی فرعون کے پروردہ شخص کو خود فرعون کے ملازم یا اس کی قوم کے آدمی کے خلاف پکار رہا ہے۔اگر موسیٰ علیہ السلام کو بدستور شاہی محل میں فرض کر لیا جائے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ فرعون کے متبنی کو ایک دوسرے فرعونی کے خلاف پکارا جائے۔یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ فرض کیا جائے کہ انہوں نے شاہی محل کو ترک کر دیا ہے اور فرعون سے ان کے رابطے ختم ہیں۔بنی اسرائیل میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل سے ہیں اور یہ کہ وہ بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کے خلاف ہیں اور اب وہ اپنی پسی ہوئی قوم کی حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔موسیٰ علیہ السلام جیسا مقام و مرتبہ رکھنے والے شخص کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ قصر شاہی سے نکل گئے ہوں کیونکہ آپ کا پاک نفس شروفساد کے اس گندے نالے میں کس طرح رہ سکتا تھا۔

فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ (۲۸ : ۱۵) ”موسیٰ نے اس کو ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا“۔ وکز اس ضرب کو کہتے ہیں جو انسان پورے ہاتھ کے ساتھ دوسرے کو لگائے۔انداز بیان سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی گھونسے کے ساتھ قبطی ڈھیر ہو گیا۔اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کس قدر مضبوط اور قوی جوان تھے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ منفعل المزاج تھے اور سخت غصے والے تھے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں فرعونیوں اور فرعون کے خلاف سخت نفرت تھی۔

لیکن قرآن کریم کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس قبطی کو قتل کرنا نہ چاہتے تھے۔یہ نہ چاہتے تھے کہ اس کی جان لے لی جائے' جونہی آپ نے دیکھا کہ وہ تو آپ کے سامنے ٹھنڈا پڑا ہے' آپ پشیمان ہو گئے کہ آپ نے یہ غلط کام کر ڈالا۔آپ نے اسے شیطانی کام کہا کیونکہ یہ غصے کی وجہ سے کام ہوا اور غصہ شیطانی عمل ہوتا ہے یا یہ شیطان کی اکساہٹ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ (۲۸ : ۱۵) ”موسیٰ نے کہا یہ شیطان کی کارفرمائی ہے وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کن ہے“۔ حضرت موسیٰ مزید کہتے ہیں کہ غصے کی وجہ سے انہوں نے اس فعل کا ارتکاب کیا۔وہ اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے اس لغزش کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔چنانچہ آپ رب تعالیٰ سے طلب مغفرت کرتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ

"پھر وہ کہنے لگا اے میرے رب، میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرما دے۔ چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی، وہ غفور و رحیم ہے"۔ اللہ نے آپ کی عاجزانہ دعا کو قبول کر لیا۔ کیونکہ آپ کو غلطی کا احساس ہو گیا اور فوراً استغفار کر لیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اپنے کانپتے ہوئے دل اور اپنے تیز احساس اور اپنی توجہ الی اللہ سے محسوس کر لیا کہ ان کے رب نے ان کو بخش دیا ہے۔ قلب مومن کو جب اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے تو وہ محسوس کر لیتا ہے اور جب دعا قبول ہوتی ہے تو بھی اسے احساس ہو جاتا ہے کہ دعا قبول ہو گئی، انسان اپنے تقویٰ خدا خوفی اور اپنے احساس کی وجہ سے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام اپنے تیز شعور، اپنی طہارت قلبی اور اتصال باللہ کے ذریعہ یہ محسوس کر لیتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا ہے تو آپ فوراً اپنے اوپر لازم کرتے ہیں کہ رب، آپ نے مجھ پر جو انعامات کیے ہیں میں آیندہ ان کا شکر ادا کروں گا کہ مجرموں کے مددگار نہ بنوں گا۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَکُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ (٢٨ : ١٧) "اے میرے رب، یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے اس کے بعد میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا"۔

حضرت موسیٰ کی طرف سے یہ عام عہد ہے کہ وہ مجرموں کا معین و مددگار نہ بنیں گے یعنی آپ نے جرم اور مجرمین سے اپنی برات کا اظہار کیا، ہر حال اور ہر صورت میں۔ اگرچہ بعض اوقات ان کا طبعی غصہ انہیں اس بات پر مجبور کر دے۔ بعض اوقات ظلم اور تشدد کے نتیجے میں ایک معتدل مزاج میں بھی تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔

آپ یہ عہد اس لیے کر رہے ہیں کہ اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمائی۔ پھر اللہ کے ان انعامات کے بدلے بطور شکر انہوں نے یہ عہد کیا کہ اللہ نے ان کو جسمانی قوت اور علم و حکمت سے نوازا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر نیکی اور صراط مستقیم پر چلنے کا یہ ارتعاش اور اس سے قبل اپنی قوم کے حق میں مشتعل ہونے اور انتقام لینے کا ارتعاش یہ بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت میں کس قدر سیمابیت تھی۔ آپ کا وجدان تیز، انتقام سخت تھا اور دوسرے مقامات پر آپ کی شخصیت کا یہ پہلو بار بار ظہور پذیر ہتا ہے۔ بلکہ اگلے ہی منظر میں دیکھئے کہ آپ پھر اپنی قوم کے شخص پر غصہ ہوتے ہیں۔

فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤی اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ یٰمُوْسٰۤی اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ کَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ٭ۖ اِنْ تُرِیْدُ اِلَّاۤ اَنْ تَکُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَ مَا تُرِیْدُ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ ﴿۱۹﴾

"دوسرے روز وہ صبح سویرے ڈرتا اور ہر طرف سے خطرہ بھانپتا ہوا شہر میں جا رہا تھا کہ یکایک کیا دیکھتا ہے کہ وہی

شخص جس نے کل اسے مدد کے لیے پکارا تھا' آج پھر اسے پکار رہا ہے۔ موسیٰ نے کہا "تو تو بڑا ہی بہکا ہوا ہے"۔ پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے تو وہ پکار اٹھا "اے موسیٰ! کیا آج تو مجھے اسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے؟ تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے' اصلاح کرنا نہیں چاہتا"۔

پہلے معرکے میں تو قبطی کا کام تمام ہو گیا تھا' اس فعل پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت ندامت ہوئی۔ آپ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ نے اس غلطی پر استغفار کیا اور آپ کو معاف کر دیا گیا۔ اور آپ نے اب عہد کر لیا کہ آپ کبھی بھی مجرمین کے معین و مددگار نہ ہوں گے۔

وہ دن تو گزر گیا لیکن آپ اس شہر میں ڈرے سہمے پھر رہے تھے شاید یہ راز کھل نہ گیا ہو۔ آپ ہر وقت راز کے انکشاف اور شرمندگی اور سزا سے خائف تھے۔ لفظ یَتَرَقَّبُ میں یہ تمام مفہوم موجود ہیں۔ آپ کی ہیئت سے بھی ظاہر تھا کہ آپ کسی پریشانی میں گھوم رہے ہیں۔ سہمے ہوئے' ہر لمحہ اور ہر لحظہ کسی خطرناک صورت حالات کی توقع کرتے ہوئے۔ ایک منفعل مزاج شخص کی حالت ہمیشہ ایسی ہوتی ہے کہ ذرا سا کھٹکا بھی اس کی حرکات و سکنات کو ظاہر کر دیتا ہے۔ یترقب سے خوف اور پریشانی کا اچھی طرح اظہار ہوتا ہے۔ یترقب کے بعد فی المدینہ سے اس میں مزید مبالغہ آ جاتا ہے کیونکہ شہر تو ہمیشہ امن و امان کی جگہ ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس پر امن شہر میں بھی خائف ہیں اور سب سے بڑا خوف وہ ہوتا ہے جو انسان کو اپنے گھر اور جائے امن میں لاحق ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ پریشانی کن حالت قطعی طور پر بتاتی ہے کہ آپ اس وقت شاہی محل سے منسلک نہیں ہیں' کیونکہ شاہی محل کے لوگوں کو کسی ظلم و فساد کے نتیجے میں کوئی ڈر لاحق نہیں ہوتا۔ اگر آپ شاہی محل ہی میں مقیم ہوتے تو قرآن کریم' آپ کے لیے۔

فِی الْمَدِیْنَةِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ (۲۸ : ۱۸) کے الفاظ استعمال نہ کرتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے ہی حالات میں پھر رہے تھے کہ وہ ایک نیا منظر دیکھتے ہیں :

فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُهٗ (۲۸ : ۱۸) "یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ وہی شخص جس نے کل اسے مدد کے لیے پکارا تھا آج پھر اسے پکار رہا ہے"۔ یہ وہی شخص ہے جس کی کل انہوں نے قبطی کے خلاف طرف داری کی تھی۔ یہی شخص اب کسی دوسرے قبطی کے ساتھ الجھ رہا ہے۔ اور حضرت موسیٰ کو پکار رہا ہے کہ بچاؤ مجھے اس سے۔ شاید اس کا خیال یہ تھا کہ حضرت موسیٰ اس دوسرے مشترکہ دشمن پر ایک ضرب کلیم لگائیں اور یہ بھی اسی طرح ڈھیر ہو جائے۔

لیکن حضرت موسیٰ کے ذہن پر تو کل کے مقتول کی سوچیں چھائی ہوئی تھیں اور اس پر انہوں نے اللہ سے معافی بھی مانگ لی تھی اور معافی ملنے کے بعد اللہ سے آپ نے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ آپ کسی مجرم کے طرفدار نہ ہوں گے اور سابقہ فعل کے راز کے افشا کا خوف بھی ابھی زندہ تھا۔ اب آپ کو اس شخص پر غصہ آ گیا جو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ آپ نے غصے میں اس شخص سے کہا کہ تم تو بہت بڑے شرپسند ہو۔

قَالَ لَهُ مُوسٰى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِينٌ (۲۸ : ۱۸) "موسیٰ نے کہا تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے" یعنی تو ایسا آدمی ہے کہ ہر کسی کے ساتھ الجھتا ہے اور تمہارا یہ الجھاؤ ختم نہیں ہوتا' ہر کسی کے ساتھ تیرا جھگڑا ہے 'جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس طرح تو بنی اسرائیل پر کوئی بڑی مصیبت لے آئے گا اور ان کی پوزیشن یہ ہے کہ نہ وہ انقلاب لا سکتے ہیں اور نہ مزید تشدد کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ وہ اس وقت کوئی تعمیری تحریک چلانے کی پوزیشن میں نہیں۔ لہٰذا اس قسم کی جزوی جھڑپوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

لیکن اس تنبیہہ کے بعد بھی موسیٰ علیہ السلام کو اس قبطی پر غصہ آ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس پر اسی طرح جھپٹے جس طرح انہوں نے گزشتہ روز کیا تھا اور اس کا کام بھی اسی طرح تمام کر دیں جس طرح کل انہوں نے کیا تھا۔ یہاں بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کی جلالی طبیعت قبطیوں کے مظالم کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ آپ مشتعل ہو گئے کیونکہ قبطیوں کے مظالم حد سے بڑھ گئے تھے۔ اس لیے ظلم و سرکشی کے خلاف ان کا یہ ردعمل فطری تھا جبکہ یہ مظالم ایک طویل عرصے سے ہو رہے تھے اور بنی اسرائیل کے دلوں میں ان لوگوں کے خلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور بہت گہری ہو چکی تھی۔

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ (۲۸ : ۱۹) "پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے تو وہ پکار اٹھا" اے موسیٰ! کیا آج تو مجھے اسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے؟ تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے 'اصلاح کرنا نہیں چاہتا"۔ ایسی باتیں اس وقت عام ہو جاتی ہیں جب معاشرہ فساد پذیر ہو' اس میں مظالم عام ہو جائیں' معاشرہ سے اعلیٰ قدریں ختم ہو جائیں' ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہو۔ ظلم کی وجہ سے لوگوں کا دم گھٹنے لگے۔ حالات' قوانین اور رسم و رواج سب خراب ہو جائیں اور انسانوں کی فطرت اس طرح بدل جائے کہ لوگ ظلم کو دیکھیں اور ان کے اندر کوئی ردعمل پیدا نہ ہو۔ ان پر زیادتی ہو رہی ہو اور ان کے نفوس کے اندر کوئی جوش مدافعت پیدا نہ ہو۔ بلکہ لوگوں کی فطرت میں اس قدر بگاڑ پیدا ہو جائے کہ لوگ ان مظلوموں کو برا کہنے لگیں جو اپنی مظلومی کا دفاع کرتے ہوں اور جو شخص حق کا ساتھ دے اور ظلم کے خلاف آواز اٹھائے' اسے کہا جائے کہ یہ شرپسند اور دہشت گرد ہے۔ اور یہ زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ الفاظ کہ "تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا ہے اور جبار بن کر رہنے والا ہے" قبطی نے حضرت موسیٰ سے کہے۔ اس لیے کہ ان قبطیوں نے یہی دیکھا تھا کہ اسرائیلیوں پر ہر طرف سے مظالم ہو رہے تھے اور وہ سر نہ ہلاتے تھے۔ اس طرح ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ ایک اعلیٰ اخلاقی اصول ہے اور یہ فضائل اخلاق میں سے ہے اور نہایت مہذب زندگی ہے اور اعلیٰ اخلاقی رویہ ہے اور اسی میں معاشرے کی اصلاح و فلاح ہے کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔ جب اس قسم کے لوگ دیکھتے کہ اور مظلوموں کے رویہ کے بر[illegible] یہ شخص مدافعت کرتا ہے اور حکمرانوں نے جو غلامانہ اخلاقی نظام جاری کر رکھا تھا اور جس کے مطابق لوگ زندگی بسر کر رہے تھے اس کے خلاف

ایک شخص بغاوت کر رہا ہے تو یہ بات ان کے لیے انوکھی ہوتی تھی ۔ اور ان کو خوف لاحق ہو جاتا تھا ۔ وہ الٹا مظلوم کو جبار و قہار کہتے تھے اور اس پر دہشت گردی اور بد اخلاقی کا الزام لگاتے تھے ۔ الٹا مظلوم کو لعنت و ملامت کرتے تھے ۔ ظالم تک ان کی لعنت و ملامت کا بہت ہی کم حصہ پہنچتا تھا ۔ مظلوم کے لیے ان کے ذہنوں میں مدافعت کا کوئی جواز نہ تھا ۔ اگرچہ وہ بند گلی تک پہنچ جانے کے بعد کوئی جسورانہ اقدام کرنے پر مجبور ہو گیا ہو ۔

حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل پر ایک عرصے تک ظلم ہوتا رہا ۔ موسیٰ علیہ السلام دیکھتے دیکھتے عاجز آ گئے ۔ ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے وہ ایک اسرائیلی کی مدافعت کرتے ہیں اور نادم ہو جاتے ہیں لیکن حالات کا دباؤ اس قدر شدید ہے کہ وہ دوبارہ وہی فعل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور قریب ہے کہ وہ یہ کام کر گزریں ۔ آپ ارادہ کر لیتے ہیں کہ اس شخص کو پکڑ لیں جو ان کا ' اور ان کی قوم کا دشمن ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ان کے اس فعل پر ' حضرت موسیٰ کو چھوڑ نہ دیا بلکہ اللہ نے ان کی تربیت کی اور ان کی دعا کو قبول کیا ۔ کیونکہ اللہ علیم و خبیر ہے ۔ اس کو اچھی طرح معلوم ہے کہ انسان کس قدر قوت برداشت رکھتا ہے ۔ جب ظلم شدید ہوتا ہے اور انصاف کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں ۔ تو مظلوم مجبور ہو کر حملہ کرتا ہے اور کسی بھی جسورانہ اقدام پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ لہٰذا قرآن نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے ارتکاب قتل کے فعل کو زیادہ خوفناک انداز میں بیان نہیں کیا ' جس طرح ایسے کام کو وہ سوسائٹیاں بہت ہی خوفناک سمجھتی ہیں جن کی فطرت اور جن کا ضمیر غلامی کے مظالم سہتے سہتے بدل جاتا ہے ۔ وہ نہیں سمجھتے کہ حالات کے دباؤ اور تشدد کے جواب میں لوگ ایسے کام پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ جب ان کی قوت برداشت جواب دے دیتی ہے ۔

قرآن کریم ان دونوں واقعات کا جس انداز میں ذکر کرتا ہے اس سے یہی تاثر ملتا ہے ۔ قرآن نہ تو ان اقدامات کے لیے وجہ جواز بیان کرتا ہے اور نہ ہی ان کی برائی میں مبالغہ آرائی کرتا ہے ۔ البتہ قرآن نے اس کو نفس پر ظلم اس لیے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مقام پر قومیت کے جذبات کا اظہار کیا جب کہ وہ ہونے والے رسول تھے ' اور اللہ تعالیٰ خود اپنی نگرانی میں ان کی تربیت فرما رہا تھا ۔ یا اس وجہ سے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے مظالم پر قبل از وقت کشمکش شروع کر دی تھی اور اللہ کا ارادہ اور اس کی اسکیم یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو پوری طرح اجتماعی نجات ملے ۔ کیونکہ انفرادی جھڑپوں کے نتیجے میں کوئی اجتماعی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی جس طرح مکہ میں مسلمانوں کو یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ ہاتھ روکے رکھیں ۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ شاید پہلے قتل کی بات پورے مصر میں پھیل گئی تھی ۔ حضرت موسیٰ کے بارے میں حکومتی حلقوں میں شبہات پھیل گئے تھے کیونکہ اس سے قبل فرعون اور اس کی کارروائیوں پر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر چکے تھے ۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھی اسرائیلی نے بھی بطور افتخار اور مسرت اس راز کو پھیلا دیا ہو گا ۔ خصوصاً بنی اسرائیل کے اپنے حلقوں کے اندر تو یہ تیزی سے پھیل گیا ہو گا ۔ اور باہر والوں کے کان میں بھی بھنک پڑ گئی ہو گی ۔

ہم اس کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ ایسے حالات میں موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے فرعون کے حاشیہ نشینوں میں سے کسی کو قتل کرنا ہر اسرائیلی کے لیے خوشی اور مسرت کی بات تھی ۔ اس طرح ان کے غیظ و غضب کی آگ ٹھنڈی ہو سکتی تھی ۔ ایسی باتیں بالعموم ایک سے دوسرے کی طرف بڑی تیزی سے پھیل جاتی ہیں ۔ اور بعض اوقات ایک حلقے سے

نکل کر دوسرے حلقوں تک جا پہنچتی ہیں جبکہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مشہور بھی تھا کہ وہ اس فرعونی تشدد پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور مظلوموں کی حمایت کرتے رہتے ہیں۔

جب موسیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ دوسرے قبطی کو پکڑ کر گوشمالی کریں تو اس نے پکار کر ان سے پہلے قبطی کے قتل کا الزام لگا دیا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ موسیٰ اسے پکڑنے ہی والے ہیں۔اور شاید ضرب کلیم اس کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہو تو وہ پکار اٹھا۔

اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ کَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ (۲۸:۱۹) رہی باقی عبارت اِنْ تُرِیْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَمَا تُرِیْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ (۲۸:۱۹) "تم مجھے اسی طرح قتل کرنا چاہتے ہو جس طرح کل تم ایک شخص کو قتل کر چکے ہو تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے تو اصلاح کرنا نہیں چاہتا"۔تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت اصلاح کی کوئی تحریک شروع کر رکھی تھی اور وہ مصلح مشہور تھے'اس لیے وہ شخص آپ پر الزام لگاتا ہے کہ تم اپنے منشور کے خلاف عمل کر رہے ہو۔تم ایک جبار شخص کی طرح اس ملک میں رہنا چاہتے ہو۔اصلاح احوال کے بجائے لوگوں کو قتل کرنا چاہتے ہو۔جس طرح یہ شخص حضرت موسیٰ پر الزام لگا رہا ہے اور جس انداز میں حضرت موسیٰ کو مخاطب کر رہا ہے ان دونوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں حضرت موسیٰ فرعون کے مقربین اور اہل خانہ میں سے نہ تھے۔ورنہ کوئی مصری ان پر الزام لگانے کی اس قدر جسارت نہ کر سکتا تھا اور اس کا انداز خطاب بھی ایسا نہ ہو سکتا تھا۔

بعض مفسرین نے کہا کہ یہ فقرے اس اسرائیلی کے ہیں جس کی حمایت میں آپ قبطی کو پکڑنا چاہتے تھے'اس قبطی کے نہیں ہیں۔کیونکہ حضرت موسیٰ نے اسرائیلی کو ڈانٹا تھا۔

اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ (۲۸:۱۸) "تو تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے"۔اس فقرے کے بعد جب موسیٰ قبطی کو پکڑنے کے لیے آگے بڑھے تو اس اسرائیلی نے یہ گمان کیا کہ شاید ضرب کلیم مجھ پر پڑنے والی ہے تو وہ خوف کے مارے یہ الزام لگا گیا اور راز فاش کر دیا۔ان مفسرین نے یہ رائے اس لیے اختیار کی ہے کہ یہ راز مصر میں راز ہی تھا کہ اس شخص کا قاتل کون ہے؟

لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ بات قبطی نے کہی ہو۔ہم نے بتا دیا ہے کہ یہ راز چپکے چپکے پورے شہر میں پھیل گیا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصری نے اپنی فراست اور دانش مندی سے یہ الزام لگا دیا ہو کہ مقتول مجہول کے قاتل موسیٰ ہی ہو سکتے ہیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب موسیٰ پر اس شخص نے قتل کا الزام لگایا تو موسیٰ علیہ السلام اس شخص کے پکڑنے سے رک گئے اور یہاں سے چھوٹ کر یہ شخص بھاگتے بھاگتے فرعون کے ہاں پہنچ گیا ہو گا اور کہہ دیا ہو گا کہ قاتل دراصل موسیٰ ہے۔اب یہاں سابق منظر اور آنے والے منظر کے درمیان ایک وقفہ اور [illegible] اگلا منظر یہ ہے کہ ایک شخص بھاگتا ہوا مدینہ سے باہر یعنی شاہی دربار و رہائش کے علاقے سے آتا ہے اور حضرت موسیٰ کو خبردار کرتا ہے کہ تمہارے

بارے میں اعلیٰ سطح پر مشورے شروع ہو گئے ہیں اور تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ جان بچاکر مصر سے نکل جاؤ۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾

"اس کے بعد ایک آدمی شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا "اے موسیٰ' سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں' یہاں سے نکل جا' میں تیرا خیر خواہ ہوں"۔

فرعون کے سرداروں' اس کے حاشیہ نشینوں اور حکومتی افسروں اور اس کے خاص الخاص لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ قتل میں موسیٰ کا ہاتھ ہے۔ اس لیے انہوں نے محسوس کر لیا کہ موسیٰ کی صورت میں خطرہ مجسم ہو کر آ گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا کام ہے جس کی نوعیت انقلابی اور خطرناک ہے۔ یہ بغاوت کا آغاز ہے۔ اور اس کے محرکات میں بنی اسرائیل کا جذبہ انتقام ہے۔ لہٰذا یہ ایک نہایت خطرناک رجحان ہے اور اس کے انسداد کے لیے سخت تدابیر کی ضرورت ہے۔ اگر یہ قتل کوئی معمولی واردات ہوتی تو اس پر انتہائی اعلیٰ سطح پر غور کی کیا ضرورت تھی۔ آئے دن انسانوں میں قتل ہوتے رہتے ہیں لیکن اس قتل نے پورے نظام حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے بھی تدابیر کا آغاز کیا اور دست قدرت نے بھی اپنا کام شروع کر دیا۔ سرداروں میں سے ایک شخص جو موسیٰ کا ہمدرد تھا' دست قدرت نے اس سے کام لیا۔ یہ شاید وہی شخص ہے جو اپنے ایمان کو چھپا رہا تھا اور جس کا ذکر سورہ غافر کی آیت ۲۸ میں ہوا ہے۔ یہ شخص اٹھا اور اس نے حضرت موسیٰ کو اعلیٰ سطح پر ہونے والے مشوروں سے آگاہ کر دیا۔ یہ شخص نہایت سنجیدگی' اہتمام اور جلدی میں آیا اور اس نے شاہی کارندوں کو کسی کارروائی سے قبل حضرت موسیٰ کو اطلاع کر دی۔

اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ (۲۸: ۲۰)

"موسیٰ' سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں' یہاں سے نکل جا' میں تیرا خیر خواہ ہوں"۔

۲ ۸ ع ۵

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾

"یہ خبر سنتے ہی موسیٰ ڈرتا اور سہمتا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دعا کی کہ "اے میرے رب' مجھے ظالموں سے بچا"۔

حضرت موسیٰ شہر سے ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے نکل کھڑے ہوئے' یکہ و تنہا' ڈر رہے ہیں اور اللہ پر اعتماد کے سوا ان کے پاس کوئی ساز و سامان نہیں ہے۔ ان کی توجہ صرف اللہ کی طرف ہے۔ صرف اللہ کی مدد اور ہدایت کے وہ طلبگار ہیں۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾

"(مصر سے نکل کر) جب موسیٰ نے مدین کا رخ کیا تو اس نے کہا "امید ہے کہ میرا رب، مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا"۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یکہ و تنہا مصر سے نکلنے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں اور وہ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بغیر کسی زاد و عتاد کے جانب مدین رواں ہیں، مدین کا علاقہ شام کے جنوب اور حجاز کے شمال میں ہے۔ یہ ایک طویل سفر ہے، دور دراز کا سفر۔ جس کے لیے حضرت موسیٰ نے کوئی تیاری نہیں کی۔ وہ شہر سے نہایت ہی ڈر کی حالت میں سہمے ہوئے نکلے اور فرعون کے سردار ناصح نے انہیں مزید خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس لیے آپ نے ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر وہاں سے نکل جانے میں عافیت سمجھی۔ اس ناصح کی نصیحت میں آپ نے کوئی شک نہ کیا اور نہ نکلنے میں کوئی تردد کیا۔ کسی کو راہنما بنانے کی تاخیر بھی نہ کی اور نہ کوئی رفیق سفر تلاش کیا۔ لیکن صاف نظر آتا ہے کہ ان کا رخ اللہ کی طرف ہے، اللہ کے آگے انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ صرف اللہ کی راہنمائی کے طالب ہیں۔

عَسٰی رَبِّیْ اَنْ یَّھْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (۲۸ : ۲۲) "امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا"۔

ایک بار پھر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ خطرات میں گھر گئے ہیں۔ بچپن کے بعد وہ نہایت امن سے عیش و آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے اور شاہی محل میں نہایت ہی آرام سے رہ رہے تھے لیکن وہی شہزادہ اب اکیلا اور تنہا صحرا نوردی کر رہا ہے اور اس کے پاس دنیا کا کوئی ساز و سامان نہیں ہے۔ فرعون اور اس کے جاسوس اس کے تعاقب میں ہیں۔ ہر جگہ اس کی تلاش ہو رہی ہے۔ آج وہ اس سے انتقام لینا چاہتے ہیں اور اس سے وہ متاع حیات چھین لینا چاہتے ہیں۔ جو بچپن میں وہ نہ چھین سکے۔ لیکن قدرت کی جن قوتوں نے اسے اس وقت بچایا وہ آج بھی اس کے ساتھ ہیں۔ قدرت اسے اس کے دشمنوں کے سپرد کرنا ہرگز گوارا نہیں کرتی۔ اس سے تو بہت سا کام لیا جانا ہے، چنانچہ وہ بے آب و گیاہ صحرا میں اکیلے جا رہے ہیں۔ اب وہ ایسے علاقے تک پہنچ گئے جہاں فرعون کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ نہ وہ انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ وَجَدَ عَلَیْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ یَسْقُوْنَ ۫ۙ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَیْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِیْ حَتّٰی یُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَیْخٌ كَبِیْرٌ ﴿۲۳﴾ فَسَقٰی لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤی اِلَی الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿۲۴﴾

"اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں سے پوچھا "تمہیں کیا

پریشانی ہے؟" - انہوں نے کہا "ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں' اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں" - یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا' پھر ایک سائے کی جگہ جا بیٹھے اور بولے "پروردگار' جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں" -

یہ طویل صحرائی سفر ختم ہوا اور حضرت موسیٰ مدین کے ایک چشمے پر پہنچے - آپ تھکے ماندے مسافر ہیں - اس چشمے پر وہ ایک ایسا منظر دیکھتے ہیں جسے کوئی شریف اور بامروت آدمی برداشت نہیں کر سکتا اور پھر حضرت موسیٰ کیسے برداشت کرتے - آپ دیکھتے ہیں کہ مرد چرواہے اپنے مویشیوں کو لا لا کر پانی پلا رہے ہیں اور دو عورتیں ہیں جو اپنی بکریوں کو پانی سے دور روک رہی ہیں - حالانکہ فطرت سلیمہ اور مروت کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے عورتوں کو موقعہ دیا جائے کہ وہ اپنی بھیڑوں کو پانی پلائیں اور چلی جائیں اور مرد ان کو موقع دیں اور ان کے ساتھ تعاون کریں - "Ladies First" ایک فطری اصول ہے -

حضرت موسیٰؑ ایک غریب الدیار مسافر ہیں' اپنے علاقے سے نکلے ہوئے ہیں اور ان کا پیچھا بھی ہو رہا ہے - تھکے ہارے ہیں اور آرام کرنے کی خاطر اس چشمے پر آئے ہیں' وہ دیکھتے ہیں کہ یہ منظر معروف اخلاقی اصولوں کے خلاف ہے - وہ آگے بڑھتے ہیں اور ان دو عورتوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا معاملہ ہے؟

قَالَ مَا خَطْبُكُمَا (۲۸ : ۲۳) "تمہیں کیا پریشانی ہے -"

قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ وَ اَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ (۲۸ : ۲۳) "انہوں نے کہا ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک چرواہے اپنے جانور نکال نہ لے جائیں اور ہمارے والد ایک سن رسیدہ بوڑھے ہیں" - چنانچہ انہوں نے بتا دیا کہ وہ کیوں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں اور کیوں دوسروں کو پہلے موقعہ دیتی ہیں - سبب یہ ہے کہ وہ عورتیں ہیں اور ضعیف ہیں اور دوسرے چرواہے مرد ہیں اور زور آور ہیں - اور باپ بوڑھے ہیں وہ نہ مویشی چرا سکتے ہیں اور نہ ان مضبوط چرواہوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں - موسیٰ علیہ السلام کے جذبہ ایمانی جوش میں آیا - آپ کی فطرت سلیمہ جاگ اٹھی - وہ آگے بڑھے اور اصول کے مطابق کام کیا تاکہ بیچاری عورتیں پہلے پانی پلائیں جیسا کہ شریف اور مہذب لوگوں کا رواج ہوتا ہے - اگرچہ وہ غریب الدیار تھے - ان کو کوئی نہ جانتا تھا' نہ یہاں ان کا کوئی حامی و مددگار تھا' تھکے ماندے تھے' ایک طویل سفر کاٹ کر یہاں تک پہنچے تھے اور ان کے پاس مزید سفر کے لیے کوئی سازوسامان بھی نہ تھا - ان کا پیچھا بھی ہو رہا تھا' دشمن تعاقب میں تھے لیکن یہ تمام امور ان کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکے کہ وہ اس موقعہ پر مروت اور جوانمردی کا مظاہرہ نہ کریں - اور امر بالمعروف پر عمل پیرا نہ ہوں اور لوگوں کو یہ بتا نہ دیں کہ قدرتی انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ عورتوں کو پہلے موقعہ دیا جائے -

فَسَقٰى لَهُمَا (۲۸ : ۲۴) "یہ سن کر موسیٰ نے ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا" - یہاں سیاق کلام سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نہایت ہی تربیت یافتہ شریف النفس شخصیت کے مالک تھے - وہ جسمانی لحاظ سے بھی ایک کڑیل جوان تھے' جسے دیکھ کر عام آدمی مرعوب ہو جاتا تھا - حالانکہ وہ طویل سفر سے تھکے ہوئے آئے تھے -

چرواہوں پر ان کی جسمانی قوت سے زیادہ ان کی نفسیاتی برتری اور اخلاقی رویہ نے زیادہ اثر کیا۔ کیونکہ جسمانی قوت کے مقابلے میں لوگ اخلاقی رویوں سے زیادہ مرعوب ہوتے ہیں۔

ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ (۲۸: ۲۴) "پھر ایک سائے کی جگہ جا بیٹھا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موسم سخت گرمی اور لو کا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس قسم کی شدید گرمی میں یہ سفر کرنا پڑا تھا۔

فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (۲۸: ۲۴) "اور بولا پروردگار جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے، میں اس کا محتاج ہوں"۔ اس وقت انہوں نے جسمانی اعتبار سے درختوں کے گھنے سائے میں اپنے جسم کو آرام پہنچانے کے لیے پناہ لے رکھی ہے، لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت اور رحم و کرم کرنے والے بادشاہ کے سایہ رحمت میں بھی پناہ چاہتے ہیں۔ اپنی روح اور اپنے قلب کو اللہ کی طرف متوجہ کیے ہوئے ہیں۔ اے اللہ میں محتاج ہوں، شدید لو ہے، میں اکیلا ہوں۔ اے رب میں بے وسائل ہوں، اے رب میں تیرے فضل و کرم اور تیرے احسان کا بے حد محتاج ہوں۔

اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (۲۸: ۲۴) "جو خیر بھی تو مجھ پر نازل کر دے میں اس کا محتاج ہوں"۔ ابھی ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مناجات کے اس منظر میں ہیں، کہ سیاق کلام میں نہایت فرحت بخش بشارت آتی ہے۔ اس کا آغاز صرف (فاء) تعقیبی سے ہوتا ہے، گویا عالم بالا نے حضرت موسیٰ کی دعاء کو اس سے قبل قبول کر لیا کہ وہ ہاتھ نیچے کریں۔ کیونکہ وہ نہایت ہی خضوع سے یہ دعا کر رہے تھے۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۚ قَالَتْ اِنَّ اَبِىْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۭ

"(کچھ دیر نہ گزری تھی) ان دونوں عورتوں میں سے ایک شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی "میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے لیے جانوروں کو پانی جو پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں"۔

اللہ کے فضل و کرم کے کیا کہنے، حضرت موسیٰ اللہ کے کس قدر قریب ہیں، ان کی پکار کس قدر تیزی سے سنی جاتی ہے۔ دو عورتوں کے والد سن رسید شیخ عالم بالا کی ہدایت پر حضرت موسیٰ کو دعوت دیتے ہیں، یہ دعوت عزت و احترام پر مبنی پناہ عطا کرنے اور جزائے احسان دینے کے لیے ہے۔ یہ دعوت لے کر ان دو دوشیزاؤں میں سے ایک آئی ہے اور وہ

تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ (۲۸: ۲۵) "شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی آئی ہے"۔ اس کی روش میں وقار ہے، عامیت نہیں ہے، وہ مقامات زینت کا اظہار نہیں کرتی بلکہ ان کو چھپا رہی ہے۔ نہ نسوانی غرور ہے اور نہ

جاذبیت کا اظہار ہے۔ وہ آتی ہے اور والد کی طرف سے نہایت ہی مختصر' جامع الفاظ میں یہ دعوت دیتی ہے۔ قرآن کریم نے اس کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

اِنَّ اَبِیۡ یَدۡعُوۡكَ لِیَجۡزِیَكَ اَجۡرَ مَا سَقَیۡتَ لَنَا (۲۸ : ۲۵) "میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے جانوروں کو پانی جو پلایا ہے' اس کا اجر آپ کو دیں"۔ شرم و حیا کے دائرے میں نہایت وضاحت کے ساتھ' جامع الفاظ میں یہ پیغام پہنچا دیا جس میں کوئی بناوٹ کوئی جھجک کوئی توقف نہ تھا اور کوئی پیچیدگی یا لکنت نہ تھی۔ یہ اس طرح کیوں ہے' اس لیے کہ فطرت سلیمہ' عفیفہ اور سیدھے سادھے کیریکٹر والی خواتین کی روش ایسی ہی ہوتی ہے۔ سیدھی فطرت کی نوجوان عورت جب بھی مردوں سے ملتی ہے' اسے حیا آتی ہے۔ وہ مردوں سے بات کرتے ہوئے شرماتی ہے لیکن یہ لڑکی چونکہ پر اعتماد اور عفیف اور سلیم الفطرت ہے۔ اس لیے اس کی باتوں میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ ورنہ گری ہوئی فطرت اور کردار کی لڑکیاں ایسے موقع پر ناز و انداز اور کشش و ہیجان پیدا کرنے کا رویہ اختیار کرتی ہیں۔ لیکن اس لڑکی نے بس نہایت ہی مختصر الفاظ میں مطلوبہ پیغام پہنچا دیا۔ کوئی ایک لفظ بھی ضرورت سے زیادہ منہ سے نہیں نکالا۔

قرآن کریم بھی اس منظر کی یہی جھلک دکھاتا ہے اور اس پر کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ صرف شیخ کبیر کی طرف سے ایک لڑکی انہیں دعوت پیش کرتی ہے۔ موسیٰ قبول کر لیتے ہیں اور پردہ گرتا ہے۔ اگلا منظر دونوں کی ملاقات کا ہے۔ اس شیخ کبیر کا نام قرآن مجید نے نہیں لیا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ مشہور نبی حضرت شعیب علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور ان کا نام یثرون تھا۔ (۱)

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَیۡهِ الۡقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفۡ ٝ نَجَوۡتَ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۵﴾

"موسیٰ جب اس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصہ اسے سنایا تو اس نے کہا "کچھ خوف نہ کرو' اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو"۔

---

(۱) میں نے ان کے بارے میں بعض جگہ تو یہ کہا ہے کہ یہ حضرت شعیب ہیں' بعض جگہ یہ کہا ہے کہ یہ حضرت شعیب نبی ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی اور ہوں۔ اب میرا میلان اس طرف ہے کہ شیخ کبیر حضرت شعیب نہیں ہیں۔ یہ مدین کے کوئی اور شخص تھے۔ اس رائے تک میں اس لیے پہنچا ہوں کہ یہ شخص تو شیخ کبیر ہیں' بوڑھے ہیں جبکہ حضرت شعیب کی قوم ان کی زندگی میں ہلاک ہوئی اور صرف اہل ایمان ہی زندہ بچے تھے۔ اگر یہی صاحب حضرت شعیب ہوتے اور اپنی مومن قوم کے اندر بستے ہوتے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ اہل ایمان ایک نبی کی لڑکیوں سے بھی پہلے اپنے جانوروں کو پانی پلائیں اور ان کا اس قدر احترام بھی نہ کریں اور نبی کی لڑکیوں کے ساتھ یہ سلوک کریں۔ نیز قرآن کریم نے بھی حضرت موسیٰ کے سسر کے بارے میں کوئی صراحت نہیں کی۔ اگر یہ حضرت شعیب نبی ہوتے جن کے ہاں حضرت موسیٰ دس سال رہے تو قرآن ضرور ان کا ذکر کرتا۔ (سید قطب)

حضرت موسیٰ کو اس وقت سب سے پہلے جائے امن کی ضرورت تھی ۔ نیز انہیں ایسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں ان کے کھانے پینے کا انتظام ہو جائے ۔ لیکن ان کو کھانے پینے کی ضروریات سے زیادہ احتیاج ایک پرامن اور مامون و محفوظ ٹھکانے کا تھا ۔ یہی وجہ ہے اس سنجیدہ اور سن رسیدہ بوڑھے نے سب سے پہلے انہیں کہا لَا تَخَفْ "خوف نہ کرو" ۔ اس شخص نے ان کو سب سے پہلے جو بات کہی کہ آپ اطمینان رکھیں ' ڈریں نہیں اور اس یقین دہانی کے بعد یہ فرمایا

نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۲۸ : ۲۵) "اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو" ۔ مدین پر ان کی حکومت نہیں ہے ۔ مدین کے باشندے کو مصری کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۔

اب منظر پر ایک نہایت ہی سلیم الفطرت اور عفیف عورت کی آواز آتی ہے ۔

قَالَتْ إِحْدٰهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ ۖ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾

"ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا "ابا جان ' اس شخص کو نوکر رکھ لیجئے ' بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو" ۔

ان دونوں بہنوں کو بھیڑ بکریاں چرانا پڑتی تھیں اور پانی پلاتے وقت ان کو مردوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کو مردوں سے واسطہ پڑتا تھا اور ان سے ٹکرانا پڑتا تھا ' جس طرح ہر اس عورت کو ایسے حالات درپیش ہوتے رہتے ہیں جو مردوں والا کام کرتی ہے ۔ ان دونوں بہنوں کو ہر وقت اس کام میں اذیت کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ امور خانہ داری تک محدود ہو جائیں اور ایک پاک دامن عفت مآب "زن خانہ" کی طرح زندگی بسر کرنے کا موقع ملے اور انہیں چراگاہوں اور گھاٹوں پر غیر مردوں کے ساتھ اختلاط پر مجبور نہ ہونا پڑے ۔ پاک دامن ' پاک فطرت اور سلیم الفطرت عورتوں کی روش یہی ہوتی ہے کہ ان کو مردوں کے ساتھ مقابلہ اور مزاحمت کرنا پسند نہیں آتا اور اس قسم کے اختلاط اور مزاحمت کی وجہ سے عورتوں کے اندر جو ہلکا پن پیدا ہو جاتا اسے کوئی سلیم الفطرت عورت پسند نہیں کرتی ۔

حضرت موسیٰ نوجوان ' مسافر اور غریب الوطن ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ قوی اور امین بھی ہیں ۔ اس عورت نے دیکھ لیا تھا کہ ان کی قوت اور شخصیت کو دیکھ کر تمام چرواہے سہم گئے تھے ۔ انہوں نے موسیٰ کو فوراً راستہ دے دیا تھا اور ان دو مستورات کے جانوروں نے پانی پی لیا تھا ۔ حالانکہ حضرت موسیٰ غریب الوطن تھے اور غریب الوطن اگرچہ کوئی بڑا آدمی ہو ۔ کمزور سمجھا جاتا ہے ۔ اور جب یہ عورت موسیٰ کو دعوت دینے گئی تھی تو اس نے دیکھ لیا تھا کہ پاک نظر اور پاک زبان رکھتے ہیں ۔ چنانچہ یہ عورت باپ کو مشورہ دیتی ہے کہ ابو آپ اس شخص سے اجارہ کر لیں تاکہ وہ اور اس کی بہن بکریاں چرانے کے عذاب سے نجات پالیں اور اس طرح ان کو وہ کام نہ کرنا پڑے جو مرد کرتے ہیں ۔ حضرت موسیٰ مضبوط آدمی ہیں ' امین ہیں ۔ اس لیے کہ جو شخص کسی دوشیزہ کی عفت کا امین ثابت ہو جائے ' وہ تمام امور پر امین ثابت ہو جاتا ہے ۔ یہ اپنے اس مشورے میں بھی بالکل واضح سوچ رکھتی ہے اور صاف صاف بات کر رہی ہے اسے یہ خطرہ نہیں ہے کہ اس پر کوئی بدظنی کرے گا کیونکہ اس کی دل کی کتاب صاف ہے ۔ اس کا احساس و شعور پاک ہے ۔ اس لیے اسے کسی محاسبے سے ڈر نہیں ہے ۔ چنانچہ وہ اپنی اس تجویز میں شف شف نہیں کرتی ۔ اور نہایت ہی صاف الفاظ میں واضح

تجویز دیتی ہے ۔

یہاں ان روایات کو دہرانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے جو مفسرین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت کے بارے میں نقل کی ہیں ' مثلاً یہ کہ جس کنویں سے چرواہے پانی پلاتے تھے ' اس پر ایک بڑا پتھر رکھا ہوا ہوتا تھا جسے بیس ' چالیس یا اس سے بھی کم و بیش افراد اٹھا سکتے تھے ۔ حالانکہ قرآن کریم کے سباق سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کنویں کے اوپر پتھر ہوتا تھا بلکہ دوسرے چرواہے پانی پلا چکتے تو بعد میں یہ دو عورتیں پانی پلاتیں ۔ حضرت موسیٰ نے ان چرواہوں کو ہٹایا اور ان عورتوں کے مویشیوں کو پانی پلا دیا یا دوسرے چرواہوں کے ساتھ ساتھ پانی پلا دیا ۔

نیز یہاں ان روایات کے دہرانے کی بھی ضرورت نہیں ہے جن میں ان کی دیانت و امانت پر یہ دلیل دی گئی ہے ۔ جس میں انہوں نے اس دوشیزہ سے کہا کہ تم میرے پیچھے چلو اور پیچھے سے مجھے راستہ بتلاتی چلو ' اس خوف سے کہ کہیں ان کی نظر اس عورت پر نہ پڑ جائے ۔ یا یہ کہ حضرت موسیٰ نے اس لڑکی کو پیچھے چلنے کا اس وقت کہا جب وہ آگے چل رہی تھی تو ہوا نے اس کے کپڑوں کو ٹخنوں سے اوپر کر دیا ۔ یہ محض تکلفات ہیں اور ان کے ذریعہ سے ایسے شکوک کو دور کرنے کی سعی کی گئی ہے جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے ۔ حضرت موسیٰ بذات خود عفیف النظر تھے ' پاک احساسات رکھتے تھے اور یہ عورت بھی پاک دامن تھی ' عفت اور امانت جہاں ہو ان کے ثبوت کے لیے ایسے تکلفات کی ضرورت نہیں ہے خصوصاً مرد اور عورت کی ملاقات کے وقت کیونکہ عفت وہ پختہ ملکہ ہے جو بغیر کسی تکلف اور بناوٹ کے حصہ کردار ہوتا ہے ۔

اس بوڑھے نے اپنی بیٹی کی اس تجویز کو قبول کر لیا ۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ لڑکی اور موسیٰ دونوں کے اندر خواہش اور اعتماد پایا جاتا ہے اور فطری میلان موجود ہے ۔ اور یہ دونوں مل کر ایک صالح خاندان کی بنیاد ڈال سکتے ہیں ۔ جب کسی نوجوان میں قوت اور عفت جمع ہو جائیں تو فطرتاً ہر سلیم الفطرت دوشیزہ ایسے شخص کو زندگی کا ساتھی بنانے پر راضی ہوتی ہے ۔ جو خود پاک دامن اور صالح ہو ۔ اس لیے اس بوڑھے نے حضرت موسیٰ کو پیش کش کر دی کہ وہ اپنی بیٹیوں میں سے ایک تمہارے نکاح میں دے سکتے ہیں ۔ اگر تم آٹھ سال تک میری خدمت کرو اور میرے مویشی چراؤ اور اگر بطور احسان تم دس سال تک یہ خدمت کرو تو تمہاری طرف سے احسان ہو گا ۔

قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ ؕ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۲۷

"اس کے باپ نے (موسیٰ سے) کہا "میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو ' اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری مرضی ہے ۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا ۔ تم ان شاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے" ۔

یوں نہایت ہی سادگی اور بے تکلفی سے اس شخص نے اپنی دو بیٹیوں میں ایک حضرت موسیٰ کے عقد میں دینے کے لیے خود پیش کش کر دی۔ شاید یہ وہی لڑکی تھی جس نے تجویز دی تھی اور اس کے اور موسیٰ علیہ السلام کے قلوب کا میلان ایک دوسرے کی طرف تھا۔ اس شخص نے بے تکلفی سے اور براہ راست پیش کش صراحت کے ساتھ کر دی۔ کیونکہ یہ پیش کش عقد کے لیے تھی۔ لہٰذا اس میں حجاب محسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یہ پیش کش اس لیے تھی کہ ایک نیا خاندان وجود میں آ جائے۔ اس شخص نے تکلف اور کنایہ و اشارہ میں بات کرنے کا تکلف نہیں کیا۔ ایسے تکلفات اور بناوٹیں ان معاشروں میں ہوتی ہیں جن میں فطرت سے انحراف پیدا ہو جاتا ہے اور ایسے معاشرے نہایت ہی باطل، گندی رسومات اور تکلفات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان تکلفات کی وجہ سے والد یا سرپرست کسی بچی کو کسی کے عقد میں دینے کے لیے بھی صاف صاف پیش کش نہیں کرتا، حالانکہ دل سے وہ کئی لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ فلاں رشتہ اس کی بہن بیٹی اور رشتہ دار کے لیے بہت مفید ہے، لیکن لوگ انتظار کرتے ہیں کہ خاوند، اس کے وکیل یا اس کے سرپرست کی طرف سے کوئی پیش کش ہو، بالعموم یہ تصور کیا جاتا ہے کہ عورت کی جانب سے پیش کش مناسب نہیں ہے۔

لیکن ایسی غیر فطری اور سڑی ہوئی سوسائٹیوں کے تضادات میں سے ایک تضاد یہ ہے کہ نوجوان لڑکے ایک دوسرے کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھتے ہیں۔ آزادانہ گپ شپ لگاتے ہیں، آزادانہ اختلاط اور باہم انکشاف کے روادار ہوتے ہیں لیکن نکاح اور عقد کی پیش کش کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جب نکاح کی پیش کش ہوتی ہے تو اس وقت بھی مصنوعی حجاب اور پردہ داری شروع ہو جاتی ہے اور لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت چھوڑ دیتے ہیں بلکہ پردہ شروع ہو جاتا ہے۔ غرض نکاح کی پیش کش میں فطری بے تکلفی نہیں ہوتی حالانکہ اس میں سادگی اور کھلا پن ہونا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں باپ صاف صاف اپنی لڑکیوں کا رشتہ پیش کرتے تھے بلکہ عورتیں بھی اپنے آپ کو پیش کرتی تھیں۔ عورتیں اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے کی پیش کش کرتی تھیں یا ان لوگوں کو بے تکلف پیش کش کرتی تھیں جو ان کے ساتھ نکاح میں دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ معاملہ نہایت سادگی اور علانیہ اور بے تکلفی اور کھلے پن سے طے ہو جاتا۔ اور اس کے لیے کوئی مخصوص آداب و تکلفات نہ تھے۔ نہ اس طرح پیش کش سے کسی کی عزت اور شرافت میں فرق آتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بچی حفصہ کی پیش کش حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کی تو وہ خاموش ہو گئے۔ پھر انہوں نے حضرت عثمان کو کی تو انہوں نے معذرت کی۔ جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ انہوں نے ایسا کیا ہے تو حضورؐ بہت خوش ہوئے اور فرمایا ہو سکتا ہے کہ اسے ایسا رشتہ مل جائے جو ان دونوں سے بہتر ہو۔ اس کے بعد حضور اکرمؐ نے خود ان کے ساتھ نکاح کر لیا۔ ایک دوسری عورت نے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیش کیا تو آپؐ نے معذرت کی۔ پھر اس عورت نے اپنے نکاح کا اختیار حضورؐ کو دے دیا۔ حضورؐ نے اس کا نکاح ایک ایسے شخص سے کر دیا جس کے پاس قرآن کی دو سورتیں تھیں۔ حضورؐ نے اس عورت کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا اور ان دو سورتوں کو اس کا مہر قرار دیا۔

--- ooo---

یہ تھی وہ سادگی جس کے ساتھ اسلامی معاشرے میں خاندان بن رہے تھے اور اس طرح ایک اسلامی سوسائٹی وجود میں آرہی تھی۔ اس معاملے میں ان کے ہاں کوئی اشارہ' کنایہ' تکلف اور تصنع اور ٹیڑھ نہ تھی۔ مدین کے اس بوڑھے نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے خود موسیٰ علیہ السلام کو یہ پیش کش کی اور یہ وعدہ بھی کیا کہ اس عرصے میں وہ ان پر کوئی سختی نہ کرے گا۔ اور ان کی وسعت سے زیادہ کام نہ لے گا۔ اور وہ یہ امید کرتا ہے کہ تم ایک صالح نوجوان کا کردار ادا کرو گے۔ اور ہمارے معاملات صحت و صفائی کے ساتھ چلیں گے۔ یہ نہایت ہی خوبصورت اور سادہ آداب ہیں۔ وہ نہ اپنے آپ کو آسمانوں پر چڑھاتے ہیں اور پاکی داماں کی حکایات کرتے ہیں اور نہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تعریف اور مدح سرائی کرتے ہیں۔ پس صرف خیر کی امید رکھتے ہیں۔ اور تمام معاملات اللہ کی مشیت کے سپرد کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ نے بھی اسی سادگی' صداقت اور بے تکلفی سے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور اس پر اللہ ہی کو گواہ ٹھہرا کیونکہ وہاں اللہ کے سوا ان کا گواہ تھا کون؟

قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾

۳ ع ۷ ۶

"موسیٰ نے جواب دیا" یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی پوری کر دوں اس کے بعد پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو' اور جو کچھ قول قرار ہم کر رہے ہیں' اللہ اس پر نگہبان ہے"۔

جب دو افراد باہم معاہدہ کرتے ہیں تو اس میں کوئی بات پیچیدہ نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہی بات کو مجمل چھوڑنا چاہئے۔ نہ اس موقعے پر بات چھپانا چاہئے بلکہ بات کھل کر ہونی چاہئے۔ عقد کے موقعہ پر کسی بات کی وضاحت کرنے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ اس پیش کش کو مان لیتے ہیں اور نکاح کر لیتے ہیں۔ اس بوڑھے نے جو مشروط پیشکش کی اس کے متعلق حضرت موسیٰ یہ وضاحت کرتے ہیں ان دو میعادوں میں سے جو بھی وہ چاہیں پورا کریں۔

اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ (۲۸ : ۲۸) "دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کروں اس کے بعد کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو گی"۔ چاہے میں آٹھ سال رہوں یا دس سال پورے کر دوں۔ لیکن کام کے فرائض میں زیادتی نہ ہو گی۔ یعنی آٹھ کے بعد دو سال کا جو اضافہ ہے وہ اختیاری ہے اور ہمارے اس معاہدے پر اللہ گواہ ہے کیونکہ وہ دیکھ رہا ہے اور معاہدہ کرنے والے دونوں فریقوں پر اللہ گواہ ہوتا ہے' اور وہ کافی گواہ ہے۔

حضرت موسیٰ نے یہ بیان اپنی فطرت کے عین مطابق دیا۔ وہ نہایت ہی سیدھی اور کھلی طبیعت کے مالک تھے۔ انہوں نے دس سال پورے کرنے کے بارے میں جو صاف صاف اختیاری ہونے کی شرط کی وضاحت کی وہ اس لیے کہ معاہدہ کرنے والے فریقوں کا فرض ہے کہ وہ صاف صاف بات کریں۔ حالانکہ ان کی نیت یہ تھی کہ وہ ان دو میعادوں میں سے لمبی معیاد پر عمل کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لمبی اور

زیادہ طویل مدت پوری کی (بخاری)۔

یوں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے سسر کے گھر میں نہایت عزت اور احترام سے رہے۔ وہ فرعون اور اس کی سازشوں سے مامون و محفوظ ہو گئے۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا اللہ کی عین حکمت کے مطابق ہو رہا تھا۔ اب یہ دس سال کیسے گزرے اسے چھوڑ دیجئے۔ ہمارے قصے میں ان کی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن نے ان کے مناظر کو کاٹ دیا ہے اور خاموش ہے۔ پردہ گرتا ہے۔

غرض یہ دس سال گزر گئے جن پر فریقین کے درمیان عقد ہوا تھا۔ اس سورت میں ان کے بارے میں کچھ مذکور نہیں ہے۔ اب اگلے منظر میں حضرت موسیٰ دس سال کی میعاد پوری کر کے جانب مصر رواں نظر آتے ہیں۔ یہ مدین کو چھوڑ کر اب مصر لوٹ رہے ہیں۔ یہ انہی راہوں پر واپس جا رہے ہیں جن پر وہ اکیلے آئے تھے، ڈرے اور سہمے ہوئے۔ لیکن اب ان کی واپسی کی فضا ایسی نہیں جس طرح ان کے فرار کی فضا تھی۔ وہ لوٹ رہے تھے لیکن اثنائے راہ وہ جن تجربات سے دوچار ہونے والے تھے ان کا خواب خیال بھی ان کے ذہن میں نہیں ہے، یہ کہ رب تعالیٰ انہیں پکارے گا۔ اب وہ موسیٰ کلیم اللہ ہو جائیں گے اور اب وہ مشن ان کے سپرد ہو جائے گا جس کے لیے اللہ نے انہیں اپنی نظروں میں بچائے رکھا۔ تربیت اور پرورش کی۔ یہ مشن کیا تھا فرعون جیسے جبار اور اس کے سرداروں کے سامنے کلمہ حق کا بلند کرنا۔ اور کلمہ بھی یہ کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دو کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے رب کی بندگی کریں اور رب تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور وہ اس سرزمین کو آزاد کرائیں جس کے بارے میں اللہ نے ان کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے اور یہ کہ حضرت موسیٰ فرعون ہامان اور ان کے حواریوں کے لیے دشمن ہوں اور ان کے لیے باعث پریشانی ہوں۔ تاکہ ان دونوں کا انجام حضرت موسیٰ کے ہاتھوں سے ہو کیونکہ یہ اللہ کا سچا وعدہ تھا۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَ اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰۤى اَقْبِلْ وَ لَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ وَّ اضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَاۡئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ

مِنْهُمْ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُوْنِ ﴿٣٣﴾ وَ أَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً يُّصَدِّقُنِيْٓ ۖ إِنِّيْٓ أَخَافُ أَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿٣٤﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ إِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ أَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿٣٥﴾

"جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر چلا تو طور کی جانب اس کو ایک آگ نظر آئی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا "ٹھہرو' میں نے ایک آگ دیکھی ہے' شاید میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارہ ہی اٹھالاؤں جس سے تم تاپ سکو"۔ وہاں پہنچا تو وادی کے دہنے کنارے پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ "اے موسیٰ' میں ہی اللہ ہوں' سارے جہاں والوں کا مالک"۔ اور (حکم دیا گیا کہ) پھینک دے اپنی لاٹھی۔ جوں ہی کہ موسیٰ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (ارشاد ہوا) "موسیٰ' پلٹ آؤ اور خوف نہ کرو' تو بالکل محفوظ ہے۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال' چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے' اور خوف سے بچنے کے لیے اپنا بازو بھینچ لے۔ یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے' وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں"۔ موسیٰ نے عرض کیا "میرے آقا' میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں' ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے' اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے' اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے' مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے"۔ فرمایا "ہم تیرے بھائی کے ذریعہ سے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو ایسی سعادت بخشیں گے کہ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہماری نشانیوں کے زور سے غلبہ تمہارا اور تمہارے پیروؤں کا ہی ہو گا"۔

قبل اس کے کہ ہم اس حلقے کے ان دو مناظر پر تفصیلی گفتگو کریں' ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ ان دس سالوں کے وقفے میں اللہ نے حضرت موسیٰ کے حوالے سے کیا تدابیر اختیار کیں اور کیا اقدامات کیے۔ اس سفر اور آنے جانے میں کیا حکمت تھی۔

•

دست قدرت کو یوں منظور تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ایک قدم آگے بڑھتے جائیں۔ یعنی اس وقت سے لے کر جب وہ شیرخوار بچہ تھے' ان کی موجودہ پوزیشن تک ان کے ساتھ دست قدرت کا معاملہ کیا رہا۔ ان کو دریا میں پھینکا گیا تاکہ فرعون کے لوگ اسے پکڑ لیں۔ ان کو دیکھ کر فرعون کی بیوی ان پر فریفتہ ہو گئی یا کر دی گئی کہ وہ عین شاہی محل میں پرورش پائیں' دشمن کے گھر میں پلیں۔ پھر وہ لوگوں کی غفلت کے وقت شہر میں داخل ہوئے اور ایک آدمی ان کے ہاتھوں مر گیا۔ پھر ان کے پاس فرعون کے حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص کو بھیجا گیا کہ نکلو تمہارے قتل کی تدابیر ہو رہی ہیں' یہ تائید ایزدی مصر اور مدین تک کے صحرائی سفر میں اس کے ساتھ رہی جبکہ ان کے پاس کوئی زاد و عتاد نہ تھا۔ اور پھر مدین کے کنویں پر ان کی ملاقات دختران شیخ سے کرا دی گئی اور اس بہترین مربی اور بوڑھے کے ساتھ ان کا دس سالہ معاہدہ ہو گیا اور جب وہاں سے واپس ہوئے تو طور پر ان کو عظیم مشن سپرد کیا گیا۔

مشن سپرد کرنے کی ندا سے قبل ان پر خدا کا طویل فضل و کرم ہوتا رہا' ان کو تلقین ہوتی رہی اور تمام آسمانی قوتیں ان کی تائید میں بڑھتی رہیں ۔ اور ان کو زندگی کے مختلف تجربات سے دوچار کیا جاتا رہا۔ مہربانی' محبت اور راہنمائی کا تجربہ' حالات کے دباؤ میں آکر انتہائی اقدام کرنے کا تجربہ' نادم ہونے' احتیاط کرنے اور غلطی پر استغفار کرنے کا تجربہ ۔ ڈر' تعاقب اور پریشانی کا تجربہ' تنہائی' مسافری اور بھوک و افلاس کا تجربہ اور دوسروں کی خدمت کرنے اور بکریاں تک چرانے کا تجربہ اور ان بڑے بڑے تجربوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے روز مرہ کے تجربات' دلی احساسات' مختلف قسم کے تصورات و خلجانات' نئی نئی دریافتیں اور معلومات ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ اللہ نے جوان ہوتے ہی ان کو علم و حکمت سے نواز لیا تھا۔ (ایک شاہزادے کی حیثیت سے نکال کر یہ تجربات کرائے گئے)

حقیقت یہ ہے کہ منصب رسالت ایک ایسا فریضہ اور ایک ایسی عظیم ذمہ داری ہوتی ہے جس کے متعدد پہلو ہوتے ہیں اور گوناگوں ذمہ داریاں نبی اور رسول پر آن پڑتی ہیں ۔ لہٰذا نبی کو علم و فضل' حکمت و دانائی اور زندگی کے مختلف تجربات اور مختلف لوگوں کی عملی زندگی کا ادراک کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے ۔ اور یہ عملی تجربہ اس لغوی علم و حکمت اور وحی الہٰی سے الگ ہوتا ہے جو ہر نبی کو کرایا جاتا ہے تاکہ نبی کا ضمیر پاک و صاف ہو جائے اور ہدایت نبی کے قلب میں بٹھا دی جائے ۔

رسولوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام انبیاء کو سپرد کئے جانے والے مشنوں میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذمہ داریاں بہت بھاری اور مشکل ذمہ داری تھی ۔ ان کو فرعون جیسے سرکش اور جبار و قہار حکمران کے سامنے جانا تھا۔ یہ اپنے دور کے بادشاہوں میں سے بڑا اور مالدار بادشاہ تھا۔ قدیم شاہی سلسلے کا مالک تھا۔ حکومت نہایت مستحکم تھی اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے مصر اس وقت ترقی یافتہ تھا۔ اس نے تمام پسی ہوئی اقوام کو غلام بنا رکھا تھا اور زمین کے اوپر اس کو مقام بلند حاصل تھا۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ایسی قوم کی آزادی اور ہجرت کے لیے بھیجا گیا تھا جس کے دل و دماغ میں غلامی رچ بس گئی تھی ۔ وہ غلامانہ زندگی کے عادی ہو گئے تھے اور ان کا ضمیر پوری طرح بدل گیا تھا۔ وہ عملاً ایک طویل زمانے تک غلام رہے تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ غلامی انسانی فطرت کو بگاڑ دیتی ہے ۔ اس کے اندر تعفن اور سڑاند پیدا ہو جاتی ہے اور اس قوم کے احساسات سے گندگی اور تعفن اور سڑاند کا احساس ہی جاتا رہتا ہے ۔ بھلائی' خیر اور جمال اور برتری اس کو راس ہی نہیں آتی ۔ اس طرح کی بگڑی ہوئی قوم کو اٹھانا معنی دارد۔

آپ کو ایسی قوم کی طرف بھیجا گیا جو قدیم زمانہ سے اسلامی نظریہ کی حامل تھی لیکن اس کے اندر نظریاتی انحراف پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے دل و دماغ میں اس کی اصل حقیقی صورت وہ نہ رہی تھی ۔ نہ یہ قوم پرانے اسلامی عقیدہ اور شریعت پر قائم تھی اور نہ جدید عقیدے کو صحیح طرح قبول کر رہی تھی ۔ اس قسم کے لوگوں کی اصلاح کرنا بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے ۔ ان کے اندر پائے جانے والی کجی کو درست کرنا' ان کے انحراف کو سیدھا کرنا اور ان کے اصل عقائد کے اوپر سے خرافات کی گہری تہوں کو ہٹانا اس مہم کی مشکل ترین باتیں تھیں۔

مختصراً یہ کہ حضرت موسیٰ نے بالکل ایک نئی امت کی تعمیر کرنا تھی ۔ بالکل نئے سرے سے ۔ پہلی مرتبہ بنی اسرائیل کو ایک خاص قوم' ایک خاص نظام کی حامل قوم اور ایک خاص رسالت کی حامل امت بنانا تھا اور ظاہر ہے کہ کسی قوم اور

امت کی تعمیر ایک نہایت ہی مشکل کام ہوتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کو بار بار دہرایا ہے ۔اس لیے کہ ایک نظریہ کی اساس پر کسی نئی امت کی تعمیر کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ایک مخصوص نمونہ تھی ۔ایسے عظیم کام کی راہ میں داخلی اور خارجی مشکلات ہوتی ہیں ۔ایسی ہمہ گیر دعوتوں میں کجی بھی پیدا ہوتی رہتی ہے ۔وہ مخصوص شکل بھی اختیار کر لیتی ہے اور اسے بہت سے تجربات سے بھی گزرنا پڑتا ہے ۔اور راستے میں مشکلات بھی آتی ہیں ۔

سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین کی بدویانہ زندگی سے کیوں گزارا گیا تو یہ اس لیے تاکہ وہ عوام الناس کی پر مشقت زندگی کے نشیب و فراز بھی جان لیں اور براہ راست تجربہ بھی حاصل کر لیں ۔

شاہی محلات کی زندگی کی ایک مخصوص فضا ہوتی ہے ' مخصوص آداب اور پروٹوکول ہوتے ہیں ۔اگر کوئی اعلیٰ درجے کا سلیم الفطرت ' پاک طینت اور صاحب علم و فضل کیوں نہ ہو ' محلات کی زندگی کی پرچھائیں اس پر ضرور پڑتی ہے ۔اور اس کے کچھ نہ کچھ اثرات ضرور رہ جاتے ہیں جہاں تک رسالت کا تعلق ہے اس میں ایک رسول کا واسطہ غنی سے بھی پڑتا ہے اور فقیر سے بھی ۔امت میں مالدار بھی ہوتے ہیں اور فقراء بھی ہوتے ہیں ۔اس میں صاف ستھرے بھی ہوتے ہیں اور میل کچیل والے بھی ہوتے ہیں ' مہذب بھی ہوتے ہیں اور وحشی بھی ہوتے ہیں ۔پاک فطرت بھی ہوتے ہیں اور خبیث الفطرت بھی ہوتے ہیں ۔اچھے بھی اور برے بھی ' قوی بھی اور ضعیف بھی ۔صابر بھی اور جزع و فزع کرنے والے بھی ۔ غرض امت میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور نبی نے سب کی اصلاح کرنی ہوتی ہے ۔فقراء لوگوں کے کھانے پینے ' چلنے پھرنے اور لباس کی الگ عادات ہوتی ہیں ۔وہ معاملات کو اپنے ذہن کے مطابق سمجھتے ہیں ۔ان کے سامنے زندگی کا ایک مخصوص تصور ہوتا ہے ' ان کی بات چیت ان کی حرکات و سکنات ' ان کا کلام اور ان کے شعور کا اپنا مخصوص انداز ہوتا ہے ۔یہ عوامی عادات ان لوگوں پر بہت بھاری ہوتی ہیں ' جنھوں نے محلات میں تربیت پائی ہوئی ہوتی ہے ۔اونچے محلات کے لوگ ' ان کے عوامی انداز کو دیکھنے کے روادار بھی نہیں ہوتے ' چہ جائیکہ وہ انہیں برداشت کریں اور ان کا علاج کریں ۔اگرچہ ان عامی لوگوں کے دل بھلائی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں ۔اور وہ اصلاح پذیر ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ظاہری رنگ ڈھنگ ' ان کی ظاہری عادات ' اونچے محلات والے کو نہیں جچتے ۔

ایک رسول کو بعض اوقات مشقتوں ' تنہائیوں اور تنگ دستیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔لیکن وہ لوگ جو بڑے بڑے محلات میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں ' ان کے اندر قربانی دینے کا بے پناہ جذبہ کیوں نہ ہو ' وہ بہت طویل عرصے تک تنگ دستی ' محرومی اور عملی زندگی میں مشقتوں کو برداشت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ محلات کے اندر پر تعیش ' فراوانی اور آرام طلبی کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں ۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کو محلات کے اس اعلیٰ معیار کی زندگی سے ذرا نیچے لا کر عوامی زندگی کی سطح تک اتارا جائے ۔انہیں چرواہوں کی سوسائٹی کے اندر ڈال دیا جائے اور خوف ' تعاقب اور پکڑے جانے کے ڈر سے فرار کے بعد ایک چرواہے کی زندگی گزارنے کا عادی بنایا جائے جہاں انہیں صرف کھانا اور ٹھکانا ملتا ہے تاکہ شہزادوں کے مزاج میں غربت اور غرباء سے جو کھچاؤ ہوتا ہے وہ دور ہو جائے ۔چرواہوں کی عادات ' ان کے اخلاق ' ان کی درشتی اور ان کی سادگی کے بارے میں شہزادوں کے اندر جو ناگواری پائی جاتی ہے وہ دور ہو جائے ۔ان کی جہالت '

غربت ' بدحالی اور مجموعی طور طریقوں سے حضرت موسیٰ شہزادہ اپنے آپ کو بلند اور دور نہ سمجھیں ' اور اس لیے کہ ان کو عوامی زندگی کے گہرے سمندروں کے اندر ڈال دیا جائے جبکہ پہلے وہ انسانی زندگی کے ایک محدود دھارے کے اندر تیرتے رہے تھے تاکہ آنے والی داعیانہ زندگی کے لیے وہ اچھی طرح تیار ہو جائیں ۔

جب موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت نے یہ تجربے مکمل کر لیے اور وہ عوامی زندگی کے نشیب و فراز سے خوب واقف ہو گئے اور یہ تجربات انہیں ایک غریب الدیار اجنبی کی حیثیت سے دوسرے علاقے میں رہ کر ہوئے تو دست قدرت نے انہیں پھر اپنی جائے پیدائش کی طرف روانہ کیا۔ جہاں ان کے اہل و عیال اور ان کی قوم رہتی تھی ۔ اور جہاں انہوں نے مشکل ترین فریضہ رسالت ادا کرنا تھا اب وہ اسی راہ پر چل رہے ہیں ۔ اس سے وہ بھاگے تھے اور بالکل یکہ و تنہا بھاگتے چلے جا رہے تھے ۔ سوال یہ ہے کہ اس ایک ہی راستے پر وہ کیوں آئے اور واپس ہوئے؟ یہ دراصل ایک جنگی مشق تھی انہیں اس راستے کے نشیب و فراز اور راہ و گھاٹ سے خبردار کرنا مطلوب تھا۔ کیونکہ قدرت نے طے کر رکھا تھا کہ عنقریب اسی راستے سے موسیٰ نے اپنی قوم کی قیادت کرتے ہوئے سینائی میں داخل ہونا ہے ۔ یہ دراصل ہراول دستے اور رہبری کی مشق تھی تاکہ حضرت موسیٰ کو خود اپنے سواکسی اور راہنما کی ضرورت نہ پڑے ' راستہ بتلانے والے کی بھی ۔ کیونکہ ان کی قوم ایسی حالت میں جاگری تھی کہ انہیں چھوٹے بڑے سب کاموں میں راہنمائی کی ضرورت تھی اس لئے کہ ذلت ' غلامی اور ماتحتی نے انہیں پوری طرح بگاڑ رکھ دیا تھا۔ ان کے اندر کوئی تدبر اور کوئی سوچ نہ رہی تھی ۔

اب معلوم ہو گیا کہ قدرت الٰہیہ کس طرح اپنی نظروں کے نیچے حضرت موسیٰ کی تربیت کر رہی تھی اور ان کو فریضہ رسالت کی ادائیگی کے لیے کس طرح اچھی تربیت دی گئی ۔ اب ذرا دیکھیے کہ حضرت موسیٰ نے واپسی کا سفر کس طرح طے کیا؟

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ

(۲۸ : ۲۹) "جب موسیٰ نے مدت پوری کر دی اور وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر چلا تو طور کی جانب اس کو ایک آگ نظر آئی ۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا "ٹھہرو' میں نے ایک آگ دیکھی ہے ' شاید میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارہ ہی اٹھا لاؤں جس سے تم تاپ سکو" ۔

یہاں یہ ایک اہم سوال ہے کہ وہ کیا سوچ تھی جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر لوٹنے پر آمادہ کیا ۔ مدین میں انہوں نے عرصہ کار پورا کر دیا۔ اب وہ مصر لوٹ رہے ہیں حالانکہ وہ مصر سے نہایت ہی خوف کی حالت میں نکلے تھے ۔ ان کو تعاقب کا ڈر تھا۔ وہ یوں واپس ہو رہے تھے کہ شاید وہ اس خطرے کو بھول گئے ہیں جو مصر میں اب بھی ان کو درپیش ہے ۔ وہاں انہوں نے ایک آدمی کو قتل کیا ہوا ہے ' فرعون ابھی زندہ ہے جو اپنے سرداروں کے ساتھ آپ کے قتل کا مشاورت کر رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ عالم بالا کی اپنی سکیم کے مطابق ہو رہا ہے ۔ اس بار شاید اہل و عیال اور قوم اور وطن

کے لیے فطری میلان انہیں واپسی پر مجبور کر رہا ہے اور ان کے دل سے وہ خطرات اب محو ہو گئے جن کی بنا پر اس نے یکہ و تنہا یہاں سے فرار اختیار کیا تھا۔ اور یہ دست قدرت اس لیے کر رہا ہے کہ وہ اس مہم اور منصب کے لیے تیار ہو جائیں جس کے لیے اللہ نے ان کو اول روز پیدا کیا ہے۔

بہرحال وجہ جو بھی ہو، حضرت موسیٰ واپس ہو رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے اہل و عیال بھی ہیں۔ رات کا وقت ہے، سخت اندھیرا ہے۔ یہ قافلہ راستے سے بھٹک گیا ہے۔ سردیوں کا موسم ہے۔ اس لیے کہ آگ دیکھ کر وہ وہاں سے آگ لانے کے لیے جا رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آگ کے پاس جو کوئی ہو گا یا تو راستہ بتا دے گا ورنہ وہ ایک انگارہ لے آئیں گے تاکہ تاپ سکیں۔ یہ اس قصے کا پہلا منظر ہے۔

دوسرا منظر نہایت غیر متوقع ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ

(۲۸: ۳۰) "وہاں پہنچا تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا"۔ حضرت موسیٰ تو دیکھ رہے ہیں کہ آگ ہے اور یہ وادی طور میں ان کے دائیں جانب ہے۔ اور یہ جگہ نہایت ہی متبرک ہے، اور یہ وادی بھی آج ہی متبرک ہو رہی ہے، پوری کائنات لمحہ بھر کے لیے خاموش ہے اور اس کے اندر عالم بالا اور رب ذوالجلال کی یہ آواز گونج رہی ہے، بظاہر کانوں پر وہ ایک درخت مبارک سے آ رہی ہے اور شاید یہ اس علاقے میں واحد درخت ہے۔

اَنْ یّٰمُوْسٰۤی اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۲۸: ۳۰) "اے موسیٰ، میں اللہ ہوں سارے جہانوں کا مالک"۔ حضرت موسیٰ نے اس آواز کو براہ راست سنا۔ اس گہری اور خاموش وادی میں وہ اکیلے کھڑے تھے۔ نہایت ہی تاریک اور خاموش رات میں۔ یہ آواز پوری کائنات بھی ہر طرف سے اس آواز کو سن رہی تھی، زمین اور آسمانوں کی دوریوں اور بلندیوں میں یہ آواز گونج رہی تھی۔ حضرت موسیٰ نے اس آواز کو پایا، کس ذریعہ سے پایا، کس طرح سے سنا، یہ ہمیں معلوم نہیں، البتہ حضرت موسیٰ کی ذات اور ان ماحول اور پوری کائنات اس سے گونج رہی تھی اور بھری ہوئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے رب کائنات کی آواز کو پایا اور اس کے متحمل ہو گئے، کیونکہ ان کو اس کے لیے تیار کر لیا گیا تھا۔

اس کائنات کے ضمیر نے اس آواز کو ریکارڈ کر لیا، جہاں اس آواز کو حضرت موسیٰ نے پایا، وہ جگہ بابرکت ہو گئی۔ یہ جگہ اب مکرم ہو گئی اور حضرت موسیٰ اب نہایت ہی بابرکت اور مکرم جگہ میں کھڑے تھے اور یہ آواز ابھی ختم نہیں ہوئی مکالمہ جاری ہے۔

اَلْقِ عَصَاكَ (۲۸: ۳۱) "پھینک دے اپنی لاٹھی"۔ حضرت موسیٰ نے باری تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے فوراً لاٹھی پھینک دی۔ دیکھتے کیا ہیں؟ وہ تو اب ان کی وہ لاٹھی نہیں ہے جو ان کے ساتھ ایک عرصہ تک رہی

اور جس کو وہ یقیناً جانتے تھے کہ یہ ایک عصا ہے ۔ عصا نہیں اب تو وہ ایک سانپ ہے جو زمین پر رینگ رہا ہے ۔ بڑی تیزی سے ادھر ادھر جا رہا ہے اور یہ اس طرح کروٹیں بدل رہا ہے جس طرح چھوٹے چھوٹے سانپ بدلتے ہیں حالانکہ یہ بہت ہی بڑا سانپ نظر آتا ہے

فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ (۲۸ : ۳۱) "جو موسیٰ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے 'تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا"۔ اس لیے کہ یہ نہایت ہی غیر متوقع صورت حال تھی 'اس کے لیے وہ ذہنا تیار نہ تھے 'پھر آپ کا مزاج بھی انفعالی تھا۔ آپ پر ہر صورت حال کا جلد اثر ہو جاتا تھا۔ آپ اس طرح بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ یہ سانپ ان کی طرف بڑھ بھی رہا ہے یا نہیں تاکہ وہ معلوم کرتے کہ یہ عجیب معجزہ ہے اور اس پر کچھ غور کرتے ۔ جو لوگ بھی جلد متاثر ہو جاتے ہیں ان کی روش اسی طرح ہوتی ہے ۔ ندائے ربانی جاری ہے ۔

يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ (۲۸ : ۳۱) "موسیٰ پلٹ آ اور خوف نہ کر تو بالکل محفوظ ہے"۔ موسیٰ علیہ السلام کے لیے خوف اور امن کے یہ تجربے کوئی نئے نہ تھے۔ ان کی زندگی کے مختلف مراحل میں خوف اور امن کے چکروں پر مشتمل ہیں یہ خوف اور امن ان کی پوری زندگی کے موسم ہین ۔ آغاز سے انجام تک اور موسیٰ علیہ السلام کا یوں متاثر ہو جانا بھی حکمت خداوندی پر مبنی اور مطلوب و مقصود تھا۔ ان کی زندگی میں اسی طرح مقدر تھا کیونکہ حضرت موسیٰ کی زندگی میں یہ زیر و بم اور یہ اضطراب اور یہ تلاطم بنی اسرائیل کی جامد 'تقلیدی اور رکی ہوئی زندگی کے بالمقابل قصداً پیدا کیا گیا تھا۔ یہ قدرت کی تقدیر تھی اور قدرت کی گہری حکمت اور تدبیر پر مبنی تھی ۔

اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ (۲۸ : ۳۱) "واپس آجاؤ 'اور ڈرو نہیں تم محفوظ ہو"۔ کس طرح وہ محفوظ نہ ہو گا جسے دست قدرت آگے بڑھا رہا ہو اور جس کی نگرانی اللہ تعالیٰ خود کر رہا ہو۔ ابھی مکالمہ جاری ہے ۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ (۲۸ : ۳۲) "اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال 'چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے"۔ حضرت موسیٰ نے حکم کی اطاعت فرمائی اور اپنے ہاتھ کو گریبان میں ڈالا اور نکالا ۔ یہ ان کے لیے اسی وقت دوسرا غیر متوقع منظر تھا کہ ہاتھ سفید اور چمکدار ہے اور بغیر کسی بیماری کے ایسا ہے حالانکہ پہلے وہ گندم گوں تھا۔ ہاتھ کے سفید ہونے میں اشارہ اس طرف تھا کہ حق اور سچائی واضح اور صاف اور روشن دن کی طرح ہے ۔

اب موسیٰ علیہ السلام جذباتی اور متاثر ہونے والی شخصیت نے اپنا کام دکھایا۔ وہ ان مناظر 'غیر متوقع مناظر کو دیکھ کر ڈر گئے اور کانپنے لگے ۔ ایک بار پھر ربانی ہدایت براہ راست آتی ہے ۔ حکم ہوتا کہ اپنے ہاتھوں کو اپنے بازوؤں کو بھینچ لو' اس طرح تمہارے دل کی دھڑکن کم ہوگی اور تمہیں پورا اطمیناں ہو جائے گا۔

وَّ اضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ (۲۸: ۳۲) ”اور خوف سے بچنے کے لیے اپنا بازو بھینچ لو“۔ گویا ان کا ہاتھ ان کا پر ہے جسے وہ سینے کے ساتھ ملا رہے ہیں جس طرح پرندہ مطمئن ہو کر پروں کو جسم سے جوڑ لیتا ہے۔ جب پرندہ پروں کے ساتھ پھڑپھڑاتا ہے تو اس کی کیفیت اس طرح ہوتی ہے جس طرح انسانی دل دھڑکتا ہے۔ اور جب وہ پروں کو جوڑتا ہے تو وہ اطمینان اور سکون کی کیفیت کے ساتھ مشابہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم یہاں اس مفہوم کی ایسی ہی تصویر کشی کرتا ہے :

اب موسیٰ علیہ السلام باری تعالیٰ کی طرف سے ہدایات پا چکے ہیں اور جو مشاہدات ان کو کرائے گئے وہ مشاہدہ وہ کر چکے ہیں۔ یہ دو نشانیاں اور معجزات تو وہ خود دیکھ چکے ہیں۔ پہلے وہ خود بھی خائف ہو گئے اور ان کا دل دھڑکنے لگا۔ پھر ان کو اطمینان دیا گیا۔ اب ان کو وہ اصل مشن سپرد کیا جاتا ہے جس کے لیے ان کو ابتداء سے آغاز پیدائش سے تربیت دی جا رہی ہے۔

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ

(۲۸: ۳۲) ”یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے ' وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں“۔

یہ پیغام گویا فرعون اور اس کے سرداروں کے لیے تھا۔ اور یہ اس وعدے کا ایفا ہوا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے ساتھ کیا گیا تھا کہ ”ہم اسے تیری طرف لوٹانے والے ہیں اور اسے مرسلین میں سے بنانے والے ہیں“۔ اور یہ پختہ وعدہ تھا' کئی سال گزر گئے کہ یہ طے ہوا تھا۔ لیکن یہ اللہ کا وعدہ تھا اور اللہ وعدہ خلافی نہیں فرمایا کرتا۔ وہ تو سب سے سچی بات کرنے والا ہے۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یاد آتا ہے کہ انہوں نے تو ان کا ایک آدمی قتل کیا ہے اور یہ کہ وہ ان سے اس وقت چلے گئے جب گرفتاری کا خطرہ تھا۔ اور اس لیے بھاگ گئے تھے کہ انہوں نے انہیں قتل کرنے کے مشورے شروع کر دیئے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کا رب تعالیٰ کے ساتھ مکالمہ شروع تھا اور یہ عظیم اعزاز تھا جو انہیں بخشا گیا۔ پھر ان کو دو عظیم معجزات کا اعزاز بھی بخشا گیا۔ اور پھر اپنی نگرانی میں ان کی تربیت فرمائی۔ لہٰذا انہوں نے اپنے مشن کے سلسلے میں ایک عملی دشواری کی طرف سے خدشے کا اظہار کیا۔ یہ نہ ہو کہ وہ لوگ چھوٹتے ہی انہیں قتل کر دیں اور دعوت کا سلسلہ ہی کٹ جائے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ (۲۸: ۳۳) ”موسیٰ نے عرض کیا میرے آقا میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے“۔ موسیٰ علیہ السلام منصب نبوت قبول کرنے سے معذرت نہ کر رہے تھے۔ نہ ان کا مقصد یہ تھا کہ پیچھے ہٹ جائیں یا منہ موڑ لیں اور نافرمانی کریں بلکہ وہ یقین دہانی چاہتے تھے اور یہ اطمینان چاہتے تھے کہ دعوت کو جاری رہنا چاہئے۔ اور اگر وہ قتل ہو گئے جس طرح خدشہ ہے تو سلسلہ شروع ہی سے ختم ہو جائے گا۔ یہ ان کی جانب سے ایک مناسب بات بھی ہے حالانکہ وہ قوی اور امین

تھے ۔ڈرنے والے نہ تھے ۔

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ (۲۸ : ۳۴) ’’اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے‘ اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے‘‘۔ ہارون مجھ سے زیادہ فصیح و بلیغ مقرر ہے اور دعوت کو اچھی طرح پیش کر سکتا ہے‘ اسے میرے لیے تائید کنندہ کے طور پر بھیج دے تاکہ وہ میرے دعوائے رسالت کی تائید کرے اور اگر وہ مجھے قتل ہی کر دیں تو میرا خلیفہ ہو۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو یقین دہانی کرائی جاتی ہے اور درخواست قبول کر لی جاتی ہے ۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا بِاٰیٰتِنَاۤ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ (۲۸ : ۳۵) ’’فرمایا‘‘ہم تیرے بھائی کے ذریعہ سے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو ایسی سعادت بخشیں گے کہ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے ۔ہماری نشانیوں کے زور سے غلبہ تمہارا اور تمہارے پیروؤں کا ہی ہو گا‘‘۔ جو واقعات بھی رونما ہو رہے ہیں ان میں قدرت الٰہیہ کی معجزانہ قوتیں زیادہ واضح طور پر حضرت موسیٰ کے ساتھ کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی اور غلبہ کے پیچھے صرف متعارف اسباب ہی نظر نہ آئیں بلکہ اس پر عالم بالا کی مشیت کا رنگ غالب ہو تاکہ لوگوں کے نظریات کے اندر محض مادی اسباب کے علاوہ آسمانی قوتوں کی مشیت بھی واضح طور پر اہمیت اختیار کر لے ۔لوگوں کو اللہ پر ایمان حاصل ہو اور وہ اللہ پر توکل کریں اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں ۔

یہ خوبصورت اور عظیم منظر ختم ہو جاتا ہے اور زمان و مکان کے فاصلے لپیٹ دیئے جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام اب دربار فرعون میں ہیں ۔ اللہ کی واضح آیات لیے ہوئے ہیں ۔ اب ہدایت و ضلالت آمنے سامنے ہیں ۔ ان کے درمیان سخت مکالمہ شروع ہے ۔اور اس دنیا میں حق و باطل کی کشمکش کا فیصلہ یوں ہوتا ہے کہ باطل اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق ہو جاتا ہے ۔اور آخرت میں لازماً وہ لعنت کا مستحق ہو گا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْۤ اٰبَآىِٕنَا الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰی رَبِّیْۤ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ ۚ فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ عَلَی الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ

صَرْحًا لَّعَلِّىْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَ اِنِّىْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ۝ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ وَ اَتْبَعْنٰهُمْ فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ۝

"پھر جب موسیٰ ...... ان لوگوں کے پاس ہماری کھلی کھلی نشانیاں لے کر پہنچا تو انہوں نے کہا کہ "یہ کچھ نہیں ہے مگر بناوٹی جادو۔ اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سنیں ہی نہیں"۔ موسیٰ نے جواب دیا "میرا رب اس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہوتا ہے' حق یہ ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے"۔

اور فرعون نے کہا "اے اہل دربار' میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ ہامان' ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا' شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں' میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں"۔

اس نے اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور سمجھے کہ انہیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے۔ آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا۔ اب دیکھ لو کہ ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔ ہم نے انہیں جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیش رو بنا دیا اور قیامت کے روز وہ کہیں سے کوئی مدد نہ پا سکیں گے۔ ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے روز وہ بڑی قباحت میں مبتلا ہوں گے۔

یہاں قرآن کریم نے نہایت ہی جلدی میں فرعون کا انجام بتا دیا اور ایک فیصلہ کن وار کے نتیجے میں اس کا کام تمام ہو گیا۔ یہاں جادوگروں کے مقابلے کو حذف کر دیا گیا ہے جبکہ دوسری سورتوں میں بعض جگہ اجمال اور بعض جگہ تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر ہوا ہے۔ یہ کڑی یہاں اس لیے حذف کر دی گئی ہے کہ تکذیب کے بعد جلد ہی ہلاکت کا منظر پیش کر دیا جائے۔ اور نہ صرف یہ کہ دنیاوی عذاب کا ذکر ہو بلکہ آخرت کے عذاب کی ایک جھلک بھی دکھا دی جائے۔ اختصار اور جلدی کے ساتھ بات کو انجام پہنچانا اس سورت میں مقصود بالذات ہے۔ کیونکہ پوری سورت کا انداز یوں ہی ہے۔ اس سورت میں دست قدرت نمایاں طور پر متحرک نظر آتا ہے اس لیے یہاں بھی موسیٰ اور فرعون کے آمنے سامنے کے بعد جلد ہی فرعون کا انجام بد دکھا دیا گیا اور دست قدرت نے چشم زدن میں اس عظیم قوت کو ختم کر دیا اور تفصیلات بیان کرنے کے بجائے جلدی سے آخری جھلک دکھا دی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا

فَلَمَّا جَآءَهُمْ ... فِىٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۸ : ۳۶) ''پھر جب موسیٰ .... ان لوگوں کے پاس ہماری کھلی نشانیاں لے کر پہنچا تو انہوں نے کہا کہ ''یہ کچھ نہیں ہے مگر بناوٹی جادو۔ اور یہ باتیں تو ہم نے اپنے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سنیں ہی نہیں''۔ یہ ایک ایسی سچائی کا انکار ہے جس کا کوئی جواب ان سے بن نہ پڑتا تھا اور تمام زمانوں میں حاملین حق کے ساتھ مکذبین نے یہی سلوک کیا ہے۔ جب وہ لاجواب ہوگئے تو ایسی باتیں کرتے رہے۔ ان کا دعویٰ یہ رہا ہے کہ یہ جادو ہے۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں ہے کہ یہ تو نئی بات ہے۔ اس قسم کی بات ہم نے کبھی اپنے آبا سے نہیں سنی۔

یہ لوگ حضرت موسیٰ کے معجزات کے مقابلے میں کوئی حجت اور دلیل نہیں پاتے اور نہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں کوئی برہان پیش کرتے ہیں۔ وہ بس ایک مجمل بات کرتے ہیں جس سے نہ حق ثابت ہوتا ہے اور نہ باطل۔ نہ کوئی دعویٰ رد ہوتا ہے اور نہ ثابت ہوتا ہے۔ کیا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم نے یہ بات کبھی نہیں سنی۔ یہ محض شک کا اظہار ہے اور اہل باطل ہمیشہ جب سچائی کو تسلیم نہیں کرتے تو وہ اسے مشکوک بنانے کی سعی کرتے ہیں۔ ہر دور میں باطل کا یہی رویہ رہا۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہاں بات مختصر کرتے ہوئے معاملہ کو اللہ کے حوالے کر دیا۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّىْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۸ : ۳۷) ''موسیٰ نے جواب دیا'' میرا رب اس شخص کے حال سے خوب واقف ہے جو اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آخری انجام کس کا اچھا ہونا ہے' حق یہ ہے کہ ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہ نہایت ہی مہذب اور باادب جواب ہے۔ یہ جواب بہت ہی واضح اور نصیحت آموز ہے لیکن اس میں کوئی تلمیح اور اشارہ اور اجمال نہیں ہے۔ یہ جواب پر اعتمادی کے ساتھ دیا گیا ہے اور حضرت موسیٰ کو پورا اطمینان ہے کہ حق و باطل کے اس مقابلے میں حق فلاح پائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو خوب معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ سچے ہیں اس لئے کہ وہ اللہ کی براہ راست ہدایت اور مکالمے کے تحت کام کر رہے ہیں۔ اور اچھا انجام ان لوگوں کے لیے ہے جو ہدایت پر ہیں اور ظالم کبھی فلاح نہیں پاتے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ اگرچہ بعض معاملات بظاہر یوں نظر آتے ہیں کہ حق کو کامیابی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے اور اسی سنت کے ساتھ حضرت موسیٰ بھی فرعون کے مقابلے میں اترے ہیں اور تمام انبیاء سنن الٰہیہ کے مطابق ہی کام کرتے ہیں۔

اب اس پر اطمینان' مہذبانہ اور معقول جواب کا جواب الجواب فرعون کیا دیتا ہے؟ محض دعویٰ سرکشی' کھیل اور مزاح اور غرور لاابالی پن اور سستی۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ فَاَوْقِدْ لِىْ يٰهَامٰنُ عَلَى

الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّىْ صَرْحًا لَّعَلِّىْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّىْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ

(۲۸ : ۳۸) ''اور فرعون نے کہا'' اے اہل دربار' میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ ہامان' ذرا اینٹیں

پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا' شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں' میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں"۔

اے سرداران مصر میں نہیں سمجھتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی حاکم و اللہ ہے ـ فسق و سرکشی کا یہ بلند ترین رویہ ہے اور سردار ظاہر ہے کہ وہ اقرار کریں گے ـ اب وہ یہاں اس نظریہ کا سہارا لیتا ہے جو اس دور میں مصر میں عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا کہ بادشاہوں کا نسب نامہ الہوں سے ملتا ہے ـ اس کے بعد وہ اس جبر کا سہارا بھی لیتا ہے جس کے مقابلے میں کوئی دماغ سوچتا نہیں اور کوئی شخص سر اٹھا کر نہیں چلتا ـ اور کوئی زبان یہ جرات نہیں کرتی کہ کوئی اختلافی بات کرے' حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بادشاہ انہی جیسا ایک بشر ہے جو پیدا ہوتا ہے اور مرتا ہے لیکن ان اساطیر اور پھر جبر کی بنا پر وہ ایسا کہتا تھا اور یہ تسلیم کرتے تھے' بغیر اعتراض اور تنقید کے ـ

اب وہ ایک ایسی حرکت کرتا ہے جس سے بظاہر تو وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ فی الواقعہ حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے ـ اور وہ چاہتا ہے کہ موسیٰ کے الہ کو وہ آسمانوں میں تلاش کرنے نکلا ہے لیکن دراصل وہ حضرت موسیٰ کے ساتھ ایک سنجیدہ مزاح کرتا ہے ـ

فَاَوْقِدْ لِیْ یٰهَامٰنُ عَلَى الطِّیْنِ فَاجْعَلْ لِّیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْۤ اَطَّلِعُ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى

(۲۸: ۳۸) "اے ہامان' ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا' شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں"۔

موسیٰ کہتا ہے کہ اس کا اللہ آسمانوں میں ہے ـ بطور مزاح وہ کہتا ہے کہ مجھے تو اس میں شک ہے لیکن اس شک کے باوجود میں حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں ـ

وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ (۲۸: ۳۸) "میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں"۔

جس طرح دوسرے مقامات پر ہوا' یہاں حضرت موسیٰ اور جادوگروں کا مقابلہ بھی ہوا ـ جس کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے ـ

وَ اسْتَكْبَرَ هُوَ وَ جُنُوْدُهٗ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ

(۲۸: ۳۹) "اس نے اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اس بڑائی کا گھمنڈ کیا اور سمجھے کہ انہیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے"۔ ـ جب ان کو یہ واہمہ ہو گیا کہ انہوں نے اللہ کی طرف نہیں پلٹنا تو انہوں نے زمین میں ناحق گھمنڈ شروع کر دیا ـ اور معجزات اور پیغمبروں کو جھٹلایا ـ وہ معجزات جن کی تفصیلات اس سے قبل گزر گئی ہیں اور دوسری سورتوں میں ان کا مظاہرہ مفصل دکھایا گیا ہے ـ

فَاَخَذْنٰهُ وَ جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ (۲۸: ۴۰) "آخر کار ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو

پکڑا اور سمندر میں پھینک دیا"۔ یہ نہایت ہی اختصار کے ساتھ لیکن فیصلہ کن انداز میں سخت پکڑ اور 'سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے جس طرح انسان کسی کنکر اور کسی پتھر کو سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ جس طرح موسیٰ کی والدہ نے شیرخوار موسیٰ کو فرعون کے ڈر سے دریا میں پھینک دیا تھا' اس طرح اسے اور اس کے لشکروں کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔ لیکن اس بچے کو اللہ نے بچانا تھا تو بچ گیا اور فرعون اور اس کے لشکروں کو غرق کرنا تھا تو غرق ہو گئے۔ سمندر ان کے لیے باعث ہلاکت ہو گیا۔ لہٰذا امن و امان بھی اللہ کے ہاں ہے اور ڈرنا ہے تو اللہ ہی سے ڈرنا چاہئے کہ وہ ڈرنے کا مستحق ہے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ (۲۸:۴۰) "دیکھو' ان ظالموں کا کیسا انجام ہوا؟"۔ یہ انجام وہ منظر پر نظر آتا ہے۔ تمام دنیا کے سامنے ہے۔ اس میں مکذبین کے لیے بھی عبرت ہے اور نصیحت پانے والوں کے لیے بھی عبرت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکش جباروں کو اللہ ہلاک کرنا چاہے تو چشم زدن میں نیست و نابود کر دیتا ہے 'نصف سطر لکھنے سے بھی پہلے۔

اگلے لمحے فرعون اور اس کا لشکر اس دنیا سے اس جہاں میں ہیں اور فرعون اور اس کا لشکر وہاں بھی ایک عجیب منظر میں نظر آتے ہیں۔ ان کو حشر کے فیصلے کے بعد جہنم کی طرف بلایا جاتا ہے۔ فرعون وہاں بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت جہنم کی طرف رواں دواں ہے جس طرح وہ تعاقب میں حضرت موسیٰ کے پیچھے رواں تھا۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (۲۸:۴۱) "ہم نے ان کو جہنم کی طرف دعوت دینے والے پیش رو بنا دیا"۔ کیا ہی بری دعوت ہے جو یہ لوگ دیتے ہیں۔ اور کیا ہی بری قیادت و امامت ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ (۲۸:۴۱) "اور قیامت کے روز کہیں سے کوئی مدد نہ پا سکیں گے"۔ دنیا میں بھی ان کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور آخرت میں بھی ان کو ناکامی کا سامنا کرنا ہو گا۔ سرکشی اور ظلم کا یہی بدلہ تو ہوتا ہے۔ وہاں صرف ناکامی ہی نہ ہو گی' بلکہ ہر طرف سے لعنت و ملامت بھی ہو گی۔ اس زمین پر بھی اور آخرت میں حشر کے میدان میں بھی۔

وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ (۲۸:۴۲) "ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی اور قیامت کے روز وہ بڑی قباحت میں مبتلا ہوں گے"۔ مقبوحین کا لفظ ہی ایسا ہے کہ اس کی آواز ہی اس کے مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔ "قبح" شرمندگی' طعن' تشنیع' گندگی اور نفرت کے تمام مفہومات مقبوحین میں شامل ہیں۔ یہ اس لیے کہ زمین میں یہ کبر و غرور کا روپ اختصار کرتے تھے۔ عزت و جاہ اور قوت اور بندوں پر ظلم ان کا وطیرہ تھا۔

--- ○○○---

یہاں سیاق کلام میں مصر سے بنی اسرائیل کے خروج کو نہایت ہی اختصار کے ساتھ اور فرعون کے انجام بد کی ایک جھلک سرعت کے ساتھ دکھانے کے بعد یہ دکھایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو کس قدر مقام بلند عطا ہوا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۴۳)

"وہ پچھلی نسلوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی 'لوگوں کے لیے بصیرتوں کا سامان بنا کر' ہدایت اور رحمت بنا کر 'تا کہ شاید لوگ سبق حاصل کریں"۔ یہ ہے حضرت موسیٰ کا انجام۔ یہ ایک بہترین انجام ہے 'کس قدر باعزت انجام و مقام ہے یہ۔ جہاں تک وہ پہنچے 'ان کو کتاب دی گئی جو لوگوں کے لئے اس طرح زریعہ ہدایت تھی جس طرح انسانوں کے لیے آنکھیں ذریعہ ہدایت ہوتی ہیں۔ ہدایت ہے اور رحمت ہے۔ اور اس لیے ہے کہ بنی اسرائیل سبق سیکھیں۔ دیکھیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے نشیب و فراز میں دست قدرت نے کس طرح بار بار مداخلت کی۔ کس طرح اللہ نے کمزوروں کی حمایت کی اور جباروں کو ہلاک کیا۔ اور مظلومین کو بالاخر برتری حاصل ہوئی۔

قصہ موسیٰ و فرعون اس سورت میں یوں بیان ہوا۔ اس سے یہاں یہ ہدایت دی گئی کہ امن و سکون اللہ کی جانب سے ہوا کرتا ہے۔ اور انسانوں سے ڈرتے وہ لوگ ہیں جو اللہ سے نہیں ڈرتے۔ جو اللہ سے دور ہو جاتے ہیں اور یہ کہ جب ظلم اور سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ مظلوموں کے حق میں براہ راست مداخلت کرتا ہے اور ہمیشہ اللہ ظالم کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب جبار و قہار لوگ ظلم کرنا شروع کر دیں اور مخلوق خدا اپنے دفاع سے عاجز آ جائے۔ یہ وہ ہدایات تھیں جو اس وقت مکہ میں برسرعمل ایک مختصر سی انقلابی جماعت کے لیے بے حد ضروری تھیں۔ نیز مکہ کے مشرکین جو ان بیچاروں کے لیے فرعون کی طرح جبار و قہار تھے 'ان کو بھی بار بار سنایا جاتا ہے کہ تم بھی غور کرو' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جہاں جہاں کوئی انقلابی عمل شروع کرے گا اسے ان ہدایات کی ضرورت ہو گی۔ جہاں بھی دعوت ہو اور اس پر تشدد ہو۔

قرآن کریم میں قصص صرف ایسی ہی انقلابی تعلیمات کے لیے آتے ہیں۔ داعیوں کی تربیت کے لیے۔ اللہ کے سنن کے مناظر دکھانے کے لیے کہ سنن الہیہ کس طرح کام کرتی ہیں 'تا کہ لوگ نصیحت حاصل کریں اور اپنی جدوجہد میں ان سے بصیرت حاصل کریں۔

--- ○○○---

درس نمبر ۱۷۷ تشریح آیات

۴۴ --- تا --- ۷۵

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ابھی گزرا اور سابقہ سبق میں اس کی مفصل تشریح کی گئی ـ اس سبق میں اس قصے پر تبصرے کیے گئے ہیں اور نتائج اخذ کیے گئے ہیں ـ ان نتائج کے بعد پھر سورت کا مضمون اپنے اصلی موضوع کی طرف پلٹ جاتا ہے ـ اصل موضوع یہ ہے کہ امن و خوف کا مالک اللہ ہے ـ امن دینے والا بھی وہ ہے اور خوف میں مبتلا کرنے والا بھی وہ ہے ـ اس کے بعد روئے سخن مشرکین مکہ کی طرف پھر جاتا ہے جو شرک پر جمے ہوئے تھے ـ اسلام کا انکار کرتے تھے اور اس کے خلاف طرح طرح کے عذرات پیش کرتے تھے ـ مشرکین کو اس پوری کائنات کے اندر موجود شواہد بتائے جاتے ہیں ـ پھر ان کو ڈرانے کے لیے میدان حشر کے بھی بعض مناظر دکھائے جاتے ہیں ـ ان کو بتایا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیم لے کر آئے وہ سچی ہے ـ اہل کتاب میں سے سلیم الفطرت لوگ اسے قبول کرتے ہیں جبکہ مشرکین مکہ مدعی دین ابراہیمی ہونے کے باوجود انکار کرتے ہیں اگر وہ اس دعوت کو قبول کرلیں تو یہ ان کے لیے رحمت ثابت ہوگی ـ

اس قصے سے جو پہلا نتیجہ یہاں نکالا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کلام نازل ہو رہا ہے وہ سچا ہے ـ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان قصص کو اس طرح بیان کر رہے ہیں جس طرح کوئی عینی شاہد کسی واقعہ کو بیان کر رہا ہوتا ہے' حالانکہ حضور اکرمؐ ان واقعات کے پیش آنے کے وقت وہاں موجود نہ تھے بلکہ یہ علیم و خبیر اللہ کی طرف سے وحی ہے جو آپ پر آرہی ہے اور یہ وحی رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو شرک میں مبتلا ہیں ـ اور اس فعل کی وجہ سے دائمی عذاب کے مستحق ہو سکتے ہیں اور اس لیے کہ اگر یہ وحی نہ آتی تو ان لوگوں کو ایک بہانہ ہاتھ آجاتا ـ

رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۸ : ۴۷)

"پروردگار تو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی نبی بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے ہوتے" ـ

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ۙ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا

وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۟ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾

۵ ع ۸ ۸

”(اے نبیؐ) تم اس وقت مغربی گوشے میں موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو یہ فرمان شریعت عطا کیا' اور نہ تم شاہدین میں شامل تھے' بلکہ اس کے بعد (تمہارے زمانے تک) ہم بہت سی نسلیں اٹھا چکے ہیں اور ان پر بہت زمانہ گزر چکا ہے۔ تم اہل مدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ ان کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے' مگر (اس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور تم طور کے دامن میں بھی اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ کو پہلی مرتبہ) پکارا تھا' مگر یہ تمہارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات دی جارہی ہیں) تاکہ تم ان لوگوں کو متنبہ کردو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا' شاید کہ وہ ہوش میں آئیں۔ (اور یہ ہم نے اس لیے کیا کہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اپنے کیے کرتوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب ان پر آئے تو وہ کہیں ”اے پروردگار' تو نے کیوں نہ ہماری طرف کوئی رسول بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے ہوتے“۔

مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آگیا تو وہ کہنے لگے ”کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟“ کیا یہ لوگ اس کا انکار کرچکے ہیں جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ انہوں نے کہا ”دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں“۔ اور کہا ”ہم کسی کو نہیں مانتے“۔ (اے نبیؐ) ان سے کہو ”اچھا تو لاؤ اللہ کی طرف سے کوئی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت بخشنے والی ہو اگر تم سچے ہو' میں اس کی پیروی اختیار کروں گا“۔ اب اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں' اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔ اور (نصیحت کی)

بات پے درپے ہم انہیں پہنچا چکے ہیں تا کہ وہ غفلت سے بیدار ہوں"۔

غربی سے یہاں طور کا جانب غربی مراد ہے جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مکالمے اور چلہ کشی کے چالیس روز وشب کے لیے متعین فرمایا تھا۔ اصل میعاد تیس راتیں تھیں پھر اس میں دس کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس کا تذکرہ سورت اعراف میں گزر چکا ہے۔ اس عرصہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کی وہ تختیاں دی گئیں جن میں احکام خداوندی لکھے ہوئے تھے تا کہ ان احکام پر بنی اسرائیل کا قانونی نظام قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ تھے کہ آپ ازخود ان حالات و مشاہدات کی رپورٹ دے رہا ہے کیونکہ حضورؐ اور حضرت موسیٰ کے زمانوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے۔

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ (۲۸: ۴۵) "ہم بہت سی نسلیں اٹھا چکے ہیں اور ان پر زمانہ گزر چکا ہے"۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ حضور اکرمؐ کو یہ اطلاعات اللہ علیم و خبیر دے رہا ہے اور یہ قرآن وحی من جانب اللہ ہے۔

قرآن کریم نے حضرت موسیٰ کے قیام مدین کے واقعات کے بارے میں بھی تحدی کی ہے اور چیلنج کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے وہاں قیام کیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ واقعات بتا رہے ہیں تو حضور ہدایت خود مدین میں بھی تو موجود نہ تھے کہ اس زمانے کی خبریں حضور اکرمؐ نے ان سے لی ہوں اور پھر تفصیلات بیان کر دیں۔ اس کی حقیقت یہی ہے کہ

لٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ (۲۸: ۴۵) "مگر یہ خبریں ہم بھیجنے والے ہیں"۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن مجید اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے جس کے پاس انبیائے سابقین کی خبریں محفوظ ہیں۔

پھر قرآن مجید نے حضرت موسیٰ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان مناجات اور مکالمے کو بھی اپنی جزئیات کے ساتھ نقل کیا ہے۔ نہایت گہرائی کے ساتھ۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا (۲۸: ۴۶) "اور تم طور کے دامن میں اس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے پہلی مرتبہ موسیٰ کو پکارا"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پکار تو نہ سنی تھی۔ نہ اس کی تفصیلات انہوں نے قلم بند فرمائی تھیں۔ یہ اللہ کی جانب سے اہل مکہ قوم رسول کے لیے ایک رحمت ہے کہ وہ خبریں تفصیلات کے ساتھ دی جا رہی ہیں لہٰذا یہ خبریں بھی اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ آپ سچے ہیں اور جو دعویٰ کرتے ہیں اس پر پہلی دلیل خود یہ قرآن ہے تا کہ عرب جیسی قوم کو آپ ڈرائیں جن کے پاس اس سے قبل ڈرانے والا نہیں آیا۔ اس سے قبل کی رسالتیں بنی اسرائیل کے پاس آتی تھیں جو عربوں کے پڑوس میں بستے تھے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد اہل عرب میں کوئی رسول نہ آیا تھا تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

یہ قرآن لوگوں کے لیے رحمت خداوندی بھی ہے اور ان پر حجت بھی ہے تا کہ وہ قیامت کے دن یہ نہ کہیں کہ ہمارے لیے تو کوئی رسول بھیجا ہی نہ گیا تھا اور یہ کہ ان کو تو اچانک ہی پکڑ لیا گیا اور یہ کہ اس پکڑ سے قبل ہمیں کوئی نوٹس نہیں دیا گیا۔ یہ لوگ جس جاہلیت اور شرک میں مبتلا تھے وہ تو موجب عذاب تھی تو اللہ نے ان کی حجت بازی اور ان کے

عذرات کو ختم کرنے کے لیے رسول بھیج دیا اور آخری رسول بھیج دیا تاکہ ان کے بعد کوئی عذر نہ کرے۔

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۸:۴۷) "اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اپنے کرتوتوں کی بدولت کوئی مصیبت جب ان پر آئے تو وہ کہیں لے پروردگار تو نے کیوں ہماری طرف کوئی رسول نہ بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے ہوتے"۔ اگر رسول نہ آتا تو وہ ایسی ہی بات کرتے۔ اگرچہ رسول کے پاس آیات نہ ہوتیں، لیکن جب رسول آگیا اور اس کے پاس آیات بھی ہیں تو یہ لوگ ماننے سے انکار کر رہے ہیں حالانکہ اس کے پاس ناقابل تردید و ناقابل شک دلائل ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا وَقَالُوْآ اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ

(۲۸:۴۸) "مگر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آگیا تو وہ کہنے لگے "کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا تھا؟" کیا یہ لوگ اس کا انکار کر چکے ہیں جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟ انہوں نے کہا" دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں"۔ اور کہا "ہم کسی کو نہیں مانتے"۔ یہ غرض تھی ان کی بہانہ سازی اور ان کے غلط عذرات کی۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی تسلیم نہ کیا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ معجزات کیوں نہیں دیئے گئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے یعنی مادی معجزات یا قرآن کریم تختیوں پر لکھا ہوا کیوں نہیں اتارا گیا جس طرح تورات کو لکھا ہوا اتارا گیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے جو دلیل بیان کی ہے، یہ اس میں سچے نہیں ہیں۔ نہ ان کا یہ اعتراض مخلصانہ ہے۔

اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ (۲۸:۴۸) "کیا یہ لوگ اس کا انکار نہیں کر چکے جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟" جزیرۃ العرب میں یہودی رہتے تھے۔ ان کے پاس تورات بھی تھی تو عربوں نے تورات کو کیوں نہ مانا۔ انہوں نے تو تورات کی بھی تکذیب کی تھی۔ نیز ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ تورات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور صفات دونوں دی گئی ہیں اور انہوں نے قرآن کے بارے میں بعض اہل کتاب سے فتویٰ بھی پوچھا تھا اور انہوں نے کہہ دیا تھا کہ محمد جو تعلیم پیش کرتے ہیں وہ سچی ہے اور یہ تعلیم بھی کتب سابقہ کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ لیکن انہوں نے ان فتاویٰ کو بھی تسلیم نہ کیا۔ انہوں نے تورات کو بھی جادو کہا۔ قرآن کو بھی جادو کہا اور چونکہ دونوں جادو ہیں اس لیے دونوں ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہے۔

قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ (۲۸ : ۴۸) ''انہوں نے کہا دونوں جادو ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور کہا ''ہم کسی کو نہیں مانتے'' وہ حق طلب کرنا ہی نہیں چاہتے ۔ ورنہ دلائل کی کوئی کمی نہیں ہے اور نہ قرآن کی پشت پر موجود دلائل ضعیف ہیں ۔

قرآن مجید ایک قدم آگے بڑھ کر ان کو اچھی طرح لاجواب کر دیتا ہے' ان سے کہا جاتا ہے اگر تم قرآن کو تسلیم نہیں کرتے' اور تورات کی تعلیمات بھی تمہارے دل کو نہیں لگتیں تو تم کوئی ایسی کتاب لاؤ جو تورات اور قرآن دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو' ہم اس کتاب کو مان لیں گے ۔

یہ آخری بات ہے اور دلیل و برہان کی آخری حد ہے کہ تم ایسی کوئی کتاب لاؤ' اس کے بعد بھی اگر کوئی حق کے سامنے نہیں جھکتا تو یہ مکابرہ ہو گا اور ہٹ دھرمی ہو گی ۔ اور ہٹ دھرمی کے سامنے کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی ۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۸ : ۵۰) ''اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں' اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا''۔

قرآن جن حقائق پر مشتمل ہے وہ نہایت واضح ہیں ۔ دین اسلام کے جو دلائل ہیں وہ قطعی الثبوت ہیں ۔ ان دلائل کا جو شخص انکار کرتا ہے وہ وہی شخص ہو گا جو اپنی خواہشات کی پیروی میں لگا ہوا ہو ۔ کیونکہ معقول انسان کے لیے دو ہی راستے ہیں ۔ تیسرا راستہ ہی نہیں ہے یا تو وہ مخلص اور حق قبول کرنے والا ہو گا تو وہ لازماً دلائل ایمان کو دیکھ کر ایمان لائے گا اور یا وہ شک میں مبتلا ہو گا' اپنی خواہشات کا پیرو ہو گا وہ ہٹ دھرم اور کج بحثی کرنے والا ہو گا ۔ انکار محض ہٹ دھرمی کی وجہ سے کرے گا' اس لیے نہیں کرے گا کہ اسلامی عقائد میں کوئی پیچیدگی ہے یا حجت میں کوئی ضعف ہے یا دلیل میں کوئی کمی ہے جیسا کہ نفس پرست لوگ کہتے ہیں ۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ (۲۸ : ۵۰) ''اگر وہ آپ کی بات نہیں مانتے تو جان لیں کہ وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں ۔ اور یہ فیصلہ حتمی ہے' آخری ہے' اللہ کا فیصلہ ہے ۔ اس لیے اسے رد نہیں کیا جا سکتا ۔ جو لوگ اس دین کو قبول نہیں کرتے وہ مفاد پرست ہیں ۔ اس کے سوا کوئی اور عذر نہیں ہے ۔ انہوں نے اپنے آپ کو زبردستی ناسمجھ بنا رکھا ہے دراصل اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ یہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں ۔ حق واضح ہے اور پھر بھی یہ لوگ منہ موڑتے ہیں ۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۲۸ : ۵۰) ''اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے؟ اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا'' ۔ اور یہ اہل مکہ اس معاملے میں بڑے ظالم اور باغی ہیں ۔

یہ آیت ان لوگوں کے تمام عذرات ختم کر دیتی ہے جن کا کہنا یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کو سمجھا نہیں ہے اور ان کو دین کا پورا پورا علم نہ تھا۔ اسلام کا موقف ہے کہ اسلام بالکل واضح ہے۔ صرف لوگوں تک پہنچنا چاہئے' ان پر حجت تمام ہونا چاہئے کہ اسلام پہنچا دیا گیا۔ بس پھر مجادلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف پہنچا دینے سے لوگوں کے عذرات ختم ہو جائیں گے۔ دین پہنچ جانے کے بعد محض نفس پرست یا مفاد پرست ہی اس سے منہ موڑ سکتا ہے اور تکذیب وہی شخص کر سکتا ہے جو زبردستی اپنے آپ کو جاہل بنائے اور اپنے اوپر ظلم کرے۔ اس سچائی پر ظلم کرے۔ ایسا شخص مستحق ہدایت ہی نہیں ہوتا۔ ''ایسے ظالموں کو تو اللہ ہدایت ہی نہیں بخشتا''۔

حق پہنچتے ہی ان کا عذر ختم ہوا۔ ان پر دعوت پیش کرتے ہی رسول اور امت کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔ اب ایسے لوگوں کے پاس کوئی عذر نہ ہو گا۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۲۸ : ۵۱) ''اور نصیحت کی بات پے درپے ہم انہیں پہنچا چکے ہیں تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہوں''۔

--- ○○○---

گزشتہ آیات میں ثابت کیا گیا کہ یہ لوگ منہ موڑتے ہیں' شک کرتے ہیں اور ہٹ دھرمی کرتے ہیں۔ اب یہاں بعض ایسے لوگوں اور ایسے کرداروں کا ذکر بھی کیا جاتا ہے جو حق کو خلوص نیت سے قبول کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی مثال اہل کتاب میں ملتی ہے۔ ذرا دیکھو انہوں نے سچائی پر مشتمل اس کتاب کو کس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۫ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾

''جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی' وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ''ہم اس پر ایمان لائے' یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں'' یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا اس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی۔ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ''ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے' تم کو سلام ہے' ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے''۔

سعید ابن جبیر فرماتے ہیں کہ یہ ان ۷۰ پادریوں کے بارے میں ہے جنہیں نجاشی نے بھیجا تھا۔ جب یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ نے ان پر سورت یٰسین پڑھی۔ جب سورت ختم ہوگئی تو یہ لوگ رونے لگے اور مسلمان ہوگئے ان کے بارے میں زیر بحث آیات بھی نازل ہوئیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۲۸ : ۵۲) "وہ لوگ جنہیں ہم نے اس سے قبل کتاب دی ہے' وہ اس پر ایمان لاتے ہیں"۔

محمد ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں نقل کیا ہے "اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قریباً بیس آدمی آئے۔ آپ مکہ میں تھے۔ یہ لوگ عیسائی تھے اور انہوں نے آپ کے بارے میں سنا تھا۔ یہ لوگ حبشہ سے آئے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کو مسجد حرام میں پایا۔ یہ لوگ حضورؐ کے پاس بیٹھے اور آپؐ سے بات کرتے رہے۔ قریش کے کچھ لوگ کعبہ کے ارد گرد محافل سجائے بیٹھے تھے۔ جب ان لوگوں کا سوال و جواب ختم ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا اور ان کے سامنے قرآن مجید پڑھا۔ جب انہوں نے قرآن مجید سنا تو ان کے آنسو جاری ہوگئے۔ انہوں نے دعوت الی اللہ قبول کر لی' ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہوا پایا تھا وہ علامات آپ میں معلوم کر لیں۔ جب یہ لوگ حضور اکرمؐ کے پاس سے اٹھ کر جانے لگے تو ابوجہل اور ہشام نے چند دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کی راہ روک لی اور انہوں نے ان لوگوں سے کہا تم کس قدر بدبخت مسافر ہو' تمہیں تمہارے ملک کے ہم مذہب لوگوں نے بھیجا تھا کہ اس شخص کے بارے میں معلومات لے کر آؤ' تم ابھی اس کے پاس اچھی طرح بیٹھے بھی نہ تھے کہ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا اور اس شخص کی تصدیق کر دی۔ ہم سمجھتے ہیں تم جیسا احمق اور کوئی سوار نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا تم پر سلامتی ہو' ہم تمہارے ساتھ جہالت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمارا دین ہمارا ہے اور تمہارا دین تمہیں مبارک ہو۔ ہم اپنے آپ کو خیر سے دور نہیں رکھتے"۔

کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ وفد نجران کے نصاریٰ کا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ یہ وفد نجرانیوں کا تھا یا حبشیوں کا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۲۸ : ۵۲) کہتے ہیں میں نے زہری سے پوچھا کہ یہ آیات کس کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے علماء سے یہ سنتا رہا کہ یہ آیات نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور وہ آیات بھی جو سورت مائدہ میں ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا ..... فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ تک۔

بہر حال یہ آیات جس کے بارے میں بھی نازل ہوئی ہوں' قرآن ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس واقعہ کے بارے میں کفار جانتے تھے اور اس کا انکار نہ کرتے تھے تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ دنیا میں ایسے پاک نفس لوگ بھی ہیں جو قرآن کو سن کر اس کی تصدیق کرتے ہیں اور پھر اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہ اس سچائی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جو اس میں ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کے پاس جو سابق کتاب تھی۔ قرآن کی تعلیمات اس کے مطابق ہیں۔ ایسے

لوگوں کو کوئی روکنے والا ایمان لانے سے روک بھی نہیں سکتا۔ نہ ان کے اندر کا ان کا نفس امارہ اور نہ بڑائی کا تصور اور گھمنڈ ہے اور ایسے لوگ پھر دوسرا جہلاء کی طرف سے دی جانے والی اذیتوں اور طعنوں کو بھی برداشت کرتے ہیں۔ اور ان ایذاؤں اور اپنی خواہشات نفس کے علی الرغم حق پر جم جاتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۲۸ : ۵۲) "وہ لوگ جنہیں اس سے قبل کتاب دی گئی ہے وہ اس پر ایمان لاتے ہیں"۔

اور قرآن کی حقانیت کے دلائل میں سے یہ ایک دلیل ہے' ورنہ تمام کتابیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ ان کے مضامین باہم ملتے جلتے ہیں جس کو اس کا ابتدائی حصہ دیا گیا وہ اس کے آخری حصہ میں بھی حق پاتا ہے' مطمئن ہوتا ہے' ایمان لاتا ہے' اور جان لیتا ہے کہ یہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

وَ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ

(۲۸ : ۵۳) "جب ان کو سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ واقعی حق ہے' ہمارے رب کی طرف سے۔ ہم تو پہلے ہی مسلم ہیں"۔ یعنی یہ کلام اس قدر واضح ہے کہ اسے صرف تلاوت کی ضرورت ہے' جن لوگوں کو پہلے کتاب حق دی گئی ہے وہ تو دیکھتے ہی معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ اسی سرچشمے سے ہے۔ اور اس کا سرچشمہ بھی وہی ہے جس سے سچائی نکلتی ہے۔ جھوٹ وہاں سے نہیں آ سکتا۔ "یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے"۔ اور یہ کہ "ہم تو اس سے پہلے سے مسلم تھے"۔ اللہ کے مسلم ہونے کا مفہوم ہے کہ ہم پہلے سے اللہ کے مطیع فرمان تھے۔

یہ لوگ جو اللہ کے مطیع فرمان تھے اور پھر انہوں نے محض سنتے ہی قرآن کی بھی تصدیق کر دی۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا (۲۸ : ۵۴) "یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دو بار دیا جائے گا' اس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی"۔ یہ کہ انہوں نے خالص اسلام پر صبر کیا' انہوں نے اپنے دل و دماغ کو اسلام کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے ذاتی خواہشات اور ہوائے نفس پر غلبہ پایا اور پہلے دین پر بھی جمے رہے اور دوسرے پر بھی جمے رہے۔ اس لیے ان کو دو مرتبہ اجر دیا جائے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے صبر کیا اور قبول حق کرنے کے بعد جم گئے۔ کسی عقیدے کو قبول کرنے کے بعد جم جانا بہت ہی مشکل کام ہے اور پھر خواہشات نفس' چاہتوں' بے راہ روی اور سرکشی کے خلاف جم جانا تو بہت ہی مشکل کام ہے۔ اور ان لوگوں نے یہ سب کام کیے۔ ان لوگوں نے لوگوں کی ملامت کی بھی پرواہ نہ کی۔ اور لوگوں کی طرف سے ایذا رسانی کی پرواہ نہ کی۔ جیسا کہ سابقہ روایات میں ذکر ہوا۔

وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۲۸ : ۵۴) "اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں"۔ یہ بھی ایک قسم کا صبر ہے۔ اور یہ صبر خالص صبر سے زیادہ پر مشقت ہوتا ہے۔ خالص صبر تو یہ ہے کہ ایذا رسانی اور مذاق پر صبر کیا جائے۔ برائی پر صبر بہت مشکل ہے۔ نفسانی غرور کو صرف اسی طرح قابو میں لایا جا سکتا ہے کیونکہ نفس چاہتا ہے کہ

مزاح اور ایذار سانی کا جواب دیا جائے 'غصہ کیا جائے اور انتقام لے کر دل کو ٹھنڈا کیا جائے اور پھر ایذا پر صبر کرنے کے بعد دوسرا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایذا کے بدلے میں احسان کیا جائے۔ مزاح کے بدلے میں نرمی اور ٹھنڈے پن کا مظاہرہ کیا جائے اور پھر بدروی کے مقابلے میں اچھا رویہ اختیار کرنا اور برائی کے بدلے احسان کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو بھلائی اور احسان کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں۔ یہ مقام صرف اچھے مومن ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ لوگوں سے اذیت پاتے ہیں اور پھر بھی راضی اور مطمئن رہتے ہیں۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲۸: ۵٤) "اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں یہاں ان لوگوں کی قبولیت حق میں کشادہ دلی کے ساتھ ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں کشادہ دلی کا ذکر بھی کر دیا گیا۔ کیونکہ نیکی اور سخاوت ایک ہی سرچشمے سے نکلنے والی بھلائیاں ہیں اور یہ تب صادر ہوتی ہیں کہ جب انسان اپنی خواہشات نفس پر قابو پالے اور زمینی اقدار کے مقابلے میں اعلیٰ قدروں کو اہمیت دے۔ ان اقدار میں پہلی قدر کا تعلق نفسیات کی دنیا سے ہے اور دوسری کا معیشت سے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بسااوقات ایمان اور انفاق کا ذکر ایک جگہ آتا ہے۔

ایمان پر صبر کرنے والوں اور خالص عقیدہ اختیار کرنے والوں کی ایک دوسری صفت :

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (۲۸: ۵۵) "اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہوگئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے' تم کو سلام ہے۔ ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے"۔ لغو کا مطلب فضول باتیں کرنا ہے جن میں کوئی فائدہ نہ ہو اور نہ ان کے پیچھے کوئی مقصد ہو۔ یعنی وہ لاحاصل گفتگو جس سے دل و دماغ کے اندر کسی مفید علم و حکمت کا اضافہ نہ ہو۔ یعنی وہ گری ہوئی باتیں جن سے احساس و شعور میں اور زبان و کلام میں گندگی اور برائی کا اضافہ ہو۔ چاہے وہ کسی کے ساتھ مکالمے کی صورت میں ہوں یا کسی غائب شخص کے واقعات نقل کرتے ہوئے ہوں۔

مومن دل کبھی بھی اس قسم کی لغو باتوں میں مشغول نہیں ہوتے۔ نہ وہ لغو باتیں سنتے ہیں کیونکہ ان کے پیش نظر بلند و بالا امور ہوتے ہیں' پاکیزہ اور نورانی باتیں۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ (۲۸: ۵۵) "انہوں نے جب بیہودہ بات سنی تو کنارہ کش ہوگئے"۔۔۔ لیکن وہ اہل لغو پر نہ غصہ ہوتے ہیں' نہ ان سے الجھتے ہیں کہ زبردستی منع کر دیں اور نہ وہ ان کے ساتھ بحث شروع کرتے ہیں۔ کیونکہ اہل لغو کے ساتھ الجھنا بھی ایک طرح کا لغو امر ہے۔ وہ بس ان کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (۲۸: ۵۵) "اور کہا ہمارے اعمال

ہمارے لیے ' اور تمہارے اعمال تمہارے لیے تم کو سلام ہے"۔ نہایت ادب سے ' دعائے خیر کے ساتھ ' اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی ہدایت یافتہ ہو جائیں ۔ لیکن یہ خواہش رکھتے ہوئے بھی یہ ان کے لغو میں شریک نہیں ہوتے ۔

لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ (۲۸ : ۵۵) "ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار نہیں کرتے"۔ اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ اپنا قیمتی وقت ان کے ساتھ ضائع کریں ۔ نہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے لغو میں شریک ہوں اور خاموشی سے سنتے رہیں ۔ ایسی رواداری کے بھی قائل نہیں ۔

یہ ایک روشن نفس کی تصویر ہے جو نفس مومنہ ہے ' اپنے ایمان پر مطمئن ہے ۔ لغو سے بالا و برتر ہے ۔ لیکن کشادہ دل اور کشادہ دست ہے ۔ یہ نفس مومنہ ان لوگوں کے لیے رسم و راہ مقرر کرتی ہے جو صحیح راستہ پر چلنا چاہتے ہیں ۔ لہٰذا جاہلوں کے ساتھ جاہلیت میں اشتراک بھی نہیں ۔ ان کے ساتھ مخاصمت بھی نہیں ' ان پر غصہ بھی نہیں ' ان کے ساتھ ترش روئی بھی نہیں بلکہ سنجیدگی ' سربلندی 'کشادہ دلی ' اور برائی کرنے والے کے ساتھ بھی نیکی اور بھلائی ۔

یہ اہل کتاب ' جو ایمان لائے ' ان کے ایمان لانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی بڑا مجاہدہ کرنا نہیں پڑا ۔ آپ نے صرف قرآن کی تلاوت فرمائی ' بس چند سوالات کیے اور ایمان قبول کر لیا جبکہ وہ خود اپنی قوم کے ساتھ آپ رات دن سالوں تک مجاہدہ کرتے رہے ۔ پھر اپنے محبوب رشتہ داروں کے ساتھ تو بہت ہی محنت کرتے رہے ۔ لیکن ان لوگوں کو ایمان نصیب نہ ہوا ۔ یہ بات حضورؐ خود جانتے تھے کہ آپؐ کے اختیار میں یہ بات نہیں ہے کہ آپ اپنے محبوبوں کو ہدایت دے دیں ۔ اللہ تعالیٰ تو صرف ان لوگوں کو ہدایت عطا کرتا ہے جن کے نفس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ وہ مستحق ہیں اور ایمان کے لیے تیار ہیں ۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝۵۶

"اے نبیؐ ' تم جسے چاہو ' اسے ہدایت نہیں دے سکتے ' مگر اللہ جسے چاہتا ہے ' ہدایت دیتا ہے اور وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں"۔

صحیحین میں وارد ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے حق میں نازل ہوئی ۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حامی و مددگار تھے اور قریش کے مقابلے میں آپ کے دفاع کے لیے بنیان مرصوص بنے ہوئے تھے ۔ یہ آپؐ کے اس قدر حامی تھے کہ ان کی حمایت کی وجہ سے آپ آزادانہ دعوت دے سکتے تھے ۔ اس حمایت کی وجہ سے قریش نے ان کا اور پورے بنی ہاشم کا مقاطعہ کیا تھا ' اور ان کو شعب ابو طالب میں محصور کر دیا ۔ یہ سب کام وہ اپنے بھتیجے کی محبت میں کرتے تھے اور قومی حمیت اور عزت و آبرو کو بچانے کے لیے کرتے تھے جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دعوت ایمان دی اور عرض کیا کہ آپ اسلام میں داخل ہو جائیں ۔ لیکن اللہ نے ان کے حق میں ایمان نہ لکھا تھا کیونکہ اس کا حقیقی علم اور اصلی سبب اللہ کو معلوم تھا ۔

زھری اور سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے تو ابوجہل ابن ہشام ان کے پاس بیٹھا تھا۔ عبداللہ ابن امیہ بھی تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے چچا' صرف لا الہ اللہ کہہ دیں۔ میں اللہ کے ساتھ اس پر تمہارے لیے جھگڑوں گا۔ ابوجہل اور عبداللہ ابن امیہ نے کہا ابو طالب تم عبدالمطلب کی ملت کو چھوڑ رہے ہو' رسول اللہ بار بار ان پر یہ پیش فرماتے تھے اور یہ دونوں بار بار اسے روکتے تھے۔ اور یہی بات دہراتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے آخری الفاظ یہ کہے "عبدالمطلب کے دین پر"۔ اور لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واللہ (خدا کی قسم) میں تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا جب تک مجھے منع نہ کر دیا جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی'۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَى اور ابو طالب ہی کے حق میں نازل ہوئی:

اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ (۲۸ : ۵۶) (صحیحین مسلم اور ترمذی نے 'ابوحازم اور ابو ہریرہ کی روایت نقل کی کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت قریب آیا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے اور کہا "اے چچا کہہ دو "لا الہ الا اللہ"۔ میں قیامت میں تمہارے حق میں شہادت دوں گا۔ انہوں نے کہا اگر یہ بات نہ ہوتی کہ قریش مجھے طعنہ دیں کہ سکرات الموت کی تکلیف کی وجہ سے اس نے یہ کہہ دیا تو میں ضرور یہ کلمہ پڑھ دیتا' تیری آنکھوں کی ٹھنڈک کی وجہ سے۔ میں یہ کلمہ صرف تیری آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پڑھتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ

(۲۸ : ۵۶) "تم ہدایت نہیں دے سکتے جسے تم محبوب سمجھو' یہ اللہ ہے جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے۔ وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے"۔

--- ooo ---

اور حضرت ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ سے روایت ہے اور مجاہد' شعبی اور قتادہ کی بھی یہی رائے ہے کہ یہ ابو طالب کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اور انہوں نے جو آخری لفظ کہے وہ تھے علی ملۃ عبد المطلب ۔

انسان جب اس حدیث پر غور کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ دین اسلام کس قدر پختہ اور سیدھا دین ہے۔ ابو طالب رسول اللہؐ کے حقیقی چچا' آپؐ کے کفیل' حامی اور آپؐ کا دفاع کرنے والے تھے۔ لیکن اللہ نے انہیں ایمان نصیب نہ کیا۔ باوجود اس کے کہ رسول اللہ کو ان سے بہت زیادہ محبت تھی اور آپؐ حد سے زیادہ خواہش مند تھے کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ابو طالب نے رشتے اور قومی حمیت کو ایمان سے زیادہ اہمیت دی۔ اللہ کو اس بات کا علم تھا اور اللہ کو اس بات کا خوب علم تھا کہ حضور اکرمؐ ان سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں

کہ شاید وہ ایمان لے آئیں ۔ اس لیے اللہ نے ہدایت نہ دینے کا اختیار حضورؐ کے اختیارات ہی سے خارج کر دیا ۔ ہدایت دینا یا نہ دینا صرف اللہ اللہ العالمین کے اختیار میں ہے اور رسول کی ڈیوٹی صرف تبلیغ تک محدود ہے ۔ لہٰذا داعیوں کی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ دعوت دیں ۔ دعوت کے بعد پھر لوگوں کے دلوں میں تصرف کرنا اللہ کا کام ہے ۔ لوگوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں ۔ اللہ لوگوں کو ہدایت دیتا ہے ' یا گمراہ کرتا ہے ۔ یہ فیصلے لوگوں کے دلوں کے حالات کے مطابق ہوتے ہیں اور ان کے شخصی استعداد پر ہوتے ہیں او. اس بارے میں علم صرف اللہ کو ہے ۔

اب قرآن مجید ان کے اس خدشے پر تبصرہ کرتا ہے جس کا اظہار وہ کرتے رہتے تھے کہ اگر ہم نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا تو قبائل عرب پر اہل قریش کو قیادت و سیادت کا جو منصب حاصل ہے ' وہ جاتا رہے گا ۔ یہ لوگ خانہ کعبہ کی تعظیم کرتے ہیں ۔ خانہ کعبہ کے مجاوروں یعنی اہل قریش کی اطاعت کرتے ہیں ' خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کی تعظیم کرتے ہیں اس لیے یہ قبائل انہیں اچک لیں گے ۔ یا جزیرۃ العرب سے باہر کا کوئی دشمن ان پر فتح پا لے گا اور یہ قبائل ایسے دشمن کی حمایت کریں گے ' چنانچہ کہا جاتا ہے کہ خوف و امن کا سرچشمہ ذات باری ہے ۔ فرعون بھی بظاہر بہت بڑی قوت کا حامل تھا ۔ ہلاکت کا حقیقی سبب تو دنیا پرستی ' دولت پرستی ' اللہ کی آیات اور اللہ کے رسولوں کی تکذیب ہے ۔ اور حق سے منہ موڑنا ہے ۔ حق کو قبول کرنا ' ہلاکت کا سبب کبھی نہیں ہوا ۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ہلاک وہ اقوام ہوا کرتی ہیں جن کے پیش نظر صرف دنیا کے مفادات ہوتے ہیں ' حالانکہ متاع دنیا ایک حقیر چیز ہے ' انسان کا اصل فائدہ آخرت میں ہے اور وہ اللہ کے پاس ہے ۔

وَقَالُوٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۶۱﴾

۶
۱۰ع
۹

”وہ کہتے ہیں ”اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے“۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پرامن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں' ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کرچکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو' وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے' آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔ اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے۔

تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟ بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو' کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیات دنیا کا سروسامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟“

یہ اہل مکہ کا ایک سطحی اور دنیاوی نقطہ نظر تھا۔ قریش کو اسی دنیا پرستی کے نقطہ نظر نے ڈر میں مبتلا کر دیا تھا کہ اگر ہم نے اس جدید تحریک کو قبول کیا تو نقصان ہو گا۔ دشمن حملہ آور ہو جائیں گے اور معاون و مددگار حمایت سے ہاتھ اٹھالیں گے اور ہم مالی لحاظ سے کمزور اور بدحال ہو جائیں گے۔

وَقَالُوٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (۲۸ : ۵۷) ”وہ کہتے ہیں اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کرلیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے“۔ یہ لوگ اس بات کے منکر نہیں تھے کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیمات پیش کرتے ہیں وہ حقیقی راہ ہدایت ہے۔ لیکن انہیں ڈر یہ تھا کہ مکہ کے ارد گرد کے لوگ ان پر ٹوٹ پڑیں گے دراصل ان کی نظروں میں صرف دنیا کی قوت ہی تھی۔ ذات باری اور اللہ وحدہ کی قوت کو انہوں نے بھلا دیا تھا۔ حالانکہ حقیقی محافظ تو اللہ ہے۔ حقیقی بچانے والا تو وہی ہے۔ اگر وہ اللہ کی حمایت میں آ جاتے ہیں تو پوری کائنات کی قوتیں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتیں۔ اور اگر اللہ ان کو ذلیل و خوار کرنا چاہے تو دنیا کی پوری قوتیں بھی ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتیں۔ ان کا یہ نقطہ نظر اس لیے تھا کہ ایمان ان کے دلوں کی تہہ تک ابھی نہ اترا تھا۔ اگر اترا ہوتا تو حقیقی قوت کے بارے میں ان کا نقطہ نظر یہ نہ ہوتا۔ وہ معاملات کا اندازہ یوں نہ کرتے۔ اور ان کو یہ یقین ہو جاتا کہ امن تو اللہ کے جوار رحمت میں ہے اور خوف اور خطرات تو اللہ سے دوری کی راہ میں ہیں اور یہ کہ تحریک اسلامی میں شامل ہونا دراصل قوت اور عزت سے وابستہ ہونا ہے۔ اور یہ کہ اللہ کا حقیقی سرچشمہ قوت ہونا محض طفل تسلی نہیں ہے' نہ کوئی وہم ہے۔ بلکہ ایک سائنٹیفک حقیقت ہے' اس لیے کہ اللہ کا اتباع کرنا دراصل اس کائنات کے قانون قدرت کا اتباع ہے۔ اس طرح انسان اور کائنات کی قوتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ یوں انسان کی پشت پر پوری تکوینی قوتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ اس کائنات کا خالق اور مدبر بھی اللہ ہے اور اسلامی دین کا بھیجنے والا بھی وہی ہے اور جو شخص اللہ کی ہدایت پر چلتا ہے وہ اللہ کی تمام قوتوں کو کام میں لاتا ہے اور اس کائنات کی قوتیں لامحدود

ہیں ۔ ایسا شخص گویا ایک عظیم سرچشمہ قوت سے مربوط ہو جاتا اور اس کا وارث بن جاتا ہے ۔ اور یہ ہے ایک تاریخی حقیقت اور پوری زندگی کے تجربوں سے ثابت شدہ حقیقت ۔

اللہ کی ہدایات ہی زندگی کا صحیح منہاج ہیں ۔ ان کے مطابق زندگی گزارنا ہی اس کرۂ ارض کی حقیقی زندگی ہے اور جب دنیا میں اسلامی نظام اور اسلامی منہاج حیات رائج اور قائم ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں اخروی فلاح اور دنیا میں شوکت نصیب ہوتی ہے ۔ اور اس نظام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دنیا اور آخرت کے درمیان کوئی دوئی نہیں ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ فلاح اخروی تب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ اس دنیا کے نظام کو معطل کر دیا جائے یا اسے پس پردہ ڈال دیا جائے ۔ اسلامی منہاج حیات میں دنیا آخرت دونوں باہم مربوط اور باندھے ہوئے ہیں ۔ اسلام کیا ہے ' دل مومن کی اصلاح ' انسانی سوسائٹی کی اصلاح اور اس کرۂ ارض پر اجتماعی نظام کی اصلاح ۔ یہی وجہ ہے کہ اس سوچ کے مطابق دنیا آخرت کے جہاں میں داخل ہونے کا راستہ ہے ۔ یہ دنیا آخرت کے لیے مزرعہ ہے ' کھیت ہے ۔ اس دنیا میں جنت کی تعمیر ہی دراصل وسیلہ ہے آخرت میں تعمیر جنت کا ' اور اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنے کا بشرطیکہ یہ کام اسلامی ہدایت اور اسلامی شریعت کے مطابق کیا جائے اور دنیا کی تمام تعمیر میں رضائے الہٰی مطلوب ہو ۔

انسانی تاریخ کا تجربہ شاہد ہے کہ جب بھی کسی جماعت نے اللہ کی ہدایت کا جھنڈا اٹھایا ہے ' اللہ نے اسے قوت ' شوکت اور دنیا کی قیادت دی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ جماعت اپنے آپ کو اس امانت کے اٹھانے کے لیے تیار کرے ' اس کی اہل ہو جائے اور جان لو کہ یہ امانت ' امانت خلافت ارضی ہے ۔ یعنی اس دنیا میں تمام قوتوں پر کنٹرول اور زندگی کے نشیب و فراز پر کنٹرول ۔

اکثر لوگ اتباع شریعت اور اللہ کی ہدایات پر چلنے سے بہت ڈرتے ہیں ۔ یہ لوگ اللہ کے دشمنوں کی عداوت اور ان کی مکاریوں سے ڈرتے ہیں ۔ یہ لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اللہ کے دشمن ان پر ٹوٹ پڑیں گے ۔ یہ لوگ اقتصادی تکالیف اور اقتصادی پابندیوں سے بھی ڈرتے ہیں ۔ یہ اسی قسم کے اوہام میں جس طرح قریش کو یہ اوہام لاحق تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (۲۸ : ۵۷) ''اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت کی پیروی کریں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے''۔ لیکن جب انہوں نے اس ہدایت کو سینے سے لگا لیا تو وہ مشرق و مغرب پر قابض ہو گئے اور یہ قبضہ صرف ۲۵ سال کے عرصے میں مکمل ہو گیا ۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عذر لنگ کی اسی وقت تردید کر دی تھی کہ وہ کون ہے جس نے ان کو مکہ میں امن عطا کیا ہے ۔ وہ کون ہے جس نے ان کے لیے مکہ کو بیت الحرام قرار دیا ۔ وہ کون ہے جو تمام دنیا کے لوگوں کے دل مکہ کی طرف مائل کرتا ہے اور وہ دنیا کے تمام ثمرات لے کر وہاں حاضر ہوتے ہیں ۔ تمام دنیا سے جمع ہو کر حرم میں آتے ہیں حالانکہ ان کے ملک مختلف ہیں اور ان کی عیدیں مختلف ہیں ۔

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پر امن حرم کو ان کے لیے جائے قیام بنایا جس کی طرف ہر قسم کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں' ہماری طرف سے رزق کے طور پر"۔ پھر وہ کیوں ڈرتے ہیں کہ لوگ ان کو اچک لیں گے۔ اگر انہوں نے اللہ کی ہدایت کو قبول کر لیا۔ حالانکہ اس حرم کو جائے امن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے اللہ ہی نے تو بنایا تھا۔ سوال یہ ہے کہ نافرمان ہونے کے باوجود ان لوگوں کو کس نے یہ پر امن ماحول دیا ہے؟ اور اگر وہ فرمان بردار ہو جائیں تو اللہ ان کو لوگوں کے حوالے کر دے گا کہ ان کی زمین سے وہ ان کو اچک کر لے جائیں۔ یہ کس طرح معقول ہو سکتا ہے؟

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۸:۵۷) "مگر ان میں سے اکثر لوگ مانتے نہیں"۔ وہ نہیں جانتے کہ امن کہاں سے ملتا ہے اور خوف کہاں سے ملتا ہے۔ ان کو معلوم نہیں ہے کہ دراصل تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

اگر وہ بدامنی اور خوف سے بچنا چاہتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ وہ ہلاکت اور بربادی سے دوچار ہوں تو بربادی کے اسباب یہ ہیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ ان سے بچیں۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۲۸:۵۸) "اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو' وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے' آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے"۔ انعامات خداوندی پر اترانا' اور ان کا شکر ادا نہ کرنا دراصل بستیوں کی ہلاکت کا حقیقی سبب رہا ہے۔ اہل قریش کو بھی اللہ نے پر امن حرم بطور نعمت خداوندی دیا ہے۔ لہٰذا ان کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ اس پر اترائیں نہیں بلکہ شکر ادا کریں ورنہ ان کی ہلاکت بھی یقینی ہو گی جیسا کہ ان بستیوں پر اللہ کی ہلاکت آئی جن کے بارے میں خوب جانتے ہیں۔ اور اہل قریش رات دن ان بستیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ برباد پڑی ہیں اور اس بربادی کے بعد کوئی بھی آ کر ان میں بسا تک نہیں۔ ان کے کھنڈرات موجود ہیں۔

لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا (۲۸:۵۸) "جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے"۔ یہ بستیاں صاف صاف نظر آتی ہیں اور اپنے باسیوں کی کہانی سنا رہی ہیں۔ اور یہ کہانی سنا رہی ہیں کہ اللہ کے انعامات پر یعنی محض معاشی ترقی پر اترانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ان کے باشندے اس طرح فنا ہوئے کہ کوئی بھی پیچھے نہ رہا۔ کوئی ان کا وارث نہ ہوا۔

وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (۲۸:۵۸) "آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے"۔ لیکن ان کے اس اترانے اور سرکشی کے باوجود اللہ نے ان کو تب ہلاک کیا جب ان بستیوں کے مرکزی مقامات پر رسول بھیجے 'کیونکہ یہ اللہ کی سنت ہے اور اس سنت کو اللہ نے انسانوں پر مہربانی کرتے ہوئے اپنے اوپر لازم کر دیا ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِىْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِى الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۲۸ : ۵۹) "اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات نہ سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے"۔ رسولوں کو بستیوں کے مرکزی مقامات میں اس لیے بھیجا گیا کہ یہ مرکزی مقامات مراکز تبلیغ ہوں اور ان سے پیغام الٰہی اطراف و اکناف میں نشر ہو' تاکہ کوئی یہ کہہ نہ سکے ان تک تو پیغام نہیں پہنچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں بھیجا گیا کیونکہ یہ عربوں کا ام القریٰ تھا۔ اور آپ کا فریضہ تھا کہ آپ ارد گرد کے تمام لوگوں کو ان اقوام کے انجام سے خبردار کریں جن کے پاس رسول آئے اور انہوں نے نہ مانا اور ظلم کیا۔

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِى الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ (۲۸ : ۵۹) "ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے تھے"۔ وہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے تھے حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ حق ہیں۔

نیز یہ کہ زندگی کا پورا پورا سامان اور دنیا کی پوری دولت اور متاع' اور وہ تمام خزانے جو زمین کے اندر ودیعت ہیں اور وہ پیداواریں تو انسانوں کو اس کرۂ ارض پر دی گئیں۔ اور وہ تمام چیزیں جو تمام انسانوں کے لیے اس جہاں میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ سب چیزیں اللہ کے ہاں جنتوں میں تیار کردہ سازوسامان کے مقابلے میں ایک حقیر چیز ہیں۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَىْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۸ : ۶۰) "تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے' وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے' وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے"۔ یہ آخری حساب ہے۔ صرف اس سازوسامان کا نہیں جس کے فوت ہونے کا انہیں ڈر لاحق تھا۔ یعنی سامان زیست' امن اور زمین کا۔ یہ حساب صرف اقتدار' ہر قسم کی پیداواروں اور امن و امان ہی کا نہیں جس کا احسان اللہ نے ان کو جتایا' صرف ان بستیوں کا حساب نہیں جنہیں اللہ نے ہلاک کیا' محض اس لیے کہ وہ اپنی معیشت پر اترا رہی تھیں' بلکہ یہ حساب ہے اس تمام سامان زندگی کا جس کا تعلق اس دنیا سے ہے۔ دنیا کا پورا سازوسامان' مکمل سازوسامان اور دائمی سازوسامان جس کے بعد کوئی ہلاکت اور بربادی بھی نہ ہو اور اس سے پوری طرح اور مکمل طور پر استفادہ بھی کیا گیا ہو' یہ سب سازوسامان اللہ کے ہاں پائے جانے والے اور ہمیشہ باقی رہنے والے متاع کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے وہ خیر ہے یعنی اپنی حقیقت کے اعتبار سے اور باقی رہنے والا ہے یعنی مدت کے اعتبار سے۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۸ : ۶۰) "کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے"۔ یعنی اس دنیاوی سازوسامان اور اخروی سازوسامان کے درمیان فرق وہی شخص کر سکتا ہے جو دنیا و آخرت کی حقیقت کو سمجھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آخری تعقیب

نہایت ہی ایسے الفاظ میں آتی ہے جن میں عقل سے کام نہ لینے پر سرزنش کی گئی ہے کیونکہ عقل سے کام لینا ہر شخص کے اختیار میں ہے۔

آخر میں دنیا اور آخرت دونوں کا تقابل پیش کیا جاتا ہے اور لوگوں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ ان میں سے اپنے لیے جسے چاہیں پسند کرلیں۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ (۲۸ : ۶۱) "بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو، کبھی اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیات دنیا کا سروسامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟"۔

ایک طرف وہ شخص ہے جس کے ساتھ اچھا وعدہ ہے اور وہ اسے قیامت کے دن پانے والا ہے اور دوسرا شخص وہ ہے جسے دنیا کا سازوسامان دیا گیا ہے اور وہ یہ مختصر زندگی میں اس حقیر سامان کو برت لیتا ہے۔ اور پھر اسے قیامت کے دن زبردستی حساب کے لیے لایا جاتا ہے۔ اس کے لیے "محضرین" کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی گرفتار کر کے حاضر کیا جاتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کی وہاں خواہش یہ ہوگی کہ ان کو حساب کے لیے نہ لایا جائے کیونکہ حساب کے بعد تو ان کے لیے عذاب حاضر ہے۔

وہ کہتے تھے کہ اگر ہم تمہارے ساتھ ایمان لے آئیں تو ہمیں اپنی زمین سے اچک لیا جائے گا اور اب ان کو اس طرح جواب دیا جاتا ہے کہ اگر تمہیں اچک بھی لیا جائے اور تم دنیا کے تمام سازوسامان سے محروم بھی کر دیئے جاؤ تو بھی یہ گھاٹا نہ ہو گا کیونکہ یہ محرومیت اس مصیبت سے ہلکی ہے کہ تمہیں گرفتار کر کے لایا جائے لیکن ایسی صورت بھی نہ ہوگی کیونکہ حضور اکرم ؐ کے متبعین تو دنیا میں بھی امن اور اقتدار اعلیٰ کے مالک رہیں گے اور آخرت میں تو ان کو بہت بڑی عطا اور بڑا امن و امان ہو گا۔ لہٰذا اللہ کی ہدایت سے منہ وہی لوگ موڑتے ہیں جو بہت ہی غافل اور احمق ہیں۔ اور وہ عقل کو کام میں لاکر اس کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کی سعی نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ خوف کا سبب کیا ہے اور امن کا سرچشمہ کیا ہے۔ اور یہی لوگ بڑے خسارے والے ہیں جو اپنی قوت اختیاری کو اچھی طرح استعمال نہیں کرتے اور اپنے آپ کو دائمی ہلاکت سے نہیں بچاتے۔

---ooo---

اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر جس میں ان لوگوں سے یوں سوال و جواب ہو گا اور اس سے اندازہ ہو گا کہ وہاں ان کی حالت زار کیسی ہوگی۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ

اِلَیۡكَ ۫ مَا كَانُوۡۤا اِیَّانَا یَعۡبُدُوۡنَ ﴿۶۳﴾ وَ قِیۡلَ ادۡعُوۡا شُرَكَآءَكُمۡ فَدَعَوۡهُمۡ فَلَمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَهُمۡ وَ رَاَوُا الۡعَذَابَ ۚ لَوۡ اَنَّهُمۡ كَانُوۡا یَهۡتَدُوۡنَ ﴿۶۴﴾ وَ یَوۡمَ یُنَادِیۡهِمۡ فَیَقُوۡلُ مَاذَاۤ اَجَبۡتُمُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۶۵﴾ فَعَمِیَتۡ عَلَیۡهِمُ الۡاَنۡۢبَآءُ یَوۡمَئِذٍ فَهُمۡ لَا یَتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۶۶﴾ فَاَمَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤی اَنۡ یَّكُوۡنَ مِنَ الۡمُفۡلِحِیۡنَ ﴿۶۷﴾

”اور (بھول نہ جائیں یہ لوگ) اس دن کو جب کہ وہ ان کو پکارے گا اور پوچھے گا ”کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟“ یہ قول جن پر چسپاں ہو گا وہ کہیں گے ”اے ہمارے رب ' بے شک یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔ انہیں ہم نے اسی طرح گمراہ کیا جیسے ہم خود گمراہ ہوئے۔ ہم آپ کے سامنے برات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ہماری تو بندگی نہیں کرتے تھے“۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ پکارو اب اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو یہ انہیں پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے اور یہ لوگ عذاب دیکھ لیں گے۔ کاش یہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے۔

اور (فراموش نہ کریں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ ”جو رسول بھیجے گئے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا؟“ اس وقت کوئی جواب ان کو نہ سوجھے گا اور نہ یہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ ہی سکیں گے۔ البتہ جس نے آج توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہو گا“۔

پہلا سوال تو سرزنش کے لیے ہو گا اور اس سے محض ان کو شرمندہ کرنا مطلوب ہو گا۔

اَیۡنَ شُرَكَآءِیَ الَّذِیۡنَ كُنۡتُمۡ تَزۡعُمُوۡنَ (۲۸ : ۶۲) ”کہاں ہیں وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے“۔ اللہ کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ اس دن اس قسم کے کسی شریک کا وجود نہ ہو گا۔ اور اس دن ان کے متبعین کو بھی کچھ پتہ نہ ہو گا کہ ان شرکاء کا کوئی وجود ہے یا نہیں۔ نہ یہ لوگ ان شرکاء تک پہنچ سکیں گے۔ یہ سوال دراصل ان لوگوں کو مجمع عام میں شرمندہ کرنے اور سرزنش کرنے کے لیے کیا جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جن سے متعلق یہ سوال کیا گیا وہ یہاں جواب نہیں دیتے کیونکہ یہ سوال جواب طلب ہی نہیں ہے بلکہ وہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے جو متبعین گمراہ ہوئے اور ان کی پیروی اختیار کی ان کے اس جرم سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیں۔ جیسا کہ کبراء قریش لوگوں کو گمراہی پر آمادہ کرتے تھے اور ان کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے۔ اس لیے ان کا جواب یوں ہو گا۔

رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ اَغۡوَیۡنَا ۚ اَغۡوَیۡنٰهُمۡ كَمَا غَوَیۡنَا ۚ تَبَرَّاۡنَاۤ اِلَیۡكَ ۫ مَا كَانُوۡۤا اِیَّانَا یَعۡبُدُوۡنَ

(۲۸: ۶۳) ”اے ہمارے رب ‘ بے شک یہی لوگ ہیں جن کو ہم نے گمراہ کیا تھا۔انہیں ہم نے اسی طرح گمراہ کیا جس طرح ہم خود گمراہ ہوئے۔ہم آپ کے سامنے برات کا اظہار کرتے ہیں۔یہ ہماری کوئی بندگی نہ کرتے تھے“۔

ہمارے رب ہم نے ان کو زبردستی گمراہ نہیں کیا۔ان کے دل و دماغ پر ہمیں کوئی کنٹرول حاصل نہ تھا۔یہ لوگ اپنی مرضی اور آزادانہ اختیار سے گمراہی میں پڑے جیسا کہ ہم خود بغیر کسی مجبوری کے گمراہی میں پڑے۔

تَبَرَّانَآ اِلَیْكَ (۲۸: ۶۳) ”ہم آپ کے سامنے برات کا اظہار کرتے ہیں“ کہ ہم نے ان کو گمراہ کیا ہے۔

مَا کَانُوْٓا اِیَّانَا یَعْبُدُوْنَ (۲۸: ۶۳) ”یہ ہماری بندگی تو نہ کرتے تھے“۔بلکہ یہ بتوں ‘ آستانوں اور دوسری مخلوقات کی بندگی کرتے تھے۔ہم نے ان سے یہ نہ کہا تھا کہ ہم تمہارے الٰہ ہیں ‘ اور نہ وہ وہاں ہماری عبادت کرتے تھے۔

اب ان کو اس مقام شرمندگی کی طرف لایا جارہا ہے جس کی طرف وہ بات کا رخ کرنا نہیں چاہتے جس سے وہ بات کو پھیر کر دوسری طرف لے جانا چاہتے ہیں یعنی وہ شرکاء جو ان لوگوں کو اللہ کے سوا پکڑے ہوئے تھے۔

وَقِیْلَ ادْعُوْا شُرَکَآءَکُمْ (۲۸: ۶۴) ”پھر کہا جائے گا کہ پکارو ‘ ان ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو“۔

یعنی ان کو پکارو ‘ اور ان کی سیرت سے نہ بھاگو ‘ ان کو پکارو کہ وہ اب تمہیں تمہاری پکار کو پہنچیں۔تمہیں اس مصیبت سے چھڑائیں ‘ ان کو پکارو کہ آج دن ہے ان کے کام کرنے کا۔یہی تو ان کا فائدہ تھا۔

یہ بدبخت لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان شرکاء کو آج پکارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے ‘ لیکن بامر مجبوری وہ احکام الٰہیہ کو بجالائیں گے۔

فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهُمْ (۲۸: ۶۴) ”یہ انہیں پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے“۔ان شرکاء سے یہی توقع تھی کہ وہ کوئی جواب نہ دیں گے۔البتہ آواز اس لیے دلوائی جائے گی تاکہ یہ پکارنے والے اچھی طرح ذلیل ہوں۔

وَرَاَوُا الْعَذَابَ (۲۸: ۶۴) ”اور یہ لوگ عذاب دیکھ لیں گے“ یعنی اس بحث و مباحثہ کے درمیان ہی عذاب دیکھ لیں گے۔یہ اس عذاب ہی کی طرف بڑھ رہے ہوں گے اور عذاب ان کو نظر آجائے گا۔اس ذلیل کرنے والے منظر کے بعد پھر اسی عذاب کا منظر ہوگا۔

یہ شرمسار کنندہ منظر جب اپنی انتہاؤں پر ہوتا ہے تو اچانک ان پر وہ ہدایت پیش کردی جاتی ہے کہ کاش تم اسے قبول کرلیتے۔اس برے حال میں یہ لوگ یہی آرزو کرتے ہوں گے کہ اے کاش کہ وہ ایسا کرتے ‘ دنیا میں تو یہ ہدایت ان کے دسترس میں تھی اور اگر وہ لبیک کہہ کر اسے قبول کرلیتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔

لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ (٢٨ : ٦٤) "کاش وہ ہدایت اختیار کرنے والے ہوتے"۔
اب سیاق کلام انہیں اس کربناک منظر کی طرف لے جاتا ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ (٢٨ : ٦٥) "اور وہ دن جب وہ ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ جو رسول بھیجے گئے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا؟" اور اللہ کو تو خوب معلوم ہے کہ انہوں نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا۔ لیکن یہ بازپرس محض ذلیل اور شرمسار کرنے کے لیے ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں وہ خاموش ہوں گے بلکہ مدہوش کھڑے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ سخت کرب میں مبتلا ہوں گے اور ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہوگا کہ وہ کیا جواب دیں۔

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ (٢٨ : ٦٦) "اس وقت کوئی جواب ان کو نہ سوجھے گا اور نہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ سکیں گے"۔ انداز گفتگو اس منظر میں لوگوں کی ایسی تصویر کھینچتا ہے کہ گویا وہ اندھے ہیں۔ گویا "خبریں" اندھی ہوگئی ہیں اور وہ ان تک پہنچ نہیں پاتیں۔ جس طرح اندھا آدمی کسی جگہ نہیں پہنچ جاتا۔ وہ کچھ نہیں جانتے۔ نہ پوچھ سکتے ہیں' نہ جواب سکتے ہیں۔ مدہوشی کی سی حالت میں کھڑے ہیں۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ

(٢٨ : ٦٧) "البتہ جس نے آج توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے وہی یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہوگا"۔ یہ صفحہ بالمقابل ہے۔ جب غم اور تکلیف مشرکین کے لیے عروج پر ہوگی' اس وقت توبہ کرنے والوں' ایمان لانے والوں اور عمل کرنے والوں کے لیے ایسی فلاح ہوگی۔ اس لیے اے لوگو! یہ موقع ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ' ابھی تمہارے سامنے کھلا وقت ہے' بہتر ہے کہ اسے اختیار کر لو۔

اب ہر امر اور ہر چیز کو نتیجہ ارادہ الٰہی قرار دیا جاتا ہے' کیونکہ وہی ذات ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور تمام معاملات اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ اول میں بھی آخر میں بھی۔ دنیا میں بھی وہی قابل تعریف ہے اور آخرت میں بھی وہی قابل تعریف ہے۔ دنیا میں بھی اس کا حکم چلتا ہے اور آخرت بھی اسی کی طرف لوٹتا ہے۔ لوگوں کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے خود کوئی فیصلہ کر سکیں نہ دوسروں کے بارے میں یہاں کوئی انسان کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے' تخلیق کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے' اختیار کر لیتا ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۸﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ

وَ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٧٠﴾

"تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور (وہ خود ہی اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے) منتخب کر لیتا ہے' یہ انتخاب ان لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ اللہ پاک ہے اور بہت بالا تر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ تیرا رب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہی ایک اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اسی کے لیے حمد ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی' فرماں روائی اس کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو"۔

یہ تبصرہ ان لوگوں کے اس ریمارکس کے بعد آیا ہے کہ اگر ہم نے ہدایت کو قبول کر لیا تو ہم اپنی زمین سے اچک لے جائیں گے۔ اس قول کے بعد یوم الحساب کا ایک منظر پیش کیا گیا اور اس میں مشرکین کے موقف کو پیش کیا گیا۔ اب اس دوسرے تبصرے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کا اختیار تو خود ان کے نفوس کے بارے میں بھی نہیں ہے کہ وہ از خود امن اور خوف کا کوئی راستہ اپنے لیے اختیار کریں۔ اس لیے اللہ کی وحدانیت کے اختیارات کی وجہ سے آخر کار تمام امور میں اللہ ہی موثر ہے۔

وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (۲۸ : ۶۸) "اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور منتخب کر لیتا ہے اور یہ انتخاب ان لوگوں کے کرنے کا کام نہیں ہے"۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے جسے بسا اوقات لوگ بھلا دیتے ہیں یا اس کے بعض پہلوؤں کو لوگ بھلا دیتے ہیں کہ اللہ جو چاہتا ہے' پیدا کرتا ہے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اللہ کے کاموں کے سلسلے میں کچھ تجاویز دے یا اللہ کی تخلیق میں کمی و اضافہ کرے یا اس کی تخلیق میں تغیر و تبدل کرے۔ وہ اپنی مخلوق میں سے مختلف چیزوں کو مختلف فرائض کے لیے اختیار کر لیتا ہے۔ مختلف مقامات میں مختلف چیزیں اپنا فریضہ ادا کرتی ہیں۔ اس لیے کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اللہ کے سامنے کسی شخص کو تجویز کرے' کسی حادثہ کی تجویز کرے' کسی حرکت' کسی بات اور کسی فعل کی تجویز کرے۔ اور نہ ایسا کام اختیار کرنے کا اللہ نے کسی کو اختیار دیا ہے۔ نہ اپنے نفسوں کے بارے میں اور نہ دوسروں کے بارے میں۔ غرض تمام امور کے فیصلے اللہ کرتا ہے' چھوٹے ہوں یا بڑے۔

اگر لوگوں کے دل و دماغ میں صرف یہ ایک حقیقت بیٹھ جائے تو لوگوں پر جو مصائب آتے ہیں وہ ان کی وجہ سے ہرگز پریشان نہ ہوں' یا ان کی اپنی وجہ سے ان کو جو تکلیف پہنچتی ہے اس کی وجہ سے بھی وہ پریشان نہ ہوں' نہ وہ اس چیز کی وجہ سے پریشان ہوں جو ان کے ہاتھوں سے نکل گئی یا وہ محروم ہو گئے کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ ہی ہے جو واقعات کا انتخاب کرتا ہے اور اس کو اختیارات ہیں۔

لیکن اس کا مفہوم یہ بھی نہیں ہے کہ لوگ اپنی عقل کو معطل کر دیں' ارادوں کو موقوف کر دیں اور سرگرمیاں چھوڑ کر ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان غور و فکر کر کے' اچھی سوچ کے بعد پوری جدوجہد کرے اور اپنی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے ایک کام کرے اور اس کے بعد جو نتائج ہوں' ان کو اللہ پر چھوڑ دے۔ نتائج کو تسلیم

ورضا سے قبول کرے۔کیونکہ اس کے دائرہ قوت میں جو کچھ تھا' اس نے کر لیا۔اس کے بعد کے امور اللہ کے لیے ہیں۔
مشرکین اللہ کے ساتھ خود ساختہ الہوں کو بھی شریک کرتے تھے۔ اور ان کو بھی پکارتے تھے۔ حالانکہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور وہی اختیار و انتخاب کرتا ہے۔ اس تخلیق میں کوئی شریک نہیں اور نہ اس کے اختیارات میں کوئی شریک ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۲۸ : ۶۸) "اللہ پاک ہے' اور بہت بالا تر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۲۸ : ۶۹) "اور تیرا رب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں"۔ اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں"۔ اس لیے وہ ان کی جن باتوں کو جانتا ہے' ان پر ان کو سزا دیتا ہے۔ ان کے لیے نتائج وہ منتخب کرتا ہے ان کے لیے ہدایت و ضلالت کا فیصلہ بھی وہی کرتا ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (۲۸ : ۷۰) "وہ ایک اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ للذا خلق میں یا اختیارات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ (۲۸ : ۷۰) "اس کے لیے حمد ہے' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی"۔ اس بات پر کہ وہ کسی کے لیے کیا انجام اختیار کرتا ہے' کسی کے لئے کیا انعامات تجویز کرتا ہے' کسی کے لیے کیا حکمت و تدبیر اختیار کرتا ہے' کسی کے ساتھ کیا انصاف کرتا ہے اور کسی پر کیا رحمت کرتا ہے۔ حمد و ثنا صرف اسی کے لیے ہے۔

وَلَهُ الْحُكْمُ (۲۸ : ۷۰) "حکم اس کا ہے"۔ اس لیے وہ اپنے بندوں کے درمان جو فیصلے چاہتا ہے' کرتا ہے اس کے کسی امر کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔ اور نہ اس کے فیصلوں کو کوئی بدل سکتا ہے۔

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸ : ۷۰) "اور اس کی طرف تم سب پلٹ کر جانے والے ہو"۔ اور آخری فیصلہ بھی وہاں اللہ ہی اپنے پورے اختیارات کے ساتھ کرے گا۔

یوں اللہ تعالیٰ یہ شعور اہل ایمان کے گلے میں تعویذ کی طرح باندھ دیتا ہے کہ اس کائنات میں صرف اللہ کا ارادہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی سمجھا دیتا ہے کہ اللہ رازوں کو بھی جانتا ہے' اس سے کوئی چیز خفیہ نہیں ہے۔ سب نے اس کی طرف لوٹنا ہے۔ اس سے کوئی شخص بچ کر نہیں نکل سکتا۔ کس طرح یہ لوگ اللہ کے ساتھ شرک کی جرات کرتے ہیں حالانکہ یہ لوگ اس کے قبضے میں ہیں۔ اس سے نکل نہیں سکتے۔

--- ooo---

اس کے بعد ایک سفر اس پوری کائنات کا بھی کرایا جاتا ہے جس میں یہ لوگ رہتے ہیں لیکن اس کے اندر اللہ کی جو گہری تدبیر و حکمت کام کر رہی ہے اس سے غافل ہیں۔ حالانکہ ان کی زندگی اور ان کی معیشت کے تمام فیصلے اللہ کے اختیار میں ہیں۔ اس طرح اللہ ان کے شعور کو اس کائنات کے دو بہت اہم مظاہر کی طرف متوجہ کرتا ہے یعنی گردش لیل و

نہار کی طرف۔ اور اس امر کی طرف کہ گردش لیل و نہار کے اس نظام کے اندر اللہ وحدہ کی وحدانیت اور اس کے اختیار مطلق کے کیسے شواہد ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ۭ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

"اے نبیؐ" ان سے کہو کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی لا دے؟ کیا تم سنتے نہیں ہو؟ ان سے پوچھو' کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں رات لا دے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کر سکو؟ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کرو اور (دن کو) اپنے رب کا فضل تلاش کرو' شاید کہ تم شکرگزار بنو"۔

لوگوں کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے رات اور دن کی گردش دیکھ دیکھ کر ان سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ اس گردش کے اندر ان کو کوئی بات نئی نہیں لگتی۔ وہ سورج کے طلوع اور غروب سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔ اسی طرح دن کا نمودار ہونا اور رات کا چھا جانا بھی ان کو کچھ زیادہ متاثر نہیں کرتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ گردش لیل و نہار کے اندر انسانوں کے لیے جو فائدے ہیں اور جو رحمتیں ہیں اور جس طرح یہ گردش ان کو تباہی و ہلاکت سے بچاتی ہے' اکتانے اور تھکانے سے بچاتی ہے۔ یہ باتیں ان کے شعور میں مستحضر نہیں رہتیں۔

قرآن کریم ان کو غفلت کی نیند سے جگاتا ہے ان کو ذرا اس عادی رویہ اور عادی منظر سے دور لے جاتا ہے۔ ان کو متوجہ کرتا ہے کہ تمہارے اردگرد گردش لیل و نہار کی وجہ سے کس قدر عظیم واقعات رونما ہوتے ہیں تو تم توجہ نہیں کرتے۔ ذرا اتنا سوچو کہ رات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رک گئی یا دن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم ہو گیا۔ تو کس قدر خوفناک نتائج کا سامنا تمہیں کرنا ہو گا۔ انسانوں کو کسی چیز کی قدر و قیمت کا پتہ تب چلتا ہے جب وہ نہیں ہوتی۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ (۲۸ : ۷۱) "اے نبیؐ" ان سے کہو کبھی تم لوگوں نے غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں روشنی لا دے۔ کیا تم سنتے نہیں ہو؟"۔ جب سردیوں میں رات قدرے طویل ہو جاتی ہے تو لوگ سپیدۂ صبح کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں اور جب

سورج تھوڑی دیر کے لیے بادلوں میں چھپ جائے تو یہ آرزوئیں کرنے لگتے ہیں کہ سورج نکل آئے۔ اور اگر روشنی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جائے تو ان کی حالت کیا ہو جائے گی جب رات ہمیشہ کے لیے قیامت تک ان پر مسلط ہو جائے۔ یہ تو اس صورت میں ہے کہ یہ پھر زندہ بھی کسی صورت میں رہ سکیں۔ حالانکہ ایسی صورت میں تو خطرہ یہ ہو گا کہ دنیا سے زندگی کے آثار ہی مٹا دیئے جائیں اور کبھی بھی دن نمودار ہو یا زندگی برقرار ہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۲۸ : ۷۲) "ان سے پوچھو' کبھی تم نے سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہیں رات لا دے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کر سکو؟ کیا تم کو سوجھتا نہیں"۔ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ اگر دن ذرا طویل ہو جائے تو وہ سایوں کے تعاقب میں دوڑتے ہیں۔ اور گرمیوں میں دن طویل ہو تو رات کے مشتاق ہوتے ہیں اور رات کی تاریکی میں سکون و قرار تلاش کرتے ہیں۔ جبکہ زندگی رات کا سکون بھی چاہتی ہے جبکہ دوسرے دن' دن کی سرگرمی دکھائی جا سکے۔ لیکن اگر دن قیامت تک کے لیے جاری کر دیا گیا تو لوگوں کی حالت کیا ہو جائے گی۔ پہلے تو وہ ختم ہی ہو جائیں گے اور اگر کسی طرح زندہ رہ گئے تو زندگی کس قدر مشکل ہو جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ہرچیز ایک مقدار کے مطابق بنائی ہے۔ اور اس جہاں کی چھوٹی اور بڑی ہرچیز کے پیچھے ایک تدبیر ہے اور ہرچیز اللہ نے ایک اندازے کے مطابق بنائی ہے۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲۸ : ۷۳) "یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں سکون حاصل کرو اور دن کو اپنے رب کا فضل تلاش کرو' شاید کہ تم شکرگزار بنو"۔

پس رات سکون و قرار کے لیے ہے۔ دن سرگرمیوں اور جدوجہد کے لیے ہے۔ اور دن کے اندر نکتہ توجہ یہ ہے کہ انسان کاروبار کرے اور رحمت الٰہی کی تلاش کرے۔ کیونکہ انسان کما کر ہی اللہ کے فضل سے کوئی چیز بطور شکر دوسروں کو دے سکتا ہے۔ اللہ نے تمہیں گردش لیل و نہار کی جو سہولت دی اس کی نعمت و رحمت ہے۔ پھر رات و دن کا ایک نظام کے ساتھ بدلتے رہنا بھی نعمت ہے اس کائنات کے دوسرے سنن اور قوانین طبیعیہ اللہ نے پیدا کیے ہیں' تم نے نہیں جاری کیے۔ اللہ نے ان قوانین کو اپنے علم و حکمت سے جاری کیا اور تم ان سے غافل ہو۔

یہ سبق قیامت کے ایک ایسے منظر پر ختم ہوتا ہے جو بڑی تیزی سے نظروں کے سامنے سے گزر جاتا ہے۔ اس منظر میں سرزنش کے طور پر مشرکین سے پوچھا گیا کہ کہاں ہیں وہ شریک جن کو تم شریک سمجھتے تھے۔ وہاں ان کو ان کے باطل موقف سے دوچار کیا جاتا ہے۔ سوال و جواب کے اس شرمسار کنندہ موقف میں یہ لوگ پگھل کر رہ جاتے ہیں اور ٹوٹ کر زمین پر گرتے ہیں۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ۝ وَنَزَعْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝

ع ۱۵ ۱۰

"(یاد رکھیں یہ لوگ) وہ دن جب کہ وہ انہیں پکارے گا' پھر پوچھے گا "کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے؟" اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ نکال لائیں گے پھر کہیں گے کہ "لاؤ اب اپنی دلیل"۔ اس وقت انہیں معلوم ہو جائے گا کہ حق اللہ کی طرف ہے' اور گم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے"۔

قیامت کے دن پکارنے کا منظر اور شرکاء کی بابت پوچھنے کا واقعہ گزشتہ سبق میں بھی گزرا ہے لیکن یہاں اسے بطور تاکید دوبارہ ایک نئے منظر میں لایا جاتا ہے۔ اس منظر میں یہ سوال و جواب ایک گواہ کے سامنے ہو گا۔ یہ ہر امت کا نبی ہو گا اور یہ شہادت دے گا کہ کس نے دعوت اسلامی کے حوالے سے کیا موقف اختیار کیا۔ اس منظر میں اصل مقصد یہ ہے کہ نبی کو سامنے لایا جائے گا تاکہ اس کی امت بھی اسے سب کی سب دیکھے اور وہ بھی ان کو سب کے سب کو دیکھے۔ اور اس عظیم گواہ کے سامنے مشرکین کو مزید شرمسار کرنے کے لیے ان سے پوچھا جائے کہ وہ شرکاء کہاں ہیں جن کو تم ایسا سمجھتے تھے۔ اس وقت ان کا نہ کوئی شریک ہو گا اور نہ اس شرک پر کوئی دلیل ہو گی۔ اور نہ وہ دنیا کی طرح ہٹ دھرمی کر سکیں گے۔ اور نہ کوئی مکالمہ اور دلیل پیش کر سکیں گے۔

فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰه (۲۸ : ۷۵) "ان کو معلوم ہو گا کہ حق اللہ کی طرف ہے"۔ اور ایسا حق اور سچائی اللہ کی طرف ہو گی جس میں کوئی شبہ نہ ہو گا۔

وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۸ : ۷۵) "اور گم ہو جائیں گے ان کے وہ سارے جھوٹ جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے"۔ یعنی ارتکاب شرک' شرکاء۔ نہ شرکاء ان کو دیکھیں گے اور نہ یہ شرکاء کو پا سکیں گے۔ حالانکہ اس مکالمے اور مناظرے کے وقت برہان کی ضرورت تھی۔

یہاں آکر موسیٰ علیہ السلام کے قصے پر تبصرہ ختم ہوتا ہے۔ اس تبصرے میں انسانوں کے دل و دماغ کو ایک وسیع بنیاد کی سیر کرائی گئی۔ دنیا کی بھی' آخرت کی بھی' النفس انسانی کے نشیب و فراز میں بھی اسے پھرایا گیا' اور اس کائنات کی وسعتوں میں بھی' سابقہ مکذبین کے کھنڈرات میں بھی اور اس کائنات کے سنن الٰہیہ میں بھی۔ اور یہ تمام سورت کے اصل مقاصد اور اس کے قصوں کے مضمون کے ساتھ ہم آہنگ اور مربوط رہی۔ اب ہم سورت کے دوسرے قصے کی طرف آتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۱۷۸ ایک نظر میں

اس سورت کا ابتدائی حصہ قصہ فرعون و کلیم پر مشتمل تھا۔ اس قصے میں بتایا گیا تھا کہ قوت اور اقتدار کے نتیجے میں کس طرح نافرمانی اور سرکشی آتی ہے۔ اور حکمران کس طرح اللہ کی ناشکری کرتے ہیں۔ اللہ کی ہدایت سے دور ہوتے ہیں اور پھر ان سب باتوں کے نتیجے میں وہ زوال کا شکار ہوتے ہیں۔ اب یہاں قارون کا قصہ لایا جاتا ہے کہ مال اور علم و ہنر جب سرکشی اختیار کر لیں' مالدار اترانے لگیں' عوام پر برتری جتلائیں' اللہ کی نعمتوں کا انکار کریں تو ان پر کس طرح ہلاکت آتی ہے۔ اس کے بعد درست تصورات اور نظریات کے مطابق مال اور علم دنیا کی زیب و زینت ہیں اور ایمان اور نیک عمل کے مقابلے میں علم و ہنر اور مال و دولت کی کوئی قدر نہیں ہے۔ نیز درست طرز فکر و عمل یہ ہے کہ علم و ہنر اور مال و دولت کو اعتدال کے ساتھ ضروریات زندگی کے لیے استعمال کیا جائے۔ علو فی الارض اور فساد فی الارض کے لیے نہیں۔

قرآن کریم نے اس قصے کا زمان و مکان بیان نہیں کیا۔ بس اس قدر معلومات کافی ہیں کہ یہ شخص قوم موسیٰ میں سے تھا اور یہ موسیٰ علیہ السلام سے باغی ہو گیا تھا۔ کیا یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا جب موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل خروج سے قبل مصر ہی میں تھے؟ یا موسیٰ علیہ السلام کے خروج کے بعد؟ یا بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد تھا۔ اور خود موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہ واقعہ ہوا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ قارون نے حضرت موسیٰ کو اذیت بھی دی تھی اور اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف رشوت دے کر ان کو ایک عورت کے ساتھ سیکنڈل میں الجھانے کی کوشش کی تھی۔ اللہ نے حضرت موسیٰ کو بچا لیا اور قارون زمین میں دھنسا دیا گیا۔

ہمیں ان روایات کی ضرورت نہیں ہے' نہ اس قصے کے زمان و مکان کے تعین کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم میں جس طرح یہ قصہ آیا ہے اس سے اس کے لانے کے مقاصد اچھی طرح واضح ہوتے ہیں اور وہ اقدار وہ اصول واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتے ہیں جن کی وجہ سے یہ قصہ لایا گیا۔ اگر اس کے زمان و مکان اور اس کے ماحول کے دوسرے واقعات و حالات کی یہاں ضرورت ہوئی اور ان سے کسی مزید حقیقت' قدر یا اصول کی وضاحت ہوتی تو اللہ ضرور وہ دوسری تفصیلات بھی دے دیتا۔ لہٰذا ہم اس کی تشریح صرف قرآنی اسلوب ہی میں کرتے ہیں۔ اور ان روایات سے ہٹ کر اس کی وضاحت کرتے ہیں کیونکہ ان تک اس کی تشریح کے سلسلے میں کوئی ضرورت باقی نہیں ہے۔

درس نمبر ۱۷۸ تشریح آیات

۷۶ --- تا --- ۸۴

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ﴿٧٦﴾ وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا ۖ وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٧٧﴾ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۚ

”یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ایک شخص تھا' پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا۔ اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی۔ ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا ”پھول نہ جا' اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر' جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے' اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر' اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا“۔ تو اس نے کہا ”یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بناء پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے“۔

یوں اس قصے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے ہیرو کا نام قارون ہے۔ اس کی قوم' قوم موسیٰ ہے اور اس نے اپنی قوم کے عقائد سے بغاوت کر لی۔ یہ اپنی قوم کے خلاف ظلم کا ارتکاب بھی کرتا اور یہ بغاوت اور ظلم وہ محض اپنی دولت مندی کی وجہ سے کرتا۔

وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ (۲۸ : ۷۶) ”اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی“۔

اور اس کے بعد پھر واقعات ' اقوال اور وہ تاثرات بیان کیے جاتے ہیں جو اس قصے کے ساتھ ساتھ ذہن میں آتے ہیں --- قارون موسیٰ علیہ السلام کا ہم قوم تھا۔ اللہ نے اسے بہت بڑی دولت دی۔ اس کی کثرت کی وجہ سے اسے خزانوں سے تعبیر کیا گیا۔ کنز (خزانہ) اس مال کو کہا جاتا ہے جو استعمال اور گردش سے زیادہ اور جسے محفوظ جگہ میں رکھا گیا ہو۔ نظروں سے اوجھل۔ اور یہ دولت اس قدر زیادہ تھی کہ اس کی تجوریوں کی چابیاں بھی بہت زیادہ تھیں۔ اور ان کو طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت ہی اٹھا سکتی تھی۔ اس دولت کی وجہ سے قارون اپنی قوم سے باغی ہو گیا۔ یہاں اس کا ذکر نہیں ہے کہ اس نے کسی قسم کی بغاوت کی۔ یہاں بغاوت مجمل ہے اس لیے اس سے ہر قسم کی بغاوت اور نافرمانی مراد ہو سکتی ہے۔ یہ بغاوت بنی اسرائیل پر ظلم کے ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ ان کی اراضی غصب کرنے کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ ان کی دوسری چیزیں چھین لینے سے بھی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ مال پر دست درازی کرنے والے اکثر لوگ کرتے ہیں۔ غریبوں کا استحصال کرتے ہیں۔ یہ بھی بغاوت ہے کہ قارون کے مال میں غریبوں کا حق تھا اور وہ ادا نہ کرتا تھا۔ کیونکہ اغنیاء کے اموال میں فقراء کا حق ہوتا ہے۔ تاکہ یہ مال اغنیاء کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے۔ محتاجوں تک بھی جائے۔ اس طرح طبقاتی نفرت پیدا ہوتی ہے اور سوسائٹی کا امن و امان تباہ ہوتا ہے۔ یہ بغاوتیں بھی ہو سکتی ہیں اور اس کے سوا اور بھی نافرمانیاں ہو سکتی ہیں۔

بہرحال قارون کی قوم میں ایسے لوگ تھے جو چاہتے تھے کہ یہ اس بغاوت سے باز آ جائے اور اسلام کے عادلانہ نظام معیشت کی طرف آ جائے ' جو اللہ نے دولت میں تصرف کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اور یہ ایسا نظام ہے کہ جس کے ذریعہ دولت مند اپنی دولت سے محروم نہیں ہوتا۔ اور وہ اعتدال کے ساتھ اپنی دولت سے استفادہ کر سکتا ہے ' جو اللہ نے اسے بخشا ہے لیکن یہ نظام میانہ روی اور اعتدال کو اہل ثروت کے لیے لازم قرار دیتا ہے ' اور یہ کہ وہ اس ذات کو ہروقت دل میں رکھیں جس نے انہیں یہ مال دیا ہے اور دولت کو اس طرح کام میں لائیں کہ قیامت میں اپنے کیے کا حساب دے سکیں۔

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (۷۶) وَ ابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَ لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (۷۷) (۲۸:۷۶ - ۷۷) "ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا "پھول نہ جا ' اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر ' جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے ' اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر ' اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا"۔ اس آیت میں ان سب اقدار اور خصوصیات کو جمع کر دیا گیا ہے جو تمام دوسرے نظامہائے زندگی کے مقابلے میں اسلامی نظام زندگی کی خصوصیات ہیں۔ اور وہ صرف اسلام میں پائی جاتی ہیں۔

لَا تَفْرَحْ (۲۸: ۷۶) "پھول نہ جاؤ"۔ مال اور دولت پرست ہو کر حد سے زیادہ خوشی محسوس نہ کرو۔ دولت کے ساتھ ضرورت سے زیادہ دلچسپی نہ لو' اور دل کو خزانوں کے ساتھ باندھ نہ دو۔ مملوکات اور مقبوضات کو دیکھ کر زیادہ مسرت کا اظہار نہ کرو' اور دولت پر اس طرح نہ پھول جاؤ کہ دولت عطا کرنے والے ہی کو بھول جاؤ۔ اللہ کی نعمتوں کو بھلا دو اور اس کا حمد و شکر چھوڑ دو۔ بعض لوگ مال و دولت ہی کی وجہ سے ہلکے ہو کر ہوا میں اڑنے لگتے ہیں' ان کا دماغ بھی اڑنے لگتا ہے اور محض دولت کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں اور لوگوں پر دست درازی کرتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ (۲۸: ۷۶) "اللہ پھول جانے والے لوگوں کو پسند نہیں کرتا"۔ اس طرح قارون کی قوم نے کوشش کی کہ قارون کو اللہ کی طرف لوٹا دے' کیونکہ اللہ مال اور دولت کی اساس پر غرور اور تکبر کو پسند نہیں کرتا اور نہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو دولت کی وجہ سے دوسرے کے ساتھ ظلم کرتے ہیں اور ان کا استحصال کرتے ہیں۔

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا (۲۸: ۷۷)
"جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے' اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام زندگی کس قدر معتدل اور سیدھا ہے جو ایسے دل کو جس کے پاس دولت ہے آخرت کے ساتھ بھی باندھ دیتا ہے اور اسے دنیا کے حصہ سے بھی محروم نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اسے حکم دیتا ہے کہ دنیا میں مال سے استفادہ کو بھول نہ جاؤ' اس طرح نہ ہو کہ تم تارک الدنیا ہو کر اس دنیا کی زندگی کو معطل کر دو۔

اللہ نے دنیا کے اندر یہ پاکیزہ چیزیں اسی لیے تو پیدا کی ہیں کہ لوگ ان سے استفادہ کریں اور زمین میں ان پاکیزہ چیزوں کی پیداوار میں اضافے کے لیے ہروقت کوشاں رہیں اور زندگی میں ترقی اور تنوع ہوتا رہے۔ اور اس طرح انسان اس کرۂ ارض پر منصب خلافت ادا کرتا رہے۔ لیکن یہ پیداوار اور یہ ترقی عالم آخرت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہو۔ آخرت کی راہ سے لوگ منحرف نہ ہوں اور آخرت کی تکالیف اور فرائض کو بھول نہ جائیں۔ اس انداز سے دنیا کے سازوسامان سے لطف اندوز ہونا بھی ایک طرح کا شکر نعمت ہے اور اللہ کے دین کو قبول کرنا ہے اور ان سے لطف اندوز ہونا ہے اور یہ بھی اللہ کی عبادات میں سے ایک عبادت اور اطاعت ہے۔

یوں اسلامی نظام زندگی' انسانی زندگی کے اندر اعتدال اور ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے اور اس معتدل زندگی ہی کے ذریعہ اس کو روحانی ترقی کے مدارج بھی طے کراتا ہے جس میں کسی قسم کی محرومیت نہیں ہوتی اور نہ اسی میں انسان کی فطری زندگی کے کسی بھی حصے کا تعطل لازم آتا ہے۔

وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ (۲۸: ۷۷) "احسان کرو' جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا"۔ یہ مال اللہ کی طرف سے بخشش اور انعام ہے۔ اور اللہ کا احسان ہے۔ لہٰذا احسان کا بدلہ احسان ہونا چاہئے۔ اس احسان کو قبول کرو' احسان کے ساتھ اس میں تصرف کرو' اور لوگوں کے اوپر احسان کرو اور اپنے ذہن میں اللہ کے

اس احسان کا شعور تازہ رکھو اور شکر ادا کرتے رہو۔ گہرے شعور کے ساتھ صرف زبان سے شکر گایا نہ کرو۔

وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ (۲۸: ۷۷) "اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کرو"۔ یعنی سرکشی اور ظلم کی وجہ سے فساد نہ کرو، اور دنیا کا سازو سامان اگر خدا خوفی اور آخرت کے حساب سے مبرا ہو کر استعمال کیا جائے تو اس سے زمین میں فساد برپا ہوتا ہے، یوں کہ مالداروں کے خلاف لوگوں کے دل میں حسد، بغض اور کینہ کی آگ جلنا شروع ہو جاتی ہے اور اگر مال کو بے جا طریقے سے خرچ کیا جائے تو بھی ظلم اور فساد کا باعث۔ اگر جائز طریقوں میں خرچ سے روکا جائے تو بھی ظلم کا باعث ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۸: ۷۷) "اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا"۔ جس طرح اللہ تعالیٰ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح مفسدوں کو بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ تو تھی نصیحت قوم قارون کی، قارون کو، اس پوری اصلاحی تقریر کے جواب میں وہ بس ایک ہی جملہ کہتا ہے لیکن یہ جملہ جامع شر و فساد ہے۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸: ۷۸) "تو اس نے کہا، یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنا پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے"۔۔۔ یعنی میرے علم و ہنر نے اس مال کو جمع کیا ہے، لہٰذا یہ میرا حق ہے۔ تم کون ہوتے ہو مجھے اس کے تصرف کے لیے خاص ہدایات دینے والے؟ اور میری مخصوص ذاتی ملکیت کے بارے میں از خود فیصلے کرنے والے۔ یہ مال تو میں نے بڑی جدوجہد کے بعد بنایا ہے اور اپنی مہارت اور دانش مندی کی وجہ سے اس دن کا اہل ہوا ہوں۔۔۔ یہ اس مغرور اور پر خود غلط شخص کی بات ہے جو نعمت اور حکمت کے اصل مصدر کو فراموش کر دیتا ہے اور جسے مال فتنے میں ڈال دیتا ہے اور دولت اندھا کر دیتی ہے۔

اس قسم کے لوگ انسانوں میں ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ کئی ایسے لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جدوجہد ان کے مالدار ہونے کا حقیقی سبب ہے۔ اس لیے اپنے حاصل کیے ہوئے مال کے بارے میں انہیں مسئول نہ ہونا چاہئے۔ اس مال کو وہ اصلاح کے کاموں میں لگائے یا فساد کے کاموں میں، اس کے اوپر کوئی محاسبہ نہ ہونا چاہئے۔ اور اس کی خوشی اور غمی اور مرضی اور انکار کے اوپر اور کوئی نگرانی نہ ہونا چاہئے۔

اسلام انفرادی ملکیت کی اجازت دیتا ہے اور حلال طریقوں سے دولت جمع کرنے کی اسلام حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسلام انفرادی جدوجہد کو نظرانداز نہیں کرتا اور نہ اسے فضول سمجھتا ہے۔ لیکن اسلام اس آزادی کے ساتھ ساتھ انفرادی دولت اور مملوکات کے استعمال کے لیے ضابطہ بھی متعین کرتا ہے جیسا کہ دولت کے کمانے اور ترقی دینے کے لیے اسلام ایک منہاج مقرر کرتا ہے۔ اسلام کا طریقہ کار اور اس کی معاشی پالیسی نہایت معتدل اور متوازن ہے۔ اس میں فرد اپنی جدوجہد کے ثمرات سے محروم نہیں ہوتا اور وہ اس جمع کردہ دولت کو اس طرح صرف بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اسراف اور تبذیر کی حدود میں داخل ہو جائے اور نہ اس کو یوں جمع اور خزانہ کرنے کی اجازت دیتا ہے کہ وہ کنجوسی اور مکھی چوسی کی حدود میں داخل ہو جائے۔ اسلام انفرادی ملکیت میں سوسائٹی کو بھی حصہ دار کرتا ہے اور انفرادی دولت کمانے کی بھی نگرانی کرتا ہے۔ دولت کو ترقی دینے کے طریقے بھی منصفانہ طور پر متعین کرتا ہے اور ان سے استفادہ کرنے اور خرچہ کرنے پر

بھی کنٹرول کرتا ہے ۔ اسلام کی معاشی ہدایات واضح ہیں اور ممتاز خصوصیات کی مالک ہیں ۔

بہرحال قارون نے اپنی قوم کی آواز پر لبیک نہ کہا ۔ اس نے اللہ کے انعامات کا شعور قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔ اور اسلام کی معاشی پالیسی قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔ اور نہایت ہی گھٹیا انداز میں قوم کی اس نصیحت سے اس نے منہ موڑا ۔ چنانچہ آیت کے خاتمہ سے بھی پہلے اسے تنبیہ کر دی گئی اور اس کے اس فقرے کو رد کر دیا گیا ۔

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

"کیا اس کو یہ علم نہ تھا کہ اللہ اس سے پہلے بہت سے ایسے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ قوت اور جمعیت رکھتے تھے ؟ مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے" ۔

اگر تم صاحب مال دولت ہو اور کچھ قوت رکھتے ہو ' تو تم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ایسی اقوام کو ہلاک کیا ہے جو تم سے مال میں بھی زیادہ تھیں اور قوت اور گرفت میں بھی ۔ یہ تاریخی حقیقت تمہیں معلوم ہونا چاہئے کیونکہ اس علم سے تمہیں نجات ملے گی ۔ اس سے نہیں جس کے بل بوتے پر تم نے دولت جمع کی ہے ۔ تم جیسے نو دولتیے تو اس قابل ہی نہیں کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے اللہ اگر انہیں ہلاک کرے تو اس سے پوچھے یا نوٹس دے ۔ کیونکہ نہ تم فیصلہ کرنے والے ہو اور نہ گواہ ہو ۔

وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ (۲۸ : ۷۸) "مجرموں سے تو ان کے گناہ نہیں پوچھے جاتے" ۔ اس قصے کے مناظر میں سے یہ پہلا منظر تھا اس منظر میں نظر آتا ہے کہ سرمایہ دار ہمیشہ سرکش اور ظلم کرتے ہیں ۔ وہ نصیحت پر کان نہیں دھرتے ' نصیحت سے اپنے آپ کو بالا سمجھتے ہیں کہ ان کا نفس کبھی ان کو شکر نعمت بجا لانے پر بھی آمادہ نہیں کرتا ۔

دوسرے منظر میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ قارون کسی موقع پر اپنی دولت کی نمائش کرتا ہے ۔ اس کی اس نمائش کو دیکھ کر بعض اہل ایمان کے دل بھی اڑنے لگے ۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہونے لگے اور وہ تمنائیں کرنے لگے کہ ہمیں بھی ایسا ہی دیا جائے جس طرح قارون کو دیا جاتا ہے اور وہ لوگ جن کو دولت سے محروم رکھا گیا تھا انہوں نے یہ تبصرہ کیا کہ قارون کو تو دولت کا حظ وافر دیا گیا ہے ۔ اس موقع پر صحیح علماء اور مومنین سامنے آتے ہیں اور وہ دکھاتے ہیں کہ وہ قارون کی اس نمائش سے بلند ہیں اور جو لوگ اس مظاہرہ سے متاثر ہو گئے تھے ان کو وہ نہایت ہی اعتماد ' یقین اور زوردار انداز سے منع کرتے ہیں" ۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝

''ایک روز وہ اپنی قوم کے سامنے اپنے پورے ٹھاٹھ میں نکلا۔ جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے ''کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے' یہ تو بڑا نصیبے والا ہے''۔ مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے ''افسوس تمہارے حال پر' اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو''۔

دنیا کی اس زندگی کے اس فتنے کے سلسلے میں دو قسم کے ردعمل سامنے آئے۔ ایک گروہ اس کی گرفت میں آگیا' مبہوت ہو گیا۔ اس منظر کے سامنے بچھ گیا اور اس پر ٹوٹ پڑا اور دوسرے گروہ کا ردعمل یہ تھا کہ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا' نظر بلند رکھی' امیدیں اس ثواب کے ساتھ وابستہ کر لیں جو اللہ کے ہاں محفوظ ہے یوں اس کے نزدیک مال کی قوت کے مقابلے میں ایمان کا ترازو بھاری رہا۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (۲۸ : ۷۹) ''جو لوگ حیات دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو دیا گیا۔ یہ تو بڑا نصیبے والا ہے''۔ ہر دور میں دنیا کی زیب و زینت بعض لوگوں کا مقصد بن جاتی ہے اور جو لوگ دنیا کے طالب ہوتے ہیں ان کی آنکھیں اسے دیکھ کر چکا چوند ہو جاتی ہیں۔ اور اس قسم کے لوگ اس چیز کی طرف بلند نظریں نہیں رکھتے جو اس دنیا سے اعلیٰ اور زیادہ قیمتی ہے۔ ایسے لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ اس زیب و زینت کو خریدنے والے نے کس قدر زیادہ قیمت ادا کر کے خریدا ہے۔ اور یہ دنیا کا سازو سامان اس شخص نے کیا کیا ذرائع کام میں لا کر حاصل کیا ہے۔ اس کے لیے مال' منصب اور عزت کی کیا کیا قربانیاں دی گئی ہیں۔ چنانچہ سطحی نگاہ رکھنے والے ایسے مظاہر پر ٹوٹ پڑتے ہیں جس طرح مکھیاں ہر میٹھی چیز پر جمع ہو جاتی ہیں۔ اور اس پر گرتی ہیں اور ایسے لوگ جب اہل ثروت کو دیکھتے ہیں تو ان کے منہ میں پانی آجاتا ہے لیکن ان کی نظر اس بات پر نہیں ہوتی کہ یہ دولت اور زیب و زینت جمع کرنے والے نے بہت مہنگی قیمت ادا کی' کن کن گندگیوں سے ہو کر گزرا ہے اور کیا کیا خسیس ذرائع استعمال کیے ہیں۔

اور جن لوگوں کا رابطہ اللہ سے ہوتا ہے اور وہ اعلیٰ اقدار کو اہمیت دیتے ہیں اور دولت اور دنیا کی زیب و زینت سے بڑھ کر ان کی نظروں میں مزید اعلیٰ قدریں بھی ہوتی ہیں۔ اپنی شخصیت کے اعتبار سے بلند ہوتے ہیں اور ان کا دماغ اس قدر اونچا ہوتا ہے کہ وہ زمین کی قدروں کے سامنے کسی مالدار کے سامنے نہیں جھکتے۔ یہ لوگ ہیں جن کو حقیقی علم دیا گیا ہے۔ یہی وہ علم ہے جو انسانی زندگی کو سیدھا رکھتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا

یلقھا الا الصبرون (۲۸ : ۸۰) "مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے افسوس تمہارے حال پر' اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو"۔

اللہ کے ہاں جو درجہ ہے وہ اس زینت سے بہتر ہے' اللہ کے خزانے قارون کے خزانوں سے زیادہ ہیں اور یہ شعور اعلیٰ قدروں کی بابت صرف ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو صبر کرنے والے ہوں' جو دوسروں کے اعلیٰ معیار حیات کو دیکھ کر متاثر نہیں ہوتے۔ اور زندگی کے تمام فتنوں اور رعنائیوں کے مقابلے میں اپنے مقام پر جمے رہتے ہیں۔ جب ایسے لوگوں کا شعور یہ ہوتا ہے کہ آخرت کا اجر' اللہ کی رضامندی بہت قیمتی سامان ہے تو ان کا درجہ اور بلند ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دنیا کے سازو سامان سے بلند ہو جاتے ہیں اور ان کی نظریں ثواب آخرت کے اعلیٰ افق پر ہوتی ہیں۔

--- ooo---

جب زیب و زینت کا یہ فتنہ انتہا کو پہنچ جاتا ہے' اور لوگ اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتے بلکہ اس سے شکست کھا کر اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں تو اب دست قدرت کی طرف سے براہ راست مداخلت کا وقت آ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ضعیف الارادہ لوگوں کو اس کے جال میں شکار ہونے سے بچانے کے لیے اس فتنے کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ زیب و زینت کا یہ غرور ختم کر دیا جاتا ہے۔ اور عبرتناک منظر میں ایک فیصلہ کن گرفت کی جھلک پیش کرتا ہے :

فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِينَ ۝

"آخر کار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلے میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا"۔

نہایت ہی مختصر جملے میں ایک مختصر جھلکی کی صورت میں یہ انجام دکھایا گیا۔

فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ (۲۸ : ۸۱) "آخر ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا"۔ زمین اسے بھی نگل گئی اور اس کے محل کو بھی نگل گئی۔ جس زمین پر وہ اپنے آپ کو سربلند سمجھتا تھا۔ جس کے اوپر وہ لوگوں پر ظلم کرتا تھا۔ اللہ نے اسے اسی کے اندر داخل کر دیا۔ اور وہ ضعیف و ناتواں ہو گیا۔ نہ اس کی مدد کوئی دوسرا کر سکا اور نہ وہ اپنی جاہ و مال کے ساتھ اپنی کوئی مدد کر سکا۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ فتنہ بھی دفن ہوا جس کے اوپر بعض لوگ فریفتہ ہو رہے تھے۔ غرض فیصلہ کن زد نے ان کو اللہ کی قدرت کی طرف پھیر دیا اور غضب اور گمراہی کے پردے دور ہو گئے اور یہ آخری منظریوں رہا۔

وَأَصْبَحَ الَّذِينَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ بِالْأَمْسِ يَقُولُونَ وَيْكَأَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَوْلَا أَنْ مَنَّ اللَّهُ

عَلَيۡنَا لَخَسَفَ بِنَا‌ؕ وَيۡكَاَنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الۡكٰفِرُوۡنَ ۝۸۲

''اب وہی لوگ جو کل اس کی منزلت کی تمنا کر رہے تھے ' کہنے لگے ''افسوس ' ہم بھول گئے تھے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے ' کشادہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے ۔ اگر اللہ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا ۔ افسوس ہم کو یاد نہ رہا کہ کافر فلاح نہیں پایا کرتے''۔

اب یہ لوگ اس بات پر اللہ کی حمد و ثنا کر رہے ہیں کہ اللہ نے ان کی دعا قبول نہ کی ۔ اور ان کو وہ دولت نہ دی جس کی وہ تمنا کرتے تھے اور جو دولت قارون کو دی گئی وہ ان کو نہ دی گئی ۔ ورنہ ان کی حالت بھی وہ ہو جاتی جو چوبیس گھنٹوں میں قارون کی ہوگئی ۔ ان کو اب ہوش آیا کہ دولت اس بات کی علامت اور دلیل نہیں ہے کہ دولت مند پر اللہ کا فضل ہے اور اللہ اس سے راضی ہے بلکہ اللہ اپنے بندوں میں سے کسی کو کم رزق دیتا ہے اور کسی کو زیادہ دیتا ہے یہ اس لیے نہیں ہے کہ اللہ ان سے راضی ہے یا ناراض ہے ۔ رزق کی فراہمی کے اسباب اور ہیں ۔ اگر وافر رزق اللہ کی رضامندی کی دلیل ہوتا تو قارون اللہ کی اس شدید گرفت اور پکڑ میں نہ آتا ۔ ایسے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو اب معلوم ہوا کہ کافر کبھی فلاح نہیں پاتے ۔ قارون کے بارے میں قرآن نے کلمہ کفر نقل نہیں کیا گیا ۔ البتہ مال و دولت پر غرور کرنا اور یہ سوچ رکھنا کہ یہ دولت اس نے خود اپنے علم و حکمت کے زور سے کمائی ہے ' یہ بھی ایک قسم کا کفر ہے اور اس کا انجام ایسا ہوا جو کافروں کا ہوتا ہے یعنی مکمل تباہی اور ہلاکت ۔

--- ○○○---

اب اس منظر پر بھی پردہ گر جاتا ہے ۔ دست قدرت کی مداخلت سے اہل ایمان کے دلوں کو قوت ملی ۔ اور اللہ کے پیمانوں میں ایمان کی قوت کو ترجیح ملی ۔ اور اب ان مناظر پر بہترین تبصرہ :

تِلۡكَ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ نَجۡعَلُهَا لِلَّذِيۡنَ لَا يُرِيۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا‌ ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ۝۸۳

''وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے''۔

یہ دار آخرت جس کی بات اہل علم کرتے ہیں یعنی وہ لوگ جن کے پاس سچا علم ہے جو اشیاء کی صحیح قدر و قیمت متعین کرتا ہے یہ جہاں نہایت ہی بلند مرتبت ہے ۔ بہت ہی وسیع ہے یہ جہاں کس کے لیے ہے ؟

نَجۡعَلُهَا لِلَّذِيۡنَ لَا يُرِيۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا (۲۸ : ۸۳) ''یہ ہم نے ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں''۔ ایسے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ وہ زمین میں برتری اپنی ذاتی سربلندی کے لیے حاصل کریں ۔ وہ تو اپنی ذات اور اپنی شخصیت

پر بھی فخر نہیں کرتے ۔ ان کی ذات بھی اللہ کے تصور ' اللہ کی یاد اور اللہ کے شعور میں گم ہوتی ہے ۔ وہ اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے نظام حیات کے لیے ساعی ہوتے ہیں ' ان لوگوں کے پیمانوں میں ' اس زمین ' اس کی اشیاء ' اس کے سامان ' اور اس کی اقدار کا کوئی وزن نہیں ہوتا ۔ وہ اقتدار فساد فی الارض کے لیے نہیں حاصل کرتے ۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ نے دار آخرت تیار کیا ہے جو عالی شان ہے ۔

وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۲۸ : ۸۳) "اور انجام کی بھلائی متقین ہی کے لیے ہے" ۔ جو اللہ سے ڈرتے ہیں ' جو اس کے غضب سے خائف ہوتے ہیں اور اس کی رضامندی کے طلبگار ہوتے ہیں" ۔

اس جہاں آخرت میں سب لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا ملے گی اور یہ بات اللہ نے اپنے اوپر لکھ دی ہے کہ نیکیوں کا اجر کئی گنا ملے گا اور برائیوں کی سزا ان کے برابر ہوگی ۔ زیادہ نہ ہوگی ۔ یہ ہے اللہ کی رحیمانہ شان ۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

"جو کوئی بھلائی لے کر آئے گا اس کے لیے اس سے بہتر بھلائی ہے ' اور جو برائی لے کر آئے تو برائیاں کرنے والوں کو ویسا ہی بدلہ ملے گا جیسے عمل وہ کرتے تھے" ۔

--- ooo---

درس نمبر ۱۷۹ تشریح آیات

۸۵--- تا--- ۸۸

اب قصص ختم ہیں ۔ ان قصص پر جو تبصرے تھے وہ بھی ختم ہو گئے ۔ اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے ۔ مکہ مکرمہ میں اس وقت مٹھی بھر اہل ایمان آپ کے ساتھ ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خطاب ایسے حالات میں ہے کہ مکہ سے لوگ آپ کو نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں ۔ آپ مدینہ کی طرف جانے والے ہیں اور اس میں بھی قوم آپ کا پیچھا کر رہی ہے ۔ ابھی آپ مدینہ نہیں پہنچے ۔ راستہ ہی میں ہیں ۔ یہ آیات جحفہ میں اتریں جو مکہ کے قریب ہے ۔ اس وقت ہجرت کرتے ہوئے آپ کی نظریں اور آپ کا دل اپنے محبوب شہر مکہ کے ساتھ لگا ہوا ہے ۔ آپؐ پر مکہ چھوڑنا نہایت ہی دشوار گذر رہا ہے ۔ اگر دعوت اسلامی کا عظیم مقصد آپ کے پیش نظر نہ ہوتا تو آپ اپنے بچپن کے اس شہر کو ہرگز نہ چھوڑتے ' جس کے ساتھ آپ کی یادیں وابستہ ہیں ۔ جہاں آپ کے آباؤ اجداد خوابیدہ ہیں اور جہاں آپ کے رشتہ دار رہتے ہیں ۔ ایسے حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے ۔

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۚ

"اے نبی ' یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین انجام کو پہنچانے والا ہے" (یعنی مکہ تک) ۔

اللہ آپ کو مشرکین کے حوالے کرنے والا نہیں ہے ۔ جبکہ اللہ نے آپؐ پر قرآن کی تبلیغ اور دعوت فرض کر دی ہے ۔ اللہ مشرکین مکہ کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپؐ کو مکہ سے نکال دیں ۔ آپؐ پر اور آپؐ کی دعوت کے حاملین پر تشدد اور ظلم کرتے رہیں ۔ اللہ نے جو آپؐ کو قرآن کی دعوت کا ذمہ دار قرار دیا ہے ۔ وہ ایک مقرر وقت پر آپ کی نصرت بھی کرنے والا ہے ۔ لیکن اس کے لیے ایک وقت مقرر ہے ۔ ٹھیک ہے آج ان لوگوں نے آپ کو نکال دیا ہے لیکن بہت جلدی آپ پھر واپس آنے والے ہیں ۔

جن حالات میں حضور اکرمؐ ہجرت پر مجبور ہوئے تھے وہ بہت زیادہ کربناک تھے لیکن اللہ نے چاہا کہ ایسے حالات ہی میں آپؐ کے ساتھ یہ پختہ عہد کر دیا جائے کہ آپ ظفرمندی کے ساتھ پھر اس شہر کو لوٹیں گے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کی مشکلات کو امن اور یقین کے ساتھ برداشت کریں ۔ مطمئن ہو جائیں کہ جلدی آپ فاتح کی حیثیت سے لوٹنے والے ہیں ۔ اور آپؐ کو اچھی طرح یقین ہو گیا کہ جلد ہی یہ تحریک مکہ میں فاتحانہ داخل ہو گی ۔ اللہ کا یہ وعدہ ان

تمام لوگوں کے لیے قائم ہے جو بھی اس راہ پر چلنا چاہیں۔ جو شخص بھی اللہ کے لیے تشدد کا شکار ہو اور وہ اس پر صبر کرے اور یقین رکھے کہ اس ظلم اور تشدد کے بعد آخر کار اللہ کی مدد آئے گی تو اللہ نے آخر کار ایسے شخص کی مدد کی ہے۔ ایسا شخص آخر کار کامیاب ہوتا ہے اس معرکے سے سرخرو ہو کر نکلتا ہے۔ اس کے کاندھوں سے بوجھ اتر جاتا ہے اور وہ اپنے فرائض اچھی طرح ادا کر لیتا ہے۔

انَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰی مَعَادٍ (۲۸ : ۸۴) "یقین کرو جس نے تم پر قرآن فرض کیا ہے وہ تمہیں ایک بہترین جگہ (مکہ) واپس پہنچانے والا ہے"۔ اور اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکال دیئے گئے تھے اور ان کا تعاقب بھی ہوا تھا لیکن اللہ نے ان کو پھر مصر کی طرف لوٹا دیا۔ وہ واپس ہوئے اور انہوں نے اپنی قوم کے کمزور لوگوں کو فرعون کی غلامی سے نکالا اور فرعون اور اس کی فوج ہلاک ہوئی اور اچھا انجام ان لوگوں کا ہوا جنہوں نے ہدایت قبول کی تھی۔ لہٰذا آپ بھی جس راہ پر نکل پڑے ہیں' چلتے رہیں اور آپ کی قوم اور آپ کے درمیان فیصلہ وہ کرے گا جس نے آپ کو اس ڈیوٹی پر مامور کیا ہے۔

قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی وَمَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴿۸۵﴾

"ان لوگوں سے کہہ دو کہ "میرا رب خوب جانتا ہے کہ ہدایت لے کر کون آیا ہے اور کھلی گمراہی میں کون مبتلا ہے" یعنی ہدایت و ضلالت کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ وہ اہل ہدایت کو جزاء دے گا اور اہل ضلالت کو سزا دے گا۔

آپ پر جو قرآن فرض کیا گیا ہے وہ آپ پر اللہ کی طرف سے ایک رحمت اور مہربانی ہے۔ آپ کے تو خواب و خیال میں یہ بات نہ تھی کہ یہ امانت آپ کے حوالے کی جائے گی۔ یہ ایک عظیم منصب ہے جو آپ کو دیا گیا اور اس منصب کے دیئے جانے سے قبل آپ کے تصور میں بھی ایسی کوئی بات نہ تھی۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْۤا اَنْ یُّلْقٰۤی اِلَیْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ

"تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی' یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی سے (تم پر نازل ہوئی ہے)"۔

یہ اس مسئلہ پر ایک فیصلہ کن بات ہے کہ رسالت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی امید نہ تھی کہ آپ رسول بھی ہو سکتے ہیں۔ پس یہ اللہ کا اچانک انتخاب تھا۔ اور اللہ جو چاہتا ہے' پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے' منتخب کرتا ہے۔ یہ اس قدر بلند منصب ہے کہ اس کے لیے کوئی انسان قبل از وقت توقع بھی نہیں کر سکتا' سوچ بھی نہیں سکتا کہ اللہ اسے اس منصب کے لیے چن لے گا یا اللہ اسے اس کے اہل بنا دے گا۔ یہ اللہ کا محض رحم و کرم ہوتا ہے۔ کسی شخص پر یا کسی قوم پر کہ ان میں سے کسی کو اللہ چن لیتا ہے اور یہ انتخاب ان کا ہوتا ہے جو اللہ کے اونچے بندے ہوں' ان کا انتخاب نہیں ہوتا جو اس منصب کے امیدوار ہوتے ہیں۔ مکہ کے ماحول میں عربوں میں اور اسرائیل میں بہت سے لوگ تھے۔ اس انتظار

میں تھے کہ نبی آخر الزمان آنے والا ہے' لیکن وہ کون ہو گا' یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ منصب رسالت کہاں لے جاکر رکھ دے ـ اللہ نے اس قوم اور اس شخص کو اس منصب کے لیے چن لیا جو اس کے لیے نہ امیدوار تھا اور نہ اس کو اس کا خیال تھا کیونکہ اللہ جہاں منصب نبوت دیتا ہے اس کے لیے پہلے اس کی قبولیت کے لیے فیض عظیم اور استعداد وافر عطا کرتا ہے ـ

یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کو حکم دیا جاتا ہے چونکہ آپ کو یہ کتاب دی گئی جس کے مطابق آپؐ نے حق پر فیصلے کرنے ہیں' لہٰذا کافروں کے مددگار نہ بنیں' کیونکہ وہ تو آپ کو اللہ کی ان روشن نشانیوں سے روک دیں گے ـ بلکہ آپ مشرکین کے مقابلے میں صاف صاف عقیدۂ توحید پر مبنی دعوت لے کر اٹھیں ـ

فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ ﴿۸۶﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ ۖ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۸۷﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ ۘ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۸۸﴾ الثلثة

۹ ع ۶ ۱۲

"پس تم کافروں کے مددگار نہ بنو ـ اور ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات جب تم پر نازل ہوں تو کفار تمہیں ان سے باز رکھیں ـ اپنے رب کی طرف دعوت دو اور ہرگز مشرکوں میں شامل نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو ـ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ـ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے ـ فرمانروائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو"ـ

اس سورت کے آخر میں یہ انسانی عقل و خرد کے تاروں پر آخری ضرب ہے ـ اس فیصلہ کن ضرب میں بتا دیا جاتا ہے کہ آپؐ اور آپؐ کے راستے اور مشرکین اور مشرکین کے طریقے کے درمیان بڑے فاصلے ہیں ـ آپ کے متبعین قیامت تک آپؐ کی راہ اور اس کے نشانات پر رہیں ـ یہ فیصلہ کن بات آپؐ کی ہجرت کے موقعہ آئی ہے جس کے ذریعے حضور اور مشرکین مکہ کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے تھے اور آنے والے عہد میں مختلف تاریخیں تیار ہونے والی تھیں ـ

فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ (۲۸ : ۸۶) "پس آپ کافروں کے مددگار نہ بنیں"ـ کیونکہ مومن اور کافر کے درمیان کوئی تعاون اور باہم نصرت کا تعلق قائم نہیں ہو سکتا ـ دونوں کے راستے جدا ہیں' دونوں کے نظام زندگی متضاد ہیں ـ مومن حزب اللہ ہیں اور کافر حزب الشیطان ہیں ـ اس لیے دونوں کے باہم تعاون کے لیے کوئی مشترکہ اساس ہی نہیں ہے ـ دونوں کے تعاون کے لیے کوئی مشترکہ میدان نہیں ہے ـ

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ (۲۸ : ۸۷) "اور ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات جب تم پر نازل ہوں تو کفار تمہیں ان سے باز رکھیں"ـ کفار کا ہمیشہ یہ مقصد رہا ہے کہ اہل دعوت

کو کسی نہ کسی طریقے سے دعوت سے باز رکھیں اور مسلمانوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت کے راستے پر چلتے رہیں۔ اگرچہ رکاوٹیں ڈالنے والے رکاوٹیں ڈالیں۔ اور اس طرح چلتے رہیں کہ کوئی ان کو راہ دعوت سے روک نہ سکے۔ وہ قرآن اور سنت کی آیات کو لے کر اور ان پر بھروسہ کر کے اپنی راہ پر چل نکلیں۔

وَ ادْعُ اِلٰی رَبِّكَ (۲۸ : ۸۵) "اپنے رب کی طرف دعوت دو"۔ یہ دعوت خالص اسلامی دعوت ہو' بالکل واضح ہو اور اس کے اندر کوئی پیچیدگی اور کوئی التباس نہ ہو۔ یہ صرف اللہ کی طرف ہو' کسی قومیت اور کسی عصبیت کی طرف نہ ہو۔ کسی زمین اور کسی جھنڈے کے لیے نہ ہو' کسی مصلحت اور کسی مفاد کے لیے نہ ہو۔ کسی ذاتی خواہش اور کسی دنیادی عیاشی کے لیے نہ ہو۔ اس دعوت کو کوئی قبول کرتا ہے یا نہیں کرتا' اس کی کوئی پرواہ نہ کی جائے۔ اور کوئی اس کو قبول نہیں کرتا تو وہ اپنے لیے کوئی اور راہ لے' ہمارا طریقہ اور راستہ تو یہی ہے۔

وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۲۸ : ۸۵) وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۲۸ : ۸۸)

"اور ہرگز مشرکین میں شامل نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ پکارو"۔ ایک ہی اصول کو تاکید اً دو مرتبہ بیان کیا گیا یعنی شرک نہ کرو' اور اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو' اس طریقہ سے اسلامی نظریہ حیات نکھر کر سامنے آتا ہے۔ توحید اور شرک اسلامی عقیدہ کا بنیادی مسئلہ ہے۔ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات بنیادی کلمہ ہے۔ اسی پر اسلامی نظریہ حیات قائم ہے۔ اسلام کے آداب' اس کے فرائض' اس کے اخلاقی ضابطے اور اس کے قانونی ضابطے سب اسی نظریہ پر قائم ہیں۔ ہر ہدایت اور ہر قانون نظریہ توحید پر قائم ہے۔ اس لیے ہر ہدایت اور ہر ضابطہ بندی سے قبل عقیدۂ توحید کا ذکر ہوتا ہے۔ مزید تاکید ملاحظہ ہو۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸ : ۸۸) "اس کے سوا کوئی معبود و اللہ نہیں ہے ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے"۔ لہٰذا اسی کے آگے جھکنا ہے۔ اسی کی بندگی کرنا ہے' اس کے سوا کسی کے پاس کوئی قوت نہیں ہے۔ اس کے سوا کسی کے پاس جائے پناہ اور جائے تحفظ نہیں ہے۔

كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸ : ۸۸) "ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے"۔ ہر شے زائل ہونے والی ہے' ہلاک ہونے والی ہے' مال ہو یا جاہ' اقتدار ہو یا قوت' زندگی ہو یا سامان زندگی' زمین ہو یا زمین کے باشندے۔ آسمان ہوں یا ان میں رہنے والی ہر چیز۔ اور یہ پوری کائنات جسے ہم جانتے ہوں یا جو ہمارے علم سے باہر ہو' ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے ماسوائے ذات باری تعالیٰ کے۔ صرف ذات باری تعالیٰ اکیلی ہی باقی رہے گی۔

لَهُ الْحُكْمُ (۲۸ : ۸۸) "فرمانروائی اسی کی ہے"۔ وہ جو فیصلے چاہتا ہے' کرتا ہے' جو احکام چاہتا ہے' دیتا ہے۔ اس کے احکام اور بادشاہت میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے فیصلے کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ اس کے حکم کے بالمقابل کوئی حکم نہیں۔ اور وہ چاہے وہ ہوتا ہے اور اس کے سوا کوئی ایسی ذات

نہیں ہے جس کی مشیت چلتی ہو۔

وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۸ : ۸۸) "اور اسی کی طرف تم کو پلٹنا ہے"۔ لہٰذا اس کے حکم سے کوئی جائے خلاصی و جائے پناہ نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں فرار کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے سوا کوئی ملجاو ماویٰ نہیں ہے۔

یوں اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ قدرت الٰہیہ اس میں برملا کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ذات باری دعوت اور داعیوں کی محافظ نظر آتی ہے۔ اور دعوت اسلامی کے مقابلے میں تمام قوتوں کو پاش پاش کرنے کے مناظر صاف نظر آتے ہیں۔ اور سورت کا اختتام دعوت اسلامی کی بنیاد یعنی عقیدۂ توحید پر ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ و حاکم نہیں ہے۔ حکم اور فیصلہ اسی کا چلے گا اور اس دعوت کو لے کر اہل دعوت کو چاہئے کہ وہ یقین' اعتماد اور یکسوئی کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہیں۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۰

سورۃ العنکبوت ۔ ۲۹

۱--- تا--- ۴۴

سورۂ العنکبوت ایک نظر میں

سورۂ عنکبوت مکی ہے ' بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ اس کی پہلی گیارہ آیات مدنی ہیں ـ محض اس لیے کہ ان میں جہاد اور منافقین کا ذکر ہے ـ لیکن ہم اس قول کو ترجیح دیتے ہیں یہ پوری سورت مکی ہے اور اس کی آٹھویں آیت کے بارے میں یہ روایت آتی ہے کہ یہ سعد ابن ابی وقاص کے اسلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے ـ جیسا کہ عنقریب اس کا ذکر ہو گا ـ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت سعد ابن ابی وقاص مکہ میں مسلمان ہوئے ـ ظاہر ہے کہ جن آیات کو مدنی کہا گیا ہے یہ بھی ان میں سے ایک ہے ـ لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ ان سب آیات کو مکی کہا جائے ـ رہی یہ بات کہ ان میں جہاد کا ذکر آیا ہے تو اس کی تاویل آسان ہے کیونکہ مضمون کلام سے یہاں آزمائشوں کے خلاف جہاد معلوم ہوتا ہے ـ نفس کے خلاف جہاد اور نفاق کا ذکر بھی اسی کا مفہوم ہے یعنی ایسی منافقت کہ ایک آدمی بات کرتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا ـ ان آیات میں لوگوں کے ایک مخصوص نمونے کا ذکر ہے ـ

یہ پوری سورت آغاز سے اختتام تک ایک ہی لائن اور ایک ہی موضوع پر جاری ہے ـ اس کا آغاز حروف مقطعات اور ایمان اور ایمان والوں کی آزمائش سے ہوتا ہے ـ بتایا جاتا ہے کہ جب ایمان کسی شخص کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس شخص سے ایمان بھاری تقاضے کرتا ہے کیونکہ ایمان صرف چند کلمات کا نام نہیں ہے جو کہہ دیئے جائیں بلکہ ایمان کے نتیجے میں جو مشکلات آتی ہے ان کو برداشت کرنا' اس کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی ایمان کا حصہ ہوتا ہے ـ فرائض و مشکلات پر صبر کرنا بھی ایمان کا حصہ ہوتا ہے ـ

معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کا محور اور موضوع ہی "ایمان اور اس کے تقاضے" ہے کیونکہ ایمان اور مشکلات راہ کے ذکر کے بعد حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت لوط' حضرت شعیب علیہم السلام کے قصص آتے ہیں ـ پھر عاد' ثمود' قارون' فرعون اور ہامان کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر تمام زمانوں اور اقوام میں یہی صورت حال اہل ایمان کو پیش آتی رہی ہے یعنی ایمان کے ساتھ فتنے اور آزمائشیں لازم ہوتی ہیں ـ

اس کے بعد یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس دنیا میں شر کی قوتیں ہمیشہ ایمان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتی ہیں اور مشکلات پیدا کرتی ہیں ـ شر کی قوتیں اہل ایمان کو معاشرے میں حقیر قوت ظاہر کرتی ہیں ـ ان کو نظرانداز کرتی ہیں لیکن اللہ ان کو خوب پکڑتا ہے ـ

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِهٖ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَّ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا (۲۹ : ٤٠) (۲۹:۴۰) "آخر کار ہر ایک کو ہم

نے اس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی' اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آ لیا' اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا' اور کسی کو غرق کر دیا"۔ پھر ان تمام قوتوں کی ایک مجسم مثال دی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں یہ کس قدر کمزور ہیں اللہ کی قوتیں جب اٹھتی ہیں تو یہ بے بس ہوتی ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹ : ۴۱) "جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنالیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے"۔

اس کے بعد یہ سورت اس سچائی کو جو تمام انبیاء کی دعوتوں میں پائی جاتی ہے' اس سچائی کے ساتھ جوڑ دیتی ہے' جو زمین اور آسمان کی تخلیق میں ہے اور اس کے بعد ان تمام دعوتوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ سب اللہ کی جانب سے ہیں۔ سب دعوتیں اللہ وحدہ کی طرف پکارتی ہیں۔ اس کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی کتاب قرآن کریم پر بات ہوتی ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ مشرکین کا ردعمل اس کتاب کے حوالے سے کیا تھا۔ وہ اس کتاب کے ہوتے ہوئے خارق عادت معجزات طلب کرتے ہیں حالانکہ اس کے اندر جو دعوت ہے وہ اللہ کی رحمت اور نہایت ہی بہترین راہنمائی اور یاد دہانی پر مشتمل ہے۔ اور پھر تعجب انگیز انداز میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس بارے میں جلدی کرتے ہیں کہ عذاب جلد کیوں نازل نہیں ہوتا حالانکہ جہنم تو بہت جلد ان کو اپنے گھیرے میں لینے والی ہے۔ پھر خود ان کی سوچ اور اپنے عقائد میں تضاد ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ "اگر ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو' تو ان کا جواب یہی ہو گا کہ اللہ نے"۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ "اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں سے پانی کس نے نازل کیا' پھر زمین کے مردہ ہو جانے کے بعد اس کے ساتھ اسے زندہ کر دیا تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے"۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۲۹ : ۶۵) "جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو صرف اللہ کو پکارتے ہیں' پورا دین اس کے لیے خالص کرتے ہوئے"۔ لیکن یہ عقائد رکھنے کے باوجود یہ لوگ شرک کرتے ہیں اور اہل ایمان کو آزمائشوں میں ڈالتے ہیں۔

اس بحث و مباحثے کے درمیان مومنین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ان آزمائشوں سے بچنے کے لیے ہجرت کریں' موت سے نہ ڈریں' کیونکہ

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ "ہر نفس موت کو چکھنے والا ہے' پھر وہ سب ہماری طرف لوٹ کر آئیں گے"۔ نیز ہجرت کرتے ہوئے اس بات کی بھی پرواہ نہ کرو کہ ہم کھائیں گے کیا' کیونکہ

وَكَأَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ (۲۹ : ۶۰) "کتنے ہی زمین پر چلنے والے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے ہوئے نہیں ہوتے' اللہ انہیں رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی دیتا ہے"۔

سورت کے آخر میں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ان کی تعریف اور تمجید کی گئی ہے اور ان کو ہدایت پر مطمئن ہونے اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (۲۹ : ۶۹) "وہ لوگ جنہوں نے ہماری راہ میں جہاد کیا' ہم ضرور ان کی راہنمائی اپنے راستوں کی طرف کریں گے' بے شک اللہ محسن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے"۔ یوں سورت کا خاتمہ اس کے آغاز کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اس طرح پوری سورت کے پیش نظر جو حکمت ہے' وہ واضح ہو جاتی ہے۔ اور اس کے تمام حلقے مربوط ہو جاتے ہیں اور سب اس سورت کے محور کے ارد گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔

چنانچہ اس سورت کی بات' اپنے اس موضوع پر تین راؤنڈز میں چلتی ہے۔ پہلے راؤنڈ میں ایمان کی حقیقت' اللہ کی یہ سنت کہ وہ کارکنوں کو آزماتا ہے اور مشکلات میں مبتلا کرتا ہے اور پھر یہ کہ ایمان لانے والوں کا انجام کیا ہو گا اور کافروں کا انجام کیا ہو گا۔ اور یہ کہ ذمہ داری انفرادی ہے۔ لہذا قیامت کے دن کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا۔

وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۲۹ : ۱۳) "قیامت کے دن ضرور ان سے پوچھا جائے گا کہ وہ کیا افتراپردازیاں کرتے رہے تھے"۔

دوسرے راؤنڈ میں وہ قصص ہیں جن کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا۔ ان قصص میں بھی وہ مشکلات اور رکاوٹیں بیان کی گئی ہیں جو ہمیشہ دعوت اور داعی کی راہ میں آتی ہیں۔ لیکن آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کی قوتوں کے سامنے ان مشکلات اور رکاوٹوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ بتایا جاتا ہے کہ رسولوں کی دعوت حق پر مبنی ہوتی ہے اور اس کائنات کی تخلیق بھی اس حق کے اصول پر ہے۔ جس حق پر کائنات استوار ہے اور جس پر دین و شریعت استوار ہے' دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔

تیسرے راؤنڈ میں یہ بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ نہ کرو مگر نہایت اچھے انداز میں۔ ہاں ان میں سے ایسے لوگوں کے خلاف سخت بات کی جا سکتی ہے جو ان میں سے ظالم ہوں۔ اہل کتاب سے یہ بات کی جا سکتی ہے کہ تمام ادیان ایک ہیں' اور کافر جس دین اسلام کا انکار کر رہے ہیں' یہ بھی تمام ادیان سماوی کا ہم مشرب دین ہے۔ سب کا سرچشمہ ایک ہے۔ اس راؤنڈ میں مشرکین کے ساتھ مباحثہ ہے۔ اور ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں کہ وہ مطمئن ہو جائیں' ان کے لیے خوشخبریاں ہیں اور ثابت قدمی سے اپنی راہ پر چلیں۔ کیونکہ۔

وَ اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (۲۹:۶۹) "بے شک اللہ محسنین کے ساتھ ہے"۔

آغاز سے اختتام تک دوران کلام جابجا تبصرے آتے ہیں' جن میں ایمان کی حقیقت کو دلوں میں بٹھایا جاتا ہے۔ ان تبصروں کے ذریعے دلوں کو خوب جھنجھوڑا جاتا ہے۔ اور داعیان حق کے دلوں کو راہ ایمان کی مشکلات کے سامنے کھڑا کیا جاتا ہے کہ یا تو ان مشکلات کو برداشت کرو یا اس راہ کو چھوڑ دو۔ اگر تم ایمان کے تقاضے پورے نہ کرو گے تو یہ نفاق ہو گا۔

غرض یہ ایسے اشارات اور ایسی ضربات ہیں جن پر ان نصوص کے ضمن ہی میں بحث کی جا سکتی ہے' جن میں یہ ضربات آتی ہیں۔ لہذا مفصل بات ہم نصوص کی تشریح تک موخر کرتے ہیں اور یہاں اسی اشارے پر اکتفاء کرتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر۱۸۰ تشریح آیات

۱---تا---۱۳

ا۔ل۔م ۔ان حروف میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ کتاب انہی حروف تہجی سے بنی ہے جو تمہیں معلوم ہیں اور تمہاری دسترس میں ہیں لیکن ان سے تم ایسی کتاب نہیں بنا سکتے جیسے قرآن ہے۔اس لیے کہ یہ کتاب اللہ کا کلام ہے ' انسان کا کلام نہیں ہے۔دوسرے مفسرین نے ان کے اور معانی بھی بیان کیے ہیں لیکن میں اس معنی کو ترجیح دیتا ہوں۔

اس سے قبل ہم نے یہ بات کی ہے کہ جس سورت کے آغاز میں یہ حروف آئے ہیں 'اس کے بعد متصلاً یا سورت کے درمیان قرآن کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔چنانچہ اس سورت میں بھی یہ آیات آتی ہیں۔

اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ (۲۹ : ۴۵) "تمہاری طرف جو کتاب نازل کی جا رہی ہے اسے پڑھئے"۔

وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ (۲۹ : ۴۷) "اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی کتاب نازل کی ہے۔

وَمَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ کِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِکَ (۲۹ : ۴۸) "اس سے پہلے آپ کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔

اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ (۲۹ : ۵۱) "کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب نازل کی ہے جو ان پر پڑھی جا رہی ہے"۔یہ تذکرہ اسی قاعدے کے مطابق ہے اور اسی لیے ہم نے حروف مقطعات کی تفسیر میں یہ رائے اختیار کی ہے۔

ان کے بعد ایمان کی بات شروع ہوتی ہے اور ان آزمائشوں کی بات آتی ہے جو اس ایمان کی حقیقت سمجھنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں 'تاکہ معلوم ہو کہ مدعیان ایمان صادق ہیں یا کاذب 'اس لئے کہ سچے اور جھوٹے کی آزمائش ' آزمائش ہی سے ہوتی ہے۔

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۳﴾

"ا۔ل۔م۔۔۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟۔

اس سورت کے پہلے پرزور قطعہ کا یہ دھماکہ خیز اعلان ہے، سرزنش آمیز سوالیہ کے ذریعے لوگوں کو متوجہ کیا گیا ہے کہ تم ایمان کو کیا سمجھتے ہو؟ کیا ایمان صرف چند الفاظ کا نام ہے جو زبانی ادا کر دیئے جائیں؟

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (۲۹ : ۲) "کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ وہ کہہ دیں کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا"۔ ایمان چند کلمات کا نام نہیں ہے جو زبان سے کہہ دیئے جائیں بلکہ وہ ایک حقیقت ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں۔ وہ ایک امانت ہے جس کی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ یہ دراصل ایک جہاد ہے جس میں بڑے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ بات کافی ہے کہ کوئی زبان سے کہہ دے "ہم ایمان لائے"۔ اگر وہ ایمان کا دعویٰ کریں گے تو خود ان کی آزمائش شروع ہو جائے گی اور ان آزمائشوں میں ان کو ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ ان آزمائشوں سے وہ صاف ہو کر نکلیں گے اور ان کے دلوں کو خالص ہونا ہو گا۔ فتنہ کے معنی ہیں سونے کو گرم کر کے اس سے کھوٹ جدا کرنا۔ اس لفظ کے یہ لغوی معنی بھی یہاں مراد ہیں کہ آزمائشوں کے نتیجے میں ہی خالص لوگ سامنے آتے ہیں۔ آزمائشوں سے نکل کر کارکنوں کے دل صاف و شفاف ہو جاتے ہیں لہٰذا ایمان کے اعلان کے بعد آزمائش کا آنا ایک اصولی بات ہے۔ ایک جاری سنت ہے اور اللہ کا معیار ہے۔ جس پر اہل ایمان پرکھے جاتے ہیں۔

وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ

(۲۹ : ۳) "حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں"۔ اللہ کو تو ہر دل کی حقیقت معلوم ہے۔ ابتلا سے پہلے ہی معلوم ہے، لیکن مقصد یہ ہے کہ جو چیز اللہ کے علم میں ہے اور لوگوں سے پوشیدہ ہے وہ کھل کر سامنے آ جائے تاکہ لوگوں کے ساتھ حساب و کتاب ان کے اعمال کے مطابق کیا جا سکے۔ اور صرف اسی بات پر ان کا محاسبہ نہ ہو کہ اللہ کو علم تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔ اور یہ ایک پہلو سے اللہ کا کرم ہے اور اللہ کا عدل ہے اور لوگوں کی تربیت ہے کہ کسی شخص کو صرف ان اعمال پر پکڑا جا

سکتا ہے جو کھلے ہوں' اور جو ایک عملی حقیقت ہوں ۔ کسی کو اس کی نیت پر نہیں پکڑا جا سکتا ۔ کیونکہ دنیا کا کوئی حاکم اللہ سے زیادہ نیات کا جاننے والا نہیں ہے ۔

اب ہم اس مضمون کی طرف آتے ہیں کہ اللہ اہل ایمان کو' اپنی سنت کے مطابق ہمیشہ آزماتا ہے اور انہیں بعض مشکلات سے دوچار کرتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور نظریہ اس کائنات میں اللہ کی امانت ہے ۔ اس امانت کے حامل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں اور جن کے اندر اس کے اٹھانے کی قدرت ہو' اور وہ ایمان اور نظریہ کے ساتھ مخلصانہ تعلق رکھتے ہوں' جو اپنا آرام اور امن اور سکون و سلامتی' سازو سامان اور عیش و عشرت اس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں ۔ یہ ایمان اور اسلامی نظریہ حیات اس زمین پر منصب خلافت الٰہیہ کا دوسرا نام ہے ۔ بایں معنی کہ اس زمین پر مومن عوام الناس کا قائد ہو اور اللہ کے احکام کو اس دنیا کی زندگی میں حقیقت کا روپ دے ۔ یہ ہے نہایت اہم اور قیمتی ذمہ داری اور یہ ایک ایسا کام ہے جو بہت ہی مشکل ہے اور اس کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو مشکلات کو انگیز کر سکتے ہوں ۔

اہل ایمان کی آزمائشوں میں سے ایک آزمائش یہ ہوتی کہ وہ ان مشکلات اور اذیتوں پر صبر کریں جو ان کو اہل باطل کی طرف سے پہنچیں ۔ خصوصاً ایسے حالات میں کہ ان کے لیے کوئی مددگار اور سہارا نہ ہو ۔ مومن نہ اپنا دفاع کر سکتا ہو اور نہ اسے کسی طرف سے کوئی مدد ملتی ہو ۔ نہ اس کے پاس کوئی ایسی قوت ہو جس کے ساتھ وہ زیادتی کرنے والوں کا مقابلہ کر سکے ۔ یہ آزمائش کی سخت ترین صورت ہوتی ہے ۔ قرآن کریم میں جب آزمائش کا ذکر ہوتا ہے تو ایسی ہی صورت حالات مراد ہوتی ہے ۔ لیکن فتنے اور آزمائش کی اس سے بھی زیادہ سخت اور شدید صورتیں ہو سکتی ہیں ۔

مثلاً بعض اوقات یہ خطرہ ہوتا ہے کہ ایک مومن کی وجہ سے اس کے دوستوں' احباب اور رشتہ داروں کو بھی اذیت دی جائے گی ۔ اور یہ مومن ان کے بارے میں بے بس ہوتا ہے ۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ یہ احباب دہائیاں دیتے ہیں کہ مومن ان کی خاطر نرمی کر لے یا باطل کے ساتھ مصالحت کرے تاکہ اقرباء اور رشتہ داروں پر تشدد نہ ہو اور دوسرے لوگ تباہ و برباد نہ ہوں ۔ اس سورت میں اس قسم کی آزمائشوں کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ جہاں مومن کے ساتھ بچے بھی مارے جاتے ہیں ۔

آزمائش کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ بعض اوقات باطل پرستوں پر دولت کی بارش ہوتی ہے ۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ اہل باطل خوشحال اور کامیاب ہیں ۔ دنیا ان کے نعرے بلند کرتی ہے ۔ عوام الناس تالیاں بجا کر ان کا استقبال کرتے ہیں ۔ اس کے راستے سے رکاوٹیں دور ہوتی چلی جاتی ہیں اور لوگ ان پر قربان ہوتے ہیں اور ان کی زندگی نہایت ہی خوشگواری سے گزرتی ہے اور یہ مومن بیچارہ نظروں سے گرا ہوا' غیر اہم جس کا کوئی حامی نہ ہو' اور وہ جس عظیم سچائی کا حامل ہے اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے ۔ ہاں چند اس جیسے لوگ اور اس کے حامی ہوتے ہیں لیکن وہ خود معاشرے کے بے اثر لوگ ہوتے ہیں ۔

بعض اوقات ایک مومن اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہے' وہ دیکھتا ہے کہ وہ خود اپنی سوسائٹی میں غریب الدیار ہے' اس کا پورا ماحول گمراہی میں مبتلا ہے ۔ اور اس ماحول میں وہ انوکھا لگ رہا ہے ۔

اور آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مومن کو ایک عجیب اذیت کے ساتھ آزمایا جاتا ہے ۔ ایک مومن دیکھتا ہے کہ اس

کرۂ ارض پر بعض اقوام گمراہی اور رزالت میں کانوں تک ڈوبی ہوئی ہیں لیکن یہ اقوام نہایت ترقی یافتہ ہیں اور نہایت خوشحال اور مہذب ہیں اور ایسی اقوام میں ایک فرد' جو بھی ہو' وہ ایک انسان کے لائق عزت اور دیکھ بھال پاتا ہے۔ یہ اقوام مالدار اور خوشحال ہیں حالانکہ یہ اللہ کی نافرمان اقوام ہیں۔

اور اس سے بھی ایک عظیم آزمائش ایک مومن کے لیے اور ہے۔ یہ بہت ہی شدید ہے۔ نفس' نفسانیت اور شہوات کا فتنہ' دنیا کی کشش' جسمانی لذت' دولت اور اقتدار کی پیاس' خوشحالی اور مرفہ الحالی کی دوڑ' اور صراط مستقیم اور راہ ایمان پر چلنے کی دشواری۔ پھر اخلاق و کردار اور نفس کے مخالف میلانات کی دشواری' جدید دور کی زندگی کے حالات' جدید لوگوں کی سوچ' اور اہل زمانہ کے تصورات کے حملے اور آزمائش۔

اور جب ایک مومن کی جدوجہد طویل تر ہو جائے' اور اللہ کی طرف سے نصرت آنے میں تاخیر اور آزمائش شدید اور ناقابل برداشت ہو جائے اور ان کا مقابلہ وہی شخص کر سکتا ہو جسے اللہ ہی لغزشوں سے بچا رہا ہو' تو ایسے مومن ہی دراصل وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس امانت کا حق ادا کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں پر اس عظیم امانت کے سپرد کیے جانے کا اعتماد کیا جاتا ہے۔ یعنی زمین کے بارے میں عالم بالا کی امانت اور انسانی ضمیر میں ایمان باللہ کی امانت۔

خدا کی قسم' یہ بات نہیں ہے کہ اللہ آزمائشوں کے ذریعہ اہل ایمان کو محض سزا دینا چاہتا ہو' یا ان کو مصائب میں مبتلا کر کے ان کو اذیت دینا چاہتا ہو' بلکہ اللہ ان کو اس امانت کے اٹھانے کے لیے حقیقتاً تیار کرنا چاہتا ہے اور یہ تیاری اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اہل ایمان کو عملاً مشقتوں میں مبتلا نہ کیا جائے' جب تک وہ صبر کر کے ہر قسم کی خواہشات اور شہوات پر برتری حاصل نہیں کر لیتے' جب تک وہ اذیتوں پر صبر کرنا سیکھ نہیں لیتے' اور جب تک انہیں اللہ کی نصرت پر حقیقی بھروسہ نہیں ہو جاتا۔ اگرچہ نصرت الہیہ بہت دیر کر دے اور اگرچہ ابتلاؤں کا دور طول کھینچ لے اور بہت شدید ہو جائے۔

نفس انسانی کو جب مصیبتوں کی بھٹی میں گرمایا جاتا ہے تو اس کا کھوٹ دور ہو جاتا ہے۔ اس کی خفیہ قوتیں جوش میں آتی ہیں' اس کی مدافعانہ قوتیں جمع ہوتی ہیں۔ مصائب کے یہ پہاڑ جب کسی پر ٹوٹتے ہیں تو اس کا باطن صیقل ہو جاتا ہے' اس کا جسم مضبوط ہوتا ہے اور یہ مومن ان مصائب و شدائد کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی جماعت پر یہ مشکلات آئیں تو وہ جماعت بھی اسی طرح صاف ہو جاتی ہے۔ اس کی صفوں سے کمزور لوگ نکل جاتے ہیں۔ مضبوط لوگ ہی رہ جاتے ہیں اور اولوالعزم اور قوی الارادہ اور اللہ کے ساتھ مضبوط تعلق والے ہی جماعت میں رہتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں کسی ایک نہ ایک اچھے نتیجے والے کی امید ہوتی ہے یا فتح کی یا اجر اخروی کی اور یہی لوگ ہوتے ہیں' جن کو آخر میں جھنڈے تھمائے جاتے ہیں اور اچھی تیاری اور ٹریننگ کے بعد پھر ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

ایسے لوگ جب اس امانت کو اٹھاتے ہیں تو یہ پھر انہیں دل و جان سے عزیز ہوتی ہے اس لیے کہ انہوں نے اس کے لیے قربانیاں دی ہوتی ہیں اور اس کی بھاری قیمت ادا کی ہوتی ہے۔ اس کی خاطر انہوں نے صبر کیا ہوتا ہے اور مشقتیں جھیلی ہوتی ہیں اور جو کارکن اپنا خون اور اپنے اعصاب قربان کرتا ہے' آرام اور اطمینان تج دیتا ہے۔ لذائذ اور مرغوبات کی قربانی دیتا ہے۔ اور پھر اذیتوں اور محرومیوں پر صبر کرتا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی کارکن کو اس امانت اور نظریہ کا شعور ہوتا ہے کہ اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس لیے وہ اسے ارزاں فروخت نہیں کرتا' کیونکہ اس نے اس کی بھاری

قیمت ادا کی ہوئی ہوتی ہے۔

رہی یہ بات کہ آخر کار یہ ایمان' امانت اور اسلامی نظریہ حیات غالب ہو کر رہے گا تو یہ وہ وعدہ ہے جو اللہ نے کیا ہے اور اس کی ضمانت دی ہے۔ اور کوئی سچا مومن اللہ کے وعدے کے بارے میں شک نہیں کر سکتا' اگر یہ وعدہ دیر سے حقیقت بنتا ہے تو اس کی بھی کوئی حکمت ہوگی۔ اس میں اہل ایمان کے لیے بھلائی ہوگی۔ جان لو کہ اللہ جس قدر حق پر غیرت کرتا ہے' جس قدر ان کی حمایت کرتا ہے' اس سے زیادہ حق کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ مومن کے لیے آزمائش اور مشقت ہی بہتر ہے تاکہ اس طرح وہ بندگان مختار میں شامل ہو جائے۔ حق کا امین بن جائے' اور اللہ اس پر گواہ ہو جائے کہ اس کا دین مضبوط ہے اور وہ حمل امانت کا اہل ہے اس لیے اسے آزمائش کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے "ابتلاؤں میں شدید اور مضبوط لوگ انبیاء ہوتے ہیں۔ پھر صالحین ہوتے ہیں' اور ان کے بعد درجہ بدرجہ' ہر آدمی کی آزمائش اس کے دین کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر اس کا دین مضبوط ہو تو اسے زیادہ آزمایا جاتا ہے"۔

رہے وہ لوگ جو اہل ایمان پر ظلم کر کے ان کو آزماتے ہیں اور برے کام کرتے ہیں تو وہ تو عذاب الٰہی سے بچ ہی نہیں سکتے۔ اگرچہ ان کی باطل قوتیں بہت پھلی پھولی ہوں۔ اگرچہ بظاہر وہ کامیاب و فاتح ہوں۔ اللہ کا وعدہ یہ ہے اور آخر کار اس کی سنت یہ ہے۔ سنو :

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ أَنْ يَسْبِقُونَا ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٤﴾

"اور کیا وہ لوگ جو بری حرکتیں کر رہے ہیں' یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ ہم سے بازی لے جائیں گے؟ بڑا غلط حکم ہے جو وہ لگا رہے ہیں"۔

کسی مفسد کو یہ خیال نہیں رکھنا چاہئے کہ وہ بچ نکلے گا یا بھاگ جائے گا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ غلط ہے۔ اس نے غلط اندازہ کیا ہے' اس کی سوچ پوچ ہے۔ کیونکہ اللہ نے اہل ایمان کی آزمائش کو ایک سنت بنایا ہے لیکن یہ اس لیے کہ سچے اور جھوٹے معلوم ہو جائیں' اس کی سنت کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ وہ بدکاروں کو پکڑتا ہے اور اس کی سنت کبھی بدلتی نہیں ہے۔

یہ اس سورت کے آغاز ہی میں ایک دوسری ضرب ہے' کہ آنکھیں کھول لو' اگر اہل ایمان کو آزمائش کی بھٹی سے گزارنا اور کھوٹے اور کھرے کے درمیان تمیز کرنا خدا کی سنت ہے تو بدکاروں اور مفسدوں کو پکڑنا بھی تو اللہ کی سنت ہے اس کے لیے بھی تیاریاں کر لو۔

اور تیسری ضرب' اس سورت کے آغاز میں یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ سے ملنے کا یقین ہے وہ اطمینان رکھیں اور یقین کر لیں جس طرح ان کے دل یقین کے درجے تک پہلے ہی پہنچ چکے ہیں کہ وقت آنے والا ہے۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

"جو کوئی اللہ سے ملنے کی توقع رکھتا ہو (اسے معلوم ہونا چاہئے کہ) اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے ہی والا ہے' اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

جو دل اللہ کی ملاقات کی امیدیں لیے ہوئے ہیں وہ مطمئن ہو جائیں اور انتظار کریں ان چیزوں کا جن کا اللہ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے ۔ یہ انتظار اس انداز کا ہونا چاہئے جس طرح کسی کو کسی چیز کے ملنے کا پختہ یقین ہو اور وہ اس کا منتظر ہو ۔ بس دن کے آنے کا انتظار ہو' اور شوق ملاقات بڑھتا ہی جائے ۔ یہاں ایسے پاکیزہ قلوب کی تصویر بڑی اشاراتی ہے ۔ ایک ایسے شخص کی تصویر جو ملاقات کا امیدوار بھی ہے' مشتاق بھی ہے' مربوط بھی ہے اور ایسے شخص کے شوق کے جواب میں اسے نہایت ہی فرحت بخش اشارے ملتے ہیں کہ دیکھو ہم دیکھ رہے ہیں' سن رہے ہیں اور ہمیں پورا پورا علم ہے ۔

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۲۹ : ۵) "اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

چوتھی ضرب کا رخ ان لوگوں کی طرف ہے جو ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں' جہاد فی سبیل اللہ کی تکالیف اٹھاتے ہیں کہ یہ جہاد اور مشقتیں وہ اپنے لیے برداشت کر رہے ہیں ۔ اپنے جمال و کمال اور اپنی خیر اور بھلائی کے لیے' اللہ کو تو ان چیزوں کی چنداں ضرورت نہیں ہے وہ تو جہانوں اور کائنات سے غنی ہے ۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"جو شخص بھی جہاد کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا ۔ اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے"۔

جب اللہ مومنین کے لیے آزمائشیں مقرر کرتا ہے اور ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ یہ مشقتیں برداشت کریں تاکہ ان کے نفوس جنگاہ حیات میں مشکلات برداشت کرنے کے اہل بن جائیں' تو یہ احکام بھی خود اہل ایمان کی اصلاح کے لیے ہیں ۔ یہ ان کو مکمل بناتے ہیں اور دنیا اور آخرت دونوں میں اہل ایمان کے لیے خیر کا باعث بنتے ہیں ۔ جہاد کی وجہ سے خود ایک مومن کا نفس اور اس کا قلب پاک ہوتا ہے ۔ ان کے تصورات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور اس کے پیش نظر دنیا کے آفاق وسیع ہوتے ہیں ۔ یہ حب مال اور حب نفس سے بھی بلند ہو جاتا ہے' اب اس کی شخصیت کے اعلیٰ جوہر کھلتے ہیں اور اس کی صلاحیت سامنے آتی ہے ۔ اس کے بعد پھر وہ اپنی ذات سے آگے بڑھ کر ایک سوسائٹی کی حدود میں داخل ہوتا ہے ۔ اس سوسائٹی کی اصلاح ہوتی ہے' اسے فائدہ ملتا ہے ۔ اس میں حق کے جھنڈے بلند ہوتے ہیں' بھلائی پھیلتی ہے اور غالب ہوتی ہے اور شر مغلوب ہوتا ہے ۔ اصلاح کو ترقی ملتی ہے اور فساد سکڑتا ہے ۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ (۲۹: ۶) "جو شخص بھی جہاد کرے گا تو وہ اپنے بھلے کے لیے کرے گا"۔

کوئی شخص جہاد شروع کر کے' آدھی راہ میں کھڑا نہ ہو جائے کہ لائیے جی معاوضہ اب تک کے جہاد کا۔ یا اللہ پر احسان جتلائے یا تحریک اسلامی پر احسان جتلائے یا یہ کہے کہ جی اس قدر جدوجہد سے ہمیں کیا ملا کیونکہ اس کے جہاد سے اللہ کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ اللہ کو انسانوں کی طرف سے جہاد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کیا ہے اور اس کا جہاد کیا ہے؟ اللہ تو دو جہانوں سے بے نیاز ہے۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے اس ضعیف انسان کو اس عظیم کام کے لیے منتخب کیا۔ اسے زمین کا خلیفہ بنایا اور وہ اس زمین میں کام تو اپنے لیے کرتا ہے پھر بھی اللہ اسے اجر و ثواب دیتا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

"اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے ان کی برائیاں ہم ان سے دور کر دیں گے اور انہیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔

لہذا اللہ کی راہ میں کام کرنے والے مزدور اس بات پر مطمئن ہو جائیں کہ انہیں بہت کچھ ملنے والا ہے' ان کی تقصیرات بھی معاف ہوں گی' ان کو اچھی جزاء ملے گی' لہذا ان کو جہاد کی تکلیفوں پر صبر کرنا چاہئے۔ مشکلات اور مصائب کو برداشت کرنا چاہئے کیونکہ ان کی امید روشن ہے اور جزاء پاکیزہ ہے۔ اللہ کے ہاں ان کا انتظار ہو رہا ہے۔ یہ اس قدر عظیم اجر ہے کہ اگر انہیں اس دنیا کی پوری زندگی میں انصاف نہ ملے تو بھی وہ کافی ہے۔

سورت کے آغاز میں ہم نے جن آزمائشوں کا ذکر کیا اس کا ایک رنگ اور پہلو اہل و عیال' محبوبوں اور دوستوں کا فتنہ ہے۔ ان آزمائشوں میں اللہ ایک مومن کو نہایت ہی معتدل موقف اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ۝

"ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔ میری

ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے' پھر میں تم کو بتا دوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو ـ اور جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہوں گے' ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے"۔

والدین' تمام اقرباء' میں سے قریب تر اور زیادہ قابل احترام ہوتے ہیں' ان کے حوالے سے اولاد کو مجسم شفقت بن جانا چاہئے اور ازروئے شریعت ان پر رحم اور ان کا احترام فرض کیا گیا ہے ـ ان کے ساتھ محبت کا طریقہ یہ ہے کہ ان کا احترام کیا جائے' اور ان کی اچھی طرح کفالت اور دیکھ بھال کی جائے' لیکن ان کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ اللہ کے حقوق مار کر ان کو دیے جائیں اور ان کی اطاعت اس طرح کی جائے کہ اللہ کی نافرمانی لازم آتی ہو' یہ ہے صحیح راستہ ـ

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (۲۹ : ۸) "ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر"۔

کیونکہ مومن کا پہلا تعلق اللہ سے ہے اور یہی تعلق اور رابطہ ناقابل شکست ہے' اگر والدین مشرک و کافر ہوں تو ان کے ساتھ صرف حسن سلوک کیا جائے گا۔ احترام و رعایت ہوگی' اتباع ان کا نہ ہوگا' دنیا کی اس مختصر زندگی میں یہی ہو گا' اصل مقام تو آخرت ہے جہاں دونوں اللہ کے سامنے ہوں گے ـ

اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹ : ۸) "میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے' پھر تم کو بتا دوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔ قیامت میں پھر تعلق والدین و اولاد کا نہ ہو گا۔ وہاں تو مومن باہم تعلق دار ہوں گے ـ نسب اور رشتے یہیں رہ جائیں گے ـ

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ (۲۹ : ۹) "جو لوگ ایمان لائے ہوں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہوں گے ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے"۔ یوں اللہ والے ایک جماعت ہوں گے' جیسا کہ حقیقتاً وہ ایک جماعت ہیں ـ اور نسب' خون اور رشتے وہاں ختم ہوں گے ـ یہ چیزیں یہاں دنیا ہی میں رہ جائیں گی ـ یہ اس دنیا کے عارضی رشتے ہیں اور جو رشتے اس اصلی رشتے سے کٹ گئے یعنی رشتہ ایمان سے تو آخرت میں وہ نابود ہوں گے ـ

امام ترمذی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور انکی ماں حمنہ بنت ابی سفیان کے بارے میں نازل ہوئی ہے ـ یہ اپنی ماں کے ساتھ بہت زیادہ حسن سلوک کرتے تھے ـ اس نے ان سے کہا" یہ کیا دین ہے جو تو نے اپنایا ہے؟ خدا کی قسم میں اس وقت تک کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی جب تک تم اس دین سے نوٹ نہیں جاتے یا یہاں تک کہ میں مر جاؤں ـ اسی طرح لوگ پوری زندگی تمہیں طعنہ دیتے رہیں گے اور لوگ کہیں گے "اے ماں کے قاتل" اس نے چوبیس گھنٹے تک یہ بھوک ہڑتال کی تو حضرت سعد اس کے پاس آئے اور عرض کی" اے ماں' اگر تمہاری سو جانیں ہوں اور تم ایک کے بعد ایک جان دیتی چلی جاؤ تو بھی میں اپنا دین چھوڑنے والا نہیں ہوں ـ اگر

چاہو تو کھا پی لو اگر نہ چاہو تو بھوک ہڑتال جاری رکھو"۔ جب وہ مایوس ہو گئی کہ یہ تو ماننے والا نہیں ہے تو اس نے کھانا پینا شروع کر دیا۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو' لیکن شرک کرنے میں والدین کی اطاعت نہ کرو"۔

یوں اس واقعہ میں نسب کے قریب ترین رشتے پر ایمان غالب آگیا لیکن قرآن نے رشتہ داروں اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک جاری رکھا۔ اہل ایمان کو ہر دور میں ایسی مشکلات پیش آتی رہتی ہیں۔ لہذا یہ آیت اور حضرت سعد کی یہ حدیث ہمارے لیے نشانات راہ ہیں۔ یہی امن و نجات کی راہ ہے۔

اب' مشکلات راہ ایمان ہی کے حوالے سے ایک دوسرا کردار' کہ جب مشکلات آتی ہیں تو چیختا چلاتا ہے' لیکن جب اللہ کی طرف سے کامیابی اور فتوحات آتی ہیں تو پھر لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے' اللہ تعالیٰ چند کلمات میں اس کردار کو بھی نمایاں فرماتا ہے' یوں کہ ایک واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾

"لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر۔ مگر جب وہ اللہ کے معاملہ میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا۔ اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آگئی تو یہی شخص کہے گا کہ "ہم تو تمہارے ساتھ تھے"۔ کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال' اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون"۔

لوگوں میں ایسے کردار عام ہیں' ایسے لوگ لفظ ایمان کو ایک معمولی بات سمجھ کر اقرار کرتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ صرف زبان سے کلمہ پڑھنا ہے۔ اس کے کچھ تقاضے نہیں۔ لیکن جب اللہ کی راہ میں تکالیف آتی ہیں' اور یہ آزمائشیں اس کلمے کی وجہ سے آتی ہیں تو

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ (۲۹ : ۱۰) "اس آزمائش کو اللہ کا عذاب سمجھتا ہے"۔ اور جزع و فزع اور فریادیں شروع کر دیتا ہے۔ اب اس کی دینی قدریں مختلف ہو جاتی ہیں۔ اس کا عقیدہ متزلزل ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہی تو جہنم کا عذاب ہے' جہنم میں ہیں ہم۔ سوچتا ہے کہ یہی تو عذاب الیم ہے۔ لہذا ایمان پرچنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر جس مصیبت میں ہم ہیں جہنم اس سے کیا زیادہ ہوگی۔ یہ ہوتی ہے اس کی سوچ۔ وہ دنیا کی اس معمولی تکلیف کو عذاب الہی سمجھتا ہے۔ حالانکہ جہنم میں وہ عذاب ہو گا جس کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے' نہ اس کی حدود ہوں گی۔۔۔ یہ تو تھا اس کا کردار آزمائش میں۔ لیکن اگر خوشیاں ہوں تو۔

وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ (۲۹ : ۱۰) "اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آگئی تو یہی شخص کہے گا کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے"۔ ہم تمہارے ساتھ تھے .... اور مشکلات میں وہ کس قدر ہلکا' ذلیل اور اس کی سوچ اور اس کے تخمینے کس قدر غلط تھے .... اب تو وہ لمبے چوڑے دعوے کر رہا ہے' پھولا نہیں سماتا' اب کہتا ہے۔

اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ (۲۹ : ۱۰) "ہم تو تمہارے ساتھ تھے"۔ اور جواب خوب آتا ہے۔

اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ (۲۹ : ۱۰) "کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ؟؟" تمہارے دل کی فلم اللہ کے ہاں موجود ہے۔ اللہ کو تو معلوم ہے کہ کون صابر رہا اور کون جزع و فزع کرتا رہا۔ مومن کون ہے اور منافق کون ہے۔ کیا یہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ (۲۹ : ۱۱) "اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون ہیں"۔ اللہ تو ان کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور یہ ضرور ظاہر ہوتے رہیں گے۔ یہ آزمائشیں تو آتی ہی اس لیے ہیں کہ کھرے اور کھوٹے جدا ہوں۔

اس منافق کردار کے بارے میں یہاں قرآن کریم نے جو الفاظ استعمال کیے وہ قابل غور ہیں۔ ان الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس کردار کو غلطی کہاں سے لگی ہے۔

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ (۲۹ : ۱۰) "تو لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا"۔ ان کی غلطی یہ نہیں ہے کہ ان پر جو سختی آئی اس کے برداشت کرنے میں ان کا صبر تمام ہو گیا' کیونکہ بعض اوقات ایک سچا مومن بھی برداشت نہیں کر سکتا' کیونکہ انسانی طاقت کے بہرحال حدود ہوتے ہیں۔ لیکن ایک سچا مومن انسانوں کی طرف سے آنے والی اذیتوں اور اللہ کے عذاب کے درمیان بہرحال تمیز کرتا ہے۔ وہ اس قدر غلطی نہیں کر سکتا کہ اس فانی دنیا کی کوئی چیز اور اللہ کے ہاں دائمی رہنے والے عالم آخرت کی کوئی چیز برابر ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کا ناقابل برداشت عذاب بھی آخرت کے عذاب الٰہی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ مومن کے احساس میں اللہ اور اس کے بے مثال کام میں کوئی چیز اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔ یہ ہے فرق مومن اور منافق کے درمیان۔

آخر میں لوگوں کو گمراہ اور بدراہ کرنے کی آزمائش کا نمونہ آتا ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ جزاء و سزا کے بارے میں اہل کفر کا تصور کس قدر پوچ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو گمراہ کر کے اخروی ذمہ داری خود لیتا ہے حالانکہ اللہ کے ہاں یہ اصل الاصول ہے کہ ہر شخص اپنے کیے کا خود ذمہ دار ہے۔ یہ اعلیٰ درجے کا انصاف ہے جو اسلام نے واضح طور پر قائم کیا۔ یہ عدل کا زرین اصول ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾

وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ ۖ وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿١٣﴾ ۱۳ ع ۱۳

"یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے ۔ حالانکہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں' وہ قطعاً جھوٹ کہتے ہیں ۔ ہاں ضرور وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی ۔ اور قیامت کے روز یقیناً ان سے ان افتراپردازیوں کی بازپرس ہوگی جو وہ کرتے رہے ہیں"۔

یہ بات' یہ لوگ اس بدویانہ اصول کے مطابق کہتے تھے جس میں جرائم کے سلسلہ میں ذمہ داری اجتماعی ہوا کرتی تھی ۔ کسی جرم کا ذمہ دار پورا قبیلہ ہوتا تھا ۔ اس غلط رواج کے تحت وہ یہ بھی زعم رکھتے تھے کہ آخرت میں شرک کی ذمہ داری بھی وہ اپنے سر لے سکتے ہیں اور اس طرح وہ ان کو جرم کی سزا سے بچالیں گے ۔ یہ دراصل آخرت کی جزاء و سزا کے ساتھ مزاح کر رہے تھے ۔

اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطَايَاكُمْ (۲۹ : ۱۲) "تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے"۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اٹل جواب آج ہے کہ ہر شخص اللہ کے سامنے ضرور حاضر ہوگا ۔ ہر شخص سے اس کے اعمال کا حساب لیا جائے گا ۔ اور کوئی شخص کسی کے اعمال کا ذمہ دار نہ ہوگا ۔

وَمَا هُمْ بِحَامِلِينَ مِنْ خَطَايَاهُمْ مِّنْ شَيْءٍ (۲۹ : ۱۲) "حالانکہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں"۔ اور بتایا جاتا ہے کہ یہ جو لاف زنی کرتے ہیں اس میں جھوٹے ہیں ۔

إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (۲۹ : ۱۲) "وہ قطعاً جھوٹ کہتے ہیں"۔

ہاں یہ لوگ اپنی گمراہی کا بوجھ بھی اٹھائیں گے ' شرک کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اس افتراپردازی کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کا بوجھ بھی اٹھائیں گے ۔ جب دوسرے گمراہ ہونے والے بھی معاف نہ ہوں گے ۔

وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ

(۲۹ : ۱۳) "ہاں وہ ضرور اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے ' اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت بوجھ بھی' اور قیامت کے روز یقیناً ان سے ان افتراپردازیوں کی بازپرس ہوگی جو وہ کرتے رہے ہیں"۔ چنانچہ اس آزمائش اور فتنے کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جاتا ہے اور اعلان کر دیا جاتا ہے کہ لوگوں کا حساب و کتاب جماعتی صورت میں نہ ہوگا' فرداً فرداً ہوگا اور ہر شخص اپنے کیے کا ذمہ دار ہوگا ۔

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ "ہر شخص اس کمائی کا رہن ہوگا جو اس نے کمائی"۔

---000---

درس نمبر ۱۸۱ ایک نظر میں

سابقہ راؤنڈ میں یہ بتایا گیا تھا کہ جو لوگ کلمہ ایمان کا اقرار کرتے ہیں' اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق ان کو ضرور آزمایا جائے گا اور مشکلات سے دوچار کیا جائے گا تاکہ سچوں اور جھوٹوں کے درمیان امتیاز ہو جائے۔ آزمائشوں میں اذیت کی آزمائش' رشتہ داروں کی آزمائش اور سازشوں اور لالچوں کی آزمائش شامل ہے۔

اس سبق میں ان آزمائشوں کا ذکر ہے جو نوح علیہ السلام سے ادھر ہر اسلامی دعوت کے قائدین کو پیش آتی رہی چاہے وہ نبی ہں یا ان کے متبعین اور ساتھی ہں۔ دعوت و عزیمت کی اس تاریخ میں حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے حالات کو ذرا تفصیل سے لیا گیا ہے اور دوسرے انبیاء کے حالات مجملاً بیان ہوئے ہیں۔

ان قصص میں بتایا گیا ہے کہ دعوت اسلامی کی راہ میں قسما قسم کی مشکلات اور رکاوٹیں آتی رہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے قصے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے طویل جدوجہد کی اور حاصل نہایت معمولی رہا۔ نو سو پچاس سال کی جدوجہد کے نتیجے میں بہت کم لوگ مسلمان ہوئے۔

فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (۲۹ : ۱۴) "آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آگھیرا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں سرکش حکمران نے یہ صلہ دیا کہ وہ تشدد پر اتر آیا' حالانکہ آپ نے حتی المقدور ان کی ہدایت کے لیے سعی کی۔ معقول دلائل سے بات کی تو اس قوم کا ردعمل بھی یہ تھا:

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ (۲۹ : ۲۴) "پھر ابراہیم کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا "قتل کر دو اسے یا جلا ڈالو اس کو"۔

حضرت لوط کے قصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رذیل لوگ کس قدر خود سر ہو گئے ہیں اور کس قدر بے حیا اور طوطا چشم بن گئے تھے۔ نبی کا بھی کوئی لحاظ اور احترام نہیں کرتے تھے اور انہوں نے انسانیت کو حیوانیت کے درجے سے بھی گرا دیا تھا اور وہ گندگی اور رذائل میں مبتلا ہو گئے تھے اور وہ اپنے ڈرانے والے ہمدرد کے مقابلے میں یہ جرات کرتے ہیں۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۹ : ۲۹) "اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا عذاب ہم پر لے آؤ"۔

حضرت شعیب کے قصے میں بھی اہل مدین کی طرف سے فساد و سرکشی سامنے آتی ہے' اور وہ سچائی اور حق سے منہ موڑتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ (۲۹: ۳۷) "آخرکار ایک سخت زلزلے نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے"۔

قوم عاد اور قوم ثمود کی طرف بھی غرور' قوت اور سرکشی کے مظاہرے کا اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح فرعون' قارون اور ہامان کی طرف یہ اشارہ کیا گیا کہ انہوں نے حق کے مقابلے میں مال و دولت' حکومت' سازش اور سرکشی کو سرچشمہ قوت سمجھا ان تمام تاریخی قوتوں پر قرآن یہ تبصرہ کرتا ہے کہ یہ قوتیں' چاہے وہ جس قدر زوردار کیوں نہ ہوں جب سچائی کے مقابلے میں آتی ہیں تو ان کی حیثیت مکڑی کے جالے کے برابر ہو جاتی ہے۔

كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹: ۴۱) "ان کی مثال مکڑی جیسی ہے' جو اپنا گھر بناتی ہے' اور سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے"۔

یہ راؤنڈ ایک ایسی بات پر ختم ہوتا ہے جس میں حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ آپ قرآن کی تلاوت فرمائیں' نماز قائم کریں اور اس کے بعد دعوت کا انجام اللہ پر چھوڑ دیں۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ "اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو"۔

--- ooo---

درس نمبر ۱۸۱ تشریح آیات

۱۴ --- تا --- ۴۴

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَ اَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾

''ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ پچاس کم ایک ہزار برس ان کے درمیان رہا۔ آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آگھیرا' اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔ پھر نوح کو اور کشتی والوں کو ہم نے بچالیا اور اسے دنیا والوں کے لیے ایک نشان عبرت بنا کر رکھ دیا''۔

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک دعوت دی۔ نبوت عطا ہونے سے پہلے بھی ان کی کچھ زندگی گزری ہوگی جس کا تعین یہاں نہیں ہے اور طوفان کے بعد بھی وہ زندہ رہے تھے' وہ عرصہ بھی متعین نہیں ہے۔ اس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی عمر بظاہر موجودہ عمر طبعی سے بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن یہ عمر قرآن نے بتائی ہے جو اس کائنات میں سب سے سچا ذریعہ علم ہے اور اس کی صداقت کے لیے یہی کافی ہے کہ یہ قرآن کی تصریح ہے۔ اس کی توضیح اس طرح ہو سکتی ہے کہ اس وقت دست قدرت نے طویل عمریں اس لیے رکھیں کہ زمین آباد ہو اور نسل پھیلے۔ جب لوگوں کی کثرت ہوئی تو پھر لمبی عمر کی ضرورت نہ رہی۔ کئی زندہ چیزوں میں یہ اصول مروج نظر آتا ہے' اگر کسی زندہ کی تعداد کم ہو تو عمر زیادہ ہوتی ہے۔ مثلاً شکاری پرندے شاہین وغیرہ اور کچھوے جن کی عمریں اب بھی سینکڑوں سال ہوتی ہیں جبکہ مکھی زیادہ سے زیادہ دو ہفتے زندہ رہتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

بغاث الطیر اکثرھا فراخًا
وام الصقر مقلاۃ نزور

''کمزور پرندوں کے بچے زیادہ ہوتے ہیں لیکن شاہین کی ماں بہت ہی کم بچے دینے والی ہوتی ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ شاہین کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور چھوٹے اور زیادہ بچے دینے والے پرندے کم عمر ہوتے ہیں۔ اللہ کے کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اور اس کے ہاں ہر چیز مقدار کے مطابق ہے۔ بہرحال حضرت نوحؑ کے ساڑھے نو سو سالہ تبلیغ کے نتیجے میں ایک قلیل مقدار ہی اسلام میں آئی اور اکثریت کو ان کے ظلم کی وجہ سے طوفان بہا کر لے گیا۔ چونکہ انہوں نے اس قدر طویل ہٹ دھرمی اور سرکشی کی اس لئے اللہ نے ان کو تباہ کیا اور عدد قلیل کو نجات دی جو مومن تھے۔ یہ اصحاب سفینہ تھے۔ انہی سے بعد میں انسانی نسل چلی۔ اور طوفان تمام جہاں والوں کے لیے معجزہ بن گیا اور ایک عرصہ تک ظلم، شرک اور کفر کا انجام قصہ نوح کے حوالے سے یاد ہوتا رہا۔

نوح علیہ السلام کے بعد صدیوں کی تاریخ کو لپیٹ کر قرآن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات کو لیتا ہے۔

وَإِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ ۖ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٦﴾ إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا وَتَخْلُقُونَ إِفْكًا ۚ إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِندَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهُ ۖ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿١٧﴾ وَإِن تُكَذِّبُوا فَقَدْ كَذَّبَ أُمَمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ۖ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿١٨﴾

"اور ابراہیم کو بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا: "اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جنہیں پوج رہے ہو وہ تو محض بت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ در حقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو، اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں، اور رسولؐ پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے"۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو نہایت واضح اور سادہ دعوت دی جس میں کوئی پیچیدگی اور اجمال نہ تھا۔ اس دعوت کو انہوں نے نہایت مرتب انداز میں پیش کیا۔ جو لوگ دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ دعوت کی اس ترتیب اور انداز پر غور کریں۔

پہلے تو انہوں نے اپنی دعوت کی حقیقت ان کے سامنے رکھی۔

اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ (۲۹ : ۱۶) "اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو"۔ اور اس کے بعد انہوں نے ان کے دلوں میں اس دعوت کے لیے دلچسپی پیدا کی کہ اس میں تمہارے لیے بہت خیر ہے، بشرطیکہ وہ اچھائی اور برائی کو سمجھیں۔ خیر اور مقامات خیر کو جانیں۔

ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۹:۱۶) "یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو"۔

اس شرطیہ تعقیب میں ان کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ جہالت کو ترک کر کے اور اپنی ذات کے حوالے سے جہالت کی نفی کر کے اپنے لیے بھلائی کی راہ اختیار کریں ۔ یہ ایک حقیقت بھی ہے محض ایک خطابت اور جوش خطابت کی ہٹ دھرمی نہیں ہے اور نہ محض لفاظی ہے ۔

تیسرے مرحلے میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ جو عقائد و نظریات رکھتے ہیں وہ متعدد پہلوؤں سے غلط ہیں ۔ وہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں اور یہ بت پتھر یا لکڑی سے بنے ہوئے ہوتے ہیں ۔ یہ بندگی اور پوجا نہایت غلط اور کھوٹا عمل ہے ۔ جبکہ یہ انہیں اللہ وحدہ کی بندگی سے بھی روک رہا ہے ۔ پھر وہ جو پوجا کرتے ہیں اس پر کوئی معقول برہان و دلیل بھی نہیں ہے بلکہ کچھ جھوٹی باتیں ہیں جو انہوں نے از خود گھڑ رکھی ہیں ۔ ان کا نہ کوئی سابقہ اور نہ کوئی لاحقہ ہے بلکہ جھوٹی خود ساختہ باتیں ہیں ۔ اور کسی مسلمہ اصول و قاعدے پر مبنی نہیں ہیں ۔ پھر یہ بت ان کو کوئی نفع یا نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے ۔ نہ ان کو کچھ دے سکتے ہیں ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا (۲۹:۱۷) "در حقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو، وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے"۔ اور چوتھے مرحلے میں قرآن پھر ان کو متوجہ کرتا ہے کہ اللہ سے رزق طلب کرو کہ وہ وحدہ رزاق ہے ۔ یہ بات ان کے لیے بہت اہم ہے اور ان کی حاجات اور ضروریات اللہ کے دربار ہی سے پوری ہو سکتی ہیں ۔

فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ (۲۹:۱۷) "اللہ سے رزق مانگو"۔

رزق دراصل مشغلہ نفوس ہے ، خصوصاً نفوس مومنہ کا ۔ اور رزق کو صرف اللہ کے ہاں طلب کرنا ایک حقیقت بھی ہے ۔ یہ محض نفسیاتی ہیجان انگیزی نہیں ہے ، نہ نفسیاتی میلان ہے جسے ابھارا جا رہا ہو ، بلکہ ایک حقیقت ہے ۔

آخر میں ان کو یہ دعوت دی جاتی ہے کہ انعامات اور ارزاق کے حقیقی مسبب اور حقیقی منعم کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو ۔

وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ (۲۹:۱۷) "اور اس کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو"۔

آخر میں ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس سے بھاگ نہیں سکتے ، نہ اس اللہ سے تم کہیں پناہ پا سکتے ہو ۔ لہٰذا مناسب یہی ہے اور اسی میں تمہاری بھلائی ہے کہ تم اس کی طرف لوٹ آؤ اور ایمان لا کر اس کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو ،

اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۲۹:۱۷) "اسی کی طرف تم پلٹ کر جانے والے ہو"۔

اور اگر اس دعوت کے بعد وہ تمہاری تکذیب کریں تو اس تکذیب کی کیا حیثیت ہے ! اس سے اللہ کی بادشاہت میں کوئی نقص یا کمی واقع نہیں ہوتی ۔ نہ رسول اللہؐ کے مقام و مرتبے میں کچھ کمی واقع ہوتی ہے ۔ اس سے پہلے کئی لوگوں نے تکذیب کی ہے اور رسول اللہؐ کی ڈیوٹی تو صرف یہ ہے کہ آپؐ بس تبلیغ کر دیں ۔

وَ اِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ

(۲۹ : ۱۸) "اگر تم جھلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں جھٹلا چکی ہیں' اور رسول پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے"۔

یوں قرآن کریم قدم بقدم ان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اور ان کے دلوں پر ہر طرف سے اثر انداز ہوتا ہے اور ان کے دل کے تاروں کو ہر طرف سے چھیڑتا ہے۔ یہ تدریجی اقدامات دعوت پیش کرنے کا ایک بہترین نمونہ ہیں اور دعوت اسلامی کے کارکنوں کو اس انداز پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے۔ اور اس انداز سے انسانی نفوس پر اثر انداز ہونا چاہیے۔ قبل اس کے کہ اس کہانی کو اختتام تک پہنچایا جائے۔ ایک وقفہ کیا جاتا ہے اور یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ اس میں ہر اس شخص کو مخاطب کیا جاتا ہے جو دعوت ایمان کا منکر ہے۔ جو اللہ کی طرف رجوع سے انکار کرتا ہے اور بعث بعد الموت کا منکر ہے۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ اِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ۫ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآئِهٖۤ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾

۲
۸ ع
۱۴

"کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتدا کرتا ہے' پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؟ یقیناً یہ (اعادہ تو) اللہ کے لیے آسان تر ہے۔ ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتداء کی ہے' پھر اللہ بار دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جسے چاہے سزا دے اور جس پر چاہے رحم فرمائے اسی کی طرف تم پھیرے جانے والے ہو۔ تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو' نہ آسمان میں' اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک سزا ہے"۔

یہ ہر اس شخص کو خطاب ہے جو اللہ کا منکر ہے اور اللہ کے سامنے جوابدہی کا انکار کرتا ہے۔ اس خطاب پر اس پوری کائنات کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ اس استدلال کا دائرہ زمین و آسمانوں تک وسیع ہے۔ یہ قرآن کریم کا معروف طرز استدلال ہے کہ وہ اس پوری کائنات کو دلائل و نشانات الہیہ کی نمائش گاہ بنا دیتا ہے اور انسانی قلب و نظر کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کھلی کتاب میں دلائل و آیات الہیہ تلاش کریں۔ اللہ کے وجود' اس کی وحدانیت اور اس کے

وعدے اور وعید کی سچائی تلاش کریں ۔ اس کائنات کے یہ مشاہد اور مظاہر تو بروقت ہماری نظروں کے لیے کھلے ہیں اور حاضر ہیں ۔ پیش پاافتادہ ہیں لیکن انسان چونکہ انہیں ہروقت دیکھتا رہتا ہے ' اس وجہ سے ان کا عادی ہوجاتا ہے اور ان کے اعجاز کا پہلو نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور یہ معجزات چونکہ بار بار دہرائے جاتے ہیں اس لیے انسانی قلب و نظر پر ان کا زیادہ اثر نہیں ہوتا ۔ قرآن کریم کا یہ کمال ہے کہ وہ ان پیش پاافتادہ مناظر اور دلائل اعجاز کو از سرنو زندہ کر کے اور حسین بنا کر پیش کرتا ہے اور یہ اس قدر خوبصورت 'حسین اور پرتاثیر بن جاتے ہیں کہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ گویا یہ مشاہد و مناظر اس کے سامنے پہلی بار پیش ہوئے ہیں ۔ یہ مناظرہ زندہ شکل میں سامنے آتے ہیں اور انسانی قلب و نظر پر اثرانداز ہوتے ہیں اور انسان ان کے آثار و نتائج کو اخذ کرتا ہے اور یہی مناظر انسانی وجدان کے لیے دلائل اور براہین بن جاتے ہیں اور ان سے انسانی شعور بے حد متاثر ہوتا ہے ۔ یہ طرز استدلال خشک منطقی استدلال کی طرح نہیں ہوتا جس میں محض ظاہری جدل و جدال ہوتا ہے اور ایک مردہ انداز گفتگو ہوتا ہے ۔ یہ فلسفیانہ اور منطقی انداز استدلال اسلامی منطق اور شعور کے لیے ہمیشہ ناآشنا رہا ہے ۔ اس لیے اسلامی شعور اس سے کبھی گہرے طور پر متاثر نہیں ہوا ۔ اسلامی انداز استدلال یہ ہے :

اَوَ لَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِیُٔ اللّٰہُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ ۔ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ

(۲۹ : ۱۹) "کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتداء کرتا ہے 'پھر اس کا اعادہ کرتا ہے ' یقیناً یہ تو اللہ کے لیے آسان تر ہے" ۔ بے شک یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ اللہ کس طرح تخلیق کرتا ہے 'ایک چھوٹے سے پودے میں بھی یہ تخلیق نظر آتی ہے ' ایک انڈے اور جنین میں بھی نظر آتی ہے ۔ اور ہر اس چیز میں نظر آتی ہے جو نہ تھی اور پھر موجود ہوگئی اور ان میں سے ہر چیز ایسی ہے کہ انسان انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر بھی کوشش کریں تو اس جیسی چیز کی تخلیق نہیں کر سکتے اور نہ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ اس کے خالق ہیں ۔ اللہ کی تخلیقات تو بہت ہیں ' صرف معجزۂ حیات ہی ایک مسلسل معجزہ ہے ۔ یہ حیات کس طرح وجود میں آئی ؟ یہ بھی ایک معجزہ ہے 'کسی کی جانب سے ایجاد حیات کا دعویٰ کرنا تو ایک بڑی بات ہے ۔ حیات کے بارے میں تو انسان صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ یہ اللہ کی پیدا کردہ ہے ۔ اللہ ہر لمحہ میں اسے دہراتا ہے اور لوگ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہیں اور اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے ۔

لوگ دیکھتے ہیں کہ اللہ لوگوں کو پیدا فرما رہا ہے تو ان اشیاء کا دوبارہ پیدا کرنا اللہ کے لیے نہایت ہی آسان ہے ۔

اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ (۲۹ : ۱۹) "اور یہ (اعادہ) اللہ کے لیے آسان تر ہے" ۔ اللہ کی مخلوقات میں سے تو کوئی چیز اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے ۔ لیکن اللہ تعالیٰ انسانی معیار کے مطابق ان سے بات کرتا ہے ۔ کیونکہ انسانوں کی مصنوعات میں پہلی صنعت کے مقابلے میں اس کا اعادہ آسان ہوتا ہے ورنہ اللہ کے لیے آغاز و اعادہ یکساں ہیں ۔ اللہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہے تو ارادہ متوجہ کر کے کن کہتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے ۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ ذرا کھلی آنکھوں کے ساتھ زمین میں پھرو ' اور اللہ کی آیات و نشانات کو دیکھو ۔ زندہ اور مردہ چیزوں میں عجائبات تخلیق الٰہی پر غور کرو 'تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کی تخلیق بھی کسی مشقت کے بغیر خودکار طریقے سے ہو رہی ہے ۔ اور اعادہ بھی اسی طرح ہو گا ۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۹: ۲۰) "ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتداء کی ہے 'پھر اللہ بار دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

زمین میں سیر و سیاحت سے انسان کی بصیرت اور بصارت دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ انسان ایسے مناظر دیکھتا ہے جو کبھی آنکھ نے نہیں دیکھے ہوتے اور قلب نے کبھی ان پر غور نہیں کیا ہوتا' اس آیت میں اللہ نے ایک گہری حقیقت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ انسان کسی خطے میں بستا ہے اور اس کے مناظر اور عجائبات اس کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں لیکن جب وہ سیاحت کرتا ہے تو اس کے احساسات اور قوائے مدرکہ ہر نئے منظر کو غور سے دیکھتے ہیں۔ جدید دنیا اور علاقے میں اسے نئے مناظر و مشاہد متاثر کرتے ہیں۔ اگرچہ اس جیسے مناظر و مشاہد یا ان سے اچھے مناظر خود اس کے علاقے میں موجود ہوتے ہیں لیکن وہ کبھی ان کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہے۔ جب وہ اپنے علاقے کو واپس آتا ہے تو پھر وہ خود اپنے مسکن کو بھی ایک جدید احساس اور جدید غور و فکر کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اس سے قبل وہ جن چیزوں کو کوئی اہمیت نہ دیتا تھا' اب وہ چند یوم غائب رہنے کے سبب ان کو نئی نظر سے دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ اب یہ مناظر و عجائبات اس سے از سرنو ہمکلام ہوتے ہیں جبکہ اس سے قبل یہ عجائبات اس کے لیے نہ عجیب تھے اور نہ اس کے ساتھ ہمکلام ہوتے تھے۔

پس پاک ہے وہ ذات جس نے یہ قرآن نازل کیا۔ جو دلوں کی ان راہوں کو جانتا ہے جن کے ذریعے دل کی دنیا پر اثر ڈالا جا سکتا ہے' عالم نفس کی راہ و رسم سے بھی وہ واقف ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ (۲۹: ۲۰) "ان سے کہو' زمین میں چلو پھرو اور دیکھو اس نے کس طرح خلق کی ابتداء کی"۔

یہاں ماضی کے صیغے کے ذریعہ آغاز تخلیق کو بیان کیا گیا ہے۔

كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ (۲۹: ۲۰) "اس نے تخلیق کا آغاز کیسے کیا تھا؟" اور اس بات کو تم زمین میں چل پھر کر' سیر و سیاحت کر کے معلوم کرو' اس سے ایک یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تم زمین میں چل پھر کر آغاز تخلیق الٰہی کو معلوم کرو' ان چیزوں پر غور کرو جن سے "حیات" کی ابتدائی حالت کا پتہ چلے کہ اس دنیا پر آغاز حیات کیسے ہوا؟ آج کل آثار قدیمہ کے بعض علماء زمین کو کھود کر ابتدائی تخلیق کی کیفیت معلوم کرتے ہیں کہ حیات کا آغاز کیسے ہوا اور اس نے کس طرح ترقی کی۔ اور وہ کس طرح پھیلی۔ ان تحقیقات کے باوجود ابھی تک یہ علماء "حیات" کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے کہ یہ حیات ہے کیا؟ یہ کہاں سے آتی ہے؟ اور اس دنیا پر پہلا زندہ انسان یا مخلوق کیسے آیا۔ یہ سب تحقیقات اور یہ سب آثار دراصل دوبارہ تخلیق پر دلائل ہوں گے۔

اور اس خیال کے ساتھ ایک دوسرا خیال! کہ آغاز حیات کے آثار و کیفیات معلوم کرنے کے تو وہ لوگ قابل ہی نہ تھے جن پر قرآن نازل ہوا تھا۔ جس طرح آج کل کے لوگ اس کے قابل ہو گئے ہیں کہ آغاز حیات کے آثار و کیفیات کا مشاہدہ کریں۔ لہٰذا اس آیت کا اگر مفہوم یہی ہے تو وہ لوگ تو اس قابل ہی نہ تھے لہٰذا قرآن کریم اپنے پہلے مخاطبین سے

کوئی اور چیز معلوم کرنے کے لیے کہ رہا تھا جو وہ معلوم کر سکتے تھے ـ اور جس کے معلوم کرنے سے وہ یہ نتیجہ نکال سکتے تھے کہ اس سے وہ نشاۃ ثانیہ کا امکان اخذ کریں ـ لہٰذا ان سے مطلوب یہ ہو گا کہ وہ ہر جگہ نباتات ' حیوانات اور انسان کے آغاز تخلیق کا مشاہدہ کریں اور زمین میں پھریں اور ان کی یہ سیر اور مشاہدہ ان کی قوت مشاہدہ کو تیز کرنے کا باعث بنے جیسا کہ ہم نے پہلے پیرے میں وضاحت کی کہ وہ آثار قدرت الٰہیہ کا مشاہدہ کریں اور رات اور دن اللہ کی قدرت جن معجزات و نشانات کو ظاہر کر رہی ہے اس پر غور کریں ـ

ایک احتمال یہ بھی ہے جو قرآن کریم کے طریقہ کار کے مطابق ہے کہ قرآن ہر دور کے لوگوں کو ان کے حالات کے مطابق 'اور علم و ثقافت کے لحاظ سے ان کے مرتبہ و مقام کے مطابق اور ان کے حالات زندگی کے مطابق اور ان کے موجودہ وسائل انکشاف کے مطابق ' متوجہ کرتا ہے وہ اپنے ظروف و احوال کے مطابق اس کائنات میں پائے جانے والے دلائل قدرت الٰہیہ پر غور کریں ـ اس طرح زندگی کے حالات کی ترقی کے مطابق قرآن کریم کے مفہوم کے فہم و ادراک میں بھی ترقی ہوگی اور دونوں خیالات میں کوئی تعارض بھی نہ ہو گا اور یہ مفہوم قرآن کے طریق کار کے زیادہ قریب ہے ـ

إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲۹ : ۲۰) "یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے"ـ اللہ اس زندگی کا آغاز بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ بھی کرے گا اور یہ اس کی قدرت قاہرہ کے ذریعہ ہو گا ـ اور اللہ کی قدرتیں انسان کی محدود سوچ کے دائرے کے اندر محدود نہیں ہیں ـ نہ اللہ کی قدرتوں کو ان کی سوچ کی محدود امکانیات کے اندر محدود کیا جا سکتا ہے کیونکہ انسان کی سوچ انسان کے محدود تجربات تک محدود ہوتی ہے ـ

یہی وجہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے ـ وہ جسے چاہے عذاب دے اور جسے چاہے اپنی رحمت کے دائرے کے اندر لے آئے ـ سب لوگوں نے آخر کار اس کی طرف لوٹنا ہے اور اللہ کو اس عمل کے کرنے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی نہ کوئی اس کی ممانعت کر سکتا ہے ـ

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ وَ اِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ (۲۹ : ۲۱) وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۲۹ : ۲۲) "جسے چاہے سزا دے اور جس پر چاہے رحم فرمائے اسی کی طرف تم پھیرے جانے والے ہو ـ تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو' نہ آسمان میں' اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے"ـ رحمت اور عذاب دونوں اللہ کی رحمت کے تابع ہیں 'اس طرح کہ اللہ نے ہدایت اور ضلالت کا راستہ بیان کر دیا ـ اور انسان کے اندر ایسی استعداد پیدا کر دی کہ وہ ہدایت و ضلالت کے راستے میں سے جو راستہ چاہے اختیار کرے ـ اور اس نے دونوں راستے انسان کے لیے میسر کر دیئے مطلب یہ انسان کی مرضی ہے کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کرتا ہے ـ البتہ اگر وہ اللہ کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اللہ نے اپنے اوپر لازم کر دیا ہے کہ ایسے شخص کی معاونت کرے اور اگر وہ اللہ کی دلائل سے منہ موڑے اور اللہ کے راستے سے رک جائے تو وہ اللہ سے رابطہ منقطع کر دیتا ہے اور اسی اصول کے نتیجے میں

اللہ کی رحمت اور اللہ کا عذاب لوگوں کو ملتا ہے۔

وَ اِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ (۲۹ : ۲۱) "اور اس کی طرف سے تم پھیرے جانے والے ہو"۔ یہ آخری انجام کی سخت تعبیر ہے اور بعد میں آنے والے مضمون کے ساتھ متناسب ہے۔

وَ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ (۲۹ : ۲۲) "تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو' نہ آسمان میں"۔ تمہارے پاس ایسی کوئی قوت نہیں ہے کہ تمام مخلوق کو اللہ کی طرف پھرنے سے روک سکو۔ نہ زمین میں نہ آسمانوں میں۔ جنات اور فرشتے بھی تمہاری قوت نہیں ہیں۔

وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ (۲۹ : ۲۲) "اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے"۔ اللہ کے سوا کوئی ولی اور مددگار ہے کون؟ اور کہاں ہے؟ کوئی ملائکہ ہے یا کوئی جن ہے؟ یہ تو سب خود اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کی مخلوق ہیں۔ یہ اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں' دوسروں کے لیے کیا کچھ کر سکیں گے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآئِهٖۤ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۹ : ۲۳) "جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لیے دردناک سزا ہے"۔ یہ اس لیے کہ انسان اللہ کی رحمت سے تب مایوس ہوتا ہے جب اس کا دل کافر ہو' اس حالات میں پھر اس کے اور رب کے درمیان رابطہ کٹ جاتا ہے۔ جو بھی کفر کی راہ اختیار کرتا ہے اس کے اور رب تعالیٰ کے درمیان رابطہ کٹ چکا ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت میں تروتازگی نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ کی رحمت میں داخل ہونے کے لیے وہ کوئی راہ نہیں پاتا۔ اور پھر انجام بھی متعین ہوتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۹ : ۲۳) "ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا ہوتی ہے"۔

اس لمحہ فکریہ کے بعد اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی طرف سے جواب آتا ہے۔ یہ ضمنی خطاب ہر اس شخص کے غور و فکر کے لیے تھا جو دعوت ایمان کا انکار کرتا ہے' یہ جواب نہایت ہی مایوس کن اور عجیب ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر اور سرکشی کے حاملین کس طرح برخود غلط ہوتے ہیں اس لیے کہ ان کے پاس اقتدار کی قوت ہوتی ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

"پھر ابراہیم کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا "قتل کر دو اسے یا جلا ڈالو اس کو"۔ آخر کار اللہ

نے اسے آگ سے بچا لیا تھا' یقیناً اس میں نشانیاں ہیں' ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں"۔

"اسے قتل کر دو یا جلا ڈالو" یہ اس سادہ اور قابل فہم دعوت کا جواب ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش فرمائی۔ جو انہوں نے ان کی عقلوں کے سامنے نہایت ہی قابل فہم انداز میں پیش کی ہے جس طرح کوئی پیش کرتا ہے۔

جب کفر اور سرکشی کھل کر سامنے آگئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوزیشن یہ تھی کہ آپ اس ظلم اور سرکشی کا دفعیہ نہ کر سکتے تھے' وہ ایک فرد تھے اور ان کا کوئی والی اور مددگار نہ تھا۔ ایک طرف عظیم قوت ہے' دوسری جانب وہ اکیلے کھڑے ہیں۔ اس لیے ایسے حالات میں دست قدرت بھی کھل کر ان کا ساتھ دیتا ہے۔ ایک خارق عادت معجزہ نمودار ہوتا ہے۔ ایک ایسا معجزہ جو انسانوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

فَاَنْجٰهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (۲۹ : ۲۴) "آخر کار اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا"۔ جس انداز میں خارق عادت کے طور پر اللہ نے ان کو بچایا تھا۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک معجزہ تھا جو ایمان لانے والے تھے مگر اس کے باوجود اس قوم نے ایمان قبول نہ کیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ طے کر لیں کہ انہوں نے مان کر نہیں دینا ہے تو معجزات بھی ان کے لیے مفید نہیں رہتے۔ ہدایت اسے نصیب ہوتی ہے جو ایمان لانے کے لیے تیار ہو' اسی لیے کہا جاتا ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۲۹ : ۲۴) "یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے ہیں"۔ پہلی نشانی تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم آگ سے نجات پا گئے۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ کفر اور سرکشی اور حکومتی قوت ایک فرد واحد کو اذیت نہ دے سکی۔ تیسرا معجزہ یہ ہے کہ اگر اللہ کسی کو ہدایت نہ دینا چاہے تو معجزات بھی مفید نہیں رہتے۔ اور یہ نشانیاں ان لوگوں کے لیے ہیں جو دعوت اسلامی کی تاریخ پر غور و فکر کرتے ہیں اور یہ معلوم کرتے ہیں کہ دلوں کو پھیرنے والا کون ہے اور ہدایت و ضلالت کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نجات کے بعد بھی یہ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ حضرت ابراہیم اب اس قوم کی ہدایت سے مایوس ہو گئے ہیں جو اس قدر واضح اور بین معجزے کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتی تو قبل اس کے کہ حضرت ان کو الوداع کہیں ان کو آخری حجت کے طور پر ایک حقیقت کے سامنے کھڑا کرتے ہیں:

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّیَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۲۵﴾

"اور اس نے کہا "تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے اور آگ تمہارا ٹھکانا ہوگی اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا"۔

تم نے بتوں کی بندگی اس لیے اختیار نہیں کی کہ تم عقیدتاً ان کو اللہ سمجھتے ہو اور تم ان کی بندگی پر مطمئن ہو بلکہ تم اس برائی پر ایک دوسرے کا لحاظ ملاحظہ کرتے ہوئے متفق ہو گئے ہو۔ محض ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے' یہ بندگی کرتے ہو۔ تم میں سے ایک دوست یہ نہیں چاہتا کہ دوسروں کے الہوں کو چھوڑ دے۔ اگرچہ حق واضح ہو گیا ہو۔ اگر کوئی نئی سچائی کو قبول کر لے تو اس صورت میں دوستیاں ختم ہونے کا خطرہ ہے۔ یہ دوستیاں تم سچائی کی حق تلفی کر کے قائم رکھتے ہو۔ تم سچائی کو نظرانداز کرتے ہو اور اس کے مقابلے میں دوستیوں کو زیادہ قائم رکھتے ہو۔ تم سچائی کو نظرانداز کرتے ہو اور اس کے مقابلے میں دوستیوں کو زیادہ اہمیت دیتے ہو' حالانکہ دعوت اسلامی ایک سنجیدہ امر ہے۔ یہ کوئی نرمی' کوئی ڈھیل اور کوئی دوستی قبول نہیں کرتی۔

اس کے بعد ان کے اخروی انجام کے صفحات کھولے جاتے ہیں۔ جن دوستوں کا لحاظ کرتے ہوئے وہ حق کو نظرانداز کر رہے ہیں اور بتوں کی بندگی پر قائم ہیں۔ قیامت کے دن یہ لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گے اور ایک دوسرے کو ملامت کریں گے اور یہ دوستیاں ٹوٹ جائیں گی۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (۲۹ : ۲۵) "مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے"۔ لیکن یہ لعن و طعن کوئی فائدہ نہ دے گا۔ اس سے تمہارے عذاب میں کوئی کمی نہ آئے گی۔

وَّمَاْوٰكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۲۹ : ۲۵) "آگ تمہارا ٹھکانا ہوگی اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہو گا"۔۔ اسی آگ میں یہ لوگ رہیں گے جس کے ساتھ وہ حضرت ابراہیم کو جلانا چاہتے تھے لیکن اللہ نے ان کی مدد کی اور ان کو نجات دے دی۔ رہے وہ تو ان کے لیے نہ نصرت ہے اور نہ نجات ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اب اپنی قوم کو دعوت دینا چھوڑ دیا۔ یہ معجزہ جو ناقابل شک تھا' وہ بھی ان کے سامنے آ گیا۔ اس دعوت اور اس ناقابل تردید معجزے کے نتیجے میں صرف ایک شخص مسلمان ہوئے' حضرت لوط' ان کی بیوی نے بھی اسلام قبول نہ کیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت لوط آپ کے بھتیجے تھے۔ یہی ایک مسلمان حضرت ابراہیم کے ساتھ کلدانیوں کے شہر اُر سے ہجرت کر کے اردن سے آگے کے علاقے میں جا کر آباد ہوئے۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٦﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٢٧﴾ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ

الْعٰلَمِيْنَ۝۲۸ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ڏ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝۲۹ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَي الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ۝۳۰ۧ

۳　۸ ع　15

"اس وقت لوط نے اس کو مانا اور ابراہیم نے کہا' میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں' وہ زبردست اور حکیم ہے"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول قابل غور ہے' وہ کہتے ہیں۔

اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ (۲۹ : ۲۶) "میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں"۔ انہوں نے کیوں ہجرت کی۔ انہوں نے نجات کے لیے ہجرت نہیں کی۔ نہ زمین کے حصول کے لیے' نہ کسی تجارت اور کمائی کے لیے ہجرت کی تھی۔ انہوں نے رب کی طرف ہجرت کی' اللہ کے قریب ہونے اور اس کی پناہ میں آنے کے لیے ہجرت کی۔ اپنا دل اور اپنا نظریہ لے کر ہجرت کی۔ ان کے جسم اور خون سے پہلے ان کے دل و دماغ نے ہجرت کی۔ انہوں نے اللہ کی طرف ہجرت کی تاکہ خالص اللہ کی عبادت اور بندگی کریں' اپنا جسم اور اپنی سوچ اس کے لیے خاص کر دیں اور کفر اور ضلالت کے علاقے کو چھوڑ دیں اس لیے کہ اس علاقے کے لوگوں کی ہدایت کا اب کوئی امکان نہ رہا تھا۔

یہ علاقے چھوڑنے کا اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس دنیا میں بھی انعام دیا۔ اللہ نے ان کو ایسی صالح اولاد دی کہ رہتی دنیا تک ان کی وراثت اور نظریات کی وارث بنی۔ اس کے بعد نبوت ان کی اولاد ہی میں رہی۔ دنیا اور آخرت میں اس سے بڑا انعام نہیں ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ وَ اٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۹ : ۲۷) "اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب (جیسی اولاد) عنایت فرمائی اور اس کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی' اور اسے دنیا میں اس کا اجر عطا کیا اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہوگا"۔

یہ اللہ کا ایسا انعام ہے جس میں سے فیوض و برکات کے سوتے پھوٹ رہے ہیں' جس میں اللہ کی رضامندی عیاں ہے۔ اس ذات بابرکات کی شخصیت میں یہ فیض عیاں ہے جس کے جلا ڈالنے پر تمام باغی اور سرکش قوتیں جمع ہو گئی تھیں لیکن اللہ نے عظیم معجزانہ انداز میں ان کے ماحول کو ٹھنڈا اور سلامتی سے بھرا ہوا بنا دیا۔ یہ تھی اللہ کی مہربانی' اس کا کرم اور اہل توحید کے لیے جزائے مناسب۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مختصر قصے کے بعد اب حضرت لوط کا قصہ آتا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رب کی طرف مہاجر ہوئے۔ دونوں وادی اردن میں اترے۔ حضرت لوط بحر مردار کے کنارے کسی قوم کو دعوت دینے لگے۔ اس کے بعد اس بحیرے کا نام بحیرۂ لوط پڑ گیا۔ آپ شہر سدوم میں مقیم ہوئے۔ حضرت لوط نے ان لوگوں میں رشتہ داری بھی کی اور معاشی سرگرمی بھی ان لوگوں میں اختیار کی۔

اس قوم میں ایک عجیب اخلاقی بیماری پھیل گئی ـ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ قبیح بیماری اس سے قبل کسی قوم میں نہ پھیلی تھی ـ یہ کہ ان لوگوں نے عورتوں کے مقابلے میں اور ان کو چھوڑ کر مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا شروع کر دیئے ـ حالانکہ اللہ نے اس مقصد کے لیے عورتوں کو پیدا کیا تھا تاکہ ایک مرد اور عورت سے ایک خاندان وجود میں آئے ـ اور اس طرح فطری طور پر انسانی زندگی کا تسلسل قائم رہے ـ جس طرح تمام دوسرے حیوانات میں یہ نظام قائم ہے کہ تمام حیوانات اور نباتات کو اللہ نے جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے ـ مرد اور عورتیں' مذکر اور مونث ـ غرض یہ بماری قوم لوط سے قبل کسی اور قوم میں پیدا نہ ہوئی تھی ـ

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۹:۲۸) اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۹:۲۹) قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۹:۳۰) "اور ہم نے لوط کو بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا :"تم تو وہ فحش کام کرتے ہو' جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے ـ کیا تمہارا حال یہ ہے کہ مردوں کے پاس جاتے ہو' اور رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے ہو؟" پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ انہوں نے کہا "لے آ' اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے" ـ لوط نے کہا "اے میرے رب' ان مفسدوں کے مقابلے میں میری مدد فرما" ـ

حضرت لوط کی اس تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس برائی میں کانوں تک ڈوب گئے تھے ـ یہ لوگ ایک ایسی برائی میں مبتلا ہو گئے تھے جس کا ارتکاب ان سے قبل کسی انسان نے نہیں کیا تھا ـ یہ مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے تھے ـ یہ ایک انوکھا اور گندہ فعل تھا ـ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی فطرت ہی بدل گئی تھی ـ جب بھی کوئی قوم اعتدال کو چھوڑتی ہے اس کی فطرت بدل جاتی ہے کیونکہ پاکیزہ جنسی تعلق ایک عورت ہی کے ساتھ قائم ہوتا ہے ـ لہٰذا اسے نہایت ہی گھناؤنا جرم قرار دیا گیا ـ عورت کے ساتھ جنسی تعلق بھی بعض اوقات حدود و قیود سے نکل جاتا ہے لیکن وہ ہوتا بہرحال ایک فطری عمل ہے ـ رہی ہم جنس پرستی تو یہ حیوانات سے بھی گری ہوئی حرکت ہے ـ اس میں انسان کی فطری عضویاتی ترکیب کے لحاظ سے بھی فساد ہے ـ اور نفسیاتی لحاظ سے بھی فساد ہے ـ زوجین کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے اس میں جو لذت ہوتی ہے وہ امتداد حیات کے عظیم مقصد کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے ـ اور اس کے نتیجے میں انسانی حیات کا تسلسل قائم ہوتا ہے اور فریقین جسمانی اور روحانی اعتبار سے اس تعلق سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کے تعلق اور ملاپ کے اندر جسمانی اور عضویاتی ہم آہنگی ہوتی ہے ـ رہا یہ تعلق جو قوم لوط قائم کرتی تھی ـ یہ غیر فطری' غیر فرحت بخش اور بے مقصد تھا ـ اگر اس تعلق میں کسی کو مزہ آتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی فطرت بگڑ گئی ہے ـ اور مسخ ہو گئی ہے اور وہ حقیقت کے مطابق نہیں ہے ـ

یہ لوگ اس برائی کے ساتھ ڈاکے بھی ڈالتے تھے 'لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے مالی مفادات وصول کرتے تھے ـ پھر وہ اس فعل کا ارتکاب بھی مردوں کو مجبور کر کے کرتے تھے ـ یہ پھر اس فعل بد کی ایک گھناؤنی شکل تھی کہ لوٹ مار کے ساتھ ساتھ لوگوں کے ساتھ اس بد فعلی کا ارتکاب کرتے تھے ـ

پھر یہ اس منکر فعل کا ارتکاب اپنی مجلسوں میں کرتے تھے ـ کھلے طور پر اور اجتماعی شکل میں ـ ایک دوسرے سے ' کتوں کی طرح ' شرم بھی محسوس نہ کرتے تھے ـ فحاشی کا یہ بدترین درجہ ہے ـ فساد فطرت کی یہ انتہا ہے اور یہ رذائل پر اس قدر فخر ہے کہ اس کے بعد کسی اصلاح کی کوئی امید نہیں رہتی ـ

یہاں اس قصے کو اختصار کے ساتھ لایا گیا ہے ـ ظاہر ہے کہ پہلے پہل حضرت لوط نے ان کو نہایت ہی اچھے انداز میں اس سے منع کیا ہو گا ـ انہوں نے اصرار کیا ہو گا ـ حضرت لوط نے ان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا ہو گا اور یہ بتایا ہو گا کہ یہ بہت ہی قبیح فعل ہے اور اس کا انجام بھی خوفناک اور عبرتناک ہو گا ـ

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّآ أَنْ قَالُوْا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۹ : ۲۹) "پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ لے آؤ اللہ کا عذاب 'اگر تم سچے ہو"۔

یہ ہے خود سری اور سرکشی ایک ڈرانے والے نبی کے مقابلے میں 'ایک چیلنج کے انداز میں تکذیب اور یہ ایک ایسا بگاڑ ہے جس سے کسی خیر کی توقع نہیں رہتی اور نہ اصلاح کی امید رہتی ہے ـ رسول خدا نے ان پر حجت تمام کر دی اور اس کے سوا کوئی راہ نہ رہی کہ وہ اللہ سے نصرت طلب کریں جو آخری سہارا ہے ـ

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۹ : ۳۰) "لوط نے کہا اے میرے رب' ان مفسدوں کے مقابلے میں میری مدد فرما"۔

اب یہاں پردہ گرتا ہے ـ منظر پر صرف لوط علیہ السلام دعا کرتے نظر آتے ہیں ـ اب ہمارے سامنے اس دعا کی قبولیت کا منظر آتا ہے ـ جن کا ملائکہ کو حکم دیا گیا ہے کہ سدوم کو اوپر نیچے کر دو 'انہوں نے اس عمل سے پہلے حضرت ابراہیم کو خوشخبری بھی دی ہے ـ ایک ایسی بیوی سے صالح بیٹے کی خوشخبری جو بانجھ تھی ـ

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا إِنَّا مُهْلِكُوْٓا أَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۚۖ ﴿۳۱﴾ قَالَ إِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۚ قَالُوْا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ۫ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَأَهْلَهٗٓ إِلَّا امْرَأَتَهٗ ۫ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

””اور جب ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر پہنچے تو انہوں نے اس سے کہا ”ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، اس کے لوگ سخت ظالم ہو چکے ہیں“۔ ابراہیم نے کہا ”وہاں تو لوط موجود ہے“۔ انہوں نے کہا، ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہے۔ ہم اسے، اور اس کی بیوی کے سوا، اس کے باقی سب گھر والوں کو بچالیں گے“۔ اس کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی“۔

یہ منظر، ابراہیم علیہ السلام اور فرشتوں کا منظر۔ یہ منظر یہاں چونکہ مقصود بالذات نہ تھا، اس لیے اسے نہایت اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں دوسری جگہ یہ بات آگئی ہے کہ انہیں حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کی بشارت دی گئی۔ اور حضرت اسحاق کی ولادت تو خوشخبری کا موضوع تھا۔ اس لیے ان باتوں کو ہاں مفصل نہیں دیا گیا کیونکہ مقصود اتمام قصہ لوط تھا۔ یہاں صرف یہ کہہ دیا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرشتے اس لیے ہو کر آئے کہ انہیں خوشخبری دے دیں اور یہ بتا دیں کہ وہ کس مہم پر آئے ہیں۔

اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (۲۹ : ۳۱) ”ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، اس کے لوگ سخت ظالم ہیں“۔

اب حضرت ابراہیم کا جذبہ رحم اور محبت امنڈ آیا۔ انہوں نے فوراً کہا کہ وہاں تو ان کے بھتیجے حضرت لوط بھی رہتے ہیں اور وہ تو ظالم نہیں، صالح ہیں۔ اللہ کے فرشتوں اور فرستادوں نے جواب دیا کہ ان کو اس مہم کے بارے میں پوری معلومات دی گئی ہیں اور وہ سب باتوں کو جانتے ہیں۔

قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ

(۲۹ : ۳۲) ”انہوں نے کہا، ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہیں۔ ہم اسے، اور اس کی بیوی کے سوا، اس کے باقی سب گھر والوں کو بچالیں گے“۔ اس کی بیوی پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے“۔

یہ بیوی قوم کے ساتھ تھی۔ یہ بھی ان کے جرائم اور بداعمالیوں کی تصدیق کرتی تھی اور یہ عجیب بات تھی کہ عورت کے حقوق پر ایک عورت ڈاکہ ڈالے۔

اب یہ قصہ ایک تیسرے منظر میں داخل ہوتا ہے۔ یہ منظر بھی عجیب ہے۔ یہ فرشتے نہایت خوبصورت نوجوانوں کی شکل میں حضرت لوط کے پاس آتے ہیں۔ حضرت لوط بھی جانتے ہیں کہ یہ خطرناک مہمان ہیں، خوبصورت نوجوان اور قوم جس گندی حالت میں۔ لازم ہے کہ یہ لوگ ان مہمانوں کے ساتھ بدسلوکی کریں گے۔ اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنے مہمانوں کا دفاع کر سکیں اس لیے اس پریشانی سے ان کا دل بھر آیا، اور ان پر پریشانی اور وحشت طاری ہوگئی۔

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا

”پھر جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور تنگ دل ہوا“۔ یہاں ان اوباشوں

کی طرف سے مہمانوں پر ہجوم کے واقعہ کو بھی مختصراً بیان کیا گیا ہے ۔ اس موقعہ پر حضرت لوط کے ساتھ ان کا جو مکالمہ ہوا' اسے بھی کاٹ دیا گیا ہے' جبکہ وہ اس وقت اس بیماری کے جوش میں تھے ۔ یہاں بات کو انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے اور آخری انجام کا ذکر ہوتا ہے اس لیے کہ یہ خدائی فرستادے خود بات کو کھول دیتے ہیں اور حضرت لوط کو اپنا تعارف کرا دیتے ہیں کیونکہ وہ شدید اعصابی دباؤ میں تھے اور سخت دل تنگ تھے ۔

وَقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾

''انہوں نے کہا' نہ ڈرو اور نہ رنج کرو ۔ ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچا لیں گے' سوائے تمہاری بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے ۔ ہم اس بستی کے لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں اس فسق کی بدولت جو یہ کرتے رہے ہیں'' ۔

اس گاؤں کے لوگوں پر جو عذاب الٰہی ہو' اس کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے کہ حضرت لوط' ان کے اہل و عیال اور اہل ایمان کے سوا تمام لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا ۔ ان پر خاک آلود پتھروں کی بارش کر دی گئی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اللہ کے فرشتوں نے آتش فشانی کا عمل برپا کر دیا جس کے نتیجے میں خاک آلود پتھروں کی بارش ہوا کرتی ہے --- اور اس عذاب کے آثار کو باقی رکھا گیا تاکہ آنے والی اقوام کے اہل عقل و دانش اس سے عبرت لیں اور صدیاں گزرنے کے بعد بھی یہ آثار باقی ہیں ۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اور ہم نے اس بستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑ دی ہے' ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں'' ۔ اور یہ انجام اس قوم کا طبعی انجام تھا ۔ کیونکہ اس کی مثال ایک خبیث درخت اور پودے کی تھی جسے زمین سے زمیندار ہمیشہ اکھاڑ پھینکتا ہے کیونکہ یہ درخت نہ پیداوار دیتا ہے اور نہ زندگی کے لیے مفید ہوتا ہے اس کے ساتھ یہی سلوک ہو سکتا ہے کہ اسے اکھاڑ کر بھوسہ بنا دیا جائے ۔

اب قصہ حضرت شعیب علیہ السلام :

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ

الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۳۷﴾

"اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو' اللہ کی بندگی کرو اور روز آخر کے امیدوار رہو اور زمین میں مفسد بن کر زیادتیاں نہ کرتے پھرو"۔ مگر انہوں نے اسے جھٹلا دیا۔ آخر کار ایک سخت زلزلے نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے"۔

اس میں یہ اشارہ ہے کہ دعوت اسلامی تمام ادوار میں ایک رہی ہے اور دعوت اسلامی کا بنیادی عقیدہ بھی ایک رہا ہے۔

اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ ارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ (۲۹: ۳۶) "اللہ کی بندگی کرو اور روز آخرت کے امیدوار رہو"۔ اللہ واحد کی بندگی کرنا اسلامی نظریہ حیات کی بنیاد ہے اور آخرت کی امیدواری کے ذریعہ یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ اس دنیا میں جو حلال و حرام سمیٹے چلے جا رہے تھے اور ناپ اور تول کے پیمانوں میں خیانت کر رہے تھے' اس سے باز آجائیں۔ نیز وہ جو لوگوں کے حقوق مارتے تھے اور راہ زنی کرتے تھے۔ شاید خوف آخرت کی وجہ سے وہ ان جرائم سے باز آجائیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ لوگوں پر کئی قسم کی دست درازیاں کرتے تھے اور زمین میں فساد برپا کرتے تھے خوف آخرت سے ان کی اصلاح ہو سکتی تھی۔

غرض آخر کار انہوں نے اپنے رسول کی تکذیب کی اور ان پر خدا کا عذاب نازل ہوا اور اللہ نے مکذبین کے بارے میں اپنی سنت جاریہ کے مطابق ان کو ہلاک کر دیا اور صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ (۲۹: ۳۷) "آخر کار ایک سخت زلزلے نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے"۔ اس سے قبل اس سخت زلزلے کی تفصیلات دے دی گئی ہیں' جس نے ان کی زمین کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور یہ زلزلہ ایک سخت چیخ کے بعد آیا تھا۔ جس نے ان کو بے ہوش کر دیا تھا اور لوگ اسی جگہ پڑے کے پڑے رہ گئے جہاں تھے۔ اور یہ سزا ان کے ان جرائم کی وجہ سے دی گئی جن میں وہ چیخ چلا کر لوگوں پر ڈاکے ڈالتے اور ان کو لوٹتے۔

اس کے بعد قوم عاد و ثمود کی ہلاکت کی طرف اشارہ :

وَ عَادًا وَّ ثَمُوْدَاۡ وَ قَدْ تَّبَیَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ ﴿۳۸﴾

"اور عاد و ثمود کو ہم نے ہلاک کیا' تم وہ مقامات دیکھ چکے ہو جہاں وہ رہتے تھے۔ ان کے اعمال کو شیطان نے ان

کے لیے خوشنما بنا دیا اور انہیں راہ راست سے برگشتہ کر دیا حالانکہ وہ ہوش گوش رکھتے تھے"۔

عاد کے لوگ جزیرۃ العرب کے جنوب میں علاقہ احقاف میں رہتے تھے۔یہ علاقہ حضرموت کے قریب ہے۔اور ثمود علاقہ حجر شمالی جزیرۃ العرب میں رہتے تھے۔ اور یہ وادی القری کے قریب علاقہ ہے' قوم عاد کو تیز رفتار ہوائی طوفان کے ذریعہ ہلاک کیا گیا جو ناقابل کنٹرول تھا اور قوم ثمود کو ایک ہلاکت خیز چیخ کے ذریعہ جس کے بعد زلزلہ آیا۔ ان کے گھر عربوں کو معلوم تھے اور یہ لوگ اپنے گرمیوں اور سردیوں کے اسفار میں ان علاقوں سے گزرتے تھے اور ان کے آثار کو دیکھتے تھے کہ عزت اور اقتدار کے بعد یہ اقوام کس طرح ملیامیٹ ہوئیں۔

یہاں اس مختصر اشارے میں بتا دیا گیا ہے کہ ان کی گمراہی کا راز کیا تھا۔یہی راز ہے دوسری تمام اقوام کی ضلالت کا۔

وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ

(۳۸:۹۸) "ان کے اعمال کو شیطان نے ان کے لیے خوشنما بنا دیا اور انہیں راہ راست سے برگشتہ کر دیا اور وہ ہوش و گوش رکھتے تھے"۔

یہ عقلمند تھے۔ہدایت کے دلائل بھی ان کے سامنے تھے لیکن شیطان نے ان کو خواہشات نفسانیہ کے تابع کر کے ان کے ان اعمال کو ان کے لیے مزین بنا دیا تھا۔اور ان پر وہ اس راستے سے حملہ آور ہوا جو کھلا تھا۔یہ کہ وہ سخت مغرور تھے اور اپنے برے اعمال پر فخر کرتے تھے اور ان اعمال کے ذریعہ انہوں نے جو قوت اور مال و متاع جمع کر لیا تھا' اس کی وجہ سے وہ اعمال انہیں اچھے لگتے تھے۔

فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ (۳۸:۹۸) "انہیں راہ راست سے برگشتہ کر دیا تھا"۔ اور ایمان کا تو یہ واحد راستہ تھا۔لہٰذا انہوں نے اس راہ پر چلنے کے مواقع گنوا دیئے۔

وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (۳۸:۹۸) "اور بڑے دانش مند تھے"۔صاحب فکر و نظر تھے اور عقل و ادراک کی قوتوں کے مالک تھے۔

اب قارون' فرعون اور ہامان کی طرف اشارہ۔

وَ قَارُوْنَ وَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾

"اور قارون و فرعون و ہامان کو ہم نے ہلاک کیا اور موسیٰ ان کے پاس بینات لے کر آیا' مگر انہوں نے زمین میں

اپنی بڑائی کا زعم کیا' حالانکہ وہ سبقت لے جانے والے نہ تھے"۔

قارون قوم موسیٰ کا فرد تھا مگر اس نے اپنی دولت مندی کی وجہ سے ان سے بغاوت کی۔ اور اس نے نصیحت کرنے والوں کی یہ نصیحت نہ سنی کہ اعتدال اور تواضع کا راستہ اختیار کرو' لوگوں پر احسان کرو اور سرکشی اور بغاوت نہ کرو۔ اور فرعون ایک جبار اور سرکش حکمران تھا۔ اور قوم کے خلاف گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کرتا تھا۔ اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا اور پوری طرح کنٹرول میں لے رکھا تھا۔ وہ بنی اسرائیل کے مردوں کو قتل کرتا تھا اور عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔ اور یہ محض ظلم کی وجہ سے۔ ہامان فرعون کا وزیر تھا اور اس کی ان قاہرانہ اور ظالمانہ ریاستی پالیسیوں کی تنفیذ وہ کرتا تھا۔ فرعون کے تمام جرائم میں یہ اس کے لیے معین و مددگار تھا۔

وَلَقَدْ جَآءَهُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَٰتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِى الْأَرْضِ (۲۹: ۳۹) "اور موسیٰ ان کے پاس بینات لے کر آیا مگر انہوں نے زمین میں بڑائی کا زعم کیا"۔ پس ان کی دولت' ان کی قوت' اور ان کا جبران کو نہ بچا سکا اور اللہ جس کو پکڑے' اسے تو کوئی بھی بچا نہیں سکتا۔ یہ لوگ اللہ کے عذاب سے نہ بچ سکے اور ان کو اللہ نے خوب پکڑا۔

یہ لوگ جو قوت' مال اور اسباب حیات کے مالک تھے اور زمین پر پوری طرح غالب تھے ان سب کو اللہ نے پکڑا' کیونکہ انہوں نے لوگوں کو فتنے میں ڈال دیا تھا اور ان کو اذیت دیتے تھے۔ اور وہ طویل عرصہ تک ایسا کرتے رہے تھے۔

فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنۢبِهِۦ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوٓا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٠﴾

"آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی' اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا' اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا' اور کسی کو غرق کر دیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے"۔

قوم عاد پر اللہ نے ایسی تیز ہوا بھیجی جو پتھر اڑا کر پھینک رہی تھی۔ اسی طرح جو جہاں تھا' مارا گیا۔ قوم ثمود پر سخت دھماکہ دار چیخ آئی اور سب ڈھیر ہو گئے۔ اور قارون مع اپنی دولت اور کوٹھیوں کے زمین میں دھنس گیا۔ اور فرعون اور ہامان بحر احمر میں غرق ہوئے۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے ظلم میں پکڑے گئے۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوٓا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۲۹: ۴۱) "اللہ ان

پر ظلم کرنے والا نہ تھا' مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے"۔

پوری انسانی تاریخ کے باغیوں' سرکشوں اور ظالموں کی تباہی اور بربادی کا عبرت آموز جائزہ لینے کے بعد اور آغاز سورت میں آزمائش اور گمراہی کے فتنوں کے ذکر کے بعد اب آخر میں' اسلام اور کفر اور ایمان اور ضلالت کی قوتوں کی کشمکش کو ایک تمثیل سے سمجھایا جاتا ہے کہ حقیقی قوت ایک ہی ہے اور وہ اللہ کی قوت ہے۔ اللہ کے سوا جس قدر قوتیں ہیں وہ نہایت ہی ناتواں اور کچی ہیں۔ ان کی مثال تار عنکبوت کی طرح ہے جو شخص تار عنکبوت کا سہارا لے گا وہ گویا ایک نہایت کچی چیز کا سہارا لیتا ہے۔ اللہ کے سوا تمام قوتوں کی یہی مثال ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝

"جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔ یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو بھی پکارتے ہیں' اللہ اسے خوب جانتا ہے اور وہی زبردست اور حکیم ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لیے دیتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں"۔

یہ ایک عجیب اور سچی تصویر ہے' ان تمام قوتوں کی جو اس کائنات میں موجود ہیں۔ اس میں ایک ایسی حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے جس سے لوگ بالعموم غافل رہتے ہیں اور اس غفلت کی وجہ سے پھر ان کے پیمانے اور اقدار بدل جاتی ہیں۔ پھر وہ غلط رابطے قائم کر لیتے ہیں۔ ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ وہ غلط سمت میں جا رہے ہیں۔ وہ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کیا لیں اور کیا چھوڑیں۔

اس غلط سوچ کی وجہ سے وہ پھر ریاستی قوت سے بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں' وہ سمجھتے ہیں کہ اس زمین پر ریاستی قوت ہی اصل قوت ہے اور سب کچھ ہے۔ اور ہر جگہ موثر ہے۔ اس لیے وہ اس قوت سے ڈرتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ وہ اس ریاستی قوت کی اذیتوں سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہیں اور اس کی حمایت کے حصول کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔

پھر ایسے لوگوں کو دولت کی قوت سے بھی دھوکہ ہوتا ہے' وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی قوت ہے' جس کے نتیجے میں زندگی کی قدریں حاصل ہوتی ہیں۔ اور تمام اقدار حیات دولت کے تابع ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگ حصول دولت کا شوق رکھتے ہیں اور زوال دولت کا انہیں ہر وقت خوف رہتا ہے۔ اور وہ حصول دولت کے لیے ہر وقت جدوجہد کرتے ہیں تاکہ اس

دولت کے ذریعہ وہ لوگوں کی گردنوں پر سوار ہوں اپنے زعم کے مطابق ۔

یہ لوگ سائنس کی قوت کو بھی ایک بڑی قوت سمجھتے ہیں ۔ اس کو بھی یہ مالی قوت اور تمام قوتوں کی بنیاد تصور کرتے ہیں ' جن کے ذریعہ کوئی شخص گرفت کرتا ہے یا چلتا پھرتا ہے ۔ سائنسی قوت کے سامنے بھی لوگ اس طرح جھکتے ہیں جس طرح سائنس کوئی معبود ہے اور لوگ اس کے بندے ہیں ۔

غرض انسان کو یہ سب ظاہری قوتیں دھوکہ دیتی ہیں ۔ جن افراد کے پاس یہ قوتیں ہیں جن سوسائٹیوں کے پاس یہ وسائل ہیں یا جن حکومتوں کے پاس یہ قوتیں ہیں ان سے دوسرے لوگ ڈرتے ہیں اور ان کا طواف کرتے ہیں اور ان پر لوگ اس طرح فدا ہوتے ہیں جس طرح پروانہ چراغ پر گرتا ہے ۔ یا جس طرح وہ آگ میں گرتا ہے ۔

ان ظاہری قوتوں سے دھوکہ کھا کر انسان اس اصلی قوت کو بھول جاتا ہے جو ان حقیر قوتوں کو پیدا کرنے والی عظیم قوت ہے ۔ جو ان قوتوں کی پیدا کرنے والی ہے ' جو ان سب قوتوں کی مالک ہے ' جو کسی کو یہ قوتیں عطا کرتی ہے ' جو ان قوتوں کی تسخیر کرتی ہے اور ان کا رخ جس طرف چاہتی ہے ' پھیر دیتی ہے ۔

لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ دنیا کی ان حقیر اور ظاہری قوتوں کے پاس پناہ لینا ' خواہ یہ قوتیں افراد کے ہاتھ میں ہوں ' چاہے کسی سوسائٹی میں ہوں ' چاہے کسی حکومت کے پاس ہوں ' اسی طرح ہے جس طرح کوئی تار عنکبوت کا سہارا لے ' یا بیت عنکبوت میں پناہ لے ۔ یہ عنکبوت تو ایک کمزور ' حقیر ' اور نہایت نرم کیڑا ہے اس کی ساخت ہی کمزور ہے ۔ اور اس کا گھر بھی کمزور گھر ہے ۔ وہ کسی کو کیا پناہ دے سکتا ہے ۔

یاد رکھو ! کہ حمایت صرف اللہ کی حمایت ہے ' پناہ صرف اللہ کی پناہ ہے جو ایک قوی پناہ دینے والا ہے ۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جو قرآن کریم مومن لوگوں کے دلوں میں بٹھاتا ہے ۔ اور ایک بار جب قرآن نے اہل ایمان کے دلوں میں یہ حقیقت بٹھا دی تھی تو وہ گروہ دنیا کا ایک طاقت ور گروہ بن گیا تھا ۔ اور اس نے ان تمام ظاہری قوتوں کو روند ڈالا تھا جو اس کی راہ میں کھڑی ہو گئی تھیں ۔ زمین کے تمام جباروں اور قہاروں کی گردنیں مروڑ کر جھکا دی تھیں اور بڑے بڑے قلعے مسمار کر کے رکھ دیئے تھے ۔

یہ حقیقت قرآن نے اس گروہ میں کس طرح بٹھا دی تھی ؟ یہ حقیقت ہر نفس میں بیٹھ گئی تھی ۔ اس سے ہر دل بھر گیا تھا ۔ یہ حقیقت ان کے خون میں مل گئی تھی اور یہ ان کی رگوں میں دوڑ رہی تھی ۔ یہ حقیقت صرف الفاظ کی ادائیگی تک محدود نہ تھی ۔ نہ یہ ایک موضوع بحث تھی جس پر سیمینار ہوتے تھے بلکہ یہ ان نفوس میں واضح طور پر نظر آتی تھی ۔ اور ان کے حس و خیال میں اس کے سوا کوئی اور بات نہ تھی ۔ یہ کہ اللہ کی قوت ہی واحد قوت ہے اور اللہ کی دوستی ہی واحد دوستی ہے اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ کمزور و ناتواں ہے ۔ اگرچہ بظاہر دوسری قوتیں جس قدر بھی ظلم و استبداد کریں ۔ اگرچہ انہوں نے ظلم و سرکشی کی حد کر دی ہو ' اگرچہ ان کے پاس گرفت اور دست درازی کے تمام وسائل ہوں اور وہ پکڑ دھکڑ کر رہے ہوں ۔

یہ سب کچھ بیت عنکبوت ہے ۔ یہ تمام قوتیں اور وسائل تار عنکبوت ہیں ۔

وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹ : ۴۱) "اور سب گھروں سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے' کاش کہ یہ لوگ جانتے"۔

وہ داعی جو فتنوں اور آزمائشوں سے دوچار ہو جاتے ہیں' جنہیں قید و بند اور تشدد و اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے' ان کو چاہئے کہ اس حقیقت پر غور کریں اور ایک لمحے بھر کے لیے بھی اسے نظروں سے اوجھل ہونے نہ دیں' ان کو تو اس میدان میں مختلف مزاحم قوتوں سے دوچار ہونا ہے۔ یہ قوتیں ان پر وار کرتی ہیں اور ان کو نیست و نابود کرنا چاہتی ہیں۔ بعض ایسی قوتیں ہوتی ہیں جو انہیں خریدنا چاہتی ہیں۔ یہ سب قوتیں تار عنکبوت کی طرح ہوتی ہیں بشرطیکہ کسی کا ایمان و نظریہ مضبوط ہو' اور کوئی جانتا ہو کہ اصل اور حقیقی قوت ہے کیا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ (۲۹ : ۴۲) "یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو پکارتے ہیں' اللہ اسے خوب جانتا ہے"۔ یہ لوگ اللہ کے سوا بعض دوسری چیزوں کا سہارا لیتے ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ یہ سہارے کے قابل چیزیں نہیں ہیں۔ ان کی حقیقت وہی ہے جو تمثیل سابق میں بیان کی گئی یعنی مکڑی کا جالا۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲۹ : ۴۲) "وہی زبردست اور حکیم ہے"۔ وہی غالب ہے' وہی قاہر ہے' وہی حکیم ہے اور وہی اس پوری کائنات کا مدبر ہے۔

وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَ مَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۲۹ : ۴۳) "یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لیے دیتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھتے ہیں"۔ مشرکین کے بعض لوگ ایسے تھے جن کے دلوں پر تالے لگے ہوئے تھے اور ان کی عقل ماری گئی تھی' وہ لوگ اس تمثیل کے ساتھ یہ مزاح کرتے تھے اور کہتے تھے کہ محمد کے رب مکھیوں اور مچھروں کی بات بھی کرتے ہیں اور اس تمثیل میں جو حقیقت بیان کی گئی تھی' اس کو وہ سمجھ ہی نہ سکے تھے۔ نہ اس کا ان پر اثر ہوا۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ

وَ مَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۲۹ : ۴۳) "مگر ان چیزوں کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو عقلمند ہیں"۔

اب آخر میں ان تمام حقائق کو اس عظیم حقیقت کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے جو اس کائنات کے نقشے میں ودیعت کر دی گئی ہے' جس طرح قرآن کریم کا خاص اسلوب ہے۔

۴

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۴ ع

۱۶

"اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے' درحقیقت اس میں ایک نشانی ہے اہل ایمان کے لیے"۔

تمام انبیاء کے قصص کے بعد یہ آیت آتی ہے اور اس تمثیل کے بعد آتی ہے جس میں اللہ کی قوت کے مقابلے میں

دوسری قوتوں کو تار عنکبوت کی طرح نزار و نحیف بتایا گیا ہے ۔ یہ آیت ان سب قصص و تمثیلات کے ساتھ مربوط اور ہم آہنگ ہے ۔ اور ان کے درمیان ایک گہرا رابطہ ہے کہ زمین و آسمان میں وہی حقیقت بکھری ہوئی ہے اور ہر سو نظر آتی ہے ۔ یہ کائنات جس ٹھوس نظام پر قائم ہے ' اس کے اندر وہی حقیقت ہے وہی قوت ہے جو اس قرآن کے اندر پوشیدہ ہے ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۲۹: ۴۴) "درحقیقت اس میں نشانی ہے اہل ایمان کے لیے" ۔ کہ یہ ایک عظیم نظام ہے ' ناپیدا کنار کائنات ہے اور پھر بھی باہم متصادم نہیں ہے ۔ اور اہل ایمان ہی ہیں جن کے دل اس کائنات میں بکھری ہوئی نشانیوں کے لیے کھلے ہوتے ہیں ' جن کا نظم و نسق یہ شہادت دیتا ہے ' جس قدر بھی دور تک ہمارا مشاہدہ جائے کہ یہ کائنات ایک عظیم سچائی پر پیدا کی گئی ہے صرف اہل ایمان ہی اس سے حقیقت کو پا سکتے ہیں اس لیے کہ ان کو مومنانہ بصیرت اور بصارت حاصل ہوتی ہے اور ان کا شعور اور قوت مدرکہ تیز ہوتی ہے ۔

آخر میں اس کتاب کو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہے ' ذکر و صلوٰۃ سے مربوط کر دیا جاتا ہے ۔ اور اس حق کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے جو اس پوری کائنات میں پوشیدہ ہے اور اس ذکر و فکر سے مربوط کیا جاتا ہے جو نوح علیہ السلام سے ادھر تمام انبیاء کا نکتہ دعوت رہا ہے ۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۲۹: ۴۵) "جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے اسے پڑھیے اور نماز قائم کیجئے بے شک نماز فحاشی اور منکرات سے روکتی ہے ۔ بے شک اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے جو کام تم کرتے ہو" ۔

ان کے سامنے کتاب پڑھیں کہ یہی ذریعہ دعوت اسلامی ہے ' اور ایک ربانی معجزہ ہے اور اس کتاب کے اندر بیان کردہ سچائی وہی ہے جو اس کائنات کے اندر پوشیدہ سچائی ہے ۔

اور نماز قائم کرو ' جب نماز قائم کی جاتی ہے تو یہ فحاشی اور منکرات سے روکتی ہے ' یہ اللہ کے ساتھ ایسا رابطہ ہے کہ جب کوئی یہ رابطہ قائم کرتا ہے تو پھر وہ فحاشی اور منکرات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا ۔ یہ ظاہری اور روحانی تطہیر کا ذریعہ ہے ۔ لہٰذا اس کے ساتھ کوئی گندگی ' ناپاکی اور میل کچیل لگا ہی نہیں کھاتی ۔ حضورؐ نے فرمایا "جو شخص ایسی نماز پڑھے جو اسے فحاشی اور منکرات سے نہ روکے تو وہ ایسی نماز سے ماسوائے اس کے کہ اللہ سے دور ہو جائے ۔ اور کوئی مفاد نہ پائے گا" ۔ (ابن جریر) ۔

اگر کوئی ایسی نماز پڑھتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے نماز ادا کر دی لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے نماز قائم کر دی ۔ اور نماز ادا کرنے میں اور قائم کرنے میں بہت بڑا فرق ہے ۔ اگر نماز قائم کی جائے تو یہ ذکر اللہ ہوتی ہے اور

وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ (۲۹: ۴۵) "اللہ کا ذکر بہت بڑا ہوتا ہے" ۔ مطلقاً وہ بڑی چیز ہوتی ہے ۔ ہر

تصور اور ہر جذبہ سے بڑا ہوتا ہے ۔ ہر عبادت اور ہر عاجزی سے ذکر اللہ بڑا ہوتا ہے ۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۲۹ : ٤٥) "اور اللہ جانتا ہے جو تم بناتے ہو"۔ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے ۔ اس پر کسی امر میں التباس نہیں ہوتا۔ تم نے آخر کار اس کی طرف لوٹنا ہے ۔ اور وہ تمہاری تمام مصنوعات کا بدلہ تمہیں دینے والا ہے ۔

صدق اللہ العظیم

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ------ ۲۱

سورۃ العنکبوت ۔ ۲۹

آیات ۴۵--- تا--- ۶۹

درس نمبر ۱۸۲ ایک نظر میں

یہ سورہ عنکبوت کا آخری سبق ہے۔ پہلے دو سبق پارہ ۲۰ میں گزر چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا اس سورہ کا محور آزمائش و ابتلاء ہے۔ جو لوگ بھی کلمہ حق بلند کرتے ہیں ان کی راہ میں رکاوٹیں آتی ہیں۔ فتنوں اور آزمائشوں کی بھٹی میں سے گزار کر اللہ تعالیٰ سچے اور جھوٹے لوگوں کے درمیان فرق واضح فرما دیتے ہیں۔ جو جس قدر گرم و سرد چشیدہ ہو گا اسی قدر وہ درجات بلند کا مالک ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں یہ بھی ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ زمین پر موجود شیطانی قوتیں اہل ایمان کا راستہ روکنے کے لئے چاہے جس قدر زور لگائیں' ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اہل ایمان اگر ذرا صبر کریں اور مصابرت سے کام لیں تو اللہ آخر کار بدکاروں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اہل ایمان کو کامیاب کرتا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے اور اسلامی دعوت کے ساتھ اللہ کی سنت کا ہمیشہ یہی معاملہ رہا ہے۔ نوح علیہ السلام سے لے کر آج تک یہ سنت اٹل رہی ہے۔ اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہوتی اور یہ سنت اس بڑی سچائی کے ساتھ بھی مربوط ہے جو اس کائنات میں کام کر رہی ہے جس طرح اللہ کی دعوت ایک ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں اسی طرح اللہ کی سنت بھی ناقابل تغیر ہے۔

درس سابق کا خاتمہ اس بات پر ہوا تھا کہ اے رسول اور اے اہل ایمان تمہاری طرف جو آیات الٰہی نازل ہو رہی ہیں بس تم ان کی تلاوت کرتے جاؤ' ان کو سمجھو اور مطالعہ کرو اور نماز قائم کر کے ان پر عمل کرو' اور اس بات کو ذہن میں حاضر رکھو کہ اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ بھی تم کرتے ہو۔

اس سبق میں بھی کتاب اللہ کے بارے میں بات چلتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کتاب اور کتب سابقہ کے درمیان کیا تعلق اور نسبت ہے۔ مسلمانوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ ظالموں کو چھوڑ کر دوسرے عام اہل کتاب کے ساتھ رویہ اچھا رکھو' ان کے ساتھ اچھے انداز سے مکالمہ کرو۔ ظالم لوگ وہ ہیں جنہوں نے کتاب اللہ میں تحریف کر دی اور جنہوں نے عقیدۂ توحید کو بدل کر شرک کا عقیدہ اپنا لیا اور شرک ہی بہت بڑا ظلم ہے۔ اہل ایمان کی راہ اور عقیدہ یہ ہے کہ اللہ ایک ہے۔ اس کی تمام رسالتیں ایک ہیں' کتب ایک ہیں' یہ کہ تمام کتابیں اللہ کے نزدیک عظیم سچائی پر مشتمل ہیں اور اہل ایمان ان کی تصدیق کرتے ہیں۔

اس کے بعد بعض ایسے اہل کتاب کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو اس آخری کتاب پر ایمان لے آئے ہیں۔ حالانکہ مکہ کے مشرکین جن کے اندر سے نبی آخر الزمان کا انتخاب ہوا' اس پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ اس عظیم اعزاز اور عظیم رحمت کی قدر نہیں کرتے جو اللہ نے ان کو بخشی۔ وہ اس کتاب کے اعجاز اور اس کی تعلیمات کو' [illegible] کے بھیجے ہوئے رسول کو اپنے لیے غنیمت نہیں سمجھتے کہ وہ ان سے ہمکلام بھی ہے اور اللہ کا کلام بھی ان کو سنا رہا ہے جبکہ اس سے قبل مشرکین کے سامنے نہ انہوں نے کوئی کتاب پڑھی اور نہ وہ کوئی قلم کار تھے۔ اگر حضورؐ مطالعہ کتب کرتے رہتے اور کتابیں لکھتے رہتے

تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ انہوں نے یہ کتاب خود تصنیف کر ڈالی ہو۔

مشرکین مکہ بات بات پر یہ مطالبہ کر دیتے تھے کہ اگر تم سچے ہو تو لاؤ عذاب الہی جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عذاب بہت ہی قریب ہے' اور یہ جہنم کی شکل میں تمہیں گھیرے گا۔ یہ قیامت کے دن اوپر سے بھی ہو گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی ہو گا۔ ہر طرف سے گھیرلے گا۔

اس کے بعد روئے سخن ان اہل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے جو مکہ میں اہل کفر کے تشدد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ اگر مکہ میں ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے تو وہ ہجرت کر جائیں تاکہ وہ رب واحد کی بندگی کر سکیں۔ یہ ہدایت ان کو ایک عجیب انداز میں دی جاتی ہے۔ ہجرت کے مشورہ سے ان کے دلوں میں جو پریشانیاں اور خدشات پیدا ہوتے ہیں انہیں دور کر دیا جاتا ہے۔ ان تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جاتا ہے جو ان کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں۔ چند چٹکیوں کے ساتھ ان کی قلبی حالت بدل دی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قرآن کو نازل کرنے والا وہی خالق ہے جو اس کائنات کو پیدا کرنے والا ہے کیوں کہ انسانی دلوں کی گہرائیوں تک اثر اور ان کے اندر اس قسم کے احساسات وہی ذات پیدا کر سکتی ہے' جس نے ان دلوں کو پیدا کیا ہے کیونکہ وہی لطیف و خبیر ہے۔

اس کے بعد روئے سخن ان مشرکین کی طرف مڑ جاتا ہے جو نظریاتی انتشار میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ وحدہ ہی خالق کائنات' خالق ارض و سما' مسخر شمس و قمر ہے اور وہی ہے جو آسمانوں سے پانی اتارتا ہے جس سے یہ زمین مردہ ہونے کے بعد زندہ ہو جاتی ہے۔ جب وہ بحری سفر میں ہوتے ہیں تو وہ صرف اللہ وحدہ کو پکارتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد وہ پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔ اللہ کی کتاب کی حقانیت کا انکار کرتے ہیں' رسول اللہ کو ناجائز اذیتیں دیتے ہیں۔ اہل ایمان کو فتنوں اور مصیبتوں میں ڈالتے ہیں۔ اہل شرک کو یہ بھی یاد دلایا جاتا ہے کہ دیکھو تمہارے لیے اس حرم کو جائے امن بنایا گیا ہے جس میں تم چین سے رہتے ہو۔ تمہارے اردگرد تمام قبائل ہر وقت خوف و ہراس میں رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ مشرکین اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اللہ کے ساتھ خود ساختہ الہوں کو شریک کرتے ہیں۔ اس لیے ان کو دھمکی دی جاتی ہے کہ تم جہنم رسید ہو گے اور وہاں تمہیں ہمیشہ رہنا ہو گا۔

سورہ کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ اہل ایمان کو کامیابی کی راہیں دکھائے گا لیکن ان اہل ایمان کو جو مومنین خالص ہوں' جنہوں نے رکاوٹوں کو پار کر لیا ہو' آزمائشوں سے گزر گئے ہوں اور مشکلات راہ پر قابو پا لیا ہو۔ اگرچہ اس راہ کی رکاوٹیں بہت ہیں' لیکن انہوں نے یہ مشکل کام کر لیا ہو۔

---○○○---

درس نمبر ۱۸۲ تشریح آیات

۴۵ --- تا --- ۶۹

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝۴۵ وَلَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۖۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۴۶

(اے نبیؐ) تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو ' یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے ۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ۔ اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں اور ان سے کہو کہ "ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی ' ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم (فرمانبردار) ہیں" ۔

وہ دعوت جس کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے ہوا اور جس کا خاتمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا ۔ یہ ایک ہی دعوت ہے ' ایک ہی اللہ کی طرف سے ہے اور اس دعوت کا مقصد اور مطلوب بھی ایک ہی ہے ۔ یہ کہ گمراہ انسانیت کو واپس لا کر رب العالمین کی راہ پر ڈال دیا جائے ' اللہ کی ہدایت اور منہاج کے مطابق وہ زندگی بسر کرے ۔ جو لوگ سابقہ رسولوں کی دعوت پر ایمان لاتے رہے ہیں وہ اہل ایمان کے بھائی ہیں ۔ سب ایک ہی امت ہیں ' ایک ہی اللہ کی بندگی کرتے ہیں ۔ انسانیت اپنے ہر دور اور ہر زمان و مکان میں دو گروہوں میں بٹی رہی ہے ۔ ایک گروہ مومنین کا ہے جسے حزب اللہ کہا جاتا ہے اور دوسرا گروہ اللہ کے دشمنوں کا ہے اور یہ حزب الشیاطین کے نام سے موسوم ہیں ۔ اس سلسلے میں کسی زمان و مکان میں کوئی فرق نہیں پڑا ۔ لہٰذا زمانہ قدیم سے لے کر آج تک مومنین ایک پارٹی ہیں اور اہل کفر ایک پارٹی ہیں ۔

یہ وہ عظیم اور بلند حقیقت ہے جس کے اوپر اسلام قائم ہے اور جسے اس آیت میں منضبط کیا گیا ہے ۔ یہ حقیقت ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان میں پائے جانے والے تعلقات اور روابط کو محض خون ' نسب ' قومیت ' وطن ' تجارت اور مفادات سے بلند کر کے انہیں الٰہ واحد کی اساس پر قائم کرتی ہے ۔ تمام انسانوں کا ایمان ایک ایسے نظریہ حیات

پر ہو جس میں تمام رنگوں اور تمام نسلوں کے لوگ پگھل جائیں ـ تمام قومیتیں ختم ہوں خواہ نسلی ہوں یا وطنی ہوں اور جس میں زمان و مکان کی دوریاں غائب ہوں اور تمام انسانوں نے ایک ہی مضبوط رسی کو پکڑ رکھا ہو ـ خالق کائنات اور شارع کائنات کی رسی کو ـ

یہی وجہ ہے کہ یہاں مسلمانوں کو اہل کتاب کے ساتھ مکالمے اور مجادلے سے منع کیا جاتا ہے ماسوائے اس کے کہ یہ مجادلہ نہایت ہی مستحسن طریقے سے ہو ـ مسلمانوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے اور سابقہ رسل کی تعلیم اور رسالت کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو اس تاریخی اسلامی دعوت کی آخری شکل یعنی دین اسلام پر اکتفاء کرنا چاہئے ' جو تمام سابقہ دعوتوں کے مطابق ہے ـ جو تمام سابقہ دعوتوں اور رسالتوں کی تکمیل ہے ـ یہ آخری صورت اس کو اللہ کے علم و حکمت نے دی ہے جو انسانوں کی مصلحت خود انسانوں سے زیادہ جاننے والے ہیں ـ

اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ (۲۹ : ۴۶) "سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں" ـ جنہوں نے توحید سے انحراف کیا ' جو اسلامی نظریہ حیات کا سنگ اساس ہے ' جنہوں نے اللہ کے ساتھ شرک کی اور جنہوں نے اسلام کو بحیثیت منہاج حیات چھوڑ دیا ' کیونکہ ایسے لوگوں کے ساتھ نہ نرمی ہے اور نہ ایسے لوگوں کے ساتھ مکالمے کی ضرورت ہے ـ ایسے ہی ظالم لوگوں کے ساتھ اسلام نے اس وقت جنگ کی ' جب مدینہ میں اسلامی مملکت قائم ہو گئی ـ

بعض لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا کہ مکہ میں جب اہل شرک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت برتاؤ کر رہے تھے تو آپ نے یہ باتیں کہیں کہ اہل کتاب کے ساتھ نرمی اور احسان کا طریقہ اختیار کیا جائے مگر جب مدینہ میں آپ کی حکومت قائم ہو گئی تو آپ نے اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ شروع کر دیا اور جنگیں لڑیں اور مکی اقوال کے خلاف طرز عمل اختیار کیا ـ یہ بہت بڑا بہتان ہے اور خود یہ مکی آیت اس کا انکار کر رہی ہے ـ اسلام صرف ان اہل کتاب کے ساتھ نرم برتاؤ کرنے کی اجازت دیتا ہے ' جو ظالم اور مشرک نہ ہوں ' اپنے اصل دین پر ہوں اور سابقہ رسولوں کی ہدایات کے مطابق صحیح توحید پہ قائم ہوں ـ

وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۲۹ : ۴۶) "اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی اور ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم ہیں" ـ لہٰذا بحث و اختلاف کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اور جدل و جدال بے محل ہے ـ ہم سب اللہ واحد کو خدا مانتے ہیں ـ اہل ایمان تو قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں اور انبیائے سابقہ کی کتب پر بھی ایمان لاتے ہیں کیونکہ اسلام کی ایک ہی زنجیر ہے اور تمام نبوتیں اس کی کڑیاں ہیں ـ

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا

الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

"(اے نبیؐ) ہم نے اسی طرح تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے' اس لیے وہ لوگ جن کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں' اور ان لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں' اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں"۔

"اسی طرح" یعنی ایک ہی مسلسل اور تاریخی منہاج کے مطابق' ایک ہی سنت الہیہ کے مطابق جو اٹل ہے اور اسی طریقے کے مطابق جس کے ذریعے اللہ ہمیشہ رسولوں کو ہدایت دیتا رہا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ (۲۹ : ۴۷) "اے نبیؐ ہم نے اسی طرح تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے"۔ اور جب کتاب نازل کی تو لوگ اس کے مقابلے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو اہل کتاب میں سے بھی تھے **اور قریش میں سے بھی تھے وہ تو** ایمان لے آئے اور دوسرا گروہ وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب کے ایمان اور شہادت کے بعد بھی اس کو تسلیم نہیں کرتے حالانکہ وہ اس کی سچائی کی تصدیق کر چکے ہیں۔

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ (۲۹ : ۴۷) "اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں"۔ یعنی یہ آیات اس قدر واضح ہیں' اس قدر سیدھی ہیں کہ ان کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جس کی عقل پر پردے پڑ گئے ہوں' جس کی روح مستور ہو' اور وہ اس قابل ہی نہ رہی ہو کہ سچائی کو دیکھ سکے۔ کفر کے حقیقی معنی ہی چھپانے اور پردوں میں ڈالنے کے ہیں۔ یہاں قرآن نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس میں کفر کے اصطلاحی معنوں کے ساتھ لغوی معنی بھی ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

"(اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے"۔

قرآن کریم کفار کے شبہات کا پیچھا کرتا ہے' یہاں تک کہ ان کے بچگانہ اعتراضات اور شبہات کا بھی دفعیہ کر دیا جاتا ہے۔ رسول اللہؐ نے زندگی کا طویل ترین حصہ کفار مکہ کے درمیان بسر کیا تھا۔ آپ نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔ اچانک انہوں نے ایسی عجیب کتاب پیش کی جس نے تمام پڑھے لکھے لوگوں اور لکھنے والوں کو عاجز کر دیا۔ اگر حضور اکرمؐ نزول قرآن سے قبل پڑھے لکھے ہوتے تو کفار مکہ جائز طور پر اعتراض کرتے کہ حضورؐ خود تصنیف کر رہے ہیں لہٰذا اب وہ جو اعتراضات کرتے ہیں وہ بے بنیاد ہے۔

میں کہتا ہوں قرآن کریم ان کے لغو اور بچگانہ سوالات کا بھی جواب دیتا ہے ۔ ورنہ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے لکھے تھے تو پھر بھی قرآن کریم پر ان کے لیے شبہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا ۔ کیونکہ اگر قرآن کریم پر بذات خود غور کیا جائے تو یہ ایک معجز کتاب ہے اور انسانوں کی تصنیف کردہ کتاب نہیں ہے ۔ یہ انسانی قوت اور معرفت کے حدود سے باہر ہے ۔ انسانی علم و معرفت کی حدود سے اس کے مضامین وراء ہیں ۔ قرآن کریم میں جو سچائی درج ہے وہ بے قید سچائی ہے جس طرح اس کائنات کے اندر موجود سچائی بے قید ہے ۔ انسان جب بھی نصوص قرآنی پر غور کرتا ہے ' اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کی پشت پر بے پناہ قوت ہے ۔ قرآن کریم کی عبارت میں بھی ایک عظیم شوکت ہے اور یہ قوت اور یہ شوکت کلام انسانی طاقت سے وراء ہے ۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝

" دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے ' اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں " ۔

یہ قرآن اہل علم کے لیے واضح دلائل پر مشتمل ہے جن میں کوئی التباس اور پیچیدگی نہیں ہے نہ کوئی شبہ اور شک ہے ۔ یہ ایسے دلائل ہیں جو لوگوں کے سینوں میں موجود ہیں ' لوگوں کے دل ان دلائل پر مطمئن ہیں اس لیے اہل علم قرآنی آیات پر کوئی مزید دلیل طلب نہیں کرتے ۔ وہ علم جس پر لفظ علم کا اطلاق کیا جا سکتا ہے وہ ان لوگوں کے دلوں میں موجود ہے ۔ وہ بصورت ملکہ مستقلاً وہاں بیٹھا ہے ۔ وہ دلوں سے پھوٹتا ہے ' وہ دلوں کی راہنمائی کرتا ہے اور سیدھا منزل مقصود تک پہنچاتا ہے ۔

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (۲۹ : ۴۹) " اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ لوگ جو ظالم ہیں " ۔ جو حقیقت اور معاملات کا صحیح اندازہ نہیں کرتے اور جو صراط مستقیم کو چھوڑ کر ٹیڑھی راہوں پر چلتے ہیں ۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

" یہ لوگ کہتے ہیں کہ " کیوں نہ اتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں اس کے رب کی طرف سے ؟ " کہو " نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر " ۔

ان معجزات اور نشانیوں سے ان کی مراد وہ معجزات اور نشانیاں ہیں جو آغاز انسانیت یعنی انسانیت کے دور طفولیت میں ان کے سامنے پیغمبروں نے پیش کیں ' یعنی مادی معجزات ۔ اور یہ معجزات صرف ان لوگوں کے لیے حجت ہوتے تھے جو

ان کو دیکھتے تھے ۔ جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وہ آخری اور دائمی رسالت ہے جو ان تمام لوگوں کے لیے حجت ہے جن تک اس کی دعوت پہنچ جائے اور یہ رسالت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک انسانیت موجود ہے اور یہ دنیا قائم ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس رسالت کو ایک ایسی معجز کتاب دی ہے جو ہمیشہ پڑھی جاتی ہے اور جس کا اعجاز ختم نہیں ہوتا ۔ اور جس کے کمالات و عجائبات ختم نہیں ہوتے ۔ اللہ کے لیے قرآن کے خزانوں کا علیحدہ ذخیرہ ظاہر ہوتا رہتا ہے اور اس کے یہ معجزات اور دلائل ہر دور کے اہل علم کے سینوں میں موجود رہتے ہیں ۔ جب بھی اہل علم اس پر غور کرتے ہیں وہ اس کتاب کے اعجاز اور معجزات کو پاتے ہیں اور وہ اچھی طرح محسوس کر لیتے ہیں کہ قرآن کریم کو یہ عظمت اور شوکت کس سرچشمے سے ملی ہے ۔

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (۲۹ : ۵۰) "کہو 'نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں"۔ اور اللہ اپنی نشانیاں اس وقت ظاہر کرتا ہے جب ان کی حاجت اور ضرورت ہو ۔ اور یہ سب کام ' اللہ کے نظام تدبیر اور تقدیر کے مطابق ہوتا ہے اس لیے میں اس سلسلے میں نہ کوئی تجویز دے سکتا ہوں اور نہ مطالبہ کر سکتا ہوں ۔ یہ میرے لائق نہیں ہے اور نہ ہی یہ میری عادت ہے ۔

وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲۹ : ۵۰) "میں صرف خبردار کرنے والا ہوں 'کھول کھول کر"۔ میں ڈراتا ہوں اور خبردار کرتا ہوں اور لوگوں کے سامنے حقائق کھول کھول کر بیان کرتا ہوں اور یہی میرا فریضہ ہے جو میں ادا کرتا ہوں ۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا وہ اللہ کی تقدیر و تدبیر کے مطابق ہو گا ۔

اس طرح اللہ اسلامی نظریہ حیات کو ہر شک اور شبہ سے پاک کرتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور مقام کی حدود کا تعین کر دیا جاتا ہے ۔ رسول اللہؐ کی صفات اور الٰہ واحد و قہار کی صفات کے درمیان امتیاز کر دیا جاتا ہے ۔ اس طرح رسول اللہؐ کی شخصیت کے ارد گرد سے شبہات کے وہ بادل چھٹ جاتے ہیں جو ان رسولوں کی شخصیات کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے جن کو مادی معجزات دیے گئے کیونکہ سابقہ رسولوں کی صفات کو خدائی صفات کے ساتھ ملا دیا گیا تھا اور لوگوں نے ان رسولوں کی شخصیات کو اوہام و خرافات سے گھیر لیا تھا جس کی وجہ سے ان کے عقائد کے اندر بہت بڑا انحراف واقع ہو گیا ۔

یہ لوگ جو مادی معجزات طلب کر رہے ہیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکے اور نہ اس کی اہمیت کو سمجھ سکے ہیں کہ اللہ نے تو قرآن نازل کر کے ان پر بہت بڑا احسان کیا ہے ۔

اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۵۱

۵ ع ۷ ا

"اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی

ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔

یہ ان کی جانب سے اللہ کی نعمتوں اور مہربانیوں کی ناشکری ہے، حالانکہ اللہ کے انعامات شکر اور قدر دانی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ یہ لوگ اس قرآن کے ساتھ آسمانوں میں پہنچ جائیں اور دیکھیں کہ یہ آسمانوں سے نازل ہو رہا ہے اور آسمانوں سے آکر وہ ان کے دلوں کے تاروں کو چھیڑ رہا ہے۔ ان کے دلوں کی بات کرتا ہے۔ ان کے ماحول کی باتیں کرتا ہے۔ ان کو یہ شعور دلاتا ہے کہ اللہ کی ان پر ہر وقت نظر ہے۔ اللہ کے ہاں تمہاری بہت اہمیت ہے کہ وہ تمہارے امور سے بحث کرتا ہے۔ تمہیں قصص سناتا ہے جبکہ اے انسان تو تو اللہ کی اس وسیع کائنات میں ایک مچھر سے بھی زیادہ کمزور اور چھوٹا ہے۔ بلکہ اے انسان تو، تمہاری یہ زمین اور تمہارا یہ شمس و قمر تو اللہ کی اس کائنات میں اس طرح ہیں جس طرح پر کاہ اس زمین کے مقابلے میں اور یہ پر کاہ بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ نے تمہیں مکرم بنایا ہے اور وہ تم پر بلندیوں سے یہ قرآن نازل کرتا ہے لیکن تم پھر بھی اس کی قدر نہیں کرتے ہو؟

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۲۹: ۵۱) "بے شک اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔ اس لیے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہی لوگ اس رحمت و شفقت کا احساس کر سکتے ہیں۔ اور وہی لوگ اس بات کا شعور حاصل کر سکتے ہیں کہ قرآن کو نازل کر کے اللہ نے اپنے بندوں پر کس قدر رحمت و شفقت فرمائی۔ یہی لوگ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ جو بہت ہی بلند مرتبہ ہے، جو بہت ہی عظمتوں والا ہے وہ اس ناچیز انسان کو اپنے اس دسترخوان پر بلاتا ہے۔ ایسے ہی لوگ اس قرآن سے نفع حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ یہ تو مطالعہ کرنے والے کے لیے آب حیات ہے اور اس کے ذریعہ مومن اور متدبر پر بے پناہ خزانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں، اور ان کی روحوں کے اندر یہ قرآن ایک روشنی اور اشراق پیدا کر دیتا ہے۔

جن لوگوں کو ان امور کا شعور نہیں دیا گیا، وہ حقیر مادی معجزات طلب کرتے ہیں اور حقیر معجزات کے ذریعے وہ اس عظیم اور ابدی معجزے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی شخصیت مسخ ہو چکی ہے اس لیے ان کے دل اس نور کے لیے نہیں کھلتے لہٰذا ایسے لوگوں پر اپنا وقت نہ ضائع کرو۔ ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو۔ ان کا فیصلہ وہی کرے گا۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ شَهِیْدًا ۚ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

"(اے نبیؐ) کہو کہ "میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین میں سب کچھ جانتا ہے۔ جو لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں"۔

وہ ذات جو جہانوں کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے اس کی شہادت سے بڑی شہادت کس کی ہو سکتی ہے اور اللہ

اپنے علم سے شہادت دے رہا ہے کہ یہ لوگ باطل پر ہیں۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۹:۵۲) "جو لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ سے کفر کرتے ہیں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں"۔ یہ مطلقاً خسارے میں ہیں۔ ہر چیز سے وہ محروم ہو گئے ہیں۔ دنیا و آخرت دونوں ہار چکے ہیں۔ اپنی ذات' شخصیت' ہدایت' استقامت' اطمینان' سچائی اور نور سب چیزوں سے محروم ہو چکے ہیں۔

اللہ کی ذات پر ایمان لانا بھی ایک عمل اور کمائی ہے۔ یہ بذات خود اچھی کمائی ہے۔ اس پر اللہ اپنے فضل و کرم سے اجر دیتا ہے۔ اجر یہ کہ ایمان سے قلبی اطمینان اور زندگی کی راہوں کا تعین ہو جاتا ہے۔ جو واقعات بھی اس زندگی میں پیش آئیں' بندۂ مومن ان کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے' وہ اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے۔ اللہ کی حمایت کا طلبگار اور امیدوار ہوتا ہے اور اسے اچھے انجام کا یقین ہوتا ہے یہ بذات خود ایک کسب ہے' ایک کمائی ہے جس سے کافر محروم ہوتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲۹:۵۲) "وہی لوگ خسارے میں ہوتے ہیں"۔

اب مشرکین کی بحث ذرا آگے بڑھتی ہے کہ یہ لوگ عذاب کے آنے میں عجلت کرتے ہیں حالانکہ جہنم تو ان کے بہت ہی قریب ہے۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَ يَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

"یہ لوگ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا۔ اور یقیناً (اپنے وقت پر) وہ آ کر رہے گا۔ اچانک' اس حال میں کہ انہیں خبر بھی نہ ہو گی۔ یہ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں' حالانکہ جہنم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے۔ (اور انہیں پتہ چلے گا) اس روز جب کہ عذاب انہیں اوپر سے بھی ڈھانک لے گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی اور کہے گا کہ اب چکھو مزا ان کرتوتوں کا جو تم کرتے تھے"۔

مشرکین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ڈراوے اور تخویف کی آیات سنتے تھے' لیکن ان کی سمجھ میں یہ حکمت نہ آتی تھی کہ پھر ان کے کفر کی وجہ سے ان پر یہ عذاب نازل کیوں نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اس مہلت کی وجہ سے بے باک ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور چیلنج عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ حالانکہ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرمین کو حد سے گزرنے کی مہلت دیتا ہے تاکہ وہ سرکشی اور فساد کی آخری حدوں کو چھو لیں۔ پھر عذاب آ جاتا ہے یا یہ مہلت اس لیے طویل ہو جاتی ہے کہ اللہ اہل ایمان کا امتحان لینا چاہتا ہے تاکہ وہ بہت زیادہ ثابت قدم اور پختہ مومن بن جائیں اور

ان کی صفوں سے وہ شخص نکل جائے جو صبر و ثبات نہیں رکھتا۔ یا یہ مہلت اس لیے ہوتی ہے۔ اللہ علیم و خبیر ہے اور اسے معلوم ہے کہ اہل کفر کی صفوں میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو حق کی راہیں تلاش کر کے ہدایت پر آ جائیں گے یا ان لوگوں کی اولاد میں سے ایسے لوگ پیدا ہونے والے ہوتے ہیں جو راہ ہدایت پا لینے والے ہوں گے۔ وہ اللہ کی پارٹی میں شامل ہوں گے اگرچہ ان کے والدین مشرک ہوں۔ ان کے علاوہ بھی اللہ کی مصلحتیں ہو سکتی ہیں جو وہ خود جانتا ہے اور جو ہم سے مستور ہیں۔

ان مشرکین کو ایسا فہم و ادراک حاصل نہ تھا کہ وہ اللہ کی ان حکمتوں اور تدبیروں کو سمجھ سکیں۔ اس لیے وہ علی سبیل التحدی اور بطور چیلنج عذاب کا مطالبہ کرتے تھے لیکن

وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ (۲۹ : ۵۳) "اگر ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان پر عذاب آ چکا ہوتا"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس حکمت کے بیان کے درمیان میں بھی ان کو متنبہ کرتے ہیں کہ جس عذاب کے بارے میں تمہیں جلدی ہے وہ اچانک ہی تم پر آ جائے گا لیکن اس وقت تمہیں اس کا انتظار اور توقع نہ ہو گی اور جب یہ اچانک آ جائے گا تو یہ لوگ مبہوت ہو کر رہ جائیں گے۔

وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۲۹ : ۵۳) "اور یقیناً وہ آکر رہے گا اچانک اس حال میں کہ انہیں خبر بھی نہ ہو گی"۔

اور بعد میں بدر کے میدان میں ان پر یہ عذاب آیا۔ اللہ کا کہنا سچ ہو کر رہا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اللہ کا وعدہ کس قدر سچا ہوتا ہے۔ اللہ نے ان پر ایسا جامع اور ہمہ گیر عذاب نازل نہ کیا جس طرح پہلی اقوام پر آیا اور اللہ نے مادی معجزات کے اظہار کا مطالبہ بھی قبول نہ کیا جس طرح پہلی اقوام کو معجزات دکھائے گئے۔ انہوں نے انکار کیا اور ان پر ہمہ گیر عذاب آیا۔ وہ نیست و نابود ہوئے کیونکہ ان میں ایسے لوگ موجود تھے جو علم الہی کے مطابق زمانہ مابعد میں ایمان لانے والے تھی۔ جو اسلامی لشکر کے بہترین لوگ بننے والے تھے اور ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا ہونے والے تھے جنہوں نے ازمنہ مابعد میں طویل عرصہ تک اسلام کے جھنڈے اٹھائے رکھے۔ یہ سب کچھ اللہ کی تدبیر و تقدیر کے مطابق ہونا تھا اور ہوا۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (۲۹ : ۵۴) "یہ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں حالانکہ جہنم ان کافروں کو گھیرے میں لے چکی ہے"۔ یہ قرآن کا مخصوص اور عجیب موثر اسلوب کلام ہے کہ وہ مستقبل موعود کو عالم شہود کی شکل دے دیتا ہے۔ ایسی تصور کشی یہاں کر دی گئی ہے کہ گویا جہنم کفار کو گھیرے میں لے چکی ہے جبکہ ابھی وہ مستقبل کے پردوں میں مستور ہے۔ لیکن ان کے کرتوتوں کے اعتبار سے وہ واقعہ ہے جو مشاہدہ میں آ چکا ہے اور انسانی احساس کے پردوں پر نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کو ایسا خطرناک چیلنج دینے سے باز رہنا چاہیے۔ کیا وہ لوگ جلدی مچاتے ہیں جن کو جہنم گھیرے میں لے چکی ہے اور کسی بھی وقت گھیرا تنگ کر کے وہ ان کو گرفت میں لے سکتی ہے۔

اب وہاں ان کی صورت حالات کیا ہوگی جس کے لیے یہ بہت ہی شتابی کر رہے ہیں ۔

يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹ : ۵۵) "اس روز جبکہ عذاب انہیں اوپر سے بھی ڈھانپ لے گا اور پاؤں کے نیچے سے بھی۔ اور کہے گا کہ اب چکھو مزا ان کرتوتوں کا جو تم کرتے تھے"۔ یہ نہایت ہی خوفناک منظر ہوگا۔ نہایت ہی خوفناک حالت میں ان کو یوں طنزیہ سرزنش کی جائے گی۔

ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹ : ۵۵) "اب چکھو مزا ان کرتوتوں کا جو تم کرتے تھے"۔ یہ ہے انجام اس جلد بازی اور عجلت کا جو تم کرتے تھے اور ڈرانے والوں کو تم اہمیت نہ دیتے تھے۔

--- ooo---

یہاں سیاق کلام منکرین' اور مکذبین اور حد سے گزرنے والوں کو ایک دردناک عذاب کے منظر میں چھوڑ دیتا ہے' یہ عذاب انہیں اوپر نیچے سے گھیرے ہوئے ہے۔ اب روئے سخن اہل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے جن پر یہ مکذبین محض عقائد و نظریات کی وجہ سے مظالم ڈھاتے ہیں اور ان کو ان کے رب کی عبادت سے روکتے ہیں' ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی زمین وسیع ہے اپنے دین' اپنے عقائد کو لے کر کہیں اور جا بسو۔ یہ نصیحت نہایت ہی پر محبت اور تر و تازہ اور نہایت ہی موثر اسلوب میں کی جاتی ہے۔ اس طرح کا یہ نغمہ دل کی تمام تاروں کو چھیڑ دیتا ہے اور ان میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَاۗبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ڰ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ڮ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾

"اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو' میری زمین وسیع ہے' پس تم میری ہی بندگی بجا لاؤ۔ ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے' پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے' کیا ہی عمدہ اجر

ہے عمل کرنے والوں کے لیے ـــ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں ـ کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے ' اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے ' وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے "ـ

دلوں کے خالق ' دلوں کی خفیہ باتوں کے جاننے والے ' دلوں میں آنے والے خیالات کے جاننے والے ' اور دلوں میں پیدا ہونے والے وساوس ' اور دلوں میں چھپے ہوئے خدشات کو جاننے والے اور ان دلوں کے پیدا کرنے والے خالق کائنات یوں پکارتے ہیں " اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو " ان الفاظ کے ساتھ پکار کر ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرو ' اس خطاب کے ذریعے پہلے ہی مرحلہ پر بتا دیا جاتا ہے کہ اس ہجرت کی حقیقت کیا ہے یہ کہ اللہ اور رب کے لیے اور مولائے کریم کی راہ میں ' میں اس کے بندوں کی یہ نقل مکانی ہے ـ

یہ تو تھا پہلا لمچ ' اور دوسرا احساس ان کو یہ دلایا جاتا ہے ـ

انَّ اَرْضِي وَاسِعَةٌ (۲۹ : ۵۶) " میری زمین وسیع ہے "ـ تم میرے بندے ہو اور یہ میری زمین ہے اور بہت ہی وسیع ہے ـ اس قدر وسیع ہے کہ یہ تمہیں جگہ دے سکتی ہے اس لیے کیوں تم مکہ کی تنگنائیوں میں ڈٹے ہوئے ہو ' جہاں تم پر محض تمہارے دین اور عقائد و نظریات کی وجہ سے مظالم ہو رہے ہیں ـ یہاں تمہیں اس کی اجازت بھی نہیں ہے کہ تم اپنے رب اور مولائے کریم کی بندگی کر سکو ـ ان تنگیوں کو خیرباد کہو اور اللہ کی وسیع دنیا کی طرف نکل جاؤ ـ اپنے دین کو لے کر اس ظلم سے نجات پاؤ تاکہ آزادی سے اپنے رب کی بندگی کر سکو ـ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنَ (۲۹ : ۵۶) " پس تم میری ہی بندگی بجا لاؤ "ـ

جب کسی کو ملک چھوڑنے پر آمادہ کیا جاتا ہے تو دل میں پہلا دکھ ملک چھوڑنے کا کروٹیں لیتا ہے ـ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہاں اس قدر میٹھا انداز اختیار کیا ' میرے بندو جو ایمان لائے ہو ' الا یہ کہ میری زمین وسیع ہے ـ مکہ بھی میرا اور مدینہ بھی میرا ہے ـ تمام زمین میری ہے ـ لہٰذا محبت صرف اسی زمین سے رکھو جس میں تم میری عبادت کر سکو اور جس میں تمہارے لیے وسعت ہو ـ دوسرا خیال ایسے مواقع پر ہجرت کے عمل کے خطرات اور خدشات کا آتا ہے یعنی یہ کہ اپنے گھروں سے نکلیں گے تو راستوں میں موت ہی نہ آ جائے ـ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ کفار نے مسلمانوں کو مکہ میں قید کر رکھا تھا ـ ان کو وہاں سے نکلنے کی اجازت ہی نہ دیتے تھے اس لیے مہاجرین کے لیے ہجرت کی راہ میں نکلنا بھی پرخطر تھا ـ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کے اس خدشے کو بھی دور فرماتے ہیں ـ

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ (۲۹ : ۵۷) " ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے ـ پھر تم سب ہماری طرف پلٹا کر لائے جاؤ گے "ـ جہاں تک موت کا تعلق ہے تو وہ ہر جگہ آنے والی ہے ' لہٰذا موت کی پرواہ مت کرو ' جبکہ موت کا وقت اور سبب کسی کو معلوم نہیں ہوتا ـ سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے ـ یہ تو ہجرت کرنے والے ہیں اور اگر نہ بھی کریں تو پھر بھی اللہ کی طرف سب کو پلٹایا جانا ہے اور تم تو اللہ کے غلام ہو ' تم کو تو دنیا و آخرت دونوں میں اللہ ہی کی طرف متوجہ ہونا ہے ـ لہٰذا اس بارے میں ڈرنا کیا یا دلوں میں خوف و خطر کو لانے کا کیا مقام ہے ـ

پھر اللہ کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ تمہیں دنیا میں زمین کی وسعتیں دے گا اور تم محفوظ ہو گے بلکہ قیامت میں تمہارے لیے جو آرام گاہ تیار ہے وہ تو بہت ہی عظیم ہے ۔ اب تم وطن چھوڑ رہے ہو تو دنیا میں بھی وسعت ملے گی اور گھر تم چھوڑ رہے ہو تو جنت میں تمہارے لیے محلات تیار ہیں اور وہ محلات تمہارے ان چھوٹے چھوٹے گھروندوں سے بہت ہی بڑے اور عظیم ہیں ۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا (۲۹:۵۸) "جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ' وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے" ۔ اور وہاں ان کو خوش آمدید ان الفاظ میں کہا جائے گا اور ان کی جدوجہد کا تذکرہ ہو گا ۔

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۲۹:۵۹) "کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے ' ان لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں" ۔ چنانچہ یوں اہل ایمان کو ہجرت پر آمادہ کیا جاتا ہے ' ان کے ساتھ وعدے کیے جا رہے ہیں اور اس پریشانی ' خدشات اور خوف کے ماحول سے ان کو ثابت قدمی اور جرات مندی اور حوصلہ سکھایا جا رہا ہے ۔

قدرتی طور پر ہجرت کے وقت یہ فکر بھی لاحق ہو جاتی ہے کہ انسان کے ساتھ پیٹ تو لگا ہوا ہے ۔ آخر صبح و شام کی ضروریات کا بندوبست کیا ہو گا ۔ وطن چھوڑ دیں گے ' مال چھوڑ دیں گے ' روزگار ترک کر کے چلے جائیں گے ۔ یہاں تو مکہ میں بہرحال ضروریات زندگی کی فراہمی کا بندوبست تو یقینی ہے ۔ ہر شخص روزگار پر لگا ہے ۔ چنانچہ ان خدشات کا جواب بھی دے دیا جاتا ہے ۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ (۲۹:۶۰) "اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے ' اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے" ۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے اور یہ واقعی صورت حالات ہم رات اور دن اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ۔ ایسے جانور ہیں جو نہ رزق اٹھائے پھرتے ہیں ' نہ جمع کرتے ہیں ' نہ اس کا کوئی اہتمام کرتے ہیں ۔ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اس رزق کو پیدا کرنے کی کیا تدبیر کریں گے ۔ نہ ذخیرہ کرنا انہیں آتا ہے ۔ اس کے باوجود اللہ سب کو رزق دیتا ہے ۔ کوئی جانور کبھی بھوک سے نہیں مرا ۔ اسی طرح اللہ لوگوں کو بھی رزق دیتا ہے ۔ اگرچہ بعض لوگوں کو یہ زعم لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ خود اپنے لیے رزق پیدا کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ وسائل رزق اللہ ہی فراہم کرتا ہے اور یہ وسائل ہی دراصل رزق ہیں ۔ اگر اللہ کے یہ پیدا کردہ وسائل نہ ہوں تو انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔ لہذا ہجرت کی وجہ سے تم بھوک سے نہ مرو گے ۔ اس کی فکر نہ کرو ' تم اللہ کے بندے ہو اور اللہ اپنے بندوں کا بندوبست کرتا ہے جہاں بھی وہ ہوں جس طرح اللہ اپنی دوسری مخلوق کا بندوبست کرتا ہے اور کسی کو بھی بھوکا مرنے نہیں دیتا ۔

یہ محبت آمیز نغمے اس شعور پر آکر ختم ہوتے ہیں کہ اللہ اہل ایمان کے ساتھ ہے۔وہ ہروقت ان پر نظر کرم رکھتا ہے' وہ ان کی سب باتیں سنتا ہے۔ان کے حالات کو جانتا ہے اور کبھی بھی ان کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۲۹ : ۶۰) "وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔ یہ دور یہاں آکر ختم ہوتا ہے' اس حال میں اللہ نے مہاجرین کے دلوں میں پائے جانے والے تمام خدشات دور کر دیئے اور اللہ کی راہ میں نکلتے وقت دل میں کھٹکنے والے تمام خدشات دور کر دیئے اور اہل ایمان کے دلوں میں جو جو خدشات اور اندیشے پائے جاتے تھے اب ان کی جگہ اطمینان نے لے لی ہے۔قلق و پریشانیوں کی جگہ اب وہ مطمئن ہیں اور اب اہل ایمان کے دل اس قدر سکون اور ٹھہراؤ اور ثبات پا چکے ہیں کہ وہ اللہ کا قرب' اللہ کی نگرانی اور اللہ کی پناہ میں اپنے آپ کو اب محفوظ تصور کرتے ہیں۔

کون ہے جو انسان کے خدشات کو اس انداز میں محسوس کر سکتا ہے اور ان کو اس طرح دور کر سکتا ہے ماسوائے خالق کائنات کے۔جو ان تمام باتوں سے واقف ہوتا ہے' جو دلوں میں گزرتی ہیں۔

مومنین کے ساتھ اس مختصر مکالمہ کے بعد روئے سخن پھر مشرکین کے باہم متضاد افکار کی طرف پھر جاتا ہے۔ان کے تصورات اس قدر غیر معقول ہیں کہ وہ ایک طرف تو یہ اقرار کرتے ہیں کہ صرف اللہ ہی ہے جو زمینوں اور آسمانوں کا خالق ہے۔وہی ہے جس نے شمس و قمر کو مسخر کر رکھا ہے۔وہی ہے جو آسمانوں سے بارشیں برساتا ہے اور زمین کو مردہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کرتا ہے اور یہ کہ وہی ہے جو رزق کو کھلا بھی کرتا ہے اور تنگ بھی کرتا ہے۔جب یہ لوگ انتہائی خوف کی حالت میں ہوتے ہیں تو صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔لیکن ان باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد یہ لوگ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔جو لوگ صرف اللہ وحدہ کو پکارتے ہیں اور اس کی بندگی کرتے ہیں' یہ ان کو اذیت دیتے ہیں حالانکہ اللہ کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں اور بلاوجہ یہ لوگ ایسے لوگوں پر مظالم ڈھاتے ہیں۔اللہ نے ان پر جو احسانات کیے' ان کو یہ لوگ بھلاتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو بیت اللہ میں خوفزدہ کرتے ہیں۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٦١﴾ اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٦٢﴾ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّن نَّزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٦٣﴾ وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٦٤﴾ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ

۶ ۱۲ع ۲

فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۵﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ۭ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

''اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے 'پھر یہ کدھر سے دھوکا کھا رہے ہیں؟ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کا چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کرتا ہے' یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے اور اگر تم ان سے پوچھو کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے مردہ پڑی ہوئی زمین کو جلا اٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔ کہو 'الحمدللہ' مگر ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔

اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے 'کاش یہ لوگ جانتے۔ جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں 'پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں تاکہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کا کفران نعمت کریں۔ اور (حیات دنیا کے) مزے لوٹیں۔ اچھا' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پر امن حرم بنا دیا ہے حالانکہ ان کے گردوپیش لوگ اچک لیے جاتے ہیں؟ کیا پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا کفران کرتے ہیں؟ اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جب کہ وہ اس کے سامنے آ چکا ہو؟ کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنم ہی نہیں ہے؟''

ان آیات میں نزول اسلام سے قبل عرب عقائد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے اصل عقائد توحید پر مبنی تھے۔ بعد کے ادوار میں ان کے عقائد اور نظریات کے اندر انحراف پیدا ہو گیا۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے کیونکہ یہ اولاد اسماعیل تھے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم کے دین پر ہیں اس لیے وہ اپنے عقائد کو حضرت اسماعیل و ابراہیم علیہم السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ یہ لوگ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے دین کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے۔ یہ دین جزیرۃ العرب کے آس پاس موجود تھے کیونکہ یہ لوگ دین ابراہیم کو برتر سمجھتے ہوئے 'اس پر فخر کرتے تھے۔ لیکن وہ اس بات کو سمجھ نہ سکتے تھے کہ ان کے عقائد کے اندر اصل دین کے مقابلے میں کس قدر انحراف آ گیا ہے اور عملاً وہ مشرک ہو گئے ہیں۔

جب ان سے پوچھا جاتا کہ آسمانوں اور زمینوں کا خالق کون ہے؟ اور شمس و قمر کو کس نے مسخر کیا ہے؟ آسمانوں سے پانی کون برساتا ہے؟ مردنی کے بعد زمین میں روئیدگی کون لاتا ہے؟ تو یہ لوگ صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ یہ سب کام اللہ ہی کرنے والا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بتوں کو بھی پوجتے ہیں۔ جنوں کی عبادت بھی کرتے ہیں 'ملائکہ کی پرستش بھی کرتے ہیں' اور ان سب کو عبادت میں اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ جبکہ تخلیق میں ان کو اللہ کے ساتھ

شریک نہیں کرتے ۔ یہ عجیب تناقض تھا ۔ اس تضاد کی وجہ سے ان آیات میں اللہ ان کے اس طرز فکر پر تعجب کا اظہار فرماتے ہیں :

فَاَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ (۲۹ : ۶۱) "پھر یہ کدھر سے دھوکہ کھا رہے ہو"۔ یعنی کس طرح تم حق سے پھر کر ان مغلوبہ عقائد میں پھنس گئے ہو۔

بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (۲۹ : ۶۳) "ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں"۔ کیونکہ جس کی عقل سلیم ہو وہ ایسے عقائد اختیار نہیں کرتا۔

خالق سماوات و ارض کے بارے میں سوال، شمس و قمر کے مسخر کرنے والے کے بارے میں دریافت اور آسمانوں سے پانی نازل کرنے والے کے بارے میں سوال اور مردہ زمین کو سرسبز کرنے والے کے بارے میں سوال کے درمیان یہ بھی قرار دیا جاتا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو کسی کا رزق تنگ کر دیتا ہے اور کسی کا کشادہ کر دیتا ہے ۔ یوں تمام آثار قدرت کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ رازق بھی وہی ہے اور اللہ تمام مخلوقات کو جانتا ہے ۔ اور سب کو رزق پہنچاتا ہے ۔

اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۲۹ : ۶۲) "یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔

آسمانوں کی گردش کے ساتھ رزق واضح طور پر مربوط ہے ۔ پانی، زندگی اور روئیدگی بھی گردش افلاک سے مربوط ہے ۔ اسی طرح رزق کی کشادگی اور تنگی بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ یہ تمام مظاہر ان آیات میں واضح طور پر دکھائے گئے ہیں ۔ رزق پانی سے وجود میں آتا ہے ۔ نہریں اور دریا بارش سے بہتے ہیں اور ان کی وجہ سے حیات و نبات قائم ہیں ۔ یہ پانی زمین کے اندر بھی ذخیرہ ہوتا ہے اور اوپر بھی بہتا ہے اور اس کی وجہ سے بحروبر کا شکار پیدا ہوتا ہے ۔ غرض تمام ارزاق پانیوں سے وابستہ ہیں ۔ اس کائنات کے نوامیس فطرت کے مطابق پانی پیدا ہوتے ہیں اور شمس و قمر کے سب مظاہر شمس و قمر کی تسخیر کے نتیجے میں، اور اگر یہ نوامیس فطرت ذرہ بھر بدل جائیں تو سطح زمین کا یہ منظر ہی یکلخت بدل جائے ۔ پھر زمین کے اندر کے تمام ذخائر اور قدرتی وسائل بھی اللہ کے جاری کردہ نوامیس زمان و مکان کے مطابق ہیں ۔ زمین کی یہ تمام بوقلمونیاں شمس و قمر کی گردش کے نتیجے میں ہیں (فی ظلال پارہ ۱۹ میں ہم نے تفصیلات دی ہیں)۔

قرآن کریم اس عظیم کائنات اور اس کے مشاہد و مناظر کو بطور حجت اور برہان پیش کرتا ہے ۔ جو سچائی قرآن لے کر آیا ہے اس کا نکتہ تدبر یہ عظیم کائنات ہے ۔ ایک متفکر اور سوچ رکھنے والا دل اس عظیم کائنات پر ضرور غور کرتا ہے ۔ وہ اس کائنات کے عجائبات کو دیکھ کر زندہ و بیدار رہتا ہے، دست قدرت کی صنعت کاریوں کو سمجھتا ہے ۔ اس وسیع کائنات کے لیے جو نہایت ہی اٹل ناموس قدرت وضع کیا گیا ہے وہ اس کا شعور رکھتا ہے ۔ وہ نہایت ہی ٹھنڈے دل اور نہایت ہی سنجیدگی سے اور نہایت ہی سہولت سے اس شعور کو پا لیتا ہے ۔ اسے بہت گہرے غور و فکر کی ضرورت بھی نہیں پڑتی اور جب بھی یہ زندہ اور بیدار دل اس کائنات کی عظیم آیات میں سے کوئی نشانی پا لیتا ہے تو وہ اللہ کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہو جاتا ہے ۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۲۹ : ۶۳) ”کہو الحمدللہ مگر ان میں سے اکثر لوگ سمجھتے نہیں“۔

زمین کے اوپر آثار حیات اور رزق کی تنگی اور کشادگی کے حوالے سے انسانوں کے سامنے اقدار حیات کا حساس ترازو رکھ دیا جاتا ہے کہ دیکھو دنیا کی یہ زندگی اپنی تمام بوقلمونیوں اور لہو ولعب کے باوجود ایک تحصیل تماشا ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۲۹ : ۶۴) ”اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے، کاش یہ لوگ جانتے۔ یہ زندگی عمومی لحاظ سے تو ایک کھیل تماشا ہی ہے۔ خصوصاً اس وقت جب یہ اس طرح گزر رہی ہو کہ آخرت کی کوئی فکر نہ ہو اور یہی دنیا لوگوں کا مقصد اعلیٰ ہو اور اس دنیا کا سازوسامان ہی غایت زندگی ہو۔ رہی آخرت کی زندگی تو وہ حقیقی زندگی ہے اور اس میں نہایت ہی اعلیٰ معیار ہو گا۔ وہی حقیقی زندگی ہے۔ وہ بھرپور ہے اور اس میں حقیقی حیات اور نشاط ہے۔

یہ کہہ کر قرآن یہ تعلیم بھی نہیں دیتا کہ دنیا کو ترک کر دیا جائے یا اس کے متاع کو دور پھینک دیا جائے یا زندگی کی سرگرمیوں سے فرار اختیار کر کے رہبانیت اختیار کی جائے۔ یہ نہ اسلام کی روح ہے اور نہ اسلام زندگی کا یہ رخ اختیار کرتا ہے بلکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اصل ہدف آخرت ہو اور حدود اللہ کا لحاظ رکھا جائے۔ اس زندگی پر سربلندی حاصل کر کے اسے اپنے قبضہ قدرت میں رکھا جائے اور انسان اس دنیا کے متاع کا اسیر نہ بن جائے۔ انسان زندگی کے فرائض پورے کرے اور اس سے فرار اختیار نہ کرے۔ غرض اصل مسئلہ صحیح سوچ اور صحیح قدر کا ہے۔ انسان کو اس دنیا کی بھی صحیح قدر و قیمت معلوم ہونا چاہئے اور آخرت کی بھی صحیح قدر و قیمت معلوم ہونی چاہئے۔ مومنین کو ان اقدار کا صحیح شعور ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جب ایک باشعور مومن دنیا سے معاملہ کرے گا تو اس کا نقطہ نظر معتدل ہو گا کہ دنیا تو کھیل تماشا ہے مختصر وقت کے لیے ہے اور آخرت اس طرح سنجیدگی کے لائق ہے جس طرح کھیل تماشے اور میلے ٹھیلے کے بعد انسان سنجیدگی سے اس دنیا کے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ فکر و نظر کی اس درستگی کے بعد اب بتایا جاتا ہے کہ کفار کے فکر و نظر میں کیا کیا تضادات ہیں۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ (۲۹ : ۶۶) ”جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں۔ پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے جاتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں“۔ یہ بھی ان کے عقائد کا بہت بڑا تضاد ہے۔ ان کے عقائد اس قدر ڈانواں ڈول ہوتے ہیں کہ جب کشتی پر وہ گہرے سمندر میں ہوتے ہیں اور یہ جہاز بحری امواج کے تلاطم میں ایک کھلونا بن جاتا ہے اور ان پر خوف طاری ہوتا ہے تو وہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں

پکارتے ـ اس وقت ان کو یہ ادراک ہوتا ہے کہ اصل قوت تو صرف اللہ ہی کی قوت ہے ـ پھر ان کی سوچ میں بھی اللہ وحدہ ہوتا ہے اور اس کی زبان پر بھی اللہ وحدہ کا نام ہوتا ہے ـ اب وہ اپنی اس فطرت کے تابع ہوتے ہیں جو وحدانیت کا شعور رکھتی ہے ـ لیکن جب اللہ ان کو بچا کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو یہ لوگ اچانک پھر شرک کرنے لگتے ہیں اور وہ فطری شعور پھر دب جاتا ہے ـ اب اچانک وہ اس حالت کو بھول جاتے ہیں جس میں وہ اللہ وحدہ کو پکارتے تھے اور اقرار اور تسلیم کے بعد دوبارہ یہ لوگ شرک کی راہ پر پڑ جاتے ہیں ـ

اس بے راہ روی اور گمراہی کا انجام کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ یہ لوگ ان انعامات کی ناشکری اور کفر کرتے ہیں جو اللہ نے ان کو دیئے ہوتے ہیں ـ یہ لوگ اس فطری راہ سے منحرف ہو جاتے ہیں جو اللہ نے ان کی شخصیت کے اندر ودیعت کر دی ہوئی ہے ـ ان فطری براہین کو نظرانداز کر دیتے ہیں جن کو وہ محسوس کرتے ہیں اور وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ حیات دنیا تو ایک محدود وقت تک کے لیے ایک سازوسامان ہے لیکن ان کو بہت جلد اپنے حقیقی انجام کا پتہ چل جائے گا ـ وہ بہت ہی برا انجام ہو گا ـ

لِيَكْفُرُوا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۲۹:۶۶) "تاکہ اللہ کی دی ہوئی نجات پر اس کا کفران نعمت کریں اور حیات دنیا کے مزے لوٹیں ـ اچھا عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا" ـ یہ نہایت ہی شدید ڈراوا ہے یعنی نامعلوم مصیبت کا ـ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا؟

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو بتاتے ہیں کہ دیکھو اللہ نے تم کو یہ "حرم امن" دیا ہے جس کے اندر تم نہایت ہی امن وسکون سے زندگی بسر کرتے ہو ـ کیا اللہ کی اس عظیم نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے ـ یوں کہ صرف اللہ کی بندگی کریں اور اسی کو پکاریں بلکہ اس کے برعکس اس حرم امن میں اہل ایمان کو تم ڈراتے اور پریشان کرتے ہیں ـ

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ (۲۹:۶۷) "کیا یہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پرامن حرم بنایا ہے حالانکہ ان کے گردوپیش لوگ اچک لیے جاتے ہیں ـ پھر بھی یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کا کفران کرتے ہیں" ـ

اہل مکہ کی حالت یہ تھی کہ وہ حرم مکی کی وجہ سے نہایت ہی امن وسکون سے زندگی بسر کرتے تھے ـ لوگ بیت اللہ کی وجہ سے ان کی تعظیم کرتے تھے ـ ان کے ارد گرد جو عرب قبائل تھے وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کے دل مین دوسرے کا خوف ہوتا تھا ـ ان کو اگر امان نصیب ہوتا تھا تو بیت اللہ کے سائے میں ہوتا تھا ـ اور یہ امان اللہ نے دیا تھا لیکن یہ بہت بڑی ناشکری کی بات تھی کہ یہ لوگ بیت اللہ کو بتوں کا اڈہ بنادیں اور بیت اللہ میں غیراللہ کی بندگی ہوتی رہے ـ

اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ (۲۹:۶۷) "کیا پھر بھی یہ لوگ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں" ـ

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ اَلَيْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ (۲۹ : ۶۸) ”اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جبکہ وہ اس کے سامنے آ چکا ہو ‘کیا ایسے کافروں کا ٹھکانہ جہنم نہیں...؟“ اور اہل مکہ اس جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں ـ انہوں نے اللہ پر افتراء باندھا ہے کہ اللہ نے خود اپنے ساتھ شریک ٹھہرائے ہیں اور ان کے پاس حق آگیا اور انہوں نے تکذیب کر دی ہے ـ آخر جہنم کے ٹھکانے کے سوا ایسے لوگ اور کس مقام کے مستحق ہیں ـ اور ان کے پاس حق آگیا اور انہوں نے تکذیب کر دی ہے ـ آخر جہنم کے ٹھکانے کے سوا ایسے لوگ اور کس مقام کے مستحق ہیں ـ یقیناً ایسے لوگ جہنم کے مستحق ہیں ـ

سورہ کا خاتمہ کفار کے فریق مقابل کی تصویر کشی پر ہوتا ہے ـ وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی راہوں میں جدوجہد کی تاکہ وہ اللہ تک پہنچ جائیں ـ ان کا رابطہ اللہ سے ہو جائے ـ جنہوں نے اللہ کی راہ میں ناقابل برداشت مصائب جھیلنے کے باوجود نہ اپنا عہد توڑا اور نہ مایوس ہوئے ـ جنہوں نے نفس کی خواہشات پر قابو پایا اور لوگوں کے تشدد کو بھی برداشت کیا ـ جنہوں نے اپنے بوجھ اٹھائے اور ان بھارتی بوجھوں کے ساتھ اس طویل سفر پر چل پڑے ‘جو طویل بھی تھا اور پر مشقت بھی ـ ایسے لوگوں کو اللہ اس سفر میں تنہا نہیں چھوڑتا اور نہ ان کے ایمان کو ضائع کرتا ہے اور نہ ان کی اس جدوجہد کو بھولتا ہے ـ اللہ اپنے عرش بریں سے ان کو دیکھ رہا ہے اور ان سے بہت ہی راضی ہے ـ وہ دیکھ رہا ہے اور قدم قدم پر ان کی راہنمائی کرتا ہے ـ وہ ان کی کوششوں کو دیکھے گا اور ان کے ہاتھ پکڑ کر ان کو صحیح راہ پر ڈال دے گا ـ ان کے صبر اور ان کی پاکیزگی کو دیکھا جا رہا ہے وہ بہت ہی اچھی جزاء دینے والا ہے ـ

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ ع ۷ / ۶ / ۳

”جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے ‘اور یقیناً اللہ نیکو کاروں ہی کے ساتھ ہے“ ـ

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ------ ۲۱

سورۂ روم ۔ ۳۰

آیات ۱--- تا--- ۶۰

سورۂ روم ایک نظر میں

اس سورہ کی ابتدائی آیات ایک مخصوص تاریخی واقعہ کے حوالے سے نازل ہوئیں ' جب اہل فارس نے اہل روما پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ کیونکہ فارس والے جزیرۃ العرب کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتے تھے۔ یہ اس دور کا واقعہ ہے جب مکہ میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان نظریاتی جنگ جاری تھی۔ مسلمان مکہ میں تھے۔ ابھی ہجرت نہیں ہوئی تھی۔ اس دور میں رومی چونکہ اہل کتاب یعنی نصاریٰ تھے اور اہل فارس مجوسی یعنی مشرک تھے۔ اس لیے اس غلبے پر اہل مکہ خوش تھے کہ ایک مشرک ملت کے لوگ ایک کتابی ملت پر غالب آگئے۔ انہوں نے مکہ میں شرک اور توحید کی کشمکش میں اس واقعہ کو اپنے لیے نیک فال تصور کیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں پیش گوئی کی گئی کہ چند سالوں کے اندر اندر اہل کتاب رومی ' مشرک فارسیوں پر غلبہ پالیں گے اور اس وقت اہل ایمان خوش ہوں گے کیونکہ اہل ایمان دوسری ملتوں کے اہل توحید کے بھی حامی تھے۔ لیکن قرآن کریم نے بس صرف یہی بتانے پر اکتفاء نہیں کیا کہ اس واقعہ میں مشرکین مکہ کی پسندیدہ قوت کو جلد ہی شکست ہوگی بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کو اس مخصوص واقعہ اور اس کے ماحول سے ذرا آگے ایک وسیع دنیا میں لے جاتا ہے کیونکہ یہ واقعہ تو ایک جزئی اور وقتی واقعہ تھا۔ قرآن کریم مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ وہ جس حق اور جس سچائی کے حامل ہیں وہ دراصل اس عظیم سچائی اور حق کا ایک حصہ ہے جس کے اوپر زمین و آسمان اور اس پوری کائنات کا نظام قائم ہے اور ان دونوں سچائیوں کے درمیان گہرا ربط ہے۔ اس طرح انسانوں کا ماضی ' ان کا حال اور ان کا مستقبل باہم مربوط ہیں۔ پھر اسی طرح یہ بات اس کائنات سے بھی آگے بڑھ کر عالم آخرت میں داخل ہوتی ہے اور اس حیات دنیا کے بعد یات اخروی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس زمین کی محدود زندگی سے انسانوں کو آخرت کی وسعتوں میں لے جایا جاتا ہے۔ پھر اس پوری کائنات کی سیر کرائی جاتی ہے ' پھر انسانی نفس کی گہرائیوں میں ' انسان کے شب و روز میں انسانی فطرت کے عجائبات بتائے جاتے ہیں۔ یوں انسان اس محدود واقعہ کے حوالے سے اس عظیم کائنات کی وسعتوں میں چلا جاتا ہے اور علم و معرفت کے بے قید اصول معلوم کر کے اس کی زندگی لامحدود ہو جاتی ہے۔ اس کا نصب العین بلند ' منزل بہت اعلیٰ و ارفع ہو جاتی ہے ' اور وہ زمان و مکان کی تنگیوں سے نکل کر اللہ کی اس کائنات کی وسعتوں میں گم ہو جاتا ہے۔ اس کا ماضی ' اس کا حال اور اس کا مستقبل سب کے سب اللہ کے وسیع اور لازوال قانون قدرت اور سنن فطرت میں گم ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایک مومن انسان کے ہاں اس دنیا کے تعلقات و روابط ' اس عظیم کائنات کے حوالے سے ' بہت ہی وسیع اور ارفع ہو جاتے ہیں اس لیے کہ اس کے ذہن میں وہ قوانین بہت ہی عظیم ہوتے ہیں جو اس عظیم کائنات کو چلاتے ہیں ' وہ اصول بہت ہی حکیمانہ ہوتے ہیں جو فطرت انسانی میں ودیعت کر دیئے گئے ہیں۔ انسانی زندگی اس کے مختلف حوادث ' اور اس میں فتح و شکست اور وہ پیمانے جن کے مطابق انسانی اعمال کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے اور جن اصولوں کے

مطابق انسان اس زمین پر کام کرتا ہے اور جن کے مطابق اسے آخرت میں جزاء و سزا ملے گی' یہ سب پیمانے اور اصول اعلیٰ اور بامقصد ہو جاتے ہیں ۔ اس سے اس پوری زندگی کے بارے میں انسان کا تصور بلند ہو جاتا ہے ۔

اس ہمہ گیر اور بلند تصور کے نقطۂ نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے جو دعوت دی ہے وہ عالمی اور ابدی دعوت ہے اور اس کا تعلق اس جہاں اور اس کے پورے ماحول سے ہے ۔ اگرچہ یہ دعوت مکہ کے بلند پہاڑوں کے درمیان سے اٹھ رہی ہے لیکن یہ وہاں مکہ تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اس کائنات کی فطرت سے مربوط ہے ۔ اس کائنات کے قوانین سے ہم آہنگ ہے ۔ نفس انسانی اور اس کے حالات کے عین مطابق ہے ۔ انسان کے ماضی' حال اور مستقبل کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے ۔ نہ صرف اس زمین پر بلکہ عالم آخرت کے ساتھ بھی اس دعوت کا گہرا تعلق ہے ۔

یہ دعوت قلب مومن کو ان وسعتوں سے باندھ دیتی ہے ۔ ایک مسلم کا تصور اور اس کا شعور اور اس کی اقدار حیات وسیع اور رفیع ہو جاتی ہیں ۔ انسان کی نظریں عالم بالا پر' آسمان پر اور آخرت پر ہوتی ہیں ۔ عالم بالا اور عالم سماوات کے اسرار و رموز پر وہ غور کرتا ہے ۔ اس کی تخلیق' اس کے انقلابات پر اس کی نظر رہتی ہے اور یہ مخصوص واقعہ کو نہیں بلکہ اس کائنات کے تمام حادثات کو وہ اچھی طرح سمجھتا ہے ۔ اس عظیم کائنات بلکہ کائناتوں کے ایک سمندر میں اس کا موقف ایک عظیم امت کا موقف ہوتا ہے ۔ وہ اپنی قدر و قیمت جانتا ہے' وہ اپنے اس عظیم تصور کی اہمیت سے واقف ہوتا ہے' اللہ کے حوالے سے بھی اور دوسرے انسانوں کے حوالے سے بھی' یوں ایک مومن عظیم انسان ہوتا ہے اور اس کا کردار بھی عظیم ہوتا ہے ۔ وہ علی وجہ البصیرت اپنے اس کردار کو ادا کرتا ہے ۔ وہ اپنے فرائض ادا کرتا ہے نہایت اطمینان' نہایت وثوق اور نہایت اہتمام کے ساتھ ۔

ان روابط پر غور کرنے' اس کائنات میں ان کے مفہوم و مدلول کو سمجھنے اور پھر انسانی دلوں میں ان کا تصور بٹھانے کے لیے یہ سورہ دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے ۔

پہلے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ مومنین کی کامیابی اسی طرح برحق ہے جس طرح یہ کائنات ایک برحق نظام پر قائم ہے اور اہل ایمان کی اس کامیابی کے ساتھ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کا تعلق ہے ۔ انسانی تاریخ میں اللہ کی جو سنت کارفرما رہی ہے وہ بھی اس پر شاہد عادل ہے ۔ کائنات کا یہ نظام شاہد ہے کہ اللہ دوبارہ تمام انسانوں کو اٹھائے گا اور حساب و کتاب ہو گا ۔ اس لیے پہلے حصے میں قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر بھی یہاں پیش کیا جاتا ہے اور اس میں مومنین اور کافرین کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا' وہ دکھایا جاتا ہے ۔ اس کے بعد پھر اس کائنات پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے اندر اللہ کی کیا کیا نشانیاں پوشیدہ ہیں اور انسان کے دل و دماغ پر وہ نشانیاں کیا اثرات چھوڑتی ہیں ۔ پھر خود انسان اور اس کے مملوک غلاموں کی مثال دے کر دکھایا جاتا ہے کہ عقیدہ شرک کس قدر غیر معقول عقیدہ ہے اور یہ کہ یہ نظریہ محض خواہشات نفسانیہ پر مبنی ہے' کسی سچائی اور کسی دلیل کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے ۔ آخر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپؐ اس سیدھے راستے پر ثابت قدمی کے ساتھ گامزن رہیں' یہ واضح راستہ ہے' فطری راستہ ہے جس کے اندر کوئی ٹیڑھ اور کوئی تغیر نہیں ہے اور یہ راستہ انسانوں کو متحد کرتا ہے' ان کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرتا جس طرح اہل شرک نے انسانیت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے طبقات میں تقسیم کر دیا ہے ۔

دوسرے حصے میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کے اندر کس قدر تلون مزاجی ہے ۔ اس تلون مزاجی کے اوپر زندگی کی

عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی ـ زندگی کا نظام تو ناقابل تغیر و تبدل اصولوں پر ہی قائم ہو سکتا ہے جن کو کچھ مخصوص لوگوں کی خواہشات کے مطابق بدلا نہ جا سکے ـ ان کے سامنے خود انسانوں کے وہ حالات رکھے جاتے ہیں جن میں وہ امن و عافیت میں ہوں یا مصیبت اور مشکلات میں ہوں' خوشحال ہوں یا بدحال ہوں ـ اس مناسبت سے پھر اس رزق کو خرچ کرنے اور اس کو ترقی دینے کا مضمون اور پھر رزق الٰہی کے حوالے سے شرک اور شرکاء کا تذکرہ کہ یہ ٹھہرائے ہوئے خود ساختہ شرکاء نہ تو رزق دے سکتے ہیں نہ زندگی عطا کر سکتے ہیں' نہ مار سکتے ہیں ـ بتایا جاتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر فساد لوگوں کے اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے ـ بتایا جاتا ہے کہ زمین میں سیر کرو' اور اس کے جغرافیائی مطالعہ کے ساتھ تاریخی مطالعہ کرو اور دیکھو کہ مشرکین کا انجام ہمیشہ کیا ہوتا رہا ہے ـ حضور اکرمؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ دین فطرت پر سیدھے جمے رہو یہاں تک کہ وہ دن آ جائے جس میں ہر شخص کے سامنے اس کی کمائی رکھ دی جائے گی ـ اس دوسرے حصے میں بھی مشاہد کائنات پیش کیے جاتے ہیں جس طرح پہلے حصے میں اس کائنات سے نشانیاں پیش کی گئی تھیں ـ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کے طریقے پر چلو ـ رسول کا فریضہ تو صرف ابلاغ ہے ـ رسول تو نہ اندھوں کو ہدایت کر سکتا اور نہ بہروں کو سنا سکتا ہے ـ اس کے بعد خود انسان کے انفس کی سیر کرائی جاتی ہے اور اس کی پیدائش سے انتہا تک اسے اس کے اطوار حیات دکھائے جاتے ہیں کہ کس طرح انسان کو پیدا کیا گیا اور طفولیت کا دور کیسے گزرا ـ پھر موت آئے گی اور دوبارہ بعث بعد الموت ہوگی ـ یہ دوسرا حصہ بھی ختم ہوتا ہے اور رسول اللہ کو ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ دعوت دیں ـ صبر کریں اور لوگ جو تکالیف دیتے ہیں ان کو برداشت کریں ـ اللہ نے جو وعدہ کیا ہے وہ آنے والا ہے لہٰذا آپ ان لوگوں کے طرز عمل سے پریشان نہ ہوں جو ایمان نہیں لاتے ـ

سورہ کی فضا اور اس کا انداز بیان سورہ کے مرکزی مضمون اور محور کی تصویر کشی میں باہم معاون ہیں ـ محور یہ ہے کہ لوگوں کے حالات' زندگی کے واقعات' ان کی تاریخ اور ماضی اور حال کے درمیان گہرا رابطہ ہوتا ہے ـ یہ سب امور پھر ان سنن الٰہیہ کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں جو اس کائنات میں جاری و ساری ہیں ـ لہٰذا انسان کی ہر حرکت اور اس کا سکون' انسان کو پیش آنے والا ہر حادثہ اور اس کا ہر حال' انسان کی ہر سرگرمی اور اس کا ہر انجام' اس دنیا میں اس کی فتوحات اور ناکامیاں سب کی سب انسان کے ان روابط اور تعلقات کی روشنی میں ظاہر ہوتی ہیں ـ اور ان کا سنن کونیہ کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے اور اصل بات یہ ہوتی ہے کہ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں ـ

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ بَعْدُ (۳۰ : ۴) "تمام امور اللہ کے لیے ہیں' پہلے بھی اور بعد میں بھی" ـ اور یہ وہ اساسی حقیقت جس کی توثیق و تاکید پورا قرآن کرتا ہے اور یہ بات اسلامی نظریہ حیات کی اساسی حقیقت ہے ـ اسی اسلامی تصور حیات سے' اقدار' شعور اور اقدار و پیمانے پھوٹتے ہیں اور اس کے سوا کوئی تصور حیات اور کوئی قدر درست نہیں ہو سکتی' نہ اسلام اس کو تسلیم کرتا ہے ـ

---ooo---

درس نمبر ۱۸۲ تشریح آیات

۱--- تا--- ۳۲

الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ا-ل-م- رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں' اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہو گا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے۔ اللہ نصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے' اور وہ زبردست اور رحیم ہے۔ یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے' اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں"۔

سورہ کا آغاز حروف مقطعات سے ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ قرآن اور یہ سورہ انہی حروف سے بنائے گئے ہیں' جو عربوں کی دسترس میں ہیں لیکن اس کے باوجود یہ قرآن اور یہ سورہ معجز ہیں۔ آج تک وہ اس قسم کا کلام نہیں بنا سکے۔ یہ حروف تہجی خود ان کی زبان کے ہیں اور وہ ان سے کلمات و کلام بنا سکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ بچی تاریخی پیش گوئی آتی ہے جس میں یہ کہا گیا کہ رومی چند سالوں میں پھر غالب آ جائیں گے ۔ ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ ایرانی رومیوں پر غالب تھے اور مشرکین عرب چاہتے تھے کہ ایرانی رومیوں پر غالب رہیں اور مسلمانوں کی خواہش نہ تھی کہ ایرانی رومیوں پر غالب آ جائیں ۔ اس لیے کہ رومی اہل کتاب تھے اور وہ مسلمانوں کے ذہن کے قریب تھے ۔ جب یہ آیت نازل ہوئی :

الٓمّٓ (۳۰ : ۱) غُلِبَتِ الرُّوْمُ (۳۰ : ۲) فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ ھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ (۳۰ : ۳) فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ --- (۳۰ : ۴) "ا ل م ۔ رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں ' اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے" ۔ تو مشرکین مکہ نے کہا ابوبکر! تمہارے دوست کہتے ہیں کہ رومی چند سالوں میں غالب آ جائیں گے ۔ تو حضرت ابوبکر نے فرمایا ہاں ' وہ سچ کہتے ہیں ۔ تو انہوں نے کہا شرط لگاتے ہو ' تو انہوں نے سات سالوں کی میعاد پر چار اونٹنیوں کی شرط لگائی ۔ یہ سات سال گزر گئے اور کچھ نہ ہوا ۔ مشرکین اس پر بہت ہی خوش ہوئے ۔ یہ بات مسلمانوں پر ناگوار گزری ۔ انہوں نے حضورؐ کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا تمہاری زبان میں بضع سنین کا مفہوم کیا ہے ؟ تو انہوں نے فرمایا دس سے کم ۔ تو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ جائیں اور میعاد میں دو سال کا اضافہ کر دیں ۔ کہتے ہیں دو سال ابھی نہ گزرے تھے کہ سواروں نے آکر اطلاع دی کہ رومی فارس پر غالب آ گئے ہیں ۔ اس پر مسلمانوں کو بہت خوشی ہوئی ۔

اس بارے میں بہت سی روایات وارد ہیں ۔ ان میں سے ہم نے امام ابن جریر کی روایت اختیار کی ہے ۔ قبل اس کے کہ ہم اس واقعہ سے آگے بڑھیں ' اس واقعہ میں جو ہدایات ہیں ان پر غور ضروری ہے ۔

اس واقعہ میں ہمارے لیے پہلی نصیحت یہ ہے کہ شرک اور کفر ہر زمان و مکان میں ایک ملت ہوتے ہیں اور وہ ہمیشہ ایمان اور عقیدۂ توحید کے خلاف رہے ہیں ۔ اگرچہ اس دور میں دنیا کی حکومتوں کے باہم روابط ہمارے دور کی طرح گہرے نہ تھے اس کے باوجود مشرکین مکہ یہ سمجھتے تھے کہ پوری دنیا میں مشرکین کا غلبہ ان کا غلبہ ہے ' اور اہل کتاب پر مشرکین کی فتح ان کی فتح ہے ۔ مکہ کے مسلمان بھی یہ سمجھتے تھے کہ ان کے اور اہل کتاب کے درمیان رابطے کی اساس موجود ہے اور وہ بھی اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ اہل کتاب پر مشرکین کو کسی بھی جگہ غلبہ حاصل ہو ۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ ان کی دعوت اور تحریک اس جہان میں الگ تھلگ نہیں رہ سکتی ۔ اور کفر و ایمان کی اس کشمکش پر بیرونی واقعات اثر انداز ہو سکتے ہیں ۔

یہ وہ کھلی حقیقت ہے جس سے ہمارے دور کے اکثر لوگ غافل ہیں اور وہ اس حقیقت کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے ' جس طرح اس کو رسول اللہؐ کے زمانے کے مسلمانوں نے سمجھا تھا ۔ حالانکہ چودہ سو سال گزر چکے ہیں ۔ آج کے مسلمان صرف جغرافیائی حدود یا قومیت کی اصطلاح میں سوچتے ہیں حالانکہ مسئلہ دراصل کفر و ایمان کا ہے اور اصل معرکہ حزب اللہ اور حزب الشیطان کے درمیان ہے ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان اس کشمکش کی اصل حقیقت کو سمجھیں کہ اصل مسئلہ کیا ہے ؟ اگر مسلمانوں نے اصل مسئلے کو سمجھ لیا تو پھر کفر و شرک کی علم بردار جماعتوں نے جو مختلف رنگوں کے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہیں ' وہ مسلمانوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے ۔ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف جنگ ' محض اسلامی نظریہ حیات کی وجہ سے

کرتے ہیں۔ ذہنی طور پر معرکے کے اسباب و علل جو بھی ہوں' اصل جنگ نظریات کی ہے۔

دوسرا سبق اس واقعہ میں یہ ہے کہ اللہ کے وعدے پر بھروسہ کرو' جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے فوراً کہا کہ حضور اکرمؐ نے سچ کہا' جبکہ مشرکین کے نزدیک حضورؐ کا یہ کلام تعجب انگیز تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے صاف صاف کہہ دیا "انہوں نے سچ کہا"۔ انہوں نے شرط باندھی اور ابوبکرؓ نے قبول کر لی اور اللہ نے جو کہا تھا کہ چند سالوں میں یہ واقعہ ہو جائے گا تو ہو گیا۔ یہ پختہ اعتماد' یقین اور بھروسہ ہی تھا جس نے مسلمانوں کے دلوں کو یقین اور ثابت قدمی سے بھر دیا تھا اور وہ تمام مصائب اور مشکلات کو خوشی خوشی جھیل رہے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ کا کلمہ مکمل ہو گیا اور اللہ کا وعدہ سچا ہو گیا اور یہی بات جہاد کے طویل راستے میں ایک نظریاتی کارکن کا بہترین ہتھیار ہوا کرتا ہے۔

تیسرا سبق اس واقعہ کے بیان کے درمیان ایک نہایت ہی مختصر جملہ معترضہ کے ذریعہ دیا گیا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ (۳۰ : ۴) "اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی"۔ نہایت ہی شتابی سے بتا دیا گیا کہ معاملات سب کے سب اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس واقعہ میں بھی اور اس کے سوا دوسرے واقعات میں بھی۔ یہ ایک اٹل کلیہ ہے' اسلامی موقف کا یہ میزان ہے۔ فتح و ہزیمت' دنیا میں حکومتوں کا اٹھنا اور مٹنا' قوت پکڑنا اور ضعیف ہونا' اسی طرح ہے جس طرح اس کائنات میں دوسرے طبیعی واقعات رونما ہوتے ہیں۔ سب کے لیے ایک سنت مقرر ہے۔ یہ سنت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح اللہ چاہتا ہے واقعات کا رخ پھیر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ کے ارادے اور اس کی حکمت پذیری سے واقع ہوتا ہے۔ تمام واقعات اور حادثات دراصل اللہ کے ارادۂ مطلقہ کے آثار ہیں اور ان کا رخ متعین کرنے میں کسی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ نہ کسی کے پاس قوت ہے۔ ان واقعات کے پیچھے جو حکمت کارفرما ہے اس کا بھی اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں ہے۔ نہ کسی کو ان واقعات کے مصدر اور ابتداء کا پتہ ہے اور نہ انجام کا۔ لہٰذا ایک انسان کے لیے یہی محفوظ راستہ ہے کہ وہ تمام واقعات پر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کریں اور یہ کہہ دے کہ یہ اللہ کی مقرر کردہ تقدیر ہے۔

الٓمّٓ (۳۰ : ۱) غُلِبَتِ الرُّوْمُ (۳۰ : ۲) فِیْ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ (۳۰ : ۳) فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ (۳۰ : ۴) بِنَصْرِ اللّٰهِ --- (۳۰ : ۵) "رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں' اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہو گا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے"۔ اور اللہ کا وعدہ سچا ہوا اور مومنین نے اللہ کی دی ہوئی نصرت پر خوشیاں منائیں۔

يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۳۰ : ۵) "اللہ نصرت عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے"۔ غرض اختیارات سب اللہ کے ہیں' پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اللہ جسے چاہتا ہے نصرت عطا کرتا

ہے - اس کی مشیت پر کوئی قید نہیں ہے - اس کی مشیت جو نتیجہ چاہتی ہے ویسے ہی اسباب بھی مہیا کر دیتی ہے - وجود اسباب اور فتح و کامرانی کو اللہ کی مشیت کے ساتھ معلق کرنے کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے - اس عالم اسباب کو جو قوانین قدرت کنٹرول کرتے ہیں وہ سب کے سب مشیت مطلقہ کے فراہم کردہ ہیں - مشیت الہیہ ہی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایسے اسباب اور ایسے سنن اہل جہاں میں جاری و ساری ہوں جو اٹل ہوں اور اس کائنات کے اندر ایک نظم اور ایک قرار و ثبات ہو - لہٰذا فتح و ہزیمت بھی قدرتی اسباب اور موثرات کے نتیجے میں ظاہر ہوتے ہیں' اللہ کے جاری کردہ قوانین قدرت کے مطابق -

اس موضوع پر اسلامی نظریہ حیات نہایت ہی واضح' معقول اور منطقی ہے - وہ تمام امور کو اللہ کے حوالے کرتا ہے لیکن اسلام عالم اسباب کی نفی بھی نہیں کرتا اور انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ عالم اسباب کے اندر اپنی جدوجہد جاری رکھے' تاکہ اللہ کے مقرر کردہ نتائج عالم ظہور میں آتے رہیں - انسانی جدوجہد کے مطابق عملاً نتائج نمودار ہوں یا نہ ہوں اس کا انسان ذمہ دار نہیں ہے - اس پر جدوجہد فرض ہے - انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے - ایک اعرابی نے اپنی اونٹنی کو مسجد نبویؐ کے دروازے پر کھلا چھوڑ دیا اور نماز پڑھنے کے لیے اندر آگیا اور کہا

تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ "میں نے اللہ پر توکل کیا" - اسے رسولؐ اللہ نے فرمایا اعقلها و توکل "اسے باندھ دو اور پھر توکل کرو" - اسلامی نظریہ حیات میں توکل عالم اسباب میں' مطابق اسباب جدوجہد کرنے کے بعد ہے - جدوجہد کرو اور پھر معاملہ اللہ پر چھوڑ دو -

يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۳۰ : ۵) "اللہ نصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ زبردست اور رحیم ہے" - یہ نصرت قدرت الہیہ کے سایوں میں ملفوف ہے اور یہ قدرت الیہ ہی ہے جو اس تصرف کو عالم واقعہ میں لاتی ہے - اس نصرت پر رحمت الہیہ کے سائے بھی چھائے ہوئے ہیں جس کے ذریعہ لوگوں کے مفادات حقیقت کا روپ اختیار کرتے ہیں - مغلوب اور پسے ہوئے طبقات کے لیے اس میں بہت سے فائدے ہوتے ہیں -

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ "اگر اللہ کی طرف سے بعض لوگوں کو بعض دوسرے لوگوں کے ذریعہ دفع کرنے کا کام نہ ہوتا رہتا تو پوری زمین میں فساد واقعہ ہو جاتا" - زمین میں اصلاح اسی طرح ہو سکتی ہے کہ مظلوموں اور پسے ہوئے لوگوں کی حمایت کی جائے اور ان کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا جائے -

وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰ : ۶) يَعْلَمُوْنَ

ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۰ : ۷) "یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے' اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں - لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل ہیں" - یہ امداد اللہ کا وعدہ ہے لہٰذا وہ لازماً واقع ہو کر رہے گا -

لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (۳۰ : ۶) "اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا" - کیونکہ اللہ کا

وعدہ اس کے بے قید ارادے کے تحت ہوتا ہے اور پھر اس کے اندر گہری حکمت مضمر ہوتی ہے اور وہ اپنے وعدہ کو حقیقت کا روپ دینے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ اس کی مشیت کو رد کرنے والی کوئی قوت نہیں ہے اور اس کے حکم سے کوئی سرتابی نہیں کر سکتا۔ اس پوری کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

اس وعدے کا پورا کرنا دراصل اللہ کے وسیع قانون قدرت کا ایک حصہ ہے اور اللہ کے ناموس اکبر اور اس کے قانون قدرت اور عظیم منصوبہ کائنات کے اندر کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰ : ۶) "مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔ اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے بڑے جبہ و دستار رکھتے ہیں اور ان کے پاس علم کی ایک بڑی مقدار ہے۔ لیکن ان کا علم سطحی ہے اور زندگی کے ظاہری امور سے متعلق ہے۔ اللہ کے اٹل قوانین قدرت' اور اس کائنات کے حقیقی ضوابط اور اس کے عظیم ناموس' اور اس کے نہایت ہی پختہ اور گہرے روابط کا انہیں علم نہیں ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۳۰ : ۷) "لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو ہی جانتے ہیں"۔ اس ظاہر کے پیچھے وہ جھانکنے کی سعی نہیں کرتے اور اپنی بصیرت سے اس کے پس منظر کو دیکھنے کی سعی نہیں کرتے۔ یہ ظاہری دنیا تو صغیر و حقیر ہے۔ اگرچہ لوگوں کو یہ بہت ہی وسیع نظر آتی ہے لیکن دراصل یہ بہت ہی حقیر ہے۔ انسان اس دنیا میں بہت جدوجہد کرتا ہے لیکن انسان کی محدود زندگی میں یہاں بہت ہی کم کچھ کیا جا سکتا ہے اور انسان کی یہ محدود زندگی اس عظیم کائنات کی وسعتوں کے مقابلے میں ان کا ایک مختصر حصہ ہے۔ اور اس زندگی پر بھی انہی قوانین کا کنٹرول ہے جن کا کنٹرول اس پوری کائنات پر ہے۔

وہ شخص جس کا ضمیر و قلب کائنات کے ساتھ مربوط نہیں ہے اور اسے یہ احساس نہیں ہے کہ اس کائنات کو کچھ اٹل قوانین قدرت کنٹرول کر رہے ہیں' ایسا شخص اس کائنات کو بظاہر دیکھ تو رہا ہوتا ہے لیکن وہ اسی طرح ہوتا ہے جس طرح اندھا ہوتا ہے۔ وہ ظاہری اشکال کو دیکھ رہا ہوتا ہے' وہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ یہاں ہر چیز دائرے کی شکل میں سرگرداں ہے لیکن وہ اس حرکت کی حقیقت کا ادراک کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے وہ اس جہاں میں نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت ایسی ہی ہوتی ہے کیونکہ حقیقی مومن تو وہ ہوتا ہے جو اس کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والے زندگی کے اسرار و رموز سے واقف ہو۔ ایسا مومن ہی دراصل علم اور سائنس کو ایسی روح عطا کرتا ہے جو حقائق کا ادراک کرتی ہے۔ اس قسم کا ایمان رکھنے والے لوگ اس جہاں میں قلیل ہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثریت حقیقی معرفت سے محجوب ہوتی ہے۔

وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۰ : ۷) "اور آخرت سے وہ غافل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ آخرت اس کائنات کے سلسلہ میں وجود ہی کی ایک کڑی ہے۔ آخرت کتاب کائنات کا ایک صفحہ ہے' جو لوگ تخلیق کی حقیقت کو نہیں سمجھتے جو لوگ اس کائنات میں پائے جانے والے نوامیس فطرت کو نہیں سمجھتے' وہ آخرت کو بھی نہیں سمجھتے۔ اس لیے وہ آخرت کو اہمیت نہیں دیتے' اس کے لیے تیاری نہیں کرتے' اور وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ حرکت کائنات

کی لائن پر آخرت بھی ایک نکتہ ہے ۔ دنیا اور اس کائنات نے اس نکتے پر پہنچنا ہے اور اس کے بعد پھر نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے ۔

لیکن آخرت سے غفلت کے نتیجے میں ایسے غافل لوگوں کی اقدار مضطرب ہوتی ہیں ' ان کی اقدار حیات میں کوئی ثبات اور پختگی نہیں ہوتی ۔ ان کا تصور حیات ' تعبیر واقعات اور ان کی قدر و قیمت کے پیمانے ناپختہ ہوتے ہیں ۔ ان کا علم سطحی ' ناقص اور ظاہری ہوتا ہے ۔ اس لیے کہ جب ایک انسان اس پوری زندگی کے اختتام پر آخرت کے قیام کو تسلیم کرتا ہے تو اس جہان کے تمام واقعات کے بارے میں اس کا نقطہ نظر بدل جاتا ہے ۔ اسے نظر آتا ہے کہ اس جہان میں اس کی زندگی ایک مختصر سا مرحلہ ہے اور اس جہاں میں اس کا جو حصہ ہے اور ہونا چاہئے وہ آخرت کے مقابلے میں بہت ہی معمولی اور حقیر ہے اور اس جہاں کی پوری زندگی دراصل طویل ترین ڈرامے کا ایک نہایت ہی مختصر شو یا جھلکی ہے ۔ لہذا کسی شخص کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اس طویل ترین ڈرامے کی صرف مختصر ترین جھلکی کو دیکھ کر کوئی فیصلہ کر دے ۔ اگر کوئی نہایت ہی حقیر جھلکی کو دیکھ کر پوری زندگی ' پوری کائنات اور آخرت اور اس کی طویل زندگی کے بارے میں فیصلہ کرے گا تو یہ سطحی فیصلہ ہو گا ۔

یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا انسان جو قیامت کا قائل ہے ' اور جو قیامت کے لیے تیاری کر رہا ہے ' اس انسان کے ساتھ اکٹھا ہو کر نہیں رہ سکتا جس کا مطمع نظر صرف یہ دنیا ہے اور اس دنیا سے آگے اس کا کوئی ہدف نہیں ہے ۔ اس قسم کے دو انسان نہ اس دنیا کے کسی پروگرام پر متفق ہو سکتے ہیں اور نہ ان کا یہاں کسی قدر پر اتفاق ہو سکتا ہے ۔ دونوں کے پیمانے بالکل جدا ہوں گے ۔ غرض ہر واقعہ ' ہر حالت ' اور زندگی کے حالات میں سے ہر حالت کے بارے میں دونوں کا فیصلہ جدا ہو گا کیونکہ دونوں کے میزان الگ ہوں گے ۔ ہر ایک کا زاویہ نظر مختلف ہو گا ۔ ہر ایک کی روشنی بھی مختلف ہو گی ۔ لہذا ہر ایک کو ایک ہی چیز مختلف نظر آئے گی ۔ واقعات ' اقدار اور حالات کے بارے میں دونوں کا تصور جدا ہو گا ۔ ایک دنیا کی ظاہری نظر سے دیکھنے والا ہے اور دوسرا گہری نظر سے واقعات کے پس منظر کو بھی دیکھ رہا ہے ۔ وہ ظاہری اسباب اور واقعات کو بھی دیکھتا ہے اور باطن پر بھی اس کی نظر ہے ۔ وہ ظاہر اور غائب دونوں کا علم رکھتا ہے ۔ دنیا و آخرت دونوں کو جانتا ہے ' حیات اور موت دونوں کی حقیقت کو جانتا ہے ۔ ماضی ' حال اور مستقبل سب کا تصور رکھتا ہے ۔ وہ انسانوں کے جہان سے بھی باخبر ہے اور اس کائنات کے دوسرے جہانوں اور زندوں اور مردوں سب سے واقف ہے ۔ یہ ہے وہ وسیع افق جس پر اسلام انسان کی نظریں فوکس کراتا ہے اور انسان کو ایک ایسا نقطہ نظر دیتا ہے جو انسان کے لائق ہے جو انسان کے لیے بحیثیت خلیفہ اللہ فی الارض ضروری ہے اور انسان کی شخصیت میں اللہ نے جو روحانیت ودیعت کی ہے ' اس کا بھی یہی تقاضا ہے ۔

--- ○○○---

اس غرض کے لیے کہ اللہ کی نصرت کا وعدہ اسی طرح یہ حق ہے جس طرح یہ منظم کائنات ایک عظیم حق پر قائم ہے ' اور یہ کہ آخرت کا قیام اس عظیم سچائی کا لازمی نتیجہ ہے ۔ اب سیاق کلام ہمیں دوبارہ اس کائنات کے ضمیر کی سیر کراتا ہے ۔ آسمانوں میں ' زمین میں اور ان کے درمیان جو جہان موجود ہیں ان میں ۔ اس کے بعد پھر انسان کو خود اس کے اپنے وجود کی سیر کرائی جاتی ہے تاکہ وہ تدبر کریں ' شاید کہ وہ اس حقیقت کبریٰ تک پہنچ جائیں جس سے وہ اس وقت غافل ہو

جاتے ہیں جب وہ آخرت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ کسی سطحی نقطہ نظر کی وجہ سے وہ دعوت اسلامی کی حقیقت کو بھی نہیں سمجھ سکتے کیونکہ یہ دعوت اس عظیم سچائی اور اس کے گہرے تدبر پر مبنی ہے۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم ۗ مَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ ﴿٨﴾

"کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں، برحق اور ایک مدت مقرر ہی کے لیے پیدا کیا ہے مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔

کیا یہ لوگ سوچتے نہیں کہ خود ان کی ساخت اور ان کی تخلیق اور ان کے اردگرد موجود یہ وسیع کائنات اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ وجود ایک سچائی پر قائم ہے۔ ایک ایسے اٹل ناموس فطرت کے مطابق رواں دواں ہے جس کے اندر کوئی اضطراب نہیں ہے۔ یہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ کائنات کبھی ادھر ڈھلک گئی اور کبھی ادھر۔ نہ س کی گردش میں فرق آتا ہے، نہ اجرام فلکی میں تصادم ہوتا ہے اور نہ اس کی حرکت کوئی غیر مرتب اندھی حرکت ہے۔ نہ یہ حرکت بدلتی ہوئی خواہشات کے مطابق بدلتی ہے۔ بلکہ یہ حرکت نہایت ہی گہری، دقیق اور حکیمانہ نظام کے مطابق چل رہی ہے۔ یہ سچائی جس کے مطابق انسانی زندگی اور یہ وسیع کائنات چل رہی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس جہان کا کوئی انجام ہو، جہاں جزاء و سزا پوری ہو سکے۔ جہاں خیر اور شر دونوں کو ان کا بدلہ مل سکے۔ یہ سچائی نظر آتی ہے کہ یہاں ہر چیز ایک مقررہ انجام تک پہنچتی ہے یہ حکمت مدبرہ کے مطابق ہے اور اس کائنات کا ہر واقعہ اپنے وقت پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس میں کوئی تقدیم یا تاخیر نہیں ہوتی۔ اگر انسان یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ آخرت کب وقوع پذیر ہوگی تو اس کے معنی یہ نہیں کہ آخرت نہیں آئے گی۔ آخرت کا عدم علم یا اس کی تاخیر سے صرف وہ لوگ غلط نتائج اخذ کرتے ہیں جو معاملات کا صرف ظاہری پہلو دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح ان کو دھوکہ لگ جاتا ہے۔ اس وجہ سے

اِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ لَكَافِرُونَ (۳۰:۸) "بے شک بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔

---ooo---

ضمیر کائنات اور زمین و آسمان کے درمیان پائے جانے والی مخلوقات کی سیر جو نہایت ہی وسیع سیر ہے جس کے آفاق بہت ہی طویل و عریض ہیں اور ناقابل تصور وسعتیں رکھتے ہیں اور ان آفاق کے اندر متنوع مخلوق ہے۔ جو زندہ اور غیر زندہ، قسم قسم کی اشیاء پر مشتمل ہے جس میں اجرام سماوی، افلاک، نجوم و کواکب، بڑے اور چھوٹے تارے اور سیارے، ظاہر اور چھپے ہوئے، قریب و بعید اور معلوم و نامعلوم ہیں۔ اس وسیع سیر کے بعد اب قرآن کریم ہمیں خود اپنی

تاریخ کی سیر کی دعوت دیتا ہے کہ آغاز انسانیت کے بعد ذرا خود انسانی تاریخ کا بھی مطالعہ کرو' خود اس تاریخ میں بھی یہ عظیم سچائی سنت جاریہ کی صورت میں اپنا کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور انسانی تاریخ کے واقعات بھی ایسے ہی اٹل اسباب کی وجہ سے ظاہر ہوتے ہیں جس طرح اس کائنات کے حوادث۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٩﴾ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ أَسَاءُوا السُّوأَىٰ أَن كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ وَكَانُوا بِهَا يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١٠﴾

۱
ع ۱۰
۴

"اور کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے' انہوں نے زمین کو خوب ادھیڑا تھا اور اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انہوں نے نہیں کیا ہے۔ ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے۔ پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا' مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ آخر کار جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں ان کا انجام بہت برا ہوا اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے"۔

ان آیات میں ہمیں دعوت دی جاتی ہے کہ گزرنے والوں کا جو انجام ہوا' ذرا اس پر بھی غور کرو' یہ بھی تو تمہاری ہی کی طرح کے انسان تھے۔ اسی طرح اللہ کی مخلوق تھے جس طرح تم ہو۔ ان کا انجام تمہارے لیے ایک نمونہ ہے۔ کیونکہ اللہ کی سنت تمام انسانوں کے لیے یکساں ہے۔ اللہ کی سنت انسانی تاریخ کے بارے میں بھی اسی طرح اٹل ہے جس طرح اس کائنات کے بارے میں اٹل ہے۔ اللہ کا انسانوں کی کسی نسل کے ساتھ کوئی مخصوص تعلق نہیں ہے کہ ان کے ساتھ کوئی ممتاز سلوک کرے۔ نہ اللہ کی کچھ خواہشات ہیں جو زمان و مکان کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ معاذ اللہ رب العالمین

یہ اس بات کی دعوت ہے کہ اس زندگی کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھا جائے اور اس پر غور کیا جائے کہ انسانی زندگی کے اس جہاں میں جو روابط و تعلقات ہیں ان کی حقیقت کیا ہے اور گذشتہ تاریخ میں اس انسانیت کی تخلیق اور اس کا انجام کیا رہا ہے تاکہ انسانوں کا کوئی گروہ اور نسل صرف اپنی زندگی' اپنے تصورات اور اپنی اقدار تک محدود نہ ہو جائے۔ تمام نسلوں کے درمیان جو مضبوط رشتہ ہے اس سے غافل نہ ہو جائے اور اس سنت کو بھی نہ بھول جائے جو تمام نسلوں پر حکمران ہے۔ اور ان انسانی قدروں کو بھی نہ بھول جائے جو ہر زمان و مکان میں ایک ہوتی ہیں۔

تاریخ ماضی میں جو اقوام ہو گزری ہیں اور جو اہل مکہ سے پہلے ہو گزری ہیں۔ وہ اہل مکہ سے۔

كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۹:۳۰) "وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے"۔

وَّ اَثَارُوا الْاَرْضَ (۹:۳۰) "انہوں نے زمین کو خوب ادھیڑا تھا"۔ انہوں نے اس میں کھیتی باڑی کا کام بھی کیا اور اس کے باطن کو پھاڑا اور اس کے ذخائر کو نکالا۔

وَ عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا (۹:۳۰) "اور انہوں نے اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا انہوں نے نہیں کیا"۔ وہ لوگ عربوں سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ تھے اور عربوں سے زیادہ زمین کے اندر تعمیرات کرنے والے تھے۔ یہ لوگ اس دنیا کی ظاہری ترقی اور خوبصورتی پر ہی اکتفاء کر گئے اور آخرت کی طرف نگاہ نہ ڈالی۔

وَ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (۹:۳۰) "ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر آئے"۔ لیکن ان روشن نشانیوں کو دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہ کھلیں اور یہ لوگ اس نور پر ایمان نہ لائے جو ان کو صحیح راستہ دکھا رہا تھا۔ چنانچہ ان پر اللہ کی اس سنت کا اطلاق ہو گیا جو ہمیشہ مکذبین پر نافذ ہوتی ہے۔ عذاب الٰہی کے مقابلے میں ان کی قوت ان کے کچھ کام نہ آئی۔ ان کا علم اور ان کی ترقی ان کے کچھ کام نہ آئی۔ اور ان کو ان کی وہ سزا و جزاء ملی جس کے وہ مستحق تھے۔

فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۹:۳۰) "پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے"۔

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى (۱۰:۳۰) "آخر کار جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں ان کا انجام بہت ہی برا ہوا"۔ یعنی وہ لوگ جو برائیوں کا ارتکاب کرتے تھے' ان برائیوں کے مطابق پوری پوری سزا اور جزاء ان کو دے دی گئی اور ان کی برائی کیا تھی؟ یہ کہ

اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ (۱۰:۳۰) "اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے"۔

قرآن کریم تکذیب کرنے والوں اور مزاح اڑانے والوں کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ ذرا خدا کی اسی زمین پر چلیں پھریں اور گھونگھے کی طرح اپنے خول ہی میں بند نہ رہیں۔ انسانی تاریخ کو بھی ذرا پڑھیں کہ آپ جیسے مکذبین اور مزاح کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا انجام بھی ان جیسا ہو۔ اللہ کی سنت اٹل ہے اور وہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی۔ وہ ذرا اپنی سوچ اور فکر کو وسعت دیں۔ پوری انسانیت کو ایک وحدت سمجھیں انبیاء کی دعوت کو ایک سمجھیں۔ اور یہ یقین کر لیں کہ اللہ کے قوانین قدرت کے مطابق تمام لوگوں کا انجام ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ تصور جس میں اسلام تمام مومنین کے فکر و نظر کو رنگنا چاہتا ہے اور اس پر بار بار زور دیتا ہے۔

اس پوری کائنات کی گہرائیوں کے مطابق اور انسانی تاریخ کے گہرے مطالعے کے بعد اب قرآن کریم انسان کو اس

میدان میں لے جاتا ہے جس سے انسان ہمیشہ غافل رہتا ہے۔ یعنی بعث بعد الموت کے میدان میں۔ یہ اس عظیم سچائی کا ایک اہم عنصر ہے جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

"اللہ ہی خلق کی ابتداء کرتا ہے' پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا' پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے"۔

یہ بہت ہی واضح اور سادہ حقیقت ہے اور اس کے دونوں اجزاء اور دونوں کڑیوں کے درمیان ربط بالکل واضح ہے۔ کیونکہ کسی چیز کا پہلی بار بنانا اور اس کا دوبارہ بنانا قابل فہم بات ہے۔ اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تخلیق میں یہی دو حلقے ہوتے ہیں' ان کے درمیان یہی تعلق ہوتا ہے اور انسان کی تخلیق کے بعد اس کے خالق کے سامنے دوبارہ پیش ہونا ایک لازمی اور معقول امر ہے۔ وہی پہلی بار تخلیق کرنے والا ہے اور وہی دوسری بار تخلیق کرنے والا ہے۔ اور یہ اس لیے کہ اچھا اور برا کام کرنے والوں کو وہ پوری پوری جزاء اور سزا دے۔

بعث بعد الموت پر یہ دلیل دینے کے بعد اب یہاں بعث بعد الموت کا ایک منظر پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں اہل ایمان اور اہل کفر کے انجام کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے' جس کے اندر شریکوں اور عقیدۂ شرک کے بودے پن کو اچھی طرح ظاہر کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

"اور جب وہ ساعت برپا ہوگی اس دن مجرم ہک دک رہ جائیں گے۔ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ان کا سفارشی نہ ہو گا اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے۔ جس روز وہ ساعت برپا ہوگی' اس دن (سب انسان) الگ گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں وہ ایک باغ میں شاداں و فرحاں رکھے جائیں گے' اور جنہوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ہے' وہ عذاب میں حاضر رکھے جائیں گے"۔

یہ ہے وہ گھڑی جس سے لوگ غافل ہیں اور جھٹلانے والے جھٹلاتے ہیں۔ یہ دیکھو وہ آگئی اور ذرا دیکھو اس کا منظر'

یہ ہے برپا ہو گئی وہ ۔ ذرا مجرمین کو دیکھو کس طرح حیران و پریشان ہیں ۔ کس قدر مایوس ہیں ' ان کو نجات کی کوئی امید نہیں ہے اور نہ ان کو رہائی کی کوئی امید ہے ۔ وہ شرکاء اور سفارشی جو انہوں نے دنیا کی زندگی میں بنا رکھے تھے اور جن سے وہ دھوکہ کھا کر گمراہ ہو گئے تھے ' ان کی جانب سے اب نہ اقتدار میں کوئی شرکت ہو گی اور نہ وہ سفارش کر سکیں گے ' بلکہ وہ تو ان لوگوں کی طرف سے شرک کرنے اور ان کی بندگی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیں گے کہ ہمیں تو معلوم ہی نہیں ہے کہ ان احمقوں نے ہمیں اللہ رب العالمین کے ساتھ شریک کیا ہے ۔ چنانچہ اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان یوں تفریق کر دی جاتی ہے اور دونوں کے راستے جدا ہو جاتے ہیں ۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ (۳۰:۱۵) " جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے وہ ایک باغ میں شاداں و فرحاں رکھے جائیں گے "۔ وہاں ان کو وہی صورت حال درپیش ہو گی جس سے وہ خوش ہوں گے ۔ ان کے ضمیر میں فرحت پیدا ہو گی اور ان کے دل کو مسرت حاصل ہو گی ۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۳۰:۱۶) " اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا وہ عذاب میں حاضر رہیں گے "۔ یہ ہے آخری انجام نیکوکاروں اور بدکاروں کا ۔

اب عالم آخرت کی سیر اور منظر سے ہم پھر واپس اس دنیا میں آ جاتے ہیں ۔ اس کائنات اور اس کے اندر زندگی اور اس کے اسرار و رموز اور عجائبات و کرامات کی سیر شروع ہوتی ہے ۔ فی الواقعہ یہ کائنات ایک دلچسپ تفریح گاہ ہے ۔ آغاز سفر صبح و شام اللہ کی حمد سے ہوتا ہے کہ صبح و شام کے مناظر کو ذرا دیکھو کس قدر دلفریب مناظر ہوتے ہیں ۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَ

مِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ ابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ۝۲۳ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَاؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۝۲۴ وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةًۖۗ مِّنَ الْاَرْضِۖۗ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ۝۲۵ وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ۝۲۶ وَ هُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِؕ وَ لَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۝۲۷ الربع ۸ ع ۳ ۶

”پس تسبیح کرو اللہ کی جب کہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو۔ آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے حمد ہے اور (تسبیح کرو اس کی) تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے۔ وہ زندہ کو مردے میں سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ میں سے نکال لاتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ اسی طرح تم لوگ بھی (حالت موت سے) نکال لیے جاؤ گے۔

اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بشر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کی پیدائش، اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جوں ہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا، بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے، اس کے بندے ہیں۔ سب کے سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہی اللہ ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے، پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے

آسان تر ہے ۔ آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے بر تر ہے اور وہ زبر دست اور حکیم ہے"۔

یہ اس کائنات کا نہایت ہی گہرا اور عظیم مطالعاتی سفر ہے ۔ اس کائنات کی دوریوں اور گہرائیوں تک ۔ انسانی قوائے مشاہدہ کو صبح و شام کے مناظر کی سیر کرائی جاتی ہے ۔ زمین کے مناظر اور آسمانوں کے مناظر' صبح و شام کے علاوہ پھر دوپہر کی دنیا ۔ ان آفاق و مناظر میں حیات و ممات اور بہار و خزاں کی کارستانیاں دکھائی جاتی ہیں' ان خوشگوار فضاؤں میں انسان کو بتایا جاتا ہے کہ وہ ذرا اپنی تخلیق پر غور کرے' اپنی فطرت کے رجحانات اور میلانات کا مشاہدہ کرے ۔ اپنی جسمانی اور روحانی قوتوں اور ان کی کشاکش کو ذرا دیکھے ۔ اس دنیا میں ہر چیز جوڑے جوڑے ہے ۔ ان جوڑوں کی باہمی محبت کو دیکھے' اور زوجین کے رجحانات و میلانات اور ان کے قوائے فطرت کو ذرا دیکھے اور اس کائنات کے زمین و آسمان' باغ و راغ اور رنگ ڈھنگ اور پھر انسانوں کی شکلیں' ان کے رنگ اور ان کی ہزارہا زبانیں اور پھر انسان کی بیداری' اس کی ہشیاری اور اس کی نیند اور اس کی جدوجہد اور اس کا آرام ۔ پھر اس طبیعی کائنات میں طوفان باد باران اور برق و بادل اور پھر لوگوں کا ان کو چاہنا اور ان سے ڈرنا' اور پھر زمین کی مردنی اور روئیدگی اور پھر زندگی اور بہار اور پھر بحیثیت مجموعی اس کائنات کا قیام اور گردش اور نظام و انتظام' یہ سب کام اللہ کے سوا اور کون کر سکتا ہے ۔ یہ اللہ ہی تو ہے جس کی یہ تجلیات ہیں ۔ اس کے لیے یہ سب کام بہت ہی آسان ہیں ۔ وہی ہے جس نے ان اشیاء کو پیدا کیا ہے اور وہی ہے جو ان کو دوبارہ پیدا کرے گا اور دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے بہت ہی آسان ہے ۔ آسمانوں اور زمینوں میں ذات باری کے اعلیٰ مشاہد موجود ہیں جو بے مثال ہیں ۔

فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ (۳۰:۱۷) وَ لَهُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ (۳۰:۱۸) "پس تسبیح کرو اللہ کی جب کہ تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو ۔ آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے حمد ہے اور (تسبیح کرو اس کی) تیسرے پہر اور جبکہ تم پر ظہر کا وقت آتا ہے"۔ تسبیح کا یہ حکم اور حمد سابق فقرات و آیات میں بیان کردہ مشاہد قیامت کے بعد آتا ہے جس میں بتایا گیا کہ اہل ایمان جنت کے ایک مخصوص باغ میں خوش و خرم ہوں گے ۔ اور کافر اور جھٹلانے والے' عذاب اور سزا کے سامنے پیش کیے جائیں گے ۔ تو یہ تسبیح دراصل بطور نتیجہ یہاں لائی گئی ہے اور سابقہ مناظر قیامت دراصل اس مطالعہ کائنات کے لیے تمہید تھے کہ یہ وسیع کائنات اور اس کے نشیب و فراز' نفس انسانی اور اس کی نفسیات و عجائبات اور اللہ کی یہ تخلیق اور اس کے اسرار و رموز یہ سب کے سب لایعنی نہیں ہیں ۔ ان پر قیامت کے نتائج مرتب ہوں گے ۔ پس سابقہ مناظر قیامت اور موجودہ مطالعہ کائنات کے اندر مکمل ربط و مناسبت ہے ۔

یہاں تسبیح اور حمد کے لیے کچھ اوقات بھی مقرر کیے گئے ہیں ۔ شام کے اوقات میں اور صبح کے مناظر میں' پچھلے پہر اور پہلے پہر میں ۔ پھر اس حمد و تسبیح کو آفاق سماوات کے ساتھ بھی جوڑا گیا تاکہ زمان و مکان کے فاصلے مٹا کر اس حمد و تسبیح کو ہمہ گیر بنا دیا جائے اور انسان کا دل ہر وقت اور ہر جگہ اللہ کے ساتھ جڑا رہے ۔ وہ اس کائنات کے ڈھانچے' کرات سماوی کی گردش اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مظاہر صبح و مساء کے مظاہر کو دیکھ کر انسان ہر لمحہ اللہ کو یاد کرے ۔ اس کا دل کھلا رہے' حساس رہے' اور اپنے ماحول کے حوالے سے بیدار رہے ۔ اپنے بدلتے ہوئے حالات میں ماحول کا

مشاہدہ کرتا رہے اور اللہ کی حمد و تسبیح کے ساتھ یہ غور و فکر جاری رہے - اور ان تمام امور کو اللہ اور خالق کائنات کی آیات و معجزات سمجھے - یہ تمام حالات' تمام مظاہر' اور تمام اوقات دراصل ایک معجزہ کردگار ہیں -

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ (۳۰:۱۹) "وہ زندہ کو مردے میں سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ میں سے نکالتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے اور اسی طرح تم لوگ بھی نکالے جاؤ گے"۔

"ہاں وہ زندہ چیزوں سے مردوں کو نکالتا ہے اور مردہ چیزوں سے زندہ کو نکالتا ہے"۔ اور یہ ایک دائمی عمل ہے - نہ رکنے والا عمل ہے - ایک لمحے کے لیے بھی اس میں توقف نہیں ہوتا - رات اور دن ہروقت یہ عمل جاری ہے' ہر زمان و مکان میں جاری ہے - زمین کی سطح میں سے چپے چپے پر جاری ہے - فضائے کائنات میں جاری ہے' سمندر کی تہوں میں جاری ہے' ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں' یہ عمل کوئی غیر معمولی عمل نہیں ہے' یہ تو ایک معجزہ ہے' لیکن رات اور دن اسے دیکھتے دیکھتے ہم اس کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اس کا معجزانہ پہلو نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے حالانکہ ہر لحظہ نئی آن اور شان کے ساتھ مردے سے زندہ اور زندہ سے مردہ نکل رہا ہے - ایک مردہ اور خشک بیج زمین میں ڈالا جاتا ہے اور اس سے خوشنما پودے اور پھول پیدا ہوتے ہیں' فصلیں اگتی ہیں اور جب یہی پھل پھول خوشے اور پودے خشک ہو کر بھوسہ بن جاتے ہیں تو اس خشک بھوسے کے اندر ہزارہا مردہ بیج تیار ہو چکے ہوتے ہیں جن کے اندر پوری حیات موجود ہوتی ہے - یہ مردہ پھر فضائے کائنات سے گرمی گیس' پانی اور تپش حاصل کر کے پھر زندہ ہوتا رہتا ہے - انسانوں اور حیوانوں کے جنین اور پرندوں کے جنین اور انڈے مختلف اشکال اور مختلف اندازوں سے زندگی کی شکل اختیار کرتے ہیں - غرض انسان' حیوانات' کیڑے اور مکوڑے اور حشرات اور بیج اور انڈے ہروقت زندگی اختیار کرتے رہتے ہیں اور پھر مردہ بیج پیدا کرتے رہتے ہیں -

یہ ایک مسلسل سرکل ہے اور زندہ مردہ اور مردہ زندہ ہوتا رہتا ہے - کیا کسی زندہ اور جاگنے والے دل کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اللہ دوبارہ تخلیق کر سکتا ہے - قرآن کی روشنی میں اس بات کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ قرآن کی روشنی اللہ کے نور سے نکلی ہوئی ہے -

وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ (۳۰:۱۹) "بعینہ اسی طرح تم نکالے جاؤ گے"۔ یہ ایک سہل الفہم مسئلہ ہے - ایک عام اور معمولی بات ہے' یہ تو تمہارا مشاہدہ ہے - کائنات میں رات اور دن دیکھا جا رہا ہے - رات اور دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے -

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ (۳۰:۲۰) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر یکایک تم بشر ہو کر پھیلتے جا رہے ہو"۔ مٹی مردہ اور ساکن ہے - اس مٹی ہی سے انسان کو پیدا کیا گیا - قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ آیا ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ "ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا"۔ (المومنون : ۱۲) مٹی دراصل انسان کا اصل الاصول ہے لیکن یہاں انسانی شخصیت کے اس اصل مادے کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ انسان مکمل شکل میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ ذرا تخلیق انسان کے اصل مادے کو دیکھو اور پھر تخلیق شدہ مکمل انسان کو دیکھو، دونوں کے اندر کس قدر فرق ہے۔ خصوصاً یہ اصول بیان کرنے کے بعد کہ

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (۳۰ : ۱۹) "وہ زندہ سے مردہ چیزوں کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردے کو نکال لاتا ہے"۔ قرآن کریم کے انداز کے مطابق یہ معنوی ربط ہے۔

یہ معجزہ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی ہے۔ اور اس کی تشریح کر کے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اس زمین پر رہنے والے انسان اور اس زمین کا آپس میں رشتہ کیا ہے اور وہ کیا نکتہ ہے جس میں وہ باہم ملتے ہیں یعنی اپنی اصل تخلیق اور ان قوانین قدرت کے زاویہ سے جو خود انسان پر بھی نافذ ہیں اور اس کائنات پر بھی نافذ ہیں۔

اس مردہ مٹی کے اندر یہ عظیم انقلاب بذات خود ایک معجزہ ہے کہ وہ ایک مردہ اور پیش پا افتادہ شکل سے ایک انسانی ذی اقتدار اور ذی قدر کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ یہ ایک ایسی تبدیلی اور صنعت کاری ہے جس سے اللہ جل شانہ کی عظیم صنعت کاری کا علم ہو جاتا ہے۔ انسان کا قلب و ضمیر بے ساختہ اللہ کی تسبیح و تمجید پر آمادہ ہو جاتا ہے اور انسان اللہ جل شانہ کی اس عظیم صنعت کاری پر رطب اللسان ہو جاتا ہے۔

پھر خود انسان کی زندگی کی تقسیم مرد اور عورت کی شکل میں اور ان اصناف کا باہم تعلق اور مشترکہ زندگی کا موضوع سامنے آتا ہے۔ کیا یہ کسی خارق العادت معجزے سے کم معجزہ ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰ : ۲۱) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ لوگوں کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کے جذبات جنس مخالف کے ساتھ کیا ہوتے ہیں۔ دونوں اجناس کے شعور اور اعصاب ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور اپنے جذبات اور میلانات کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے لیے بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔ یہ جذبات اور میلانات ان کو بے شمار کاموں اور مشقتوں پر آمادہ کرتے ہیں۔ لیکن جس ذات حکیم نے یہ سب کچھ کیا ہے اس کے دست قدرت کی طرف میاں بیوی کے رجحانات جاتے ہی نہیں۔ جس خالق نے ان نفوس کے اندر یہ کشش اور یہ میلان رکھا ہے اسے کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔ حالانکہ میاں بیوی کے اس تعلق کی وجہ سے انسان کے جسم، اس کی روح، اس کے اعصاب بلکہ اس کی پوری زندگی کے اندر ایک سکون اور ٹھہراؤ اور سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس تعلق سے انسان جسمانی اور روحانی لذت بھی حاصل کرتا ہے اور یہ لذت مرد اور عورت دونوں کے لیے برابر ہوتی ہے۔

یہاں قرآن نے نہایت ہی لطیف اور نازک انداز بیان اختیار کیا ہے اور نہایت ہی اشاراتی پیرایہ میں میاں بیوی کے

تعلق کو ظاہر کیا ہے ۔گویا قرآن دل کی گہرائیوں اور احساس و شعور کی تہوں میں تصویر کھینچ رہا ہے ۔

لِتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡهَا (۳۰ : ۲۱) "تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو"۔

وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً وَّرَحۡمَۃً (۳۰ : ۲۱) "تمہارے درمیان الفت اور باہم نرمی کے جذبات پیدا کر دیئے"۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ (۳۰ : ۲۱) "یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ اور جب وہ فکر کریں گے تو ان کو معلوم ہو گا کہ مرد اور عورت کی اصناف کی تخلیق کے اندر خالق نے کیا کیا حکمتیں رکھی ہوئی ہیں۔ طبیعی لحاظ سے دونوں کو کس طرح ایک دوسرے کے مواق اور تکمیلی بنایا ہے۔ کس طرح دونوں ایک دوسرے کی فطری ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے نفسیاتی' عقلی اور جسمانی لحاظ سے تکمیل کا درجہ رکھتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اطمینان' استقرار اور سکون کی جگہ ہیں۔ دونوں کے اجتماع سے تکمیل ہو جاتی ہے اور ایک خود مختار یونٹ وجود میں آجاتا ہے۔ اس یونٹ کے اندر محبت اور رحمت ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی جسمانی' نفسیاتی' اعصابی اور طبیعی تشکیل ہی ایسی ہے کہ ایک دوسرے کے سوا ادھوری ہے۔ مرد عورت کی خواہشات کی تسکین کا محل ہے اور عورت مرد کی خواہشات کی تسکین کی جگہ ہے۔ اس طرح دونوں کا اتحاد یکجہتی اور ملاپ اس کرۂ ارض پر صدور حیات کا ذریعہ ہے۔اس سے زندگی کی فصل کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔

وَمِنۡ اٰیٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَاَلۡوَانِکُمۡ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ (۳۰ : ۲۲) "اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمان و زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے"۔ زمین و آسمان کی تخلیق وہ نشانی ہے جس کی جانب قرآن کریم نے بار بار توجہ مبذول کرائی ہے لیکن ہم رات اور دن اس زمین کے اوپر رہتے ہیں اور اس آسمان کے نیچے رہتے ہیں لیکن ہم اللہ کی اس تخلیق پر غور نہیں کرتے۔حالانکہ زمین و آسمان اس قابل ہیں کہ ان پر طویل عرصہ تک غور کیا جائے اور بار بار غور کیا جائے اور گہرا غور و فکر کیا جائے۔

خلق السموات کا مفہوم کیا ہے کہ اللہ نے یہ عظیم' پیچیدہ اور نہایت ہی وسیع کائنات تخلیق کی ہے۔اس عظیم اور وسیع کائنات کے ایک نہایت ہی معمولی حصے کا علم ہم ابھی تک حاصل کر سکے ہیں۔ افلاک اور فلکی کرات کا یہ عظیم اور لاتعداد اژدھام' ستارے' سیارے' ان کے مدار' کہکشاں اور پھر بلیک ہول۔اس پوری کائنات کے اندر ہماری یہ زمین اس طرح ہے جس طرح ایک حقیر ذرہ جو ہماری اس زمین کی فضا میں اڑ رہا ہے جس کا نہ کوئی وزن ہے اور نہ کوئی سایہ ہے۔اس ہولناک کائنات کی ناقابل تصور وسعت کے ساتھ یہ کائنات نہایت دقیق اور ناقابل تغیر نظم کے ساتھ جاری و ساری ہے۔اس کی حرکات اور اس کے کرات کے مدارات میں بے انتہا نظم و ضبط ہے حالانکہ ان کے درمیان طویل فاصلے ہیں۔ان حرکات میں کوئی اضطراب کوئی بے قاعدگی نہیں ہے اور ہر چیز حکم ربی کے مطابق چل رہی ہے۔

یہ مشاہدہ تو عمو ا حجم اور ان کرات کی حرکت کے نظم کے اعتبار سے ہے۔ رہے اس کائنات کے اسرار تو اس کے اندر پائی جانے والی متنوع مخلوقات ' ان کے مزاج اور وہ حالات جن میں وہ مخلوق رہتی ہے اور وہ حالات جو اس پر طاری ہوتے ہیں تو ان کی انتہا نہیں ہے ۔ پھر وہ قوانین جو اس تمام مخلوق کو محفوظ رکھتے ہیں ' اس مخلوق کو چلاتے ہیں ' اور اس کے اندر تصرف کرتے ہیں تو ان کی انتہا تک پہنچنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے ۔ ان تمام امور اور موضوعات پر انسان کا علم بہت ہی محدود ہے ۔ سمندر میں سے قطرے کے برابر بھی نہیں ہے ۔

زمین و آسمان کی تخلیق پر یہ ایک سرسری نظر ہے ' بہت ہی اختصار کے ساتھ ۔ سائنس دان اور علمائے انسانیات نے اس سلسلے میں جو مختصر سا علم حاصل کر لیا ہے اس پر ہم طویل بحث کر سکتے ہیں ۔ اب تک جو معلومات فراہم ہو سکی ہیں ان کے مطابق یہ کائنات بہت ہی عظیم ہے اور اس کے مختلف اجزاء باہم مربوط ہیں ۔ یہ تمام اجزاء بغیر اس کے کہ باہم متصادم ہوں ' روز تخلیق سے حرکت میں ہیں ' ایک سیکنڈ کے لیے بھی ان میں ٹھہراؤ نہیں ہے لیکن اس عجیب نظام میں جو بہت ہی پیچیدہ ہے ' کبھی بھی یہ اجزاء اور اجرام باہم متصادم نہیں ہوتے ۔ اس نظام کے بارے میں موجودہ فراہم شدہ معلومات کے باوجود بعض ہلکے لوگ یہ کہنے کی جرات کرتے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے ۔ اور پھر اس کا کوئی مدبر نہیں ہے جو اسے یوں چلا رہا ہے ۔ ان نام نہاد سائنس دانوں کی یہ بکواس آج بھی سنی جاتی ہے ۔

پھر ان آسمانوں اور زمین کے ساتھ ساتھ اس میں پائے جانے والوں یعنی مختلف انسانوں کے مختلف رنگ اور مختلف شکلیں اور مختلف زبانیں ۔ یہ اختلاف بھی تخلیق سماوات سے مربوط ہے ۔ زمین پر مختلف قسم کے رنگوں اور زبانوں کا تعلق بھی تخلیق سماوات سے ہے ۔ مختلف علاقوں اور موسموں سے رنگ اور زبانیں بدل جاتی ہیں ۔ انسان کے رنگ و زبان اور شکل و صورت کا موسمیات کے ساتھ گہرا ربط ہے ۔

ہمارے دور کے علماء اور سائنس دان لوگوں کے رنگ اور زبانوں کے اختلاف کو دیکھتے ہیں اور کبھی انہوں نے اس پر غور نہیں کیا اور نہ وہ اس حقیقت کی طرف جاتے ہیں کہ اللہ کی تخلیقات کے یہ نمونے ہیں اور یہ کہ یہ باتیں بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں ۔ حالانکہ وہ زبانوں کے اختلاف پر بہت ہی گہرا مطالعہ کرتے ہیں لیکن وہ اسے اللہ کی نشانی سمجھ کر اللہ تک پہنچنے کی سعی نہیں کرتے ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ باوجود اس کے کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم سائنس دان ہیں مگر دراصل وہ سائنس دان نہیں ہیں ۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۳۰ : ۷) "یہ لوگ اس زندگی کے بھی بس ظاہری پہلو کو جانتے ہیں" ۔ اور انسان اور علوم انسانی کا یہ پہلو کہ لوگوں کے رنگ مختلف ہیں اور زبانیں مختلف ہیں اسے صرف حقیقی علماء اور مومن سائنس دان ہی دیکھ سکتے ہیں ۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ (۳۰ : ۲۲) "بے شک اس میں نشانیاں ہیں صرف دانش مندوں کے لیے" ۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

يَسْمَعُوْنَ(۳۰ : ۲۳) ''اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا' اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور سے سنتے ہیں''۔ اس آیت میں بھی کائناتی مظاہر اور ان کے ساتھ انسانی احوال میں تبدیلی کی بات کی گئی ہے اور دونوں کے درمیان تعلق دکھایا گیا ہے۔ جس کے ذریعے اس عظیم الجثہ موجودات کے اندر ربط ظاہر ہوتا ہے اور ان کے درمیان ہم آہنگی بتائی جاتی ہے۔ شب و روز کے اختلاف کے ساتھ انسان کا سونا اور جاگنا اور اس دنیا میں رزق حلال کے لیے جدوجہد کرنا مربوط ہے۔ رزق حلال کو یہاں فضل الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے بشرطیکہ وہ آرام کے بعد رزق حلال کے لیے جدوجہد کریں اللہ نے اس کائنات کو یوں بنایا ہے کہ وہ انسان کے لیے اس کی جدوجہد آسان کر دے اور وہ اس کرۂ ارض پر خوشگواری سے رہ سکے۔ اس جدوجہد کے لیے دن کی روشنی کو موزوں بنایا ہے۔ آرام اور راحت کے لیے رات کی تاریکی کو آسان بنایا ہے۔ یہ منظر اس کرۂ ارض پر رہنے والی بیشتر مخلوقات کے لیے ہے۔ ہر کسی کے لیے درجہ بدرجہ سہولت کا انتظام کیا گیا ہے۔ غرض نظام کائنات میں موجودات میں سے ہر موجود اپنے لیے سہولیات پاتا ہے اور یہ سہولیات اس کے لیے نہایت فطری ہیں۔ اس کی فطرت اور اس کی زندگی سے ہم آہنگ اور خوشگوار۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ (۳۰ : ۲۳) ''یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سنتے ہیں''۔ نیند سکون ہے اور سعی حرکت ہے۔ دونوں کا ادراک سننے سے ہوتا ہے۔ لہٰذا یسمعون کا لفظ قرآن کریم کے اسلوب بیان کے مطابق نہایت ہی موزوں ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۳۰ : ۲۴) ''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے' پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے' یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔

بجلی کی چمک اس کائناتی نظام اور اس کی تخلیق کا ایک منظر ہے۔ بعض سائنس دانوں نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ بادلوں کے اندر بجلی موجود ہوتی ہے۔ جب ان کے دو ٹکڑے باہم ملتے ہیں تو اس ٹکراؤ سے بجلی کا ایک شرارہ بادلوں کے اندر پائے جانے والی بجلی کو مشتعل کر دیتا ہے یا یوں ہوتا ہے کہ یہ بادل کسی پہاڑ کی چوٹی سے ٹکراتے ہیں اور ان سے یہ اشتعال پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے یہ بجلی چمک اٹھتی ہے۔ بالعموم اس چمک اور تصادم کے بعد بارش ہو جاتی ہے۔ بہرحال اس کی حقیقت جو بھی ہو' لیکن یہ اس کائنات میں دست قدرت کا ایک مظاہرہ ہے' ایک خوفناک مظاہرہ۔ یہ اللہ کی ان قوتوں اور قدرتوں کا ظہور ہے جو اس نے اس کائنات میں ودیعت کی ہوئی ہیں۔

کا اسلوب بیشتر اوقات میں یہی ہے کہ وہ ان قدرتی مظاہر کی حقیقت اور ان کے سائنسی اسباب پر بات نہیں کرتا بلکہ ان مظاہروں سے صرف یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انسان کا دل و دماغ ان مظاہر کو دیکھ کر خالق تک رسائی حاصل کر لے۔ اس لیے قرآن مجید ان مظاہر سے یہی سبق عطا کرتا ہے کہ یہ قدرت الٰہیہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (۳۰: ۲۴) "اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے۔ خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی"۔ یہ وہ احساسات ہیں جو بجلی کی چمک کے ساتھ انسان میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔ انسان ڈرتا بھی ہے کیونکہ یہ انسانوں' حیوانوں اور فصلوں کو جلا دیتی ہے۔ اور پھر اس عظیم قوت اور چمک اور کڑک کو دیکھ کر انسان کے اندر اس عظیم الہیکل کائنات کی قوتوں سے خوف پیدا ہو جاتا ہے اور طمع یوں پیدا ہوتا ہے کہ اکثر اوقات بجلی کے ساتھ بارش ہوتی ہے جو انسان کے لیے بہت ہی مفید ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے چمک اور کڑک کے ساتھ بارش کا ذکر کر دیا ہے۔ وَّ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۰: ۲۴) "اور آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ساتھ مردہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے"۔

زمین کی طرف مرنے کی نسبت اور پھر مرنے کے بعد اس کی طرف زندگی کی نسبت کر کے یہ تصور دیا جا رہا ہے کہ یہ زمین دراصل زندہ ہے۔ یہ بھی زندہ ہوتی ہے اور مرتی ہے۔ اور حقیقت میں بھی یہ ایسی ہی ہے جس طرح قرآن کریم اس کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ یہ زمین بھی دراصل ایک زندہ مخلوق ہے۔ یہ اللہ کے حکم کا امتثال کرتی ہے۔ اپنے رب کی مطیع اور فرمانبردار ہے۔ ہر وقت رب کے احکام پر لبیک کہتی ہے۔ یہ اللہ کی بندگی میں ہے اور یہ انسان جو اس کرۂ ارض پر رینگ رہا ہے' یہ بھی اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے۔ یہ بھی اس زمین کے ساتھ اللہ رب العالمین کے احکام کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔

مزید یہ کہ جب زمین پر بارش ہوتی ہے تو اس کے اندر سرسبزی اور شادابی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے بڑھنے والی فصلیں اگتی ہیں اور اس زمین کی سطح پر وہ لہلہاتی ہیں۔ یوں یہ زمین زندہ نظر آتی ہے۔ اس طرح جس طرح انسان اور حیوان زندہ ہوتے ہیں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۳۰: ۲۴) "یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں"۔ وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (۳۰: ۲۵) وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۳۰: ۲۶) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جوں ہی کہ اس نے تمہیں' زمین سے پکارا' بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں' اس کے بندے ہیں۔ سب کے سب اسی کے تابع فرمان ہیں"۔

آسمانوں اور زمین کا انتظام و قیام نہایت ہی سلیم و متین انتظام ہے جس کی حرکات متعین ہیں اور ان میں ایک سیکنڈ کی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔ یہ اللہ جل شانہ کی تدبیر سے ہے۔ کوئی مخلوق یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ یا اس کے سوا کوئی اور یہ انتظام کر رہا ہے اور کوئی عقلمند شخص اس بات کا قائل نہیں ہو سکتا کہ یہ سب کچھ بغیر کسی کرنے والے مدبر کے ہو رہا

ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ اللہ کے معجزات میں سے ایک معجزہ نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ یہ زمین و آسمان اللہ کے کھڑے کرنے سے کھڑے ہیں۔ اللہ کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں' اس کے مطیع فرمان ہیں۔ ان میں کوئی سرتابی' انحراف اور اضطراب نہیں ہے۔

ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (۳۰:۲۵) "پھر جونہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارابس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے"۔ جو سائنس دان بھی اللہ کے اس نظام اور ان اندازوں اور ان قدرتوں پر غور کرے وہ اللہ کی اس دعوت کے جواب میں لبیک ہی کہہ سکتا ہے کہ جب اللہ پکارے گا تو لوگ خود کار طریقوں سے نکل آئیں گے۔

اب یہاں اس بیان اور مضمون کا خاتمہ آتا ہے اور اس میں بتایا جاتا ہے کہ انسان' حیوان' نباتات و جمادات سب کے سب اللہ کے مطیع فرمان ہیں۔

وَلَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۳۰:۲۶) "اور آسمان و زمین میں جو ہیں اس کے بندے ہیں۔ سب کے سب اس کے تابع فرمان ہیں"۔ مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان میں جو مخلوق بھی ہے وہ اللہ کے بندے ہیں' طوعاً و کرہاً مطیع فرمان ہیں اور یہ سب کچھ اللہ کی سنت کے مطابق چلتے ہیں اور ان میں نہ تخلف ہو سکتا ہے اور نہ انحراف ہو سکتا ہے۔ سب چیزیں اللہ کی سنت اور مشیت کی محکوم ہیں۔ دینی اعتبار سے وہ مومن ہوں یا کافر ہوں۔ اگرچہ ان کا دل اور دماغ کافر ہوتا ہے لیکن ان کا پورا جسم اور ان کے گرد پھیلی ہوئی یہ پوری کائنات اللہ کی مطیع ہے۔ جس طرح کائنات کی دوسری اشیاء سنت الہیہ کے لیے قانت اور مطیع ہیں اسی طرح انسان بھی ہے۔ رب کائنات کا یہ گہرا' طویل اور عظیم سفر آخری اور اہم بات پر ختم ہوتا ہے کہ ایک دن تم نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے لیکن تم اس دن سے غافل ہو۔

وَهُوَ الَّذِىْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳۰:۲۷) "وہی اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے' پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

اس سورہ میں آغاز تخلیق اور اعادہ تخلیق کا ذکر پہلے بھی ہوا ہے۔ اس طویل سفر اور کائنات کی سیر کے بعد از سر نو اس کا ذکر اس اضافے سے کیا جاتا ہے۔

وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (۳۰:۲۷) "اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے"۔ حالانکہ اللہ کے لیے کوئی چیز نہ آسان ہے اور نہ مشکل ہے اس کا معاملہ تو یہ ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ "اس کا معاملہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا

ارادہ کرتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا' پس وہ ہو جاتی ہے"۔ لیکن اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس انداز میں سمجھاتے ہیں جس طرح' اللہ جانتا ہے کہ وہ سمجھ سکتے ہیں۔ لوگوں کے ہاں پہلی تخلیق سے اعادہ آسان ہوتا ہے لیکن وہ خود اپنے تجربات کے خلاف جاتے ہیں کہ ابتدائی تخلیق سے اعادہ مشکل ہے۔ حالانکہ اعادہ آسان ہونا چاہئے۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۳۰: ۲۷) "آسمانوں اور زمین میں اس کی صفت سب سے برتر ہے"۔ وہ آسمانوں اور زمین میں منفرد ہے۔ اس کی ذات و صفات میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ وہ اکیلا اور حمید ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۳۰: ۲۷) "وہ زبردست اور حکیم ہے"۔ زبردست ہے اور قاہر ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکیم ہے جو بھی کرتا ہے حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کا کیا نہایت ہی پختہ اور پورا پورا ہوتا ہے۔ کامل مکمل۔

اس عظیم مطالعاتی سفر کے اختتام پر' جس میں ہم نے اس کائنات کے آفاق' طول و عرض' اس کے ظاہری احوال اور اس کی گہرائیوں کا سفر کیا' جس میں ہم نے مناظر بھی دیکھے اور حقائق بھی اخذ کیے' اب سیاق کلام میں عقل و خرد کی تاروں پر آخری ضرب لگائی جاتی ہے۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ أَنفُسِكُمْ ۖ هَل لَّكُم مِّن مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن شُرَكَاءَ فِي مَا رَزَقْنَاكُمْ فَأَنتُمْ فِيهِ سَوَاءٌ تَخَافُونَهُمْ كَخِيفَتِكُمْ أَنفُسَكُمْ ۚ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٢٨﴾

"وہ تمہیں خود تمہاری اپنی ہی ذات سے ایک مثال دیتا ہے۔ کیا تمہارے ان غلاموں میں سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں' کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو ہمارے دیئے ہوئے مال و دولت میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہوں اور تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے ہمسروں سے ڈرتے ہو۔ اس طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

یہ مثال ان لوگوں کے لیے دی گئی ہے جو اللہ کی مخلوق میں سے کسی مخلوق کو اللہ کا شریک بناتے ہیں۔ چاہے جن ہوں' چاہے ملائکہ ہوں' پتھر ہوں یا درخت ہوں' لیکن ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود اپنے مالوں میں' اپنے نوکروں اور غلاموں کو شریک نہیں کرتے۔ اپنے غلام کو شریک کیا' اپنے برابر انسان کا درجہ بھی نہیں دیتے۔ لہٰذا ان کا یہ رویہ بہت ہی عجیب ہے کہ وہ اللہ کا شریک ان لوگوں کو بناتے ہیں جو اللہ کی مخلوق ہیں جبکہ اپنے زیردستوں کو اپنے مالوں میں شریک نہیں کرتے۔ یہ ان کا مال خود ان کا تخلیق کردہ بھی نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کا تخلیق کردہ ہے۔ لہٰذا ان کے موقف میں یہ واضح

تضاد ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اس تمثیل کو نہایت ہی تدریج کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (۲۸:۳۰) "وہ تمہیں خود تمہاری اپنی ہی ذات سے مثال دیتا ہے"۔ یہ مثال تمہاری عملی زندگی سے دور نہیں ہے کہ تم اسے سمجھ نہ سکو۔ اس کے ملاحظے کے لیے کسی دور دراز علاقے کا سفر ضروری نہیں ہے۔

هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ

(۲۸:۳۰) "کیا تمہارے ان غلاموں میں سے جو تمہاری ملکیت میں ہیں' کچھ غلام ایسے بھی ہیں جو ہمارے دیئے ہوئے مال و دولت میں تمہارے ساتھ برابر کے شریک ہوں"۔ ظاہر ہے کہ مشرکین مکہ تو یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ ان کے غلام ان کی دولت میں شریک ہوں چہ جائیکہ کہ ان کے حقوق ان کے ساتھ مساویانہ ہوں۔

تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ (۲۸:۳۰) "اور تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے آپ سے ڈرتے ہو"۔ یعنی ان کو وہی مرتبہ و مقام دیتے ہو جو تم آپس میں اپنے آزاد شرکاء کو دیتے ہو۔ اور تم ڈرتے ہو کہ وہ تم پر ظلم کریں گے اور تم ان کے ساتھ ظلم کرنے سے احتیاط کرتے ہو کیونکہ ان کو تمہارے ساتھ برابر کا مقام و مرتبہ حاصل ہے کیا تمہارے ماحول میں اور خود تمہارے معاشرے میں ایسا ہوتا ہے؟ اگر خود تم اپنے غلاموں کے ساتھ مساویانہ سلوک نہیں کرتے ہو اور نہ اس پر راضی ہوتے ہو تو بتاؤ کہ ملاء اعلیٰ کے بارے میں کیونکر ایسی بات سوچتے ہو۔

یہ ایک واضح' سادہ اور فیصلہ کن مثال ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر کوئی جدل و جدال نہیں رہتا۔ یہ مثال ایک نہایت ہی سادہ استدلال اور عقل سلیم پر مبنی ہے۔

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۲۸:۳۰) "اسی طرح ہم آیات کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

ان کے عقائد کے اس پوچ تضاد کو یہاں تک کھول کر بیان کر دینے کے بعد اب یہ بتایا جاتا ہے کہ ان کے عقائد کے اندر یہ تضاد پیدا کیوں ہوا۔ اس کا اصل سبب کیا ہے۔ صرف یہ کہ ان کا نفس یہی چاہتا ہے اور جب کوئی شخص خواہشات نفسانیہ کا غلام ہو جائے تو پھر عقل و بصیرت سے محروم ہو جاتا ہے۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۲۹

"مگر یہ ظالم بے سمجھے بوجھے اپنے تخیلات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ اب کون اس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو، ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہو سکتا"۔

ہوائے نفس کا پھر نہ کوئی معیار ہوتا ہے اور نہ کوئی ضابطہ ہوتا ہے۔ بس نفس انسانی کی بدلتی ہوئی خواہشات آگے آگے ہوتی ہیں اور انسان ان کے پیچھے ہوتا ہے۔ جس طرف میلان ہوا، اسی طرف ڈھل گیا۔ جہاں کوئی ڈر ہوا، رک گیا۔ جہاں ذرا بھی امید اور لالچ پیدا ہوا دوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ نہ ایسا شخص کسی حد پر رکتا ہے، نہ حق و باطل کا لحاظ رکھتا ہے اور نہ حلال و حرام کی تمیز کرتا ہے اور نہ اپنے تصورات و اعمال کو کسی ترازو میں تولتا ہے۔ جب کوئی اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کی ہدایت کی کوئی امید نہیں رہتی، ایسا شخص گمراہی کی راہوں پر اس قدر دور چلا جاتا ہے کہ واپسی کی کوئی امید نہیں رہتی۔

فَمَنْ يَّهْدِىْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ (۳۰ : ۲۹) "اب کون اس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو"۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ شخص ہوائے نفس کا مطیع فرمان ہو گیا ہے۔

وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۳۰ : ۲۹) "ایسے لوگوں کا کوئی مددگار نہ ہو گا"۔ جو ان کو اس برے انجام سے بچا سکتا ہو۔

اب ان لوگوں کی بات ختم ہو جاتی ہے جو اس دنیا میں بدلتی ہوئی خواہشات کی بندگی کرتے ہیں اور جن میں ہر وقت اضطراب رہتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ اپنے دین حق پر قائم رہیں جو دین فطرت ہے۔ جو مضبوط دین ہے اور اس دین اور لوگوں کی فطرت کے درمیان مکمل موافقت ہے، کیونکہ فطرت کا خالق اور لوگوں کا خالق اور اس دین کا شارع ایک ہے۔ یہ وہ واحد عقیدہ اور نظریہ اور طرز عمل ہے جو صراط مستقیم پر لے جاتا ہے۔ اس سے ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ جس طرح کفار کی راہیں ہر وقت بدلتی رہتی ہیں۔ ہر روز کی خواہشات کے لیے ایک نیا دین ہوتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۰ۙ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۳۱ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝۳۲

"پس (اے نبیؐ، اور نبیؐ کے پیرو) یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو، قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس

طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے ' اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی ' یہی بالکل راست اور درست دین ہے 'مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ۔ (قائم ہو جاؤ اس بات پر) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے ' اور ڈرو اس سے ' اور نماز قائم کرو ' اور نہ ہو جاؤ ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنالیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں ' ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے"۔

یہ ہدایت نہایت بروقت آتی ہے کہ اپنی توجہات اس دین کی طرف کر دو ۔ یہ ہدایت اس وقت آتی ہے جب قرآن نے انسانی فکر کو اس کائنات کی ماہیت ' اس کائنات کے مناظر 'نفس انسانی کی گہرائیوں اور اس کی فطرت کے نشیب و فراز میں خوب گھمایا اور دوڑایا ۔ اس سیر اور مطالعہ کے بعد سلیم الفطرت ذہن تسلیم کرنے اور استقبال حق کے لیے تیار ہوتا ہے ۔ لہذا یہ ہدایت کہ تم لوگ اپنے چہرے کو دین حنیف کی طرف پھیر دو 'بہت بروقت ہدایت ہے ۔ اس کے مقابلے میں منحرفین اور مکذبین کی حالت یہ ہے کہ ان کے سامنے عقل و خرد اور دلیل و برہان کے تمام ہتھیار کند ہو گئے اور انہوں نے مان کر دینے سے صاف صاف انکار کر دیا ۔ باوجود اس کے کہ یہ ان کے پاس کوئی دلیل اور حجت نہیں ہے ۔ یہ ہے وہ دلیل اور برہان ناطق اور لاجواب انداز گفتگو جس کے ذریعہ قرآن کریم حق کو پیش کرتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں کوئی عقل ٹھہر نہیں سکتی اور نہ فطرت سلیمہ انکار کر سکتی ہے ۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا (۳۰ : ۳۰) "پس یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو"۔ اور سیدھے سیدھے اس دین کی طرف متوجہ ہو جاؤ ۔ کیونکہ یہی دین ایسا ہے جو انسان کو متفرق خواہشات سے بچا سکتا ہے ان خواہشات کی پشت پر حق بالعموم نہیں ہوتا ۔ یہ علم اور تحقیق پر مبنی نہیں ہوتیں ۔ یہ محض طبیعی شہوت اور مادی میلانات پر مبنی ہوتی ہیں اور ان کی پشت پر کوئی ضابطہ اور کوئی دلیل نہیں ہوتی ۔ لہذا تمام سمتوں کو چھوڑ کر دین اسلام کی سمت اختیار کر لو ۔ سیدھے سیدھے ۔ اس کے سوا تمام سمتوں کو پس پشت ڈال دو ۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (۳۰ : ۳۰) "اس فطرت پر جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے ۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی"۔ یوں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ فطرت انسانی اور اس دین کے اندر گہرا ربط ہے ۔ یعنی دونوں اللہ کی مصنوعات و تخلیقات ہیں ۔ دونوں اس ناموس کے مطابق ہیں جو اس کائنات کی روح ہے اور دونوں ایک دوسرے کے موافق اور ہم رخ اور ہم سمت ہیں ۔ جس خدا نے انسان کو پیدا کیا اسی نے یہ دین نازل کیا کہ یہ انسانوں کی زندگیوں میں نافذ ہو اور انسانوں کی پوری زندگی اس کے مطابق چلے ۔ یہ دین ہی فطرت انسانی کا علاج ہے ' اسے روحانی بیماریوں سے بچاتا ہے اور صحیح راہ سے منحرف ہونے نہیں دیتا ۔ کیونکہ اللہ اپنی مخلوق کے بارے میں زیادہ جاننے والا ہے ۔ وہ تو نہایت باریک بین اور بہت بڑا خبردار ہے ۔ جس طرح فطرت ثابت ہے اسی طرح دین بھی ثابت اور مستحکم ہے ۔

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (۳۰ : ۳۰) "اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدل نہیں سکتی"۔ جب نفس انسانی فطری راہ سے منحرف ہو جائے تو صرف یہی دین اسے فطرت کی راہ پر ڈال سکتا ہے کیونکہ فطرت کائنات 'فطرت انسانی اور

فطرت دین ایک ہی ہیں۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰:۳۰) "یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔ چنانچہ وہ بغیر علم کے اپنی خواہشات کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ اور یوں راہ راست سے بھٹک کر بہت دور چلے جاتے ہیں"۔

یہ حکم کہ اپنے چہرے کو دین قیم کی طرف کر لو اگرچہ لفظاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن اس کے اندر تمام اہل ایمان بھی آتے ہیں لہذا آگے کی تفصیلات میں ان کو بھی شامل کر دیا گیا۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳۰:۳۱)

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰:۳۲)

"اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے، اور ڈرو اس سے، اور نماز قائم کرو، اور نہ ہو جاؤ ان مشرکین میں سے جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ہر ایک گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے"۔

انابت سے مراد اللہ کی طرف رجوع ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں۔ جب انسان کے اندر اللہ کا خوف پیدا ہوتا ہے اور وہ حساس ہو جاتا ہے تو وہ خفیہ اور کھلے بندوں ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ہر حرکت اور ہر سکون میں اسے خدا کا شعور ہوتا ہے۔ پھر وہ اس شعور اور حساسیت کے اعلیٰ مقام صلوٰۃ کی طرف دوڑتا ہے۔ اس شعور سے تمام ماسوا اللہ مٹ جاتا ہے لہذا وہ موحد ہو جاتا ہے اور مشرکین سے جدا ہو جاتا ہے اور مشرکین کون ہوتے ہیں۔

الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا (۳۰:۳۲) "جنہوں نے اپنا اپنا دین الگ بنا لیا اور گروہوں میں بٹ گئے"۔ شرک کے بھی کئی رنگ اور اقسام ہیں۔ بعض لوگ جنوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض ملائکہ کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض آباؤ اجداد کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض ملوک و سلاطین کو، بعض کاہنوں اور مولویوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض پتھروں اور درختوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض سیاروں اور ستاروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض آگ کو شریک ٹھہراتے ہیں، بعض رات اور دن کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض جھوٹی اقدار کو شریک ٹھہراتے ہیں اور بعض خواہشات اور اغراض کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض پیروں اور فقیروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ غرض شرک کی بے شمار قسمیں ہیں اور

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰:۳۲) جبکہ دین قیم ایک ہے، اس میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ دین حق کے پیروکار صرف ایک اللہ، ایک قبلہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اس اللہ کی طرف جس نے ان آسمانوں کو تھام رکھا ہے۔ وہ آسمانوں کا بھی بادشاہ ہے اور زمین کا بھی اور سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۱۸۴ ایک نظر میں

اس سورہ کا یہ سفر اور یہ باب اس کے حقیقی موضوع پر ہے ۔ یعنی اس کائنات کے واقعات و حادثات اور انسانی زندگی کی اقدار و حادثات کے اندر گہرا ربط ہے ۔ اس کائنات کے نوامیس قدرت ' اس زندگی کے قوانین فطرت اور اس دین کے قوانین شریعت باہم موافق ' ہم آہنگ ' مربوط اور بلاتضاد ہیں ۔

اس سبق میں بتایا جاتا ہے کہ انسانی خواہشات تو بدلتی رہتی ہیں لیکن سنت الٰہیہ کے اندر کوئی تغیر نہیں ہوتا ۔ دین قیم کے اصولوں کے مقابلے میں شرکیہ عقائد پائے چوبیں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ پھر اس سبق میں انسانی نفس کی کیفیات کی مختلف حالات میں تصویر کشی کی گئی ہے ۔ حالت امن میں نفس انسانی کی حالت کیا ہوتی اور حالت خطرہ میں کیا ہوتی ہے ۔ روح کی قبض کی حالت میں وہ کیسا ہوتا ہے اور بسط کی حالت میں کیا کرتا ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ جب تک انسان اللہ کے پیمانوں کے مطابق اپنی اقدار اور تصورات کا ناپ و تول نہ کرے اس وقت تک انسانی قدروں اور اس کی روح میں ٹھہراؤ اور سکون نہیں آ سکتا ۔ ہاں جب انسان اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو کسی کا رزق کشادہ کرتا ہے اور کسی کا تنگ کرتا ہے ۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں رزق اور مال کو بڑھانے کا بھی ایک مستحکم طریقہ ہے ۔ کس طریقے سے مال بڑھتا ہے اور کس سے گھٹتا ہے ۔ کس سے پاک ہوتا ہے اور کس سے ناپاک ہوتا ہے اور مالیات کا قانون بھی وہی درست اور قیم ہو گا جو دین قیم کے مطابق ہو اور اس سے ماخوذ ہو ۔ اس کے بعد سامعین کو لوٹا کر اس ذات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو خالق اور رازق اور زندگی دینے والا اور مارنے والا ہے ۔ اللہ کے سوا جن ہستیوں کو تم شریک ٹھہراتے ہو ' وہ تو یہ کام نہیں کر سکتے ۔ بتایا جاتا ہے کہ ہر زمان و مکان میں شرک موجب فساد ہوتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو دوبارہ یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ اس راست اور درست دین پر جم جائیں ۔ اور جو کچھ کمانا ہے اس دن کے آنے سے قبل ہی کما لیں جہاں کوئی عمل اور کوئی کمائی نہ ہو گی ۔ وہاں تو اعمال کا حساب و کتاب ہو گا ۔ اس کے بعد ان کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ نے ان کے لیے کیا کیا سہولیات دنیا میں پیدا کی ہیں ۔ بعض چیزیں ان کی حیات مادی کے لیے ہیں ' مثلاً پانی آسمانوں سے برستا ہے اور زمین زندہ اور تروتازہ ہو کر تمہارے لیے سب کچھ پیدا کرتی ہے ۔ پھر سمندروں میں تمہارے لیے کشتی رانی کا سامان اور تمہاری روحانی زندگی کے لیے یہ آیات بینات ہیں جو رسول اللہؐ پر اتر رہی ہیں ۔ جن سے دل و دماغ زندہ اور سرسبز ہوتے ہیں ۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگ نہ ہدایت لیتے ہیں اور نہ سنتے ہیں ۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس دنیا میں زندہ رہ کر اللہ رب العالمین کی طرف لوٹنے والے ہیں ۔ اس دن پھر کسی سے کوئی معذرت قبول نہ ہو گی اور نہ معافی کی درخواستیں طلب ہوں گی اور آخر میں رسول اللہ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپؐ ثابت قدمی سے اپنا کام جاری رکھیں ' صبر کریں یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ سب بن کر سامنے آ جائے ۔ اللہ کا وعدہ حق الیقین ہے اور اٹل ہے ۔

درس نمبر ۱۸۴ تشریح آیات

۳۳ --- تا --- ۶۰

وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۟ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

"لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتے ہیں' پھر جب وہ کچھ اپنی رحمت کا ذائقہ انہیں چکھا دیتا ہے تو یکایک ان میں سے کچھ لوگ شرک کرنے لگتے ہیں تاکہ ہمارے کیے ہوئے احسان کی ناشکری کریں۔ اچھا' مزے کر لو' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کیا ہم نے کوئی سند اور دلیل ان پر نازل کی ہے جو شہادت دیتی ہو' اس شرک کی صداقت پر جو یہ کر رہے ہیں؟ جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں اور جب ان کے اپنے کیے کرتوتوں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں۔ کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے جس کا چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے (جس کا چاہتا ہے) یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔

یہ ایک ایسے انسان کی نفسیاتی تصویر ہے جس کو پختہ رنگوں سے نہیں بنایا گیا۔ جو مستقل اقدار حیات نہیں رکھتا اور

جس کے سامنے واضح منہاج حیات نہیں ہے۔اس شخص کا نفس وقتی انفعال اور وقتی تاثرات کے درمیان ڈول رہا ہے جو تصور ذہن میں آیا اس کی طرف لپکا۔حادثات اور وقتی واقعات کی وجہ سے وہ بدلتا رہتا ہے۔ایسے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں' رب کو یاد کرتے ہیں اور اس حقیقی قوت کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جس کے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہوتا۔اور اس کے دربار میں گڑگڑانے کے سوا کوئی نجات نہیں ہوتی۔اور جب مشکلات کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور سختی دور ہو جاتی ہے اور اللہ کی رحمت آجاتی ہے۔

اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ بِرَبِّھِمْ یُشْرِکُوْنَ (۳۰:۳۳) "تو یکایک ان میں سے کچھ لوگ شرک کرنے لگتے ہیں"۔یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو صحیح عقیدے کا سہارا نہیں لیتے۔جن کی قدریں مستقل نہیں ہوتیں۔کیونکہ اللہ کی رحمتیں اور دنیا کی سہولیات ان کو ان مجبوریوں سے نکال دیتی ہیں جن کی وجہ سے ایسے لوگ اللہ کی طرف متوجہ تھے۔وہ اچانک اپنے وہ مشکل کے دن بھول جاتے ہیں جن میں وہ خدا کو یاد کیا کرتے تھے۔چنانچہ وہ اللہ کی دی ہوئی ہدایت کی ناشکری کر کے اور اللہ کی رحمتوں کو چھوڑ کر کفر کی طرف چلے جاتے ہیں حالانکہ حالت رحمت میں خصوصاً مصیبت کے بعد رحمت میں ان کو تو شکر اور انابت الی اللہ پر جم جانا چاہئے تھا۔

ایسے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود تھے' اللہ بھی نہایت مختصر الفاظ میں جلدی سے ان کو دھمکی دیتے ہیں اور ان کو یوں خطاب ہوتا ہے۔حضور اکرمؐ کے دور کے متعین افراد پیش نظر ہیں۔اس لیے خطاب کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳۰:۳۴) "اچھا' مزے کر لو' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا"۔ یہ سخت خوفناک تہدید ہے۔اگرچہ براہ راست نہیں ہے۔انسان کی حالت تو یہ ہے کہ وہ ایک معمولی حاکم اور رئیس کی دھمکی سے بھی ڈرتا ہے۔اللہ جل شانہ کی دھمکی تو بہت ہی خوفناک ہے کیونکہ اللہ کے سامنے کوئی بات مشکل نہیں ہے۔ہر بات لفظ کن سے وجود میں آجاتی ہے۔

فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳۰:۳۴) "اچھا مزے کر لو' عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا"۔

جلدی اور اختصار کے ساتھ یہ دھمکی دینے کے بعد اب ان کے اس موقف پر سخت برہمی کے ساتھ گرفت کی جاتی ہے کہ یہ اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں کے باوجود شرک کرتے ہیں اور کفر کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔آخر اس پر ان کے پاس کیا دلیل ہے؟

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَیْھِمْ سُلْطٰنًا فَھُوَ یَتَکَلَّمُ بِمَا کَانُوْا بِہٖ یُشْرِکُوْنَ (۳۰:۳۵) "کیا ہم نے کوئی سند اور دلیل ان پر نازل کی ہے جو شہادت دیتی ہو' اس شرک کی صداقت پر جو یہ کر رہے ہیں"۔اس لیے کہ کسی شخص کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے عقائد و نظریات اللہ کے سوا کسی اور ماخذ سے لے۔کیا ہم نے کوئی دلیل شرک پر نازل کی ہے؟ نہیں۔یہ سخت سرزنش اور استنکاری سوال ہے۔نیز اس میں مزاح اور حقارت کا رنگ بھی ہے۔مقصد یہ ہے کہ ان کا یہ رویہ نہایت ہی احمقانہ ہے۔اس پر کوئی حجت اور دلیل اور سلطان نہیں ہے۔دوسرے

الفاظ میں یہ ایک تقریری سوال بھی ہے ۔ مفہوم یہ ہے کہ کوئی عقیدہ اللہ کی نازل کردہ وحی کے بغیر ثابت نہیں ہوتا۔ جب اللہ نے شرک پر کوئی دلیل نہیں اتاری تو گویا عقیدہ شرک باطل ہے ۔ بے اصل ہے ، ضعیف ہے ۔

اب انسان کی ایک دوسری نفسیاتی تصویر ۔ جب وہ خوش حال اور خوش و خرم ہوتا ہے تو وہ ہلکا اور مغرور ہو جاتا ہے ۔

وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ (۳۰ : ۳۶) "جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں اور جب ان کے اپنے کیے کرتوتوں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں"۔

یہ بھی ایک ایسے شخص کی نفسیاتی تصویر ہے ، جو اپنے معاملات کی ماہیت کو ایک مستقل پیمانے کے مطابق سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ ان کا رویہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہر حال میں ایک معیار اور پیمانہ ان کے سامنے رہے ۔ ایسا مستقل پیمانہ کہ وہ کبھی بدلتا نہیں ۔ یہاں مراد وہ لوگ ہیں جن کی قدریں اور پیمانے مستقل اور دائمی نہیں ہوتے ۔ جب اچھے دن آتے ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور یہ اچھے دن عطا کرنے والے کو بھول جاتے ہیں اور ہوا میں ہوتے ہیں ۔ عیش و عشرت میں غرق ہو جاتے ہیں اور اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے جو منعم حقیقی ہے اور وہ یہ بات پیش نظر نہیں رکھتے کہ اللہ کی رحمت اور خوشحالی بھی ایک امتحان ہوتا ہے لیکن جب اللہ کی مشیت ان کی اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے ان پر مصیبت لاتی ہے تو پھر وہ اندھے پن کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ یقین نہیں کرتے کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے اور یہ بدحالی کی آزمائش ہے ۔ لہٰذا اللہ کو یاد کریں اور صبر کریں کہ وہ مشکلات دور کر دے ۔ اس کے بجائے وہ مایوس ہو جاتے ہیں اور واہی تواہی بکتے ہیں ۔ یہ تصویر ان دلوں کی ہے ، جو اللہ سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں ۔ جو نہ سنن الہیہ کو جانتے ہیں نہ حکمت الہیہ ان کے سمجھ میں آتی ہے ۔ یہ لوگ دراصل نہیں جانتے ۔ بے علم ہوتے ہیں ۔ یہ زندگی کے ظاہری حالات کو دیکھ کر ہی فیصلے کرتے ہیں ۔

اس نفسیاتی تصویر کشی کے بعد ایک سخت تہدیدی سوال کیا جاتا ہے جس میں ان کے معاملے پر سخت تعجب کا اظہار بھی ہے ۔ ان کے اندھے پن اور بے بصیرتی پر ماتم بھی ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ خوشحالی اور بدحالی دونوں اللہ کے ایک مستقل قانون قدرت کے مطابق آتی ہیں ۔ ان کا تعلق سنن الہیہ اور اللہ کی مشیت سے ہے کیونکہ رحمت بھی وہی کرتا ہے اور مصیبت بھی وہی لاتا ہے ۔ وہی رزق میں کشادگی کرتا ہے اور وہی تنگی کرتا ہے ۔ سب کچھ اس کی حکمتوں کے تقاضے کے مطابق ہوتا ہے ۔ اس جہان میں ہر وقت اس اصول کے مطابق واقعات ہوتے رہتے ہیں لیکن لوگ اندھے بن جاتے ہیں ، دیکھتے ہی نہیں ۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (۳۰ : ۳۷) "کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ اللہ ہی رزق کشادہ کرتا ہے ، جس کا چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے"۔ لہٰذا جب رزق کشادہ ہو جائے تو تکبر اور غرور نہ کرنا چاہئے ۔ پھولنا مناسب نہیں ہے اور جب رزق تنگ ہو جائے تو مایوس نہیں ہونا چاہئے ۔ یہ تو عارضی حالات ہوتے ہیں ، حکمت الہیہ کے مطابق آتے رہتے ہیں ۔ ان حالات کی وجہ سے قلب مومن تو یقین کر لیتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کا ہے ۔ سنت الہیہ اپنا کام کرتی رہتی ہے ۔ اللہ کا نظام مستقل ہے ۔ اس کی حکمت کے مطابق روز و شب بدلتے رہتے ہیں ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۳۰: ۳۷) "یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔ چونکہ رزق کی کشادگی اور رزق کی تنگی صرف اللہ کے اختیار میں ہے' وہی ہے جو دیتا ہے اور وہی ہے جو روکتا ہے اپنی مشیت کے مطابق لہٰذا وہ تمہیں بتا دیتا ہے کہ تمہاری معیشت کی ترقی کی راہ کون سی ہے اور وہ کون سی معیشت ہے جو ترقی نہیں کرتی۔ حالانکہ لوگ اسے ترقی پذیر معیشت سمجھتے ہیں' ہدایت ہوتی ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا۠ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

"پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین و مسافر کو (اس کا حق)۔ یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوں' اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے' اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا' اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو' اسی کے دینے والے درحقیقت اپنے مال بڑھاتے ہیں"۔

جب تصور یہ ہے کہ تمام دولت اللہ کی ہے اور اللہ نے اپنے بندوں میں سے بعض کو زیادہ اور بعض کو کم دے رکھی ہے۔ اس تصور کے مطابق اللہ تعالیٰ تمام اموال کا مالک اول ہے۔ تو وہ حکم دیتا ہے کہ جو لوگ نادار ہیں ان کی طرف دولت کو منتقل کیا جاتا رہنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اسے ناداروں کا حق کہا ہے۔ یہاں ان ناداروں میں بعض لوگوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ (۳۰: ۳۸) "رشتہ داروں' مسکینوں اور مسافر کو"۔ جس دور میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اس میں زکوٰۃ کا تعین نہ ہوا تھا۔ نہ اس کے مستحقین کے مدات کا تعین ہوا تھا۔ اصولاً یہ بات متعین کر دی گئی تھی کہ تمام مال دراصل اللہ کی ملکیت میں ہے' کیونکہ رازق اللہ ہے۔ محتاج لوگوں کا اس مال میں ایک حق متعین ہے اور یہ حق مال کے اصل مالک نے دیا ہے۔ یہ حق ان تک اس شخص کے واسطہ سے پہنچتا ہے جس کے ہاتھ میں مال جمع ہے۔ مال کے بارے میں اسلام کا یہ بنیادی نظریہ ہے۔ اسلام کے اقتصادی اور معاشی نظریات کی اساس یہی تصور ہے کہ اصل مالک اللہ ہے۔ جب مال اللہ کا ہے تو اللہ کی جانب سے عائد شدہ واجبات سب سے پہلے ادا ہوں گے۔ مال کے بارے میں اللہ کے احکام ملکیت ہوں' یا احکام ترقی اور تنمیہ ہوں یا احکام انفاق ہوں' یہ سب لازمی احکام ہیں اور مال کا قابض آزاد نہیں ہے کہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔

اب یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جن کو اس نے بطور امانت یہ مال دیا ہے' کہ تم لوگ کس طریق کار کے مطابق اس مال کو بڑھاؤ گے اور ترقی دو گے۔ بڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے رشتہ داروں' مسافروں اور مسکینوں پر

خرچ کیا جائے۔ یہ سب اللہ کے راستے میں خرچ ہوگا۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۰:۳۸) "یہ طریقہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں"۔

بعض لوگ اپنا مال بطور ہدیہ مالدار لوگوں کو دیتے تھے تاکہ وہ ہدیہ کے جواب میں زیادہ لوٹا دیں۔ دو گنا' تین گنا' تو اللہ نے بتایا یہ مال بڑھانے کا طریقہ نہیں ہے۔

وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ (۳۰:۳۹) "اور جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے تو اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا"۔ روایات میں اس آیت کا یہی مفہوم بتایا گیا ہے لیکن قرآن کی نص عام ہے اور وہ تمام سودی معاملات اس کی زد میں آتے ہیں جن کے ذریعے سے لوگ مال بڑھاتے ہیں چاہے اس کی شکل و صورت جو بھی ہو۔ ربا کے طریق کے مطابق مال بڑھانے کے بجائے یہ بتایا گیا کہ حقیقی ترقی کی صورت کیا ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۰:۳۹)

"اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی کے لیے دیتے ہو' اس کے دینے والے درحقیقت اپنا مال بڑھاتے ہیں"۔ یہ ہے وہ ذریعہ اور طریقہ جو مال کے بڑھانے کا یقینی طریقہ ہے۔ یعنی مال مفت عطا کرو' کسی جوابی انعام کا انتظار نہ کرو' کوئی معاوضہ نہ ہو۔ خالص فی سبیل اللہ اور لوجہ اللہ خرچ کرو اس لیے کہ وہی اللہ ہے جو رزق میں کشادگی عطا کرتا ہے اور وہی رزق کو تنگ کرنے والا بھی ہے۔ دینے والا اور روکنے والا وہی ہے۔ جو لوگ اللہ کے لیے خرچ کرتے ہیں وہ ان کو کئی گنا زیادہ دیتا ہے اور جو لوگ لوگوں کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں' ان کے اموال میں وہ کمی کرتا ہے۔ یہ سودی کاروبار دنیا کا انتظام ہے اور وہ حساب آخرت ہے اور اس میں کئی گنا مال ملتا ہے۔ یہی نفع بخش تجارت ہے' یہاں بھی اور وہاں بھی۔

اب رزق اور کسب کے زاویہ سے شرک کے مسئلہ کو لیا جاتا ہے۔ موجودہ لوگوں میں شرک کے آثار اور امم سابقہ میں شرک کے آثار بتائے جاتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ۝

"اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا' پھر تمہیں رزق دیا' پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے' پھر وہ تمہیں زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو؟ پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے۔ لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا' شاید کہ وہ باز آئیں۔ (اے نبیؐ) ان سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو۔ پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے' ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے"۔

اللہ ان کی زندگی کی حقیقی صورت حال ان کے سامنے رکھتے ہیں اور ان کے ایسے حالات ان کے سامنے پیش فرماتے ہیں جن کے بارے میں انہیں شک نہیں ہے کہ ان حالات کا موجد اللہ ہے' یا ایسے حالات جن کے بارے میں وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے مزعومہ خدا اور الہ ان حالات کے موجد ہیں' یا شریک ہیں' یہ کہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ وہی ہے جو تمہارا رازق ہے' وہی تمہیں مارتا ہے' وہی تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ جہاں تک تخلیق کا تعلق ہے' اس کا وہ اقرار کرتے تھے' جہاں تک رزق کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں بھی وہ یہ دعویٰ نہ کر سکتے تھے کہ ان کے مزعومہ الٰہ ان کو رزق دیتے ہیں۔ رہا مارنا تو وہ اس بات کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ اللہ ہی مارنے والا ہے۔ رہا مسئلہ بعث بعد الموت کا تو اس میں وہ شک کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مسلمات کے ساتھ بعث بعد الموت کو بھی فہرست مسلمات میں پیش فرماتے ہیں تاکہ ان کا شعور جاگ اٹھے۔ اور اس طرح وہ اس کے قائل ہو جائیں۔ یہ براہ راست ان کی فطرت اور وجدان سے ہمکلامی ہے۔ اگرچہ ان کی فطری سوچ کے اندر انحراف آ گیا تھا لیکن اگر فطرت کو اصل حالات پر چھوڑا جائے اور انسان فطری انداز میں سوچے تو بعث بعد الموت کے عقیدے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان سے پوچھتے ہیں۔

هَلْ مِنْ شُرَكَآءِ كُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ (۳۰ : ۴۰) "کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے' جو ان میں سے کوئی کام بھی کرتا ہو"۔ اس سوال کے جواب کا انتظار نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ ایک ایسا سوال ہے جو تردید کے لیے ہے اور ساتھ ساتھ سرزنش بھی جس کے جواب کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ بس اس کے بعد یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ اس قسم کے شریکوں سے پاک ہے۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۳۰ : ۴۰) "اللہ پاک ہے' بہت بالا و برتر اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں انسانی زندگی کی اصلاح و فساد کا تعلق لوگوں کے اعمال سے ہے۔ جب لوگوں کے دل بگڑ جائیں' ان کے اعمال خراب ہوں اور ان کے عقائد خراب ہوں تو اس سے نظام ارضی میں خلل پڑ جاتا ہے اور خشکی اور تری دونوں اس فساد کی لپیٹ میں آ جاتی ہیں۔ لوگوں کی اقدار حیات پر یہ فساد غالب آ جاتا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ (۳۰ : ۴۱) "خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے"۔ دنیا کے نظام میں فساد کا ظہور اور اس کا پھیل جانا بے مقصد نہیں ہوتا۔ اور نہ اچانک بطور اتفاق ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ کی تدبیر اور اس کے قوانین فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔

لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا (۳۰ : ۴۱) "تاکہ مزہ چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا"۔ یعنی جب وہ ایسے اعمال کر رہے ہوں جو شر و فساد کا باعث ہوں اور جب اس عمومی فساد کی لپیٹ میں وہ آ جاتے ہیں اور اس کی جلن اور تپش محسوس کرتے ہیں تو امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۳۰ : ۴۱) "شاید کہ وہ باز آ جائیں"۔ اور عزم کر لیں کہ ہم اس فساد کا مقابلہ کریں گے اور اللہ کی طرف رجوع کر کے عمل صالح شروع کر دیں گے اور زندگی کے راست اور درست نظام کو اپنا لیں گے۔

اس سبق کے آخر میں ان کو اس انجام سے ڈرایا جاتا ہے جو زمانہ ماقبل کے مشرکین کو نصیب ہوا۔ اہل مکہ ان میں سے اکثر کے انجام سے واقف بھی تھے کیونکہ وہ اپنے سفروں میں ان کے آثار دیکھا کرتے تھے۔ یہ آثار امام مبین پر تھے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ (۳۰ : ۴۲) "(اے نبیؐ) ان سے کہو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو۔ پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہو چکا ہے' ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے"۔ ان کا انجام وہ بار بار دیکھتے تھے جب وہ زمین میں پھرتے تھے۔ یہ انجام ایسا تھا جو کسی کو اس رویے پر آمادہ نہ کرتا تھا جو ان لوگوں نے اختیار کیا ہوا تھا۔

یہاں آکر اب دوسرا راستہ بھی بتا دیا جاتا ہے جس پر چلنے والے کبھی گمراہ نہیں ہوتے۔ اور ایک دوسرے بلند افق کی طرف ان کی نظریں مبذول کرائی جاتی ہیں جس کی طرف جانے والے کبھی نامراد نہیں ہوتے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ۖ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ﴿٤٣﴾ مَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ﴿٤٤﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِن فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿٤٥﴾

"(اے نبیؐ) اپنا رخ مضبوطی کے ساتھ جما دو' اس دین راست کی سمت میں قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹل جانے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن لوگ پھٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے' جس نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے' اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے' وہ اپنے ہی لیے (فلاح کا راستہ) صاف کر رہے ہیں تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے' یقیناً وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا"۔

دین قیم کی طرف متوجہ ہونے والے کے لیے قرآن جو شکل تجویز کرتا ہے وہ نہایت ہی اثر انگیز ہے اور یہ بتاتی ہے کہ متوجہ ہونے والا شخص اپنی پوری توجہ سے اس طرف مڑ گیا ہے۔ وہ سنجیدہ اور سیدھا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ (۳۰ : ۴۳) "اپنا رخ مضبوطی کے ساتھ جما دو دین راست کی سمت میں"۔ نہایت اہتمام' نہایت توجہ' صدور حکم کے انتظار کی طرح' نہایت پختگی کے ساتھ اپنا رخ عالم بالا کی طرف کر دو جس طرح ایک فوجی (اٹن شن) کی حالت میں ہوتا ہے۔

دین قیم کی طرف رخ جما دینے کا حکم پہلی مرتبہ اس سورہ میں اس وقت آیا تھا جب بات لوگوں کی خواہشات نفسانیہ کے پیچھے دوڑنے کے موضوع پر ہو رہی تھی اور مختلف احزاب مختلف سمتوں میں دوڑ رہی تھیں۔ یہاں شرکاء کے مقابلے میں یہ حکم آیا ہے۔ رزق کے اضافے کے مضمون کے موقعہ پر ہے۔ شرک کی وجہ سے فساد پیدا ہونے اور لوگوں کی بدعملی کی وجہ سے پوری دنیا میں فساد پھیلنے کے مضمون کے موقعہ پر یہ حکم آیا ہے۔ اس کے بعد یہاں بتایا جاتا ہے کہ جس نے اچھے عمل کیے تو وہ اچھا پھل پائیں گے اور جس نے برے کام کیے تو اس کا برا انجام ہو گا۔ یہ دن ایسا ہو گا کہ جہاں لوگوں کے دو فریق ہوں گے' اہل ایمان اور اہل کفر اور ہر ایک کا اپنا انجام ہو گا اور یہ دن اٹل ہو گا۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ (۳۰ : ۴۴) "جس نے کفر کیا ہے اس کے کفر کا وبال اس پر اور جن لوگوں نے نیک عمل کیا ہے' وہ اپنے ہی لیے (فلاح کا راستہ) صاف کر رہے ہیں"۔ یمهد کا مفہوم ہے تیار کرنا' کنٹرول میں لانا' پنگھوڑا تیار کرنا جس میں بچہ آرام سے رہتا ہے' راستہ تیار کرنا' بستر تیار کرنا' جس پر آرام کیا جاتا ہے۔ تمام مفاہیم کا مطلب یہ ہے کہ اپنے لیے کسی چیز کو ہموار کرتے ہیں۔ یمهدون سے عمل صالح کے مزاج' نوعیت اور اس کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ جو لوگ عمل صالح کرتے ہیں وہ دراصل خود اپنے لیے آرام' خوشگواری اور مسرت کا ماحول تیار کرتے ہیں' یعنی حالت عمل میں بھی ان کو یہ نتائج مل جاتے ہیں' بعد کی بات تو اور ہے۔ قرآن کے انداز تعبیر يَمْهَدُوْنَ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ (۳۰ : ۴۵) "تاکہ اللہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کو اپنے فضل سے جزا دے"۔ فضل سے جزاء دینے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان جنت کا مستحق صرف اپنے اعمال ہی پر نہیں ہو سکتا۔ انسان جس قدر اعمال بھی کرے ان سے وہ اللہ کے ایک معمولی فضل کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا۔ جنت صرف فضل ربی سے مل سکتی ہے۔ اللہ سبحانہ کافروں کو بہت ہی ناپسند کرتے ہیں۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (۳۰ : ۴۵) اب یہاں اللہ کی بعض نشانیوں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ اللہ کی نشانیاں ہونے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے لیے وہ فضل و رحمت بھی ہیں۔ ان نشانیوں کی وجہ سے انسان کو رزق فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ ان کے لیے ہدایت ہے لیکن وہ اللہ کی ان نشانیوں میں سے بعض کو پہچانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا

مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾ وَ لَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾

"اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے' بشارت دینے کے لیے اور تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرنے کے لیے اور اس غرض کے لیے کہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکرگزار بنو۔ اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے' پھر جنہوں نے جرم کیا ان سے ہم نے انتقام لیا اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں۔

اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں' پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے' پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے' برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و خرم ہو جاتے ہیں حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔ دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ وہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جلا اٹھاتا ہے' یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثر سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں تو وہ کفر کرتے رہ جاتے ہیں"۔

ان آیات میں بظاہر نہایت مختلف النوع موضوعات کو جمع کیا گیا۔ بشارت دینے والی ہوائیں' رسولوں کو معجزات اور نشانیوں کے ساتھ بھیجنا' مومنین کا رسولوں کے ذریعہ مدد کرنا' ایسی بارشوں کا نزول جو مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہیں اور بعث بعد الموت کا مسئلہ۔ یہ اجتماع بامقصد ہے۔ یہ سب چیزیں اللہ کی رحمت کی نشانیاں ہیں۔ یہ سب سنت الہیہ کے مظاہر ہیں' یہ سب اس کائنات کے نظام کے تحت ہیں' رسولوں کو ہدایت کے ساتھ بھیجنے اور مومنین کی نصرت کے درمیان گہرا تعلق ہے اور یہ سب آیات الہیہ کے مختلف نمونے ہیں۔ یہ سب امور اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں سے متعلق ہیں۔ لوگوں کی زندگی ان سب امور پر موقوف ہے اور یہ سب امور نظام کائنات کے ساتھ متعلق ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ (٣٠ : ٤٦) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے"۔ یہ ہوائیں بارشیں برساتی اور پھیلاتی ہیں۔ یہ لوگ بارش برسانے والی ہواؤں کو خوب جانتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کو مہارت اور تجربہ حاصل تھا۔ جب ایسی ہوائیں چلتیں تو یہ لوگ خوش ہوتے۔

وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ (٣٠ : ٤٦) "تاکہ وہ انہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند کرے"۔ اس رحمت کے نتیجے میں سرسبزی اور شادابی اور روئیدگی ہوتی ہے۔

وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ (٣٠ : ٤٦) "تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں"۔ یہ کشتیاں اس طرح بھی چلتی ہیں کہ یہ ہوائیں انہیں چلاتی ہیں اور یوں بھی کہ ہواؤں سے بارش برستی ہے ' دریا بہتے ہیں اور ان میں کشتیاں چلتی ہیں۔ یہ ان ظاہری اسباب کے باوجود امرالہی سے چلتی ہیں۔ اس سنت الہیہ کے مطابق جس کے مطابق اللہ نے اس کائنات کو بنایا ہے۔ اللہ کے اس نظام تقدیر کے مطابق کہ اللہ نے ہر چیز کے اندر ایک خاصیت مقدر کر دی ہے۔ مثلاً یوں کہ پانی کی سطح پر کشتی کو ہلکا بنایا اور وہ چلنے لگی۔ اور یوں کہ یہ کشتی ہوا اور موجوں کے رخ پر اور ہوا اور موجوں کے رخ کے تضاد میں چلے۔ اللہ نے ہر چیز کو ایک مقدار کے مطابق بنایا ہے۔

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (٣٠ : ٤٦) "تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو"۔ یعنی تجارتی سفروں میں اور فصل کاٹنے میں 'لین اور دین میں یہ سب امور اللہ کے فضل سے ہیں اور اللہ نے ہر چیز کو ایک مقدار کے مطابق پیدا کیا ہے --- پورا پورا۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (٣٠ : ٤٦) "تاکہ تم شکر کرو"۔ یہ سب امور فضل الہی ہیں اور ان پر تم شکر کرو۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جن کے مقابلے میں بندگان خدا کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی ان نعمتوں کے مناسب رویہ اختیار کریں۔ ہواؤں کے بھیجنے کی طرح رسولوں کا بھیجنا بھی انسانوں پر اللہ کا فضل و کرم ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (٣٠ : ٤٧) "اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے"۔ لیکن لوگوں نے اللہ کی اس رحمت کا انتظار نہ کیا حالانکہ اللہ کی یہ رحمت ایسی تھی کہ ان کو اس کا استقبال تو ہواؤں سے زیادہ کرنا چاہئے تھا۔ ان لوگوں نے رسولوں سے کوئی استفادہ نہ کیا حالانکہ یہ نفع زیادہ اور دائمی نفع تھا بمقابلہ بارش اور پانی کے منافع کے اور رسولوں کے مقابلے میں یہ لوگ بٹ گئے۔ ایک گروہ ان مجرمین کا تھا جو ایمان نہ لاتے تھے۔ اللہ کی آیات پر تدبر نہ کرتے تھے۔ رسولوں کو اذیت دینے سے بھی نہ چوکتے تھے ' اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے باز رکھنے کے جرم سے بھی باز نہ آتے تھے۔ دوسرا گروہ ان مومنین کا تھا جو اللہ کی آیات کو سمجھ جاتے تھے۔ اللہ کا شکر ادا کرتے تھے ' اللہ کے وعدوں پر اعتماد کرتے تھے اور وہ ان مجرمین کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کرتے۔ بہت زیادہ اذیتیں۔ چنانچہ انجام وہی ہوتا تھا جو اللہ کے عدل کے مطابق تھا اور اللہ کا وعدہ ہمیشہ پختہ ہوتا ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ۚ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۰ : ۴۷) ”پھر جنہوں نے جرم کیا ان سے ہم نے انتقام لیا اور ہم پر یہ حق تھا کہ ہم مومنوں کی مدد کریں“۔

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے اوپر مومنین کی امداد فرض کر لی۔ اور اسے مومنین پر محض فضل و کرم کے بجائے ان کا حق قرار دیا۔ اسے اس انداز میں موکد قرار دیا اور لازمی قرار دیا کہ اس امداد میں کوئی شک و شبہ نہ رہا اور شک و شبہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب وعدہ کرنے والا اللہ ہو' جو قوی' عزیز اور جبار ہے۔ وہ بلند اور اپنے بندوں پر کنٹرول کرنے والا اور حکیم و خبیر ہے۔ یہ اللہ فرماتے ہیں جس کا ارادہ کبھی رد نہیں ہوتا اور اس کی سنت کبھی بھی ٹلنے والی نہیں ہوتی کیونکہ اس کا ناموس فطرت اس پوری کائنات میں جاری ہے۔

بعض اوقات یہ نصرت بظاہر دیر میں آتی ہے لیکن یہ دیر انسانوں کے اپنے اندازوں کے مطابق ہوتی ہے کیونکہ لوگ معاملات کا حساب اپنے پیمانوں سے کرتے ہیں' اللہ کے پیمانوں سے نہیں کرتے۔ معاملات کا اندازہ اللہ کے اندازوں کے ساتھ نہیں کرتے اور اللہ حکیم اور خبیر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ امداد کا صحیح وقت کون سا ہے۔ اس کا وعدہ اس وقت سچ ہوتا ہے جس وقت اللہ کی مشیت ہو۔ اس کی حکمت کا تقاضا ہو' اللہ جو وقت مقرر کرتا ہے اس کی حکمت بعض اوقات انسانوں کو معلوم ہوتی ہے اور بعض اوقات معلوم نہیں ہوتی لیکن اللہ جو چاہتا ہے' وہی بہتر ہوتا ہے اور اللہ جو وقت مقرر کرتا ہے وہی صحیح ہوتا ہے۔ لیکن اللہ کا وعدہ قطعی ہے اور عین الیقین ہے اور صبر کرنے والے' اس پر بھروسہ کرنے والے بڑے اطمینان سے اس کا انتظار کرتے ہیں۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے' جو بارشیں برساتی ہیں۔ جن سے زمین زندہ ہوتی ہے حالانکہ وہ مر چکی تھی۔ بس یہی انداز ہو گا حشر میں لوگوں کے اٹھائے جانے کا۔ یہی انداز ہو گا۔ فصل کی طرح لوگ زمین سے اگ آئیں گے۔ یہ دونوں اس کائنات کے طبیعی سنن ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ (۳۰ : ۴۸) ”اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے“۔ یہ ہوائیں اس کے قانون قدرت کے مطابق چلتی ہیں اور یہ قانون اس کائنات میں اچھی طرح متصرف ہے۔

فَتُثِيْرُ سَحَابًا (۳۰ : ۴۸) ”وہ بادل اٹھاتی ہیں“۔ اور یہ ہوائیں پانی کے بخارات اٹھاتی ہیں۔ ان بخارات کو وہ آسمانوں میں پھیلاتی ہیں۔

فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ (۳۰ : ۴۸) ”پھر ان کو آسمانوں میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے“۔

وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا (۳۰ : ۴۸) ”پھر انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے“۔ یعنی جمع کرتا ہے۔ وہ کثیف اور بوجھل بن جاتے ہیں۔ وہ پھر ایک دوسرے کے اوپر اور نیچے تہوں میں جم جاتے ہیں۔ بعض ٹکڑیوں کا بعض کے ساتھ تصادم ہوتا ہے۔ پھر بجلیاں چمکتی ہیں۔

فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ (۳۰ : ۴۸) ”پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکتے چلے آتے ہیں“۔ ودق کے معنی بارش کے ہیں جو بادلوں سے نکلتی ہے۔

فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۰:۴۸) "یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے' برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و خرم ہو جاتے ہیں"۔ اس خوشی کو اچھی طرح وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی زندگی بارش پر موقوف ہوتی ہے۔ عرب اس منظر سے اچھی طرح واقف تھے جن کی پوری معیشت آسمانوں کے پانیوں پر موقوف تھی اور ہے۔ اس کا تذکرہ وہ اپنے اشعار اور اپنی روایات و محاورات میں بڑی محبت سے کرتے ہیں اور بڑے فخر و مباہات کے ساتھ کرتے ہیں۔

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ (۳۰:۴۹) "حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے"۔ یہ تو ہے ان کی حالت اس وقت جب بارش نہ بر سی ہوئی تھی۔ وہ مایوس ہوتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ گویا وہ مرنے ہی والے ہیں۔ لیکن جب بارش آجاتی ہے تو وہ خوش و خرم ہوتے ہیں۔

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ (۳۰:۵۰) "دیکھو' اللہ کی رحمت کے اثرات کو"۔ ذرا ان خوش و خرم چہروں کو دیکھو جو بالکل مایوس ہو گئے تھے اور اس زمین پر ان آثار کو دیکھو جو تباہ شدہ تھی اور مردہ تھی۔ اور ذرا اس زندگی میں دیکھو جو زمین پر چلتی پھرتی ہے اور اسے ذرا لوگوں کے دلوں میں دیکھو کہ خوشی کی وجہ سے ان میں کیا کیا امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔

يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۰:۵۰) "کہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو کس طرح جلا اٹھاتا ہے"۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ اس کے دیکھنے کے لیے کسی زیادہ عقل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی بات دلیل روشن ہے اس پر کہ حشر کے دن اس زمین سے انسان اسی طرح اگ آئیں گے۔ یہ قرآن کریم کا وجدانی طرز استدلال ہے کہ وہ اس کائنات کے قابل مشاہدہ مناظر سے عقائد اور مستقبل کے واقعات اور امکانیات ثابت کرتا ہے۔ قرآن انہی پیش پا افتادہ مناظر سے اپنا مدعا ثابت کرتا ہے۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۳۰:۵۰) "یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ اس زمین پر اللہ کی رحمت کے یہ آثار بتاتے ہیں کہ اللہ کا یہ وعدہ سچا ہے کہ وہ لوگوں کو اٹھائے گا اور ان کا اچھا یا برا انجام ہو گا' حسب وعدۂ الٰہی۔

اس حقیقت کی تصویر کشی کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ لوگ پانی سے لدے ہوئے بادل لانے والی ہواؤں کی آمد پر خوش ہوتے ہیں اور جب وہ اللہ رحمت کے آثار بادلوں اور بارش کی صورت میں دیکھتے ہیں تو خوش و خرم ہوتے ہیں۔ یہی لوگ اگر دیکھیں کہ یہ ہوا اور یہ بادل زرد ہیں' ان ہواؤں میں پانی کے بجائے گرم ریت اور مٹی بھری ہوئی ہے۔ پانی کا قطرہ بھی نہیں ہے' اور یہ ہوا ایسی ہے کہ فصلوں کو زرد کر کے رکھ دیتی ہے اور دودھ پلانے والے جانوروں کو خشک کر دیتی ہے اور جس سے فصل زرد ہو کر قبل از وقت خشک ہو کر بھوسہ بن جاتی ہے تو ان کی حالت یہ ہوتی ہے :

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ (۳۰:۵۱) "اور اگر ہم ایک ایسی ہوا بھیج دیں جس کے اثرات سے وہ اپنی کھیتی کو زرد پائیں تو وہ کفر کرتے رہ جائیں"۔ اس عذاب کو پا کر اور

مایوس ہو کر بھی وہ کفر کریں ۔ اور اللہ کی قدرت کا اقرار نہ کریں اور اللہ کے سامنے نہ گڑگڑائیں کہ وہ اس مصیبت کو دور کرے بلکہ کفر کے رویہ ہی پر جم جائیں ' ایمان نہ لائیں اور یہ ہرگز نہ سمجھ سکیں کہ اللہ کی حکمت اور تدبیر کیا کیا کرتی ہے ۔ ان کو ان مصیبتوں کے پیچھے دست قدرت نظر نہ آئے ۔ وہ ان واقعات اور حادثات کی تفسیر و تعبیر اس طرح نہ کریں کہ یہ سب کچھ اللہ کے قانون قدرت اور ناموس فطرت کے مطابق ہو رہا ہے ...... بلکہ ابدی کافرانہ تاویلات ہیں ۔

جب لوگ اس حد تک پہنچ جائیں کہ وہ اس دنیا کے واقعات اور حادثات کی تعبیر بھی اپنی خواہشات کے مطابق کرنے لگیں اور ان واقعات کے اندر جو اللہ کے نشانات و اشارات پنہاں تھے ' ان کو سمجھنے کی سعی ہی نہ کریں ۔ اپنے ماحول کے اندر غور ہی نہ کریں ۔ ان مشاہدات میں ان کو اللہ کی قدرت اور حکمت نظر ہی نہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ بس ایسے لوگوں کو ہدایت دینے سے آپ معذور ہیں ۔ ایسے لوگوں کو ان کے مزاج کے حوالے کر دیں کیونکہ ان کی بصیرت اور بصارت دونوں ختم ہو چکی ہیں ۔

فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿٥٢﴾ وَمَا أَنتَ بِهَادِ الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ ﴿٥٣﴾

۵ ۱۳ع ۸

" (اے نبیؐ) تم مردوں کو نہیں سنا سکتے ' نہ ان بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہو جو پیٹھ پھیرے چلے جا رہے ہوں ' اور نہ تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہ راست دکھا سکتے ہو ۔ تم تو صرف انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں "۔

یہ لوگ مردے ہیں ' ان میں زندگی کی رمق نہیں ' یہ بہرے ہیں 'کوئی آواز نہیں سن سکتے ۔ یہ اندھے ہیں ان کو کچھ بھی نظر نہیں آتا ۔ جو شخص اپنے احساس کے دروازے اس کائنات نوامیس فطرت کے لیے بند کر دیتا ہے اور اسے فطرت کے یہ نشانات نظر نہیں آتے وہ مر چکا ہے ۔ اس میں حیات نہیں ہے ۔ اگر کوئی زندگی ہے تو پھر یہ حیوانی زندگی ہے بلکہ وہ حیوانوں سے بھی زیادہ گمراہ ہے ۔ حیوانوں میں ایک فطری شعور ہوتا ہے اور وہ شعور کبھی بھی غلطی نہیں کرتا ۔ جو شخص اللہ کی ان نشانیوں کی پکار نہیں سنتا وہ بالکل بہرہ ہے ۔ اگرچہ اس کے کان ہوں اور ان کے ساتھ آواز ٹکراتی ہو ۔ جو شخص اس کائنات میں بکھری ہوئی اللہ کی نشانیوں کو نہیں دیکھتا ' وہ اندھا ہے اگرچہ حیوان کی طرح اس کے بڑے بڑے موٹے موٹے دیدے ہوں ۔

اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَھُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۳۰ : ۵۳) " تم صرف انہی کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لاتے اور سر تسلیم خم کر دیتے ہیں "۔ ایسے ہی لوگ دعوت کو سنتے ہیں کیونکہ ان کے دل زندہ ہوتے ہیں اور زندہ دراصل دل کی زندگی ہوتی ہے ۔ ان کی آنکھیں بینا ہوتی ہیں ۔ ان کی قوائے مدرکہ صحیح و سلامت ہوتی ہیں '

لہذا وہ سنتے ہیں ۔ سر تسلیم خم کرتے ہیں ۔ دعوت کی پکار ان کی فطرت سے ٹکراتے ہی ان کے اندر انابت پیدا کرتی ہے ۔

--- ○○○---

اب ذرا انسان کو خود اس کی ذات اور اس کے جسم کی دنیا میں گھمایا جاتا ہے ۔ اپنے ماحول سے لاکر خود اپنے نفس کی وادیوں میں پھرایا جاتا ہے کہ تم پیدا کیسے ہوئے ؟ اس زمین پر تمہاری پیدائش کیسی ہے ؟ زندگی کیسی ہے اور تم مر کس طرح جاتے ہو ؟ اور پھر قیامت کا منظر کیا ہو گا ؟

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ۝ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۫ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝

”اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی ۔ ابتدا کی ' پھر اس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی ' پھر اس قوت کے بعد تمہیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا ۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے ' پیدا کرتا ہے ۔ اور وہ سب کچھ جاننے والا ' ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۔ اور جب وہ ساعت برپا ہوگی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے ہیں ' اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکا کھایا کرتے تھے ' مگر جو علم اور ایمان سے بہرہ مند کیے گئے تھے وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روز حشر تک پڑے رہے ہو ' سو یہ وہی روز حشر ہے ' لیکن تم جانتے نہ تھے ۔ پس وہ دن ہو گا جس میں ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا“ ۔

یہ ایک بہت ہی طویل مطالعاتی سفر ہے ۔ اس کا آغاز تو انسانی زندگی کے آغاز سے ہوتا ہے اور یہ ہمارے سامنے ہے اور آئے دن کا مشاہدہ ہے ۔ اس کا آخری حصہ نہایت ہی اگرچہ مشہود نہیں ہے لیکن قرآن کی تصویر کشی ایسے الفاظ میں کرتا ہے کہ گویا وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے ۔ یہ ایک ایسا مطالعاتی سفر ہے کہ چشم بینا رکھنے والوں کے لیے اور کھلے کان رکھنے والوں کے لیے اور کان لگا کر سننے والوں کے لیے اس میں سامان عبرت ہے ۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ (۳۰ : ۵٤) ”اللہ ہی تو ہے جس نے ضعف کی حالت سے تمہاری پیدائش کی“ ۔ یہ کہا کہ تمہیں ضعف سے پیدا کیا ۔ یہ نہ کہا کہ تمہیں ضعیف پیدا کیا ۔ گویا ان کی حیات کے آغاز کا عنصر ہی ضعیفی ہے اور یہاں جس ضعف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے کئی مفہوم اور مظاہر ہیں اور یہ مظاہر انسان کے

اندر قابل مشاہدہ ہیں اور مزید مشاہدات ہوتے جاتے ہیں ۔

وہ چھوٹا سا خلیہ جس سے جنین بنتا ہے جو بہت ہی خوردبینی اور چھوٹا سا ہے اور ضعیف ہے ۔ پھر جنین اور اس کے تمام مدارج حالت ضعف ہیں ۔ پھر زمانہ طفولیت سب کا سب حالت ضعف ہے ، اس وقت تک جب انسان مکمل نوجوان ہو جاتا ہے ۔

پھر وہ مادہ جس سے انسان بنتا ہے' ضعیف ہے مٹی ۔ اگر اس میں نفخ ربانی نہ ہوتی تو یہ مٹی ہی ہوتی یا نباتات ہوتے یا حیوانات ہوتے ۔ جو انسان کے مقابلے میں سب حالات ضعف ہیں ۔ پھر انسان اپنی خواہشات کے سامنے کمزور ہے ۔ امتحانات و میلانات اسے مجبور کر دیتے ہیں' اگر اللہ کی جانب سے نفخ روح نہ ہوتا تو انسان اس احسن تقویم میں نہ ہوتا ۔ اس کے اندر یہ صلاحیتیں نہ ہوتیں اور یہ بھی دوسرے حیوانات کی طرح ایک ضعیف اور لاچار حیوان ہوتا ۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً (۳۰ : ۵۴) "پھر اس ضعف کے بعد تمہیں قوت بخشی" ۔ ایسی قوت اور ان معنوں میں قوت جن معنوں میں ضعف بیان ہوا ۔ جسمانی قوت' انسانی ساخت میں قوت' انسان کی نفسیاتی اور روحانی قوت اور انسان کی فکری اور عقلی قوت ۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَّ شَيْبَةً (۳۰ : ۵۴) "پھر اس قوت کے بعد تمہیں ضعیف اور بوڑھا کر دیا" ۔ انسانی جسم ڈھیلا پڑ گیا' بڑھاپا دراصل انسان کی تمام قوتوں کے اندر طفولیت کی طرف رجوع ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی اس کے اندر نفسیاتی گراوٹ بھی آ جاتی ہے اور انسان ضعیف الارادہ ہو جاتا ہے ۔ بعض اوقات ایک بوڑھا اس طرح لایعنی باتیں کرتا ہے جس طرح ایک بچہ ہوتا ہے ۔ اس کے ارادے کے اندر کوئی قوت نہیں ہوتی ۔ بڑھاپے کے ساتھ بالوں کی سفیدی دراصل بڑھاپے کو مجسم کر دیتی ہے اور بالوں کی سفیدی کے ساتھ قوائے انسانی کا ضعف سامنے نظر آتا ہے ۔

یہ ادوار' جن سے کوئی فانی چیز نہیں بچ سکتی اور جس شخص کو طویل عمر نصیب ہو' ان کے اندر کبھی کوئی دور غائب نہیں ہوتا' کبھی یوں نہیں ہوتا کہ ان میں سے کوئی دور اپنے وقت پر نہ آئے ۔ ان ادوار کا اسی ترتیب کے ساتھ ہر شخص پر آنا اس بات کا مظہر ہے کہ یہ انسان کسی مدبر ہستی کے کنٹرول میں ہے ۔ وہ ہستی جو چاہتی ہے' تخلیق کرتی ہے' جو چاہتی ہے' مقدر بناتی ہے اور جس طرح چاہتی ہے' ہر مخلوق کے لیے اس کے حالات اور طور طریقوں کا منصوبہ بناتی ہے ۔ یہ سب کام اللہ کے پختہ علم' اس کی تقدیر اور گہری ٹیکنالوجی کے مطابق انجام پاتے ہیں ۔

يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ (۳۰ : ۵۴) "وہ جو کچھ چاہتا ہے' پیدا کرتا ہے' جو سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔

لہذا اس محکم اور ٹیکنیکل اور نقشے کے مطابق بنی ہوئی اس مخلوق کا کچھ بامعنی انجام بھی ہے ۔ ہاں اس کا ایک نہایت ہی بامعنی انجام اور فلسفہ ہے اور دیکھو اسے ایک منظر میں جو قیامت کے مناظر میں سے ایک پرتاثیر منظر ہے اور حرکت اور مکالموں سے ہر منظر میں پیش کیا جاتا ہے ۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ (۳۰ : ۵۵) "اور جب

وہ ساعت برپا ہوئی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھہرے ہیں"۔ ان کے احساس میں دنیا میں گزرا ہوا پورا زمانہ سکڑ جائے گا۔ اس لیے وہ اپنے احساس کے مطابق قسم کھائیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قبروں میں گزرے ہوئے زمانے کے بارے میں یہ کہہ رہے ہوں کہ یہ زمانہ اس قدر مختصر تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد پورا زمانہ ہو یعنی زمین کی زندگی کا اور پھر قبروں میں رہنے کا۔

كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ (۳۰: ۵۵) "اسی طرح وہ دنیا کی زندگی میں دھوکہ کھایا کرتے تھے"۔ اور حق سے منہ پھیرتے تھے اور دنیا میں بھی انہوں نے واقعات کا صحیح اندازہ نہ لگایا تھا۔ چنانچہ اہل علم اور اہل ایمان ان کے اس خیال کی تصحیح کر دیں گے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ

فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۳۰: ۵۶) "مگر جو اہل علم اور ایمان سے بہرہ مند کیے گئے تھے' وہ کہیں گے کہ خدا کے نوشتے میں تو تم روز حشر تک پڑے رہے ہو' سو یہ وہی روز حشر ہے' لیکن تم جانتے نہ تھے"۔ یہ صاحبان علم و بصیرت وہی تھے جو اہل ایمان تھے۔ جنہوں نے حشر پہ یقین کیا ہوا تھا۔ اور انہوں نے وہ حقائق بھی جان لیے تھے جو اس ظاہری دنیا کے پیچھے تھے۔ یہ لوگ بھی معاملے کو اللہ کے علم کے سپرد کر دیتے ہیں۔

لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ (۳۰: ۵۶) "در حقیقت اللہ کی کتاب میں تم یوم حشر تک رہے ہو"۔ یہ ہے وہ میعاد مقرر۔ اور اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ حشر تک پہنچتے پہنچتے تمہیں کتنی دیر لگی۔ یہ تھا مقررہ دن اور یہ آگیا دیکھ لو۔

اب یہ منظر ایک اجمالی کلیہ کی شکل میں ختم ہوتا ہے اور اس میں بتایا جاتا ہے کہ اب ظالموں کو کیا حالات پیش آنے والے ہیں جو حشر اور قیامت کی تکذیب کرتے تھے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ (۳۰: ۵۷) "پس وہ دن ہو گا جس میں ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ان سے معافی مانگنے کے لیے کہا جائے گا"۔ نہ ان کی کوئی معذرت قبول ہو گی اور نہ کوئی ان پر عتاب کرے گا کہ تم نے ایسا ایسا کیوں کیا ہے۔ مانگو معافی' توبہ کرو' کیونکہ آج تو سزا ہو گی' یہاں کسی کو کوئی سرزنش نہ ہو گی' یہ یوم عقاب ہو گا' یوم عتاب نہ ہو گا۔

اب اس برے اور مایوس کن منظر سے واپس لا کر انہیں ان کے اس حال میں لایا جاتا ہے جس میں وہ اپنے عناد اور تکذیب میں ڈرے ہوئے تھے۔ یہ تھا عناد کا انجام اور یہ تھا تکذیب کا خاتمہ۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ۝۵۸ كَذٰلِكَ

يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾

"ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا ہے۔ تم خواہ کوئی نشانی لے آؤ' جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے' وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو۔ اس طرح ٹھپہ لگا دیتا ہے اللہ ان لوگوں کے دلوں پر جو بے علم ہیں"۔

سیاق کلام میں اور مخاطبین کے زمان و مکان میں یکایک تبدیلی آگئی۔ یہ بہت ہی دور رس تبدیلی ہے لیکن یہاں دوریوں کے فاصلے سمیٹ لیے جاتے ہیں اور جس مقام پر اب ہم کھڑے ہیں وہ بہت ہی قریب نظر آتا ہے۔ دوبارہ ہم قرآن کے سامنے ہیں اور اس کی اعلیٰ مثالیں سن رہے ہیں۔ قرآن کے مختلف اور متنوع اسالیب کلام ہمارے سامنے ہیں' جہاں ہر رنگ اور ہر اسلوب اور ہر طریقے سے دلوں میں بات اتارنے کی سعی کی گئی ہے اور جس کے اندر بے شمار ایسے لمحات آتے ہیں جو انسان پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔ یہ قرآن ہر دل سے ہم کلام ہے' ہر درجے کی عقل سے مخاطب ہے۔ ہر معاشرے اور ہر تہذیب سے اس کے مکالمات بقدر عقول الناس ہیں۔ وہ نفس انسانی کو اس کے مختلف حالات میں خطاب کرتا ہے۔ انسان کے حالات و اطوار میں سے ہر حال اور ہر طور کو زیر بحث لاتا ہے۔ لیکن ان ہمہ گیر اور ہمہ جہت مسائل کے بعد بھی لوگ تکذیب پر تلے ہوئے ہیں۔ اور یہ اللہ کی نشانیوں اور آیات کی تکذیب پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ یہ لوگ صحیح علم رکھنے والوں پر دست درازیاں بھی کرتے ہیں اور الٹا ان پر الزام لگاتے ہیں کہ یہ لوگ باطل پرست ہیں۔

لَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ (۳۰ : ۵۸) "تم خواہ کوئی نشانی لے کر آجاؤ' جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے' وہ یہی کہیں گے کہ تم باطل پر ہو"۔ پھر زبانوں پر یہ تبصرہ آتا ہے:

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰ : ۵۸) "اس طرح ٹھپہ لگا دیتا ہے اللہ ان لوگوں کے دلوں پر جو بے علم ہیں"۔ یوں' یعنی اس طریقے کے مطابق اور ان وجوہات سے۔ یہ لوگ جو نہیں جانتے ان کے دلوں پر مہریں لگ گئی ہیں۔ ان کی چشم بصیرت اللہ کی آیات اور اس کے نشانات کو دیکھنے کے لیے کھلتی ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ اہل علم اور اہل ہدایت پر دست درازی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات کے مستحق بن گئے ہیں کہ اللہ ان کی بصیرت کو مسخ کر دے۔ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دے کیونکہ اللہ سبحانہ ان دلوں کے بارے میں خوب جانتا ہے اور ان کی بصیرتوں کو بھی وہ اچھی طرح دیکھتا ہے۔

اس سورہ میں مشرکین کے ساتھ مکالمے' اس کائنات کی سیر' انسانی تاریخ کے مطالعے' اور انسانی شخصیت' انسانی زندگی اور اس کی نشوونما کی سیر کے بعد اور تمام شواہد اور نشانیوں کے دیکھ لینے کے بعد بھی بعض ایسے لوگوں کے مشاہدے کے بعد جو بالکل نہیں مانتے' اب یہ آخری ضرب ہے عقل و خرد کے تاروں پر۔ اس کے ذریعہ اہل ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾

"پس (اے نبیؐ) صبر کرو ' یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے ' اور ہرگز ہلکا نہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے"۔

اس طویل جدوجہد اور اسلامی انقلاب کے دشوار گزار سفر میں صبر ہی وسیلہ مومنین ہے ۔ یہ سفر اس قدر طویل ہے ' اس قدر مشکل ہے کہ بعض اوقات انسان کو لاانتہا نظر آتا ہے ۔ لیکن اللہ کے وعدے پر یقین کرنا چاہئے ۔ بغیر کسی بے چینی ' کسی تزلزل ' بغیر کسی حیرانی و پریشانی کے اپنے مقصد پر جم جانا ہی اس راہ کا توشہ ہے ۔ اس وقت صبر اور ثابت قدمی کا مظاہرہ جبکہ دوسرے لوگ ڈگمگا جائیں ' جبکہ بعض لوگ تکذیب کر دیں اور اللہ کے وعدے میں شک کرنے لگیں ۔ اس لیے کہ شک کرنے والے اسباب یقین سے محروم ہوتے ہیں ۔ رہے وہ لوگ جو اللہ تک پہنچ چکے ہیں جنہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے ' ان کا منہاج صبر و ثبات کا منہاج ہے ۔ اگرچہ راہ طویل ہو جائے ۔ اگرچہ اس کا انجام نظروں سے اوجھل ہو ۔ اگرچہ وہ غبار اور بادلوں کے پیچھے محجوب ہو ۔

---ooo---

یہ سورہ یوں ختم ہوتی ہے جبکہ اس کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ شکست یافتہ رومیوں کو اللہ کے وعدے کے مطابق چند سالوں کے بعد فتح نصیب ہوگی اور اسی وقت مومنین کو بھی فتح نصیب ہوگی اور اس کا خاتمہ اس مضمون پر ہوتا ہے کہ اگر تم صبر و ثبات سے کام لو تو اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا کہ اللہ اہل ایمان کی مدد کرتا ہے ۔ نیز جب لوگ اس تحریک کو بے وقار کرنے کی سعی کر رہے ہوں اور ان کی صفوف کے اندر وسوسہ اندازی کر رہے ہوں اور یہ لوگ وہی ہوتے جو تحریک اسلامی کے دشمن ہوتے ہیں اور ان کا اس جدید دعوت پر ایمان نہیں ہوتا تو ایسے حالات میں صبر ہی اہل ایمان کا ہتھیار ہوتا ہے ۔

یوں سورہ کا آغاز اور انجام ہم آہنگ ہو جاتے ہیں ۔ یوں یہ سورہ ختم ہوتی ہے اور ایک سچے قاری کے ذہن میں ایک قوی امید چھوڑ جاتی ہے کہ اگر صبر و ثبات سے کام لیا جائے تو اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا ۔ اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے اور وہ اہل یقین سے بے وفائی نہیں کرتا ۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ------ ۲۱

سورہ لقمان ۔ ۳۱

آیات ۱--- تا--- ۳۴

سورۂ لقمان ایک نظر میں

قرآن کریم نے انسانی فطرت سے فطری منطق کے ذریعہ خطاب کیا اس لیے کہ یہ کلام فطرت کا کلام ہے۔ خالق جانتا ہے انسان کے لیے کیا مفید ہے' اور کس چیز سے اس کی اصلاح ممکن ہے۔ اسے معلوم ہے کہ انسانی فطرت کے ساتھ کس انداز کا مکالمہ مناسب ہے۔ خالق اپنی مخلوق کی رسم راہ سے بہت ہی اچھی طرح واقف ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس فطرت انسانی کے سامنے وہی حقیقت پیش کی جو اس میں پہلے سے موجود تھی۔ فطرت انسانی اس حقیقت سے پہلے ہی خبردار تھی' قرآن کے مکالمے سے بھی پہلے۔ کیونکہ انسانی فطرت اس اصول پر قائم ہے جو انسانی فطرت کے اندر تخلیق کے وقت سے ودیعت کر دیا گیا ہے۔ وہ حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور یہ کہ وہ خالق وحدہ لاشریک ہے۔ یہ پوری کائنات اس کی ثناخواں ہے۔ تو عاد کرہا اس کے احکام کی مطیع فرمان ہے حمد و تسبیح کرنے والی ہے۔ لہذا انسان کو صرف اسی کی بندگی اور اسی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ یہ ہے اصل فطرت لیکن یہ فطرت اس دنیا کے گرد و غبار اور دھوئیں کی تہوں کے نیچے دب جاتی ہے اور گوشت و پوست کی سفلی خواہشات اس کو دبا لیتی ہیں۔ خواہش نفس اور جسمانی شہوات اسے جادۂ مستقیم سے منحرف کر دیتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم آتا ہے اور وہ اس فطرت کو اس کے اندر موجود سبق یاد دلاتا ہے اور فطری منطق کے مطابق اس کے ساتھ مکالمہ کرتا ہے۔ اس کو یاد دلاتا ہے کہ وہ خارجی وجوہات سے غافل ہو گئی ہے اور یہ یاد دہانی ایسے اسلوب میں کی جاتی ہے کہ جیسے فطرت جانتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم اس فطری منہاج پر یہاں ایک مکمل نظام وضع کرتا ہے۔ یہ منہاج درست عقیدہ کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ نہایت فطری ہے اور اسی راستے پر ہے جو انسان اور فطرت کے خالق کا پیدا کردہ ہے۔

یہ مکی سورہ ہے اور یہ نمونہ اور مثال ہے قرآن مجید کے اندر مکالمات کا کہ قرآن کس طرح انسانی دل میں بات اتارتا ہے۔ خصوصاً عقیدۂ توحید کو مشرکین کے سامنے کس اسلوب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ عقیدۂ توحید وہ بنیادی مسئلہ ہے جسے تمام مکی سورتیں مختلف اسالیب میں پیش کرتی ہیں۔ مختلف زاویوں سے بات کرتی ہیں اور قلب انسانی کو مختلف پہلوؤں سے لیتی ہیں اور مختلف پہلوؤں سے فطرت کے ساتھ ہم کلام ہو کر اسے جگانے کی کوشش کرتی ہیں۔

اس سورہ میں نظریاتی بحث عقیدۂ توحید' اللہ وحدہ کی بندگی اور اللہ وحدہ کا شکر ادا کرنے کے موضوعات تک محدود ہے۔ آخرت پر یقین اور آخرت میں عادلانہ جزاء و سزا اور ان عقائد کے سوا تمام دوسرے اعتقادات کی نفی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت' یہ ہیں اہم موضوعات اس سورہ کے۔

یہ سورہ عقیدے کے مسئلے کو قرآن کے بیان اور موضوع کے دائرے کے اندر پیش کرتی ہے۔ قرآن کریم کا دائرہ بحث اس پوری کائنات تک وسیع ہے۔ آسمان' زمین' شمس و قمر' شب و روز' فضا اور سمندر' لہریں اور بارش' نباتات اور درخت' یہ ہیں وہ موضوعات جن پر قرآن بحث کرتا ہے اور یہ بحث قرآن میں بار بار دہرائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس

پوری کائنات کو قرآن کریم ایک ناطق موثر عامل کے طور پر پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اس کے اندر آیات الٰہیہ بکھری پڑی ہیں ۔اس میں دلائل ایمان بھی ہیں اور دلائل اخلاق بھی ہیں ۔یہ تمام نشانات و دلائل قلب انسانی پر اثرانداز ہوتے ہیں' اس کے اندر جوش پیدا کرتے ہیں اور اس کا ایک رخ متعین کرتے ہیں اور اسے سمت عطا کرتے ہیں ۔

یہ درست ہے کہ مسئلہ ایک ہی ہے اور اس مسئلہ کا میدان بحث بھی ایک ہے لیکن اس ایک ہی سورت میں اسے چار مرتبہ پیش کیا گیا ہے اور چار بار عقیدۂ توحید کو ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔ ہربار انسانی دل و دماغ کو اس وسیع کائنات میں لے جایا گیا' پھرایا گیا' اور ہربار ایک نیا تاثر چھوڑا گیا۔ ہرباز بیان اور زبان کا ایک نیا انداز اپنایا گیا۔ کائنات کی یہ سیر پے درپے آتی ہے ۔سفر کا آغاز ہوتا ہے اور ختم ہوتا ہے اور اس سیر میں قلب و نظر کو عجیب عجیب تفریحات ملتی ہیں اور قلب انسانی ایک نئے تاثر سے مالا مال ہو کر از سرنو آمادۂ عمل ہوتا ہے ۔

ان اسفار اربعہ کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے ۔یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ سورہ بھی انہی حروف سے مرکب ہے اور یہ کتاب حکیم کی آیات پر مشتمل ہے ۔اور محسنین کے لیے ہدایت و رحمت ہے ۔یہ محسنین کون ہیں ۔

اَلَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۳۱ : ۴)

"جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں"۔گویا محسن وہ ہے جو اللہ کی عبادت کرتا ہے اور آخرت کی جولب دہی پر یقین رکھتا ہے ۔ایسے لوگوں کے لیے خوشخبری یہ ہے کہ

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۱ : ۵) "یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں"۔پھر کون ہے جو کامیاب نہ ہونا چاہتا ہو ۔ان کے مقابلے میں دوسرے لوگ وہ ہیں جو لہو و لعب کی باتیں قیمتاً خریدتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے بدراہ کریں' یہ لوگ جاہل ہیں ۔یہ اللہ کی آیات کا مزاح اڑاتے ہیں اور ایسے لوگوں کا انجام بھی بتا دیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذہن کا آپریشن ہو جائے اور وہ جو آیات الٰہیہ کا مزاح اڑاتے ہیں اس کا نفسیاتی جواب ہو جائے ۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۳۱ : ۶ ب) "ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے"۔
اس کے بعد اس فریق کی مزید حرکتیں بیان کی جاتی ہیں ۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا (۳۱ : ۷) "اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتا ہے کہ گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں"۔

اس بیان کے ساتھ ایک ایسی بات بھی کہہ دی جاتی ہے جو نفسیاتی اعتبار سے قاری کو متاثر کرتی ہے اور اس قسم کے لوگوں کے لیے ایک قسم کی تحقیر بھی اس میں ہے ۔

كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا (۳۱ : ۷) "گویا اس کے دونوں کانوں میں پردے ہیں"۔اور ایک دوسری پرتاثیر بات جس میں مزاح کا رنگ بہت نمایاں ہے ۔

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۱ : ۷) ”اسے دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو“۔ بشارت کا لفظ بطور تحقیر اور مذاق اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے بعد روئے سخن اہل ایمان کی طرف پھر جاتا ہے ' ان کی کامیابیوں کے بیان کے بعد جو سورہ کے آغاز ہی میں بیان کی گئی ہیں۔ آخرت میں ان کی جزاء کا تذکرہ ہے۔ دوسری جانب اسلام کے ساتھ مزاح کرنے والے بڑے لوگوں کی جزاء کا بھی ذکر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ (۳۱ : ۸) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳۱ : ۹) ”البتہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے۔ اور وہ زبردست و حکیم ہے“۔
یہاں آکر عظیم کتاب کائنات کا ایک صفحہ کھولا جاتا ہے۔ جس میں فطرت کے براہین ہیں ' یہ براہین فطرت انسانی کے مطالعہ کے لیے ہیں ' یہ اس فطرت کو خطاب کرتے ہیں اور اس کے سامنے وہ عظیم سچائی پیش کرتے ہیں ' جسے لوگ نہیں دیکھتے اور نہایت لاپرواہی سے اس پر سے گزر جاتے ہیں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ

(۳۱ : ۱۰) ”اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستون کے جو تمہیں نظر آئیں۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیئے اور آسمانوں سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگا دیں“۔ ان کائناتی دلائل کے بعد جس سے احساس میں خوف پیدا ہوتا ہے اور شعور ششدر رہ جاتا ہے ' اب بے راہ روش اختیار کرنے والے دلوں کو گریبان سے پکڑا جاتا ہے ' جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی آنکھوں کے ساتھ اللہ کی اس عظیم اور ہولناک کائنات کو دیکھ رہے ہیں۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

(۳۱ : ۱۱) ”یہ تو ہے اللہ کی تخلیق اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟--- اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں“۔ پہلا سبق یا پہلا مطالعاتی سفر اس کائناتی مطالعہ کے بعد یہاں ختم ہو جاتا ہے اور مسائل و نظریات کی یہ بحث اللہ کی وسیع کائنات کے میدان میں ہے۔
دوسرے سبق کے کردار انسانی نفوس ہیں۔ یہ سبق بھی مسئلہ توحید ہی کو موضوع بحث بناتا ہے۔ یہ بحث بھی کائناتی میدان میں ہے۔ البتہ اسلوب بحث جدید ہے اور اس میں بعض نئے دلائل دیئے گئے ہو ' جو.. کا اثر نیا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (۳۱ : ۱۲) ”ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی“۔ یہ حکمت کیسی تھی

اور اس کا اظہار کس شکل میں ہوا؟ خلاصہ صرف یہ تھا کہ اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرو'

اَن اشْكُرْ لِلّٰه (۳۱ : ۱۲) "کہ اللہ کا شکر ادا کرو"۔ یہ تھا اس حکمت کا خلاصہ اور یہ تھی اس کی سمت ۔ اور اس کا دوسرا رخ یہ تھا کہ حضرت لقمان اپنی اولاد کو نصیحت کرتے ہیں ۔ ایک دانشمند آدمی اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے ۔ یہ نصیحت ہر قسم کی کمزوری سے پاک ہوگی اس لیے کہ نصیحت کرنے والا حکیم ہے' اور یہ نصیحت مشکوک بھی نہیں ہے کیونکہ کوئی والد اپنے بیٹے کو دھوکہ نہیں دے سکتا ۔ اس نصیحت میں یہ حکیم اپنے بیٹے کو عقیدۂ توحید کی تلقین کرتے ہیں اور آخرت کے خوف اور جوابدہی کی طرف متوجہ کرتے ہیں' نہایت ہی پر اثر انداز میں اور نئے موثر الفاظ اور دل میں اترنے والے دلائل کے ساتھ ۔

وَ اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَ هُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (۳۱ : ۱۳) "یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا "بیٹا خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے"۔ ایک دوسری دلیل اس موضوع پر یہ دی جاتی ہے اور اس سلسلے میں باپ اور اولاد' ماں اور اولاد کے رشتے کو پیش کیا جاتا ہے' نہایت ہی موثر اور جذباتی انداز میں ۔ جس کے نتیجے میں رحم و محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ۔

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ (۳۱ : ۱۴) "اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے ۔ اس کی ماں نے ضعف پہ ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے"۔ یوں اللہ کے شکر کا حکم والدین کے شکر کے ساتھ یکجا ہو جاتا ہے ۔ اور اپنے شکر کو ان کے شکر پر مقدم رکھا جاتا ہے ۔

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ (۳۱ : ۱۴) "میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا"۔ اس کے بعد اسلامی نظریہ حیات کا پہلا اصول سامنے لایا جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں نظریاتی اخوت گوشت و پوست کی اخوت اور قوم و نسب کے تعلق پر مقدم ہوگی ۔ اگرچہ نسب اور خون کے رشتے بہت مضبوط ہوتے ہیں لیکن یہ اللہ کی ذات اور عقیدۂ توحید اور نظریہ حیات کے زاویہ سے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں ۔

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (۳۱ : ۱۵) "لیکن اگر وہ یہ دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان ۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے"۔ اس کے بعد آخرت کی جوابدہی کا احساس ۔

ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۱: ۱۵) "پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو"۔ اب ایک دوسری دلیل توحید سامنے آتی ہے۔ یہ ایک عظیم دلیل ہے۔ اس میں اللہ کے علم کے عموم و شمول اور جامعیت و مانعیت کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ یہ علم محیط ہے۔ یہ تصویر کشی اس قدر موثر ہے کہ انسانی شعور میں ایک قسم کا ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ جب انسانی سوچ اس دلیل کا میدان کائنات میں پیچھا کرتی ہے۔

یٰبُنَیَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ (۳۱: ۱۶) "بیٹا' کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو اللہ اسے نکال لائے گا' وہ باریک بین اور باخبر ہے"۔ اس کے بعد لقمان اپنے بیٹے کو عقیدۂ توحید کے تقاضوں کی نصیحت کرتے چلے جاتے ہیں کہ امر بالمعروف کرو' منکر سے روکو اور اسلامی نظریہ حیات اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے آپ کو جو تکالیف پیش آئیں ان پر صبر کرو کیونکہ داعی الی اللہ کو مشکلات آتی ہیں اور اس طریقہ پر صبر ہوتا ہے۔ لوگوں پر دست درازی نہ کرو' اس لیے کہ زبان سے جو اصلاح کی جائے گی برے عمل سے وہ بگڑ جائے گی۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۳۱: ۱۸) وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (۳۱: ۱۹) "اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر' نہ زمین میں اکڑ کر چل' اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز پست رکھ سب آوازوں میں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے"۔ یہاں کسی سے منہ پھیرنے اور تکبر نہ کرنے کے لیے لاتصعر اور لاتمش مرحا کے الفاظ استعمال کر کے ان حرکتوں کو حقیر بتایا گیا ہے۔ یہاں آکر یہ سبق ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی اصل موضوع بحث عقیدۂ توحید ہی ہے بالکل عملی انداز میں۔ اور نئے موثر دلائل اور نئے اسلوب کے ساتھ۔

تیسرے سبق میں بھی یہی عقیدۂ توحید ہے' لیکن اسے زمین و آسمان کے وسیع میدان میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ دلیل یہ دی گئی کہ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ نے انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اللہ کا شکر بجالائے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ (۳۱: ۲۰) "کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین و آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی

ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں ۔ اس پر بھی حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو یا ہدایت یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب" ۔ اور اس کائنات اور اس کے اندر اللہ کی نعمتوں کو دیکھتے ہوئے فطرتِ انسانی کے بارے میں ایسے مباحثے سے نفرت کرتی ہے ۔ اس کے بعد راہ راست پر چلنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے کفر اور انکار پر سرزنش کی جاتی ہے ۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا

(۳۱ : ۲۱) "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے ۔ تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے" ۔ یہ کس قدر بودا موقف ہے اس لیے اس کی پرزور دلائل سے تردید کر دی جاتی ہے ۔

اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۳۱ : ۲۱) "کیا یہ انہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا ہو" ۔ اب آخرت کی جزاء و سزا کو ایمان کے ساتھ مربوط کر کے پیش کر دیا جاتا ہے ۔

وَ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۳۱ : ۲۲) وَ مَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ـــ (۳۱ : ۲۳) "جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور عملاً وہ نیک ہو' اس نے فی الواقعہ ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ۔ اب جو کفر کرتا ہے اس کا کفر تمہیں غم میں مبتلا نہ کرے ۔ انہیں پلٹ کر آنا تو ہماری طرف ہے ۔ پھر ہم بتا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں" ۔ اب یہاں پھر اللہ کے وسیع علم کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے :

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳۱ : ۲۳) "یقیناً اللہ سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے" ۔ اور اب تہدید اور تنبیہ

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۳۱ : ۲۴) "ہم تھوڑی مدت انہیں دنیا میں مزے کرنے کا موقعہ دے رہے ہیں' پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے" ۔ اس سبق کے خاتمے کے قریب ان کو فطرت کا آمنا سامنا کرایا جاتا ہے ۔ ان کو اس پوری کائنات کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے ۔ اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ اعتراف ہی کر لیں ۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۱ : ۲۵) "اگر ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو پھر یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے 'کہو الحمدللہ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

اس سفر کا خاتمہ ایک کائناتی منظر پر ہوتا ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے علم کی انتہا نہیں ہے اور زمین و آسمان میں اللہ کی مشیت حاکم ہے ۔ وہ خالق مطلق ہے ۔ اس سے بعث بعد الموت پر استدلال کیا جاتا ہے اور دوبارہ تخلیق کا اسے ثبوت قرار دیا جاتا ہے ۔

وَ لَوْ اَنَّ مَا فِى الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۳۱ : ۲۷) مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۳۱ : ۲۸) "زمین و آسمان میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر دوات بن جائے جسے مزید سات سمندر روشنائی فراہم کریں 'تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی بے شک اللہ زبردست و حکیم ہے ۔ تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ بلا اٹھانا بس ایسا ہے جیسے ایک متنفس کو پیدا کرنا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے"۔

چوتھا سفر بھی ایک کائناتی منظر میں ہے ۔ قلب بشری پر اس کے زبردست اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔ یہ منظر لیل و نہار ہے ۔ رات لمبی ہوتی ہے اور دن کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے ۔ اور یوں لمبی ہوتی جاتی ہے' اور دن لمبا ہوتا ہے اور وہ رات کے جسم میں داخل ہوتا ہے اور آگے ہی بڑھتا ہے ۔ شمس و قمر اپنے فلک میں مسخر ہیں اور یہ چلتے ہیں اور چلتے رہیں گے اس وقت تک جس میں ان کا خاتمہ ہو گا' خالق ہی جانتا ہے کہ یہ وقت کب آئے گا جو ان چیزوں کو بھی جانتا ہے اور لوگوں کو بھی جانتا ہے اور زمان و مکان سے بھی باخبر ہے ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۳۱ : ۲۹) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں پروتا ہوا لے آتا ہے ۔ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے ۔ سب وقت مقررہ تک چلے جا رہے ہیں ۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو' باخبر ہے ۔ اس منظر سے فطرت انسانی کی راہنمائی اس حقیقت کی طرف کی جاتی ہے جو زیر بحث ہے ۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِىُّ الْكَبِيْرُ (۳۱ : ۳۰) "یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی برحق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو

یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں اور اللہ ہی بزرگ و برتر ہے"۔

اب اللہ کی ایک دوسری نعمت لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہ بھی کائنات کا ایک حصہ ہے۔ انسانوں کے دلوں کو چھوا جا رہا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ (۳۱:۳۱) "تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تاکہ وہ تمہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ اب ان کو اپنے فطری خوف کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ یہ سمندر میں ہیں۔ ان کے پاس اب نہ علم ہے اور نہ قدرت۔ تمام قدرتیں اللہ کے پاس ہیں اور یہ بھی دلیل ہے عقیدۂ توحید پر کہ سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (۳۱:۳۲) "اور جب سمندر میں ان لوگوں پر ایک موج سائبان کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں' اپنے دین کو بالکل اسی کے لیے خالص کر کے پھر جب وہ بچا کر انہیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اقتصاد برتتا ہے اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکرا ہے"۔ امواج بحری ہولناکی قیامت کے ہول کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک عظیم خوف ہو گا' یہ یوم آخرت ہو گا۔ ایسا ہولناک منظر ہو گا کہ وہاں وہ تمام رشتے کٹ جائیں گے جو دنیا کی کسی ہولناکی میں نہیں کٹتے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِىْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۳۱:۳۳) "لوگو' بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جبکہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف کچھ بدلہ لینے والا ہو گا۔ فی الواقعہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور نہ کوئی دھوکہ باز تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکہ دینے پائے۔ اس مقطع پر سورہ ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس حال میں ختم ہوتی ہے کہ مومنین کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔ سورہ کے مسائل پر بحث ختم ہوتی ہے اور قاری اور سامع کے دل اور دماغ پر گہرے اثرات پڑ چکے ہوتے ہیں اور اب قلب ونظر کے تاروں پر آخری ضرب

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌۢ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۳۱:۳۴) "اس گھڑی کا علم اللہ کے پاس ہے' وہی بارش برساتا ہے' وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے۔ کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس

سرزمین میں اسی کی موت آتی ہے ۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے"۔

یہ چار سفر اور سبق اپنے مخصوص انداز بیان' دلائل اور آیات و نشانات کے ساتھ ایک نمونہ ہیں کہ قرآن مجید کس انداز سے دلوں میں اپنی بات اتارتا ہے اور یہ انداز اللہ نے اختیار کیا ہے جو انسانی دلوں کا خالق ہے ۔وہ ان راہوں کو جانتا ہے جن کے ذریعے ان دلوں میں اترا جاسکتا ہے ۔وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان کے لیے کیا مفید ہے اور کس طرح مفید ہے ۔

اب مناسب ہے کہ اس اجمالی اور سرسری نظر کے بعد آیات کی تفصیلات کی طرف آئیں ۔ ہم ان اسفار اربعہ کو دو سبقوں کی شکل میں پیش کریں گے کیونکہ مضمون و موضوع بہرحال ایک ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۱۸۵ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۱۹

الٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ "ا۔ل۔م۔ یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں' ہدایت اور رحمت نیکو کار لوگوں کے لیے' جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں"۔

حروف مقطعات ا۔ل۔م سے آغاز ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد یہ فقرہ آتا ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (۳۱ : ۲) "یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں"۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ کتاب انہی حروف سے مرکب ہے۔ جیسا کہ دوسری سورتوں میں بھی یہی اشارات موجود ہیں۔ کتاب کو کتاب حکمت کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا اصل موضوع ہی فلسفہ و حکمت ہے لہٰذا یہاں اس کتاب کی اس صفت کو لایا گیا کیونکہ اس سورہ کے مضامین کے ساتھ اس کی مناسبت ہے اور یہی قرآن کا انداز ہے۔ کتاب کو کتاب حکیم کہہ کر یہ تاثر دیا گیا کہ یہ ایک زندہ کتاب ہے۔ اور یہ ارادتاً ایک ہدف کی بڑھ رہی ہے۔ گویا یہ ایک زندہ شخصیت ہے۔ بہت ہی دانشمند اور اس کی گفتگو میں ایک مقصد ہے۔ اس کا ایک متعین ہدف ہے' اور یہ اس ہدف کی طرف بالارادہ بڑھ رہی ہے۔ اس میں روح ہے' اس میں زندگی ہے۔ اس میں حرکت ہے' اور اس کتاب کی ایک ذات اور شخصیت ہے جو متعین ہے۔ یہ محبت کرنے والی ہے اور

یہ ہر اس شخص کے ساتھ مکالمہ کرتی ہے جو اس کی صحبت میں بیٹھے ۔ جو اس کے سایوں میں زندگی بسر کرے اور وہ اس کی اس کشش کو محسوس کرے جس طرح ایک زندہ دوسرے زندہ کی طرف رکھتا رکھتا ہے اور جس طرح دوست دوست کی طرف کھنچتا ہے ۔

یہ ہے کتاب حکیم ۔ اور اس کی آیات ہدایت اور رحمت ہیں محسنین کے لیے ۔ یہ اس کی اصل ماہیت ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے اور یہ محسنین کے لیے ہمیشہ ہدایت رہتی ہے ۔ یہ ان کو ایک متعین منزل مقصود تک پہنچاتی ہے جس طرح ایک زندہ شخص کسی کو راہ دکھاتا ہے مگر کرخت طریقے سے نہیں بالکل الفت اور محبت کے ساتھ نہایت آرام اطمینان کے ساتھ اور اس کی ہدایت یہ ہے کہ پہلے نماز قائم کرو اور اپنے رب سے رابطہ قائم کرو اور پھر زکوۃ ادا کرو' اہل ایمان کے دل اس کے ذریعے باہم جوڑ کر رکھ دو اور پھر تمام اہل ایمان اللہ کی اس کائنات کے لیے ہمکلام اور مربوط ہو جائیں جس میں وہ رہتے ہیں ۔ یہ کتاب وہ اقدار اور وہ حالات پیدا کرتی ہے جس میں تمام انسانوں کا مقام متعین ہو اور وہ اپنی اصل پہچان جان سکیں ۔ اس کتاب کے ہدایت یافتہ لوگ اس فطرت سے بھی متعارف ہوں جس فطرت پر انہیں پیدا کیا گیا ہے اور سیدھے ہوں اور ان کے اندر کوئی زیغ اور ٹیڑھ نہ ہو ۔

یہ کتاب جن محسنین کے لیے ہدایت ہے وہ کون ہیں؟

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۳۱:۴)

"جو نماز قائم کرتے ہیں' زکوۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں" ۔ جب کوئی نماز قائم کرتا ہے ۔ اس کے پورے ارکان کے ساتھ اسے ادا کرتا ہے' بروقت ادا کرتا ہے اور مکمل طور پر ادا کرتا ہے تو اس کی حکمت' اس کا اثر انسانی شعور اور انسانی طرز عمل میں واضح ہو کر سامنے آتا ہے' اور اس کے ذریعہ اللہ اور بندے کے درمیان وہ تعلق قائم ہو جاتا ہے' جو مطلوب ہے ۔ اللہ سے انس پیدا ہوتا ہے اور نماز کے اندر مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے اور زکوۃ کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کے اندر جو فطری بخل ہے' اس پر انسان قابو پا لیتا ہے ۔ وہ امت مسلمہ کے لیے ایک اجتماعی نظام کی بنیاد ہوتی ہے اور امت کے اندر اجتماعی کفالت کی بنیاد پڑتی ہے ۔ اس سوسائٹی میں امیروں اور غریبوں دونوں کے اندر اعتماد ہوتا ہے ۔ اطمینان ہوتا ہے اور باہم مودت اور محبت ہوتی ہے ۔ اس کے اندر طبقاتی نفرت نہیں ہوتی اور آخرت پر ایمان تو تمام نیکیوں کی اساس ہے ۔ اس سے قلب بشری ہر وقت بیدار رہتا ہے ۔ اس کی نظریں عالم آخرت پر ہوتی ہیں اور زمین کی گندگیوں اور زمین کے عارضی سازوسامان کے مقابلے میں اس کی نظریں بلند ہوتی ہیں ۔ خفیہ طور پر اور اعلانیہ طور پر انسان یہ دیکھتا ہے کہ اسے اللہ دیکھ رہا ہے اور انسان درجہ احسان تک پہنچ جاتا ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو کہ اسے تم دیکھ رہے ہو' اگر تم اسے نہ دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے" ۔ (بخاری و مسلم' کتاب الایمان)

یہ لوگ جو ایسی نماز پڑھتے ہیں' جو اس نیت سے زکوۃ دیتے ہیں ۔ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں ۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۱:۵) "یہی لوگ رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں" ۔ جس نے ہدایت پائی' اس نے فلاح پائی ۔ وہ ایک

روشنی پر چل رہا ہوتا ہے۔ منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ گمراہیوں سے اور فساد سے بچ جاتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس کرۂ ارض پر اپنے اس سفر پر وہ مطمئن ہوتا ہے۔ پتہ رہتا ہے۔ وہ اس کائنات کے ساتھ ہم سفر ہوتا ہے اور اس کائنات کے ایک جزء کے طور پر اس کے ساتھ ہم آہنگی سے سفر طے کرتا جاتا ہے 'نہایت انس و محبت کے ساتھ۔

ایسے ہی لوگ اس کتاب کی آیات سے راہنمائی پاتے ہیں۔ محسن' غازی' زکوٰۃ دینے والے' آخرت کا یقین رکھنے والے۔ یہ لوگ دنیا اور آخرت میں فلاح پانے والے ہیں۔ یہ لوگ ایک فریق ہیں۔ ان کے مقابلے میں ایک فریق اور بھی ہے۔ کیا ہیں اس کے خدوخال؟

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿٦﴾ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٧﴾

"اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے۔ ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتا ہے گویا کہ اس نے انہیں سنا ہی نہیں' گویا کہ اس کے کان بہرے ہیں۔ اچھا' مژدہ سنا دو اسے ایک دردناک عذاب کا"۔

لہو الحدیث سے مراد تفریحی اور دلچسپ کلام ہے جس سے محض وقت گزارنا مطلوب ہو۔ اس کلام سے کوئی اچھا اور مفید نتیجہ نہ نکلتا ہو اور نہ اس میں کوئی ایسی تعمیری بات ہو' جو انسان کے منصب خلافت سے متعلق ہو۔ جو انسان کی ذہنی' اخلاقی اور معاشی اور دینی اور اخروی کسی غرض سے وابستہ نہ ہو۔ اسلام انسان کے لیے اس دنیا میں کچھ فرائض متعین کرتا ہے۔ ان فرائض کے حدود' وسائل اور طریقہ کار بھی متعین کرتا ہے۔ یہ آیت عام ہے۔ یہ انسانوں کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے جو ہر زمان و مکان میں بالعموم پایا جاتا ہے۔ بعض روایات یہ بتاتی ہیں کہ اسلام کی پہلی جماعت کے دور میں ایک متعین واقعہ بھی ہوا تھا' اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ مکہ کا ایک ادیب نضر ابن الحارث ایران سے ایسی کتابیں خرید کر لاتا تھا جن میں ایرانیوں اور ان کے بڑے لوگوں کے افسانے اور تاریخی واقعات ہوتے تھے اور ان کی جنگوں کے دلچسپ واقعات ہوتے تھے۔ یہ شخص مکہ کی گلیوں میں بیٹھ کر ان لوگوں کو روکتا جو قرآن سننے کے لیے جاتے تھے اور ان کو یہ افسانے سناتا۔ یہ شخص قصص القرآن کے مقابلے میں قصص ایران سناتا تھا۔ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ یہ آیت اس واقعہ میں وارد ہے تو بھی یہ آیت عام ہے۔ یہ لوگوں کی اس قسم کے خدوخال واضح طور پر بتاتی ہے۔ اس قسم کے لوگ ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی موجود تھے جس دور میں مکہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ (۳۱ : ۶) ”انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے“۔ یعنی اس کام میں اپنا مال اور اپنا وقت خرچ کرتا ہے اور اپنی زندگی اس میں کھپاتا ہے۔ اس قدر قیمتی چیزیں وہ اس قدر بے وقعت اور بے قیمت چیزوں میں خرچ کرتا ہے۔ اپنی محدود اور قیمتی عمر اس میں کھپاتا ہے۔ یہ عمر جو نہ واپس آتی ہے اور نہ واپس لائی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کام کیوں کرتا ہے۔

لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا (۳۱ : ۶) ”تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے“۔ ایسا شخص جاہل ہے اور اس کی نظروں سے حقیقت اوجھل ہے۔ وہ کوئی بات علم و یقین کی بنیاد پر نہیں کرتا۔ نہ وہ حکمت کی بنیاد پر کوئی کام کرتا ہے۔ اس کی نیت بھی خراب ہے اور اس کی غرض بھی فاسد ہے۔ وہ لوگوں کو بدراہ کرنا چاہتا ہے۔ خود اپنے آپ کو بھی گمراہ کرتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے اور اپنی زندگی کو اس میں فضول ضائع کرتا ہے۔ پھر وہ اس قدر گستاخ ہے کہ دعوت اسلامی کے ساتھ مذاق کرتا ہے اور اس اسلامی نظام کے ساتھ مذاق کرتا ہے جو اللہ نے وضع کیا ہے تاکہ وہ لوگوں کی زندگی کا دستور و قانون ہو۔ چنانچہ قرآن مجید ایسے لوگوں کی تصویر کشی سے بھی قبل ان کو اہانت آمیز عذاب کی دھمکی دیتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۳۱ : ۶) ”ایسے لوگوں کے لیے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ان کے لیے توہین آمیز عذاب ہوگا' اس لیے کہ انہوں نے یہاں دعوت اسلامی کی توہین کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ لوگ اسلامی نظام زندگی کے ساتھ مزاح کرتے تھے۔

اب اس دھمکی کے بعد اس گروہ کے خدوخال قلم بند کیے جاتے ہیں۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا (۳۱ : ۷) ”اسے جب ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ اس طرح رخ پھیر لیتا ہے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں“۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جس کے اندر اس متکبر شخص کی ہیئت کذائی کو اچھی طرح قلم بند کر دیا گیا ہے۔ وہ نہایت غرور سے منہ موڑ کر گزر جاتا ہے' سنی ان سنی کر دیتا ہے۔ چنانچہ اگلا رنگ اس تصویر میں نہایت حقارت آمیزی سے بھرا جاتا ہے۔

كَاَنَّ فِیْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا (۳۱ : ۷) ”گویا اس کے کان بہرے ہیں“۔ گویا اس کے کانوں کا یہ بھاری پن اللہ کی آیات کو اس کے کانوں تک پہنچنے ہی نہیں دیتا۔ ورنہ ان آیات کو کوئی انسان بھی اگر سنے تو وہ ان کے ساتھ یہ مذموم برتاؤ نہیں کر سکتا۔ یہ رنگ پھر مزید اہانت آمیز کر دیا جاتا ہے۔

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۱ : ۷) ”مژدہ سنا دو اسے دردناک عذاب کا“۔ یہ موقع کسی بشارت کا موقع نہیں ہے لیکن یہاں ان کی توہین مطلوب ہے اور ایسے متکبرین مسخروں کے لیے یہی انداز مناسب ہے۔

--- ooo---

اعراض کرنے والوں' تکبر کرنے والوں اور کفر کرنے والوں کی اس اہانت آمیز سزا کی مناسبت سے یہاں ضروری ہے

کہ اچھے عمل کرنے والے اہل ایمان کے انعام اور جزا کا بھی ذکر کر دیا جائے ۔اس سورہ کے آغاز میں ان کا ذکر ہو چکا ہے اور ان کی کامیابی کا ذکر کر دیا گیا ہے ۔اگرچہ وہاں اجمالی تھا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتُ النَّعِيمِ ﴿٨﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٩﴾

"البتہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں 'ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے ۔ یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اہل ایمان کی جزاء کا ذکر ہے وہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر ضرور کیا گیا ہے اس لیے کہ اسلامی نظریہ حیات کا مزاج یہ نہیں ہے کہ ایمان محض منجمد' پوشیدہ' معطل اور مجرد تصور ہی ہو بلکہ ایمان کو ایک زندہ' فعال اور متحرک حقیقت ہونا چاہئے ۔جب وہ دل میں پیدا ہو' قرار پکڑے پورا ہو' تو متحرک ہو کر عملی شکل اختیار کرے ۔وہ حرکت اور طرز عمل کی شکل اختیار کرے اور عالم واقعہ میں اس کے آثار اپنی ترجمانی کریں ۔اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس مومن کے دل میں کیا ہے ۔

یہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو عملی شکل دی ۔

لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيمِ (۳۱ : ۸) "ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔ یہ باغات اور یہ دوام اللہ کے عہد کے مطابق ان کو دیا جا رہا ہے ۔

وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا (۳۱ : ۹) "یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے"۔اللہ کی مہربانی اس حد تک آگے بڑھ گئی کہ اس نے اپنے اوپر اپنے بندوں کے ساتھ احسان کرنا فرض کر لیا ۔یہ ان کے نیکی اور ان کے نیک اعمال کے بدلے میں حالانکہ اللہ تو غنی ہے ۔اسے کسی کے عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۳۱ : ۹) "وہ تو زبردست و حکیم ہے"۔وہ اپنے عہد کو پورا کرنے کی قدرت رکھتا ہے ۔مخلوقات کو اس نے بڑی حکمت سے بنایا ہے ۔وعدہ بھی حکمت سے کرتا ہے اور پورا بھی حکمت سے کرتا ہے ۔

---ooo---

اس بات کی دلیل کیا ہے کہ اللہ عزیز و حکیم ہے اور اس سے قبل جو کچھ کہا اس کا ثبوت کیا ہے؟ یہ عظیم کائنات جس کی تخلیق کا دعویٰ کوئی انسان اور کوئی قوت نہیں کر سکتی ماسوائے اللہ کے ۔یہ کائنات بہت ہی عظیم ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔اس کا نظام نہایت مستحکم اور دقیق ہے ۔اس کی ساخت نہایت ہی متوازن ہے ۔جوں جوں اس کائنات کے بارے میں زیادہ معلومات ہوتی ہیں اور انسان غور کرتا جاتا ہے 'عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسان کا تصور بھی رک جاتا ہے اور یہ عظیم کائنات ایک ایسی دلیل اور ایک ایسی شہادت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا تھا ۔جس سے کوئی منہ نہیں موڑ

سکتا۔ جو بھی ذرا غور کرے' ذات باری کے تسلیم کرنے کے سوا اس کے لیے چارہ کار ہی نہیں ہے اور جو لوگ پھر بھی اللہ وحدہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں وہ حق کے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

"اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیئے اور آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگا دیں۔ تو یہ ہے اللہ کی تخلیق' اب ذرا مجھے دکھاؤ' ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔

یہ آسمان' بغیر اس کے کہ ان کے بارے میں ہم جدید پیچیدہ سائنسی معلومات پیش کریں' اپنی ظاہری حالت میں جب ہمارے حواس کے سامنے آتے ہیں تو یہ بہت ہی عظیم لگتے ہیں۔ یہ آسمان ستارے اور سیارے ہوں' یا کہکشاں اور سدم ہوں۔ جو بلندیوں میں تیر رہے ہیں اور ان کے حقیقی راز سے صرف اللہ ہی واقف ہے یا آسمان سے مراد یہ قبہ ہو جسے ہم دیکھتے ہیں اور جس کی حقیقت سے اللہ ہی خبردار ہے۔ غرض آسمان سے مراد جو بھی ہو' بہرحال یہ عظیم کرات بغیر سہارے اور ستونوں کے کھڑے ہیں۔ انسان رات اور دن ان سماوات کو دیکھتے ہیں اور جس چھوٹے سے ستارے پر انسان سوار ہیں' اس تک ہم جس قدر دوریاں قریب کر دیں اس عالم کا محض تصور ہی سر کو چکرا دیتا ہے کہ یہ عالم کس قدر عظیم اور ہولناک ہے جس کے حدود و قیود انسان کے ادراک سے ابھی تک باہر ہیں۔ پھر جب ایک انسان سوچتا ہے کہ اس عظیم کائنات کو ایک منظم نظام میں باندھ دیا گیا ہے کہ اس کی حرکت میں ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں آتا۔ پھر اس عالم کو کس قدر خوبصورت بنایا گیا ہے کہ انسان دیکھتا ہی رہ جائے۔ دل سوچتا ہی رہے اور نہ تھکے۔ نظریں بھرتی ہی رہیں اور اس کے نظارے سے ملول نہ ہوں اور جب انسان یہ سوچے کہ اس گول آسمان میں جو چھوٹے چھوٹے نکتے نظر آتے ہیں ان میں سے ایک ایک ستارہ زمین سے ہزاروں گنا بڑا ہے (مثلاً مشتری ایک ہزار گنا) لاکھوں گنا بڑا ہے تو کسی بھی عقلمند انسان کے لیے یہی کافی دلیل ہے۔

فضائے کائنات کے اس لاانتہا سفر سے واپس آیئے' یہ تو قرآن نے ایک سرسری اشارہ ہی کیا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (۳۱ : ۱۰) "اس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے پیدا کیا جو تم کو نظر آئیں"۔ اب اسی زمین کی طرف' اور ذرا جم کر دیر تک اس کے نظاروں کو غور سے دیکھئے۔ یہ چھوٹی سی زمین' کائنات کا ایک ذرہ' اس عظیم کائنات میں تو یہ ایک ذرہ ہی ہے جو فضا میں اڑ رہا ہے۔ ہم اس پر واپس آتے ہیں۔ ہم

سمجھتے ہیں کہ یہ زمین بہت وسیع اور طویل و عریض ہے۔ انسان اپنی مختصر زندگی میں اس کی سیر بھی نہیں کر سکتا۔ اگرچہ وہ پوری عمر اس چھوٹے سے ذرے کے سیر و سفر میں گزار دے۔ انسان کو کہا جاتا ہے کہ ذرا اسی کا مطالعہ کھلی آنکھوں سے کرو' اور طویل الفت اور بار بار دیکھنے کی وجہ سے انسان سے اس کا انوکھا پن گم ہو گیا ہے۔ ذرا اس کے عجائبات کو دیکھو۔

وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ (۳۱ : ۱۰) "اور اس نے زمین میں پہاڑ جما دیئے کہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے"۔ رواسی معنی پہاڑ۔ علمائے طبقات الارض یہ کہتے ہیں کہ پہاڑ دراصل زمین کے چھلکے کی شکنیں ہیں۔ جب زمین کا چھلکا سرد ہو گیا اور اس کے اندر کی گیس سکڑ گئیں تو زمین کا حجم کم ہوتا گیا جس کی وجہ سے زمین کے چھلکے کے اندر شکنیں پیدا ہو گئیں اور اس طرح زمین کے اوپر بلندیاں اور پستیاں اور نشیب و فراز پیدا ہو گئے۔ جس قدر جہاں زیادہ سکیڑ کا عمل ہوا اسی قدر پہاڑ بلند ہو گئے۔ اب چاہے علمائے طبقات الارض کا یہ نظریہ درست ہو یا غلط ہو' لیکن اللہ کی کتاب یہ کہتی ہے۔ اللہ نے پہاڑ جما دیئے تاکہ زمین کی رفتار کے اندر توازن ہو اور انسان اس کی سطح پر رک سکے اور اس کے اندر ڈولنے کا عمل نہ ہو۔ علمائے طبقات الارض کا یہ نظریہ درست ہو سکتا ہے اور وہ اس بات کو تسلیم بھی کرتے ہیں کہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین کی رفتار محوری کے اندر وہ توازن نہ ہوتا جو ہے اور اللہ کا حکم ہر حالت میں بلند ہے اور رہے گا کیونکہ اللہ تمام متکلمین میں سے سچا اور صادق ہے۔ صدق اللہ العظیم۔

وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ (۳۱ : ۱۰) "اور اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیئے"۔ اس عظیم کائنات کے عجائبات میں سے یہ ایک حیرت انگیز اعجوبہ ہے کہ اس زمین کے اوپر اللہ نے رنگا رنگ زندگی کو پھیلایا ہے۔ آج تک کوئی شخص راز حیات ہی کو نہیں پا سکا اس کی یہ بوقلمونی اور رنگا رنگی تو بڑی چیز ہے۔ انسان اس حیات کی سادہ ترین صورت کو بھی نہیں پا سکا چہ جائیکہ وہ زندگی کی اعلیٰ اقسام' اس کی رنگا رنگی اور مختلف ضخامتیں' اور خوبصورت جانور اور پرندوں کو جان سکے جن کی تعداد کا بھی انسان کو علم نہیں ہے۔ بے حد افسوس ہے کہ بعض لوگ علم کے باوجود ان عجائبات پر آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں گویا وہ ایک بالکل معمولی چیز دیکھ رہے ہیں۔ یہی انسان جب انسان کی بنائی ہوئی ایک چھوٹی سی مشین کو دیکھتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے اور بار بار الٹ پلٹ کر اسے دیکھتا چلا جاتا ہے حالانکہ یہ مشین اللہ کے پیدا کردہ ایک سادہ خلیے سے زیادہ پیچیدہ نہیں ہو سکتی اور ان خلیوں کے جو دقیق اور پیچیدہ متصرفات ہیں' وہ سب اعجوبے ہیں۔ ہم صرف سادہ خلیے کے عجائبات کی بات کرتے ہیں۔ رہے وہ پیچیدہ تخلیق والے بڑے انسان جن کے جسم میں سینکڑوں کیمیاوی تجربہ گاہیں اور لیبارٹریاں کام کر رہی ہیں جن کے اندر سینکڑوں سٹورز ہیں جہاں مواد جمع ہوتے ہیں اور تقسیم ہوتے ہیں اور جن کے اندر ایک عجیب مواصلاتی نظام ہے جو لاسلکی کے طور پر پیغامات لیتا ہے اور ارسال کرتا ہے اور سینکڑوں دوسرے عوامل ہزارہا فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ (۳۱ : ۱۰) "اور آسمانوں سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اگا دیں"۔ آسمانوں سے پانی برسانا عجائبات تکوینی میں سے ایک اعجوبہ ہے لیکن چونکہ یہ اکثر ہمارے سامنے دہرایا جاتا ہے اس لیے ہم اس پر سے غفلت کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ یہ پانی جس

سے نہریں ہو کر بہتی ہیں جس سے بحیرے بھر جاتے ہیں جس کے ساتھ زمین میں چشمے پھوٹتے ہیں ۔ یہ پانی ایک نہایت ہی پیچیدہ نظام کے تحت آسمانوں سے برستا ہے ۔ یہ آسمانوں کے نظام کے ساتھ مربوط ہے ۔ اس کا مزاج ' اس کی تشکیل اور کرات کی دوریوں سے یہ مربوط ہے ۔ پھر پانی کے نزول کے بعد زمین کے اندر مختلف النوع اور مختلف المشکل نباتات ' ذائقے مختلف ' رنگ مختلف ' حجم مختلف ' خواص مختلف ۔ ان کے اندر ایسے ایسے عجائبات کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتے نباتات میں زندگی اور نمو ان کا تنوع ' ان کی وراثتی خصوصیات جو چھوٹے سے بیج کے اندر موجود ہوتے ہیں ۔ یہ چھوٹا سا بیج اپنے آپ کو دہراتا ہے ۔ پودا ' پھول اور درخت کی شکل اختیار کرتا ہے ۔ ایک ہی پھول کے اندر رنگوں کی تقسیم کا مطالعہ ہی انسان کو خالق کائنات کی عظیم قوتوں کی طرف کھینچ لیتا ہے اور انسان کا ایمان گہرا ہوتا چلا جاتا ہے ۔

پھر قرآن تصریح کرتا ہے کہ اللہ نے نباتات میں بھی جوڑے پیدا کیے ۔

مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ (۳۱ : ۱۰) "عمدہ قسم کے جوڑے"۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے کہ سائنس کو بہت ہی قریب زمانے میں اس کا علم اور تجربہ ہو سکا ہے ۔ ہر پودے میں نر اور مادہ خلیے ہوتے ہیں ۔ یہ خلیے ایک ہی پھول میں یا ایک ہی شاخ کے دو پھولوں میں ہوتے ہیں یا یہ خلیے دو درختوں میں علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور کوئی پودا اس وقت پھل نہیں دیتا جب تک نر اور مادی خلیے باہم ملتے نہیں ہیں ۔ جیسا کہ انسانوں اور حیوانوں کے توالد کا نظام واضح ہے ۔

اور زوج کے ساتھ کریم کی صفت ' یہاں اس لفظ کے استعمال کے ذریعے ایک خاص تاثر دینا مطلوب ہے کہ یہ اللہ کریم کی تخلیق ہے اور یہ بہت ہی اہم اعجوبہ ہے جسے دیدۂ عبرت سے دیکھا جانا چاہیے اور اس کا احترام کرنا چاہیے ۔ یہ اس لیے بھی لایا گیا ہے کہ اللہ نے تو یہ عمدہ کام کیے ہیں اور جن ہستیوں کو تم الٰہ سمجھے ہوئے ' ذرا بتاؤ انہوں نے کیا کام کیے ہیں ۔ یہ تو ہے

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (۳۱ : ۱۱) "یہ تو ہے اللہ کی تخلیق اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے"۔ زوج کریم کے بعد یہ چیلنج اور اب یہ نتیجہ

بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۱ : ۱۱) "اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔ اور شرک سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے جبکہ اس عظیم کائنات کا یہ معجزہ ہمارے ساتھ ہے ۔ یہاں پہلا سفر ختم ہوتا ہے اور نہایت ہی رو داد الفاظ پر ۔

--- ○○○---

اس کے بعد اب دوسرا راؤنڈ شروع ہوتا ہے ۔ یہ بالکل جدید ترتیب سے ہے ۔ یہ بالواسطہ ہدایت اور حکایتی انداز تلقین ہے ۔ موضوع بحث اللہ وحدہ کا شکر ادا کرنا ہے ۔ اور اللہ کو ہر قسم کے شرک سے پاک قرار دینا ہے ۔ اس حکایت کے درمیان آخرت اور اعمال اور ان کی جزا کی بات کی گئی ہے ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ

فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿١٢﴾

”ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔ جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے“۔

حضرت لقمان حکیم کی زبانی یہاں عقیدۂ توحید، عقیدۂ آخرت اور دوسری اخلاقی تعلیمات یہاں دی گئی ہیں۔ ان کے بارے میں روایات مختلف ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ نبی تھے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ نبوت کے منصب کے بغیر ایک عبد صالح تھے۔ زیادہ تر مفسرین اس دوسری رائے کی طرف گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک حبشی غلام تھے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ نوبہ کے رہنے والے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے ججوں میں سے ایک جج تھے۔ وہ جو بھی ہوں قرآن نے ہمیں یہ اطلاع دی ہے کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جس کو اللہ نے حکمت عطا کی تھی اور اس حکمت اور فلسفے کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلَّهِ (۳۱ : ۱۲/۱) ”ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کے شکر گزار ہو“۔ چنانچہ قرآن کریم ہمیں اس قصے کے ضمن میں یہ ہدایت دیتا ہے کہ تم لوگ للہ کا شکر ادا کرو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت اور اطلاع کہ شکر تو شکر کرنے والے کے لیے ایک ذخیرہ ہے۔ اس کے نتیجے میں خود شاکر کو نفع ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تو غنی بادشاہ ہے کوئی شکر کرے یا نہ کرے اس کی بادشاہت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اللہ تو بذات خود محمود اور قابل ستائش ہے، چاہے کوئی اس کی حمد و ثنا کرے یا نہ کرے۔

وَمَن يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (۳۱ : ۱۲) ”جو کوئی شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے اور جو کفر کرے تو حقیقت میں اللہ بے نیاز ہے“۔ لہٰذا بہت بڑا احمق ہے وہ جو حکمت کے مخالف ہو اور وہ اپنے لیے یہ سرمایہ جمع نہ کرتا ہو۔

اب مسئلہ توحید ایک تقریر کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کے سامنے کی۔

وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴿١٣﴾

”یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا ”بیٹا، خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے“۔

یہ ایک ایسا وعظ ہے جو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے کیونکہ کوئی والد اپنے بیٹے کے لیے اچھائی کے سوا اور کوئی ارادہ ہی نہیں کر سکتا۔ ایک والد اپنے بیٹے کے لیے ناصح مشفق ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ہیں لقمان حکیم جو اپنے بیٹے کو شرک سے منع کرتے ہیں اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ شرک دراصل ایک عظیم ظلم ہے۔ وہ اس بات کو دو بار اپنی تقریر میں

دہراتے ہیں۔ایک بار تو وہ شرک سے روک کر اس کی علت بتاتے ہیں اور دوسری تاکید لفظ ان اور لام تاکید کے ساتھ کرتے ہیں۔یہی وہ بات ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ ہیں کہ ناحق مجادلہ کرتے ہیں اور اس عقیدے پر زور دینے کی وجہ سے حضرت پر الزامات عائد کرتے ہیں کہ شاید ان کی کوئی ذاتی غرض اس سے وابستہ ہے' مثلاً یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حکمران بننا چاہتے ہیں اور ان کے مقابلے میں بڑا آدمی بننا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ان کی یہ بات درست نہیں ہے اس لیے کہ حضرت لقمان اپنے بیٹے کے سامنے یہی تقریر کرتے ہیں اور ان کو شرک سے رکنے کا امر کرتے ہیں ظاہر ہے کہ کوئی والدکم ازکم اپنے بیٹے سے کوئی غلط بات نہیں کر سکتا۔لہٰذا یہ نصیحت ہر قسم کے ظن اور گمان سے پاک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے بھی حکمت دی گئی وہ عقیدۂ توحید کا قائل ہوتا ہے۔عقیدۂ توحید سے غرض خیر ہی خیر ہے اور کچھ بھی نہیں اور یہ ایک نفسیاتی استدلال ہے۔

---ooo---

چونکہ یہ والد کی جانب سے اپنے بیٹے کو ایک مشفقانہ وعظ تھا' اس لیے یہ بھی بتا دیا گیا کہ جب والد اپنی اولاد کے حق میں اس قدر مخلص اور مشفق ہوتا ہے تو تمام انسانوں کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ والدین کا تم پر حق ہے۔یہ تقریر بھی نہایت ہی محبت بھرے الفاظ میں ہے۔یہ باپ اور بیٹے' والدین اور اولاد کے تعلق کو نہایت ہی شفیقانہ اور اشاراتی انداز میں بیان کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود نظریاتی تعلق اور نظریاتی روابط کو نسب اور خون کے تعلق سے مقدم رکھا جاتا ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿١٤﴾ وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾

"اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔(اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا' میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے' اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو"۔

قرآن کریم میں بار بار اولاد کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے والدین کا خیال رکھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نصائح میں بھی اس کی بار بار تاکید آتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں والدین کو اپنی اولاد کے بارے میں بہت کم ہدایت دی گئی ہے۔جو نصیحت کی گئی ہے وہ زندہ درگور کرنے کی بری رسم کے سلسلے میں ہے جبکہ یہ رسم بہت ہی محدود علاقوں

میں تھی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچوں پر رحم و شفقت ہر انسان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے ۔ اللہ نے سلسلہ حیات کو جاری رکھنے کے لیے والدین کے اندر یہ داعیہ رکھ دیا ہے کہ وہ بچوں کی نگہداشت کریں ۔ والدین ' اپنے جسم ' اپنے اعصاب اور اپنی عمریں بچوں کے لیے کھپا دیتے ہیں ۔ وہ اپنی ہر قیمتی چیز اپنے بچوں پر قربان کر دیتے ہیں اور اس راہ میں جو بھی مشکلات آ جائیں اف نہیں کرتے اور نہ شکوہ کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات والدین لاشعوری طور پر بچوں کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں بلکہ وہ بچوں پر نہایت ہی خوشی خوشی سے سب کچھ قربان کر دیتے ہیں ۔ اس طرح گویا یہ سب کچھ والدین اپنے لیے کرتے ہیں ۔ لہذا بچوں کے لیے فطرت انسانی خود کفیل ہوتی ہے ' مزید کسی وصیت اور تاکید کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ۔ رہا لڑکا اور اولاد تو ان کو بار بار یاد دہانی کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس نسل کا خیال رکھیں جس نے تم پر سب کچھ قربان کر دیا ہے ' جس نے سب تدبیریں تمہارے لیے کیں اور جواب ٹمٹماتے چراغ ہیں یا چراغ سحری ہیں جنہوں نے اپنی عمر ' اپنے جسم اور اپنی روح کو کشید کر کے تمہاری زندگی کا ساماں تیار کیا ہے اور جہاں تک بچوں اور اولاد کا تعلق ہے وہ والدین کی قربانیوں کا پورا معاوضہ نہیں دے سکتے اگرچہ وہ اپنی پوری عمر ہی والدین کے لیے وقف کر دیں ۔ ذرا اس پر تاثیر تصویر کو دیکھیں ۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ (۱۴:۳۱) "اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے" ۔ اس قربانی اور اس نیکی کی تصویر اس سے اچھی نہیں بنائی جا سکتی ۔ والدہ اپنے فریضہ طبعی کی رو سے زیادہ قربانی دیتی ہے اور بچوں کے لیے اس کی محبت ' شفقت اور نرمی باپ کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے ۔ حافظ ابوبکر بزار نے اپنی سند میں یہ روایت کی ہے بذریعہ مریدہ اور اس کے والد کہ ایک شخص طواف میں تھا اور اپنی ماں کو اٹھا کر طواف کرا رہا تھا تو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا میں نے اس کا حق ادا کر دیا ہے ؟ تو حضور ؐ نے فرمایا نہیں ' ایک سانس کے برابر بھی نہیں ۔ یوں ایک سانس کے برابر بھی نہیں ۔ حمل کے دور میں اور وضع حمل کے دور میں ' جب کہ وہ اسے ضعف پر ضعف جھیل کر اٹھا رہی تھی ۔

اس خوشگوار شکر گزاری کے سائے میں متوجہ کیا جاتا ہے کہ منعم اول کا شکر ادا کرنا بھی ضروری ہے ۔ پہلا شکر اللہ کا ہے اور دوسرا والدین کا ہے ۔

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (۱۴:۳۱) "کہ میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا" ۔ اور ان حقائق کے ساتھ یہ اہم حقیقت بھی یاد رکھو ۔

اِلَيَّ الْمَصِيْرُ (۱۴:۳۱) "میری ہی طرف تمہیں پلٹنا ہے" ۔ اور وہاں یہی ساز و سامان تمہیں فائدہ دے گا ۔

لیکن والدین اور اولاد کے اس تاکیدی تعلق کے باوجود اور اولاد کی جانب سے اس حرمت اور ادب کے باوجود یہ تعلق ثانوی ہے ۔ اس سے قبل نظریاتی تعلق ہے ۔ لہذا اولاد کو یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ نظریات کے سلسلے میں والدین کے احکام اور خواہش کو بھی رد کیا جا سکتا ہے ۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (۱۵:۳۱)

"لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان"۔
کیونکہ والدین کی اطاعت کی سرحد یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے رب تعالیٰ کی اطاعت کا حکم ہے اور نظریاتی تعلق باپ بیٹے کے تعلق سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اس لیے والدین کسی کو مشرک بنانے کے جو احکام دیں، جدوجہد کریں، دباؤ ڈالیں، مطالبے کریں، ناراض ہوں، تو ان کی یہ بات نہیں مانی جا سکتی کیونکہ اولاد جانتی نہیں ہے کہ اللہ کا کوئی شریک بھی ہے۔ لہٰذا حکم یہ ہے کہ یہاں سے آگے والدین کی اطاعت نہیں ہے۔ خالق کی اطاعت ہے۔

لیکن نظریاتی اختلاف اور نظریات کے بارے میں والدین کی عدم اطاعت کے حکم کے باوجود والدین کی عزت و احترام اور ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ ضروری ہے۔

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (۳۱:۱۵) "دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ"۔ یہ دنیا کی زندگی تو ایک مختصر سفر ہے۔ اصل سفر یہ ہے۔

وَّ اتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ (۳۱:۱۵) "مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے"۔ یعنی اہل ایمان کی پیروی کرو۔ اور اس مختصر سفر کے بعد پھر تم نے اللہ کے سامنے حاضری دینی ہے۔

ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۱:۱۵) "پھر تم سب کو پلٹنا میری طرف ہے۔ پھر میں تمہیں بتا دوں گا کہ تم کیسے عمل کر کے آئے ہو"۔ اور ہر شخص کے لیے وہاں جزاء ہوگی اس کے اعمال کی چاہے اس نے شکر کیا یا کفر کیا۔ شرک کی راہ اختیار کی یا توحید کا راستہ اپنایا۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت اور سورہ عنکبوت کی آیت جو اس کے مشابہ ہے اور سورہ احقاف کی ایک آیت جس کا یہی مضمون ہے، یہ آیات حضرت سعد ابن ابی وقاص اور اس کی ماں کے حق میں نازل ہوئیں۔ (میں نے بیسویں پارے میں سورہ عنکبوت کی آیت کے ضمن میں تفصیلات دی ہیں) بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت سعد ابن مالکؓ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ طبرانی نے اسے کتاب العشرۃ میں نقل کیا ہے جو انہوں نے داؤد ابن ہند سے روایت کی ہے۔ مسلم کی حدیث میں سعد ابن ابی وقاص کا قصہ آیا ہے اور راجح بات یہی ہے لیکن مفہوم اور حکم تمام ایسے حالات پر عام ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ تعلقات میں بھی درجات ہیں اور فرائض میں بھی درجات ہیں۔ ہر حکم اور ہر تعلق کی اپنی قدر و قیمت ہوتی ہے لہٰذا اسلام میں اللہ کا رابطہ سب سے پہلا رابطہ ہے اور اللہ کے حقوق سب سے اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن کریم مراتب کے اس ذوق کو بار بار جتاتا ہے کہ اگر فرق مراتب نہ کنی زندیقی۔ اور بار بار تاکید اس لیے کی جاتی ہے کہ اس معاملے میں کوئی اجمال و اشکال نہ رہے۔

یہ تو تھا جملہ معترضہ حضرت لقمان کی تقریر میں۔ اس کے بعد ان کی تقریر اور نصیحت پھر شروع ہوتی ہے۔ اور یہ مسئلہ بعث بعد الموت اور حشر و نشر اور جزاء و سزا کے بارے میں ہے کہ وہاں سب کو جزاء و سزا ملے گی اور یہ بہت ہی عادلانہ ہوگی لیکن اس اصول کو محض اصول کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اسے ایک کائناتی تمثیل اور تصویر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس قدر موثر انداز میں جس سے انسانی شعور بے حد متاثر ہوتا ہے اور اس تصویر میں بتایا گیا ہے کہ اللہ اس

کائنات کے ذرے ذرے کو جانتا ہے اس لیے ہر کسی کے اجزائے جسم کے تمام ذرات کو وہ لا سکتا ہے۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿١٦﴾

"(اور لقمان نے کہا تھا کہ) "بیٹا' کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو' اللہ اسے نکال لائے گا۔ وہ باریک بین اور باخبر ہے"۔

اگر کوئی اللہ کے علم کی جامعیت اور ہمنیت کو محض اصولی الفاظ میں بیان کر دے اور اللہ کو بہت قدرتوں والا کہہ دے اور یہ کہ اسے ذرے ذرے کا حساب لینے والا کہہ دے تو وہ اس قدر موثر نہیں ہو سکتا جس طرح یہ مصور انداز تعبیر موثر اور دلنشین ہے۔ یہ قرآن کریم کا مخصوص انداز تعبیر ہے کہ نہایت معنوی اور ذہنی امور کو مصور کر دیا جاتا ہے۔ (دیکھئے میری کتاب التصویر الفنی)۔ رائی کا دانہ بہت ہی چھوٹا' گم گشتہ' بے حقیقت اور بے وزن ہوتا ہے۔ اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ پھر یہ دانہ کسی چٹان (صخرہ) میں ہو کہ وہاں تک پہنچنے کی کوئی راہ بھی نہ ہو یا وہ سماوات میں ہو' جن کی دوریوں کے تصور ہی سے سر چکرا جاتا ہے' جن کے اندر بڑے بڑے عظیم الجثہ کرات بے وزن تیر رہے ہیں یا اس زمین کے اندر وہ رائی کا دانہ کہیں غبار میں پڑا ہو تو اسے بھی اللہ ڈھونڈ لائے گا۔ پس ذرا تصور کر لو اس کے علم و قدرت کے بارے میں۔ وہ بہت ہی باریک بین ہے۔

يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ (۳۱ : ۱۶) اس مضمون کے ساتھ لطیف کا لفظ بہت ہی موزوں ہے۔

اور خیال اس ہولناک' عظیم اور وسیع و عریض کائنات کی وادیوں میں اس رائی کے دانے کے پیچھے سرپٹ دوڑ رہا ہے اور یہ اللہ کے علم اور قدرت کے تصور پر احاطہ کرنے سے عاجز رہ جاتا ہے' اس لیے وہ اللہ کی طرف مڑ کر اپنی عاجزی کا اقرار کرتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ اللہ ہر خفیہ بات کا جاننے والا ہے اور وہ بات ذہن نشین ہو جاتی ہے جسے پورا قرآن انسان کے ذہن میں بٹھانے کے درپے ہے کہ "وہ" دیکھ رہا ہے۔ نہایت ہی بہترین انداز میں اور دلنشیں اسلوب ہیں۔

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت جاری رکھے ہوتے ہیں۔ اللہ پر پختہ ایمان لانے اور دل سے ہر قسم کے شرک کا شائبہ تک دور کرنے اور عقیدۂ آخرت ثابت کرنے اور اسلامی نظریہ حیات دل میں بٹھانے کے بعد اب وہ اسلامی عقیدے کے تقاضے سامنے لاتے ہیں۔ وہ تقاضے یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کے لیے نماز پڑھیں' یہ معراج المومنین ہے۔ لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کے لیے ان کو اسلام کی دعوت دیں۔ جو بھی دعوت دیتا ہے اسے مشکلات پیش آتی ہیں' اس لیے مشکلات پر صبر کرو۔

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ

عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾

"بیٹا" نماز قائم کر' نیکی کا حکم دے' بدی سے منع کر' اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے"۔

یہ اسلامی نظریہ حیات کا راستہ ہے کہ اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھنا' یہ شعور پیدا کرنا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ اس بات کا حتمی ہونا کہ اصل اجر اس کے پاس ہے۔ اس پر بھروسہ کرنا کہ وہ عدل کرے گا اور اس کے عذاب سے بروقت ڈرنا اور اس کے بعد لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دینا' ان کی اصلاح کرنا اور ان کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا اور ان تمام امور سے قبل اپنے آپ کو کفر کے ساتھ معرکہ آرائی کے لیے تیار کرنا اور اس راہ میں مادی تیاری سے زیادہ اہم تیاری اخلاقی تیاری ہے۔ اور وہ اقامت صلوٰۃ اور اس کے بعد پیش آنے والی مشکلات پر صبر' کیونکہ لوگ دعوت کے مقابلے میں کج روی اختیار کرتے ہیں۔ دعوت کے ساتھ عناد رکھتے ہیں اور اعراض کرتے ہیں۔ اذیت میں لسانی اذیت اور دست درازی کی دونوں اذیتیں شامل ہیں۔ مال کی آزمائش اور جان کی آزمائش۔

اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۳۱:۱۷) "یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے"۔ عزم الامور کا مفہوم ہے راستے میں تردد ہونے کے بعد جب کوئی کسی طرف عزم کر لیتا ہے اور پھر راستہ طے کرتا ہے۔

اب حضرت لقمان اپنی نصیحت کو نظریات و عبادات کے بعد اخلاقیات کی حدود میں داخل کرتے ہیں۔ جو کسی بھی داعی کا بہترین زاد راہ ہے کیونکہ دعوت الی اللہ دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان دوسروں کو حقیر سمجھے اور اپنے آپ کو برتر سمجھے اور پھر دعوت دیتے وقت اگر امیر بن جائے تو وہ لوگوں پر اپنی قیادت مسلط کرے اور اگر ایک آدمی دعوت الی الخیر کا کام بھی نہیں کرتا اور پھر بھی وہ بڑا بنتا ہے اور لوگوں سے اونچا رہتا ہے تو یہ بہت ہی زیادہ قبیح حرکت ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿۱۹﴾

۲
ع ۸
۱۱

"اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر' نہ زمین میں اکڑ کر چل' اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر' اور اپنی آواز ذرا پست رکھ' سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے"۔

صعر ایک بیماری ہے جب اونٹ کو لگ جاتی ہے تو وہ اپنی گردن ٹیڑھی کر لیتا ہے۔ قرآن کریم مغرور شخص کے فعل کو صعر کے ساتھ تشبیہ دے کر اس سے لوگوں کو متنفر کرنا چاہتا ہے۔ کبر اور سرتابی کے عمل کو صعر کہا گیا یعنی اپنے رخساروں کو

لوگوں سے کبر و غرور کی وجہ سے پھیر دینا ـ زمین پر اکڑ کر چلنے کے معنی ہیں غرور اور استکبار کے ساتھ چلنا۔ بھولا ہوا اور لوگوں کو کچھ نہ سمجھنے والا ' یہ ایسی حرکت ہے جسے اللہ بھی مکروہ سمجھتا ہے اور لوگ بھی اسے برا سمجھتے ہیں ـ ایسا شخص اپنے بارے میں اونچا خیال رکھتا ہے اور اپنی رفتار میں اس کا اظہار کرتا ہے ـ

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۳۱ : ۱۸) "اللہ کسی خود پسند اور فخر جتلانے والے کو پسند نہیں کرتا"۔

اکڑ کر چلنے کی ممانعت کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ اعتدال کے ساتھ چلو۔

وَ اقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ (۳۱ : ۱۹) "اور اپنی چال میں اعتدال اختیار کرو"۔ قصد سے مراد میانہ روی ہے ـ یعنی وہ اقتصادی پالیسی جس میں اسراف نہ ہو' کیونکہ جو شخص اکڑ کر چلتا ہے' گردن مروڑ کر چلتا ہے اور اپنے آپ کو اونچا سمجھتا ہے وہ اپنی قوت کو ضائع کرتا ہے ـ گویا اسراف کرتا ہے ـ قصد سے مراد ارادہ بھی ہو سکتا ہے یعنی تمہارے چلنے کی حرکت بامقصد ہو اور تمہاری منزل متعین ہو ـ اور اکڑ کر خود پسندی سے چلنے والا شخص ماسوائے دکھاوے کے اور اپنے ذہن میں بڑائی کے کوئی اور مقصد نہیں رکھتا اور یہ کوئی مقصد نہیں ہے ' یعنی اگر چلتے ہو تو کسی مقصد سے سادہ طریقے سے چلو۔

دھیمی آواز میں شائستگی ہوتی ہے ـ اس میں جو شخص بات کرتا ہے وہ اعتماد سے بات کرتا ہے اور اسے اپنی بات کی سچائی کا یقین ہوتا ہے ـ اونچی اور گرجدار آواز سے بات کرنے والا شخص عموماً بے ادب ہوتا ہے یا اسے اپنی بات پر یقین نہیں ہوتا ـ یا وہ اپنی شخصیت کی کمزوری کو شور و شغب میں چھپانا چاہتا ہے ـ جھوٹا شخص ہمیشہ جوش و خروش دکھاتا ہے ـ

قرآن کریم کا اپنا اسلوب ہے ' یہاں بے مقصد اونچی آواز کی قباحت کو ظاہر کرنے کے لیے ایک نہایت ہی مکروہ ' حقیر اور احمقانہ صورت پیش کی جاتی ہے ـ

اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (۳۱ : ۱۹) "سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے"۔ یوں ہر اونچی آواز کو گدھوں کی آواز سے تشبیہ دے کر ' اسے قابل نفرت بنا دیا گیا اور یوں ہر عقلمند اور مہذب شخص اسے حقیر اور قابل نفرت سمجھنے لگتا ہے ـ یہ حقارت آمیز تصویر جس شخص کی نظروں میں ہو ' وہ کبھی بھی گدھوں کی آواز کی طرح آواز نہیں نکالے گا۔

یوں یہ دوسرا سفر ختم ہوتا ہے جس کے اندر پہلے ہی مسئلے پر بحث کی گئی ہے ـ یہ بحث نہایت ہی متنوع اور جدید سے جدید اسلوب میں کی گئی ہے ' قرآن کے اپنے انداز تصویر کشی میں ـ

---ooo---

درس نمبر ۱۸۶ تشریح آیات

۲۰ --- تا --- ۳۴

یہ اس سورہ کا تیسرا راؤنڈ ہے ۔ اس کا آغاز تکوینی دلیل کے بیان سے ہوتا ہے جس کا تعلق لوگوں سے اور ان کی زندگی کی سہولیات و مفادات سے ہے کہ اللہ نے ان پر کیا کیا انعامات کیے' جو ظاہر بھی ہیں اور باطن بھی ہیں' جن سے وہ رات اور دن فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن ان کے باوجود انہیں شرم نہیں آتی کہ وہ ایسے منعم' فضل و کرم کرنے والے' داتا کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور اس کے بعد وہی مسئلہ توحید بیان ہوتا ہے جو اس سے قبل دونوں اسفار میں بیان ہوا۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

"کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں؟ اس پر حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو ان کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو' یا ہدایت' یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب ۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے ۔ کیا یہ انہی کی پیروی کریں گے خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو؟

یہ وہ نظارہ ہے جسے ہم روز دیکھتے ہیں ۔ جسے قرآن کریم بار بار نقل کرتا ہے اور ہر بار منظر کائنات پڑھنے والے کو نیا نظر آتا ہے کیونکہ یہ عظیم کائنات اور اس کے کسی پہلو پر بھی اگر غور کیا جائے' جب بھی غور کیا جائے اور اس کے اسرار و رموز پر تدبر کیا جائے اور اس کے عجائبات دیکھے جائیں تو یہ نیا نظر آتا ہے ۔ اور اس کے اسرار اور عجائبات ختم نہیں ہوتے ۔ انسان اپنی محدود عمر میں وہ پوری معلومات حاصل نہیں کر سکتا ۔ جب بھی کوئی دریافت ہوتی ہے عقل دنگ رہ جاتی ہے

اور جب بھی ہم از سرنو غور کرتے ہیں اسے جدید پاتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم اس کائنات کے اس پہلو کو پیش کرتا ہے کہ اللہ نے یہ کائنات ہمارے لیے مسخر کر دی ہے اور یہ ہر طرف سے انسانی ضروریات کو پورا کر رہی ہے۔ پھر جب اس کائنات کے اندر پائے جانے والی تمام چیزوں کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی ترکیب بڑی عجیب ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی مدبر انجینئر نے بنایا ہے اور یہ یونہی اتفاقی طور پر پیدا نہیں ہو گئی۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ارادہ اس پوری کائنات کے پیچھے کام کر رہا ہے اور وہ اللہ مدبر ہے' جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کائنات کی تمام چیزوں کو انسان کی خدمت میں لگا دیا اور پھر اس کرۂ ارض کی تو ہر چیز کو خدمت انسان میں لگا دیا۔

جہاں تک اس ہولناک کائنات کا تعلق ہے' یہ زمین اس کا ایک چھوٹا سا ذرہ ہے اور اس زمین پر پھر انسان ایک چھوٹی سی ضعیف مخلوق ہے بمقابلہ حجم زمین اور بمقابلہ ان قوتوں کے جو اس زمین کے اندر قدرت نے رکھی ہیں جو زندہ بھی ہیں اور مردہ بھی ہیں۔ ان قوتوں کے مقابلے میں انسان اپنے حجم' طاقت اور وزن کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں۔ لیکن اللہ نے انسان کو فضیلت دی اور اس کے جسم میں اپنی روح پھونکی اور اسے اپنی مخلوقات کے ایک بڑے حصے پر فضیلت دے دی۔ اللہ کا یہ فضل و کرم ہی تھا جس کا تقاضا یہ ہوا کہ اس مخلوق کی اس کرۂ ارض پہ اہمیت ہو۔ اور اس کا سب مخلوق سے بلند مقام ہو۔ اس کے اندر یہ قوت اور صلاحیت ہو کہ وہ اس دنیا کے وسائل کو کام میں لائے اور اس کے اندر یہ قوت اور صلاحیت ہو کہ وہ اس دنیا کے وسائل کو کام میں لائے اور اس کے قدرتی ذخائر کی تلاش کرے۔ اس آیت میں جس تسخیر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' وہ یہی ہے کیونکہ تسخیر کائنات ہی میں اللہ کی ظاہری اور پوشیدہ نعمتوں کا شمار ہوتا ہے۔ یہ تسخیر اس کے علاوہ ہے جو اللہ نے سماوات کی قوتوں کو بھی انسان کے لیے مفید بنایا ہے۔ انسان کا وجود ہی اللہ کا فضل ہے اور پھر انسان کو اس قدر قوت و صلاحیت دی جاتی ہے کہ وہ اس کائنات کی سرکش قوتوں کو مسخر کرے۔ یہ اللہ کا دوسرا فضل ہے اور پھر اس کی ہدایت کے لیے رسولوں کو بھیجنا' اللہ کا مزید فضل ہے۔ ہر وہ سانس جو وہ لیتا ہے' دل کی ہر دھڑکن جو اس کے جسم میں خون دوڑاتی ہے۔ اس دنیا کا ہر منظر جسے وہ دیکھتا ہے' ہر وہ آواز جو اس کے کانوں سے ٹکراتی ہے' ہر وہ خیال جو اس کے ضمیر میں آتا ہے' ہر نئی فکر جو وہ تخلیق کرتا ہے۔ یہ سب اللہ کے وہ انعامات ہیں جن میں ایک کا شکر بھی انسان اپنی پوری زندگی میں ادا نہیں کر سکتا۔ یہ سب اللہ کے فضل ہی فضل ہیں۔

اس انسانی مخلوق کے لیے اللہ نے ان تمام قوتوں کو مسخر کیا ہے جو زمین و آسمان کے درمیان ہیں۔ سورج کی کرنوں کو اس کی خدمت میں لگا دیا۔ چاند کے نور کو اس کے لیے مفید کر دیا' ستاروں سے اس کے لیے سمندروں میں راہنمائی فراہم کی۔ بارش' ہوا' پرندے اور چرندے اس کے مفید مطلب بنا دیئے گئے۔ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کے لیے مفید اور مسخر ہو گئے۔ یہ تو ہم بڑی سہولت سے دیکھ سکتے ہیں۔ ان پر تو ہمیں رات اور دن تدبر کرنا چاہئے۔ اس طویل و عریض کرۂ ارض پر اسے خلیفہ بنایا گیا اور زمین کے تمام خزانوں پر اس کا کنٹرول قائم کر دیا گیا۔ بعض خزانے ظاہر ہیں اور بعض باطن ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کے آثار و اثرات اس کے ادراک میں ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو ابھی اس کے ادراک سے باہر ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ ان سے وہ استفادہ کرتا رہا لیکن اسے ان کا علم ہی نہ تھا۔ غرض انسان ہے کہ رات اور دن کے ہر لمحے میں اس پر اللہ کے فضل و کرم کی بارش ہو رہی ہے اور وہ اللہ کی رحمتوں میں غرق ہے لیکن اسے معلوم نہیں

کہ ان رحمتوں کی انتہا کیا ہے۔اس کے انواع و اقسام کیا کیا ہیں لیکن ان سب امور کے باوجود لوگوں میں سے ایک فریق ایسا ہے جو اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا' ان پر غور نہیں کرتا' اپنے ماحول میں غور و فکر کر کے یقین نہیں رکھتا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (۳۱: ۲۰)

"اس کے باوجود حال یہ ہے کہ انسانوں میں سے بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو یا کوئی ہدایت یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب"۔

اللہ کے بارے میں یہ مجادلہ عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے جبکہ یہ کائنات اور اس کی بوقلمونیاں ہمارے سامنے ہیں اور ان وافر نعمتوں کی تعداد ہی ہمیں معلوم نہیں۔ ایسے حالات میں یہ انکار اور یہ تکذیب نہایت قبیح' نہایت مذموم' قابل نفرت اور فطرت کے خلاف ہے۔ اور انسان اگر غور کرے تو مارے خوف کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور واضح طور پر نظر آتا ہے کہ اللہ کی نعمتوں کا یہ انکار کرنے والا شخص دراصل فطرتاً منحرف ہے۔اس کے اندر فطری بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کی پکار کو نہیں سن رہا ہے اور وہ اس قدر جری اور بے شرم ہو گیا ہے کہ وہ اپنے ایسے منعم کے بارے میں گستاخی کرتا ہے۔پھر اس شخص کا یہ مجادلہ اور یہ انکار کسی علم سائنس پر بھی مبنی نہیں ہے۔محض جہالت پر مبنی ہے۔پھر ایسے شخص کے پاس نہ کوئی کتابی ثبوت ہے اور نہ دلیل منیر ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا

(۳۱: ۲۱) "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا"۔یہ ہے ان کی واحد دلیل جو وہ اپنے رویے پر پیش کر سکتے ہیں۔یہ بھی عجیب دلیل ہے۔پتھر جیسی جامد تقلید' جو نہ علم پر مبنی ہے' نہ کسی نظریہ پر مبنی ہے۔یہی وہ تقلید ہے جس سے اسلام انسانیت کو چھڑانا چاہتا ہے۔ان کی عقل کو آزادی دیتا ہے کہ وہ آزادانہ غور و فکر کریں اور انسان کے اندر بیداری' حرکت اور روشنی پھیلانا چاہتا ہے لیکن انسان ہیں کہ وہ اپنے ماضی کے آثار سے منحرف ہو گئے ہیں اور انہوں نے زبردستی قلادے اپنی گردنوں میں ڈالے ہوئے ہیں اور مویشیوں کی طرح اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھا ہوا ہے اور بیڑیاں ازخود پہن رکھی ہیں۔

اسلام تو دراصل ضمیر کی حریت اور شعور کی حریت کا نام ہے۔وہ نور کی تلاش میں آگے بڑھتا ہے۔وہ زندگی کا ایسا نظام ہے جس میں کوئی تقلید اور کوئی غلامی اور جمود نہیں ہے۔لیکن افسوس ہے کہ یہ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور اپنی روح سے اس آزادی کو پرے پھینکتے ہیں اور اللہ کے بارے میں بغیر علم' بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی کتاب منیر کے مجادلہ کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اب ان کے ساتھ مذاق کیا جاتا ہے اور ان کے موقف کی ایک خفیہ خطرناکی بیان کر دی جاتی ہے۔

اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (۳۱: ۲۱) "کیا یہ انہی کی پیروی

کریں گے خواہ شیطان انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف کیوں نہ بلاتا ہو"۔ انہوں نے جو یہ موقف اختیار کر رکھا ہے تو وہ شیطان کی دعوت پر اختیار کر رکھا ہے تاکہ وہ انہیں جہنم کی آگ تک پہنچا دے۔ تو سوال یہ ہے کہ اگر شیطان انہیں جہنم کی طرف لے جا رہا ہے تو پھر بھی یہ اس کی تقلید کریں گے۔ یہ نہایت ہی احساس دلانے والی چٹکی ہے۔ نہایت ہی بیدار کرنے والی اور ڈرانے والی۔ خصوصاً اس عظیم کائناتی دلیل کے بعد۔

اس ہٹ دھرمی پر مبنی جدال اور بے دلیل جھگڑے کے حوالے سے۔ اب ان کو بتایا جاتا ہے کہ ان کے لیے مناسب طرز عمل کیا ہے اور اس کائناتی دلیل اور اللہ کے وسیع انعامات کے بعد انہیں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾

"جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور عملاً وہ نیک ہو' اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے"۔

یعنی پوری طرح اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور اس کے ساتھ حسن عمل اور حسن سلوک کو اپنانا' یعنی مکمل سپردگی اور اللہ کے فیصلوں پر پوری طرح راضی ہونا' اللہ کے احکام' ہدایات اور فرائض میں رنگ جانا' اس شعور اور یقین کے ساتھ کہ اللہ کی رحمت ہمارے شامل حال ہے اور اللہ ہروقت نگہبان ہے۔ اس کا وجدان اللہ کی رضامندی کو پاتا ہو اور وہ اس سپردگی میں اپنے ساتھ پوری کائنات کو سربسجود دیکھتا ہو۔ یہ سب اشارات اپنے چہرے کو اللہ کے حوالے کرنے کے لفظ کے اندر موجود ہیں۔ چہرہ دراصل نہایت ہی مکرم حصہ ہے وجود انسانی کا۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى

(۳۱ : ۲۲) "جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور عملاً وہ نیک ہو' اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا"۔ یعنی وہ رسی جو نہیں کٹتی۔ جو کبھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔ جو کبھی اس شخص کو دھوکہ نہیں دیتی جو اسے پکڑتا ہے۔ مراد وہ سہارا ہے جسے انسان تھام لیتا ہے یعنی جو شخص اللہ کے سپرد ہو جائے وہ سمجھے کہ وہ مشکل ترین حالات میں' تاریک راتوں میں' سخت مشکلات میں' سخت آندھیوں میں' کبھی بے سہارا نہ ہو گا۔

یہ مضبوط سہارا وہ یقین ہے اور وہ گہرا رابطہ ہے جو بندۂ مومن اور اس کے رب کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ ایسا شخص ہر حال میں مطمئن ہوتا ہے اور اس پر جو مشکلات بھی آئیں وہ انہیں برداشت کرتا ہے۔ نہایت اطمینان اور نہایت وقار کے ساتھ۔ بڑے بڑے واقعات اور حادثات میں وہ باوقار رہتا ہے اور مشکلات کو برداشت کرتا ہے۔ نیز وہ اگر خوشحال ہوتا ہے تو بھی وہ آپے سے باہر نہیں ہوتا اور اعتدال اور سنجیدگی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ اسی طرح اگر اس پر اچانک کوئی بحران آجائے تو وہ حواس باختہ نہیں ہوتا اور نہ خدا کے راستے میں آنے والی گوناگوں مشکلات میں پریشان ہوتا ہے۔

دعوت اسلامی کا سفر طویل اور خطرات سے پر ہے۔ اس میں محرومیاں اور مشکلات بھی خطرناک ہوتی ہیں لیکن

خوشحالی اور مالداری اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ مصیبت بھی آزمائش اور عافیت بھی آزمائش ۔ لہٰذا ایسے سہارے کی اس راہ میں ہروقت ضرورت ہوتی ہے جو کبھی ڈھیلا نہ ہو۔ایسی رسی کی ضرورت ہوتی ہے جو ٹوٹ نہ جائے اور یہ ضرورت ہروقت رہتی ہے۔یعنی مضبوط سہارے کی اور یہ مضبوط سہارا کیا ہے؟ اسلام لانا' اللہ پر یقین کرنا' اس کے سپرد ہو جانا اور راہ احسان اختیار کرنا۔پھر انجام اللہ کے ہاتھ میں دے دینا۔

وَالَی اللّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (۳۱:۲۲) "اور سارے معاملات کا آخری فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے"۔ یعنی اسی کی طرف لوٹنا ہے اور آخری مرجع وہی ہے تو مناسب ہے کہ انسان پہلے سے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے اور اس کی طرف نہایت روشن اعتماد اور قرآن وسنت کی ہدایت کے مطابق راستے طے کرتا رہے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝

"اب جو کفر کرتا ہے اس کا کفر تمہیں غم میں مبتلا نہ کرے' انہیں پلٹ کر آنا تو ہماری ہی طرف ہے' پھر ہم انہیں بتا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔ یقیناً اللہ سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ہم تھوڑی مدت انہیں دنیا میں مزے کرنے کا موقع دے رہے ہیں' پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے"۔

وہ تو تھا انجام ان لوگوں کا جو اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کے سپرد کر دیں اور یہ ہے انجام ان لوگوں کا جو کفر اختیار کرتے ہیں اور متاع دنیا ان کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔ دنیا میں ان کا انجام یہ ہو گا کہ رسول اور اہل ایمان ان کو اہمیت ہی نہ دیں گے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ (۳۱:۲۳) "اور جو کفر کرتا ہے' اس کا کفر تمہیں غم میں مبتلا نہ کرے"۔ ان کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ آپ جو سرور کونین ہیں ان کے لیے پریشان ہوں۔یہ تو بہت ہی حقیر و صغیر ہیں اور آخرت میں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ حقارت آمیز ہونے والا ہے۔یہ اللہ کے قبضے میں ہیں۔یہ اللہ سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔اللہ ان کو ان کے اعمال کے بدلے پکڑے گا' وہ ہر شخص کے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے' خواہ ظاہر ہو یا خفیہ ہو' یا اس کے سینے میں ہو یا اس کی نیت میں ہو۔

اِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ فَنُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳۱:۲۳) "انہیں پلٹ کر آنا تو ہمارے ہی طرف ہے۔پھر ہم انہیں بتا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر کے آئے ہیں۔یقیناً اللہ سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے"۔ زندگی کا سازوسامان جو انسان کو فریب دیتا ہے ایک مختصر عرصے کے لیے ہے اور نہایت ہی کم قیمت

ہے۔

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَى عَذَابٍ غَلِيظٍ (۳۱ : ۲۴) "ہم انہیں تھوڑی مدت اس دنیا میں مزے کرنے کا موقعہ دے رہے ہیں' پھر ان کو بے بس کر کے ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لے جائیں گے"۔ تھوڑے دن تو مزے کریں گے' پھر خوفناک عذاب سے دوچار ہوں گے اور انہیں اس عذاب کی طرف دھکیل کر لے جایا جائے گا۔ عذاب کی تعریف میں غلیظ کا لفظ آیا ہے اور اس کے ذریعے عذاب کو مجسم کر دیا گیا ہے۔ اور اضطرار کے معنی میں کفار کی بے بسی کا اظہار کیا گیا یعنی وہ اس عذاب سے اپنے آپ کو بچا نہ سکیں گی اور نہ لیت و لعل کر سکیں گے۔ یہ تو تھا کافروں کا حال لیکن جو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لے اور اپنے رخ کو اللہ کے سپرد کر دے اور سنجیدہ اور مطمئن ہو کر رب تعالیٰ کی طرف چل پڑے وہ نہایت ہی اعلیٰ مقام پر ہو گا بمقابلہ کافر کے۔

--- ○○○---

اب ان کو خود ان کی فطرت کی منطقی دلیل سے دوچار کر دیا جاتا ہے' جب ان کے سامنے یہ عظیم کائنات رکھ دی جاتی ہے اور سوال یہ ہے کہ آیا اس کا کوئی خالق ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ہے کیونکہ ذات باری تو انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ اس کے سوا اس کائنات کی اور کوئی تعبیر ہی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ لوگ فطرت کی اس سادہ منطق سے بھی کجی اختیار کرتے ہیں اور اسے بھی بھلا دیتے ہیں حالانکہ اس سے اور کوئی قوی اور درست دلیل نہیں ہے۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢٥﴾ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٢٦﴾

"اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے' تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو الحمدللہ۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ بے شک اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے۔

کوئی معقول انسان جب خود اپنے دل سے پوچھے کہ آخر اس کائنات عظیم کا خالق کون ہے تو وہ یہی جواب پائے گا کہ اللہ۔ یہ جواب ہر شخص اپنی فطرت میں پاتا ہے۔ یہ زمین اور یہ افلاک ہماری نظروں کے سامنے قائم ہیں' ان کے حالات' ان کے حجم' ان کی حرکات' ان کی دوریاں' ان کے خواص اور ان کی صفات سب کے سب اندازہ کیے ہوئے' صحیح اور متعین اور باہم نظم اور نسق میں پروئے ہوئے۔ پھر یہ مخلوق ہیں اور کوئی مدعی بھی نہیں ہے کہ ان کا وہ خالق ہے۔ نہ یہ کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے ان کا اور یہ بھی عقلاً ممکن نہیں ہے کہ یہ عظیم کائنات خود بخود

یونہی پیدا ہوگئی ہے ۔ پھر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ کسی مدبر کے بغیر ہی یہ صدیوں سے اس قدر اٹل تنظیم کی گرفت میں ہے ۔ اور اس کے نظام میں کوئی خلل نہیں ہے ۔ لہٰذا مدبر کا ہونا لازم ہے ۔ جو شخص اس کا قائل ہے کہ یہ خود بخود وجود میں آ گئی ' خود بخود قائم ہوگئی اور منظم ہوگئی محض اتفاقاً ' تو اس سے بڑا احمق اور کوئی نہیں ہے ۔ اس قسم کے قول کو فطرت اپنی گہرائیوں کے ذریعہ مسترد کر دیتی ہے ۔

وہ لوگ جو اس دور میں عقیدۂ توحید کا مقابلہ کر رہے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا راستہ روکے کھڑے تھے سخت مجادلہ کر رہے تھے ۔ یہ لوگ خود اپنی فطرت کے شعور اور منطق کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے ' جب ان کے سامنے یہ کائنات اور اس کی موجودگی کو رکھا جاتا تھا ' جو ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی اور صرف دیکھنے کی ضرورت تھی ۔

اس لیے وہ اس سوال کے جواب میں کوئی تردد نہ کرتے تھے ۔ جب پوچھا جاتا کہ "زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا؟" تو وہ فوراً کہہ دیتے "اللہ نے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ اس جواب کے جواب میں بس اللہ کی حمد کریں "الحمدللہ"۔ الحمدللہ کہ ان پر حق واضح ہوگیا اور انہوں نے فطری منطق کو تسلیم کر لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اس کائنات کی تخلیق کی حد تک موحد ہوگئے ۔ اس کے سوا ہر حال میں حمد و ثنا کرتے رہو ۔ اب جدال و مباحثہ کو چھوڑ کر ایک دوسرا تبصرہ ۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۱ : ۲۵) "مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں"۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ بحث اور مجادلہ کرتے ہیں ۔ دلائل فطرت کو نہیں سمجھتے اور اس عظیم کائنات کے ہوتے ہوئے بھی عقیدۂ توحید کے قائل نہیں ۔

انہوں نے چونکہ زمین اور آسمان کی تخلیق کی حد تک اللہ کی وحدانیت کو مان لیا ہے اس لیے اب بتایا جاتا ہے کہ اللہ خالق ہونے کے ناطے اس کائنات کا مالک مطلق بھی ہے ۔ اس حصے کا بھی جسے انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے اور اس حصے کا بھی جسے مسخر نہیں کیا گیا ۔ لیکن وہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان سازی مخلوق سے غنی ہے اور وہ اپنی ذات میں خود محمود ہے اگرچہ لوگ اس کی حمد و ثنا نہ کریں ۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۳۱ : ۲۶) "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے ۔ بے شک اللہ بے نیاز اور آپ سے آپ محمود ہے ۔ یہ سفر اب اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ غنا ختم ہونے والی نہیں ۔ اللہ کا علم لامحدود ' اس کی قدرت بے انتہا اور اس کی مشیت کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ہے ۔ تمام مخلوق پر وہ قادر ہے اور یہ بات ایک کائناتی منظر کی شکل میں بتائی جاتی ہے ۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۷﴾ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾

"زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی ـ بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے ـ تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا تو (اس کے لیے) بس ایسا ہے جیسے ایک متنفس کو (پیدا کرنا اور جلا اٹھانا) ـ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے ـ

یہ ایک ایسا منظر ہے جو انسانوں کی معلومات اور ان کے محدود مشاہدات سے لیا گیا ہے تاکہ اللہ کی مشیت کے لامحدود کارناموں کو ان کے تصور کے قریب کر دیا جائے ـ اس تمثیل اور مجسم انداز کے بغیر انسانی تصور اس کا ادراک ہی نہیں کر سکتا تھا ـ

انسان اپنے علم کو لکھتے ہیں اور اپنے اقوال کو ریکارڈ کرتے ہیں ' اپنے احکام کو نافذ کرتے ہیں اور قلموں کے ذریعے وہ لکھتے ہیں ـ یہ قلمیں جنگلوں اور کلک سے بناتے ہیں اور پھر سیاہی بنا کر اس سے لکھتے ہیں ـ یہ سیاہی ایک شیشی یا ایک دوات میں ہوتی ہے ـ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ پوری زمین کے درختوں سے قلمیں بنا دی جائیں اور تمام سمندروں کے پانی کو سیاہی میں بدل دیا جائے اور ان جیسے سات اور سمندر بھی لے آئے جائیں اور لکھنے والے بیٹھ جائیں ـ اللہ کے نئے نئے کلمات جو اللہ کے علم پر دلالت کرتے ہوں تو یہ سب سمندروں کی روشنائی ختم ہو جائے اور اللہ کے کلمات علیہ ختم نہ ہوں اور اللہ کے علم کی انتہا نہ ہو ـ اس لیے کہ ایک محدود قوت لامحدود کو احاطہ میں لانا چاہتی ہے ـ محدود قوت جس قدر بھی آگے جائے ' بہرحال اس کی قوت ایک جگہ جا کر ختم ہو جاتی ہے اور لامحدود غیر محیط ہی رہتا ہے ـ غرض اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوتے کیونکہ اللہ کا علم لامحدود ہے ـ اللہ کا ارادہ کسی سرحد پر نہیں رکتا ـ اور اللہ کی مشیت کے حدود و قیود نہیں ہیں ـ

درخت اور سمندر غائب ہو جاتے ہیں ـ تمام زندہ چیزیں اور تمام مردہ چیزیں غائب ہو کر ختم ہو جاتی ہیں ـ تمام حالات اور صورتیں پس پردہ چلی جاتی ہیں اور انسانی دل ' اللہ کے جلال اور قدرت کے سامنے سہا ہوا رہ جاتا ہے ـ وہ قدرت جو نہ پھرتی ہے ' نہ بدلتی ہے اور نہ غائب ہوتی ہے ـ اللہ خالق اور قوی اور مدبر اور حکیم کے سامنے انسان دنگ رہ جاتا ہے ـ

إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۳۱ : ۲۷) "بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے"ـ

اس سفر میں ہم ہولناک منظر کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور اب انسانی فکر و نظر کی تاروں پر آخری مضراب! بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے سامنے تمام لوگوں کا دوبارہ اٹھانا بہت ہی آسان ہے ـ

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ (۳۱ : ۲۸) "تم سارے انسانوں کو پیدا کرنا اور پھر دوبارہ جلا اٹھانا تو بس ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس کو پیدا کرنا اور اٹھانا ـ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے"ـ وہ ارادہ جس کے متوجہ ہوتے ہی مخلوق پیدا ہو جاتی ہے ـ اس کے لیے برابر ہے کہ وہ ارادہ ایک چیز کی طرف متوجہ ہو یا بے شمار چیزوں کی طرف متوجہ ہو ـ اللہ کے لیے یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایک آدمی کو بناتا پھرے اور ایک ایک آدمی پر محنت کرے ـ اس کے لیے ایک آدمی کا پیدا کرنا اور بے شمار ملین لوگوں کا پیدا کرنا ایک ہی طرح کا ہے ـ ایک شخص کا زندہ کر کے اٹھانا اور بے شمار بلین لوگوں کو اٹھانا اللہ کے لیے ایک ہی جیسا ہے ـ اللہ نے تو

صرف ایک لفظ کن کہنا ہے ۔

اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ "اس کا حکم 'جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہے ' تو یہ ہوتا ہے کہ اسے کہہ دے کہ ہو جا 'بس وہ ہو جاتی ہے"۔

اس قدرت 'اس علم 'اور اس مہارت کے ساتھ تخلیق اور بعث بعد الموت اور حساب و کتاب کا عمل سرانجام دیا جائے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ (۳۱ : ۲۸) "اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے"۔

--- ooo---

اب اس سورہ کا تیسرا سفر یا تیسرا راؤنڈ ہے ۔اور اس میں بھی وہی مسئلہ توحید زیر بحث ہے جو پہلے دو اسفار میں تھا۔ فیصلہ ہوتا ہے کہ اللہ حق ہے ۔لوگ جن شرکاء کو پکارتے ہیں وہ باطل ہیں 'عبادت صرف اللہ وحدہ کی چاہئے ۔قیامت کے دن کے بعد جو حساب و کتاب ہو گا اس میں نہ والد اپنی اولاد کا فدیہ دے سکے گا اور یہ ہی بچہ اپنے والدین کی طرف سے کوئی بدلہ دے سکے گا۔ان فیصلوں کے ساتھ کئی دوسرے اور جدید ایشوز نہایت موثر انداز میں لیے گئے ہیں ۔یہ سب مسائل بھی اس کائنات کے فریم ورک میں زیر بحث آتے ہیں ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِىْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۳۰﴾

۳ ا ا ع ۱۲

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں ؟ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے 'سب ایک وقت مقرر تک چلے جا رہے ہیں 'اور (کیا تم نہیں جانتے) کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو 'اللہ اس سے باخبر ہے ؟ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں 'وہ سب باطل ہیں 'اور (اس وجہ سے کہ) اللہ ہی بزرگ و برتر ہے"۔

رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا' ان کا باہم متضاد ہونا اور مختلف موسموں میں ان کا لمبا اور چھوٹا ہونا ایک عجیب منظر ہے۔ لیکن سالوں سے اسے دیکھتے چلے جانا اور بار بار ایسا ہونا انسانوں کو اس سے مانوس کر دیتا ہے اور اکثریت اس اعجوبے کو دیکھتے ہوئے بھی اس کو محسوس نہیں کرتی۔ حالانکہ وہ نہایت ہی باریکی کے ساتھ اور کڑے نظم کے ساتھ واقعہ ہو رہا ہے اور اس میں سیکنڈ کا فرق بھی نہیں آتا۔اس میں کوئی خلل نہیں آتا۔کبھی ایک بار بھی۔ یہ مسلسل دوران زمین اور دوران گردش 'جس میں کوئی کرہ اپنے مدار سے نہ ادھر ادھر ہوتا ہے اور نہ رکتا ہے ۔ایک عظیم اعجوبہ ہے ۔صرف اللہ وحدہ کی ذات ہی اس قسم کے نظام کو وجود میں لا سکتی ہے اور چلا سکتی ہے اور حفاظت سے رکھ سکتی

ہے۔ اس حقیقت کا ادراک صرف افلاک سماوی اور کرات فلکی کے مدارات ہی کے مشاہدے سے ہو جاتا ہے۔

رات اور دن کے اس تغیر کا تعلق شمس و قمر کے دوران سے بھی واضح ہے۔ شمس و قمر کو مسخر کر کے فضا میں رکھنا' روز و شب کے ظہور سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ ان کے لمبے چھوٹے ہونے سے بھی زیادہ عجیب۔ اس عظیم نظام کو صرف اللہ ہی مسخر کر سکتا ہے جو مدبر و خبیر ہے' وہی ہے جو ان چیزوں کو وقت معلوم تک صحیح اندازے سے چلا سکتا ہے۔ رات کا دن میں داخل ہونا اور دن کا رات میں داخل ہونا تو اس پوری کائنات کا ایک معمولی حصہ ہے۔ شمس و قمر کی تسخیر بھی ایک واضح حقیقت ہے' شمس و قمر کی اہمیت ایک عام آدمی کے لیے یہ ہے کہ یہ دونوں اجرام فلکی انسان کے سامنے اور قریب ہیں ورنہ کائنات میں تو یہ بھی ذرے اور حقیر ذرے ہی ہیں۔ اس عظیم علم اور انتظام کے بعد پھر:

اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۳۱ : ۲۹) "جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے"۔ یہ تو ایک معمولی سی بات ہے۔ ان کائناتی حقائق کے بعد یہ غیبی حقیقت بہت ہی چھوٹی ہے اور اللہ کے لیے اس کا کرنا مشکل نہیں۔ یہ دونوں حقائق باہم مربوط ہیں۔

گردش لیل و نہار' تسخیر و شمس و قمر اور اللہ کے علیم و خبیر ہونا' ان تین حقائق کے بعد ایک عظیم حقیقت بیان کی جاتی ہے جس کے اوپر ان تینوں حقائق کا دارومدار ہے اور اس عظیم حقیقت کو اس سفر میں بیان کیا گیا ہے اور اس کے لیے یہ دلیل دی گئی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۳۱ : ۳۰) "یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں' وہ سب باطل ہیں' اور (اس وجہ سے کہ) اللہ ہی بزرگ و برتر ہے"۔ "یہ" یعنی یہ نظام کائنات جو بہت ہی پیچیدہ' باریک دائم' ثابت اور نہایت ہی ہم آہنگ ہے۔ یہ نظام اس لیے قائم ہے کہ اللہ حق ہے اور اللہ کے سوا تمام دوسرے معبود و الٰہ باطل ہیں۔ یہ نظام کائنات حقیقت کبریٰ کی وجہ سے قائم ہے اور حقیقت کبریٰ اللہ واجب الوجود ہے جس کی وجہ سے یہ پورا وجود قائم ہے۔ چونکہ یہ کائنات قائم ہے' لہٰذا اللہ حق ہے اور تبھی یہ کائنات قائم ہے۔ وہی اسے قائم کرتا ہے' چلاتا ہے' حفاظت کرتا ہے اور تدبیر کرتا ہے۔ وہی ہے جو اس کائنات کے قائم رہنے کی ضمانت ہے' وہی اس کے قرار ربط اور نظم کا سبب ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (۳۱ : ۳۰) "یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے"۔ اللہ کے سوا ہر چیز متغیر اور متبدل ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز اپنا رخ بدلتی ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز میں زیادتی اور نقصان واقع ہوتا ہے۔ اس کے اوپر ضعف اور قوت' جوانی اور بڑھاپا' عروج و زوال' اقبال و ادبار آتا ہے۔ اللہ کے سوا ہر چیز نہ تھی نہ ہوئی نہ تھی اور نہ ہو گی۔ یہ صرف اللہ ہی ہے جو قائم و دائم ہے۔ اور اس پر کوئی تغیر' تبدل اور زوال نہیں آتا۔

نفس انسانی کے اندر ایک چیز رہتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ کا یہ قول۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (۳۱: ۳۰) کی پوری مراد ہم الفاظ میں منتقل نہیں کر سکتے۔ اس کا ایک مفہوم ہے اور اس کو محسوس کیا جاتا ہے لیکن میرے لیے اسے الفاظ میں لانا مشکل ہے۔ اسی طرح یہ تعبیر اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۳۱: ۳۰) اس کے سوا کوئی علی اور کبیر نہیں ہے۔ ان تعبیرات کے بارے میں 'میں نے ایک ایسی بات کہہ دی ہے جس کو میرا پورا ادب دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ انسانی تعبیرات میں وہ الفاظ نہیں ہیں کہ ان کے ذریعے ان دو فقروں میں پائے جانے والے حقائق کا اظہار کیا جا سکے۔ یہ بہت ہی بلند حقائق ہیں۔ اللہ حق ہے 'علی ہے 'کبیر ہے۔ انسانی تعبیرات ان مفاہیم کو جو ان فقروں سے محسوس کیے جا سکتے ہیں اور محدود کر دیتی ہیں۔ اس لیے صرف قرآن کی تعبیر ہی ان کے لیے کافی ہے۔

اس کائناتی منظر' عالم بالا کے منظر کے بعد اب ایک دوسرا منظر جو انسانوں کے تجربے اور مشاہدے میں آتا ہی رہتا ہے' روز و شب انسان ان کے تجربے سے گزرتے ہیں۔ یہ ایک کشتی ہے جو سمندر کی وسعتوں میں تیر رہی ہے۔ یہ بھی اللہ کے فضل و کرم سے تیر رہی ہے۔ اللہ لوگوں کو اس منظر میں ایک خطرناک حالت کے ساتھ کھڑا کر دیتے ہیں۔ ایسے مناظر سے اکثر مخاطبین خود گزر چکے ہیں۔ یہ ایک فطری سفر ہے۔ اس میں انسان قدرت اور قدرتی قوتوں کے اندر گھرا ہوتا ہے۔ اس کے پاس کوئی قوت' کوئی مقابلہ' کوئی گرفت اور کوئی غرور نہیں ہوتا۔ جب انسان اس کشتی میں سفر کر رہا ہوتا ہے اور سمندر کی گہرائیوں میں ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۲﴾

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تاکہ وہ تمہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے؟ درحقیقت اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو۔ اور جب (سمندر میں) ان لوگوں پر ایک موج سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دین کو بالکل اسی کے لیے خالص کر کے۔ پھر جب وہ بچا کر انہیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اقتصاد برتتا ہے اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو غدار اور ناشکرا ہے"۔

یہ کشتی ان قوانین قدرت کے مطابق چلتی ہے جو اللہ نے سمندر' کشتی' ہوا' زمین اور آسمانوں میں رکھتے ہیں۔ اللہ نے ان چیزوں کو ان خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا کہ کشتی سمندروں میں چلنے لگی ہے' نہ ڈوبتی ہے' اور نہ ایک جگہ منجمد رہتی ہے۔ اگر ان خواص میں سے کوئی بھی خاصیت کسی ایک چیز کی ختم ہو جائے تو کشتی سمندر میں نہ چل سکے۔ اگر پانی کی کثافت

ختم ہو جائے یا کشتی کے مادے کی کثافت ختم ہو جائے یا اس کی مقدار میں کمی بیشی ہو جائے ۔ ہوا کا دباؤ سمندر پر کم ہو جائے ' ہوا کی موجیں یا سمندر کی موجوں میں خلل ہو جائے اور اگر وہ درجہ حرارت ختم ہو جائے جس کے مطابق پانی پانی رہتا ہے اور جس کی وجہ سے ہوا اور پانی کی موجیں مناسب حدود میں رہتی ہیں ۔ اگر موجودہ حالت سے ایک فیصدی تبدیلی بھی ہو جائے تو کشتی سمندر کے پانیوں کے اوپر نہ تیر سکے ۔ ان خواص کے علاوہ دوسرے عوامل کے مقابلے میں اللہ پر کشتی کا حامی و مددگار ہوتا ہے کہ امواج کی سرکشی کو روکتا ہے ۔ طوفانوں اور موسمی اثرات سے بچاتا ہے ۔ سمندر کی دوریوں میں اللہ کے سوا کوئی اور بچانے والا نہیں ہوتا لہٰذا یہ ہر حال میں اللہ کے رحم و کرم اور فضل و مہربانی کے ساتھ چلتی ہے ۔ پھر اس کے اندر اللہ کے فضل کی چیزیں لدی ہوتی ہیں ۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ فضل کے یہ دونوں معنے ہو سکتے ہیں ۔

لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ (۳۱ : ۳۱) "تاکہ وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے جو تمہاری نظروں کے سامنے ہیں ۔ بشرطیکہ کوئی دیکھنا چاہے ۔ ان میں کوئی اجمال اور اخفا نہیں ہے ۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۳۱ : ۳۱) "اس میں نشانیاں ہیں ہر صبار اور شکور کے لیے" ۔ یعنی مشکلات پر صبر کرنے والا اور سہولیات پر شکر کرنے والا ۔ انسان ہر وقت ان دونوں حالات میں سے کسی ایک میں تو ہوتا ہی ہے ۔ لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ نہ صبر کرتے ہیں اور نہ شکر کرتے ہیں ۔ جب مصیبت آتی ہے تو چیخنے لگتے ہیں اور اگر نجات دے دی جاتی ہے تو چند لوگوں کے سوا شکر نہیں کرتے ۔

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۳۱ : ۳۲) "اور جب ان پر ایک موج سائبان کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ کو پکارتے ہیں اپنے دین کو صرف اسی کے لیے خالص کر کے"۔ ایسے حالات میں کہ کشتی گہرے سمندروں میں ایک پر کاہ کی طرح ہوتی ہے اور موجیں ایسی اٹھ رہی ہوتی ہیں جیسے سائبان ' اور کشتی کے اوپر آ جاتی ہیں تو ایسے خطرناک حالات میں یہ لوگ جھوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ' موہومہ خداؤں کو چھوڑ کر صرف اللہ کو پکارتے ہیں ۔ امن و امان کے دنوں میں یہ جھوٹے اور موہوم معبود ان کی فطرت کو ڈھانپ لیتے ہیں اور فطرت اور خالق فطرت کے درمیان حائل ہو جاتے ہیں اور حالت خطر میں جب یہ پردے گر جاتے ہیں اور ان کی فطرت پردوں اور تہوں کے نیچے کھلی ہو کر سامنے آتی ہے اور وہ اپنے رب کے سامنے سیدھی کھڑی ہوتی ہے ۔ اپنے رب کی طرف رجوع کر لیتی ہے تو دین اللہ کے لیے خالص کر دیتی ہے ۔ اب وہ ہر جھوٹے مدعی کا انکار کر دیتی ہے ہر اس معبود کو ترک کر دیتی ہے جو اجنبی ہے اور دین اللہ کے لیے خالص کر کے صرف اسی کو پکارتی ہے ۔

فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ (۳۱ : ۳۲) "پھر جب وہ بچا کر انہیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کوئی اقتصاد برتتا ہے" ۔ اسے امن و سلامتی اور خوشحالی و سرکشی اور حد سے گزرنے کی طرف نہیں کھینچ لاتی ۔ اور یہ مسلسل اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا ہے ۔ اگرچہ یہ ذکر و فکر میں اللہ کا پورا حق ادا نہیں کرتا کیونکہ ذاکر و شاکر جن انتہاؤں تک پہنچ سکتا ہے وہ یہی ہو سکتی ہیں کہ وہ ادا میں مقتصد ہو اور باطل سیدھا ہو ۔ (لہٰذا مقتصد کا مطلب میانہ

روی کا ہے)

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ خطرہ ٹلتے ہی اور حالت امن آتے ہی وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔

وَمَا يَجْحَدُ بِايٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (۳۱ : ۳۲) "اور ہماری آیتوں کا انکار وہی شخص کرتا ہے جو غدار اور ناشکرا ہو"۔ ختار 'سخت غدار کو کہتے ہیں اور کفور شدید کفر کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ یہ مبالغہ ایسا ہے کہ جو کسی شخص کا وصف بن جاتا ہے اور یہ الفاظ اس شخص کے لیے بہت ہی مناسب ہیں جو کائنات کی ان لاجواب نشانیوں دیکھ کر بھی اور فطرت کی واضح منطق پاکر بھی اللہ کی آیات کا انکار کرتا ہے۔

--- ○○○---

سمندر کی خوفناکیوں کی مناسبت سے 'جہاں لوگوں کا غرور علم' غرور قوت اور غرور قدرت کافور ہو جاتا ہے اور فطرت کے اوپر سے باطل کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور انسان فطری دلائل و نشانات کو اپنے سامنے پاتا ہے۔ ان خوفناکیوں کی مناسبت سے یہاں بتا دیا جاتا ہے کہ اصل ہولناکیوں کا دن تو قیامت کا دن ہو گا۔ اس کے مقابلے میں سمندر کی ہولناکیاں کچھ بھی نہیں ہیں۔ وہ ایسا ہولناک دن ہو گا کہ باپ بیٹے کا تعلق' رحم کا تعلق اور خون کا تعلق بھی ختم ہو گا۔ والد اپنی اولاد کو چھوڑ دے گا اور بیٹا والدین سے بھاگ رہا ہو گا وہاں ہر شخص اکیلا کھڑا ہو گا۔ کوئی مددگار نہ ہو گا اور کوئی سہارا نہ ہو گا۔ تمام رشتہ داریاں اور تعلقات ختم ہوں گے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾

"لوگو' بچو اپنے رب کے غضب سے اور ڈرو اس دن سے جب کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے بدلہ نہ دے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی اپنے باپ کی طرف سے کچھ بدلہ دینے والا ہو گا۔ فی الواقعہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے"۔

یہ نفسانفسی کا عالم ہو گا۔ یہاں دنیا میں جو خوف ہوتا ہے دلوں میں اور شعور میں اس کی تو مثال ہوتی ہے۔ لیکن قیامت کا یہ خوف بے مثال ہو گا۔ اس میں تمام رشتہ داری اور خون کے تعلقات ختم ہوں گے۔ والد اولاد سے بھاگ رہا ہو گا۔ اور اولاد کو والدین کی پرواہ اور فکر نہ ہو گی۔ ہر شخص کو اپنی پڑی ہو گی' نفسانفسی کا عالم ہو گا' کوئی کسی کی جگہ ضامن نہ ہو گا' کسی کو بھی خود اس کے اپنے اعمال کے سوا کسی کا عمل فائدہ نہ دے سکے گا۔ ایسے حالات ظاہر ہے کہ ایسے خوف میں ہوں گے جس کی کوئی نظیر اس دنیا میں نہ ہو گی۔ لہٰذا یہاں خدا سے ڈرنے کی دعوت دینا بہت ہی برمحل دعوت ہے اور آخرت کا مسئلہ نہایت ہی خوف کے عالم میں پیش ہوا ہے اس لیے دل و دماغ اس کی طرف متوجہ ہیں۔

انَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ (۳۱:۳۳) "فی الواقعہ اللہ کا وعدہ سچا ہے"۔ نہ اللہ اس کے خلاف کرتا ہے اور نہ اللہ کا کوئی ٹال سکتا ہے۔ ہر شخص کو اس بے مثال خوف سے گزرنا ہے اور ہر شخص کو پوری باریکی سے حساب و کتاب دینا ہے۔ ایک عادلانہ فیصلہ سنتا ہے جس کے نتیجے میں نہ باپ بیٹے کا بدل ہو گا اور نہ بیٹا باپ کا۔

فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا (۳۱:۳۳) "پس یہ دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے"۔ اس دنیا میں سازو سامان ہے' لہو و لعب ہے لیکن اس کی مہلت بہت ہی محدود ہے۔ یہاں انسان آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے۔

وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ (۳۱:۳۳) "اور نہ دھوکہ باز تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکا دینے پائے"۔ کوئی سازو سامان تمہیں دھوکا نہ دے' کوئی شغل میلہ تمہیں بدراہ نہ کر دے' کوئی شیطان تمہیں وسوسے میں نہ ڈالے۔ دھوکہ باز بہت ہیں' شیطان بے شمار ہیں اور دنیا کی دلچسپیاں بھی ہر طرف سے دامن کش ہیں۔ مال کا غرور بھی شیطان ہے۔ علم کا غرور بھی شیطان ہے' قوت کا غرور بھی شیطان ہے۔ اور شیطان پرستی بھی شیطان ہے' خواہش نفس بھی شیطان ہے۔ شہوت جسمانی بھی شیطان ہے۔ ان تمام شیطانوں سے بچانے والی قوت خوف خدا کی قوت ہے۔

--- ○○○---

اس سورہ کے خاتمے اور اس چوتھے راؤنڈ کے خاتمے پر اور اس خوفناک منظر آخرت کی مناسبت سے فکر و خرد کے تاروں پر یہ آخری اور ذرا شدید مضراب لگتا ہے۔ اس میں اللہ کے علم لامحدود اور انسان کے محدود علم کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ انسان کا علم جس کی دسترس سے ہر وہ چیز غائب ہے جو نظروں سے اوجھل ہو۔ اب اس مسئلے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے جو اس سورہ کا موضوع ہے اور یہ نتیجہ قرآن کی عجیب تصویر کشی سے نکلتا ہے' اللہ کے علم ازلی اور ابدی کی تصویر۔

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ ۚ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۳۴﴾ ع ۴ ۱۳

"اس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے' وہی بارش برساتا ہے' وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے' کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے' اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آنی ہے' اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے قیام قیامت کی گھڑی کو ایک ایسا غیب رکھا ہے جس کا علم کسی کو نہیں ہے تاکہ لوگ ہر وقت چوکنے رہیں۔ ہر وقت قیامت کی توقع کرتے رہیں۔ اور ہر وقت یہ کوشش کرتے رہیں کہ اس کے لیے کچھ کمائیں۔ ان کو معلوم نہیں ہے کہ کب قیامت ہو گی۔ بہرحال یہ اچانک آ جائے گی اور اس وقت پھر کسی تیاری کی کوئی مہلت نہ دی جائے گی۔

نہ کوئی توشہ جمع کرنے کی اجازت ہوگی۔

اللہ اپنی حکمت کے مطابق جہاں چاہتا ہے' بارش برساتا ہے 'جس قدر چاہتا ہے' برساتا ہے۔لوگ اپنے تجربوں اور آلات و علامات کے ذریعہ بارش کے قریب ہونے کا اندازہ لگاتے ہیں۔لیکن وہ نہ بارش برسانے کے اسباب پیدا کر سکتے ہیں اور نہ وقت کا علم رکھتے ہیں۔آیت میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ بارش اللہ برساتا ہے کیونکہ اللہ ہی ہے جو بارش کے لیے طبیعی اسباب فراہم کرتا ہے اور ان کو منظم کرتا ہے۔بارش میں اللہ کا اختصاص یہ ہے کہ اللہ ہی ان کے برسانے پر قادر ہے۔جیسا کہ آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے۔جن لوگوں نے بارش کے وقت کو اللہ کے مخصوص غیبی علوم میں داخل کیا ہے' ان کا خیال درست نہیں ہے' حالانکہ علم دراصل اللہ ہی کا ہوتا ہے اور وہ ہر معاملے میں مختص ہوتا ہے کیونکہ اللہ کا علم ہی صحیح' دائمی اور حاوی ہوتا ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔

وَيَعْلَمُ مَافِي الْاَرْحَامِ (۳۱ : ۳٤) "وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے"۔
یہ اس طرح کا مخصوص علم ہے جس طرح قیام قیامت کا علم ہے اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ماں کے رحم میں کیا ہے۔یعنی پیٹ کے اندر ہر لحظہ اور ہر لمحہ کیا پرورش ہو رہی ہے۔خصوصاً اس وقت جبکہ حمل کا کوئی وزن اور حجم نہیں ہوتا۔پیٹ میں مذکر ہے یا مونث ہے' ابتدائی وقت سے جب خلیہ انڈے میں داخل ہوتا ہے' اللہ کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خدو خال کیا ہیں۔خواص کیا ہیں' حالت کیا اور صلاحیت کیا ہے۔یہ سب امور اللہ کے علم کے ساتھ مختص ہیں۔

وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا (۳۱ : ۳٤) "کوئی متنفس نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرنے والا ہے"۔اچھائی کمائے گا یا برائی۔اسے نفع ہو گا یا نقصان۔آسانی ہوگی یا مشکلات سے دوچار ہو گا۔صحت مند رہے گا یا بیمار ہو گا۔اللہ کی اطاعت کرے گا یا معصیت کرے گا۔اس لیے کہ کسب محض منافع سے بہت عام ہے۔کسب کے اندر وہ تمام حالات داخل ہیں جو کسی شخص کو پیش آ سکتے ہیں۔یہ ایک غیبی امر ہے جس کے دروازے بند ہیں۔یہ پردوں کے پیچھے ہے اور انسان پردوں کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے۔اور وہ نہیں جانتا کہ آگے کیا ہے؟

وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (۳۱ : ۳٤) "کسی شخص کو خبر نہیں کہ کس زمین پر اسے موت آئے گی"۔کیونکہ یہ بھی ایک ایسا معاملہ ہے جو پردہ فردا کے پیچھے ہے اور مستقبل کا دبیز پردہ اس کے اور نفس انسانی کے درمیان حائل ہے۔

نفس انسانی ان پردوں سے ادھر کھڑا ہے۔وہ بے بس ہے' اسے کچھ معلوم نہیں کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کا علم کس قدر محدود ہے۔اس کی بے بسی واضح ہے۔اس طرح سوچنے سے اس کے ذہن سے علم و معرفت کا غرور ختم ہو جاتا ہے اور اس طرح ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان کو بہت ہی قلیل علم دیا گیا ہے اور یہ کہ پس پردہ فردا بے شمار ایسے امور ہیں جنہیں انسان نہیں جانتا۔اگر انسان ان پردوں سے ادھر کی تمام چیزوں کو جانتا تو وہ ان پردوں کے پاس کھڑا ہو جاتا اور معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ کل کیا ہو گا۔لیکن انسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ کل کیا ہو گا بلکہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔یوں انسانی نفس اپنی کبریائی سے ذرا نیچے اتر آتا

ہے ۔ وہ اللہ سے ڈرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اے اللہ اگلے لمحے میں خیر ہو ۔

قرآن کریم اللہ کے ان مخصوص علوم کو نہایت وسیع دائرے میں پیش کرتا ہے ۔ ایسے وسیع دائرے میں جس کا انسان پر بہت اثر ہوتا ہے ۔ نہایت ہی گہرا اثر ۔

یہ میدان زمان و مکان کی وسعت کو بھی سمیٹے ہوئے ہے ۔ حاضر بھی اس کی لپیٹ میں ہے اور آنے والا مستقبل بھی ۔ قریب بھی اور بعید بھی ۔ دلوں کے خیالات میں بھی اور وسوسوں اور تفکرات میں بھی ۔ قیام قیامت کی ساعت بھی اور بارش کے اوقات بھی ۔ پھر رحم مادر تک یہ میدان پھیلا ہوا ہے جو نظروں سے اوجھل ہے ۔ پھر یہ مستقبل قریب کے پیچھے کہ کل کیا ہو گا ۔ زمانہ اگرچہ قریب ہے لیکن علم جہالت کی دور وادیوں میں ہے ۔ موت اور قبر تک یہ دائرہ پھیل جاتا ہے ۔

غرض اللہ کے مخصوص علم کا ایک وسیع دائرہ ہے ۔ لیکن اس وسیع چادر کے کونوں کو سمیٹ کر قرآن کے انداز بیان نے اسے ایک گٹھڑی کی شکل میں جمع کر دیا ہے ۔ یہ علم غیب کی وسیع چادر ہے اور اس کے اندر مختلف النوع تمام امور' کو رکھ کر سمیٹ لیا گیا ہے ۔ اب یہ سب امور، امور غیبیہ مخصوصہ ہیں اور یہ گٹھڑی مضبوطی سے بندھی ہوئی ہے ۔ اور اس سے سوئی کے ناکے کے برابر کوئی چیز باہر نہیں آسکتی ۔ انسان کے سامنے ان علوم کا دروازہ بند ہے کیونکہ یہ دائرہ قدرت انسان سے باہر ہیں ۔ انسان کے علم سے وراء ہیں ' اللہ کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا' ہاں اللہ اپنے حکم سے کسی کو کچھ بتا دے تو الگ بات ہے ' اللہ علیم و خبیر ہے اور اس کے سوا کوئی علیم و خبیر نہیں ہے ۔

یہاں یہ سورہ ختم ہوتی ہے ۔ یہ درحقیقت ایک طویل اور دور دراز کا سفر تھا ۔ اب ہم اس دور دراز کے مطالعاتی سفر سے تھک کر واپس ہوتے ہیں ۔ ہم نے اس میں طویل راہوں کو طے کیا' بوجھ اٹھایا اور غور و فکر کیا ۔ اس کائنات کا مشاہد قدرت دنیا اور اس کے بوقلموں پرندے اور چرندے دیکھے ۔ یہ سورہ ۳۴ آیات پر مشتمل ہے لیکن معانی و افکار کی دنیا طویل و عریض ہے ' بڑی برکت والی ہے ' وہ ذات جس نے دل و دماغ کی تخلیق کی ۔ جس نے اس قرآن کو اتارا' جو دلوں کی بیماریوں کے لیے شفاء ہے اور مومنین کے لیے ہدایت و رحمت ہے ۔

--- ooo ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ------ ۲۱

سورۃ السجدۃ - ۳۲

آیات ۱--- تا--- ۳۰

سورہ سجدہ ایک نظر میں

یہ ایک مکی سورہ ہے اور یہ اس عظیم عقیدۂ توحید اور نظریہ حیات کو قلب انسانی میں بٹھانے اور فطرت انسانی کے قریب تر کرنے کے لیے بہترین انداز خطاب کا' ایک دوسرا نمونہ ہے۔ یہ عظیم عقیدہ کیا ہے؟ یہ کہ اللہ ایک ہے اور بے نیاز ہے۔ نظام زندگی اسی کا ہوگا اور وہی اس کائنات کا خالق ہے۔ وہی آسمانوں اور زمینوں کا مدبر ہے۔ اور اس کائنات کے اندر پائے جانے والی تمام مخلوقات جس کا علم صرف اللہ وحدہ کو ہے وہ سب اس اللہ ہی کے کنٹرول میں ہے۔ یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ ان پر یہ کلام اللہ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اور یہ پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے ہے۔ لوگوں کو ایک دن دوبارہ اٹھایا جاتا ہے اور وہ قیامت کا دن ہوگا اور جزاء وسزا ہوگی۔

یہ ہے وہ نظریہ حیات جسے یہ سورہ ذہن نشین کراتی ہے اور تمام مکی سورتیں اسی نظریہ اور عقیدہ کی دعوت دیتی ہیں۔ ہر سورہ کا اپنا اسلوب ہوتا ہے' اپنے دلائل ہوتے ہیں اور یہ سورتیں قلب انسانی سے مکالمہ کرتی ہیں اور ان میں خطاب اللہ علیم وبصیر کی طرف سے ہوتا ہے۔ اللہ انسانی دلوں کے پوشیدہ رازوں اور خفیہ باتوں سے بھی واقف ہے اور وہ انسانی شخصیت کے نشیب و فراز کو اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ اس کی ساخت اور تخلیق سے بھی اچھی طرح واقف ہے' اس کے اندر جو جذبات' خواہشات اور تقاضے ہیں' ان سے بھی واقف ہے اور مختلف حالات اور مختلف مقامات پر اس کے جو تقاضے ہوتے ہیں ان سے بھی واقف ہے۔

سورہ سجدہ کا موضوع وہی ہے جو سورۂ فرقان کا تھا' مگر اس کا انداز سورہ فرقان سے بالکل مختلف ہے۔ ابتدائی آیات ہی اس نظریہ کو بیان کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد یہ سورہ دل کو جگانے والے دلائل' روح کو روشن کرنے والے براہین اور غور وفکر کو جگانے والے شواہد پیش کرتی ہے جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ آئے ہیں کہ اس موضوع پر اس کائنات اور اس کے صفحات اور مناظر میں دلائل و شواہد موجود ہیں۔ خود انسان کی پیدائش میں اور اس کے مختلف حالات اور اطوار میں اور قیامت کے مناظر میں سے بعض مناظر پیش کر کے بھی اس موضوع کے شواہد دیئے جاتے ہیں۔ یہ مناظر ہاؤ ہو اور دوڑ دھوپ سے بھرپور ہوتے ہیں۔ پھر یہ شواہد گزشتہ زمانوں کی ہلاک شدہ قوموں کے آثار میں بھی موجود ہیں۔ لیکن صرف ان لوگوں کے لیے جو سنتے اور تدبر کرتے ہیں۔

اس سورہ میں ایک سچے مومن کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے کہ وہ کس طرح اللہ سے ڈرتا ہے اور کس طرح اس کی نظریں ہر وقت اللہ کی طرف اٹھی رہتی ہیں۔ اس میں ان نفسوں کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے جو منکر ہیں اور انکار پر مصر ہیں۔ اس جزاء کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے جو ان دونوں فریقوں کو ملنے والی ہے۔ یہ منظر اس طرح بیان ہوا ہے کہ گویا وہ واقعہ ہو گیا اور نظر آرہا ہے اور ہر قاری قرآن اسے دیکھ رہا ہے۔

ان تمام مناظر اور مظاہر میں قلب مومن کو بیدار کرنے' متحرک کرنے اور اسے غور وفکر پر آمادہ کرنے کی کوشش کی

گئی ہے ۔ کبھی ڈرایا دھمکایا گیا ہے ' کبھی امید دلائی گئی ہے اور حوصلہ افزائی کی گئی ہے ۔ کبھی تہدید ہے تو کبھی امید ہے ۔ کبھی وعظ ہے اور کبھی استدلال ہے ' اور اس کے بعد قلب بشری کو ذرا آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ ان مظاہر ' مشاہد اور براہین کو پیش نظر رکھ کر جو چاہے ' رویہ اختیار کرے ۔ اپنے نفس کے لیے جو منہاج چاہے ' اختیار کرے اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور ہدایت اور ضلالت کو دیکھ پرکھ کر اپنے لیے کوئی راستہ اختیار کرے ۔

سورہ اس مسئلے کو چار یا پانچ حصوں میں بیان کرتی ہے ۔ آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے ۔ الف ' لام ' میم ۔ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ سورہ انہی حروف سے مرتب ہے اور اس کے من عند اللہ نزول میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے ۔

مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۲ : ۲) "یہ رب العالمین کی طرف سے ہے"۔ اور اس کے بعد نہایت ناخوشگواری سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ اس کے باوجود یہ لوگ ایسے الزامات لگاتے ہیں ۔ یہ محض افتراء ہیں ۔ یہ تو حق ہے ان کے رب کی طرف سے تاکہ حضرت محمد اپنی قوم کو ڈرائیں ۔

لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۳۲ : ۳) "شاید کہ وہ ہدایت پائیں"۔ یہ مسئلہ اسلام کا پہلا لشو ہے یہ کہ رسول اکرمؐ اللہ کے پیغمبر ہیں اور ان پر وحی آتی ہے اور وہ یہ تبلیغ بحیثیت مامور من جانب اللہ کر رہے ہیں ۔

اس کے بعد اس کائنات میں اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کے مسئلے کو لیا جاتا ہے ' یوں کہ زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان پائے جانے والی تمام مخلوق کا خالق اللہ ہی ہے ۔ اس پوری کائنات کو اللہ نے سنبھال رکھا ہے اور زمین و آسمان کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے ۔ آخرت میں بھی تمام لوگ اس کے آگے پیش ہونے والے ہیں ۔ انسان کا پیدا کرنا اس کے مختلف طور طریقوں میں اس کی سرگرمیاں ' اسے سننے ' دیکھنے اور ادراک کی قوت دینا وغیرہ لیکن افسوس ہے کہ لوگ ان شواہد کو دیکھ کر بھی شکر بجا نہیں لاتے ۔

یہ دوسرا مسئلہ ہے یعنی الوہیت حاکمیت اور اس کے خدوخال ۔ صفت تخلیق ' صفت تدبیرِ کائنات ' صفت احسان صفت انعام ' صفت علم ' صفت رحمت ۔ یہ سب صفات تخلیق اور تکوین کی آیات کے ضمن میں آتی ہیں ۔

اس کے بعد مسئلہ حشر و نشر پیش کیا جاتا ہے اور ان کے اس اشکال کا ذکر کیا جاتا ہے کہ جب ہم مر کر ذرات کی شکل اختیار کر لیں گے تو پھر کس طرح اٹھائے جائیں گے ۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۳۲ : ۱۰) "اور وہ کہتے ہیں کہ جب ہم زمین میں رل مل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے"۔

اس کے بعد تیسرا مسئلہ آتا ہے ۔ خیر و شر اور آخری فیصلے کا مسئلہ ۔ اس کے لیے قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے ۔

اذ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۳۲ : ۱۲) ”جب مجرم سر جھکائے رب کے ہاں کھڑے ہوں گے“۔ یہ اس وقت اپنے یقین بالآخرت کا اظہار کر رہے ہوں گے اس وقت یہ اس قرآن کی بھی تصدیق کر رہے ہوں گے۔ وہ ایسی باتیں کریں گے کہ اگر یہ باتیں وہ دنیا میں کرتے تو ان کے لیے اب جنت کے دروازے کھل جاتے۔ لیکن اے کاش کہ اب یہ یقین و اقرار ان کے لیے مفید نہ ہوگا۔ یہ منظر اس لیے پیش کیا گیا کہ ذرا وقت جانے سے پہلے ہی ان کی آنکھیں کھول دی جائیں اور وہ اس کلمے کا اقرار کر لیں جس کا وہ اس مصیبت کے وقت اقرار کریں گے۔ اب یہ لوگ اقرار کر لیں گے لیکن اب وقت نہیں۔

اس منظر کے ساتھ ہی مومنین کا منظر بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان کو اللہ کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو

خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۳۲ : ۱۵) تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

(۳۲ : ۱٦) ”سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔ ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ بھی رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں“۔ یہ نہایت ہی صاف شفاف تصویر ہے اور اس کو دیکھ کر دل پھڑپھڑاتے ہیں۔ اس تصویر کے ساتھ ساتھ وہ انعامات و اکرامات بھی بتا دیئے جاتے ہیں جو ان کے لیے منتظر ہیں۔ یہ اکرام ایسا ہے کہ انسان کے تصور سے بالا ہے اور یہ اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ لوگ جو اللہ سے ڈر کر خضوع و خشوع کرتے تھے، اس انجام کے امیدوار تھے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِىَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۳۲ : ۱۷) ”پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے“

اس کے بعد مومنین کے انجام کی ایک سرسری جھلک جنت میں اور فاسقین کی جزاء کی ایک سرسری جھلک جہنم میں دکھائی جاتی ہے۔ اور فاسقین کو یہ دھمکی بھی دے دی جاتی ہے کہ جہنم سے قبل اس جہان میں بھی تمہیں سزا دی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی طرف ایک مختصر اشارہ ہے۔ مطلب یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کے مقاصد ایک تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے بھی مومن تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے بھی مومن ہیں۔ انہوں نے بھی دعوت اسلامی کی راہ میں مشکلات اٹھائیں اور صبر کیا۔ اور ان کو جزاء یہ دی گئی کہ امت موسیٰ علیہ السلام نے دنیا کے لوگوں کی امامت کی۔ اشارہ اس طرح ہے کہ مسلمان بھی مشکلات پر صبر کریں اور ان کے خلاف جو سازشیں ہو رہی ہیں ان کو برداشت کریں کیونکہ انہوں نے بھی فرائض امامت ادا کرنے ہیں۔

اس کے بعد اقوام سابق کی ہلاکت کی طرف مختصر اشارات ہیں۔ اہل مکہ رات اور دن ان کھنڈرات سے گزرتے ہیں۔ پھر یہ بھی اشارہ کہ مردہ زمین کو اللہ کس طرح زندہ کرتا ہے اور کس طرح دنیا کی زندگی کی ترقی اور نشوونما ہوتی ہے۔

اور سورہ کا خاتمہ ان کی اس بات پر ہوتا ہے۔

مَتٰی ھٰذَا الْفَتْحُ (۳۲ : ۲۸) "وہ کہتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا"۔ وہ تو یہ سوال اس لیے کرتے تھے کہ ان کو یقین نہ تھا۔ اس لیے جواب نہایت خوفناک دیا جاتا ہے' نہایت تہدید آمیز۔ اور حضور سے کہا جاتا ہے کہ ان سے منہ پھیرلیں اور چھوڑ دیں انہیں کہ اپنے انجام' طے شدہ انجام تک پہنچ جائیں۔

اب ہم تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۱۸۷ تشریح آیات

۱--- تا--- ۳۰

الٓمّٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳﴾

"ا۔ل۔م۔ اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا' شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں"۔

الف۔لام۔میم--- یہ وہ حروف ہیں جن سے عرب واقف تھے جن سے یہ کتاب سب سے پہلے مخاطب تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان حروف سے کلام کس طرح بنایا جاتا ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان حروف سے وہ جو کلام بناتے ہیں اس میں اور اس کلام میں کس قدر فرق ہے۔ ہر وہ شخص یہ فرق جانتا تھا جو اسالیب کلام سے واقف تھا۔ اور جو شخص بھی افکار و معانی کو الفاظ کا لباس پہنانے کا کام کرتا تھا۔ یہ لوگ یہ بھی جانتے تھے اور اسے مانتے تھے کہ نصوص قرآنی کے اندر کوئی خفیہ قوت ہے اور اس کے اندر کوئی گہرا عنصر ہے' جو اسے ایک ایسی قوت قاہرہ عطا کرتا ہے جو بات کو دل میں اتار دیتا ہے۔ ایسی تاثیر ان تمام باتوں اور اشعار میں نہیں ہے جو انسان خود بناتا ہے' یا اس نے بنائے ہیں۔ یہ قرآن مجید کی ایسی خصوصیت تھی جس میں کسی کو کلام نہ تھا' موافق ہو یا مخالف۔ کیونکہ جو شخص بھی یہ کلام سنتا تھا وہ اسے محسوس کرتا تھا۔ وہ اس کلام کو دوسرے کلاموں سے ممتاز پاتا تھا اور اس پر جھوم جاتا تھا۔ اگرچہ وہ یہ نہ جانتا تھا کہ یہ کلام الہی ہے۔

قرآن کریم کو مکہ میں جن مخالف لوگوں نے بھی سنا' کلام کا یہ عنصر ان پر اثر انداز ہوا۔ مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف واقعات پیش آئے۔

ادبائے عرب کے کلام اور شعر میں اور قرآن کریم کی سورتوں اور آیات میں وہی فرق ہے جو اللہ کی مصنوعات میں اور انسانوں کی مصنوعات میں ہے۔ اللہ کی مصنوعات واضح اور ممیز اور جدا ہیں۔ کوئی انسانی مصنوعی چیز اللہ کی بنائی ہوئی چیز کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو لے لیں۔ ایک اصلی پھول کو لے لیں اور ایک مصنوعی پھول کو لے لیں۔ اگر دنیا کے تمام تصویر کشوں کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ مل کر ایسی تصویر بنائیں جس میں کسی ایک اصلی پھول میں رنگوں کی تقسیم کا مقابلہ ہو تو وہ ایسا نہ کر سکیں گے۔ ایک پھول کی کلر اسکیم ہی ایک معجزہ ہے۔ یہی حال ہے کلام الٰہی کا اور دوسرے انسانی کلاموں کا جو سب کے سب انہی حروف تہجی سے بنے ہوئے ہیں۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۲ : ۲) "اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے"۔ یہ ایک فیصلہ کن بات ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے ہے۔ یہاں آیت کے درمیان لَا رَيْبَ فِيْهِ یعنی شک کی نفی کو لایا گیا ہے۔ یعنی مبتداء اور خبر کے درمیان کیونکہ یہ حقیقی "ایشو" ہے اور اس آیت کا اصل مدعا یہ ہے کہ شک کی تردید کی جائے اور اس فقرے کا آغاز حروف مقطعات سے اس بات کا اظہار ہے کہ اگر کوئی شک کرتا ہے تو یہ رہے وہ حروف' وہ میٹریل جس سے یہ کلام بنا ہے' تم بھی بنا لو۔ لہٰذا شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ حروف تمہیں مہیا ہیں' تم اہل لسان ہو' اس کتاب کا انداز ایسا ہے جس کو تم بھی معجزانہ کلام تصور کرتے ہو۔ یہ تمہارا تجربہ ہے اور تمہارے تجربہ کار لوگوں کا یہی کہنا ہے۔

اس قرآن کی ہر سورہ اور ہر آیت اپنے اندر ایک معجزانہ عنصر رکھتی ہے۔ یہ عنصر اس کلام کے اندر بہت ہی گہرا ہے اور وہ یہ بتاتا ہے کہ اس کلام کے اندر کوئی خفیہ قوت ہے۔ جب اس کی تلاوت ہوتی ہے تو انسان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ جھوم اٹھتا ہے' وہ متزلزل ہو جاتا ہے اور اسے اپنے اوپر کنٹرول نہیں رہتا۔ جب بھی کسی نے اس کے لیے دل کھولا' احساس نے کان دھرا' اور انسانی ادراک بلند ہوا اور اس کو سننے اور قبول کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ انسانی ثقافت اور علم و بصیرت جوں جوں وسیع ہوتی جاتی ہے' قرآن کریم کی یہ خصوصیت بہت ہی نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں انسان کا علم بڑھتا ہے' وہ اس کائنات کے اندر دور تک اپنا مشاہدہ بڑھاتا ہے اور وہ اس کائنات اور اس کے اندر کی مخلوق اور افراد تک اپنا علم بڑھاتا ہے۔ .اس کلام کی تاثیر وقتی نہیں ہوتی۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہوتی ہے جب قرآن انسانی فطرت سے ہمکلام ہوتا ہے اور یہ تاثیر ایک حقیقت بن کر سامنے آتی ہے جب قرآن ایک تجربہ کار دل و دماغ سے مخاطب ہو۔ جب یہ ایک تعلیم یافتہ عقل سے ہمکلام ہو' جو ایک بھرے ہوئے ذہن سے بات کر رہا ہو' جس کے اندر علم و معلومات ہوں۔ جوں جوں انسان کا درجہ علم' ثقافت اور معلومات بلند ہوتا ہے' اس قرآن کے معانی' مفاہیم اور اثرات بڑھتے جاتے ہیں (بشرطیکہ انسانی فطرت سیدھی ہو' اس میں ٹیڑھ نہ ہو اور اس کے اوپر خواہشات نفسانیہ کے پردے نہ پڑ گئے ہوں) اور انسان علی وجہ الیقین یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰہُ (۳:۳۲) "تو یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے"۔ یہ بات انہوں نے محض ضد اور عناد سے کہی تھی۔ لیکن سیاق کلام میں یہاں اس کو بصورت سوال استنکاری اور نہایت ہی ناپسندیدہ بات کے لاتا ہے۔ کیا وہ ایسا کہتے ہیں؟ ایسی بات تو انہیں نہیں کہنا چاہئے اس لیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار اور سیرت ان کے اندر موجود مثال ہے۔ انہوں نے تو کبھی کسی پر الزام نہیں لگایا۔ کیا وہ اللہ پر الزام لگاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب بذات خود اپنے اوپر شہادت ہے اس میں تو شک کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔

بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (۳:۳۲) "بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے"۔ سچائی' یہ فطرت ازلی کے عین مطابق ہے۔ یہ کائنات کے اندر موجود حق اور سچائی کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا اس کے اندر گہری سچائی پائی جاتی ہے۔ اس کی ساخت' اس کے بیان' اور اس کے نظام کا ثبات و دوام اور اس کا جامع و مانع ہونا۔ اس کے اجزاء کا باہم ہم آہنگ ہونا اور متصادم نہ ہونا اور اس کے اجزاء کا باہم تعارف اور یگانگت یہ سب اس کے حق پر ہونے پر شاہد ہیں۔

یہ قرآن دراصل اس کائنات کے قوانین قدرت کا ترجمان ہے۔ اس کائنات کے اندر جو سچائی ودیعت شدہ ہے قرآن اس کا لفظی ایڈیشن ہے۔ کائنات عمل ہے اور قرآن اس عمل کی ترجمانی ہے' اس لیے حق ہے۔

یہ اس لیے حق ہے کہ یہ انسان اور اس کائنات کے اندر پائے جانے والے قوانین فطرت کے درمیان رابطہ پیدا کرتا ہے۔ انسان اور اس کائنات کے قوانین کلیہ کے درمیان مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور قرآن انسان اور ان کائناتی قوتوں کے درمیان توافق اور سلامتی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ انسانی قوت اور کائناتی قوتیں باہم معاون' باہم ملاقی ہو جاتی ہیں اور ان کے درمیان پوری پوری مفاہمت ہوتی ہے۔ یوں انسان اپنے اس وسیع ماحول کا دوست بن جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے کہ جب انسانی فطرت اسے پاتی ہے تو اس پر لبیک کہتی ہے۔ نہایت یسر' نہایت خوشی اور نہایت شوق سے بغیر کسی تشتت اور دشمنی کے' کیونکہ دونوں کے اندر ازلی اور قدیم حق رکھ دیا گیا ہے۔

یہ ایک ایسی سچائی ہے جس کے اندر کوئی تعارض' کوئی تضاد نہیں ہے اور وہ پوری انسانیت کے لیے ایک مکمل منہاج حیات ہے۔ یہ منہاج انسانوں کی شخصیت ان کی قوت' ان کے جذبات و میلانات' ان کی حالت صحت اور حالت مرض اور حالت قوت اور حالت ضعف حالت امن اور حالت فساد کو اچھی طرح مدنظر رکھ کر بنایا گیا ہے۔

یہ ایک ایسی سچائی ہے جس میں مکمل عدل ہے۔ یہ نہ دنیا میں بے انصافی کرتا ہے نہ آخرت میں' انسانوں کے اندر جو قوتیں موجود ہیں ان کے ساتھ بھی یہ کوئی بے انصافی نہیں کرتا۔ یہ دینی اور فکری قوتوں کے ساتھ بھی بے انصافی نہیں کرتا۔ یہ انسان کی کسی حرکت کے ساتھ ظلم کر کے اسے کسی معقول سرگرمی سے نہیں روکتا۔ جب تک وہ سرگرمی اس عالم گیر سچائی کے دائرہ کے اندر ہو' جو اس پوری کائنات کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے۔

بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (۳:۳۲) "بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے"۔ یہ تمہاری طرف سے نہیں ہے۔ یہ رب کی طرف سے ہے۔ یہ رب مسلمانوں کا ہی نہیں ہے' رب العالمین ہے۔ یہ ہے اس حق میں کرامت انسانی۔ اس میں رسول کی تکریم ہے کہ وہ اپنی طرف سے افتراء نہیں باندھ رہا۔ پھر یہ اللہ اور رسولؐ کے درمیان

قرب کا ایک رنگ اور پر تو ہے۔ اور یہ در پردہ جواب ہے ان کے اس الزام کا 'کہ یہ اللہ پر افتراء ہے۔ ربک سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حضورؐ اور قرآن کریم کا مصدر اور سرچشمہ باری تعالٰی کے درمیان پختہ تعلق ہے۔ ایک باعزت تعلق اور اس کی وجہ سے وہ نہایت ذمہ داری اور امانت داری کے ساتھ ٹھیک ٹھیک وحی نقل کرتے ہیں۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ (۳۲ : ۳) "تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں"۔ عرب جن کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا تھا۔ آپؐ سے قبل ان کی طرف کوئی رسول نہ بھیجا گیا تھا۔ تاریخ میں بنی اسماعیل میں سے کسی رسول کے آنے کا ذکر نہیں ہے جو عربوں کے جد اول تھے۔ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب نازل کی جو سچائی پر مشتمل ہے تاکہ آپ ان کو ڈرائیں اور وہ ہدایات پالیں۔ ان کی ہدایت اسی کتاب کے ذریعے ممکن ہے کیونکہ اس میں سچائی ہے 'وہ سچائی جو انسان کی فطرت میں بھی موجود ہے۔ انسانوں کے دلوں کے اندر بھی موجود ہے۔

یہ لوگ جن کے ڈرانے کے لیے یہ کتاب نازل کی گئی ہے کہ ان کو ڈرایا جائے 'یہ اللہ کے ساتھ دوسرے الہوں کو شریک کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں سے اللہ کی ان صفات کا بیان شروع ہوتا ہے جن کے ذریعہ وہ معلوم کرلیں کہ اللہ کی الوہیت اور حاکمیت کی مخصوص صفات کیا ہیں اور اس طرح انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کے عقائد نہایت پوچ ہیں۔ ان عظیم صفات کا موصوف تو اللہ ہے جو رب العالمین ہے اور اس کے ہم پلہ و ہمسر ہونے کا کوئی مستحق نہیں ہے۔ نہ ان کو چاہئے کہ وہ کسی اور کو اس کا ہم پلہ بنائیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

"وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کے بعد عرش پر جلوہ فرما ہوا 'اس کے سوا نہ تمہارا کوئی حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کے آگے سفارش کرنے

والا‘ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے ۔ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے ۔ وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا‘ زبردست اور رحیم ۔ جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی ۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی‘ پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے‘ پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیئے‘ آنکھیں دیں اور دل دیئے تم لوگ کم ہی شکرگزار ہوتے ہو“۔

یہ ہے اللہ ۔ اور یہ ہیں اس کی الوہیت کے آثار و شواہد ۔ یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے اور لاانتہا عالم میں اس کے شواہد ہیں جو انسان کے محدود ادراک سے وراء ہے ۔ خود انسان کی پیدائش اور اس کی نشوونما کے مختلف مدارج ہیں جنہیں لوگ جانتے ہیں اور انسانی نشوونما کے ان مدارج میں جن سے انسان ابھی تک بے خبر ہے‘ اس کے شواہد موجود ہیں ۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (۳۲ : ۴) ”وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے‘ چھ دنوں میں پیدا کیا“۔ اور یہ چھ دن ہمارے ان دنوں سے یقیناً مختلف ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں کیونکہ زمین کے دن تو وہ ہیں جو سورج کے سامنے زمین کی گردش محوری سے پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ دن ایک شب و روز پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ زمین اس کائنات کے اندر بہت ہی مختصر سا ٹکڑا ہے ۔ ایک ذرہ ہے جس کی اس عظیم فضا میں کوئی وقعت نہیں ہے ۔ ہمارے روز و شب تو زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد پیدا ہوئے اور یہ روز و شب زمانہ کی وہ مقدار ہے جس کے مطابق ہم حساب و کتاب کرتے ہیں ۔

ان چھ ایام کی حقیقت کیا ہے تو اس کا علم اللہ ہی کو ہے ۔ ہمارے پاس ان دنوں کے حساب و کتاب کا کوئی ذریعہ نہیں ہے ۔ یہ اللہ کے ایام ہیں جن کے بارے میں اللہ نے فرمایا

فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲ : ۵) ”اور تمہارے رب کے نزدیک ایک دن‘ تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہے“۔

یہ چھ دن وہ چھ حالات بھی ہو سکتے ہیں جن سے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی فضا گزری‘ یہاں تک کہ وہ اپنی موجودہ حالت تک پہنچی یا یہ تخلیق کے چھ مراحل تھے یا یہ چھ زمانے تھے جن کے درمیان کے وقت کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے ۔ بہرحال جو بھی مراد ہو‘ ان سے وہ دن مراد نہیں ہیں جو ہمارے زمانے کے دن ہیں ۔ بہرحال وہ ایک غیبی امر ہے اور اس کی مراد ہم متعین نہیں کر سکتے ۔ مراد وہ زمانہ ہے جو تخلیق‘ تقدیر میں مطابق حکمت الہیہ صرف ہوا اور اس زمانے میں اللہ نے ہر چیز کو اس کی موجودہ شکل تک پہنچایا مختلف مراحل‘ ادوار سے گزار کر ۔

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (۳۲ : ۴) ”اور اس کے بعد عرش پر جلوہ فرما ہوا“۔ استواء علی العرش اشارہ ہے اس طرف کہ اللہ کے قبضہ قدرت میں تمام کائنات ہے ۔ رہا یہ کہ عرش کیا ہے تو ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے ۔ انہی الفاظ پر بات کو ختم کرتے ہیں ۔ بہرحال استوا علی العرش سے مراد ہے قدرت شاملہ ہے ۔ پھر لفظ ثم بھی ترتیب زمانی کے لیے نہیں ہے کیونکہ اللہ کے حالات بدلتے نہیں ہیں ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے اللہ کس حال میں تھا

پھر کسی دوسرے حال میں ہو گیا۔ یہ معنوی ترتیب ہے کہ اللہ نے اس کائنات کو پیدا کیا اور جب سے پیدا کیا وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے یعنی بالعموم یہ کہا جاتا ہے کہ پیدا پہلے کیا اور قبضہ قدرت میں بعد میں ہوا اور نہ ایسا کوئی زمانہ نہ تھا کہ اللہ کے قبضہ قدرت میں نہ ہو۔ اس بے قید قبضہ قدرت کے بیان کے بعد اب لوگوں سے کہا جاتا ہے۔

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ (۳۲ : ۴) "اس کی مانند نہ تمہارا کوئی حامی و مددگار ہے اور نہ کوئی اس کے آگے سفارش کرنے والا ہے"۔ کہاں اور کون سفارشی ہو سکتا ہے جبکہ اللہ سبحانہ عرش پر متمکن ہوں اور زمین و آسمان سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہوں اور خالق ارض و سما بھی وہی ہو۔ تو اس کے سوا کوئی حامی ہو سکتا ہے اور اس کے سوا سفارش کرنے والا کون ہو سکتا ہے اور کون سفارشی اللہ کی سلطنت سے خارج ہو سکتا ہے۔

اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (۳۲ : ۴) "کیا تم ہوش میں نہیں آتے"۔ یہ حقیقت اس بات کی یاد دہانی کراتی ہے کہ اللہ کا اقرار کرو، اور اپنا رخ اسی کی طرف کر دو۔ تخلیق اسی کی ہے وہی مکمل اختیارات رکھتا ہے، وہی تدبیر کرتا ہے اور امور طے کرتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ زمین و آسمان کے تمام امور اس کی طرف بلند ہوتے ہیں، قیامت میں بھی تمام معاملات اس کے سامنے پیش ہوں گے اور دنیا میں بھی تمام رپورٹیں اس کی طرف پہنچتی ہیں اس طویل دن میں جس کی مقدار اس کو معلوم ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲ : ۵) "وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے"۔

قرآن کا انداز تعبیر اللہ کے تدبیر کائنات کے وسیع ترمیدان کی خوب تصویر کشی کرتا ہے۔

مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (۳۲ : ۵) "آسمانوں سے زمین تک"۔ اس سے انسانی ذہن کے اندر بات بٹھانا مقصود ہے یعنی ان الفاظ میں جن کا تصور ذہن انسانی کر سکتا ہے تاکہ دل میں خوف خدا پیدا ہو۔ ورنہ اللہ کی تدبیر کائنات کا دائرہ زمین اور آسمان سے بہت ہی وسیع ہے۔ لیکن انسانی احساس اور شعور کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اس کائنات کے سامنے کھڑا ہے اور اپنے شعور اور مشاہدے کی حد تک اللہ کی وسعت تدبیر کا تصور کر رہا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی وسعت تدبیر ہمارے تصور اور ہمارے ان شماریات سے بھی وسیع ہے جو ہمارے استعمال میں ہیں۔

پھر اللہ کی تمام تدابیر اور اللہ کی تمام تقدیرات کی رپورٹ میں ان کے نتائج اللہ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں اور یہ روئیداد اسے پورے عواقب و نتائج کے ساتھ، تمام اعمال، اموال اور افعال کے ساتھ، اشیاء اور زندوں اور تمام مواد کائنات کے بارے میں ایک دن اٹھائی جاتی۔ اس دن کی مقدار ایک ہزار سال ہمارے شماریات کے مطابق ہے۔ غرض اس کائنات کی کوئی چیز یونہی نہیں چھوڑ دی جاتی ہے، نہ کسی چیز کو عبث پیدا کیا گیا ہے بلکہ ایک مقررہ وقت تک تمام چیزوں کی تدبیر کی گئی ہے۔ ہر شے، ہر معاملہ، ہر نتیجہ اور ہر واقعہ اللہ کے تحت ہے اور اس کی روئیداد اللہ کے ہاں پہنچتی

ہے جس طرح وہ طلب کرتا ہے۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۳۲:۶) "وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا' زبردست اور رحیم"۔ یعنی یہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور یہ استواء علی العرش اور آسمانوں سے زمین تک تمام امور کا انتظام۔ یہ ہے اللہ عالم غیب اور عالم مشاہدہ کا جاننے والا' وہی خالق ہے۔ وہ قادر مطلق ہے اور زبردست اور رحیم ہے۔ قدرت رکھنے والا ہے' اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے برتاؤ میں مخلوقات کے ساتھ رحم کرنے والا ہے۔

الَّذِىْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲:۷) "جو چیز بھی اس نے بنائی خوب بنائی"۔ کیا شان ہے اللہ کی! بے شک یہ حق ہے' فطرت اسے دیکھ رہی ہے' آنکھیں دیکھ رہی ہیں' دل اسے دیکھ رہا ہے اور عقل اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ یہ حق جو اشیاء کی شکل میں بھی ہے۔ ان کے فرائض میں بھی ہے' ان کی طبیعت اور ان کی ہم آہنگی میں بھی ہے۔ ان کی ہیئت میں بھی ہے اور ان کی شکل میں بھی ہے۔ بہرحال جو چیز بھی حسن اور احسان سے متعلق ہے وہ اس مخلوقات میں موجود ہے۔

سبحان اللہ! یہ ہے اللہ کی کاریگری تمام اشیاء میں۔ اس کے دست قدرت کے کمالات تمام اشیاء میں موجود ہیں۔ جو چیز بھی اللہ نے بنائی ہے وہ حسین اور مکمل ہے۔ نہ حد سے آگے ہے اور نہ اس میں کوئی قصور ہے۔ حسن سے زیادہ نہ کم۔ نہ افراط ہے نہ تفریط۔ حجم کے اعتبار سے' شکل کے لحاظ سے اور مقاصد اور مفاد کے زاویہ سے۔ ہر چیز ایک متعین قدر کے ساتھ ہے۔ نہ حد حسن و جمال سے کم یا زیادہ ہے۔ اپنے وقت سے نہ پہلے آتی ہے' نہ بعد میں۔ نہ اپنی حد سے آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے رہتی ہے۔ ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے اجسام تک میں حسن ملحوظ ہے۔ سادہ خلیے سے لے کر پیچیدہ ترین ذی حیات اشیاء تک ہر چیز حسین اور موزوں ہے۔ اسی طرح' اعمال' اطوار' واقعات اور حرکات سب کے سب مقدر ہیں۔ سب اللہ کی تخلیق ہیں اور ہر واقعہ اور ہر حادثہ اپنے مقرر معیار کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے مقررہ اثرات مرتب ہوتے ہیں' اور یہ اس منصوبے اور نقشے کے مطابق ہوتا ہے جو ازل میں اللہ نے تیار کیا ہے اور ابد تک ایسا ہی تدبیر الٰہی کے مطابق ہوتا رہے گا۔

ہر چیز اور ہر مخلوق اس لیے بنائی گئی ہے کہ وہ اپنا مقرر اور متعین فریضہ ادا کرے اور اس فریضے کا تعین نہایت دقیق وزن کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ اس چیز کے تمام فرائض اس کے اندر رکھ دیے گئے ہیں اور ان خواص کی وجہ سے وہ اپنا فریضہ منصبی پورا کرتی ہے اور اس کے لیے پوری طرح اہل ہے۔ یہ خلیہ جو متعدد مقاصد کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ کیڑا رینگ رہا ہے اور جس کے پاؤں اور بال و پر ہیں۔ یہ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ اس زمین پر اپنے لیے راستہ نکالے۔ یہ اپنا کام احسن طریقے سے کرتا ہے۔ یہ پرندہ' یہ حیوان' اور یہ انسان' یہ کواکب' یہ ستارے' یہ سیارے' یہ افلاک اور جہاں اور یہ جہانوں کے جہاں' یہ کرات اور ان کے دورے اور گردشیں' متعین اور مقرر' عجیب اور مضبوط اور نہایت ہی وقت کے ساتھ متعین وقت کے حامل۔ دائمی طور پر متحرک۔ غرض اس کائنات کی جس چیز کو دیکھو چھوٹی یا بڑی ہر چیز حسین و جمیل ہے۔ اس کے حسن و جمال میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہر کھلی آنکھ' ہر حساس انسان' اور ہر صاحب بصیرت شخص اس حسن اور احسان کو دیکھ سکتا ہے جو اس کائنات کی

مجموعی شکل میں بھی ہے اور اس کی ایک ایک چیز میں بھی ہے ۔جب قلب و نظر اور ذہن و خیال متوجہ ہوں تو انسان اس جہان میں حسن و جمال اور صفت و کمال کے بڑے بڑے ذخائر دریافت کر سکتا ہے ۔اس حسن و جمال اور اس تدبر و کمال کے نتیجے میں ہر طرف سے انسان کے لیے خیر اور برکات جمع ہوتے ہیں ۔ مثلاً نہایت ہی خوشگوار پھل اور وہ روحانی ذوق و شوق جس سے کاسہ دل بھر جاتا ہے اور اس طرح انسان اس ربانی میلے میں اور اس خدائی جشن میں جدھر دیکھے' حسن و جمال ہی نظر آئے' جس چیز کا مطالعہ کرے وہ بدیع الجمال اور انتہائے کمال پر نظر آئے ۔اس طرح اس جہان فانی کے زائل ہونے والے اس حسن و جمال سے آگے بڑھ کر عالم آخرت کے دائمی حسن و جمال اور لازوال کمال تک پہنچ سکتا ہے جو صفت الٰہی میں ہے اور جس کا تصور بھی کسی دل میں نہیں آیا۔

انسان ان انعامات اور حسن و جمال اور دقت و کمال کو اس وقت دیکھ سکتا ہے جب انسان ایک عادی اور معمولی اور روٹین کے مناظر کو ذرا آنکھیں کھول کر دیکھے ۔ یہ اس وقت ہی اسے پا سکتا ہے جب وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کی گھنٹیوں کو سنے ۔فطرت کے اشارات کو سمجھنے کی کوشش کرے ۔جب وہ اس جہاں کو نور ربانی کے ساتھ دیکھے ۔جب وہ ان کو ربانی نور کے ساتھ دیکھے گا تو پھر اس کو معلوم ہو گا کہ ہر چیز کے اندر کیسا حسن و جمال ہے اور ہر چیز کی صنعت میں انوکھا پن کیا ہے اور یہ حسن اسے اس وقت نظر آئے گا جب وہ ہر حسین چیز کو دیکھ کر اللہ کو یاد کرے اور سبحان اللہ کہے ۔یوں اس کا تعلق خالق کائنات سے پیدا ہو گا۔ یوں اس کا شعور جمال تک پہنچ جائے گا کیونکہ مخلوقات کے کمال و جمال سے انسان اللہ کے کمال و جمال تک پہنچ سکتا ہے ۔

یہ کائنات جمیل ہے اور اس کا جمال ختم نہیں ہوتا اور انسان اس جمال کے ادراک میں روز بروز ترقی کرتا ہے ۔اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کا یہ فائدہ غیر محدود ہے ۔وہ جس قدر چاہے اس فائدے کو آگے بڑھا سکتا ہے ۔جہاں تک بدیع السموات انسان کے لیے مقدر کرتا ہے اور موقع دیتا ہے ۔

پھر اس مخلوق میں خوبصورتی کا عنصر مقصود بالذات ہے ۔اللہ نے ہر چیز کو خوبصورت بنایا ہے کیونکہ جب کسی بنائی ہوئی چیز کو خوبصورت اور اچھا بنایا جاتا ہے تو وہ اپنا فرض منصبی یا ڈیوٹی بہت اچھی طرح ادا کرتی ہے ۔یوں مصنوعات کی عمدگی کو بڑھا کر کمال تک پہنچایا جاتا ہے جبکہ اس کائنات کی خوبصورتی اس کے ہر جزء سے ظاہر ہے اور مخلوقات کی ہر قسم سے عیاں ہے ۔ذرا اس کھجور کو دیکھئے' ذرا کسی ایک پھول کو دیکھئے' ذرا ایک چھوٹے سے چھوٹے ستارے کو دیکھئے' ذرا رات کو دیکھئے اور پھر دن کو دیکھئے' چھاؤں اور بادلوں کو دیکھئے' اس پورے وجود کے اندر جاری و ساری نغمہ سرائی کو دیکھئے اور غایت درجہ کی ہم آہنگی' ہمواری اور حرکت کو دیکھئے ۔فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔

--- ooo ---

یہ ایک سیاحت ہے اور اس خوبصورت وجود اور نہایت ہی خوبصورت اور انوکھی کائنات میں ایک تفریح ہے اور مخلوقات کا مطالعاتی سفر ہے ۔قرآن کریم ہماری توجہ اس طرف مبذول کراتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ اس سے لطف اٹھاؤ۔

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲ : ۷) "جس نے ہر چیز کو خوبصورت تخلیق بخشی"۔ اس ہدایت سے انسان اس کائنات میں حسن و جمال کے نکات تلاش کرتا ہے' اور لطف اٹھاتا ہے ۔

وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (۳۲ : ۷) "اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی"۔ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے انسان کی تخلیق گارے سے کی۔ انداز تعبیر سے یوں سمجھ میں آتا ہی کہ انسان کا آغاز گارے سے تھا۔ یعنی انسان کی ابتدائی شکل مٹی کے گارے کی سی تھی۔ اللہ نے یہ نہیں بتایا کہ گارے سے انسان تک کتنے مراحل سے انسان گزرا یا کتنا زمانہ اس میں لگا۔ اس معاملے میں قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ خصوصاً جب ہم اس آیت کو سورہ المومنون کی آیت سے ملا کر پڑھیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ "انسان کو مٹی کے ست سے پیدا کیا گیا"۔ لہٰذا یہ کہنا ممکن ہے کہ انسان کی تخلیق ایسے مراحل سے گزری ہے جس کا اصل مٹی تک جا پہنچتا ہے۔

اس سے مراد وہ خلیہ بھی ہو سکتا ہے جو اس زمین میں پیدا کیا گیا اور یہ خلیہ مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔ اور نفخ حیات اور نفخ روح سے وہ خالص مٹی تھا اور یہی وہ راز ہے جس تک آج تک انسان نہیں پہنچ سکا۔ نہ انسان یہ معلوم کر سکا ہے کہ یہ زندگی کیا ہے اور نہ یہ معلوم کر سکا ہے کہ اس خلیے میں روح کیسے داخل ہوئی اور اس خلیے سے بھی انسان کیسے پیدا کیا گیا۔ قرآن کریم نے اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ یہ پوراعمل کیسے انجام تک پہنچا اور نہ یہ بتایا ہے کہ اس پر کس قدر وقت لگا۔ اس تحقیق کے لیے اللہ نے انسان کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ جس طرح چاہے فیصلہ کرے اور اس قسم کی تحقیقات نص قرآنی کے خلاف نہیں ہیں۔ نص قرآنی میں صرف یہ ہے کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے یا مٹی کے ست سے ہوئی ہے۔ یہ ہے وہ موقف جس میں قرآن مجید جو قاطع ہے اپنی جگہ رہتا ہے۔ اور سائنسی تحقیقات بھی اپنے مقام پر رہتی ہیں۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ صراحت کر دی جائے کہ ڈارون کا نظریہ ارتقا کہ تمام حیوانات ایک ہی خلیے سے ارتقاء کر کے مختلف انواع کی شکل اختیار کر گئے ہیں اور خود انسان بھی بندر کی ترقی یافتہ شکل ہے اور یہ کہ انسان اور اعلیٰ قسم کے بندر کے درمیان ارتقائی مراحل کے انواع موجود رہے ہیں۔ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ نیز ڈارون کو وراثتی خصوصیات (جینز) کا علم ہی نہ تھا۔ لیکن جینز کی دریافت کے بعد تو یہ طے ہو گیا ہے کہ ایک نوع کا دوسرے نوع میں منتقل ہونا محال ہو گیا ہے۔ ہر خلیے یعنی نوع حیوان کے خلیے کے اندر ایسے جینز ہیں جو اسے اپنی نوع بدلنے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔ یہ جینز اپنی صورت نوعیہ کی پوری طرح حفاظت کرتے ہیں۔ لہٰذا بلی جس خلیے سے پیدا کی گئی وہ بلی ہی رہی ہے اور اس کی صورت نوعیہ میں کسی مرحلے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کتا کتا رہا ہے' بیل بیل رہا ہے 'گھوڑا ہمیشہ گھوڑا رہا ہے' بندر ہمیشہ بندر رہا ہے اور انسان ہمیشہ انسان رہا ہے۔ جو چیز ممکن ہے وہ یہ ہے کہ ایک نوع اپنی حدود کے اندر ترقی کرے یا زوال پذیر ہو۔ بہرحال ممکن ہے کہ ایک نوع اپنی حدود کو کراس کر کے دوسری نوع میں داخل ہو جائے۔ یہ وہ بات ہے جو ڈارون کے نظریہ کی حقیقت ہی باطل کر رہی ہے۔ بہرحال یہ لوگ سائنس کے نام پر خود اپنے نظریات گھڑتے ہیں' ان پر یقین کرتے ہیں لیکن یہ نظریات کسی دن جا کر باطل ہو جاتے ہیں۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (۳۲ : ۸) "پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے یعنی نطفے کے پانی سے جو جنین کے ارتقاء کی پہلی شکل ہے کہ وہ ایک نقطے سے ایک لوتھڑا بن جاتا ہے۔ پھر وہ گوشت کی بوٹی بن جاتا ہے۔ پھر اس کے اندر ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر وہ مکمل جنین بن جاتا ہے۔ یہ پانی کا ست

اور اس کا ارتقاء ہے - یہ نقطہ جو اس حقیر پانی میں ہوتا' جس طرح یہ ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور جس طرح آج کل اس کا مشاہدہ ہوا ہے یہ ایک عظیم ارتقاء ہے اور پھر یہ پورے انسان کی شکل میں آ جاتا ہے اور یہ انسان اپنی ذات میں ایک عجیب جہان ہے اور اس حقیر پانی کے ست میں ایک دوسرے نقطے کو دیکھو اور پھر اس مکمل انسان کو دیکھو کہاں سے کہاں تک آ گیا اور کیا سے کیا کچھ بن گیا - قرآن کریم اس عظیم تغیر و ارتقاء کو اس طرح ایک ہی آیت میں بیان کر دیتا ہے -

ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ

(۳۲ : ۹) "پھر اس نے اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیئے' آنکھیں دیں اور دل دیئے" - سبحان اللہ یہ کس قدر عظیم ارتقائی سفر ہے انسان کا - کن کن مشکل حالات سے یہ انسان گزرا ہے - کس قدر عظیم معجزہ ہے خود انسان کی تخلیق لیکن لوگ اس سے غافل ہیں - انسان کو دیکھو اور اس معتبر نطفے کے پانی کے اندر اس نکتے کو دیکھو - اگر دست قدرت اس معجزانہ عمل کو تکمیل تک نہ پہنچائے - یہ دست قدرت ہی ہے جو اس نہایت ہی چھوٹے نکتے کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ ان دشوار گزار مراحل اور راستوں سے گزر کر انسان کی شکل اختیار کر لے -

اس چھوٹے سے نقطے اور اس علیسے کے اندر کس قدر تقسیم ہوتی ہے اور کس قدر کثرت ہوتی ہے - یہ بڑھتا بھی جاتا ہے اور تقسیم بھی ہوتا جاتا ہے - اس سے مزید مختلف قسم کے خلیسے بنتے جاتے ہیں - یہ خلیسے پھر باہم متضاد ہوتے ہیں - یہ بڑھتے جاتے ہیں - پھر اس انسان کے ہر ہر عضو کے اپنے خلیسے ہوتے ہیں' جن کی مخصوص نوعیت ہوتی ہے اور ان کے پھر مزید اجزاء ہوتے ہیں اور ہر جزء کا اپنا وظیفہ ہوتا ہے - ایک ہی عضو کے اندر کئی قسم کے خلیسے بنتے چلے جاتے ہیں - یہ پہلا خلیہ کس طرح اس قدر کثرت میں آجاتا ہے' پھر اس کے اندر نوعیت کے اعتبار سے یہ تقسیم کس طرح ہو جاتی ہے' پھر اس ایک ہی ابتدائی نکتے اور خلیسے سے خلیات کا عظیم مجموعہ کس طرح بن جاتا ہے - پھر ان خلیات کے اندر انسانی خصوصیات کہاں چھپی تھیں - پھر یہ جنین کے اندر مخصوص صلاحیتیں کہاں سے آ جاتی ہیں - ہر خلیسے کے لیے متعین فریضہ کس طرح قائم ہو جاتا ہے - اور ہر ایک کی خصوصیات دوسرے سے جدا کس طرح ہو جاتی ہیں - کون ہے جو اس قسم کے معجزے کے صادر ہونے کا یقین کرتا اگر عملاً یہ معجزہ روز ہمارے سامنے وجود میں نہ آتا -

یہ اللہ کا دست قدرت ہی ہے جس نے انسان کو اس طرح برابر کیا اور درست کیا اور پھر یہ اللہ کی جانب سے انسان کے اندر روح پھونکنے کا عمل ہے جو انسان کو انسان بنا دیتا ہے - یہی ایک معقول تشریح ہے اس معجزے کی جو ہر سیکنڈ میں واقع ہو رہا ہے - لیکن لوگ ہیں کہ اس سے غافل ہیں - یہ اللہ کا نفخ روح ہے جس کی وجہ سے انسان انسان بن جاتا ہے - اس کے اندر سننے اور دیکھنے کی قوت آ جاتی ہے اور اس سمع و بصر ہی کی وجہ سے تمام عضویاتی حیوانات سے انسان مختلف اور ممتاز ہوتا ہے -

وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ (۳۲ : ۹) "تم کو کان دیئے' آنکھیں دیں اور دل دیئے" - یہ وہ معجزہ ہے جو ہمارے سامنے ہر سیکنڈ میں رونما ہوتا ہے - اس کی تشریح اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی جانب سے نفخ روح ہے ورنہ عقل انسانی اس اتھاہ سمندر میں غوطے کھاتی رہتی اور قیامت تک وہ اس کی تشریح نہ

کر سکتی۔ اس کے علاوہ یہ اللہ کے فضل و کرم کا فیضان ہے اور یہ اللہ کا فضل ہی ہے جو اس حقیر پانی کے ایک نکتے سے انسان بنا دیتا ہے۔ پھر وہ اللہ ہی ہے جو اس ایک حقیر خلیے کے اندر ارتقا اور نمو کی وہ خصوصیات رکھ دیتا ہے کہ وہ' تبدیلیوں سے ہوتے ہوئے اور اپنے اندر مزید خصوصیات لیتے ہوئے انسان کی شکل میں پہنچ گیا۔ جس کے اندر ایسی خصوصیات پیدا ہو گئیں کہ انسان تمام دوسرے حیوانات میں ممتاز ہو گیا۔ لوگ ہیں کہ اللہ کے اس فضل و کرم کا کوئی شکر ادا نہیں کرتے۔ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۳۲: ۹)

---ooo---

انسان کی پیدائش' اس کے مختلف مراحل اور ان سے اس کا عجیب انداز سے گزرنا اور ہر وقت اس عظیم معجزے کا صادر ہونا اور اس معجزے کا ہمارے سامنے بار بار دہرایا جانا' ان امور کی روشنی میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ یہ انسان جب مر کر پھر مٹی بن گیا اور زمین کی دوسری مٹی میں مل گیا تو حشر و نشر کیسے ہو گا۔ اس بیان کے بعد یہ شک اور یہ اعراض بجائے خود عجیب اور احمقانہ نظر آتے ہیں۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰

"اور یہ لوگ کہتے ہیں: "جب ہم مٹی میں رل مل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔

یہ لوگ کہتے تھے کہ مرنے اور دفن کرنے کے بعد اور اجسام کے مٹی ہو کر مٹی میں رل مل جانے کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمیں از سر نو پیدا کر دیا جائے جبکہ ہمارے ذرات دوسرے ذرات میں مل کر ناپید اور گم ہو جائیں گے۔ جب انسان کی تخلیق اوّل پر غور کیا جائے تو اللہ کے لیے اس کا دوبارہ تحقق کرنا کوئی عجیب و غریب چیز نہیں ہے۔ آغاز میں اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا اور یہ مٹی اس زمین سے تھی جس میں وہ اپنی ذات کو گم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری پیدائش بھی تو پہلی پیدائش ہی کی طرح ہے۔ اس میں کوئی عجیب و غریب بات تو نظر نہیں آتی۔ اصل بات یہ ہے۔

بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ (۳۲: ۱۰) "کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔ اس وجہ سے وہ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ اللہ کے سامنے حاضری کا یہ انکار ہی ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ اس قسم کے واضح معاملے میں اپنے اوپر شک طاری کرتے ہیں' یہ معاملہ ایسا ہے جو ایک بار ہو چکا ہے اور اس قسم کے واقعات و معجزات ہر لحظہ ہوتے رہتے ہیں۔ تاکیداً ان کی وفات اور اللہ کی طرف لوٹ آنے کی تاکید کی جاتی ہے اور دلیل وہی ہے جو اس سے پہلے دے دی گئی ہے۔

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱ ع

۱ ۱۱ع ۱۴

"ان سے کہو "موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹالائے جاؤ گے"۔

یہ ایک یقینی اطلاع کی صورت میں بتا دیا جاتا ہے ۔ ملک الموت کون ہے اور وہ انسانوں کو پورا پورا اپنے قبضے میں کس طرح لے لیتا ہے یہ اللہ کے غیبی نوشتوں میں سے ایک ہے ۔ اس کے بارے میں اللہ نے ہمیں یہ اطلاع دے دی ہے کہ وہ لوگوں کو پورے کا پورا قبضے میں لے لیتا ہے اور پھر قیامت میں پیش کر دے گا ۔ ہمیں اس پر یقین کرنا چاہئے اور زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہئے ۔ یقین اس لیے کہ یہ اللہ کے سچے زریعے سے اطلاع مل گئی ہے ۔

--- ○○○---

موت کے بعد جی اٹھنے کے مسئلے کی مناسبت سے جس میں وہ شک کرتے تھے یا شک کرنا چاہتے تھے اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں ۔ یہ ایک زندہ و تابندہ منظر ہے ۔ حرکات اور مکالمات سے بھرپور ۔ یوں کہ گویا ابھی یہ واقعہ ہو رہا ہے ۔

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ۝۱۲ وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۝۱۳ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَاۚ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۱۴

"کاش تم دیکھو وہ وقت جب یہ مجرم سر جھکائے اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے (اس وقت یہ کہہ رہے ہوں گے) "اے ہمارے رب، ہم نے خوب دیکھ لیا اور سن لیا، اب ہمیں واپس بھیج دے تاکہ ہم نیک عمل کریں، ہمیں اب یقین آ گیا ہے"۔ (جواب میں ارشاد ہو گا) "اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے مگر میری وہ بات پوری ہو گئی جو میں نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے بھر دوں گا ۔ پس اب چکھو مزا اپنی اس حرکت کا کہ تم نے اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا، ہم نے بھی اب تمہیں فراموش کر دیا ہے ۔ چکھو ہمیشگی کے عذاب کا مزا اپنے کرتوتوں کی پاداش میں"۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جس میں منکرین قیامت نہایت ہی شرمندگی کے ساتھ اعتراف کر رہے ہیں ۔ اب وہ اس سچائی کو مان رہے ہیں جس کا وہ انکار کرتے تھے ۔ وہ یہ درخواست کریں گے کہ ہمیں ایک بار پھر زمین پر لوٹا دیا جائے اور وہ اب کی بار اس کمی کو پورا کر دیں گے جو پہلی بار ہو گئی ۔ یہاں شرمندگی کی وجہ سے وہ سرنگوں کھڑے ہوں گے ۔ اب یہ لوگ اپنے اس رب کے پاس (عِنْدَ رَبِّهِمْ) ہوں گے جس کے پاس حاضر ہونے کا وہ انکار کرتے تھے ۔ لیکن ان کی یہ سب

باتیں بعد از وقت ہوں گی اور اب اعتراف اور اعلان ان کو کوئی فائدہ نہ دے گا۔

قبل اس کے کہ ان کی اس شرمندگی پر کوئی تبصرہ کیا جائے' یہ بتا دیا جاتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں فیصلہ کن قوت کون سی ہے اور وہ کون سی قوت ہے جو لوگوں کے آخری انجام کا فیصلہ کرنے والی ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (۳۲: ۱۳) "اگر ہم چاہتے تو پہلے ہی ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیتے مگر میری وہ بات پوری ہوگئی جو میں نے کہی تھی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا"۔ اگر اللہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی راہ پر ڈال دیتا۔ اور یہ تھا طریقہ ہدایت' جس طرح اس مخلوقات کا طریقہ ایک ہے جو الہام فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے اور وہ پوری زندگی ایک ہی طرح سے گزارتی ہے جیسے حشرات الارض پرندے اور زمین پر چلنے والے جانور یا وہ مخلوق جو اطاعت شعار ہے مثلاً فرشتے' لیکن اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں ہوا کہ انسانوں کا ایک خاص مزاج اور ماہیت ہو۔ اس کے اختیار میں ہو کہ وہ ہدایت اختیار کرے یا ضلالت اختیار کرے اور وہ اپنی اس مخصوص طبیعت کے ساتھ اس جہان میں ایک مخصوص کردار ادا کرے جس کے لیے اللہ نے اسے اس کرۂ ارض پر بھیجا ہے اور ایک منصوبے کے مطابق بھیجا ہے۔ چنانچہ اس منصوبے کے تقاضے کے طور پر اللہ نے لکھ دیا کہ جنوں اور انسانوں سے وہ جہنم کو بھر دے گا ان لوگوں سے جو جنوں اور انسانوں میں سے ضلالت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ جس راہ کا انجام جہنم ہے۔ یہ لوگ جو اللہ کے سامنے قیامت کے دن پیش کیے گئے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اختیار اور خوشی سے جہنم کی راہ اختیار کی۔ اب وہ اللہ کے سامنے سر جھکائے شرمندہ کھڑے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے :

فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا (۳۲: ۱۴) "اب چکھو مزا اپنی اس حرکت کا کہ تم اس دن کی ملاقات کو فراموش کر دیا تھا"۔

یہ ہے تمہارا دن جو حاضر ہے کیونکہ اس منظر میں ہم اسے حاضر دیکھ رہے ہیں۔ تم نے چونکہ اس دن کو بھلا دیا تھا۔ اب اس کا مزہ چکھو۔ تمہارے پاس کافی وقت تھا مگر تم نے اس کے لیے تیاری نہ کی۔

إِنَّا نَسِينَاكُمْ (۳۲: ۱۴) "ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا ہے"۔ اللہ تو کسی کو نہیں بھلاتا۔ لیکن ان کے ساتھ معاملہ اس طرح کرتا ہے کہ گویا وہ نسیا منسیا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ایسا سلوک ہے جس میں انہیں توہین آمیز انداز میں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۳۲: ۱۴) "چکھو' اب ہیشگی کے عذاب کا مزہ اپنے کرتوتوں کی پاداش میں"۔ اب اس منظر پر پردہ گر جاتا ہے۔ فیصلہ کن بات کر دی جاتی ہے اور مجرموں کو ان کے برے انجام میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ منظر قرآن کے پڑھنے والے کے پردۂ فکر پر یوں نقش ہوتا ہے کہ گویا اب یہ لوگ وہاں اسی حال میں چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ تو وہ وہاں ہی کھڑے ہیں جہاں چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ ہے قرآن کی

اندر کی تصویر کشی۔

اب اس مشاہدہ و منظر پر پردہ گرتا ہے اور ایک دوسرا منظر سامنے آتا ہے' اس دوسرے منظر کا ماحول اور فضا مختلف ہے۔ یہ ایک دوسری ہی عطر آمیز اور فرحت بخش فضا ہے جس میں دل اڑا جا رہا ہے۔ یہ مومنین کا منظر ہے۔ وہ لوگ جو اللہ سے ڈرتے ہیں' نہایت یکسوئی سے اس کی عبادت کرتے ہیں' وہ اللہ کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل کے اندر خدا کا خوف بیٹھا ہے۔ ان کے دل کانپ رہے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے فضل و کرم کی امیدیں لیے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے رب ذوالجلال نے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جس کا کوئی انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩ ﴿١٥﴾ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿١٦﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾

"ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنہیں یہ آیات سنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔ ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں' اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے' اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے"۔

یہ اہل ایمان کی نہایت ہی خوبصورت اور روشن تصویر ہے۔ یہ نہایت ہی لطیف اور شفاف اور حساس لوگ ہیں۔ ان کے دل خوف خدا سے کانپتے ہیں اور وہ نہایت ہی پرامید انداز سے اس کی اطاعت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی بندگی کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ نہ وہ اللہ کے مقابلے میں بڑائی اور تکبر کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ ہی دراصل اللہ کی آیات پر ایمان لانے والے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی آیات کو تیز احساس' بیدار دل اور روشن ضمیر کے ساتھ لیتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو اللہ کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو یہ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا (۳۲: ۱۵) اس لیے کہ وہ اللہ کی آیات سے بہت ہی متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ اللہ کی باتیں سن کر اللہ اور اس کی آیات کی تعظیم کرتے ہوئے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں یہ احساس کرتے ہوئے کہ اللہ اور اس کی آیات کی عظمت کا اظہار صرف سجدہ ریز ہو کر ہی کیا جا سکتا ہے اور اپنی پیشانی کو خاک آلود کرنے ہی سے اس کا اظہار ہو سکتا ہے۔

وَسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (۳۲: ۱۵) "اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں"۔

یعنی جسمانی اعتبار سے وہ سجدہ کرتے ہیں اور زبان کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔

وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۳۲:۱۵) "اور وہ تکبر نہیں کرتے"۔ کیونکہ وہ مطیع فرمان ہو کر' اللہ کی طرف رجوع کر کے' اللہ کی کبریائی کا شعور رکھتے ہوئے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

اب ذرا ان کی جسمانی شکل و ہیئت کی تصویر دیکھیے' انداز تعبیر اس طرح ہے کہ ان کی قلبی' روحانی اور ذہنی کیفیت مجسم ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (۳۲:۱۶) "ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں۔ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں"۔ یہ لوگ رات کو نماز کے لیے اٹھتے ہیں یعنی عشاء کی آخری نماز کے لیے۔ وتروں کے لیے' تہجد کے لیے اور رات کو دعاؤں کے لیے۔ لیکن قرآن نے ان امور کو اس انداز سے بیان کیا: ان کی پیٹھیں ان کے بستروں سے الگ رہتی ہیں۔ رات کے وقت بستروں کی تصویر کشی یوں کی جاتی ہے کہ انسان اس راحت' آرام' نیند اور دوسری لذتوں کو بڑی مشکل سے چھوڑتا ہے۔ لیکن ان کی پیٹھیں' نرم بستروں' آرام اور نیند اور عیش کے مقابلے میں دوسرا کام رکھتی ہیں۔ ان کا اپنے رب کے ساتھ کام ہوتا ہے۔ ان کو خیال ہوتا ہے کہ ان کو ایک دن رب کے ہاں حاضر ہونا ہے اور وہ خوف و رجاء کے درمیان اللہ کی طرف متوجہ ہیں۔ خوف ان کو اللہ کے عذاب کا ہوتا ہے اور امید اللہ کی رحمت کی ہوتی ہے۔ خوف اللہ کے غضب کا ہوتا ہے اور امید اللہ کی رضامندی کی ہوتی ہے۔ خوف اللہ کی معصیت کا ہوتا ہے اور امید اس کی توفیق اطاعت کی ہوتی ہے۔ ان تمام امور کو قرآن کریم نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ نہایت ہی مجسم انداز میں۔

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (۳۲:۱۶) "اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں"۔

اس حساسیت اور کپکپی' خضوع و خشوع کے ساتھ نماز اور گڑگڑا کر دعا کرنے کے علاوہ اپنی سوسائٹی کی بھلائی کے لئے بھی فکر مند ہوتے ہیں اور اللہ کو راضی کرتے ہوئے وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳۲:۱۶) "اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں"۔

ان بلند' روشن' حساس اور مشفق صورتوں کے ساتھ اللہ کا معاملہ بھی بہت مشفقانہ ہے اور نہایت ہی منفرد قسم کی جزاء ان کے لیے تیار ہے۔ وہ جزاء جس کے اندر ان کے لیے خاص مہربانی جھلکتی ہے۔ ان کے لیے ایک خاص اعزاز کا اعلان ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے ان پر کرم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے بلند نفوس کے لیے کیا خصوصی اور مخفی مہربانیاں اور تعلقات رکھتے ہیں۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۳۲:۱۷)

"پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزاء میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے"۔

یہ ایک عجیب انداز تعبیر ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ خفیہ تعلق ہوتا ہے اور اللہ نے بذات خود اپنے دوستوں کے لیے تحفے تیار کر رکھے ہیں' ان کو خفیہ رکھا ہے اور اللہ نے ان کے بارے میں کسی کو کوئی اطلاع بھی نہیں دی تاکہ ان کو قیامت کے دن اچانک ظاہر کیا جائے ۔ اب یہ ہونے والی ملاقات کس قدر باعث احترام ہے 'کس قدر اس کا انتظار ہے اور کس قدر شاندار ہے کہ اس میں اللہ اپنے دوستوں میں نادیدہ تحفے تقسیم کریں گے جو تیار ہو چکے ہیں اور اللہ اپنی موجودگی میں یہ تحفے تقسیم کریں گے ۔

سبحان اللہ ! اپنے بندوں پر اللہ کے کیا کرم ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کس طرح ان کو اپنے فضل و کرم سے نوازتا ہے ۔ ان کا عمل جو بھی ہو' ان کی عبادت جو بھی ہو' اور ان کی اطاعت جس قدر بھی ہو' بہرحال اللہ تعالیٰ نے خود ان کے لیے بعض تحفے تیار کر رکھے ہیں ۔ نہایت اہتمام' رعایت' اکرم اور شفقت کے ساتھ ۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے اور وہ بہت ہی فضل و کرم کرنے والا ہے ۔

پھر دوبارہ اس اجمال کی تفصیل دی جاتی ہے ۔ ذلیل شدہ مجرمین کے انجام کے مقابلے میں مومنین کا بہترین انجام ذرا مفصلاً بیان ہوتا ہے کہ اللہ مومنین کو کس قدر منصفانہ جزاء ان کے اعمال کی دے گا ۔ وہ مومنین اور مجرمین کے انجام میں دنیا اور آخرت دونوں میں فرق کرے گا یعنی خفیہ تحفوں کے علاوہ ان کے اعمال کا بھی پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ۔

أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۚ لَا يَسْتَوُونَ ﴿١٨﴾ أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ جَنَّاتُ الْمَأْوَىٰ نُزُلًا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ فَسَقُوا فَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۖ كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٢١﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنْتَقِمُونَ ﴿٢٢﴾

۲
۱۱ ع
۱۵

"بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو' وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہو؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے ۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے تو جنتوں کی قیام گاہیں ہیں 'ضیافت کے طور پر ان کے اعمال کے بدلے میں ۔ اور جنہوں نے فسق اختیار کیا ہے' ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ۔ جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو اب اسی آگ کے عذاب کا مزا جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے ۔ اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا مزا انہیں چکھاتے رہیں گے' شاید

کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آجائیں۔ اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جائے اور پھر وہ ان سے منہ پھیر لے۔ ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے"۔

مومنین اور فاسقین' مزاج' شعور اور طرز عمل کسی چیز میں برابر نہیں ہوتے کہ وہ دنیا و آخرت کی جزاء میں برابر ہو جائیں۔ مومن کی فطرت سیدھی' سلیم ہوتی ہے اور وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے سیدھے راستے اور سیدھے نظام کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور فاسق منحرف' بے راہ رو' مفسد فی الارض ' اور اللہ کے سیدھے راستے پر چلنے والے نہیں ہوتے اور نہ اسلامی نظام اور اسلامی قانون کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ مومن اور فاسق ایک جیسی زندگی بسر نہ کریں اور ان کی زندگی کا انجام ایک نہ ہو' دنیا اور آخرت میں۔ اور ان میں سے ہر ایک کو دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے کیے کے مطابق جزاء و سزا ملے گی۔

اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰی (۳۲: ۱۹) "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے' ان کے لیے تو جنتوں کی قیام گاہیں ہیں"۔ یہ ان قیام گاہوں میں فروکش ہوں گے اور یہ قیام گاہیں ان کو اپنے اندر لے لیں گی۔ یہ ان کے لیے اچھی منزلیں ہوں گی اور ان منازل میں وہ رہیں گے اور یہ بطور جزاء ہوں گی ان کے اعمال حسنہ پر۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰهُمُ النَّارُ (۳۲: ۲۰) "اور جنہوں نے فسق اختیار کیا ہے ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ وہ اس کی طرف لوٹیں گے اور وہ وہاں سر چھپائیں گے۔ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔

كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِیْدُوْا فِیْهَا (۳۲: ۲۰) "جب کبھی نکلنا چاہیں گے اس میں دھکیل دیئے جائیں"۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جس میں بھرپور دوڑ دھوپ ہے۔ لوگ بھاگ رہے ہیں اور انہیں پکڑ پکڑ کر دوبارہ دوزخ میں ڈالا جارہا ہے۔

وَ قِیْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۳۲: ۲۰) "اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو اب اسی آگ کے عذاب کا مزہ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے"۔ یہ ان کی سرزنش ہے۔ ان کو زیادہ ذلیل کرنے اور زیادہ سزا دینے کے لیے۔

یہ ہے آخرت میں انجام فاسق لوگوں کا۔ لیکن ان کو قیامت کے عذاب کے آنے تک مہلت نہیں دے دی گئی۔ ان کو قیامت سے پہلے اس جہاں میں بھی عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے۔

وَ لَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰی دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ

(۳۲: ۲۱) "اس بڑے عذاب سے پہلے ہم اسی دنیا میں (کسی نہ کسی چھوٹے) عذاب کا مزا انہیں چکھاتے رہیں گے' شاید کہ یہ (اپنی باغیانہ روش سے) باز آجائیں"۔

لیکن ان چھوٹے موٹے عذابوں کی تہہ میں بھی دراصل اللہ کی رحمت پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں

فرماتے کہ اپنے بندوں کو بہرحال عذاب دیں ۔ اگر وہ عذاب کے مستحق نہ ہوں ۔ اگر وہ عذاب کے معصیات پر اصرار نہ کریں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرا چھوٹا موٹا عذاب جو بندوں پر آتا رہتا ہے وہ بھی انہیں متنبہ کرنے کے لیے آتا ہے کہ شاید وہ لوٹ آئیں ۔ ان کی فطرت جاگ اٹھے اور یہ عذاب انہیں راہ راست پر لے آئے ۔ اور اگر وہ باز آجائیں تو وہ اس عذاب اکبر سے بچ جائیں جو ابھی ان کے سامنے گذشتہ منظر میں پیش کر دیا گیا ہے ۔ اگر ان کو رب تعالیٰ کی آیات کی یاد دہانی کی گئی اور انہوں نے ان سے اعراض کیا اور اس کی وجہ سے ان پر معمولی عذاب آگیا اور پھر انہوں نے عبرت حاصل نہ کی اور اپنی روش سے نہ لوٹے تو اب یہ ظالم ہیں ۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا (۳۲ : ۲۲) "اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جسے ہماری آیات سنائی گئیں اور پھر وہ اس دن ان سے منہ پھیر لے" ۔ لہٰذا ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان سے انتقام لیا جائے ۔

اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (۳۲ : ۲۲) "ایسے مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے" ۔ یہ ایک خوفناک تہدید ہے کہ اللہ جبار اور متکبر یہ دھمکی دے رہا ہے اور وہ اعلان کرتا ہے کہ ایسے مجرموں سے میں انتقام لوں گا ۔ اللہ کے مقابلے میں یہ بیچارے ضعیف کر بھی کیا سکیں گے ۔ واہ رے اللہ کا انتقام !

یہ سبق اب مجرمین اور صالحین ' مومنین اور فاسقین کے انجام پر ختم ہوتا ہے ۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کا انجام مناظر قیامت کی شکل میں ہے ۔ جس کے وقوع میں یہ لوگ شک کرتے تھے ۔ اس کے بعد سیاق کلام میں ایک نظر حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کے حالات پر ڈالی جاتی ہے ۔ حضرت موسیٰ کو کتاب دی گئی تھی کہ بنی اسرائیل کے لیے کتاب ہدایت ہو جیسا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن دیا گیا ہے کہ یہ مومنین کے لیے ہدایت ہو ۔ صاحب قرآن اور صاحب تورات ایک ہی نظریہ حیات پر متفق ہیں اور جس طرح حضرت موسیٰ کے متبعین نے صبر و ثبات سے کام لیا اور ان کو ائمہ ہدایت بنایا گیا تھا اس طرح اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اگر صبر و ثبات سے کام لیں تو وہ بھی امامت کے مستحق ہوں گے امامت کی مستحق امت کی صفات کیا ہوتی ہیں ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۳﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾

"اس سے پہلے ہم موسیٰ کو کتاب دے چکے ہیں ' لہٰذا اسی چیز کے ملنے پر تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہئے ۔ اس کتاب کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا تھا ' اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر

ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے ۔یقیناً تیرا رب ہی قیامت کے روز ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں (بنی اسرائیل) باہم اختلاف کرتے رہے ہیں ۔

فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهٖ (۳۲ : ۲۳) "لہٰذا اس چیز کے ملنے پر تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہیے"۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حق آپ کو دیا گیا ہے آپ اس پر ثابت قدم رہیں ۔یہی کافی ہے جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھی اور ان دو رسولوں کی دو کتابوں میں یہی سچائی تھی ۔ یہ تفسیر اس تفسیر سے زیادہ اچھی ہے جو بعض مفسرین نے بیان کی ہے کہ اس آیت میں اشارہ اس طرف ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم شب معراج میں حضرت موسیٰ سے ملے تھے ۔ غرض حضرت موسیٰ سے ملنے کے مقابلے میں اس سچائی کا ملنا زیادہ احسن ہے جو حضرت موسیٰ کو بھی ملی تھی اور دونوں رسول ایک ہی حق اور ایک ہی سچائی پر باہم مل گئے اور اس بات کا ذکر یہاں موزوں ہے ۔یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس میں ان مصائب و شدائد کی طرف اشارہ ہے جو رسول اللہ اور مسلمان مخالفین کے ہاتھوں جھیل رہے تھے ۔رسول اللہ کی تکذیب ہو رہی تھی اور کفار اعراض کر رہے تھے ' اس لیے یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ ثابت قدم رہو اور بعد کی آیات بھی اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں ۔

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ

(۳۲ : ۲۴) "اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر ایمان لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے راہنمائی کرتے تھے"۔ یہاں مکہ میں چھوٹی سی مومن جماعت کو یہ اشارہ دیا جاتا ہے کہ تم اسی طرح صبر کرو جس طرح موسیٰ کے مختار مومنین نے صبر کیا اور جس طرح ان میں سے امام پیدا کیے گئے جو اللہ کی شریعت کے مطابق حکمرانی کرتے تھے ' تم میں سے بھی ایسے امام پیدا ہوں گے جو اسلامی شریعت کے مطابق حکمرانی کریں گے بشرطیکہ صبر کیا اور یقین کیا۔ رہا یہ سوال کہ بنی اسرائیل نے بعد کے ادوار میں اختلاف کیا تو وہ اللہ کے حوالے ہے ۔وہی ان اختلافات کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۳۲ : ۲۵) "یقیناً تیرا رب ہی قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ باہم اختلاف کرتے رہے"۔

--- ooo ---

اب سیاق کلام مکذبین مکہ کو ذرا پیچھے انسانی تاریخ کے سامنے کھڑا کرتا ہے کہ ذرا دیدہ عبرت سے دیکھو۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾

"اور کیا ان لوگوں کو (ان تاریخی واقعات میں) کوئی ہدایت نہیں ملی کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں' جن کے رہنے کی جگہوں میں آج یہ چلتے پھرتے ہیں؟ اس میں بڑی نشانیاں ہیں 'کیا یہ سنتے نہیں ہیں؟"

تاریخ کی ہلاک شدہ اقوام کے ساتھ جو کچھ ہوا' وہ تمام بعد کے جھٹلانے والوں کے لیے عبرت ہے۔ اللہ کی سنت تو اس جہان میں جاری و ساری ہے اور وہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتی۔ یہ انسانیت ترقی اور زوال کے لیے الہی قوانین فطرت کے تابع ہے۔ اس کی کمزوری اور اس کی قوت کا راز الہی قوانین کے اتباع و انکار میں ہے۔ قرآن کریم بار بار اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اقوام کے عروج و زوال کے لیے اللہ نے خصوصی قوانین جاری کر رکھے ہیں اور یہ قوانین مسلسل جاری ہیں اور ماضی کے واقعات اور اقوام ہلاک شدہ کے آثار میں بڑی عبرت ہے۔ اس موضوع پر آزادانہ مطالعہ ہونا چاہئے تاکہ باقی آثار سے لوگوں کے دل بیدار ہوں' ان کے اندر احساس پیدا ہو' اور لوگ اللہ کی پکڑ اور انتقام سے ڈریں کیونکہ اللہ نے بڑے بڑے جباروں کو پکڑا ہے۔ پھر تاریخی واقعات میں سنن الہیہ کے مناظر اور مظاہر ہیں۔ لوگوں کے ادراک اور ان کی اقدار اور انداز قیاس و استنباط کے لیے تاریخی مطالعہ ضروری ہے کیونکہ کوئی قوم زمان و مکان کے کسی گوشے میں گوشہ نشین نہیں ہو سکتی۔ نہ وہ اس نظام کو نظرانداز کر سکتی ہے جس کے مطابق انسانیت کی زندگی کا قافلہ آگے بڑھ رہا ہے اور صدیوں سے تسلسل کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ چونکہ اکثر اقوام نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا' اس لیے وہ نیست و نابود ہوئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہلاک شدہ اقوام کے آثار میں بہت ہی گہرا سبق ہوتا ہے اور یہ سبق بہت ہی خوفناک ہوتا ہے۔ بشرطیکہ دل شعور رکھتا ہو' احساس و بصیرت موجود ہو۔ اگر کوئی اس سبق کو پڑھے تو پڑھنے والے پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ ضمیر کانپ اٹھتا ہے اور دل دہل جاتے ہیں۔ عرب جن کو ان آیات میں پہلی بار خطاب کیا گیا تھا وہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی اقوام عاد' ثمود' لوط کے آثار دیکھتے رہتے تھے۔ قرآن کریم ان لوگوں کو ملامت کرتا ہے کہ ان اقوام کے آثار تمہارے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ تم رات اور دن ان پر سے گزرتے ہو' لیکن تمہارے دلوں میں پھر بھی خدا کا خوف پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا شعور بیدار نہیں ہوتا۔ تمہارے احساسات کے اندر روشنی کی چمک پیدا نہیں ہوتی۔ اور تم اس قسم کے انجام .... سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں کرتے ہو۔ تم ہدایت اخذ نہیں کرتے اور احتیاطی اور انسدادی تدابیر اختیار نہیں کرتے۔

انَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ (۳۲ : ۲۶) "اس میں بڑی نشانیاں ہیں کیا یہ سنتے نہیں"۔
ان کو چاہئے کہ ان لوگوں کے جو قصے' قرآن کریم پیش کرتا ہے ان کو سنیں اور پھر ان کے انجام پر غور کریں' جبکہ رات اور دن ان لوگوں کے مساکن اور کھنڈرات سے یہ گزرتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ڈرانے والے کی بات سچی ہو جائے اور یہ بھی ہلاک ہو جائیں انہیں ہوش میں آ جانا چاہیے۔

اس ہلاکت اور تباہی کے منظر کے بعد فکر و احساس کی اس بیداری اور خوف خدا پر ابھارنے اور ڈرانے کے بعد اور ان کے دلوں پر کپکپی طاری کرنے کے بعد ان کو ایک دوسری نشانی کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اس خوفناک فضا کے بعد بہت ہی خوشگوار منظر ہوتی ہے۔ دیکھو ایک مردہ زمین تمہارے سامنے پڑی ہوتی ہے' خشک سالی سے سوختہ اور ہم اس کی

طرف پانی چلاتے ہیں۔ اس کے اندر زندگی حرکت کرنے لگتی ہے۔ جبکہ اقوام سابقہ کے حالات میں ہم نے پڑھا کہ اس طرح کی سرسبز اور شاداب اراضی کو اللہ بنجر بھی کر دیتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ۚ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

"اور کیا ان لوگوں نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا کہ ہم ایک بے آب و گیاہ زمین کی طرف پانی بہا لاتے ہیں اور پھر اسی زمین سے وہ فصل اگاتے ہیں جس سے ان کے جانوروں کو بھی چارہ ملتا ہے اور یہ خود بھی کھاتے ہیں؟ تو کیا انہیں کچھ نہیں سوجھتا"۔

یہ مردہ زمین، تباہ حال زمین، یہ دیکھتے ہیں کہ قدرت خداوندی اس کی طرف پانی چلاتی ہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ یہی مردہ زمین سرسبز و شاداب ہو کر زندگی سے بھرپور ہو گئی ہے اور لہلہاتی ہے۔ فصلیں اگتی ہیں۔ لوگ بھی کھاتے ہیں اور ان کے مویشی بھی کھاتے ہیں۔ مردہ زمین کا منظر جس پر بارش برستی ہے اور وہ زندہ و تابندہ ہو جاتی ہے۔ یہ منظر دراصل دلوں کے بند دروازوں کو کھولنے کے لیے نہایت ہی موثر منظر ہے۔ دیکھو ہر طرف زندگی اور نباتات کا اگاؤ اور لوگوں اور مویشیوں کی خوشیاں اور ان کا استقبال۔ زندگی کی مٹھاس اور تروتازگی کا شعور۔ پھر اس سرسبز زندگی اور خوبصورت اور تروتازہ ماحول کی خوبصورتی۔ قرب اور محبت کی فضا میں زمزمے، جن میں اللہ کی قدرت کا جمال ہر طرف نظر آتا ہے اور اس کی صنعت کاریوں کے نمونے جابجا بکھرے پڑے ہیں اور جن سے اس کائنات کے صفحات پر ہر طرف زندگی اور خوبصورتی کے مناظر نظر آتے ہیں۔

یوں قرآن مجید دل انسان کو زندگی کے مختلف نشیب و فراز کی سیر کراتا ہے۔ جہاں زندگی بھی ہے اور نشو و نما بھی ہے اور سرسبزی و شادابی بھی ہے اور اقوام سابقہ کی ہلاکتوں کے میدان اور آثار بھی ہیں۔ ہر جگہ قرآن کریم کی یہ کوشش ہے کہ کسی طرح قلب انسانی کے اندر حرکت پیدا ہو، وہ جاگے اور اسے اس جہان کے ساتھ الفت پیدا ہو۔ اس جہاں اور اس کی بو قلمونیوں پر سے محض غافل ہو کر نہ گزرے۔ آنکھوں پر سے پردے دور کر دے۔ ان مشاہد اور مناظر قدرت کے اسرار و رموز کو جاننے کی کوشش کرے۔ واقعات سے عبرت حاصل کرے اور تاریخ سے برہان اور دلائل حاصل کرے۔

آخر میں اس طویل سیاحت کے بعد سورہ کا مقطع آتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس عذاب کے آ جانے میں جلدی کرتے ہیں، جس سے انہیں ڈرایا جاتا ہے۔ دراصل یہ لوگ اس ڈراوے اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی نصیحت کو مشکوک بات سمجھتے ہیں۔ ان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ جس چیز سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے، وہ حق ہے اور حقیقت بننے والی ہے۔ اس دن ان کا ایمان ان کو کوئی نفع نہ دے گا۔ اور اس وقت ان سے جو غلطی ہو چکی ہو گی اس کی تلافی ممکن نہ ہو گی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ ان کو چھوڑ دیا جائے وہ اپنے حتمی انجام تک پہنچنے والے ہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ

الثلثۃ

يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

۳ ع ۸ ۱۲

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ "یہ فیصلہ کب ہو گا اگر تم سچے ہو؟" ان سے کہو "فیصلے کے دن ایمان لانا' ان لوگوں کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو گا جنہوں نے کفر کیا ہے اور پھر ان کو کوئی مہلت نہ ملے گی"۔ اچھا' انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور انتظار کرو' یہ بھی منتظر ہیں"۔

فتح دراصل فریقین کے درمیان اختلاف کے فیصلے کو کہا جاتا ہے۔ وہ عذاب جس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ڈرا رہے تھے اس کا آنا بھی فتح ہے۔ یہ لوگ غافل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہرحال کسی حکمت کی وجہ سے اس کے آنے کی میعاد موخر کی ہوتی ہے۔ وہ اگر سو بار بھی مطالبہ کریں اللہ کا کام اپنے وقت پر ہوتا ہے اور جب وہ آئے گا تو یہ لوگ اس کی مدافعت نہ کر سکیں گے اور اس سے بچ کر نہ نکل سکیں گے۔

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (۳۲ : ۲۹) "ان سے کہو' فیصلے کے دن ایمان لانا ان لوگوں کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو گا جنہوں نے کفر کیا ہے اور پھر ان کی کوئی مہلت نہ ملے گی"۔ خواہ فیصلے کا دن اس دنیا میں ہو۔ اس وقت ان کو دھر لیا جائے گا جبکہ وہ کافر ہوں گے۔ پھر ان کو کوئی مہلت نہ دی جائے گی۔ نہ ان کا ایمان لانا اس وقت نافع ہو گا اور یہ فیصلے کا دن آخرت میں ہو گا۔ اس وقت یہ مہلت طلب کریں گے اور مہلت نہ دی جائے گی۔

یہ جواب اعصاب شکن ہے اور اس سے دل دہل جاتے ہیں اور آخری ضرب ان پر یہ لگائی جاتی ہے۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ (۳۲ : ۳۰) "انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور انتظار کرو' یہ بھی منتظر ہیں"۔ اس فقرے کی تہ میں دراصل بالواسطہ ایک دھمکی چھپی ہوئی ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دامن جھاڑ لیں اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیں تو انجام معلوم ہے۔

اس آخری ضرب پر یہ سورہ ختم ہوتی ہے۔ اس میں طویل مطالعاتی سفر ہے' اشارات و ہدایات ہیں اور قسم قسم کے مشاہدات اور دلائل دیئے گئے ہیں اور قلب انسانی کو ہر پہلو سے متاثر کرنے کی سعی کی گئی ہے اور ہر راستے سے اس کو کھینچ کر ہدایت کی طرف لانے کے لیے حملہ کیا گیا ہے۔

--- ooo ---

فی ظلال القرآن

جلد --- پنجم

پارہ ----- ۲۱

سورۃ الاحزاب ۔ ۳۳

آیات ۱--- تا--- ۲۷

سورۃ احزاب ایک نظر میں

یہ سورہ جماعت مسلمہ کی سیرت کا ایک حقیقی حصہ ہے۔اس کا تعلق بدر الکبریٰ سے لے کر صلح حدیبیہ سے پہلے کے زمانے کے ساتھ ہے۔یہ اس دور کے مسلمانوں کی حقیقی زندگی کی ایک خوبصورت تصویر کشی ہے۔اس میں اس عرصہ کے بیشتر واقعات بیان ہوئے ہیں۔نیز اس میں اس عہد کے اداروں اور انتظامی معاملات سے بھی بحث کی گئی ہے۔

اس سورہ میں ان واقعات اور ان انتظامی اقدامات کے بارے میں ہدایات بہت کم ہیں۔ہدایات و احکام سورہ کے ایک قلیل ہی حصے میں دیئے گئے ہیں۔ان ہدایات کے ذریعہ واقعات اور انتظامی معاملات کو اسلام کی بنیادوں سے مربوط کیا گیا ہے یعنی اللہ پر ایمان لانا اور اللہ کے نظام قضا و قدر پر ایمان لانا مثلاً سورہ کا آغاز یوں ہے :

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۱) وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۲) وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۳) مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ وَ مَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ وَ مَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَ اللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ (۳۳ : ۴)

"اے نبیؐ اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو۔ حقیقت میں علیم و خبیر تو اللہ ہی ہے۔پیروی کرو اس چیز کی جس کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں کیا جارہا ہے 'اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو' اللہ پر توکل کرو' اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے--- اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے"۔

اسی طرح سورہ کے آغاز میں بعض انتظامی امور پر ایک تبصرہ آیا ہے :

كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا (۳۳ : ۶) وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۳۳ : ۷) لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا

"یہ حکم کتاب الہیٰ میں لکھا ہوا ہے اور اے نبی یاد رکھو اس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا' تم بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی' سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں تاکہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے اور کافروں کے لیے تو اس نے دردناک عذاب مہیا کر ہی رکھا ہے"۔ اور پھر جنگ احزاب کے موقعہ پر مدینہ میں افواہیں پھیلانے والوں پر تبصرہ ہوا ہے' یاد رہے کہ یہ سورہ اسی نام سے احزاب کہلائی ہے۔

قُلْ لَّنْ یَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَ اِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا (۳۳:۱۶) قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً وَ لَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا (۳۳:۱۷) "اے نبیؐ ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ نفع بخش نہ ہوگا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقعہ تمہیں مل سکے گا۔ ان سے کہو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہو۔ اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر تم پر مہربانی کرنا چاہے۔ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے"۔ مثلاً بعض ایسے انتظامی امور پر تبصرہ' یہ انتظامی امور ان کے زمانہ جاہلیت میں جاری طریقے کے خلاف تھے اور ان کی جاہلی ذہنیت کے بھی خلاف تھے۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا (۳۳:۳۶) "کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے خود اپنے معاملے کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہو"۔ اور آخر میں وہ عظیم تبصرہ:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳:۷۲) "ہم نے اس امانت کو آسمان اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا' بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے"۔

تحریک اسلامی اور اسلامی سوسائٹی اس دور میں ایک خاص خصوصیت رکھتی تھی۔ اس دور میں اسلامی سوسائٹی اور اسلامی مملکت کے خدوخال ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن یہ خدوخال اور اسلامی مملکت ابھی مستحکم نہ ہوئے تھے' جس طرح فتح مکہ کے بعد اسلامی سوسائٹی اور اسلامی مملکت مستحکم ہو گئی تھی اور لوگ فوج در فوج دین اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور تمام اختیارات اسلامی نظام اور اسلامی حکومت کو حاصل ہو گئے تھے۔

اس سورہ میں اسلامی سوسائٹی کو از سرنو منظم کرنے کی سعی کی گئی ہے اور جدید اقدامات کو اسلامی معاشرے اور اسلامی حکومت میں مستحکم کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔ یہ بتایا گیا کہ اسلامی نظام میں نظریہ حیات کیا ہے اور اسلامی مملکت کا دستوری نظام کیا ہو گا۔ بعض جاہلانہ رسومات اور رواجات اور قوانین کے اندر تبدیلیاں کی گئیں اور ان امور کو اسلامی تصور حیات اور اسلامی دستوری نظام کے مطابق ڈھالا گیا۔

ان معاشی ' معاشرتی اور دستوری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ غزوۂ احزاب پر بھی تبصرہ کیا گیا۔ اور غزوۂ بنی قریظہ اور اس کے بارے میں کفار ' منافقین اور یہودیوں کے موقف کو بیان کیا گیا ہے ۔ یہ لوگ اسلامی صفوں کے اندر جس طرح سازشیں کر رہے تھے اس کا بھی تذکرہ ہے اور ان سازشوں کی وجہ سے اسلامی سوسائٹی میں جو بے چینی پیدا ہوئی تھی اس کا بھی تذکرہ ہے ۔ اس طرح وہ مسلمانوں کے اخلاق آداب ' ان کی بیویوں اور ان کے گھروں کے بارے میں جو سازشیں کرتے تھے اس پر بھی تبصرے ہیں ۔

اس سورہ میں بیان کردہ اخلاقی 'تنظیمی اور قانونی اور دستوری اصلاحات اور ان دو غزوات کے واقعات کے درمیان مابہ الاشتراک کیا ہے کہ ان معاملات کے بارے میں کافر' یہودی اور منافقین ایک خاص موقف رکھتے تھے ۔ یعنی اسلامی سوسائٹی کے خلاف مخالفین کی سازشوں کا جواب ' یہ لوگ اس جدید اسلامی سوسائٹی اور مملکت کے اندر بے چینی پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے ۔ اگر کسی جنگی حملے کا موقعہ ہوتا تو وہ بھی کرتے ۔ اگر افواہیں پھیلانی ہوتیں تو بھی پھیلاتے ۔ اگر لوگوں کو بددل کر کے شکست پر آمادہ کرنے کے مواقع ہوتے تو یہ بھی کرتے ۔ اگر کوئی جدید اسلامی اخلاقیات میں سے کوئی بات جاری ہوتی تو یہ اس پر بھی معترض ہوتے ۔ پھر غزوات کی وجہ سے جو اموال غنیمت آتے تھے اور اسلامی سوسائٹی کے جو حالات بدل رہے تھے تو اس کی وجہ سے بھی بعض معاشی روابط بدل رہے تھے ۔ جدید اسلامی خطوط پر نئے اجتماعی روابط اور ادارے قائم ہو رہے تھے ۔ لہٰذا اس پہلو سے یہ تمام متفرق اصلاحات باہم مربوط ہو جاتی ہیں اور سورہ کا مضمون ایک وحدت بن جاتا ہے ۔ اگرچہ موضوعات بظاہر متنوع ہیں لیکن جن متنوع اختلافات مابہ الاشتراک میں واقعات پر تبصرہ ہے ' وہ ایک ہی دور سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے سورہ کے مضامین باہم مربوط ہیں ۔

--- ooo ---

آغاز یوں ہوتا ہے کہ اے پیغمبر آپ اللہ سے ڈریں ۔ کافرین ' منافقین کی اطاعت نہ کریں ۔ آیت پر جو وحی اللہ کی طرف سے آتی ہے اسی کا اتباع کریں اور اللہ پر توکل کریں ۔ اس سورہ میں جو واقعات ' جو انتظامی اصلاحات جو قانونی اور دستوری دفعات ' جو اخلاقی اور معاشی آداب ہیں ان میں آپ صرف قرآن اور وحی کا اتباع کریں ۔ سب سے بڑا اللہ ہے ۔ اللہ کے ارادے اور ہدایت ہی کا اتباع کیا جائے ۔ اللہ ہی کے نظام کو اختیار کیا جائے ۔ اس پر توکل کیا جائے اور کفار اور منافقین سے اب مشورے نہ لیے جائیں اور اللہ کی نصرت پر بھروسہ کریں یہ لوگ آپ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے ۔

اب اس کے بعد بعض اجتماعی رسم و رواج کے اندر اصلاحات کر کے اسلام کا کلمہ حق بتایا جاتا ہے ۔ سب سے پہلے تو یہ کہا جاتا ہے کہ تمام اداروں کا اخذ اب خدا سے ہو گا ۔ انسان بیک وقت اپنے اندر دو دل نہیں رکھ سکتا ۔ اس کے دو قبلے نہیں ہو سکتے ۔ نہ دو مختلف نظاموں کو بیک وقت چلایا جا سکتا ہے ۔ اگر کوئی ایسا کرے گا تو وہ منافق ہو جائے گا ۔ اس کے اقدامات میں اضطراب ہو گا ۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِه (۳۳ : ٤) ”اللہ نے کسی کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے“۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ ایک الٰہ ' ایک عقیدہ اور ایک نظام کی طرف متوجہ ہو اور اب مسلمانوں کو چاہئے کہ تمام جاہلی اطوار ' عادات ' رسم و رواج اور قوانین کو یکلخت چھوڑ دیں۔

پہلی اصلاح قانون ظہار میں کی گئی۔ مثلاً جاہلیت میں کوئی اپنی بیوی کو کہتا کہ وہ میرے لیے میری ماں کی پیٹھ (ظہر) کی طرح ہے تو یہ عورت اس پر ماں کی طرح تاابد حرام ہو جاتی تھی۔

وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِیْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ (۳۳ : ٤) ”اللہ نے ان بیویوں کو تمہاری ماں نہیں بنایا ہے جن سے تم ظہار کرتے ہو“۔ یہ ایک بات ہے جو تم اپنی زبان سے کہتے ہو اور یہ بیوی کو ماں نہیں بنا دیتی۔ ان الفاظ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ بیوی ' بیوی ہی رہتی ہے ' اس کلام کی وجہ سے ماں نہیں بن جاتی۔ اسی طرح متبنی بنانے اور اس پر جو آثار مرتب ہوتے تھے ان کو بھی لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ (۳۳ : ٤) ”اور اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو حقیقی بیٹا نہیں بنایا“۔ لہٰذا آج کے بعد اس قسم کے تعلق کے ذریعے ان کے درمیان وراثت جاری نہ ہوگی۔ اور نہ دوسرے آثار حرمت ان کے درمیان پیدا ہوں گے۔ تفصیلات کا انتظار کریں۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیندہ تمام اہل ایمان کے ولی ہوں گے اور یہ ولایت ان کی خود اپنے اختیارات ذاتی سے بھی برتر ہوگی اور نبی کی بیویاں آج کے بعد تمام اہل ایمان کی مائیں ہیں۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (۳۳ : ٦) ”بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں“۔ اس کے بعد اسلام کے ابتدائی دنوں میں مہاجرین اور انصار کے درمیان جو مواخات قائم کی گئی تھی اور ان کے درمیان وراثت کے حقوق تھے ' ان کو ختم کر دیا گیا اور اب وراثت اپنے نسبی قریبی رشتہ داروں کے درمیان محدود کر دی گئی۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ

(۳۳ : ٦) ”کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین اور مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے سے زیادہ حقدار ہیں“۔ یوں اسلامی سوسائٹی کے قانون نظام کو معقول اور طبیعی بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے اور جو جاہلی رسوم تھیں یا وقتی انتظامات تھے ' ان کو ختم کر دیا گیا۔

یہ نیا انتظام جو اسلام اور اللہ کے احکام پر مبنی تھا ' اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی قدیم کتاب میں درج شدہ ہے۔ اور یہ اس عہد کے مطابق ہے جو تمام انبیاء سے لیا گیا تھا۔ خصوصاً انبیاء میں سے اولوالعزم نبیوں سے لیا گیا تھا۔ یہ قرآن کا مخصوص انداز ہے کہ وہ قانون سازی کرنے کے بعد اس پر تبصرہ کر کے ہدایات بھی دیتا ہے تاکہ وہ نیا قانون لوگوں کے ایمان اور ضمیر کا حصہ بن جائے۔ یہ تو تھا خلاصہ پہلے سبق کا۔

دوسرے سبق میں یہ بتایا گیا ہے کہ مومنین پر اللہ کا کس قدر رحم و کرم ہے کہ اس نے حملہ آور جماعتوں کی سازشوں کو رد فرمایا۔ اس کے بعد جنگ احزاب اور جنگ بنو قریظہ کے واقعات کی تصویر کشی کی جاتی ہے اور یہ تصویر کشی پے درپے مناظر کی شکل میں ہے۔ ان کے اندرونی احساسات کو کاغذ پر منقش کر دیا جاتا ہے۔ ان کی ظاہری دوڑ دھوپ اور افراد و جماعتوں کے مکالمات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ ان معرکوں کے واقعات کے بیان کے درمیان جابجا تبصرے بھی آتے ہیں اور واقعات سے قرآن کریم تھوڑی قدر بس اخذ کر کے ان کو آئندہ زندگی کے لیے راہنما بناتا ہے۔ یعنی ان واقعات سے جو عہد ہوئے اور ان باتوں سے جو لوگوں کے دلوں اور ضمیروں میں پیدا ہوئیں۔

قرآن کریم کا انداز ہی ایسا ہے کہ وہ واقعات پر تبصرہ کر کے اہل ایمان کے نفوس کی تربیت کرتا ہے۔ اقدار اور پیمانے وضع کرتا ہے اور ان کے دل و دماغ میں ایسے تصورات وضع کرتا ہے جو ان کے لیے آئندہ فکری اساس ہوں۔ قرآن کا انداز بیان یوں ہے کہ وہ واقعہ بیان کرتا ہے جو عملاً ہوا۔ اس کے بارے میں لوگوں کے خیالات' اور اندرونی سوچ بیان کرتا ہے اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے بعد اہل ایمان کو اس واقعہ کی حکمت بتائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس پر نقد و تبصرہ کیا جاتا ہے کہ اس کا اچھا پہلو کیا تھا اور برا کیا تھا۔ کس نے راہ صواب اختیار کیا اور کون غلطی پر تھا۔ اس کے بعد غلطیوں کا ازالہ کیا جاتا ہے اور اس کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ جو ہو گیا سو ہو گیا اللہ کے ہاں مقرر یوں ہی تھا۔ یوں تمام معاملات کو اللہ کی مشیت اور قانون فطرت کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے۔

چنانچہ اس معرکے کے بیان کا آغاز یوں ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا (۳۳ : ۹) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یاد کرو اللہ کے احسان کو جو اس نے تم پر کیا ہے جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں' اللہ سب کچھ دیکھ رہا تھا"۔ اور ان واقعات کے درمیان یہ تبصرے

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۳۳ : ۱۶) قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْۗءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۭ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۳۳ : ۱۷) "اے نبی' ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ ہو گا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقعہ تمہیں مل سکے گا۔ ان سے کہو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہے۔ وہ اگر تمہیں نقصان پہنچانا چاہے اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر تم پر مہربانی کرنا چاہے۔ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے"۔ اور دوسرا تبصرہ

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ

وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (۳۳ : ۲۱) "درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا۔اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے"۔اور خاتمہ اس پر ہوتا ہے :

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ

اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳ : ۲۴) "تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزاء دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے اور چاہے توبہ قبول کرلے' بے شک اللہ غفور و رحیم ہے"۔

اس کے ساتھ ساتھ اس جنگ کے بارے میں مومنین صادقین کا موقف' ان کے تصورات اور منافقین کا موقف ان کے تصورات اور احساسات بھی یہاں پیش کیے گئے تاکہ مسلمانوں پر سچی قدریں اور کھوٹی قدریں اچھی طرح واضح ہو جائیں ۔

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا

غُرُوْرًا (۳۳ : ۱۲) "یاد کرو جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا' صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کیے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے"۔اور دوسری طرف

وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ

وَ رَسُوْلُهٗ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا (۳۳ : ۲۲) "جب مومنین نے احزاب کو دیکھا تو پکار اٹھے ۔یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور بڑھا دیا"۔اس کے بعد اس کا فیصلہ کن انجام یقینی الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے ۔

وَ رَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ وَ كَانَ اللّٰهُ

قَوِيًّا عَزِيْزًا (۳۳ : ۲۵) "اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا۔وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یونہی پلٹ گئے اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی جنگ کرنے کے لیے کافی ہو گیا' اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے"۔

اس کے بعد ازواج مطہرات کو اختیار دینے کا مشہور واقعہ ہے کہ جب مسلمانوں پر ہر طرف سے اموال غنیمت آنے شروع ہو گئے تو انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر نان و نفقہ کا مطالبہ شروع کر دیا۔یہ اموال غزوہ بنی قریظہ کے ذریعے اور اس سے قبل کے اموال غنیمت کے ذریعہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئے تھے ۔ازواج مطہرات کو دو باتوں کے درمیان میں سے ایک کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا یا تو وہ دنیا کی زیب و زینت اور عیش و عشرت کی زندگی

اختیار کرلیں اور یا اللہ اور رسول اور آخرت کو اختیار کرلیں۔ چنانچہ انہوں نے اللہ 'رسول اور آخرت کو اختیار کر لیا۔ تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کے مقام محترم کو چن لیا اور زندگی کے عیش اور عشرت کو ترک کر دیا۔ اس کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ جس طرح تم نے اللہ و رسول اور آخرت کو اختیار کیا ہے تو تمہاری جزائے بھی عظیم ہوگی اور اگر تم نے گناہ اور فحاشی اور دنیا پرستی کو اختیار کیا تو تمہارے لیے سزا بھی دوسرے لوگوں سے زیادہ ہوگی۔ اور یہ اس لیے کہ تم نبی کریم کی عظیم ازواج ہو اور تمہارے گھروں میں قرآن نازل ہو رہا ہے اور اس کی تلاوت ہو رہی ہے۔ وہ رات اور دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکمت بھرے وعظ سن رہی ہیں۔ اس کے بعد تمام مومنین و مومنات کی جزائے اخروی کو بیان کر دیا جاتا ہے۔ یہ تیسرا سبق تھا۔

چوتھا سبق آپ کی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کے بارے میں ہے۔ یہ قریشی اور ہاشمی النسب تھیں۔ ان کا نکاح آپ کے آزاد کردہ غلام زید ابن حارثہ سے ہوا تھا۔ اس کے بارے میں یہ حکم ہوا تھا۔ مومنین اور مومنات کے معاملات کا اختیار اللہ کو ہے۔ اب ان کا اپنے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ نہ وہ اللہ اور رسول کے فیصلوں کے بعد کوئی اختیار رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا ارادہ ہے جو تمام معاملات کو چلاتا ہے اور مومنین کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے بارے میں سر تسلیم خم کر دیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (۳۳ : ۳۶) "کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے میں فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا"۔ یہ تو تھا زینب کے نکاح کا معاملہ۔

اب نکاح کے بعد ان کے درمیان طلاق ہوگئی۔ طلاق کے بعد متبنی بنانے کے قانون کو منسوخ کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں پہلے بات ہو چکی ہے اور یہ قانون پہلے ہی منسوخ ہو چکا تھا۔ یہ قانون عرب معاشرے میں چونکہ جڑیں پکڑ گیا تھا' اس لیے اللہ نے اس کے اجراء کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو چنا۔ چنانچہ اس سلسلے میں خود رسول اللہ کو آزمائش میں ڈالا گیا تاکہ آپ خود اس بات کو اپنے اوپر نافذ کریں اور یہ نیا اصول عربی معاشرے میں قائم ہو جائے اور سابقہ جاہلی قانون کا قلع قمع کر دیا جائے۔

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ

ادعيائهم اذا قضوا منهن وطرا و كان امر الله مفعولا (۳۳: ۳۷) "پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنین پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے، جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے"۔ اس مناسبت سے یہاں حضور اکرم اور مومنین کے باہم تعلق کے بارے میں ہی بات ہو جاتی ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

(۳۳: ۴۰) "محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔ اس سبق کا خاتمہ رسول اللہ اور مومنین کے نام اس ہدایت کے اجراء سے ہوتا ہے:

وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ دَعْ اَذٰهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ

وَكِيْلًا (۳۳: ۴۸) "اور ہرگز اطاعت نہ کرو کفار اور منافقین کی، کوئی پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ کر لو اللہ پر۔ اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ اپنے معاملات اس کے سپرد کیے جائیں"۔

پانچویں سبق میں ان طلاق شدہ عورتوں کے مسائل ہیں جن کی رخصتی نہ ہوئی ہو۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عائلی زندگی کے بارے میں کچھ احکام ہیں، کہ کون سی عورتیں آپ پر حرام ہیں اور کون سی حلال ہیں۔ پھر مومنین کا تعلق ازواج مطہرات سے کیا ہے۔ زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد اور یہ کہ ان کا حجاب کن کن سے ہو گا۔ باپ، بیٹے، بھائیوں، بھتیجوں یا غلاموں کے سوا تمام دوسرے لوگوں سے حجاب ہو گا۔ پھر ان لوگوں کا حکم جو رسول اللہ کو آپ کی بیویوں اور خاندان کے بارے میں اذیت دیتے ہیں۔ ان پر دنیا و آخرت میں لعنت بھیجی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت منافقین اور کافرین اس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

اس کے بعد یہ حکم آتا ہے کہ ازواج مطہرات، آپ کی بیٹیاں مومنین کی ازواج اور تمام مومنہ عورتیں اپنی اوڑھنیاں سینوں پر ڈال لیا کریں۔

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (۳۳: ۵۹) "تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں"۔

اس کے بعد ان منافقین کو تہدید آمیز تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ اگر مدینہ میں شر و فساد اور افواہیں پھیلانے سے باز نہ آئے تو ہم رسول اللہ کو آمادہ کریں گے کہ تم لوگوں کے خلاف وہ کاروائی کریں، تمہیں نکال دیں جس طرح بنی قینقاع کو نکال دیا۔ بنو نضیر کو نکال دیا۔ یا تمہارا کام ہی تمام کر دیں۔ جس طرح بنی قریظہ کا کام تمام کر دیا۔ یہ سب امور یہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں منافقین رات اور دن مدینہ میں اسلام کے خلاف سرگرم تھے اور شرارتیں کرتے تھے۔

آخری سبق لوگوں کے اس سوال کا جواب ہے کہ قیامت کب آئے گی اور اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اس طرف اشارہ ہے کہ شاید یہ قریب ہی ہو۔ اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے دو منظر پیش کیے جاتے ہیں۔

یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْھُھُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰہَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا

(۳۳ : ۶۶) "جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کیے جائیں گے' اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش ہم نے اللہ اور رسول ؐ کی اطاعت کی ہوتی"۔ وہ اپنے اکابر پر لعنت اور ملامت کریں گے جن کی انہوں نے اطاعت کی اور انہوں نے ان کو گمراہ کیا۔

وَ قَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا (۳۳ : ۶۷) رَبَّنَآ

اٰتِھِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْھُمْ لَعْنًا کَبِیْرًا (۳۳ : ۶۸) "اور کہیں گے اے ہمارے رب' ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب' ان کو دہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر"۔

سورہ کا خاتمہ نہایت ہی عظیم اور گہرے تبصرے پر ہوتا ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَھَا وَ

اَشْفَقْنَ مِنْھَا وَ حَمَلَھَا الْاِنْسَانُ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا (۳۳ : ۷۲) "ہم نے امانت کو آسمان' زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے مگر انسان نے اسے اٹھا لیا اور بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے تاکہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے"۔

یہ آخری تبصرہ یہ بتاتا ہے کہ انسانیت کے کاندھوں پر کس قدر بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہے خصوصاً جماعت مسلمہ کے کاندھوں پر۔ یہ عظیم امانت فی الوقت جماعت مسلمہ ہی اٹھا رہی ہے۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات کے پھیلانے کی ذمہ داری۔ اور اس دعوت کی راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر کرنا' شریعت کو قائم کرنا' اپنے اوپر اور زمین پر شریعت کو قائم کرنا وغیرہ یہ سب امور اسی سورہ کے موضوع کا اہم حصہ ہیں۔ یعنی اسلامی نظریہ حیات سے اسلامی نظام' اسلامی دستور و قانون اور سلامی معاشرے کا قیام اللہ کی امانت ہے جو مومنین کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے۔

اب سورہ ہذا کی آیات کی تشریح۔

---ooo---

درس نمبر ۱۸۸ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۸

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾ وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾ وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اے نبیؐ" اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو' حقیقت میں علیم اور حکیم تو اللہ ہی ہے۔ پیروی کرو اس بات کی جس کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں کیا جا رہا ہے' اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم لوگ کرتے ہو۔ اللہ پر توکل کرو' اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے"۔

یہ اس سورہ کا آغاز ہے جس میں اس نئے اسلامی معاشرے کی اخلاقی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم نو کی گئی ہے۔ یہ آغاز ہی بتاتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کا مزاج کیا ہے اور وہ قواعد اور اصول کیا ہیں جن پر اسلامی نظام عملاً قائم ہے۔ وہ تصورات کیا ہیں جن کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے ضمیر و اخلاق پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اسلام محض ہدایات اور وعظ نہیں ہے۔ نہ اسلام محض چند اخلاقی تعلیمات کا نام ہے' نہ اسلام صرف قوانین کا مجموعہ ہے۔ نہ وہ محض رسم و رواج کا نام ہے۔ اسلام دراصل مذکورہ بالا تمام چیزوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں بھی اسلام نہیں ہیں۔ اسلام دراصل سر تسلیم خم کر دینے کا نام ہے۔ اللہ کی مشیت اور اللہ کی خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا۔ اللہ کی تقدیر کے سامنے جھکنا۔ اور سب سے اول بات یہ کہ اللہ کے احکام اوامر و نواہی کے ماننے کے لیے تیار ہو

جانا۔ اللہ انسانوں کے لیے جو نظام تجویز کرتا ہے اس کے مطابق زندگی بسر کرکے ' بغیر ادھر ادھر توجہ کرنے کے ' اور اس کے سوا کسی اور طرف رخ کرنے کے ۔ بغیر اس کے کہ اللہ کے سوا کسی اور قوت پر بھروسہ کیا جائے ۔ اسلام کا بنیادی شعور یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ وہ ایک ایسے قانون قدرت کا تابع ہے جو خود انسان اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی پوری کائنات کو کنٹرول کرتا ہے ۔ یہ نظام افلاک و کواکب کو بھی کنٹرول کرتا ہے اور تمام وجود کو بھی کنٹرول کرتا ہے خواہ خفیہ ہو یا ظاہر ہو ۔ غائب ہو یا حاضر ہو ۔ انسان اسے سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہو ۔ اس یقین کے ساتھ کہ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے ۔ انہوں نے صرف اللہ کے احکام کا اتباع کرنا ہے اور ان کاموں سے رکنا ہے جن سے رکنے کا اللہ نے حکم دیا ہے ۔ ان اسباب اور ذرائع کو استعمال کرنا ہے جو اللہ نے ان کے لیے فراہم کیے ہیں اور پھر ان نتائج کا انتظار کرنا ہے جو اللہ نے نکالنے ہیں ۔ یہ وہ قاعدہ ہے جس کے اوپر تمام شریعتیں اور تمام قوانین قائم ہوتے ہیں ' رسم و رواج قائم ہوتے ہیں ' آداب و اخلاق قائم ہوتے ہیں یعنی وہ عقیدہ جو ضمیر و شعور میں ہوتا ہے وہ انسانی زندگی میں عملاً ظہور پذیر ہو اور انسان کی زندگی میں اس کے عملی آثار موجود ہوں کہ انسان کا نفس اللہ کے سامنے جھک گیا ہے اور وہ اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے شریعت پھوٹتی ہے ۔ اس شریعت پر بھی ایک پورا نظام زندگی استوار ہوتا ہے اور یہ تینوں امور باہم مربوط اور ہم جسم ہوتے ہیں ۔ یہ ہے اسلام ۔

چنانچہ اس سورہ کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے لیے جدید قانون سازی کی جائے یعنی اللہ سے ڈرنا ۔ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے کیونکہ حضور اکرم ؐ ہی اس جدید معاشرے کے منتظم اعلیٰ تھے ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ (۳۳ : ۱) "اے نبی ' اللہ سے ڈرو" ۔ اللہ سے ڈرنا اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ اللہ ہمارے اوپر نگران ہے اور وہ بہت جلیل القدر ہے ۔ یہ اسلام کا بنیادی شعور اور بنیادی قاعدہ ہے ۔ تقویٰ ہی انسان کے اندر ایک پاسبان ہوتا ہے جو انسان کو اللہ کے احکام کی پیروی پر مائل کرتا ہے ۔ چنانچہ تقویٰ ہی کی وجہ سے اسلامی نظام زندگی عملاً قائم ہوتا ہے ۔

دوسرا حکم آیا ہے کہ کافروں اور منافقوں کی خواہشات کی اطاعت نہ کرو ۔ ان کی تجاویز اور ان کی ہدایات کو نظر انداز کرو ' نہ ان سے رائے لو اور نہ ان کے اصرار کو تسلیم کرو ۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (۳۳ : ۱) "کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کرو" ۔ اللہ کے احکام کی اطاعت کرنے کا حکم یہاں بعد میں آتا ہے ۔ اس سے بھی پہلے کہا گیا کہ کفار اور منافقین کی اطاعت نہ کرو ' اس لیے کہ اس دور میں کفار اور منافقین کی طرف مسلمانوں اور حضور اکرم ؐ پر بہت ہی دباؤ تھا ۔ اس لیے یہاں حکم دیا گیا کہ آئندہ اسلامی معاشرے کی عملی تنظیم میں بھی ان کی کوئی بات نہ سنو اور ان کے دباؤ کے آگے نہ جھکو ۔ حضور ؐ کو تو اس وقت کے حالات کے مطابق حکم دیا گیا لیکن تحریک اسلامی کو ہر زمان و مکان میں یہی کرنا چاہیے کہ جہاں اپنی حکومت قائم ہو تو وہاں غیروں کی آراء و تجاویز کو قبول نہ کرو تاکہ اسلامی نظام حیات خالص اپنی پالیسی پر آگے بڑھے اور وہ کسی غیر کی پالیسی کے دباؤ میں نہ ہو ۔

کسی مسلمان کو یہ دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ ان کفار اور منافقین کے پاس مہارت ہے اور وہ علم و تجربہ رکھتے ہیں جس

طرح آج کل اپنے لیے اپنی کمزوری کے دور میں یہ وجہ جواز تلاش کرتے ہیں اس لیے کہ اللہ ہی علیم و حکیم ہے ۔ اس نے مسلمانوں کو جو نظام زندگی دیا ہے وہ اس نے علم و حکمت کی اساس پر دیا ہے ۔ اس میں کوئی فتور اور قصور نہیں ہے اور لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی علم و حکمت نہیں ہے ۔

اور اس کے بعد متصلاً یہ حکم دیا جاتا ہے ۔

وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۳۳ : ۲) "اور پیروی کرو اس بات کی جس کا اشارہ تمہارے رب کی طرف سے تمہیں کیا جا رہا ہے"۔ کیونکہ مسلمانوں کے لیے ہدایات اللہ سے آیا کرتی ہیں ۔ کفار اور منافقین کی طرف سے نہیں ۔ مسلمان خدا کا اتباع کرتے ہیں کسی اور کا نہیں ۔ اس آیت کی طرز تعبیر ہی میں بعض گہرے اشارات پائے جاتے ہیں یعنی اتباع کرو اس بات کی جو تمہارے طرف وحی (اشارہ) کی جا رہی ہے ' خصوصیت کے ساتھ ۔ پھر یہ اشارہ رب کی طرف سے ہے ۔ گویا یہاں یہ خاص اشارات کئے جا رہے ہیں ' ان کو سمجھو ۔ اور یہ اشارات اللہ مطاع کی طرف سے ہیں ۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۳۳ : ۲) "اللہ ہر اس بات سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو ۔ اللہ جو ہدایات دیتا ہے وہ اعلیٰ درجے کے علم اور مہارت پر مبنی ہیں ۔ وہ تمہارے اعمال کی حقیقت سے باخبر ہے ' تمہارے رجحانات اور تمہاری خواہشات سے باخبر ہے ۔

اور آخری ہدایت یہ ہے کہ

وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۳۳ : ۳) "اللہ پر توکل کرو ' اللہ ہی وکیل ہونے کے لیے کافی ہے"۔ یہ بات اہم نہیں ہے کہ کفار و منافقین تمہارے ساتھ ہیں یا تمہارے خلاف ہیں ۔ نہ ان کی مکاریوں اور سازشوں کی کوئی حیثیت ہے ۔ اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو ' اللہ تمہارے معاملات کے اندر اپنے علم ' اپنی خبرداری اور مہارت سے تصرف کرے گا ۔ معاملات کو اللہ پر چھوڑ دینا ہی وہ چیز ہے جس پر آخر کار انسان کا دل مطمئن ہو کر شرح صدر حاصل کر لیتا ہے اور وہ اپنے حدود و قیود سے باخبر ہو جاتا ہے ۔ اپنے حدود سے باہر کے معاملات کو اللہ پر چھوڑ دیتا ہے ۔ اپنی حدود پر رک جاتا ہے اور آگے کی بات ' بات والے پر چھوڑ دیتا ہے ۔ نہایت اطمینان ' پورے بھروسے اور پورے یقین کے ساتھ اپنے حصے کا کام کرتا ہے ۔

یہ تین عناصر ' خدا کا خوف ' وحی الٰہی کا پورا اتباع اور اللہ وحدہ پر بھروسہ یہ کسی بھی داعی کے اصل زاد راہ ہیں ۔ بشرطیکہ کہ وہ کفار اور منافقین سے کٹ جائے ۔ یہ عناصر دعوت اسلامی کو اپنے منہاج پر قائم رکھتے ہیں یعنی اللہ سے (خوف) ' اللہ کی طرف سے آنے والے حکم کا اتباع اور اللہ پر بھروسہ ۔ یہ ہدایات ایک زبردست ' گہرے تبصرے پر رقم ہوتی ہیں اور یہ تبصرہ ایک حسی مشاہدے پر مبنی ہے ۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ

"اللہ نے کسی شخص کے دھڑ میں دو دل نہیں رکھے"۔ ہر انسان کے اندر ایک ہی دل اور ایک ہی دماغ ہوتا ہے ۔ لہٰذا اس کا تصور بھی ایک ہو گا اور اس کا نظام بھی ایک ہو گا۔ وہ ایک ہی صراط مستقیم پر چل سکتا ہے ۔ اس کے سامنے ایک ہی پیمانہ ہو گا جس سے وہ حسن و قبح کو ناپے گا۔ اور ایک ہی پیمانے سے وہ واقعات اور اقدار کو ناپے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس کی زندگی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی ۔ وہ منافق ہو گا۔ اس کی زندگی میں نشیب و فراز ہوں گے اور وہ صراط مستقیم پر نہ ہو گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک انسان اپنے اخلاق و آداب ایک سرچشمے سے لے اور اپنا دستور و قانون کسی دوسرے سرچشمے سے لے اور اپنا اجتماعی اور معاشی نظام کسی تیسرے سرچشمے سے لے اور اپنے فنون اور فلسفے کسی چوتھے سرچشمے سے لے ۔ اس قسم کے مخلوط خیالات کسی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے ۔ ایسا شخص اور اس کی شخصیت ٹکڑے ٹکڑے ہو گی اور اس کا وجود قائم نہ رہ سکے گا۔

ایک نظریاتی شخص ، جس کا فی الواقعہ کوئی نظریہ اور عقیدہ ہو ' یہ نہیں کر سکتا کہ وہ زندگی کے چھوٹے یا بڑے معاملے میں کوئی نظریاتی موقف نہ رکھتا ہو ۔ وہ ہر وقت اپنے نظریات کے تقاضوں کے مطابق قدر بس اپناتا ہے اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ کوئی بات کرے یا کوئی حرکت کرے ' یا کوئی نیت و ارادہ کرے یا کوئی سوچ کرے اور وہ اس کے نظریات سے متاثر نہ ہو یا اس کے عقیدے سے مبرا ہو ۔ کیونکہ اللہ نے کسی انسان کے سینے میں دو دل نہیں رکھے ۔ ایک دل ہوتا ہے ' ایک عقیدہ ہوتا ہے ' ایک عمل ہوتا ہے ' ایک سمت ہوتی ہے اور ایک ہی پیمانہ اور قدر ہوتی ہے ۔

کوئی نظریاتی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کام میں نے اپنی ذاتی حیثیت میں کیا ہے اور یہ میں نے ایک مسلمان کی حیثیت میں کیا ہے ۔ جیسا کہ آج کل کے سیاست دان ایسا کرتے ہیں ' یا جیسا کہ اجتماعی جمعیتیں کرتی ہیں یا علمی سوسائٹیاں کرتی ہیں ۔ غرض انسان ایک ہوتا ہے ' اس کا دل ایک ہوتا ہے ' نظریہ ایک ہوتا ہے ' قبلہ ایک ہوتا ہے ' اس کا تصور ایک ہوتا ہے ' اقدار اور حسن و قبح کے پیمانے ایک ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ اس کے عقائد میں ہوتا ہے ۔

غرض اسی ایک دل کے ساتھ انسان تنہا بھی زندہ رہتا ہے ' خاندان میں بھی رہتا ہے ' جماعت میں بھی رہتا ہے ' حکومت میں بھی رہتا ہے ' دنیا میں بھی رہتا ہے ' چھپے بھی رہتا ہے اور برملا بھی رہتا ہے ۔ مزدور و آقا بھی رہتا ہے ' حاکم و محکوم بھی رہتا ہے ۔ مشکلات اور سہولیات میں بھی رہتا ہے ۔ غرض یہ اس کا رنگ ہوتا ہے ۔ یہ تبدیل نہیں ہوتا ۔ نہ اس کا معیار بدلتا ہے اور نہ قیمت بدلتی ہے ۔ نہ اس کی سوچ بدلتی ہے ۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ (۳۳ : ۴) لہٰذا کسی بھی نظریاتی اسلام کا منہاج ایک ہوتا ہے ' راستہ ایک ہوتا ہے ' رخ ایک ہوتا ہے ۔ صرف اللہ کے حکم کے سامنے جھکتا ہے ۔ دل ایک ہے تو الٰہ بھی ایک ہے ' آقا بھی ایک ہے ' منہاج حیات بھی ایک ہے اور اگر کوئی ایسا نہ ہو گا تو اس کی زندگی منتشر ہو گی اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گا۔

اس فیصلہ کن تبصرے کے بعد اور منہاج حیات کے تعین کے بعد اب سیاق کلام قانونی اصلاحات شروع کرتا ہے ۔ پہلے ظہار اور متبنی بنانے کا قانون منسوخ کیا جاتا ہے تاکہ خاندان کو بیرونی عناصر سے پاک کر کے خالص رشتہ داری اور قدرتی بنیادوں پر تعمیر کیا جائے ۔

وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمُ الّٰٓئِ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ أُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَآءَكُمْ أَبْنَآءَكُمْ ۚ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ ۖ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ﴿۴﴾ أُدْعُوْهُمْ لِآبَآئِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا آبَآءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۚ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ أَخْطَأْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵﴾

"نہ اس نے تم لوگوں کو ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو' تمہاری ماں بنا دیا ہے' اور نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو لوگ تم اپنے منہ سے نکال دیتے ہو' مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو' یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔ اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں۔ نادانستہ جو بات تم کہو' اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے' لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا تم دل سے ارادہ کرو' اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔

جاہلیت میں رواج یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی سے کہتا تھا تم مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو۔ یعنی تم مجھ پر اس طرح حرام ہو جس طرح ماں حرام ہے۔ اسی وقت سے اس پر اس کے ساتھ مجامعت حرام ہو جاتی۔ اب یہ معلقہ ہو جاتی نہ یہ مطلقہ ہوتی کہ دوسرا کوئی اس سے نکاح کرتا' نہ اس کی بیوی بن سکتی۔ اور یہ عورتوں پر ہونے والے مظالم میں سے سب سے بڑا ظلم تھا۔ اور جاہلیت کے دور کی بدسلوکیوں میں سے ایک بدسلوکی تھی۔

اسلام نے اصلاحات کا کام سب سے پہلے خاندانی نظام سے شروع کیا۔ خاندان کے اندر ہونے والے اس ظلم کو ختم کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خاندان انسانی اجتماعیت کا پہلا دائرہ ہے۔ اس لیے اسلام نے خاندانی نظام کی طرف بہت توجہ دی تاکہ جس تربیت گاہ میں بچے پرورش پاتے ہیں' اس کی فضا خوشگوار ہو' اور پرامن ہو۔ چنانچہ عورت کو اس عظیم بوجھ سے نکالا گیا اور اسے اس حالت قید سے رہائی دلا دی گئی۔ اور میاں بیوی کے تعلقات کو از سرنو عدل و انصاف پر استوار کیا۔ چنانچہ یہ قانون وضع کیا گیا۔

وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمُ الّٰئِي تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ أُمَّهٰتِكُمْ (۳۳ : ۴) "اس نے تم لوگوں کی ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو' تمہاری ماں نہیں بنا دیا ہے"۔ کیونکہ صرف زبان سے ماں کہنے سے بیوی ماں نہیں بن جاتی۔ حقیقت واقعہ کے مطابق ماں' ماں ہے اور بیوی' بیوی ہے۔ محض ایک لفظ کہنے سے تعلقات و روابط کی نوعیت نہیں بدل جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ظہار کی وجہ سے ابدی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ جس طرح ماں حرام ہوتی ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں تھا۔

روایات میں آتا ہے کہ سورہ مجادلہ میں ظہار کے ظالمانہ قانون کو باطل کیا گیا اور واقعہ یوں ہوا کہ اوس ابن الصامت نے اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ کے ساتھ ظہار کر لیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس نے یہ دعویٰ کیا رسول خدا! یہ میرا مال کھا گیا' اس نے میری جوانی کو ختم کر دیا' اور میرا پیٹ پھول گیا۔ اور میری عمر بڑھ گئی اور میری اولاد ختم ہو گئی تو اس نے میرے ساتھ ظہار کر لیا۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا "میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم اس پر حرام ہو گئی ہو"۔

اس نے اپنی شکایت بار بار پیش کی۔ اس پر سورہ مجادلہ کی یہ آیات نازل ہوئیں :

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ (۵۸ : ۱) اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ وَ اِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَ زُوْرًا وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۵۸ : ۲) وَ الَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (۵۸ : ۳) فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۵۸ : ۴)

"اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے' وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں ان کی بیویاں ان کی مائیں نہیں ہیں' ان کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں ان کو جنا ہے۔ یہ لوگ ایک سخت ناپسندیدہ اور جھوٹی بات کہتے ہیں اور حقیقت یہ کہ اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی تھی تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ایک غلام آزاد کرنا ہو گا' اس سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے درپے روزے رکھے' قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ یہ حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے دردناک سزا ہے"۔

اس قانون کی رو سے ظہار کی وجہ سے میاں بیوی کو وقتی طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا اور سابق قانون میں جو ابدی حرمت تھی' اسے ختم کر دیا گیا۔ اور اگر میاں بیوی باہم دوبارہ ازدواجی زندگی اختیار کرنا چاہیں تو اس سے قبل وہ ایک غلام آزاد کریں یا مسلسل دو ماہ روزے رکھیں یا ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائیں۔ یوں دوبارہ وہ بیوی خاوند کے لیے

حلال ہو جائے گی اور دونوں کی ازدواجی زندگی حسب سابق شروع ہو جائے گی۔ اور یہ نیا قانون واقعیت پسندانہ ہے اور واقعی صورت حالات پر مبنی ہے۔

وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَکُمُ الّٰٓئِیْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِکُمْ (۳۳ : ۴) "اللہ نے تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرتے ہو، تمہاری مائیں نہیں بنایا"۔ اس جاہلی عادت کی وجہ سے خاندان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا تھا اور دوسری جانب عورت پر ایک دائمی ظلم تھا اور وہ زندہ درگور ہو جاتی تھی۔ یوں خاندانی روابط کے اندر اضطراب، طوائف الملوکی اور پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی تھیں اور یہ سب کچھ مرد کی ذاتی خواہشات اور جاہلی سوسائٹی میں ان کی برتری اور تشدد کی وجہ سے تھا۔

یہ تو تھا مسئلہ ظہار رہا قانون متبنی اور لوگوں کو اپنے باپوں کے سوا دوسروں کے نام سے پکارنا، یہ بھی خاندانی نظام کے لیے باعث پریشانی تھا اور اس کی وجہ سے ایک خاندان کی ہم آہنگی میں خلل پڑتا تھا۔

اس کے باوجود کہ عربی معاشرے میں عفت اور نسب کا بہت بڑا خیال رکھا جاتا تھا اور نسب پر فخر کیا جاتا تھا لیکن اس فخر و مباہات کے ساتھ ساتھ بعض کمزور پہلو بھی عرب معاشرے میں پائے جاتے تھے۔ معدودے چند خاندانوں کے سوا یہ کمزوریاں عموماً تھیں۔

بعض لوگوں کے ہاں ایسے بیٹے بھی تھے جن کے سرے سے باپ معلوم ہی نہ تھے۔ بعض لوگوں کو اس قسم کے نوجوان پسند آئے تو وہ انہیں اپنا بیٹا بنا لیتے اس کو اپنے نسب میں شمار کر لیتے اور دونوں ایک دوسرے کی میراث کے حقدار ہو جاتے۔

بعض بیٹے ایسے تھے کہ ان کے باپ معلوم تھے لیکن بعض اوقات ایک شخص کو کوئی ایسا لڑکا پسند آ جاتا، وہ اسے اپنا بیٹا بنا لیتا۔ اور اسے اپنے نسب میں شریک کر لیتا۔ لوگوں کے اندر وہ ابن فلاں مشہور ہوتا۔ وہ اس کے خاندان کا فرد بن جاتا۔ یہ معاملہ خصوصاً جنگی قیدیوں اور اغواشدہ لوگوں کے ساتھ ہوتا۔ جنگ اور ڈاکوں میں بچے اور نوجوان لڑکے قید ہو جاتے۔ بعض لوگ ایسے لوگوں کو اپنا بیٹا بنا لیتے۔ اسے اپنا نام دے دیتے اور وہ اس کے ساتھ مشہور ہو جاتا اور وہ بیٹے کے حقوق و فرائض ادا کرتا۔

انہی میں سے زید ابن حارثہ کلبی بھی تھا۔ یہ ایک عربی قبیلہ ہے 'ایام جاہلیت کے دور کی ڈکیتیوں میں سے کسی ڈکیتی میں یہ قید ہو کر آ گیا۔ اسے حکیم ابن حزام نے اپنی پھوپھی خدیجہ کے لیے خرید لیا۔ جب حضورؐ نے خدیجہ کو اپنے نکاح میں لے لیا تو اس نے یہ حضورؐ کو بخش دیا۔ اس کے بعد اس کے باپ اور بیٹے نے اسے آزاد کرنے کا مطالبہ کیا تو حضور اکرمؐ نے اسے اختیار دے دیا تو زید نے حضورؐ کو اختیار کر لیا۔ حضور اکرمؐ نے اسے آزاد کر کے متبنی بنا دیا اور لوگ اسے زید ابن محمد کہنے لگے۔ غلاموں میں سے حضورؐ پر وہ سب سے پہلے ایمان لائے۔

جب اسلام نے خاندانی تعلقات کو اپنی طبیعی اور فطری بنیادوں پر استوار کرنا شروع کیا، خاندانی روابط کو مستحکم بنانے کی سعی کی اور خاندان کو خالص خاندانی حد تک محدود کیا تو جاہلی قانون متبنی کو ختم کر دیا اور خاندانی روابط کو نسب کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ یعنی خونی رشتے باپ بیٹے کی اساس پر۔ اور یہ حکم دیا۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ (۳۳ : ۴) "اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا

نہیں بنایا"۔

ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ (۳۳: ٤) "یہ وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکالتے ہو"۔ صرف باتوں سے واقعات اور حقائق نہیں بدلتے۔ اور صرف باتوں سے خونی رشتے بھی قائم نہیں ہوتے اور وراثت کے حقوق بھی پیدا نہیں ہو جاتے۔ اور محض زبان سے یہ رشتے ایسے نہیں ہوتے جو اس وقت ہوتے ہیں جب ایک زندہ بچہ زندہ ماں سے پیدا ہوتا ہے یا حقیقی باپ سے پیدا ہو جاتا ہے۔

وَ اللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ (۳۳: ٤) "مگر اللہ جو بات کہتا ہے وہی حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتا ہے"۔ وہ مطلق حق کہتا ہے جس کے اندر کوئی باطل نہیں ہوتا اور ان سچائیوں میں سے ایک سچائی یہ ہے کہ خاندانی قوانین اور رشتے حقیقت پر مبنی ہوں۔ یعنی خون اور نسب کے روابط ہوں' نہ محض زبانی باتوں پر۔ وہ قانون سازی میں سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اور اسی کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ یہ فطری قانون ہوتا ہے اور انسان کے بنائے ہوئے قوانین ان فطری قوانین کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جبکہ وہ حقائق نہ ہوں' محض خالی باتیں ہوں۔ ایسے الفاظ ہوں جن کا کوئی مفہوم نہ ہو' لہٰذا ایسے قوانین و روابط پر حقیقی قوانین و ضوابط غالب ہو جاتے ہیں جو سیدھے راستے پر مبنی ہوں۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ (۳۳: ۵) "منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے"۔ منصفانہ بات یہ ہے کہ بیٹے کو باپ کے نام سے پکارا جائے۔ یہی اس والد کے ساتھ انصاف ہے جس کے جسم سے یہ ٹکڑا علیحدہ ہو کر شخص بنا۔ بیٹے کے ساتھ بھی انصاف ہے اور انہی دونوں کے درمیان وراثت بھی انصاف ہے۔ باپ اور بیٹا ہی ایک دوسرے کے حقیقی معاون ہو سکتے ہیں۔ بیٹا باپ کی خفیہ خصوصیات کا بھی امین ہو سکتا ہے اور آباؤ اجداد کے خصائص کا بھی امین ہے۔ یہ اس طرح بھی عدل ہے کہ ہر حق کو اس کی جگہ رکھ دیا گیا اور روابط کو فطری اصولوں پر قائم کر دیا گیا۔ نہ والد کی حق تلفی ہو اور نہ بیٹے کی حق تلفی ہو۔ غیر حقیقی والد کو متبنیٰ ہونے کی ذمہ داریاں نہ اٹھانی پڑیں گی اور نہ اسے وہ مفادات ملیں گے جن کا وہ مستحق نہ تھا۔ نہ متبنیٰ غیر ضروری ذمہ داریاں اٹھائے گا اور نہ وہ مفادات لے سکے گا جس کا وہ مستحق نہ تھا۔

یہ وہ عائلی نظام ہے جس کی وجہ سے خاندان کی ذمہ داریوں میں توازن پیدا ہوتا ہے اور خاندان نہایت ہی مستحکم اور گہری اور واقعیت پسندانہ بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ اس کی اساس میں سچائی' حق پسندی اور فطرت سے ہم آہنگی ہے۔ ہر وہ نظام جو خاندانی نظام کو نظرانداز کرتا ہے وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ وہ ضعیف کمزور اور جعلی بنیادوں پر اٹھا ہوا ہوتا ہے اور کوئی ایسا نظام زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ (۱)

---

(۱) اشتراکیت نے اپنے نظام کو خاندانی بنیاد پر استوار نہیں کیا۔ آج تک اشتراکی معاشرہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ روسی نظام کی مذہبی اور فلسفیانہ بنیادوں کی مخالفت کے باوجود' یہ ملک آہستہ آہستہ خاندانی نظام کی طرف منتقل ہوا اور خاندانی قوتیں منظم ہو رہی ہیں۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ دور جاہلیت میں خاندان کے روابط میں بہت انتشار تھا۔ اسی طرح جنسی تعلقات میں بھی انتشار تھا' اس کے نتیجے میں انساب کے اندر بہت ہی اختلاط پیدا ہو گیا تھا اور بعض اوقات لوگوں کے باپوں کا بھی پتہ نہ لگتا تھا۔ اسلام نے اس معاملے کے اندر سہولت پیدا کر دی کیونکہ اسلام کا منشا یہ تھا کہ خاندانی نظام کو از سر نو منظم کیا جائے۔ اور اسلام خاندان کی اساس پر اجتماعی نظام کی تشکیل کے درپے تھا۔ اس لیے جن لوگوں کے آباء و اجداد کا پتہ نہ تھا' ان کو اسلامی جماعت میں ایک مقام دے دیا۔ یہ اخوت اسلامی کا مقام تھا۔

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (۳۳ : ۵) "اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور رفیق ہیں"۔ اخوت فی الدین کا تعلق ایک اخلاقی اور روحانی تعلق ہے اور اس پر کوئی قانونی حقوق و فرائض مرتب نہیں کیے گئے۔ مثلاً وراثت کی کفالت اور ادائیگی دے کر' جبکہ متبنیٰ بنانے پر یہ قانونی حقوق و فرائض مرتب ہوتے تھے۔ یہ اس لیے کہ ان لوگوں کا بھی اسلامی جماعت میں کوئی نہ کوئی مقام اور رابطہ ہونا چاہئے۔

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ (۳۳ : ۵) "اگر تمہیں ان کے آباؤ اجداد معلوم نہ ہوں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دور جاہلیت کے معاشرے میں نسب کے اعتبار سے بہت بڑا انتشار تھا۔ اس کے نتیجے میں جنسی تعلقات کے معاملے میں بھی انتشار تھا۔ اس انتشار سے بچنے کے لیے اسلام نے خاندانی نظام کو از سر نو مرتب کیا۔ یوں خاندانی نظام مستحکم بنیادوں پر استوار ہو گیا۔

انساب کو اپنی حقیقت کی طرف واپس کر دینے کے بعد اب یہ کہا جاتا ہی کہ اگر کسی کو اپنا نسب صحیح معلوم نہ ہو اور وہ نسب کے سلسلے میں کوئی غلط بات کہہ دے تو اس کا کوئی قصور نہ ہو گا۔

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ (۳۳ : ۵)

"نادانستہ جو بات تم کہو اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے کہ تم دل سے ارادہ کرو۔ یہ اللہ کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ اللہ کسی پر کوئی ایسا حکم عائد نہیں کرتا جس کے بجالانے کی ان میں طاقت نہ ہو۔

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳ : ۵) "اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نسب کے سلسلے میں بہت ہی تاکید اور تشدید فرمائی ہے کیونکہ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ جدید معاشرے کو ایسے خطوط پر منظم کیا جائے جس میں کوئی انتشار نہ ہو جس طرح جاہلی معاشروں میں کسی کے بارے میں کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ کون کس کی اولاد سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنا نسب چھپاتے ہیں ان کو سخت وعید کی گئی اور ان پر کفر کا اطلاق کیا گیا۔ ابن جریر نے 'یعقوب ابن ابراہیم سے 'ابن علیہ سے 'عیینہ ابن عبدالرحمٰن نے ان کے باپ سے 'ابوبکرؓ سے فرماتے ہیں 'اللہ نے فرمایا۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ (۳۳ : ۵) "منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو' یہ اللہ کے نزدیک بہت

ہی منصفانہ بات ہے۔ اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں"۔ میرے باپ نے کہا "عیینہ ابن عبدالرحمٰن کہتے ہیں"۔ "خدا کی قسم میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ اگر کسی کو یقین ہوتا کہ میرا باپ گدھا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرتا"۔ اور حدیث میں آیا ہے۔

من ادعی الی غیر ابیه وهو یعلم الا کفر "جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا اور کسی طرف منسوب کیا اور وہ جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو اس نے کفر کا ارتکاب کیا"۔ یہ تہدید اس پالیسی کے مطابق ہے جس کے ذریعے اسلام خاندان اور خاندانی روابط کو ہر شک و شبہ سے پاک رکھنا چاہتا ہے اور اسلام سلسلہ نسب کو صحیح 'سلامت ' مسلم الثبوت رکھنا چاہتا ہے تاکہ اس پر اسلامی معاشرے کی تعمیر کی جائے اور یہ معاشرہ صحیح اور پاک معاشرہ ہو۔

--- ooo---

اس کے بعد ایک دوسرے عبوری قانون کے اندر ترمیم کر دی جاتی ہے۔ حضور اکرمؐ جب وارد مدینہ ہوئے تو وہاں آپؐ نے انصار اور مہاجرین کے درمیان مواخات قائم کی۔ اسلام سے قبل جاہلیت میں اس قسم کا کوئی نظام نہ تھا۔ یہ نظام ہجرت کے بعد اسلام نے ایجاد کیا تھا کیونکہ مہاجرین اپنی دولت مکہ میں چھوڑ آئے تھے۔ یہاں تہی دست وارد ہوئے۔ اسی طرح مدینہ میں بھی ایسے لوگ تھے جن کو ان کے خاندان والوں نے گھروں سے نکال دیا تھا کیونکہ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ مواخات کو ختم کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ولایت عامہ دے دی گئی اور یہ ولایت تمام دوسری ولایتوں پر مقدم قرار دے دی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ولی عام بننے کے ساتھ ساتھ آپ کی ازدواج کو بھی روحانی مائیں قرار دے دیا گیا۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۶﴾

"بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے' اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں' مگر کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں' البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہیں۔ یہ حکم کتاب الٰہی میں لکھا ہوا ہے"۔

مہاجرین نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر مدینہ چلے آئے' اللہ کی طرف بھاگ نکلے۔ صرف دین لے کر بھاگ گئے۔ انہوں نے اپنے عقیدہ کو اپنی برادری کے تعلقات' اپنے مال کے ذخائر' اپنے اسباب حیات' بچپن کی یادوں' یاروں اور دوستوں کی محفلوں پر ترجیح دے دی۔ یہ لوگ صرف اپنا عقیدہ بچا کر نکل آئے اور

اس کے سوا سب کچھ چھوڑ چھاڑ دیا۔اس انداز پر ہجرت کر کے انہوں نے وہ تمام چیزیں چھوڑ دیں جو ہر انسان کے لیے عزیز ہوتی ہیں۔اہل و عیال' بیٹے بیٹیاں اور دوسرے رشتہ دار۔یہ ایک زندہ مثال تھی اور یہ اس کرۂ ارض پر واقع ہوئی کہ لوگوں نے صرف عقائد کی خاطر سب کو چھوڑ دیا۔ان کے دلوں پر عقیدہ چھایا ہوا تھا۔چنانچہ ان کے دل میں اس عقیدے اور نظریہ کے سوا کوئی چیز باقی ہی نہ رہی۔ان کی شخصیت مجتمع ہوگئی۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِي جَوْفِهِ (۳۳ : ۴) "اللہ نے کسی انسان کے دھڑ میں دو دل نہیں بنائے"۔اسی طرح مدینہ میں بھی ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی۔بعض خاندانوں کے افراد اسلام میں داخل ہوگئے اور دوسرے لوگ شرک کرتے رہے۔دونوں کے درمیان تعلقات کٹ گئے۔غرض خاندانی روابط کے اندر ایک بھونچال سا آگیا اور اجتماعی نظام بھی درہم برہم ہوگیا۔یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اسلامی معاشرہ نوزائیدہ تھا۔اور اسلامی مملکت ابھی مستحکم نہ تھی۔یہ دراصل ابھی تک ایک مجوزہ نظام ہی تھا جس کا زیادہ حصہ تصورات ہی میں تھا۔ابھی تک اس کے مستحکم ادارے تشکیل نہ پائے تھے۔

غرض مدینہ میں ایک نظریاتی طوفان اٹھا۔یہ اسلامی نظریہ حیات کا طوفان تھا۔اس نے تمام جذبات' تمام رسم و رواج اور تمام روابط اور تعلقات کو ختم کر دیا اور اس نئی سوسائٹی کے اندر صرف اسلامی رابطہ باقی رہ گیا۔تمام دل عقیدہ اسلامی پر جمع تھے' خاندان' نسب' قبیلہ' دوستی اور قومی تعلقات نظریاتی لہروں کے نیچے دب گئے اور یہ نئی اکائیاں جو اسلامی سوسائٹی میں جمع ہو چکی تھیں باہم مل گئیں۔ایک نئی سوسائٹی وجود میں آگئی اور اسلامی اخوت پر لوگ جمع ہوگئے۔یہ لوگ اسلامی اخوت پر کسی قانون یا حکم کے ذریعہ جمع نہ ہوگئے تھے بلکہ اسلامی نظریہ حیات نے ان کے اندر ایک زبردست اتحادی شعور پیدا کر دیا تھا۔یہ شعور اس قدر پختہ تھا کہ انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہ تھی۔غرض اس طرح ایک بہت بڑا خاندان وجود میں آگیا۔ایک جماعت وجود میں آگئی۔اس قسم کا خاندان نہ حکومت کی اساس پر قائم ہو سکتا تھا' نہ معاشرتی حالات اسے پیدا کر سکتے تھے۔بہرحال یہ اخوت اسلامی تھی' ایک اندرونی شعور تھا۔

مہاجرین انصار بھائیوں کے ہاں آکر اترے۔جنہوں نے ان کے لیے مدینہ کو خوب سنبھالا۔استقبال کیا۔ان کو اپنے دلوں اور گھروں میں اتارا اور آنکھوں پر بٹھایا۔انہوں نے ان کو اپنے مالوں میں شریک کیا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر ان کو پناہ دی۔اس قدر مقابلہ ہوا کہ کوئی مہاجر کسی انصاری کے ہاں صرف قرعہ اندازی کے ذریعے جا سکتا تھا۔کیونکہ مہاجرین کم تھے اور انصار زیادہ تھے جو پناہ دینا چاہتے تھے۔یہ پناہ نہایت اعتماد اور شوق سے دی گئی۔حقیقی خوشی اور دلی مسرت کے ساتھ دی گئی۔یہ پناہ ہر قسم کے فطری بخل اور تکبر اور نمائش سے پاک تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کی۔یہ نظام نظریاتی سوسائٹیوں کی تاریخ میں ایک بے مثال نظام تھا۔یہ برادری باقاعدہ خون کی برادری کے قائم مقام ہوگئی۔چنانچہ اس نظام کے تحت لوگ ایک دوسرے کے وارث بھی ہوئے اور اجتماعی تکافل کے دوسرے فرائض و واجبات بھی ادا کرتے رہے۔مثلاً دیت وغیرہ۔

یہ شعوری اتحاد نہایت بلند مقام تک جا پہنچا اور مسلمانوں نے بڑی سنجیدگی سے ان تعلقات کو مستحکم کیا۔اسی طرح وہ بھائی بن گئے جس طرح اسلام کے دوسرے احکام انہوں نے قبول کیے۔چنانچہ یہ سوسائٹی ایک مستحکم حکومت کی شکل اختیار

کر گئی ہے اور مواخات کے اصول باقاعدہ حکومتی ادارہ' ایک قانونی نظام اور ایک مستقل صورت حال اختیار کر گئے ۔ بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہو گئیں ۔ اس نئی جماعت اور سوسائٹی کو کسی دھچکے سے بچانا بھی ضروری تھا ۔ یہ نظام جو مستقل شکل اختیار کر رہا تھا اللہ کے منشاء کے مطابق ایک عارضی انتظام تھا ۔

جس جماعت کو بھی ایسے حالات کا سامنا ہو جیسا کہ مدینہ کی اسلامی جماعت کو تھا' اس کے لیے اس قسم کا شعور پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ اس شعور کے تحت ایک مستقل سوسائٹی اور حکومت وجود میں آ جائے ۔ ایک قانونی نظام ہو' اور مسلم ادارے ہوں تاکہ غیر معمولی حالات میں ایسی جماعت کو درپیش مسائل حل کیے جا سکیں اور اس طرح جماعتی زندگی کو ترقی دی جا سکے ۔ یہ کام اس وقت تک ہوتا رہے جب تک حالات معمول پر نہیں آ جاتے ۔

اسلام اگرچہ اس قسم کے شعور کو ہر وقت زندہ رکھنا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اس قسم کی اخوت اور ایثار کے فوارے اسلامی سوسائٹی کے اندر پھوٹتے ہی رہیں ۔ ان سے محبت اور قوت کے چشمے جاری رہیں لیکن اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ سوسائٹی کا ارتقاء طبیعی حالات کے مطابق ہو اور اجتماعیت کا نظام محض وقتی جذبات اور وقتی طوفان پر نہ ہو' جن سے غیر معمولی حالات میں کام لیا جاتا ہے بلکہ سوسائٹی کو طبیعی اور نارمل حالات پر استوار کیا جاتا رہے ۔ اور معمول کے مطابق نظام چلتا رہے ۔ حتی کہ غیر ضروری اور استثنائی حالات ختم ہوں ۔

جب غزوۂ بدر کے بعد مدینہ میں حالات قدرے معمول پر آ گئے' اسلامی حکومت مستحکم ہو گئی' اجتماعی حالات معمول کے مطابق مستحکم ہو گئے اور لوگوں کے لیے روزگار کا انتظام ہو گیا ۔ اسلامی لشکروں نے جو چھوٹی موٹی لشکر کشیاں شروع کر دی تھیں' بدر کی جنگ کے بعد ان کی وجہ سے لوگوں کے مالی حالات درست ہو گئے' خصوصاً بنی قینقاع کی جلاوطنی کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس کافی اموال جمع ہو گئے ۔ جونہی سوسائٹی کے اندر دوسرے ذرائع سے سوشل سیکورٹی کا انتظام ہو گیا قرآن کریم نے مواخات کے اس غیر معمولی نظام کو ازروئے قانون ختم کرنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں لگائی اور اجتماعی کفالت کا نظام خاندانی اور نسب کے نظام کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ۔ البتہ اسلام نے اسلامی اخوت اور مواخات کے پیچھے جو شعوری جذبہ تھا' اسے بہرحال بحال رکھا کہ اگر پھر اس قسم کے غیر معمولی حالات پیدا ہو جائیں تو دوبارہ یہ نظام قائم ہو سکے ۔ اس طرح جماعت مسلمہ کے اندر اجتماعی کفالت کا نظام اپنی حقیقی حالت کی طرف لوٹا دیا گیا' غرض وراثت' دیات میں تکافل خون اور نسب کی طرف لوٹا دیا گیا ۔ جیسا کہ اللہ کی کتاب میں پہلے ہی یہ درج تھا

وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُمْ مَعْرُوفًا كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا (۳۳ : ۶) "مگر کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں' البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کر سکتے ہیں ۔ یہ حکم کتاب الہی میں لکھا ہوا ہے"۔

فیصلہ کر دیا گیا کہ رسول اللہ ولی عام ہیں اور یہ وہ ولایت ہے جو رشتہ داری بلکہ اپنے نفوس پر بھی مقدم ہے ۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ (۳۳ : ۶) "نبی مومنین کے لیے ان کے نفوس سے بھی

مقدم ہے"۔ اور یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا کہ ازواج مطہرات روحانی مائیں ہیں۔

وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (۳۳ : ٦) "آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت عام ولایت ہے' آپ کو اختیارات حاصل تھے کہ آپ امت مسلمہ کو زندگی کا پورا نظام دے دیں۔ اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ رسول اللہ پر درود و سلام بھیجیں اور ان کے لیے کوئی راہ اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ ان امور کو اپنالیں جو ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کر لیے۔

لایومن احدکم حتیٰ یکون ھواہ تبع لما جئت بہ "تم میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشات ان احکام کے تابع نہ ہو جائیں جو میں لے کر آیا ہوں"۔

اس میں مسلمانوں کا شعور بھی شامل ہے' لہٰذا ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہونی چاہئے۔ اپنی جان سے بھی وہ بمقابلہ رسول زیادہ محبت نہیں کر سکتے۔ ان کے دلوں میں کوئی ذات یا کوئی چیز ذات رسول سے مقدم نہ ہونی چاہئے۔ حدیث صحیح میں ہے۔

والذی نفسی بیدہ لایومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من نفسہ ومالہ

وولدہ والناس اجمعین "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا' جب تک میں اس کے نزدیک اس کے نفس اس کے مال' اور اس کی اولاد بلکہ تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ صحیح حدیث میں ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ میں نے کہا حضور' آپ میرے نفس کے سوا مجھے دنیا کی تمام چیزوں سے عزیز ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں اے عمر' یہاں تک کہ میں آپ کے لیے تمہاری جان سے بھی محبوب نہ ہو جاؤں"۔ اس پر اس نے کہا رسول خدا' خدا کی قسم بے شک آپ مجھے تمام چیزوں سے محبوب ہیں یہاں تک میرے نفس سے بھی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا "اب اے عمر"۔ یہ صرف باتیں ہی نہ تھیں۔ یہ ایک بلند معیار تھا جس تک اسلامی سوسائٹی پہنچی ہوئی تھی اور اس تک کوئی دل تب ہی پہنچ سکتا ہے جب تک کسی دل کو عالم بالا کی جانب سے مساس حاصل نہ ہو جائے اور وہ اپنی نظریں افق بلند تک اونچی نہ کر دے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ذات کی کشش اور اس کی گہری محبت بھی رسول اللہؐ کے لیے ہو جاتی ہے۔ انسان اپنی ذات اور اپنی ذات کے متعلقات سے ناقابل تصور محبت کرتا ہے۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے جذبات اور احساسات پر قابو پالیا ہے۔ اپنے نفس کو رام کر لیا ہے اور حب ذات کی بلندیوں سے وہ اتر آیا ہے لیکن جب اس کی ذات اور اس کے مفادات پر زد پڑتی ہے تو وہ یوں اچھل پڑتا ہے جیسا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ وہ اس چبھن کو اس طرح محسوس کرتا ہے کہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ اگر برداشت کر بھی لے تو یہ درد اس کے شعور میں بیٹھ جاتا ہے اور اس کی گہرائیوں میں گھر کر لیتا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنی پوری زندگی بھی قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن اپنی ذاتی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ نہ وہ کوئی ایسا عیب برداشت کر سکتا ہے جو اس کی ذات وصفات کی طرف منسوب کیا جائے اگرچہ کوئی بظاہر یہ ظاہر کرے کہ

وہ ان باتوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتا' یا ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ غرض اپنی ذات پر قابو پانا اور اپنی ذات سے بھی حضور اکرمؐ اور اپنے نظریہ کو زیادہ اہمیت دینا' محض زبانی بات نہیں ہے کہ کوئی آسانی سے کہہ دے ۔ یہ ایک ایسا مقام بلند ہے جس تک عالم بالا کے مساس کے بغیر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے طویل جدوجہد' طویل مشق اور دائمی بیداری اور مخلصانہ خواہش کی ضرورت ہے جس کے ساتھ اللہ کی خاص مدد شامل حال رہے ۔ یہ ہے عظیم جہاد۔ جیسا کہ اسے رسول اللہؐ نے جہاد اکبر کہا اور یہ وہ مقام ہے کہ حضرت عمرؓ جیسی شخصیت کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تنبیہ اور تصحیح کی ضرورت پڑگئی ۔ یہ ان کے قلب صافی کی ایک چنگی تھی جس کے نتیجے میں حضرت عمرؓ اس مقام بلند تک پہنچ گئے اور ایک سیکنڈ میں ۔ ولایت عامہ میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے امت کے افراد پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ حدیث صحیح میں ہے ''جو بھی مومن ہیں میں ان کے لیے تمام لوگوں سے محبوب ہوں' دنیا اور آخرت دونوں میں' اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ (۳۳ : ٦) ''نبی مومنین کے لیے ان کے نفسوں سے بھی مقدم ہے''۔ اس لیے جس مومن نے مال چھوڑا تو یہ اس کے عصبات کو ملے گا جو بھی ہوں اور اگر اس پر قرض ہو یا کوئی نادان ہو تو وہ میرے پاس آئے' میں اس کا والی ہوں''۔ معنی یہ ہے کہ اگر مومن مرجائے اور اس کی میراث میں مال نہ ہو جس سے اس کا قرضہ ادا کر دیا جائے تو میں اس کا قرض ادا کروں گا اور اگر اس کے عیال ہوں تو میں ان کی پرورش کروں گا' اگر چھوٹے ہوں۔ اس کے علاوہ عام حالات میں' عام لوگوں کی زندگی طبعی حالات کے مطابق اپنی جدوجہد کے مطابق گزرے گی' اس کے لیے اس قسم کے غیر معمولی جوش و خروش پیدا کرنے کی ضرورت نہیں جو غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے ۔ اگرچہ نظام مواخات قانونی اعتبار سے تو ختم کر دیا گیا مگر اخلاقی دائرے میں موجود رہا۔ لہٰذا اگر کوئی دوست اپنے دوست کے لیے کوئی وصیت کرنا چاہے تو اسے ثلث مال تک وصیت کی اجازت ہے ۔

اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِکُمْ مَّعْرُوْفًا (۳۳ : ٦) ''الا یہ کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ کوئی احسان کرنا چاہو''۔

ان تمام اقدامات کو مضبوطی سے اس کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ یہ اللہ کا ارادہ اور مشیت ہے اور کَانَ ذٰلِكَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا (۳۳ : ٦) ''یہ قانون کتاب میں لکھا ہوا تھا''۔ لہٰذا دل مطمئن رہیں اور اس اصل کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں جس کی طرف تمام قوانین لوٹتے ہیں۔

یوں اب لوگوں کی معاشی زندگی اپنے قدرتی اصولوں پر استوار ہو جاتی ہے اور نہایت ہی سنجیدگی اور اطمینان سے چلتی ہے ۔ اور اس کو ایسے معیار پر نہیں رکھا گیا جو غیر معمولی حالات میں قائم کیے جا سکتے ہیں ۔ محدود جماعتوں اور محدود افراد کے اندر۔

لیکن اسلام اس فیاض سرچشمے کو بند بھی نہیں کرتا تاکہ اگر مستقبل میں اسلامی جماعت کو کسی استثنائی حالت میں ضرورت پڑے تو وہ اس جذبہ کو کام میں لائے یعنی ہنگامی حالات میں۔

اس بات کی مناسبت سے کہ یہ سب کچھ پہلے ہی کتاب میں لکھا ہوا تھا اور اللہ کی مشیت نے طے کر دیا تھا کہ وہ باقی

رہنے والا دائمی قانون بن جائے اور مسلسل طریقہ کار ہو۔ اس حوالے سے نبیوں کے ساتھ ہونے والے معاہدے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ خصوصاً اولوالعزم نبیوں سے کہ وہ اسلامی نظام کے قیام کی ذمہ داری قبول کریں اور اس تحریک پر جمے رہیں لوگوں کے اندر تبلیغ و تحریک کا کام جاری رکھیں اور ان اقوام میں اس دعوت کو جاری رکھیں جن کی طرف ان کو بھیجا گیا ہے تاکہ یہ بات لوگوں کے خلاف حجت ہو کہ ان تک پیغام پہنچا تھا اور وہ اپنی ضلالت و ہدایات کے ذمہ دار ہیں کفر اور ایمان کے ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ پیغمبروں کی تبلیغ کے بعد تو حجت تمام ہو جاتی ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ ۸

اور (اے نبیؐ) یاد رکھو اس عہد و پیمان کو جو ہم نے سب پیغمبروں سے لیا ہے، تم سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔ سب سے ہم پختہ عہد لے چکے ہیں۔ تاکہ سچے لوگوں سے (ان کا رب) ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے، اور کافروں کے لیے تو اس نے دردناک عذاب مہیا کر ہی رکھا ہے"۔

یہ وعدہ نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک مسلسل لیا گیا۔ یہ واحد میثاق والا نظام ہے اور یہ واحد امانت ہے۔ ہر نبی اپنے ماقبل سے لیتا رہا اور آنے والے کو دیتا رہا۔

ابتداء میں تمام نبیوں کے بارے میں کہا گیا کہ ہم نے ان سے میثاق لیا اور اس کے بعد قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی طور پر تھا (وَمِنْكَ) کیونکہ آپ خاتم النبین ہیں اور آپ کی دعوت عالمی ہے۔ اس کے بعد اولوالعزم رسولوں کے نام گنوائے، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا ذکر ہوا۔

اصحاب میثاق کے ذکر کے بعد اب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عہد تھا کیا اور کیسا تھا تو وہ بہت پختہ عہد تھا، بہت بھاری عہد تھا۔

مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۳۳ : ۷) پختہ عہد۔ اس میں لفظ میثاق کے لغوی معنے کی طرف اشارہ ہے۔ لغت میں میثاق بٹی ہوئی رسی کو کہتے ہیں۔ استعارہ کے طور پر عہد کے لیے استعمال کیا گیا۔ اس لفظ کے استعمال سے ایک معنوی مفہوم کو مجسم کر کے دکھانا مطلوب ہے تاکہ انسانی شعور اچھی طرح سمجھ لے کہ یہ کوئی پختہ اور اہم عہد تھا جو اس قدر بڑے بڑے پیغمبروں سے لیا گیا کہ وہ وحی وصول کریں، اس کی تبلیغ کریں اور اس کے مطابق اسلامی نظام قائم کریں اور نہایت امانت اور استقامت کے ساتھ، اس کی ذمہ داریاں برداشت کریں۔

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ (۳۳ : ۸) "تاکہ اللہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں

سوال کرے"۔ اور صادق اہل ایمان ہیں کیونکہ انہوں نے سچ کہا اور سچے عقیدے کو قبول کیا۔ ان کے سوا تمام دوسرے لوگ جھوٹے ہیں کیونکہ ان کے عقائد باطل ہیں اور ان کی باتیں باطل ہیں۔ لہذا تعبیر کا خاص مفہوم ہے۔ سچوں سے سوال ایسا ہی ہو گا جس طرح ایک لائق شاگرد سے استاد لوگوں کے سامنے مجلس یا تقریب میں یہ پوچھتا ہے کہ تم نے کتنے نمبر لیے اور کیسے جوابات دیئے اور یوں کامیابی حاصل کی۔ یہ سوال ان کی عزت افزائی کے لیے اعلانیہ تمام لوگوں کے سامنے ہو گا تاکہ تمام سننے والے بھی ان کی تعریف کریں۔ اسی طرح یوم الحشر میں اللہ صادقین سے سوال ان کی تکریم کے لیے کرے گا۔

اب دوسرے لوگ جنہوں نے باطل نظریات اپنائے اور جنہوں نے جھوٹے بول بولے حالانکہ ان کے سامنے اس کائنات کا بہت بڑا مسئلہ پیش کیا گیا تھا' جس میں یا انہوں نے سچا کلمہ کہنا تھا یا جھوٹا' ان سے سوال ہو گا اور ان کے لیے سزا بھی حاضر ہو گی اور وہ تیار کھڑی ہو گی۔

وَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا (۳۳:۸) "اور کافروں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

---ooo---

درس نمبر ۱۸۹ ایک نظر میں

جنگاہ حیات اور حادثات کے میدان کارزار میں اسلامی شخصیت کی تشکیل ہو رہی تھی ۔ ہر نئے دن کے طلوع ہوتے کے بعد اور ہر نئے حادثے کے بعد یہ شخصیت واضح ہوتی جاتی تھی ۔ اس کے خدوخال نکھر کر سامنے آتے تھے ۔ جماعت مسلمہ ان شخصیات سے تشکیل پا رہی تھی جن کی خاص صلاحیتیں تھیں ۔ ان کی خاص اقدار حیات تھیں اور تمام دوسری سوسائٹیوں سے اس کا رنگ ڈھنگ بالکل مختلف تھا ۔

اس جماعت کے خلاف روز کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آتا اور یہ واقعات جماعت کے لیے بڑا فتنہ بن جاتے اور یہ فتنہ اس طرح ہوتا تھا جس طرح سونے کا "فتنہ" ہوتا ہے ۔ اس فتنے سے اصلی جوہر اور کھوٹ علیحدہ ہو جاتے تھے ' انسانوں کی حقیقت اور ان کا اصل جوہر سامنے آجاتا تھا ۔ جھاگ دور ہو جاتی تھی اور خالص سونا جدا ہو جاتا تھا ۔ یوں اسلامی سوسائٹی سے ایسی قدریں ختم ہو جاتی تھیں جن میں ملاوٹ ہوتی تھی ۔

ان ابتلاؤں میں قرآن کریم نازل ہوتا تھا یا واقعات و حادثات کے بعد ان پر تبصرہ ہوتا تھا ۔ اس تبصرے میں واقعات بتائے جاتے ' ان پر روشنی ڈالی جاتی اور ان کے نشیب و فراز بتائے جاتے ۔ یوں ہر ایک کا موقف سامنے آتا ۔ ضمیر و شعور اور نیت و ارادے کی اصلاح ہوتی اور ان واقعات کی روشنی میں لوگوں کو ہدایات دی جائیں اور وہ ہدایات اچھی طرح ان کی سمجھ میں آجاتیں لوگ ان ہدایات سے اچھی طرح متاثر ہوتے اور اپنی اصلاح کرتے ۔ یوں اسلامی جماعت کی تربیت ہر دن کے بعد ہوتی رہتی اور ہر حادثے کے بعد اسے ہدایات ملتی رہتیں ۔ اسلامی نظام حیات کے اہداف کے مطابق اس جماعت مسلمہ کی شخصیت بنتی اور وہ ان تبصروں سے تاثرات لیتے ۔

یوں نہیں ہوا کہ تمام احکام اور ہدایات ایک ہی بار نازل کر کے مسلمانوں کے سامنے رکھ دیئے گئے ہوں اور پھر یہ کہا گیا ہو کہ جاؤ ان پر عمل کرو ۔ بلکہ یہ ہدایات اور یہ قوانین واقعات کے بعد نازل ہوتے رہے ' آزمائشیں آتیں ' فتنے آتے اور واقعات پیش آتے ' ادھر سے وحی آجاتی کیونکہ اللہ خالق کریم کو یہ علم تھا کہ انسانی اخلاق کو صرف تدریج ہی کے ساتھ اچھی طرح نئے سانچے میں ڈھالا اور اچھی طرح پختہ کیا جا سکتا ہے ۔ انسانی اخلاق کی نوک پلک صرف آزمائشوں اور واقعات و حادثات کی شکل میں درست کی جا سکتی ہے ۔ یعنی واقعاتی تجربات کی صورت میں ۔ کیونکہ عملی تجربات کے نتیجے میں بات دلوں کی تہ تک اتر جاتی ہے اور اعصاب بھی اس کے مطابق حرکت کرنے لگتے ہیں ۔ یہ اعصاب پھر اس طرح جدید ردعمل ظاہر کرتے ہیں جس طرح معرکہ کارزار میں یا واقعات اور حادثات میں انسان کا فطری ردعمل ہوتا ہے ۔ ایسے واقعات میں جب قرآن نازل ہوتا تو وہ بتا دیتا کہ یہ واقعہ کیا ہے ۔ اس کے پیچھے کیا عوامل ہیں اور اس میں ایک مسلمان کا اسلامی ردعمل کیا ہونا چاہئے ۔ اس طرح اسلامی شخصیت آزمائشوں کی بھٹی سے صاف و ستھری ہو کر نکل آتی ' نکھر آتی ' آزمائش کی تپش اس کے اخلاقی جسم سے ہر قسم کا کھوٹ نکال کر رکھ دیتی اور اب اسلام جس سانچے میں چاہتا ' ان شخصیات کو ڈھال لیتا ۔

یہ ایک عجیب دور تھا جو مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں گزارا۔ اس میں آسمانوں و زمین کے قلابے ملے ہوئے تھے۔ آسمان سے اہل زمین کا براہ راست رابطہ تھا۔ تمام واقعات اور تمام مکالمات میں آسمان سے ہدایت آ جاتی۔ ہر مسلمان رات اور دن یوں زندگی بسر کر رہا تھا کہ اللہ دیکھ رہا ہے سن رہا ہے۔ ابھی کوئی ہدایت یا تبصرہ نہ آ جائے۔ اس کا کوئی کلمہ 'اس کی کوئی حرکت بلکہ اس کا کوئی ارادہ نزول وحی کا سبب نہ بن جائے۔ لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہو جائے' رسول اللہ کے پاس سے اس کے بارے میں کوئی تبصرہ نہ آ جائے۔ گویا ہر مسلمان محسوس کرتا تھا کہ وہ رب تعالیٰ کے ساتھ براہ راست منسلک ہے۔ اگر اسے کوئی معاملہ درپیش ہوتا یا کوئی مشکل درپیش ہوتی تو وہ انتظار کرتا کہ اس کے بارے میں کوئی فتویٰ 'کوئی ہدایت' کوئی فیصلہ آسمان سے آ جائے اور اللہ بتا دے بذات خود 'اے فلاں تم نے یہ کہا' تم نے یوں کہا' تم نے یوں سوچا۔ یہ ظاہر کیا اور یہ چھپایا' یوں کرو' یوں نہ کرو' اور ایسا طرز عمل اختیار نہ کرو۔ یہ ایک عجیب دور تھا کہ اللہ کا ایک متعین حکم کسی متعین شخص کے بارے میں آ پہنچتا۔ اور یہ حکم پھر اس کے لیے بھی ہوتا اور تمام اہل زمین کے لیے بھی ہوتا۔ زمین کے ذرے ذرے کے لیے ہوتا۔ پوری زمین کے لیے ہی ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عجیب دور تھا۔ آج جب انسان اس کے بارے میں سوچتا ہے اس کے واقعات اور حادثات کو دہراتا ہے' پڑھتا ہے' پڑھاتا ہے تو وہ اچھی طرح ایک نقشہ ذہن میں لا سکتا ہے' ایک منظر دیکھ سکتا ہے کہ کس قدر عجیب دور تھا یہ۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تربیت صرف اس شعور کے ذریعہ ہی نہیں کی کہ ان کی شخصیت کو پختہ کر دیا جائے بلکہ ان کو عملی تجربوں سے گزارا گیا۔ ان کو آزمائشوں میں مبتلا کیا گیا جس میں ان کا نقصان بھی ہوا لیکن فائدے بہت ہوئے اور یہ سب امور اللہ کی گہری حکمتوں کے مطابق سرانجام پاتے' کیونکہ اللہ علیم و خبیر ہے اور وہ اپنی مخلوق کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔

یہ حکمت کیا تھی؟ ہمیں اس پر ذرا طویل غور و فکر کرنا چاہیے تاکہ ہم اسے معلوم کر لیں' پھر اس پر تدبر کریں۔ اور پھر ہم زندگی کے واقعات' آزمائشوں پر اس کی روشنی میں غور کریں۔

--- ooo---

اس سبق میں تحریک اسلامی کو پیش آنے والے ایک بڑے واقعہ کی تشریح کی گئی ہے۔ اور اسلامی تاریخ کے اس واقعہ میں جماعت مسلمہ کے لیے ایک بڑی آزمائش تھی اور یہ وقت امت مسلمہ پر بہت برا وقت تھا۔ بڑی مشکل دور سے تحریک گزر رہی تھی۔ یعنی غزوۂ احزاب کا دور۔ یہ جنگ ہجرت کے پانچویں یا چوتھے سال میں پیش آئی۔ یہ اس نئی اٹھنے والی تحریک کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔ تحریک اسلامی کی تمام اقدار اور تمام نظریات داؤ پر تھے۔ ان آیات پر غور کرنے سے' غزوۂ احزاب کے واقعہ کے پیش کرنے سے' اس کے اسلوب بیان سے' بعض واقعات پر تبصرے سے' بعض لوگوں کی حرکتوں سے' بعض افراد کی سوچ سے' اور بعض لوگوں کے خدشات سے اور پھر اس جنگ میں سامنے آنے والی اقدار سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے ذریعہ امت مسلمہ کی تربیت کس خوش اسلوبی سے فرما رہے تھے۔

جنگ احزاب جیسے اہم واقعہ پر قرآن کریم کس انداز سے تبصرے کرتا ہے اور امت کو کس انداز سے ہدایات دیتا ہے۔ قرآنی نصوص کی تشریح سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ اس واقعہ کی پوری تفصیل ذرا اختصار سے کتب سیرۃ سے نقل کر دی

جائے۔اس سے ہم تقابلی مطالعہ کر سکیں گے کہ انسان واقعات کو کس طرح بیان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے تبصرہ کیسے ہوتا ہے۔

محمد ابن اسحاق نے اپنی سند کے ساتھ ایک جماعت سے نقل کیا ہے.... جنگ خندق کے واقعات میں یہ ہے کہ کچھ یہودی جن میں سے سلام ابن ابو الحقیق نضری' یحیی ابن اخطب نضری' کنانہ ابن ابو الحقیق نضری' ہودہ ابن قیس وائلی اور ابو عمار وائلی تھے اور ان کے ساتھ کچھ لوگ بنو نضیر' کچھ لوگ بنی وائل کے بھی تھے۔یہی لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ کے خلاف لشکر جمع کیے۔یہ سب سے پہلے گھروں سے نکلے' قریش سے ملے اور ان کو دعوت دی کہ رسول خدا کے خلاف جنگ کریں اور انہوں نے کہا کہ ہم تمہارا ساتھ اس وقت تک دیں گے جب تک اس کو بنیاد سے نہ اکھاڑ دیں۔قریش نے کہا' اے ملت یہود' تم لوگ پہلی کتاب کے حاملین ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کیا اختلاف ہے' تم لوگ بتاؤ کہ اس کا دین اچھا ہے یا ہمارا۔تو انہوں نے کہا اس کے دین سے تمہارا دین سچا ہے اور اس کے مقابلے میں تم زیادہ برحق ہو۔یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ آیات اتریں :

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا (٤ : ٥١) "کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں"۔یہاں سے لے کر آیت

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا (٥٤) فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا (٥٥) (٤ : ٥٤ – ٥٥) "پھر کیا یہ دوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا اگر یہ بات ہے تو انہیں معلوم ہو کہ ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخش دیا۔مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لائے اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا اور منہ موڑنے والوں کے لیے تو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے"۔

جب انہوں نے قریش کو یہ فتویٰ دیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور جوش میں آگئے اور رسول اللہ کے خلاف لڑنے کی حامی بھر لی۔یہ لوگ اب قریش کو چھوڑ کر غطفان کے پاس گئے' جو قیس غیلان کی نسل سے ہیں۔انہوں نے ان کو بھی دعوت دی کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لڑیں انہوں نے ان کو بتایا کہ یہ خود بھی ساتھ دیں گے اور قریش بھی ساتھ دیں گے۔لہٰذا تم لوگ قریش کے ساتھ میٹنگ کرو۔

چنانچہ قریش کا یہ لشکر ابو سفیان ابن حرب کی سربراہی میں' غطفان اپنے سردار عیینہ ابن حصن بن فزاری کے ساتھ' اور حارث ابن عوف بنی مرہ کے ساتھ اور مسعر ابن امیہ اپنے متبعین بنی اشجع کے ساتھ نکلے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لشکرکشی کی اطلاعات ملیں تو آپ ؐ نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودنا شروع کر دی ۔ خندق کھودنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کام کیا اور مسلمانوں نے بھی کام کیا ۔ آپ نے بھی جانفشانی سے کام کیا اور مسلمانوں نے بھی سخت جانفشانی سے کام کیا ۔ اس کام میں رسول اللہ ؐ اور مسلمانوں کے مقابلے میں بعض منافقین نے نہایت سست روی سے کام لیا ۔ وہ بہت چھوٹے موٹے کاموں میں لگ جاتے اور بغیر اذن رسول ؐ کے کھسک جاتے ۔ وہ گھروں کو چلے جاتے اور رسول اللہ کو علم بھی نہ ہوتا ۔ اور مسلمانوں کی روش یہ ہوتی کہ اگر کسی کا کوئی ضروری کام پیش آتا تو وہ رسول اللہ ؐ سے اجازت لے کر چلا جاتا اور کام کر کے جلدی سے واپس آجاتا ۔ اور نہایت ہی ذوق و شوق سے کام کرتا ۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۲۴ : ۶۲) "مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ؐ کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقعہ پر رسول کے ساتھ ہوں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں ۔ اے نبی جو لوگ تجھ سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسول کے ماننے والے ہیں ۔ پس وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں تو جسے چاہو ' اجازت دے دیا کرو ۔ اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو ۔ اللہ غفور و رحیم ہے " ۔ اس کے بعد اللہ نے ان لوگوں کے بارے میں کہا جو بغیر اجازت کے کھسک جاتے تھے اور کام چوری کرتے تھے ۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۲۴ : ۶۳) "مسلمانو! اپنے درمیان رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو ۔ اللہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی آڑ لے کر چپکے سے کھسک جاتے ہیں ۔ رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ فتنے میں گرفتار نہ ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آجائے " ۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خندق سے فارغ ہوئے تو قریش حبشیوں ' کنانہ اور تہامہ کا ایک بڑا لشکر جرار لے کر پہنچ گئے ۔ یہ مقام رومہ کے مجمع اسیال پر اترے اور غطفان اور ان کے تابع دوسرے کچھ قبائل احد کے پاس ذنب نقمی پر اترے ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان تین ہزار کی تعداد میں تھے ۔ انہوں نے اپنی پشت کو سلع کی طرف

تھی ۔ یہ لشکر یہاں اترا اور احزاب اور مسلمانوں کے لشکر کے درمیان خندق تھی ۔ بچوں اور عورتوں کو حکم دیا کہ وہ قلعہ بند ہو جائیں ۔

--- ○○○---

اللہ کا دشمن حیی ابن اخطب نضری 'کعب ابن اسد قرظی سے ملا ۔ یہ صاحب تھے جنہوں نے بنی قریظہ کی طرف سے عہد کیا تھا اس نے اپنی قوم کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دہانی کرائی تھی اور ان پر رسول اللہ ؐ سے عہد و پیمان کیا تھا ۔ حیی کعب ابن اسد سے چپکا رہا اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف آمادہ کرتا رہا ۔ اسے دھوکہ دینے کے لیے بار بار چکر لگاتا رہا ۔ یہاں تک کہ اس نے اس سے بھی وعدہ لے لیا کہ اگر قریش اور غطفان واپس ہو گئے اور محمد پر حملہ آور نہ ہوئے تو میں تمہارے ساتھ تمہارے قلعہ میں رہوں گا تاکہ مجھے بھی وہ بات نہ پہنچ جائے جو تجھے پہنچے ۔ ان یقین دہانیوں پر کعب ابن اسد نے حضور اکرم ؐ سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دیا اور اس کے اور رسول اللہ ؐ کے درمیان جو عہد تھا 'اس سے براءت کا اظہار کر دیا ۔

اس پر مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا اور خوف و ہراس پھیل گیا ۔ اب اوپر سے بھی دشمن حملہ آور ہو گیا اور نیچے سے بھی ۔ مسلمانوں نے ہر قسم کے خیالات دل میں دوڑانے شروع کر دیئے ۔ بعض منافقین کا نفاق بھی ظاہر ہونا شروع ہو گیا ۔ ایک شخص معتب ابن قسیر 'بنی عمر ابن عوف قبیلے کے فرد سے یہ کہتے سنا گیا "محمد ؐ تو ہم سے یہ وعدے کرتے تھے کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے کھائیں گے اور آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم 'میں سے کوئی بے خوف ہو کر قضائے حاجت کے لیے نہیں جا سکتا" ۔ اور قبیلہ بنی حارثہ کے ایک شخص اوس ابن قیظی کہنے لگا "حضور ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور یہ بات انہوں نے اپنی قوم کے سامنے کہی تو آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم لوگ اپنے گھروں کو چلے جائیں کیونکہ ہمارے گھر مدینہ سے باہر ہیں" ۔

رسول اللہ ؐ بھی ڈٹے رہے اور مشرکین بھی تقریباً ایک ماہ تک پڑے رہے ۔ جنگ صرف تیروں اور محاصرے تک محدود رہی ۔ جب لوگوں کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا تو حضور ؐ نے ایک وفد عیینہ ابن حصن اور حارث ابن عوف کی طرف بھیجا ۔ یہ دونوں غطفان کے لیڈر تھے ۔ ان کو یہ پیش کش کی کہ ہم مدینہ کی کھجوروں کا ۳/۱ حصہ ادا کریں گے اس شرط پر کہ تم لوگ اپنے آدمیوں کو لے کر واپس ہو جاؤ ۔ صلح کے مذاکرات ہوئے 'ایک معاہدے کا مسودہ بھی تیار ہو گیا ۔ شہادت اور دستخط ابھی نہ ہوئے تھے جب حضور ؐ نے دستخط کرنا چاہے تو آپ نے سعد ابن معاذ رئیس اوس اور سعد ابن عبادہ رئیس خزرج کو بلایا اور ان کے سامنے اس معاہدے کا تذکرہ کیا اور مشورہ طلب کیا ۔ انہوں نے کہا حضور اکرم ؐ اگر آپ اس معاہدے کو پسند کرتے ہیں تو آپ کی مرضی ہے 'دستخط کر دیں ۔ یا اگر اللہ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر ۔ اور اگر یہ بات آپ ہمارے مفاد میں کرنا چاہتے ہیں تو جائیں ۔ حضور ؐ نے فرمایا میں یہ صرف تمہاری خاطر کرنا چاہتا ہوں ۔ میں تو یہ اس لیے کر رہا ہوں کہ تمام عرب ایک ہی کمان سے تمہارے خلاف تیر اندازی کر رہے ہیں اور ہر طرف سے تمہارے اوپر ٹوٹ پڑے ہیں ۔ تو میں نے سوچا کہ ان کی قوت میں کچھ کمی کر دوں" ۔ اس پر سعد ابن معاذ نے فرمایا ہم اور یہ لوگ سب شرک پر تھے ۔ اور بتوں کی بندگی کرتے تھے ۔ نہ اللہ کی بندگی کرتے تھے اور نہ اللہ کو پہچانتے تھے ۔ یہ لوگ ہم سے کھجور کا ایک دانہ بھی نہ لے سکتے تھے الا یہ کہ بیعہ خریدتے یا بطور مہمان نوازی کے ہم ان کو کھلاتے ۔ اب جبکہ اللہ نے ہمیں

اسلام کے ذریعہ عزت بخشی ہے اور ہمیں ہدایت دی ہے اور آپ کے ذریعہ ہمیں اعزاز دیا ہے تو کیا اب ہم ان کو اپنا دل دے دیں ۔ ہمیں اس رعایت کی ضرورت نہیں ہے ۔ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ تلوار کرے گی ۔ تو حضورؐ نے فرمایا جو آپ کی مرضی ہو ۔ سعد ابن معاذ نے وہ مسودہ لیا اور اس کے اندر جو کچھ لکھا تھا' مٹا دیا ۔ اس نے کہا وہ ہمارے خلاف جو کچھ کرنا چاہیں کریں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان نہایت خوف اور شدت کی حالت میں رہے ۔ کیونکہ دشمن نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا اور اس کی قوت زیادہ تھی ۔ یہودیوں نے ان کے ساتھ معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ خیبر کی کھجوریں دیں گے ۔ اگر وہ اس موقعہ پر ان کی امداد کریں (تبریزی) ۔ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ میں حضورؐ کے ساتھ کئی شدت اور خوف کے مقامات پر رہی ہوں ۔ غزوہ مریسیع' خیبر' حدیبیہ' فتح مکہ' حنین ۔ ان میں سے کسی جگہ حضورؐ نے تھکاوٹ محسوس نہیں کی ۔ نہ زیادہ خائف ہوئے' جس قدر تھکاوٹ اور خوف خندق میں تھا ۔ بنی قریظہ عورتوں اور بچوں کے قریب تھے ۔ مدینہ میں ساری رات پہرہ ہوتا تھا ۔ ہم مسلمانوں کا نعرۂ تکبیر صبح تک سنتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے خود بخود ان کو واپس کر دیا ۔

--- ooo---

ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ ایک شخص نعیم ابن مسعود ابن عامر غطفانی رسول اللہؐ کے پاس آیا ۔ اس نے کہا رسول خداؐ میں مسلمان ہو چکا ہوں لیکن میری قوم کو میرے اسلام کا پتہ نہیں ۔ آپ جو خدمت میرے سپرد کر دیں' اس وقت کر سکتا ہوں ۔ حضورؐ نے فرمایا "ہم میں آپ واحد آدمی ہیں تو جس طرح ہو سکے' لوگوں کو ہمارے خلاف جنگ کرنے سے روک لیں کیونکہ جنگ ایک قسم کی چال ہوتی ہے ۔ اس نے ایک ایسی کارروائی کی جس کی وجہ سے ان احزاب اور بنو قریظہ کے درمیان اعتماد ختم ہو گیا ۔ اس کی تفصیلات کتب سیرت میں مفصلاً موجود ہیں ۔ اللہ نے احزاب کے اندر بھی بددلی پیدا کر دی اور ایک ایسا طوفان باد و باراں بھیجا کہ سردیوں کی شدید ٹھنڈی رات میں ان کے خیمے اکھڑ گئے' ان کی ہانڈیاں الٹ گئیں اور چولہے بجھ گئے --- جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کے اختلافات پہنچے' اور ان کی اجتماعیت ختم ہو گئی تو اس آخری رات کے حالات معلوم کرنے کے لیے حضورؐ نے حضرت حذیفہ ابن الیمان کو بھیجا ۔

محمد ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ میرے سامنے زید ابن زیاد ابن محمد ابن کعب قرظی نے روایت کی ہے "ایک کوفی باشندے نے حضرت حذیفہ ابن الیمان سے کہا : ابو عبداللہ ! تم نے رسول اللہ کو دیکھا ہے اور آپ کے ساتھ صحبت کی ہے ۔ تو اس نے کہا ہاں بھتیجے' میں نے دیکھا اور صحبت کی ۔ تو پھر تم کیا کرتے تھے ؟ خدا کی قسم ہم بہت جدوجہد کرتے تھے تو اس شخص نے کہا' خدا کی قسم اگر ہم رسول اللہؐ کو پاتے تو اسے ہرگز زمین پر چلنے نہ دیتے ۔ اور اپنی گردنوں پر انہیں اٹھائے رکھتے ۔ اس پر حضرت حذیفہ نے فرمایا : بھتیجے ہم نے حضورؐ کے ساتھ جنگ خندق میں حصہ لیا ۔ یوں ہوا کہ حضورؐ نے رات کے ایک حصے میں نماز پڑھی اور پھر ہماری جانب متوجہ ہوئے ۔ کون ہے جو اٹھے اور جا کر معلوم کرے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں ۔ پھر وہ واپس آ جائے ۔ اس کے لیے رسول اللہؐ نے واپسی کی شرط لگائی ۔ میں اللہ سے سوال کروں گا کہ وہ جنت میں میرا ساتھی ہو" ۔ اس قدر شدید خوف تھا کہ کوئی نہ اٹھا ۔ اس قدر شدید بھوک تھی کہ کسی میں تاب نہ تھی اور سردی بھی شدید تھی ۔ جب کوئی نہ اٹھا تو مجھے رسول اللہؐ نے پکارا ۔ جب حضورؐ نے نام لیا تو میرے لیے اب کوئی چارۂ کار نہ تھا ۔ فرمایا "حذیفہ جاؤ' ان لوگوں میں داخل ہو جاؤ' دیکھو وہ کیا کرتے ہیں اور کوئی بات نہ کرو جب تک

ہمارے پاس نہ آجاؤ"۔ حذیفہ کہتے ہیں میں گیا۔ لشکر کے اندر داخل ہوگیا۔ طوفان اور اللہ کے لشکر ان کے ساتھ وہ کچھ کر رہے تھے جو کر رہے تھے۔ ہانڈیاں اپنی جگہ ٹھہر نہ سکتی تھیں۔ آگ سلگ نہ سکتی تھی۔ ابو سفیان کھڑا ہوا' حکم دیا کہ ہر شخص اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے بارے میں تسلی کرے۔ میں نے پہلے ہی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھ لیا کون ہو؟ تو اس نے بتایا فلاں ابن فلاں۔ اس کے بعد ابو سفیان نے کہا اہل قریش اب یہاں مزید نہیں رہ سکتے۔ گھوڑے اور اونٹ ہلاک ہوگئے۔ بنو قریظہ نے ہمارے ساتھ وعدہ خلافی کر دی اور ان کی جانب سے ہمیں وہ جواب ملا جسے ہم ناپسند کرتے ہیں' طوفان اس قدر ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔ ہنڈیا اپنی جگہ قرار نہیں پکڑتی' آگ نہیں جلتی' خیمے اکھڑ گئے۔ لہٰذا کوچ کرو میں تو یہ گیا۔ یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ اپنے اونٹ کو اٹھایا۔ وہ تین ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا اور اس کا عقال اس نے کھڑے کھڑے کھولا۔ اگر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم نہ دیا ہوتا کہ کوئی بات نہ کرو جب تک میرے پاس نہ آجاؤ تو میں ایک ہی تیر مار کر ابو سفیان کا کام تمام کر دیتا۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ میں جب واپس پہنچا تو دیکھا کہ حضورؐ کھڑے ہیں اور ایک ایسی چادر میں نماز پڑھ رہے ہیں جو لمبی تھی اور منقش تھی۔ یہ آپؐ کی ازواج میں سے کسی کی تھی۔ جب آپؐ نے مجھے دیکھا تو مجھے اپنے پاؤں کے نیچے چادر میں داخل کر لیا اور چادر کا ایک حصہ مجھ پر ڈال دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے رکوع کیا اور سجدہ کیا اور میں چادر ہی میں لیٹا رہا۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو میں نے آپؐ کو پوری اطلاع دی۔ اب غطفان نے جب سنا کہ قریش نے یہ کام کیا ہے تو وہ بھی اپنے علاقوں کی طرف واپس ہوگئے۔

قرآن کے ان نصوص میں اشخاص کے نام نہیں لیے گئے۔ بلکہ لوگوں کے نمونے دیئے گئے ہیں اور واقعات کی تفصیلات اور جزئیات بھی قرآن نے چھوڑ دی ہیں۔ قرآن نے وہ اقدار' وہ کردار اور وہ طرز عمل یہاں ریکارڈ کیے ہیں جو نمونہ ہیں اور ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ وہ کردار جو کسی واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں' جو کسی شخص کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جو حالات کے مٹ جانے سے مٹتے نہیں۔ وہ کردار اور وہ قدریں یہاں درج کر دی ہیں جو آیندہ کی نسلوں کے لیے نمونہ عبرت ہیں اور ہر گروہ کے لیے معیار مطلوب ہیں۔ قرآن کریم تمام واقعات اور حادثات کو اللہ کی تدبیر اور تقدیر کے ساتھ منسلک کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ دست قدرت کس کس مرحلے پر مسلمانوں کا معاون رہا۔ اس معرکے کے ہر مرحلے میں تدبیر الٰہی نے اپنا کام کیا اور قرآن نے ہر مرحلے کا تبصرہ پیش کیا۔

قرآن کریم نے یہ قصہ ان لوگوں کے سامنے دہرایا۔ جو اس کے اندر موجود تھے جو اس کے کردار تھے۔ لیکن قرآن کریم وہ اسباب بھی ان کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے جن کا انہیں علم نہ تھا۔ ان واقعات و حادثات کے وہ پہلو جو نظروں سے اوجھل تھے حالانکہ وہ اس کہانی کے کردار تھے۔ قرآن کریم نفس انسانی کے نشیب و فراز کو بھی کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ لوگوں کے ضمیر کے میلانات بتاتا ہے اور بتاتا ہے کہ لوگوں کے دلوں کے اندر کیا کیا خلجانات پیدا ہوگئے تھے۔

ان باتوں کے علاوہ انداز بیان کی خوبصورتی' اس کا رعب اور شوکت کلام' بات کی قوت اور حرارت اور منافقین کے بارے میں مزاحیہ انداز' اور ان کے نفاق کے پیچ و تاب اور مسلمانوں کی شجاعت اور ایمان' صبر اور اللہ پر پورا بھروسہ' غرض یہ سب باتیں قرآن نہایت خوبصورتی کے ساتھ قلم بند کرتا ہے۔

یہ نصوص قرآنی دراصل ہر پڑھنے والے کو عمل پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ صرف ان لوگوں کو آمادہ نہیں کرتیں جن

لوگوں نے یہ معرکے لڑے اور ان میں ان کا بنیادی کردار رہا اور انہوں نے سب کچھ دیکھا بلکہ زمانہ مابعد کے تمام ادوار اور معاشروں میں بھی یہ نصوص ابھارنے والی ہیں' جب بھی تحریک اسلامی کو ایسے ہی حالات سے واسطہ پڑتا ہے جیسا کہ ان لوگوں کو پڑا اگرچہ بہت زمانہ گزر چکا ہو۔ اگر جدید ترین متنوع معاشروں میں بھی ایسے حالات پیش ہوں تو بعینہ اسی طرح یہ نصوص ایک مومن کو متحرک رکھتی ہیں جس طرح قرون اول میں انہوں نے مسلمانوں کو متحرک رکھا۔

ان نصوص کو صحیح طرح وہی شخص سمجھ سکتا جس کے لیے ویسے ہی حالات درپیش ہوں جس طرح جنگ احزاب میں اس وقت کے مسلمانوں کو درپیش تھے۔ جب ایسے حالات ہوں پھر ان آیات سے ہدایات کے چشمے پھوٹتے ہیں اور اسلام کے لیے کام کرنے والوں کے دل ان کے معانی کے لیے کھل جاتے ہیں۔ اب قرآن کے کلمات اور سطریں قوت اور اسلحہ بن جاتی ہیں اور کارکن ویسے ہی معرکوں میں کود جاتا ہے۔ پھر یہ آیات زندہ' بیدار' آگے بڑھنے والے لوگ پیدا کرتی ہیں اور یہ لوگ ایک حقیقی تحریک لے کر اٹھتے ہیں۔ قرآن کریم کی یہ نصوص عالم واقعہ میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

یاد رہے کہ قرآن کریم محض تلاوت اور علمی مباحث کی کتاب نہیں ہے۔ یہ کام تو بہت ہو چکا' یہ تو ایک زندگی ہے' اچھلتی آگے بڑھتی زندگی۔ یہ تو نئے نئے واقعات کے لیے نئی نئی ہدایات ہیں۔ جب بھی کوئی دل ان نصوص کو سمجھے ان کے ہمقدم ہو کر چلے' ان پر لبیک کہے تو ان نصوص کے اندر پوشیدہ قوت کے سرچشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ یہ ہے اس کتاب کا راز کہ اس کے اندر انفجار و قوت کے ذخائر ہیں۔

ایک انسان ایک آیت کو ہزار بار پڑھتا ہے' پھر وہ ایسے موقف اور ایسے حادثے کا شکار ہوتا ہے اور جب وہ اسی آیت کو پڑھتا ہے تو یہ وہ آیت نہیں ہوتی۔ یہ بالکل ایک نئی آیت ہوتی ہے۔ یہ اسے وہ کچھ بتلاتی ہے جو پہلے نہ بتلاتی تھی۔ یا اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ یہ حیران کن سوالات کا جواب دینے لگتی ہے۔ یہ پیچیدہ مشکلات حل کر دیتی ہے۔ صاف صاف راستہ بتلاتی ہے۔ ایک سمت متعین کر دیتی ہے اور وہ اس دل کو اس معاملے میں عزم بالجزم میں تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے اور پڑھنے والے کو پورا پورا اطمینان ہو جاتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۸۹ تشریح آیات

۹ --- تا --- ۲۷

قرآن کریم اس سورۃ کا آغاز یوں کرتا ہے کہ اے اہل ایمان اس بات کو ذرا یاد کرو کہ یہ لشکر تمہارے خلاف جمع ہوئے اور ان کا ارادہ یہ تھا کہ تمہیں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیں اللہ نے محض اپنے کرم سے اور اپنی خاص فوجوں کی مدد سے ان کو نامراد واپس کر دیا۔ چنانچہ پہلی ہی آیت میں واقعہ کا مزاج' اس کا آغاز اور اس کا انجام بتا دیا گیا۔ تفصیلات سے بھی پہلے تاکہ جس نکتے کو اللہ ان کے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں وہ اچھی طرح بیٹھ جائے۔ وہ اس کو یاد کریں' اور ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اللہ کا منشاء یہ ہے' کہ تم اللہ' رسول' اور وحی کی اتباع کرو' اس پر توکل کرو' اور کافرین اور منافقین کی اطاعت نہ کرو' اور یہ کہ اللہ کی دعوت اور اس کے نظام پر جو لوگ عمل کرتے ہیں' اللہ ان کا حامی و مددگار ہوتا ہے بمقابلہ کافرین اور منافقین کے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿٩﴾

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اس نے تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے"۔

یوں اس اجمالی آغاز ہی میں معرکہ کا آغاز اور انجام قلم بند کر دیا گیا۔ اور وہ عناصر بھی بتا دیئے گئے جو اس معرکے میں فیصلہ کن رہے۔ یعنی احزاب کا جمع ہو کر ٹوٹ پڑنا' اور طوفان باد باراں اور دوسری خدائی افواج کا آنا جو نظر نہ آتی تھیں' اور اللہ کی نصرت جو اللہ کے علم و تدبیر پر مبنی تھیں اور وہ مسلسل نگرانی کر رہا تھا۔

اب اس کے بعد تفصیلات :

إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ﴿١٠﴾ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ

الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ﴿۱۱﴾ وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ﴿۱۲﴾ وَإِذْ قَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا ۚ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۖ إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾

"جب دشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے' جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں' کلیجے منہ کو آگئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے' اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔

یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا' صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کیے تھے' وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ "اے یثرب کے لوگو' تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقعہ نہیں ہے' پلٹ چلو"۔

جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ "ہمارے گھر خطرے میں ہیں' حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے' دراصل وہ (محاذ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔

یہ وہ ہولناک صورت حال ہے جس نے مدینہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہر شخص خوف اور کرب میں مبتلا تھا۔ اس صورت حال سے کوئی ایک شخص بھی غیر متاثر نہ تھا۔ قریش اور اس کے حوالی و موالی' بنی غطفان اور ان کے زیر اثر قبائل' اور یہودیاں بنی قریظہ ہر طرف سے اٹھ آئے تھے' اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی۔ ایسے حالات تھے کہ ان کا خوف ایک دل اور دوسرے دل میں جدا نہ تھا۔ اختلاف جو تھا وہ ردعمل میں تھا۔ اللہ کے بارے میں یقین میں اختلاف تھا۔ طرز عمل' اقدار' اسباب کے تصور اور نتائج کے ظہور میں اختلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایک ہمہ گیر آزمائش تھی اور اس نے مومنین اور منافقین میں بالکل جدائی کر دی۔

آج ہم جب اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اسی موقف میں کھڑے ہیں۔ وہی حالات ہیں' وہی تاثرات ہیں' وہی خلجانات ہیں' وہی حرکات ہیں اور ان نصوص کے شیشے کے اندر ہمیں اپنے چہرے صاف صاف نظر آتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں اور یہ منظر ہمیں صاف صاف نظر آتا ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ (۳۳ : ۱۰) "جب دشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے"۔ اور اس کے بعد لوگوں پر اس موقف کے اثرات

وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (۳۳ : ۱۰) "جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے"۔ یہ ایک نہایت ہی مکمل تصویر ہے اس شخص کی جو انتہائی تنگی' خوف اور

کرب میں مبتلا ہو۔اس تصویر میں چہرے کی حالت اور دلوں کی حرکت دونوں کو دکھایا گیا ہے۔

وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا (۳۳: ۱۰) "اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے"۔
ان گمانوں کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ ان کو مجمل چھوڑ کر تمام حالات اضطراب، تمام خلجانات اور تمام برے احساسات کو اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مختلف دلوں میں ظنون کی تفصیل مختلف ہو گی۔

اب ذرا اس خوفناک صورت حالات کو مزید کھولا جاتا ہے۔ اور اس کے خدوخال اور اس کی حرکات کو سامنے لایا جاتا ہے۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۳۳: ۱۱) "اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے"۔ وہ خوف جو اہل ایمان کو ہلا مارتا ہے، لازم ہے کہ وہ بہت ہی شدید اور ہولناک ہو گا۔

محمد ابن مسلمہ وغیرہ نے روایت کی کہ خندق میں ہماری رات بھی دن ہوتا تھا جبکہ مشرکین نے اپنے لیے باری مقرر کر رکھی تھی۔ ایک دن ابوسفیان ابن حرب اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کے لیے آتا، ایک دن خالد ابن ولید اپنے ساتھیوں سمیت آتا، اور ایک دن عمرو ابن عاص آتا، ایک دن ہبیرہ ابن ابو وھب آتا اور ایک دن عکرمہ ابن ابوجہل آتا اور ایک دن ضرار ابن الخطاب۔ یہاں تک کہ یہ مصیبت بہت بڑھ گئی اور لوگوں کے اندر شدید خوف پھیل گیا۔

مقریزی نے اپنی کتاب امتاع الاسماع میں مسلمانوں کے حال کی تصویر کشی یوں کی ہے: "مشرکین نے صبح کے تڑکے اچانک حملہ کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو تیار کیا۔ اس دن رات کے ایک حصے تک لڑائی رہی اور رسول اللہؐ اور مومنین میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ حضورؐ ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نماز نہ پڑھ سکے۔ آپؐ کے ساتھی یہ کہنے لگے رسولؐ خدا ہم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس پر رسولؐ اللہ نے فرمایا، خدا کی قسم میں نے بھی نماز نہیں پڑھی۔ یہاں تک کہ اللہ نے مشرکین کو ہٹا دیا۔ دونوں فریق اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔ اسید ابن حضیر خندق کے کنارے پر دو سو آدمیوں کو لے کر کھڑے ہوئے، خالد ابن ولید کی سرکردگی میں مشرکین نے حملہ کر دیا، یہ اچانک حملہ کرنا چاہتے تھے۔ تھوڑی دیر انہوں نے مقابلہ کیا۔ وحشی نے طفیل ابن نعمان، ابن حنسا انصاری سلمی کو ایک نیزے کے ساتھ مارا۔ اسے اسی طرح قتل کر دیا جس طرح احد میں حضرت حمزہ کو قتل کیا تھا۔ اس دن حضور اکرمؐ نے فرمایا "مشرکوں نے ہمیں درمیانی نماز، نماز عصر سے مشغول رکھا اللہ ان کے دلوں اور پیٹوں کو آگ سے بھر دے"۔

یوں ہوا کہ مسلمانوں کے دو دستے رات کو نکلے۔ وہ آپس میں الجھ پڑے کسی کو علم نہ تھا کہ وہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ ہم دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ ان کے درمیان بھی قتل ہوئے اور بعض لوگ زخمی ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے اسلامی شعار سے پکارا۔ کو ڈور ڈ تھا۔

(حم لا ینصرون) چنانچہ وہ رک گئے۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا "تمہارا زخمی ہونا اللہ کے لیے ہے اور جو قتل ہو گیا وہ شہید ہے"۔

مسلمانوں پر شدید مشکلات اس وقت آئیں جب وہ خندق کے دہانے پر مصروف جنگ تھے ۔ ادھر بنو قریظہ کی طرف سے خبریں آرہی تھیں کہ وہ وعدہ خلافی پر مائل ہوگئے ہیں ۔ اس لیے مسلمانوں کو ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ کسی وقت بھی مشرکین کا لشکر خندق کی جانب سے حملہ آور ہو سکتا ہے اور پیچھے سے یہودی حملہ کر سکتے ہیں اور وہ ان عظیم لشکروں کے درمیان ایک قلیل تعداد میں ہیں ۔ یہ لشکر آتے اس لیے ہیں کہ مسلمانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں اور یہ معرکہ فیصلہ کن اور آخری معرکہ ہو ۔

یہ حالات اس کے علاوہ تھے ۔ مدینہ میں منافقین سازشیں کر رہے تھے اور افواہیں پھیلا رہے تھے خود اسلامی صفوں میں بددلی پھیلائی جارہی تھی ۔

وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا (۳۳ : ۱۲) ”یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا' صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے ہم سے کیے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے“ ۔ ان شدید حالات میں ان لوگوں کو بھی موقع مل گیا کہ وہ اپنے خبث باطن کا اظہار کر دیں جبکہ مسلمان شدید کرب میں مبتلا تھے اور کلیجے منہ کو آرہے تھے ۔ ایسے حالات میں کوئی نہ تھا جو ان کو ملامت کرتا ۔ ان لوگوں کو مسلمانوں کی توہین اور تذلیل اور شکوک پھیلانے کا موقع مل گیا ۔ اور انہوں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ اللہ اور رسول کے وعدے جھوٹے تھے حالانکہ اللہ اور رسولؐ کے وعدے تو پورے ہونے والے تھے ۔ یہ منافقین یہ باتیں اس لیے کرتے تھے کہ ان حالات میں ان پر گرفت کرنے والا کوئی نہیں ہے ۔ کیونکہ بظاہر حالات ایسے تھے کہ ان کی بات درست معلوم ہوتی تھی ۔ وہ اپنے خیال میں درست موقف پر تھے ۔ مسلمان جن ہولناک حالات سے دوچار تھے ان کی وجہ سے ان منافقین کے چہروں پر ایک جو مہین پردہ تھا' جس کی وجہ سے وہ رکھ رکھاؤ کرتے تھے وہ بھی اتر گیا ۔ اور ان کے نفوس نے ان کو اس پر آمادہ کر دیا کہ وہ اس ظاہری رواداری کو بھی ختم کر دیں ۔ چنانچہ انہوں نے اپنے حقیقی شعور کا اظہار کر دیا اور رکھ رکھاؤ کا پردہ چاک کر دیا ۔

اس قسم کے منافقین اور افواہیں پھیلانے والے ہر جماعت میں ہوتے ہیں اور مشکل حالات میں ان کا موقف بھی ایسا ہوتا ہے جیسا کہ ان کے بھائیوں کا موقف ہوتا ہے ۔ لہٰذا اس قسم کے لوگ تمام نسلوں میں ایک مکرر نمونہ ہوتے ہیں ۔ زمان و مکان کی قید کے بغیر اس قسم کے لوگ ہر جماعت میں ہوتے ہیں ۔

وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا (۳۳ : ۱۳) ”جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا : اے اہل یثرب' تمہارے لیے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے ' پلٹ چلو“ ۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ لوگ صف بندی کو ترک کر کے گھروں میں بیٹھ جائیں اور یہ کہہ دیں کہ خندق کے سامنے اس طرح صف بندی کر کے کھڑے رہنے کا کیا موقع و محل ہے ۔ پیچھے سے گھروں کو خطرہ ہے ۔ یہ ایک ایسی دعوت تھی جہاں سے لوگ متاثر ہو سکتے تھے کیونکہ عورتیں اور بچے خطرے میں تھے ۔ خطرہ حقیقی تھا ۔ خوف ہر طرف سے لاحق تھا اور حالات بہت ہی مخدوش

تھے ۔کسی کا دل قرار نہ پکڑتا تھا۔

وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ (۳۳: ۱۳) "جب ان کا ایک فریق یہ کہہ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگے کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں"۔ یعنی ہمارے گھر دشمن کے سامنے کھلے ہیں اور ان کا کوئی دفاع نہیں ہے ـــ لیکن قرآن یہاں اصل حقیقت بھی کھول دیتا ہے :

وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ (۳۳: ۱۳) "حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے"۔ چنانچہ یہاں ساف صاف کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ بزدل ہیں۔ بھاگنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے یہ جھوٹے حیلے گھڑتے ہیں۔

اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا (۳۳: ۱۳) "دراصل وہ بھاگنا چاہتے ہیں"۔ روایات میں آتا ہے کہ بنی حارثہ نے لوس ابن قیطی کو رسول اللہؐ کے پاس بھیجا اور یہ کہا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں اور انصاریوں میں سے کسی کا گھر ہمارے گھروں کی طرح نہیں ہے۔ ہمارے اور غطفان کے درمیان کوئی نہیں ہے جو ان کو روک سکے۔ تو آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم گھروں کی طرف لوٹ جائیں تاکہ گھروں اور عورتوں کی حفاظت کر سکیں۔ حضورؐ نے ان کو اجازت دے دی۔ یہ بات سعد ابن معاذ تک پہنچی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ حضورؐ ان کو اجازت نہ دیں کیونکہ ہمیں اور ان کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی ہے' انہوں نے ایسا ہی کیا ہے خدا کی قسم! چنانچہ حضورؐ نے ان کو واپس کر دیا ـــ غرض قرآن ان کو ملامت کرتا ہے کہ یہ محض فرار چاہتے ہیں' وہ تھے ہی ایسے۔

---ooo---

یہاں سیاق کلام قدرے رک جاتا ہے۔ ایک بہترین تصور پر غور کرنے کے لیے جس میں اس وقت کے خوفناک اور پریشان کن حالات اور باہم حیلہ بازی کے موقف کی تصویر کشی کی گئی ہے تاکہ ان بیمار دلوں والے منافقین کی نفسیاتی تصویر بھی دکھا دی جائے۔ یہ ان کی داخلی تصویر ہے اور یہ حالت ان کی اس لیے ہے کہ ان کا عقیدہ اور نظریہ کمزور ہے۔ یہ بزدل ہیں اور اسلامی صفوں سے یہ لوگ ایک معمولی بہانہ اور عذر کی وجہ سے بھی بھاگنے کے لیے تیار ہوئے ہیں۔ یہ کسی موقف پر جمنے والے نہیں ہیں اور نہ ہی یہ اس سلسلے میں کوئی رکھ رکھاؤ کرنے والے ہیں۔

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾

"اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اس وقت انہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں شریک فتنہ ہونے میں کوئی تامل ہوتا"۔

یہ ہے ان منافقین کی اندرونی تصویر۔ دشمن ابھی تو مدینہ سے باہر ہے۔ ابھی تو وہ شہر کے اندر گھسنے نہیں پایا۔ اگرچہ حالات بہت ہی خوفناک تھے لیکن ابھی تو حملہ آور باہر ہی پڑے تھے۔ کوئی خطرہ ابھی واقع نہ ہوا تھا۔ اگر لشکر مدینہ کے

اطراف سے حملہ آور ہو جاتا اور پھر

سُئِلُوا الْفِتْنَةَ (۳۳ : ۱۴) ”پھر ان کو فتنے کی دعوت دی جاتی یعنی ان سے مطالبہ کیا جاتا کہ تم مرتد ہو جاؤ تو یہ لوگ فوراً مرتد ہو جاتے اور کچھ دیر نہ کرتے اور نہ ہی کوئی تردد کرتا۔

اِلَّا قَلِيلًا یعنی اگر دیر کرتے تو تھوڑی ہی دیر کرتے یا ان میں سے قلیل لوگ تردد کرتے ۔یعنی مرتد ہونے سے قبل کچھ دیر کے لیے سوچتے ۔یہ ہے نقشہ ڈھیلے عقیدے اور نظریہ کا ہے ۔یہ گہری کمزوری ہے اس کے ساتھ یہ مقابلہ نہیں کر سکتے۔
یوں قرآن مجید ان کی حقیقت کا اظہار کرتا ہے اور ان کی اندرونی کیفیت سے پردہ اٹھا دیتا ہے اور اس کے بعد ان پر الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے عہد توڑ دیا اور وعدے کی خلاف ورزی کر دی ۔یہ عہد کس کے ساتھ تھا؟ یہ عہد انہوں نے اللہ کے ساتھ کیا تھا کہ بھاگیں گے نہیں ۔ان کے ساتھ یہ پہلے بھی ہو چکا ہے ۔

وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْاَدْبَارَ ۚ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُولًا ﴿۱۵﴾

”ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ یہ پیٹھ نہ پھیریں گے ، اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی بازپرس تو ہونی ہی تھی“۔
ابن ہشام نے ابن اسحاق کی روایت اپنی سیرۃ میں نقل کی ہے کہ یہ لوگ بنو حارثہ تھے ۔یہی لوگ تھے جو احد کے دن بھی بھاگنا چاہتے تھے اور بنو سلمہ اور ان دونوں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اللہ کے ساتھ عہد کر لیا تھا کہ وہ ایسا ہرگز نہ کریں گے ۔یہاں یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ تم نے خود یہ عہد اللہ کے ساتھ کیا تھا کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے ۔
احد کے دن تو اللہ کے فضل و کرم سے وہ بچ گئے تھے ۔اللہ نے ان کو ثابت قدمی دے دی تھی ۔اور ان کو فرار کے نتائج سے بچا لیا تھا۔ ابتدائی زمانے میں جہاد کے اسباق میں سے یہ ایک سبق تھا لیکن آج تو تحریک اسلامی پر طویل دور گزر گیا ہے ۔کافی تجربات ہو گئے ہیں ۔اس لیے قرآن کریم ان پر یہ سخت تبصرہ کرتا ہے ۔
آج جب انہوں نے عہد توڑ دیا۔ آج وہ خطرے سے بچنے کے لیے اور خوف کی حالت سے بھاگنے کے لیے عہد توڑ چکے ، تو قرآن کریم ان کو بتاتا ہے اور ہر وقت بتاتا ہے کہ اسلامی نظریہ حیات میں اعلیٰ قدر کیا ہے اور اسلامی تصور حیات میں موت اور زیست کا تصور کیا ہے ۔کیا فرار اور نقض عہد زندگی کا ضامن ہے ؟

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۶﴾ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ

أَرَادَ بِكُمْ سُوٓءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٧﴾

"اے نبی ؐ ان سے کہو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو تو یہ بھاگنا تمہارے لیے کچھ نفع بخش نہ ہو گا۔ اس کے بعد زندگی کے مزے لوٹنے کا تھوڑا ہی موقعہ تمہیں مل سکے گا۔ ان سے کہو کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہو۔ اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر تم پر مہربانی کرنا چاہے۔ اللہ کے مقابلے میں تو یہ لوگ کوئی حامی و مددگار نہیں پا سکتے ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام واقعات اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ نظام قضا و قدر ان واقعات و نتائج کو آگے بڑھاتا جاتا ہے اور ہر معاملہ اس نظام کے مطابق انجام کو پہنچتا ہے۔ موت اور قتل ایک تقدیر ہے' اس سے تو کوئی فرار ممکن نہیں ہے۔ یہ وقت پر آتی ہے۔ ایک لحظہ پہلے اور بعد میں نہیں آتی۔ فرار کی وجہ سے موت موخر نہیں ہوتی۔ اگر کوئی جنگ سے بھاگ گیا تو اپنی موت مر جائے گا جس کا وقت بہت قریب ہے۔ دنیا کا تو ہر عرصہ قریب ہی ہے۔ نیز دنیا کا ہر ساز و سامان بھی قلیل ہوتا ہے۔ بچانے والا کوئی نہیں ہے صرف یہ کہ اللہ کی مشیت کسی کی موت کی راہ میں حائل ہو جائے۔ یہ اللہ ہی ہے جو کسی کے بارے میں برائی کا فیصلہ کرتا ہے اور کسی کے بارے میں اچھائی کا فیصلہ کرتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی والی اور مددگار نہیں ہے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو کسی کو تقدیر الٰہی سے بچا لے۔ لہٰذا سپردگی' سپردگی ہے' اطاعت' اطاعت ہے' وفا' وفا ہے' خواہ وہ سہولیات کے دور میں ہو یا مشکلات کے دور میں۔ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ پر توکل کرنا چاہئے۔ وہ جو چاہتا ہے' کرتا ہے۔

اب بات کا رخ ان لوگوں کی طرف مڑ جاتا ہے جو جنگ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں جو جہاد سے لاپرواہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور جو دوسروں کو بھی جہاد سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں۔

لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا (۳۳ : ۱۳) "تمہارے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے' لوٹ جاؤ"۔ اور ان کی عجیب تصویر یہاں کھینچی جاتی ہے۔ یہ تصویر سچی تصویر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین کارٹون ہے اور اس قسم کے لوگ ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ بزدل' پیچھے ہٹنے والے' بہت چیخنے اور چلانے والے' شدید حالات میں جزع و فزع کرنے والے اور پرامن حالات میں تیز و طرار بات کرنے والے' ہر بھلائی کے معاملے میں کنجوس' جدوجہد سے فراری۔ اگر ذرا بھی ڈر کا خطرہ ہو' اگرچہ دور ہو تو ایک دم مضطرب ہونے والے۔ قرآن کا انداز تعبیر ایسا دلکش ہے کہ اس تصویر کے کسی رنگ کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ذرا خود قرآنی رنگ میں پڑھئے :

قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الْمُعَوِّقِينَ مِنكُمْ وَالْقَائِلِينَ لِإِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا ۖ وَلَا يَأْتُونَ الْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٨﴾ أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۖ فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ

رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ؕ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ۲ ۱۲ ع

۱۸ "اللہ تم میں سے ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو (جنگ کے کام میں) رکاوٹیں ڈالنے والے ہیں' جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ "آؤ ہماری طرف"۔ جو لڑائی میں حصہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو' جو تمہارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں۔ خطرے کا وقت آ جائے تو اس طرح دیدے پھرا پھرا کر تمہاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو' مگر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو یہی لوگ فائدوں کے حریص بن کر قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں لیے تمہارے استقبال کو آ جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لائے' اسی لیے اللہ نے ان کے سارے اعمال ضائع کر دیئے۔ اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں ہیں۔ اور اگر وہ پھر حملہ آور ہو جائیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر کہیں صحرا میں بدوؤں کے درمیان جا بیٹھیں اور وہیں سے تمہارے حالات پوچھتے رہیں۔ تاہم اگر یہ تمہارے درمیان رہے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیں گے"۔

آغاز یوں ہوتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہے جو لوگوں کو جنگ سے روکتے ہیں اور اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ جو اپنے بھائیوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ جنگ میں شرکت نہ کریں گھروں میں بیٹھے رہیں۔

وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا (۳۳ : ۱۸) "جو لڑائی میں حصہ لیتے بھی ہیں تو بس نام گنانے کو"۔ یہ جہاد میں محض دکھاوے اور نام داخل کرنے کے لیے شریک ہوتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ معلوم لوگ ہیں اور ان کی مکاریاں بھی معلوم ہیں۔

اب اللہ اپنے معجزانہ قلم ان کے اور ان جیسے لوگوں کے خدوخال سے بڑی خوبصورتی سے رقم فرماتے ہیں :

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ (۳۳ : ۱۹) "یہ تمہارا ساتھ دینے میں بہت بخیل ہیں"۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بغض اور دشمنی بھری ہوئی ہے۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں بھی بخیل ہیں' مالی امداد میں بھی بخیل ہیں اور اچھی نیت اور اچھی خواہشات میں بھی بخیل ہیں۔

فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ

لْمَوْتِ (۳۳: ۱۹) "خطرے کا وقت آجائے تو دیدے پھرا پھرا کر تمہاری طرف دیکھتے ہیں جیسے کسی مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو"۔ یہ ایک واضح تصویر ہے جس کے خدوخال واضح ہیں، جس کے اعضاء متحرک ہیں، لیکن ان خصوصیات کے ساتھ ساتھ یہ تصویر مضحکہ انگیز ہے۔ اس سے ان کی بزدلی ٹپکتی پڑتی ہے۔ اس قدر بزدل کہ مارے خوف کے ان کے اعضاء کانپ رہے ہیں اور ان کے پورے جسم پر رعشہ طاری ہے۔ لیکن جب خوف چلا جاتا ہے تو ان کی تصویر زیادہ مضحکہ انگیز ہو جاتی ہے۔

فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ (۳۳: ۱۹) "مگر جب خطرہ گزر جاتا ہے تو یہی تمہارے استقبال میں قینچی کی طرح تیز زبانوں کے ساتھ آجاتے ہیں"۔ یہ سوراخوں سے نکل آتے ہیں، ان کی آوازیں بلند ہو جاتی ہیں حالانکہ پہلے ان پر رعشہ طاری تھا۔ ان کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں۔ پہلے تو سکڑ گئے تھے، اب پھول گئے اور بغیر شرم و حیاء کے لمبے لمبے دعوے کرنے لگے کہ ہم نے یہ یہ مشقتیں برداشت کیں۔ یہ یہ جنگیں کیں اور یہ یہ فضائل اعمال کیے اور اس قدر شجاعت اور بہادری دکھائی --- اور پھر یہ لوگ۔

اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ (۳۳: ۱۹) "مال کے لیے بہت لالچی ہیں"۔ یہ کسی بھلائی کے کام میں کچھ خرچ نہیں کرتے۔ نہ اپنی قوت، نہ اپنا عمل، نہ اپنی دولت اور نہ اپنی جان --- حالانکہ وہ بہت بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ ان کی زبان تیز ہے اور اپنے آپ کو بہت ہی بڑا سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے لوگ کسی ایک قوم قبیلے تک محدود نہیں ہیں۔ یہ ہمیشہ ہر معاشرے میں رہتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بڑے بہادر، فصیح اللسان اور چیلنج کرنے والے ہوتے ہیں بشرطیکہ وہاں امن ہو۔ اور اگر خوف اور شدید خطرہ ہو تو یہ بخیل، بزدل، خاموش اور پیچھے پیچھے رہنے والے۔ یہ لوگ ہر بھلائی اور ہر خیر کے معاملے میں بہت ہی بخیل ہوتے ہیں بس زبانی کلامی یہ ہر کام میں حصہ لیتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ (۳۳: ۱۹) "یہ لوگ ہرگز ایمان نہیں لاتے اس لیے اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے"۔ ان کی منافقت کا پہلا سبب یہ ہے کہ ایمان ان کے دلوں ہی میں نہیں اترا اور ایمان کی روشنی میں انہوں نے اپنا راستہ تلاش نہیں کیا۔ نہ یہ لوگ ایمان کے طریقوں پر چلنے والے ہیں۔ اس لیے اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے ہیں اور یہ کامیاب نہیں کیونکہ کامیابی کا اصلی مواد ہی ان کے پاس نہیں ہے۔

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (۳۳: ۱۹) "اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے"۔ اللہ کے لیے کوئی کام مشکل نہیں، بس سمجھ لو کہ ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔

رہا یہ کہ یوم الاحزاب میں ان کی حالت کیا تھی اور ان کی سوچ کیا تھی۔

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا (۳۳: ۲۰) "سمجھ رہے ہیں کہ حملہ آور گروہ ابھی گئے نہیں

ہیں"۔ گویا یہ لوگ ابھی تک کانپ رہے ہیں' ابھی تک جنگ سے چھپ رہے ہیں' لوگوں کو روک رہے ہیں' ان کو یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ احزاب تو بھاگ گئے ہیں اور خوف ختم ہوگیا ہے اور امن و امان لوٹ آیا ہے۔

وَ اِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ

(۳۳ : ۲۰) "اور اگر وہ پھر حملہ آور ہو جائیں تو ان کا جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر کہیں صحرا میں بدوؤں کے درمیان جا بیٹھیں اور وہیں سے تمہارے حالات پوچھتے رہیں"۔ کیا سنجیدہ مزاح ہے ان کے ساتھ اور کس قدر بھونڈی تصویر ہے ان لوگوں کی --- یوں جس طرح کارٹون ۔ اگر دوبارہ احزاب حملہ آور ہوں تو یہ لوگ چاہیں گے کہ یہ اہل مدینہ ہی نہ ہوں اور دور کہیں بدو باشندے ہو جائیں اور مدینہ والوں کی زندگی اور ذمہ داریوں میں شریک ہی نہ ہوں۔ ان کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس کے بارے میں ان کو پتہ ہی نہ ہو اور دوسروں سے اہل مدینہ کے حالات اس طرح پوچھیں جس طرح اجنبی' اجنبی کے بارے میں پوچھتا ہے اور ان کو اہل مدینہ سے کوئی ذاتی تعلق نہیں ہے اور یہ بزدل جان بچاکر نکل آتے ہیں۔

یہ لوگ ایسی مضحکہ خیز تمنائیں کرتے ہیں' یہ معرکے سے دور ہیں اور اس معرکے میں ذاتی طور پر شریک نہیں ہیں نہ براہ راست یہ لوگ اس معاملے کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ یہ دور سے بھی ڈرتے ہیں اور اس قدر بعید ہو کر بھی جزع و فزع کرتے ہیں۔

وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا (۳۳ : ۲۰) "تاہم اگر یہ تمہارے درمیان رہے بھی تو لڑائی میں کم ہی حصہ لیں گے"۔ یہ آخری لائن ہے جس کے کھینچنے سے یہ تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے تصویر ان منافقین کی جو مدینہ طیبہ میں اٹھنے والی اس نئی اسلامی جماعت کے اندر رہتے تھے۔ ایسے ہی لوگ قیامت تک اٹھنے والی ہر تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہی ہر دور کے منافقین کے خدوخال ہوتے ہیں۔ یہ تصویر یہاں ختم ہوتی ہے اور اہل ایمان کے دل میں ان کی تحقیر' ان سے نفرت اور ان سے دوری اچھی طرح بٹھا دی جاتی ہے اور یہ لوگ اللہ کے ہاں بھی ہلکے ہوجاتے ہیں اور لوگوں کی نظروں میں بھی گر جاتے ہیں۔

--- ooo ---

یہ تو تھا حال ان لوگوں کا جو منافق تھے' جن کے دلوں میں روگ تھا' جو اسلامی صفوں میں بد دلی پھیلاتے تھے۔ یہ تھی ان کی مکروہ تصویر' لیکن جنگ احزاب کے شدید اور ہلا مارنے والے خوف اور بدتر حالات نے تمام لوگوں کو اس طرح مکروہ الصورت نہ بنا دیا تھا۔ ان تاریک اور کربناک حالات میں کچھ روشن چہرے بھی موجود تھے۔ ان ہلا مارنے والے حالات میں ایسے لوگ بھی تھے جو چٹان کی طرح مضبوط کھڑے تھے۔ جن کا اپنے اللہ پر پورا بھروسہ تھا۔ اللہ کے فیصلوں پر راضی تھے۔ ان کو یقین تھا کہ اللہ کی نصرت آئے گی باوجود اس کے کہ بظاہر حالات بہت ہی مایوس کن تھے اور ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔

اب قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور نمونہ پیش کر کے ان روشن چہروں کے البم کا آغاز کرتا ہے اور

دیکھیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴿٢١﴾

"درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ تھا' ہراس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے"۔

اس خوفناک ڈر' اور جان لیوا حالات کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے لیے امن و اطمینان کا سرچشمہ تھے اور آپ کی ذات وثوق' اطمینان اور امیدوں کا سرچشمہ تھی۔ اس مشکل وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کردار ادا کیا وہ دراصل تمام تحریکات اسلامی کے قائدین کے لیے مثال اور نمونہ ہے۔ ان تمام لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے جو صرف رضائے الٰہی اور یوم آخرت کے لیے کام کرتے ہیں اور جو اپنے آپ کو بہترین قائد ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ جو ہروقت اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور کبھی بھی اللہ کو نہیں بھولتے۔

ہمیں چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنگ میں جو موقف اختیار فرمایا اس کی کچھ جھلکیاں یہاں دے دیں۔ پوری تفصیلات تو یہاں دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے اور عام مسلمانوں کے ساتھ خندق کھودنے لگے۔ آپ کدال سے زمین کھودتے اور بیلچے سے مٹی جمع فرماتے اور پھر ٹوکری میں بھر کر کناروں پر ڈالتے۔ کام کرنے والے جو رجز پڑھتے آپ بھی ان کے ساتھ شریک ہوتے۔ یہ لوگ اونچی آواز سے رجز پڑھتے' رجز کے آخری لفظ کو دہراتے۔ وہ لوگ سادہ قسم کے ترانے گاتے تھے جن کا تعلق اس وقت کے واقعات سے ہوتا تھا۔ ایک شخص تھا جس کا نام جعیل تھا۔ حضور اکرم کو یہ نام اچھا نہ لگا تو آپ نے اس کا نام بدل کر عمرو رکھ دیا۔ اب مسلمانوں نے اس کے ساتھ رجز بنایا' بہت ہی سادہ :

سماہ من بعد جعیل عمراً و کان للبائس یوماً ظہراً

جب مسلمان یہ رجز پڑھتے اور "عمراً" کہتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی جواب میں "عمراً" فرماتے اور جب وہ دوسرے فقرے میں لفظ "ظہراً" پڑھتے تو آپ بھی ان کے جواب میں ظہراً دہراتے --- اب ذرا اس فضا کے بارے میں سوچئے اور اس جوش و خروش کا تصور کیجئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رجز کے ساتھ مقطع دہراتے ہیں۔ "عمراً" اور "ظہراً"--- اور ساتھ ساتھ کدال بھی مار رہے ہیں۔ بیلچے سے مٹی بھی جمع کر رہے ہیں اور پھر ٹوکری میں مٹی اٹھا کر بھی لے جا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ رجز کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ یہ طرز عمل ان لوگوں کے جسم کے رونگٹے رونگٹے کو قوت سے بھر رہا ہو گا۔ ان کی ارواح کا پیمانہ کس قوت و شجاعت سے لبریز ہو گا اور کس قدر جرأت' شجاعت اور اعتماد اور اعزاز ان کو حاصل ہو رہا ہو گا۔

○ زید ابن ثابت مٹی لے جا رہے تھے تو حضور نے فرمایا یہ ایک بہترین نوجوان ہے۔ اسے نیند آگئی اور خندق ہی میں سو گیا۔ بہت [illegible] ۔ حضرت عمارہ ابن حزم نے ان کا اسلحہ چپکے سے لے لیا' اسے پتہ بھی نہ چلا۔ آنکھ کھلی

تو اسلحہ ندارد ـ یہ پریشان ہو گئے ـ اس پر رسول اللہ ؐ نے فرمایا "اے ابو اماد (زیادہ سونے والے کے باپ) تم اس قدر سو گئے کہ اسلحہ ہی چلا گیا"۔ پھر آپ ؐ نے فرمایا "کس کو اس نوجوان کے اسلحہ کے بارے میں علم ہے؟" عمارہ نے فرمایا "رسول خدا وہ میرے پاس ہے"۔ آپ ؐ نے فرمایا اسے دے دو اور اس کے بعد حکم دیا کہ کسی مسلمان کی کوئی چیز بطور مزاح بھی نہ چھپاؤ ــ یہ واقعہ بھی بتاتا ہے کہ اسلامی صفوں میں جو لوگ تھے وہ بیدار مغز اور بیدار چشم تھے اور حضور ؐ کی نظر ہر کسی پر تھی، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سنجیدہ مزاح اور خوش مزاجی ان مشکل حالات میں بھی قائد انقلاب کے ساتھ تھے ـ "اے سونے والے کے باپ 'تم سو گئے اور اسلحہ چلا گیا"۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کن حالات میں تھے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کس قدر قریب تھے ـ

○ آپ ؐ کی روح دور دور تک اسلامی انقلاب کے نقوش دیکھ رہی تھی ـ پتھروں کی چمک میں بھی اللہ آپ ؐ کو اسلامی انقلاب کی وسعتوں کو دکھاتے تھے ـ پہلے دن سے آپ ؐ نے خوشخبری سنائی تھی کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے ہاتھ آئیں گے ـ لیکن جنگ احزاب جیسے مایوس کن حالات مین بھی جب کدال کی ضرب سے پتھر سے چمک نکلتی تو اس سے بھی حضور ؐ کو مستقبل کا نقشہ بتا دیا جاتا اور آپ ؐ فوراً مسلمانوں کو بتا دیتے اور اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں یقین اور امید کے چشمے پھوٹ نکلتے ـ

ابن اسحاق لکھتے ہیں ـ سلمان فارسی کی یہ روایت مجھ تک پہنچی ہے کہ میں خندق کا ایک کونا کھود رہا تھا کہ ایک پتھر میرے لیے مشکل ہو گیا ـ رسول اللہ اس وقت میرے قریب تھے ـ آپ نے دیکھا کہ میں مسلسل وا[illegible] رہا ہوں اور جگہ میرے لئے مشکل ہو گئی ہے ـ حضور ؐ اترے اور میرے ہاتھ سے کدال لیا اور پتھر پر وار کیا ـ کدال کے نیچے سے ایک چمک اٹھی ـ پھر آپ ؐ نے دوسری ضرب لگائی اور پھر پتھر سے ایک چمک اٹھی ـ پھر آپ ؐ نے تیسری ضرب لگائی اور پتھر سے پھر چمک اٹھی ـ کہتے ہیں میں نے پوچھا رسول خدا یہ چمک کیسی تھی جو میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ ؐ جب مارتے ہیں تو کدال چمک اٹھتا ہے ـ حضور ؐ نے فرمایا (سلمان تو نے یہ دیکھ لیا ہے) میں نے کہا ہاں ـ پہلی چمک میں یہ بات دکھائی گئی کہ میرے لیے یمن فتح ہو گیا ہے ـ دوسری چمک میں یہ دکھایا گیا کہ اللہ نے میرے لیے شام اور مغرب کا علاقہ فتح کر دیا اور تیسری چمک میں یہ بات تھی کہ اللہ نے میرے لیے مشرق کو فتح کر لیا ہے ـ

مقریزی نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عمر ؓ کو پیش آیا اور اس وقت سلمان فارسی بھی موجود تھے ـ ہمارے لیے سبق اس بات میں یہ ہے کہ اس قسم کے خوفناک ماحول میں بھی مسلمانوں کے دل و دماغ اعتماد سے بھرپور تھے ـ

○ ذرا وہ وقت بھی یاد کیجئے کہ حذیفہ ؓ شدید سردی میں دشمن کے کیمپ سے نکل آئے ہیں ـ ان کے پاس اطلاعات ہیں ـ وہ سردی سے کانپ رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک کی لمبی شال میں نماز پڑھ رہے ہیں ـ حضور ؐ نماز میں ہیں ـ اپنے رب کے ساتھ مناجات میں ہیں ـ آپ حضرت حذیفہ کو چھوڑ نہیں دیتے کہ وہ اس وقت تک کانپتے رہیں جب تک حضور ؐ نماز سے فارغ نہیں ہو جاتے بلکہ آپ حذیفہ ؓ کو اپنے پاؤں ٹانگوں کے اندر دبا لیتے ہیں اور اپنی شال کا ایک کونہ ان پر ڈال دیتے ہیں کہ وہ گرم ہو جائیں اور آپ ؐ نماز جاری رکھتے ہیں ـ نماز ختم ہوتی ہے ـ حذیفہ آپ ؐ کو اطلاعات فراہم کرتے ہیں اور آپ ؐ کو خوشخبری سناتے ہیں کیونکہ [illegible] مبارک کہہ رہا تھا کہ آج کچھ ہونے والا ہے ـ حذیفہ اسے دیکھ کر آ گئے ـ

○ جہاں تک آپؐ کی شجاعت' ثابت قدمی اور اللہ پر بھروسے کا تعلق ہے تو وہ آپ کی سیرت سے عیاں ہیں اور اس پورے قصے سے بالکل عیاں ہیں ۔ اور مشہور ہیں' لہٰذا ہم یہاں تفصیلات نہیں دے سکتے ۔ اللہ نے سچ کہا "درحقیقت تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک بہترین نمونہ تھا ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے"۔

--- ○○○---

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب ایک سچے مومن کی تصویر ملاحظہ ہو ۔ جو اللہ پر پورا پورا بھروسہ رکھتا ہے اور پوری طرح مطمئن ہے ۔ یہ تصویر روشن' چمکدار اور خوبصورت ہے ۔ دیکھیے ہر قسم کے ہولناک حالات کے مقابلے میں یہ مومن ڈٹا ہوا ہے ۔ خطرات میں کو د پڑتا ہے ۔ ایسے خطرناک حالات میں چٹان کی طرح ڈٹا ہے جن میں عام لوگوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور خطرہ جس قدر شدید ہوتا ہے اسے اسی قدر زیادہ اطمینان' اللہ پر زیادہ بھروسہ اور خوشخبری کا یقین ہوتا ہے ۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

"اور سچے مومنوں (کا حال اس وقت یہ تھا کہ) جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ "یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا' اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی"۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا"۔

اس جنگ میں مسلمان جس خوف سے دوچار ہوئے وہ اس قدر عظیم تھا' اور اس غزوہ میں جو دکھ ان کو پہنچا وہ اس قدر شدید تھا' اور اس واقعہ میں وہ جس بے چینی کا شکار ہوئے' وہ اس قدر سخت تھی کہ وہ ہلا مارے گئے اور قرآن نے اس کے لیے زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۳۳ : ۱۱) کا لفظ استعمال کیا ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۳۳ : ۱۱) "یہاں مومنین کو آزمایا گیا اور وہ ہلا مارے گئے"۔

یہ لوگ بہرحال انسان تھے اور انسان کی قوت برداشت بہرحال محدود ہوتی ہے ۔ اللہ بھی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتا ۔ اگرچہ ان کو پورا پورا یقین تھا کہ آخری فتح ہماری ہی ہوگی ۔ اور رسول اللہ نے ان کو بشارت بھی دے دی تھی اور یہ بشارت نہ صرف عرب بلکہ یمن' شام اور مشرق و مغرب کی فتح کی تھی ۔ لیکن ان حقائق کے باوجود موجودہ ہولناک حالات نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا اور وہ مسلسل کرب اور خوف محسوس کرتے تھے ۔

مسلمان کن حالات میں تھے اور کس قدر سہمے ہوئے تھے' اس کی تصویر حضرت حذیفہ ابن ایمان کی روایت سے بہت وضاحت سے معلوم ہوتی ہے ۔ اصحاب رسولؐ کی حالت کیا تھی اور ان کی اندرونی حالت کیا تھی ۔ "حضورؐ صحابہؓ سے کہتے ہیں کون ہے وہ شخص جو کھڑا ہو اور جائے اور دشمن کے لشکر کے اندر جا کر معلوم کرے کہ وہ کیا کرتے ہیں ۔ اس کے

لیے شرط ہے کہ وہ واپس آئے گا۔ میں اللہ سے دعا کروں گا کہ اللہ اسے میرے ساتھ جنت میں رکھے"۔ باوجود اس کے کہ اس شخص کی واپسی کی بھی ضمانت ہے اور اس کے لیے جنت کی دعاء کی بھی ضمانت ہے، لیکن کوئی بھی خود اٹھ کر نہیں آتا۔ اور حضورؐ تین بار دہراتے ہیں۔ آخر میں حضورؐ حضرت حذیفہؓ کا نام لے کر پکارتے ہیں اور حذیفہؓ بھی فرماتے ہیں کہ جب میرا نام لے لیا گیا تو اب میرے لیے جانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ رسولؐ یہ موقف انتہائی خوف کی حالت ہی میں اختیار کر سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات ان کی طاقت سے زیادہ تھی۔

لیکن اس زلزال شدید کے باوجود، اور آنکھیں پتھرانے کے باوجود جان کی بے چینی کے باوجود، ان لوگوں کا اللہ کے ساتھ ایک غیر منقطع تعلق تھا۔ وہ سنن الہیہ کو اس حد تک جانتے تھے کہ وہ کسی وقت بھی ان نظروں سے اوجھل نہ ہوتی تھیں اور ان کو سنن الہیہ پر غیر متزلزل بھروسہ تھا کہ اللہ کے یہ سنن ناقابل تغیر ہیں اور جب ان کے مطابق اسباب فراہم ہوں تو نتائج ضرور ان کے مطابق نکلیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مومنین نے یہ سمجھ لیا کہ اس شدید خوف اور ہلا مارنے کے بعد اب نصرت قریب آگئی ہے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (حوالہ) "کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تم پر وہ حالات نہ آئیں گے جو تم سے پہلے لوگوں پر آئے۔ ان پر سختیاں آئیں مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی --- ہاں اللہ کی مدد قریب ہے"۔ اور اب چونکہ وہ ہلا مارے گئے ہیں لہٰذا نصرت الٰہی قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کہا: "یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی"۔ (اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی کو اور زیادہ کر دیا)۔

هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (۳۳:۲۲) "یہ وہی چیز ہے جس کو اللہ اور رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا"۔ یہ خوف، یہ بے چینی، اور یہ کپکپی، یہ تنگی وہ چیزیں ہیں جن پر ہم سے نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا نصرت آنے ہی والی ہے۔

وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (۳۳:۲۲) "اور اللہ اور رسول کی بات بالکل سچی تھی"۔ یعنی اللہ اور رسول نے نصرت الٰہی کی آمد کے لیے جو علامات رکھی تھیں، وہ سچ تھیں اور اب وہ علامات ظاہر ہو رہی ہیں تو بھی سچی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دل اللہ کی نصرت کے آنے پر مطمئن ہو گئے۔

وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (۳۳:۲۲) "اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی کو اور

زیادہ کر دیا"۔

بہرحال وہ انسان اور بشر تھے اور بشری جذبات سے وہ بھی پاک نہ ہو سکتے تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ ان سے شریعت کا مطالبہ یہ نہ تھا کہ وہ بشر سے زیادہ بوجھ اٹھائیں۔ دائرہ بشریت کے اندر ہی ان کو رہنا تھا۔ اور بشریت کی خصوصیات اور علامات کا ان کے اندر پایا جانا حکمت خداوندی تھا۔ اس لیے ان کو پیدا کیا گیا تھا تاکہ وہ بشر ہوتے ہوئے کام کریں اور بشریت کے علاوہ کوئی اور جنس نہ ہوں۔ نہ ملائکہ ہوں اور نہ شیاطین ہوں۔ نہ جانور ہوں اور نہ پتھر ہوں۔ وہ بشر تھے۔ اس لیے ان پر خوف بھی طاری ہوتا تھا اور انہیں پریشانی بھی لاحق ہوتی تھی اور تنگی بھی محسوس کرتے تھے۔ اگر خطرہ حد برداشت سے زیادہ ہو جاتا تو ان پر کپکپی بھی طاری ہوتی تھی۔ لیکن ان کمزریوں کے باوجود مضبوط رسی سے ان کا ربط تھا۔ وہ اللہ سے باندھے ہوئے تھے اور اللہ ان کو گرنے سے بچا رہا تھا۔ از سرنو امید یں ان کے اندر پیدا فرماتا ہے اور ناامیدی سے ان کو بچاتا تھا۔ اس لیے وہ انسانیت کی تاریخ میں ایک منفرد مثال تھے۔ ایسی مثال جس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

ہمیں چاہئے کہ اس حقیقت کا ادراک کریں تاکہ ہمیں معلوم ہو کہ پوری انسانی تاریخ کے انسانوں میں ایک ایسا نمونہ بھی تھا اور کبھی بشریت اس معیار تک بھی پہنچی تھی۔ یہ بشر تھے 'فرشتے نہیں تھے' ان میں کمزوریاں بھی تھیں اور قوت بھی تھی اور ان کا اعزاز اور معیار یہ ہے کہ انہوں نے بشریت کو اس قدر اونچے معیار تک پہنچا دیا یوں کہ دائرہ بشریت کے اندر رہتے ہوئے وہ اس قدر بلند معیار تک پہنچ گئے۔

جب ہم دیکھیں کہ ہمارے اندر کمزوری آگئی ہے یا ہمارے قدم متزلزل ہوگئے ہیں' یا ہم ڈر گئے ہیں' یا ہم پر تنگی کا وقت آگیا ہے۔ ہولناک اور خطرناک حالات سے دوچار ہوگئے ہیں تو ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے اور ہمیں چیخ و پکار نہ شروع کر دینا چاہئے کہ وائے مارے گئے۔ لیکن ہمیں یہ موقف بھی نہ اختیار کرنا چاہئے کہ یہ کمزوریاں تو خیر القرون میں بھی تھیں اور یہ ہماری فطرت کا حصہ ہیں اور ہم بلکہ تمام انسانوں سے اچھے لوگوں میں بھی تھیں' اس لیے کہ ایک مضبوط رسی بھی ہے' یہ مضبوط رسی آسمان سے تعلق کی رسی ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اللہ پر بھروسہ کریں۔ اس کی رسی کو تھامیں اور اعتماد اور اطمینان کو واپس لوٹائیں اور ہمارے جب قدم متزلزل ہو جائیں تو ہم سمجھ لیں کہ اب اللہ کی نصرت آنے والی ہے تاکہ ہم ثابت قدم رہیں۔ ہمیں استقرار حاصل ہو اور نہایت ہی قوت سے از سرنو راہ حق پر چل پڑیں۔

آغاز اسلام میں اللہ نے صحابہ کرام کی جو ٹیم تشکیل دی تھی اسے یہی توازن عطا کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک منفرد ٹیم تھی۔ اس ٹیم کی تعریف خود قرآن بار بار کرتا ہے کہ اس ٹیم نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیے۔ کس طرح ثابت قدم رہے۔ ان میں سے بعض تو اللہ کے ہاں پہنچ گئے اور بعض انتظار میں ہیں۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

"ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے ۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے ۔ انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی"۔
یہ نمونہ اس مکروہ نمونے کے بالمقابل ہے ۔ یہ مکروہ نمونہ وہ ہے جس میں لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ پیٹھ نہ پھیریں گے مگر بعد میں انہوں نے اپنا عہد وفا نہ کیا۔

وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا "اور اللہ کے عہد کے بارے میں تو پوچھا جاتا ہے"۔
امام احمد نے حضرت ثابت سے نقل کیا ہے کہ "میرے چچا انس ابن نضرؓ رسول اللہؐ کے ساتھ بدر میں حاضر نہ ہو سکے تھے ۔ ان پر یہ بات بہت شاق تھی ۔ وہ کہتے تھے کہ یہ پہلا معرکہ تھا جس میں رسول خداؐ شریک ہوئے اور میں غائب رہا۔ اگر اللہ نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی معرکے میں شریک کیا تو اللہ تعالیٰ دیکھ لے گا کہ میں کیا کرتا ہوں ۔ ان کے سوا اور کوئی یہ بات نہ کہہ سکا ۔ یہ رسول اللہؐ کے ساتھ احد کے دن حاضر ہوئے ۔ یہ سعد ابن معاذؓ کے سامنے آگئے ۔ انس نے ان سے کہا ابو عمر! واہ! واہ! جنت کی ہوا کیا خوب ہے ۔ مجھے تو احد سے جنت کی ہوا آرہی ہے ۔ کہتے ہیں اس نے ان کے ساتھ جنگ کی اور وہ قتل ہو گئے ۔ ان کے جسم پر ۸۰ سے اوپر زخم تھے ۔ تیروں' تلواروں اور نیزوں کے ۔ ان کی بہن میری پھوپھی ربیع بنت نضر نے کہا میں نے اپنے بھائی کو اس کی انگلیوں کے پوروں سے پہچانا۔ کہتی ہیں ان پر یہ آیت نازل ہوئی :

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا (۳۳ : ۲۳) صحابہ کرامؓ کا خیال تھا کہ یہ آیت انس ابن نضر اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ۔ بے مثال مومنین کی یہ نہایت ہی روشن تصویر ہے ۔ یہاں ہم اس کا تذکرہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ ایمان کی حقیقت کیا ہوتی ہے ۔ اور نفاق کیا ہوتا ہے ۔ وفائے عہد کیا ہوتا ہے اور نقض عہد کیا ہوتا ہے ۔ یہ میدان تربیت گاہ کے درمیان تقابلی مطالعہ تھا۔
اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو ایسی آزمائشوں میں کیوں ڈالتا ہے اور جو لوگ وفائے عہد نہیں کرتے ان کا انجام کیا ہوتا ہے اور جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے ۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۲۴

(یہ سب کچھ اس لیے ہوا) "تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزا دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کر لے ' بے شک اللہ غفور و رحیم ہے"۔
قرآن کریم میں واقعات و حادثات پر ایسا تبصرہ آتا رہتا ہے ۔ مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ تمام معاملات اللہ کے اختیار میں ہیں ۔ ان واقعات کی حکمت بھی بتا دی جاتی ہے کہ کوئی واقعہ عبث یا یونہی پیش نہیں آجاتا۔ ہر واقعہ حکمت الٰہیہ کا حصہ ہوتا ہے اور مقررہ وقت پر آتا ہے ۔ اس کے پیچھے بامقصد تدبیر ہوتی ہے اور اس کے مقررہ نتائج نکلتے ہیں ۔ اللہ کے بندوں کے

لئے رحمت اور فضل اس میں عیاں ہوتا ہے اور یہ جان لینا چاہئے کہ اللہ کی رحمت اور اس کا فضل ہمیشہ عیاں ہوتا ہے۔

انَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳:۲٤) "بے شک اللہ غفور و رحیم ہے"۔ اور یہ عظیم واقعہ اس پر ختم ہوتا ہے کہ مومنین کا اپنے رب کے بارے میں جو یقین تھا وہ درست ثابت ہوا اور منافقین اور افواہیں پھیلانے والے غلط خیالات لیے ہوئے تھے۔ غرض ایمانی انداز آخر کار کامیاب رہیں۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾

"اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا، وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یونہی پلٹ گئے، اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا، اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے"۔

اس معرکے کا آغاز ہوا۔ یہ آگے بڑھا۔ اپنے انجام تک پہنچا لیکن پورے دور میں اس کی باگیں اللہ کے ہاتھ میں تھیں۔ جس طرح اللہ چاہتا تھا، واقعات کا رخ موڑ دیتا تھا۔ قرآن کریم اپنے انداز تعبیر کے ذریعہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو بھی واقعات ہوئے، وہ اللہ نے کرائے اور یہ بات اچھی طرح اہل ایمان کے دلوں میں بٹھا دی گئی۔ یوں اسلامی تصور حیات کو واضح کر دیا گیا۔

--- ○○○ ---

اب اس لشکرکشی کا وبال صرف مشرکین قریش، اور غطفان پر ہی نہ پڑا بلکہ مشرکین کے حلفاء بنی قریظہ بھی اس کی زد میں آگئے۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾

۳ ع ۷ ۱۹

"پھر اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا، اللہ ان کی گڑھیوں سے انہیں اتار لایا اور ان کے دلوں میں اس نے ایسا رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کر رہے ہو۔ اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

بنی قریظہ کا کیا قصہ تھا؟ اس کا تعلق مسلمانوں اور یہودیوں کے باہم تعلقات سے ہے۔ مناسب ہے کہ یہاں اس کی وضاحت کر دی جائے۔ یہودیوں نے اسلام کے ساتھ بہت ہی مختصر عرصہ کے لیے رواداری کا رویہ اپنایا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آتے ہی ان کے ساتھ باہمی امن کا معاہدہ کر لیا تھا اور ذمہ داری قبول فرمائی تھی کہ مسلمان ان کی نصرت اور حمایت کریں گے بشرطیکہ وہ غداری نہ کریں' فسق و فجور نہ کریں' جاسوسی نہ کریں دشمن کی حمایت نہ کریں' اور کسی مسلمان کو اذیت نہ دیں۔

بہت ہی تھوڑے دن گزرے تھے کہ یہودیوں نے یہ محسوس کیا کہ دین جدید ان کے لیے بھی خطرہ بن گیا ہے اور ان کی موروثی امتیازی حیثیت کہ وہ اہل کتاب ہیں' اب ختم ہو رہی ہے۔ یہ لوگ اہل یثرب کے درمیان اپنی اس امتیازی حیثیت کی وجہ سے ایک اہم مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مسلمانوں کی جدید صف بندی سے بھی خطرات محسوس کر لیے۔ اس سے قبل وہ اوس اور خزرج کے درمیان پائے جانے والے طویل اختلافات اور جنگوں سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس طرح مدینہ میں انہی کی بات ہوتی تھی۔ جب نبی کریمؐ کی قیادت میں اسلام نے ان روایتی دشمنوں کو باہم شیروشکر کر دیا تو یہودیوں کے وہ مفادات ختم ہو گئے جو وہ ان دونوں فریقوں سے حاصل کرتے تھے۔

جس بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا وہ یہ تھی کہ ان کے عالم اور مذہبی راہنما عبداللہ ابن سلام مسلمان ہو گئے۔ ان کا دل اسلام کے لیے کھل گیا۔ یہ مسلمان ہو گیا۔ اس نے اپنے خاندان سے بھی کہا تو وہ بھی مسلمان ہو گئے لیکن اس نے کہا کہ اگر وہ ایسے ہی اپنے اسلام کا اعلان کر دے تو یہودی الزام لگائیں گے تو انہوں نے رسول اللہؐ سے مطالبہ کیا کہ میرے بارے میں پہلے آپ ان سے پوچھ لیں۔ پہلے اس کے کہ میرے اسلام کا اعلان ہو' تو انہوں نے کہا یہ ہمارے سردار ہیں' سردار کے بیٹے ہیں۔ ہمارے حبر اور عالم ہیں۔ اس پر عبداللہ ابن سلام نکلے اور ان سے کہا کہ ایمان لاؤ چنانچہ انہوں نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور تمام یہودی قبائل کو ان کے بارے میں آگاہ کر دیا۔ اب انہوں نے محسوس کر لیا کہ ہمارے دین کو حقیقی خطرہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ ایسی سازشیں جو کبھی رکتی نہ تھیں۔ اس دن سے یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو جنگ شروع ہوئی وہ آج تک جاری ہے اور یہ میدان کارزار آج تک ٹھنڈا نہیں ہوا۔

پہلے یہ سرد جنگ تھی اور جوں جوں ہمارے مسلمانوں کے حالات خراب ہوتے رہے' یہ جنگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور اسلام کے خلاف جاری رہی۔ اس جنگ نے مختلف رنگ اور اسلوب اختیار کیے۔ پہلے انہوں نے جدید رسالت کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلائے۔ پھر جدید عقیدے پر الزامات لگائے۔ پھر انہوں نے مسلمانوں کے درمیان عداوتیں ڈالنا شروع کر دیں۔ اوس اور خزرج کو بار بار لڑانا چاہا۔ انصار اور مہاجرین کے درمیان انہوں نے دشمنی ڈالی۔ یہ مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ کے لیے جاسوسی بھی کرتے رہے۔ یہ پھر منافقین کے دوست بن گئے۔ ان منافقین کے ذریعے اسلامی صفوں میں فتنے ڈالتے۔ آخر کار یہ کھل کر سامنے آگئے اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف لشکر کشیاں کیں اور احزاب کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً غزوۂ احزاب کی شکل میں۔

ان کے اہم قبیلے بنی قینقاع اور بنی النضیر اور بنی قریظہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

مسلمانوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ تھا۔ بنو قینقاع یہودیوں میں سے بہت ہی دلیر تھے ۔ ان کے دل تو اس وقت جل اٹھے جب مسلمانوں کو بدر میں کامیابی ہوئی ۔ انہوں نے عہد کی خلاف ورزی شروع کر دی بلکہ عہد سے انکار ہی کر دیا اور ان کا خیال یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو کفار قریش کے ساتھ پہلے ہی معرکے میں کامیاب رہے ہیں لہٰذا اگر حالت یونہی رہی تو یہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔

ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ابن اسحاق کے ذریعہ سے ان کے یہ حالات درج کیے ہیں ۔ بنی قینقاع کا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ نے ان کو قینقاع کے بازار میں جمع کیا اور کہا: اے اہل یہود' اللہ سے ڈرو' جس طرح اللہ نے قریش پر وبال نازل کیا ہے' ویسا ہی حال تمہارا نہ ہو جائے ۔ اسلام قبول کر لو' تمہیں تو معلوم ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں ۔ یہ بات تمہاری کتاب کے اندر موجود ہے"۔ انہوں نے کہا اے محمدؐ' تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم قریش کی طرح ہیں ۔ تم اس بات پر مغرور نہ ہو جاؤ کہ تم ایک ایسی قوم پر غالب آگئے جنہیں جنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور تم نے انہیں مار لیا۔ اگر ہم نے تمہارے ساتھ جنگ کی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کیسے لوگ ہیں۔

ابن ہشام نے بواسطہ عبداللہ ابن جعفر نقل کیا ہے --- بنی قینقاع کا قصہ یوں ہوا کہ ایک عرب عورت دودھ لے کر آئی اور بنی قینقاع کے بازار میں اسے فروخت کیا' اس کے بعد وہ ایک سنار کے ہاں زیور بنانے کے لیے بیٹھ گئی ۔ انہوں نے یہ کوشش کی کہ اس عورت کے چہرے کو کھول دیں ۔ اس نے انکار کیا۔ سنار نے جھٹ اس کے کپڑے کو اس کی پیٹھ کے ساتھ باندھ دیا۔ جب وہ اٹھی تو اس کی شرم گاہ ننگی ہو گئی۔ اس پر وہ خوب ہنسے ۔ اس نے چلا کر مدد کے لیے پکارا۔ ایک مسلمان سنار پر ٹوٹ پڑا اور اسے قتل کر دیا۔ یہ یہودی تھا۔ تمام یہودی مسلمان پر ٹوٹ پڑے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ آوازیں ہوئیں ۔ تمام مسلمان قینقاع کے خلاف جمع کیے اور یوں ان کے درمیان شر شروع ہوا۔

ابن اسحاق نے بات یوں مکمل کی --- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا محاصرہ کیا۔ ان لوگوں نے حضورؐ کے حکم پر ہتھیار ڈال دیئے ۔ اس پر عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے کہا: "محمدؐ یہ لوگ میرے دوست ہیں ان کے ساتھ بھلائی کرو' یہ خزرج کے دوست تھے ۔ حضورؐ خاموش رہے ۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ یہ مطالبہ کیا کہ یہ میرے دوست ہیں ان کے ساتھ حسن سلوک کرو"۔ اس پر حضورؐ نے پھر اعراض فرمایا۔ اب اس نے حضورؐ کے زرہ کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ رسول اللہؐ نے اسے کہا مجھے چھوڑ دو ۔ آپؐ نے سخت غصہ میں فرمایا۔ یہاں تک کہ آپؐ کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے ۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا بدبخت چھوڑ دو مجھے ۔ اس پر اس نے کہا - خدا کی قسم میں آپؐ کو اس وقت نہ چھوڑوں گا جب تک آپؐ میرے دوستوں کے ساتھ احسان نہ کریں ۔ یہ چار سو شہ سوار اور تین سو زرہ پوش ہیں ۔ انہوں نے سرخ وسیاہ اقوام کے خلاف میری مدد کی ہے ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ان کو صبح کے تڑکے فصل کی طرح کاٹ دو ۔ میں ایک ایسا آدمی ہوں جو مشکلات سے ڈرتا ہوں ۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا تم جو چاہتے ہو وہی ہو گا۔

عبداللہ ابن ابی ابھی تک اپنی قوم میں ذی حیثیت تھا۔ چنانچہ رسول اللہؐ نے اس کی سفارش قبول کر لی اور فیصلہ یہ ہوا کہ بنی قینقاع مدینہ سے نکل جائیں ۔ وہ اپنے ساتھ اپنے مال لے جائیں ماسوائے اسلحہ کے ۔ یوں مدینہ یہودیوں کی ایک ٹکڑی سے خالی ہوا۔ یہ رجمنٹ بڑی قوت والی تھی۔

رہے بنی نضیر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر کے بعد سن چار ہجری میں ان کے پاس گئے ۔ آپ نے ان

سے دو مقتولین کی دیت میں شرکت کا مطالبہ کیا۔ حسب عہد انہوں نے یہ ادائیگی کرنی تھی۔ جب حضورؐ آئے تو انہوں نے کہا ہاں ابو القاسم ہم آپ کی امداد حسب خواہش کریں گے۔ اس کے بعد یہ لوگ علیحدہ ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ تم اس شخص کو کبھی ایسی حالت میں نہ پاؤ گے۔ اس وقت رسول ان کی ایک دیوار کے نیچے بیٹھے تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ کون ہے جو جاکر ایک پتھر گرائے تاکہ اس شخص سے ہماری جان چھوٹے۔

چنانچہ یہ لوگ اس سازش کو عملی جامہ پہنانے میں لگ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع دے دی گئی۔ حضورؐ اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ کی طرف لوٹ آئے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کے ساتھ جنگ کی تیاری کرو' یہ لوگ قلعہ بند ہو گئے۔ عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے ان کو پیغام بھیجا کہ ڈٹ جاؤ۔ ہم تمہیں ان کے سپرد نہ کریں گے۔ اگر جنگ ہوئی تو ہم تمہارے ساتھ مل کر جنگ کریں گے۔ اگر تمہیں نکالا گیا ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے۔ لیکن منافقین نے اپنا یہ عہد پورا نہ کیا۔ بنی نضیر کو اللہ نے مرعوب کر دیا۔ بلا حرب و قتال انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ انہوں نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ ان کو جلاوطن کر دیں اور قتل نہ کریں۔ اونٹوں پر وہ اسلحہ کے سوا جو کچھ لے جا سکتے ہیں' لے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ لوگ خیبر کو چلے گئے۔ بعض لوگ شام کو چلے گئے۔ حضورؐ نے یہ درخواست منظور کر لی۔ ان کے اشراف میں سے جو لوگ خیبر کو گئے' یہ لوگ تھے۔ سلام ابن ابوالحقیق' کنانہ ابن ابرہہ' حیی ابن اخطب۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے غطفان اور قریش کو جمع کیا مسلمانوں کے خلاف اور غزوۂ احزاب برپا کیا۔

اب رہا بنی قریظہ کا قصہ۔ غزوۂ احزاب میں انہوں نے جو کردار ادا کیا وہ معلوم ہو چکا ہے۔ یہ بھی مشرکین کے ساتھ جمع ہو گئے تھے۔ بنی نضیر کے زعماء کی تحریص اور آمادہ کرنے پر اور حیی ابن اخطب اس کام کا ذمہ دار تھا۔ بنی قریظہ کی عہد شکنی دوسرے احزاب کے مقابلے میں مسلمانوں پر بہت ہی گراں گزری۔ ان لوگوں کا رویہ کس قدر خطرناک تھا۔ اس کا اندازہ تم اس سے کر سکتے ہو کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی عہد شکنی کی اطلاعات ملیں تو آپ نے سعد ابن معاذ رئیس اوس کو ان کے پاس بھیجا۔ اور سعد ابن عبادہ رئیس خزرج بھی ساتھ ہوئے۔ ان کے ساتھ عبداللہ ابن رواحہ اور خوات ابن جبیر بھی گئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ذرا جاکر دیکھو کہ ہم تک جو اطلاعات پہنچ رہی ہیں وہ درست ہیں یا نہیں؟ اگر یہ اطلاعات درست ہوں تو میرے سامنے ایسے الفاظ میں رپورٹ دو کہ میں ہی سمجھوں اور مسلمانوں پر اس کا برا اثر نہ ہو اور اگر وہ وفا پر قائم ہوں تو پھر اعلانیہ کہہ دینا۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کس طرح سمجھتے تھے کہ لوگوں پر اس خبر کا اثر کیا ہو گا)

یہ وفد گیا تو دیکھا کہ یہ لوگ اطلاع سے بھی زیادہ خراب پوزیشن میں تھے۔ انہوں نے رسول اللہؐ کو برا بھلا کہا۔ اور کہا کون رسول' کس کی بات کرتے ہو۔ ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی عہد و معاہدہ نہیں ہے' وفد آیا۔ انہوں نے رسول اللہؐ کو اطلاع دی۔ اشاروں کے ساتھ۔ رسول اللہ نے فرمایا اللہ اکبر! مسلمانو تمہیں خوشخبری دی ہے (حضورؐ نے یہ الفاظ مسلمانوں کو ثابت قدم بنانے کے لیے کہے)۔

ابن اسحاق کہتے ہیں اب مصیبت دگنی ہو گئی۔ خوف پھیل گیا۔ اوپر اور نیچے سے دشمن آ گئے اور اب مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔ بعض منافقین کھل کر سامنے آ گئے۔

معرکہ احد سے پہلے تو یہ صورت حالات تھی۔ لیکن جب اللہ کے نبی کو جنگ احزاب میں اللہ کی نصرت ملی اور دشمنان

مسلمانان خائب و خاسر ہوئے' انہیں کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ اللہ نے خود ہی مومنین کی طرف سے جنگ کی۔ حضورؐ مدینہ کی طرف کامیاب لوٹے۔ لوگوں نے اسلحہ رکھنا شروع کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل جنگی حالت کی وجہ سے غسل کرنے لگے۔ آپ اُم سلمہ کے گھر تھے تو جبریل علیہ السلام آگئے۔ "حضورؐ آپ نے اسلحہ رکھ دیا ہے"۔ حضورؐ نے فرمایا "ہاں"۔ "لیکن ملائکہ نے تو اسلحہ نہیں رکھا اور میں ابھی اس قوم کا پیچھا کر کے آرہا ہوں"۔ اس کے بعد حضرت جبریل نے فرمایا "اللہ کا حکم ہے بنی قریظہ کی طرف پہنچو"۔ بنی قریظہ مدینہ سے کئی میل دور تھے۔ یہ واقعہ نماز ظہر کے بعد کا ہے۔ حضورؐ نے حکم دیا "کوئی شخص نماز نہ پڑھے مگر دیار بنی قریظہ میں" لوگ نکل پڑے۔ راستے میں نماز عصر کا وقت آ گیا۔ بعض لوگوں نے راستہ ہی میں نماز پڑھ لی اور انہوں نے کہا کہ رسول اللہؐ کا ارادہ صرف یہ تھا کہ جلدی پہنچو لیکن دوسروں نے کہا کہ ہم بنی قریظہ کی بستیوں سے ادھر نماز نہ پڑھیں گے لیکن اس پر کسی نے ایک دوسرے کو ملامت نہ کی۔ حضورؐ ان کے بعد پہنچے۔ مدینہ میں ابن ام مکتوم صاحب۔

عَبَسَ وَ تَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی کو والی مقرر کر دیا۔ جھنڈا حضرت علیؓ ابن ابو طالب کو دیا گیا۔ حضورؐ نے ان کا پچیس دنوں تک محاصرہ کیا اور ان کو کہا کہ ہتھیار ڈال دو۔ جب ان پر معاملہ طویل ہو گیا تو انہوں نے سعد ابن معاذ رئیس اوس کے حکم پر ہتھیار ڈال دیئے۔ جاہلیت میں یہ ان کے حلفاء میں سے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ان کے ساتھ احسان کریں گے۔ جس طرح عبداللہ ابن ابی ابن السلول نے اپنے دوستوں کے ساتھ کیا تھا اور ان کو رسول اللہ سے چھڑا لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سعد ابن معاذ بھی وہی کرے گا جو عبداللہ ابن ابی نے کیا۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ سعد کو ایک تیر بازو کی بڑی رگ میں لگا ہوا تھا۔ اور اگر یہ رگ کٹ جائے تو وہ زخمی ہرگز تندرست نہ ہوتا تھا۔ یہ خندق کے ابتدائی دنوں ہی میں لگ گیا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے داغ دھوئے تھے اور مسجد کے اندر ہی ایک خیمے میں انہیں رکھا ہوا تھا تاکہ حضورؐ سہولت کے ساتھ ان کی تیمار داری کر سکیں اور سعد یہ دعا کیا کرتے تھے اے اللہ! اگر آپ نے ہمارے اور قریش کے درمیان ابھی مزید جنگیں لکھی ہوئی ہیں تو مجھے زندہ رکھ اور اگر ہمارے ان کے درمیان جنگ ختم ہو چکی ہے تو پھر یہ زخم بہتا رہے اور پھر میری صرف یہ تمنا ہے کہ میری آنکھیں بنی قریظہ کے معاملے میں ٹھنڈی ہو جائیں۔ اللہ نے اس کی دعا قبول کی اور یہ مقدر کر دیا کہ وہ انہی کے فیصلے پر ہتھیار ڈال دیں اور یہ درخواست خود انہوں نے اپنی خوشی سے کی۔

اب رسول اللہؐ نے حضرت سعد کو مدینہ سے بلایا کہ وہ ان لوگوں کے بارے میں فیصلہ کریں۔ جب وہ آیا اور وہ ایک گدھے پر سوار تھا جو انہوں نے اس کے لیے خوب تیار کیا تھا تو اوس اس کے پاؤں پڑنے لگے۔ کہتے اے سعد ہم تیرے دوست ہیں۔ ان کے ساتھ احسان کرو' وہ تو منتیں کر رہے تھے کہ اس کے دل کو ان کے لیے نرم کر دیں۔ سعد ابن معاذ خاموش ہیں اور کچھ بھی نہیں کہہ رہے۔ جب انہوں نے اصرار کر لیا تو انہوں نے جواب دیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ سعد اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈرے۔ تو انہوں نے جان لیا ہے کہ سعد درست فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں۔

جب سعد اس خیمے کے پاس گئے جو رسول اللہ کا خیمہ تھا' تو حضورؐ نے فرمایا "اٹھو اپنے سردار کے احترام و استقبال

ہیں ۔ مسلمان اٹھے اور اسے اتارا۔بہت ہی اعزاز و احترام اور اکرام کے ساتھ ۔تاکہ ان کا فیصلہ اچھی طرح نافذ ہو۔

جب سعد بیٹھے توحضور اکرمؐ نے فرمایا ان لوگوں نے اشارہ بنی قریظہ کی طرف--- تمہارے فیصلے پر ہتھیار ڈالے ہیں ۔ لہٰذا آپ جو چاہیں ان کے بارے میں حکم دیں ۔ تو اس پر اس نے کہا"کیا میرا حکم ان پر نافذ ہو گا؟" حضور اکرمؐ نے فرمایا "ہاں" ۔"اور ان تمام لوگوں پر نافذ ہو گا جو اس خیمے میں ہیں؟" تو آپؐ نے فرمایا "ہاں" ۔پھر انہوں نے کہا اور وہاں جو لوگ ہیں ان پر بھی (اس وقت سعد نے حضور اکرمؐ کی جگہ کی طرف اشارہ کیا جبکہ وہ خود اپنا منہ بوجہ حیاء اور احترام و اکرام پھیرے ہوئے تھے) تو رسول اللہؐ نے فرمایا "ہاں" ۔اس پر سعد ابن معاذؓ نے فرمایا :"میں فیصلہ کرتا ہوں کہ ان کے جنگی لوگوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے اموال اور اولاد کو مال غنیمت بنا دیا جائے ۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا "تم نے بے شک اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے اور اللہ نے یہ فیصلہ سبع سموات کے اوپر کر دیا تھا" ۔

پھر حضورؐ نے حکم دیا کہ زمین میں گڑھے کھودے جائیں اور یہ لوگ باندھے ہوئے لائے گئے ۔ان کی گردنیں اڑا دی گئیں ۔ یہ لوگ سات آٹھ سو کے قریب تھے اور جو مرد عورتیں بالغ نہ تھے ان کو غلام بنا لیا گیا۔ مقتولین میں حیی ابن اخطب بھی تھا ۔یہ حسب معاہدہ ان کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا تھا ۔

اس وقت سے یہودی ذلیل ہوئے اور آج کے بعد مدینہ میں نفاق کی تحریک کمزور پڑ گئی ۔منافقین کے سر نیچے ہو گئے اور اس سے قبل وہ جو کچھ کرتے تھے اب اس سے ڈر گئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس دن کے بعد کفار نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کی ۔ بلکہ اب حملے مسلمانوں کی طرف سے ہوتے رہے ۔ یہاں تک کہ مکہ اور طائف فتح ہوئے ۔یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہودیوں' مشرکین مکہ اور منافقین کی تحریکات کا تانا بانا ملا ہوا تھا اور جب یہودی مدینہ سے جلاوطن ہوئے تو یہ ریشہ دوانیاں ختم ہو گئیں اور آج کے بعد اسلامی مملکت کی بنیاد مستحکم ہو گئی ۔یہ ہے پس منظر اس قول ربانی کا ۔

وَ اَنْزَلَ الَّذِیْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَیَاصِیْهِمْ وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ وَ تَاْسِرُوْنَ فَرِیْقًا (۲۶) وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِیَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا (۳۳ : ۲۷) "پھر اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا ان کی گڑھیوں سے انہیں اتار لایا اور ان کے دلوں میں اس نے اب رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کر رہے ہو؟ اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا ۔اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔صیاصی سے مراد قلعے ہیں اور وہ زمین جو مسلمانوں نے پامال نہ کی تھی وہ ارض بنو قریظہ تھی جو ان کی مملوکہ تھی ۔ان کے محلے کے ارد گرد اور یہ زمین بھی ان کے اموال کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھ آ گئی ۔ اور یہ اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ بنی قریظہ نے بغیر قتال کے زمین دے دی اور پامال کرنے سے مراد جنگ ہے ۔اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرًا (۳۳: ۲۷) ان تمام واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ یعنی تمام امور اللہ کے اختیارات میں ہیں ۔ اس پورے قصے میں تمام امور کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور تمام واقعات کو دست قدرت کا نتیجہ بتایا گیا ہے تاکہ باقی مسلمانوں کے دلوں میں اللہ واقعات کے ذریعے بٹھانا چاہتے ہیں اور واقعات کے بعد پھر قرآن کو نازل کر کے بٹھانا چاہتے ہیں کہ اسلامی تصور حیات صاف اور ستھرا دلوں میں بیٹھ جائے ۔

یوں یہ عظیم حادثہ یہاں اختتام کو پہنچا ۔ اس کے اندر بے شمار سنن الہیہ ' بے شمار اعلیٰ قدریں ' بے شمار ہدایات اور بے شمار اصول بیان کیے گئے تاکہ یہ چیزیں صاف صاف ہو کر جماعت مسلمہ کی زندگی کا حصہ بن جائیں ۔

یوں یہ واقعات تربیت کے لیے ایک اچھا مواد ہیں اور قرآن میں ان کو جگہ دے کر اسلامی نمونہ حیات کے لیے معیار اور راہنما بنا دیا گیا ۔ ان آیات کو اسلامی جماعت کا رخ قرار دیا اور ان کے تصورات کو اچھی طرح ان کی زندگی کے اندر بٹھا دیا گیا ۔ اسلامی جماعت کے لیے اعلیٰ قدریں واضح کر دی گئیں اور ان ابتلاؤں اور آزمائشوں میں اسلامی کردار نکھر کر سامنے آ گیا ۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ----- ۲۲

سورۃ الاحزاب ۔ ۳۳ آیات ۲۸ --- تا --- ۷۳

سورۃ سبا ۔ ۳۴ آیات ۱ --- تا --- ۵۴

سورۃ فاطر ۔ ۳۵ آیات ۱ --- تا --- ۴۵

سورۃ یٰسین ۔ ۳۶ آیات ۱ --- تا --- ۲۱

درس نمبر ۱۹۰ تشریح آیات

۲۸ --- تا --- ۳۵

یہ سورہ احزاب کا تیسرا سبق ہے اور یہ ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص ہے۔ ماسوائے اس کے آخری فقرے کے جس میں تمام مسلمین اور مسلمات کے لیے اجر عظیم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سورہ کے آغاز میں ازواج مطہرات کو امہات المومنین کا لقب دیا گیا تھا اور اس لقب کے فرائض بھی بتائے گئے تھے اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس صفت کی وجہ سے ان کو بہت ہی عظیم مقام نصیب ہوا ہے۔ اس لقب کے بھی فرائض ہیں اور رسول اللہ کی بیویاں ہونے کی وجہ سے بھی فرائض ہیں۔ اس سبق میں ان فرائض کا ایک حصہ بیان ہوا ہے اور وہ اقدار بتائی گئی ہیں جن کے اعتبار سے گھرانہ نبوت ایک مثال ہونا چاہئے اور یہ ایک ایسا مقام ہونا چاہئے جس سے لوگ روشنی حاصل کریں یعنی گھرانہ نبوت روشنی کا مینار ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

”اے نبی“ اپنی بیویوں سے کہو اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے“۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نفس اور اپنے اہل بیت کے لیے بقدر کفاف زندگی بسر کرنے کا راستہ اختیار کیا، یہ اس وجہ سے نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وسائل نہ تھے۔ عربوں کے ایک بڑے علاقے کو آپ نے فتح کر لیا تھا، اموال غنیمت کی کثرت تھی، اور صدقات بہت جمع ہو رہے تھے۔ وہ لوگ بھی غنی ہو گئے جن کے پاس اس سے قبل نہ مال تھا اور نہ اخراجات کے لیے کچھ تھا۔ ان جیسے حالات کے باوجود ایک ایک مہینہ گزر جاتا اور حضور کے ہاں چولہا نہ جلتا اور حضور کے پاس جو کچھ آتا آپ بطور ہبہ، صدقہ اور ہدیہ لوگوں میں بانٹ دیتے۔ لیکن یہ زندگی حضور نے اس لیے اختیار کی کہ آپ اس دنیا اور متاع دنیا کو بھی فتح کرنا چاہتے تھے اور صرف اللہ کے لیے خالص

ہونا چاہتے تھے - حضور اکرم اپنی یہ خواہشات پوری کرنے کی پوزیشن میں تھے لیکن آپ نے ان رغبات کو رضاکارانہ طور پر ترک فرما دیا اور بلند رویہ اختیار کیا - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عقیدے یا اپنی شریعت کی رو سے اس بات کے پابند نہ تھے کہ وہ یہ رویہ اختیار کریں اور اپنے اہل و عیال اور گھر والوں کو بھی اسی طرح رکھیں کیونکہ اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی شریعت کی رو سے طیبات حرام نہ تھیں - جب آپ کے سامنے یہ طیبات پیش کی جاتیں تو آپ ان کے تناول کرنے سے کبھی انکار نہ فرماتے - بلا تکلف آپ استعمال فرماتے بشرطیکہ یہ چیزیں روٹین میں آپ کے سامنے آجائیں ' آپ خواہش لے کر ان کے پیچھے کبھی نہ جاتے اور نہ ان طیبات میں ڈوب جاتے اور اپنے آپ کو ان میں مشغول کر لیتے - آپ نے اپنی امت کو بھی اس بات کا حکم نہیں دیا کہ عام لوگ بھی آپ کی طرح زہد اور ورع اختیار کریں - ہاں جو شخص رضاکارانہ طور پر چاہے تو اختیار کرلے یعنی اپنے آپ کو لذائذ اور دنیا کی عیش و عشرت سے بلند کرتے ہوئے اور دنیا کی رغبات اور سازو سامان کے بوجھ سے اپنے آپ کو سربلند کرتے ہوئے ' اور ان بکھیڑوں سے اپنے آپ کو آزاد کرتے ہوئے -

لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات بہرحال عورتیں تھیں ' بشر تھیں - ان کے اندر بھی انسانی خواہشات تھیں - ان کی فضیلت ' ان کی کرامت اور سرچشمہ نبوت سے ان کے قرب کے باوجود ان کے دلوں میں بھی قدرتی خواہشیں اور چاہتیں ان کے نفوس کے اندر بھی زندہ تھیں - جب اللہ نے نبی پر اور مسلمانوں پر ہر طرف سے مال و دولت کے دروازے کھول دیئے تو انہوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسب نفقات کے سلسلے میں کچھ مطالبات کیے - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس مطالبے پر خوشی کا اظہار نہ کیا بلکہ آپ کو یہ مطالبہ ناگوار لگا اور آپ نے ناراضی کا اظہار کیا - کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان حالات میں زندگی بسر کرنا چاہتے تھے جو اللہ ان کے لیے پسند فرماتے تھے یعنی آزادی ' بلندی اور قناعت اور معیار زندگی کے بارے مکمل لاپرواہی اور اس کے بارے میں معمولی مصروفیت سے بھی اجتناب اور آپ کی خواہش یہ تھی کہ آپ کی زندگی اور آپ کے زیر سایہ رہنے والوں کی زندگی دنیا کے تمام شوائب سے پاک اور بلند افق پر ایک روشن مثال نظر آئے - اس نقطہ نظر سے نہیں کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے ؟ کیونکہ حلال اور حرام تو قرآن نے بیان کر دیئے تھے بلکہ اس زاویہ سے کہ آپ اپنے آپ کو زندگی کی ضروریات اور اس دنیا کی خواہشات اور دنیا کے جھمیلوں سے آزاد اور سربلند رکھنا چاہتے تھے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ازواج مطہرات کے ان مطالبات سے اس قدر دکھ پہنچا کہ آپ نے صحابہ کرام کے ساتھ مجلس عام بند کر دی اور آپ گھر ہی میں بیٹھ گئے - صحابہ کرامؓ تو ہر بات برداشت کر سکتے تھے لیکن حضورؐ کا ان میں نہ بیٹھنا یہ ان کے لیے قابل برداشت نہ تھا - لوگ آئے ' حضورؐ نے ان کو ملاقات کی اجازت نہ دی - امام احمد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے - حضرت ابوبکر تشریف لائے اور لوگ آپ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے تھے - تو آپ نے اجازت نہ دی - پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے اور انہوں نے اجازت طلب کی تو ان کو بھی اجازت نہ دی گئی - حضورؐ اندر بیٹھے ہوئے تھے - اس کے بعد حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کو اجازت دے دی - یہ دونوں اندر حضورؐ کے پاس گئے - حضورؐ بیٹھے ہوئے تھے - آپ کے ارد گرد ازواج مطہرات بیٹھی ہوئی تھیں اور آپ خاموش تھے - حضرت عمرؓ نے کہا کہ میں ایسی بات کروں گا کہ حضور اکرم ہنس پڑیں گے - حضرت عمرؓ نے کہا رسول خدا ! ابھی آپ کے سامنے اگر زید کی بیٹی ' میری بیوی ' مجھ سے نفقہ طلب کرے تو میں اس کی گردن توڑ دوں - اس پر حضورؐ ہنس پڑے یہاں تک کہ آپؐ کے دانت مبارک نظر آگئے - حضورؐ

نے فرمایا: یہ سب میرے گرد جمع ہوگئی ہیں اور یہ نفقہ ہی مانگ رہی ہیں"۔ حضرت ابوبکر اٹھے کہ حضرت عائشہؓ کو ماریں اور حضرت عمرؓ اٹھے کہ حفصہ کو ماریں۔ دونوں یہ کہہ رہے تھے کہ تم دونوں ہرگز نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کچھ نہ مانگو جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مارنے سے روک دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس مجلس کے بعد ہم رسول اللہؐ سے وہ کچھ نہ مانگیں گی جو آپؐ کے پاس نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ نے خیار نازل کر دیا ہے۔ حضورؐ نے حضرت عائشہ سے شروع کیا۔ حضورؐ نے فرمایا میں تمہارے سامنے ایک بات رکھتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ اس کے بارے میں جلدی نہ کریں اور اپنے والدین سے مشورہ کریں۔ انہوں نے کہا کیا ہے وہ؟ حضورؐ نے فرمایا

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ (۳۳:۲۸) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا "کیا میں آپ کے بارے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں! میں تو اللہ اور رسول کو اختیار کرتی ہوں اور میری درخواست ہے کہ آپ دوسری عورتوں سے اس کا ذکر نہ کریں کہ میں نے آپ کو چن لیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ نے مجھے سختی کرنے والا نہیں بنا کر بھیجا بلکہ معلم اور آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ جو عورت بھی مجھ سے پوچھے کہ عائشہ نے کیا فیصلہ کیا ہے تو میں ضرور انہیں بتاؤں گا۔ (مسلم)

بخاری میں ابو سلمہ، ابن عبدالرحمن اور عائشہ سے روایت ہے کہ جب اللہ نے اپنے رسول کو یہ حکم دیا کہ اپنی بیویوں کو اختیار دے دیں تو آپ سب سے پہلے میرے پاس آئے۔ اور یہ فرمایا میں ایک بات آپ کے سامنے رکھتا ہوں لیکن آپ پر لازم نہیں ہے کہ آپ جلدی فیصلہ کر دیں۔ مناسب ہے کہ والدین سے مشورہ کر لیں۔ حضورؐ کو معلوم تھا کہ میرے والدین مجھے یہ مشورہ نہ دیں گے کہ تم رسول اللہؐ کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد رسول اللہ نے یہ پڑھا:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ (۳۳:۲۸) "میں نے کہا کہ میں کس معاملے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں، اللہ اور رسولؐ کے بارے میں یا دارالآخرۃ کے بارے میں۔

قرآن کریم کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی تصور حیات کے لیے مستقل قدریں وضع کر دے اور ان قدروں کا مجسم اور زندہ ترجمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے میں ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کی ترجمان ہو اور یہ ترجمانی بیت نبوت میں نہایت ہی وضاحت اور تفصیل سے ہو کیونکہ یہ گھرانہ پورے کرۂ ارض کے مسلمانوں کے لیے روشنی کا مینار تھا اور رہنے والا تھا۔ ازواج مطہرات کو اختیار دینے والی یہ دو آیات نازل ہوئیں اور ان آیات نے طریقہ کار متعین کر دیا۔ وہ طریقہ اور منہاج یہ ہے کہ یا تو تم لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت اختیار کر سکو گی یا اللہ اور رسول اللہ اور دار آخرت کو حاصل کر سکو گی۔ انسان کا دل ایک ہوتا ہے اور اس ایک دل میں دو متضاد باتیں بیک وقت نہیں سما سکتیں۔ اللہ نے کسی ایک جسم میں دو دل پیدا نہیں کیے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ (۳۳:۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج نے یہ تو وعدہ کر لیا تھا کہ آج کی مجلس کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف وہ کچھ طلب کریں گے جو آپ کے پاس ہے۔ وہ نہیں طلب کریں گی جو آپ کے پاس نہیں۔ اس کے بعد پھر قرآن کریم کی ہدایت آئی تاکہ اصل مسئلہ کا فیصلہ کر

دے ۔ مسئلہ یہ نہ تھا کہ آپ کے پاس کچھ تھا یا نہ تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ اللہ ' اللہ کے رسول اور دار آخرت کو تمام چیزوں پر ترجیح دے دیں یا وہ دنیا کی زینت کے اسباب اختیار کر لیں ۔ چاہے پوری دنیا کا مال و اسباب ان کے ہاتھ میں ہو یا ان کے گھر خرچے سے بھی خالی ہوں ۔ اس تخییر کے بعد سب نے اللہ اور رسول اللہؐ اور دار آخرت کو چن لیا اور وہ ایسی ہو گئیں جس کا تقاضا وہ مقام کرتا تھا جس میں وہ تھیں ۔ وہ رسول کرمؐ کے گھر میں تھیں ۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس اختیار کے نتیجے میں بہت خوش ہوئے ۔

مناسب ہے کہ اس واقعہ پر ہم قدرے غور کریں اور اس کے بعض گوشوں کو واضح کریں ۔ یہ واقعہ اسلام کی قدروں کو بہت ہی واضح شکل میں پیش کرتا ہے اور دنیا اور آخرت کا شعوری احساس انسان کے اندر پیدا کرتا ہے ۔ یہ واقعہ انسانوں کے دل سے ہر قسم کی غیر یقینی صورت حال اور ہر قسم کا شف شف ختم کر کے رکھ دیتا ہے کہ کبھی ایک مسلمان دنیا پرست ہو جائے اور کبھی آخرت پرست ۔ کبھی وہ بندۂ نفس ہو اور کبھی بندۂ خدا ہو ۔ اللہ کے ساتھ خلوص اور آخرت کی فکر کی راہ میں جو بات بھی رکاوٹ بنتی ہے ' یہ واقعہ اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے ۔

یہ تو ایک پہلو ہے ' دوسرا پہلو یہ ہے کہ حضورؐ کی حقیقی زندگی اس واقعہ سے ہمارے سامنے آتی ہے اور پھر ان انسانوں کی حقیقی زندگی بھی ہمارے سامنے آتی ہے جو حضورؐ کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے ۔ اس زندگی میں جو اعلیٰ درجے کی خوبصورتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ زندگی انسانوں کی ایک معیاری زندگی ہے ۔ یہ لوگ بشر تھے ۔ بشریت کے خواص اور تقاضے ان سے سلب نہ کر لیے گئے تھے ۔ ان کا شعور انسانی تھا اور ان کے خصائص انسانی تھے ۔ باوجود اس کے کہ وہ بہت ہی اعلیٰ درجے کے بشر تھے ' باوجود اس کے کہ وہ اللہ اور آخرت کے ساتھ اعلیٰ درجے کا خلوص رکھتے تھے ' انسانی خواہشات اور انسانی شعور ان نفوس قدسیہ کے اندر سے ختم نہ کر دیا گیا تھا البتہ یہ نفوس بہت ہی سربلند ہو گئے تھے ۔ وہ دنیا کی آلودگیوں سے پاک ہو گئے تھے ۔ اس کے باوجود ان کی انسانیت ' طبیعت اور ان کی میٹھی زندگی موجود تھی ۔ ان کے راستے میں کوئی ایسی رکاوٹ نہ آ سکتی تھی جو ان کو اس مقام بلند تک پہنچنے سے روکتی جو انسانوں کے لیے مقدر تھا۔

انسان بعض اوقات یہ غلطی کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے لیے غیر حقیقی زندگی کے تصورات اپناتے ہیں یا ہم ان کو انسان کامل نہیں سمجھتے بلکہ تمام انسانی جذبات اور خواہشات ہی سے ان کو پاک کر دیتے ہیں ۔ ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کو بلند درجہ دیتے ہیں ۔ ہم ان کو پاک تصور کرتے ہیں اور ان کو نقص اور ضعف سے پاک سمجھتے ہیں ۔

یہ پوری غلطی ہے کہ اس طرح ہم ان نفوس قدسیہ کو غیر حقیقی شخصیات بنا دیتے ہیں ۔ ہم ان کے گرد اوہام کا ایک ایسا ہالہ بنا دیتے جس کے اندر ان کی کامل درجے کی انسانی صفات غائب ہو جاتی ہیں اس لیے ہمارے اور ان کے درمیان بشری رشتہ ختم ہو جاتا ہے اور ہمارے احساس کے اندر اس ہالہ کے اندرون ایسی شخصیات بن جاتی ہیں جو موہومہ شخصیات ہوتی ہیں ۔ ہم نہ ان کو چھو سکتے ہیں اور نہ ان کو ہاتھ لگا سکتے ہیں اور ہمارے شعور کے اندر یہ بات آ جاتی ہے کہ شاید وہ ایک ایسی مخلوق تھے جو ہمارے جیسے نہ تھے ۔ وہ ملائکہ تھے یا ایسے لوگ تھے جو انسانی خواص سے عاری تھے ۔ باوجود اس تصور اور تصویر کی خوبصورتی کے ' ہم اس کے دائرے سے دور ہو جاتے ہیں ۔ نہ ہم ان کے ساتھ ہم محفل ہو سکتے ہیں اور ان سے متاثر ہو سکتے ہیں ۔ اس کے نتیجے میں ہمارے اندر ایک مایوسی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم ان جیسے کیسے بن سکتے ہیں ' ہم

ان جیسے کام کیسے کر سکتے ہیں؟ اور اس طرح سیرت رسولؐ اور سیرت صحابہؓ کا ایک اہم عنصر اور اہم محرک ہم سے چلا جاتا ہے یعنی ہمارے شعور کے اندر ان حضرات کی تقلید سے مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے اندر ان کا رعب بیٹھ جاتا ہے اور ہم ان کو فوق الفطرت مخلوق سمجھنے لگتے ہیں۔ ہماری واقعی اور عملی زندگی پر ان کا اثر نہیں ہوتا۔ پھر ہمارے اور ان شخصیات کے درمیان ہم آہنگی نہیں رہتی کیونکہ ہم ان کے ساتھ ہم آہنگ تب ہی ہو سکتے ہیں اور ان کے ہمقدم تب ہی ہو سکتے ہیں۔ جب ہم یہ شعور رکھتے ہوں کہ یہ لوگ در اصل انسان تھے 'بشر تھے۔ وہ انسانی جذبات 'میلانات' اور خواہشات رکھتے تھے اور اس اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے وہی میلانات' جذبات اور خواہشات ہم بھی رکھتے ہیں۔ لیکن ہم ان کی طرح سربلند نہیں ہوتے اور وہ ہو گئے۔

اس سے وہ حکمت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے رسولوں کو انسان اور بشر بنایا۔ نہ ملائکہ بنایا اور نہ کوئی دوسری مخلوق بنایا' تاکہ رسولوں اور ان کے متبعین کے درمیان حقیقی ربط قائم ہو۔ یہ متبعین محسوس کریں کہ رسول اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ ویسے ہی جذبات' ویسا ہی شعور اور ویسی ہی سوچ اور ویسی ہی خواہشات رکھتے تھے جیسی ہم رکھتے ہیں لیکن انہوں نے باطن کو صاف کیا۔ اپنے آپ کو دنیا کی آلودگیوں سے ہلکا کیا۔ اس طرح وہ جلدی سے اٹھ کر مقام بلند تک پہنچ گئے لہٰذا متبعین انسانوں کی طرح رسولوں سے محبت کرتے تھے جس طرح ایک چھوٹا انسان بڑے انسان کا احترام کرتا ہے۔

پھر اس واقعہ میں ازواج مطہرات کی طبیعی خواہشات بھی سامنے آتی ہیں کہ ان کے گھر میں بھی سازوسامان ہو۔ پھر حضور اکرمؐ کے گھر کا ماحول سامنے آتا ہے اور اس میں ازواج مطہرات ایک بشر کی طرح اپنے خاوند سے اچھے حالات کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ حضور اکرمؐ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان کی گردن توڑ دیں البتہ اللہ تعالیٰ نہایت ہی شائستگی کے ساتھ ان پر جسمانی ضرب سے زیادہ سخت ضرب لگاتے ہیں۔ مارتے اس لیے نہیں کہ مسئلہ انسان کی جائز خواہشات کا ہے' اسے پورا کیا جانا چاہئے اور خواہشات کو دبانا نہیں چاہئے۔ یہ معاملہ یوں ہی رہ جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تخییر نازل فرماتے ہیں۔ ایسا اختیار جس میں ضرب نہیں ہے۔ کوئی دباؤ نہیں ہے' مکمل آزادانہ اختیار ہے اور جب وہ آزادانہ اختیار کو بھی اپنی آزادی کے لیے نہیں بلکہ رسول کی غلامی کے لیے استعمال کرتی ہیں تو حضورؐ بہت خوش ہوتے ہیں۔

پھر اس واقعہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں حضرت عائشہ کے لیے جذبہ محبت ہے اور وہ ہر میلان سے محبت کرتے ہیں۔ آپؐ چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت عائشہ اس مقام عالی پر فائز ہونے کا اعلان کر دیں جو اللہ کو حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے لیے پسند ہے۔ اس لیے آپ یہ تجویز سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کے سامنے رکھتے ہیں اور آپ کی خواہش یہ ہے کہ وہ آپؐ کے ساتھ اس مقام بلند میں تعاون کریں اور دنیاوی آلودگیوں سے پاک ہو جائیں اس لیے آپ ان کو مشورہ دیتے ہیں کہ پیش آنے والی بات کے معاملے میں جلدی فیصلہ نہ کریں اور والدین سے مشورہ کے بعد فیصلہ کریں۔ حضورؐ کو یقین تھا کہ وہ بہرحال آپؐ کے حق میں مشورہ دیں گے اور یہ جذبہ محبت جو حضرت عائشہ کے ساتھ تھا' اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ کی جانب سے بھی کسی غلطی کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ وہ بھی اسے پاتی ہیں۔ یہ جذبہ انہیں بھی خوش کرتا ہے اور وہ اسے ریکارڈ پر لاتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ بھی ایک بشر ہیں اور وہ اپنی اس چھوٹی بیوی سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ پسند فرماتے ہیں

کہ وہ اس افق تک بلند ہو جائے جس تک آپ ؐ چاہتے ہیں اور آپ ؐ کے ساتھ اس مقام بلند پر رہیں اور آپ ؐ کے ساتھ اس شعور میں حصہ دار ہوں کہ اعلیٰ قدریں کیا ہوتی ہیں ' جن کو اللہ حضور ؐ کے لیے پسند فرماتے ہیں اور آپ کے اہل بیت کے لیے پسند فرماتے ہیں ۔یوں حضرت عائشہ ؓ بھی ایک بشر ہیں اور اللہ نے ان کے خاوند کے دل میں ان کے لیے ایک اچھا مقام پیدا کر دیا ہے ۔وہ اس پر بہت خوش ہیں ۔پھر وہ اس پر بھی خوش ہیں کہ آپ ؐ اس کے والدین کی امداد بھی چاہتے ہیں کہ وہ اس مقام بلند کا انتخاب کریں جو رسول اللہ ان کے لیے پسند کرتے ہیں ۔پھر وہ جب اللہ اور رسول کو اختیار کرتی ہیں تو وہ حضور ؐ سے درخواست کرتی ہیں کہ ان کا یہ فیصلہ دوسری ازواج مطہرات کو نہ بتایا جائے تاکہ وہ منفرد رہیں یا بعض کے مقابلے میں ممتاز رہیں ۔اور دوسری جانب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کہ آپ ان سے کہتے ہیں۔

ان اللہ لم یبعثنی ھنھا ولکن بعثنی معلما میسرا "مجھے اللہ نے سخت گیر بنا کر نہیں بھیجا بلکہ معلم اور سہولت دینے والا بنایا ہے"۔اس لیے آپ ؐ نے فرمایا کہ مجھ سے جو بھی پوچھے گی میں تو بتاؤں گا۔اس لیے آپ نے کسی بھی بیوی سے ایسی بات چھپانا مناسب نہ سمجھا جس سے کسی کار خیر میں مدد مل سکتی ہو۔ لہٰذا ان کو اندھیرے میں رکھ کر ان سے امتحان لینا مناسب نہیں تھا بلکہ اس امتحان میں ان کی جس قدر معاونت ہو سکتی تھی ' کی گئی ۔تاکہ دوسری ازواج بھی دنیا پر خدا ' رسول ؐ اور آخرت کو ترجیح دے کر سربلند ہو جائیں اور دنیاوی آلودگیوں سے صاف ہو جائیں ۔

یہ بشری خدوخال نہایت اہم ہیں ۔سیرت کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں چاہئے کہ ہم ان کے آثار نہ مٹائیں اور نہ ان کو مہمل چھوڑ دیں اور نہ یہ مناسب ہے کہ ان کی قدر و قیمت کم کر دیں ۔ان کا صحیح طرح ادراک کرنا ہی ہمیں رسول اللہ ؐ کی ذات اور صحابہ کرام ؓ کی شخصیات سے اچھی طرح مربوط کر سکتا ہے ۔یہ رابطہ زندہ رابطہ ہو گا۔ان میں باہم محبت اور ہم آہنگی پیدا ہو گی اور انسانوں کے دل میں ان ذوات سے ہمدردی پیدا ہو کر ہم ان کی اقتداء کر سکیں گے ۔

اس نوٹ کے بعد اب ہم نص قرآن کی طرف آتے ہیں ۔اب ہم دنیا اور آخرت کے فرق کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں اور یہ بات بھی اچھی طرح ہماری سمجھ میں آ چکی ہے کہ اللہ نے کسی انسان کے سینے میں دو دل نہیں رکھے ۔یہ حقیقت ہمارے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ایک عملی مثال میں پیش کر دی گئی ہے جس میں آپ کے اہل بیت بھی فریق تھے ۔اب اہل بیت النبی سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم لوگ تقویٰ کی راہ اختیار کرو تو تمہارے لیے رزق کریم ہو گا اور اگر تم نے برے کام کیے تو تمہارے مقام کے حساب سے تمہاری سزا بھی بہت بڑی ہو گی ۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

"نبیؐ کی بیویو' تم میں سے جو کسی صریح فحش حرکت کا ارتکاب کرے گی اسے دوہرا عذاب دیا جائے گا' اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی اس کو ہم دوہرا اجر دیں گے اور ہم نے اس کے لیے رزق کریم مہیا کر رکھا ہے"۔

یہ اس بلند مقام کا تقاضا ہے جس پر وہ فائز ہیں ۔ وہ سرور دوعالم کی بیویاں ہیں ۔ ان کو امہات المومنین کا مرتبہ دیا گیا ہے اور یہ دونوں اعزاز ان پر بہت ہی بھاری ذمہ داریاں عائد کرتے ہیں ۔ ان کا پہلا تقاضا ہے کہ تم تمام فاحشات سے مکمل اجتناب کرو' اگر بفرض محال ان میں سے کسی نے بھی فحاشی کا ارتکاب کیا تو اسے دوہرا عذاب دیا جائے گا اور اس فرضی دھمکی کے ذریعے دراصل بتانا یہ مقصود ہے کہ وہ کس قدر بلند مقام پر فائز ہیں اور اس کے تقاضے کیا ہیں۔

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرًا (۳۳ : ۳۰) "اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے"۔ رسول اللہؐ کی بیویاں ہونے کے باوجود بھی اللہ کو کوئی نہیں روک سکتا کہ تمہیں سزا نہ دے ۔ ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ رسول مختار صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو سزا دینے میں شاید کوئی رکاوٹ ہو' اس لیے تردید کر دی گئی۔

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا (۳۳ : ۳۱) "اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گی اور نیک کام کرے گی"۔ قنوت کے معنی طاعت اور خضوع وخشوع ہیں اور عمل صالح قنوت کا صحیح ترجمہ ہے۔

نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ (۳۳ : ۳۱) "تو اس کو ہم دہرا اجر دیں گے"۔ جس طرح ان میں سے اگر کوئی فحاشی کا ارتکاب کرے تو سزا دگنی ہوگی۔

وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا (۳۳ : ۳۱) "اور ہم نے اس کے لیے رزق کریم مہیا کر رکھا ہے"۔ وہ حاضر ہے' تیار ہے' دوگنے اجر کے بعد رزق کریم مزید ہے' یہ اللہ کا فضل وکرم ہوگا۔

--- ○○○---

اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ نبی کی ازواج مطہرات عام عورتوں کی طرح نہیں ہیں لہٰذا لوگوں کے حوالے سے بھی ان کے کچھ فرائض ہیں اور اللہ کی بندگی کرنے میں بھی ان کے کچھ فرائض ہیں ۔ گھروں میں بھی ان کے فرائض ہیں ۔ بتایا جاتا ہے کہ اس عظیم گھرانے کا نگہبان اللہ خود ہے ۔ اللہ اس گھرانے کی زندگی کو پاک وصاف کرنا چاہتا ہے ۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارے گھروں کے اندر جس حکمت اور آیات الٰہیہ کا نزول ہو رہا ہے اس کے حوالے سے تم پر خاص ذمہ داریاں ہیں اور یہ گھریلو ماحول تمہیں تمام جہان کی ازواج اور عورتوں سے ممتاز کرتا ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا

مَعْرُوفًا ﴿۳۲﴾ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴿۳۳﴾ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا ﴿۳۴﴾

"نبیؐ کی بیویو، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔ یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں، بے شک اللہ لطیف اور باخبر ہے۔

جب اسلام آیا تو اس وقت عربی معاشرے میں، تمام دوسرے جاہلی معاشروں کی طرح حالت یہ تھی کہ عورت کو سامان تعیش سمجھا جاتا تھا اور فقط شہوت رانی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی نقطہ نظر سے اسے ایک گری ہوئی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ نیز عربی معاشرے میں جنسی اعتبار سے بھی بڑی بے قاعدگی اور افراتفری پائی جاتی تھی اور نظام خاندانی میں ثبات نہ تھا جس طرح اس سورہ میں ہم نے تفصیلات دی ہیں۔

پھر جاہلیت کے زمانے میں عورت کی صنف کی طرف نہایت گری ہوئی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور ذوق جمال بھی نہایت گرا ہوا تھا۔ ننگے اجسام کی طرف زیادہ توجہ تھی اور اعلیٰ اور پاکیزہ ذوق جمال مفقود تھا۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار کے اندر یہ خصوصیات اچھی طرح نظر آتی ہیں جو عورت کے جسم خصوصاً عورتوں کے اندامہائے نہانی کے بارے میں تھیں اور پھر نہایت ہی عریاں افعال اور معانی سے متعلق اشعار سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

جب اسلام آیا تو اس نے عورت کو معاشرے میں ایک باعزت مقام دیا اور مرد اور عورت کے درمیان تعلق کے معاملے میں انسانی پہلو کو زیادہ اہمیت دی۔ کیونکہ مرد اور عورت کا تعلق محض جسمانی بھوک کو فرو کرنے ہی کا تعلق نہیں ہوتا اور نہ خون اور گوشت کے جوش کو ٹھنڈا کرنا مطلوب ہوتا ہے بلکہ مرد اور عورت کا تعلق دراصل دو انسانی شخصیات کا اتصال ہے جن کو نفس واحد سے پیدا کیا گیا ہے اور ان کے درمیان محبت اور شفقت پیدا کی گئی ہے۔ ان کے ملاپ کی وجہ سے دونوں کو راحت اور سکون ملتا ہے اور دونوں کے ملاپ کا ایک ہدف مقرر ہے اور اس وقت سے مقرر ہے جب سے اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ پھر اس کا مقصد زمین کی آبادی ہے۔ اس میں انسان نے سنن الہیہ کے مطابق جو فرائض ادا کرنے ہیں، ان کا ادا کرنا ہے۔

اسلام نے خاندانی تعلقات کو لیا اور خاندانی تعلقات کو اس طرح منظم کیا کہ اسلام کی اجتماعی تنظیم کے لیے اسے اساس بنایا اور پھر خاندان کو ایک ایسی نرسری قرار دیا جس کے اندر آیندہ نسلوں کے لیے پودے تیار ہوتے ہیں اور اس نرسری کی نشوونما اور ارتقا اور تربیت کے لیے تمام ضروریات فراہم کیں اور اسے بچانے، پاک و صاف رکھنے کے

انتظامات کیے ، خصوصا نئی نسل کے شعور اور خیالات کو پاک و صاف رکھنے کے لیے۔

اسلام کے نظام قانون میں خاندانی نظام کی حفاظت کے لیے سب سے زیادہ قانون سازی کی گئی ہے اور قرآن کریم کی کئی آیات اس کے لیے مخصوص ہیں۔ قانونی اقدامات کے علاوہ بھی اسلام کے نظام اجتماعی کے اس ابتدائی یونٹ کو محفوظ کرنے کے لیے اسلام نے مسلسل ہدایات دی ہیں ، خصوصاً اس یونٹ کی روحانی تطہیر کے لیے اور اس میں دو اصناف کے جنسی تعلق کے زاویہ سے ، اس تعلق کو عریانی ، بے راہ روی سے پاک کیا گیا اور محض جسمانی ملاپ کے لیے بھی سخت ہدایات دی گئیں۔

اس سورہ میں بھی اجتماعی تنظیم اور خاندانی نظام کی پختگی کے لیے آیات کا ایک بڑا حصہ وقف ہے۔ آیات زیر بحث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو خطاب ہے۔ ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق ، ان کا لوگوں کے ساتھ تعلق ، ان کا اللہ کے ساتھ تعلق ، اور ان کے بارے میں اللہ کے ارادے کا ذکر کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا

(۳۳:۳۳) (اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے"۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہی کہ وہ کون سے وسائل ہیں جن کے ذریعہ اللہ نبیؐ کے اہل بیت کو پاک کرنا چاہتے ہیں اور اہل بیت کے لیے ان کو لازمی قرار دیتے ہیں جبکہ ازواج مطہرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں اور وہ اس زمین کی تمام عورتوں سے زیادہ پاک ہیں۔ ظاہر ہے کہ تمام دوسری عورتیں ان وسائل اور ان اقدامات کی بہت زیادہ محتاج ہیں۔ کیونکہ اگر ازواج مطہرات کو ان وسائل کی ضرورت تھی جو نبیؐ کے گھر میں رہتی تھیں تو دوسری بیویوں کو ان کی بدرجہ اتم ضرورت ہے۔

پہلا وسیلہ یہ ہے کہ ازواج مطہرات کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ تم نہایت ہی اونچے مرتبہ اور منصب اور مقام پر فائز ہو چکی ہو۔ تم تمام نساء عالم سے بلند مرتبہ ہو ، لہٰذا سب سے پہلے تم اپنے اس مقام بلند کا خیال رکھو اور اس کے تقاضے پورے کرو۔

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ (۳۲:۳۳) "نبیؐ کی بیویو ، تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو"۔ اگر تم خدا کا خوف کرو تو تم عام عورتوں کی طرح نہ رہو گی۔ تم تو ایسے مقام پر بیٹھی ہو جو قابل رشک ہے ، اور اس میں تمہارے ساتھ عام عورتیں شریک نہیں ہیں ، اور نہ تم اس میں کسی کو شریک کرتی ہو۔ لیکن یہ امتیاز تمہیں تقویٰ سے حاصل ہو گا کیونکہ محض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرابت داری کچھ چیز بھی نہیں ہے بلکہ تقویٰ کے ساتھ اس قرابت داری کے تقاضے بھی پورے کرنے ہوں گے خود اپنے نفوس کے اندر۔

یہ وہ دو ٹوک سچائی ہے جس کے اوپر یہ دین قائم ہے۔ اس کا اعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتہ داروں کے سامنے کر دیا کہ لوگو ، تمہیں رسول اللہؐ کی رشتہ داری کہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے۔ کیونکہ رسول خدا تمہارے معاملے میں کچھ اختیارات نہیں رکھتے۔ "اے فاطمہ بنت محمد! اے صفیہ بنت عبدالمطلب! اے اولاد عبدالمطلب! میں تمہارے حق

میں اللہ کے ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ جہاں تک میرے مال کا تعلق ہے' اس کے بارے میں تم جو چاہتے ہو' مجھ سے مانگ لو"۔ (مسلم) دوسری روایت میں ہے "اے اہل قریش' اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ۔ اے اولاد بنی کعب اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ' اے فاطمہ بنت محمد! اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ! خدا کی قسم میں اللہ کے ہاں تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ ہاں میرے ساتھ تمہاری قرابت ہے اور اس کا حق میں ادا کرتا رہوں گا"۔ (مسلم ترمذی)

جب ان کو ان کی منزلت اور مقام سے آگاہ کر دیا گیا کہ اس مقام تک وہ صرف تقویٰ سے پہنچ سکتی ہیں تو اب اللہ تعالیٰ وہ ذرائع بیان فرماتے ہیں جن کے ذریعہ اللہ اہل بیت نبی کو مکمل طور پر پاک و صاف کرنا چاہتے ہیں اور ان کی مکمل تطہیر پیش نظر ہے۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ (۳۳ : ۳۲) "تو دبی زبان سے بات نہ کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں نہ پڑ جائے"۔ اللہ ازواج مطہرات کو پہلا حکم یہ دیتے ہیں کہ جب ان کو غیر محرم لوگوں سے بات کرنا پڑے تو ان کی زبان میں وہ لچک نہیں ہونا چاہئے کہ جو نرم اور دبی زبان میں بات کریں تو سننے والے کے لیے شہوت انگیزی کا باعث ہو۔ کیونکہ بالعموم نرم باتوں سے مردوں کو اشتہا پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے اندر تحریک ہوتی ہے اور بیمار دل اور کمزور اخلاق کے لوگ برے خیالات دلوں میں لا سکتے ہیں۔

ذرا یہاں غور کریں کہ وہ کون خواتین ہیں جن کو اللہ یہاں ڈرا رہا ہے۔ یہ ازواج مطہرات ہیں۔ امہات المومنین ہیں جن کے بارے میں کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کر سکتا اور نہ کوئی طمع کر سکتا ہے اور نہ کسی بیمار کی بیماری کا اثر ان پر پڑ سکتا ہے۔ بظاہر انسان یہی سوچ سکتا ہے۔ پھر یہ تنبیہ کس دور میں ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں' ان ممتاز اور برگزیدہ صحابہ کرام کے دور میں جن کے معیار کے لوگ نہ پہلے گزرے اور نہ بعد میں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جس خدا نے مردوں اور عورتوں کو پیدا کیا وہ تو جانتا تھا کہ عورت اگر دبی اور نرم زبان میں ناز و انداز سے بات کرے تو لوگوں کے دلوں میں غلط خیالات پیدا کر سکتی ہے اور دلوں میں فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ خصوصاً وہ دل جو پہلے سے مریض ہوں وہ تو فوراً اشتعال میں آ سکتے ہیں اور یہ مریض دل ہر دور اور عہد میں موجود ہوتے ہیں۔ ہر معاشرے میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں اور ایسے مریض ہر عورت کی طرف مائل ہو سکتے ہیں چاہے وہ نبی آخر الزمان کی زوجہ محترمہؓ ہو امہات المومنین میں سے ہو۔ کوئی ماحول اس وقت تک پاک اور صاف نہیں ہو سکتا جب تک گندگی کے اسباب کا سد باب نہ کیا جائے۔

اور ہم آج جس معاشرے میں رہتے ہیں' اس کا حال کیا ہے؟ یہ معاشرہ پہلے سے مریض' ناپاک اور گرا ہوا ہے جس میں قدم قدم پر فتنے ہیں۔ ہر طرف شہوت انگیزیاں ہیں' خواہشات پھڑپھڑاتی پھرتی ہیں۔ اس ماحول میں ہمیں کیا کرنا چاہئے جس میں ہر طرف سے شہوت کو اٹھایا جاتا ہے' جگایا جاتا ہے' اور جنس کو گرم سے گرم تر کیا جاتا ہے۔ اس معاشرے اور اس زمانے میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ہمارا دور جس میں عورتوں کا لہجہ نہایت لوچ دار' جن کی آواز نہایت ہی مائع' نسوانیت کے تمام فتنے مجتمع کیے ہوئے' جنسی کشش کے تمام فتنے پیدا کیے ہوئے' نہایت ہی خوش الحانی اور فتنہ سامانی کے ساتھ ہر جگہ حاضر۔ ایسی عورتیں کہاں پاک ہیں اور پاکی کی فضا کہاں ہے۔ یہ تو اپنی حرکات' اپنی آواز اور اپنی عریانی کے ذریعہ ان تمام گندگیوں میں ملوث ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ازواج مطہرات کو پاک کرنا چاہتے ہیں اور جس سے اللہ

اپنے مختار بندوں کو پاک کرنا چاہتے ہیں ۔ایسے حالات میں عریانی اور اختلاط کس قدر خطرناک ہے !

وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۳۳ : ۳۲) "بلکہ صاف سیدھی بات کرو" ۔پہلے ان کو نرم اور لوچدار آواز سے منع کیا گیا اور اب یہاں کہا گیا کہ وہ سیدھی سادی بات کریں معروف طریقے کے مطابق ۔جس طرح عام طور پر ایک اجنبی مرد اور اجنبی عورت ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں ۔ان باتوں میں کوئی منکر بات نہ ہو ۔بعض اوقات نرم لہجے سے زیادہ موضوع گفتگو بھی بے راہ روی پر آمادہ کر سکتا ہے ۔لہٰذا کسی اجنبی مرد اور عورت کے درمیان لب و لہجے کا اشارہ بھی نہ ہو ۔نہ ان کے درمیان گپ شپ ہو' نہ مزاح اور غیر سنجیدہ گفتگو ہو' تاکہ اس کے نتیجے میں کچھ دوسرے امور کی طرف میلان نہ ہو' اور قریبا یا بعیدا لوگ غلط راستوں پر نہ پڑ جائیں ۔

اللہ تعالیٰ خالق ہے اور اپنی مخلوق کے مزاج اور طبیعت کے بارے میں بہت ہی اچھا جانتا ہے ۔یہ اللہ ہی ہے جو امہات المومنین کو یوں مخاطب کر رہا ہے تاکہ وہ اپنے دور کے اجنبی لوگوں کے ساتھ اس انداز میں گفتگو کریں جبکہ وہ خیر القرون تھا ۔

•

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ (۳۳ : ۳۳) "اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو" ۔قرن' وقر یقر سے ہے معنی ہیں بھاری ہوا' اپنی جگہ پر ٹھہر گیا ۔اس کے لغوی معنی یہ نہیں کہ گھروں کے اندر بند رہیں اور گھروں سے باہر ہی نہ نکلیں ۔یہ ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ عورت کی اصل جگہ اس کا گھر ہے ۔یہ ان کا مقر ہے اور اس کے سوا وہ اگر کہیں پائی جائیں تو وہ عارضی حالت ہوگی اور استثنائی صورت ہوگی ۔اس پر وہ قائم و دائم نہیں رہیں گی ۔یا بر محل ضرورت سے نکلنا ہوگا ۔

بیت اور گھر عورت کا وہ مستقر اور جائے آرام ہے جو اللہ نے اس کے لیے ازروئے تخلیق و فطرت پسند فرمایا ہے ۔ جس میں وہ اپنی فطرت سے منحرف نہیں رہتی' غلط کاریوں میں ملوث نہیں ہوتی اور جہاں وہ ان مشقت آمیز فرائض میں نہیں جتی ہوتی ازروئے فطرت اس کے لیے تیار نہیں کیے ۔جہاں وہ اس کام میں لگی ہوتی ہے جس کے لیے دراصل اللہ نے اسے پیدا کیا ہے ۔"اس لیے کہ اسلام گھر کے لیے ایک مخصوص فضا مہیا کر دے اور تاکہ بچوں کی پرورش اس فضا میں خوب سے خوب تر ہو سکے ۔اللہ نے مرد پر بیوی کا نفقہ لازم کیا' اور اسے لازمی قرار دیا تاکہ ماں کو معاشی جدوجہد نہ کرنا پڑے اور اسے محنت و مزدوری میں وقت نہ لگانا پڑے' وہ پوری طرح مطمئن ہو کر بچوں کی تربیت کر سکے اور گھر کے نظام اور سجاوٹ اور خوشی کو دوبالا کر سکے ۔وہ عورت جو محنت کر کے تھکی ہاری ہوئی ہوتی ہے' جسے اپنی ملازمت کے فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں اور جس کے اوقات اور مصروفیات بیرون خانہ ہوں اور اس کی قوتیں وہاں خرچ ہوتی ہوں' اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ گھر کو خوشیاں دے سکے ۔اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ ناتواں بچوں کی پوری تربیت کر سکے ۔جو عورتیں ملازمت کرتی ہیں' ان کے گھر' ہوٹل اور بیکریوں سے زیادہ کوئی مقام نہیں رکھتے ۔ان کے اندر وہ کشش نہیں ہوتی جو گھر میں ہوتی ہے ۔حقیقی گھر تو وہ ہوتا ہے جس کی تخلیق ایک گھریلو عورت کرتی ہے اور گھر کی کشش بھی وہی ہوتی ہے جس کا منبع ایک اچھی بیوی ہو ۔گھر کی محبت کا سرچشمہ ماں ہوتی ہے ۔وہ بیوی' وہ ماں یا وہ عورت جو اپنا وقت ملازمت میں گزارتی ہے وہ گھر کو تنگی اور حزن و ملال کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتی" ۔(اسلام اور عالمی سلامتی)

"عورت کا گھر سے نکلنا کسی گھرانے کے لیے بہت ہی بڑا حادثہ ہوتا ہے اور کبھی کبھار اس کی حقیقی ضرورت بھی ہوتی

ہے لیکن اگر کسی کو ضرورت نہ ہو تو اس صورت میں یہ عقل و خرد کے لیے ایک لعنت ہے اور اس کا رواج ان زمانوں میں ہوا جن میں شر و فساد اور بے راہ روی اور گمراہی بڑھ گئی اور انسانیت نے ہزیمت اختیار کر لی" (ایضاً)

رہا عورت کا بغیر کسی ضرورت کے یا بغیر کسی ملازمت کے گھر سے نکلنا اور مرد و زن کا بازاروں اور گلیوں میں اختلاط اختیار کرنا تو یہ وہ ہزیمت ہے جس کے بعد انسانیت گندگی کے دلدل میں گر جاتی ہے اور انسان حیوان کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عورتیں نماز کے لیے نکلتی تھیں اور اب بھی شرعاً اس کی ممانعت نہیں ہے۔ لیکن وہ ایک ایسا دور تھا جس میں لوگ عفت اور پاکیزگی کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ لوگوں کے اندر خدا خوفی تھی اور عورت نماز کے لیے پوری طرح لپٹ کر نکلتی تھی۔ یوں کہ لوگ اسے پہچان نہ سکیں اور اس وقت خواتین اپنے مقامات فتنہ ہرگز نہ ظاہر کرتی تھیں۔ اس کے باوجود حضرت عائشہؓ نے اس دور میں ان کا نکلنا ناپسند فرمایا۔

صحیحین میں روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا مومنین کی بیویاں حضورؐ کے ساتھ نماز صبح میں شریک ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنی چادروں میں لپٹی واپس ہوتی تھیں اور اندھیرے کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی تھیں۔

اور صحیحین ہی میں ان کی روایت ہے کہ اگر حضورؐ وہ دور پاتے جس میں عورتوں نے نئی نئی باتیں ایجاد کر لی ہیں تو ان کو اسی طرح منع فرماتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کے دور میں عورتوں نے کیا نیا فیشن اختیار کر لیا تھا؟ اور وہ کیا تبدیلیاں تھیں کہ اگر حضورؐ دیکھتے تو عورتوں کو نماز سے منع کر دیتے۔ ذرا قیاس کرو کہ یہ خیر القرون تھا اور آج ہم کہاں کھڑے ہیں۔

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (۳۳ : ۳۳) "اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو"۔ یعنی جب کوئی تم میں سے باہر نکلنے پر مجبور ہو۔ اس سے قبل گھروں میں ٹک کر رہنے کا حکم دیا جا چکا ہے۔ جاہلیت کے دور میں عورتیں زیب و زینت کی نمائش کرتی تھیں لیکن روایات میں اس سج دھج کی جو صورتیں مروی ہیں وہ سب کی سب بہت سادہ اور سنجیدہ ہیں۔ آج کے دور میں عورتوں نے جو عریانی اختیار کر رکھی اس کا دور جاہلیت سے بھی کوئی موازنہ نہیں ہے۔

مجاہد کہتے ہیں "جاہلیت میں عورتیں نکلتی تھیں اور مردوں کے اندر پھرتی تھیں یہ تھا تبرج جاہلیہ"۔ قتادہ کہتے ہیں "یہ ناز و انداز سے چلتی تھیں، اس سے منع کیا گیا"۔ مقاتل ابن حیان کہتے ہیں "عورتیں سروں پر دوپٹہ ڈالتی تھیں، اور اسے یوں نہ لپیٹتی تھیں کہ وہ گردن کے زیورات کو ڈھانپ لے یا کانوں کے زیورات چھپا لے۔ اس وقت گردن کا زیور اور کان کا زیور ظاہر ہوتے تھے"۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں "عورت مردوں میں اس طرح نکلتی کہ اس کا سینہ کھلا ہوتا، اور اس کے اوپر کچھ نہ ہوتا، بعض اوقات اس کی گردن اور بالوں کی مینڈھیاں ننگی ہوتیں اور کان کے بندے بھی ظاہر ہوتے۔ اللہ نے مومنات کو حکم دیا کہ وہ ان چیزوں کو ظاہر نہ کریں۔

یہ تھی جاہلیت کی سج دھج اور قرآن اس وقت کے برے آثار سے اسلامی معاشرے کو پاک کرنا چاہتا تھا تاکہ فتنے کے

تمام عوامل اسلامی معاشرے سے ناپید ہو جائیں اور اسلامی معاشرے کے آداب ،تصورات اور اس کا اجتماعی شعور اور ذوق بلند اور پاکیزہ ہو۔

ہم نے اسلامی معاشرے کی تطہیر میں ''ذوق'' کی تطہیر کو بھی شامل کیا ہے کیونکہ جسم انسانی کو ننگا دیکھنا ایک ایسا ذوق ہے ' جو نہایت ہی غلیظ اور پسماندہ ذوق ہے ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ذوق سنجیدہ اور مستقل اور منظم ذوق جمال کے مقابلے میں بد دیانہ ہے ۔اس بد دیانہ ذوق میں روح 'عفت اور شعور کا ذوق مفقود ہوتا ہے ۔

یہ کہ اسلامی معیار انسانی سطح کو بلند کرتا ہے اور انسان کو ترقی یافتہ بناتا ہے ۔ سنجیدگی اور وقار اپنی جگہ ایک خوبصورتی ہے ۔یہ حقیقی حسن ہوتا ہے لیکن اس حقیقی حسن کے ادراک و شعور سے سطحی اور جاہلی ذوق محروم ہوتا ہے ۔کیونکہ گرے ہوئے جاہلی ذوق کے مطابق حسن صرف گوشت و پوست میں ہوتا ہے اور جاہلی ذوق کا داعیہ یہی ذوق ہوتا ہے ۔

قرآن کریم کی یہ آیات یہاں جاہلی سج دھج کی طرف اشارہ کر کے یہ بتاتی ہیں کہ یہ گری ہوئی جاہلیت کی باقیات ہیں اور جو لوگ جاہلیت کے دور کو لے کر کے آگے بڑھ گئے ہیں وہ اس معیار سے بلند ہو جاتے ہیں اور ان کا شعور اور ان کا ذوق جمال بھی جاہلیت کی سطح سے بلند ہوتا ہے ۔

جاہلیت کسی متعین زمانے کا نام نہیں ہے ۔زمانہ جاہل نہیں ہوتا' لوگ جاہل ہوتے ہیں ۔جاہلیت ایک حالت کا نام ہے ۔اس میں لوگوں کے خاص تصورات ہوتے ہیں اور یہ حالت ، یہ تصورات اور یہ رسم و رواج ہر زمان و مکان میں ہو سکتے ہیں ۔

اس معیار کے مطابق ہم آج دور جاہلیت میں ہیں ۔ بالکل اندھی جاہلیت میں ۔جس کا احساس غلیظ ہے 'شعور غلیظ ہے جس کے تصورات حیوانی ہیں اور مقام انسانی سے فرو تر گندگی میں لت پت مقام کو یہ شعور پسند کرتا ہے ۔جس کے اندر کوئی طہارت ' پاکیزگی اور برکت نہیں ہوتی ۔انسانیت اس میں ڈوبی ہوئی ہے اور وہ اس معیار کے مطابق تطہیر نہیں چاہتی جس کے مطابق اسلام انسانی معاشرے کو پاک کرنا چاہتا ہے ۔اسے جاہلیت اولیٰ کے باقیات کو زائل کرنا چاہتا ہے اور یہ کام قرآن اور اسلام نے اہل بیت نبویؐ سے شروع کیا ہے تاکہ وہ عام مسلمانوں کے لیے طہارت' لطافت اور روشنی کا مینار ہو ۔

قرآن کریم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کرتا ہے کہ وہ یہ اقدامات کریں ۔ ازواج مطہرات کے دلوں کو اللہ سے جوڑ دیں ' اور ان کا نصب العین بلند افق پر متعین کر دیں ۔ نہایت روشن ' نہایت پاکیزہ اور یوں وہ اس روشن مینار تک بتدریج بلند ہو جائیں ۔

وَاَقِمْنَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ وَاَطِعْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (۳۳:۳۳) ''نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو' اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو'' ۔ اللہ کی بندگی اجتماعی طرز اور اجتماعی اخلاق کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی وہ راستہ ہے جس کے ذریعہ انسان اعلیٰ اور بلند اخلاق اور اجتماعی سطح تک بلند ہو سکتا ہے ۔اللہ کی بندگی ہی سالک کے لیے زاد راہ ہے ۔ سالک کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کی بندگی کے لیے مدد لے ۔ لہذا اللہ سے تعلق کی ضرورت ہے جہاں سے انسان کو مدد ملے اور اللہ کے ساتھ ایسے تعلق کی ضرورت ہے جس سے دل صاف اور پاک ہوتا

رہے۔ اللہ کے ساتھ ایسے مضبوط رابطے کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے انسان لوگوں کے متعارف طرز عمل سے اور موجودہ معاشرے کے رسم و رواج سے بالا ہو جائے۔اس کے اندر یہ سوچ اور یہ شعور ہو کہ اللہ سے رابطہ لوگوں اور پورے معاشرے اور اپنے خاندان سے اعلیٰ و ارفع ہے۔اس تعلق کی وجہ سے انسان میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی تعلق باللہ کی طرف دعوت دے۔یہ نہ ہو کہ ایک شخص اسلام کی روشنی سے خبردار ہوتے ہوئے بھی دوسرے لوگوں کا پیرو کار بن جائے اور وہ اس کی قیادت ظلمت اور تاریکی کی طرف کریں جو عموماً اللہ سے تعلق کٹ جانے کی وجہ سے ہر طرف چھا جاتی ہے۔

اسلام ہی ہر قسم کے مراسم عبودیت' ہر قسم کے اخلاق و آداب' ہر قسم کے قوانین اور ہر قسم کے دستوری انتظامات کا حامل دین ہے۔یہ تمام امور ایک نظریہ حیات کے فریم ورک کے اندر ہیں اور یہ تمام امور اس فریم ورک میں رہتے ہوئے اسلامی نظریہ حیات کے مقاصد پورے کرتے ہیں۔یہ سب شعبے باہم توافق کے ساتھ ایک ہدف کی طرف بڑھتے ہیں اور اسی ہم آہنگی اور توافق سے دین اسلام کا مجموعی ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ان تمام عناصر کی موجودگی اور توافق کے بغیر یہ دین ہرگز قائم نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ حکم دیا گیا کہ تم نماز کو قائم کرو' زکوٰۃ دو' اور اللہ اور رسول ؐکی اطاعت کرو اور اللہ اور رسول ؐکی اطاعت کے اندر تمام شعوری سمت' تمام اخلاقی ہدایات' ہر قسم کا طرز عمل' خاندان اور اجتماعی معاملات میں رویہ سب کے سب سمٹ آتے ہیں۔کیونکہ اسلام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کوئی ان کو قائم نہ کرے اور یہ مجموعی اطاعت شعاری ایک خاص مقصد کے لیے ہے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَ يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا

(۳۳:۳۳) ""اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی ؐسے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے""۔

اس تعبیر میں کئی اشارات 'سب کے سب محبت' شفقت' وارفتگی اور نرمی سے بھرے ہوئے ہیں۔ان سے کہا جاتا ہے کہ ""تم اہل بیت نبی"" ہو اہل بیت میں تصریح تو نہیں لیکن نبی کے گھر کی طرف اشارہ ہے۔گویا دنیا میں یہی ایک عظیم گھرانا ہے اور یہ گھرانا اس صفت کا مستحق ہے۔جب ""البیت"" کہہ دیا تو گویا مراد بیت النبیؐ ہے۔یہی اشارات خانہ کعبہ کے بارے میں قرآن میں ہوتے ہیں۔اسے بھی ""البیت""'""البیت الحرام"" کہا جاتا ہے اور اسی معنی میں بیت نبی کو بھی البیت کہا گیا۔گویا یہ عظیم گھرانا ہے 'یہی گھرانا ہے۔

اور پھر یہ تعبیر کہ اے اہل بیت تم سے اللہ گندگی کو پوری طرح دور کر کے صاف کرنا چاہتا ہے یعنی نبی کے گھرانے کو پاک کرنے کا کام خود اللہ نے سنبھال لیا ہے۔اللہ تعالیٰ اور کسی گھر کی تطہیر کے کام کی ذمہ داری خود لینا! گویا یہ اہل بیت نبی کا نہایت ہی بلند مرتبہ ہے۔یہ وہ ذات کہہ رہی ہے جس نے پوری کائنات کو کن فیکون سے بنا دیا۔اور وہ عزیز و جبار اور علی کل شئی قدیر ہے اور وہ اس کام کو کرنا چاہتا ہے تو یہ اہل بیت کے لیے بڑا اعزاز بھی ہے۔

یہ بات اللہ اپنی اس کتاب میں کہہ رہے ہیں جو آسمانوں پر پڑھی جاتی ہے۔زمین پر پڑھی جاتی ہے۔ہر دور اور ہر جگہ پڑھی جاتی ہے اور جس کی پیروی ہر دور میں کئی ملین لوگ کرتے چلے آئے ہیں اور جس کی تلاوت ہر وقت کئی ملین

لوگ کرتے ہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ یہ اوامر اور یہ ہدایات یہاں تطہیر اور پاکی کا وسیلہ بنائے جا رہے ہیں اور ان کے ذریعہ اس گھرانے کو پاک کرنا مقصود ہے۔ تطہیر تطہر سے ہے گندگی تب دور ہوتی ہے جب کوئی ایسے وسائل اختیار کرے جس سے وہ دور ہو اور یہ کام لوگ خود کریں اور اپنی عملی زندگی کی تطہیر کریں۔ لوگوں کے اندر پاکیزگی کا شعور ہو اور وہ متقی ہوں' ان کا طرز عمل پاکیزہ ہو۔ وہ پوری طرح اسلام میں داخل ہو کر اپنی زندگی کا رخ اسلام کی طرف کر دیں اور اس کے اہداف اسلامی ہوں۔

اور یہ بحث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو مزید ہدایات پر ختم ہوتی ہے کہ ازواج مطہرات کو پھر یاد دلایا جاتا ہے کہ تمہارا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ دوسری عورتوں سے تم ممتاز ہو۔ اس لیے کہ تم سرور کونین کے گھرانے کی فرد ہو۔ تمہارے گھروں کے اندر قرآن نازل ہو رہا ہے۔ جو حکمت و دانائی پر مشتمل ہے۔ گویا تمہارے گھر حکمت و دانائی کے مقامات نزول ہیں۔ نور ہدایت اور ایمان کی بارشیں وہاں ہو رہی ہیں۔

وَ اذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا (۳۳ : ۳۴) "یاد رکھو' اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں بے شک اللہ لطیف اور باخبر ہے"۔ یہ وہ بلند مرتبہ ہے جس کا ان کو یاد دلانا ہی کافی ہے۔ ہر کوئی اس مرتبہ بلند کو محسوس کرتا ہے۔ یہ اللہ کا دیا ہوا بہت بڑا مقام ہے اور وہ انعام ہے جس کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ نصیحت اس خطاب اور تقریر کے آخر میں دہرائی جاتی ہے جو ازواج مطہرات کے سامنے اس وقت کی گئی جب ان کو اختیار دیا جاتا تھا کہ تمہیں اختیار ہے کہ تم دنیا اور اس کی زوال پذیر آرائشوں کو پسند کرتی ہو یا اللہ اور رسول اللہ اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہو۔ دکھایا جاتا ہے کہ غور کر لو' اللہ نے تمہیں بہت ہی بڑی نعمت دی ہے اور یہ پوری زندگی اس کے مقابلے میں کوئی چیز بھی نہیں ہے۔

--- ooo---

نبی کے گھرانے کے بعد اب اسلامی سوسائٹی کے اندر تطہیر کے اسباب بھی نہایت تفصیل اور باریکی کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔ اس میں مرد اور عورتیں دونوں برابر ہیں۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا

وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

”بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں‘ مومن ہیں‘ مطیع فرمان ہیں‘ راست باز ہیں‘ صابر ہیں‘ اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں‘ صدقہ دینے والے ہیں‘ روزے رکھنے والے ہیں‘ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں‘ اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں‘ اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے“۔

یہ تمام صفات جو اس آیت میں جمع کر دی گئی ہیں یہ نفس انسانی کی تربیت اور تشکیل میں بہت ہی اہم کردار ادا کرتی ہیں ۔ یہ صفات کیا ہیں‘ اسلام‘ ایمان‘ اطاعت امر‘ راست بازی‘ صبر‘ اللہ کے آگے جھکنا‘ صدقہ دینا‘ روزے رکھنا‘ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنا اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنا۔ یہ تمام صفات ایسی ہیں کہ انسان کی شخصیت کی تعمیر اور کردار کی تشکیل میں بہت اہم ہیں۔ اسلام سر تسلیم ختم کر دینے کا نام ہے‘ ایمان کے معنی یقین اور تصدیق کے ہیں اور ان کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے ۔ ہر ایک دوسرے کے لیے ایک شکل ہے ۔ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کا مطلب انتہائی اور گہری تصدیق ہے ۔ اور جہاں سچی تصدیق ہو وہاں سر تسلیم خم کرنا خود بخود پایا جاتا ہے ۔

قنوت کے معنی اطاعت امر کے ہیں لیکن اس اطاعت کے پیچھے ایمان اور اسلام موجود ہو ۔ یہ اطاعت اور اس کا داعیہ اندر سے ہو‘ محض جبریہ نہ ہو ۔ خوشی سے ہو‘ اکراہ سے نہ ہو ۔

صدق ایک مسلمان کی عمومی صفت ہے اور ایک عمومی لباس ہے‘ اور جو سچا نہ ہو وہ امت مسلمہ سے خارج تصور ہوتا ہے ۔ دوسری جگہ ہے ۔

اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ”جھوٹ وہی باندھتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے“۔ جھوٹا اسلامی صفوں سے نکال دیا جاتا ہے کیونکہ امت کی صف سچوں کی صف ہے ۔

صبر وہ صفت ہے جس کے سوا ایک مسلم اور مومن اپنے فرائض سرانجام دے ہی نہیں سکتا۔ مومن ہر وقت صبر کا محتاج ہے‘ قدم قدم پر۔ نفسانی خواہشات پر صبر‘ دعوت اسلامی کی راہ میں مشکلات پیش آنے پر صبر۔ لوگوں کے اذیت دینے پر صبر۔ دلوں کی کمزوریوں‘ دلوں کے تلون اور کجی پر صبر‘ ابتلاء‘ امتحان اور مشکلات پر صبر‘ خوشی اور غم پر صبر۔ غرض ہر صورت میں صبر اور سنجیدگی ایک مشکل اور ضروری کام ہے ۔

خشوع اور خشیت دلی اور ظاہری اعضا دونوں کی صفت ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ قلب اور اعضاء دونوں اللہ کی کبریائی‘ اللہ کی ہیبت اور عظمت کو محسوس کر رہے ہوں اور اللہ سے ڈرتے ہوں ۔

روزہ کو بھی مومن کی صفت قرار دیا گیا ہے ۔ اشارہ اس طرح ہے کہ روزہ رکھنا اور اس کا انتظام اور استقبال کرنا مومنین کی صفات میں سے ہے ۔ روزہ کے ذریعہ خواہشات‘ ضروریات کی چاہت کو ایک محدود وقت کے لیے روکنا مطلوب ہوتا ہے اس میں صبر بھی شامل ہے ۔ قوت ارادی کی پختگی بھی مطلوب ہے اور انسانی صفات کا حیوانی صفات پر غلبہ مطلوب ہے ۔

حفظ فروج‘ شرم گاہوں کی حفاظت کرنا‘ اور اس طرح پاکیزگی اختیار کرنا اور گہرے فطری میلانات پر قابو پائے رکھنا‘

جو انسانی ذات کا حصہ ہوتے ہیں اور اس کے اندر گہرائی تک موجود ہوتے ہیں ۔ یہ میلانات اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ ان پر قابو وہی لوگ پا سکتے ہیں جن کو اللہ کی نصرت اور معاونت حاصل ہو ۔ پھر اس کے ذریعہ سوسائٹی میں مرد و زن کے باہم تعلق کی تنظیم بھی مطلوب ہے ۔ اور انسان کو اعلیٰ اور ارفع مقاصد کی طرف متوجہ کرنا مطلوب ہے ۔ مرد اور عورتوں کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے جنسی میلانات اور خواہشات کو شریعت کے تابع بنائیں ۔ اس میں بہت بلند حکمت کارفرما ہے اور انسان اس ضابطہ کی پابندی سے اس زمین پر اپنے فرائض اچھی طرح ادا کر سکتا ہے ۔

اللہ کا ذکر کثیر ۔ یہ وہ صفت ہے جس سے انسان کی پوری زندگی مربوط ہو جاتی ہے ۔ زندگی کے اعمال نظریہ حیات سے مربوط ہوتے ہیں ۔ اس طرح ایک انسان کا دل بروقت اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے ۔ اس نے اللہ کی رسی اور رابطہ مضبوطی سے پکڑا ہوتا ہے ۔ اس کا کوئی خیال ' کوئی تصور اور عمل اس رابطے سے باہر نہیں ہوتا ۔ پھر اللہ کی یاد سے اس کا دل نور ربانی سے منور ' پاک اور صاف ہوتا ہے ۔ ایسے انسان کی پوری زندگی صاف ستھری اور روشن ہوتی ہے ۔

جن لوگوں میں یہ صفات جمع ہو جائیں وہ مل کر ایک ایسی شخصیت بناتی ہیں جو ایک کامل شخصیت ہوتی ہے ۔ اس دنیا میں بھی ممتاز اور آخرت میں ۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۳۳ : ۳۵) "اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے"۔ یوں ان آیات نے ایک مسلم اور مسلمہ کی شخصیت کے بنیادی عناصر یہاں گنوائے ہیں ۔ یہ آیت ان ہدایات کے بعد آئی ہے جو اس سبق کے آغاز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئیں ۔ یہاں مردوں کے ساتھ ساتھ خصوصاً عورتوں کا بھی ذکر کیا گیا تاکہ یہ بتایا جائے کہ بحیثیت مسلمان اور انسان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور معاشرے میں جو اسلامی حیثیت مرد کی ہے وہ عورت کی بھی ہے ۔ اسلامی نظریہ حیات ' ایمان ' عبادت ' اخلاق اور زندگی کے ہر طرز عمل میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۱۹۱ ایک نظر میں

یہ سبق بھی اسلامی سوسائٹی اور اسلامی جماعت کے درمیان باہم روابط کو مضبوط کرنے کے لیے ہے۔ یہ سبق دراصل اسلامی سوسائٹی سے رسم تبنیت کو ختم کرنے اور نئے اسلامی معاشرے میں روابط کو اپنے حقیقی اصولوں پر قائم کرنے کے لیے ہے۔ اللہ نے اس رسم کو ختم کرنے کے لیے، اس کا عملی آغاز خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرایا۔ اہل عرب کے اندر یہ رواج تھا کہ جس طرح بیٹے کی مطلقہ حرام ہوتی ہے اسی طرح متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کی مطلقہ بھی اس شخص پر حرام سمجھی جاتی تھی۔ اسلامی معاشرے میں متبنیٰ کی مطلقہ عورت کو حلال قرار دینے کے لیے کسی مثال اور نظیر کا پایا جانا ضروری تھا۔ کسی مثال کے بغیر محض قانون بنانے سے یہ تبدیلی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ اللہ نے اس غرض کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب کیا اور یہ اس قدر عظیم بوجھ تھا جس طرح رسالت کا بوجھ ہوتا ہے۔ اس واقعہ کا جو ردعمل ہوا اس نے ثابت کر دیا کہ رسول اللہ کے سوا کوئی اور شخص اس رسم کو نہیں توڑ سکتا تھا۔ یہ رسم معاشرے میں بہت ہی گہری جڑیں رکھتی تھی اور آپ ؐ کے سوا کسی کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ایسا انوکھا اور نامانوس کام کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد جو طویل تبصرہ آیا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا تعلق خدا سے کیسا ہونا چاہیے۔ آپس میں کس طرح ہونا چاہیے اور ان کے درمیان نبی کے فرائض کے حوالے سے ان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ سب اقدامات لوگوں کی آسانی کے لیے کیے گئے اور اس لیے کیے گئے کہ لوگ تسلیم ورضا سے اللہ کے احکام کو دل کی خوشی کے ساتھ قبول کریں۔

اس واقعہ کے بیان سے قبل یہ اصول بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اللہ اور رسول اللہ ؐ کا حکم ماننا لازمی ہے۔ اگر اللہ اور رسول اللہ ؐ کوئی فیصلہ کر دیں تو پھر مسلمانوں کو کسی بھی ایسے معاملے میں چوں چرا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم عربوں کے اندر گہری جڑیں رکھتی تھی اور اسے آسانی سے ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ ایک سخت رسم تھی۔

---000---

درس نمبر ۱۹۱ تشریح آیات

۳۶ --- تا --- ۴۸

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾

”کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا“۔

روایات میں آتا ہے کہ یہ آیت زینب بنت جحشؓ کے بارے میں اتری ہے۔ حضورؐ نے چاہا جماعت مسلمہ کے اندر جو طبقاتی فرق پایا جاتا ہے اسے پاش پاش کر دیا جائے اور لوگ اسی طرح برابر ہو جائیں جس طرح ایک کنگھی کے دندانے ہوتے ہیں۔ تقویٰ کے سوا کسی کو دوسروں پر فضیلت حاصل نہ ہو۔ اس دور میں آزاد کردہ غلاموں کو ”موالی“ کہتے ہیں۔ اور یہ لوگ عام لوگوں سے ذرا کم تر سمجھے جاتے تھے۔ رسول اللہؐ کے آزاد کردہ غلام زید ابن حارثہ ان میں سے ایک تھے۔ ان کو رسول اللہ نے متبنیٰ بنا دیا تھا۔ حضورؐ نے یہ مثال قائم کرنا چاہی کہ بنو ہاشم کی ایک شریف زادی کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا جائے جو حضورؐ کی قریبی بھی تھی یعنی زینب بنت جحشؓ کا نکاح زید سے کر دیا جائے' تاکہ یہ طبقاتی فرق ختم ہو جائے اور یہ کام وہ خود اپنے خاندان میں کریں۔ یہ بات یہاں نوٹ کرنا چاہئے کہ جس طرح متبنیٰ کی رسم پختہ اور شدید تھی اسی طرح معاشرے میں آزاد شدہ غلاموں کو بھی کم درجے کے لوگ سمجھا جاتا تھا۔ اس فرق کو بھی خود حضور اکرمؐ کے عملی قدم ہی سے ختم کیا جا سکتا تھا تاکہ جماعت اس کی تقلید کرے اور پوری انسانیت ایک ہی راہ پر گامزن ہو جائے۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے عوفی کی ایک روایت نقل کی ہے کہ زیر تفسیر آیت مَا كَانَ ..... کی شان نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید ابن حارثہ کے لیے ایک دوشیزہ کے لیے پیغام دینا چاہا تو آپ زینب بنت جحش اسدیہ کے پاس گئے۔ آپ نے ان کو پیغام دیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں اس کے ساتھ نکاح نہیں کرنا چاہتی۔ حضورؐ نے فرمایا تم اس کے ساتھ نکاح کر لو۔ اس پر اس نے کہا کہ میں اس پر غور کروں گی۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا (۳۳: ۳۶) تو اس پر زینب نے کہا رسول خدا! کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں کہ میرا نکاح اس کے ساتھ ہو؟ تو حضورؐ نے فرمایا ہاں میں نے تو یہ فیصلہ کر دیا ہے۔ تو اس پر اس نے کہا اچھا مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ میں رسولؐ خدا کی نافرمانی نہیں کروں گی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے نکاح میں دے دیا۔

ابن لھیعہ نے ابو عمرہ سے 'عکرمہ سے' ابن عباسؓ سے' فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے زینب بنت جحش کا رشتہ زید ابن حارثہ کے لیے طلب کیا۔ اس نے اسے پسند نہ کیا اور کہا میں اس سے حسب و نسب میں برتر ہوں' یہ ایک سخت مزاج عورت تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ (۳۳: ۳۶) یہی تفسیر مجاہد' قتادہ' مقاتل ابن حیان نے کی ہے کہ یہ آیت زینب بنت جحش کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس وقت نازل ہوئی جب حضورؐ نے ان کا رشتہ زید ابن حارثہ کے لیے طلب فرمایا۔ پہلے اس نے انکار کیا اور پھر قبول کر لیا۔

ابن کثیر نے تفسیر میں ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے کہ عبدالرحمٰن ابن زید ابن اسلم کا کہنا یہ ہے کہ یہ آیت ام کلثوم بنت عقبہ ابن ابو معیط کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ صلح حدیبیہ کے بعد پہلی عورت تھی جو ہجرت کر کے آگئی تھی۔ اس نے اپنا نفس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بخش دیا تھا۔ تو حضورؐ نے فرمایا اچھا میں نے قبول کر لیا۔ حضورؐ نے اسے زید ابن حارثہ کے نکاح میں دے دیا [شاید زینب کے فراق کے بعد] اس پر یہ عورت اور اس کا بھائی ناراض ہوگئے۔ انہوں نے کہا ہم نے تو حضور اکرمؐ کو بخشا تھا' انہوں نے اپنے غلام کو بخش دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا (۳۳: ۳۶) وہ کہتے ہیں' قرآن میں اس سے بھی زیادہ جامع حکم آیا ہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (۳۳: ٦) "نبی تمام مومنین کے لیے ان کی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں"۔ انہوں نے کہا کہ پہلی آیت خاص ہے اور یہ جامع ہے۔

امام احمد نے ایک تیسری روایت بھی نقل کی ہے۔ عبدالرزاق سے' معمر سے' ثابت بنانی سے' حضرت انسؓ سے حضورؐ نے انصاریوں کی ایک عورت کے بارے میں جلیبیب کے لیے اس عورت کے والد کو پیغام بھیجا تو اس شخص نے کہا کہ میں اس کی ماں سے مشورہ کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا' اچھا مشورہ کر لیں۔ یہ شخص بیوی کے پاس گیا اور اس نے اس کا تذکرہ کیا تو عورت نے کہا خدا کی قسم حضور اکرمؐ کو جلیبیب کے علاوہ کوئی نہیں ملا۔ اور ہم نے تو فلاں فلاں کا پیغام رد کیا ہے۔ یہ لڑکی پردے میں سن رہی تھی۔ یہ شخص حضورؐ کی طرف نکلنے لگا کہ حضورؐ کے سامنے انکار کر دے۔ تو اس لڑکی نے کہا کیا تم لوگ رسول اللہؐ کے حکم کو رد کر رہے ہو۔ اگر حضورؐ تمہارے لیے اس بات کو پسند کرتے ہیں تو منظور کر لو۔ گویا اس نے اپنے والدین سے برتر رویہ اختیار کیا۔ دونوں نے کہا یہ ٹھیک کہتی ہے تو یہ شخص حضورؐ کے پاس گیا کہ اگر آپ راضی ہیں تو ہم راضی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا میں تو راضی ہوں۔ کہتے ہیں اس نے لڑکی جلیبیب کو نکاح کر کے دے

یہ ایک آزاد کردہ غلام تھا۔

ہم نے یہاں تیسری روایت کو بھی نقل کر دیا ہے جس کا تعلق جلیبیب سے تھا۔ کیونکہ اس کا تعلق ایک ایسی مہم سے ہے جس کے ذریعے حضور اکرمؐ خاندانی روایات کی ذہنیت کو توڑنا چاہتے تھے کیونکہ اسلام معاشرتی مساوات قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی سوسائٹی کو جدید تصورات پر استوار کیا جائے۔ اس کرۂ ارض کی زندگی کے لیے اسلام نے جو قدریں وضع کیں ان کے مطابق اسلام نے لوگوں کے فضول روایاتی بندھنوں سے آزاد کرنے کا جو بیڑا اٹھایا تھا اس مہم کا تعلق اس روح سے تھا۔

بہرحال آیت کی عبارت کسی مخصوص واقعہ سے عام ہے۔ اس کا تعلق رسم تبنی کے مٹانے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ متبنیٰ کی مطلقہ کے ساتھ نکاح جائز ہے اور اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے زینب سے نکاح کر لیا جبکہ زید نے اسے طلاق دے دی۔ اس پر مدینہ میں ایک غلغلہ بلند ہو گیا اور آج بھی بعض دشمنان اسلام اس کو بنیاد بنا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تنقید کرتے ہیں۔ اسی واقعہ کے اوپر افسانوں کی تہیں چڑھاتے ہیں۔ چاہے سبب نزول وہ ہو جو ان روایات میں آیا ہے یا زینب بنت جحش کے ساتھ آپ کا نکاح ہو۔ لیکن یہ اصول بہت عام ہے کہ اللہ و رسول جو فیصلہ کر دیں اس کے بعد مسلمانوں کو اس موضوع پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔

غرض اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی عناصرمیں سے یہ عنصر ایسا تھا جو پہلی جماعت مسلمہ کے دلوں میں پوری طرح بیٹھ گیا تھا۔ ان کے دلوں میں اس کا یقین آگیا تھا' اور ان کا شعور اس میں ڈوب گیا تھا۔ یہ عنصر کیا تھا' یہ کہ ان کے اختیار میں' اسلام لانے کے بعد' اب کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ بذات خود' ان کی تمام مملوکات' اور ان کے جذبات سب کے سب اللہ کے اختیار میں ہیں' وہ جس طرح چاہے' ان کو پھیر دے اور یہ کہ ان کی حیثیت وہی ہے جس طرح اس کائنات کی ہے۔ وہ اس کا حصہ ہیں اور اللہ اسے جس طرح چاہتا ہے' چلاتا ہے۔ جس طرح اللہ اس کائنات کی دوسری چیزوں کو چلاتا ہے اور اس اس عظیم وجود کے چلانے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو فرائض مقرر کر دیئے ہیں وہ ان کے مطیع ہیں۔ ان کے لیے اس عظیم اسٹیج پر جو کردار متعین کر دیا گیا ہے وہ اسے پورا پورا ادا کریں گے۔ ان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے خود کوئی کردار متعین کریں۔ کیونکہ جو قصہ انہوں نے پیش کرنا ہے وہ خود اس سے زیادہ خبردار نہیں ہیں۔ نیز وہ اپنے لیے کوئی حرکت یا کردار خود پسند نہیں کرتے۔ اس طرح کسی بھی کھیل کا پورا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ وہ اس کھیل کے ڈائریکٹر نہیں ہیں۔ یہ تو کردار ہیں اور ڈائریکٹر کے مطیع فرمان ہیں۔ ان کے ساتھ ان کے کردار کا معاوضہ طے شدہ ہے۔ یہ اپنا کردار ادا کریں اور معاوضہ باقی' ان کو کوئی چوں و چرا کا اختیار نہیں ہے۔

انہوں نے اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ اسلامی نظام کے تمام اجزاء کو قبول کر لیا ہے۔ اس لیے معاہدے کے بعد اب ان کے پاس ان کے اختیار میں کوئی چیز باقی نہیں ہے اور جس طرح یہ کائنات حکم الٰہی سے چل رہی ہے یہ شریعت الٰہیہ کے مطابق چلیں۔ اپنی تمام حرکات میں اپنا متعین کردار ادا کریں اور اپنے مدار میں اس طرح چلیں جس طرح کرات اپنے اپنے مدارات میں چلتے ہیں' نہ ادھر نہ ادھر' نہ آگے نہ پیچھے۔ تمام دوسرے کرات کے توازن کے ساتھ۔

ان لوگوں نے سر تسلیم خم کر دیا' ان سب حادثات کے لیے جو تقدیر الٰہی نے ان کے لیے مقدر کر دیئے ہیں۔ ان کا اندرونی شعور اس بات کو تسلیم کر چکا ہے کہ جو کچھ پیش آتا ہے اللہ کے حکم سے پیش آتا ہے۔ ایک شخص کے لئے ہر

حادثہ' ہر حالت اللہ کی آور دہ ہے اور وہ مانتے ہوئے خوشی خوشی سے' نہایت اطمینان سے اللہ کی تقدیر کو قبول کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ اللہ کے فیصلوں کو نہ سمجھتے تھے۔ جب ان پر نازل ہو جاتے۔ نہ وہ ظاہر داری کرتے ہوئے جزع و فزع سے اپنے آپ کو بچاتے تھے یا وہ کوئی تکلیف محسوس کرتے تھے مگر صبر و مصابرت سے کام لے کر خاموش ہو جاتے تھے بلکہ ان کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ اللہ کے فیصلوں کا استقبال کرتے تھے جیسے وہ پہلے سے خبردار ہوں اور ان کے انتظار میں ہوں۔ جو فیصلہ آ رہا ہے وہ ان کے حس و شعور میں ہے۔ ان کو معلوم ہے اور ان کے ضمیر کی آواز ہے۔ کوئی اچنبھا کوئی انوکھا پن اور کوئی بدک ان کے اندر نہ پید ہوتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ وہ یہ نہ چاہتے کہ آسمانوں کی رفتار ذرا تیز ہو جائے اور وہ کام جلدی سے ہو جائیں جو وہ چاہتے تھے۔ اور وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ کچھ واقعات جلدی وقوع پذیر ہوں تاکہ ان کی بعض ضروریات پوری ہو جائیں۔ وہ اپنے طریقے کے مطابق تقدیر الہی کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اور یہ تقدیر الہی جہاں ان کو پہنچا دیتی تھی وہ اس پر راضی ہو جاتے تھے' خوش ہوتے تھے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا' وہ اس راہ میں خرچ کر رہے تھے۔ جان تک قربان کر دیتے تھے' مال خرچ کر دیتے تھے' نہ جلدی کرتے' نہ تنگی محسوس کرتے' نہ غرور کرتے اور نہ حسرت کرتے۔ ان کو پوری طرح یقین تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے' یہ اللہ کا فیصلہ ہے' جو اللہ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور ہر کام کے لیے ایک وقت متعین ہے اور ریکارڈ شدہ میعاد ہے۔

ان کے قدم پوری طرح اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اٹھتے تھے۔ ان کی حرکات اللہ کی ڈائریکشن کے مطابق تھیں۔ وہ امن' بھروسے اور یقین کا پورا شعور رکھتے تھے۔ وہ نہایت سادگی' نرمی اور آسانی سے تقدیر کے ساتھ چلتے تھے۔

اس تسلیم و رضا کا یہ اثر نہ تھا کہ وہ عمل نہ کریں یا ان کے پاس جو کچھ تھا' اسے سب کا سب لٹا دیں' یا وقت اور جدوجہد میں عقیدہ تقدیر بی کوئی کمی کریں۔ وہ اسباب سے قطع نظر نہ کرتے تھے۔ وہ ایسی باتیں اپنے اوپر نہ لیتے تھے جن کی ان کے اندر قدرت نہ ہو۔ مالا یطاق ہوں۔ وہ بشریت اور اس کے حدود و قیود سے بھی نہ نکلتے تھے۔ ضعیف بھی تھے' قوی بھی تھے۔ وہ ان باتوں کا دعویٰ نہ کرتے تھے جو ان میں نہ تھیں' وہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ ایک کام انہوں نے نہ کیا ہو اور اس پر ان کی تعریف کی جائے' نہ وہ ایسی باتوں کا دعویٰ کرتے تھے جو انہوں نے کی نہ ہوں۔

اللہ کی تقدیر کے سامنے مطلقاً سر تسلیم خم کر دیتے اور پھر عملاً جدوجہد کرتے جہاں ان کی طاقت ہو۔ ہر کام کے درمیان انہوں نے ایک حسین توازن قائم کر دیا تھا اور جو بات ان کی استطاعت میں تھی' وہ کرتے تھے۔ جماعت اول کے کردار میں یہ توازن نہایت مکمل تھا۔ اور یہ توازن ان کا خصوصی امتیاز تھا۔ یہی توازن تھا جس کی وجہ سے وہ اس عظیم امانت کے اٹھانے کے لائق ہوئے' جس کے اٹھانے سے پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا تھا۔

اسلام کی جماعت اول نے اپنی زندگی میں ان معجزات کو دکھایا اور حقیقت بنا دیا۔ یہ اس توازن کے مرہون منت تھے۔ اس وقت کے انسانی معاشرے ہی میں یہ معجزات رونما ہوئے۔ یہ معجزات کہ اس جماعت کی حرکات اور اعمال اس طرح متوازن تھے کہ یہ جماعت افلاک کی طرح منظم تھی اور مربوطی کے ساتھ حرکت پذیر تھی۔ ان کے اقدامات اور اعمال اسی طرح تھے جس طرح زمانے کی گردش مربوط ہے۔ یہ لوگ فطرت کے ساتھ متصادم نہ تھے اور نہ الجھتے تھے کہ

گردش زمانہ ان کو الجھا دے بلکہ وہ نظام قضا و قدر جس کا ایک حصہ گردش زمانی ہے' اس کے ساتھ چلتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک نہایت ہی مختصر عرصے میں وہ نتائج پیدا کر دیئے جو تاریخ پیدا نہ کر سکی ۔

یہ انقلاب یوں برپا ہوا کہ وہ اپنے عمل میں اس پوری کائنات کی حرکت کے ساتھ چلتے تھے ۔ اللہ کی تقدیر کے مطابق قدم اٹھاتے تھے ۔ یہی انقلاب تھا جس نے معجزات صادر کیے ۔ یہ معجزات اس ذات نے پیدا کیے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ۔ جس نے کواکب و افلاک کو پیدا کیا اور جس نے پہلی جماعت کو اس طرح راضی برضائے تقدیر الٰہی کیا جس طرح افلاک تقدیر العزیز العلیم سے سرمو انحراف نہیں کر سکتے ۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم کی بیشتر آیات اشارہ کر رہی ہیں ۔ اللہ فرماتے ہیں ۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ "تم ہدایت نہیں دے سکتے جن کو محبوب سمجھو بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے" ۔ اور دوسری جگہ ہے :

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ "تم پر ان کی ہدایت کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے' ہدایت دیتا ہے" ۔ دوسری جگہ

اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهُ "ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے" ۔ یہ ہے ہدایت اپنی عظیم حقیقت کے حوالے سے اور اپنے وسیع مفہوم میں ۔ یعنی یہ راہنمائی کہ اس عظیم کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے اور یہ کہ اس کی حرکت' حرکت کائنات سے ہم آہنگ ہو جائے ۔

انسانی جدوجہد اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک انسان کا دل اس مفہوم میں ہدایت یافتہ نہ ہو ۔ ایک فرد کی جدوجہد اس کائنات کی حرکت کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو ۔ اور جب تک انسانی شعور و ضمیر تقدیر الٰہی پر راضی نہ ہو' بایں مفہوم کہ یہاں جو واقعہ ہوتا ہے' وہ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے ۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی یہ آیت

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (۳۳:۳۶) "کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے" ۔ کسی مخصوص واقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے ۔ یہ زیادہ عام' شامل اور کامل اصول ہے اور دوررس نتائج کا حامل ہے ۔ یہ اسلامی نظام کا ایک بنیادی دستوری اصول ہے ۔

--- ooo---

اس کے بعد زینب بنت جحش کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ آتا ہے ۔

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾ مَا كَانَ عَلَى النَّبِیِّ مِنْ حَرَجٍ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ﴿۳۸﴾ الَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ یَخْشَوْنَهٗ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ﴿۳۹﴾ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۴۰﴾

۵
ع ۶
۲

"اے نبیؐ، یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ "اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو"۔ اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا، تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ پھر جب زیدؓ اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا۔ نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو۔ یہی اللہ کی سنت ان سب انبیاء کے معاملہ میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔ (یہ اللہ کی سنت ہے ان لوگوں کے لیے) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور محاسبہ کے لیے بس اللہ ہی کافی ہے۔ (لوگو) محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔

اس سورہ کے آغاز ہی میں متبنیٰ بنانے کی رسم کو ختم کر دیا گیا تھا اور یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ ایسے لوگوں کو اب ان کے حقیقی آباء کی طرف منسوب کر دیا جائے اور عائلی تعلقات حقیقی نسب پر قائم ہوں گے، کہا گیا تھا۔

وَ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَ اللّٰهُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَ

هُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ (۳۳: ۴) اُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ فَإِنْ لَمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَٰكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا (۳۳: ۵) "نہ اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے ۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو ۔ مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو نبی پر حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتا ہے ۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو ۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے ۔ اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں ۔ نادانستہ جو بات تم کہو' اس کے لیے تم پر کوئی گرفت نہیں ہے لیکن اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا دل سے ارادہ کرو ۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے" ۔

عربی سوسائٹی میں منہ بولے بیٹوں کے پختہ رسم و رواج تھے اور گہرے آثار تھے ۔ ان آثار کو مٹانا اس قدر آسان نہ تھا جس قدر نفس متبنیٰ کو مٹانا آسان تھا ۔ اس لیے کہ اجتماعی رسم و رواج دلوں پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں ۔ اس لیے اس قسم کی رسومات کو مٹانے کے لیے ان کے بالمقابل سخت اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے ۔ بالعموم پہلے پہل جو اقدامات کیے جاتے ہیں ان کے خلاف شوروغل بھی ہوتا ہے اور ابتدا میں اس کے اثرات بھی نفوس پر پڑتے ہیں ۔

اس سے قبل یہ بات آگئی ہے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زید ابن حارثہ کی شادی کرائی تھی ۔ یہ آپ کے متبنیٰ تھے اور ان کو زید ابن محمد کہا جاتا تھا ۔ اس کے بعد زید ابن حارثہ کہلانے لگا ۔ یہ شادی زینب بنت جحش سے کرائی گئی تھی جو آپ کی پھوپھی زاد تھیں' مقصد یہ تھا کہ غلاموں کو عرب سوسائٹی میں جو دوسرے درجے کا انسان سمجھا جاتا تھا' اسے دور کر دیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے شرافت و کرامت کا جو اصول مقرر فرمایا ہے اسے بروئے کار لایا جائے ۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ "تمہارے اندر زیادہ شریف وہی ہے' جو زیادہ متقی ہے" ۔ اور یہ مثال عملاً قائم کی جائے جو فی الواقعہ مثال ہو ۔

اس کے بعد مشیت الٰہیہ کا تقاضا یوں ہوا کہ رسالت کی ذمہ داریوں میں اس ذمہ داری کا اضافہ کر دیا جائے کہ متبنیٰ کی مطلقہ کے ساتھ نکاح کی مثال بھی حضورؐ خود قائم کریں تاکہ متبنیٰ کی رسم کے جو گہرے آثار تھے' وہ بھی مٹ جائیں اور حضورؐ یہ نمونہ معاشرے کے سامنے پیش کریں ۔ ان حالات میں کہ کسی اور کی ہمت اس کام کے لیے نہ ہو سکتی تھی اگرچہ رسم متبنیٰ قانوناً اور شرعاً اس سے قبل ختم ہو گئی تھی ۔

اللہ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی بتا دیا کہ زید عنقریب اپنی بیوی کو طلاق دے دیں گے اور آپ کو یہ نکاح کرنا ہو گا ۔ یہ تقاضائے حکمت الٰہیہ ہے ۔ اس دوران زید اور زینب کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے اور آثار بتا رہے تھے کہ یہ نکاح قائم نہیں رہ سکتا ۔

حضرت زید بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شکایت کر رہے تھے کہ ان کی زندگی زینب کے ساتھ بہت مضطرب ہے اور یہ کہ وہ مزید ان کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی بے باکی سے اسلامی نظریہ حیات کی تبلیغ فرماتے تھے اور اس سلسلے میں کسی کی پرواہ نہ فرماتے تھے لیکن زینب کے ساتھ نکاح کرنے کے معاملے میں آپ بھی متامل تھے۔ اس سلسلے میں آپ بھی عوام کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے اور آپ ہمیشہ زید سے کہتے 'جن پر اللہ کا انعام ہوا تھا کہ وہ مسلمان ہوئے اور پھر رسول اللہؐ کے قریب ہوئے اور رسول اللہؐ آپ سے محبت فرماتے تھے اور یہ محبت ایسی تھی کہ بلا استثناء سب سے زیادہ تھی۔ پھر رسول اللہ نے ان پر یہ مہربانی کی کہ انہیں آزاد کر دیا۔ ان کی تربیت کی اور ان سے بہت پیار کرتے۔ حضرت زید سے رسول اللہؐ یہی کہتے۔

اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ (۳۳: ۳۷) "کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑو اور اللہ سے ڈرو"۔ اور دراصل حضور اکرمؐ اس طرح اس عظیم معاملے کو موخر کرنا چاہتے تھے جس کے وقوع کے بعد آپ کو عوام کا سامنا کرنے میں تردد تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی۔

وَ تُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (۳۳: ۳۷) "اس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا۔ تم لوگوں سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو"۔ اور حضورؐ اپنے دل میں یہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کا اللہ نے آپ کو یہ سبب بتا دیا تھا کہ اگر حضرت زید ان کو طلاق دیں گے تو آپؐ کو نکاح کرنا ہو گا۔ یہ معاملہ صریح حکم نہ تھا' ورنہ حضورؐ اس میں تردد نہ فرماتے' نہ موخر کرتے اور نہ یہ کوشش کرتے کہ کسی طرح ٹل جائے اور حضورؐ اس وقت اس کا اعلان کر دیتے۔ نتائج جو بھی ہوتے' البتہ حضورؐ کے دل میں بطور الہام یہ بات ڈال دی گئی تھی اور حضورؐ اس وقت پریشان تھے کہ لوگ غوغا آرائی کریں گے یہاں تک کہ خدا کے حکم سے زید نے طلاق دے دی اور یہ تصور نہ زید کا تھا اور نہ زینب کا کہ اس کے بعد حضورؐ سے نکاح ہو گا کیوں کہ عربوں میں یہ قانونی رواج تھا کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ کے ساتھ نکاح جائز نہ تھا۔ یہاں تک کہ متبنیٰ بنانے کے قانون اور رواج کو ختم کر دینے کے بعد بھی لوگ مطلقہ متبنیٰ کو حرام سمجھتے تھے اور ابھی ان کے حلال ہونے کا حکم بھی نہ آیا تھا۔ صرف اس واقعہ سے یہ رسم ختم ہوئی لیکن یہ واقعہ بہرحال اس سوسائٹی میں ایک دھماکہ اور ایک انوکھی اور نئی بات تھی۔

اس تفسیر سے وہ تمام روایات ختم ہو جاتی ہیں جن پر اعتماد کر کے دشمنان اسلام نے قدیم دور میں بھی اور جدید دور مین بھی افسانے تصنیف کیے ہیں اور حاشیہ آرائیاں کی ہیں۔ معاملہ بس اس قدر تھا۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا (۳۳: ۳۷) "پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی تو ہم نے اس کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی

رہے جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں"۔ اور یہ واقعہ رسالت کی ان بھاری ذمہ داریوں میں سے ایک تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اٹھایا۔ یوں آپ نے ایک ایسے معاملے میں جاہلی معاشرے کی ایک رسم مٹانے میں نمونہ پیش کیا جسے ایام جاہلیت میں ایک مکروہ فعل سمجھا جاتا تھا۔ یہ فعل اس قدر مکروہ سمجھا جاتا تھا کہ حضور اکرمؐ نے اسلامی نظریہ حیات کے حوالے سے بڑی بڑی باتوں میں تامل نہ فرمایا تھا مگر اس میں متردد تھے۔ مثلاً عربوں کے خودساختہ الٰہوں کی مذمت آپ نے بے دھڑک فرمائی اور یہ آپ نے برملا اعلان فرمایا کہ ہمارے آباء و اجداد غلطی پر تھے۔

وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا (۳۳: ۳۷) "اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہئے تھا"۔ حضرت زینب سے حضور اکرم کا نکاح عدت پوری ہونے کے بعد طے ہوا تھا"۔ یعنی اسے رد نہ کیا جا سکتا تھا اور نہ اس سے کوئی مفر تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی اور اٹل حقیقت تھی اور اس سے کوئی پہلوتہی نہ کر سکتا تھا۔

آپ کا نکاح زینب سے عدت گزر جانے کے بعد ہوا اور حضورؐ نے ان کو انہیں حضرت زید کے ذریعہ پیغام بھیجا تھا۔ یہ زید حضورؐ کو بہت ہی محبوب تھے۔ یہ گئے اور انہوں نے حضورؐ کا پیغام ان کو دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'فرماتے ہیں کہ جب زینب کی عدت ختم ہو گئی تو حضورؐ نے زید ابن حارثہ سے کہا "آپ جائیں اور زینب کو میرے لیے پیغام دیں"۔ زید گئے 'اس وقت وہ آٹے میں خمیر ڈال رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب میں نے اسے دیکھا تو میرا ان کے ساتھ سامنا کرنا مشکل ہو گیا۔ میں ان کو دیکھ نہ سکا اور نہ کہہ سکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا تذکرہ کیا ہے۔ میں نے ان کی طرف اپنی پیٹھ پھیر لی اور واپس جاتے ہوئے یہ کہا "اے زینب تمہارے لیے خوشخبری ہے 'حضورؐ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں ان کا پیغام آپ تک پہنچا دوں"۔ اس نے کہا "میں کوئی بات اس وقت تک کرنے والی نہیں ہوں جب تک میں اپنے رب کے ساتھ اس معاملے میں مشورہ نہ کر لوں۔ وہ اٹھی اور اپنی جائے نماز پر نماز پڑھنے لگی"۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور رسول اللہؐ اس کے بعد اس سے اجازت لینے کے بغیر اس کے پاس آ گئے۔ (روایت احمد 'مسلم اور نسائی بطریقہ سلیمان ابن مغیرہ)۔

بخاری شریف میں حضرت انس کی روایت ہے کہ حضرت زینب دوسری ازواج مطہرات پر یہ فخر کرتی تھی کہ تمہارا نکاح تمہارے رشتہ داروں نے کیا ہے اور میرا نکاح اللہ نے سات آسمانوں کے اوپر کیا ہے۔

یہ معاملہ اسی طرح آسانی سے طے نہ پا گیا بلکہ اسلامی سوسائٹی میں اس کی وجہ سے ایک بھونچال آ گیا اور منافقین کو ایک مسئلہ مل گیا کہ حضورؐ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے۔ چونکہ یہ معاملہ اسلامی معاشرے میں قانونی اصلاحات سے متعلق تھا اور اسلامی معاشرے کے لیے ایک نیا اصول طے کرتا تھا۔ اس لیے اللہ نے اس کی تاکید مزید کر دی اور پھر اس میں لوگوں کے نزدیک جو انوکھا پن تھا اسے یوں زائل کیا اور معاملات کو اپنی اصل حقیقت کی طرف لوٹا دیا۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَه (۳۳: ۳۸) "نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو"۔ اللہ نے نبی پر فرض کر دیا تھا کہ زینب کے ساتھ اس کا نکاح ہو تاکہ یہ جاہلی رسم ٹوٹے کہ کسی کا نکاح ان کے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نہیں ہو سکتا جبکہ اس نے اسے طلاق دے دی ہو یا مر گیا ہو 'اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی پہلے رسول نہیں ہیں۔ اس سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (۳۳: ۳۸) "یہی اللہ کی سنت ان سب انبیاء کے معاملے میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں" ۔ تو یہ معاملہ سنت الہیہ کے مطابق جارہا ہے اور اس میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان رسوم اور رواجات کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکتا رہا ہے جو معاشرے میں رائج رہی ہیں اور جن کی کوئی حقیقت و افادیت نہ تھی۔

وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳: ۳۸) "اور اللہ کا حکم قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے"۔ اللہ کا حکم نافذ ہوتا ہے اور اسے نافذ کیا جانا ہی چاہئے۔ اس کے سامنے کوئی بھی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی اور نہ بننا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ تمام امور کو نہایت مہارت سے طے کرتا ہے ' نہایت حکمت سے طے کرتا ہے اور اس کی تہہ میں وہ مقاصد ہوتے ہیں جو اللہ کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اللہ ہی ان احکام کی ضرورت اور کسی زمان و مکان میں ان کی اہمیت کو جانتا ہے اور اللہ نے رسول اللہ کو حکم دے دیا ہے کہ وہ اس عادت کو محو کر دیں ' اس کے عملی آثار کا بھی قلع قمع کر دیں اور یہ کام وہ بنفس خود کریں۔ اللہ کے حکم کے نفاذ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جا سکتی اور اللہ کے رسولوں کی یہ سنت رہی ہے ۔ تمام گزرے ہوئے رسولوں کی :

الَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ یَخْشَوْنَهٗ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (۳۳: ۳۹)
"جو لوگ اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے"۔ ایسے لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے نظام کو عملاً قائم کرتے ہیں اور لوگوں کی باتوں سے نہیں ڈرتے ۔ اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ۔ وہ اللہ کے احکام پہنچاتے ہیں اور نافذ کرتے ہیں ۔

وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا (۳۳: ۳۹) "اور محاسبہ کے لیے اللہ ہی کافی ہے"۔ حساب و کتاب نیک و بد کا اللہ ہی لے گا اور لوگوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے نبی کا محاسبہ کریں ۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ (۳۳: ۴۰) "محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں"۔ لہٰذا زینب محمد کے کسی بیٹے کی مطلقہ نہیں ہے ۔ زید ابن محمد دراصل زید ابن حارثہ ہیں ۔ لہٰذا اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے اگر حقیقت پسندانہ نظروں سے دیکھا جائے ۔ حضرت محمدؐ اور تمام لوگوں کا آپس میں تعلق نبی اور قوم کا تعلق ہے وہ ان میں سے کسی کا باپ نہیں ہے ۔

وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (۳۳: ۴۰) "وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ قانون بناتے ہیں ۔ اور یہ دائمی اور آخری شریعت ہے اور یہ قیامت تک رہنی ہے ۔ اس کے بعد ان قوانین میں کوئی تغیر و تبدل ہونے والا نہیں ہے ۔

وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا (۳۳: ۴۰) "اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔ اللہ ہی جانتا ہے

کہ انسانیت کے لیے کون سا قانون مفید ہے۔یہ اللہ ہی ہے جس نے نبی پر یہ کام کرنا فرض کیا اور اس کے لیے یہ آسائش مقرر کی تاکہ لوگوں کے لیے منہ بولے بیٹوں کے معاملہ میں پابندی ختم ہو۔جبکہ وہ کسی بیوی کو طلاق دے چکے ہوں اور ان سے اپنی ضرورت پوری کر چکے ہوں اور ان کو آزاد کر چکے ہوں۔اللہ نے اپنے علم کے مطابق فیصلہ فرمایا ہے اور اللہ ہی ہے جو اپنی حکمت اور علم کے مطابق قانون بنانے والا ہے۔

--- ۰۰۰---

اب سیاق کلام میں اللہ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے کہ اللہ کو یاد کرو،صبح و شام' اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے رہو۔وہی تو ہے جس نے اپنی مہربانی اور رحمت سے تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں داخل کیا۔وہ مومنین پر کس قدر رحیم ہے۔جب یہ مومنین قیامت میں حاضر ہوں گے تو ہر طرف سے مبارک سلامت ہوگی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿٤١﴾ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٤٢﴾ هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ﴿٤٣﴾ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ ۚ وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا كَرِيمًا ﴿٤٤﴾

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو' وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے' وہ مومنوں پر بہت مہربان ہے جس روز وہ اس سے ملیں گے' ان کا استقبال سلام سے ہوگا اور ان کے لیے اللہ نے بڑا باعزت اجر مہیا کر رکھا ہے"۔

اللہ کا ذکر انسان کو اللہ کے ساتھ مربوط رکھتا ہے۔اور انسان کا دل اللہ کی فکر اور سوچ میں رہتا ہے کہ اللہ کی ذات ہی سب کچھ کرنے والی ہے۔صرف زبان ہی سے اللہ اللہ کرنا ذکر نہیں ہے۔نماز قائم کرنا بھی ذکر الہی کی ایک شکل ہے بلکہ خصوصی قرآن و سنت میں ذکر کا مطلب قریب قریب نماز ہی ہے۔امام ابو داؤد اور ابن ماجہ نے اعمش کی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اغر' ابو سعید اور ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب کسی شخص نے اپنی بیوی کو رات کے وقت جگایا اور دونوں نے دو رکعت نماز پڑھی تو دونوں اس پوری رات میں ذاکرین اور ذاکرات میں شمار ہوں گے"۔

اگرچہ ذکر الہی نماز سے عام ہے لیکن ہر وہ صورت جس میں بندہ خدا کو یاد کرے' وہ ذکر الہی ہے۔جس میں بندے کا دل رب سے مربوط ہو' چاہے زبان سے وہ ادا کرے یا نہ کرے۔اصل بات یہ ہے کہ قلبی اور روحانی لحاظ سے انسان اللہ سے مربوط ہو جائے۔

جب انسان اللہ سے غافل ہو' تو اس کا دل خالی ہوتا ہے' وہ لاپرواہ ہوتا ہے اور وہ حیران و پریشان ہوتا ہے۔جب وہ اللہ تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ مانوس اور پرسکون ہو جاتا ہے۔اب اس کا قلب بھرا ہوا ہوتا ہے۔وہ سنجیدہ

بن جاتا ہے ۔اسے قرار و سکون مل جاتا ہے ۔ اسے زندگی کی راہ معلوم ہو جاتی ہے ' وہ اپنے منہاج سے باخبر ہوتا ہے ۔ اسے پتہ ہوتا ہے کہ وہ کہاں ہے ' اسے کہاں جانا ہے اور اس کی راہ کون سی ہے

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ذکر الٰہی پر بہت زور دیتا ہے ۔بہت ہی تاکید کی جاتی ہے کہ اللہ کو یاد کرو' چنانچہ قرآن مجید ذکر الٰہی کو انسان کے مصروف ترین اوقات اور حالات سے مربوط کرتا ہے تاکہ کسی بھی مصروفیت میں انسان ذکر الٰہی سے غافل نہ ہو جائے ۔ اس کے وہ اوقات اور حالات بھی وسیلہ یاد الٰہی بن جائیں اور یوں انسان حالات اور اوقات کے حوالے سے بھی اللہ سے مربوط ہو جائے ۔

وَّ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (۳۳ : ۴۲) "صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو"۔ صبح و شام کے اوقات میں ایک خاصیت ہے ۔وہ یہ کہ ان اوقات میں انسانی قلب اللہ کی طرف مائل ہوتا ہے ۔کیونکہ ان اوقات میں انسان کے حالات اور دن اور رات کے اصول بدلتے ہیں جبکہ اللہ لازوال ہے اور اس کے سوا ہر چیز تغیر پذیر اور زوال پذیر ہے ۔

اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ جس ذات کو تم یاد کرتے ہو' اور جس کی تسبیح کرتے ہو' وہ لازوال ہونے کے ساتھ تم پر بہت ہی رحیم و کریم ہے اور وہی ہے جو تمہاری تخلیق کرتا ہے' تمہاری بہتری چاہتا ہے' حالانکہ وہ غنی بادشاہ ہے اور تم محتاج ہو ۔اس کو کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ یہ تو محض اس کا فضل و کرم ہے ۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۳۳ : ۴۳) "وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے اور وہ مومنین پر بہت مہربان ہے"۔ اللہ بہت بلند ہے' اس کی رحمتیں بہت زیادہ ہیں ۔ اس کا فضل و کرم بہت ہی عظیم ہے ۔ اللہ اپنے ان ضعیف اور محتاج بندوں پر رحمت فرماتا ہے جو کمزور اور بے قرار ہوتے ہیں' ان کو نصیحت کرتا ہے' ان پر رحم و کرم کرتا ہے ۔اس کے فرشتے انسانوں کے لیے دعا کرتے ہیں اور ان کو بھلائی سے یاد کرتے ہیں ۔ یوں پھر پوری کائنات بھی بندوں کو یاد کرتی ہے ۔ رسول اللہؐ نے فرمایا "اللہ فرماتے ہیں جس نے مجھے یاد کیا اپنے دل میں' میں اسے دل میں یاد کرتا ہوں ۔ جس نے مجھے لوگوں میں یاد کیا میں اسے ان سے اچھے لوگوں میں یاد کرتا ہوں"۔

یہ ایک عظیم قسمت ہے جس کا تصور انسان کے لیے ممکن نہیں کہ انسان اور یہ زمین اس کائنات کا ایک حقیر ذرہ ہیں اور یہ افلاک اور یہ پوری کائنات اللہ کی لاتعداد مخلوقات و املاک کا حقیر حصہ ہیں جو کن فیکون سے پیدا ہوئے ۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

(۳۳ : ۴۳) "وہی ہے جو تم پر رحمت فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ تمہارے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئیں"۔

اللہ کا نور ایک ہے' وہ ہر کسی کے شامل حال ہے اور عام ہے ۔ اللہ کے نور کے سوا جس قدر افکار و خیالات بھی ہیں' وہ ظلمات ہیں ۔ جب بھی لوگ اللہ کے نور سے نکلیں گے وہ تاریکیوں میں ہوں گے ۔ جزوی تاریکی ہو گی یا کلی تاریکی ہو گی ۔ اور یہ تاریکی صرف ایک ہی ذریعہ سے دور ہو سکتی ہے کہ کسی کے دل میں نور آفتاب طلوع ہو جائے ۔ اس کی روح بدل جائے' وہ فطرت کی طرف لوٹ آئیں ۔ یہی کائنات کی فطرت ہے اور یہی رحمت الٰہی' دعائے ملائکہ اور یہی وہ راہ ہے جس کے ذریعے انسان ظلمات سے نکل آتا ہے لیکن جب اس کا دل کھل جائے ۔

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (۳۳ : ۴۳) "اللہ مومنوں پر بہت مہربان ہے"۔

یہ تو ہے دنیا میں اہل ایمان کا معاملہ ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دنیا دار العمل ہے ۔ رہی آخرت جو دار الجزاء ہے تو وہاں بھی اللہ کا فضل و کرم ان کے شامل حال رہے گا اور اللہ کی رحمت وہاں بھی ان کو ڈھانپے ہوئے ہو گی ۔ وہ ان کے لیے بہت ہی اعزاز ہو گا' بہت ہی خصوصی کرم ہو گا اور اجر عظیم ان کے لیے وہاں تیار ہے ۔

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَٰمٌ وَأَعَدَّ لَهُمْ أَجْرًا كَرِيمًا (۳۳ : ۴۴) "جس روز وہ اس سے ملیں گے' ان کا استقبال سلام سے ہو گا اور ان کے لیے اللہ نے باعزت اجر تیار کر رکھا ہے"۔ ان کے لیے ہر خوف و خطر سے سلامتی ہو گی ۔ ہر تھکاوٹ سے وہ دور ہوں گے ۔ ان کے لیے کوئی مشکل نہ ہو گی ۔ اللہ کی طرف سے مبارک و سلامت کے پیغامات فرشتوں نے اٹھائے ہوئے ہوں گے ۔ یہ فرشتے ان کے پاس ہر طرف سے آتے ہوں گے اور اللہ کی جانب سے سلام پہنچا رہے ہوں گے ۔ یہ سلام ان باعزت اجر و معاوضات کے علاوہ ہو گا جو ابھی سے تیار ہیں ۔

یہ ہے وہ رب کریم جو لوگوں کے لیے قانون بناتا ہے جو ان کے لیے راہ پسند کرتا ہے ۔ لہٰذا کون بدبخت ہو گا جو ایسے رب کے اختیار کردہ نظام سے منہ موڑے گا ۔

--- ۰۰۰ ---

رہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو ان لوگوں تک اللہ کے پسند کردہ قوانین اور ضوابط پہنچاتے ہیں اور خود اپنی سنت اور اپنے اسوہ اور نمونہ کے ذریعے وہ راستے متعین فرماتے ہیں تو یہاں ان کے بارے میں بھی بتا دیا جاتا ہے کہ ان کے فرائض کیا ہیں ۔ آپ کس مشن پر مامور ہیں اور ان کے ذریعے اس دنیا میں اللہ مومنین پر کس قدر فضل کر رہے ہیں ۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى ٱللَّهِ بِإِذْنِهِۦ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ۝ وَبَشِّرِ ٱلْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ ٱللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا ۝ وَلَا تُطِعِ ٱلْكَٰفِرِينَ وَٱلْمُنَٰفِقِينَ وَدَعْ أَذَىٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى ٱللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ وَكِيلًا ۝

"اے نبیؐ' ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر' بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر' اللہ کی اجازت سے اس کی

طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔ بشارت دے دو ان لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لائے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے اور ہرگز نہ دبو کفار و منافقین سے 'کوئی پروانہ کرو ان کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ کر لو اللہ پر' اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے"۔

نبی کا فریضہ منصبی یہ ہے کہ آپ لوگوں پر گواہ ہوں لہٰذا لوگوں کو ایسا عمل کرنا چاہیے کہ حضور اکرمؐ اچھی شہادت دینے کے قابل ہوں کیونکہ آپ نے تو سچی شہادت دینی ہے۔ اصل واقعہ سے کوئی تغیر و تبدیلی آپ نے نہیں کرنی ہے۔ رسول تو خوشخبری دینے والے ہیں ان لوگوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں۔ نیک لوگوں کے لیے اللہ کی رحمت انتظار میں ہے اور غافل اور بے راہ رو لوگوں کو ڈرانے والے ہیں کہ ان کے لیے سخت عذاب ہے تاکہ وہ بیچارے غفلت میں نہ مارے جائیں اور اگر سزا دی جائے تو وارننگ کے بعد۔

وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ (۳۳ : ۴۶) "اور اللہ کی طرف بلانے والا بنا کر بھیجا ہے"۔ اس لیے نہیں بھیجا کہ صرف تمہاری دنیا اچھی ہے۔ تم دنیا میں برتر ہو جاؤ اور قومی وقار تمہارا بلند ہو۔ نہ جاہلی عصبیات کے لیے اسے داعی بنایا ہے۔ نہ مال غنیمت کے حصول کے لیے اٹھایا ہے۔ نہ نظام مملکت کا قیام مطلوب ہے۔ صرف دعوت الی اللہ ان کا منشور و مطلوب ہے اور یہ کام اللہ کے حکم سے انہوں نے شروع کیا ہے۔ نہ یہ اپنی طرف سے ہے اور نہ رضاکارانہ ہے۔ نہ آپ اپنی طرف سے یہ کام بطور رضاکار کرتے ہیں۔ یہ سب کام اللہ کے حکم سے ہے۔

وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا (۳۳ : ۴۶) "آپ روشن چراغ ہیں"۔ آپ ظلمتوں کو دور کرنے والے ہیں۔ شہادت کو قائم کرتے ہیں۔ راستہ متعین کرتے ہیں اور لوگوں کے لیے ایسے راہنما ہیں جس طرح سراج منیر ہوتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح روشنی لے کر آئے۔ یہ روشنی ایک واضح تصور تھا' ایک واضح نظریہ اور عقیدہ تھا' جس نے پوری کائنات کو منور کر دیا۔ اس کائنات اور انسان کا ربط واضح کر دیا اور اس کائنات میں انسان کے مقام و مرتبہ کو متعین کیا۔ ان اقدار کی وضاحت کی جن پر یہ کائنات قائم ہے۔ انسان کا مقصد' اس کی غرض' اور اس کے حصول کا طریقہ متعین کیا۔ نہایت ہی واضح اسلوب میں اور نہایت ہی فطری انداز میں۔ اس طرح کہ بات انسان کے دل کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے۔ مشکل سے مشکل مسائل اور زندگی کے نشیب و فراز میں پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو آسان ترین طریقوں سے حل کر دیا گیا ہے۔

مکرر اس بات کی تفصیل دی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریوں میں اس بات کا اضافہ کیا جاتا ہے کہ آپ مومنین کے لیے مبشر ہیں۔

وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا (۳۳ : ۴۷) "بشارت دے دو ان لوگوں کو جو تم پر ایمان لائے کہ ان کے لیے اللہ کا بہت بڑا فضل ہے"۔ اس سے قبل آیت

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا (۳۳ : ۴۵) "اے نبی' ہم نے آپ

کو گواہ، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے) میں مجملاً آپ کو مبشر کہا گیا تھا اور یہ تفصیل اس لیے دی ہے کہ مومنین یقین کر لیں کہ ان پر اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم ہو گا اور یہ جو ان کے لیے قوانین اور ضوابط تیار ہو رہے ہیں اور نبی اپنے عمل سے ان کے لیے جو راہ و رسم وضع کر رہے ہیں یہ آخر کار ان کے لیے خوشخبری اور عظیم فضل و کرم کی بشارت ہوں گے ۔

اس خطاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ آپ کافروں اور منافقوں کی کسی معاملے میں اطاعت کریں اور مومنین اور آپ کو یہ لوگ جو اذیت دیتے ہیں اس کی بھی کوئی پرواہ نہ کریں ۔ صرف اللہ وحدہ پر توکل کریں ۔ وہی تمہارے لیے کافی مددگار ہے ۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۳۳: ٤٨) "اور ہرگز نہ دبو کافروں اور منافقین سے کوئی پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی ۔ اور بھروسہ کر لو اللہ پر، اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے"۔

یہ وہی خطاب ہے جو سورہ کے آغاز میں بھی تھا ۔ اس سے قبل کہ وہاں قانون سازی کا آغاز کیا جاتا اور جدید انتظامی ہدایات دی جائیں ۔ یہاں البتہ یہ بات زیادہ ہے کہ اے نبیؐ آپ کافروں اور منافقوں کی اذیت رسانی کی کوئی پرواہ نہ کریں اور نہ ان کی پیروی کسی معاملے میں کریں اور نہ کسی معاملے میں ان پر اعتماد کریں ۔ کیونکہ اللہ وحدہ قابل اعتماد ہے ۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (۳۳: ٤٨) "اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اس کے سپرد کر دے"۔

یوں زید اور زینبؓ کے واقعہ اور منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے ساتھ نکاح کے جواز کے مسئلہ کی تمہید اور تبصرہ دونوں طویل ہیں اور یہ عملی مثال جسے پیش کرنے کے فریضے کو حضورؐ بھی بہت بھاری محسوس سمجھ رہے تھے ۔ اس لیے اس میں اللہ کی طرف سے تشریح اور لوگوں کی حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی ۔ ان معاملات میں تعلق باللہ کو مضبوط کرنے کی ضرورت تھی تاکہ بندہ اللہ کے احسان اور رحمت کا گہرا شعور حاصل کر لے اور ان احکام کو خوشدلی سے وصول کرے، قبول کرے اور تسلیم و رضا کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہو ۔

---ooo---

درس نمبر ۱۹۲ ایک نظر میں

اس سبق کے ابتدائی حصہ میں عام خاندانی اور عائلی قانون سازی ہے۔ مطلقہ جسے رخصتی سے قبل طلاق ہو چکی ہو' اس کا حکم عدت وغیرہ۔ اس کے بعد حضورؐ کی خاندانی زندگی کے لیے ہدایات' ازواج کے ساتھ آپ کے تعلقات' اور رواج کے دوسرے لوگوں سے رابطے کی ضابطہ بندی اور مسلمانوں کا رسول کے گھرانے سے تعلق' اور پھر اس گھرانے پر درود و سلام۔ پھر پردے کا عام حکم جس میں رسول اللہؐ کی بیٹیاں' بیویاں اور مومنین کی تمام عورتیں شامل ہیں یہ کہ جب وہ قضائے حاجت کے لیے باہر نکلیں تو اپنی اوڑھنیاں سینوں پر لٹکا لیا کریں تاکہ وہ اس لباس کے ساتھ پہچانی جا سکیں اور ان کے ساتھ تعرض نہ کیا جا سکے۔ کیونکہ منافقین' فساق و فجار اور مدینہ میں افواہیں پھیلانے والے اوباش عورتوں سے چھیڑ خانی کرتے تھے۔ آخر میں ایسے لوگوں کو دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی ان کارروائیوں سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف سخت اقدامات کیے جائیں گے۔

یہ تمام قانونی' معاشرتی اور امن و امان کے اقدامات اس لیے تھے کہ مدینہ کی سوسائٹی کو مکمل اسلامی خطوط پر منظم کیا جائے۔ جو ہدایات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے بارے میں ہیں' وہ اس لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس گھرانے کو قیامت تک کے لیے آنے والی نسلوں کے لیے کھلی کتاب کے طور پر باقی رکھنا چاہتے تھے کیونکہ یہ کتاب تو قیامت تک پڑھی جانے والی تھی اور پھر یہ ہدایات اور کتاب الٰہی میں ان کا ثبت کیا جانا اس گھر کے لیے ایک اعزاز بھی تھا کہ خود اللہ اس کی تربیت کر رہے ہیں اور قیامت تک کے لیے نمونہ بنا رہے ہیں۔

--- ○○○---

درس نمبر ۱۹۲ تشریح آیات

۴۹ --- تا --- ۶۲

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو' اور پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔ لہٰذا انہیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو“۔

سورہ بقرہ میں یہ احکام اس عورت کے بارے میں گزر گئے تھے جس کو قبل از رخصتی طلاق دے دی گئی ہو۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّ مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ (۲:۲۳۶) وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَ اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

(۲:۲۳۷) (۲:۲۳۶ ۔ ۲۳۷)”تم پر کچھ گناہ نہیں اگر اپنی عورتوں کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ ہاتھ لگانے کی نوبت آئے یا مہر مقرر ہو۔ اس صورت میں انہیں کچھ نہ کچھ ضرور دینا چاہئے۔ خوشحال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدرت کے مطابق معروف طریقہ سے دے۔ یہ حق ہے نیک آدمیوں پر۔ اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے

پہلے طلاق دی ہو مگر مہر مقرر کیا جا چکا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہو گا۔ یہ اور بات ہے کہ عورت نرمی برتے۔ یا وہ مرد جس کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے نرمی سے کام لے اور تم نرمی سے کام لو' تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ آپس کے معاملات میں فیاضی کو نہ بھولو' تمہارے اعمال کو اللہ دیکھ رہا ہے"۔

ایسی مطلقہ جس کی رخصتی نہ ہوئی ہو اگر مہر مقرر ہو تو نصف مہر ادا کرنا ہو گا اور اگر مہر مقرر نہ ہو تو اس کے لیے کچھ نہ کچھ سامان دینا لازمی ہے۔ مالدار پر اس کی حیثیت کے مطابق اور غریب پر اس کی حالت کے مطابق۔ اس آیت میں عدت کے مسئلے کا اضافہ کر دیا گیا جو وہاں نہ تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ چونکہ رخصتی نہیں ہوئی ہے اس لیے عدت نہ ہو گی۔ کیونکہ ان لوگوں کے درمیان چونکہ ہم بستری نہیں ہوئی اس لیے عدت کے ذریعے رحم کو پاک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ سابقہ نکاح کے آثار ہی موجود نہیں تاکہ نسب کا اختلاط نہ ہو اور کسی آدمی کی طرف وہ بچہ منسوب نہ ہو جو دراصل اس کا نہ ہو۔ یا ایک شخص کا بچہ ہو اور وہ اس سے محروم ہو جائے لیکن رخصتی نہ ہونے کی صورت میں تو رحم پاک ہے۔ لہٰذا نہ عدت ہے اور نہ انتظار ہے۔

فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا (۳۳: ۴۹) "تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کرو"۔ فَمَتِّعُوهُنَّ "انہیں کچھ مال دو"۔ اگر مہر مقرر ہو تو نصف مہر ہے۔ اور اگر نہ ہو تو بھی کچھ دو' اپنی مالی حالت کے مطابق۔

وَ سَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (۳۳: ۴۹) "اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو"۔ نہ روکے رکھو' نہ اذیت دو' نہ بغض رکھو اور نہ ان کو جدید ازدواجی زندگی گزارنے سے روکو۔ اس سورہ میں یہ عام حکم ہے اور پوری اسلامی سوسائٹی کے لیے ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ کے لیے کون سی عورتیں حلال کی گئی ہیں اور وہ خصوصیات جو آپ کی ذات اور آپ کے اہل بیت کے لیے ہیں۔ یہ احکام سورہ نساء کی آیت (مثنیٰ وثلاث ورباع) کے بعد آئے۔ وہاں مسلمانوں کے لیے چار عورتوں سے زیادہ کرنا حرام کر دیا گیا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں ۹ بیویاں تھیں۔ ہر ایک کے ساتھ نکاح ایک خاص ضرورت کے تحت ہوا تھا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بیٹیاں تھیں۔ یہ آپ کے قریبی ساتھی تھے۔ ام حبیبہ ابو سفیان کی بیٹی تھی۔ ام سلمہ' سودہ بنت زمعہ' زینب بنت خزیمہ ان لوگوں میں سے تھیں جو خاوندوں سے محروم ہو گئی تھیں اور حضورؐ نے ان کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی فرمائی۔ زینب بنت جحشؓ کا قصہ تو ابھی گزرا ہے۔ چونکہ آپؐ نے اصرار پر ان کو زید ابن حارثہ غلام کے ساتھ بیاہ دیا تھا اور یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی تو اللہ نے حضورؐ سے ان کا نکاح کر دیا۔ ان کی دل جوئی کے لیے اور متبنیٰ بنانے کی رسم کے آثار کو ختم کرنے کے لیے' تفصیلات گزر چکی ہیں۔ جویریہ بنت الحارث بنی المصطلق اور صفیہ بنت حیی ابن اخطب' دونوں غلام ہو کر آئیں اور حضورؐ نے ان کو آزاد کر کے نکاح میں لے لیا تاکہ ان قبائل سے تعلقات قائم ہوں اور ان دونوں دختران سرداران کی عزت ہو۔ یہ دونوں اسلام لا چکی تھیں اگرچہ ان کی اقوام کے ساتھ سخت سلوک ہوا۔

یہ سب عورتیں وہ تھیں جنھوں نے امہات المومنین کا مقام پایا اور جب آیت تخییر نازل ہوئی تو ان سب نے اللہ اور رسول اللہ ؐ کو اختیار کیا اور دنیا پر آخرت کو اختیار کر لیا۔ نیز جب عورتوں کی تعداد کو چار کے اندر محدود کر دیا گیا تو ان ازواج نبی سے لیے حضور ... تحدید ہونا شاق گزرا۔ اللہ نے ان پر نظر کرم فرمائی اور بقرہ کی آیت سے حضورؐ کو مستثنیٰ کر دیا اور ان تمام عورتوں کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی۔ ان سب کو آپ کے لیے حلال کر دیا لیکن اس کے بعد یہ حکم بھی ... کہ آپ ان پر اضافہ نہیں کر سکتے۔ نہ ان میں سے کسی ایک کے بدلے دوسری لا سکتے ہیں۔ یہ اجازت صرف موجودہ ازواج تک محدود ہے تاکہ وہ شرف زوجیت رسولؐ سے محروم نہ ہو جائیں جبکہ اس سے قبل وہ اللہ کے رسول اور دار آخرت کو ترجیح دے چکی تھیں۔ یہی موضوعات ہیں ان آیات کے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۰﴾ تُرْجِيْ مَنْ تَشَاۗءُ مِنْهُنَّ وَتُـــْٔوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِــيْمًا حَلِــيْمًا ﴿۵۱﴾ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاۗءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾

۶　۱۲ع　۳

”اے نبیؐ، ہم نے تمہارے لیے حلال کر دیں تمہاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کیے ہیں، اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمہاری ملکیت میں آئیں، اور تمہاری وہ چچا زاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ

زاد بہنیں جنہوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی ہے اور وہ مومن عورت جس نے اپنے آپ کو نبیؐ کے لیے ہبہ کیا ہو اگر نبی اسے نکاح میں لینا چاہے ۔ یہ رعایت خالصتاً تمہارے لیے ہے ۔ دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے ۔ ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود عائد کیے ہیں ۔ تمہیں ان حدود سے ہم نے اس لیے مستثنیٰ کیا ہے تاکہ تمہارے اوپر کوئی تنگی نہ رہے ' اور اللہ غفور و رحیم ہے ۔ تم کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو ' اپنے سے الگ رکھو ' جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بلا لو ۔ اس معاملہ میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ اس طرح زیادہ متوقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی تم ان کو دو گے اس پر وہ سب راضی رہیں گی ۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے ' اور اللہ علیم و حلیم ہے ۔ اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں ' اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی پسند ہو ' البتہ لونڈیوں کی تمہیں اجازت ہے ۔ اللہ ہر چیز پر نگران ہے''۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس آیت میں مذکورہ عورتوں کو حلال قرار دیا گیا ۔ اگرچہ وہ چار کی تعداد سے زیادہ ہوں جبکہ دوسرے مسلمانوں پر چار سے زیادہ تعداد حرام ہے ۔ یہ اقسام یہ ہیں : وہ ازواج جن کو مہر دے کر آپ نے نکاح فرمایا ۔ وہ عورتیں جو غلام بن کر آ جائیں ۔ چچازاد اور خالہ زاد عورتیں ۔ پھوپھی زاد اور ماموں زاد عورتیں ۔ ان میں سے صرف وہ جو آپ کے ساتھ ہجرت کر کے آئیں ۔ یہ ان مہاجرات کی عزت افزائی کے لیے ہے ۔ نیز وہ عورت بھی جو اپنے نفس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بخش دے ' بغیر مہر کے اگر نبی اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہیں ۔ (روایات میں اضطراب ہے کہ آیا اس قسم کی عورتوں میں سے کسی کے ساتھ حضورؐ نے نکاح فرمایا یا نہیں ۔ راجح بات یہ ہے کہ جن عورتوں نے اپنے آپ کو حضورؐ کے لیے پیش کیا آپؐ نے ان کے ساتھ نکاح کیا) ۔ یہ اقسام حضورؐ کے لیے بطور خصوصیت جائز کی گئیں کیونکہ حضورؐ مومنین اور مومنات کے ولی بھی تھے ۔ رہے دوسرے لوگ تو وہ اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے معاملے میں اللہ کے جاری کردہ قوانین کے پابند تھے ۔ یہ استثناء اس لیے کی گئی کہ حضورؐ اپنے شخصی اور اجتماعی حالات کی وجہ سے مشکلات میں مبتلا نہ ہوں ۔

اس کے بعد یہ اختیار بھی حضور اکرمؐ کو دے دیا کہ اگر کوئی اپنی ذات کے بارے میں حضورؐ کو پیش کش کرے تو حضور اسے اپنے حرم میں لے لیں یا موخر کر دیں ۔ اور جن کے معاملے کو آپ نے موخر کر دیا تو بعد میں اسے حرم میں داخل کر دیں ۔ یہ بھی اختیار دے دیا کہ جن عورتوں کو الگ کر دیں انہیں دوبارہ ساتھ بلا لیں ۔

ذٰلِكَ أَدْنٰى أَنْ تَقَرَّ أَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ (۳۳ : ۵۱)

''اس طرح زیادہ متوقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں ۔ اور جو کچھ بھی تم ان کو دو گے اس پر وہ سب راضی ہوں گی''۔ گویا یہ حضور اکرمؐ کے خاص حالات کے تحت اجازت دی گئی ۔ کیونکہ سب عورتیں آپ کی طرف راغب تھیں اور آپ کے ساتھ رابطہ چاہتی تھیں ۔ اللہ کو ان حالات کا سب سے زیادہ علم تھا ۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِىْ قُلُوْبِكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا (۳۳ : ۵۱) ''اللہ جانتا ہے جو تم لوگوں کے دلوں میں ہے اور اللہ علیم و حلیم ہے''۔

اس کے بعد یہ حکم ہے کہ آپ کے حرم میں جو عورتیں ہیں، وہ ذاتی طور پر آپ کے لیے جائز ہیں، تعداد مطلوب نہیں ہے۔ اس لیے آپ ان میں سے کسی کے بدلے کسی دوسری عورت کو نہیں لا سکتے۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ آیا حضورؐ نے اس آیت کے نزول سے قبل کسی عورت کا اضافہ کیا تھا۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ

(۳۳ : ۵۲) "اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ، خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔ اس میں کوئی استثناء نہیں۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ (۳۳ : ۵۲) "البتہ لونڈیوں کی تمہیں اجازت ہے"۔ لونڈیاں جس قدر چاہیں رکھ سکتے ہیں۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا (۳۳ : ۵۲) "اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے"۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ یہ حرمت بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل اٹھالی گئی تھی لیکن اجازت کے باوجود حضور اکرمؐ نے ان کے سوا کسی عورت کے ساتھ نکاح نہ کیا اس لیے وہی امہات المومنین رہیں۔

--- ooo---

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے اور عام مسلمانوں کے تعلقات و روابط کی ضابطہ بندی کی گئی ہے کہ آپ کی زندگی میں لوگوں کا ربط آپ کی ازواج کے ساتھ کیسا ہو گا اور آپ کی وفات کے بعد کیا تعلق ہو گا۔ یہ احکام اس وقت کے واقعی حالات کے مطابق آئے۔ کیونکہ بعض منافقین اور بعض مریض اخلاق والے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی ازواج کے بارے میں اذیت دیتے تھے۔ اس لیے ان آیات میں ان کو سخت دھمکی دی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے نزدیک ان کی حرکات بہت ہی گھناؤنی ہیں۔ یہ لوگوں سے تو چھپ سکتے ہیں مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ اللہ ان کی شرارتوں کو بھی جانتا ہے اور نیتوں کو بھی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۫ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ وَمَا

كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا ۚ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمًا ﴿٥٣﴾ إِنْ تُبْدُوا شَيْئًا أَوْ تُخْفُوهُ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٥٤﴾

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' نبی کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔ مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ۔ باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔ تمہاری یہ حرکتیں نبیؐ کو تکلیف دیتی ہیں 'مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے۔ اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ نبیؐ کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔ تمہارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسولؐ کو تکلیف دو' اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو' یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ' اللہ کو ہر بات کا علم ہے"۔

امام بخاری نے حضرت انس ابن مالک کی روایت نقل فرمائی ہے کہ حضورؐ نے جب زینب بنت جحش سے شادی کی تو روٹی اور گوشت کی دعوت دی اور مجھے بلانے کے لیے بھیجا گیا۔ لوگ آتے اور کھانا کھاکر چلے جاتے۔ میں نے سب کو بلایا یہاں تک کہ کوئی نہ رہا۔ تو میں نے کہا حضور اکرمؐ کوئی رہ نہیں گیا۔ تو حضورؐ نے فرمایا اب دستر خوان اٹھالو' کمرے میں تین آدمی بیٹھ گئے جو باتیں کر رہے تھے۔ حضور اکرمؐ نکلے اور حضرت عائشہؓ کے کمرے میں گئے۔ اور فرمایا السلام علیکم اہل البیت ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ آپ نے فرمایا وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ۔ اے رسول خدا آپ کی نئی بیوی کیسی ہیں۔ اللہ آپ کے لیے اسے مبارک کرے۔ آپ اپنی ازواج کے ہاں گئے اور ایسا ہی مکالمہ کیا جس طرح عائشہؓ سے ہوا اور سب نے ایسا ہی جواب دیا۔ جب حضورؐ واپس ہوئے تو یہ تین افراد اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ حضورؐ نہایت ہی حیادار تھے۔ تو حضورؐ حضرت عائشہؓ کے کمرے میں چلے گئے۔ معلوم نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے حضورؐ کو اطلاع دی کہ لوگ چلے گئے یا کسی اور نے اطلاع دی۔ جب حضورؐ واپس ہوئے اور اپنا پاؤں دروازے کی چوکھٹ سے اندر رکھا اور دوسرا باہر تھا تو میرے اور اپنے درمیان پردہ گرا دیا اور اس وقت حجاب کی آیت نازل ہوئی۔

اس آیت میں وہ آداب مذکور ہیں جو دور جاہلیت میں ناپید تھے۔ یہاں تک کہ حضورؐ کے گھر میں بھی یہ ناپید تھے۔ لوگ گھروں میں بغیر اجازت کے داخل ہو جاتے تھے جیسا کہ سورہ نور کی آیت استیذان کی تشریح میں تفصیلات گزر گئیں اور حضورؐ اکرم کے گھر میں تو ان آداب کا بالکل خیال نہ رکھا جاتا تھا اس لیے کہ آپ کا گھر ایک مقام اجتماع تھا اور وہاں لوگ ہر وقت علم و حکمت کے حصول کے لیے بیٹھے رہتے تھے۔ بعض لوگ آتے اور دیکھتے کہ کچھ پک رہا ہے تو وہ بیٹھ جاتے تا کہ بغیر دعوت کی کھالیں۔ بعض لوگ کھا پی لینے کے بعد بھی بیٹھے رہتے۔ چاہے دعوت دی گئی یا خود گھس آئے ہوں۔ پھر باتوں میں لگ جاتے اور نہ سمجھتے کہ اس سے حضور اکرمؐ کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے اور آپ کے اہل بیت کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ تین افراد جب باتیں کر رہے تھے تو اس وقت حضورؐ کی دلہن اسی کمرے میں منہ دیوار کی طرف کر کے بیٹھی تھی اور حضورؐ اس بات سے حیا کرتے تھے کہ وہ ان لوگوں کو بتادیں کہ وہ آپ کے لیے کس قدر بوجھ ہیں۔ محض اس لیے کہ وہ شرمندہ نہ ہوں۔ چنانچہ اللہ نے رسول اللہؐ کی جانب سے یہ اعلان فرمایا۔

وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ (۳۳ : ۵۳) "اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا"۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی غیرت کی بنیاد پر اور حساس ہونے کی وجہ سے حضورؐ کے سامنے یہ تجویز رکھا کرتے تھے کہ حجاب نافذ ہو جائے اور یہ تمنا بھی کرتے تھے یہاں تک کہ آیت حجاب نازل ہو گئی۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "حضورؐ آپ کے پاس تو نیک و بد سب آتے ہیں۔ لے کاش کہ آپؐ امہات مومنین کو پردے کا حکم دیتے"۔

اس آیت میں یہ تعلیم دی گئی کہ لوگ نبی کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل نہ ہوں۔ جب کسی دعوت طعام کے لیے بلایا جائے تو داخل ہوں۔ اگر بلائے نہ گئے ہوں تو جلدی میں نہ آئیں اور کھانے کے پکنے کا انتظار جائے دعوت میں جا کر نہ کریں۔ پھر جب ان کو کھانا کھلا دیا جائے تو چلے جائیں اور کھانا کھانے کے بعد محض گپ شپ کے لیے بیٹھ نہ جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے مقابلے میں آج مسلمان آداب کے زیادہ محتاج ہیں کیونکہ اس ترقی کے دور میں بھی ہم ان آداب سے دور ہیں کیونکہ جن لوگوں کو دعوت پر بلایا جاتا ہے وہ کھانے کے بعد بھی جم جاتے ہیں بلکہ کھانا کھاتے وقت ہی وہ طویل باتیں کرتے ہیں اور گھر والے جو اسلام کے احکام حجاب سے بعض احکام ہی کی پیروی کرتے ہیں وہ قید ہوتے ہیں اور مہمان اپنی باتوں میں غرق ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی آداب ہر دور اور ہر معاشرے کے لیے مفید ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلامی اور خدائی آداب اختیار کرنے کے لیے تیار ہوں۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور عام لوگوں کے درمیان حجاب کی بات سامنے آتی ہے۔

وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (۳۳ : ۵۳) "نبی کی بیویوں سے اگر تم نے کچھ مانگنا ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو"۔ اور یہ حجاب تمہارے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔

ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ (۳۳ : ۵۳) "یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے مناسب طریقہ ہے"۔ لہٰذا کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اس بات کے سوا کوئی اور بات کہے۔ اس لیے کسی کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ اختلاط' بے پردگی' بے باک باتیں' بے قید ملاقاتیں' ہم نشینی اور جنس کے درمیان اشتراک دلوں کو پاک کرتا ہے اور اس طریقے سے ضمیر زیادہ عفیف ہوتے ہیں۔ اس طرح میلانات اور خواہشات دب جاتی ہیں۔ انسانی سلوک اور شعور شفاف ہو جاتے ہیں۔ یہ ہیں بعض وہ خرافات جو اللہ کی مخلوق میں سے گرے ہوئے لوگ کہتے ہیں۔ میں مشورہ دوں گا کہ کسی کو یوں نہیں کہنا چاہئے جبکہ اللہ فرماتے ہیں۔

وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَ قُلُوْبِهِنَّ (۳۳ : ۵۳) "نبی کی بیویوں سے اگر تم نے کچھ مانگنا ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگو' یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے نہایت مناسب طریقہ ہے"۔ یہ حضور اکرمؐ کی بیویوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے جو امہات المومنین ہیں اور ان لوگوں سے کہا جا رہا ہے جو زمین کا نمک ہیں۔ رسول کے ساتھی ہیں جن کی ہمسری کا کوئی سوچ بھی

نہیں سکتا۔ جب اللہ بات کرتا ہے اور دوسری جانب سے اللہ کی مخلوق ایک بات کرتی ہے تو بات اللہ کی ہوتی ہے اور دوسروں کی باتیں خرافات ہوتی ہیں۔ اللہ کے مقابلے میں انسانوں کی باتوں کو اہمیت وہی شخص دے سکتا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ ایک انسان اللہ سے زیادہ جانتا ہے۔

سالوں کے تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اللہ نے جو کچھ کہا' وہ زیادہ سچا تھا اور یہ چھوٹے اور بونے لوگ جو کچھ کہتے ہیں' ان کو سالوں اور صدیوں کے تجربات نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ آج مغرب میں جہاں عورت و مرد کا اختلاط اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہے کیا تمام لوگوں کے دل پاک و صاف ہوگئے ہیں۔ امریکہ اس میدان میں سب سے عروج پر ہے۔ ذرا اسی کے حالات کا مطالعہ کر لو۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ بلانے سے بھی پہلے آجانا اور کھانے کے پکنے کا انتظار کرنا اور پھر کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دور دراز کی باتیں کرنا حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تکلیف دہ تھا اور آپ ازروئے حیا چشم خاموش تھے۔ حالانکہ مسلمانوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت دیں یا آپ کے بعد آپ کی ازواج سے نکاح کریں۔ جبکہ وہ ان کی ماؤں جیسی ہیں۔ رسول اللہؐ کے مقام و مرتبے کا یہ تقاضا ہے کہ آپ کے بعد کوئی ان کے ساتھ نکاح نہ کرے' اس گھرانے کی حرمت اور عزت کو قائم کرنے کے لیے۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا

(۳۳: ۵۳) "تمہارے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ رسول کو تکلیف دو اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو"۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض منافقین یہ کہتے تھے کہ وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ حضورؐ کی وفات ہو اور وہ عائشہؓ سے نکاح کریں۔

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا (۳۳: ۵۳) "یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے"۔ اور جو گناہ اللہ کے ہاں عظیم ہو وہ کس قدر ہولناک ہو گا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد مزید دھمکی دی جاتی ہے جو بہت ہی شدید ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا شَيْئًا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۳۳: ۵۴) "تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ' اللہ کو ہر بات کا علم ہے"۔ لہٰذا یہ سب معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ ہر ظاہر اور چھپے کا جاننے والا ہے۔ ہر تدبیر اور ہر سوچ کو جانتا ہے اور یہ معاملہ اس کے ہاں ہے بھی گناہ کبیرہ۔ اگر کوئی پھر بھی اس کے ساتھ الجھتا ہے تو وہ اللہ کے ساتھ جنگ کرتا ہے اور جس نے اللہ سے جنگ کی وہ مٹ گیا۔

اس عام حجاب کے بعد ازواج مطہرات کے لیے بعض محرمات سے پردہ نہ کرنے کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ ان کے سامنے آسکتی ہیں۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ

وَلَآ اَبۡنَآءِ اِخۡوَانِهِنَّ وَ لَآ اَبۡنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيۡنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدًا ﴿۵۵﴾

"ازواج نبیؐ کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کے باپ' ان کے بیٹے' ان کے بھائی' ان کے بھتیجے' ان کے بھانجے' ان کے میل جول کی عورتیں اور ان کے مملوک گھروں میں آئیں۔ (اے عورتو) تمہیں اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرنا چاہیے اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے"۔

یہ وہی محرم ہیں جن کے سامنے تمام مسلمان عورتوں کو حجاب نہ کرنے کی اجازت ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ ان دو آیات میں سے کون سی پہلے نازل ہوئی ہے۔ یعنی یہ آیت جو ازواج نبی کے ساتھ مخصوص ہے یا سورہ نور کی وہ عام آیت جو تمام مسلم عورتوں کے لیے ہے۔ راجح بات یہ ہے کہ پہلے حکم ازواج مطہرات کے لیے آیا اور پھر عام مسلم عورتوں کے لیے اور یہ اللہ کی طرف سے فرائض عائد کیے جانے کے مزاج کے مطابق ہے۔

اس اجازت کو بھی خدا کے خوف کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ اللہ سے ڈرو' اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔ تقویٰ اور اللہ کی نگرانی کو ذہن میں رکھنا ایسے مقامات پر بالعموم مذکور ہوتا ہے کیونکہ تقویٰ ہر برائی سے بچنے کی آخری ضمانت ہے۔ یہ وہ نگران ہے جو ہر وقت دل و دماغ کی نگرانی کرتا ہے۔

---ooo---

سیاق کلام لوگوں کو اس بات سے ڈرانے میں ذرا مزید آگے بڑھتا ہے کہ وہ رسول اللہ کو اذیت نہ دیں۔ نہ آپ کی ذات کے معاملے میں اور نہ آپ کے خاندان کے معاملے میں۔ اس کام کے گھناؤنے پن کو مزید وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے اور یہ بات دو طریقوں سے بیان کی جاتی ہے۔ پہلے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ حضور اکرمؐ اللہ کے ہاں کس قدر بلند مرتبہ ہیں اور دوسرا طریقہ یہ کہ براہ راست یہ کہا گیا کہ حضور اکرم کو ایذا دینے والے دراصل اللہ کو ایذا دیتے ہیں اور اس کی سزا اللہ کے ہاں یہ ہے کہ ان کو اللہ کی رحمت سے دور کر دیا جاتا ہے اور وہ دنیا اور آخرت میں محروم ہوں گے اور ان کو یہ عذاب دیا جائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوۡنَ عَلَى النَّبِىِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَيۡهِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا ﴿۵۶﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمۡ عَذَابًا مُّهِيۡنًا ﴿۵۷﴾

"اللہ اور اس کے ملائکہ نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں' اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔ جو لوگ

اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے رسواکن عذاب مہیا کر دیا ہے"۔

اللہ کی طرف سے رسول اللہؐ پر درود بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ عالم بالا میں نبی کی تعریف کی جاتی ہے اور فرشتوں کی طرف سے درود کے معنی یہ ہیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دعا کرتے ہیں۔ کیا ہی عظیم مرتبہ ہے حضورؐ کا اللہ کے ہاں کہ یہ پوری کائنات آپ کے لیے دعاگو ہے۔ اس کے ذریعہ پوری کائنات منور ہو جاتی ہے اور اللہ کی جانب سے یہ ثنا اور تعریف ہوتی ہے اور جو باقی ہے اور ازلی اور ابدی ہے اور پوری کائنات اس کے ہمقدم ہے۔ اس نعت اور تکریم سے بڑی اور نعت کیا ہو سکتی ہے۔ ہم انسانوں کے درود و سلام کا اللہ اور پوری کائنات کے درود و سلام سے کیا مقابلہ۔ انسانوں سے صلوۃ و سلام کا مطالبہ اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کی یہ حقیر آواز بھی کائنات کی گونج سے مل کر اس عظیم ثنا میں شریک ہو جائے اور اس طرح انسان بھی اس بڑی تقریب میں شرکت کے مدعی بن جائیں جبکہ اللہ کی جانب سے صلوۃ و سلام تو ازلی اور ابدی ہو گا۔

اس عظیم حمد و ثنا کو دیکھتے ہوئے جس میں رب تعالیٰ 'فرشتے' کائنات اور انسان بھی شریک ہیں۔ اگر کوئی بدبخت نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ممدوح کائنات اور رب کائنات کو اذیت دیتا ہے تو اس کا یہ فعل کس قدر گھناؤنا ' کس قدر قبیح اور قابل ملامت ہو جاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا (۳۳:۵۷) "جو لوگ اللہ اور رسول اللہؐ کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور ان کے لیے رسواکن عذاب مہیا کر دیا ہے۔ یہ فعل اور بھی قبیح ہو جاتا ہے کہ ایک مخلوق اپنے خالق کو اذیت دیتی ہے۔ حالانکہ لوگ اللہ کو اذیت دے ہی نہیں سکتے۔ بلکہ انداز کلام یہ بتاتا ہے کہ وہ رسول اللہ کو اس قدر سخت اذیت دیتے ہیں جس سے گویا اللہ جل و شانہ کو اذیت پہنچتی ہے۔ لہذا ان کی یہ حرکت بہت بری 'بہت قبیح اور نہایت گھناؤنی ہے۔

اس کے بعد مومنین و مومنات کی ایذا کا ذکر آتا ہے کہ ان کو اذیت دینا' ان پر بہتان باندھنا' کہ ان میں کوئی عیب نہیں جیسے یہ منافقین ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا ﴿۵۸﴾

ع ۶ ۷ ۴

"اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بے قصور اذیت دیتے ہیں انہوں نے ایک بڑے بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مدینہ میں ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو اس طرح مومنین اور مومنات کو اذیت

رسانی کے مشغلے میں مصروف تھا۔ مومنین کے بارے میں بری باتیں رات اور دن منسوب کی جاتی تھیں۔ ان کے خلاف سازشیں کرتے، تہمتیں لگاتے، جس طرح ہر زمان و مکان میں اسلامی تحریکات کے خلاف ہوا کرتا ہے۔ بدکار اور اشرار کے ہر معاشرے میں مومنین اور مومنات کے ساتھ ہمیشہ یہی سلوک ہوا ہے۔ مریض دل لوگ اور منافقین کا کسب ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اللہ نے مومنات کا دفاع یہاں اپنے ذمہ لیا ہے اور الزام لگایا ہے کہ ان کے دشمن جھوٹے اور جہنمی ہیں اور اللہ سے سچا اور کون ہو سکتا ہے۔

---○○○---

اس کے بعد حکم دیا جاتا ہے کہ اے نبی اپنی بیویوں، لڑکیوں اور مومنین کی عورتوں کو یہ ہدایت کرو کہ وہ جب باہر نکلیں تو اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں تاکہ وہ پہچان لی جائیں کہ وہ شریف زادیاں ہیں۔ اس طرح کہ ان کے سر، چہرے اور سینے پوشیدہ ہوں۔ جیوب جمع جیب ہے اور یہ قمیص کا کھلا شگاف ہوتا ہے جو سینے پر ہوتا ہے۔ اس دور میں لوگ عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اس لیے اس طرح کے لباس سے اس قسم کے شرپسند ذرا سہم جائیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ یہ خواتین شرم و حیا والی ہیں لہٰذا وہ دست درازی کی جرأت نہ کر سکیں گے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾

"اے نبیؐ اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے"۔

سدی کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایسے فساق موجود تھے جو اس دور میں رات کو نکلتے تھے، اس وقت جب اندھیرا گہرا ہو جاتا تھا اور مدینہ کی تنگ گلیوں میں عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ کیونکہ لوگوں کے گھر تنگ تھے اور قضائے حاجت کے لیے عورتوں کو باہر نکلنا پڑتا تھا۔ یہ فساق ان عورتوں کے پیچھے پڑتے تھے۔ جب وہ دیکھتے کہ کسی عورت نے حجاب کیا ہوا ہے تو وہ یہ کہتے کہ یہ آزاد عورت ہے اس لیے یہ اس سے رک جاتے۔ اور جب وہ دیکھتے کہ پردہ نہیں ہے تو یہ اس پر ٹوٹ پڑتے۔

مجاہد کہتے ہیں کہ معنی یہ ہے کہ اپنے اوپر جلباب ڈال لیں تاکہ معلوم ہو کہ یہ آزاد عورتیں ہیں تاکہ کوئی فاسق ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرے یا شک نہ کرے اور یہ کہ۔

كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۳۳: ۵۹) "اور اللہ غفور و رحیم ہے"۔ یعنی ایام جاہلیت میں جو کچھ ہوتا ہے اللہ اس سے درگزر فرمائے گا کیونکہ اس وقت ان کو نہ حکم تھا اور نہ علم تھا۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ عرب کے گندے معاشرے کو اسلام آہستہ آہستہ پاک کر رہا تھا اور فتنہ و فساد اور جنسی بے راہ روی کی ایک ایک راہ کو بند کرتا چلا جاتا تا اور بدی کا دائرہ تنگ کیا جا رہا تھا تاکہ اسلام کی پاک رسم و راہ آہستہ آہستہ اسلامی معاشرے میں جڑ پکڑتی چلی جائے ۔

آخر میں مدینہ کے ان ناپسندیدہ عناصر کو سخت دھمکی دی جاتی ہے کہ منافقین' بیمار اخلاق کے لوگ اور ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے اگر باز نہ آئے اور جن کارروائیوں میں وہ مصروف ہیں ان کو ترک نہ کیا تو ان کے خلاف رسول اللہ کو سخت کارروائی کرنے کا حکم دے دیا جائے گا۔ نبی اور مومنین اور مومنات ان پر مسلط کر دیئے جائیں گے جس طرح یہودیوں پر نبی اور مسلمانوں نے مکمل اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ پھر ان کے لیے مدینہ میں رہنا مشکل ہو جائے گا اور ان کو بھی ملک بدر کر دیا جائے گا۔ ان کے خلاف کارروائی یہ ہوگی کہ مومنین و مومنات ، اذیت دینے والے مباح الدم ہیں جہاں ملیں ان کا سر قلم کر دیا جائے جس طرح یہودیوں کا حشر انہوں نے دیکھ لیا ہے اور جس طرح ازمنہ ماضیہ میں غیر یہودی فساق و فجار کا یہی حشر انبیاء کے ہاتھوں ہوتا رہا ہے ۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾ الربع

"اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے' اور وہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں' اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمہیں اٹھا کھڑا کریں گے' پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے۔ ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی' جہاں کہیں پائے جائیں گے' پکڑے جائیں گے اور بری طرح مارے جائیں گے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو ایسے لوگوں کے معاملے میں پہلے سے چلی آ رہی ہے' اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے ۔

اس تہدید سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی قریظہ کے قلع قمع کے بعد مدینہ میں مسلمان چیلنج پاور بن گئے تھے اور اسلامی مملکت قوت سے اخلاقی تعلیمات نافذ کر رہی تھی اور منافقین کارز ہو گئے تھے۔ صرف خفیہ سازشیں کرتے تھے' کھلے بندوں مسلمانوں کے خلاف ظاہر نہ ہو سکتے تھے بلکہ بظاہر وہ خائف اور سہمے ہوئے تھے ۔

---ooo---

درس نمبر ۱۹۳ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا آخری سبق ہے' اس میں لوگوں کے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے جو وہ قیامت کے بارے میں کرتے تھے اور قیام قیامت کے لیے مطالبے کرتے تھے بلکہ دراصل ان کو وقوع قیامت کے بارے میں شک تھا۔ جواب یہ دیا جاتا ہے کہ قیام قیامت کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ البتہ اس کا وقت بہت دور بھی ہے اور ممکن ہے کہ وہ اچانک ہی تمہیں آلے اور تم غفلت میں ڈوبے رہو۔ اس کے بعد مناظر قیامت میں سے ایک ایسا منظر پیش کیا جاتا ہے جو وقوع قیامت کا مطالبہ کرنے والوں کے لیے ہرگز مسرت بخش نہیں ہے۔ جب ان کے چہرے جہنم میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے اور اس وقت وہ اللہ اور رسول اللہؐ کی معصیت پر سخت نادم ہوں گے' جب وہ اپنے لیڈروں اور پیشواؤں کے لیے دگنا عذاب طلب کریں گے۔ یہ اس قدر شرمسار کنندہ منظر ہے کہ کوئی شتابی کرنے والا ہرگز اسے پسند نہ کرے گا۔

اب اس منظر سے ان کو واپس لاکر پھر اس دنیا میں قوم موسیٰ کی مثال ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے کہ اس قوم نے بھی موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دی تھی اور پھر اللہ نے حضرت موسیٰ کو ان کے لگائے ہوئے الزام سے بری کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عملی واقعہ تھا۔ اشارہ اس طرف ہے کہ مدینہ میں جو لوگ حضورؐ کے خلاف باتیں کرتے ہیں کہ حضورؐ نے زینب کے ساتھ نکاح کر کے عربوں کے رواج کے خلاف کیا ہے۔ ایسا ہی کوئی الزام حضرت موسیٰ پر بھی تھا اور مومنین سے کہا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی معاملے میں سیدھی بات کیا کریں اور اشارہ و کنایہ میں الزمات عائد نہ کیا کریں تاکہ اللہ تمہارے اعمال و اخلاق کو درست کر دے۔ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے اور جو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے گا' اللہ ان کو بہت بڑی کامیابی عطا کرے گا۔

سورہ کا خاتمہ ایک عظیم تبصرے پر ہوتا ہے یہ کہ زمین و آسمان نے دعوت قرآنی کی امانت کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کر دیا لیکن انسان نے اس عظیم ذمہ داری کو قبول کر لیا تاکہ اللہ کی اسکیم پایہ تکمیل تک پہنچے۔ لوگوں کے اعمال پر جزاء و سزا مرتب ہو اور انسان اپنے لیے جو راہ اختیار کرتا ہے اس پر اس کا محاسبہ اور جزاء و سزا ہو۔

لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۷۳:۳۳) ”تاکہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے اور اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے“۔

---ooo---

درس نمبر ۱۹۳ تشریح آیات

۶۳ --- تا --- ۷۳

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ
وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿٦٣﴾

"لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کی گھڑی کب آئے گی ۔ کہو اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے ۔ تمہیں کیا خبر' شاید کہ وہ قریب ہی آگئی ہو"۔

اہل مکہ مسلسل قیامت کے دن کے بارے میں رسول خدا سے پوچھتے رہتے تھے 'کیونکہ حضور ؐ نے ان سے قیامت کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے تھے اور ان کو قیامت سے بہت زیادہ ڈرایا تھا ۔ اور قرآن کریم نے قیامت کے مناظر اس قدر طوالت سے ذکر کیے کہ یوں نظر آنے لگا کہ شاید یہ مناظر آنکھوں کے سامنے ہیں ۔ اے پیغمبر' آپ سے یہ لوگ قیامت کے وقت وقوع کے بارے میں پوچھتے ہیں ۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ یہ جلدی واقع ہو جائے اور یہ لوگ جلدی اس لیے کر رہے تھے کہ ان کو دراصل اس کے وقوع میں شک تھا ۔ یا جلدی کا مطالبہ کر کے دراصل وہ تکذیب کرنا چاہتے تھے یا قیامت کے ساتھ مزاح کرنا چاہتے تھے ۔ ہر سائل کا سوال اس کی نفسیات کے اعتبار سے تھا' جس کے جو خیالات تھے اور جس کے جو اعتقادات تھے وہ اپنے اعتقاد کے مطابق سوال کرتا ۔

قیام قیامت کا علم ایک ایسا غیب ہے جو خاصہ خدا ہے اور اللہ نے اپنی مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس کی اطلاع نہیں دی ' نہ رسولوں کو نہ ملائکہ مقربین کو ۔ عبداللہ ابن عمر سے جو حدیث حقیقت ایمان اور حقیقت اسلام کے بارے میں وارد ہے ' اس میں ہے کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص نمودار ہوا ' بالکل سفید لباس میں ۔ بالکل اس پر سفر کے آثار میں سے کوئی علامت نہ تھی ہم میں سے کوئی اسے نہ پہچانتا تھا ۔ وہ رسول اللہ کے سامنے بیٹھ گیا اور اپنے زانو حضور ؐ کے زانوؤں کے ساتھ ملا دیئے ۔ اپنے ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ دیئے اور کہا اے محمد ! بتایئے اسلام کیا ہے ؟ تو حضور ؐ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں ۔ نماز پڑھے ' زکوٰۃ دے اور رمضان کے روزے رکھے اور حج کرے اگر راستے کی طاقت ہو تو اس نے کہا :

"آپ نے سچ کہا"۔ ہم نے تعجب کیا کہ عجیب شخص ہے خود پوچھتا ہے اور خود ہی تصدیق کرتا ہے۔ پھر اس نے پوچھا ایمان کیا ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا: یہ کہ تو اللہ پر ایمان لائے' اس کے ملائکہ' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں' قیامت کے دن' اور اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لے آئے"۔ تو اس نے کہا: آپ نے درست کیا۔ اس کے بعد اس نے پوچھا' پھر احسان کے معنی کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا یہ کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کرے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے' اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تو تجھے ہی دیکھ رہا ہے۔ پھر اس نے سوال کیا مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے؟ تو آپ نے فرمایا پوچھے جانے والا پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ جبرائیل علیہ السلام تھے اور یہ تمہارے پاس آئے تمہیں تمہارا دین سکھارہے تھے۔

مسئول عنہا رسول اللہؐ تھے اور سائل جبرئیل تھے۔ دونوں کا علم برابر تھا یعنی قیامت کے بارے میں دونوں نہ جانتے تھے۔

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ (۳۳ : ۶۳) "کہو' اس کا علم اللہ ہی کو ہے"۔ اور یہ اللہ کی خصوصیت ہے اور اللہ اس کے بارے میں منفرد ہیں اور اللہ کی مخلوق میں سے کسی کو اس کا علم نہیں۔

یہ اللہ کی حکمت ہے کہ اس نے اس کا علم کسی کو نہیں دیا۔ ہماری سمجھ میں اسی قدر حکمت آتی ہے کہ لوگ اس سے ہروقت ڈرتے رہیں اور ہروقت اس کی توقع کرتے رہیں اور اس کے اچانک آجانے کی تیاری میں لگے رہیں۔ یہ تو ان لوگوں کے لیے ہے جن کو اللہ نے اس کے ذریعے بھلائی کی راہ کی طرف پھیر دیا اور اس کے دل میں قیامت کا ڈر پیدا کر دیا۔ رہے وہ لوگ جو اس سے غافل ہیں اور ہروقت اس کی تیاری میں لگے نہیں رہتے تو وہ لوگ اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو آگ سے نہیں بچاتے۔ ایسے لوگوں کے سامنے اللہ نے اس کے مناظر رکھے' اس سے ڈرایا اور اسے غیب قرار دیا جو رات اور دن کے کسی وقت بھی آسکتی ہے۔

وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا (۳۳ : ۶۳) "شاید کہ وہ قریب ہی آلگی ہو"۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۶۵﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَ قَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾

۸
ع ۱۰
۵

"بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر دی ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے' کوئی حامی و مددگار نہ پاسکیں گے۔ جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کیے جائیں گے اس وقت وہ کہیں گے کہ "کاش ہم نے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی"۔ اور کہیں گے "اے رب ہمارے' ہم نے اپنے

سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب ' ان کو دو ہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر"۔

یہ لوگ قیامت کے قیام کے بارے میں پوچھتے ہیں ' ذرا ان کو قیام قیامت کا ایک منظر ہی بتا دو۔

اِنَّ اللّٰہَ لَعَنَ الْکٰفِرِیْنَ وَ اَعَدَّ لَھُمْ سَعِیْرًا (۳۳: ٦٤) "بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر دی ہے"۔ اللہ نے کافروں کو اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کی ہے ۔ وہ ان کے لیے تیار اور حاضر ہے ۔

خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ (۳۳: ٦٥) "اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔ اس قدر طویل عرصہ اس میں رہیں گے کہ اس کی طوالت کا علم اللہ ہی کو ہے ۔ اس کی انتہا نہیں ہے الا یہ کہ اللہ کے علم میں ہو ' جب وہ چاہے ختم کر دے ۔ ان کے ساتھ کوئی بھی معاونت کرنے والا نہ ہو گا ۔ کوئی مددگار نہ ہو گا ۔ لہٰذا اس آگ سے نکلنے کی کوئی امید ان کو نہ ہو گی ۔

لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (۳۳: ٦٥) "کوئی حامی و مددگار وہ نہ پا سکیں گے"۔ اس عذاب میں ان کا منظر نامہ کیا ہو گا؟ نہایت ہی بری حالت اور نہایت ہی المناک صورت حال :

یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْھُھُمْ فِی النَّارِ (۳۳: ٦٦) "جس روز ان کے چہرے آگ پر الٹ پلٹ کیے جائیں گے"۔ ہر طرف سے آگ ان کو ڈھانپ رہی ہو گی ۔ یہاں ان کی حرکات کی تصویر یعنی فلم بنائی جا رہی ہے اور اسے مجسم کر کے پیش کیا جا رہا ہے ۔ اس طرح کہ ان کے چہروں کے ہر حصے کو آگ جھلسائے گی اور اس طرح انہیں سخت سے سخت عذاب دیا جائے گا۔

یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰہَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا (۳۳: ٦٦) "اس وقت وہ کہیں گے اے کاش ہم نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی ہوتی"۔ یہ ان کی جانب سے بالکل بے کار تمنا ہو گی ۔ کیونکہ تب اطاعت کا موقع و محل کہاں ہو گا ۔ اس وقت تو کوئی موقع نہ ہو گا آزمائش کا ۔ اب تو صرف حسرت ہی ہے ۔ اب ان کو اپنے سرداروں اور کبراء پر سخت غصہ آئے گا ' جنہوں نے دراصل ان کو گمراہ کیا تھا ' اور وہ اب اللہ کے مطیع فرمان بننے کی سعی کریں گے مگر اب تو اطاعت کا موقع ہی ختم ہو گیا۔

وَ قَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا (۳۳: ٦٧) رَبَّنَآ اٰتِھِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْھُمْ لَعْنًا کَبِیْرًا (۳۳: ٦٨) "اور کہیں گے اے رب ہمارے ' ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب ان کو دہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر"۔

یہ ہے قیامت کا نمونہ۔ پوچھتے کیا ہو؟ اس روز بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ اس کے لیے تیاریاں کرو ورنہ یہ المناک انجام تمہارے سامنے ہو گا۔

حضرت زینب کے ساتھ حضورؐ کا نکاح چونکہ جاہلیت کی ایک نہایت ہی گہری رسم کے خلاف تھا اور اسلام نے اسی لیے اس پر حضور اکرمؐ کے فعل کے ذریعے ضرب کاری لگائی تھی' لیکن اس معاشرے نے درد محسوس کیے بغیر اپنے اندر سے اس رسم کا اکھاڑ پھینکنا قبول نہ کیا۔ منافقین اور مریض اخلاق کے لوگوں نے سخت غوغا آرائی شروع کر دی۔ ان کے ساتھ ہاں میں ہاں ملانے والے ایسے مسلمان بھی تھے جن کے ذہنوں میں اسلامی تصور حیات ابھی اچھی طرح نہ بیٹھا تھا۔ چنانچہ یہ عناصر طنز و تشنیع' اعتراض و تنقید کرتے تھے۔ پورے شہر میں انہوں نے کانا پھوسی شروع کر رکھی تھی اور حضور اکرمؐ کے بارے میں بری باتیں کرتے تھے۔

منافقین اور افواہیں پھیلانے والے کب خاموش رہ سکتے تھے۔ وہ کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے جس طرح غزوۂ احزاب میں انہوں نے ایک زبردست مہم شروع کر رکھی تھی۔ افک کے معاملے میں وہ اس سے قبل تجربہ کر چکے تھے۔ مال غنیمت کی تقسیم میں وہ ایسی ہی مہم چلا چکے تھے۔ غرض ہر موقع و محل میں یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اذیت کا باعث تھے اور بالکل بے جواز۔

اس دور میں جبکہ بنی قریظہ اور سارے یہودیوں کو مدینہ سے نکالا گیا تھا' مدینہ میں کوئی کافر اور مشرک نہ تھا۔ اہل مدینہ یا تو سچے مسلمان تھے اور یا منافق تھے اور اس قسم کی مہم یہ منافق ہی چلاتے تھے۔ یہ جھوٹی افواہیں پھیلاتے۔ بعض سادہ لوح مسلمانوں پر بھی ان کا اثر تھا جو ان کے ساتھ نافہمی کی وجہ سے شریک ہو جاتے تھے۔ اس لیے قرآن کریم نے اہل ایمان کو یہاں متنبہ کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث اذیت نہ بنو' اس سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی مومنین نے بھی حضرت موسیٰ کو اذیت دی تھی۔ اس لیے ان منافقین کی باتوں پر بلاتحقیق و تفتیش کان نہ دھرو۔ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت کرو' تمہارے لیے یہ بڑی کامیابی ہوگی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿٦٩﴾ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿٧٠﴾ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧١﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو' ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنہوں نے موسیٰ کو اذیتیں دی تھیں' پھر اللہ نے ان کی بنائی ہوئی باتوں سے اس کی براءت فرمائی اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھا۔ اے ایمان لانے والو' اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔ اللہ تمہارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔

قرآن کریم نے اس ایذا کا تعین نہیں کیا جو حضرت موسیٰ کو دی گئی تھی ۔ البتہ روایات میں اس کا تعین کیا گیا ہے ۔ لہٰذا ہم اس بات کو مجمل ہی چھوڑتے ہیں جسے قرآن کریم نے مجمل چھوڑ دیا ۔ یہاں مقصد اہل ایمان کو اس بات سے خبردار کرنا ہے کہ وہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت نہ دیں ۔ اللہ نے قرآن کریم میں بنی اسرائیل کی بدعملیوں اور بدکرداریوں کی کئی مثالیں دی ہیں ۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کر دیا کہ انہوں نے اپنے نبی کو اذیت دی تھی ۔ لہٰذا مسلمانوں کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تاکہ مسلمانوں کا شعور ایسا بن جائے کہ وہ کسی معاملے میں بھی بنی اسرائیل کے مماثل نہ ہوں ۔ ان کے دلوں میں ان کی نفرت بیٹھ جائے کیونکہ یہ لوگ مجسم بدعمل ' بے راہ رو ' نبی کو ہروقت تنگ کرنے والے تھے ۔

بنی اسرائیل نے اپنے نبی پر جو الزام لگایا تھا اللہ نے ان کو اس سے بری کر دیا تھا ۔

وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا (۳۳ : ۶۹) "اور وہ اللہ کے نزدیک باعزت تھا" ۔ یعنی وہ اللہ کے نزدیک صاحب قدر و منزلت تھا ۔ اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے رسولوں کو ہر قسم کے بہتان اور الزام سے علی روس الاشہاد بری کرتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سے افضل ہیں اس لیے اللہ ان کو بھی بری اور پاک کرتا ہے ۔

قرآن کریم اہل ایمان کو ہدایت کرتا ہے کہ کسی معاملے میں منافقین اور دشمنوں کے ساتھ اتفاق کرنے سے قبل اس کی تحقیق اور درستگی کا پتہ کرنا فرض ہے ۔ خصوصاً اپنے نبی ' مرشد اور ولی اور دوست کے بارے میں گمراہوں اور فساق و فجار کی باتوں پر کان دھرنے سے اجتناب کرنا چاہئے ۔ قرآن کریم ان کو ایک صالح بات کی ہدایت کرتا ہے جس کے نتیجے میں عمل صالح نمودار ہوتا ہے ۔ جو لوگ سچے ہوتے ہیں اللہ ان کی نگہبانی کرتا ہے اور ان کی راہنمائی اعمال خیر کی طرف کرتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اچھی باتیں کرنے والوں اور اچھے اعمال کرنے والوں کی مغفرت فرماتا ہے اور ان کی تقصیرات کو معاف کرتا ہے کیونکہ تقصیرات سے کوئی آدمی محفوظ نہیں رہتا ۔ ان تقصیرات سے آدمی صرف مغفرت الٰہی سے نکل سکتا ہے ۔

مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۳۳ : ۷۱) "جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی ۔ اطاعت الٰہی بذات خود فوز عظیم ہے ' کیونکہ اطاعت سے انسان اللہ کے نہج پر قائم ہوتا ہے ۔ اور اللہ کے طریقے پر استقامت انسان کے لیے نفع بخش ہوتی ہے ۔ اور جسے اللہ کے سیدھے طریقہ اور راستے کی طرف ہدایت ہو جائے یہ بذات خود دائمی سعادت اور نیک بختی ہے ۔ اگرچہ اس کے سوا اس کے لیے کوئی اجر و جزاء نہ ہو ۔ کیونکہ جو شخص ٹھیک ٹھیک اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہو ' اسے اپنا راستہ صاف نظر آ رہا ہو اور اس کے اردگرد مخلوق اسی کے ساتھ معاون ہو وہ اس شخص کی طرح نہیں ہو سکتا جسے اپنی راہ معلوم نہ ہو ' پریشان ہو ' اور اس کی راہ کے اردگرد تمام کائنات اس سے متصادم ہو اور اس کے لیے اذیت ناک ہو ۔ لہٰذا اللہ اور رسول کی اطاعت بذات خود احسن الجزاء ہے ۔ یہی فوز عظیم ہے ۔ یوم الحساب اور جنت نعیم سے بھی پہلے یہ کامیابی ہے ۔ اخروی کامیابی تو فضل عظیم ہے اور یہ بونس ہے جو نعمت ملے گی اور یہ فضل اللہ جسے چاہتا ہے ' دیتا ہے ۔ یہ اللہ کا فضل اس لیے ہے کہ حضرت انسان بہت ہی ضعیف ہیں ۔ اور اللہ نے انسان کے کاندھوں پر جو ذمہ داری عائد کی ہے وہ بہت ہی بھاری ہے اور انسان نے اپنی نادانی کی وجہ سے اس قدر عظیم بوجھ اپنے اوپر لیا ہے جس کے اٹھانے سے آسمان ' زمین اور پہاڑوں نے معذرت کی تھی ۔ حالانکہ اسے اپنی کمزوریاں معلوم تھیں ۔ شہوات و میلانات کا دباؤ ' علم و ہنر کا قصور ' عمر کا

اختصار اور زمان و مکان کی مشکلات اور مستقبل کے واقعات کی پیش بینی میں انسان کی کمزوری وغیرہ۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾

"ہم نے اس امانت کو آسمانوں' اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے 'مگر انسان نے اسے اٹھا لیا' بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے"۔

زمین و آسمان اور زمین کے اندر بڑے بڑے پہاڑ' دراصل ایک عام انسان کے لیے عظیم مخلوق ہیں' جن کا یہاں قرآن نے ذکر کیا ہے اور جن کے اندر انسان رہتا ہے' ان کے مقابلے میں انسان بہت ہی ضعیف اور حقیر ہے۔ یہ مخلوقات اپنے خالق کو اچھی طرح جانتی ہے اور اللہ کے تکوینی نظام اور قانون کے مطابق چل رہی ہے۔ اللہ کے احکام کو براہ راست پاتی ہے اور ان پر عمل پیرا ہے۔ یہ اس ناموس فطرت کے مطابق چلتی ہے جو اللہ نے اس کے اندر جاری کیا ہے۔ آغاز تخلیق سے یہ کائنات یونہی' نظام قضا و قدر کے مطابق جاری و ساری ہے۔ نہ اللہ کی اطاعت سے نکلتی ہے اور نہ اللہ کے ناموس فطرت سے سرمو انحراف کرتی ہے اور نہ کر سکتی ہے۔ یہ سب مخلوق اپنا فریضہ منصبی ادا کر رہی ہے' چاہے اسے شعور ہو یا نہ ہو۔ چاہے اس کا کوئی اختیار ہو یا نہ ہو۔

یہ سورج اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے اور اس کے دورے میں کوئی خلل نہیں آتا۔ یہ چمک رہا ہے اور جہاں تک اللہ کا حکم ہو گا' کائنات کو گرم اور روشن کرتا رہے گا۔ پھر اس سورج کا کنبہ بھی اس کے دائرے کے اندر ٹھیک ٹھیک اپنے اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہے اور اپنا فریضہ منصبی ادا کر رہا ہے۔

یہ زمین اپنے مدار میں گردش کر رہی ہے۔ اس گردش کے نتیجے میں فصلیں اگتی ہیں۔ انسانوں کے رزق کا انتظام ہو رہا ہے۔ یہ مردوں کو سمیٹتی ہے۔ اس کے اندر سے چشمے پھوٹتے ہیں اور یہ سب کام سنت الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے بغیر زمین کے ارادہ کے۔

یہ چاند اور یہ ستارے و سیارے' یہ ہوائیں اور یہ بادل یا یہ پانی اور یہ سمندر' یہ پہاڑ اور یہ میدان سب کے سب اپنے رب کے حکم سے اور اپنے خالق کی تقدیر سے اپنے اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور یہ تمام اشیاء یہ فرائض بغیر جہد و مشقت کے ادا کرتی ہیں۔ یہ ارکان کائنات بار امانت نہ اٹھا سکے' ڈر گئے اور سہم گئے۔ یہ اس عظیم امانت کو نہ اٹھا سکے۔ یہ امانت کیا تھی' ذاتی ارادے اور اختیار سے اپنے فرائض کو سرانجام دینا اور اپنے اعمال اور افعال کا ذمہ دار ہونا۔ لیکن!

وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (۳۳ : ۷۲) "مگر انسان نے اسے اٹھا لیا"۔ انسان جو اللہ کو اپنے شعور اور اپنے ادراک سے جانتا ہے' اپنے تدبر اور اپنی بصیرت سے ناموس قدرت کو معلوم کرتا ہے' اور اپنی سعی و جدوجہد سے اس ناموس کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے' وہ اپنے ارادے سے اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور بالارادہ ذمہ داریاں اٹھاتا ہے۔ اور اپنے میلانات اور خواہشات پر قابو پاتا ہے۔ اپنی زندگی کے ہر قدم پر وہ متحرک بالارادہ ہے۔ اپنی راہ کا ادراک رکھتا

ہے۔ جان بوجھ کر اپنے لیے راہ اختیار کرتا ہے اور علی وجہ البصیرت کسی کی راہ پر چلتا ہے۔

یہ ہے وہ عظیم امانت جو اس انسان نے اٹھائی حالانکہ انسان بہت ہی ضعیف 'کمزور اور چھوٹا اور بے طاقت تھا۔ جس طرح اس کی قوت محدود تھی اس طرح اس کی عمر بھی محدود تھی اور پھر اس ضعیف انسان پر ہر طرف سے میلانات خواہشات اور طبیعی شہوات کی افواج حملہ آور تھیں۔

اس زاویہ سے اس ضعیف انسان نے اپنے کاندھوں پر ایک عظیم ذمہ داری اٹھائی۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ اپنے نفس پر اس نے ظلم کیا کہ یہ بھاری بوجھ اس پر ڈالا اور اپنی قوت کی کمی سے وہ بے خبر تھا۔ لیکن جب انسان اس ذمہ داری کو پورا کرے جو اس نے اٹھائی اور جب وہ اپنی معرفت اور اپنے ادراک سے باری تعالیٰ تک پہنچ جائے تو وہ براہ راست ناموس الٰہی کی معرفت حاصل کر لیتا ہے' اور پوری طرح اپنے رب کے ارادے کا مطیع ہو جاتا ہے۔ یہ معرفت' یہ ہدایت اور یہ اطاعت اپنی حقیقت کے اعتبار سے اور اپنے آثار کے اعتبار سے ایک بلند مقام تک پہنچ جاتی ہے اور اس قدر خودکار طریقے سے کام کرتی ہے جس طرح آسمان اور زمین اور پہاڑ بڑی سہولت سے' براہ راست ہدایت 'معرفت اور اطاعت پذیر ہوتے ہیں' کیونکہ یہ تمام مخلوقات براہ راست اللہ کی معرفت حاصل کیے ہوئے ہوتی ہیں۔ براہ راست اللہ کی ہدایت کے تحت چلتے ہیں۔ براہ راست اطاعت کرتے ہیں اور ان کے اور باری تعالیٰ کے درمیان کوئی حائل اور کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اور کوئی چیز ان کو اللہ کی اطاعت سے روکنے والی نہیں ہوتی' تو جب انسان بھی اس پوری کائنات کی طرح اللہ کی معرفت' ہدایت اور اطاعت کا پابند ہو جاتا ہے تو اس وقت' وہ واصل باللہ ہو جاتا ہے اور تب اللہ کی مخلوقات میں اس کا مقام منفرد ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ارادہ' ادراک اور اختیار اور ذمہ داری اٹھانا ہی انسان کی امتیازی خصوصیات ہیں اور انہی کی وجہ سے انسان ان مخلوقات کے اندر ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ یہی وہ کرامت اور شرف ہے جس کا اعلان اللہ نے عالم بالا میں کیا تھا کہ فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اس انسان کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور قرآن کے اندر یہ اعلان قیامت تک ثبت کر دیا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ "حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی"۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی اس تکریم کی اصلی وجہ سمجھے اور اللہ نے اس کے حوالے جو امانت کی ہے اور اس نے جسے قبول کیا ہے اور جس کے اٹھانے سے آسمانوں' زمین اور پہاڑوں نے انکار کیا' اور ڈر گئے اسے اچھی طرح ادا کرے۔ یہ امانت یا ذمہ داری اللہ نے انسان کے اوپر کیوں ڈالی؟

لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۷۳

"اس بار امانت کو اٹھانے کا لازمی نتیجہ ہے تاکہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں' اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے' اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے"۔

وہ خصوصیات کیا ہیں جو انسان نے اپنے کاندھوں پر اٹھائیں؟ یہ کہ اپنے آپ کو پہچانے ' اپنی قوت عقلیہ سے معرفت کردار حاصل کرے ۔بذات خود عمل کرے اور خود خدا تک پہنچے ۔یوں وہ اپنے اختیار کو صحیح استعمال کرے اور اپنے اعمال کی سزا اور جزاء کا ذمہ دار ہو۔اس طرح منافقین اور منافقات سزا کے مستحق ہوں' مشرکین اور مشرکات اپنے انجام تک پہنچیں اور اللہ مومنین و مومنات کی امداد کرے اور ان سے جو تقصیرات 'کمزوریاں' ناتوانیاں صادر ہوں ان کو معاف کرے ۔ کیونکہ انسان کی راہ میں ضعف 'کمزوری' شہوات 'جذبات' میلانات اور معاشرے کے تاثرات کی بے شمار رکاوٹیں ہیں اور اس کو اللہ کی رحمت اور مغفرت کی بے حد ضرورت ہے اور اللہ ہے بھی غفور و رحیم ۔

اس عظیم تبصرے اور عقل و خرد کی تاروں پر آخری اور شدید ضرب سے اس سورہ کا خاتمہ ہوتا ہے جس کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ اے نبی تم اللہ کی اطاعت کرو اور کفار اور منافقین کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ۔اللہ کی وحی اور اشاروں کے مطابق کام کرو' اللہ پر بھروسہ کرو' اور اللہ کے سوا کسی قوت پر تکیہ نہ کرو۔اس کے بعد اسلامی نظام حیات کے لیے ضروری قانون سازی اور مملکت اسلامی کو عملی ہدایات دی گئی تھیں اور حکم تھا کہ اللہ کے قانون اور اللہ کی حکمت عملی پر چلو۔

اس آخری ضرب اور تبصرے میں یہ بتایا گیا کہ جو ذمہ داری انسان پر عائد ہو' اس کا ذرا احساس کرے ۔یہ کس قدر عظیم ذمہ داری تھی؟ کہ پہاڑ بھی اس کے اٹھانے سے کانپ اٹھے ۔اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح یہ کائنات ---- اللہ کے ناموس کی مطیع ہے انسان طوعا اللہ کے ناموس تک رسائل حاصل کر کے مطیع ہو جائے اور اللہ کی مشیت کی اطاعت کرے ۔

اس تبصرے پر سورہ ختم ہوتی ہے ۔اس کا آغاز اور اختتام دونوں باہم متناسب پاس اور پوری سورہ اس آغاز اور اختتام کے رخ پر رواں دواں ہے ۔ نہایت توافق کے ساتھ ۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی ذات کریم اس کتاب کو بھیجنے والی ہے جو اس کائنات کو چلا رہی ہے ۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۲

سورۃ سبا ۔ ۳۴

آیات ا --- تا --- ۵۴

سورہ سبا ایک نظر میں

اس مکی سورہ کے موضوعات عقائد سے متعلق ہیں۔ اللہ وحدہ لاشریک ہے، وحی پر ایمان، بعث بعد الموت کا عقیدہ اور اسلامی نظریہ حیات کے بارے میں بعض اہم اقدار کی تصحیح۔ یہ کہ ایمان اور عمل صالح ذریعہ نجات ہے۔ مال اور اولاد ذریعہ نجات نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک جزاء و سزا کا مدار ایمان و عمل پر ہے۔ اللہ اگر پکڑنا چاہے تو اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اور اللہ کے ہاں کوئی سفارش نہیں ہو سکتی الا یہ وہ اجازت دے۔

اس سورہ میں بعث بعد الموت اور جزاء و سزا کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور یہ کہ اللہ کا علم محیط ہے، عام ہے اور بہت گہرا اور پیچیدہ اور نہایت دقیق ہے۔ اس سورہ میں مختلف اسالیب سے ان دونوں موضوعات کو بار بار لایا گیا ہے اور ابتداء سے انتہاء تک اس سورہ کی فضا یہی ہے۔

بعث بعد الموت کے بارے میں ہے

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۳٤ : ۳) "منکرین حق کہتے ہیں کہ کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آتی؟ کہو میرے پروردگار عالم الغیب کی قسم وہ تم پر آکر رہے گی اللہ سے ایک ذرے کے برابر چیز بھی پوشیدہ نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں بلکہ اس کے ہاں چھوٹی اور بڑی ہر چیز کھلی کتاب میں موجود ہے"۔

سزا و جزا کے بارے میں کہا گیا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۳٤ : ۷) اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ (۳٤ : ۸) "منکرین لوگوں سے کہتے ہیں "ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہو گا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنوں لاحق ہے"۔ نہیں بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور بری طرح بہکے ہوئے ہیں"۔ اور دوسری جگہ ہے:

لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ (۳۴: ۴) وَ الَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ (۳۴: ۵) ”اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ جزا دے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے رہے ہیں' ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم ہے اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے' ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے“۔

اس سورہ میں متعدد مناظر قیامت دکھائے گئے ہیں۔ ان میں قیامت کے منکرین کو سخت سرزنش کی گئی ہے اور عذاب کی ایسی صورتیں پیش کی گئی ہیں جن کی وہ تکذیب کرتے تھے یا ان کے واقعہ ہونے میں شک کرتے تھے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ لَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ لَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْ لَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (۳۴: ۳۱) قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ (۳۴: ۳۲) وَ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ نَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۳۴: ۳۳) ”کافروں نے کہا کہ ہم نہ تو قرآن کو مانیں نہ اس سے پہلے کی کتابوں کو کاش تم دیکھو ان کا حال' اس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔ وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: ”کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں' بلکہ تم خود مجرم تھے؟ وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے ”نہیں' بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں“۔ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈالیں گے۔ کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ جیسے اعمال ان کے تھے' ویسے ہی جزاء وہ پائیں گے؟“

یہ مناظر اس سورہ میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں اور بار بار آتے ہیں اور خاتمہ یوں ہوتا ہے۔

وَلَوْ تَرٰى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ (۳۴: ۵۱) وَّقَالُوْآ اٰمَنَّا بِهٖ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ (۳۴: ۵۲) وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ (۳۴: ۵۳) وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ (۳۴: ۵۴) "کاش تم دیکھو انہیں اس وقت جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جا سکیں گے، بلکہ قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے۔ اس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لائے حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کب ہاتھ آ سکتی ہے۔ اس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور بلاتحقیق دور دور کی کوڑیاں لایا کرتے تھے۔ اس وقت جس چیز کی یہ تمنا کر رہے ہوں گے اس سے محروم کر دیئے جائیں گے جس طرح ان کے ہم مشرب پیش رو محروم ہو چکے ہوں گے۔ یہ بڑے گمراہ کن شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔

سورہ کے آغاز میں اللہ کے علم محیط اور شامل کے متعلق کہا گیا ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ (۳۴: ۲) "جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے ہر چیز کو وہ جانتا ہے"۔

اور قیامت کے منکرین پر جگہ جگہ تبصرے ہوتے ہیں کہ قیامت آئے گی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۳۴: ۳) "منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے قیامت ہم پر آ کیوں نہیں جاتی، کہو، قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر آ کر رہے گی۔ اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہے، نہ زمین میں، نہ ذرے سے بڑی نہ اس سے چھوٹی سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے"۔

اور سورہ کے خاتمہ کے قریب آتا ہے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ (۳۴: ۴۹) "منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے قیامت ہم پر آ کیوں نہیں جاتی۔ کہو، میرا رب حق کا القاء کرتا ہے۔ وہ تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا ہے"۔

توحید کے مضمون کا آغاز اللہ کی حمد و ثنا سے ہوتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (۳۴: ۱) "حمد اس خدا کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے اور

آخرت میں بھی اس کے لیے حمد ہے ۔ وہ دانا اور خبیر ہے"۔ اور مشرکین کو ان کے بنائے ہوئے الہوں کے بارے میں بار بار چیلنج دیا جاتا ہے ۔ جن کو وہ پکارتے ہیں ۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ (۳۴ : ۲۲) "ان سے کہو کہ پکارو اپنے ان معبودوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو ۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں، نہ زمین میں ۔ وہ آسمان و زمین کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں ۔ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے"۔

قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں اشارتاً کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ملائکہ اور جنوں کی بندگی کرتے ہیں ۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ (۳۴ : ۴۰) قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (۳۴ : ۴۱) "اور جس دن وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کرتے تھے؟ تو وہ جواب دیں گے، پاک ہے آپ کی ذات ۔ ہمارے ولی تو آپ ہیں نہ یہ لوگ، دراصل یہ ہماری نہیں جنوں کی عبادت کرتے تھے ۔ ان میں سے اکثر انہی پر ایمان لائے ہوئے تھے ۔

اور اس بات کی تردید کر دی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ بعض مشرکین کا یہ عقیدہ غلط ہے کہ ملائکہ اللہ کے ہاں ان کی کوئی سفارش کریں گے ۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ حَتّٰى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۳۴ : ۲۳) "اور اللہ کے حضور کوئی شفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی ۔ بجز اس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو ۔ حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی تو وہ پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا کہا ۔ وہ کہیں گے ٹھیک جواب ملا ہے اور وہ بزرگ و برتر ہے ۔

جنوں کی عبادت کی تردید کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصہ لایا جاتا ہے کہ وہ پوری طرح ان کے زیر کنٹرول تھے اور ان کو پتہ ہی نہ چلا کہ حضرت فوت ہو گئے ہیں ۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ (۳۴ : ۱۴) "پھر جب سلیمان پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس

گھن کے سوا نہ تھی جو اس عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے"۔

اور اس رسالت کے بارے میں آتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (۳۴ : ۳۱) "اور کافر کہتے ہیں کہ ہم ہرگز اس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے کاش دیکھو ان کا حال اس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے اس وقت کمزور متکبرین سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔" اور دوسری جگہ ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۳۴ : ۴۳) "اور ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان معبودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ اور یہ قرآن محض ایک جھوٹ گھڑ لایا ہے۔ ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو صریح جادو ہے"۔

اس کی تردید یوں کی جاتی ہے کہ یہ قرآن وحی من جانب اللہ ہے۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۳۴ : ۶) "اے نبی علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے اور خدائے عزیز و حمید کا راستہ دکھاتا ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے :

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۴ : ۲۸) "اور ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

اقدار حیات کے سلسلے میں آتا ہے :

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴ : ۳۴) وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۴:۳۶) وَ مَآ اَمْوَالُکُمْ وَ لَآ اَوْلَادُکُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُکُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَ هُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (۳۴:۳۷) وَ الَّذِیْنَ یَسْعَوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِکَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۳۴:۳۸)

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو' اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے' انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں"۔ اے نبی' ان سے کہو "میرا رب جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے یا نپا تلا عطا کرتا ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے"۔ یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے' یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے عمل کی دہری جزاء ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے"۔

اور اس مضمون پر بعض تاریخی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ آل داؤد کا قصہ پیش کیا جاتا ہے جو اللہ کی نعمتوں پر شکر کرنے والے تھے اور اہل سبا کا قصہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو دولت کی وجہ سے سرکش ہو گئے تھے اور دونوں کا جو انجام ہوا وہ بھی پیش کیا گیا ہے اور ان دو مثالوں میں مدعا کی پوری تصدیق ہے۔

---ooo---

یہ مسائل جن پر اکثر مکی سورتیں بحث کرتی ہیں' ان کو مختلف سورتوں میں پیش کیا جاتا ہے اور ہر سورہ میں ایک مستقل تکوینی پس منظر میں ان موضوعات کو پیش کیا جاتا ہے۔ ہر بار نئے دلائل کے ساتھ اور ہر بار دل پر ان کا ایک نیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ سورہ سبا میں بھی ان مسائل کو اسی طرح کائناتی پس منظر میں لایا گیا ہے۔ اس معلوم کائنات کے وسیع پس منظر میں اور اس سے بھی وسیع تر عالم غیب کے میدان میں جو ابھی تک نامعلوم ہے۔ پھر ان حقائق کو حشر کے میدان کے زبردست مناظر کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور پھر خود انسان کی شخصیت کی گہرائیوں میں اور انسانی تاریخ کے صفحات میں اور جس پس منظر میں بھی ان حقائق کو قرآن پیش کرتا ہے ہر مرتبہ ایک نیا تاثر قائم کرتا ہے اور انسان کے لیے غفلت سے جاگنے کا سبب بنتا ہے۔

سورہ کے آغاز ہی سے اس کائنات کی عظیم نشانیوں کو وحدت کردگار کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کائنات کے صفحات کو پیش کیا جاتا۔ اس کے اندر جو نشانیاں ہیں انہیں پیش کیا جاتا ہے اور ان سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ اللہ کا علم بہت ہی گہرا' دقیق اور محیط ہے۔

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْهَا

هُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ (٣٤ : ٢) "جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے اور وہ رحیم و غفور ہے۔" اور دوسری جگہ ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (٣٤ : ٣) "منکرین حق کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آرہی ہے ۔کہو "قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی وہ تم پر آکر رہے گی ۔اس سے ذرا برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں' نہ ذرے سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی سب ایک نمایاں دفتر میں درج ہے"۔

اور جو لوگ آخرت کی تکذیب کرتے ہیں ان کو عظیم کائناتی حادثات کی دھمکی دی جاتی ہے ۔

اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (٣٤ : ٩) "کیا انہوں نے کبھی آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا جو انہیں آگے اور پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے؟ ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں یا آسمان کے کچھ ٹکڑے ان پر گرا دیں ۔ درحقیقت اس میں ایک نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہو"۔

اور جو لوگ اللہ کے سوا اوروں کی پوجا کرتے ہیں ملائکہ کی یا جنوں کی' ان کو عالم غیب کے حقائق کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ۔یہ ملا اعلیٰ کا ایک خوفناک منظر ہے ۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ حَتّٰى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (٣٤ : ٢٣) "اور اللہ کے ہاں کوئی شفاعت کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی بجز اس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو' حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوگی تو وہ پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا جواب دیا' وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے اور وہ بزرگ و برتر ہے"۔

اور دشمنوں کے لیے ان کو حشر کے میدان میں پیش کیا جاتا ہے جہاں کوئی شک و شبہ نہ ہو گا اور نہ کوئی بات کی گنجائش ہوگی؟

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ (٣٤ : ٤٠) "اور جس دن وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کیا یہ لوگ

تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟" تو وہ جواب دیں گے پاک ہے آپ کی ذات ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ ان سے' دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے"۔

اور رسول اللہ کو جھٹلانے والے ' جو یہ کہتے ہیں کہ آپ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں' یا یہ کہ آپ مجنون ہیں' ان کو بھی لا کر ان کی فطرت کی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے دل کی عدالت میں ان کو پیش کیا جاتا ہے جہاں کوئی جھوٹی اور مصنوعی شہادت پیش ہوتی۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (۳۴:۴۶) "اے نبیؐ ان سے کہو کہ "میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں' خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو' تمہارے صاحب میں آخر کون سی بات ہے جو جنوں کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے"۔

یوں یہ سورہ انسانی عقل و خرد کو لے کر ان مختلف میدانوں کی سیر کراتی ہے' مختلف دلائل اور اشارات سے دوچار کرتی ہے اور آخرت کے ہولناک مناظر کی سیر بھی کراتی ہے۔

اس سورہ کو اپنے ان مضامین' دلائل اور اشارات کے اعتبار سے ہم پانچ چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ پانچ حصوں میں بھی ہم اسے محض آسان تفسیر کے لیے تقسیم کرتے ہیں ورنہ پورا سورہ ایک مسلسل مضمون ہے۔ یہی اس سورہ کی خصوصیت ہے۔

سورہ کا آغاز اللہ کی حمد سے ہوتا ہے جو زمین و آسمان کا مالک اور دنیا و آخرت میں محمود ہے۔ اور اس کا علم محیط ہے۔ اوپر سے نیچے آنے والی چیزوں اور نیچے سے اوپر جانے والی ہر چیز پر محیط ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قیامت کس طرح برپا ہوگی اور انسانوں کے ذرے ذرے کو اللہ کس طرح جمع کرے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا علم ذرے ذرے پر محیط ہے۔ اللہ سب کو جمع کرے گا اور جزاء و سزا دے گا۔ خصوصاً ان لوگوں کو سزا دے گا جو اللہ کی اس دعوت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ جو لوگ اہل علم ہیں اور فطرت سلیم رکھتے ہیں' وہ قیام قیامت کو حق سمجھتے ہیں اور جو لوگ اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں وہ دراصل راہ حق سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ ایسے لوگوں کا علاج تو یہ ہے کہ ان پر آسمان کا کوئی حصہ گرا دیا جائے۔

دوسرے حصے میں آل داؤد کے احوال ہیں جنہوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا کیونکہ اللہ نے اکثر کائناتی قوتوں کو ان کے لیے مسخر کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مغرور اور سرکش نہ بنے اور ان مسخر کردہ قوتوں میں سے جنوں کی قوت بھی تھی جن کو بے وقوف عرب پوجتے ہیں اور ان سے غیبی باتیں معلوم کرتے ہیں۔ حالانکہ جنوں کو بھی غیب کا علم نہیں ہوا۔ یہ تو خود سلیمان علیہ السلام کے لیے مشقت کرتے رہے۔ وہ مر بھی گئے ان کو علم نہ ہوا۔ یہ راز تو تب کھلا جب ان کے عصا کو گھن نے کھا لیا اور سلیمان کے شکر الہی کے مقابلے میں قوم سبا کی ناشکری اور سرکشی' کا قصہ۔ ان کو بھی اللہ نے نعمتوں سے نوازا تھا۔ اس ناشکری کی وجہ سے۔

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (۳۴:۱۹) "ہم نے ان کو داستان سابقہ بنا دیا

اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا"۔ کیونکہ یہ شیطان کے پیرو ہو گئے تھے۔ حالانکہ شیطان کا ان پر کوئی جبر نہ تھا۔ یہ خوشی سے شیطان کے پیرو ہو گئے تھے۔

اور تیسرا سبق اس چیلنج سے شروع ہوتا ہے جو مشرکین کو دیا گیا ہے کہ وہ ذرا ان الہوں کو بلائیں جن کو وہ الٰہ سمجھتے ہیں حالانکہ وہ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ (۳۴:۲۲) "کہو کہ پکار دیکھو اپنے ان معبودوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں 'وہ زمین و آسمان کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی اللہ کا مدد گار بھی نہیں ہے"۔ ان کو اللہ کے ہاں سفارش کا بھی کوئی اختیار نہیں ہے اگرچہ وہ ملائکہ ہوں۔ کیونکہ ملائکہ تو نہایت عاجزی سے احکام لیتے ہیں اور وہ اس وقت تک بات نہیں کرتے جب تک ان پر سے خوف دور نہیں ہو جاتا۔ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آسمان و زمین میں سے ان کو کوئی رزق دیتا ہے جبکہ مالک اُن کا اللہ ہے اور وہی ان کو رزق دیتا ہے۔ بہرحال معاملہ اللہ کے حوالے ہے' وہی قیامت کے دن وہ فیصلہ کرے گا۔ سبق کا خاتمہ بھی اس تحدی پر ہوتا ہے جو شرک کرتے ہیں کہ وہ اس سے باز آجائیں۔ معبود تو صرف ایک ہے جو اللہ عزیز و حکیم ہے۔

چوتھے سبق کا موضوع وحی و رسالت ہے۔ اس کے متعلق مشرکین کے موقف پر بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح یہ بتایا گیا کہ مشرکین کے مالدار لوگ یہ کہتے تھے کہ منصب رسالت کے ہم مستحق ہیں' جواب آتا ہے کہ مال اور اولاد اسلام میں معیار مطلوب نہیں ہے۔ جزاء و سزا میں امارت اور غربت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ایمان اور عمل پر دارومدار ہے۔ اولاد اور مال پر نہیں ہے۔ اس سبق میں مکذبین کا انجام انسانی تاریخ سے بھی پیش کیا گیا ہے اور مناظر قیامت میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ جہاں اطاعت کرنے والے غریب امراء لیڈروں سے براءت کا اظہار کریں گے جیسا کہ ملائکہ گمراہوں اور مشرکین کی عبادت سے انکار کریں گے۔ اس کے بعد لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دل میں اور اپنی فطری منطق کے ذریعے غور و فکر کریں کہ آخر دعوت اسلامی میں کیا نقص ہے اور داعی اسلام میں کیا چیز ہے کہ تم تکذیب کرتے ہو۔ وہ تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ یہ جھوٹا اور مجنون نہیں ہے۔ پھر قیامت کا ایک منظر' اور آخر میں ایک زبردست تبصرہ۔

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَّامُ الْغُيُوبِ (۳۴:۴۸) قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۳۴:۴۹) قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَى نَفْسِي وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِي إِلَيَّ رَبِّي إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ (۳۴:۵۰) "ان سے کہو میرا رب مجھ پر حق کا القاء کرتا ہے اور وہ تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔ کہو "حق آگیا اور اب باطل کے لیے کچھ نہیں ہو سکتا"۔ کہو "اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہے۔ اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اس وحی کی بنا پر ہوں جو میرا رب میرے اوپر نازل کرتا ہے۔ وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب ہی ہے"۔

اور سورہ اور اس سبق کا خاتمہ قیامت کے ایک مختصر منظر پر ہوتا ہے جس کے اندر حرکات مختصر مگر بہت ہی قوی اور سخت ہیں۔ اب آیات کی تشریح۔

درس نمبر ۱۹۴ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۹

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱﴾ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ ﴿۲﴾

”حمد اس خدا کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہرچیز کا مالک ہے اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد ہے ۔ وہ دانا اور باخبر ہے ۔ جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے ' ہرچیز کو وہ جانتا ہے ' وہ رحیم اور غفور ہے“۔

یہ اس سورہ کا آغاز ہے جس میں مشرکین کے شرک ' ان کی جانب سے رسول اللہ کی تکذیب ' آخرت میں تشکیک ' اور ان کی طرف سے بعث بعد الموت کو مستبعد سمجھنے کے موضوعات پر کلام کیا گیا ہے ۔ آغاز ان کلمات کے ساتھ ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں ۔ جو بذات خود محمود ہے اگرچہ مخلوقات میں سے کوئی بھی اس کی تعریف نہ کرے ۔ وہ اس پوری کائنات میں محمود ہے اور اس کائنات کی پوری قوتیں اور مخلوقات اللہ کی حمد کرتی ہیں اگرچہ یہ انسان اس کی حمد نہ کرے ۔

حمد کے ساتھ اللہ کی اس صفت کا ذکر ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے ۔ اللہ کے ساتھ کسی کا کوئی حق نہیں ہے ۔ نہ زمین اور آسمانوں میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک ہے ۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے اور یہ اسلامی نظریہ حیات کا پہلا اور اساسی نکتہ ہے ۔ اس طویل و عریض کائنات کا مالک اللہ ہے اور اس کے سوا کوئی شریک نہیں ہے ۔

وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ (۳۴ : ۱) ”اور آخرت میں بھی اسی کے لیے حمد ہے“۔ یعنی اللہ اپنی ذات

میں محمود ہے اور بندوں کی طرف سے کی جانے والی حمد بھی اسی کے لیے ہے ۔ غرض وہ لوگ جو اللہ کا انکار کرتے ہیں یا اس کے ساتھ کسی کو شریک کرتے ہیں ان کی طرف سے بھی حمد اللہ ہی کے لیے ہے اور وہی اس کا مستحق ہے اور ان پر یہ بات آخرت میں منکشف ہوگی۔

وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (۳۴ : ۱) "وہ دانا اور باخبر ہے"۔ وہ ایسا حکیم ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے ۔ وہ زمین اور آسمان کو بھی حکمت سے چلاتا ہے ۔ اس کائنات کی تدبیر نہایت حکمت سے کرتا ہے ۔ وہ ہر چیز سے خبردار ہے ' ہر معاملے کا اسے علم ہے اور اس کا علم بہت گہرا' شامل اور محیط ہے ۔ اللہ کے علم کو اگر دیکھنا ہے تو اس کی مثال کے لئے اس کی کتاب علم کا ایک صفحہ ملاحظہ ہو۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا

(۳۴ : ۲) "جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے ' ہر چیز کو وہ جانتا ہے"۔ یہ چند الفاظ ہیں ذرا ان پر غور کرو 'کس قدر تعداد زمین کے اندر جاتی ہے کسقدر اس سے نکلتی ہے 'کس قدر تعداد کا آسمانوں سے نزول ہوتا ہے اور کس قدر اشیاء کا عروج ہوتا ہے ۔ مختلف حرکات ' مختلف شکلوں ' مختلف صورتوں ' مختلف تصورات اور مختلف ہیئات میں ۔ اس قدر کثیر کہ خیال ان کو اپنے دائرے میں نہیں لے سکتا۔

اگر تمام اہل زمین ایک سیکنڈ میں ہونے والے مذکورہ اعمال کا احاطہ کرنا چاہیں تو شمار نہ کر سکیں ۔ اگرچہ پوری زندگی اس کام میں لگا دیں ۔ یقیناً وہ ایسا نہیں کر سکتے ۔ کیونکہ لاتعداد اشیا اس ایک لحظہ میں زمین میں داخل ہوتی اور نکلتی ہیں اور آسمان سے لاتعداد اشیاء کا نزول و عروج ہوتا ہے ۔ کس قدر بیج زمین میں گرتے ہیں اور کس قدر کونپلیں نکلتی ہیں ' کتنے ہی حشرات داخل ہوتے اور نکلتے ہیں ۔ کس قدر اجرام اور حیوانات 'کس قدر پانی کے قطرے اور کس قدر گیس کے ذرات اور کس قدر کہربائی ذرات زمین کے اطراف میں داخل ہوتے ہیں اور کس قدر دوسری اشیاء داخل و خارج ہوتی ہیں ۔ اللہ کی آنکھ ان کو دیکھ رہی ہے اور شمار کر رہی ہے ۔

ذرا نباتات ہی کو دیکھئے ! ذرا چشموں کو دیکھئے ' ذرا آتش فشاں پہاڑوں کو دیکھئے ' ذرا دوسری گیسوں کو دیکھئے اور یہ دیکھئے کہ کس قدر مستور خزانے ہیں اور ذرا حشرات الارض کو دیکھئے جو نظر آتے ہیں اور جو خوردبینوں سے بھی نظر نہیں آتے ۔ بعض کے بارے میں انسان نے علم حاصل کر لیا ہے اور لاتعداد ابھی تک نامعلوم ہیں ۔

آسمانوں سے نازل ہونے والے بارش کے قطروں کا شمار کر سکتے ہو ! شہاب ثاقب تو قطرے نہیں ان کی تعداد معلوم ہے ۔ سورج سے کسی بھی لمبے شعاعیں نکلتی ہیں ۔ کس قدر جلانے والی 'کس قدر روشنی کرنے والی 'کس قدر فیصلے نافذ ہو رہے ہیں اور کس قدر ابھی تک چھپے ہوئے ہیں ۔ کس قدر رحمتیں ہیں جو عوام الناس پر ہیں اور کس قدر ہیں جو بعض بندوں پر نافذ ہونے والی ہیں ۔ کس قدر رزق ہے جو تقسیم ہوتا ہے اور کس قدر رزق ہے جو روک لیا جاتا ہے اور کیا کچھ ہے جو صرف اللہ کے علم میں ہے ۔

کتنے نفوس اور کتنے سانس ہیں جو آسمانوں کی طرف بلند ہوتے ہیں ' نباتات کے ' حیوانات کے جراثیم کے اور دوسری مخلوقات کے اور کتنی ہی دعوتیں ہیں جو اللہ کی طرف سے دی جا رہی ہیں ' اعلانیہ ہیں یا چھپی ہوئی ہیں اور کوئی

ان کو نہیں سنتا مگر اللہ!

کس قدر روحیں ہیں جن کو ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے ۔ یہ اللہ کی طرف اٹھتی ہیں اور کتنے ہی فرشتے ہیں جو ہر روز اللہ کے ہاں واپس ہوتے ہیں اور کتنی روحیں اس کائنات میں ہیں جنہیں صرف اللہ ہی جانتا ہے ۔

سمندر سے بخارات کے کس قدر ذرے اور گیس کے دوسرے ذرات اٹھتے ہیں' جن کا علم صرف اللہ کو ہے ۔ یہ تمام اشیاء صرف ایک ہی لمحہ میں یہ عمل کرتی ہیں ۔ یہ ایک لمحے کی بات ہے جس کا شمار سب انسان پوری زندگی لگا کر بھی نہیں کر سکتے ۔ اگرچہ وہ عمریں صرف کر دیں جبکہ اللہ کا علم شامل اور محیط ہے ۔ ہر لمحے اور ہر زمانے اور ہر جگہ کے ان واقعات کا اس کے ہاں حساب و کتاب ہے بلکہ وہ انسان کی حرکات و سکنات اور خیالات و وساوس کا بھی حساب کرتا ہے لیکن وہ ستار ہے اور انسان کی کمزوریوں کو چھپاتا ہے ۔

وَهُوَ الرَّحِيْمُ الْغَفُوْرُ (۳۴ : ۲) وہ رحیم وغفور ہے"۔

قرآن کریم کی آیات میں سے ایسی ایک ایک آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ قرآن انسانی کلام نہیں ہے ۔ انسانی عقل کا مزاج یہ ہے کہ وہ اس قدر گہرا تصور پیش ہی نہیں کر سکتی جس کی انتہاؤں تک وہ خود نہ جا سکے ۔ انسانی تخیل میں ایسے عمومی اور جامع خیالات آ ہی نہیں سکتے ۔ اور اس قسم کے جوامع العلم جس کے اندر اس قدر مفہومات و مدلولات آ جائیں جن کا احاطہ ممکن نہ ہو ۔ انسانی کلام میں نہیں ہوتے کیونکہ انسانی کلام انسانی عقل کا نتیجہ ہوتا ہے اور انسانی عقل کے مزاج کے یہ بات خلاف ہے ۔ اس قسم کی آیات بندوں کے کلام سے مختلف ہیں ۔

اللہ کے علم کی اس جامعیت اور اللہ کے شماریات کے محیط ہونے کے ثبوت اور معجزانہ بیان کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اہل کفر قیامت کا انکار کرتے ہیں جبکہ خود ان کا علم اس قدر محدود ہے کہ وہ کل کے بارے میں نہیں جانتے کہ کیا ہو گا ۔ جبکہ اللہ علیم و بصیر ہے ۔ زمین اور آسمانوں میں کوئی شے بھی اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور قیامت اس لیے ضروری ہے کہ نیک اور بد دونوں کو اپنے کیے کا انجام ملے ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ ۚ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَأْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۳﴾ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۵﴾

"منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آ رہی ہے! کہو قسم ہے ۔ عالم الغیب پروردگار کی' وہ تم پر آ کر رہے گی ۔ اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں ۔ نہ ذرے سے بڑی اور نہ اس

سے چھوٹی ۔ سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے" ۔ اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ جزا دے اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے رہے ہیں ۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے' ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے ۔

کافروں کی جانب سے آخرت کا انکار اس وجہ سے تھا کہ وہ تخلیق انسانیت میں پنہاں حکمت الہیہ اور تقدیر الٰہی کا ادراک نہ کر سکے ۔ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو شتر بے مہار کی طرح نہ چھوڑ دیا جائے کہ جو اچھائی کرے اس کی بھی مرضی ہے اور جو برائی کرے اس کی بھی مرضی ہے ۔ نہ محسن کو جزاء ملے اور نہ بدکار کو سزا ملے ۔ اللہ نے اپنے رسولوں کی زبانی لوگوں کو متنبہ کر دیا تھا کہ جزاء کا ایک حصہ آخرت کے لیے باقی رہتا ہے اور سزا کا ایک حصہ بھی آخرت کے لیے چھوڑا جاتا ہے ۔ لہٰذا جن لوگوں کو حکمت تخلیق کا ادراک ہو جائے وہ جان لیتے ہیں کہ اللہ کی اسکیم کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ آخرت برپا ہو' تاکہ اللہ کا وعدہ پورا ہو اور اللہ کی اطلاع سچی ہو ۔ کفار کی نظروں سے بس یہی حکمت اوجھل ہوتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے ۔

لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ (٣٤ : ٣) "قیامت ہم پر نہیں آئے گی" ۔ اور اللہ ان کی اس بات کی پرزور تردید فرماتے ہیں۔

قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ (٣٤ : ٣) "کہہ دیجئے' ہاں میرے رب کی قسم قیامت تم پر ضرور آئے گی" ۔ اللہ بھی سچا ہے اور اس کے رسول بھی سچے ہیں ۔ وہ غیب تو نہیں جانتے لیکن وہ اللہ پر اعتماد کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں ۔ جس چیز کا خود انہیں علم نہیں ہوتا اس کے معاملے میں وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں ۔ اللہ جو تاکیداً کہتا ہے کہ قیامت آئے گی وہ عالم الغیب ہے اس لیے اس کی بات سچ ہے کیونکہ وہ علم پر مبنی ہے ۔

اب علم الٰہی کو ایک کائناتی حقیقت کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس طرح سورہ کے آغاز ہی میں اس کی ایک جامع مثال دی گئی تھی ۔ اس شہادت سے معلوم ہوا تھا کہ یہ قرآن انسانی کلام نہیں ہے کیونکہ اس قسم کی جامع تمثیلات انسانی فکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں ۔ اسی بات کو اب یہاں دوسرے الفاظ میں پڑھیئے ۔

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (٣٤ : ٣) "اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمان میں چھپی ہے نہ زمین میں ۔ نہ ذرے سے بڑی نہ اس سے چھوٹی ! سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے" ۔ میں اس بات کو یہاں دوبارہ دہراتا ہوں کہ یہ تصور ایک انسانی تصور نہیں ہے اور نہ انسان اس طرح کی جامع سوچ سوچتا ہے ۔ آج تک انسانی کلام کے جو نمونے ہیں نظم کے ہیں یا نثر کے' ان میں ایسی جامع بات نہیں ملتی ۔ جب بھی انسان علم کی جامعیت اور اس کے احاطے کے بارے میں کوئی سوچ پیش کرتا ہے وہ اس قدر کائناتی رنگ میں نہیں ہوتی ۔

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ (٣٤ : ٣) "اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمان میں چھپی ہے نہ زمین میں' نہ ذرے سے بڑی نہ اس سے

چھوٹی"۔کم ازکم انسانی نمونہ ہائے کلام میں علم کی شمولیت' گہرائی اور جامعیت کے لیے ایسا انداز نہیں ملتا جو قرآن نے اختیار کیا ہے ۔یہ اللہ ہی ہے جو اس طرح اپنے علم کی جامعیت کو بیان کر سکتا ہے اپنے علم کی گہرائی کو بیان کر سکتا ہے ۔یہ باتیں انسانی تخیل کے احاطے میں ہی نہیں آسکتیں ۔اسی طرح مسلمانوں کا تصور الٰہ اس طرح بلند ہو جاتا ہے جس کی مثال ان کے خیال میں نہیں آتی ۔وہ اپنے تصور اور خیال کو سمجھتے ہوئے اور اسے فوق التصور اور فوق الخیال سمجھتے ہوئے اس کی بندگی کرتے ہیں ۔

سوال یہ ہے کہ کتاب مبین کیا ہے؟ کتاب مبین اللہ کا علم ہی ہے جس نے ہر چیز کو اپنے احاطے میں لیا ہوا ہے ۔ جس سے کائنات کے اندر تیرنے والا ذرہ بھی چھوٹ کر رہ نہیں گیا' نہ ذرے سے کم اور نہ اس سے بڑی کوئی چیز ۔

ذرا اس تعبیر پر کھڑے ہو کر غور کیجئے "نہ ذرے سے کم" نزول قرآن کے زمانہ تک معروف اور مشہور بات یہ تھی کہ ذرہ صغیر ترین جسم ہے ۔اس سے کم کا تصور موجود ہی نہ تھا ۔آج ذرے کے توڑنے سے انسان کو معلوم ہوا کہ ذرے سے زیادہ چھوٹی چیز بھی موجود ہے ۔اس وقت انسان کے تصور اور حساب میں اس کا کوئی وجود نہ تھا ۔اللہ بہت ہی برکت والا ہے کہ اس کے بندے اس کی صفت کے وہ اسرار و رموز بھی جانتے ہیں ۔دوسرے لوگ صدیوں بعد مانتے ہیں اور یہ اللہ ہی ہے جو کسی بھی وقت ان اسرار و رموز سے پردہ اٹھا دیتا ہے' جب چاہتا ہے ۔یہ قیامت کیوں برپا ہوگی؟ جس کا حتمی اور جزی علم اللہ کو ہے جو صغیر و کبیر کا جاننے والا ہے؟

لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (٣٤ : ٤) وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ (٣٤ : ٥) "اور یہ قیامت اس لیے آئے گی کہ اللہ جزاء دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ۔ان کے لیے مغفرت ہے اور رزق کریم ہے ۔اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے زور لگایا ہے ان کے لیے بدترین قسم کا دردناک عذاب ہے"۔

یہ ہے اللہ کی حکمت' اس کا ارادہ اور اس کی تدبیر ۔اللہ نے اس بات کو مقدر بنا دیا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد نیک کام کیے ان کو پوری جزاء دے اور ان لوگوں کو بھی سزا دے جنہوں نے اللہ کی آیات کو نیچا دکھانے کے لیے مقدر بھر کوشش کی ۔

وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کا ایمان اعمال صالحہ کے روپ میں نمودار ہوا ۔ان کے لیے مغفرت ہے' ان معاملات کے لیے جو ان سے غلط ہو گئے اور تقصیرات ہو گئیں اور پھر مغفرت کے بعد ان کے لیے رزق کریم ہے ۔اس سورہ میں رزق کا ذکر بہت آتا ہے' مراد جنتیں ہیں کیونکہ اللہ کی نعمتیں رزق کریم ہیں ۔

رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی آیات کو نیچا دکھانے کی مساعی کیں اور تحریک اسلامی کے خلاف پوری قوت لگا دی ان کے لیے دردناک عذاب ہے ۔رجز نہایت ہی برے عذاب کو کہا جاتا ہے ۔یہ اس لیے کہ انہوں نے تحریک اسلامی کے خلاف سرگرمیاں دکھائیں' تحریک کو ناکام کرنے کی سعی کی اور بری راہ پر جدوجہد کرتے رہے ۔یوں اللہ کی حکمت اور اس کا منصوبہ مکمل ہوتا ہے اور ان لوگوں نے جو نظریہ اپنا رکھا ہے کہ آخرت برپا نہ ہوگی اس کی وجہ ان کی لاعلمی ہے ۔

حالانکہ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ ضرور آئے گی۔

--- ooo---

ان لوگوں نے یقین کر لیا تھا کہ قیامت نہ آئے گی جبکہ وہ اللہ کے مخصوص غیوب میں سے ایک غیب ہے اور اللہ نے فیصلہ دے دیا کہ وہ ضرور آئے گی۔ اللہ ہی عالم الغیب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے دیا کہ آپؐ اس پیغام کو نشر کر دیں اور یہ کہ ان کا یہ عقیدہ جہالت پر مبنی ہے۔ اہل علم بھی اس نتیجے تک پہنچے ہیں جس تک اہل ایمان پہنچے ہیں۔ یہی راستہ ہے اللہ عزیز و حمید کا۔

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿٦﴾

"اے نبیؐ، علم رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے اور خدائے عزیز و حمید کا راستہ دکھاتا ہے"۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اہل العلم سے مراد اہل کتاب ہیں جن کو اپنی مذہبی کتابوں کی پیشن گوئیوں کی وجہ سے معلوم تھا کہ قرآن کتاب برحق ہے اور وہ صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرنے والا ہے' لیکن آیت کا دائرہ اطلاق اہل کتاب تک محدود نہیں ہے۔ اس سے مطلق اہل علم مراد ہیں۔ یہ آیت کسی زمان و مکان تک بھی محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے کے اہل علم اس کے دائرے میں آتے ہیں۔ ہر زمانے' ہر نسل اور ہر قسم کے اہل علم مراد ہیں۔ بشرطیکہ ان کا علم صحیح علم ہو۔ اس لیے کہ قرآن کریم تو تمام زمانوں کے لیے کھلی کتاب ہے۔ اس کے اندر جو سچائی ہے وہ ہر زمانے اور علاقے کے اہل علم کے لیے سچائی ہے۔ یہ کتاب اسی سچائی پر مشتمل ہے جو اس کائنات کی تہہ میں ہے۔ اس لیے قرآن کریم اس کائناتی سچائی کا بہترین اور سچا ترجمہ ہے۔

وَيَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيْدِ (٣٤: ٦) "اور خدائے عزیز و حمید کا راستہ دکھاتا ہے"۔ اللہ عزیز و حمید کا راستہ وہی ہے جو اللہ نے اس کائنات کے لیے اختیار کیا ہے اور وہی راستہ اللہ نے انسان کے لیے بھی اختیار کیا ہے تاکہ انسانی رفتار کے ساتھ ہم آہنگ ہو جو اس کائنات کے لیے ہے جس میں انسان رہتا ہے۔ یہ راستہ قانون قدرت ہے اور ناموس فطرت کا راستہ ہے جس کے مطابق یہ کائنات چلتی اور جس کے مطابق خود یہ زندگی چلتی ہے کیونکہ خود انسانی زندگی اپنے نظام اور اپنی رفتار کے مطابق اس کائنات سے علیحدہ نہیں ہے۔ نہ ان تمام چیزوں سے علیحدہ ہے جو اس کائنات میں ہیں۔

وہ اللہ عزیز و حمید کی راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے' یوں کہ وہ مومنین کی قوت مدرکہ کے اندر اس کائنات کا مناسب تصور پیدا کرتا ہے' اور پھر اس کائنات کے ساتھ مومنین کے تعلقات' روابط اور اقدار کا ایک تصور پیدا کرتا ہے کہ اس کائنات کے اندر انسان کا مقام کیا ہے۔ اس کے اندر انسان کا کردار کیا ہے' انسان اور اس کے گرد پھیلی ہوئی کائنات

مل کر کس طرح اللہ کی حکمت تخلیق کو بروئے کار لا سکتے ہیں اور انسان اور یہ کائنات باہم مل کر کس طرح اللہ جل شانہ کی سمت کی طرف سفر کر سکتے ہیں۔

یہ سچائی انسان کو عزیز و حمید کے راستے کی طرف ہدایت کرتی ہے ۔یوں کہ وہ انسان کو ایک منہاج فکر دیتی ہے ۔اس فکر کو نہایت ہی مضبوط بنیادوں پر اٹھاتی ہے اور یہ کائناتی اثرات فطرت انسانی پر اثرانداز ہوکر اسے اس کائنات کا بہترین ادراک عطا کرتے ہیں ۔انسان اس کائنات کے خواص اور قوانین کو سمجھتا ہے اور ان سے استفادہ کرتا ہے ۔پھر وہ کائناتی حقائق کے ساتھ ٹکرانے کے بجائے ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے ۔

یہ سچائی انسان کو اللہ عزیز و حمید کی راہ یوں دکھاتی ہے کہ ایک فرد کی تربیت کر کے اسے ایک سوسائٹی کے ساتھ ہم آہنگی کے ساتھ چلانا سکھائی ہے ۔ پھر یہ ایک سوسائٹی کو دوسری سوسائٹیوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس پوری کائنات کی تعمیر اور ترقی کے لیے ہم آہنگ کرتی ہے ۔اور تمام سوسائٹیوں کو اس کائنات کے ساتھ ہم قدم کرتی ہے تاکہ یہ کائنات اور اس کے اندر انسانی سوسائٹیاں بڑی سہولت کے ساتھ چل سکیں۔

یہ سچائی اللہ عزیز و حمید کی راہ کی طرف یوں بھی ہدایت کرتی ہے کہ وہ انسان اور انسانی سوسائٹی کو ایسے قوانین عطا کرتی ہے جو فطرت انسانی سے ہم آہنگ ہوں ۔انسانی زندگی کے حالات اور انسانی معیشت کے بارے میں ایسی ہدایات دیتی ہے کہ انسان تمام زندہ مخلوقات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر چلے ۔یہ نہ ہو کہ انسانی نظام اس کائنات اور اس کے اندر موجود دوسرے حیوانات کے نظام کے ساتھ متضاد ہو ۔حالانکہ انسان بھی اس کرۂ ارض کی دوسری مخلوقات اور امم میں سے ایک امت ہے ۔

غرض یہ کتاب اور یہ سچائی راہنما ہے 'سیدھی راہ کی طرف اور یہ راہنما بھی اللہ کا ارسال کردہ ہے اور یہ راستہ بھی اسی کا پیدا کردہ ہے ۔اگر آپ نے کسی سڑک پر چلنا ہے اور آپ کو راہنمائی کے لیے وہی انجینئر مل جائے جس نے اس راستے کا نقشہ بنایا تھا تو آپ جیسا خوش قسمت اور کون ہے اور آپ کس خوش اسلوبی اور بے فکری سے یہ سفر طے کر سکیں گے ۔یقیناً بہت اطمینان کے ساتھ !

اس حساس تبصرے کے بعد اب دوبارہ بات شروع ہوتی ہے بعث بعد الموت کے موضوع پر 'تعجب کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ بعث بعد الموت پر کس قدر بے تکے اعتراضات کرتے ہیں ۔وہ اپنی جانب سے حضورؐ پر تعجب کرتے ہیں کہ آپ ایسی انہونی باتیں کرتے ہیں' یا اللہ پر افتراء باندھتے ہیں حالانکہ خود ان کی تعجب انگیزی احمقانہ ہے ۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۝ أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَمْ بِهِ جِنَّةٌ ۗ بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِيدِ ۝٨

"منکرین لوگوں سے کہتے ہیں "ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہو گا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہے"۔ نہیں، بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بری طرح بہکے ہوئے ہیں"۔

یہ لوگ قیام قیامت کو اس قدر عجیب سمجھتے تھے ۔ یہ لوگ قیامت کے قائل کو قابل تعجب یا مجنون یا جھوٹا سمجھتے تھے ۔ ذرا انداز گفتگو کو دیکھو "بتائیں تمہیں ایسا شخص جو کہتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو جائے گا اس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے"۔ یہ ایک عجیب و غریب شخص پیدا ہو گیا ہے جو اس قسم کی انہونی باتیں کرتا ہے کہ مرنے کے بعد، مٹی کے ذرات بن جانے کے بعد اور مٹی میں رل مل جانے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا۔

یہ لوگ مزید تعجب کرتے ہیں اور نہایت ہی انوکھا سمجھتے ہوئے یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ یا تو یہ اللہ کے نام سے افتراء باندھتا ہے اور یا پھر یہ شخص مجنون ہے ۔ کیونکہ ان کے زعم کے مطابق اس قسم کی باتیں یا تو جھوٹا شخص کر سکتا ہے یا مجنوں کر سکتا ہے ۔ اگر مجنون ہے تو یہ کلام ہذیان ہے اور اگر جھوٹا ہے تو یہ تعجب خیز ہے ۔ وہ یہ باتیں کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہیں کہ تمہیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا لیکن خود ان کی بات تعجب خیز ہے ۔ کیا یہ لوگ پہلی بار پیدا نہیں کیے گئے؟ انسان کی تخلیق کیا کوئی کم واقعہ ہے ۔ پہلی بار ایسی تخلیق؟ اگر یہ اسے تدبر اور غور سے دیکھیں تو کبھی بھی تعجب نہ کریں ۔ لیکن یہ گمراہ ہیں اور ہدایت کی راہ نہیں لیتے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس تعجب پر ان کو سخت دھمکی دی جاتی ہے ۔

بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ فِی الْعَذَابِ وَ الضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ (۳۴:۸) "بلکہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں اور وہی بری طرح بہکے ہوئے ہیں"۔ اس عذاب سے مراد عذاب آخرت بھی ہو سکتا ہے گویا وہ عذاب ان پر واقعہ ہو گیا ہے ۔ چونکہ وہ گمراہی میں بہت دور تک چلے گئے ہیں اس لیے اب ان کے ہدایت پر آنے کی کوئی امید نہیں ہے ۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ جس طرح عذاب الہی میں مبتلا ہیں اسی طرح گمراہ بھی ہیں ۔ یہ بہت گہری حقیقت ہے اس لیے کہ جس شخص کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا وہ نفسیاتی لحاظ سے سخت عذاب اور کشمکش میں ہوتا ہے ۔ ایسے شخص کو دنیا کی بے انصافیوں میں نہ انصاف کی امید ہوتی ہے، نہ عدل کی، نہ جزائے آخرت کی اور نہ اخروی اجر کی ۔ انسانی زندگی میں ایسے واقعات اور حوادث آتے ہیں کہ انسان انہیں صرف اجر اخروی کی خاطر ہی برداشت کر سکتا ہے اور یہ تسلی رکھتا ہے کہ نیکوکار کے لیے اجر حسن ہے اور بدکار کے لیے سزا ہے ۔ کئی ایسی مشکلات ہوتی ہیں کہ انسان رضائے الہی اور جزائے اخروی کے لیے انہیں برداشت کرتا ہے کیونکہ آخرت میں چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ضائع نہیں ہوتا ۔ اگر وہ ذرا برابر ہو اور کسی چٹان کے اندر ہو، وہاں سے بھی اللہ اس مطلوب ذرے کو جو رائی کے دانے کے برابر ہو، لے کر آتا ہے اور جو شخص اس تروتازہ اور فرحت بخش اور روشن چراغ سے محروم ہے وہ گویا دائمی عذاب میں ہے ۔ اس دنیا میں بھی منکر آخرت ایک مسلسل عذاب میں گرفتار ہوتا ہے اور آخرت میں تو وہ اپنے اعمال کی جزا بہرحال پائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا عقیدہ انسان کے لیے ایک رحمت ہے، ایک عظیم نعمت ہے جس کے مستحق اللہ کے مخلص بندے ہوتے ہیں، جو حق کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور جن کی خواہش ہر وقت یہ ہوتی ہے کہ وہ راہ راست پر

گامزن ہوں۔ راجح بات یہی ہے کہ اس آیت میں اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ گمراہی کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں بھی ایک مصیبت میں گرفتار ہیں۔

ان مکذبین کو اب ایک سخت دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر اللہ چاہے تو ان کی اس گمراہی کی وجہ سے مزید عذاب دنیا ان پر نازل کر دے اور آسمان کا ایک ٹکڑا ان پر گرا دے یا ان کو اس ضلالت کی وجہ سے زمین کے اندر دھنسا دے۔ یہ اس نظام کائنات پر غور نہیں کرتے کہ یہ نظام تو کسی بھی وقت بگڑ سکتا ہے۔

اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰى مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَیْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ﴿۹﴾

ا
ع ۹
ے

"کیا انہوں نے کبھی اس آسمان و زمین کو نہیں دیکھا جو انہیں آگے اور پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے؟ ہم چاہیں تو انہیں زمین میں دھنسا دیں' یا آسمان سے کچھ ٹکڑے ان پر گرا دیں۔ درحقیقت اس میں ایک نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہو"۔

یہ ایک سخت ڈراؤنا کائناتی منظر ہے۔ یہ منظر ان کے مشاہدات سے ماخوذ ہے جن کو وہ رات اور دن دیکھتے رہتے ہیں۔ زمین کا دھنس جانا بھی انسانی مشاہدہ ہے اور قصص اور روایات میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح شہاب ثاقب کے گرنے اور بجلیوں کے گرنے سے بھی آسمانی چیزیں گرتی رہی ہیں۔ یہ سب چیزیں ان کی دیکھی سنی ہیں۔ اس قدر خوفناک حالات کی طرف ان کو متوجہ کر کے ڈرایا جاتا ہے جو قیام قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ اگر قیام قیامت سے پہلے ہی اللہ ان کو عذاب دینا چاہے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسی زمین اور اسی آسمان میں ان کو یہ عذاب دے دیا جائے جو ان کے آگے پیچھے ان کو گھیرے ہوئے ہے اور یہ ان سے دور بھی نہیں ہے جس طرح قیام قیامت ان کو بعید نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے عذاب سے تو غافل لوگ ہی بے فکر ہوتے ہیں۔

یہ آسمانوں کے اندر جو عملیات وہ دیکھتے ہیں' بجلیاں اور شہاب ثاقب اور زمین کا دھنس جانا اور زلزلے۔ کسی وقت بھی ان میں سے کوئی عذاب اگر آ جائے تو قیامت ہی ہو گی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ (۳۴ : ۹) "حقیقت یہ ہے کہ اس میں نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والا ہو"۔ اور جو غلط راہ پر اس قدر دور نہ چلا گیا ہو۔

---ooo---

درس نمبر ۱۹۵ ایک نظر میں

اس سبق میں شکر اور سرکشی کی دو صورتیں پیش کی گئی ہیں اور یہ مثال بھی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے لیے ایسی قوتیں مسخر کر دیتے ہیں جو عموماً لوگوں کے لیے مسخر نہیں کی جاتیں ـ لیکن اللہ کی مشیت اور اللہ کی تقدیر کو لوگوں کی عادات کے تابع نہیں کیا جا سکتا ـ ان نقوش کے درمیان جنوں کی حقیقت بھی سامنے آتی ہے جن کی پوجا بعض عرب کیا کرتے تھے یا ان سے یہ عرب قبائل غیب کی خبریں طلب کرتے تھے جبکہ یہ جنات بذات خود غیب کی خبروں سے محروم ہوتے ہیں ـ اس سبق میں گمراہی کے وہ اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں جن کے ذریعے شیطان لوگوں کو گمراہ کرتا ہے ـ لیکن یہ اسباب انسان کے دائرہ اختیار کے اندر ہیں ـ اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ لوگوں کے جو اعمال پوشیدہ ہوتے ہیں اللہ ان کو ظاہر فرماتے ہیں اور اس سبق کا خاتمہ بھی سابقہ سبق کی طرح ذکر آخرت پر ہوتا ہے ـ

---ooo---

درس نمبر ۱۹۵ تشریح آیات

۱۰ --- تا --- ۲۱

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

"ہم نے داؤد کو اپنے ہاں سے بڑا فضل عطا کیا تھا۔ (ہم نے حکم دیا کہ) اے پہاڑو' اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو۔ (اور یہی حکم ہم نے) پرندوں کو دیا۔ ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ زرہیں بنا اور ان کے حلقے ٹھیک اندازے پر رکھ۔ (اے آل داؤد) نیک عمل کرو' جو کچھ تم کرتے ہو' اس کو میں دیکھ رہا ہوں"۔

حضرت داؤد اللہ کے مطیع فرمان بندے تھے۔ گزشتہ سبق کا خاتمہ اس ذکر سے ہوا تھا۔

اِنَّ فِیْ ذَالِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ "اس میں نشانی ہے ہر اس بندے کے لیے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو"۔ اس اشارہ کے بعد حضرت داؤد کا قصہ لایا گیا اور اس کا آغاز اس بات سے کیا گیا جو بطور فضیلت ان کو دی گئی۔

يٰجِبَالُ اَوِّبِىْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ (۳۴: ۱۰) "اے پہاڑو' اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو اور اے میرے پرندو تم بھی"۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو بہت ہی خوبصورت آواز دی گئی تھی۔ یہ آواز اپنی خوبصورتی میں ایک معجزانہ آواز تھی۔ وہ اپنے ترانے نہایت خوش الحانی سے گاتے تھے۔ یہ ترانے اللہ کی حمد پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض عہد قدیم میں موجود ہیں اگرچہ ہم ان کی صحت کے بارے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کی آواز سنی جو رات کو قرآن پڑھتے تھے' آپ کھڑے ہو کر سننے لگے تو آپ نے فرمایا کہ "ان کو ایسی خوش الحانی دی گئی ہے جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کو دی گئی تھی"۔

اس آیت میں حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ کے فضل و کرم کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اس قدر شفاف ہے کہ ان کی حمد و ثنا کے نتیجے میں ان کے اور اس کائنات کے درمیان پردے اٹھ گئے تھے۔ ان کی حقیقت' حقیقت کائنات کے ساتھ

ہم آہنگ ہو گئی تھی ۔ اور جس طرح وہ رب تعالیٰ کی حمد گاتے تھے ۔ اسی طرح پہاڑ بھی ان کے ساتھ گاتے تھے اور ان کی حمد کے جواب میں پہاڑ اور پرندے بھی حمد گاتے تھے ۔ اس طرح کہ ان کے وجود اور کائنات کی حقیقت کے درمیان فاصلے مٹ گئے تھے ۔ یہ کائنات بھی اللہ کی حدی خواں تھی اور حضرت داؤد بھی ۔ یوں اللہ کی مخلوقات کی دو اقسام کے درمیان فاصلے مٹ گئے اور دونوں مخلوقات الٰہی حقیقت کے ساتھ مربوط ہو گئیں جس نے ان کے درمیان یہ پردے قائم کر رکھے تھے ۔ دونوں اللہ کی تسبیح اور حمد گانے لگیں اور دونوں کا نغمہ ایک ہو گیا ۔ یہ اشراق' صفائی اور خلوص کا ایک درجہ ہے اور اس مقام اور درجے تک اللہ کے فضل و کرم کے سوا کوئی نہیں پہنچ سکتا ۔ جب حقیقت نوعیہ کے پردے اٹھ جائیں تو اللہ کی مخلوق ایک رہ جاتی ہے اور تمام حائل پردے اٹھ جاتے ہیں ۔ کوئی رکاوٹ نہیں رہتی ۔

جب حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کی حمد و ثنا گاتے تو پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ گاتے ۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی شخصیت میں جو ترنم تھا' وہ پوری کائنات میں سرایت کر جاتا اور یوں پوری کائنات خالق کی طرف متوجہ ہو کر حمد گاتی ۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جن کا ذوق انہی لوگوں کو ہوتا ہے جو ان تجربات سے گزرے ہوں اور جن لوگوں نے اپنی زندگی میں ایسے لمحات پائے ہوں ۔

وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (۳۴ : ۱۰) "ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا" ۔ یہ اللہ کے فضل و کرم کا ایک دوسرا رنگ تھا جو حضرت داؤد علیہ السلام پر ہوا تھا ۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر انعامات کا جس طرح یہاں بیان ہو رہا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی خارق العادت عمل تھا ۔ معاملہ یہ نہ تھا جس طرح بھٹیوں میں لوہے کو گرم کر کے ان کو پگھلاتے ہیں اور پھر ڈھلائی کا کام کرتے ہیں ۔ یہ دراصل ایک معجزانہ عمل تھا اور حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت پر ایک دلیل تھا اور سیاق کلام سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہاں مخصوص فضل و کرم کا ذکر ہو رہا ہے ۔ یہ کوئی معمولی اور عادی ٹیکنالوجی نہ تھی ۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ (۳۴ : ۱۱) "اس ہدایت کے ساتھ کہ زرہیں بنا اور اس کے حلقے ٹھیک اندازے سے رکھ" ۔ سابغات معنی زرہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے قبل تختیاں بنائی جاتی تھیں اور تختیوں کی زرہیں جسم کے لیے ثقیل ہوتی تھیں اور جسم کو زخمی کر دیتی تھیں ۔ اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ امر سکھایا کہ آپ گرم تاروں سے ان کو بنائیں تاکہ وہ نرم ہوں اور کپڑے کی طرح جسم ان کے اندر حرکت کر سکے ۔ حکم دیا کہ اس زرہ کے حلقے تنگ کیے جائیں تاکہ اس کے اندر سے تیر نہ جائیں اور حلقے سب کے سب ایک اندازے سے بنائے جائیں اور یہ تمام کام اللہ کی جانب سے الہامی طور پر ہوا ۔ ان کو مزید ہدایات یوں دی گئیں :

وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۳۴ : ۱۱) "اے آل داؤد نیک عمل کرو' جو کچھ تم کرتے ہو' میں دیکھ رہا ہوں" ۔ اس زرہ سازی کے کام ہی میں نہیں' بلکہ ہر کام میں اعمال صالحہ کرو' ہر معاملے میں اللہ کو حاضر سمجھو ۔ اور یہ یقین رکھو کہ اللہ جزاء دینے والا ہے ۔ اس سے کوئی چیز رہ نہ جائے گی ۔ وہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے ۔

--- ooo ---

یہ تو تھا حضرت داؤد علیہ السلام کا معاملہ ۔ رہے حضرت سلیمان تو ان پر بھی بہت ہی بڑا فضل و کرم ہوا تھا۔

وَلِسُلَيْمَٰنَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۖ وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ ۖ وَمِنَ الْجِنِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَمَن يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ﴿١٢﴾ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِن مَّحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَّاسِيَاتٍ ۚ اعْمَلُوا آلَ دَاوُودَ شُكْرًا ۚ وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ﴿١٣﴾

"اور سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا' صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک ۔ ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور ایسے جن اس کے تابع کر دیے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے ۔ ان میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے ۔ وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا' اونچی عمارتیں' تصویریں' بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں --- اے آل داؤد' عمل کرو شکر کے طریقے پر' میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں ۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا گیا تھا' اس کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہیں ۔ ان روایات پر اسرائیلیات کا رنگ غالب ہے ۔ اگرچہ یہودی کتابوں میں ان کا تذکرہ نہیں ہے ۔ ان روایات میں پڑنے سے بچنا ہی بہتر ہے ۔ آیت میں جو کچھ آیا ہے بس اس پر اکتفا محفوظ راستہ ہے ۔ آیات کا ظاہری مفہوم ہی مراد لیا جائے ۔ آیات کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تھا اور یہ ہوا صبح کے وقت ایک علاقے کی طرف چلتی تھی ۔ (سورہ انبیاء میں ہے کہ یہ ارض مقدس کی طرف چلتی تھی) اور ایک مہینے کا فاصلہ طے کرتی تھی اور شام کے وقت وہ دوسرے علاقے کی طرف چلتی اور مسافت ایک ماہ کا فاصلہ ہوتا ۔ دونوں سے حضرت سلیمان اپنے مفادات لیتے اور اللہ کے حکم سے استفادہ کرتے ۔ اس کی تفصیلات کیا ہیں ۔ وہ ہمیں معلوم نہیں ۔ اور بلا تحقیق انسانوں کے پیچھے پڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہے ۔

وَ اَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ (۳۴ : ۱۲) "ہم نے اس کے لیے پگھلے ہوئے تانبے کا ایک چشمہ بہا دیا تھا" ۔ قطر نحاس یعنی تانبے کو کہتے ہیں ۔ سیاق کلام سے یہاں بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوہے کو نرم کرنے کی طرح' تانبے کا چشمہ بھی کوئی معجزانہ عمل تھا ۔ یوں ہو سکتا ہے کہ اللہ نے آتش فشانی کے عمل کی طرح ان کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا ہو یا یوں کہ اللہ نے ان کو بطور الہام تانبا پگھلانا سکھا دیا ہو ۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے فضل عظیم تھا ۔

وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (۱ : ۳۴ : ۱۲) "جن ان کے تابع کر دیئے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے"۔ اللہ نے معجزانہ طور پر جن ان کے تابع کر دیئے تھے اور وہ ان کی مملکت میں معجزانہ ڈیوٹیاں دیتے تھے ۔ عربی میں ان تمام مخفی قوتوں کو جن کہا جاتا ہے جو نظر نہیں آتیں ۔ یہ ایک مخلوق ہے جس پر اللہ نے جن کے لفظ کا اطلاق کیا ہے ہم اس مخلوق کے بارے میں وہی کچھ جانتے ہیں جو اللہ نے بتایا ہے اس سے زیادہ نہیں ۔ یہاں اللہ نے صرف یہی کہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ان کا ایک گروہ مسخر کر دیا گیا تھا جو آپ کے تحت کام کرتا تھا اور ان میں سے جو بھی بھاگ جاتا اسے اللہ سخت سزا دیتے تھے ۔

وَ مَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ (۱ : ۳۴ : ۱۲) "ان میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا اس کو ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے"۔ جنوں کی تسخیر کی بات ختم ہونے سے قبل ہی یہ تبصرہ کیا گیا کہ جن اللہ کے اس طرح قبضے میں ہیں کہ اگر نافرمانی کریں تو اللہ انہیں آگ میں ڈال دے ۔ چونکہ بعض مشرکین جنوں کی پوجا کرتے تھے اس لیے یہاں ان کی اس بے بسی کو بیان کیا گیا کہ مشرکین کی طرح ان کے معبود بھی نار جہنم میں جائیں گے بوجہ نافرمانی کے --- جن حضرت سلیمان کے لیے یوں مسخر تھے ۔

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (۱۳ : ۳۴ : ۱۳) "وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا تھا ۔ اونچی عمارات، تصاویر، بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بڑی بڑی دیگیں"۔ محاریب تو ان جگہوں کو کہا جاتا ہے جہاں عبادت کی جاتی ہے ۔ تماثیل تانبے اور لکڑی کی تصاویر کو کہتے ہیں ۔ جوابی جابیہ کی جمع ہے وہ حوض جس میں پانی آئے ۔ جن حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ایسے بڑے لگن بناتے تھے جو حوضوں کی طرح تھے اور وہ ان کے لیے ایسے بڑے دیگ بناتے تھے جو اپنی بڑائی کی وجہ سے جڑے رہتے تھے ۔ یہ تمام خدمات وہ ہیں جن پر جنات مامور تھے ۔ یہ تمام امور اس وقت خارق عادت تھے اس لیے ان کی یہی تفسیر درست ہے ۔ اگر ان کو معمولی بنا دیا جائے تو یہ فضل نہیں رہتا ۔

اب آل داؤد کو مخاطب کر کے ہدایت دی جاتی ہے ۔

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (۱ : ۳۴ : ۱۳) "اے آل داؤد عمل کرو شکر کے طریقے پر"۔ ہم نے تمہارے لیے یہ فضل و کرم حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی شکل میں فراہم کر دیا ہے، لہٰذا اے آل داؤد تم شکر کا طریقہ اختیار کرو ۔ فخر و مباہات کا طریقہ نہ اپناؤ اور عمل صالح کا طریقہ اپناؤ ۔

وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (۱ : ۳۴ : ۱۳) "میرے بندوں میں سے کم ہی شکر گزار ہیں"۔ یہ ایک ایسا تبصرہ ہے جو حقیقت نفس الامری قارئین کے سامنے رکھتا ہے اور یہ قرآن کریم کے تمام قصوں پر آتا ہے ۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ کا فضل و کرم انسانوں پر اس قدر زیادہ ہے کہ کم انسان شکر ادا کر سکتے ہیں اور بشر ہمیشہ شکر الٰہی کی بجا آوری میں قاصر ہی رہتے ہیں ۔ وہ جس قدر زیادہ شکر بھی ادا کریں پھر بھی قاصر رہتے ہیں لیکن اگر وہ بالکل شکر ہی نہ

کریں تو ان کا قصور بہت زیادہ ہو گا اور اگر سرکشی کریں تو ....

اللہ کے بندے نہایت ہی محدود قوت کے مالک ہیں اور ان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اللہ کی لامحدود نعمتوں پر شکر بجا لا سکیں ـ اگر اللہ کی نعمتوں کو کوئی گننے تو گن ہی نہ سکے ' یہ نعمتیں گو انسان کو اوپر سے ڈھانپ رہی ہے ' پاؤں کے نیچے سے انسان ان میں غرق ہے ' دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے انسان ان سے لطف اندوز ہو رہا ہے ـ اس کی ذات ان میں ڈوبی ہوئی ہے ـ خود انسان انعامات الہیہ کا ایک نمونہ ہے ـ

ایک بار ہم بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ نہایت ہی دلچسپی کے ساتھ ہمکلام تھے ـ ہر قسم کی باتیں ہو رہی تھیں ـ اچانک چھوٹی بلی سو سو نمودار ہوئی ـ یہ ہمارے ارد گرد گھوم رہی تھی گویا کوئی چیز تلاش کر رہی ہے لیکن وہ بلی زبان سے کچھ کہنے پر قادر نہ تھی ـ اچانک اللہ نے ہمارے دل میں ڈال دیا کہ شاید پیاسی ہے ـ جب ہم نے پانی فراہم کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پیاسی تھی ' اسے شدید پیاس لگی ہوئی تھی لیکن وہ زبان سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی ـ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ انسان پر اللہ کے فضل و کرم سے ایک بڑا فضل و کرم زبان بھی ہے جس کا شکر ادا کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے ـ

ایک طویل عرصے تک ہم نے سورج نہ دیکھا تھا ـ سورج کی شعاعیں صرف ایک پیسے کے برابر ہم پر چمکتی تھیں ہم اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور اپنے منہ ' ہاتھ اور چہرے اس سورج کے سامنے لاتے ' سر ' پیٹھ اور پاؤں کو اس سورج کی شعاعوں کی ٹکیا سے غسل دیتے ـ اور ہم سب یہ عمل باری باری کرتے ـ یہ ایک نعمت تھی جو ہمیں مل رہی تھی اور جب پہلے دن ہم سورج میں نکلے تو میں وہ خوشی بھول نہیں سکتا ـ اس وقت ہر ایک کے چہرے پر جو مسرت تھی اس کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا ـ ہر ایک اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا ' الحمد للہ یہ ہے سورج اور یہ تو ہمیشہ ہی چمکتا رہتا ہے ـ

روزانہ یہ شعاعیں کس قدر پھیلتی ہیں اور ہم ان سے گرمی حاصل کرتے ہیں ـ اور ان شعاعوں میں غسل کرتے ہیں ـ یوں ہم اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اللہ کی نعمت میں غرق رہتے ہیں ـ ذرا سوچئے کہ ہم اس عظیم فیض الہی سے کس قدر فائدہ اٹھاتے ہیں جو مفت اور بلا حساب ہمیں فراہم کر دیا گیا ہے بغیر مشقت اور بغیر کسی تکلیف کے ـ

اگر ہم اسی طرز پر اللہ کی نعمتوں کو پیش کرتے رہیں تو ہماری عمر ختم ہو جائے ' ہماری پوری قوت صرف ہو جائے لیکن پھر بھی ہم ان نعمتوں میں سے کسی معتدبہ حصے کا شمار نہ کر سکیں ـ لہذا ہم بھی یہاں اسی مجمل اشارے پر اکتفاء کرتے جو قرآن نے کیا ہے تاکہ آگے اہل فکر و تدبر خود ہی سوچ لیں اور وہ جس قدر اللہ چاہے اس سے تاثر لیں ـ یہ تو ہے اللہ کی نعمتوں کا ایک حصہ اور وہی شخص ان کو پا سکتا ہے جو نہایت ہی توجہ ' خلوص اور یکسوئی کے ساتھ اس طرف متوجہ ہو ـ

اب ہم قرآنی قصے کی آخری آیات کی طرف آتے ہیں ـ یہ آخری منظر کا حصہ ہیں ـ حضرت سلیمان وفات پا جاتے ہیں اور جنات ان احکام کی تعمیل میں لگے ہوئے تھے جو انہوں نے اپنی زندگی کے دوران دیئے تھے ـ جنات کو معلوم نہیں ہے کہ حضرت سلیمان تو فوت ہو چکے ہیں ـ حضرت سلیمان جنات کے سامنے عصا پر ٹیک لگائے کھڑے ہی تھے کہ گھن نے ان کے عصا کو کھا لیا اور آپ گر گئے ـ تب جنوں کو معلوم ہوا کہ وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس مشقت میں مبتلا رہے ـ

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ

الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۱۴﴾

"پھر جب سلیمان علیہ السلام پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس گھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے"۔

روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا وقت آگیا تو وہ عصا پر تکیہ کیے ہوئے تھے۔ جن اپنی اپنی ڈیوٹیاں سرانجام دے رہے تھے اور ان کے ذمہ بہت سے شدید فرائض تھے جو ان کو کرتے تھے۔ جنوں کو ایک عرصہ تک معلوم نہ ہوا کہ حضرت سلیمان فوت ہو گئے ہیں یہاں تک کہ گھن نے ان کے عصا کو چاٹ لیا۔ یہ کیڑا جہاں ہوتا ہے چھت کے شہتیروں، دروازوں، ستونوں کو بری طرح کھا جاتا ہے۔ پورٹ سعید کے علاقے میں لوگ گھر بناتے ہیں اور اس گھن کے ڈر سے اس میں ایک لکڑی بھی نہیں لگاتے کہ یہ کیڑا ہر قسم کی لکڑی کو چاٹ جاتا ہے۔ جب اس نے عصا کو چاٹ لیا تو وہ حضرت سلیمان کو نہ سہار سکا اور آپ زمین پر گر پڑے۔ اس وقت جنوں کو معلوم ہوا کہ حضرت تو وفات پا چکے ہیں۔ یہاں آکر جنوں کو معلوم ہوا۔

تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ

(٣٤ : ١٤) "یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے"۔ یہ ہیں وہ جن جن کو عرب پوجتے ہیں اور ان کو اللہ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کے تابع بنا دیا اور ان کو اپنے قریب کے غیب کا بھی علم نہ تھا۔ لیکن بعض لوگ اس قدر کم فہم ہیں کہ ان سے دور کی باتیں پوچھتے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے گھرانے کا قصہ تو ان اہل ایمان کا قصہ تھا جو اللہ کے فضل و کرم کا بے حد شکر ادا کرنے والے تھے۔ اس کے بالمقابل قوم سبا کا قصہ ہے۔ سورہ نمل میں حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کے حالات گزر گئے ہیں۔ اب ان کا قصہ بعد کے ادوار سے متعلق ہے کیونکہ جن واقعات کا یہاں ذکر ہے وہ زمانہ مابعد سے متعلق ہیں۔

راجح بات یہ ہے کہ جب قوم سبا نے سرکشی اختیار کی تو اللہ نے ان سے اپنی نعمتیں چھین لیں اور اس کے بعد یہ لوگ اس علاقے سے منتشر ہو گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں یہ لوگ ایک بہت بڑی ترقی یافتہ مملکت کے مالک تھے اور ان کے علاقے میں ہر طرف خوشحالی اور رفاہ عامہ کے کام تھے۔ کیونکہ ہدہد نے سلیمان علیہ السلام کے سامنے یہ رپورٹ پیش کی۔

اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ وَجَدْتُّهَا

مَا يَعْبُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ "میں نے دیکھا کہ ایک عورت ان کی ملکہ ہے اور اسے ہر چیز دی گئی ہے اور اس کا ایک عظیم تخت ہے۔ میں نے پایا کہ وہ اور اس کی قوم سورج کے پجاری ہیں' اللہ کے سوا" ۔ اس کے بعد پھر ملکہ سبا سلیمان علیہ السلام کے سامنے مسلمان ہو کر آ جاتی ہے۔ لہذا یہاں کے جو واقعات ہیں وہ ملکہ سبا کے زمانہ کے بعد سے متعلق ہیں۔ یہ مصائب ان پر اس وقت آئے جب انہوں نے سرکشی اختیار کر لی۔ اور اللہ کی ناشکری کی وجہ سے اللہ نے اپنے انعامات ان سے چھین لیے۔

قصے کا آغاز اس حالت کے بیان سے ہوتا ہے جس میں وہ تھے۔ اچھے دن' فراوانی' ترقی اور اللہ کی نعمتیں اور ہر طرح کی پیداوار جس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان انعامات کے بدلے میں اللہ کا شکر ادا کرتے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ۬ ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾

"سبا کے لیے ان کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھے' دو باغ دائیں اور بائیں۔ کھاؤ اپنے رب کا رزق اور شکر بجالاؤ اس کا' ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا"۔

سبا اس قوم کا نام ہے جو جنوب یمن میں رہتی تھی۔ ان کی زمین تروتازہ تھی۔ اس کا ایک حصہ آج بھی اسی حالت میں موجود ہے۔ یہ اس قدر ترقی یافتہ تھے کہ مشرق اور جنوب سے آنے والی بارشوں کے پانی کا انہوں نے ذخیرہ بنا لیا تھا۔ ایک ایسا ڈیم بنایا تھا جس کے دونوں جانب قدرتی پہاڑ تھے۔ پہاڑوں کے درمیان تنگ جگہ پر انہوں نے ڈیم بنا لیا تھا' جس میں سے چشمے اور نہریں نکلتی تھیں۔ ان کا پانی وہ حسب ضرورت بند کرتے تھے اور کھولتے تھے۔ انہوں نے پانی کی بہت ہی بڑی مقدار کو جمع کر لیا تھا اور اس ذخیرے پر انہیں کنٹرول حاصل تھا۔ چنانچہ یہ ان کے لیے ایک وسیع ذریعہ آبپاشی تھا۔ اسے یہ لوگ سد مارب کہتے تھے۔

اس ڈیم کے دائیں اور بائیں جانب کی نہروں کے تحت باغات تھے۔ یعنی پورا علاقہ سرسبز اور شاداب تھا' حسین و جمیل تھا اور یہ نشانی تھی' رب کریم کی انعامات کی۔ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ رب غفور کا شکر ادا کریں ان نعمتوں پر۔

كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ (۳۴ : ۱۵) "کھاؤ اپنے رب کا رزق اور شکر بجالاؤ اس کا"۔ ان کو یہ نصیحت کی گئی کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرو' جس نے تمہیں یہ خوبصورت علاقہ دیا۔ اور اس میں ہر قسم کی پیداوار دی اور پھر تم سے جو تقصیرات سرزد ہوئیں وہ بھی معاف کی گئیں۔

بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ (۳۴ : ۱۵) "ملک عمدہ اور پروردگار بخشش کرنے والا"۔ زمین عمدہ'

پیداوار والی' اور نعمتوں اور آسانیوں والی اور آسمانوں کی بادشاہت معاف کرنے والی۔ سوال یہ ہے کہ زمین ہر قسم کا پھل دینے والی ہے اور اللہ غفور الرحیم ہے تو پھر شکر ادا نہ کرنے اور اللہ کی حمد نہ کرنے کا جواز کیا ہے؟ لیکن اس کے باوجود انہوں نے شکر ادا نہ کیا۔

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَ بَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾

"مگر وہ منہ موڑ گئے۔ آخر کار ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انہیں دیئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں"۔

انہوں نے اللہ کے شکر بجا لانے سے منہ موڑ لیا۔ نیک کام کرنا چھوڑ دیا۔ اللہ کے انعامات میں غلط تصرفات کرنا شروع کر دیئے۔ لہٰذا اللہ نے ان سے وہ خوشحالی چھین لی جس میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان پر اس قدر شدید سیلاب بھیجا جو راستے میں آنے والے پتھروں کو بھی بہا کر لے جا رہا تھا۔ العرم کے معنی پتھر ہیں۔ یوں یہ ڈیم ٹوٹ گیا۔ پانی نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔ یہ گاؤں اور باغات تباہ ہو گئے۔ اور از سرنو پانیوں کے ذخیرہ کرنے کا انتظام ان سے نہ ہو سکا۔ اس لیے خوشحالی کی جگہ خشک سالی نے لی۔ زمین خشک ہو کر جل گئی اور سرسبز باغات بیریوں کی جھاڑیوں میں بدل گئے اور سرسبز زمین صحرا میں بدل گئی۔

وَ بَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ (٣٤ : ١٦) "اور ان کے پچھلے دو باغوں کے بدلے دو اور باغ انہیں دیئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں"۔ خمط اراک کے درخت کو کہتے ہیں۔ ہر خار دار درخت کو بھی خمط کہتے ہیں۔ اور اثل ایک درخت ہے جو الطرفاء کے مماثل ہوتا ہے یعنی جھاؤ۔ اور سدر بیری کو کہتے ہیں اور یہ بیری جو اب ان کے لیے بہترین پھل رہ گئی تھی یہ بھی قلیل مقدار میں تھی۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۭ وَ هَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿۱۷﴾

"یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا' اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے"۔ یعنی کفران نعمت کی وجہ سے ان کو یہ سزا دی گئی۔

لیکن ابھی تک یہ لوگ اپنی بستیوں ہی میں رہ رہے تھے اگرچہ اس سیلاب کی وجہ سے ان کے رزق کے ذرائع محدود ہو گئے تھے۔ خوشحالی اور سہولیات کے بدلے بدحالی اور مشکلات معیشت نے جگہ لے لی تھی۔ لیکن ابھی تک ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین کے اندر بکھیر نہ دیا گیا تھا۔ اور ان کی بستیوں اور برکت والی بستیوں مکہ مکرمہ اور بیت المقدس کے

درمیان مواصلات کا سلسلہ باقی تھا۔ علاقہ سبا کے شمال میں یمن کا علاقہ بھی آباد تھا اور یمن مکہ اور مدینہ کے ذریعہ شام اور بیت المقدس سے جڑا ہوا تھا۔ یہ راہ مامون اور جاری تھی۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ﴿١٨﴾

"اور ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان، جن کو ہم نے برکت عطا کی تھی، نمایاں بستیاں بسا دی تھیں اور ان میں سفر کی مسافتیں ایک اندازے پر رکھ دی تھیں۔ چلو پھرو ان راستوں میں رات دن پورے امن کے ساتھ"۔

یہ راستہ ایسا تھا کہ مسافر اور قافلے صبح نکلتے اور اندھیرا ہونے سے پہلے دوسرے شہر تک پہنچ جاتے۔ لہٰذا ان شہروں کے درمیان محدود فاصلے کا سفر ہوتا اور یہ راستہ مسافروں کے لیے نہایت ہی امن و امان کا اور محفوظ ہوتا تھا۔ روز کے سفر کے بعد مسافر آرام کر سکتے تھے اور ان کو جگہ جگہ سرو سز کی سہولیات مل جاتی تھیں۔

فَقَالُوا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿١٩﴾

مگر انہوں نے کہا "اے ہمارے رب، ہمارے سفر کی مسافتیں لمبی کر دے"۔ انہوں نے خود مطالبہ کیا کہ اے اللہ ہمیں طویل المسافت سفر دے۔ ایسا سفر جو سالوں میں کیا جا سکے کیونکہ ان تھوڑے تھوڑے مختصر سفروں سے ہم تنگ آ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دماغ اور ان کے نفوس فساد پذیر ہو گئے تھے۔

وَظَلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ (۳۴ : ۱۹) "انہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا"۔ انہوں نے یہ دعا کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اللہ نے بھی ان کی دعا قبول کر لی۔ یہ دعا دراصل سرکشی کی دعا تھی اور اللہ نے اسے بطور سزا قبول کر لیا۔

فَجَعَلْنَٰهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (۳۴ : ۱۹) "آخر کار ہم نے انہیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انہیں بالکل تتر بتر کر ڈالا"۔ وہ خود اپنی خواہش کے مطابق اس ملک سے نکال دیئے گئے، تتر بتر ہو گئے اور پورے جزیرۃ العرب میں پھیل گئے۔ ان کی تاریخ افسانہ بن گئی۔ صرف قصے رہ گئے قوم اور ملک ناپید ہو گیا۔ حالانکہ وہ ملک اور امت کے مالک تھے اور بہترین زندگی بسر کرتے تھے۔

إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۳۴ : ۱۹) "یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو بڑا صابر و شاکر ہو"۔ شکر کے ساتھ یہاں صبر کا ذکر بھی کیا گیا ہے کیونکہ مشکلات میں صبر بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ نعمتوں میں شکر انسان کے لیے بہت ہی مفید رویہ ہوتا ہے اور قصہ قوم سبا میں دونوں کے لیے سبق ہے۔

یہ تو تھا آیت کا ایک مفہوم لیکن ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے۔ اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً (۳۴ : ۱۸) "اور ہم نے ان بستیوں اور برکت والی بستیوں کے درمیان کئی بستیاں پیدا کر دیں جو قوت اور شوکت والی تھیں"۔ یعنی ان ہلاک شدہ بستیوں اور مبارک بستیوں کے درمیان غالب بستیاں وجود میں آگئیں۔ جبکہ سبا کے لوگ فقراء بن گئے اور خشک صحراوی زندگی کی طرف لوٹ گئے۔ ان کو چراگاہوں اور پانیوں کی طرف رات دن سفر کرنا پڑتا۔ انہوں نے ان آزمائشوں پر صبر نہ کیا۔ اور یہ دعا کی اے رب باعد۔

بَيْنَ أَسْفَارِنَا (۳۴ : ۱۹) "ہمارے سفروں کو دور کر دے"۔ یعنی ہماری حالت پاوندگی کو ختم کر دے۔ ہم تنگ آگئے۔ یہ دعا انہوں نے انابت اور اصلاح حال کے ساتھ نہ کی تھی اور وہ پوری طرح تائب نہ ہوئے تھے۔ اس لیے دعا قبول نہ ہوئی۔ انہوں نے خوشحالی کی وجہ سے سرکشی اختیار کی تھی اور مشکلات پر صبر نہ کیا تو اللہ نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ یوں یہ لوگ افسانہ بن گئے جس کا کوئی مصداق روئے زمین پر نہ رہا۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ (۳۴ : ۱۹) "بے شک اس میں نشانیوں میں ہر اس شخص کے لیے جو صابر اور شاکر ہو"۔ چونکہ انہوں نے شکر نہ کیا تھا اور مشکلات میں صبر نہ کیا تھا۔ اس آیت کی یہ بھی ایک تفسیر ہے جو ذہن میں آتی ہے۔

--- ooo---

اب آخر میں بات قصے کے محدود احاطے سے نکل کر اللہ کی عمومی تدبیر کے دائرے میں آتی ہے۔ اللہ کا نظام قضا و قدر جو نہایت ہی محکم ہے، جو عام اور جو بطور سنت الٰہیہ اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔ قصے کا سبق یوں نچوڑا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۰﴾ وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يُؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ ۗ وَرَبُّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ﴿۲۱﴾

۲
ع۱۲
۸

"ان کے معاملہ میں ابلیس نے اپنا گمان صحیح پایا اور انہوں نے اسی کی پیروی کی، بجز ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن تھا۔ ابلیس کو ان پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر جو کچھ ہوا وہ اس لیے ہوا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون آخرت کا ماننے والا ہے اور کون اس کی طرف سے شک میں پڑا ہوا ہے۔ تیرا رب ہر چیز پر نگراں ہے"۔

یہ قوم، اس راستے پر چل کر اس کا یہ انجام کیوں ہوا؟ اس لیے کہ ابلیس نے اپنی منصوبہ بندی کو درست پایا اور وہ ان کو گمراہ کرنے میں کامیاب رہا۔ ہاں اہل ایمان کو وہ گمراہ نہ کر سکا، مومنین کے گروہ کو وہ گمراہ نہ کر سکا۔ کیونکہ ہر گمراہ سوسائٹی میں لوگوں کی ایک قلیل تعداد ایسی رہ جاتی ہے جو گمراہ ہونے سے انکار کر دیتی ہے اور یہ قلیل گروہ مومنین اس

بات کا گواہ ہوتا ہے کہ سچائی اپنی جگہ قائم ہوتی ہے ۔ صرف اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی سچائی کا طالب ہو ۔ اگر کوئی طالب ہو تو سچائی مل جاتی ہے ۔ بدترین حالات میں بھی سچائی قائم رہتی ہے ۔ جہاں تک ابلیس کا تعلق ہے لوگوں کے اوپر اس کو کوئی جابرانہ اقتدار حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کو مجبور کر کے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے ۔ شیطان ہر حال میں لوگوں پر مسلط ہوتا ہے ۔ اب لوگوں میں سے بعض حق پر ثابت قدم ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ حق کے طالب ہی نہیں ہوتے ' وہ گمراہ ہو جاتے ہیں ۔ پھر عالم واقعہ میں یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ مومن کون ہے اور مومن کو اس کا ایمان برے راستے سے بچاتا ہے ۔

مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ (۳۴ : ۲۱) ”اس سے جو آخرت سے شک میں ہوتا ہے“ ۔ جو شخص آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ بچ جاتا ہے اور جو آخرت کے بارے میں شک کرتا ہے وہ شیطان کی گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے ۔

اللہ کو تو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ کون سیدھی راہ لے گا اور کون غلط لے گا لیکن اللہ تعالیٰ فیصلوں کو تب صادر کرتا ہے جب وہ عملاً صادر ہو جاتے ہیں ۔

اس وسیع میدان میں یعنی اللہ کی تدبیر اور تقدیر کے وسیع میدان میں شیطان کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ کسی کو مجبور کیے بغیر لوگوں پر مسلط ہو جائے اور ان نتائج کو ظاہر کر دے جو پہلے سے اللہ کے علم میں تھے ۔ اس میدان میں قصہ سبا دراصل تمام اقوام عالم کا قصہ ہے ۔ اقوام کے عروج و زوال کی داستان وہی ہے جو سبا کی ہے ۔ اس لیے اس آیت کے دائرہ اطلاق کو وسیع کر دیا جاتا ہے ۔ یہ اصول قوم سبا تک محدود نہیں رہتا ۔ تمام انسانوں کے اچھے اور برے حالات اسی اصول کے تحت آتے جاتے ہیں ۔ لوگوں کا ہدایت پانا اور گمراہ ہونا اسباب ہدایت اور اسباب ضلالت اختیار کرنے کے نتیجے میں ہوتا ہے ۔

وَرَبُّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (۳۴ : ۲۱) ”اور تیرا رب ہر چیز پر نگران ہے“ ۔ اس سے کوئی چیز غائب نہیں ہوتی ' کوئی چیز نظام تخلیق میں مہمل نہیں ہوتی اور نہ بے کار ہوتی ہے“ ۔

--- ○○○---

درس نمبر ۱۹۶ ایک نظر میں

یہ ایک مختصر سبق ہے جس کا موضوع توحید اور شرک ہے' لیکن اس سبق میں انسان کے عقل و خرد کو پوری کائنات کی سیر کرائی جاتی ہے ۔ ظاہری کائنات ہو یا مخفی ہو' حاضر ہو یا غائب ہو' زمین سے ہو یا افلاک سے ہو' دنیا سے متعلق ہو یا آخرت سے ۔ اس سفر میں انسان پر اس قدر خوف طاری کر دیا جاتا ہے کہ اس کا وجود کانپنے لگتا ہے اور اللہ کا جلال اس پر اس قدر طاری ہوتا ہے کہ انسان مدہوش ہو جاتا ہے ۔ انسان کے سامنے اس کا نسب' اس کا رزق اور جزاو سزا کے مناظر رکھے جاتے ہیں ۔ اس سبق میں نہایت ہی زور دار الفاظ میں لفظ قل قل قل کے ساتھ انسان کو جھنجھوڑا جاتا ہے ۔ ہر فقرے میں ایک لاجواب دلیل سامنے لائی جاتی ہے ۔ نہایت ہی قوی دلیل ۔

---OOO---

درس نمبر ۱۹۶ تشریح آیات

۲۲--- تا --- ۲۷

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾

(" اے نبیؐ" ان مشرکین سے) کہو کہ " پکار دیکھو اپنے ان معبودوں کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں نہ زمین میں ۔ وہ آسمان و زمین کی ملکیت میں شریک بھی نہیں ہیں ۔ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے "۔

آسمانوں اور زمین کے وسیع میدان میں یہ چیلنج ہے ۔

قُلِ ادْعُوْا الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳۴ : ۲۲) " کہو کہ پکار دیکھو اپنے معبودوں کو جن کو تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو "۔ ان کو بلاؤ ' وہ آئیں ۔ ذرا ظاہر تو ہوں میدان میں ' وہ خود دعویٰ کریں یا تم ان کی جانب سے دعویٰ کرو کہ زمین و آسمانوں کی بادشاہت میں ان کے اختیارات کیا ہیں ؟ کچھ نہیں ۔

لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ (۳۴ : ۲۲) " وہ نہ آسمانوں میں کسی ذرے کے برابر چیز کے مالک ہیں اور نہ زمین میں "۔ ظاہر ہے کہ وہ اور نہ ان کی جانب سے کوئی اور اس زعم کا دعویٰ کر سکتا ہے کیونکہ مالک تو وہ ہوتا ہے جو کسی چیز میں متصرف ہوتا ہے اور اس میں وہ متصرف نہیں ہیں ۔ لہذا یہ معبود کسی چیز کے مالک نہیں ہیں کیونکہ اس وسیع کائنات میں ان کا کوئی تصرف نہیں ہے ۔

وَ مَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ (۳۴ : ۲۲) " آسمان اور زمین کی ملکیت میں وہ شریک ہی نہیں "۔ یعنی نہ تو وہ واحد مالک ہیں اور نہ وہ شریک مالک ہیں ۔

وَّ مَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ (۳۴ : ۲۲) "ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار بھی نہیں ہے"۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ رضاکارانہ طور پر اللہ کے مددگار ہوں' یہ بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اشارہ مخصوص قسم کے معبودوں اور مخصوص قسم کے شرک کی طرف ہے۔ یعنی اشارہ ملائکہ کی طرف ہے' جنہیں عرب اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ سفارشی سمجھتے تھے اور انہی کے بارے میں ان کا کہنا تھا۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى "ہم ان کی بندگی اس لیے کرتے ہیں کہ یہ تو ہمیں اللہ کے بہت قریب کرتے ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں سفارش کی نفی کی جاتی ہے اور ایک ایسے منظر میں جو نہایت ہی خوفناک ہے"۔

وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُۥٓ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُۥ ۚ

"اور اللہ کے حضور کوئی شفاعت بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہو سکتی بجز اس شخص کے جس کے لیئے اللہ نے سفارش کی اجازت دی ہو"۔

اللہ کے ہاں شفاعت وہی لوگ کر سکیں گے جن کو اللہ کی جانب سے اجازت ہو گی۔ اللہ کسی ایسے شخص کے لیے اجازت نہیں دیا کرتا جو مومن نہ ہو اور سفارش کا مستحق نہ ہو۔ وہ لوگ جو شرک کرتے ہیں وہ اس کے مستحق نہیں رہتے۔ نہ ملائکہ کو اس کی اجازت ہے اور نہ ان کے علاوہ اور لوگوں کو جن کو شفاعت کی اجازت ہو گی۔ جن حالات میں شفاعت کرنے والے شفاعت کریں گے باوجود اجازت کے' وہ کس قدر خوفناک ہوں گے' کس قدر دہشت ناک ہوں گے؟

حَتّٰٓى إِذَا فُزِّعَ عَن قُلُوبِهِمْ قَالُوا۟ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ ۖ قَالُوا۟ ٱلْحَقَّ ۖ وَهُوَ ٱلْعَلِىُّ ٱلْكَبِيرُ ﴿٢٣﴾

"حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی تو وہ (سفارش کرنے والوں سے) پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا جواب دیا' وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے اور وہ بزرگ و برتر ہے"۔

یہ اس دن کا منظر ہے جو نہایت ہی خوفناک ہو گا۔ لوگ قیامت کے دن کھڑے ہوں گے۔ سفارش کرنے والے اور جن کی سفارش ہو رہی ہو گی سب کے سب سہمے ہوئے ہوں گے۔ پہلے تو سفارش کرنے والے اجازت کے منتظر ہوں گے۔ یہ انتظار طویل ہو گا۔ لوگ توقعات میں کھڑے ہوں گے اور تھک جائیں گے۔ سہمے ہوئے ہوں گے' دل ڈرے ہوئے ہوں گے اور کان فیصلہ سنتے ہوں گے۔

جب اللہ کی بارگاہ عزت سے فیصلہ صادر ہو گا تو سفارش کرنے والے اور جن کی سفارش ہو رہی ہے اس قدر ڈرے ہوئے ہوں گے کہ وہ فیصلے کو سمجھ ہی نہ سکیں گے۔

حَتّٰى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ (۳۴ : ۲۳) "حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی"

جب حالت خوف سے وہ نکلیں گے اور وہ اس ہیبت سے نکل آئیں جس کی وجہ سے وہ مدہوش ہو گئے تھے تو پھر کہیں گے ۔

مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ (۳۴ : ۲۳) "تمہارے رب نے کیا جواب دیا" ۔ یعنی وہ ایک دوسرے سے پوچھیں گے ۔ ان میں سے شاید بعض لوگوں نے حواس بحال رکھ کر بات کو سمجھ لیا ہو گا ۔

قَالُوا الْحَقَّ (۳۴ : ۲۳) "انہوں نے کہا حق کہا" ۔ شاید یہ کہنے والے ملائکہ مقربین تھے جنہوں نے یہ مجمل اور جامع بات کہہ دی کیونکہ اللہ نے جو کچھ کہنا تھا وہ حق ہی تھا ۔ وہ حق ہے ' ازلی حق اور ابدی حق ہے ۔ لہٰذا اس کی بات بھی حق ہے ۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (۳۴ : ۲۳) "اور وہ بزرگ و برتر ہے" ۔ اللہ کی یہ صفت ایسے مقام پر آئی ہے ، جس میں اللہ کی علو شان نمایاں ہے اور اس مقام پر ہر شخص اللہ کی شان بلند کا ادراک کر سکتا ہے" ۔

یہ مجمل سورہ اس بات کا مظہر ہے کہ فضا کے اندر گہری سنجیدگی اور خوف چھایا ہوا ہے کہ اس میں بھی مختصر بات کہی جا سکتی ہے ۔ یہ سفارش کا خوفناک موقعہ ہے ۔ اگر منظور نہ ہو تو؟ اور یہ حالت ملائکہ مقربین کی ہے ۔ کیا اس خوفناک منظر کے بعد کوئی دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ شریک ہے یا کوئی عقلمند شخص یہ عقیدہ رکھ سکتا ہے؟

یہ تو تھی عقل و خرد کے تاروں پر پہلی ضرب اور دوسری ضرب کا تعلق ان ارزاق سے ہے جو انسان رات اور دن استعمال کرتے ہیں ۔ یہ انسانی ضروریات کون فراہم کرتا ہے ۔ انسانی حیات اور اس کے قائم رکھنے کے لیے خوراک ہی پر اگر غور کیا جائے تو یہ بھی اللہ وحدہ کی ذات پر ایک سلطان اور برہان ہے ۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾

" (اے نبیؐ) ان سے پوچھو "کون تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے؟" کہو ' اللہ ۔ اب لامحالہ ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہی ہدایت پر ہے یا کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے" ۔

رزق ہر انسان کی زندگی کا واقعی اور زندہ مسئلہ ہے ۔ رزق نتیجہ ہے آسمانوں سے بارشوں ' سورج کی روشنی اور نور کا ۔ یہ باتیں تو اس وقت قرآن کے مخاطب جانتے تھے ۔ اس کے بعد رزق کے بارے میں بہت سے انکشافات ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں ۔ زمین کے رزق کیا ہیں ۔ نباتات ' حیوانات ' چشمے ' نہریں ' معدنیات اور خزانے ۔ سابقہ ادوار کے لوگ بھی ان سے واقف تھے ' بعد کے لوگوں نے مزید انکشافات کیے ۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ (۳۴ : ۲۴) "کون ہے جو آسمانوں اور زمین میں سے تمہیں رزق دیتا ہے ' کہو اللہ" ۔ اس لیے کہ وہ اس جواب میں شک نہ کر سکتے تھے اور نہ اس کے سوا کسی

اور جواب کا دعویٰ کر سکتے تھے۔

کہو کہ رزق تو اللہ ہی دیتا ہے اور تمہارے امور اور ان کے امور اللہ کے سپرد ہیں۔ تم دونوں میں سے کوئی ایک خواہ مخواہ ضلالت پر ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ دونوں ہدایت پر ہوں' یا دونوں ضلالت پر ہوں۔ لہٰذا ایک فریق ایک راستے پر ہے اور دوسرا دوسرے پر ہے۔

وَ اِنَّآ اَوْ اِیَّاکُمْ لَعَلٰی هُدًی اَوْفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۴ : ۲۴) "اب لامحالہ ہم میں اور تم میں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی گمراہی میں پڑا ہوا ہے"۔ بحث و مباحثہ میں یہ نہایت ہی معتدلانہ انداز گفتگو ہے کہ رسول اللہؐ مشرکین سے کہتے ہیں کہ ہم اور تم میں سے ایک فریق ہدایت پر ہے اور دوسرا ضلالت پر ہے۔ ہدایت یافتہ اور گمراہ فریق کا تعین نہیں کیا جاتا تاکہ سامع خود غور و فکر کے بعد تعین کرے۔ نہایت سنجیدگی کے ساتھ' بغیر ہٹ دھرمی اور بغیر بحث و جدال اور حجت بازی کے۔ کیونکہ حضور اکرمؐ تو ایک ہادی اور معلم تھے۔ آپ کا مقصد لوگوں کو راہ راست دکھانا تھا۔ ان کو لاجواب کر کے ذلیل کرنا مطلوب نہ تھا۔

اس انداز گفتگو سے نہایت معاند' متکبر' سرکش اور دست درازی کرنے والے شخص کے دل پر بھی بات کا اثر ہوتا ہے اور کسی شخص کا مقام و مرتبہ راہ ہدایت لینے میں رکاوٹ نہیں۔ اور ایک بلند مقام رکھنے والا بھی سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور نہایت ہی ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہے۔ اسے اطمینان ہو جاتا ہے۔ یہ انداز گفتگو خصوصاً ان لوگوں کے گہرے غور کا مستحق ہے جو دعوت اسلامی کا کام کرتے ہیں۔

--- ooo ---

اب عقل و خرد کے تاروں پر تیسری ضرب' نہایت منصفانہ اور عادلانہ انداز گفتگو کے ساتھ لگائی جاتی ہے۔ ہر دل کو اس کے اعمال اور ان کے نتائج کے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

"ان سے کہو' جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی"۔

مشرکین رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر یہ الزام لگاتے تھے کہ یہ لوگ غلط کار' صابی اور مجرم ہیں اور انہوں نے اپنا حقیقی دین چھوڑ دیا ہے جو ان کے آباء و اجداد کا دین تھا۔ اہل باطل اہل حق کو ہمیشہ گمراہ کہتے چلے آئے ہیں۔ یہ ان کی طوطا چشمی اور غرور ہوتا ہے اور اس کا جواب یہی ہے۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۳۴ : ۲۵) "کہہ دو' جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی کوئی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہ ہوگی"۔ ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا۔ اور ہر شخص کو اپنے اعمال ہی کی جزاء ملے گی۔ لہٰذا یہ ہر شخص کا اپنا کام ہے کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھائے۔ فلاح کی طرف یا ہلاکت کی طرف۔

یوں قرآن ان کو جھنجوڑتا ہے کہ وہ غور و فکر کریں۔ سچائی کی طرف چلنے کے لیے یہ پہلا مرحلہ ہے کہ انسان راہ حق پر غور کرے۔

اب چوتھی ضرب :

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۚ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴿٢٦﴾

"کہو، ہمارا رب ہم کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا۔ وہ ایسا زبردست حاکم ہے جو سب کچھ جانتا ہے"۔

پہلے سبق میں اللہ اہل حق اور اہل باطل کے درمیان مشترکہ فیصلہ دیا گیا کہ دونوں میں سے ایک ہی حق پر ہے، اور ایک باطل پر ہے۔ اور حق اور باطل کا آمنا سامنا ہوا تھا کہ اہل حق، حق کی طرف آئیں، داعی اپنی دعوت پیش کریں اور حق و باطل باہم کشکش کریں۔ دلائل کے سامنے شبہات لائے جائیں اور باطل حق کو بچھاڑنے کی کوشش کرے۔ لیکن یہ صورت ایک مختصر وقت کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے بعد فریقین کے درمیان فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہ فیصلہ دو ٹوک ہے اور فیصلہ کرنے والا بہت بڑا حاکم ہے اور علیم بھی ہے۔ وہ علم اور معرفت پر فیصلہ کرتا ہے۔

اللہ کو فتاح علیم کہہ کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ کے فیصلے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ایسا حاکم ہے جو حق و باطل کے درمیان علم کے مطابق فیصلہ کرنے والا ہے۔ وہ حق و باطل کو نکھار کر رکھ دیتا ہے اور ان کے درمیان التباس رہنے نہیں دیتا۔ حق پرستوں اور باطل پرستوں کو اکٹھا اور ملا جلا نہیں چھوڑا جاتا بشرطیکہ حق اپنی دعوت زوردار انداز سے پیش کرے، قوت اس راہ میں لگا دے۔ پورے تجربات سے کام لے اور پوری قوت لگا کر معاملے کو اللہ کے سپرد کر دے تاکہ اللہ فتاح علیم فیصلہ کرے۔

یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کس وقت کرتا ہے۔ اس فیصلے کے لیے وقت کا تعین بھی اللہ کرتا ہے۔ نہ اس میں جلدی کا کوئی داعیہ ہے کیونکہ یہ اللہ ہی ہے جو حق و باطل کا آمنا سامنا کراتا ہے، کشکش کراتا ہے اور پھر فیصلہ کراتا ہے۔ وہی فتاح علیم ہے۔

---○○○---

اب آخری ضرب، یہ آخری ضرب پہلی ضرب کے مشابہ ہے۔ اس میں اللہ کے نام نہاد شرکاء کو چیلنج دیا جاتا ہے۔

قُلْ أَرُونِيَ الَّذِينَ أَلْحَقْتُم بِهِ شُرَكَاءَ ۖ كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٢٧﴾

"ان سے کہو، ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی وہ کون ہستیاں ہیں جنہیں تم نے اس کے ساتھ شریک لگا رکھا ہے۔ ہرگز نہیں، زبردست اور دانا تو بس وہ اللہ ہی ہے"۔

یہ نہایت ہی تہدید آمیز اور حقارت آمیز سوال ہے۔ ذرا دکھاؤ تو سہی وہ کون لوگ ہیں جن کو تم نے اللہ کے ساتھ

الوہیت میں ملحق کر دیا ہے - یہ لوگ کون ہیں؟ ان کی کیا حیثیت ہے - کس درجے کے لوگ ہیں یہ! اور پھر اس مقام کے لیے ان کا استحقاق کیا ہے؟

اس کے بعد لفظ کلا سے ان کی سرزنش کی جاتی ہے - کہاں سے یہ لائیں گے جبکہ اللہ کا کوئی شریک ہی نہیں ہے -

بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (٣٤ : ٢٧) "زبردست اور دانا تو بس اللہ ہی ہے"- جس ذات کی صفات یہ ہوں اس کا کوئی شریک کیسے ہو سکتا ہے اور ضرورت بھی کیا ہے' لہذا اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے -

اس پر یہ سبق ختم ہوتا ہے - اس کے آخر میں نہایت ہی دو ٹوک اور سبق آموز تبصرے ہیں - اس عظیم کائنات کو پیش نظر رکھتے ہوئے - ایسے حالات میں جبکہ قیامت میں شفاعت کا مرحلہ ہو گا - حق و باطل کی کشمکش کے حوالے سے اور نفس انسانی کے اندر غور و فکر اور سوچ و بچار کے حوالے سے -

--- ooo---

درس نمبر ۱۹۷ ایک نظر میں

اس سبق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اوپر نازل ہونے والی کتاب کے بارے میں مشرکین کا موقف بیان کیا گیا ہے۔ یہ ہر رسول کے مقابلے میں اختیار کیا جانے والا کھاتے پیتے لوگوں کا موقف ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنے مال اور اولاد اور اپنے معاشرتی مقام کی وجہ سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر صرف اس دنیا کے مفادات ہوتے ہیں اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ یہ دنیا کے مفادات حاصل کرنے میں دوسروں سے آگے ہیں اس لیے یہ مختار اور افضل لوگ ہیں۔ اور یہ کہ اس دنیاوی دولت کی وجہ سے وہ دنیا و آخرت دونوں کے عذاب سے بچ جائیں گے۔ چنانچہ یہاں ان کے سامنے وہ منظر پیش کیا جاتا ہے جو آخرت میں ان کا ہو گا۔ یہ منظر ایسا ہے کہ گویا واقعہ ہو چکا ہے تاکہ وہ دیکھ لیں کہ جن چیزوں نے ان کو مغرور کر دیا ہے، وہ تو قیامت میں کچھ فائدہ دینے والی نہیں ہیں۔ اس منظر میں یہ بات بھی دکھائی گئی ہے کہ دنیا میں وہ جن فرشتوں اور جنوں کی بندگی کرتے تھے وہ تو قیامت کے دن ان کے لیے ذرہ بھر مفید نہیں ہیں۔ اس منظر کے مکالموں کے درمیان یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ کے ترازو میں کون سی چیز وزن رکھتی ہے۔ اسی طرح ان کھوئی قدروں کی تردید خود بخود ہو جاتی ہے۔ جن کو وہ اس دنیا میں سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ ثابت یہ ہوتا ہے کہ رزق کا کشادہ ہونا یا محدود ہونا مشیت الٰہیہ پر موقوف ہے اور یہ اللہ کے غضب یا رضامندی کی دلیل نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کی آزمائش ہوتی ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۹۷ تشریح آیات

۲۸ --- تا --- ۴۲

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾ النصف

۳
ع ۹
۹

”اور (اے نبیؐ) ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے ‘مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ـ یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ ”وہ (قیامت کا) وعدہ کب پورا ہو گا اگر تم سچے ہو؟“ کہو ‘ تمہارے لیے ایک ایسے دن کی میعاد مقرر ہے جس کے آنے میں نہ ایک گھڑی بھر کی تاخیر تم کر سکتے ہو اور نہ ایک گھڑی بھر پہلے اسے لا سکتے ہو؟“

گذشتہ سبق میں یہ بات طے کی گئی تھی کہ ہر شخص اپنے کیے کا ذمہ دار ہے اور اہل حق اور اہل باطل کے درمیان مکالمہ ضرور ہونا چاہئے ـ اہل حق کو چاہئے کہ اپنی بات کھول کر رکھ دیں نہایت حکمت کے ساتھ ‘ پھر معاملہ اللہ کے سپرد ہے ـ وہاں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ نبی کا منصب و مقام اور فریضہ کیا ہے ـ یہ لوگ منصب نبوت سے جاہل ہیں ـ آخرت کی جس جزاء و سزا کا نبی ذکر کرتے ہیں اپنی اس جہالت کی وجہ سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قیامت برپا کیوں نہیں ہو جاتی تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ قیامت کے برپا ہونے کے لیے ایک وقت مقرر ہے ‘ اس سے وہ نہ پہلے آ سکتی ہے اور نہ بعد میں ـ

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۳۴ : ۲۸) ”اے نبیؐ ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے“ ـ یہ رسالت کے منصب کے عام فرائض ہیں کہ آپ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے اور تمام انسانوں کے لیے بھیجا گیا ہے ـ نبی کا فرض پورا ہو جاتا ہے جب وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لوگوں کو جنت کی خوشخبری دے دے اور دوزخ کے عذاب سے ڈراوے ـ

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۴ : ۲۸) وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ

صٰدِقِيْنَ (۳۴ : ۲۹) ”لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ـ یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ وہ ڈراوا کب آئے گا اگر تم سچے ہو“ ـ ان کے اس سوال ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی رسول کے فرائض منصبی ہی سے واقف نہیں ہیں ـ آخر رسول کا یہ فرض نہیں ہوتا کہ وہ انجام برپا کر دے ـ رسول کا فریضہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کر دے ـ رسول کی ڈیوٹی محدود ہوتی ہے ـ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں اور اپنے فرائض سے رسول اللہؐ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے ـ اصل اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں ـ وہی بھیجنے والا ہے ' وہی کام کی حدود مقرر کرنے والا ہے ـ اللہ نے رسول کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ قیامت برپا کر دیں یا اس کا وقت بتا دیں ـ یہ رب تعالیٰ کا کام ہے ـ رسول اپنے حدود کار سے باخبر ہیں لہٰذا وہ اللہ سے کوئی ایسا سوال نہیں کرتے جو ان کی ڈیوٹی کی حدود سے باہر ہو ـ اور اس کے بارے میں کوئی ذمہ داری ان پر ڈالی نہ گئی ہو ـ حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو ایک اصولی بات بتا دی جائے ـ

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ (۳۴ : ۳۰) ”کہو، تمہارے لیے ایک دن کی میعاد مقرر ہے جس کے آنے میں نہ ایک گھڑی کی تاخیر تم کر سکتے ہو اور نہ گھڑی بھر پہلے اسے لا سکتے ہو“ ـ ہر میعاد اپنے مقررہ وقت پر آتی ہے ' جو اللہ نے مقرر کیا ہے ' اس میں تقدیم و تاخیر ممکن نہیں ہے ـ نہ کسی کی خواہش پر اللہ اس طرح کرتا ہے ـ دنیا میں کوئی کام نہ عبث ہوتا ہے ' نہ اتفاقاً واقعہ ہو جاتا ہے ـ ہر واقعہ اللہ کا تخلیق کردہ اور تقدیر کے مطابق ہوتا ہے ـ ہر معاملے کا تعلق آخرت سے ہے ـ اللہ کی تقدیر ان واقعات کو اپنی حکمت کے مطابق روبعمل لاتی ہے اور حکمت الٰہی سے انسان اسی قدر خبردار ہوتا ہے جس قدر اللہ انسان کو سمجھاتا ہے ـ ورنہ اللہ کی حکمت کا بیشتر حصہ مستور ہوتا ہے ـ

اللہ کے وعدے اور اللہ کی سزا کے معاملے میں جلدی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا مطالبہ کرنے والا انسان اس اصول اور حکمت ربانی کے نظام سے واقف نہیں ہے اور علم نہیں رکھتا ـ اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں اور اپنی لاعلمی کی وجہ سے جلد بازی سے کام لیتے ہیں ـ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ

”یہ کافر کہتے ہیں کہ ”ہم ہرگز اس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے“ ـ یہ ہے وہ عناد جس میں مخالفین اسلام اول روز سے مبتلا تھے ـ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہدایت کو مان کر نہ دیں گے اگرچہ اس کا منبع کتب سابقہ میں ہو ـ نہ قرآن کو مانیں گے اور نہ پہلی کسی کتاب کو ـ نہ اس کو نہ سابقہ کتب کو ـ یہی فیصلہ مخالفین اسلام کا کل بھی تھا اور آج بھی ہے ـ مطلب یہ ہے کہ وہ کفر پر اصرار کرتے ہیں ـ پختہ فیصلہ انہوں کر لیا ہے کہ وہ کفر پر اصرار کریں گے اور دلائل ہدایت پر غور ہی نہ کریں گے ـ جب انہوں نے یہ فیصلہ کر ہی دیا ہے تو ان کا علاج یہی ہے کہ ان کے سامنے بس مناظر قیامت میں سے ایک منظر پیش کر دیا جائے ـ

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ

إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ ۚ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ﴿٣١﴾ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُم ۖ بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا ۚ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا الْأَغْلَالَ فِي أَعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٣٣﴾

"کاش تم دیکھو ان کا حال اس وقت جب یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں گے ۔ اس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے ۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ "اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے"۔ وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے ۔ "کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی ؟ نہیں ، بلکہ تم خود ہی مجرم تھے"۔ وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے "نہیں ، بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں"۔ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے ۔ کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال ان کے تھے ، ویسے ہی جزا وہ پائیں ؟"

یہ تو تھی ان کی دنیاوی بات "ہم ہرگز قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو تسلیم کریں گے"۔ لیکن ان ظالموں کی حالت قیامت کے دن دیکھنے کے قابل ہو گی جب یہ لوگ ــــــ اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور بطور ملزم اللہ کی عدالت میں سزا کا انتظار کر رہے ہوں گے اور ان کو اس وقت یقین ہو گا کہ انہوں نے تو ہدایت کا انکار کیا تھا لہذا نتیجہ سامنے ہے ۔ اب اور تو کچھ بس نہ چلے گا ایک دوسرے پر لعنت و ملامت کریں گے اور اس انجام کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالیں گے ۔ یہ اس وقت کیا کہیں گے ؟

يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ (۳۴ : ۳۱)

"جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے "اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے"۔ اس وقت وہ جس خوفناک صورت حالات سے دوچار ہیں یہ اس کی ذمہ داری اکابرین پر رکھیں گے ۔ کیونکہ ان کو نظر آ رہا ہے کہ مصیبت سر پر ہے ۔ آج تو وہ ان کے منہ پر یہ حق بات کہہ رہے ہیں لیکن دنیا میں ان کو یہ حق بات کہنے کی توفیق نہ تھی ۔ ان کو وقت 'کمزوری ' غلامی ' حق بات کہنے نہ دیتی تھی ۔ انہوں نے اللہ کی بخشی ہوئی آزادی کو فروخت کر دیا تھا ۔ وہ

عزت جو اللہ نے ہر انسان کو دی تھی اس سے وہ دستبردار ہو گئے تھے ۔ وہ قوت مدر کہ جو ہر انسان کو دی گئی ' انہوں نے معطل کر دی تھی ۔ آج تو سب جھوٹی اور کھوٹی قدریں ختم ہیں ۔ سامنے دردناک عذاب ہے ۔ اب وہ یہ حق بات کہتے ہیں جس کا کوئی فائدہ نہیں ہے ۔

لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (۳۴ : ۳۱) "اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے" ۔

اور یہ اکابرین بھی نہایت ہی تنگی اور ترشی سے جواب دیتے ہیں ۔ خطرہ تو اب دونوں کے لیے برابر ہے ۔ یہ اپنی ذمہ داری خواہ مخواہ ان پر ڈالتے ہیں ۔ وہ بھی خوب جواب دیتے ہیں ۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ (۳۴ : ۳۲) "اور ان بڑے بننے والوں نے جواب دیا' کیا ہم نے تمہیں اس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی ؟ نہیں بلکہ تم خود مجرم تھے" ۔ یوں وہ کسی ذمہ داری کے قبول کرنے کا صاف انکار کر دیتے ہیں ۔ اور یہ اقرار کر لیتے ہیں کہ ہدایت آئی تھی ۔ یہ مستکبرین دنیا میں تو ضعفاء کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتے تھے ۔ نہ ان سے رائے طلب کرتے تھے ' بلکہ ان کا وجود ہی تسلیم نہ کرتے تھے اور یہ بات برداشت ہی نہ کرتے تھے کہ یہ ضعفاء ان کی مخالفت کریں یا مباحثہ کریں لیکن آج جبکہ عذاب کا سامنا ہے تو وہ صاف صاف انکار کرتے ہیں کہ ۔

اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ (۳۴ : ۳۲) "کیا ہم نے تمہیں روکا تھا' جب تمہارے پاس ہدایت آئی تھی" ۔ بلکہ تم خود ہی مجرم تھے ۔ تم نے مجرمانہ انداز اختیار کر لیا تھا ۔

اگر دنیا ہوتی تو ان کمزور لوگوں کے ہونٹ سلے ہوئے ہوتے لیکن آخرت میں دنیا کے تمام جھوٹے پردے اٹھ جائیں گے ۔ جھوٹی قدریں مٹ جائیں گی ۔ آنکھیں کھل جائیں گی اور چھپے حقائق پردے سے باہر آ جائیں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں یہ کمزور لوگ بھی کھل کر بات کریں گے ۔ بلکہ اب وہاں مستکبرین کے منہ میں منہ ڈال کر بات کریں گے اور کہیں گے کہ تم ہی اس سب صورت حالات کے ذمہ دار ہو ۔ تم رات اور دن مکاری کرتے تھے اور ہمیں ہدایت سے روکتے تھے ۔ تم نے باطل کو تھام رکھا تھا' ہم پر مسلط کر دیا تھا اور دعوت اسلامی کو ہم پر مشتبہ بنا دیا تھا ۔ تم اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے ہمیں گمراہ کرتے تھے ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا (۳۴ : ۳۳) وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے ' "نہیں' بلکہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھہرائیں" ۔

اب ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مکالمہ اور مجادلہ نہ ان کے لیے مفید ہے اور ان کے لیے ـ نہ بڑوں کی نجات ممکن ہے اور نہ چھوٹوں کی ـ ہر گروہ مجرم ہے' البتہ بڑوں پر اپنی گواہی کی بھی ذمہ داری ہے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی بھی ذمہ داری ہے ـ چھوٹوں پر یہ ذمہ داری ہے کہ انہوں نے کیوں ان بڑے لوگوں کی اطاعت کی ـ یہ بات وہاں معافی کی وجہ نہیں بن سکتی کہ یہ ضعیف تھے ـ اللہ نے ان کو عقل اور آزادی دی تھی ـ انہوں نے عقل سے کام نہ لیا اور اپنی آزادی رائے کو فروخت کر دیا۔ وہ طفلی پن رہنے پر راضی ہوئے اور ذلت کی زندگی قبول کی ـ اس لیے وہ عذاب کے مستحق بن گئے ـ اس گفتگو کے دوران ہی ان پر سخت ندامت طاری ہوگئی اور یہ اسے چھپانے لگے ـ جب انہوں نے عذاب دیکھ لیا ـ

وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ (۳۴: ۳۳) "جب یہ عذاب دیکھیں گے تو پچھتائیں گے" ـ اور اپنی ندامت کو چھپانے کی کوشش کریں گے ـ یہ ایسی حالت ہوتی ہے کہ دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے ـ زبانیں بند ہو جاتی ہیں' ہونٹ سل جاتے ہیں اور سخت عذاب انہیں آلیتا ہے ـ

وَ جَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (۳۴: ۳۳) "ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے" ـ اب یہ لوگ طوقوں میں بندھے ہوئے ہیں لیکن بات کا رخ ان سے پھر جاتا ہے اور عام بدکاروں سے کہا جاتا ہے کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے ـ

هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۳۴: ۳۳) "کیا لوگوں کو اس کے سوا اور کوئی بدلہ دیا جا سکتا ہے کہ جیسے اعمال ان کے تھے' ویسی ہی جزا وہ پائیں" ـ

اب بڑے بننے والے اور چھوٹے بننے والے دونوں قسم کے ظالموں کے اس منظر پر پردہ گرتا ہے ـ دونوں ظالم ہیں ـ یہ اس لیے ظالم ہیں کہ سرکش تھے اور باغی تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے ـ وہ اس لیے ظالم تھے کہ انہوں نے انسانی شرافت اور آزادی کے مقام کو ترک کر دیا اور اپنے جیسے انسانوں کے غلام بن گئے ـ ان کے سامنے ذلت اختیار کی ـ اب دونوں کے لیے دائمی عذاب ہے ـ

پردہ گرتا ہے اور ظالم اپنا منظر اچھی طرح دیکھ چکے' زندہ شکل میں ـ انہوں نے اپنی ہر حالت دیکھ لی اور وہ اس زمین پر زندہ ہیں ـ دوسروں نے بھی اس منظر کو دیکھ لیا ـ سب کے سامنے ابھی مہلت کی گھڑیاں ہیں ـ

--- ○○○ ---

کبراء قریش جو باتیں کرتے ہیں ایسی ہی باتیں اقوام رفتہ کے متکبرین بھی کرتے چلے آئے ہیں ـ

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ

کہا ہو کہ "جو پیغام تم لے کر آئے ہو' اس کو ہم نہیں مانتے"۔

یہ ایک عام رویہ ہے' بار بار دہرایا جاتا ہے' اس دنیا میں ۔ زمانوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے ۔ خوشحالی دلوں کو سخت کر دیتی ہے ۔ دلوں سے احساس ختم ہو جاتا ہے ۔ فطرت بگڑ جاتی ہے ۔ اور باطل کے نیچے دب جاتی ہے ۔ اسے دلائل ہدایت نظر ہی نہیں آتے ۔ اس لیے ہدایت کے مقابلے میں مفسدین اپنے آپ کو اونچا سمجھتے ہیں اور ان کے سینے روشنی کے لیے بند ہو جاتے ہیں ۔

ہمیشہ یوں ہوتا ہے کہ اہل ثروت اور کھاتے پیتے لوگوں کی جھوٹی قدریں ان کو دھوکہ دیتی ہیں ۔ ان کے پاس جو دولت اور قوت ہوتی ہے وہ ان کو دھوکے میں ڈالتی ہے ۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ اثر ان کو عذاب الٰہی سے بھی بچا لے گا ۔ اللہ نے جو ان کو دولت دی ہے یہی تو اللہ کی رضا کی علامت ہے اور یہ کہ وہ حساب و کتاب اور جواب دہی کے مقام سے بلند ہیں ۔

وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۳۵﴾

"انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ "ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں"۔

لیکن قرآن کریم جواب دہی کے لیے وہ معیار اور وہ قدریں وضع کرتا ہے جو اللہ کے ہاں معمول بہا ہیں ۔ اللہ کے ہاں رائج ہیں ۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ رزق کی کشادگی اور تنگی پر مدار فیصلہ نہیں ہے ۔ فیصلہ اللہ کی رضا و غضب پر ہو گا ۔ رزق نہ کسی کو سزا دیتا ہے اور نہ بچاتا ہے ۔ حساب و کتاب اور جزاء و سزا کا معاملہ دولت مندی اور تنگدستی سے جدا ہے ۔ اللہ کی رضامندی اور ناراضگی کا تعلق رزق سے نہیں ہے اس کے لیے دوسرا معیار ہے ۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع ۶ ۴ ۱۰

"اے نبیؐ ان سے کہو" "میرا رب جسے چاہتا ہے' کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے' نپا تلا عطا کرتا ہے مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے"۔

یہ مسئلہ یعنی رزق کی فراوانی اور تنگی کا مسئلہ' عیش و عشرت کے وسائل کی ملکیت اور زیب و زینت کے ذرائع اور ان سے محرومی کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے کئی لوگوں کے دلوں میں بے حد خلجان پیدا ہوتا ہے ۔ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ اہل شر' اہل فساد اور باطل پرستوں پر دنیا کے مال و دولت کے دروازے کھلے ہیں ۔ اہل حق' اہل خیر اور نیک لوگ ان سے محروم ہیں اس لیے بعض لوگ یوں سوچتے ہیں کہ اگر اللہ ان لوگوں سے ناراض ہوتا تو ان پر وسائل کی یوں بارش کیوں کرتا ۔ بعض اوقات لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ نیکی' سچائی اور پاکبازی ہمیشہ محروم رہتی ہے ۔

یہاں قرآن مجید دنیا کے مال و متاع اور سازو سامان اور ان قدروں کے درمیان جدائی کر دیتا ہے جو اللہ کی نظروں میں بلند ہیں ۔ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ رزق کی تنگی اور فراوانی اللہ کی مشیت کے تحت ہے ۔ اس کا اللہ کی رضامندی اور

ناراضگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض اوقات اللہ ایک ایسے شخص کو بھی رزق فراواں دے دیتا ہے جس سے وہ ناراض ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کو بھی دیتا ہے جس سے راضی ہوتا ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ اہل شر اور اہل خیر دونوں غریب اور نادار ہوتے ہیں لیکن تمام حالات میں علل و اسباب ایک نہیں ہوتے۔

بعض اوقات اللہ اہل شر کو زیادہ نوازتا ہے تاکہ وہ سرکشی 'فساد اور نافرمانی میں آگے بڑھ جائیں۔ یوں ان کو پکڑنا مقصود ہوتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ جرائم کا ارتکاب کر لیں تاکہ ان کو زیادہ سزا ملے۔ پھر اللہ ان کو دنیا میں بھی سزا دیتا ہے اور آخرت میں بھی دے گا۔ اپنی حکمت اور تدبیر کے مطابق بھی بعض اوقات اللہ اہل شر کا رزق تنگ کرتا ہے تو وہ مزید جرائم کرتے ہیں۔ اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں اور اپنی ناداری کی وجہ سے شر و فساد اور ظلم و ضلالت کی حدوں کو پار کر جاتے ہیں۔

بعض اوقات اللہ اہل خیر پر بارش کر دیتا ہے تاکہ وہ مزید نیکی کے کام کریں۔ اگر ان کے پاس دولت نہ ہوتی تو وہ یہ کام نہ کر سکتے اور اس لیے بھی کہ وہ اللہ کا شکر ادا کریں۔ دل کے ساتھ 'زبان کے ساتھ اور عمل کے ساتھ۔ وہ اپنے مال کے ذریعے ایسی نیکیاں کمائیں جو اللہ کے ہاں ان کے لیے ذخیرہ ہوں اور کبھی اہل خیر محروم کیے جاتے ہیں تاکہ محرومیت پر ان کے صبر اور شکر کو آزمایا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ وہ اللہ پر کس قدر بھروسہ کرتے ہیں۔ کس قدر رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں اور اللہ کی تقدیر پر ان کو کس قدر یقین ہوتا ہے۔ کس قدر راضی برضا ہوتے ہیں اور رب تعالیٰ اچھا اور باقی رہنے والا ہے۔ اس طرح ان کا ذخیرہ آخرت بڑھ جاتا ہے اور اللہ ان سے بہت راضی ہوتا ہے۔

بہرحال رزق کی فراوانی اور تنگی کے جو اسباب بھی ہوں' اور لوگوں کے اعمال اور حکمت الہیہ کے حوالے سے جو بھی سبب ہو' حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ اللہ کے ہاں مقبولیت سے بالکل علیحدہ مسئلہ ہے۔ اس کی بنا پر اللہ کے ہاں کوئی مقدم و موخر نہیں ہوتا۔ اللہ کے ہاں مقدم اور موخر ہونے کا دارومدار اس پر ہے کہ جس شخص کے مال اور اولاد میں فراوانی دی گئی ہے وہ اپنے مال اور اولاد میں تصرف کیسے کرتا ہے۔ اسی طرح جسے رزق کی تنگی دی گئی ہے وہ کس قدر صبر و شکر کرتا ہے۔ لہٰذا مال و اولاد والا شخص اگر اپنے مال اور اولاد میں اچھا تصرف کرتا ہے تو اللہ اس کے اجر میں اضافہ کرے گا۔

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

"یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے عمل کی دہری جزا ہے۔ اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں' تو وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے"۔

نہایت صراحت کے ساتھ بتایا جاتا ہے کہ رزق کی فراوانی کے ذریعہ کوئی اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہو جاتا۔ ہاں اگر کوئی اپنی دولت میں سے فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے تو وہ اللہ کے ہاں مفید ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ﴿۳۹﴾

"اے نبی ان سے کہو" میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے۔ جو کچھ تم خرچ کر دیتے ہو اس کی جگہ وہی تم کو اور دیتا ہے وہ سب رازقوں سے بہتر رازق ہے"۔

یہ سبق اب ایک ایسے منظر پر ختم ہوتا ہے جس میں وہ تمام لوگ فرشتوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں' جو فرشتوں کی بندگی کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا تھا کہ قیامت کے عذاب سے ڈرو تو وہ کہتے تھے کہاں ہے قیامت 'لاؤ۔ ان سے کہا جائے گا اب چکھو اس عذاب کو جس کے متعلق تمہیں جلدی تھی۔

وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اَهٰۤؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ وَ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾

"اور جس دن وہ تمام انسانوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا "کیا یہ لوگ تمہاری ہی عبادت کیا کرتے تھے؟" تو وہ جواب دیں گے کہ "پاک ہے آپ کی ذات' ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ ان لوگوں سے۔ دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے' ان میں سے اکثر انہی پر ایمان لائے تھے۔ (اس وقت ہم کہیں گے کہ) آج تم میں سے کوئی نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان' اور ظالموں سے ہم کہہ دیں گے کہ اب چکھو اس عذاب جہنم کا مزہ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

ان فرشتوں کی وہ اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے یا ان کو وہ اللہ کے ہاں سفارشی بناتے تھے۔ اب ان کو ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ فرشتے اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ یہ لوگ ان کی عبادت کرتے تھے۔ گویا یہ بندگی اور عبادت ان کی جانب سے لغو اور کالعدم حرکت تھی۔ گویا یہ ہوئی ہی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بندگی دراصل شیطان کی بندگی ہے۔ یا تو یہ لوگ شیطان کی پوجا کرتے تھے یا شیطان کا حکم سن کر اس کی اطاعت کرتے تھے۔ جب وہ فرشتوں کی بندگی کرتے تھے تو گویا شیطان کی بندگی کرتے تھے۔ جنوں کی بندگی تو عربوں میں مور س تھا۔ بعض لوگ ایسے تھے جو جنوں کی بندگی بھی کرتے تھے اور ان سے استعانت بھی کرتے تھے۔

بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ (٣٤ : ٤١) "دراصل یہ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے اور ان میں سے اکثر انہی پر ایمان لائے تھے"۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ قصہ سلیمان علیہ السلام کا ان مسائل کے ساتھ تعلق ہے ۔ یہ قرآن کریم کا خاص انداز ہے کہ قصص سورہ کے موضوع سے مربوط ہوتے ہیں۔

یہ منظر اسکرین پر چل رہا تھا کہ اچانک کلام کا اسلوب بدل جاتا ہے اور براہ راست خطاب شروع ہو جاتا ہے اور یہ شرمسار کنندہ باتیں ان سے کہی جاتی ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَلَا ضَرًّا (٣٤ : ٤٢) "آج تم میں سے کوئی نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان"۔ نہ فرشتے کسی کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں ۔ نہ یہ کفار ایک دوسرے کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں ۔ وہ آگ جس کی ظالم تکذیب کرتے تھے اور جس کے بارے میں وہ مطالبہ کرتے تھے کہ لاؤ وہ آگ ' اسے اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے ۔

وَنَقُولُ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابَ النَّارِ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ (٣٤ : ٤٢) "اور ظالموں سے ہم کہہ دیں گے کہ اب چکھو اس عذاب جہنم کا مزہ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

یہاں یہ سبق ختم ہو جاتا ہے جس کا مرکزی مضمون حساب و کتاب ' سزا و جزاء اور قیام قیامت ہے ' جس طرح دوسرے اسباق کا بھی یہی مضمون رہا ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۱۹۸ ایک نظر میں

اس سورہ کے اس آخری سبق کا آغاز مشرکین اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کے بارے میں ان کے اقوال سے ہوتا ہے ۔ ان کو یہ بات یاد دلائی جاتی ہے کہ ان جیسے لوگوں کا انجام کیا ہوا کرتا ہے ۔ انسانی تاریخ کی ایسی اقوام کی داستانوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو ان سے زیادہ قوی ' زیادہ علم والی اور زیادہ مالدار تھیں ' جن کو اس دنیا ہی میں پکڑ لیا گیا ۔

اس کے بعد عقل و خرد کے تاروں پر مسلسل شدید ترین ضربات لگائی جاتی ہیں ۔ پہلی ضرب میں ان کو یہ بات سکھائی جاتی ہے کہ ذرا تنہائی میں ' تمام رکاوٹوں اور پردوں کو ہٹا کر جو انہیں صحیح فکر و نظر سے روکتے ہیں اللہ کے بارے میں سوچیں ۔ دوسری ضرب میں ' ان کو اس حقیقت پر غور کرنے کے لیے دعوت دی گئی ہے کہ وہ دیکھیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو مسلسل جو دعوت دے رہے ہیں اس دعوت میں ان کا کوئی مفاد بھی نہیں ہے اور آپ ان سے اجر بھی طلب نہیں کرتے تو آخر یہ لوگ حضور ؐ کی دعوت میں شک کیوں کرتے ہیں اور منہ کیوں موڑتے ہیں ۔ اس کے بعد قل قل سے یہ ضربات مسلسل لگائی جاتی ہیں اور یہ اس قدر زوردار ہیں کہ اگر کسی دل میں ذرہ برابر بھی شعور ہو تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔

اور یہ سبق قیامت کے ایک نہایت ہی متحرک منظر پر ختم ہوتا ہے جو نہایت ہی متحرک ہے اور سابقہ ضربات کے ساتھ مناسب بھی ہے ۔

--- ooo ---

درس نمبر ۱۹۸ تشریح آیات

۴۳ --- تا --- ۵۴

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَن يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ ۚ وَقَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ مُّفْتَرًى ۚ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٤٣﴾ وَمَا آتَيْنَاهُم مِّن كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا ۖ وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِن نَّذِيرٍ ﴿٤٤﴾ وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٥﴾

۵
۹ع
۱۱

”ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان معبودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے آئے ہیں“۔ اور کہتے ہیں کہ ”یہ (قرآن) محض ایک جھوٹ ہے گھڑا ہوا“۔ ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ ”یہ تو صریح جادو ہے“۔ حالانکہ نہ ہم نے ان لوگوں کو پہلے کوئی کتاب دی تھی کہ یہ اسے پڑھتے ہوں اور نہ تم سے پہلے ان کی طرف کوئی متنبہ کرنے والا بھیجا تھا۔ ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں۔ جو کچھ ہم نے انہیں دیا تھا اس کے عشر عشیر کو بھی یہ نہیں پہنچے ہیں۔ مگر جب انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی“۔

ان لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت واضح سچائی پیش فرماتے تھے لیکن وہ اس کا مقابلہ ماضی کے افسانوں سے کرتے تھے۔ یہ چند پارینہ رسم رواج تھے اور اوہام و خرافات تھے جو انہوں نے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کے اندر کوئی جامعیت اور ربط بھی نہ تھا۔ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ قرآن مجید سیدھی سادی سچائی پیش کر رہا ہے اور قرآن کی تعلیمات ایک مکمل اور مربوط نظام زندگی ہیں اور معقول اور دل کو لگتی ہیں تو انہوں نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ ان کے آباؤاجداد سے منقول خرافات، غیر معقول، رسم و رواج اس معقول نظام زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے انہوں نے یہ اعلان کیا کہ یہ نئی تعلیم ان کے تمام سرمایہ رسوم کے لیے خطرہ ہے۔

مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّکُمْ عَمَّا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَآءُکُمْ (۴۳:۳۴) ”کہ یہ

شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان معبودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے آئے ہیں"۔ لیکن صرف یہ الزام لگا دینا تو کافی نہ تھا کیونکہ صرف یہ بات کہ آباء و اجداد کے معبودوں سے روکتا ہے سب لوگوں کے لیے مسلم نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک دوسرا الزام بھی لگایا کہ جو تعلیمات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔

وَ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى (۳۴: ۴۳) "اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو محض ایک جھوٹ گھڑا ہوا ہے"۔ افک کے معنی جھوٹ اور افتراء کے ہیں۔ لیکن مفتری کا لفظ بطور تاکید مزید لائے ہیں تاکہ ابتداء ہی سے قرآن کی قدر و قیمت میں کمی کر دیں کیونکہ جب قرآن کریم کے حقیقی مصدر ہی کو مشکوک بنا دیا گیا تو اس کی قدر و قیمت ظاہر ہے کہ کم ہو جاتی ہے۔

اور مزید یہ الزام۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۳۴: ۴۳)
"ان کافروں کے سامنے جب حق آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو صریح جادو ہے"۔ اور یہ الزام انہوں نے اس لیے لگایا کہ قرآن ایک نہایت موثر کلام تھا۔ جو اس کو سنتا اس کی دینی دنیا میں بھونچال آ جاتا۔ اس لیے صرف یہ بات بھی کافی نہ تھی کہ یہ جھوٹ اور گھڑا ہوا ہے۔ اس لیے اس کے اثر کی تاویل یہ کی کہ یہ کھلا جادو ہے۔

یہ مسلسل الزامات تھے۔ ایک کے بعد دوسرا الزام اور یہ الزامات بھی وہ اللہ کے قرآن پر لگا رہے تھے تاکہ لوگوں کے دلوں پر اس کا اثر نہ ہو لیکن یہ لوگ جو الزام لگاتے تھے ان میں سے کسی پر خود ان کے ساتھ کوئی ثبوت نہ تھا۔ یہ سب جھوٹے الزامات تھے اور عوام الناس کو گمراہ کرنے کے لیے تھے۔ جو لوگ یہ الزامات لگاتے تھے وہ کبراء اور سردار تھے۔ یہ کبراء اور سردار خود پوری طرح یقین رکھتے تھے کہ قرآن کریم خدا کی سچی کتاب ہے۔ یہ کتاب انسانی طاقت سے باہر ہے۔ بڑے سے بڑے متکلمین بھی اس قسم کا کلام لانے سے عاجز آ گئے تھے۔ ہم نے ظلال القرآن میں ایسے لوگوں کی کئی روایات دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں ان کی اصل رائے کیا تھی۔ اور یہ روایات بھی ہم نے بتا دیں کہ وہ قرآن کریم کے بارے میں اور اس کے خلاف کیا کیا تدابیر کرتے تھے۔

قرآن کریم نے ان کی اس کمزوری کو کھول دیا۔ اور یہ کہا کہ یہ عرب تو امی تھے' یہ اہل کتاب نہ تھے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کی تعلیمات کے بارے میں کوئی فیصلہ کن بات کر سکیں۔ یہ لوگ وحی کے بارے میں بھی نہ جانتے تھے۔ اس لیے یہ لوگ وحی کے بارے میں بھی کوئی ماہر لوگ نہ تھے۔ نیز ان کے پاس حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی رسول بھی نہیں آیا تھا کہ یہ اس بارے میں کوئی ماہرانہ رائے دے سکیں۔ لہٰذا وہ رسول اللہؐ' قرآن اور وحی کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ ایسی باتیں ہیں جس موضوع پر ان کو کوئی علم نہیں۔

وَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَ مَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ (۳۴: ۴۴)
"حالانکہ ہم نے ان لوگوں کو پہلے کوئی کتاب نہ بھیجی تھی کہ یہ اسے پڑھتے ہوں اور نہ تم سے پہلے ان کی طرف کوئی متنبہ

کرنے والا بھیجا تھا"۔ ان کے دلوں کو احساس دلایا جاتا ہے کہ ذرا ان سے پہلے کے ان لوگوں کے انجام پر غور کرو جنہوں نے تکذیب کی۔ تم لوگ ان لوگوں کے مقابلے میں بہت کم قوت والے ہو۔ وہ علم والے تھے' مال والے تھے' قوت والے تھے اور ترقی یافتہ تھے لیکن جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو ان کو عذاب الہی نے گھیر لیا اور وہ بہت ہی سخت پکڑ میں آ گئے۔

وَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ مَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (٣٤ : ٤٥) "ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ جھٹلا چکے ہیں جو کچھ ہم نے انہیں دیا تھا اس کا عشر عشیر بھی ان کے پاس نہیں ہے مگر جب انہوں نے میرے رسولوں کو جھٹلایا تو دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی"۔ اللہ کی یہ سزا نہایت ہی تباہ کن تھی۔ ان منکرین میں سے بعض لوگ ایسے تھے جن کے بارے میں قریش جانتے بھی تھے لہذا ان کو یہ یاد دہانی کافی تھی۔ لیکن یہاں طنزیہ انداز میں سوال کیا گیا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (٣٤ : ٤٥) "میری سزا کیسی تھی"۔ چونکہ مخاطبین کو معلوم تھا کہ یہ سزا کیسی تھی اس لیے یہ سوالیہ انداز نہایت موثر ہے۔

--- ○○○---

اب لوگوں کو نہایت ہی سنجیدگی کے ساتھ یہ دعوت دی جاتی ہے کہ سچائی کے ساتھ تم حق کو تلاش کرو اور سچائی کے بارے میں جو جھوٹا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اسے سمجھنے کی کوشش کرو اور جو دعوت تمہارے سامنے پیش کی جا رہی ہے اس کے بارے میں خارجی موثرات سے آزاد ہو کر سوچو اور اس کی قدر و قیمت معلوم کرو۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۝۴۶

"اے نبیؐ ان سے کہو کہ "میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو' تمہارے صاحب میں آخر کون سی بات ہے جو جنون کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے"۔

یعنی اللہ کے معاملے میں غور کرو' اور یہ غور اپنی ذاتی خواہشات کو ایک طرف رکھ کر دو۔ اپنی مصلحتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے غور کرو۔ دنیا کے حالات اور میلانات سے ہٹ کر کرو' اور ان وسوسوں اور خلجانات سے ہٹ کر کرو جو دلوں میں پیدا ہوتے ہیں' یہ سب چیزیں انسان کو اللہ سے دور کرتی ہیں' غرض تمہاری سوسائٹی اور تمہارے معاشرے کے

اندر رائج تصورات سے ہٹ کر تم اللہ کے معاملے پر غور کرو۔

یعنی دعوت اسلامی کے مضمون کو سادہ انداز میں لو' اپنے رائج تصورات کے حوالے سے نہ لو۔ نہ خالص منطق اور فلسفیانہ انداز میں لو جس میں لفاظی تو بہت ہوتی ہے لیکن سیدھی سادہ حقیقت کو جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ منطقیانہ سوچ کے بجائے فطرت کی سنجیدہ سوچ کا راستہ اختیار کرو۔ جس میں شور و شغب کم ہوتا ہے اور خلط مبحث نہیں ہوتا نہ سوچ میں ٹیڑھ ہوتی ہے اور نہ فکر میں گدلاپن ہوتا ہے بلکہ صاف و شفاف سوچ ہوتی ہے۔

لیکن فطری انداز میں تلاش حقیقت بھی دراصل حقیقت کی تلاش ہی ہوتی ہے۔ جبکہ یہ سوچنے کا سیدھا سادہ طریقہ ہوتا ہے۔ جس پر معاشرے کے رائج افکار اثر انداز نہیں ہوتے' نہ معاشرے کے اندر رائج غلط رسم و رواج اثر ڈالتے ہیں صرف خدا کا خوف اور اللہ کی نگرانی ہی بڑی موثر ہوتی ہے۔

اس سوچ کا راستہ صرف ایک ہی ہے خدا کا راستہ' خدا کے سامنے جھکنے کا راستہ' خدا کی رضا کا راستہ۔ اور بے لوث راستہ جس میں کوئی ذاتی خواہش' کوئی مصلحت' کوئی مفاد موثر نہ ہو' خالص انداز میں فطری سوچ جس پر کوئی خارجی عوامل اثرانداز نہ ہوں۔ یعنی صرف اللہ کے لیے سوچ۔

اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى (۳۴ : ۴۶) "خدا کے لیے تم اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ"۔ دو دو اس طرح کہ دعوت اسلامی کے مسئلے پر ایک دوسرے کے ساتھ مذاکرہ کرو' یعنی محدود تعداد میں شور و شغب سے علیحدہ ہو کر مذاکرہ کرو' عوام الناس کی بھیڑ سے الگ ہو کر۔ حالات اور عوام سے متاثر ہوئے بغیر کیونکہ عوام الناس وقتی حالات سے متاثر ہوتے جاتے ہیں' اور اکیلے غور کرو' جو غور و فکر کا سب سے موثر طریقہ ہے۔

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (۳۴ : ۴۶) "سوچو کہ تمہارے صاحب میں آخر کون سی بات ہے جو جنون کی ہو"۔ آپ کے سامنے تو وہ عقل' تدبر اور نہایت ہی دانائی کی بات کرتا ہے۔ اور آخر وہ کون سی بات ایسی کرتا ہے جس سے معلوم ہو کہ اس کی عقل میں فرق ہے۔ وہ تو نہایت ہی مضبوط' قوی اور واضح بات کرتا ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (۳۴ : ۴۶) "وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے"۔ شدید ترین عذاب کے واقع ہونے کا امکان انسان کو غور و فکر پر آمادہ کرتا ہے اور ڈرانے والے نے متنبہ بھی کر دیا تاکہ جو بچنا چاہتا ہے' بچ جائے۔ مگر ایک شخص چلاتا ہے کہ آگ لگ گئی ہے بھاگو۔ اگر کوئی نہیں بھاگتا تو اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتا ہے جبکہ آواز دینے والا ہے بھی سچا شخص اور نہایت ہی بہترین کردار کا مالک ہے۔

امام احمد نے ابو نعیم بشیر سے عبد اللہ ابن بریدہ سے' اس نے اپنے باپ سے' کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ہم پر نکلے تو تین بار آواز دی لوگو' تمہیں معلوم ہے کہ میری اور تمہاری مثال کیا ہے؟ لوگوں نے کہا اللہ اور رسول اللہ خوب جانتے ہیں۔ تو آپ ؐ نے فرمایا: "میری اور آپ لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک قوم کو کسی دشمن کے حملے کا خطرہ ہو۔ انہوں نے ایک آدمی بھیجا کہ وہ حالات معلوم کر کے بتائے۔ یہ شخص دیکھ رہا تھا کہ دشمن آ گیا۔ وہ چلانے لگا اور اسے ڈر تھا کہ لوگوں کو اس

کی آواز پہنچنے سے پہلے ہی اسے دشمن پکڑ نہ لے۔ تو اس نے دور ہی سے کپڑا ہلایا 'لوگو' دشمن آگیا' دشمن آگیا' لوگو تم پر حملہ ہو گیا"۔ اور ایک دوسری روایت میں حضورؐ سے مروی ہے کہ میں اور قیامت ایک ہی ساتھ بھیجے گئے ہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ قیامت مجھ سے بھی پہلے آجائے۔

یہ تو تھی پہلی ضرب 'اب دوسری ضرب ملاحظہ ہو۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

"ان سے کہو "اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تم ہی کو مبارک رہے۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے"۔

پہلے تو آپ نے ان کو دعوت دی کہ تم لوگ اکیلے یا دو دو مل کر تحریک اسلامی پر غور کرو کہ تمہارے ساتھی کی دعوت میں آخر جنوں کی کیا بات ہے۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ حضور اکرمؐ لوگوں کے ڈرانے میں اس قدر مگن ہیں اور لوگوں کو شدید عذاب سے ڈرا رہے ہیں۔ آخر اس میں ان کا مفاد کیا ہے۔ اس کے اسباب کیا ہیں۔ حضورؐ کو کیا فائدہ ہے۔ اس حقیقت کی طرف ان لوگوں کی سوچ اور قوت استدلال کو نہایت ہی موثر انداز میں متوجہ کیا جاتا ہے۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (۳۴ : ۴۷) "کہو' میں اگر تم سے کوئی اجر مانگتا ہوں تو وہ تم ہی لے لو"۔ یہ اجر تمہیں ہی مبارک ہو۔ یہ نہایت ہی طنزیہ انداز ہے اور اس میں ان کے لیے سرزنش بھی ہے۔

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (۳۴ : ۴۷) "میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے"۔ اسی نے مجھے اس کام پر لگایا ہے۔ وہی معاوضہ دے گا۔ میں اسی سے امید رکھتا ہوں اور جو شخص اللہ کے عطیہ کا امیدوار ہو' اس کے نزدیک پھر لل دنیا کا ہر عطیہ حقیر اور بے قیمت ہو جاتا ہے۔ اس کے بارے میں ایسا شخص سوچتا ہی نہیں ہے۔

وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۳۴ : ۴۷) "وہ ہر چیز پر گواہ ہے"۔ وہ جانتا ہے' دیکھتا ہے اور اس سے کوئی چیز خفیہ نہیں ہوتی۔ وہ میرے اوپر گواہ ہے۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں' جو کچھ کہتا ہوں اور جو کچھ کرتا ہوں۔

اب تیسرا مضراب :

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝

"ان سے کہو' میرا رب (مجھ پر) حق کا القاکرتا ہے اور وہ تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا ہے"۔

یعنی میں جو چیز لے کر آیا ہوں وہ حق ہے۔ یہ وہ مضبوط حق ہے جسے اللہ قوت سے پھینکتا ہے۔ اس سچائی کے مقابلے میں کون کھڑا ہو سکتا ہے جسے اللہ زوردار انداز سے نازل کر رہا ہو۔ یہ ایک نہایت ہی مجسم اور مصور انداز تعبیر ہے۔ گویا

حق کے گولے برس رہے ہیں' بمباری ہو رہی ہے اور کسی کو ہمت نہیں ہے کہ اس کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ اللہ سچائی کے گولے پھینک رہا ہے جو علام الغیوب ہے۔ وہ علم سے یہ گولے پھینک رہا ہے۔ علم کے ساتھ ان کا رخ کسی کی طرف کرتا ہے۔ اس کا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ کوئی چیز اس سے غائب نہیں ہے اور کوئی چیز اس سچائی کی زد سے بچ نہیں سکتی اس لیے کہ رکاوٹ بننے والی کوئی چیز سامنے نہیں ہے۔ اللہ کے سامنے نشانہ کھلا ہے۔

اب آخری ضرب :

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ ﴿٤٩﴾

"کہو' حق آگیا اور اب باطل کے لیے کچھ نہیں ہو سکتا"۔ سچائی آگئی ہے' رسول آگیا' قرآن آگیا' اسلامی نظام زندگی سیدھا سیدھا آگیا۔ اعلان کر دو' اور کھلا اعلان کر دو کہ اب حق آگیا ہے۔ یہ گولہ قوت کے ساتھ پھینکا گیا ہے۔ قوت اور سربلندی کے ساتھ آگیا ہے۔

وَ مَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَ مَا يُعِيدُ (٣٤ : ٤٩) "باطل کے لیے اب نہ آغاز ہے اور نہ انجام"۔ اس کا معاملہ اب ختم ہے۔ اس کی زندگی ختم ہے۔ اب اس کے لیے کوئی میدان عمل نہیں ہے۔ اس کا جانا ٹھہر گیا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی ہلا مارنے والی ضرب ہے۔ جو کوئی بھی اس اعلان کو سنتا ہے' وہ یقین کر لیتا ہے کہ اب کوئی گنجائش نہیں ہے' باطل کے قائم رہنے کی۔ لہٰذا حق کے سوا اب کسی اور کی حکمرانی نہ ہو گی۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب سے قرآن آیا ہے۔ سچائی کا منہاج دنیا میں قائم ہو گیا ہے اور باطل اب اس سچائی کے سامنے دفاعی پوزیشن میں ہے' کیونکہ سچ نے غالب ہونے کا عزم بالجزم کیا ہوا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات باطل کو مادی قوت حاصل ہوتی ہے لیکن وہ کبھی حق پر نظریاتی برتری حاصل نہیں کر سکا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات اہل باطل اہل حق پر غالب آجاتے ہیں لیکن یہ اہل حق کی غلطی کی وجہ سے وقتی تزلزل ہوتا ہے۔ جہاں تک حق کا تعلق ہے' وہ اپنی جگہ جما ہوا ہوتا ہے۔ واضح ہوتا ہے' صریح ہوتا ہے۔

اور آخری ضرب۔

قُلْ إِن ضَلَلْتُ فَإِنَّمَآ أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۖ وَإِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِيٓ إِلَيَّ رَبِّيٓ ۚ إِنَّهُۥ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ﴿٥٠﴾

"کہو' اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھ پر ہے' اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اس وحی کی بناء پر ہوں جو میرا رب میرے اوپر نازل کرتا ہے' وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب ہی ہے"۔

اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں تو اس کا وبال تم پر نہ ہو گا۔ میں خود ذمہ دار ہوں گا اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو اللہ نے بذریعہ وحی مجھے یہ ہدایات دی ہیں۔ میں خود از خود کوئی کام کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ میں تو خود بھی اسیر اشارہ ابرو ہوں۔

اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (۳۴ : ۵۰) "وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب ہی ہے"۔ یہ لوگ اللہ کو قریب پاتے تھے ۔ ان کے تصور میں اللہ کی یہ صفات بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کی حقیقی زندگی میں یہ صفات موثر تھیں ۔ ان کو یقین تھا کہ اللہ سمیع ہے اور قریب ہے ۔ اور وہ ان کے امور کو براہ راست دیکھ رہا ہے ۔ ان کی شکایت اور ان کے مشورے سب اللہ کے سامنے ہیں ۔ اللہ نے اپنے بندوں کو چھوڑ نہیں رکھا اور نہ کسی کے حوالے کر رکھا ہے ۔ چنانچہ ان کی زندگی اللہ کے انس و محبت میں گزرتی تھی ۔ اللہ کے زیر سایہ تھی ۔ اس کے پڑوس میں تھی ۔ اس کی مہربانیوں میں تھی ۔ اس کی نگرانی میں تھی اور یہ عقیدہ وہ اپنے نفوس کے اندر زندہ پاتے تھے ' زندہ اور سادہ شکل میں ۔ یہ صفات محض تصور ہی نہ تھیں بلکہ زندہ اور عملی تھیں اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (۳۴ : ۵۰)

اب خاتمہ اس سورہ کا قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کے ساتھ ہوتا ہے ۔ یہ منظر حرکت اور دوڑ دھوپ سے پر ہے ۔ اس میں دنیا اور آخرت کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں ۔ گویا دنیا اور آخرت ایک ہی اسٹیج پر ہیں ۔ اس منظر کی جھلکیاں بڑی تیزی سے اسکرین پر گزرتی ہیں ۔

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾ وَّقَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾

۶
ع ۹
۱۲

"کاش تم دیکھو انہیں اس وقت جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جا سکیں گے ' بلکہ قریب ہی سے پکڑ لیے جائیں گے ۔ اس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لے آئے ۔ حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کہاں ہاتھ آ سکتی ہے ۔ اس سے پہلے یہ کفر کر چکے تھے اور بلاتحقیق دور دور کی کوڑیاں لایا کرتے تھے ۔ اس وقت جس چیز کی یہ تمنا کر رہے ہوں گے اس سے محروم کر دیئے جائیں گے جس طرح ان کے پیش رو ہم مشرب محروم ہو چکے ہوں گے ۔ یہ بڑے گمراہ کن شک میں پڑے ہوئے تھے"۔

کاش تم دیکھو ' منظر تو سب کے سامنے کھلا ہے اور دیکھا جا سکتا ہے ۔ دیکھو یہ کس طرح گھبرائے پھر رہے ہیں ۔

فَزِعُوْا (۳۴ : ۵۱) اچانک ان پر خوف طاری ہو گیا ہے ۔ یہ بھاگنا چاہتے تو تھے لیکن دیکھو پکڑے جا رہے ہیں ' کوئی ایک بھی بھاگ نہیں سکتا ۔ بلکہ یہ دور تک نہیں بھاگ سکتے قریب قریب ہی سے پکڑے جا رہے ہیں ۔

وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ (۳۴ : ۵۱) اچانک انہوں نے تھوڑی بہت حرکت تو کی بھاگنے کے لیے مگر نہ بھاگ سکے ۔

اب سب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے بعد از وقت ۔ اب تو ایمان ان سے بہت دور نکل گیا ہے ۔ بہت دور جا چکا

ہے ۔ یہ اب اسے پکڑ نہیں سکتے ۔

التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ (۳۴ : ۵۲) اب ان کی سعی اس طرح ہے جس طرح کوئی کسی چیز کو دور سے پکڑنا چاہے' مگر نہ پکڑ سکے ۔ ایمان تو دور دنیا میں رہ گیا ہے ۔ انہوں نے موقع ضائع کر دیا ۔

وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ (۳۴ : ۵۳) "اس سے پہلے انہوں نے ایمان سے انکار کر دیا" ۔ اب یہاں تو معاملہ ختم ہے' مہلت ختم' اب سعی لاحاصل ہے ۔

وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ (۳۴ : ۵۳) "یہ دور سے غائب نشانے پر پھینکتے تھے" ۔ اس وقت انہوں نے انکار ہی کر دیا تھا کہ قیامت نہیں ہے' حالانکہ وہ مستقبل کے پردوں میں اسے کس طرح دیکھ سکتے تھے کہ نہیں ہے ۔ اس طرح وہ دور نامعلوم نشانے پر بمباری کر رہے تھے ۔ اور اب ایمان لانے کی سعی کر رہے ہیں جبکہ وہ دور نکل گیا ہے ۔

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ (۳۴ : ۵۴) "اس وقت جس چیز کی یہ تمنا کر رہے ہوں گے ۔ اس سے وہ محروم کر دیئے جائیں گے" ۔ اب یہ ایمان سے محروم ہوں گے کیونکہ وہ بعد از وقت ہوگا ۔ اب عذاب سے بچنا ممکن نہ ہوگا کہ وہ سرپر ہوگا ۔

كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ (۳۴ : ۵۴) "جس طرح ان کے پیش رو ہم مشرب محروم کر دیئے جائیں گے" ۔ یعنی جب ان پر پکڑ آئی تو انہوں نے نجات کی دعا کی لیکن اب نہ دعا کا وقت تھا نہ بھاگنے کی جگہ تھی ۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ (۳۴ : ۵۴) "یہ بڑے گمراہ کن شک میں پڑے ہوئے تھے" ۔ اور اب یقین کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں" ۔

اس سورہ کا خاتمہ اس شدید ضرب پر ہوتا ہے ۔ اور یہ منظر قیامت' قیام قیامت کو عملاً ثابت کر دیتا ہے کہ وہ دیکھو قیامت برپا ہوگئی! یہی مضمون تھا اس سورہ کا ۔ آغاز بھی قیامت کے قیام ہے اور انتہا بھی احوال قیامت پر ۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ------ ۲۲

سورة فاطر ۔ ۳۵

آیات ا --- تا --- ۴۵

سورۂ فاطر ایک نظر میں

یہ مکی سورہ ہے اور سیاق کلام اور موضوع کے اعتبار سے اس کا ایک مخصوص انداز ہے ۔اس کا انداز سورہ رعد کے مطابق ہے ۔ آغاز سے لے کر انتہا تک قلب انسانی کے لیے نہایت ہی موثر ضربات لگائی گئی ہیں ۔ یہ ضربات نہایت ہی موثر اور اشاراتی اور انسان کو خوب جھنجھوڑنے والی ہیں ۔ انسان کو غفلت سے جگاتی ہیں تاکہ وہ غور کرے اور اس کائنات کی عظمت کا ادراک کرے ۔ اس کائنات کی حیران کن خوبصورتی سے لطف اندوز ہو سکے اور اس کے اندر خالق کائنات کے وجود پر جو دلائل اور نشانیاں جابجا بکھری پڑی ہیں ان پر انسان غور اور تدبر کرے ۔ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرے اور اللہ کی رحمت اور اللہ کی نگرانی اور مہربانی کو یاد کرے ۔گزرے ہوئے لوگوں کی مقتل گاہوں کو دیکھے اور قیامت کے مناظر بھی دیکھے ۔ اس کائنات میں اللہ کی صنعت کاریوں' دست قدرت کے معجزات' انسانی نفس کے اندر تخلیق کردہ اعجوبے' انسانی زندگی کے عجیب نشیب و فراز اور انسانی تاریخ کے عبرت آموز واقعات کو دیکھ کر اللہ کا خوف اپنے دل کے اندر پیدا کرے ۔ پھر وہ دیکھے کہ اس کائنات اور ان تمام آثار کے اندر ایک ہی سچائی اور ایک ہی قانون جاری و ساری ہے اور ایک ہی صانع' مبدع اور قوی دست قدرت کام کر رہا ہے ۔ یہ تمام امور ایسے موثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں کہ کوئی زندہ دل ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ سورہ اس طرح ہے جس طرح زنجیر کی کڑیاں باہم پیوست ہوتی ہیں' اس کو اسباق اور دروس کے اندر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ پوری سورہ کا ایک ہی موضوع ہے ۔ انسان کے قلب و خرد کی تاروں پر ضربات ہیں اور یہ ضربات اس کائنات 'نفس انسانی' حیات انسانی' تاریخ انسانی' بعث بعد الموت کے واقعات سے مملو ہیں ۔یوں یہ زمزمے نفس کو ہر پہلو سے متاثر کرتے ہیں اور دل کو ہر طرف سے گھیرتے ہیں اور انسان کی روحانی دنیا کو ایمان' خضوع و خشوع اور یقین سے بھر دیتے ہیں ۔

ان تمام تبصروں اور نصیحتوں میں ممتاز بات یہ ہے کہ تمام ڈوریوں کے سرے دست قدرت میں پکڑے گئے ہیں اور یہ دکھایا گیا ہے کہ دست قدرت کی کارفرمائیاں ہیں کہ وہ ان ڈوریوں کو ہلاتا ہے اور اس کائنات میں اعجوبے نمودار ہوتے ہیں ۔ یہ دست قدرت ہی ہے جو کسی رسی کو کھینچ لیتا ہے اور کسی کو دراز چھوڑتا ہے' کسی کو سخت کرتا ہے اور کسی کو نرم کرتا ہے ۔اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی مددگار اور شریک ہے ۔

سورہ کے آغاز ہی سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دست قدرت کی یہ کارفرمائیاں نمایاں ہیں۔ اور یہ سورہ کے خاتمے تک یونہی جاری ہیں ۔سب سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ یہ عظیم کائنات دست قدرت کا کرشمہ ہے ۔ یہ اللہ ہی ہے جو اسے وجود میں لایا ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۳۵ : ۱) "تعریف اللہ ہی کے لیے جو آسمان اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے جن کے دو دو' تین تین اور چار چار بازو ہیں ۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے' یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔

اور اللہ کا یہ قبضہ قدرت بے قید ہے ۔ اگر اللہ رحمت کا فیضان عام کرتا ہے تو اسے کوئی بند نہیں کر سکتا اور اگر اللہ اپنی رحمت کے سرچشمے خشک کر دے تو کوئی نہیں ہے کہ انہیں جاری کر سکے ۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ هَلْ مِنْ بَعْدِهٖ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۳۵ : ۲) "اللہ جس رحمت کا لوگوں کے لیے دروازہ کھول دے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جسے بند کر دے' اسے کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں ہے ۔ وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

ہدایت اور ضلالت بھی ایک قسم کی رحمت ہے یا زحمت ۔

فَاِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (۳۵ : ۸) "اللہ ہی ہے جسے چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے ہدایت دے دے"۔

اِنَّ اللّٰهَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ (۳۵ : ۲۲) اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِیْرٌ (۳۵ : ۲۳) "اللہ جسے چاہتا ہے' سنواتا ہے مگر تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں ۔ تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو"۔

یہی دست قدرت ہے جس نے پہلے زندگی پیدا کی اور وہ دوبارہ بھی زندگی عطا کرے گا اور قیامت میں مردوں کو اٹھائے گا ۔

وَ اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (۳۵ : ۹) "وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے' پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں پھر ہم اسے ایک اجاڑ زمین کی طرف لے جاتے ہیں جو مری پڑی تھی ۔ مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اس طرح ہو گا" ۔ اور عزت اور برتری سب اللہ کے لیے ہیں ۔ اور ہر قسم کی عزت اور برتری کا سرچشمہ اللہ ہی ہے ۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا (۳۵ : ۱۰) "جو عزت چاہتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے"۔

تخلیق ' وجود میں لانا 'نسل چلانا اور پھر مارنا سب کے سب اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۳۵ : ۱۱) "اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفہ سے ۔ پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے ۔ کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے ۔ کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا ہوتا ہے ' اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہوتا ہے"۔

اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں آسمان و زمین کی کنجیاں ' افلاک و کواکب کی حرکات اسی کے ہاتھ میں ہیں ۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ (۳۵ : ۱۳) "وہ دن کے اندر رات اور رات کے اندر دن کو پروتا ہے ہوالے آتا ہے' چاند اور سورج کو اس نے مسخر کر رکھا ہے ۔ یہ سب کچھ ایک وقت مقررہ تک چلے جا رہا ہے ۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے ۔ بادشاہی اسی کی ہے ۔ اسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو' وہ ایک پرکاہ کے مالک بھی نہیں ہیں"۔ اللہ کا دست قدرت اس کائنات میں متصرف ہے ۔ وہ جمادات 'نباتات اور حیوانات اور انسانوں میں تصرف کر رہا ہے ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ (۳۵ : ۲۷) وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵ : ۲۸) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمانوں سے پانی برسا رہا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں ۔ جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں ۔ پہاڑوں میں بھی سفید سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں ۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہوتے ہیں ۔

یہ دست قدرت انسان کو قدم بقدم آگے لے آتا ہے اور ایک نسل کو دوسری نسل کا وارث بناتا ہے ۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (۳۵ : ۳۲) "پھر ہم نے اس کتاب کا

وارث بنا دیا ان لوگوں کو، جنہیں ہم نے اپنے بندوں کے لیے منتخب کیا"۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (۳۵:۳۹) "وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو خلیفہ بنایا"۔اور یہی اللہ ہے جس نے اس پوری کائنات کو تھام رکھا ہے اور اسے زوال سے محفوظ کر دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَ لَئِنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (۳۵:۴۱) حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو زمین و آسمان کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے سوا کوئی دوسرا انہیں تھامنے والا نہیں ہے"۔

تمام امور اللہ کے دست قدرت کے قبضہ میں ہیں اور اللہ تعالیٰ کو کوئی قوت کسی کام سے عاجز نہیں کر سکتی۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعْجِزَهٗ مِنْ شَیْءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ (۳۵:۴۴) "اللہ تعالیٰ کو زمین و آسمان کی کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی"۔

اِنَّهٗ كَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا (۳۵:۴۴) "وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۳۵:۲) "وہ عزیز و حکیم ہے"۔

وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۳۵:۴) "تمام امور اللہ کی طرف لوٹتے ہیں"۔

عَلِیْمٌۢ بِمَا یَصْنَعُوْنَ (۳۵:۸) "وہ ان باتوں کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو"۔

لَهُ الْمُلْكُ "بادشاہت اسی کی ہے"۔

الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ "وہ غنی اور اپنی ذات میں محمود ہے"۔

اِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ (۳۵:۱۸) "اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے"۔وہ "عزیز و غفور" ہے۔وہ "غفور و شکور" ہے وہ "خبیر و بصیر" ہے۔وہ "زمین و آسمانوں" کے غیب کا جاننے والا ہے۔وہ علیم بذات الصدور ہے۔وہ حلیم و غفور ہے۔وہ علیم و قدیر ہے۔وہ تمام بندوں پر بصیر ہے۔ان آیات اور آیات کے تراجم سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ کی فضا کیا ہے اور اس پوری سورہ کا یہ رنگ ہے۔

ہاں سورہ کی تشریح کی خاطر ہم نے اسے چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے تاکہ اس کے معانی اور تشریحات سہولت سے کی جائیں ورنہ یوں یہ سورہ دراصل ایک ہی حلقہ اور ایک ہی سبق ہے اور اول سے آخر تک مضمون و موضوع بھی ایک ہی رنگ کا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۱۹۹ تشریح آیات

۱ ـ تا ـ ۳

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ ”تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمان اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے جن کے دو دو' تین تین اور چار چار بازو ہیں۔ وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے' یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے“۔

سورہ کا آغاز حمد باری سے ہو رہا ہے۔ اس پوری سورہ کا مضمون یہ ہے کہ انسانی دل کو اللہ کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اللہ کی نعمتوں کو دیکھا جائے' اللہ کی رحمتوں کا شعور زندہ کیا جائے اور انسان کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ اپنی مخلوقات میں اللہ نے کیا کیا عجائبات پیدا کیے ہیں۔ انسانی احساس کو ان عجائبات کے شعور سے بھر دیا جائے اور نتیجتہً انسان اللہ کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہو۔

سب حمد اللہ کے لیے ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (۳۵ : ۱) ”سب تعریف اللہ کے لیے ہے“۔ اور اس کے بعد اللہ کی وہ صفت بیان ہو رہی ہے جو خلق اور ایجاد پر دلالت کرتی ہے۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۳۵ : ۱) "جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے"۔ وہ ان عظیم اور ہولناک مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے جنہیں ہم اپنے اوپر نیچے دیکھ رہے ہیں۔ جہاں بھی ہم ہوں اور ان میں سے نہایت ہی چھوٹے اجسام اور ہم سے قریب ترین اجسام کے بارے میں ہم کچھ معلومات رکھتے ہیں۔ ان تمام اجسام کو ایک ہی قانون قدرت کنٹرول کرتا ہے' نہایت ہی تناسب اور توافق کے ساتھ۔ یہ سب چیزیں چلتی ہیں اور ان کا تصور بھی ہم اپنے ذہن پر بہت بڑا بوجھ ڈال کر 'کر سکتے ہیں۔ یہ تمام اجسام اپنی عظمت اور خوفناکی کے ساتھ ساتھ ایک ایسے دقیق اور پیچیدہ تناسب کے ساتھ اپنے مدارات میں ایک ہی رخ پر چلتے ہیں کہ اگر اس تناسب میں بالفعل ایک معمولی فرق آ جائے تو یہ تمام عظیم اجسام ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں اور قیامت برپا ہو جائے اور سب کے سب روئی کے گالوں کی طرح بکھر جائیں۔

قرآن کریم اسی عظیم تخلیق سماوات کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے اور ہم اس پر سے یونہی گزر جاتے ہیں' بغیر اس کے کہ ہم اس کے سامنے رک کر قدرے تامل اور تدبر کریں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ کہ ہمارا احساس جمود اختیار کر گیا ہے۔ ہماری عقل و خرد کے تار زنگ آلود ہو گئے ہیں اور ان پر قرآن کریم کے مضراب کی اس قدر سخت ضربات بھی کارگر نہیں ہیں اور ان ضربات کے باوجود ان سے کوئی نغمہ نہیں نکلتا۔ وہ سرود جو کبھی اللہ کے لیے جڑے ہوئے دلوں سے نکلتا تھا' جو اللہ کو یاد کرتے تھے اور اللہ کی قدرت کی ان نشانیوں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے اور یہ بڑی وجہ ہے کہ اس عظیم کائنات کو ہم دیکھتے دیکھتے اس کے اس قدر عادی بن گئے ہیں کہ اس کے عجائبات ہمیں عجائبات ہی نہیں لگتے۔ ان کا بے مثال حسن ہمیں متاثر ہی نہیں کرتا اور ان کی نہایت ہی پیچیدہ ٹیکنالوجی ہمیں ششدر نہیں کرتی۔ اگر ہم ان پر ایسی نظر ڈالیں جس طرح کوئی انہیں پہلی مرتبہ دیکھتا ہے اور بہت ہی حیران ہو جاتا ہے۔

یاد رہے کہ کھلے دل' اللہ کے ساتھ جڑے ہوئے دل کے لیے آسمان میں' ستاروں کے مواقع و مدارات پر غور اور تدبر کرنے کے لیے' ان کے حجم اور عظمت کو دیکھنے کے لیے' اور ان کے ماحول کے مطالعے کے لیے' بعض کا دوسرے کے ساتھ تعلق اور کشش کے معلوم کرنے کے لیے۔ اور ہر ایک کے حجم' ہر ایک کی حرکت اور ہر ایک کے حالات معلوم کرنے کے لیے کسی بڑے علم کی ضرورت نہیں ہے' جو دل اللہ سے جڑا ہوا ہو' اس کے لیے کسی بڑے اور گہرے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ معمولی توجہ سے اس کائنات کے حسن و جمال کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مناظر ایک خدا رسیدہ شخص کے دماغ کے تاروں کے اندر نغمہ پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ رات کے وقت ذرا صاف ستھری فضا اور صاف موسم میں ان گنت تاروں ہی کو چمکتا ہوا دیکھ لیجئے! تاریک رات ہو اور موسم صاف ہو اور ہر ستارہ زمین پر ضوپاشی کر رہا ہو۔ پھر صبح کے وقت ذرا سپیدۂ صبح کی نمود داری اور سورج کے طلوع ہونے کے منظر کو دیکھئے۔ اسی طرح پہاڑوں کی اوٹ میں ڈوبنے والے سورج اور سرخ شفق ہی کو دیکھئے۔ پھر اس چھوٹی سی زمین اور اس کے مختلف مواقع اور مناظر کو دیکھئے۔ ان مناظر کو کوئی سیاح ختم نہیں کر سکتا اور نہ ان کی سیر سے سیر ہو سکتا ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ صرف ایک پھول ہی کو دیکھئے۔ اس کا رنگ اور اس کی پتیاں اور اس کی تشکیل اور رنگوں کی تنظیم سُبْحَانَ اللّٰهِ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ۔

قرآن کریم ان امور کی طرف جابجا اشارات کرتا ہے۔ بڑے بڑے مناظر کی طرف بھی اور چھوٹے چھوٹے پیش پا افتادہ مناظر کی طرف بھی۔ اگر کوئی زندہ دل ان میں سے ایک کی طرف بھی اشارہ کر دے تو زندہ و بیدار مغز انسان کی

ہدایت کے لیے صرف ایک ہی چیز یا ایک ہی پھول کا مطالعہ کافی ہے اور کسی ایک چیز کے اندر موجود عجائبات پر بھی انسان اللہ کی حمد و ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (۳۵ : ۱) ”تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے' جن کے دو دو' تین تین' اور چار چار بازو ہیں“۔ اس سورہ میں موضوع سخن رسولوں' وحی الٰہی اور نزول وحی ہے۔ فرشتوں کا اس کے اندر بہت اہم کردار ہے کیونکہ یہ فرشتے ہی آسمانوں سے وحی لے کر مختار رسولوں کے پاس آیا کرتے ہیں اور یہ پیغام رسانی جو اللہ سے رسولوں کے پاس آتی ہے' نہایت ہی اہم اور نہایت ہی بھاری کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کائنات کی عظیم تخلیقات کے بعد فرشتوں کی تخلیق کا خصوصی ذکر ہوا کیونکہ یہ فرشتے ہی زمین اور آسمان کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہیں۔ وہی رابطہ ہوتے ہیں خالق سماوات و ارض اور اللہ کے مختار بندوں یعنی رسولوں کے درمیان اور یہ پیغام رسانی اور ذریعہ ربط اس کائنات کا اہم کام فریضہ رسالت کے بارے میں ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں آغاز سے یہاں تک فرشتوں کا ذکر تو ہوتا رہا ہے لیکن فرشتوں کی شکل و صورت کے بارے میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے۔ اس سے قبل فرشتوں کی طبیعت اور ان کے فریضہ منصبی کی بات ہوتی رہی ہے مثلاً

وَمَنْ عِنْدَہٗ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ (۲۱ : ۱۹) یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَ النَّھَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ (۲۱ : ۲۰) (انبیاء : ۱۹-۲۰) ”اور جو اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں۔ نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ دم نہیں لیتے“۔ دوسری جگہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَیُسَبِّحُوْنَہٗ وَلَہٗ یَسْجُدُوْنَ

(۷ : ۲۰۶) ”جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے۔ اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں“۔ (۷ : ۲۰۶) یہاں ایک نئی بات یہ کہی گئی ہے کہ ان کی تخلیقی صورت کیا ہے کہ ”جن کے دو دو' تین تین اور چار چار بازو ہیں“۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس کی کوئی مثال نہیں ہے' نہ اس کا ہم کوئی تصور کر سکتے ہیں کہ ان کے بازو اور پر کیسے ہیں۔ ہمیں بس چاہئے اور ہم یہی کر سکتے ہیں کہ بس اجمالاً ایمان لائیں کہ ان کے پر ایسے ہوں گے۔ اس بارے میں کوئی متعین تصور ہم نہیں کر سکتے کیونکہ ہم جو اندازہ بھی کریں گے اس میں غلطی ہوگی جبکہ ان کی شکل کے بارے میں تفصیلات ہمیں احادیث صحیحہ سے بھی نہیں ملتیں۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ ان کی ایک اور صفت آئی ہے اور وہ یہ ہے۔

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۶۶ : ۶)

"جن پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں"۔ اس میں بھی فرشتوں کی شکل کو متعین نہیں کیا گیا۔ احادیث میں جو کچھ آتا ہے وہ یہ ہی کہ رسول اللہ نے جبرئیل علیہ السلام کو دو مرتبہ اپنی اصل شکل میں دیکھا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اس کے چھ سو پر تھے اس سے بھی ان کی شکل و ہیئت کا تعین نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ معاملہ بھی علوم غیبیہ میں سے ایک ہے۔

ان کے دو دو یا تین تین یا چار چار پر ہیں اور انسانوں نے صرف پرندوں کے پر دیکھے ہیں۔ اس لیے اللہ فرماتے ہیں۔

يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵ : ۱) "وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے 'اضافہ کرتا ہے"۔ یوں اللہ کی مشیت بے قید ہے اور وہ خود اپنی بنائی ہوئی اشکال کا پابند نہیں ہے۔ اس کی مخلوقات میں ہم دیکھتے ہیں کہ لاتعداد شکلیں ہیں اور لاتعداد شکلیں ایسی ہیں جو ابھی تک ہمارے علم ہی سے باہر ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (۳۵ : ۱) "اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ یہ تبصرہ نہایت وسیع ہے اور زیادہ جامع ہے"۔ لہٰذا کسی صورت کے تعین کی ضرورت نہیں ہے۔ یعنی تمام شکلیں اللہ کی قدرت کے دائرے کے اندر آتی ہیں۔ ہر قسم کا تغیر و تبدل اللہ کی قدرت کے تحت ہوتا ہے۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

"اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جسے وہ بند کر دے اسے اللہ کے بعد پھر کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں۔ وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

اس سورہ کی اس دوسری آیت میں اللہ کی قدرتوں کا ایک رنگ دکھایا گیا ہے جبکہ پہلی آیت میں اللہ کی قدرت کا ذکر تھا۔ جب یہ رنگ کسی انسان کے تصور اور عمل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کے تصورات 'اس کا شعور' اس کا رخ' اس کے حسن و قبح کے پیمانے بھی اس رنگ میں رنگے جاتے ہیں اور اس کی پوری زندگی اس رنگ میں رنگی جاتی ہے۔

یوں کہ یہ رنگ انسان کو اس کائنات کی پوری قوتوں سے کاٹ کر اللہ کی قوت سے جوڑ دیتا ہے۔ اسے زمین و آسمان کی تمام مشکوک رحمتوں سے مایوس کر دیتا ہے۔ صرف اللہ کی رحمت سے جوڑتا ہے اور اس کا امیدوار بنا دیتا ہے۔ زمین و آسمان کے تمام دروازے بند کر کے صرف اللہ کا دروازہ کھلا چھوڑتا ہے اور اس کے سامنے زمین و آسمان کے تمام راستے بند کر کے صرف اللہ کا دروازہ کھلا چھوڑتا ہے۔ اس کے سامنے زمین و آسمانوں کے تمام راستے بند کر کے صرف اللہ کا راستہ کھلا چھوڑتا ہے۔

اللہ کی رحمت کے مظاہر متعدد ہوتے ہیں' لاتعداد ہوتے ہیں۔ اللہ نے انسانوں کی جس انداز سے تخلیق کی' اس کے

نفس کے اندر جو ممتاز قوتیں ودیعت کیں اور اپنی مخلوق میں سے جس طرح اسے مکرم بنایا صرف ان رحمتوں کو اگر انسان قلم بند کرنا چاہے تو وہ انتہاؤں تک نہیں پہنچ سکتا۔جس طرح اللہ نے انسان کے لیے اس کے ماحول کو سازگار بنایا ہے۔اس کے اردگرد' اس کے اوپر نیچے ہرچیز کو اس کے لیے مسخر کیا ہے اور اس کے اوپر جو انعامات کیے ہیں جنہیں وہ جانتا ہے اور وہ انعامات جنہیں وہ نہیں جانتا' یہ انعامات بے شمار ہیں' ان گنت ہیں۔

اللہ کی رحمت ان چیزوں میں بھی موجود ہے جو ممنوع ہیں۔ان میں بھی موجود ہے' جن کی اجازت ہے اور جس شخص پر اللہ کی رحمتوں کا دروازہ کھل جاتا ہے' اسے یہ رحمت ہرچیز میں نظر آتی ہے۔ ہر حال' ہر ماحول' اور ہر جگہ نظر آتی ہے۔اس کے شعور میں' اس کے ماحول میں جہاں بھی وہ ہو' جیسا بھی ہو' اگرچہ انسان ان تمام نعمتوں سے محروم ہو جائے جنہیں لوگ محرومیت سمجھتے ہیں۔اس رحمت سے اپنے آپ کو وہ ہر شخص محروم پاتا ہے جس پر اللہ اس کا دروازہ ہرچیز میں بند کر دیتا ہے۔ایسا شخص پھر ہر حال میں' ہر صورت میں اور ہر جگہ محروم ہی ہوتا ہے اگرچہ اس کے پاس بظاہر وہ سازو سامان موجود ہوں جس کو لوگ خوشحالی تصور کرتے ہیں۔

دنیا کے بے شمار سازو سامان ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ اللہ کی رحمت شامل نہیں ہوتی' وہ عذاب الٰہی بن جاتے ہیں اور کئی ایسی مشکلات ہوتی ہیں جن کے ساتھ اللہ کی رحمت شامل ہوتی ہے۔یہ مشکلات بذات خود رحمت بن جاتی ہیں۔ بعض اوقات انسان کانٹوں پر سوتا ہے مگر اس پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔یہ کانٹے اس کے لیے نرم بچھونا ہو جاتے ہیں۔بعض اوقات نرم و نازک بستر انسان کے لیے کانٹے بن جاتے ہیں اور بہت ہی اذیت کا باعث ہوتے ہیں۔انسان مشکل ترین کام کر رہا ہوتا ہے اور وہ اس کے لیے اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔وہ نہایت ہی پر تعیش زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے لیکن وہ اس کے لیے مصیبت ہوتی ہے۔بعض اوقات وہ ایک خوفناک صورت حالات میں گھس جاتا ہے اور وہ اس کے لیے امن ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ مشکلات کے بغیر مراحل عبور کر لیتا ہے اور وہ اس کے لیے ہلاکت کا باعث بن جاتے ہیں۔

اللہ کی رحمت کے ساتھ کوئی تنگی' تنگی نہیں رہتی۔اگرچہ کوئی جیل کی تاریکیوں میں ہو' یا ہلاکت کی دیواروں میں یا سخت مصائب میں ہو' بلکہ اللہ کی رحمت کے سوا تمام کشادگیاں تنگی ہوتی ہیں۔اگرچہ کوئی نعمتوں اور سہولتوں میں زندگی بسر کر رہا ہو' خوشحال ہو' اسے زندگی کی تمام سہولیات حاصل ہوں۔جب انسان اللہ کی رحمت کی وجہ سے قلبی طمانیت کا مقام حاصل کر لیتا ہے تو اس کے اندر سے نیک بختی' رضامندی اور اطمینان کے سرچشمے پھوٹنے لگتے ہیں اور یوں نفس کے اندر قلق' تھکاوٹ' واماندگی اور محنت و مشقت کی تکلیف دہ نیش زنیاں ختم ہونا شروع ہو جاتی ہیں اگرچہ وہ نفس کے اندر جمی ہوئی ہوں۔

اللہ کی رحمت کی کنجی تمام دروازوں کے لیے ماسٹر چابی ہے۔اس سے تمام دروازے کھل جاتے ہیں' اس سے تمام چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں اور تمام غلط راہیں مسدود ہو جاتی ہیں' انسان بے فکر ہو جاتا ہے' اللہ کی رحمت کا دروازہ کھل جانے سے پھر وسعتیں' کشادگیاں اور آرام و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔یہ ایک ایسا دروازہ ہے کہ اس کے کھل جانے سے تمام نفع بخش دروازے اور راستے کھل جاتے ہیں اور تمام غیر نفع بخش دروازے بند ہو جاتے ہیں اور جب یہ دروازہ بند ہو جائے تو تمام ایسے دروازے' کھڑکیاں اور راستے کھل جاتے ہیں جو نفع بخش نہیں ہوتے اور انسان تنگی' کرب' سختی' بے چینی اور واماندگی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات اللہ کا یہ فیض انسان کو ڈھانپ لیتا ہے' پھر اگر زندگی تنگ ہو یا مالی حالت اچھی نہ ہو' رہنے اور سہنے کے

حالات خراب ہوں تو کوئی پرواہ نہیں ہوتی ۔ یہ فیض رحمت ہی دوام' راحت' سعادت ہے ۔ اور جب اس رحمت کا دروازہ بند ہوتا ہے اور دوسری جانب سے رزق کشادہ ہوتا ہے اور ہر سامان کی آمد آمد ہوتی ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے تنگی' حرج اور شقاوت و بدبختی حاصل ہوتی ہے ۔

مال و دولت' صحت و قوت' شان و شوکت بھی بسااوقات رنج الم اور تھکاوٹ اور مشقت کا باعث ہوتے ہیں ۔ اگر دست قدرت اپنا فضل و رحمت کھینچ لے ۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور متاع حسن اور دنیا کے سازو سامان کو جمع کر دیا ۔ پھر کیا ہوتا ہے' ہر طرف آرام اور سکون ہوتا ہے ۔ دنیا میں عیش و عشرت اور آخرت کے لیے پوری تیاری ہوتی ہے ۔ ایسے لوگوں کے خلاف پھر دنیا پرستوں کے دل میں حسد اور کینہ برپا ہوتا ہے لیکن مال و دولت کے ساتھ ایک شخص کو اگر بخل دے دیا جائے تو وہ محروم ہو جاتا ہے یا مال و دولت کے ساتھ بیماری بھی دے دی جائے تو بھی وہ دنیا کے انعامات سے محروم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات مالدار سرکش ہو جاتا ہے اور اس کا مال تلف بھی ہو جاتا ہے ۔

بعض اوقات اللہ کسی کو اولاد دیتا ہے اور اس اولاد کے ساتھ رحمت خداوندی بھی شامل ہوتی ہے ۔ پھر یہ اولاد زینت حیات بن جاتی ہے ۔ خوشی اور سعادت کا باعث بن جاتی ہے اور آخرت میں' مزید اجر کا باعث بنتی ہے ۔ وہ اس شخص کے لیے نیک اور اچھے جانشین بن جاتے ہیں اور اسی اولاد کے ساتھ اگر رحمت خداوندی نہ ہو تو یہی میٹھی اولاد زحمت بن جاتی ہے' بلائے جان ہوتی ہے' باعث بدبختی اور پریشانی ہوتی ہے ۔ راتوں کی نیند حرام کر دیتی ہے اور دن کا آرام غارت کر دیتی ہے ۔ اللہ انسان کو صحت اور قوت دیتا ہے ۔ اب اگر اس صحت اور قوت کے ساتھ رحمت خداوندی بھی ہو تو یہ نعمت ہوتی ہے ۔ زندگی اچھی طرح بسر ہوتی ہے ۔ زندگی کی لذتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ لیکن اگر اس صحت و قوت کے ساتھ رحمت خداوندی شامل نہ ہو تو یہ صحت اور یہ قوت بلائے جان بن جاتی ہیں ۔ اور ایک صحیح اور قوی شخص مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ وہ اپنی صحت اور اپنی قوت کو ان کاموں میں کھپا دیتا ہے جو خود اس کی صحت اور قوت کے لیے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں ۔ اس کی روح اور اس کے اخلاق کی تباہی کے ساتھ ساتھ اس کی آخرت بھی تباہ ہو جاتی ہے ۔

بعض لوگوں کو اللہ مرتبہ اور مقام دیتا ہے اور اس کی رحمت ایسے لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے ۔ یہ مرتبہ و مقام اصلاح کا ذریعہ بن جاتے ہیں ۔ ملک میں امن قائم ہو جاتا ہے اور یہ مرتبہ و جاہ اس بات کا ذریعہ بن جاتے ہیں کہ انسان اپنے پیچھے اچھے اعمال اور اچھے آثار چھوڑے جو آخرت کا بہترین ذخیرہ ہوں ۔ اگر اللہ کی رحمت اقتدار اور جاہ کے ساتھ شامل نہ ہو تو وہ شخص بے چین رہتا ہے ۔ لوگوں پر ظلم کرتا ہے ۔ حد سے تجاوز کرتا اور سرکشی اختیار کرتا ہے ۔ لوگوں کے ساتھ نہایت بغض اور کینہ رکھتا ہے ۔ یہ جاہ و اقتدار ہی ایسے لوگوں کے لیے عداوت کا ذریعہ بن جاتا ہے اور ایسا شخص پھر ایسے کام کرتا ہے کہ اپنے لیے آخرت میں آگ کا ایک بہت بڑا سرمایہ جمع کر لیتا ہے ۔

گہرا علم اور طویل عمر اور جاہ و مرتبہ بدلتے رہتے ہیں ۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ علم و معرفت کسی کے لیے مفید ہوتے ہیں اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ طویل عمر باعث برکت ہو ۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ قلیل عمر ہی برکت کا باعث ہوتی ہے اور نہایت ہی قلیل مال و دولت بڑی سعادت مندی کا ذریعہ ہو جاتا ہے ۔

جماعت بھی ایک فرد کی طرح ہوتی ہے اور ملت بھی ایک فرد ہے ۔ ہر حال اور ہر صورت میں اور مثالوں پر غور

کرنے سے کوئی بھی نکالنا مشکل کام نہیں ہے۔

اللہ کی رحمت کی علامت یہ ہے کہ انسان اللہ کی رحمت کو محسوس کرے۔اس طرح اللہ کی رحمت پھر انسان کو سینے سے لگا لیتی ہے اور رحمت الٰہی کی بارش ہو جاتی ہے۔فیوض و برکات نازل ہوتے ہیں۔لیکن کسی کا یہ شعور کہ اس پر اللہ کی رحمت ہے'سب سے بڑی رحمت یہی ہے۔کسی انسان کا صرف اللہ سے امیدوار ہونا' اسی پر بھروسہ کرنا رحمت ہے۔ ہر معاملے میں اللہ سے امیدیں وابستہ کرنا اور اللہ پر اعتماد کرنا ہی رحمت ہے۔اور حقیقی عذاب یہ ہے کہ انسان اس سے چھپ جائے۔اس سے مایوس ہو جائے اور اس میں شک کرے۔یہ ایک ایسا عذاب ہے جو کسی مومن کے کبھی قریب ہی نہیں جاتا۔

اِنَّهٗ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ "اس میں شک نہیں ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس صرف کافر ہوا کرتے ہیں"۔

اللہ کی رحمت کا اگر کوئی طالب ہو تو وہ ہر کسی کو ہر جگہ مل جاتی ہے۔کسی کے لیے ناپید نہیں ہے۔ابراہیم علیہ السلام نے اسے آگ میں پایا۔یونس علیہ السلام نے اسے مچھلی کے پیٹ کے اندھیروں میں پایا۔موسیٰ علیہ السلام نے اسے سمندر کی لہروں میں پایا جبکہ وہ طفل ناتواں تھے۔پھر انہوں نے اسے فرعون کے محل میں پایا جبکہ وہ ان کا دشمن ہو گیا اور اس کی تلاش میں نکل گیا۔اصحاب کہف نے اسے غار میں پایا جبکہ محلات اور شہروں میں وہ اس سے محروم رہے جب انہوں نے یہ فیصلہ کیا۔

فَاْوٗا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ (۱۸ : ۱۶) "غار میں پناہ لے لو' تمہارا رب تمہارے لیے اپنی رحمت کی چادر بچھا دے گا"۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق نے اسے غار میں پایا جبکہ کفار ان لوگوں کا تعاقب کر رہے تھے۔اور ان کے قدموں کے نشانات کو تلاش کر کے غار کے دھانے تک پہنچ گئے تھے۔یہ رحمت ہر اس شخص کو ملتی ہے جو تمام دوسرے ذرائع سے مایوس ہو جائے اور اسے بالکل یہ امید نہ رہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور قوت بھی بچانے والی ہے اور وہ پوری طرح یقین کرتا ہو کہ اب اللہ کی رحمت ہی بچانے والی ہے اور تمام دروازوں کو چھوڑ کر وہ اللہ کے در پر سوالی ہو گیا ہو۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر اللہ اپنی رحمت کا دروازہ کسی پر کھول دے تو اس کا بند کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور جب اللہ اپنی رحمت کے دروازے کسی پر بند کر دے تو کوئی کھولنے والا نہیں ہوتا۔لہٰذا ایک سچے مومن کے دل میں کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔کسی سے کچھ امید نہیں رہتی۔کسی چیز کے چلے جانے کا خوف نہیں رہتا اور کسی چیز کی امید نہیں رہتی۔ کسی ذریعے کے فوت ہونے کا ڈر نہیں ہوتا اور کسی وسیلے کی موجودگی کی بھی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی۔اللہ کی مطلق مشیت ہی اصل فیکٹر ہے۔لہٰذا اللہ اپنی رحمت کے دروازے کھول دے تو کوئی بند کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ بند کر دے تو کوئی کھولنے والا نہیں ہے۔معاملہ براہ راست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔وہ عزیز و حکیم ہے۔وہ ایسے اندازے اور تقدیر مقرر کرتا ہے کہ کسی کو روکنے یا عطا کرنے کا کوئی اختیار ہی نہیں رہتا۔اللہ کی عطا اور اللہ کا روک لینا اس کی اپنی رحمت کے مطابق ہوتا ہے۔بلکہ اس کی اپنی حکمتوں کے مطابق ہوتا ہے اور اللہ کے ہر کام کے پیچھے ایک حکمت کام کر رہی ہوتی ہے۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا "اللہ جس رحمت کا دروازہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے اسے کوئی روکنے والا ہی نہیں ہے"۔ اللہ کی رحمت اور لوگوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں۔ لوگ براہ راست اللہ سے براہ راست طلب کر سکتے ہیں۔ وہ بلاواسطہ اور بلا وسیلہ طلب کر سکتے ہیں۔ صرف بندے کی طرف سے توجہ 'اطاعت 'امید' بھروسے اور سراطاعت خم کر دینے کی ضرورت ہے۔

وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهُ مِنْ بَعْدِهِ "اور جسے وہ بند کر دے اسے پھر اللہ کے سوا کوئی کھولنے والا نہیں ہے"۔

یہ آیت انسانی ضمیر کو انتہائی قرار و سکون اور انسانی شعور اور تصور کو نہایت ہی نمایاں کرتی اور انسانی اقدار اور پیمانوں کو اونچا معیار عطا کرتی ہے۔ انسانی شخصیت کو وقار اور اطمینان ملتا ہے۔

یہ ایک مختصر آیت ہے لیکن زندگی کے لیے بالکل ایک نیا نقشہ تیار کرتی ہے۔ انسانی تصور اور شعور کو نہایت مستحکم قدریں عطا کرتی ہے۔ ایسی قدریں جن میں نہ تزلزل ہے' نہ جھکاؤ اور نہ وہ وقتی باتوں سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ اثر انداز ہونے والے فیکٹر آئیں یا جائیں' بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں' عظیم ہوں یا چھوٹے ہوں' ان کا مبدا لوگ ہوں یا واقعات ہوں' یا اشیاء ہوں' ان سے یہ قدریں متاثر نہیں ہوتیں۔

یہ زندگی کی ایک صورت ہے اگر یہ عقیدہ انسانی زندگی میں بیٹھ جائے تو وہ واقعات 'اشیاء' افراد' بڑی بڑی قوتوں' اقدار اور حالات کے سامنے پہاڑ کی طرح سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو جائے۔ اگرچہ اس پر جن و انس باہم مل کر' سب کے سب ٹوٹ پڑیں۔ یہ تمام جن و انس نہ اللہ کی رحمت کے دروازے کو بند کر سکتے اور نہ اگر بند ہوں تو کھول سکتے ہیں۔ صرف اللہ ہی العزیز اور الحکیم ہے۔

اسلام کے آغاز میں اسلام اور قرآن نے انسانوں کا ایک ایسا ہی گروہ پیدا کر دیا تھا۔ یہ ایسا گروہ تھا کہ اللہ نے خود اپنی نگرانی میں اس قرآن کے ذریعہ پیدا کر دیا تھا' تاکہ یہ گروہ قدرت الٰہیہ کے لیے دست قدرت ہو۔ یہ گروہ اس زمین کے اندر وہ عقائد و تصورات تخلیق کرے جنہیں اللہ چاہتا تھا۔ وہ قدریں عطا کرے جن کو اللہ کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ وہ حالات اور صورت حالات پیدا کر دے جو اللہ چاہتا تھا اور دنیا کے اندر ایک ایسی زندگی' عملی زندگی قائم کر کے چلا جائے جس کے بارے میں آج جب ہم پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں افسانہ اور قصے' نظر آتے ہیں۔ وہ گروہ جو اللہ کی تقدیر تھا' اسے اللہ جس پر چاہتا تھا' مسلط کر دیتا تھا۔ اس کے ذریعہ اللہ نے کچھ کو اقوام کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا اور کچھ کو قائم کر دیا۔ جنہیں اللہ مٹانا چاہتا تھا یا جنہیں اللہ کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس لیے کہ یہ یہ گروہ اس قرآن کے الفاظ ہی کے ساتھ معاملہ نہ کرتا تھا' نہ خوبصورت نظریات و تصورات ہی سے بحث کرتا تھا بلکہ اس نے قرآن کو اپنی زندگیوں کے اندر عملاً قائم کر دیا تھا اور وہ گروہ قرآن کی دنیا میں زندہ رہتا تھا۔

وہی قرآن لوگوں کے پاس موجود ہے۔ یہ قرآن اب بھی ایسے گروہ پیدا کر سکتا ہے جو دنیا سے اقوام کو مٹا دیں اور دوسری اقوام کو اٹھا دیں۔ لیکن یہ تب ہو گا کہ قرآنی تصورات کسی گروہ کی زندگی میں ٹھوس شکل میں' عملی شکل میں بیٹھ جائیں' رائج ہو جائیں اور قرآن کسی گروہ کی زندگی میں چلتا پھرتا نظر آئے۔ اسے لوگ آنکھوں سے دیکھ سکیں اور ہاتھوں سے چھو سکیں۔

اب میں اس طرف آتا ہوں کہ اس مختصر آیت کے ذریعے میں نے معلوم کر لیا ہے کہ اللہ کی مجھ پر خاص رحمت

ہے ۔میں نے جب اس آیت کا سامنا کیا تو میں روحانی لحاظ سے نہایت ہی خشک ' فکری لحاظ سے بہت تنگ ' نفسیاتی لحاظ سے بہت ہی پریشان ' جسمانی اور سازوسامان کے لحاظ سے مشکل حالات میں تھا ۔ ایسے سخت اور شدید حالات میں ' میں نے اس آیت کا مطالعہ کیا ۔ اللہ نے مجھے اس آیت کی حقیقت تک پہنچا دیا ۔ یہ حقیقت میری روح میں انڈیل دی گئی ۔ گویا وہ ایک شراب طہور ہے جو میرے جسم کی رگ رگ میں سرایت کر رہی ہے اور میں اسے محسوس کر رہا ہوں ۔ یہ حقیقت ہے جس کا میں ادراک کر رہا ہوں ۔ محض تصور نہیں ہے ۔ یہ حقیقت بذات خود میرے لیے رحمت ہے اور یہ آیت میرے سامنے خود اپنی تفسیر بیان کر رہی ہے ۔ یہ ایک واقعی اور عملی تفسیر تھی ۔ جس طرح اس آیت کے اسرار و رموز میرے سامنے کھلے اسی طرح اللہ کی رحمت کے دروازے بھی میرے سامنے کھلے ۔ اس سے قبل میں اس آیت کو پڑھتا رہا اور اس آیت کے پاس سے اس سے قبل میں بارہا گزرا ہوں لیکن آج یہ آیت مجھ پر رحمت کا فیضان کر رہی ہے ۔ میں اس کے معانی اور مفہومات سے سیراب ہو رہا ہوں ۔ میں اس آیت کی حقیقت کو صاف صاف دیکھ رہا ہوں ۔ یہ آیت مجھے پکار رہی ہے کہ آیئے میں ادھر ہوں ۔ میں اللہ کی رحمت ہوں ' جس کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے ۔ ذرا دیکھئے اللہ کی رحمت کے کرشمے ۔

غور کیجئے میرے ماحول کی کوئی چیز نہیں بدلی لیکن میرے احساس نے اب ہر چیز کو ایک نیا رنگ دے دیا ہے ۔ یہ ایک نہایت عظیم رحمت ہے جو کسی پر ہو جاتی ہے ۔ اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں ۔ جس طرح اس آیت کے خزانے مجھ پر کھل گئے ۔ یہ ایک نعمت خداوندی ہے اور جب یہ کسی پر آتی ہے تو انسان اسے چکھتا ہے ۔ اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے لیکن ان کے لیے اس کو بیان کرنا مشکل ہوتا ہے ۔ اسی طرح اس احساس کو اور اس ذوق کو قلم بند کرنا ممکن نہیں ہوتا ۔ میں ایک عرصہ رحمت خداوندی کے اس فیضان میں زندہ رہا ہوں ' اسے محسوس کرتا رہا ہوں اور اسے پہچانتا رہا ہوں ۔ اپنی زندگی کے مشکل ترین حالات میں مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوئی ہے ۔ اب میری حالت یہ ہے کہ میں کشادگی ' خوشی ' سیرابی ' آزادی اور بے قیدی محسوس کرتا ہوں ۔ ہر چیز سے آزادی ' ہر کرب اور ہر رنج سے آزادی محسوس کرتا ہوں اور میں اسی جگہ ہوں ' جہاں تھا ۔ یہ اللہ کی رحمت ہی ہے جس کے دروازے مجھ پر کھل گئے ہیں ۔ یہ اللہ کا فیض ہی ہے جس کی مجھ پر اس آیت کے ذریعہ بارش ہو رہی ہے ۔ یہ آیت ہے ' قرآن کی بس ایک ہی آیت لیکن اس نے تاریک کوٹھڑی میں روشنی کا ایک طاق کھول دیا ہے ۔ اس نے میری سیرابی کے لیے خشک جگہ پر ایک چشمہ آب صافی بہا دیا ہے اور میں اب نہایت ہی کھلی شاہراہ پر رضائے الٰہی کی سمت نہایت ہی اطمینان کے ساتھ بڑھ رہا ہوں ۔ اور چشم زدن میں ۔ اذیت کے بجائے میری زندگی راحت میں بدل گئی ہے ۔ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ، حَمْدًا کَثِیْرًا "اے پروردگار ' جس نے اس قرآن کو اللہ کی رحمت بنا کر بھیجا مومنین کے لیے رحمت اور شفاء اور ہدایت"۔

مطالعہ کلام الٰہی کے دوران یہ ایک چمک تھی جسے میں نے قلم بند کر دیا ۔ اب دوبارہ ہم سورہ کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ پہلی دو آیات کے اندر جو اشارات تھے وہی تیسری آیت میں بھی ہیں ۔ لوگوں پر ان کے حوالے سے اللہ کے انعامات اور رحمتوں کا ذکر ہے ۔ اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ مالک اور حاکم اور رازق نہیں ہے ۔ تعجب انگیز اسلوب سے کہا جاتا ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ لوگ یہ اختیارات اللہ کے سوا کسی اور معبود کو دیتے ہیں ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ

غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۳

"لوگو' تم پر اللہ کے جو احسانات ہیں انہیں یاد رکھو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ ... کوئی معبود اس کے سوا نہیں' آخر تم کہاں سے دھوکا کھا رہے ہو؟"

اللہ کی نعمتوں کی تو یاد دہانی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ نعمتیں بہت ہی واضح اور کھلی ہیں' جو ان کو دیکھتے ہیں' محسوس کرتے ہیں اور چھوتے ہیں۔ لیکن وہ بھول جاتے ہیں۔ ان کو یہ نعمتیں یاد نہیں رہتیں۔

ذرا اس زمین و آسمان اور انسان کو گھیرے ہوئے اس کائنات پر نگاہ دوڑاؤ' ہروقت اللہ کے انعامات انسان پر برسا رہی ہے۔ رزق کے دروازے ان پر کھل گئے ہیں۔ ہر قدم پر ایک نعمت ہے۔ ہر لحظہ میں ایک نیا فیض ہے۔ آسمانوں اور زمین سے انسان کے لیے سہولیات چلی آرہی ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے آرہی ہیں جو وحدہ خالق و رازق ہے۔ اللہ کا فیض عام ہے اور یہ کس کی طرف سے ہے؟ سخت سے سخت مشرک بھی یہ نہیں کہہ سکتے۔

کیا ان فیوض و برکات اور رحمتوں کا نزول خالق کائنات اللہ کے سوا کوئی اور کر رہا ہے۔ جب اللہ کے سوا کوئی خالق اور رازق نہیں ہے تو پھر کیوں وہ نصیحت حاصل کر کے شکر الٰہی بجا نہیں لاتے؟ پھر کیوں وہ اللہ کی حمد و ثنا نہیں کرتے اور صرف اسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور بندگی سے منہ موڑتے ہیں؟ اس کے سوا تو کوئی حاکم نہیں ہے۔ آخر وہ ایسے خدا پر ایمان لانے سے کیوں منہ موڑتے ہیں جس میں کوئی شک نہیں ہے۔

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۳۵ : ۳) يٰاَيُّهَا النَّاسُ "آخر تم کہاں دھوکہ کھا رہے ہو؟" تعجب انگیز بات ہے کہ ایک ایسے واضح حق اور بین سچائی سے عقل مند لوگ منہ موڑیں جو رات اور دن انہیں رزق بھی دے رہا ہے اور پھر اس سے بڑا تعجب خیز امر اور کیا ہو گا کہ لوگ رب ذوالجلال کا انکار بھی نہیں کر پاتے اور اس کا اعتراف بھی نہیں کرتے؟

یہ تین ضربات تھیں' نہایت ہی قوی اور تیز جو عقل و خرد کی تاروں پر لگائی گئیں اور سورہ کا آغاز ہوا تاکہ پوری سورہ کے زمزمے کو لوگ توجہ سے سنیں۔ ہر آیت میں انسان کو جو تعلیم دی گئی ہے وہ انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے اور اس کے شعور میں ایک گہری حقیقت کے طور پر بیٹھ جاتی ہے۔ یہ تینوں ضربات باہم مربوط اور متناسب ہیں اور مختلف سمتوں سے ایک ہی اثر ڈالتی ہیں۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۰۰ ایک نظر میں

پہلا سبق اس کائنات کے نہایت ہی بنیادی تین حقائق پر تھا۔ یعنی یہ کہ اس کائنات کا خالق اور موجد اللہ وحدہ ہے۔ رحمت کا خزانہ اسی کے پاس ہے اور رازق بھی وہی وحدہ ہے۔ اس دوسرے سبق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ ان لوگوں کی تکذیب اور انکار سے پریشان نہ ہوں۔ ان کا اور ان کے ردعمل کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں اور لوگوں سے زوردار اور بلند آواز کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدۂ قیامت برحق ہے اور شیطان سے خبردار رہیں کیونکہ اس کا مشن ہی یہ ہے کہ تمہیں ان عظیم حقائق سے بدراہ کرے۔ تمام لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ جو ایمان لائیں گے ان کا صلہ کیا ہو گا اور جو شیطان کے دھوکے میں آ جائیں گے ان کا انجام کیا ہو گا۔ آخر میں دوبارہ حضور اکرمؐ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو پریشان کر کے اپنی جان نہ گھلائیں۔ ہدایت و ضلالت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگوں کی صنعت کاریوں کے بدلے ان کو ملتی ہے اور اللہ ان کے کارناموں سے واقف ہے۔

---000---

درس نمبر ۲۰۰ تشریح آیات

۴--- تا--- ۸

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۴

"اب اگر (اے نبیؐ) یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) تم سے پہلے بھی بہت سے رسولؐ جھٹلائے جا چکے ہیں اور سارے معاملات آخر کار اللہ ہی کی طرف رجوع ہونے والے ہیں"۔

یہ عظیم حقائق بالکل واضح ہیں۔ اگر پھر بھی یہ لوگ تکذیب کرتے ہیں تو آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کیا آپ سے پہلے رسول نہیں آتے رہے۔

فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ (۳۵ : ۴) "تم سے پہلے بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں"۔ تمام امور اللہ کے لیے ہیں اور تمام معاملات کے فیصلے اللہ کی طرف جاتے ہیں۔ تبلیغ و تکذیب تو ایک روٹین کام ہے۔ یہ اللہ نے اسباب مقرر کیے ہیں۔ انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انجام کی تدبیر وہ جس طرح چاہتا ہے، کرتا ہے۔ لوگوں کو دوسری آواز یہ دی جاتی ہے کہ خبردار!

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٚ وَ لَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۵ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۶

"لوگو، اللہ کا وعدہ یقیناً برحق ہے، لہٰذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے، اور نہ وہ بڑا دھوکے باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے پائے، درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنے پیروؤں کو اپنی راہ پر اس لیے بلا رہا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں"۔

اللہ کا وعدہ برحق ہے اور وہ واقع ہونے والا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ جب یہ حق ہے تو حق ہوتا ہی وہ ہے جو واقع ہونے والا ہو۔ حق نہ ضائع ہوتا ہے، نہ باطل ہوتا ہے اور نہ کالعدم ہوتا ہے، نہ اپنا دھارا اور راستہ بدلتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان کو صرف یہ دنیاوی زندگی دھوکہ دیتی ہے۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (۳۵ : ۵) "لہٰذا دنیا کی زندگی تمہیں دھوکہ نہ دے"۔ لیکن شیطان تو رات اور دن لگا ہوا ہے دھوکہ دینے میں' اس لیے تم کو چاہئے کہ اس سے چوکنے رہو۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۳۵ : ۵) "اور نہ کوئی بڑا دھوکہ باز تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ دینے پائے"۔ شیطان نے اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ تمہارا دشمن ہے اور اسے تمہاری دشمنی پر اصرار بھی ہے۔

فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا (۳۵ : ۶) "لہٰذا تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو"۔ اس کی طرف نہ جھکو" اسے اپنا ناصح نہ سمجھو۔ اس کے نقش قدم پر نہ چلو کیونکہ دشمن' دشمن کے قدم پر نہیں چلا کرتا۔ اگر وہ عقلمند ہے کیونکہ دشمن انسان کو کبھی بھی بھلائی کی طرف نہیں بلاتا اور نہ دشمن دشمن کی فلاح و نجات چاہتا ہے۔

اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۳۵ : ۶) "وہ تو اپنے پیروؤں کو اپنی راہ پر اس لیے چلا رہا ہوتا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں"۔ کیا کوئی عاقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ جہنمیوں میں سے ہو جائے۔

یہ ایک وجدانی احساس ہے۔ جب انسان اس بات کو ذہن میں رکھ لے کہ اس کے اور شیطان کے درمیان معرکہ جاری ہے تو وہ اپنی پوری قوت مجتمع کر لیتا ہے۔ وہ ہروقت بیدار رہتا ہے اور اپنی ذات اور اپنے خیالات کا دفاع کرتا ہے۔ وہ دشمن کے دھوکے اور گمراہ کن اقدامات سے اپنے آپ کو بچاتا ہے اور وہ ہر وسوسہ اندازی سے بیدار رہتا ہے۔ ہر نئی بات کو اللہ اور رسول کے پیمانوں سے پیمائش کرتا ہے تاکہ وہ معلوم کر سکے کہ یہ حقیقت ہے یا دھوکہ ہے۔

یہ ایک وجدانی حالت ہے جسے قرآن ہر ضمیر میں پیدا کرنا چاہتا ہے یعنی ہروقت شیطانی وساوس سے بچاؤ کے لیے تیار رہنا اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنا۔ جیسا کہ کوئی شخص یا ملک اپنے دشمن سے ہروقت چوکنا رہتا ہے۔ اور اس کے شر و فساد کا مقابلہ کرنے کے لیے ہروقت تیار رہتا ہے۔ دشمن کے ذہنی اور جسمانی شر سے بچاؤ کے لیے۔ اور ہروقت کسی بھی معرکے میں کود نے کے لیے تیاری کی حالت کا برقرار رکھنا' اسی احتیاط' مدافعتی تیاری اور احتیاطی تدابیر کو مزید مستحکم کرنے کے لیے بتایا جاتا ہے کہ کافرین کا انجام کیا ہو گا اور اہل اسلام کا کیا ہو گا۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۬ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۷

۷ ع ۱۳

"جو لوگ کفر کریں گے ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے"۔ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ شیطان کس طرح انسان کو گمراہ کرتا ہے اور شیطان کا عمل اور اس کی گمراہ کن چالیں کیسی ہوتی ہیں۔ وہ کون سا دروازہ کھول دیتا ہے جس سے ہر قسم کا شر در آتا ہے۔ کس طرح وہ انسان کو راہ

ضلالت پر دور تک لے جاتا ہے تاکہ وہاں سے کوئی واپس نہ آسکے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖؗ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝

(بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس شخص کی گمراہی کا) جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے اچھا سمجھ رہا ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے 'راہ راست دکھا دیتا ہے۔پس (اے نبیؐ) خواہ مخواہ تمہاری جان ان لوگوں کی خاطر غم و افسوس میں نہ گھلے۔جو کچھ یہ کر رہے ہیں 'اللہ اس کو خوب جانتا ہے"۔

شر کا دروازہ اور اس کی کنجی یہ ہے کہ انسان کے لیے اس کے برے اعمال کو اچھا بنا دیا جائے۔شیطان یہی کام کرتا ہے کہ انسان کے لیے اس کے برے اعمال اچھے بنا دیئے جاتے ہیں اور وہ برے کاموں کو اچھے کام سمجھتا ہے۔وہ جس قدر برے افعال کرتا ہے 'وہ سمجھتا ہے کہ وہ اچھا کر رہا ہے اور وہ کام اسے لگتے بھی اچھے ہیں۔ایسا شخص کبھی اپنے اعمال کا جائزہ بھی نہیں لیتا کہ ان میں کیا کیا غلطی کے مقامات ہیں کیونکہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ غلطی نہیں کرتا۔اسے پختہ یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ کہتا اور کرتا ہے 'وہ درست ہے۔وہ اپنے قول و عمل پر اتراتا ہے اور اپنے کاموں سے اسے عشق ہو جاتا ہے۔اسے یہ خیال بھی نہیں آتا ہے کہ وہ اپنے کسی کام پر نظرثانی کرے یا اپنا محاسبہ خود کرے۔لہٰذا وہ اپنے کسی خیال اور کسی عمل سے رجوع نہیں کرتا۔کیونکہ جب کوئی سمجھے کہ وہ اچھا کر رہا ہے تو وہ کس طرح اسے چھوڑ سکتا ہے کیونکہ اچھے کام کبھی نقصان دہ نہیں ہوتے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا (۳۵:۸) "بھلا ہے کچھ ٹھکانا اس شخص کی گمراہی کا جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو"۔

یہ ہے وہ عظیم مصیبت جو انسان پر شیطان لاتا ہے اور یہ ہے وہ مقام جہاں تک شیطان انسان کی راہنمائی کر کے اسے لے جاتا ہے۔پہلے اسے گمراہ کرتا ہے 'پھر اسے ہلاکت کے گڑھے میں گراتا ہے۔

جس شخص کے لیے اللہ ہدایت اور بھلائی لکھ دیتا ہے اس کے دل میں احساس 'شعور 'احتیاط اور غور و فکر کی عادت ڈال دیتا ہے۔وہ اللہ کی تدبیروں سے غافل نہیں رہتا۔اور نہ اس بات سے غافل ہوتا ہے کہ اللہ انسان کے دل کو کسی بھی وقت بدل سکتا ہے۔نہ وہ انسان کی فطری کمزوری 'تزلزل اور خطاکاری سے غافل رہتا ہے۔نہ وہ انسان کے فطری نقص اور عاجزی کو نظرانداز کر سکتا ہے۔ایسا شخص ہروقت اپنے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔ہروقت اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے۔اپنے بارے میں بہت حساس رہتا ہے۔وہ شیطان سے ہروقت ڈرتا ہے اور ہروقت اللہ کی مدد اور نصرت کا امیدوار ہوتا ہے۔

یہ ہے مقام امتیاز اور جدائی ہدایت و ضلالت اور فلاح اور بربادی کے درمیان ...... یہ ایک گہری نفسیاتی حقیقت ہے

جس کی تصویر کشی قرآن کریم ان الفاظ میں کرتا ہے۔

أَفَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ فَرَآهُ حَسَنًا (۳۵ : ۸) "بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس شخص کی گمراہی کا جس کے لیے اس کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ اسے اچھا سمجھ رہا ہو"۔

یہ ہے نمونہ اس گمراہ شخص کا جو تباہ و برباد ہو گیا اور آخر کار وہ ہلاکت کے برے انجام تک پہنچ گیا اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اس کے لیے اس کے برے اعمال کو مزین بنا دیا گیا۔ اس خوشنمائی کی وجہ سے وہ مغرور ہو گیا۔ یوں اس شخص کے دل پر اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ صحیح راہ کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ ایسا شخص کوئی اچھا کام بھی نہیں کر سکتا اس لیے کہ وہ خود اپنے کام کو اچھا سمجھتا ہے۔ ایسا شخص اپنی غلطی کی اصلاح بھی نہیں کر سکتا اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس سے غلطی سرزد ہی نہیں ہو سکتی۔ وہ کسی فاسد کام کی اصلاح بھی نہیں کر سکتا کیونکہ بزعم خود اس سے فاسد کام کا صدور ہی نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص ایک حد پر جا کر رکتا بھی نہیں کیونکہ وہ اپنے ہر قدم کو اصلاح سمجھتا ہے۔ غرض شیطان کا صرف یہی کام تمام فسادوں کا دروازہ ہے اور آخری گمراہی کی چابی ہے۔

یہاں اللہ سوال فرماتے ہیں کہ اس شخص کی گمراہی کی کیا حد ہو گی جس کے لیے اس کے برے اعمال خوبصورت بنا دیئے گئے ہیں اور وہ انہیں اچھا سمجھتا ہے؟ اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ اس کا کوئی جو جواب بھی دے وہی جواب ہو گا۔ کیا ایسے شخص کی اصلاح کی امید کی جا سکتی ہے؟ کیا یہ شخص اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو ہر وقت اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا رہتا ہے اور اللہ سے ڈرتا ہے۔ کیا یہ شخص اللہ سے ڈرنے والوں جیسا ہو سکتا ہے۔ غرض اس سوال کا اب جو جواب بھی دیں وہی جواب ہو گا۔ یہ وہ اسلوب ہے جو قرآن کریم میں بہت آتا ہے۔ لیکن اس میں ان جوابات میں سے ایک جواب کی طرف بالواسطہ اشارہ کر دیا گیا ہے۔

فَإِنَّ اللَّهَ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ (۳۵ : ۸) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہ راست دکھاتا ہے"۔ گویا یہ جواب دیا گیا کہ جس شخص کے لیے شیطان اس کے اعمال کو خوشنما بنا دے ایسے شخص پر ضلالت لکھ دی جاتی ہے۔ اس کے لیے اللہ نے ضلالت کا راستہ کھول دیا ہے۔ وہ اس کے اندر چلا گیا ہے، اس کی واپسی کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ اللہ کا اختیار ہے کہ وہ جسے چاہے ہدایت دے دے اور جسے چاہے، ضلالت دے دے۔ یوں کہ جو شخص طالب ضلالت ہوتا ہے اسے ضلالت ملتی ہے اور جو طالب ہدایت ہوتا ہے، اسے ہدایت مل جاتی ہے۔ ضلالت کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ وہ برے اعمال کو اچھا دکھاتی ہے اور ہدایت کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ ہدایت پانے والا ہر معاملے میں محتاط ہوتا ہے، ڈرتا ہے، محاسبہ کرتا ہے اور یہی فرق ہے ہدایت اور ضلالت کا۔

اور جب فیصلہ یہی ہے۔

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ (۳۵ : ۸) "آپ اپنی جان کو ان لوگوں کے غم میں نہ

جملائیں"۔ یہ معاملہ ہدایت و ضلالت کا معاملہ ہے جو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ یہ بشر خود رسول اللہؐ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ دل اللہ کی انگلیوں کے درمیان رہیں اور اللہ مقلب القلوب ہے۔ اس طرح اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہیں۔ تاکہ آپ کا رحیم و شفیق دل قرار پکڑے کیونکہ آپ سے ان لوگوں کی گمراہی دیکھی نہ جاتی تھی۔ جبکہ آپ دیکھ رہے تھے کہ ان بیچاروں کا کس قدر برا انجام ہونے والا ہے اس لیے آپ کا دل جوش مارتا تھا کہ آپ ان کے سامنے جو حق پیش کر رہے ہیں وہ اسے تسلیم کرلیں۔ یہ انسانی حرص ہے ہر شخص جانتا ہے کہ انسان جس چیز کو پسند کرتا ہے' وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ اسے قبول کرلیں اور اللہ کو رسول اللہؐ سے ہمدردی ہے کہ انکے احساسات پر یہ ناحق بوجھ ہے کیونکہ یہ حضورؐ کے اختیار اور استطاعت میں نہیں ہے کہ وہ سب کو ہدایت میں لے آئیں' یہ کام اللہ کا ہے۔

تمام مخلص داعیوں کو اس کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کی اہمیت' خوبصورتی اور افادیت کو دیکھتے ہیں۔ دوسری جانب عوام کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ وہ اس خوبصورتی' افادیت اور حسن کو محسوس نہیں کر سکتے جو داعی محسوس کرتا ہے۔ اس عدم احساس کی وجہ سے یہ اس دعوت سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ لہٰذا ایسے مخلص داعیوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کی اس ہدایت کو پلے باندھ لیں۔ اپنی پوری قوت دعوت میں جھونک دیں اور پھر لوگوں کو اللہ کے سپرد کر دیں۔ اگر کسی قوم کے لیے اللہ نے سچائی کو مقدر نہ کیا ہو تو اسے اپنے حال پر چھوڑ دیں اور مایوس نہ ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (۳۵:۸) "جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے"۔ وہی ہدایت کی تقسیم کرتا ہے اور کسی کے لیے ضلالت مقدر کرتا ہے۔ یہ سب کام اس کے علم اور اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ ان باتوں کو اس وقت سے جانتا ہے جب ان کا صدور بھی نہیں ہوا ہوتا۔ اسے پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہو گا۔ یہ تقسیم اس نے علم ازلی سے کر لی ہوئی ہے۔ لیکن اللہ اپنے علم ازلی کی بنیاد پر سزا نہیں دیتا۔ سزا اس وقت دیتا ہے جب ان سے اس معصیت کا صدور ہوتا ہے۔ یہاں دوسرا سبق ختم ہوتا ہے۔ اس سبق اور پہلے سبق کے درمیان گہرا ربط ہے اسی طرح آنے والے سبق سے بھی ربط ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۰۱ ایک نظر میں

یہ تیسرا سبق دراصل پے درپے اسفار پر مشتمل ہے۔ یہ سفر انسانی خیال کو' اس کائنات کی وسعتوں میں کرائے گئے ہیں اور قرآن نے ان اسفار میں انسان کو دلائل ایمان سے آگاہ کیا ہے۔ ان اسفار کے درمیان انسان کو جو مظاہر دکھائے گئے ہیں' ان سے قرآن دعوت اسلامی پر دلائل و براہین فراہم کرتا ہے۔

یہ اسفار اس مضمون کے بعد آئے ہیں کہ ہدایت و ضلالت کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ آپ منہ موڑنے والوں کے رویہ کی کوئی پرواہ نہ کریں اور ان کا معاملہ اس اللہ کے سپرد کر دیں جو ان کی تمام کارستانیوں سے باخبر ہے۔ اس سبق کا مضمون یہ ہے کہ اگر کوئی ایمان لانا چاہتا ہے تو یہ دیکھو دلائل ایمان اس کائنات میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ جس کے اندر کوئی پیچیدگی نہیں ہے لیکن بہرحال اگر کوئی گمراہ ہونا ہی چاہے تو وہ اس حال میں گمراہ ہو گا کہ دلائل ایمان ہر طرف سے اس کا گھیرا ڈالے ہوئے ہوں گے۔

صرف ایک منظر پر غور کرو' یہ زمین بالکل مردہ ہونے کے بعد سرسبز ہو جاتی اور زندہ و تابندہ ہو جاتی ہے۔ کیا اس میں اس بات کے لیے دلیل نہیں ہے کہ موت کے بعد اسی طرح لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ پھر انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور اسے اس کی موجودہ شکل میں ایک نہایت ہی برتر مخلوق بنایا گیا۔ یہ بھی ایک برہان ہے۔ پھر انسانی تخلیق کے مراحل میں سے ہر مرحلہ ایک حجت ہے اور انسان اپنے تخلیقی مراحل میں نہایت ہی طے شدہ نقشے کے مطابق آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے اور یہ نقشہ بھی کتاب مبین میں درج ہے اور ایک برہان ہے۔

پھر دو قسم کے پانی ایک ہی سمندر میں علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔ ایک میٹھا ہے دوسرا کھارا ہے۔ یہ بھی ایک حجت ہے۔ اور سمندروں کے اندر مزید اللہ کی نعمتیں ہیں اور ہر ایک چیز میں اللہ کی کبریائی ہے۔

پھر رات اور دن کا منظر جو ایک دوسرے کے اندر داخل ہوتے ہیں' بڑھتے گھٹتے ہیں۔ یہ بھی ایک حجت ہے اور اس نظام کو جاری کرنے میں بھی ایک حجت ہے۔ شمس و قمر کو ایک نظام کے اندر مسخر کر دیا جانا بھی ایک حجت اور دلیل ہے۔

یہ سب دلائل و براہین اس کائنات کے اندر بکھرے ہوئے ہیں اور یہ اللہ ہے جو خالق و مالک ہے اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسرے معبود سمجھے جاتے ہیں۔ وہ تو ایک گٹھلی کے برابر بھی تخلیق نہیں کر سکتے۔ جو نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دیتے ہیں۔ وہ قیامت کے دن ان کی عبادت سے براءت کا اظہار کریں گے اور یہ فیصلہ دیں گے کہ یہ لوگ گمراہ تھے اور سچائی کے علاوہ جو کچھ بھی ہے' گمراہی ہے۔

---ooo---

درس نمبر۲۰۱ تشریح آیات

۹ --- تا --- ۱۴

وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝۹

"وہ اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے' پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں' پھر ہم اسے ایک اجاڑ علاقے کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ سے اسی زمین کو جلا اٹھاتے ہیں جو مری پڑی تھی۔ مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہو گا"۔

یہ منظر قرآن میں دلائل تکوینی کے بیان کے دوران بار بار آتا ہے۔ ہواؤں کا منظر' بادلوں کا منظر' سمندروں کا منظر۔ بادلوں کو ہواؤں کا چلانا' سمندروں سے بخارات کا اٹھنا۔ گرم ہوائیں بخارات اٹھاتی ہیں۔ سرد ہوائیں ان کو کثیف کر کے بادل کی شکل دیتی ہیں۔ سمندروں سے یہ بخارات اور بادل پھر ہوا کی موجوں کی سمت میں شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی طرف چلتے ہیں جس طرف بھی اللہ کو ان کا چلانا منظور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ کر برستے ہیں اور جہاں مردہ زمینوں پر بارش ہوتی ہے۔ وہاں زمین زندہ ہو جاتی ہے۔

فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۵ : ۹) "اور اس کے ذریعے سے اس زمین کو جلا اٹھاتے ہیں جو مری پڑی تھی"۔ یوں یہ معجزہ برپا ہوتا ہے لیکن تعجب کی بات ہے کہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور ہر لحظہ اس قسم کے معجزات دیکھتے ہوئے بھی انہیں قیامت میں لوگوں کا اٹھایا جانا مستبعد نظر آتا ہے حالانکہ حشر و نشر تو ان کے ہاتھوں میں اس دنیا میں موجود ہے۔

كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (۳۵ : ۹) "مرے ہوئے انسانوں کا جی اٹھنا بھی اسی طرح ہو گا"۔ یہی سادہ طریق استدلال ہے قرآن کا۔ اسی طرح آسانی سے یہ عمل ہو گا' اللہ کے لیے اس میں کوئی دقت نہیں ہے۔

یہ منظر قرآن میں کائناتی دلائل کے بیان کے دوران بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ منظر ایسا ہے جسے ہر شخص دیکھتا ہے اور اس کے انکار کا کوئی جواز انسان کے سامنے نہیں ہے۔ پھر یہ منظر انسان کو بے حد جھنجھوڑتا ہے بشرطیکہ انسان اسے دیکھیں۔ اسے سمجھیں اس حال میں کہ ان کے دل زندہ ہوں اور جب بھی انسان اس منظر پر غور کرے تو یہ انسانی شعور پر چھا جاتا ہے۔ پھر یہ منظر ایک خوبصورت اور پسندیدہ منظر ہے۔ خصوصاً صحرائی علاقوں میں جہاں انسان ریگستانوں میں

جلتا رہتا ہے۔ اچانک جب سرسبز اور شاداب علاقہ آ جاتا ہے تو انسان کی نگاہ گرویدہ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ کل جب بارش نہ ہوئی تھی تو یہی علاقہ چٹیل میدان اور خشک صحرا تھا۔ قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ اپنے دلائل ایسے مناظر سے اخذ کرتا ہے جو انسان نے دیکھے ہوئے ہوں۔ جبکہ ان مناظر سے انسان روز گزرتے ہیں لیکن نہایت غفلت سے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ان مناظر پر انسان غور کرتا ہے تو اسے یہ منظر معجزات نظر آتے ہیں۔

اب روئے سخن مردہ زمین کے احیا کے موضوع سے ہٹ کر نفسیاتی شعور کے میدان میں آتا ہے۔ موضوع کی یہ تبدیلی بظاہر عجیب لگتی ہے یہ کہ عزت 'سربلندی' قوت اور شوکت کا سرچشمہ کیا ہے؟ اور عزت اور سربلندی کو مربوط کیا جاتا ہے۔ قول طیب اور قول صالح کے ساتھ 'کیونکہ قول صالح بھی اللہ کی طرف اٹھتا ہے اور عمل صالح بھی عزت اور رفعت پاتا ہے اور اس کے مقابلے میں قول خبیث اور عمل خبیث سرنگوں ہو کر ہلاکت اور تباہی کی طرف آتے ہیں۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَ مَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝۱۰

"جو کوئی عزت چاہتا ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔ اس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے 'اور عمل صالح اس کو اوپر چڑھاتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو بے ہودہ چال بازیاں کرتے ہیں' ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کا مکر خود ہی غارت ہونے والا ہے"۔

شاید مردہ زمین میں اٹھنے والی نباتاتی زندگی اور کلمہ طیبہ اور عمل صالح کے درمیان ربط یہ ہے کہ دونوں میں پاکیزہ زندگی اور قدر مشترک ہے۔ نباتات کی بھی طیب زندگی ہے اور عمل صالح اور کلمہ طیبہ بھی پاک زندگی ہے۔ اور ان کے درمیان ربط اور تعلق وہی ہے جس کی طرف سورہ ابراہیم کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی کائنات کے مزاج اور اسلامی زندگی کے مزاج کی یکسانی سورہ ابراہیم میں فرمایا:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَاۗءِ (۲۴) تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (۲۵) وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِۨ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (۲۶) (ابراہیم ۲۴ تا ۲۶) "کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی

ہیں ۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے ۔ یہ مثالیں اللہ اس لیے دیتا ہے کہ لوگ اس سے سبق لیں اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بد ذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے ۔ اس کے لیے کوئی استحکام نہیں ہے"۔ یہ ایک حقیقی مشابہت ہے جو ایک پاک کلمہ اور پاک درخت کے درمیان پائی جاتی ہے ۔ دونوں کے اندر حیات اور برہنہ موجود ہے ۔ ایک کلمہ اور نظریہ بھی نشوونما پاتا ہے اور بار آور ہوتا ہے اور ایک درخت بھی نشوونما پاتا ہے اور پھل دیتا ہے ۔ دونوں کی ایک ہی مثال ہے ۔

مشرکین اس لیے شرک کرتے تھے کہ مکہ کے اندر ان کا جو دینی مقام تھا وہ برقرار رہے ۔ محض عقیدے اور نظریہ کی وجہ سے وہ دوسرے قبائل سے برتر تسلیم کیے جاتے تھے ۔ پھر ان کو مالی مفادات بھی حاصل تھے ۔ مثلاً ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس وجہ سے وہ پرشوکت اور پرقوت تھے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے تھے ۔

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا "اگر تمہارے ساتھ ہدایت کے تابع ہو جائیں تو ہمیں ہماری زمین سے اچک لیا جائے گا"۔۔۔ لہٰذا اللہ فرماتے ہیں :

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا (۳۵ : ۱۰) "جو کوئی عزت چاہتا ہو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے"۔ یہ حقیقت جب کسی کے دل میں بیٹھ جائے تو اس انسان کی قدریں اور حسن و قبح کے اصول بدل جاتے ہیں ۔ ان قدروں کے حصول کے ذرائع اور منصوبے ہی بدل جاتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ عزت سب کی سب اللہ کے لیے ہے اور عزت کا کوئی حصہ بھی اللہ کے سوا کسی کا نہیں ہے ۔ اگر کوئی عزت چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ عزت اپنے مصدر حقیقی سے طلب کرے اور اللہ کے سوا عزت کا کوئی سرچشمہ نہیں ہے ۔ اگر کوئی اللہ کے ہاں عزت طلب کرے گا تو وہاں لازماً جائے گا اور اسے عزت ضرور ملے گی اور اگر کسی اور دروازے پر عزت تلاش کرے گا تو خوار ہو گا اس لیے کہ ۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا "عزت تو سب کی سب اللہ کے ہاں ہے"۔

قریش اپنے بت پرستانہ عقیدے کی وجہ سے لوگوں سے عزت چاہتے تھے ۔ وہ لوگوں کے علی الرغم ہدایت قبول کرنے سے ڈرتے تھے حالانکہ وہ سمجھتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو دعوت دیتے ہیں وہ ہدایت ہے ۔ وہ اس لیے ڈرتے تھے کہ ان کے مقام و مرتبہ میں فرق نہ آجائے ۔ جن عوام اور قبائل سے وہ ڈرتے تھے ان کے پاس عزت کا کوئی سرچشمہ ہی نہ تھا ۔ وہ عزت کے مالک ہی نہ تھے ۔ عزت کا مالک تو اللہ ہے ۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا "بے شک عزت اللہ کی ہے"۔ اگر قریش قوی تھے تو قوت کا مصدر بھی اللہ ہی ہے ۔ لہٰذا ان کا فرض ہے کہ وہ عزت اور قوت اور شوکت اپنے اصلی مصدر سے لیں 'لوگوں سے نہ لیں ۔ یہ لوگ تو خود عزت کے طالب ' محتاج اور کمزور ہیں ۔

اسلامی نظریہ حیات کے حقائق میں سے یہ اولین حقیقت ہے ۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ اگر کسی کے ذہن میں بیٹھ جائے تو اس کی قدریں بدل کر رکھ دیتی ہے ۔ حسن و قبح کے پیمانے بدل دیتی ہے ۔ اقوام کے فیصلے اور ان کی تقدیریں بدل دیتی ہے ۔ ان کا منہاج زندگی اور طرز عمل بدل جاتا ہے ۔ وہ اپنے اسباب و وسائل بدل دیتے ہیں ۔ ہمیں چاہئے کہ ہم صرف

اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیں اور پھر پوری دنیا کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں ۔ پھر ہم دنیا میں نہایت معزز' پروقار اور مستقل مقام و مرتبہ پائیں گے ۔ اقوام عالم میں ہمارا وزن ہو گا۔ یہی ہے عزت و وقار کا طریقہ ۔ ایک مسلمان کے لیے اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں ہے ۔

جب کسی دل میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو وہ دل پھر کسی جبار و قہار کے سامنے نہیں جھکتا۔ وہ کسی تند و تیز طوفان سے بھی نہیں ڈرتا ۔ کوئی عظیم حادثہ بھی اس کے عزائم کو ختم نہیں کر سکتا۔ کوئی صورت حال اور کوئی حکومت اسے متاثر نہیں کر سکتی ۔ کوئی مملکت اور کوئی مصلحت اسے متاثر نہیں کر سکتی ۔ اس کرۂ ارض کی قوتوں میں سے کوئی قوت اسے نہیں جھکا سکتی اور کیوں ایسا ہو سکے ؟ جب کہ ہر قسم کی قوت کا سرچشمہ اللہ کے پاس ہے اور اس کے سوا کسی کے پاس کوئی قوت نہیں ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں کلمہ طیبہ اور عمل صالح کا ذکر ہوتا ہے ۔

اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ (۳۵ : ۱۰) "اس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ پاکیزہ قول ہے اور عمل صالح اس کو اوپر اٹھاتا ہے"۔

اس عظیم حقیقت کے ذکر کے بعد اس تبصرے کا ایک خاص مفہوم اور اشارہ ہے ۔ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کوئی عزت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے ذرائع کیا ہیں ؟ وہ ہیں قول طیب اور عمل صالح ۔ قول طیب سیدھا اللہ کی طرف بلند ہوتا ہے اور عمل صالح اللہ کی طرف اٹھایا جاتا ہے ۔ یوں اللہ عمل صالح کو مکرم بناتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قول طیب اور عمل صالح کے مالک ہمیشہ سربلند اور معزز اور مکرم ہوتے ہیں اور ان کو عزت عطا ہوتی ہے ۔

صحیح عزت وہ ہوتی ہے جو قبل اس کے کہ اس دنیا میں وہ نمودار ہو یا اس کے آثار نمودار ہوں ایک شخص کے قلب میں بیٹھتی ہے ۔ جب یہ حقیقت کسی دل میں بیٹھ جائے تو ایسا شخص ذلت اور سرنگونی کے تمام اسباب کے دائرے سے باہر نکل آتا ہے ۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جب کسی کے دل میں بیٹھ جائے تو سب سے پہلے تو وہ خود اپنے نفس امارہ پر قابو پا لیتا ہے ۔ یہ سب سے پہلے اپنی سفلی خواہشات کو کنٹرول کر لیتا ہے ۔ جب کوئی انسان ان انسانی کمزوریوں پر قابو پا لے تو پھر اس کو ذلیل کرنے اور تابع کرنے کا کوئی سبب ہی نہیں رہتا ۔ لوگوں کو جو چیز ذلیل کر کے رکھ دیتی ہے وہ ان کی خواہشات اور رغبات ہوتی ہیں ۔ ڈر اور لالچ ہوتا ہے اور جو شخص ان کمزوریوں پر غالب آ جاتے وہ گویا تمام انسانوں پر غالب آ گیا ۔ اور وہ یہ حقیقی عزت ہے جس کے ذریعے انسان سربلند' قوی اور نڈر ہو جاتا ہے ۔

عزت یہ نہیں ہے کہ انسان حق کے ساتھ معاند ہو' خود سر ہو اور باغی ہو اور باطل کو بلند کرنے کی سعی کرتا ہو نہ قوت اس بات کا نام ہے کہ کوئی فاسق و فاجر ہو جائے ' اللہ کا باغی اور نافرمان ہو جائے اور نہایت ہی جبر اور اصرار کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کرے اور نہ قوت اس بات کا نام ہے کہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے کوئی آزادانہ شہوت رانی اور بے حیائی کا رویہ اختیار کرے ۔ نہ قوت یہ ہے کہ کوئی بغیر کسی اصول اور ضابطے کے طاقت کا استعمال کرے اور انصاف اور اصلاح کے مقاصد کے بغیر پکڑ دھکڑ شروع کر دے ۔ ہرگز نہیں 'بلکہ قوت یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پا لے ۔ انسان ذلت اور غلامی کا مقابلہ کرے 'اللہ کے سوا کسی اور کے سامنے نہ جھکے اور صرف اللہ وحدہ کے سامنے عاجزی اور خشوع کرے ' اللہ کا خوف کرے 'اس سے ڈرے 'خوشی اور غم دونوں حالتوں میں اللہ سے ڈرے ..جب کوئی ایسی قوت حاصل کر لے تو پھر اس کی پیشانی بلند ہو گی اور ایسا انسان ہر اس بات کا مقابلہ کر سکے گا جسے اس کا ضمیر پسند نہ کرتا ہو ۔ اور ایسا انسان اللہ

کی رضا کے سوا کسی اور چیز کو خاطر میں نہ لائے گا ـ یہ ہے کلمہ طیبہ اور عمل صالح کا مقام ـ عزت کے حوالے سے اور سیاق کلام میں بات کی مناسبت اور ربط کے ... ـ اس کے بعد صفحہ بالمقابل کی تکمیل یوں کی جاتی ہے ـ

وَ الَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَ مَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ

"رہے وہ لوگ جو بیہودہ چال بازیاں کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کا مکر خود ہی غارت ہونے والا ہے"۔ (۳۵ : ۱۰) یمکرون کے اندر تدبیر کے معنی بھی شامل ہیں لیکن یہاں مکر بمعنی سازش اور چال اس لیے استعمال ہوا ہے کہ اس کا اکثر استعمال برے معنوں ہی میں ہوتا ہے ـ ایسے لوگوں کے لیے عذاب شدید ہے اور یہ عذاب تو ان کے لیے مقدر ہے کہ ان کی یہ چال بازیاں غارت جائیں گی' نہ قائم رہیں گی اور نہ ان کا کوئی نتیجہ نکلے گا ـ یہ "بور" ہے اور "بور" اور "بوران" دونوں کے ایک ہی معنی ہیں ـ آیت سابقہ میں چونکہ اشارہ زمین کی آبادی اور پھل دینے کے معنی کی طرف تھا' یہاں اس کے بالمقابل بوران کا لفظ لایا گیا ہے جس میں پھل ضائع ہو جانے کے معنی ہیں ـ

جو لوگ یہ چال بازیاں کرتے ہیں وہ جھوٹی عزت حاصل کرنے کے لیے یہ کام کرتے ہیں ـ چاہتے ہیں کہ سوسائٹی میں عام لوگوں کی نظروں میں' وہ معزز ہوں ـ بظاہر وہ بڑے لوگ اور صاحب عزت ہوں اور قوت والے نظر آئیں ـ یہاں عزت ذرا وسیع مفہوم میں ہے لیکن ہر بری تدبیر جس میں قول طیب نہ ہو اور عمل صالح نہ ہو' اس کا مدبر کبھی بھی معزز' پروقار اور صاحب قوت نہیں ہوتا ـ اگرچہ بعض اوقات وہ ایک مختصر وقت کے لیے اپنا رعب جما لیتا ہے لیکن آخر کار وہ ہلاکت کی طرف جاتا ہے ـ یہ اللہ کا وعدہ ہے ـ اور اللہ اپنے وعدوں سے کبھی الٹ نہیں کرتا ـ ہاں وہ ہر مکار کو قدرے مہلت ضرور دیتا ہے لیکن جب وقت آتا ہے تو یہ تمام مکاریاں غارت چلی جاتی ہیں ـ

---000---

اب انسان کی پہلی زندگی اور پہلی پیدائش کا ایک منظر' اس سے قبل کے منظر میں بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک خشک زمین کو پانی کے ذریعہ کس طرح زندہ اور سرسبز و شاداب بنا دیتا ہے ـ انسان کی پیدائش میں اس کے زمانہ حمل مادر اور پھر اس کی طویل عمر یا قصیر عمل ـ یہ سب چیزیں اللہ کے علم اور منصوبے کے مطابق ہوتی ہیں ـ

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۱﴾

"اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفہ سے' پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے (یعنی مرد اور عورت) کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے ـ کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا ـ اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے ـ مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے ـ اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے"ـ

انسان کی پہلی تخلیق کی طرف قرآن کریم میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے کہ اسے مٹی سے پیدا کیا گیا۔ اسی طرح قرآن میں حمل کے ابتدائی مراحل کی طرف بھی مفصل اشارہ کیا گیا ہے ۔ یعنی نطفے کی طرف ۔ تراب وہ عنصر ہے جس میں زندگی نہیں ہوتی اور نطفہ وہ عنصر ہے جس میں زندگی ہوتی ہے ۔ اس کائنات کے عظیم معجزات میں سے ایک یہ ہے کہ اس بے جان عنصر میں کس طرح جان ڈال دی گئی اور حیات کس طرح پہلے عنصر کے ساتھ گھل مل گئی ۔ آج تک یہ راز معمہ ہے اور انسان ابھی تک اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکا ۔ یہ ایک قائم اور دیکھی جانے والی حقیقت ہے ۔ اس کے اعتراف کے سوا چارۂ کار بھی نہیں ہے ۔ یہ معجزہ خالق ' زندہ کرنے والے اور عظیم قدرت والے اللہ کی طرف انسان کو دھکیل کر لے جاتا ہے اور انسان کسی شکل میں بھی اسے رد نہیں کر سکتا اور نہ اس میدان میں کوئی چوں چرا کر سکتا ہے ۔

بے جان سے جان دار کی طرف کسی عنصر کو منتقل کرنا نہایت ہی بڑا انقلاب ہے اور یہ زمان و مکان کی دوریوں سے بھی زیادہ اہم ہے ۔ اس انقلاب پر ایک زندہ دل شخص جس قدر بھی غور کرے وہ ملول نہ ہو گا ۔ اس طرح اس کائنات کے اسرار بھی ختم نہ ہوں گے اور اس راہ میں علم کے آگے بڑھنے سے جو اسرار و رموز بھی کھلیں گے ہر اگلا راز پچھلے سے زیادہ عجیب ہو گا ۔

اب اس نطفے سے ذرا آگے بڑھیے ۔ ایک خلیہ کامل ہوتا ہے 'جنین بنتا ہے اور پھر ایک مرحلے میں اس جنین کی جنس کا تعین ہوتا ہے ۔ مرد اور عورت الگ الگ ۔ پھر وہ صورت بنتی ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے ۔

ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا (۳۵ : ۱۱) "پھر تمہارے جوڑے بنا دیئے" ۔ چاہے اس سے مراد یہ ہو کہ جنین کی حالت میں مذکر اور مونث کا امتیاز کر دیا یا اس سے مراد یہ ہو کہ ولادت کے بعد اور بالغ ہونے کے بعد شادیاں کر کے جوڑے بنا دیا ۔ یہ انقلاب بھی کیا فکر و نظر کے لیے کم ہے کہ نہایت چھوٹے نطفے سے یوں مذکر و مونث بنا دیا گیا تو یہ بھی ایک عظیم انقلاب ہے ۔ یا تو ایک چھوٹا سا نکتہ جو نطفے کی شکل میں ہے اور یا پھر ایک مکمل انسان جو ایک قوی ہیکل مخلوق ہے اور جس کے جسم کے اندر کثیر التعداد مشینیں ہیں جو مختلف کام کر رہی ہیں ۔ جس کی تفصیلات میڈیکل سائنسز میں موجود ہیں اور باہم بالکل جدا ہیں ۔

اب ہمارے زیر مطالعہ یہ سادہ خلیہ ہے ۔ یہ اب تقسیم در تقسیم ہوتا ہے اور اس سے اور خلیے نکلتے ہیں ۔ اب اس ایک خلیے سے خلیات کے مجموعے بنتے چلے جاتے ہیں اور اعضاء بنتے چلے جاتے ہیں اور ہر عضو کا ایک فریضہ مقرر ہوتا چلا جاتا ہے ۔ ان تمام اعضا سے ترکیب پا کر ایک انسان وجود میں آتا ہے اور اس کے تمام اعضاء باہم مربوط اور ہم آہنگ ہوتے ہیں ۔ یہ انسان ایک بالکل ممتاز مخلوق ہوتا ہے ۔ یہ اپنے ہم جنس بنی نوع انسان سے بھی الگ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے ۔ بلکہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی جدا ہوتا ہے ۔ ممکن ہی نہیں ہے کہ دو انسان بالکل ایک ہی جیسے ہوں ' حالانکہ یہ ایک ہی نطفے سے پیدا ہوئے اور اس کے اندر کسی فرق کا ادراک انسان کو نہ تھا ۔ پھر یہ خلیے مرد و عورت کی شکل اختیار کر کے جوڑے بن جاتے ہیں اور ان جوڑوں کے ذریعے پھر اس تخلیق کا تسلسل قائم ہوتا ہے اور یہ تسلسل انہی مراحل میں چلتا ہے ۔ وہی مراحل دوبارہ دہرائے جاتے ہیں ۔ یہ اس قدر عجیب سلسلہ ہے کہ جس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے ۔ اس وجہ سے قرآن میں اس اعجوبے کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے ۔ یہ ایک راز نہیں ہے بلکہ جسم انسانی میں رازوں کا مجموعہ ہے ۔ لوگ اگر اس پر تدبر کریں تو ایک انسان کے جسم میں بے شمار عجائبات ہیں اور انسان کی روح ان پر تدبر کر کے جاگ سکتی

ہے ۔یہی وجہ ہے کہ قرآن اس زاویہ سے انسان کو بار بار جھنجھوڑتا ہے اور جگاتا ہے ۔

اس باریک مطالعہ کو پیش کرنے کے بعد اللہ کے علم کی وسعت کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے ۔ جیسا کہ سورہ سبا میں اس کی تفصیلات آئی ہیں کہ اللہ کا علم بہت ہی وسیع ہے ۔ یہاں مذکر و مونث کی تخلیق اور حمل اور وضع حمل بھی اس کے علم میں رہتا ہے ۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ (۳۵ : ۱۱) ”کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ کوئی بچہ جنتی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے“۔ اب یہاں مذکر و مونث کا دائرہ عام کر دیا جاتا ہے ۔ انسان ' حیوان ' طیور ' مچھلیاں اور تمام حشرات الارض اس کے دائرے میں آجاتے ہیں ۔ چاہے ہم ان کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں کہ جن کا وضع حمل ہوتا ہے یا جو انڈے دیتے ہیں کیونکہ انڈا بھی ایک قسم کا حمل ہوتا ہے ۔ انڈے کے اندر جو جنین ہوتا ہے وہ ماں کے پیٹ میں نہیں بڑھتا بلکہ انڈے کے اندر بڑھتا ہے ۔ صرف انڈا ماں کے پیٹ سے باہر آجاتا ہے اور یہ بھی اللہ کی صنعت کاری کا ایک کرشمہ ہے کہ ایک عمل جو پیٹ کے اندر ہوتا ہے ' یہاں یہ پوری ٹیکنالوجی انڈے کے اندر پیٹ کے باہر کر دی جاتی ہے اور پھر وہ بڑھتی ہے اور ان سب عملوں کو اللہ جانتا ہے اور اس پر اس کا علم محیط ہے ۔ اس پوری کائنات کے مختلف اطراف ہیں ۔

اللہ کے علم کی یہ جامعیت ایسی ہے کہ ذہن انسانی اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا ۔ نہ تصور کے اعتبار سے اور نہ انداز تعبیر کے اعتبار سے جیسا کہ ہم نے سورہ سبا میں یہ نکتہ بیان کیا ۔ یہ توبذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ہی قرآن کا نازل کرنے والا ہے اور قرآن کا مصدر وسیع ذات باری ہے اور یہ ایک منفرد انداز استدلال ہے ۔ پھر مختلف افراد و اشیاء کی عمر بھی اللہ کے علم میں ہے اور کتاب میں درج ہے ۔

وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖٓ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ

(۳۵ : ۱۱) ”کوئی عمر پانے والا عمر نہیں پاتا اور نہ کسی کی عمر میں کچھ کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوتا ہے ۔ اللہ کے لیے یہ سب کچھ بہت آسان کام ہے ۔ جب خیال اس طرف جاتا ہے کہ اس کائنات میں نباتات ' پرندے ' حیوانات اور انسان اور دوسری چیزیں ' جن کے سائز اور حجم مختلف ہیں اور مختلف انواع و اقسام کی ہیں ۔ مختلف علاقوں اور زمانوں میں ہیں ' پھر انسان جب یہ تصور کرتا ہے کہ یہ عظیم تعداد ' جس کا صحیح علم صرف خالق ہی کو ہے ' اس کے ہر فرد کو ایک عمر دی جاتی ہے ۔ یہ عمر طویل ہو یا قصیر ہو ' اس میں زیادتی ہو یا کمی ہو ' سب کی سب ایک کتاب میں درج ہے اور اللہ سب کے بارے میں جانتا ہے ۔

بلکہ ہر ایک فرد کے جزء کے بارے میں بھی اللہ جانتا ہے کہ اس کی عمر کیا ہوگی ۔ زیادہ ہوگی یا کم ہوگی مثلاً کسی درخت کے پتے کی عمر کیا ہوگی ۔ کب نکلے گا اور کب گرے گا اور کب مٹی ہو گا ۔ ہر پرندے کے ہر پر کے بارے میں بھی اللہ کو معلوم ہے کہ وہ کب جسم سے الگ ہو گا ۔ ہر حیوان کا ہر سینگ کس قدر عمر پائے گا یا حیوانات کی باہم ٹکر میں کوئی سینگ ٹوٹ جائے گا ۔ پھر انسان کے اعضاء آنکھ اور کان وغیرہ یہ کب تک رہیں گے اور کب کام چھوڑ دیں گے ۔

یہ سب باتیں اللہ کی کتاب تقدیر میں درج ہیں ۔ اور اللہ کے علم میں شامل ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کو اس سلسلے میں کوئی جہد

کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۳۵ : ۱۱) "اللہ کے لیے یہ بہت آسان ہے"۔

جب انسانی خیال ان باتوں پر غور و فکر کرتا ہے اور ان لائنوں پر آگے بڑھتا ہے تو یہ بہت ہی عجیب نظر آتا ہے۔ اس آیت کے ضمن میں ہم اس طرف متوجہ ہوتے ہیں جس طرف انسانی خیال بالعموم متوجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح کی باتیں سوچنا انسان کی عادت ہی نہیں ہے۔ یہ صرف خداوند قدوس کی ہدایت ہے کہ تم ذرا اس انداز سے غور کرو۔

اور عمر کی زیادتی سال و ماہ کی تعداد کے ذریعے بھی ہوتی ہے اور عمر میں برکت کے ذریعے بھی ہوتی ہے۔ عمر میں برکت یوں ہوتی ہے کہ انسان کی عمر اچھے کاموں میں صرف ہو اور اس میں دوڑ دھوپ' مفید کام اور اعمال و آثار زیادہ ہوں۔ اور عمر کا نقص بھی اسی طرح ہے یا تو ماہ و سال کم ہو جائیں یا عمر کی افادیت کم ہو جائے اور اس سے برکت نکل آئے بجائے اس کے کہ انسان اچھے کام کرے اس کی زندگی خالی ہو۔

بعض اوقات زندگی کا ایک گھنٹہ بھی پوری عمر کے برابر ہوتا ہے۔ وہ افکار اور شعور اور احساسات سے بھرپور ہوتا ہے۔ اور اس کے اندر اونچے درجے کے اعمال عمل میں آجاتے ہیں اور اچھے نتائج نکلتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات انسان کا پورا سال خالی خولی گزر جاتا ہے اور اس کا کوئی حساب و کتاب نہیں ہوتا۔ اللہ کے نزدیک اس سال کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ یہ سب امور اللہ کے حساب و کتاب میں ہیں اور ہر موجود مخلوق کے بارے میں یہ سب امور صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

جماعتیں افراد کی طرح ہیں۔ اسی طرح اقوام بھی ایک فرد کی طرح ہیں۔ ان کی عمر کا بھی یہی قانون ہے۔ کسی کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے اور کسی امت کا پتہ جلد ہی کاٹ لیا جاتا ہے اور یہ سب معانی اس آیت میں داخل ہیں۔ امم کی بھی تقدیر ہوتی ہے اور وہ طاؤس و رباب پر ختم ہوتی ہے۔ تمام اشیاء کی بھی عمر ہوتی ہے جس طرح زندہ چیزوں کی عمر ہوتی ہے۔ ایک چٹان کی بھی عمر ہوتی ہے۔ ایک پہاڑ کی بھی عمر ہوتی ہے۔ ایک نہر کی بھی عمر ہوتی ہے اور ایک پتھر کی بھی عمر ہوتی ہے۔ پھر وہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ایک غار کی بھی عمر ہوتی ہے اور پھر وہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ایک نہر کی عمر ہوتی ہے اور جب عمر ختم ہو تو نہر خشک ہو کر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔

بعض اشیاء ایسی ہوتی ہیں جن کو انسان بناتا ہے۔ ان کی بھی عمر ہوتی ہے۔ مشینیں' کپڑے اور تمام دوسری مصنوعات کی بھی عمر ہوتی ہے اور اپنی مقررہ عمر پوری کر کے وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں --- اور یہ سب کام اللہ کی تقدیر میں ہیں اور معلوم و مقدر ہیں۔

اس زاویہ سے اگر امور پر تدبر کیا جائے تو اس کائنات کا مطالعہ ایک نئے افق سے ہوتا ہے۔ یہ کائنات کے مطالعہ کا یہ ایک نیا اسلوب ہے اور انسانی فہم و ادراک کی قوتوں کو ایک نیا شعور ملتا ہے۔ انسان محسوس کرتا ہے کہ اللہ کی قدرت اور علم وسیع اور شامل اور کامل ہے۔ لہذا انسان اس شعور کے ہوتے ہوئے کبھی غافل اور گمراہ نہیں ہو سکتا۔ وہ جہاں دیکھتا ہے' دست قدرت کی کاری گری نظر آتی ہے۔ اللہ کی نگرانی نظر آتی ہے اور ہر چیز میں اللہ کی مہربانی اور قدرت نظر آتی ہے۔

--- ooo ---

اب سیاق کلام کا رخ کائناتی مناظر کے ایک منظر کی طرف ہوتا ہے۔ سمندر کے پانیوں کے مناظر میں سے ایک منظر' پانیوں کی اقسام۔ یہ ہے میٹھا پانی اور وہ ہے سخت کھارا۔ دونوں قسم کے پانیوں کے پہاڑ سمندر کے اندر ساتھ ساتھ چلتے

ہیں ۔ دونوں انسانوں کی خدمت کرتے ہیں ' باہم ملتے نہیں ہیں ۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۖ وَمِن كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۖ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٢﴾

"اور پانی کے دونوں ذخیرے یکساں نہیں ہیں ۔ ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا ہے ' پینے میں خوشگوار اور دوسرا سخت کھاری کہ حلق چھیل دے ۔ مگر دونوں سے تم تروتازہ گوشت حاصل کرتے ہو ' پہننے کے لیے زینت کا سامان نکالتے ہو ' اور اسی پانی میں تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس کا سینہ چیرتی چلی جارہی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو"۔

پانی کی تخلیق میں انواع و اقسام واضح ہیں ۔ اور اس تقسیم کے پیچھے جو خدمت ہے وہ بھی واضح ہے ۔ میٹھے پانی کا استعمال تو واضح ہے ۔ رات اور دن ہم اسے استعمال کرتے ہیں ۔ ہر قسم کی زندگی تو پانی پر موقوف ہے اور پانی زندگی کا اہم عنصر ہے ۔ رہا کڑوا پانی مثلاً سمندر اور بڑے سمندر تو اس کے بارے میں بعض سائنس دانوں نے عجیب معلومات دی ہیں اور بتایا ہے کہ اس کی تخلیق میں کس قدر گہری انجینئرنگ کارفرما ہے ۔

"لاکھوں سالوں سے زمین مختلف قسم کے گیس چھوڑتی ہے اور ان میں سے اکثر گیسیں زہریلی ہوتی ہیں ۔ لیکن قدرت الہیہ کی منصوبہ بندی دیکھیے کہ زمین کے اوپر جو ہوا ہے ' اس کے اندر پائے جانے والی نسبت متاثر نہیں ہوتی ۔ جو انسان کے وجود کے لیے ضروری ہے ۔ اس عظیم توازن کی گاڑی پانی کی وہ عظیم مقدار ہے یعنی گہرا سمندر جس سے زندگی ' غذا ' بارش ' معتدل موسم اور نباتات اور پھر خود انسانی زندگی حاصل کرتے ہیں"۔

پانی کی تخلیق کے بارے میں آج تک جو راز معلوم ہوئے ہیں ' ان میں بالارادہ رکھی ہوئی حکمت بالکل واضح ہے ۔ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس تخلیق میں خالق نے بالارادہ توازن اور ہم آہنگی رکھی ہے ۔ اور ان ہم آہنگیوں اور توازنوں پر اس کائنات کی مختلف چیزوں کی زندگی قائم ہے اور حیات کا پورا نظام ایستادہ ہے ۔ اور یہ پیچیدہ نظام اللہ جل شانہ نے بالارادہ وضع کیا ہے ۔ یہ توازن اس قدر پیچیدہ ہے اور اس قدر باریک انجینئرنگ پر مبنی ہے کہ کوئی عقلمند انسان یہ نہیں سوچ سکتا کہ یہ اتفاقاً ایسا ہو گیا ہے ۔ یہاں دو قسم کے سمندری پانی کی طرف اشارے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پانی ایک دوسرے کے ساتھ مکس نہیں ہوتے ۔ ان کے درمیان واضح فرق ہے ۔ اس قسم کا امتیازی افتراق انسانی جذبات ' انسانی شعور ' انسانی رجحانات اور انسانی قدروں میں بھی ہوتا ہے ۔ پھر دونوں قسم کے پانی انسانوں کے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں ۔

وَمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ (۳۵ : ۱۲) "مگر دونوں سے تم تروتازہ گوشت حاصل کرتے ہو ' پہننے کے لیے زینت کا سامان نکالتے ہو اور اسی پانی میں تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس کا سینہ چیرتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور اس کے

شکر گزار بنو"۔ تروتازہ گوشت سے مراد مچھلیاں اور سمندر کے دوسرے جانور ہیں جو مختلف قسم کے ہیں اور زیب و زینت کے لیے سیپ اور مرجان اور دوسرے موتی جو سمندر سے نکالے جاتے ہیں - یہ موتی سمندر کی سیپوں میں پائے جاتے ہیں - سیپوں کے اندر جب پانی اور ریت کے ذرات داخل ہوتے ہیں تو اس کے اندر کیمیاوی عمل سے یہ موتی تیار ہوتے ہیں - مرجان ایک حیوانی پودا ہے جو سمندر میں میلوں تک پھیل جاتا ہے اور یہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ بعض اوقات سمندری سفر کے لیے خطرہ بن جاتا ہے - بعض اوقات اس کی شاخوں میں زندہ مخلوق بھی پھنس جاتی ہے - یہ مرجان بھی ایک خاص طریقے سے کاٹ کر اس سے زیورات بنائے جاتے تھے -

کشتی سمندروں اور دریاؤں کو چیرتی چلی جاتی ہے اس لیے کہ اللہ نے پانی اور کشتی دونوں میں بعض خواص رکھ دیئے ہیں - جن چیزوں سے کشتی بنائی جاتی ہے' ان کی کثافت اور ساخت اور سمندر کے پانی کی اپنی کثافت ہے - یوں سمندر کی سطح پر کشتی تیرتی ہے - ہواؤں کے اندر بھی یہی خصوصیات رکھ دی گئی ہیں - پھر اللہ نے ان قوتوں کو انسان کے لیے مسخر کر دیا اور انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے -

لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (۳۵ : ۱۲) "تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو"۔ سفر اور تجارت کے ذریعہ سے تم اللہ کا فضل تلاش کرو - سمندر سے مفاد کی چیزیں نکالو اور پانی اور کشتیوں کو نقل و حمل کے مقاصد کے لیے استعمال کرو -

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۳۵ : ۱۲) "تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو"۔ اللہ نے تمہارے لیے شکر کے اسباب فراہم کر دیئے ہیں - یہ اسباب تمہارے ہاتھ میں ہیں اور یوں اللہ تمہاری جانب سے ادائے شکر میں بھی تمہارا مددگار ہے -

--- ooo ---

اور اب رات اور دن کے منظر پر یہ کائناتی سفر ختم ہوتا ہے - شمس و قمر کی تسخیر جو اللہ کے وسیع کائناتی نظام کا ایک حصہ ہے -

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۡ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ

"وہ دن کے اندر رات اور رات کے اندر دن کو پروتا ہوا لے آتا ہے - چاند اور سورج کو اس نے مسخر کر رکھا ہے - یہ سب کچھ ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے"۔

رات کو دن میں داخل کرنا اور دن کو رات میں - یہ نہایت ہی خوبصورت مناظر ہیں - جب رات دن میں داخل ہوتی ہے تو روشنی آہستہ آہستہ مدہم پڑتی ہے اور تاریکی دھیرے دھیرے چھاتی ہے - غروب کے بعد پھر تاریکی گہری ہوتی جاتی ہے اور رات کے اندر دن کے داخل ہونے کا منظر بھی بہت ہی دلچسپ ہے - سفیدۂ صبح آہستہ آہستہ نمودار ہوتا ہے' روشنی پھیلتی جاتی ہے اور اندھیرا آہستہ آہستہ غائب ہوتا چلا جاتا ہے - یہاں تک کہ روشنی نمودار ہوتی ہے اور خوب پھیل

جاتی ہے۔ یعنی رات دن کو پوری طرح کھا جاتی اور دن رات کو کھا جاتا ہے۔ دونوں اوقات میں دل کو خوشی اور سکون حاصل ہوتا ہے اور دونوں اوقات میں انسان کے غوروفکر کی قوت تیز ہوتی ہے۔ وہ خدا سے ڈرتا ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ وہ خدا بہت ہی عظیم ہے جو یہ عظیم تصورات لاتا ہے۔ یوں خلوط کھینچتا ہے۔ ایک رسی کو کھینچتا ہے اور دوسری کو ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔ اور گردش لیل و نہار کا یہ نظام نہایت ہی پیچیدہ اور حساس ہے۔ اس کے اندر اس قدر استحکام ہے کہ کبھی اس میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی اضطراب پیدا نہیں ہوتا اور نہ کبھی اس میں خلل پڑتا ہے۔

شمس و قمر کی تسخیر اور اجل مقرر تک ان کا یونہی چلتے رہنا۔ اس وقت تک جس کے بارے میں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ وہ منظر ہے جسے ہر انسان دیکھتا ہے اور سنتا ہے۔ چاہے اسے شمس و قمر کا صحیح علم ہو یا نہ ہو' چاہے اسے ستاروں اور سیاروں کے جسم' حرکت اور حجم کے بارے میں معلومات ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن یہ دونوں اجرام فلکی ہمارے سامنے طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ ہر آنکھ کے سامنے چڑھتے اور گرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ حرکت ایک مسلسل حرکت ہے اور اس کے اندر ایک لمحے کے لیے بھی خلل' اضطراب اور وقفہ نہیں ہوتا۔ اس منظر کو اس حد تک دیکھنے کے لیے کسی گہرے علم و حساب کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لہٰذا گردش لیل و نہار اور شمس و قمر کا طلوع و غروب وہ منظر ہے جو ہماری نظروں کے سامنے بچھا ہوا ہے۔ آج ہم ان کے بارے میں ذرا زیادہ جانتے ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جن کے سامنے یہ قرآن نازل ہو رہا تھا۔

لیکن علم کی مقدار اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم ان سے کس قدر متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے دل اس سے کس قدر اثر لیتے ہیں۔ ہمارے اندر غوروفکر کی کس قدر قوت پیدا ہوتی ہے اور ہم اس منظر سے اللہ کی قدرت کا کس قدر گہرا ادراک کرتے ہیں۔ اس سے ہمارے دل کس قدر زندہ ہوتے ہیں کیونکہ اصل زندگی تو دلوں کی زندگی ہوتی ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مرجائے ۔ کہ زندگی تو عبارت ہے تیرے جینے سے

--- ○○○---

نہایت ہی گہرائی تک متاثر کر دینے والے ان مناظر کی چھاؤں میں اور حیران کن حد تک متاثر کر دینے والے دلائل ربوبیت کے ان مناظر میں بتایا جاتا ہے کہ رب تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔ یہ اسی کے کارنامے ہیں اور جو لوگ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں وہ نہایت ہی بڑے خسارے میں ہوں گے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴿۱۳﴾ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۗ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۗ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾ الثلثة

۲

ع ۷

۱۴ "وہی اللہ (جس کے یہ سارے کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم

پکارتے ہو' وہ ایک پرکاہ کے مالک بھی نہیں ہیں۔ انہیں پکارو' تو وہ تمہاری دعائیں سن نہیں سکتے۔ اور سن لیں تو ان کا تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔ حقیقت حال کی ایسی صحیح خبر تمہیں ایک خبردار کے سوا کوئی نہیں دے سکتا''۔

یہ ہے وہ رب جس نے ہواؤں کے ذریعہ بادل بھیجے' جس نے بادلوں کے ذریعہ بارشیں بھیجیں' جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا' جس نے تمہیں جوڑے جوڑے بنایا' جو جانتا ہے کہ ہر مادہ کیا حمل لیتی ہے' وہ جو جانتا ہے کہ کس کی عمر کیا ہے اور ڈیوریشن کیا ہے' جس نے دو سمندر پیدا کیے۔ میٹھا اور کھارا' جس نے رات اور دن پیدا کیے' جس نے شمس و قمر کی گردش مقرر کی۔ یہ ہے تمہارا رب۔

سب کچھ اسی کا ہے۔

لَهُ الْمُلْكُ (۳۵:۱۳) اور وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ

(۳۵:۱۳) ''اور اس کے سوا جن دوسروں کو تم پکارتے ہو' وہ پرکاہ کے مالک بھی نہیں ہیں''۔ قطمیر گٹھلی کے غلاف اور مہین پردے کو کہتے ہیں۔ یہ مہین اور حقیر پردہ بھی ان کی ملکیت میں نہیں ہے جن کو تم خواہ مخواہ پکارتے ہو۔ ذرا مزید تشریح۔

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ (۳۵:۱۴) ''انہیں پکارو تو وہ تمہاری دعائیں سن ہی نہیں سکتے''۔ یہ تو بت اور مورتیاں ہیں' درخت ہیں' ملائکہ اور جن ہیں۔ یہ سب کے سب بھی قطمیر کے مالک نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی تمہاری دعائیں نہیں سنتا۔ اگر سنتا بھی ہے تو وہ سمجھتا نہیں۔ اگر سمجھتا بھی ہے تو مدد نہیں دے سکتا۔

وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا (۳۵:۱۴) ''اگر سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے''۔ مثلاً جن و ملائکہ تو سنتے ہیں تو جن جواب ہی نہیں دے سکتے۔ اور ملائکہ بھی از خود کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ یہ تو ہے ان کی حالت دنیا میں اور قیامت میں تو وہ تم سے براءت کا اعلان کر دیں گے۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ (۳۵:۱۴) ''اور قیامت کے روز تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے''۔ ذرا ہوش کرو' یہ اطلاع تمہیں کون دے رہا ہے''۔

وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ (۳۵:۱۴) ''ایسی صحیح خبریں تمہیں خبردار کرنے والے کے سوا کوئی نہیں دے سکتا''۔ یہاں یہ سبق ختم ہوتا ہے اور اس کائنات کی سیر ختم ہوتی ہے۔ اس سیر سے قلب مومن نے بہت کچھ سیکھا اور دیکھا۔ وہ کیفیات مغفرت میں ڈوبا اور تیرا۔ اگر کوئی ہدایت لینا چاہے تو قرآن کی ایک سورہ کا ایک ہی سبق اس کے لیے کافی ہے بشرطیکہ کوئی برہان و سلطان کا متلاشی ہو کسی نشانی اور معجزات کا طالب ہو۔

---ooo---

درس نمبر ۲۰۲ ایک نظر میں

ایک بار پھر پکارا جاتا ہے کہ لوگو! ذرا اپنی حقیقت پر غور کرو' اور اپنے تعلق باللہ کا جائزہ لو۔ ایک بار پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں۔ یہ جو لوگ روگردانی کرتے ہیں' یہ خود اپنا نقصان کرتے ہیں۔ اس سورہ کے دوسرے سبق میں بھی حضورؐ کو ایسی ہی تسلی دی گئی تھی۔ البتہ یہاں ذرا اس بات کی وضاحت کر دی جاتی ہے کہ ہدایت اور ضلالت کی حقیقت اور ماہیت ایک نہیں ہے' دونوں کے درمیان اس طرح کا فرق و امتیاز ہے جس طرح اندھے اور بینا میں ہوتا ہے۔ جس طرح نور و تاریکی میں ہے' جس طرح سائے اور کڑکتی دھوپ میں ہے۔ جس طرح موت و حیات میں ہے۔ پھر ہدایت' بصیرت' نور' سائے اور زندگی اپنے اندر بذات خود ایک گہرا ربط اور مشابہت رکھتے ہیں اور اسی طرح اندھاپن' تاریکی' گرمی اور موت باہم مربوط اور مماثل ہیں۔ یہ سبق مکذبین کے انجام پر ختم ہوتا ہے۔

---000---

درس نمبر ۲۰۲ تشریح آیات

۱۵ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۲۶

يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ اللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ وَ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾

"لوگو' تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ تو غنی و حمید ہے ۔ وہ چاہے تو تمہیں ہٹا کر کوئی نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے 'ایسا کرنا اللہ کے لیے کچھ بھی دشوار نہیں"۔

لوگوں کو جب یہ دعوت دی جائے کہ وہ اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آنے کی جدوجہد کریں اور ضلالت کے بدلے ہدایت اختیار کریں تو اس وقت ان کو یہ حقیقت یاد دلانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ فقراء ہیں اور اللہ کی طرف محتاج ہیں جب کہ اللہ ان کے مقابلے میں پوری طرح غنی ہے اور جب ان کو ایمان 'اللہ کی عبادت اور اللہ کی حمد و ثنا کی دعوت دی جاتی ہے تو اللہ ان کی عبادت اور حمد سے پوری طرح بے نیاز ہے ۔ وہ تو بذات خود محمود ہے ۔ اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے ۔ یہ اللہ کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے ۔ اگر اللہ چاہے تو ان کو ختم کر کے ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے اور ان کو اپنا خلیفہ بنالے تو یہ اللہ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں اور یہ کام اللہ کے لیے بہت آسان ہے ۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگوں کو یہ حقیقت یاد دلائی جائے تاکہ ان کے ذہنوں سے یہ غرور نکل جائے کہ اللہ ان کی ہدایت کے لیے رسول بھیجتا ہے اور ان کی ہدایت کا سازوسامان کرتا ہے تو شاید اللہ کو ہماری ہدایت کی کوئی ضرورت ہے ۔ اللہ رسول بھیجتا ہے اور وہ پوری انسانی تاریخ میں لوگوں کی ہدایت کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں ۔ لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتے رہے ہیں ۔

اللہ اپنے بندوں کے ساتھ مہربانی کرتا ہے 'ان پر رحمت کرتا اور ان پر فضل و کرم کرتا ہے یوں کہ ان کے پاس اپنے رسول بھیجتا ہے ۔ یہ رسول لوگوں کی نافرمانی اور لوگوں کی ایذا رسانی کی وجہ سے مصیبتیں برداشت کرتے ہیں اور ان روگردانیوں اور ایذا رسانیوں کے باوجود وہ دعوت حق پر جمے رہتے ہیں تو یہ اہتمام کر کے اللہ اپنے بندوں پر محض رحم و کرم کرتے ہیں کیونکہ وہ رحیم و کریم ہے ۔ یہ اس کی ذاتی صفات ہیں 'اس لیے نہ یہ لوگ اللہ کی حکومت میں پرکاہ کے برابر کوئی اضافہ کر سکتے ہیں یا اللہ کی حکومت میں ذرے کے برابر کسی چیز کا اضافہ کر سکتے ہیں ۔ نیز اللہ کے مقابلے میں

انسان کوئی بڑی طاقتور یا غالب مخلوق نہیں ہے کہ اللہ ان کو بدل نہیں سکتا۔ اس لیے اللہ ان کی غلطیوں کو برداشت کرتا ہے۔ کیا یہ انسان ایک ایسی مخلوق ہیں جن کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ایسی صورت نہیں ہے۔

انسان جب اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو دیکھتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ ایک طرف یہ انسان کمزور' حقیر اور ناتواں ہے اور اس کے مقابلے میں ذات باری ہے' جو بہت طاقتور ہے اور اس کی جانب سے انسانوں پر یہ مہربانیاں ہیں۔

انسان تو اس کائنات کے مکینوں میں سے ایک نہایت ہی چھوٹی سی مخلوق ہے اور یہ انسان سورج کے گرد چکر لگانے والے ذرات و کرات میں سے ایک نہایت ہی چھوٹے سے کرے پر رہتا ہے۔ سورج بھی ان ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے اور سورج جیسے ستاروں کی تعداد کا بھی ابھی تک انسان کو علم نہیں ہے۔ یہ دوسرے ستارے تو چھوٹے چھوٹے نکلتے ہیں حالانکہ اپنی جگہ نہایت دوریوں میں وہ بہت ہی عظیم الجثہ ہیں اور یہ عظیم الجثہ ستارے اس فضا میں حقیر ذروں کی طرح تیرتے پھرتے ہیں۔ یہ اللہ کی مخلوقات کا نہایت ہی مختصر حصہ ہیں۔

اس کے باوجود انسان اللہ کی جانب سے اس قدر عظیم فضل و کرم اور اس کے بے شمار فیوض کا وصول کنندہ ہے۔ اس پر اس قدر مہربانیاں ہیں جو اس کے لیے اسی زمین میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس کے جسم کے اندر ودیعت کر دیئے گئے ہیں اور اس کے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیر مخلوق گمراہ ہو کر اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتی ہے اور اللہ کو اس کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے رسول بھیجنے پڑے۔ ایک کے بعد دوسرا رسول آیا۔ رسولوں پر کتابیں بھیجی گئیں۔ رسولوں کو خوارق عادت معجزات دیئے گئے۔ اور اللہ کا یہ فضل و کرم اس مقام تک پہنچ گیا کہ اللہ نے اپنی آخری کتاب بھیج دی۔ اس میں تمام انبیاء کے قصص بھی ثبت کر دیئے۔ اسلاف کی تاریخ اس میں ثبت کر دی۔ پھر انسان کو جو صلاحیتیں دی گئیں اور اس کے اندر جو کمزوریاں رکھ دی گئی تھیں وہ سب اس میں بیان کر دی گئیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک ایک انسان کی مشکلات کا حل بتا دیا اور اس کی مشکلات کو دور کر دیا۔

یہ عظیم کرم ایک طرف اور دوسری جانب یہ حقیقت کہ یہ انسان سکان زمین میں سے ایک حقیر اور کمزور مخلوق ہے۔ یہ زمین جس پر وہ رہتا ہے۔ یہ شمسی کہکشاں کا ایک حقیر تابع ستارہ ہے جو اس عظیم اور ہولناک عظیم الجثہ کائنات کے اندر یوں ہے جس طرح زمین کی فضا میں تیرتا ہوا ایٹم اور اللہ سبحانہ اس پوری کائنات و سماوات کا پیدا کنندہ ہے۔ اس نے اس پوری کائنات اور مافیہا کو صرف ایک کلمہ سے پیدا کیا۔ صرف ارادہ متوجہ ہوا اور کن فیکون سے سب کچھ وجود میں آگیا اور وہ ایسا کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

لوگوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں اور غور کریں کہ اللہ کا فضل و کرم کس قدر ہے اور وہ معلوم کر لیں کہ اگر وہ زندہ رہ رہے ہیں تو محض اللہ کے فضل و کرم کی وجہ سے زندہ رہ رہے ہیں اور اللہ کی عظیم رحمت کی وجہ سے زندہ رہ رہے ہیں اور یہ رحمت انسان کے انکار' اعراض' نافرمانیوں کے باوجود ہے۔

اس لحاظ سے یہ ایک نہایت ہی وجدانی ٹچ ہے جبکہ یہ ایک حقیقت بھی ہے۔ قرآن کریم ایسے ہی حقائق انسانی قلوب پر القاء کرتا ہے۔ کیونکہ جب حقیقت انسان کے دل پر روشن ہوتی ہے تو وہ انسان کے دل کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ قرآن حق ہے اور سچائی کے ساتھ یہ نازل ہو رہا ہے۔ لہٰذا قرآن کی تمام باتیں حق ہیں۔ وہ سچائی کے ساتھ لوگوں کو مطمئن کرتا ہے' سچائی پیش کرتا ہے۔ اس کے اشارات تمام کے تمام حق ہیں۔

--- ○○○---

اب ایک دوسرا نتیجہ ۔یہ کہ دنیا و آخرت میں ذمہ داری انفرادی ہے ۔ ذمہ داری انفرادی ہوگی 'کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا ۔ نہ کوئی کسی کو فائدہ دے سکے گا ۔ لہٰذا لوگ اگر ہدایت یافتہ ہو جائیں تو اس سے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ان کے اعمال اور فرائض کے بارے میں پوچھا جائے گا جب کہ دوسرے تمام افراد سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا ۔ ہر شخص اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوگا ۔ کوئی اس سے پوچھنے والا نہ ہوگا ۔ اگر کوئی پاکیزہ زندگی اختیار کرتا ہے تو اپنے لیے کرتا ہے وہ اپنے لیے کرتا ہے ۔ کسی اور کے لیے نہیں اور قیامت میں معاملات کا اختیار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہوگا ۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰىؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا یُحْمَلْ مِنْهُ شَیْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰىؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَؕ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا یَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ﴿۱۸﴾

"کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا 'اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے پکارے گا تو اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصہ بھی بٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو ۔ (اے نبیؐ) تم صرف انہی لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں ۔ جو شخص بھی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لیے کرتا ہے اور پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے"۔

انفرادی ذمہ داری کے اصول کا انسانی اخلاقیات پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے اور اسی طرح انسانی طرز عمل پر بھی اس کا فیصلہ کن اثر ہوتا ہے ۔ کسی انسان میں یہ شعور پیدا ہونا ضروری ہے کہ اسے سزا و جزاء صرف اس کے اعمال پر ہوگی اور اس سے مواخذہ صرف اس کے اعمال پر ہوگا ۔ کسی دوسرے کی بدعملی پر اسے سزا نہ ہوگی اور اپنے اعمال بد سے بھی وہ کسی طرح بچ کر نہ نکل سکے گا ۔ یہ ایک ایسا فیکٹر ہے جو انسان کو ہر وقت بیدار رکھتا ہے اور اس کا یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ انسان جھوٹی امیدوں پر تکیہ نہیں کرتا کہ کوئی اسے فائدہ دے گا یا اس کی جگہ کوئی ذمہ داری برداشت کر لے گا ۔ یہ اصول انسانوں کے لیے باعث اطمینان بھی ہے ۔ اس میں ایک فرد اس بات سے مطمئن ہو جاتا ہے کہ پوری جماعت کی بداعمالیوں کا مواخذہ اس سے نہ ہوگا ۔ یوں وہ خود اپنے اچھے اعمال سے مایوس نہ ہوگا بشرطیکہ اس نے جماعت اور سوسائٹی میں تبلیغ و نصیحت اور معروف کو جاری کرنے اور منکر کو روکنے کی سعی کی ہو اور اپنی طاقت اس کام کے لیے استعمال کی ہو ۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کا محاسبہ بحیثیت جماعت نہیں کرے گا ۔ بلکہ ہر ایک فردہ محاسبہ ہوگا ۔ اور یہ محاسبہ اس کے پورے اعمال کا ہوگا ۔ ان حدود کے اندر ہوگا جو اس پر فرض کیے گئے ہیں اور ہر فرد پر یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ دوسروں کو نصیحت

کرے اور اپنی طاقت کی حد تک ان کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دے۔ اگر اس نے اپنی یہ اجتماعی ذمہ داری ادا کر دی تو پھر سوسائٹی جو کچھ بھی کرتی ہے وہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ وہ صرف اپنے اچھے اعمال کی جزاء پائے گا۔ نیز اگر جماعت اور سوسائٹی اچھی ہو اور یہ شخص اس کے اندر گمراہ اور بدکار ہو تو بھی سوسائٹی کی اچھائی اسے کچھ فائدہ نہ دے گی۔ کیونکہ اللہ لوگوں کا محاسبہ فہرستوں کے مطابق نہ کرے گا۔

قرآن کریم نے اس اصول کو قرآن کے مخصوص انداز تعبیر کے مطابق بیان کیا ہے۔ اس انداز کا نہایت ہی گہرا اثر ہوتا ہے۔ یوں بتایا جاتا ہے کہ بے شمار لوگ ہیں اور انہوں نے اپنا اپنا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ کوئی شخص جس کا بوجھ ہلکا ہو وہ دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا رہا۔ اگر کسی کا بار گناہ زیادہ ہے اور وہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو بلاتا ہے تو کوئی شخص اس کی اس دعوت پر لبیک نہیں کہتا اور کوئی اس کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

یہ ایک ایسے قافلے کا منظر ہے جس میں ہر شخص اپنا اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔ اپنے راستے پر جا رہا ہے یہاں تک کہ لوگ ترازو کے سامنے پہنچ جاتے ہیں اور وزن کرنے والا وزن کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر نظر آتا ہے کہ ہر شخص بوجھ کے نیچے ہے۔ کوئی تھکا ماندہ ہے اور کوئی ہلکا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے نتیجے کا منتظر ہے اور اپنے آپ میں مشغول ہے۔

اس منظر کو دیکھتے ہوئے جس میں اہل قافلہ تھکے ماندے ہیں روئے سخن حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۳۵: ۱۸) "تم صرف انہی لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں"۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ڈرانا مفید ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں حالانکہ انہوں نے اپنے رب کو دیکھا نہیں ہے اور وہ نماز قائم کر کے اپنے رب کے ساتھ رابطہ قائم کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ذات پیغمبر سے استفادہ کر سکتے تھے۔ تمہاری بات سن سکتے تھے۔ لہٰذا آپ پر ان لوگوں کی ذمہ داری نہیں ہے جو اللہ سے نہیں ڈرتے اور جو نماز قائم نہیں کرتے۔

وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ (۳۵: ۱۸) "اور جو شخص پاکیزگی کی راہ اختیار کرتا ہے وہ اپنے ہی کے لیے کرتا ہے"۔ نہ آپ کسی کے ذمہ دار ہیں اور نہ کوئی اور کسی کا ٹھیکہ دار ہے۔ جو شخص نیکی اختیار کرتا ہے اور پاکیزگی کرتا ہے وہ خود اس سے نفع اندوز ہوتا ہے۔ (تزکّی) کے اندر نہایت ہی لطیف اور گہرا مفہوم ہے۔ جس کے اندر ظاہری صفائی بھی شامل ہے۔ جس کے اندر قلب و شعور کی صفائی بھی شامل ہے۔ جس کے اندر طرز عمل اور رویہ کی صفائی بھی شامل ہے۔ (تزکّی) کے اندر گہرا اشاراتی مفہوم پایا جاتا ہے۔

وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (۳۵: ۱۸) "اور پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے"۔ اللہ ہی محاسب ہے۔ وہی جزاء و سزا دینے والا ہے۔ اس کے ہاں نہ اچھا عمل ضائع ہوتا ہے، نہ برا عمل شمار سے رہ سکتا ہے اور نہ جزاء و سزا کے احکام ایسے لوگوں کے حوالے کیے جاتے ہیں جو فیصلے میں رعایت کرتے ہیں یا بھولتے ہیں یا دیئے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

---○○○---

اللہ کے نزدیک ایمان و کفر برابر نہیں ہیں ۔ خیر و شر کی برابر قیمت نہیں ۔ ہدایت و ضلالت اللہ کے ہاں برابر نہیں ہوتے ۔ اندھا اور آنکھوں والا بھی اس کے ہاں ایک نہیں ہوتے ۔ روشنی اور تاریکی کی قدر وہاں ایک نہیں ہے ۔ چھاؤں اور گرمی کی افادیت بھی برابر نہیں ہے اور نہ اللہ کے ہاں زندہ اور مردہ برابر ہوتے ہیں ۔ یہ سب چیزیں واضح طور پر قدر و قیمت کے اعتبار سے جدا ہیں ۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ﴿٢١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ

"اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہیں ۔ نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں ۔ نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے اور نہ زندے اور مردے مساوی ہیں"۔

یہاں ایک طرف کفر' اندھے پن' تاریکی' گرمی اور موت سب کے سب ایک مزاج رکھتے ہیں اور ان کے مفہومات کے درمیان ربط ہے ۔ دوسری جانب ایمان' نور' بصارت' چھاؤں اور زندگی کے مفہومات کا ایک ہی مزاج ہے اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں ۔

ایمان نور ہے ۔ دل میں نور' اعضاء میں نور' حواس میں نور' ایسا نور جس سے اشیاء کی حقیقت منکشف ہوتی ہے ۔ اقدار اور واقعات روشن ہوتے ہیں اور ان کی حدود اور روابط واضح ہوتے ہیں ۔ مومن اس نور سے تمام اشیاء کو دیکھتا ہے اور وہ روشنی کے اندر واقعات کو دیکھتا ہے ۔ اس لیے اس کے معاملات اچھے ہوتے ہیں ۔ اس کے اقدامات درست سمت میں ہوتے ہیں اور اس کے قدم ڈگمگاتے نہیں ۔

ایمان ایک آنکھ ہے جو دیکھتی ہے ۔ یہ آنکھ چیزوں کو ان کی حقیقت کے مطابق دیکھتی ہے ۔ نہ اس میں تزلزل ہوتا ہے اور نہ اس میں انتشار ہوتا ہے اور صاحب ایمان اپنی راہ پر روشنی میں' اعتماد کے ساتھ اور اطمینان کے ساتھ چلتا ہے ۔

پھر ایمان ایک سایہ ہے جس کے نیچے انسان راحت کی زندگی بسر کرتا ہے ۔ اس کا نفس اس میں آرام کرتا ہے اور روح خوش ہوتی ہے ۔ شک' بے چینی' حیرت اور اندھیروں کے سفر کی گرمی سے انسان پناہ میں ہوتا ہے ۔

پھر ایمان ایک زندگی ہے ۔ دلوں اور شعور کی زندگی ۔ ارادہ کی زندگی' رخ اور سمت کی زندگی ۔ ایمان ایک حرکت اور جدوجہد کا نام ہے ۔ یہ تعمیری جدوجہد ہے' مفید اور بامقصد زندگی ہے' جس کے اندر یہ مردگی اور مردنی نہیں ہے اور زندگی بجھی بجھی بھی نہیں ہوتی ہے ۔ نہ اس میں کوئی چیز عبث ہے اور نہ بیہودگی ہے ۔

کفر تاریکی ہے یا تاریکیاں ہیں ۔ جب لوگ نور ایمان کے دائرہ سے نکل آئیں تو پھر وہ مختلف قسم کے اندھیروں میں داخل ہو جاتے ہیں ۔ ایسے اندھیرے جن کے اندر کسی چیز کی صحیح حقیقت نظر نہیں آتی ۔ کفر ایک قسم کی سخت دھوپ ہے ۔ اس کے اندر دل حیرانی' پریشانی' قلق' بے چینی' تزلزل اور عدم اطمینان کی گرم آندھیوں کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور آخرت میں جہنم کی گرمی کا شکار ہوتا ہے ۔ کفر ایک طرح کی موت ہے ۔ ضمیر کی موت' منبع حیات سے کٹ جانا' صحیح راستے

سے کٹ جانا' حقیقی سرچشمے سے کٹ جانا اور حقیقی آب حیات سے محروم ہونا' جس سے انسانی سیرت متاثر ہوتی ہے۔ غرض ان صفات میں سے ہر ایک صفت کی ایک حقیقت ہے اور دونوں کے درمیان مکمل تضاد ہے اور اللہ کے ہاں دونوں برابر نہیں ہیں۔

--- ○○○---

اب روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے۔ آپ کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کو بتایا جاتا ہے کہ دعوت اسلامی کے حوالے سے آپ کے فرائض اور عمل کی حدود کیا ہیں۔ اپنے فرائض و حدود سے آگے جو معاملات ہیں وہ اللہ کے سپرد کر دیں کیونکہ اللہ ہی ان کا ذاکدار ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُورِ ﴿٢٢﴾ إِنْ أَنْتَ إِلَّا نَذِيرٌ ﴿٢٣﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ﴿٢٤﴾ وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٢٦﴾

۳
۱۰ ع
۱۵

"اللہ جسے چاہتا ہے' سنواتا ہے 'مگر (اے نبیؐ) تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں۔ تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔ اب اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن ہدایات دینے والی کتاب لے کر آئے تھے۔ پھر جن لوگوں نے نہ مانا ان کو میں نے پکڑ لیا اور دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی"۔

اس کائنات کی حقیقت اور نفس انسانی کی ماہیت میں امتیازات حقیقی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ لوگوں کا مزاج مختلف ہوتا ہے اور دعوت اسلامی کے حوالے سے ان کا ردعمل بھی جدا ہوتا ہے اس طرح جس طرح بصارت اور اندھے پن کا' سائے اور دھوپ کا' اندھیروں اور روشنی کا اور حیات اور موت کا' اور ان تمام معاملات کی پشت پر اللہ کی حکمت اور قدرت کام کر رہی ہوتی ہے۔

لہٰذا رسول صرف نذیر ہوتا ہے۔ اس کی انسانی طاقت محدود ہوتی ہے۔ وہ قبروں کے اندر پڑے مردوں تک دعوت نہیں پہنچا سکتا۔ نہ ایسے چلتے پھرتے مردوں کو وہ دعوت دے سکتا ہے یا سنا سکتا ہے۔ وہ اصل میں حقیقی مردوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اللہ ہی ہے جو ہر اس شخص کو سنا دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ جب چاہے' جس طرح چاہے۔ لہٰذا رسول اللہؐ کی ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی گمراہ ہوتا ہے تو کیوں ہوتا ہے۔ اگر کوئی منہ پھیرتا ہے تو پھیرے بشرطیکہ رسولؐ نے دعوت

دے دی ہو اور رسالت کی ڈیوٹی ادا کر دی ہو۔ لہٰذا جو سنتا ہے ' سنے ' اور جو اعراض کرتا ہے ' اعراض کرے۔
اس سے قبل رسول اللہؐ سے کہا گیا تھا۔

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ (۳۵ : ۸) "پس آپؐ ان پر حسرت کر کے اپنے آپ کو گھلا نہ دیں"۔ اللہ نے رسول اللہؐ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا تھا۔ آپؐ کا منصب ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کے دوسرے بھائی رسولوں کا تھا۔ وہ تعداد میں تو بہت زیادہ تھے کیونکہ ہر امت اور ہر قوم کے لیے رسول بھیجا جاتا رہا ہے۔

وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۳۵ : ۲۴) "اور کوئی امت نہیں گزری جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو"۔ اگر آپ کی قوم تکذیب کر رہی ہے تو بے شمار رسولوں کی اقوام نے اسی طرح تکذیب کی ہے اور اس تکذیب کی وجہ رسولوں کی تبلیغ کا قصور نہ تھا۔ اور نہ دلائل کی کمی تھی۔

وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (۳۵ : ۲۵) "اب اگر یہ لوگ جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رسول کھلے دلائل اور صحیفے اور روشن ہدایات دینے والی کتاب لے کر آئے تھے"۔ بینات سے مراد مختلف قسم کے دلائل ہیں۔ معجزات بھی دلائل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ رسول اللہؐ سے معجزات طلب کرتے تھے اور تحدی دیتے تھے۔ الزبر سے مراد متفرق صحیفے ' رسائل اور پمفلٹ ہیں ' جن میں نصیحتیں ' ہدایات اور تکالیف و فرائض ہوتے تھے۔ کتاب منیر سے مراد مطابق قول راجح حضرت موسیٰ کی کتاب تورات ہے۔ لیکن ان کی امت نے کتب الٰہیہ کی تکذیب کی۔

ہمیشہ اکثر اقوام نے رسولوں اور ان کی ہدایات اور کتابوں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ لہٰذا معاملہ جدید نہیں ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے والا سلوک کوئی منفرد سلوک نہیں ہے۔ یہ تو ایک معمول بہ طرز عمل ہے۔ لیکن ایسا رویہ اختیار کرنے والوں کا انجام بھی ایک ہی رہا ہے۔

ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳۵ : ۲۶) "پھر جن لوگوں نے ظلم کیا میں نے ان کو پکڑا"۔ اور ذرا دیکھو یہ پکڑ کیسی تھی۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (۳۵ : ۲۶) "دیکھو لو ' میری سزا کیسی سخت تھی"۔ اللہ کی پکڑ بہت سخت تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ نے ان کو ہلاک کر کے رکھ دیا۔ لہٰذا جو لوگ اس راہ پر گامزن ہیں ' انہیں ذرا ڈرنا چاہئے کہ ان کا انجام ایسا ہی نہ ہو جائے۔

یہ ہے قرآنی منہج جس کے ساتھ یہ سبق مکمل ہوتا ہے۔ اب ہم ایک دوسری وادی کے لیے رخت سفر باندھتے ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۲۰۳ ایک نظر میں

یہ سبق اس کائنات کی کتاب اور اللہ کی کتاب کے ایک اقتباس پر مشتمل ہے۔ کتاب کائنات کا مطالعہ اور اس کے خوبصورت اور عجیب صحائف پر ایک نظر ہے جو مختلف اقسام اور مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ جن کے پھل قسما قسم ہیں' جس کے پہاڑ رنگا رنگ ہیں۔ جن کے انسان' حیوان اور زمین پر چلنے والے جانور مختلف النوع اور مختلف الاشکال ہیں۔ اس خوبصورت کائنات کا یہ عجیب مطالعہ بہت ہی دلچسپ ہے اور پوری کائنات اس کا موضوع ہے۔ پھر اللہ کی کتاب منزل کا مطالعہ اور اس کے اندر جو تعلیمات ہیں اور جو سچائیاں ہیں اور جو اس سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتی ہے پھر امت مسلمہ کا سابقہ امتوں کا وارث بنایا جانا اور وارثوں کے درجے اور اہل ایمان کے لیے جو عفو و مغفرت اور انعامات تیار کیے گئے ہیں۔ جنتوں کے مناظر اور جہنم کے مناظر اور کافروں کے حالات' اور آخر میں یہ قرارداد کہ یہ سب کچھ اللہ کے علم کے مطابق ہوتا ہے۔

--- ٥٥٥ ---

درس نمبر ۲۰۳ تشریح آیات

۲۷ --- تا --- ۳۸

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا ۚ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ﴿٢٧﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ ۗ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿٢٨﴾

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعہ سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید' سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے"۔

یہ اس کائنات کی ایک جھلک ہے۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ کتاب اللہ کا سرچشمہ اور کتاب کائنات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اس جھلکی میں پوری زمین کو دکھا دیا گیا ہے اور پوری زمین کے رنگ ڈھنگ ظاہر کیے گئے ہیں۔ پھلوں کے رنگ و اقسام' پہاڑوں کے رنگ اور ان کی انواع' لوگوں کے رنگ اور شکلیں' حیوانات اور مویشیوں کی اقسام و انواع' چند الفاظ کے اندر پوری زمین کے خدوخال ضبط کر دیئے گئے ہیں جس میں زندہ اور غیر زندہ سب چیزوں کو لپیٹ لیا گیا ہے۔ چند الفاظ کے اندر خداوند قدوس کی اس نمائش کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے جو بہت ہی دلکش ہے اور یہ دلکشیاں پوری زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔

آغاز میں ہم دیکھتے ہیں کہ بارشیں ہو رہی ہیں۔ اور ان بارشوں کے نتیجے میں اس زمین پر رنگا رنگ پھل پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں چونکہ مختلف رنگوں کی نمائش مقصود ہے اس لیے پھلوں کے ذکر کے بجائے ان کے رنگ دکھائے جاتے ہیں۔

فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا (۳۵ : ۲۷) "اور پھر اس کے ذریعے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں"۔ پھلوں کے رنگ بھی درحقیقت ایک عظیم نمائش گاہ ہے اور اس میں رنگوں کی جو اسکیم ہے' اس کا کوئی حصہ' دنیا کے تمام نقاش مل کر بھی تیار نہیں کر سکتے۔ ایک قسم کے پھلوں کا رنگ دوسری اقسام سے مختلف ہے۔ بلکہ ایک قسم کے پھلوں میں بھی مختلف رنگ ہیں اور ایک قسم کا رنگ دوسروں سے مختلف ہے۔ اور ہر دانے کا رنگ بھی

دوسروں سے مختلف ہے۔

اور پھلوں کے رنگ کے بعد پھر پہاڑوں کے رنگ' اور پھلوں کے رنگوں اور پہاڑوں کے رنگوں کے درمیان بظاہر کوئی ربط نظر نہیں آتا لیکن اگر حقیقی مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو ایک قدرتی ربط موجود ہے۔ پہاڑوں کے رنگوں اور پھلوں کے رنگوں کے درمیان ایک قسم کا ربط موجود ہے۔ بلکہ پتھروں اور پہاڑوں کے رنگ بھی بعض اوقات پھلوں کے رنگوں جیسے ہوتے ہیں۔

وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيبُ سُودٌ

(۳۵ : ۲۷) "پہاڑوں میں سفید' سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں"۔ جدد کے معنی راستے اور شاخیں ہیں یعنی دھاریاں۔ آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ "جدد بیض" کا رنگ بھی مختلف ہے اسی طرح "جدد حمر" کا رنگ بھی مختلف ہے۔ یعنی ہر قسم یعنی سفید و سرخ کا رنگ بھی مختلف ہے اور بعض دھاریاں شدید درجے کی سیاہ ہیں۔

یہاں اس بات کی طرف توجہ دی جاتی ہے کہ ایک رنگ کے پتھر مثلاً سرخ و سفید پھر آپس میں مختلف ہیں۔ پہاڑوں اور پتھروں کے یہ مختلف رنگ' پھلوں کے مختلف رنگوں کے بعد ذکر ہوئے۔ اس سے انسان کے دل میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور ذوق جمال تیز ہو جاتا ہے۔ یوں یہاں جمال اور خوبصورتی کو بھی تجریدی آرٹ کی شکل میں پیش کیا گیا جو بیک وقت پتھروں میں بھی ذوق نظر کے لیے دامن کش ہے اور پھلوں میں بھی ذوق نظر کو کھینچتا ہے جبکہ پھلوں میں اور پتھروں میں بظاہر کوئی نسبت نہیں ہے۔ لیکن تجریدی ذوق جمال ہر جگہ خوبصورتی کو دیکھ لیتا ہے اور قرآن کی یہ خصوصیت قابل التفات ہے۔

پھر لوگوں کے رنگ؟ یہ انسانوں کے عام رنگوں تک محدود نہیں' بلکہ ایک رنگ کے مختلف لوگوں کے رنگ اور ہر ایک کی بناوٹ کے درمیان فرق ہے بلکہ دو توام بھائی بھی رنگ میں مختلف ہوتے ہیں۔

انسانوں سے آگے پھر پرندوں' چرندوں اور درندوں کے رنگ' دابہ ہر حیوان کو کہا جاتا ہے جو زمین پر چلتا ہے۔ انعام اونٹ' گائے' بھیڑ اور بکریوں کے لیے آتا ہے۔ دواب کے لفظ کے بعد انعام کا خصوصی ذکر اس لیے کیا کہ انسان ان سے زیادہ مانوس ہے۔ ان کے رنگوں کی اسکیم بھی پھلوں اور پتھروں کی طرح حیران کن ہے۔

اس کائنات کے رنگوں کا یہ البم عجیب و غریب ہے۔ قرآن کریم اس کی ورق گردانی کرتا ہے اور انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ چشم بینا کے ساتھ رنگوں کی اس کائناتی اسکیم پر غور کرے۔ صرف اہل علم اور اہل ذوق ہی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ صرف اہل علم ہی حکمت اور قدرت خداوندی کو پا کر اللہ کی عظمت کا خیال کر کے اس سے ڈر سکتے ہیں۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵ : ۲۸) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں"۔ کتاب کائنات کے جو اوراق قرآن مجید نے الٹے ہیں وہ اس کے بہت کم اوراق ہیں اور علماء دراصل اس کائنات پر غور کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے علماء ہی دراصل اللہ کی حقیقی معرفت رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کی صنعتوں کے آثار سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور اللہ کی معرفت کا ادراک' اس کی قدرت کے آثار

سے ملاحظہ کرتے ہیں ۔ اللہ کی تخلیق کے عجائبات کو دیکھ کر اس کی عظمت کا شعور رکھتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ سے صحیح معنوں میں ڈرتے ہیں ۔ وہ اس کی حقیقی بندگی اس کے خوف کی وجہ سے کرتے ہیں ۔ اللہ کے بارے میں ان علمائے کائنات کا شعور مہمل اور پیچیدہ شعور نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے بارے میں ان کو گہری معرفت حاصل ہوتی ہے ۔

قرآن کے یہ صفحات اللہ کی کتاب کا نمونہ ہیں جبکہ رنگ اور دوسرے کائناتی عجائبات اس کائنات کا نمونہ ہیں اور ان کی حقیقت دراصل علمائے کائنات ہی مانتے ہیں ۔ وہ لوگ جو حقیقی علم کتاب رکھتے ہیں اور جو حقیقی تکوینی علم بھی رکھتے ہیں ۔ جو اللہ کی معرفت براہ راست رکھتے ہیں ۔ ایسا علم جو ان کے دل کا شعور ہو اور جس کے ذریعہ ان کا دل متحرک ہو ۔ جس کے ذریعہ وہ اس کائنات کے خوبصورت رنگوں کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں ' اور ان سے خوشی حاصل کر سکتے ہیں اور اللہ کی قدرت کاملہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں ۔

اس کائنات کی تشکیل و تخلیق میں حسن و جمال کا عنصر اصل مقصود ہے اور اس جسن کا کمال یہ ہے کہ ہرچیز اپنے فرائض منصبی اپنے طبیعی جمال اور حسن کے واسطے سے ادا کرتی ہے ۔ یہ پھول اپنے حسن و جمال اور اپنی نہایت ہی اچھی خوشبو کی وجہ سے شہد کی مکھیوں اور پروانوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں ۔ مکھیوں اور پروانوں کی ڈیوٹی پھولوں کے حوالے سے یہ ہے کہ یہ مادہ اور نر پھولوں کے درمیان ملاپ کرائیں تاکہ پودوں کے ساتھ پھل لگیں ۔ یوں یہ پھول اپنی خوبصورتی اور حسن و جمال کے ذریعے یہ کام کرواتے ہیں ۔ مادہ اور نر کے درمیان حسن و جمال ایک دوسرے کے لیے باعث کشش ہوتا ہے اور اس طرح دو صنفیں اپنا اپنا فریضہ منصبی اور طبیعی ادا کرتے ہیں ۔ یوں تمام اشیاء فریضہ طبیعی حسن و جمال کے ذریعے سرانجام دیتی ہیں ۔ پس جمال اس کائنات کی اسکیم میں مقصود بالذات ہے اور یہی وجہ ہے کہ کتاب کائنات کے حسن و جمال کے اظہار کے لیے کتاب الہٰی جابجا انسانی نظر کے لیے دامن کش ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ غَفُوْرٌ (۳۵ : ۲۸) "بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے" ۔ وہ زبردست ہے جس نے یہ اشیاء پیدا کیں اور وہ جزاء و سزا بھی دے سکتا ہے ۔ وہ غفور ہے اور جو لوگ اس کی اطاعت اور خوف و خشیت میں تقصیر کرتے ہیں وہ ان کو معاف کرتا ہے ۔ نیز جو لوگ اللہ کی صنعت کے عجائبات میں غور نہیں کرتے وہ ان کو بھی معاف کرتا ہے ۔

اب صفحات کائنات سے روئے سخن صفحات کتاب الہٰی کی طرف پھر جاتا ہے کہ جو لوگ اس کی تلاوت کرتے ہیں ان کے پیش نظر کیا ہے اور ان کے لیے کیا کیا انعامات تیار ہیں ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾

"جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں' اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں' یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے متوقع ہیں جس میں ہرگز خسارہ نہ ہو گا۔ (اس تجارت میں انہوں نے اپنا سب کچھ اس لیے کھپایا ہے) تاکہ اللہ ان کے اجر پورے کے پورے ان کو دے اور مزید اپنے فضل سے ان کو عطا فرمائے ۔بے شک اللہ بخشنے والا اور قدر دان ہے"۔

تلاوت کتاب سے مراد صرف جہراً یا خاموشی کے ساتھ کلمات کتاب دہرانے کے بجائے کوئی اور چیز ہے اور وہ ہے قرآن کو تدبر کے ساتھ پڑھنا۔جس کے بعد پڑھنے والا کسی حقیقت کا ادراک کرے اور اس سے متاثر ہو۔اس کے بعد وہ اس پر عمل کرے اور اپنی زندگی کو اس پر ڈھالے ۔یہی وجہ ہے کہ تلاوت قرآن کے بعد اقامت صلوٰۃ اور انفاق کا ذکر ہوا' خواہ پوشیدہ ہو یا علانیہ ہو۔اور اس کے بعد پھر ایسے لوگوں کو یہ امید ہو کہ اس سودے میں انہیں کوئی گھاٹا نہ ہو گا۔ ایسے لوگوں کو یہ معرفت حاصل ہو کہ اللہ کے ہاں جو اجر ہے وہ ان امور سے بہتر ہے جو ان کے ہاں ہیں ۔ان کو یہ یقین بھی ہو کہ وہ ایک ایسی تجارت کر رہے ہیں جس کا فائدہ محفوظ ہے اور ضمانت شدہ ہے ۔وہ اللہ وحدہ سے معاملہ کیے ہوئے ہیں اور اللہ کے ساتھ کیا ہوا بیوپار بہت ہی نفع بخش ہوتا ہے ۔یہ تجارت اخروی تجارت ہے جس میں منافع کی شرح بہت زیادہ ہے ۔ یہ ایک ایسی تجارت ہے جس میں لین دین بالکل پورا پورا ہوتا ہے اور اس پر فضل اللہ بھی ہوتا ہے ۔وہ (غفور و شکور ہے) تقصیرات کو معاف کرتا ہے اور بہت ہی شکر کرنے والا ہے ۔اور اللہ کی طرف سے شکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ بہترین جزاء دیتا ہے لیکن لفظ شکر انسان کے لیے حوصلہ افزائی کے لیے استعمال ہوا ہے اور یہ بات انسان کو شرم دلانے کے لیے اور حیا کرنے کے لیے کہی گئی ہے کہ جب اللہ منعم حقیقی اپنے بندوں کا شکر کرتا ہے تو پھر بندوں کا تو فرض ہے کہ وہ ہروقت اللہ کے شکر میں رطب اللسان رہیں۔

---OOO---

اس کے بعد اس کتاب کے مزاج کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے اندر حق ہی حق ہے اور اس کے وارث جنتوں کے وارث ہوں گے ۔آگے اس حق کے وارثوں کی بات آرہی ہے ۔

وَالَّذِيٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝۳۱

"(اے نبیؐ) جو کتاب ہم نے تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی ہے وہی حق ہے' تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے آئی تھی ۔بیشک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے"۔

سچائی کے دلائل اس کتاب کے مضامین میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہیں ۔یہ کتاب اس کائنات کے حقائق کی ترجمان ہے ۔ بلکہ یہ کتاب اس کائنات کا وہ صفحہ ہے جو پڑھا جاتا ہے اور پوری کائنات وہ صفحہ ہے جو خاموش ہے اور اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے ۔یہ کتاب تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو اللہ نے پہلے بھی بھیجی ہیں کیونکہ دونوں کا مصدر اور سرچشمہ ایک ہے ۔اور سچائی ہمیشہ ایک ہوتی ہے ۔اس میں تعدد نہیں ہوتا۔اس کتاب کے نازل کرنے والے نے اسے لوگوں کے

لیے بھیجا ہے اور وہ لوگوں کا خالق ہے اور وہ اچھی طرح لوگوں کو جانتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس چیز میں ان کی مصلحت ہے اور کس چیز کے ذریعہ ان کی اصلاح ممکن ہے ۔

انّ اللّٰہ بعبادہ لخبیرٌ بصیرٌ (۳۵ : ۳۱) "بے شک اللہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر اور ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے"۔

یہ تو ہے حقیقت اس کتاب کی ۔ یہ کتاب اللہ نے امت مسلمہ کو دی ہے اور اللہ نے اس کام کے سلسلے میں اس کا انتخاب کیا ہے جیسا کہ اللہ فرماتے ہیں :

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ

"پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنا دیا ان لوگوں کو جنہیں ہم نے (اس وراثت کے لیے) اپنے بندوں میں سے چن لیا"۔ ان الفاظ پر امت مسلمہ کو غور کرنا چاہئے ۔ اللہ نے اسے بہت ہی بڑا اعزاز دیا ہے اور اللہ نے اس کے کاندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے ۔ اس انتخاب کے ذریعہ سے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس کتاب کے کچھ تقاضے ہیں ۔ کیا یہ برگزیدہ امت سن رہی ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے ؟ اور اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہے ۔ اللہ نے تو اس امت کو اس انتخاب کی وجہ سے بہت بڑی عزت دی ہے اور اس کے بعد اللہ نے اس پر جزاء اور انعام مقرر کر کے اسے مزید فضیلت عطا کر دی ہے ۔

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

"اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے ، اور کوئی بیچ کی راس ہے ، اور کوئی اللہ کے اذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے"۔ پہلا فریق تعداد میں زیادہ ہوگا اس لیے اس کا ذکر پہلے کیا گیا ۔ یہ لوگ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہوں گی اور ان لوگوں کے اعمال میں سے سئیات زیادہ ہوں گے اور نیکیاں کم ہوں گی ۔ اور دوسرا فریق مقتصد ہوگا ۔ یعنی میانہ روی والا ۔ اس کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی ۔ اور تیسرا فریق سابق بالخیرات ہوگا یعنی نیکیوں میں سبقت لے جانے والا ۔ اس کی نیکیاں برائیوں سے بہت زیادہ ہوں گی لیکن ان تینوں کے ساتھ اللہ کا فضل شامل رہے گا ۔ یہ سب لوگ آنے والی آیتوں میں مذکور نعمتوں میں داخل ہوں گے ۔ اگرچہ درجات میں مختلف ہوں گے ۔

قرآن کریم نے امت کی کرامت کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے ہم اس میں کوئی اضافہ کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اللہ نے اس امت کو برگزیدہ کر لیا ہے اور اس کے لیے جزائے خیر کا اعلان کر دیا ہے ۔ آیات یہی بتاتی ہیں کہ آخر کار امت کا انجام یہی ہوگا ۔ امت سب کی سب اس اچھے انجام تک پہنچ جائے گی اور اس کی تفصیلات ہم اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں ۔ اس جزاء کو ہم یہاں لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں جو اللہ نے اس امت کے ان تینوں قسم کے لوگوں کے لیے مقدر کر رکھی ہے اور وہ

اچھی ہی جزاء ہو گی۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۳۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾

”یہی بہت بڑا فضل ہے ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے‘ وہاں انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا‘ وہاں ان کا لباس ریشم ہو گا‘ اور وہ کہیں گے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیا‘ یقیناً ہمارا رب معاف کرنے والا اور قدر فرمانے والا ہے‘ جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ ٹھیرا دیا‘ اب یہاں نہ ہمیں کوئی مشقت پیش آتی ہے اور نہ تکان لاحق ہوتی ہے“۔

اس منظر میں نہایت ٹھوس اور مادی نعمتوں کا ذکر ہے اور ایسی نفسیاتی سہولتوں کا ذکر ہے جنہیں محسوس کیا جاتا ہے۔ وہاں ان کی ظاہری حالت یہ ہو گی۔

يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (۳۵: ۳۳)
”وہاں انہیں سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا‘ وہاں ان کا لباس ریشم ہو گا“۔ یہ سازو سامان مادی اور ٹھوس ہے اور نظر آنے والا ہے۔ انسان کا نفس ان چیزوں کو پسند کرتا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی رضامندی‘ دلی اطمینان اور امن و سکون ہو گا۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵: ۳۴) ”شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کیا“۔ اور یہ دنیا جہاں ہر شخص قلق و بے چینی‘ اور مصائب و مشکلات سے دوچار ہوتا ہے آخرت کے مقابلے میں حزن ہے جہاں نعیم مقیم ہو گا۔ حشر کے دن کی پریشانی دنیا کی پریشانیوں سے بھی بڑی ہو گی جس سے ان کو نجات مل چکی ہو گی۔

اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۳۵: ۳۴) ”بے شک ہمارا رب معاف کر دینے والا اور قدر فرمانے والا ہے“۔ اس نے ہمیں بخش دیا‘ ہمارے معتبر اعمال کی قدر کی اور اس پر بہت بڑا معاوضہ دیا۔

الَّذِيْ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ (۳۵: ۳۵) ”جس نے ہمیں اپنے فضل سے ابدی قیام کی جگہ ٹھہرایا“۔ ہمیشہ کے لیے رہائش پذیر کر دیا اور مستقلاً ہم آباد ہو گئے۔ یہ کام اس نے اپنے فضل و کرم سے کیا کیونکہ ہم اپنے اعمال

کے بل بوتے پر تو مستحق نہ تھے ۔ یہ تو فضل تھا ہمیں کوئی مشقت پیش آتی ہے اور نہ تکان لاحق ہوتی ہے ۔ بلکہ یہاں راحت ' اطمینان اور ہر قسم کی نعمتیں جمع ہیں ۔

پوری فضا آرام ' راحت اور نعمتوں سے مالا مال ہے ۔ اور اس نرم و نازک اور پر لطف ماحول کے لیے اللہ نے الفاظ بھی نہایت ہی نرم و نازک چنے ہیں ۔ یہاں تک کہ لفظ حزن کو بھی یہاں حزن کہہ کر نرم و نازک کر دیا گیا ہے اور جنت کے لیے دار المقامہ کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ تکان اور مشقت کے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ چھو کر بھی نہ جا سکے گی ۔ اور الفاظ اور فقروں کا ترنم اپنی جگہ نہایت ہی فرحت بخش ہے ۔ نہایت ہی دھیمی موسیقی کی طرح ۔ اب ذرا دوسری جانب آیئے ! قلق ' اضطراب اور پریشانی اور افراتفری ۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ

"اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے لیے جہنم کی آگ ہے ۔ نہ ان کا قصہ پاک کر دیا جائے گا کہ مر جائیں اور نہ ان کے لیے جہنم کے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی" ۔ نہ یہ ہے اور نہ وہ ۔ ان کے لیے موت بھی نہ ہوگی ۔

كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۝۳۶

"اس طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اس شخص کو جو کفر کرنے والا ہو" ۔ اور اب ہمارے کان ایک کرخت اور سخت آواز سنتے ہیں ۔ یہ ایک غوغا ہے جو مختلف آوازوں سے مل کر اٹھ رہا ہے ۔ یہ مختلف اطراف سے آنے والی چیخ و پکار ہے ۔ ان کی طرف سے جو جہنم میں پھینک دیئے گئے ہیں ۔

وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاۗءَكُمُ النَّذِيْرُ ۭ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝۳۷

۴ اا ع ۱۶

"وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے کہ اے ہمارے رب ' ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں ان اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے ۔ (انہیں جواب دیا جائے گا) "کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا ؟ اور تمہارے پاس متنبہ کرنے والا بھی آ چکا تھا ۔ اب مزا چکھو ۔ ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے" ۔

وَ هُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا (۳۵ : ۳۷) "وہ وہاں چیخ چیخ کر کہیں گے" - لفظ (یصطرخون) کے تلفظ کے اندر ہی اس کے تمام مفہوم ثبت ہیں - اس کرخت آواز ہی سے اس کا مفہوم ظاہر ہو جاتا ہے - وہ کیا کہتے ہیں:

رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ (۳۵ : ۳۷) "اے ہمارے رب، ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں ان اعمال سے مختلف جو پہلے کرتے رہے تھے" - اب یہ اللہ کی طرف جھک رہے ہیں - اعتراف گناہ کر رہے ہیں اور نادم ہیں لیکن جب چڑیاں چگ گئیں کھیت - دیکھئے کس قدر سخت اور دو ٹوک جواب سنتے ہیں ہم جس کے اندر سرزنش بھی ہے -

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ

(۳۵ : ۳۷) "(انہیں جواب دیا جائے گا) "کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟ اور تمہارے پاس متنبہ کرنے والا بھی آچکا تھا - اب مزا چکھو - ظالموں کا یہاں کوئی مددگار نہیں ہے"۔

تمہیں ہم نے 'عمر دی' تم نے اس سے استفادہ نہ کیا' حالانکہ یہ عمر ان لوگوں کے لیے کافی تھی جو نصیحت حاصل کرنا چاہتے تھے - پھر تمہاری مزید سہولت کے لیے انبیاء بھی بھیجے گئے - انہوں نے تمہیں ڈرایا مگر تم نہ ڈرے - ان آیات میں دو باہم متقابل صورتیں بتائی گئی ہیں - ایک جانب امن و راحت ہے اور دوسری جانب قلق و اضطراب ہے - ایک طرف شکر نعمت کا میٹھا نغمہ ہے اور دوسری طرف چیخ و پکار ہے - ایک طرف اعزاز و اکرام و استقبال ہے اور دوسری جانب نظرانداز کرنا اور سرزنش کرنا ہے - ایک طرف نرم و نازک اور فرحت بخش الفاظ اور دوسری جانب کرخت اور سخت جھڑکی ہے - یوں کلام کے دونوں اطراف میں مکمل تقابل ہے' ہر ہر جزء میں -

اور سب سے آخر میں تمام مناظر پر ایک آخری تبصرہ آتا ہے' خصوصاً اہل دین اور امت مصطفوی کو چن لینے اور اسے اعزاز و اکرام دینے پر -

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۸﴾

"بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی ہر پوشیدہ چیز سے واقف ہے - وہ تو سینوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے"۔

اللہ کا کامل و شامل اور وسیع و عریض علم تو ان موضوعات کے بعد بیان کیا گیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے کتاب نازل کی اور اس کتاب کے جو لوگ وارث بنائے گئے ہیں' وہ جہاں والوں سے برگزیدہ کیے گئے ہیں - ان میں سے اگر بعض لوگوں سے کوئی ظلم و تقصیر صادر ہو جائے تو اللہ ان کو معاف کر دے گا - یہ اللہ کی جانب سے ان پر فضل و کرم ہو گا اور پھر اہل کفر کا جو انجام بتایا گیا - ان سب حقائق پر یہ آخری تبصرہ کہ وہ عالم الغیب ہے اور آسمانوں اور زمینوں میں پائی جانے والی ہر چیز کو جانتا ہے - وہ دلوں کی باتوں کو بھی جانتا ہے لہٰذا وہ تمام فیصلے اپنے اس عظیم اور کامل و شامل علم کے ذریعے کرے گا - اللہ کے فیصلوں میں کوئی ناانصافی نہ ہو گی -

درس نمبر ۲۰۴ ایک نظر میں

یہ اس سورہ کا آخری سبق ہے اور یہ وسیع مطالعاتی اسفار پر مشتمل ہے۔ اس میں جابجا دل و دماغ کو تیز احساس دلایا گیا ہے اور اشارات و ہدایات دی گئی ہیں۔ انسانوں کی تاریخ کی طویل وادی میں دور تک یہ سفر ہے' جس میں بے شمار نشیب و فراز آتے ہیں۔ بعض اقوام و ملل کیا اور بعض کچھ ہیں۔ پھر زمین و آسمان کا ایک سفر بھی اس میں ہے جس میں سعی بسیار کے باوجود اللہ کا کوئی شریک اور ہمسر نہ ملا۔ پوری کائنات کو چھان مارا۔ پھر ایک سفر اس مطالعہ کے لیے ہے کہ زمین و آسمان کو اللہ نے کس طرح تھام رکھا ہے۔ وہ مبین توازن کیا ہے جس کی وجہ سے کائنات کے یہ دیو ہیکل کرے باہم نہیں ٹکراتے۔ پھر ایک سفر اس قوم کی وادیوں میں ہے جس نے ہدایت کو ٹھکرا دیا ہے حالانکہ اس سے قبل یہ قوم دعائیں کرتی تھی کہ اگر اس کے اندر کوئی رسول آگیا تو وہ دو امتوں میں سے کسی ایک کے مقابلے میں کم از کم زیادہ ہدایت پر ہوں گے۔ لیکن جب ان کے ہاں رسول بشیر و نذیر بھیجا گیا تو وہ اپنے وعدے کو بھلا بیٹھے اور بے حد نفرت کرنے لگے اپنے مطلوب رسول سے۔ اور پھر انسانی تاریخ کی طویل وادیوں میں ہلاک کردہ اقوام کی سیر جن پر عذاب آئے اور ہلاک ہوئیں لیکن آج کے لوگ ان مصائب سے کوئی عبرت نہیں لیتے اور پھر اس سبق کا خوفناک خاتمہ۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (۳۵: ۴۵)

"اگر کہیں اللہ لوگوں کو ان کے کرتوتوں پر پکڑتا تو زمین پر کسی متنفس کو جیتا نہ چھوڑتا"۔ لیکن یہ اللہ کا عظیم فضل ہے کہ وہ لوگوں کو مہلت دیئے جا رہا ہے اور ان پر تباہ کن عذاب نازل نہیں فرماتا حالانکہ وہ اس کے مستحق ہیں۔

---ooo---

درس نمبر ۲۰۴ تشریح آیات

۳۹ --- تا --- ۴۵

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾

"وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے ۔ اب جو کوئی کفر کرتا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے ' اور کافروں کو ان کا کفر اس کے سوا کوئی ترقی نہیں دیتا کہ ان کے رب کا غضب ان پر زیادہ سے زیادہ بھڑکتا چلا جاتا ہے ۔ کافروں کے لیے خسارے میں اضافے کے سوا کوئی ترقی نہیں"۔

زمین کے اوپر نسلوں کا آنا اور جانا اور اس کا تسلسل اور ایک نسل کا مٹنا اور دوسری کا اس کی جانشینی کے مقام کو پانا' ایک مملکت کا ختم ہونا اور دوسری کا قیام عمل میں آنا' ایک شعلہ جوالہ کا بجھنا اور دوسرے کا اشتعال پذیر ہونا' ایک قوم کا مٹنا اور دوسری کا ظاہر و غالب ہونا اور صدیوں سے ایسا ہوتے چلے جانا ۔ تاریخ کی اس رفتار پر غور و فکر کرنے سے انسان کو بہت سا سبق اور عبرت حاصل ہوتی ہے اور حاضر اقوام یہ سوچتی ہیں کہ انہیں بھی اسی طرح نیست و نابود ہونا ہے ۔ ان کے آثار پر بھی آنے والے اسی طرح غور کریں گے جس طرح ہم جانے والوں کے آثار پر غور کرتے ہیں ۔ یوں غافل سے غافل شخص بھی ہوش کے ناخن لے سکتا ہے ۔ یوں ایک غور کرنے والا یہ غور کر سکتا ہے کہ وہ دست قدرت کیا ہے جس کی یہ سب کرشمہ سازیاں ہیں کہ کسی کی عمر کم ہے اور کسی کی زیادہ ۔ آج ایک حکومت ہے اور کل دوسری ۔ آج ایک ملک پر قابض ہے اور کل دوسرا قابض ہے ۔ ایک قوم دوسری قوم کی جانشین ہے ۔ ہر چیز جاری ہے ۔ اس کی انتہاء ہو رہی ہے اور باقی ہے صرف نام اللہ کا ۔ جو نہ زائل ہوتا ہے اور نہ اس کے لیے انتہاء ہے ۔

جو چیز جانے والی ہے اور اس کا وجود ختم ہوتا ہے وہ دائمی نہیں ہوتی ۔ اس کی مثال اس طرح ہے جس طرح ایک مسافر کسی منزل پر رکتا ہے ۔ کل اسے آگے جانا ہوتا ہے ۔ اور بعد میں دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اس نے کیا کیا اور کیا چھوڑا ۔ اور اس کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ اس کا حساب کیا جائے کہ اس نے کیا کیا اور کیا نہ کیا ۔ لہذا ہر شخص کا یہ

فرض ہے کہ وہ اپنی قلیل زندگی میں اچھے کام کرے اور اپنے پیچھے ذکر جمیل چھوڑے ۔ کچھ ایسے کام کرے جو اس کے جائے آرام میں اسے کام آئیں ۔

یہ ہیں بعض وہ خیالات جو دل و دماغ کی دیواریں پھلانگ کر آتے ہیں لیکن اس وقت جب کوئی اقوام کے عروج و زوال کو دیکھتا ہے ۔ طلوع و غروب پر غور کرتا ہے ۔ عروج پانے والی قوتوں اور مٹ جانے والی قوتوں کے امور پر غور کرتا ہے اور ایک قوم کو دیکھتا ہے کہ وہ دوسری قوم کی وارث ہو جاتی ہے ۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (۳۵ : ۳۹) "وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے" ۔ اس موثر، مسلسل اور دیکھے جانے والے منظر کے سائے میں، انسانوں کو یہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ ذمہ داری انفرادی ہے ۔ لہٰذا قیامت میں کوئی کسی کی جگہ کوئی ذمہ داری نہ اٹھا سکے گا اور کوئی کسی کے مقابلے میں مدافعت نہ کر سکے گا ۔ یہاں اشارہ کیا جاتا ہے کہ تم جس طرح منہ پھیرتے ہو، جس طرح کفر کرتے ہو، جس طرح گمراہی میں مبتلا ہوتے ہو، آخر کار اس کا انجام نہایت ہی گھناؤنا ہو گا ۔

فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا وَ لَا یَزِیْدُ الْكٰفِرِیْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (۳۵ : ۳۹) "اب جو کوئی کفر کرتا ہے اس کے کفر کا وبال اسی پر ہے، اور کافروں کو ان کا کفر اس کے سوا کوئی ترقی نہیں دیتا کہ ان کے رب کا غضب ان پر زیادہ سے زیادہ بھڑکتا چلا جاتا ہے ۔ کافروں کے لیے خسارے میں اضافے کے سوا کوئی ترقی نہیں" ۔ مقت کا مفہوم شدید غضب ہے اور جس پر اللہ کا شدید غضب ہو جائے تو اسے جان لینا چاہئے کہ کس قدر برا انجام اس کے انتظار میں ہے ۔ اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے ۔

--- ○○○ ---

دوسرا سفر آسمانوں کی وسعتوں میں ہے تاکہ معلوم کیا جا سکے کہ جن لوگوں کو یہ اللہ کا شریک بناتے ہیں آیا ان کے کسی کارنامے کے کوئی آثار زمین و آسمان میں ہیں ۔ زمین و آسمان میں تو ان کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے اور نہ کچھ آثار ہیں ۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۴۰﴾

"(اے نبیؐ) ان سے کہو، "کبھی تم نے دیکھا بھی ہے اپنے ان شریکوں کو جنہیں، تم خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہو؟ مجھے بتاؤ، انہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں میں ان کی کیا شرکت ہے (اگر یہ نہیں بتا سکتے تو ان سے پوچھو) کیا ہم

نے انہیں کوئی تحریر لکھ کر دی ہے جس کی بنا پر یہ (اپنے اس شرک کے لیے) کوئی صاف دلیل رکھتے ہوں؟ نہیں، بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسے دیئے جا رہے ہیں"۔

یہ حجت بالکل واضح ہے اور یہ دلیل محتاج تشریح نہیں ہے۔ یہ زمین اور اس کے اندر جو بھی ہے اس کے ساتھ وہ اللہ کی مخلوق ہے اور یہ آسمان اپنی وسعتوں تک اللہ کا ہے۔ اس زمین کے اندر نظر آنے والی اشیاء میں سے کون سی چیز ایسی ہے جس کے بارے میں اللہ کے سوا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہو یا کسی اور کے بارے میں دعویٰ کیا جا سکتا ہو کہ اس نے اسے پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے تو ہر چیز اس کے دعویٰ کے خلاف پکار اٹھے گی کہ یہ غلط ہے اور ہر چیز پکار کر کہے گی کہ اسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ ہر چیز اپنے اندر ایسے آثار اٹھائے ہوئے ہے کہ وہ کسی مدعی کے دعویٰ کو رد کرنے کے لیے کافی ہیں کیونکہ یہ آثار کسی انسانی صنعت سے مشابہت ہی نہیں رکھتے۔ یعنی انسانوں نے جس قدر چیزیں بنائی ہیں ان میں نظام قدرت کی مصنوعات کی صفات نہیں ہیں۔

اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ (۳۵ : ۴۰) "یا آسمانوں میں ان کی کیا شرکت ہے"۔ یہ تو بطریق اولیٰ مسترد ہے۔ جب زمین کی کسی چیز میں وہ شریک نہیں تو آسمان کی کسی چیز میں شریک کیسے ہیں۔ کیونکہ جب زمین کی کسی چیز کے بارے میں کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ان نام نہاد والیوں کی مخلوق ہے تو آسمان کی کسی چیز کے بارے میں کوئی کیسے دعویٰ کر سکتا ہے۔ غرض نہ یہ الٰہ آسمانوں کی کسی چیز کی تخلیق میں شریک ہیں اور نہ ملکیت میں شریک ہیں۔ جو چیز بھی آپ کہیں۔ یہاں تک کہ جن اور ملائکہ کو بھی ایسی کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ ان کے بارے میں تو ان کا زعم یہ تھا کہ جن آسمانوں کی خبریں چرا کر لاتے ہیں اور یہ ان سے یہ خبریں معلوم کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ عقیدہ کبھی نہیں رہا ہے کہ جن یا ملائکہ آسمانوں میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ (۳۵ : ۴۰) "کیا ہم نے ان کو کوئی تحریر لکھ کر دی ہے جس کی بنا پر کوئی صاف سند رکھتے ہیں"۔ یہ کہ اللہ نے ان خود ساختہ خداؤں کو کوئی تحریر دی ہو اور انہیں یقین ہو کہ وہ بھی خدا کے ساتھ شریک ہیں یہ مفروضہ بھی غلط ہے۔ یہاں یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہ استفہام انکاری شرکاء کے بجائے مشرکین سے ہو، یعنی ان خود ساختہ الہوں پر ان لوگوں کا جو اندھا عقیدہ ہے کیا یہ عقیدہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کسی تحریر پر مبنی ہے۔ جو ان مشرکین پر اتری ہو۔ اس سے یہ اپنا عقیدہ لیتے ہوں اور استدلال کرتے ہوں جبکہ یہ صحیح نہیں ہے اور نہ وہ کوئی ایسی تحریر پیش کر سکتے ہیں۔ یہاں اس تفسیر کے مطابق یہ اشارہ بھی نکلے گا کہ عقائد صرف اللہ کی جانب سے کسی کتاب اور صریح نص ہی سے ثابت ہوتے ہیں اور کتاب اللہ ہی نظریات کے لیے ماخذ ہو سکتی ہے کیونکہ یہی یقینی سرچشمہ ہدایت ہوتی ہے۔ ان کے پاس کوئی منصوص دلیل چونکہ نہیں ہے اس لیے ان کا دعویٰ غلط ہے۔ ان کے مقابلے میں رسول اللہ ؐ کا ہر قول اللہ تعالیٰ کا فرمایا ہوا ہے اور مستند ہے۔ پس کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ منہ پھیرتے ہیں حالانکہ عقائد لینے کا صحیح راستہ یہی ہے کہ یہ لوگ رسول ؐ کی بات مانیں۔

بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا (۳۵ : ۴۰) "بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو

محض فریب کے جھانسے دیئے جا رہے ہیں" ۔ یہ ظالم ایک دوسرے سے لمبے چوڑے وعدے کرتے ہیں کہ ان کا راستہ یہی راستہ ہے جو آباء و اجداد کا ہے اور یہ کہ وہ آخرکار کامیاب ہوں گے ۔ حالانکہ یہ لوگ فریب خوردہ اور مغرور ہیں ۔ ان میں سے بعض لوگ بعض کو دھوکہ دیتے ہیں ۔ وہ اس غرور میں زندہ رہتے ہیں اور یہ ان کے لیے کوئی نفع بخش صورت حال نہیں ہے ۔

اس کے بعد کہ اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے نہ آسمانوں میں ' نہ زمین میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ دست قدرت کا کارنامہ ہے کہ جس نے زمین و آسمان کو تھام رکھا ہے اور وہ بلا شرکت غیرے اس کائنات کا مدبر اور چلانے والا ہے ۔ کائنات میں کوئی اور الٰہ تلاش کرنے کے بجائے خود اس کو دیکھو ۔

إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَن تَزُولَا ۚ وَلَئِن زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّن بَعْدِهِ ۚ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿٤١﴾

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے ' اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا انہیں تھامنے والا نہیں ہے ۔ بے شک اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے" ۔

ذرا اس آسمان پر نگاہ ڈالو ' ذرا زمین کو دیکھو اور ان لاتعداد اربوں اجرام فلکی کو دیکھو جو اس لاانتہا فضا میں بکھرے ہوئے ہیں ۔ تمام کے تمام اپنی جگہ پر رکے ہوئے ہیں جو اپنے افلاک میں پھر رہے ہیں ۔ اپنے مدارات میں مقرر ' پھر ادھر ادھر نہیں ہوتے ۔ نہ ان کی رفتار میں کوئی خلل آتا ہے نہ مدارات سے نکل سکتے ہیں ' نہ ان کی رفتار سست ہو سکتی ہے ' اور نہ تیز ہو سکتی ہے ۔ لیکن ان کو اس طرح اپنے مقام پر ٹھہرانے کے لیے کوئی ستون نہیں لگا ہوا اور نہ یہ مضبوط رسیوں سے باندھے ہوئے ہیں ۔ کسی چیز کا بظاہر ان پر کوئی سہارا نہیں ہے ۔ اس عظیم مخلوق کو دیکھتے ہو جو اربوں کھربوں کی تعداد سے زیادہ ہے اور جو نہایت ہی عجیب و غریب ہے ۔ ایک عقلمند انسان کی آنکھیں ضرور کھل جانی چاہئیں کہ اس کے پیچھے ایک نہایت طاقتور اللہ العالمین کا دست قدرت کام کر رہا ہے ' جس نے اس عظیم کارخانے کو تھام رکھا ہے ۔

اگر آسمانوں کے یہ سیارے اور ستارے اور زمین اپنی جگہ سے ٹل جائیں اور بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھر جائیں تو ان کو کوئی پھر سے مرتب نہیں کر سکتا ۔ یہ ہے وہ وقت جب قیامت برپا ہو جائے گی اور اس جہان کے خاتمہ کے لیے قرآن نے اسی نظام کے اختلال کو علامت قرار دیا ہے جہاں پہاڑ اور ستارے روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائیں گے اور اس نظام کائنات کی ہر شے دوسری سے ٹکرا جائے گی ۔

یہ وہ مقرر وقت ہے جس میں تمام لوگوں کا حساب و کتاب ہو گا اور دنیا میں جس نے جو عمل کیا اس کا محاسبہ ہو گا ۔ دنیا کا انجام عالم آخرت پر ہو گا اور یہ دوسرا جہان اپنے مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے اس دنیا سے بالکل مختلف ہو گا ۔

یہی وجہ ہے کہ زمین و آسمان کو تھامے رکھنے پر یہ تبصرہ ہوتا ہے ۔

إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا (۳۵ : ۴۱) "اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے" ۔ وہ حلیم ہے ۔

لوگوں کو مہلت دیتا ہے' وہ ان کی بد عملی کی وجہ سے اس جہان کو ختم نہیں کرتا اور اجل مقرر سے قبل ہی ان سے حساب و کتاب لینا نہیں شروع کر دیتا۔ لوگوں کو توبہ کا بھی موقعہ دیتا ہے' قیامت کی تیاری کی مہلت بھی دیتا ہے اور غفور اس طرح ہے کہ لوگوں نے جو جو جرائم کیے سب پر مواخذہ نہیں کرتا بلکہ اللہ لوگوں کی برائیوں کے ایک بڑے حصے سے درگزر فرماتا ہے۔ جب بھی اللہ ان میں کوئی بھلائی دیکھے تو ان کی مغفرت کر دیتا ہے۔ یہ ایک ہدایت ہے جو لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ وہ اس موقع اور ضرورت کو غنیمت سمجھیں اور اگر یہ فرصت گنوادی تو یہ واپس نہ آئے گی۔

--- ○○○---

چوتھا سفر اہل مکہ اور اس کے ارد گرد کے مشرکین کے احوال کا ہے۔ ان لوگوں کی دعا ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ اگر اللہ ان میں رسول بھیج دے اور اسے کتاب دے دے تو وہ ایمان لائیں گے۔ پھر انہوں نے نقض عہد کیا اور فساد فی الارض کا ارتکاب کیا۔ ان کو ڈرایا جاتا ہے کہ اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَىِٕنْ جَآءَهُمْ نَذِیْرٌ لَّیَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِیْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَاﰳ اسْتِكْبَارًا فِی الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّیِّئِؕ وَلَا یَحِیْقُ الْمَكْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖؕ فَهَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِیْنَۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًاۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِیْلًاﰴ

"یہ لوگ کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہوتا تو یہ دنیا کی ہر دوسری قوم سے بڑھ کر راست رو ہوتے۔ مگر جب خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا تو اس کی آمد نے ان کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔ یہ زمین میں اور زیادہ سرکشی کرنے لگے اور بری بری چالیں چلنے لگے' حالانکہ بری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا ہے وہی ان کے ساتھ بھی برتا جائے؟ یہی بات ہے تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے"۔

اہل عرب دیکھتے تھے کہ یہودی جزیرۃ العرب میں ان کے ساتھ رہتے ہیں اور ان کو ایک کتاب دی گئی ہے اور وہ دیکھتے تھے کہ یہ یہودی اپنے دین سے منحرف ہو گئے ہیں اور بے عمل ہیں۔ عرب ان کی تاریخ بھی پڑھتے تھے کہ انہوں نے اپنے بے شمار رسولوں کو قتل بھی کیا اور جب بھی ان کے پاس سچائی آئی انہوں نے اس سے منہ پھیرا۔ اس وقت یہ یہودیوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے قسمیں کھایا کرتے تھے کہ اگر اللہ نے ہمیں کوئی پیغمبر دیا' اور وہ عربوں میں مبعوث ہوا تو وہ دنیا کی تمام امتوں سے بڑھ کر نیک ہوں گے۔ مراد ان کی یہ تھی کہ یہودیوں سے وہ زیادہ ہدایت پر

رہیں گے ۔ یہ لوگ اشارہ یہودیوں کی طرف کرتے تھے ۔

لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ (۳۵ : ۴۲) "اگر کوئی خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا ہوتا تو وہ دنیا کی ہر قوم سے زیادہ راست رو ہوتے"۔

یہ تھا ان کا حال قبل بعثت اور یہ تھا ان کا عقیدہ۔ یہ عقیدہ قرآن مجید ان پر اس طرح پیش کرتا ہے کہ ذرا تم اس صورت حالات کو یاد کرو کہ تم کیا کہا کرتے تھے ۔ بس کے بعد ان کے سامنے وہ حالات پیش کیے جاتے ہیں جو عملاً رسول کے آنے کے بعد پیش آئے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (۳۵ : ۴۲) اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ (۳۵ : ۴۳) "مگر جب خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا تو اس کی آمد نے ان کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔ زمین میں اور زیادہ سرکشی کرنے کی خاطر اور بری چالیں چلنے کی وجہ سے"۔ یہ کس قدر بری بات ہے کہ ایک شخص قسمیں کھائے کہ اس کا رویہ یہ ہو گا اور پھر وہ اس کے الٹ رویہ اختیار کرے ۔ مگر تکبر و غرور کی وجہ سے اور اپنی بری سازشوں کی وجہ سے ۔ قرآن مجید ان کے انکار کا اصلی سبب ریکارڈ کرتا ہے اور اس کے بعد قرآن مجید پھر ان کی ان مکاریوں کے بارے میں یہ فیصلہ اور جواب یوں دیتا ہے کہ جو شخص اس قدر قبیح حرکت کرتا ہے اس کا ایمان کیا ہو گا۔ اور انجام کیا ہو گا۔

وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (۳۵ : ۴۳) "حالانکہ بری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں"۔ یعنی ان کی بری چالیں ان ہی کے خلاف پڑیں گی اور یہ بری چالیں ان کو مخبوط الحواس کر دیں گی اور ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے ۔ اگر صورت یہ ہے تو پھر یہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں۔ صرف اس کا کہ ان پر بھی وہی مصائب آجائیں جو ان سے پہلی اقوام پر آئے ۔ سابقہ اقوام کے قصے تو انہیں معلوم ہیں۔ وہ بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ کی مستحکم سنت انہیں پکڑ لے ۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۳۵ : ۴۳) "یہی بات ہے تو تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے ۔ اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقررہ راستے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے ۔

--- ooo ---

لوگوں کے معاملات اتفاقاً نہیں چل رہے اور اس زمین پر یہ زندگی اور مخلوقات عبث طور پر نہیں پیدا کیے گئے ۔ اس دنیا کے کچھ قوانین ہیں جو ہرگز تبدیل نہیں ہوتے ۔ قرآن کریم اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے اور لوگوں کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ اس دنیا کے واقعات کو ایک انفرادی واقعہ ہی نہ سمجھیں اور اپنی زندگی ان سنن الٰہیہ سے غافل ہو کر نہ گزاریں بلکہ اپنی زندگی کو زمان و مکان کے مختصر ترین لمحات و مقامات تک بھی محدود نہ کر دیں ۔ قرآن ان کے تصور کو ذرا

بلند کر کے ان کی زندگی کے طریقوں کو اس کائنات کے طریقوں کے ساتھ مربوط کرنا چاہتا ہے ۔ چنانچہ قرآن مجید بار بار اس طرف توجہ کرتا ہے کہ اس کائنات میں اللہ نے کچھ اٹل اصول جاری کر رکھے ہیں ۔ وہ ان کو ان واقعات کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے جو اس دنیا میں ان سنن الٰہیہ کے مطابق ظاہر ہوئے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کا ماضی بتاتا ہے کہ یہ سنن اس کائنات میں جاری ہیں۔

یہ پانچواں سفر اسی کی ایک مثال ہے ۔ یہاں بھی یہ کہنے کے بعد کہ اللہ کے سنن نہیں بدلتے' اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ﴿٤٤﴾

"یہ لوگ زمین میں کبھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان سے بہت زیادہ طاقت ور تھے ؟ اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے' نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں ۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

اس زمین میں سیر کھلی آنکھوں اور بیدار دل و دماغ کے ساتھ ہونا چاہئے اور اس میں گذشتہ اقوام کے واقعات بھی پیش نظر رہنے چاہئیں کہ وہ کیا کرتے تھے اور ان کا انجام کیا ہوا۔ زمین کے واقعات و حادثات سے انسانی شعور اور دل میں خدا کا خوف اور عبرت آموز اشارات کا بیٹھنا ضروری ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار یہ ہدایت کی گئی ہے کہ زمین میں پھرو اور اقوام کے عروج و زوال کی داستانوں کا مطالعہ کرو' ہلاک شدہ اقوام کے شب و روز دیکھو' جن کا نام و نشان اس زمین سے مٹا دیا گیا۔ان سے عبرت حاصل کرو اور ان دلوں کو جگاؤ جن کو علم نہیں ہے ۔ اگر علم ہے تو ان کے اندر احساس نہیں ہے اور اگر احساس ہے تو وہ عبرت نہیں لیتے ۔ ان مردہ دلوں میں سنن الٰہیہ کا کوئی شعور نہیں ہے اور وہ تاریخی واقعات کی تعبیر سنن الٰہیہ کی روشنی میں نہیں کرتے ۔ حالانکہ انسان اور حیوان کے اندر فرق ہی صرف یہ ہے کہ انسان واقعات کی تعبیر و تشریح اصولوں کی روشنی میں کرتا ہے جبکہ حیوان حالات' واقعات' اصولوں اور قواعد اور سنن الٰہیہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچتا' نہ وہ کسی واقعہ سے احکام و نتائج اخذ کرتا ہے ۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ تمام بنی نوع انسان سنن الٰہیہ اور نوامیس فطرت کے سامنے یکساں ہوتے ہیں۔

اس تاریخی سفر میں قرآن کریم ناظرین کو تاریخ کی ہلاک شدہ اقوام کے کھنڈرات کے دہانے کھڑا کر کے ان کو یاد دہانی کراتا ہے کہ یہ لوگ نہایت قوت اور شوکت والے تھے اور ان کو ان کی یہ قوت اور شوکت بچا نہ سکی' لہٰذا تمام قوتوں سے برتر قوت موجود ہے ۔ وہ قوت جس کے مقابل کی کوئی قوت نہیں ہے اور نہ اس کو کوئی قوت عاجز کر سکتی ہے ۔ یہ قوت

ان لوگوں کو اسی طرح پکڑ سکتی ہے جس طرح سابقہ اقوام کو اس نے پکڑا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ (۳۵ : ۴۴) ”اور اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں“ اور اس پر یہ تبصرہ آتا ہے جو اس کی تفسیر کرتا ہے اور دلیل پیش کرتا ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا (۳۵ : ۴۴) ”وہ سب کچھ جانتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے“۔ سب سے آخر میں سورہ کا خاتمہ آتا ہے جس میں اللہ کی مہربانیاں اور معافیاں اور درگزر کا اظہار بھی کیا جاتا ہے اور اللہ کی قدرت اور قوت کا احساس بھی دلایا جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ لوگوں کو جو مہلت دیئے جا رہا ہے وہ اس لیے دے رہا ہے کہ وہ رحیم و کریم ہے اور اللہ حساب و کتاب میں نرم رویہ اختیار کرتا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝

۵
ع ۸
۱۷

”اگر کہیں وہ لوگوں کو ان کے کیے کرتوتوں پر پکڑتا تو زمین پر کسی متنفس کو جیتا نہ چھوڑتا۔ مگر وہ انہیں ایک مقرر وقت تک کے لیے مہلت دے رہا ہے۔ پھر جب ان کا وقت آن پورا ہو گا تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھ لے گا“۔

لوگ جو اللہ کے انعامات کا کفر کرتے ہیں، زمین میں شر و فساد کا ارتکاب کرتے ہیں اور ظلم و زیادتی اور سرکشی کرتے ہیں یہ ان کی جانب سے بہت ہی بری حرکت ہے۔ اگر اللہ لوگوں کو ان کی اس بری حرکت پر پکڑتا تو اللہ کی پکڑ کا دائرہ پورے کرۂ ارض تک پھیل جاتا اور یہ پورا کرۂ ارض زندگی کے قابل ہی نہ رہتا۔ صرف انسانوں کے لیے نہیں بلکہ کوئی زندہ چیز بھی یہاں نہ رہتی۔

اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ بہت برا اور گھناؤنا کام ہے اور اگر اللہ اس پر فوراً ہی پکڑ لیتا تو لوگوں کے اعمال کے طبعی اور اخلاقی نتائج ان کی فوری بربادی پر منتج ہوئے۔ لیکن اللہ حلیم ہے اور وہ لوگوں کی پکڑ میں شتابی نہیں فرماتا۔

وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (۳۵ : ۴۵) لیکن وہ انہیں ایک مقررہ وقت تک کے لیے مہلت دیتا ہے“۔ یعنی ہر فرد کو اس کی عمر طبعی تک مہلت دیتا ہے اور دنیا میں وہ اپنی عمر پوری کرتا ہے۔ اور وہ سوسائٹیوں اور ملتوں کو بھی اپنے وقت مقررہ تک مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ وہ نیست و نابود ہو کر دوسری ملل کے لیے جگہ خالی کرتی ہیں اور پوری بنی نوع انسان کو وہ مہلت دیتا ہے۔ جب وقت مقرر آئے گا تو قیامت برپا کر کے حساب و

کتاب لے گا اور وہ اس طرح لوگوں کو موقع دیتا ہے کہ وہ شاید نیک کام کر سکیں۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ (۳۵: ۴۵) "پھر جب ان کا وقت پورا ہو گا"۔ جب کسب و عمل کا وقت پورا ہو گا اور حساب و کتاب کا وقت آئے گا تو اللہ ان پر کوئی ظلم نہ کرے گا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا (۳۵: ۴۵) "تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھ لے گا"۔ اللہ کا اپنے بندوں کو دیکھ لینا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ پورا پورا حساب و کتاب ان کے اعمال کے مطابق کر لے۔ ان کے اعمال میں سے صغیرہ اور کبیرہ کوئی چیز رہ نہ جائے گی۔

--- ooo---

یہ اس سورہ کا آخری زمزمہ ہے۔ اس کا آغاز حمد الٰہی سے ہوا تھا جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ (۳۵: ۱) "جو فرشتوں کو رسول بناتا ہے جو پروں والے ہیں"۔ اور جو آسمانوں سے اس کا پیغام زمین پر لاتے ہیں جس کے اندر خوشخبری اور ڈراوا ہے۔ خوشخبری جنت کی ہے اور ڈراوا جہنم کا ہے۔

اس آغاز اور اختتام کے درمیان اس سورہ نے قارئین کو اس پوری کائنات کے مطالعہ کے لیے بے شمار سفر کرائے۔ یہ ہے اختتام ان اسفار کا۔ یہ ہے انجام زندگی کا اور یہ ہے انجام حضرت انسان کا۔

مانسہرہ - ۵ نومبر ۱۹۹۴ء

--- ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۲

سورۃ یٰسین ـ ۳۶

آیات ۱--- تا--- ۲۱

سورۂ یٰسین ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے اور اس کے فقرے مختصر ہیں۔ یوں لگتا ہے اس میں عقل و خرد کی تاروں پر جلدی جلدی ضربات لگائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کی آیات ۸۳ ہونے کے باوجود یہ اس سے پہلے آنے والی سورت 'سورۂ فاطر سے بہت چھوٹی ہے جبکہ اس کی آیات ۴۵ ہیں۔

مختصر فقرات اور آیات کے آخر میں فواصل اور پے درپے ضربات کی وجہ سے اس سورت کا ایک خاص مزاج اور ایک خاص طبیعت واضح نظر آتی ہے۔ عقل و خرد کی تاروں پر مسلسل ضربات 'انسانی احساس کو بیدار کرتی چلی جاتی ہیں اور کلام کی اس تیز رفتاری کی وجہ سے اس سورت کے اثرات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور وہ سائے اور تصویر کشیں اور مناظر جو اس سورت کے آغاز سے انجام تک مسلسل اور پے درپے آرہے ہیں' وہ انسان پر مختلف النوع اور گہرے اثرات چھوڑتے ہیں۔

اس سورت کا مرکزی موضوع اور مضمون وہی ہے جو تمام مکی سورتوں کا ہوا کرتا ہے۔ سورت کا مقصد اس کے آغاز ہی سے یہ نظر آتا ہے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی نکات کو مستحکم کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ آغاز ہی سے وحی و رسالت کی سچائی پر زور دیا جاتا ہے۔

یٰسٓ (۳۶ : ۱) وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (۳۶ : ۲) اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۶ : ۳)

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۶ : ۴) تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (۳۶ : ۵) (۳۶ : ۵) "یس۔ قسم ہے قرآن حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو' سیدھے راستے پر ہو اور یہ قرآن غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے"۔

اس کے بعد اصحاب القریہ کا قصہ آتا ہے۔ اس گاؤں والوں کے پاس رسول آتے ہیں۔ یہ رسول لوگوں کو وحی و رسالت کی تکذیب سے ڈراتے ہیں اور قصہ کا انجام دکھا کر سورت کے محور اور موضوع کو ثابت کیا جاتا ہے اور سورت کے اختتام کے قریب بھی دوبارہ اسی موضوع کو لیا جاتا ہے۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۶ : ۶۹)

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۳۶ : ۷۰) "اور ہم نے اس نبی کو شعر نہیں سکھایا اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے۔ یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف صاف پڑھی جانے والی کتاب تاکہ ہر اس شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت تمام ہو جائے"۔

اس سورت میں اللہ کی حاکمیت اور وحدانیت کے مسئلے کو بھی لیا گیا ہے ۔ایک رجل مومن کی زبانی شرک کی کراہت اور نہایت گھناؤنے پن کو ظاہر کیا جاتا ہے ۔یہ شخص اس قریہ کے دور دراز علاقوں سے آیا اور رسولوں کے حوالے سے اپنی قوم کے رویے پر اس نے سخت مواخذہ کیا ۔اس نے اپنی قوم پر اس طرح تنقید کی ۔

وَ مَالِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۳۶:۲۲) ءَ اَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا وَّ لَا یُنْقِذُوْنِ (۳۶:۲۳) اِنِّیْۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۶:۲۴) "آخر کیوں نہ میں اس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور جس کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے ۔کیا میں اس کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود بنالوں حالانکہ اگر خدائے رحمن مجھے کوئی نقصان پہنچانا ہے تو نہ ان کی شفاعت کچھ کام آسکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں ۔اگر میں ایسا کروں تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا" ۔اور سورت کے خاتمے کے قریب اس موضوع کو دوبارہ لایا جاتا ہے ۔ وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ یُنْصَرُوْنَ (۳۶:۷۴) لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَهُمْ وَ هُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ (۳۶:۷۵) "اور انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنالیے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی ۔وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ الٹے ان کے لئے حاضر ہیں" ۔

جس مسئلے پر اس سورت میں بہت زور دیا گیا ہے وہ مسئلہ بعث بعد الموت ہے ۔ اس سورت میں یہ مسئلہ بہت سے مقامات پر دہرایا گیا ہے ۔اس کے آغاز میں اس پر یوں بحث کی گئی ہے ۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ وَ كُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ (۳۶:۱۲) "ہم یقیناً ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں ۔جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ ہم سب لکھتے جارہے ہیں اور جو آثار انہوں نے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں ۔ ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے" ۔اور گاؤں والوں کے قصہ میں بھی بعث بعد الموت کا ذکر آتا ہے ۔رجل مومن کے واقعہ کے ضمن میں اور سیاق کلام میں اس کی جزاء کا فوری تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے ۔

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ (۳۶:۲۶) بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَ جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُكْرَمِیْنَ (۳۶:۲۷) "اس شخص سے کہہ دیا کہ "داخل ہو جا جنت میں" اس نے کہا کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرما دی اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل کر دیا" ۔اس کے بعد سورت کے وسط میں بھی اس کا تذکرہ ہوتا ہے ۔

وَ یَقُولُونَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۳۶:۴۸) مَا یَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً تَاْخُذُھُمْ وَ ھُمْ یَخِصِّمُوْنَ (۳۶:۴۹) فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ تَوْصِیَۃً وَّ لَآ اِلٰی اَھْلِھِمْ یَرْجِعُوْنَ (۳۶:۵۰) "یہ لوگ کہتے کہ یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو" دراصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں عین اسی حالت میں دھرلے گا جب یہ اپنے دنیوی معاملات میں جھگڑ رہے ہوں گے اور اس وقت یہ وصیت نہ کر سکیں گے' نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے"۔

اس کے بعد پھر مناظر قیامت میں سے ایک مکمل منظر دیا جاتا ہے اور سورت کے آخر میں اس موضوع کو ایک مکالمے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔

وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِیَ خَلْقَہٗ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَ ھِیَ رَمِیْمٌ (۳۶:۷۸) قُلْ یُحْیِیْھَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَھَآ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَ ھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ (۳۶:۷۹) "اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔کہتا ہے "کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں" اس سے کہو انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے"۔

یہ مسائل تو وہ تھے جو اسلامی نظریہ حیات کے بنیادی مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔یہ مسائل بار بار زیر بحث لائے جاتے ہیں اور مکی سورتوں میں تو ان پر کلام باز بار کیا جاتا ہے۔لیکن ہر بار ان مسائل کو مختلف زاویوں سے لیا جاتا ہے اور ہر بار قصہ نیا نظر آتا ہے۔موضوع پر ہر بار نئی روشنی ڈالی جاتی ہے۔اور ہر بار اس کے اثرات نئے ہوتے ہیں اور ہر بار سورت کی مجموعی فضا' اس کے ماحول اور اس کی تصاویر کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ سب اثرات مناظر قیامت کے ذریعہ اور پھر قصے کے مناظر اور اس کے کرداروں کے موقف اور ان کے مکالمات کے ذریعہ نفس انسانی پر نقش کیے جاتے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ میں گزری ہوئی اقوام پر آنے والے عذاب اور اس کائنات کے مختلف النوع اور حیرت انگیز مظاہر کے ذریعہ انسان کو مسحور کرایا جاتا ہے۔ایک بے آب وگیاہ مردہ زمین ہے اور چشم زدن میں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔اندھیری رات ہے اور اس سے سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے اور پھر شام کے بعد اندھیرا۔پھر سورج اپنے جائے قرار کے لیے چل رہا ہے۔چاند اپنی منازل میں سرگرداں ہے اور سوکھتے سوکھتے کھجور کی خشک شاخ کی طرح بن جاتا ہے۔پھر ذرا سمندر کے سینے پر کشتی کو دیکھو کہ وہ انسانوں سے بھری جاری ہے۔اور پھر ذرا حیوانات کو دیکھو کہ وہ انسانوں کے لیے مسخر ہیں اور پھر انسان کو دیکھو کہ نطفے کے اندر وہ خوردبین کے ذریعے بمشکل نظر آتا ہے اور پھر مختلف مراحل سے ہو کر جب وہ مکمل انسان بنا دیا جاتا ہے تو وہ باتیں بناتا ہے۔اور سرسبز و شاداب درخت کو تو دیکھو کہ اس کے اندر تمہارے لئے آگ کو مسخر کر دیا گیا ہے اور تم اسے جلاتے ہو۔

ان مشاہد کے علاوہ اس سورت میں کچھ اور بھی سحرانگیز چیزیں ہیں جو انسانی وجدان پر اثر ڈالتی ہیں اور اسے جگاتی ہیں۔مثلاً ان مکذبین کی تصویر کشی جن کے خلاف خود ان کے کفر کی وجہ سے اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا اور ان کی حالت یہ ہو

گئی نہ ڈراوا ان پر اثر انداز ہوا اور نہ آیات الٰہیہ ان کے لیے نفع بخش ثابت ہوئیں ۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِیْ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۳۶:۸) وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۳۶:۹) ”ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں ۔ اس لیے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں ۔ ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے ۔ انہیں اب کچھ نظر نہیں آتا۔

انہی چیزوں میں سے یہ امر بھی ہے کہ لوگوں کے نفسیاتی حالات سے اللہ تعالیٰ باخبر ہے ' چاہے وہ چھپے ہوئے ہوں یا ظاہر ہوں --- اور یہ کہ عمل تخلیق صرف ایک لفظ کن سے مکمل ہوتا ہے ۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (۳۶:۸۲) ”وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے ۔

یہ تمام امور انسان کے دل و دماغ کو چھوتے ہیں اور انسان ان چیزوں کے مفہوم کو عالم واقعہ میں موجود پاتا ہے ۔

--- ooo---

یہ سورت اپنے مضامین کے بیان کے اعتبار سے تین اسباق میں منقسم ہوتی ہے ۔

۱ـ پہلا سبق دو حروف کے ساتھ قسم کھا کر شروع کیا جاتا ہے ۔ یاسین اور ان حروف کی قسم کے بعد پھر قرآن مجید کے ساتھ قسم کھائی جاتی ہے ۔ یہ قسم اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کھائی جاتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول ہیں اور بالکل سیدھے راستے پر چل رہے ہیں اور جو لوگ غفلت کی وجہ سے آپ کی تکذیب کر رہے ہیں ' ان کا انجام نہایت ہی برا ہونے والا ہے ۔ اللہ نے ان لوگوں کے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ لوگ راہ راست کی طرف نہ پلٹ سکیں گے ۔ کیونکہ ان کے اپنے عمل کی وجہ سے ان کے اور راہ راست کے درمیان مشیت الٰہیہ حائل ہو چکی ہے اور اس حقیقت کی تفصیل یہ ہے کہ ہدایت صرف اس شخص کے لیے مفید ہوا کرتی ہے جو اللہ سے غائبانہ طور پر ڈرتا رہے اور جو نصیحت قبول کرنے کا داعیہ رکھتا ہو ۔ اور اس کا قلب دلائل ہدایت کی طرف مائل ہو اور اس کائنات میں جو شواہد انسان کو ایمان لانے پر مجبور کرتے ہیں وہ ان کو دیکھنے کے لئے تیار ہو ۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اصحاب قریہ کا قصہ اور مثال بیان کریں ۔ اور ذرا ان کو بتائیں کہ جھٹلانے کا انجام کیا ہوا کرتا ہے ۔ اور ایمان لانے والا دل کیا ہوتا ہے اور جو شخص ایمان لے آتا ہے اس کا انجام کیا ہوتا ہے ۔

دوسرا سبق ایسے مکذبین کی حالت پر سخت افسوس کے اظہار پر مشتمل ہے ' جو تکذیب پر تل جاتے ہیں ۔ ہر رسول کی تکذیب ایسے ہی لوگ کرتے چلے آئے ہیں بلکہ وہ اس پر مزید استہزاء اور مذاق بھی کرتے چلے آتے ہیں اور انسانوں نے کبھی بھی اپنی تاریخ میں ' اس تکذیب کی وجہ سے ہلاک کی جانے والی اقوام کے انجام پر غور نہیں کیا ۔ اور یہ لوگ ہمیشہ غافل رہتے ہیں اور اس کائنات میں پائی جانے والی روشن نشانیوں پر غور نہیں کرتے ۔ اور اس کے بعد دوسرے سبق میں

ان نشانیوں کو تفصیل سے لایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ آئے ہیں۔ اس سبق میں بڑی تفصیل سے قیامت کے مظاہر بھی دیئے جاتے ہیں۔

تیسرے سبق میں دوبارہ پوری سورت کے مضامین کو دہرایا گیا ہے۔ پہلے یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لے کر آئے ہیں وہ شعروشاعری نہیں ہے۔ اس کے بعد بعض وجدانی اشارات دیئے جاتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور وحدہ لاشریک ہے۔ اس بات پر افسوس کیا جاتا ہے کہ لوگ اللہ کے سوا دوسری ہستیوں کو الٰہ پکڑتے ہیں۔ یہ لوگ ان الہوں سے نصرت طلب کرتے ہیں اور خود ان الہوں کے فوجدار بنے ہوئے ہیں' اس کے بعد مسئلہ بعث بعد الموت کو لیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ دیکھو تمہیں اللہ نے نطفے سے پیدا کیا' کیا اس کے لیے بوسیدہ ہڈیوں سے ایک انسان کو کھڑا کرنا مشکل ہے۔ اس میں آخر انوکھے پن کی کیا بات ہے۔ اللہ تو وہ ہے جو بالکل سرسبز درخت سے آگ پیدا کر دیتا ہے۔ یہ بات کیا عجیب تر نہیں ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین پر مشتمل یہ عظیم کائنات تخلیق کی ہے۔ اللہ ایسا ایک دوسرا جہان بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اور آخرت میں انسانوں کو بھی دوبارہ بنا سکتا ہے۔ اب سورت کے آخر میں فکر و نظر کی تاروں پر ضرب لگائی جاتی ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳۶ : ۸۲) فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۳۶ : ۸۳) ''وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو''۔

---ooo---

درس نمبر ۲۰۵ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۹

يٰسٓ ﴿١﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿٢﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣﴾ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٤﴾ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿٥﴾ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿٦﴾ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٧﴾ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿٨﴾ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿٩﴾ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠﴾ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿١١﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۣ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٢﴾

ع ۱۲
۱۸

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے ۔

یس ۔ قسم ہے قرآن حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو' سیدھے راستے پر . . . . . . (اور یہ قرآن) غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے تاکہ تم خبردار کرو ایک ایسی قوم کو جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ

غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ـ ان میں سے اکثر لوگ فیصلہ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں' اسی لئے وہ ایمان نہیں لاتے ـ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں' اس لیے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں ـ ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے ـ ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے' انہیں اب کچھ نہیں سوجھتا ـ ان کے لیے یکساں ہے' تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو' یہ نہ مانیں گے ـ تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور بے دیکھے خدائے رحمان سے ڈرے ـ اسے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دے دو ـ ہم یقیناً ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں ـ جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں' اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں' وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں ـ ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے"۔

اللہ تعالیٰ دو حرفوں "یا" اور "سین" کی قسم اٹھاتا ہے اور اسی طرح قرآن کریم کی بھی قسم اٹھاتا ہے ـ اللہ نے یہاں قسم میں ان حروف اور قرآن کریم کو یکجا فرمایا ہے' اس سے حروف مقطعات کی اس تفسیر کو ترجیح حاصل ہو جاتی ہے جو ہم نے ان حروف کے حوالے سے اختیار کی ہے ـ ان حروف کے تذکرے اور قرآن کے تذکرے کے درمیان یہ ربط ہے کہ یہ قرآن انہی حروف سے بنا ہے ـ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہے اور جس پر یہ لوگ تدبر نہیں کرتے' اس کے ذریعہ قرآن کریم ان لوگوں کو متوجہ کرتا ہے کہ تم اس نکتے پر غور کرو' کہ یہ قرآن انہی حروف سے بنایا گیا ہے جو تمہاری دسترس میں ہیں ـ لیکن قرآن کا انداز تعبیر' اس کا انداز بیان اور اس کی منطق فکر ایسی ہے کہ تم اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز آ گئے ہو ـ

قسم کھائے ہوئے قرآن کی جو صفت یہاں لائی جاتی ہے ـ وہ صفت حکمت ہے ـ حکمت ایک ذی عقل کی صفت ہوتی ہے جو زندہ اور عقلمند ہو ـ قرآن کریم کی یہ صفت بتا کر یہ تاثر دینا مطلوب ہے کہ یہ زندہ اور قصد و ارادے کی مالک کتاب ہے ـ اسی وجہ سے یہ حکیم ہے ـ اگرچہ قرآن کریم کے لیے یہ صفت بطور مجاز استعمال کی گئی ہے لیکن یہ ایک عظیم حقیقت کی مظہر ہے ـ ایک اہم حقیقت کو اذہان کے قریب لایا جا رہا ہے ـ وہ یہ کہ اس کتاب کی ایک روح اور ایک زندگی ہے ـ اور جب قاری کا دل صاف ہو جائے اور وہ محبت کے ساتھ اس سے ہم کلام ہو جائے تو یہ کتاب نہایت الفت اور محبت کے ساتھ اس شخص کے ساتھ ہمکلام ہوتی ہے اور وہ ایسے شخص پر پھر اپنے اسرار و رموز کھولتی ہے بشرطیکہ قاری خود اس کے لئے اپنا دل کھول دے اور اپنے دل و جان کے ساتھ اس کا ہو جائے ـ پھر اس کے قاری کو اس کے وہ خدوخال نظر آئیں گے جس طرح کسی دوست کے چہرے میں انسان کو نظر آتے ہیں ـ اور وہ اس کتاب کی طرف اسی شوق کے ساتھ مائل ہو گا جس طرح کوئی اپنے دوست کی طرف مائل ہوتا ہے ـ اور پھر قرآن میں اسے وہی سکون ملتا ہے جس طرح ایک دوست کی محفل میں ملتا ہے ـ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں سے قرآن کو سننا پسند فرماتے تھے ـ آپ ایسے دروازوں پر کھڑے ہو جاتے اور سنتے جن میں قرآن حکیم کی تلاوت ہو رہی ہوتی تھی ـ جس طرح کوئی عاشق اپنے محبوب کی باتیں غور سے سنتا ہے ـ

اور قرآن تو حکیم ہے ـ وہ ہر اس شخص سے ہمکلام ہوتا ہے جو اس کا گرویدہ ہو جائے ـ وہ ایک مومن کے دل کی حساس تاروں کو چھیڑتا ہے ـ اس کے ساتھ اسی مقدار میں ہمکلام ہوتا ہے جس قدر اس کو ضرورت ہوتی ہے ـ اور یہ مکالمہ نہایت حکمت سے ہوتا ہے ـ اس انداز میں کہ مخاطب کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کو ایک سمت ملتی ہے ـ

قرآن حکیم ہے ' بڑی حکمت کے ساتھ تربیت کرتا ہے ۔ نہایت ہی معقول انداز میں ۔ درست نفسیاتی سمت میں ۔ ایسے انداز میں کہ جس میں تمام انسانی صلاحیتوں کو تعمیری انداز میں کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور انسانی صلاحیتوں کو صحت مند ترقی کے لئے ایک سمت دی جاتی ہے ۔ یہ انسانوں کو زندگی گزارنے کا نہایت ہی حکیمانہ نظام دیتا ہے جس کے کھلے اور وسیع حدود کے اندر انسان زندگی کی سرگرمیاں جاری رکھتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ یا اور سین اور پھر قرآن مجید کی قسم کھا کر یقین دہانی فرماتا ہے کہ اے رسول آپ رسولوں میں سے ہیں اور آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے ۔ آپ رسول کریم ہیں اور یہ قرآن حکیم ہے ۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (٣٦ : ٣) عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٣٦ : ٤) "تم یقیناً رسولوں میں سے ہو 'سیدھے راستے پر ہو" ۔ اللہ تعالیٰ کو قسم اٹھانے کی ضرورت کیا ہے ؟ لیکن قرآن اور حروف قرآن کی یہ قسم ' ان چیزوں کو جلالت شان عطا کرتی ہے جن کی قسم اٹھائی گئی ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ کسی عظیم الشان اور اہم چیز کی قسم اٹھاتا ہے یہاں تک کہ اس چیز کی اہمیت ایک شاہد اور ثابت کنندہ کی ہو جاتی ہے ۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (٣٦ : ٣) "تم یقیناً رسولوں مین سے ہو" ۔ جس انداز سے یہ آیت آئی ہے ' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں رسولوں کا بھیجنا اور انتخاب پہلے سے طے شدہ ہے ۔ یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حلفیہ بیان کی صورت میں بتایا جاتا ہے کہ آپ کا نام رسولوں کی فہرست میں ہے اور یہاں مکذبین اور منکرین کو خطاب کرنے کی بجائے رسول اللہ کو خطاب فرمایا جاتا ہے ۔ اس میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ رسول اور منصب رسالت ' اس قدر بلند و بالا ہیں کہ جن پر کوئی کلام اور مباحثہ اور مجادلہ نہیں ہو سکتا ۔ بس اللہ کی جانب سے رسول کو اطلاع دے دینا ہی مکمل ثبوت تصور ہوتا ہے ۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (٣٦ : ٣) عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (٣٦ : ٤) "تم یقیناً رسولوں میں سے ہو 'سیدھے راستے پر ہو" ۔ رسولوں کے تعین اور تقرر کے بعد بتایا جاتا ہے کہ رسالت کی نوعیت کیا ہے ؟ یہ کہ وہ ایک سیدھا راستہ ہے ۔ یہ رسالت تلوار کی دھار کی طرح سیدھی ہوتی ہے ۔ اس میں کوئی ٹیڑھ پن اور کوئی انحراف نہیں ہوتا ۔ نہ اس میں کوئی پیچیدگی ہوتی ہے اور نہ کوئی لچک ہوتی ہے ۔ یہ ایسی سچائی پر مشتمل ہوتی ہے جو بالکل واضح ہوتی ہے ۔ اور اس میں کوئی التباس نہیں ہوتا ۔ نہ وہ خواہشات نفسانیہ کی تابع ہے ۔ اور نہ وہ مصلحتوں کی سمت میں قبلہ بدلتی ہے ۔ جو شخص بھی اس سچائی کی تلاش کرے اور مخلص ہو ' یہ اسے مل جاتی ہے ۔

یہ رسالت چونکہ سیدھا راستہ بتاتی ہے اس لیے اس مین نہ کوئی اشکال ہے ' نہ پیچیدگی ہے ' اور نہ کوئی چکر ہے ۔ یہ مسائل کو مشکل نہیں بناتی ۔ نہ لوگوں کو مشکلات میں ڈالتی ہے ' اس کے اندر جدلیاتی مسائل پر مکالمہ نہیں ہوتا ۔ اور نہ فلسفیانہ تصورات میں الجھایا جاتا ہے ۔ یہ سچائی کو نہایت ہی سادہ شکل میں پیش کرتی ہے ۔ اور اس قدر سادہ شکل میں جس میں کوئی شبہ اور کوئی غلط مبحث نہیں ہوتا ۔ اس قدر سادہ کہ اسے مزید تشریح کی ضرورت ہی نہیں ہوتی ۔ الفاظ کا جوڑتوڑ ' اور باتوں سے بات نکالنا اس میں پیش ہوتا ہے اور نہ پیچیدہ اور ژولیدہ افکار کو زیر بحث لایا جاتا ہے ۔ اسی رسالت کے ساتھ موجودہ ہدایات اور ظاہری احکام پر عمل

کرتے ہوئے زندگی بسر کی جاسکتی ہے - یہ امی اور عالم دونوں کے لیے ہدایت ہے - یہ دیہاتی اور شہری دونوں کے لیے ہدایت ہے - ہر شخص اور ہر طبقہ اس کے اندر اپنی ضرورت کی ہدایت پاتا ہے - اور اس کے ساتھ اس کی زندگی کی اصلاح ہو جاتی ہے - اس کا نظام زندگی درست ہو جاتا ہے - زندگی کے طور طریقے درست ہو جاتے ہیں اور انسانوں کے باہم تعلقات نہایت ہی آسانی کے ساتھ سرانجام پاتے ہیں -

پھر یہ رسالت اس کائنات کی فطرت اور اس کائنات کے اندر جاری و ساری قانون الٰہی کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے - انسان اور انسان کے ماحول میں پائے جانے والی ’ندواشیاء کے ساتھ بھی یہ رسالت ہم آہنگ ہے - یہ نہ دنیا کی اشیاء کے ساتھ متصادم ہے‘ نہ انسان کو یہ رسالت حکم دیتی ہے کہ وہ فطرت کے ساتھ متصادم ہو - یہ اپنے منہاج پر درست استوار ہے - اور اس کائنات کے ساتھ متوازی ہے - یہ معاون ہے‘ یہ ایک ایسا نظام دیتی ہے جو مکمل کائنات ہے -

یہ رسالت اللہ تک پہنچنے کا صحیح راستہ بتاتی ہے‘ اور اللہ تک پہنچاتی ہے - اس رسالت کے متبعین کو کبھی یہ خطرہ درپیش نہیں ہوتا کہ وہ راستہ بھلا دیں - نہ ان کی راہ میں کوئی ٹیڑھ آتی ہے جو اس وادی میں داخل ہوتا ہے - وہ اس کے نشیب و فراز سے ہوتا ہوا سیدھا رضائے الٰہی اور اپنے خالق عظیم تک جا پہنچتا ہے -

اس رسالت نے یہ قرآن دیا ہے - جو اس سیدھی راہ کا پورا نقشہ بتاتا ہے اور ایک گائیڈ ہے - جب انسان اس کتاب کی راہنمائی میں چلے تو وہ سچائی کی سیدھی ڈگر پا لیتا ہے - وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور پھر اس کی قدروں کے بارے میں یہ کتاب فیصلہ کن ہدایت دیتی ہے اور ہر چیز کو اس کی صحیح جگہ پر رکھ دیتی ہے -

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (۳۶ : ۵) ”یہ غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے“ - ایسے مقامات پر اللہ اپنے بندوں سے اپنے آپ کو متعارف فرماتا ہے تاکہ وہ اللہ کے کلام کی حقیقت کو سمجھیں کہ اللہ غالب ہے اور رحیم ہے - وہ غالب ہے لہٰذا جو چاہے کر سکتا ہے - اور رحیم ہے‘ اس لیے اپنے بندوں کے ساتھ رحیمانہ برتاؤ کرتا ہے - اس لیے اللہ کے احکام میں رحمت کا پہلو ضرور ہوتا ہے -

رہی یہ بات کہ اس قرآن کے نزول کے مقاصد کیا ہیں اور اس کی حکمت کیا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو انجام بد سے ڈرایا جائے اور ان تک سچائی کا پیغام پہنچایا جائے‘ خصوصاً

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۶ : ۶) ”تاکہ تم خبردار کرو ایسی قوم کو جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں“ - غفلت وہ بڑی بیماری ہے جس کی وجہ سے دلوں میں فساد پیدا ہو جاتا ہے - ایک غافل دل دراصل اپنے فریضہ منصبی کو چھوڑ دیتا ہے‘ اس لیے وہ ایک عضو معطل ہو جاتا ہے - کیونکہ ہدایت اخذ کرنا اور اسے قبول کرنا یہ دل کا کام ہے - جب انسانوں کے سامنے دلائل ہدایت پیش کیے جاتے ہیں تو انسانی دل یا تو ان پر غافل ہو کر گزر جاتا ہے اور یا ان دلائل کو اخذ کر لیتا ہے - لہٰذا ان غافل لوگوں کو ڈرانا مفید تھا - کیونکہ نسلیں گزر گئی تھیں اور اس قوم کے پاس کوئی ڈرانے والا نہ آیا تھا - نہ کوئی ایسا شخص آیا تھا جو ان کو متنبہ کرتا - یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امت اور اولاد میں سے تھے - اور ان کے بعد صدیاں گزر گئی تھیں - اور ان کے پاس کوئی نبی اور نذیر نہ آیا تھا - لہٰذا ایسا ڈرانے والا ان کی ضرورت تھا‘ جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کر دے

کیونکہ آباؤ اجداد کے وقت سے یہ لوگ خواب غفلت میں پڑے ہوئے تھے ۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ ان غافلوں کا انجام کیا ہونے والا ہے ۔ اللہ کے نظام قضا و قدر نے ان کے بارے میں کیا فیصلہ کر دیا ہے کیونکہ اللہ کو ان کے قلوب کے بارے میں خوب علم تھا ۔ وہ ان سے سرزد ہونے والے امور کو پہلے سے جانتا تھا ۔ انہوں نے جو کیا وہ بھی اللہ کے علم میں تھا اور جو ہونے والا تھا ' وہ بھی اس کے علم میں تھا ۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰی اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۳۶ : ۷) "ان میں سے اکثر لوگ فیصلہ عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اسی لیے وہ ایمان نہیں لاتے" ۔ ان کے معاملے میں اللہ نے فیصلہ صادر کر دیا ہے اور اللہ کا فیصلہ ان کے حق میں درست ہے ۔ یہ فیصلہ سچائی پر ہوا ہے ۔ حق کے مطابق ہے ۔ کیونکہ اللہ ان کی حقیقت سے خوب واقف تھا ۔ اللہ ان کے شعور اور میلان سے بھی واقف تھا ۔ یہ لوگ ایمان لانے والے ہی نہ تھے ۔ اکثریت کا یہی انجام ہے ۔ ان کے نفوس اور ہدایت کے درمیان پردے حائل ہو چکے ہیں ۔ وہ نہ سچائی کے دلائل کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان کو ان کا شعور حاصل ہے ۔

جن لوگوں پر اللہ کا فیصلہ حق ہو چکا ان کی نفسیاتی حالت کی تصویر یہ ہے ۔ ان کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں ' ان طوقوں کے اندر وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے ہوئے ہیں ۔ وہ دیکھ بھی نہیں سکتے ۔ ان کے اور ہدایت کے درمیان پردے اور رکاوٹیں حائل ہو چکی ہیں ۔ ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں ' اس لیے وہ دیکھنے کے اہل ہی نہیں رہے ۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۳۶ : ۸) وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۳۶ : ۹)

"ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جن سے وہ ٹھوڑیوں تک جکڑے گئے ہیں ' اس لیے وہ سر اٹھائے کھڑے ہیں ۔ ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے ۔ ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے ' انہیں اب کچھ نہیں سوجھتا" ۔

ان کے ہاتھ طوقوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں ۔ پھر یہ ان کی گردنوں کے ساتھ بندھے ہیں اور ان کی ٹھوڑیوں کے نیچے جکڑ دیے گئے ہیں ۔ اس طرح ان کے سر مجبوراً اوپر کی طرف اٹھ گئے ہیں ۔ اس لیے وہ اپنے سامنے کی طرف نیچے راستے کو دیکھنے کے قابل ہی نہیں ہیں ۔ چونکہ وہ اس بری حالت میں ہیں ۔ اس لیے نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کچھ کر سکتے ہیں ۔ پھر ان کے آگے بھی ایک دیوار ہے اور پیچھے بھی ایک دیوار ہے ۔ اس طرح وہ کسی طرح بھی حق تک پہنچنے کے اہل ہی نہیں رہے ۔ یہ کسے ہوئے ہیں لہٰذا دیکھ نہیں سکتے ۔ آگے پیچھے دیواریں ہیں جن سے ان کی نظریں پار نہیں ہو سکتیں ۔ خود اپنی اپنی نالائقی اور بدعملی کی وجہ سے وہ اس نفسیاتی حالت تک پہنچے ہیں ۔

یہ منظر حسی ہے اور بڑا شدید منظر ہے لیکن روز مرہ کی زندگی میں ہمیں بے شمار لوگ ملتے ہیں جن کے بارے میں انسان اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ یہ لوگ واضح سچائی کو نہیں دیکھ پا رہے ۔ لہٰذا ان کے سامنے ایسے پردے اور ایسی دیواریں حائل ہیں کہ وہ ان سے اس پار نہیں دیکھ سکتے ۔ اگر ہاتھ پاؤں یوں بندھے ہوئے نہ بھی ہوں اور ان کے سر اوپر

کی طرف کس نہ بھی دیئے گئے ہوں کہ وہ اوپر ہی کو دیکھ سکتے ہوں' بلکہ وہ بظاہر صحیح سالم اور آزاد ہوں لیکن ان کی نفسیاتی حالت ایسی ہی ہوتی ہے' کہ وہ اپنی بصیرت کے ذریعے ہدایت کو نہیں دیکھ پاتے اور دلائل ہدایت اور ان کی سوچ کے درمیان غیر مرئی دیواریں حائل نظر آتی ہیں۔ یہی حالت مکہ کے ان لوگوں کی تھی جنہوں نے قرآن کا استقبال ایسی ہی نفسیاتی حالت کے ساتھ کیا۔ قرآن ان کے سامنے صاف صاف دلائل و نشانیاں پیش کرتا اور وہ انکار پر مصر رہتے۔ پیش کردہ دلائل کے علاوہ قرآن تو بذات خود معجزانہ دلیل اور نشانی تھا جس کے مقابلے میں کوئی صاحب بصیرت انسان نہیں ٹھہر سکتا تھا مگر یہ لوگ انکار پر مصر رہے۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۳٦ : ۱۰) "ان کے لیے یکساں ہے تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو' یہ نہ مانیں گے"۔ اس لیے کہ ان کے معاملے میں اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کیونکہ اللہ کو علم تھا کہ ان کے دلوں میں ایمان کے راہ پانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اور ایسے دلوں پر خبردار کرنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جو ایمان کے لیے تیار ہی نہ ہوں۔ وہ دل جو بندھے ہوئے ہیں جن کے اور سچائی کے درمیان دیواریں حائل ہوں۔ انذار اور تبلیغ کی وجہ سے مردہ دلوں کو زندہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ غافل اور سوئے ہوؤں کو جگایا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ایسے سوئے ہوئے دلوں کو جو ہدایت لینا چاہیں اور اس کے لیے تیار ہوں۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ

(۳٦ : ۱۱) "تم تو اسی شخص کو خبردار کر سکتے ہو جو نصیحت کی پیروی کرے اور جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرے' اسے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دے دو"۔ الذکر سے یہاں قرآن کریم مراد ہے۔ راجح قول یہی ہے۔ وہ شخص جو قرآن کی تابعداری کرے اور رحمٰن سے بن دیکھے ڈرے' یہی شخص ڈرانے سے استفادہ کر سکتا ہے۔ گویا یہی شخص ہے جس کے لیے ڈراوا آیا ہے۔ گویا ایسے ہی شخص کے لیے رسول اللہ کو بھیجا گیا ہے۔ اگرچہ رسالت عمومی ہے لیکن دوسرے لوگوں اور ہدایت کے درمیان پردے حائل ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ہدایت اس شخص تک محدود ہو گئی جو قرآن کو مان لے اور بن دیکھے رحمٰن سے ڈرے۔ ایسے ہی لوگ جب وہ ڈراوے سے استفادہ کرتے ہیں تو وہ خوشخبری کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ (۳٦ : ۱۱) "اسے مغفرت اور اجر کریم کی بشارت دے دو"۔ مغفرت ان غلطیوں پر جو واقع ہو گئیں اور ان پر اصرار نہ کیا گیا۔ اور اجر کریم اس لیے کہ یہ شخص غائبانہ طور پر اللہ سے ڈرتا رہا۔ اور اللہ کی جانب سے جو یاد دہانی آتی رہی اس کا اتباع کرتا رہا۔ یہ دونوں چیزیں قلب مومن میں باہم دگر لازم و ملزوم ہیں۔ جب بھی کسی دل میں خدا کا خوف پیدا ہو تو انسان خدا کی ہدایات پر عمل شروع کر دیتا ہے اور جس نظام زندگی کا اس نے ارادہ کیا اس پر استقامت حاصل ہو جاتی ہے۔

چنانچہ یہاں یاددہانی کرائی جاتی ہے کہ ایک دن تم نے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے' تمہارا حساب نہایت وقت کے ساتھ تیار ہو گا اور اس میں سے کوئی بات چھوٹی ہوئی نہ ہو گی۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ ۚ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۳۶ : ۱۲) ”یقیناً ہم ایک روز مردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جارہے ہیں اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں۔ ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے“۔

مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا وہ مسئلہ ہے جس پر ہمیشہ مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ اس سورت میں بھی اس کے امکان پر کئی مثالیں دی جائیں گی۔ یہاں ان کو ڈرایا جاتا ہے کہ وہ جو اعمال بھی کر رہے ہیں اور اپنے پیچھے جو بھی اچھے یا برے آثار چھوڑ رہے ہیں وہ سب اللہ کے ہاں ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ ان اعمال میں سے نہ کوئی چیز چھوٹ سکتی ہے اور نہ بھول سکتی ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ وہی ہے جو ان کے اعمال و آثار کو قلم بند کر رہا ہے۔ وہی ہے جو ہر چیز کو لکھ رہا ہے۔ لہٰذا یہ تمام امور اسی طرح ظہور پذیر ہوں گے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے دست قدرت سے انہیں ظاہر کرے گا اور جس طرح اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے کہ وہ ان امور کو اسی طرح ظاہر کرے گا۔

امام مبین سے مراد لوح محفوظ ہے یا وہ دفتر جہاں اللہ کے نظام کے مطابق اعمال ریکارڈ ہوتے ہیں' لوح محفوظ سے اللہ کا ازلی اور قدیم علم مراد ہے۔ اور اللہ کا علم ہر چیز کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔

--- ooo ---

وحی و رسالت کے مسئلے کے اس تاکیدی بیان اور قضیہ حساب و کتاب کے اس اٹل اعلان کے بعد' اب اسی مضمون کو قصے کی صورت میں لایا جاتا ہے۔ اس قصے میں ایمان اور کفر کے جو دو باہم متقابل موقف سامنے آتے ہیں وہ نفس انسانی پر نہایت گہرے اثرات چھوڑتے ہیں اور دونوں مواقف کا انجام بھی آنکھوں کے سامنے منقش نظر آتا ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

"انہیں مثال کے طور پر اس بستی والوں کا قصہ سناؤ جب کہ اس میں رسول آئے تھے۔ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے اور انہوں نے دونوں کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے تیسرا مدد کے لیے بھیجا اور ان سب نے کہا "ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں"۔ بستی والوں نے کہا "تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان اور خدائے رحمٰن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے' تم محض جھوٹ بولتے ہو"۔

رسولوں نے کہا "ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں' اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے"۔ بستی والے کہنے لگے "ہم تو تمہیں اپنے لیے فال بد سمجھتے ہیں۔ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے"۔ رسولوں نے جواب دیا "تمہاری فال بد تو تمہارے اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کیا یہ باتیں تم اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی گئی؟ اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو"۔

قرآن کریم نے اصحاب قریہ کا نام نہیں لیا' نہ اس گاؤں کا اتہ پتہ بتایا ہے۔ اس کے بارے میں مفسرین نے بہت سی روایات نقل کی ہیں۔ ان روایات کے پیچھے پڑنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ نہ ان پر بحث کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم کا اس شہر کا نام نہ لینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ قصہ کے جو مقاصد ہیں ان میں اس گاؤں کا نام لینے سے کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس شہر اور اس کے محل وقوع کا نام نہیں لیا۔ اور قصے اور اس سے حاصل ہونے والے سبق ہی پر اکتفاء کیا۔ بہرحال یہ ایک گاؤں تھا جس کی طرف دو رسول بھیجے گئے تھے۔ جس طرح حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہما السلام دونوں کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا گیا تھا۔ اس گاؤں والوں نے ان رسولوں کی تکذیب کی۔ اللہ نے ان دونوں رسولوں کی تائید میں ایک تیسرا رسول بھی بھیج دیا اور اس تیسرے نے لوگوں کو بتایا کہ یہ دونوں برحق رسول ہیں' چنانچہ ان تینوں نے از سر نو اپنی دعوت کا آغاز کیا۔

فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ (۳۶ : ۱۴) "ان سب نے کہا ہم تمہاری طرف رسول کی حیثیت سے بھیجے گئے ہیں"۔ اب اس گاؤں والوں نے ان پر وہی گھسے پٹے اعتراضات کیے جو ہمیشہ رسولوں پر ہوتے ہیں۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ مَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ

(۳۶ : ۱۵) "بستی والوں نے کہا "تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے چند انسان اور خدائے رحمٰن نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی ہے' تم محض جھوٹ بولتے ہو"۔ یہ اعتراضات جو تمام رسولوں پر ہوتے رہے ہیں' ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت ہی سادہ لوح تھے اور ان کی سوچ ناپختہ تھی۔ یہ لوگ رسول اور رسالت کے بارے میں عجیب تصورات رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں رسول کی شخصیت ایک پراسرار شخصیت ہونا چاہئے اور اس کی شخصیت کے ساتھ بہت سے اوہام اور قصے منسوب ہونے چاہئیں۔ اس لیے کہ رسول آسمان کی طرف سے زمین والوں کی طرف آتا ہے لہٰذا اس کی شخصیت کے ساتھ اوہام و اساطیر وابستہ ہونا ضروری ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہو کہ ایک رسول کھلا اور سادہ انسان ہو۔ ہماری طرح اس کی زندگی میں کوئی راز نہ ہو اور نہ کوئی عجوبہ ہو۔ ہم جیسا ایک عام اور معمولی انسان رسول کس طرح ہو

سکتا ہے جو بازاروں میں پھرتا ہو اور ہمارے جیسے گھروں میں رہتا ہو۔

یہ تھی ان کے فکر اور ان کی سوچ کی سادگی۔ اس لیے کہ نبوت کے ساتھ پراسراریت لازم نہیں ہے، لیکن مقام نبوت اس قدر سادہ بھی نہیں ہے جس طرح یہ لوگ سمجھے ہیں۔ منصب رسالت اور منصب نبوت میں ایک عظیم اور گہرا راز بھی پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک عام اور سادہ انسان کے اندر ایسی استعداد پیدا کر دیتا ہے کہ وہ ایک عام انسان ہونے کے باوجود باری تعالیٰ سے وحی وصول کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات اس سے زیادہ تعجب خیز ہے کہ ایک رسول فرشتہ ہو جیسا کہ ان لوگوں کی تجویز تھی کہ رسول کو تو فرشتہ ہونا چاہئے۔

اصل بات یہ ہے کہ رسالت کا مقصد لوگوں کو اسلامی نظام زندگی سے روشناس کرنا ہوتا ہے اور رسول کی زندگی اس نظام کا عملی نمونہ ہوا کرتی ہے اور رسول کی دعوت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو اس عملی نظام کے اتباع کی طرف بلاتا ہے۔ لوگ چونکہ انسان ہیں، اس لیے ان کا مقتدا بھی انسان ہونا چاہئے تاکہ وہ ان لوگوں کے لیے عملی نمونہ پیش کر سکے۔ اور وہ اس کی تقلید کر سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر رسول کی زندگی لوگوں کے لیے ایک کھلی کتاب ہوا کرتی ہے۔ قرآن جو اللہ کی محکم کتاب ہے، اس نے اس تفصیلی زندگی کے ایک معمولی اور اصولی حصے کو قلم بند کیا، تفصیلات کے بجائے اصول لکھ دیئے۔ باقی تفصیلی نظام زندگی رسول وقت کی عملی زندگی سے امت اخذ کرتی ہے اور وہ عملی زندگی ایک کھلی کتاب کے طور پر تمام امت کے سامنے ہوتی ہے اور کئی سالوں پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ ان تفصیلات میں رسول کی خاندانی اور گھریلو زندگی کے خدوخال اور اجتماعی زندگی کے نمونے سب موجود ہوتے ہیں۔ بعض اوقات قرآن نے تو رسول کی نفسیاتی کیفیات کو بھی قلم بند کیا ہے تاکہ آنے والی امتیں بھی دیکھیں کہ نبی امین کی قلبی کیفیت کیا تھی۔

یہ تھی وہ واضح اور قریب الفہم حقیقت جس پر ہمیشہ انسانوں کی طرف سے اعتراض ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ اس گاؤں کے باشندوں نے تینوں رسولوں سے یہ کہا

مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۳۶:۱۵) "تم اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم جیسے انسان ہو"۔ یہ تم محض دعویٰ کر رہے ہو کہ تم رسول ہو۔

اب ذرا رسولوں کا جواب دیکھیں۔ وہ حقیقت حال سے واقف ایک مطمئن اور پر اعتماد شخص کی طرح جواب دیتے ہیں۔

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ (۳۶:۱۶) وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ

(۳۶:۱۷) "رسولوں نے کہا، ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے"۔ اللہ جانتا ہے کہ ہم رسول ہیں، بس یہی ہمارے لیے کافی ہے۔ ہمارا فریضہ صرف یہ ہے کہ رب کا پیغام پہنچا دیں۔ اور یہ تو ہم نے ادا کر دیا ہے۔ اس کے بعد لوگ آزاد ہیں اپنی زندگی میں جو تصرف چاہیں، کریں۔ اور وہ جو رویہ بھی اختیار کریں گے، اس کی ذمہ داری وہ اٹھائیں گے۔ رسولوں اور

استوں کے درمیان تعلق صرف فریضہ رسالت کی ادائگی کا ہے۔جب یہ فریضہ ادا کر دیا گیا تو اس کے نتائج اللہ کے اختیار میں ہیں اور اللہ ہی کے حوالے ہیں۔

لیکن جاہلی گروہ اور جھٹلانے والے اس معاملے کو اس طرح سادگی سے اور آسانی سے نہیں لیتے۔وہ داعیان حق کو برداشت کرنے کے روادار بھی نہیں ہوتے۔ ان کو ان کا غرور نفس مجبور کرتا ہے کہ وہ کوئی سخت قدم اٹھائیں۔وہ محبت اور دلیل کے مقابلے میں تشدد اور بدمزاجی اور سخت کلامی کا سہارا لیتے ہیں کیونکہ باطل ہمیشہ تھڑدلا ہوتا ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ

(۱۸:۳۶) بستی والے کہنے لگے ہم تو تمہیں اپنے لیے فال بد سمجھتے ہیں۔اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے"۔تم منحوس لوگ ہو' تمہاری وجہ سے ہم پر مصیبت آگئی ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ تمہاری دعوت کی وجہ سے ہماری بستی میں شر و فساد پھیل جائے گا۔اگر تم باز نہ آئے تو ہم خاموش نہ رہ سکیں گے۔ اور ہمارے لیے یہ ممکن نہ ہو گا کہ تم اس طرح دعوت دیتے چلے جاؤ۔

لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۸:۳۶) "اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے اور ہم سے تم بڑی دردناک سزا پاؤ گے"۔یوں باطل نے اپنی برہمی کا اظہار کر دیا اور ہدایت دینے والوں کو دھمکی دے دی اور پرامن کلمہ حق کے مقابلے میں سرکشی اختیار کی اور فکر و خیال اور انداز گفتگو میں بدمستی کا اظہار کیا۔

لیکن رسولوں کا فریضہ تو یہ ہے کہ جیسے بھی حالات ہوں وہ اپنی راہ پر چلتے رہیں۔اس لیے ان کا رویہ بالکل مختلف ہے۔

قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ (۱۹:۳۶) "رسولوں نے کہا تمہاری فال بد تمہارے اپنے ساتھ لگی ہوئی ہے"۔اس لیے کہ نیک فالی یا بدفالی دونوں جاہلیت کے خرافات میں ہیں۔اور رسولوں کے مشن میں یہ بھی داخل ہے کہ اس وہم کو بھی دور کیا جائے۔اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان کو خیر و شر باہر سے نہیں ملتا بلکہ خیر اور شر دراصل خود اس کے نفس کے اندر سے پیدا ہوتا ہے۔خیر اور شر تو تمہارے ساتھ لگا ہوا ہے۔ تمہاری نیتوں اور تمہارے اعمال سے آنے والے خیر و شر کا گہرا ربط ہے اور خیر و شر کا مدار تمہارے اعمال پر ہے۔یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ تم آنے والے واقعات کو اپنے لیے بہتر بناؤ اور نیک انجام پاؤ یا ات خود اپنے لیے شر بنا دو کیونکہ اللہ لوگوں کے بارے میں وہی فیصلے کرتا ہے جن کے لیے ان کے نفوس میں میلان ہو اور اپنے عمل کی وجہ سے اس طرف انسانوں کا رجحان ہو۔لہٰذا تمہارا شگون اور بدشگونی تمہارے ساتھ اور تمہارے نفوس کے اندر ہے۔یہ ہے ایک قائم اور دائم حقیقت۔رہی یہ بات کہ کسی کا منہ دیکھ کر فال بد لینا' یا کسی جگہ سے بدشگونی یا الفاظ سے بدشگونی لینا یہ خرافات جاہلیت میں سے ایک موہوم بات ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اس لیے رسولوں نے کہا اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ (۱۹:۳۶) "کیا یہ باتیں تم اس لیے کرتے ہو کہ تمہیں نصیحت کی گئی؟؟" یعنی تم ہمیں رجم کرنے کی دھمکی اس لیے دیتے ہو یا ہمیں سخت سزا اس لیے دیتے ہو کہ ہم تمہیں نصیحت کر رہے

ہیں اور راہ بد سے بچا رہے ہیں۔

بَل اَنتُم قَومٌ مُسرِفُونَ (۳۶ : ۱۹) ''اصل بات یہ ہے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو''۔ یعنی اپنی سوچ اور واقعات کو وزن کرنے میں تم حدود سے نکل چکے ہو' تم نصیحت کا بدلہ دھمکی سے دیتے ہو' اور تشدد پر اتر آئے ہو۔ اور دعوت اسلامی کے جواب میں تشدد اور قتل کی بات کرتے ہو۔

---ooo---

جن لوگوں کے دلوں پر پردے پڑ گئے تھے۔ ان کی جانب سے رسولوں کی دعوت کا جواب یہ دیا گیا اور یہ ہے مثال ان سرکش لوگوں کی جو ہمیشہ دعوت اسلامی کی راہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور تشدد پر اتر آتے ہیں۔ جب بھی دعوت اسلامی کا آغاز ہو گا اس قسم کے لوگ متحرک ہو جائیں گے۔ یہ ہے راہ و رسم دعوت اللہ کے کام کی۔

اس کے بالمقابل انسانوں میں سے ایک دوسرا نمونہ بھی ہوتا ہے جو نصیحت قبول کر کے اس کی اطاعت کرتا ہے۔ رحمٰن سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔ اس لیے اس دوسرے نمونے کا رویہ بالکل پہلے رویے سے مختلف ہوتا ہے۔ اور اس کا ردعمل پہلے والے لوگوں کے ردعمل سے بالکل جدا ہوتا ہے۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰی قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اتنے میں شہر کے دور دراز گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا ''اے میری قوم کے لوگو' رسولوں کی پیروی اختیار کر لو۔ پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں''۔

یہ ہے نمونہ فطرت سلیمہ کا۔ جب فطرت سلیمہ ایک سیدھے سادے حق کو سنتی ہے تو وہ فوراً تصدیق کرتی ہے۔ نہایت سادگی اور نہایت ہی گرم جوشی کے ساتھ اور فطرت سلیمہ کی فکر مستقیم ہوئی ہے۔ اور وہ پرشوکت سچائی کے مقابلے میں جوش و خروش سے لبیک کہتی ہے۔

یہ ایک شخص بھی اسی معاشرے اور گاؤں کا فرد ہے' دعوت اسلامی کو سنتے ہی وہ لبیک کہتا ہے۔ وہ سچائی کے دلائل و نشانات کو اچھی طرح پاتا ہے۔ رسولوں اور ان کی قوم کے درمیان جو مکالمہ ہوا ہے اس کے اندر پائے جانے والی گہری منطق کو وہ پا لیتا ہے۔ جب یہ سچائی اس کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گئی تو وہ فوراً حرکت میں آ جاتا ہے۔ اب وہ خاموش نہیں رہ سکتا۔ یہ اپنا دروازہ بند کر کے اپنے گھر میں بیٹھا بھی نہیں رہتا جبکہ اس کے اردگرد گمراہی کا دور دورہ ہو' فسق و فجور عام ہو اور لوگ کفر کر رہے ہوں' اس کے ضمیر کے اندر جو سچائی اتر چکی ہے اور جس کو اس کا شعور حق تسلیم کر چکا ہے وہ اسے لے کر دوڑتا ہوا آتا ہے' وہ اپنی قوم کے پاس آتا ہے' یہ قوم جو انکار کر رہی ہے' دھمکیاں دے رہی ہے' تشدد پر اتر آئی ہے۔ یہ شخص شہر کے مضافاتی علاقے میں رہتا ہے۔ یہ اپنا فریضہ ادا کرنے کے لیے بھاگ نکلا ہے۔ اور اپنی اس منکر حق قوم کو دعوت حق دیتا ہے ان کو بغاوت' سرکشی اور تشدد سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے جس کا وہ اپنے رسولوں کے بارے میں ارادہ کر چکے ہیں۔

معلوم یوں ہوتا ہے کہ یہ شخص اس سوسائٹی کا کوئی بااثر فرد نہ تھا۔ نہ اس کے پاس کوئی خاندانی وجاہت اور قوت تھی کہ اس کو ان سرکشوں کے تشدد سے بچائے۔ ہاں اس کے قلب میں ایک زندہ اور پرجوش ایمان تھا۔ یہ ولولہ انگیز ایمان تھا جو اسے بستی کے مضافات سے اٹھالایا۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ (۳۶:۲۰)

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۶:۲۱) "اتنے میں شہر کے دور دراز گوشے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور بولا "اے میری قوم کے لوگو' رسولوں کی پیروی اختیار کر لو۔ پیروی کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں"۔

جو شخص اس قسم کی تحریک اٹھاتا ہے اور اس پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا' نہ کوئی مفاد اس کا اس تحریک سے وابستہ ہوتا ہے۔ بے شک وہ سچا ہے۔ اگر یہ فریضہ اس کی جانب سے عائد نہیں ہے اور اللہ کے لیے نہیں ہے تو پھر وہ کیوں یہ سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ لہٰذا لازمی نتیجہ ہے کہ یہ سچا ہے۔ اگر سچا نہیں تو پھر وہ کیوں خواہ مخواہ یہ مشکلات برداشت کرتا ہے۔ لوگوں کو ایسے خیالات و نظریات دیتا ہے جن کے وہ عادی نہیں ہیں' لوگ اسے اذیت دیتے ہیں' اس کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں' اس کے ساتھ مذاق کرتے ہیں' اس سے انتقام لیتے ہیں' وہ یہ سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی مفاد اس کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ نہ وہ کوئی اجرت طلب کرتا ہے۔ لہٰذا معقول راہ یہی ہے کہ

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۳۶:۲۱) "پیروی اختیار کرو ان لوگوں کی جو تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور ٹھیک راستے پر ہیں"۔

ان کی ہدایت تو ان کی دعوت اور ان کے کردار سے واضح ہے۔ وہ فقط ایک اللہ کی دعوت دیتے ہیں اور یہ نہایت ہی معقول بات ہے۔ وہ ایک واضح منہاج زندگی کی طرف دعوت دیتے ہیں جو واضح طور پر معقول ہے۔ وہ ایسے عقائد و نظریات کی طرف دعوت دیتے ہیں جن میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے اور نہ کوئی وہم و گمان ہے۔ یہ لوگ دراصل ایک نہایت ہی درست اور سیدھے راستے کی طرف راہ پا چکے ہیں اور ہدایت یافتہ ہیں۔

اس پورے معاشرے اور بستی سے پھر یہ اکیلا شخص کیوں ایمان لایا۔ اس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ دیکھو میرے ایمان کے اسباب یہ ہیں۔ میری فطرت جاگ اٹھی ہے۔ اور اپنی فطری سلامتی کی وجہ سے بات میری سمجھ میں آگئی ہے اور کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ اس دعوت سے کوئی سلیم الفطرت شخص منہ موڑے۔

---○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ------ ۲۳

سورۃ یٰسین ۔ ۳۶

آیات ۲۲--- تا--- ۸۳

سورۃ الصفات ۔ ۳۷

آیات ۱--- تا--- ۱۸۲

سورۃ ص ۔ ۳۸

آیات ۱--- تا--- ۸۸

سورۃ الزمر ۔ ۳۹

آیات ۱--- تا--- ۳۱

وَمَا لِيَ لَآ أَعْبُدُ الَّذِي فَطَرَنِي وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٢﴾ ءَأَتَّخِذُ مِن دُونِهِۦٓ ءَالِهَةً إِن يُرِدْنِ الرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّي شَفَٰعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَلَا يُنقِذُونِ ﴿٢٣﴾ إِنِّيٓ إِذًا لَّفِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٢٤﴾ إِنِّيٓ ءَامَنتُ بِرَبِّكُمْ فَٱسْمَعُونِ ﴿٢٥﴾

"آخر کیوں نہ میں اس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے؟ کیا میں اسے چھوڑ کر دوسرے معبود بنالوں؟ حالانکہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو نہ ان کی شفاعت میرے کسی کام آسکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں۔ اگر میں ایسا کروں تو میں صریح گناہوں میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ میں تو تمہارے رب پر ایمان لے آیا، تم بھی میری بات مان لو"۔

یہ سوچ اور یہ سوالات ایک ایسی فطرت کے ہیں جسے خالق کائنات کا شعور حاصل ہو چکا ہو، جو اپنے مقصد وجود کو پا چکی ہو اور اس کے ساتھ پوری طرح وابستہ ہو چکی ہو۔ پھر اس کی پکار یہ ہوتی ہے۔

وَ مَالِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ (۳٦ : ۲۲) "آخر کیوں نہ میں اس ہستی کی بندگی کروں جس نے مجھے پیدا کیا"۔ آخر میں اس فطری منہاج سے کیوں ہٹ جاؤں جو میرے دل میں پیوست ہو چکا ہے۔ کیونکہ انسان کے اندر اس ذات کی کشش ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ سب سے پہلے انسانی فطرت خدا اور خالق کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اور اگر فطرت اس راہ سے انحراف کرتی ہے تو اس کے اسباب خارجی ہوتے ہیں اور یہ گمراہ کن اسباب اور موثرات انسانی طبیعت کے اندر نہیں ہوتے۔ اور خالق کی طرف توجہ فطرت کا پہلا اور بہترین داعیہ ہوتا ہے۔ یہ فطرت کے اندر ہوتا ہے اور اس کے لیے کسی بیرونی محرک یا موثر کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ نفس انسانی فطری طور پر اس کی طرف مائل ہوتا ہے جب کسی کے دل میں ایمان داخل ہو جاتا ہے کہ تو نفس کے اندر گہرائیوں میں وہ اپنے خالق کو محسوس کرتا ہے۔ اس رجل مومن کی یہ تعبیر اس کے اس فطری میلان کا ظہور ہے۔ بلا تکلف وہ پکار اٹھتا ہے کہ کیوں میں اس خالق کی بندگی نہ کروں؟

یہ فطرت سلیمہ یہ بات بھی محسوس کرتی ہے کہ آخر کار انسان نے اپنے خالق ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۳٦ : ۲۲) "اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے"۔ فطری سوچ یہ ہے کہ جس نے میری تخلیق کی ہے میں اس کی بندگی کیوں نہ کروں؟ جبکہ تم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے کیونکہ تمہارا خالق بھی تو وہ ہے، اور تمہارا حق بھی یہ ہے کہ تم بھی اسی کی بندگی کرو۔

اب یہ رجل مومن مخالفانہ رویہ پر بھی تبصرہ کرتا ہے کہ میرا رویہ اور میری سوچ تو معقول اور فطری ہے اور اس کے خلاف اگر میں رویہ اختیار کروں تو وہ خلاف فطرت اور گمراہانہ ہوگا۔

ءَ اَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا وَّ لَا یُنْقِذُوْنِ (۳٦ : ۲۳)
"کیا میں اسے چھوڑ کر دوسرے معبود بنا لوں حالانکہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو نہ ان کی شفاعت

میرے کسی کام آ سکتی ہے اور نہ وہ مجھے چھڑا ہی سکتے ہیں' ـ

اس سے بڑا گمراہ اور کون ہو سکتا ہے جو اس فطری سوچ کو ترک کر دے کہ جو ہر مخلوق کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے خالق کی عبادت کرے اور ایسے معبودوں کی بندگی نہ کرے جو خالق نہیں ہیں ـ جن کا کوئی جواز نہیں اور جن میں کوئی معقولیت نہیں ـ اور یہ معبود ہوں بھی ضعیف و ناتواں' نہ کسی کی حمایت کر سکتے ہیں اور نہ کسی سے مدافعت کر سکتے ہیں' خصوصاً جبکہ حقیقی خالق کسی کو اس کی گمراہی کی وجہ سے سزا دینا چاہے ـ

اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۶:۲۴) "اگر میں ایسا کروں تو میں صریح گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا"۔ اس رجل مومن نے لوگوں کے سامنے فطری سوچ تو پیش کر دی' نہایت ہی سچے اور عارفانہ اور واضح انداز میں ـ اب وہ خود اپنا فیصلہ ان کو سناتا ہے ـ وہ جو تکذیب پر تلے ہوئے' وہ جو تشدد پر آمادہ ہیں ـ یہ فیصلہ وہ اس لیے سناتا ہے کہ یہ فطری آواز اس کے دل کو ایمان سے بھر چکی ہے ـ اس کا دل اب کسی دھمکی اور کسی نامعقول تہدید و تکذیب کو خاطر ہی میں نہیں لاتا ـ وہ کہتا ہے ـ

اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّکُمْ فَاسْمَعُوْنِ (۳۶:۲۵) "میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہوں سن لو میری بات"۔ یوں اس نے نہایت اطمینان' نہایت اعتماد کے ساتھ اپنے ایمان کا آخری اعلان کیا اور اس پر اس نے خود ان کو گواہ ٹھہرایا ـ اشارہ یہ دیا کہ جس طرح میں ایمان لایا ہوں تم بھی ایمان لاؤ کیونکہ میں جس رب پر ایمان لایا ہوں وہ تمہارا ہی رب ہے یا یہ کہ سن لو میں ایمان لایا ہوں جو چاہو کرو' جو چاہو کہو ـ

--- ○○○---

اس کے بعد اس رجل مومن کی تقریر پر جو تبصرہ آتا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اس شخص کو تو وہیں شہید کر دیا ـ اگرچہ قرآن کریم نے اس کی صراحت نہیں کی ـ لیکن اس قصے کا وہ منظر جو اس دنیا سے تعلق رکھتا ہے' وہ ختم ہو جاتا ہے ـ پردہ گر جاتا ہے ـ دنیا اور اس کے اندر اس کی قوم کے ساتھ یہ مکالمہ ختم ہوتا ہے ـ اب یہ شہید آخرت میں نظر آتا ہے ـ جس نے کلمہ حق بلند کیا' جس نے اپنی فطرت کی پکار پر لبیک کہا' اور جس نے اپنے ایمان کا اعلان ان لوگوں کے سامنے جہار اکیا جو نبیوں کو بھی قتل اور تشدد کی دھمکیاں دے رہے تھے ـ اب یہ شخص عالم آخرت میں ہے ـ وہاں اللہ کے ہاں اس کا عظیم استقبال ہو رہا ہے ـ جیسا کہ مومنین صادقین اور شہداء کا وہاں ہوتا ہے ـ

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾

"(آخر کار ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا اور) اس شخص سے کہہ دیا گیا کہ "داخل ہو جا جنت میں"۔ اس نے کہا "کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے رب نے کس چیز کی بدولت میری مغفرت فرما دی اور مجھے باعزت لوگوں میں داخل فرمایا"۔

یہاں دنیا کی زندگی کے ڈانڈے آخرت سے مل جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ موت اور شہادت نے اسے عالم فنا سے عالم بقا کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ یہ ایک جست ہوتی ہے جس کے ذریعے ایک مومن دنیا کی تنگنائیوں سے نکل کر جنت کی وسعتوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ باطل کی زیادتیوں سے رہائی پا کر سچائی کی مطمئن دنیا میں داخل ہو جاتا ہے اور تشدد کی دھمکیوں سے نکل کر 'امن و سلامتی کی نعمتوں میں پہنچ جاتا ہے اور جاہلیت کے اندھیروں سے یقین کی روشنی میں آجاتا ہے۔

اب ہم اس رجل مومن کو دیکھتے ہیں۔ یہ ان انعامات و اکرامات کی اطلاع چشم زدن میں پا چکا ہے۔ لیکن وہاں سے بھی قوم کے نام اس کی ایک پکار آتی ہے' اس کی اس پکار میں کوئی تلخی نہیں ہے اس کا نفس راضی ہے' وہاں بھی وہ یہی تمنا کرتا ہے کہ لے کاش میری قوم جانتی کہ میں کہاں پہنچ چکا ہوں' اللہ کے اکرام اور انعام کی کیا شان ہے تاکہ وہ بھی حق کو قبول کرلیں اور ان کو بھی یقین کی دلالت مل جائے۔

---()()()---

یہ تو ہے جزائے ایمان' رہے نبیوں کے مقابلے میں ڈٹ جانے والے تو ان کی حیثیت ہی کیا ان کو تو اللہ اپنے ملائکہ کے ذریعے ہلاک کر سکتا ہے۔ وہ تو بہت ہی ضعیف و حقیر ہیں۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ۝۲۸ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ۝۲۹

"اس کے بعد اس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارا۔ ہمیں لشکر بھیجنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ بس ایک دھماکہ ہوا اور یکایک وہ سب بجھ کر رہ گئے"۔

ان سرکشوں کا کیا انجام ہوا' یہاں اللہ تعالیٰ ان کو حقیر سمجھتے ہوئے قلم زد فرما دیتا ہے۔ ان حقیر لوگوں کے خلاف کسی لشکر کشی کی ضرورت نہ تھی۔ بس اچانک ایک دھماکہ ہوا' ایک سخت چیخ اٹھی اور وہ بجھ کر رہ گئے۔ یہاں اب ان لوگوں کے اس حسرتناک' ذلت آمیز اور توہین آمیز انجام پر پردہ گرتا ہے۔ اور یہ منظر یہاں لپیٹ لیا جاتا ہے۔

---()()()---

درس ۲۰٦ ایک نظر میں

پہلے سبق میں بات ان لوگوں کے بارے میں تھی جنہوں نے دعوت اسلامی کا استقبال انکار اور تکذیب کے ساتھ کیا۔ اور اس کا انجام ان کے گاؤں کا قصہ بیان کر کے بتایا گیا کہ ان جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ ان کا انجام یہ ہوا کہ

فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ (۳٦ : ۲۹) ”اچانک وہ بجھ کر رہ گئے“۔ لیکن اس سبق میں تمام ملتوں اور تمام کتب سماوی کے مکذبین کا انجام بتایا گیا ہے۔ اور پوری انسانی تاریخ سے گمراہ انسانوں کے خدوخال اور نقوش یہاں بتائے گئے ہیں اور یہاں نہایت ہی دلدوز آواز و انداز میں پکارا جاتا ہے کہ تعجب ہے کہ لوگ ان اقوام کی تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے۔ جن کو سچائی کو جھٹلانے کی وجہ سے ہلاک کیا گیا۔ یہ مکذبین وہ ہیں جو گمراہی کے راستے پر آگے ہی بڑھ رہے ہیں اور یوم الدین کا انہیں کوئی خیال نہیں ہے۔

وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (۳٦ : ۳۲) ”ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جاتا ہے“۔

اس کے بعد تکوینی دلائل اور معجزات اور نشانیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ وہ نشانیاں ہیں جن کو یہ لوگ رات اور دن دیکھتے ہیں اور نہایت ہی لاپرواہی سے ان پر سے گزر جاتے ہیں۔ یہ خود ان کے نفوس کے اندر بھی موجود ہیں۔ ان کے ماحول میں بھی موجود ہیں۔ ان کی قدیم تاریخ میں بھی موجود ہیں لیکن ان کو اس کا شعور نہیں ہے اور جب ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو وہ یاد نہیں کرتے۔ سبق نہیں حاصل کرتے۔

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ (۳٦ : ٤٦) ”ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے، یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے“۔ اس کے برعکس یہ لوگ اللہ کے عذاب کے بارے میں جلد آنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ مطالبہ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کو عذاب کے آنے کا کوئی یقین نہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳٦ : ٤۸) ”کہتے ہیں کہ یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو“۔

چونکہ یہ لوگ عذاب میں شتابی کا مطالبہ کرتے ہیں، قیامت کے آنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور دل میں یہ ہے کہ ان کو ان امور کے واقع ہونے کا یقین نہیں ہے۔ اس لیے یہاں مناظر قیامت میں سے ایک طویل منظر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ منظر صاف صاف بتاتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہو گا، جس کے واقع ہونے کی ان کو بہت جلدی ہے۔ یہ منظر اس انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ گویا ان کا انجام واقع ہو گیا اور یہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔

درس نمبر ۲۰۶ تشریح آیات

۳۰ --- تا --- ۶۸

یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٣٠﴾ أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٣١﴾ وَإِنْ كُلٌّ لَمَّا جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٣٢﴾

''افسوس بندوں کے حال پر' جو رسول بھی ان کے پاس آیا اس کا وہ مذاق ہی اڑاتے رہے ۔کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں اور اس کے بعد وہ پھر کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آئے ؟ ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جانا ہے''۔

حسرت ایک ایسی نفسیاتی حالت ہے جس میں انسان کو بے حد افسوس ہوتا ہے لیکن وہ اس حالت کو بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔پس وہ دیکھ دیکھ کر کڑھتا ہے اور اسے اذیت ہوتی ہے ۔اللہ کو تو بندوں کے ایمان نہ لانے پر کوئی حسرت نہیں ہوتی ۔ مفہوم یہ ہے کہ انسانی نقطہ نظر سے یہ لوگ قابل حسرت ہیں ۔وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی حالت پر افسوس کیا جائے ۔کیونکہ ان کا یہ حال نہایت ہی قابل تاسف 'پریشان کن اور قابل رحم ہے کہ یہ لوگ اپنی اس ضلالت کی وجہ سے دائمی شر اور دائمی مصیبت میں مبتلا ہونے والے ہیں ۔

یقیناً وہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی حالت پر افسوس کیا جائے جن کو نجات کا موقعہ ملتا ہے اور وہ اس سے استفادہ نہیں کرتے ۔ان کے سامنے انسانی تاریخ موجود ہے اور وہ اس تاریخ سے عبرت نہیں پکڑتے اور نہ ہی تاریخی واقعات پر غور کرتے ہیں ۔ان لوگوں کے پاس وقتاً فوقتاً اللہ ان کی ہدایت کے لیے رسولوں کو بھیجتا ہے لیکن یہ لوگ اللہ کی رحمت کے دروازوں سے دور ہو جاتے ہیں اور پھر اللہ کی شان میں گستاخی بھی کرتے ہیں ۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ

(۳۶ : ۳۰) ''جو رسول بھی ان کے پاس آیا اس کا وہ مذاق ہی اڑاتے رہے''۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ (۳۶ : ۳۱) "کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں اور اس کے بعد وہ پھر کبھی ان کی طرف پلٹ کر نہ آئے"۔ وہ اقوام جو ہلاک کی گئیں اور اس دنیا سے مٹا دی گئیں' ان کے مٹ جانے میں لوگوں کے لیے سامان عبرت و نصیحت ہے۔ اور طویل انسانی تاریخ انسانوں کے لیے موضوع غور و فکر و تدبر ہے۔ لیکن یہ بدبخت لوگ انسانی تاریخ پر غور نہیں کرتے۔ حالانکہ اپنی اس لاپرواہی کی وجہ سے وہ ہلاکت اور بربادی کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ تو ان کی اس افسوسناک حالت پر حسرت کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

ایک حیوان بھی جب دوسرے حیوان کی موت اور ہلاکت اپنے سامنے دیکھتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے اور مقدور بھر کوشش کرتا ہے کہ وہ اس انجام سے بچ جائے۔ لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ اپنے بھائیوں کو اپنی بے راہ روی کی وجہ سے ہلاک ہوتے دیکھتا ہے اور پھر وہ اسی راہ پر چلتا ہے۔ محض اپنے غرور اور کبر اور لاپرواہی کی وجہ سے' وہ دھوکہ کھاتا ہے اور دیکھنے کے باوجود اسی راہ پر چلتا ہے۔ انسان کی ایک طویل تاریخ اس کے سامنے اور وہ جانتا بھی ہے کہ انسانوں کی ہلاکت فلاں فلاں اسباب کی وجہ سے ہوئی لیکن وہ پھر بھی اندھوں کی طرح لاپرواہی سے انہی راہوں پر چلتا ہے۔ اور نہیں دیکھتا۔

جب ہلاک ہونے والے اور نابود کر دیئے جانے والے اب اپنے جانشینوں کے پاس واپس نہیں آ سکتے تو یہ جانشین بھی اسی راستے پر جائیں گے۔ یہ ہم سے بچ کر نہ نکل سکیں گے۔ ان سے بھی حساب لیا جائے گا۔

وَإِن كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ (۳۶ : ۳۲) "بے شک ان سب کو ایک روز ہمارے سامنے حاضر کیا جانا ہے"۔

وَآيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ ﴿٣٣﴾ وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ﴿٣٤﴾ لِيَأْكُلُوا مِن ثَمَرِهِ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٥﴾ سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾

"ان لوگوں کے لیے بے جان زمین ایک نشانی ہے۔ ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلہ نکالا جسے یہ کھاتے ہیں۔ ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس کے اندر سے چشمے پھوڑ نکالے تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ پھر کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے؟ پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوع انسانی) میں یا ان

اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں ہیں"۔

یہ لوگ رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں اور انسانی تاریخ کے اندر تکذیب کرنے والوں کی قتل گاہوں اور بربادیوں پر غور نہیں کرتے۔اور یہ لوگ مخلوق کی اس حالت سے کوئی سبق نہیں لیتے کہ لوگ چلے جارہے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں ہو رہا ہے۔اور رسول کی دعوت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔وہ اللہ جس کے وجود پر ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی یہ کائنات اچھی طرح دلالت کرتی ہے۔اللہ کی ثنا کرتی ہے اور اس کے وجود پر شاہد ہے۔یہ زمین جو ان کے پاؤں کے نیچے ہے' یہ دیکھتے ہیں کہ ایک وقت میں یہ مرجاتی ہے۔اس میں کوئی روئیدگی نہیں ہوتی۔پھر یہ زندہ ہو جاتی ہے۔اس میں حیوانات پیدا ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ اس کے اندر باغات پیدا ہوتے ہیں۔کھجوریں' انگور اور پھر ان باغات کے اندر چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور یوں انسانی اور دوسری زندگی رواں دواں نظر آتی ہے۔

اور پھر یہ زندگی بذات خود ایک معجزہ ہے اور کوئی انسان یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہ زندگی کا اجرا کر سکے' اس کی تخلیق کر سکے اور اس کے بعد اس کا سلسلہ تناسل کو جاری کر سکے۔زندگی کے اس عظیم معجزے کا اجراء دست قدرت کا عجیب کارنامہ ہے۔مردہ جسم کے اندر زندگی کی روح پھونک دی جاتی ہے دم بدم بڑھنے والی فصل کو دیکھ کر' گھنی چھاؤں والے باغات کو دیکھ کر' اور اس سے بھرے ہوئے پختہ پھلوں کو دیکھ کر انسانی دل و دماغ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔انسان دیکھتا ہے کہ یہ پوری زمین کو پھاڑ کر روشنی اور آزادی کے لیے سر نکالتے ہیں۔اور یہ سر نکالنے والی لکڑی سورج کی روشنی میں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔اور پھر یہ پوداپتوں اور پھلوں سے مزین ہو جاتا ہے۔پھول کھل جاتے ہیں' پھل پک جاتے ہیں اور توڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

لِيَأْكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ (۳۶: ۳۵) "تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں اور یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے"۔یہ اللہ ہی کا ہاتھ ہے جس نے ان کو اس کام پر قدرت دی۔جس طرح اس نے فصلوں اور پھلوں کو بڑھنے کی صلاحیت دی۔

أَفَلَا يَشْكُرُونَ (۳۶: ۳۵) "پھر کیا یہ شکر ادا نہیں کرتے۔

اس کے بعد قرآن کریم میں ایک لطیف اشارہ' اس طرح آتا ہے کہ جس ذات نے انسان کی راہنمائی ان نباتات اور باغات کی طرف فرمائی۔وہ وہی ہے جس نے فصلوں کے اندر بھی جوڑے پیدا کیے یعنی نر اور مادہ جس طرح انسانوں اور حیوانوں کے اندر جوڑے ہیں اور تمام دوسری مخلوق میں بھی جوڑے ہیں جن کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۶: ۳۶) "پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں"۔

اللہ کی یہ تسبیح نہایت ہی موزوں وقت پر آتی ہے اور تسبیح کے ساتھ ساتھ یہ اس کائنات کی عظیم حقیقت کا اظہار بھی کر رہی ہے۔یہ کہ تمام مخلوق ایک جیسی ہے۔اللہ کی تخلیق کا ایک اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے تمام مخلوقات کو

جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے ۔ نباتات بھی انسانوں کی طرح جوڑے ہیں ۔ اور انسانوں اور نباتات کے علاوہ دوسری مخلوق بھی جوڑے ہیں ۔

وَ مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۶ : ۳۶) ”اور ان اشیاء میں بھی جوڑے ہیں جنہیں یہ جانتے تک نہیں“ ۔ اصول تخلیق اور تکوین کی یہ یگانگت بتلاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق بھی ایک ہے ۔ تمام شکلوں ' تمام مجموعوں ' تمام انواع ' تمام اجناس ' تمام خصائص اور تمام علامات کے اندر یہ قاعدہ پوری طرح کارفرما ہے ۔ یہ بات معلوم ہوگئی ہے کہ ایٹم اس کائنات کا وہ چھوٹا سا حصہ ہے جو آج معلوم ہو چکا ہے اور یہ ایٹم بھی دو جوڑوں سے مرکب ہے ۔ یعنی مثبت اور منفی الیکٹرانک شعاعیں ۔ یہ باہم جدا بھی ہوتی ہیں اور متحد بھی ۔ اسی طرح ہزاروں ستارے ایسے معلوم ہو چکے ہیں جو مزدوج تخلیق کے مالک ہیں ۔ جو دو ستاروں سے بنے ہوئے ہیں اور باہم مرتب و ہم آہنگ ہیں اور ایک ہی مدار میں پھرتے ہیں ۔ گویا وہ ایک مرتب نغمہ کی شکل میں ہیں ۔

--- OOO ---

یہ تو تھی مردہ زمین جس سے زندگی پھوٹ رہی ہے ۔ اب زمین سے آگے بڑھ کر قرآن آسمان کی طرف متوجہ ہوتا ہے ' آسمانی نظارے ہمارے سامنے پیش ہوتے ہیں اور یہ تمام نظارے دست قدرت کے عجوبے ہیں ۔

وَ اٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾ وَ الْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾

”ان کے لیے ایک اور نشانی رات ہے ' ہم اس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور سورج ' وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے ۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے ۔ اور چاند ' اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے ۔ نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے ۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں“ ۔

رات کے آنے کا منظر ' روشنی ختم ہو جاتی ہے اور اندھیرا آہستہ آہستہ چھا جاتا ہے ۔ یہ وہ منظر ہے جسے تمام انسان ۲۴ گھنٹوں میں دہرایا ہوا دیکھتے ہیں ' ماسوائے ان خطوں کے جہاں رات اور دن کا عمل چھ ماہ کے بعد دہرایا جاتا ہے ۔ یعنی ان علاقوں میں جو قطبین کے بہت قریب ہیں ۔ یہ عمل اگرچہ رات اور دن میں بار بار دہرایا جاتا ہے لیکن اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ اللہ کی قدرت کا ایک عجوبہ ہے اور اس قابل ہے کہ انسان اس پر غور و فکر کریں ۔

یہاں اس مقام پر اس عجوبے کا انداز تعبیر بھی منفرد ہے ۔ یہاں رات کو دن میں ملبوس تصور کیا گیا ہے اور جب دن کا لباس اتر جائے تو رات آجاتی ہے ۔ اور لوگ اچانک اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں ۔ اسی انداز تعبیر کا ادراک یوں ہو سکتا ہے اور یہ اس وقت پھر مجاز کے بجائے حقیقت نظر آتی ہے ' جب ہم زمین کی گردش محوری پر غور کریں ۔ سورج کے سامنے اس کی اس گردش کے بدولت زمین کا ایک نقطہ سورج کے سامنے رہتا ہے اور وہاں دن ہوتا ہے اور جب زمین کا وہ حصہ غائب ہوتا ہے تو اچانک دن کا لباس اتار دیا جاتا ہے اور ماحول پر پھر اندھیرا چھا جاتا ہے ۔ اور یہ منظر نہایت ہی تنظیم کے ساتھ یونہی چلتا رہتا ہے ۔ ہر وقت دن کے لباس کو رات کے جسم سے کھینچا جاتا ہے اور رات ظاہر ہوتی رہتی ہے ۔ غرض یہ قرآنی تعبیر حقیقی بھی ہے اور نہایت ہی فصیح اور ادیبانہ بھی ۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (۳۶ : ۳۸) "اور سورج' وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے" ۔ سورج بھی گردش محوری رکھتا ہے ۔ بالعموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اپنی جگہ ایستادہ ہے لیکن تازہ ترین سائنسی معلومات یہ ہیں کہ یہ سورج اپنی جگہ رکا ہوا نہیں ہے بلکہ یہ بھی چل رہا ہے ' عملاً رواں ہے ۔ یہ ایک ہی سمت میں جا رہا ہے ۔ اس عظیم کائنات اور اس فضا اور خلا میں یہ ایک طرف جا رہا ہے ۔ اور یہ ۱۲ میل فی سیکنڈ کے حساب سے ایک ہی سمت میں جا رہا ہے ۔ لیکن اس کی حرکت اور رفتار کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے جو خبیر و بصیر ہے اور اللہ صریح طور پر فرماتا ہے کہ اس کی ایک جائے قرار ہے اور اس کے لیے وہ بے تابی سے چل رہا ہے ۔ کس طرح اور کب وہاں پہنچتا ہے یہ قیامت ہے اور اس کا علم اللہ ہی کو ہے ۔

جب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ اس سورج کا حجم زمین سے ایک ملین گنا زیادہ ہے اور یہ سورج اپنی اس کہکشاں کے ساتھ (اور کہکشاں کس قدر عظیم ہے ' ذرا سوچ لیں) ایک فضائے لامتناہی میں اپنے مستقر کے لیے رواں ہے ' تو اس سے اللہ کے علم اور قدرت کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ یہ ہے مفہوم اس آیت کا ۔

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۳۶ : ۳۸) "یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے" ۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ (۳۶ : ۳۹) "چاند' اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے" ۔ لوگ چاند کو تو اپنی ان منزلوں میں دیکھ سکتے ہیں ۔ وہ ہلال کی طرح نمودار ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ گول ہو کر بدر ہو جاتا ہے ۔ اس کے بعد گھٹنا شروع ہوتا ہے اور پھر وہ ہلال کی طرح ہو جاتا ہے اور یوں نظر آتا ہے جس طرح کھجور کی پرانی خشک شاخ ۔ الْعُرْجُوْن اس شاخ کو کہتے ہیں جس میں کھجور کی قسم "دبلح" ہوتی ہے ۔

جو لوگ چاند کو ہر رات دیکھتے ہیں وہ قرآن کریم کی اس انداز تعبیر کا لطف اٹھا سکتے ہیں ۔

عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ (۳۶ : ۳۹) "یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے" ۔ خصوصاً اس تعبیر میں لفظ قدیم معنی خیز ہے ۔ چاند پہلی راتوں میں ہلال ہوتا ہے اور آخری راتوں میں بھی ہلال ہوتا ہے لیکن پہلی راتوں میں وہ شگفتہ اور نشو و نما والا نظر آتا ہے ۔ اور آخری راتوں میں پژمردہ' زوال پذیر

اور خشکی اور سکڑنے کا منظر پیش کرتا ہے ۔ یہ سکڑ کر اس قدر خشک ہو جاتا ہے جس طرح خشک شاخ ۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ قرآن نے یہ انداز تعبیر اختیار کیا ہے بلکہ یہ بامقصد اور اصل صورت کا حقیقی اظہار ہے اور عجیب ہے ۔

چاندنی راتوں میں مسلسل غور و فکر کرنے سے انسانی احساس کے پردوں پر شعور اور تخیلات کی عجیب و غریب اور تر و تازہ کیفیات آتی ہیں اور انسان پر اس سوچ کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں ۔ اور وہ انسان جو اس چاند کا پورے ایک ماہ تک مشاہدہ کرتا ہے اور غور کرتا ہے وہ تاثرات لیے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ اور وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بدیع السموات اور خالق جلال و جمال کی قدرت کی شان کیا ہے جس نے اس قدر عظیم اجرام سماوی کو یہ خوبصورتی اور یہ تنظیم عطا کی ہے ۔ ہر شخص اس منظر سے بقدر ہمت ہدایت لے سکتا ہے ۔ چاہے وہ اس عظیم کائنات کے ان رازوں کو جانتا ہے یا نہیں ۔ میں کہتا ہوں صرف رات کے وقت چاند کا مشاہدہ ہی انسانی دل کو ہلا دینے کے لیے کافی ہے ۔ اس سے شعور بیدار ہوتا ہے اور انسان کے اندر غور و فکر کی عادت پڑتی ہے ۔

اب اللہ ذرا اس عظیم کائنات اور ان عظیم اجرام فلکی کی لطیف تنظیم کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور اس تنظیم اور ترتیب کی وجہ سے کیا کیا مظاہر پیدا ہوتے ہیں ؟ غور کیجیے !

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶ : ۴۰) ”نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے ۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں“ ۔ ہر ستارے اور سیارے کے لیے ایک فلک ہے یا اس کا اپنا مدار ہے ۔ اپنی رفتار اور گردش میں وہ اپنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا ۔ ستاروں اور سیاروں کے درمیان عظیم فاصلے ہیں ۔ زمین سورج کے درمیان ۷۳ ملین میل کا فاصلہ ہے اور چاند زمین سے ۲۴۰ ملین میل دور ہے ۔ لیکن یہ فاصلے بھی اپنی اس دوری کے باوجود شمسی کہکشاں اور اس کے قریب ترین دوسری کہکشاں کے قریب تارے سے چار نوری سال دور ہے ۔ اور نوری سال میں ٹائم کا تعین یوں کیا گیا ہے کہ جس میں روشنی کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ ہو گویا سورج کی کہکشاں سے قریب ترین ستارہ ایک سو چار ملین میل دور ہے ۔

اللہ جو اس کائنات کا خالق ہے 'اس نے ستاروں اور سیاروں کے درمیان اس قدر عظیم فاصلے پیدا کیے ہیں اور جس نے اس عظیم کائنات کا یہ عجیب نقشہ تیار فرمایا ہے تاکہ اسے باہم تصادم اور ٹکراؤ سے بچایا جائے اور یہ نظام یونہی جاری رہے الا یہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت برپا کر دے اس لیے سورج کے اندر یہ قوت نہیں ہے کہ وہ چاند کو جا لے ۔ اور نہ رات دن سے پہلے آ سکتی ہے نہ اس کے مقابلے میں کھڑی ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ جس گردش کی وجہ سے روز و شب پیدا ہوتے ہیں وہ جاری ہے ۔ لہٰذا ان دونوں میں سے کوئی دوسرے سے آگے نہیں ہو سکتا اور نہ دوسرے کی راہ روک سکتا ہے ۔

وَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶ : ۴۰) ”اور سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں“ ۔ فضائے کائنات میں ان سیاروں اور اجرام فلکی کی حرکت یوں ہے جس طرح سفینہ سمندر میں تیر رہا ہوتا ہے ۔ یہ بحری جہاز اپنی عظمت کے باوجود اس عظیم سمندر میں ایک سیاہ نکتہ ہی ہوتا ہے ۔

انسان حیران اور ششدر رہ جاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ لاکھوں سیارے اور جرم فلکی اس وسیع فضائے کائنات میں بکھرے پڑے ہیں اور تیر رہے ہیں۔ ہرسیارے اور اجرام فلکی کے ارد گرد ایک وسیع فضا ہے اور وہ دوسرے سے بہت دور ہے اور ان سیاروں اور اجرام کا حجم بہت بڑا ہونے کے باوجود اس وسیع فضا میں وہ ایک نکتہ ہیں۔ بہت ہی معمولی نکتہ!!

---○○○---

وَ اٰیَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَهُمْ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا یَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ وَ لَا هُمْ یُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ ﴿۴۴﴾

"ان کے لیے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کر دیا' اور پھر ان کے لیے ویسی ہی کشتیاں اور پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔ ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں' کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو' اور کسی طرح یہ نہ بچائے جا سکیں۔ بس ہماری رحمت ہی ہے جو انہیں پار لگاتی اور ایک وقت خاص تک زندگی سے متمتع ہونے کا موقعہ دیتی ہے"۔ یہاں سیاق کلام میں ایک نہایت ہی لطیف مناسبت ہے۔ ستارے اور سیارے بلند فضائے کائناتی میں تیر رہے ہیں اور کشتی اولاد آدم سے بھری ہے اور وہ پانیوں میں تیر رہی ہے۔ ان دونوں مناظر کے اندر ظاہری نسبت بھی ہے' رفتار کی مناسبت بھی ہے' اور یہ ربط بھی ہے کہ ان دونوں کو اللہ نے مسخر کر لیا ہے۔ اور اللہ نے آسمانوں اور زمینوں کے اندر اپنی قدرت سے ان کو تھام رکھا ہے۔

یہ دونوں مناظر انسانوں کی نظروں کے سامنے ہیں لیکن انسان ان پر غور نہیں کرتے۔ اگر انسان اپنے قلب کو کھول دے اور اپنے دماغ کو وسعت دے تو ان امور پر غور و تدبر کر کے وہ بڑی سہولت سے اللہ کی نشانیوں کو پا سکتا ہے۔

بھری ہوئی کشتی سے مراد شاید کشتی نوح ہو جس نے اولاد آدم کو اٹھایا اور اس کے بعد اللہ نے ان کے لیے ایسی ہی دوسری کشتیاں پیدا کیں جو انسانوں کو اٹھا کر چلتی ہیں اور ان دونوں کو اللہ کے ان قوانین قدرت نے چلایا جو اس نے اس کائنات میں ودیعت کیے کہ کشتی پانیوں کی سطح پر تیر رہی ہے۔ سیارے آسمانوں کی فضاؤں میں تیر رہے ہیں اور لکڑی' پانی اور ہوا' بخارات یا ایٹمی قوت پیدا کی جس کی وجہ سے یہ بڑے بڑے جہاز چلتے ہیں۔ یہ سب امور تقدیر الٰہی کے مطابق ہیں۔

وَ اِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِیْخَ لَهُمْ وَ لَا هُمْ یُنْقَذُوْنَ (۳۶ : ۴۳) اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ (۳۶ : ۴۴) "ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں' کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو' اور کسی طرح یہ نہ بچائے جا سکیں۔ بس ہماری رحمت ہی ہے جو انہیں پار لگاتی اور ایک وقت خاص تک زندگی سے متمتع ہونے کا موقعہ دیتی ہے"۔

گہرے سمندروں میں کشتی کی حیثیت وہی ہوتی ہے جس طرح طوفان میں ایک پر کی ہوتی ہے۔ جس قدر بھی کشتی بھاری اور بڑی ہو' اور چاہے وہ بہت ہی اعلیٰ سائنسی اصولوں کے مطابق بنی ہو۔ اگر ان کشتیوں کے ساتھ اللہ کی رحمت اور شفقت نہ

ہو تو وہ رات یا دن کے کسی بھی لمحے میں تباہ ہو جائیں ۔ وہ لوگ جنہوں نے سمندروں کا سفر کیا ہے ' چاہے یہ سفر چھوٹے بجرے میں ہوا ہو یا بڑے بحری جہاز میں ...... وہ سمندر کی ہولناکی کو اچھی طرح جانتے ہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ سمندر کی طاقتور لہروں کے مقابلے میں انسانی بچاؤ کی تدابیر کس قدر معمولی ہوتی ہیں ۔ اس لیے ایسے لوگ اللہ کی رحمت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم کائنات میں عالم طبیعت کے طوفانوں اور انقلابات کے مقابلے میں صرف اللہ کی رحمت ہے جس نے سرکش طبیعی قوتوں کی لگام تھام رکھی ہے ۔ زمین و آسمان میں اللہ کے دست قدرت کے سوا اور کوئی نہیں ہے جس نے سب چیزوں کو تھام رکھا ہے ۔ یہاں تک کہ قیام قیامت کا وقت آ پہنچے جس طرح اللہ حکیم و خبیر نے اس کے لیے وقت مقرر کیا ہے ۔

وَ مَتَاعًا اِلٰی حِیْنٍ (٣٦ : ٤٤) "پھر وقت خاص تک متمتع ہونے کا موقعہ دیتی ہے"۔

---()()()---

لیکن ان واضح ترین نشانیوں کے باوجود لوگ غفلت کی نیند میں سوئے ہوئے ہیں ۔ ان کی نظر ان نشانیوں پر نہیں پڑتی ۔ اور ان کے دل بیدار نہیں ہوتے اور وہ انکار اور تمسخرانہ انداز کو نہیں چھوڑتے ۔ اور بس انہوں نے یہی رٹ لگا رکھی ہے کہ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو بس اسے لے ہی آؤ ۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَیْنَ اَیْدِیْكُمْ وَ مَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴿۴۵﴾ وَ مَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ﴿۴۶﴾ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖۗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴿۴۷﴾ وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴿۴۸﴾

"ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ بچو اس انجام سے جو تمہارے آگے آ رہا ہے اور تمہارے پیچھے گزر چکا ہے ' شاید کہ تم پر رحم کیا جائے (تو یہ سنی ان سنی کر جاتے ہیں) ۔ ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے ' یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے ۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہیں عطا کیا ہے ' اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرو تو یہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے ایمان لانے والوں کو جواب دیتے ہیں "کیا ہم ان کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو" ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ "یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟"

یہ نشانیاں بھی ان کے دل و دماغ میں تجسس 'تدبر اور احساس خدا خوفی پیدا نہیں کرتیں ۔ حالانکہ اگر کسی انسان کا دل کھلا ہو تو یہ نشانیاں اس کے اندر حرکت پیدا کرتی ہیں ' اسے جھنجوڑتی ہیں اور اسے پر جوش رویہ اختیار کرنے پر آمادہ

رہتی ہیں - اور یہ نشانیاں اس قابل ہیں کہ انسان کو اس کائنات کے ساتھ ملا دیں - وہ کائنات جو ایک کھلی کتاب ہے اور اس کا ہر ایک صفحہ خالق کی عظمت کا کھلا ثبوت ہے - اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تدابیر بہت گہری اور اس کے اندازے نہایت ہی درست ہوتے ہیں - لیکن یہ لوگ جن کی فطرت اور بصیرت مسخ ہو چکی ہے - وہ ان نشانیوں کو نہیں دیکھ سکتے - اور اگر وہ ان کو دیکھ بھی لیں' ان پر تدبر نہیں کرتے - لیکن اللہ تعالیٰ اپنی عظیم رحمتوں کی وجہ سے پھر بھی ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ نہیں دیتا - اللہ پھر بھی ان کے پاس رسول بھیجتا ہے' جو ان کو ڈراتا ہے - اور ان کو اس کائنات کے خالق کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ اسے وجود میں لانے والا ایک قادر مطلق ہے - یہ رسول ان کو ڈراتا ہے' ان کے دل میں خوف اور تقویٰ پیدا کرتا ہے - اور ان کو اللہ کے غضب اور ان کو عذاب الٰہی کے اسباب فراہم کرنے سے ڈراتا ہے - کیونکہ اللہ کے عذاب نے تو ان کو احاطہ میں لیا ہوا ہے - ان کے آگے اور پیچھے عذاب الٰہی موجود ہے - اگر یہ لوگ محتاط نہ رہے تو کسی بھی وقت اللہ کے عذاب میں پڑ سکتے ہیں اور ان کے قدم پھسل سکتے ہیں - پھر ان تکوینی نشانیوں کے علاوہ دوسری نشانیاں اور معجزات بھی اللہ پے درپے ان کے لیے بھیجتا ہے لیکن وہ توجہ نہیں کرتے اور اپنی روش پر آگے ہی بڑھ رہے ہیں لاپرواہ ہو کر -

وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّقُوۡا مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡکُمۡ وَمَا خَلۡفَکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ (۳۶:۴۵)

وَمَا تَاۡتِیۡهِمۡ مِّنۡ اٰیَةٍ مِّنۡ اٰیٰتِ رَبِّهِمۡ اِلَّا کَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِیۡنَ (۳۶:۴۶) "ان لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ بچو اس انجام سے جو تمہارے آگے آرہا ہے اور تمہارے پیچھے گزر چکا ہے' شاید کہ تم پر رحم کیا جائے (تو یہ سنی ان سنی کر جاتے ہیں) - ان کے سامنے ان کے رب کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے' یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے" -

اور اگر ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنی دولت میں سے کچھ فقراء پر بھی خرچ کرو تو وہ مزاح کرتے ہوئے کہتے ہیں -

اَنُطۡعِمُ مَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطۡعَمَهٗۤ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (۳۶:۴۷) "کیا ہم ان کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلاتا؟ تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو" - مزاح کے علاوہ یہ لوگ ان لوگوں پر گمراہی کا الزام لگاتے جو ان کو دعوت انفاق دیتے ہیں -

ان لوگوں کے اس انداز گفتگو سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ انسانوں کی زندگی میں جاری و ساری سنن الہیہ سے بالکل بے بہرہ ہیں - اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ ہی سب کو کھلاتا ہے - اللہ ہی سب کا رازق ہے - زمین میں بندوں کے پاس جو دولت اور جو رزق ہے وہ اللہ ہی کا تخلیق کردہ ہے - انسانوں نے خود تو اپنے لیے کچھ پیدا کیا ہی نہیں' اور نہ وہ کسی ایک چیز کی تخلیق پر قدرت رکھتے ہیں - لیکن اللہ کی مشیت یہ ہے کہ اس زمین کو انسان آباد کریں - اس لیے اللہ نے لوگوں کو ضروریات کا محتاج کیا - یہ ضروریات لوگوں کو صرف ان کی جہد اور سعی سے مل سکتی ہیں - زمین کے اندر زراعت کا انتظام صنعتوں کا انتظام پھر زمین کے خزانوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا انتظام - پھر ان اشیاء کی

سپلائی اور خرید و فروخت مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے - یہ سب انتظامات اللہ نے کیے - پھر لوگ اپنی قابلیت اور صلاحیت کے اعتبار سے مختلف اور متفاوت ہیں اور اللہ اپنی مشیت کے مطابق مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں دیں اور یہ اس لیے تاکہ انسان مل کر خلافت ارضی کے فرائض سرانجام دیں - انسان کی صلاحیتوں کے اندر تفاوت صرف مال اور دولت جمع کرنے ہی میں نہیں ہے - بلکہ بعض اوقات انسان دوسری ضروریات میں مصروف ہوتے ہیں اور یہ دوسرے میدان بھی خلاف ارضی کا تقاضا ہوتے ہیں - اس لیے بعض انسان مال دولت جمع کرنے کے کام کے لیے فارغ ہی نہیں ہوتے اور مالی لحاظ سے محتاج ہوتے ہیں -

ایک طرف انسان کے منصب خلافت ارضی کے وسیع تقاضے ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے صلاحیتیں ہوتی ہیں - اور ان صلاحیتوں کے مطابق پھر انسانوں کے درمیان ضروریات اور منافع کا لین دین ہوتا ہے - لوگوں کے درمیان مقابلہ اور حصہ رسدی کا تعین ہوتا ہے - یہ ایک وسیع معاشی نظام ہے جس کی بے شمار کڑیاں ہیں اور ہر کڑی دوسری سے ملی ہوئی ہے بلکہ اس کا تعلق نسلوں سے بھی ہے - یعنی نسلا بعد نسل ایسے اسباب ہوتے ہیں جو لوگوں کی معاشی جدوجہد پر اثرانداز ہوتے ہیں - غرض معاشیات کے میدان میں مختلف اور متنوع اسباب کی بنا پر اللہ نے لوگوں کے درمیان دولت اور ان کے رزق میں تفاوت رکھی - یہ تفاوت اپنی حقیقت کے اعتبار سے تو اس لیے رکھی گئی ہے کہ انسان خلافت ارضی کے منصب کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اس زمین کی تعمیر و ترقی میں کوشاں رہے لیکن اس تفاوت کو حد اعتدال میں رکھنے کے لیے اسلام نے بعض انفرادی محرومیوں کا مداوا بھی کیا ہے - وہ یہ کہ اہل ثروت پر لازم ہے کہ وہ اپنی دولت کا ایک حصہ فقراء اور محرومین کے لیے نکالیں - اور معاشرے کے اندر کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ رہے جو بنیادی معاشی ضروریات سے محروم ہو - ان انتظامات کی وجہ سے اغنیاء اور فقراء کی اخلاقی اور نفسیاتی اصلاح ہو جاتی ہے - اس انفاق کے لیے اسلام زکوٰۃ لیتا ہے اور زکوٰۃ کے لغوی مفہوم میں طہارت کے معنی شامل ہیں - گویا یہ انفاق طہارت مال بھی ہے اور عبادت بھی - اور اس کے ذریعے اللہ نے فقراء اور اغنیاء کے درمیان محبت اور دوستی کا رشتہ بھی استوار کر دیا ہے

لہٰذا ان لوگوں کا جو حکمت خداوندی کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے : یہ کہنا -

اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ (۳۶ : ۴۷) "کیا ہم ان کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا؟" اور اس پر مزید پھر ان کی جانب سے انفاق کی دعوت دینے والوں پر یہ الزام

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۶ : ۴۷) "تم تو بالکل ہی بہک گئے ہو" - دراصل حقیقی گمراہی ہے - اور یہ لوگ اس کائنات میں جاری سنن الٰہیہ سے بے خبر ہیں - اور یہ لوگ اس جہاں میں زندگی کی حقیقی چلن اور اس کے متنوع معاشی اسباب سے بھی بے خبر ہیں - پھر اس جہاں میں اللہ نے جن مقاصد کی خاطر لوگوں کو متنوع صلاحیتیں دی ہیں اور جن کے نتیجے میں لوگ مختلف کام کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے پھر سامان زیست کا تبادلہ ہوتا ہے اور دنیا کا معاشی نظام چل رہا ہے - یہ لوگ اس سے بھی واقف نہیں ہیں -

اسلام ایک ایسا نظام معیشت وضع کرتا ہے جس کے اندر تمام لوگوں کو کام کرنے کے آزادانہ مواقع حاصل ہوتے

ہیں۔ اس کے بعد اسلامی نظام تمام لوگوں کے مختلف قسم کے کام کرنے کے آزادانہ مواقع فراہم بھی کرتا ہے۔ اور لوگ اس طرح پاک اور صاف زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کے بعد اپنے عملی اقدامات سے معاشی ناہمواریوں کے حل کے لیے خصوصی اقدامات بھی کرتے ہیں۔

سب سے آخر میں بات ان کے اس خلجان پر ہوتی ہے۔ جو انہیں بعث بعد الموت کے سلسلے میں تھا۔ اور جس کی وجہ سے وہ اس قسم کا عقیدہ رکھنے والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۶ : ۴۸) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قیامت کی دھمکی آخر کب پوری ہوگی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو"۔

اللہ نے قیامت کے واقع ہونے کے لیے جو وقت مقرر کر رکھا ہے وہ انسانوں کی جلد بازی یا مطالبے کی وجہ سے وقت سے پہلے نہیں آسکتا۔ اور اگر لوگ یہ امید کریں کہ وہ اپنے مقررہ وقت سے ذرا دیر کر کے واقع ہوگا تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک ہر شے ایک مقدار کے مطابق ہے۔ اور ہر واقعہ اپنے مقررہ وقت پر ہوتا ہے۔ تمام واقعات اپنے وقت پر ہوتے ہیں جس طرح اللہ نے ان کے بارے میں فیصلہ ازل میں کر رکھا ہے اور اپنی حکمت کے مطابق کر رکھا ہے۔ اس دنیا کا ہر واقعہ اپنے وقت پر نظام قضا و قدر کے مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے۔

ان لوگوں کے ان سوالات اور خلجانات کا جواب کیا ہے تو وہ قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر کی صورت میں دیا گیا ہے۔ اس منظر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جب قیامت ہوگی تو اس کی کیفیت یہ ہوگی۔ رہی یہ بات کہ یہ کب ہوگی تو اس کا علم صرف اللہ کو ہے۔

مَا يَنظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ ﴿۵۰﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ ﴿۵۱﴾ قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا ۜ هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۲﴾ إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿۵۳﴾

"دراصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں اس حالت میں دھر لے گا جب یہ (اپنے دنیوی معاملات میں) جھگڑ رہے ہوں گے، اور اس وقت یہ وصیت تک نہ کر سکیں گے، نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے۔ پھر ایک صور پھونکا جائے گا اور یکایک یہ اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے اپنی اپنی قبروں سے نکل پڑیں گے۔ گھبرا کر کہیں گے: "ارے، یہ کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اٹھا کھڑا کیا؟" --- "یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچی تھی"۔ ایک ہی زور کی آواز ہوگی اور سب کے سب ہمارے سامنے

حاضر کر دیئے جائیں گے"۔

جھٹلانے والوں کا سوال یہ تھا۔

وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۳۶:۴۸) "یہ قیامت کی دھمکی کب پوری ہو گی؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو"۔ لہٰذا ان کا جواب اس منظر کی شکل میں دیا گیا۔

مَا یَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَ هُمْ یَخِصِّمُوْنَ (۳۶:۴۹) فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ تَوْصِیَةً وَّلَاۤ اِلٰۤى اَهْلِهِمْ یَرْجِعُوْنَ (۳۶:۵۰) "دراصل یہ جس چیز کی راہ تک رہے ہیں وہ بس ایک دھماکہ ہے جو یکایک انہیں عین اس حالت میں دھر لے گا جب یہ جھگڑ رہے ہوں گے اور اس وقت یہ وصیت تک نہ کر سکیں گے اور نہ اپنے گھروں کو پلٹ سکیں گے"۔ قیامت اچانک لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لے گی' اس وقت وہ اپنے دنیاوی جھگڑوں یا مذہبی مباحثوں میں مصروف ہوں گے اور ان کو وقوع قیامت کی امید ہی نہ ہو گی۔ اور نہ وہ اسے کچھ اہمیت دیں گے۔ لیکن وہ اچانک واقع ہو جائے گی۔ ہر شخص اسی حال میں گرفتار ہو گا۔ جس پر وہ اس وقت ہو گا۔ کسی کو آنے والوں کے بارے میں نہ وصیت کے مواقع ہوں گے۔ اور نہ ان کو اس قدر مہلت ہو گی کہ وہ گھر تک چلا جائے اور گھر والوں سے کچھ کہہ دے۔ اور وہ ہوں گے کہاں؟ کیونکہ گھر والے بھی جہاں ہوں گے اسی قیامت کی گرفت میں ہوں گے۔

اور اس کے بعد صور پھونکا جائے گا۔ ہر شخص اپنی قبر سے اٹھے گا اور جلدی سے دوڑ پڑے گا۔ یہ انتہائی درجے میں ہیبت زدہ اور دہشت زدہ ہو گا۔ ہر شخص دوسرے سے پوچھے گا۔

مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (۳۶:۵۲) "ارے یہ کس نے ہماری خوابگاہ سے ہمیں اٹھا کر کھڑا کیا؟ قدرے وقفے کے بعد اب دہشت ختم ہو گی تو اصل حقیقت ان کو معلوم ہو جائے گی۔

هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (۳۶:۵۲) "یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچی تھی"۔

اور اب آخری آواز ہو گی۔ ایک پکار اور یہ تمام بکھرے ہوئے پریشان اور حیران لوگ اللہ کے حضور حاضر ہوں گے۔

فَاِذَا هُمْ جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ (۳۶:۵۳) "اور اچانک سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے"۔ اور سب کے سب صفوں کی صورت میں منظم کر دیئے جائیں گے اور یہ چشم زدن میں ہو گی اور صدائے بازگشت کی طرح ہو گی اور اس موقعہ و محل پر اللہ کا یہ فیصلہ سنایا جائے گا اور اعلان ہو گا کہ جزاء و سزائیں کسی کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ ہو گی۔

فَالْیَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾

"آج کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا اور تمہیں ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے رہے تھے"۔

یوں نہایت تیزی کے ساتھ تین مناظر کی جھلک دکھائی جاتی ہے اور ان لوگوں کے شکوک اور خلجانات کا رد کر دیا جاتا ہے جو خواہ مخواہ وقوع قیامت میں شک کرتے ہیں اور نہایت ہی ترتیب کے ساتھ۔

اب یہاں اہل ایمان کے ساتھ حساب و کتاب کا حال بھی چند لمحوں میں لپیٹ لیا جاتا ہے اور ان کا انجام بھی تیزی کے ساتھ دکھا دیا جاتا ہے۔

إِنَّ أَصْحَٰبَ ٱلْجَنَّةِ ٱلْيَوْمَ فِى شُغُلٍ فَٰكِهُونَ ﴿٥٥﴾ هُمْ وَأَزْوَٰجُهُمْ فِى ظِلَٰلٍ عَلَى ٱلْأَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔونَ ﴿٥٦﴾ لَهُمْ فِيهَا فَٰكِهَةٌ وَلَهُم مَّا يَدَّعُونَ ﴿٥٧﴾ سَلَٰمٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ﴿٥٨﴾

"آج جنتی لوگ مزے کرنے میں مشغول ہیں۔ وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں ہیں۔ مسندوں پر تکیے لگائے ہوئے، ہر قسم کی لذیذ چیزیں کھانے پینے کو ان کے لیے وہاں موجود ہیں، جو کچھ وہ طلب کریں ان کے لیے حاضر ہے، رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے"۔

یہ عیش و عشرت میں مشغول ہوں گے، ان پر اللہ کے انعامات کی بارش ہو گی اور نہایت ہی خوشگوار چھاؤں میں بیٹھے ہوں گے۔ آمنے سامنے تختوں پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے اور وہ جنت کے مالک ہوں گے اور ان کا یہ حق ہو گا کہ جو چاہیں گے، مہیا ہو گا۔ اور ان لذائذ کے اوپر مزید ان کے اہل خانہ بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ اور ان کی تکریم ہو گی کہ خود اللہ تعالیٰ ان کے نام سلام بھیجے گا۔ یہ رب کریم کی طرف سے ان کا اعزاز ہو گا۔

سَلَٰمٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ (۳۶ : ۵۸) "رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے"۔ رہے کفار تو ان کے ساتھ حساب و کتاب یہاں نہیں دکھایا گیا بلکہ یہاں محض سرزنش اور جھڑکی اور ملامت کر دی جاتی ہے۔

وَٱمْتَٰزُوا۟ ٱلْيَوْمَ أَيُّهَا ٱلْمُجْرِمُونَ ﴿٥٩﴾ أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَٰبَنِىٓ ءَادَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا۟ ٱلشَّيْطَٰنَ ۖ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾ وَأَنِ ٱعْبُدُونِى ۚ هَٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۖ أَفَلَمْ تَكُونُوا۟ تَعْقِلُونَ ﴿٦٢﴾ هَٰذِهِۦ جَهَنَّمُ ٱلَّتِى كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿٦٣﴾ ٱصْلَوْهَا ٱلْيَوْمَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٦٤﴾

"اور اے مجرمو، آج تم چھٹ کر الگ ہو جاؤ۔ آدم کے بچو، کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور میری ہی بندگی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے؟ مگر اس کے باوجود اس نے تم میں سے ایک گروہ

کثیر کو گمراہ کر دیا۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے؟ یہ وہی جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا تھا جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو' اس کی پاداش میں اب اس کا ایندھن بنو"۔

ان لوگوں کی تواضع حقارت اور توہین سے کی جائے گی۔

وَ امْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (۳۶: ۵۹) "اور اے مجرمو' آج تم چھٹ کر الگ ہو جاؤ"۔ تم اہل ایمان سے دور ہو کر الگ ہو جاؤ۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ

(۳۶: ۶۰) "آدم کے بچو' کیا میں نے تم کو ہدایت نہ کی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کرو' وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔

"آدم کے بچو!" کے الفاظ سے پکار کر ان کو شرمندہ کیا گیا ہے' اس لیے کہ شیطان نے ان کے باپ کو جنت سے نکالا تھا' اس کے باوجود تم اس کی بندگی کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

وَّ اَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۳۶: ۶۱) "میری بندگی کرو' یہ سیدھا راستہ ہے"۔

یہ راستہ مجھ تک پہنچانے والا ہے اور اس پر چلنے سے میری رضامندی حاصل ہوتی ہے --- تم اس دشمن سے نہ ڈرے جس نے تمہاری نسلوں اور گروہوں کو گمراہ کر دیا۔

اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ (۳۶: ۶۲) "کیا تم عقل نہیں رکھتے تھے"۔

اور اس موقع پر ان کو دی جانے والی سزا یہاں سنا دی جاتی ہے جو نہایت ہی دردناک ہے۔ اور یہ فیصلہ بھی سختی اور سرزنش کے انداز میں سنایا جاتا ہے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۳۶: ۶۳) اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ

(۳۶: ۶۴) "یہ وہی جہنم ہے جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا تھا' جو کفر تم دنیا میں کرتے رہے ہو اس کی پاداش میں اب اس کا ایندھن بنو"۔

یہ پیشی یہاں ختم نہیں ہو جاتی اور اس کی بساط کو لپیٹ نہیں لیا جاتا بلکہ اس موضوع پر بات چیت جاری ہے اور ایک نیا منظر ہمارے سامنے آتا ہے۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

"آج ہم ان کے منہ بند کیے دیتے ہیں' ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دنیا

میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں"۔

یوں وہ ایکدوسرے کو ملامت کرتے ہیں۔ ان پر خود ان کے اعضاء شہادت دے رہے ہیں خود ان کی اپنی شخصیت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے اور ان کی ذات کے حصے ایک دوسرے کے خلاف گواہ ہوں گے اور انسان کا ہر عضو اپنے رب کے سامنے انفرادی طور پر ذمہ دار ہو گا۔ اور اللہ کے سامنے ہر عضو اقرار گناہ کرے گا اور سر تسلیم خم کرے گا۔ یہ نہایت ہیبت ناک اور خوفناک منظر ہے۔ انسان اس منظر کے بارے میں سوچتے ہی کانپ اٹھتا ہے۔

--- ○○○---

یہ منظر یوں اختتام پذیر ہوتا ہے کہ ان کی زبانیں بند ہیں اور ان کے ہاتھ بات چیت کر رہے ہیں۔ ان کے پاؤں شہادت دے رہے ہیں' حالانکہ انہیں اپنے ہاتھ پاؤں سے یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ ان کے ساتھ اس کے سوا کوئی اور سلوک کرتا اور انہیں جو سزا چاہتا' دیتا اور ان پر جو مصیبت چاہتا لے آتا۔ یہاں اللہ دوسری سزاؤں کے دو نمونے بھی دیتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو یوں ہوتا۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓی اَعْیُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی یُبْصِرُوْنَ ﴿۶۶﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰی مَکَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِیًّا وَّلَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾

"ہم چاہیں تو ان کی آنکھیں موند دیں' پھر یہ راستے کی طرف لپک کر دیکھیں' کہاں سے انہیں راستہ سجھائی دے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں ان کی جگہ ہی پر اس طرح مسخ کر کے رکھ دیں کہ یہ نہ آگے چل سکیں نہ پیچھے پلٹ سکیں"۔

یہ دو مناظر ہیں ان میں عذاب اور سزا بھی ہے اور تحقیر اور مزاح بھی ہے۔ تحقیر ان لوگوں کی ہے جو دعوت اسلامی کی تکذیب کرتے ہیں اور مزاح ان لوگوں کا ہے جو دین اسلام کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں۔ جو یہ کہتے تھے۔

مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۳۶: ۴۸) "یہ وعدہ کب پورا ہو گا اگر تم سچے ہو"۔

چنانچہ پہلے منظر میں ان کو ان کی شکل بگاڑ کر ان کو اندھا کر دیا گیا ہے۔ اندھوں کے درمیان ایک دوسرے کے درمیان آگے بڑھنے کا مقابلہ ہے۔ وہ راستے کو عبور کر کے ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ لیکن ان کو اندھوں کی طرح راہ نہیں سوجھتی۔ اور وہ گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ سیدھی راہ دیکھ سکیں۔

فَاَنّٰی یُبْصِرُوْنَ (۳۶: ۶۶) "کہاں سے انہیں راستہ سجھائی دے گا"۔

اور دوسرے منظر میں انہیں یوں دکھایا گیا ہے کہ چلتے چلتے وہ اپنی جگہ جم گئے۔ بت بن گئے جو نہ آگے جا سکتے ہیں اور نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ حالانکہ ابھی یہ لوگ اندھے تھے اور ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔

ان دو مناظر میں وہ کھلونے نظر آتے ہیں' ایسے کھلونے جنہیں دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ یہ وہی لوگ تھے جو

قیامت کے وقوع کے بارے میں مزاح کرتے تھے اور اسے اہمیت ہی نہ دیتے تھے ۔

--- ○○○---

یہ حالت تو ان کی اس وقت ہوگی جب قیامت واقع ہو جائے گی جس کے بارے میں انہیں بہت جلدی ہے لیکن اگر انہیں زمین پر مہلت دے دی گئی اور انہوں نے اس میں خوب ترقی کی اور اسے ترقی دی اور قیام قیامت تک اللہ کے منصوبے کے مطابق یہاں زندہ رہے تو بھی یہ لوگ ایک ایسی ناپسندیدہ حالت تک پہنچ جائیں گے جس کے اندر زندگی گزارنے کے بجائے وہ جلدی مرنا زیادہ پسند کریں گے ۔ یہ لوگ ایسے ناتواں اور بوڑھے ہو جائیں گے اور ان کی جسمانی اور دماغی قوتیں اس قدر مضمحل ہو جائیں گی کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آئے گی ۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾

"جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں اس کی ساخت کو ہم الٹ ہی دیتے ہیں کیا (یہ حالات دیکھ کر) انہیں عقل نہیں آتی؟"۔ جب انسان بہت بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ دوبارہ الٹ کر طفل ناتواں بن جاتا ہے ۔ لیکن اس میں بچوں جیسی محبوبیت اور کشش نہیں ہوتی ۔ یوں بوڑھے لوگ پیچھے کی طرف چلتے رہتے ہیں ۔ ان کے پاس جو علم تھا' اسے بھولتے جاتے ہیں ۔ ان کے اعصاب کمزور ہوتے جاتے ہیں ۔ ان کی فکر مضمحل ہوتی جاتی ہے ۔ ان کی قوت برداشت ختم ہوتی جاتی ہے ۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ایسا انسان خالص بچہ ہو جاتا ہے ۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ بچہ اگر توتلی زبان بھی بولتا ہے تو اچھا لگتا ہے ۔ لوگ اسے دیکھ کر مسکرا دیتے ہیں ۔ وہ اگر کوئی حماقت کرتا ہے تو بھی دیکھنے والے خوش ہوتے ہیں ۔ لیکن بوڑھا تو کبیدہ خاطر ہوتا ہے ۔ اس کی حماقتوں کو محض رحم اور احترام ہی سے برداشت کیا جا سکتا ہے ۔ اور جوں جوں اس کی قوتیں مضمحل ہوتی ہیں اور اس سے حماقتیں سرزد ہوتی ہیں ۔ لوگ اس کے ساتھ مزاح کرتے ہیں ۔ جوں وہ ناتواں ہوتا ہے اس کی کمر ٹیڑھی ہوتی ہے وہ پیچھے ہٹتا ہے اور ہٹتا چلا جاتا ہے ۔

دونوں صورتوں میں یہ برا انجام ہے جو دعوت اسلامی کو جھٹلانے والوں کے انتظار میں ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو ان کے اعمال کی وجہ سے اللہ نے رشد و ہدایت سے محروم کر دیا ہے اور ایمان کی وجہ سے ان کو جو اعزاز ملنے والا تھا' اس سے وہ بے بہرہ رہ گئے ۔

--- ○○○---

درس نمبر ۲۰۷ تشریح آیات

۶۹ --- تا --- ۸۳

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے اور اس میں ان تمام مسائل کو لیا گیا ہے جو اس سورت کا محور ہیں ۔ وحی کا مسئلہ ' وحی کی ماہیت ' مسئلہ الوہیت اور وحدانیت الٰہی ۔ بعث بعد الموت اور حشر و نشر ۔ اس سبق میں یہ تمام مسائل علیحدہ علیحدہ یکے بعد دیگرے بیان کیے گئے ہیں ' نہایت ہی موثر اور زور دار انداز میں ۔ تمام موضوعات میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہرچیز کی صنعت میں دست قدرت کارفرما ہے اور اس کائنات کی کنجیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں ۔ یہ مضمون اس سبق اور اس سورت کی آخری آیت میں بیان کیا گیا ہے ۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۳۶ : ۸۳) "پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو" ۔ یہ دست قدرت اور اس کی صنعت کاریاں ہیں کہ اس نے جانوروں کو بشر کے لیے پیدا کیا اور ان کے تابع فرمان کر دیا ۔ جس نے انسان کو ایک حقیر نطفے سے پیدا کیا اور جس طرح ایک نہایت ہی چھوٹے نطفے سے اسے پیدا کیا ۔ اسی طرح بوسیدہ ہڈیوں سے اسے دوبارہ پیدا کر دے گا ۔ جس نے سرسبز درخت سے آگ پیدا کی ۔ جس نے زمین و آسمان جیسی عظیم کائنات پیدا کی ۔ اور جو اس جہاں کی ہرچیز کا مالک اور مقتدر اعلیٰ ہے ۔ یہ ہے اس سورت کا خلاصہ ۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ۙ﴿۶۹﴾ لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَیًّا وَّ یَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ﴿۷۰﴾

"ہم نے اس (نبی ﷺ) کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے ۔ یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب ' تاکہ وہ ہر اس شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت قائم ہو جائے ۔

وحی کے موضوع پر سورت کے آغاز ہی میں بحث ہوئی تھی ۔

یٰسٓ (۳۶ : ۱) وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ (۳۶ : ۲) اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۳۶ : ۳) عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۳۶ : ۴) تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ (۳۶ : ۵) لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُھُمْ فَھُمْ غٰفِلُوْنَ (۳۶ : ۶) "یٰس ' قسم

ہے قرآن حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو' سیدھے راستے پر ہو اور یہ قرآن غالب اور حکیم ہستی کا نازل کردہ ہے تاکہ تم خبردار کرو ایک ہی قوم کو جس کے باپ دادا خبردار نہ کیے گئے تھے اور اس وجہ سے وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے"۔ یہاں وحی کا ذکر اس مضمون اور مناسبت سے آتا ہے کہ یہ وحی الٰہی ہے' شاعری نہیں ہے۔ کیونکہ بعض لوگ آپ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ شاعر ہیں اور قرآن کریم ایک مخصوص قسم کا شعری کلام ہے۔ دراصل کبرائے قریش جانتے تھے کہ معاملہ یہ نہیں ہے۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام لائے ہیں وہ عربوں کے اسالیب شعر کے مطابق نہ شعر ہے اور نہ ان کی نثر کی طرح نثر ہے۔ یہ الزام دراصل اسلام کے خلاف ان کی جانب سے پروپیگنڈے کی جنگ تھی۔ اور عوام الناس کو گمراہ کرنے کے لیے قرآن اور حضورؐ پر یہ الزام تھا۔ ہاں یہ لوگ قرآن کریم کے حسن و جمال اور انوکھے اور موثر اسلوب کلام سے یہ استدلال کرتے تھے۔ اس طرح عوام الناس اشعار اور قرآن میں فرق نہ کر سکتے تھے اور اس لیے وہ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوتے تھے۔

یہاں اللہ اس بات کی تردید فرماتا ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعری سکھائی ہے جب اللہ نے آپ کو شعر کا علم نہیں سکھایا تو آپ کو شعر کا علم ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انسان وہی جانتا ہے جو اللہ اسے سکھاتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس حقیقت سے بھی نقاب کشائی کرتا ہے کہ شعر کہنا آپ کے شایان شان ہی نہیں ہے۔ (وَمَا یَنْبَغِیْ لَہٗ) کیونکہ شاعری کا منہاج نبوت کے منہاج سے بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔ شعر ایک تاثر ہوتا ہے اور تاثرات کا بیان ہوتا ہے۔ اور انسانی تاثرات مختلف حالات میں بدلتے رہتے ہیں جبکہ نبوت کا منہاج وحی پر مبنی ہوتا ہے اور مستقل ہوتا ہے۔ اور نبی ایک سیدھے راستے پر ہوتا ہے۔ اور اس ناموس الٰہی کے تابع ہوتا ہے جس کے مطابق یہ پوری کائنات رواں دواں ہوتی ہے۔ اور یہ ناموس بدلتی ہوئی خواہشات اور بدلتے ہوئے تاثرات کے مطابق نہیں بدلتا۔ جس طرح شعر بدلتے رہتے ہیں اور ہر حال میں شعر میں ایک نظریہ نہیں پایا جاتا۔

نبوت میں تو نبی براہ راست ہر وقت اللہ سے مربوط ہوتا ہے اور وہ براہ راست اللہ کی وحی سے ہدایت لیتا ہے اور اس کی جدوجہد دائمی انداز لیے ہوئے ہوتی ہے کہ زندگی کا نظام اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق چلے۔ جبکہ شعر' اپنے اعلیٰ معیار کے ساتھ محض انسانی خواہشات اور جمال و کمال کے تاثرات پر مشتمل ہوتا ہے۔ انسان میں انسانی سوچ کی تقصیرات اور کمزوریاں موجود ہوتی ہیں۔ اور وہ انسان کے محدود تصورات کا عکس ہوتا ہے اور انسان کی محدود صلاحیت اور علم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ شعر جب اپنے اعلیٰ مقام سے گر جاتا ہے تو یہ محض جسمانی لذت اور طبعی خواہشات اور جنسی لذت تک گر کر محدود ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر وہ جسمانی بخار کا نام ہوتا ہے۔ لہٰذا نبوت اور شاعری اپنی نوعیت اور ماہیت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ شعر اگر اعلیٰ درجے کا بھی ہو وہ ان خواہشات پر مشتمل ہوتا ہے جو زمین سے اٹھتی ہیں اور نبوت آسمانوں سے ایک ہدایت کی شکل میں نازل ہوتی ہے۔

اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ (۳۶:۶۹) "یہ تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھے جانے والی کتاب ہے"۔ ذکر اور قرآن دونوں ایک ہی چیز کی صفات ہیں۔ ذکر اس معنی میں ہے کہ اس کتاب کا اصل مقصد ہی نصیحت ہے اور قرآن اس حساب سے ہے کہ اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ یہ گویا اللہ کی یاد ہے اور دل اس میں مشغول

ہوتا ہے اور قرآن ہے جس کی تلاوت زبان سے ہوتی ہے اور اسے نازل اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ اپنا متعین مقصد پورا کرے۔

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۳۶ : ۷۰) ”تاکہ وہ ہر اس شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت تمام ہو جائے“۔ قرآن نے کفر اور حیات کو بالمقابل رکھا ہے۔ گویا کفر موت کے ہم معنی ہے۔ اور جس شخص کے دل میں ایمان کی استعداد ہو' وہ زندہ ہے اور قرآن کا مقصد یہ ہے کہ وہ رسول اللہؐ پر اس لیے نازل ہوا ہے تاکہ آپ اس کے ذریعے ان لوگوں کو ڈرائیں جو زندہ ہوں' جن لوگوں کے اندر زندگی کی رمق ہو' وہ مر نہ گئے ہوں تاکہ ڈرانے کا انہیں فائدہ ہو۔ رہے کفار تو وہ مردے ہوتے ہیں۔ ان کو ڈرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ نیز ڈرانے کا فریضہ اس لیے عائد کیا گیا ہے تاکہ وہ عذاب کے مستحق ہو جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی کو سزا نہیں دیتا جب تک اس تک اللہ کا پیغام پہنچ نہ جائے اور پھر وہ کفر نہ کر دے۔ اور پھر اگر اللہ انہیں ہلاک کر دے تو وہ بلاحجت اور بغیر سبب کے ہلاک نہ کیا جائے۔

یوں لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کے حوالے سے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک فریق وہ ہے جو اسے قبول کرتا ہے تو وہ زندہ ہے اور ایک وہ ہے جو قبول نہیں کرتا تو وہ مردہ ہے۔ اور اس فریق کو معلوم ہو جائے کہ اس کے خلاف فیصلہ برحق ہوا اور وہ سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔

--- ○○○---

اس سبق کے دوسرے ٹکڑے میں الوہیت اور وحدانیت کا مضمون بیان ہوا ہے۔ الوہیت اور وحدانیت کا یہ بیان لوگوں کے مشاہدات کے فریم ورک میں ہے کہ ذرا دیکھو کہ اللہ کے ان پر کس قدر انعامات ہیں جنہیں وہ استعمال کر رہے ہیں لیکن اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾

”کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے ہیں اور اب یہ ان کے مالک ہیں۔ ہم نے انہیں اس طرح ان کے بس میں کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی پر یہ سوار ہوتے ہیں' کسی کا یہ گوشت کھاتے ہیں' اور ان کے اندر ان کے لیے طرح طرح کے فوائد اور مشروبات ہیں۔ پھر کیا یہ شکرگزار نہیں

ہوتے؟ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنا لیے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی ۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ الٹے ان کے لیے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں ۔ اچھا' جو باتیں یہ بنا رہے ہیں' وہ تمہیں رنجیدہ نہ کریں' ان کی چھپی اور کھلی سب باتوں کو ہم جانتے ہیں"۔

کیا یہ دیکھتے نہیں؟ اللہ کی نشانیاں تو ان کے سامنے موجود ہیں اور سب کو نظر آتی ہیں ۔ نہ ان سے اوجھل ہیں اور نہ دور ہیں ۔ اور نہ یہ نشانیاں اس قدر پیچیدہ ہیں کہ انہیں سمجھنے کے لیے کسی بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے ۔ یہ انعامات جو اللہ نے انسانوں کے لیے پیدا کیے اور انسانوں کو ان کا مالک بنایا' ان میں سے جانور ہیں جن کو انسانوں کے تابع بنایا جن پر انسان سوار ہوتے ہیں' ان میں سے بعض نعمتوں کو کھاتے اور پیتے ہیں ۔ اور بعض سے بعض دوسرے فائدے اٹھاتے ہیں اور یہ سب امور اللہ کی تدابیر اور تقادیر کے مطابق ہے ۔ اور پھر اللہ نے انسانوں کے اندر مختلف صلاحیتیں اور خصوصیات ودیعت فرمائیں ۔ پھر جانوروں کو مختلف خصائص اور صلاحیتیں دیں ۔ انسانوں کو یہ قدرت دی کہ وہ ان کو اپنا تابع فرمان بنائیں اور ان سے فائدے اٹھائیں ۔ چنانچہ وہ سدھائے گئے تابع فرمان بنائے گئے اور ان سے انسانوں کی مختلف حاجات و ضروریات پوری ہوتی رہیں ۔ انسانوں کے اندر یہ قدرت نہ تھی کہ وہ ازخود ان نعمتوں کو پیدا کر سکتے ۔ سب نعمتیں تو بڑی بات ہے اگر تمام انسان جمع ہو جائیں اور وہ ایک مکھی کی تخلیق کرنا چاہیں تو وہ بھی نہ کر سکیں گے ۔ نیز اللہ نے چونکہ مکھی کے اندر یہ خاصیت نہیں رکھی کہ وہ انسانوں کے تابع ہو جائے اس لیے آج تک انسان مکھی کو تابع نہ کر سکے ۔

اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ (۳۶: ۷۳) "پھر کیا یہ شکر گزار نہیں ہوتے"۔ جب انسان ان معاملات کے بارے میں اس انداز سے سوچتا ہے اور قرآن کریم کی روشنی میں ان امور پر غور کرتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ تو اللہ کے انعامات کے اندر ڈوبا ہوا ہے اور اس پر اللہ کے کرم کی ہروقت بارش ہو رہی ہے ۔ اس کے ماحول کی ہر چیز اس کے لیے رحمت ہے ۔ جب بھی وہ کسی حیوان پر سوار ہوتا ہے' یا گوشت کا کوئی ٹکڑا کھاتا ہے' یا دودھ کا ایک گھونٹ پیتا ہے یا سوت' اون اور ریشم کا کوئی کپڑا پہنتا ہے' یا گھی اور پنیر استعمال کرتا ہے یا اپنے انعامات کو کام میں لاتا ہے تو اسے گہرا شعور حاصل ہوتا ہے کہ خالق کائنات کی رحمت کس قدر وسیع ہے اور اس کے انعامات کا دائرہ کس قدر بڑا ہے ۔ غرض یہ شعور اور بھی پختہ ہو جاتا ہے جب انسان اس جہان کی تازہ اور باسی فصلوں اور پھلوں کو استعمال کرتا ہے اور اسی شعور کے نتیجے میں انسانی زندگی پوری کی پوری حمد و ثنا ہو جاتی ہے ۔ قدم قدم پر اس شعور کی وجہ سے انسان عبادت اور بندگی کرتا ہے اور رات دن اللہ کا ثناخواں ہوتا ہے ۔

لیکن لوگوں کے اندر یہ شعور نہیں ہے اس لیے وہ شکر نہیں بجا لاتے بلکہ انہوں نے الٹا اللہ کی مخلوق میں دوسری چیزوں کو اللہ کے سوا الٰہ اور مددگار بنا رکھا ہے ۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ (۳۶: ۷۴) لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ (۳۶: ۷۵) "انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے خدا بنا لیے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی ۔ وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ الٹے ان کے لیے حاضر باش لشکر بنے

ہوئے ہیں"۔ ماضی میں یوں ہوتا تھا کہ بت اور آستانے پوجے جاتے تھے' یا درختوں اور ستاروں کی پوجا کی جاتی تھی۔ فرشتوں' اور جنوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ ماضی کی بت پرستی آج بھی بعض علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ اس مظاہر پرستی میں مبتلا نہیں ہیں وہ بھی خالص توحید کے قائل نہیں ہیں۔ آج اکثر لوگ اللہ کے سوا دوسری کھوئی اور جھوٹی قوتوں سے خائف ہیں اور اللہ کے سوا دوسرے سہاروں پر اعتماد کرتے ہیں۔ شرک کے بہرحال بہت سے رنگ ہوتے ہیں۔ زمان و مکان کے اختلاف سے اس کے رنگ ڈھنگ بھی بدلتے رہتے ہیں۔

یہ لوگ ان الہوں کی بندگی اس لیے کرتے تھے کہ ان کے ذریعے یہ لوگ کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ حالانکہ عملاً صورت حالات یہ ہوتی تھی کہ ان کے الہوں کے خلاف اگر کوئی کچھ اقدام کرتا تھا تو یہ لوگ اپنے الہوں کی امداد کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے اور اپنے الہوں کی حمایت کرتے تھے۔ اصل میں تو یہ لوگ اپنے کھوٹے خداؤں کے مددگار ہوتے تھے۔

وَهُمْ لَهُمْ جُندٌ مُّحْضَرُونَ (۳۶ : ۷۵) "وہ اپنے الہوں کے لیے حاضر باش فوجدار تھے"۔ یہ ان کی سوچ اور فکر کی انتہائی کمزوری تھی۔ آج بھی لوگوں کی اکثریت اسی سوچ میں مبتلا ہے۔ اور صرف شکل و صورت کے اعتبار سے ہی اختلاف ہے۔ اصل سوچ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آج جو لوگ بڑے بڑے سرکشوں اور ڈکٹیٹروں کو الہ بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ازمنۂ سابقہ کے بتوں کے پجاریوں سے کہیں دور نہیں ہیں۔ دراصل یہ لوگ ان بتوں کے فوجدار ہیں۔ یہ لوگ ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کو پوجتے بھی ہیں۔ اور ان کی حمایت و مدافعت بھی کرتے ہیں۔

بت پرستی بہرحال بت پرستی ہے۔ اس کی شکل و صورت مختلف ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ہر دور میں موجود ہوتی ہے۔ اور جب بھی عقیدۂ توحید میں اضطراب پیدا ہوتا ہے بت پرستی کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ شرک اور جاہلیت لے لیتی ہے۔ انسانوں کی فلاح اور نجات صرف توحید خالص میں ہے جس کے اندر صرف اللہ ہی کو الٰہ سمجھا جائے۔ صرف اس کی بندگی کی جائے۔ اور صرف اسی پر بھروسہ کیا جائے اور اطاعت اور تعظیم بھی اسی کی کی جائے۔

فَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ (۳۶ : ۷۶) "اچھا جو باتیں یہ بنا رہے ہیں وہ تمہیں رنجیدہ نہ کریں۔ ان کی چھپی اور کھلی سب باتوں کو ہم جانتے ہیں"۔ اس میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ آپ کے مخاطب وہی لوگ تھے جنہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو الہ بنا رکھا تھا۔ اور یہ لوگ اللہ کا شکر ادا نہ کرتے تھے۔ لہٰذا یہ لوگ نصیحت بھی نہ لیتے تھے۔ حضور سے کہا گیا کہ آپ ان کی فکر نہ کریں۔ اللہ ان کے بارے میں خوب جانتا ہے۔ وہ تحریک اسلامی کے خلاف اور بت پرستی کے حق میں جو تدابیر اختیار کر رہے ہیں' وہ ہماری نظروں میں ہیں۔ لہٰذا اے رسول آپ پر ان باتوں کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ان کے معاملات قدرت الٰہیہ کے سامنے کھلے ہیں اور اللہ کی قدرت ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تحریک اسلامی کے کارکن جب یہ عقیدہ رکھیں تو ان کا معاملہ بہت ہی سہل ہو جاتا ہے۔ وہ چونکہ صرف اللہ پر بھروسہ کرنے والے ہوتے ہیں اس لیے ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ کیونکہ ان کو یقین ہوتا ہے کہ اللہ ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ یہ کہ وہ اللہ کے قبضے میں ہیں' اللہ کی نظروں میں ہیں اگرچہ بظاہر یہ بات نظر نہ آتی ہو۔

اس آخری سبق کا یہ تیسرا حصہ ہے۔ اس میں حشر و نشر کے مسئلہ کو لیا گیا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ ۝ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ۝ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝

"کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے "کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟" اس سے کہو' انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا' اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے' وہی جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو۔ کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں' جب کہ وہ ماہر خلاق ہے۔ وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے"۔

اس حصے میں بات کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ انسان کو خود اپنے وجود اور اپنی ذات کی طرف دیکھنا چاہئے۔ اس کی تخلیق کا آغاز کس طرح ہوا' وہ کس طرح بڑا ہوا اور سن بلوغ کو پہنچا۔ یہ سب مراحل جو اس کی زندگی میں طے ہوئے وہ اس کی نظروں میں ہیں۔ وہ دیکھتا رہا ہے۔ کیا اس سے وہ کوئی سبق اور نصیحت نہیں لے رہا ہے۔ کیا خود انسانی زندگی تخلیق و تشکیل سے وہ یہ سبق نہیں اخذ کر سکتا کہ اللہ کے لیے دوبارہ اٹھانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اگرچہ وہ مٹ جائے اور اس کی ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ (۷۷:۳۶) "کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ وہ نطفہ کیا چیز ہے جس کے بارے میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ انسان کا اصل قریب ہے۔ یہ ایک حقیر پانی سے مرکب ہے' یہ کوئی ٹھوس چیز ہے اور نہ اس کی کوئی قیمت ہے۔ یہ ایک پانی ہے جس میں ہزارہا خلیے ہوتے ہیں۔ ان ہزارہا خلیوں میں سے صرف ایک جنین بنتا ہے۔ اور یہ ایک جنین پھر انسان بنتا ہے۔ یہ پھر اپنے رب اور خالق کے ساتھ گستاخانہ باتیں کرتا ہے۔ رب کی مخالفت کرتا ہے اور اپنے خالق سے برہان و دلیل کا مطالبہ کرتا ہے۔

حالانکہ وہ خالق قدیر ہی ہے جس نے اس قدر حقیر چیز سے انسان کو بنایا اور وہ "خصیم مبین" اور صریح جھگڑالو بن گیا۔

ذرا غور تو کیا جائے کہ یہ انسان کیا سے کیا بن گیا۔ذرا اس کے آغاز اور انجام پر غور کیا جائے۔کیا اس قدرت "قادرہ" کے سامنے یہ کوئی مشکل کام ہے کہ وہ اجزائے جسم کو دوبارہ یکجا کر دے۔اگر چہ وہ مرنے کے بعد زمین میں بکھر گئے ہیں۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ (۳۶:۷۸)

قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُ (۳۶:۷۹) "وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔کہتا ہے "کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں"۔ اس سے کہو انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے"کس قدر سادہ منطق ہے یہ؟ نہایت فطری استدلال۔ایسا استدلال جو مشاہدہ کے مطابق نظر آتا ہے۔

یہ نطفہ جو کچھ کہ وہ ہے کیا وہ بوسیدہ ہڈیوں سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔کیا انسان اسی نطفے سے نہیں بنا اور کیا انسان کی پیدائش ثانی کا عمل پیدائش اول کا عمل نہیں ہے۔اور جس ذات نے اس حقیر نطفے کو ایک انسان بنایا اور اسے وہ شخصیت دی کہ وہ صریح جھگڑالو بن گیا تو وہ ذات ان بوسیدہ ہڈیوں سے انسان کو تیار نہیں کر سکتی اور انہی ہڈیوں اور اجزاء سے ایک خلق جدید تیار نہیں کر سکتی؟

یہ معاملہ تو بہت ہی آسان اور ظاہر ہے۔اور اس قدر ظاہر و باہر ہے کہ اس پر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔چہ جائیکہ کوئی اس پر مباحثہ کرے۔

قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُ (۳۶:۷۹) "اس سے کہو انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے"۔

اس کے بعد اللہ کی قدرت خالقہ کی ماہیت کا ایک نمونہ انہیں بتایا جاتا ہے تاکہ یہ بات ان کے ذہن میں بیٹھ جائے۔ اللہ کی یہ صنعت کاری ان کے مشاہدہ اور ان کے روز مرہ کے معمولات میں سے ہے اور یہ اسے آزماتے رہتے ہیں۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ (۳۶:۸۰)

"وہ جس نے تمہارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو"۔یعنی یہ سادہ ابتدائی مشاہدہ ہی اللہ کی قدرت مذکورہ کی تصدیق کر دے گا۔یہ مشاہدہ تم لوگ روز کرتے ہو لیکن اس کی حقیقت نہیں پاتے ہو۔یہ سرسبز درخت جو پانی کے رس سے بھرا ہوا ہے جب اس کا ایک حصہ دوسرے سے رگڑا جاتا ہے تو اس سے آگ پیدا ہوتی ہے اور یہ درخت بھی پھر اس آگ کا ایندھن بن جاتا ہے۔باوجود اپنی سرسبزی اور تروتازگی کے۔ اور وہ گہری تحقیق کہ درخت کے اندر جو طبعی حرارت کا خزانہ ہوتا ہے،جو وہ سورج کی تاب کاری سے جذب کرتا ہے اور وہ اسے اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتا ہے حالانکہ وہ پانی کے رس سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔اور ان درختوں کے رگڑ سے پھر وہ آگ پیدا ہوتی ہے جس طرح جلنے کے عمل سے آگ پیدا ہوتی ہے تو اس تحقیقی علم و معرفت سے یہ حقیقت اور کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہرے بھرے درخت سے آگ کس طرح نمودار ہوتی ہے۔خالق کائنات ہی نے درختوں کے اندر یہ

کمالات ودیعت فرمائے جس نے ہر چیز کو اس کی تخلیق دی اور پھر اسے حکم دیا کہ وہ ان مقاصد کو پورا کرے جن کے لیے پیدا کیا گیا۔ ہاں یہ ہماری بے راہ روی ہے کہ ہم اس مخلوق کو اسی زاویہ نظر سے نہیں دیکھتے اور نہ کھلی آنکھوں سے کائنات کے ان عجائبات پر غور کرتے ہیں۔ اس لیے ہم پر یہ اسرار و رموز نہیں کھلتے اور نہ وہ ہماری راہنمائی اس خالق اور صانع کی طرف کرتے ہیں۔ اگر ہم کھلے دلوں اور گہری نظروں کے ساتھ دیکھیں تو یہ اسرار و رموز ہماری دسترس میں ہیں اور ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم انہیں سمجھیں' اللہ کی بندگی کریں اور ہر وقت اللہ کی حمد و ثنا کرتے رہیں۔

اس کے بعد دلائل قدرت الٰہیہ بیان کیے جاتے ہیں اور یہ بتایا جاتا ہے کہ تخلیق کا یہ عمل کس قدر سادہ ہے اور اسی طرح اللہ کے لوگوں کا دوبارہ پیدا کرنا کس قدر آسان ہے۔

اَوَلَيْسَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ (۳۶ : ۸۱) "کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کر دیا اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے کیوں نہیں! جبکہ وہ ماہر خلاق ہے"۔ آسمان اور زمین اور یہ وسیع کائنات تو ایک عجیب مخلوق ہے۔ یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں اور اس میں لاکھوں ملین اجناس و اصناف مخلوقات موجود ہیں' بعض اس قدر باریک کہ ہم ان کے حجم ہی کو نہیں پکڑ سکتے۔ نہ ہم ان کی حقیقت کو پا سکتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں آج تک ہم بہت کم جانتے ہیں۔ یہ زمین اس سورج کے کہکشاں میں سے ایک چھوٹا سا تابع سیارہ ہے جس پر ہم رہتے ہیں۔ اس میں ہم سورج کی روشنی اور حرارت سے رہتے ہیں اور ہمارا یہ سورج جس کہکشاں کے تابع ہے' اس کے اندر ایک کروڑ ستاروں میں سے سورج ایک ہے جس سے ہماری قریب کی یہ دنیا بنتی ہے۔ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس جہاں میں کئی اور کہکشاں ہیں۔ اور کئی ایسی دنیائیں ہیں جس طرح ہماری قریب کی دنیا ہے۔ ماہرین فلکیات ابھی تک ایک کروڑ کہکشاؤں تک شمار کر سکے ہیں اور یہ شمار انہوں نے اپنی محدود طاقت والی دوربینوں سے کیا ہے۔ اور وہ اس انتظار میں ہیں کہ کئی اور کہکشاں دریافت ہوں گے جب طاقتور رصد گاہیں اور بہت ہی دور تک دکھانے والی دوربینیں بنا دی جائیں گی۔ ہماری اس کہکشاں اور اس سے قریب ترین کہکشاں کے درمیان فاصلہ کتنا ہے؟ سات لاکھ پچاس ہزار نوری سال کا فاصلہ ہے۔ اور ایک نوری سال کا فاصلہ کیا ہوتا ہے یعنی ۲۶ ملین میل۔ کہتے ہیں کہ طبعی مواد کا ایک عظیم ذخیرہ یا گولہ تھا اور اس کے بکھرنے سے یہ سورج بنے ہیں۔ یہ ہے اللہ کی وسیع کائنات اور اس کی وسیع کرسی اور اس کے بارے میں ہمارے حقیر اور محدود معلومات۔

یہ سورج جن کو گنا نہیں جا سکتا ان میں سے ہر ایک کا ایک مدار یا آسمان اور فلک ہے جس کے اندر یہ سورج چلتا ہے اور ان سورجوں میں سے ہر سورج کے اپنے تابع اجرام ہیں جن کے اپنے اپنے مدار ہیں۔ وہ ان مداروں میں اپنے اپنے سورجوں کے گرد گھومتے ہیں۔ جس طرح ہماری زمین ہمارے سورج کے گرد گھومتی ہے۔ یہ تمام گھومنے والے اربوں سورج اور چاند اور ستارے نہایت ہی دقیق اور متعین رفتار کے ساتھ چلتے ہیں اور کبھی اپنی رفتار اور مدار کو نہیں بدلتے۔ ایک لمحہ کے لیے نہیں رکتے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کائنات کے تمام مجموعے جو اس وقت ان فضاؤں میں تیر رہے ہیں' سب باہم متصادم ہو جائیں اور یہ تمام نظام درہم برہم ہو جائے۔

یہ فضا جس میں اربوں اجرام فلکی چکر لگا رہے ہیں اور جن کی تعداد بھی ابھی تک معلوم نہیں' یوں ہیں جس طرح

چھوٹے چھوٹے زرے ہیں۔ نہ ان کی تصویر کشی ہو سکتی ہے اور نہ یہ دائرہ تصور میں آ سکتے ہیں۔ یہ اس قدر وسیع و عریض کائنات کے حصے ہیں جس کے تصور ہی ت سر چکرا جاتا ہے۔

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ

(۳۶ : ۸۱) ''وہ جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں کہ ان جیسوں کو پیدا کر سکے''۔ لوگوں کی تخلیق تو ایک معمولی بات ہے جبکہ یہ کائنات بہت ہی وسیع اور عظیم ہے۔

بَلٰی وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ (۳۶ : ۸۱) ''ہاں وہ ماہر خلاق ہے''۔ اللہ نے یہ سب چیزیں پیدا کیں وہ ان کے علاوہ اور چیزوں کو بھی پیدا کر سکتا ہے اور بغیر کسی تکلیف اور محنت کے۔ اللہ کے لیے چھوٹی یا بڑی چیز کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۳۶ : ۸۲) ''وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے''۔ یہ چیز زمین ہو یا آسمان ہوں، مچھر ہو یا پسو ہو، یا چیونٹی، یہ سب چیزیں اللہ کے حکم کے سامنے یکساں ہوتی ہیں۔ کن فیکون۔

اللہ کے سامنے مشکل و آساں کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ کے لیے قریب و بعید یکساں ہیں۔ صرف ارادے کا متوجہ ہونا ہوتا ہے۔ ادھر ارادہ ہوا ادھر وہ چیز ہو گئی۔ وہ جو بھی ہو۔ اللہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ لوگ اللہ کے اعمال و افعال کو سمجھ جائیں۔ ورنہ انسان کی محدود قوت مدرکہ کے لیے چیزوں کا سمجھنا ہی مشکل ہے۔

---ooo---

اب اس سورت میں انسان کے قلب و نظر کی تاروں پر ایک آخری ضرب لگائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی ضرب ہے س سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کیا ہے۔

۵ ۱۶ ع ۴

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

''پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے، اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو''۔

لفظ ملکوت سے خالق و مخلوق کے تعلق کی اہمیت اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس کائنات کی ہر چیز مطلقاً اللہ کی ملکیت ہے اور اس کائنات کی تمام مملوکات پر اللہ کا مکمل قبضہ اور کنٹرول ہے۔

دوسری بات یہ کہ تمام چیزوں کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ یہ آخری ضرب ہے اور اس سورت کی نہایت عظیم اور ہولناک فضا کے لیے یہ نہایت ہی مناسب تنبیہ ہے۔ اس سورت کا موضوع بھی نہایت ہی عظیم اور اہم ہے۔ اور اس کے اندر جو حقائق اور دلائل بھی لائے گئے ہیں وہ بھی بہت ہی عظیم اور ہولناک ہیں اور اس عظیم حقیقت سے مربوط و متعلق ہیں جن کی تفصیلات اور موضوع اس سورت میں دی گئی ہیں۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ----- ۲۳

سورہ الصّٰفّٰت ۔ ۳۷

آیات ۱--- تا --- ۱۸۲

سورۃ الصٰفٰت ایک نظر میں

سابقہ سورت کی طرح یہ سورت بھی مکی ہے۔اس کی آیات اور فواصل مختصراور زود اثر ہیں اور ان کے اندر مختلف مناظر اور مختلف مواقف ہیں۔ مختلف تصاویر اور مختلف سائے ہیں۔اس کے اندر تمام واقعات ایسے ہیں جن کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔لیکن بعض واقعات خصوصی طور پر نہایت ہی شدید 'سخت اور گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔

تمام دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورت کا ہدف بھی یہی ہے کہ انسانوں کے نظریات اور عقائد کو درست کیا جائے۔انسانی سوچ کو ہر قسم اور ہر شکل و صورت کی شرک سے پاک کیا جائے۔لیکن خصوصاً یہاں شرک کی اس صورت کو لیا گیا ہے جو اس وقت عربی معاشرے میں رائج تھی۔یہ سورت شرک کی اس قسم پر طویل تبصرہ کرتی ہے اور مختلف وسائل اور ذرائع سے اس کے کھوٹ اور باطل ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔جاہلیت عربیہ نے اس شرک کی شکل و صورت یوں گھڑ رکھی تھی کہ وہ اللہ اور جنوں کے درمیان رشتہ داریاں ثابت کرتے تھے۔اس سوچ میں وہ اس قدر آگے بڑھے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ نے نعوذ باللہ جنوں کے ساتھ شادی کی اور اس کے نتیجے میں ملائکہ پیدا ہوئے۔پھر یہ بھی ان کا عقیدہ تھا کہ فرشتے عورتیں ہیں اور یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

اس سورت میں ان خرافاتی کہانیوں پر تنقید کی گئی ہے۔اس تصور کے پوچ اور اس سوچ کے کھوٹے پنے سے بحث کی گئی ہے۔چونکہ اس سورت کا یہ اہم موضوع تھا' اس لیے سورت کے آغاز ہی میں فرشتوں کے بعض گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ اللہ کے حوالے سے ان کی حیثیت کا تعین ہو۔

وَ الصّٰفّٰتِ صَفًّا (۳۷:۱) فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (۳۷:۲) فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا

(۳۷:۳) "قطار در قطار صف باندھنے والوں کی قسم 'پھر ان کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں۔پھر ان کی قسم جو کلام نصیحت سنانے والے ہیں"۔اس کے بعد سرکش شیاطین کا ذکر آتا ہے جن کو شہاب ثاقب کے ذریعہ مارا جاتا ہے تاکہ وہ ملاء اعلیٰ کے قریب نہ جا سکیں۔اور عالم بالا میں اللہ کے تکوینی امور کے بارے میں جو فیصلے ہوتے ہیں ان کے سننے کے لیے یہ کان نہ لگائیں۔اگرچہ عربوں میں مروج وہم پرستانہ کہانیوں کے مطابق عالم بالا سے ان شیاطین کو یوں نہ بھگایا جا سکتا تھا۔اس سورت میں زقوم کے پودے کے پھلوں کو رؤس الشیاطین سے تشبیہ دی گئی ہے۔یعنی اس درخت کو مزید گھناؤنا اور قبیح ثابت کرنے کے لیے 'سورت کے آخر میں اس پوچ تصور پر براہ راست حملہ کیا گیا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُوْنَ (۳۷:۱۴۹) اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّ هُمْ شٰهِدُوْنَ (۳۷:۱۵۰) اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ (۳۷:۱۵۱) وَلَدَ اللّٰهُ

وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۳۷:۱۵۲) اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ (۳۷:۱۵۳) مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (۳۷:۱۵۴) اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۳۷:۱۵۵) اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۷:۱۵۶) فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۷:۱۵۷) وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ (۳۷:۱۵۸) سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۳۷:۱۵۹)(۳۷:۱۴۹-۱۵۹) ''پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو' کیا (ان کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے؟ کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سن رکھو' دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ ''اللہ اولاد رکھتا ہے''۔ اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کر لیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے' کیسے حکم لگا رہے ہو؟ کیا تمہیں ہوش نہیں آتا؟ یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے' تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو۔ انہوں نے اللہ اور ملائکہ کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے' حالانکہ ملائکہ خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ مجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ اللہ پاک ان باتوں سے جو یہ لوگ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں''۔

اس مخصوص صورت شرکیہ کی تردید کے ساتھ ساتھ' اس سورت میں ان تمام دوسرے غلط عقائد کی بھی تردید کی گئی ہے جو کی سورتوں کا خاص موضوع ہے۔ چنانچہ خالص توحید پر اس ظاہرو باہر کائنات سے استدلال کیا جاتا ہے۔

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (۳۷:۴) رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (۳۷:۵) ''تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہے' وہ جو زمین اور آسمانوں اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں اور سارے مشرقوں کا مالک ہے''۔ یہ سورت تصریح کرتی ہے کہ شرک جہنم رسید ہونے اور عذاب پانے کا سبب اول ہے۔ یہ تصریح مناظر قیامت کے ایک منظر میں کی جاتی ہے۔

فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ (۳۷:۳۳) اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ (۳۷:۳۴) اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ (۳۷:۳۵) وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۷:۳۶) بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷:۳۷) اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ (۳۷:۳۸) وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۷:۳۹)

(۳۷:۳۳ تا ۳۹) ''اس طرح وہ سب اس روز عذاب میں مشترک ہوں گے۔ ہم مجرموں کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے تو یہ گھمنڈ میں آ جاتے تھے

اور کہتے تھے کہ ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں ـ حالانکہ وہ حق لے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی ـ اب ان سے کہا جائے گا کہ تم لازماً دردناک سزا کا مزہ چکھنے والے ہو اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جارہا ہے وہ انہی اعمال کا دیا جارہا ہے ـ جو تم کرتے رہے ہو ـ

اس سورت میں بعث بعد الموت اور جزاء و سزا کے مسئلے کو بھی لیا گیا ہے ـ

وَ قَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۳۷:۱۵) ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (۳۷:۱۶) اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۳۷:۱۷) قُلْ نَعَمْ وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ

(۳۷:۱۸) "اور وہ کہتے ہیں یہ تو صریح جادو ہے ـ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اس وقت ہم پھر ...... زندہ کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباؤ اجداد بھی اٹھائے جائیں گے ـ ان سے کہو ہاں اور تم خدا کے مقابلے میں بے بس ہو" ـ اور اس کے بعد پھر مناظر قیامت میں سے ایک طویل اور منفرد منظر پیش کیا جاتا ہے ' جس کے اندر بے شمار مناظر ' حرکات ' تاثرات اور اچانک آنے والے حالات پیش کیے گئے ہیں ـ

اس سورت میں وحی الٰہی اور منصب رسالت سے بھی بحث کی گئی ہے ـ وہ کہتے تھے ـ

وَ يَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۷:۳۶) "کیا ہم اپنے الہوں کو ایک شاعر اور مجنوں کی وجہ سے چھوڑ دیں" ـ اس کا جواب یوں آتا ہے :

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَ صَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷:۳۷) "بلکہ وہ سچ لے کر آیا ہے اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی ہے" ـ

اہل مکہ کی گمراہی اور تکذیب کی مناسبت سے رسولوں کے قصے بھی اس سورت میں لائے گئے ہیں ـ حضرت نوح ' حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کے قصص لائے گئے ہیں ـ حضرت موسیٰ ' حضرت ہارون ' حضرت الیاس ' حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کے قصص بھی لائے گئے ہیں ـ ان قصص سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے رسولوں پر ہمیشہ رحمت فرماتا رہا ہے اور ان کی نصرت کرتا رہا ہے ـ اور ان کے مخالفین اور مکذبین پر اللہ کا عذاب آتا رہا ہے ـ اور ان کو سزا دی جاتی رہی ہے ـ

وَ لَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۷:۷۱) وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (۳۷:۷۲) فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ (۳۷:۷۳) اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ (۳۷:۷۴) "حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے تھے اور ان میں ہم نے تنبیہ

کرنے والے رسول بھیجے تھے۔ اب دیکھو کہ ان تنبیہہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بدگمانی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا تھا"۔

ان قصص میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بہت ہی ممتاز ہے۔ حضرت اپنے بیٹے کو خواب میں اشارے کی بنا پر ذبح کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طاعت اور سر تسلیم خم کرنے کا اعلیٰ ترین معیار کیا ہوتا ہے۔ یہ اطاعت امر رب کی اعلیٰ ترین مثال ہے اور اس اعلیٰ اور بلند ترین چوٹی پر وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جنہوں نے اپنے نفوس کی تربیت اعلیٰ مقاصد کے لیے کی ہو اور ان کی نظریں افق اعلیٰ پر ہوں جو نہایت ہی روشن ہے۔

اس سورت میں موضوع سخن اور مسائل زیر بحث کے نتیجے میں جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا خلاصہ واضح طور پر یوں ہے :

۱۔ آسمانوں کے مناظر، کواکب اور شہاب ثاقب کے حیران کن مناظر :

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ (۳۷:۶) وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (۳۷:۷) لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ (۳۷:۸) دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۳۷:۹) اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۳۷:۱۰) "ہم نے آسمان دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے۔ ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پیہم عذاب ہے۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے"۔

۲۔ قیامت کے مناظر اور اس کے نہایت ہی اچانک، غیر متوقع اور دہشت ناک مناظر اور نہایت ہی قوی اثرات اس سورت میں بیان کیے گئے۔ اس سورت میں یہ مناظر ایک خصوصی شان لیے ہوئے ہیں۔ ان کی تفصیلات ہم تشریح آیات کے وقت دیں گے۔ انشاء اللہ!

۳۔ پھر اس سورت میں لائے ہوئے قصص میں خاص اشارات اور اسباق پوشیدہ ہیں۔ خصوصاً قصہ ابراہیم اور آپ کے ذبیح بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے واقعات میں یہ اثرات اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ باپ جب بیٹے کو حکم الٰہی کے تحت ذبح کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں تو تسلیم و رضا کی یہ ایک اعلیٰ ترین مثال قرار پاتی ہے اور بہت ہی مشکل تعمیل۔

۴۔ پھر اس سورت میں ترنم انگیز فواصل آیات ہیں۔ مختصر آیات اور آیات کا ہم وزن خاتمہ۔ اس سورت کے مناظر، اس کے پرتوؤں اور اس کے مواقف اور اشارات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

یہ سورت ان موضوعات کو تین اسباق کی شکل میں لیتی ہے۔

۱۔ پہلے سبق کا آغاز ان ملائکہ کی قسم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جو صف بستہ تعمیل حکم ... ہیں اور جو ڈانٹتے اور پھٹکارتے ہیں اور وہ جو کلام نصیحت سناتے اور پھیلاتے ہیں۔ یہ قسم اس بات پر اٹھائی جاتی ہے کہ تمام مشرقوں کا رب

اللہ وحدہ ہے جس نے آسمانوں کو کواکب کے ذریعے مزین کیا ہے ۔ پھر شیاطین ' ان کی جانب سے عالم بالا کے راز چرانے اور شہاب ثاقب سے مارے جانے کا ذکر ہے اور اس کے بعد سوال کیا جاتا ہے ۔

اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا (۳۷:۱۱) "کیا یہ لوگ زیادہ طاقتور ہیں" یا یہ بندگان خدا ملائکہ 'کواکب ' شیاطین اور شہاب ثاقب؟ اس سے اس بات پر استدلال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ بعث بعد الموت کو بعید سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ اللہ کے لیے یہ بہت ہی آسان کام ہے ۔ یہ لوگ اپنی کج فہمی کی وجہ سے اسے مستبعد سمجھتے ہیں اور مزاح کرتے ہیں ۔ چنانچہ اس کے بعد حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کا ایک طویل منظر پیش کیا جاتا ہے ' یہ ایک منفرد منظر ہے ۔

۲۔ دوسرے سبق کا آغاز اس مضمون سے کیا جاتا ہے ۔ کہ مکہ کے گمراہوں کی مثالیں امم سابقہ میں بھی موجود رہی ہیں ۔ ان کے پاس بھی ڈرانے والے آئے تھے لیکن ان میں سے اکثر لوگ گمراہ ہی رہے ۔ ان ڈرانے والوں میں قوم نوح ' قوم ابراہیم ' موسیٰ ' ہارون ' الیاس ' لوط اور یونس علیہم السلام کے قصص لائے گئے ہیں ۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان ڈرانے والوں کی اقوام کا انجام کیا ہوا ۔

۳۔ تیسرے سبق میں وہ خرافاتی تصور پیش کر کے اسے رد کیا گیا ہے ۔ جس کا تذکرہ ہم کر آئے ہیں ۔ یعنی جنات اور ملائکہ کا قصہ ۔ اس آخری سبق میں اللہ کے اس عہد کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس نے تمام رسولوں کے ساتھ کیا ہے ۔

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷:۱۷۱) اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ (۳۷:۱۷۲) وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۳۷:۱۷۳) "اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا" ۔ سورت کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ تمام شرکوں سے پاک ہیں ۔ اس کے رسولوں پر دنیا و آخرت میں سلامتی ہے ۔ اور ہر قسم کی حمد و ثنا اور حاکمیت و ربوبیت اللہ کے لیے ہے ۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۳۷:۱۸۰) وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷:۱۸۱) وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۷:۱۸۲) "پاک ہے تیرا رب ' عزت کا مالک ' ان تمام باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں اور سلام ہے رسولوں پر ' اور ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے" یہی وہ اصل مسائل ہیں جو اس سورت کا موضوع سخن ہیں ۔ اور سورت کے مضامین انہی کے گرد گھومتے ہیں ۔

اب تفصیلات اور تشریحات ۔

--- ٥٥٥ ---

درس نمبر ۲۰۸ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۶۸

وَ الصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۳﴾ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِ ؕ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"قطار در قطار باندھنے والوں کی قسم' پھر ان کی قسم جو ڈانٹنے پھٹکارنے والے ہیں' پھر ان کی قسم جو کلام نصیحت سنانے والے ہیں' تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے --- وہ جو زمین اور آسمانوں کا اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں' اور سارے مشرقوں کا مالک"۔

قطاروں میں صف آرا ہونے والے' زجر کرنے والے اور تلاوت کرنے والے دراصل وہ فرشتے ہیں جو ان اعمال کے حامل ہیں۔ صفیں باندھنے والے یعنی نمازوں میں یا اللہ سے احکام لینے کے انتظار میں صف بستہ مراد ہوں اور زجر و توبیخ سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ جن نافرمانوں کی روح قبض کرنا مقصود ہو تو وہ ڈانٹتے ہوئے لیتے ہیں' یا وہ جو حشر میں ان کو ڈانٹ ڈپٹ سے جہنم کی طرف چلائیں گے۔ یا کسی بھی حال میں اللہ کی مرضی کے مطابق زجر کرنے والے۔ اور تلاوت و ذکر کرنے والوں سے مراد کتاب الٰہی پڑھنے والے اور اللہ کی تسبیحات کرنے والے ہو سکتے ہیں۔

غرض ملائکہ کی ان خاص اقسام و انواع کی قسم کھانے کی غرض و غایت یہ ہے کہ لوگو! جان لو کہ۔

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (۳۷ : ۴) "تمہارا معبود حقیقی بس ایک ہی ہے"۔ اور ان فرشتوں کی اس حالت کی پھر قسم اس لیے کھائی گئی ہے کہ فرشتوں کے بارے میں عربوں کا مقصود بہت غلط تھا جیسا کہ ہم نے کہا کہ عرب فرشتوں کو اللہ کی اولاد سمجھتے تھے اور بعض عرب فرشتوں کو الٰہ بھی اس لیے بناتے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں لہٰذا ہماری دیویاں ہیں۔

ضروری ہوا کہ فرشتوں کی حیثیت بتانے کے بعد اللہ خود اپنی تعریف بھی فرما دے :

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ رَبُّ الْمَشَارِقِ (۳۷ : ۵) "وہ جو زمینوں اور آسمانوں کا اور تمام ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان ہیں اور سارے مشرقوں کا مالک ہے" - یہ زمین اور آسمان جو انسانوں کے ارد گرد قائم ہیں وہ انسانوں کو بتاتے ہیں کہ اس عظیم کائنات کا ایک خالق مدبر ہے - اس جہاں میں کوئی ذات اس کے سوا نہیں ہے جس کا یہ دعویٰ ہو کہ اس کی تخلیق اور تدبیر میں اس کا بھی حصہ ہے - کوئی عقلمند انسان اس اعتراف سے نہیں بھاگ سکتا کہ اس جہاں کا خالق بے قید قدرتوں کا مالک ہے - اور وہ رب ہے اور وہی مالک ہے زمین و آسمان اور ان کے درمیان ہر چیز کا - خواہ ہوائیں ہیں' بادل ہیں' روشنی ہے' مخلوقات ہیں' دیکھی جانے والی مخلوقات ہیں یا ایسی مخلوقات ہیں جو نظر نہیں آسکتیں اور آئے دن ان کے بارے میں انسانوں کے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے - لیکن ان کی اکثریت اب بھی نظروں سے اوجھل ہے -

آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی مسافتیں اسی قدر وسیع' اس قدر عظیم ہیں اور ان کے درمیان پائی جانے والی مخلوقات اس قدر متنوع' خوبصورت اور باہم ہم آہنگ ہیں کہ ایک زندہ دل انسان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - اور اس کائنات سے گہرے تاثر اور عبرت پکڑنے اور اس پر غور و فکر کے بغیر وہی شخص گزر سکتا ہے جس کا دل مر چکا ہو' اس لیے ایسے شخص پر پھر یہ خوشگوار تاثرات کوئی اثر نہیں کرتے اور اس کا دل و دماغ ان عجائبات کو دیکھ کر بھی جوش میں نہیں آتا -

رَبُّ الْمَشَارِقِ (۳۷ : ۵) "مشرقوں کا مالک" - ہر ستارے کے لیے ایک مشرق ہے اور ہر سیارے کا بھی ایک مشرق ہے - لہٰذا اس کائنات میں بے شمار مشارق ہیں - ان وسیع اجرام فلکی میں ان گنت مشارق ہیں - اس تعبیر میں اس زمین کی طرف بھی گہرا اشارہ ہے جس پر ہم رہتے ہیں - زمین جب سورج کے سامنے حرکت محوری کا عمل کرتی ہے' تو کسی نہ کسی وقت اس کا ایک حصہ مشرق ہوتا ہے - اسی طرح کسی نہ کسی وقت اس کا ایک حصہ مغرب ہوتا رہتا ہے - اور یہ عمل پے درپے چلتا رہتا ہے - جونہی کوئی حصہ سورج کے سامنے آتا ہے وہ مشرق ہوتا ہے - اور اس کے بالمقابل حصہ مغرب ہوتا ہے - جوں جوں حرکت اور گردش ہوتی رہتی ہے' مشرق بھی بدلتا رہتا ہے اور مغرب بھی - یہ وہ حقیقت ہے جس سے نزول قرآن کے وقت لوگ بے خبر تھے - لیکن اللہ نے ان کو اس قدر قدیم زمانے میں خبر دے دی -

یہ نہایت ہی گہرا انظام ہے' جس کے مطابق اس زمین پر مشارق رواں دواں ہیں اور یہ خوبصورتی جو طلوع آفتاب کے وقت اس زمین پر بکھر جاتی ہے' یہ اس قابل ہے کہ انسانی دل کو خوشگوار' تاثر اور گہرے غور و فکر کے تاثرات سے بھر دیں - اور انسان چلا اٹھے کہ صانع کائنات کی کیا شان ہے اور انسان چلا اٹھے کہ بے شک اللہ وحدہ خالق کائنات ہے کہ اس عجیب صفت کے آثار اور اس کی مسافت اور طبیعت یہ بتاتی ہے کہ اس کا بنانے والا ایک ہی ہے -

یہی وجہ ہے کہ یہاں اللہ کی صفت رب المشارق کو لایا گیا ہے - عنقریب ہم کواکب' شہاب ثاقب' شیاطین اور ان کے بھگائے جانے پر بحث کریں گے' اس موقعہ پر رب المشارق کے کچھ اور مفہوم اور مناسبتیں بھی بیان کریں گے -

--- ○○○ ---

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ اِۨلْكَوَاكِبِ ۝ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ یُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝

''ہم نے آسمان دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے اور ہر شیطان سرکش سے اس کو محفوظ کر دیا ہے ۔ یہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے ۔ ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پیہم عذاب ہے ۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے ۔

سورت کے آغاز میں ملائکہ کے بارے میں عربوں کے غلط خیالات پر بحث کی گئی تھی ' یہاں شیاطین کے بارے میں ان کے غلط خیالات کو لیا جاتا ہے ۔ عربوں کے یہ خیالات تھے کہ اللہ اور جنوں کے درمیان رشتہ داری ہے ۔ بعض عرب محض اس خیال سے شیاطین کی پوجا کرتے تھے کہ شیاطین کو ملکوت السموات کی بعض غیوب کا علم ہوتا ہے ۔ وہ ملاء اعلیٰ سے وابستہ ہوتے ہیں اور یوں نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں ۔

زمین ' آسمان اور مشرقوں کے ذکر کے بعد ' چاہے ان سے مراد ستاروں کے مشرق ہوں ' زمین کے اوپر جاری مشرق ہوں ' یا دونوں مشرق ہوں یا ان سے مراد نور اور روشنی ہو ' بہرحال اب یہاں کواکب کا تذکرہ کیا جاتا ہے ۔

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ الْكَوَاكِب (۳۷ : ۶) ''ہم نے آسمان دنیا کو تاروں سے آراستہ کیا ہے''۔ صرف ایک نظر ہی سے یہ زینت دکھائی دیتی ہے ۔ چاندنی رات میں تارے اور کواکب کیا نظارہ پیش کرتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کائنات میں جمال ایک اہم عنصر ہے ۔ جس طرح اللہ کی تخلیق غور و فکر کے بعد انوکھی معلوم ہوتی ہے ۔ اسی طرح خوبصورت بھی معلوم ہوتی ہے ۔ جمال اس کائنات کے نقشے میں کوئی عارضی رنگ نہیں ہے ۔ بلکہ یہ ایک حقیقی عنصر ہے ۔ تخلیق کائنات میں دو چیزیں بنیادی مواد ہیں ۔ ایک کمال درجے کا منصوبہ اور دوسرا نہایت ہی خوبصورت نقوش فطرت ۔ یہ دونوں عنصر برابر اور مقصود بالذات ہیں ۔ اور اس کائنات میں کمال و جمال دونوں اپنا اپنا کام کرتے ہیں ۔

چاندنی رات میں جب انسان تاروں بھرے آسمان کو دیکھتا ہے تو وہ اس دنیا کے خوبصورت ترین منظر کو دیکھ رہا ہوتا ہے ۔ یہ منظر اس قدر خوبصورت ہوتا ہے کہ انسان دیکھتا چلا جائے ' نظریں تھکتی نہیں اور دل ملول نہیں ہوتا ۔ ہر ستارہ ضو بار ہوتا ہے اور چمکتا ہے ۔ ہر سیارہ اپنا نور بکھیر رہا ہوتا ہے ۔ انسان محسوس کر رہا ہے کہ یہ کائنات کی محبت بھری آنکھیں ہیں جو نظر چرا کے دیکھ رہی ہیں اور جب انسان ان پر نظر ڈالتا ہے تو یہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں ' چھپ جاتی ہیں اور جب آپ ان سے نظر ہٹاتے ہیں تو یہ آنکھیں پھر چمک اٹھتی ہیں اور اپنے منظور نظر کی تلاش میں رہتی ہیں ۔ ہر رات ان آنکھوں کا موقف مختلف ہوتا ہے اور منزل جدا ہوتی ہے ۔ یہ بھی انسان کے لیے ایک ذہنی اور نفسیاتی خوراک ہے اور اسے جس قدر بھی کوئی کھائے سیر نہیں ہوتا اور نہ ملول ہوتا ہے ۔

اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ ان کواکب کا ایک دوسرا فریضہ بھی ہے ۔ ان میں سے بعض شہاب ثاقب ہوتے ہیں اور یہ ان شیاطین پر بمباری کرتے ہیں جو ملاء اعلیٰ کے قریب جانے کی سعی کرتے ہیں ۔

وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ (۳۷ : ۷) لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ یُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ (۳۷ : ۸) دُحُوْرًا وَّ لَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۳۷ : ۹) اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۳۷ : ۱۰) اور ہر سرکش شیطان سے اس کو محفوظ کر دیا ہے ۔ یہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے ۔ ہر طرف سے مارے اور ہانکے جاتے ہیں اور ان کے لیے پیہم عذاب ہے ۔ تاہم اگر کوئی ان میں سے کچھ لے اڑے تو ایک تیز شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے ۔

بعض سیارے ایسے ہوتے ہیں جو عالم بالا کی حفاظت کرتے ہیں ۔ ان کی ڈیوٹی یہ ہوتی ہے کہ یہ عالم بالا میں جو فیصلے اس عالم کے بارے میں ہوتے ہیں ' شیاطین کو ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سے روکتے رہیں ۔ جب بھی کوئی شیطان عالم بالا سے کوئی راز چرانے کی سعی کرتا ہے تو شہاب ثاقب اس کا پیچھا کرتے ہیں ۔ اور ان کو مار کر ہانک دیتے ہیں ۔ ایسے شیاطین متمردین کے لیے آخرت میں ایسا عذاب ہو گا جو کبھی ختم ہونے والا نہ ہو گا ۔ بعض اوقات شیاطین ' بعض معلومات لے اڑتے ہیں ایسے شیاطین کا پیچھا یہ شہاب ثاقب کرتے ہیں ۔ یہ شہاب ایسے شیاطین پر لگتے ہیں اور انہیں جلا کر رکھ دیتے ہیں ۔

ہم ان کیفیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے کہ یہ شیاطین جاسوسی کا یہ عمل کس طرح کرتے ہیں اور کس طرح وہ کچھ معلومات لے اڑتے ہیں اور کس طرح انہیں شہاب ثاقب کے ذریعے بھسم کر دیا جاتا ہے ۔ یہ عالم غیب کی باتیں ہیں اور انسانی فہم وادراک کی جو طبیعت ہے وہ ان کے معلوم کرنے سے عاجز ہے ۔ اور نہ ان کی کیفیات کا تصور کر سکتی ہے ۔ ہمارا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی طرف سے جو کچھ آجائے ہم اس کی تصدیق کر دیں ' اس جہاں کے اندر ہم طبیعیات کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں وہ سطحی علم ہے ۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ شیاطین جن کو عالم بالا تک پہنچنے نہیں دیا جاتا ۔ اور وہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کی طرف کان لگانے سے بھی ان کو روکا جاتا ہے ۔ وہی شیاطین ہیں جن کے بارے میں عرب کے لوگوں کا دعویٰ تھا کہ ان کا اور اللہ تعالیٰ کا آپس میں رشتہ ہے (نعوذ باللہ) ۔ اگر ان لوگوں کا یہ دعویٰ درست ہوتا تو معاملہ مختلف ہوتا ۔ اور یہ نہ ہوتا کہ اللہ کے رشتہ داروں کو اس طرح دھتکارا جاتا ' ہانکا جاتا اور اگر کچھ بات وہ لے اڑیں تو انہیں رجم کر دیا جاتا ۔ یہ رشتہ دار تو عالم بالا میں آزادانہ آتے جاتے ۔

ملائکہ کے ذکر اور آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان اشیاء کے ذکر کے بعد اور ان ستاروں کے ذکر کے بعد جن سے آسمانوں کو مزین کیا گیا اور ان شیطانوں کے ذکر کے بعد جو سرکش ہیں اور جن پر شہاب ثاقب چھوڑے جاتے ہیں ' اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ذرا ان لوگوں سے پوچھیں کہ وہ زیادہ طاقتور ہیں یا مذکورہ بالا ... طاقتور ہے اور زیادہ قوی ہے تو پھر وہ دوبارہ اٹھائے جانے کے

تصور سے کیوں دہشت زدہ ہو جاتے ہیں اور مزاح کرتے ہیں۔ اور اس کے وقوع کو مستبعد سمجھتے ہیں۔ حالانکہ قیامت میں لوگوں کو دوبارہ اٹھانا اس عظیم اور ہولناک مخلوقات کی پیدائش سے زیادہ مشکل امر نہیں ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَم مَّنْ خَلَقْنَا ۚ إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ ﴿١١﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ﴿١٢﴾ وَإِذَا ذُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ ﴿١٤﴾ وَقَالُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿١٦﴾ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ﴿١٧﴾

"اب ان سے پوچھو' ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا ان چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟ ان کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔ تم (اللہ کی قدرت کے کرشموں پر) حیران ہو اور یہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں "یہ تو صریح جادو ہے' بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اس وقت ہم پھر زندہ کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباؤ اجداد بھی اٹھائے جائیں گے"۔

ذرا ان سے پوچھو کہ تم مانتے ہو کہ ملائکہ' سماوات' زمین' ان کے درمیان فضائیں' شیاطین' ستارے اور شہاب ثاقب سب اللہ کی مخلوق ہیں۔ تو کیا تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا اللہ کے ان جہانوں کی تخلیق؟

اس سوال کے بعد ان کے جواب کا انتظار ہی نہیں کیا جاتا کیونکہ جواب تو ظاہر ہے۔ یہ سوال تو محض سرزنش کے لیے کیا گیا ہے اور ان کی غباوت پر تعجب کے اظہار کے لئے کیا گیا ہے۔ اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ لوگ حد درجہ غافل اور حیران کن حد تک نافہم ہیں۔ چنانچہ ان کے سامنے یہ حقیقت رکھی جاتی ہے کہ آغاز میں تمہیں ایک لیس دار گارے سے بنایا گیا ہے۔ اور یہ گارا اسی زمین سے لیا گیا ہے۔ جو خلائق میں سے ایک ہے۔

إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ (۳۷:۱۱) "ہم نے انہیں لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے"۔

لہٰذا یہ لوگ پیدائش کے اعتبار سے کوئی زیادہ دشوار نہیں ہیں اور نہ ان کی تخلیق مشکل ہے۔ لہٰذا ان کا موقف عجیب ہے کہ اپنی حماقتوں کو نہیں سمجھتے۔ الٹا اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ ان کو بعث بعد الموت کی جواب وہی سے ڈرایا جاتا ہے اور یہ لوگ مذاق سمجھتے ہیں۔ ان کی یہی حماقت ہے جس پر حضور اکرمؐ کو تعجب ہوتا ہے اور یہ لوگ ہیں کہ اپنی روش پر چل رہے ہیں۔

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ (۳۷:۱۲) وَإِذَا ذُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ (۳۷:۱۳) وَإِذَا

رَاَوْا اٰیَۃً یَّسْتَسْخِرُوْنَ (۳۷ : ۱۴) "تم حیران ہو اور یہ مذاق اڑا رہے ہیں۔ سمجھایا جاتا ہے تو سمجھ کر نہیں دیتے۔ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں اڑا دیتے ہیں"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو حق ہے کہ آپ ان کے معاملات پر تعجب کریں۔ کیونکہ آپ تو اللہ کو اپنے قلب میں پاتے ہیں۔ جس طرح ہر مومن پاتا ہے اور اللہ کی آیات کو واضح طور پر دیکھتا ہے۔ جو اس کائنات میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ آپ کو اس پر تعجب ہے کہ ان آیات اور نشانیوں کو دیکھتے ہوئے کس طرح ایک شخص اندھا ہو سکتا ہے اور کس طرح اس قسم کا جاہلانہ موقف اختیار کر سکتا ہے۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے رویہ کی وجہ سے انگشت بدنداں ہیں' ادھر ان کی حالت یہ ہے کہ مسئلہ کی اس قدر وضاحت کے باوجود' عقیدہ توحید اور بعث بعد الموت کے مسائل کے واضح ہونے کے باوجود ان کے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں ان کی فطرت مسخ ہو چکی ہے۔ اور وہ مذاق کرتے ہیں۔ بلکہ وہ مذاق طلب کرتے ہیں۔ دوسروں کو بھی مذاق کی دعوت دیتے ہیں۔ لفظ (یستسخرون) سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔

ان کے مذاق اور ناسمجھی کا ایک نمونہ یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید کو جادو کہتے ہیں اور اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ قرآن کریم موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے نظریہ کی دعوت دیتا ہے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۳۷ : ۱۵) ءَاِذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ (۳۷ : ۱۶) اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۳۷ : ۱۷) "اور وہ کہتے ہیں یہ تو صریح جادو ہے۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اس وقت ہم پھر زندہ کر کے اٹھا کھڑے کیے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباد اجداد بھی اٹھائے جائیں گے"۔

اپنے ماحول میں اللہ کی قدرت کے آثار کے دیکھنے سے یہ لوگ غافل ہیں' خود اپنی ذات کے اندر اللہ کی قدرت کے آثار یہ دیکھ نہیں پاتے۔ زمین اور آسمانوں کی تخلیق کے اندر جو آثار پائے جاتے ہیں' ان سے بھی یہ غافل ہیں۔ ستاروں' سیاروں اور شہاب ثاقب پر بھی غور نہیں کرتے۔ ملائکہ' شیاطین کی تخلیق پر غور نہیں کرتے۔ خود اپنی تخلیق پر غور نہیں کرتے کہ کسی طرح ایک لیس دار گارے سے ان کو بنایا گیا۔ یہ سب آثار قدرت ان کی نظروں سے اوجھل ہیں اور تعجب کرتے ہیں اس بات پر کہ جب وہ مر مٹ جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو انہیں دوبارہ کس طرح اٹھایا جائے گا اور پھر اگلے دور کے آباء کو کس طرح اٹھایا جائے گا۔ جن کی ہڈیاں بھی نہیں۔ حالانکہ اس طرح دوبارہ اٹھائے جانے میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ بعید از امکان ہے۔ صرف معمولی غور و فکر کی ضرورت ہے اور انفس و آفاق کے مذکورہ مشاہدات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

---۰۰۰---

اگر یہ لوگ اس جہاں میں ان مشاہدات پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر نہیں کرتے اور صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے سامنے یہ ہولناک منظر پیش فرماتا ہے کہ اب یہ لوگ گویا موت کے بعد اٹھا دیئے گئے ہیں۔ قیامت کے اس منظر کی تصویر کشی اس قدر خوفناک انداز میں کی گئی ہے کہ اس میں وہ ماننے آپ کی طرح مضطرب نظر آتے ہیں۔

قُلْ نَعَمْ وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

"ان سے کہو ہاں' اور تم (خدا کے مقابلے میں) بے بس ہو"۔ ہاں تم اور تمہارے آباء و اجداد از منہ قدیم والے بھی اٹھائے جائیں گے ۔ اور نہایت ہی بے بسی کی حالت میں' ذلیل اور گرفتار کر کے' یوں کہ سرتابی کی مجال نہ ہوگی ۔ اور یہ کس طرح ہو گا۔ ذرا دیکھو اس منظر کو اب قیامت کا ایک طویل منظر پیش کیا جاتا ہے ۔ اس منظر کے پیش کرنے کا اسلوب منفرد ہے ۔ زندہ اور متحرک ہے ۔ مکالمے اور حرکات سے بھرپور ہے ۔ کبھی بیانیہ انداز کلام ہے اور کبھی مکالمے کی شکل میں ہے اور کبھی واقعات پر بیچ میں تبصرہ آجاتا ہے ۔ چنانچہ کلام کے اعلیٰ ترین خصوصیات پر یہ منظر مشتمل ہے ۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾

"بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جارہی ہے) دیکھ رہے ہوں گے"۔ یعنی پلک جھپکتے ہی وہ یہ منظر دیکھ رہے ہوں گے ۔ بس ایک تنبیہہ آمیز چیخ ہوگی ۔ (زجرۃ) کا لفظ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ اس میں سختی کلام ہوگی ۔ ایک برتر اتھارٹی کی طرف سے حاکمانہ چیخ ۔ اس چیخ کے ساتھ ہی وہ اپنی نظروں کے سامنے سب کچھ دیکھ رہے ہوں گے ۔ یہ منظر ان کے سامنے اچانک بغیر کسی تمہید کے ہو گا ۔ یہ لوگ حواس باختہ ہو کر چیخنے چلانے لگیں گے ۔

وَ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾

"اس وقت یہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی' یہ تو یوم الجزاء ہے"۔ یہ لوگ اسی حالت میں ہوں گے' ان کے حواس ابھی تک درست نہ ہوں گے کہ اچانک ان کے کانوں سے ایک دوسری سخت آواز ٹکرائے گی' بالکل خلاف توقع!

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع ۵ ۲۱

"یہ وہی فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔ اب یہاں انداز کلام "بیانی" اور "خبری" سے بدل کر خطاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور خطاب ان لوگوں سے ہے جو مرنے کے بعد اٹھائے جانے کی تکذیب کرتے تھے ۔ ایک سخت حکم ہے جو ان کے کانوں سے بڑی سختی سے ٹکراتا ہے ۔ فیصلہ کن انداز میں ۔ اور اس کے بعد روئے سخن اللہ کے کارندوں کی طرف ۔

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ الربع

مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾

(حکم ہو گا) "گھیر لاؤ سب ظالموں اور ان کے ساتھیوں اور ان معبودوں کو جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر بندگی کیا کرتے تھے 'پھر ان سب کو جہنم کا راستہ دکھاؤ اور ذرا انہیں ٹھیراؤ' ان سے کچھ پوچھنا ہے"۔

گھیر لاؤ اور اٹھا لاؤ گرفتار کر کے ان لوگوں جنہوں نے ظلم کیا اور جو ظالموں کی صف میں تھے ۔یہ ایک جیسے ہیں۔ اس لیے ان کو جوڑے بنا دیا اور ان کو جہنم کا راستہ دکھاؤ۔ انداز کلام کس قدر سخت فیصلہ کن اور توہین آمیز ہے۔

فَاهْدُوهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ (۳۷ : ۲۳) "ان کو جہنم کا راستہ دکھاؤ"۔جنت کا راستہ تو ان کو دکھایا جا رہا تھا لیکن انہوں نے اسے رد کر دیا۔اب جہنم کا راستہ ہی ان کے لیے رہ جاتا ہے جو ان کے لائق ہے۔

چشم زدن میں ان کو جہنم رسید کر دیا گیا۔ جہنم تک پہنچا دیا گیا لیکن ایک ضمنی حکم میں کہا گیا کہ ذرا ٹھہراؤ ان کو' ان سے کچھ پوچھ ہی لیا جائے اور اچانک ان کو ملامت سے بھرپور انداز میں خطاب کیا جاتا ہے۔سوالیہ انداز میں مکالمہ ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾

"کیا ہو گیا تمہیں 'اب کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے"۔اب کیا وجہ ہے کہ تم یہاں کوئی اجتماعی بچاؤ کی تدابیر نہیں کرتے۔ یہاں تو تم سب کھڑے ہو اور اب تمہیں ایک دوسرے کی امداد کی بہت ضرورت بھی ہے۔ اور وہ دیکھو تمہارے وہ معبود بھی کھڑے ہیں جن کی دنیا میں تم بندگی کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ان کے پاس نہ کوئی جواب ہے اور نہ وہ بات کر سکتے ہیں۔یہ سوال تو کیا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس پر ایک تبصرہ ہو۔

بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾

"ارے' آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کیے دے رہے ہیں"۔یعنی ہر ایک اپنے آپ کو بے بسی میں دوسرے کے حوالے کر رہا ہے 'بندگی کرنے والے ہوں کہ معبود ہوں۔

اب یہاں خطابی انداز کلام کو بدل کر پھر مطالبتی اور بیانیہ انداز سامنے آتا ہے۔اس منظر میں یہ ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾

"اس کے بعد یہ ایک دوسرے کی طرف مڑیں گے اور باہم تکرار شروع کر دیں گے۔ (پیروی کرنے والے اپنے

پیشواؤں سے) کہیں گے ”تم ہمارے پاس سیدھے رخ سے آتے تھے“۔

یعنی تم سیدھے رخ سے آکر ہمارے دلوں میں وسوسے ڈالتے تھے ' بالعموم جب کسی کے کان میں کوئی بات ڈالتا ہے تو وہ دائیں جانب سے آتا ہے۔ لہٰذا تم ہماری اس حالت کے ذمہ دار ہو۔

اور ان کا جواب یہ آتا ہے کہ تمہارا یہ الزام احمقانہ ہے۔ تم خود اپنے کیے کے ذمہ دار ہو ' جو فیصلہ کیا تم نے کیا۔

قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾

”وہ جواب دیں گے ”نہیں ' بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہ تھے“۔ یہ ہمارا وسوسہ ہی نہ تھا جس نے تمہیں گمراہ کیا بلکہ تم تو ایمان ہی نہ لائے تھے اور تم نے تو ہدایت کو قبول ہی نہ کیا تھا۔

وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ

”ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا“۔ کہ ہم نے تمہیں اس رائے کے اختیار کرنے پر مجبور کیا جو ہماری تھی۔ ایسا نہ تھا کہ تم ایک رائے کو اختیار کرنا تو نہ چاہتے تھے اور ہم نے تم سے زبردستی کر کے اس رائے کے اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾

”تم خود ہی سرکش لوگ تھے“۔ تم خود ہی حد سے گزرنے والے تھے۔ کسی حد پر رکنے والے نہ تھے۔

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآىِٕقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾

”آخر کار ہم اپنے رب کے اس فرمان کے مستحق ہوگئے کہ ہم عذاب کا مزا چکھنے والے ہیں۔ سو ہم نے تم کو بہکایا ' ہم خود بہکے ہوئے تھے“۔

لہٰذا ہم لوگ اور تم لوگ دونوں عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔ وہ ڈراوا اب ہم پر حق بن کر آگیا ہے۔ اب ہمارے لیے عذاب کا مزہ چکھنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ تم لوگ ہمارے ساتھ اس لیے آگئے تھے کہ تم ہمارے راستے پر چلنے کے لیے تیار ہوگئے تھے۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ تم ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔

فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ (۳۷ : ۳۲) ”سو ہم نے تم کو بہکایا ' ہم خود بہکے ہوئے تھے“۔ اب یہاں اس صورت حال پر ایک دوسرا تبصرہ آتا ہے۔ یہ گویا عدالت ' کھلی عدالت کا ایک فیصلہ ہے۔ جس کے اندر دلائل بھی موجود ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں یہ لوگ ایسے کام کرتے رہے۔ اس لیے آخرت میں ان کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا گیا :

فَاِنَّهُمْ يَوْمَىِٕذٍ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۳۵﴾

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ﴿٣٦﴾

"اس طرح وہ سب اس روز عذاب میں مشترک ہوں گے ۔ ہم مجرموں کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں ۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان سے کہا جاتا "اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے"۔ تو یہ گھمنڈ میں آ جاتے تھے اور کہتے تھے "کیا ہم ایک شاعر مجنون کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟""

اور یہ تبصرہ اور یہ فیصلہ ان لوگوں کی سرزنش پر ختم ہوتا ہے جنہوں نے دنیا میں یہ رائے اختیار کی تھی جبکہ یہ رائے نہایت ہی گھٹیا رائے تھی ۔

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٧﴾ إِنَّكُمْ لَذَائِقُوا الْعَذَابِ الْأَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٩﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾

"حالانکہ وہ حق لے کر آیا تھا اور اس نے رسولوں کی تصدیق کی تھی ۔ (اب ان سے کہا جائے گا کہ) تم لازماً دردناک سزا کا مزا چکھنے والے ہو ۔ اور تمہیں جو بدلہ بھی دیا جا رہا ہے انہی اعمال کا دیا جا رہا ہے جو تم کرتے رہے ہو ..... مگر اللہ کے چیدہ بندے (اس انجام بد سے) محفوظ ہوں گے ۔

مجرموں کے خلاف فیصلہ سناتے ہوئے اور اللہ کے مخلص بندوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا تھا کہ وہ عذاب الیم سے بچ گئے تھے ۔ اس مناسبت سے قیامت میں ان کے انجام کی ایک جھلک بھی دکھا دی جاتی ہے ۔ ان مجرموں کے عذاب الیم کے بالمقابل وہ انعامات بھی رکھ دیئے جاتے ہیں ۔ جن میں وہ مزے لے رہے ہوں گے ۔ انداز یوں ہے کہ ایک منظر کے بالمقابل دوسرا منظر۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۖ وَهُم مُّكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿٤٥﴾ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ ﴿٤٦﴾ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ ﴿٤٧﴾ وَعِندَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِينٌ ﴿٤٨﴾ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ ﴿٤٩﴾

"ان کے لیے جانا بوجھا رزق ہے ' ہر طرح کی لذیذ چیزیں اور نعمت بھری جنتیں جن میں وہ عزت کے ساتھ رکھے جائیں گے ۔ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھیں گے ۔ شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے ۔

چمکتی ہوئی شراب' جو پینے والوں کے لیے لذت ہوگی۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی' خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی' ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلی"۔

جنت کی نعمتیں کیسی ہوں گی؟ اس میں نعمتوں کا ہر رنگ ہوگا جس میں نفس انسانی کی غذا بھی ہوگی اور انسانی احساسات اور انسانی جسم سب کے لیے متاع ہوگا۔ مزید یہ کہ وہاں جو نفس جو کچھ چاہے گا وہ اسے ملے گا۔ قسما قسم انعامات' اس لیے کہ یہ لوگ سب سے پہلے تو اللہ کے مکرم بندے ہیں' اللہ کی بندگی انسان کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ پھر عالم بالا میں وہ معزز ترین مہمان ہوں گے۔ یہ ان کے آرام کی جگہ ہوگی اور وہاں ان کو کوئی مشقت اور ڈیوٹی نہ کرنا ہوگی۔ پھر مزید یہ کہ آرام کے ساتھ اللہ کی رضامندی بھی انہیں حاصل ہوگی۔ جو سب سے بڑی نعمت ہوگی۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ (۳۷:۴۵) بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ (۳۷:۴۶)

لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ (۳۷:۴۷) "شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر ان کے درمیان پھرائے جائیں گے چمکتی ہوئی شراب جو پینے والوں کے لیے لذت ہوگی۔ نہ ان کے جسم کو اس سے کوئی ضرر ہوگا اور نہ ان کی عقل اس سے خراب ہوگی"۔ یہ جنت کی شراب کی نہایت ہی خوبصورت تعریف ہے کہ اس سے شراب کی لذت تو ہوگی لیکن شراب کے مضرات اس میں نہ ہوں گے۔ اس میں نشہ نہ ہوگا جس سے سر چکرا جائیں گے۔ اور نہ اس میں کمی ہوگی کہ کبھی ملے اور کبھی نہ ملے اور مزہ جاتا رہے۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ (۳۷:۴۸) "اور ان کے پاس نگاہیں بچانے والی خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی"۔ نہایت حیادار' نظریں اپنے خاوندوں کے سوا کسی پر نہ ڈالیں گی بوجہ حیا و عفت۔ اور ان کی آنکھیں بہت ہی خوبصورت ہوں گی۔ وہ نہایت محفوظ' نرم و نازک اور پتلی ہوں گی۔

كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ (۳۷:۴۹) "جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلی"۔ یہ جھلی ایسی ہوتی ہے کہ نہ اس کو کسی کا ہاتھ لگ سکتا ہے اور نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے اور ہوتی بھی نرم و نازک ہے۔

یہ تصویر کشی ابھی جاری ہے۔ اللہ کے یہ مخلص اور نیک بندے جو جنت کے متاع اور عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں' نہایت ہی خوشگوار موڈ میں باہم گفتگو بھی کرتے ہیں۔ اس گفتگو میں اپنے ماضی اور حال پر بحث کرتے ہیں جبکہ اس سے قبل ہم پڑھ آئے ہیں کہ مجرمین بھی باہم لعن طعن کرتے تھے۔ چنانچہ جنتیوں میں ایک شخص دوسروں کے سامنے اپنے حالات رکھتا ہے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا

تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿۵۳﴾

"پھر وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر حالات پوچھیں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا "دنیا میں میرا ایک ہم نشین تھا جو مجھ سے کہا کرتا تھا کیا تم بھی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو؟ کیا واقعی جب ہم مرچکے ہوں گے اور مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہمیں جزا و سزا دی جائے گی؟"

اس جنتی کا یہ دوست وقوع قیامت اور حساب و کتاب کا منکر تھا اور وہ اس جنتی کو ملامت کرتا تھا کیا تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ لوگ قیامت میں دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور ان کا حساب و کتاب ہو گا۔ اس کے بعد کہ وہ مٹی ہو جائیں اور محض ہڈیاں رہ جائیں گی۔

یہ جنتی اپنے ساتھیوں کے ساتھ محو گفتگو ہے کہ اچانک اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ ذرا تلاش تو کرے کہ اس کے دوست کا انجام کیا ہوا ہے۔ اسے یقین ہے کہ جنت میں تو وہ ہو نہیں سکتا لازماً جنہم میں ہو گا۔ وہ خود بھی تلاش کرتا ہے اور دوستوں سے بھی کہتا ہے کہ اسے تلاش کیا جائے۔

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾

"اب کیا آپ لوگ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ صاحب اب کہاں ہیں؟" یہ کہہ کر جونہی وہ جھکا تو جنہم کی گہرائی میں اس کو دیکھ لیا"۔

اب یہ جنتی اپنے دوزخی دوست سے ہم کلام ہوتا ہے جسے اس نے جنہم میں دیکھ لیا۔ یہ اس سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔ اے فلاں، قریب تھا کہ اپنی وسوسہ اندازیوں کی وجہ سے تو مجھے ہلاک کر دیتا۔ یہ تو مجھ پر اللہ کا انعام تھا کہ اس نے مجھے بچا لیا اور میں نے تیری باتوں پر توجہ نہ دی۔

قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾

"اور اس سے خطاب کر کے کہے گا "خدا کی قسم، تو تو مجھے تباہ ہی کر دینے والا تھا۔ میرے رب کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو آج میں بھی ان لوگوں میں سے ہوتا جو پکڑے ہوئے آئے ہوں"۔

یعنی میں بھی ان لوگوں میں سے ہوتا جنہیں پکڑ کر کچہری میں لایا جاتا ہے اور وہ دراصل پیشی نہیں چاہتے۔

اس دوست کو دیکھو وہ اپنی خوشحالی اور نیک انجامی کو بیان کر کے اپنی خوشی میں اضافہ کرتا ہے۔ جب کہ اس کا دوست جنہم کے بیچ میں پڑا ہے اور یہ اور اس کے دوست انعامات الٰہیہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ تحدیث نعمت ہے، دوام نعمت پر خوشی کا اظہار ہے اور یوں لذت میں نفسیاتی اضافہ۔

اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾

"اچھا تو کیا اب ہم مرنے والے نہیں ہیں؟ موت جو ہمیں آنی تھی وہ بس پہلے آ چکی؟ اب ہمیں کوئی عذاب نہیں

ہوتا؟؟" اب یہاں قرآن ایک تبصرہ لاتا ہے جس کے ذریعے قارئین کو اچھے کاموں میں باہم مسابقت اور اچھے انجام کے لیے جہد مسلسل پر ابھارا جاتا ہے۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هَٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ ﴿٦١﴾

"یقیناً یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے"۔

اس قسم کے اچھے انجام کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے جو دائمی ہے۔جس کے ختم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔جس کے بعد کوئی موت نہیں ہے۔جس کے بعد کسی عذاب اور سزا کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔یہ انجام ہے جس کی فکر ہونی چاہئے۔اس کے علاوہ جو کچھ بھی اس زمین پر ہے اور جس کے لیے اہل زمین عمریں کھپا دیتے ہیں وہ ہیچ ہے۔اس اخروی انجام کے مقابلے میں جو دائمی ہے۔

یہاں فریق مخالف کے انجام کا منظر بھی دے دیا جاتا ہے جو قیامت اور حشر و نشر کا منکر تھا تاکہ اہل جنت کے اچھے' دائمی' پرامن اور ہمہ گیر عیش اور اچھے انجام کی اہمیت اور اجاگر ہو جائے اہل جہنم کا انجام یہ ہو گا۔

أَذَٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ﴿٦٢﴾ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِّلظَّالِمِينَ ﴿٦٣﴾ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ﴿٦٥﴾ فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ﴿٦٦﴾ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ ﴿٦٨﴾

"بولو' یہ ضیافت اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟ ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے فتنہ بنا دیا ہے۔وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے' پھر اس پر پینے کے لیے ان کو کھولتا ہوا غیر خالص پانی ملے گا اور اس کے بعد ان کی واپسی اسی آتش دوزخ کی طرف ہوگی"۔

یہ قائم اور دائم نعمتیں بہتر ہیں اور جنت بہترین جائے قیام ہے۔یا زقوم کا درخت بطور خوراک اور جہنم جائے قیام بہتر ہے اور زقوم ہے کیا؟

إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ (٣٧: ٦٤) طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ (٣٧: ٦٥) "وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہ سے نکلتا ہے۔اس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر"۔اور لوگ شیطانوں کے سروں کو نہیں جانتے۔لہٰذا ان کی سمجھ میں کیا آئے ؟ یہ دراصل ایک خوفناک صورت حال ہے۔اس کا محض تصور ہی خوفناک ہے۔چہ جائیکہ وہ اسے کھائیں گے اور اس سے اپنے پیٹ بھریں

گے ۔

اللہ نے اس درخت کو ظالموں کے لیے ایک آزمائش بنا دیا ہے جب وہ زقوم کا نام سنتے تھے تو اس کے بارے میں مذاق کرتے تھے کہ کس طرح یہ درخت جہنم میں اگ سکے گا۔ کیا جلے گا نہیں؟ بعض لوگوں نے کہا' مثلاً ابوجہل ابن ہشام نے نہایت ہی مزاحیہ انداز میں "اے اہل قریش تمہیں معلوم ہے کہ زقوم کا درخت کیا ہے؟ محمد تمہیں اس سے ڈراتا ہے تو انہوں نے کہا: ہمیں تو معلوم نہیں۔ اس نے کہا یہ یثرب کے عمدہ کھجور اور مکھن ہو گا اور اگر یہ ہمیں دستیاب ہوا تو ہم اسے ضرور نگل جائیں گے"۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ یہ زقوم کا درخت ایک دوسری چیز ہے جسے انسانوں نے نہیں چکھا۔ اور نہ جانتے ہیں۔

فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ (۳۷: ۶۶) "جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے"۔ اور اس کے کھانے میں اور نگلنے میں ان کو تکلیف ہوگی کیونکہ یہ تو شیاطین کے سروں جیسا ہو گا۔ اور اس سے ان کے پیٹ جل اٹھیں گے۔ اس لئے کہ یہ تو پیدا ہی جہنم میں ہو گا۔ اور یہ خود نہیں جلے گا یہ ہو گا ہی آگ کی نوعیت کا۔ اب یہ پانی کی طرف متوجہ ہوں گے تاکہ پیاس بجھا سکیں۔ چنانچہ پینے کے لیے ان کو غیر خالص پانی ملے گا۔

ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ (۳۷: ۶۷) "پھر پینے کے لیے ان کو کھولتا ہوا غیر خالص پانی ملے گا"۔ اور اس کے بعد یہ لوگ اس دسترخوان سے اٹھیں گے اور اپنے اصل مقر جہنم کی طرف جائیں گے۔ کیا ہی برا مقام اور جائے قرار ہے۔ اللہ کی پناہ۔

ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ (۳۷: ۶۸) "اس کے بعد ان کی واپسی اسی آتش دوزخ کی طرف ہوگی"۔ یوں اس منفرد منظر کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اور اس سورت کا پہلا سبق ختم ہوتا ہے۔ گویا یہ منظر ایک دیکھا ہوا منظر ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۰۹ تشریح آیات

۶۹ --- تا --- ۱۴۸

اس سبق میں سیاق کلام عالم آخرت ' اللہ کی نعمتوں اور قیامت میں اللہ کی سزاؤں سے نکل کر اب انسانی تاریخ اور امم ماضیہ کے حالات میں داخل ہوتا ہے ۔ انسانیت کے آغاز سے قصہ ہدایت و ضلالت کو لیا جاتا ہے ۔ یہ قصہ تمام اقوام کے ہاں ایک ہی ہے اور نظر آتا ہے کہ مکہ کے منکرین جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تکذیب کرتے ہیں ۔ وہ سابقہ مکذبین کے بقایا اور نمونہ ہیں ۔ ان کو بتایا جاتا ہے کہ تم سے پہلے بھی یہی ہوتا رہا ہے ۔ یوں ان کے دلوں کے سامنے انسانی تاریخ کے قدیم ترین صفحات رکھے جاتے ہیں ۔ ان قصص میں اہل ایمان کے لیے بھی اطمینان کا سامان ہے کہ پوری انسانی تاریخ شاہد ہے کہ اللہ نے ہمیشہ اہل ایمان کا خیال رکھا ہے ۔

چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے قصے ' کا ایک رخ حضرت ابراہیم ' اسماعیل ' اسحاق ' موسیٰ ' ہارون ' الیاس ' لوط اور یونس علیہما السلام کے قصص کے بعض حصے قارئین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں ۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے حالات ذرا طوالت کے ساتھ لیے گئے ہیں ' جن میں عظمت ایمان ' قربانی ' اطاعت اور ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کے ذہنوں میں اسلام کا جو تصور تھا ' وہ یہاں بیان کیا جاتا ہے اور اس میں ان کے قصے کا ایک ایسا حلقہ دیا جاتا ہے جو اس سورت کے سوا کسی دوسری سورت میں نہیں دیا گیا ۔ اس سبق کا بنیادی مواد انہی قصص پر مشتمل ہے ۔

إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّينَ ﴿٦٩﴾ فَهُمْ عَلَىٰ آثَارِهِمْ يُهْرَعُونَ ﴿٧٠﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ أَكْثَرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٧١﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِم مُّنذِرِينَ ﴿٧٢﴾ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنذَرِينَ ﴿٧٣﴾ إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٧٤﴾

۲
ع ۵۳
۶

" یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا اور انہی کے نقش قدم پر دوڑ چلے حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے تھے ۔ اور ان میں ہم نے تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے ۔ اب دیکھ لو کہ ان تنبیہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا ۔ اس بدانجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے " ۔

یہ لوگ ضلالت اور گمراہی میں غرق ہو چکے ہیں ۔ یوں کہ وہ ہر بات میں آباؤ اجداد کی تقلید کرتے ہیں ۔ کسی پیش آمدہ

معاملے پر غور و فکر نہیں کرتے۔ بلکہ یہ جلد بازوں کی طرح اڑتے اور دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ آباؤ اجداد کے قدموں پر قدم رکھتے چلے جا رہے ہیں، بغیر سوچے اور بغیر عقل سے کام لیتے ہوئے اور وہ چونکہ گمراہ تھے لہٰذا یہ بھی گمراہ ہیں۔

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ (۳۷ : ۶۹) فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ (۳۷ : ۷۰)

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے باپ دادا کو گمراہ پایا اور انہی کے نقش قدم پر دوڑتے چلے گئے"۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اور ان کے آباءاجداد اسی گمراہی پر تھے جس میں اکثر مکذبین مبتلا تھے۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ (۳۷ : ۷۱) "حالانکہ ان سے پہلے بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے ہیں"۔ اور یہ گمراہی اس کے باوجود تھی کہ ہم نے ان کی خاطر ڈرانے والے بھیجے تھے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (۳۷ : ۷۲) "اور ان میں ہم تنبیہ کرنے والے رسول بھیجے تھے"۔

لیکن ان لوگوں کا کیا انجام ہوا اور اللہ کے مخلص بندوں کا انجام کیا ہوا؟ یہ سب آپ کو انبیاء کے قصص سے معلوم ہو جائے گا۔ یہ بات یہاں محض متوجہ کرنے کے لیے کہی جا رہی ہے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ (۳۷ : ۷۳) اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ

(۳۷ : ۷۴) "اب دیکھ لو، ان تنبیہ کیے جانے والوں کا انجام کیا ہوا، اس بدانجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا"۔

اب قصہ نوح کا آغاز کیا جاتا ہے اور اس میں اللہ کے نیک بندوں کا انجام نہایت ہی تیزی سے بتا دیا جاتا ہے اور یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ اللہ اپنے مخلص بندوں کے انجام کا لحاظ رکھتا ہے۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾

"ہم کو (اس سے پہلے) نوح نے پکارا تھا، تو دیکھو کہ ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے۔ ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو کرب عظیم سے بچا لیا۔ اور اسی کی نسل کو باقی رکھا، اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی۔ سلام ہے نوح پر تمام دنیا والوں میں۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ ہمارے مومن

بندوں میں سے تھا۔ پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا"۔

اس میں حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے رب تعالیٰ سے کی تھی۔ اور اللہ نے ان کی دعا کو پوری طرح قبول فرمایا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بہترین جواب دینے والا ہے۔

فَلَنِعْمَ الْمُجِيبُونَ (۳۷: ۷۵) "ہم کیسے اچھے جواب دینے والے تھے"۔ اور اللہ نے ان کو اور ان کے اہل و عیال کو کرب عظیم سے نجات دی تھی۔ یعنی وہ کرب عظیم دراصل وہ طوفان تھا جس سے صرف وہی لوگ بچے جن کے بچانے کا اللہ نے ارادہ کر لیا تھا۔ اور جن کی زندگی ابھی باقی تھی اور اللہ کی تقدیر میں جن لوگوں کے بارے میں لکھا تھا کہ اللہ نوح کی اولاد سے ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جنہوں نے اس زمین پر بطور خلیفۃ اللہ کام کرنا تھا اور اس زمین کو آباد رکھنا تھا تاکہ حضرت نوح کا ذکر آنے والی نسلوں میں باقی رہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۳۷: ۷۸) "اور بعد کی نسلوں میں ان کی تعریف و توصیف چھوڑی"۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ دونوں جہانوں میں نوح پر سلامتی ہوگی اس لیے کہ انہوں نے نیک راہ اختیار کی۔

سَلٰمٌ عَلٰى نُوحٍ فِي الْعٰلَمِينَ (۳۷: ۷۹) اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ

(۳۷: ۸۰) "سلام ہے نوح پر تمام دنیا والوں میں۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزاء دیا کرتے ہیں"۔ اللہ کے سلام کے بعد اور کیا جزاء درکار ہے کسی بندے کو۔ اور تمام جہاں میں قیامت تک کسی کے نام کو باقی رکھنے کے بعد اور کیا انعام ہے کسی بندے کے لیے۔ احسان اور اس کے بعد انعام کا حقیقی سبب بہرحال ایمان ہے۔ اس لیے کہا گیا۔

اِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ (۳۷: ۸۱) "درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا"۔ اور یہی جزاء ہے اہل ایمان کی۔ رہے وہ لوگ جو قوم نوح سے غیر مومن تھے تو ان پر اللہ نے ہلاکت اور فنا لکھ دی تھی۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِينَ (۳۷: ۸۲) "پھر دوسرے گروہ کو ہم نے غرق کر دیا"۔ لہٰذا انسانیت کے آغاز ہی سے سنت الٰہیہ یہی رہی ہے جس طرح ان قصص کے آغاز میں کہا گیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيهِمْ مُّنْذِرِينَ (۳۷: ۷۲) فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِينَ

(۳۷: ۷۳) اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِينَ (۳۷: ۷۴) "اور ان میں ہم نے تنبیہہ کرنے والے رسول بھیجے تھے۔ اب دیکھ لو کہ ان تنبیہہ کیے جانے والوں کا کیا انجام ہوا۔ اس بدانجامی سے بس اللہ کے وہی بندے بچے ہیں جنہیں اس نے اپنے لیے خالص کر لیا ہے"۔

--- ○○○ ---

اس کے بعد حضرت ابراہیم کا قصہ آتا ہے۔ اس قصے کی دو کڑیاں یہاں لائی گئی ہیں۔ پہلی کڑی میں آپ اپنی قوم کو

دعوت دیتے ہیں۔ بتوں کو توڑتے ہیں' لوگ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں اور اللہ کے حکم سے ان کے لیے آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور قصے کا یہ حصہ کئی دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے۔ اور دوسری کڑی وہ ہے جو صرف اسی سورت میں آئی ہے' یعنی خواب' ذبح اور فدیہ۔ یہ کڑی نہایت ہی تفصیل کے ساتھ آئی ہے' جس کے واقعات اور مراحل کو نہایت ہی تفصیلات کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اسلوب کلام نہایت موثر' دلکش اور پرشوکت ہے۔ اس کڑی کے اندر تسلیم و رضا' سمع و طاعت کا اعلیٰ معیار اور اعلیٰ مثال پائی جاتی ہے۔ انسانی نظریات کی تاریخ میں اس قسم کی کوئی مثال نہیں ہے۔

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ﴿٨٣﴾ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿٨٤﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ ﴿٨٥﴾ أَئِفْكًا آلِهَةً دُونَ اللَّهِ تُرِيدُونَ ﴿٨٦﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٨٧﴾

"اور نوح ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیم تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا۔ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا" یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو؟ آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟""

یہ اس قصے کا آغاز ہے اور قصے کے اندر پہلا منظر ہے۔ نوح سے اب ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام تک آگئے۔ ان دونوں انبیاء کی دعوت' نظریہ اور منہاج دعوت ایک ہے۔ اگرچہ دونوں کے درمیان زمان و مکان کے فاصلے ہیں لیکن دونوں ایک ہی گروہ کے لوگ ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کا دیا ہوا نظام زندگی ایک ہے۔ اور اس زاویہ سے یہ دونوں باہم مربوط ہیں اور ان کا تعلق ایک ہی سلسلہ سے ہے جس میں وہ باہم شریک ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کی صفات میں قلب کی سلامتی' عقیدے کی راستی اور خلوص ممتاز صفات ہیں۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۳۷: ۸۴) "جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا"۔

قلب سلیم کیا چیز ہے؟ پوری طرح اسلام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا۔ اللہ کے ساتھ پوری محبت رکھنا۔ صاف ستھری' سیدھی روش سلامت قلبی ہے۔ قلب سلیم کی تعبیر نہایت معنی خیز اور اپنے مفہوم کی واضح تصویر لیے ہوئے ہے۔ تعبیر سادہ اور قریب الفہم بھی ہے اور واضح بھی۔ قلب سلیم کے اندر صفائی' اخلاص' سیدھا پن اور پاکیزگی کے مفاہیم شامل ہیں۔ یہ لفظ بہت ہی سادہ ہے۔ پیچیدہ نہیں۔ اور مذکورہ تمام معانی پر حاوی ہے جبکہ مذکورہ الفاظ کے اندر اس قدر جامعیت نہیں ہے۔ یہ قرآن مجید کا انوکھا انداز تعبیر ہے۔

یہ قلب سلیم ہی تھا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی قوم کے عقائد کو ناپسند کیا۔ انسان جب صحت مند سوچ رکھتا ہے اور سلیم الفطرت ہوتا ہے تو وہ ازروئے طہارت قلب ناپسندیدہ چیز کو ناپسند کرتا ہے۔ تصور میں بھی اور عمل میں بھی۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا ذَا تَعْبُدُوْنَ (۸۴:۳۷) اَئِفْکًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِیْدُوْنَ (۸۶:۳۷) فَمَا ظَنُّکُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۸۷:۳۷) ”جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا۔ یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو۔ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو۔ آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے“۔ حضرت دیکھ رہے تھے کہ وہ بتوں اور آستھانوں کو پوجتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی فطرت سلیمہ کی رو سے ان پر شدید گرفت کرتے ہیں کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟

مَا ذَا تَعْبُدُوْنَ (۸۴:۳۷) ”یہ کیا ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو“۔ یعنی یہ کیا چیزیں ہیں؟ یہ تو اس قابل ہرگز نہیں کہ ان کی بندگی کی جائے یا کوئی ان کا بندہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان ان کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ یہ تو محض گھڑے ہوئے ہیں ' افتراء ہیں اور ان کے من گھڑت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ کیونکہ ان جھوٹے خداؤں کی بندگی کر کے تم عمداً افتراء باندھتے ہو۔

اَئِفْکًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِیْدُوْنَ (۸۶:۳۷) ”جھوٹ گھڑے ہوئے معبود تم چاہتے ہو“۔ یہ تمہارا اللہ کے بارے میں کیا تصور ہے۔ تمہارا تصور الہ اس قدر گرا ہوا ہے کہ انسانی فطرت سلیمہ پہلی نظر ہی میں اس کا انکار کر دیتی ہے۔

فَمَا ظَنُّکُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۸۷:۳۷) ”آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟“ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت سلیمہ ایسے امر کا پہلی ہی نظر میں انکار کر دیتی ہے جو عقل و ضمیر کے خلاف ہو اور انسانی عقل اور شعور اس کا انکار کرتے ہوں۔

اب سیاق کلام میں ان کی جانب سے کسی جواب کا تذکرہ نہیں ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ازروئے فطرت سلیمہ اور قلب سلیم جس نتیجے تک پہنچے اگلی کڑی میں وہ بتا دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی قوم کھلے من گھڑت عقائد پر تھی۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِی النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِیْنَ ﴿۹۰﴾ فَرَاغَ اِلٰۤی اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْکُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَکُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَیْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْیَمِیْنِ ﴿۹۳﴾

”پھر اس نے تاروں پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا میری طبیعت خراب ہے۔ چنانچہ وہ لوگ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے پیچھے وہ چپکے سے ان کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا ”آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں؟ کیا ہو گیا' آپ لوگ بولتے بھی نہیں؟“ اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں“۔

روایات میں آتا ہے کہ اس وقت عید یا میلے کا دن تھا۔ شاید نوروز ہو۔ اس دن لوگ شہر سے باہر چلے جاتے تھے۔ رواج کے مطابق وہ اپنے الہوں کے سامنے برائے تبرک پھل رکھتے تھے۔ اور سیر اور تفریح کے بعد وہ یہ مبارک کھانے لیتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے جب معقول باتوں کے مقابلے میں مایوس کن رویہ پایا اور اس نتیجے تک پہنچے کہ ان کے عقائد اور نظریات کے اندر اس قدر بگاڑ پیدا ہو گیا ہے کہ اب ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تو انہوں نے دل میں ...... ایک فیصلہ کر لیا کہ ان کو ذرا تلخ سبق دیا جائے۔ آپ نے اپنے منصوبے کے لیے اس دن کا انتظار فرمایا۔ کیونکہ اس دن یہ لوگ عبادت گاہوں کو خالی چھوڑ کر باہر چلے جاتے تھے۔ اور حضرت کے لیے اپنے منصوبے پر عمل کرنا ممکن ہو سکتا تھا۔ ان لوگوں کی تنگ نظری اور کج فہمی حضرت ابراہیم کے لیے اب قابل برداشت نہ رہی تھی۔ جب دوسرے لوگوں نے ان سے کہا کہ تم عبادت گاہ کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلو تو آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ میں سیر و تفریح کے لیے نہیں جا سکتا۔ کیونکہ سیر و تفریح اور میلوں میں تو وہ لوگ جاتے ہیں جو عیش و عشرت کرنا چاہیں، جن کے دل خالی ہوں اور ان کے لیے کوئی دلچسپی یا اہم کام پیش نظر نہ ہو۔ حضرت ابراہیم تو ہر وقت پریشان تھے۔ اپنی قوم کی اس بیماری کی وجہ سے۔ اس لیے ان کے قلب سلیم کو سیر و تفریح میں خوشی کب نصیب ہوئی تھی۔

بہر حال لوگ جلدی میں تھے تاکہ جائیں اور اپنے رسم و رواج کے مطابق اپنی عید منائیں۔ اس لیے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کوئی زیادہ فکر نہ کی بلکہ ان کو چھوڑ کر چلے گئے اور اپنی خوشیاں منانے لگے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ موقعہ مل گیا جس کی تلاش میں تھے۔

حضرت ابراہیم فوراً ان کے نام نہاد الہوں کے پاس پہنچے۔ ان کے سامنے قسم قسم کے کھانے اور تازہ پھل رکھے ہوئے تھے۔ بطور مزاح حضرت نے فرمایا تم کھاتے نہیں ہو؟ ظاہر ہے کہ بتوں نے اس مزاح کا کیا جواب دینا تھا۔ اب آپ نے ذرا غصے اور کھلے مزاح کے ساتھ کہا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم بات کیوں نہیں کرتے۔ بعض اوقات انسان ایسی چیز سے بطور مزاح ہمکلام ہوتا ہے جس کے بارے میں اس کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ نہیں سنتی اور نہ جواب دے سکتی ہے۔ حقیقت کا علم ہوتے ہوئے بھی انسان ایسی باتیں کرتا ہے۔ یہ بات دراصل حضرت ان لوگوں کے پوچ اور غلط عقائد سے تنگ آ کر کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ بتوں نے جواب تو نہ دینا تھا اور نہ دیا۔ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان کے بجائے آپ کے ہاتھ حرکت میں آ گئے۔

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ (۳۷ : ۹۳) "اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں"۔ اب آپ کی بیماری دل گرفتگی اور پریشانی دور ہوئی۔ بالفاظ دیگر آپ کا دل ٹھنڈا ہوا۔

اب یہ منظر ختم ہوتا ہے اور دوسرا منظر سامنے آتا ہے۔ لوگ واپس ہوئے انہیں علم ہوا کہ ان کے بتوں کے سر پاؤں اور ہاتھ کٹے ہوئے ہیں۔ دوسری سورتوں میں تفصیلات آتی ہیں کہ انہوں نے تفتیش کی کہ کس نے یہ کام کیا ہے۔ آخر وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ ابراہیم نام کا ایک شخص ان کے بارے میں بدگوئی کرتا ہے۔ بہر حال یہاں اختصار کر کے فریقین کا آمنا سامنا دکھایا جاتا ہے۔

فَأَقْبَلُوٓا إِلَيْهِ يَزِفُّونَ ﴿٩٤﴾

(واپس آکر) "وہ لوگ بھاگے بھاگے اس کے پاس آئے"۔ انہوں نے ایک دوسرے سے یہ خبر سن لی تھی ۔ یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ کام کرنے والا کون ہے ۔ لہٰذا سب لوگ دوڑ کر ابراہیم کے پاس پہنچے ۔ سب ان کے ارد گرد جمع ہو گئے ۔ لوگوں کی بڑی تعداد بلکہ پورا میلہ اکٹھا ہو گیا۔ سب لوگ ایک طرف اور ایک مومن ایک طرف ۔ ایک ایسا فرد جو کام کرنا چاہتا ہے ۔ ایسا فرد جس کا تصور اللہ واضح ہے جس کا عقیدہ ٹھوس اور متعین ہے ۔ وہ اپنے نفس کے اندر اسے حقیقت کے طور پر پاتا ہے ۔ وہ اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی کائنات میں اسے پاتا ہے ۔ یہ ایک فرد ہے لیکن افراد کی اس بھیڑ اور جم غفیر سے وہ اپنے آپ کو قوی پاتا ہے ۔ جن کا عقیدہ درست نہیں ۔ جن کا تصور حیات ٹھوس نہیں ۔ چنانچہ وہ فطری سچائی کے ساتھ جرات مندانہ طریقے سے ان کو یوں خطاب کرتا ہے ۔ اور ان کے کسی ردعمل کا کوئی خیال نہیں کرتا ۔ حالانکہ یہ لوگ اس وقت اشتعال کی حالت میں ہیں اور بڑی تعداد میں ہیں ۔

قَالَ اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ ﴿۹۵﴾ وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَ مَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾

"اس نے کہا "کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو"۔

یہ ایک فطری استدلال تھا' حضرت ابراہیم نے ببانگ دہل ان کے سامنے رکھ دیا کہ تم اپنی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو ۔ معبود حق تو وہ ہو سکتا ہے جو سب چیزوں کا بنانے والا ہو نہ کہ اسے کسی سنگ تراش نے تراشا ہو ۔

وَ اللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَ مَا تَعۡمَلُوۡنَ (۳۷:۹۶) "اللہ تو وہ ہے جس نے تمہیں بھی بنایا اور تمہاری مصنوعات کو بھی بنایا" ۔ یہ صانع مطلق اس قابل ہے کہ اس کی پوجا کی جائے ۔

اس استدلال کی سادگی اور واضح ہونے کے باوجود' لوگوں نے اپنی غفلت اور غلط روش کی وجہ سے اس پر کان نہ دھرا ۔ باطل کی روش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ سچائی کے نہایت ہی سادہ اور منطقی استدلال پر کان نہیں دھرتا ۔ اور اللہ کی جانب سے جن لوگوں کے ذمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے ۔ وہ ہمیشہ اہل باطل کی طرف سے تشدد سہتے رہے ہیں ۔

قَالُوا ابۡنُوۡا لَہٗ بُنۡیَانًا فَاَلۡقُوۡہُ فِی الۡجَحِیۡمِ ﴿۹۷﴾

"انہوں نے کہا اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو" ۔ یہ ہے قوت اور طاقت کا استدلال ۔ اور آگ اور تشدد جس کے سوا سرکشوں کے پاس اور کوئی استدلال نہیں ہوتا ۔ جب بھی دلیل ختم ہوتی ہے اور کوئی سرکش حجت پیش نہیں کر سکتا' وہ تشدد کرتا ہے ۔ خصوصاً جبکہ سرکشوں کے سامنے کلمہ حق پیش کیا جائے اور وہ اسے لاجواب کر دے ۔

ان کی اس دھمکی کے بعد کیا ہوا' یہاں قرآن مجید اس کی کوئی صراحت نہیں کرتا ۔ اور یہ بتا دیا جاتا ہے کہ اہل حق کو

کامیابی نصیب ہوئی اور مکذبین گھاٹے میں رہے۔

فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ﴿٩٨﴾

"انہوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی' مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا"۔ جب اللہ نہ چاہے تو ضعیف بندوں کی تدابیر کیا کر سکتی ہیں اور اللہ کے معاملے میں ضعیف اور حقیر بندے کر بھی کیا سکتے ہیں۔ دنیا کے سرکش ' جبار' حکمران' ڈکٹیٹر اور ان کے اعوان و انصار اللہ کے مقابلے میں ہیچ ہوتے ہیں۔ جب اللہ کا فضل اللہ کے بندوں کے شامل حال ہو۔

--- ○○○ ---

اب قصہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری کڑی شروع ہوتی ہے۔ اپنے باپ اور اپنی قوم کے ساتھ آپ کا تنازعہ ختم ہو گیا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ ایک خود ساختہ جحیم (آگ) میں آپ کو جلا دیں۔ اور اللہ نے ارادہ کیا کہ وہ گھاٹے میں رہیں۔ اور حضرت ابراہیم ان کی سازش سے بچ گئے۔ یہاں آکر حضرت ابراہیم نے اپنی سابقہ زندگی کو خیرباد کہا اور زندگی کے نئے مرحلے کا آغاز کیا۔ سابقہ زندگی کا دفتر لپیٹ لیا گیا اور زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہو گیا۔

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٩٩﴾

"ابراہیم نے کہا "میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں' وہی میری راہنمائی کرے گا"۔ میں رب کی طرف ہجرت کر کے جا رہا ہوں۔ یعنی مسافاتی ہجرت سے قبل یہ نفسیاتی اور نظریاتی ہجرت ہے۔ ایک ایسی ہجرت جس میں وہ اپنی تمام ماضی اور آبائی مقام کو خیر آباد کہہ رہے ہیں۔ اپنے باپ اور قوم کو چھوڑ رہے ہیں۔ اپنے گھر اور وطن کو چھوڑ رہے ہیں۔ ان تمام روابط کو کاٹ رہے ہیں جو انسان کو اس زمین سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں سے وابستہ کر دیتے ہیں' تمام رکاوٹوں کو عبور کر کے آگے بڑھ رہے ہیں۔ تمام مصروفیتوں کو ختم کر رہے ہیں۔ تمام بوجھ ہلکے کر کے اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ تمام چیزوں کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ اپنی پوری ذات کو رب کے سپرد کر رہے ہیں۔ اور اپنی ذات کا کوئی حصہ اپنے لیے نہیں رکھ رہے ہیں انہیں یقین ہے کہ ان کا رب ضرور انہیں ہدایت دے گا۔ ان کی مدد کرے گا اور سیدھی راہ بجھائے گا۔

یہ ایک مکمل ہجرت ہے بلکہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف مکمل انتقال ہے۔ تمام روابط کو کاٹ کر صرف ایک رب سے جڑنا' یہ گویا نہایت ہی یکسوئی' تجرد' خلوص اور سر تسلیم خم کر دینے کا اقدام ہے۔ پورے اطمینان اور پورے یقین کے ساتھ۔

حضرت ابراہیم اس وقت تک اکیلے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ پیچھے وہ جو کچھ چھوڑ رہے تھے وہ اقرباء اور رشتہ داری کے تعلقات تھے۔ ہر قسم کی دوستی اور آشنائی کو ترک کر رہے تھے۔ ماضی کے تمام مالوفات اور عادات کو ترک کر رہے تھے۔ ان تمام روابط کو کاٹ رہے تھے جو جنم بھومی سے قائم ہو جایا کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم اور ان کے اہل کے درمیان پائے جانے والے تمام روابط کٹ گئے جنہوں نے ان کو آگ میں ڈالنے کا اقدام کیا۔ اس لیے آپ نے اس عزم

کا ارادہ کر لیا کہ اب میں اللہ کی طرف جا رہا ہوں اور چونکہ اہل و اہالی رہ گئے اس لیے رشتہ داروں کی جگہ اولاد اور جانشیں کے طلبگار ہوئے۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿١٠٠﴾

"اے پروردگار، مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو"۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مخلص بندے کی دعا قبول کر لی۔ جس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور قلب سلیم لے کر اللہ کے دربار میں آ گیا تھا۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيمٍ ﴿١٠١﴾

"(اس دعا کے جواب میں) ہم نے اس کو ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی"۔ یہ حضرت اسماعیل ہیں جس طرح اس سورت اور سیرت کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اللہ نے ان کے حلم اور صبر اور بردباری کی تعریف کی۔ جبکہ وہ ابھی لڑکے تھے۔ ہمیں چاہئے کہ اس مقام پر حضرت ابراہیم کی تنہائی، وطن سے جدائی اور اہل قرابت سے دوری کے بارے میں سوچیں اور پھر اس بچے کی خوشخبری پر خوشی کا تصور کریں جس کی تعریف رب تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ یہ بچہ غلام حلیم ہو گا۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی، ان کا وہ طرز عمل سامنے آتا ہے جو پوری انسانی تاریخ میں ایک منفرد طرز عمل ہے اور ان کی زندگی میں تو وہ بہرحال ایک یادگار طرز عمل ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو قیامت تک امت مسلمہ کے لیے ایک اعلیٰ و ارفع مثال ہے۔ یہ عمل حضرت ابراہیم نے خود پیش فرمایا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ إِنِّي أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۚ قَالَ يٰأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِينَ ﴿١٠٢﴾

"وہ لڑکا جب اس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیم نے اس سے کہا "بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟" اس نے کہا "ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے، اسے کر ڈالیے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے"۔

یا اللہ، کیا عظیم ایمان ہے اور تسلیم و رضا کا کیا اعلیٰ مقام ہے۔

یہ ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک بوڑھے، اپنے اقرباء اور رشتہ داروں سے دور، اپنے ملک اور وطن سے دور۔ ان کو بڑھاپے اور کبرسنی میں ایک بیٹا عطا ہوتا ہے۔ ایک طویل عرصہ تک انہوں نے اس بچے کا انتظار فرمایا۔ جب اللہ ان کو یہ ممتاز اور ذی صلاحیت بیٹا دیا اور ان کے مرتبہ و مقام کی شہادت دی۔ وہ ابھی ان کے ساتھ اچھی طرح مانوس بھی نہیں ہوا، ابھی بچہ ہے۔ آپ کے ساتھ چلنے پھرنے لگا ہے اور قریب ہے کہ اب وہ زندگی کا ساتھی بن جائے۔ غرض ابراہیم علیہ السلام کی اس بچے سے امیدیں وابستہ ہی ہوئی تھیں کہ وہ خواب میں دیکھتے ہیں کہ وہ اس بچے کو ذبح کر رہے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے اشارہ ہے کہ اس بچے کی قربانی دے دو۔ اب کیا ہوتا ہے؟ آپ بالکل تردد نہیں کرتے۔ آپ کو کوئی شک اور خلجان نہیں ہوتا۔ بس جذبہ اطاعت ہی سامنے آتا ہے۔ آپ تسلیم امر ربی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض اشارہ تھا۔ یہ امر صریح نہ تھا' نہ براہ راست وحی آئی تھی۔ لیکن آپ نے رب کی طرف سے اشارہ ہی کو کافی سمجھا۔ آپ کے لیے تو اشارہ ہی کافی تھا۔ آپ نے لبیک کہہ دیا۔ اور تعمیل پر آمادہ ہو گئے بغیر کسی اعتراض کے' بغیر کسی سوال کے کہ لے اللہ میں اپنے واحد بیٹے کو کیوں ذبح کر دوں۔

حضرت ابراہیم جزع و فزع کی حالت میں لبیک نہیں کہتے۔ نہ ان پر کوئی اضطرابی کیفیت طاری ہوتی ہے' بلکہ وہ تسلیم و رضا کے پیکر ہیں' مطمئن اور پر وقار ہیں اور ان کا یہ اطمینان' ٹھہراؤ اور تسلیم و رضا ان کے ان کلمات سے ظاہر ہوتی ہے جن میں وہ یہ تجویز اپنے بیٹے کے سامنے رکھتے ہیں۔ یہ تو نہایت ہی عظیم اقدام ہے لیکن ان کے الفاظ نہایت سنجیدہ اور ان کی روش پر وقار ہے۔

قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰى (۳۷:۱۰۲)

"ابراہیم نے اس سے کہا" "بیٹا' میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں' اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟" یہ الفاظ اس شخص کے ہیں جن کو اپنے اعصاب پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔ وہ درپیش اہم معاملے کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہے۔ اسے یقین ہے اور وہ اس پر تلا ہوا ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے گا۔ یہ ایک مومن کے الفاظ ہیں ایسے مومن کے جسے یہ عظیم امر خوفزدہ نہیں کر رہا ہے تاکہ وہ جلدی جلدی اسے کر گزرے۔ آنکھیں بند کر کے تاکہ وہ اس سے بچ جائے اور یہ معاملہ ختم ہو جائے اور اس کے اعصاب پر جو ناقابل برداشت بوجھ آپڑا ہے وہ اتر جائے۔ ایسا نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ فعل ناقابل برداشت ضرور ہے۔ مطالبہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کسی معرکہ کارزار میں بھیج دیں۔ نہ حکم یہ ہے کہ اسے ایک ایسے کام میں لگا دیں جس سے اس کی زندگی ختم ہو جائے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کر دیں۔ اور یہ حکم انہیں اس طرح خواب میں ملتا ہے۔ اور آپ اسے اپنے اکلوتے بیٹے کے سامنے رکھتے ہیں۔ اور اس سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے پر غور کرے اور اپنی رائے دے۔

نیز حضرت ابراہیم اپنے بیٹے کو اچانک پکڑ کر ایسی حالت میں ذبح نہیں کر دیتے کہ انہیں پتہ ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے اور معاملہ ختم کر دیا جائے۔ بلکہ معاملہ تجویز کی صورت میں ان کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ابراہیم علیہ السلام محسوس کرتے ہیں کہ ان کے رب کی مرضی ہی ایسی ہے۔ لہٰذا اس معاملے کو اس طرح سرانجام دینا چاہئے جس طرح رب کی مرضی ہے۔ رب کا حکم سر آنکھوں پر۔ لہٰذا بچے کو بھی معلوم ہونا چاہئے کہ معاملہ کیا درپیش ہے اور وہ بھی اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ کوئی جبر اور کوئی اضطرار نہ ہو تاکہ اس کو بھی اطاعت امر کا اجر ملے۔ وہ بھی تسلیم و رضا کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو اور اطاعت امر کے مٹھاس کو پالے۔ ذرا ان کے اکلوتے بھی جان سپردگی کی لذت چکھ لیں اور وہ بھی وہ بھلائی دیکھ لیں جو زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و ارفع ہے۔

اب بیٹے کا فیصلہ کیا ہے؟ کہ اس کے باپ نے خواب دیکھا ہے اور باپ خواب بیٹے کے سامنے رکھتے ہیں اور تجویز یہ ہے کہ بیٹے کو ذبح کر دیا جائے' فیصلہ کیا ہے؟ بیٹا بھی آخر حضرت ابراہیم کا بیٹا ہے۔ وہ بھی اس مقام بلند پر پہنچ چکے ہیں جس پر حضرت ابراہیم ہیں۔

قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۳۷ : ۱۰۲)

"اس نے کہا 'ابا جان' جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے۔ آپ انشاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے"۔

حضرت اسماعیل بھی اس حکم کے سامنے صرف سر تسلیم خم نہیں کر دیتے بلکہ وہ نہایت اعتماد اور رضائے الٰہی سے سرشار ہو کر تسلیم کرتے ہیں۔ یا ابت ابا جان' نہایت ہی محبت اور نہایت ہی اپنائیت کے ساتھ۔ وہ ذبح ہونے جا رہے ہیں لیکن ان پر کوئی خوف طاری نہیں ہے' کوئی جزع و فزع نہیں ہے۔ ان کے حواس بحال ہیں بلکہ ادب اور محبت میں بھی کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (۳۷ : ۱۰۲) "آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل فرمائیں"۔ حضرت اسماعیل کا احساس بھی وہی ہے۔ جو اس سے قبل آپ کے باپ کا تھا۔ بیٹا بھی یہ سمجھا ہے کہ باپ کو ذبح عظیم کا اشارہ مل گیا ہے۔ اور خدا کی طرف سے اشارہ بھی امر ربی ہے اور ایک جلیل القدر پیغمبر کے لیے یہ اشارہ ہی کافی ہے کہ وہ بغیر کسی تردد' بغیر کسی شک اور بغیر کسی بہانہ سازی کے عمل کریں۔

بارگاہ رب العزت میں نہایت ادب کے ساتھ بات ہو رہی ہے۔ بات کرنے والے کو اپنی قوت کے حدود کا اچھی طرح علم ہے اور اپنی قوت برداشت کا بھی علم ہے۔ اسے اپنی کمزوریوں کا علم ہے۔ اس لیے اللہ کی معاونت طلب کی جاتی ہے۔ اس لیے اس قربانی اور اطاعت شعاری کی نسبت بھی اللہ کی مشیت کی طرف کی جاتی ہے۔

سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۳۷ : ۱۰۲) "آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے"۔

یہ بیٹے اپنی بہادری کا اظہار بھی نہیں کرتے۔ نہ جسورانہ اور تہورانہ بات کرتے ہیں۔ نہ لاپرواہی سے دوڑ کر خطرے میں کودتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کا کوئی رنگ یہاں نہیں دکھاتے۔ نہ اپنا حجم اور نہ اپنا وزن جتاتے ہیں۔ تمام معاملے کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں۔ کہ اللہ نے جو قربانی طلب کی ہے اگر اللہ کی معاونت شامل حال رہی اور اس نے صبر عطا کر دیا تو یہ کام ہو جائے گا۔

سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (۳۷ : ۱۰۲) "اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں سے پائیں گے"۔ ورنہ نہیں۔

کیا شان ہے اللہ کے جناب میں عاجزی کی۔ اور کس قدر روشن ایمان ہے کس قدر عالی شان اطاعت اور بے مثال تسلیم و رضا ہے یہ!

باتوں سے آگے اب اس منظر میں واقعات ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ اب صرف مکالمہ نہیں ہے۔ عمل شروع ہو رہا ہے۔

فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾

"آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا"۔ ایک بار پھر یہاں اطاعت سربلند ہوتی ہے اور عظمت ایمان کا اظہار ہوتا ہے اور تسلیم و رضا کی وہ مثال سامنے آتی ہے جو پوری انسانی تاریخ کا ایک جلی عنوان ہے ۔ ایک انسان اپنے اکلوتے بیٹے کو منہ کے بل گراتا ہے تاکہ اسے ذبح کے لیے تیار کر لے ۔ اور یہ لڑکا بھی سر تسلیم خم کرتا ہے اور بے حس و حرکت گر جاتا ہے ۔ بات اب عمل تک آپہنچی ہے اور قریب ہے کہ چھری چل جائے ۔

باپ بیٹے دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا ہے ۔ یہی ہے اسلام ۔ اسلام میں تسلیم و رضا ہی اصل حقیقت ہے ۔ اعتماد ' طاعت ' اطمینان اور تسلیم و رضا ' دونوں کے جذبات 'نظریات اور عمل یکساں ہیں ۔ نفاذ امر کے لیے تیار ہیں ۔ اس قسم کی تیاری کہ تنفیذ کے لیے بس ایک کش کی ضرورت ہے اور یہ کام ایک عظیم ایمان ہی کر سکتا ہے ۔

یہ جرات اور جسارت کا معاملہ نہیں ہے ۔ یہ جوش اور بہادری کا معاملہ نہیں ہے ۔ بعض اوقات میدان کارزار میں ایک مجاہد پر جوش انداز میں آگے بڑھتا ہے ' قتل کرتا ہے اور قتل ہوتا ہے ۔ بعض اوقات ایک فدائی اقدام کرتا ہے اور اسے علم بھی ہوتا ہے کہ وہ زندہ نہ بچے گا لیکن وہ جذبہ فداکاری سے سرشار ہوتا ہے اور یہ ایک انداز ہوتا ہے ' لیکن حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل جو کچھ کر رہے ہیں اس کی ادا بالکل نرالی ہے ۔ یہاں کوئی خونی جوش نہیں ہے ۔ نہ جذبہ حمایت کارفرما ہے ۔ نہ عجلت پسندانہ جوش ہے جس کی تہہ میں خوف و ہراس کو چھپایا جاتا ہے ۔ کمزوری اور بزدلی کو نعروں میں لپیٹ لیا جاتا ہے ۔ بلکہ یہ ایسی تسلیم و رضا ہے جو معاملے کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر کی جا رہی ہے ۔ عقلمندی کے ساتھ ایک کام ہو رہا ہے ۔ قصد و ارادے اور سوچ و فکر کے بعد ہو رہا ہے ۔ پورے مشورے اور بحث و مباحثے کے بعد ۔ یہ جانتے ہوئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں ' اطمینان کے ساتھ کہ نتائج کیا ہوں گے ۔ ٹھنڈی رضامندی ' خوشی خوشی سے اللہ کا جذبہ اطاعت کام کر رہا ہے ۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے حق ادا کر دیا ۔ تسلیم و رضا کا اظہار ہو گیا ۔ امر الٰہی کو وہ رو بعمل لے ہی آئے ۔ فرض پورا کر دیا ۔ بس چھری کی ایک کش ہی باقی رہ گئی تھی ۔ خون کی ایک دھار ہی باقی تھی ۔ اکلوتے بیٹے کی روح کی پرواز ہو چکنی باقی تھی ۔ اللہ کے ہاں اس روح کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی ۔ اللہ کے پیمانے میں وزن کسی اور چیز کا تھا جو ہو چکا ۔ دونوں نے عزم و ارادہ اس میزان میں رکھ دیا تھا ۔ رب جانتا تھا کہ ان کے شعور کی حالت کیا ہے ' ان کا جذبہ کیا ہے ۔

یہ ایک امتحان تھا جو ہو چکا ۔ اس میں وہ فتح یاب ہو گئے ۔ نتائج سامنے آگئے ۔ مقصد امتحان پورا ہو گیا جو بات رہ گئی وہ صرف یہ تھی کہ کوئی تڑپ جائے ۔ خون بہہ جائے ۔ ذبیح کا جسم ٹھنڈا ہو جائے ۔ لیکن اللہ بندگی و اطاعت چاہتا ہے ۔ عبادت کے معنی اسلام میں ابتلا اور تعذیب نہیں ۔ اللہ خون اور جسموں کو گرانا نہیں چاہتا ۔ جب خلوص کا اظہار ہو گیا ۔ بندہ اس مشکل حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہو گیا ۔ اپنے دل و جان سے تیار ہو گیا تو فرض ادا ہو گیا اور امتحان میں وہ کامیاب ہو گیا ۔

اللہ جانتا تھا کہ ابراہیم اور اسماعیل دونوں سچے ہیں ۔ اس لیے اللہ نے ان کی تیاری ہی کو عمل سمجھا ۔

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۙ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ

نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ ہٰذَا لَہُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۰۶﴾ وَ فَدَیۡنٰہُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۰۷﴾

"اور ہم نے ندا دی کہ "اے ابراہیم 'تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی"۔ اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا"۔

تمہارا خواب بھی سچا تھا' تم نے اسے سچ کر دکھایا۔ عملاً سچا کر دیا۔ اللہ تو تسلیم و رضا کا خواہش مند ہے ۔یوں کہ نفس کے اندر کوئی ایسی بات نہ رہے جو اللہ سے چھپائے' جو اللہ کے حکم سے زیادہ عزیز ہو' یا حکم الہٰی کے مقابلے میں کوئی تحفظ ہو۔ اگرچہ وہ اکلوتا بیٹا اور جگر گوشہ ہو۔ اگرچہ وہ جان اور روح ہو۔ اے ابراہیم تو نے تو یہ گویا کر دکھایا۔ تم تو ذبح عظیم کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اگر اللہ ہاتھ کو نہ پکڑتا۔ تم نے تو عزیز ترین متاع قربان کر دی تھی۔ اور تم نہایت ہی سنجیدگی' دھیمے انداز اور پروقار طریقے سے' اطمینان اور اعتماد کے ساتھ' مشورے اور سوچ کے ساتھ قربانی کر دی۔ اب تو صرف خون اور گوشت رہ گیا تھا۔ اس مقام پر انسان کے خون اور گوشت کے بدلے قربانی کا خون اور گوشت پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس کا بدل دے دیا جاتا ہے اور اسے ذبح عظیم کا نام بھی دے دیا جاتا ہے۔ ایک مینڈھا حکم ربی سے ابراہیم علیہ السلام کی چھری کے نیچے آ جاتا ہے۔ اور وہ اسے اسماعیل علیہ السلام کے بدلے ذبح کر دیتے ہیں اور کہا جاتا ہے :

اِنَّا کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ (۳۷ : ۱۰۵) "ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں"۔ ہم ان کو اس قسم کی آزمائش کے لیے چن کر ان پر کرم کرتے ہیں اور ان کے دلوں کو تسلیم و رضا اور اطاعت وفا کے لیے تیار کر کے اور ان کو اس عظیم کام پر آمادہ کر کے ان پر انعام کرتے ہیں اور اس قسم کی عظیم قربانی پر ان کو قدرت دے کر اور صبر دے کر ان کو جزاء دیتے ہیں۔ اور حقیقی جزاء کے مستحق قرار دے کر ان پر احسان کرتے ہیں۔

اس تعذیب و ابتلا کو ایک سنت جاریہ بنایا گیا ہے۔ ہر بقر عید پر قربانی جاری ہو گئی۔ یہ اس عظیم واقعہ کی دائمی یادگار ہے۔ جس کے اندر ایمان اپنے عروج پر نظر آتا ہے جس میں اطاعت کا حسن اور تسلیم و رضا کی بلندی اور عظمت نظر آتی ہے۔ اور امت مسلمہ اس قربانی کی یاد تازہ کرتی رہتی ہے تاکہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم کی عظمت کی معرفت تازہ ہوتی رہے۔ جن کی ملت پر یہ امت ہے جن کی نسبت اور جن کی نظریاتی میراث کی وہ وارث ہے تاکہ وہ اس نظریہ حیات اور ان عقاید و ایمانیات کا اچھی طرح ادراک کر سکے جو ملت ابراہیمی کی میراث ہیں۔ اور جسے معلوم ہو کہ مسلم وہ ہوتا ہے۔ جو بے چون و چرا رب تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرے' خوشی خوشی۔ اور اللہ کا حکم پاتے ہی بلکہ اشارہ پاتے ہی وہ اسے روبعمل لائے۔ اپنے لیے کچھ نہ رکھے۔ کوئی تحفظ نہ ہو۔ وہ اللہ کی اطاعت میں کوئی اپنا طریقہ' اپنا اسلوب اختیار نہ کرے بلکہ اللہ کی مرضی اور اس کے طریقے کے مطابق عمل پیرا ہو' جس طرح حکم ہو اور جس طرح حکم ملا ہو۔

پھر امت کو یہ بھی سبق دیا گیا کہ اللہ کے احکام کی تعمیل میں امت پر سختی اور تشدد مطلوب نہیں ہے کہ اسے ایسے احکام دیئے جائیں جو اس کی وسعت اور طاقت میں نہ ہوں۔ اللہ ایسے احکام دیتا ہے جن پر امت لبیک کہہ کر تعمیل کر سکے۔ اور پوری طرح ان احکام کو ادا کر سکے۔ اور جو حکم بھی آئے اس پر مطمئنا کہے۔ اور اپنی طرف سے کوئی تجویز نہ دے۔ نہ اس میں سستی دکھائے اور نہ احسان جتلائے۔ جب اللہ آمادگی اور تسلیم کو جان لیتا ہے تو پھر وہ اپنے بندوں کو

عذاب دے کر اور ان پر تشدد کر کے خوش نہیں ہوتا۔ آمادگی اور سر تسلیم خم کرنا ہی دراصل عمل شمار ہوا اور اصل عمل کا فدیہ دے دیا گیا۔ یہ سلوک اللہ کا اس امت کے ساتھ ہے جس طرح اس کے جد امجد ابراہیم کے ساتھ ہوا۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿۱۰۸﴾

"اور اس کی تعریف و توصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی"۔ صدیوں سے اس واقعہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام امہ قرار پائے۔ انبیاء کے باپ قرار پائے۔ اس امت کے باپ قرار پائے۔ یہ امت ان کی ملت کی وارث ہوئی۔ اور اللہ نے اسی لیے ان کے ذمہ پوری بشریت کی راہنمائی اور قیادت کا فریضہ عائد کیا۔ چنانچہ اس امت کو ابراہیم کا جانشین قرار دیا گیا' قیامت تک کے لیے۔

سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿۱۰۹﴾

"سلام ہے ابراہیم پر"۔ رب تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم پر سلام آتا ہے۔ اس کو قرآن کریم جیسی دائمی اور باقی رہنے والی کتاب میں رجسٹر کر دیا جاتا ہے۔ اور یوں اسے اس کائنات کے وجود میں ثبت کر دیا جاتا ہے۔

كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۱۰﴾

"ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں"۔ آزمائش میں ڈال کر ان سے وفا کا اظہار کرا کے' ان کے ذکر کو دوام بخش کر' ان پر سلام بھیج کر' اور ان کو اعزاز دے کر ہم جزاء دیتے ہیں۔

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۱۱﴾

"یقیناً وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا"۔ یہ ہے جزاء ان کے ایمان کی اور اس کی حقیقت وہ ہے جو اس آزمائش میں کامرانی سے ظہور میں آئی۔ اس کے بعد اللہ ان پر ایک بار پھر تجلیات فرماتا ہے۔ اور اللہ کا ایک بار پھر کرم ہوتا ہے۔ اور وہ یوں کہ بڑھاپے میں ان کو ایک دوسرا لڑکا اسحاق دیا جاتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو بھی برکت دی جاتی ہے۔ اور ان کے بیٹے اسحاق کو بھی برکت دی جاتی ہے اور حضرت اسحاق کو بھی صالح نبی بنایا جاتا ہے۔

وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۱۲﴾ وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلَىٰ إِسْحَاقَ ۚ وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ ﴿۱۱۳﴾ ع

"اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی' ایک نبی صالحین میں سے اور اسے اور اسحاق کو برکت دی۔ اب ان دونوں کی ذریت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے"۔

اسماعیل اور اسحاق کے بعد ان کی اولاد کا سلسلہ چلتا ہے لیکن ان کی اولاد کی وراثت 'وراثت گوشت و پوست نہیں ہے ۔ یہ نظریاتی اور ملی وارثت ہے لہٰذا جو اس ملت پر رہا وہ محسن رہا اور جس نے ملت اور نظریات سے انحراف کیا وہ ظالم قرار پایا اور قرابت اور نسب اس کے لیے مفید نہ ہوا۔

وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِیْنٌ (۱۱۳:۳۷) "اب ان دونوں کی ذریت میں سے کوئی محسن ہے اور کوئی اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والا ہے" ۔ اور انہی کی اولاد سے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام تھے ۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰی مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَ نَجَّیْنٰهُمَا وَ قَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۱۵﴾ وَ نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِیْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَ اٰتَیْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَ هَدَیْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۱۱۸﴾ وَ تَرَكْنَا عَلَیْهِمَا فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۲۲﴾

"اور ہم نے موسیٰ و ہارون پر احسان کیا' ان کو اور ان کی قوم کو کرب عظیم سے نجات دی 'انہیں نصرت بخشی جس کی وجہ سے وہی غالب رہے ' ان کو نہایت واضح کتاب عطا کی 'انہیں راہ راست دکھائی اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکر خیر باقی رکھا۔ سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر ۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں' درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے" ۔

قصہ موسیٰ کی اس جھلک میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اللہ نے ان پر احسان کیا کہ ان کو منصب نبوت کے لیے منتخب کیا اور ان کے ذریعہ ان کو اور ان کی قوم کو نجات دی اور یہ نجات ان کو اس عظیم اذیت سے دلائی جس میں وہ اور ان کی قوم مبتلا تھے ۔ دوسری سورتوں میں اس کی تفصیلات دی گئی ہیں ۔ یہاں صرف یہ کہا کہ ظالموں اور جلادوں پر ان کو نصرت اور غلبہ دیا گیا اور ان کو واضح احکام پر مشتمل کتاب دی گئی اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت دی گئی ۔ وہ راستہ جو اللہ تمام اہل ایمان کو عطا کرتا ہے یعنی اسلامی نظام زندگی اور ان پر یہ احسان کہ موسیٰ و ہارون کے ذکر کو دوام بخشا گیا۔ اس حصے کا خاتمہ بھی موسیٰ اور ہارون پر اللہ کی طرف سے سلامتی کے اظہار سے ہوتا ہے ۔ یہ مختصر اور پر تاثیر فقرے بار بار دہرائے جاتے ہیں ۔ یہ جتانے کے لیے کہ اللہ اپنے محسن بندوں پر احسان بھی کرتا ہے اور ان کے ذکر کو دوام بھی بخشتا ہے ۔ اور یہ بتانے کے لیے کہ اہل ایمان کی قدر و قیمت ان کے ایمان اور اسلام کی وجہ سے ہوتی ہے یعنی احسان کی وجہ سے ۔

--- ooo---

اس کے بعد ایک جھلک حضرت الیاس علیہ السلام کی ۔ یہ کون تھے ؟ راجح بات یہ ہے کہ عہد نامہ قدیم میں جو پیغمبر

ایلیا کے نام سے مذکور ہیں' وہی الیاس ہیں ۔ یہ شام کے لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے ۔ یہ لوگ ایک بعل نامی بت کے پرستار تھے ۔بعلبک آج تک اسی بت کے آثار میں سے ہے ۔بعل کے پرستار یہاں رہتے ہوں گے ۔

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور الیاس بھی یقیناً مرسلین میں سے تھا ۔یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ''تم لوگ ڈرتے نہیں ہو؟ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو' اس اللہ کو جو تمہارا اور تمہارے اگلے پچھلے آباو اجداد کا رب ہے؟'' مگر انہوں نے اسے جھٹلا دیا' سو اب یقیناً وہ سزا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں' بجز ان بندگان خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا اور الیاس کا ذکر خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا ۔سلام ہے الیاس پر ۔ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں ۔واقعی وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا''۔

حضرت الیاس نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور اس بات پر تنقید کی کہ تم بعل کی عبادت کرتے ہو اور اس ذات کو چھوڑتے ہو جو احسن الخالقین ہے ۔ تمہارا بھی رب ہے' اور تمہارے آباؤ اجداد کا بھی رب ہے' بعینہ اسی طرح جس طرح حضرت ابراہیم نے اپنی قوم اور باپ کی بت پرستی پر تنقید کی تھی ۔جس طرح ہر رسول اپنی اپنی قوم کی بت پرستی پر احتساب کرتا آیا تھا۔

نتیجہ یہ تھا کہ قوم نے تکذیب کی ۔ اللہ تعالیٰ حاضیہ فرماتا ہے کہ ان کو گرفتار کر کے حاضر کیا جائے گا۔اور ان کو وہی سزا ملے گی جو ہمیشہ مکذبین کو ملتی ہے ۔ہاں ان میں سے اہل ایمان اور اللہ کے خالص بندے مستثنیٰ ہوں گے ۔

حضرت الیاس علیہ السلام کے ساتھ یہ محفل بھی اس بات پر ختم ہوتی ہے کہ اللہ کی طرف سے ان پر سلام آتا ہے ۔ ان کی بھی تکریم ہوتی ہے ۔اور اہل ایمان اور اہل احسان کو اللہ ایسی ہی جزاء دیتے ہیں۔

حضرت الیاس علیہ السلام کی سیرت یہاں پہلی مرتبہ آتی ہے مگر نہایت اختصار کے ساتھ ۔ہم بھی اختصار کے ساتھ اسی پر اکتفاء کرتے ہیں ۔البتہ یہاں ایک فنی نکتہ بیان کرنا ضروری ہے ۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ (۳۷ : ۱۳۰) ''سلام ہے الیاس پر''۔ یہاں الیاس علیہ السلام کے نام کے ساتھ ''ین'' کا فاصلہ لگا دیا گیا تاکہ عبادت کا صوتی حسن دوبالا ہو جائے ۔ اور یہ قرآن کا مخصوص انداز بیان ہے کہ

سورت کی آیات کا خاتمہ تقریباً صوتی ہم آہنگی کے ساتھ ہوتا ہے اور اس انداز تعبیر کا سامع پر بہت اثر ہوتا ہے۔

--- ○○○ ---

اب قصہ لوط کی ایک جھلک ۔ دوسرے مقامات پر یہ قصہ حضرت ابراہیم کے قصے کے ساتھ آتا ہے۔

وَ اِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَ اِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَیْهِمْ مُّصْبِحِیْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَ بِالَّیْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

۳
ع ۲۵
۸

"اور لوط بھی انہی لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یاد کرو جب ہم نے اس کو اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی' سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔ پھر باقی سب کو تہس نہس کر دیا۔ آج تم شب و روز ان کے اجڑے دیار پر سے گزرتے ہو۔ کیا تم کو عقل نہیں آتی؟"

یہ جھلک نوح علیہ السلام کے قصے کی جھلک کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ اس میں اس بات کا ذکر ہے کہ لوط علیہ السلام رسول تھے۔ ان کو اپنے اہل و عیال کے ساتھ نجات دی گئی۔ ماسوائے ان کی بیوی کے۔ اور گمراہ جھٹلانے والوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ عربوں کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم تو روز و شب علاقہ لوط پر سے گزرتے ہو۔ کیا تمہارے دل بیدار نہیں ہوتے اور تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ کیا یہ کھنڈرات جو کہانی سناتے ہیں' تم اس کی طرف کان نہیں لگاتے اور کیا تمہارے دل میں ایسے انجام کا ڈر پیدا نہیں ہوتا۔

قصص انبیاء کی یہ جھلکیاں قصہ یونس پر ختم ہوتی ہیں۔

وَ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَ هُوَ مُلِیْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْ لَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَ هُوَ سَقِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۱۴۸﴾

"اور یقیناً یونس بھی رسولوں میں سے تھا۔ یاد کرو جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا' پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوا اور اس میں مات کھائی۔ آخر کار مچھلی نے اسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا۔ اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں

سے نہ ہوتا تو روز قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتا۔ آخر کار ہم نے اسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا۔ اور اس پر ایک بیلدار درخت اگا دیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے ایک لاکھ یا اس سے زائد لوگوں کی طرف بھیجا۔ وہ ایمان لائے اور ہم نے ایک وقت خاص تک انہیں باقی رکھا"۔

قرآن کریم اس بات کا تذکرہ نہیں کرتا کہ قوم یونس کہاں تھی۔ یہ بات قرآن سے صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ لوگ کسی ساحلی بستی میں آباد تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت یونس کی قوم کی جانب سے مسلسل تکذیب کی وجہ سے ان کا دل بھر آیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی قوم کو یہ وارننگ دے دی کہ جلد ہی تم پر عذاب آنے والا ہے۔ آپ نے اپنی قوم سے سخت غصہ ہو کر نکل کھڑے ہوئے۔ چنانچہ آپ سمندر کے ساحل پر چلے گئے۔ اور وہاں ایک لمبی کشتی میں سوار ہو گئے جو سواریوں سے بھری ہوئی تھی۔ سمندر کے درمیان میں کشتی کو طوفان نے آلیا اور وہ موجوں کی لپیٹ میں آگئی۔ لوگوں کی طرف سے اعلان ہوا کشتی کے سواروں میں کوئی شخص ایسا ہے جس نے غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور وہ مغضوب علیہ ہے اور یہ بات لازمی ہے کہ ایسے شخص کو سمندر میں پھینک دیا جائے تاکہ کشتی نجات پا جائے۔ اس لیے ان لوگوں نے قرعہ اندازی کی کہ جس کا قرعہ نکلا اسے سمندر میں پھینک دیا جائے۔ یونس علیہ السلام کا قرعہ نکل آیا۔ ان لوگوں کے اندر یونس علیہ السلام نیکی اور تقویٰ میں معروف تھے۔ لیکن جب ان کے نام بار بار قرعہ نکلا تو انہوں نے انہیں سمندر میں پھینک دیا یا خود وہ سمندر میں کود گئے۔ چنانچہ ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ اس وقت سب لوگ ان کو ملامت کر رہے تھے یعنی وہ ملامت کے بظاہر مستحق تھے کیونکہ انہوں نے اس مہم کو چھوڑ دیا تھا جس کے لیے ان کو بھیجا گیا تھا اور اپنی قوم سے ناراض ہو کر ان کو چھوڑ دیا حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نہ آئی تھی۔ جب مچھلی کے پیٹ میں انہوں نے احساس کر لیا تو اس ظلم سے استغفار کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ اعتراف کر لیا کہ میں نے ظلم کیا ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ "نہیں ہے کوئی حاکم مگر تو، تو پاک ہے، بے شک میں ظالموں میں سے تھا"۔ اللہ نے ان کی دعا کو سنا اور قبول کر لیا۔ چنانچہ مچھلی نے ان کو ساحل پر اگل دیا۔

فَلَوْلَا اَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ (۳۷:۱۴۳) لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ

(۳۷:۱۴۴) "اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو روز قیامت تک اس مچھلی کے پیٹ میں رہتا"۔ جب آپ مچھلی کے پیٹ سے نکلے تو بہت ہی کمزور ہو چکے تھے اور آپ کے پاس اوڑھنے کے لیے بھی کچھ نہ تھا اور آپ ساحل کی گرمی میں پڑے تھے۔

وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ (۳۷:۱۴۶) "اور ہم نے اس پر ایک بیلدار درخت اگا دیا"۔ اور یہ کدو کی بیل تھی۔ یہ اپنے پھیلے ہوئے پتوں کے ذریعہ انہیں دھوپ سے بچاتی اور یہ ان سے مکھیوں کو بھی دور رکھتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مکھیاں اس درخت کے قریب نہیں جاتیں۔ یہ اللہ کا لطف و کرم تھا اور معجزانہ تدابیر تھیں۔ جب ان کی صحت لوٹ آئی تو اللہ نے ان کو اپنی اس قوم کے پاس واپس بھیجا جن سے ناراض ہو کر وہ آگئے تھے۔ حضرت یونس

کے بعد یہ لوگ ڈر گئے تھے' ایمان لے آئے تھے ۔ اللہ سے استغفار کیا اور اجتماعی طور پر معافی مانگی اور اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی اور ان پر وہ عذاب سنت الہیہ کے مطابق نہ آیا جو مکذبین پر آتا رہتا ہے ۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۳۷ : ۱٤۸) "وہ ایمان لے آئے اور ہم نے ایک مقررہ وقت تک ان کو متاع حیات دیا" ۔ ان کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے زیادہ تھی ۔ اور یہ سب کے سب ایمان لے آئے تھے ۔

یہ قصہ یہاں یہ بتاتا ہے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوتا ہے جو ایمان لاتے ہیں جبکہ سابقہ قصص کا مدعا یہ بتانا تھا کہ جو ایمان نہیں لاتے ان کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ لہذا اے قوم محمد' تم ان دو انجاموں میں سے اپنے لیے جو انجام چاہتے ہو' اختیار کر لو ۔۔۔ یہاں آکر اس سورت کا یہ سبق ختم ہوتا ہے اور اس پر وہ تاریخی جائزہ بھی ختم ہوتا ہے جو نوح علیہ السلام کے بعد تمام ڈرانے والوں کی اقوام کے انجام کے بارے میں تھا' خواہ وہ مومنین تھے یا مکذبین تھے ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۱۰ ایک نظر میں

اس سورت کے سبق ۲ میں لائے جانے والے قصص نے جن امور پر روشنی ڈالی اور اللہ اور اس کے بندوں کے تعلق کی جو وضاحت کی اور اللہ کی جانب سے اپنے رسولوں کے مکذبین کو جس طرح پکڑا گیا جو غیراللہ کی بندگی کرتے تھے اور اللہ کے ساتھ خود اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق کو شریک کرتے تھے اور اس حقیقت کی روشنی میں جو درس اول کا موضوع تھی، اب اس آخری سبق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جاتی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ اس موضوع پر مکالمہ کریں کہ ان تمام حقائق کے مقابلے میں ان کے اس افسانوی عقیدے کی کیا حقیقت ہے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں نیز ان کے اس افسانوی عقیدے کی کیا حیثیت ہے جس کے مطابق وہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ اور جنوں کے درمیان کوئی رشتہ داری ہے اور ان کو یاد دلائیں کہ تم تو تمنائیں کرتے تھے کہ ہم میں بھی کوئی رسول آجائے اور تم یہ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی رسول آجائے تو ہم اس کی ہدایات کو بسروچشم قبول کریں گے لیکن اب تمہارا حال یہ ہے کہ جب رسول آگیا تو تم نے کفر کا رویہ اختیار کر لیا۔ سورت کا خاتمہ اس ریکارڈ پر ہوتا ہے کہ اللہ نے رسولوں کے ساتھ وعدہ کر لیا ہے کہ وہی غالب رہیں گے اور یہ کہ یہ مشرکین اللہ کی طرف جو نسبتیں کرتے ہیں وہ ان سے پاک ہے اور تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔ چنانچہ آغاز ہوتا ہے۔

---000---

درس نمبر ۲۱۰ تشریح آیات

۱۴۹ --- تا --- ۱۸۲

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

"پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو 'کیا (ان کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے؟ کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سن رکھو' دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ "اللہ اولاد رکھتا ہے" اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کر لیں' تمہیں کیا ہو گیا ہے' کیسے حکم لگا رہے ہو؟ کیا تمہیں ہوش نہیں آتا؟ یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے' تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو"۔

ان کے اس غلط عقیدے کا ہر طرف سے گھیراؤ کیا جاتا ہے۔ ان کے خلاف ان کی زبان میں بات کی جاتی ہے اور ان کے سماج میں جو سوچ تھی اسی کو ان کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ عربوں کے سماج میں لڑکوں کو لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اور وہ بچیوں کی پیدائش کو مصیبت سمجھتے تھے۔ لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلے میں کم تر مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ فرشتے دیویاں ہیں اور یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ چنانچہ اس عقیدے کو ان کی منطق اور سوچ کے مطابق رد کر دیا گیا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ حقیقت تو دور کی بات ہے خود ان کے تسلیم شدہ معیار کے مطابق بھی ان کا عقیدہ غلط ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ (۳۷:۱۴۹) "پھر ذرا ان سے پوچھو کہ تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے"۔ کیا تمہارے دل کو یہ بات لگتی ہے۔ جبکہ تمہارے سماج میں لڑکیاں لڑکوں سے کم تر رتبہ رکھتی ہیں۔ کیا خوب تقسیم ہے تمہاری' کہ تمہارے لیے ہوں بیٹے اور خالق کے لیے ہوں

بیٹیاں یا یہ کہ خود اللہ نے اپنے لیے بیٹیاں چن لیں اور بیٹے تمہارے لیے چھوڑ دیئے ۔ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں ۔ تمہارے یہ مزعومات کس قدر پوچ ہیں ۔

آج تمہارے اندر یہ افسانوی سوچ کیسے پیدا ہو گئی ۔ کہاں سے یہ عقیدہ پھیل گیا کہ فرشتے مونث ہیں ۔ کیا انہوں نے ان کی پیدائش کو دیکھا ہے ' اس وقت یہ موجود تھے اور انہوں نے ان کی جنس کو معلوم کر لیا؟

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ (۳۷ : ۱۵۰) "کیا ہم نے ملائکہ کی تخلیق مونث کے طور پر کی اور یہ اس وقت دیکھ رہے تھے" ۔

یہاں اللہ تعالیٰ ان کے اس مقولے اور عقیدے کو ان کے منصوص الفاظ میں نقل کر کے رد کرتا ہے ۔

اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ (۳۷ : ۱۵۱) وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ

(۳۷ : ۱۵۲) "دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ "اللہ اولاد رکھتا ہے" اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں" ۔ یہ اپنے سماج کے مسلمہ رواج اور اپنی ثابت شدہ روایات کے خلاف یہ بات کرتے ہیں ۔ یہ خود تو بیٹے چاہتے ہیں اور اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے ہیں ۔

اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ (۳۷ : ۱۵۳) "کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کیں" ۔ تمہاری یہ منطق خود تمہارے غلط یا صحیح مسلمات کی رو سے ہی غلط ہے ۔

مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (۳۷ : ۱۵۴) اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۳۷ : ۱۵۵) "تمہیں کیا ہو گیا ہے ' کیسے حکم لگا رہے ہو ' کیا تمہیں ہوش نہیں آتا" ۔ یہ استدلال تم کہاں سے نکال لائے ہو ' عجیب ہے یہ؟

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۷ : ۱۵۶) فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

(۳۷ : ۱۵۷) "پھر کیا تمہارے پاس اپنی باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو" ۔

ان کا دوسرا افسانہ یہ تھا کہ اللہ اور جنوں کے درمیان رشتہ داری ہے ۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۚ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

"انہوں نے اللہ اور جنوں کے درمیان نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے ' حالانکہ جن خوب جانتے ہیں کہ یہ مجرم کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں" ۔

ان کا زعم یہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں تھیں اور ان سے جن پیدا ہوئے یوں جنوں اور اللہ کے درمیان قرابت ہوگئی۔ جنوں کو تو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ کی دوسری مخلوق کی طرح ایک مخلوق ہیں۔ اور وہ قیامت کے دن اللہ کے حکم سے حاضر کیے جائیں گے اور رشتہ داروں کے ساتھ یہ سلوک تو نہیں کیا جاتا کہ وہ بطور مجرم پکڑے جا کر پیش کیے جائیں۔

اس کے ساتھ ساتھ صراحت کے ساتھ اس عقیدے کی تردید بھی کر دی جاتی ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

"اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں"۔

یہاں جنوں سے اللہ کے نیک بندوں کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے جو جنوں سے ہیں اور جو ایمان لانے والے ہیں۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

"ماسوائے اللہ کے ان بندوں کے جو مخلص ہیں"۔

اس کے بعد فرشتوں کی طرف سے خطاب ہے' ان مشرکین کو اور ان کے ان معبودوں کو' جن کی وہ بندگی کرتے تھے۔ یہ خطاب ان کے خود ساختہ عقائد پر ہے جو وہ رکھتے ہیں۔ بظاہر انداز کلام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب فرشتوں کا ہے۔

فَاِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾ وَ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

"پس تم اور تمہارے یہ معبود اللہ سے کسی کو پھیر نہیں سکتے مگر صرف اس کو جو دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھلسنے والا ہو۔ اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا ایک مقام مقرر ہے اور ہم صف بستہ خدمت گار ہیں اور تسبیح کرنے والے ہیں"۔

مفہوم یہ ہے کہ تم اور تمہارے معبود مل کر اللہ کے مقابلے میں اس کے بندوں میں سے کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے ماسوائے ان لوگوں کے جو جہنم کے حساب میں لکھے جا چکے ہیں اور تقدیر الٰہی نے فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔ تم لوگ اس مومن کو گمراہ نہیں کر سکتے جس کا نیک انجام لکھا ہوا ہے کہ اس نے راہ اطاعت لی ہے۔ کیونکہ جہنم کے ایندھن کا انتظام بھی اللہ نے کرنا ہے۔ اور سب کو معلوم ہے کہ یہ ایندھن وہ لوگ اور ان کے معبود ہیں جو اس فتنے کی راہ خود اختیار کرتے ہیں اور جو فتنہ پردازیوں کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں۔

یہ فرشتے اس افسانوی عقیدے پر صرف یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ اللہ نے ہر کسی کے لیے مقام و انجام مقرر کر دیا ہے۔

ہر کسی نے اس تک لامحالہ پہنچنا ہے۔ ہم فرشتے تو سب اللہ کے بندے ہیں' مخلوق ہیں' ہمارے لیے اللہ نے اپنی اطاعت کے فرائض مقرر کر رکھے ہیں۔ ہم نماز کے لیے صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے مقام پر کھڑا ڈیوٹی دے رہا ہے اور اللہ تو اللہ ہے (فرشتوں کی بات یہاں ختم ہو گئی)۔

اب روئے سخن پھر مشرکین کی طرف پھر جاتا ہے جو ان افسانوی عقیدے کے قائل تھے۔ ان کو ان کے وہ وعدے اور وہ آرزوئیں یاد دلائی جاتی ہیں کہ جب وہ اہل کتاب کے ساتھ حسد کرتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے پاس بھی کوئی ایسی کتاب آجائے جس میں پہلے لوگوں کا ذکر ہو یعنی حضرت ابراہیم اور آپ کے بعد آنے والوں کا تو ہم اللہ کے مخلص اور اعلیٰ بندے بن جائیں اور اللہ کے ہاں ہمارا بلند مقام ہو۔

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

”یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے پاس وہ ”ذکر“ ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے چیدہ بندے ہوتے۔ مگر (جب وہ آگیا) تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اب عنقریب انہیں (اس روش کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا“۔ یہ ہے وہ ذکر جو ان کے پاس آگیا اور یہ اس کرۂ ارض پر عظیم ترین نصیحت ہے لیکن ان لوگوں نے اسے نہ پہچانا۔

فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۳۷: ۱۷۰) ”مگر جب آگیا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اب عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا“۔

(عنقریب) کے لفظ میں درپردہ دھمکی بھی ہے اور یہ دھمکی ان کے مناسب حال ہے کیونکہ وہ خود تمنائیں کرتے تھے اور اب انکار کرتے ہیں۔۔۔ اس تہدید خفی کے بعد اب بتایا جاتا ہے کہ اللہ اپنے رسولوں کو غالب کرے گا اور ان کی نصرت کرے گا۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

”اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا“۔ یہ وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے اور اللہ کی بات اپنی جگہ قائم ہے۔ زمین کے اوپر توحیدی نظریہ حیات قائم ہے۔ ایمان کی عمارت مکمل ہو چکی ہے۔ تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے علی الرغم توحید کا کلمہ بلند ہے۔ اگرچہ جھٹلانے والے جھٹلاتے ہیں۔ اگرچہ دنیا میں اسلام کی دعوت اور اسلام کے قیام کا علم بلند کرنے والوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ آج بھی کفار کے عقائد' ان کا رعب دنیا سے ختم ہے۔ کفار' مشرکین کا تمام نظریاتی زور ختم ہے۔ آج دنیا

میں وہی عقائد و نظریات زندہ ہیں جو رسولوں نے پیش کیے ۔ آج بھی رسولوں کا پیش کردہ عقیدۂ توحید لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے ۔ لوگوں کے تصورات اور نظریات کو ایک خاص کیف دے رہا ہے اور تمام رکاوٹوں کے باوجود اس کرۂ ارض پر انسانوں کے دل و دماغ پر واضح طور پر چھایا ہوا ہے ۔ اور وہ تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں جو رسولوں کے پیش کردہ نظریہ توحید کے مخالف تھے ۔ یہ نظریات ان علاقوں میں بھی ختم ہو چکے ہیں جہاں سے وہ اٹھے تھے ۔ (سوشلزم روس میں) اور اللہ کے رسولوں کا کلمہ آج بھی بلند ہے اور وہ اللہ کا لشکر نظریاتی اعتبار سے آج بھی غالب ہے ۔

یہ تو ہم ایک عمومی بات کرتے ہیں لیکن ایک بات تمام روئے زمین پر بطور حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ ہمیشہ ہر زمانے میں پائی گئی ہے اور ہر تحریک اور دعوت پر وہ اصول صادق آیا ہے کہ جب داعی مخلص ہوں' سچے ہوں اور دعوت کے لیے یکسو ہوں تو وہ ہر حال میں غالب رہتے ہیں ۔ اس کے راستے میں مشکلات اور رکاوٹوں کے پہاڑ کیوں نہ کھڑے کر دیئے جائیں ۔ اللہ کا لشکر بہرحال غالب رہتا ہے اور اسے اللہ کی نصرت حاصل رہتی ہے ۔ مخلصین کی راہ میں مشکلات کے پہاڑ کیوں نہ کھڑے کر دیئے جائیں اور دشمن کی قوتیں اور شیطانی قوتیں ان کے خلاف حرب و ضرب کا بازار کیوں نہ گرم کریں ۔ وہ غالب رہتے ہیں ۔ مخلصین کو بے شک مختلف جنگیں لڑنی پڑتی ہیں جو کبھی لڑائی سے سابقہ پیش آتا ہے لیکن آخری نتیجہ وہی ہوتا ہے کہ اللہ کا لشکر غالب ہوتا ہے ۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے ۔ اگر پوری دنیا کی قوتیں اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں' یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا ۔ مخلصین مومنین کو نصرت ملے گی' وہ غالب ہوں گے اور زمین پر ان کا اقتدار قائم ہو گا ۔

اللہ کا یہ وعدہ کوئی جزوی واقعہ نہیں ہو گا بلکہ یہ اس کائنات کی سنتوں میں سے ایک سنت الہیہ ہے ۔ اور اللہ کی سنت اس طرح حرکت میں رہتی ہے جس طرح یہ ستارے اور سیارے اپنے مدار میں متحرک ہوتے ہیں ۔ ان کے مدار پر ان کی رفتار میں ایک لمحے کا فرق نہیں آتا ۔ جس طرح رات اور دن کے ظہور میں کوئی خلل نہیں پڑتا ۔ صدیوں سے یہ ظہور جاری ہے ۔ جس طرح بہار و خزاں کے مظاہر آتے جاتے ہیں اور مردہ زمین کو زندہ کرتے رہتے ہیں اسی طرح سنت الہیہ بھی جاری و ساری ہے ۔ لیکن وہ اللہ کی تقدیر کی پابند ہے اور اللہ کے ارادے کے مطابق چلتی ہے ۔ اور جس طرح اللہ چاہتا ہے' اس کا ظہور ہوتا ہے ۔ کبھی کبھی اس کے ظہور میں دیر نظر آتی ہے اور یہ دیر عجلت پسند انسان کی تمناؤں کی وجہ سے آتی ہے ۔ لیکن اس سنت میں تخلف نہیں ہوتا ۔ بعض اوقات یہ سنت اس طرح اپنا کام کرتی ہے کہ انسان اسے سمجھ ہی نہیں سکتا ۔ وہ ایسی شکل و صورت میں آتی ہے جو انسان کے تصور میں نہیں ہوتی ۔ اور جب سنت الہیہ اپنا کام کر کے چلی جاتی ہے تو ایک عرصے کے بعد اہل ایمان کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں گوشے سے نصرت الہیہ نے کام کیا تھا ۔

اللہ کے رسولوں کا اتباع کرنے والے لشکر خداوندی کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی امداد اس متعین صورت میں ہو جو اس کے ذہن میں ہے ۔ لیکن اللہ کی مشیت یہ ہوتی ہے کہ یہ نصرت نہایت ہی اعلیٰ اور مکمل شکل میں ہو ۔ چنانچہ ہوتا وہی کچھ ہے جو اللہ چاہتا ہے ۔ اگرچہ یہ لشکر اپنے خیال میں بہت زیادہ مشقت اٹھا رہا ہو اور اس کے خیال میں جدوجہد پر بہت عرصہ گزر چکا ہو اور انتظار ان کے تصور سے زیادہ ہو گیا ہو ۔ مثلاً مسلمانوں کا ارادہ یہ تھا کہ جنگ بدر کے موقعے پر قافلہ ان کے ہاتھ آ جائے لیکن اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ دنیاوی نفع ان کے ہاتھ سے جاتا رہے اور ان کی مڈبھیڑ فوج اور لشکر جرار سے ہو جائے اور وہ ایک ایسے گروہ سے ٹکرا جائیں جو زاد و عتاد رکھتا ہو ۔ اور اللہ نے جو چاہا وہ بہتر تھا ۔ اسلام اور مسلمانوں دونوں کے لیے بہتر تھا ۔ یہ تھی اللہ کی نصرت لشکر الٰہی کے حق میں ۔ اللہ پوری انسانی تاریخ میں اپنے لشکروں کے

ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔

بعض اوقات اللہ کے لشکر کسی نہ کسی جنگ میں شکست بھی کھا جاتے ہیں اور جنگ کا رخ ان کے خلاف چلا جاتا ہے۔ ان پر ابتلائیں اور مشکلات بھی آ جاتی ہیں۔ کیونکہ اللہ کی مشایہ ہوتی ہے کہ کسی دوسرے بڑے معرکے میں نصرت اور غلبہ دے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ اس موقعے پر اس کے لشکر کے لیے فتح مفید نہیں ہے اور اگلے موقعے پر وہ فتح بہت وسیع، بہت ہمہ گیر اور دور رس اثرات کی حامل ہوگی۔

اللہ نے اپنی بات کر دی ہے، اس کا وعدہ اور ارادہ کام کر چکا ہے اور اللہ کی سنت بارہا ثابت ہو چکی ہے۔

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷: ۱۷۱) اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ (۳۷: ۱۷۲) وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۳۷: ۱۷۳) "اپنے بھیجے ہوئے بندوں سے ہم پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ یقیناً ان کی مدد کی جائے گی اور ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا"۔

---ooo---

اس فیصلہ کن وعدے کے بعد اور نہایت ہی دیرینہ دستاویز ہونے کے بعد اور اللہ کی طرف سے ہونے کے بعد اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اب آپ مشرکین مکہ کو چھوڑ دیں۔ اب دیکھیں کہ اللہ کا یہ وعدہ کس طرح سچا ہوتا ہے اور سنت الہیہ کس طرح کام کرتی ہے۔ آپ بھی انتظار کریں اور وہ بھی انتظار کریں اور اللہ کے کاموں اور شانوں کا نظارہ کریں۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾ وَّ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَ تَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّ اَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

"پس اے نبیؐ، ذرا کچھ مدت تک انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے۔ کیا یہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟ جب وہ ان کے صحن میں اترے گا تو وہ دن ان لوگوں کے لیے بہت برا ہو گا، جنہیں متنبہ کیا جا چکا ہے۔ بس ذرا انہیں کچھ مدت کے لیے چھوڑ دو اور دیکھتے رہو، عنقریب یہ خود دیکھ لیں گے"۔

ان سے منہ پھیرلیں۔ ان کو پوری طرح نظرانداز کر دیں۔ ان کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ ان کو اس دن تک اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ جب آپ ان کو دیکھیں گے اور وہ آپ کو دیکھ رہے ہوں گے اور اللہ کا وعدہ سچا ہو رہا ہو گا۔ ہاں اگرچہ یہ ہمارے عذاب کے آنے کے لیے بہت جلدی کر رہے ہیں لیکن اے کاش کہ وہ سوچ سکتے کہ اس دن کیا تباہی مچے گی۔ جب یہ عذاب ان کے صحن میں ہو گا جب ہمارے رسول ڈراتے ہیں اور لوگ مان کر نہیں دیتے تو اس وقت سخت عذاب

نازل ہوتا ہے۔

دوبارہ حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان سے روگردانی کرلیں اور ان کو نظرانداز کر دیں ۔ یہ دراصل ان کو درپیش آنے والے خوفناک انجام کی طرف اشارہ ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ (۳۷ : ۱۷۴) "ذرا انہیں کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیں"۔ اور عذاب کی ہولناکی کی طرف بھی دوبارہ اشارہ کر دیا جاتا ہے۔

وَّ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ (۳۷ : ۱۷۵) "اور دیکھتے رہو عنقریب یہ خود بھی دیکھ لیں گے"۔

سورت کا خاتمہ اللہ کی پاکی کے بیان پر ہوتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ عزت اور غلبہ اسی کا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہے جس طرح تمام رسولوں پر ہے۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو بلاشرکت غیرے رب العالمین ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

۵
ع ۴۴
۹

پاک ہے تیرا رب، عزت کا مالک، ان تمام باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں، اور سلام ہے رسولوں پر، اور ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے"۔

یہ ایسا خاتمہ ہے جو اس سورت کے تمام موضوعات پر حاوی ہے اور مضامین سورت اور مسائل زیر بحث کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہے۔

--- ooo ---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ----- ۲۳

سورہ ص ۔ ۳۸

آیات ۱--- تا--- ۸۸

سورۂ ص ایک نظر میں

یہ مکی سورت ہے ۔ مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی مسئلہ توحید ' مسئلہ وحی الٰہی اور مسئلہ بعث بعد الموت پر بحث کی گئی ہے ۔ یہ تینوں مسائل اس سورت کے آغاز میں پہلے ہی سبق میں لیے گئے ہیں ۔ جن آیات میں ان مسائل کو لیا گیا ہے ۔ وہ فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں ۔ ان میں اس تعجب ' دہشت اور اچھنبے کو ظاہر کیا گیا جو مشرکین کے سرداروں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے طاری ہو گیا تھا ۔ ان کو یہ بات بہت ہی انوکھی لگی کہ یہ شخص ایک خدا کا قائل ہے اور باقی تمام الٰہوں کو اس نے ختم کر دیا ہے ۔ پھر وہ اس بات پر بھی متعجب تھے کہ اس پر وحی آتی ہے اور وہ اللہ کا فرستادہ بن گیا ہے ۔

وَ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۳۸ : ۴) اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (۳۸ : ۵) وَ انْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَ اصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ (۳۸ : ۶) مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸ : ۷) ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا (۳۸ : ۸) "ان لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آگیا ۔ منکرین کہنے لگے کہ یہ ساحر ہے سخت جھوٹا ہے 'کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے اور سرداران قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر ۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض کے لیے کہی جا رہی ہے ۔ یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی ۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات ۔ کیا ہمارے درمیان بس ایک ہی شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا" ۔

نیز جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس بات سے ڈرایا کہ تمہاری تکذیب کی وجہ سے تم پر عذاب نازل ہو جائے گا تو انہوں نے مذاق کرتے ہوئے دعا کی ۔

وَ قَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸ : ۱۶) "یہ کہتے ہیں اے ہمارے رب ' یوم الحساب سے پہلے ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے" ۔ ان لوگوں نے اس بات کو ناقابل تصور سمجھا کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے ایک شخص پر ذکر نازل کر دے اور پھر یہ شخص محمد ابن عبد اللہ ہو ' جو کوئی رئیس نہ تھا اور نہ اس کی سابقہ ریاست تھی ۔ نہ وہ علاقے کا حکمران تھا ۔ چنانچہ ان کے اس تعجب کے سبب ہی سے ان کا یہ قول نقل کیا کہ کیا ہم میں سے

اسی پر یہ ذکر نازل ہوتا تھا۔اس پر اللہ نے ان سے پوچھا کہ کیا اللہ عزیز اور وہاب کے خزانوں کی چابیاں ان کے پاس ہیں یا زمین آسمانوں اور ان کے درمیان کی حکومت ان کے پاس ہے۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ (۳۸:۹) اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ (۳۸:۱۰) ''کیا تیرے داتا اور غالب پروردگار کی رحمت کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں؟ کیا یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک ہیں۔اچھا یہ عالم اسباب کی بلندیوں پر چڑھ دیکھیں''۔

اللہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس کی کی رحمت کو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔اپنی رحمت کے دروازے وہ جس پر چاہتا ہے' کھول دیتا ہے۔زمین اور آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک وہ نہیں ہیں۔لہٰذا یہ خزانے اللہ جسے چاہے دے دے۔اپنے بندوں میں سے جسے چاہے مختار بنا دے۔کیونکہ وہی جانتا ہے کہ کسی منصب کا مستحق کون ہے وہ اپنے بندوں پر بے قید اور بے حساب انعامات کر سکتا ہے۔چنانچہ اس نکتے کو ثابت کرنے کے لیے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے قصے لائے گئے کہ اللہ نے انہیں نبوت' حکومت' پہاڑوں کی تسخیر' پرندوں کی تسخیر جنوں اور ہواؤں کی تسخیر کی قوت دی اور زمین کے خزانوں کا تو شمار ہی نہ تھا۔اور دنیا کا سازو سامان اور زیب و زینت تو بے انتہا تھی۔

کیا داؤد و سلیمان ان سب انعامات کے باوجود انسان نہ تھے۔کیا ان کے اندر بشری کمزوریاں نہ تھیں۔کیا وہ ہر رحمت خداوندی کے محتاج نہ تھے۔کیا ان جیسے طاقتور نبیوں اور بادشاہوں کی امداد اللہ نے قدم قدم پر نہ کی تھی۔کیا ان کی غلطی پر توبہ قبول نہ کی تھی اور راہ صواب کی طرف ان کی راہنمائی نہ کی تھی۔

ان قصص کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کو ہدایت کی گئی کہ آپ ان مکذبین کی ایذا رسانیوں پر صبر کریں اور اللہ کے فضل کے امیدوار رہیں۔اللہ آپ کا نگہبان ہے۔

اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ اِنَّهٗ اَوَّابٌ (۳۸:۱۷)

''اے نبی صبر کرو ان باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کرو جو بڑی قوتوں کا مالک تھا۔اور ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا''۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ اس مقصد کے لیے لایا گیا کہ اللہ اپنے مخلص ترین بندوں کو ابتلاؤں میں آزماتا ہے۔لہٰذا دعوت اسلامی کے کارکنوں کو اس طرح صبر کرنا چاہئے جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام نے صبر کیا۔یہ قصہ نیک لوگوں کے حسن انجام کی تصویر ہے۔نیکوں پر بالآخر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔وہ رحمت میں ڈوب جاتے ہیں۔قدرت اپنے رحیمانہ ہاتھوں سے ان پر شفقت کا ہاتھ پھیرتی ہے۔اس دور میں رسول اللہ اور اہل ایمان مکہ میں بے حد مصائب برداشت کر رہے تھے۔ان کو یہ اشارہ دیا جا رہا ہے کہ ان مشکلات کے بعد رحمتوں کا فیضان ہو گا۔اور اللہ کے خزانوں کے منہ کھل جائیں گے۔

یہ قصص سورت کے ایک بڑے حصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔اور سورت کا سبق نمبر ۲ انہی پر مشتمل ہے۔

یہ لوگ عذاب کے نازل ہونے میں بہت جلدی کرتے تھے وہ کہتے تھے :

وَ قَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸ : ۱۶) "اے ہمارے رب، یوم الحساب سے پہلے ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے"۔ چنانچہ ان قصص کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر یہاں لایا جاتا ہے ۔ بتایا جاتا ہے کہ متقین کا انتظار کیا انعامات کر رہے ہیں اور یہ کہ جہنم کس شان سے مکذبین کا انتظار کر رہی ہے ۔ قیامت کے اس منظر میں بتایا جاتا ہے کہ وہ حقیقی قدریں کیا ہیں جن کی وہاں اہمیت ہے ۔ یہ سردار وہاں اپنا انجام دیکھ لیں گے ۔ اور دنیا میں جن فقراء اور مساکین کے ساتھ وہ مذاق کرتے تھے اور ان کو اس بات کا اہل نہ سمجھتے تھے کہ یہ بھی اللہ کی رحمتوں اور خزانوں کے حق دار ہو جائیں ۔ یہاں معلوم ہو گا کہ یہ سردار امراء نہیں اور یہ فقراء، فقراء نہیں ۔ یہاں ان فقراء کا انجام یہ ہو گا۔

جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ (۳۸ : ۵۰) مُتَّكِئِیْنَ فِیْهَا یَدْعُوْنَ فِیْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِیْرَةٍ وَّ شَرَابٍ (۳۸ : ۵۱) وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ (۳۸ : ۵۲) "ہمیشہ رہنے والی جنتیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے ۔ خوب خوب خوراک اور مشروب طلب کر رہے ہوں گے اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہوں گی"۔
اور جو سرکش ہیں ان کا انجام بہت ہی برا ہو گا۔

جَهَنَّمَ یَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمِهَادُ (۳۸ : ۵۶) هٰذَا فَلْیَذُوْقُوْهُ حَمِیْمٌ وَّ غَسَّاقٌ (۳۸ : ۵۷) وَّ اٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ (۳۸ : ۵۸) "جہنم جس میں وہ جھلسے جائیں گے ۔ بہت ہی بری قیام گاہ یہ ہے ان کے لیے ۔ پس وہ مزہ چکھیں کھولتے ہوئے پانی اور پیپ، لہو اور اس قسم کی دوسری تلخیوں کا"۔ یہ لوگ جہنم میں ایک دوسرے کو لعنت و ملامت کریں گے ۔ باہم جھگڑیں گے اور یہ بات یاد کریں گے کہ وہ تو مومنین کو حقیر سمجھ کر ان سے مذاق کرتے تھے ۔

وَ قَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ (۳۸ : ۶۲) اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِیًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ (۳۸ : ۶۳) "وہ آپس میں کہیں گے کیا بات ہے ہم ان لوگوں کو کہیں نہیں دیکھتے جن کو ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے ۔ ہم نے یونہی ان کا مذاق بنا لیا تھا یا کہیں وہ نظروں سے اوجھل ہیں"۔ یہ لوگ ان مومنین کو جہنم میں نہ پائیں گے اور یہ بات تو معلوم ہے کہ وہ جنت میں ہیں ۔ لہذا یہ ہے جواب ان کے اس مطالبے کا اور مذاق کا ۔ یہ منظر اس سورت کا تیسرا سبق ہے ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن کفار کو علوم وحی سناتے وہ تکذیب کرتے ہوئے ان باتوں کو انوکھی سمجھتے ۔ حضرت

آدم علیہ السلام کا قصہ سنا کر ان کو بتایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ قصص بذریعہ وحی آ رہے ہیں ورنہ وہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو موجود نہ تھے ۔ یہ خبریں ان کو اللہ بتاتا ہے ۔ وہاں آدم علیہ السلام کے سوا کوئی اور تو موجود ہی نہ تھا ۔ دوران قصہ بتایا جاتا ہے کہ ابلیس کو جس امر نے ہلاکت میں ڈالا وہ صرف یہ تھا کہ اسے حضرت آدم کے ساتھ ضد ہو گئی تھی ۔ اور اس نے اس بات کو ناپسند کیا کہ اللہ نے اس کے مقابلے میں آدم علیہ السلام کو کیوں ترجیح دی ۔ جس طرح اہل مکہ یہ کہتے تھے کہ بس یہی رہ گیا ہمارے میں سے نبی بننے کے لیے ۔ اشارہ یہ مطلوب ہے کہ ان کے موقف اور ابلیس کے موقف میں پوری پوری یگانگت ہے ۔ لہٰذا جس طرح وہ راندۂ درگاہ ہوا یہ بھی ہوں گے ۔

اس سورت کا خاتمہ سبق چہارم پر ہوتا ہے ۔ اس میں حضور ان لوگوں سے خطاب کر رہے ہیں کہ آپ جو دعوت دے رہے ہیں وہ خود اپنی جانب سے نہیں دے رہے ہیں ۔ اور نہ آپ اس پر ان سے کوئی اجرت طلب کرتے ہیں اور یہ کہ اس دعوت کے بہت ہی عظیم نتائج نکلنے والے ہیں ۔

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (۳۸:۸۶) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۳۸:۸۷) وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ (۳۸:۸۸) ”اے نبی ان سے کہہ دو کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹی لوگوں میں سے ہوں ۔ یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے اور تھوڑی مدت ہی گزرے گی کہ تمہیں اس کا حال خود معلوم ہو جائے گا“ ۔

یہ چاروں سبق اس سورت کے موضوعات کو اس طرح آگے بڑھاتے ہیں کہ انسان کے دل و دماغ کو تاریخ کے ان اقوام کی سیر کراتے ہیں جنھوں نے زمین پر بڑائی حاصل کی' جباری و قہاری کا رویہ اختیار کیا اور رسولوں اور مومنین پر دست درازیاں کیں ۔ لیکن ان کا انجام تباہی و بربادی اور مکمل ہلاکت کی صورت میں سامنے آیا ۔

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ (۳۸:۱۱) كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ (۳۸:۱۲) وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ (۳۸:۱۳) اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ (۳۸:۱۴)

”یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا جتھہ ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے ۔ ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور میخوں والا فرعون اور ثمود اور قوم لوط اور ایکہ والے جھٹلا چکے ہیں ۔ جتھے وہ تھے ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور میری عقوبت کا فیصلہ ان پر چسپاں ہوا“ ۔

چنانچہ انسانی فکر کے سامنے اقوام کی تاریخی ہلاکتیں' بربادیاں اور تمام سرکشوں کی بربادیاں پیش کر کے اس کے مقابلے میں اللہ کے سچے بندوں اور اللہ کے لشکروں کی کامیابیاں بھی بیان کی جاتی ہیں ۔ عزت' اقتدار اعلیٰ اور اللہ کی رحمت اور شفقت ان کے شامل حال رہتی ہے ۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے قصص کی صورت میں رسولوں اور اللہ کے بندوں کی کامیابیاں بھی بیان کی جاتی ہیں ۔

یہ کامیابیاں تو زمین پر ہیں ـ اس کے بعد کچھ مناظر قیامت کی کامرانیوں کے بھی پیش کیے جاتے ہیں ـ نعمتیں اور اللہ کی رضامندیاں ـ دوسری جانب جہنم اور اللہ کا غضب مکذبین کے لیے ـ اس دار فناء کے بعد دار بقا میں دونوں فریقوں کے حال و احوال بھی ان اسباق میں پیش کیے گئے ہیں ـ

آخری سبق قصہ انسانیت ہے ـ کس طرح شیطان نے حسد اور بغض کی وجہ سے انسانیت کے خلاف سازش کی ـ آج بھی یہی شیطان درحقیقت مکذبین کی نکیل تھامے ہوئے ہے مگر وہ غافل ہیں ـ

ان اسباق کے دوران انسانی احساس کو چکا کر بتایا جاتا ہے کہ زمین و آسمان کے اندر دراصل ایک حقیقی سچائی کام کر رہی ہے ـ یہ ایک سچے نظام پر قائم ہیں ـ بعینہ اس طرح رسول بھی ایک سچائی لے کر آئے ہوئے ہیں ـ یہ دونوں سچائیاں ایک ہیں ـ نہ انسان بے مقصد ہے اور نہ یہ کائنات بے مقصد ہے ـ

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا (۳۸ : ۲۷) ”ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان پائی جانے والی چیزوں کو فضول پیدا نہیں کر دیا“ ـ قرآن کریم میں ایسے بے شمار اشارات موجود ہیں اور یہ وہ اصل نظریہ ہے جس پر یہ کائنات اور یہ شریعت قائم ہے اور تمام کی قرآن میں اس حقیقت کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے ـ

اب تفصیلات اور تشریحات ـ

---ooo---

درس نمبر ۲۱۱ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۱۶

صٓ وَ الْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ۟ؕ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ۟ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّ لَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ ۟

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ص، قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی' بلکہ یہی لوگ' جنھوں نے ماننے سے انکار کیا ہے' سخت تکبر اور ضد میں مبتلا ہیں۔ ان سے پہلے ہم ایسی کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں (اور جب ان کی شامت آئی ہے) تو وہ چیخ اٹھے ہیں' مگر وہ وقت بچنے کا نہیں ہوتا"۔

اللہ تعالیٰ حرف ص اور قرآن کریم کی قسم کھاتا ہے۔ اس قرآن کی قسم جو نصیحت سے مالا مال ہے۔ یہ حرف ص بھی اللہ کا بنایا ہوا ہے اور یہ قرآن بھی اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ اللہ ہی ہے جو انسان کے گلے میں حرف صاد پیدا کرتا ہے اور پھر یہ حرف اور اللہ کے پیدا کردہ دوسرے حروف ہجی مل کر قرآن کے اسالیب کلام پیدا کرتے ہیں۔ لیکن تمام انسان ایسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ کیونکہ قرآن کلام الٰہی ہے اور اس کے اندر وہ ادبی صنعت کاری ہے جو انسان کے دائرہ قدرت سے باہر ہے اور اللہ کا یہ اعجاز' کلام الٰہی قرآن میں بھی ہے اور دوسری پیدا کردہ چیزوں میں بھی ہے۔ یہ آواز ص جو انسان کے گلے سے نکلتی ہے' یہ اس اللہ کی تخلیق سے نکلتی ہے۔ جس نے انسان کا گلا بنایا' جس سے اس کے سوا دوسری آوازیں بھی نکلتی ہیں۔ انسانوں کی قدرت میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ آواز نکالنے کا کوئی ایسا چلتا پھرتا زندہ آلہ بنالیں اور یہ بھی ایک خارق العادت معجزہ ہے اور اس قسم کے ہزارہا معجزات خود ان کے جسم میں ہیں۔ اگر یہ لوگ صرف اپنے انفس کے اندر پائے جانے والے معجزات ہی پر غور کرتے تو انہیں اس بات پر کوئی اچنبھا نہ ہوتا کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے

ایک بندے پر وحی نازل کی ہے اور ایک بندے کو مختار بنایا ہے کیونکہ وحی کے اندر اچنبھے کی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس طرح اللہ کے پیدا کردہ انسان اور دوسری چیزوں کے اندر ایک ایک بات معجزہ ہے۔

ص وَ الْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ (۳۸ : ۱) "ص، قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی"۔ قرآن کریم میں جس طرح قوانین، دستور، قصص، فلسفہ اور تہذیب کی باتیں ہیں اسی طرح نصیحت اور یاددہانی بھی ہے۔ لیکن نصیحت اور اللہ کی طرف راہنمائی سب دوسرے مضامین کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ قرآن کی اصل غرض نصیحت و ہدایت ہے بلکہ نصیحت کے سوا دوسرے مضامین بھی دراصل اللہ تک پہنچانے والے ہیں۔ یوں کہ سب اللہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ذوالذکر کا مفہوم مذکور اور مشہور بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی قرآن کی صفت ہے کہ وہ بہت مشہور ہے۔

بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ (۳۸ : ۲) "بلکہ یہی لوگ جنہوں نے ماننے سے انکار کیا ہے سخت تکبر اور ضد میں مبتلا ہیں"۔ یہاں کلام میں اضراب اور اچانک موضوع سخن کی تبدیلی نظر آتی ہے۔ پہلے قرآن کا موضوع تھا، اب مشرکین پر تبصرہ شروع ہو گیا کہ وہ کبر و غرور میں ڈوبے ہوئے ہیں اور سخت ضد اور دشمنی میں مبتلا ہیں۔ لیکن یہ موضوع سخن کی تبدیلی فقط ظاہری ہے اور اس ظاہری تبدیلی سے غرض یہ ہے کہ قاری مسئلے پر ذرا سنجیدگی سے غور کرے۔ یہاں ص اور قرآن ذی ذکر کی قسم اٹھائی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس بات کا ذکر ہو رہا ہے وہ بہت بڑی بات ہے۔ اسی لیے اللہ نے اس پر قسم اٹھائی ہے۔ اس کے بعد مشرکین کے غرور اور ہٹ دھرمی کا ذکر کیا گیا۔ مسئلہ "بل" حرف اضراب سے قبل اور بعد ایک ہی ہے۔ ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ اللہ قرآن کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اور مشرکین ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کس طرح قرآن کو نظر انداز کرتے ہیں۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ اس سے قبل انسانی تاریخ میں جن جن اقوام نے غرور و تکبر کیا اور اس کی وجہ سے ضد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہوئے وہ صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ کیونکہ انہوں نے بہت بڑا تکبر کیا اور دعوت اسلامی سے شدید دشمنی اختیار کی۔ ذرا تاریخ میں ان کا منظر دیکھو کہ چیخ و پکار کر رہے ہیں اور کوئی سنتا ہی نہیں۔ اب تو ان کے دماغ سے وہ سب کچھ نکل گیا ہے۔ اب تو وہ پچھتا رہے ہیں۔ دشمنی انہوں نے ترک کر دی اور اب تو وہ بہت ہی برخوردار بنے جا رہے ہیں۔ لیکن اس وقت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت!

كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّ لَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ (۳۸ : ۳) "ان سے پہلے ہم ایسی کتنی ہی قوتوں کو ہلاک کر چکے ہیں اور جب ان کی شامت آئی تو وہ چیخ اٹھے ہیں مگر وہ وقت بچنے کا نہیں"۔

شاید تاریخ کے ان صفحات کے مطالعے کا ان پر اثر ہو اور وہ اپنے کبر و غرور سے دستکش ہو جائیں اور اپنی بے جا دشمنی کو ترک کر دیں۔ اور اپنے آپ کو اس موقف پر کھڑا نہ کریں جو ان ہلاک شدہ اقوام کا تھا کہ وہ چیختے پکارتے رہے لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی۔ اب تو ان کے سامنے وسیع وقت ہے۔ وہ اس بے بسی کی پکار سے بچ سکتے ہیں۔ جب کوئی سننے والا نہ ہو۔ اور نہ بچنے کی کوئی راہ ہو۔

--- ○○○ ---

یہ تو تھی ان کو جھنجھوڑنے کے لیے ایک سخت ضرب ـ اب تفصیلا بتایا جا رہا ہے کہ ان کے تکبر اور ان کی دشمنی کی تفصیلات کیا تھیں ـ سنئے تفصیلات :

وَعَجِبُوٓا اَنۡ جَآءَهُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡهُمۡ وَقَالَ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۖۚ اَجَعَلَ الۡاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَىۡءٌ عُجَابٌ ۝ وَانۡطَلَقَ الۡمَلَاُ مِنۡهُمۡ اَنِ امۡشُوۡا وَاصۡبِرُوۡا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمۡ ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَىۡءٌ يُّرَادُ ۝ مَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِى الۡمِلَّةِ الۡاٰخِرَةِ ۖۚ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ ۝

"ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آگیا ـ منکرین کہنے لگے کہ "یہ ساحر ہے، سخت جھوٹا ہے، کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے" ـ اور سرداران قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ "چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر ـ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے ـ یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی ـ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات" ـ تکبر یہ تھا ـ

ءَاُنۡزِلَ عَلَيۡهِ الذِّكۡرُ مِنۡۢ بَيۡنِنَا (۳۸ : ۸) "کیا ہمارے درمیان بس یہی شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کر دیا گیا" ـ اور دشمنی یہ تھی کہ

اَجَعَلَ الۡاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (۳۸ : ۵) "کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا" ـ اور یہ بھی دشمنی کی وجہ ہے ـ

مَا سَمِعۡنَا بِهٰذَا فِى الۡمِلَّةِ الۡاٰخِرَةِ (۳۸ : ۷) "یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی" ـ اور یہ کہ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۳۸ : ۴) "یہ جادوگر ہے بڑا جھوٹا" ـ اور اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا اخۡتِلَاقٌ (۳۸ : ۷) "یہ کچھ نہیں مگر ایک من گھڑت بات" ـ یہ سب دشمنی کی وجوہات تھیں ـ

رسول کا انسان ہونا زمانہ قدیم سے قابل تعجب رہا ہے ـ ہر زمانے میں اس کا اعادہ ہوا ہے ـ جب سے رسالتوں کا آغاز ہوا ہے، یہ اعتراض ہوتا رہا ہے ـ رسول بھی آتے رہے اور اس قسم کے اعتراضات بھی ہوتے رہے ـ

وَعَجِبُوٓا اَنۡ جَآءَهُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡهُمۡ (۳۸ : ۴) "اور ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انہی میں سے آگیا" ـ حالانکہ مناسب ترین اور معقول ترین بات تو یہی ہے کہ ڈرانے والا انہی میں سے ہو، وہ بشر ہو اور یہ بات جانتا ہو کہ انسان کیا سوچتے ہیں اور ان کے احساسات کیا ہوتے ہیں ـ ان کے خلجانات کیا ہوتے ہیں اور ان کے وجود میں کیا کشمکش ہے ـ اور ان کے اندر کیا کیا کمزوریاں ہوتی ہیں اور کیا کیا کوتاہیاں ان کے وجود

میں ہوتی ہیں ـ ایک انسان ہی یہ جان سکتا ہے کہ انسان میں کہاں کہاں کیا کمزوری ہے ـ کہاں کہاں وہ جذبات اور میلانات کا دباؤ محسوس کرتا ہے ـ اس کی وسعت اور قدرت کی حدود کیا ہیں ـ وہ کس قدر مشقت برداشت کر سکتے ہیں ـ کن کن رکاوٹوں اور مشکلات کے سامنے وہ بے بس ہو جاتے ہیں اور کیا کیا چیزیں ان پر اثر انداز ہوتی ہیں ـ

رسول ایک انسان ہوتا ہے ' انسانوں سے ہوتا ہے ' انسانوں میں رہتا ہے تو اس کی زندگی ان کے لیے نمونہ ہوتی ہے ـ اور وہ اس کے اسوہ کو اپناتے ہیں ' وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارا ہی بھائی ہے اور ہم ہی میں سے ہے ـ اور یہ کہ قوم اور رسول کے درمیان انسانی اور سماجی روابط پہلے سے موجود ہوتے ہیں ـ لہٰذا وہ اس منہاج کو اپنا سکتے ہیں جس پر وہ ہوتا ہے ـ اور لوگوں سے بھی یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ اسے اپناؤ ـ کیونکہ رسول جیسے طرز عمل کو وہ بھی اپنا سکتے ہیں ـ اس لئے کہ اس نظام پر ایک شخص نے عمل کر کے دکھا دیا ہے ـ جو خود ان میں سے ہے اور ان جیسا انسان ہے ـ

لیکن یہ بات تعجب انگیز ہے کہ یہ معقول ترین اور لازمی امر بھی ہمیشہ لوگوں کے لیے باعث تعجب بنا رہا ہے ـ وہ اسے انوکھا سمجھتے رہے ہیں اور تکذیب کرتے رہے ہیں ـ کیونکہ یہ لوگ انسانوں میں سے رسول بھیجنے کی حکمت کو نہ سمجھتے تھے ـ وہ رسالت کے منصب کی حقیقت کو بھی نہ سمجھتے تھے ـ بجائے اس کے کہ وہ رسول کو ایک بشر قائد اور راہنما سمجھتے جو ان کو اللہ کی راہ دکھاتا ہے ' وہ رسول کو ایک عجوبہ ناقابل فہم اور خیالی شخصیت سمجھتے تھے ـ وہ یوں سیدھے سادے انسانوں کو رسول نہ مانتے تھے ـ وہ رسول کو بھی ایسی شخصیت سمجھتے تھے جو خیالی ہو ' جسے چھوا نہ جا سکتا ہو ـ جسے دیکھا نہ جا سکتا ہو ـ وہ ظاہر و باہر نہ ہو ' جو اس کرۂ ارض پر ایک عملی زندگی نہ رکھتا ہو ـ غرض وہ رسولوں کو ایک افسانوی شخصیت کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے ـ اور جس طرح ان کے عقائد تھے وہ رسولوں کو بھی ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے ـ

لیکن اللہ کی مرضی یہ تھی کہ انسانوں کے لیے اس کی یہ آخری رسالت نہایت عملی اور واقعیت پسندانہ ہو ـ اس میں لوگوں کے لیے پاکیزہ ' طیب اور اعلیٰ درجے کی زندگی کا انتظام ہو ـ اور یہ آخری رسالت زمین کے اوپر ایک حقیقت ہو ـ اوہام تخیلات اور محض ہوائی مثالوں اور افسانوں پر مبنی نہ ہو ـ حقائق پر مبنی ہو ' محض اوہام و اساطیر نہ ہو ـ

وَ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۳۸ : ۴) "منکرین کہنے لگے یہ تو ساحر ہے ' سخت جھوٹا ہے"۔ اور کافروں نے یہ بات محض اس لیے کہی کہ وہ اپنے جیسے ایک شخص کی رسالت کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے ـ اور پھر انہوں نے یہ بات اس لیے بھی کہی کہ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متنفر ہو جائیں اور وہ سچائی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے جو واضح تھی اور پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ صدق و صفا میں مشہور تھے ' وہ اس کو لوگوں کی نظروں میں مشتبہ بنانے کے لیے ایسا کرتے تھے ـ

اصل حقیقت یہ ہے اور اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مشرکین مکہ نے کسی بھی مرحلے میں خود اپنی اس بات کو کبھی بھی سچا نہیں سمجھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جادوگر ہیں یا بہت بڑے جھوٹے ہیں کیونکہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت اچھی طرح جانتے تھے ـ حقیقت یہ ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈے اور گمراہ کن نشر و اشاعت کی جو مہم چلا رہے تھے ـ یہ اس کے ہتھیاروں میں سے ایک اوچھا ہتھیار تھا ـ اس طرح وہ اپنے آپ کو ' اپنے مقام و مرتبہ کو اور اپنے غلط عقائد کو بچانا چاہتے تھے ـ کیونکہ تحریک اسلامی کی صورت میں ان کو جو خطرہ درپیش تھا ' اس کی

وجہ سے ان کی کھوئی اور جھوٹی اقتدار کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور ان کے بناوٹی طور طریقوں کے وجود تک کو خطرہ لاحق تھا اور کبرائے قریش اسے اچھی طرح سمجھتے تھے۔

ہم نے یہ بات اس سے پہلے بھی نقل کی ہے اور یہاں بھی نقل کر رہے ہیں کہ کبرائے قریش نے پروپیگنڈے کی یہ جھوٹی مہم نہایت ہی سنجیدگی اور سوچ سمجھ کر شروع کی تھی۔ اس طرح وہ اپنے وجود' اپنے طور طریقوں اور اپنے نظریات کو بچانا چاہتے تھے۔ نیز اس طرح موسم حج میں عرب قبائل میں تحریک اسلامی کے اثرات کے پھیلنے کا جو خطرہ درپیش تھا اس کا وہ سد باب چاہتے تھے۔

محمد ابن اسحاق نے نقل کیا ہے کہ ولید ابن مغیرہ کے پاس قریش کے کچھ معمر لوگ جمع ہوئے' موسم حج آنے والا تھا۔ ولید نے ان سے کہا کہ اکابرین قریش آپ کو معلوم ہے کہ موسم حج آ رہا ہے اور عرب کے وفود آنے شروع ہوں گے۔ نیز انہوں نے اس شخص کے بارے میں بھی سن رکھا ہو گا۔ لہٰذا اس موضوع پر اپنی بات کو ایک کر لو۔ یوں نہ ہو کہ ہر شخص ایک علیحدہ بات کرے اور تم خود ایک دوسرے کی تکذیب کرتے پھرو۔ تو انہوں نے کہا عبدشمس تم ہی کچھ کہو اور ہمیں ایک مضبوط موقف دے دو تاکہ ہم سب ایک ہی بات کریں تو ولید نے کہا تم کہو میں سن کر قیاس کروں گا۔ کسی نے کہا اسے کاہن کہو' ولید نے کہا یہ تو بات نہیں ہے۔ خدا کی قسم یہ کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کو خوب دیکھا ہوا ہے۔ نہ قرآن کاہنوں کا زمزمہ ہے اور نہ ان کا مسجع کلام ہے تو کسی نے کہا اسے پاگل کہو۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ مجنون بھی نہیں ہے۔ لوگ مجنونوں اور پاگلوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ نہ وہ مجنونوں کی طرح گلوگیر ہے۔ نہ ذہنی خلجان میں مبتلا ہے اور نہ اسے کوئی وسوسہ ہے۔ تو پھر اسے شاعر کہنا چاہئے۔ تو اس نے کہا کہ اس کا کلام شعر بھی نہیں ہے۔ ہم اشعار کو جانتے ہیں۔ نہ رجز ہے' نہ ہزج ہے' نہ قریض ہے' نہ مقبوض ہے' نہ مبسوط ہے۔ لہٰذا یہ کلام شعر نہیں ہے تو انہوں نے کہا پھر اسے جادوگر ہی کہا جا سکتا ہے۔ تو ولید نے کہا وہ تو جادوگر بھی نہیں ہے۔ ہم نے جادوگر بھی دیکھے ہوئے ہیں۔ ان کے جادو کے کرشمے بھی دیکھے ہوئے ہیں۔ نہ یہ ان کی پھونک ہے اور نہ ان کی بندش ہے تو ان اکابرین نے کہا عبدشمس پھر تم ہی بتاؤ کہ کیا کہیں اسے۔ تو اس نے کہا خدا کی قسم اس کی بات میں مٹھاس ہے۔ اس کی جڑیں بہت ہی گہری ہیں۔ اور اس کی شاخوں پر پھل ہیں اور تم ان باتوں میں سے جس کا بھی پروپیگنڈہ کرو معلوم ہو گا کہ تمہاری بات غلط ہے۔ ہاں ممکن حد تک جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ تم اسے ساحر کہو کہ وہ جو کلام لایا ہے وہ جادو کی طرح ایک شخص اور اس کے بھائی' ایک شخص اور اس کی بیوی ایک شخص اور اس کے خاندان کے درمیان تفریق کرتا ہے۔ لہٰذا سب یہی ایک بات کرو' چنانچہ موسم حج میں یہ لوگ راستوں پر بیٹھ گئے۔ اور جو بھی گزرتا اسے وہ کہتے تھے کہ لوگو ڈرو اس شہر میں ایک جادوگر پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ از خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تفصیلات بتاتے۔

یہ تھی حقیقت اس بات کی جو وہ کہتے تھے۔

سٰحِرٌ كَذَّابٌ (۳۸ : ٤) جبکہ وہ خود جانتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچ کہتے تھے' نہ ساحر تھے اور نہ کذاب تھے۔

نیز وہ اس بات پر بھی تعجب کرتے تھے کہ وہ تمام الہوں کی جگہ ایک ذات کو الہ ماننے کی دعوت دے رہا ہے۔

حالانکہ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ اس کائنات کا الہ ایک ہی ہے۔

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (۳۸:۵) وَانطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ (۳۸:۶) مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸:۷) کیا اس نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا بنا ڈالا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے اور سرداران قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض کے لیے کی جا رہی ہے۔ یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات"۔

قرآن کریم اسلامی نظریہ حیات سے ان کی دہشت اور بوکھلاہٹ کی خوب تصویر کشی کرتا ہے۔

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا (۳۸:۵) "کیا اس نے تمام الہوں کو ایک الہ بنا دیا"۔ گویا اسلام کا فطری عقیدہ ایک انہونی اور ناقابل تصور بات ہے۔

إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (۳۸:۵) "یہ تو ایک عجیب نظریہ ہے"۔ لفظ "عجاب" یہ بتاتا ہے کہ ان کی دہشت زدگی اور بوکھلاہٹ بہت ہی عظیم تھی۔

جمہور کے ذہنوں سے اسلامی عقائد کے اثرات مٹانے کے لیے وہ جس قسم کی جدوجہد کر رہے تھے۔ قرآن کریم اس کی بھی زبردست تصویر کشی کر رہا ہے۔ وہ بے حد جدوجہد کر رہے تھے کہ لوگ اپنے موروثی عقائد پر جمے رہیں۔ اگرچہ وہ عقائد و نظریات باطل اور پوچ ہوں۔ وہ عوام کو یہ باور کراتے تھے کہ دراصل اس تحریک کے پیچھے کوئی خفیہ ہاتھ ہے۔ اور یہ کہ وہ سردار ہیں اور خفیہ سازشوں سے باخبر ہیں۔ اور یہ گہری سازش کی جا رہی ہے۔

وَانطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ (۳۸:۶) "اور سرداران قریش یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ چلو اور اپنے معبودوں کی عبادت پر ڈٹے رہو۔ یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کی جا رہی ہے"۔ یہ کوئی دین اور نظریہ کی بات نہیں ہے۔ یہ کوئی اور ہی گہری سازش ہے اور جمہور عوام کا یہ فرض ہے کہ یہ معاملہ اکابر پر چھوڑ دیں۔ جو خفیہ باتوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے موروثی طرز عمل پر جمے رہیں اور اپنے آباؤ اجداد کے عقائد کو سختی سے پکڑے رکھیں۔ اور اس جدید تحریک کے پیچھے جو سازش ہے اس میں نہ پڑیں۔ یہ لیڈروں کا کام ہے کہ وہ ان سازشوں کا دفاع کریں۔ عوام کو مطمئن رہنا چاہئے۔ قیادت اپنے مفادات، عوام کے مفادات اور اپنے الہوں کے مفادات کو اچھی طرح جانتی ہے۔

یہ ہے ایک عام اور ہر سوسائٹی میں دہرائے جانے والا طریقہ کار جس کے مطابق لوگ عوام الناس کو ملک و ملت کے

مسائل سے ہٹانے کے لیے جسے ہر سوسائٹی کے سرکش ' باغی اور ڈکٹیٹر اور طاغوتی قوتیں استعمال کرتی ہیں ۔ اس لیے کہ اگر عوام الناس قومی مسائل پر سوچنا شروع کر دیں تو یہ طاغوتی قوتوں کے لیے ایک خطرناک علامت ہوتی ہے ۔ طاغوت کے اقتدار کے لیے یہ خطرہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ اس طرح ان اندھیروں کے چھٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے جن میں عوام الناس غرق ہوتے ہیں ۔ کیونکہ طاغوت کا اقتدار قائم ہی تب ہوتا ہے جب جمہور جہالت میں غرق ہوں ۔

اس کے بعد وہ اہل کتاب کے ظاہری عقیدے سے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں یعنی اہل کتاب کے حوالے سے جبکہ اہل کتاب کے عقائد میں بھی افسانے داخل ہوگئے تھے اور انہوں نے توحید کے خالص عقیدے میں تحریف کر کے اسے شرکیہ عقائد بنا دیا تھا ۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸ : ۷) "یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی ۔ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک من گھڑت بات"۔

نزول قرآن کے زمانے میں عیسائیوں کے درمیان عقیدۂ تثلیث عام ہوگیا تھا اور حضرت عزیر کی الوہیت کا عقیدہ بھی یہودیوں کے درمیان پھیل گیا تھا ۔ اکابرین قریش اس طرف اشارہ کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ "یہ بات ہم نے زمانہ قریب کی ملت میں نہیں سنی ۔ یہ خالص توحید تو نہ یہودیت میں ہے اور نہ عیسائیت میں ۔ لہٰذا حضرت محمدؐ جو کچھ پیش کر رہے ہیں ' یہ ان کا من گھڑت دین ہے ۔

اسلام نے خالص توحید کے قیام کے لیے بہت ہی جدوجہد کی ۔ اور عقیدۂ توحید سے ہر قسم کے افسانوں ' شرک خفی اور شرک جلی اور تمام دوسری بے راہ رویوں اور کج فکریوں کو دور کر دیا ۔ یہ اس لیے کہ عقیدۂ توحید وہ حقیقت ہے جس پر یہ پوری کائنات قائم ہے ۔ اور اس پر یہ پوری کائنات شہادت دے رہی ہے ۔ نہایت ہی واضح انداز میں ۔ پھر انسان کی شخصیت کی اصلاح ' اس کی ذات میں ' ان کے اصول حیات میں اور زندگی کے فروعی مسائل میں اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ عقیدہ توحید پر قائم نہ ہو ۔

یہاں مناسب ہے کہ اس بات کی تفصیل دے دی جائے کہ قریش عقیدۂ توحید کی کس قدر شدید مزاحمت کر رہے تھے ۔ اس عقیدے کی وجہ سے وہ کس قدر زیادہ دہشت زدہ ہوگئے تھے اور وہ بے شمار الہوں کی جگہ الہ واحد کے عقیدے کو کس قدر عجیب اور انوکھا سمجھتے تھے ۔ اور یہ بھی بیان کر دیں کہ قریش سے قبل انسانی تاریخ میں تمام مشرکین نے کس طرح ہمیشہ اس عقیدے کی مخالفت کی اور آدم علیہ السلام سے ادھر تمام انبیائے کرام نے کس طرح ہمیشہ اس عقیدے پر اصرار کیا ۔ اور اس بات کے لیے ان تھک مساعی کیں کہ لوگ اس عقیدے کو تسلیم کرلیں اور یہ کہ حقیقتاً ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ بیٹھ جائے ۔ سب سے پہلے یہ مناسب ہے کہ قارئین عقیدۂ توحید کی اہمیت کو سمجھ لیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ عقیدۂ توحید وہ بنیادی سچائی ہے جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے اور یہ پوری کائنات نہایت وضاحت کے ساتھ وحدت الوہیت پر شہادت دیتی ہے ۔

وہ قوانین قدرت جو اس پوری زمین پر لاگو ہیں اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے بالکل ایک اکائی ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ جس ارادے کے تحت یہ قوانین وجود میں آئے ہیں ' وہ ایک ہی ارادہ ہے ۔ اس کائنات پر مجموعی نظر ڈالنے

سے یا اس کائنات کے ایک ہی جزء کے مطالعے سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر وحدت پائی جاتی ہے ـ اور یہ وحدت بتاتی ہے کہ اس کو وجود میں لانے والا ارادہ ایک ہی ہے ـ

اس کائنات میں جس قدر اشیاء ہیں' ان میں سے ہر شے متحرک ہے ـ یہ پوری کائنات چھوٹے چھوٹے ذرات سے مرکب ہے ـ خواہ زندہ کائنات ہو یا مردہ ـ یہ تمام ذرات الیکٹرون سے مرکب ہیں اور یہ الیکٹران ایک گٹھلی کے ارد گرد حرکت کرتے ہیں جو پروٹونز سے مرکب ہے ـ یہ حرکت اسی طرح ہے جس طرح کواکب سورج کے ارد گرد حرکت کرتے ہیں ـ اور جس طرح بے شمار سورجوں کا مجموعہ کہکشاں اپنے ارد گرد حرکت کرتا ہے ـ یہ تمام حرکات غرب سے شرق کی طرف حرکت کرتے ہیں ـ یہ وقت کی حرکت سے متضاد حرکت ہے ـ

وہ عناصر جن سے زمین اور دوسرے ستارے اور سیارے مرکب ہوتے ہیں یہ ایک ہی ہیں ـ تمام ستارے بھی انہی عناصر سے مرکب ہیں جن سے زمین مرکب ہے ـ یہ تمام عناصر ذرات سے مرکب ہیں اور ذرات الیکٹرون' پروٹون اور نیوٹرون سے مرکب ہیں ـ تمام ذرات بلا استثناء ان تین اجزاء سے مرکب ہیں ـ

"جس طرح پورا مادہ ان تین اجزاء سے مرکب ہے' اسی طرح قوت بھی ایک ہی اصل کی طرف لوٹتی ہے ـ روشنی اور حرارت' بنفشی شعائیں' لاسلکی شعاعیں' ماورائے بنفشی شعاعیں اور تمام دوسری شعاعیں دراصل مقناطیسی کہربائی قوت کی مختلف اقسام ہیں ـ ان کی رفتار ایک ہے' اختلاف صرف ان کی موجوں میں ہے"ـ

"مادہ تین اجزاء سے مرکب ہے اور قوت موجوں سے مرکب ہے"ـ

"آئن سٹائن کا مخصوص نظریہ اضافت یہ ثابت کرتا ہے کہ مادہ اور قوت ایک ہی چیز ہے ـ تجربات نے اس دعویٰ کی تصدیق کر دی ہے ـ ایک آخری تجربہ بھی سامنے آگیا ہے ـ جس نے جہاراً یہ اعلان کر دیا ہے اور تمام دنیا نے اسے سن لیا ہے کہ ایک جدید بم میں ایٹم نے قوت کی شکل اختیار کر لی"ـ

"یوں ثابت ہوتا ہے کہ مادہ اور قوت ایک چیز ہے"ـ[۱]

یہ ہے اس کائنات کی طبیعی تشکیل میں وحدت اور حال ہی میں انسان اس کی حقیقت کو معلوم کر سکا ہے ـ اس کائنات کی مسلسل حرکت میں بھی ایک طرح کی یگانگت اور وحدت ہے جیسا کہ ہم نے بار بار اس کی طرف اشارہ کیا ہے ـ پھر اس کائنات کی تمام حرکات منظم اور مسلسل ہیں ـ اس قدر باقاعدہ کہ ان میں سے ایک سیکنڈ کا خلل بھی نہیں پڑتا ـ نہ اس میں کوئی اضطراب ہے ـ پھر پورے نظام میں اس قدر توازن ہے کہ نہ کسی جرم فلکی کی حرکت میں تعطل آتا ہے اور نہ ہی اجرام فلکی کے درمیان کوئی تصادم آتا ہے اور وہ ستارے اور سیارے جو ان کہکشانوں میں جو ہمارے قریب ہیں اور جو اس فضائے کائنات میں تیر رہی ہیں' ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مدار' ان کی حرکت اور ان کے فاصلے متعین ہیں ـ ان کے اندر کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوتا ـ ان کی ہر چیز مقدر ہے ـ ایک منصوبے کے مطابق' یعنی یہ ایک ناقابل تغیر و تبدل منصوبے اور نقشے کے مطابق چل رہے ہیں ـ

---

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھیے "اللہ کے ساتھ آسمانوں میں" مصنفہ ڈاکٹر احمد زکی' سابق وائس چانسلر جامعہ ازہر ـ

میں سمجھتا ہوں کہ نظام کائنات کے اندر پائی جانے والی وحدت اور عقیدۂ توحید پر کائناتی شہادت کے مطالعہ کے لیے یہ سرسری وقفہ کافی ہے۔ عقیدۂ توحید وہ اہم حقیقت ہے کہ انسان کی اصلاح اور ترقی اس کے سوا کسی اور عقیدے پر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا عقیدۂ توحید کی وضاحت کے بغیر انسان کا تصور کائنات مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کائنات میں انسان کی قدر و قیمت متعین ہو سکتی ہے۔ اور نہ انسان اور اس کائنات کا باہم تعلق صحیح سمت لے سکتا ہے۔ نہ انسانوں کے ذہنوں میں اس کائنات کو وجود میں لانے والی ہستی کا تصور درست ہو سکتا ہے اور نہ انسان اور خدا کا تعلق درست ہو سکتا ہے۔ لہٰذا انسان کے شعور کو صحیح سمت دینے کے لیے اور انسان کے طرز عمل کو درست حالت میں رکھنے کے لئے عقیدۂ توحید کی تشریح ضروری ہے۔

اب دیکھیے کہ جو شخص اللہ وحدہ پر ایمان لاتا ہے' جو اس عقیدۂ توحید کے معنی کو سمجھتا ہے۔ اس کا تعلق اپنے رب کے ساتھ بھی درست ہوتا ہے۔ اور اس کا تعلق اللہ کے سوا پوری کائنات کے ساتھ بھی درست ہو جاتا ہے۔ اور یہ تعلقات نہایت حقیقت پسندانہ ہوتے ہیں اور ان میں افراط و تفریط نہیں ہوتی۔ یوں اس کے شعور میں انتشار نہیں ہوتا۔ اور اس کی سوچ مختلف الٰہوں میں نہیں بٹتی۔ اور نہ اس پر اللہ کے سوا کوئی اور مسلط ہوتا ہے۔

اور جو شخص اللہ پر ایمان لے آتا ہے اور جو اللہ کو اس کائنات کا مصدر و منبع سمجھتا ہے وہ اس کائنات کے ساتھ' اس کے اندر موجود اشیاء کے ساتھ باہم تعارف' محبت اور الفت کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور اس کی زندگی پر امید ہوتی ہے اور اس کی زندگی کی ایک ایسی صورت گری ہوتی ہے جو اس شخص سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا۔ اور وہ اپنے آپ کو اپنے ماحول اور اپنے معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں پاتا۔

وہ شخص جو اللہ پر ایمان لاتا ہے وہ اللہ کی جانب سے مخصوص ہدایات پاتا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کو اس کائنات کے اندر پائے جانے والے ناموس اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ شریعت کے مطابق تشکیل دے۔ کائنات پر بھی اللہ کا قانون جاری و ساری ہے اور انسانی زندگی پر اللہ کی مقرر کردہ شریعت جاری ہوتی ہے اور یوں انسان کی عملی زندگی اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

غرض اس حقیقت کا ادراک اس لیے ضروری ہے کہ انسان کا شعور درست ہو۔ وہ روشن ہو' وہ صحیح سمت رکھتا ہو۔ اور وہ اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات کے ساتھ ہم آہنگ متناسق اور متوازن ہو۔ اور انسان کے باہمی تعلقات' اس کائنات کے ساتھ تعلقات اور اپنے معاشرے کے ساتھ تعلقات واضح اور متعین ہوں۔ یہ تعلقات اخلاقی ہوں یا طرز عمل سے متعلق ہوں' اجتماعی معاملات سے متعلق ہوں' شخصی ہوں یا انسانی ہوں۔ (۱) [1]

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم عقیدۂ توحید کو اس قدر اہمیت دیتا ہے اور عقیدۂ توحید کے لیے یہ جدوجہد آدم علیہ السلام سے ادھر آنے والے تمام انبیاء نے کی ہے۔ اور تمام رسولوں نے عقیدۂ توحید پر سخت اصرار کیا ہے۔ کلمہ توحید کے الفاظ بھی ایک رہے ہیں اور مفہوم بھی ایک رہا ہے۔

---

(۱) میں ارادہ رکھتا ہوں کہ ان نکات کی تفصیل ایک مجوزہ کتاب "انسان' انسانی زندگی اور اس کائنات کے بارے میں اسلامی تصور" میں مرتب کروں۔ (سید قطب)

قرآن میں تو عقیدۂ توحید پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ اسے بار بار دہرایا گیا ہے ـ اس پر اصرار کیا گیا ہے ـ مسئلہ توحید اور اس کے تقاضوں کی بار بار مختلف اسالیب سے تشریح کی گئی ہے ـ خصوصاً مکی سورتوں میں تو اس پر بہت زور دیا گیا ہے جبکہ مدنی سورتوں میں بھی عقیدۂ توحید پر مدنی موضوعات کے اعتبار سے زور دیا گیا ہے ـ جہاں حاکمیت اور قانون سازی کے حق کا پہلو زیادہ نمایاں ہے ـ

یہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے مشرکین مکہ تعجب کر رہے تھے کہ حضور اکرمؐ تمام الہوں کو رد کر کے صرف ایک ہی اللہ کے قائل ہیں ـ چنانچہ اس پر وہ حضور اکرمؐ سے الجھتے تھے ـ تعجب کرتے تھے' لوگوں کو اس نظریہ سے پھیرتے تھے اور اس نظریہ حیات کے خلاف اپنے تمام وسائل انہوں نے مجتمع کر لیے تھے ـ

اب ان کے تعجب کا دوسرا پہلو' یہ کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دولت اور شخصی وجاہت کے زاویہ سے منصب نبوت کے قابل نہ سمجھتے تھے ـ وہ سمجھتے تھے کہ قائد کوئی خان اور نواب ہونا چاہئے ـ

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ۭ

"کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کیا گیا؟" یہ کوئی قابل تعجب بات تو نہ تھی مگر اکابرین قریش حسد میں مبتلا تھے ـ اس حسد کی وجہ سے وہ غرور' دشمنی اور کینہ پر اتر آتے تھے ـ

• ابن اسحاق نے محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری سے نقل کیا ہے کہ ایک بار ابوسفیان ابن حرب' ابوجہل ابن ہشام اور اخنس ابن شریق ابن عمرو ابن وہب ثقفی حلیف بنی زہرہ رات کے وقت نکلے کہ قرآن سنیں ـ حضورؐ رات کے وقت نماز میں قرآن کریم پڑھا کرتے تھے ـ ان تینوں میں سے ہر شخص دوسرے سے بے خبر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گیا ـ رات دیر تک یہ سنتے رہے ـ جب سپیدۂ صبح نمودار ہوئی تو یہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے ـ راستے میں وہ اتفاقاً مل گئے اور انہوں نے ایک دوسرے کو خوب ملامت کی ـ انہوں نے ایک دوسرے سے کہا آئندہ یہ حرکت مت کرو' اگر بعض نادانوں نے تمہیں دیکھ لیا تو ان کے دلوں میں بات بیٹھ جائے گی ـ یہ لوگ چلے گئے جب دوسری رات ہوئی تو دوبارہ ہر شخص پھر آکر اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھ گیا ـ رات گئے تک سنتے رہے ـ جب فجر نمودار ہوئی تو یہ لوگ نکلے اور راستے میں پھر اکٹھے ہو گئے ـ انہوں نے گزشتہ رات کی طرح ایک دوسرے کو ملامت کی ـ اور چلے گئے ـ تیسری رات کو پھر ہر شخص آکر بیٹھ گیا ـ رات کو سنتے رہے ـ جب فجر ہوئی تو جانے لگے اور راستے میں پھر ایک دوسرے کو دیکھ لیا ـ اب انہوں نے کہا کہ جب تک ہم کوئی معاہدہ نہ کر لیں' نہ جائیں گے ـ چنانچہ انہوں نے باقاعدہ معاہدہ کیا اور پھر چلے گئے ـ صبح ہوئی تو اخنس ابن شریق نے اپنی عصا لی ـ یہ پہلے ابوسفیان کے پاس گیا ـ اس نے کہا ابوحنظلہ تم نے محمد سے جو کچھ سنا' بتاؤ ـ اس کے بارے میں کیا رائے ہے ـ اس نے کہا میں نے بعض باتیں سنی جو میرے علم میں ہیں اور میں ان کا مطلب بھی سمجھتا ہوں اور بعض باتیں میں نے نہیں سنی اور نہ میں ان کا مطلب سمجھتا ہوں ـ تو اس نے کہا خدا کی قسم میرا بھی یہی حال ہے ـ اس کے بعد یہ شخص ابوجہل کے پاس آیا ـ اس کے گھر میں اس سے ملا ـ اس سے کہا ابوالحکم' محمد سے تم نے جو کچھ سنا' اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے کہا میں نے کیا سنا؟ ہمارا اور بنو عبدمناف کے درمیان ہمیشہ مقابلہ رہا ـ انہوں نے کھانا کھلایا' ہم نے بھی کھلایا ـ انہوں نے لوگوں کو سواریاں دیں' ہم نے بھی سواریاں دیں ـ انہوں نے عطیے دیئے ہم نے بھی عطیے دیئے ـ جنگ

میں بھی ہم نے مقابلہ کیا یہاں تک کہ ہم مقابلے کے گھوڑوں کی طرح ساتھ ساتھ رہے ـ اب وہ کہتے ہیں ہم میں نبی پیدا ہو گیا ہے ـ اس پر آسمانوں سے وحی آتی ہے اب ہم ان کے مقابلے میں نبی کہاں سے لائیں ؟ کبھی بھی ہم اس پر ایمان نہ لائیں گے ' خدا کی قسم اور کبھی بھی اس کی تصدیق نہ کریں گے ـ اخنس اٹھ کھڑا ہوا اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا ـ

دیکھئے یہ کھلا کینہ ہے جس کی وجہ سے ابو جہل حق کا اعتراف نہیں کر رہا ہے ـ حالانکہ جب مسلسل تین راتوں کو وہ کلام الٰہی سن رہا تھا تو وہ جانتا تھا کہ یہ برحق ہے ـ یہ حسد اور کینہ تھا جو اس کے ایمان کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا یہی ہے راز اس بات میں ہے ـ

ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَیْنِنَا (۳۸ : ۸) "کیا ہمارے درمیان میں اس شخص پر کلام الٰہی نازل ہوا' اور کوئی نہ تھا" ـ

یہی لوگ تھے جو یہ کہتے تھے ـ

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ (۴۳ : ۳۱) "یہ قرآن ان دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ ہوا" ـ ان دو بستیوں سے ان کی مراد مکہ اور طائف تھی ـ جہاں قریش کے اکابر حکمران تھے ـ جہاں ان لوگوں کی مذہبی سیادت و قیادت قائم تھی ـ نیز انہوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ ایک نیا نبی آنے ہی والا ہے اور جب اللہ نے یہ منصب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کر دیا تو یہ لوگ جل بھن گئے ـ اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ اللہ کی اس عظیم رحمت اور اس اونچے منصب کے مستحق وہ نہیں ہیں ـ کیا سارے جہاں سے محمد ہی اس کے مستحق ٹھہرے ؟

اللہ تعالیٰ بھی ان کو اسی انداز میں جواب دیتا ہے حقارت کے ساتھ' جس کے اندر تہدید اور ڈراوے کے اشارات موجود ہیں ـ

بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِیْ ۚ بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝

"اصل بات یہ ہے کہ یہ میرے "ذکر" پر شک کر رہے ہیں' اور یہ ساری باتیں اس لیے کر رہے ہیں کہ انہوں نے میرے عذاب کا مزا چکھا نہیں ہے" ـ

ان کا سوال یہ تھا کہ "کیا ہمارے درمیان سے نزول قرآن کے لیے صرف اس شخص کا انتخاب کیا جانا تھا؟" جبکہ وہ خود قرآن کی سچائی ہی کے بارے میں مشکوک ہیں ـ ان کے دلوں کے اندر یہ یقین ہی نہیں ہے کہ یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہے ـ وہ تو حقیقت وحی کے بارے میں سخت خلجان میں تھے لیکن اس کے باوجود یہ بھی وہ تسلیم کرتے تھے کہ یہ قرآن ایک عام کلام کے مقابلے میں ایک بلند پایہ کلام ہے ـ

اب قرآن کریم کے بارے میں ان کی بات سے روئے سخن پھر جاتا ہے ـ اور ان کے خلجان کو بھی ایک طرف چھوڑ دیا جاتا ہے ـ اور ان کو سخت عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے ـ

بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَاب (۳۸ : ۸) "یہ ساری باتیں اس لیے کر رہے ہیں کہ انہوں نے میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا۔ یعنی اللہ نے اپنی مہربانی سے نجات دی ہوئی ہے لیکن جب ان کو عذاب نے آلیا تو پھر وہ ایسی باتیں نہ کریں گے۔ اس وقت ان کو حقیقت حال کا اچھی طرح علم ہو جائے گا۔

اب آخری تبصرہ یہ آتا ہے کہ یہ لوگ حضرت محمد ﷺ پر ہونے والے فضل و کرم کو ان کے استحقاق سے زیادہ سمجھتے ہیں تو سوال یہ کیا جاتا ہے کہ کیا رحمت ربی کی تقسیم کے انچارج یہ ہیں اور ان کا اختیار ہے کہ کسی پر رحمت کریں کس پر نہ کریں۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۝

"کیا تیرے داتا اور غالب پروردگار کی رحمت کے خزانے ان کے قبضے میں ہیں"۔

یہ ان کو سخت تنبیہہ ہے کہ ان کی یہ باتیں بارگاہ عزت میں صریح گستاخی ہیں۔ یہ ان معاملات میں ٹانگ اڑا رہے ہیں جن میں مداخلت کرنے کا ان کو کوئی حق نہیں ہے۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ کسی پر فضل کرتا ہے یا کسی سے اپنے فضل کو روکتا ہے۔ وہ غالب ہے' قدرتوں والا ہے' کوئی شخص اس کے ارادے کے سامنے بطور رکاوٹ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ وہ داتا ہے' سخی ہے اور اس کی داد و دہش کی کوئی حد نہیں ہے۔

یہ لوگ اس بات پر چیں بجبیں ہیں کہ حضرت محمدؐ رسول بنا دیئے گئے ہیں۔ کیا اللہ کی کرم نوازیوں کی تقسیم ان کے ہاتھ میں ہے؟ کیا اللہ کے خزانے ان کے چارج میں ہیں؟

اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

"کیا یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مالک ہیں"۔ اس کا وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے کیونکہ یہ دعویٰ وہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ خود ان کا یہ عقیدہ تھا کہ زمین اور آسمانوں کا مالک اللہ ہے اور وہ دیتا ہے اور وہی روکتا ہے۔ وہ کرم نوازیاں کرتا ہے اور وہی مناصب عطا کرتا ہے۔ اور چونکہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کا اقتدار انہیں حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اللہ مقتدر اعلیٰ کے معاملات میں ان کو دخل بھی نہ دینا چاہئے وہ تو بلاقید متصرف ہے۔

اب بطور مزاح اور لاجواب کرنے کی خاطر انہیں کہا جاتا ہے کہ اگر ان کا جواب اثبات میں ہے کہ وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے مقتدر اعلیٰ ہیں تو وہ اپنی قوت مقتدرہ کو کام میں لائیں۔

فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ۝

"اچھا تو یہ عالم اسباب کی بلندیوں پر چڑھ کر دیکھیں!؟" تاکہ زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان جو مدارج ہیں ان پر ان کا کنٹرول ظاہر ہو۔ اور وہ اللہ کے کام خود سرانجام دیں۔ اللہ کے خزانوں کی تقسیم کریں۔ جسے چاہیں' دیں اور جس سے چاہیں روک لیں۔ جب کہ ان کے رویے کا تقاضا ہے کہ وہ منصب نبوت کی تقسیم پر اعتراضات کرتے ہیں۔ یہ تو تھا مزاح' اب حقیقت کیا ہے اور کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں یہ لوگ؟

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ﴿۱۱﴾

"یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھہ ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے"۔ ان کا انجام اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ دور جاکر پھینک دیئے جائیں اور ان کے اس لشکر کو شکست ہو جائے۔ وہ مقام جس کا اپنے لئے یہ دعویٰ کرتے ہیں اس سے بہت دور اور بہت فروتر کسی جگہ ان کا لشکر شکست کھانے والا ہے۔ یہ لشکر اللہ کی مملکت میں دخیل نہیں ہے۔ یہ اللہ کے ارادوں کو نہیں بدل سکتا۔ اور اللہ کی مشیت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ ایک مجہول النسب لشکر ہے، مجہول الشان ہے اور شکست خوردہ ہے۔ گویا شکست اس کی لازمی صفت ہے۔ اس کی شخصیت کا حصہ ہے اور یہ لشکر مختلف احزاب سے بنا ہوا ہے۔ جن کے رجحانات مختلف ہیں اور جن کی خواہشات مختلف ہیں۔

اللہ اور رسول اللہ کے دشمن صرف اسی قدر ترقی کر سکتے ہیں جس کی تصویر کشی قرآن کریم کمزوری، عجز اور ضعف کے رنگوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اور یہ تاثر دیتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے تصرف اور تدبیر کے دائرے سے بہت ہی دور ہیں۔ اگرچہ دنیا کی نظروں میں وہ جبار و قہار ہوں اور ان کی پکڑ سخت ہو اور کچھ عرصہ کے لیے دنیا میں ان کی بات چلتی ہو۔

پوری تاریخ انسانی میں ایسے جباروں کے بارے قرآن مجید یہ تصویر کشی کرتا ہے۔

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ (۳۸: ۱۱) "یہ تو جتھوں میں سے ایک چھوٹا سا جتھا ہے جو اسی جگہ شکست کھانے والا ہے"۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ﴿۱۲﴾ وَ ثَمُوْدُ وَ قَوْمُ لُوْطٍ وَّ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ ؕ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ﴿۱۳﴾ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿۱۴﴾

۱
۱۴ع
۱۰

"ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد، اور میخوں والا فرعون اور ثمود اور قوم لوط اور ایکہ والے جھٹلا چکے ہیں۔ جتھے وہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور میری عقوبت کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو کر رہا"۔

یہ مثالیں تو ان لوگوں کی ہیں جو قریش سے قبل تاریخ میں گزرے ہیں۔ قوم نوح، قوم عاد، فرعون جو بڑے بڑے اہراموں والا تھا۔ یہ اہرام زمین پر ایسے ہیں جیسی میخیں، قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب جنہیں اصحاب الایکہ بھی کہا جاتا ہے یعنی گھنے جنگلوں والے، یہ ہیں وہ جتھے جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ تو انجام کیا ہوا ان کا۔ حالانکہ وہ بڑے جبار اور پکڑ والے تھے۔ یہ ہوا کہ فَحَقَّ عِقَابِ (۳۸: ۱۴) "میرے عذاب کا فیصلہ ان پر چسپاں ہوا"۔ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ وہ اس طرح نیست و نابود کر دیئے گئے کہ ان کا کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے۔

یہ تو تھی پوزیشن ان لوگوں کی جو زمانہ ماضی میں گزرے۔ رہے یہ لوگ تو ان کے لیے بھی ایک عذاب آنے والا

ہے - یہ دن یوم الحساب سے قبل آئے گا اور ایک چیخ ہوگی اور پوری دنیا میں کچھ نہ رہے گا۔

وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾

"یہ لوگ بھی بس ایک دھماکے کے منتظر ہیں جس کے بعد کوئی دوسرا دھماکہ نہ ہوگا"۔

یعنی جب یہ وقت آئے گا تو اس میں اس قدر تاخیر بھی نہ ہوگی جس قدر اونٹنی کا دودھ دوہنے کے دو اوقات میں ہوتا ہے - اس لیے کہ دودھ دینے والے جانوروں کا دودھ وقت مقررہ پر نکالا جاتا ہے جس میں تقدیم و تاخیر نہیں کی جاتی - یہ امت آخری امت ہے اور اللہ نے اسے قیامت تک کا وقت اور مہلت دے دی ہے - کیونکہ اس امت کو اللہ امم سابقہ کی طرح نیست و نابود نہیں کرتا۔

یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اس امت کو اللہ نے طویل مہلت دے دی ہے لیکن افسوس کہ اہل قریش نے اس کو غنیمت نہ جانا اور اس پر خدا کا شکر ادا نہ کیا - الٹا اپنے مقررہ انجام کے جلدی آنے کا مطالبہ کرتے رہے' دعا کرتے رہے کہ اے اللہ' تم میں سے جس کا انجام برا ہے جلدی وہ اس تک پہنچ جائے - اور یوم الحساب سے بھی پہلے اسی دنیا میں یہ عذاب آجائے۔

وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾

"اور یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب' یوم الحساب سے پہلے ہی ہمارا حصہ ہمیں جلدی سے دے دے" - بس یہاں آکر قرآن مجید ان کے بارے میں بات ختم کر دیتا ہے اور روئے سخن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے - آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ ان کی حماقتوں کی پرواہ نہ کریں - یہ عذاب کا مطالبہ کر کے اللہ کے جناب میں سوء ادب کا ارتکاب کر رہے ہیں - دراصل یہ قیامت کے قیام پر یقین ہی نہیں رکھتے - اللہ کی رحمت پر ناشکری کرتے ہیں - آپ کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ انبیائے سابقہ کے حالات پڑھیں کہ ان پر کیا کیا آزمائشیں آئیں - اور اس کے بعد اللہ کی رحمتیں ان پر نازل ہوئیں۔

--- ooo ---

درس نمبر ۲۱۲ تشریح آیات

۱۷ --- تا --- ۴۸

یہ پورا سبق قصص اور رسولوں کی زندگیوں کی اعلیٰ مثالوں پر مشتمل ہے ۔ یہ مثالیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس لیے پیش کی جارہی ہیں کہ آپ ذرا رسل سابقین کی زندگیوں پر غور کریں اور قریش جو تکذیب کر رہے تھے ۔ الزام تراشیاں کرتے تھے ' الزام لگاتے تھے اور آپ کی رسالت کو انوکھا سمجھتے تھے ' اس پر صبر کریں اور ان مشکلات کو برداشت کریں جن کی وجہ سے انسان کا جی بھر آتا ہے ۔

یہ تمام قصص ' حضور اکرم ﷺ کو تسلی دینے کے لیے رسولوں پر اللہ کی رحمتوں اور مہربانیوں کے واقعات پیش کرتے ہیں ۔ اس طرح کہ ان رسولوں پر اللہ نے کیا کیا کرم نوازیاں کیں ' بعض رسولوں کو اللہ نے حکومتیں اور بڑی بڑی سلطنتیں عطا کیں ۔ اور ان پر بڑے بڑے انعامات کیے ۔ یہ واقعات اس لیے بیان کیے کہ اہل قریش کو اس بات پر تعجب ہو رہا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب رسالت کیوں عطا کر دیا گیا ۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کوئی پہلے رسول نہ تھے ۔ رسولوں کو تو بڑی بڑی مملکتیں عطا ہوئی ہیں ۔ بعض کے لیے تو پہاڑ بھی مسخر کر دیے گئے اور پرندے ان کے ساتھ مل کر تسبیح پڑھتے تھے ۔ بعض کے لیے ہوائیں مسخر تھیں اور جن اور شیطان بھی ان کے تابع تھے مثلاً داؤد و سلیمان علیہما السلام ۔ آخر یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ محمد ابن عبداللہ کو نبی آخر الزمان کے منصب کے لیے منتخب کر دیا گیا ۔

ان قصص میں یہ بھی ثبت ہے کہ اللہ اپنے رسولوں کی نگرانی ہروقت کرتا رہتا ہے ۔ ان کی زندگی کے ہر موڑ پر ہر وقت ہدایات دی جاتی ہیں ' ان کو تجربات کرائے جاتے ہیں ۔ وہ بھی بشر تھے جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں ۔ ان رسولوں میں بشری کمزوریاں بھی تھیں ۔ چنانچہ اللہ ہروقت نگرانی کر کے ان کو بشری کمزوریوں سے بچاتا تھا ۔ اللہ ہروقت ان کو صحیح موقف بتاتا ہے ' ان کی راہنمائی کرتا ہے اور ان کو آزماتا ہے تاکہ ان کی لغزشوں پر مغفرت کر دے ۔ یہ باتیں بتانے سے حضور اکرم ﷺ کے دل کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ اپنے رب کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ آپ کی نگرانی اور حمایت کر رہا ہے ۔

اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾

"اے نبیؐ صبر کرو ان باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں' اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کرو جو بڑی قوتوں کا مالک تھا۔ ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کر رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ پرندے سمٹ آتے' سب کے سب اس کی تسبیح کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی تھی' اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی"۔

اِصْبِرْ صبر کرو' یہ تمام رسولوں کی زندگی کا اہم خاصہ ہے۔ وہ خاصہ جس کی بناء پر یہ سب لوگ ایک ہی گروہ قرار پاتے ہیں۔ سب اسی راہ پر چلے' سب نے تکالیف برداشت کیں۔ سب پر آزمائشیں آئیں اور سب نے ان پر صبر کیا۔ صبر سب کا زاد راہ تھا۔ انبیائی سلسلہ کے اندر سب نے درجہ بدرجہ مشکلات برداشت کیں۔ ان کی زندگی تجربہ تھی اور یہ تجربہ مشقتوں اور ابتلاؤں سے بھرا ہوا تھا۔ مصائب پر وہ صبر کرتے تھے اور یہ ان کے لیے آزمائش تھی اور پھر اللہ کے فضل و کرم پر بھی وہ صبر کرتے تھے اور یہ بھی ابتلا تھی۔ دونوں حالات میں صبر ضروری ہوتا ہے اور انہوں نے صبر کیا۔

جس طرح قرآن نے رسولوں کی زندگی کی حکایات بیان کی ہیں اگر ہم ان سب کو پیش نظر رکھیں تو ان کی زندگی کی بنیاد اور ان کی زندگی کا اہم فیچر ہی صبر ہے۔ ان کی پوری زندگی عبارت ہے آزمائشوں' مشقتوں اور جدوجہد اور صبر و مصابرت سے۔

انبیاء کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزمائشوں پر مشتمل ایک برگزیدہ زندگی ہے۔ فی الواقع یہ ایک پر مشقت زندگی ہے۔ یہ ایک کھلی کتاب ہے' جس کے اندر صرف ابتلاؤں اور صبر کے نغمے لکھے ہوئے ہیں۔ اور انسانیت کے لیے بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں تاکہ تاریخ کے اندر اس بات کو ریکارڈ کر دیا جائے کہ روح انسان کس طرح مصائب اور زندگی کی ضروریات اور سہولیات کی خواہش پر غالب ہو جاتی ہے۔ اور انسانی روح کس طرح ان تمام اقدار سے برتر ہو جاتی ہیں جن پر دنیا فخر کرتی ہے اور کس طرح انسانی روح دنیا کی دھوکہ دینے والی چیزوں اور نفس کو مرغوب چیزوں سے لاتعلق ہو جاتی ہے۔ صرف اللہ کے لیے ہو جاتی ہے اور یوں آزمائشوں میں فلاح پالیتی ہے۔ وہ اللہ کو تمام ماسوا اللہ پر ترجیح دے دیتی ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ہی پھر وہ انسانیت کو چیلنج کر کے کہہ سکتی ہے کہ یہ ہے طریق زندگی۔ یہ ہے سربلندی کی راہ۔ اور یہ ہے وہ راہ جو نہایت ہی بلندیوں پر اللہ کی طرف جاتی ہے۔

اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (۳۸ : ۱۷) "یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو"۔ اور وہ کیا باتیں کرتے تھے؟

ھٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ (۳۸ : ۴) "یہ جادوگر ہے بہت بڑا جھوٹا"۔ اور وہ یہ کہتے تھے۔

اَجَعَلَ الْاٰلِھَةَ اِلٰھًا وَّاحِدًا (۳۸ : ۵) "کیا اس نے تمام الہوں کی جگہ ایک خدا ٹھہرایا ہے"۔ اور وہ یہ کہتے تھے۔

ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّکْرُ (۳۸ : ۸) "کیا خدا کے کلام کے لیے ہمارے درمیان میں سے صرف اسی کا

انتخاب ہونا تھا" وغیرہ - اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو متوجہ فرماتا ہے کہ بس آپ صبر کرتے چلے جائیں - اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ ان کفار کے ماڈلوں کے مقابلے میں کچھ دوسرے ماڈلوں میں زندہ رہیں - پرخلوص اور شریف النفس ماڈلوں کے ساتھ - یہ ماڈل آپ کے بھائی انبیائے سابقہ کے ماڈل ہیں - آپ کے سامنے ان کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ آپ ان کے ساتھ قریبی تعلق کا احساس کریں کہ یہ ہیں آپ کے بھائی' آپ کے نسبی اور رشتہ دار - چنانچہ حضور فرماتے ہیں - اللہ میرے فلاں بھائی پر رحم کرے .... اور میں اس نبی کا زیادہ قریبی ہوں -

اصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (۳۸:۱۷)

"اے نبی صبر کرو' ان باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کرو' جو بڑی قوتوں کا مالک تھا اور ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا" - داؤد علیہ السلام کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نہایت قوتوں والے تھے لیکن ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے - اس سے قبل قوم نوح' قوم عاد اور فرعون' قوم ثمود' قوم لوط اور اصحاب ایکہ کا ذکر ہوا تھا - یہ سب اقوام نہایت ہی سرکش تھیں - وہ اپنی قوت کا اظہار یوں کیا کرتی تھیں کہ وہ لوگوں پر ظلم' زیادتی کرتی تھیں اور حق کی تکذیب کرتی ہیں - اس کے مقابلے میں داؤد علیہ السلام بھی بڑی قوتوں والے تھے - لیکن وہ اواب تھے - ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے - اللہ کے مطیع' عبادت گزار اور اسے یاد کرنے والے - حالانکہ وہ قوتوں والے اور مقتدر اعلیٰ تھے -

حضرت داؤد کے قصے کا ابتدائی حصہ اور طالوت کے لشکر میں ان کی نمایاں کارکردگی بیان ہو چکی ہے - موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کا یہ لشکر طالوت کی قیادت میں اٹھا تھا - اس دور میں بنی اسرائیل زوال پذیر تھے اور انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ ہمارے لیے اللہ کی طرف سے بادشاہ اور قائد ریاست مقرر ہو - یہ لشکر بنی اسرائیل کے جبار دشمن جالوت سے ٹکرایا - داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا - اس دور میں حضرت داؤد نوجوان تھے - یوں ان کا ستارہ چمکا اور بالآخر وہ بادشاہ بن گئے - لیکن ان کا رویہ یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے - اطاعت شعار اور عبادت گزار تھے اور ہر وقت ذکر و استغفار میں لگے رہتے تھے -

اس اقتدار و سلطنت کے ساتھ اللہ نے ان کو نبوت بھی عطا کی اور نہایت ہی خوبصورت آواز ان کو دی گئی تھی - یہ نہایت ہی خوش الحانی کے ساتھ اللہ کی ثنا کرتے تھے - یہ ذکر میں اس قدر مستغرق تھے اور حمد و ثنا کو اس قدر ترتیل سے پڑھتے تھے کہ ان کے اور اس کائنات کے درمیان کے تمام پردے اٹھ گئے تھے - یوں ان کے ساتھ پرندے' اور پہاڑ بھی ثنا پڑھتے تھے اور اللہ کی تعریف و تمجید کرتے تھے - پہاڑ ان کے ساتھ گنگناتے تھے اور پرندے ان کے اردگرد پھڑپھڑاتے تھے - اور سب کے سب مولائے کریم کے ثنا خواں تھے -

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ (۳۸:۱۸) وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ (۳۸:۱۹) "ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کر رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے - پرندے سمٹ آتے سب کے سب اس کی تسبیح کی طرف متوجہ ہو جاتے" -

عام لوگ اگر اس آیت کو پڑھیں تو حیران رہ جائیں گے کہ جامد پہاڑ کس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور یہ تسبیح وہ صبح و شام کرتے تھے، خصوصاً جب وہ اپنے رب کی یاد کے لیے تخلیہ میں جاتے تھے۔ وہاں وہ اللہ کی حمد گاتے تھے۔ نہایت ہی خوش الحانی کے ساتھ۔ اور اللہ کی تعریف و تمجید کرتے تھے۔ پرندے ان کے نغمات کو سن کر جمع ہوتے تھے۔ اور وہ بھی ان کو دہراتے تھے۔ فی الواقع لوگوں کے لیے یہ بات حیران کن ہوگی۔ کیونکہ عادی امور اور عادی روش اس کے خلاف ہے۔ لوگ جب گوشہ نشین ہوتے ہیں تو وہ ایسی باتیں محسوس نہیں کرتے۔ انسانوں اور پرندوں کے اجناس میں اور جامد پہاڑوں کے درمیان یہ یگانگت کیسے وجود میں آگئی۔

لیکن اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ کوئی تعجب خیز دعویٰ نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تمام مخلوقات کی حقیقت اور ماہیت ایک ہے۔ اگرچہ شکل و صورت اور جنس و نوع میں وہ باہم مختلف ہیں۔ یہ سب چیزیں اپنے خالق کے حوالے سے ایک ہیں۔ اور ایک کلی وجود کا حصہ ہیں۔ زندہ وجود ہو یا غیر زندہ چیزیں ہوں۔ جب ایک انسان اپنے رب کے لیے خالص ہو جاتا ہے اور اسے صفائے باطن اور اشراق کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے تو جنس و نوع کے یہ تمام پردے اٹھ جاتے ہیں اور یہ تمام چیزیں اپنی اصل حقیقت کے ساتھ سامنے آ جاتی ہیں۔ یہ سب مخلوق ان ظاہری پردوں کی پشت سے ایک ہو جاتی ہیں۔ مختلف اجناس، اصناف، شکلیں اور صورتیں، ظاہری رنگ اور خصوصیات تو دراصل پردے ہیں۔ حقیقت ان کے پیچھے ہے۔

وَ شَدَدْنَا مُلْكَهُ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ (۳۸ : ۲۰) "ہم نے اس کی حکومت مضبوط کر دی تھی اور اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی"۔ چنانچہ آپ کی حکومت بہت ہی مضبوط تھی۔ آپ کی حکومت کی پالیسی حکمت دانش مندی اور ٹھوس فکر پر مبنی تھی۔ اور اس کے فیصلے دو ٹوک ہوتے تھے۔ آپ کے اندر بے پناہ قوت فیصلہ تھی۔ کسی حکومت میں جب قوت اور حکمت جمع ہو جائے تو وہ کمال کی انتہاؤں کو چھو لیتی ہے۔

لیکن ان کمالات کے باوجود حضرت داؤد پر بھی اللہ کی طرف سے امتحان آئے۔ ان کو بھی آزمایا گیا۔ ان آزمائشوں میں بھی وہ اللہ کی نگرانی میں رہے، کیونکہ وہ پیغمبر تھے اور اللہ اپنے پیغمبروں کو غلطی سے بچاتا ہے۔ ان کی کمزوریوں کے مقامات پر دست گیری کرتا ہے۔ اور اس راہ کی مشکلات سے انہیں بچاتا ہے۔ احتیاط کے طریقے سکھاتا ہے۔

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ ۗ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۗ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا

مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ۗ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۩

"پھر تمہیں کچھ خبر پہنچی ہے ان مقدمے والوں کی جو دیوار چڑھ کر اس کے بالاخانے میں گھس آئے تھے؟ جب وہ داؤد کے پاس پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ انہوں نے کہا "ڈریئے نہیں' ہم دو فریق مقدمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے' بے انصافی نہ کیجئے اور ہمیں راہ راست بتائیے۔ یہ میرا بھائی ہے' اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دنبی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک دنبی بھی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا لیا"۔ داؤد نے جواب دیا: "اس شخص نے اپنی دنبیوں کے ساتھ تیری دنبی ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تجھ پر ظلم کیا' اور واقعہ یہ ہے کہ مل جل کر ساتھ رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں' بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے اور عمل صالح کرتے ہیں' اور ایسے لوگ کم ہی ہیں"۔ داؤد سمجھ گیا کہ یہ تو ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے' چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رجوع کر لیا"۔

اس واقعہ کی تشریح یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے وقت کا ایک حصہ امور مملکت کو دیتے تھے' لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے۔ کچھ وقت وہ خلوت تنہائی' عبادت اور حمد و ثنا اور حمد الٰہی کے ترانے پڑھنے کے لیے دیتے تھے۔ جب آپ محراب میں خلوت گزیں ہوتے تھے تو کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ جب تک کہ آپ خود باہر نہ آجائیں۔

ایک دن یوں ہوا کہ دو افراد دیوار پھلانگ کر اس خلوت گاہ میں گھس آئے۔ آپ ان کے اس طرح گھس آنے سے گھبرا گئے۔ کیونکہ کوئی اہل ایمان یا کوئی ذمہ دار شخص یوں ان کی خلوت گاہ میں نہ آ سکتا تھا۔ چنانچہ ان دو افراد نے بھی آپ کے خوف کو محسوس کیا اور جلدی سے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ (۳۸ : ۲۲) "انہوں نے کہا ڈریئے نہیں' ہم دو فریق مقدمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے"۔ چنانچہ ہم فیصلے کے لیے آئے ہیں۔

فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ (۳۸ : ۲۲) "آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے' بے انصافی نہ کیجئے اور ہمیں راہ راست بتائیے"۔ اس کے بعد ایک نے بیان دعویٰ شروع کر دیا۔

اِنَّ هٰذَآ اَخِىْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِىَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِىْ فِى الْخِطَابِ (۳۸ : ۲۳)

"یہ میرا بھائی ہے' اس کے پاس ۹۹ دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ یہ ایک

دنبی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبالیا"۔ اکفلنی کے معنی ہیں مجھے دے دے، میری ملکیت میں دے دے اور میری کفالت میں دے دے اور عزنی کے معنی ہیں مجھ پر بات میں سختی کی اور غالب ہوگیا۔

جہاں تک مقدمے کا تعلق ہے خود بیان دعویٰ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا ظالمانہ فعل ہے جس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ حضرت داؤد نے بھی جواب دعویٰ سننے سے پہلے ہی فیصلہ کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ بادی النظر میں اس بھائی کا فعل ظالمانہ تھا۔ اس لیے حضرت داؤد نے دوسرے فریق سے بات ہی نہ کی۔ نہ جواب دعویٰ سنا نہ اس سے کوئی عذر طلب کیا۔ بس دعویٰ سن کر ہی فیصلہ کر دیا۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ (۳۸: ۲۴)

"داؤد نے جواب دیا اس شخص نے اپنی دنبیوں کے ساتھ تیری دنبی ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تجھ پر ظلم کیا اور واقعہ یہ ہے کہ مل جل کر رہنے والے لوگ اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں۔ بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے ہوں اور عمل صالح کرتے ہیں اور ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں"۔ خلطاء سے مراد اقربا جو اکٹھے ہوتے رہتے ہیں۔ سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اشخاص اس مرحلے پر غائب ہوگئے کیونکہ یہ فرشتے تھے اور امتحان لینے آئے تھے یعنی اس نبی کا امتحان مطلوب تھا جسے اللہ نے عوام الناس کا حاکم اور سربراہ اور جج بنایا تھا۔ اور حکم دیا تھا کہ لوگوں کے درمیان عدل کے مطابق فیصلہ کریں۔ اور فیصلہ سنانے سے قبل مقدمات کی اچھی طرح تفتیش کریں۔ امتحان اس طرح زیادہ شدید ہو جاتا ہے جب ان کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش کیا جاتا ہے تو بادی النظر میں صریح ظلم نظر آتا ہے لیکن ایک جج کا یہ رویہ ہوتا ہے کہ وہ کسی فریق کی بات سے متاثر نہ ہو۔ وہ جلدی میں فیصلہ نہ کرے۔ محض ظاہری باتوں یا حالات پر فیصلہ نہ کرے۔ بیان دعویٰ کے مقابلے میں جواب دعویٰ طلب کرے۔ کیونکہ بعض اوقات جواب دعویٰ سننے سے دعویٰ کی حیثیت ہی بدل جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بیان دعویٰ اگر ظاہراً درست ہے مگر درحقیقت مسئلہ کی نوعیت دوسری ہے۔ یا یہ کہ مدعی بعض باتیں چھپا رہا ہے اور دھوکہ دے رہا ہے۔

اس مقام پر داؤد علیہ السلام کو یہ خیال آیا کہ یہ معاملہ کوئی حقیقی مقدمہ نہ تھا بلکہ پرچہ امتحان تھا۔

وَظَنَّ دَاوُودُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ (۳۸: ۲۴) "اب داؤد کو یقین ہوگیا کہ ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے"۔ یہاں اب ان کا اصل مزاج سامنے آتا ہے۔ وہ تو ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ (۳۸: ۲۴) "السجدۃ" "چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رجوع کر لیا"۔

فَغَفَرْنَا لَهُ ذَٰلِكَ ۖ وَإِنَّ لَهُ عِندَنَا لَزُلْفَىٰ وَحُسْنَ مَآبٍ ﴿٢٥﴾

"تب ہم نے اس کا وہ قصور معاف کیا اور یقیناً ہمارے ہاں اس کے لیے تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے"۔

بعض تفاسیر نے اس آیت کے تحت اسرائیلیات سے رطب و یابس جمع کیا ہے اور حضرت داؤد کی آزمائش کے معاملے میں بہت دور تک چلے گئے ہیں۔ انہوں نے ایسی باتیں بھی نقل کی ہیں جو نبوت کے شایان شان ہی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ مطلقاً منصب نبوت کے ساتھ یکجا نہیں ہو سکتیں۔ بعض روایات نے اگرچہ بعض انسانوں کی تاویل کر کے ان کی قباحت کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن انہوں نے بھی بعض افسانوی پہلو اپنے اندر سمیٹ لیے ہیں۔ لہٰذا یہ روایات اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کو نقل کیا جائے اور ان پر نظر ڈالی جائے۔ کیونکہ یہ روایات قرآن کریم کے اس تبصرے کے بالکل خلاف ہیں۔

وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰی وَ حُسْنَ مَاٰبٍ (۳۸: ۲۵) "یقیناً ہمارے ہاں اس کے لیے تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے"۔

اس قصے پر جو تبصرہ آیا ہے وہ صاف صاف بتاتا ہے کہ حضرت داؤد کی آزمائش کی نوعیت کیا تھی۔ اللہ نے حضرت داؤد کو حکومت دی تھی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلے کریں اس لیے متعین ہو گیا کہ اس آزمائش و امتحان کا تعلق جوڈیشل پروسیڈنگز سے تھا۔ چنانچہ کہا گیا:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾

۲ ۱۲ ع ۱۱

(ہم نے اس سے کہا) "اے داؤد، ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً ان کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے"۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ کہا گیا کہ آپ کو زمین کا اقتدار اعلیٰ دیا گیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان حق پر مبنی فیصلے کریں اور ان فیصلوں میں اپنی ذاتی چاہت کا خیال نہ رکھیں۔ جہاں تک نبی کا تعلق ہے وہ تو خواہشات نفس کی پیروی سے محفوظ ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ابتدائی میلان پر ہی فیصلہ نہ کر دیا کریں۔ یہ نہ ہو کہ بغیر سوچے سمجھے اور بغیر تحقیقات کیے ہی فیصلہ نہ کر دیا کریں۔ کیونکہ اس طرح جلدی میں بغیر تحقیق کے فیصلے اکثر غلط ہوتے ہیں۔ آیت کے آخر میں حکم عام ہے۔ ان تمام لوگوں کے لیے جو اللہ کے راستے سے گمراہ ہوتے ہیں۔ جو اللہ کو بھول جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے دن شدید عذاب سے دوچار ہوں گے۔

اللہ کی حضرت داؤد پر کرم نوازی دیکھیے کہ پہلی فرصت میں ان کو متنبہ کر دیا گیا اور اپنے ذاتی میلان سے روک دیا گیا اور آپ کو دور رس انجام سے ڈرایا گیا حالانکہ حضرت داؤد علیہ السلام نے عملاً اس غلط اقدام کی طرف ایک قدم بھی نہ اٹھایا تھا۔ اللہ کے تمام مختار بندوں پر یہ اللہ کا فضل ہوتا ہے کہ انہیں قبل از وقت متنبہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ بتقاضائے بشریت ذرا سی لغزش کھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو ثابت قدم کر دیتا ہے۔ ان کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے' ان کو تعلیم دیتا ہے اور ان کو اپنی طرف موڑ دیتا ہے۔ ان کی لغزش صاف کر دیتا ہے۔ اور اس آزمائش کے بعد ان پر رحمتوں کی بارش کر دیتا ہے۔

خلافت ارضی میں سچائی پر چلنے کے اصول کے طے ہونے کے بعد اور لوگوں کے درمیان سچائی اور حق پر مبنی فیصلے کے احکام کے بعد اور قصہ داؤد علیہ السلام کے ختم ہونے سے پہلے اس سچائی کو اس عالم گیر سچائی کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے جس کے اوپر زمین و آسمان قائم ہیں اور آسمان اور زمینوں کے درمیان پوری کائنات قائم ہے۔ یہ سچائی اس کائنات کے اندر بہت گہری ہے اور صرف خلافت فی الارض کی سچائی اور لوگوں کے درمیان عدل کی سچائی سے بہت عام ہے۔ یہ سچائی اس زمین سے بھی وسیع تر ہے جبکہ یہ صرف اس دنیا کی زندگی سے بھی آگے عالم آخرت تک پھیلی ہوئی ہے۔ جس طرح یہ کائنات اس کی لپیٹ میں ہے اسی طرح عالم آخرت بھی اس کی لپیٹ میں ہے۔ اس عالم گیر سچائی پر یہ آخری رسالت مبنی ہے اور اللہ کی یہ آخری کتاب اسی ہمہ گیر اور عالم گیر سچائی کی مظہر اور مفسر ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿٢٧﴾ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۖ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٩﴾

"ہم نے اس آسمان اور زمین کو' اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے' فضول پیدا نہیں کر دیا۔ یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا ہے' اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور ان کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں' یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں؟ یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں"۔

یہ ہے اصل بات' ان تین آیات میں وہ عظیم حقیقت بیان کر دی گئی ہے' جس کی قرآن میں بہت اہمیت ہے۔ یہ نہایت ہی گہری' عمومی اور عظیم الشان حقیقت ہے۔ اس کی جڑیں اور شاخیں اس پوری کائنات کے اندر گہری ہیں اور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی مخلوق کوئی کھیل تماشا نہیں ہے۔ یہ باطل نہ تھی' نہ ہے اور نہ ہوگی۔ بلکہ یہ حق ہے۔ یہ کائنات حقائق پر قائم ہے۔ اس ہمہ گیر سچائی سے تمام سچائیاں پھوٹتی ہیں

اور یہ سچائی دراصل اس کائنات اور پھر اس زمین کی حقیقت و ماہیت ہے۔ اس دنیا پر انسان کی حکمرانی میں سچائی' لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کے قیام میں سچائی' لوگوں کے شعور و خیال میں سچائی اور ان کے اعمال میں سچائی کا قیام اس عظیم حق اور سچائی کی شاخیں ہیں۔ لہٰذا جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور شعور کی سچائی رکھتے ہیں اور جو لوگ نیک عمل کرتے ہیں اور ان کا طرز عمل درست ہے وہ مفسدین کی طرح نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اس کرۂ ارض پر متقین کا وزن اور فساق و فجار کا وزن برابر نہیں ہو سکتا۔ جس عظیم سچائی کو یہ کتاب لے کر آئی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور ان میں سے جو عقلمند ہیں وہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔ وہ عظیم سچائی ہے۔ اور لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس عظیم حقیقت کا وافر حصہ پالیں اور اس پر تدبر کریں۔ کافر درحقیقت اس عظیم سچائی کا تصور اور شعور بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ ان کی فطرت' ان کا شعور اس عظیم سچائی سے محروم ہے جس کے اوپر یہ کائنات قائم ہے۔ اور جس کا حامل قرآن ہے۔ کافر تو رب تعالیٰ کے بارے میں سوئے ظن رکھتے ہیں۔ اور وہ اس عظیم سچائی کے ادراک سے محروم ہوتے ہیں۔

ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸:۲۷) "یہ تو ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے' جہنم کی آگ سے"۔

اسلامی شریعت دراصل اللہ کے اس عظیم حق کی تشریح کر رہی ہے۔ جس پر یہ پوری کائنات قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں حکام اور خلفاء سے جس سچائی اور عدل کا مطالبہ فرماتا ہے وہ اس کلی حق اور سچائی کا ایک حصہ ہے۔ اس حق کا تقاضا یہ ہے کہ جس طرح وہ کائنات میں قائم ہے اسی طرح انسانوں کے نظام اور معاشرے میں بھی قائم ہو تاکہ یہ عظیم سچائی ادھوری نہ ہو۔ اس کے تمام اطراف قائم ہو جائیں۔ اس لیے جو لوگ شریعت سے انحراف کرتے ہیں' عدالت سے انحراف کرتے ہیں۔ وہ دراصل اس سچائی سے انحراف کرتے ہیں جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے۔ اس طرح وہ اس کائنات میں ایک عظیم شر و فساد پیدا کر دیتے ہیں۔ یوں کائناتی قوتوں کے درمیان تصادم پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں ان کائناتی قوتوں کے درمیان بھی تصادم کا خطرہ ہوتا ہے اور انسانی قوتوں کے درمیان بھی۔ یوں کائنات اور انسانی معاشرے دونوں میں ٹوٹ پھوٹ کا خطرہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک ظالم' باغی اور ناموس الٰہی اور شریعت الٰہیہ سے متصادم ہونے والا شخص صحیح سالم اور صراط مستقیم پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور یہ ضعیف اور ناتواں انسان اگر بغاوت بھی کرے تو اللہ کی عظیم قوتوں کا وہ کیا بگاڑ سکتا ہے۔ وہ اگر کوئی فساد برپا کرے گا اور نقصان کرے گا تو اپنا کرے گا۔ اللہ کی جبار و قہار قوتوں کے مقابلے میں تو وہ بس ہو جائے گا۔

یہ وہ عظیم حقیقت ہے جس کے اوپر تمام اہل دانش کو غور و فکر کرنا چاہئے اور اصحاب دانش اور عقل کو چاہئے کہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔ اس قصے کے درمیان یہ سبق آموز واقعہ بیان ہوا اور اس پر تبصرہ ہوا تاکہ اس اہم بات کی وضاحت کر دی جائے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ کے مزید انعامات گنائے جاتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ان کی اولاد میں حضرت سلیمان جیسے باکمال شخص پیدا کیے جن پر اللہ کا بہت بڑا کرم ہوا۔ بلکہ کئی قسم کی کرم نوازیاں ہوئیں۔ حضرت سلیمان کی آزمائش' ان پر اللہ کے کرم کے واقعات اور آزمائش کے بعد اللہ کی رحمتوں کی بارش کے واقعات کا ذکر ہوتا ہے۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝۳۰ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۝۳۱ فَقَالَ اِنِّىْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ۝۳۲ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ۭ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ۝۳۳ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰي كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ۝۳۴ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۳۵ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ ۝۳۶ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّاۗءٍ وَّغَوَّاصٍ ۝۳۷ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝۳۸ هٰذَا عَطَاۗؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۹ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝۴۰

۳ ع۱۴ ۱۲

"اور داؤد کو ہم نے سلیمان (جیسا بیٹا) عطا کیا، بہترین بندہ، کثرت سے اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا۔ قابل ذکر ہے وہ موقع جب شام کے وقت اس کے سامنے خوب سدھے ہوئے گھوڑے پیش کیے گئے تو اس نے کہا "میں نے اس مال کی محبت اپنے رب کی یاد کی وجہ سے اختیار کی ہے"۔ یہاں تک کہ جب وہ گھوڑے نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو (اس نے حکم دیا کہ) انہیں میرے پاس واپس لاؤ، پھر لگا ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے۔ اور (دیکھو کہ) سلیمان کو بھی ہم نے آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کیا اور کہا کہ "اے میرے رب، مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو، بے شک تو ہی اصل داتا ہے"۔ تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی۔ جدھر وہ چاہتا تھا، اور شیاطین کو مسخر کر دیا، ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابند سلاسل تھے (ہم نے اس سے کہا) "یہ ہماری بخشش ہے، تجھے اختیار ہے جسے چاہے دے اور جس سے چاہے روک لے، کوئی حساب نہیں"۔ یقیناً اس کے لیے ہمارے ہاں تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے"۔

یہاں دو اشارات ہیں۔ ایک الصافنات الجیاد ہے یعنی اچھے سدھے ہوئے قیمتی گھوڑے۔ اور دوسرا اشارہ یہ کہ حضرت سلیمان کی کرسی پر ایک جسد ڈال دیا۔ ہمارے تفسیری ذخیرے میں جس قدر روایات یا تاویلات وارد ہیں۔ ان میں سے ان اشارات کی تفسیر میں کسی ایک تفسیر اور روایت پر میرا دل مطمئن نہیں ہے۔ جہاں تک روایات کا تعلق ہے، ان میں سے بہت تو اسرائیلیات سے متعلق ہیں اور تفاسیر جو بھی کی گئی ہیں وہ ایسی تاویلات ہیں جن کے اوپر کوئی صحیح سند نہیں

ہے ۔ یہ دو واقعات اصل میں کیا ہیں؟ ان کے بارے میں کوئی اطمینان بخش چیز سامنے نہیں آئی تا کہ اس پر غور کر کے میں یہاں نقل کر دوں ۔ ماسوائے ایک حدیث کے اور کوئی صحیح حدیث بھی منقول نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جائے ۔ ایک صحیح حدیث ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا تعلق ان واقعات کے ساتھ ہے ۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے ۔ امام بخاری نے یہ حدیث مرفوعاً نقل کی ہے ۔ ''حضرت سلیمان نے کہا میں آج رات اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا ۔ ہر ایک سے ایک جوان پیدا ہو گا ۔ جو جہاد فی سبیل اللہ کرے گا ۔ لیکن انہوں نے ان شاء اللہ نہ کہا ۔ وہ ان بیویوں کے پاس گئے ۔ ان میں سے صرف ایک کا حمل ٹھہرا اور جب بچہ پیدا ہوا تو ناتمام تھا ۔ خدا کی قسم اگر حضرت سلیمان ان شاء اللہ کہتے تو یقیناً یہ سب اللہ کی راہ میں جہاد کرتے'' ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان آیات میں جس فتنے کا ذکر کیا گیا ہے' وہ یہی ہو اور ان کی کرسی پر یہی جسد ناتمام پھینکا گیا ہو ۔ لیکن یہ بھی احتمال درجے میں ہے ۔ گھوڑوں کا قصہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ شام کے وقت ان کے سامنے گھوڑے پیش کیے گئے اور غروب سے قبل وہ جو عبادت کرتے تھے وہ قضا ہو گئی تو حضرت نے کہا ان سب گھوڑوں کو واپس کرو' چنانچہ انہوں نے ان کی گردنوں اور پنڈلیوں کو تلوار سے کاٹنا شروع کیا ۔ کیونکہ ان کی وجہ سے ان کی نماز قضا ہوئی اور وہ ذکر رب سے غافل ہو گئے ۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ان کے پاؤں اور گردنوں پر ہاتھ پھیر کر ان کو تھپکی دیتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے ۔ کہ یہ اللہ کی راہ میں لڑنے والے گھوڑے ہیں ۔ دونوں روایتوں پر کوئی دلیل نہیں ہے ۔ اور اس کے بارے میں کوئی فرضی بات نہیں کر سکتے ۔ لہٰذا کوئی محقق ان دونوں واقعات کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کر سکتا ۔

جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی آزمایا گیا ۔ اور یہ آزمائش امور مملکت کے بارے میں تھی اور اسی نوعیت کی تھی جس طرح تمام انبیاء کو راہ حق دکھانے کے لیے آزمایا جاتا ہے ۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس راہ میں ان سے کوئی لغزش سرزد نہ ہو جائے ۔ اس آزمائش کے بعد حضرت سلیمان نے اپنے رب کی طرف انابت اور رجوع کر لیا اور مغفرت طلب کی ۔ اور اللہ کی طرف مڑ کر دست بدعا ہوئے :

قَالَ رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (۳۸ : ۳۵) ''کہا' اے میرے رب مجھے معاف کر اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو' بے شک تو ہی اصل داتا ہے'' ۔

حضرت سلیمان کی مذکورہ بالا دعا کا مطلب جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسی خصوصیت چاہتے تھے جو معجزانہ ہو ۔ یعنی ان کو حکومتی اقتدار چلانے کے لیے معجزانہ قوتیں دی جائیں اور تمام دوسرے ذی اقتدار لوگوں سے یہ اعجاز مختلف ہو ۔ اس کی ایک متعین شکل ہو' جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہ ہو ۔ یعنی عوام الناس کے ہاں جس طرح کی حکومتیں متعارف ہیں ۔

رب تعالیٰ نے بھی ان کی دعا قبول کرنے میں دیر نہیں فرمائی ۔ چنانچہ جیسی حکومت انہوں نے چاہی تھی وہ ان کو دے دی ۔ ایسی حکومت جو آئندہ کسی کو نہ دی جائے گی ۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِأَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ أَصَابَ (۳۸:۳۶) وَ الشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّ غَوَّاصٍ (۳۸:۳۷) وَّ اٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ (۳۸:۳۸) ”تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی' جدھر وہ چاہتا تھا اور شیاطین کو مسخر کر دیا۔ ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابند سلاسل تھے“۔

ہوا کو اللہ کے حکم سے اس کے بندوں میں سے کسی کے لیے مسخر کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہوا اللہ کے ارادے سے باہر آ گئی۔ انسانوں کی تسخیر کے باوجود ہوا بدستور ارادہ الٰہی کے تحت چلتی ہے۔ اللہ کے حکم سے اس کے نوامیس فطرت کے مطابق ہی چلتی ہے۔ جب اللہ اپنے کسی بندے کے لیے یہ بات سہل بنا دے کہ اس کا فعل ارادۂ الٰہی کی تعبیر ہو اور بندے کا حکم الٰہی کے موافق ہو جائے تو ایسے حالات میں کائناتی قوتیں اللہ کے امر کے ساتھ ساتھ بندے کے امر کے ساتھ چلتی نظر آتی ہیں۔ پھر یہ ہوائیں نہایت ہی نرمی کے ساتھ جہاں وہ بندہ چاہتا ہے ادھر چلتی ہیں۔ یہ ایک ایسا فعل ہے جس کا صدور اللہ سے مستبعد نہیں ہوتا ہے۔ یہ فعل کی صورتوں میں سرزد ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرماتا ہے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا (۳۳:۶۰) ”اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے' اور وہ مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلاتے ہیں ایسی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمہیں اٹھا کھڑا کریں گے۔ پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے“۔ اس کا مفہوم کیا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ باز نہ آئے تو اللہ اپنا ارادہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کی صورت میں حرکت میں لائے گا اور آپ کو ان کے خلاف اٹھا کر یوں ان کو مدینہ سے نکال دے گا۔ اللہ کے ارادے کے نتیجے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خلاف قتال شروع کر دیں گے۔ یوں اللہ کے ارادے اور نبی کے ارادے میں توافق پیدا ہو جائے گا۔ دونوں کے ارادے باہم مل جائیں گے اور اللہ کا ارادہ رسول اللہ ﷺ کے اقدامات کی شکل میں نظر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو اسی معنی میں مسخر کر دیا تھا جس طرح حضرت سلیمان چاہتے۔ اسی طرح اللہ ہواؤں کو مسخر فرما دیتا۔ یا جس طرح اللہ چاہتا اسی طرف حضرت سلیمان کا ارادہ ہو جاتا۔

اسی طرح آپ کے لیے شیاطین کو بھی مسخر کر دیا گیا اور آپ ان سے تعمیرات کا کام لیتے تھے۔ سمندر میں اور خشکی میں یہ لوگ آپ کے لیے غوطے لگاتے تھے اور جو اشیاء حضرت سلیمان چاہتے تھے وہ نکال لاتے تھے اور مخالفین اور مفسدین کو سزا دینے کی پوری پوری قدرت اللہ نے آپ کے لیے ودیعت کر دی تھی۔ مجرموں کو گرفتار کرنے' قید کرنے اور پکڑنے کی پوری قدرت آپ کو دے دی تھی۔ آپ کی حکومت میں امن و امان کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یعنی مجرم اکیلے اور اجتماعی شکل میں گرفتار ہو کر پابہ زنجیر کر دیئے جاتے۔

زمین میں دولت کی تقسیم کے پورے اختیارات آپ کو دے دیئے تھے۔ جسے چاہتے عطا کرتے' جسے چاہتے نہ

دیتے - یا جسے جس قدر چاہتے ' دے دیتے -

هٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۸ : ۳۹) "یہ ہماری بخشش ہے تجھے اختیار ہے ' جسے چاہے دے اور جس سے چاہے روک لے کوئی حساب نہیں ہے" - یہ اس لیے کہ آپ کو اللہ بہت بڑا اعزاز دینا چاہتا تھا کہ آپ کی حکومت پر کوئی مالی قدغن عائد نہیں ہے - مزید اس پر یہ اضافہ فرمایا کہ حضرت سلیمان ہمارے نزدیک بہت ہی مقرب اور برگزیدہ بندے تھے - اور ان کا انجام بہتر ہو گا -

وَاِنَّ لَهُ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ (۳۸ : ۴۰) "یقیناً اس کے لیے ہمارے ہاں تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے" - یہ ایک نہایت ہی عظیم مقام و مرتبہ ہے جو حضرت سلیمان کو دیا گیا - نہایت ہی فضل و کرم اور رضامندی اور بخشش اور مہربانیاں -

--- ooo---

حضرت سلیمان کے بعد اب حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ ابتلا آتا ہے اور اس کے بعد ان پر اللہ کا فضل و کرم - حضورؐ اور مسلمانوں کے لیے امید پیدا کی جاتی ہے -

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴿۴۱﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿۴۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ۗ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۗ نِعْمَ الْعَبْدُ ۗ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

"اور ہمارے بندے ایوب کا ذکر کرو ' جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے - (ہم نے اسے حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مار ' یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے - ہم نے اسے اس کے اہل و عیال واپس دیئے اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور ' اپنی طرف سے رحمت کے طور پر ' اور عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر - (اور ہم نے اس سے کہا) تنکوں کا ایک مٹھا لے اور اس سے مار دے ' اپنی قسم نہ توڑ - ہم نے اسے صابر پایا ' بہترین بندہ ' اپنے رب کی طرف بہت رجوع کرنے والا" -

حضرت ایوب کے صبر کا قصہ تو ایک مثال بن گیا ہے - اور بہت ہی معروف و مشہور ہے - صبر ایوبی ایک محاورہ ہے - لیکن اس قصے کے اوپر اسرائیلی روایات کی تہہ جم گئی ہے - اور حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے - اصل حقیقت وہ ہے جس طرح قرآن کریم تصریح کرتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام بندۂ صالح اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے - اللہ کی آزمائش ان پر آئی اور اس میں انہوں نے خوب صبر فرمایا - یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آزمائش اس طرح تھی کہ مال چلا گیا ' صحت چلی گئی اور بیوی بھی ساتھ چھوڑ گئی - لیکن ان تمام جان لیوا تکالیف میں انہوں نے رب تعالیٰ کا دامن تھامے

رکھا۔ اللہ پر ان کا بھروسہ رہا اور وہ راضی برضائے الہی رہے۔

شیطان ان لوگوں کے دل میں وسوسے ڈالتا رہا جو تعداد میں تھوڑے تھے مگر ان کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان میں سے ان کی بیوی بھی تھی۔ شیطان ان کے دلوں میں یہ وسوسے ڈالتا کہ اگر ایوب اللہ کا برگزیدہ بندہ ہوتا تو اللہ ہرگز ان کو اس آزمائش میں نہ ڈالتا۔ جب یہ لوگ حضرت ایوب کو یہ باتیں بتاتے تو مالی جسمانی مصیبت سے بھی زیادہ اذیت ان کو ان شیطانی وسوسہ اندازیوں سے ہوتی۔ جب ان کی بیوی نے ان کے سامنے ایسی باتیں کیں تو آپ نے حلف اٹھایا کہ اگر اللہ نے اس مصیبت سے نجات دی اور وہ تندرست ہوگئے تو بیوی کو کوڑے ماریں گے۔ بعض نے سو کوڑے کہا ہے۔

انہی آزمائشوں پر جب شیطان کی جانب سے ایذا رسانی بھی شروع ہوگئی اور اس کا اثر ان کے مخلصین پر بھی ہونا شروع ہوگیا اور خود ان کے دل پر اثر ہوگیا تو وہ دست بدعا ہوئے۔

اَنِّی مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ (۳۸ : ۴۱) "کہ شیطان نے مجھے تکالیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے"۔

جب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ سچے اور صابر ہیں اور وہ شیطانی وسوسہ اندازیوں سے بھی نفرت کرتے ہیں اور اس سے ان کی اذیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تو اب اللہ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ آزمائش کے دن بیت جاتے ہیں۔ ان کی صحت لوٹ آتی ہے۔ رب تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اپنے قدموں کو زمین پر ماریں۔ ٹھنڈا پانی نکل آئے گا۔ اس سے وہ پئیں اور غسل کریں۔ صحت لوٹ آئے گی۔

اُرْکُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ (۳۸ : ۴۲) "اپنا پاؤں زمین پر مار' یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے اور پینے کے لیے"۔ مزید رحمتیں یوں آتی ہیں :

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَ ذِكْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ

(۳۸ : ۴۳) "اور ہم نے اسے اہل و عیال واپس کر دیئے اور اپنی طرف سے رحمت کے طور پر ان کے ساتھ اتنے ہی اور دیئے اور عقل و فکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر"۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ اللہ نے ان کے وہ بچے زندہ کر دیئے جو فوت ہو گئے تھے اور اسی تعداد میں اور اولاد بھی دے دی۔ قرآن کریم اس بات کی صراحت نہیں کرتا کہ مردوں کو زندہ کیا گیا۔ مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو لوگ ان کو چھوڑ کر غائب ہوگئے تھے' وہ اور ان کے اہل خانہ واپس کر دیئے گئے اور پھر مزید اولاد دی گئی۔ مزید انعام اور رحمت و رعایت کے طور پر۔ اور یہ انعامات اس لیے کیے گئے کہ اہل عقل و دانش اس سے عبرت لیں۔

ان تمام قصص سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کے جو بندے مشکلات اور آزمائشوں میں صبر کریں اللہ ان پر کرم نوازی کرتا ہے اور آخرکار ان پر کرم ہوتا ہے۔

یہ کہ ان کی قسم کا نتیجہ کیا ہوا تو اللہ کی رحمت نے ان کو اور ان کی بیوی کو ڈھانپ لیا۔ کیونکہ ان کی بیوی نے اس

طویل آزمائش میں حضرت ایوب کی بہت خدمت کی تھی ۔ اور اس نے بھی بہت ہی مصابرت سے کام لیا تھا ۔ اللہ نے حکم دیا تھا کہ انہوں نے جتنے کوڑے مارنے کی قسم اٹھائی ہے اتنی ہی شاخیں لیں اور ان تمام شاخوں سے ایک ہی وار اس پر کر لیں ۔ اس طرح ان کی قسم پوری ہو جائے گی اور وہ حانث نہ ہوں گے ۔

وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ (۳۸ : ٤٤) " تنکوں کا ایک مٹھا لے اور اس سے مار دے ' اپنی قسم نہ توڑ " ۔ یہ سہولت ان کو اس لیے دی گئی کہ اس عظیم امتحان میں انہوں نے اللہ کی منشاء کے مطابق صبر کیا اور اطاعت شعار بندے کے طور پر رہے اور آخر میں اللہ ہی سے التجا کی ۔

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ (۳۸ : ٤٤) " ہم نے اسے صابر پایا ۔ بہترین بندہ اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا " ۔

یہ تین قصص تو قدرے تفصیل سے ذکر ہوئے ۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی موجودہ مشکلات پر صبر کریں ۔ اب رسولوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔ ان کے قصص میں بھی آزمائشیں اور صبر کے واقعات ہیں اور ان پر بھی اللہ کے انعامات اور فضل و کرم ہوتے رہے ہیں جس طرح حضرت داؤد ' حضرت سلیمان اور ایوب علیہم السلام کے قصص میں آزمائشیں اور فضل و کرم ہیں ۔ ان میں سے بعض انبیاء تو ان سے پہلے گزرے ہیں اور معروف ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کے زمانے کا تعین نہیں ہے ۔ کیونکہ قرآن اور ہمارے ہاں حقیقی تاریخی مصادر کے اندر ان کے زمانے کا تعین نہیں کیا گیا ۔

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿٤٥﴾ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿٤٦﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿٤٧﴾ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ﴿٤٨﴾

" اور ہمارے بندوں ' ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا ذکر کرو ۔ بڑی قوت عمل رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ تھے ۔ ہم نے ان کو ایک خالص صفت کی بنا پر برگزیدہ کیا تھا ' اور وہ دار آخرت کی یاد تھی ۔ یقیناً ہمارے ہاں ان کا شمار چنے ہوئے نیک اشخاص میں ہے ۔ اور اسماعیل ' الیسع اور ذوالکفل علیہم السلام کا ذکر کرو ' یہ سب نیک لوگوں میں سے تھے " ۔

حضرت ابراہیم ' حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہم السلام تو یقیناً حضرت داؤد اور حضرت سلیمان سے قبل تھے لیکن حضرت ایوب کے دور کے بارے میں ہمیں یقینی معلومات نہیں ہیں ۔ الیسع و ذوالکفل کے بارے میں بھی صحیح معلومات نہیں ہیں ۔ ان کے بارے میں قرآن کریم میں صرف اشارات ہی پر اکتفاء کیا گیا ہے ۔ بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے ایک نبی کا نام عبرانی میں الیشع آتا ہے ۔ یہی عربی میں الیسع ہیں ۔ اسی لیے ہم بھی ترجیح دیتے ہیں ۔ رہے ذوالکفل تو ان کے بارے

میں زیادہ تاریخی معلومات نہیں ہیں ۔

اللہ نے حضرت ابراہیم ' حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے بارے میں صرف یہ کہا ہے کہ وہ

أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ (٣٨ : ٤٥) "بڑی قوت رکھنے والے اور دیدہ ور لوگ تھے"۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں سے عمل صالح کرنے والے اور نظریاتی اعتبار سے فکر مستقیم کے مالک تھے ۔ گویا جو عمل صالح نہیں کرتا وہ کمزور ہوتا ہے اور جو شخص فکر سلیم نہیں رکھتا وہ آنکھوں کے باوجود اندھا ہوتا ہے ۔

قرآن کریم میں ان پیغمبروں کے اعزاز کی صفت کے بیان میں کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے خالص بندے تھے ۔ اور ان کی دوسری خاص صفت یہ تھی وہ دار آخرت کو ہروقت یاد کرنے والے اور اس کا لحاظ کرنے والے تھے ۔ وہ صرف رضائے الٰہی اور فلاح اخروی کے لیے کام کرتے تھے ۔

اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (٣٨ : ٤٦) "ان کو ایک خاص صفت کی بناء پر برگزیدہ کیا تھا اور وہ دار آخرت کی یاد تھی"۔ یہ ان کا مرتبہ اور ان کی بلندی تھی اور اس مرتبے اور بلندی نے ان کو برگزیدہ بنا دیا تھا۔

وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ (٣٨ : ٤٧) "اور یقیناً ہمارے ہاں ان کا شمار چنے ہوئے نیک اشخاص میں سے ہے"۔

نیز اللہ تعالٰی تصریح فرماتا ہے کہ حضرت اسماعیل ' حضرت ذوالکفل اور حضرت الیسع علیہم السلام اس کے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرماتا ہے کہ تم لوگ ان کی روحانی صحبت میں رہو ۔ ان کے صبر و مصابرت کو یاد کرو ' اور آخر کار ان پر جو فضل و کرم ہوا ' اس کی امید رکھو ۔ اور تمہاری قوم کی طرف سے جو تکذیب ہو رہی ہے اور اس پر تمہیں جو اذیت ہو رہی ہے اس کو برداشت کرو ۔ کیونکہ تمام رسولان کرام کا طریقہ صبر اور مصابرت کا ہے ۔ اور رسولوں کے بعد بھی تمام دعوتوں کا طریقہ بھی صبر کا ہے اور ہمیشہ یوں ہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰی اپنے صبر کرنے والے بندوں پر رحم و کرم کرتا ہے ۔ ان کو قوت اور اقتدار عطا کرتا ہے اور ان پر رحمتیں اور برکتیں نازل کرتا ہے ۔ اللہ کے ہاں اپنے بندوں کے لیے جو اجر اور انجام ہوتا ہے وہ بہرحال بہتر ہوتا ہے ۔ اور اللہ کی رحمتوں ' اللہ کی برکتوں کے مقابلے میں سازشیوں کی سازشوں اور مکاروں کی مکاریوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی ۔ اللہ اپنے بندوں کا ہروقت نگہبان ہوتا ہے ۔

--- ○○○---

درس نمبر ۲۱۳ تشریح آیات

۴۹ --- تا --- ۶۴

هٰذَا ذِكْرٌ ۚ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ ﴿٤٩﴾ جَنَّاتِ عَدْنٍ مُفَتَّحَةً لَهُمُ الْأَبْوَابُ ﴿٥٠﴾ مُتَّكِئِينَ فِيهَا يَدْعُونَ فِيهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَشَرَابٍ ﴿٥١﴾ وَعِنْدَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ أَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾ هٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٥٣﴾ إِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِنْ نَفَادٍ ﴿٥٤﴾ هٰذَا ۚ وَإِنَّ لِلطَّاغِينَ لَشَرَّ مَآبٍ ﴿٥٥﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۖ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٥٦﴾ هٰذَا فَلْيَذُوقُوهُ حَمِيمٌ وَغَسَّاقٌ ﴿٥٧﴾ وَآخَرُ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ ﴿٥٨﴾ هٰذَا فَوْجٌ مُقْتَحِمٌ مَعَكُمْ ۖ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ۚ إِنَّهُمْ صَالُو النَّارِ ﴿٥٩﴾ قَالُوا بَلْ أَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ۖ أَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوهُ لَنَا ۖ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٦٠﴾ قَالُوا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿٦١﴾ وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرَىٰ رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِنَ الْأَشْرَارِ ﴿٦٢﴾ أَتَّخَذْنَاهُمْ سِخْرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْأَبْصَارُ ﴿٦٣﴾ إِنَّ ذَٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾

۴ ع ۲۴ ۱۳

"یہ ایک ذکر تھا (اب سنو کہ) متقی لوگوں کے لیے یقیناً بہترین ٹھکانا ہے' ہمیشہ رہنے والی جنتیں جن کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے ۔ ان میں وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے' خوب خوب فواکہ اور مشروبات طلب کر رہے ہوں گے' اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہوں گی ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں حساب کے دن عطا کرنے کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے ۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ۔ یہ تو ہے متقیوں کا انجام ۔ اور سرکشوں کے لیے بدترین ٹھکانا ہے'

جہنم جس میں وہ جھلسے جائیں گے بہت ہی بری قیام گاہ۔ یہ ہے ان کے لیے 'پس وہ مزا چکھیں کھولتے ہوئے پانی اور پیپ ' لہو اور اسی قسم کی دوسری تلخیوں کا۔ (وہ جہنم کی طرف اپنے پیروؤں کو آتے دیکھ کر آپس میں کہیں گے)''یہ ایک لشکر تمہارے پاس گھسا چلا آرہا ہے 'کوئی خوش آمدید ان کے لیے نہیں ہے' یہ آگ میں جھلسنے والے ہیں''۔ وہ ان کو جواب دیں گے ''نہیں بلکہ تم ہی جھلسے جارہے ہو 'کوئی خیر مقدم تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم ہی تو یہ انجام ہمارے آگے لائے ہو 'کیسی بری ہے یہ جائے قرار''۔ پھر وہ کہیں گے ''اے ہمارے رب 'جس نے ہمیں اس انجام کو پہنچانے کا بندوبست کیا 'اس کو دوزخ کا دوہرا عذاب دے''۔ اور وہ آپس میں کہیں گے ''کیا بات ہے 'ہم ان لوگوں کو کہیں 'نہیں دیکھتے جنہیں ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے؟ ہم نے یونہی ان کا مذاق بنالیا تھا 'یا وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہیں؟'' بے شک یہ بات سچی ہے 'اہل دوزخ میں یہی کچھ جھگڑے ہونے والے ہیں''۔

درس ماضی میں ہم اللہ کے مختار بندوں کے ہم محفل تھے۔ ان لوگوں کی زندگی کی آزمائش اور پھر ان کی جانب سے مشکلات پر صبر کا پہلو نمایاں طور پر موضوع سخن تھا۔ آزمائش کے بعد ان سب بندوں کو اللہ کی رحمت اور اس کے فضل و کرم نے ڈھانپ لیا۔ اس محفل ذکر میں ہمیں یہ بتانا مقصود تھا کہ اس کرۂ ارض پر یہ اعلیٰ ترین زندگی ہے اور اس عارضی زندگی کو اس طرح گزارنا چاہئے۔ اب یہاں اس سبق میں یہ بتایا جاتا ہے عالم آخرت میں اللہ کے متقی بندوں کا کیا حال ہو گا اور سرکشوں اور جھٹلانے والوں کے شب و روز کیا ہوں گے۔ گویا سابقہ سبق میں حیات فانی موضوع سخن تھا اور اس میں حیات باقیہ کے شب و روز زیر بحث ہیں۔ یہ زندگی یہاں مناظر کی شکل میں دکھائی گئی جیسا کہ قرآن کریم کا انداز ہے۔ یہاں مناسب ہے کہ میں اپنی کتاب ''مشاہد قیامت'' کے کچھ اقتباسات دے دوں۔

ان مناظر کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ دو مناظر ہیں اور دو انجام ہیں اور ایک دوسرے کے بالکل بالمقابل ہیں۔ مجموعی طور پر بھی ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں اور اجزاء کے اعتبار سے بھی یہ دونوں مناظر باہم متقابل ہیں۔ ہیئت و شکل اور مفہوم اور خواص کے اعتبار بھی دونوں مناظر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ متعین ایک اچھے انجام تک پہنچ چکے ہیں (حسن مآب)۔ جبکہ مفسدین برے انجام تک پہنچ چکے (شرمآب)۔ اگر متقین کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے دروازے ان کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔

جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ (۳۸ : ۵۰) اور وہ اس میں بالمقابل تکیے لگائے بیٹھے ہیں اور اچھا کھانا اور اچھا پینا ان کو میسر ہے۔ اور ان کو نوجوان حوریں میسر ہیں اور جوانی کے باوجود وہ شرمیلی بھی ہیں۔ نہ وہ کسی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی ہیں اور نہ سر اٹھا کر چلتی ہیں اور جوانی کے ساتھ ہم عمر بھی ہیں۔ پھر یہ تمام سہولیات دائمی ہیں اور اللہ کی طرف سے ہیں اور مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ''ختم ہونے والی نہیں ہیں''۔

تو مکذبین بھی ایک جائے قرار میں نظر آتے ہیں۔ یہ بہت ہی بری جائے قرار ہے۔

فَبِئْسَ الْمِهَادُ (۳۸ : ۵۶) وہاں ان کے پینے کے لیے گرم پانی ہے اور قابل نفرت اور ستے لانے والا کھانا وہ کھا رہے ہوں گے۔ یعنی ان کے زخموں کا دھون اور پیپ۔ اس قسم کے کئی دوسرے عذاب ان کے لیے ہوں گے۔ اور ان عذابوں کو ازواج سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان مذکورہ تلخیوں کے علاوہ دوسری بھی تلخیاں ہوں گی۔

ان دو مناظر کے بعد اب تیسرا منظر دیکھیے جس کے کردار ایک دوسرے سے ہمکلام بھی ہیں۔ اہل جہنم سرکشوں کا ایک گروہ دنیا میں ایک دوسرے کا جگری دوست تھا۔ اب یہ لوگ یہاں ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور نفرت کرنے والے ہیں۔ دنیا میں یہ گمراہی کے ہم سفر تھے۔ یہ مومنین سے اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔ مومنین کی دعوت اور ان کے منشور کے ساتھ یہ لوگ مذاق کرتے تھے۔ خصوصاً ان کے اس عقیدے کے ساتھ کہ وہ جنتوں میں ہوں گے جیسا کہ قریش کہتے تھے۔

ءَ اُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّکْرُ مِنْ بَیْنِنَا "کیا ہم میں سے ذکر اسی پر اتر گیا!"

ذرا ان کے منظر کو دیکھیے کہ یہ فوج در فوج جہنم میں گھسے جا رہے ہیں' یا دھکیلے جا رہے ہیں اور ایک دوسرے سے وہ یوں ہمکلام ہیں۔

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ (۳۸ : ۵۹) "یہ لشکر تمہارے پاس گھسا چلا آ رہا ہے"۔ جواب کیا ہے؟ نہایت ہی تنگ مزاجی سے جواب آتا ہے۔

لَا مَرْحَبًا بِهِمْ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ (۳۸ : ۵۹) "کوئی خوش آمدید ان کے لیے نہیں ہے۔ یہ تو آگ میں جھلسنے والے ہیں"۔ جس فوج پر یہ تبصرہ کیا جا رہا ہے' وہ بھی سن کر جل بھن جاتی ہے اور ان کا جواب یہ ہے'

قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا فَبِئْسَ الْقَرَارُ (۳۸ : ۶۰) "وہ کہیں گے بلکہ تمہارے لیے کوئی خوش آمدید نہیں ہے' تم ہی تو یہ انجام ہمارے آگے لائے ہو۔ کیسی بری ہے یہ جائے قرار"۔ تم ہی تو اس مصیبت کا باعث بنے ہو۔ اب یہ لوگ نہایت دل تنگی' گھٹن اور انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر یہ درخواست کرتے ہیں۔

قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِی النَّارِ (۳۸ : ۶۱) "پھر وہ کہیں گے اے ہمارے رب' جس نے ہمیں اس انجام کو پہنچایا اس کو دوزخ کا دوہرا عذاب دے"۔

اب یہ لوگ جہنم میں مومنین کو تلاش کریں گے۔ ان کا کوئی اتہ پتہ جہنم میں نہ ہو گا۔ حالانکہ یہ لوگ اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں اونچے لوگ سمجھتے تھے' اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ تو چند شریر لوگ ہیں۔ اور ان کے دستور اور منشور کے ساتھ بھی مذاق کرتے تھے۔ اور جن اعلیٰ مقاصد اور رضائے الٰہی کے لیے وہ کام کرتے تھے' اس کو حماقت سمجھتے تھے۔ یہ لوگ ان جہنم میں گھسنے والوں میں نہیں ہیں۔ یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں چلے گئے وہ لوگ۔ یہاں وہ موجود نہیں یا ہمیں نظر نہیں آتے۔

وَ قَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ (۳۸ : ۶۲) اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِیًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ (۳۸ : ۶۳) "وہ آپس میں کہیں گے "کیا بات ہے' ہم ان لوگوں

کو کہیں نہیں دیکھتے جنہیں ہم دنیا میں برا سمجھتے تھے اور ہم نے یونہی ان کا مذاق بنا لیا تھا' یا وہ کہیں نظروں سے اوجھل ہیں؟"
یہ لوگ ان کے بارے میں جہنم میں اتہ پتہ دریافت کر رہے ہیں حالانکہ وہ لوگ جنتوں کے مزوں میں ہیں ۔
یہ منظر اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ اہل دوزخ میں یہ جھگڑے یونہی چلتے رہیں گے ۔

إِنَّ ذَٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ (۳۸ : ۶۴) "بے شک یہ بات سچی ہے کہ اہل دوزخ میں یہی کچھ جھگڑے ہونے والے ہیں"۔

ذرا دیکھیے کہ ان کا انجام اہل ایمان کے انجام سے کس قدر مختلف اور اپنے طور پر کس قدر بھیانک ہے ۔ دنیا میں تو اہل جہنم متقین کا مذاق اڑاتے تھے ۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ اللہ نے ان پر جو کلام الٰہی نازل کیا ہے ۔ یہ اس کے اہل ہی نہیں ۔ اور یہی وہ نقشہ عذاب ہے جس کے لیے وہ بچوں کی شتابی مچا رہے تھے ۔ اور کہتے تھے ۔

وَقَالُوا رَبَّنَا عَجِّلْ لَنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ (۳۸ : ۱۶) "اے ہمارے رب' ہمارا حصہ ہمیں یوم الحساب سے بھی پہلے ہمیں دے دے"۔

--- ooo---

درس نمبر ۲۱۴ تشریح آیات

۶۵---تا--- ۸۸

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے اور یہ ان مسائل کو دہراتا ہے جو اس سورت کے آغاز میں دہرائے گئے تھے۔ مسئلہ توحید' مسئلہ وحی الہی' مسئلہ جزاء و سزا' حضرت آدم علیہ السلام کے قصے کو ثبوت وحی کے لیے پیش کیا جاتا ہے کیونکہ رسولوں کا بھیجنا اس وقت طے ہو گیا تھا جب اللہ تخلیق آدم کے بارے میں فرشتوں کو بتا رہا تھا۔ نیز اسی دن یہ طے ہو گیا تھا کہ ہدایت و ضلالت کی راہ اختیار کرنے کا حساب اللہ لے گا اور جزاء و سزا ہوگی۔ اس قصے میں یہ بھی بتایا گیا ہے۔ انسان کے ساتھ شیطان کو روز ازل سے حسد اور کینہ ہے کیونکہ اس نے روز اول سے اپنے آپ کو انسان سے افضل سمجھا۔ یوں معرکہ آدم و ابلیس شروع ہوا اور یہ معرکہ ہمیشہ جاری ہے اور قیامت تک یہ جنگ سرد نہیں پڑ سکتی۔ کوئی فریق ہتھیار نہ ڈالے گا۔ شیطان کا ہدف یہ ہے کہ وہ انسانوں کی بڑی سے بڑی تعداد کو گمراہ کر دے تاکہ وہ ان کو جہنم رسید کر دے اور یہ وہاں اس کے ساتھی ہوں۔ یہ شیطان کی طرف سے انسان سے انتقام' ان کے باپ سے انتقام ہے' اس نے آدم کو جنت سے نکالا لیکن تعجب ہے کہ ابن آدم اس کھلی دشمنی کے باوجود شیطان کی اطاعت قبول کرتا ہے۔

سورت کا اختتام وحی الہی کے مضمون پر ہوتا ہے۔ انسان کے لیے وحی الہی کی اہمیت بہت ہی عظیم ہے۔ جبکہ تکذیب کرنے والے غافل وحی الہی کی اہمیت کو سمجھ نہیں پا رہے ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۶۵﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾

"(اے نبی) ان سے کہو "میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں۔ کوئی حقیقی معبود نہیں۔ مگر اللہ جو یکتا ہے' سب پر غالب' آسمانوں اور زمین کا مالک اور ان ساری چیزوں کا مالک جو ان کے درمیان ہیں' زبردست اور درگزر کرنے والا"۔ ان مشرکین سے کہو' جن پر تحریک اسلامی کی وجہ سے دہشت طاری ہوگئی اور یہ لوگ حیران ہو کر کہتے ہیں۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ---------- اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (۳۸:۵)

"کیا اس نے تمام الہوں کے بجائے صرف ایک الہ اختیار کر لیا ہے ----- یہ تو ایک عجیب چیز ہے"۔ ان سے کہو کہ یہی تو حقیقت عظمی ہے۔

وَمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ (۳۸:۶۵) "کوئی معبود نہیں مگر اللہ جو یکتا سب پر غالب"۔ اور ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ اختیارات میرے پاس نہیں ہیں۔ میرے ذمے جو کام ہے وہ صرف یہ ہے کہ میں لوگوں کو ڈراؤں اور اس کے بعد اللہ واحد اور قہار پر ان کا انجام چھوڑ دوں جو

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا (۳۸:۶۶) "جو زمین و آسمان اور ان ساری چیزوں کا رب ہے جو ان کے درمیان ہیں"۔ لہٰذا اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے اور زمین و آسمان میں کسی کے لیے اس کے دربار کے سوا جائے پناہ نہیں ہے۔ وہ عزیز ہے 'قوی ہے' اور وہ گناہوں کا بخشنے والا ہے' وہ درگزر فرمانے والا ہے۔ جو لوگ توبہ کر کے اس کی پناہ گاہ میں آتے ہیں وہ محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ جو کلام عظیم میں لایا ہوں' اس کی جو قدر و قیمت تم متعین کرتے ہو' وہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اور اس کے تو بہت عظیم نتائج' انقلابی نتائج نکلنے والے ہیں مگر تم غافل ہو۔

قُلْ ھُوَ نَبَؤٌا عَظِیْمٌ ﴿۶۷﴾ اَنْتُمْ عَنْہُ مُعْرِضُوْنَ ﴿۶۸﴾

ان سے کہو "یہ ایک بڑی خبر ہے جس کو سن کر تم منہ پھیرتے ہو"۔

کہہ دو' قرآن کریم اپنے موجودہ زمانے اور مستقبل قریب کی بہ نسبت آگے چل کر بہت ہی عظیم نتائج پیدا کرنے والا ہے۔ اس کائنات میں یہ امرالہی ہے۔ اور اس کا تعلق اس پوری کائنات کے عظیم معاملات میں سے ہے۔ یہ اس کائنات میں جاری و ساری نظام قضا و قدر سے متعلق ہے۔ یہ قرآن اور اس کا نزول زمین و آسمانوں کے معاملات سے کوئی علیحدہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس سے ماضی بعید کے امور بھی متعلق ہیں اور مستقبل کی تبدیلیاں بھی اس کے نتیجے میں ہوں گی۔

یہ تو ایک عظیم شہ سرخی ہے۔ یہ عظیم خبر قریش سے بھی آگے بڑھنے والی' یہ مدین اور جزیرۃ العرب سے بھی آگے پھیلنے والی ہے۔ یہ اس وقت کی موجود نسل سے بھی آگے آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک شہ سرخی ہے۔ یہ خبر زمان و مکان میں محدود رہنے والی نہیں ہے۔ یہ انسانیت کے مستقبل کے زمانوں میں اور تمام اقطار عالم میں انقلاب برپا کرنے والی خبر ہے۔ اور یہ انسانیت کے حالات اور مسائل کو اس وقت تک متاثر کرتی رہے گی جب تک قیامت برپا نہیں ہو جاتی۔ نظام کائنات میں اس خبر کے لیے جو وقت مقرر تھا۔ یہ خبر بعینہ اپنے وقت پر نشر ہوئی ہے تاکہ اس کے ذریعے دنیا کے اندر وہ تغیرات پیدا ہوں جو اللہ چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دست قدرت نے اس بناء عظیم کے ذریعے انسانیت کے سفر کے لیے جو راہ متعین کی ہے اور جس طرح انسانیت کو صراط مستقیم پر ڈالا ہے اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو وہ انقلابی تغیرات ثابت ہوں گے۔ ان لوگوں پر تو یہ اثرات ہوئے جو ماننے والے تھے لیکن اس سے وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جو نہ ماننے والے تھے بلکہ جو مخالف تھے۔ نزول قرآن کے دور میں جانی جانے والی نسلیں بھی اس سے متاثر ہوئیں اور بعد میں آنے والے بھی اس سے متاثر ہوئے۔ پوری انسانی تاریخ پر کسی بات 'کسی خبر نے اس قدر گہرے اثرات مرتب نہیں کیے [illegible] قرآن نے کیے۔

قرآن نے دنیا کو اعلیٰ اقدار اور برتر تصورات عطا کیے۔ اس دنیا کو ضابطہ اخلاق' ضابطہ قانون اور بین الاقوامی

قانون دیا۔ اور یہ قوانین اور انتظامات پوری انسانیت کے لیے تھے۔ ان اقدار اور ضابطہ عمل کے بارے میں عربوں نے تو سوچا ہی نہ تھا۔

عربوں نے کبھی یہ نہ سوچا تھا اور نہ سوچ سکتے تھے کہ اس عظیم خبر کے نتیجے میں روئے زمین پر اس قدر تغیرات واقع ہوں گے۔ تاریخ کا دھارا بدل جائے گا۔ اس زندگی کا نقشہ اللہ کی تقدیر کے مطابق بدل جائے گا۔ انسان کے ضمیر و شعور اور اس کے حالات میں انقلاب برپا ہو جائے گا۔ اور یہ تغیرات اس لائن پر ہوں گے جس پر یہ پوری کائنات چل رہی ہے اور یہ کہ یہ خبر دراصل اس سچائی کی خبر ہے جس کے اوپر یہ کائنات چل رہی ہے اور قیامت تک زندگی نے اب اس طرح چلنا ہے اور اس طرح اس بناء عظیم نے انسانوں کی قسمت کو بدلنا ہے۔

آج مسلمانوں کا ردعمل اس خبر پر وہی ہے جس طرح ابتداء میں عربوں کا تھا۔ وہ یہ نہ سمجھ پائے کہ اس خبر کا تعلق روح کائنات کے ساتھ ہے۔ آج مسلمان بھی یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بناء عظیم اسی سچائی کی حامل ہے جس پر یہ کائنات قائم ہے۔ مسلمان اس کائنات پر اس کے اثرات کو اس طرح پیش نہیں کرتے۔ جس طرح فی الواقع وہ اثرات مرتب ہوئے۔ انسانی تاریخ پر وہ قرآنی نظریہ اور قرآنی زاویہ سے نگاہ نہیں ڈالتے بلکہ وہ انسانی اور خود اپنی تاریخ اور اس عظیم خبر کو ان لوگوں کی عینک لگا کر پڑھتے ہیں جو اسے سرے سے درست ہی نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس کرۂ ارض پر نہ اپنے ماضی کے کردار کو سمجھے ہیں' نہ اپنے حالیہ کردار کی اہمیت کو سمجھے ہیں اور نہ مستقبل میں جو کردار انہوں نے ادا کرنا ہے اس کو سمجھے ہیں۔ حالانکہ قیامت تک یہ کردار ادا کرنا ان کا فریضہ ہے۔

ابتدائی دور کے عرب یہ سمجھتے تھے کہ یہ معاملہ عربوں کا ہے' قریش کا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ اور صرف یہ ہے کہ عربوں سے محمد نامی شخص کو نبی چن لیا گیا حالانکہ ان کے خیال میں وہ کوئی بڑا آدمی نہ تھا۔ ان کے ارادے اور ان کی سوچ اس قدر محدود شکل میں تھی۔ قرآن کریم ان سے کہتا ہے کہ یہ کوئی میونسپل مسئلہ نہیں ہے' یہ تو بہت ہی عظیم امر ہے۔ یہ محمد ابن عبداللہ کا ذاتی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ تو صرف اس عظیم خبر کو نشر کرنے والے ہیں۔ یہ خود اس کے موجد بھی نہیں ہیں۔ وہ صرف وہ بات کہہ رہے ہیں جس کے بارے میں ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس عظیم خبر کا اعلان کر دو۔ محمد کو کیا پتہ کہ آغاز کائنات میں اللہ نے تخلیق انسانیت کے بارے میں کیا مکالمہ کیا۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝ إِنْ يُوحَىٰ إِلَيَّ إِلَّا أَنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝

"(ان سے کہو) "مجھے اس وقت کی کوئی خبر نہ تھی جب ملاء اعلیٰ میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ مجھ کو تو وحی کے ذریعہ سے یہ باتیں صرف اس لیے بتائی جاتی ہیں کہ میں کھلا کھلا خبردار کرنے والا ہوں"۔

یہاں پھر قصہ انسانیت شروع ہوتا ہے کہ اس بناء عظیم میں انسان کا کیا مقام ہے۔ اس وقت عالم بالا میں وہ مکالمہ ہوا جس سے انسانی تاریخ کی لائن متعین ہوتی ہے۔ اور انسانی قدریں متعین ہوتی ہیں اور اسی نظریہ اور فلسفہ کی تبلیغ کے لیے حضرت محمد ﷺ بھیجے گئے ہیں۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّى خَٰلِقٌۢ بَشَرًا مِّن طِينٍ ﴿٧١﴾ فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِى فَقَعُوا۟ لَهُۥ سَٰجِدِينَ ﴿٧٢﴾

”جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا ”میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں‘ پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں‘ اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ“۔

ہمیں اس کا علم نہیں ہے کہ یہ مکالمہ کس انداز میں ہوا۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی فرشتوں کے ساتھ مکالمے کی کیفیت کیا ہے اور یہ بھی ہمیں معلوم نہیں ہے کہ فرشتے اللہ سے ہدایات کس طرح اخذ کرتے ہیں۔ نہ ہم فرشتوں کی حقیقت سے باخبر ہوں۔ نہ ہمیں ان مسائل میں الجھنے کی ضرورت لاحق ہے اور نہ کوئی فائدہ متوقع ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس قصے کا جو مطلب ہے اور اس کے اندر جو فلسفہ ہے اس پر بات کریں۔

اللہ نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ جس طرح زمین کی تمام ذی روح چیزوں کو مٹی سے بنایا۔ تمام زندہ مخلوقات کے عناصر ترکیبی مٹی میں موجود ہیں۔ صرف ایک چیز ابھی تک راز ہے کہ روح اور حیات اس کے اندر کہاں سے آئی اور کس طرح آئی۔ اس راز کے سوا انسان کی ذات کے تمام عناصر مٹی سے ہیں۔ اور انسان دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں انسان قرار پایا۔ وہ اسی روح کی وجہ سے جو اللہ نے اس کی ذات کے اندر پھونکا۔ انسان کی ماں یہ زمین ہے۔ زمین کے عناصر سے اس کی تخلیق ہوئی ہے اور جب اس سے روح جدا ہوتی ہے تو وہ پھر مٹی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب اس کے جسد خاکی سے روح نکلتی ہے تو اس سے اس کے آثار علوی نکل جاتے ہیں۔

روح کی پھونک کی کیا حقیقت ہے‘ اس کی ماہیت سے ہم بے خبر ہیں‘ البتہ روح کے آثار ہمارے علم میں ہیں۔ یہ روحانی آثار ہیں جن کی بنا پر یہ حضرت انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور اس روح ہی کی وجہ سے وہ روحانی اور عقلی ارتقاء کرتا ہے۔ یہ روح ہی ہے جس کی وجہ سے انسان ماضی سے تجربات حاصل کرتا ہے۔ اور مستقبل کے لیے راہ عمل متعین کرتا ہے۔ اس طرح انسانی عقل حواس کے مدرکات اور عقل کے مدرکات سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور اسے وہ روحانی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو حواس اور عقل کے دائرے سے وراء ہیں۔

عقل اور روحانی ارتقاء انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس زمین پر زندہ ہونے والے تمام دوسرے ذی حیات انسان کے ساتھ اس خاصہ میں شریک نہیں ہیں۔ جب سے انسان پیدا ہوا ہے اس کے ساتھ دوسرے حیوانات بھی پیدا ہوئے۔ لیکن انسان اور زمین کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حیوانات میں سے کوئی حیوان عقل اور روح کے اعتبار سے انسان جیسی ترقی کر گیا ہو۔ اگر ہم عضویاتی ارتقاء کو تسلیم بھی کر لیں لیکن عقلی ارتقاء کی کوئی مثال نہیں ہے۔

اللہ نے اس بشری مخلوق میں اپنی روح پھونکی ہے۔ کیونکہ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ حضرت انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہو اور اس خلافت اور نیابت کی رو سے زمین کے اختیارات اپنے حدود و قدرت کی حد تک سنبھال لے۔ یعنی اس کی تعمیر کرے۔ اس کے اندر پوشیدہ قوتوں کو اپنے کام میں لائے اور یہاں خدا کی منشاء کو پورا کرے۔

اللہ نے انسان کو ترقی اور حصول علم کی قوت دی اور اپنے روز آفرینش سے وہ ترقی کر رہا ہے بشرطیکہ وہ اس روح

کے منبع سے جڑا رہے یعنی ذات باری سے ۔ اور ذات باری سے وہ صراط مستقیم کی طرف گامزن ہونے کی ہدایت لیتا رہے لیکن اگر وہ عالم بالا کی ہدایات سے منحرف ہو جائے تو پھر انسان کی ذات میں ترقی اور آگاہی کا جو تموج ہے وہ متوازن نہیں رہتا۔ اور اس کی سمت بھی درست نہیں رہتی۔ اور بعض اوقات انسان آگے بڑھنے کے بجائے ترقی معکوس کرتا ہے اور یہ تموج پھر اس کی ذاتی اور انسانی سلامتی کے لیے خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر وہ انسانی خصوصیات میں رجعت قہقری اختیار کر لے تو حقیقی ارتقاء کے بجائے وہ زوال کی راہ پر پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس کے علوم و فنون زیادہ ہو گئے ہوں۔ وہ تجربات میں بہت آگے جا چکا ہو اور زندگی کے بعض پہلوؤں کے اعتبار سے ترقی کر گیا ہو۔

یہ انسان! نہایت ہی چھوٹا انسان، کائنات کے ان عظیم اور ہولناک اجسام و کرات کی یہ نسبت! یہ انسان! جس کی قوتیں نہایت محدود ہیں جس کا عمل بہت قصیر ہے۔ جس کا علم بہت ہی محدود ہے۔ یہ انسان اس قدر عظمت و کرامت حاصل ہی نہ کر سکتا تھا۔ اگر اللہ نے اس میں اپنی روح نہ پھونکی ہوتی اور اس پر اللہ کا یہ مخصوص کرم نہ ہوا ہوتا۔

ذرا سوچو، اس انسان کی حیثیت ہی کیا ہے۔ یہ تو اس کائنات کے اندر ایک نہایت ہی چھوٹا سا کیڑا ہے اور یہ لَا تَعُدُّ وَلَا تُحْصِی دوسرے زندہ کیڑوں، مکوڑوں اور پرندوں اور چرندوں کے ساتھ یہاں رہتا ہے اور یہ زمین کیا ہے، یہ کسی ایک نظام شمسی میں چھوٹی سی گیند ہے اور اس قسم کی کئی بلین گیندیں اس کائنات میں تیرتی پھرتی ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کا آغاز کہاں سے ہے اور انتہا کہاں پر ہے، یہ انسان! اس انسان کو فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ کے فرشتے، یہ محض اس نفخ روح کی وجہ سے ہے جو نہایت ہی گہرا راز ہے اور عظیم راز ہے۔ اس راز ہی کی وجہ سے یہ انسان زمان قدیم سے محض حیوان رذیل نہیں ہے۔ اگر اس سے یہ روح اور روحانیات کو منفی کر دیا جائے تو یہ ایک حقیر مٹی کا ٹکڑا ہے۔ ملائکہ نے بہرحال امر الٰہی کی تعمیل کی۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿٧٣﴾

”حکم کے مطابق فرشتے سب کے سب سجدے میں گر گئے“۔ کس طرح سجدہ کیا۔ کہاں کیا، کب کیا؟ یہ سب اللہ کے علوم غیبیہ سے ہیں۔ اگر یہ معلومات اللہ فراہم ہی کر دیتا تو اس سے اس قصے کے مفہوم اور مطلب میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہوتا۔ قصے کا مقصد یہ ہے کہ مٹی سے بنایا ہوا یہ حضرت انسان جو دوسرے حیوانات کی طرح ہے کس طرح مکرم اور مسجود ملائک بن گیا۔ یوں کہ اسے نفخ ربانی کی وجہ سے یہ برتری حاصل ہوئی۔ اس کی روح اور روحانیات کی وجہ سے نہ جسم اور جسمانیات کی وجہ سے۔

ملائکہ نے از راہ امتثال امر الٰہی سجدہ کر لیا۔ وہ اس کی حکمت کو پا گئے تھے۔ کیونکہ اللہ ان کو سکھا گیا تھا۔

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٤﴾

”مگر ابلیس نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا“۔ کیا ابلیس فرشتوں میں سے تھا؟ ظاہر یہ ہے کہ نہ تھا۔ کیونکہ اگر یہ فرشتوں میں سے ہوتا تو معصیت کیسے کرتا اس لئے کہ فرشتے تو اللہ کے اوامر سے معصیت نہیں کرتے اور ان کو جو بھی حکم دیا جاتا ہے۔ اسے وہ کر گزرتے ہیں۔ آئندہ یہ بات آئے گی کہ یہ آگ سے پیدا شدہ مخلوق ہے۔ اور

یہ بات معقول ہے کہ فرشتے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن وہ فرشتوں میں رہتا تھا۔ اور اسے بھی حکم دیا گیا تھا کہ سجدہ کرو۔ اور حکم دیتے وقت صرف فرشتوں کا تذکرہ ہوا۔ اور اس کا تذکرہ نہ ہوا یعنی "یہ نہیں کہا کہ اے فرشتو اور شیطان سجدہ کرو"۔ اس لیے کہ اللہ کے علم میں تھا کہ یہ نافرمانی کرے گا لہٰذا اسے نظرانداز کرنے کے لیے ایسا کیا گیا۔ ہمیں تب معلوم ہوا کہ شیطان کو بھی سجدے کا حکم دیا گیا تھا جب اس پر عتاب نازل ہوا۔

قَالَ يَٰٓإِبۡلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَن تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَيَّۖ أَسۡتَكۡبَرۡتَ أَمۡ كُنتَ مِنَ ٱلۡعَالِينَ ﴿٧٥﴾

"رب نے فرمایا "اے ابلیس، تجھے کیا چیز اس کو سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟ تو بڑا بن رہا ہے یا تو ہے ہی کچھ اونچے درجے کی ہستیوں میں سے"۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا؟ اللہ تو سب مخلوقات کا خالق ہے۔ لہٰذا انسان کی تخلیق میں کوئی امتیازی بات ہے، اس لیے یہاں اللہ نے اپنے دست قدرت کا ذکر کیا۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے اس مخلوق پر مخصوص عنایات کی ہیں، اس میں اپنی مخصوص روح پھونکی ہے اور اس پر بہت کچھ عنایات کی ہیں۔

تو نے میرے حکم کے مقابلے میں سرکشی کی ہے یا تو کچھ اونچے درجے کی ہستیوں میں سے ہے۔ (اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ (۳۸ : ۷۵) یعنی ان لوگوں میں سے ہے جو میری بغاوت پر تلے ہوئے ہوتے ہیں۔

قَالَ أَنَا۠ خَيۡرٞ مِّنۡهُ خَلَقۡتَنِي مِن نَّارٖ وَخَلَقۡتَهُۥ مِن طِينٖ ﴿٧٦﴾

"اس نے جواب دیا "میں اس سے بہتر ہوں، آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے"۔

اس جواب سے حسد ٹپکا پڑتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جسد آدم میں مٹی کے عنصر سے جو زائد عنصر ہے، شیطان اس سے غافل تھا۔ یہ وہی زائد عنصر تھا یعنی روح ربانی جو اس عزت افزائی کا مستحق تھا۔ بہرحال یہ اس ذات کی جانب سے ایک کورا جواب ہے جو اس منظر میں ہر قسم کی خیر اور بھلائی سے محروم ہوتی ہے۔

چنانچہ بارگاہ رب العزت سے حکم نامہ جاری ہوا اور اس قبیح ذات کو دربار عالیہ سے نکال دیا گیا۔

قَالَ فَٱخۡرُجۡ مِنۡهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٞ ﴿٧٧﴾ وَإِنَّ عَلَيۡكَ لَعۡنَتِيٓ إِلَىٰ يَوۡمِ ٱلدِّينِ ﴿٧٨﴾

"فرمایا، اچھا تو یہاں سے نکل جا، تو مردود ہے، اور تیرے اوپر یوم الجزاء تک میری لعنت ہے"۔

یہ واضح نہیں ہے کہ منہا کی ضمیر کس طرف عائد ہوتی ہے۔ کیا یہ جنت کی طرف راجع ہے اور یہ خبیث جنت میں تھا۔ یا اس کا مرجع رحمت الٰہیہ ہے۔ دونوں کی طرف یہ ضمیر راجع ہو سکتی ہے۔ اس پر کسی مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔ غرض شیطان راندۂ درگاہ ہو گیا اس پر اللہ کی لعنت ہوئی اور غضب ہوا کیوں؟ اس لیے کہ اس نے امر الٰہی کے مقابلے

میں سرکشی اختیار کی اور اللہ کے احکام کے مقابلے میں جرات اور جسارت کا مظاہرہ کیا۔
اب یہ حسد دشمنی میں بدل جاتا ہے اور شیطان انتقام کا منصوبہ بناتا ہے۔

قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٧٩﴾

وہ بولا "اے میرے رب، یہ بات ہے تو پھر اس وقت تک کے لیے مجھے مہلت دے دے جب یہ لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے"۔ اللہ کی مشیت کا تقاضا یوں تھا کہ اس کی درخواست منظور کر لی جائے اور اسے قیامت تک فرصت د مہلت دے دی جائے۔

قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿٨٠﴾ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٨١﴾

فرمایا "اچھا، تجھے اس روز تک کی مہلت ہے جس کا وقت مجھے معلوم ہے"۔
شیطان نے اپنے مقاصد صاف صاف بتا دیئے کہ اپنی کینہ پروری وہ ان مقاصد کے لیے استعمال کرے گا۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾

اس نے کہا "تیری عزت کی قسم، میں سب لوگوں کو بہکا کر رہوں گا، بجز تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے خالص کر لیا ہے"۔

اس نے اپنا منہاج کار بھی متعین کر دیا، وہ اللہ کی عزت کی قسم اٹھا کر اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ میں ان تمام انسانوں کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ ہاں وہ صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ کرتا ہے جن پر اس کا بس نہیں چلتا۔ اس لیے نہیں کہ اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ وہ کچھ مہربانی کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ اس کے دام میں آنے والے نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ شیطان کی دست درازیوں سے محفوظ ہیں۔ ان کے اور شیطان کے درمیان کیا پردہ ہوتا ہے؟ وہ یہ کہ بندہ اللہ کی بندگی اخلاص کے ساتھ کرے تو وہ شیطان کی دسترس سے دور ہو جاتا ہے۔ یہی طریق نجات ہے اور یہی زندگی کی مضبوط رسی ہے۔ اور یہ بھی اللہ کے ارادے اور تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ کی مشیت کے دائرہ کے اندر ہلاکت یا نجات ملتی ہے۔
اس موقعہ پر اللہ نے بھی اپنے ارادے کا برملا اظہار کر دیا اور اللہ نے بھی اپنے منہاج کا اعلان کر دیا۔

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ﴿٨٤﴾ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٥﴾

فرمایا "تو حق یہ ہے، اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں، کہ میں جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا جو ان انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے"۔

اللہ حق بات کہتا ہے اور ہمیشہ حق بات کہتا ہے ۔ اس بات کی طرف اس سورت میں مختلف اسالیب میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ وہ دو فریق مقدمہ جو دیوار پھلانگ کر داؤد علیہ السلام کے پاس برائے فیصلہ پہنچ گئے تھے وہ کہتے ہیں ۔

فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ (۳۸ : ۲۲) "ہمارے درمیان حق پر مبنی فیصلہ کرو اور بے انصافی نہ کرو"۔

اللہ اپنے بندے داؤد کو کہتا ہے ۔

فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (۳۸ : ۲۶) "لوگوں کے درمیان حق پر مبنی فیصلہ کرو اور اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو"۔ اس کے بعد زمین اور آسمانوں کی تخلیق کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ تخلیق حق پر ہوئی ہے ۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

(۳۸ : ۲۷) "اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو باطل طور پر پیدا نہیں کیا ۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا"۔ اس کے بعد حق کا تذکرہ اللہ قوی اور عزیز کی زبان پر ہوتا ہے ۔

فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ (۳۸ : ۸۴) "تو حق یہ ہے اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں"۔

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۳۸ : ۸۵) "کہ میں جہنم کو تجھ سے اور ان لوگوں سے بھر دوں گا جو ان انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے"۔ یہ ہے معرکہ انسانوں یعنی بنی آدم اور شیطان کے درمیان ۔ یہ معرکہ باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہے ۔ اور اللہ نے بھی ان کو ان کا انجام نہایت ہی واضح الفاظ میں بتا دیا ۔ اور اس وضاحت کے بعد اب لوگ جو راہ اختیار کریں وہ خود ذمہ دار ہوں گے ۔ اللہ کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ لوگوں کو بے خبری میں نہ پکڑا جائے ۔ نہ جہالت میں رکھ کر پکڑ لیا جائے ۔ اس لیے اللہ نے انبیائے منذرین ان کے پاس بھیجے ۔

سبق کے آخر اور سورت کے اختتام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو آخری بات صاف طور پر کہہ دی جائے ۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿۸۶﴾ ۵
اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿۸۸﴾ ع ۲۴
۱۲

"(اے نبیؐ) ان سے کہہ دو کہ میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا ' اور نہ میں بناوٹی لوگوں میں سے ہوں ۔

یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے اور تھوڑی مدت ہی گزرے گی کہ تمہیں اس کا حال خود معلوم ہو جائے گا"۔ یہ تو خالص نجات کی دعوت ہے۔ انجام بتا دیا گیا اور اس سے خوب ڈرا بھی دیا گیا۔ یہ ایسی مخلصانہ دعوت ہے کہ داعی کسی اجر و انعام کا طلبگار نہیں ہے۔ یہ داعی سلیم الفطرت ہے۔ وہ عام لوگوں کی زبان میں بات کرتا ہے۔ کوئی تکلیف اور کوئی بناوٹ اس کی بات میں نہیں ہے۔ وہ وہی باتیں کرتا ہے جو اسے فطرت کی منطق سکھاتی ہے اور جو قریب الفہم ہے اور یہ ان لوگوں کے لئے یاددہانی ہے، جو اپنی غفلت کی وجہ سے اس وعظ و نصیحت کو بھول چکے ہیں اور یہ تو وہ عظیم خبر اور شہ سرخی ہے جس کے نتائج عنقریب وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ لیکن بہت ہی تھوڑی دیر کے بعد۔ یہ پورے کرۂ ارض کی عالمی خبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کے چند سال بعد ہی ان لوگوں نے اس کے نتائج دیکھ لیے۔ اور قیامت میں بھی اس کے نتائج دیکھ لیں گے کہ انسانوں اور جنوں سے جہنم کو بھر دیا جائے گا۔

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَ مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۳۸: ۸۵) "میں ضرور جہنم کو تجھ سے اور ان سب لوگوں سے بھر دوں گا جو ان انسانوں میں سے تیری پیروی کریں گے"۔

یہ اس سورت کا خاتمہ ہے اور یہ اس سورت کے افتتاحی کلام اور اس کے موضوعات و مسائل سے ہم آہنگ ہے، جن کے بارے میں اس سورت میں بحث کی گئی ہے۔ یہ ایک آخری اور گہری ضرب ہے۔ اور اس کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ اسلامی انقلاب کی اس تحریک کی خبریں مستقبل میں کیا ہوں گی۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ (۳۸: ۸۸) "تھوڑے ہی وقت کے بعد تم اس کی خبر پالو گے"۔

صدق اللہ العظیم

مانسہرہ جمعہ ۲۲ جولائی ۱۹۹۴ء

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ----- ۲۳

سورۃ الزمر ـ ۳۹

آیات ۱--- تا--- ۳۱

سورۃ الزمر ایک نظر میں

اس پوری سورت میں مسئلہ توحید کو لیا گیا ہے ۔ انسان کے دل و دماغ کو پے در پے سوچ کی وادیوں کی سیر کرائی گئی ہے ۔ اور انسانی سوچ کی تاروں کو بار بار مضراب سے چھیڑا گیا ہے اور بار بار ان پر شدید ضربات لگائی گئی ہیں تاکہ انسانی فکر میں مسئلہ توحید کو اچھی طرح بٹھا دیا جائے اور انسانی عقائد کو شرک اور شرک کے شائبہ تک سے پاک کر دیا جائے اور انسانی فکر ونظر پر شرک کا خفیف سا سایہ بھی باقی نہ رہے ۔ اس لیے یہ سورت آغاز سے انجام تک ایک ہی موضوع رکھتی ہے ۔ البتہ اس موضوع پر متنوع اسالیب سے بات کی گئی ہے جس طرح قرآن کا طریقہ ہے ۔

سورت کے آغاز ہی سے مسئلہ توحید نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور پوری سورت میں یہی نظر آتا ہے کہ اس سورت میں عقیدۂ توحید ہی سے بحث ہوگی ۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۳۹ : ۱) اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (۳۹ : ۲) اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (۳۹ : ۳) ''اے نبی ' یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے ۔ لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو ' دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے ۔ خبردار دین خالص اللہ کا حق ہے'' ۔ اس سورت میں آیات کے مقاطع پر بار بار منصوص طور پر یا اشارۃً یا معناً عقیدہ توحید ہی کو لایا گیا ہے ۔

منصوص طور پر یوں ' مثلاً

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (۳۹ : ۱۱) وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ (۳۹ : ۱۲) قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۳۹ : ۱۳) قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ (۳۹ : ۱۴) فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ (۳۹ : ۱۵) ا تا ۱۴ ۔ ''اے نبی ' ان سے کہو مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے ' اس کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں ' کہو اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے ۔ کہہ دو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں گا ۔ تم اس کے سوا جس کی بندگی کرنا چاہو ' کرتے رہو'' ۔

اور دوسری جگہ ہے:۔

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْنِّيْ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ (۳۹: ۶۴) وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳۹: ۶۵) بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۳۹: ۶۶) ”اے نبی، ان سے کہو، پھر کیا اے جاہلو، تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو؟ تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے ۔ لہٰذا تم بھی اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں ہو جاؤ“۔

اور مفہوم کے اعتبار سے بھی، مثلاً

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹: ۲۹) ”اللہ ایک مثال دیتا ہے ۔ ایک شخص تو وہ ہے جس کے مالک ہونے میں بہت سے کج خلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے ۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟ الحمدللہ ۔ مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں“ ۔ یا یہ قول ۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ وَ يُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۹: ۳۶) وَ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ (۳۹: ۳۷) ”اے نبی، کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں حالانکہ اللہ جس کو گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے اور جسے وہ ہدایت دے اسے بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں ہے ۔ کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے“۔

حقیقت توحید جو اس سورت کا اہم موضوع ہے ۔ اور اسے یہ سورت مومن کے دل و دماغ میں اچھی طرح بٹھانا چاہتی ہے لیکن اس کے علاوہ دل مومن کو جگانے کے لیے اور اس کے اندر شدید احساس پیدا کرنے کے لیے اور اسے اخذ ہدایت کے لیے تیار پاکر ہوکر دعوت حق پر لبیک کہنے کا جوش لانے کے لیے اس سورت میں خصوصی ہدایات و اشارات بھی ہیں ۔ مثلاً یہ فرمان ۔

وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى فَبَشِّرْ عِبَادِ (۳۹: ۱۷) الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۹: ۱۸) ”جن

لوگوں نے طاغوت کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا۔ان کے لیے خوشخبری ہے ۔پس اے نبی بشارت دو میرے ان بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں ۔یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور یہی دانشمند ہیں۔

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَی اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۹ : ۲۳) ”اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے' ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں' اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں' اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ راہ راست پر لے آتا ہے' جسے چاہتا ہے اور جسے اللہ ہی ہدایت نہ دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں“۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِیْبًا اِلَیْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِیَ مَا كَانَ یَدْعُوْا اِلَیْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِیْلًا اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ (۳۹ : ۸) ”انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے ۔پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نوازتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھہراتا ہے تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کرے ۔اے نبی اس سے کہو تھوڑا اپنے کفر سے لطف اٹھالے یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے“۔

اس سورت کے اندر ایک خاص بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے ۔وہ یہ کہ اس سورت کے آغاز سے آخر تک اس پر قیامت کا سایہ چھایا ہوا ہے ۔اور اس کے تمام مختصر راؤنڈز میں سیاق کلام انسان کو عالم آخرت کی سیر کراتا ہے ۔اور انسان کا بڑا وقت عالم آخرت کی سیر میں گزرتا ہے ۔یہ ہے اس سورت کا پہلا دائرہ کلام اور اس پر اس میں بار بار نہایت ہی موثر دلائل دیئے گئے ہیں بار بار۔چنانچہ اس سورت میں بار بار قیامت کے مناظر آتے ہیں یا ہر آیت کے مقطع میں قیامت کی طرف صراحت کے ساتھ یا رمز کے ساتھ اشارہ موجود ہے ۔مثلاً درج ذیل اشارات اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَیَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ (۳۹ : ۹) ”وہ جو مطیع فرمان ہے' رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا ہے اور سجدے کرتا ہے' آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے ۔

قُلْ اِنِّیْ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (۳۹ : ۱۳) ”کہو' اگر میں اپنے

رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے"۔

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِى النَّارِ (۳۹ : ۱۹) "اے نبیؐ اس شخص کو کون بچا سکتا ہے جس پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہو؟ کیا تم اسے بچا سکتے ہو جو آگ میں گر چکا ہو۔

اَفَمَنْ يَّتَّقِىْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۳۹ : ۲۴) "اب اس شخص کی بدحالی کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو جو قیامت کے روز عذاب کی سخت مار اپنے منہ پر لے گا"۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۳۹ : ۲۶) "اور آخرت کا عذاب تو اس سے شدید تر ہے، کاش یہ لوگ جانتے"۔

اَلَيْسَ فِىْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ (۳۹ : ۳۲) "کیا کافروں کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے"۔

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ (۳۹ : ۴۷)

"اگر ان ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو، اور اتنی ہی اور بھی تو یہ روز قیامت کے میرے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے"۔

وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۳۹ : ۵۴) وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۳۹ : ۵۵) اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِىْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ (۳۹ : ۵۶) اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِىْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۳۹ : ۵۷) اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِىْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۳۹ : ۵۸) "پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ، قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے۔ اور پیروی اختیار کر لو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی شخص کہے "افسوس میری اس تقصیر

جو میں اللہ کی جناب میں کرتا رہا، بلکہ میں تو الٹا مذاق اڑانے والوں میں سے تھا"۔ یا کہے "کاش اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہوتی تو میں متقیوں میں سے ہوتا یا عذاب دیکھ کر کہے کاش مجھے ایک موقع اور مل جائے اور میں بھی نیک عمل کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں"۔ یہ مقاطع اور آیات کے آخری حصے ان مکمل مناظر اور مشاہد قیامت سے علیحدہ ہیں جو اس سورت کا بڑا حصہ ہیں اور جن کی پوری فضا قیامت کے مضامین پر مشتمل ہے۔

رہے وہ کائناتی مناظر، جو تمام مکی سورتوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں، خصوصاً اسلامی نظریہ حیات پر بطور دلائل و نشانات تو وہ بھی اس سورت میں ہیں مگر بہت ہی کم۔

ایک کائناتی منظر سورت کے آغاز ہی میں ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ یُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّیْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ

(۳۹: ۵) "اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اس نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک 'ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو' وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے"۔ اور ایک دوسرا منظر سورت کے وسط میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُهٗ حُطَامًا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِی الْاَلْبَابِ

(۳۹: ۲۱) "کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں۔ پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں، پھر آخر کار ان کو بھس بنا دیتا ہے۔ درحقیقت اس میں ایک سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے"۔

ان دونوں کھلے مشاہد اور مناظر میں زمین و آسمان کی تخلیق کی طرف مختصر اشارات کیے گئے ہیں۔ اس سورت میں انسانی زندگی کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔ انسانی نفسیات میں گہرائیوں تک جا کر بعض موتی نکال لائے گئے ہیں۔ اور یہ اس سورت میں جگہ جگہ بکھیر دیئے گئے ہیں۔

آغاز ہی میں تخلیق انسانیت کی کہانی ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ

رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۳۹ : ۶) ”اس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا‘ پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا اور اس نے تمہارے لیے مویشیوں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے ـ وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں میں تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے ـ یہی اللہ تمہارا رب ہے‘ بادشاہی اس کی ہے‘ کوئی معبود اس کے سوا نہیں ـ پھر تم کدھر پھرائے جا رہے ہو ـ

اور مشکلات اور آسانیوں میں نفس انسانی کا مختلف ردعمل ـ

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ (۳۹ : ۸) ”انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے ـ پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا“ ـ

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ (۳۹ : ۴۹) ”انسان کو جب مصیبت چھو جاتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے اور جب ہم اسے اپنی طرف سے نعمت دے کر اٹھا دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ـ

نیز یہ کہ انسانی جانیں اور نفوس دراصل ہر حال میں اللہ کے قبضے میں ہیں ـ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۹ : ۴۲) ”یہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے ـ پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے‘ اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں وقت مقررہ تک کے لیے واپس بھیج دیتا ہے ـ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں“ ـ

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ پوری سورت میں آخرت کی فضا ہے ـ اور سورۃ کا خاتمہ بھی ایک ایسے منظر پر ہوتا ہے جس میں آخرت کے حالات عیاں ہیں ـ

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَ قِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۹ : ۷۵) ”اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہوں گے اور لوگوں کے درمیان ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ ہو گا اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے اللہ رب العالمین کے لیے“ ـ

آخرت کی یہ فضا ـ اس پوری سورت کے مضامین اور اس کی فضا کے ساتھ نہایت موزوں ہے ـ اور رنگ اور ان

احساسات کے مطابق ہے جو اس سورت میں انسانی دل کے اندر پیدا کیے گئے ہیں۔ پوری سورت میں انسان کے اندر خضوع، خشوع، آخرت کا خوف اور اس کے قلب کے اندر کپکپی پیدا کی گئی ہے۔ چنانچہ پوری سورت میں ہم وہ حالات پاتے ہیں جو انسانی دل میں خشیت، خوف اور ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ایسا کردار اس سورت میں ہے، جو اللہ کے سامنے رات کو کھڑا ہے، سجود اور رکوع میں اور آخرت سے ڈر رہا ہے اور رحمت ربی کا امیدوار ہے۔ پھر ایسے کردار بھی نظر آتے ہیں جو اللہ سے ڈرے سہمے ہیں اور جن کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہیں اور جب وہ تلاوت قرآن کرتے ہیں تو ان کے دل تسبیح کرتے جاتے ہیں اور وہ اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس سورت میں ہدایات دی جاتی ہیں کہ اللہ سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو اور اللہ کے عذاب سے بچنے کی فکر کرو۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ (۳۹ : ۱۰) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو"۔

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۳۹ : ۱۳) "کہہ دیجئے میں اگر اپنے رب کی معصیت کروں تو یوم عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ (۳۹ : ۱۶) "ان پر آگ کی چھتریاں ہیں۔ اوپر سے بھی چھائی ہوئی ہوں گی اور نیچے سے بھی۔ یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے کہ اے میرے بندو، میرے غضب سے بچو"۔ پھر قیامت کے مناظر اور وہاں کے جزع و فزع میں اور اللہ کی طرف یکسوئی اور اس کے خوف میں یہی خدا خوفی کی فضا نظر آتی ہے۔

یہ پوری سورت عقیدۂ توحید اور فکر آخرت کے موضوع پر مشتمل ہے۔ اس سورت کو بڑے بڑے دروس میں تقسیم کرنا مشکل ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے اسفار پر مشتمل ہے جو توحید و قیامت کے مطالعاتی سفر ہیں اور ان میں یا تو قیامت کا کوئی منظر پیش کیا گیا ہے یا قیامت کی کوئی جھلکی دکھائی گئی ہے۔ مناسب ہے کہ اس سورت کو اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں لیا جائے۔

درس نمبر۲۱۵ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۷

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿۲﴾ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ڛ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے"۔ (اے نبیؐ) یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے' لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو' دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔ خبردار' دین خالص اللہ کا حق ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (اور اپنے اس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں' اللہ یقیناً ان کے درمیان ان تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو جھوٹا اور منکر حق ہو"۔

سورت کا آغاز اس فیصلہ کن قرارداد سے ہوتا ہے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۳۹ : ۱) "اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے"۔ وہ زبردست ہے اور وہ اس قسم کی کتاب کے نزول پر قدرت رکھتا ہے۔ اور وہ حکیم دانا ہے اور وہ جانتا ہے کہ نزول قرآن کس بارے میں ہے اور یہ حکیم کیوں ہے۔ یہ تمام کام اللہ نہایت حکمت اور تدبر اور تقدیر سے کرتا ہے۔

اس قرارداد پر بات طویل نہیں ہوتی کیونکہ یہ تو تمہید تھی' اصل بات کے لیے اور اصل موضوع کے لیے یہ پوری

سورت وقف ہے ۔ سورت کا نزول ہی اس موضوع کا ثبوت اور تاکید ہے ۔ یعنی مسئلہ توحید ' اللہ کی بندگی میں توحید اور اسلامی نظام زندگی میں توحید ۔ اور عقیدے ' بندگی اور نظام زندگی کو ہر پہلو سے شرک سے پاک کرنا ۔ اور پھر اللہ تک رسائی کے لیے واسطوں کو ختم کر کے براہ راست اس کو پکارنا بغیر کسی سفارش کے ۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (۳۹ : ۲) "اے نبی' یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف برحق نازل کی ہے" ۔ اور جس سچائی پر یہ کتاب نازل کی گئی ہے ۔ وہ ہمہ جہت وحدانیت ہے ' جس کے اوپر یہ کائنات قائم ہے ۔ اس سورت کی پانچویں آیت میں ہے :

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۳۹ : ۵) "آسمانوں اور زمین کو اس نے برحق پیدا کیا ہے" ۔ لہٰذا جس حق اور سچائی پر سماوات کا قیام ہے ' وہی سچائی اس کتاب کا موضوع ہے ۔ اس کتاب کا تصور توحید اور اس کائنات کی تخلیق کی وحدت ایک ہی ہیں ۔ جس طرح یہ کائنات اللہ واحد کی تخلیق اور مصنوع ہے اور جس طرح یہ انسان اللہ کی تخلیق اور اس کے امر پر قائم ہے ' اسی طرح یہ کتاب بھی اللہ کے اوامر پر قائم ہے ۔ لہٰذا منطقی نتیجہ یہ ہے :

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (۳۹ : ۲) "لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو ' دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے" ۔

خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے جن کی طرف یہ کتاب برحق نازل کی گئی ۔ اور یہ کتاب رسول کا پیش کردہ منہاج حیات ہے جس کی طرف آپ تمام انسانوں کو دعوت دیتے ہیں ۔ جو اس عقیدے پر قائم ہے کہ اللہ ایک ہے ' اسی کی بندگی کرنی ہے ۔ نظام زندگی صرف اسی سے اخذ کرنا ہے اور پوری زندگی کو اس عقیدۂ توحید پر قائم کرنا ہے ۔

اللہ کو ایک الٰہ سمجھنا اور دین اس کے لیے خالص کرنا محض چند کلمات کا نام نہیں ہے جو زبان سے ادا کر دیئے جائیں ۔ یہ دراصل زندگی کا پورا نظام ہے جو انسان کے دل و دماغ سے عقیدۂ توحید کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور ایک اسلامی سوسائٹی میں مکمل نظام زندگی کے قیام پر ختم ہوتا ہے ۔

وہ دل جو اللہ وحدہ کو الٰہ سمجھتا ہے ' جو صرف اللہ کی بندگی کرتا ہے ' وہ اپنا سر کسی کے آگے نہیں جھکاتا ۔ وہ نہ تو غیر اللہ سے کوئی چیز طلب کرتا ہے ' نہ غیر اللہ پر اعتماد کرتا ہے ۔ ایسے شخص کے نزدیک صرف اللہ ہی قوی ہے اور صرف اللہ اس پوری کائنات پر غالب ہے ۔ سب کے سب ضعیف اور کمزور ہیں اور وہ کسی کے لیے کوئی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے ۔ لہٰذا کسی انسان کو کسی انسان کے سامنے سر نہیں جھکانا چاہیے ۔ کیونکہ یہ انسان سب کے سب اسی کی طرح ہیں اور خود اپنے نفع و نقصان کے مختار بھی نہیں ۔ اللہ وحدہ ہی دینے والا اور روکنے والا ہے ۔ لہٰذا اللہ کو اس سلسلے میں کسی وسیلے اور واسطے کی ضرورت نہیں ۔ تمام مخلوق اس کی محتاج ہے اور وہ غنی ہے ۔

پھر جو دل عقیدۂ توحید سے لبریز ہے وہ اس بات پر بھی ایمان لاتا ہے کہ اس کائنات کے ایک ہی قانون قدرت اور ناموس فطرت کنٹرول کرتا ہے ۔ لہٰذا اس کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ جو نظام زندگی اللہ نے انسانوں کے لیے تجویز کیا ہے ' یہ بھی انہی قوانین قدرت کا حصہ ہے ۔ جو اس کائنات کے لیے وضع ہوئے ہیں ۔ لہٰذا یہ انسان اس دنیا کے ساتھ ہم آہنگی کی

زندگی نہیں بسر کر سکتا الا یہ کہ وہ اسلامی نظام زندگی کو اپنا لے ۔ لہٰذا وہ وہی احکام و انتظام اختیار کرتا ہے جو اللہ چاہتا ہے یعنی وہ اللہ ہی کی شریعت کی اطاعت کرتا ہے جو اس نظام کائنات اور انسان کے وجود کے نظام کے ساتھ موافق ہے ۔

پھر جو دل اللہ کو وحدہ لا شریک سمجھتا ہے ' وہ اپنے اور اس اللہ کی پیدا کردہ تمام کائنات کے درمیان ایک قربت اور تعلق محسوس کرتا ہے ۔اس کائنات کی زندہ چیزیں ہوں یا مردہ ۔ لہٰذا اس کی زندگی ایک ایسے ماحول کے اندر بسر ہوتی ہے جو اس کا دوست ' مدد و معاون اور اس کے ساتھ ہمقدم اور محبت کرنے والا ہوتا ہے ۔ وہ اپنے ماحول میں اللہ کے دست قدرت کی کارستانیاں محسوس کرتا ہے ۔ لہٰذا وہ اس ماحول میں اللہ اور اس کی مخلوقات کے ساتھ مانوس ہو کر رہتا ہے ۔ اس کے ساتھ اللہ کی مخلوق ہوتی ہے ۔ اس کی آنکھیں اللہ کی پیدا کردہ عجائبات پر ہوتی ہیں ۔ وہ یہاں اس کائنات کی کسی چیز کو ایذا نہیں دیتا ۔ وہ اس کائنات کی کسی چیز کو تلف نہیں کرتا مگر امر الٰہی سے ۔ کیونکہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے ۔ وہی زندگی دینے والا ہے ۔ وہ سب کا رب ہے اور ہر چیز کا رب ہے ۔

اسی طرح انسانی تصورات اور میلانات میں بھی توحید ظاہر ہوتی ہے ۔ انسانی طرز عمل اور اس کی چال ڈھال میں بھی توحید کا اثر ہوتا ہے ۔ اور انسانی زندگی اور سوسائٹی کے لیے منہاج اور طریق زندگی میں بھی توحید کا اثر ہوتا ہے ۔ اور عقیدۂ توحید محض ایک کلمہ نہیں رہتا جسے زبان سے کہہ دیا جائے ۔ وہ ایک مکمل نظام بن جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن میں عقیدۂ توحید کو بہت ہی بڑی اہمیت دی گئی ہے ۔ ہر جگہ اس پر اصرار و تکرار کیا گیا ہے ۔ لہٰذا توحید پر ان زاویوں سے غور کیا جانا چاہئے ۔ اس زاویہ سے توحید ایک فکر ' ایک نظام عمل ' ایک نظام اجتماعی اور نظام حکومت بن جاتی ہے ۔ اور اس پر ہر وقت تدبر کی ضرورت ہے ۔ ہر زمانے میں ' ہر خاندان اور سوسائٹی میں اور اسی مفہوم میں اس پر تدبر کی ضرورت ہے ۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (۳۹ : ۳) "خبردار دین خالص اللہ کا حق ہے" ۔ نہایت ہی اونچی نہایت ہی طویل اور نہایت ہی رعب دار آواز میں ۔ گویا اعلان شاہی ہے اور لفظ "الا" خبردار ! سے اس کا آغاز ہوتا ہے اور نہایت ہی قصر اور حصر کے الفاظ میں کہ اللہ ہی کا حق ہے نظام زندگی اور خالص اللہ کا حق ہے ۔ جس طرح مفہوم موکد ہے اس طرح الفاظ بھی پر شوکت ہیں ۔ یہ اصول حیات ہے ۔ پوری زندگی اس پر قائم ہے بلکہ پوری کائنات اس اعلان پر قائم ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس قدر مختصر زور دار اور قصر و حصر کے الفاظ میں یہ قانون نافذ ہوتا ہے ۔

اور اس کے مقابلے میں اس دور کی جاہلیت کا کلمہ اور نظریہ کیا تھا ' جسے رد کیا گیا ۔

وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ

(۳۹ : ۴) "رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (کہتے ہیں) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں ۔ اللہ یقیناً ان کے درمیان ان تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں ۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو" ۔ وہ اعلان کرتے تھے کہ اللہ ان کا

خالق ہے ۔ وہ سموات اور زمین کا خالق ہے ۔ لیکن پھر وہ فطری استدلال کی راہ پر نہ چلتے تھے کہ اگر وہی خالق ہے تو وہی بندگی کے لائق ہے ۔ اور پھر دین اور دستور اور قانون اسی کا چلنا چاہئے ۔ یہاں آکر وہ یہ افسانہ گھڑتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں ۔ پھر وہ فرشتوں کے بت بناتے اور ان کو پوجتے ۔ پھر یہ کہتے کہ وہ ملائکہ کے بتوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں ' جن کو وہ اللہ کہتے تھے ۔ لات ' منات اور عزیٰ ' یہ دراصل ان کی عبادت نہیں ہے بلکہ یہ محض اللہ کے قریب ہونے کے لیے ہم ان کے آگے جھکتے ہیں ' تاکہ یہ فرشتے اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں ۔ اور یوں ہم اللہ کے نزدیک ہو جائیں ۔

یہ عقیدہ سیدھے فطری انداز فکر سے انحراف ہے اور یہ عقیدہ غلط ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ اور ناقابل فہم بھی ہے ۔ نہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور نہ یہ بت فرشتوں کے بت ہیں ۔ نہ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے ۔ نہ اللہ کسی کی سفارش سنتا ہے اور نہ اللہ اپنے بندوں کو اس طریقے پر اپنے قریب لاتا ہے ۔

جب بھی انسانیت نے عقیدۂ توحید کو ترک کیا ہے ۔ وہ فطرت کے سیدھے انداز فکر اور سیدھے سادے انداز استدلال سے محروم ہو گئی ہے ' جو اسلام اول روز سے لے کر آیا ہے اور آدم علیہ السلام سے لے کر ادھر تمام رسولان محترم نے یہی عقیدۂ توحید پیش کیا ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت ہر جگہ نیک لوگوں اور اولیاء کی عبادت اسی طرح کی جاتی ہے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عرب فرشتوں اور فرشتوں کے بتوں کی عبادت بطور تقرب الہٰی ' اپنے زعم کے مطابق کیا کرتے تھے ۔ مقصد ان کی سفارش کا حصول ہوتا تھا ' لیکن اللہ عقیدۂ توحید ' اور سیدھے راستے کی نشاندہی فرماتا ہے ایسی توحید جس کے ساتھ کوئی التباس ' کوئی سفارشی اور کوئی انسانوی مقربین خدا نہ ہوں ۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ (۳۹ : ۳) "اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکر حق ہو" ۔ کیونکہ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں ۔ ایک تو یہ جھوٹ ہے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں ' دوسرا یہ جھوٹ ہے کہ یہ اللہ کے ہاں سفارش کرتے ہیں جبکہ فرشتے ان کی اس بندگی کی تکذیب کرتے ہیں ۔ یہ لوگ دراصل اللہ کے صریح احکام کا کفر کرتے ہیں ۔ اس لیے اللہ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو اس پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اس کا انکار کرتے ہیں ۔ ہدایت تو ان کو ملتی ہے جو مخلص ہوں ' متوجہ ہوں ' برائی سے بچنا چاہتے ہوں اور ان کو نیکی کے کاموں میں دلچسپی بھی ہو اور وہ غور و فکر کر کے اپنے لیے صحیح راستے کا انتخاب کرتے ہوں ۔ جو لوگ جھوٹ باندھتے ہیں ' اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں تو وہ اللہ کی ہدایت اور مہربانیوں کے مستحق نہیں ہوتے اس لیے کہ ایسے لوگ جان بوجھ کر صحیح راستے سے دوری اختیار کرتے ہیں ۔

اس کے بعد اس شرکیہ تصور خدا کی کمزوری اور پوچ ہونے کو ظاہر کیا جاتا ہے ۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰہُ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰی مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَہٗ ؕ ھُوَ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ﴿۴﴾

"اگر اللہ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا ' برگزیدہ کر لیتا ' پاک ہے وہ اس سے (کہ کوئی اس کا

بیٹا ہو)' وہ اللہ ہے اکیلا اور سب پر غالب"۔

یہ ایک استدلالی مفروضہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر اللہ کسی کو اپنا شریک بناتا تو اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی شریک کر کے اس کا اعلان کر دیتا۔ اس کا ارادہ تو بے قید ہے 'لیکن اللہ کی ذات ان سے پاک ہے۔ اس لیے اللہ کی طرف نہ بیٹے کی نسبت ہو سکتی ہے 'نہ اللہ کسی کا بیٹا ہے۔ یہ اللہ کی مشیت و ارادہ اور اس کی تقدیر ہے۔ ان چیزوں سے اللہ پاک ہے۔

سُبْحٰنَهٗ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۹: ۴) "پاک ہے وہ اس سے 'وہ اللہ ہے اکیلا اور سب پر غالب"۔

اللہ اپنے لیے کسی کو بیٹا کب بناتا ہے۔ وہ تو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ ہر چیز کا خالق ہے۔ ہر چیز کا مدبر ہے۔ ہر چیز اور ہر انسان اس کی ملکیت میں ہے اور وہ جس طرح چاہتا ہے 'تصرف کرتا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝

"اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔ اسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک ایک وقت مقررہ تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو 'وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے"۔

آسمان و زمین کی بادشاہت پر یہ ایک سرسری نظر 'لیل و نہار کے نظام اور شمس و قمر کے نظام اور اسے زبردست طریقے سے مسخر کرنے کے نظارے پر ایک نگاہ 'اس بات کو ثابت کر دیتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور الہ نہیں ہے۔ یہ نظام فطرت دل کے اندر یہ بات اتار دیتا ہے کہ نہ اللہ کا کوئی شریک ہے اور نہ اس کا کوئی بیٹا ہے۔

زمین و آسمان کی تخلیق میں اللہ کی وحدانیت کے دلائل بالکل ظاہر ہیں اور ان قوانین میں بھی وحدت الٰہی کے نشانات ظاہر ہیں جو ان کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ اس پوری کائنات پر ایک سرسری نظر ہی اس بات کو ظاہر کر دیتی ہے کہ اس کو چلانے والا ارادہ ایک ہے۔ آج تک انسانوں نے جو سائنسی انکشافات کیے ہیں 'ان میں وحدت الوہیت کے لیے بے شمار دلائل موجود ہیں۔ یہ بات انسانوں پر ثابت ہو گئی ہے کہ یہ کائنات جس تک انسان نے رسائی حاصل کر لی ہے 'یہ ایسے ذرات سے بنی ہوئی ہے جن کی حقیقت اور ماہیت ایک ہے اور ان ذرات میں سے ہر ایک ذرہ ایسی شعاعوں سے مرکب ہے 'جن کی حقیقت ایک ہے۔ اور یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ ان ذرات سے جو اجرام فلکی بنے ہیں خواہ وہ ایسے ہوں جس میں ہم رہتے ہیں یا دوسرے سیارے اور ستارے ہوں۔ یہ سب کے سب ایک مکمل حرکت میں ہیں اور اس حرکت کا ایک مخصوص جاری قانون ہے جس سے کوئی ستارہ بھی ہٹ نہیں سکتا۔ چھوٹے ذرات اور ستاروں میں بھی وہی حرکت ہے اور اس دنیا کے عظیم ترین ذرات میں بھی وہی حرکت ہے۔ پھر مطالعہ کائنات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

اس حرکت کا ایک نظام ہے ۔ یہ نظام وہ حقیقت ہے جو اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اس پوری کائنات کا خالق و مدبر ایک ہے ۔ سائنس دان ہرروز جس نئی حقیقت کی دریافت کرتے ہیں اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کائنات کے منصوبے میں جو کچھ رکھا ہوا ہے وہ اللہ وحدہ کی ذات پر شاہد عادل ہے اور یہ ایک سچائی ہے اور یہ لوگوں کی خواہشات کے مطابق نہیں بدلتی ۔ اور نہ کسی شخص کے میلانات کے مطابق کسی طرف مائل ہوتی ہے ۔ نہ اپنی راہ ایک سیکنڈ کے لیے چھوڑتی ہے اور نہ بے راہ روی اختیار کرتی ہے ۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۳۹ : ۵) ''اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا''۔ اور کتاب بھی اس نے برحق نازل فرمائی ۔ لہٰذا اس کائنات میں بھی حق ہے اور اس کتاب میں بھی حق ہے اور یہ ایک ہی حق اور سچائی ہے جو اس کائنات میں بھی ہے اور اس کتاب میں بھی ہے اور دونوں کا منبع و مصدر ایک ہی ہے ۔ اور دونوں اس بات کی نشانی ہیں کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے ۔

یُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ (۳۹ : ۵) ''وہی ہے جو دن پر رات کو اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے''۔ یہ انداز تعبیر ایسا ہے کہ انسان کا دامن کھینچ کر ان جدید انکشافات کی طرف اس کی توجہ مبذول کراتا ہے جن کے مطابق زمین کا گول ہونا ثابت ہوا ہے ۔ باوجود اس خواہش کے کہ میں قرآن مجید کی تفسیر میں جدید سائنسی انکشافات سے دامن بچاؤں ۔ کیونکہ انسانی نظریات کبھی درست ہوتے ہیں کبھی غلط ۔ آج ثابت ہوتے اور کل باطل ہو جاتے ہیں جبکہ قرآن حق ہے اور اپنی سچائی پر وہ خود دلیل ہے ۔ ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' قرآن اپنی سچائی کا ثبوت اپنے موافق یا مخالف سے مانگتا ہی نہیں ۔ نہ ان انکشافات سے جو یہ ضعیف انسان فراہم کرتا ہے ۔ لیکن اپنے اس رویے کے باوجود یہ انداز تعبیر مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں زمین کی گردش محوری اور اس کی کروی ساخت پر غور کروں اس لیے کہ ایک ظاہری منظر اس تعبیر سے صاف صاف نظر آتا ہے اور اس کا انکار ممکن نہیں ۔ زمین گول ہے اور گردش محوری کے ساتھ سورج کے سامنے ہے ۔ اس لیے اس کا جو حصہ سورج کے سامنے ہے ' وہ روشن ہے اور دن ہے لیکن یہ حصہ ایک جگہ کھڑا نہیں رہتا ۔ جونہی یہ حصہ حرکت کر کے آگے بڑھتا ہے ۔ اندھیرا زمین کے اس حصے کو ڈھانپتا جاتا ہے ۔ اور اسے لپیٹتا جاتا ہے ۔ لہٰذا یہ دن والا حصہ لپیٹتا جا رہا ہے اور رات اسے لپیٹتی جاتی ہے ۔ دوسری جانب سے جہاں رات لپٹی ہوئی ہے وہ بھی آگے بڑھتی اور روشنی رات والے حصے کو لپیٹتی ہے اور اس میں دن آتا جاتا ہے ۔ یوں ایک طرف سے دن کو رات کور (Cover) کرتی ہے اور دوسری طرف سے رات دن کو کور کرتی جاتی ہے اور یہ حرکت جاری ہے ۔

یُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ (۳۹ : ۵) یہ الفاظ صورت حال کا خوب نقشہ کھینچتے ہیں اور صورت حال کا صحیح نقشہ ذہن میں آجاتا ہے ۔ اس طرح زمین کی حرکت کی نوعیت کا اظہار بھی ہو جاتا ہے ۔ زمین کا گول ہونا بھی ثابت ہوتا ہے ۔ اس کا دورہ بھی ثابت ہوتا ہے ۔ اس انداز بیان کی یہ بہترین تفسیر ہے 'اس کے سوا کوئی دوسری تفسیر اس سے زیادہ گہری نہیں ہو سکتی ۔

وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (۳۹ : ۵) ''اس نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے''۔ سورج اپنے مدار پر چل رہا ہے اور چاند اپنے مدار پر چل رہا ہے۔ اور دونوں حکم الٰہی سے مسخر ہیں۔ اور کسی کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ ان کو چلا رہا ہے اور فطری استدلال اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ بغیر کسی محرک کے یہ حرکت ہو رہی ہے اور از خود یہ نہایت ہی پیچیدہ نظام اس باقاعدگی سے چل رہا ہے کہ کئی ملین سال گزرنے کے بعد ہمیں اس حرکت میں بال برابر کی بیشی نظر نہیں آتی۔ اور یہ شمس و قمر اسی طرح جاری رہیں گے اور ایک وقت تک جاری رہیں گے۔ یعنی قیامت تک اور اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ جب حکم ہو گا یہ رک جائیں گے۔

اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ (۳۹ : ۵) ''جان رکھو وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے''۔ لہٰذا قوت قدرت اور غلبے کی وجہ سے وہ کائنات کو سنبھالتا ہے اور اس قوت کے ساتھ ساتھ وہ غفار بھی ہے۔ جو لوگ اس کی طرف مڑ جاتے ہیں' ان کی کوتاہیوں کو بخش دیتا ہے حالانکہ انہوں نے تکذیب اور شرک جیسے بڑے جرائم کیے تھے۔ اور وہ اللہ کے ساتھ الٰہ بناتے تھے۔ اور پھر اللہ کے لیے اولاد مقرر کرتے ہیں اور دوسرے جرائم کرتے ہیں لیکن توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور اس سے داخل ہونے کے لیے راہ واگزار ہے اور اللہ عزیز و غفار ہے۔

---ooo---

اس عظیم کائنات کے مطالعے کے لیے اس سرسری نظر کے بعد اب روئے سخن ذرا پھر جاتا ہے۔ انسان کے نہایت ہی چھوٹے نفس کی طرف جو اپنے اندر ایک عظیم جہان رکھتا ہے۔ صرف اس پہلو کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا ''زندگی'' اور ''حیات'' پر غور کرو۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶

''اسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا' پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے' بادشاہی اسی کی ہے' کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے' پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو؟''

انسان جب اپنے نفس پر غور کرتا ہے' اس نفس پر جسے اس نے خود پیدا نہیں کیا اور وہ اس کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں بھی خود نہیں جانتا۔ صرف وہی معلومات اس کے پاس ہیں جو اللہ خالق نے دیئے ہیں۔ انسان کا نفس ایک

ہے' اس کی ذات ایک ہے ۔ اس کی اس ذات اور نفس کے خصائص ایک ہیں اور اس نفس انسانی کے بعض خصائص دوسری مخلوقات سے بالکل جدا ہیں ۔ جس طرح نفس انسانی کے تمام افراد ایک مخصوص دائرے کے اندر محدود اور متمیز ہیں ۔ اسی طرح "نفس انسانی" ان اربوں افراد کے درمیان ایک ہے جو اس زمین میں منتشر ہیں یا رہتے ہیں ۔ اسی نفس واحد سے پھر اس کا جوڑا یا بیوی بھی پیدا ہوئی ۔ تمام انسانی خصوصیات کے اندر عورت مرد کے ساتھ شریک ہے ۔ اگرچہ تفصیلی خصوصیات مختلف ہیں لیکن بنیادی خصوصیات ایک ہی ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد و عورت کی ساخت ایک ہی نقشے کے مطابق ہے ۔ اسی نقشے کے اندر بعض ترمیمات کی وجہ سے مرد اور عورت الگ الگ ہو گئے ۔ ایک ہی ارادہ ہے جو مرد اور عورت کو الگ کرتا ہے ۔

نفس انسانی کے اندر مرد و عورت کے اختلافات کے حوالے اور مناسبت سے یہاں دوسرے حیوانات کی اہم اجناس کے نر و مادہ کے نظام کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ اس پوری کائنات میں اور انسانوں کے علاوہ دوسرے حیوانات میں بھی حق جاری ہے ۔

. وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (۳۹ : ۶) "اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے" ۔ یہ آٹھ جانور نر و مادہ جس طرح دوسری آیات میں آئے ہیں' بھیڑ' بکریاں' ڈنگر اور اونٹ ہیں ۔ یعنی نر و مادہ کے شمار سے آٹھ بنتے ہیں ۔ اور جب نر و مادہ کو جمع کیا جائے تو ان پر ازواج یعنی جوڑوں کا لفظ بولا جاتا ہے ۔ یوں مجموعہ آٹھ بن جاتا ہے ۔

انداز بیان یہ بتاتا ہے کہ اللہ نے ان کو نازل کیا ہے یعنی پیدا کر کے تمہارے لیے مسخر کیا ہے ۔ یہ تسخیر اللہ کی طرف سے منزل ہے ۔ یعنی اللہ کے علوشان کا یہ کارنامہ ہے اور اس اللہ نے اس کی اجازت دی ہے کہ انسان ان آٹھ قسم کے جانوروں کا گوشت استعمال کرے ۔

جانوروں میں نر و مادہ کی خصوصیات کے تذکرے کے بعد پھر ماؤں کے پیٹ میں پائے جانے والے جنین کے مختلف مراحل کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔

يَخْلُقُكُمْ فِىْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ (۳۹ : ۶) "پھر وہ ماؤں کے پیٹوں میں تخلیق کے بعد تخلیق کرتا چلا جاتا ہے" ۔ پہلے نطفہ' پھر لوتھڑا' پھر گوشت کا قطعہ' پھر ہڈیاں' پھر واضح شکل اور آخر میں اس کے اندر انسانی حواس کا پیدا کرنا اور انسانی خصوصیات کا پیدا کرنا ۔

فِىْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ (۳۹ : ۶) "تین تین تاریک پردوں کے اندر" ۔ پہلے اس پردے کی تاریکی جس کے اندر جنین ہوتا ہے' پھر رحم مادر کی ظلمت جس کے اندر وہ ملفوف ہوتا ہے اور پھر ماں کا پیٹ جس کے اندر رحم ہوتا ہے اور اللہ کا دست قدرت اس ذرے کو روز بڑھاتا چلا جاتا ہے ۔ اور یہ دست قدرت روز اسے بڑھاتا چلا جاتا ہے ۔ پھر اس کی شکل و صورت بدلتی چلی جاتی ہے ۔ یہ ترقی کرتا چلا جاتا ہے ۔ اللہ اس مخلوق کی نگرانی کرتا ہے اور اسے بڑھنے کی طاقت دیتا ہے ۔ اور یوں شکل بدلنا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے ۔ یہ قدم بقدم آگے جاتا ہے ۔ اللہ کی تقدیر اور اندازے کے مطابق ۔

انسان کے اس مختصر سفر اور اس کے اندر اس کی ساخت کی ان دور رس تبدیلیوں پر ایک نظر ڈالنے اور ان تغیرات کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر پائی جانے والی عجیب و غریب خصوصیات کی کارفرمائی اور راہنمائی میں اس کمزور ترین اور خوردبینی خلیے نے جس انداز سے ترقی کی 'ان اندھیروں میں اور اس عجیب انداز میں' تو انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب باتیں انسان کے علم و بصیرت اور اس کی قدرت سے وراء ہیں۔

یہ تمام حقائق اس بات کے لیے کافی ہیں کہ انسان کو خالق کائنات کی معرفت پر مجبور کریں۔ اور انسان خالق کائنات کو اس کے ان زندہ آثار کے ذریعے پہچان لے اور اس تخلیق کے اندر جو وحدانیت ہے۔ اس کے آثار بالکل ظاہر و باہر ہیں اور کوئی سوچنے والا انسان کس طرح ان سے صرف نظر کر سکتا ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۳۹ : ۶) "یہی تمہارا رب ہے' بادشاہی اسی کی ہے' کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے' پھر تم کدھر پھرے جا رہے ہو؟"

اللہ وحدہ کی ان نشانیوں کو دیکھتے ہوئے' اللہ کی بے قید قدرت کے ان نشانات کو ملاحظہ کرتے ہوئے یہاں لوگوں کو خود اپنے طرز عمل پر غور کرنے کے لیے ذرا کھڑا کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اب تمہارے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ شکر کی راہ اور کفر کی راہ اور جو راہ بھی تم اختیار کرو گے اس کے سارے نتیجے کی ذمہ داری انفرادی ہے۔ اور اشارہ دے دیا جاتا ہے کہ وقت قریب ہے۔ دنیا کا یہ مرحلہ ختم ہونے والا ہے۔ پھر حساب و کتاب ہو گا اور یہ حساب و کتاب وہ ذات لے گی جس نے تمہیں تین تاریک ترین پردوں کے اندر سے نکال کر ذمہ دار بنایا ہے۔ اور وہ اب تمہارے دلوں کی خفیہ ترین باتوں کو بھی جانتا ہے۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۣ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑦

"اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے' لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا' اور اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ آخر کار تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے' پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو' وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے"۔

تمہاری ماؤں کے پیٹ کا عرصہ تو تمہارے طویل سفر زندگی کا ایک مختصر حصہ ہے۔ ابتدائی مرحلہ ہے۔ پھر پیٹ سے باہر آکر تم قدرے طویل مرحلے میں داخل ہو گے۔ اس کے بعد تیسرا طویل اور ابدی مرحلہ ہو گا۔ حساب و کتاب ہو گا اور یہ مرحلہ اللہ علیم و خبیر کی تدبیر سے طے ہو گا۔

جہاں تک اللہ کی ذات کا تعلق ہے وہ انسان جیسی کمزور مخلوق کا محتاج نہیں ہے۔ انسان بہت ہی ضعیف مخلوق ہے۔

یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ وہ انسانوں کی طرف متوجہ ہے اور ان کی نگرانی اور ان پر مہربانی کرتا ہے۔ اور وہ کس قدر ضعیف ہیں اور کس قدر کمزور ہیں۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ (۳۹:۷) "اگر تم کفر کرو تو اللہ بے نیاز ہے"۔ کیونکہ تمہارا ایمان اللہ کی مملکت میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کر سکتا۔ اور تمہارا کفر اس میں کسی چیز کی کمی نہیں کر سکتا۔ لیکن اللہ اپنے بندوں کی جانب سے کفر کو پسند نہیں کرتا اور کفر کو محبوب نہیں رکھتا۔

وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (۳۹:۷) "لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا"۔ اور اگر تم شکر کرو۔

وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ (۳۹:۷) "اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے"۔ وہ شکر کو محبوب رکھتا ہے' اور اس پر جزائے خیر دیتا ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۳۹:۷) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا"۔ آخر کار ہم نے اللہ کے ہاں لوٹنا ہے۔ صرف اس کے آگے پیش ہونا ہے اور اس کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔

ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۹:۷) "آخر کار تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے۔ پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو"۔

اس پر کوئی امر مخفی نہیں ہے۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳۹:۷) "وہ دلوں کا حال جانتا ہے"۔ یہ ہے انجام حیات۔ یہ ہیں دلائل ہدایت اور یہ ہے دوراہہ جس سے دونوں راستے الگ ہوتے ہیں۔ ایک ہدایت کا راستہ اور ایک ضلالت کا راستہ۔ اب ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جو شخص جس راستے کو اختیار کرے خوب سمجھ کر اختیار کرے۔ غور و تدبر کے بعد کرے۔ علم اور فکر کے ساتھ کرے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۱۶ ایک نظر میں

پہلے سبق میں یہ بات کہی گئی کہ تخلیق انسان کی کہانی کیا ہے - یہ کہ تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا گیا ہے اور پھر اسی نفس سے ایک جوڑا بھی بنایا گیا ہے - پھر مویشیوں کو بھی بے شمار جوڑوں کی صورت میں بنایا گیا ہے - اور پھر تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تخلیق کے بعد تخلیق تمہیں دی اور تین ظلمتوں کے اندر تمہیں پیدا کیا - پھر اللہ نے تمہیں انسانی خصوصیات عطا کیں اور پھر ان خصائص کا نظام تسلسل قائم کیا اور اس کو ترقی دی -

اب یہاں انسانوں کی نفسیاتی دنیا کے حالات بتائے جاتے ہیں کہ خوشی اور غم اور امن و خوف کے وقت اس کی حالت کیا ہوتی ہے - وہ کس قدر کمزور ہیں اور کس قدر متلون مزاج ہیں اور کس قدر کمزور و ناتواں ہیں الا یہ کہ وہ رب تعالیٰ کے ساتھ رابطہ قائم کر لیں - اور اسی کی طرف امید لگائے رہیں ' اس کے مطیع فرمان ہو جائیں اور صحیح راستہ پہچان لیں - اور اصل حقیقت کو پالیں اور اللہ نے انسان کو جو انسانی خصائص دیئے ہیں اپنے آپ کو ان کی راہ پر ڈالیں -

--- ooo ---

درس نمبر ۲۱۶ تشریح آیات

۸ --- تا --- ۱۰

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْۤا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۸

"انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے۔ پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھیراتا ہے تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کرے۔ (اے نبیؐ) اس سے کہو کہ تھوڑے دن اپنے کفر سے لطف اٹھا لے، یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے"۔

یہ انسان کی فطرت کا مزاج ہے کہ جب خطرات لاحق ہوں تو انسانی فطرت کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور وہ تمام پردے اور حجابات دور ہو جاتے ہیں جو اس فطرت کے اوپر چھائے ہوئے ہوں اور تمام اوہام و خرافات بھی دور ہو جاتے ہیں۔ خطرے کے وقت انسان صرف رب ذوالجلال کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ فطرت انسانی اس وقت اس بات کا ادراک کر لیتی ہے کہ یہ خطرہ صرف اللہ ہی کے ٹالنے سے ٹل سکتا ہے۔ اللہ کے سوا تمام دوسری قوتیں جھوٹی ثابت ہوتی ہیں۔

لیکن جب مشکلات دور ہوتی ہیں اور امن و امان اور خوشحالی کا دور آتا ہے اور اللہ مشکلات کو نعمتوں سے بدل دیتا ہے اور یوں مشکلات دور ہو جاتی ہیں تو یہی انسان جس کی فطرت کھل کر سامنے آگئی تھی پھر اوہام و خرافات میں پھنس کر اپنی سابقہ حالت کے زیر اثر آجاتا ہے۔ اور مشکلات میں اپنے گڑگڑانے، اللہ کی طرف متوجہ ہونے اور توبہ کرنے کو بھول جاتا ہے۔

اس وقت پھر اس کی وہ حالت نہیں ہوتی کہ وہ اللہ ہی کو پکارے، اس سے ڈرے اور یہ سمجھے کہ اب اللہ کے سوا کوئی بھی مشکلات کو دور نہیں کر سکتا۔ یہ تمام حالات بھلا کر اب دوبارہ اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک کرتا ہے۔ یا تو وہ ان

الہوں کو پوجتا ہے جو جاہلیت کے دور میں پوجے جاتے تھے یا بعض اشخاص کو پوجتا ہے ۔ یہ ایسے حالات کی بندگی کرتا ہے جو اللہ کے ساتھ شریک ہوتے ہیں ۔ جس طرح ہر جاہلیت کا ایک الہ ہوتا ہے ۔ کبھی وہ اپنی خواہشات اور اپنے مفادات کو پوجتا ہے یا وہ مستقبل کی امیدوں اور ان جانے خوف سے ڈرتا ہے یا اپنی اولاد و اور حکام کو پوجتا ہے یا اپنے سرداروں اور لیڈروں کو پوجتا ہے ۔ یاد رہے کہ یہ سردار بھی پوجے جاتے ہیں جس طرح خدا کو پوجا جاتا ہے ۔ بعض اوقات یہ خدا ۔ بھی زیادہ پوجے جاتے ہیں ۔ یاد رہے کہ شرک کی بھی کئی اقسام ہیں ۔ بعض شرک نہایت ہی خفی ہوتے ہیں ۔ شرک نہ اسے دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان کو اس کا احساس ہوتا ہے ۔ قرآن کریم صرف معروف و مشہور شرک ہی کو نہیں لیتا بلکہ وہ ہر اس بات کو لیتا ہے جو اپنے نقشے کے اعتبار شرک پر ۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا انسان اللہ کے راستے سے گمراہ ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ اللہ کی راہ تو ایک ہوتی ہے ۔ اس میں تعدد ممکن نہیں ہے ۔ وہ یہ کہ بندگی صرف اللہ ہی کی ہوگی ۔ محبت صرف اللہ کے ساتھ ہوگی ۔ اور کسی شخص کے تصور میں بھی اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو ۔ نہ مال کا خدا شریک ہو' نہ اولاد کا خدا شریک ہو' نہ وطن کا خدا شریک ہو' نہ زمین کا خدا شریک ہو' نہ رشتہ داری کا خدا شریک ہو' شرک کی ان صورتوں میں سے جو بھی کسی کے دل میں جاگزیں ہوگی تو یہ انداد اللہ میں شامل ہوگی ۔ اللہ کے راستے سے گمراہی ہوگی ۔ اور اللہ کے راستے سے گمراہی کا انجام آگ ہے اور یہ بات بہت جلد اس دنیا کی قلیل زندگی کے بعد سامنے آنے والی ہے ۔

قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ (۳۹ : ۸) "کہہ دیجئے کہ تھوڑے ہی دن اپنے کفر سے لطف اٹھالے یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے" ۔ اس دنیا کے دن جس قدر بھی طویل ہوں' تھوڑے ہی ہیں ۔ انسان کے دن زمین پر بہرحال گنے چنے ہیں اگرچہ عمر طویل کوئی پائے ۔ بلکہ خود پوری جنس انسانی کی زندگی بھی اس کرۂ ارض پر قلیل ہے ۔ جب ہم اس عمر کا مقابلہ ایام اللہ سے کریں ۔

--- ○○○---

اس بری تصویر کے مقابلے میں ایک اچھی تصویر اور اچھی نفسیاتی کیفیت بھی ہے ۔ اللہ سے ڈرنے والا دل' ہر حالت میں' ہر آفت میں اللہ کو یاد کرنے والا دل' دنیا میں آخرت کو نظر میں رکھ کر زندگی گزارنے والا دل' اللہ کی رحمت کا طلبگار' اللہ کے ساتھ ایسا رابطہ کرنے والا دل جس سے علم صحیح پیدا ہو' اور اس کائنات کی حقیقت کو پا لینے والا دل' اس کی تصویر یہ ہے :

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۹

۱ ۹ ع ۱۵

"(کیا اس شخص کی روش بہتر ہے یا اس شخص کی) جو مطیع فرمان ہے 'رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے' آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے؟ ان سے پوچھو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں؟"

یہ نہایت ہی روشن اور حساس تصویر ہے۔ مطیع فرمان' اطاعت شعار' سجدے کی حالت میں اور رکوع کی حالت میں ہونا دراصل حساس اطاعت شعاری ہے۔ ایسا شخص آخرت سے ڈرتا ہے اور اللہ کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔ یہ صفائی اور باطن کی یہ شفافی انسانی بصیرت کو کھول دیتی اور انسانی دل و دماغ کو دیکھنے' اخذ کرنے اور فکر کرنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ ان تمام امور کے ذریعہ مومنین کی بہت ہی اچھی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ جبکہ آیت سابقہ میں مشرکین کی نہایت ہی بھونڈی تصویر تھی۔ اس کے بعد ان کے درمیان موازنہ دیکھئے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۹:۳۹) "ان سے پوچھو کیا علم رکھنے والے اور نہ رکھنے والے دونوں یکساں ہو سکتے ہیں"۔

سچا علم دراصل معرفت الٰہی کا نام ہے۔ سچائی تک پہنچنے کا نام ہے۔ اور ایسا علم انسانی بصیرت کو کھول دیتا ہے۔ اور یوں ایک عالم ان حقائق تک رسائی حاصل کر لیتا ہے جو اس وجود میں ہوتی ہے۔ علم ان معلومات کا نام نہیں ہے جو ذہن میں جمع ہو جائیں اور جن سے کوئی سچا اصول اور کوئی سچی حقیقت ذہن نشین نہ ہو۔ اور نہ محسوسات کے علاوہ کوئی حقیقت ذہن میں بیٹھی ہو۔

یہ ہے صحیح راستہ علم حقیقی اور اس حقیقت کا جو دل و دماغ کو منور کر دیتی ہے۔ یہی ہے اللہ کا مطیع فرمان ہونا۔ دل کا حساس ہونا اور آخرت کا خوف اور اللہ کے فضل و کرم کی امیدواری اور یہ ہے اللہ کا خوف اور اللہ کے سامنے ڈرے اور سہے رہنا۔ علم اور حقیقی علم یہی ہے اور اس طرح جو عقلیت پیدا ہوتی ہے وہ دیکھنے والی اور سننے والی اور جس چیز کو وہ پاتی ہے اس سے فائدہ اٹھانے والی ہوتی ہے اور یوں اس قسم کا علم ان مشاہدات کے پیچھے حقیقت عظمیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ انفرادی تجربات کو علم کہتے ہیں اور صرف ان چیزوں کو معلومات کہتے ہیں جو نظر آتی ہیں۔ ایسے لوگ معلومات جمع کرنے والے تو ہیں لیکن علماء نہیں۔

اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۹:۳۹) "نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں"۔ یعنی کھلے دلوں والے' جن کی بصیرت کے دروازے وا ہوں اور جو ظواہر و مشاہد کے پیچھے جھانک سکتے ہوں۔ وہ لوگ عقلمند ہیں اور وہی لوگ ہر چیز میں اللہ کے نشانات دیکھ کر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور وہ اللہ کے سامنے جوابدہی کے یقین کو بھول نہیں جاتے۔

ان دو تصویروں کے بعد اہل ایمان کو مخاطب کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور اچھے کام کریں اور اس مختصر زندگی میں طویل زندگی کے لیے کچھ کما کر اور سجا کر چھوڑیں۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِىْ هٰذِهِ

الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ ؕ وَ اَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ ؕ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَہُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾

"(اے نبیؐ) کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو' اپنے رب سے ڈرو۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے اور خدا کی زمین وسیع ہے' صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا"۔

کہو اے میرے بندو' جو ایمان لائے ہو' قُلۡ یٰعِبَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (۳۹: ۱۰) اہل ایمان کی طرف نہایت ہی نظر کرم ہے۔ اصل میں عربی عبارت یوں ہے:

قُلۡ یٰعِبَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (۳۹: ۱۰) یعنی ان سے میرا یہ پیغام کہہ دو کہ متقی بن جاؤ۔ اپنے رب سے ڈرو۔ لیکن اللہ نے اسے براہ راست پکار کے صیغے میں تبدیل کر دیا۔ یہ ایک قسم کا اعلان اور تنبیہ ہے۔ رسول اللہؐ تو مسلمانوں کو (یاعبادی) کہہ کر نہیں پکارتے تھے آپ تو یاعباد اللہ کہہ کر انہیں پکارتے تھے لیکن یہ اللہ کی نظر کرم ہے کہ وہ حضورؐ سے فرماتا ہے کہ (یاعباد) کہہ کر پکارو۔ یوں یہ پکار اللہ کی جانب سے ہو اور حضور اکرمؐ اللہ کے ڈائریکٹ خطاب کی حکایت فرمائیں۔

قُلۡ یٰعِبَادِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ (۳۹: ۱۰) "اے نبی کہو' اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو' اپنے رب سے ڈرو"۔ تقویٰ کیا ہے' وہی دل کی حساسیت۔ اللہ کی طرف ڈر اور خشیت کے ساتھ دیکھنا۔ امید اور طمع کے ساتھ دیکھنا۔ اس کے غضب' ناراضگی سے ڈرتے رہنا۔ یہ ہے بہترین تصویر اہل ایمان کی۔ اس آیت میں جو تصویر کشی کی گئی ہے اور اس میں جو رنگ بھرے گئے ہیں وہ وہی ہیں جو آیت سابقہ میں ہیں' البتہ یہ عملی رنگ ہیں۔

لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃٌ (۳۹: ۱۰) "جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا' ان کے لیے بھلائی ہے"۔ کیا خوب جزاء ہے کہ اس دنیا میں اچھا سلوک کرو۔ تو یہاں اس حقیر دنیا میں بھی اچھائی پاؤ اور آخرت میں بھی اچھائی پاؤ۔ جو دار بقا اور دار دوام ہے۔ لیکن یہ انسان پر فضل و کرم ہے اور اللہ کو معلوم ہے کہ یہ انسان کس قدر ضعیف اور ناتواں ہے۔ اس لیے اللہ نے اس پر بے پناہ کرم کیا۔

وَ اَرۡضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃٌ (۳۹: ۱۰) "خدا کی زمین وسیع ہے"۔ لہٰذا زمین کی محبت اور کسی ایک جگہ کے ساتھ الفت تمہیں بٹھا کر نہ رکھ دے۔ نسب' رشتہ داری اور دوستی کے روابط تمہیں بڑے کاموں سے روک نہ دیں۔ ہجرت ایک عظیم مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ اگر کوئی جگہ تمہارے دین کے لیے تنگ ہو اور جہاں تم اسلام کا محسنانہ نظام جاری نہیں کر سکتے تو پھر زمین سے چمٹے رہنا شیطان کی حرکت ہے۔ اور یہ انسان کے دل بہ شرک کا ایک رنگ ہے۔

یہ قرآن کا نہایت ہی لطیف اشارہ ہے' اس طرف کہ انسان کے دل و دماغ میں شرک خفی اس طرح سرایت کرتی

ہے کہ بات اللہ کی وحدانیت اور اللہ سے ڈرنے کی ہو رہی ہے ۔ اور اس میں یہ لطیف اشارہ کیا گیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا سرچشمہ وہی ذات باری ہے جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے ۔ کیونکہ انسان کے دل و دماغ کا یہ علاج وہی ذات کر سکتی ہے جو انسان کی خالق ہے اور جو انسان کے بارے میں پوری معلومات رکھتی ہے ۔ اور انسان کی شخصیت کے خفیہ گوشوں کو جانتی ہے ۔

اللہ جانتا ہے کہ یہ ہجرت انسانوں کے لیے کس قدر مشکل کام ہے ۔ دنیا کے ان رابطوں کو یکلخت ترک کر دینا 'کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ ایک چالو زندگی کو ترک کرنا 'رزق کے ایسے وسائل جن کا انسان عادی ہو جائے ۔ ان کو ترک کرنا ' چلتے ہوئے کاروبار کو چھوڑنا ' اور بالکل ایک نئی سرزمین پر از سرنو زندگی شروع کرنا ایک بہت ہی مشکل کام ہے ۔ اس کے لئے انسان مشکل سے تیار ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اس معاملے کو بڑا صبر کہا گیا ہے اور اس پر بڑے اور پورے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے ۔

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۹ : ۱۰) "صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا" ۔ یہاں اللہ تعالیٰ انسانی دلوں کو نہایت ہی برمحل یہ احساس دلاتا ہے اور ان کو اس کام کے لیے آمادہ فرماتے ہیں جو بالعموم انسانوں کے لیے بہت ہی دشوار ہوتا ہے ۔ اور ہجرت جیسے شدید حالات میں اللہ ان پر اپنی رحمت اور شفقت اور اپنے قرب کی شبنم گراتا ہے ۔ اور وطن کے روابط ' الفت و محبت اور اہل و عیال اور رشتہ داریوں اور دوستیوں کو قربان کرنے پر بعض بے حساب اجر کا وعدہ فرماتا ہے ہیں ۔ پاک ہے وہ ذات جو انسان کے بارے میں حلیم و خبیر ہے ۔ اور انسانی قلوب کے ساتھ یہ مشفقانہ معاملہ کرتی ہے ۔ اور انسانی نفسیات کے نشیب و فراز کے اندر گہرائیوں تک پائے جانے والے نہایت ہی خفیہ احساسات کو جانتی ہے اور ان کا مداوا کرتی ہے ۔

--- ooo---

درس نمبر ۲۱۷ ایک نظر میں

اس سبق پر آخرت کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ اور آخرت کے عذاب کے مختلف رنگ اور سائے ہیں۔ نیز آخرت کے ثواب کی امیدیں بھی ہیں۔ حضور اکرم ؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ خالص توحید کے عقیدے کا اعلان کر دیں۔ اور یہ بھی اعلان کر دیں کہ اگر میں اس سے انحراف کروں تو مجھے عذاب الٰہی کا ڈر ہے اور یہ کہ میں اپنے منصوبے اور منہاج پر قائم ہوں اور تم جانو اور تمہارا منہاج و طریقہ۔ البتہ اسلامی منہاج کا انجام یہ ہو گا اور کفریہ منہاج کا انجام یہ ہو گا۔

--- ooo---

درس نمبر ۲۱۷ تشریح آیات

۱۱--- تا--- ۲۰

قُلۡ اِنِّیۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ﴿۱۱﴾ وَ اُمِرۡتُ لِاَنۡ اَکُوۡنَ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۲﴾ قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۳﴾

(اے نبیؐ) ان سے کہو' مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں' اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں۔ کہو' اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے''۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلان ہے کہ آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ اللہ وحدہ کی بندگی کریں اور دین اس کے لیے خالص کر دیں۔ اور اس طرح آپ پہلے مسلمان بن جائیں اور یہ بھی اعلان کر دیں کہ اگر میں اپنے رب کی معصیت کا ارتکاب کر لوں تو میرے لیے بھی عذاب الٰہی کا خطرہ ہے۔ اسلام نے جو عقیدۂ توحید پیش کیا ہے اس کو خالص کرنے کے لیے اس اعلان کی بڑی اہمیت ہے۔ اس عقیدے کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے ایک بندے ہی ہیں اور آپؐ مقام بندگی سے آگے نہیں جا سکتے۔ اور تمام انسان بھی بندگی کے مقام پر مساوی طور پر کھڑے ہیں اور صرف ذات باری ہی ہے جو ان بندوں کے اوپر نگہبان ہے۔ یہ ہے مراد اس آیت سے۔

اس طرح مقام الوہیت اور مقام بندگی اپنی اپنی جگہ پر الگ ہو جاتے ہیں اور بالکل متمیز ہو جاتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی اختلاط ہوتا ہے اور نہ کوئی اشتباہ ہوتا ہے اور وحدانیت کی صفت للہ وحدہ کے لیے مختص ہو جاتی ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا۔ اور جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت بندہ دوسرے بندوں کے ساتھ ہم صف کھڑے ہیں اور آپ بھی اللہ کی معصیت کے ارتکاب سے ڈرتے ہیں لہٰذا بتوں اور فرشتوں کی سفارش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ اللہ کے ساتھ ساتھ یا مستقلا ان کی عبادت کا سوال پیدا ہوتا ہے' حضور اکرمؐ ایک بار پھر اللہ کی بندگی کا اعلان فرماتے ہیں اور اصرار کے ساتھ بندگی کا اعلان فرماتے ہیں اور مشرکین سے کہہ دیا جاتا ہے کہ تم جانو اور تمہارا دردناک انجام۔

قُلِ اللّٰہَ اَعۡبُدُ مُخۡلِصًا لَّہٗ دِیۡنِیۡ ﴿۱۴﴾ فَاعۡبُدُوۡا مَا شِئۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ ؕ قُلۡ

إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَأَهْلِيهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴿١٥﴾

''کہہ دو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں گا' تم اس کے سوا جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔ کہو' اصل دیوالیے تو وہی ہیں جنھوں نے قیامت کے روز اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو گھاٹے میں ڈال دیا۔ خوب سن رکھو' یہی کھلا دیوالیہ ہے''۔

اور دوبارہ اعلان کیا جاتا ہے کہ دیکھو میں تو اپنی راہ پر چل رہا ہوں' میں بندگی صرف اللہ کی کرتا ہوں' نظام زندگی صرف اللہ کا اپناتا ہوں' تم بھی جس راہ کو پسند کرو اور جس کی بندگی چاہو' اختیار کرو لیکن تم اس عظیم دیوالیہ پن سے دوچار ہو گے۔ اتنا بڑا خسارہ ہو گا تمہیں جس سے بڑا اور کوئی خسارہ نہ ہو گا۔ تم اپنی جان کو جہنم تک پہنچا دو گے۔ تمہیں اہل و عیال کا خسران ہو گا چاہے مومن ہوں یا کافر۔ اگر اہل مومن ہوں تو وہ جنتوں کو چلے جائیں گے اور یہ جہنم میں ان سے بہرحال گم ہوں گے۔ اگر کافر ہوں تو جس طرح خود کو گنوایا اسی طرح ان کو بھی گنوایا۔ دونوں جہنم میں ہوں گے۔

ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ (۳۹ : ۱۵) ''یہی کھلا دیوالیہ ہے''۔ اور اس خسارے کا ایک منظر یہ ہے:

لَهُم مِّن فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِن تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۚ ذَٰلِكَ يُخَوِّفُ اللَّهُ بِهِ عِبَادَهُ ۚ يَا عِبَادِ فَاتَّقُونِ ﴿١٦﴾

''ان پر آگ کی چھتریاں اوپر سے بھی چھائی ہوں گی اور نیچے سے بھی۔ یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے 'پس اے میرے بندو' میرے غضب سے بچو''۔

فی الواقع یہ ایک خوفناک منظر ہے۔ یہ آگ کا منظر ہے۔ ان کے اوپر بھی آگ کی چھتریاں ہوں گی اور نیچے بھی اور وہ ان چھتریوں میں لپٹے ہوں گے اور آگ کے یہ شعلے جنہیں چھتریاں کہا گیا ہے ان پر حاوی ہوں گے۔ یہ خوفناک منظر اللہ اپنے بندوں کے سامنے اس وقت پیش کرتا ہے جبکہ ابھی وہ دنیا میں ہیں اور اگر وہ اس سے بچنا چاہیں تو بچ سکتے ہیں۔

ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللَّهُ بِهِ عِبَادَهُ (۳۹ : ۱۶) ''یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے''۔ ان کو زور زور سے پکارتا ہے کہ بچو بچو! آگے بہت بڑا خطرہ ہے۔

يَا عِبَادِ فَاتَّقُونِ (۳۹ : ۱۶) ''اے میرے بندو' میرے غضب سے بچو''۔ اور دوسری جانب' بالمقابل پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں وہ لوگ جو نجات پا چکے ہیں' جو دنیا میں اس برے انجام سے ڈر گئے تھے:

وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَن يَعْبُدُوهَا وَأَنَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ

الْبُشْرٰی ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾

"بخلاف اس کے جن لوگوں نے طاغوت کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا ان کے لیے خوشخبری ہے ۔ پس (اے نبیؐ) بشارت دے دو میرے ان بندوں کو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی دانش مند ہیں"۔

طاغوت کا صیغہ طغیان سے ہے ۔ جس طرح ملکوت' عظموت اور رحموت کے صیغے بنے ہیں اس کے مفہوم میں ضخامت اور مبالغہ پایا جاتا ہے ۔ اس کا مروج مفہوم یہ ہے کہ جو بھی سرکشی کرے اور حد سے تجاوز کر جائے' وہ طاغوت ہے ۔ اور جو لوگ طاغوت کی بندگی اور طاعت سے اجتناب کرتے ہیں وہ لوگ کون ہیں؟ وہ جو کسی شکل میں بھی طاغوت کی بندگی نہ کریں ۔ اور یہ وہی لوگ ہوں گے جو ہر چھوٹے بڑے کام میں اللہ کی بندگی کرنے والے ہوں' اس کی طرف لوٹنے والے ہوں اس کی طرف رجوع کرنے والے ہوں اور بندگی کے صحیح مقام پر کھڑے ہوں ۔

ایسے ہی لوگوں کے لیے بشارت ہے اور یہ بشارت عالم بالا سے ہے اور رسول اللہؐ ان کو اس کی خوشخبری دے رہے ہیں ۔

لَهُمُ الْبُشْرٰی فَبَشِّرْ عِبَادِ (۳۹:۱۷) "ان کے لیے خوشخبری ہے ۔ (پس اے نبیؐ) بشارت دے دو میرے ان بندوں کو" ۔ ان کے لیے عالم بالا سے بشارت آئی اور رسول اللہؐ نے سنا دی تو اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے؟

اللہ کے ایسے بندوں کی صفت یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ اللہ کی جو بات سنتے ہیں اسے غور سے سنتے ہیں ۔ پھر اس بات کی وہ اطاعت کرتے ہیں کیونکہ وہ بہت ہی احسن ہوتی ہے اور دوسری باتوں کو وہ ترک کر دیتے ہیں ۔ لہٰذا وہ صرف اچھی بات ہی لیتے ہیں ۔ اس کے ذریعہ اپنے اذہان و قلوب کو صاف کرتے ہیں ۔ اور ہمیشہ یوں ہوتا ہے کہ پاک اور طیب نفوس پاک اور احسن باتوں کے لیے ہمیشہ کھلے ہوتے ہیں ۔ وہ فوراً قبول کرتے ہیں اور ناپاک اور خبیث دل طیب چیزوں کے لیے بند ہوتے ہیں ۔ اور گندی باتیں ہی قبول کرتے ہیں ۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ (۳۹:۱۸) "یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے" ۔ کیونکہ اللہ نے دیکھ لیا کہ ان کے دلوں میں خیر موجود ہے ۔ لہٰذا اللہ نے ان کو خیر کی طرف ہدایت دی اور انہوں نے اچھی باتوں کو سنا اور قبول کر لیا ۔ اور ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے ۔

وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۹:۱۸) "اور یہی لوگ دانشمند ہیں" ۔ عقل سلیم ہی انسانوں کو پاکیزگی کی طرف مائل کرتی ہے ۔ نجات کی طرف مائل کرتی ہے ۔ لہٰذا جو شخص پاکیزگی اور نجات کی طرف میلان نہیں رکھتا

وہ گویا مسلوب العقل ہے اور اس نے اللہ کی دی ہوئی نعمت سے انکار کر دیا ہے۔ قبل اس کے پاکیزہ لوگوں کے انعام و انجام کو پیش کیا جائے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ طاغوت کے یہ بندے دراصل عملاً آگ تک پہنچ گئے ہیں اور ان میں سے ایک بھی آگ سے نجات نہیں پا سکتا۔

أَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۖ أَفَأَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴿١٩﴾

"(اے نبیؐ) اس شخص کو کون بچا سکتا ہے جس پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہو؟ کیا تم اسے بچا سکتے ہو جو آگ میں گر چکا ہو"۔

خطاب رسول خدا سے ہے۔ اور اگر رسول اللہؐ ان کو آگ سے نہیں بچا سکتے تو آپ کے سوا اور پھر کون ہے جو ان لوگوں کو آگ سے بچا سکے"۔

ان جہنمیوں کے منظر کے بالمقابل ان لوگوں کا منظر ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور ان باتوں سے ڈرتے ہیں جن سے اللہ نے ان کو ڈرایا ہے۔ گویا یہ جہنمی عملاً جہنم میں ہیں اور جنتی عملاً جنت میں ہیں۔

لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَبْنِيَّةٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَعْدَ اللَّهِ ۖ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْمِيعَادَ ﴿٢٠﴾

"البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈر کر رہے ان کے لیے بلند عمارتیں ہیں منزل پر منزل بنی ہوئی، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا"۔

اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے منزل پر منزل بنی ہوئی بلند عمارتوں یعنی بالا خانوں کا یہ منظر اہل جہنم کے اس منظر کے بالمقابل ہے جن کے اوپر بھی چھتریاں ہوں گی آگ کی اور نیچے بھی ہوں گی۔ یہ تقابل قرآن کے انداز کلام کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ ان تمام مناظر میں پایا جاتا ہے جو قرآن مجید میں تقابلی مناظر کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔

یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ ہمیشہ واقع ہو کر رہتا ہے۔ جن مسلمانوں نے سب سے پہلے اس قرآن کو سنا۔ انہوں نے ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے لیے کوئی وعدہ یا وعید دور نہ تھا۔ ان کے قلوب اور ان کے احساسات تو ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ وعدے اور وعید تو ان کے لیے مشاہدہ تھے۔ یہ وعدے اور وعید سن کر وہ کانپ اٹھتے تھے اور ان کے نفوس اس طرح اپنا رخ قرآن کے ساتھ بدل دیتے تھے۔ جس طرح بادنما ہوا کے ساتھ رخ کو بدل دیتا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کو اخروی مناظر کے مطابق بدل دیتے تھے اور وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی مناظر قیامت میں زندہ رہ رہے تھے۔ یہی رویہ ہونا چاہئے ایک مسلمان کا قرآن کے حوالے سے کہ وہ قرآن کو سمجھے اور اپنی عملی زندگی کے رخ کو قرآن کے رخ پر ڈالتا رہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۱۸ ایک نظر میں

یہ سبق عالم نباتات کی ایک جھلک دکھاتا ہے کہ کس طرح اللہ پانی آسمانوں سے اتارتا ہے اور پھر زمین سرسبز ہو کر فصلیں اگتی ہیں اور یہ فصلیں اپنے انجام تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ مثال قرآن میں زمین کی بے ثباتی اور حیات دنیا کے اختصار کے لیے دی جاتی ہے۔ اور اہل فکر و نظر کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس پر غور و فکر کریں۔ پھر آسمانوں سے پانی کے نزول کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ کتاب بھی ایک قسم کا باران رحمت ہے جو آسمانوں سے نازل ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ سے خشک دل سرسبز ہو جاتے ہیں اور کھل جاتے ہیں۔ اس موقعہ پر ایک نہایت ہی اشاراتی تصویر بھی پیش کی جاتی ہے کہ کھلے دل اس کتاب سے کس طرح استفادہ کرتے ہیں۔ وہ اس سے ڈرتے ہیں' ان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے' رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور نرم ہو کر ان کے اندر قبولیت پیدا ہوتی ہے اور پھر ہدایت قبول کر کے وہ خوب مطمئن ہو جاتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کی تصویر جو ذکر الٰہی کی طرف لبیک کہتے ہیں اور ان کی تصویر جن کے دل پتھر ہو گئے ہیں۔ آخر میں توحید کی حقیقت کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور ایک مثال دی جاتی ہے کہ اللہ واحد کی بندگی کرنے والوں اور متعدد الہوں کی بندگی کرنے والوں کی حالت کیا ہوتی ہے۔ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ دونوں کا ایک حال نہیں ہو سکتا' مثلاً ایک غلام جس کے مختلف اور باہم لڑنے جھگڑنے والے مالک ہوں اور دوسرا غلام جو صرف ایک ہی سنجیدہ مالک کا غلام ہو۔

---ooo---

درس نمبر ۲۱۸ تشریح آیات

۲۱ --- تا --- ۲۹

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾

۲ ع۱۲ ۱۶

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا' پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا' پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں' پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں' پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں' پھر آخر کار اللہ ان کو بھس بنا دیتا ہے ۔ در حقیقت اس میں ایک سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے"۔

یہ منظر جس کی طرف یہاں قرآن کریم ہماری توجہ مبذول کراتا ہے' ایک ایسا منظر ہے جو اس کرۂ ارض پر ہر جگہ دہرایا جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ اس منظر میں جو عجائبات ہیں ان کی تعجب خیزی بوجہ بار بار دہرائے جانے کے' ختم ہو جاتی ہے اور انسان ان سے مانوس ہو جاتا ہے ۔ قرآن کریم انہی مناظر کو دوبارہ گہرے غور و فکر کے لیے پیش کرتا ہے کہ انسان اس منظر کی ترقی پر مرحلہ وار غور کرے ۔

دیکھو' آسمانوں سے پانی نازل ہو رہا ہے ۔ یہ پانی کیا ہے اور کس طرح یہ آ رہا ہے ۔ یہ چونکہ اکثر نازل ہوتا رہتا ہے ۔ اس لیے ہم اس پر سے یوں ہی گزر جاتے ہیں ۔ یہ پانی اور اس کی تخلیق بذات خود ایک معجزہ ہے ۔ اگرچہ ہمیں اس قدر معلوم ہو گیا ہے کہ یہ ایک متعین انداز میں ہائیڈروجن کے دو ذروں کا آکسیجن کے ایک ذرے کے ملاپ کا نام ہے ۔ لیکن ہمارا یہی علم ہے کہ اللہ نے کائنات کے اندر ہائیڈروجن اور آکسیجن کو پیدا کیا اور پھر ایسے حالات پیدا کیے ۔ کہ یہ ذرے آپس میں مل گئے اور اس اتحاد کے نتیجے میں پانی وجود میں آ گیا ۔ اور اس کے بعد اس زمین پر حیات کا پیدا کیا جانا ممکن بنا دیا گیا اور اللہ کا دست قدرت ان تمام امور کے پیچھے ہے ۔ اور یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی صنعت کاریاں ہیں ۔ پھر آسمانوں سے اس پانی کا نازل کرنا' اس مخصوص انداز میں ایک دوسرا معجزہ ہے کہ اس زمین اور اس کائنات کو اس انداز

میں بنایا کہ پانیوں کا برسنا ممکن ہو گیا۔
پھر اس کے بعد جو مرحلہ آتا ہے وہ یہ کہ

فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ (۳۹ : ۲۱) "پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا"۔ اس میں وہ دریا بھی شامل ہیں جو زمین پر بہتے ہیں۔ اس میں وہ ذخیرے بھی شامل ہیں جو سطح زمین کے نیچے ادھر ادھر چلتے ہیں۔ اور سوتوں اور چشموں کی شکل میں نکلتے ہیں۔ یا اس سطح زمین کے اندر کنویں نکال کر جاری کیے جاتے ہیں اس طرح کہ اللہ اس پانی کو سطح کے قریب رکھتا ہے اور یہ پانی دور تک نہیں جاتے کہ کبھی واپس ہی نہ ہو سکیں۔

ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ (۳۹ : ۲۱) "پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جس کی قسمیں مختلف ہیں"۔ نباتاتی زندگی جو بارش کے نتیجے میں نمودار ہوتی ہے اور بارش سے پیدا ہوتی ہے ایک ایسا معجزہ ہے جس کا مقابلہ انسانی جدوجہد نہیں کر سکتی۔ ایک چھوٹی سی کونپل جو زمین سے سر نکالتی ہے ' زمین کے بھاری بوجھ کو پھاڑ کر اور سر نکال کر کھلی فضا میں سانس لیتی ہے اور روشنی اور ہوا سے لطف اندوز ہوتی ہے اور آزاد فضا میں آزادی سے لہلہاتی ہے اور پھر یہ فضا میں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی ہے۔ صرف اس کونپل کا ملاحظہ ہی انسان کے دل و دماغ کو ذکر الٰہی سے بھر دیتا ہے۔ اور اللہ خالق کائنات کے احساس کی ایک لہر انسان کے ذہن میں اٹھا دیتا ہے وہ اللہ جس نے ہر چیز کو اس کا وجود بخشا اور پھر اسے ہدایت دی پھر ایک ہی قطعہ زمین میں مختلف قسم کے پھل ' مختلف پھل نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا پودا بلکہ ایک ہی قطعہ زمین میں مختلف قسم کے پھل ' مختلف پھل نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا پودا بلکہ ایک چھوٹا سا پھول بھی قدرت باری تعالیٰ کی ایک عظیم نمائش گاہ ہے۔ انسان صرف ایک پھول کا تجزیہ کر کے ہی اپنے عجز کا اظہار کر دیتا ہے۔

اور پھر یہ سرسبز فصل اپنی سرسبزی ختم کر کے پک جاتی ہے اور اپنے دن پورے کر کے۔

ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا (۳۹ : ۲۱) "پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں"۔ اور اس کائنات کے ناموس فطرت میں اس کے لیے جو انجام مقرر ہے اس تک وہ پہنچ جاتی ہے اور مراحل حیات طے کر کے پک جاتی ہے۔

ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا (۳۹ : ۲۱) "پھر آخر کار اللہ ان کو بھس بنا دیتا ہے"۔ اس کا وقت مقررہ آپہنچا ہے۔ وہ اپنا کردار ادا کر دیتی ہے۔ اور اس کا دور ختم ہوتا ہے جو زندگی بخشنے والے اللہ نے اس کے لیے مقرر فرمایا تھا۔

انَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (۳۹ : ۲۱) "درحقیقت اس میں سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے"۔ وہ عقل رکھنے والے جو غور کرتے ہیں' سبق لیتے ہیں اور اللہ نے ان کو جو صلاحیتیں دی ہیں اور جو عقل و خرد دی ہے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ فَوَيْلٌ

لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾

"اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟)۔ تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل اللہ کی نصیحت سے اور زیادہ سخت ہو گئے ۔ وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں ۔ اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے' ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں ۔ اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں' اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں ۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ راہ راست پر لے آتا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے اللہ ہی ہدایت نہ دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں ہے"۔

جس طرح آسمانوں سے پانی نازل ہوتا ہے' زمین سے نباتات لگتے ہیں اور ان کے رنگ مختلف ہوتے ہیں ۔ اسی طرح آسمان سے ذکر اور نصیحت نازل ہوتی ہے ۔ اس ذکر سے بھی زندہ دل فائدہ اٹھاتے ہیں' ان دلوں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں ۔ وہ ہدایات لیتے ہیں اور اچھے کاموں کے لیے آگے بڑھتے ہیں ۔ اور جس طرح آسمانوں کی بارش پتھروں پر فصل نہیں اگاتی ۔ اسی طرح سنگدل لوگوں پر ذکر آسمانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ ان میں کار خیر کی روئیدگی ہوتی ہے اور نہ فکر خیر کی روئیدگی ہوتی ہے ۔

اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے ایسے دلوں کے اندر شرح صدر پیدا کر دیتا ہے جن کے بارے میں اللہ کے علم میں ہوتا ہے کہ ان کے اندر خیر ہے ۔ ان تک نور الٰہی پہنچتا ہے تو وہ چمک اٹھتے ہیں اور ان سے روشنی پھوٹتی ہے ۔ اور شرح صدر والے قلوب اور سنگدل قلوب میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے ۔

فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (۳۹ : ۲۲) "تباہی ان لوگوں کے لیے جن کے دل نصیحت سے اور سخت ہو جاتے ہیں"۔

اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۹ : ۲۲) "وہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔ یہ آیت کریمہ ان دلوں کی حقیقت بیان کرتی ہے جو اسلام کے لیے کھل جاتے ہیں' جو اسلام سے ہدایات لیتے ہیں اور اسلام سے تر و تازگی حاصل کرتے ہیں اور اپنے دلوں کا تعلق اللہ سے جوڑتے ہیں ۔ ان کی شرح صدر کی حالت سے ان کی تر و تازگی' ان کے اندر پائی جانے والی بشاشت اور مسرت اور نورانیت اور اشراق کی کیفیات وجود میں آتی ہیں اس کے مقابلے میں یہ آیت

ان دلوں کا حال بھی بتاتی ہے جو سخت اور پتھر ہیں۔ جو اپنی خشکی کی وجہ سے مرچکے ہیں۔ بانجھ اور تاریک ہو چکے ہیں۔ غرض اللہ جس کو اسلام کے لیے پسند کرتا ہے اس کا دل اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور اسلام کا نور ان کے دلوں میں داخل ہو جاتا ہے اور جسے محروم کرنا چاہتا ہے اس کا دل سخت کر دیتا ہے اور ان دونوں کے اندر بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

دوسری آیت میں یہ بتایا گیا کہ اہل ایمان قرآن کریم کو کس انداز میں لیتے ہیں۔ قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جس کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس کی طبیعت اور مزاج میں' اس کی سمت میں' اس کی روح میں' اس کے خصائص میں' یہ ان تمام زاویوں سے متشابہ اور مثانی ہے (دہرائی ہوئی)۔ اس کی آیات کے آخری حصے یعنی مقطعے' اس کے قصص اور اس کی ہدایات اور اس کے مناظر بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں تضاد نہیں ہوتا۔ ہر جگہ ایک نئے زاویہ سے دہرائے جاتے ہیں اور ہر جگہ نئے لگتے ہیں اور ہر جگہ نیا فائدہ ہوتا ہے۔ نہایت ہم آہنگی' نہایت سنجیدگی اور مضبوط اصولوں کے مطابق' جن میں نہ تصادم ہے اور نہ تضاد ہے۔

وہ لوگ جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس کے احکام کے مطابق پرہیز کرتے ہیں اور ہر وقت احتیاط میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر وقت اللہ کے فضل کے امیدوار ہوتے ہیں۔ وہ قرآن کریم کے باران رحمت کو نہایت خوف اور کپکپی سے لیتے ہیں۔ اور وہ اس سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ کانپ اٹھتے ہیں۔ ان کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کے نفوس کے اوپر سکون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ان کے دل اس ذکر سے مانوس ہو جاتے ہیں' پھر ان کے دل نرم ہو کر اس نصیحت کو قبول کر لیتے ہیں۔

یہ ایک زندہ اور حساس صورت حالات ہے۔ یہ صورت حالات الفاظ کے رنگ سے منقش ہے اور یہ تصاویر یوں نظر آتی ہیں کہ گویا زندہ و متحرک ہیں۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۳۹: ۲۳) "یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ جس کو چاہتا ہے' راہ راست پر لے آتا ہے"۔ یہ دل از خود اس طرح کانپ نہیں جاتے بلکہ یہ رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتے ہیں اور رحمٰن کے فضل و کرم سے وہ لبیک کہتے ہیں اور ان کے اندر نور پیدا ہو جاتا ہے' اللہ کو تمام قلوب کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی کو ہدایت دیتا ہے اور کسی کو گمراہی لیکن یہ ان قلوب کی پسند کے مطابق ہوتا ہے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۹: ۲۳) "اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں ہے"۔ اللہ اس کو اس لیے گمراہ کرتا ہے کہ وہ شخص گمراہی اختیار کرتا ہے اور اللہ کو علم ہوتا ہے کہ اس نے ایسا کر لیا ہے یا کرے گا اور وہ کبھی بھی ہدایت کو قبول نہ کرے گا۔ اور نہ ہدایت کے سامنے سر جھکائے گا۔

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝۲۴

"اب اس شخص کی بدحالی کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو جو قیامت کے روز عذاب کی سخت مار اپنے منہ پر لے گا؟ ایسے ظالموں سے تو کہہ دیا جائے گا کہ اب چکھو مزہ اس کمائی کا جو تم کرتے رہے تھے"۔

انسان کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں اور اپنے جسم کے ذریعے بھی اپنے چہرے کو بچاتا ہے ۔ یہاں دوزخ کے اندر تو وہ اپنے آپ کو کسی صورت میں بھی آگ سے نہیں بچا سکتا ۔ نہ ہاتھوں سے ' نہ پاؤں سے ۔ لہٰذا وہ یہاں چہرے سے آگ کو دفع کرے گا ۔ اور چہرے کے ذریعہ سخت عذاب سے بچنے کی سعی کرے گا ۔ یہاں مراد ہے شدید ڈر ' شدید خوف اور شدید اضطراب ۔ اس قسم کی صورت حال میں اب کفار کو سرزنش کی جاتی ہے اور اس کے سامنے اس کی پوری زندگی کی کمائی پیش کی جاتی ہے ۔

وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (۳۹ : ۲۴) "اور ظالموں سے کہہ دیا جائے گا ' اب چکھو مزہ ' اس کمائی کا جو تم کرتے تھے"۔ اب روئے سخن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے والے لوگوں سے پھر کر ان اقوام کی طرف چلا جاتا ہے جنہوں نے انسانی تاریخ میں دوسرے نبیوں کی تکذیب کی تاکہ ذرا وہ تاریخ سے بھی سبق لیں اور اپنا بندوبست بھی کر لیں ۔

كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

"ان سے پہلے بھی بہت سے لوگ اسی طرح جھٹلا چکے ہیں ۔ آخر ان پر عذاب ایسے رخ سے آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ جا سکتا تھا ۔ پھر اللہ نے ان کو دنیا ہی کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا ' اور آخرت کا عذاب تو اس سے شدید تر ہے ' کاش یہ لوگ جانتے"۔

یہ ہے حال مکذبین کا دنیا اور آخرت دونوں میں ۔ دنیا میں بھی اللہ نے ان کو شرمندہ اور ذلیل کیا ۔ آخرت میں بھی ان کے لیے ایک عظیم عذاب انتظار میں ہے ۔ اللہ کی سنت اپنا کام کرتی ہے ۔ وہ اٹل ہے ۔ اقوام رفتہ کا انجام پوشیدہ نہیں ہے ۔ وہ شاہد عادل ہے ۔ اللہ کی دھمکی قائم ہے کہ وہ آخرت میں ان کو سزا دے گا ۔ ان کے سامنے اب بھی فرصت کے لمحات موجود ہیں ۔ ان کو غنیمت سمجھیں اور قرآن کی نصیحت سے ہدایت لیں '

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۳۹ : ۲۶) "کاش یہ لوگ جانتے"۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۲۸﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ط هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ط اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ج بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾

"ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح کی مثالیں دی ہیں کہ یہ ہوش میں آئیں۔ ایسا قرآن جو عربی زبان ہے، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، تاکہ یہ برے انجام سے بچیں۔ اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ ایک شخص تو وہ ہے جس کے مالک ہونے میں بہت سے کج خلق آقا شریک ہیں جو اسے اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں اور دوسرا شخص پورا کا پورا ایک ہی آقا کا غلام ہے۔ کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے؟ ـــ الحمد للہ، مگر اکثر لوگ نادانی میں پڑے ہوئے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کسی ایسے بندے کی جو موحد ہے اور کسی ایسے بندے کی جو مشرک ہے، یہ مثال دیتا ہے کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک غلام ایک شخص کی خالص ملکیت ہو اور دوسرا غلام کئی مختلف الخیال مالکان کے درمیان مشترکہ ہو۔ اس مشترکہ غلام میں مختلف مالکان کے علیحدہ علیحدہ مطالبے ہیں۔ اور یہ بیچارہ ان کے درمیان حیران و پریشان ہے۔ کوئی ادھر کھینچتا ہے، کوئی ادھر۔ وہ اسے کوئی ایک پروگرام نہیں دیتے اور اس بیچارے کی یہ طاقت ہی نہیں ہے کہ وہ ان کی متضاد فرمائشیں شروع کر سکے۔ کیونکہ وہ اس کے رخ کو بھی تبدیل کر رہی ہیں۔ اور اس کی خواہشات کو بھی تبدیل کر رہی ہیں۔ اور ایک مالک کا غلام یکسو ہے۔ اس کو مالک نے ایک پروگرام دیا ہوا ہے اور اسے معلوم ہے کہ اس نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک آقا کا غلام مطمئن، خوش اور یکسو ہو گا۔

هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا (۳۹ : ۲۹) "کیا ان دونوں کا حال یکساں ہو سکتا ہے"۔ یقیناً دونوں برابر نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کا ایک آقا ہے وہ آرام، استراحت، استقامت اور یقینی پروگرام رکھتا ہے۔ اس کی قوتیں مجتمع ہیں۔ اس کا رخ متعین ہے۔ اس کی راہ متعین ہے اور جس غلام کے مختلف الخیال آقا ہیں۔ وہ ایک دائمی عذاب میں ہے۔ ایک دائمی کشاکش میں ہے۔ اور ہر وقت قلق و بے چینی میں مبتلا ہے۔ کسی ایک حال پر برقرار نہیں ہے۔ اور اس سے ایک مالک بھی راضی نہ ہو گا، سب کا راضی ہونا تو محال ہے۔

یہ مثال حقیقت توحید اور حقیقت شرک پر تمام حالات میں منطبق ہے۔ ایک موحد و مومن اس زمین پر اپنا سفر نہایت ہی سیدھے راہ پر علی وجہ البصیرت طے کرتا ہے۔ کیونکہ ان کی نظریں ہمیشہ ایک نصب العین پر مرکوز ہیں۔ پوری زندگی، پوری قوت اور تمام ضروریات اور تمام نفع و نقصان وہ ایک جہت سے طلب کرتا ہے۔ ایک ذات ہے جو اسے روکتی ہے اور ایک ہی ذات ہے جو اسے اجازت دیتی ہے۔ لہٰذا اس کے قدم سیدھے اس ایک سرچشمے کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ اسی سرچشمے سے اخذ کرتا ہے اور اس کے ہاتھوں میں ایک ہی مضبوط رسی ہے جسے اس نے مضبوطی سے پکڑا رکھا ہے، ایک ہی ہدف ہے جس پر وہ نظریں جمائے ہوئے ہے۔ ایک ہی آقا کی وہ خدمت کرتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میرا

آقا کس بات پر راضی ہوتا ہے اور کس پر ناراض ہوتا ہے - یوں اس کی قوتیں مجتمع ہوتی ہیں اور یوں وہ پوری قوت کے ساتھ زمین پر کام کرتا ہے - اور آسمان پر نظریں جمائے ہوتا ہے -

اور اس مثال پر تبصرہ الحمدللہ سے کیا جاتا ہے کہ اس نے عقیدۂ توحید کے ذریعے اپنے بندوں کو آرام و اطمینان اور راحت بخشی ہے - اور ان کی زندگی کو ثبات و قرار عطا کیا - اب اگر وہ اس سے انحراف کرتے ہیں تو وہ لاعلم ہیں -

یہ ان مثالوں میں سے ایک ہے جو قرآن نے لوگوں کی راہنمائی کے لیے دی ہیں تاکہ لوگ حقیقت کو جان سکیں - یہ قرآن عربی ہے 'سیدھا' واضح اور بین ہے - اس کے معانی میں کوئی التباس نہیں - نہ پیچیدگی اور انحراف ہے اور یہ عوام الناس کو ایک فطری استدلال سے خطاب کرتا ہے 'جو ان کی سمجھ میں آتا ہے -

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۱۹ ایک نظر میں

یہ سبق اس سے ماقبل کے تمام اسباق پر ایک تبصرہ ہے۔ آسمانوں سے پانی کے نزول کی نشانی بیان کرنے کے بعد' مردہ زمین پر روئیدگی پیدا ہو کر فصل کاٹنے تک کی نشانی کے بعد' اور اللہ کی جانب سے نازل ہونے والی اس کتاب کی نشانیوں کے بعد اور قرآنی امثال کے بیان کے بعد اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین دہانی کرانے کے بعد کہ اکثر لوگ نہیں جانتے' یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ لوگوں کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اب بعث بعد الموت کے بعد ہی اللہ تمام حقائق کا فیصلہ کر دے گا۔ لہٰذا تکذیب کرنے والوں کو ان کی تکذیب کا بدلہ مل جائے گا اور وہ اس کے مستحق ہوں گے۔ اور سچوں کو سچائی کا وہ صلہ مل جائے گا جس کے وہ مستحق ہوں گے۔

--- ○○○---

درس نمبر ۲۱۹ تشریح آیات

۳۰---تا---۳۵

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾

۳
۱۰ع
۱۷

"(اے نبیؐ) تمہیں بھی مرنا ہے اور ان لوگوں کو بھی مرنا ہے' آخر کار قیامت کے روز تم سب اپنے رب کے حضور اپنا اپنا مقدمہ پیش کرو گے"۔

ہر زندہ مخلوق نے اس جام کو ہونٹوں سے لگانا ہے' باقی رہے گا صرف نام اللہ کا۔ اور موت کے معاملے میں تمام انسان برابر ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جان دینی ہے اور یہاں اس کا ذکر بھی توحید کے ثبوت کے لیے ہے۔ اور توحید اس سورت کا بڑا موضوع ہے۔ اس کے بعد بعث بعد الموت کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔ کیونکہ موت ہی پر معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ تو ایک مرحلہ ہے۔ اس کے بعد کے مراحل آنے والے ہیں۔ اس لئے کہ مخلوقات میں سے کوئی چیز عبث نہیں ہے کہ یونہی چلی جائے کہ بس پیدا ہوئے اور مر گئے۔ آج دنیا میں جن موضوعات پر لوگ باہم دست و گریباں ہیں ان پر رب کے ہاں بھی جھگڑے ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے ہاں کھڑے ہوں گے اور وہاں پھر پوچھا جائے گا کہ اب بتاؤ تم رسول اللہ کے مقابلے میں کیا کیا کرتے رہے ہو۔ اور اللہ کی ہدایت اور قرآن کا کیا کیا مقابلہ کرتے رہے ہو۔

--- ○○○ ---

فی ظلال القرآن

پارہ ۔ ۲۴

جلد پنجم

سورہ الزمر ۔ ۳۹

۳۲ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۷۵

سورہ المومن ۔ ۴۰

۱ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۸۵

سورہ حم السجدہ ۔ ۴۱

۱ ۔۔۔ تا ۔۔۔ ۴۶

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِىْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

"پھر اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور جب سچائی اس کے سامنے آئی تو اسے جھٹلا دیا۔ کیا ایسے لوگوں کے لیے جہنم میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟"

یہ سوال استفہام کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ سوال تقریری ہے۔ اس لیے کہ ایسے شخص سے بڑا ظالم اور کوئی نہیں ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے' کسی کو اللہ کا بیٹا اور کسی کو بیٹی کہتا ہے۔ سچائی کی تکذیب کرتا ہے جسے رسول اللہ لے کر آئے ہیں۔ وہ کلمہ توحید کی تصدیق نہیں کرتا۔ چونکہ یہ ایک کفریہ عمل ہے' اور کافروں کا ٹھکانہ یقیناً جہنم ہے اس لئے اس کے فیصلہ کن اظہار کی خاطر سوالیہ انداز اور اسلوب اختیار کیا گیا ہے تاکہ بات زیادہ واضح ہو جائے اور اس کی زیادہ تاکید ہو جائے۔

یہ تو مجادلہ اور جھگڑے کا ایک فریق تھا۔ اور فریق مقابل کون ہے؟ تو وہ شخص ہے جو اللہ کی طرف سے وہ سچائی لے کر آیا۔ اور اس نے اس کی تصدیق کی اور اس سچائی کو لوگوں تک پہنچایا' نہایت عقیدت مندی اور تسلی کے ساتھ۔ اور اس شخص یعنی رسول اللہ کے ساتھ تمام رسول اور انبیائے کرام شامل ہیں۔ اور اسی طرح رسول اللہ کے ساتھ اس میں وہ تمام لوگ بھی شامل ہیں جو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں درآنحالیکہ وہ اسلام پر پوری طرح ایمان لاتے ہیں اور اچھی طرح مطمئن ہیں اور اس دعوت میں ان کا قلب اور ان کی زبان دونوں شریک ہیں ایسے تمام لوگ متقی ہیں۔

وَالَّذِىْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾

"اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنہوں نے اس کو سچ مانا' وہی عذاب سے بچنے والے ہیں"۔

یہاں متقین اور ان کے لیے تیار شدہ جزاء کی تفصیلات دی جاتی ہیں:

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾

"انہیں اپنے رب کے ہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ خواہش کریں گے۔ یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا"۔

یہ ایک جامع انداز تعبیر ہے جو بھی چیز دل مومن کو مرغوب ہو اور جس کی چاہت اس کے دل میں پیدا ہو وہ اس کے لیے اس کے رب کے ہاں تیار ہو گی۔ یہ اس کا حق ہو گا' جس میں کوئی خسارہ نہ ہو گا اور نہ کوئی حصہ اس کا ضائع ہو گا۔

ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ (۳۹ : ۳۴) "یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزاء"۔

اور یہ اس لیے کہ اللہ نے ان کے لیے جس بھلائی اور جس عزت افزائی کا ارادہ فرمالیا تھا وہ حقیقت بن جائے اور عدل سے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ فضل و کرم کا معاملہ کرے۔

لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِىْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ

بِاَحۡسَنِ الَّذِیۡ کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

"تاکہ جو بدترین اعمال انہوں نے کیے تھے انہیں اللہ ان کے حساب سے ساقط کر دے اور جو بہترین اعمال وہ کرتے رہے ان کے لحاظ سے ان کو اجر عطا فرمائے"۔

اس لیے کہ عدل تو یہ ہو گا کہ نیکیوں کا بھی حساب کیا جائے اور برائیوں کا بھی حساب کیا جائے اور پھر دونوں پر سزا و جزاء دی جائے --- لیکن اللہ یہاں فضل و کرم کرے گا۔ اللہ اپنے متقی بندوں پر اپنے کرم کی تجلی کرے گا۔ یوں کہ ان کے بہت برے اعمال کو قلم زد کر دے گا۔ لہٰذا میزان میں ان کا کوئی حساب نہ ہو گا اور ان کو اجر بھی احسن طریقے سے دے گا' یعنی ان کے استحقاق سے زیادہ۔ چنانچہ ان کے ترازو میں ان کی نیکیوں کو زیادہ وزن دے دیا جائے گا۔ یہ اللہ کا فضل ہو گا اور یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ جسے چاہے' یہ فضل دے۔ ہاں اللہ نے اپنے ڈرنے والے بندوں کے لیے یہ وعدہ کر دیا ہے لہٰذا ایسا ہی ہو گا اور اہل تقویٰ اس پر مطمئن ہیں۔

--- ooo---

درس نمبر ۲۲۰ ایک نظر میں

اس سورت کا یہ سفر تمام اسفار سے زیادہ طویل اور وسیع ہے۔اس میں عقیدہ توحید کو مختلف زاویوں سے لیا گیا ہے اور اس کے بارے میں نہایت ہی حساس دلائل دیے گئے ہیں۔اور یہ نہایت ہی متنوع دلائل ہیں۔اس سبق کا آغاز ایک سچے مومن کی قلبی کیفیات سے کیا گیا ہے' جو صرف اللہ پر اعتماد رکھتا ہے۔اللہ ہی کو بڑی قوت سمجھتا ہے اور اللہ کے سوا تمام حقیر اور کمزور قوتوں کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔اس لیے وہ ان تمام قوتوں سے قطع تعلق کر کے اپنے امور اور ان کے امور کا فیصلہ قیامت کے دن پر چھوڑ دیتا ہے اور وہ اپنے راستے پر ثابت قدمی' اعتماد اور یقین کے ساتھ گامزن رہتا ہے۔

اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضے کا تعین کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کے ذمہ دار اور ٹھیکہ دار نہیں ہیں کہ ضرور ان کو راہ ہدایت پر لانا ہے۔وہ تو اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ان کی چوٹی اللہ کے ہاتھ میں' ہر حال اور ہر صورت میں۔لوگوں کے لیے اللہ کے سوا اور کوئی سفارش بھی نہیں ہے۔سفارش کے اختیارات تو اللہ کے پاس ہیں۔زمین و آسمانوں کا مالک ہی وہ ہے۔اور سب نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

پھر مشرکین کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کی نفسیاتی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کلمہ توحید کا ذکر ہو تو ان کی طبیعت منقبض ہو جاتی ہے اور اگر شرکیہ کلمہ سنیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ کلمہ توحید کا اعلان کر دیں۔اور مشرکین کو اللہ پر چھوڑ دیں۔اور ان کی ایک تصویر آپ کے سامنے کر دی جاتی ہے کہ قیامت کے دن تو یہ چاہیں گے کہ پوری روئے زمین کی دولت اور اس جیسی مزید دولت بھی فدیے میں دے کر جان چھڑا لیں۔اس لیے کہ وہاں وہ اللہ کی وہ بادشاہت دیکھ لیں گے جس سے وہ حواس باختہ ہو جائیں گے۔

اور ان کی حالت یہ ہے کہ جب وہ کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں تو وہ اللہ وحدہ کو پکارتے ہیں اور اگر وہ خوشحالی پا لیں تو پھر اکڑ کر لمبے چوڑے دعوے کرنے لگتے ہیں۔اور ان میں سے بعض یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ دولت ہمیں اپنے علم و ٹیکنالوجی کی وجہ سے دے دی گئی ہے اور یہ وہی بات ہے جو ان سے پہلے لوگوں نے بھی کہی تھی اور ان کو اللہ نے پکڑا اور وہ اللہ کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ بن سکے اور نہ اللہ کو عاجز کر سکے۔رہی رزق کی فراخی اور اس کی تنگی تو یہ اللہ کے سنن اور قوانین پر موقوف رکھی گئی ہے اور اللہ کے یہ قوانین قدرت اس کی حکمت کے مطابق چلتے ہیں۔وہی ہے جو رزق میں کشادگی دیتا ہے۔اور وہی ہے جو کسی کا رزق تنگ کر دیتا ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۳۹:۵۲) "بے شک اس میں آیات اور نشانیاں ہیں' ہر اس قوم کے لیے جو مومن ہو"۔

درس نمبر ۲۲۰ تشریح آیات

۳۶ --- تا --- ۵۲

أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ ۖ وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِن دُونِهِ ۚ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿٣٦﴾ وَمَن يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّضِلٍّ ۗ أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَزِيزٍ ذِي انتِقَامٍ ﴿٣٧﴾ وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۚ قُلْ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ إِنْ أَرَادَنِيَ اللَّهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كَاشِفَاتُ ضُرِّهِ أَوْ أَرَادَنِي بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكَاتُ رَحْمَتِهِ ۚ قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ ۖ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿٣٨﴾ قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٤٠﴾

” (اے نبیؐ) کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں۔ حالانکہ اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے۔ اور جسے وہ ہدایت دے ‘ اسے بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں۔ کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے؟ ان لوگوں سے اگر تم پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے ‘ تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے۔ ان سے پوچھو ‘ جب حقیقت یہ ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا تمہاری یہ دیویاں ‘ جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو ‘ مجھے اس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بچا لیں گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گی؟ بس ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے ‘ بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان سے صاف کہو کہ ” اے میری قوم کے لوگو ‘ تم اپنی جگہ اپنا کام کیے جاؤ ‘ میں اپنا کام کرتا رہوں گا ‘ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے

جو کبھی ٹلنے والی نہیں"۔

یہ چار آیات بتاتی ہیں کہ اہل ایمان کا سیدھا سادا استدلال کیا ہوتا ہے' یہ استدلال کس قدر قدرتی اور پرزور ہوتا ہے۔کس قدر واضح اور گہرا ہوتا ہے۔جس طرح یہ استدلال اور یہ سوچ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں ہے اور جس طرح اسے ہر مومن کے قلب میں ہونا چاہئے۔جس کا ایمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر پختہ ہو۔اور وہ اسی دعوت پر قائم ہو اور اسی کی تبلیغ کر رہا ہو اور جسے وہ اپنا دستور و منشور سمجھتا ہو اور وہ اس کے لیے کافی و شافی ہو۔اور وہ اس کو ایک مکمل راستہ بتاتی ہو' جو سیدھا منزل مقصود تک پہنچتا ہو اور مستقل راستہ ہو۔

اس آیت کے نزول میں ایسی روایات آئی ہیں کہ مشرکین مکہ رسول اللہ کو اپنے بتوں اور ان کے غضب سے ڈراتے تھے۔جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ صفات ان کے سامنے رکھتے تھے اور ان کی بے بسی و بے کسی بیان فرماتے تھے۔مشرکین مکہ حضور اکرمؐ کو ڈراتے تھے کہ اگر آپؐ نے ان کے بارے میں خاموشی اختیار نہ کی تو یہ بت آپؐ کو اذیت دیں گے۔

لیکن اس آیت کا مفہوم اس مخصوص شان نزول سے زیادہ وسیع ہے۔مراد ہر وہ دعوت حق ہے جو اس کرۂ ارض پر قیام نظام اسلامی کے لیے اٹھی ہے اور ہر وہ قوت ہے جو اس نظام اور اس دعوت کے خلاف ہے۔اس لیے کہ یہاں دعوت حق اٹھانے والے اہل ایمان کے مکمل بھروسے' اطمینان اور یقین کا ذکر کیا گیا ہے اور ان مخالف قوتوں کو بھی صحیح طرح تولا گیا ہے کہ ان کا وزن کیا ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (۳۹:۳۶) "کیا اللہ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں ہے"۔ہاں اللہ کافی ہے' لہٰذا وہ لوگ کون ہیں جن سے حضورؐ کو ڈرایا جا رہا ہے۔اللہ جب اپنے بندے کے ساتھ ہے' تو ان دوسری مخلوقات کی حیثیت کیا ہے۔خصوصاً جبکہ حضورؐ نے بندگی کا منصب لے لیا ہو اور وہ بندگی کا حق بھی ادا کر رہے ہوں۔اللہ نہایت قوی اور اپنے تمام بندوں پر کنٹرول کرنے والا ہے۔

وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (۳۹:۳۶) "یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں"۔آپؐ کس طرح ڈر سکتے ہیں۔اللہ کے سوا دوسری تمام قوتیں کس طرح ڈرا سکتی ہیں۔اس شخص کو جس کی حفاظت اللہ کر رہا ہو۔اور تمام روئے زمین پر جو قوتیں ہیں وہ اللہ سے فروتر قوتیں ہیں۔

یہ ایک بالکل سادہ اور واضح مسئلہ ہے۔یہ کسی بڑی بحث اور مباحثے اور کسی زیادہ سوچ کا محتاج نہیں ہے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ہر داعی کا حامی تو اللہ ہے اور دوسری تمام قوتیں فروتر ہیں۔اور جب کوئی شخص یہ موقف اختیار کرے تو پھر کوئی شک اور اشتباہ نہیں رہتا کہ اللہ کا ارادہ ہی نافذ ہو کر رہتا ہے اور اللہ کی مشیت ہی غالب رہتی ہے۔وہ اپنے بندوں کے درمیان فیصلے فرماتا ہے۔ان کی ذات کے بارے میں' ان کے دلوں کے بارے میں اور ان کی سوچ اور شعور کے بارے میں بھی۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۹:۳۶) وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ (۳۹:۳۷)

"اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے ۔ اور جسے وہ ہدایت دے دے اسے بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں ہے"۔ اللہ جانتا ہے کہ ضلالت کا مستحق کون ہے لہٰذا وہ اسے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہدایت کا مستحق کون ہے لہٰذا وہ اسے ہدایت دے دیتا ہے ۔ اور وہ جس کے بارے میں جو فیصلہ بھی کر دے اس کے فیصلے کو بدلنے والا بھی کوئی نہیں ہے ۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ (۳۹ : ۳۷) "کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے"۔ ہاں وہ انتقام لینے والا ہے ۔ اور وہ عزیز و قوی ہے ۔ اور وہ ان تمام لوگوں کو ان کے استحقاق کے مطابق جزاء دیتا ہے ۔ اور جس سے وہ انتقام لیتا ہے ۔ وہ مستحق ہوتا ہے کہ اس سے انتقام لیا جائے لہٰذا اس کی بندگی کرنے والے کو کسی چیز کا ڈر نہیں رہتا وہ کافی اور کفیل ہے ۔

اس کے بعد خود ان کی منطق اور ان کے زاویہ نگاہ کے مطابق استدلال کر کے یہی نتائج نکالے جاتے ہیں اور اس منطق اور اس طرز فکر کا وہ اقرار کرتے تھے اور اللہ کے بارے میں وہ اس قسم کا تصور رکھتے تھے ۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہُ قُلْ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ اَرَادَنِیَ اللّٰہُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِیْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ قُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ عَلَیْهِ یَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۳۹ : ۳۸) "ان لوگوں سے اگر تم پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے ' تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے ۔ ان سے پوچھو ' جب حقیقت یہ ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا تمہاری یہ دیویاں ' جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو ' مجھے اس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بچالیں گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکیں گی؟ بس ان سے کہہ دو کہ میرے لیے اللہ ہی کافی ہے ' بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں"۔

جب ان لوگوں سے پوچھا جاتا تھا کہ خالق ارض و سما کون ہے؟ تو وہ اقرار کرتے تھے کہ خالق ارض و سماء اللہ وحدہ ہے ۔ کوئی صحیح الفطرت انسان اس کے سوا جواب دے ہی نہیں سکتا ۔ اور کوئی عقلمند زمین و آسمان کی تخلیق کا سبب ایک ذات بلند اور عالی مقام کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا ۔ لہٰذا قرآن ان کو اور تمام عقلاء کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ تمہاری فطرت کے اندر یہ بات بیٹھی ہوئی ہے اور بہت واضح ہے ۔ اگر صورت یہی ہے تو پھر کوئی ہے جو اس مصیبت کو روک سکنے والا ہو جو وہ ذات عالی اپنے بندوں پر لانا چاہے ' یا زمین و آسمان میں کون ہے کہ اگر وہ کسی بندے پر رحمت کرنا چاہے تو اس کی رحمت کو روک سکے ۔

تو ان سوالات کا قطعی جواب یہ ہے کہ "نہیں"۔ اگر یہ بات طے ہو جاتی ہے تو داعی الی اللہ کس سے ڈر سکتا ہے ۔ وہ کس سے خائف ہو سکتا ہے اور کس سے امیدیں وابستہ کر سکتا ہے ۔ کون ہے جو اس کی مصیبتوں کو دور کر سکتا ہے ۔ کون ہے جو اللہ کی رحمت کو اس سے دور کر سکتا ہے ۔ کون ہے جو اسے بے چین کر سکتا ' اسے ڈرا دھمکا سکتا ہے اور اپنے

راستے سے ہٹا سکتا ہے؟

جب قلب مومن میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو اس کی نسبت سے معاملہ ختم ہو جاتا ہے' تنازعہ ختم ہے' غیر اللہ سے تمام امیدیں ختم۔ صرف اللہ سے امید باقی رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے بندوں کے لیے کافی ہے اور ہمیں اسی پر توکل کرنا چاہئے۔

قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۳۹:۳۸) "بس کہہ دو' اللہ میرے لیے کافی ہے اور بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں"۔

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ مجھے رب تعالیٰ پر پورا اعتماد' بھروسہ اور یقین ہے۔ اس قدر بھروسہ جس میں کوئی شک نہیں۔ ایسا یقین جس میں کوئی تزلزل نہیں۔ اور اس قدر اطمینان جس میں بے چینی کا شائبہ نہیں۔ اور اس زاد راہ کے ساتھ آپ چل پڑیں اور منزل تک پہنچنے سے پہلے دم نہ لیں۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳۹:۳۹) مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (۳۹:۴۰) ان سے صاف کہو کہ "میری قوم کے لوگو' تم اپنی جگہ اپنا کام کئے جاؤ' میں اپنا کام کرتا رہوں گا' تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسواکن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو کبھی ٹلنے والی نہیں"۔ اے قوم تم اپنے منہاج کے مطابق کام کرو' اور میں اپنی راہ پر چل پڑا ہوں' نہ ڈرتا ہوں اور نہ شک ہے مجھے۔ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ اسی دنیا میں تم پر کس قدر شرمسار کنندہ عذاب آتا ہے اور پھر آخرت میں تو یہ عذاب دائمی ہو گا۔

اس معاملے کا فیصلہ ہو چکا' اور اس فطری استدلال کے ذریعہ ہوا جس پر ہر سلیم الفطرت انسان گواہی دیتا ہے اور جس پر یہ کائنات گواہ ہے کہ اللہ خالق سماوات ہے اور خالق ارض ہے۔ اور تمام رسولوں نے آج تک جو دعوت پیش کی ہے یہ دعوت اللہ کی ہے۔ لہٰذا اللہ کے رسولوں اور داعیان حق کے لیے زمین اور آسمان میں کون ہے جو کوئی اختیار رکھتا ہے۔ کوئی ہے جو ان سے مصائب دور کر سکتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو لوگ غیر اللہ اور ان دنیاوی قوتوں سے ڈرتے کیوں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ معاملہ واضح ہے اور راستہ صاف ہے اور اب بحث و مباحثے کی مزید کچھ ضرورت نہیں ہے۔

--- ooo---

یہ تو ہے تعلق رسولوں اور داعیان حق کا اور ان قوتوں کا جو ان کی راہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں اب سوال یہ ہے کہ دعوت حق کے حوالے سے رسولوں اور داعیان کا فریضہ کیا ہے اور جھٹلانے والوں کے ساتھ وہ کیا رویہ اختیار کریں گے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۴۱﴾ ۴ ع ۱۰

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ ۱

الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۝ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَ لَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَعْقِلُوْنَ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۝

"(اے نبیؐ) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کر دی ہے ۔ اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا اپنے لیے کرے گا) اور جو بھٹکے گا اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہو گا' تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو ۔ وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے' پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے' اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں ایک وقت مقرر کے لیے واپس بھیج دیتا ہے ۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں ۔ کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے ؟ ان سے کہو' کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ ہو نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں ؟ کہو' شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے ۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے ۔ پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو"۔

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ (۳۹ : ۴۱) "ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کی ہے"۔ اس کتاب کی ماہیت سچائی ہے ۔ یہ جو طرز زندگی اور منہاج حیات انسان کو عطا کرتی ہے' وہ برحق ہے ۔ اس کا قانون برحق ہے اور یہی وہ سچائی ہے جس پر زمین و آسمان قائم ہیں اور وہ نظام جو اس کتاب نے انسانوں کے لیے وضع کیا ہے اور وہ ضابطہ جو اللہ نے اس کائنات کے چلانے کے لیے وضع کیا' دونوں حق ہیں اور باہم ہم آہنگ اور متوافق ہیں ۔ یہ سچائی لوگوں کے لیے نازل کی ہے کہ لوگ اس سے ہدایات لے کر اس کے مطابق زندگی بسر کریں اور آپ اس حق کے مبلغ ہیں ۔ اور یہ فیصلہ انہوں نے کرنا ہے کہ وہ اپنے لیے راہ ہدایت کا انتخاب کرتے ہیں یا راہ ضلالت کا ۔ جنت کی نعمتیں حاصل کرتے ہیں یا جہنم کی آگ اختیار کرتے ہیں ۔ ہر شخص اپنے نفس کو جدھر چاہے لے جائے ۔ نہ آپ ان کے ذمہ دار ہیں اور نہ حوالدار ۔

فَمَنِ اهْتَدٰی فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ (۳۹ : ۴۱) "اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا تو اپنے لیے کرے گا' اور جو بھٹکے گا تو اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہو گا ۔ تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو"۔ ان کا ذمہ دار اللہ ہے ۔ وہ بیداری میں بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور سوتے میں بھی اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اپنے تمام حالات میں وہ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ جس طرح چاہتا ہے' ان کے اندر تصرف فرماتا ہے ۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی (۳۹ : ۴۲) ”وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا ہے اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے ' پھر جس پر وہ موت کا فیصلہ نافذ کرتا ہے ' اسے روک لیتا ہے اور دوسروں کی روحیں ایک وقت مقرر کے لیے واپس بھیج دیتا ہے“۔

اللہ تعالیٰ تمام مردوں کی روحیں ان کے وقت مقرر کے مطابق قبض کرتا ہے ۔ اس سے قبل اللہ ہر شخص کی روح کو سونے کی حالت میں بھی قبض کرتا ہے ۔ اگرچہ وہ شخص مردہ نہیں ہوتا ۔ لیکن اس کی روح اس وقت بھی قبض ہوتی ہے ' ایک وقت مقررہ تک کے لیے ۔ اگر سوتے ہی میں اس کا وقت مقرر آجائے تو پھر وہ شخص جاگ نہیں اٹھتا ۔ اور اگر وقت مقرر نہ آیا تو روح واپس بھیجی جاتی ہے ۔ اور یہ شخص جاگ اٹھتا ہے ۔ لہٰذا تمام نفوس اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں ' سوتے میں بھی اور جاگتے میں بھی ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۳۹ : ۴۲) ”اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو فکر کرتے ہیں“۔ غرض یہ لوگ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ ہی ان کا ذمہ دار ہے اور آپ ان کے انجام کے ذمہ دار نہیں ہیں ۔ اگر وہ ہدایت پاتے ہیں تو اپنے لیے پاتے ہیں اور اگر وہ گمراہی کی راہ اختیار کرتے ہیں تو اپنے لیے کرتے ہیں ۔ محاسب سب کے لیے ہے ۔ کوئی بھی مہمل چھوڑ دیا جانے والا نہیں ہے ۔ لہٰذا ان کو اپنے آپ کو چھڑانے کی فکر کرنی چاہئے ۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ کَانُوْا لَا یَمْلِکُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ (۳۹ : ۴۳) قُلْ لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ

(۳۹ : ۴۴) ”کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو ' کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ ان کے اختیار میں کچھ ہو نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہو ' شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے ۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے ۔ پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو“۔ یہ ان کے ساتھ ایک مذاق ہے ۔ وہ لوگ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ملائکہ کی بندگی اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ملائکہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے ۔

اَوَلَوْ کَانُوْا لَا یَمْلِکُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ (۳۹ : ۴۳) ”خواہ ان کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی کچھ نہ ہوں“۔ اور اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ سفارش تو اللہ کے اختیار میں ہے ۔ یہ اللہ ہی ہے کہ جس کو سفارش کی چاہے اجازت دے دے ۔ لیکن اگر اللہ کسی کو سفارش کی اجازت دے تو ہمارے لیے یہ جائز نہ ہو گا کہ ہم اسے اللہ کا شریک بنا لیں ۔

لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۹ : ۴۴) ”زمین و آسمان کی بادشاہی کا وہی مالک ہے“۔ اس

بادشاہی میں کوئی اس کی ملکیت اور ارادہ کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ سب نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ اور اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے اور سب نے آخر کار اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

---ooo---

یہ نظریہ اور موقف کہ اللہ وحدہ بادشاہ ہے۔ وہ تمام اختیارات کا مالک ہے اور قہار ہے اور جس کا خلاصہ کلمہ توحید ہے، اس سے وہ کس قدر بدکتے ہیں اور کلمہ شرک کے لیے یہ کس قدر خوش ہوتے ہیں، حالانکہ کلمہ شرک کا انکار ان کی فطرت بھی کرتی ہے۔ اور ان کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات بھی کرتی ہے۔

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٤٥﴾

"جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں، اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں"۔

یہ ایک حقیقی صورت حال کی نقشہ کشی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں موجود تھی۔ اس وقت صورت یہ تھی کہ جب مشرکین کے خداؤں کا ذکر احترام سے کیا جاتا تو یہ مشرکین کھل اٹھتے اور بہت خوش ہوتے۔ اور جب کلمہ توحید کا بیان ہوتا تو یہ لوگ مرجھا جاتے اور ان کی طبیعت میں انقباض پیدا ہو جاتا--- لیکن یہ ایک نفسیاتی حالت ہے جو ہر زمان و مکان میں پائی جاتی ہے۔ ہر دور میں ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ وحدہ کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے اور صرف اللہ کی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے اور صرف اسلامی نظام اور اسلامی دستور و منشور کی بات کی جائے تو ان کو سخت انقباض ہوتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں جب انسانوں کے بنائے ہوئے نظام ہائے زندگی کی بات کی جائے، انسانی قوانین کی بات کی جائے تو وہ بہت ہی خوش ہوتے ہیں، کھل اٹھتے ہیں اور ایسی باتوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی تصویر کشی اس آیت میں کی گئی ہے۔ یہ لوگ ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی فطرت مسخ ہو چکی ہے۔ ان کے مزاج میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہ لوگ ضال اور مضل ہیں۔ اگرچہ کوئی معاشرہ حضور اکرمؐ کے معاشرے سے مختلف ہو۔ اگرچہ ان کی جنس اور قوم عربوں سے جدا ہو۔

ایسے منحرفین، گمراہوں اور بگڑے ہوئے لوگوں کا جواب وہی ہے جو اللہ نے حضورؐ کو بتایا تھا جب آپ کو ایسے حالات سے مقابلہ درپیش تھا۔

قُلِ اللَّهُمَّ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِي مَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٤٦﴾

"کہو، خدایا، آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، حاضر و غائب کے جاننے والے، تو ہی اپنے بندوں کے درمیان

اس چیز کا فیصلہ کرے گا' جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں"۔

یہ اس فطرت کی پکار ہے جو زمین و آسمان کو دیکھ رہی ہو۔ اور اس کے لیے یہ بات مشکل ہو کہ وہ اللہ کی ذات کے سوا کسی کو الٰہ مان سکے جو خالق ارض و سما ہے۔ لہٰذا یہ فطرت اس کی طرف اعتراف اور اقرار کے ساتھ متوجہ ہوتی ہے اور اللہ کی تعریف و تمجید ان صفات کے ساتھ کرتی ہے جو اس کے لائق ہیں یعنی "اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے"

عٰلِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ (۳۹:۴۶) "اے حاضر و غائب کو جاننے والے"۔ اے ظاہر و باطن کو جاننے والے۔

اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۳۹:۴۶) "تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہتے ہیں"۔ کیونکہ قیامت کے دن تو وہی حاکم ہو گا۔ اور سب نے قیامت میں اسی کے سامنے آنا ہو گا۔ اور کوئی قیامت کی حاضری سے بچ کر نکلنے والا نہیں ہے۔

--- ooo---

اور جب اللہ کے بندے قیامت کے روز کے فیصلے کے لیے حاضر کیے جائیں گے تو ان کی حالت پھر کیا ہو گی ذرا اسکرین پر یہ منظر دیکھیں:

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۸﴾

"اگر ان ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو' اور اتنی ہی اور بھی' تو یہ روز قیامت کے برے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ وہاں اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے۔ وہاں اپنی کمائی کے سارے برے نتائج ان پر کھل جائیں گے اور وہی چیز ان پر مسلط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں"۔

ایک ہولناک صورت حال کو الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ یہ قرآن ہی کر سکتا ہے' یہ ظالم جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں اور شرک ظلم عظیم ہے۔ اگر قیامت کے دن ان کے قبضے میں یہ پوری زمین ہو اور اس جیسی ایک اور زمین بھی اور وہ اس کے اور مافیہا کے واحد مالک ہوں تو وہ قیامت کے دن کے عذاب سے بچنے کے لیے وہ سب کچھ دینے کے لیے تیار ہوں گے۔ اور اس عذاب سے یہ لوگ رہائی نہ پا سکیں گے۔

ان جامع الفاظ کے اندر ایک دوسری دھمکی بھی چھپی ہوئی ہے۔

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (۳۹: ۴۷) ”اور اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انھوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے“۔ یہاں اس بات کا تذکرہ نہیں کیا گیا کہ وہاں ان کے سامنے اللہ کی طرف سے کیا غیر متوقع انکشافات ہوں گے؟ لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ جو کچھ ظاہر ہو گا وہ بہت ہی خوفناک ہو گا اور وہ ان کو مدہوش کر دے گا۔ اور وہ حواس باختہ پھریں گے۔ ایک طرف اللہ ہے اور دوسری طرف یہ ضعفاء ہیں اور اللہ کی طرف سے ان کے سامنے خوفناک انکشافات ہوں گے یہاں ان کو متعین نہیں کیا گیا۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۳۹: ۴۸) ”وہاں اپنی کمائی کے سارے نتائج ان پر کھل جائیں گے اور وہی چیز ان پر مسلط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں“۔ اس سے بھی ان کی حالت مزید بگڑ جائے گی۔ جب ان کے سامنے اپنے کرتوتوں کے نتائج بھیانک شکل میں آئیں گے۔ اور جس عذاب کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ انہیں گھیر لے گا۔ اور وہ نہایت ہی کربناک حالت میں ہوں گے۔ اعاذنا اللہ منھا۔

---ooo---

اب اس موقف کے بعد جب وہ اپنے رب کے سامنے حاضر کیے جائیں گے' اس رب کے سامنے جس کے ساتھ یہ لوگ شرک کرتے تھے اور جب اللہ وحدہ کا ذکر کیا جاتا تو ان کے دل سکڑ جاتے تھے اور جب ان کے شرکاء کا ذکر ہوتا تو وہ کھل جاتے تھے۔ ان مضامین کے بعد ان کی ایک عجیب حالت کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ یہ اللہ کی وحدانیت کا تو انکار کرتے ہیں لیکن جب یہ کسی بڑی مصیبت میں پھنستے ہیں تو صرف اللہ وحدہ کو نہایت عاجزی سے پکارتے ہیں۔ لیکن جب ان سے یہ مصیبت ٹل جائے تو پھر تکبر کرتے ہوئے انکار کرتے ہیں۔

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلٰى عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۴۹﴾

”یہی انسان جب ذرا سی مصیبت اسے چھو جاتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے' اور جب ہم اسے اپنی طرف سے نعمت دے کر ابھار دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ہے' نہیں بلکہ یہ آزمائش ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں“۔

یہ آیت انسانوں کے ایک ایسے نمونے کا ذکر کرتی ہے جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایسا نمونہ ہے جس کی فطرت نے سچائی تک رسائی حاصل نہیں کی۔ رب واحد کے عقیدے تک نہیں پہنچ سکی کہ اسے صحیح رویہ معلوم ہو اور خوشی اور غم کی حالت میں بھی وہ اپنا صحیح راستہ نہ بھولے۔

مصیبت' انسانی فطرت کے اوپر سے خواہشات نفسانیہ کی جمی ہوئی دبیز تہوں کو دور کر دیتی ہے اور مصنوعی عوامل کو

ہٹا کر انسانی ضمیر کے اندر موجود سچائی نکھارتی ہے۔جب انسان مشکلات سے دوچار ہوتا ہے تو اسے اللہ نظر آتا ہے "جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا" اب خدا کی تعریف ہونے لگتی ہے اور لوگ صرف اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور جب یہ شدت اور مصیبت ختم ہو جاتی ہے اور خوش حالی اور امن لوٹ آتا ہے تو انسان ان باتوں کو بھول جاتا ہے جو اس نے شدت و مصیبت کے وقت میں کی تھیں اور اس کی فطرت پھر خواہشات نفسانیہ اور وقتی عوامل کے دباؤ میں آجاتی ہے اور پھر اللہ کی نعمتوں اور فضل و کرم کے بارے میں وہ کہتا ہے۔

اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ (۳۹ : ۴۹) "یہ تو مجھے علم کی بناء پر دیا گیا ہے"۔یہ بات قارون نے بھی کی تھی۔ ہر وہ شخص اور قوم جسے یہ دھوکہ ہو جائے کہ اس کے اچھے دن علم و حکمت اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہیں۔یہ اس کی مہارت ہے کہ اس کو مال اور اقتدار ملا ہے۔ایسے لوگ فضل و کرم کے اصل مصدر سے غافل ہوتے ہیں اور علم دینے والے کو نہیں پہچانتے جو مسبب الاسباب ہے اور جو رزق مقرر کرتا ہے۔

یہ ہے امتحان اور آزمائش۔اس کے ذریعے اللہ معلوم کرتا ہے کہ جس پر فضل و کرم ہو رہا ہے' وہ شکر کرے گا یا کفر کرے گا۔ آیا اس فضل و کرم کی وجہ سے اس کی اصلاح ہوتی ہے یا وہ مزید بگڑتا ہے۔وہ راہ راست لیتا ہے یا گمراہی کی راہ پر آگے بڑھتا ہے۔

قرآن کریم نے بندوں پر مہربانی کرتے ہوئے یہ راز ان پر کھول دیا ہے اور اس خطرے سے انہیں پیشگی آگاہ کر دیا ہے کہ یہ مال اور دولت اور اقتدار و جاہ بھی تمہارے لیے آزمائش ہے۔قرآن کریم اقوام گزشتہ کے حالات ان پر پیش کر کے ان کو متنبہ کرتا ہے کہ پہلے بھی اس قسم کے لوگوں نے کہا تھا کہ۔

اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ (۳۹ : ۴۹) "یہ تو مجھے علم کی بنا پر دیا گیا ہے"۔

قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۭ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾

"یہی بات ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگ بھی کہہ چکے ہیں 'مگر جو کچھ وہ کماتے تھے وہ ان کے کسی کام نہ آیا۔پھر اپنی کمائی کے برے نتائج انہوں نے بھگتے ' اور ان لوگوں میں سے بھی وہ جو ظالم ہیں وہ عنقریب اپنی کمائی کے برے نتائج بھگتیں گے ' یہ ہمیں عاجز کر دینے والے نہیں ہیں"۔

یہ وہی الفاظ ہیں جو اس سے قبل کے بدفطرت لوگوں نے کہے تھے۔اور اس کا و[illegible] آیا۔نہ ان کا علم ان کے کام آیا' نہ ان کا اقتدار انہیں بچا سکا۔اور نہ ان کی ٹیکنالوجی اور اللہ کے عذاب نے انہیں آلیا۔یہ اللہ کی آزمائش تھی

اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اور اللہ کو عاجز کرنے والا کوئی نہیں۔ انسان جیسی ضعیف مخلوق اللہ کو کیسے عاجز کر سکتی ہے۔

رہی یہ بات کہ اللہ نے ان کو مال و اقتدار دیا تو یہ اللہ کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ اور یہ حکمت اللہ خود ہی جانتا ہے کہ وہ کسی کو مال و اقتدار کی فراوانی کیوں دیتا ہے۔ اصل بات ہوتی ہے اس کی مشیت اور اس کی آزمائش۔

اَوَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۲﴾ؑ

۵ ۱۱ع ۲

"اور کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ جس کا چاہتا ہے، رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے؟ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔

یہ تو اللہ کی نشانیاں ہیں کہ وہ کسی کو زیادہ اور کسی کو کم دیتا ہے، اور ان نشانات سے راہ ہدایت لینا چاہیے، نہ یہ کہ ان نشانات الٰہیہ کو کفر و ضلالت کا ذریعہ بنایا جائے۔

---000---

درس نمبر ۲۲۱ ایک نظر میں

اس سے پہلے سبق میں بتایا گیا تھا کہ قیامت کے دن ظالموں کے حالات کیا ہوں گے ۔

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ (۳۹ : ۴۷)

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۹ : ۴۸) ”اگر ان ظالموں کے پاس زمین کی ساری دولت بھی ہو' اور اتنی ہی اور بھی' تو یہ روز قیامت کے برے عذاب سے بچنے کے لیے سب کچھ فدیے میں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے ۔ وہاں اللہ کی طرف سے ان کے سامنے وہ کچھ آئے گا جس کا انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں کیا ہے ۔ وہاں اپنی کمائی کے سارے برے نتائج ان پر کھل جائیں گے اور وہی چیز ان پر مسلط ہو جائے گی جس کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں“۔

اس لیے اس سبق میں توبہ کا دروازہ کھولا جاتا ہے اور کوئی کس قدر گناہوں کا مرتکب کیوں نہ ہو گیا ہو' اسے دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہرگز نہ ہوں' چاہے وہ میری راہوں پر بہت آگے نکل گئے ہوں ۔ دعوت دی جاتی ہے کہ لوٹ آؤ' میرے در پر کوئی مایوسی نہیں ہے' لیکن اگر اس عام معافی اور عام دعوت سے تم نے فائدہ نہ اٹھایا اور توبہ نہ کی تو پھر تمہارے لیے وہ عذاب ہے جس سے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہ ہو گی ۔ اس فرصت سے فائدہ اٹھاؤ' قبل اس کے کہ وقت چلا جائے ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۲۱ تشریح آیات

۵۳ --- تا --- ۶۱

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

"(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو' جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا' یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے' وہ تو غفور و رحیم ہے"

اللہ کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ وہ بڑی سے بڑی معصیت کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے' چاہے وہ جو بھی ہو۔یہ توبہ اور واپس آ جانے کی دعوت عام ہے۔ان لوگوں کو دعوت ہے جو گمراہی' فسق و فجور اور بدکاری کی راہوں میں بہت دور چلے گئے ہیں اور مایوس ہو گئے ہیں۔ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں' اللہ پر بھروسہ کریں اور اللہ کی رحمت کا دروازہ وسیع ہے اور عفو و درگزر کی چادر بہت کھلی ہے۔وہ اپنے بندوں پر رحیم و کریم ہے۔وہ جانتا ہے کہ میرے بندے کس قدر کمزور اور ضعیف ہیں۔وہ جانتا ہے کہ ان کے طرز عمل پر داخلی اور خارجی عوامل اثرانداز ہوتے ہیں۔اللہ کو یہ بھی معلوم ہے کہ شیطان لعین گھات میں بیٹھا ہوا ہے اور دائیں بائیں ہر طرف سے وہ ان کے راستوں پر بیٹھا ہوا ہے اور ان کو گمراہ کرتا ہے۔اور اپنی تمام سوار افواج اور پیدل افواج اس نے انسانوں پر حملہ آور کر دی ہیں۔اور وہ اپنے اس خبیث منصوبے میں بہت ہی سنجیدہ ہے۔اور اللہ جانتا ہے کہ انسان کی ساخت بہت ہی کمزور ہے اور اس غریب کے ہاتھ سے جونہی حبل متین چھوٹتی ہے یہ اپنے ذاتی میلانات' نفسیاتی رجحانات سے برائی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اس کا توازن ختم ہو جاتا ہے اور وہ انحراف کی راہوں پر چل نکلتا ہے اور اس کا توازن ختم ہو کر وہ معصیت کی راہوں پر نکل پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی اس مخلوق کی ان سب کمزوریوں سے واقف ہے۔اس لیے اللہ اس کی معاونت فرماتا ہے اس کے لیے دامن رحمت وسیع فرماتا ہے اور سزا صرف اس وقت دیتا ہے جب اس کی اصلاح کے لیے تمام وسائل کام میں لائے کہ وہ راہ راست پر آ جائے اور جب وہ معصیت کی راہوں پر دور نکل جائے' گناہوں میں حد سے گزر جائے' اور اسے یقین ہو جائے کہ وہ تو اب ہر مردود و مسترد ہو گیا ہے اور اس کے لیے نہ اب واپسی ممکن ہے اور نہ معافی' اس قسم کی مایوسی اور قنوطیت کی حالت میں اللہ کی یہ پکار سنتا ہے۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (۳۹:۵۳) "(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو' جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا' یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے' وہ تو غفور و رحیم ہے"۔

یہ شخص معصیت میں حد سے گزر گیا ہے' گناہوں میں ڈوب گیا' محفوظ جگہ سے بھاگ گیا ہے اور راستے سے بے راہ ہو گیا ہے' اب اس کے اور سایہ رحمت' ترو تازہ کرنے والی رحمت' زندہ کرنے والی رحمت' نرم و نازک رحمت کے درمیان صرف ایک ہی دروازہ رہ گیا ہے ۔ یہ ہے توبہ کا دروازہ' یہ دروازہ ہروقت کھلا ہے' اس پر کوئی دربان نہیں ہے ۔ اس دروازے سے رحمت خداوندی کے سایوں تک پہنچنے کے لیے کسی اجازت نامے کی ضرورت نہیں ہے بس توبہ کرو اور لوٹ آؤ' صد بار اگر توبہ شکستی باز آ۔

وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ وَاَسْلِمُوْا لَہٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ بَغْتَۃً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

"پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ اس کے قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں تمہیں مدد نہ مل سکے ۔ اور پیروی اختیار کر لو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی ۔ قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو"۔

انابت' اسلام اور سر تسلیم خم کر دینے کے دائرے میں لوٹ آنا ایک ہی مفہوم رکھتا ہے اور ایک ہی حقیقت ہے ۔ اللہ کی اطاعت کے حظیرہ میں داخل ہونا ایک ایسا عمل ہے جس میں کوئی مراسم نہیں' کوئی رکاوٹ نہیں' کوئی واسطہ اور سفارش نہیں' جو چاہے' جس وقت چاہے' اسلام کے سادہ سے نظام میں داخل ہو جائے ۔

اسلام بندے اور رب کے درمیان بلاواسطہ دین ہے ۔ یہ خالق اور مخلوق کے درمیان بلاواسطہ تعلق ہے ۔ گناہ گاروں میں سے جو بھی واپس ہونا چاہے' گمراہوں میں سے جو چاہے' لوٹ آئے' جو لوگ بھی جس قدر نافرمانی کرتے رہے ہیں وہ سر تسلیم خم کر دیں اور واپس آ جائیں' دروازہ کھلا ہے ۔ سایہ دار پناہ گاہ موجود ہے ۔ تروتازہ اور نرم و نازک فضا موجود ہے ۔ اور یہ سب چیزیں ایک ایسے دروازے کے اندر ہیں جس کے لیے کوئی دربان نہیں ہے اور اس دروازے سے داخل ہونے کے لیے کوئی حساب و کتاب نہیں ہے ۔

لوٹ آؤ' لوٹ آؤ' قبل اس کے کہ آواز آ جائے کہ فلاں نماند!

مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (۳۹:۵۴) "قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ

جائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے"۔ وہاں تو کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اس لیے لوٹ آؤ، وقت کے ختم ہونے میں دیر نہیں ہے۔ کسی بھی وقت آخری گھڑی کا فیصلہ ہو سکتا ہے اور دروازہ بند ہو سکتا ہے۔ رات اور دن کے کسی وقت میں مہلت کی گھڑیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۳۹ : ۵۵) "اور پیروی اختیار کرو اپنے رب کی بھیجی ہوئی کتاب کے بہترین پہلو کی"۔ اس سے مراد قرآن کریم ہے جو تمہارے ہاتھوں میں ہے۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۳۹ : ۵۵) "قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے اور تم کو خبر بھی نہ ہو"۔

لہٰذا باز آ جاؤ، قبل اس کے کہ فرصت ختم ہو جائے، مہلت جاتی رہے اور تم نے اللہ کے حق میں کوتاہی کی ہو اور پھر تم پچھتاؤ کہ کیوں ہم اللہ کے وعدے کا مذاق اڑاتے تھے۔

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ۝۵۶

"کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی شخص کہے "افسوس میری اس تقصیر پر جو میں اللہ کی جناب میں کرتا رہا، بلکہ میں تو الٹا مذاق اڑانے والوں میں شامل تھا"۔

یا کوئی یہ بات کہے کہ اللہ نے میرے لیے تو گمراہی لکھ دی تھی۔ اگر اللہ میرے لیے ہدایت مقدر کر دیتا تو میں ہدایت پر آ جاتا۔

اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۵۷

"یا کہے "کاش اللہ نے مجھے ہدایت بخشی ہوتی تو میں بھی متقیوں میں سے ہوتا"۔ یہ استدلال بادی النظر میں غلط ہے۔ فرصت کی گھڑی موجود ہے، ہدایت کے ذرائع موجود ہیں، توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور تمہیں آزادی دی گئی ہے۔

اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۸

"یا عذاب دیکھ کر کہے "کاش مجھے ایک موقع اور مل جائے اور میں بھی نیک عمل کرنے والوں میں شامل ہو جاؤں"۔

اور یہ تو ایک ایسی آرزو ہے، جسے کوئی نہیں پا سکتا۔ جب یہ زندگی ختم ہو گی تو دوبارہ اس جہاں میں کسی کے بھیجے جانے کی کوئی امید نہیں ہے۔ کیا تم دار العمل میں موجود نہیں ہو۔ یہ ایک فرصت ہے اور جب یہ ختم ہو جائے تو پھر وقت لوٹ کر نہیں آتا۔ اور اس وقت کے بارے میں تم سے نہایت ہی سرزنش کے انداز میں باز پرس ہو گی!

بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِىْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾

"(اور اس وقت اسے یہ جواب ملے کہ) "کیوں نہیں' میری آیات تیرے پاس آچکی تھیں' پھر تو نے انہیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور تو کافروں میں سے تھا"۔

--- ○○○---

سیاق کلام اب قیامت میں متقین اور منکرین کا ایک منظر پیش کرتا ہے ـ عین اس وقت جب قارئین کو قیامت کے برپا ہونے کے آخری لمحات تک پہنچا دیا گیا ہے ـ

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِىْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَيُنَجِّى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾

"آج جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ باندھے ہیں قیامت کے روز تم دیکھو گے کہ ان کے منہ کالے ہوں گے ـ کیا جہنم میں متکبروں کے لیے کافی جگہ نہیں ہے؟ اس کے برعکس جن لوگوں نے یہاں تقویٰ کیا ہے' ان کے اسباب کامیابی کی وجہ سے اللہ ان کو نجات دے گا' ان کو نہ کوئی گزند پہنچے گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔

یہ ہے آخری انجام' ایک گروہ ہے کہ شرمندگی کی وجہ سے اس کا چہرہ سیاہ ہے ـ نیز غم کی وجہ سے اور جہنم کی شعلوں کی وجہ سے ـ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں اپنے آپ کو بہت ہی بڑا سمجھتے تھے ـ ان کو رات اور دن اللہ کی دعوت دی جاتی تھی ـ یہ دعوت اس وقت بھی برقرار تھی جب یہ گناہوں میں گردن تک ڈوبے ہوئے تھے لیکن انہوں نے داعی کی پکار پر کان نہ دھرا ـ آج یہ گروہ بہت ہی شرمندہ ہے ـ شرمندگی اور کبیدگی کی وجہ سے اس کا چہرہ سیاہ ہے اور دوسرا فریق نجات پا چکا ہے' کامیاب ہو گیا ہے ـ اب اسی کوئی گزند پہنچنے کا امکان ہی باقی نہیں رہا ـ نہ اسے کوئی پریشانی لاحق ہو گی ـ یہ متقین کا فریق ہے جو دنیا میں اس طرح زندہ رہے کہ آخرت سے ڈرتے رہے اور اللہ کی رحمت کے امیدوار رہے ـ آج وہ نجات' کامیابی' امن اور سلامتی میں ہیں ـ

لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۳۹ : ۶۱) "ان کو اب کوئی گزند نہ پہنچے گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے"۔ اس صورت حال کے بعد اب جو چاہے داعی حق کی پکار پر لبیک کہے اور اللہ کی تر و تازہ رحمت اور جنت میں داخل ہو جائے ـ یہ رحمتیں اور یہ جنتیں توبہ کے دروازے کے ساتھ موجود ہیں ـ دروازہ کھلا ہے ـ چھوڑ دو اپنا اسراف' چھوڑ دو بے راہ روی اور ترک کرو فسق و فجور' قبل اس کے کہ تمہیں عذاب الٰہی آلے اور تمہیں اس کا شعور ہی نہ ہو ـ

--- ○○○---

درس نمبر ۲۲۲ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے' اس میں تخلیق کائنات کے حوالے سے حقیقت توحید کے مضمون کو لیا گیا ہے ۔ یہ کہ اللہ نے تمام چیزوں کی تخلیق کی ہے ۔ وہ تمام چیزوں میں مالکانہ تصرف رکھتا ہے ۔ لہذا مشرکین کی یہ تجویز کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے الہوں کی بندگی کریں اور ہم اس کے مقابلے میں اللہ رب العالمین کی بندگی کریں ۔ یوں ایک مشترکہ دین وجود میں آ جائے' یہ تجویز اور مطالبہ نہایت احمقانہ ہے اور عجیب و غریب ہے ۔ اللہ تو خالق کائنات ہے ۔ آسمانوں اور زمین کے تمام اختیارات اور بادشاہت اسی کی ہے ۔ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے ۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور چیز کی بندگی بھی کی جائے ۔ جبکہ زمین و آسمان کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہیں ۔

حقیقت یہ ہے ۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ "اور ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے"۔ یہ لوگ اللہ کے ساتھ اوروں کو شریک کرتے ہیں ۔ حالانکہ اللہ وحدہ معبود' قدرت والا اور تمام کائنات کا کنٹرول کرنے والا ہے ۔

وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ (۳۹ : ۶۷)

"قیامت کے روز پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دست راست میں لپٹے ہوں گے"۔ اور اس حقیقت کو اس انداز میں ریکارڈ کرنے کے لیے قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے اور یہ منظر اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ فرشتے عرش الہی کے ارد گرد ننگے پاؤں پھر رہے ہوں گے ۔ یہ اللہ کی تسبیح کے ساتھ اس کی حمد بیان کر رہے ہوں گے ۔ پوری کائنات حمد و ثنا میں رطب اللسان ہوگی ۔ اور کہا جائے گا ہر طرف اور ہر جہت سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ "سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں"۔ اور اس کائنات کی حقیقت میں یہ ایک فیصلہ کن بات ہوگی۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۲۲ تشریح آیات

۶۲ --- تا --- ۷۵

اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۫ وَّ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ ﴿۶۲﴾ لَہٗ مَقَالِیۡدُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۶۳﴾

۶
۱۱ع
۳

”اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے ۔ زمین اور آسمانوں کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں ' اور جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہیں ۔ وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں“ ۔

یہ وہ حقیقت ہے جس پر ہر چیز گواہ ہے ۔ کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے کوئی چیز بنائی ہے اور کوئی معقول انسان یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ یہ کائنات بغیر کسی پیدا کرنے والے کے خود وجود میں آگئی ۔ حالانکہ اس کائنات کے اندر جو موجودات بھی ہیں ' ان کی ذات اور ان کی اسکیم بتاتی ہے کہ اس کو بالارادہ بنایا گیا ہے ۔ کوئی چیز اتفاقی نظر نہیں آتی ' چاہے چھوٹی ہو یا بڑی ۔

وَّ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ وَّکِیۡلٌ (۳۹ : ۶۲) ”اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے“ ۔ زمین و آسمان کو وہی چلانے والا ہے اور اپنے ارادے اور منشا کے مطابق اللہ زمین و آسمان کو چلاتا ہے ۔ یہ پوری کائنات اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق چلتی ہے ۔ اللہ کے ارادے کے سوا کسی اور کا ارادہ ان تصرفات میں دخیل نہیں ہے ۔ اس بات کی شہادت فطرت دیتی ہے ۔ حقیقت واقعہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے اور انسانی عقل و ضمیر بھی اس کی تائید میں ہے ۔

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ (۳۹ : ۶۳) ”اور جو لوگ اللہ کی آیات سے کفر کرتے ہیں وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں“ ۔ ان کو اس علم اور آگاہی سے محرومی ہے جس کے ذریعے ان کی زندگی اس پوری کائنات کی حرکت سے ہم آہنگ رہتی ہے ۔ یہ ان کے لیے بڑا خسارہ ہے ۔ وہ ہدایت کی راحت اور ایمان کے حسن سے محروم رہے اور اعتقاد اور نظریہ کے اطمینان اور یقین کی مٹھاس سے بھی محروم رہے اور آخرت

میں وہ خود بھی گھاٹے میں رہے اور ان کی وجہ سے ان کے خاندان بھی گھاٹے میں رہے ۔ وہ تو اس قدر نقصان اٹھا رہے ہیں کہ ان پر الخاسرون کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے ۔

--- ооо---

اس حقیقت کی روشنی میں جس پر آسمان اور زمین گواہ ہیں اور جس پر اس کائنات کی ہر چیز گواہ ہے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ ان سے کہو : کیا تجویز کرتے ہو کہ میں تمہارے الہوں کی بندگی کروں اور اس بدلے میں تم اللہ العالمین کی بندگی کرو ۔ کس قدر جاہلانہ تجویز ہے یہ ؟ کیا سچائی کوئی بکنے والی جنس ہے جس کا بازاروں میں سودا ہوتا ہو ۔

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾

" (اے نبیؐ) ان سے کہو " پھر کیا اے جاہلو ، تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو " ۔ یہ ایک فطری سرزنش ہے اور ان لوگوں کی پوچ تجویز کا مناسب جواب ہے ان کی اس تجویز ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر گہری جہالت میں ڈوبے ہوئے تھے اور خالص اندھے تھے ۔

چنانچہ اس کے بعد مشرک لوگوں کو ڈرایا جاتا ہے اور اس ڈراوے کے مخاطب اول حضور اکرمؐ اور تمام انبیاء علیہم السلام ہیں ۔ حضرات انبیاء کے بارے میں تو شرک کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ دراصل یہ ڈراوا ان کی امتوں کو ہے کہ وہ اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں ۔ اور بندگی صرف اللہ کی کریں اور تمام انسان جن میں انبیاء علیہم السلام بھی ہیں اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھیں ۔

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾

" (یہ بات تمہیں ان سے صاف کہہ دینی چاہئے کیوں کہ) تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارے میں رہو گے " ۔

شرک سے ڈراوے کا خاتمہ توحید پر کاربند ہونے کے حکم پر کیا جاتا ہے ۔ یعنی صرف اللہ کی بندگی کرو اور ایمان اور ہدایت پر اللہ کا شکر ادا کرو اور اللہ کی ان نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرو جو اللہ کے بندوں کو ڈھانپ لیتی ہیں اور جن کو وہ گن بھی نہیں سکتے جبکہ وہ ان میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں :

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

" لہٰذا (اے نبیؐ) تم بس اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکرگزار بندوں میں سے ہو جاؤ " ۔

--- ооо---

اب اللہ جل شانہ کی قدرت اور اللہ کے مقام کے بارے میں بتایا جاتا ہے جس کے ساتھ شریک کرنے کی تجاویز وہ دیتے تھے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ

"ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے"۔ حقیقت یہ کہ انہوں نے اللہ کی ذات کی قدر نہیں کی۔ ورنہ وہ اللہ کے ساتھ اس کی مخلوقات کو شریک نہ کرتے۔ نہ انہوں نے اللہ کی بندگی کا حق ادا کیا ہے کیونکہ وہ عقیدۂ توحید اور اللہ کی عظمت کو سمجھ ہی نہیں سکے۔ ان کو اللہ کی جلالت قدر کا شعور ہی نہیں ہے۔

اللہ کی جلالت قدر اور عظمت کا شعور ان کو یوں دیا جاتا ہے، قرآن کے مخصوص انداز بیان کے مطابق کہ قرآن اعلیٰ عقلی افکار کو بھی نہایت ہی مشخص انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ کلی اور عقلی مفاہیم محدود انسانی ادراک کے قریب آجائیں۔

وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۷﴾

"اس کی قدرت کاملہ کا حال تو یہ ہے کہ قیامت کے روز پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی، اور آسمان اس کے دست راست میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ پاک اور بالا تر ہے وہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں"۔

قرآن و سنت میں جہاں جہاں اس قسم کی تصاویر اور مناظر آتے ہیں وہ دراصل تمثیلات ہیں اور حقائق کو انسانی ادراک کے قریب تر کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ معانی کو ایسے الفاظ میں بیان کیا جائے جن کا تصور ان کے لیے ممکن ہو، یہاں بھی اللہ کی قدرت مطلقہ کو مٹھی کی شکل میں لایا گیا ہے، ورنہ اللہ نہ کسی شکل، نہ کسی جگہ اور نہ کسی حد کا پابند ہے۔ یہاں عقلی حقائق کو حسی انداز دیا گیا ہے۔

--- ooo ---

اس کے بعد قیامت کا ایک طویل منظر آتا ہے۔ اس کا آغاز نفخہ اولیٰ سے ہوتا ہے اور خاتمہ اس وقت ہوتا ہے جب قیامت کے تمام معاملات چکا دیئے جاچکے ہیں۔ اور اہل جہنم کو جہنم کی طرف چلا دیا جاتا ہے۔ اور اہل جنت کو جنت کی طرف رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اور صرف ذات باری رہ جاتی ہے اور تمام کائنات ذات باری کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہوتی ہے۔

یہ ایک زبردست منظر ہے۔ جوش و خروش اور حرکت سے پر ہے اور اس کی حرکات نہایت ترتیب سے آہستگی کے ساتھ شروع ہوتی ہیں اور آگے بڑھتی ہیں۔ یہاں تک کہ تمام حرکات ختم ہو جاتی ہیں، تمام آوازیں بیٹھ جاتی ہیں اور منظر پر ایک خوفناک خاموشی چھا جاتی ہے۔ تمام مخلوقات اللہ واحد اور قہار کے سامنے سہم جاتی ہیں۔

دیکھیے! ایک سخت آواز بلند ہو جاتی ہے اور سب لوگ مر کر گر جاتے ہیں۔ اس وقت زمین میں موجود پوری آبادی چشم زدن میں بے جان ہو جاتی ہے۔ آسمانوں کی پوری مخلوق بھی ختم ہو جاتی ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اب ہمیں یہ معلوم نہیں

ہے کہ کتنے وقفے کے بعد دوسری چیخ بلند ہوتی ہے ۔ لیکن دوسری چیخ بلند ہو جاتی ہے ۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿۶۸﴾

"اور اس روز صور پھونکا جائے گا اور وہ سب مر کر گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں ' سوائے ان کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے ۔ پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکایک سب کے سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے ۔
یہاں تیسری آواز کا تذکرہ نہیں ہے ۔ جس میں جمع ہونے اور اللہ کے ہاں حاضر کا حکم ہو گا ۔ اور حشر و نشر کی چیخ و پکار اور اژدہام کے شور کی تصویر کشی نہیں کی گئی کیونکہ اس منظر کو نہایت ہی پرسکون انداز میں پیش کرنا مطلوب ہے ۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹ : ۶۹) "زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی" ۔ یعنی وہ میدان جس میں قیامت برپا ہوگی ۔ یہ میدان جہاں نور ربی ہو گا دوسرا کوئی نور نہ ہو گا ۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ (۳۹ : ۶۹) "کتاب اعمال لا کر رکھ دی جائے گی" ۔ وہ کتاب جس میں لوگوں کا اعمال نامہ درج ہو گا ۔

وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ (۳۹ : ۶۹) "انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیئے جائیں گے" ۔ تاکہ وہ حق بات کہہ دیں جو وہ جانتے تھے اور ہر تنازعہ وہاں طے کر دیا گیا ۔ نہایت خاموشی کے ساتھ 'کیونکہ اس منظر میں تمام معاملات خشوع اور خضوع سے طے ہوتے ہیں ۔ کوئی تنازعہ نہیں رہتا ۔

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۰﴾ ع ۴

"لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا' ان پر کوئی ظلم نہ ہو گا اور ہر متنفس کو جو کچھ بھی اس نے عمل کیا تھا' اس کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا ۔ لوگ جو کچھ بھی کرتے ہیں ' اللہ اس کو خوب جانتا ہے" ۔

یہاں کسی کو کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے' نہ کوئی آواز اٹھانے کی یہاں کوئی ضرورت ہے۔ چنانچہ پوری انسانیت کا حساب و کتاب بڑی خاموشی کے ساتھ لپیٹ لیا جاتا ہے اور اجمال کے ساتھ جبکہ دوسرے مناظر میں تفصیلات دی گئی ہیں' کیونکہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس دن اللہ کا رعب اور خوف چھایا ہوا ہو گا۔ اور اللہ کے جلال کے سامنے کسی کو دم مارنے کی سکت نہ ہو گی۔

وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾

"(اس فیصلہ کے بعد) وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا' جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے' یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے' تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے کارندے ان سے کہیں گے "کیا تمہارے پاس تمہارے اپنے لوگوں میں سے ایسے رسول نہیں آئے تھے جنہوں نے تم کو تمہارے رب کی آیات سنائی ہوں اور تمہیں اس بات سے ڈرایا ہو کہ ایک وقت تمہیں یہ دن بھی دیکھنا ہو گا؟" وہ جواب دیں گے۔ "ہاں' آئے تھے' مگر عذاب کا فیصلہ کافروں پر چپک گیا"۔

یہاں فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور کہیں گے ہاں تم اس جہنم کے مستحق ہو اور یہ ہیں اس کے اسباب۔ کافروں کے خلاف اللہ کا فیصلہ برحق صادر ہو چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اس لیے کافر یہاں بغیر کسی مخاصمت کے اسے تسلیم کرتے ہیں' اقرار کرتے ہیں کہ ہم مجرم تھے اور سر تسلیم خم کرتے ہیں۔

قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾

"کہا جائے گا' داخل ہو جاؤ' جہنم کے دروازوں میں' یہاں اب تمہیں ہمیشہ رہنا ہے' بڑا ہی برا ٹھکانا ہے یہ متکبروں کے لیے"۔ یہ جہنمیوں کا قافلہ ہے۔ متکبرین کا قافلہ ہے۔ وہ گیا' اس کے لیے دروازے کھلے --- لیکن دیکھئے دوسری طرف متقین کا قافلہ بھی آ رہا ہے۔ یہ اہل جنت کا قافلہ ہے!

وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَ فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

"اور جو لوگ اپنے رب کی نافرمانی سے پرہیز کرتے تھے انہیں گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے' اور اس کے دروازے پہلے ہی کھولے جا چکے ہوں گے' تو اس کے منتظمین ان سے کہیں گے کہ "سلام ہو تم پر' بہت اچھے رہے' داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے لیے"۔

یہ ایک بہترین استقبال ہے۔ تعریف ہے۔ اور اس کے اندر اس کا سبب بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ طِبْتُمْ "تم اچھے رہے" یعنی تم پاکیزہ رہے۔ تم پاک تھے۔ پاک ہو کر آئے کیونکہ جنت میں تو پاک لوگ ہوں گے۔ پاک لوگ ہی وہاں داخل ہو سکتے ہیں کیونکہ وہاں تو خلود اور نعمتیں ہیں۔

اب یہاں اہل جنت کی آوازیں نہایت خشوع سے بلند ہوتی ہیں اور وہ دھیمی آواز کے ساتھ اللہ کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿۷۴﴾

"اور وہ کہیں گے "شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہم کو زمین کا وارث بنا دیا' اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں"۔

یہ جنت کی سرزمین کے وارث ہو گئے۔ جہاں چاہتے ہیں اس کے اندر جا رہے ہیں اور بس رہے ہیں۔ جو چاہتے ہیں کھا رہے ہیں' سب کچھ موجود ہے۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔

اب اس منظر کا خاتمہ نہایت ہی خوفناک انداز میں ہوتا ہے' لیکن یہ جلال بھی نہایت دھیمی انداز کا ہے۔ اس منظر کی فضا سے ہم رنگ۔ پوری کائنات رب کی ثنا میں رطب اللسان ہے۔ نہایت ہی دھیمے انداز میں' خشوع اور سرافگندگی کے ساتھ اور ہر زندہ مخلوق جس کلمے کو دہراتی وہ نہایت عجز کے ساتھ دہراتی ہے۔

وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۷۵﴾ ع ۸ ۵

"اور تم دیکھو گے کہ فرشتے عرش کے گرد حلقہ بنائے ہوئے اپنے رب کی حمد و تسبیح کر رہے ہوں گے اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ چکا دیا جائے گا' اور پکار دیا جائے گا کہ حمد ہے "اللہ رب العالمین کے لیے"۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ----- ۲۴

سورۃ المومن ـ ۴۰

آیات ۱--- تا--- ۸۵

سورۃ المومن ایک نظر میں

اس سورت میں حق و باطل کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے ۔ ایمان اور کفر کے مسئلے پر بحث ہے ۔ دعوت اسلامی کے مقاصد اور زمین پر جابرانہ نظام اور بغیر استحقاق کے اقتدار کے حصول کے مسائل زیر بحث آئے ہیں ۔ اور یہ بتایا گیا کہ اس طرح جبار اور قہار لوگوں کے ساتھ اللہ کا پھر سلوک کیا ہوتا ہے ۔ اس موضوع کے درمیان مومنین اور اللہ کے مطیع فرمان لوگوں کو تسلی دی جاتی ہے کہ اللہ کی نصرت تمہارے شامل حال رہے گی ۔ فرشتے تمہارے لیے دعاگو ہیں اور اللہ تمہارے بارے میں فرشتوں کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور آخرت میں تو بہت بڑے انعام و اکرام تمہارے انتظار میں ہیں ۔

اس سورت کی مجموعی فضا' اس کے موضوع کے اعتبار سے یوں لگتی ہے کہ گویا جنگ ہو رہی ہے اور کشمکش برپا ہے ۔ حق و باطل کا باہم ٹکراؤ ہے ۔ ایمان اور کفر میدان معرکہ میں ہیں ۔ زمین کی سرکش قوتوں کے مقابلے میں عذاب الٰہی ہے کہ انہیں تباہ و برباد کر رہا ہے اور اس فضائے کشمکش کے درمیان جب مومنین کا ذکر آتا ہے تو گویا رحمت خداوندی کی باد نسیم چل پڑتی ہے ۔

معرکے کی یہ فضا اس سورت میں جابجا بکھری ہوئی ہے ۔ جہاں اقوام ماضی کی تباہی کے مناظر آتے ہیں ان میں بھی اور جہاں قیامت کے مناظر آتے ہیں ان میں بھی ہے اور انداز بیان نہایت ہی سخت اور خوفناک ہے ۔ جس طرح پوری سورت کی فضا ہے ۔ رعب' شدت اور سختی اس کے انداز بیان کا خاص رنگ ہے ۔

غالباً اس سورت کی عمومی فضا کی مناسبت ہی سے شاید سورت کا آغاز شاندار اور زوردار فقروں سے کیا گیا ہے جن کے ذریعہ غور و فکر کی تاروں پر زوردار ضربات لگا کر ایک خاص زمزمہ پیدا کیا گیا ہے :

غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۴۰ : ۳) "گناہ معاف کرنے والا' توبہ قبول کرنے والا سخت سزا دینے والا' بڑا صاحب فضل ہے' کوئی معبود اس کے سوا نہیں' اس کی طرف پلٹنا ہے"۔ یہ منظم ضربات ہیں جن کی آواز منظم ہے' جن کی تاثیر مستقل ہے' آیات کے مقاطع جس طرح زوردار ہیں' اسی طرح معانی بھی ذی جلال ہیں اور موسیقی بھی پرتاثیر ہے ۔

اسی طرح اس سورت میں الباس ، باس اللہ ، باسنا کے الفاظ بار بار دہرائے جاتے ہیں اور سورت میں مختلف مقامات پر آتے ہیں ۔ اس کے سوا بعض دوسرے الفاظ بھی ہیں جن کے مفہوم و مراد میں سختی پائی جاتی ہے ۔

بالعموم یوں نظر آتا ہے کہ پوری سورت میں دل و دماغ کو کھٹکھٹایا جاتا ہے اور بہت ہی زوردار انداز میں تاکہ انسان کا دل و دماغ بیدار ہو' یہ سختی گزشتہ ملتوں کی ہلاک شدہ اقوام کے واقعات کے بیان میں بھی ہے اور قیامت کے مظاہر کے

بیان کے دوران بھی ہے ۔ لیکن بعض اوقات اندازِ بیان نرم بھی ہو جاتا ہے ۔ دل و دماغ کے تاروں کو نہایت ہی لطف اور محبت سے چھیڑا جاتا ہے ' خصوصاً جبکہ ان فرشتوں کا بیان آتا ہے جو حاملین عرش ہیں ' جو اپنے رب کو پکارتے ہیں کہ اے اللہ اپنے مومن بندوں پر فضل و کرم فرما اور خصوصاً اس وقت جب انسان کے سامنے اس کائنات کی نشانیاں پیش کی جا رہی ہوں یا خود نفس بشری کے اندر موجود آیات دکھائی جا رہی ہوں ۔

بعض مثالوں کا یہاں ذکر ضروری ہے جن سے معلوم ہو کہ سورت میں پایا جانے والا سخت انداز کیا ہے اور نرم انداز کیا ہے --- ہلاک شدہ اقوام کے بارے میں :

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّ الْاَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَ جٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ

(۴۰ : ۵) " ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم بھی جھٹلا چکی ہے اور اس کے بعد بہت سے جتھوں نے بھی یہ کام کیا ۔ ہر قوم اپنے رسول پر جھپٹی تاکہ اسے گرفتار کرے ' ان سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کی مگر آخر کار میں نے ان کو پکڑ لیا ' پھر دیکھ لو میری سزا کیسی سخت تھی " ۔

اَوَ لَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِى الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ (۴۰ : ۲۱) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ اِنَّهٗ قَوِىٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۴۰ : ۲۲) " کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا ۔ جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں ؟ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین پر چھوڑ گئے تھے ۔ مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا ' اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا ۔ یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول بینات لے کر آئے اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا ' آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا ۔ یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے ۔

اور قیامت کے مناظر میں یہ دو منظر :

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّ لَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۴۰ : ۱۸) " اور ان لوگوں کو اس دن سے جو قریب آ لگا ہے ' ڈراؤ ' جب کلیجے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ پی رہے ہوں گے ' ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہو گا اور نہ کوئی شفیع

جس کی بات مانی جائے"۔

اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَ بِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (۴۰:۷۰) اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ (۴۰:۷۱) فِی الْحَمِیْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ (۴۰:۷۲) "یہ لوگ اس کتاب کو اور ان ساری کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجی تھیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا جب طوق ان کی گردن میں ہوں گے اور زنجیریں جن سے پکڑ کر وہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف کھینچے جائیں گے اور پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے"۔

اور وہ دیکھئے کہ حاملین عرش نہایت ہی خشوع کے ساتھ مومنین کے لیے دعا کر رہے ہیں! کس قدر خوشگوار اور تروتازہ منظر ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَ قِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ (۴۰:۷) رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ اِلَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۴۰:۸) وَ قِهِمُ السَّیِّاٰتِ وَ مَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۴۰:۹) "عرش الٰہی کے حامل فرشتے اور وہ جو عرش کے گرد پیش حاضر رہتے ہیں، سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: "اے ہمارے رب تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ بس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچا لے ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے ہمارے رب اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں، جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کے والدین اور بیویوں اور اولاد سے، جو صالح ہوں۔ تو بلاشبہ قادر مطلق اور حکیم ہے۔ اور بچا دے ان کو برائیوں سے اور جن کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا، اس پر تو نے بڑا رحم کیا۔ یہی بڑی کامیابی ہے"۔

اس سورت میں ان نشانات کو بھی بیان کیا گیا ہے جو انفس و آفاق میں ہیں، نہایت ہی دلکش اور نرم انداز میں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ

ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا وَ مِنكُم مَّن يُتَوَفّٰى مِن قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۶۷:۴۰) هُوَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَ يُمِيْتُ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۶۸:۴۰) ''وہی تو ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفے سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر تمہیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے' پھر تمہیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ' پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو' وہی ہے زندگی دینے والا اور وہی ہے موت دینے والا۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے' بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے' وہ ہو جاتی ہے''۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (۶۱:۴۰) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۶۲:۴۰) ''وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو' اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے' ہر چیز کا خالق' اس کے سوا کوئی معبود نہیں' پھر تم کدھر بہکائے جا رہے ہو''۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۶۴:۴۰) ''اللہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اوپر آسمان کا گنبد بنایا جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی' جس نے تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔ وہی تمہارا رب ہے' بے حساب برکتوں والا ہے' وہ کائنات کا رب ہے۔

یہ دونوں قسم کے انداز اور مناظر سورت کی فضا بتاتے ہیں۔ اور یہ اس کے موضوع اور مضمون کے مطابق مناسب انداز بیان بھی ہیں۔ سورت کا سیاق ہم نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ چار ممتاز اسباق پر مشتمل ہے۔

پہلا سبق حروف مقطعات سے سورت کا آغاز کرتا ہے۔

حٰمٓ (۱:۴۰) تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۲:۴۰) ''حا' میم' اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے' جو زبردست ہے' سب کچھ جاننے والا ہے''۔ اور اس کے بعد عقل و خرد کے تاروں پر وہ مضبوط اور مستقل ضربات ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۴۰ : ۳) "گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے' سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحب فضل ہے' کوئی معبود اس کے سوا نہیں' اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے"۔ اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ یہ پوری کائنات مسلم ہے۔ اور اللہ کے سامنے سرتسلیم خم کرنے والی ہے۔ اور اللہ کی نشانیوں کے بارے میں وہی لوگ مجادلہ کرتے ہیں جو کفر پر اصرار کرتے ہیں لہٰذا وہ اس پوری کائنات سے مختلف رویہ اختیار کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کو رسول اللہ کوئی اہمیت دیں۔ اگرچہ وہ مالدار ہوں اور ان کی بات چلتی ہو۔ کیونکہ یہ اسی انجام تک پہنچنے والے ہیں جس سے ان سے قبل انسانی تاریخ کے دوسرے مکذبین پہنچے۔ اللہ نے ان کو خوب پکڑا۔ اور ان کو ایسا عذاب دیا جو حیران کن تھا۔ اس دنیا میں بھی ان کو عبرتناک سزا دی گئی اور آخرت کا عذاب تو مستقلاً ان کے لیے تیار ہے اور ان کے انتظار میں ہے۔ یہ تو کفر کرتے ہیں لیکن جن فرشتوں نے اللہ کے عرش کو اٹھا رکھا ہے' وہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنے رب پر ایمان لائے ہیں۔ اس کی بندگی کرتے ہیں پھر زمین میں جو لوگ ایمان لاتے ہیں۔ یہ حاملین عرش ان کے لیے دعا کرتے ہیں' ان کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور ان کے لیے دائمی نعمتوں اور فلاح کی دعا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قیامت میں کافروں کے منظر کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے کہ ان پر یہ پوری کائنات ہر طرف سے آوازے کسے گی' وہ کائنات جو مومن اور سرتسلیم خم کرنے والی ہے :

لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ

(۴۰ : ۱۰) "آج تمہیں جتنا شدید غصہ اپنے اوپر آ رہا ہے۔ اللہ تم پر اس سے زیادہ غضبناک ہے اس وقت ہوتا تھا جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم کفر کرتے تھے"۔ اب یہ لوگ استکبار کے بجائے نہایت ہی ذلت کے مقام پر کھڑے ہیں' اپنے گناہوں کا اقرار کر رہے ہیں' رب کا اعتراف کر رہے ہیں لیکن یہ اقرار و اعتراف مفید ہی نہیں ہے۔ بس وہی گناہ یاد کیے جا رہے ہیں جو یہ شرک اور تکبر کی صورت میں کرتے تھے اور اب روئے سخن قیامت کے اس منظر سے پھر کر دنیا میں آ جاتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا (۴۰ : ۱۳) "وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے' اور آسمانوں سے تمہارے لیے رزق نازل کرتا ہے"۔ یہ اس لیے یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ رب کی طرف لوٹ کر اسے وحدہ لا شریک سمجھیں۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۴۰ : ۱۴) "اللہ ہی کو پکارو' اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے' خواہ تمہارا یہ فعل کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو"۔ پھر وحی کی طرف اشارہ آتا ہے اور قیامت کے ہولناک دن سے ڈرایا جاتا ہے۔ اور پھر قیامت کا ایک منظر

يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ (۴۰ : ۱۶) "وہ دن جب کہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے' اللہ سے ان کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہو گی"۔

اس دن جبار' متکبر اور جھگڑنے والوں کا نام و نشان نہ ہو گا۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۴۰ : ۱۶) "آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ واحد قہار کی"۔ آج کے دن کا بیان چلتا ہے۔ جہاں فیصلے اور احکام صرف اللہ کے چلتے ہیں اور اللہ کے سوا جو دوسرے معبود تھے ' وہ چھپ گئے ہیں۔ مضمحل ہو گئے ہیں۔ جس طرح اس دن سرکشوں اور فاسق فاجر لوگوں کا کوئی نام و مقام نہیں ہے۔

دوسرے سبق میں سابق اقوام کی ہلاکتوں سے بات چلتی ہے۔ اس کا آغاز حضرت موسیٰ اور فرعون ' ہامان اور قارون کے قصے سے ہوتا ہے۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ ہمیشہ سرکش لوگ دعوت اسلامی کے مقابلے میں کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں قصہ موسیٰ کا ایک ایسا حصہ بیان کیا جاتا ہے جو اس سے پہلے بیان نہیں ہوا۔ اور یہ کڑی صرف اسی سورت میں ہے۔ ایک مومن شخص حضرت موسیٰ کی حمایت کرتا ہے اور ان کے قتل کے منصوبے کی مخالفت کرتا ہے۔ اور نہایت ہی احتیاط کے ساتھ حق بات کہتا ہے۔ نرمی اور حکمت کے ساتھ بات شروع کرتا ہے اور جب سمجھتا ہے کہ بات میں اثر ہے تو وہ نہایت وضاحت اور صراحت سے اپنی بات کرتا ہے اور اپنی تقریر میں وہ حق کے دلائل دیتا ہے۔ یہ دلائل نہایت قوی اور واضح ہیں ' وہ ان کو قیامت کے دن سے ڈراتا ہے اور قیامت کے بعض مناظر بھی ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نہایت موثر انداز میں یہ شخص تقریر کرتا ہے۔ یہ شخص ان کو خود ان کا موقف بھی یاد دلاتا ہے اور اس سے قبل انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی یاد دلاتا ہے۔ اور قصے کے آخر میں وہ ان کو قیامت کے مناظر تک لے جاتا ہے کہ وہاں وہ آگ میں ایک دوسرے سے جھگڑتے ہیں۔ اور ضعفاء اور متکبرین ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہیں اور پھر یہ سب جہنم کے داروغوں کے ساتھ مکالمہ کرتے ہیں کہ کیا کوئی صورت ہے رہائی کی۔ لیکن اے کاش کہ وقت گزر گیا ہے۔ اس تقریر اور اس منظر کی روشنی میں حضورؐ کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں اور حمد و تسبیح کے ساتھ استغفار کریں۔

تیسرے سبق کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ جو لوگ سچ بات کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ' ان کو اس بات پر وہ کبر آمادہ کرتا ہے جو ان کے نفس میں ہوتا ہے حالانکہ وہ اپنے آپ کو جس قدر بڑا سمجھتے ' درحقیقت اس کے مقابلے میں ان کے قد اتنے ہی بونے ہوتے ہیں۔ یہاں سیاق کلام لوگوں کو اس عظیم کائنات کی طرف متوجہ کرتا ہے جسے اللہ نے پیدا کیا اور وہ اللہ ہے جو اکبر اور کبیر اور متکبر ہے۔ یہ اس لیے کہ شاید وہ اللہ کی عظمت اور کائنات کی عظمت کو دیکھ کر اپنے حدود میں آجائیں۔ اور ان کی آنکھیں کھل جائیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ قَلِيلًا مَّا تَتَذَكَّرُونَ (۴۰ : ۵۸) "اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائیں اور ایماندار اور صالح اور بدکار برابر ٹھہریں۔ مگر تم لوگ کم ہی سمجھتے ہو"۔ پھر ان کو قیام قیامت کی یاد دہانی کی جاتی ہے اور ان کو اس دعا کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو مستجاب ہوتی ہے ' جو لوگ اللہ کو پکارنے سے اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں وہ جہنم میں الٹے منہ پھینکے جائیں گے ' ذلیل و خوار ہوں گے۔ یہاں بعض ایسی نشانیوں کو ان کے سامنے رکھا جاتا ہے جن پر سے وہ رات اور دن گزرتے ہیں لیکن ان سے غافل ہو کر گردش لیل و نہار ' زمین کا اپنی جگہ رکے ر... ...انوں کی دوریاں اور چھت کی طرح رہنا۔ پھر خود حضرت انسان کی ذات و شخصیت اور اس کی خوبصورتی۔ ان سب دلائل کے پیش نظر کہا جاتا ہے کہ

صرف اللہ کو پکارو' اس کے دین کو خالص کرتے ہوئے 'حضورؐ سے فرمایا جاتا ہے کہ آپ ان کے معبودوں کی عبادت سے برات کا اعلان کر دیں کہ اللہ نے مجھے اس سے روکا ہے اور یہ حکم دیا کہ میں صرف خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں۔ اس لیے کہ صرف اللہ ہے جس نے انسان کو مٹی سے اور نطفے سے پیدا کیا' وہی پیدا کرنے والا اور مارنے والا ہے۔ حضورؐ سے نہایت تعجب کے انداز میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور عذاب قیامت کا ایک خوفناک منظر پیش کر کے ان کو ڈرایا جاتا ہے۔

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ (۴۰ : ۷۱) فِی الْحَمِیْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ يُسْجَرُوْنَ (۴۰ : ۷۲) "جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں جن سے پکڑ کر وہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف کھینچے جائیں گے اور پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے"۔ اس وقت ان کے معبود اس بات کا انکار کر دیں گے کہ وہ انہیں پوجتے تھے اور آخر کار یہ جہنم رسید ہوں گے۔

اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۴۰ : ۷۶) "اب جاؤ' جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ' ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے۔ بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا"۔ اس منظر کی روشنی میں اللہ حضور اکرمؐ کو تسلی دیتا ہے کہ آپ صبر کریں اور یقین کریں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے چاہے آپ موجود ہوں اور ان کا انجام دیکھیں یا آپ کی وفات کے بعد یہ لوگ اس انجام سے دو چار ہوں اور اللہ کا وعدہ پورا ہو۔

آخری سبق کا مضمون تیسرے سبق سے ملتا جلتا ہے۔ حضورؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ صبر کریں' انتظار کریں' آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے گئے اور ان کے ساتھ یہی ہوا۔

وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِیَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴۰ : ۷۸) "کسی رسول کی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی لے آتا"۔ اور یہ دیکھتے نہیں کہ یہ کائنات ایک پوری نشانی ہے۔ ان کے سامنے معجزات موجود ہیں۔ لیکن یہ ان پر غور نہیں کرتے۔ کیا یہ جانوروں پر غور نہیں کرتے' جو ان کے لیے مسخر کر دیئے ہیں' کیا یہ سمندروں میں کشتیوں کی پلٹ کو نہیں دیکھتے' کیا یہ انسانی تاریخ پر غور نہیں کرتے کہ کس طرح اللہ نے بڑی بڑی قوموں کو نیست و نابود کر دیا اور سورت کا خاتمہ ایک ایسی قوی ضرب سے ہوتا ہے جس سے دل و دماغ کی تمام یادیں زمزمہ بکھیرتی ہیں کہ جب جھٹلانے والوں پر ہلاکت آئی اور انہوں نے عذاب دیکھا تو فوراً بر خودار بن گئے اور ایمان لانے لگے لیکن فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (۴۰ : ۸۵) "مگر ہمارا عذاب دیکھنے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے نافع نہ ہو سکتا تھا کیونکہ یہی اللہ کا مقرر ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں پر جاری رہا ہے' اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے"۔ یہ ہے سورت کا خاتمہ جس میں متکبرین کا انجام بتایا گیا ہے اور یہ خاتمہ اس سورت کے موضوعات و مضامین اور اس کی فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

اب ہم اس سورت کے اسباق و آیات کی تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔

---OOO---

درس نمبر ۲۲۳ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۰

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۲﴾ غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۳﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ح 'م ۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے 'سب کچھ جاننے والا ہے 'گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے 'سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحب فضل ہے 'کوئی معبود اس کے سوا نہیں 'اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے"۔

یہ سورت ان سات سورتوں میں سے پہلی سورت ہے جن کا آغاز حا اور میم کے حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک سورت ایسی ہے جس میں حا۔میم کے بعد عین 'سین اور قاف بھی آیا ہے۔ حروف مقطعات کے بارے میں ہم تمام سورتوں میں کہہ آئے ہیں کہ ان میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ کلام انہی حروف تہجی سے بنا ہے اور یہ ایک معجز کلام ہے حالانکہ یہ حروف تہجی تمہاری دسترس میں ہیں۔ یہ تمہاری زبان کے حروف ہیں اور اس زبان کو تم بولتے بھی ہو 'لکھتے بھی ہو۔

ان حروف کے بعد پھر نزول کتاب کی طرف اشارہ ہے۔ یہ وہ بات ہے جو اکثر مکی سورتوں کے آغاز میں کہی جاتی ہے جن کا مضمون اکثر اسلامی نظریہ حیات اور کلمہ توحید سے ہوتا ہے۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۴۰ : ۲) "اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے"۔

اس اشارے کے بعد اب بات اس ذات کی بعض صفات کی طرف منتقل ہوتی ہے جس نے یہ کلام نازل کیا ہے ۔ یہ وہ صفات ہیں جن کا اس سورت کے موضوع کے ساتھ گہرا ربط ہے ۔ اس سورت میں جو موضوعات اور جو مسائل لیے گئے ہیں ان کے ساتھ ان صفات الٰہی کا ربط ہے ۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۴۰ : ۳) "زبردست ہے' سب کچھ جاننے والا ہے' گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے' سخت سزا دینے والا اور بڑا صاحب فضل ہے' کوئی معبود اس کے سوا نہیں' اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے"۔

اس آیت میں عزت' علم' گناہوں کی مغفرت' توبہ کی قبولیت' سخت سزا' فضل و کرم' الوہیت اور حاکمیت کی وحدت اور سب لوگوں کا اس کی طرف لوٹنے کی صفات بیان کی گئی ہیں ۔

اور اس سورت کے تمام موضوعات انہی معانی کے ارد گرد گھومتے ہیں جن کو اس آیت میں قلم بند کیا گیا ہے ۔ اس آیت میں نہایت زوردار انداز' زوردار آواز میں اور قوی تر تراکیب اور جملوں میں نہایت پختگی اور استقلال سے لایا گیا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ صفات یہاں متعارف کرائی ہیں جن کا انسانی وجود اور انسانی زندگی پر گہرا اثر ہے ۔ یوں اللہ نے انسانوں کے دلوں اور ان کے شعور کے احساسات کو تیز کیا ۔ ان کے اندر رجائیت پیدا کی اور امید کو جگایا ۔ ان کے اندر خوف اور تقویٰ پیدا کیا گیا اور ان کو یہ یقین دلایا گیا کہ وہ اللہ کے قبضے میں ہیں ۔ وہ اللہ کے تصرفات سے کہیں بھاگ نہیں سکتے ۔ ذرا ان صفات کا تفصیلی جائزہ لیں ۔

الْعَزِيْزِ (۴۰ : ۲) "وہ قوی اور قادر مطلق جو ہر کسی پر غالب ہے' اور اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا ۔ وہ تمام امور میں تصرف کرتا ہے اور اس پر کوئی قدرت نہیں رکھتا اور نہ اس کے اوپر کوئی نگران ہے ۔

الْعَلِيْمِ (۴۰ : ۲) وہ ذات ہے جو اس کائنات کو علم اور مہارت سے چلاتی ہے' اس پر اس کائنات کا کوئی راز مخفی نہیں ہے ۔ اور کوئی چیز اس کے علم سے غائب نہیں ہے ۔

غَافِرِ الذَّنْبِ (۴۰ : ۳) وہ جو بندوں کے گناہوں کو بخشتا ہے' ان بندوں کے گناہوں کو جن کے بارے میں اپنے شامل علم کے ذریعے اللہ جانتا ہے کہ وہ بخشش کے مستحق ہیں ۔

وَ قَابِلِ التَّوْبِ (۴۰ : ۳) وہ جو نافرمانوں پر مہربانی کرتا ہے اور ان کو لوٹا کر اپنے خطیرۂ امن میں لاتا ہے اور ان کے لیے اپنی رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے اور بلا روک ٹوک ان کو اندر آنے دیتا ہے ۔

شَدِيْدِ الْعِقَابِ (۴۰ : ۳) جو متکبرین کو نیست و نابود کرتا ہے' اور اسلام کے دشمنوں کو سزا دیتا ہے'

جو نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ استغفار کرتے ہیں۔

ذی الطَّوْل (۴۰ : ۳) وہ جو لوگوں کو انعامات دیتا ہے ' جو نیکیوں میں اضافہ کرتا ہے اور لوگوں کو اس قدر دیتا ہے کہ ان انعامات کا کوئی حساب نہیں کیا جا سکتا۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوْ (۴۰ : ۳) الوہیت ' حاکمیت اسی کی ہے ' اور وہ وحدہ لاشریک ہے ' اپنی ذات وصفات میں۔

اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۴۰ : ۳) حساب وکتاب کے لیے ہر کسی نے اس کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اس سے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اور اس سے ملاقات ہوگی۔ تمام مخلوق نے اسی کی طرف لوٹنا ہے اور وہی لوٹنے کی جگہ ہے۔

یوں بندوں کا تعلق اللہ سے اور اللہ کا تعلق بندوں سے واضح کیا جاتا ہے۔ بندوں کے شعور ان کے تصورات ' ان کے ادراک ' اور ان کے علم میں اللہ سے رابطہ بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ کس قدر چوکنا ہو کر اور احتیاط سے معاملہ کرنا ہے اور یہ جانتے ہوئے معاملہ کرنا ہے کہ کس چیز سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور کس چیز سے راضی ہوتا ہے۔

جن لوگوں کے ادیان اور عقائد افسانوی ہیں ' وہ اپنے الہوں کے بارے میں جو تصور رکھتے ہیں ' وہ اس کے بارے میں حیرت میں رہتے ہیں ' انہیں ان الہوں کے بارے میں کوئی ٹھوس معلومات نہیں ہوتیں ' ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ کیا چیز انہیں ناراض کرتی ہے اور کس سے وہ راضی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے الہوں کی جو تصویر کھینچتے ہیں۔ اس کے مطابق ان الہوں کی خواہشات بدلتی رہتی ہیں ' ان کا رجحان صاف نہیں ہوتا۔ وہ الہہ جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان الہوں کے ساتھ ہمیشہ بے چینی کی زندگی گزارتے ہیں اور ہر وقت اس بات کی تلاش میں رہتے ہیں کہ ان کی رضا کس میں ہے اور کس میں نہیں ہے۔ آیا وہ تعویذوں سے راضی ہوتے ہیں ' قربانیوں سے راضی ہوتے ہیں۔ ذبیحوں سے راضی ہوتے ہیں یا اور اگر وہ یہ کام کر بھی گزریں تو بھی ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ راضی ہوگئے یا نہیں ہوئے۔

ان حالات میں اسلام آیا ' اس نے واضح اور ستھرے تصورات و عقائد دیئے ' لوگوں کو اپنے سچے خدا سے ملا دیا۔ ان کو اللہ کی صحیح صفات سے آگاہ کر دیا۔ ان کو اللہ کی مشیت کے بارے میں بتا دیا ' یہ بھی صاف صاف بتا دیا کہ وہ اللہ کے قریب کس طرح ہو سکتے ہیں ' اس کی رحمت کی امید وہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ اس کے عذاب سے کس طرح ڈر سکتے ہیں اور اللہ کا سیدھا اور درست راستہ کون سا ہے۔

---ooo---

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ

الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝

"اللہ کی آیات میں جھگڑے نہیں کرتے مگر صرف وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے۔ اس کے بعد دنیا کے ملکوں میں ان کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ ان سے پہلے نوح کی قوم بھی جھٹلا چکی ہے' اور اس کے بعد بہت سے دوسرے جتھوں نے بھی یہ کام کیا ہے۔ ہر قوم اپنے رسول پر جھپٹی تاکہ اسے گرفتار کرے۔ ان سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کی' مگر آخر کار میں نے ان کو پکڑ لیا' پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی۔ اسی طرح تیرے رب کا یہ فیصلہ بھی ان سب لوگوں پر چسپاں ہو چکا ہے۔ جو کفر کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واصل بجہنم ہونے والے ہیں"۔

اس فیصلے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند صفات رکھتا ہے اور وہ وحدہ لاشریک ہے' اب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ حقائق' اس کائنات کی ہر چیز کی طرف سے مسلم ہیں کیونکہ اس کائنات کی فطرت ان حقائق کے ساتھ مربوط ہے اور یہ تعلق براہ راست ہے جس میں کوئی تنازعہ اور کوئی مجادلہ نہیں ہے۔ یہ پوری کائنات بڑے اطمینان سے آیات الٰہیہ کو تسلیم کرتی ہے' اللہ کی وحدانیت پر شاہد عادل ہے۔ اور اس میں مجادلہ وہی لوگ کرتے ہیں جو کفر پر تلے ہوئے ہیں اور یہ لوگ اس کائنات سے منحرف ہیں۔

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۴۰ : ۴) "اللہ کی آیات میں جھگڑے نہیں کرتے مگر وہی لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے"۔ "وہی لوگ" یعنی اس کائنات میں سے صرف وہی لوگ اکیلے ان آیات کا انکار کرتے ہیں جو کفر پر تلے ہوئے ہیں۔ اس عظیم مخلوقات میں سے صرف یہی لوگ منحرف ہیں۔ اور ان کی اس عظیم الشان وجود میں چیونٹی سے بھی کم حیثیت ہے۔ جس طرح اس کرۂ ارض کی نسبت سے ایک چیونٹی حقیر شے ہے۔ اس طرح اس کائنات کے حوالے سے انسان ایک چیونٹی سے بھی کم ہے۔ لیکن جھگڑتا ہے یہ حضرت انسان اللہ کی نشانیوں کے بارے میں' جبکہ یہ عظیم کائنات اہل کفر کے مقابلے میں کھڑی ہے۔ اور حق تعالیٰ کا اعتراف کر رہی ہے۔ اور عزیز و جبار کی قوتوں کی معترف ہے۔ یہ لوگ' اس موقف میں اپنے انجام کے خلاف کھڑے ہیں۔ یہ لوگ چاہے دنیا میں قوت رکھتے ہوں اور جاہ و مال کے مالک ہوں اور مقتدر اعلیٰ ہوں' لیکن جس جگہ انہوں نے جانا ہے' اس کی انہیں کوئی فکر نہیں ہے۔

فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ (۴۰ : ۴) "اس کے بعد دنیا کے ملکوں میں ان کی چلت پھرت تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے"۔ وہ جس قدر دوڑ دھوپ کریں' جس قدر اقتدار اور مال و جاہ کے وہ مالک ہوں' جس قدر وہ عیش و عشرت میں ہوں' آخر کار یہ لوگ تباہ و برباد اور ہلاک ہونے والے ہیں۔ ان کی اس جنگ کا انجام معروف ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس عظیم خالق کائنات کے درمیان اور اس کائنات کی ایک حقیر چیونٹی کے درمیان کوئی معرکہ برپا ہو سکتا ہے۔

ان سے پہلے ان جیسی کئی اقوام اس زمین پر ہو گزری ہیں' ان کا جو انجام ہوا' اس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسی اقوام کا انجام کیا ہوا کرتا ہے' جو اللہ کی قوت کے مقابلے میں آجائیں۔ اللہ کی قوت ان کو پیس کر رکھ دیا کرتی ہے

اور ہر اس قوت کو پیس ڈالتی ہے جو اللہ کے ساتھ جنگ کے لیے اٹھتی ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَ جٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ

(۰ ٤ : ٥) ”ان سے پہلے نوح کی قوم بھی جھٹلا چکی ہے اور ان کے بعد بہت سے دوسرے جتھوں نے بھی یہ کام کیا۔ ہر قوم اپنے رسول پر جھپٹی تاکہ اسے گرفتار کرے۔ ان سب نے باطل کے ہتھیاروں سے حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کی مگر آخر کار میں نے ان کو پکڑ لیا۔ پھر دیکھ لو کہ میری سزا کیسی سخت تھی“۔ یہ سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے چلا آ رہا ہے اور یہ ایک ایسا معرکہ ہے جو ہر زمان و مکان میں برپا ہے' اور یہ آیت اس قصے کا خلاصہ بتاتی ہے۔ رسولوں اور ان کی تکذیب کا قصہ۔ اور ان کے اور اللہ کے مقابلے میں سرکشی کا رویہ ہر زمان و مکان میں یونہی ہوتا رہا ہے اور انجام بھی ایک رہا ہے۔

رسول آیا ہے' اس کی قوم کے سرکشوں نے اس کی تکذیب کی ہے۔ انہوں نے دلیل کا جواب دلیل سے نہیں دیا' بلکہ دلیل کے مقابلے میں تشدد کے ہتھیار لے کر آئے اور انہوں نے رسول کو پکڑ کر گرفتار کرنے کی کوشش کی اور جمہور عوام کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کی کوشش کی تاکہ حق کا مقابلہ کریں' حق کو نیچا دکھائیں مگر اللہ کی قوت جبارہ نے مداخلت کی ہے۔ اور ایسے سرکشوں کو اس طرح چوٹی سے پکڑا کہ وہ آنے والوں کے لیے عبرت بن گئے۔

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ (۰ ٤ : ٥) ”میری سزا کیسی سخت تھی“۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی سزا تباہ کن تھی' بہت سخت تھی۔ ان اقوام کے جو آثار بھی آج باقی ہیں' وہ بتاتے ہیں کہ یہ سزا بہت سخت تھی۔ اور احادیث و روایات بھی یہ بتاتی ہیں کہ وہ سزا بہت سخت تھی۔

اور یہ معرکہ یہاں ختم نہیں ہو گیا بلکہ یہ قیامت تک چلا گیا :

وَ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (۰ ٤ : ٦) ”اسی طرح تیرے رب کا یہ فیصلہ بھی ان سب لوگوں پر چسپاں ہو چکا ہے جو کفر کے مرتکب ہوئے ہیں کہ وہ واصل بجہنم ہونے والے ہیں“۔ جب یہ اللہ کا فیصلہ حق ہوا' چسپاں ہوا' گویا نافذ ہو گیا' اور ہر قسم کا مباحثہ ہی ختم ہو گیا۔

یوں قرآن کریم ایک حقیقی صورت حال کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ایمان اور کفر کے طویل معرکہ کی تصویر کشی۔ حق اور باطل کے درمیان معرکہ آرائی' ان لوگوں کے درمیان جو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور ان لوگوں کے درمیان معرکہ آرائی جو زمین میں سرکشی اختیار کرتے ہیں' بغیر دلیل کے بات کرتے ہیں۔ یوں قرآن یہ بتاتا ہے کہ یہ معرکہ حق و باطل آغاز انسانیت سے شروع ہے اور اس کا میدان زمین سے بھی آگے ہے۔ اس پوری کائنات میں بھی یہ جاری ہے

کہ یہ پوری کائنات اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے لیکن ایک کافر نہ صرف اہل ایمان سے بلکہ پوری کائنات کے ساتھ بھی بر سرپیکار ہوتا ہے ۔ یہ اس کائنات کے اندر موجود اللہ کی نشانیوں سے بھی لڑتا ہے اور اس معرکہ آرائی کا انجام بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق کی قوتیں 'بہت بڑی 'بہت طاقتور ہیں ۔ اللہ ہے ' پوری کائنات ہے ' اہل ایمان ہیں اور اس کے مقابلے میں کفار کی قلیل و حقیر قوت ہے ۔ اگرچہ عارضی طور پر اس کا پلہ بھاری ہو اور بظاہر یہ قوت بہت ہی خوفناک نظر آئی ہو مگر آخر کار یہ تباہ ہونے والی ہے ۔

یہ حقیقت کہ حق و باطل کا معرکہ اور اس میں لڑنے والی قوتیں اور اس کا میدان جنگ یعنی طویل انسانی تاریخ ' اس کی تصویر کشی قرآن اس لیے کرتا ہے کہ اہل ایمان کے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جائے ' خصوصاً ان اہل ایمان کے دلوں میں جو پیغمبروں کے اصول و منہاج پر دعوت حق لے کر آئے ہیں اور ہر زمان و مکان میں دعوت ایمان دیتے ہیں وہ اچھی طرح جان لیں اور یقین کر لیں کہ باطل کی قوت کچھ بھی نہیں ہے ۔ اگرچہ وہ بظاہر پھولی ہوئی نظر آئے ' ایک محدود وقت کے لیے کسی محدود سرزمین میں ' یہ قوت حقیقت نہیں ہے ۔ اصل حقیقت وہ ہے ' جس کی نشاندہی اللہ کی کتاب کر رہی ہے ' جسے وہ کلمۃ الحق کہتی ہے ' اور حق غالب ہوا کرتا ہے ۔ اللہ سب سے سچا ہے اور اس کی بات سچی ہے ۔

--- ooo---

اس حقیقت کے ساتھ ساتھ کہ دعوت حق ہے اور اس کے حامل مومنین ہیں ۔ ان کے ساتھ وہ مومنین بھی شامل ہیں جو اللہ کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے اردگرد متعین وہ بھی اہل ایمان کے ساتھ تائید میں کھڑے ہیں ۔ وہ ہروقت انسان مومنین کی رپورٹ اللہ کے ہاں پیش کرتے ہیں ' ان کے لیے مغفرت طلب کرتے رہتے ہیں اور ان کے لیے جو اللہ کا وعدہ ہے ' اللہ سے اس کے پورا کرنے کی درخواست کرتے ہیں ۔ کیوں ؟ اس لیے کہ یہ انسان بھی مومن ہیں اور وہ بھی مومن ہیں ۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۷﴾ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۸﴾ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۹﴾

"عرش الٰہی کے حامل فرشتے ' اور وہ جو عرش کے گردوپیش حاضر رہتے ہیں ' سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی

تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :
"اے ہمارے رب، تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے، پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچا لے، ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ اے ہمارے رب، اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے، اور ان کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ ہی پہنچا دے)۔ تو بلاشبہ قادر مطلق اور حکیم ہے۔ اور بچا دے ان کو برائیوں سے، جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے بڑا رحم کیا، یہی بڑی کامیابی ہے"۔

ہم نہیں جانتے کہ عرش کی حقیقت کیا ہے، نہ اس کی صورت متعین کر سکتے ہیں اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اس کے اٹھانے والے اسے کس طرح اٹھاتے ہیں۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ اس کا ماحول کیسا ہے اور اس کے اردگرد فرشتے کیسے ہیں، لہٰذا ہمیں ان چیزوں کی ہیئت اور ماہیت معلوم کرنے کی فضول جدوجہد نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ اشیاء انسانی ادراک کے دائرہ سے ماوراء ہیں۔ نہ ہمیں ان غیبی امور کے پیچھے پڑنا چاہئے، جن کے بارے میں مباحثہ کرنے والوں کو کوئی علم نہیں دیا گیا۔ جو بات آیات سے سمجھ میں آتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ اللہ کے بعض مقرب بندے، رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں، اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور قرآن کریم ان کے ایمان کی تصریح اس لیے کر رہا ہے کہ ان کا ربط مومن انسانوں کے ساتھ واضح ہو جائے اور اللہ کے یہ مقرب بندے ان مومن انسانوں کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں جو یہاں اس دنیا میں معرکہ خیر و شر میں کود پڑے ہوئے ہیں۔ یہ بندے جس انداز سے دعا کرتے ہیں اس میں ہمارے لیے تعلیم ہے کہ ہر انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ کو یوں مخاطب کرے۔ وہ کہتے ہیں :

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (۴۰ : ۷) "اے ہمارے رب، تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے"۔ وہ اللہ کے سامنے طلب رحمت کے لیے یوں درخواست کرتے کہ (اے اللہ) ہم انسانوں کے لیے وہ رحمت طلب کرتے ہیں جو دراصل ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور وہ اللہ کے علم کو ذریعہ بناتے ہیں جو ہر چیز کو شامل ہے۔ وہ اللہ کے سامنے کوئی نئی چیز پیش نہیں کرتے جو اللہ کے پیش نظر نہ ہو۔ اللہ کی رحمت اور علم جو ہر چیز کو محیط ہیں انہی کے واسطہ سے وہ التجا کرتے ہیں۔

فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (۴۰ : ۷) "پس معاف کر دے اور عذاب دوزخ سے بچا لے، ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کر لیا ہے"۔ اس دعا میں ایک اشارہ مغفرت اور توبہ کا ہے جو آغاز سورت میں غافر الذنب اور قابل التوب کے ساتھ موافق ہے اور دوسرا اشارہ عذاب جہنم سے بچانے کی طرف ہے جو آغاز سورت میں شدید العقاب کے ساتھ موافق ہے۔

اس کے بعد یہ بندے دعا میں ذرا آگے بڑھتے ہیں، اب وہ مغفرت اور عذاب جہنم سے بچانے سے بھی آگے جنت عطا کرنے کا سوال کرتے ہیں اور ان وعدوں کے پورے کیے جانے کا سوال کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے نیک بندوں سے کر رکھے ہیں۔

رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآءِ هِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۴۰ : ۸) ”اے ہمارے رب، اور داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والی ان جنتوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے، اور ان کے والدین اور بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہوں (ان کو بھی وہاں ان کے ساتھ ہی پہنچا دے)۔ تو بلاشبہ قادر مطلق اور حکیم ہے“۔

جنت میں داخلہ، بے شک بہت بڑی نعمت اور بہت بڑی کامیابی ہے، اور اس پر مزید کہ آباء، ازواج اور اولاد بھی ساتھ ہوں۔ یہ مزید نعمت ہے۔ اس سے اس بات کا مظاہرہ ہوتا ہے کہ مومنین جنت میں بھی اکٹھے خاندانی نظام کی شکل میں ہوں گے۔ یہ ایمان ہے جو اباء، ازواج اور اولاد کے درمیان اکٹھ پیدا کرتا ہے، اگر ایمان نہ ہوتا تو یہ رشتے کٹ جاتے۔ اور اس فقرے پر جو آخری نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۴۰ : ۸) ”تو قادر مطلق اور حکیم ہے“۔ اس میں ایک طرف قوت ہے اور دوسری طرف حکمت۔ بندوں کے معاملے میں کوئی فیصلہ قوت اور حکمت کے سوا نہیں ہو سکتا۔

وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ وَ مَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۴۰ : ۹) ”اور بچا دے ان کو برائیوں سے، جس کو تو نے قیامت کے دن برائیوں سے بچا دیا اس پر تو نے بڑا رحم کیا، یہی بڑی کامیابی ہے“۔ جنت میں داخل ہونے کی دعا کے بعد یہ دعا کہ ان کو برائیوں سے بچا، یہ توجہ دلاتی ہے کہ ذرا غور کرو کہ یہ سیئات اور برائیاں ہی ہیں جو ان کا ارتکاب کرنے والوں کو برباد کرتی ہیں۔ اور یہ بربادی آخرت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی جہنم رسید کرتی ہیں۔ جب اللہ نے مومنین کو برائیوں سے بچا لیا تو وہ جہنم سے ہی بچ گئے اور برے نتائج سے بھی۔ یہی رحمت خداوندی کا عروج ہو گا اس مشکل وقت میں۔ اور

وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۴۰ : ۹) ”یہی بڑی کامیابی ہے“۔ کہ کوئی برائیوں سے بچ جائے۔

---ooo---

ایک طرف عرش کے حاملین اپنے مومنین بھائیوں کے لیے دعاگو ہیں، دوسری جانب کفار کی حالت یہ ہے کہ وہ سخت مصیبت میں پھنس گئے ہیں، کسی مددگار کی تلاش میں ہیں اور کوئی مددگار نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اور پوری کائنات کے درمیان کوئی ربط نہیں رہا ہے۔ ہر طرف سے ان پر پھٹکار اور لعنت و ملامت ہے۔ دنیا کے استکبار کے بعد اب یہاں وہ سخت ذلت میں ہیں۔ اور بے یار و مددگار ہیں، لیکن پھر بھی موہوم امیدوں کے سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، لیکن کہاں ہے منزل مراد!

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِیْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰﴾ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَ

اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۱۱﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۚ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿۱۲﴾

"جن لوگوں نے کفر کیا ہے 'قیامت کے روز ان کو پکار کر کہا جائے گا'" آج تمہیں جتنا شدید غصہ اپنے اوپر آرہا ہے 'اللہ تم پر اس سے زیادہ غضبناک اس وقت ہوتا تھا جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم کفر کرتے تھے"۔ وہ کہیں گے "اے ہمارے رب 'تو نے واقعی ہمیں دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی دے دی 'اب ہم اپنے قصوروں کا اعتراف کرتے ہیں 'کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟" (جواب ملے گا) "یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو 'اس وجہ سے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو ملایا جاتا تو تم مان لیتے تھے۔ اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر کے ہاتھ ہے"۔

مقت کا مفہوم ہے بہت شدید ناپسندیدگی۔ ان کو سب مخلوق خدا ہر طرف سے یہ پکارے گی 'کہ بدبختو تمہیں رسول اللہ" ایمان کی پکار دے رہے تھے اور تم ناحق انکار کرتے تھے۔ اور اللہ تم پر بہت ناراض ہوتا تھا۔ اور تمہارے رویے کو بہت ناپسند فرماتا تھا' جس طرح آج تمہیں حقیقت معلوم ہوئی ہے تو تم اپنے اس رویے کو ناپسند کرتے ہو لیکن تم سے تو وقت چلا گیا ہے۔ تم نے کفر کیا' ایمان سے منہ موڑا اور تم سے ایک عظیم دولت چلی گئی۔ پوری کائنات کی جانب سے یہ ملامت آرہی ہو گی اور یہ ان کے لیے سخت سوہان روح ہوگی۔ اس برے دن میں کسی تسلی کے بجائے ہر طرف سے مزید ملامت۔

اب تو دھوکے اور گمراہی کے پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے ہیں۔ اور جانتے ہیں کہ نجات کی جگہ اب صرف ذات باری ہے۔ لہٰذا گڑگڑاتے ہیں:

قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ

(۱۱ : ۴۰) "وہ کہیں گے "اے ہمارے رب 'تو نے واقعی ہمیں دو دفعہ موت اور دو دفعہ زندگی دے دی 'اب ہم اپنے قصوروں کا اعتراف کرتے ہیں 'کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟" یہ ایک نہایت ہی بدحال 'مایوس اور بدبخت شخص کی درخواست ہے 'اب تو وہ کہتے ہیں "اے ہمارے رب" اور اس وقت وہ رب کا انکار کرتے تھے 'تو نے پہلی مرتبہ ہمیں زندگی دی۔ مردے میں روح ڈالی 'وہ زندہ ہو گیا۔ پھر مرنے کے بعد دوبارہ زندگی دی اور اب ہم میدان حشر میں ہیں۔ اس لئے تو اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ہمیں موجودہ مصیبت سے نکال دے۔ اب تو ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے۔

فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ (۱۱ : ۴۰) "کیا نکلنے کا کوئی راستہ ہے"۔ یہ ہے سرزنش جس سے ان کی بے تابی 'مایوسی اور تلخی ظاہر ہوتی ہے۔

اس کڑے وقت میں ان کو یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ تمہارے اس برے انجام کا اصل سبب کیا ہے:

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ وَ اِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْكَبِیْرِ (۴۰ : ۱۲) "یہ حالت جس میں تم مبتلا ہو' اس وجہ سے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو ملایا جاتا تو تم مان لیتے تھے۔ اب فیصلہ اللہ بزرگ و برتر کے ہاتھ ہے"۔ میں ذلیل کرنے والے انجام تک تمہیں یہ بات لائی ہے کہ تم عقیدۂ توحید کا انکار کرتے تھے۔ اور عقیدۂ شرک کو مان لیتے تھے۔ لہٰذا اب فیصلہ اللہ وحدہ کے ہاتھ میں ہے جو علی اور کبیر ہے۔ فیصلے کے حوالے سے یہ دونوں مناسب صفات ہیں۔ کوئی فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے جو بزرگ ہو اور برتر مقام رکھتا ہو اور اللہ تو ہر چیز پر برتر ہے اور ہر چیز سے بڑا ہے' خصوصاً قیامت کے دن۔

--- ○○○---

یہاں اللہ کی صفات علی و کبیر کی ایک جھلک بھی دکھائی جاتی ہے اور مومنین کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس علی و کبیر کی بارگاہ میں دعا کرو اور توحید کا عقیدہ اپنا کر نظام زندگی بھی اسی کا اپنا لو' یہاں قیامت کے فیصلے کی گھڑی سے بھی ڈرایا جاتا ہے جہاں اللہ واحد و قہار کے پاس سب اختیارات ہوں گے اور وہ بہت ہی بلند و برتر ہے۔

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ؕ وَ مَا یَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ یُّنِیْبُ ﴿۱۳﴾ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ یَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ۬ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلْیَوْمَ تُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾

"وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور آسمان سے تمہارے لیے رزق نازل کرتا ہے' مگر (ان نشانیوں کے مشاہدے سے) سبق صرف وہی شخص لیتا ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ (پس اے رجوع کرنے والو) اللہ ہی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے' خواہ تمہارا یہ فعل کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ بلند درجوں والا' مالک عرش ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے' اپنے حکم سے روح نازل کر دیتا ہے تاکہ وہ ملاقات کے دن سے خبردار کر دے۔ وہ دن جب کہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے' اللہ سے ان کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ (اس روز پکار کر پوچھا جائے گا) آج بادشاہی کس کی ہے؟ (سارا عالم پکار اٹھے گا) اللہ واحد قہار کی۔ (کہا جائے گا) آج ہر متنفس کو اس کمائی بدلہ دیا جائے گا۔ جو اس نے کی تھی' آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا اور اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے"۔

هُوَ الَّذِىْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ (۴۰ : ۱۳) "وہی تو ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے"۔ اور اللہ کی نشانیاں تو اس کائنات کی ہر چیز میں نظر آتی ہیں۔ شمس و قمر کی گردش میں' رات اور دن کے نظام میں۔ رعد و برق اور باد و باراں میں' ذرے' خلیے' پتے اور پتیوں میں غرض ہر چیز میں ایک معجزانہ نشانی ہے اور اس نشانی کی عظمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اس کی نقل کرنے کے لیے بیٹھے۔ یا اس جیسی کوئی چیز بنائے لیکن لے کاش کہ وہ اس قسم کی کسی چیز کی نقل کر سکتا یا اس جیسی ہی بنا سکتا اور اللہ کی بنائی ہوئی ایک نہایت ہی چھوٹی چیز ہی بنا سکتا۔

وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا (۴۰ : ۱۳) "اور آسمانوں سے تمہارے لیے رزق نازل کرتا ہے"۔ لوگوں کو صرف بارش کے بارے میں علم ہے جس کی وجہ سے اس زمین پر زندگی قائم ہے' اور یہ کھانے و پینے کے تمام اسباب فراہم کرتی ہے اور آسمانوں سے نازل ہونے والی دوسری اشیاء بھی بے شمار ہیں جن کے انکشافات روز ہوتے رہتے ہیں' ان میں وہ شعاعیں ہیں جو زندگی بخشتی ہیں کہ اگر وہ نہ ہوں تو زمین کے اس ستارے پر زندگی نہ ہوتی اور یہ بھی انسان کے لیے ایک ذہنی اور روحانی غذا ہے جو آدم علیہ السلام سے انبیاء پر نازل ہوتی چلی آ رہی ہے اور جس کے ذریعے انسان بچپنے سے آگے بڑھ کر بالغ ہو گیا ہے۔ اور اب نبوت محمدیؐ کی وجہ سے صراط مستقیم پر گامزن ہو گیا ہے۔ اور اس رزاق نے اسے منہاج حیات دیا' اور اس کائنات کا مستقل قانون عطا کیا۔

وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ (۴۰ : ۱۳) "سبق صرف وہی شخص لیتا ہے جو اللہ سے رجوع کرنے والا ہو"۔ جو شخص اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے' وہ جانتا ہے کہ اللہ کا فضل و کرم کس قدر عظیم ہے اور وہ اس کائنات میں اللہ کی نشانیوں کو پاتا ہے جبکہ غافل اور سخت دل ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے --- انابت کی وجہ سے اہل ایمان کے دل میں جو یاد الٰہی پیدا ہوتی ہے' اور وہ ان نشانیوں پر غور و فکر کرتے ہیں' اس کے حوالے سے مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ وحدہ کو پکاریں' اسی کے مطابق کردہ نظام زندگی جاری کریں اور کافروں کی ناپسندیدگی کی کوئی پرواہ نہ کریں۔

اگر مومنین اپنا دین اللہ کے لیے خالص کر دیں اور صرف اسلامی نظام زندگی نافذ کر دیں تو اس صورت میں کافران سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح وہ اگر اللہ وحدہ کو پکاریں تو بھی کافر راضی نہیں ہو سکتے۔ مومنین کافروں کے ساتھ جس قدر نرمی بھی کریں' جس قدر مصالحت بھی کریں اور ان کی رضا جوئی کے لیے جس قدر جتن بھی کریں وہ ان سے راضی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا مومنین کو بے خطر اپنے راستے پر گامزن ہو جانا چاہئے۔ رب واحد کو پکارنا چاہئے' اس کے لیے عقیدہ خالص اختیار کرنا چاہئے۔ دلوں کو اللہ کی طرف متوجہ کرنا چاہئے' چاہے کافر خوش ہوں یا خفا ہوں وہ تو کبھی راضی نہ ہوں گے۔

اب بتایا جاتا ہے کہ اس اللہ کی صفات کیا ہیں جس کی عبادت کی طرف اہل ایمان متوجہ ہوں گے اور اس پر کافر ناپسندیدگی کا اظہار کریں گے۔ وہ صفات یہ ہیں :

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِى الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۴۰ : ۱۵) "وہ بلند درجوں والا ہے' مالک عرش ہے' اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنے حکم سے روح نازل کر دیتا ہے"۔ اللہ

ہی رفعتوں والا اور عالی مقام ہے ۔ اور وہ ایک ایسے عرش کا مالک ہے جو قابض ہے پوری کائنات پر اور بہت ہی بلند ہے اور یہ وہی ہے جو اپنے کسی بندے پر روحانی تعلیمات نازل کر دیتا ہے ۔ اور ان کی وجہ سے یہ زمین دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے ۔ اس میں بسنے والے انسانوں کی روح اور دل زندہ ہو جاتے ہیں ۔ اس سے مراد وحی اور رسالت ہے ۔ لیکن انداز تعبیر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وحی اور رسالت کی غرض و غایت کیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ وحی لوگوں کے لیے روح اور زندگی ہے ۔ اور پھر یہ بلندیوں سے اللہ کے چنے ہوئے بندوں پر آتی ہے ۔ یہ سب صفات اور سائے اور رنگ اللہ کی اس صفت کے ساتھ متناسب ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ وہ العلی الکبیر ہے ۔

اب جن لوگوں کو چنا جاتا ہے اور ان پر روح نازل کی جاتی ہے ۔ ان کا فریضہ منصبی کیا ہے ؟ صرف لوگوں کو متنبہ کرنا ۔

لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ (۱۵ : ۴۰) "تاکہ وہ ملاقات کے دن سے خبردار کر دے" ۔ اس دن تمام لوگ باہم ملیں گے ، لوگ اپنے اعمال کے ساتھ دوچار ہوں گے ۔ لوگ ملائکہ ، جنوں اور تمام مخلوقات سے ملیں گے اور تمام لوگوں کو پھر باری تعالیٰ سے ملنا ہو گا اور حساب دینا ہو گا ۔ گویا یہ دن اپنے ان تمام مفاہیم کے ساتھ یوم التلاق ہے ۔

پھر یہ ایسا دن ہو گا جو کھلا ڈھلا ہو گا ، کوئی پردہ ، کوئی ملمع کاری اور کوئی دھوکہ بازی اس میں نہ چلے گی :

يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ (۱۶ : ۴۰) "وہ دن جبکہ سب لوگ بے پردہ ہوں گے ، اللہ سے ان کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہو گی" ۔ اور اللہ سے تو کسی بھی وقت ، کسی بھی دن اور کسی بھی حال میں کوئی شیٔ مخفی نہیں ہوتی ، لیکن دوسرے دنوں میں ، اس دنیا کے دنوں میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مخفی ہیں اور ان کے اعمال اور حرکات پوشیدہ ہیں ، آج لوگ خود بھی یہ سمجھیں گے کہ اب تو سب کچھ کھل گیا ہے ، ان کا سیاہ و سپید سامنے ہے ۔ اور سب پردے غائب ہیں اور وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہیں ۔

آج تو مکذبین اور مستکبرین برخوردار ہوں گے ، سکڑے اور سمٹے ہوئے ہوں گے ۔ تمام کائنات سہمی ہوئی ہو گی ، لوگ ڈرے ہوئے ہوں گے ۔ بادشاہت صرف اللہ واحد و قہار کی ہو گی ۔ اللہ تو ہر وقت وحدہ بادشاہ ہے لیکن پہلے لوگوں کو اللہ کی بادشاہت نظر نہ آتی تھی ۔ آج ان کا دل و دماغ تسلیم کرتا ہے کہ بادشاہت اللہ کی ہے ۔ ہر منکر اور ہر متکبر بھی جان جائے گا کہ بادشاہ صرف اللہ ہے ۔ ہر قسم کی شور و غوغا اس دن ختم ہو گی اور ایک عظیم القدر اور صاحب جلالت آواز آئے گی ۔ خود ہی سوال کرے گی اور خود ہی جواب دے گی کیونکہ پوری کائنات میں تو آج جواب دینے والا ہی کوئی نہیں ہے ۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۱۶ : ۴۰) "آج بادشاہی کس کی ہے ؟ اللہ واحد قہار کی" ۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۷ : ۴۰) "آج ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے گا ، جو اس نے کی تھی ، آج کسی پر کوئی ظلم نہ ہو گا ۔ اور اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے" ۔ آج کا دن جزائے حق کا دن ہے ۔ آج عدل کا دن ہے ، آج فیصلے اور حکم سنانے کا دن ہے ۔ کوئی مہلت کسی کے لیے نہیں اور نہ سست روی ہے ۔

فضا پر رعب اور خاموشی چھا جاتی ہے ۔ لوگوں پر خشوع اور خوف طاری ہو جاتا ہے ' تمام مخلوق بات سنتی ہے اور سہم جاتی ہے ۔ تمام معاملات طے کر دیئے جاتے ہیں اور تمام دفاتر لپیٹ لیے جاتے ہیں ' بڑی تیزی میں ۔

سورت کے آغاز میں کہا گیا تھا کہ جو لوگ اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں ۔

فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ (۴۰ : ۴) "شہروں میں ان کی چلت پھرت تمہیں دھوکہ نہ دے ۔ یہاں بتا دیا کہ زمین میں ان کی اس چلت پھرت کا ' ان کی سربلندی اور ناحق بڑائی کا ' ان کی جباری و قہاری کا ' اور ان کی دولت و سازو سامان کا یہ انجام ہے کہ مارے خوف کے سہمے ہوئے ہیں ' بات تک نہیں کر سکتے ۔

--- ○○○---

اب روئے سخن حضور اکرم ؐ کی طرف مڑ جاتا ہے کہ اپنی قوم کو اس سخت دن سے ڈرائیں ۔ ایک منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں فیصلے کے اختیارات صرف اللہ کے ہیں ' جبکہ اس سے قبل ان کے اس دن کے حالات حکایتی انداز میں بیان کیے گئے تھے اور اس میں ان کو بات کرنے کی کوئی اجازت نہ تھی ۔

وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِينَ ۚ مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ﴿١٨﴾ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ﴿١٩﴾ وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ۖ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿٢٠﴾

۲ ۱۱ع ۷

"اے نبی ؐ ڈراؤ ان لوگوں کو اس دن سے جو قریب آ لگا ہے ' جب کلیجے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ پیئے کھڑے ہوں گے ۔ ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہو گا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے ۔ اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں اور اللہ ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلہ کرے گا ۔ رہے وہ جن کو (یہ مشرکین) اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں ' وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں ۔ بلاشبہ اللہ ہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے" ۔

آزفہ کے معنی ہوتے ہیں قریبہ ' جلدی آنے والی ' معنی ہے قیامت ۔ یہ لفظ قیامت کی تصویر اس طرح کھینچ رہا ہے کہ گویا وہ پہنچنے ہی والی ہے ۔ انسانی سانس تیز ہو گا ' لوگ ہانپ رہے ہوں گے ۔ اور کلیجے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگوں پر بہت بڑا دباؤ ہو گا لیکن یہ پریشان دل لوگ دباؤ کا مقابلہ کرنے کی سعی کریں گے ۔ سانس کی تیزی کو روک رہے ہوں گے ۔ درد پر قابو پانے کی سعی کریں گے ' خوف کو چھپائیں گے ۔ اور اس برداشت کی وجہ سے ان پر مزید دباؤ ہو گا ' ان کے سینے پھٹ رہے ہوں گے ۔ کوئی دوست نہ ہو گا جس کے سامنے سینہ کھول کر رکھ دیں اور وہ ہمدردی کرے ' کوئی سفارشی نہ ہو گا جو ان کے حق میں کوئی بات کرے ۔ اس قدر خوفناک اور کربناک مقام پر کوئی کیا بات کر سکتا ہے ۔

ان کے راز اس دن کھلیں گے ' ان کی کوئی بات اللہ سے مخفی نہ ہوگی ۔ یہاں تک کہ آنکھوں کے خائن کی کوئی بات بھی مخفی نہ ہوگی اور دلوں کے راز بھی مخفی نہ ہوں گے ۔

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۴۰ : ۱۹) "اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے ' اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں میں چھپا رکھے ہیں" ۔ خائن آنکھیں ہمیشہ اپنی خیانت کو چھپائے رکھتی ہیں ۔ لیکن اللہ پر تو کوئی بات مخفی نہیں ہوتی ' نہ دلوں کا راز مخفی ہوتا ہے ' اللہ تو سب کچھ جانتا ہے ۔

اس دن صرف اللہ ہی فیصلے کرے گا ۔ یہ سچے فیصلے ہوں گے ۔ لوگوں نے جن کو الہ بنا رکھا ہے ' ان کا کوئی اختیار نہ ہوگا اور نہ وہ فیصلہ کر سکیں گے ۔

وَ اللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ وَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ (۴۰ : ۲۰) "اور اللہ ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلے کرے گا ۔ رہے وہ جن کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں" ۔ اللہ حق کے فیصلے علم اور مہارت سے کرتا ہے ۔ وہ دیکھ سن کر فیصلے کرتا ہے ۔ نہ کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ کوئی چیز بھولتا ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۴۰ : ۲۰) "بلاشبہ اللہ ہی سب کچھ دیکھنے اور سننے والا ہے" ۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۲۴ ایک نظر میں

اس سے قبل ہم اس سبق پر اجمالی تبصرہ کر آئے ہیں۔تفصیلی تشریح سے قبل یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ یہاں یہ قصہ سورت کے موضوع کی مناسبت سے لایا گیا ہے۔اور اس سورت کے انداز بیان کے ساتھ ہم آہنگ کر کے لایا گیا ہے' بلکہ بعض اوقات اسی سورت کے فقروں ہی کو استعمال کیا گیا ہے۔اور ایک ہی انداز بیان اختیار کیا ہے۔مثلاً رجل مومن فرعون کے سامنے جو تقریر کرتا ہے' اس کے بعض فقرے اس سے قبل اسی سورت میں موجود ہیں۔وہ فرعون' ہامان اور قارون کو نصیحت کرتا ہے کہ تم لوگ زمین میں چلت پھرت رکھتے ہو' نیز ان کو وہ ایک ایسے دن سے ڈراتا ہے جو دوسری اقوام کو پیش آیا۔اور وہ ان کو قیامت کے دن سے بھی اسی طرح ڈراتا ہے۔جس طرح اس سے قبل سورت میں قیامت کے مشاہد ذکر ہوئے۔یہ اس بات کو دہراتا ہے کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہو گا جو اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں۔اللہ کی ناراضگی کا ذکر' اہل ایمان کی ناراضی جس طرح پہلے سبق میں ذکر ہوئی۔اس کے بعد جہنم میں ان کا منظر' جہاں سے وہ نکالے جانے کی درخواست کریں گے لیکن منظور نہ ہوگی جیسا کہ ایسا ہی منظر اس سے پہلے ذکر ہوا۔

رجل مومن کی پوری تقریر اس سورت کے مضامین کو دہراتی ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان سب کے سب ایک طرح سوچا کرتے ہیں۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریر سے سورت کی فضا یک رنگ ہو جاتی ہے۔اس سورت کی ایک شخصیت سامنے آتی ہے جس کے خدوخال واضح ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو پورے قرآن میں پیش نظر رکھی گئی ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۲۴ تشریح آیات

۲۱--- تا--- ۵۵

اَوَ لَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡا ہُمۡ اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّ اٰثَارًا فِی الۡاَرۡضِ فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ بِذُنُوۡبِہِمۡ ؕ وَ مَا کَانَ لَہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَانَتۡ تَّاۡتِیۡہِمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَکَفَرُوۡا فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ ؕ اِنَّہٗ قَوِیٌّ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۲﴾

"کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین میں چھوڑ گئے ہیں مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول بینات لے کر آئے اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

یہ آیات قصہ موسیٰ اور سورت کے سابقہ مضامین کے درمیان پل کا کام دے رہی ہیں۔ مشرکین مکہ کو یاد دلاتی ہیں کہ تم زرا ان تاریخی واقعات پر غور کرو اور ان سے عبرت حاصل کرو جو تمہارے گردوپیش ہی میں واقع ہوئے۔ زمین کے اندر پھرو اور گزشتہ اقوام کی ہلاکت کے واقعات پر غور کرو، جنہوں نے سچائی کے مقابلے میں وہی رویہ اختیار کیا تھا جو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ وہ قوت کے اعتبار سے اور زمین کے اوپر آثار چھوڑنے کے اعتبار سے تمہارے مقابلے میں زیادہ قوی تھے لیکن اپنی اس زبردست تہذیب و تمدن کے باوجود اللہ کے عذاب کے مقابلے میں بے بس تھے۔ اپنے گناہوں کی وجہ سے وہ قوت کے اصلی مرکز سے دور ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کے گناہوں نے اہل ایمان کو دعوت دی کہ وہ ان کی ہلاکت کے لیے اٹھیں جن کے ساتھ اللہ عزیز و قہار کی قوتیں معاون و مددگار تھیں۔

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ (۴۰ : ۲۱) "مگر اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا"۔ کیونکہ بچانے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہوتی ہے۔ اور اس سے وہ محروم تھے۔ پھر بچانے والی چیز یہ ہوتی ہے کہ انسان ایمان، عمل صالح اور سچائی کے محاذ کے ساتھ ہو لیکن وہ تو

تکذیب کرنے والے اور اللہ کی نشانیوں کو جھٹلانے والے تھے اور ان چیزوں کا انجام بربادی اور ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ

الْعِقَابِ (٤٠ : ٢٢) "یہ ان کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول بینات لے کر آئے اور انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے ان کو پکڑ لیا۔ یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے"۔

---- OOO----

اس اصولی اور کلی اشارے کے بعد اب اللہ تعالیٰ ایسی اقوام میں سے ایک نمونہ پیش فرماتا ہے۔ یہ لوگ مشرکین مکہ سے بہت قوی تھے اور انہوں نے زمین پر بہت سے آثار چھوڑے تھے۔ ان کے گناہوں کی وجہ سے اللہ نے انہیں پکڑ لیا۔ یہ تھے فرعون، قارون اور ہامان۔ اور ان کے ساتھ بڑے بننے والوں کے ٹولے بھی تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ کئی حصوں اور مناظر پر مشتمل ہے۔ آغاز اس مقام سے ہوتا ہے جہاں حضرت موسیٰ فرعون کے سامنے اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور اس کا انجام اس پر ہوتا ہے کہ آخرت میں جہنم رسید ہو کر وہ آگ میں باہم لڑتے ہیں۔ یہ بہت ہی طویل سفر ہے لیکن یہاں اس طویل سفر کی جھلکیوں پر اکتفاء کیا گیا ہے اور یہ جھلکیاں اس قصے کے وہ تمام حصے دکھا دیتی ہیں جو یہاں مطلوب ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٣﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿٢٤﴾

"ہم نے موسیٰ کو فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف اپنی نشانیوں اور نمایاں سند ماموریت کے ساتھ بھیجا، مگر انہوں نے کہا "ساحر ہے، کذاب ہے"۔

یہ ہے فرعون کے ساتھ پہلا ملاپ۔ حضرت موسیٰ بمعہ معجزات کھڑے ہیں اور ان کے ساتھ وہ ہیبت بھی ہے جو ہر سچائی کے ساتھ ہوتی ہے اور سچائی ان کے ہاتھ میں ہے۔ فرعون، ہامان اور قارون بھی موجود ہیں۔ ان کے ساتھ ان کا کھوٹا اور باطل موقف ہے اور ان کے ساتھ ان کی ظاہری قوت ہے اور وہ مقام و مرتبہ ہے جس کے چلے جانے کا ان کو بہت ڈر ہے، یہ لوگ سچائی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ اب باطل بحث و مباحثے میں پڑ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں سٰحِرٌ كَذَّابٌ (٤٠ : ٢٤) "جادوگر ہے جھوٹا ہے"

---- OOO----

یہاں اب قصے میں سے وہ تمام حصے کاٹ دیئے جاتے ہیں، جو اس مباحثے کے بعد پیش آئے۔ جادوگروں کے ساتھ مقابلے کا حصہ بھی کٹ جاتا ہے، جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے سب باطل جادو ٹونوں کو عصائے موسوی چاٹ گیا تو وہ ایمان

لاتے ہیں تو یہ سب جھے کاٹ کر فرعونیوں کے وہ اقدامات لائے جاتے ہیں جو انہوں نے میدان میں ہارنے کے بعد کیے ۔

فَلَمَّا جَآءَهُم بِالْحَقِّ مِنْ عِندِنَا قَالُوا اقْتُلُوٓا أَبْنَآءَ الَّذِينَ ءَامَنُوا مَعَهُۥ وَاسْتَحْيُوا نِسَآءَهُمْ ۚ وَمَا كَيْدُ الْكَٰفِرِينَ إِلَّا فِى ضَلَٰلٍ ﴿٢٥﴾

''پھر جب وہ ہماری طرف سے حق ان کے سامنے لے آیا تو انہوں نے کہا ''جو لوگ ایمان لا کر اس کے ساتھ شامل ہوئے ہیں' ان سب کے لڑکوں کو قتل کرو اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دو''۔ مگر کافروں کی چال اکارت ہی گئی''۔ یہی انداز ہمیشہ سب سرکشوں کا ہوتا ہے جب ان سے دلیل و حجت کے ہتھیار ختم ہوتے ہیں تو وہ تشدد کے ہتھیار تھام لیتے ہیں' جب بھی دلائل کے اعتبار سے وہ ذلیل ہوتے ہیں اور ان کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ حق تو غالب آنے والا ہے کیونکہ اس کی بات صاف' زوردار ہے ۔ واضح اور قابل فہم ہے' اور دل لگتی اور فطرت کو اپیل کرتی ہے' جس طرح جادوگروں کی فطرت نے قبول کر لیا' وہ ایمان لے آئے حالانکہ وہ مقابلے کے لیے لائے گئے تھے ۔ انہوں نے حق کو قبول کر کے فرعون کا مقابلہ شروع کر دیا حالانکہ وہ بہت بڑا جبار تھا ۔ اس پر یہ تبصرہ نہایت برمحل ہے ''کافروں کی چال اکارت گئی''۔

اب فرعون اور ہامان اور قارون کیا کرتے ہیں ۔ انہوں نے کہا :

اقْتُلُوٓا أَبْنَآءَ الَّذِينَ ءَامَنُوا مَعَهُۥ وَاسْتَحْيُوا نِسَآءَهُمْ (۴۰ : ۲۵) ''جو لوگ ایمان لا کر اس کے ساتھ شامل ہوئے ہیں ان کے لڑکوں کو قتل کرو اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دو''۔

فرعون نے اس قسم کا حکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے زمانے میں جاری کیا تھا ۔ ہو سکتا کہ اس سے پہلے فرمان کے صدور کے بعد یہ ہوا کہ جس فرعون نے یہ حکم جاری کیا تھا وہ مر گیا ہو' اور اس کا بیٹا اور ولی عہد فرعون مقرر ہو گیا ہو اور جدید عہد میں یہ ظالمانہ فرمان مردہ قانون ہو گیا ہو' اور حضرت موسیٰ جب آئے اور انہوں نے فرعون کو دعوت دی تو وہ آپ کو جانتا تھا کیونکہ آپ کی تربیت تو شاہی محل میں ہوئی تھی ۔ اور یہ جدید فرعون یہ بھی جانتا تھا کہ سابقہ حکومت نے ایک فرمان بنی اسرائیل کے خلاف جاری کیا تھا کہ ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑو اور مردوں کو قتل کر دو' یوں اس کے حاشیہ نشینوں اور مشیروں نے یہ مسورت دیا ہو کہ موسیٰ پر جو لوگ ایمان لائے ہیں ان پر وہی فرمان دوبارہ نافذ کیا جائے' چاہے وہ جادوگر مصری ہوں یا بنی اسرائیل ہوں یا اور لوگ ہوں جنہوں نے موسیٰ کی دعوت کو قبول کر لیا ہو ۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرعون وہی ہو جس نے موسیٰ علیہ السلام کو پالا تھا لیکن اس کے سابقہ فرمان میں قدرے نرمی کر دی گئی ہو اور اس قانون کے نفاذ میں شدت نہ رہی ہو اور اب یہاں اس کے مشیروں نے از سرنو مسورت دیا ہو کہ اس قانون کو صرف ان لوگوں پر نافذ کیا جائے جو حضرت موسیٰ پر ایمان لائے ہوں تا کہ ان کو ڈرایا جا سکے ۔

رہا فرعون تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی رائے اور تھی ۔ وہ یہ کہتا تھا کہ موسیٰ تمہارا دین بدل دے گا اور ملک کا امن و امان تباہ ہو جائے گا لہٰذا مجھے اجازت دو کہ میں موسیٰ سے تمہاری جان ہی چھڑا دوں ۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِىٓ أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُۥٓ ۖ إِنِّىٓ أَخَافُ أَن

يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾

"ایک روز فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا "چھوڑو مجھے میں اس موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں' اور پکار دیکھے یہ اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالے گا' یا ملک میں فساد برپا کرے گا"۔

اس کے اس قول سے ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى (۴۰ : ۲۶) "چھوڑو مجھے میں اس موسیٰ کو قتل کروں" سے معلوم ہوتا ہے' اس کے حاشیہ نشینوں کی جانب سے حضرت موسیٰ کے قتل کے خلاف دلائل دیئے جا رہے تھے کہ اگر آپ موسیٰ کو قتل کر بھی دیں تو مسئلہ ختم نہ ہو گا' جمہور عوام انہیں شہید سمجھ کر اسے ایک مقدس شخصیت قرار دیں گے ۔اس طرح لوگ شعوری طور پر ان کے دین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں' خصوصاً جبکہ ایک قومی میلے کے دن جادوگر اس پر ایمان لا چکے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کی وجہ بھی لوگوں کو بتا دی ہے ۔حالانکہ جادوگروں کو جمع اس لیے کیا گیا تھا کہ اس کے دین کو باطل ثابت کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بادشاہ کے بعض مشیر دل ہی دل میں ڈر گئے ہوں کہ حضرت موسیٰ کا خدا ان سے انتقام لے گا۔ اور وہ خدا کی پکڑ میں آ جائیں گے' یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کیونکہ بت پرست تو متعدد الہوں کے قائل دتے تھے ۔اور وہ قدرتی طور پر سوچ سکتے تھے کہ موسیٰ کا خدا ان سے انتقام لے ۔اور فرعون کا یہ قول کہ وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ (۴۰ : ۲۶) "اور یہ اپنے رب کو بھی پکار دیکھے"۔ اگرچہ بظاہر فرعون کی ایک متکبرانہ بات ہے ۔ لیکن شاید یہ ان مشیروں کے رد میں ہو اور اسی متکبرانہ بات کی وجہ سے بعد میں اسے اللہ نے پکڑا اور ہلاک کر دیا ۔جیسا کہ بعد میں آئے گا۔

یہ بات بڑی دلچسپ ہے جو فرعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کے جواز کے بارے میں کہی ۔

اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (۴۰ : ۲۶) "مجھے ڈر ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالے گا یا زمین میں فساد برپا کر دے گا"۔ فرعون کی اس دلیل پر غور ضروری ہے ۔کیا ایک بت پرست بادشاہ کی یہ بات کوئی نئی بات ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ تمہارا دین بدل دے گا' یا کم از کم ملک میں فساد ضرور برپا کر دے گا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ ہر سرکش اور مفسد ہمیشہ یہی کہتا ہے' جب بھی کسی نے اسلام کی اصلاحی دعوت شروع کی ہے ۔ مفسدین نے یہی بات کہی کہ انہوں نے اصلاح کو فساد کہا' ہمیشہ اہل ایمان داعیوں اور مصلحین کے بارے میں مطلب پرست سرکشوں اور مفسدوں نے عوام کے سامنے یہی عذر پیش کیا۔

جب بھی حق و باطل کے درمیان کشمکش شروع ہوئی' باطل کی منطق اور استدلال یہی رہا۔ ایمان اور کفر کی جنگ میں یہی منطق چلتی رہی ۔ ہر زمان و مکان میں اور تاریخ کے ہر دور میں اصلاح کو فساد اور فساد کو اصلاح کہا گیا۔ غرض یہ قدیم کہانی ہے اور اسے بار بار دہرایا جاتا ہے ۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے تھے ۔ان کا بھروسہ نہایت مضبوط قوت پر تھا۔ وہ حصن حصین میں محفوظ تھے۔ اور انہوں نے اس ذات کے ہاں پناہ لے رکھی تھی جہاں ہر سرکش متکبر سے بھاگ کر لوگ پناہ لیتے ہیں ۔

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا

۳
۷ع يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾

۸
''موسیٰ نے کہا''میں نے تو ہر اس متکبر کے مقابلے میں جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا' اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے لی ہے''۔

حضرت موسیٰ نے یہ بات کہہ دی اور مطمئن ہوگئے اور اپنی حفاظت کا معاملہ اس ذات کے سپرد کر دیا جو ہر متکبر سے بلند ہے۔ ہر جبار کے اوپر ہے' اور تمام دوسرے جباروں سے بھاگ کر اس کی پناہ میں آنے والوں کی حفاظت کرتا ہے۔ حضرت نے یہ کہا کہ وہ اس رب کی پناہ میں ہیں جو خود ان کافروں کا بھی رب ہے اور ہمارا بھی رب ہے' اللہ نے ہمیں بھلا نہیں دیا اور نہ فرعون کی دھمکیوں کے مقابلے میں بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔ یہ لوگ تو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس لیے یہ زمین میں اپنی کبریائی قائم کرتے ہیں۔ کوئی شخص جو قیامت کی جوابدہی پر ایمان رکھتا ہو وہ متکبر نہیں بن سکتا۔ کیونکہ وہ تصور کر سکتا ہے کہ قیامت کے دن لوگ کس قدر ذلیل' سہمے ہوئے اور ڈرے ہوئے ہوں گے۔ کوئی قوت اور طاقت اور کوئی سہارا نہ ہو گا' نہ کوئی دوست ہو گا اور نہ کوئی سفارشی ہو گا اور نہ کوئی فدیہ دیا جا سکے گا۔

اب یہاں منظر پر خود فرعون کے حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص آتا ہے۔ اس کے دل پر سچائی اثر انداز ہو گئی. لیکن اس نے اپنا ایمان ابھی چھپا رکھا ہے۔ یہ شخص حضرت موسیٰ کی مدافعت میں آواز بلند کرتا ہے' کوشش کرتا ہے کہ لوگ حضرت موسیٰ کے قتل سے باز آجائیں۔ یہ اپنی تقریر میں مختلف پہلوؤں سے بات کرتا ہے۔ یہ اپنی ناصحانہ باتیں ان کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے' ان کے اچھے جذبات کو ابھارتا ہے' ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انجام بد سے بھی ڈراتا ہے۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَن يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُم بِالْبَيِّنَاتِ مِن رَّبِّكُمْ ۖ وَإِن يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ ۖ وَإِن يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُم بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ يَا قَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَن يَنصُرُنَا مِن بَأْسِ اللَّهِ إِن جَاءَنَا ۚ قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُم مِّثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَيَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ

عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿٣٢﴾ يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ ۚ مَا لَكُم مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۗ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُم بِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن يَبْعَثَ اللَّهُ مِن بَعْدِهِ رَسُولًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۖ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ وَعِندَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿٣٥﴾

"اس موقع پر آل فرعون میں سے ایک مومن شخص ' جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا ' بول اٹھا :"کیا تم ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے ؟ حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بینات لے آیا۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر پلٹ پڑے گا۔ لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آجائیں گے ۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو ۔ اے میری قوم کے لوگو ' آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین میں تم غالب ہو ' لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آگیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا"۔ فرعون نے کہا "میں تو تم لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے اور میں اسی راستے کی طرف تمہاری رہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے"۔

وہ شخص جو ایمان لایا تھا اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو ' مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آجائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آچکا ہے ' جیسا دن قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اے قوم! مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پر فریاد و فغاں کا دن نہ آجائے ۔ جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے ' مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔ سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس بینات لے کر آئے تھے مگر تم ان کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے ۔ پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا اب ان کے بعد اللہ کوئی رسول ہرگز نہ بھیجے گا"۔ اسی طرح اللہ ان سب لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شکی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں ' بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو ۔ یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے ۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر و جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے"۔

یہ وہ عظیم گفتگو ہے ' جو رجل مومن نے فرعون کے سازشی حاشیہ نشینوں کے ساتھ کی ۔ اس شخص نے نہایت فطری انداز میں ' نہایت احتیاط کے ساتھ ' نہایت مہارت اور زوردار انداز میں یہ بات کی ۔ پہلے تو اس نے یہ کہا کہ تم جو تجویز پیش کر رہے ہو اور وہ نہایت گھناؤنی تجویز ہے ۔

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ (۴۰ : ۲۸) ''کیا تم ایک شخص کو صرف اس بناء پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے''۔

کیا یہ کوئی جرم ہے کہ کوئی ایک خدا ہونے کا عقیدہ رکھے۔ یہ ہر کسی کا حق ہے کہ وہ وہی عقیدہ رکھے جس پر اس کا قلب اور اس کا نفس مطمئن ہو۔ کسی عقیدے پر کوئی اس بات کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس کی جان لے لی جائے۔ یہ تو نہایت مکروہ اور ظالمانہ بات ہے اور اس کی کراہت اور برائی اور گھناؤنا پن بالکل ظاہر ہے۔

اس کے بعد یہ شخص ایک قدم آگے بڑھتا ہے کہ یہ شخص جو کہتا ہے کہ ''میرا رب صرف اللہ ہے''۔ تو وہ بے دلیل بات بھی نہیں کرتا' وہ دلیل و برہان اور معجزات دکھا کر بات کرتا ہے۔

وَقَدْ جَآءَکُمْ بِالْبَیِّنٰتِ مِنْ رَّبِّکُمْ (۴۰ : ۲۸) ''حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلائل لے کر آیا ہے''۔ اشارہ ان معجزات کی طرف ہے جو حضرت موسیٰ نے پیش فرمائے۔ اور انہوں نے بچشم سر دیکھے اور جمہور عوام سے دور اپنی اس اونچی محفل میں تو وہ ان معجزات کا انکار بھی نہیں کر سکتے اور نہ شک کر سکتے ہیں۔

اب یہ شخص بطور فرض ان کے سامنے اس اقدام کے برے نتائج پیش کرتا ہے اور اس مسئلہ کا ایک منصفانہ حل پیش کرتا ہے کہ تم اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو فرض کر سکتے ہو وہ یہ ہے۔

وَاِنْ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیْہِ کَذِبُہٗ (۴۰ : ۲۸) ''اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اسی پر پلٹ پڑے گا''۔ اپنے جھوٹ کا وہ خود ذمہ دار ہو گا۔ اور اپنے انجام تک پہنچ جائے گا اور اپنے جرم کی سزا پائے گا۔ محض جھوٹ بولنے پر تم کسی شخص کو کیسے قتل کر سکتے ہو۔

لیکن ایک دوسرا احتمال بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ شخص سچا ہو' لہٰذا تم اس کو بھی بطور احتیاط پیش نظر رکھو اور اپنے آپ کو برے نتائج کا مستحق نہ ٹھہراؤ۔

وَاِنْ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ (۴۰ : ۲۸) ''لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تم کو خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آ جائیں گے''۔ وہ جن چیزوں سے تمہیں ڈراتا ہے ان میں بعض کا تو احتمال پیش نظر رکھو' یہ شخص ان کو تمام امور سے نہیں ڈراتا بلکہ مباحثے کو کم کرنے کے لیے بعض کے احتمال کا ذکر کرتا ہے یعنی اپنی بات کو منصفانہ بناتا ہے۔

اب وہ مزید اصولی بات کرتا ہے جو دونوں فریقوں پر منطبق ہو سکتی ہے اگرچہ خفیہ اشارہ ان کے لیے ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہْدِیْ مَنْ ہُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ (۴۰ : ۲۸) ''اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب ہو''۔ اگر موسیٰ جھوٹا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت بھی نہ دے گا اور توفیق بھی نہ دے گا۔ پھر چھوڑ دو اسے کہ اپنے انجام کو پہنچے۔ اور اگر تم جھوٹے ہو اور موسیٰ کے خلاف جھوٹ بک رہے ہو اور اس

کے بارے میں حد سے گزر رہے ہو تو تم پر اللہ کا عذاب آ سکتا ہے۔

جب اس نے ان کو اس بات سے ڈرایا کہ اللہ حد سے گزرنے والوں اور جھوٹوں کو ہدایت نہیں دیتا تو اب مزید کہتا ہے اگر اللہ کا عذاب ہم پر آگیا تو ہمیں کون بچا سکتا ہے اللہ کے عذاب سے کیونکہ موجودہ قوت اور سلطنت اور اقتدار کا ہم شکر ادا نہیں کر رہے ہیں کفران نعمت کر رہے ہیں اور قوت کے بل بوتے پر ایک شخص کو قتل کرنے جا رہے ہیں۔

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا

(۴۰:۲۹) "اے میری قوم کے لوگو' آج تمہیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین میں تم غالب ہو' لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آگیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا"۔ اس شخص کو وہ مکمل شعور حاصل ہے جو ایک صحیح مومن کو حاصل ہوتا ہے کہ اللہ کا عذاب بادشاہوں' برسر اقتدار طبقات اور زمین پر بااختیار لوگوں پر سب سے پہلے آتا ہے اور ان کو چاہئے کہ وہ اللہ کے عذاب سے زیادہ ڈریں۔ یہ عذاب تو رات اور دن کے ہر لمحے میں تمہارے انتظار میں ہے۔ اس لیے یہ شخص ان کو یاد دلاتا ہے کہ تم زمین کے مقتدر اعلیٰ ہو' بادشاہ ہو' لہٰذا تمہیں اللہ سے' ان کے مقابلے میں زیادہ ڈرنا چاہئے۔ یہ بات اس رجل مومن کے احساسات کا حصہ ہے' اور جب اللہ کے عذاب کی بات وہ کرتا ہے تو اپنے آپ کو ان میں شامل کرتا ہے۔

فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا (۴۰:۲۹) "اگر خدا کا عذاب ہم پر آگیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا"۔

جب تقریر یہاں تک پہنچتی ہے تو فرعون کے اندر وہی ردعمل پیدا ہوتا ہے جو ہر سرکش پر طاری ہوتا ہے۔ جھوٹا وقار ہر شخص کو برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ اور ایسا شخص خالص نصیحت کو بھی اپنی سلطنت اور اختیارات پر حملہ تصور کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ نصیحت کرنے والا ہمیں اقتدار میں شرکت چاہتا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ (۴۰:۲۹)

"فرعون نے کہا' میں تو لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے۔ اور میں اس راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتا ہوں' جو ٹھیک ہے"۔ میں تمہیں وہی کچھ کہتا ہوں جسے میں درست سمجھتا ہوں۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ وہ مفید ہے اور بغیر شک کے وہی صحیح راستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ سرکش ڈکٹیٹر جو سوچتا ہے وہی درست ہوتا ہے۔ کسی کو یہ کیسے اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ سوچے کہ بادشاہ غلط بھی سوچ سکتے ہیں یا کر سکتے ہیں یا کسی کو یہ اختیار کب ہے کہ وہ شاہ یا ڈکٹیٹر کی رائے ہوتے ہوئے کوئی دوسری رائے رکھے۔ اگر یہ بات ہو سکتی ہے تو پھر وہ کس چیز کے بادشاہ اور ڈکٹیٹر ہیں!

لیکن رجل مومن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ شاہ کے مقابلے میں مستقل سوچ رکھے۔ پھر ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ ان کو ڈرائے اور متنبہ کرے اور نصیحت کرے اور ایمانداری سے اس کی جو رائے ہے' اس کا اظہار کرے۔ اور اس بات کو اپنا فریضہ سمجھے کہ جس رائے کو وہ حق سمجھتا ہے' اس کی حمایت کرے' سرکشوں' ڈکٹیٹروں اور بادشاہوں کی جو رائے ہو'

سو ہو۔ اس لیے یہ رجل مومن اس دوسرے زاویہ سے ان کے دل و دماغ پر دستک دیتا ہے کہ شاید وہ احساس کر لیں، جاگ اٹھیں اور ان کے اندر ارتعاش پیدا ہو اور وہ نرم ہو جائیں، اس لیے وہ ان کو تاریخ میں گزری ہوئی سرکش اقوام کے برے انجام کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ تاریخ کے اندر بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جو بتاتے ہیں کہ سرکشوں اور حد سے گزرنے والوں کو اللہ نے پکڑا ہے۔

وَقَالَ الَّذِىْ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّىْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ (۴۰:۳۰) مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۴۰:۳۱) "وہ شخص جو ایمان لایا تھا، اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، مجھے خوف ہے، کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آ جائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آ چکا ہے، جیسا دن قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا"۔ ہر جتھے کا ایک دن علیحدہ تھا۔ لیکن رجل مومن نے تمام علیحدہ علیحدہ دنوں کی تعبیر ایک ہی دن سے کر دی۔

مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ (۴۰:۳۰) وہ گویا ایک ہی دن تھا، جس کی نوعیت ایک طرح تھی۔ اگرچہ احزاب بہت تھے۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۴۰:۳۱) "اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا"۔ اللہ ان کے گناہوں پر انہیں پکڑتا ہے۔ اور ان لوگوں کے انجام کو دیکھ کر دوسرے لوگ جو ان کے ارد گرد بستے ہیں، ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور جو لوگ ان ہلاک شدہ اقوام کے بعد آتے ہیں ان کو عبرت ہوتی ہے۔

اب یہ رجل مومن ان کے دلوں پر ایک اور دستک دیتا ہے اور یہ اللہ کے دنوں میں سے بڑے دن یوم آخرت کو یاد دلاتا ہے۔ اسے یہاں فریاد و فغاں کا دن کہا گیا ہے۔

وَيٰقَوْمِ اِنِّىْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ (۴۰:۳۲) يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۴۰:۳۳) "اے قوم، مجھے ڈر ہے کہ کہیں فریاد و فغاں کا دن نہ آ جائے جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے، مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔ سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہوتا"۔

تنادی کے معنی ہیں باہم پکار، اس دن ملائکہ جو لوگوں کو پکڑ کر حساب و کتاب کے لیے لائیں گے اور ایک دوسرے کو احکامات دیتے ہوئے پکاریں گے۔ پھر اصحاب اعراف جنت والوں کو پکاریں گے، اور دوزخ والوں کو بھی پکاریں گے اور دوزخی جنت والوں کو پکاریں گے۔ لہٰذا مختلف صورتوں میں لوگ ایک دوسرے کو پکاریں گے اس لیے قیامت کے دن کو

یوم التناد کیا گیا ہے جس کے مفہوم میں باہم چیخ و پکار اور فریاد و فغاں شامل ہے ۔ ہر طرف سے دوڑ دھوپ اور شور ہو گا ۔ یہ مفہوم رجل مومن کے اس قول کے مطابق ہے ۔

يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ (۴۰ : ۳۳) ”جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا“ ۔ یہ جہنم کے خوف سے بھاگنے کی کوشش بھی کریں گے لیکن بھاگ نہ سکیں گے ۔ یہاں فریاد و فغاں اور فرار اور پکڑے جانے کی جو تصویر کھینچی گئی ہے ' وہ ان متکبرین کے لیے نہایت ہی مناسب ہے ' جو یہاں جاہ و مرتبہ رکھتے ہیں کہ وہاں یہ حالت ہو گی تمہاری ۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۴۰ : ۳۳) ”سچ یہ ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دے اسے پھر کوئی راستہ دکھانے والا نہیں“ ۔ اس میں ایک خفیہ اشارہ فرعون کے اس قول کی طرف ہے ۔

وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ (۴۰ : ۲۹) ”اور میں تو صرف صحیح راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتا ہوں“ ۔ اشارہ یہ ہے کہ ہدایت والا راستہ تو وہ ہے جو اللہ بتائے اور فرعون کا بتایا ہوا راستہ وہ نہیں ہے جو اللہ نے بتایا ہے ۔ کیونکہ اللہ لوگوں کی حقیقت اور ان کے حالات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے لیے ہدایت کا راستہ کیا ہے اور ضلالت کیا ہے ۔ آخر میں یہ رجل مومن ان کو یاد دلاتا ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں کیا موقف اختیار کیا تھا ۔ یہ موسیٰ علیہ السلام انہی کی اولاد سے تھے ۔ یہ مصری حضرت یوسف علیہ السلام کی رسالت میں بھی شک کرتے تھے حالانکہ آپ آیات اور نشانیاں لے کر آئے تھے ۔ لہٰذا وہی سلوک حضرت موسیٰ سے نہ دہراؤ ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کی بھی تصدیق فرما رہے ہیں ۔ تم نے حضرت یوسف کی تعلیمات میں بھی شک کیا اور یہ غلط تصور قائم کر دیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا ۔ حضرت موسیٰ حضرت یوسف کے ایک عرصہ بعد آگئے ہیں اور انہوں نے تمہارے اس اعتقاد کی تکذیب کر دی ہے کہ اب رسالت ختم ہے ۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ (۴۰ : ۳۴) اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۴۰ : ۳۵)

”اس سے پہلے یوسف تمہارے پاس بینات لے کر آئے تھے مگر تم ان کی لائی ہوئی تعلیم کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہے ۔ پھر جب ان کا انتقال ہو گیا تو تم نے کہا اب ان کے بعد اللہ کوئی رسول ہرگز نہ بھیجے گا“ ۔ اسی طرح اللہ ان سب لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے جو حد سے گزرنے والے اور شکی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں ؛ بغیر

اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔ یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر و جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے"۔

یہ واحد جگہ ہے جس میں قرآن نے حضرت یوسف کی رسالت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کو مصر والوں کی طرف رسول بناکر بھیجا گیا تھا۔ سورت یوسف سے ہمیں یہ معلوم ہوگیا ہے کہ آپ کو مصر کے خزانے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ آپ ان میں خود مختاری کے ساتھ تصرف کر رہے تھے اور آپ "عزیز مصر" کے مرتبے تک پہنچ گئے تھے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ اس وقت مصری وزیر اعظم کا لقب تھا۔ سورت یوسف میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ مصر کے تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ بات یقینی نہیں کہ آپ بادشاہ مصر بن گئے تھے۔

وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا وَ قَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا (یوسف: ۱۰۰) "اور انہوں نے اپنے والدین کو تخت پر اٹھایا۔ وہ اس کے سامنے سجدے میں گر گئے اور اس نے کہا اے باپ! یہ ہے تاویل میرے خواب کی جو میں نے پہلے دیکھی تھی، جسے اللہ نے حق بنا دیا"۔

یہ ہو سکتا ہے کہ جس تخت پر آپ نے اپنے والدین کو اٹھاکر بٹھایا وہ کوئی اور ممتاز جگہ ہو اور مملکت مصر کا تخت نہ ہو جس پر فرعون بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن ان آیات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یوسف اقتدار اعلیٰ تک پہنچ گئے تھے۔ اس لیے ہم رجل مومن کے اس قول کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کو حضرت یوسف کی تعلیمات کے بارے میں شک تھا۔ البتہ حضرت یوسف چونکہ اقتدار کے بہت ہی اعلیٰ مقام پر تھے اس لیے لوگ آپ کی مخالفت میں آواز نہ اٹھاتے تھے۔

حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا (۴۰: ۳۴) "یہاں تک کہ جب آپ فوت ہوگئے تو تم نے کہا اس کے بعد اللہ ہرگز کوئی رسول نہ بھیجے گا"۔ گویا آپ کی موت سے ان کو بے حد خوشی ہوئی اور خوشی کا اظہار انہوں نے اس شکل میں کیا کہ رسالت کا خاتمہ کر دیا کیونکہ شاید وہ آپ کی تعلیمات کو پسند نہ کرتے تھے کیونکہ آپ تو توحید خالص کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ تعلیم جیسے آپ کی تقریر زنداں سے واضح ہے۔

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲: ۳۹) "کیا کئی رب بہتر ہیں یا ایک اللہ واحد اور زبردست"۔ انہوں نے یہ عقیدہ اس لیے اختیار کیا کہ حضرت یوسف کے بعد کوئی رسول نہ آئے اس لیے وہ اس طرح چاہتے تھے۔ بعض اوقات ایک شخص ایک چیز کو بہت پسند کرتا ہے۔ پھر وہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ یہ بات واقع ہوگئی ہے کیونکہ اس طرح اس کی خواہش پوری ہوتی ہے۔

رجل مومن کا انداز یہاں قدرے سخت ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے تم شک کرتے ہو اور حد سے گزر کر تکذیب کرتے ہو۔

كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ (۴۰: ۳۴) "اللہ ان لوگوں کو اسی طرح گمراہ کرتا

ہے جو حد سے گزرنے والے اور شک کرنے والے ہوتے ہیں"۔ یہ رجل مومن ان کو ڈراتا ہے کہ اللہ نے جو دعوت نشانیوں کے ساتھ بھیجی ہے اس کے بارے میں جو حد سے گزرے گا اور اس میں شک کرے گا' تو اللہ اسے گمراہ کر دے گا' وہ تو دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد بڑی سختی سے ان کو بتلاتا ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کے بارے میں بلاحجت و دلیل جھگڑتے ہیں' ان کو مومنین اور اللہ دونوں ناپسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا رویہ بہت ہی برا ہے۔ اور ان کے تکبر اور جبر کے رویہ پر بھی یہ شخص تنقید کرتا ہے اور ان کو اللہ کی پکڑ سے ڈراتا ہے اور اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ جباروں اور قہاروں کو بالآخر پکڑتا ہے!

الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۴۰ : ۳۵) "اور اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں' بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو۔ یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر و جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے"۔ رجل مومن کی زبانی جو بات کی گئی وہی بات سورت کے آغاز میں براہ راست بھی کہی گئی کہ جو لوگ اللہ کی آیات میں بغیر دلیل و حجت کے مجادلہ کرتے ہیں' ان کے دلوں میں ہدایت کی کوئی جگہ نہیں ہوتی اور نہ ان کا دماغ حقیقت کے ادراک تک پہنچ سکتا ہے۔

--- ○○○ ---

رجل مومن کی اس طویل ترین تقریر کے باوجود جس میں ان کو تاریخ کے بہت سے نشیب و فراز دکھائے گئے اور ان کو متاثر کرنے کی سعی کی گئی' فرعون اپنی گمراہی میں آگے ہی بڑھتا رہا اور اس نے حق کو پہچاننے کی کوئی سعی نہ کی لیکن بظاہر اس نے یہ احمقانہ رویہ اختیار کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے دعاوی کی تحقیقات کر رہا ہے۔ بہرحال رجل مومن کی تقریر کا یہ اثر ضرور ہوا کہ فرعون کسی نہ کسی انداز میں اس تحریک کے بارے میں تحقیق پر آمادہ ہوا یوں فرعون نے مجلس شیوخ کی رائے کو براہ راست رد نہ کیا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿۳۶﴾ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾

۴ ع ۱۰

۹ "فرعون نے کہا "اے ہامان' میرے لیے ایک بلند عمارت بنا تاکہ میں راستوں تک پہنچ سکوں' آسمانوں کے راستوں تک' اور موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں۔ مجھے تو یہ موسیٰ جھوٹا ہی معلوم ہوتا ہے"--- اسی طرح فرعون کے لیے اس کی بدعملی خوشنما بنا دی گئی اور وہ راہ راست سے روک دیا گیا۔ فرعون کی ساری چال بازی (اس کی اپنی) تباہی کے راستہ

ہی میں صرف ہوئی)"۔

فرعون نے ہامان سے کہا میرے لیے ایک بلند عمارت بنا تاکہ میں آسمان کے راستوں تک پہنچ سکوں اور موسیٰ کے خدا کے بارے میں جان سکوں۔

وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا (۴۰ : ۳۷) "مجھے تو یہ موسیٰ جھوٹا ہی معلوم ہوتا ہے"۔ یہ سرکش فرعون کی چالاکی اور اٹکل بازی ہے' وہ سچائی کے مقابلے میں علانیہ آنا نہیں چاہتا اور عقیدۂ توحید کا اعتراف بھی نہیں کرتا کیونکہ اس صورت میں اس کی حکومت جاتی ہے' جن انسانوں پر اس کی مملکت قائم تھی وہ عقیدۂ توحید کے بعد باطل قرار پاتے تھے۔ یہ بات بعید از امکان ہے کہ فرعون اس قدر کم عقل تھا اور وہ اس علمی سطح کا آدمی تھا۔ اور وہ الہ موسیٰ کو اس سادہ انداز سے دھوکہ دے رہا تھا کیونکہ فراعنہ مصر علمی لحاظ سے بہت ہی ترقی یافتہ تھے۔ یہ دراصل اس کی طرف سے حضرت موسیٰ اور اللہ العالمین کے ساتھ مذاق تھا۔ البتہ اس مذاق کے ساتھ وہ اپنے رویہ کو بظاہر منصفانہ بنانا چاہتا تھا۔ اور رجل مومن نے جو زبردست منطقی تقریر کی تھی اس سے جان چھڑانے کا یہ بھونڈا طریقہ اور تدبیر تھی لیکن یہ سب باتیں یہ ضرور ظاہر کر دیتی ہیں کہ فرعون مصر کو اپنی گمراہی پر اصرار تھا اور وہ کبر میں مبتلا تھا۔ اور حضرت موسیٰ کی دعوت کو رد کرنے پر تلا ہوا تھا۔

وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ (۴۰ : ۳۷) "اس طرح فرعون کے لیے اس کی بدعملی خوشنما بنا دی گئی اور وہ راہ راست سے روک دیا گیا"۔ اور اب وہ اس بات کا مستحق قرار پا گیا کہ اسے راستے سے روک دیا جائے کیونکہ وہ جس رویے کا اظہار کر رہا تھا' وہ صراط مستقیم سے دور اور انحراف کا رویہ تھا۔ نتیجہ یہ نکالا جاتا ہے کہ وہ بربادی اور ناکامی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

وَ مَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ (۴۰ : ۳۷) "اور فرعون کی ساری چالبازی تباہی کے راستہ ہی میں صرف ہوئی۔

---ooo---

اسی مذاق اور فریب اور گمراہی پر یہ اصرار کو دیکھ کر رجل مومن نے بھی مناسب سمجھا کہ ایک آخری بات ان سے کہہ دے۔ یہ بہت ہی بلند' واضح بات ہے۔ اس سے پہلے تو لوگوں کو یہ دعوت دی کہ میرا اتباع کرو' میں تمہیں سیدھی راہ کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ پھر اس نے لوگوں کو بتایا کہ یہ زندگی تو بہت ہی مختصر اور فانی زندگی ہے۔ اس لیے تم اس زندگی کا انتظام کرو جو باقی رہنے والی ہے اور آخرت کے دائمی عذاب سے بچو اور اس نے واضح طور پر بتایا کہ شرک کے عقیدے میں کیا کیا کمزوریاں ہیں :

وَ قَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۖ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ

هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَیٰقَوْمِ مَا لِیْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ۫ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَلَا فِی الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾

"وہ شخص جو ایمان لایا تھا' بولا "اے میری قوم کے لوگو' میری بات مانو' میں تمہیں صحیح راستہ بتاتا ہوں۔ اے قوم' یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے' ہمیشہ کے لیے قیام کی جگہ آخرت ہی ہے' جو برائی کرے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اس نے برائی کی ہو گی۔ اور جو نیک عمل کرے گا' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ ہو وہ مومن' ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ جہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا' اے قوم' آخر یہ کیا ماجرا ہے' کہ میں تو تم لوگوں کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم لوگ مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو! تم مجھے اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھیراؤں جنہیں میں نہیں جانتا' حالانکہ کہ میں تمہیں اس زبردست مغفرت کرنے والے خدا کی طرف بلا رہا ہوں۔ نہیں' حق یہ ہے اور اس کے خلاف نہیں ہو سکتا کہ جن کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو' ان کے لیے نہ دنیا میں کوئی دعوت ہے' نہ آخرت میں' اور ہم سب کو پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے' اور حد سے گزرنے والے آگ میں جانے والے ہیں۔ آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' عنقریب وہ وقت آئے گا' جب تم اسے یاد کرو گے۔ اور اپنا معاملہ میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں' وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے"۔

یہ وہ حقائق ہیں جن کے بارے میں اس سورت کے آغاز میں دو ٹوک الفاظ میں بتا دیا گیا تھا۔ یہاں رجل مومن اپنی تقریر میں فرعون کے سامنے ان کو دہراتا ہے۔ یہ فرعون کے سامنے کہتا ہے۔

یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ (۴۰ : ۳۸) "اے قوم' میری بات مانو' میں تمہیں صحیح راستہ بتاتا ہوں"۔ اس سے چند لمحے پہلے فرعون نے یہ کہا تھا:

وَمَآ اَهْدِیْكُمْ اِلَّا سَبِیْلَ الرَّشَادِ (۴۰ : ۲۹) "اور میں تو تمہیں سیدھے راستے کے سوا کوئی

راستہ نہیں بتاتا"۔ رجل مومن کی طرف سے گویا فرعون کو اس کی بادشاہت اور جباری و قہاری کے باوجود صریح چیلنج ہے۔ یہ چیلنج اس وقت دیا جا رہا ہے جبکہ اس کے پاس اس کے امرا ہامان اور قارون بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں فرعون کے وزیر تھے جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔

رجل مومن ان کے سامنے دنیا کی زندگی کی حقیقت یوں کھولتا ہے۔

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ (۴۰ : ۳۹) "یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے"۔ ایک ایسا سازوسامان ہے جو زائل ہونے والا ہے اس کے لیے ثبات و دوام نہیں ہے۔

وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ (۴۰ : ۳۹) "اور دار آخرت ہی ہمیشہ قیام کی جگہ ہے"۔ آخرت اصل ہے اور اسے زیادہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔

پھر وہ یہ بات دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہے کہ

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ (۴۰ : ۴۰) "جو برائی کرے گا اس کو اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنی اس نے برائی کی ہو گی اور جو نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ ہو وہ مومن' ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے' جہاں ان کو بے حساب رزق دیا جائے گا"۔

اللہ کے فضل وکرم کا تقاضا ہوا کہ نیکیوں کو بڑھایا جائے اور بغیر حساب معاوضہ ہو اور برائیوں کو نہ بڑھایا جائے۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے اپنے بندوں پر۔ بندوں کی کمزوریوں کا اللہ نے خیال رکھا ہے اور خیر اور بھلائی کے کاموں کو پرکشش بنانے کے لیے اللہ نے ان کے اجر کو زیادہ رکھا تاکہ لوگ اس راہ پر ثابت قدمی سے گامزن ہوں۔ اللہ نے نیکی کو سیئات اور برائیوں کا کفارہ بنا دیا اور جب وہ اس نرم حساب و کتاب کے بعد جنت میں پہنچیں گے تو وہاں بغیر حساب و کتاب ان کو دیا جائے گا۔ یہ رجل مومن اپنی تقریر میں ان پر تنقید بھی کرتا ہے کہ وہ تو ان کو راہ نجات کی طرف بلاتا ہے۔ جنتوں کی طرف بلاتا ہے' اور وہ اسے آگ کی طرف بلا رہے ہیں۔ وہ سرزنش کے انداز میں کہتا ہے :

وَ يٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ (۴۰ : ۴۱) "اے قوم' آخر یہ کیا ماجرا ہے کہ میں تو تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو"۔ انہوں نے تو بظاہر اس کو آگ کی طرف نہیں بلایا' شرک کی طرف بلایا۔ ظاہر ہے کہ شرک کی طرف بلانے اور آگ کی طرف بلانے میں کیا فرق ہے۔ یہ ایک ہی بات ہے اور اگلی آیت میں بات صاف کر دیتا ہے۔

تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَّ اَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ (۴۰ : ۴۲) "تم مجھے اس بات کی طرف دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ سے کفر کروں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو

شریک ٹھہراؤں جنہیں میں نہیں جانتا حالانکہ میں تمہیں زبردست مغفرت کرنے والے خدا کی طرف بلاتا ہوں"۔ اور ان دونوں دعوتوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے۔ میری دعوت تو بہت واضح اور صاف ہے۔ عزیز و غفار کی طرف سے یہ دعوت۔ ایک ایسے اللہ وحدہ کی طرف دعوت ہے جس کی وحدانیت پر اس کائنات کے تمام آثار شاہد ہیں اور اس کی قدرت اور حکمت پر اس کائنات کی ہر چیز شاہد عادل ہے۔ وہ ان کو اس کی طرف بلاتا ہے جو مغفرت کرنے والا ہے تاکہ بخش دے۔ جو بہت بڑا بخشنے والا ہے۔ اور یہ لوگ اس رجل مومن کس طرف بلاتے ہیں؟ کفر کرنے کے لیے ' شرک کرنے کے لیے ' جس کا اسے کوئی علم نہیں ہے۔ محض دعویٰ ہے ' اوہام ہیں اور افسانے ہیں جن پر ان کا عقیدہ ہے۔ وہ ان کو دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہے کہ جن ہستیوں کو تم نے خدا کا شریک بنا رکھا ہے۔ ان کی تو نہ دنیا میں کوئی پوزیشن ہے اور نہ آخرت میں کوئی پوزیشن ہے۔ آخر کار تمام انسانوں کو تو صرف اللہ کے ہاں لوٹنا ہے۔ اور یہ تم لوگ جو اسراف کرتے ہو اور حدود کو پار کرتے ہو تمہارے لیے تو جہنم کے سوا کچھ نہیں ہے۔

لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَا فِی الْاٰخِرَةِ وَ اَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَی اللّٰهِ وَ اَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (۴۰ : ۴۳) "حق یہ ہے اور اس کے خلاف نہیں ہو سکتا کہ جن کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو ' ان کے لیے نہ دنیا میں کوئی دعوت ہے ' نہ آخرت میں اور ہم سب کو پلٹنا اللہ ہی کی طرف ہے اور حد سے گزرنے والے آگ میں جانے والے ہیں"۔ عقائد کے حوالے سے یہ بنیادی باتیں دو ٹوک انداز میں بیان کر دینے کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ یہ سب باتیں اس رجل مومن نے فرعون ' اس کے درباریوں اور وزراء سامنے کر دیں ' بغیر کسی جھجک اور شف شف کے۔ پہلے تو وہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا لیکن تقریر کے آخر میں اس نے اس کا اظہار کر دیا۔ اب صرف یہ بات رہتی ہے کہ حق تبلیغ ادا کرنے کے بعد وہ تمام امور کو اللہ پر چھوڑ دے۔ اس نے بات کہہ دی ' اس کا ضمیر مطمئن ہو گیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ لے کاش! عنقریب تم میری باتوں کو یاد کرو گے لیکن اس وقت اس نصیحت کا تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ حقیقت میں معاملات کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ (۴۰ : ۴۴) "آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں عنقریب وہ وقت آئے گا جب تم اسے یاد کرو گے اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے"۔ اب اس پر یہ تقریر اور مکالمہ ختم ہوتا ہے۔ رجل مومن نے کلمہ حق اس کائنات کے ضمیر میں ریکارڈ کرا دیا اور قرآن نے اسے لازوال دوام بخشا۔

--- ○○○ ---

یہاں سیاق کلام حضرت موسیٰ اور فرعون کی طویل کشمکش کی بعض کڑیوں کو مجمل کر دیتا ہے۔ اب یہاں بنی اسرائیل کے فرار اور نجات اور فرعون کی غرقابی کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس پر تبصرے کیے جاتے ہیں۔ برزخی زندگی میں اس کا حال یہ ہو گا۔

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝٤٥ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝٤٦ وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ۝٤٧ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ۝٤٨ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۝٤٩ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰۗؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝٥٠ ع

۵ ۱۳ع

۱۰

”آخر کار ان لوگوں نے جو بری سے بری چالیں اس مومن کے خلاف چلیں' اللہ نے ان سب سے اس کو بچا لیا' اور فرعون کے ساتھ خود بدترین عذاب کے پھیر میں آ گئے۔ دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح و شام وہ پیش کیے جاتے ہیں اور جب قیامت کی گھڑی آ جائے گی تو حکم ہو گا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔ پھر ذرا خیال کرو اس وقت کا جب یہ لوگ دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہوں گے۔ دنیا میں جو لوگ کمزور تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ ”ہم تمہارے تابع تھے' اب کیا یہاں تم نار جہنم کی تکلیف کے کچھ حصے سے ہم کو بچا لوگے“؟ وہ بڑے بننے والے جواب دیں گے ”ہم سب یہاں ایک حال میں ہیں' اور اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے“۔ پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے اہل کاروں سے کہیں گے ”اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن کی تخفیف کر دے“۔ وہ پوچھیں گے ”کیا تمہارے پاس رسول بینات لے کر نہیں آتے رہے تھے؟“ وہ کہیں گے ”ہاں“۔ جہنم کے اہل کار بولیں گے :”پھر تو تم ہی دعا کرو' اور کافروں کی دعا اکارت ہی جانے والی ہے“۔

یہاں اس دنیا کے صفحات کو لپیٹ دیا جاتا ہے اور کتاب دنیا کا آخری صفحہ جو ہم نے پڑھا یہ ہے کہ رجل مومن جس نے کلمۂ حق نہایت بے باکی کے ساتھ کہا اور چلا گیا تو اس کو اللہ نے فرعون کی بری اور گہری مکاریوں سے بچا لیا۔ فرعون اور اس کے حاشیہ نشین نہ اسے اس دنیا میں گزند پہنچا سکے اور نہ آخرت میں جبکہ فرعون اور اس کے تمام ساتھی ایک نہایت ہی برے عذاب میں گھر گئے۔

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (٤٠ : ٤٦) ”دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے یہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں اور جب

قیامت کی گھڑی آئے گی تو حکم ہو گا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو"۔ آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ صبح و شام ان کو آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کے زمانے میں ' یہ ہو گا عذاب قبر۔ کیونکہ اس کے بعد یہ فقرہ آتا ہے۔

وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۰:۴۶) "اور جب قیامت کی گھڑی آئے گی تو حکم ہو گا کہ آل فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو"۔ لہٰذا آگ پر پیش کرنے کا عذاب قیامت سے پہلے کا عذاب ہو گا اور یہ بہت ہی سخت سزا ہے کہ صبح و شام ان کو آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ اسے دیکھتے اور سوچتے ہیں کہ یہ آگ ہے جو انہیں جلائے گی۔ اس کی حرارت تو ان کو بہرحال پہنچے گی۔ یہ بھی شدید عذاب ہے کیونکہ لفظ عرض قرآن میں چھونے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ عملاً انہیں صبح و شام آگ میں جلایا جاتا ہے اور قیامت کے دن پھر مستقلاً شدید ترین عذاب میں داخل ہوں گے۔

لیکن اگلی آیت میں اب جو منظر ہے اس میں قیامت عملاً برپا ہے۔ ایک جھلک جہنم کی دکھائی جاتی ہے۔ جہاں وہ یوں جھگڑتے ہیں:

فَیَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا کُنَّا لَکُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِیْبًا مِّنَ النَّارِ (۴۰:۴۷) "دنیا میں جو لوگ کمزور تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے 'ہم تمہارے تابع تھے' اب کیا یہاں تم نار جہنم کی تکلیف کے کچھ حصے سے ہم کو بچا لو گے"۔ اس وقت ضعفاء بھی مستکبرین کے ساتھ جہنم میں ہوں گے۔ یہ بات ان کے لیے مفید نہ ہو گی کہ وہ دوسروں کے تابع مہمل تھے اور ماتحت تھے۔ ان کے لیے یہ بات مفید نہ ہو گی کہ انہیں تو دنیا میں بھیڑ بکریوں کی طرح چلایا جا رہا تھا۔ اور ان کی کوئی رائے اور کوئی ارادہ نہ تھا اور نہ اختیارات تھے۔

اللہ نے تو ان کو بہت بڑا مرتبہ دیا تھا' انسانی کرامت اور شرافت دی تھی اور یہ شرافت دی تھی کہ ہر ایک فرد اپنے کیے کا ذمہ دار ہے۔ اور ہر فرد کو آزادی اور حریت دی تھی لیکن انہوں نے از خود ان سب باتوں کو ترک کر دیا اور از خود انہوں نے ان بڑے اور سرکشوں کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ اس لیے اب یہ لوگ ان کبراء سے کیوں شکایت کرتے ہیں بلکہ وہ اس شکایت کے بارے میں سوچتے کیوں ہیں بلکہ یہ جو شکایت کرتے ہیں اس کے بارے میں انہوں نے سوچا ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

اِنَّا کُنَّا لَکُمْ تَبَعًا (۴۰:۴۷) "ہم تمہارے تابع تھے"۔ لیکن یہ اس لیے تو تابع نہ ہوئے تھے اور اپنی آزادی سے اس لیے تو دستکش نہ ہوئے تھے کہ اللہ کے ہاں یہ کبراء کوئی شفاعت کریں گے۔ وہ تو اس وقت آگ میں جل رہے ہیں اور یہاں تک کبراء ہی نے ان کو پہنچایا ہے' جس طرح وہ دنیا میں ان کو چلاتے تھے' اس طرح جیسے بھیڑ بکریوں کو چلایا جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ ان کبراء سے پوچھتے ہیں۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِیْبًا مِّنَ النَّارِ (۴۰:۴۷) "اب کیا یہاں تم نار جہنم کی تکلیف کے کچھ

حصے سے ہم کو بچالو گے"۔ جس طرح زمین میں تمہارا دعویٰ تھا کہ ہم عوام کو سیدھے راستے کی طرف لے جاتے ہیں اور فساد سے بچاتے ہیں اور شر اور تکلیفوں اور دکھوں سے اور دشمنوں کی سازشوں سے بچاتے ہیں۔

رہے وہ لوگ جو دنیا میں بڑے بنے ہوئے تھے۔ وہ اس سوال کا جواب بڑی ترشی سے دیتے ہیں 'کیونکہ وہ جہنم کے عذاب میں جل رہے ہیں' نہایت ہی تنگدلی کے ساتھ' وہ دوٹوک الفاظ میں' جواب دیتے ہیں اور استکبار کے بعد اب اجرام کا اقرار کرتے ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ (۴۰ : ۴۸) "بڑے بننے والے جواب دیں گے 'ہم سب یہاں ایک حال میں ہیں اور اللہ بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا ہے"۔ ہم سب اس میں ہیں

اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ (۴۰ : ۴۸) "ہم سب اسی میں ہیں" اب ہم سب ضعفاء ہیں۔ کوئی معاون اور کوئی مددگار نہیں ہے۔ سب رنج و الم میں مبتلا ہیں' سب کے سب درد و کرب میں ہیں۔ اس لیے تمہارا سوال احمقانہ ہے۔ یہاں تو کبراء و ضعفاء سب ہی مر رہے ہیں۔ اللہ نے فیصلہ سب کا کر دیا ہے' اس پر کوئی اپیل نہیں ہو سکتی' اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ یہ فائنل فیصلہ ہے۔ بندوں میں سے تو کوئی اللہ کے کسی فیصلے کی سزا میں کمی نہیں کر سکتا۔

جب دونوں نے معلوم کر لیا کہ اللہ کے سوا کوئی شنوائی نہیں کر سکتا تو یہ لوگ اب جہنم کے داروغہ کی طرف جاتے ہیں' نہایت ہی ذلت کی حالت میں' نہایت ہی عاجزی اور بے کسی میں' اور یہ حالت کبراء و ضعفاء' دونوں پر طاری ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ (۴۰ : ۴۹) "پھر یہ دوزخ میں پڑے ہوئے لوگ جہنم کے اہل کاروں سے کہیں گے "اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے عذاب میں بس ایک دن کی تخفیف کر دے"۔ اب یہ جہنم کے اہل کاروں کی سفارش لانے کی سعی کریں گے کہ وہ ان کی درخواست پیش کریں' ان اہل کاروں سے امیدیں وابستہ کریں گے کیونکہ عذاب سخت ہے۔ اور تم لوگ رب تعالیٰ سے صرف ایک دن کی معافی دلوادو۔ صرف ایک دن۔ کہ ایک دن کے لیے تو ہم سانس لے سکیں اور ایک دن ہی تو آرام سے گزر جائے۔ جہنم میں ایک دن بھی اس قدر اہم ہو گا کہ اس کے لیے یہ عاجزانہ التماس کر رہے ہیں۔

لیکن جہنم کے اہل کار اس عاجزانہ درخواست پر بحث ہی نہیں کرتے۔ جو نہایت ہی ذلت اور مصیبت میں دی گئی ہے کیونکہ ان کو اللہ کے قواعد معلوم ہیں۔ ان کو سنت الہیہ کا علم ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ ان لوگوں نے وقت گنوا دیا ہے۔ لہٰذا وہ ان کو ملامت کر کے مزید دکھ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اب تو سوچو کہ اس حالت زار تک کس طرح پہنچے۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا بَلٰى (۴۰ : ۵۰) "وہ پوچھیں گے کیا تمہارے پاس تمہارے رسول نشانیاں لے کر نہیں آتے رہے تھے۔ وہ کہیں گے ہاں"۔ جہنم کے اہل کار ان کا یہ سوال جواب ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ بات یہاں ختم ہو جائے۔ اب جہنم کے اہل کار ان سے دامن جھاڑ لیتے ہیں اور نہایت ہی حقارت اور استہزاء کے ساتھ ان کو اس مایوسی میں ڈوبا ہوا چھوڑ دیتے ہیں۔

قَالُوْا فَادْعُوْا (٤٠ : ٥٠) "پھر تو تم دعا کرو" ۔ اگر یہ دعا تمہاری اس حالت کے اندر کوئی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے ۔۔۔ اور آخر میں یہ تبصرہ آتا ہے :

وَ مَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (٤٠ : ٥٠) "اور کافروں کی دعا اکارت ہی جانے والی ہے" ۔ وہ مقام تک نہیں پہنچ سکتی ۔ وہ نہ جگہ تک پہنچتی ہے اور نہ اس کا جواب آتا ہے ۔ یوں ضعفاء اور کبراء دونوں کو ناقابل التفات حالت میں چھوڑ دیا جاتا ہے ۔

--- ○○○---

جہنم کے اس فیصلہ کن موقف کے بعد پھر آخری تبصرہ یہ ہے ۔ یہ تمام مخلوق کے لیے سبق ہے ۔ اس سے قبل اس طرف اشارہ آیا تھا کہ جو گروہ اور پارٹیاں اللہ کے عذاب کو دعوت دیتی ہیں اور رسول کی تکذیب کرتی ہیں اور زمین میں استکبار کا رویہ اختیار کرتی ہیں ، قیامت میں تو ان کا یہ حال ہو گا ہی دنیا میں بھی بے غم نہ رہیں گے ۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿٥١﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿٥٢﴾ وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَ اَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿٥٣﴾ هُدًى وَّ ذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿٥٤﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴿٥٥﴾

"یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں ، اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے ، جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان پر لعنت پڑے گی اور بد ترین ٹھکانا ان کے حصے میں آئے گا ۔ آخر دیکھ لو کہ موسیٰ کی ہم نے رہنمائی کی اور بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنا دیا جو عقل و دانش رکھنے والوں کے لیے ہدایت و نصیحت تھی ۔ پس اے نبی صبر کرو ، اللہ کا وعدہ برحق ہے ، اپنے قصور کی معافی چاہو اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو" ۔

اس دو ٹوک موقف پر یہ فیصلہ کن تبصرہ بہت ہی مناسب ہے ۔ انسانیت کو معلوم ہو گیا کہ حق و باطل کی کشمکش کا آخری انجام کیا ہوا کرتا ہے ۔ اس دنیا میں دونوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور آخرت میں دونوں کا انجام کیا ہو گا ۔ انسانوں نے دیکھ لیا کہ فرعون اور اس کے سرداروں کا انجام اس دنیا میں کیا ہوا جس طرح انہوں نے قیامت کے منظر میں دیکھ لیا کہ وہ آگ میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ لڑ رہے تھے ۔ اور ان کو نہایت حقارت کے ساتھ ناقابل التفات چھوڑ دیا گیا ۔ ہر کشمکش کا فیصلہ یہی ہوتا ہے جس طرح قرآن کا صریح فیصلہ ہے ۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (۴۰:۵۱) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ

الدَّارِ (۴۰:۵۲) "یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں' اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے' جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان پر لعنت پڑے گی اور بدترین ٹھکانا ان کے حصے میں آئے گا"۔ رہی آخرت تو کسی مومن کی جانب سے تو اس کے بارے میں کسی بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر بحث ہو سکے۔ رہی دنیا میں نصرت تو اس کی تشریح کی ضرورت ہے۔

بہرحال اللہ کا فیصلہ اور وعدہ تو یقینی ہے۔ قطعی الفاظ میں ہے۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۴۰:۵۱) "بے شک ہم اپنے رسولوں اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں مدد کرتے ہیں"۔ لیکن لوگوں کا مشاہدہ یہ ہے کہ رسولوں میں سے بعض تو قتل بھی کیے گئے' بعض کو اپنی زمین سے بھی نکالا گیا۔ ان کو اپنا گھر اور قوم چھوڑنا پڑی اور علاقہ بدر کر دیئے گئے۔ مومنین میں سے بعض بعض کو سخت عذاب دیا جاتا ہے۔ بعض کو گڑھوں میں جلایا جاتا ہے' بعض شہید ہوتے ہیں' بعض نہایت دکھ درد اور مصیبتیں جھیلتے ہیں تو پھر یہ قطعی وعدہ کس طرح ہے کہ ہم حیات دنیا میں اپنے رسولوں اور مومنین کی مدد کرتے ہیں۔ اس سوال کے ذریعہ شیطان اللہ کے بندوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور ان کے ساتھ کیا کچھ کرتا ہے؟ تو حقیقت کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ تمام امور کے ظاہری پہلو ہی کو جانتے ہیں۔ ان کے سامنے وہ بیشتر قدریں اور حقائق نہیں ہوتے۔ جن کا تعلق اللہ کے نظام قضا و قدر سے ہوتا ہے --- پھر لوگوں کی سوچ' اعمال و نتائج کے بارے میں ایک محدود زمانے تک محدود ہوتی ہے اور انسان کے قیاس اور سوچ کا دائرہ محدود ہوتا ہے' رہے اللہ کے فیصلے تو زمان و مکان کے اعتبار سے ان کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک زمانے اور دوسرے زمانے میں جدائی نہیں کرتا۔ ایک علاقے اور دوسرے علاقے میں فرق نہیں کرتا۔ اگر ہم زمان و مکان کے حدود سے آگے بڑھ کر ایمان کے مسئلہ پر سوچیں تو حقیقت یہ سامنے آئے گی کہ ایمان کامیاب رہتا ہے۔ ایمان اور عقیدے کی کامیابی دراصل ان لوگوں کی کامیابی ہوتی ہے جو ایمان اور عقیدے کو اپناتے ہیں۔ اہل ایمان کا ایمان سے باہر کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ اور ایمان کا پہلا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ ایمان لانے والے اس میں فنا ہو جائیں۔ وہ خود مٹ جائیں اور ایمان کو نمایاں کر دیں۔

پھر نصرت کا مفہوم بھی لوگوں کے ہاں محدود ہے۔ وہ قریبی نصرت دیکھتے ہیں جسے وہ خود دیکھ سکیں۔ لیکن نصرت کی اشکال تو بے شمار ہیں۔ بعض اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ انسان کو نصرت بظاہر شکست نظر آتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا جاتا ہے لیکن وہ اپنے عقیدے اور دعوت سے نہیں پھرتے۔ سوال یہ ہے کہ ان کو نصرت ہوئی یا وہ شکست کھا گئے۔ ایمان کے پیمانوں سے دیکھا جائے تو ان کو فتح ہوئی۔ اس وقت بھی وہ فاتح تھے' جب ان کو آگ میں پھینکا

جا رہا تھا اور اس وقت بھی وہ فاتح تھے جب ان کو نجات دی گئی ـ یہ بھی فتح کی ایک صورت ہے اور آگ کا گلزار ہونا بھی اس کی ایک صورت ہے ـ جبکہ بظاہر دونوں کی صورتیں مختلف ہیں ـ لیکن اپنی اصلیت میں دونوں ایک ہیں ـ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کربلا میں شہادت پاتے ہیں' یہ ایک دلدوز واقعہ ہے ـ یہ فتح تھی یا شکست ـ اگر بظاہر محدود پیمانوں سے دیکھا جائے تو شکست تھی ـ اور اگر حقیقت کے پیمانوں سے دیکھا جائے تو یہ عظیم فتح ہے ـ

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حسین کو آج تک محبت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے ـ آج تک لوگوں کے دل حسین کے ساتھ ہیں ـ آج تک لوگ ان پر فدا ہوتے ہیں جبکہ فاتح یزید کا نام و نشان غائب ہے ـ حسین پر شیعہ سنی سب فدا ہیں اور یزید کے بارے میں کوئی نہیں کہتا کہ وہ اولاد یزید ہے یا یزیدی ہے ـ

کئی ایسے شہداء ہیں کہ اگر وہ ہزار سال زندہ رہتے تو اپنے نظریات کو پھیلا نہ سکتے ـ لیکن ایک شہادت سے ان کے نظریات اقطار عالم تک پھیل گئے ـ کوئی بھی شہید اپنے بیان اور تقریروں سے عوام کو بلند مقاصد عطا نہیں کر سکتا ـ نہ عوام کو بلند مقاصد کے لیے ابھار سکتا ہے ـ لیکن اپنے خون کے ذریعہ وہ جو خطبہ دیتا ہے اور وہ اس کا آخری خطاب ہوتا ہے ـ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محرک ہوتا اور نسلوں تک نشان منزل رہتا ہے ـ اور بعض اوقات تو ایک شہید جو راہ متعین کرتا ہے صدیوں تک تاریخ اس پر چلتی رہتی ہے اور قافلے اسی راہ پر گامزن رہتے ہیں ـ

تو پھر فتح کیا ہے اور ہزیمت کیا ہے؟ ہمیں چاہئے کہ فتح و شکست کے جو پیمانے ہم نے اپنے ذہنوں میں قائم کر رکھے ہیں ان پر ذرا نظر ثانی کریں ـ اور اس کے بعد پھر پوچھیں کہ اللہ کی وہ مدد کہاں ہے' جس کا وعدہ اللہ نے مومنین سے کیا ہے' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ـ

ہاں بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ جب ظاہری صورت حال' اللہ کے اعلیٰ اور دور رس پیمانوں کے ساتھ موافق ہو جاتی ہے تو فوری فتح بھی نصیب ہو جاتی ہے ـ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے اپنی زندگی ہی میں نصرت اور کامرانی عطا فرمائی تھی کیونکہ دنیا میں اسلامی نظریہ حیات کی حقیقت اور یہ نصرت ساتھ ساتھ قائم ہو گئی تھیں ـ عقیدے کو نصرت تب ملتی ہے جب عقیدہ انسانی سوسائٹی پر غالب آجائے اور وہ سوسائٹی اس کے رنگ میں رنگ کر اس کے اندر ڈوب جائے ـ ایک فرد' ایک جماعت اور ایک قوت حاکمہ سب کی سب اس میں ڈوب جائیں تو پھر اللہ ایسے داعیوں اور ایسی دعوت کی مدد کرتا ہے اور یہ نظریہ اور یہ نظام اپنی حقیقی صورت میں پھر قائم ہو جاتا ہے اور یہ نظام غالب ہو کر تاریخ پر اپنے نقوش چھوڑتا ہے ـ اور تاریخ پر اس کے یہ نقوش نمایاں نظر آتے ہیں ـ یوں قریبی نصرت کی صورت اور دور رس مقاصد کی صورت باہم متصل ہو جاتی ہیں ـ اب بظاہر نصرت عاجلہ ظہور میں آتی ہے جو دور رس سنت الٰہیہ کا حصہ ہوتی ہے ـ یوں سنت الٰہیہ اور تقدیر الٰہی کے اندر ایک فوری فتح کی صورت پیدا ہو جاتی ہے ـ

اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس کو مدنظر رکھنا ضروری ہے ـ اللہ کا وعدہ اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کے ساتھ قائم ہے ـ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ وعدے کے مستحق ہونے والے مومنین کے دلوں کے اندر حقیقت ایمان صحیح طرح قائم اور جاگزیں ہو جائے تاکہ اس پر اللہ کا وعدہ مرتب ہو ـ حقیقت ایمان کے سلسلے میں بسا اوقات لوگ سہل

انکاری سے کام لیتے ہیں ۔ ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ قلب مومن میں شرک کا شائبہ تک نہ رہے ۔ کسی قسم کی شرک بھی دل کے قریب نہ ہو ۔ شرک کی بعض صورتیں نہایت خفیہ ہوتی ہیں ۔ ان سے دل پاک و صاف اس وقت ہوتا ہے جب انسان صرف اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہو ۔ اور صرف اللہ وحدہ پر توکل کرے ۔ اور اللہ انسان کے بارے میں جو فیصلہ کرے اس پر وہ مطمئن ہو جائے ۔ اور انسان اپنے آپ کو تقدیر الٰہی کے سپرد کر دے ۔ انسان کے اندر یہ احساس ہو کہ اس کے معاملات میں صرف اللہ ہی متصرف ہے ۔ لہٰذا اس کے لیے اللہ جو اختیار کرتا ہے اس پر وہ کسی حال میں حیران نہ ہو اور اس کو جو پیش آئے اسے نہایت اطمینان ' اعتماد اور سر تسلیم خم کر کے قبول کرے ۔ جب انسان تسلیم و رضا کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے تو وہ بھی اللہ کے آگے نہیں بڑھتا اور جلد بازی نہیں کرتا ۔ اور اللہ کے سامنے فتح و نصرت اپنی پسندیدہ صورت میں پیش نہیں کرتا ۔ اپنے معاملات اللہ کے حوالے کر دیتا ہے اور اپنی راہ پر گامزن رہتا ہے ۔ اسے اسی راہ میں جو بھی پیش آتا ہے ' وہ اسے خیر سمجھتا ہے ۔ یہ ہے حقیقی نصرت ...... یہ ہے نصرت اور فتح اپنی ذات ' اپنی خواہشات پر ۔ یہ ہے اندرونی فتح اور خالص فتح تب ہی حاصل ہوتی ہے ' جب اندرونی فتح مکمل ہو ۔

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ (۴۰ : ۵۱) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْءُ الدَّارِ (۴۰ : ۵۲) "یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیائی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں ' اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے ' جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان پر لعنت پڑے گی اور بدترین ٹھکانا ان کے حصے میں آئے گا" ۔

سابقہ منظر میں ہم نے دیکھا کہ ظالموں کے لیے کوئی معذرت مفید نہیں ہے ۔ اور ان کا انجام یہ ہوا کہ ان پر لعنت پڑی اور جہنم رسید ہوئے ۔ رہی یہ بات کہ اللہ رسولوں کی مدد کس طرح کرتا ہے تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ نے مدد فرمائی ۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدٰى وَ أَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَآءِيلَ الْكِتٰبَ (۴۰ : ۵۳) هُدًى وَّ ذِكْرٰى لِأُولِي الْأَلْبَابِ (۴۰ : ۵۴) "آخر کار دیکھ لو کہ موسیٰ کی ہم نے رہنمائی کی اور بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنا دیا جو عقل و دانش رکھنے والوں کے لیے ہدایت و نصیحت تھی" ۔ یہ اللہ کی نصرت کا ایک نمونہ تھا کہ حضرت موسیٰ کو کتاب دی ' ہدایت دی اور پھر نجات دی ۔ یہاں بطور مثال قصہ موسیٰ کی طرف اشارہ کر دیا ۔ یہ قصہ بہت ہی طویل ہے اور اس میں نصرت اور تائید خداوندی کے کئی نمونے ہیں ۔

اس مثال کے بعد ایک آخری تسلی کیونکہ مکہ میں مسلمان اور رسول اللہ بہت ہی مشکل حالات میں زندگی بسر فرما رہے تھے ' ان کو تسلی دی جا رہی ہے کہ نصرت ضرور آئے گی اور رسول اللہ کے بعد جو لوگ دعوت اسلامی کا کام کر رہے ہیں اور ایسے ہی حالات میں ہیں ' ان کے لیے بھی ایسی ہی تسلی ہے ۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ (۴۰ : ۵۵)

"اے نبی 'صبر کرو' اللہ کا وعدہ برحق ہے' اپنے قصوروں کی معافی چاہو اور صبح و شام اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو"۔ عقل و خرد کی تاروں پر یہ آخری ضرب ہے۔ صبر کی دعوت' لوگوں کی جانب سے تکذیب پر صبر کرو' اس پر صبر کرو کہ باطل کو اقتدار اور قوت حاصل ہے اور اس کی وجہ سے وہ پھیل رہا ہے لیکن یہ ایک عرصے کے لیے ہے' لوگوں کے مزاج۔ ان کے اخلاق اور ان کے معاملات کی غلطیوں پر صبر کرو' انسان کے نفس' اس کی خواہشات اور چاہتوں پر صبر کرو' خصوصاً جب نفس یہ چاہے کہ اللہ کی نصرت بہت جلد آنی چاہئے اور نصرت کے نتیجے میں ہونے والی کامیابیوں اور تحریک اسلامی کی طویل جدوجہد میں دشمنوں سے بھی پہلے دوستوں کی طرف سے پیدا کی جانے والی مشکلات پر صبر کرو۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (۴۰ : ۵۵) "اے نبی صبر کرو' اللہ کا وعدہ حق ہے"۔ دیر آید درست آید۔ اگر آپ کے معاملات پیچیدہ ہوں۔ اگر بظاہر اسباب نصرت نہ نظر آتے ہوں' کیونکہ نصرت کا وعدہ وہ ذات باری کر رہی ہے جو اپنے وعدے کو حقیقت کا جامہ پہنا سکتی ہے اور اللہ نے وعدہ کیا ہے تو اللہ نے ارادہ کر لیا ہے۔

وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ (۴۰ : ۵۵) "اور اپنے قصور کی معافی چاہو اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو"۔ یہ ہے اصلی زادسفر۔ نہ راہ بہت طویل ہے اور دشوار گزار ہے۔ اس میں وہی شخص آگے قدم بڑھا سکتا ہے جو اپنے قصوروں کی معافی چاہتا رہے' جو حمد باری تعالیٰ کرتا رہے اور حمد کے ساتھ اللہ کی تسبیح اور پاکی بیان کرتا رہے۔ اس میں نصرت بھی مل سکتی ہے' اور نفس انسانی کی تربیت بھی۔ اور اس راستے پر چلنے کی تیاری بھی اور قلب و نظر کی تطہیر بھی۔ یہ وہ نصرت ہے جو قلت تعداد کے اندر بھی اپنا کام کرتی ہے اور اس کے بعد نصرت کی وہ صورت سامنے آتی ہے جو زندگی کی عملی صورت میں ہوتی ہے۔

صبح و شام کا ذکر یا تو اس لیے ہے کہ اس سے مراد پورا وقت ہے کیونکہ صبح و شام اوقات کے اطراف ہیں۔ یا ان اوقات میں انسانی قلب صاف اور متوجہ ہوتا ہے اور ان اوقات میں غور و فکر اور اللہ کی حمد و تسبیح کے اثرات گہرے ہوتے ہیں۔

یہ ہے وہ منہاج جس کے مطابق اللہ کی نصرت حاصل ہو سکتی ہے اور اسے اللہ نے اپنی نصرت دینے کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اسی کے مطابق اس راستے پر چلنے کی تیاری ہوگی' زادسفر تیار ہوگا۔ اور تب نصرت ملے گی اور کسی بھی معرکے کے لیے تیاری اور ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی جنگ بغیر تربیت اور سامان کے نہیں ہو سکتی۔

---ooo---

درس نمبر ۲۲۵ ایک نظر میں

یہ سبق اپنے موضوع اور مضمون کے اعتبار سے پوری طرح سابق سبق سے بالکل مربوط اور یکساں ہے۔ اس سبق میں وہی مضمون آگے چلتا ہے جو پہلے سبق کے آخر میں چھوڑا گیا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ لوگ دعوت اسلامی کی جو ناحق تکذیب کرتے ہیں۔ آپ اس پر صبر کریں۔ وہ آپ کو ایذا دیتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف آنے سے روکتے ہیں' یہ سب کچھ وہ اپنے جھوٹے فخر و غرور کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگ بغیر دلیل و برہان کے اللہ کی آیات میں کیوں جھگڑتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ہیں تو بہت چھوٹے اور بونے مگر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں اور یہ کبر ان کے دلوں میں بیٹھا ہے اور حق کو تسلیم کرنے سے مانع ہو رہا ہے۔

چنانچہ ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم بڑے ہو یا اللہ کی بنائی ہوئی یہ کائنات بڑی ہے۔ ذرا آسمانوں کی دوریوں پر غور کرو اور اس زمین پر غور کرو' تمہیں نظر آ جائے گا کہ تم کتنے بڑے ہو۔ یہ سبق آگے بڑھتا اور اس کائنات کی بعض نشانیوں کو بیان کرتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ دیکھو ان عظیم نشانیوں کو اس چھوٹے اور کمزور انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ خود انسانی ذات پر اللہ نے جو فضل و کرم کیے ہیں۔ ذرا ان پر تو غور کرو' کیا یہ سب چیزیں اللہ وحدہ کے وجود اور اس کی بادشاہت اور وحدانیت پر مکمل دلیل نہیں ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جاتا ہے کہ آپ کلمہ توحید بلند کریں اور ان الہوں سے منہ پھیرلیں جن کی پرستش یہ لوگ کرتے ہیں۔ اس سبق کا خاتمہ ایک ایسے خوفناک منظر کے ساتھ ہوتا ہے جو قیامت کے مناظر میں سے ہے۔ ان کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے وہاں ان سے پوچھا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ تمہارے الہ۔ اور اس کا خاتمہ بھی درس سابق کے خاتمہ کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تلقین پر ہوتا ہے کہ آپ صبر فرمائیں۔ چاہے اللہ آپ کو اسلامی انقلاب کا کچھ حصہ دکھاوے' یا آپ کو اٹھالے۔ قبل اس کے کہ نصرت آئے۔ یہ معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور سب نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۲۵ تشریح آیات

۵۶ --- تا --- ۷۷

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۙ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَا هُمْ بِبَالِغِيهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿٥٦﴾ لَخَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٥٧﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ قَلِيلًا مَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٥٨﴾ إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٥٩﴾ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾

۶ ع ۱۰ ۱۱

”حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی سند و حجت کے بغیر' جو ان کے پاس آئی ہو' اللہ کی آیات میں جھگڑ رہے ہیں' ان کے دلوں میں کبر بھرا ہوا ہے' مگر وہ اس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جس کا وہ گھمنڈ رکھتے ہیں۔ بس اللہ کی پناہ مانگ لو' وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسان کو پیدا کرنے کی بہ نسبت یقیناً زیادہ بڑا کام ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائیں اور ایماندار و صالح اور بدکار برابر ٹھہریں مگر تم لوگ کم ہی کچھ سمجھتے ہو۔ یقیناً قیامت کی گھڑی آنے والی ہے' اس کے آنے میں کوئی شک نہیں' مگر اکثر لوگ نہیں مانتے۔ تمہارا رب کہتا ہے ”مجھے پکارو' میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا' جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں' ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے“۔

یہ انسان بسا اوقات اپنے آپ کو بھول جاتا ہے' یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اس کائنات کی ایک چھوٹی اور ضعیف مخلوق ہے۔ یہ بذات خود قوت کا سرچشمہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنی قوت دراصل قوت کے اصلی سرچشمے سے اخذ کرتا ہے' یعنی اللہ

ہے ۔ جب اللہ سے اس کا رابطہ کٹ جاتا ہے تو پھر وہ پھولنا سوجنا شروع ہو جاتا ہے ' اونچا ہونا اور سرکش ہونا شروع ہو جاتا ہے ۔ اور اس کے دل میں یہ بات بیٹھنا شروع ہو جاتی ہے کہ وہ کوئی بہت بڑی چیز ہے اور اس کی یہ سوچ شیطان سے اخذ ہوتی ہے جو اس کبر ہی کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوا اور پھر اللہ نے اسے انسان پر مسلط کر دیا ' جس پر وہ ہر طرف سے حملہ آور ہوتا ہے ۔

یہ انسان پھر اللہ کی نشانیوں کے بارے میں جھگڑتا رہتا ہے اور ہٹ دھرمی کرتا ہے ۔ یہ ہٹ دھرمی ایک ایسی صفت ہے جس سے انسان کی فطرت کھل کر سامنے آ جاتی ہے ۔ اس قسم کا انسان خود اپنے آپ کو اور لوگوں کو یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ حق کے لیے تحقیق و تفتیش کر رہا ہے اور بحث اس لیے کر رہا ہے کہ اسے تسلی نہیں ہوئی ۔ اور اسے پورا پورا یقین نہیں ہے لیکن اللہ تو اپنے بندوں کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ وہ سمیع و بصیر ہے اور دل کے رازوں کا جاننے والا ہے ' یہ اللہ فیصلہ فرماتا ہے کہ یہ کبر کی وجہ سے ہے صرف اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے ہے ۔ یہ کبر دل میں جاگزیں ہوتا ہے اور یہ کسی شخص کو ایسے مسئلے میں جھگڑے پر آمادہ کر دیتا ہے جو جھگڑے کا ہوتا نہیں ہے ۔ یہ کبر ہی ہے جو انسان کو ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالنے پر آمادہ کرتا ہے جو انسان کی حقیقت سے زیادہ اونچے ہوتے ہیں ' انسان ایسے مقام تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے جو اس سے بلند ہوتا ہے اور انسانی حقیقت سے بالا ہوتا ہے ۔ انسان کے پاس اس کے لیے نہ دلیل ہوتی ہے اور نہ وجہ جواز ۔ صرف اس کبر کی وجہ سے وہ اس طرح کی اونچی پرواز شروع کر دیتا ہے ' ایسے ہی لوگ ہیں

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَا هُمْ بِبَالِغِيهِ (۴۰ : ۵۶) "حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی سند اور حجت کے بغیر جو ان کے پاس آئی ہو ' اللہ کی آیات میں جھگڑ رہے ہیں ' ان کے دلوں میں کبر بھرا ہوا ہے ' مگر وہ اس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جن کا وہ گھمنڈ رکھتے ہیں "۔ اگر انسان اس کائنات کو اچھی طرح سمجھ لے اور اپنی ذات کی معرفت حاصل کر لے اور اس کائنات میں اپنی حیثیت کا ادراک کرے تو وہ مطمئن ہو جائے اور اپنی حیثیت اور منصب سے آگے نہ بڑھے ۔ اگر وہ یہ معلوم کرے کہ وہ ان لاتعداد موجودات میں سے ایک ہے اور جس طرح یہ پوری کائنات امر ربی کی پابند ہے ' اس طرح وہ بھی ہے اور وہ بھی اللہ کے نظام قضا و قدر کے مطابق چل رہا ہے جسے صرف اللہ جانتا ہے اور یہ کہ اس کائنات میں اس کا کردار ایک متعین کردار ہے ' اگر انسان ان حقائق کا ادراک کرے تو وہ مطمئن اور آرام سے بیٹھ جائے ور اس کا سر قدرے جھک جانے اور اس کے اندر تواضع پیدا ہو جانے اور وہ اپنے آپ کے ساتھ ' اس کائنات کے ساتھ اور اپنے ماحول کے ساتھ نہایت امن و سلامتی کے ساتھ رہے ۔

فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (۴۰ : ۵۶) "پس اللہ کی پناہ مانگ لو وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے "۔ کبر کے مقابلے میں اللہ کی پناہ مانگنے کا مشورہ دینا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ بہت ہی قبیح اور قابل نفرت خصلت ہے ۔ کیونکہ اللہ کی پناہ نہایت ہی قبیح اور ناپسندیدہ چیز سے مانگی جاتی ہے ۔ جس کے نتیجے میں شر و فساد اور اذیت ملتی ہے ۔ اور کبر میں یہ سب چیزیں موجود ہیں ۔ کبر خود صاحب کبر کے لیے مصیبت ہے اور اس کے ماحول کے لیے بھی

مصیبت ہے ۔جس دل میں کبر ہو ' اس کے لیے بھی اذیت ہے اور دوسروں کے دلوں کو بھی دکھانے والی عادت ہے ۔ لہٰذا کبر ایک ایسا شر اور فساد ہے جس سے اللہ کی پناہ مانگنا ضروری ہے ۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۴۰ : ۵۶) "وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے"۔ کبر انسان کو ایسی حرکات پر آمادہ کرتا ہے جو دیکھی جا سکتی ہیں اور انسان سے ایسی باتیں کرواتا ہے جو سنی جا سکتی ہیں اس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو سننے اور دیکھنے والے کی ولایت میں دے دو ۔

اس کے بعد انسان کو بتایا جاتا ہے کہ اس عظیم کائنات میں اس کا حقیقی مقام کیا ہے ۔ اور اللہ کی بعض مخلوقات جسے انسان دیکھ سکتے ہیں ۔ ان کے مقابلے میں وہ کس قدر چھوٹا اور کمزور ہے ۔ اور یہ چیزیں جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے ۔ دیکھتے ہی انسان ان کی ضخامت کا قائل ہو جاتا ہے ۔ اور جب ان کی پوری حقیقت ان کی سمجھ میں آ جائے تو ان کا شعور اور پختہ ہو جاتا ہے ۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۰ : ۵۷) "آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کے مقابلے میں یقیناً زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔ آسمان اور زمین انسان کے سامنے بچھے ہوئے ہیں اور انسان ان کو دیکھتا ہے ۔ اور انسان کی طاقت میں ہے یہ بات کہ وہ ان کے حوالے سے اپنی قدر و قیمت معلوم کرے ۔جب انسان کو اس زمین و آسمان کے حوالے سے اپنی نسبت ' آسمانوں کی دوریاں اور افلاک سماوی کے حجم کا علم ہوتا ہے تو اس کا سر جھک سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنی کم مائیگی کے شعور کی وجہ سے وہ پگھل کر رہ جائے الا یہ کہ وہ انسان کے اس شرف کو یاد کرے جو اللہ نے اس کے اندر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے انسان کو مکرم بنایا گیا ہے ۔ وہ واحد صفت ہے جس کی وجہ سے انسان اس کائنات کی عظمت کے سامنے کھڑا ہو سکتا ہے کیونکہ کائنات بہت ہی عظیم اور ہولناک ہے اور وہ بہت ہی چھوٹا ہے ۔

اس عظیم کائنات کے اوپر ایک لمحہ غور کرنا انسان کو یہ سب کچھ معلوم کرنے کے لیے کافی ہے ۔یہ زمین جس کے اوپر ہم رہتے ہیں ۔یہ سورج کے تابع ستاروں میں سے ایک چھوٹا سا ستارہ ہے ۔ اس سورج کے تابع ستاروں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور یہ زمین سورج سے دس لاکھ گنا چھوٹی ہے ۔پھر یہ سورج اس قسم کے سو ملین سورجوں میں سے ایک ہے ' جو ہمارے قریب ترین کہکشاں میں ہیں ۔ اور ہم بھی اسی کہکشاں میں ہیں ' اور انسانوں نے آج تک سو ملین کہکشاں دریافت کر لیے ہیں جو اس عظیم فضا میں تیر رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ اس فضا کا نہایت ہی چھوٹا حصہ ہوں ۔

جہاں تک انسانی معلومات کا تعلق ہے تو انسان نے ابھی تک اس کائنات کے ایک مختصر اور قابل ذکر حصے کی دریافت کی ہے اور یہ چھوٹا سا حصہ بھی اس قدر بڑا ہے کہ صرف اس کے تصور ہی سے انسان کا سر چکرا تا ہے ۔ ہم اپنے سورج سے تقریباً ۹۳ ملین میل دور ہیں اور یہ سورج ہماری اس چھوٹی سی زمین کے کنبے کا سرخیل ہے ۔ اور یہ زمین بھی اپنی اس ماں کی جھولی سے یعنی سورج سے ۹۲ ملین میل دور ہے ۔یہ زمین سورج ہی سے جدا ہوئی ہے ۔

وہ کہکشاں جس کے تابع یہ سورج ہے ' اس کا قطر تقریباً ایک لاکھ ملین نوری سال ہے ۔ اور نوری سال چھ سو ملین

میل ہوتا ہے کیونکہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ ہوتی ہے ۔

اور ہماری کہکشاں سے قریب ترین کہکشاں ایک لاکھ سات سو پچاس ہزار نوری سال دور ہے ۔ ہمیں یہاں یہ بات پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ دوریاں اور حجم وہ ہیں جو اس حقیر انسان نے دریافت کر لیے ہیں اور اس کے ساتھ انسان نے یہ بھی دریافت کر لیا ہے وہ حقیقت کا نہایت ہی چھوٹا سا حصہ ہے ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۰ : ۵۷) "آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسان کو پیدا کرنے کی یہ نسبت یقیناً زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

اللہ کی قدرت کے سامنے کوئی بات نہ بڑی ہے اور نہ چھوٹی' نہ مشکل ہے اور نہ آسان ۔ وہ تو ہر چیز کی تخلیق ایک کلمہ سے کرتا ہے ۔ یہ صفات تو اشیاء کی ہیں ۔ لوگ انہیں کم دیکھتے ہیں یا زیادہ' آسان دیکھتے یا مشکل ۔ پھر انسان اور اس ہولناک سرچکرا دینے والی کائنات کی باہم کیا نسبت ہے ؟ اس کم مائیگی کے باوجود پھر انسان کا یہ کبر!

وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الْمُسِيْٓئُ (۴۰ : ۵۸) "اور یہ نہیں ہو سکتا کہ اندھا اور بینا یکساں ہو جائیں اور ایماندار اور صالح اور بدکار برابر ٹھہریں"۔

صاحب بصارت تو دیکھتا ہے اور اسے علم ہوتا ہے ۔ اور وہ اپنی قدر و قیمت بھی جانتا ہے ۔ حد سے نہیں گزرتا' پھولتا نہیں اور نہ تکبر کرتا ہے ۔ وہ دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے' اندھا نہ دیکھتا ہے اور نہ خود اپنی قدر و قیمت جانتا ہے' نہ اپنی پوزیشن جانتا ہے اور نہ اپنے ماحول کے ساتھ اپنی نسبت کو جانتا ہے ۔ اس لیے سب سے پہلے وہ اپنے بارے میں غلط اندازہ کرتا ہے ۔ پھر اپنے ماحول کے بارے میں غلط فیصلہ کرتا ہے ۔ اور ان غلط اندازوں کی وجہ سے پھر وہ راہ بھول جاتا ہے ۔ اس طرح مومن و صالح اور بدکار برابر نہیں ہو سکتے ۔ مومن دیکھنے والے اور جاننے والے ہوتے ہیں ۔ لہٰذا وہ اپنا اور اپنے ماحول کا صحیح اندازہ کرتے ہیں' جبکہ کافر اور بدکار جاہل ہوتے ہیں ۔ وہ ہر چیز کو برباد کر دیتے ہیں ۔ اپنے آپ کو' اپنے ماحول کو' لوگوں کو' اور سب سے پہلے وہ اپنے عمل اور فہم کو برباد کر دیتے ہیں ۔ وہ اپنے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے ۔ اندھے ہوتے ہیں' دلوں کے اندھے ۔

قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ (۴۰ : ۵۸) "مگر تم لوگ کم ہی سمجھتے ہو"۔ اگر ہم سمجھتے تو ہمیں حقیقت معلوم ہوتی ۔ بات واضح ہے ۔ صرف یاد دہانی کی ضرورت ہے ۔ اگر ہم آخرت پر پختہ یقین رکھتے اور اسے یاد کرتے اور مقامات قیامت کو ذہن میں رکھتے اور وہاں کی حاضری ہمارے ذہن میں ہوتی تو ہم پختہ مومن ہوتے ۔

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۴۰ : ۵۹) "یقیناً قیامت آنے والی ہے ۔ اس کے آنے میں کوئی شک نہیں مگر اکثر لوگ نہیں مانتے"۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اللہ کی آیات میں

مجادلہ کرتے ہیں اور کبر کرتے ہیں ۔ ذرنہ اگر مانتے اور یقین کرتے تو وہ حق کو پہچانتے ۔ وہ جانتے کہ حق کے حوالے سے ان کا کیا مقام ہے ۔ اس لیے تجاوز نہ کرتے ۔

صرف اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور بندگی کرنا' اور نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ کو پکارنا' انسان کو اس کبر سے بچاتا ہے ۔ جس کی وجہ سے انسان پھول جاتا ہے اور بغیر حجت کے اللہ کی آیات میں جھگڑا کرنے لگتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اپنے دروازے کھولتا ہے تاکہ ہم اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کو پکاریں اور اعلان فرماتا ہے کہ میں نے ہر پکارنے والے کی پکار کو قبول کرنا اپنے اوپر لکھ دیا ہے ۔ اور ان لوگوں کو ڈراتا ہے جو اللہ کی پکار کے مقابلے میں تکبر کرتے ہیں کہ وہ آگ میں ذلیل و خوار ہوں گے ۔

وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ (۴۰ : ۶۰) "تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو' میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں' ضرور وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"۔ یہ یاد رہے کہ دعا کے بھی آداب ہیں اور ان کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔ قلب کو اللہ کے لیے خالص ہونا چاہئے' کوئی صورت متعین کیے بغیر مانگنا چاہئے اور اس یقین کے ساتھ مانگنا چاہئے کہ اللہ ضرور قبول فرماتا ہے ۔ قبولیت کے ظروف و احوال اور زمان و مکان متعین نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ آداب دعا کے سراسر خلاف ہے ۔ اور یہ یقین کرنا چاہئے کہ دعاء کی توفیق صرف اللہ ہی دیتا ہے ۔ یہ بھی ایک انعام ہے' قبول ہونا دوسرا انعام ہے ۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "میں استجابت دعا کی پریشانی اٹھا کر نہیں پھرتا' میری ذمہ داری تو یہ ہے کہ دعا کروں ۔ جو مجھے یہ توفیق دے دی گئی اور یہ الہام کر دیا گیا کہ دعا کرو تو قبولیت ساتھ ہوتی ہے"۔ دعاء تو عارف کے دل کی بات ہوتی ہے' عارف اس بات کو جانتا ہے کہ جس خدا نے دعاء کو مقدر کیا وہی قبولیت کا فیصلہ بھی کرتا ہے ۔ جب اللہ توفیق دے تو دعاء اور قبولیت دونوں باہم موافق اور مطابق اور ساتھ ساتھ ہوتے ہیں ۔

جو لوگ اللہ کی طرف متوجہ ہونے سے کبر کرتے ہیں تو ان کی سزا یہ ہے کہ جہنم میں خوار اور ذلیل کر کے پھینکے جائیں اور کبر کی سزا اللہ کے ہاں یہی ہے جس کی وجہ سے انسان پھولتا ہے ۔ ایک چھوٹا سا انسان' اس چھوٹی سی زمین پر اور اس چھوٹی سی زندگی میں ۔ اور یہ شخص اللہ کی عظیم تخلیق کو بھول جاتا ہے' اللہ کی عظمت کو بھول جاتا ہے اور آخرت کو بھول جاتا ہے جبکہ یہ آنے والی ہے' اور وہاں پھر اسے ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں گرنا ہو گا ۔

--- ○○○---

جب ان لوگوں کا ذکر ہوا جو اللہ کی بندگی کرنے اور اسے پکارنے سے کبر کرتے ہیں تو اس حوالے سے اللہ کی بعض نعمتوں کا ذکر کر دیا گیا ۔ وہ نعمتیں جو اللہ کی عظمت کی گواہ ہیں اور اس قسم کے متکبران پر اللہ کا شکر نہیں بجالاتے بلکہ اللہ کی عبادت کرنے' اسے پکارنے اور اس کی طرف متوجہ ہونے سے کبر کرتے ہیں :

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ

إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٦١﴾ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ ﴿٦٢﴾ كَذَٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِينَ كَانُوا بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ﴿٦٣﴾ اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۖ فَتَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٤﴾

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو' اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ وہی اللہ (جس نے تمہارے لیے یہ کچھ کیا ہے) تمہارا رب ہے۔ ہر چیز کا خالق۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کدھر سے بہکائے جا رہے ہو؟ اسی طرح وہ سب لوگ بہکائے جاتے رہے ہیں جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔ وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اوپر آسمان کا گنبد بنا دیا۔ جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی ہی عمدہ بنائی۔ جس نے تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا۔ وہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بے حساب برکتوں والا ہے۔ وہ کائنات کا رب ہے۔ وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کو تم پکارو اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے۔ ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے"۔

گردش لیل و نہار تو دو کائناتی مظاہر ہیں جبکہ زمین و آسمان دو کائناتی تخلیقات ہیں۔ ان دونوں کو یہاں ذکر کر کے پھر بتایا جاتا ہے کہ اس لیل و نہار اور ارض و سماء کے اندر اللہ نے تمہاری خوبصورت شکلیں پیدا کیں اور پھر تمہارے لیے اس جہان میں قسم قسم کے رزق پیدا کیے۔ یہ ہے تمہارا رب اور یہ ہیں اس کے کارنامے۔ بڑی ہی برکتوں والا ہے رب العالمین! وہی زندہ ہے اور اس کے سوا کوئی زندہ نہیں ہے اور یہ سب کچھ اس کا فضل ہے۔ لہٰذا اللہ کو وحدہ لاشریک سمجھتے ہوئے صرف اسی کی بندگی کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کائناتی مظاہر اور ان تکوینی معانی اور اللہ کی ان تخلیقات کو اللہ کی توحید اور اللہ کے نظام زندگی کے حوالے سے وسیع دائرہ میں پڑھنا' ان پر تدبر کرنا اور توحید اور شریعت کے ساتھ ان کا ربط پانا ضروری ہے۔ اور یہ دیکھنا کہ اس تکوینی نظام' شرعی نظام کے درمیان ہم آہنگی کیا ہے۔

یہ کائنات اللہ نے جس اصول پر بنائی ہے' پھر اللہ نے اسے جس ناموس فطرت کے مطابق چلایا ہے' وہی اللہ ہے جس نے اس کرۂ ارض پر زندگی کو چلایا' اس کی ترقی اور نشوونما کا انتظام فرمایا۔ پھر یہ وہی ذات باری ہے جس نے انسان کو اس کی موجودہ شکل عطا فرمائی جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اور انسان کی تخلیق اور اس کی حیات کے لیے ضروری امور کو اس کائنات کے اندر ملحوظ رکھا۔ وہی تو ہے جس نے رات کو سکون' آرام اور راحت کے لیے بنایا۔ اور دن روشن' دیکھنے کے لیے معاون اور دوڑ دھوپ کے لیے بنایا۔ اور زمین کو زندگی کے قابل اور چلنے پھرنے کے اہل بنایا اور آسمان کو ایک چھت کی طرح بنایا کہ وہ بلندیوں پر سیاروں اور ستاروں کو لیے ہوئے ہے' جو گرتے نہیں۔ اور جن کی دوریاں بھی باہم ایک

دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر خلل نہیں ڈالتیں۔ اگر ان دوریوں میں ذرا بھر فرق پڑ جائے تو اس چھوٹے سے کرۂ ارض پر انسان کے وجود کے اندر خلل واقع ہو جائے۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے اس زمین پر پاک خوراک پیدا کی۔ یہ رزق اسی زمین سے پیدا کیا۔ یہ رزق آسمانوں سے بارش کی شکل میں نازل ہوتا ہے اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔ اور انسانی صورتیں کس قدر خوبصورت اور رنگا رنگ ہیں۔ اور پھر وہی ہے جس نے انسان کے اندر وہ صلاحیتیں پیدا کیں جو اس کائنات کے ساتھ متفق ہیں۔ اور یہ صلاحیتیں اس زمین پر رہنے کے لیے کافی ہیں۔ پھر یہ صلاحیتیں اس پوری کائنات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہیں۔ تو یہ تمام امور باہم مربوط اور موافق ہیں جیسا کہ ہر شخص ملاحظہ کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام امور کو قرآن ایک ہی جگہ لیتا ہے۔ اسی ترتیب اور ربط سے لیتا ہے اور ان امور سے وحدانیت پر برہان قاطع پیش کرتا ہے۔ اور ان امور ہی کی روشنی میں قلب انسانی کو دعوت دیتا ہے کہ اللہ وحدہ کو پکارو۔ اوز دین اور نظام زندگی صرف اسی کا رائج کرو۔ اور آخر میں کہا جاتا ہے 'الحمد للہ رب العالمین! اور یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ رب العالمین وہی ذات ہو سکتی ہے جس نے ان تمام چیزوں کو اس طرح پیدا کیا۔ یہی ہے اللہ 'رب العالمین' لہٰذا تعجب ہے کہ لوگ اس عظیم سچائی سے کس طرح منہ موڑتے ہیں۔

یہاں ہم سرسری طور پر وہ جھلکیاں دیتے ہیں جو خود بتائیں گی کہ اس کائنات کی ساخت میں' اور انسان کی زندگی کے ساتھ اس کے تعلق میں یہ امور ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ اللہ نے یہاں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے' اس سمت میں چند لمحات۔

"یہ زمین سورج کے سامنے گردش محوری کر رہی ہے جس کے نتیجے میں لیل و نہار کا نظام وجود میں آیا ہے' اگر اپنی گردش کی موجودہ رفتار سے اس کی رفتار قدرے تیز ہو جائے تو تمام مکانات گر جائیں' اس زمین کے اجزاء ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور فضائے آسمانی میں بکھر جائیں"۔

"اور اگر یہ زمین موجودگردش محوری کی رفتار سے اپنی رفتار ذرا کم کر دے تو لوگ گرمی یا سردی سے ہلاک ہو جائیں۔ زمین کی موجودہ گردش محوری ایسی بنائی گئی ہے کہ یہ اس زمین کے اوپر حیوانی اور نباتاتی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ اور ان کے لیے اپنے وسیع معنوں میں مفید ہے"۔

"اور اگر زمین کی گردش محوری صرف رک جائے تو بخارات ختم ہو جائیں اور سمندر پانیوں سے خالی ہو جائیں"۔

"اگر زمین گردش محوری ختم کر دے اور سورج کے اردگرد اپنی گردش سالانہ جاری رکھے تو کیا ہو گا۔ تمام فصلیں ختم ہو جائیں' لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ گرمیاں کہاں ہیں اور سردیاں کب ہوئیں اور ربیع و خریف ختم ہو جاتے"۔

"اگر زمین کا چھلکا چند قدم اور دبیز ہوتا تو بعض گیسوں کے جذب کر لینے کی وجہ سے نباتات ختم ہو جائے"۔

"زمین کے اوپر کرۂ ہوائی جس قدر بلندی پر ہے اگر اس سے مزید بلند ہو جائے تو آج کل لاکھوں کے حساب سے ہوا میں جو شہاب ثاقب جل جاتے ہیں' وہ سب کے سب کرۂ ارض پر گرنے لگتے' ان کی رفتار ۴۶ میل فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ اس طرح وہ زمین کے اوپر ان تمام چیزوں کو جلا کر رکھ دیں گے جو جلنے کے قابل ہیں۔ اور اگر یہ شہاب بندوق کی گولی کی رفتار سے بھی چلیں تب بھی سب کے سب زمین سے ٹکرا جائیں۔ اور اس کے نتائج نہایت ہی خوفناک ہوں۔ انسان بیچارے کی حالت تو یہ ہے کہ اگر ایک چھوٹا سا شہاب جس کی رفتار بندوق کی گولی سے ستر مرتبہ زیادہ ہو' اس زمین سے

بھی ٹکرا جائے تو اس شہاب کے گزرنے سے جو حرارت پیدا ہوگی' صرف اس حرارت ہی سے اس کے اجزائے جسم بکھر کر رہ جائیں"۔(۱)

"اس وقت ہوا میں آکسیجن کی نسبت ۲۱ فیصد ہے اگر یہ ۵۰ فیصد ہو جائے تو جل جانے کی قابل تمام چیزیں آگ پکڑ لیں اور جل جائیں۔بس آگ کی ایک چنگاری لگتے ہی تمام جنگلات جل جائیں بلکہ بھک سے اڑ جائیں۔اگر ہوا کی آکسیجن کم ہو کر ۱۰ فیصد ہو جائے یا اس سے کم ہو جائے تو کرۂ ارض کی زندگی شاید ایک طویل عرصہ بعد اپنے آپ کو اس کے ساتھ ہم آہنگ کر ہی لے لیکن وہ تمام سہولیات ختم ہو جائیں جن کی وجہ سے انسان متمدن قرار پایا ہے مثلاً آگ وغیرہ"۔(۲)

غرض اس کائنات کی تخلیق و تشکیل میں ہزاروں ایسی ممد اور معاون چیزیں' باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ رکھی ہوئی نظر آتی ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک چیز میں معمولی خلل آجائے تو ہماری زندگی اپنی موجودہ شکل میں نہ رہے۔ اسی طرح دوسرے حیوانات کی زندگی کی موجودہ شکل بھی نہ رہے۔

رہا انسان تو اس کی تو یہ پیاری پیاری صورت ہی ایسی ہے' جو نہایت ہی منفرد انداز میں ہے اور تمام زندہ اشیاء میں ممتاز ہے۔یہ ایک اس قدر کامل اور مکمل تخلیق ہے کہ وہ اپنے تمام فرائض نہایت ہی سہولت اور باریکی سے ادا کرتی ہے۔اس کی یہ تخلیق اس کی زمین کے اوپر حرکت اور وہ حالات جن میں اس کے لیے زندہ رہنا اور کام کرنا آسان بنایا گیا ہے' پھر اس کی وہ اعلیٰ و ارفع خصوصیت جس کے ذریعہ اسے تمام روئے زمین کی مخلوقات کا سردار بنایا گیا ہے اور اسے منصب خلافت ارضی دی گئی ہے اور اس منصب کے فرائض کی ادائیگی کے لیے اسے عقل و خرد سے نوازا گیا ہے۔اور پھر رب تعالیٰ کے ساتھ اسے رابطے کا اعزاز دیا ہے۔یہ تو انسان کی ممتاز ترین خصوصیات ہیں۔

اب ذرا ذات انسان کی طرف آیئے' اگر انسانی ذات اس کے اعضاء' اور ان کے فرائض کی باریکی پر بحث کریں' جو اس آیت کا مفہوم بھی ہے۔

وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۰ ۴ : ۶۴) "جس نے تمہاری صورت بنائی اور بہت ہی عمدہ بنائی"۔تو ہمیں انسان کے چھوٹے چھوٹے اعضاء میں سے ہر ایک کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔بلکہ انسان کے خلیات میں سے ہر ایک خلیے پر بحث کرنی ہوگی۔

ایک ہی مثال سے تخلیق انسانی اور جسم انسان کی گہری ٹیکنالوجی کا پتہ چل سکتا ہے۔انسان کے جبڑے کو لیجیے اور اس کے اندر دانتوں کی تنصیب کو اگر آلہ خوراک کے زاویہ سے دیکھا جائے تو یہ اس قدر حساس ہیں کہ اگر زبان یا لعاب میں ۱۰/ا ملی میٹر کی حد تک ابھار آجائے تو یہ جبڑے زبان اور لعاب کی مزاحمت کرتے ہیں۔اور اگر کسی دانت میں اسی قدر ابھار آجائے تو وہ اپنے مقابل جسم کے ساتھ ٹکرانا شروع کر دے اور اگر دو جبڑوں کے درمیان سگریٹ کے کاغذ جتنا موٹا کاغذ آجائے تو وہ دونوں جبڑوں کا دباؤ محسوس کرے گا۔اور اس پر بھی دونوں جبڑوں کا دباؤ ہو گا کیونکہ دونوں جبڑوں

---

(۱) "اللہ کے ساتھ جو آسمانوں میں ہے" ڈاکٹر احمد زکی۔
(۲) "سائنس ایمان کا تقاضا کرتی ہے" ترجمہ ڈاکٹر صالح فلکی

کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ جب یہ دونوں ملتے ہیں تو دونوں طرف کے دانت پوری طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ یوں یہ پینے اور چبانے کا عمل کرتے ہیں اور ایسی چیزوں کو بھی چبا لیتے ہیں جن کا موٹاپا سگریٹ کے ابری کاغذ جیسا باریک ہو۔

پھر اسی انسان کو اپنی اس ساخت کے ساتھ' اس زمین پر رہنے کے لیے سہولیات فراہم کی گئی ہیں کہ یہ یہاں زندہ رہے۔ اس کی آنکھوں کو روشنی کی لہروں پر بنایا گیا ہے تاکہ یہ دیکھنے کا کام کریں۔ اور اس کے کانوں کو ہوا اور آواز کی لہروں پر بنایا گیا ہے تاکہ یہ سننے کا کام کریں۔ غرض اس کے تمام اعضاء اور حواس کو اس فضا کے مطابق بنایا گیا ہے جس کے اندر اس نے زندگی بسر کرنا ہے اور اسے یہ طاقت بھی دی گئی ہے کہ وہ ایک حد تک اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال سکے۔

غرض اسے اس زمین کے لیے بنایا گیا ہے تاکہ یہ یہاں زندہ رہے۔ اس سے متاثر ہو' اس کو متاثر کرے۔ غرض یہ ماحول جس میں انسان رہتا ہے' اس کے اور انسان کی تخلیق کے درمیان گہری منصوبہ بندی موجود ہے۔ پھر انسان کی موجودہ شکل و صورت کا بھی اس کے موجودہ ماحول کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس کی ساخت کو اس ماحول کے مطابق بنایا گیا ہے' جہاں وہ رہتا ہے' یعنی اس زمین و آسمان کے مطابق۔ اس لیے یہاں اللہ نے انسان کی اسی شکل کا ذکر اس آیت کے درمیان کیا ہے جس میں زمین و آسمان کی تخلیق کا ذکر ہے۔

اب قرآنی آیات کی قدرے تشریح۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا (۴۰ : ۶۱) "وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو' اور دن کو روشن کیا"۔ رات کو سکون حاصل کرنا ہر زندہ چیز کے لیے ضروری ہے۔ نیز ایک تاریکی کا عرصہ ضروری ہے تاکہ اس میں زندہ خلیے آرام کر سکیں اور اس وقت کے بعد پھر روشنی میں کام شروع کر سکیں۔ صرف نیند ہی کافی نہیں ہے تاریکی بھی ضروری ہے۔ بلکہ رات ضروری ہے۔ کیونکہ زندہ خلیہ روشنی کو برداشت کرتے کرتے اس قدر تھک جاتا ہے کہ اس کے اعصاب تلف ہونا شروع ہو جاتے ہیں چونکہ روشنی میں اسے آرام نہیں مل سکتا۔ لہذا رات کی تاریکی ضروری ہے۔

وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا (۴۰ : ۶۱) "دن کو روشن کیا"۔ انداز تعبیر بالکل مشخص ہے گویا دن ایک شخص ہے جو دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ لوگ دن میں دیکھتے ہیں۔ یہ تو ہے دن کی غالب افادیت اور صفت --- لیکن گردش لیل و نہار کا یہ نظام ایک نعمت ہے جو اپنے اندر مزید نعمتیں پوشیدہ رکھتی ہے۔ اگر رات اور دن میں سے کوئی ایک دائمی ہو جائے' بلکہ اپنے موجودہ وقت سے وہ ذرا طویل ہی ہو جائے تو زندگی ناپید ہو جائے' یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اللہ کے اس فضل کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جس کا لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ (۴۰ : ۶۱)
"حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے"۔ اور ان دو فطری مظاہر یعنی

گردش لیل و نہار کے بعد یہ تصریح کر دی جاتی ہے کہ ان کو اللہ نے پیدا کیا ہے لہٰذا وہی الٰہ ہونے کا مستحق ہے اور یہ نام "اللہ" ایک عظیم نام ہے۔

ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ (۴۰:۶۲) "یہ ہے اللہ تمہارا رب جو ہر چیز کا خالق ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' پھر تم کدھر بہکائے جا رہے ہو"۔ یہ ایک نہایت ہی تعجب انگیز اور حیرت افزا بات ہے کہ لوگ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز میں اللہ کا ہاتھ ہے' اور تمام اشیاء کا موجود ہونا ہی از روئے عقل اس بات کو فرض کر دے کہ اس کا اللہ خالق ہے اور اللہ کے سوا کوئی اور قوت بھی نہ ہو کہ وہ خالق ہونے کی مدعی ہو' اور یہ بات بھی ذہن میں نہ آتی ہو کہ یہ چیزیں خود بخود وجود میں آگئی ہوں' یہ فی الواقع ایسی عجیب بات جو ہر معقول انسان کے لیے تعجب انگیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اور دیکھتے ہوئے بھی لوگ ایمان لانے سے منہ موڑیں۔

فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ (۴۰:۶۲) "کدھر بہکائے جا رہے ہو"۔

لیکن' ہو یہی رہا ہے کہ لوگ بدستور اس واضح سچائی سے منہ موڑ رہے ہیں جیسا کہ قرآن کے پہلے مخاطب منہ موڑ رہے تھے اور اس کے بعد بھی ہر زمان و مکان میں منہ موڑ رہے ہیں۔ بغیر سبب' بغیر حجت اور بغیر دلیل کے۔

کَذٰلِکَ یُؤْفَکُ الَّذِیْنَ کَانُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ (۴۰:۶۳) "اسی طرح وہ سب لوگ بہکائے جا رہے ہیں' جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے"۔

اب سیاق کلام اس طرف آتا ہے کہ زمین کو اپنی جگہ ٹھیرایا گیا اور آسمان کو چھت کی طرح اوپر ٹھیرایا گیا۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً (۴۰:۶۴) "وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے قرار بنایا اور اوپر آسمان کا گنبد بنا دیا"۔ زمین تو برقرار ہے اور انسانوں کی رہائش کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور اس میں ایسی بے شمار سہولیات رکھ دی گئی جو انسان کے لیے ضروری ہیں اور جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور آسمان ایک ایسی چھت ہے جس کی نسبتیں متعین اور مقرر ہیں۔ جس کی دوریاں' حرکتیں اور چکر مقرر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وجہ سے زمین پر انسان کی زندگی کو قرار حاصل ہے اور یہ قرار اور یہ سہولیات اس کائنات کے نقشے کے اندر باقاعدہ حساب سے رکھ دی گئی ہیں اور اس کی تعمیر میں انہیں ایک خاص نسبت سے رکھا گیا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق کے ساتھ ہی انسان کی پیاری صورت اور انسان کے لیے رزق کو بھی مربوط کر دیا گیا جیسا کہ ہم نے ان باتوں کی طرف اجمالی اشارہ کر دیا ہے۔

وَّ صَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَ رَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ (۴۰:۶۴)

"جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی جس نے تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا"--- اور پھر ان نشانیوں اور مہربانیوں پر یہ تبصرہ:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۰ : ۶۴) "یہ ہے اللہ تمہارا رب' بے حساب برکتوں والا ہے ۔ وہ کائنات کا رب ہے" ۔ یہ اللہ جو تخلیق کرتا ہے' جو انداز سے تخلیق کرتا ہے اور پھر اپنی مخلوقات کا مدبر بھی ہے ۔ وہ تمہاری نگہبانی کرتا ہے اور تمہیں اس نے اپنی اس مخلوق میں بسایا ہے ۔ یہ ہے تمہارا رب' برکتوں والا' اور بہت بہت برکتوں والا اور تمام جہانوں والا' جن کے تصور ہی سے سر چکرا جاتا ہے ۔

هُوَ الْحَيُّ (۴۰ : ۶۵) "وہی زندہ ہے" ۔ ہاں' وہی اکیلا زندہ ہے ۔ اس کی ذاتی زندگی ہے' کسی سے لی نہیں گئی' کسی کی تخلیق کردہ نہیں ہے ۔ نہ اس کی ابتداء اور نہ انتہا ہے نہ اس کے درمیان کوئی حائل ہے اور نہ وہ زائل ہونے والی ہے ۔ نہ اس میں کوئی انقلاب آتا ہے اور نہ تغیر ۔ اللہ کے سوا کسی کو یہ صفات حاصل نہیں ہیں ۔ اللہ پاک ہی منفرد ہے ان صفات میں ۔ لہٰذا وہی منفرد ہے الوہیت میں ۔ اس لیے کہ زندہ وہی ہے ۔ لہٰذا حق یہی ہے کہ وہی واحد و قہار ہو ۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (۴۰ : ۶۵) "نہیں کوئی الٰہ مگر وہ" تو پھر صرف : فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۴۰ : ۶۵) "اسی کو تم پکارو' اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کر کے" ۔ اس کی حمد کرو' اس سے دعا کرو'

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۰ : ۶۵) "ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے" ۔

--- ○○○ ---

ان نشانیوں اور مہربانیوں کے تذکرے اور ان پر تبصرے کے بعد اور حقیقت الوہیت اور عقیدۂ توحید اور مظاہر ربوبیت کی تشریح کے بعد اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ آپ اعلان کر دیں کہ ان نشانیوں اور دلائل کی بنا پر میں روک دیا گیا ہوں کہ میں تمہارے معبودوں کی بندگی کروں' مجھے تو حکم دے دیا گیا کہ صرف رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں ۔

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَاۗءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۶

"اے نبیؐ' ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے تو ان ہستیوں کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے ۔ جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو ۔ (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جب کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے بینات آچکی ہیں ۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کے آگے سر تسلیم خم کر دوں" ۔

یہ اعلان ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کی آیات سے منہ موڑتے ہیں اور اللہ کے عطیات کی ناشکری کرتے ہیں' کہ میں تو ان معبودوں کی بندگی سے منع کر دیا گیا ہوں جن کو تم پکارتے ہو۔ لہٰذا میں منع ہو گیا ہوں۔ اس لیے کہ میرے پاس نشانات آگئے ہیں اور آئے بھی میرے رب کی طرف سے ہیں۔ میرے پاس دلائل پہنچ چکے ہیں اور میں ان پر ایمان لا چکا ہوں۔ اور اللہ نے میرے پاس جو دلائل بھیجے ہیں' ان کا حق ہے کہ میں ان پر مطمئن ہو جاؤں اور تصدیق کر دوں اور اس سچائی کا اعلان کر دوں جو میرے پاس آگئی ہے۔ اور غیر اللہ کی بندگی سے رک جانا ہی کافی نہیں بلکہ رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور ایک مثبت پروگرام شروع کرنا بھی بڑا مشن ہے۔ اس میں "لا" بھی ہے اور "الا" بھی ہے۔

اور آفاقی دلائل الٰہیہ کے بیان کے بعد اب انفس کی طرف روئے سخن مڑتا ہے۔ انفس کے دلائل میں سے بڑی دلیل ظہور حیات انسانی ہے اور پھر اس کے ظہور کے عجیب اطوار و درجات ہیں۔ انسانی حیات کا مطالعہ ایک مقدمہ ہے۔ اس بات کے لیے کہ اس کائنات میں ہر قسم کی حیات در حقیقت اللہ کے دست قدرت کا کرشمہ ہے اور اس کی مٹھی میں ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۶۸﴾

۸ ع ۱۲

"وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفے سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر وہ تمہیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے' پھر تمہیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ' پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔ وہی ہے زندگی دینے والا' اور وہی موت دینے والا ہے۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے' بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ ہو جاتی ہے"۔

اس کرۂ ارض پر انسانی پیدائش کا ادراک انسانی علم نہیں کر سکتا' کیونکہ انسان اس وقت نہ تھا جب اسے پیدا کیا گیا تھا' انسانی پیدائش کے تسلسل میں بعض امور ایسے ہیں جن کا مشاہدہ انسان کرتا ہے لیکن یہ انسانی مشاہدہ اپنی موجودہ ترقی یافتہ شکل میں زمانہ حال میں سامنے آیا ہے' نزول قرآن کے صدیوں بعد۔

پہلی بات یہ ہے کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور یہ واقعہ اس وقت ہوا جب انسان نہ تھا۔ لیکن معلوم ہو گیا کہ اس کرۂ ارض پر مٹی ہی حیات کی بنیاد ہے۔ اسی سے انسان کو بنایا گیا ہے اور اسے زندگی دی گئی ہے۔ یہ بات اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا کہ یہ معجزہ کس طرح ظہور میں آیا زندگی اور زمین کی تاریخ میں یہ عظیم واقعہ کب اور کس طرح وجود میں آیا۔ رہا نسلوں کا چلنا تو اس کا نظام یوں بنایا گیا کہ مرد کا خلیہ یعنی نطفہ جب عورت کے انڈے سے ملتا ہے اور یہ دونوں آپس میں متحد ہو جاتے ہیں اور رحم میں خون کے ایک لوتھڑے کی شکل میں ٹک جاتے ہیں تو جنین اپنے مراحل طے کرتا ہے اور

اپنے آخری مرحلے میں بچہ نمودار ہوتا ہے۔ پیدا ہونے سے قبل بچے میں بہت بڑے بڑے انقلابات ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ابتدائی خلیے کو غور سے دیکھا جائے تو اس کی زندگی بچے کی زندگی سے زیادہ طویل ہے یعنی ولادت سے لے کر موت تک کے عرصہ سے 'سیاق کلام میں قرآن مجید نے یہاں صرف اس کی بعض ممتاز صفات و مراحل کا ذکر کیا ہے۔ یعنی بچپنے کا مرحلہ 'پھر سن رشد تک پہنچنا یعنی تیس سال کی عمر تک پھر بڑھاپا۔ یہ وہ مراحل ہیں جنہیں طے کر کے انسان اپنے کمزور' آغاز و انجام کے درمیان اپنی پوری قوت تک پہنچتا ہے۔

وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ (۴۰ : ۶۷) "تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے"۔ اور وہ یہ پورے مراحل طے نہیں کرتا یا بعض مراحل اس سے چھوٹ جاتے ہیں اور وہ فوت ہو جاتا ہے۔

وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى (۴۰ : ۶۷) "یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ"۔ یہ وقت مقرر' طے شدہ اور معلوم ہے۔ اس میں کوئی تقدیم اور تاخیر نہیں ہوتی۔

وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۴۰ : ۶۷) "اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو"۔ جنین کا سفر طے کرنا' پھر بچے کا سفر طے کرنا' پھر ان کی شکل و صورت کا حسن اور ان کی طبیعی نشو و نما کے صحیح صحیح اندازے اور اطوار میں سوچنے کا بہت بڑا سامان ہے۔

جنین کا سفر تو نہایت ہی حیرت انگیز سفر ہے۔ علوم طبیہ کی ترقی کے بعد تو اس کے بارے میں ہم نے حیرت انگیز معلومات حاصل کر لی ہیں۔ علوم جنین ایک مستقل شعبہ ہے لیکن قرآن نے جس انداز سے آج سے چودہ سو سال قبل اس کے بعض مراحل کی طرف جس ٹھیک ٹھیک اندازے سے اشارہ کیا ہے' یہ فکر و نظر کے لیے دامن گیر ہے۔ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان مراحل سے غافل ہو کر گزر جائے اور ان پر گہرا غور و فکر نہ کرے۔ جنین کا سفر اور بچے کا سفر انسانی احساس پر گہرے اثرات چھوڑتے ہیں اور انسانی دل کو خوب جھنجھوڑتے ہیں۔ چاہے عقل و رشد کے جس مرحلے میں بھی وہ ہو۔ ہر نسل انسانی' اپنی معلومات کے حوالے سے اس سے متاثر ہوتی ہے' اس لیے قرآن نے انسانی نسلوں کو اس طرف متوجہ کیا ہے اس لیے کہ اس سے انسان متاثر ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ آزاد ہے' لبیک کہے یا نہ کہے۔

اس بحث کے بعد زندہ کرنے اور مارنے اور تخلیق اور نشو و نما کے بارے میں ایک سبق آموز تبصرہ:

هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۴۰ : ۶۸)

"وہی ہے زندگی اور موت دینے والا۔ وہ جس بات کا بھی فیصلہ کرتا ہے بس ایک حکم دیتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ ہو جاتی ہے"۔ قرآن میں آیات موت و حیات کا بہت ذکر ہوا ہے۔ کیونکہ موت و حیات کا مضمون انسانی شخصیت کو گہرے طور پر متاثر کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی ممتاز اور بار بار دہرائے جانے والے واقعات ہیں اور انسانی حس ان کو بہت ہی قریب سے دیکھتی ہے۔ بادی النظر میں زندہ کرنے اور مارنے سے جو بات انسان کی سمجھ میں آتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو حیات و ممات کا مفہوم اس سے کہیں گہرا ہے۔ حیات کی بھی کئی اقسام ہیں' موت کی بھی کئی اقسام ہیں۔ زمین کو ہم مردہ

دیکھتے ہیں ۔ پھر زمین ہی کو ہم زندہ اور سرسبز دیکھتے ہیں ۔ جب مردہ ہو تو درختوں کے پتے نہیں ہوتے ' شاخیں خشک نظر آتی ہیں ' ایک تو یہ موسم ہوتا ہے ' اور جب یہ زندہ ہوتے ہیں تو یہی مردہ شاخیں اور ٹہنیاں سرسبز اور شاداب ہو کر لہلہاتی ہیں ۔ ان شاخوں کا انگ انگ پھوٹ جاتا ہے اور پھول اور پتے نکل آتے ہیں ۔ یوں لگتا ہے کہ زندگی ان شاخوں سے ابلی پڑتی ہے ۔ ایک انڈے کو دیکھو ' پھر بچے کو دیکھو ' بیج کو دیکھو اور اگنے والے پودے کو دیکھو ' اور پھر الٹے سفر کو دیکھو کہ یہی زندگی موت میں بدل جاتی ہے اور بجھے ہوئے کھیت سامنے آتے ہیں ۔ یہ سب حالات دل اور دماغ کو متاثر کرتے ہیں اور بموجب "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" ہر شخص کا تاثر مختلف ہوتا ہے ۔

آخر میں موت و حیات سے آگے ' اہم سوال کہ کائنات کس طرح وجود میں آئی ؟ بس اللہ کا ارادہ ہوا ' کن کا حکم ہوا اور سب کچھ ہو گیا یا جو چاہا ہو گیا ۔ یہ کائنات ہوتی چلی گئی اور تسلسل قائم ہوتا چلا گیا ۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

--- ○○○---

حیات و ممات کے اس منظر کے بعد اور انشاء و تخلیق کے کن فیکون کے بعد ' اللہ کی نشانیوں اور مہربانیوں میں جدل و جدال اور بحث و تکرار لاحاصل اور بہت عجیب و غریب ہے اور رسولوں کے پیغام اور دعوت کی تکذیب اس سے بھی عجیب تر ہے ۔ اب ہو جاؤ خبردار ! ایک خوفناک منظر تمہارے سامنے آنے والا ہے ۔ خبردار ! یہ قیامت ہے اور تم نے اس منظر کو دیکھنا ہے ' ذرا دیکھنے سے پہلے ہی دیکھ لو !

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿٦٩﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ڜ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٠﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ﴿٧١﴾ فِي الْحَمِيْمِ ڏ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿٧٢﴾ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٣﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـــًٔا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٤﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿٧٥﴾ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٧٦﴾

"تم نے دیکھا ان لوگوں کو جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں ' کہاں سے وہ پھرائے جا رہے ہیں ؟ یہ لوگ جو اس کتاب کو اور ان ساری کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجی تھیں ' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں کھینچی جائیں گی ' کھولتے ہوئے پانی میں اور دوزخ کی آگ میں

بھونک دیئے جائیں گے۔ پھران سے پوچھا جائے گا کہ ”اب کہاں ہیں اللہ کے سوا وہ دوسرے خدا جن کو تم شریک کرتے تھے؟“ وہ جواب دیں گے ”کھوئے گئے وہ ہم سے، بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہ پکارتے تھے“۔ اس طرح اللہ کافروں کو گمراہ ہونا متحقق کر دے گا۔ ان سے کہا جائے گا ”یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم زمین میں غیر حق پر مگن تھے۔ اور پھر اس پر اتراتے تھے۔ اب جاؤ، جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے، بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا“۔

یعنی گزشتہ آیات میں اللہ کی جو نشانیاں بیان ہوئیں ان کے ہوتے ہوئے ان لوگوں کا رویہ قابل تعجب ہے جو اللہ کی ان نشانیوں کے بارے میں پھر بھی بحث و جدال کرتے ہیں، لیکن ان کا انجام کیا ہونے والا ہے، نہایت عبرت آموز!

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ اَنّٰی یُصْرَفُوْنَ (۴۰:۶۹) اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَ بِمَاۤ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا (۴۰:۷۰) ”تم نے دیکھا ان لوگوں کو جو اللہ کی آیات میں جھگڑے کرتے ہیں، کہاں سے وہ پھرائے جا رہے ہیں؟ یہ لوگ جو اس کتاب کو اور ان ساری کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجی تھیں“۔

انہوں نے تو صرف ایک کتاب قرآن اور ایک رسول حضرت محمد ﷺ کو جھٹلایا تھا مگر اس طرح کر کے انہوں نے تمام کتابوں اور تمام رسولوں کو جھٹلا دیا کیونکہ تمام رسولوں کا عقیدہ توحید ایک ہی تھا اور یہی عقیدہ اپنی مکمل صورت میں خاتم النبیین ﷺ کو دیا گیا۔ لہٰذا انہوں نے گویا تمام رسالتوں اور تمام رسولوں کی تکذیب کر دی۔ ہر مکذب نے یہی کیا خواہ قدیم زمانے میں تھا یا جدید زمانے میں اس نے عقیدۂ توحید ہی کی تکذیب کی۔

فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ (۴۰:۷۰) ”عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا“۔ کہ ان کا انجام کیا ہو گا۔ آگے تفصیلات دے دیں کہ ایسے لوگوں کا انجام کیسا ہوتا ہے۔ یہی کہ نہایت توہین آمیز اور حقارت آمیز انداز میں ان کو سزا دی جائے گی صرف سزا نہ ہو گی بلکہ اہانت اس کے ساتھ شامل ہو گی۔

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ (۴۰:۷۱) ”جب طوق اور زنجیریں ان کی گردنوں میں ہوں گی، اور کھینچے جائیں گے“۔ اس طرح جس طرح مویشی کھینچے جاتے ہیں، اہانت کے ساتھ۔ عزت ان کی کیوں ہو، انہوں نے خود ہی عزت کا لباس اتار پھینکا تھا۔ یوں توہین کے ساتھ کھینچ کر اور چلا کر آخر کار انہیں گرم پانیوں اور آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

فِی الْحَمِیْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ (۴۰:۷۲) ”گرم پانی میں، پھر آگ میں جھونک دیئے جائیں گے“۔ یعنی ان کو باندھا جائے گا۔ پھر کتوں کی طرح گلے میں زنجیریں ڈال کر ہانکا جائے گا اور ان کو ایسے مکان میں گرا دیا جائے گا جو گرم پانی اور آگ سے بھرا ہو گا۔

یہ لوگ ایسی ہی حالت میں ہوں گے کہ ان پر سرزنش، ملامت دھتکار آئے گی:

ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۴۰ : ۷۴) "پھر ان سے پوچھا جائے گا اب کہاں ہیں اللہ کے سوا وہ خدا جن کو تم شریک کرتے تھے"۔

اب وہ ایسا جواب دیتے ہیں جس طرح وہ شخص دیتا ہے جس کے ساتھ دھوکہ ہوا اور پھر یہ دھوکہ ظاہر ہو گیا اور وہ نہایت مایوس اور ضرر رسیدہ ہوتا ہے :

قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا (۴۰ : ۷۴) "وہ جواب دیں گے کھوئے گئے وہ ہم سے ' بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہ پکارتے تھے"۔ وہ تو ہم سے اس طرح غائب ہو گئے کہ اب ہمیں ان کے ڈھونڈنے کا راستہ تک معلوم نہیں۔ اور نہ اب وہ ہم کو راستہ بتاتے ہیں۔ بلکہ اس سے پہلے ہم جن کو پکارتے تھے وہ تو کوئی چیز ہی نہ تھے محض اوہام اور افسانے تھے۔۔۔ اس مایوس کن جواب پر یہ تبصرہ اور عبرت ۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ (۴۰ : ۷۴) "اس طرح اللہ کافروں کا گمراہ ہونا متحقق کر دے گا" اور اس کے بعد پھر سرزنش اور ان کے گمراہی کا سبب ۔

ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ (۴۰ : ۷۵) اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ

(۴۰ : ۷۶) "ان سے کہا جائے گا" یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم زمین میں غیر حق پر مگن تھے ۔ اور پھر اس پر اتراتے تھے ۔ اب جاؤ' جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ' ہمیشہ تم کو وہیں رہنا ہے 'بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا"۔

اے فریاد رس خداوند! یہ طوق اور زنجیریں گلے میں باندھ کر گرم پانیوں اور آگ میں کہاں لے جائے گئے؟ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے دائمی عذاب سے پہلے گرم پانی اور آگ کا عذاب دیا گیا۔

فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۴۰ : ۷۶) "بہت ہی برا ٹھکانا ہے متکبرین کا"۔ یہ توہین آمیز سزا ان کو جو دی جا رہی ہے اس کا حقیقی سبب تو کبر ہی ہے اور اس کبر ہی کی وجہ سے اس سخت سزا کے ساتھ تحقیر اور تذلیل کو شامل کیا گیا ہے۔

--- ○○○---

اس خوفناک عذاب کے منظر اور ذلت آمیز سلوک کے بعد' جو آیات الٰہی میں ناروا جدل و جدال کے نتیجے میں ان پر نازل ہوا اور جس کا سبب حقیقی کبر تھا' جو انسان کو پھلا دیتا ہے' اس منظر کے بعد اور اس برے انجام کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں کیونکہ ان لوگوں کے کبر و جدال کی وجہ سے آپ کو بے حد تکلیف ہوتی ہے' آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ چاہے اسلامی انقلاب کا وعدہ آپ کی حیات میں پورا ہو یا بعد

میں 'یہ اللہ کی رضا ہے کہ وہ جس طرح چاہے 'کرے رسول کا کام یہ ہے کہ وہ تبلیغ کر کے اللہ کے پاس چلا جائے ۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝

"پس اے نبیؐ 'صبر کرو' اللہ کا وعدہ برحق ہے 'اب خواہ ہم تمہارے سامنے ہی ان کو ان برے نتائج کا کوئی حصہ دکھا دیں جن سے ہم انہیں ڈرا رہے ہیں 'یا (اس سے پہلے) تمہیں دنیا سے اٹھالیں 'پلٹ کر آنا تو انہیں ہماری ہی طرف ہے" ۔

یہ ایک جھلک ہے 'ہمیں چاہئے کہ ذرا اس پر غور کریں ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دور میں مخالفین کی جانب سے کبر' اذیت 'تکذیب اور نافرمانی کی اذیت جھیل رہے تھے ۔آپ کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ کے فرائض یہ ہیں 'بس آپ ان تک اپنے آپ کو محدود کر دیں 'رہے نتائج تو ان کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے یہاں تک کہ وہ مکذبین اور متکبرین کو اس دنیا میں سزا پاتے دیکھنے کی خواہش بھی نہ رکھیں ۔آپ کا فرض ہے کہ آپ حکم بجالائیں 'اپنا فریضہ ادا کر دیں 'کیونکہ انجام تک کسی بات کو پہنچانا یہ داعی کا کام نہیں ہے ۔یہ اللہ کے اختیار میں ہے 'اور وہ وہی کچھ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے ۔

الہ العالمین! کس قدر بلند مقام ہے یہ ۔کس قدر کامل آداب کی تلقین ان لوگوں کو جو دعوت اسلامی کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور یہ کون ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے رفقاء!

نفس انسانی کے لیے یہ حکم بہت بھاری ہے ۔یہ ایک ایسا حکم ہے جو ضعیف انسان کی چاہتوں کے خلاف ہے ۔یہی وجہ ہے کہ یہاں یہ حکم دینے سے بھی پہلے صبر کی تلقین کی گئی ہے ۔لہذا یہاں دوبارہ صبر کی تلقین کا حکم دینا تکرار نہیں ہے ۔یہ ایک نئے انداز کا صبر ہے ۔یہ صبر ایذا 'تکذیب اور استہزاء سے بھی زیادہ مشکل صبر ہے ۔تمام داعیوں کو 'انسان اور بشر داعیوں کو' یہ کہہ دینا کہ تمہارے دشمنوں کو ضرور سزا ہوگی 'اللہ ان کو ضرور پکڑے گا لیکن شاید تم نہ دیکھ سکو' یہ انسان کی اس خواہش کے خلاف ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کو سزا پاتے دیکھے ۔یہ شدید خواہش ہوتی ہے 'جبکہ داعیوں پر مظالم ہو رہے ہوں لیکن یہ آداب الٰہیہ ہیں اور یہ اللہ کی جانب سے اپنے مختار بندوں کی تربیت ہے اور نفس انسانی کو ہر اس بات سے پاک کرنا مطلوب ہے جس میں کوئی ادنیٰ سی خواہش بھی ہو ۔اگرچہ یہ خواہش صرف یہ ہو کہ دشمنان دین کو سزا ہو جائے ۔

اس نکتے پر تمام داعیان دین کو غور کر لینا چاہئے 'چاہے وہ جس زمان و مکان میں بھی ہوں' خواہشات کے طوفانوں میں یہ کامیابی کا لنگر ہے ۔یہ خواہشات تو ابتداء میں بڑی پاکیزہ نظر آتی ہیں لیکن آخر میں شیطان ان میں گھس آتا ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۲۶ ایک نظر میں

یہ پورا سبق اس سے پہلے سبق کے آخر میں آنے والے درس عبرت کی تکمیل و تشریح ہے ۔ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی مومنین کو ہدایت کی گئی تھی کہ آپ لوگ مشکلات راہ پر صبر کریں ۔ اس وقت تک کہ اللہ کا حکم آجائے اور اللہ نے فتح اسلام کا جو وعدہ کیا ہے وہ پورا ہو جائے ۔ چاہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہو یا آپؐ کی وفات کے بعد ہو ۔ کیونکہ اختیار آپؐ کے ہاتھ میں نہیں ہے ۔ بلکہ معاملہ اسلام اور اسلام کو ماننے والوں اور ان کے مخالفین اور مجادلین کا ہے ۔ دونوں برسرجنگ ہیں اور فیصلہ ان کے درمیان اللہ کو کرنا ہے ۔ اور یہ اللہ ہی ہے جو اسلامی انقلاب کی تحریک کو چلاتا ہے ' جس طرح چاہتا ہے ۔

یہ سبق جس پر اس سورت کا خاتمہ ہو رہا ہے ' اس حقیقت کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کر رہا ہے یہ کہ کفر و اسلام کی جنگ کوئی نئی بات نہیں ہے اور نہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور اسلام سے شروع ہوئی ہے ۔ آپؐ سے قبل بھی رسول بھیجے گئے ہیں بعض کے قصے آپ کے سامنے بیان کیے گئے ہیں اور بعض کے بیان نہیں کیے گئے ۔ ان سب کا استقبال تکذیب اور انکار سے کیا گیا ۔ سب سے مطالبہ کیا گیا کہ معجزات پیش کرو ' اور سب نے یہ تمنائیں کیں کہ کاش اللہ کوئی معجزہ صادر کر دے جس کو دیکھ کر تکذیب کرنے والے مان لیں ' لیکن معجزات کا صدور اللہ کے حکم سے ہوتا ہے ۔ اور اس وقت ہوتا ہے جب اللہ چاہتا ہے ۔ یہ دعوت ' اللہ کی دعوت ہے وہ جس طرح چاہتا ہے ' اسے چلاتا ہے ۔

البتہ اللہ کے بعض معجزات اس کائنات میں بکھرے پڑے ہیں ' ہر زمان و مکان کے لوگوں کی نظروں کے سامنے ہیں ۔ مثلاً مویشی ' کشتیاں اور دوسری چیزیں جن کا انکار کوئی نہیں کر سکتا ۔

اور اس سبق کا خاتمہ ایک نہایت شدید جھٹکے سے ہوتا ہے جس میں ان اقوام کی ہلاکت دکھائی گئی ہے جنہوں نے اس سے قبل تکذیب کی اور وہ اپنے مال ' دولت اور ترقی پر نازاں رہے ۔ اللہ نے پھر ان کو اپنی سنت کے مطابق پکڑا ۔

فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ (۴۰ : ۸۵) "مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکا تھا ' کیونکہ یہی اللہ کا مقرر شدہ ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا ہے اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑے ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۲۶ تشریح آیات

۷۸ --- تا --- ۸۵

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾

۸
ع ۱۰
۱۳

"اے نبیؐ، تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تم کو بتائے ہیں اور بعض کے نہیں بتائے۔ کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی لے آتا۔ پھر جب اللہ کا حکم آگیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا اور اس وقت غلط کار لوگ خسارے میں پڑ گئے"۔

اقامت دین کی جدوجہد کی مثالیں اور پیغمبر بھیجنے کی مثالیں سابقہ تاریخ میں موجود ہیں۔ بعض کے واقعات قرآن میں بیان کیے گئے ہیں اور بعض کا تذکرہ نہیں کیا گیا' اور جن کے واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں تحریک اسلامی کی طویل جدوجہد کے نشانات راہ موجود ہیں۔ یہ راستہ واضح ہے اور طویل ہے اور اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ اور ان پیغمبروں کے واقعات صاف صاف بتاتے ہیں کہ اللہ کی سنت کیا ہے اور رسولوں کا فریضہ کیا ہے۔

اور جس بات کی تاکید مطلوب ہے اس کی وضاحت بھی کر دی گئی جس پر ہر داعی کو اعتماد کرنا چاہئے وہ یہ کہ۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴۰ : ۷۸) "کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی لے آئے"۔

نفس انسانی کی یہ شدید خواہش ہوتی ہے' اگرچہ رسول ہی کیوں نہ ہو کہ دعوت اسلامی کے مخالفین دعوت اسلامی کو قبول کرلیں' اور اس کے مقابلے میں سرکشی اور ضد کرنے والے لوگ اس پر یقین کرلیں۔ اس لیے قدرتی وطر پر انسانی نفوس معجزات کے صدور کی خواہش رکھتے ہیں تاکہ مخالفین کی زبانیں بند ہو جائیں اور وہ یقین کرلیں لیکن اللہ کی خواہش یہ ہے کہ اس کے مختار بندے صبر کا سہارا لیں اور اپنے آپ کو دعوت پر قائم رکھیں۔ یہ بات یوں کہی جاتی ہے کہ فتح و شکست کا معاملہ تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم دعوت پہنچا دو۔ رہا معجزہ دکھانا' تو یہ اللہ کا کام ہے'

جس وقت اللہ چاہے گا معجزہ آ جائے گا۔ تم اطمینان رکھو' ثابت قدم رہو اور دلجمعی سے کام کرو اور جو نتائج تمہارے ہاتھوں سے برآمد ہوتے ہیں' ان پر صبر کرو' دعوت کا انجام اللہ کے سپرد کر دو۔

یہاں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ لوگ حقیقت الوہیت کو بھی جان لیں اور منصب رسالت کو بھی سمجھ لیں۔ اور یہ جان لیں کہ رسول بھی بشر ہوتے ہیں۔ ان کو اللہ نے منصب نبوت کے لیے چن لیا ہوتا ہے۔ ان کے لیے فریضہ مقرر کر دیا جاتا ہے' نہ وہ طاقت رکھتے ہیں اور نہ ان کو اجازت ہے کہ اپنے فرائض کے حدود سے آگے بڑھیں۔

پھر یہ کہ معجزات کے آنے میں تاخیر ان کے لیے ایک نعمت ہے کیونکہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جب معجزات آتے ہیں اور لوگ انکار کرتے ہیں تو اللہ پھر ایسی اقوام کو ہلاک کر دیتا ہے اس لیے معجزہ نہ آنا دراصل ایک مہلت ہے اور یہ مہلت اللہ کی طرف سے ہے۔

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ (۴۰ : ۷۸) "پھر جب اللہ کا حکم آ گیا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا۔ اور اس وقت غلط کار لوگ خسارے میں پڑ گئے"۔ اب پھر عمل اور توبہ یا واپسی کی کوئی مہلت باقی نہیں رہتی اور آخری فیصلہ ہو جاتا ہے۔

---ooo---

اب ان لوگوں کو جو معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں' ان آیات و معجزات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اس کائنات میں بکھرے پڑے ہیں اور جن کو رات دن دیکھتے دیکھتے انسان ان کے ساتھ اس قدر مانوس ہو گیا ہے کہ اب وہ اس کے لیے معجزہ نہیں رہے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر ان پر غور و فکر کیا جاتا تو ہرگز مزید کسی معجزے کا مطالبہ نہ ہوتا۔ یہ تمام چیزیں اللہ کی الوہیت کی بھی نشانیاں ہیں' کیونکہ اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جو دعویٰ کر سکتا ہو کہ اس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے اور اسی طرح یہ دعویٰ بھی بادی النظر میں مسترد ہے کہ یہ تمام کائنات از خود وجود میں آگئی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

"اللہ ہی نے تمہارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔ ان کے اندر تمہارے لیے اور بھی بہت سے منافع ہیں۔ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمہارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو وہاں تم ان پر پہنچ سکو۔ ان پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو۔ اللہ اپنی یہ نشانیاں تمہیں دکھا رہا ہے' آخر تم اس کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے"۔

ان مویشیوں کی ابتدائی تخلیق اسی طرح نشانی ہے جس طرح انسان کی تخلیق نشانی اور معجزہ ہے' ان حیوانات کے اندر

روح ڈالنا' ان کو اس شکل و صورت میں بنانا اور ان کو رنگا رنگ پیدا کرنا سب معجزات ہیں ـ پھر یہ تمام جانور اور مویشی انسان کے لیے مسخر کیے گئے ہیں حالانکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو جسم کے اعتبار سے بھی اور قوت کے اعتبار سے بھی انسان سے زیادہ قوی ہیں لیکن ـ

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۴۰ : ۷۹) ”اللہ ہی نے تمہارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ“ ـ اب اگر کوئی کہے کہ یہ جانور اسی طرح دنیا میں پائے گئے ہیں اور یہ کہ انسان کے لیے یہ کوئی معجزہ نہیں ہیں' یا یہ کہ یہ جانور کسی خالق پر دلالت نہیں کرتے جس نے انہیں پیدا کیا ہو اور انسان کے لیے مسخر کیا اور ان جانوروں کے اندر یہ خصائص موجود ہیں اور انسانوں کے اندر بھی یہ خصائص موجود ہیں تو اسی قسم کی باتیں قابل قبول نہیں ہیں اور انسانی کی فطری سوچ اس کے خلاف ہے ـ لہٰذا جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ بہت ہی سطحی لوگ ہیں اور ان کی یہ باتیں بالکل سطحی اور محض جدال ہیں ـ

ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ ان آیات میں کیا کیا خوارق عادت معجزات ہیں اور کیا کیا نعمتیں ہیں ـ

لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۴۰ : ۷۹) وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ (۴۰ : ۸۰) ”تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ ـ ان کے اندر تمہارے لیے اور بھی بہت سے منافع ہیں ـ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمہارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو وہاں تم ان پر پہنچ سکو ـ ان پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو“ ـ اور وہ خواہشات جو ان کے دلوں میں ہوتی تھیں اور ان جانوروں پر سوار ہو کر وہ ان تک پہنچتے تھے ـ وہ بہت بڑی حاجات و ضروریات تھیں' خصوصاً اس دور میں ـ اس دور میں نقل و حمل کے موجودہ ذرائع تو تھے نہیں ـ لیکن آج تک یہ جانور بعض ضروریات پورا کرتے ہیں ـ آج بھی بعض پہاڑ ایسے دشوار گزار ہیں کہ وہاں تک کوئی جہاز' کوئی ریل' کوئی موٹر وغیرہ نہیں جاتے ـ وہاں یہی جانور کام آتے ہیں ـ ان پہاڑوں میں راستے اس قدر تنگ ہوتے ہیں کہ وہاں یہی جانور کام کرتے ہیں ـ

وَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ (۴۰ : ۸۰) ”ان پر بھی اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو“ ـ یہ دونوں اللہ کی نشانیوں میں سے نشانیاں ہیں ـ اور اللہ کی ان مہربانیوں میں سے ہیں جو اس نے انسان پر کیں ـ کشتی کو پانی پر چلایا ـ یہ وہ خصوصیات ہیں جو پانی اور کشتی کے اندر تخلیق کے وقت رکھی گئیں ـ زمین میں بھی اور آسمان میں بھی ـ خشکی میں بھی اور تری میں بھی ـ چاہے یہ کشتی بادبانوں سے چلے' بخارات سے چلے یا ایٹمی قوت سے چلے یا ان کے بھی علاوہ کسی اور قوت سے چلے جو اللہ نے اس کائنات میں رکھ دی ہیں اور انسان کو یہ توفیق بخشی ہے کہ وہ ان قوتوں کو کام میں لائے ـ اس لیے ان سب چیزوں کو اللہ کے معجزات اور اللہ کے دیئے ہوئے انعامات کے مضمون میں لایا گیا ہے ـ

اور اس قسم کی کئی آیات و معجزات اس کائنات میں جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کسی معجزے اور انعام کا انکار کر سکے بشرطیکہ وہ سنجیدہ ہو۔

وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ فَاَیَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ (۴۰ : ۸۱) "اللہ اپنی یہ نشانیاں تمہیں دکھا رہا ہے ' آخر تم اللہ کی کن کن نشانیوں سے انکار کرو گے"۔ ہاں بعض لوگ ہیں جو انکار کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں ' بعض ایسے ہیں جو باطل دلائل لے کر آتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے حق کو نیچا دکھائیں۔ لیکن ان سب میں سے کوئی بھی نیک نیت نہیں ہے یا اس کے اندر ٹیڑھ ہے یا کوئی مفاد ہے ' یا کبر ہے یا اسے کوئی مغالطہ ہے یا کسی اور غرض کے لیے یہ کر رہا ہے۔

بعض لوگ اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ فرعون اور دوسرے لوگوں کی طرح ذی جاہ اور سرکش اور ظالم ہیں ' ان کو اپنی حکومت اور اقتدار کا خطرہ ہے ' ان کو تخت و تاج کا خطرہ ہے ' یہ تخت و تاج جن خاکوں پر قائم ہیں ان کو دعوت حق اڑا دیتی ہے 'کیونکہ دعوت اسلامی کا نظریہ یہ ہے کہ الٰہ اور حاکم ایک ہوتا ہے۔

بعض لوگ اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ مذہبی راہنما ہیں ' بعض اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ ایک خاص طرز کا نظام حکومت و معیشت چاہتے ہیں مثلاً اشتراکیت کے علم بردار ' جب آسمانی عقائد و نظریات ثابت ہو جائیں تو ان کا نظریہ اڑ جاتا ہے۔ اسلام تو لوگوں کو زمین کے ساتھ نہیں چمٹاتا۔ پیٹ اور جسم کی خواہشات کا بندہ نہیں بناتا اور اللہ کی بندگی سے چھڑا کر کسی دوسرے نظریہ یا کسی دوسرے لیڈر کی بندگی میں داخل نہیں کرتا۔

بعض لوگ اس لیے جھگڑتے ہیں کہ وہ پاپائیت سے جان چھڑانا چاہتے ہیں جیسا کہ قرون وسطیٰ میں اہل کینسہ اور عوام کے درمیان ہوا۔ چونکہ عوام پاپائیت سے جان چھڑانا چاہتے ہیں ' اس لیے انہوں نے اہل کینسہ کو ان کا الٰہ بھی واپس کر دیا۔ کیونکہ الٰہ کے نام سے انہوں نے لوگوں کو غلام بنا رکھا تھا۔

ان اسباب کے سوا اور بھی کئی اسباب ہیں ' لیکن انسان کی فطری سوچ ان تمام اسباب کو مسترد کر دیتی ہے اور اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے جو اس کائنات کے وجود میں مستقلاً موجود ہے اور جس کی موجودگی کی نشاندہی کائنات کی یہ نشانیاں کرتی ہیں۔ اور آخر میں یہ زور دار تبصرہ :

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸۲ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸۳ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَ كَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ

مُشْرِكِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾

۹ ع ۷ ۱۴

"پھر کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کو ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے تعداد میں زیادہ تھے' ان سے بڑھ کر طاقتور تھے' اور زمین میں ان سے زیادہ شاندار آثار چھوڑ گئے ہیں۔ جو کچھ کمائی انہوں نے کی تھی' آخر وہ ان کے کس کام آئی؟ جب ان کے رسول ان کے پاس بینات لے کر آئے تو وہ اسی علم میں مگن رہے جو ان کے اپنے پاس تھا' اور پھر اسی چیز کے پھیر میں آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو پکار اٹھے کہ ہم نے مان لیا اللہ وحدہ لاشریک کو اور ہم انکار کرتے ہیں ان سب معبودوں کا جنھیں ہم اس کا شریک ٹھیراتے تھے مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکتا تھا' کیوں کہ یہی اللہ کا مقرر ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا ہے اور اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے"۔

انسانی تاریخ میں گزشتہ اقوام کی تباہی کے ایام بہت ہیں اور بعض تو ایسے ہیں جس کے آثار آج بھی موجود ہیں اور ان کے مرثیہ خواں ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ زبانی روایات کے ذریعے ان کی کہانیاں محفوظ ہیں۔ بعض کی کہانیاں کتابوں کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ قرآن کریم بار بار ان ایام اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس لیے کہ انسانیت جس لائن پر بڑھتی چلی آئی ہے اس میں جابجا حقائق موجود ہیں۔ پھر ان ایام اللہ کا اثر بھی انسان پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اور قرآن چونکہ خالق فطرت کی طرف سے نازل ہو رہا ہے اس لیے وہ فطرت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرتا ہے۔ قرآن فطرت کی راہ و رسم سے خوب واقف ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ اس کی یہ مخلوق کس بات سے متاثر ہوتی ہے اور کس انداز سے اس کے دل میں بات اتاری جا سکتی ہے' اللہ کو پتہ ہے کہ انسانی دل کا کون سا دروازہ صرف ایک ہی دستک دینے سے کھل جاتا ہے اور کون سا دروازہ چند زوردار دستک دینے سے کھلتا ہے اور کون سا ہے جو زنگ آلود ہو گیا اور توڑے بغیر نہیں کھلتا۔

اللہ انسانوں سے پوچھتا ہے' انہیں انسانی تاریخ کی سیر کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے کہ ذرا کھلی آنکھوں سے انسانی تاریخ کے نشیب و فراز کو دیکھو۔ وادی وادی میں گھومو اور احساس کو تیز رکھو' اور قلب و نظر کو کھول کر چلو' دیکھو اور غور کرو' تم سے پہلے اس زمین پر کیا کیا ہوتا رہا ہے اور انسان پر کیا کیا مصائب ٹوٹے ہیں۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

(۴۰ : ۸۲) "پھر کیا زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کو ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں"۔ قبل اس کے کہ ان کے انجام کو بتایا جائے' ان کے کچھ خدوخال بتائے جاتے ہیں اور ان کے حالات زندگی سے موازنہ کیا جاتا ہے تاکہ یہ عبرت آموزی مکمل ہو۔

كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ (۴۰ : ۸۲) "وہ ان سے تعداد میں

زیادہ تھے' ان سے بڑھ کر طاقتور تھے اور زمین میں ان سے زیادہ شاندار آثار چھوڑ گئے ہیں"۔ کثرت تعداد' سیاسی قوت اور ترقی سب میں موجودہ لوگوں سے زیادہ تھے۔ ان میں سے کئی نسلیں تھیں جو عربوں سے پہلے گزری تھیں۔ بعض کے قصے تو رسول کو سنائے گئے اور بعض کو تاریخ کے قبرستان میں مدفون ہی چھوڑ دیا گیا اور بعض قصے عربوں کو معلوم تھے اور بعض کے آثار کو وہ شب و روز دیکھتے تھے۔

فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۴۰ : ۸۲) "جو کچھ کمائی انہوں نے کی تھی آخر وہ ان کے کس کام آئی"۔ نہ ان کی کثرت' نہ قوت اور نہ ترقی ان کو بچا سکی۔ حالانکہ وہ انہی چیزوں پر بھروسہ کیے ہوئے تھے اور مغرور تھے۔ بلکہ ان کی ہلاکت کا سبب یہی باتیں ہوئیں۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (۴۰ : ۸۳) "جب ان کے رسول ان کے پاس بینات لے کر آئے تو وہ اس علم میں مگن رہے جو ان کے پاس تھا"۔ علم بغیر ایمان کے ایک عظیم فتنہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور سرکش بنا دیتا ہے۔ اس قسم کے ظاہری اور سائنسی علوم لوگوں کو مغرور بنا دیتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنے اس علم کی وجہ سے وہ اقتدار میں ہیں' بڑی بڑی قوتوں کو چلاتے ہیں اور بڑے بڑے خزانوں کے مالک ہیں۔ یوں وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور وہ ان وسعتوں کو بھول جاتے ہیں جن تک ابھی ان کے علم کو رسائی نہیں ہوئی ہے حالانکہ وہ وسعتیں اس کائنات میں موجود ہیں۔ ان قوتوں پر ابھی انہوں نے قابو نہیں پایا ہوتا ہے بلکہ ان کا تصور بھی وہ نہیں کر پاتے' ان کو تو وسعتوں کے صرف ایک معمولی کنارے تک رسائی ہوئی ہوتی ہے۔ یوں یہ بے ایمان صاحب علم پھول جاتا ہے اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس کا علم اسے بھلا دیتا ہے اور اس کا جہل اسے اپنی حقیقت بھلا دیتا ہے۔ اگر وہ یہ قیاس کر لیتا کہ اس کا علم تو بہت ہی تھوڑا ہے اور اس کے جہل کا دائرہ بہت وسیع ہے اور جس کا وہ اندازہ کرتا ہے وہ اس سے بہت تھوڑا ہے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تو وہ سر جھکا لیتا اور اپنی کبریائی کو تھوک دیتا اور یہ جو پھول رہا ہے اس میں زرا کمی کر دیتا۔

بہرحال یہ لوگ جو اپنے موجودہ علم میں مگن ہو گئے تھے وہ یاد دہانی کرانے والوں کا مذاق اڑاتے رہے۔

وَحَاقَ بِهِمْ مَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۰ : ۸۳) "پھر اس چیز کے پھیرے میں آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے"۔

جب انہوں نے اللہ کے عذاب کو دیکھا تو پردہ گر گیا اور ان کو معلوم ہو گیا کہ جس چیز پر ان کو غرور تھا وہ تو کچھ نہ تھی۔ اب انہوں نے اس بات کا اعتراف کر لیا جس کا وہ انکار کرتے تھے۔ اللہ کی وحدانیت کے قائل ہو گئے۔ اپنے شرکاء کا انکار کر دیا لیکن اب تو وقت چلا گیا تھا۔

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَکَفَرْنَا بِمَا کُنَّا بِهٖ مُشْرِکِیْنَ

(۴۰ : ۸۴) فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (۴۰ : ۸۵) "جب انہوں نے ہمارا

عذاب دیکھ لیا تو پکار اٹھے کہ ہم نے مان لیا اللہ وحدہ لاشریک کو اور ہم انکار کرتے ہیں ان سب معبودوں کا جنھیں ہم اس کا شریک ٹھیراتے تھے مگر ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد ان کا ایمان ان کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکتا تھا"۔کیونکہ یہ اللہ کی سنت ہے کہ عذاب دیکھ لینے کے بعد ایمان قبول نہیں ہوتا اس لئے کہ اس وقت خوف کی توبہ ہوتی ہے ۔ ایمان کی توبہ نہیں ہوتی۔

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ (۴۰ : ۸۵) "کیونکہ یہی اللہ کا مقرر ضابطہ ہے جو ہمیشہ اس کے بندوں میں جاری رہا ہے"۔اور اللہ کی سنت میں کوئی تغیر اور ترمیم نہیں ہوا کرتی ۔یہ اپنی مقرر راہ پر چلتی ہے۔

وَ خَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (۴۰ : ۸۵) "اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے"۔

---ooo---

اس سخت منظر' یعنی منظر عذاب الہی پر یہ سورت ختم ہوتی ہے' جس میں یہ چیخ و پکار کرتے ہیں' جزع فزع کرتے ہیں اور معافیاں مانگتے ہیں' ایمان و یقین کا اعلان کرتے ہیں' سورت کا یہ خاتمہ سورت کی فضا اور موضوعات اور مضامین کے ساتھ متناسب ہے۔

اس سورت کے دوران ہم نے ایسے مسائل پر بھی بحث کی ہے جو خالص مکی سورتوں کے اہم مسائل ہیں' مثلاً مسئلہ توحید' مسئلہ معاد' مسئلہ وحی' لیکن یہ مسائل اس سورت کا اصل موضوع نہ تھے ۔اس کا اصل موضوع معرکہ حق و باطل تھا۔ایمان وکفر تھا۔ اصلاح و سرکشی تھی ۔یہ اس سورت کے نمایاں موضوعات و مضامین تھے ۔اور اس سورت کے اہم خدوخال' اور تمام سورتوں کے مقابلے میں نہایت ہی نمایاں مقاصد.....

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ------ ۲۴

سورۃ حم السجدۃ ۔ ۴۱

آیات ۱--- تا--- ۴۶

سورۂ حم السجدۃ ایک نظر میں

اسلامی نظریہ حیات اور اس کے اساسی عناصر اس سورت کا مرکزی مضمون ہے۔ یعنی مسئلہ الوہیت' قیام قیامت اور وحی و رسالت۔ ان مضامین کے ساتھ ایک مضمون یہ بھی اس سورت میں آتا ہے کہ دعوت اسلامی کا طریقہ کار کیا ہو گا اور داعی کے اخلاق کیسے ہونے چاہئیں۔ اس سورت میں جو مضامین و مباحث بھی آئے وہ انہی مسائل کی تشریح و تفصیل ہیں۔ ان موضوعات پر استدلال ہے اور آفاق اور انفس سے ان موضوعات پر دلائل جمع کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ جھٹلانے کے برے نتائج اور سابقہ جھٹلانے والوں کے برے انجام اور قیامت کے دن جھٹلانے والوں کے حالات اور یہ بیان کہ جن و انس میں سے مکذبین ان واضح حقائق کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور اللہ وحدہ کے سامنے نہیں جھکتے جبکہ زمین و آسمان اور شمس و قمر اور فرشتے سب کے سب اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔ سجدہ کرتے ہیں' خضوع و خشوع کرتے ہیں اور سر تسلیم خم کرتے ہیں اور مطیع فرمان رہتے ہیں۔

سورت کے آغاز میں اللہ کی الوہیت کے بارے میں آتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَ وَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (۴۱ : ۶) "اے نبی' ان سے کہو میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا' مجھے وحی کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔ لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ اور تباہی ہے مشرکین کے لیے"۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۱ : ۹) "اے نبی' ان سے کہو 'کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیراتے ہو' جس نے زمین کو دو دنوں میں بنایا۔ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے"۔

عاد و ثمود کے بارے میں نقل کیا جاتا ہے کہ ان کے رسولوں نے بعینہ یہی بات ان سے کہی تھی۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (۴۱ : ۱۴) "کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو"۔ اس قصے کے وسط میں آتا ہے۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ (۴۱ : ۳۷)
"سورج و چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا"۔ اور سورت کے آخر میں ہے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَاءِي قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِن شَهِيدٍ (۴۱ : ۴۷) "پھر جس روز وہ ان لوگوں کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟ یہ کہیں گے "ہم عرض کر چکے ہیں آج ہم میں سے کوئی اس کی گواہی دینے والا نہیں ہے"۔

مسئلہ آخرت کے بارے میں تو منکرین آخرت کو سب سے پہلے دھمکی ملتی ہے۔

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ (۴۱ : ۶) الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَوٰةَ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ (۴۱ : ۷)

"تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں"۔ اور سورت کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے۔

أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ (۴۱ : ۵۴) "آگاہ رہو' یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں' سن رکھو وہ ہر چیز پر محیط ہے"۔ جبکہ قیامت کے مناظر میں بھی اس کے وقوع کو بطور حقیقت واقعہ پیش کیا گیا ہے بلکہ قیامت کے لیے ثبوت اور دلیل پیش کرنے کی نسبت اس کا منظر پیش کرنا زیادہ موثر طریقہ ہے۔

اور وحی و رسالت پر اس سورت میں کافی مواد موجود ہے' یوں لگتا ہے کہ یہ سورت کا اصل موضوع ہے' افتتاح یوں ہوتا ہے۔

حٰمٓ (۴۱ : ۱) تَنزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ (۴۱ : ۲) كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۴۱ : ۳) بَشِيرًا وَنَذِيرًا فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ (۴۱ : ۴) وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِن بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ (۴۱ : ۵) قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۴۱ : ۶) "یہ خدائے رحمن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے' ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں' عربی زبان کا قرآن' ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں' بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہیں۔ ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے۔ تو اپنا کام کر' ہم اپنا کام کیے جا رہے ہیں' کہہ دو میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا...." اور اس سورت کے درمیان آتا ہے کہ مشرکین نے قرآن کا استقبال یوں کیا۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ (۴۱ : ۲۶) "یہ منکرین حق کہتے ہیں اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو شاید کہ

اسی طرح تم غالب آجاؤ"۔ اس کے بعد بھی اس ردعمل کی تفصیلات آتی ہیں اور ان کے اقوال کا رد بھی کیا جاتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ (۴۱:۴۱) لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ (۴۱:۴۲) مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ (۴۱:۴۳) وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ءَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ (۴۱:۴۴) "یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے کلام نصیحت آیا تو انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے' باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے نہ پیچھے سے یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے۔ اے نبی" تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں سے نہ کہی جا چکی ہو' بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے' اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا بھی دینے والا ہے۔ اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں۔ کیا ہی عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی۔ ان سے کہو کہ یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت و شفا ہے مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے تو اس کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو"۔

طریقہ دعوت اور داعی کے اخلاق کے بارے میں کہا گیا ہے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۴۱:۳۳) وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (۴۱:۳۴) وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (۴۱:۳۵) وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۴۱:۳۶) "اور اس شخص کی بات سے اچھی بات کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اے نبی نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو نیکی سے دفع کرو' جو بہترین ہو' تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے' یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں

اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو' تو اللہ کی پناہ مانگ لو' وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

یہ مسائل گہرے شعوری دلائل اور اثر کرنے والے انداز کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں' اس کائنات میں جو بے شمار دلائل و نشانات پائے جاتے ہیں' ان کے دائرے کے اندر' پھر عالم نفس کے اندر جو نشانات ہیں' ان کے رنگ میں' پھر انسانی تاریخ کے سفر کے ساتھ جس میں گزرے ہوئے منکرین حق کے عبرتناک نشانات ہیں اور پھر ان مسائل کو مشاہد قیامت کی آہ و فغاں کی کے رنگ میں بھی لایا جاتا ہے جس کا انسان پر گہرا اثر ہوتا ہے اور اس سورت کے بعض مناظر تو منفرد قسم کے ہیں اور نہایت ہی خوفناک ہیں۔

اس کائنات کے مشاہد میں زمین و آسمان کی ابتدائی تخلیق کی کہانی جسے نہایت ہی تفصیل سے لیا گیا ہے۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۱ : ۹) وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱ : ۱۰) ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَى السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ (۴۱ : ۱۱) فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَ حِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (۴۱ : ۱۲) "اے نبیؐ' ان سے کہو' کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیراتے ہو' جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا۔ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے' اس نے اوپر سے اس میں پہاڑ جما دیے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے۔ پھر وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ جو اس وقت محض دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا' وجود میں آ جاؤ' خواہ تم چاہو' یا نہ چاہو"۔ دونوں نے کہا "ہم آ گئے فرمانبرداروں کی طرح"۔ تب اس نے دو دن کے اندر آسمان بنا دیے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے"۔

ان نشانیوں ہی میں سے رات اور دن کی نشانی ہے' شمس و قمر کی نشانی ہے' ملائکہ کی عبادت و اطاعت کی نشانی ہے۔ زمین کی قانون قدرت کے سامنے اطاعت کی نشانی اور اس پر روئیدگی کی نشانی ہے۔

وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَ النَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۴۱ : ۳۷) فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا

فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ هُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ (۴۱:۳۸) وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۱:۳۹) "اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند' سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو' بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو' جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔ لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آکر اپنی ہربات پر اڑے رہیں تو پرواہ نہیں' جو فرشتے تیرے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے اور اللہ کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سونی پڑی ہوئی ہے۔ پھر جونہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا' یکایک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھاتا ہے وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہرچیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

رہا نفس انسانی تو اس کی حقیقت کو بھی اس سورت میں کھولا گیا ہے اور انسانوں کے سامنے اسے صاف صاف کھلا اور واشگاف کر کے رکھ دیا ہے۔

لَا يَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ وَ اِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ (۴۱:۴۹) وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۴۱:۵۰) وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ (۴۱:۵۱) "انسان کبھی بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا اور جب کوئی آفت اس پر آتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہوتا ہے' مگر جونہی سخت وقت گزر جانے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں' یہ کہتا ہے کہ "میں اس کا مستحق ہوں' اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی اگر میں واقعی اپنے رب کی طرف پلٹایا گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا' حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم بتا کر رہیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں اور انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔ انسان کو جب ہم نعمت دیتے تو وہ منہ پھیرتا ہے اور اکڑ جاتا ہے اور اسے جب کوئی آفت چھو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔

گزشتہ اقوام کی ہلاکتوں میں' قوم عاد اور قوم ثمود کے عذاب کو چنا گیا ہے۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ (۴۱:۱۵)

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ (۱۶:۴۱) وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوْا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۷:۴۱) وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۱۸:۴۱) "عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے "کون ہے ہم سے زیادہ زور آور" ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے' وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے ۔ آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت اور رسوائی کا مزہ چکھا دیں اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہے ۔ وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو گا ۔ رہے ثمود تو ان کے سامنے ہم نے راہ راست پیش کی مگر انہوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا رہنا پسند کیا ۔ آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی اور بدعملی سے پرہیز کرتے تھے ۔

اس سورت کے نہایت ہی موثر مشاہد قیامت میں سے 'بعض یہ ہیں :

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (۱۹:۴۱) حَتّٰى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲۰:۴۱) وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۱:۴۱) "اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے ۔ ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا ۔ پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان' ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کرتے رہے ہیں ۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے "تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟" وہ جواب دیں گے ہمیں اس خدا نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے ۔ اس نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا' اب اس کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو" ۔ اور ایک وہ آیت جس میں دھوکہ دینے والوں پر ان لوگوں کا طیش جنہوں نے دھوکہ کھایا ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ (۲۹:۴۱) "وہاں یہ کافر کہیں گے "اے ہمارے رب' ذرا ہمیں دکھا دے ان جنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا' ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں" ۔

غرض اس سورت میں اسلام کے بنیادی عقائد گہرے موثر دلائل کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ ان موثر دلائل و مناظر ہی سے اس سورت کی فضا' مزاج اور رنگ ڈھنگ کا پتہ بھی چلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سورت کے آغاز سے لے کر اختتام تک یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم زمین' آسمان اور دنیا و آخرت اور نفس انسانی کی گہرائیوں کی سیر کر رہے ہیں اور نہایت موثر مناظر و دلائل دیکھ رہے ہیں۔ اس سفر سے قلب و نظر کی تاروں سے تازہ بتازہ زمزمہ اٹھتا ہے۔

سورت میں دو ہی سبق ہیں اور یہ اپنے موضوعات اور ان پر دلائل و مناظر لے کر آگے بڑھتی ہے اور کڑیوں سے کڑیاں ملتی چلی جاتی ہیں۔ پہلا سبق ان آیات سے شروع ہوتا ہے جو نزول کتاب سے متعلق ہیں۔ کتاب کی نوعیت اور اس کے بارے میں مشرکین کا موقف بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد زمین و آسمانوں کی تخلیق اور عاد و ثمود کے واقعات اور آخرت میں ان کے خلاف خود ان کے اعضا اور ان کی کھالوں کی شہادت کا منظر ہے' اس کے بعد یہ کہ دنیا میں وہ کس طرح گمراہ ہوئے' یوں کہ جن و انس کے کچھ ساتھی ان پر مسلط ہو گئے' انہوں نے ان کے اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا' کفار کا یہ مشورہ کہ قرآن کو نہ سنو اور قیامت میں کافروں کی یہ خواہش کہ اللہ جن دو افراد نے ہمیں گمراہ کیا ذرا ان کو سامنے لائیے کہ ان کو روند ڈالیں۔ دوسری جانب اہل ایمان ہیں جن پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور جو اپنی دعوت پر استقامت سے گامزن ہیں۔ یہ فرشتے ان کو دنیا و آخرت میں خوشخبری دیتے ہیں۔ یہ اچھے ساتھی ہیں اور پھر دعوت اور داعی کے لیے ہدایات۔

دوسرے سبق کا آغاز گردش لیل و نہار اور گردش شمس و قمر سے ہوتا ہے' پھر ملائکہ عبادت گزار اور زمین اور اس کی سرسبزیاں۔ پھر کتاب الٰہی کا موضوع اور اس میں الحاد کرنے والے' کتاب موسیٰ اور اس میں اس کی قوم کا اختلاف اور آخرت میں اختلاف قوم موسیٰ کا فیصلہ وغیرہ مضامین آتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کہ قیامت کا علم اللہ کو ہے۔ اور پھر اللہ کے علم کی وسعت کا عجیب بیان کہ تمام پھوٹنے والے پودوں' کلیوں' رحموں کی حالت اور ان میں پیدا ہونے والوں پر اللہ کا علم محیط ہے۔ قیامت کا منظر جہاں کافر اپنے شریک کیے ہوئے معبودوں کو تلاش کریں گے۔ نفس انسانی کی حالت اور انسان کی بے احتیاطیاں اور تکذیب کفر اور اس کے نتیجے میں ہلاکت اور آخر میں یہ وعدہ کہ اللہ انفس و آفاق میں اپنی نشانیوں کو عنقریب ظاہر کر دے گا!

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۴۱ : ۵۳) أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ (۴۱ : ۵۴) "عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھا دیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ فرمان واقعی برحق ہے کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔ آگاہ رہو' یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں۔ سن رکھو وہ ہر چیز پر محیط ہے۔ اس آخری تبصرے پر یہ سورت ختم ہوتی ہے۔

--- ooo---

درس نمبر ۲۲۷ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۳۶

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۳ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝۴ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ وَ فِيْۤ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝۵ قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْۤا اِلَيْهِ وَ اسْتَغْفِرُوْهُ ؕ وَ وَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝۶ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۷ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۸

۱ ۸ ع ۱۵

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ح م' یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے' ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں' عربی زبان کا قرآن' ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں' بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا ہے۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں ”جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں' ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک

ائل ہو گیا ہے تو اپنا کام کر' ہم اپنا کام کیے جائیں گے"۔ اے نبی" ان سے کہو' میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ مجھے ں کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے' لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں' رہے وہ لوگ جنہوں نے مان لیا اور نیک اعمال کیے' ان کے لیے یقیناً ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے"۔

حروف مقطعات کے بارے میں بات کئی سورتوں میں ہو چکی ہے اور اس افتتاح مکرر "حم" میں بھی وہی اشارہ ہے جس طرح قرآن کریم کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ بار بار ان حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے جو انسانی دل و دماغ پر اثر ڈالتے ہیں اور تکرار اس لیے کہ انسان کو بار بار کی یاد دہانی کی ضرورت ہے۔ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی نظر سے نصب العین اوجھل ہو جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی بھی شعوری حقیقت بٹھانے کے لیے' اسے بار بار تنبیہہ کی ضرورت ہوتی ہے اور قرآن کا نازل کرنے والا اپنے تخلیق کردہ فطرت انسانی سے خوب واقف ہے۔ اور اس کے خصائص اور صلاحیتیں اسی نے عطا کی ہیں اس لیے وہ بار بار یاد دلاتا ہے' وہ خالق قلب اور مصرف القلوب ہے۔

حٰمٓ (۴۱ : ۱) تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۴۱ : ۲) "یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے"۔ حم گویا سورت کا نام ہے یا جنس قرآن جو انہی حروف سے بنایا گیا ہے۔ حم مبتداء ہے اور تنزیل خبر ہے یعنی یہ ہیں حم (جن سے قرآن بنا ہے جو) رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔

نزول کتاب کے وقت رحمٰن و رحیم کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ اس تنزیل کی صفات عالیہ رحمت الٰہیہ ہے۔ اور یہ کتاب اور حاصل کتاب دونوں بطور رحمت اللعالمین آئے ۔ یہ صرف ان لوگوں پر رحمت نہیں ہے جو ایمان لائیں اور اس کی اطاعت کریں۔ بلکہ غیروں کے لیے بھی رحمت ہے صرف انسانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام زندہ لوگوں کے لیے رحمت ہے کیونکہ اس کتاب نے ایک ایسا منہاج حیات دنیا کو دیا جس کی وجہ سے پوری دنیا متاثر ہوئی۔ انسانیت کو نئی زندگی ملی۔ اس کو تصورات دیئے' اس کو علم دیا اور غرض اس قرآن نے انسانیت کے آگے بڑھنے کی سمت ہی بدل کر رکھ دی۔ قرآن کے رحیمانہ اثرات صرف اہل ایمان تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے اثرات عالمی تھے اور اس وقت سے آج تک یہ اثرات جاری ہیں۔ جو لوگ انسانی تاریخ کا مطالعہ انصاف سے کرتے ہیں اور اس کا عام انسانی زاویہ سے مطالعہ کرتے ہیں اور اس مطالعہ میں انسانی سرگرمیوں کا پوری طرح احاطہ کرتے ہیں وہ اس حقیقت کو پاتے ہیں اور وہ اس نکتے پر مطمئن بھی ہوتے ہیں کہ قرآن رحمت اللعالمین ہے' بعض منصف مزاج لوگوں نے اس بات کا اعتراف کر کے اس کو ریکارڈ بھی کرا دیا ہے۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۴۱ : ۳) "ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں' عربی زبان کا قرآن ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"۔ یعنی اغراض و مقاصد کے لحاظ سے' لوگوں کی طبیعت اور سمجھ کے مطابق' معاشروں اور زمانوں کے مطابق' لوگوں کی نفسیات اور ان کی ضروریات کے مطابق اس کی آیات کو نہایت پختہ انداز میں مفصل بنایا گیا ہے۔ اور یہ اس کتاب کی امتیازی خصوصیت ہے اس زاویہ سے یہ کتاب مفصل اور محکم ہے۔ ان تمام پہلوؤں سے یہ کتاب مفصل ہے۔ پھر عربی زبان میں ہے۔

لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۴۱ : ۳) "ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں"۔ یعنی جن کے پاس علمی استعداد ہے وہ سمجھ سکتے ہیں اور کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتے ہیں۔

اس قرآن کے نزول کا بڑا مقصد بشارت اور ڈراوا ہے۔

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (۴۱ : ۴) "بشارت دینے والا اور ڈرانے والا"۔ یہ قرآن مومنین کو بشارت دیتا ہے اور مکذبین اور بدکاروں کو ڈراتا ہے اور پھر خوشخبری اور ڈراوے کے اسباب بھی بتاتا ہے۔ یہ اسباب وہ عربی مبین میں بتاتا ہے اور ان لوگوں کے سامنے پیش ہو رہا ہے جو عرب ہیں لیکن ان کی اکثریت اسے قبول نہیں کر رہی ہے۔

فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۴۱ : ۴) "مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے"۔

اور یہ لوگ روگردانی اس لیے کرتے تھے اور نہ سنتے تھے اور اپنے دلوں کو روگردانی کر کے قرآن سننے سے بچاتے تھے۔ کیونکہ قرآن غضب کی تاثیر رکھتا ہے اس لیے جو جمہور عوام کو بھی اس بات پر ابھارتے تھے کہ نہ سنو جس طرح عنقریب اس کی تفصیلات آئیں گی۔

وَقَالُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (۴۱ : ۲۶) "منکرین حق کہتے ہیں اس قرآن کو نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو' شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ"۔ بعض اوقات وہ سنتے تھے لیکن اس طرح جیسے کہ نہ سنتے ہوں' اس لیے قرآن کے ان پر جو اثرات پڑتے تھے' ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کا مقابلہ کرتے تھے' گویا وہ بہرے ہیں' سنتے ہی نہیں۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ (۴۱ : ۵) "کہتے ہیں: جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں میں غلاف چڑھے ہوئے ہیں' ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے' تو اپنا کام کر' ہم اپنا کام کیے جا رہے ہیں"۔ یہ بات وہ گہری ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے کہتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مایوس کرنے کے لیے کہتے تھے تاکہ آپ دعوت دینا بند کر دیں کیونکہ وہ آپ کی دعوت کا اثر خود اپنے دلوں میں پاتے تھے اور وہ بالارادہ اس موقف پر جمے ہوئے تھے کہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔

چنانچہ انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں ڈھنپے ہوئے ہیں' تمہاری بات تو ہمارے دلوں تک پہنچتی ہی نہیں۔ ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہیں' لہٰذا تمہاری بات ہم تک پہنچتی ہی نہیں۔ تمہارے اور ہمارے درمیان دبیز پردے حائل ہیں' اس لیے رابطے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیں' ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہے کہ تم کیا کرتے ہو' کیا کہتے ہو' کس سے ڈراتے ہو' کس کا وعدہ کرتے ہو' ہم اپنی راہ پر چلنے والے ہیں۔ تم چاہو تو اپنی راہ پر چلو' تمہاری جو مرضی ہے کرو۔ ہم نے سن کر نہیں دینا۔ جس عذاب سے تم ہمیں ڈراتے ہو وہ لے ہی آؤ۔

ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہے۔

یہ تھے وہ حالات و مشکلات جن سے داعی اول صلی اللہ علیہ وسلم دوچار تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ دعوت دیتے چلے جاتے تھے۔ کبھی رکے نہیں تھے۔ ان مایوس کن حالات سے کبھی آپ متاثر نہیں ہوئے' کبھی آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اتنا عرصہ ہو گیا' اللہ کا وعدہ سچا نہیں ہوا اور نہ دشمنوں پر عذاب آیا۔ آپ یہی کہتے کہ اللہ کے وعدے کا پورا ہونا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں تو ایک بشر ہوں۔ اللہ کا پیغام میرے پاس آتا ہے اور میں تبلیغ کرتا ہوں' لوگوں کو اللہ واحد کی طرف بلاتا ہوں اور جو مان لیں' ان سے کہتا ہوں کہ اسی راستے پر جم جاؤ' اور مشرکین کو انجام بد سے ڈراتا ہوں اس کے بعد کے مراحل میرے اختیار میں نہیں۔ میں تو ایک بشر اور مامور ہوں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْۤا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (۴۱ : ۶) "اے نبی" ان سے کہو' میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ مجھے وحی کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے' لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے"۔ کس قدر عظیم صبر ہے! کس قدر برداشت ہے! کیا عظیم ایمان ہے اور تسلیم و رضا ہے! لیکن ایسی صورت حال کو صرف وہی داعی سمجھ سکتا ہے' ایسے حالات پر وہی صبر کر سکتا ہے' اس قسم کے حالات میں صرف وہی اپنے ماحول سے لاپرواہ ہو کر دعوت دیتے آگے بڑھ سکتا ہے اور اعراض' تکذیب' تکبر اور توہین آمیز سلوک کو برداشت کر سکتا ہے جو ایسے حالات سے دوچار ہو گیا ہو' جس نے تجربہ کر لیا ہو کہ جلد بازی نہیں کرنی' جس نے روگردانی کرنے والوں' متکبرین اور سرکشوں کی مدافعت کی ہو' جس نے دعوت کی راہ میں مشقت برداشت کی ہو' اور جس نے دعوت کی راہ میں مشقت برداشت کرنے کا حوصلہ پایا ہو اور پھر ان مشکلات کے باوجود وہ ڈٹ گیا ہو۔

ایسے ہی مقامات کی وجہ سے انبیاء و رسل کو بار بار ہدایت کی گئی ہے کہ صبر کریں' کیونکہ دعوت کی راہ صبر کی راہ ہے۔ طویل صبر' اور صبر کی آزمائش سب سے پہلے اس خواہش میں ہوتی ہے' جو بہت شدید ہوتی ہے کہ دعوت جلدی کامیاب ہو جائے۔ نصرت جلدی آ جائے' نصرت کے نشانات بھی نہ ہوں لیکن داعی صبر' استقامت اور تسلیم و رضا سے کام کیے جا رہا ہو۔

اور ان مشکلات' روگردانیوں اور کبر و لاپرواہی کے جواب میں رسول اللہ صرف یہ کہتے ہیں۔

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ (۴۱ : ۶) الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ (۴۱ : ۷) "تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں"۔ اس مقام پر زکوۃ کے ذکر کی کوئی وقتی مناسبت ہو گی' کسی روایت میں اس کا ذکر نہیں آیا' کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور زکوۃ سن دو ہجری میں مدینہ میں فرض ہوئی۔ اگرچہ اصولاً مکہ مکرمہ میں بھی معروف تھی۔ مدینہ میں فرضیت کے ساتھ نصاب بھی مقرر ہو گیا۔ اور اسے بطور معین فرض وصول کیا جانے لگا۔ مکہ میں یہ ایک عام [illegible] تھا۔ لوگ رضا کارانہ طور پر زکوۃ دیتے تھے۔

اس کی کوئی حد نہ تھی اور ادائیگی دینے والے کے ضمیر پر چھوڑ دی گئی تھی ۔کفر بالاخرۃ تو وہی کفر ہے جس کے نتیجے میں انسان دائمی تباہی کا مستحق ہو جاتا ہے ۔ بعض لوگوں نے اس آیت کی تفسیر میں زکوٰۃ سے مراد ایمان لانا اور شرک سے پاک ہونا لیا ہے ۔ یہ مفہوم بھی رد نہیں کیا جا سکتا' ایسے حالات میں اس کا احتمال ضرور ہے ۔

--- ○○○---

اب داعی حق ان کو یہ بتانے کے لیے کہ کفر و شرک کا ارتکاب کر کے وہ کس قدر عظیم جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں ۔ ان لوگوں کو اس کائنات کی سیر کراتے ہیں کہ ذرا تم زمین و آسمانوں پر مشتمل اس عظیم کائنات پر غور تو کرو' کہ تم اس کے مقابلے میں کس قدر چھوٹے ہو' کس قدر کمزور ہو' یہ سیر اس لیے کرائی جاتی ہے کہ ذرا وہ اللہ کی بادشاہت کو بھی دیکھ لیں جس کا وہ انکار کرتے ہیں کیونکہ انسان بھی فطرت کائنات کا ایک نہایت ہی حقیر جزء ہے اور تاکہ وہ ان کو بتائیں کہ اس دعوت کی طرف تم نہایت ہی تنگ زاویہ نظر سے دیکھ رہے ہو' تم صرف یہ دیکھ سکتے ہو کہ ہمچو ما دیگرے نیست ۔ تم تو صرف اپنے آپ کو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو دیکھتے ہو اور تم یہ سوچتے ہو کہ محمد ابن عبد اللہ کو اگر مان لیا تو وہ بلند مقام پر فائز ہو جائے گا ۔ تمیں تو یہ تنگ نظری اس عظیم حقیقت کے دیکھنے سے روکے ہوئے ہے جو حضرت محمد ﷺ لے کر آئے ہیں' جس کی تفصیلات قرآن کریم میں درج ہیں ۔ یہ حقیقت جس کا تعلق آسمانوں' زمین' انسان' پوری انسانی تاریخ اور اس عظیم سچائی کے ساتھ ہے جو زمان و مکان سے وراء ہے ۔ اور جسے اس کائنات کے نقشے میں رکھا گیا ہے :

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۹ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝۱۰ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۝۱۱ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۱۲

"اے نبی" ان سے کہو 'کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیراتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا؟ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے ۔ اس نے (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا ۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے ۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا' جو اس وقت محض دھواں تھا ۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا "وجود میں آ جاؤ' خواہ تم چاہو یا نہ چاہو"۔ دونوں نے کہا

"ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح"۔ تب اس نے دو دن کے اندر آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا۔ اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا۔ یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے"۔

اے پیغمبر ان سے کہو کہ تم جب کفر کرتے ہو اور لاپرواہی میں یہ عظیم بات کہہ جاتے ہو' یہ تو تم ایک بہت ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرتے ہو' یہ نہایت ہی قبیح اور ناپسندیدہ فعل ہے' تم ایک ایسی ذات کا انکار کرتے ہو' جس نے زمین کو پیدا کیا' اس کے اندر پہاڑ پیدا کیے' ان کے اندر برکات پیدا کیں' اس زمین کے اندر رزق کی تمام ضروریات پوری پوری رکھ دیں' جس نے آسمانوں کو پیدا کیا اور یہ سب کام اس نے چار دنوں میں سرانجام دیئے اور تمام مانگنے والوں کے لیے ان کی ضروریات مہیا کر دیں جس نے آسمانوں کو پیدا کیا' منظم کیا' خصوصاً دنیا سے قریب والے آسمان کو خوب مزین کیا' زمین اور آسمان نے اس کے قوانین قدرت اور احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا' لیکن اے اہل زمین تم ہو کہ تم انکار کرتے ہو اور تکبر کرتے ہو۔

لیکن قرآن کی عبارت نے' قرآن کے انداز بیان کے مطابق ان مضامین کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ بات فوراً دل میں اتر جاتی ہے اور دل کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ ذرا نص قرآن کے الفاظ دوبارہ پڑھئے اور غور کیجئے۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۱: ۹) وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱: ۱۰) "اے نبیؐ' ان سے کہو' کیا تم اس خدا سے کفر کرتے ہو اور دوسروں کو اس کا ہمسر ٹھیراتے ہو' جس نے زمین کو دو دنوں میں بنا دیا۔ وہی تو سارے جہان والوں کا رب ہے' اس نے اوپر سے اس میں پہاڑ جما دیئے اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس کے اندر سب مانگنے والوں کے لیے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک انداز سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب کام چار دن میں ہو گئے"۔

یہاں زمین کی تخلیق کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسے دو دنوں میں پیدا کیا گیا۔ زمین کی پیدائش کی مزید بات سے پہلے اس پر تبصرہ کر کے شرک کی نفی کی گئی اور بتایا گیا کہ

ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۱: ۹) "یہی جہاں والوں کا رب ہے"۔ تم اس رب کا انکار کر رہے ہو' اور اس کے ساتھ لوگوں کو شریک کر رہے ہو' جس زمین پر تم چل پھر رہے ہو' وہ تو اس نے بنائی ہے لہٰذا تکبر اور لاپرواہی تمہیں زیب نہیں دیتی۔ یہ تو بہت ہی قبیح فعل ہے۔ اس کے بعد پھر باقی بات۔

سوال یہ ہے کہ یہ دو دن کون سے دن ہیں' جس کے اندر زمین پیدا کی گئی اور جن دو دنوں میں پہاڑ پیدا کیے اور زمین کے اندر ضروریات زندگی پیدا کی گئیں اور یوں یہ چار دن ہو گئے؟

یہ ایام دراصل ایام اللہ ہیں اور ان کی طوالت کے بارے میں اللہ ہی جانتا ہے۔ یہ ایام اس زمین کے ایام بہرحال

نہیں ہیں۔کیونکہ زمین کے ایام تو وہ زمانی معیار ہے جو زمین کے پیدا ہونے اور اس کی گردش متعین ہونے کے بعد، وجود میں آیا ہے۔جس طرح اس زمین کے ایام ہیں۔اور یہ گردش محوری اور سورج کے گرد سالانہ گردش کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اسی طرح کواکب میں سے ہرایک کے اپنے اپنے ایام ہیں۔ستاروں کے اپنے ایام ہیں یہ زمین کے ایام سے مختلف ہیں۔بعض زمین کے ایام سے چھوٹے اور بعض طویل ہیں۔

وہ ایام جن میں ابتداء زمین پیدا ہوئی' پھر اس میں پہاڑ پیدا ہوئے' پھر اس کے اندر حسب ضرورت رزق اور ضروریات رکھی گئیں' یہ کوئی اور ہی ایام تھے اور ان کا معیار بھی اور تھا۔ہمیں اس کا علم نہیں ہے' لیکن اس قدر ضرور معلوم ہے کہ یہ ایام ان دنوں کے مقابلے میں بہت ہی طویل تھے۔

آج تک انسانی علم جہاں تک پہنچ سکا ہے' اس کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مراد وہ زمانے ہیں جن سے یہ زمین گزرتی رہی' یہاں تک کہ وہ اپنے موجودہ مدار میں ٹھہری' اس کا چھلکا سخت ہو گیا اور یہ زندگی کے قیام کے لیے قابل ہو گیا' جس زندگی کو ہم جانتے ہیں اور آج تک جو نظریات پیش ہوئے ہیں ان کے مطابق اس پر ہمارے زمین کے معیار ایام کے مطابق نو ہزار ملین سالوں کا وقت لگا۔

یہ بھی محض علمی نظریات ہیں اور ان نظریات کو تبصروں اور چٹانوں کے مطالعہ کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔قرآن کے مطالعہ میں ہم ان علمی نظریات کو آخری بات نہیں کہتے کیونکہ یہ فائنل تو ہیں نہیں۔یہ نظریات ہیں اور ان میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ہم قرآن کو ان کا تابع تو نہیں کر سکتے۔ہاں اگر ان نظریات اور نص قرآنی کے درمیان قرب اور موافقت ہو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظریہ درست ہو سکتا ہے۔اور ایسا نظریہ تشریح قرآن کا معاون بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ذریعہ ہم قرآن کے مفہوم کے قریب جا سکتے ہیں۔

آج کل کے نظریات کے مطابق راجح قول یہی سمجھا جاتا ہے کہ زمین بھی کسی وقت ایک آگ کا گولا تھی جس طرح اس وقت سورج ہے اور گیس کی شکل میں تھی۔اور یہ زمین بھی سورج ہی کا حصہ تھی' اس سے جدا ہو گئی' اس کے بارے میں سائنس دانوں کا اتفاق نہیں ہے کہ کیوں ہوئی اور کس طرح ہوئی البتہ اسے ٹھنڈا ہونے کے لیے طویل وقت لگا جبکہ اس کا پیٹ ابھی تک اسی حالت میں ہے۔جہاں بڑے بڑے پہاڑ پگھل جاتے ہیں۔اور کھولنے لگتے ہیں۔

"جب زمین کا چھلکا ٹھنڈا ہوا تو یہ سخت ہو گیا۔پہلے پہل یہ سخت پتھر تھا اور پتھر کے پھر طبقے تھے۔اوپر اور نیچے کے پتھر۔اور نہایت ہی ابتدائی دور میں بخارات پیدا ہوئے جن کا ۳/ ۲ حصہ ہائیڈروجن اور ۳/ ۱ حصہ آکسیجن تھا۔ان کے اتحاد کی وجہ سے زمین پر پانی پیدا ہو گیا۔

"ہوا اور پانی نے باہم تعاون کر کے چٹانوں کو توڑا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کو ایک جگہ سے اٹھایا اور دوسری جگہ ڈھیر لگا دیا اور اس کی وجہ سے مٹی پیدا ہوئی جس میں فصل اگنا ممکن ہوا' اس طرح ہوا اور پانی نے پہاڑوں کو توڑا اور اونچی جگہوں کو پست کیا اور گڑھوں اور نیچی جگہوں کی بھرائی کا کام کیا۔لہٰذا زمین کے اندر جو بھی چیز ہے یا ہونے والی ہے۔اس میں ہمیں تعمیر و تخریب ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں"۔

"زمین کا اوپر کا حصہ جسے چھلکا کہہ سکتے ہیں' دائمی طور پر حرکت اور تغیر میں رہتا ہے۔سمندر میں جب موجیں اٹھتی ہیں تو یہ چھلکا متاثر ہوتا ہے۔سورج کی گرمی سے سمندر کا پانی بخارات بن جاتا ہے' آسمانوں کی طرف اٹھتا ہے' بادلوں کی

شکل اختیار کرتا ہے' زمین پر میٹھا پانی برساتا ہے۔ موسلا دھار بارشیں ہوتی ہیں' سیلاب آتے ہیں' دریا بہتے ہیں' اور یہ اس زمین کے چھلکے کے اوپر چلتے ہیں اور اس میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ ایک پتھر اور چٹان پر یوں اثر انداز ہوتے ہیں کہ اسے ایک، چٹان سے دوسری قسم کی چٹان میں بدل دیتے ہیں۔ اور پھر یہ سیلاب اور دریا اسے اٹھا کر دوسری جگہ بھی لے جاتے ہیں اور صدیوں کے بعد پھر زمین کا چہرہ بدل جاتا ہے۔ اور ہزاروں اور لاکھوں سالوں کے بعد وسیع تغیرات پیدا ہوتے ہیں' پھر پہاڑوں پر برف جمتی ہے' یہ وہی کام کرتی ہے جو ہوا اور پانی کرتے ہیں اور سورج بھی زمین کی چھلکے پر ویسے ہی اثرات ڈالتا ہے جس طرح ہوا اور پانی ڈالتے ہیں۔ یہ اسے گرم کرتا ہے۔ پھر زمین کے اوپر زندہ جانور بھی زمین کے اس چہرے کو بدلتے رہتے ہیں اور آتش فشانی کا عمل بھی زمین پر تغیرات پیدا کرتا ہے۔

"اس زمین کے چٹانوں کے بارے میں آپ کسی بھی جیالوجسٹ سے پوچھ سکتے ہیں' وہ چٹانوں کے بارے میں آپ کو بہت سی معلومات دے گا اور وہ اس کی تین بڑی اقسام بتائے گا--- مثلاً "ناری چٹانیں" (Igneous Rocks) جو زمین کے پیٹ کے پگھلے ہوئے مادے کی شکل میں باہر آئیں۔ یہ مادہ پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ آپ کو لاوا کی چٹان (Granites) بطور مثال پیش کرے گا اور پتھر دکھا کر آپ کو بتائے گا کہ اس کے اندر سفید' سرخ اور سیاہ چمکدار مادے ہیں۔ یہ کیمیاوی مرکبات ہیں اور ان کا اپنا وجود ہے کیونکہ یہ مخلوط دھاتوں کے پتھر ہیں۔ وہ یہ بتائے گا کہ تمام روئے زمین کا چھلکا انہی پتھروں سے بنا ہوا ہے۔ جب یہ زمین تیار ہوئی بہت زمانہ پہلے' بارشیں شروع ہوئیں' زمین پر دریا بہے' یا برف پگھلی' طوفان چلے' سورج نے اثر دکھایا۔ ان موثرات نے ان ناری چٹانوں کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل کیا۔ ان کے ملبے اور ان کے اندر کی کیمیاوی مواد سے یہ جدید چٹانیں تیار ہو گئیں اور لاوے کی ان چٹانوں سے کئی اور رنگ اور قسم کی چٹانیں تیار ہو گئیں۔

"اب چٹانوں کی ایک دوسری اہم قسم ہے جس کو جیالوجی کی زبان میں گارے (Sedimentary Rocks) کی چٹانیں کہتے ہیں یہ وہ چٹانیں ہیں جو پانی' ہوا' سورج یا زندہ چیزوں کے عمل سے زمین کی اصلی سخت چٹانوں سے ٹوٹ پھوٹ کر بنیں اور ان کو Sedimentary اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنی اصلی جگہ میں نہیں ہوتی ہیں۔ یہ اپنی اصلی چٹانوں سے ٹوٹ پھوٹ کر اور پانی' ہوا اور طوفان کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہیں اور وہاں گارے کی شکل میں جمع ہو کر جم جاتی ہیں"

"ان گارے کی چٹانوں کی مثال جیری پتھر ہیں جن سے پورا "مقطم" پہاڑ بنا ہوا ہے اس پہاڑ سے اہل قاہرہ پتھر توڑ کر اپنے مکانات بناتے ہیں۔ ماہرین بتائیں گے کہ یہ کیلشیم کاربونیٹ (Calcium Carbonate) ہے اور یہ زمین سے زندہ چیزوں یا کیمیاوی عمل سے جدا ہوا' پھر ریت بھی اسی قسم کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے نیز کیلشیم ایسڈ بھی اس قسم سے بنا ہے۔ یہ بھی دوسری چٹانوں سے نکلا ہے۔ مثلاً خشک گارے کے پتھر اور خشک بجنے والی مٹی کے پتھر۔ یہ تمام سابقہ اصول کے مطابق بنتے ہیں"

یہ سابقہ اصلی چٹانیں ہیں جن سے گارے کی (Sedimentary) چٹانیں بنیں جن کی اقسام مختلف ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اصلی چٹانیں لاوے کی چٹانیں ہیں' جب زمین کی سطح جم گئی اور اس کی مائع حالت جاتی رہی اور یہ عمل بہت ہی پہلے ہوا' اس وقت سطح زمین پر لاوے کی چٹان کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر بخارات اور پانی پیدا ہوا اور اس نے لاوے کی چٹان پر توڑ پھوڑ کا عمل شروع کیا۔ اس میں ہوا اور مختلف قسم کی گیسوں نے بھی کام کیا۔ سخت طوفانوں اور سورج کی گرمی نے بھی

لداد دی - یہ سب مراحل جمع ہوئے اور اپنے اپنے طبیعی اور مزاج کے مطابق کام کیا اور یہ لاوے کے پتھر مفید پتھروں کی شکل میں بدلے - اب ان پتھروں سے عمارت بنتی ہیں - معدنیات نکالی جاتی ہیں - اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سخت لاوے کے پتھر ہی سے مٹی نکالی گئی 'جو سطح زمین پر مختلف مقامات پر جمع ہوئی اور یہی مٹی نباتات و حیوانات کے لیے تمہید بنی -

"لاوے کی چٹانیں کھیتی 'فصل اور آبپاشی کے لیے مفید نہیں ہے - لیکن اس سے ' نرم و ملائم مٹی نکلتی ہے یا'' جیسی دوسری چٹانوں سے یہ مٹی جمع ہوتی ہے اور اس مٹی سے پھر نباتات و حیوانات پیدا ہوئے - اور یوں اس زمین کے رئیس المخلوقات انسان کی پیدائش کے لیے راہ ہموار ہوئی - (۱)

یہ طویل سفر جس کا انکشاف علم جدید نے کیا ہے 'اس کی مدد سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ زمین و آسمان کی تخلیق میں جو ایام لگے 'زمین کی تخلیق 'اس کے اوپر پہاڑوں کی تنصیب 'اس کے اندر برکات و ضروریات کی تشکیل پر جو چار دن لگے ' یہ ایام اللہ کے چار دن تھے جن کی طوالت کا ہمیں علم نہیں کہ ان کی طوالت کا کیا معیار و مقیاس ہے - ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ یقیناً ہماری اس زمین کے ایام نہ تھے -

اب ہم نص قرآنی کے ایک ایک فقرے پر غور کریں گے 'قبل اس کے کہ ہم زمین کے موضوع کو چھوڑ کر آسمان کی طرف چلیں :

وَ جَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا (۴۱ : ۱۰) "اور اوپر سے اس پر پہاڑ جما دیئے"- بعض اوقات ان پہاڑوں کے لیے رواسی کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے - رواسی کے معنی لنگر انداز ہونے والی کشتی اور پہاڑ ہیں اور بعض جگہ پہاڑوں کو رواسی کہہ کر

اَنْ تَمِيْدَبِكُمْ "کہ تم ڈھلک نہ جاؤ" - یعنی زمین لنگر انداز ہے 'یہ پہاڑ اسے ایک جگہ ٹکاتے ہیں 'تاکہ انسان ڈھلک نہ جائیں - ایک وقت ایسا تھا کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ زمین ایک جگہ جمی ہوئی ہے اور مستحکم بنیادوں پر ٹھہری ہوئی ہے - اب ایسا وقت آگیا ہے کہ یہ زمین تو ایک کرہ ہے ' چھوٹی سی گیند جو فضا میں تیر رہی ہے اور کسی چیز کا سہارا نہیں لے رہی ہے - جب انسانوں کو سب سے پہلے یہ بات بتائی گئی ہوگی تو وہ پریشان ہو کر دائیں بائیں دیکھ رہے ہوں گے کہ واقعی کہیں ہم گر نہ جائیں - ڈھلک نہ جائیں - یا ہم فضا کی گہرائیوں میں نہ اڑ جائیں - اطمینان رکھو ' اللہ نے اس کو فضا ہی میں تھامے رکھا ہے اور زمین و آسمان دونوں اپنی جگہ سے ہٹ یا پھسل نہیں سکتے - اگر ان کا توازن کبھی بگڑ گیا تو پھر اللہ کے سوا کوئی اسے قائم بھی نہیں کر سکتا - اطمینان کیجئے ! اللہ نے جو قوانین فطرت کائنات میں جاری کیے ہیں وہ بہت ہی پختہ ہیں اور اللہ قوی و عزیز ہے -

ذرا پہاڑوں کا مزید مطالعہ درکار ہے - ان کو اللہ نے "رواسی" کہا ہے - یہ زمین کو باندھتے ہیں کہ وہ ڈھلک نہ جائے ' جیسا کہ ظلال القرآن میں ہم نے دوسری جگہ یہ نکتہ بیان کیا کہ سمندروں کے اندر جو گہرائیاں ہیں اور زمین کے اوپر جو بلندیاں ہیں یہ دونوں حصوں کا توازن برابر کرتی ہیں - یوں زمین کے دونوں حصے سمندری اور خشکی متوازن ہو

(۱) کتاب مع اللہ فی السماء

جاتے ہیں---ایک سائنس دان کی سنئے!

"زمین کے اندر جو حادثہ ہوتا ہے اس کی سطح پر یا اندر' اس کی وجہ سے زمین کا مادہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کو منتقل ہوتا ہے' یہ اس کی گردش کو متاثر کرتا ہے۔اس میں صرف مدوجزر ہی واحد عامل نہیں ہے۔یعنی زمین کی رفتار میں کمی کے بارے میں' یہاں تک کہ دریا ایک جگہ سے جو پانی دوسری جگہ کو منتقل کرتے ہیں اس کا بھی زمین کی رفتار پر اثر ہوتا ہے۔ ہوائیں جو ادھر سے ادھر جاتی ہیں' یہ بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔سمندروں کے اندر کی سطح کا جگہ جگہ گرنا اور خشکی کی سطح کا جگہ جگہ سے اٹھنا بھی گردش زمین کی رفتار کو متاثر کرتا ہے اور یہ چیز بھی زمین کی گردش کی رفتار کو متاثر کرتی ہے کہ کسی جگہ سے زمین پھیلے یا سکڑے۔اگرچہ یہ سکڑنا اور پھیلنا چند اقدام تک محدود کیوں نہ ہو"۔

غرض یہ حساس زمین' جس کی حساسیت کے بارے میں ہم نے یہ مطالعہ کیا' کیا بعید کہ اس کی رفتار کی تیزی میں یہ اونچے اونچے پہاڑ توازن قائم کرتے ہوں اور وہ اس کو غیر متوازن ہونے سے روکتے ہوں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن نے آج سے چودہ سو سال قبل یہ بات کہہ دی اَنْ تَمِيْدَبِكُمْ "کہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے"۔

وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا (۴۱ : ۱۰) "اور اس میں برکتیں رکھ دیں اور اس میں ٹھیک اندازے سے خوراک کا سامان مہیا کر دیا"۔یہ فقرہ ہمارے اسلاف کے ذہنوں میں یہ مفہوم منتقل کرتا ہوگا کہ فصلیں اگا دیں اور زمین کے اندر بعض مفید جمادات اور دھاتیں رکھ دیں مثلاً سونا چاندی اور لوہا وغیرہ۔ لیکن آج اللہ تعالیٰ نے انسان پر زمین کی جو برکات کھول دی ہیں اور جو صدیوں پہلے اس زمین میں رکھ دی گئی تھیں اور ہم ان سے استفادہ کرتے ہیں تو اس فقرے کا مفہوم بہت ہی وسیع ہو گیا ہے۔

اب ہم نے دیکھ لیا کہ کس طرح ہوا کے عناصر نے تعاون کیا اور پانی تشکیل ہوا اور کس طرح پانی اور ہوا نے تعاون کیا اور سورج اور طوفانوں نے تعاون کیا اور مٹی کی تشکیل ہوئی جو قابل زراعت بن گئی۔اور پانی' سورج' ہواؤں کے باہم تعاون سے بارشیں برسیں' یہ بارش ہی ہے جس کے ذریعہ سے تمام پانی فراہم ہوتے ہیں۔میٹھی نہروں کے ذریعے' دریاؤں اور ندیوں کے ذریعے اور زمین کے اندر کے ذخیروں اور چشموں کے ذریعہ' یہ سب برکات و ارزاق ہی تو ہیں۔ اور پھر ہوا اور ہمارا اور تمام حیوانات کا نظام تنفس اور ہمارے جسم۔

"زمین ایک کرہ اور گیند ہے۔اس کے اوپر چٹان کی ایک تہہ ملفوف ہے اور اس چٹان کی تہہ کے اکثر حصے کے اوپر پانی کی تہہ ہے جس سے یہ چٹان ملفوف ہے۔پھر اس پانی اور چٹان کی تہہ کے اوپر ایک ہوائی کرہ ہے جو دبیز گیس کی شکل میں دنیا کو ملفوف کیے ہوئے ہے۔یہ ہوائی کرہ سمندر کی طرح ہے۔اس کی سمندر کی طرح گہرائی ہے۔ہم انسان اور حیوان اور نباتات ہوا کے اس سمندر کی تہہ میں زندہ رہ رہے ہیں اور بڑے مزے سے رہ رہے ہیں"۔

"ہوا میں ہم سانس لیتے ہیں' آکسیجن لیتے ہیں' ہوا ہی سے نباتات اپنا جسم بناتے ہیں' ہوا ہی سے کاربن لیتے ہیں بلکہ آکسائیڈ سے کاربن لیتے ہیں جسے اہل کیمیا کاربن ڈائی آکسائیڈ کہتے ہیں۔نباتات اپنا جسم کوئلے کے آکسائیڈ سے بناتے ہیں۔ ہم نباتات کھاتے ہیں اور ہم حیوانات کو بھی کھاتے ہیں۔اور حیوانات نباتات کو کھاتے ہیں۔دونوں سے ہمارا جسم تیار ہوتا ہے۔ہوا میں نائٹروجن ہے' یہ آکسیجن کو خفیف بناتی ہی۔ورنہ ہم سانس لیتے ہی جل جائیں۔پانی کے بخارات ہوا کے

اندر رطوبت پیدا کرتے ہیں - کچھ دوسری گیس ہیں جو قلیل مقدار میں پائی جاتی ہیں اور غیر مرتب ہیں -- ان میں ہیلیم' نیون وغیرہ اور ہائیڈروجن گیس' یہ ہوا میں ابتدائی تخلیق کے وقت سے موجود ہیں - (۱)

وہ مواد جو ہم کھاتے ہیں اور اپنی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں' جبکہ رزق اس مواد سے وسیع مفہوم رکھتا ہے جو صرف پیٹ میں جاتا ہے' یہ سب چیزیں اس اصلی مواد اور عناصر پر مشتمل ہیں جو یہ زمین اپنے پیٹ میں رکھتی' ہے یا فضا میں رکھتی ہے - مثلاً چینی کیا چیز ہے - یہ کاربن ہائیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ہے اور پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مرکب ہے - یہ دونوں چیزیں ہمارے کھانے اور پینے کی چیزوں کے بڑے مرکبات ہیں - نیز لباس اور آلات بھی انہیں عناصر سے بنتے ہیں' جو اس زمین کے اندر اللہ نے ودیعت کیے ہیں -

یہ ہیں وہ امور جو اس زمین کی برکات اور اس کے اندر موجود ذرائع رزق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کو چار دنوں یا چار طویل ادوار' یعنی ایام اللہ میں بنایا گیا جن کی مقدار ہمیں معلوم نہیں ہے -

--- ooo---

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ (۴۱ : ۱۱) فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَحِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ

(۴۱ : ۱۲) "پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا' جو اس وقت محض دھواں تھا - اس نے آسمان اور زمین سے کہا "وجود میں آ جاؤ' خواہ تم چاہو یا نہ چاہو" - دونوں نے کہا "ہم آ گئے فرمانبرداروں کی طرح" - تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیئے' اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر دیا - یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے" -

استواء کا مفہوم یہاں ارادہ کرنا ہے - اور اللہ کی طرف سے قصد کرنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف اپنے ارادے کو متوجہ کر دے - ثم بعض اوقات ترتیب زمانی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ معنوی ارتقاء کے لیے بھی آتا ہے - آسمان چونکہ انسانوں کو ارفع اور بلند نظر آتے ہیں اس لیے اس کے لیے ثم کا لفظ آیا -

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ (۴۱ : ۱۱) "پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اس وقت محض دھواں تھا" - یہ کہا جاتا ہے کہ ستاروں کی تخلیق سے قبل ایک حالت تھی جیسے "سدم " کی حالت ہوتی ہے اور یہ ایک قسم کا گیس تھا' جیسے دھواں ہوتا ہے -

"سدم (Black Whole) میں جو گیس اور غبار ہوتا ہے وہ وہی ہوتا ہے' جو ستاروں کی تخلیق سے بچ گیا ہوتا

---

(۱) حوالہ سابق

ہے۔ نظریہ تخلیق کائنات یہ ہے کہ کہکشاں گیس اور غبار سے مرکب ہوتی ہے۔ جب یہ گیس اور غبار زیادہ کثیف ہو گئے تو اس کے نتیجے میں ستارے پیدا ہوئے۔ کچھ ملبہ رہ گیا۔ یہ بقیہ ملبہ سدم کی شکل اختیار کر گیا۔ اس وسیع کہکشاں میں اس کا جو حصہ باقی ہے وہ منتشر ہے۔ گیس اور غبار کی شکل میں۔ اس کی مقدار اتنی ہے جتنے ستارے بن گئے۔ یہ ستارے اس بقیہ گیس اور غبار کو اپنی طرف اپنی جاذبیت کے ذریعے کھینچتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس عمل سے آسمانوں کی صفائی ہو رہی ہے لیکن اس غبار کو جذب کرنے والے ستارے اس ہولناک فضا میں بہت تھوڑے ہیں۔ اور جن علاقوں کو اس سے صاف نا ہے وہ بہت ہی وسیع ہیں"۔

یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کیونکہ یہ اس مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔ جو اس آیت میں ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (۴۱ : ۱۱) "پھر وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اس وقت دھواں تھا"۔ یہاں تک کہ اس سے آسمان بنائے اور ان میں دو ایام اللہ صرف ہوئے یعنی طویل عرصہ۔

اس کے بعد اب ہم اس حقیقت پر غور کریں گے۔

فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (۴۱ : ۱۱) "اس نے آسمان اور زمین سے کہا: وجود میں آجاؤ، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو"۔ دونوں نے کہا "ہم آگئے فرمانبرداروں کی طرح"۔ اس آیت میں عجب اشارہ ہے اس قانون قدرت اور ناموس فطرت کی طرف جو اس کائنات میں چلایا گیا ہے اور اس کائنات کا تعلق اپنے خالق کے ساتھ اطاعت اور سر تسلیم خم کر دینے کا تعلق ہے۔ پوری کائنات اللہ کی مشیت اور حکم کے مطابق چل رہی ہے۔ یہاں صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اللہ کے ناموس کے سامنے مجبور ہو کر سر طاعت خم کرتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے۔ یہ انسان بھی یقینی طور پر اس ناموس فطرت کا مطیع فرمان ہے، اس سے نکل نہیں سکتا۔ یہ اس عظیم کائنات کا نہایت ہی معمولی پرزہ ہے۔ اور اس کائنات کے کلی قوانین اس پر بھی نافذ ہیں خواہ وہ راضی ہو یا نہ ہو، لیکن اس کائنات میں یہ انسان واحد ذات شریف ہے جو اللہ کی اطاعت اس طرح نہیں کرتا جس طرح ارض و سما کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اطاعت سے آزاد کرنا چاہتا ہے یا راہ حق سے انحراف چاہتا ہے جو مستقیم اور آسان ہے، لہٰذا وہ قوانین فطرت سے ٹکراتا ہے اور یہ بات لازمی ہے کہ یہ قوانین اس پر غالب آکر اسے پاش پاش کر دیتے ہیں۔ اس وقت یہ پھر کر مطیع فرمان ہوتا ہے۔ ہاں اللہ کے وہ بندے جن کے دل، جن کا وجود، جن کی حرکات، جن کے تصورات، جن کا ارادہ، جن کی خواہشات اور جن کا رخ نوامیس فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو ایسے بندے پھر خوشی خوشی سے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اس کائنات کے ساتھ ہمقدم ہو کر نہایت تعاون سے چلتے ہیں اور جس طرح یہ پوری کائنات اللہ کی سمت چلتی ہے۔ وہ بھی اسی سمت رواں دواں ہوتے ہیں۔ وہ کائناتی قوتوں کے ساتھ لڑتے ہیں، جب مومن اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کے ہاتھوں معجزات کا صدور ہوتا ہے کیونکہ اس نے ناموس قدرت کے ساتھ اتحاد کر لیا ہے۔ اس کائنات کی عظیم قوتیں اس کی پشت پر آجاتی ہیں۔ اور یہ عظیم قوت جب اللہ کی راہ میں چلتی ہے تو مطیع فرمان ہو کر چلتی ہے۔

ہم اگر اللہ کی اطاعت کرتے ہیں تو مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ کاش کہ ہم خوشی سے مطیع فرمان ہوتے۔ کاش ہم بھی زمین و آسمان کی طرح خوشی سے اطاعت کرتے، رضا اور خوشی سے۔ اس حال میں کہ ہم روح کائنات کے ساتھ ہم

آہنگ ہو چکے ہوں اور نہایت خوشی اور خضوع و خشوع کے ساتھ لبیک کہتے ہوئے اور سر تسلیم خم کرتے ہوئے اللہ رب العالمین کی طرف چلیں۔

بعض اوقات ہم سے بڑی مضحکہ خیز حرکات سرزد ہوتی ہیں' تقدیر کی گاڑی اپنی شاہراہ پر چلتی ہے' تیزی سے چلتی ہے۔ اپنی سمت پر چلتی ہے' یہ پوری کائنات اس کے ساتھ چلتی ہے۔ مستقل قوانین فطرت کے مطابق چلتی ہے۔ ہم آتے ہیں اور ہمارا یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ ہم تقدیر سے بھی آگے ہو جائیں یا تقدیر سے سست روی اختیار کر لیں حالانکہ ہم اس عظیم کائنات کا حصہ ہیں۔ ہم اپنی نفسیاتی کمزوریوں کی وجہ سے جب قافلہ کائنات سے الگ ہو جاتے ہیں تو ہمارے سفر کی سمت ہی بدل جاتی ہے اور یہ سمت اس لیے بدلتی ہے کہ ہم بے چین' جلد باز' لالچی' مطلب پرست اور ڈرپوک ہو جاتے ہیں۔ اور قافلہ ایمان اور قافلہ کائنات سے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں' ہم کبھی اس طرف ٹکراتے ہیں' کبھی ادھر لڑھکتے ہیں اور درد پاتے ہیں' ادھر گرتے ہیں' ادھر حادثہ کرتے ہیں' اور پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ جبکہ کائنات کی گاڑی اپنے راستے پر' اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف جا رہی ہے۔ اور اسی طرح ہماری تمام قوتیں' تمام جدوجہد بے کار ہو جاتی ہیں لیکن جب ہمارے دل ایمان سے لبریز ہوں' ہم اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں' روح کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں' اس وقت ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمارا کردار کس قدر حقیقی ہے۔ پھر ہم اپنے قدموں اور تقدیر کی رفتار کے درمیان توازن پیدا کر دیں گے۔ اور ہم مناسب وقت میں مناسب رفتار سے مناسب سمت کی طرف حرکت کریں گے۔ ہمارے ساتھ اس پوری کائنات کی قوت شامل ہوگی۔ اور ہم عملاً بہت عظیم کام کر سکیں گے' سوائے اس کے کہ ہم پر کبر و غرور کا اثر ہو' کیونکہ ہمیں تو اصل حقیقت معلوم ہوگی کہ جس قوت کے ذریعے ہم یہ کارہائے نمایاں کر رہے ہیں' اس کا سرچشمہ تو دراصل کوئی اور ہے۔ یہ ہماری ذاتی قوت نہیں ہے۔ ہماری قوت میں یہ برکت اس لیے پیدا ہو گئی کہ یہ اس کائنات کے اندر ودیعت کردہ اللہ کی قوت کے ساتھ یکجا ہو گئی ہے۔

کیا ہی سعادت مندی ہوگی' کیا رضامندی ہوگی' کس قدر راحت ہوگی اور کس قدر اطمینان ہو گا' کہ ہم اس کرۂ ارض پر جو اللہ کو لبیک کہنے والا ہے' اپنا یہ مختصر سفر اس خوشی میں' اس کرۂ ارض کی معیت میں طے کریں اور آخر کار رب تعالیٰ کے ہاں ایک بڑے سفر کے آغاز کے لیے پہنچ جائیں۔

وہ کیا عظیم امن و سلامتی ہوگی جب ہم ایک ایسی کائنات میں زندہ رہ رہے ہوں جو ہماری دوست ہو' سب کی سب اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والی ہو اور ہم بھی اللہ کے مطیع فرمان ہوں۔ ہم دونوں ہمقدم ہوں' دشمنی پر نہ ہوں' دوست ہوں' کیونکہ ہم اس کائنات کا حصہ ہیں اور اسی کے ہمہ رخ ہیں۔

قَالَتَآ اَتَيۡنَا طَآئِعِيۡنَ (۴۱ : ۱۱) ”ہم آ گئے فرمانبرداروں کی طرح“۔

فَقَضٰهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ (۴۱ : ۱۲) ”تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیئے۔

وَ اَوۡحٰى فِىۡ كُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا (۴۱ : ۱۲) ”اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا“۔ یہ

دو ذن وہی ہو سکتیں جن میں سدم سے ستارے تیار ہوئے یا جن میں ان کی تشکیل مکمل ہوئی ۔ حقیقت اللہ ہی جانتا ہے ۔ ہر آسمان کی طرف اس کے امور کی وحی کے معنی یہ ہیں کہ اس پر قوانین قدرت نافذ کر دیئے ۔ اور ہدایت کر دی کہ یوں چلو' پھر آسمان کے حدود کیا ہیں تو اس کا تعین فی الحال ہم نہیں کر سکتے ۔ دوری کا ایک درجہ ایک آسمان ہو سکتا ہے ۔ ایک کہکشاں ایک آسمان ہو سکتی ہے' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دوری تک جس قدر کہکشاں ہیں وہ ایک آسمان ہوں یا اس کا اور سوم بھی ہو سکتا ہے ۔ البتہ یہ بلندیاں سات ہیں ۔

وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَ حِفْظًا (۴۱ : ۱۲) "اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے محفوظ کر دیا" ۔ سماء دنیا کا بھی کوئی متعین مفہوم نہیں ہے' اس سے مراد قریب ترکہکشاں بھی ہو سکتی ہے جو ہمارے ہاں شمسی کہکشاں کے نام سے مشہور ہے اور جس کا قطر ایک لاکھ ملین نوری سال ہے ۔ یا کوئی اور معیار ہو اللہ کے نزدیک جس پر لفظ سما کا اطلاق ہوا ہو ۔ اس میں ستارے اور سیارے ہیں جو ہمارے لیے چراغ ہیں اور بہت خوبصورت ہیں ۔

حفاظت کس چیز سے ؟ شیطانوں سے ۔ قرآن میں دوسری جگہ اس کی تصریح ہے ۔ پھر شیاطین کی حقیقت کیا ہے ؟ قرآن کریم میں جو افعال ان کی طرف منسوب ہیں اور جو اشارے ہیں' ان کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی حقیقت اور ماہیت کا علم اللہ کو ہے ۔

ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۴۱ : ۱۲) "یہ سب کچھ ایک زبردست اور علیم ہستی کا منصوبہ ہے ۔ کون ہے اللہ کے سوا جو اس عظیم اور ہولناک کائنات کو چلا سکتا ہے ؟ صرف اللہ زبردست اور علیم و حکیم' اس کام کو کر سکتا ہے' جو ہر چیز سے باخبر ہے ۔

--- ○○○ ---

ایک عظیم کائناتی سفر کے بعد اللہ کا انکار کرنے والوں کے موقف کی کیا وقعت رہ جاتی ہے اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں ان کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے' جبکہ آسمان و زمین دونوں بیک زبان کہتے ہیں کہ ہم ہیں مطیع فرمان ۔ لیکن انسان ہے اور کیا انسان ؟ اس کائنات کے اعتبار سے ایک نہایت چھوٹی سی چیونٹی بلکہ جرثومہ' بے وقعت' جو زمین پر رینگتا ہے ۔ یہ نہایت ہی لاپرواہی' غرور کے ساتھ کہتا ہے کہ میں نہ مانوں ! --- کیا سزا ہونی چاہئے ایسے لوگوں کی' ایسے لاپرواہ متکبرین کی !

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ﴿۱۳﴾ إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿۱۴﴾ فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾

۲
۱۰ع
۱۶

"اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں' جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا۔ جب خدا کے رسول ان کے پاس آگے اور پیچھے ہر طرف سے آئے اور انہیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو' تو انہوں نے کہا "ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا' لہٰذا ہم اس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو"۔ عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے "کون ہے ہم سے زیادہ زور آور"۔ ان کو یہ نہ سوجھا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ زور آور ہے؟ وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے' آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں' اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی زیادہ رسوا کن ہے' وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو گا۔ رہے ثمود' تو ان کے سامنے ہم نے راہ راست پیش کی مگر انہوں نے راستہ دیکھنے کے بجائے اندھا بنا رہنا ہی پسند کیا' آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی و بدعملی سے پرہیز کرتے تھے"۔

یہ فی الحقیقت ایک خوفناک ڈراوا ہے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱ : ۱۳) "اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا"۔ یہ ڈراوا مشرکین کے جرائم اور نہایت ہی مکروہ بدکاریوں کے لیے نہایت مناسب تھا جس طرح کے غرور میں مشرکین مکہ مبتلا تھے' جس کا ذکر سورت کے آغاز میں ہوا' نیز وہ اس پوری کائنات کی روش اطاعت سے بھی پھرے ہوئے تھے' جس کا ذکر اس ڈراوے سے متصلاً پہلے ہوا۔

اس ڈراوے کے قصے کے بارے میں ابن اسحاق نے روایت کی ہے یزید ابن زیادہ سے انہوں نے محمد ابن کعب قرظی سے' انہوں نے کہا مجھے یہ بتایا گیا کہ عتبہ ابن ربیعہ نے' جو قریش کا ایک سردار تھا' ایک دن جبکہ وہ قریش کی محفل

میں بیٹھا ہوا تھا' اور رسول اللہ ﷺ مسجد الحرام میں اکیلے بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگا سرداران قریش 'کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ میں محمد سے بات کروں اور ان کے سامنے کچھ تجاویز پیش کروں' شاید وہ ان میں سے بعض کو قبول کر لے - وہ جو چاہے ہم اس کو دے دیں اور وہ ہمیں معاف کر دے - یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت حمزہ اسلام لے آئے تھے - اور سرداران قریش نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں تو اضافہ ہو رہا ہے - وہ تو زیادہ ہو رہے ہیں بلکہ لوگ کثرت سے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں - اہل مجلس نے کہا ابوالولید یہ تو بہت اچھی بات ہے - آپ اٹھیں اور اس سے بات کریں - عتبہ اٹھا اور حضورؐ کے پاس گیا' یہ رسول اللہؐ کے پاس بیٹھا اور کہا' بھتیجے! تو ہم میں خاندانی مقام و مرتبہ کے اعتبار اور جاہ و نسب کے لحاظ سے ایک ممتاز مقام رکھتا ہے - تو نے اپنی قوم کو ایک بہت بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے - قوم کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ہے - تو نے ان کے نظریات اور عقائد کی تضحیک بھی کی - ان کے دین اور الہوں پر نکتہ چینی کی - پھر تو نے ان آباو اجداد کی تکفیر کی جو چلے گئے ہیں - لہٰذا اب میری کچھ تجاویز سنو' ان پر غور کرو - اگر تم ان میں سے بعض تجاویز کو قبول کرو تو آپؐ نے فرمایا ابو الولید آپ کہیں میں سنتا ہوں - تو اس نے کہا:

''بھتیجے تم نے جو تحریک چلا رکھی ہے اگر اس سے تمہاری غرض مال و دولت جمع کرنا ہے تو ہم تمہارے لیے مال و دولت کی بڑی مقدار جمع کرتے ہیں - یہاں تک کہ تم سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے' اگر تم اقتدار چاہتے ہو تو ہم تمہیں ایسے اختیارات کے ساتھ سردار بناتے ہیں کہ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہ ہو سکے گا - اور اگر سرداری سے بھی آگے تم بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تمہیں بادشاہ بنا دیتے ہیں - اور اگر یہ صورت ہے کہ جو تم پر آتا ہے وہ کوئی بیماری ہے جسے تم اپنے آپ سے دور نہیں کر سکتے ہو تو ہم تمہارے لیے بڑے بڑے طبیب لاتے ہیں اور اس میں بہت کچھ خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں یہاں تک کہ تم تندرست ہو جاؤ' کیونکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے پیچھے لگنے والا اس پر غالب ہو جاتا ہے اور اسے اس کا علاج کرانا پڑتا ہے - یہ تھی عتبہ کی تقریر جو اس نے کی - جب عتبہ فارغ ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی باتیں غور سے سن رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا: آپ کی بات ختم ہو گئی تو اس نے کہا ''ہاں'' - حضورؐ نے فرمایا سنئے میری بات' تو اس نے بھی کہا بات کیجئے' حضورؐ نے فرمایا

حٰمٓ (۴۱:۱) تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۴۱:۲) كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۴۱:۳) بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۴۱:۴)

''ح م' یہ خدائے رحمن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے' ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں' عربی زبان کا قرآن' ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں' بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا ہے - مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سورت اس کے سامنے پڑھتے رہے - عتبہ نے سنا تو وہ خاموش رہا اور اپنے ہاتھ اپنی پیٹھ کے پیچھے لگا کر ان پر ٹیک لی اور سنتا رہا یہاں تک کہ رسول اللہؐ سجدے کے مقام تک آئے' تو حضورؐ نے سجدہ فرمایا - اس کے بعد فرمایا: ابو الولید تم نے سن لیا - اب تم جانو اور تمہارا کام - عتبہ اٹھا اور اپنے ساتھیوں کی طرف گیا - انہوں نے ایک دوسرے سے کہا' ہم خدا کی

قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ابوالولید کا چہرہ وہ نہیں ہے جس کے ساتھ وہ گیا تھا۔ جب وہ ان کے پاس بیٹھا' تو انہوں نے پوچھا ابو الولید کیا خبر لائے ہو۔ تو اس نے کہا خبر یہ ہے کہ خدا کی قسم میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے' اپنی زندگی میں' میں نے ایسا کلام ہرگز نہیں سنا۔ خدا کی قسم یہ جادو نہیں ہے' یہ شعر نہیں ہے' یہ کہانت نہیں ہے۔ اے برادران قریش میری بات مانو اور یہ معاملہ میرے حوالے کر دو' اس شخص کو چھوڑ دو وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے' اسے کرنے دو' اسے اپنے حال پر چھوڑ دو' خدا کی قسم وہ جو کچھ کہتا ہے' آئندہ اس کی بڑی اہمیت ہوگی۔ اگر دوسری عرب اقوام نے اسے کچل دیا تو وہ تمہاری مصیبت کو ختم کر دیں گے تمہارے بغیر ہی۔ اور اگر یہ شخص عربوں پر غالب آگیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی ہوگی۔ اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور تم اس کے ذریعہ خوشحال ترین لوگ ہو جاؤ گے تو انہوں نے کہا "خدا کی قسم' ابو الولید تم پر اس نے اپنی باتوں سے جادو کر دیا۔ اس پر اس نے کہا کہ میری رائے تو یہی ہے' تم جو چاہو' کرو"۔

علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی ہے (محمد ابن فضل سے' انہوں نے اجلح سے) یہ اجلح ابن عبداللہ الکندی الکوفی ہیں۔ (اس آدمی کے بارے میں ابن کثیر نے کہا کہ یہ کسی قدر ضعیف ہے) اس نے زیال ابن حرملہ سے انہوں نے حضرت جابر ابن عبداللہؓ سے کہ جب حضورؐ اس آیت تک آئے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ (۴۱ : ۱۳) تو عتبہ نے آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور صلہ رحمی کا واسطہ دیا۔ اور یہ عتبہ اپنے گھر چلا گیا اور پھر قریش کی محفل میں نہ آیا اور اپنے آپ کو ان سے دور رہنے کے لیے گھر میں بند کر لیا۔

اس ڈراوے کے اثرات کی ایک صورت آپ نے دیکھی کہ حضورؐ کی زبان سے ایک غیر مسلم نے اسے سنا اور وہ کانپ اٹھا۔ اس حدیث پر غور ابھی ختم نہیں ہوا ذرا رکئے' رسول اللہ کی تصویر دیکھئے' اس عظیم انسان کے آداب گفتگو دیکھئے۔ آپ کے اطمینان قلبی کو دیکھئے' آپ نے بڑے اطمینان سے عتبہ کے منہ سے نہایت گری ہوئی باتیں سنیں جن کی آپ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں ہے۔ لیکن آپ کا دل اپنے عظیم مقصد کو چھوڑ کر نیچے نہیں آتا۔ یہ چھوٹی چھوٹی پیش کشیں آپ کو گندی تجاویز محسوس ہوتی ہیں جن سے آپ کا نفس نفرت کرتا ہے لیکن حضورؐ نہایت ہی حلم کے ساتھ ان کو سنتے ہیں۔ شریفانہ انداز میں سنتے ہیں۔ آپ مطمئن' ٹھہرے ہوئے' سنجیدہ اور محبت کرنے والے کی طرح سنتے ہیں۔ آپ صبر سے عتبہ کو یہ گری ہوئی تجاویز پیش کرنے دیتے ہیں۔ جب وہ بات ختم کرتا ہے تو پھر بھی آپ جلدی نہیں کرتے نہایت ہی اطمینان کے ساتھ پوچھتے ہیں اور کے ساتھ۔ "ابو الولید تم فارغ ہو گئے"؟ وہ کہتا ہے ہاں۔ تو آپ فرماتے ہیں اچھا اب میری بات سنو۔ اور آپ اس وقت تک نہیں شروع کرتے جب تک وہ کہہ نہیں دیتا کہ سنائیے۔ اب حضور نہایت اطمینان' اعتماد اور بھرپور انداز میں شروع کرتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایسی تصویر ہے جسے دیکھتے ہی دل میں ہیبت و احترام کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اعتماد و محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور اطمینان ہو جاتا ہے کہ آپ ایک عظیم شخصیت ہیں' یہی وجہ ہے کہ آپ کے سامعین پر آپ چھا جاتے تھے' جو بھی آپ کی طرف آتا وہ مسحور ہو کر لوٹتا یا مبہوت ہو جاتا۔ اللہ نے سچ کہا کہ اللہ جانتا ہے کہ وہ منصب رسالت کس کے سپرد کرتا ہے۔۔۔ اب ہم اس واقعہ کو چھوڑ کر نص قرآنی کی طرف آتے ہیں۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (۴۱:۱۳) ”اگر یہ منہ موڑیں تو ان سے کہہ دیں کہ میں تم کو اسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا کہ عاد وثمود پر نازل ہوا تھا“۔ یہ ایک سفر ہے گزری ہوائی اقوام کے کھنڈرات کی سیر کے لیے۔ جبکہ اس سے قبل قرآن نے ہمیں آسمانوں کی وسعتوں کی سیر کرائی۔ یہ ایک ایسی سیر ہے جو خوف کے مارے دلوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے کہ کیسی کیسی اقوام کو اللہ نے تباہ کیا جو اس جہاں میں اپنے خیال کے مطابق بڑے بنے ہوئے تھے۔

اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ (۴۱:۱۴)

”جب خدا کے رسول ان کے پاس آگے اور پیچھے، ہر طرف سے آئے اور انہیں سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو“۔ یہ وہی ایک کلمہ ہے جسے تمام انبیاء ورسل نے پیش کیا اور جس پر تمام ادیان حقہ کی عمارت تعمیر ہوئی۔

قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۴۱:۱۴) ”تو انہوں نے کہا، ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجتا لہٰذا ہم اس بات کو نہیں مانتے، جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو“۔ یہ بھی وہی اعتراض ہے جس کا سامنا تمام انبیاء ورسل نے کیا۔ حالانکہ انسانوں سے خطاب کرنے والے رسول کو انسان ہی تو ہونا چاہیے، جو ان کو جانتا ہو، اور جسے وہ جانتے ہوں، جس کے اندر لیڈرشپ کے حقیقی اوصاف وہ پائے جاتے ہوں۔ وہ انہی مشکلات میں رہتا ہو، جس میں وہ رہتے ہوں، لیکن عاد اور ثمود نے اپنے رسولوں کی دعوت کا انکار کر دیا۔ اور اس لیے کر دیا کہ وہ بشر کیوں ہیں۔ ان کی تجویز کے مطابق ملائکہ کیوں نہیں۔

یہاں تک تو عاد وثمود دونوں کی بات ایک تھی کہ دونوں پر عذاب ایک سخت کڑک دار آواز یا دھماکے سے آیا تھا۔ اب یہاں سے آگے ان کی ہلاکت کی تفصیلات الگ تھیں۔ اس لیے الگ الگ بیان کیا گیا۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً

(۴۱:۱۵) ”عاد کا حال یہ تھا کہ وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور کہنے لگے: ”کون ہے ہم سے زیادہ زور آور“۔ حق تو یہ ہے کہ انسان اللہ کے سامنے جھکے اور زمین میں استکبار نہ کرے۔ پھر انسان ذرا اللہ کی عظیم خلقت کے مقابلے میں اپنے آپ کو دیکھے، لہٰذا اس کرۂ ارض پر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنا کسی استحقاق کے بغیر ہی ہوتا ہے۔ پھر استکبار کے بعد اظہار غرور بہت بڑا جرم ہے کہ ہمچو ما دیگرے نیست۔

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (۴۱:۱۵) ہر سرکش ڈکٹیٹر یہی کچھ سمجھتا ہے۔ یہ اس شعور کے تحت ایسا کرتا ہے کہ اب ہماری قوت کے برابر کوئی دوسری بڑی قوت نہیں ہے، لیکن یہ ڈکٹیٹر بھول جاتے ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِىْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۴۱:۱۵) ”ان کو یہ نہ سوجھا کہ

جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے' وہ ان سے زیادہ زور آور ہے؟" غرض بادی النظر میں ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کو پیدا کرنے والی ذات بہرحال ان سے زیادہ قوت والی ہے' کیونکہ یہ خالق ہی ہے جس نے ان کو یہ محدود قوت فراہم کی ہے لیکن کوئی سرکش اس بات کو نہیں سمجھا کرتا۔

وَكَانُوا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ (۱۵:۴۱) "وہ ہماری آیات کا انکار ہی کرتے رہے"۔ یہ لوگ اس منظر میں تھے' اپنے زور بازو کا مظاہرہ کر رہے تھے' اپنی قوت پر اترا رہے تھے کہ اچانک پردہ گرتا ہے اور ایک دوسرا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس منظر میں یہ پوری طرح پٹے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کو ان کے قابل نفرت کبر و غرور کی مناسب سزا دے دی جاتی ہے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۶:۴۱) "آخر ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں"۔ یہ نہایت ہی تیز رفتار' مسلسل چلنے والی ہوا تھی' جس نے ان لوگوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا' سخت سرد دنوں میں سخت سردی کے ساتھ آئی' یہ تباہی تو ان کے لیے دنیا کی زندگی میں شرمندگی تھی۔ ان لوگوں کے لائق سزا تھی یہ جو دنیا میں بڑے بنتے ہیں۔ تکبر کرتے اور لوگوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو اونچا سمجھتے ہیں۔ یہ تو تھی دنیا میں' لیکن آخرت میں بھی یہ لوگ بچ نہ سکیں گے۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ (۱۶:۴۱) "اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی رسوا کن ہے' وہاں کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو گا"۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (۱۷:۴۱) "رہے ثمود تو ان کو ہم نے سیدھا راستہ دکھایا مگر انہوں نے اس راستے پر چلنے کی بجائے اندھا بنا رہنا ہی پسند کیا"۔ اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ ناقہ کی نشانی کے بعد انہوں نے ہدایت قبول کر لی تھی۔ پھر مرتد ہو گئے اور کفر کی راہ اپنا لی اور ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دے دی۔ اور ہدایت پا لینے کے بعد گمراہ ہونا اندھے پن کے مشابہ ہے۔

فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۷:۴۱) "آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا"۔ اور ذلت آمیز عذاب ان کے لیے مناسب تھا' یعنی صرف ہلاک ہی نہ کیے گئے بلکہ ان کی ارتداد کی وجہ سے اور ہدایت کے بعد ضلالت کی وجہ سے ان کو ذلیل بھی کیا گیا۔

وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (۱۸:۴۱) "اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور بدعملی سے پرہیز کرتے تھے"۔ یہ سفر عاد و ثمود کی بربادی پر ختم ہوتا ہے اور یہ نہایت ہی ڈراؤنا سفر ہے۔ اس

میں قارئین کو بتایا گیا کہ اللہ کی قوت کا کیا عالم ہے۔ اور اس کی بادشاہت کیسی ہے۔ ان کی قوت کا اللہ کی قوتوں سے کوئی مقابلہ نہیں اور اللہ کی بادشاہت سے کوئی قلعہ نہیں بچا سکتا۔ اور کوئی خود ساختہ بڑا اس بادشاہت میں نہیں رہ سکتا۔

--- ○○○ ---

اب جبکہ فطرت کائنات کے اندر اللہ کی قوتوں کا مطالعہ کر لیا گیا۔ انسانی تاریخ میں اللہ کے فیصلوں کو ہم نے دیکھ لیا کہ کتنی کتنی طاقتور تہذیبوں کو نیست و نابود کیا گیا۔ اب اللہ ان کو بتاتا ہے کہ خود نفس انسانی پر اللہ کی بادشاہت کس طرح قائم ہے کہ خود اپنی ذات کی کسی چیز کے بھی وہ مالک نہیں ہیں۔ اور اللہ کے اقتدار سے وہ اپنی ذات کی کوئی چیز بھی بچا کر نہیں رکھ سکتے۔ یہاں تک کہ ان کے کان' ان کی آنکھیں' ان کا گوشت و پوست بھی اللہ کے مطیع فرمان ہیں اور جب قیامت کا دن آئے گا تو یہ سب خود انسان پر گواہ ہوں گے۔ اس وقت انسان کی حیرانگی کا عالم کیا ہو گا! ملاحظہ کیجئے:

وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَآءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿١٩﴾ حَتَّىٰٓ إِذَا مَا جَآءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَٰرُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿٢٠﴾ وَقَالُوا۟ لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوٓا۟ أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِىٓ أَنطَقَ كُلَّ شَىْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢١﴾ وَمَا كُنتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَن يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ أَبْصَٰرُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَٰكِن ظَنَنتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢٢﴾ وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِى ظَنَنتُم بِرَبِّكُمْ أَرْدَىٰكُمْ فَأَصْبَحْتُم مِّنَ الْخَٰسِرِينَ ﴿٢٣﴾ فَإِن يَصْبِرُوا۟ فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۖ وَإِن يَسْتَعْتِبُوا۟ فَمَا هُم مِّنَ الْمُعْتَبِينَ ﴿٢٤﴾

"اور ذرا اس وقت کا خیال کرو جب اللہ کے یہ دشمن دوزخ کی طرف جانے کے لیے گھیر لائے جائیں گے۔ ان کے اگلوں کو پچھلوں کے آنے تک روک رکھا جائے گا' پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے "تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟" وہ جواب دیں گی "ہمیں اسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔ اسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو۔ تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمہیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمہارے اپنے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی۔ بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمہارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے۔ تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا' تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے"۔ اس حالت میں وہ صبر کریں (یا نہ کریں)

آگ ہی ان کا ٹھکانا ہوگی ' اور اگر رجوع کا موقع چاہیں گے تو کوئی موقع نہیں نہ دیا جائے گا"۔

یہاں اچانک قارئین کے سامنے ایک منظر آتا ہے ' انتہائی مصیبت کا منظر ہے ۔ اللہ کا اقتدار عروج پر ہے ۔ انسان کے اعضا اللہ کے حکم پر کلمہ حق کہتے ہیں ۔ یہ کس کے اعضا ہیں؟ اللہ کے دشمنوں کے اعضاء 'کیا ہے انجام اعدائے الٰہی کا ۔ یہ حشر کے میدان میں جمع ہیں ' آدم علیہ السلام سے لے کر اس جہاں پر آخری پیدا ہونے والا انسان تک حاضر ہیں ۔ ایک ریوڑ کی طرح جمع ہوں گے ۔ ان میں سے دشمنان خدا کو چلایا جائے گا کس طرف؟ آگ کی طرف ' جب حساب و کتاب شروع ہو گا ۔ ان کے خلاف ایسے گواہ آتے ہیں جن کے بارے میں ان کو توقع ہی نہ تھی ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی حالانکہ یہ ان کے حق میں جھوٹ بولتی تھی ' افتراء باندھتی تھی اور مذاق اڑاتی تھی ۔ ان کے کان ' ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے ان کے خلاف عدالت میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور تسلیم و رضا کے ساتھ اللہ کے ہاں گواہی دے رہے ہیں ' جو کچھ انہوں نے کہا ' پورا پورا بیان کر رہے ہیں ۔ یہ لوگ تو یہ سب باتیں اللہ سے چھپاتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اللہ انہیں دیکھ نہیں رہا ہے ۔ وہ اپنی نیتوں اور جرائم کو ہلکا سمجھتے ہیں اور چھپاتے ہیں لیکن اپنے اعضاء سے تو نہ چھپا سکتے تھے ۔ اعضاء تو ان کے ساتھ تھے ۔ یہ تو ان کا حصہ تھے ۔ یہ اعضاء ان باتوں کو کھول دیتے ہیں جن کے بارے ان کا خیال تھا کہ وہ خفیہ راز میں اور تمام لوگوں سے چھپے ہوئے ہیں ۔ رب العالمین سے بھی چھپے ہیں ۔ اللہ کی سلطنت اور اقتدار اعلیٰ کا یہ منظر اچانک ہمارے سامنے آتا ہے ۔ اور اقتدار الٰہی ہم سے ہمارے اعضاء بھی چھین لیتا ہے ۔

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا (۴۱ : ۲۱) "وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟" تو وہ ان کو وہ حقیقت بتاتے ہیں جو ان سے پوشیدہ تھی ۔ اور یہ بات وہ بغیر کسی جھجک اور رکھ رکھاؤ کے بتاتے ہیں ۔

قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (۴۱ : ۲۱) "وہ جواب دیں گے ہمیں اس خدا نے گویائی دی ہے ' جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے" ۔ کیا وہی نہیں ہے جس نے زبانوں کو گویائی دی ۔ کیا وہ دوسرے اعضاء کو گویائی نہیں دے سکتا ۔ آج تو اس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے ' ہر چیز اب بولتی ہے ۔

وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۴۱ : ۲۱) "اسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو" ۔ تخلیق بھی اسی کی ہے اور آخر کار رجوع بھی اس کی طرف ہو گا ۔ اس کے قبضہ قدرت سے کوئی باہر نہیں ہے ۔ اور نہ بھاگ سکتا ہے ۔ نہ اس دنیا میں اور نہ آخرت میں ۔

ان باتوں کا تو انہوں نے انکار کیا تھا ۔ اب خود ان کے اعضاء ان کا اقرار کر رہے ہیں ۔ اب اگلی آیت اعضاء کے کلام کی حکایت بھی ہو سکتی ہے اور اس پورے واقعہ پر تبصرہ بھی ہو سکتا ہے ۔

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ

(۴۱ : ۲۲) "تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمہیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمہارے اپنے کان '

تمہاری آنکھیں اور تمہارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی"۔ تمہارے تو تصور میں بھی نہ تھا کہ یہ اعضاء تمہارے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ اور تمہاری طاقت میں بھی یہ بات نہ تھی کہ تم کسی بھی طرح اللہ سے چھپا سکو اگر چاہو بھی۔

۔ وَ لٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (۴۱ : ۲۲) "بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمہارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے"۔ نا سمجھی نے تمہیں دھوکہ دے دیا۔ یہ نہایت ہی جاہلانہ اور بدکارانہ روش تھی جس نے تمہیں جہنم کے دہانے پر پہنچا دیا۔

وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ

(۴۱ : ۲۳) "تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑگئے"۔

اور اب اس پورے منظر پر تبصرہ اور اس سے حاصل ہونے والا سبق :

فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۱ : ۲۴) "اس حالت میں اگر وہ صبر کریں تو آگ ہی ان کا ٹھکانا ہے"۔ کیا سنجیدہ مزاح ہے۔ صبر اب آگ جہنم پر ہے۔ یہ وہ صبر نہیں ہے جس کے نتیجے میں انسان کو خوشی، اور حسن جزاء نصیب ہوتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس پر جزاء نار جہنم ہے کیونکہ اب تو قرار دیا جا چکا ہے کہ یہی ان کا ٹھکانا ہے۔

وَ اِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ (۴۱ : ۲۴) "اگر رجوع کا موقعہ چاہیں گے تو کوئی موقعہ انہیں نہ دیا جائے گا"۔ نہ وہاں رضامندی ہے اور نہ وہاں توبہ کی گنجائش ہے۔ کیونکہ جو شخص معافی مانگتا ہے تو معافی تب ہوتی ہے جب ظلم و زیادتی کو زائل کر کے معافی طلب کی جائے۔ آج تو معافی اور ازالے کا دروازہ ہی بند ہو چکا ہے۔ اور اس لیے ان کے پاس کوئی موقعہ نہیں ہے۔

--- ○○○---

اب اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا اقتدار تو تمہارے دلوں پر بھی قائم ہے۔ جب تم زمین میں تھے اس وقت بھی تمہارے دل اللہ کے قبضہ قدرت میں تھے۔ جب تم اللہ کی نافرمانی کرتے تھے۔ جب اللہ کو تمہارے دلوں کا میلان فساد معلوم ہوا تو اللہ نے تمہارے دلوں پر ایسے ساتھی مسلط کر دیئے جو جنوں میں سے بھی تھے اور انسانوں میں سے بھی۔ یہ برائی کو تمہارے دل و دماغ کے لیے مزین کرتے تھے۔ یہ ساتھی ان کو اس قافلے میں ملا دیتے تھے جس کا انجام گھاٹے کا لکھا گیا تھا۔ یوں ان پر کلمہ عذاب اور فیصلہ عذاب صادق ہوا :

وَ قَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ

وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٢٥﴾

''ہم نے ان پر ایسے ساتھی مسلط کر دیئے تھے جو انہیں آگے اور پیچھے ہر چیز خوشنما بنا کر دکھاتے تھے' آخر کار ان پر بھی وہی فیصلہ عذاب چسپاں ہو کر رہا جو ان سے پہلے گزرے ہوئے جنوں اور انسانوں کے گروہوں پر چسپاں ہو چکا تھا' یقیناً وہ خسارے میں رہ جانے والے تھے''۔

ذرا دیکھیں تو سہی کہ وہ کس حد تک اللہ کے قبضے میں ہیں' جس کی بندگی کرنے سے وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں۔ اور ان کے دل جو ان کے پہلوؤں میں ہیں' وہ ان کو عذاب اور برے انجام کی طرف لے جا رہے ہیں۔ جس کو اللہ گمراہ کرنا چاہے اس پر وہ ایسے ساتھی مسلط کر دیتا ہے جو اس کے دل میں وسوسہ اندازی کا کام کرتے ہیں اور اس کے ماحول میں جو بری چیز ہوتی ہے اس کو اس کے لیے مزین کرتے ہیں اور اس کے جو اعمال ہوتے ہیں اس کی نظروں میں اچھے بناتے ہیں' ان کو ان میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی اور انسان کے لیے سب سے بڑی بیماری یہ ہوتی ہے کہ اس کے برے افعال اور اس کی گمراہی کے بارے میں اس کا احساس ختم ہو جائے۔ اپنی ذات کے ہر پہلو کے بارے میں وہ یہ دیکھنے لگے کہ وہ اچھا ہے۔ اس مقام پر جب انسان پہنچ جائے تو پھر وہ ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ لوگ اس گلے میں شامل ہو گئے جس نے ہلاکت کی طرف جانا تھا۔ یعنی ان گروہوں میں جن پر اللہ کا فیصلہ طے ہو چکا تھا' جنوں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی کہ

اَنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ (۴۱ : ۲۵) ''کہ یقیناً وہ خسارہ میں رہ جائیں گے''۔

ان لوگوں کے جو ساتھی تھے ان کو گمراہ کرنے کے لیے' انہوں نے ان کو آمادہ کیا کہ قرآن کا مقابلہ اس طرح کرو کہ اسے نہ سنو' نہ سننے دو کیونکہ انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ اس کے اندر غضب کی تاثیر ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿٢٦﴾

''یہ منکرین حق کہتے ہیں ''اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو' شاید کہ اسی طرح تم غالب آ جاؤ''۔

یہ وہ بات ہے جو قریش کے کبراء اپنے آپ کو اور جمہور عوام کو کہتے تھے۔ یہ لوگ قرآن کریم کی حیرت انگیز اثر آفرینی سے عاجز آ گئے تھے۔ یہ اثر ان پر بھی تھا اور عوام پر بھی تھا۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ (۴۱ : ۲۶) ''اس قرآن کو ہرگز نہ سنو''۔ کیونکہ جس طرح وہ کہتے تھے یہ ان پر جادو کرتا ہے۔ ان کی سوچ پر غالب آ جاتا ہے اور ان کی زندگی کو خراب کر رہا ہے۔ باپ اور بیٹے کے درمیان تفرقہ کر دیتا ہے' خاوند اور بیوی کے درمیان جدائی کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن ایسی جدائیاں کر دیتا تھا لیکن اس لیے کہ خود اللہ نے ایمان اور کفر کے درمیان جدائی کر دی ہے' ہدایت اور ضلالت کے درمیان جدائی کر دی ہے' جو اسے مانتا تھا وہ خلوص سے مانتا تھا۔ اس لیے اس کے بعد وہ کسی اور تعلق کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ چنانچہ اس طرح جدائیاں ہو جاتی تھیں۔

وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ (۴۱ : ۲۶) "اور اس میں خلل ڈالو' شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ"۔ یہ پاگلوں کی باتیں ہیں۔ لیکن وہ اس کے سوا کہ کیا سکتے ہیں وہ تو عاجز آ چکے ہیں' وہ دلیل و برہان سے بات نہیں کر سکتے کہ انہیں کوئی دلیل و حجت دستیاب ہی نہیں ہے۔ اس لیے پاگل پنے پر اتر آئے ہیں اور جو شخص ایمان لانے پر آمادہ نہیں ہوتا وہ پھر اس پاگل پنے پر اتر آتا ہے۔

چنانچہ انہوں نے رستم و اسفندیار کے قصوں کے ذریعہ قرآن میں خلل ڈالنے کی کوشش کی۔ ابن نضر خصوصاً یہ کام کرتا تھا۔ اس طرح شوروشغب اور سیٹیاں بجانے کے ذریعے بھی وہ یہ کام کرتے تھے اور اپنے سجع اور رجز کے اشعار کے ذریعے بھی کرتے تھے لیکن یہ سب تدبیریں ہوا ہو گئیں اور قرآن غالب رہا۔ کیونکہ اس کے اندر غلبے کا راز تھا۔ وہ حق پر مشتمل تھا۔ اور سچائی ہمیشہ غالب ہوا کرتی ہے۔ اگرچہ اہل باطل لاکھ جتن کریں ان کی اس مکروہ بات کی تردید میں ان کو سخت ڈراوا دیا جاتا ہے۔

فَلَنُذِيقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٧﴾ ذَٰلِكَ جَزَاءُ أَعْدَاءِ اللَّهِ النَّارُ ۖ لَهُمْ فِيهَا دَارُ الْخُلْدِ ۖ جَزَاءً بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿٢٨﴾

"ان کافروں کو ہم سخت عذاب کا مزہ چکھا کر رہیں گے اور جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں' ان کا پورا پورا بدلہ انہیں دیں گے۔ وہ دوزخ ہے جو اللہ کے دشمنوں کو بدلے میں ملے گی۔ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کا گھر ہو گا۔ یہ ہے سزا اس جرم کی کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے"۔

آگے اب بہت جلد ہم انہیں آگ میں دیکھتے ہیں اور اب ان دوساتھیوں پر ان لوگوں کی نفرت کی بوچھاڑ ہوتی ہے جنہوں نے ان کو دھوکہ دیا تھا' اور ان کے لیے ان کے ماحول کو مزین کر دیا تھا اور دھوکہ دے کر اس مقام تک انہیں لے آئے تھے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا رَبَّنَا أَرِنَا الَّذَيْنِ أَضَلَّانَا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ أَقْدَامِنَا لِيَكُونَا مِنَ الْأَسْفَلِينَ ﴿٢٩﴾

"وہاں یہ کافر کہیں گے کہ "اے ہمارے رب' ذرا ہمیں دکھا دے ان جنوں اور انسانوں کو جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا' ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں"۔

یہ بہت سخت غصہ ہے۔ یہ لوگ اب انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں اور ان کے دلوں میں یہ خواہش ہے کہ۔

نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا (۴۱ : ۲۹) "ہم انہیں پاؤں تلے روند ڈالیں"۔

لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ (۴۱ : ۲۹) "تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں"۔ لیکن پہلے تو تم دوست تھے' گہرے یار تھے' ان کے وسوسوں اور ان کی تزئین پر تم یقین کرتے تھے۔

--- ○○○---

یہ تو انجام تھا وسوسوں کا اور عوام کو گمراہ کرنے کا۔ لیکن لوگوں کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرنے والوں کا بھی ایک انجام اور اجر ہے۔ یہ مومن ہیں' جنہوں نے اخلاص کے ساتھ کہہ دیا کہ بس اللہ ہمارا رب ہے' پھر اپنی راہ پر استقامت اختیار کی یعنی ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔ ایسے لوگوں پر اللہ پھر برے ساتھی مسلط نہیں کرتا۔ ان کے ساتھ ملائکہ ہوتے ہیں جو ہر وقت ان کے دلوں پر امن و اطمینان وحی کرتے رہتے ہیں اور ان کو جنت کی خوشخبری دیتے رہتے ہیں اور یہ فرشتے ان کے ساتھ دنیا اور آخرت دونوں میں محبت کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿۳۲﴾

۴ ع ۷ ۱۸

"جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے' اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے' یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ ڈرو' نہ غم کرو' اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے وہ تمہاری ہو گی' یہ ہے سامان ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے"۔

یعنی اللہ کو اپنا رب کہہ کر' استقامت کے یہ معنی ہیں کہ اس اقرار کے تقاضے پورے کیے جائیں جس طرح ان کا حق ہے۔ ضمیر میں شعوری طور پر یہ عقیدہ بیٹھا ہوا ہو' زندگی اور عمل میں اس پر گامزن ہو' اس راہ میں اگر تکالیف آئیں تو ان کو برداشت کرے۔ اس معنے میں یہ دراصل بہت بڑا حکم ہے اور بھاری ذمہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے ہاں پھر اس کا بہت بڑا اجر ہے کہ ملائکہ ان پر نازل ہوں گے اور ان کے ہمدم ہوں گے۔ ان کے دوست ہوں گے اور وہ جو باتیں کریں گے اللہ نے ان فرشتوں کی زبانی ان کو نقل کیا ہے۔

اَلَّا تَخَافُوْا (۴۱ : ۳۰) "نہ ڈرو" وَلَا تَحْزَنُوْا (۴۱ : ۳۰) "نہ غم کرو"۔ اور اس جنت کے لیے خوش ہو جاؤ۔ بشارت ہے تم کو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ اس کے بعد یہ فرشتے پھر ان کے سامنے اس جنت کی تصویر کھینچتے ہیں جو انہیں ملنے والی ہے کہ "وہاں جو

کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے ، تمہاری ہوگی"--- پھر وہ مزید حسن و جمال اور عزت و استقبال کا ذکر کرتے ہیں :"یہ ہے سامان ضیافت اس ہستی کی طرف سے جو غفور و رحیم ہے"۔ یعنی یہ اللہ نے تمہاری ضیافت اور مہمانی کے لیے تیار کیا ہے۔ اب ان نعمتوں کے بعد اور کیا رہ جاتا ہے۔

--- ○○○---

اس سبق کا خاتمہ ایک داعی کے خدوخال اور حوصلہ افزائی پر ہوتا ہے۔ اس کی روح' اس کے الفاظ' اس کے آداب اور اس کی میٹھی میٹھی باتوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ ان باتوں کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے تمام داعیوں کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ سورت کا آغاز اس مضمون سے ہوا تھا کہ پیغمبروں اور داعیوں کے ساتھ عوام الناس کا رویہ کس قدر ظالمانہ ہوتا ہے۔ اور وہ کس قدر گستاخی اور تکبر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس لیے یہاں داعی کو بتایا جاتا ہے کہ آپ لوگوں کا منہاج دعوت یہ ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿۳۵﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۶﴾

"اور اس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اور اے نبی' نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی' وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا' مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو' وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔

دعوت اسلامی کا کام ایک بہت بڑا اور کٹھن کام ہے' داعی کو مخاطب کی پیچیدہ نفسیات کا' اس کی جہالت کا' اس کی عزت نفس' اس کے استکبار کا' اس کی خواہشات کا' اس کے مفادات کا اور اس کے مرتبہ و مقام کا سامنا ہوتا ہے۔ صرف اللہ وحدہ کی حاکمیت کی طرف دعوت دینا' ان میں سے بیشتر چیزوں کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ پھر یہ دعوت دینا اور ایک طبقاتی معاشرے میں دینا کہ سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ برابر ہیں' ایسے حالات میں دعوت کی ذمہ داری اٹھانا حقیقت ہے کہ ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ لیکن مشکل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ایک عظیم کام بھی تو ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

۳۳) ”اور اس شخص کی بات سے اور اچھی بات کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا میں مسلمان ہوں“۔ جو لوگ دعوت اسلامی کا کام لے کر اٹھتے ہیں ان کی دعوت اس عالم میں سب سے برگزیدہ دعوت ہے ' ان کے کلمے آسمانوں کی طرف پاکیزہ کلمات کی صورت میں بلند ہوتے ہیں ' لیکن داعی کی دعوت کے ساتھ اس کا عمل بھی ایسا ہی ہونا چاہئے ۔ وہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہو ۔ اس کی ذات اس دعوت میں گم ہو جائے اور اس کے سب کام دعوت ہو جائیں اور اس کی تمام سرگرمیوں میں اس کا اپنا کچھ نہ ہو ۔

اس کے بعد پھر داعی کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی ہے کہ اس کی دعوت کا ردعمل کیا ہوتا ہے ۔ کوئی انکار کرتا ہے ' کوئی گستاخی کرتا ہے ' کوئی تکبر کرتا ہے ' بہرحال داعی ایک اچھا انداز لے کر ہی چلتا ہے ۔ وہ تو بلند مقام پر ہوتا ہے ۔ اس کا مخالف برائی لے کر آتا ہے ۔ اس کا مخالف تو نہایت ہی گرے ہوئے مقام پر ہوتا ہے ۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ (۴۱ : ۳۴) ”اے نبی ' نیکی اور بدی یکساں نہیں“۔ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ برائی کا جواب برائی سے دے ۔ نیکی اور بدی کا اثر یکساں نہیں ہوتا ۔ نہ دونوں کی قدر و قیمت یکساں ہے ۔ داعی کو چاہئے کہ شر کا مقابلہ شر سے کرنے کی دلی رغبت کو ترک کر دے اور برائی کو صبر ' معافی اور سنجیدگی کے ساتھ رد کرے ۔ کرخت نفوس کو اعتماد اور نرمی پر آمادہ کرے ۔ چنانچہ دشمن دوستی سے بدل جائے اور سختی نرمی میں بدل جائے ۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ

(۴۱ : ۳۴) ”تم بدی کو نیکی سے دفع کرو ' جو بہترین ہو ' تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے“۔ اسلام کا یہ اصول بسا اوقات نہایت ہی اچھے نتائج دیتا ہے ۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ سخت دشمنی دوستی میں بدل جاتی ہے اور غضب اور کینہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے ۔ تکبر ' شرم و حیاء میں بدل جاتا ہے ' بشرطیکہ کوئی اچھی بات کرنا جانتا ہو ' اور سنجیدگی سے بات کر سکتا ہو ' اور ایک نہایت ہی ہیجانی کیفیت کے سامنے مسکراہٹ سے بات کر سکتا ہو ۔ ایک ایسے شخص کے سامنے نہایت ہی ٹھنڈے مزاج کا مظاہرہ کر سکتا ہو ' جو آپے سے باہر ہو گیا ہو ۔

اگر کسی ایسے شخص کا مقابلہ ایسے ہی انداز میں کیا گیا جس طرح اس کا ہے تو پھر کیا ہو گا ۔ وہ مزید آپے سے باہر ہو گا ' تکبر کرے گا اور سرکشی پر آمادہ ہو گا ' حیا و شرم کا جامہ اتار پھینکے گا اور آپے سے باہر ہو کر آمادۂ جنگ ہو گا ۔

لیکن اس میں ایک شرط ہے ' وہ یہ کہ اس طرح کی شرافت کا مظاہرہ کرنے والا ایک بڑے دل اور بڑے مقام کا مالک ہو ' وہ اس پوزیشن میں ہو کہ اگر اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہے تو دے سکے ۔ برائی کا جواب دینے کی اگر قدرت ہو تو پھر شرافت کا اثر ہو گا ۔ ورنہ ”گدا اگر تواضع کند خوئے اوست“۔ یہ نہ ہو کہ اچھا رویہ اختیار کرنے کو کمزوری سمجھا جائے ۔ اگر مخالف نے یہ سمجھ لیا کہ یہ کمزور ہے تو پھر وہ ہرگز احترام نہ کرے گا اور پھر اچھائی کا کوئی اثر نہ ہو گا ۔

پھر یہ بات بھی نوٹ کر لینا چاہئے کہ اس شرافت کا مظاہرہ شخصی دست درازی کے مواقع پر ہونا چاہئے ۔ اگر کوئی اسلام اور اللہ کے اصولوں پر دست درازی کرتا ہے ' یا کوئی اہل ایمان پر مظالم ڈھاتا ہے ۔ لوگوں کو دین سے روکتا ہے ' تو اس صورت میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے مقابلہ ضروری ہے یا پھر اگر مقابلے کی صورت نہ ہو تو صبر کیا جا سکتا ہے ۔ یہ نہ

ہو کہ ایک تو اسلام کی تبلیغ کر رہا ہو اور دوسرا برائی کا بدلہ نیکی سے دے رہا ہو۔

یہ مقام 'کہ برائی کو نیکی کے ساتھ دفع کرنا' اور غیظ و غضب کے مقام پر رواداری اور برداشت کرنا اور یہ فیصلہ کر سکنا کہ کہاں رواداری اور برداشت کرنا ہے اور کہاں برائی کو نیکی کے ساتھ دفع کرنا ہے۔ یہ ایک عظیم مرتبہ ہے۔ یہ مرتبہ و مقام ہر انسان کو نہیں مل سکتا۔ اس مقام پر وہی شخص فائز ہو سکتا ہے جسے صبر کی بڑی مقدار دی گئی ہو۔ یہ وہ مقام ہے جس پر اللہ کے خاص بندے اور صبر کرنے والے ہی فائز ہو سکتے ہیں۔

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ مَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (۴۱: ۳۵) "اور یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہوتے ہیں"۔ یہ اس حد تک بلند درجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو ذاتی معاملات میں بھی کبھی غصے میں نہیں آتے تھے اور اگر غصے میں آتے تھے تو ان کے مقابلے میں کوئی کھڑا نہیں ہو سکتا تھا' آپ کو اور آپ کے ذریعہ ہر داعی کو یہ کہا جاتا ہے :

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۴۱: ۳۶)

"اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو' وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے"۔ غصے میں بھی اکساہٹ ہوتی ہے انتقام کی' برائی کی وجہ سے بعض اوقات انسان صبر کی کمی محسوس کرتا ہے یا شرافت میں تنگ دلی محسوس کرتا ہے۔ ایسے حالات میں اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھنا چاہئے۔ اس سے وہ سوراخ بند ہو جائے گا جو شیطان کرنا چاہتا تھا۔

اللہ انسانی دل کا خالق ہے' وہ اس کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ اس کی طاقت اور حد برداشت کو بھی جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ شیطان کس سوراخ سے حملہ آور ہوتا ہے۔ یہ داعی کے قلب کو گھیرتا ہے اور اکساتا ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جو بچانے والا ہے۔ کیونکہ یہ راستہ کٹھن ہے۔ یہ راہ بڑی دشوار گزار ہے' نفس انسانی کے نشیب و فراز میں اور نفس انسانی کی پیچیدہ وادیوں میں داعی کو سفر کرنا ہوتا ہے تاکہ داعی گہرے نفسیاتی میلانات میں ہدایت اور قیادت کا حق ادا کر سکے۔

--- ооо---

درس نمبر ۲۲۸ ایک نظر میں

اس سبق کا تعلق بھی اسلامی دعوت کے ساتھ ہے - یہ کائناتی نشانیوں سے شروع ہوتا ہے - اور گردش لیل و نہار کو ہمارے غور کے لیے پیش کرتا ہے اور شمس و قمر کو اس لیے پیش کرتا ہے کہ مشرکین میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو شمس و قمر کے پجاری تھے - حالانکہ یہ دونوں خدا کی مخلوقات میں سے ہیں - ان آیات کے باوجود یہ لوگ اللہ کی آیات سے انکار کرتے ہیں اور اس کی بندگی نہیں کرتے لیکن اللہ کے ہاں ایسی مخلوق ہے جو ہر وقت اس کی بندگی میں لگی ہوئی ہے - پھر یہ پوری زمین بھی اللہ کی بندگی میں لگی ہوئی ہے' یہ مردہ ہو جاتی اور پھر اللہ سے فیض حیات لیتی ہے جیسا کہ انسان کو بھی زندگی اللہ نے دی ہے' لیکن انسان ہے کہ نافرمانی کرتا ہے - اللہ کی آیات کو الٹے معنی پہناتا ہے - قرآن کی آیات کے معنی بگاڑتا ہے' حالانکہ قرآن مجید صاف عربی میں ہے - اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر سامنے آتا ہے - پھر خود س کی زندگی کو پیش کر کے یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان ایک ضعیف مخلوق ہے - مال کا لالچی ہے اور جب کوئی مشکل پڑتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے - اور سورت کے آخر میں انفس و آفاق کے دلائل و نشانات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں پر حق واضح ہو جائے اور ان کے دلوں کے شبہات دور ہو جائیں -

--- ○○○---

درس نمبر ۲۲۸ تشریح آیات

۳۷ --- تا --- ۵۴

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۭ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝۳۷

"اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اگر فی الواقع تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو"۔

یہ نشانیاں جن کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے' آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہیں' عالم بھی انہیں دیکھ سکتا ہے اور جاہل بھی' انسانی دل پر ان کے براہ راست گہرے اثرات بھی ہیں۔ اگرچہ انسان ان کی سائنسی حقیقت بالکل نہ جانتا ہو' کیونکہ انسان اور اس کائنات کے درمیان' سائنسی علم سے بھی زیادہ گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ دونوں کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ فطرت دونوں کی ایک ہے' ساخت ایک ہے' انسان اس کائنات کا حصہ ہے اور یہ کائنات انسان ہی کا حصہ ہے۔ دونوں کا مادۂ وجود ایک ہے' فطرت ایک ہے اور جس قانون قدرت کے مطابق انسان چلتا ہے' اس کے مطابق یہ کائنات بھی چلتی ہے۔ دونوں کا الٰہ ایک ہے۔ اس لیے انسان اس زمین و آسمان کے بارے میں ایک گہرا احساس اور گہرا فطری ادراک رکھتا ہے۔ اور یہ ادراک اسے گہری فطری منطق کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم صرف اس پر اکتفاء کرتا ہے کہ انسان کو اس کی طرف متوجہ کر دے اور اسے غفلت سے جگا دے اور یہ غفلت انسانوں پر اس لیے طاری ہو جاتی ہے کہ انہوں نے گردش لیل و نہار اور شمس و قمر کو دیکھتے دیکھتے اب ان کی کوئی اہمیت ان کے ہاں نہیں رہی ہے۔ ان کے دل و دماغ پر پردے آگئے ہیں' اس لیے قرآن انسان کو جگاتا ہے' ان کی سوچ کو صیقل کرتا ہے کہ ذرا ان معجزات پر غور کرو' یہ تمہاری دوست کائنات کا حصہ ہیں' تم لیل و نہار اور شمس و قمر کے ساتھ رہتے ہو۔

شمس و قمر کے حوالے سے ایک گمراہی اور فکری انحراف کی طرف بھی متوجہ کر دیا۔ بعض لوگ شمس و قمر کی پوجا کرتے

تھے تاکہ اس طرح وہ اللہ کا تقرب حاصل کر لیں 'کیونکہ اللہ کی بہترین مخلوق کے سامنے سجدہ کرنا اللہ کے سامنے سجدہ کرنا ہے ـ قرآن نے یہاں حتمی طور پر اس انحراف کی تصیح بھی کر دی اور عقائد کی آلودگی کو صاف بھی کر دیا ـ اگر تم فی الحقیقت اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو تو پھر شمس و قمر کی عبادت نہ کرو '

وَ اسْجُدُوْا اللّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ (۴۱ : ۳۷) "بلکہ اس خدا کی بندگی کرو 'جس نے ان کو پیدا کیا ہے" ـ مخلوق کو صرف خالق کی طرف متوجہ ہونا چاہئے 'اور شمس و قمر بھی تمہاری طرح اللہ ہی کے پیروکار ہیں ـ اللہ نے ان دو شمس و قمر کو پیدا کیا ہے اور ان دو کے لیے یہاں جمع مونث کی ضمیر استعمال کی ہے ـ کیونکہ یہاں جنس ستاروں اور سیاروں کی طرف اشارہ ہے ـ صرف یہ دو مراد نہیں اور پھر جمع مونث عاقل کی خبر ان کی طرف اس لیے راجع کی گئی ہے کہ یہ بھی تمہاری طرح اشخاص ہیں اور اللہ کی عبادت کرتے ہیں ـ

ان آیات و نشانات اور اس تبلیغ و بیان کے بعد بھی اگر وہ تکبر کرتے ہیں 'تو اس سے اللہ کی بادشاہت میں کوئی کمی بیشی اور کوئی تقدیم و تاخیر واقع نہیں ہوتی 'اللہ کے ہاں بے شمار مخلوقات اس کی عبادت میں لگی ہوئی ہیں ـ

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ هُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ ۩ ﴿۳۸﴾

"لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آکر اپنی ہی بات پر اڑے رہیں تو پروا نہیں 'جو فرشتے تیرے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں 'اور کبھی نہیں تھکتے" ـ

اس کا قریب الفہم مفہوم تو یہی ہے کہ اللہ کے پاس کی مخلوق سے مراد ملائکہ ہیں ـ لیکن اللہ کے مقرب بندوں پر مشتمل کوئی اور مخلوق بھی اس سے مراد ہو سکتی ہے ـ اللہ کی مخلوقات کے بارے میں تو ہم بہت کم جانتے ہیں ـ

وہ لوگ جو رب کے ہاں ہیں وہ ارفع و اعلیٰ مخلوق ہیں 'وہ زیادہ مکرم اور مثالی لوگ ہیں ـ یہ اللہ کے مقابلے میں اس طرح کبر نہیں کرتے جس طرح زمین کی یہ کمزور مخلوق انسان کرتا ہے 'نہ وہ اس طرے میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہم اللہ کے مقربین ہیں اور نہ وہ رات اور دن کے کسی بھی وقت اللہ کی تسبیح کرنے سے رکتے یا تھکتے ہیں ـ

وَ هُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ (۴۱ : ۳۸) "کبھی نہیں تھکتے" ـ لہٰذا اگر اہل زمین سب کے سب ہی اللہ کی بندگی چھوڑ دیں تو اللہ کی پرستش میں کوئی فرق نہیں پڑتا ـ

ذرا اس زمین کو تو دیکھیں جس میں وہ رہتے ہیں 'جس سے وہ پیدا ہوتے ہیں ـ اور جس کی طرف لوٹا کر دفنائے جائیں گے ـ یہ زمین جس کے اوپر یہ چیونٹیوں جیسے پھرتے ہیں ان کے کھانے پینے کا کوئی سامان بھی اس زمین کے سوا کہیں نہیں ہے ـ یہ زمین بھی نہایت خشوع میں اللہ کے سامنے سہمی ہوتی ہے ـ مردہ ہو جاتی ہے تو اللہ ہی اسے زندہ اور سرسبز و شاداب کر دیتا ہے ـ

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا

الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِیْٓ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۳۹﴾

"اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو زمین سونی پڑی ہوئی ہے' پھر جونہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا' یکایک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھاتا ہے وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

ہر مقام پر قرآن کا انداز تعبیر قابل ملاحظہ ہے۔ زمین کا "خشوع" کی حالت میں ہونا سے مراد یہ ہے کہ بارش سے پہلے وہ سوئی ہوئی اور مردہ حالت میں تھی۔ جب بارش برسی تو وہ پھبک اٹھی' سرسبز و شاداب ہوگئی گویا اس نے شکر ادا کیا اور سجدے میں گر گئی کہ اسے زندگی مل گئی۔ جس سیاق میں یہ مثال آرہی ہے وہاں عبادت خشوع و خضوع اور حمد و ثنا اور تسبیح کا مضمون چل رہا ہے۔ چنانچہ زمین کی بھی یہی کیفیت دکھائی گئی گویا وہ بھی زندہ ہے اور اللہ کے حوالے سے وہ بھی شعور رکھتی ہے۔ مناسب ہے کہ میں اپنی ہی کتاب التصویر الفنی فی القرآن سے ایک صفحہ یہاں نقل کر دوں:

"قرآن نے بارش ہونے سے قبل زمین کی حالت کو بعض جگہ خاشعہ (سوئی ہوئی' مردہ' اور سہمی ہوئی) اور بعض جگہ ھامدہ (سوکھی' بجھی ہوئی' مردہ) کہا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض طرز تعبیر کا تنوع ہے' لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دونوں لفظ کس سیاق میں کس طرح استعمال ہوئے ہیں' یہ الفاظ قرآن نے دو مختلف سیاق و سباق میں استعمال کیے ہیں:

لفظ ھامدۃ سورۂ حج میں آیا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْـًٔا ؕ وَتَرَی الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ (۲۲:۵) "لوگو' اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے' پھر نطفے سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر گوشت کی بوٹی سے' جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں' پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کو پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے' پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر

قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی"۔

اور لفظ خاشعہ اس سیاق و سباق میں آیا ہے:

وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَ النَّهَارُ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَ اسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۴۱:۳۷) فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ هُمْ لَا یَسْـَٔمُوْنَ (۴۱:۳۸) وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ اِنَّ الَّذِیْۤ اَحْیَاهَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۴۱:۳۹) "اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں یہ رات اور دن اور سورج اور چاند۔ سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے' اگر فی الواقعہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو' لیکن اگر یہ لوگ غرور میں آکر اپنی ہی بات پر اڑے رہیں تو پروا نہیں' جو فرشتے ترے رب کے مقرب ہیں وہ شب و روز اس کی تسبیح کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ دیکھتے ہو زمین سونی پڑی ہوئی ہے! پھر جونہی کہ ہم نے اس پر پانی برسایا' یکایک وہ پھبک اٹھتی ہے اور پھول جاتی ہے"۔

ان دونوں سیاق و سباق پر ایک سرسری نظر ڈالنے ہی سے ھامدہ اور خاشعہ کا ربط ظاہر ہو جاتا ہے۔ پہلے سیاق و سباق میں فضا اٹھانے' زندہ کرنے اور نکالنے کی ہے۔ تو اس کے ساتھ زمین کی حالت مردہ (ھامدہ) زیادہ مناسب ہے۔ مردنی کے بعد وہ حرکت میں آتی ہے' پھولتی ہے' اور ہر قسم کے خوش منظر نباتات کے جوڑے پیدا کرتی ہے (میں کہوں گا کہ لفظ زوج بھی یہاں نہایت معنی خیز ہے) دوسرے سیاق و سباق میں مضمون عبادت' خضوع و خشوع کا ہے' لہٰذا اس کے ساتھ زمین کی تصویر خاشعہ اور سہمی ہوئی زیادہ مناسب ہے۔ اور جب بارش ہوتی ہے تو وہ پھول اٹھتی ہے۔

یہاں اس دوسرے سیاق میں زمین کے پھبک اٹھنے اور پھول جانے کے بعد نباتات کے اگنے کا ذکر نہیں جبکہ پہلے سیاق میں ذکر ہے' کیونکہ یہاں عبادت کا موضوع ہے اور عبادت کے ساتھ نباتات کے اگنے کی کوئی مناسبت نہیں ہے کیونکہ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ (۴۱:۳۹) کے لفظ کے بھی دونوں جگہ دو الگ مقاصد ہیں' یہاں دوسرے سیاق میں مطلب یہ ہے کہ زمین حرکت میں آئی جس طرح اس منظر میں تمام متحرک چیزیں عبادت کے لیے حرکت میں آتی ہیں۔ لہٰذا زمین کو بھی خشوع اور مردنی کی حالت میں نہ چھوڑا جائے۔ اس لیے یہاں وہ حرکت میں آئی کہ وہ دوسرے عبادت گزاروں کے ساتھ عبادت میں شریک ہو' اور منظر کے تمام اجزاء اس میں شریک ہو جائیں۔ یوں انداز بیان کی نہایت ہی باریک جزئیات کے تناسق کو بھی پیش نظر رکھتا ہے جبکہ پہلے سیاق میں اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ (۴۱:۳۹) پیدائشی عمل کی حرکت کے لیے ہے"۔

اب ہم پھر سیاق کلام کی طرف آتے ہیں' اس زمین کے احیاء کے استدلال سے یہ نتیجہ کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت

کے دن مردوں کو نکال لائے گا۔

اِنَّ الَّذِیْٓ اَحْیَاھَا لَمُحْیِ الْمَوْتٰی اِنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۴۱ : ۳۹) "یقیناً جو خدا اس مری ہوئی زمین کو جلا اٹھاتا ہے وہ مردوں کو بھی زندگی بخشنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ اس قسم کے مناظر سے قرآن میں بار بار یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ اسی طرح مردوں کو اٹھا لے گا اور اس سے اللہ کی بے پناہ قدرت پر بھی استدلال قرآن کریم میں بارہا کیا جاتا ہے۔ زمین کے اندر نباتاتی اور دوسری زندگیوں کے مناظر کو انسان بڑے قریب سے مشاہدہ کرتا ہے۔ عقل سے بھی پہلے یہ بوقلمونیاں دل کو متاثر کرتی ہیں۔ جب موت سے زندگی نمودار ہوتی ہے تو انسان اس قدرت کے کرشمے کو بڑی حیرت سے دیکھتا ہے اور انسان کے شعور میں اس کے اثرات بیٹھتے ہیں اور قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ عقل کی بجائے فطری شعور سے مخاطب ہوتا ہے۔

---ooo---

اب اس قدر تفصیلات کے بعد اور کائناتی شواہد و دلائل کے بعد اگر لوگ ان نشانیوں کو الٹے معنی پہناتا ہے یا قرآن کی آیات میں الحاد کرتے ہیں تو وہ تیار ہو جائیں اپنے انجام کے لیے۔ یہ لوگ اللہ کی واضح آیات کا انکار کرتے ہیں اور ان میں مغالطے ڈالتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ؕ اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْٓ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۴۰﴾

"جو لوگ ہماری آیات کو الٹے معنی پہناتے ہیں وہ ہم سے کچھ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہو گا؟ کرتے رہو جو کچھ تم چاہو' تمہاری ساری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے"۔

یہ تہدید اگرچہ بالواسطہ اور مجمل ہے لیکن نہایت ہی خطرناک ہے۔

لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا (۴۱ : ۴۰) "وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں"۔ اللہ کے علم میں وہ بالکل سامنے ہیں۔ لہٰذا وہ جو الحاد کرتے ہیں' قرآن کے معنوں کو الٹے معنی پہناتے ہیں۔ اس پر ان کو سزا ہو گی۔ اگرچہ وہ مغالطے اور تاویلات کریں۔ اگرچہ وہ سمجھیں کہ ہم اللہ کے ہاتھوں چھوٹ جائیں گے۔ جس طرح وہ قرآن کے معانی میں مغالطہ ڈال کر اپنے آپ کو ذمہ داریوں سے آزاد کرتے ہیں۔ یا لوگوں کے سامنے بہانہ بنا لیتے ہیں۔

اس اجمالی ڈراوے کے بعد قدرے تصریح

أَفَمَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ خَيْرٌ أَمْ مَنْ يَأْتِي آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۴۱ : ۴۰) "خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کی حالت میں حاضر ہو گا"۔ یہ دھمکی کی تصریح ہے کہ آگ میں پھینکا جانا اور جزع فزع تمہارے انتظار میں ہے جبکہ مومن نہایت امن و اطمینان کے ساتھ آئیں گے۔

اس آیت میں ایک دوسری دھمکی بھی ہے۔

اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (۴۱ : ۴۰) "کرتے رہو جو تم چاہو، تمہاری ساری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے"۔ کس قدر بدبخت ہے وہ شخص جسے ہر کچھ کرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ وہ جس طرح چاہے اللہ کی آیات میں مغالطے ڈالے اور اللہ اس کے تمام کرتوتوں کو نوٹ کر رہا ہو۔

---○○○---

اب سیاق کلام انہی لوگوں کے بارے میں آگے بڑھتا ہے جو قرآن مجید کا انکار کرتے ہیں، جبکہ وہ ایک طاقتور اور غالب ہونے والی کتاب ہے، نہایت ہی محفوظ ہے۔ اس کے قریب بھی باطل نہیں پھٹک سکتا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ﴿۴۱﴾ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿۴۲﴾ مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ ۗ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ ۖ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۚ أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۴۴﴾

۵ ۱۲ ع ۱۹

"وہ لوگ جن کے سامنے کلام نصیحت آیا تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس پر آسکتا ہے نہ پیچھے سے، یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے۔ اے نبی"، تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو۔ بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے، اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔ اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے :"کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟ کیا ہی عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی"۔ ان سے کہو، یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان

کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو"۔

آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ذکر ربی کا انکار کرتے ہیں جبکہ وہ ان کے پاس آگیا ہے۔ لیکن یہ لوگ کون ہیں اور ان کا انجام کیا ہو گا' اس کا ذکر نہیں ہے۔ مبتداء ہے اور خبر نہیں ہے۔ گویا ان کا فعل اس قدر گھناؤنا ہے کہ اس پر منطبق کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ بہت ہی بری حرکت یہ کر رہے ہیں--- ان لوگوں کے بارے میں کوئی خبر دینے کی بجائے یہ تفصیلات دے دی جاتی ہیں کہ وہ ذکر و نصیحت کیسی ہے جس کا وہ انکار کر رہے ہیں تا کہ ان کے اس فعل کی کراہت اور زیادہ سمجھی جائے۔

اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ (۴۱ : ۴۱) لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (۴۱ : ۴۲) "مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زبردست کتاب ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس پر آ سکتا ہے نہ پیچھے سے' یہ ایک حکیم و حمید کی نازل کردہ چیز ہے"۔ باطل اس کتاب میں کس طرح داخل ہو سکتا ہے۔ یہ تو اللہ برحق کی طرف سے نازل شدہ ہے جو حق بیان کرتا ہے' اور یہ کتاب اس سچائی سے مربوط ہے جس کے اوپر آسمان و زمین [illegible]م ہیں۔ یہ کتاب 'کتاب عزیز ہے اور یہ محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے لی ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵ : ۹) "بے شک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی [illegible] کرنے والے ہیں"۔

جو شخص بھی قرآن پر تدبر کرتا ہے وہ اس سچائی کو پا لیتا ہے جس کو لے کر یہ نازل ہوئی ہے۔ اور جو نازل ہی اس لیے ہوئی ہے کہ اسے پڑھا جائے اور جو شخص بھی اسے پڑھے گا وہ یہ سچائی ایک طرف اپنی روح میں پائے گا اور دوسری طرف اس کے نصوص میں پائے گا۔ بڑی سادگی اور آسانی کے ساتھ قرآن سے ہر شخص سچائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سچائی نہایت فطری' اطمینان بخش اور انسانی فطرت کے اندر موجود ہے۔ ہر قاری پر اس کتاب کا نہایت ہی گہرا اور عجیب اثر ہوتا ہے۔

اور پھر یہ کتاب۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (۴۱ : ۴۲) "یہ حمید و حکیم کی نازل کردہ ہے"۔ اس کی تعبیر ہی میں حکمت پنہاں ہے۔ اس کے طریق نزول اور اس کی ہدایات سے حکمت عیاں ہے۔ لہٰذا جس رب تعالیٰ نے اسے نازل کیا ہے' وہ حمد کثیر کا مستحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار حمد و ثنا کے لیے ابھارا گیا ہے۔

اب قرآن کو کتب سابقہ کے ساتھ مربوط کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ اور تمام انبیائے سابقہ کے درمیان ایسا تعلق قائم کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ہی محفل ہے' ایک ہی خاندان ہے' ان کی بات بھی ایک ہے' ان کی روح اور قلب بھی ایک ہیں۔ طریقہ دعوت بھی ایک ہے۔ یوں ہر ایک مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے درخت کا پتہ ہے جس کے اندر بے شمار پتے ہیں اور جس کی جڑیں گہری ہیں اور یہ کہ وہ ایک ایسی محفل کا ممبر ہے جو آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے :

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَّ ذُو عِقَابٍ

أَلِيمٍ (۴۱ : ۴۳) "اے نبیؐ، تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے ' اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو - بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے ' اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے"۔ ایک ہی وحی ' ایک ہی رسالت ' ایک ہی عقیدہ اور پوری تاریخ میں انسانوں کا اس کے مقابلے میں ایک ہی ردعمل رہا ہے - سب لوگوں نے تکذیب کی ' سب نے ایک جیسا اعتراض کیا - لہٰذا تمام انبیاء کے درمیان ایک ہی پختہ رشتہ ہے ' ایک ہی شجرۂ نسب ہے ' ایک ہی خاندان ہے ' دکھ اور درد بھی ایک ہے - تجربات بھی ایک ہی طرح کے ہیں اور مقاصد بھی ایک ہی جیسے اور راستہ بھی ایک اور طریقہ کار بھی ایک -

انس و محبت کا کیا گہرا شعور ہے یہ! قوت ' صبر اور گہری پختگی کا شعور - داعی کو یہ اشارہ دیا جا رہا ہے کہ آپ ایک ایسے راستے پر رواں ہیں جس پر آپ سے قبل نوح ' ابراہیم ' موسیٰ ' عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رواں دواں رہے ہیں --- کس قدر اعزاز اور بلندی کا شعور دیا جا رہا ہے کہ اس راہ کے مصائب ' اس کی ٹھوکریں ' اس کے کانٹے اور مشکلات کو برداشت کرو کہ یہ راہ تو بہت بڑے لوگوں کی ہے - یہ تو انبیاء و صالحین کی راہ ہے اور اس شعور کے ساتھ داعی کی قوت برداشت میں اضافہ ہوتا ہے -

اور یہ حقیقت ہے -

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ (۴۱ : ۴۳) "تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے ' جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو"۔ کہنے کو تو یہ ایک معمولی بات ہے لیکن اس حقیقت کو مومنین کے دل و دماغ میں بٹھانے کے کس قدر عظیم اثرات ہیں - اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا - یہ کام قرآن ہی کر سکتا ہے - وہ اس عظیم حقیقت کے بیج دلوں میں کاشت کرتا ہے اور رسولوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے یہ بھی کہا گیا :

إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَّ ذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ (۴۱ : ۴۳) "بے شک تمہارا رب بڑا درگزر کرنے والا ہے اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی"۔ مغفرت کے ساتھ سزا بھی ہے تاکہ توازن قائم ہو جائے - انسان اگر کسی مغفرت کا امیدوار بھی ہو گا اور اس کے عقاب الیم سے ڈرنے والا بھی - نہ مایوس ہو اور نہ بے باک ہو حقیقت یہ ہے کہ توازن اسلامی تعلیمات کا بنیادی اصول ہے -

اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ اللہ کی یہ مہربانی ہے کہ اس نے عربی مبین میں ' تمہاری زبان میں قرآن اتارا لیکن تمہاری ہٹ دھرمی ' تمہارے مغالطے ' تمہارے مجادلے اور پھر اس کتاب میں تحریفات قابل تعجب ہیں -

وَلَوْ جَعَلْنَٰهُ قُرْءَانًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا۟ لَوْلَا فُصِّلَتْ ءَايَٰتُهُۥٓ ءَا۬عْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ (۴۱ : ۴۴) "اگر ہم اس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے 'کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی

گئیں۔ کیا ہی عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی''۔ یہ لوگ ایک عربی قرآن کی طرف کان نہیں لگاتے 'کیونکہ یہ اس کی بے پناہ تاثیر سے ڈرتے ہیں۔ یہ عربی کلام ہے۔ اور عربوں کی فطرت سے مخاطب ہوتا ہے' ان کی اپنی زبان میں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں خلل ڈالو۔ جب پڑھا جائے تو شور کرو' اسی طرح تم غالب ہوگے۔ تو اگر یہ عجمی ہوتا تو پھر بھی یہ اس پر اعتراض کرتے کہ کیوں نہ قرآن عربی میں نازل ہوا' کیوں نہ مفصل اور فصیح زبان میں آیا اور اگر اس کا بعض حصہ عربی ہوتا اور بعض عجمی ہوتا تو پھر کہتے کہ عربی و عجمی' غرض ان کا مقصد ہر صورت میں اعتراض کرنا ہے۔

اور اس بحث و جدال سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جھگڑا صرف الفاظ اور زبان کے بارے میں ہے۔ اور قرآن کی تعلیمات کے بارے میں نہیں ہے۔ تعلیمات کے لحاظ سے یہ مومنین کے لیے ہدایت اور شفا ہے۔ مومنین کے دل ہی اس کی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ اس سے رہنمائی اور شفا پاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان ہی نہیں لاتے ان کے دل اندھے ہیں' ان تک قرآن کی روشنی ہی نہیں پہنچتی۔ ان کے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے۔ وہ دلوں کے اندھے ہیں' لہٰذا ان کو اس کتاب میں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔ کیوں؟ یہ لوگ اس کتاب کے مزاج ہی سے بہت دور ہیں' اس کی آواز ہی کو نہیں سمجھتے۔

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ (۴۱ : ۴۴) ''ان سے کہو' یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے' مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ ان کا حال تو ایسا ہے جیسے ان کو دور سے پکارا جا رہا ہو''۔ اس آیت کا اطلاق جن لوگوں پر ہوتا ہے وہ ہر زمان و مکان اور ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ یہ قرآن ان کے نفوس میں اثر کرتا ہے اور ان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ وہ اپنی ذات اور اپنے ماحول میں عظیم لوگ بن جاتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے دل و دماغ پر یہ قرآن بہت بھاری لگتا ہے۔ اور اگر ان کو سنایا جائے تو یہ ان کو اور اندھا اور بہرا کر دیتا ہے۔ قرآن تو وہی ہے' دلوں کا فرق ہے۔

--- ooo---

قرآن کے حوالے سے حضرت موسیٰ اور ان کی کتاب اور اس کے بارے میں ان کی قوم کے اختلافات کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے۔ یہاں بطور نمونہ حضرت موسیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے تمام رسولوں کا ذکر مجموعی طور پر ہوا۔ یہاں کتاب موسیٰ کے اختلافات کو بھی مجمل چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس سے قبل کہہ دیا گیا ہے کہ ان کا فیصلہ یوم عظیم یعنی قیامت کے دن ہوگا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝

"اس سے پہلے ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کے معاملے میں بھی یہی اختلاف ہوا تھا۔ اگر تیرے رب نے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر دی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے سخت اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔

اور یہی فیصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں کیا گیا۔ قیامت میں اس کے بارے میں بھی فیصلہ ہو جائے گا' لوگ جس طرح چاہیں عمل کریں' قیامت میں جزاء و سزا ہو گی ان کے اعمال پر۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

"جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے اچھا کرے گا' جو بدی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہو گا' اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے"۔

رسالت محمدیؐ نے اعلان کر دیا کہ انسانیت اب بالغ ہو چکی ہے اور اس کے کاندھوں پر آزادی کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ اور ہر شخص کو اپنے کیے کا ذاتی طور پر ذمہ دار قرار دے دیا گیا ہے۔ اب جو شخص جو راستہ چاہے اختیار کرے۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۴۱ : ۴۶) "اور تیرا رب اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے"۔

---ooo---

آیات گزشتہ میں قیامت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اس میں اللہ کی جانب سے سب کے ساتھ انصاف کرنے کی طرف بھی اشارہ تھا کہ کوئی ظلم نہ ہو گا۔ اس لیے یہاں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ قیامت کی گھڑی کا علم صرف اللہ وحدہ کو ہے۔ اس ضمن میں اللہ کے علم کی تصویر کشی بھی کر دی جاتی ہے کہ وہ ہر معاملے میں کتنی گہرائیاں اور تفصیلات رکھتا ہے۔ بعض مثالیں بھی دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد قیامت کا ایک منظر بھی پیش کیا جاتا ہے جس میں مشرکوں سے سوال و جواب ہوتے ہیں :

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد پنجم

پارہ ۔۔۔۔ ۲۵

سورہ حم السجدہ ۔ ۴۱ ۴۷ ۔۔ تا ۔۔ ۵۴
سورہ الشوریٰ ۔ ۴۲ ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵۳
سورہ الزخرف ۔ ۴۳ ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۸۹
سورہ الدخان ۔ ۴۴ ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۵۹
سورہ الجاثیۃ ۔ ۴۵ ۱ ۔۔ تا ۔۔ ۳۷

إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَمَا تَخْرُجُ مِن ثَمَرَاتٍ مِّنْ أَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِن شَهِيدٍ ﴿٤٧﴾ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَدْعُونَ مِن قَبْلُ ۖ وَظَنُّوا مَا لَهُم مِّن مَّحِيصٍ ﴿٤٨﴾

"اس ساعت کا علم اللہ ہی کی طرف راجع ہوتا ہے' وہی ان سارے پھلوں کو جانتا ہے جو اپنے شگوفوں میں سے نکلتے ہیں' اسی کو معلوم ہے کہ کون سی مادہ حاملہ ہوئی ہے اور کس نے بچہ جنا ہے۔ پھر جس روز وہ ان لوگوں کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟ یہ کہیں گے "ہم عرض کر چکے ہیں' آج ہم میں سے کوئی اس کی گواہی دینے والا نہیں ہے"۔ اس وقت وہ سارے معبود ان سے گم ہو جائیں گے جنہیں یہ اس سے پہلے پکارتے تھے' اور یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں ہے"۔

قیام قیامت ایک ایسا غیب ہے جو مجہول اور مستقبل کے ضمیر میں گہرا پوشیدہ ہے۔ اسی طرح شگوفوں میں سے جو پھل مستقبل میں بر آمد ہوتے ہیں ان کو بھی صرف اللہ جانتا ہے۔ اسی طرح رحم میں حمل بھی غیب ہے' جو چھپا ہوا ہے۔ یہ سب اللہ کے علم میں ہیں۔ انسانی سوچ ان پھلوں کے پیچھے دوڑ رہی ہے جو پھولوں اور کلیوں سے نکلتے ہیں' ان بچوں کے پیچھے جو ماؤں کے رحم میں ہیں' ہماری سوچ اس وسیع زمین کے نشیب و فراز میں دوڑ رہی ہے اور لاتعداد پھولوں اور شگوفوں کے بارے میں سوچتی ہے۔ پھر ہر مادہ کے رحم میں موجود بچے جن کی تعداد متعین کرنا انسان کے دائرہ قدرت میں نہیں ہے' تمام انسانوں' حیوانوں کی مادیاں' چرندوں پرندوں اور حشرات کی مادیاں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کا راہوار خیال تھک کر گر پڑتا ہے۔ اللہ کے علم کے حدود کا تصور بھی ممکن نہیں کہ وہ لامحدود ہے۔

انسانوں میں سے گمراہوں کا ایک چھوٹا سا ریوڑ' ایک دن اس علم کا سامنا کرے گا اور اس علم کے دائرے سے تو کوئی چیز باہر نہ ہوگی۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ أَيْنَ شُرَكَائِي (۴۱ : ۴۷) "پھر جس روز وہ ان کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک؟" اس وقت بھی کوئی جھگڑا' مجادلہ اور مغالطہ کام نہ دے گا' نہ زبان کی تحریف و تاویل چل سکے گی تو وہ پھر کیا کہہ سکیں گے اس کے سوا:

قَالُوا آذَنَّاكَ مَا مِنَّا مِن شَهِيدٍ (۴۱ : ۴۷) "یہ کہیں گے ہم عرض کر چکے ہیں' آج ہم میں سے کوئی اس کی گواہی دینے والا نہیں ہے"۔ اے اللہ ہم نے تو تجھے اطلاع کر دی ہے کہ آج تو ہم میں سے کوئی بھی

اس بات کا گواہ نہیں ہے۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُم مِّنْ مَّحِيْصٍ (۴۱ : ۴۸) "اس وقت وہ سارے معبود ان سے گم ہو جائیں گے جنہیں یہ اس سے پہلے پکارتے تھے اور یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لیے اب کوئی جائے پناہ نہیں ہے"۔

کیونکہ اب ان کو اپنے سابقہ دعویٰ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو گا کہ اس کی تصدیق کر سکیں۔ ان کے نفوس میں یہ بات گہرے طور پر بیٹھ گئی ہو گی کہ اب تو کوئی جائے فرار نہیں ہے۔ یہ ہو گی ان کی کربناک اور مدہوش کر دینے والی حالت اس دن۔ جب ایسی حالت آتی ہے تو انسان اپنا تمام ماضی بھول جاتا ہے' پھر اسے وہی حالات یاد ہوتے ہیں جو درپیش ہوتے ہیں۔

--- ○○○---

یہ کس قدر خوفناک دن ہے لیکن انسان اس کے بارے میں بالکل محتاط نہیں ہے۔ انسان ہر قسم کی بھلائی کے لیے بہت ہی حریص ہے۔ لیکن قیامت کی بھلائی کی وہ ذرا بھی فکر نہیں کرتا۔ انسان معمولی مصیبت پر جزع فزع کرنے لگتا ہے۔ لیکن قیامت کے ہولناک جزع فزع کا اسے خیال نہیں ہے۔ یہاں انسان کے نفس کی اندرونی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ تمام لباس اور پردے اتار دیے جاتے ہیں اور ہر قسم کی ملمع کاری کو ہٹا کر نقش انسانی کا اصل رنگ دکھایا جاتا ہے۔

لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ۡ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿۴۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۡ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۰﴾ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴿۵۱﴾

"انسان کبھی بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا' اور جب کوئی آفت اس پر آ جاتی ہے تو مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے' مگر جونہی کہ سخت وقت گزر جانے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں' یہ کہتا ہے کہ "میں اسی کا مستحق ہوں' اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کب آئے گی' لیکن اگر واقعی میں اپنے رب کی طرف پلٹایا گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا"۔ حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم بتا کر رہیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں اور انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزہ

چکھائیں گے ۔ انسان کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ منہ پھیرتا ہے اور اکڑ جاتا ہے اور جب اسے کوئی آفت چھو جاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے"۔

نفس انسانی کی یہ نہایت ہی سچی تصویر ہے ۔ نہایت ہی باریک خدوخال کو بھی اس میں نمایاں کیا گیا ہے ۔ وہ لوگ جو اللہ کی ہدایات پر ایمان نہیں رکھتے' جو لوگ ایمان رکھتے ہیں' وہ تو بالکل سیدھی راہ پر گامزن ہوتے ہیں' ان کا ایک ہی رنگ ڈھنگ ہوتا ہے ۔ لیکن گمراہ لوگوں کی نفسیات کیا ہیں' یکدم بدلنے والے' ضعیف الارادہ' دکھاوے کے شیدائی' مال کے لالچی' ناشکرے' خوشحالی میں مغرور اور بدحالی میں آہ و فغاں کرنے والے' غرض یہ نہایت ہی تفصیلی تصویر ہے ان لوگوں کی اور عجیب تصویر ہے ۔

انسان بھلائی کی دعا مانگتے نہیں تھکتا۔ وہ بڑے اصرار اور گڑگڑا کر دعائے خیر کرتا ہے ۔ اور دعا کرتے ہوئے نہیں تھکتا۔ لیکن شر اگر محض اس کو چھو کر بھی گزر جائے تو وہ تمام امیدیں کھو دیتا ہے' مکمل طور پر مایوس ہو جاتا ہے ۔ یہ خیال کرتا ہے کہ اس شر سے تو اب نکلنے اور بچنے کی کوئی امید نہیں ہے ۔ یوں وہ سمجھ لیتا ہے کہ سب اسباب و وسائل ختم ہو گئے ۔ اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے' مغموم و متفکر ہو جاتا ہے ۔ اللہ کی رحمتوں اور مہربانیوں سے مایوس ہو جاتا ہے ۔ یہ اس لیے کہ اس کا اپنے رب پر بھروسہ نہیں ہوتا اور رب سے اس کا تعلق کمزور ہوتا ہے ۔

لیکن یہی انسان' جب اللہ اس پر اپنی رحمتیں اور مہربانیاں کرتا ہے' یہ مصیبت جاتی رہتی ہے' تو اللہ کی نعمتیں اسے ہلکا اور متکبر کر دیتی ہیں ۔ یہ شکر نہیں بجالاتا۔ اب خوشحالی اسے آسمانوں پر چڑھا دیتی ہے ۔ وہ کہتا ہے یہ تو میرا حق ہے ۔ میں اپنی صلاحیت پر اس کا مستحق ہوا ہوں اور یہ حق دائمی ہے ۔ یہ شخص آخرت کو بھول جاتا ہے اور اسے بعید از امکان سمجھتا ہے ۔ کہتا ہے ۔

وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً (۴۱ : ۵۰) "میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کبھی آئے گی"۔ اب یہ اپنے آپ میں مست ہے ۔ اللہ پر احسان جتلاتا ہے ۔ اور یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ کے ہاں بھی میرا یہی مقام ہو گا حالانکہ اس کا کوئی مقام نہ ہو گا ۔ یہ تو آخرت کا منکر اور کافر ہے ۔ اس کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ اگر اللہ کے ہاں چلا گیا تو وہاں بھی باعزت لوگوں میں شمار ہو گا۔

وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰی رَبِّیْٓ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰی (۴۱ : ۵۰) "لیکن اگر واقعی میں اپنے رب کی طرف پلٹایا گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا"۔ یہ ہے بے جا غرور' اب نہایت ہی برمحل تنبیہ آتی ہے ۔

فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَلَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ (۴۱ : ۵۰)

"حالانکہ کفر کرنے والوں کو لازماً ہم بتا کر رہیں گے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں اور انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزہ چکھائیں گے"۔ یہ ہے انسان کہ جب اللہ اسے خوشحال بناتا ہے ۔ تو یہ سرکشی اختیار کرتا ہے ۔ منہ موڑتا ہے اور غرور کرتا ہے ۔ لیکن اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو پھر گر جاتا ہے ۔ اپنے آپ کو ذلیل و خوار سمجھتا ہے ۔ حقیر و لاچار ہوتا ہے ۔ اور گڑگڑانے اور بلبلانے لگتا ہے' لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے ۔

ذرا دیکھئے تو سہی، قرآن کریم نے انسانی نفسیات کے چھوٹے بڑے عمل اور ردعمل کو کس باریکی سے ریکارڈ کیا ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے جو خالق انسان ہے اور خود خالق بتا رہا ہے کہ یہ ہے حضرت انسان۔ کیونکہ خالق اپنی مخلوق کے کل پرزوں کو اچھی طرح جانتا ہے، اللہ جانتا ہے کہ یہ ان نشیب و فراز میں پھرتا رہتا ہے، الا یہ کہ اسے صراط مستقیم کی طرف پکڑ کر لے جایا جائے۔ تب وہ راہ راست پر چلتا ہے۔

نفس انسانی کی اس نہایت ہی ننگی تصویر کے بعد اللہ ان سے پوچھتا ہے کہ تم اس وقت کیا کرو گے کہ جس کتاب کی تم تکذیب کرتے ہو۔ اگر یہ اللہ کی جانب ہی سے ہو اور تم اس عذاب کے مستحق ہو جاؤ جس سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے اور اس وقت تم تکذیب اور دشمنی کے عواقب و نتائج کا اپنے آپ کو مستحق کر لو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾

"اے نبیؐ، ان سے کہو، کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر واقعی یہ قرآن خدا ہی کی طرف سے ہوا اور تم اس کا انکار کرتے رہے تو اس شخص سے بڑھ کر بھٹکا ہوا اور کون ہو گا جو اس کی مخالفت میں دور تک نکل گیا ہو؟"

قرآن ان کے سامنے ایک احتمال پیش کرتا ہے کہ اس قدر احتیاط تو کرو، لیکن انہوں نے کوئی احتیاط بھی نہ کی۔

---ooo---

اس کے بعد اب قرآن کریم ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے کہ سوچیں۔ اور پھر اس وسیع کائنات کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ دیکھو اللہ نے اس میں کچھ نشانات اور تقدیرات طے کر رکھی ہیں، جن کا ظہور مستقبل میں ہو گا۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۵۳﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ﴿۵۴﴾

۶ ع ۱۰ ۱

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے، اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز ... ہے؟ آگاہ رہو، یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں۔ سن رکھو، وہ ہر چیز پر محیط ہے"۔

یہ آخری ضرب ہے اور آخری تبصرہ ہے--- اللہ اپنے بندوں کے ساتھ وعدہ فرماتا ہے کہ عنقریب تمہیں اس کائنات کے کچھ رازوں سے آگاہ کیا جائے گا، اسی طرح خود تمہارے نفس اور ذات کے اندر جو راز ہیں ان کے بارے میں تم پر انکشافات ہوں گے یعنی انفس و آفاق کے نشانات تمہیں دکھائے جائیں گے۔ اور یہ رازہائے نہفتہ جب کھلیں گے

تو معلوم ہوگا کہ یہ کتاب 'کتاب برحق ہے ۔ یہ کتاب اور یہ منہاج اور نظام زندگی' اور یہ قول جو تمہیں بتایا جارہا ہے' یہ سب سچے ہیں ۔

فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا تھا ۔ گزشتہ چودہ سو سال سے اللہ نے انفس و آفاق کے کئی نشانات انسانوں پر ظاہر فرمائے ہیں ۔ اور یہ سلسلہ جاری ہے ۔ انسان کی ذات کے بارے میں بھی عجیب و غریب انکشافات ہوئے ہیں ۔ اور کائنات کے بارے میں بھی ۔

پھر انسان بھی لگا ہوا ہے' اس نے نزول قرآن کے وقت سے آج تک بہت سارے انکشافات کیے ہیں ۔ اس کائنات کی وسعتیں بھی دور تک انسان نے دیکھ لیں اور اس کے لیے کھل گئیں اور نفس انسانی کے وسائل بھی اس پر واضح ہوگئے اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا ۔

انسان نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے' اور دیکھ لیا ہے' اگر انسان یہ بات معلوم کرے کہ کس طرح اس نے ان چیزوں کا ادراک کیا اور اللہ کا شکر ادا کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوگا ۔

مثلاً انسان نے معلوم کر لیا کہ وہ جس زمین کو کائنات کا مرکز سمجھتا تھا ۔ یہ تو ایک حقیر سا ذرہ ہے جو سورج کے تابع ہے ۔ اور انہوں نے معلوم کر لیا کہ یہ سورج اس کائنات کا ایک چھوٹا سا کرہ ہے ۔ اور اس جیسے کئی سو ملین سورج ہیں ۔ انہوں نے شمس و قمر اور ارض و سما کی حقیقت معلوم کر لی اور انہوں نے اپنے وجود کی اور نفس کی حقیقت بھی معلوم کر لی ہے ۔

پھر انسان نے اس کائنات کے مادے میں سے بھی اکثر چیزوں کو معلوم کر لیا ہے کہ اس مادے کے اندر کیا عناصر ہیں ۔ اگر یہ بات صحیح ہو کہ کوئی مادہ ہے ۔ پھر انسان نے یہ دیکھ لیا کہ اس کائنات کا اصل مادہ ذرہ ہے ۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ یہ ذرہ شعاع کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ چنانچہ اس نے یہ دیکھ لیا کہ دراصل تو یہ پوری کائنات روشنی ہے ۔ مختلف انداز کی روشنی جس سے مختلف شکل و صورت کی چیزیں بنتی ہیں ۔

انسانوں نے اس چھوٹے سے کرے اور زمین کے بارے میں تو بہت کچھ جان لیا ہے کہ یہ گیند ہے اور گیند کی طرح ہے ۔ یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ یہ اپنے گرد بھی گھومتا ہے اور سورج کے گرد بھی گھومتا ہے ۔ انہوں نے اس کے براعظموں' اس کے سمندروں اور اس کے دریاؤں کو معلوم کر لیا ۔ اس کے اندرون تک گھس گئے اور اس کے پیٹ میں جو کچھ چھپا تھا اس کو بھی انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ کیا کیا قوتیں اس کے اندر ودیعت کردہ ہیں ۔ پھر ان قوتوں میں سے فضا میں کون کون سی ہیں ۔

انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ ان کی اس زمین کو اس پوری کائنات کے ساتھ جس قانون قدرت نے مربوط کر دیا ہے وہ ایک ہی قانون ہے ۔ اس کائنات میں تصرفات ہوتے ہیں' ان میں سے بیشتر کو انسان نے دریافت کر لیا ہے ۔ اب انسانوں میں سے کچھ اہل علم ایسے ہیں کہ انہوں نے ان قوانین سے معلوم کر لیا ہے کہ کوئی مقنن اور خالق ہے اور بعض ایسے ہیں کہ ان کے لیے ان کا یہ علم ہی وبال بن گیا ۔ یہ ان ظاہری انکشافات کے اندر ہی گم ہوگئے ۔ آگے نہ بڑھ سکے ۔ لیکن آیات الٰہیہ کے اس عظیم انکشاف کے بعد انسانیت نے اب اللہ کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا ہے اور تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے کہ یہ حق ہے ۔

انسان کی ذات اور اس کے نفس کے اندر علم کی فتوحات اس کائنات سے کم نہیں ہیں انسانوں نے انسانی جسم' اس کی

ترکیب ' اس کے خصائص اور اس کے اسرار و رموز کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا ہے ۔ اس کی بناوٹ ' اس کے اعضاء ' ان کے فرائض ' اس کے امراض ' اس کی غذا کے بارے میں وافر علوم جمع کر لیے ہیں ' انسانی اعمال اور حرکات کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم کر لیا ہے ۔ یہ تمام انکشافات دراصل آیات الٰہیہ کے بارے میں ہیں ۔ ان چیزوں کا خالق اس کے سوا کوئی نہیں ہے ۔

انسانی نفسیات کے بارے میں بھی انسان نے بہت کچھ جان لیا ہے ۔ یہ اگرچہ اس حد تک نہیں ہے جو نشانات جسم کے بارے میں انسان نے دریافت کر لیے ہیں ۔ کیونکہ انسان کی جدوجہد زیادہ تر انسانی جسم اور اس کی آلاتی حیثیت پر مرکوز ہے ۔ انسان کی عقل ' اس کی روح کی طرف ابھی زیادہ توجہ نہیں ہوئی ۔ لیکن نفس انسانی کے میدان میں بعض چیزوں کا انکشاف ہوا ' وہ بتاتا ہے کہ اس میدان میں بھی مستقبل میں بڑی فتوحات ہوں گی اور انسان مزید نشانات دیکھیں گے ۔۔۔ ابھی تو انسان راستے ہی میں ہے ۔

اللہ کا وعدہ قائم ہے ۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱ : ۵۳)

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے ' اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے"۔ اور اس وعدے کا آخری حصہ کہ قرآن کتاب برحق ہے ' بیسویں صدی میں اس کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے ہیں ۔ ایمان کے قافلے مختلف راستوں سے جمع ہو رہے ہیں ۔ یہاں تک کہ خالص مادی علوم کے راستے سے بھی لوگ اسلام کی حقانیت کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔ ہر طرف سے اسلامی افواج کا اجتماع ہو رہا ہے ۔ اگرچہ ماضی میں اس کرۂ ارضی پر مادیت و الحاد کی جو لہریں اٹھیں وہ بڑی سرکش تھیں ۔ لیکن اب یہ طوفان ختم ہو رہا ہے ۔ اگرچہ باد مخالف بڑی تند تھی ۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ صدی جس سے ہم گزر رہے ہیں ' ابھی ختم نہ ہو گی کہ مادیت و الحاد کے یہ طوفان ختم ہوں گے اور اللہ کا کلمہ حق ہو کر رہے گا ۔ (سید قطب ! آپ کی روح کو اللہ اطلاع کرے کہ اشتراکی روس ختم ہو گیا ہے ' جس کے ایک کتے نے آپ کو شہادت کے منصب پر فائز کیا ۔ اور یہ تو تھی مادیت اور امریکی الحاد کے خلاف بھی خدائی فوجیں لڑ رہی ہیں ' امید ہے کہ بہت جلد وہ بھی ختم ہو گا ۔ مترجم)

اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۴۱ : ۵۳) "کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے"۔ اللہ نے یہ وعدہ علم و یقین کے ساتھ کیا ہے ۔ وہ دیکھ رہا ہے اور شاید عادل ہے ' اس لیے یہ سچا ہے ۔

اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ (۴۱ : ۵۴) "آگاہ رہو یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غلطیاں کرتے ہیں کیونکہ ان کو اللہ کی ملاقات پر پورا یقین نہیں ہے ۔ یہ نہایت ہی تاکیدی امر ہے ۔

اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ (۴۱ : ۵۴) "سن رکھو وہ ہر چیز پر محیط ہے"۔ لہٰذا تم اس کی ملاقات سے کیسے بچ سکتے ہو ۔ تم مکمل طور پر اس کے گھیرے میں ہو ۔

۱۷ ستمبر ۱۹۹۴ء کراچی ڈیفنس کالونی

--- ooo ---

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۵

سورۃ الشوریٰ ـ ۴۲

آیات ۱--- تا--- ۵۳

سورۃ الشوریٰ ایک نظر میں

یہ سورت بھی تمام دوسری مکی سورتوں کی طرح نظریاتی مسئلے پر بحث کرتی ہے۔ لیکن اس کے زیادہ تر مضامین وحی و رسالت کے مضمون کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس سورت کا مرکزی مضمون اور محور ہی وحی و رسالت ہے تو درست ہو گا۔ اس سورت کا تانا بانا اسی موضوع سے بنے اور دوسرے موضوعات اسی مرکزی مضمون کے تابع ہیں۔

اللہ کی وحدانیت کے مضمون کو یہ سورت مختلف پہلوؤں سے لیتی ہے اور اس موضوع پر بات کو بہت پھیلایا گیا ہے۔ قیامت اور قیامت پر ایمان کا موضوع بھی ہے اور قیامت کے بعض مناظر بھی اس کے اندر بیان ہوئے ہیں' جابجا اس سورت میں مومنین کی امتیازی صفات اور خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں اور یہ بھی ہے کہ کسی کو وافر مقدار میں رزق دینا اور کسی کے رزق میں تنگی کرنا اللہ کا کام ہے اور یہ کہ انسان کو خوشحالی اور مشکلات میں کس طرح کا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔

اگرچہ مذکور متنوع مضامین بھی اس سورت میں ہیں لیکن وحی و رسالت اور ان سے متعلقہ مضامین اس سورت میں ممتاز ہیں اور سورت کا بڑا حصہ انہی پر مشتمل ہے اور دوسرے مضامین پر بھی انہی کا سایہ ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ دوسرے مضامین بھی وحی و رسالت کے ثبوت کے لیے لائے گئے ہیں۔

یہ مضامین اور ان کے ذیلی مضامین اس سورت میں اس طرح لائے گئے ہیں جو قابل غور اور قابل تدبر ہیں اور اس انداز پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کئی پہلوؤں سے موضوعات کو دہرایا گیا ہے' اگرچہ بعض آیات ایسی ہیں جن میں خالق کی وحدانیت' رازق کی وحدانیت' دلوں میں تصرف کی وحدانیت' اور اچھے یا برے انجام عطا کرنے میں وحدانیت کے مضامین ہیں لیکن یہ اس وقت ہے جب وحی و رسالت بھیجنے والے کی وحدانیت کی بات آتی ہے' جس میں وحدت وحی' وحدت عقیدۂ توحید' وحدت شریعت اور منہاج حیات اور سب سے آخر میں یہ اس نظریہ حیات کی روشنی میں انسانوں کی قیادت کی وحدت کے مضامین۔

چنانچہ قاری کے ذہن میں توحید کے خطوط ابھرنا شروع ہوتے ہیں اور وہ واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مختلف پہلوؤں اور مختلف معانی کے لحاظ سے توحید کے اشارات ذہن میں ابھرتے ہیں۔ سورت کے تمام مضامین سے اور مختلف قسم کے موضوعات سے۔ مناسب ہے کہ بعض اجمالی اشارات یہاں دے دیئے جائیں' تفصیلات بعد میں آئیں گی۔

سورت کا آغاز حا' میم' عین' سین اور قاف کے حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔ اور اس کے متصلا یہ آیت ہے:

كَذَالِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۲ : ۳) "اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی [illegible] ہی کرتا رہا ہے"۔ گویا وحی کا سرچشمہ اولین اور آخرین کے لیے ایک ہی رہا ہے۔

اِلَیْكَ وَ اِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ (۴۲ : ۳) "تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف"۔
اس کے بعد اللہ عزیز و حکیم کی صفات بیان کی گئی ہیں۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ (۴۲ : ۴) "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے' اسی کا ہے۔وہ برتر اور عظیم ہے"۔ اس میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ آسمانوں اور زمین کا مالک اللہ وحدہ ہے اور برتری اور عظمت کا مستحق وہی ہے اور صرف وہی ہے۔

صفت عزیز و حکیم کے بعد اب سیاق کلام اللہ وحدہ پر ایمان کے سلسلے میں اس کائنات کے ردعمل کو بھی پیش کرتا ہے۔اور یہ بتایا جاتا ہے جو لوگ شرک کرتے ہیں یہ پوری کائنات بھی ان کے اس فعل کو مسترد کرتی ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (۴۲ : ۵) وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ اللّٰهُ حَفِیْظٌ عَلَیْهِمْ وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ (۴۲ : ۶)
"قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں۔فرشتے اپنی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے جاتے ہیں' آگاہ رہو حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہی ہے۔ جن لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں اللہ ہی ان پر نگران ہے' تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو"۔گویا پوری کائنات ایمان اور شرک کے مسئلے میں لگی ہوئی ہے۔شرک اس قدر بڑا گھناؤنا فعل ہے کہ اس سے قریب ہے کہ آسمان ٹوٹ پڑیں اور جو لوگ اس برے فعل کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے لیے فرشتے بھی استغفار کرتے ہیں کہ خدایا' ان کو اس فعل بد سے موڑ دے۔

اس کے بعد روئے سخن پہلی حقیقت کی طرف آتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَیْبَ فِیْهِ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّةِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ (۴۲ : ۷) "ہاں اسی طرح اے نبیؐ' یہ قرآن عربی ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے تاکہ تم بستیوں کے مرکز (شہر مکہ) اور اس کے گردوپیش رہنے والوں کو خبردار کرو' اور جمع ہونے کے دن سے ڈراؤ جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ایک گروہ کو جنت میں اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں جانا ہے"۔

اس کے بعد فریق جنت اور فریق جہنم کی بات آگے بڑھتی' کہا جاتا ہے کہ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو تمام انسانوں کو ایک ہی فریق بنا دیتا لیکن اللہ کی مشیت کا یوں تقاضا ہوا کہ اس نے جسے چاہا اپنی رحمت میں داخل کر دیا اور یہ فیصلہ اللہ نے اپنے علم اور معرفت کی بنا پر کیا۔

وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۴۲ : ۸) "اور ظالموں کا کوئی والی و مدد گار نہیں ہے"۔ اور والی و مدد گار تو اللہ ہی ہے۔

فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۲ : ۹) "ولی تو اللہ ہی ہے وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے"۔

اس کے بعد روئے سخن پھر پہلی حقیقت کی طرف پھر جاتا ہے یعنی وحی و رسالت کی طرف آتا ہے کہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہیں تو انہی کے لیے اللہ نے یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کو معیار بنا کر اپنے مسائل حل کریں۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَى اللّٰهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (۴۲ : ۱۰) "تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو، اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے، وہی اللہ میرا رب ہے، اس پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں"۔

وحدانیت خالق کے ثبوت کے لیے بات اب اللہ کی ربوبیت کے نظام میں داخل ہوتی ہے کہ وہ وحدہ خالق ہے، رب ہے اور متصرف فی الامور ہے۔ آسمانوں اور زمینوں کا نظام اس نے مقرر کیا ہے، رزق کی فراوانی اور تنگی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۴۲ : ۱۱) لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۴۲ : ۱۲) "آسمانوں اور زمین کا بنانے والا جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے اور اس طرح جانوروں میں بھی جوڑے بنائے، اور اس طریقہ سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے، کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ آسمان اور زمین کی کنجیاں اس کے پاس ہیں، جسے چاہتا ہے، کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے، نپا تلا دیتا ہے، اسے ہر چیز کا علم ہے۔

اس کے بعد پھر پہلی حقیقت وحی الٰہی کی طرف :

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (۴۲ : ۱۳)

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۴۲ : ۱۴) فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ (۴۲ : ۱۵) ”اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے ' جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا ' اور جسے اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے ' اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں ۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو ۔ اللہ جسے چاہتا ہے ' اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اس کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے ۔ لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا ' وہ اس کے بعد ہوا ' کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے ۔ اگر تیرا رب پہلے ہی نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقررہ تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا ہوتا ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں ۔ اس لیے اے محمد ' تو اب اس دین کی طرف دعوت دے اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے ' اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ ' اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو ' اور ان سے کہو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے اس پر میں ایمان لایا“ ۔

عرض حقائق کے بیان کرنے میں یہ سورت اس نہج پر چلتی ہے اور یہ اس کے موضوعات ہیں ۔ یہ فضا ہے اور یہ تمام امور وحی و رسالت کے ساتھ متعلق ہیں ۔ جو اس سورت کا مرکزی موضوع ہے ۔

اس سورت کے پہلے سبق کے اندر ترتیب اور ربط مضامین بالکل واضح ہے ۔ مضمون جوں جوں آگے بڑھتا ہے ' وحی و رسالت کے ساتھ اس کا تعلق واضح ہوتا جاتا ہے ۔ مضمون کا کوئی نہ کوئی حصہ وحی و رسالت سے وابستہ نظر آتا ہے ۔

دوسرا سبق بقیہ سورت پر مشتمل ہے ۔ اس کا آغاز رزق کی فراوانی اور تنگی کے مضمون سے ہے ۔ پھر باران رحمت ' زمین و آسمان کی تخلیق اور زمین کے اندر قسم قسم کے حیوانات کا پھیلانا پہاڑوں جیسے بحری جہاز ۔ پھر صفات مومنین اور ان کی جماعت ' پھر وہ منظر جب ظالم قیامت کے دن عذاب دیکھیں گے ۔

وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ (۴۲ : ۴۴) وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ (۴۲ : ۴۵) ”تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں تو کہیں گے اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے ' اور تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے تو ذلت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے اور اس کو نظر بچا بچا کر کن انکھیوں

سے دیکھیں گے"۔

اس دن مومنین سربلند ہوں گے اور وہ ظالموں کے حالات پر یہ تبصرہ کریں گے ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اَلَا اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ (۴۲ : ۴۵) "اس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنھوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈالا ـ خبردار رہو ظالم لوگ مستقل عذاب میں رہیں گے"۔

اس لیے لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اپنے آپ کو اس قسم کے انجام بد سے بچاؤ ـ قبل اس کے وقت ہاتھوں سے چلا جائے ۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّ

مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ (۴۲ : ۴۷) "مان لو اپنے رب کی بات قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے ۔ اس دن تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا"۔

اب یہاں آکر مضمون پھر پہلی حقیقت کی طرف مڑ جاتا ہے یعنی حقیقت وحی و رسالت کی طرف ' رسالت کا ایک پہلو یہاں لیا جاتا ہے ۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (۴۲ : ۴۸) "اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے نبیؐ ہم نے تم کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے ـ تم پر تو صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے ۔

اس کے بعد اب سیاق کلام اسی مضمون کے گرد گھومتا ہے ' براہ راست یا بالواسطہ ' دوران بیان وحی و رسالت کی طرف کسی نہ کسی شکل میں اشارہ آتا ہے ۔ یہاں تک کہ سورت کے آخر میں وحی و رسالت کے بارے میں یہ بیان آتا ہے ۔

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا

فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴۲ : ۵۱) وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا

مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ

نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲ : ۵۲) صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ اَلَآ اِلَی اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ (۴۲ : ۵۳) ”کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے' اس کی بات یا تو وحی کے طور پر ہوتی ہے' یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغام بر بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ چاہتا ہے' وحی کرتا ہے' وہ برتر اور حکیم ہے اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے ۔ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے' مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں' اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں' یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو' اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمان کی ہر چیز کا مالک ہے ۔ خبردار رہو' سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں ۔

--- ○○○---

اس پوری سورت میں اگرچہ مرکزی مضمون وحی و رسالت ہے لیکن اس مضمون کو اس انداز میں پیش کرنے کا ایک خاص مقصد ہے' وہ یہ کہ مبشرین اور مبلغین کی ایک جدید قیادت متعین کی جائے جو اس آخری پیغام' اس آخری نبی اور اس آخری امت کے مشن کو آگے بڑھائے' یہ امت جو اسلام کے نہایت ہی مستحکم منہاج پر چل رہی ہے ۔

چنانچہ اس غرض کے لیے پہلا اشارہ سورت کے آغاز ہی میں ہے ۔

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۲ : ۳) ”اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف وحی کرتا رہا ہے“ ۔ تاکہ یہ بتا دیا جائے کہ تمام رسولوں کی طرف رسالت اللہ ہی وحی کرتا رہا ہے اور یہ آخری رسالت سابقہ رسالتوں کا تسلسل ہے اور اس کا مضمون پہلے سے طے شدہ ہے ۔

اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یہی اشارہ آتا ہے ۔

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا (۴۲ : ۷) ”اور اسی طرح ہم نے اے نبیؐ' یہ قرآن عربی تمہاری طرف وحی کیا ہے تاکہ تم بستیوں کے مرکز (مکہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو“ ۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قیادت کا مرکز مکہ ہے اور اس کی طرف بعد میں بھی اشارہ آئے گا ۔

اور تیسرے اشارے میں ہے کہ رسالت بھی ایک ہے جس طرح پہلے اشارے میں ہے کہ رسالت اللہ کی طرف سے بھیجی گئی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی ایک ہے ۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۴۲ : ۱۳) ”اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا ۔ اور جسے تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں ۔ اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس

دین کو اور متفرق نہ ہو جاؤ"۔ اس بیان کو جاری رکھتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ تفرق فی الدین اس وصیت کی مخالفت میں واقع ہوا، ان رسولان کرام کے متبعین نے یہ تفرق جہل کی وجہ سے اختیار نہ کیا بلکہ مانتے ہوئے حسد، ظلم اور دست درازی کی خاطر انہوں نے تفرق کیا۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (۴۲ : ۱۴) "اور ان لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آچکا تھا۔ اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے"۔ اور یہی مضمون چلتا ہے کہ ان اختلاف کرنے والوں کے بعد جو لوگ آئے ان کا حال کیا تھا۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۴۲ : ۱۴) "حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے، وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔ یعنی سابقہ کتب کے بارے میں۔

یہاں آکر یہ بات متعین ہوگئی کہ تمام انسانیت ذہنی انتشار اور شک میں مبتلا ہے اور بے رہبر ہے، اور کسی مستحکم دین پر نہیں ہے۔ آسمانی ہدایات اور کتب سابقہ میں سخت اختلاف ہوگئے اور بعض میں آنے والے تو اپنی کتابوں کے بارے میں سخت خلجان میں مبتلا ہوگئے اور ان کی کوئی قیادت بھی نہ رہی۔ لہٰذا ان حالات میں یہ آخری رسالت بھیجی جارہی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قائد ہیں اور ان کی ڈیوٹی یہ ہے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ (۴۲ : ۱۵) "اس لیے اے محمدؐ، اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو، جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے، اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو، اور ان سے کہہ دو "اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہی ہمارا رب بھی اور تمہارا رب بھی"۔ یہی وجہ ہے کہ درس دوئم میں جماعت مسلمہ کی صفات کو لایا گیا ہے کہ اس جماعت نے اس کام کو لے کر اٹھنا ہے، تاکہ وہ انسانیت کی قیادت ایک مستحکم منہاج پر کرے۔

جب ہم ان باتوں کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے، اس سورت کا سیاق، اس کا مرکزی موضوع اور دوسرے متعلقہ موضوعات ایک خاص سمت کی طرف واضح ہدف لے کر جارہے ہیں۔ آیات کی تشریح کے دوران ہم ان اشارت کی تفصیلات دیں گے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۲۹ تشریح آیات

۱--- تا --- ۲۴

حٰمٓ ﴿۱﴾ عٓسٓقٓ ﴿۲﴾ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۴﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ڮ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ح م ' ع س ' ق ۔ اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے (رسولوں) کی طرف وحی کرتا رہا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اسی کا ہے' وہ برتر اور عظیم ہے۔ قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں۔ فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں' اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے جاتے ہیں۔ آگاہ رہو' حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہی ہے۔ جن لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں' اللہ ہی ان پر نگراں ہے' تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو"۔

حروف مقطعات کے بارے میں کئی سورتوں کے آغاز میں بات ہو چکی ہے جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ حروف بتاتے ہیں کہ سورت کا آغاز ہو رہا ہے۔ ان حروف کے بعد پہلا فقرہ یہ ہے۔

كَذٰلِكَ يُوْحِىْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۲ : ۳) ”اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف وحی کرتا رہا ہے“۔ یعنی جس طرح تمہاری طرف وحی ہو رہی ہے اسی طرح اور اسی انداز میں ہم نے پہلے رسولوں کی طرف بھی وحی بھیجی ہے ۔ یہ وحی الفاظ ' کلمات اور حروف تہجی پر مشتمل رہی ہے ۔ وحی کا کلام الٰہی حروف سے بنایا گیا ہے ۔ ان حروف سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں ۔ ان کلمات کے معانی وہ سمجھتے ہیں لیکن اس وحی کی طرح وہ کلام پیش نہیں کر سکتے ۔ حالانکہ جس مواد سے یہ کلام بنا ہے ' وہ ان کے سامنے ہے اور دسترس میں ہے ۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ وحی ایک ہے ' وحی کا مصدر و ماخذ ایک اللہ ہے جو عزیز و حکیم ہے ۔ اور جن کی طرف وحی آتی ہے وہ ہر زمان و مکان کے رسول ہیں ۔ رسول مختلف ہیں ' زمان و مکان کا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن وحی اور ہدایت ایک ہی ہے ۔

اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (۴۲ : ۳) ”تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف“۔

یہ بہت لمبی کہانی ہے ' زمانے کے نشیب و فراز اور تاریخ کی بے شمار کڑیوں پر مشتمل اس کے مختلف سلسلے ہیں البتہ وحی کا یہ ایک مستحکم و مستقبل اصول و منہاج ہے اور اس کی کئی شاخیں ہیں ۔

یہ بات اس انداز سے جب اہل ایمان کے دلوں میں بیٹھ جاتی ہے تو وہ اپنے اندر یہ شعور پاتے ہیں کہ وہ جس منہاج اور طریقے پر ہیں ' یہ ایک مستقل ' واحد طریقہ ہے اور اس کا سرچشمہ بھی واحد اللہ وحدہ ہے ۔ اور یہ کہ ان کا سررشتہ بھی اللہ العزیز الحلیم ہے ۔ اس طرح ان کے اندر یہ شعور بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایک تاریخی قافلہ حق کے ممبر ہیں جس کا آخری سرا یا پہلا سرا زمان و مکان کے اندر دور تک چلا گیا ہے ' یہ گویا اہل ایمان کا ایک خاندان ہے جس کا روحانی شجرۂ نسب انسانی تاریخ کے آغاز ہی سے شروع ہوتا ہے ۔ آخر میں اس شجرے کی کڑیاں ملتی ہیں اور سب جا کر اللہ العزیز پر ملتے ہیں ' جو قوی اور قادر مطلق ہے ' جو حکیم ہے ' جو اپنی حکمت و تدبیر کے ساتھ جس کی طرف چاہتا ہے ' وحی کرتا ہے ۔ لہٰذا تم اس واحد ثابت اور مستقل ربانی منہاج سے منتشر ہو کر ادھر ادھر پگڈنڈیوں پر کیوں جا رہے ہو 'کیونکہ یہ پگڈنڈیاں تو اللہ تک نہیں پہنچاتیں ' ان کے جائے آغاز کا نہ پتہ اور نہ ان کے مقام انجام کا پتہ ہے اور نہ ان کا راستہ مستقیم ہے ۔

اللہ جس نے تمام رسولوں کی طرف وحی فرمائی ۔ اس کی مزید صفات بھی دی جاتی ہیں کہ وہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا واحد مالک ہے ۔ اور وہی بلند اور عظیم ہے ۔

لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَهُوَ الْعَلِىُّ الْعَظِيْمُ (۴۲ : ۴) ”آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے ' اسی کا ہے ' وہ برتر اور عظیم ہے“۔

بسا اوقات لوگوں کو یہ دھوکہ ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بھی مالک ہیں ' محض اس لیے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں ان کے ہاتھوں میں ہیں ۔ ان کے قبضہ قدرت اور کنٹرول میں ہیں ۔ وہ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں ان سے خدمت لیتے ہیں لیکن یہ دراصل حقیقی ملکیت نہیں ہے ۔ حقیقی ملکیت اللہ کی ہے ۔ وہ اللہ ہے جو موجود

اور معدوم کرتا ہے ' زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے ـ یہ وہی ہے جو کسی بشر کو جو چاہتا ہے ' دیتا ہے ـ اور جس چیز سے چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے ـ جس وقت چاہتا ہے ان کے ہاتھ میں جو کچھ ہوتا ہے وہ یکدم چلا جاتا ہے ـ اور اگر وہ چاہے تو جو چلا گیا ہے ' اس کا متبادل دے دے ـ مالک حقیقی تمام اشیاء میں اللہ ہے ـ وہ ان چیزوں کو اپنے قانون قدرت کے مطابق چلاتا ہے ـ اور یہ تمام اشیاء اس کے حکم پر لبیک کہتی ہیں ـ اس لحاظ سے زمین و آسمان میں جو چیز ہے ' وہ اللہ کی ہے اور اس لحاظ سے اللہ کے ساتھ اس ملکیت میں کوئی شریک نہیں ہے ـ

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (۴۲ : ۴) "وہ برتر اور عظیم ہے" ـ وہ صرف مالک ہی نہیں ہے ـ وہ مالک اعلیٰ بھی ہے ـ اور وہ بڑی عظمتوں والا ہے ' اور اس عظمت میں وہ منفرد ہے ـ وہ اس طرح برتر ہے کہ اس کے مقابلے میں ہر چیز کمتر ہے اور وہ اس معنی میں عظیم ہے کہ اس کے مقابلے میں ہر چیز بہت ہی چھوٹی ہے ـ

جب یہ حقیقت انسانوں کے خمیر میں اچھی طرح بیٹھ گئی اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے نفوس کے لیے جو مال ' جو رزق اور جو روزگار طلب کرتے ہیں ' یہ انہوں نے کہاں سے طلب کرنا ہے یعنی یہ کہ زمین و آسمان میں جو چیزیں موجود ہیں ' ان کا مالک اللہ ہے ـ اور وہ مالک ہی کسی کو کوئی چیز دے سکتا ہے ـ پھر وہ برتر اور عظیم بھی ہے ـ اس سے اگر کوئی کچھ مانگتا ہے تو وہ اس کے سوال کو رد نہیں کرتا ـ جس طرح مخلوقات کے سامنے ہم ہاتھ پھیلاتے ہیں وہ نہ برتر ہیں اور نہ عظیم ہیں ' اس لیے ان کا سوالی محروم بھی ہو سکتا ہے ـ

اس کے بعد اس کائنات میں سے ایک ایسا منظر دکھایا جاتا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کائنات کا مالک صرف اللہ ہے اور برتری اور عظمت اللہ ہی کے لیے ہے کہ قریب ہے کہ یہ آسمان اللہ کی عظمت کے رعب کی وجہ سے اور بعض لوگوں کی کج روی اور بری باتوں کی وجہ سے پھٹ پڑیں پھر اللہ کی عظمت کا ایک منظر یہ بھی یہاں لایا گیا ہے کہ ملائکہ ہر وقت اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اہل زمین کے لیے مغفرت مانگتے رہتے ہیں ' کیونکہ اہل زمین کے انحراف اور بے راہ روی کو دیکھ کر وہ بھی سہم جاتے ہیں ـ

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۴۲ : ۵) "قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں ـ فرشتے اپنی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے جا رہے ہیں ـ آگاہ رہو ' حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہی ہے" ـ

سماوات وہ عظیم کائنات ہے جو ہمارے اوپر نظر آتی ہے ـ اس کرۂ ارض کی پشت پر ہم جہاں کہیں بھی ہوں اور ہمارے پاس اس کے بارے میں ابھی تک جو معلومات جمع ہوئی ہیں وہ اس کے ایک بالکل معمولی حصے کے بارے میں ہیں ـ آج تک جو معلومات دستیاب ہیں ان سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہمارے سورج جیسے ایک لاکھ ملین سورج معہ اپنے لاتعداد توابع کے موجود ہیں ـ اور ایسے مجموعے یا گروپ کتنے ہیں؟ تقریباً ایک لاکھ ملین گروپ معلوم ہو چکے ہیں ـ یاد رہے کہ یہ سورج ہماری زمین سے ایک ملین گنا بڑا ہے ـ اور یہ لاکھوں اربوں سورج تو وہ ہیں جن کو ہم اپنی چھوٹی چھوٹی رصد

گاہوں کے ذریعے دیکھتے ہیں' یہ اس لامحدود فضائے کائنات (جسے ہم آسمان کہتے ہیں) کے اندر بکھرے ہوئے ہیں اور ان کے درمیان طویل مسافتیں ہیں جو ہزارہا ملین نوری سالوں کی دوری پر ہیں' جن کا حساب روشنی کی رفتار کے حساب سے کیا جاتا ہے یعنی ۱۸۶۰۰۰ میل فی سیکنڈ کے حساب سے۔

یہ آسمان جن کے بارے میں ہمارا علم بہت ہی محدود ہے' قریب ہے کہ پھٹ پڑیں' ہمارے اوپر اس فضا میں سے' کیوں؟ اللہ کے خوف سے' اللہ کی عظمت سے' اور اللہ کے جلال سے اور زمین کے ان لوگوں کی بدکاریوں کی وجہ سے ان کی غفلت اور نسیان کی وجہ سے جو انہوں نے اس رب ذوالجلال اور اس کائنات کے بارے میں روا رکھی ہوئی ہیں۔ قریب ہے کہ آسمانوں پر رعشہ طاری ہو جائے اور یہ ٹوٹ پڑیں اور اس مقام سے گر جائیں جہاں یہ ٹکے ہوئے ہیں۔

وَالْمَلٰئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ (۴۲ : ۵) "فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں درگزر کی درخواستیں کیے جاتے ہیں"۔ ملائکہ وہ مخلوق ہے جو مکمل طور پر اطاعت شعار ہے۔ یہ تمام مخلوقات میں سے بہتر مخلوق ہے' لیکن یہ مسلسل اپنے رب کی تسبیح کر رہے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا رب کتنا برتر ہے۔ اور کتنا عظیم ہے۔ وہ باوجود اپنی مکمل اطاعت شعاری کے پھر بھی اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں حمد و ثنا میں اور اطاعت میں ان سے کوئی تقصیر نہ ہو جائے۔ جبکہ اہل زمین قصوروار بھی ہیں' ضعیف بھی ہیں۔ راہ راست سے منحرف بھی ہیں' پھر بھی احساس نہیں رکھتے چنانچہ ملائکہ اللہ کے غضب سے ڈرتے ہیں اور زمین میں جو معصیت ہوتی ہے' جو تقصیرات ہوتی ہیں' اس پر وہ اللہ کے غضب کے ڈر سے استغفار کرتے ہیں۔ یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں ملائکہ کے استغفار سے مراد اہل ایمان کے لیے استغفار ہو' جس طرح سورۂ غافر میں آیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (غافر: ۷) "عرش الٰہی کے حامل فرشتے' اور وہ جو عرش کے گردوپیش حاضر رہتے ہیں' سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں"۔ اس حالت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فرشتے زمین پر معصیت کے ارتکاب سے بہت ڈرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اہل ایمان بھی اگر معصیت کریں تو فرشتے ڈرتے ہیں اور اس خوف کی وجہ سے وہ اللہ سے اہل زمین کے لیے معافی طلب کرتے ہیں اور وہ اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں تاکہ ان معصیتوں کی وجہ سے اللہ کا عذاب نہ آ جائے اور اس لیے کہ اللہ کی رحمت لوگوں پر آتی رہے۔ وہ امید کرتے ہیں کہ لوگوں کو معاف کیا جائے گا اور ان پر رحمت ہو گی۔

اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۴۲ : ۵) "آگاہ رہو حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہے"۔ اللہ کی صفات عزت اور حکمت کے ساتھ اور صفات علو اور عظمت کے ساتھ صفات مغفرت اور رحمت کو بھی یہاں جمع کیا گیا ہے تاکہ لوگ رب کی تمام صفات کو پیش نظر رکھیں۔

اس پیرے کے آخر میں ' ان صفات الہیہ کے بیان اور اس کائنات میں ان کے اثرات کے بیان کے بعد ' روئے سخن ان لوگوں کی طرف مڑ جاتا ہے ۔ جنہوں نے اللہ کے سوا کچھ اور سرپرست بھی بنا رکھے ہیں ' حالانکہ یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی سرپرست نہیں ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معاملات سے اب دستکش ہو جائیں ' کیونکہ آپ کو ان کا حوالہ دار نہیں مقرر کیا گیا ۔ اللہ ہی دراصل ان پر نگران ہے اور مختار ہے ۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (۴۲ : ۶) ''جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں ' اللہ ہی ان پر نگران ہے ' تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو'' ۔ انسانی تصور میں ان کج خلق اور بدبختوں کی یہ تصویر آتی ہے کہ انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے سرپرستوں کے سامنے ہاتھ دراز کیے ہوئے ہیں اور ان سے کچھ مانگتے ہیں اور ان کے ہاتھ خالی ہیں ' وہاں تو ہوا کے سوا کچھ نہیں ۔ ان کی تصویر اور ان کے سرپرستوں کی تصویر نہایت ہی مکروہ ' حقیر اور بونی تصویر ہے ۔ اللہ کے قبضے میں ہیں یہ لوگ اور نہایت ہی چھوٹے ہیں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہہ دیا گیا ہے کہ آپ ان کے معاملے سے بری الذمہ ہیں ۔ آپ ان کی پرواہ نہ کریں ' اللہ تعالیٰ ان کا بندوبست کرے گا ۔

اہل ایمان کے دلوں میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ جانی چاہئے اور اس معاملے میں ان کو مطمئن ہونا چاہئے ' ہر حال میں مطمئن ہونا چاہئے ۔ وہ لوگ جن کو سرپرست بنایا گیا ہے ' وہ اس کرۂ ارض پر برسر اقتدار اور اصحاب جاہ و مرتبہ ہوں یا دوسرے لوگ ہوں ۔ اصحاب اقتدار کے بارے میں تو اہل ایمان کو یوں مطمئن ہونا چاہئے کہ وہ جس قدر جبار و قہار بھی ہوں ' اگر ان کا اقتدار قرآن و سنت سے ماخوذ نہیں ہے تو پھر وہ اللہ کی گرفت میں ہیں ' اللہ نے انہیں احاطے میں لے رکھا ہے ۔ ان کے اردگرد پوری کائنات اللہ پر ایمان لانے والی ہے ' صرف وہی منحرف ہیں ۔ وہ ایک نہایت ہی موزوں زمزمے میں ایک کرخت آواز کی طرح ہیں ۔ اور اگر یہ سرپرست اہل اقتدار کے علاوہ اور پیر فقیر ہوں تو اہل ایمان پر ان کی ذمہ داری نہیں ہے کیونکہ اللہ کی مخلوق میں سے اگر کوئی غلط راہ اختیار کرتا ہے ۔ تو یہ ذمہ دار نہیں ۔ دین و عقائد میں زبردستی نہیں ہے ' ان پر صرف تبلیغ کی ذمہ داری ہے ۔ بندوں کے دلوں پر نگران اللہ ہی ہے ۔

چنانچہ مومنین کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی سیدھی راہ پر وحی الہٰی کی روشنی میں چلیں اور اگر دوسرے لوگ غلط عقائد اختیار کرتے ہیں تو ان پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے ۔ یہ غلط عقائد جو بھی ہوں ' وہ خود ذمہ دار ہیں ۔ اب ہم اس سورت کے پہلے موضوع یعنی وحی و رسالت کی طرف آتے ہیں :

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ ۝ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ

فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ۝ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِیُّ وَ هُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰی ؗ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ ۱ ۹ع

۲ "ہاں اسی طرح اے نبیؐ' یہ قرآن عربی ہم نے تمہاری طرف وحی کیا ہے' تاکہ تم بستیوں کے مرکز (شہرمکہ) اور اس کے گردوپیش رہنے والوں کو خبردار کر دو' اور جمع ہونے کے دن سے ڈرادو جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ایک گروہ کو جنت میں جانا ہے اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں۔اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا' مگر وہ جسے چاہتا ہے' اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے' اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے' نہ مددگار۔کیا یہ (ایسے نادان ہیں کہ) انہوں نے اسے چھوڑکر دوسرے ولی بنا رکھے ہیں؟ ولی تو اللہ ہی ہے' وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے' اور وہ ہرچیز پر قادر ہے"۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (۴۲ : ۷) "ہاں' اسی طرح اے نبی یہ قرآن عربی ہم نے تمہاری طرف وحی کیا ہے"۔تاکہ تم بستیوں کے مرکزی شہرمکہ کے لوگوں کو ڈراؤ۔یہ فقرہ معطوف ہے' اس فقرے پر جس سے سورت کا آغاز ہوا۔یعنی كَذٰلِكَ يُوْحِىْٓ پر۔ سورت کے آغاز میں آنے والے اس كَذٰلِكَ سے مراد حروف مقطعات تھے۔یہاں معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مناسبت حروف مقطعات اور قرآن عربی کی ہے۔یہ مناسبت ظاہر ہے۔یعنی یہ حروف عربی ہیں اور یہ قرآن عربی ہے۔وحی نے ان حروف سے یہ قرآن بنایا ہے تاکہ وہ اپنا مقصد پورا کرے اور غرض و غایت کیا ہے۔

لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (۴۲ : ۷) "تاکہ تم بستیوں کے مرکز(شہرمکہ)اور اس کے گردوپیش رہنے والوں کو خبردار کر دو"۔ام القریٰ سے مرادمکہ مکرمہ ہے۔اس میں بیت اللہ' اللہ کا پراناگھر تھا۔اللہ نے یہ پسند فرمایا کہ خانہ کعبہ اس آخری رسالت کا مرکز ہو اور اللہ نے اپنی آخری کتاب کے لیے عربی زبان کو منتخب کیا۔یہ اس کی مصلحت تھی اور وہی اس کو جانتا ہے کہ کیوں۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ "اللہ ہی بہترجانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں رکھے"۔

آج جب ہم تاریخی واقعات کا جائزہ لیتے ہیں اور پوری تاریخ کو چھانتے ہیں' اس وقت کے حالات اور تقاضوں کو دیکھتے ہیں۔پھرہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دعوت کس طرح پھیلی اور کن خطوط پر آگے بڑھی اور اس نے کیا کیا نتائج پیدا کیے اور دنیا پر کیا کیا اثرات چھوڑے۔آج جب ہم یہ جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ نے اس سرزمین کو اس مقصد کے لیے کیوں منتخب کیا تھا۔اور تاریخ کے ایک خاص موڑ پر اس آخری رسالت کے لیے کیوں مکہ مکرمہ کو مرکز ٹھہرایا۔جبکہ یہ آخری رسالت تھی بھی عالمی رسالت' تمام انسانوں کے لیے تھی۔اور جس کے عالمی خدوخال اس کے ابتدائی دنوں ہی سے عیاں تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہورکے دورمیں پورے کرۂ ارض کے آباد علاقوں کو چار شہنشاہوں نے باہم تقسیم کر رکھا تھا۔رومی سلطنت جو پورے ایشیاکے ایک حصے' اور افریقہ پر حکمران تھی۔کسرائے فارس کی مملکت جس کا اقتدار ایشیاکے

ایک بڑے حصے' افریقہ کے ایک حصے پر قائم تھا' مملکت ہند اور مملکت چین ـ یہ آخر الذکر دونوں شہنشاہتیں اپنے خول میں بند تھیں' ان کے اپنے عقائد تھے اور صرف چین و ہند کے باہم سیاسی روابط تھے' چونکہ چین و ہند کی مملکتیں اپنے ہی خول میں بند تھیں ـ اس لیے دنیا کے معاشروں پر حقیقی اثر قیصر روم اور کسرائے فارس ہی کی حکومتوں کو حاصل تھا ـ

اس دور میں دنیا میں دو مشہور سماوی دین تھے ـ یہودیت اور نصرانیت ـ یہ دونوں مذاہب اس پوزیشن تک پہنچ گئے تھے کہ یہ کسی نہ کسی حکومت اور مملکت کے زیر اثر ہو گئے تھے ـ ان ادیان پر حکومت کا اثر قائم ہو گیا تھا ـ کسی مملکت پر دین کا اثر نہ تھا بلکہ مملکت دین پر غالب تھی ـ یہ اس لیے کہ ان ادیان کے اندر تحریف و تغیر واقع ہو گیا تھا اور اہل دین بدعمل ہو گئے تھے ـ

یہودیوں پر تو کبھی رومی ظلم کرتے اور کبھی اہل فارس ان پر مظالم ڈھاتے ـ ان کی تو اس علاقے میں کوئی قابل ذکر پوزیشن نہ تھی ـ حالات نے یہودیت کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ صرف یہودیوں' یعنی بنی اسرائیل کا دین بن جائے اور خود اپنے اندر سکڑ جائے ـ ان کو نہ اس بات کی ضرورت تھی اور نہ خواہش تھی کہ وہ دوسری اقوام کو دین یہودیت میں لائیں ـ

جہاں تک موجودہ عیسائیت کا تعلق ہے' تو یہ مملکت روما کی پیدا کردہ ہے ـ جس وقت عیسائیت وجود میں آئی تو مملکت روما' فلسطین' مصر' شام اور ان باقی حصوں پر برسر اقتدار تھی جن میں مسیحیت خفیہ طور پر پھیل گئی تھی اور مملکت روما اس پر تشدد کر رہی تھی ـ اس دین کو ماننے والوں کا پیچھا کیا جاتا تھا ـ اور ان پر سختیاں کی جاتی تھیں ـ یہ تشدد اس قدر سخت تھا کہ ہزارہا لوگوں کو ظالمانہ طریقے پر ذبح کیا گیا ـ جب اس تشدد کا دور ختم ہوا اور قیصر روم خود دین مسیحیت میں داخل ہو گیا تو وہ اپنے ساتھ بت پرستانہ افسانے بھی لایا ـ چنانچہ یونان کے مذہبی دیومالائی فلسفے عیسائیت میں داخل ہو گئے اور عیسائیت کی سادہ شکل ہی کو بدل کر رکھ دیا گیا ـ لہٰذا اب سرکار کے سائے میں جو عیسائیت وجود میں آئی ' وہ اس دین سے بالکل مختلف تھی جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتارا تھا بلکہ یہ ایک نئی چیز وجود میں آ گئی ـ ہوا یوں کہ مملکت روم نے کلمہ تو پڑھ لیا مگر وہ مسیحیت سے متاثر نہ ہوئی ـ ادھر مسیحیت تشدد سے تو کنٹرول میں نہ آئی تھی' اب مکمل طور پر کنٹرول میں آ گئی ـ اس سرکاری کنٹرول کی وجہ سے یہ دین مزید ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اس طرح تشدد کا ایک دوسرا دور شروع ہوا' سرکاری مسیحیت نے دوسرے فرقوں کو کچلنا شروع کر دیا ـ کینہ تقسیم ہو گیا اور یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا کہ اس کے نتیجے میں مملکت روما منقسم ہو جائے ـ یوں ایک سرکاری فرقے نے دوسرے فرقوں کو کچلا اور دونوں کی حالت یہ ہو گئی کہ کوئی بھی حضرت عیسیٰ کے دین پر نہ رہا ـ

یہ وقت تھا جب اسلام نمودار ہوا ـ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت جس انحراف' فساد' ظلم اور جاہلیت میں گرفتار ہے' اسے ان تاریکیوں سے نکالا جائے ـ اسلام نے چاہا کہ پوری انسانی زندگی کو اپنے کنٹرول میں لے' اور نہایت ہی روشنی اور صحیح راستے پر اس کی راہنمائی کرے ـ یہ ضروری تھا کہ اسلام پوری انسانیت کے اوپر اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کرے تاکہ انسانی زندگی میں وہ عظیم انقلاب لایا جا سکے ـ جو اسلام کے پیش نظر تھا ـ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ اسلام کا آغاز کسی ایسے مقام سے کیا جائے جو آزاد ہو اور وہاں دنیا کی بڑی شہنشاہیتوں میں سے کوئی بھی برسر اقتدار نہ ہو ـ اور اسلام کی ترقی اور نشوونما ایسے حالات میں ہو کہ اس پر کوئی ایسی مملکت مسلط نہ ہو' جو اس کے مزاج کے متضاد ہو ـ بلکہ اس علاقے پر اسلام خود ہی برسر اقتدار ہو ـ ان مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر سوچا جائے تو مکہ مکرمہ' اس وقت کے حالات کے مطابق

آغاز اسلام کے لیے ایک بہترین مقام تھا' جہاں سے اسلام نے اپنا عالمی سفر شروع کیا کیونکہ ایک عالمی انقلاب اول روز سے اسلام کے پیش نظر تھا۔

جزیرۃ العرب میں ان دنوں کوئی منظم حکومت نہ تھی جس کے اپنے قوانین ہوں' جس کی فوجیں ہوں' جس کی پولیس ہو' اور وہ پورے جزیرۃ العرب پر اقتدار رکھتی ہو۔ اور جو اپنے منظم ڈھانچے کے بل بوتے پر جدید نظریہ حیات کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ اور جمہور عوام پوری طرح اس کے کنٹرول میں ہوں جیسا کہ اس وقت دنیا کی چار شہنشاہیتوں میں ایسا انتظام تھا۔

پھر جزیرۃ العرب میں ایسا واضح دین بھی نہ تھا' جس طرح یہودیت' عیسائیت تھی یا بکھری ہوئی بت پرستی تھی۔ تمام قبائل کے معتقدات اور ان کے طریقہ ہائے حیات مختلف تھے۔ پھر ان کے الٰہ بھی مختلف تھے۔ ملائکہ سے' جنوں سے' سیاروں اور ستاروں سے' اور بتوں سے' لیکن ان حالات کے باوجود خانہ کعبہ اور قریش کی دینی قیادت و سیادت پورے جزیرۃ العرب میں مسلم تھی۔ اگرچہ یہ قیادت باقاعدہ اقتدار اعلیٰ کی نہ تھی' نہ مکہ پر اور نہ بیرون مکہ پر۔ اس وجہ سے دین جدید کی مزاحمت حکومتی سطح پر نہ تھی۔ قریش نے دین جدید کا ایک حد تک مقابلہ ضرور کیا لیکن اگر اقتصادی وجوہات نہ ہوتیں' اور قریش کے سرداروں کے خاص مفادات کا مسئلہ نہ ہوتا تو اسلام کی جو مخالفت ام القریٰ میں ہوئی وہ بھی نہ ہوتی۔ جہاں تک عقائد و نظریات کا تعلق ہے' وہ جانتے تھے کہ ان کے عقائد پوچ ہیں اور ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

جزیرۃ العرب میں کسی سیاسی نظام کا نہ ہونا' یا کسی منظم دینی نظام کا نہ ہونا' اسلام کے مفاد میں تھا' ابتدائی ادوار میں اسلام کے اوپر کوئی خاص دباؤ نہ تھا۔ اگر کوئی ایسا نظام ہوتا تو وہ لازماً اسلام کے مزاج کے خلاف ہوتا اور وہ اسلام کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا۔

بلکہ کسی اجتماعی حکومتی اور دینی نظام کی عدم موجودگی میں' ایک طرح اسلام کی حمایت کا پہلو نکل آیا۔ اجتماعی نظام حکومت کی جگہ جزیرۃ العرب میں قبائلی نظام تھا اور اس قبائلی نظام میں خاندان کو اہمیت حاصل ہوتی۔ جب حضورؐ دعوت اسلامی لے کر اٹھے تو بنی ہاشم کی تلواریں آپ کے ساتھ تھیں اور جو قبائلی توازن قائم تھا وہ آپ کے حق میں تھا۔ کیونکہ بنو ہاشم باوجود اس کے کہ آپ کے دین کو قبول نہ کرتے تھے لیکن آپ کے حامی ضرور تھے۔ بلکہ آغاز اسلام میں جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا اور ان کا تعلق اہم قبائل سے تھا' ان پر لوگ کسی قسم کے تشدد سے ڈرتے تھے۔ ان کی اصلاح اور تادیبی کارروائی کا کام قبائل کے سپرد تھا۔ اسی طرح جن غلاموں پر تشدد ہوا ان پر بھی ان کے مالکان نے تشدد کیا' یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر ایسے غلاموں کو خریدتے اور آزاد کر دیتے۔ اس طرح ان پر سختی ختم ہو جاتی اور وہ حضرت ابوبکر کے موالی ہو جاتے۔ اب لوگ ان کے دین کے بارے میں زیادہ نہ چھیڑتے۔ اس صورت حال نے دین جدید کو ایک امتیازی شان دے دی۔ تمام غرباء اور غلام اس کی طرف لپکے۔

پھر عربوں کے اندر بہادری' ذاتی وقار' جوانمردی اور بھلائی پر خوشی سے آمادہ ہو جانے کی صفات بھی تھیں۔ یہ وہ صفات ہیں جو جدید دین کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے ضروری تھیں۔

ان باتوں کے علاوہ جزیرۃ العرب میں اس وقت وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو کسی تہذیب و ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہیں اور ساکنان جزیرہ ان پر فخر کرتے تھے۔ جزیرۃ العرب میں قوت' قابلیت' شخصیات کے کافی ذخائر موجود تھے جو بے تاب تھے کہ ان کو کام میں لایا جائے۔ غیب کے قلب میں یہ سب کچھ موجود تھا۔ پھر اہل قریش پوری دنیا میں

گرویدہ اور گرم و سرد چشیدہ تھے - وہ ایک طرف قیصر روم کی مملکت میں سفر کرتے تھے دوسری جانب وہ کسریٰ فارس کے علاقوں میں سفر کرتے تھے اور انہوں نے اس وقت کی تہذیب و تمدن کے تمام تجربات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے تھے - اہل قریش کے سفر موسم گرما اور سفر موسم سرما کو قرآن کریم نے ہمیشہ کے لیے ریکارڈ بھی کر دیا ہے -

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ (۱۰۶:۱) اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ (۱۰۶:۲) فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ (۱۰۶:۳) الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶:۴) "چونکہ قریش مانوس ہوتے ہیں، جاڑے اور گرمی کے سفروں سے، لہٰذا ان کو چاہیے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک سے بچا کر کھانے کو دیا اور خوف سے بچا کر امن عطا کیا"۔ پھر تجربات کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے ہاں مختلف اسباب کے تحت جمع ہو گیا، تاکہ جزیرۃ العرب اسلامی انقلاب کی مہم کے لیے تیار ہو جائے - جب اسلام آیا تو اس نے ان تمام ذخائر اور صلاحیتوں کو اسلام کے حق میں استعمال کیا - عربوں کی طاقت اور جنگی صلاحیت جو صدیوں سے جمع ہو چکی تھی، وہ صلاحیت کھل گئی - اسلام کی کنجی سے یہ خزانے روبعمل ہو گئے - یہ تمام صلاحیتیں اسلام کا سرمایہ بن گئیں - یہی وجہ ہے کہ آغاز اسلام ہی سے اسلام کو ایسی عظیم شخصیات مل گئیں جن کا ملنا کسی تحریک کے لیے بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام اس زاویہ نظر سے بہت بڑا مقام رکھتے ہیں، مثلاً حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ، حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت سعدؓ، حضرت خالدؓ، حضرت معاذؓ، حضرت ابو ایوب انصاری وغیرھم - ساتھیوں کا یہ باصلاحیت گروپ جنہوں نے ابتداء ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا، ان کے دل اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیئے، انہوں نے اس دعوت کو اٹھایا - اس دعوت کے ذریعہ یہ باصلاحیت لوگ مزید بڑے لوگ بن گئے اور ان کی صلاحیتیں اور نکھر گئیں - لیکن ان کے اندر بنیادی قابلیت اسلام سے پہلے بھی موجود تھی -

یہاں ہم تفصیلی اسباب نہیں لکھ سکتے کہ جزیرۃ العرب کو کیوں دعوت اسلامی کے لیے منتخب کیا گیا - کیوں اس دعوت کو آغاز میں بچا کر جزیرۃ العرب ہی میں اس کی نشوونما کی گئی، اور کیوں ام القریٰ اور ماحول کو برتری دی گئی کہ بڑی مملکتیں اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوئیں، تو یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جزیرۃ العرب کو جدید رسالت کے لیے ایک پرورش گاہ بنانا چاہتا تھا - جس نے پوری انسانیت کو روشنی دینی تھی - اور پھر ام القریٰ کو منتخب کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے اٹھیں - بہرحال یہ بہت ہی طویل بحث ہو گی اور اس کے لیے ایک مستقل کتاب کے صفحات درکار ہیں - یہاں یہی اشارات کافی ہیں اور جن سے آگے بڑھ کر مزید اسباب بھی معلوم کیے جا سکتے ہیں، یہ تو ان اسباب کا ایک حصہ ہیں - جس طرح ہم کائنات میں سنن الٰہیہ کے سلسلے میں نئے اسباب معلوم کر رہے ہیں - اسی طرح ام القریٰ کے بارے میں مزید وجوہات غور و فکر کے بعد سامنے لائی جا سکتی ہیں -

غرض یوں یہ قرآن ام القریٰ میں نازل ہوا، اس نے اس کے اردگرد کام شروع کیا اور جب پورا جزیرۃ العرب جاہلیت سے نکل کر اسلام میں داخل ہو گیا - اور عرب پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو گئے تو انہوں نے اسلام کے

جھنڈے بلند کر دیے اور وہ اسلام کو لے کر شرق و غرب میں داخل ہو گئے اور انہوں نے جدید رسالت اور اس کے ذریعہ آیا ہوا نظام اسلام اور نظام شریعت تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا۔جس طرح اسلام کا مزاج تھا۔جن لوگوں نے یہ جھنڈے بلند کیے وہ اس مقصد کے لیے صالح ترین لوگ تھے ۔ جنھوں نے اسے اٹھایا اور پوری دنیا میں پھیلا دیا۔جب وہ اسے لے کر اٹھے تو اسلام کی تولید و تشکیل ایک بہترین ماحول میں ہو چکی تھی ۔

یہ بات کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے جزیرۃ العرب میں اسلام کے مکمل غلبے تک زندہ رکھا اور پورے جزیرۃ العرب کو مشرکین اور شرک کے آثار سے بھی پاک کر دیا گیا۔پھر اس دعوت کے لیے عربی زبان کو بھی محض اتفاق سے نہ چنا تھا بلکہ دنیا کی زبانوں میں یہ اس دعوت کے پھیلانے کے لیے نہایت ہی موزوں زبان تھی ۔ یہ ایک مکمل اور پختہ زبان تھی ۔ اس کے اندر وسعت کی بے پناہ صلاحیت تھی اور اس دعوت کے مقاصد کے لیے اس وقت اس سے زیادہ بہتر اور کوئی زبان نہ تھی ۔ اگر یہ کوئی اور زبان ہوتی یا اس زبان کی تشکیل اور ساخت میں کوئی جھول ہوتی تو اس کے لیے ممکن نہ ہوتا ہے کہ یہ زبان دعوت اسلامی کے مقاصد کو پورا کر سکتی اور نہ یہ زبان اس دعوت کو جزیرۃ العرب کے باہر پھیلا سکتی ۔ غرض جس طرح رجال عرب اس دعوت کا بوجھ اٹھانے کے لیے موزوں تھے اسی طرح ان کی زبان بھی موزوں تھی ' (یہ زبان پھر قرب و جوار کے ملکوں کی زبان بن گئی) ۔

غرض یہ وہ قدرتی سازگاریاں تھیں جو اس رسالت کے جزیرۃ العرب سے آغاز میں مضمر تھیں ۔ لیکن تمام وجوہات کے مقابلے میں اصل وجہ یہی ہے جو خود قرآن نے بتائی ہے ۔

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ "اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں رکھتا ہے"۔ بہرحال غور و تدبر سے حکمت الٰہیہ کو معلوم کیا جا سکتا ہے ۔

لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَھَا وَتُنْذِرَ یَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَیْبَ فِیْہِ فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ (۴۲ : ۷) "تاکہ تم بستیوں کے مرکز اور اس کے گردو پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو ' اور جمع ہونے کے دن سے ڈراؤ جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ۔ ایک گروہ کو جنت میں جانا ہے اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں"۔ قرآن کریم میں ڈراوے کا ذکر بہت آتا ہے ۔ بار بار مختلف طریقوں سے لفظ انذار آتا ہے ۔ اس سے مراد یوم قیامت سے ڈرانا ہے ۔ پوری دنیا کی تاریخ میں جس زمان و مکان میں انسان پیدا ہوئے اور فوت ہوئے ۔ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو جمع کرے گا اور پھر ان کی گروہ بندی ہو گی '

فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ (۴۲ : ۷) "ایک گروہ جنت میں جائے گا اور ایک جہنم میں"۔ جس طرح انہوں نے اس دنیا میں عمل کیا' جو دار العمل ہے اور جو رویہ انہوں نے اپنی اس مختصر زندگی میں اختیار کیا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَھُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِہٖ وَالظّٰلِمُوْنَ

مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۴۲ : ۸) "اگر اللہ چاہتا ہے تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے اور نہ مددگار"۔ اگر اللہ چاہتا تو انسانوں کی تخلیق ہی دوسرے انداز سے کرتا جس میں ان کا رویہ ایک جیسا ہوتا۔ ان کا انجام بھی ایک ہی ہوتا' یا سب جنتی ہوتے یا سب جہنمی ہوتے لیکن اللہ نے اس انسان کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ اور اس خلافت کا تقاضا یہ تھا کہ انسان ایسا ہو جیسا کہ وہ ہے۔ انسان کو خصوصی استعداد دی جائے' اس استعداد کے ذریعہ وہ فرشتوں سے بھی ممتاز ہو اور شیاطین سے بھی ممتاز ہو۔ اور اللہ کی دوسری مخلوقات سے بھی ممتاز ہو۔ جن کی تخلیق کسی محدود مقصد کے لیے ہے اور ان کا ایک ہی رویہ ہے۔ اس استعداد کے ذریعہ بعض انسان ہدایت اور نور کی طرف آ جائیں' عمل صالح کریں' اور بعض لوگ گمراہی اور تاریکی کی طرف چلیں اور برے کام کریں۔ ہر انسان ان احتمالات میں سے ایک طرف جھک جائے جو اس کی طبیعت میں رکھے ہوئے ہیں اور پھر اس احتمال کے لیے جو انجام مقرر ہے اس سے دوچار ہو' یعنی ایک فریق جنت میں جائے اور دوسرا دوزخ میں۔ اور اس طرح یہ بات حق بن جائے کہ۔

یُدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِہٖ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَھُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۴۲ : ۸)

"اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے اور نہ مددگار"۔ اور اللہ کی مشیت نے اپنا کام اپنے سابق علم کی وجہ سے کیا۔ انسان اس کی ہدایت کی وجہ سے اس کی رحمت کا مستحق ہوا اور ضلالت کی وجہ سے وہ گمراہی و عذاب کا مستحق ہو گیا۔

اس سے قبل یہ بات گزر گئی کہ بعض لوگوں نے اللہ کے سوا اور سرپرست بنا رکھے تھے۔ یہاں یہ فیصلہ دے دیا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا تو کوئی ولی و مددگار نہ ہو گا۔ لہٰذا جن کو وہ ولی و مددگار پکڑتے ہیں تو' یہ ایک فضول حرکت ہے ان کی جانب سے کیونکہ ان کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ پھر پوچھا جاتا ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ (۴۲ : ۹) "کیا انہوں نے اللہ کے سوا اور ولی و مددگار پکڑ رکھے ہیں؟" یہ سوال استنکاری اس لیے ہے کہ ان کو متوجہ کر کے یہ فیصلہ دے دیا جائے کہ اللہ وحدہ ولی و مددگار ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور اس سے اس کی قدرت واضح ہوتی ہے۔ مردے کو حیات دینا یہ بہت بڑی قدرت ہے۔

فَاللّٰہُ ھُوَ الْوَلِیُّ وَھُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰی (۴۲ : ۹) "اللہ ہی ولی و مددگار ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے"۔ اس کے بعد اس خصوصی قدرت کے مظہر یعنی احیائے موتٰی کے بعد عام قدرت کا ذکر کیا جاتا ہے۔

وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۴۲ : ۹) "اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔ اس کی قدرت صرف احیائے موتٰی تک محدود نہیں۔

--- ○○○ ---

پھر روئے سخن اس سورت کے موضوع اول کی طرف مڑتا ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں اپنے تمام اختلافات کس معیار

پر رفع کیے جائیں گے ۔ یہ وحی واحد معیار حق ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہے ' یہ صراط مستقیم ہے اور مکمل اسلامی نظام زندگی آنے کے بعد تم نے تمام اختلافات اس کے مطابق ختم کرنے ہیں ۔ اب یہ نہ ہو گا کہ ہر شخص ہوائے نفس کے مطابق چلے :

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿١٠﴾ فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَمِنَ الْأَنْعَامِ أَزْوَاجًا ۖ يَذْرَؤُكُمْ فِيهِ ۚ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿١١﴾ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١٢﴾

" تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو ' اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے وہی اللہ میرا رب ہے ' اسی پر میں نے بھروسہ کیا ' اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں ۔ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ' جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے ' اور اسی طرح جانوروں میں بھی (انہی کے ہم جنس) جوڑے بنائے ' اور اس طریقہ سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے ۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ' وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے ' آسمان اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں ' جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے ' اسے ہر چیز کا علم ہے ۔

ان حقائق کو اس ایک پیراگراف میں پیش کرنے کا طریقہ بڑا عجیب ہے ۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ ان حقائق کے درمیان ایک باریک اور خفیہ ربط موجود ہے ۔ یہ کہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہیں ' ان کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲ : ۱۰) " تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو ' اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے " ۔ اور اللہ نے اپنا فیصلہ اس قرآن میں نازل کر دیا ہے اور اس قرآن نے دنیا و آخرت دونوں کے بارے میں فیصلے کر دیئے ہیں اور لوگوں کی زندگی کے لیے انفرادی اور اجتماعی منہاج اس کے اندر ضبط کر دیا ہے ۔ ان کے نظام زندگی ' ان کے نظام معیشت ' ان کے نظام قانون ' ان کے نظام سیاست اور ان کے نظام اخلاق و سلوک کے تمام امور قرآن کریم نے طے دیئے ہیں اور ان موضوعات پر کافی و شافی بیان دے دیا ہے ۔ اس قرآن کو انسانی زندگی کا دستور العمل بنا دیا ہے ۔ یہ تمام دنیا کے دساتیر سے زیادہ جامع و مانع ہے ۔ اگر ان کے درمیان کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اس کا حکم اس قرآن میں تیار ہے اور حاضر ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے ۔ اور آپ نے اس قرآن کی اساس پر نظام زندگی قائم کر کے بتا دیا ہے ۔

اس ہدایت کے بعد اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر شروع ہوتی ہے کہ آپ نے اعلان کر دیا کہ آپ اپنے امور تمام کے تمام اللہ کے حوالے کرتے ہیں اور اس طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ یہ ہے رب تعالیٰ جس نے مجھے یہ کلیہ دیا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ (۴۲ : ۱۰) "وہی اللہ میرارب ہے' اس پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں"۔ یہ انابت اور یہ توکل اور یہ اقرار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہاں ریکارڈ کیا جاتا ہے تاکہ اس کا لوگوں پر ایک نفسیاتی اثر ہو کہ دیکھو یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ کے نبی ہیں' وہ بھی شہادت دیتے ہیں کہ اللہ ہی ان کا رب اور حاکم ہے اور یہ کہ آپ اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں' اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ لہٰذا دوسرے انسان اور مسلمان اپنے اختلافات میں کس طرح کسی اور کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اور نبی جو ہدایت پر ہیں اپنے فیصلے اللہ ہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ لہٰذا تمام لوگوں کو بطریق اولیٰ اپنے فیصلے قرآن کی طرف لے جانے چاہئیں۔ اور اس سے کسی جگہ بھی ایک لمحے کے لیے بھی ادھر ادھر نہیں ہونا چاہئے۔ اور کس طرح وہ اپنے امور میں کسی دوسری جانب جا سکتے ہیں جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود بھی کسی دوسری طرف نہیں جاتے۔ اللہ ہی کی طرف رجوع فرماتے ہیں کیونکہ رب بھی اللہ' والی بھی اللہ' کفیل بھی اللہ اور یہ اللہ ہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جدھر موڑنا چاہتا ہے' موڑتا ہے۔

جب کسی مومن کے دل میں یہ حقیقت بیٹھ جاتی ہے تو اس کا راستہ روشن ہو جاتا ہے' اس کے سفر زندگی کے نشانات واضح ہو جاتے ہیں اس لیے وہ اپنے سفر میں ادھر ادھر دیکھتا ہی نہیں۔ طمانیت کا ایک لبریز پیمانہ اس کے دل پر انڈیل دیا جاتا ہے اور اس کے مقامات قدم پر اعتماد بچھا دیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ نہ شک کرتا ہے' نہ تردد کرتا ہے' اور نہ حیرت زدہ ہوتا ہے۔ اس کو یہ شعور مل جاتا ہے کہ اللہ اس کا حامی' نگہبان' محافظ اور اس کے قدموں کو درست رکھنے والا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس راستے کے راہی رہے ہیں۔

جب مومن کے ضمیر میں اور شعور میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے تو اس کے نظام زندگی اور طرز زندگی کے بارے میں اس کا شعور اور اس کی سوچ بلند ہو جاتی ہے' اس لیے وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ اسلامی نظام زندگی کے سوا اور بھی کوئی قابل التفات منہاج ہو سکتا ہے۔ نہ وہ یہ تصور کر سکتا ہے کہ اللہ کے حکم اور فیصلے کے سوا اور بھی کوئی حکم اور فیصلہ ہو سکتا ہے' جس کی طرف اختلاف کی صورت میں کوئی نگاہ بلند کر سکے۔ جبکہ ہادی اور نبی بھی اپنے فیصلوں میں اللہ کی شریعت اور حکم کی طرف ہی دیکھتے ہیں۔

اب ایک بار پھر اس حقیقت کو ذہن نشین کیا جاتا ہے تاکہ وہ اچھی طرح مومن کے شعور کی گہرائی تک اتر جائے۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (۴۲ : ۱۱) "آسمانوں اور زمین کا بنانے والا جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے اور اس طرح جانوروں میں بھی جوڑے بنائے' اور اس طریقے سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا

ہے"۔ اللہ قرآن کو نازل کرنے والا ہے کہ اس کا حکم تمہارے اختلافات کے اندر فیصل ہو۔ وہی اللہ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین کا مدبر ہے۔ زمین اور آسمان میں جو قانون قدرت چلتا ہے' وہ زمین اور آسمان کے امور میں فیصلہ کن ہے۔ لوگوں کی زندگیوں کے معاملات بھی دراصل اس کائنات ہی کا ایک حصہ ہیں' لہٰذا لوگوں کی زندگیوں میں قانون خداوندی کا اجراء دراصل لوگوں کی زندگیوں کو اس پوری کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر دے گا۔ اس طرح تمام انسان اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ اور ہم قدم ہو کر چلیں گے۔ جبکہ کائنات میں حکمرانی میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ لہٰذا انسان کی زندگی میں حکمرانی اس کی ہوگی۔

وہ اللہ جس کے حکم کی طرف لوگوں نے اپنے اختلافات میں رجوع کرنا ہے' وہ اللہ وہی ذات ہے جو تمہارا خالق ہے۔ تمہارے نفوس کو اسی نے بنایا ہے اور یہ اپنی مخلوق کو اچھی طرح جانتا ہے۔ پھر۔

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (۴۲ : ۱۱) "پھر تمہاری جنس ہی سے تمہارے لیے جوڑے بنائے"۔ اس طرح تمہاری زندگی کی بنیاد کی تشکیل ایک خاندان کی صورت میں ہوئی' لہٰذا وہی جانتا ہے کہ کس طرح یہ زندگی درست ہو سکتی ہے' اور انسان کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے' اللہ وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق اس طرح کی جس طرح تمام دوسری زندہ مخلوق کو اس نے بنایا اور ان کے بھی جوڑے بنائے۔

وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا (۴۲ : ۱۱) "اور اسی طرح جانوروں میں بھی جوڑے بنائے"۔ تخلیق میں وحدت نظام اور تسلسل نوع' یہ ظاہر کرتا ہے کہ خالق ایک ہی ہے۔ تم اور مویشی اسی نظام کے مطابق تکاثر و تناسل کے عمل سے گزرتے ہو۔ جبکہ اللہ کی مثال اپنی مخلوقات میں سے نہیں ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (۴۲ : ۱۱) "کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں"۔ انسانی فطرت اس اصول کو تسلیم کرتی ہے کیونکہ کوئی چیزیں اگر کسی نے بنائی ہیں تو خالق کسی طرح بھی ان کے مماثل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اس بے مثال خالق کے احکام ہی کی طرف لوٹیں۔ خصوصاً اس دنیا میں اپنے اختلافات کے معاملے میں۔ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رجوع نہ کریں۔ کیونکہ وہ بے مثال خالق و حاکم ہے۔ لہٰذا ایک مرجع کے سوا کوئی اور مرجع اور جائے فیصلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ جیسا کوئی نہیں ہے۔

باوجود اس کے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے مشابہ کوئی شئی اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اللہ اور اس کی مخلوقات کے درمیان رابطہ باقی اور قائم ہے۔ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور پھر دیکھنے اور سننے والے کی طرح فیصلے کرتا ہے۔ اور اللہ جس اختلافی معاملے میں فیصلہ کرتا ہے وہ پھر آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ اس معنی میں کہ کنجیاں سب کائنات کی اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اس وقت سے ہیں جب سے اس نے اس کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے اور اس کے لیے ایک ناموس فطرت بنا کر اس میں اسے رائج کر دیا ہے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴۲ : ۱۲) "آسمان اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے ہاتھ

میں ہیں"۔ لہٰذا انسانوں کے اختیارات بھی اسی کے ہیں کیونکہ انسان بھی اس کائنات کا حصہ ہیں۔ لہٰذا انسانوں کی کنجیاں بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

پھر وہ اللہ ہی ہے جو انسانوں کے رزق کی کشادگی اور تنگی کے اختیارات رکھتا ہے۔ اور یہ رزق ان کو زمین و آسمان کے خزانوں سے دیتا ہے۔

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ (۴۲ : ۱۲) "جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے، نپا تلا دیتا ہے"۔ وہ ان کا رازق ہے، وہ ان کا کفیل ہے، وہ ان کو کھانا دینے والا ہے، ان کو پلانے والا ہے لہٰذا وہ غیر اللہ کے متوجہ کیوں ہوتے ہیں کہ وہ ان کے درمیان فیصلے کرے۔ حق تو یہ ہے کہ لوگ فیصلوں کے لیے رازق اور کفیل کی طرف رخ کریں جو رزق اور دوسرے معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔

اِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۴۲ : ۱۲) "اسے ہر چیز کا علم ہے"۔ فیصلہ وہی ذات کر سکتی ہے جو علم رکھتی ہے اور اسی کا فیصلہ عادلانہ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ یوں اس پوری تقریر کے معانی نہایت ہی دقیق و لطیف انداز میں باہم مربوط اور متناسب ہیں تاکہ وہ انسانی قلب و عقل پر اثر انداز ہوں اور عقل و خرد کی تاروں پر ایسی چوٹ لگائیں کہ ان سے نہایت ہی گہرا، موزوں اور خوش آواز زمزمہ پیدا ہو۔

--- ○○○ ---

اب پھر وحی الٰہی کی طرف :

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِى اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۶﴾

"اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے' اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں' اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف (اے محمدؐ) تم انہیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے' اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا' وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا' اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تیرا رب پہلے ہی نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقررہ تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے' وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ (چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے) اس لیے اے محمدؐ اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو' اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ' اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو' اور ان سے کہہ دو کہ: "اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا' مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔ اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ (لبیک کہنے والوں سے) اللہ کے معاملہ میں جھگڑے کرتے ہیں' ان کی حجت بازی ان کے رب کے نزدیک باطل ہے' اور ان پر اس کا غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے"۔

اس سورت کے آغاز میں آیا تھا۔

كَذٰلِكَ يُوْحِىْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۲: ۳) "اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کی طرف وحی کرتا رہا ہے"۔ یہ ایک اجمالی اشارہ تھا کہ وحی الٰہی کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور اس وحی نے جو نظام پیش کیا ہے' یہ وہی ہے جو سابقہ رسولوں نے پیش کیا تھا' اور اس وحی کا رخ بھی اسی طرف ہے جس طرف سابقہ انبیاء کا تھا۔ اب اس اشارے کی تفصیلات دی جا رہی ہیں کہ اللہ نے مسلمانوں کے لیے جو نظام زندگی اور جو شریعت وضع کی ہے' وہ عمومی اصولوں میں وہی ہے جو حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو دی گئی تھی۔ سب کو حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کے واحد دین کو قائم

کرو' اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو' اور تمہارا فرض ہے کہ اللہ کے اس قدیم نظام زندگی پر جم جاؤ اور جو لوگ اس سے ادھر ادھر دیکھتے ہیں' محض خواہشات نفسانیہ پوری کرنے کے لیے تو ان کی طرف کوئی توجہ نہ کرو' اس دین کو غالب کرو' اور جو لوگ اس دین کے خلاف حجت بازیاں کرتے ہیں' ان کی حجت کو رد کر کے باطل کر دو' اور ان کو اللہ کے غضب اور شدید عذاب سے ڈراؤ۔

اس پیراگرف کے فقروں کے اندر بھی نہایت ہی لطیف ربط ہے جس طرح سابقہ پیراگراف کے فقروں میں ہم نے بیان کیا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (۴۲:۱۳) ''اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے' اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں' اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ''۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کو واضح کر دیا جاتا ہے جس کی تفصیلات ہم نے سورت کے آغاز میں دیں کہ ادیان کی جڑ ایک ہے۔ زمان و مکان کے لحاظ سے مختلف زمانوں میں اس کی نشوونما ہوئی۔ اس سے حس مومن میں ایسے تصورات و لمحات آتے ہیں کہ وہ سوچتا ہے کہ اس کا ماضی بہت طویل ہے اور اس کے سلف بہت ہی عظیم لوگ ہیں اور وہ ایسے عظیم لوگوں کا تابع اور پیروکار ہے۔ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اجمعین۔ یہ شعور پختہ ہوتا ہے کہ یہ دین ادیان سابقہ ہی کا تسلسل ہے اور یہ کہ وہ انبیاء و رسل کے راستے ہی پر رواں دواں ہے۔ اور اس راستے پر وہ نہایت خوشی سے چل رہا ہے۔ اگرچہ اس میں تھکاوٹ ہو' مشکلات ہوں اور اسے اپنے بے شمار مفادات قربان کرنے پڑیں۔ مومن کو یہ پختہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ وہ عظیم لوگوں کے قافلے کا فرد ہے اور یہ قافلہ پوری انسانی تاریخ میں عظیم لوگوں کا قافلہ ہے۔

یہ کہ جو لوگ اللہ کے اس دین پر چلنے والے ہیں' ان کے درمیان دائمی امن و آشتی ہے۔ یہ ایک مستقل شریعت اور شاہراہ پر قائم ہیں۔ ان کے درمیان کوئی اختلاف اور دشمنی نہیں ہے بلکہ ان کے درمیان تو گہرے تعلقات و روابط ہیں۔ یہ تعلقات و روابط باہمی مزید تعلق اور مفاہمت کا تقاضا کرتے ہیں۔ یوں مومنین کا حال ان کے ماضی سے مربوط ہو جاتا ہے اور ان کا ماضی ان کے حال سے جڑ جاتا ہے اور وہ سب وہ ایک ہی راستے پر چل پڑتے ہیں۔

اگر اسلامی نظام اور شریعت جو اللہ نے مومنین اور مسلمین کے لیے مقرر کی ہے' وہی ہے جس کی وصیت اور تاکید حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو بھی اس سے قبل کی گئی تھی تو پھر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے متبعین باہم کیوں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین میں سے مختلف فرقے کیوں باہم دست و گریباں ہیں۔ پھر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے متبعین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کے ساتھ کیوں عناد رکھتے ہیں۔ پھر وہ لوگ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں یعنی مشرکین عرب تو ان کے لیے کیا جواز ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور وہ کیوں نبی آخر

الزمان کے جھنڈے تلے جمع نہیں ہوتے جن کی دعوت یہ ہے کہ تمام پیروکاران دین کو یہ وصیت کی گئی تھی کہ۔

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (۴۲ : ۱۳) ”دین کو قائم کرو اور اس میں فرقے نہ بنو“۔ اور کیوں اپنے فرائض ادا نہیں کرتے، کیوں ایسا نہیں کرتے کہ وہ انحراف کو چھوڑ دیں۔ کج روی سے توبہ کریں اور کیوں پھر یہ لوگ، آخری نبی کے جھنڈے تلے صف واحد کی صورت میں کھڑے نہیں ہوتے۔ کیونکہ حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے بعد اب حضرت محمد کی باری ہے اور یہ امانت اب ان تک پہنچی ہے۔

مشرکین جو ام القریٰ میں بستے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ دین ابراہیمی پر ہیں وہ دعوت اسلامی کے مقابلے میں ایک معاند اور مخالف کے طور کھڑے ہیں۔ یہ کیوں؟

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ (۴۲ : ۱۳) ”یہ بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف تم انہیں دعوت دے رہے ہو“۔ ان کو یہ بات ناگوار ہے کہ ان میں سے محمد ابن عبداللہ پر وحی کیوں آئی۔ حالانکہ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ وحی دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر نازل ہوگی۔

عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ یعنی ان دو گاؤں کے کبراء اور اہل اقتدار میں سے کسی پر نازل ہوتی۔ لیکن خود ان کی یہ بات بھی حقیقت واقعہ کے طور پر درست نہ تھی، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے قول کے مطابق صادق و امین تھے۔ اور آپ قریش کے ایک ممتاز قبیلے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ تو بے شک عظیم آدمی تھے۔

ان پر یہ نئی دعوت شاق گزرتی تھی کیونکہ اگر یہ کامیاب ہوتی ہے تو بت پرستی کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ بت اور بتوں کے افسانے ختم ہو جاتے ہیں اور اسی پر تو ان کی سیادت و قیادت قائم تھی۔ ان کے ذاتی اور اقتصادی مفادلت انہی تصورات سے وابستہ تھے، لہٰذا انہوں نے شرک کو سینے سے لگا لیا اور خالص توحید پر مبنی دعوت ان پر بھاری تھی، جس کی طرف رسول بلاتے تھے۔

پھر ان پر یہ بات بھی گراں گزر رہی تھی کہ ان کے جو آباء و اجداد جاہلیت پر مرگئے ہیں وہ گمراہی پر گئے اور وہ کافر اور جہنمی تھے۔ لہٰذا انہوں نے کہا اگر آباء جہنمی ہیں تو ہم بھی ہیں۔ یوں وہ ضد میں آگئے اور غلط راہ عناد کی وجہ سے پکڑ لی۔ اور عمداً اپنے آپ کو جہنم میں گرانے کے لیے تیار ہو گئے۔ محض اس لیے کہ وہ اپنے آباء کو گمراہ قرار دینے کے لیے تیار نہ تھے۔

قرآن کریم ان کے اس موقف کی تردید یوں کرتا ہے کہ یہ اللہ کا اختیار ہے کہ جسے چاہے، چن لے۔ اس طرح اللہ اپنی جانب صرف اسی کو متوجہ کرتا ہے جو اللہ کی پناہ میں آنا چاہے اور دھتکارے ہوئے لوگوں کو بذریعہ توبہ واپس کرتا ہے:

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (۴۲ : ۱۳) ”اللہ جسے چاہتا ہے، اپنا لیتا ہے اور جو اپنی طرف اسی کو راستہ دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے“۔ تو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چن لیا۔ اور جو بھی اب اللہ کے بتائے ہوئے راستے کی طرف متوجہ ہو گا اللہ اسے ہدایت دے دے گا۔

اب روئے سخن مذکور بالا بڑے انبیاء کے متبعین کے موقف کی طرف پھرتا ہے' جن کو اللہ نے ایک ہی دین دے کر بھیجا تھا اور انہوں نے قوم کے سامنے ایک ہی دین پیش کیا تھا مگر متبعین نے اس میں تفرقہ اختیار کر لیا :

وَمَا تَفَرَّقُوْآ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآئَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۴۲ : ۱۴) "لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا' وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا' اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تیرا رب پہلے ہی نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقررہ تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے' وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔ ایک تو یہ کہ یہ اختلافات جہالت کی وجہ سے نہ تھے۔ یہ وجہ نہ تھی کہ ان کو اس اصل حقیقت کا پتہ نہ تھا اور یہ پتہ نہ تھا کہ رسولوں کی تعلیم کا ماخذ کیا ہے بلکہ انہوں نے اچھی طرح جانتے بوجھتے شک کیا۔ آپس کی دشمنی کی وجہ سے تفرقہ کیا۔ بغض اور حسد کی وجہ سے یہ اختلافات ہوئے۔ ظالمانہ خواہشات نے مجبور کیا کہ وہ تفرقہ کریں۔ اور ناقابل کنٹرول خواہشات نفس نے ان کو مجبور کیا۔ یہ تفرقہ اس لیے نہیں ہوا کہ ان کے پاس درست عقائد کے لیے کوئی دلیل نہ تھی یا جو نظام زندگی انہیں دیا گیا تھا' اس میں سے ان کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ اگر وہ اپنے حقیقی عقیدے اور شریعت پر مخلصانہ طور پر قائم رہتے تو تفرقہ نہ کرتے۔

یہ لوگ اس بات کے مستحق تھے کہ اللہ ان کو پکڑ لیتا اور ان پر جلدی اللہ کا عذاب آ جاتا' ان کی سرکشی اور ان کے ظلم کی وجہ سے جو انہوں نے یہ تفریق کر کے دین حق کے ساتھ کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے تدبیر کائنات کے سلسلے میں پہلے سے ایک فیصلہ کر دیا تھا اور ان کو ایک مقررہ وقت تک مہلت دے دی گئی تھی۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ (۴۲ : ۱۴) "اگر تیرا رب پہلے یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقرر تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا"۔ اور اس طرح ان اختلافات میں حق' حق ہو چکا ہوتا اور باطل باطل ہو چکا ہوتا اور معاملہ اس دنیا ہی کی زندگی میں ہی ختم ہو چکا ہوتا لیکن ان کو وقت معلوم تک مہلت دے دی گئی ہے۔

وہ نسلیں جو ان ابنائے سابقین کے پہلے متبعین کی وارث بنیں جنہوں نے تفرقہ کیا تھا۔ اور یہ کتاب ان کو ملی تو ان کو یہ کتاب اور یہ نظریہ یقینی انداز میں نہ ملا۔ کیونکہ اختلافات کا ریکارڈ ان کے سامنے تھا اور اس سے کوئی جزمی اور قطعی بات سامنے نہ آتی تھی۔ تمام فرقہ وارانہ اختلافات عمل' غیر واضح اور پریشان کن تھے۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ (۴۲ : ۱۴) "اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے تھے"۔ یوں ہوتا ہے عقیدہ تو اس مضبوط چٹان کی طرح ہوتا ہے جس کے ارد گرد سے زمین حرکت میں ہوتی ہے لیکن

وہ مضبوط ہوتا ہے۔اور ایک مومن اس راسخ چٹان پر مضبوطی سے جم جاتا ہے اور اسے کوئی زلزلہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور عقیدہ وہ ستارہ ہوتا ہے جو اپنی جگہ جما ہوا ہوتا ہے اور لہروں اور طوفانوں کے باوجود مومن کی نظر بلند افق پر اپنے ستارے پر ہوتی ہے جو سمت کا تعین کرتا ہے۔اس طرح ایک مومن راستہ نہیں بھولتا اگرچہ تاریک سمندروں میں ہو۔ لیکن جب عقیدہ اور نظریہ ہی مشکوک ہو جائے تو پھر کسی کی کوئی بات مستقل نہیں ہو سکتی۔نہ کسی بے عقیدہ شخص کی کوئی بات مستقل ہو سکتی ہے۔نہ ایسا شخص کسی بھی سمت پر مستقل رہ سکتا ہے۔نہ کسی راستے پر مطمئن ہو سکتا ہے۔

عقیدہ اور نظریہ ہوتا ہی اس لیے ہے کہ لوگوں کا نصب العین اور ان کی سمت متعین کرے اور پھر وہ دوسرے لوگوں کی اس راہ پر چلتے ہوئے قیادت کریں۔اگر وہ خود اضطراب اور شک میں پڑے ہوں تو وہ کسی کی قیادت نہیں کر سکتے۔ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار ــــ جب اس دنیا میں دین اسلام آیا تو امم سابقہ کے متبعین کی یہی حالت تھی۔مولانا ابو الحسن علی ندوی اپنی "کتاب عالم اسلام میں مشرقیت و مغربیت کی کشمکش" میں لکھتے ہیں :

"حقیقت یہ ہے کہ دوسرے بڑے ادیان کے لیڈر کھیلنے والوں اور کھلاڑیوں کے ہاتھ میں شکار ہیں اور ان پر تحریف کرنے والوں اور منافقوں کا اثر ہے۔یہ ادیان اپنی روح اور شکل گنوا بیٹھے ہیں۔اگر ان ادیان کے پہلے ماننے والوں کو اللہ اب زندہ کر دے تو وہ خود اپنے نام سے منسوب ان ادیان کو نہ پہچان سکیں۔چنانچہ کبھی تو یہ ادیان تہذیب و تمدن اور حکومت و سیاست عطا کرنے والے تھے۔اب وہاں سے بدنظمی' خلل اور اختلافات اور طوائف الملوکی ہوتی ہے' حکام بدعمل ہیں' اپنی ذات میں گم ہیں۔ان کے پاس اقوام اور دنیا کے لیے کوئی پیغام نہیں ہے۔مقاصد عالیہ کے اعتبار سے وہ مفلس ہیں۔ان کی زندگی کے سوتے خشک ہو چکے ہیں' ہدایات سماوی کی روشنی میں ان کے پاس کوئی راہ نہیں ہے' نہ کوئی مستقل اور محکم نظام زندگی ہے۔

مشہور امریکی مصنف جارج ایچ۔ڈنسن اپنی کتاب جذبات بحیثیت اساس تمدن (Emotion as the basis of civilisation) میں لکھتے ہیں :

"پانچویں صدی اور چھٹی صدی عیسوی میں اہل دین کی دنیا تباہی کے ایک گہرے گڑھے کے دہانے پر تھی۔کیونکہ جو نظریات تمدن کو جنم دینے میں مدد و معاون تھے' وہ ختم ہو چکے تھے اور اس وقت کے موجودہ ادیان کی جگہ لینے کے لیے کوئی نظریہ موجود نہ تھا۔اور یہ واضح طور پر نظر آنے لگا تھا کہ جس انسانی تہذیب کی تعمیر و ترقی پر چار ہزار سال گزرے تھے وہ ختم اور برباد ہونے والی ہے اور انسانیت دوبارہ جہالت' قبائلی نظام کے چنگل میں پھنسنے والی ہے' جس میں کوئی قانون و نظام نہیں ہوتا کیونکہ مسیحیت نے جو اجتماعی نظم و نسق قائم کیا تھا' اس کی عمارت گرنے ہی والی تھی۔اس لئے کہ عیسائیت فرقے فرقے ہوگئی تھی۔اس کے اندر کوئی اتحاد اور نظم نہ تھا۔اس دور میں تمدن کی مثال اس طرح تھی کہ وہ ایک عظیم درخت کی طرح تھی جس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اور اس کا سایہ تمام دنیا پر چھایا ہوا تھا' یہ درخت سخت طوفانوں کی زد میں نہایت کمزوری کی حالت میں کھڑا تھا اور ہلاکت اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی' کہ اس اثناء میں ایک شخص (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہو گیا"۔

یہ صورت حال اس لیے تھی کہ ادیان سماوی کے حاملین نے باہم سخت اختلافات شروع کر دیئے تھے' بعد اس کے کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا۔اور ادیان کے اصحاب اولین کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنے تھے ان کو ان کتابوں کی

صداقت کے بارے ہی میں شک تھا۔ان وجوہات سے اور پوری دنیا میں انسانیت کی قیادت کے لیے کسی مرکز کے ناپید ہو جانے کی وجہ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا اور آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ سیدھے راستے پر چل پڑیں لوگوں کو دعوت دیں اور آپ کی واضح اور بین نظریات اور آپ کی مستحکم دعوت کے بارے میں لوگ جو چاہیں کہیں۔ آپ کسی کی طرف متوجہ نہ ہوں اور یہ اعلان کر دیں کہ یہ دعوت اور یہ نظام وہی ہے جو اللہ نے تمام انبیاء کو دیا تھا اور اس کے بارے میں وصیت کی تھی۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۴۲ : ۱۵) "(چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے) اس لیے اے محمدؐ اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو' اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ' اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو' اور ان سے کہہ دو کہ: "اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا' مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے"۔

اب دعوت اسلامی گویا پوری انسانیت کے لیے نئی قیادت تھی۔یہ ایک دانشمند' صحیح الفکر قیادت تھی جس کا نظام زندگی واضح تھا' جس کو یقین محکم حاصل تھا۔یہ اللہ کی طرف بلاتی تھی اور اپنے مقصد کے لیے علی وجہ البصیرت کام کر رہی تھی اور بغیر کسی کج روی کے امر الٰہی پر گامزن تھی۔اور وہ اپنے فیصلوں میں بدلتے ہوئے مقاصد اور بدلتی ہوئی خواہشات کے پیچھے نہ جاتی تھی۔ایسی قیادت جس کا پیغام ایک تھا' جس کی کتاب ایک تھی' نظام و شریعت ایک تھا' جس کا ایمان ماخذ ایمان کی طرف راجع تھا۔اور جس نے تمام انسانیت کو ایک اہم اصول کی طرف لوٹا دیا تھا۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ (۴۲ : ۱۵) "اور ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں"۔اس کے بعد یہ دعوت یہ تحریک دعوت حق کو لے کر دنیا میں سربلند ہوتی ہے اور اقتدار اعلیٰ حاصل کرتی ہے تاکہ وہ لوگوں کے درمیان عدل کرے۔

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (۴۲ : ۱۵) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں"۔یہ ایسی قیادت ہے جس کے پاس اقتدار بھی ہے اور یہ زمین میں عدل گستری کا اعلان کرتی ہے۔(یہ بات حضورؐ اس وقت کر رہے ہیں جب دعوت اسلامی مکہ میں ہے اور داعی اور تحریک شعب ابی طالب میں محصور ہیں' ان پر مصائب کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں لیکن وہاں بھی دعوت اسلامی کا مزاج' چھا جانے والا مزاج بالکل واضح ہے) (مترجم)۔یہ دعوت اعلان کرتی ہے کہ رب واحد ہے'

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ (۲ ٤ : ۱ ٥) "اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی"۔ اور یہ اعلان بھی کیا جاتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور جواب دہی انفرادی ہے۔

لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ (۲ ٤ : ۱ ٥) "ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے' تمہارے لیے ہیں"۔ اس لیے اب فضول بحث و مباحثہ ختم ہونا چاہئے۔

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۲ ٤ : ۱ ٥) "ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں"۔ ۔

اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۲ ٤ : ۱ ٥) "اللہ ہم سب کو ایک روز جمع کرے گا۔ اور اسی کی طرف لوٹنا ہے"۔

یہ ایک آیت ہے لیکن یہ دعوت اسلامی کے مزاج کی وضاحت پوری طرح کر دیتی ہے۔ اس آیت کے فقرے بھی چھوٹے چھوٹے ہیں' لیکن وہ نہایت ہی دو ٹوک اور فیصلہ کن بات کرتے ہیں۔ یہ ایک دعوت ہے جس نے اپنی راہ پر گامزن رہنا ہے اور انسانوں کی خواہشات کا کوئی لحاظ نہیں رکھنا۔ اس نے اس کرۂ ارض پر اقتدار اعلیٰ پر خالص ہونا ہے تاکہ وہ عدل کر سکے۔ اس نے تمام انسانوں کو ایک سیدھی راہ دکھانی ہے جو صراط مستقیم ہے اور یہی راہ تمام رسولوں کی راہ رہی ہے۔

چنانچہ دعوت اسلامی کی اس رنگ میں وضاحت کرنے کے بعد اور اہل ایمان کے ایک گروہ کی جانب سے اس دعوت پر لبیک کہنے کے بعد' الجھنے والوں اور بے فائدہ مباحثہ کرنے والوں کی باتوں کی طرف التفات کرنے کا کوئی موقعہ نہیں رہا ہے۔ ان کی تمام دلیلیں باطل ہو چکی ہیں' ان کا کوئی وزن نہیں ہے' نہ اہمیت ہے۔ لہٰذا ان کے بارے میں اب فیصلہ کن بات کر دی جاتی ہے اور ان کو اللہ کی شدید دھمکی کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ (۲ ٤ : ۱ ٦) "اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں' ان کی حجت بازی ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر اس کا غضب ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے"۔ جو لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور ان کی حجت اللہ کے نزدیک ہی باطل ہے تو پھر ان کا جھگڑا باطل ہے اور ان کی دلیل کی کوئی حیثیت نہیں۔ زمین پر بھی ان کی دلیل مسترد ہے اور آخرت میں ان کو اللہ کے شدید غضب اور عذاب کا سامنا کرنا ہو گا۔ اور یہ فضول جھگڑے اور حجت بازی ان کے لیے موزوں سزا ہے جبکہ وہ دیکھتے بھی ہیں کہ نہایت ہی مخلص اور دانشمند لوگوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ لہٰذا ان کی یہ بحث اور مناظرہ حق کی وضاحت کے بعد ہے اور کچھ دوسرے مقاصد کے لیے ہے۔

اب سیاق کلام کا رخ پھر پہلے موضوع کی طرف۔

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ

لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ﴿١٧﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ ۗ أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿١٨﴾ اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿١٩﴾

۲
۱۰ ع
۳

"وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب اور میزان نازل کی ہے اور تمہیں کیا خبر' شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آ لگی ہو۔ جو لوگ اس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے' وہ تو اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں' مگر جو اس پر ایمان رکھتے ہیں'وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یقیناً وہ آنے والی ہے۔ خوب سن لو' جو لوگ اس گھڑی کے آنے میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے جسے جو کچھ چاہتا ہے' دیتا ہے اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔ جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے' اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں' اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے' اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے"۔

اللہ نے ایک تو کتاب برحق نازل کی اور اس میں عدل نازل کیا۔ اس میزان عدل کے مطابق لوگوں کے اختلافات کے بارے میں حکم دینے اور فیصلہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ فیصلہ لوگوں کی خواہشات و دعاوی کے بارے میں ہو یا ان کی آراء کے بارے میں ہو یا عقائد و نظریات کے بارے میں۔ اور اللہ نے ایک نظام شریعت بھی نازل کیا جس کی اساس عادلانہ فیصلوں پر رکھی۔ قرآن نے عدل کے لیے میزان کا لفظ استعمال کیا۔ یعنی ایسا عدل کہ جس کے مطابق حقوق کا وزن کیا جا سکے۔ اعمال اور تصرفات کو تولا جا سکے۔

اب روئے سخن کتاب و میزان سے قیامت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور مناسبت مضمون واضح ہے کہ کتاب اور شریعت نے بھی لوگوں کے درمیان اس دنیا میں میزان لگا کر عدل کرنا ہے' اور آخرت میں بھی میزان لگا کر عدل و انصاف ہو گا۔ قیام قیامت چونکہ ایک غیب ہے اور اس کے قیام کی گھڑی کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ بہت ہی قریب ہو۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ (۴۲ : ۱۷) "اور تمہیں کیا معلوم کہ فیصلے کی گھڑی قریب آ لگی ہو"۔ اور لوگ اس سے غافل ہوں اور وہ ان کے قریب ہو۔ اور یہ آخری عدل و انصاف کا ترازو بھی نصب ہو جائے جہاں کسی عمل کو مہمل نہ چھوڑا جائے گا اور نہ کوئی گم ہو گا۔ یہاں قیامت کے بارے میں مومنین اور منکرین دونوں کی سوچ کو بتایا جاتا ہے۔

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ (۴۲ : ۱۸) "جو لوگ اس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے' وہ اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں' مگر جو اس پر

ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ یقیناً آنے والی ہے"۔ ظاہر کہ جو اس پر ایمان نہیں لاتے ان کے دلوں پر اس کا خوف ہی نہیں ہے اور ان کو اندازہ نہیں ہے کہ وہاں انہیں کیا پیش آنے والا ہے۔ اس لیے وہ بطور مزاح اس کے آنے کا مطالبہ کرتے ہیں' یا اس کے لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اندھے ہیں اور ان کو نظر ہی نہیں آتا۔ رہے وہ لوگ جو ایماندار ہیں تو انہیں قیامت پر بھی یقین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں اور نہایت خوف اور ڈر سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جب وہ آئے گی تو کیا ہو گا' وہ حق ہے۔ اس کا آنا حق ہے اور مومن اسے جانتا ہے کیونکہ مومن اور حق کے درمیان رابطہ ہے۔

اَلَآ اِنَّ الَّذِیْنَ یُمَارُوْنَ فِی السَّاعَةِ لَفِیْ ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ (۴۲ : ۱۸) "خوب سن لو' جو لوگ اس گھڑی میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں' وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں"۔ انہوں نے گمراہی میں غلو کر لیا ہے۔ اور اس راہ پر بہت دور نکل گئے ہیں' اب ان کے لیے اس قدر دور نکلنے کے بعد واپسی ممکن نہیں ہے۔ اب آخرت' اس کے انکار اور اس کے بارے میں لاپرواہی اور اس سے ڈرنے کے مضمون سے روئے سخن اس دنیا میں لوگوں کے رزق کی بحث کی طرف مڑتا ہے جو اللہ کسی کو کم' کسی کو زیادہ دیتا ہے۔

اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ (۴۲ : ۱۹) "اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے' جسے جو کچھ چاہتا ہے' دیتا ہے اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے"۔ بظاہر آخرت اور بندوں کے رزق کے مضامین کے درمیان کوئی خاص مناسبت اور ربط نظر نہیں آتا۔ لیکن بعد کی آیت پڑھنے کے بعد ربط ظاہر ہو جاتا ہے۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ (۴۲ : ۲۰) "جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے' اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا"۔ بس اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے' جسے جو کچھ چاہتا ہے' دیتا ہے۔ صالح کو بھی دیتا ہے' برے کو بھی دیتا ہے' مومن کو بھی دیتا ہے' کافر کو بھی دیتا ہے' کیونکہ انسان خود اپنے رزق کا بندوبست نہیں کر سکتے' جب اللہ نے ان کو زندگی دی ہے تو زندگی کے بنیادی اسباب بھی دیئے ہیں' اگر اللہ کافر' فاسق اور بدکار کو رزق نہ دیتا تو وہ اپنے رزق کا بندوبست تو خود نہ کر سکتے اور بھوک اور پیاس سے مر جاتے۔ جب وہ زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ رکھ کر مہلت دینے کا جو قانون مقرر فرمایا تھا' وہ پورا نہ ہوتا۔ اور یہ نہ ہو سکتا تھا کہ لوگ دنیا میں آزادانہ عمل کریں اور ان کے اعمال کا حساب آخرت میں ہو۔ اس لیے اللہ نے رزق کا معاملہ نیکی اور برائی کے دائرے سے باہر رکھا۔ ایمان و کفر کے ساتھ رزق کا تعلق نہیں ہے اور رزق کے معاملے کو انسانوں کی اجتماعی زندگی کے حالات پر رکھ دیا' پھر ان اجتماعی حالات میں بندوں کے طرز عمل پر رکھ دیا اور مال کو بھی لوگوں کے لیے فتنہ اور آزمائش بنا دیا جس پر جزاء و سزا کا دارومدار ٹھہرا۔

پھر آخرت اور دنیا کے لیے علیحدہ علیحدہ کھیت قرار دیا۔ ہر آدمی کو اختیار دے دیا کہ وہ دنیا کے کھیت میں محنت کرتا

ہے یا آخرت کے کھیت میں ۔ جو شخص آخرت کے لیے کھیتی باڑی کرتا ہے اسے آخرت کی فصل ملے گی اور اللہ بطور انعام اس کے کھیت میں اضافہ کر دے گا اور اس کی نیت کی وجہ سے اس کام میں اس کے لیے اسباب فراہم کر دے گا۔ اس میں برکت دے گا۔ اس آخرت کی کھیتی میں اس کے لیے ضروریات دنیا کا بھی انتظام ہو گا۔ دنیا کے لیے بھی رزق اسے ملے گا ۔ اس میں کوئی کمی نہ ہوگی ۔ بلکہ یہی دنیا کا رزق ہی فلاح آخرت قرار پائے گا۔ جب وہ اس دنیا کے رزق کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور اس میں ' اللہ کے حکم کے مطابق تصرف ۔ انفاق فی سبیل اللہ کرے گا۔ اور جو شخص صرف دنیا کا کھیت چاہے تو اللہ اسے دنیا کا سازوسامان دے گا اور جو اس کے لیے لکھ دیا گیا ہو وہ اسے ملے گا۔ لیکن آخرت میں اس کا حصہ نہ ہو گا اس لیے کہ اس نے آخرت کی کھیت میں کام ہی نہیں کیا کہ وہاں اس کے لیے کوئی چیز منتظر ہو۔

اب ذرا طلبگار ان کشت زار دنیا اور طلب گاران کشت زار آخرت پر ایک نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ صرف دنیا کے کھیت میں کام کرنے والے بہت ہی احمق ہیں ۔ جہاں تک دنیا کے رزق کا تعلق ہے تو اللہ دونوں فریقوں کو دیتا ہے ۔ کیونکہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے رزق تو ہر کسی کو ملتا ہے جس قدر اس کے مقدر میں لکھا ہوا ہے ۔ ہاں آخرت کے کھیت میں کام کرنے والے کے لیے آخرت کا حصہ صرف اس کا ہوتا ہے ۔

صرف دنیا کے کھیت کا انتخاب کرنے والوں میں فقراء بھی ہوتے ہیں اور امراء بھی ۔ یعنی جس کے پاس جس قدر دولت ہے ' اس معاشرے کے عام حالات کے مطابق جس میں وہ رہتا ہے ' اور اس کی ذاتی صلاحیت اور محنت کے مطابق ۔ یہی حال ہے آخرت کے کھیت میں کام کرنے والوں کا کہ ان میں امراء بھی ہوں گے اور فقراء بھی ۔ کیونکہ رزق کے معاملے میں مومن اور کافر میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ اختلاف تو یہاں ہو گا کہ کون کس کھیت کا انتخاب کرتا ہے ' فقط دنیا کا ' یا آخرت کا۔ احمق وہ ہے جو آخرت کے کھیت کو ترک کرتا ہے جس میں دنیا کا رزق بھی ہے اور آخرت کا بھی ۔ اور جب وہ آخرت کے کھیت کو ترک کرتا ہے تو دنیا میں بھی اسے اسی قدر ملتا ہے جو مقدر ہے ۔

غرض معاملہ اس سچائی کے مطابق اپنے انجام کو پہنچے گا جو اللہ نے اپنی کتاب میں نازل کی ہے ۔ حق اور انصاف یہ ہے کہ تمام زندہ چیزوں کو رزق دیا جائے اور آخرت کا حصہ صرف ان لوگوں کے لیے ہو جنہوں نے آخرت کے لیے کام کیا اور جو آخرت کے لیے کام نہ کریں وہ آخرت میں محروم ہوں ۔

--- ○○○ ---

اب پھر ایک سفر پہلے موضوع پر یعنی توحید و رسالت پر ۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا

كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَاۗءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿٢٢﴾ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿٢٣﴾

”کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریک خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے ۔لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا؟ اگر فیصلے کی بات طے ہو گئی ہوتی تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا۔ یقیناً ان ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم اس وقت اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہوں گے۔ اور وہ ان پر آکر رہے گا۔ بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں' وہ جنت کے گلستانوں میں ہوں گے' جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے' یہی بڑا فضل ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جنہوں نے مان لیا اور نیک عمل کیے۔ اے نبیؐ' ان لوگوں سے کہہ دو کہ ”میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' البتہ قرابت کی محبت ضرور چاہتا ہوں“۔ جو کوئی بھلائی کمائے گا' ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے۔ بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے“۔

پچھلے پیراگراف میں یہ کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے لیے جو نظام زندگی اور شریعت تجویز کی تھی وہ وہی ہے جس کے بارے میں نوح' ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو تاکید کی گئی تھی۔ وہی بات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی وحی کی گئی۔ اب اس پیرے میں ان سے گرفت کے انداز میں پوچھا جاتا ہے کہ تم بتاؤ تمہاری شریعت اور قانون اور نظام اور نظریہ کا ماخذ کیا ہے؟ تمہاری شریعت کس نے بنائی ہے۔ یہ تم جس نظام کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہو' یہ تو تمام شریعتوں کے خلاف ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰۗؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (۴۲ : ۲۱) ”کیا کچھ لوگ ایسے شریک خدا ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کر دیا جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا“۔ اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اللہ کی شریعت اور قانون کے متضاد کوئی قانون بنانا چاہے وہ کوئی شخص بھی ہو۔ قانون سازی کا اختیار صرف اللہ وحدہ کو ہے کیونکہ اللہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے اس پوری کائنات کے لیے ایک نظام تجویز کر رکھا ہے اور انسان بھی اس کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس لیے انسان کی زندگی کو ضابطے میں لانے کے لیے ایسا ہی قانون چاہیے جو قانون فطرت ہو۔ اللہ کے قوانین فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اور یہ صرف اس وقت ہوتا ہے کہ جب قانون وہ ذات بنائے جو نظام فطرت کی موجد ہے۔ اللہ کے سوا

کوئی اور ذات یہ کام نہیں کر سکتی ۔ اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے ۔ لہٰذا کوئی شخص انسانوں کی قانون سازی پر' وہ اعتماد نہیں کر سکتا جو اللہ کے قانون پر کرتا ہے ۔

اگرچہ یہ وہ حقیقت ہے جو بداہت کی حد تک واضح ہے لیکن پھر بھی زیادہ لوگ اس کے بارے میں جھگڑتے ہیں یا ان کو اس پر یقین نہیں آتا ۔ اور پھر بھی وہ جرات کرتے ہیں کہ اللہ کے قانون کے سوا کسی اور اصول کے مطابق قانون سازی کریں ۔ ان کا زعم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے لیے بھلائی کر رہے ہیں' پھر وہ اپنے حالات کو ان قوانین کے مطابق ڈھالتے ہیں جو انہوں نے خود بنائے ہیں ۔ گویا وہ اللہ سے زیادہ جانتے ہیں' زیادہ بہتر فیصلے کرنے والے ہیں' یا اللہ کے سوا ان کے کوئی اور الٰہ ہیں جو ان کے لیے ایسے قانون بناتے ہیں جس کا اللہ نے اذن نہ دیا ہو ۔ اس قسم کے لوگ اللہ کے نزدیک گھاٹا اٹھانے والے ہیں اور اللہ کی ذات کے خلاف جرات کرتے ہیں ۔

اللہ نے انسانوں کے لیے ایسا قانون بنایا ہے جو انسان کی فطرت اور اس کائنات کے ناموس فطرت اور انسان کے مزاج کے مطابق ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس قانون کے مطابق انسانوں کا باہم تعاون اپنے اعلیٰ درجات تک پہنچ جاتا ہے اور اس کائنات کی دوسری قوتوں کے ساتھ بھی انسان کو تعاون حاصل ہو جاتا ہے ۔ اللہ نے انسان کی پوری زندگی کے بارے میں قانون بنا دیا ہے ۔ صرف جزئیات کا دائرہ چھوڑ دیا گیا جن کے بارے میں انسان نئے حالات کے مطابق خود قانون سازی کر سکتا ہے ۔ لیکن یہ قانون سازی بھی اللہ کے جاری کردہ اصولی قوانین کے دائرے کے اندر کر سکتا ہے ۔ اور اگر کسی معاملے میں انسانوں کے درمیان اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ بھی اللہ اور رسولؐ کے قانون کے مطابق طے کرنا ہو گا ۔ کیونکہ اصول اسلامی شریعت میں طے کر دیئے گئے ہیں اور یہ اصول وہ ترازو ہیں جن کے مطابق تمام انسانوں نے اپنی آراء کو تولنا ہے ۔

یوں قانون سازی کا ماخذ طے ہو جاتا ہے اور حکم اللہ کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے جو احکم الحاکمین ہے ۔ اس کے سوا کوئی اگر اصول و دستور طے کرے گا وہ اسلامی شریعت سے بغاوت کرے گا ۔ اللہ کے دین سے بغاوت کرے گا ۔ اور اس وصیت اور تاکید کے خلاف چلے گا جو حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو کی گئی ۔ اور اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وہی شریعت نافذ کر دی گئی ۔

وَلَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ (۴۲ : ۲۱) ''اگر فیصلے کی بات طے نہ ہو گئی ہوتی تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا'' ۔ اللہ نے فیصلہ کی بات یوں کر دی ہے کہ لوگوں کو فیصلے کے دن تک مہلت دے جائے گی ۔ اگر یہ بات طے نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسی دنیا میں ان کا فیصلہ کر دیتا ۔ اور اللہ کی شریعت کے مخالفین کو یہاں ہی پکڑ لیا جاتا ۔ ان کا قضیہ جلدی ہی چکا دیا جاتا ۔ لیکن اللہ نے مہلت دے دی ہے ۔

وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۴۲ : ۲۱) ''اور ان ظالموں کے لیے یقیناً دردناک عذاب ہے'' ۔ یہ عذاب ان کے ظلم کی وجہ سے ان کا منتظر ہے اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو شخص اللہ کی شریعت کی مخالفت کرے ۔ اور اللہ کے سوا دوسروں کی شریعت کی حمایت کرے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان ظالموں کو اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر میں پیش کیا جاتا ہے ۔ یہ لوگ وہاں ڈرے ہوئے ہیں' سہمے ہوئے ہیں ۔ عذاب جہنم ان کے سامنے ہے ۔

اس سے قبل تو وہ اس سے نہ ڈرتے تھے اور نہ خوف کھاتے تھے بلکہ مذاق اڑاتے تھے۔

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ (۴۲: ۲۲) "تم دیکھو گے کہ یہ ظالم اس وقت اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ ان پر آکر رہے گا"۔ قرآن کا انداز تعبیر بڑا عجیب ہے کہ یہ لوگ وہاں "اپنی کمائی" سے ڈر رہے ہوں گے۔ ان کی کمائی گویا ایک بلا ہو گی جس سے وہ ڈر رہے ہوں گے اور یہ بلا انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے کمائی اور دنیا سے وہ اپنے اس کارنامے (غیر اسلامی قانون سازی) پر بہت خوش تھے لیکن آج وہ اس سے خوفزدہ ہیں لیکن وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ (۴۲: ۲۲) "اور وہ ان پر واقع ہونے والا ہے"۔

اور اس منظر کی دوسری جھلک مومنین کے بارے میں ہے، جو اس دن سے ڈرتے تھے لیکن آج وہ امن و عافیت سے ہیں اور بہت ہی خوشحال ہیں:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (۴۲: ۲۲) ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۴۲: ۲۳) "بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں، وہ جنت کے گلستانوں میں ہوں گے، جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے، یہی بڑا فضل ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جنہوں نے مان لیا اور نیک عمل کیے"۔

قرآن کی تعبیر بھی نہایت ہی خوش کن، نرم اور دھیمے انداز کی ہے۔ روضات الجنت جنتوں کے گلستان، کئی جنتیں اور کئی گلستان۔ "جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے"۔ بلا حدود و قیود۔ "یہی بڑا فضل ہے"۔ "یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے بندوں کو دیتا ہے"۔ یہ حاضر خوشخبری ہے اور یہ سابقہ خوشخبری کے لیے مصداق ہے۔ خوشخبری کی فضاسب سے زیادہ فرحت بخش ہوتی ہے۔ جب کسی کو نعمت حاصل ہو تو خوشخبری دینے سے اس کا احساس اور تیز ہو جاتا ہے۔

نعمتوں کے اس نرم و نازک اور لطف و کرم کے اس بھرپور منظر کے دکھانے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ جو ہدایت میں پیش کر رہا ہوں اور جس سے تمہیں یہ نعمتیں ملیں گی اور جہنم سے دور ہو جاؤ گے یہ میں اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ تم میرے رشتہ دار ہو اور مجھے تم سے محبت ہے میرے لیے یہی اجر کافی ہے۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۴۲: ۲۳) "اے نبی ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم لوگوں سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ البتہ قرابت محبت کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ تم جہنم سے بچ جاؤ۔ جو کوئی بھلائی کمائے گا ہم اس کے لیے بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے۔ بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے"۔

جس مفہوم کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا بلکہ قرابت داری کی محبت مجھے

اس کام پر مجبور کر رہی ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت داری قریش کی ہر شاخ سے تھی اور آپ یہ کوشش فرماتے تھے کہ آپ کے رشتہ دار ہدایت پر آ جائیں ۔ آپ اس قرابت داری کی وجہ سے چاہتے تھے کہ یہ بھلائی ان کو مل جائے اور یہی وافر اجر ہے آپ کے لیے ۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ انداز تعبیر آیا ہے اسے پڑھنے کے بعد میرے خیال میں یہی معنی واضح ہے ۔ حضرت ابن عباس سے ایک تفسیر بھی مروی ہے ۔ یہاں میں اسے اس لیے نقل کرتا ہوں کہ وہ صحیح بخاری میں وارد ہے ۔ بخاری نے روایت کی ہے ۔ محمد ابن بشار سے انہوں نے محمد ابن جعفر سے انہوں نے شعبہ ابن عبدالملک ابن میسرہ سے انہوں نے طاؤس سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ انہوں نے آیت الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (۴۲ : ۲۳) کے بارے میں پوچھا تو سعید ابن جبیر نے کہا "آل محمد کے رشتہ دار مراد ہیں" ۔ حضرت ابن عباس نے کہا تم نے جلدی کی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ قریش کی کوئی شاخ نہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں رشتہ داری نہ ہو" ۔ اس کے بعد انہوں نے کہا معنی یہ ہے "الا یہ کہ میرے اور تمہارے درمیان جو قرابت داری ہے اس کا تعلق رکھو" ۔

اس حدیث کے مطابق معنی یہ ہو گا کہ تم میری قرابت داری کا لحاظ رکھتے ہوئے ' مجھے اذیت دینے سے باز آ جاؤ ۔ اور میں جو کچھ کہتا ہوں سنو اور نرم رویہ اختیار کرو ۔ یہی کافی اجر ہو گا ۔ بس یہی اجر میں تم سے چاہتا ہوں ' اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا ۔

حضرت ابن عباس کی تاویل ' سعید ابن جبیر کی تاویل سے زیادہ قریب الفہم ہے ۔ لیکن میں نے جو مفہوم اوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ قریب اور زیادہ خوبصورت ہے ۔ واللہ اعلم ۔

بہرحال مفہوم جو بھی ہو مذکورہ باغات اور خوشخبریوں کے مناظر کے بعد اللہ فرماتا ہے کہ پیغمبر اس کام پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتے اور یہ بات تو بہت ہی بعید ہے کہ جن کو ہدایت کی جا رہی ہے وہ اس پر ان سے اجر طلب کریں ' لیکن یہ تو اللہ کے فضل و کرم ہیں کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ تجارتی حساب و کتاب نہیں کرتا ' نہ منصفانہ حساب کرتا ہے ۔ اللہ کا حساب مہربانی اور فضل والا ہے ۔

وَمَنْ يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا (۴۲ : ۲۳) "جو بھلائی کمائے گا ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے" ۔ صرف یہ نہیں کہ ہدایت پر کوئی اجر نہیں لیا جاتا بلکہ مزید انعامات بھی دیئے جاتے ہیں ۔ اور اس کے بعد مغفرت کی جاتی ہے اگر کوئی غلطی ہو اور مزید یہ کہ اللہ کی طرف سے قدر کی جاتی ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ شَكُورٌ (۴۲ : ۲۳) "بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے" ۔ اللہ معاف بھی کرتا ہے ' پھر خود شکریہ بھی ادا کرتا ہے ۔ کس کا شکریہ ادا کرتا ہے ۔ اپنے بندوں کا کہ وہ راہ راست پر آئے ' حالانکہ راہ راست پر آنے کی توفیق بھی اسی نے دی ۔ پھر مزید یہ کہ ان کی صفات میں اضافہ کرتا ہے ' برائی کو صاف کرتا ہے اور اس کے بعد قدر دانی بھی کرتا ہے ' کیا ہی مہربانیاں ہیں ! انسان کے لیے تو ایسا سلوک کرنا ممکن نہیں ۔ صرف اللہ کا شکر ادا کیا جا سکتا ہے اور توفیق قلب کی جا سکتی ہے ۔

اب روئے سخن پھر وحی الٰہی کی طرف !

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۖ فَإِن يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۗ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٢٤﴾

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے؟ اگر اللہ چاہے تو تمہارے دل پر مہر کر دے۔ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے' وہ سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے"۔

اب یہاں مشرکین کے آخری اعتراض کو لیا جاتا ہے۔ وحی کے بارے میں ان کا جو رویہ تھا اس پر یہ ان کی آخری دلیل تھی' اس سے قبل وحی کے مصدر اور سرچشمہ' وحی کے مزاج و ماہیت اور وحی کے اغراض و مقاصد کے مفصل بیان کے بعد اب یہ ان کا آخری سوال ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (۴۲ : ۲۴) "کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے"۔ اور اصل وجہ یہ ہے کہ وہ قرآن کی تصدیق نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کا زعم یہ ہے کہ یہ وحی نہیں ہے' اللہ کی طرف سے کوئی بات نہیں آرہی۔

یہ سوال اس لیے پر درد ہے کہ اللہ کس طرح ایسے شخص کو اجازت دے سکتا ہے کہ وہ اللہ کی مملکت میں اللہ کے نام پر یہ فریب کرتا پھرے۔ اور یہ کہے کہ اس پر وحی آرہی ہے حالانکہ اس پر وحی نہ آرہی ہو۔ اللہ تو اس بات پر قادر ہے کہ ایسے کسی شخص کے دل پر مہر لگا دے اور وہ سرے سے کوئی بات ہی نہ کر سکے اور کسی اور ذریعہ سے اس باطل کا پول کھول دے۔ اور اس طرح اسے مٹا دے اور اصل بات کو واضح کر کے رکھ دے۔

فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ وَ يَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَ يُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ

(۴۲ : ۲۴) "اگر اللہ چاہے تو تمہارے دل پر مہر کر دے۔ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے"۔ اللہ پر تو کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں آتی ہے۔ اگر اللہ کی جانب سے یہ باتیں نہ ہوتیں تو اللہ مٹا دیتا۔

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۴۲ : ۲۴) "بے شک وہ سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے"۔

لہٰذا یہ ایک ایسا شبہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو اللہ کے علم کے خلاف ہے۔ اللہ کی قدرت کو یہ چیلنج ہے اور یہ اللہ کی سنت جاریہ کے خلاف ہے کیونکہ اللہ زمین میں حق کو ٹھیراتا ہے اور باطل کو مٹاتا ہے۔ لہٰذا یہ وحی برحق ہے۔ حضرت محمد صادق و امین ہیں اور جو اعتراضات و الزامات لگائے جاتے ہیں وہ غلط اور باطل ہیں۔ یوں وحی پر یہاں وقتی طور پر بات ختم ہوتی ہے۔ اور ایک دوسرا سبق شروع ہوتا ہے۔

--- ooo ---

درس نمبر ۲۳۰ ایک نظر میں

سورت کا یہ دوسرا حصہ انفس و آفاق میں موجود دلائل ایمان کے بیان پر مشتمل ہے اور اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت کے آثار کس طرح قدم قدم پر موجود ہیں۔ اور لوگوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ان آثار کا تعلق ان کی زندگی اور ان کی معیشت کے ساتھ ہے۔ اور پھر اس میں اہل ایمان کی صفات بیان کی گئیں کہ وہ دوسرے لوگوں کے مقابلے میں کیا کیا امتیازی خصوصیات رکھتے ہیں جبکہ پہلے حصے میں موضوع سخن زیادہ تر وحی و رسالت تھا۔ اس سبق کے آخر میں وحی الٰہی کی شکلیں بیان کی گئی ہیں۔ اس سورت کے دونوں حصوں میں ربط ظاہر ہے اللہ کے دلائل ایمان کا مقصد بھی یہی ہے کہ لوگ وحی و رسالت کے ساتھ منسلک ہو جائیں۔

--- ۰۰۰ ---

درس نمبر ۲۲۳ تشریح آیات

۲۵--- تا--- ۵۳

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ﴿٢٥﴾ وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلَٰكِنْ يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ بَصِيرٌ ﴿٢٧﴾

”وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر فرماتا ہے' حالانکہ تم لوگوں کے سب اعمال کا اسے علم ہے ۔ وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اور زیادہ دیتا ہے ۔ رہے انکار کرنے والے' تو ان کے لیے سخت سزا ہے ۔ اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے' مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے' نازل کرتا ہے ۔ یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے“ ۔

یہ بیان اس منظر کے بعد آتا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ قیامت کے دن ظالم ڈرے ہوئے ہوں گے' یہ خوف انہیں اپنے کرتوتوں کی بلائے ناگہانی سے ہو گا جو یقیناً آنے ہی والی تھی اور پھر اس منظر کے بعد کہ اہل ایمان جنات کے گلستانوں میں ہوں گے اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا' آپ جو پہنچا رہے ہیں' اللہ کی طرف سے پہنچاتے ہیں اور یہ کہ اللہ تو دلوں کے راز تک جانتا ہے“ ۔

ان حالات میں کہا جاتا ہے کہ مایوس نہ ہو جاؤ' تم جس گمراہی میں پڑے ہو' کسی بھی وقت تم اس سے باہر نکل سکتے ہو۔ قبل اس کے کہ آخری فیصلہ ہو جائے ۔ توبہ کا دروازہ کھلا ہے' اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے اور سیئات کو معاف کرتا ہے ۔ لہٰذا ناامیدی اور معصیت ہی میں آگے بڑھنے پر تم مجبور نہیں ہو۔ سابقہ گناہوں کے بارے میں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ اللہ جانتا ہے وہ سچی توبہ کو بھی جانتا ہے ۔ سابقہ گناہوں کو بھی جانتا ہے اور معاف کرتا ہے ۔ اس

خوبصورت طرز بیان کے درمیان بھی مومنوں اور کافروں کا انجام ذکر کیا جاتا ہے ' جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں وہ اپنے رب کی دعوت قبول کرتے ہیں اور رب پھر ان پر مزید فضل فرماتے ہیں ۔

وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ (۴۲ : ۲۶) "اور انکار کرنے والوں کے لیے شدید سزا ہے"۔ جبکہ توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور ہر شخص اس عذاب شدید سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے ۔ اور جو توبہ کرے گا اسے مزید فضل الٰہی بطور انعام ملے گا۔

آخرت میں اللہ کا فضل بلاحساب ہو گا اس پر کوئی حد اور قید نہیں ہے ۔ رہا اس جہاں میں بندوں کے لیے رزق کا انتظام تو اس پر اللہ نے حدود و قیود رکھے ہوئے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کو جانتا ہے کہ ان کا ظرف کتنا ہے ۔ لامحدود فضل الٰہی کے وہ متحمل نہیں ہیں ۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ اِنَّهٗ

بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌ بَصِيْرٌ (۴۲ : ۲۷) "اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے ' مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے ' نازل کرتا ہے ۔ یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا رزق چاہے وہ جتنا بھی ہو ' آخرت کے فیض اور آخرت کے ارزاق کے مقابلے میں کفاف ہی ہے ۔ اللہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے ۔ اللہ ان پیراں پارسا کو خوب جانتا ہے کہ ان کو ایک حد تک ہی مالدار ہونا چاہئے ۔ اور اگر ان کے لیے رزق اسی طرح وسیع کر دیا جاتا جس طرح آخرت میں ہے تو یہ زمین پہ طوفان بدتمیزی مچا دیتے ۔ ان کا ظرف کم ہے ۔ یہ اپنے حدود میں نہیں رہ سکتے ۔ یہ ایک حد تک ہی مالداری برداشت کر سکتے ہیں ۔ اور اللہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے ۔ لہٰذا اس جہاں میں ان کے لیے رزق کو محدود کر دیا ہے ۔ ایک مقدار کے مطابق ' جو ان کے لیے برداشت کرنے کے قابل ہو اور جو اس زمین کی آزمائشوں میں کامیاب ہوں گے اور امتحان پاس کر لیں گے اور سلامتی کے ساتھ دار بقاء تک پہنچ جائیں گے ان کو اللہ کا فیض اور فضل کبیر وہاں بلاحدود و قیود ملے گا۔

--- ○○○---

وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾

"وہی ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے ' اور وہی قابل تعریف ولی ہے"۔

یہ ایک دوسرا انداز ہے جو ان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اس دنیا میں بندوں پر اللہ کے فضل و کرم کے کئی رنگ ہیں ۔

بعض اوقات سخت خشک سالی ہو جاتی ہے ' بارشیں بند ہو جاتی ہیں اور وہ زندگی کی پہلی ضرورت کی فراہمی سے بھی عاجز آ جاتے ہیں ' زندگی کی پہلی ضرورت پانی ہے ۔ حالت یہاں تک آ پہنچتی ہے کہ یہ مایوس ہونے لگتے ہیں ' اس کے بعد اللہ بارشیں برسا دیتا ہے ۔ ان کی حاجت پوری ہوتی ہے ۔ اللہ کی رحمت پھیل جاتی ہے ۔ ' زمین زندہ اور سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے ۔ بیج پھوٹنے لگتے ہیں ' نباتات اٹھنے لگتے ہیں ۔ فضا لطیف ہو جاتی ہے ۔ اور ہر طرف زندگی حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ چہرے کھل جاتے ہیں ' دل کھل جاتے ہیں ' امیدیں بڑھ جاتی ہیں اور امنگیں پوری ہوتی ہیں ۔ یاد رہے کہ مایوسی اور امید و رحمت کے درمیان بس چند لمحے ہوتے ہیں ۔ چند لمحوں میں اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں ۔ آسمانوں کے دروازے پانی کھول دیتے ہیں ۔

وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ (۲۸ : ۴۲) "اور وہی قابل تعریف ولی ہے"۔ وہ مددگار ' کفیل ہے اور اپنی ذات و صفات میں محمود ہے ۔

یہاں قرآن مجید نے بارش کے لیے غیث کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ جس میں امداد اور دادرسی کا مفہوم شامل ہے ۔ اس وقت امداد دینا جب لوگوں پر تنگی اور مصیبت ہو ' غیث ہے ۔ اسی طرح اس مدد کے نتائج کو رحمت کا نام دیا ۔

وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ (۲۸ : ۴۲) "اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے"۔ اس سے تروتازگی ' سرسبزی ' امید اور خوشی کے معانی نکلتے ہیں ۔ جو نباتات کے پھوٹنے سے ' اور پھلوں کے نکلنے سے ظاہری طور پر رحمت کے پھیلاؤ کی شکل میں نظر آتے ہیں جب بھی طویل خشک سالی کے بعد باران رحمت کا نزول ہوتا ہے تو لوگوں کی خوشی ' جسم اور اعصاب کی تروتازگی اور قلب و شعور کا سرور قابل دید ہوتا ہے ۔ ایسی خشک سالی کے بعد جب زمین نباتات سے سبز سبز ہو جاتی ہے تو انسانی دلوں سے تمام پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں ۔ زمین مردنی کے بعد زندہ ہو جاتی ہے ۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَابَّةٍ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ ﴿٢٩﴾ وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ ﴿٣٠﴾ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ۖ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿٣١﴾

"اس کی نشانیوں میں سے ہے ۔ یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش ' اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں ۔ وہ جب چاہے انہیں اکٹھا کر سکتا ہے ۔ تم لوگوں پر جو مصیبت بھی آئی ہے ' تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے ۔ اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے ۔ تم زمین میں اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو ' اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے"۔

یہ نشانی ہر وقت انسانی نظروں کے سامنے ہے اور جب وحی آئی تو اس نے اس کی شہادت دی ۔ وحی میں تو انہوں

نے شک کیا اور جھگڑتے رہے لیکن آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی جو نشانی ہے اس میں تو کوئی شک نہیں وہ تو قطعی الدلالہ ہے ۔ یہ فطرت انسانی کو فطری زبان میں خطاب کرتی ہے ۔ کوئی سنجیدہ گفتگو کرنے والا اس کے بارے میں کوئی اختلاف رائے نہیں رکھ سکتا ۔ یہ نشانی یہ بتاتی ہے کہ جس ذات نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی ہے وہ انسان نہیں ہے ۔ نہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی اس نشانی کا خالق نظر آتا ہے ۔ لہٰذا کسی خالق و مدبر کے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے ۔ پس کائنات کی ہولناک ضخامت' اس کی رفتار کی باریک اور دقیق یکسانی' اس کے نظام کا حیران کن تسلسل اور اس پوری کائنات کے اندر ایک ہی قانون طبیعت اور ناموس فطرت کا اجراء' ان سب امور کی کوئی عقلی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ ایک ذات ہے جو اللہ العالمین ہے' جو اس کی تدبیر کر رہا ہے ۔ رہی انسانی فطرت تو وہ براہ راست اس استدلال کو اور ان نشانیوں کو دیکھ پاتی ہے اور ان کا ادراک کر کے مطمئن ہو جاتی ہے ۔ قبل اس کے کہ ایک بھی لفظ کسی خارجی ذریعہ سے سنے ۔

آسمانوں اور زمین کی یہ بڑی نشانی اپنے اندر کئی نشانیاں رکھتی ہے ۔

وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ (۴۲ : ۲۹) "اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھے ہیں" ۔ اس کو چھوڑ دیجئے کہ آسمانوں میں زندگی ہے یا نہیں' ابھی تک ہمیں اس کا علم نہیں' البتہ اس زمین کے اندر زندگی کی جو رنگا رنگی ہے یہ ایک نہایت ہی عظیم نشانی ہے ۔ یہ ایک ایسا راز ہے کہ ابھی تک اس کی ماہیت تک کوئی نہیں پہنچا ہے ۔ یہ تو دور کی بات ہے کہ کوئی اسے پیدا کر سکے ۔ یہ ایک پوشیدہ راز ہے کہ زندگی کہاں سے آتی ہے ۔ کس طرح آتی ہے ۔ اجسام کے اندر کس طرح مل جاتی ہے ۔ آج تک حیات کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے جس قدر مساعی کی گئی ہیں اس راز کے دریافت کے تمام دروازے بند پائے گئے ہیں جو کچھ دریافت ہوا' وہ حیات کے بعد زندگی کی ترقی اور نشوونما کے بارے میں ہے ۔ زندگی کی رنگا رنگی اور اس کے مقاصد اور حکمتوں کے بارے میں ہے ۔ اور اس محدود دائرے میں بھی آراء اور نظریات کا بے حد اختلاف ہے ۔ ظاہری زندگی کے پیچھے کیا ہے' وہ پردۂ راز کے پیچھے ہے ۔ کوئی آنکھ وہاں تک نہیں دیکھ سکتی ۔ کوئی قوت مدرکہ اس کا ادراک نہیں کر سکتی ۔ یہ امرالٰہی ہے' اللہ کے سوا اس کو کوئی نہیں جانتا ۔

یہ رنگا رنگ زندہ مخلوق جو سطح زمین کے اوپر ہے' سطح کے اندر ہے اور سمندروں کے اندر ہے اور لاانتہا فضاؤں میں ہے ۔ ان میں سے انسان نہایت ہی معمولی حصے کے بارے میں جانتا ہے ۔ رہی یہ کہ اس نہایت ہی وسیع اور ناقابل تصور وسعتوں والی کائنات میں اور کوئی زندہ مخلوق ہے یا نہیں اس کے متعلق ہمیں کوئی معلومات نہیں ہیں ہم تو زمین کے اوپر موجود اور مشہود حیات میں سے بھی نہایت ہی تھوڑے حصے کو معلوم کر سکے ہیں' یہ زندہ مخلوقات جو آسمانوں اور زمین میں ہے اسے اللہ جس دن چاہے گا' جمع کرے گا ۔ کوئی ایک فرد بھی جو یہاں وجود کائنات کے بعد پیدا ہوا ہے' رہ نہ جائے گا یا غائب نہ ہو سکے گا ۔

انسانوں کی حالت تو یہ ہے کہ اگر ان کے پنجروں سے پرندوں کی ایک ڈار اڑ جائے یا مکھیوں کے ایک چھتے سے ایک ڈار اڑ جائے تو وہ اسے جمع نہیں کر سکتے ۔ رہے پرندوں کے ڈار' وہ کتنے ہیں' یہ صرف اللہ ہی جانتا ہے ۔ پھر مکھیوں' چیونٹیوں اور اسی طرح کے دوسرے حیوانات کے چھتے تو ان کے بارے میں بھی اللہ ہی جانتا ہے ۔ اللہ ہی ان کو گن سکتا ہے ۔ حشرات ارض' کیڑے' کوڑے اور جراثیم تو ان کی تعداد اور ان کی جگہ کو صرف اللہ ہی جانتا ہے ۔ مچھلیوں اور

دوسرے حیوانات بحر تو ان کی تعداد اور اقسام کے بارے صرف اللہ ہی جانتا ہے ۔ پالتو اور جنگلی جانوروں کی اقسام و تعداد کہ کہاں کہاں بکھرے ہیں اس کا علم بھی صرف اللہ کو ہے اور پھر انسانوں کی آبادیاں اور گروہ اور اقوام و انواع سے اللہ ہی باخبر ہے کہ وہ کہاں کہاں رہتے رہے ہیں' رہتے ہیں اور رہیں گے ۔ ان اقسام کے علاوہ بے شمار خلائق ہیں جو تعداد میں ان سے زیادہ اور جو زمین و آسمانوں میں مخفی ہیں' ان کو بھی اللہ ہی جانتا ہے ۔ یہ اللہ ہی کی مخلوق ہے ۔ اللہ جب جمع کرے گا تو وہ ایک ہی لفظ کے ساتھ چشم زدن میں جمع کر دے گا ۔ ایک ہی آیت میں ان سب زندہ چیزوں کے بکھیرنے اور پھر جمع کرنے کے دونوں مناظر دکھا دیئے گئے' قبل اس کے کہ فقرہ پوری طرح زبان سے ادا ہو جائے ۔ منظر پہلے ہی ذہن کے پردے پر آکر چلا جاتا ہے ۔ یہ قرآن کا مخصوص انداز ہے ۔

ان مناظر کے درمیان ان کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارے اعمال کی وجہ سے اس جہاں میں تم پر وبال بھی آتے رہے ہیں ۔ یہ وبال پورے نہیں بلکہ ان کا ایک حصہ تم پر آتا ہے' اکثر تو اللہ معاف کر دیتا ہے کیونکہ اللہ انسانوں کو ان کے اعمال کی پوری پوری سزا نہیں دیتا ۔ اکثر اعمال بد سے اللہ درگزر کر دیتا ہے ۔ اللہ ان کو یاد دلاتا ہے کہ تم تو بہت ہی عاجز و لاچار ہو ۔ تم اللہ کے کسی منصوبے کو تو نہیں روک سکتے ۔ تم تو اس کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہو ۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (۴۲ : ۳۰) وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۴۲ : ۳۱)

"تم لوگوں پر جو مصیبت بھی آئی ہے' تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے ۔ اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے ۔ تم زمین میں اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو' اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے" ۔ پہلی آیت میں اللہ کے عدل کی تجلی ہے' اور انسانوں پر اللہ کی رحمت کی تجلیات ہیں ۔ اس پر جو مصائب آتے ہیں اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی کی وجہ سے آتے ہیں ۔ لیکن اللہ تو تمام بدکاریوں پر خود انہیں پکڑ پکڑ کر معاف کر دیتا ہے ۔ کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ انسان بہت ضعیف ہے ۔ اس کی فطرت کے رجحانات اور اس کا ماحول اسے بدکاری پر مجبور کرتا ہے ۔ اس لیے بہت سے گناہوں کو اللہ معاف کر دیتا ہے ۔ یہ اس کی رحمتیں اور مہربانیاں ہوتی ہیں ۔

دوسری آیت میں میں انسان کی کمزوری کا اظہار ہے کہ وہ زمین پر اللہ کے کسی منصوبے کو نہیں روک سکتا ۔ (اسی طرح وہ دعوت اسلامی کو نہیں روک سکتا) اس کا کوئی ولی و مددگار اللہ کے سوا نہیں ہے ۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے حقیقی ولی کی طرف لوٹ آئے ۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾ وَّ يَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۵﴾

"اس کی نشانیوں میں سے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح نظر آتے ہیں ۔ اللہ جب چاہے ' ہوا کو ساکن کر دے اور یہ سمندر کی پیٹھ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں ۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو کمال درجہ صبر و شکر کرنے والا ہو --- یا (ان پر سوار ہونے والوں کے) بہت سے گناہوں سے درگزر کرتے ہوئے ان کے چند ہی کرتوتوں کی پاداش میں انہیں ڈبو دے ' اور اس وقت ہماری آیات میں جھگڑے کرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے"۔

پہاڑوں کی طرح دریاؤں میں چلنے پھرنے والے بحری جہاز اللہ کی نشانیوں میں سے مزید نشانیاں ہیں ۔ یہ نشانی بھی حاضر و مشہود ہے ۔ یہ نشانی ایسی ہے جو اللہ کی بنائی ہوئی نشانیوں میں سے کئی نشانیوں پر قائم ہے اور اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے ۔ یہ سمندر ' اللہ کے سوا کون ہے جس نے اسے بنایا؟ انسانوں نے اسے بنایا اور نام نہاد الہوں نے ۔ کون ہے جس نے اسے یہ گہرائی ' یہ کثافت اور یہ وسعت دی کہ وہ بڑی بڑی کشتیوں اور جہازوں کے اٹھانے کے قابل ہو گیا ۔ پھر جس مواد سے کشتیاں بنتی ہیں ' اس مواد میں ایسی خصوصیت کس نے رکھی کہ وہ سطح سمندر پر تیرتا پھرے اور پھر یہ ہوا جو اس وقت ان بحری جہازوں کو چلاتی تھی اور اس وقت کے مخاطب جانتے تھے اور ہمارے دور میں وہ تمام قوتیں جن کو اللہ نے انسانوں کے لیے مسخر کیا ہے اور وہ انہیں عظیم الجثہ جہازوں کے چلانے کے لیے کام میں لاتے ہیں ۔ یہ قوتیں کس نے پیدا کیں جو جدید سے جدید پہاڑوں جیسے جہازوں کو چلاتی ہیں ۔

اِنْ یَّشَاْ یُسْکِنِ الرِّیْحَ فَیَظْلَلْنَ رَوَاکِدَ عَلٰی ظَھْرِہٖ (۴۲ : ۳۳) "اللہ جب چاہے ' ہوا کو ساکن کر دے اور یہ سمندر کی پیٹھ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں"۔ اور بعض اوقات یہ جہاز اس طرح کھڑے رہ جاتے تھے جیسے ان کے اندر کوئی زندگی نہیں ہے ۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ (۴۲ : ۳۳) "اس میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لیے جو کمال درجے صبر و شکر کرنے والا ہو"۔ یعنی ان جہازوں کے چلانے میں اور ان کے کھڑے کرنے میں نشانیاں ہیں ۔ قرآن کریم میں بسا اوقات صبر اور شکر ساتھ ساتھ آتے ہیں ۔ صبر ابتلا پر ہوتا ہے اور شکر نعمتوں پر ہوتا ہے ' خوشی اور غم اور صبر اور شکر دونوں انسانی نفسیات میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔

اَوْ یُوْبِقْھُنَّ بِمَا کَسَبُوْا (۴۲ : ۳۴) "یا ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں ڈبو دے"۔ ان کشتیوں کو پاش پاش کر دے یا ان کو غرق کر دے ' اس وجہ سے کہ لوگوں نے گناہوں اور معاصی کا ارتکاب کیا ۔ انہوں نے ایمان کی مخالفت کی حالانکہ اللہ کی تمام مخلوقات مومن ہے انسانوں میں سے بعض لوگ انکار کرتے ہیں ۔

وَیَعْفُ عَنْ کَثِیْرٍ (۴۲ : ۳۴) "اور اللہ بہت سے گناہوں سے درگزر کرتا ہے"۔ اس لیے وہ لوگوں کو قدم قدم پر ان کے ہر گناہ پر نہیں پکڑتا بلکہ درگزر فرماتا ہے اور معاف کر دیتا ہے ۔

وَّیَعْلَمَ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مَا لَھُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ (۴۲ : ۳۵) "اور اس وقت

ہماری آیات میں جھگڑا کرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے"۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو اپنے عذاب کے سامنے لاکھڑا کرتا' ان کی کشتیاں غرق کر دیتا اور وہ نجات نہ پا سکتے --- یوں ان کو یہ بات سمجھائی جاتی ہے کہ وہ اس دنیا کے جس ساز و سامان اور کاروبار کے مالک ہیں' وہ بھی اللہ کی ہلاکت کی زد میں ہیں۔ لہٰذا دنیا میں کسی چیز کے لیے قرار و ثبات نہیں' ماسوائے تعلق باللہ کے۔

--- ○○○---

اس کے بعد ان کو ذرا اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس دنیا میں ان کو جو ساز و سامان دیا گیا ہے' ذرا اس پر نگاہ ڈالیں کہ یہ کس قدر مختصر وقت کے لیے ہے۔ اور اصل باقی رہنے والی چیز اور دولت وہی ہے جو اللہ کے ہاں ذخیرہ کی گئی ہے۔ اور یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں اور رب تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں۔ یہ بیان آگے جاتا ہے اور اہل ایمان کی صفات گنواتا ہے جو ان کو ایک امت بنا دیتی ہیں' جس کے الگ خدوخال ہوتے ہیں اور وہ امت تمام امتوں سے ممتاز ہے۔

فَمَآ أُوتِيتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۖ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٣٦﴾ وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنتَصِرُونَ ﴿٣٩﴾ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۖ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿٤٠﴾ وَلَمَنِ انتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِم مِّن سَبِيلٍ ﴿٤١﴾ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٤٢﴾ وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿٤٣﴾

۴
۱۴ ا ن

"جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں' جو بڑے

۵

بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں، جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں، ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں ـــ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے، البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے"۔

اس سورت میں اس سے قبل قرآن مجید نے انسانیت کی حالت کی تصویر کشی کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اہل کتاب نے علم آ جانے کے باوجود باہم اختلافات کیے اور یہ اختلافات غلط فہمی اور جہالت پر مبنی نہ تھے۔ حالانکہ ان کے پاس کتاب الٰہی صاف صاف آگئی تھی۔ بلکہ انہوں نے باہم یہ تفرقہ حسد اور دشمنی کی وجہ سے کیا۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ عہد نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے لوگوں کے لیے وہ آسمانی دین اور ایک منہاج اور نظام زندگی مقرر کر دیا گیا تھا۔ اور یہ وصیت بھی کی گئی تھی کہ اسے قائم کرو۔ اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جن لوگوں نے حسد اور دشمنی کی وجہ سے منہاج الٰہی میں اختلاف کیا ان کے بعد جب کوئی کتاب ان کی اگلی نسلوں کو ملی تو ان اختلافات کی وجہ سے وہ سرے سے کتابوں کے بارے میں شک میں پڑ گئے۔ جب اہل کتاب اور اہل دین سماوی کا یہ حال ہو گیا تھا تو جن اقوام کے پاس کوئی کتاب یا کوئی دین ہی نہ تھا، ظاہر ہے کہ ان کی حالت تو ان سے بھی بدتر ہو گی۔

یہی وجہ ہے کہ انسانیت کو ایک صالح قیادت کی ضرورت تھی تاکہ وہ انسانوں کو ان اندھی جاہلیتوں سے نکالے اور ان کی رہنمائی کر کے ان کو ایک مضبوط رسی میں باندھ دے۔ اور ان کی رہنمائی ایک ایسے راستے کی طرف کرے جو اللہ تک پہنچاتا ہو جو اس وجود کا رب ہے۔

اس لیے اللہ نے یہ آخری کتاب عربی زبان میں اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری تاکہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ اور اس کے ماحول میں رہنے والوں سے دعوت کا آغاز کرے اور ان کے اندر وہی دین قائم کرے جس کی سخت تاکید حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو کی گئی تھی تاکہ تمام ادیان حقہ کی کڑیاں باہم مل جائیں اور آغاز تاریخ سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی نہج، ایک منہاج، ایک ہی دین اور ایک ہی شریعت ہو اور ایک ایسی جماعت یہاں قائم کی جائے جو اس تاریخی دعوت کی محافظ ہو، اس کی قیادت کرے اور اس کرۂ ارض پر اس دعوت کو اللہ کی منشا کے مطابق برپا کر کے یہاں اس منہاج کو قائم کرے۔ اور یہ کام اس شکل و صورت میں ہو جو اللہ کو پسند ہو۔ لہٰذا زیر بحث آیات میں اس جماعت کے خدوخال بیان ہو رہے ہیں۔ جس نے یہ عظیم فریضہ سرانجام دینا ہے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ آیات مکی ہیں اور مدینہ میں اسلامی نظام حکومت کے قیام سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ لیکن ہم مکہ میں بھی تحریک اسلامی کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت دیکھتے ہیں۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲ : ۳۸) "اور اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاورت کا قیام اسلامی سوسائٹی اور مسلمانوں کی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ اسلامی جماعت کی بنیادی خصوصیت ہے۔ جماعتی نظام شوریٰ پر قائم ہوتا ہے۔ یہی نظام جماعت سے آگے بڑھ کر پھر مملکت کا حصہ بن جاتا ہے۔ یعنی اسلامی معاشرے کی جان شورائیت ہے اور یہ اس کے اندر پھیلتی جاتی ہے۔ اس طرح اس جماعت کی دوسری خصوصیت یہ بتائی گئی ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (۴۲ : ۳۹) "جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ اس کا مقابلہ کرتے ہیں"۔ باوجود اس کے کہ مکہ میں حکم یہی تھا کہ صبر کرو، اور زیادتی کا بدلہ زیادتی سے نہ دو، اور یہ حکم اس وقت تک کے لئے تھا جب ہجرت کے بعد قتال کی اجازت دے دی گئی اور یہ کہا گیا۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ (۲۲ : ۳۹)

"اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً اللہ انکی مدد پر قادر ہے"۔ تو اس صفت کا ان مکی آیات میں ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ تحریک اسلامی کا مزاج یہی ہے کہ وہ زیادتی کے خلاف سینہ سپر ہو جاتی ہے اور اس سے پہلے اور بعد کے جو احکام ہیں وہ صبر کرنے اور رُکے رہنے کے لیے ہیں۔ اور استثنائی احکام ہیں اور ایک متعین وقت تک کے لیے ہیں۔ یہاں اس مکی سورت میں چونکہ جماعت مسلمہ کی بنیادی صفات قلم بند کی جارہی تھیں اس لیے یہاں ذکر کر دیا کہ اگرچہ فی الوقت انتصار کی ممانعت تھی لیکن یہ صفت اہل ایمان کی بنیادی صفات میں سے ہے۔

بہر حال جماعت مسلمہ کی صفات کے ضمن میں ایسے امور کا ذکر جن پر عمل نہ ہو رہا تھا اور نہ جماعت کے ہاتھ میں کسی ملک کی عملی قیادت تھی اور جماعت ابھی مکہ میں مصائب برداشت کر رہی تھی، یہ اس لیے ہوا کہ اس جماعت نے پوری انسانیت کی قیادت کرنی تھی اور اسے اس لیے برپا کیا گیا تھا کہ وہ پوری انسانیت کو اندھیروں سے نکال کر نور اسلام میں لائے گی۔ لہٰذا جماعت مسلمہ کے اندر ان صفات کا پیدا ہونا اور جماعت کے لیے ان مقاصد کے لیے تیاری کرنا ضروری تھا۔ یہاں ان باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ جب اس کے ہاتھ میں اقتدار آئے تو وہ اس کی اہل ہو۔ لہٰذا ان صفات پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے کہ یہ کیا ہیں؟ ان کی حقیقت کیا ہے؟ اور انسانی معاشرے میں ان کی اہمیت کیا ہے۔

یہ ہیں ایک اسلامی جماعت کی صفات۔ ایمان، توکل، اجتناب کبائر اور فواحش، غصے کے وقت معافی، اللہ کی پکار پر لبیک کہنا، اقامت صلوٰۃ، ہر معاملے میں مشاورت، انفاق فی سبیل اللہ، ظلم و زیادتی کا مقابلہ، عفو، اصلاح اور صبر۔ یہ کیا ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ اور ان کی اہمیت کیا ہے۔ مناسب ہے کہ ان صفات کو قرآنی ترتیب کے مطابق بیان کریں۔

قرآن کریم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طے کردہ مستحکم اور دائمی میزان کے سامنے کھڑا کر دیتا ہے تاکہ وہ دائمی اور مستقل قدروں اور عارضی اور بدلنے والے حالات کے درمیان فرق و امتیاز کر سکیں۔ اور ان کی سوچ میں فرق نہ ہو ورنہ ان کی نگاہ میں ہر چیز کی حقیقی قدر و قیمت صحیح نہ رہے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مومنین کی صفات کے بیان سے پہلے ایک مستقل میزان اور پیمانہ بیان کر دیا کہ ایک مسلم جماعت کی صفات کے لیے یہ پیمانہ ہے۔

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (۴۲ : ۳۶)

”جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی“۔ اس زمین کا ساز وسامان بہت ہی پرکشش اور زرق وبرق ہے۔ کھانے پینے کے سامان' اولاد' شہوات' لذائذ' مرتبہ اور اقتدار وغیرہ اور بعض نعمتیں وہ ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں کو زمین میں بطور مہربانی دی ہیں اور یہ اللہ کی جانب سے خالص بخشش ہیں۔ ان کو اللہ نے اس دنیا میں معصیت اور طاعت پر موقوف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ اطاعت شعار کی اس قلیل بخشش میں برکت ہوتی ہے اور بدکار کے ہاتھ میں اگر بہت کچھ ہو تب بھی اس سے برکت چھن جاتی ہے۔

لیکن یہ سب امور باقی اقدار نہیں ہیں۔ یہ متاع اور اس زندگی کا سروسامان ہے۔ یہ سروسامان محدود وقت کے لیے ہے۔ یہ نہ کسی کا مرتبہ بلند کرتا ہے' نہ گراتا ہے۔ یہ اللہ کے نزدیک نہ شرافت وعزت کی دلیل ہے اور نہ کراہت اور ناپسندیدگی کی دلیل ہے۔ نہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسے شخص سے اللہ راضی ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اللہ ناراض ہے۔ بس یہ اس زندگی' فانی زندگی کا سامان ہے اور اس کے مقابلے میں۔

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (۴۲ : ۳۶) ”جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی“۔

بہتر ہے اپنی قیمت کے اعتبار سے اور پائیداریوں کہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ لہٰذا اس فانی دنیا کا ساز وسامان بمقابلہ آخرت کچھ بھی نہیں ہے۔ بہت ہی محدود اور کم قیمت ہے اور چند روزہ ہے۔ ایک فرد کے لیے صرف اسی کی زندگی میں کارآمد ہے اور پھر ہر شخص سوچ لے کہ وہ کتنی عمر لے کر آیا ہے اور کتنی رہ گئی ہے۔ اور بمقابلہ ایام اللہ یہ تو بہت کم بلکہ لمحات ہیں جس طرح چشم زدن۔

اس تمہیدی بیان اور اصل معیار نیک وبد کے بیان کے بعد اب اللہ ان مومنین کی صفات بیان فرماتا ہے جن کے لیے اللہ نے بہتر اور پائیدار انجام اپنے ہاں تیار کر رکھا ہے۔

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۴۲ : ۳۶) ”اور اللہ کے ہاں جو ہے وہ بہتر اور پائیدار ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں“۔ ایمان وہ حقیقت ہے کہ جب یہ ذہن میں بیٹھ جائے تب ہی جاکر اس کے ذریعہ انسانوں کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس کائنات کی ہر چیز کی اصل ”قدر“ معلوم کر سکیں۔ صرف ایمان کے ذریعہ ہم اس کائنات کی حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں کہ اس کائنات کو اللہ العالمین نے بتایا ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے بعد ہی کوئی شخص اس کائنات کے ساتھ کوئی معاملہ کر سکتا ہے۔ اس طرح انسان اس کی حقیقت کو معلوم کر لیتا ہے۔ اس کے اندر پائے جانے والے قوانین قدرت کا حقیقی ادراک کر سکتا ہے اور اس طرح یہ انسان اپنی حرکت کو اس کائنات کی حرکت کے ساتھ ہم آہنگ کر سکتا ہے۔ پھر انسان اس کائنات کے کلی قوانین قدرت سے انحراف نہ کرے گا کیونکہ اس طرح یہ ہم آہنگی ختم ہو جائے گی اور یہ ہم آہنگی اس قدر اہم ہے کہ اس کے ساتھ انسان اس دنیا میں بھی اچھی زندگی بسر کر سکے گا۔ اور اس عظیم وجود کے ساتھ مل کر اپنے باری تعالیٰ اور خالق کی اطاعت اور تابعداری میں زندگی بسر کر سکے گا۔ یہ صفت ہر انسان کے لیے لازمی صفت ہے کہ وہ مومن ہو' لیکن جس جماعت نے پوری انسانیت کے اس سفر کی قیادت کرنی ہے اور جس نے پوری انسانیت کو خالق کائنات تک پہنچانا ہے اس کے اندر اس صفت کا بدرجہ اتم موجود ہونا ضروری ہے۔

اس ایمان کے نتائج کیا نکلتے ہیں؟ مومن کو نفسیاتی اطمینان اور نصب العین کا تعین حاصل ہو جاتا ہے۔ تردد' حیرت' خوف اور مایوسی اس کے قریب نہیں لگتی اور اس کرۂ ارض پر عام زندگی گزارنے کے لیے بھی یہ صفات اشد ضروری ہیں۔ لیکن یہ صفات اس جماعت کے لیے تو لابدی ہیں جس نے اس کٹھن راہ میں دوسرے انسانوں کی رہنمائی کرنی ہے۔

ایمان کو اہم قدروں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مومن خواہشات نفسانیہ' ذاتی اغراض' ذاتی مصلحتوں' مفادات کے حصول سے پاک ہو۔ تب جاکر وہ کسی اونچے مقاصد کے لیے کام کر سکے گا۔ اور یہ سوچے گا کہ اس کام میں اس کی ذات کی کوئی حصہ داری نہیں ہے۔ یہ تو صرف دعوت الی اللہ کی ڈیوٹی ہے۔ یہ عند اللہ اجر پا چکا ہے۔ اللہ کے ساتھ سودا ہو چکا ہے اور یہ شعور اس شخص کے لیے تو بہت ہی لازمی ہے جو قائد تحریک ہو' تاکہ وہ اس وقت مایوس نہ ہو جب ایک خود سر گروہ اس سے الگ ہو جائے یا اسے دعوت کی وجہ سے ایذا دی گئی ہو' اور اگر تمام عوام اس کے گردیدہ ہو جائیں اس کے مطیع ہو جائیں تو وہ مغرور نہ ہو جائے کیونکہ وہ تو ایک مزدور ہے' اس نے اجرت اللہ سے پہلے ہی لے لی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا پہلا گروہ' جماعت صحابہ کے اندر اس قسم کا ایمان پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے ایمان نے ان کے نفوس' ان کے اخلاق' ان کے طرز عمل میں ایک عجیب انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ان کے دور میں پوری انسانیت کے اندر ایمان کی شکل ہی بگڑ گئی تھی۔ ایمان دب گیا تھا' بلکہ ایمان کا لوگوں کے اخلاق' ان کے طرز عمل اور ان کی نفسیات پر کوئی اثر ہی نہ رہا تھا۔ جب اسلام آیا تو اس نے ایمان کی ایک زندہ' موثر' فعال صورت دی۔ اور اس نے صحابہ کرام ؓ کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جنہوں نے اسلامی انقلاب کا بیڑا اٹھایا۔

---ooo---

سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب ''مسلمانوں کے زوال کے عالمی اثرات'' میں فرماتے ہیں:

''یہ ہے وہ ایمان جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور اس میں ایمان کو اس جماعت کی صفت اول بتایا گیا ہے جو پوری انسانیت کی قیادت کے لیے اٹھائی گئی ہے جو اپنے ایمان کی وجہ سے انسانیت کی قیادت کرتی ہے۔ اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ایک مومن صرف اللہ پر توکل کرے''۔ لیکن قرآن مجید توکل علی اللہ کو بطور ایک مستقل عنوان ذکر کرتا ہے۔

وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۴۲: ۳۶) ''اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں''۔ یہاں سیدھے سادے فقرے يَتَوَكَّلُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ کی بجائے وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۴۲: ۳۶) کہا۔ یعنی بعد کے الفاظ کو مقدم یعنی جار مجرور کو مقدم کرنے سے حصر کے معنی پیدا ہوئے یعنی صرف اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں اور کسی پر نہیں کرتے۔ یہ بھی عقیدۂ توحید ہے اور عقیدۂ توحید کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ان کا اللہ پر بھروسہ ہو۔ مومن کا اللہ کی ذات اور صفات پر ایمان ہوتا ہے۔ اس کا یقین ہوتا ہے کہ اس کائنات میں کوئی شخص اپنی مشیت سے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ کوئی کام یہاں اللہ کے اذن کے بغیر واقع ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مومن صرف اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔ کسی کام کے کرنے یا کسی کام کے نہ کرنے میں مومن صرف اللہ پر توکل کرتا ہے۔

ہر شخص کے لیے یہ شعور اس کی عملی زندگی میں لابدی ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ ہر کسی کے سامنے سر اٹھا کے چلے گا۔ اور اس کا سر کسی کے سامنے نہ جھکے گا۔ وہ بہت مطمئن ہو گا' نہ کسی سے کوئی امید رکھے گا نہ اسے کسی کا خوف ہو گا

اگر مشکلات آجائیں تو پر جوش اور ثابت قدم ہو گا اور اچھے دن ہوں تو سنجیدہ رہے گا۔ نہ خوشحالی اور نہ ہی بدحالی اسے اپنی جگہ سے ہلا سکے گی۔ لیکن یہ شعور اسلامی انقلاب کے قائد کے لیے بہت ہی ضروری ہے کہ وہ اس راہ کے نشیب و فراز میں جم جانے اور اسلامی انقلاب لانے والی جماعت کے ہر فرد میں بھی یہ صفت ضروری ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ (۴۲ : ۳۷) "جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں"۔ قلب کی طہارت، طرز عمل کا شفاف ہونا، خصوصاً بڑے گناہوں اور فحاشی کے کاموں سے، اسلامی معاشرے کی اساسی خصوصیت ہے اور یہ ایمان کے نمایاں آثار میں سے ہے۔ اور کسی صحیح قائد اور خصوصاً اسلامی دعوت کے لیے اٹھنے والی جماعت کے لیے تو یہ بہت ہی ضروری صفت ہے۔ کوئی دل صاف اور شفاف نہیں رہ سکتا، اگر وہ گناہوں کا ارتکاب کر رہا ہو اور فحاشی کے کاموں میں حصہ دار ہو اور ان چیزوں سے اجتناب کرنے والا نہ ہو، اور کوئی فرد اور کوئی جماعت قیادت کے قابل نہیں، اگر اس کا دل صاف نہ ہو، اور معصیت اور فحاشی نے اس کے ایمان کو خود ختم کر دیا ہو اور اس کی شکل ہی بگڑی ہوئی ہو۔

پہلی جماعت مسلمہ کے دل میں ایمان اس قدر تیز احساس کے ساتھ، اس درجے تک بلند ہو گیا تھا، جس کی طرف محولہ بالا ص ۲۲ میں اشارہ کیا گیا اور اس طرح اس جماعت کو اس کے ایمان نے انسانی قیادت کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔ اور انہوں نے ایسی قیادت کی کہ اس کی مثال نہ سابقہ قدیم تاریخ میں ملتی ہے اور نہ نئی تاریخ میں۔ اس قیادت کی مثال ایسی ہے جس طرح ایک تیر ہو اور جو ستارے کی طرف اشارہ کرتا ہو، اس جہان میں جہاں خواہشات کی جنگ برپا ہو اور نفسا نفسی کا عالم ہو۔

اللہ اس انسانی مخلوق کی کمزوریوں سے خوب واقف ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے قیادت کے لیے شرائط بھی معقول حد کے اندر رکھی ہیں۔ جن پر کوئی قیادت عمل کر سکے اور اس پر وہ اللہ کے ہاں موجود اجر پا سکے۔ اللہ نے جو معیار تجویز فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی جماعت اور اس کی لیڈر شپ کبائر گناہوں اور فواحش سے مجتنب ہو۔ رہے چھوٹے گناہوں کا ارتکاب تو وہ اللہ معاف کر دے گا۔ کیونکہ اللہ انسانوں کی طاقت کی حدود و قیود سے خوب واقف ہے۔ یہ اللہ کا فضل، اس کی مہربانی اور رحمت ہے، جو اس نے اس انسان پر کیا۔ مناسب ہے کہ ہم اللہ سے شرم کریں کیونکہ مہربانی سے انسان کے اندر حیا کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور عفو و درگزر کی وجہ سے عزت و احترام پیدا ہوتا ہے۔

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (۴۲ : ۳۷) "اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں"۔ یہ صفت اس کے بعد متصلاً آئی جب اس سے قبل اشارہ کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے چھوٹے گناہ معاف کر کے درگزر فرماتا ہے۔ لہٰذا بندوں کو بھی چاہئے کہ وہ آپس میں مہربانی اور درگزر کا سلوک روا رکھیں۔ چنانچہ مومنین کی صفات میں اس بات کو شامل کیا گیا کہ جب ان کو غصہ آئے تو وہ ایک دوسرے کو معاف کریں۔

اس معاملے میں بھی اسلام نفس انسانی کے ساتھ نہایت ہی احسان کرتا ہے۔ اسلام انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اللہ کو تو معلوم تھا کہ غصہ ایک ایسا انسانی ردعمل ہے جو انسان کی فطرت سے اٹھتا ہے۔ اور یہ غصہ سراسر شر بھی نہیں ہے۔ اللہ کے لیے، اللہ کے دین کی خاطر، سچائی کے لیے اور انصاف کی خاطر تو غصہ مطلوب ہے۔ اور

اس میں خیر ہے ۔ لہٰذا اسلام نفس غصے کو جرم قرار نہیں دیتا۔ نہ اسے غلطی قرار دیتا ہے بلکہ اسلام انسانی مزاج اور فطرت میں غصے کو قبول کرتا ہے ۔ اس لیے اسلام انسان اور اس کی فطرت کے درمیان کسی دینی حکم کی وجہ سے جدائی اور تفریق نہیں کرتا۔ ہاں اسلام یہ ہدایت ضرور دیتا ہے کہ انسان کو اپنے غصے پر قابو پانا چاہئے ۔ اسے چاہئے کہ حتی الوسع عفو و درگزر سے کام لے اور یہ اس کی ایمانی صفات میں سے ایک مثالی صفت ہوگی ۔ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات منقول ہے کہ آپ کبھی بھی ذاتی معاملات میں غصہ نہیں ہوئے ۔ آپ کا غصہ اللہ کے لیے ہوتا تھا اور پھر آپ کے غصے کے سامنے کوئی طاقت ٹھہر نہ سکتی تھی ۔ خیر یہ تو مقام محمدیؐ کے درجات و کمالات ہیں ۔ عام مسلمانوں کو اللہ ان کی طاقت کے مطابق ہی حکم دیتا ہے ۔ اگرچہ وہ اس میں ان کو آزماتا ہے اور صرف یہ حکم دیتا ہے کہ اگر غصہ آجائے تو معاف کر دیں' اور اگر ممکن ہو سکے تو معاف کر دیں اور انتقام کے جذبات پر قابو پالیں بشرطیکہ معاملہ ذاتی حدود کے اندر ہو ۔ اور دو افراد کے درمیان ہو ۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (۴۲ : ۳۸) "جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں"۔ وہ اپنے اور رب کے درمیان حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کرتے ہیں اور نفس انسانی سے وہ باتیں محو کرتے ہیں جو توجہ الی اللہ سے مانع ہوں' یہ رکاوٹیں نفسانی خواہشات' جذبات و میلانات اور وہ رکاوٹیں جو انسان کے وجود اور اس کی ذات سے لگی ہوئی ہیں' جب انسان ذاتی خواہشات پر قابو پالے اور شخصی رکاوٹوں کو دور کرے تو پھر اس کے اور اس کے رب کے درمیان راستہ صاف ہو جاتا ہے ۔ اور پھر یہ رب کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے ہر وقت تیار ہوتا ہے اور اللہ کے حکم کے سامنے ذاتی خواہشات کی کوئی رکاوٹ' رکاوٹ نہیں بن سکتی ۔ اللہ کے احکام پر عمل کرنے کی یہ عمومی صفت ہے لیکن احکام الٰہی میں سے بعض کا یہاں خصوصی ذکر بھی کیا جاتا ہے ۔

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۴۲ : ۳۸) "نماز قائم کرتے ہیں"۔ اسلام میں نماز کو ایک بہت بڑا مقام و مرتبہ حاصل ہے ۔ کلمہ طیبہ کے اقرار کے بعد پہلا حکم نماز کا آتا ہے ۔ گویا نماز اللہ کے احکام کی پیروی کا آغاز ہوتا ہے ۔ بندے اور اس کے رب کے درمیان تعلق کا نام نماز ہے ۔ پھر یہ اس بات کا اظہار ہے کہ اسلام میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے ۔ کسی کا سر دوسرے کے مقابلے میں بلند نہ ہو گا' کوئی کسی سے آگے نہ ہو گا ۔ اور یہی پہلو ہے یعنی مساوات کا پہلو کہ نماز کے بعد بالعموم زکوٰۃ کا ذکر آتا ہے لیکن یہاں زکوٰۃ سے پہلے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى (۴۲ : ۳۸) کا ذکر کیا تاکہ معلوم ہو کہ رائے ہر شخص کی برابر شمار ہوگی ۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲ : ۳۸) "اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں"۔ انداز بیان ایسا ہے کہ ان کے تمام امور مشورے کے نتیجے میں ہوتے ہیں گویا ان کی پوری زندگی مشورے کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے ۔ جیسا کہ ہم نے کہا یہ ایک مکی آیت ہے اور یہ حکم اسلامی حکومت کے قیام سے بھی پہلے کا ہے ۔ یہ رنگ گویا صرف حکومتی امور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک اسلامی سوسائٹی کا عمومی طرز عمل ہے ۔ اگرچہ حکومت اس وقت قائم ہی نہ ہوئی تھی ۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں حکومت کی تنظیم دراصل اسلامی سوسائٹی کے خدوخال کا ایک منظم ظہور ہی ہے اور اسلامی سوسائٹی میں اسلامی حکومت بھی آتی ہے۔ لہٰذا اسلامی سوسائٹی' اسلامی حکومت کو بھی اسی نہج پر چلاتی ہے۔ جس طرح اس کے عمومی امور چلتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں آغاز ہی سے مشورے کا عمل جاری تھا۔ اور اس مشورے کا دائرہ حکومت اور حکومتی احکام سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ یہ دراصل اسلامی سوسائٹی کی صفت ہے اور اس جماعت کی تو ممتاز صفات میں سے ہے جسے اللہ نے پوری انسانیت کی قیادت کے لیے برپا کیا ہے۔ اور قیادت کے لیے تو یہ بہت ہی اہم ہے۔

شوریٰ کی شکل و صورت کیا ہونی چاہیے تو اسلام نے اس کے لیے کوئی فولادی قالب نہیں تیار کیا۔ ہر زمان و مکان کے حالات میں اس کی مختلف شکل و صورت تیار ہو سکتی ہے تاکہ یہ صفت یعنی شورائیت اسلامی سوسائٹی میں بھی رائج ہو۔ اسلامی اداروں میں بھی مروج ہو' لیکن اس کی کوئی جامد شکل نہ ہو بلکہ شوریٰ کی روح ہر جگہ موجود ہو۔ یعنی یہ شورائیت دراصل الفاظ اور اشکال کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک صفت ہے جو ایمان کے نتیجے میں اسلامی سوسائٹی میں شورائی شعور اور طرز عمل پیدا کرتی ہے۔ بعض لوگ ایسے اسلامی اداروں کی بات کرتے ہیں جن کی تہہ میں ایمان نہ ہو یا ایمان کا ہونا ضروری نہ ہو تو وہ ایک فضول کام کر رہے ہیں۔ اور یہ کوئی سطحی بات نہیں ہے جس طرح پہلی نظر میں نظر آئے گی اور خصوصاً ان لوگوں کو نظر آئے گی جنہوں نے اسلامی نظریہ حیات میں ایمان کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ کیونکہ اسلامی نظریہ حیات اداروں اور تنظیمات میں منتقل ہونے سے قبل' اس کے اندر ایسی عقلی اور نفسیاتی حقیقتیں ہوتی ہیں جو انسانی سوچ اور انسان کی ذات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اور اس کے بعد اسلام کے اجتماعی اداروں میں وہ اصول بن کر ایک متعین شکل اختیار کر کے سامنے آتی ہیں اور اس کے بعد پھر نصوص آتے ہیں اور وہ ان اشکال اور حالات کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ نصوص ان اصولوں کو منظم کر دیتے ہیں' ان کی تخلیق نہیں کرتے' ان کی تخلیق تو ایمان کی وجہ سے ہو چکی ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلامی نظریہ حیات کی کسی شکل و صورت کے ظہور کے لیے کسی ملک میں اسلامی سوسائٹی اور مسلمانوں کا وجود ضروری ہے۔ اور ان مسلمانوں کا ایمان فعال اور بااثر ہو۔ اگر مسلمانوں کا وجود ہی نہ ہو تو محض اداروں کے قیام سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ محض ادارے ضرورت پوری نہ کر سکیں گے اور اس صورت میں کوئی ایسا نظام وجود میں نہ آ سکے گا جسے اسلامی کہا جا سکے۔

جب مسلمان صحیح معنوں میں پائے جائیں گے اور ایمان اپنی حقیقت کے اعتبار سے وجود میں آ جائے گا تو اسلامی نظام بذات خود وجود میں آ جائے گا اور اس کی ایک اداراتی شکل خود بخود وجود میں آ جائے گی جو ان مسلمانوں کی ضرورت ہو گی اور ان کی سوسائٹی کی ضرورت ہو گی اور صرف اس طرح اسلامی اصولوں کے خواب کی سچی تعبیر وجود میں آ سکے گی۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۴۲ : ۳۸) "اور ہم نے ان کو جو رزق دیا اس سے خرچ کرتے ہیں"۔
یہ آیت بھی حکم فرضیت زکوٰۃ سے پہلے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ زکوٰۃ دو ہجری میں فرض ہوئی لیکن انفاق فی سبیل اللہ عام حکم اسلامی جماعت کے لیے پہلے سے تھا۔ بلکہ اسلامی سوسائٹی کی تشکیل کے ساتھ ہی یہ حکم وجود میں آ گیا تھا۔

دعوت اسلامی کے عمل کے لیے مال کی ضرورت ہے اور یہ مال بذریعہ انفاق حاصل ہو گا۔ انفاق کے ذریعہ انسانوں کے دل کنجوسی کی بری خصلت سے پاک ہوتے ہیں۔ جب انسانی جذبہ مال پر قابو پا لیتا ہے اور اپنی مملوکات کی بجائے اللہ پر بھروسہ

کرنا سکھاتا ہے‘ ایمان کے مفہوم کے نکھار کے لیے یہ سب امور ضروری ہیں۔اور یہ بات تو اپنی جگہ ہے کہ انفاق کے بغیر کوئی اجتماعی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔کیونکہ دعوت تو ایک جدوجہد ہے اور جدوجہد میں کارکنوں کی کفالت ضروری ہے تاکہ اجتماعی ضروریات پوری ہوں اور نتائج برآمد ہوں۔ بعض اوقات یہ تکافل ہمہ گیر ہو جاتا ہے کہ کسی کے لیے انفرادی دولت رکھنے کی اجازت ہی نہیں ہوتی۔جب مہاجرین مکہ سے نکلے اور مدینہ میں انصار کے ساتھ مل کر جو نظام قائم ہوا یہ سب اسی اصول کے تحت تھا لیکن جب حالات معمول پر آگئے تو پھر زکوٰۃ کو رائج کر کے مواخات کے نظام کو منسوخ کر دیا گیا جو کلی تکافل تھا۔بہرحال انفاق فی سبیل اللہ اس جماعت کی ممتاز خصوصیت ہے جسے اس مقصد کے لیے چنا گیا ہو یا اسے اس مقصد کے لیے قائم کیا گیا ہو کہ وہ کسی خطے میں اسلامی انقلاب برپا کرے۔

وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (۴۲ : ۳۹) ”اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں“۔مکی سورتوں میں اس صفت کا ذکر اپنے اندر خاص معنی رکھتا ہے۔جیسا کہ ہم نے پہلے کہا۔اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلامی جماعت مسلمہ کے اندر یہ طبیعی صفت ہوتی ہے کہ وہ زیادتی کا مقابلہ کرتے ہیں۔برائی کا مقابلہ کرنا ایک اہم فریضہ ہے کیونکہ اگر کوئی ظالم کے سامنے ہتھیار ڈال دے تو ظالم اور جری ہو جاتا ہے۔لہٰذا ظالم کا مقابلہ کرنا بہت ضروری ہے۔اور ایک ایسی ملت جسے اٹھایا ہی اس لیے گیا ہو کہ لوگوں کے حقوق کی پاسبانی کرے‘ امر بالمعروف اس کا مشن ہو اور نہی عن المنکر اس کا فریضہ ہو‘ اس کے لیے تو برائی کا مقابلہ کرنا بہت ہی اہم ہے کیونکہ امت مسلمہ اور جماعت مسلمہ کا نصب العین یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی پر چھا جائے اور اس کے اندر سچائی کے ساتھ عدل و انصاف قائم کرے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ”اور عزت اللہ‘ رسول اللہؐ اور مومنین کے لیے ہے“۔لہٰذا اسلامی جماعت کا مزاج‘ اس کے فرائض کی نوعیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ زیادتی کا مقابلہ کرے اور اس پر جو دست درازیاں کی جا رہی ہیں ان کی مدافعت کرے۔مکہ میں حکم یہ تھا کہ رک جاؤ اور ہاتھ روک لو اور صبر کرو۔نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو‘ وہاں یہ احکام مکہ کے مخصوص حالات کی وجہ سے تھے اور ابتدائی عرب مسلمانوں کی قدرے تربیت بھی مطلوب تھی کیونکہ عرب مزاجاً منتقم المزاج تھے‘ یہ اسلامی جماعت اور اسلامی سوسائٹی کے لیے مستقل احکام نہ تھے۔مکہ میں بعض خصوصی اسباب کی وجہ سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ ہر قیمت پر بقائے باہمی کے لیے امن اور سلامتی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

ا۔ اس لیے کہ مسلمانوں کے خلاف سختی اور زیادتی کسی منظم حکومتی ادارے کی طرف سے نہ تھی جو اس وقت کی جماعت پر حکمران ہو کیونکہ جزیرۃ العرب کی سیاسی صورت حال غیر منظم قبائلی انداز کی تھی۔وہاں مسلمانوں پر جو تشدد کیا جاتا تھا اگر کوئی مسلمان کسی قبیلے کا فرد تھا تو اس پر یہ تشدد قبیلہ کرتا تھا اور قبیلے میں بھی اس کے قریبی رشتہ دار کے علاوہ کوئی جرأت نہ کر سکتا تھا۔مسلمانوں پر بحیثیت جماعت کوئی تشدد نہ ہوتا تھا۔بعض اوقات آقا اپنے مسلمان غلاموں پر تشدد کرتے تھے اور مسلمان انہیں خرید کر آزاد کر دیتے تھے۔اس لیے کوئی بھی اپنے غلاموں پر زیادہ تشدد کی جرأت نہ کرتا تھا‘ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ چاہتے تھے کہ مکہ میں گھر گھر کے اندر لڑائی شروع ہو جائے۔ایک ہی گھر کے جو لوگ مسلمان ہو گئے ہیں وہ غیر مسلموں سے لڑنا شروع کر دیں۔پھر مکہ میں نرمی دوسرے لوگوں کے دلوں کو زیادہ نرم کر دیتی تھی بنسبت سختی کے۔

پھر عرب معاشرہ ایک خوددار اور جوانمرد معاشرہ تھا۔ اس میں مظلوم کی حمایت میں لوگ اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مسلمان جب اذیت برداشت کرتے تھے اور اپنے عقیدے پر جم جاتے تھے تو عربوں کی جوانمردی کے جذبات ان کے حق میں اٹھتے تھے۔ شعب ابی طالب میں محصوری کے دوران بالعموم اسی جذبے نے مسلمانوں کی مدد کی' جس میں بنی ہاشم سب محصور کر دیئے گئے تھے۔ اس محاصرے کے خلاف لوگوں کی ہمدردیاں' مسلمانوں کے حق میں ہوگئیں اور لوگوں نے اس معاہدے کے پرزے پرزے کر دیئے جو صحیفے میں تھا اور یوں یہ ظالمانہ معاہدہ ختم ہوا۔

پھر عربوں کے اندر یہ رواج تھا کہ وہ بات بات پر تلوار سونت لیتے تھے۔ وہ بڑے جذباتی تھے اور کسی نظم و نسق کے پابند نہ تھے۔ اسلامی جماعت میں جو تنظیم مطلوب تھی اس کا تقاضا تھا کہ اس جذباتیت کو ذرا دبایا جائے اور اسے کسی ہدف کا پابند کیا جائے۔ اور لوگوں کو اعصابی ضبط اور صبر کا عادی بنایا جائے۔ اور لوگوں کے اندر یہ شعور پیدا کیا جائے کہ نظریہ اور نصب العین ہر جذبے اور ہر مفاد پر مقدم ہیں۔ لہٰذا مکہ میں صبر اور مسلسل صبر کی تلقین کرنا اسلام کے منہاج تربیت کے لیے بہت ضروری تھا۔ اس طرح ایک مسلم کی شخصیت میں مطلوبہ توازن پیدا ہو گیا اور وہ صبر و ثبات کے ساتھ اپنے مقصد کے لیے آگے بڑھتے رہے--- غرض یہ اور اس طرح کے دوسرے اسباب تھے جن کو اللہ اور رسول جانتے ہیں۔ ان کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں 'صبر کی تلقین ہوتی رہی لیکن اصلی ہدف تحریک اسلامی کا یہی تھا۔

وَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ (۴۲ : ۳۹) "وہ لوگ جب ان پر زیادتی ہو تو وہ مقابلہ کرتے ہیں"۔

اس اصول کو زندگی کا ایک دوسرا اصول عملاً رائج کرتا ہے' وہ ہے:

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُھَا (۴۲ : ۴۰) "برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے"۔ سزا کا یہ اصول ہے کہ جیسا جرم ہو' ویسی ہی سزا دی جائے تاکہ سرکشی اختیار نہ کرے۔ اگر کسی سرکش انسان کو کوئی روکنے والا نہ ہو تو وہ سرکشی اور ظلم میں بڑے اطمینان سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔

یہ تو ہے مظلوم کا حق اور اصول عامہ۔ لیکن اگر کوئی اپنے اصلاح نفس یا جزائے خیر اور اخروی اجر کے لیے کسی کو معاف کرتا ہے یا جماعت مسلمہ کے خلاف اٹھنے والے جذبات کی وجہ سے معاف کرتا ہے تو اس قاعدے میں استثناء موجود ہے۔ لیکن معافی کو اس وقت معافی تصور کیا جائے گا جب کوئی شخص برائی کا جواب برائی کے ساتھ دینے پر قدرت رکھتا ہو۔ اس وقت عفو کا وزن بھی ہو گا اور دست درازی کرنے والے کی اصلاح بھی ہوگی کیونکہ دست درازی کرنے والا جب یہ سوچے گا کہ عفو اور درگزر محض احسان کی وجہ سے ہوئی ہے اور اس میں معاف کرنے والے کی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ تو اس صورت میں وہ شرمندگی محسوس کرے گا' نادم ہو گا اور آئندہ حیا کرے گا۔ اور یہ سوچے گا کہ میرے مخالف نے میرے ساتھ شریفانہ سلوک کیا ہے۔ وہ اونچا آدمی ہے اور جو شخص انتقام لینے پر قادر ہو اور معاف کر دے تو اس کا دل بھی صاف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایسے حالات میں عفو و درگزر دونوں کے لیے مفید ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایک شخص انتقام لینے سے عاجز ہو اور معاف کر دے تو پھر صورت یہ ہوگی' گد اگر تواضع کند خوئے اوست۔ لہٰذا ایسے عفو کو عفو کہنا ہی نہیں چاہئے کیونکہ وہاں عفو نہیں ہے' مجبوری ہے۔ اور یہ صورت حال ایک شر انگیز صورت حال ہے۔ اس کے نتیجے میں

ظلم کرنے والا اور جری ہوتا ہے ۔ اور فساد اور پھیلتا ہے 'یہ ہے مفہوم آیت ۔

فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ (۴۲ : ۴۰) "پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے"۔

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (۴۲ : ۴۰) "اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا"۔ یہ پہلے قاعدے کی تاکید ہے کہ "برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے"۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ یا تو معاف کر دو یا اگر بدلہ لینا ہے تو برابر بدلہ لو اس میں حد سے نہ بڑھو ۔۔ ایک دوسری تاکید اسی قاعدے کی :

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیْھِمْ مِنْ سَبِیْلٍ (۴۲ : ۴۲) اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۴۲ : ۴۲) "اور جو لوگ ظلم کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی ۔ ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں 'ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ لہٰذا جو شخص ظلم کے بعد مدافعت کرتا ہے اور برائی کا بدلہ اس کے مساوی لیتا ہے 'تعدی نہیں کرتا تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے ۔ وہ تو اپنا قانونی حق استعمال کرتا ہے ۔ لہٰذا اس کے خلاف کسی کے پاس کوئی حجت نہیں ہے ۔ نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ اس کی راہ روکے ۔ راہ تو ان لوگوں کی روکنی چاہئے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں 'اور زمین میں بغیر استحقاق کے زیادتیاں کرتے ہیں ۔ کیونکہ کسی ایسے ملک کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب اس میں ایک ظالم لوگوں پر ظلم کر رہا ہو اور اس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ ہو ۔ اس میں باغی ہو جو لوگوں پر مظالم ڈھا رہا ہو اور کوئی قوت ایسی نہ ہو جو اس کا ہاتھ روکے یا اس سے قصاص دلوا سکے ۔ اللہ تعالیٰ بہرحال اس قسم کے ظالموں کو عذاب الیم کی دھمکی دیتا ہے ۔ لیکن یہ لوگوں کا بھی فریضہ ہے کہ وہ ظالم کا ہاتھ پکڑیں ۔

آخر میں پھر انفرادی حالات اور طاقت انتقام کے باوجود 'توازن 'اعتدال 'ضبط نفس 'صبر اور احسان کا رویہ اپنانے پر متوجہ کیا جاتا ہے ۔ جب صبر اور احسان فی الواقعہ ایک درگزر ہو 'ذلت نہ ہو 'کوئی احسان ہو 'مجبور نہ کر دیا گیا ہو ۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۴۲ : ۴۳) "البتہ جو صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے"۔

اس پیراگراف کی تمام ہدایات و احکام نہایت ہی اعتدال اور میانہ روی پر مبنی ہیں ۔ نفس انسانی کو ایک طرف کینہ اور غصے سے بچانے کی سعی کی گئی ہے 'اور دوسری جانب کمزوری 'ذلت اور ظلم و زیادتی سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اور ہر حال میں اللہ کی رضامندی کو پیش نظر رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے ۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ صبر بہرحال زاد راہ ہے ۔

اور مومنین کی جو صفات یہاں دی گئی ہیں وہ اس انقلابی جماعت کی خصوصیات ہیں 'جس نے پوری انسانیت کی

قیادت کرنی ہے' اور جس کے پیش نظر انعام اخروی اور رضائے الٰہی ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائیں اور رب پر توکل کریں۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہ صفات مومنین یہ ہیں اور ان کے لیے جو اخروی اجر ہے' وہ بہت بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔ اب بطور تقابل تصویر کا دوسرا رخ بعض ظالموں کا انجام بھی یہاں دے دیا جاتا ہے۔ اور ان کے لیے ذلت اور خسران کا اعلان کیا گیا ہے۔

وَمَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۶﴾

"جس کو اللہ ہی گمراہی میں پھینک دے اس کا کوئی سنبھالنے والا اللہ کے بعد نہیں ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ اور تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے تو ذلت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے اور اس کو نظر بچا بچا کر کن انکھیوں سے دیکھیں گے۔ اس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈال دیا۔ خبردار رہو' ظالم لوگ مستقل عذاب میں ہوں گے اور ان کے کوئی حامی و سرپرست نہ ہوں گے۔ جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کو آئیں جسے اللہ گمراہی میں پھینک دے اس کے لیے بچاؤ کی کوئی سبیل نہیں"۔

اللہ کے فیصلے کو رد نہیں کیا جا سکتا اور اللہ مشیت کی راہ کوئی روک نہیں سکتا۔

وَمَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَلِيٍّ مِّنْ بَعْدِهِ (۴۲ : ۴۴) "جس کو اللہ گمراہی میں پھینک دے' اس کا کوئی سنبھالنے والا اللہ کے بعد نہیں"۔ جب اللہ کے علم میں یہ بات آ جاتی ہے کہ یہ بندہ گمراہی کا مستحق ہے تو اللہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے کہ یہ گمراہ ہو گا۔ اس کے بعد پھر کوئی ولی اسے ہدایت دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ نہ اس کی مدد یوم الحساب میں عذاب سے بچانے میں کر سکتا ہے۔ باقی آیت میں ایک منظر!

وَتَرَى الظّٰلِمِينَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ (۴۲ : ۴۴)

وَتَرٰهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ (۴۲ : ۴۴) "تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے اب پلٹنے کی کوئی سبیل ہے؟ اور تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے ' ذلت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے ۔ اور اس کو نظریں بچا کر کن اکھیوں سے دیکھیں گے"۔ ظالم چونکہ سرکش اور باغی تھے تو اللہ تعالیٰ نے یوم الجزاء میں انہیں بظاہر ذلت کی حالت میں رکھا۔ یہ عذاب دیکھتے ہیں تو ان کی بڑائی دھڑام سے گرتی ہے اور نہایت ہی ذلت اور انکسار سے باہم بات کرتے ہیں کہ کوئی راستہ ہے پلٹنے کا ہے۔ اس بے تابانہ مایوسی کے مکالمے اور اس ذلت و خواری کی حالت میں جب آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تو حالت خشوع میں ہیں۔ تقویٰ اور احترام کی وجہ سے نہیں بلکہ ذلت اور خواری کی وجہ سے ' وہ خود بھی سہمے ہوئے ' جھکے ہوئے ہیں اور نظریں بھی نیچی ہیں ۔ ذلت اور شرمندگی کی وجہ سے نظریں اٹھا کر نہ دیکھ سکیں گے ۔

يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ (۴۲ : ۴۴) "اور نظریں بچا بچا کر کن اکھیوں سے دیکھیں گے"۔ یہ اس وقت نہایت ہی توہین آمیز حالت میں ہوں گے ۔

اور اس وقت یہ معلوم ہو گا کہ یہ دن اہل ایمان کا ہے ۔ وہ بات کرتے ہیں اور تبصرے کرتے ہیں ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

(۴۲ : ۴۵) "اس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈال دیا"۔ اور یہ کفار واقعی سب کچھ ہار گئے ۔ اور یہ لوگ ذلت سے جھکے کھڑے ہیں وہ بھی باہم تبصرہ کرتے ہیں مگر یوں کہ کیا ایسی کی کوئی راہ ہے؟ --- اب ایک عام تبصرہ آتا ہے اس پورے منظر پر کہ یہ لوگ جن کو آگ پر پیش کیا گیا ہے ان کا انجام کیا ہو گا۔

اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ (۴۲ : ۴۵) وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ

يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ (۴۲ : ۴۶) "خبردار رہو ' ظالم لوگ مستقل عذاب میں ہوں گے اور ان کے کوئی حامی و سرپرست نہ ہوں گے ' جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کو آئیں اور جسے اللہ گمراہی میں پھینک دے اس کے لیے بچاؤ کی کوئی سبیل نہیں"۔ نہ کوئی مددگار ہے اور نہ نکلنے کا کوئی راستہ ہے ۔ لہٰذا اب ان کے لیے عذاب مقیم ہی ہے ۔

--- ○○○ ---

اس منظر کی روشنی میں حضورؐ کے معاندین اور مغرور مخاطبین کو اب نہایت ہی ہمدردی سے خطاب کیا جاتا ہے کہ اللہ کی بات کو قبول کر لو ' قبل اس کے کہ اچانک تم پر یہ دن آجائے ' جس سے پھر کوئی پناہ تمہیں نہ ملے ' کوئی مددگار نہ ملے جو اس برے انجام پر احتجاج کر سکے ' اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اگر یہ اس مخلصانہ تنبیہ کو نہیں مانتے اور منہ موڑتے ہیں تو آپ کا فرض پورا ہو گیا۔ آپ کا فریضہ صرف یہ ہے کہ بات پہنچا دیں ' آپ ان کی

ہدایت کے مکلف اور ذمہ دار نہیں نہ ان کے ٹھیکہ دار ہیں۔

اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ یَّوْمَىِٕذٍ وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِیْرٍ ۝۴۷ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ؕ اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ

"مان لو اپنے رب کی بات قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا۔ اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے نبیؐ ہم نے تم کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے۔ تم پر تو صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے"۔

اس کے بعد انسان کے عمومی مزاج کو ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ انسان جو دعوت اسلامی اور سچائی کا مقابلہ کرتا ہے اور رسول برحق سے عناد رکھتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو اذیت و عذاب کا مستحق گردانتا ہے تو اس کی حالت یہ ہے کہ جب کسی اذیت میں یہ مبتلا ہو جاتا ہے تو اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی قوت برداشت جواب دے دیتی ہے۔ جزع فزع اور آہ و فغاں شروع کر دیتا ہے اور اگر اللہ کی کوئی نعمت مل جائے تو ہواؤں پر اڑنے لگتا ہے۔ اور حدود پار کر لیتا ہے جبکہ سختی میں مایوس اور کافر ہو جاتا ہے۔

وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ۝۴۸

"انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو اس پر پھول جاتا ہے، اور اگر اس کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اس پر الٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے"۔ اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے حصے میں خوشی آتی ہے یا غم آتا ہے، تنگی آتی ہے یا کشادگی نصیب ہوتی ہے، یہ سب امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ پس یہ بدبخت انسان جو بھلائی کا شیدائی ہے اور برائی اور سختی سے نفور ہے، اسے کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس مالک سے دور رہا ہے جس کے ہاتھ میں اس کے سب امور ہیں اور ہر حال میں وہ خالق و مالک ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝۴۹ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ

وَيَجۡعَلُ مَن يَشَآءُ عَقِيمًاۚ إِنَّهُۥ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ۝٥٠

"اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے' جو کچھ چاہتا ہے' پیدا کرتا ہے' جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے' جسے چاہتا ہے' لڑکے دیتا ہے' جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے' اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے"۔

اولاد کسی شخص پر فضل و کرم ہونے یا اس سے محروم ہونے کی بڑی نشانی ہے۔ پھر اولاد انسانی نفس کے بہت ہی قریب پسندیدہ چیز ہے۔ اولاد سے انسان کو بہت محبت ہوتی ہے۔اس لیے کسی پر اللہ کے فضل ہونے یا اس سے محروم ہونے کے حوالے سے یہ بہت ہی حساس اور قوی الاثر چیز ہے۔اس سورت میں رزق کے اعتبار سے خوشحالی اور بدحالی کی بات گزر چکی ہے۔ یہاں اولاد کے حوالے سے بھی انسان کے نصیب کی بات کر دی تاکہ مال و اولاد دونوں کی بات ہو جائے' کیونکہ اولاد بھی اللہ کی طرف سے ایک بہترین رزق ہے۔مال کی طرح بلکہ اس سے پیارا۔

جہاں بھی اللہ کے ملک کی بات ہوتی ہے وہ ملک سماوات اور پوری زمین سے شروع ہوتی ہے' مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ عام مالک ہے۔ اسی طرح يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ (۴۲ : ۴۹) "جو چاہتا ہے' پیدا کرتا ہے"۔ تخلیق کا ذکر بھی یہاں نہایت مناسب اور معنی خیز ہے۔ یہاں اولاد کو زندہ کرنے اور عطا کرنے کا مضمون ہے۔اس کے ساتھ صفت تخلیق کا ذکر مناسب ہے۔انسان کو بتایا گیا کہ تم جو پسند کرتے ہو' ان کو بھی اللہ پیدا کرتا ہے اور جن کو تم ناپسند کرتے ہو' ان کو بھی اللہ پیدا کرتا ہے۔وہی دینے والا اور وہی محروم کرنے والا ہے۔

اب حالات داد و دہش اور حالات محرومیت کی تفصیلات۔ اللہ جسے چاہتا ہے عورتیں دیتا ہے اور یہ لوگ عورتوں کو پسند نہ کرتے تھے (جس طرح آج بھی نہیں کیا جاتا) یہ تو اللہ ہے کہ کسی کو لڑکے' کسی کو لڑکیاں اور کسی کو دونوں دیتا ہے۔اور کسی کو اس میٹھے پھل سے صاف صاف محروم کر دیتا ہے۔یہ سب حالات اللہ کی مشیت پر موقوف ہیں۔اس میں اللہ کے سوا کسی کا دخل نہیں ہے۔وہ اپنے علم و قدرت کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔

إِنَّهُۥ عَلِيمٌ قَدِيرٌ (۴۲ : ۵۰) "وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

--- ○○○ ---

سورت کے خاتمہ پر موضوع اول سامنے آتا ہے جس پر اس پوری سورت میں بات ہوتی رہی ہے۔یعنی رسالت اور وحی کی حقیقت یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس عمل میں بندے اور خدا کے درمیان رابطہ کس طرح ہوتا ہے' اور اس کی صورتیں کیا کیا ہیں؟ اور یہ رابطہ رسول کریم کے ساتھ ہو چکا ہے اور اس کے نہایت ہی بلند مقاصد ہیں یہ کہ جو صراط مستقیم کی طرف آنا چاہے اسے لایا جائے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ ٱللَّهُ إِلَّا وَحۡيًا أَوۡ مِن وَرَآيِٕ حِجَابٍ أَوۡ يُرۡسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذۡنِهِۦ مَا يَشَآءُۚ إِنَّهُۥ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ۝٥١ وَكَذَٰلِكَ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ

رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾

''کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے' یا پردے کے پیچھے سے' یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے' وہ برتر اور حکیم ہے اور اسی طرح (اے نبیؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے' مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو' اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو' سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں''۔

اس آیت میں یہ بات قطعی انداز میں کہہ دی گئی ہے کہ کوئی انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ آمنے سامنے ہو کر بات نہیں کر سکتا۔ حضرت عائشہؓ سے یہ مروی ہے: ''جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو اس نے بہت بڑا افترا باندھا'' (متفق علیہ) خدا کا مکالمہ بندوں کے ساتھ تین طریقوں سے سرانجام پاتا ہے۔ بذریعہ وحی' یہ وحی قلب نبی پر براہ راست ہوتی ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ یہ وحی ہے' یا پردے کے پیچھے سے' جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مکالمہ ہوا۔ لیکن جب آپ نے اللہ کو دیکھنے کی درخواست کی تو اس درخواست کو قبول نہ کیا گیا۔ اور پہاڑ نے بھی تجلیات الٰہیہ کو برداشت نہ کیا۔

وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ

''اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑا جب ہوش آیا تو بولا: پاک ہے تیری ذات میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والوں میں سے ہوں''۔ (۷:۱۴۳) یا پھر یہ طریقہ ہے کہ ایک پیغام لانے والا بھیج دے اور یہ فرشتہ ہوتا ہے جو اللہ کے حکم سے جو چاہے وحی کر دے۔ اور اس کی تفصیلات حضور اکرمؐ نے خود بتا دی ہیں۔ پہلا طریقہ یہ کہ فرشتہ آپ کے دل میں بات ڈال دے ماسوائے اس کے کہ آپ فرشتے کو دیکھیں۔ حضورؐ نے فرمایا ''روح القدس نے میرے دل میں یہ بات پھونک دی کہ ہرگز کوئی نفس نہ مرے گا قبل اس کے کہ وہ اپنا رزق مکمل نہ کر دے' لہٰذا اللہ سے ڈرو اور نہایت ہی خوبصورت طریقے سے رزق کی تلاش کرو''۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فرشتہ ایک انسان کی شکل میں آپ سے بات کرتا اور آپ اس کی بات کو سمجھ لیتے۔ تیسری صورت یہ کہ وحی آپ پر گھنٹی کی آواز کی طرح آتی اور یہ طریقہ آپ کے لیے بہت سخت ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ سخت سردی کے دنوں میں بھی آپ کے ماتھے سے پسینہ ٹپکتا اور ایسی حالت میں اگر آپ سواری پر ہوتے تو اس پر اس قدر بوجھ ہوتا کہ سواری بیٹھ جاتی۔ آپ پر ایک بار ایسی حالت میں وحی آئی اور آپ کا سر مبارک زید ابن ثابت کی ران پر تھا۔ اس پر یہ اس قدر بھاری ہو گیا کہ قریب تھا کہ اس سے ان کی ران چورہ چورہ ہو جاتی۔ چوتھی صورت یہ تھی کہ آپ فرشتے کو اسی شکل میں دیکھتے جس میں اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔

اس وقت وہ جو چاہتا' وحی کر دیتا۔اور اس شکل میں فرشتہ صرف دو بار آیا ہے۔ جیسا کہ سورت نجم میں ذکر ہوا (زاد المعاد' ابن قیم الجوزیہ)

یہ ہیں وحی کی صورتیں' اور ان کے مطابق اللہ کے ساتھ حضور اکرمؐ کا رابطہ ہوتا رہا ہے۔

اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ (۴۲ : ۵۱) "اللہ برتر اور حکیم ہے"۔وہ اپنی بلندیوں سے وحی کرتا ہے اور وہ اپنی حکمت سے جسے چاہتا ہے' چن لیتا ہے۔

میں یہاں ضرور کہوں گا کہ جب بھی میں نے کسی ایسی آیت یا حدیث پر غور کیا ہے جس میں بندے اور رب کے درمیان رابطے کا ذکر ہو' تو میرا رواں رواں کانپ اٹھا ہے کہ ایک ازلی ابدی ذات جو لازمان اور لامکان ہے' جس کو کسی جگہ میں محدود نہیں کیا جا سکتا' جس کی مثل کائنات میں کوئی چیز نہیں ہے اور فانی بندے کے درمیان اتصال کس طرح واقع ہو سکتا ہے چنکہ انسان ایک جگہ میں محدود ہے' ایک زمان تک محدود ہے۔اور مخلوقات کی دوسری حدود کا پابند ہے۔پھر یہ رابطہ معانی اور کلمات کی شکل کس طرح اختیار کرتا ہے اور ایک فانی محدود ذات کے اندر یہ قوت کس طرح ودیعت کر دی جاتی ہے کہ وہ ازلی و ابدی اور لامکان ذات کا کلام پا سکے۔جس کی کوئی مثال نہیں ہے' یہ کس طرح ممکن ہوا۔کیونکر ہوا؟

لیکن میں نے پھر لوٹ کر اپنے آپ سے پوچھا تم کیف سے سوال کرتے ہو؟ لیکن خود تمہارا یہ کیف بھی محدود' فانی' قاصر اور ایک حدود کے اندر ہے۔لیکن یہ حقیقت تو واقع ہو چکی ہے۔اور اس نے ایک شکل بھی اختیار کر لی۔اس کا ایک وجود ہمارے سامنے آگیا ہے اور تم اسے پا رہے ہو۔

لیکن اس کے باوجود یہ اچنبھا' یہ گھبراہٹ اور یہ خوف موجود ہے۔یہ نبوت تو بہت ہی عظیم امر ہے۔اور اس پیغام کے وصول کرنے کا وقت تو بہت ہی عظیم ہے۔ایک انسانی ذات ایک ذات عالی مقام کا پیغام وصول کرتی ہے۔بھائی! تم یہ کلمات پڑھتے ہو کیا تم میرے اس تصور میں میرے ساتھ شریک ہو؟ کیا تم میرے ساتھ اس امر عظیم کو سوچ رہے ہو؟ کہ یہ وحی وہاں سے آ رہی ہے۔نہیں میں کہتا ہوں کیا میں کہہ سکتا ہوں کہ "وہاں" سے اس دربار عالی میں تو "یہاں" اور "وہاں" نہیں ہے۔یہ نزول تو غیر مکان اور لازمان سے واقع ہے۔یہ تو جگہ مکان اور حدود سے پاک ہے۔جہت اور طرف تو اس بارگاہ میں نہیں۔انتہائی مطلق' ازلی ابدی ذات ہے' اللہ ذوالجلال ہے۔دوسری طرف ایک انسان ہے' نبی ہے' رسول ہے لیکن انسان ہے۔وہ حدود و قیود رکھتا ہے۔یہ وحی! یہ ایک عجیب رابطہ ہے۔معجزانہ رابطہ ہے۔یہ اللہ ہی ہے جو اسے ایک حقیقت واقعہ بنا سکتا ہے۔اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ یہ واقعہ کیسے متحقق ہوا۔بھائی! تم یہ کلمات پڑھ رہے ہو کیا تم ان خیالات کو پا رہے ہو جو میرے دل میں آتے ہیں اور میں انہیں کلمات کی شکل دے رہا ہوں۔میرا پورا وجود جس قدر رعب' کپکپی محسوس کرتا ہے اور میں اسے کلمات میں منتقل کر رہا ہوں' میں نہیں جانتا کہ اس کے لیے میں کیسے کلمات لا سکتا ہوں۔یہ واقعہ تو اپنی ماہیت کے اعتبار سے بہت ہی عظیم عجیب اور خارق عادت ہے۔جن صورتوں میں بار بار واقعہ ہوا۔لوگوں نے اسے محسوس کیا اور بارہا اس کے مناظر بھی دیکھے' رسول اللہؐ کے عہد میں آپ کے ساتھیوں نے۔حضرت عائشہؓ انسانی تاریخ کے اس عظیم واقعہ کو دیکھ رہی ہیں۔اور روایت کر رہی ہیں۔آپؐ فرماتے عائشہ! یہ ہیں جبرئیل' تم پر سلام کہتے ہیں۔آپ فرماتی ہیں وعلیہ السلام۔آپ فرماتی ہیں وہ دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتیں۔یہ ہیں زید

ابن ثابتؓ ۔اس وقت حضور کا سر مبارک ان کی ران پر تھا ۔وحی آتی ہے' قریب ہے کہ ان کی ران کو پیس ڈالے ۔ اور یہ دوسرے صحابہ کرام بارہا اس واقعہ کو دیکھتے ہیں اور پہچان جاتے ہیں آپ کے چہرۂ مبارک پر آثار وحی ۔ آپ کو تنہا چھوڑ دیتے ہیں کہ وحی کی تلقی کا عمل پورا ہو جائے ۔ آپ بھی واپس آتے ہیں اور وہ بھی واپس آتے ہیں ۔

یہ کیا شخصیت ہے رسول خدا کی جو ذات علوی کے ساتھ یہ رابطہ رکھتے ہیں؟ آپ کا جوہر کیا ہے؟ آپ کی روح کیسی ہے کہ ایک ابدی کے ساتھ ازلی کے ساتھ آپ رابطہ ہو جاتا ہے ۔یہ اختلاط کیسے ہوتا ہے ۔یہ مسائل ہیں لیکن یہ حقیقت ہو چکے ہیں ۔ لیکن یہ واقعات ہمارے ادراک کے آفاق سے بہت دور ہیں 'بہت بلند ہیں ۔

ہمارے نبی کی روح ایک انسانی روح ہے ۔یہ انسانی اور فانی روح کس طرح وحی اخذ کرتی ہے ۔تلقی اور ادراک کے دروازے کس طرح کھل جاتے تھے؟ کس طرح ان پر یہ فیضان ہوتا تھا ۔ان عجیب لمحات میں وجود رسول اور وجود کائنات کس طرح محسوس کرتا تھا ۔جس میں اللہ کی تجلیات آتی تھیں ۔اور یہ تجلیات کلمات کی شکل اختیار کرتی تھیں ۔

پھر اللہ کی نگہبانیاں' اللہ کی مہربانیاں اور اللہ کی عزت افزائیاں تو دیکھو! اللہ بہت ہی بلند' بہت ہی بڑا اور وہ اس نہایت ہی چھوٹی 'کمزور اور بے بس مخلوق پر رحمتیں نازل کرتا ہے ۔یہ وحی اس کی اصلاح کے لیے ہے ۔ اس کی راہ روشن کرنے کے لیے ہے ۔ان میں سے جو بے راہ ہو گئے ۔حیران ہیں ان کی راہنمائی کے لیے ۔ انسان جو اللہ کے لیے اس سے بھی کم قیمت ہے جس طرح انسانوں کے لیے ایک مچھر ۔وہ اللہ کی مملکت میں اسی طرح ہے جس طرح پوری زمین کے مقابلے میں ایک مچھر ۔یہ ایک عظیم حقیقت ہے لیکن یہ انسان کی قوت مدرکہ کے تصور سے بہت ہی بلند و بالا ہے ۔ہم صرف اس افق عالی کی طرف دیکھ سکتے ہیں ۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲ : ۵۲) صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ (۴۲ : ۵۳) ''اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے ۔تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے 'مگر اس روح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ۔یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو' اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے ۔خبردار رہو' سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں''۔

وَكَذٰلِكَ (اسی طرح) اس عجیب رابطے کے ذریعہ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (۴۲ : ۵۲) ''ہم نے تمہاری طرف وحی کی''۔گویا وحی مذکور طریقے سے ہوئی ۔کوئی نئی بات نہ تھی ۔اور رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (۴۲ : ۵۲) ''اپنے حکم سے ایک روح''۔ہم نے تمہاری طرف وحی کی ۔یہ ایک روح ہے' اس میں زندگی ہے ۔یہ انسانوں کو زندگی عطا کرتی ہے ۔یہ انسانوں کو آگے بڑھاتی ہے' حرکت دیتی ہے اور نشوونما عطا کرتی ہے' دلوں کو زندہ کرتی ہے اور عملی زاویہ سے لوگوں کو

زندہ کرتی ہے۔

مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (۴۲ : ۵۲) "تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے"۔ یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذہنی کیفیت کی تصویر اللہ کھینچتا ہے۔ اور اللہ آپ کے بارے میں زیادہ علم رکھتا ہے۔ یہ اس وحی کے نزول و وصول سے پہلے کی بات ہے۔ اس نزول وحی سے قبل حضورؐ نے کتابوں کے بارے میں بھی سنا ہوا تھا۔ اور ایمان کے بارے میں بھی سنا ہوا تھا۔ اور جزیرۃ العرب میں یہ بات مشہور تھی کہ وہاں اہل کتاب ہیں اور ان کے پاس کتاب الٰہی ہے' اور ان کا یہ عقیدہ ہے۔ لہٰذا مراد یہ نہیں ہے کہ آپ نہ کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو جانتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے ضمیر کے اندر وحی کتاب اور ایمان کا وہ شعور نہ پاتے تھے۔ وحی الٰہی سے قبل آپ کے شعور میں یہ باتیں نہ تھیں جو وحی کے ذریعہ اب آپ لوگوں کو بتاتے ہیں۔

وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ (۴۲ : ۵۲) "مگر اس کو ہم نے روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں"۔ یہ ہے اس وحی کی ماہیت اور اس کی ذاتی خصوصیت۔ یہ روح' یہ وحی' یہ کتاب دراصل ایک نور ہے۔ یہ نور جب قلب کا حصہ بن جاتا ہے تو پھر یہ رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن یہ نور اسی شخص کے دل میں داخل ہوتا ہے جس کے بارے میں اللہ کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کے دل میں راہ پا سکتا ہے۔ اور یہ شخص اس کی طرف مائل ہے۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲ : ۵۲) "یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہو"۔ یہاں تاکید کے ساتھ وحی کی رہنمائی کی حیثیت کو واضح کیا جاتا ہے کہ یہ ایک عملی رہنمائی کا پروگرام ہے۔ اور ہدایت بھی اسی کو ملتی ہے۔ جس شخص کے بارے میں اللہ کی مشیت ہو۔ یہ اللہ کا کام ہے کہ جس کے مقدر میں چاہے' لکھ دے۔ اور اللہ ہر مقدر اپنے پیشگی علم کی وجہ سے تحریر کرتا ہے۔ یہ علم صرف اللہ ہی کو ہوتا ہے۔ رسول کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا۔ رسول تو حکم الٰہی سے تبلیغ پر مامور ہے۔ وہ کسی کے دل میں ہدایت نہیں ڈال سکتا۔ آپ اپنا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ کی مشیت کام کرتی ہے۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲ : ۵۲) صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِىْ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ (۴۲ : ۵۳) "یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کر رہے ہو' اس خدا کے راستے کی طرف جو زمین و آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے"۔ یہ وحی ہدایت ہے اللہ کے راستے کی طرف۔ جہاں تمام راستے آکر ملتے ہیں اور یہ مالک کا راستہ ہے جو زمین و آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے جو اس راستے پر آگیا۔ اسے اس کائنات کے قوانین فطرت کی راہ بھی معلوم ہو گئی۔ اسے زمین و آسمان کی قوتوں کا پتہ بھی چل گیا' اسے آسمانوں اور زمینوں کی ارزاق کا بھی پتہ چل گیا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زمین و آسمان سب اللہ کی راہ پر چل رہے ہیں۔ اللہ ہی ان کا مالک ہے' یہ سب اس کی طرف متوجہ ہیں اور تمام امور اسی کی طرف مڑتے ہیں۔

أَلَآ إِلَى اللّٰهِ تَصِيرُ الْأُمُورُ (۴۲:۵۳) "خبردار رہو' سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں"۔ سب چیزیں اللہ پر جاکر منتہی ہوتی ہیں' وہاں سب امور جمع ہوں گے اور ان کے فیصلے ہوں گے۔ اور یہ نور اس راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو اللہ نے بندوں کے لیے پسند کیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ جڑنے کے لیے اس کی طرف آئیں اور اس کے نشانات پر مطیع فرمان ہو کر چلیں۔

یوں اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس کا آغاز وحی پر بات سے ہوا' اس کا آخری مضمون اور محور وحی تھا۔ ابتدائی نبوتوں سے لے کر اس نے تمام نبوتوں کو لیا اور بتایا کہ یہ ایک ہی سلسلہ ہے۔ ایک ہی نظام اور منہاج کی طرف دعوت ہے' راستہ بھی ایک ہے' طریقہ بھی ایک ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت نے تمام انسانیت کی رہنمائی کرنی ہے اور اس کی قیادت جماعت مومنہ نے کرنی ہے۔ اس نے لوگوں کو راہ راست پر لانا ہے۔ یہ اس ذات کا راستہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ پھر اس سورت نے اس ابتدائی جماعت کی خصوصیات بھی بتا دیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی اور جس نے بھی یہ کام کرنا ہو' اس کے اندر یہ خصوصیات لازمی ہیں۔ ان خصوصیات کے بغیر نہ قیادت ممکن ہے اور نہ اس امانت کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہ امانت جو اس منہاج کے مطابق آسمانوں سے زمین پر اتاری گئی۔

--- ○○○---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ----- ۲۵

سورۃ الزخرف ـ ۴۳

آیات ۱--- تا--- ۸۹

سورۃ الزخرف ایک نظر میں

اس سورت میں ان مشکلات اور مصائب کا ایک حصہ پیش کیا گیا ہے جن سے اس کے زمانہ نزول میں تحریک اسلامی دو چار تھی۔ اور وہ رکاوٹیں اور اعتراضات بھی اس میں نقل کیے گئے ہیں جن سے دعوت اسلامی کو سابقہ درپیش تھا۔ ان موضوعات کے ساتھ ساتھ یہ بھی اس سورت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کو قرآن مجید کس طرح حل کر رہا تھا۔ چاہے ان کا تعلق خیالات سے ہو یا عمل سے ہو۔ اور یہ کہ قرآن مجید بت پرستانہ عقائد اور افسانوں کی جگہ کس خوبصورتی کے ساتھ اپنے حقائق اور قرآنی اقدار کو لوگوں کے ذہن میں بٹھا رہا تھا۔ اور جاہلی اقدار کو ایک ایک کر کے ذہنوں سے محو کر رہا تھا۔ یہ جاہلی اقدار اس وقت تو ہر انسان کے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھیں، مگر آج بھی ان کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ ہر زمان و مکان میں موجود رہی ہیں۔

جاہلیت کی بت پرستی اس بات کی قائل تھی کہ ان جانوروں میں جن کو اللہ نے بندوں کے لیے مسخر کیا ہے' ایک حصہ اللہ کا ہے اور ایک حصہ ان کے الہوں کا ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ (٦ : ١٣٦) "انہوں نے اللہ کے لیے خود اس کے پیدا کیے ہوئے کھیتوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہے' بزعم خود اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے۔ پھر وہ جو ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے' وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا اور مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے"۔

اور انہی جانوروں کے بارے میں انہوں نے اور بے شمار خرافات اور افسانے بھی گھڑ رکھے تھے' سب کے سب نظریاتی انحراف سے پیدا ہوئے تھے۔ بعض جانور ایسے تھے جن پر سواری ممنوع تھی۔ بعض کے گوشت کو حرام کر دیا گیا تھا۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا (٦ : ١٣٨) "اور کہتے ہیں یہ جانور اور کھیت محفوظ ہیں' انہیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنہیں ہم کھلانا چاہیں' حالانکہ یہ پابندی ان کی خود ساختہ ہے۔ پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن کے اوپر یہ اللہ کا نام نہیں لیتے"۔

اس سورت میں اس قسم کے نظریاتی اور عقائد کی بے راہ روی کی اصلاح کی گئی ہے ۔ انسانی ذہن کو اصلی فطرت اور پہلی حقیقت کی طرف لوٹایا گیا ہے کہ تمام جانور اللہ کی مخلوق ہیں ۔ یہ حیات روئے زمین پر اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے ۔ یہ جانور بھی اس کا حصہ ہیں ۔ اور ان کی تخلیق بھی زمین و آسمان کی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہے ۔ اللہ نے ان کو انسان کے لیے پیدا کیا ہے تاکہ انھیں استعمال کریں اور اپنے رب کی ان نعمتوں پر رب کا شکر ادا کریں ۔ یہ نہ کریں کہ اللہ کے لیے بعض لوگوں کو شریک بنائیں اور پھر اللہ کی چیزوں میں سے اپنے لیے اور اپنے شرکاء کے لیے حصے مقرر کریں ۔ حالانکہ وہ عقیدتاً اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا خالق صرف اللہ ہے ۔ لیکن اس عقیدے کے لازمی تقاضے سے پھر جاتے ہیں اور اس اقرار کا کوئی اثر ان کی زندگی میں نظر نہیں آتا ۔ اور وہ خرافات اور افسانوں کے قائل ہیں ۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (۹)
اَلَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۱۰)
وَ الَّذِىْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ (۱۱)
وَ الَّذِىْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ (۱۲)
لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ
الَّذِىْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ (۱۳) وَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (۱۴)

(۴۳ : ۹ تا ۱۴) "اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے' تو وہ خود کہیں گے کہ "انھیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے"۔ وہی نا جس نے تمہارے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا۔ اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنا دیے تاکہ تم اپنی منزل مقصود کی راہ پا سکو۔ جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین ... اٹھایا ۔ اس طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے ۔ وہی جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا ۔ تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو ... ن یاد کرو' اور کہو کہ "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ۔ ورنہ ہم انھیں قابو میں ... ت نہ رکھتے تھے ۔ اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"۔

... یہ جاہلیت کی بت پرستی کے یہ عقائد بھی تھے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ اپنے لیے وہ بیٹیوں کو پسند نہ کرتے تھے لیکن اللہ کے ... بیٹیاں بناتے تھے ۔ اور اللہ کے سوا ان کی پوجا بھی کرتے تھے ۔ اور پھر یہ کہتے تھے کہ ہم جو ان کی عبادت کرتے ہیں تو اللہ کی مرضی اور مشیت سے کرتے ہیں ۔ اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے اور یہ افسانہ محض ان کی نظریاتی بگاڑ سے پیدا ہوا تھا ۔

اس سورت میں اللہ ان کے سامنے خود ان کے اقوال رکھتا ہے اور فطری منطق سے استدلال کرتا ہے کہ یہ خرافات

ور یہ اوہام اور افسانے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۵) اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ (۱٦) وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۱۷) اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (۱۸) وَجَعَلُوا الْمَلٰۗىِٕكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْــَٔــلُوْنَ (۱۹) وَقَالُوْا لَوْ شَاۗءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ۭ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۤ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۲۰) اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ (۲۱) بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ

(۲۲) (۴۳:۱۵ تا ۲۲) ’’ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزء بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے۔ کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے' تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا اچھی طرح واضح بھی نہیں کر سکتی۔ انہوں نے فرشتوں کو' جو خدائے رحمٰن کے خاص بندے ہیں' عورتیں قرار دے لیا۔ کیا ان کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھ لی ہے؟ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ یہ کہتے ہیں' اگر خدائے رحمن چاہتا تو ہم ان کو کبھی نہ پوجتے۔ یہ اس معاملہ کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے محض تیر تکے لڑاتے ہیں۔ کیا ہم نے اس سے پہلے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند یہ اپنے پاس رکھتے ہوں۔ نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں‘‘۔

جب ان سے کہا جاتا کہ تم تو مورتیوں اور پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے ہو اور تم جن چیزوں کی پوجا کرتے ہو وہ تو جہنم کا ایندھن ہیں کہ جن معبودوں کی تم پوجا کرتے ہو تم اور وہ دونوں جہنم میں ہوگے تو وہ اس واضح کلام کی تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پھر عیسیٰ ؑ کا کیا حال ہوگا' ان کی قوم نے تو ان کی بندگی کی ہے۔ کیا وہ آگ میں ڈالے جائیں گے' پھر وہ کہتے یہ مورتیاں تو فرشتوں کی نقل ہیں اور ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں کیا ان کو بھی جہنم میں ڈالا جائے گا۔ لہٰذا ہم ان کی عبادت کرتے ہوئے بہرحال نصاریٰ کی حالت سے بہتر ہیں جو عیسیٰ ؑ کی بندگی کرتے تھے۔ کیونکہ عیسیٰ ؑ بہرحال بشر تھے۔ اور ہمارے معبود فرشتے ہیں۔

اس سورت میں ان کے اس غلط مبحث کا بھی جواب دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین نے ان کے بعد جو ان کی بندگی شروع کی ہے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے ۔ وہ بری الذمہ ہیں ۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ (۵۷) وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (۵۸) اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۵۹) (۴۳: ۵۷ تا ۵۹) ”اور جونہی ابن مریم کی مثال دی گئی، تمہاری قوم کے لوگوں نے اس پر غل مچا دیا اور لگے کہنے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمہارے سامنے کج بحثی کے لیے لاتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ ۔ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اپنی قدرت کا نمونہ بنا دیا ۔

ان کا زعم یہ تھا کہ وہ ملت ابراہیمی کے پیروکار ہیں ۔ لہٰذا وہ دوسرے اہل کتاب سے زیادہ ہدایت پر ہیں اور عقائد کے اعتبار سے افضل ہیں ۔ حالانکہ وہ اس بت پرستانہ جاہلیت میں گم کردہ راہ تھے ۔

چنانچہ اس سورت میں حضرت ابراہیم کی حقیقت بتائی گئی اور بتایا کہ ابراہیم کی ملت تو خالص توحید کی ملت تھی ۔ کلمہ توحید تو ابراہیم علیہ السلام کا کلمہ ہے، انہی کی وراثت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اسی کلمے کو لے کر آئے ہیں لیکن انہوں نے اس کلمے کا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال اس طرح نہیں کیا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ملت کو کرنا چاہئے تھا ۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (۲۶) اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ (۲۷) وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۲۸) بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ (۲۹) وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۰) (۴۳: ۲۶ تا ۳۰) ”یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے اپنے باپ اور قوم سے کہا تھا کہ تم جن کی بندگی کرتے ہو، میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ میرا تعلق صرف اس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا، وہی میری رہنمائی کرے گا“ ۔ اور ابراہیم یہی کلمہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں ۔ بلکہ میں انہیں اور ان کے باپ دادا کو متاع حیات دیتا رہا یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آگیا مگر جب وہ حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں“ ۔

وہ اس حکمت کو نہ سمجھ سکے کہ اللہ نے کیوں رسول کو منتخب کر کے بھیجا ۔ ان کی نظروں میں زمین ہی کی معمولی، کھوٹی

اور بے قیمت قدریں بیٹھ گئیں اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دنیا پرستوں میں سے ایک آدمی ہی سمجھا۔

اس سلسلے میں ایک رسول کے بارے میں ان کے اقوال' ان کے تصورات اور ان کی سوچ کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں اور ان کو بتایا گیا کہ رسالت کے بارے میں حقیقی سوچ کیا ہے اور یہ کہ رسول کے متعلق وہ جو سوچتے ہیں وہ محض دنیا داری کی سوچ ہے ۔ بہت ہی گھٹیا قسم کی دنیا داری ۔ اسلامی اقدار پر مبنی سوچ کی ایک جھلک ان کو دکھائی جاتی ہے ۔

وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۳۱) اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۳۲) وَ لَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ (۳۳) وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِــُٔوْنَ (۳۴) وَ زُخْرُفًا وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۳۵) (۴۳ : ۳۱ تا ۳۵) ''کہتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں بڑے شہروں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کی رحمت یہ تقسیم کرتے ہیں ۔ دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ۔ اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو سمیٹ رہے ہیں ۔

یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالاخانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگائے بیٹھے ہیں سب چاندی اور سونے کے بنا دیتے ۔ یہ تو محض حیات دنیا کی متاع ہے اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے''۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصے کی ایک کڑی آتی ہے' فرعون بھی اسی طرح کی قدروں پرست ہے ۔ اللہ کے مقابلے میں کبر کرتا ہے ۔ جن جھوٹی قدروں پر فرعون نے فخر کیا' ایسے فخر کرنے والوں کا انتظار بہت برا انجام کرتا ہے ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۶) فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ (۴۷) وَ مَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا وَ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۴۸) وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ

ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ (٤٩) فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (٥٠) وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (٥١) اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (٥٢) فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْجَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ (٥٣) فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (٥٤) فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ (٥٥) فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ (٥٦)

(٤٣: ٤٦ تا ٥٦) "ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے پاس بھیجا اور اس نے جاکر کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ پھر جب اس نے ہماری نشانیاں ان کے سامنے پیش کیں تو وہ ٹھٹھے مارنے لگے۔ ہم ایک پر ایک ایسی نشانی ان کو دکھاتے چلے گئے جو پہلے سے بڑھ چڑھ کر تھی اور ہم نے ان کو عذاب میں دھر لیا کہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔ ہر عذاب کے موقع پر وہ کہتے: اے ساحر اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے' اس کی بنا پر ہمارے لیے اس سے دعا کر' ہم ضرور راہ راست پر آجائیں گے' مگر جونہی کہ ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے۔ ایک دن فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا "لوگو کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا۔ اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی۔ درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔ آخرکار جب انہوں نے ہمیں غضبناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونہ عبرت بناکر رکھ دیا"۔ غرض اس پوری سورت میں بت پرستی 'نظریاتی بگاڑ' دنیا کی جھوٹی قدروں پر بات کی گئی ہے اور بھرپور تنقید۔ اس سورت کے تین اسباق ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا جن کا اکثر مواد ہم نے یہاں دے دیا ہے۔

---○○○---

درس نمبر ۲۲۳ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۵

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۳﴾ وَ اِنَّهٗ فِيْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۴﴾ اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ﴿۵﴾ وَ كَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶﴾ وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۷﴾ فَاَهْلَكْنَاۤ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّ مَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ح۔م۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی کہ ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تا کہ تم لوگ اسے سمجھو۔ اور در حقیقت یہ ام الکتب میں ثبت ہے' ہمارے ہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب۔ اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درس نصیحت تمہارے ہاں بھیجنا چھوڑ دیں صرف اس لیے کہ تم حد سے گزرے ہوئے ہو؟ پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی بارہا ہم نے نبی بھیجے ہیں' کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی نبی ان کے ہاں آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ پھر جو لوگ ان سے بدرجہا زیادہ طاقتور تھے' انہیں ہم نے ہلاک کر دیا' پچھلی قوموں کی مثالیں گزر چکی ہیں"۔

سورت کا آغاز دو حروف حا اور میم سے ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد۔

وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۴۳ : ۲) کا عطف ہے۔ اللہ حا اور میم کی بھی قسم اٹھاتا ہے اور کتاب مبین کی بھی۔

حا اور میم بھی اسی کتاب کے حروف ہیں ۔یا کتاب مبین ان دو حروف کے جنس سے ہے ۔ غرض یہ کتاب مبین حروف تہجی کے اعتبار سے ایسے ہی حروف تہجی سے مرکب ہے ۔یہ دو حروف اسی طرح کے حروف ہیں جس طرح کے حروف انسانی زبانوں میں ہوتے ہیں ۔یہ خالق کائنات کی نشانیاں ہیں جس نے انسان کو اس انداز سے پیدا کیا اور اس کو اس قسم کی آوازیں دیں ۔ قرآن کے ساتھ ان حروف کا جب ذکر آتا ہے کہ تو اس کے بے شمار معانی اور بے شمار دلالات و اشارات ہوتے ہیں ۔ قسم اس بات پر اٹھائی جاتی ہے کہ ہم نے قرآن مجید کو اس انداز پر بنایا عربی زبان میں ۔

انَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۴۳ : ۳) ''ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم لوگ اسے سمجھو'' ۔جب قرآن ان کی زبان میں ہے اور وہ اس کے معنی جانتے بھی ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اسے سمجھنے کی کوشش کریں ۔ قرآن تو وحی الہی ہے لیکن اللہ نے اسے عربی زبان میں منتقل کیا 'کیونکہ قرآن کی دعوت کے لیے اللہ نے آغاز میں عربی معاشرے کو چنا اور سب سے پہلے اس دعوت کے حاملین عرب ہی رہے ۔اس حکمت کی بنا پر جس کی طرف ہم نے سورۂ شوریٰ میں اشارات کیے ہیں ۔کیونکہ اللہ تعالیٰ اس امانت اور اس زبان کی صلاحیتوں کو اچھی طرح جانتا تھا کہ امت عربیہ اور لسان عربی اس دعوت کو دوسری اقوام تک اچھی طرح منتقل کر سکتے ہیں ۔ اللہ جانتا ہے کہ اپنی رسالت کی امانت کو کہاں رکھے اور کہاں نہ رکھے ۔

اس کے بعد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس قرآن کا مقام و مرتبہ اللہ ازلی اور ابدی ذات کے ہاں کیا ہے؟

وَ اِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴۳ : ۴) ''اور درحقیقت یہ ام الکتب میں ثبت ہے اور ہمارے ہاں بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب ہے'' ۔ام الکتاب کیا ہے 'اس کے لفظی معنوں میں ہم نہیں پڑتے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہے یا اللہ کا علم ازلی ہے 'کیونکہ ہمارے ادراک میں نہ تو لوح محفوظ کا ۔اور نہ اللہ کے علم ازلی کا پورا تصور ہے البتہ اس آیت سے ہمارے علم میں ایک اصولی حقیقت آتی ہے ۔جب ہم یہ آیت پڑھتے ہیں ۔

وَ اِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ (۴۳ : ۴) ''یہ درحقیقت ام الکتب میں ثبت ہے اور ہمارے ہاں بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب ہے'' ۔تو اس سے ہمارے ذہن میں یہ بات واضح طور پر آ جاتی ہے کہ اللہ کے علم میں اس کتاب کی بڑی وقعت ہے اور اسے بہت ہی اہم دستاویز سمجھا جاتا ہے ۔بس یہ اصولی اور کلی بات ہمارے لیے کافی ہے کہ قرآن ایک بلند مرتبت کتاب ہے اور حکیم ہے یعنی حکمت والی کتاب ہے ۔یہ دونوں صفات اس کتاب کو ایک ایسی شخصیت دیتی ہیں جس طرح زندہ انسان ہوتا ہے یعنی بلند اور حکیم کا ۔اور بالکل یہ بات اسی طرح ہے ۔ یہ ایسی کتاب ہے گویا اس میں زندگی ہے اور اس میں زندہ شخصیت کی صفات ہیں یہ کہ جو ارواح اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں یہ ان کے ہمقدم چلتی ہے ۔اور یہ اپنی بلندی اور حکمت کے بدولت انسانیت پر نگران ہے 'اس کو ہدایت دیتی ہے 'اس کی قیادت کرتی ہے 'اپنی طبیعت اور اپنے خصائص کے مطابق 'اور یہ انسانی فہم و ادراک میں وہ اقدار اور وہ تصورات بٹھاتی ہے جن پر ان دو صفات علی اور حکیم کا اطلاق ہوتا ہے ۔

اس حقیقت کو فیصلہ کن انداز میں طے کرنے کے بعد اب اس قوم کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے جن کی زبان

میں یہ علی و حکیم کتاب اتری ہے کہ اللہ نے ان کو کتنا بڑا اعزاز بخشا ہے اور یہ لوگ پھر بھی اللہ کے اس فضل و کرم کو نہیں سمجھتے۔ اور پھر بھی اس خزانہ حکمت سے منہ موڑتے ہیں اور اس کی توہین کرتے ہیں۔ ان حالات میں یہ تو اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے پاس آنے والی اس حکمت و ہدایت پر مشتمل کتاب کا نزول ہی بند کر دیں' چنانچہ یہاں ان کی اس زیادتی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور سوالیہ انداز میں پوچھا جاتا ہے کہ کیا تمہاری اس زیادتی اور حد سے گزر کر زیادتی کی وجہ سے اس سرچشمہ ہدایت دانائی کو بند کر دیں۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ (۴۳ : ۵) "اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درس نصیحت تمہارے ہاں بھیجنا بند کر دیں۔ صرف اس لیے کہ تم حد سے گزرے ہوئے ہو۔ یہ بات نہایت ہی عجیب لگتی ہے اور آیندہ بھی عجیب رہے گی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی قوم کو اس قدر اہمیت دی کہ اس کے لیے اس نے کتاب بھیجی۔ ان کی زبان میں بھیجی۔ اس کتاب نے ان کی فطرت کے عین مطابق وہ باتیں کیں جو ان کے دل میں تھیں' ان کی زندگی کی گہرائیوں تک چلی گئی' اور ان کے لیے ہدایت کا راستہ بیان کیا' پہلی اقوام کے عبرت آموز قصے بیان کیے' گزشتہ اقوام کے ساتھ سنت الہیہ نے جو سلوک کیا وہ بیان کیا گیا' لیکن اس نے اس کتاب کو نظرانداز کر دیا اور اعراض کر لیا! پھر بھی اللہ ان لوگوں کی فکر کرتا ہے حالانکہ وہ نہایت بلند' نہایت عظیم اور غنی بادشاہ ہے۔

اس آیت میں در حقیقت ایک خوفناک تہدید ہے کہ اگر اللہ چاہے تو اس سرچشمہ فیض و حکمت کو ختم کر دے اور تم پر ہونے والی اس مہربانی کو بند کر دے۔ کیونکہ تم اس عظیم حکیمانہ اور بلند مرتبہ کتاب کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کر رہے ہو' اور تم سے ان اقوام جیسا سلوک کرے جو تم سے پہلے گزری ہیں۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ (۴۳ : ۶) وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۳ : ۷) فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ (۴۳ : ۸)

"پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی بارہا ہم نے نبی بھیجے ہیں' کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی نبی ان کے ہاں آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ پھر جو لوگ ان سے بدرجہا زیادہ طاقتور تھے' انہیں ہم نے ہلاک کر دیا' پچھلی قوموں کی مثالیں گزر چکی ہیں"۔ وہ اب اور کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں' اللہ نے ایسے رویہ پر تو ان سے زیادہ قوت گرفت رکھنے والی اقوام کو ہلاک کیا ہے جو انہی کی طرح رسولوں اور کتابوں کے ساتھ مذاق کرتے تھے۔ کئی مثالیں موجود ہیں۔

بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے وجود کا اعتراف کرتے تھے۔ یہ بھی اعتراف کرتے تھے کہ اللہ ہی ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا' لیکن ان اعترافات کے بعد پھر ان کے قدرتی نتائج کو قبول نہ کرتے تھے اور اپنی زندگی کے امور میں صرف اللہ کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو شریک کرتے تھے اور اللہ کے پیدا کردہ بعض جانوروں کو ان الٰہوں کے لیے مخصوص کرتے تھے اور یہ عقیدہ انہوں نے گھڑ لیا تھا کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور ملائکہ کے بت بنا کر یہ ان کو پوجتے تھے۔

قرآن مجید یہاں ان کے اعترافات کو پیش کر کے پھر اس کے فطری نتائج مرتب کرتا ہے اور پھر ان کو فطری استدلال

کے سامنے کھڑا کرتا ہے جس سے وہ بھاگتے تھے۔ قرآن کریم ان کے سامنے اللہ کی مخلوقات میں سے حیوانات اور کشتی کو بطور مثال پیش فرماتا ہے کہ ان میں تمہارے لیے کتنے فائدے ہیں اور اس کے مقابلے میں تمہارا رویہ کیا ہونا چاہئے مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کے بعد دوسرے پیراگراف میں یہ بتایا گیا کہ کیا جواز ہے کہ تم نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿٩﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠﴾ وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُونَ ﴿١١﴾ وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ﴿١٢﴾ لِتَسْتَوُوا عَلٰى ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحٰنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ﴿١٣﴾ وَإِنَّا إِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ ﴿١٤﴾

"اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا تو یہ خود کہیں گے کہ "انہیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے"۔ وہی نا جس نے تمہارے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنا دیئے تاکہ تم اپنی منزل مقصود کی راہ پا سکو۔ جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو جلا اٹھایا، اسی طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے۔ وہی جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے، اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا تاکہ ان کی پشت پر چڑھو اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے، اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"۔

عربوں کے اندر خدا پر یقین تھا، وہ ملت ابراہیمی پر تھے۔ لیکن عربوں کے اندر ملت ابراہیمی کی بگڑی ہوئی شکل رہ گئی تھی۔ اس میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ توحید کی جگہ شرک اور دوسرے افسانے اس میں داخل ہو گئے تھے۔ بہرحال وجود باری کے وہ قائل تھے کیونکہ فطرت انسانی بہرحال اس کا انکار نہیں کر سکتی کہ ایک خالق ہے، جو اللہ ہے۔ کیونکہ کسی خالق کا انکار کوئی سلیم الفطرت انسان نہیں کر سکتا۔ اور کوئی معقول انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ عظیم اور ہولناک کائنات خالق کے بغیر پیدا ہو گئی۔ اس کائنات کو اللہ کے سوا کوئی اور پیدا بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس عظیم کائنات کا خالق تو اس سے بھی عظیم اور طاقتور ہونا چاہئے لیکن وہ یہاں آکر رک جاتے تھے اور خود اپنے عقیدے کے لازمی تقاضوں کو تسلیم نہ کرتے تھے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ (۴۳ : ۹) "اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ تو یہ خود کہیں گے کہ انہیں اسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے"۔ یہ

بات واضح ہے کہ یہ دو صفات عزیز و زبردست اور علیم یہ کفار کا قول نہ تھا۔ وہ تو صرف اسی قدر مانتے تھے کہ وہ اللہ ہے۔ وہ اللہ کی وہ صفات نہ مانتے تھے جو اسلام اور قرآن نے پیش کیں۔ ایسی صفات جو ان کی زندگی پر مثبت اثر ڈالیں۔ جو ان کی زندگی اور اس کائنات کو بیک وقت عملاً چلائیں۔ وہ اللہ کو بس اس کائنات کا خالق مانتے تھے۔ خود اپنا خالق بھی اللہ کو مانتے تھے لیکن زندگی کو عملاً چلانے کے لیے پھر انہوں نے کچھ دوسری ہستیاں بنا رکھی تھیں۔ کیونکہ اللہ کی ایسی صفات سے متعارف نہ تھے جن کے بعد پھر انہیں شرک کی ضرورت نہ پڑے۔ اور عقیدہ شرک انہیں پوچ اور بے وقعت نظر آئے۔

قرآن مجید یہاں ان کو یہی تعلیم دیتا ہے کہ جس خدا کو تم خالق السموٰت والارض سمجھتے ہو۔ وہ العزیز بھی ہے اور العلیم بھی ہے۔ وہ قادر بھی ہے' وہ علیم و عارف بھی ہے۔ چنانچہ اللہ ان کے اس اعتراف کو بنیاد بنا کر ان کو درج ذیل اعترافات پر مجبور کرتا ہے۔ غرض ان کو ایک قدم آگے بڑھا کر ان کو یہ بتاتا ہے کہ تخلیق کے بعد اللہ نے تم پر یہ فضل کیا :

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا لَّعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ

"وہی نا جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنا دیے تا کہ تم اپنی منزل کی راہ پا سکو"۔ (۴۳ : ۱۰) یہ حقیقت کہ اللہ نے انسان کے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا اسے ہر دور کے انسان نے اپنے حدود علم کے مطابق سمجھا ہے اور اس کی تصویر بنائی ہے۔ جن لوگوں نے پہلی مرتبہ اس کو سنا ہو گا' انہوں نے بھی یہ سمجھا ہو گا کہ اللہ نے زمین کو اس قابل بنایا کہ وہ ان کے قدموں کے نیچے چلنے کے لیے موزوں ہے۔ پھر وہ زراعت کے لیے موزوں ہے۔ پھر وہ زندگی اور نباتات کے لیے موزوں ہے لیکن آج ہم اس بات کو کہ زمین تمہارے لیے گہوارہ بنا دی گئی ذرا زیادہ وسعت اور گہرائی کے ساتھ سمجھ رہے ہیں۔ جس حد تک ہم نے اس زمین کے بارے میں معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اس کی بعید و قریب تاریخ کے بارے میں معلومات فراہم کر لی ہیں بشرطیکہ ہمارے اپنے علوم کے بارے میں جو نظریات قائم ہوتے ہیں وہ ہوں بھی درست اور ہم جو اندازے اور تخمینے لگاتے ہیں وہ صحیح ثابت ہو جائیں۔ ہم سے بعد میں آنے والی نسلیں ان کے بارے میں ہم سے بھی زیادہ سمجھیں گی۔ یوں اس آیت کا مفہوم وسعت اختیار کرتا جائے گا۔ جس قدر ہم علم میں آگے بڑھیں گے' علم و معرفت کی فتوحات کی وسعت کے ساتھ ساتھ اس آیت کے معانی بھی وسیع ہوتے جائیں گے اور یوں انسانی جہالت کا پردہ دور ترجاتا رہے گا۔

ہم آج جانتے ہیں کہ یہ زمین انسان کے لیے کس قدر اچھا گہوارہ بنائی گئی ہے اور اس کے اندر انسان اپنے لیے زندگی کی کس قدر مختلف راہیں تلاش کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کرۂ ارض مختلف مراحل سے گزر کر یہاں تک یعنی اپنی موجودہ حالت تک پہنچی ہے اور انسان کے لیے گہوارہ بنائی گئی ہے۔ ان مراحل میں سے ایک مرحلہ یہ تھا کہ اس پوری زمین کی سطح ایک سخت چٹان کی طرح تھی۔ اس کے بعد اس پر جگہ جگہ مٹی جمع ہوئی اور اس میں نباتات اگنا شروع ہوئے اور اس کی سطح پر جو ہائیڈروجن گیس اور آکسیجن گیس موجود تھی' ان کے ملاپ سے پانی وجود میں آگیا۔ پھر اپنی گردش محوری کے نتیجے میں اس کے دن کے اندر اس قدر معتدل حرارت پیدا ہوئی کہ وہ حیوانات کی زندگی کے لیے مناسب ہو گئی۔ اور اس کی رفتار گردش محوری کو یوں رکھا گیا کہ اس کی سطح پر چیزوں کا کھڑا رہنا ممکن ہوا۔ انسان مکانات اور دوسری چیزیں بکھر کر ہوا میں نہیں اڑ گئیں۔

پھر اللہ نے اس زمین کے اندر کشش ثقل پیدا کی ۔ یوں ہوا کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا جس کے اندر زندگی ممکن ہوئی ۔ اگر اس زمین کے ارد گرد پائی جانے والی ہوا زمین کی جاذبیت سے چھوٹ جائے تو زمین پر کسی چیز کا زندہ رہنا ممکن نہ ہو' دوسرے اجرام فلکی کی سطح پر چونکہ جاذبیت نہیں ہے یا اس سے کمزور ہے تو وہاں حیات ممکن نہیں ہو سکی ۔ ان کرات سے ہوا چلی گئی ۔ مثلاً چاند کے اوپر کوئی ہوا نہیں ہے ۔ یہ جاذبیت اس قدر متوازن ہے کہ حرکت زمین کی وجہ سے اشیاء کو دور پھینکنے کا جو عمل پیدا ہوتا ہے اس کے اندر یہ توازن پیدا کر دیتی ہے ۔ یوں تمام اشیاء اور زندہ چیزیں بکھرنے اور اڑ جانے کے عمل سے محفوظ ہیں ۔ اور یہاں زمین کی سطح پر ان کا ٹھہرنا اور چلنا بالکل ممکن ہے ۔ اگر یہ جاذبیت موجودہ مقدار سے بڑھ جائے تو تمام زندہ اور مردہ چیزیں زمین کے ساتھ لپٹ جائیں ۔ انسانوں کے لیے قدم اٹھانا ممکن نہ ہو' یا بہت مشکل ہو اور اس کے لیے بہت ہی قوت صرف کرنی پڑے اور دوسری جانب سے انسان پر ہوا کا دباؤ بڑھ جائے تو انسان کو زمین کے ساتھ چپکا دے ۔ جس طرح ہم مچھروں اور مکھیوں کو پریشر کے ارتکاز سے ہاتھ لگائے بغیر ہلاک کر دیتے ہیں ۔ اور اگر یہ دباؤ اس سے کم ہو جائے جو ہے تو ہمارا سینہ اور ہماری شریانیں خون کے دباؤ کی وجہ سے پھٹ جائیں ۔

اور زمین کو گہوارہ بنانے اور اس کے اوپر راستوں کو ہموار کرنے کے سلسلے میں ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق ارض و سما نے اس زمین کے اندر ایسی موافق قوتیں ودیعت فرمائی ہیں جو سب کی سب مل کر اس زمین پر زندگی کو سہل بناتی ہیں ۔ اگر ان موافق حیات یا ممد حیات قوتوں میں سے ایک قوت بھی ناپید ہو جائے یا اس میں خلل واقع ہو جائے تو اس کرۂ ارض پر زندگی محال ہو جائے ۔ بعض تو وہ ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ۔ اور بعض اور ہیں ۔ مثلاً اللہ نے اس کرۂ ارض پر پانیوں کی مقدار کو اس قدر رکھا ہے جو سمندروں' دریاؤں کی شکل میں زمین کی سطح کے اوپر ہونے والے تمام مسموم گیسوں کو چوس لیتے ہیں اور زمین کی فضا کو آلودگی سے اس قدر صاف رکھا جاتا ہے کہ یہاں زندگی کا وجود ممکن ہوتا ہے ۔ پھر اللہ نے نباتات کو آکسیجن کے درمیان توازن کے قیام کا ذریعہ بنایا ۔ وہ آکسیجن جس کو انسان سانس کے ذریعہ لیتا ہے اور اس آکسیجن کے درمیان جس کو نباتات چھوڑتے ہیں ۔ اگر یہ توازن نہ ہوتا تو ایک عرصہ کے بعد انسان دم گھٹ کر مرجاتا ۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے مفہوم و معانی اس آیت میں شامل ہیں ۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا (۴۳ : ۱۰) "جس نے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ بنایا اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنائے"۔ ہر دم اور ہر روز اس کے نئے نئے معانی منکشف ہو رہے ہیں اور یہ معانی اور مدلولات ان معانی پر اضافہ ہوتے جاتے ہیں جو اس آیت سے اس کے اول مخاطبین کرام سمجھتے تھے ۔ اور یہ سب اللہ حاکم سموات والارض کے علم کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور اس کی قدرت کے بھی مظاہر ہیں ۔ جو زبردست ہے اور نہایت حکمت والا ہے ۔ یہ سب معانی ایک شعور رکھنے والے دل کو یہ دکھاتے ہیں کہ ایک خالق اور مدبر قوت موجود ہے جس قدر انسان کی نظر آگے بڑھتی ہے اور اس کی سوچ گہرائی تک جاتی ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ کوئی ایسی مخلوق نہیں جو آوارہ چھوڑ دی گئی ہو' اور یہ کہ اس نے کسی کے آگے جواب نہیں دینا ہے بلکہ انسان یہ یقین کر لیتا ہے کہ ایک زبردست قوت والے مدبر نے ان کو پکڑ رکھا ہے اور وہ اس کے تمام امور کا والی ہے' زندگی میں بھی' زندگی سے پہلے بھی اور زندگی کے بعد بھی ۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۴۳ : ۱۰) "تاکہ تم اپنی منزل مقصود پاسکو"۔ اس کائنات پر اس طرح گہرائی کے ساتھ غور کرنا' اور اس کے اندر پائے جانے والے نوامیس فطرت کا گہرا مطالعہ اس بات کا ضامن ہے کہ انسان کا دل و دماغ خالق کائنات کی طرف راہ لے۔ جس نے اس کائنات کے اندر اس قدر گہری تنظیم اور توازن رکھا ہے۔

زندگی کی نشوونما اور اس میں زندوں کے لیے سہولیات اور زمین کو ان کے لیے گہوارہ بنانے اور اس میں انسانوں کے لیے راستے بنانے کے بعد اب ایک قدم اور آگے :

وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ

(۴۳ : ۱۱) "جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو جلا اٹھایا اسی طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے"۔ وہ پانی جو آسمانوں سے نازل کیا جاتا ہے اسے تو ہر انسان دیکھتا ہے اور جانتا ہے لیکن اس منظر کو اکثر لوگ یونہی دیکھ کر گزر جاتے ہیں اور اس پر انہیں کوئی تعجب نہیں ہوتا اور اس کے احساس و شعور میں کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ وہ ہروقت اور بسااوقات نزول باران رحمت دیکھتے رہے ہیں لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بارش کے قطروں کو نہایت ہی محبت' نہایت ہی دلچپی اور نہایت مسرت سے دیکھتے تھے' اس لئے کہ آپ کو یہ پختہ شعور حاصل تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے آ رہے ہیں اس لئے کہ آپ کا زندہ و بیدار قلب اچھی طرح دیکھ رہا تھا کہ یہ قطرے اللہ کی صفت کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ آپ ان میں دست قدرت کی کاریگری دیکھ رہے تھے۔ ان قطروں پر اس دل کو اسی طرح دیکھنا چاہئے جو اللہ تک پہنچا ہوا ہو اور اس کائنات کے اندر اللہ کے جاری کردہ نوامیس فطرت کو جانتا ہو۔ کیونکہ بارش کے یہ قطرے انہی قوانین قدرت کے نتائج ہیں۔ یہ نوامیس فطرت اس کائنات میں اللہ کی نظروں کے تحت اور اللہ کے دست قدرت کے ذریعہ ایک ایک قطرہ ہو کر گرتے ہیں۔ اس حقیقت کی ضرورت اور اس کے اثرات میں یہ سوچ کمی نہیں لا سکتی کہ یہ پانی دراصل بخارات تھے جو زمین سے اوپر فضا میں جاکر ٹھنڈے ہو گئے اور فضاؤں میں ان کے اندر اس قدر کثافت پیدا ہو گئی کہ بارش ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ آخر زمین کو کس نے پیدا کیا۔ یہاں پانی کس نے بنایا۔ پھر ان پر حرارت کس نے مسلط کی اور پانی کی ساخت کس نے اس طرح بنائی کہ وہ حرارت سے بخار بن جائے۔ پھر بخارات کے اندر یہ خاصیت کس نے رکھی کہ وہ اوپر جائیں؟ اور اوپر پھر کثیف ہو جائیں۔ پھر یہ خصائص کس نے رکھے۔ یہ بخارات بجلیوں سے بھی بھر جائیں جو آپس میں ملیں تو پانی نیچے گر جائے اور پھر بجلی کیا چیز ہے؟ غرض وہ تمام خصائص طبیعت کیا ہیں جن سے مل کر بارش بنتی ہے۔

سائنس پڑھ کر دراصل ہم اپنے احساس کے پردوں کو اس قدر کثیف بنا دیتے ہیں کہ اس کائنات کے عجائبات کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا حالانکہ ہمیں چاہئے تو یہ ہے کہ سائنس کے ذریعہ ہم اپنے احساسات کو مزید تیز کر دیں' اس قدر تیز کہ دل خوف خدا سے کانپ اٹھیں۔

وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ (۴۳ : ۱۱) "جس نے ایک خاص مقدار میں آسمان سے پانی اتارا"۔ یہ پانی ایک اندازے کے اندر مقدار اور موزوں ہے' نہ زیادہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو غرق کر دے' نہ اس قدر

کم ہوتا ہے کہ زمین خشک ہو کر زندگی کے قابل ہی نہ رہے ـ ہم یہ عجیب توازن اور مقدار دیکھ رہے ہیں ـ اور آج اسے اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ توازن زندگی کی ضروریات کے لیے ضروری ہے اور یہ ارادۂ الٰہیہ سے قائم ہوا ـ

فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا (۴۳ : ۱۱) "اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو جلا اٹھایا" ـ انشا سے مراد احیاء ہے اور ہر قسم کی زندگی پانی کے بعد آتی ہے کیونکہ اللہ نے ہر چیز کو پانی سے زندہ کیا ـ

كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ (۴۳ : ۱۱) "اس طرح تم ایک روز زمین سے برآمد کیے جاؤ گے" ـ جس نے پہلی مرتبہ زندہ کیا وہ دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے ـ جس نے زندہ چیزوں کو پہلی مرتبہ مردہ زمین سے نکالا ' اس طرح وہی قیامت کے دن میدان حشر میں سب زندہ انسانوں کو اگا کر نکال لائے گا ـ جب ابتداء ہو گئی تو اعادہ اور تکرار مشکل نہیں رہتا ـ اس میں اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے ـ

پھر یہ جانور جن کو یہ لوگ تقسیم کر کے کچھ اللہ کو دیتے ہیں اور کچھ اللہ کے سوا دوسرے شریکوں کو ' وہ تو اللہ نے اس لیے نہیں پیدا کیے کہ تم اس طرح کی تقسیم کرو ' یہ تو اس لیے تخلیق کیے گئے ہیں کہ یہ لوگوں کے لیے نعمت خداوندی کا کام کریں ـ لوگ ان پر اس طرح سوار ہوں جس طرح کشتیوں پر سوار ہوتے ہیں اور ان کی اس تسخیر پر اللہ کا شکر ادا کریں ـ اور اللہ کے انعامات کے مقابلے میں شکریہ ادا کریں ـ

وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ (۴۳ : ۱۲) لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ (۴۳ : ۱۳) وَ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (۴۳ : ۱۴) "وہی جس نے یہ تمام جو ـ ے پیدا کیے اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا ـ تاکہ تم ان کی پشت پر چڑھو اور جب ـ پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو ' اور کہو کہ "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا ـ ورنہ ـ ہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے ـ اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے" ـ

اللہ نے زندگی کے تسلسل کو زوجیت کے اصول پر رکھا ہے ـ تمام زندہ اشیاء جوڑے جوڑے ہیں ـ یہاں تک کہ پہلا خلیہ بھی اپنے ساتھ تذکیر زمانیت کے خصائص لیے ہوئے ہوتا ہے ' بلکہ سائنسی تحقیقات نے یہ بتا دیا ہے کہ پوری کائنات کا دارومدار ازواج پر ہے ـ اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ کائنات کی پہلی اکائی ذرہ ہے ـ جو منفی الیکٹرون اور مثبت پروٹون سے مرکب ہے تو یہ بھی جوڑا ہے اور طبیعی تحقیقات اسی نہج پر آگے جاری ہیں ـ

بہرحال زندگی میں زوجیت کا نظام بالکل ظاہر ہے اور یہ اللہ ہی ہے جس نے تمام جوڑے پیدا کیے خواہ انسانوں کے ہوں یا حیوانوں کے :

وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ (۴۳: ۱۲) "اور جس نے تمہارے لیے کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا"۔ یہاں اشارہ اسی طرف ہے کہ تمہیں خلیفتہ اللہ فی الارض بنایا اور اس زمین کی تمام قوتیں اور طاقتیں تمہارے لیے مسخر کیں۔ اس کے بعد ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ ان نعمتوں کا شکر لازم ہے۔ اس مرتبے کے آداب بجالانا لازم ہے۔ اور جب بھی نعمت سامنے آئے، منعم کو یاد کرو، تاکہ دل خالق سے جڑے رہیں۔ زندگی کی ہر حرکت اور ہر سکون میں۔

لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ (۴۳: ۱۳) "اور جب ان پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو، اور کہو کہ "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے ان چیزوں کو مسخر کر دیا۔ ورنہ ہم انہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے"۔ ہم تو اللہ کی نعمتوں میں سے کسی ایک نعمت کے مقابلے میں نعمت کا بدلہ نعمت سے نہیں دے سکتے۔ ہم تو نعمتوں کے مقابلے میں صرف شکر کر سکتے ہیں۔ پھر وہ یاد کریں کہ زمین پر سے اپنی خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد انہوں نے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ اور وہ ان کو ان کے تمام اعمال پر جزا دے گا جو انہوں نے فریضہ خلافت سرانجام دینے کے سلسلے میں کیے اور یہاں ان پر انعامات کیے اور پوری دنیا کو ان کے لیے مسخر کیا۔

وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (۴۳: ۱۴) "اور ایک روز ہم نے اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے"۔ یہ ہے منعم حقیقی کے حوالے سے ایک مسلمان کا رویہ اور طرز عمل۔ اللہ اس کے بارے میں ہمیں یاد دہانی فرماتا ہے کہ جب بھی کسی نعمت سے لطف اندوز ہو جاؤ تو رب کا شکر ادا کرو۔ کیونکہ تم ہر وقت اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہو لیکن نعمت اور شکر نعمت بھول جاتے ہو۔

یہ اسلامی آداب جو اللہ کی نعمتوں کے استعمال کے وقت سکھائے گئے ہیں، یہ محض رسومات نہیں کہ رسماً یہ دعا پڑھ لی جائے جب بھی کوئی کسی سواری پر سوار ہو یا کشتی پر سوار ہو، یا محض منتر کی طرح عبارات نہیں کہ ان کو پڑھ لیا جائے بلکہ ان عبارات کے معانی کو سمجھ کر ان کا شعور اپنے دل میں پیدا کرنا چاہیے۔ اللہ کی ذات کا تصور، بندے اور خدا کے تعلق کا تصور اور اللہ کی ان تمام نعمتوں کا تصور جو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی ہیں اور جن قوتوں کو اللہ نے ہمارے لیے مسخر کیا ہے ان کے بارے میں یہ زندہ تصور کہ یہ تو اللہ کے بہت بڑے انعامات ہیں جو انسان پر ہوئے ہیں۔ جن کا کوئی بدلہ انسان اللہ کو نہیں دے سکتا وہ اللہ کے فضل و کرم کا بدلہ دینے پر تو قادر ہی نہیں۔ اس لیے وہ نعمتوں کا شکر ادا کریں اور اللہ کے ہاں حاضر ہونے سے ہر وقت ڈرتے رہیں کہ حساب و کتاب میں مارے نہ جائیں۔ یہ سب احساسات اس بات کے ضامن ہیں کہ انسان کا دل ہر وقت بیدار رہے، حساس رہے اور اللہ کی نگرانی کا ہر وقت خیال کرے۔ اور کسی بھی وقت اس پر غفلت اور نسیان کی حالت طاری نہ ہو۔

--- ooo ---

اور اس کے بعد یہ بات کہ فرشتوں کو انہوں نے اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔ یہ ان کا زعم تھا اور حقیقت کے مطابق ان کا

افسانوی عقیدہ تھا۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۵ۭ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ۝۱۶ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝۱۷ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ۝۱۸ وَجَعَلُوا الْمَلٰۗىِٕكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْــَٔــلُوْنَ ۝۱۹ وَقَالُوْا لَوْ شَاۗءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ۭ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۤ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝۲۰ۭ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ۝۲۱ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۲۲ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَاۗءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝۲۳ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَاۗءَكُمْ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۲۴ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۲۵ۧ

"(یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے بھی) ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جز بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے۔ کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا؟ اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا پوری طرح واضح بھی نہیں کر سکتی؟ انہوں نے فرشتوں کو، جو خدائے رحمٰن کے خاص بندے ہیں، عورتیں قرار دے لیا۔ کیا ان کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھی ہے؟ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہ کہتے ہیں "اگر خدائے رحمٰن چاہتا (کہ ہم ان کی

عبادت نہ کریں) تو ہم کبھی ان کو نہ پوجتے"۔ یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے 'محض تیر تکے لڑاتے ہیں۔کیا ہم نے اس سے پہلے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند (اپنی اس ملائکہ پرستی کے لیے) یہ اپنے پاس رکھتے ہوں؟ نہیں' بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا' اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے ان سے پوچھا' کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمہیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو' ہم اس کے کافر ہیں۔ آخر کار ہم نے ان کی خبر لے ڈالی اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا"۔

قرآن مجید اس افسانوی عقیدے پر اس طرح حملہ آور ہوتا ہے کہ اس کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا جاتا ہے اور ان کی اپنی دنیا میں ہر طرف سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے یہاں تک ان کے ذہنوں تک اس کے پہنچنے کی ہر راہ بند کر دی جاتی ہے۔اور پھر قرآنی استدلال خود ان کی منطق اور ان کے مسلمات کی اساس پر ہے اور یہ دلائل ان کی زندگی کے واقعات پر ہیں۔ نیز قرآن مجید ان کے سامنے اقوام سابقہ کی مثال بھی پیش کرتا ہے کہ جس نے بھی یہ عقیدہ اختیار کیا ہے ہم نے اس سے عبرت آموز انتقام لیا ہے۔

آغاز اس عقیدے کی کمزوری سے کیا جاتا ہے اور یہ کہ خدا کے نزدیک یہ ایک عظیم گناہ ہے اور صریح کفر ہے۔

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُبِينٌ (۴۳ : ۱۵) "ان لوگوں نے اس کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزء بنا ڈالا حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے"۔فرشتے تو اللہ کے بندے ہیں اور ان کو اللہ کی بیٹیاں کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ ان کو اللہ کی صفت عبودیت سے محروم کر دیا گیا۔اور ان کو اللہ کی قریبی رشتہ داری کا مقام دے دیا گیا۔حالانکہ وہ ساری مخلوقات کی طرح مخلوق ہیں۔اور اللہ کے بندے ہیں۔کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ ہم ان کو اللہ کی بندگی کے بجائے کوئی اور صفت دیں۔اور ان کا اور ان کے رب کا کوئی اور تعلق جائیں۔ جبکہ اللہ کی تمام مخلوقات اس کے بندے بندیاں ہیں۔لہٰذا جو لوگ اس قسم کے دعوے کرتے ہیں وہ بلاشبہ کفر کا ارتکاب کرتے ہیں۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُبِينٌ (۴۳ : ۱۵) "بے شک انسان کھلا احسان فراموش ہے"۔

اس کے بعد ان کے خلاف ان کے عرف اور ان کی ذہنیت سے دلیل دی جاتی ہے اور اس طرح یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ ان کا دعویٰ کس قدر غلط اور اللہ کے حق میں کس قدر توہین آمیز ہے کہ تم فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے ہو۔

أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَاكُمْ بِالْبَنِينَ (۴۳ : ۱۶) "کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لیے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا"۔اگر اللہ نے اولاد پیدا ہی کرنی تھی تو یہ کیسے ہوا کہ خود تو بیٹیاں پیدا کیں اور تم کو بیٹوں سے نوازا۔اور کیا ان کے لیے ایسی بات کہنا مناسب ہے کہ خود وہ بیٹی پیدا ہونے سے بہت سخت کبیدہ

خاطر ہوتے ہیں۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ

(۴۳ : ۱۷) "اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اس خدائے رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں اس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے"۔ کیا ادب' احترام اور انسانیت کا تقاضا یہ نہ تھا کہ جس اولاد کی پیدائش سے وہ خود کبیدہ خاطر ہوتے ہیں اس کی نسبت رحمٰن کی طرف نہ کریں۔ خود تو یہ لوگ لڑکیاں ہونے پر اس قدر خفا ہوتے ہیں کہ چہرے سیاہ ہو جاتے ہیں اور کسی کو منہ نہیں دکھاتے اور ولادت کو چھپاتے پھرتے ہیں اور قریب ہوتا ہے کہ اس غم کی وجہ سے مر ہی جائیں۔ کیا وہ کمزور مخلوق جو زیورات میں پلتی ہے اور نہایت ہی ناز اور نخرے میں زندہ رہتی ہے اور اپنا مافی الضمیر بھی پیش نہیں کر سکتی اور نہ جنگ و قتال میں حصہ لیتی ہے' اس کی نسبت خدا کی طرف کرتے ہیں' جبکہ خود اپنے لیے ایسی اولاد چاہتے ہیں جو تیز و طرار ہو اور جنگ کے موقعے پر گھوڑ سوار ہو۔

غرض قرآن یہاں ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر بحث کرتا ہے اور ان کو شرمندہ کرتا ہے کہ جس اولاد کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے ہو وہ اللہ کے لیے پسند کرتے ہو۔ اگر تم نے یہ حماقت کرنی ہی تھی تو تم اللہ کے لیے ایسی نسبت کرتے جسے تم خود بھی اپنے لیے پسند کرتے ہو اگر یہ کفر تم نے کرنا ہی تھا۔ اب ان کے اس افسانوی عقیدے کو اس دوسرے زاویہ سے گھیرا جاتا ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ فرشتے لڑکیاں ہیں۔ آخر کس بنیاد پر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ يُسْئَلُوْنَ

(۴۳ : ۱۹) "انہوں نے فرشتوں کو جو خدائے رحمٰن کے خاص بندے ہیں' عورتیں قرار دیا کیا ان کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھی ہے۔ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جوابدہی کرنی ہو گی"۔ کیا جب فرشتے پیدا کیے جا رہے تھے تو یہ لوگ وہاں موجود تھے کہ وہ بیٹیاں ہیں کیونکہ جو شخص ایک دعویٰ کرتا ہے اس کے پاس چشم دید شہادت ہونی چاہئے جو اس کے دعوے کو ثابت کرے۔ وہ یہ دعویٰ تو نہ کرتے تھے اور نہ کر سکتے تھے کہ انہوں نے فرشتوں کے جسم کی ساخت دیکھی ہے۔ لیکن باوجود اس کے کہ انہوں نے یہ ساخت نہیں دیکھی پھر بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں لہٰذا اب اس جھوٹی شہادت کے نتائج برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ يُسْئَلُوْنَ (۴۳ : ۱۹) "ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور انہیں اس کی جواب دہی کرنی ہو گی"۔

اس کے بعد ان کی اس افترا پردازی پر مزید بحث کی جاتی ہے اور اس کے لیے وہ جو جھوٹے دلائل لاتے تھے ان کا رد کیا جاتا ہے۔

وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ

"وہ کہتے ہیں کہ اگر خدائے رحمٰن چاہتا تو ہم کبھی ان کو نہ پوجتے' یہ اس معاملے کی حقیقت کو قطعی نہیں جانتے ـ محض تیر تکے لڑاتے ہیں"۔ جب ان کو قوی دلائل کے ذریعہ سے ہر طرف سے گھیرا جاتا ہے ۔ اور ان کا یہ افسانوی عقیدہ ان کے سامنے تہس نہس ہو جاتا ہے تو پھر وہ نظریہ مشیت الٰہی کا سہارا لیتے ہیں یہ کہ اللہ دراصل فرشتوں کی عبادت پر خوش ہے ۔ اگر اللہ راضی نہ ہوتا تو ان کے لیے یہ عبادت کرنا ممکن ہی نہ ہوتا ۔ اللہ سختی سے ہمیں منع کر دیتا ۔

یہ دراصل ایک دھوکہ ہے' یہ درست ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی مشیت سے واقع ہوتی ہے لیکن اللہ کی مشیت کے دائرے میں تو یہ بات بھی ہے کہ انسان ہدایت بھی لے سکتا ہے اور گمراہی کا راستہ بھی لے سکتا ہے اور اللہ نے انسان پر یہ فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ہدایت اختیار کرے اور اس پر اللہ راضی ہوتا ہے ۔ اور اگر انسان گمراہ اور کافر ہو تو اللہ ناراض ہوتا ہے ۔ اگرچہ اللہ کی مشیت نے اسے ہدایت وگمراہی دونوں کے قابل بنایا ہے ۔

وہ مشیت الٰہیہ کے نظریہ سے دھوکہ دیتے ہیں ۔ خود ان کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہے کہ اللہ نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ لوگ فرشتوں کی پوجا کریں ۔ یہ یقین وہ تو نہیں رکھتے ۔

مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۴۳ : ۲۰) "یہ اس معاملے کی حقیقت کو نہیں جانتے محض تیر تکے اڑاتے ہیں"۔ اور اوہام و خرافات پر یقین کرتے ہیں ۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ (۴۳ : ۲۱) "کیا ہم نے ان سے پہلے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند یہ اپنے پاس رکھتے ہیں"۔ اور ان کا دعویٰ اس کتاب کے نصوص پر مبنی ہے ۔ اور اپنی یہ عبادت انہوں نے اس کتاب سے اخذ کی ہے ۔ اور اس کے دلائل ان کے پاس موجود ہیں؟ یوں ان لوگوں کے لیے نقلی دلیل کی راہ بھی بند کر دی جاتی ہے ۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ عقائد و نظریات' واہی تباہی باتوں اور اندھیرے میں تیر تکے چلانے سے ثابت نہیں ہوتے' محض ظن و تخمین سے عقائد ثابت نہیں ہوتے ۔ عقائد تو اللہ کی کتابوں سے صریح طور پر ثابت ہوتے ہیں ۔

اب آخر میں بتایا جاتا ہے کہ ان کے پاس اپنے اس افسانوی عقیدے پر واحد دلیل جو یقینی شہادت پر مبنی نہیں ہے اور کسی کتاب سے بھی ماخوذ نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ :

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳ : ۲۲)

"نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں"۔ یہ ایک نہایت مضحکہ خیز استدلال ہے ۔ پھر دلیل کے اعتبار سے بھی یہ ایک گری ہوئی بات ہے ۔ یہ محض نقالی اور تقلید ہے اور اس پر کوئی غور و فکر انہوں نے نہیں کیا ہے ۔ اور صحیح استدلال اور منطقی انداز میں اس پر غور نہیں کیا ۔ ان کی مثال ایک ریوڑ کی طرح ہے جسے ہانکنے والا جس طرف چاہتا ہے' لے جاتا ہے ۔ کوئی پوچھتا نہیں کہ اس طرف ہمیں کیوں چلایا جا رہا ہے' ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں؟

اسلام فکری آزادی کا بھی ایک پیغام ہے اور شعور و نظریہ کی کی آزادی کی ایک تحریک ہے ۔ اسلام اس قسم کی جامد تقلید کو تسلیم نہیں کرتا ۔ وہ گناہ اور گمراہی کو محض اس لیے برداشت نہیں کرتا کہ ہمارے آباو اجداد ایسا کرتے تھے ۔ ہر

کام، ہر سند اور ہر بات پر دلیل چاہئے۔ ہر اقدام سے پہلے غور و فکر کی ضرورت ہے۔اس کے بعد اسے علم و یقین پر مبنی خود مختاری دی گئی ہے۔

آخر میں بتایا جاتا ہے کہ اس قسم کے افسانوی عقائد جنہوں نے اختیار کیے اور محض نقالی اور جامد تقلید کی راہ اختیار کی ایسے لوگوں کا انجام تاریخ میں کیا ہوا، جن کے سامنے حقیقت بیان کر دی گئی اور ان کا یہ بہانہ بھی ختم کر دیا گیا کہ ہم تک توصحیح بات ہی نہیں پہنچی اور پھر بھی انہوں نے حقیقت کو تسلیم کرنے سے منہ موڑا۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآئَنَا عَلٰى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۲۳:۴۳) قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآئَكُمْ قَالُوْآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۲۴:۴۳) فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۲۵:۴۳) ”اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا، اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے ان سے پوچھا، کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں تمہیں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو، ہم اس کے کافر ہیں۔ آخر کار ہم نے ان کی خبر لے ڈالی اور دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا“۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ تمام روگردانی کرنے والوں کی دلیل و مزاج ایک ہوتے ہیں۔ یہ کہ ”ہم نے اپنے باپ دادا کو اس طریقہ پر پایا اور ہم ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں“۔ بس نقالی آنکھیں بند کر کے، عقل اندھی ہو جاتی ہے جو لوگ غور و فکر کے بغیر تقلید کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے سامنے جو بات پیش کی جاتی ہے وہ تقلیدی نظریات و اعمال سے زیادہ معقول کیوں نہ ہو۔ اس کی پشت پر دلائل و شواہد کا انبار کیوں نہ ہو۔ ایسی فطرت کے لوگوں کو ہلاک کرنا ہی بہتر ہے جو آنکھ نہیں کھولتے کہ دیکھیں، دل نہیں کھولتے کہ سمجھیں دماغ نہیں کھولتے کہ دلائل کا وزن کریں۔

اس قسم کے لوگوں کا یہی انجام ہوتا ہے اور ان کے سامنے اسے پیش کیا جاتا ہے کہ سمجھ کر اس سے بچیں اور اس راہ کے انجام سے خبردار ہوں۔

---ooo---

درس نمبر ۲۳۲ ایک نظر میں

قریش کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اور یہ دعویٰ برحق تھا۔ پھر ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں اور ان کی یہ بات غلط تھی۔ حضرت ابراہیم نے تو عقیدۂ توحید کا اعلان نہایت کھل کر کیا تھا۔ جس کے اندر کوئی التباس اور پیچیدگی نہ تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے باپ کو چھوڑا' اپنی قوم کو چھوڑا' اس سے پہلے ان کو قتل کرنے اور جلانے کی سعی کی گئی۔ اور ان کی شریعت بھی عقیدۂ توحید پر قائم تھی اور اسی کی انہوں نے اپنی اولاد کو تاکید کی تھی۔ اس لیے ابراہیم علیہ السلام کی دعوت اور شریعت میں شرک کا شائبہ تک نہ تھا۔

اس سبق میں قرآن اپنے مخاطبین کو خود ان کی تاریخ کی سیر کراتا ہے تاکہ ان کے دعوے کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اس کے بعد رسالت محمدی پر ان کے اعتراضات کو پرکھا جا رہا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳:۳۱) "کہتے ہیں یہ قرآن دو شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نازل نہیں ہوا"۔ ان کے اس قول کی تردید یوں کی جاتی ہے کہ ان کی سوچ میں بہت بڑی کجی ہے۔ کیونکہ اسلام جن قدروں پر مبنی ہے' ان کے اعتبار سے یہ سوچ ہی غلط ہے کہ دعوت اسلامی کی زمام کسی بڑے آدمی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ جھوٹی قدریں ہیں اور یہی اسلام کی طرف آنے میں ان کے لیے رکاوٹ بن رہی ہیں۔ انہی باطل سوچوں نے ان کو حق و ہدایت سے دور رکھا ہوا ہے۔ اس فیصلے کے بعد ان کو یہ اطلاع بھی کر دی جاتی ہے کہ اس گمراہی کی اصل علت اور وجہ یہ ہے کہ شیطان ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اس درس کے آخر میں رسول اللہ کی طرف توجہ کر کے آپ کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ آپ ان سے منہ موڑ لیں' ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں' آپ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ کسی اندھے کو بینا کر دیں' کسی بہرے کو شنوائی دے دیں۔ یہ اندھے اور بہرے ہو گئے ہیں۔ اور ان کو ضرور سزا ملے گی خواہ آپ کی زندگی میں اللہ ان سے انتقام لے یا آپ کے بعد وہ اس سے دوچار ہوں۔ آپ کو یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ کو جو پیغام دیا گیا ہے' آپ اس کو مضبوطی سے پکڑیں۔ یہی پیغام تمام انبیاء کو دیا گیا تھا۔ سب کلمہ توحید لے کر آئے تھے۔

وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ (۴۳:۴۵) "تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے' ان سب سے پوچھ دیکھو کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے"۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا ایک حلقہ پیش کیا جاتا ہے۔ فرعون کلیم کے قصے کا وہ حصہ جس میں وہی جھوٹی قدریں سامنے آتی ہیں جو اہل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پیش کیں گویا یہ ایک تیار استدلال ہے' بنا بنایا اور تاریخ کے ہر مرحلے میں اسے دہرایا جاتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۳۲ تشریح آیات

۲۶ --- تا --- ۵۶

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖۤ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

"یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ "تم جن کی بندگی کرتے ہو' میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا تعلق صرف اس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا' وہی میری رہنمائی کرے گا"۔ اور ابراہیم یہی کلمہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں"۔

دعوت توحید جسے یہ لوگ انوکھا سمجھتے ہیں' یہ دراصل ان کے باپ کی دعوت ہے' یہ وہ دعوت ہے جو انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور ان کے باطل عقائد کی تردید کی۔ اور اس میں انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے موروثی عقائد کو ترک کیا اور موروثی راہ و رسم پر نہ چلے۔ محض اس لیے کہ آباء و اجداد یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے' اس معاملے میں ان کے مقابلے میں برات کے اظہار میں کوئی لگی لپٹی بات نہیں کی بلکہ نہایت ہی صاف الفاظ اور شفاف عمل میں ان کی تردید کی' جس طرح قرآن نقل کرتا ہے :

اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (۴۳:۲۶) اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ (۴۳:۲۷) "بے شک میں ان سے بری الذمہ ہوں جن کی تم بندگی کرتے ہو' میرا تعلق صرف اس سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا وہی میری رہنمائی کرے گا"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اظہار برات اور پھر اس اعلان سے کہ میں صرف اس خدا کی بندگی کروں گا جو میرا خالق ہے' یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمرودی معاشرہ بھی بالکل خدا کا منکر نہ تھا بلکہ وہ اللہ کے سوا اور الہوں کو اللہ کے ساتھ شریک قرار دیتے تھے۔ اور ان کی بندگی کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ان سے برات کا اظہار کیا۔ اس لاتعلقی کے اظہار سے آپ نے خالق کائنات کو مستثنیٰ کیا۔ اور اللہ کی یہاں آپ نے وہ صفت بیان کی جو صرف اللہ کے لیے عبادت کا استحقاق ثابت کرتی ہے۔ یہ کہ وہ پیدا کرنے والا ہے۔ لہٰذا بندگی اور حکم بھی اسی کا چلنا

چاہئے اور آپ نے اس یقین کا اظہار کیا کہ اللہ انہیں ہدایات دے گا کہ وہ کیا کریں کیونکہ خالق اپنی مخلوق کی راہنمائی کا انتظام بھی کرتا ہے اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کس طرح ہدایت دے ۔ یہ کلمہ جس کے اوپر زندگی قائم ہے جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے اور جس پر شہادت دے رہی ہے ' یہ حضرت ابراہیم نے کہا ۔

وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۴۳ : ۲۸) "اور ابراہیم یہی کلمہ پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں" ۔ اس کرۂ ارض پر کلمہ توحید کے اقرار اور رواج میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا بڑا حصہ ہے ۔ آپ ہی کے بعد یہ کلمہ تمام نسلوں میں رائج ہوا ۔ اور یہ رواج آپ کی اولاد کے ذریعے ہوا ۔ آپ کی اولاد سے بے شمار رسول بھیجے گئے ۔ تین رسول تو اولوالعزم رسول تھے ۔ حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۔ آج دنیا میں ایک ارب سے زیادہ لوگ ایسے پائے جاتے ہیں' جو مختلف بڑے ادیان کے پیروکار ہیں جو اپنے باپ کے کلمہ توحید پر کاربند ہیں ۔ اس نے اس کلمے کو اپنی اولاد میں باقی رکھا ۔ اگرچہ ان میں سے بھی گمراہ ہونے والے گمراہ ہوئے لیکن یہ کلمہ باقی رہا ۔ کبھی یہ بالکل ناپید نہیں ہوا' اور اس کے قدم مضبوط رہے' کبھی کسی نے اسے جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینکا اور نہ اس کے ساتھ باطل کا امتزاج ہوا ہے تاکہ لوگ اللہ کی طرف لوٹیں کیونکہ اللہ ہی نے ان کو پیدا کیا ہے' لہٰذا ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو تو پہچانیں ۔ اور اس سچائی کی طرف لوٹیں اور اسے سینے سے لگائیں ۔

ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی کلمہ توحید سے انسانیت واقف تھی لیکن زمین کے اوپر کلمہ توحید کو قرار و ثبات حضرت ابراہیم کے بعد نصیب ہوا ۔ آپ سے پہلے حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح اور شاید حضرت ادریس علیہم السلام نے کلمہ توحید پیش کیا لیکن ان رسولوں کو ایسے جانشین نہ ملے جو ان کے بعد کلمہ توحید کو باقی رکھتے اور اس کے مطابق زندگی گزارتے اور جو اس کے لیے زندہ رہتے ۔ لیکن جب یہ کلمہ حضرت ابراہیم نے پیش فرمایا تو آپ کے بعد اس کا تسلسل قائم ہو گیا ۔ اور رسولوں کا بھی ایک غیر منقطع سلسلہ چل نکلا ۔ چنانچہ آپ کی اولاد میں سے آخری بیٹے اور آپ کے ساتھ زیادہ مشابہ (۱) حضرت محمد خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے' اور انہوں نے کلمہ توحید کو اس کی کامل اور شامل صورت میں پیش کیا جس نے پوری زندگی کو اس کلمے کے اردگرد گھما دیا ۔ اور انسان کی ہر سرگرمی میں اس کو اثرانداز کر دیا ۔

یہ تھی توحید کی کہانی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ادھر جن کے بارے میں اہل قریش یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں اور اس کلمے کو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں وراثت میں باقی رکھا اور حضرت ابراہیم سے ادھر یہ کلمہ نسلاً بعد نسل نقل ہوتا رہا ۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت کرنے والے اس کلمے کے مقابلے میں کیا ردعمل اختیار کرتے ہیں ۔

زمانے گزر گئے ۔ اللہ نے نسلاً بعد نسل ان کو زندگی کے خوب سازوسامان دیئے' بہت زیادہ دور چلے جانے کے بعد

---

(۱) حضورؐ نے فرمایا مجھ پر سب انبیاء پیش کیے گئے' حضرت موسیٰ علیہ السلام اہل شنوءہ کے مردوں جیسے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ ترین افراد جو میں نے دیکھے ان میں سے عروہ ابن مسعود ہیں ۔ اور میں نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو وہ تمہارے ساتھی کے زیادہ مشابہ تھے ۔

انہوں نے ملت ابراہیمی کو بھلا دیا۔ اور ان عربوں کے اندر کلمہ توحید انوکھا ہو گیا۔ اب جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں تو انہوں نے اس کا بہت ہی برا استقبال کیا اور اسے بھی اہل زمین اور دنیا پرستوں کی قدروں کے پیمانوں سے ناپنا شروع کر دیا اور خود ان کے پیمانے بھی بدل گئے۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾ وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَ لَوْ لَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَ زُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾

۳
ع ۱۰
۹

”(اس کے باوجود جب یہ لوگ دوسروں کی بندگی کرنے لگے تو میں نے ان کو مٹا نہیں دیا) بلکہ میں انہیں اور ان کے باپ دادا کو متاع حیات دیتا رہا، یہاں تک کہ ان کے پاس حق، اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آ گیا۔ مگر جب وہ حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟ کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (ان کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں، اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالاخانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں، سب چاندی اور سونے

کے بنا دیتے۔ یہ تو محض حیات دنیا کی متاع ہے اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے"۔

اب سیاق کلام میں روئے سخن اچانک اہل مکہ کی طرف پھر جاتا ہے' اسے اضراب کہتے ہیں اور یہ انداز عربوں میں رائج تھا۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ (۴۳:۲۹)

"بلکہ میں انہیں اور ان کے باپ دادا کو متاع حیات دیتا رہا یہاں تک کہ ان کے پاس حق' اور کھول کھول کر بیان کرنے والا رسول آگیا"۔ گویا یوں کہا گیا کہ چھوڑو حضرت ابراہیم کی بات کو' ان لوگوں کے ساتھ مناسبت اور نسبت ہی کیا رہ گئی ہے۔ ہمیں ان کے شب و روز کو دیکھنا چاہئے۔ ان کے حالات' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات سے تو ملتے نہیں۔ ان لوگوں کے حالات یہ ہیں کہ ان کو اور ان کے آباو اجداد کو خوب سامان زندگی دیا گیا' ان کو طویل مہلت دی گئی' یہاں تک کہ وہ سچائی اس قرآن کی شکل میں آئی اور اس کے ساتھ ایک نہایت ہی کھول کر بات سمجھانے والا رسول بھی آ گیا جو ان پر یہ سچائی پیش کرتا ہے اور نہایت ہی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۴۳:۳۰) "مگر جب وہ حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں"۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جادو میں سچائی کا شائبہ تک نہیں ہوتا' یہ بات بالکل واضح ہے۔ یہ تو ان کا محض ایک دعویٰ اور الزام تھا اور اس کے بارے میں سب سے پہلے خود ان کو یقین تھا کہ یہ الزام غلط ہے۔ کیونکہ کبراء قریش اس حد تک جہاندیدہ تھے کہ ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی کہ قرآن کریم کلام حق ہے' یہ جو الزامات وہ لگاتے تھے۔ وہ جمہور عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے وہ ایسا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے اور اس کے بعد یہ جو اعلان کرتے تھے کہ ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔ یہ بات کو پکی کرنے کے لیے اعلان کرتے تھے۔

اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۴۳:۳۰) "اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں"۔ جمہور عوام کو وہ اس سے یہ تاثر دیتے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا انہیں پورا پورا یقین ہے۔ اس طرح وہ ان کو یہ اشارہ دیتے تھے کہ ہمارے پیچھے چلتے رہو اور ہمارے مطیع فرمان رہو اور ہر قوم سے سردار جمہور عوام کو اس طرح دھوکہ دیتے ہیں' یہ نہ ہو کہ وہ ان کے دائرہ اختیار سے نکل جائیں اور کلمہ توحید کو قبول کرلیں۔ کیونکہ جب کلمہ توحید کا اقتدار قائم ہوتا ہے' تمام گردن کش گر جاتے ہیں۔ پھر تو صرف اللہ کی بندگی ہوتی ہے اور لوگ اللہ ہی سے ڈرتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے کھری اور کھوٹی قدروں کے درمیان کس طرح ملاوٹ کر دی ہے۔ وہ یہ اعتراض کرتے ہیں اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی منتخب کیا ہے کہ وہ یہ پیغام پہنچائیں۔

وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳:۳۱) "اور وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟" دو گاؤں سے ان کی مراد مکہ

اور طائف ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریش کی ایک شاخ سے تھے۔ پھر بنی ہاشم کی ایک شاخ کے فرد تھے۔ اور یہ لوگ عربوں میں سے برتر لوگ تھے جبکہ آپ کی ذات بھی اخلاق عالیہ کے لحاظ سے ممتاز تھی۔ بعثت سے پہلے آپ صادق و امین اور اعلیٰ اخلاق کے مالک انسان کے طور پر مشہور تھے۔ لیکن آپ اپنے قبیلے کے سربراہ نہ تھے۔ نہ کسی خاندان کے رئیس تھے اور اس دور میں لوگ انہی چیزوں پر فخر کرتے تھے کہ کوئی قبیلے یا کسی شاخ کا سربراہ ہو۔ معترضین کا اعتراض یہی تھا۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳ : ۳۱) "کہتے ہیں یہ قرآن ان دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر نازل کیوں نہ کیا گیا"۔ حالانکہ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ اس کی رسالت اور دعوت کے لیے کون موزوں ہے اور یہ منصب کس کو دیا جائے۔ لہٰذا اللہ نے اہل ترین شخص کا انتخاب کر لیا۔ اللہ کا منشا یہ نہ تھا کہ اس رسالت کو خارجی اسباب میں سے کوئی سہارا ملے' اس کی قوت اس کے خارج سے نہ ہو بلکہ اس کے اندر سے ہو۔ لہٰذا اس نے اس کے لیے ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جس کی بڑی خصوصیت اس کے اخلاق تھے۔ اس دعوت کا مزاج ہی یہ ہے اور یہ اس کی بالکل ممتاز خصوصیت ہے۔ اس لیے کسی قبیلے کے سردار کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ نہ کسی خاندان کے سربراہ کو اس کے لیے منتخب کیا گیا۔ نہ کسی صاحب جاہ و مرتبہ کا انتخاب ہوا۔ نہ ایک بہت بڑے مالدار کا یوں انتخاب ہوا تاکہ آسمانوں پر سے نازل ہونے والی اس دعوت کی اصل اقدار کسی ایسی قدر سے ملتبس نہ ہو جائیں جس کا تعلق اس دنیا پرستی سے ہو اور اس دعوت کے اندر دنیا پرستی کے خلیات میں سے کوئی خلیہ داخل نہ ہو جائے جو اس دعوت کی حقیقت کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں رکھتا۔ اور دعوت اسلامی کی ذاتی قوت کے سوا کوئی اور خارجی سبب اس پر اثر انداز نہ ہو۔ نہ کوئی طالع آزما اس کے قریب آئے اور نہ کوئی پاکباز اس سے دور ہو۔

لیکن اس قوم پر دنیا پرستی کا غلبہ تھا' اس لیے جو لوگ آسمانی دعوت کی نوعیت کو سمجھتے نہ تھے۔ وہ اس قسم کے اعتراضات کیا کرتے تھے۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳ : ۳۱) "یہ قرآن ان دو شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا"۔

لہٰذا قرآن نے اللہ کی اس عظیم رحمت پر ان کے اس سطحی اعتراض کو رد فرما دیا' یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ اپنی رحمت کے لیے جو چاہے' اختیار کرلے' جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے انہوں نے دنیا پرستی اور جاہلیت کی اقدار اور اللہ کی آسمانی مقدروں کو ملا دیا ہے۔ اور وہ اپنی دنیا پرستی کی آنکھوں سے اس دعوت اسلامی کو دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دعوت خدا پرستی اور آخرت کے حساب سے دی جا رہی ہے۔

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ

خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۴۳: ۳۲) "کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کی گزربسر کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو یہ سمیٹ رہے ہیں"۔ یعنی تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اب نبوت بھی خود تقسیم کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کو اللہ کی رحمت اور نبوت سے واسطہ کیا ہے؟ اصل پوزیشن ان کی یہ ہے کہ یہ کسی چیز کے مالک نہیں ہیں' خود اپنے رزق کے بھی یہ مالک نہیں ہیں' یعنی اس دنیا کی مختصر زندگی کے لیے بھی ان کا رزق ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ بھی ہم ان پر تقسیم کرتے ہیں۔ یہ ہم اپنی حکمت اور تدبیر سے تقسیم کرتے ہیں اور یہ ہماری تقسیم اس زمین کی تعمیر و ترقی کے لیے ہے۔

اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے رزق لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق دیا جاتا ہے۔ زندگی کے حالات کے مطابق دیا جاتا ہے اور معاشرے کے افراد کے باہم تعلقات کے مطابق دیا جاتا ہے۔ مختلف عوامل کے مطابق افراد معاشرہ کے درمیان اس کی تقسیم ہوتی ہے۔ ہر معاشرے میں نظام تقسیم رزق مختلف ہوتا ہے۔ ہر زمانے میں اس کے اندر تبدیلیاں آتی ہیں۔ ہر سوسائٹی دوسری سے مختلف ہوتی ہے۔ اور اس میں عمومی حالات اور افراد معاشرہ کے باہم تعلقات پر دارومدار ہوتا ہے۔ لیکن ہر دور اور ہر معاشرے میں تقسیم رزق میں جو بات موجود رہی ہے' وہ یہ رہی ہے کہ رزق کی تقسیم میں فرق رہا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مصنوعی معاشروں میں بھی تقسیم رزق میں فرق ہے' جن کا مقصد ہی پیداوار بڑھانا اور مساویانہ تقسیم کرنا ہے۔

تفاوت رزق کے اسباب مختلف معاشروں میں مختلف رہے ہیں۔ لیکن مقدار رزق کے اختلاف میں اختلاف ناپید کبھی نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ جن مصنوعی معاشروں کے اندر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مکمل مساوات ہے وہاں بھی رزق مختلف ہوتا ہے اور وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ (۴۳: ۳۲) "اور کچھ لوگ کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے"۔

اور تمام معاشروں میں فرق مراتب رزق کے اسباب تو مختلف رہے ہیں لیکن حکمت یہی رہی ہے۔

دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (۴۳: ۳۲) "تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں"۔ یعنی بعض لوگ دوسروں کو اپنا ماتحت کر کے ان سے خدمات لیں' اس دنیا میں جب معیشت کی گاڑی چلتی ہے تو بعض لوگ خدمات فروخت کرتے ہیں اور بعض خریدتے ہیں۔ یوں بعض بعض کے لیے مسخر ہو جاتے ہیں' یہاں تسخیر کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک طبقہ برتر ہو اور دوسرا کمتر ہو یا ایک فرد دوسرے کا غلام ہو۔ اگر یہ لیا جائے تو یہ اس لفظ کا بہت ہی سادہ مفہوم ہو گا۔ یہ اللہ کے دائمی اور بلند کلام کی سطح تک نہیں پہنچتا۔ اللہ کے فرمان کا مفہوم کسی تغیر سے بالا ہے' اگرچہ انسانی سوسائٹی کے حالات میں جس قدر تبدیلی واقع ہو جائے' یہ ایسا مفہوم نہیں ہے کہ جانے والے حالات میں اور ہو اور آنے والے حالات میں اور ہو۔ حقیقی مفہوم یہ ہے کہ تمام انسان ایک دوسرے کے لیے مسخر ہیں اور زندگی اور معیشت کا چکر سب کو گھماتا ہے۔ اور ہر حال اور ہر صورت میں لوگ ایک دوسرے کے محتاج و مجبور ہیں۔ ہر ایک کے وسائل رزق متعین ہیں' کسی کے ذرائع کشادہ ہیں اور کسی کے محدود ہیں۔ کوئی اس کام میں لگا ہوا کہ دولت

جمع کرے' اس سے خود بھی کھائے اور وہ دوسروں کو بھی دے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے مسخر ہیں ۔ اور دونوں کے وسائل رزق میں جو فرق ہے اس نے دونوں کو ایک دوسرے کے لیے محتاج اور مسخر بنا دیا ہے ۔ اور زندگی خصوصاً معاشی زندگی کے چکر میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں' مزدور انجینئر کا محتاج ہے اور انجینئر مالک کا محتاج ہے ۔ انجینئر اور مزدور دونوں مالک کے محتاج ہیں' مالک انجینئر اور مزدور دونوں کا محتاج ہے ۔ اور ہر ایک اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت الہیہ کے پورا کرنے میں لگا ہوا ہے اور مسخر ہے ۔ اور یہ سب نظام رزق میں تعاون کی وجہ سے قائم ہوا ہے ۔ کسی کو خدمات درکار ہیں اور کسی نے بیچنی ہیں ۔

بعض ایسے لوگ جو خود ساختہ نظریات کے داعی ہیں وہ اس آیت کو پیش نظر رکھ کر اسلام اور اسلام کے اقتصادی نظام پر بہت سے اعتراضات کرتے ہیں اور پھر بعض مسلمان اس آیت کے سامنے شش و پنج کرتے ہیں اور ان کا انداز یوں ہوتا ہے کہ وہ گویا اسلام پر یہ ایک الزام ہے اور وہ اس کا رد کرتے ہیں کہ اسلام رزق کے معاملے میں فرق مراتب کا قائل نہیں ہے اور یہ کہ رزق میں فرق مراتب اسلام پر تہمت ہے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ اہل اسلام' اسلام کے بارے بالکل کھل کر اور صاف صاف بات کریں ۔ وہ ان خود ساختہ نظریات سے متاثر ہوئے بغیر اور دفاعی انداز اختیار کیے بغیر صاف صاف کہہ دیں کہ رزق میں فرق مراتب ایک حقیقت ہے جسے اسلام روا رکھتا ہے اور لوگ ہمیشہ وسائل رزق کے معاملے میں مختلف ہوتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی حالت طبیعی بر حالت نفسی اسی تفاوت پر قائم ہے ۔ لوگوں کو خالق کائنات کی طرف سے مختلف درجوں کی صلاحیتیں دی گئی ہیں ۔ ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق کام کر سکتا ہے اور یہ تفاوت اور فرق مراتب اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہر شخص نے اس کرۂ ارض پر فریضہ خلافت الہیہ کی ادائیگی میں بالکل ایک جدا کردار ادا کرنا ہے ۔ اگر سب لوگ اس طرح پیدا کیے گئے ہوتے جس طرح پریس سے ایک اشتہار چھپتا ہے یا کتاب کا ایک نسخہ تیار ہوتا ہے تو اس دنیا میں زندگی کی یہ اجتماعی صورت نہ ہوتی اور کئی ضروری کام یونہی رہ جاتے جن کے سرانجام دینے کے لیے کوئی قابل آدمی نہ ہوتا کیونکہ ان کے لیے کوئی قابل آدمی ہی نہ ملتا ۔ جس اللہ نے زندگی پیدا کی ہے اور اس کے لیے بقا کا انتظام فرمایا ہے اس نے ہر شخص کے لیے ایک کردار رکھا ہے اور ہر عمل کے لیے ایک شخص' ہر کسے را بہر کارے ساختند' پھر ہر شخص کی کارکردگی کی وجہ سے اس کے رزق میں بھی فرق ہوتا ہے 'اگر فرق مراتب نہ کنی زندیقی' یہ ہے اصل قاعدہ ۔ رہا یہ کہ مختلف اہلیت کے لوگوں کے رزق کے اندر کس قدر فرق ہو تو یہ ہر نظام' ہر معاشرے اور ہر ملک کے اپنے حالات پر موقوف ہوتا ہے ۔ لیکن یہ فطری اصول کسی جگہ رد نہیں کیا جا سکتا کہ فرق مراتب ہو اور اس طرح زندگی نشو و نما پائے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے مصنوعی نظامہائے معیشت کے پیروکاروں نے جنہوں نے مساوات کے بلند بانگ دعوے کیے' مزدور' انجینئر اور مینیجر کی تنخواہوں کے اندر مساوات قائم نہ کی اور نہ کر سکے ۔ حالانکہ انہوں نے اپنے نظام کو بروئے کار لانے کے لیے بڑے سے بڑا تشدد کیا لیکن آخر کار یہ لوگ اللہ کے ابدی اصول کے سامنے شکست کھا گئے ۔ کیونکہ اللہ کا قانون اس کائنات کے اندر موجود نہایت ہی مستحکم ناموس زندگی پر مبنی ہے (سید قطب' اے کاش آپ زندہ ہوتے اور ان مصنوعی مذاہب کو روس میں دھڑام سے گرتے دیکھتے!) اور جس نظام کی نشاندہی اللہ نے اس دنیا کی زندگی کے لیے کی ہے اسی میں اللہ کی رحمت ہے ۔

وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۴۳ : ۳۲) "تیرے رب کی رحمت اس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو یہ جمع کرتے ہیں"۔ اور یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ اپنی اس رحمت کے لیے جس کو چاہے' چن لے' کیونکہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کس منصب کے لیے کون اہل ہے ۔ پھر اللہ کی رحمت کا تعلق اس دنیا میں پائے جانے والے نظام معیشت کی اہلیت پر نہیں ہے ۔ یہ تو دنیاوی اقدار ہیں ۔ اللہ کے نزدیک یہ کوئی بہت بڑا کمال نہیں ہے کہ کوئی بہت بڑی دولت جمع کر دے کیونکہ دولت کے جمع کرنے میں نیکو کاروں اور بدکاروں کے لیے برابر کے مواقع ہیں اور اچھوں اور بروں کے لیے اس میں برابر مواقع ہیں لیکن اللہ کی رحمت (نبوت) کے لیے تو بہت ہی ممتاز ترین لوگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے اور اس کام کو اللہ ہی جانتا ہے ۔

اللہ کے نزدیک یہ دنیا اور اس کی دولت اس قدر حقیر اور اس قدر بے وقعت ہے کہ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سب لوگ کافر ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ یہاں کافروں پر دولت کی بارش کر دیتا ۔ لیکن اندیشہ یہ تھا کہ یہ دولت لوگوں کے لیے فتنہ بن جائے گی اور انہیں ایمان کی راہ سے روک دے گی ۔

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ (۴۳ : ۳۳) وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ (۴۳ : ۳۴) وَزُخْرُفًا وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۴۳ : ۳۵) "اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ سارے لوگ ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو ہم خدائے رحمٰن سے کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتیں' اور ان کی سیڑھیاں جن سے وہ اپنے بالاخانوں پر چڑھتے ہیں اور ان کے دروازے اور ان کے تخت جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے ہیں' سب چاندی اور سونے کے بنا دیتے ۔ یہ تو محض حیات دنیا کی متاع ہے اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے"۔

اللہ جانتا ہے کہ اس کی مخلوق ضعیف ہے اور وہ دنیا کے مال و دولت سے کس قدر متاثر ہو جاتی ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ اپنی اس عظیم رحمت کا انکار کرنے والوں کو اس حقیر و ذلیل دنیا سے مالا مال کر دیتا' ان کے مکانات' ان کی چھتیں اور ان کے دروازے اور ان کا فرنیچر سب سونے چاندی کے ہو جاتے ۔ ان کے گھروں کے بڑے بڑے گیٹ ہوتے ۔ جن تختوں پر وہ بیٹھے ان کے بڑے بڑے تکیے ہوتے اور یہ سونے چاندی اور دوسری قیمتی دھاتوں کے ہوتے ۔ یہ دنیائے دنی سب کی سب ان کفار کے حوالے کر دی جاتی ۔

وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۴۳ : ۳۵) "یہ تو سب حیات دنیا کی متاع ہے"۔ یعنی زائل ہونے والا ساز و سامان' جو اس دنیا کی حدود سے آگے جاتا ہی نہیں ۔ یہ دنیا بھی کم قیمت اور مختصر اور اس پر انسان کی زندگی بھی مختصر ۔

وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ (۴۳ : ۳۵) "اور آخرت تیرے رب کے ہاں صرف متقین کے لیے ہے"۔ اور یہ لوگ اللہ کے نزدیک اپنے تقویٰ کی وجہ سے مکرم ہیں۔ لہٰذا اس نے ان کے لیے وہ انعامات تیار کر رکھے جو بہت ہی باعزت اور قیمتی ہیں۔ اور وہ اس دنیا کے فانی متاع کے مقابلے میں زیادہ باقی رہنے والے بیش قیمت ہیں۔ اور اللہ ان کو قیامت میں رحمٰن کے کافروں کے مقابلے میں بہت ہی امتیازی شان دے گا اور رہے یہ کافر تو ان کو اللہ متاع حیات اس حساب سے دیتا ہے جس طرح حیوانات کو چارہ دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حیات دنیا کا یہ سازوسامان جس کی مثال اللہ نے یہاں دی' اس دنیا کے بہت سے لوگوں کی نظروں کو چکاچوند کر دیتا ہے۔ اور جب اہل ایمان فساق و فجار کے ہاتھ میں یہ مال و دولت دیکھتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ اللہ کے نیک بندوں کے ہاتھ ان سے خالی ہیں یا وہ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ عسرت' سختی اور تنگی ترشی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ فساق و فجار اپنی دولت کے بل بوتے پر' قوت و سطوت اور اقتدار پر ہیں تو وہ فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ یہ فتنہ لوگوں پر بہت اثر کرتا ہے لیکن اللہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ یہ چیزیں نہایت ہی حقیر' عارضی اور کم قیمت ہیں۔ اور اللہ نے اپنے ہاں متقین کے لیے جو کچھ تیار کر رکھا' وہ ناقابل تصور ہے۔ یہ نیک لوگوں کے لیے ہے۔ اس طرح قلب مومن اس حالت پر مطمئن ہو جاتا ہے جو اللہ نے ابرار کے لیے اختیار کیا ہے یا فجار کے لیے اختیار کیا ہے۔

ان لوگوں کا اعتراض یہ تھا کہ اللہ نے نبوت کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جس کے پاس دولت دنیا نہیں ہے۔ وہ لوگوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ان کے اقتدار' ان کے مال' اور ان کے مرتبے سے لگاتے ہیں۔ ان کو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں تو یہ چیزیں حقیر اور فانی ہیں۔ یہ تو اللہ کی شریر ترین مخلوق کے پاس بہت زیادہ ہوتی ہیں اور اللہ کے مبغوض ترین لوگوں کے پاس زیادہ ہوتی ہیں۔ لہٰذا مال و دولت اللہ کے ہاں قرب' مرتبہ اور رضائے الٰہی کی دلیل نہیں ہے۔

یوں قرآن کریم ہر چیز کو اپنی جگہ اور صحیح مقام پر رکھتا ہے۔ اور اللہ کے قوانین بابت تقسیم رزق بیان کرتا ہے کہ اس دنیا میں دولت کی تقسیم کا یہ نظام ہے۔ اور یہ وضاحت کرتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس سلسلے میں کیا قدریں ہیں اور یہ تمام باتیں اس حوالے سے کی گئیں کہ ان لوگوں کو رسالت محمدی پر اس زاویہ سے اعتراض تھا کہ اللہ نے مکہ اور طائف کے روسا کو چھوڑ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا دیا جو دولت کے اعتبار سے ایک عام آدمی تھے۔

یوں' اس مناسبت سے امارت اور غربت کے بارے میں' اسلامی نظام معیشت کے لیے بنیادی اور کلی قواعد وضع کر دیئے گئے' جن کے اندر کوئی تبدیلی نہ ہوگی اور کوئی تغیر ممکن نہ ہوگا۔ زندگی کی بوقلمونیاں' نظام کا اختلاف' نظریات کا اختلاف' معاشروں اور سوسائٹیوں کا اختلاف کوئی چیز بھی ان قواعد کو متاثر نہ کرے گی۔ کیونکہ زندگی کی بعض مستقل قدریں ہیں اور یہ زندگی ان کے دائرے کے اندر ہی حرکت کرتی ہے۔ وہ اس کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں کو بدلتے ہوئے حالات اس طرف سے اندھا کر دیتے ہیں کہ وہ زندگی کی ان مستقل قدروں کو دیکھ سکیں' وہ اللہ کے اس مستقل معاشی اصول اور معاشی کلیہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ (انہدام روس کے بعد سمجھ لیا ہے) اسلامی نظام دراصل ثبات اور تغیر کے درمیان ایک حسین امتزاج ہے۔ اس کے معاشی نظام میں بدلنے والے اصول بھی ہیں اور ناقابل تغیر بھی ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو اس حقیقت کو نہیں سمجھتے' وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ زندگی کی ترقی میں تغیر و تبدل ہی اصل چیز ہے۔ یہ تغیر اور انقلاب اشیاء کی حقیقت میں بھی آتا ہے اور شکل میں بھی آتا ہے اور ان لوگوں کا زعم یہ ہے کہ اس تغیر اور تبدیلی کے

ساتھ مستقل اور ثابت اصول نہیں چل سکتے ۔ یہ لوگ اس بات کے منکر ہیں کہ تبدل و تغیر کے سوا اور کوئی مستقل قانون معیشت بھی ہو سکتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں ۔ یہ لوگ صرف تغیر کے قانون کو تسلیم کرتے ہیں ۔ رہے ہم مسلمان تو ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اس پوری کائنات میں ثبات اور تغیر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اور ساتھ ساتھ چلتے ہیں ۔ اور اس دنیا کی بعض چیزوں میں ثبات بطور ایک مستقل قدر موجود ہے اور اس کی بڑی مثال تو یہی مسئلہ موضوع بحث ہے ۔ لوگوں کے درمیان تقسیم رزق میں تفاوت ایک مستقل اصول ہے اور نسبت تفاوت میں فرق و امتیاز بہرحال ہوتا ہی رہتا ہے ۔ یہ نسبت ہر ملک اور ہر معاشرے اور ہر زمانے میں بدل سکتی ہے ۔ خود موضوع زیر بحث میں دونوں مثالیں موجود ہیں کہ ثبات و تغیر تقسیم معیشت میں موجود ہے ۔ اور تفاوت مستقل ہے اور نسبت تفاوت متغیر ہے ۔

--- ○○○---

جب یہ بیان کر دیا گیا کہ اللہ کے نزدیک اس دنیا کا مال و متاع کوئی چیز نہیں ہے اور یہ ایک حقیر سامان چند روزہ ہے ۔ اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ فساق و فجار کو جو دولت دی جاتی ہے یہ ان کی کرامت اور شرافت کی دلیل نہیں ہے ۔ اور آخرت کے تمام مزے متقین کے لیے ہیں ۔ تو یہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں دولت دی گئی اور وہ اللہ کو یاد نہیں کرتے اور وہ ان عبادات سے منہ پھیرے ہیں جن کے نتیجے میں آخرت میں نعمتیں ملیں گی تو ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو گا ۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾

"اور جو شخص رحمٰن کے ذکر سے تغافل برتتا ہے 'ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے ۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں' اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں ۔ آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا "کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بعد ہوتا تو بدترین ساتھی ہے" اس وقت ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ جب تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تمہارے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہے کہ تم اور تمہارے شیاطین عذاب میں مشترک ہیں" ۔

العشی کے معنی ہوتے ہیں نظر کا دیکھ نہ سکنا' بالعموم یہ حالت اس وقت ہوتی ہے جب تیز روشنی سے آنکھیں دوچار ہوں' جس میں آنکھوں کو کھولنا ممکن نہ ہو ۔ نیز عشی کی وجہ سے شام کے اندھیرے میں کمزور نظر کے لوگ صحیح طرح معلوم نہیں کر سکتے ۔ اور ایک خاص بیماری کی وجہ سے بھی یہ ہوتا ہے ۔ یہاں مقصد غفلت اور اللہ کی یاد سے منہ موڑنا اور دل سے یہ شعور محو کر دینا کہ اللہ دیکھ رہا ہے ۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ (۴۳ : ۳۶) ”جو شخص رحمٰن کے ذکر سے تغافل برتتا ہے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے“۔ اللہ کی مشیت نے فطرت انسان میں یہ بات رکھ دی ہے کہ جب بھی اس کا دل ذکر الٰہی سے غافل ہوا اس کی طرف ایک شیطان راہ پا لیتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ لگ جاتا ہے، ہر وقت اس کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔ اور اس کے لیے برائی کو خوبصورت بناتا رہتا ہے۔ یہ شرط اور اس کا جواب دونوں مل کر اللہ کے نظام مشیت کی خوبصورت تعبیر کرتے ہیں۔ اللہ کی سنت کے مطابق سبب آتے ہی نتیجہ سامنے آ جاتا ہے۔ یہی فیصلہ پہلے سے اللہ کے علم کے مطابق طے ہوتا ہے اور اسے قضا و قدر کہتے ہیں۔ اور شیطانی برے دوستوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے انسانی برے دوستوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ یوں یہ انسان خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں۔

وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳ : ۳۷) ”اور یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں اور وہ اپنی جگہ یہ سوچتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں“۔ ایک دوست کی طرف سے ایک دوست کے ساتھ یہ نہایت ہی برا سلوک ہے کہ وہ دوست کو سیدھے راستے سے روک کر غلط راہ پر ڈال دے اور پھر اسے مسلسل غافل رکھے کہ وہ انسانی دوست کبھی یہ سوچ بھی نہ سکے کہ وہ غلطی پر ہے بلکہ اسے یہ تسلی دیتا رہے کہ وہ سیدھی راہ پر جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ برے انجام کے ساتھ متصادم ہو جاتا ہے۔

یہاں انداز تعبیر کے لیے فعل مضارع استعمال ہوا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہر عمل جاری ہے۔ لَيَصُدُّوْنَهُمْ ”وہ روکتے ہیں“۔ يَحْسَبُوْنَ ”وہ گمان کرتے ہیں“۔ اور دیکھا جا سکتا ہے بلکہ دوسرے لوگ دیکھ رہے ہیں اس تماشہ کو، جبکہ وہ خود اسے نہیں دیکھ رہے جو جہنم کی طرف رواں ہیں لیکن انجام سے بے خبر اور جس راہ پر وہ جا رہے ہیں، اچانک ہی وہ انجام بد تک پہنچ جائیں گے۔

حَتّٰى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ

(۴۳ : ۳۸) ”آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا ”کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بعد ہوتا، تو بدترین ساتھی نکلا“۔

چشم زدن میں ہم دنیا سے آخرت میں چلے جاتے ہیں، ہماری اس زندگی کا دفتر لپیٹ لیا جاتا ہے اور یہ اندھا پن اس کو شیطان کی رفاقت میں آخری انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ یہاں اب ہوش آ جائے گا، جس طرح شرابی کا نشہ اترتا ہے اور اندھے پن اور مدہوشی کے بعد یہ نظریں اٹھا کر دیکھیں گے۔ اب یہ شخص اپنے ساتھی کو غور سے دیکھے گا جو اسے یہ یقین دہانیاں کرا رہا تھا کہ میں تو آپ کو صحیح راہ پر لے جا رہا ہوں، لیکن تھا وہ بربادی و ہلاکت کا راہبر۔ اس لیے وہ جل بھن کر اسے کہے گا۔

يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ (۴۳ : ۳۸) ”کاش میرے اور تیرے درمیان شرق و مغرب کا بعد ہوتا“۔ کاش کہ ہم ملتے ہی نہ اور ہمارے درمیان یہ دوریاں ہوتیں اور پھر قرآن مجید کہتا ہے۔

فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ (۴۳ : ۳۸) "یہ تو بہت ہی برا ساتھی ہے"۔ اب دونوں کی حالت پر مایوس کر دینے والا تبصرہ۔ اور پھر اس منظر پر پردہ گرتا ہے۔

وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ (۴۳ : ۳۹) "اور اس وقت ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ جب تم ظلم کر چکے تو آج یہ بات تمہارے لیے کچھ نافع نہیں ہے کہ تم اور تمہارے شیطان عذاب میں مشترک ہیں"۔ عذاب سب کے لیے برابر ہے اور اس کو باہم تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

--- ○○○ ---

اب روئے سخن ان لوگوں سے بھر جاتا ہے۔ ان لوگوں کو اس بری حالت میں چھوڑ کر کہ ایک دوسرے کو ملامت کریں' الزامات کی بوچھاڑ کریں' برا بھلا کہیں' خطاب رسول اللہ سے شروع ہو جاتا ہے کہ آپ ان لوگوں کے اس انجام بد سے پریشان نہ ہوں اور ان کے اعراض اور کفر کی پرواہ بھی نہ کریں جو حق آپ کی طرف آ رہا ہے اس پر جم جائیں اور سچائی قدیم زمانے سے مسلسل آ رہی ہے اور ہر رسول نے اسی کو پیش کیا ہے۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِى الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِىْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِىْٓ اُوْحِىَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾

۴
۱۰ ع
۱۰

"اب کیا اے نبی' تم بہروں کو سناؤ گے؟ یا اندھوں اور صریح گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ دکھاؤ گے؟ اب تو ہمیں ان کو سزا دینی ہے خواہ ہم تمہیں دنیا سے اٹھالیں' یا تم کو آنکھوں سے ان کا وہ انجام دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے' ہمیں ان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ تم بہرحال اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو' جو وحی کے ذریعہ سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے' یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا شرف ہے اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جواب دہی کرنی ہو گی۔ تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے ان سب سے پوچھ دیکھو' کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے؟"

قرآن کریم میں یہ مثال بار بار دہرائی جاتی ہے ۔ یہ رسول اللہؐ کو تسلی دینے کے لیے آتی ہے ۔ اور اس کے ذریعہ ہدایت و ضلالت کی حقیقت بھی بتائی جاتی ہے اور اس سلسلے میں اللہ کی مشیت اور قضا و قدر کا جو نظام ہے اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی بھی رسول کے فرائض میں یہ شامل نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت پر لے آئے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ انسانوں میں سے ایک اعلیٰ ترین جدوجہد کرنے والے انسان یعنی رسول کے کام کی حدود کہاں ختم ہوتی ہیں اور قدرت الٰہیہ اور نظام مشیت کہاں تک ہے ۔ اور اس سے عقیدہ توحید کی طرف اشارہ' بہت ہی لطیف اشارہ کہ وہی کچھ ہوتا جو منظور خدا ہوتا ہے ۔

أَفَأَنتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ أَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَن كَانَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۴۳ : ۴۰)

"اے نبیؐ کیا تم بہروں کو سناؤ گے ' یا اندھوں اور صریح گمراہی میں پڑے ہوئے لوگوں کو راہ راست دکھاؤ گے ؟" وہ تو نہ بہرے تھے اور اندھے تھے لیکن بہروں اور اندھوں کی طرح تھے اور گمراہی میں دور چلے گئے تھے ' اور ان پر دعوت اور پکار کا کوئی اثر نہ ہو رہا تھا ۔ نہ وہ دلائل ہدایت کو سمجھتے تھے حالانکہ رسول اللہؐ کی ڈیوٹی تو یہ تھی کہ جو سنتا ہے اسے سمجھائیں اور جو دیکھنا چاہے اسے راہ راست دکھائیں ۔ جب انہوں نے اپنے یہ اعضا ہی معطل کر دیئے ہیں اور انہوں نے اپنے دل و دماغ کی آنکھیں ہی بند کر دی ہیں تو رسول اللہؐ ان کو ہدایت کس طرح دے سکتے ہیں ۔ پھر اگر یہ گمراہ ہوتے ہیں تو رسول اللہؐ پر کیا ذمہ داری ہے ۔ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا ـــ اب اللہ کا کام ہے کہ ادائیگی فرض کے بعد ان کے ساتھ کیا کرتا ہے ۔

فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُم مُّنتَقِمُونَ (۴۳ : ۴۱) أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا عَلَيْهِم مُّقْتَدِرُونَ (۴۳ : ۴۲) "اب تو ہمیں ان کو سزا دینی ہے ' خواہ تمہیں دنیا سے اٹھالیں ' یا تم کو آنکھوں سے ان کا وہ انجام دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے ' ہمیں ان پر پوری قدرت حاصل ہے" ۔ بہرحال ان دونوں صورتوں میں سے ایک ضرور پیش آئے گی ۔ اگر اللہ نے نبی کو اٹھا لیا تو اللہ اس کے مکذبین سے انتقام لے گا اور اگر آپ کے ہوتے ہوئے وہ بات وجود میں آگئی جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو اللہ اس پر قادر ہے کہ جس بات سے وہ ڈرا رہا ہے ' اس کو وجود میں لائے ۔ وہ تو اللہ کو کسی صورت میں شکست نہیں دے سکتے ۔ دونوں حالات میں معاملہ اللہ کی قدرت اور مشیت کے اختیار میں ہے ' اللہ ہی اس دعوت کا مالک ہے ۔ رسول تو پیغام پہنچانے والا ہے ۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۴۳ : ۴۳) "تم بہرحال اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو جو وحی کے ذریعہ سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے ' یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو" ۔ آپ جس کام میں لگے ہوئے ہیں ' اس پر جم جائیں اور اپنے راستے پر چلیں ان لوگوں نے جو رویہ اختیار کیا یا آئندہ کریں گے اس کی کوئی پرواہ نہ کریں ۔ اپنے راستے پر پوری طرح مطمئن ہو کر چلیں ۔ آپ تو یقیناً سیدھے راستے پر ہیں ۔ یہ راستہ آپ کو نہ ادھر ادھر لے جائے گا ' نہ اس میں ٹیڑھ ہے اور نہ وہ اپنی منزل سے دور لے جاتا ہے ۔

پھر جس عقیدے اور نظریہ کی آپ تبلیغ کرتے ہیں وہ اس پوری کائنات کی حقیقت کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور اللہ کے اس عام قانون کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس پر یہ پوری کائنات قائم ہے ۔ یہ نظریہ اس کائنات کے ناموس اکبر کی لائن پر ہے ۔ اس سے جدا نہیں ہوتا اور نہ اس سے منقطع ہوتا ہے ۔ اور یہ راستہ اپنے راہ رو کو ٹھیک اپنے خالق تک پہنچاتا ہے اور یہ اس قدر سیدھا ہے کہ سفر بھی نہایت ہی خوشگوار رہتا ہے ۔

آپؐ کو تاکید کی جاتی ہے کہ آپؐ اس حقیقت پر جے رہیں اور آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کے جو داعی ہوں گے آپؐ کا عمل ان کے لیے مشعل راہ ہو گا اگرچہ اس راہ کے منحرفین کے ہاتھوں ان کو اذیتیں کیوں نہ مل رہی ہوں ۔

وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ (۴۳ : ۴۴) "اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا شرف ہے اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جوابدہی کرنی ہو گی"۔ یہاں اس آیت کے دو مفہوم ہیں کہ یہ قرآن تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے نصیحت ہے اور تم سے جلد ہی قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ لہٰذا اس نصیحت اور یاد دہانی کے بعد تمہارے پاس کوئی حجت نہ رہے گی ۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے ایک شرف اور شہرت ہے اور یہ وہ مفہوم ہے جو واقع ہو گیا ۔

جہاں تک رسول اللہؐ کا تعلق ہے تو اربوں ہونٹ آپؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں اور رات دن اور صبح و شام آپؐ کو عاشقانہ انداز میں یاد کرتے ہیں اور اس طرح حضورؐ کی بعثت سے لے کر قیامت تک اربوں لوگ آپؐ پر درود و سلام پڑھتے رہیں گے ۔

رہی حضورؐ کی قوم تو جب قرآن آیا تو دنیا میں ان کا نام و نشان نہ تھا ۔ اور اگر کچھ تھا تو زندگی کی کتاب پر ایک حاشیے کی شکل میں ' ایک کونے میں ۔ یہ یہی قرآن ہے جس کے ذریعے انسانی تاریخ میں عربوں کا ایک عظیم کردار متعین ہوا ۔ یہ قرآن ہی تھا جس کی وجہ سے ربع مسکوں ان کے زیر نگین رہا ۔ جب تک انہوں نے قرآن کو سینے سے لگا رکھا تھا اور جب انہوں نے قرآن کو چھوڑا تو دنیا نے ان کو چھوڑ دیا ' وہ دوبارہ حقیر ہو گئے اور پھر ان کو قافلہ انسانیت کی لائن میں سب سے پیچھے پھینک دیا ۔ لیکن جب قرآن انہوں نے سینے سے لگایا ہوا تھا تو وہ قافلہ سالار تھے --- اور یہ ایک عظیم ذمہ داری تھی ' قیادت انسانیت کی ذمہ داری اور اس کے بارے میں اللہ عنقریب تم سے جواب دہی کرے گا کہ کیوں تم نے اس منصب کو چھوڑا ۔ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ (۴۳ : ۴۴) "اور جلد ہی تم سے پوچھا جائے گا"۔ یہ آخری مفہوم زیادہ جامع و مانع ہے ۔ میں اسی کی طرف مائل ہوں ۔

وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ

(۴۳ : ۴۵) "تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے تھے ان سب سے پوچھ دیکھو کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے کہ ان کی بندگی کی جائے؟" اس حقیقت کو قرآن یہاں نہایت ہی منفرد انداز میں پیش کرتا ہے ۔ اس صورت میں کہ رسول اللہ سابقہ رسولوں سے پوچھ لیں ۔

اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ (۴۳ : ۴۵) "کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے سوا کچھ دوسرے معبود بھی مقرر کیے تھے کہ ان کی بندگی کی جائے" ۔ اور پھر اس سوال کا جواب ہر رسول کی طرف سے قطعی انکار ہے ۔ استفہام انکاری کی یہ صورت نہایت ہی عجیب اور موثر ہے ۔ اور یہ اسلوب نہایت ہی پر تاثیر ہے 'یعنی تاریخ سے پوچھو ۔

رسول اللہؐ اور انبیائے سابقین کے درمیان تو زمان و مکان کے طویل فاصلے ہیں ۔ پھر موت و حیات کے فاصلے بھی بہت طویل ہیں 'آپ زندہ ہیں اور انبیائے سابقہ فوت ہو گئے ہیں لیکن یہ تمام فاصلے مٹ جاتے ہیں ۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ پوری انسانی تاریخ میں رسالت تو ایک ہے 'پیغام ایک ہے اور کلمہ توحید بھی ایک ہے ۔ اگرچہ زمان و مکان بعید ہیں ۔ حیات اور موت کے درمیان دبیز پردے ہیں لیکن وحدت نبوت ان تمام دوریوں اور پردوں کو مٹا دیتی ہے ۔ مردے اور زندہ ایک ہو جاتے ہیں ۔ ماضی و حال ایک ہو جاتے ہیں ۔ یہ ہے قرآن کریم کا انداز تعبیر جو لطیف اور عجیب ہے ۔

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے برادر دیگر انبیائے کرام اور اللہ کے ساتھ ان کے ربط کو دیکھا جائے تو یہاں قریب و بعید کے فاصلے ختم ہو جاتے ہیں ۔ اللہ کے ہاں یہ پردے چشم زدن میں دور ہو جاتے ہیں اور تمام رکاوٹیں اور فاصلے دور ہو کر حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے ۔ حضورؐ پھر سوال کرتے ہیں اور انبیاء جواب دیتے ہیں جیسا کہ لیلتہ المعراج میں ہوا ۔

ایسے مقامات پر چاہئے کہ ہم اپنی زندگی کے معمولات اور عادات کو اہمیت نہ دیں کیونکہ یہ مالوفات جو ہم دیکھتے ہیں کہ سبب کے بعد مسبب آتا ہے ۔ یہ اللہ کے حوالے سے کوئی کلی قواعد نہیں ہیں ۔ ہم تو اس کائنات کے بعض آثار ہی کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کائنات کے طبیعی حالات کے بھی ایک نہایت ہی معمولی حصے تک پہنچ سکے ہیں ۔ کئی ایسے حقائق ہیں جو ہماری ساخت 'ہمارے حواس اور ہمارے مرتب کردہ نتائج سے وراء ہیں ۔ جب نفس انسانی ان مالوفات اور طبیعیات کے دائرے سے نکل جاتا ہے اور اسے تجرد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر ایک مجرد حقیقت تک انسان کا پہنچنا بہت آسان ہو جاتا ہے ۔ یہ ادراک پھر اس سے آسان تر ہوتا ہے جس طرح کوئی اپنے ہی جسم سے کسی دوسرے جسم کو چھو کر ادراک کرے ۔

---ooo---

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے حوالے سے کہ کبرائے قریش نے آپ کی نبوت پر اعتراض کیا ۔ آپ کو کیوں منتخب کیا گیا ہے ۔ اور پھر آپ کے انتخاب پر ان کا اعتراض صرف دنیا کی کھوٹی اور جھوٹی قدروں کی بنا پر کیا گیا' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حصے کی ایک کڑی لائی جاتی ہے جس میں یہ بتایا گیا کہ آپ کی قوم نے جس طرح اپنے آپ کو بڑا سمجھا' اسی طرح فرعون نے بھی موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھا تھا ۔ جس طرح انہوں نے کہا ۔

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۴۳ : ۳۱) "یہ قرآن ان دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہیں اتارا گیا" ۔ اسی طرح فرعون نے بھی اپنی قوت 'حکومت اور مال و دولت پر گھمنڈ کیا تھا اور نہایت فخریہ انداز میں پوچھا تھا :

اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۴۳ : ۵۱)

"لوگو 'کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے 'اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا" ۔ اور وہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا وہ محض اپنے دنیاوی مرتبہ و مقام کی بنا پر اور مال و دولت

کی بنا پر تھا حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ بندے اور نبی تھے ۔ لیکن وہ دنیاوی اعتبار سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا :

اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (۴۳ : ۵۲) "میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا" ۔ اور فرعون کی تجویز اور اہل قریش کی تجویز کس قدر مماثل ہیں ۔

فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ (۴۳ : ۵۳)

"کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن نہ اتارے گئے یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا" ۔ یہ ایک نسخہ ہے جو بار بار پیغمبروں کے خلاف آزمایا جا رہا ہے ۔ بنی بنائی دلیل ہے جو ہر نبی کے خلاف استعمال ہو رہی ہے ۔

اس کے بعد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عوام جن کو فرعون نے ذلیل کر کے رکھا ہوا تھا اور پوری طرح دھوکے میں رکھا ہوا تھا' کس طرح فرعون کی بات پر لبیک کہتے ہیں ۔ حالانکہ عوام اور فرعون کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حیران کن معجزات پیش کیے تھے ۔ پھر ان لوگوں پر اور آزمائشیں بھی آئی تھیں اور یہ لوگ دوڑ کر آتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام سے دعا کراتے تھے اور اللہ ان مصیبتوں سے ان کو نجات دیتا تھا ۔

جب معجزات اور تبلیغ کے ذریعہ ان پر حجت تمام ہو گئی تو ان کا انجام یہ ہوا ۔

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۴۳ : ۵۵) فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ (۴۳ : ۵۶) "آخر کار جب انہوں نے ہمیں غضبناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونہ عبرت بنا کر رکھ دیا" ۔

اور دیکھیے' یہ ہیں بعد میں آنے والے' نہ عبرت پکڑتے اور نہ نصیحت لیتے ہیں ۔ اس پیراگراف کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ رسالت اور دعوت ایک رہی ہے ۔ تمام رسولوں کا منہاج کار ایک رہا ہے' راستہ ایک رہا ہے ۔ اس طرح سرکشوں اور کبراء زمانہ کا رویہ بھی سچائی کے ردعمل میں ایک ہی رہا ہے ۔ انہوں نے ہمیشہ دنیا کی کھوٹی اور جھوٹی قدروں کے زاویہ سے پیغمبروں کو دیکھا اور ہمیشہ جمہور عوام کا رویہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے جن کو کبراء ذلیل کر کے رکھتے ہیں اور پوری انسانی تاریخ اس کی داستان ہے ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۶ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ۝۴۷

"ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے پاس بھیجا اور اس نے جا کر کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں ۔ پھر جب اس نے ہماری نشانیاں ان کے سامنے پیش کیں تو وہ ٹھٹھے مارنے لگے" ۔

حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان یہ پہلی ملاقات ہے اور اس کا ذکر بطور تمہید ہوا ۔ اصل مقصد یہ ہے کہ اس

قصے' کا متعلقہ حصہ پیش کیا جائے' متعلقہ حصہ یہ ہے کہ جس طرح قریش نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کیے' ویسے ہی فرعون نے بھی کیے تھے' جس طرح یہ اعتراضات دنیائے دنی کے جھوٹے معیار کے حوالے سے تھے اسی طرح فرعون نے بھی اپنی برتری کے لیے دنیاوی معیار پیش کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں اور تمام رسولوں نے کہا کہ ہم رسول ہیں' یہاں حضرت موسیٰ کے معجزات کی طرف ا۔ ر ان کے مقابلے میں فرعونیوں کے ردعمل کی طرف بھی صریح اشارہ۔

اذا ھم منھا یضحکون (۴۳ : ۴۷) "وہ ٹھٹھے مارنے لگے"۔ اور ہمیشہ جاہلوں کا یہی انداز ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان آزمائشوں کی طرف اشارہ آتا ہے' جن کی تفصیلات دوسری سورتوں میں دے دی گئی ہیں۔ یہ آزمائشیں پے درپے ان پر آئیں اور یہ حضرت موسیٰ کے ہاں فریادی ہوئے اور آپ کی دعاؤں سے وہ آزمائشیں دور ہوئیں۔

وَمَا نُرِيهِم مِّنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا ۖ وَأَخَذْنَاهُم بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤٨﴾ وَقَالُوا يَا أَيُّهَ السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِندَكَ إِنَّنَا لَمُهْتَدُونَ ﴿٤٩﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ ﴿٥٠﴾

"ہم ایک پر ایک ایسی نشانی ان کو دکھاتے چلے گئے جو پہلی سے بڑھ چڑھ کر تھی' اور ہم نے ان کو عذاب میں دھرلیا کہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔ ہر عذاب کے موقع پر وہ کہتے 'اے ساحر' اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے' اس کی بنا پر ہمارے لیے اس سے دعا کر' ہم ضرور راہ راست پر آجائیں گے مگر جوں ہی کہ ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے"۔

یوں یہ مسلسل معجزات جو حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے جارہے تھے ذریعہ ایمان نہ بنے۔ حالانکہ ایک سے ایک بڑا معجزہ ظاہر ہورہا تھا۔ یہ بات قرآن کریم کے اس اصول کی تصدیق کرتی ہے جو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے کہ جو دل ہدایت کے قابل ہی نہ ہو اس کو معجزات کے ذریعہ بھی ہدایت نہیں ملتی اور یہ کہ کوئی رسول بہرے کو سنا نہیں سکتا اور اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا۔

یہاں قرآن کریم فرعون اور اس کے درباریوں سے جو بات نقل کرتا ہے اس میں عجیب بات یہ ہے جو وہ کہتے ہیں۔

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا السَّاحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ إِنَّنَا لَمُهْتَدُونَ

(۴۳ : ۴۹) "اے ساحر' اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے' اس کی بنا پر ہمارے لیے اس سے دعا کر' ہم ضرور راہ راست پر آجائیں گے"۔ یہ ایک مصیبت میں گرفتار ہیں رب۔ موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ دعا کراتے ہیں کہ یہ مصیبت ٹل جائے لیکن اس کے ساتھ حضرت موسیٰ کو "اے جادوگر" سے خطاب کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں۔

ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ (۴۳ : ۴۹) "اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے ' اس کی بنا پر ہمارے لئے اس سے دعا کر"۔ حالانکہ حضرت موسیٰ تو ان کو کہتے تھے کہ میں رب العالمین کا رسول ہوں ۔ یہ نہ کہتے تھے کہ میں صرف اپنے رب کی طرف سے رسول ہوں ۔ لیکن اصل بات یہ تھی نہ ان معجزات نے ان کے دل پر اثر کیا تھا اور نہ رسول کے کلام نے ان پر اثر کیا تھا ۔ وہ یہ غلط کہتے تھے کہ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ (۴۳ : ۴۹) "ہم ضرور راہ راست پر آجائیں گے"۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (۴۳ : ۵۰) "مگر جونہی کہ ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے"۔ لیکن بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ معجزات کے نتیجے میں جمہور عوام کے دلوں پر اثر ہو جاتا ہے اور ان کے دھوکہ کھائے ہوئے دماغوں میں بعض اوقات بات آجاتی ہے ۔ اب فرعون دبدبہ شاہی اور اقتدار کے رنگ میں آتا ہے ۔ زیب و زینت اور اقتدار کے کروفر میں ۔ اور جمہور کے سامنے اپنی سطحی منطق پیش کرتا ہے ۔ اور عوام کو متاثر کرنے کی سعی کرتا ہے ۔ غلامی کی ذہنیت رکھنے والے عوام کے سامنے جن کا خمیر ظلم اور جبر کے دور میں بالعموم بدل جاتا ہے ' وہ چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے اور ان کے سامنے کروفر کے ذریعے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا ہے ۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِىْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ۝ فَلَوْلَآ اُلْقِىَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ۝

"ایک روز فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا' "لوگو ' کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے ' اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟ کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے؟ یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا؟"

مصر کی بادشاہت ' مصر کی نہریں فرعون کے زیر انتظام تھیں اور جمہور عوام کو نظر آتی تھیں ۔ یہ ان کی آنکھوں کو چکاچوند کر دیتی تھیں ۔ اس لیے لوگ دھوکہ کھا جاتے تھے ۔ رہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہت جس میں مصر ایک ذرہ ہے ' تو اس کو سمجھنے کے لیے مومن دلوں کی ضرورت ہوتی ہے ' جو اس بات کو سمجھ سکیں اور اللہ کی بادشاہت اور مصر کی بادشاہت کے درمیان موازنہ کر سکیں ۔

رہے غلامی کے خوگر عوام جن کا ہر دور میں استحصال کیا جاتا ہے تو ان کو قریب کی دنیاوی چمک دمک متاثر کر دیتی ہے اس لیے ان کی نظریں ' ان کے دل اور ان کے دماغ اللہ کی بلند حکومت اور بادشاہت کو سمجھنے کے لیے سربلند ہی نہیں ہوتے ۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون نے ان عوام کے غافل اور سطحی دلوں کے سامنے ترقیات کا زرق برق نقشہ پیش کیا اور کہا۔

اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (۴۳ : ۵۲) "میں بہتر ہوں یا یہ جو ذلیل و حقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا"۔ یہاں ذلت سے اس کی مراد یہ تھی کہ یہ نہ امیر ہے' نہ صاحب اقتدار اور نہ اس کے پاس نظر آنے والی مالی پوزیشن ہے۔ لفظ ام سے وہ اشارہ بنی اسرائیل کی غلام قوم کی طرف کرتا ہے اور "اپنی بات کھول کر بیان نہیں کر سکتا" اس طرف کہ مصر سے جانے سے پہلے آپ کی زبان میں لکنت تھی۔ یہ پہلے کی بات تھی ورنہ اب لکنت نہ تھی۔ حضرت موسیٰ نے دعا فرمائی تھی۔

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ "اے میرے رب میرے سینہ کو کھول دے' میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے' اور میری زبان میں لکنت ہے' اسے کھول دے تاکہ وہ میری بات کو سمجھیں"۔ اس وقت آپ کی زبان کا عقدہ کھل گیا تھا اور آپ اب بات بیان کر سکتے تھے۔

اور جمہور عوام کا ظاہر ہے کہ فیصلہ یہی ہو گا کہ فرعون جو مصر کا بادشاہ ہے 'مصر میں نہریں اس نے جاری کر رکھی ہیں۔ وہ موسیٰ علیہ السلام سے بہتر ہو گا۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس تو حق بات' نبوت کا پیغام' نجات کی دعوت اور دردناک عذاب سے بچنے کی راہ تھی۔

فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ (۴۳ : ۵۳) "کیوں نہ اس پر سونے کے کنگن اتارے گئے"۔ یہ ہے ذہنیت وڈیروں کی۔ اس دنیا کا حقیر ساز و سامان' نبوت کی حقانیت کے لیے بطور علامت تجویز ہو رہا ہے۔ سونے کے کنگن' ان معجزات سے بھاری ہو گئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوئے۔ مطلب یہ تھا کہ اسے مصر کا اقتدار کیوں نہیں دیا گیا۔ کیونکہ مصر کے بادشاہ کی تاج پوشی کے موقعہ پر سونے کے کنگن اتارے جاتے تھے۔ یہ ان کی رسم تھی۔ یوں وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ رسول کو مقتدر اعلیٰ ہونا چاہئے اور یہ میں ہوں۔

اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ (۴۳ : ۵۳) "یا فرشتوں کا ایک دستہ اس کی اردلی میں نہ آیا"۔ یہ بھی ایک اعتراض تھا' جس کا تعلق اس دنیا کی چمک دمک سے تھا۔ اور عوام پر اثر انداز ہوتا تھا۔ یہ بھی ایک بنا بنایا اعتراض ہے جو ہر رسول پر کیا گیا۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝

"اس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انہوں نے اس کی اطاعت کی' درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ"۔ جمہور عوام کو ڈکٹیٹروں کی طرف سے خفیف و حقیر سمجھنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے وہ پہلے تو عوام سے ہر بات کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ ان سے حقائق کو چھپاتے ہیں تاکہ وہ بھول جائیں۔ اور ان کے بارے میں وہ دوبارہ کھوج ہی نہ لگائیں۔ ان کے دل و دماغ کو اس قدر متاثر کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت عوام کے ذہنوں پر چھا جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر ان کے لیے عوام کو ہلکا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ مطیع ہو جاتے اور جدھر چاہتے ہیں' ادھر جاتے ہیں۔

لیکن کوئی ڈکٹیٹر عوام کو اس قدر ہلکا نہیں بنا سکتا جب تک وہ خود فاسق و فاجر نہ ہوں اور بے راہ روی نہ کرتے

ہوں۔ انہوں نے اللہ کی رسی نہ پکڑی ہو۔ معاملات کو ایمان کے ترازو سے نہ تولتے ہوں، رہے مومن تو نہ ان کو کوئی ہلکا سمجھ سکتا ہے، نہ ان کو دھوکہ دے سکتا ہے، اور نہ ان کو کھلونا بنایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ عوام الناس نے فسق و فجور کی وجہ سے فرعون کا ساتھ دیا۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ (۴۳ : ۵۴) ”اس نے اپنی قوم کو ہلکا بنا دیا، پس انہوں نے اس کی اطاعت کر لی اور یہ لوگ ایک فاسق قوم کے فرد تھے“۔

اب ان کی آزمائش، ان کو ڈرانے اور سمجھانے کا مرحلہ ختم ہوتا ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ یہ قوم ایمان لانے والی نہیں ہے۔ فتنہ عام ہو گیا ہے، جمہور عوام فرعون کے پیچھے لگ گئے ہیں اور فرعون بہت ہی سرکش، متکبر، مغرور ہے اور عوام اللہ کے بین معجزات کے مقابلے میں بالکل اندھے ہو گئے ہیں، ان کو یہ روشنی نظر ہی نہیں آتی۔ اب اللہ کے عذاب کا فیصلہ ان پر آجاتا ہے۔

فَلَمَّا آسَفُونَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا لِلْآخِرِينَ ﴿۵۶﴾

۵
۱۱ع
۱۱

”آخر کار جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو اکٹھا غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونہ عبرت بنا کر رکھ دیا“۔

یہاں اللہ کا قرآن ذات باری کے غضب اور انتقام اور تباہی مچانے والے اقدام کو پیش کرتا ہے اور جتایا جاتا ہے کہ اللہ کے غضب کے نتیجے میں اس کی قوت جو کام کرتی ہے وہ تاریخ میں مثال ہوتی ہے۔

فَلَمَّا آسَفُونَا (۴۳ : ۵۵) ”جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا“۔ یعنی بہت زیادہ ناراض کر دیا۔

انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ (۴۳ : ۵۵) ”ہم نے ان سے انتقام لیا اور سب کو اکٹھا غرق کر دیا“۔ فرعون، اس کے سرداروں اور لشکر کو۔

یہی لوگ تھے جو حضرت موسیٰ کے تعاقب میں ہلاک ہوئے، ان کو پیشوا بنا دیا کہ ہر ظالم یہی کام کرے اور اسی انجام تک پہنچے۔

وَمَثَلًا لِلْآخِرِينَ (۴۳ : ۵۶) ”اور نمونہ عبرت پچھلوں کے لیے“۔ یعنی ان لوگوں کے لیے جو فرعون کے بعد ایسے کام کرنے والے تھے اور جو ان کے قصے کو معلوم کر کے اس سے عبرت حاصل کرنے والے تھے۔

---ooo---

حضرت موسیٰ کے قصے کی یہ کڑی یہاں ختم ہوتی ہے۔ یہ کڑی ان حالات کے مشابہ تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو

بمقابلہ قریش درپیش تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ مومنین نے سخت بے جگری سے ان کا مقابلہ کیا۔اس قصے کے ذریعہ عرب کے مشرکین کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ تم جس طرح کے اعتراضات کرتے ہو' یہی اعتراضات فرعون اور اس کی قوم نے کیے تھے اور ان کا یہ انجام ہوا تھا۔

اس طرح اس قصے میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں' وہ قصہ فرعون و موسیٰ اور حالات موجودہ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل قریش کے حالات پر پوری طرح منطبق ہوتے ہیں' اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سورت میں بیان کردہ حالات میں قصے کی اس کڑی کو کیوں لایا گیا ہے' پھر اس طرح یہ قصہ الٰہی منہاج تربیت کے مطابق مسلمانوں کے لیے بہترین ذریعہ تربیت بھی ہے۔

---ooo---

اب قصہ موسیٰ علیہ السلام کی اس کڑی سے بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ایک کڑی کی طرف منتقل ہوتی ہے۔اور یہ کڑی اس نکتے پر لائی گئی ہے کہ مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر ان کی عبادت کرتے تھے اور پیروکاران مسیح ان کو خدا کا بیٹا سمجھ کر ان کی بندگی کرتے ہیں اور یہ اس سورت کا آخری سبق ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۳۲ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے اور اس کا موضوع بھی عربوں کے افسانوی عقائد ہیں 'یہ کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں ' اس لیے ہم ان کی بندگی کرتے ہیں ' یہاں ایک استدلال نقل کیا جاتا ہے جو مشرکین مکہ اپنے واہی تباہی عقائد کی مدافعت میں پیش کیا کرتے تھے ۔یہ استدلال وہ اس نیت سے نہ کرتے تھے کہ وہ سچائی کے متلاشی تھے 'یہ محض دکھاوا اور دھوکہ تھا۔

جب ان سے کہا گیا کہ تم اور جن بتوں کی تم بندگی کرتے ہو' وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے ۔ مراد تو یہ تھی کہ جن بتوں کی پوجا کرتے ہو' خواہ وہ فرشتوں کے نام سے ہیں یا کسی اور کے نام کے ۔ مراد یہ نہ تھی کہ جن کے نام سے تم بتوں کو منسوب کرتے ہو' وہ بھی جہنم میں ہوں گے ۔ غرض ان سے جب یہ کہا گیا کہ عابد و معبود دونوں جہنم میں ہوں گے ۔ جب ان سے یہ کہا گیا تو بعض لوگوں نے عیسیٰ ابن مریم کی مثال دی کہ بعض گمراہ عیسائی ان کی بندگی کرتے تھے ۔ یہ ان کی طرف سے محض ایک کج بحثی تھی ۔پھر وہ کہتے تھے کہ جب اہل کتاب حضرت عیسیٰ کی بندگی کرتے ہیں تو ان سے ہم بہتر ہیں کہ ہم فرشتوں کی بندگی کرتے ہیں ۔یہ استدلال بناء الباطل علی الباطل کی بہترین مثال تھا۔

اس بنا پر یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ایک کڑی لائی جاتی ہے ۔اس میں بتایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی حقیقت کیا ہے ۔ آپ کی دعوت کیا تھی ۔ اور ان سے پہلے بنی اسرائیل میں کیا اختلافات تھے اور ان کے بعد کیا اختلافات پیدا ہوئے ۔

اس کے بعد تمام بدعقیدہ اور مشرکانہ خیالات رکھنے والوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ اچانک قیامت آجائے گی اور پھر حالت کیا ہوگی؟ اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک طویل منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں ایک جھلک ان نعمتوں کی ہے جو متقین کے لیے تیار کی گئی ہیں اور ایک جھلک اس دردناک عذاب کی ہے جو مجرمین کے لیے تیار کیا گیا ہے ۔

اس سبق میں فرشتوں کے بارے میں عربوں کے اس افسانے کو بھی رد کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں ۔اللہ پاک ان باتوں سے بری ہے جو یہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔اس مناسبت سے اللہ کی بعض صفات کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے ۔اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اللہ زمین و آسمان اور دنیا و آخرت کا مطلق مالک ہے اور سب لوگوں نے اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے ۔

اور آخر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ آپ ان کو نظرانداز کر دیں ' ان سے منہ پھیر لیں اور ان کو کرتے دیں جو کرتے ہیں ۔ عنقریب ان کو اپنا انجام معلوم ہو جائے گا اور یہ ایک ایسی بالواسطہ دھمکی ہے جو ان لوگوں کے لیے مناسبت ہے جو محض دکھاوے کے لیے کٹ حجتی کرنے میں ' احقاق حق کے لیے بات نہیں کرتے ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۳۳ تشریح آیات

۵۷ --- تا --- ۸۹

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ﴿۵۷﴾ وَقَالُوا أَآلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ﴿۵۸﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۵۹﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ﴿۶۰﴾ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿۶۲﴾ وَلَمَّا جَاءَ عِيسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿۶۳﴾ إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿۶۴﴾ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ ﴿۶۵﴾

"اور جونہی کہ ابن مریم کی مثال دی گئی' تمہاری قوم کے لوگوں نے اس پر غل مچا دیا اور لگے کہنے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں' حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ ۔ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اسے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا دیا۔ ہم چاہیں تو تم کو فرشتے بنا دیں جو زمین میں تمہارے جانشین ہوں اور وہ (یعنی ابن مریم) دراصل قیامت کی ایک نشانی ہے' پس تم اس میں شک نہ کرو اور میری بات مان لو' یہی سیدھا راستہ ہے' ایسا نہ ہو شیطان تم کو اس سے

روک دے کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور جب عیسیٰ صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا' اس نے کہا تھا کہ "میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں' اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو' لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ اسی کی تم عبادت کرو' یہی سیدھا راستہ ہے"۔ مگر (اس کی اس صاف تعلیم کے باوجود) گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا' پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب سے"۔

ابن اسحاق نے سیرۃ میں لکھا ہے کہ جس طرح مجھ تک یہ بات پہنچی' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں ولید ابن مغیرہ کے پاس بیٹھے تھے' نضر ابن الحارث بھی آیا اور وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گیا۔ مجلس میں قریش کے کئی اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ بات کی۔ نضر ابن حارث نے کچھ اعتراض کیا' تو حضورؐ نے اس کو خاموش کرا دیا۔ اس کے بعد ان پر یہ آیت پڑھی۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ (۲۱ : ۹۸)

"تم اور جن بتوں کی تم پوجا کرتے ہو' جہنم کا ایندھن ہیں۔ تم اس جہنم میں پہنچنے والے ہو....."۔ رسول اللہ اس مجلس سے اٹھ گئے اور عبداللہ ابن الزبعری تمیمی آیا اور مجلس میں بیٹھ گیا تو ولید ابن مغیرہ نے کہا: "خدا کی قسم نضر ابن الحارث کا کھڑا ہونا تھا کہ عبدالمطلب کے بیٹے اٹھ کر چلے گئے۔ محمد کا خیال یہ ہے کہ ہم اور ہمارے سب معبود جہنم کا ایندھن ہیں۔ اس پر عبداللہ ابن الزبعری نے کہا' خدا کی قسم اگر مجھے ملے تو میں اس کے ساتھ جھگڑا کروں گا۔ تم محمد سے پوچھو کیا وہ تمام معبود جن کی عبادت کی جاتی ہے' اپنے عبادت کرنے والوں کے ساتھ جہنم میں ہوں گے۔ ہم تو ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں۔ یہودی عزیر کی عبادت کرتے ہیں اور نصاریٰ مسیح ابن مریم کی عبادت کرتے ہیں تو ولید اور اہل مجلس' عبداللہ ابن زبعری کی بات سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے سمجھا کہ اس نے خوب دلیل پیش کی اور مباحثہ کیا۔ یہ بات رسول اللہ کے سامنے ذکر ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا: "جس نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ اللہ کے سوا پوجا جائے تو بے شک وہ ان لوگوں کے ساتھ جہنم میں ہو گا جنہوں نے اسے پوجا۔ یہ لوگ دراصل شیطان کی عبادت کرتے ہیں جس نے ان کو ان بزرگوں کی بندگی کا حکم دیا ہے"۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ (۲۱ : ۱۰۱) "رہے وہ لوگ جن کے بارے میں ہماری طرف سے بھلائی کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہو گا تو وہ یقیناً اس سے دور رکھے جائیں گے"۔ یعنی حضرت عیسیٰ' حضرت عزیر اور ان کے ساتھ پوجے جانے والے دوسرے احبار اور رہبان۔ جو اللہ کی عبادت پر قائم رہے اور ان کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کی عبادت شروع کر دی اور ان کو ارباب من دون اللہ بنا دیا۔ اور یہ جو عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں بات کی گئی کہ ان کی بھی من دون اللہ عبادت کی جاتی ہے اور ولید اور دوسرے اہل مجلس اس سے متاثر ہوئے تو اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ (۴۳ : ۵۷) "جب ابن مریم کی

مثال دی گئی تو تمہاری قوم نے اچانک غل مچا دیا"۔یصدون کے معنی ہیں یَصُدُّوْنَ عَنْ اَمْرِكَ یعنی تمہاری دعوت سے روکتے رہیں....."۔

علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہؐ نے قریش کے سامنے یہ آیت پڑھی اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (۲۱ : ۹۸) "تم اور تمہارے معبود جہنم کا ایندھن ہوں گے اور سب نے اس میں جانا ہے"۔ تو اس پر اہل قریش سخت برہم ہوئے ۔ عبداللہ ابن زلبعری نے پوچھا محمدؐ، یہ حکم صرف ہمارے معبودوں اور ہمارے بارے میں ہے یا دوسری ملتوں کے بارے بھی ہے ۔ آپ نے فرمایا "یہ تمہارے لیے تمہارے الہوں کے لیے اور تمام اقوام کے لیے ہے"۔ تو اس نے کہا، رب کعبہ کی قسم میں نے تمہیں شکست دے دی۔ کیا تم یقین نہیں کرتے کہ عیسیٰ ابن مریم نبی ہیں اور تم ان کے اور ان کی والدہ کے بارے میں اچھی باتیں کرتے ہو، اور تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ نصاریٰ ان کی عبادت کرتے ہیں اور عزیر کی بھی یہودی بندگی کرتے ہیں، ملائکہ کی بھی بندگی کی جاتی ہے ۔ اگر یہ سب لوگ جہنم میں ہوں گے تو ہم بھی اپنے الہوں کے ساتھ جہنم میں جانے کے لیے تیار ہیں ۔ اس پر وہ بہت ہنسے اور خوش ہوئے ۔ حضورؐ خاموش ہو گئے ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی :

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى (۲۱ : ۱۰۱) "رہے وہ لوگ جن کے بارے میں ہماری طرف سے بھلائی کا فیصلہ ہو چکا ہو گا"۔ اور یہ آیت بھی نازل ہوئی جس کے معنی یہ ہیں کہ جب عبداللہ ابن الزبعری نے عیسیٰ ابن مریم کی مثال دی اور رسول اللہؐ کے ساتھ مباحثہ کیا کہ نصاریٰ بھی تو عیسیٰ کی عبادت کرتے ہیں تو اچانک تمہاری قوم اہل قریش نے شور و غل مچانا شروع کر دیا ۔ اور یہ انہوں نے اس لیے کیا کہ وہ اس دلیل پر بہت خوش ہوئے ۔ کیونکہ رسول اللہؐ کو زلبعری نے خاموش کر دیا تھا ۔ جس طرح بعض اوقات بے دلیل لوگ جب بحث میں ہار جاتے ہیں اور اچانک ان کو کوئی دلیل مل جاتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں ۔ لفظ یصدون کے معنی تو ہیں شور کرنا ۔ لیکن جنہوں نے اسے یصدون (حرف صاد پر پیش کے ساتھ) پڑھا ہے تو اس کے معنی ہوں گے کہ وہ حق سے منہ موڑتے ہیں، اعراض کرتے ہیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ یصدون الصدید سے ہے جس کے معنی مقابلہ اور کٹ جانے کے ہیں ۔ یصدون اور یصدون دونوں طرح آتا ہے جس طرح یعکف اور یعکف آتا ہے ۔

وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَیْرٌ اَمْ هُوَ (۴۳ : ۵۸) "ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ"۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارے نزدیک ہمارے الٰہ عیسیٰ سے اچھے اور بہتر نہیں؟ اگر عیسیٰ جہنم کا ایندھن ہیں تو پھر ہمارے الہوں کا معاملہ آسان ہے ۔

یہ تھی صاحب کشاف کی روایت، معلوم نہیں انہوں نے کس سے اخذ کی ہے لیکن اپنے عمومی مضمون میں یہ ابن اسحاق کی روایت کے ساتھ متفق ہے ۔

دونوں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس جدل و جدال میں محض ظاہری اور لفظی کج بحثی سے کام لیتے تھے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کہتا ہے ۔

بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (۴۳ : ۵۸) "حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ"۔ یہ جھگڑتے ہیں اور تنقید کرنے میں بہت ماہر ہیں' مناظرہ باز ہیں۔ ان کو پہلے سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور رسول اللہؐ کی مراد کیا' اس کے بعد وہ مفہوم کو توڑ مروڑ کر اپنی مراد پر لاتے ہیں اور پھر اعتراض کرتے ہیں اور الفاظ کے عموم کو لے کر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ ان کے اندر وہ پورے قرآن کی تعلیمات سے خود اختصاص پیدا کر سکتے تھے اور اس قسم کے عمومی اعتراضات وہی عائد کرتا ہے جو مخلص نہ ہو اور پوری طرح چالاک ہو' جس کی سوچ درست نہ ہو' مکابرہ کرنے والا ہو اور ہر وقت شبہات' الفاظ کے ہیر پھیر اور کسی جگہ پر نقب زنی کرنے کا متلاشی ہو۔ اس لیے حضور اکرمؐ نے ہمیشہ ایسی گفتگو سے منع فرمایا ہے جس میں محض دکھاوا ہو' حقیقت نہ ہو' اور جس میں صاحب کلام ہر صورت میں اپنی بات کو غالب کرنا چاہتا ہو۔

ابن جریر نے' ابو کریب سے انہوں نے احمد ابن عبدالرحمٰن سے انہوں نے عبادہ ابن عبادہ سے انہوں نے جعفر سے انہوں نے قاسم سے اور انہوں نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلے اور لوگ قرآن کریم میں مباحثہ اور مناظرہ کر رہے تھے۔ آپ کو بہت شدید غصہ آیا۔ گویا آپ کے چہرۂ مبارک پر سرکہ ڈال دیا گیا ہو۔ (ترش روئی کا اظہار کیا) اس کے بعد آپ نے فرمایا "قرآن کے بعض حصوں کو بعض دوسرے حصوں سے نہ ٹکراؤ' کیونکہ لوگ گمراہ تب ہوئے جب ان کے اندر مذہبی جھگڑے اور اختلافات شروع ہو گئے"۔ اس کے بعد آپ نے پڑھا۔

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (۴۳ : ۵۸) "یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت ہی جھگڑالو لوگ ہیں"۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک دوسرا احتمال بھی ہے۔

وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ (۴۳ : ۵۸) "اور وہ کہنے لگے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟" میں یہ اشارہ ہے کہ ان کے افسانوی عقائد کے مطابق وہ ملائکہ کی پوجا کرتے تھے ان کا خیال یہ تھا کہ ان کی یہ پوجا نصاریٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا سے بہتر ہے۔ کیونکہ ملائکہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اور ان کے افسانوی خیال کی رو سے خدا کے زیادہ قریب ہیں۔ اس پر یہ تبصرہ۔

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (۴۳ : ۵۸) "یہ مثال وہ تمہارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت ہی جھگڑالو لوگ ہیں"۔ اور جس طرح پہلے گزرا یہ ابن الزبعری پر رد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نصاریٰ کی عبادت مسیح کی مثال لانا یہاں باطل ہے۔ نصاریٰ کا عمل حجت نہیں ہے کیونکہ وہ تو توحید سے پھر گئے ہیں جس طرح مشرکین توحید سے پھر گئے ہیں۔ لہٰذا دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ سب کے سب گمراہ ہیں۔ بعض مفسرین نے اس طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بھی ایک قریب الفہم تفسیر ہو سکتی ہے۔ اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ کے بارے میں جامع تبصرہ۔

انْ هُوَ الَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۴۳ : ۵۹) ’’ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ ایک بندہ تھا جس پر ہم نے انعام کیا اور بنی اسرائیل کے لیے اسے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا دیا‘‘۔ اور وہ الہہ نہیں جس کی عبادت کی جائے‘ جس طرح نصاریٰ کا ایک گروہ گمراہ ہوا اور اس نے ان کی بندگی شروع کر دی۔ وہ تو ایک بندۂ خدا ہیں ان پر اللہ کا انعام ہو گیا‘ اور اگر بعض لوگوں نے ان کی بندگی کی ہے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے ان کو رسالت اور معجزات دے کر بنی اسرائیل کے لئے نمونہ قدرت الہیہ بنایا گیا تھا اور بنی اسرائیل کو چاہئے تھا کہ وہ ان کی پیروی کرتے اور ہدایت حاصل کرتے مگر وہ گمراہ ہو گئے۔

اب بات ان کے عقائد بابت ملائکہ کے موضوع کی طرف آتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ فرشتے تو تمہاری طرح اللہ کی مخلوق ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اس زمین میں تمہارا جانشین فرشتوں کو بنا دیں یا بعض لوگوں کو فرشتے بنا دیں جو زمین میں جانشین ہو جائیں۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ (۴۳ : ۶۰) ’’اگر اللہ چاہتا تو ملائکہ کو تمہارا خلیفہ بنا دیتا‘‘۔ یہ سارے معاملات اللہ کی مشیت پر موقوف ہیں۔ اپنی مخلوق کے بارے میں جو چاہے کر دے لیکن مخلوق میں سے کوئی اللہ سے نسب نہیں جوڑ سکتا۔ اور نہ اللہ سے مل سکتا ہے سوائے خالق و مخلوق کے تعلق سے یا عبد و معبود کے تعلق سے یا غلام اور مالک کے تعلق سے۔

اس کے بعد کچھ فیصلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق کہ وہ ایک تو قیامت کی نشانی ہیں۔ اس قیامت کی جس کی یہ تکذیب کرتے ہیں یا ان کو اس کے آنے میں شک ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۴۳ : ۶۱) وَ لَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۴۳ : ۶۲) ’’اور ابن مریم دراصل قیامت کا علم ہے بس تم اس میں شک نہ کرو‘ اور میری بات مان لو۔ یہی سیدھا راستہ ہے‘ ایسا نہ ہو کہ شیطان تم کو اس سے روک دے‘ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے‘‘۔ قیامت سے قبل نزول عیسیٰ علیہ السلام کے موضوع پر کئی احادیث آئی ہیں۔ یہ قیامت سے قدرے پہلے زمین پر اتریں گے۔ اور اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ (۴۳ : ۶۱) ’’اور وہ قیامت کا علم ہے‘‘۔ یعنی ان کے آنے سے قرب قیامت کا علم ہو جائے گا اور دوسری قرات یہ ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَعَلَمٌ لِّلسَّاعَةِ (۴۳ : ۶۱) ’’اور وہ قیامت کی نشانی ہے‘‘۔ دونوں معنی صحیح ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ قریب ہے کہ تمہارے اندر ابن مریم بطور ایک منصف حاکم نازل ہوں‘ وہ صلیب کو توڑیں گے‘ خنزیر کو قتل کریں گے‘ لوگوں پر جزیہ عائد کریں گے اور مال تقسیم کریں گے یہاں تک کہ کوئی لینے والا نہ ہو گا‘ حالت یہ ہو گی کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا

سے بہتر ہو گا (متفق علیہ' ابو داؤد' مالک)۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' میری امت میں سے ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے گا اور قیامت تک غالب رہے گا یہاں تک کہ عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے' مسلمانوں کے امیران سے کہیں گے' آپ ہمیں نماز پڑھائیں' وہ کہیں گے' نہیں۔ تم میں سے بعض بعض کے امراء ہوں گے' اللہ نے اس امت کو یہ اعزاز بخشا ہے"۔ (مسلم)

یہ ایک غیب ہے' اور اس کی اطلاع ہمیں صادق و امین صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور اس طرف قرآن کریم نے بھی اشارہ کیا ہے' لہٰذا اس بارے میں کوئی انسان کوئی اور بات نہیں کر سکتا صرف وہی بات حق ہے جو ان دو سچے ذرائع سے آئی ہے اور ہمارے لیے سچے مصادر قیامت تک یہی ہیں۔

فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (۴۳: ۶۱) "پس تم اس میں شک نہ کرو اور میری بات مانو' یہی سیدھا راستہ ہے"۔ یہ لوگ قیامت میں شک کرتے تھے۔ قرآن کریم انہیں دعوت دیتا ہے کہ اس پر یقین کرو' حضور اکرمؐ کی زبانی ان کو دعوت یقین دی جاتی ہے کہ تم میری اطاعت کرو اور میں تمہیں سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ جو بالکل سیدھا اور منزل مقصود تک پہنچنے والا ہے۔ اور اس پر چلنے والے کبھی گمراہ نہیں ہوتے۔

یہ بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ صراط مستقیم سے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں اور راندۂ درگاہ ہوتے ہیں' وہ شیطان کے اثر سے ہوتے ہیں' لہٰذا شیطان کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ اس بات کے مستحق ہیں کہ آپ کی اطاعت کی جائے۔

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۴۳: ۶۲) "ایسا نہ ہو کہ شیطان تم کو اس سے روک دے' وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔ قرآن کریم اس مسلسل معرکہ کی طرف بار بار اشارہ کرتا ہے جو اولاد آدم اور شیطان کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے جاری ہے۔ یہ معرکہ جنت سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ اور اس شخص سے بڑا احمق اور غافل اور کون ہو سکتا ہے جسے بار بار متنبہ کیا جائے کہ گھات میں دشمن بیٹھا ہے اور اس نے تمہارا ارادہ کر رکھا ہے اور یہ شخص اس کے برعکس دشمن کا مطیع فرمان بن جائے۔

اسلام نے تو انسان کو حکم دیا کہ وہ اپنی پوری زندگی میں شیطان کے خلاف اس دوامی جنگ میں برسرپیکار رہے اور اس کے ساتھ اس قدر عظیم مال غنیمت کا وعدہ کیا ہے جو کسی بشر کے تصور سے باہر ہے۔ اسلام نے انسانی جنگ کا رخ اس معرکہ خیر و شر کی طرف پھیر دیا جس کی وجہ سے انسان صحیح انسان بنتا ہے اور جس کی وجہ سے تمام مخلوقات میں سے انسان کو ایک ممتاز مخلوق بنایا گیا ہے اور ایک خاص مزاج دیا گیا ہے اور یہاں انسان کا سب سے بڑا نصب العین یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے کھلے دشمن شیطان پر غالب آ جائے' یوں وہ شر' خباثت اور ہر قسم کی گندگی پر غالب آ جائے اور زمین میں خیر کی بنیادیں رکھ دے جن میں لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں گے اور پاکیزہ زندگی گزاریں گے۔

اس نصیحت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مزید معلومات کہ وہ کیا پیغام لے کر آئے تھے اور ان سے پہلے بنی اسرائیل کے باہم اختلافات کیا تھے اور بعد میں کیا ہوتا رہا۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيسَى بِالْبَيِّنَتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۴۳:۶۳) إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ (۴۳:۶۴) فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِن بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ (۴۳:۶۵) "اور جب عیسیٰ صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ اسی کی تم عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے مگر گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب کی"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کے سامنے واضح نشانیاں لے کر آئے تھے۔ یہ نشانیاں وہ معجزات بھی تھے جن کا صدور آپ کے ہاتھوں پر ہوا۔ اور وہ کلمات اور تقاریر بھی تھیں جو آپ نے لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے کیں۔ آپ نے اپنی قوم سے کہا:

قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ (۴۳:۶۳) "میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں" اور جسے حکمت دی گئی وہ گویا خیر کثیر کا مالک بن گیا۔ وہ لغزش اور بے راہ روی سے امن میں ہو گیا۔ تفریط اور تقصیر سے محفوظ ہو گیا۔ اور صحیح راستے پر اس کے قدم نہایت ہی توازن اور روشنی میں اٹھنے لگے اور آپ ان کے پاس اس لیے بھی خصوصی طور پر آئے تھے کہ اس وقت مذہبی گروہوں میں جو بہت بڑا تفرقہ پیدا ہو گیا تھا آپ اسے دور کریں۔ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں ان کے فقہاء نے بے حد اختلاف شروع کر دیا تھا۔ وہ فرقے فرقے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ آپ نے قوم کو اس طرف بلایا کہ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو اور آپ نے عقیدۂ توحید تو بڑی وضاحت، بلا ریب اور بغیر کسی التباس اور پیچیدگی کے بیان کیا۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ (۴۳:۶۴) "بے شک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے لہٰذا اسی کی بندگی کرو"۔ نہ آپ نے یہ دعویٰ کیا کہ آپ الٰہ ہیں اور نہ یہ دعویٰ کیا کہ آپ ابن اللہ ہیں اور آپ نے اپنے کلام میں کسی جگہ ماسوائے تعلق رب اور بندہ اور خالق و مخلوق، اللہ کے ساتھ کسی اور تعلق کا اشارہ تک نہیں کیا۔ صرف یہی کہا کہ میں رسول ہوں، صراط مستقیم دے کر بھیجا گیا ہوں، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، نہ کوئی پھسلن ہے اور نہ کج روی۔ لیکن جو لوگ حضرت عیسیٰ کے بعد آئے وہ بھی اسی طرح ٹکڑے اور پارٹیاں بن گئے جس طرح آپ سے پہلے کے لوگ ٹکڑے اور پارٹیاں تھے۔ یہ اختلافات انہوں نے محض ظلم کرتے ہوئے کیے، اختلافات کے لیے نہ کوئی جواز تھا اور نہ شبہ تھا۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ (۴۳ : ۶۵) ”پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب کی“۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ اس دور میں بنی اسرائیل رومیوں سے غلام تھے۔ ان کو انتظار تھا کہ نجات دہندہ آئے گا اور ہمیں چھڑائے گا لیکن جب وہ آیا تو انہوں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا اور اس کی دشمنی پر اتر آئے اور انہوں نے اسے سولی پر چڑھانے کی سعی کی۔

جب آپ تشریف لائے تو اس وقت بنی اسرائیل ٹکڑے ٹکڑے تھے، اہم فرقے چار تھے :

(۱) صدوقی فرقہ : یہ صدوق کی طرف منسوب تھے، وہ اور اس کے خاندان کے لوگ ہیکل سلیمانی کے کاہن تھے۔ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے زمانے سے وہ اس منصب پر تھے۔ شریعت کے مطابق ضروری تھا کہ ان کا نسب ہارون علیہ السلام تک پہنچے جو حضرت موسیٰ کے بھائی پیغمبر تھے کیونکہ ہارون علیہ السلام کی اولاد ہی ہیکل کی متولی تھی۔ یہ لوگ اپنے فرائض کے مطابق عبادات کی ظاہری صورت پر بہت زور دیتے تھے۔ اور کسی قسم کی بدعت کے سخت مخالف تھے جبکہ اپنی مخصی زندگی میں بہت عیاش تھے اور زندگی کے مزے لیتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ قیامت نہیں ہے۔

(۲) فریسیوں کا فرقہ : یہ صدوقیوں کے سخت خلاف تھے۔ ان کو اعتراض یہ تھا کہ یہ لوگ مذہبی رسومات اور عبادات کی ظاہری شکل پر بہت زور دیتے ہیں اور قیامت اور حساب و کتاب کے منکر ہیں۔ یہ نہایت ہی متقی اور صوفی قسم کے لوگ تھے۔ اگرچہ بعض کے اوپر علمی غرور چھایا ہوا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کا علمی غرور پسند نہ تھا۔ تیز آپ کو ان کی لفاظی بھی پسند نہ تھی۔

(۳) تیسرا فرقہ سامریوں کا تھا، یہ فرقہ یہودیوں اور اشوریوں پر مشتمل تھا۔ اور یہ عہد قدیم کی صرف پانچ کتابوں کو مانتا تھا۔ باقی کتب کو بعد کے اضافے سمجھتا تھا۔ یہ پانچ کتابیں موسوی کتب کے نام سے مشہور ہیں جبکہ دوسرے فرقے ساری کتب کو مانتے تھے۔

(۴) ان کو آسین یا اسینیین کہتے تھے۔ یہ لوگ بعض فلسفیانہ افکار سے متاثر تھے۔ اور یہ لوگ دوسرے فرقوں سے علیحدہ رہتے تھے۔ اور اپنے آپ کو نہایت سختی اور تقشف میں رکھتے تھے اور ان کی جماعت بھی تنظیم میں بہت سخت تھی۔

ان چار مشہور فرقوں کے علاوہ بھی بہت سے انفرادی فرقے تھے۔ غرض بنی اسرائیل کے اندر نظریات اور طرز عمل کا سخت اختلاف و انتشار تھا۔ جن پر رومی شہنشاہیت کا سخت دباؤ تھا۔ اور پوری قوم سخت ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ یہ منظر تھا جس میں ایک نجات دہندہ کی پیش گوئی کتابوں میں کی گئی تھی کہ وہ آئے گا اور ہمیں نجات دلائے گا۔ جب حضرت مسیح عقیدۂ توحید کے ساتھ بھیجے گئے اور انہوں نے اعلان کر دیا۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ (۴۳ : ۶۴) ”کہ اللہ میرا بھی رب ہے، اور تمہارا بھی رب ہے، لہٰذا اس کی عبادت کرو“۔ اور اس کے ساتھ انہوں نے ایسی شریعت پیش کی جس میں رواداری اور روحانی اصلاح پر اور عبادات کی ظاہری صورت کی بجائے عبادات کے روحانی پہلو پر زور دیا گیا تھا تو ان فقہاء اور فریسیوں نے آپ کا مقابلہ کیا کیونکہ یہ لوگ عبادات کی ظاہری شکلوں ہی پر زور دیتے تھے۔

ان لوگوں کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ کہا' ان میں سے آپ کے بعض اقوال نہایت ہی موثر ہیں "شاگٹیہ لوگ بڑے بڑے بھاری بوجھ باندھتے ہیں اور لوگوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کو اپنے کاندھوں پر اٹھائیں اور خود اپنی انگلی بھی آگے نہیں بڑھاتے کہ اس بوجھ کو جگہ سے ہلا دیں ۔ وہ جو کام بھی کرتے ہیں' اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ اسے دیکھیں ۔ اور اپنے کپڑوں کے دامن لمبے کرتے ہیں اور دعوتوں مین اول مقام پر بیٹھتے ہیں اور جلسوں میں پہلی جگہ پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں اور بازاروں میں پھر کر سلام وصول کرتے ہیں اور یہ پسند کرتے ہیں کہ انہیں پکارا جائے' ''سیدی سیدی'' کہہ کر جہاں بھی وہ جائیں"۔

اور فریسیوں اور فقیہوں سے کہتے ہیں ''اے اندھے قائدین! تم مچھر چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو' تم پیالے اور تھالی کے ظاہری حصے کو خوب صاف کرتے ہو لیکن ان کے اندر گندگی اور بدکاری ہوتی ہے' اے لکھنے والے مفتیان کرام اور دکھاوا کرنے والے فقہاء' تمہاری مثال یوں ہے جس طرح ایک چونا گچ کی سفید قبر' جس کا ظاہری حصہ خوبصورت اور ملمع شدہ ہے اور اندر بوسیدہ ہڈیاں ہیں''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان کلمات کو پڑھو اور خود اپنے دور کے علماء اور مفتیان کرام کو دیکھو' کیا یہی الفاظ ان پر صادق نہیں آتے' دین کی تحریف کرنے والے' رسومات کے پجاری' ظاہر پرست اور دکھاوا کرنے والے۔

اس کے بعد حضرت مسیح اپنے رب کے پاس چلے گئے ۔ اس طرح آپ کے پیروکاروں کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے ۔ یہ اس طرح فرقے فرقے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ۔ بعض نے خود ان کو الہ بنا دیا ۔ بعض نے اللہ کا بیٹا بنا لیا ۔ بعض نے ثالث ثلاثہ کہا اور وہ کلمہ توحید ان سے گم ہو گیا جس کی دعوت لے کر آپ اس لئے تشریف لائے تھے کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف لوٹ آئیں اور دین اللہ کے لیے خالص کر دیں۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ

(۴۳ : ۶۵) ''مگر گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک عذاب کے دن کی'' مشرکین عرب آئے اور انہوں نے حضور اکرمؐ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مجادلہ شروع کر دیا ۔ اس وجہ سے کہ پیروکاران مسیح نے آپ کے بعد گل کھلائے تھے اور آپ کے بارے میں بے شمار افسانے گھڑ لیے تھے۔

--- ٥٥٥ ---

جب ظالموں اور مشرکوں کے لیے ہلاکت کی خوشخبری دے دی گئی تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہونے والے ظالم احزاب کو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان احزاب کے غلط نظریات کی اساس پر مباحثہ اور مناظرہ کرنے والے ظالمین کو قیامت کے ایک منظر میں دکھایا جاتا ہے اور اس منظر میں ایک جھلک مومنین متقین کو بھی دکھائی جاتی ہے جو جنت کے گلستانوں میں نہایت ہی عزت سے ہوں گے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا

يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۶﴾ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۷﴾ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۖ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾

"کیا یہ لوگ اب بس اسی چیز کے منتظر ہیں کہ اچانک ان پر قیامت آ جائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو؟ وہ دن جب آئے گا تو متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس روز ان لوگوں سے جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور مطیع فرمان بن کر رہے تھے، کہا جائے گا کہ "اے میرے بندو، آج تمہارے لیے کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم لاحق ہو گا۔ داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں، تمہیں خوش کر دیا جائے گا"۔ ان کے آگے سونے کے تھال اور ساغر گردش کرائے جائیں گے اور ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز وہاں موجود ہو گی۔ ان سے کہا جائے گا "تم اب یہاں ہمیشہ رہو گے۔ تم اس جنت کے وارث اپنے ان اعمال کی وجہ سے ہوئے ہو جو تم دنیا میں کرتے رہے۔ تمہارے لیے یہاں بکثرت فواکہ موجود ہیں جنہیں تم کھاؤ گے"۔ رہے مجرمین، تو وہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے، کبھی ان کے عذاب میں کمی نہ ہو گی، اور وہ اس میں مایوس پڑے ہوں گے۔ ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ وہ پکاریں گے "اے مالک، تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے تو اچھا ہے"۔ وہ جواب دے گا "تم یوں ہی پڑے رہو گے"۔

یہ منظر یوں شروع ہوتا ہے کہ قیامت اچانک برپا ہو جاتی ہے۔ جب وہ اس سے غافل اور لاپرواہ تھے۔ ان کو توقع نہ تھی کہ اچانک قیامت آ جائے گی۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۶۶:۴۳) "کیا یہ لوگ بس اسی چیز کے منتظر ہیں کہ اچانک ان پر قیامت آ جائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو"۔

اور جب یہ آ جاتی ہے تو دنیا کے تمام حالات کو بدل کر رکھ دیتی ہے، دنیا کی تمام باتیں بدل جائیں گی اور یہ بہت بڑا حادثہ ہو گا۔

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُہُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ (۴۳ : ۶۷) ”متقین کو چھوڑ کر باقی سب دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے“۔ ان کی دوستی کے سرچشمے ہی سے ان کی دشمنی پھوٹے گی۔ اس دنیا میں وہ شر پر مجتمع تھے اور وہ گمراہی میں ایک دوسرے کے مشیر تھے۔ آج وہ ایک دوسرے پر ملامت کرنے والے ہوں گے اور اس شر اور گمراہی کی ذمہ داری وہ ایک دوسرے پر ڈال رہے ہوں گے۔ کبھی تو وہ یاران ہمدم تھے اور آج وہ ایک دوسرے سے الجھنے والے مخالف۔ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ (۴۳ : ۶۷) ”ماسوائے متقین کے“۔ ان کی دوستی باقی ہوگی، کیونکہ وہ دوستی ہدایت پر تھی، باہم خیرخواہی پر تھی، اور انجام کار ان کو نجات ملی۔

جہاں دوست باہم جھگڑیں گے اور الجھیں گے پوری کائنات سے آواز ہوگی اور یہ اللہ کریم کی جانب سے ہوگی اور متقین کے لیے ہوگی:

یٰعِبَادِ لَاخَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۴۳ : ۶۸) اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ (۴۳ : ۶۹) اُدْخُلُوا الْجَنَّۃَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ تُحْبَرُوْنَ

(۴۳ : ۷۰) ”اس روز ان لوگوں سے جو ہماری آیات پر ایمان لائے تھے اور مطیع فرمان بن کر رہے تھے، کہا جائے گا کہ ”اے میرے بندو، آج تمہارے لیے کوئی خوف نہیں اور نہ تمہیں کوئی غم لاحق ہو گا۔ داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں، تمہیں خوش کر دیا جائے گا“۔ یعنی تم اس قدر خوش ہو گے کہ سرور اور خوشی تمہارے پہلوؤں اور چہروں کو ڈھانپ لے گی یوں نظر آئے گا کہ تم پر ایک خوبصورت چادر بچھی ہوئی ہے۔

اب ہمارا تخیل کچھ اور عجیب چیز دیکھتا ہے۔ سونے اور چاندی کے تھال اور پیالے ان پر پھرائے جا رہے ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جنت میں ان کے لیے وہ کچھ ہے جنہیں ان کا نفس چاہتا ہے اور نفوس جو کچھ چاہتے ہیں ان کے علاوہ آنکھیں جو کچھ چاہتی ہیں، وہ بھی ہے اور یہ سب ضیافتیں ان کی کمال درجے کی عزت اور تکریم کے لیے ہوں گی۔

یُطَافُ عَلَیْہِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَہَبٍ وَّ اَکْوَابٍ وَفِیْہَا مَا تَشْتَہِیْہِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْیُنُ (۴۳ : ۷۱) ”ان کے آگے سونے کے تھال اور ساغر گردش کرائے جائیں گے اور ہر من بھاتی اور نگاہوں کو لذت دینے والی چیز وہاں موجود ہوگی“۔

اور ان نعمتوں کے علاوہ، وہ چیز ہوگی جو ان سے بھی بڑی اور افضل ہے۔ یہ کہ اللہ خود مخاطب ہو کر ان کی عزت افزائی کرے گا اور یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہو گا۔

وَ اَنْتُمْ فِیْہَا خٰلِدُوْنَ (۴۳ : ۷۱) وَتِلْکَ الْجَنَّۃُ الَّتِیْٓ اُوْرِثْتُمُوْہَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۳ : ۷۲) لَکُمْ فِیْہَا فَاکِہَۃٌ کَثِیْرَۃٌ مِّنْہَا تَاْکُلُوْنَ (۴۳ : ۷۳) ”تم اب یہاں ہمیشہ

رہو گے ' تم اس جنت کے وارث اپنے ان اعمال کی وجہ سے ہوئے ہو' جو تم دنیا میں کرتے رہے ۔ تمہارے لیے یہاں بکثرت فواکہ موجود ہیں جنہیں تم کھاؤ گے "۔

اور ان مجرمین یاران دنیا کا کیا حال ہے جنہیں ہم ابھی لڑتے جھگڑتے چھوڑ آئے ہیں :

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ (۴۳ : ۷۴) "رہے مجرمین تو وہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے "۔ جہنم کا عذاب ایک دائمی عذاب ہے اور یہ نہایت ہی شدید اور اعصاب شکن عذاب ہوتا ہے ' مسلسل ہوتا ہے اور ایک منٹ کے لیے بھی ٹھنڈا نہیں ہوتا ۔ اور اس میں ان کے لیے امید کی کوئی چنگاری نہ ہو گی اور نہ دور دور رہائی کا کوئی نشان ہو گا ۔ اور یہ بدبخت اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔

لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ (۴۳ : ۷۵) "کبھی ان کے عذاب میں کمی نہ ہو گی اور وہ اس میں مایوس پڑے ہوں گے "۔ یہ کام انھوں نے خود اپنے خلاف کیا اور اپنے آپ کو اس ہلاکت خیز گھاٹ پر اتارا ۔ یہ خود ظالم ہیں اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ' مظلوم نہیں ہیں ۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ (۴۳ : ۷۶) "ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے "۔ اب اس منظر میں دور سے ایک چیخ اٹھتی ہے ۔ ایک ایسی دردناک پکار جس میں مایوسی' تنگ دلی اور کربناکی کی تمام علامات موجود ہیں ۔

وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ (۴۳ : ۷۷) "اور پکاریں گے اے مالک ' تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے تو اچھا ہے "۔ یہ چیخ نہایت دور سے جہنم کی تہوں سے اٹھتی ہے ۔ جس کے دروازے بھی اب بند ہو چکے ہیں ۔ یہ انہی مجرمین اور ظالمین کی آواز ہے ۔ اب ان کی یہ پکار نجات کے لیے نہیں ' نہ کسی امداد کے لیے ہے ' یہ تو اب جہنم میں مایوس پڑے ہوئے ہیں ' اب ان کی تجویز یہ ہے کہ اللہ ہمیں نیست و نابود کر دے ' فوراً ختم کر دے تاکہ ہم آرام کر لیں ۔ اور بہت سی آرزوئیں آرزوئیں ہی رہتی ہیں ۔ لیکن اس پکار میں غضب کی تنگی اور بے تابی اور کربناکی ہے ۔ اس فریاد و فغاں کے پیچھے ہمیں ایسے لوگ نظر آتے ہیں جن کی حالت عذاب نے خراب کر دی ہے ۔ ہوش ٹھکانے نہیں رہے ' درد کی حد ہو گئی اور یہ ان کی طاقت برداشت سے باہر ہو گیا ہے ۔ اس لیے آخر میں مجبور ہو کر یہ چیخ بے ساختہ نکل گئی ۔

يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ (۴۳ : ۷۷) "اے مالک ' تیرا رب ہمارا کام تمام ہی کر دے تو اچھا ہے "۔

لیکن اس پکار کا جواب نہایت ہی مایوس کن اور توہین آمیز ہے اور بغیر کسی لحاظ کے اور بغیر اس کے کہ ان کی کربناک پکار کو کوئی اہمیت دی گئی ہو ۔

قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ (۴۳ : ۷۷) "وہ جواب دے گا' تم یونہی پڑے رہو گے "۔ اب رہائی کی کوئی امید نہیں ہے ۔ نہ موت ہے اور نہ تم نیست و نابود کیے جاؤ گے ۔ تم نے اب یہاں ہی ٹھہرنا ہے ۔

اب سچائی کو ناپسند کرنے والوں اور منہ موڑنے والوں اور اس انجام تک پہنچنے والوں کو اس کربناک منظر کے متصلاً بعد خطاب کیا جاتا ہے اور نہایت ہی سنجیدہ اور تعجب خیز انداز میں کہا جاتا ہے اور اس حیرت انگیز فضا میں ان کو ڈرایا جاتا ہے ۔

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَ رُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾

”ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے تھے مگر تم میں سے اکثر کو حق ہی ناگوار تھا۔ کیا ان لوگوں نے کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟ اچھا تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کیے لیتے ہیں ۔ کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں“۔

یہ ہے وہ اصل بات ۔ اصل حق کی کراہیت اور ناگواری اس بات سے مانع تھی کہ وہ اسے قبول کریں ۔ یہ بات مانع نہیں تھی کہ وہ سچائی کا ادراک نہ کر سکے تھے ۔ رسول اللہؐ کی سچائی میں ان کو کوئی شک ہی نہ تھا ۔ انہوں نے کبھی آپ کی طرف جھوٹ منسوب ہوتے نہ دیکھا تھا ۔ جب ایک شخص لوگوں کے ساتھ جھوٹ کا معاملہ نہیں کرتا تو وہ اپنے اللہ پر جھوٹ کس طرح باندھ سکتا ہے ۔ اور جھوٹا دعوائے نبوت کیسے کر سکتا ہے ۔

دنیا میں جو لوگ بھی حق کے خلاف جنگ کرتے ہیں ' وہ حق سے لاعلم نہیں ہوتے ' اصل بات یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کو پسند نہیں کرتے ۔ کیونکہ حق ان کی خواہشات نفسانیہ کے خلاف ہوتا ہے ' ان کی شہوات سے متصادم ہوتا ہے اور ایسے لوگ اخلاقی لحاظ سے اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ اپنی خواہشات اور اپنی حاجتوں کو دبا نہیں سکتے ۔ اس کے مقابلے میں وہ سچائی پر وار کرنے میں بڑے جری ہوتے ہیں اور سچائی کے داعیوں کے ایسے لوگ جانی دشمن ہوتے ہیں ' اپنی خواہشات اور چاہتوں کے مقابلے میں ان کی یہ کمزور سچائی اور سچائی کے حاملین کے خلاف قوت کے استعمال کا ذریعہ بن جاتی ہے ۔ تو پھر حقیقی قوت کا مالک اور جبار و قہار بھی ان کو دھمکی دیتا ہے ۔ اور فرماتا ہے کہ میں ان کی تمام خفیہ اور ظاہری سازشوں سے باخبر ہوں ۔

اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ (۴۳ : ۷۹) اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ بَلٰى وَ رُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ (۴۳ : ۸۰) ”کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں ہیں؟ ہم سب کچھ سن رہے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہی لکھ رہے ہیں“۔ حق کے مقابلے میں باطل پر ان کا اصرار ہے تو اللہ کو بھی اصرار ہے کہ ان کے باطل کے مقابلے میں حق کا بول بالا کر کے رہے گا ۔ ان کی تدابیر اور ان کی سازشوں کے مقابلے میں اللہ کا علم کام کر رہا ہے جو راز کو بھی جانتا ہے اور

سرگوشیوں سے بھی باخبر ہے۔ اللہ خالق اور عزیز و علیم ہے اور اس کے مقابلے میں آنے والے ضعیف انسان ہیں' اس لیے یہ کچھ نہ کر سکیں گے۔

--- ○○○---

اس خوفناک ڈراوے کو چھوڑ کر رسول کریمؐ کو ایک ایسی بات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو آخری بات ہے کہ یہ ان سے کہہ دیں اور پھر ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں تاکہ اس انجام تک پہنچ جائیں جس کی تصویر تم نے ابھی دیکھی ہے۔

قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَأَنَا أَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿٨١﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿٨٣﴾

"ان سے کہو 'اگر واقعی رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے عبادت کرنے والا میں ہوتا"۔ پاک ہے آسمانوں اور زمین کا فرماں روا' عرش کا مالک' ان ساری باتوں سے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اچھا' انہیں اپنے باطل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل میں منہمک رہنے دو' یہاں تک کہ یہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جس کا انہیں خوف دلایا جارہا ہے"۔

یہ لوگ فرشتوں کی عبادت اس تصور پر کرتے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اگر اللہ کی اولاد ہوتی تو اس کے ساتھ جان پہچان اور اس کی بندگی کا حق دار سب سے پہلے نبی ہوتا۔ کیونکہ انسانوں میں سے خدا کے قریب نبی اور رسول ہی ہوتے ہیں۔ اور پھر اللہ کی بندگی اور اطاعت میں بھی وہ سب سے آگے ہوتے ہیں اور اگر کوئی اولاد ہوتی تو اس کی عزت بھی سب سے پہلے نبی کرتے۔ لہٰذا ان لوگوں کا یہ تصور اور زعم ہی محض افسانہ ہے۔ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اس قسم کی صفات کی اللہ کی طرف نسبت کرنا اس کے شایان شان نہیں ہے' وہ پاک ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۴۳: ۸۲) "پاک ہے آسمان اور زمین کا فرماں روا' عرش عظیم کا مالک ان ساری باتوں سے جو یہ لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں"۔

جب انسان ان آسمانوں اور زمین پر غور کرتا ہے' ان کے نظام پر غور کرتا ہے' ان کی رفتار اور آثار کے اندر غایت درجہ ہم آہنگی دیکھتا ہے' اور اس نظام کے پیچھے جب بلند اور عظیم قوت کی عظمت کو دیکھتا ہے اور پھر اس پورے نظام پر اس کے قبضے اور کنٹرول کو دیکھتا ہے' جس کی طرف رب العرش کا لفظ اشارہ کرتا ہے تو انسان کے ذہن سے اس قسم کے افسانوی خیالات و خرافات خود بخود محو ہو جاتے ہیں۔ اور یہ غور کرنے والا انسان خود اپنی فطرت کے ذریعہ یہ معلوم کر لیتا ہے کہ ایسی ذات بے مثال ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں ہو سکتی جس طرح مخلوق کی اولاد ہوتی ہے اور نسلیں چلتی ہیں۔ یہ اللہ کے لائق نہیں ہے۔ وہ اس سے پاک ہے۔ اس قسم کے عقائد اس سوچ کے بعد خود بخود لغو نظر آتے ہیں۔ یہ فضول کلام اور ناجائز جسارت ہے۔ اس لیے کلام کرنا ہی فضول ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنے حال

پر چھوڑ دیا جائے ۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّى يُلْقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ (۸۳:۴۳)

"انہیں اپنے باطل خیالات میں غرق اور اپنے کھیل میں منہمک رہنے دو یہاں تک کہ یہ اپنا وہ دن دیکھ لیں جن کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے"۔ اور وہ دن کیسا ہو گا' اس کی ایک تصویر تو ابھی انہوں نے دیکھ لی ہے ۔

--- ooo ---

ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کے بعد اللہ کی تعریف اور حمد میں کچھ باتیں کی جاتی ہیں' یہ بتانے کے لیے کہ اس عظیم کائنات کا رب ایسا ہوتا ہے ۔ یہ ہیں اس کی صفات :

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ﴿٨٤﴾ وَتَبَارَكَ الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَعِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٥﴾ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾

"وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا' اور وہی حکیم و علیم ہے ۔ بہت بالا و برتر ہے جس کے قبضے میں زمین اور آسمانوں اور ہر اس چیز کی بادشاہی ہے جو زمین و آسمان کے درمیان پائی جاتی ہے' اور وہی قیامت کی گھڑی کا علم رکھتا ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو ۔ اس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ کسی شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے' الا یہ کہ کوئی علم کی بناء پر حق کی شہادت دے"۔

یہ ہے زمین و آسمان میں صرف ایک ہی الوہیت کا اعلان' جو وحدہ لا شریک ہے' وہ جو کام بھی کرتا ہے حکمت کی بنا پر کرتا ہے اور اپنے بے قید علم کے مطابق کرتا ہے ۔ پھر یہاں لفظ تبارک کا استعمال ہوا ہے یعنی برکتوں والا ہے اور اس کے بارے میں یہ لوگ جو تصورات رکھتے ہیں' ان سے بہت بلند ہے' وہ زمین و آسمانوں اور ان کے اندر تمام مخلوقات کا رب اور مالک ہے ۔ وہی قیامت کے دن کا جاننے والا ہے اور اس کی طرف لوٹنا ہے ۔ اس دن ان الہوں میں سے کوئی بھی نہ ہو گا ۔ سب غائب ہوں گے جن کو یہ پکارتے ہیں ۔ کیونکہ یہ لوگ کہتے تھے ہمارے یہ رب دراصل ہمارے سفارشی ہیں اور وہاں تو سفارش اس کی چلے گی جس کو پیشگی اجازت دے دی جائے گی' اور ظاہر ہے جن کو پیشگی اجازت ملے گی وہ معاندین حق اور دشمنان اسلام کی سفارش کرنے سے رہے ۔

اب یہاں ان کے سامنے وہ بات رکھی جاتی ہے جس میں وہ نہ شک کرتے تھے اور نہ جھگڑتے تھے ۔ یہ کہ اللہ ہی ہمارا خالق ہے ۔ سوال یہ کیا جاتا ہے جب اللہ خالق ہے تو پھر کیوں دوسروں کو اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہو ۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٨٧﴾

"اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ اللہ نے ۔ پھر کہاں سے یہ دھوکا کھا رہے ہیں"۔ یعنی جس سچائی کو ان کی فطرت تسلیم کرتی ہے اس سے وہ کیوں منہ موڑتے ہیں اور ایک طرف ہو کر نکل جاتے ہیں۔

سورت کے آخر میں حضور اکرم ؐ کی فریاد کو لایا جاتا ہے جو آپ کرتے تھے کہ میری قوم کفر' عناد اور ایمان نہ لانے پر تلی ہوئی ہے ۔ یہاں اس فریاد کو لا کر اس کی قسم اٹھائی جاتی ہے ۔

وَقِيلِهِ يَٰرَبِّ إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَٰمٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٨٩﴾

۲۲ ع ۱۳

"قسم ہے رسول ؐ کے اس قول کی کہ اے رب' یہ وہ لوگ ہیں جو مان کر نہیں دیتے' اچھا' اے نبی ؐ ان سے درگزر کرو اور کہہ دو کہ سلام ہے تمہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

اس انداز تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریاد دوررس ہے' اس کے گہرے نتائج نکلنے والے ہیں' اسے سن لیا گیا' اور عالم بالا اس کے نتیجے میں کچھ عظیم اقدامات کر رہا ہے ۔ لہٰذا اے نبی ؐ آپ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں اور ان کی کارروائیوں اور ریشہ دوانیوں کی کوئی پرواہ نہ کریں' مطمئن رہیں' نہایت امن سلامتی اور شرافت کے ساتھ اپنی راہ پر چلتے رہیں ۔ اس میں بھی درپردہ ایمان نہ لانے والوں کو سخت دھمکی دی جا رہی ہے ۔ اس دن کے سلسلے میں جب سب چھپے ظاہر ہوں گے ۔ "اے نبی ؐ ان سے درگزر کرو اور کہہ دو سلام ہے تمہیں' عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا"۔

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ------ ۲۵

سورۃ الدخان ۔ ۴۴

آیات ۱--- تا--- ۵۹

سورۃ الدخان ایک نظر میں

اس سورت کی آیات چھوٹی ہیں اور آیات کے مقفی اور مسجع ردیف اور فواصل ایک دوسرے کے قریب ہیں' ان میں زور دار قسم کی تصویر کشی ہے جس کے تمام رنگ نہایت اشاراتی ہیں ـ یوں نظر آتا ہے کہ گم گشتہ راہ انسانیت کے دل و دماغ کی تاروں پر زور دار چوٹیں لگائی جا رہی ہیں ـ

پوری سورت میں سیاق کلام متحد اور مربوط ہے ـ جس کا محور اور عمود ایک ہے ـ تمام تاریں اسی ایک عمود سے ملتی ہیں' خواہ قصص ہوں' قیامت کے مناظر ہوں یا تاریخ کی ہلاک کردہ اقوام کی بربادیوں کے مناظر ہوں یا اس وسیع و عریض کائنات کے مناظر ہوں ـ توحید' رسالت اور قیامت پر براہ راست بات چیت ہے' یہ سب چیزیں انسان کے مردہ دلوں کو زندہ کرنے والی ہیں اور اس کے اندر زندہ اور متحرک ایمان پیدا کرنے والی ہیں اور پورے قرآن کا مقصد یہ ہے کہ مردہ دلوں کے اندر زندہ اور متحرک ایمان پیدا کیا جائے ـ

آغاز یوں ہوتا ہے کہ یہ قرآن ایک مبارک رات میں نازل ہوا جس کے اندر اللہ بڑے بڑے فیصلے فرماتا ہے اور اللہ کا بندوں پر بڑا کرم تھا کہ اس نے یہ کتاب نازل فرمائی ـ اور ان کو قبل از وقت خبردار کر دیا ـ اور یہ نازل کرنے اور کرم کرنے والا کون ہے؟ آسمانوں کا رب اور زمین کا رب ـ اور ان کے درمیان کا بھی رب ـ جو اولین اور آخرین کا رب ہے ـ اور جو زندہ کرنے والا اور مارنے والا رب ہے ـ

روئے سخن یکلخت پھر جاتا ہے ـ یہ ایک نہایت ہی دل لگتا انداز ہے ـ

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ (۴۴ : ۹) "بلکہ یہ اپنے شک میں پڑے کھیل رہے ہیں" ـ اور اس شک پر بھی ان کو خوفناک دھمکی دی جاتی ہے ـ

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ (۴۴ : ۱۰) يَّغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۴۴ : ۱۱) "اچھا انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا' یہ ہے دردناک سزا" ـ اب یہ لوگ اس عذاب کے دور کرنے کی دعائیں کرتے ہیں لیکن یہ تو ایسا دن ہے کہ جب آتا ہے تو پھر ٹلتا نہیں ـ ان سے کہا جاتا ہے کہ تصویر تو تم نے دیکھ لی ہے یہ عذاب گو آیا نہیں ہے تو کیا تم اس فرصت کو غنیمت نہیں سمجھتے ـ بجائے اس کے کہ یہ رب کے سامنے پہنچ جائیں ـ کیوں نہ ابھی سے تیاری شروع کر دیتے ـ

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (۴۴ : ۱۶) "جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں

گے وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے"۔

یہ ایک شدید ضرب ہے سوئے ہوئے دلوں پر کہ آ رہا ہے وہ دن جس کی پکڑ سخت ہو گی' شدید عذاب ہو گا اور اللہ کا انتقام ہو گا۔ اس کے بعد فرعون اور اس کے سرداروں کی ہلاکت کا منظر جب ان کے پاس ایک رسول کریم آیا اور اس نے ان کو پکارا۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ (۴۴:۱۸) وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ (۴۴:۱۹) "اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو۔ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو"۔ انہوں نے سننے سے انکار کر دیا اور یہ شریف رسول ان سے مایوس ہو گیا۔ اس تکبر' غرور کے بعد پھر ان کی ہلاکت نہایت ہی توہین آمیز انداز سے ہوئی۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ (۴۴:۲۵) وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِیْمٍ (۴۴:۲۶) وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِیْهَا فٰكِهِیْنَ (۴۴:۲۷) كَذٰلِكَ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ (۴۴:۲۸) فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ (۴۴:۲۹)

"کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے' کتنے ہی عیش کے سروسامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے' ان کے پیچھے دھرے رہ گئے' یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا' نہ زمین' اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی"۔

جب یہ منظر عروج پر تھا تو انہیں متوجہ کیا گیا کہ پھر بھی تم لوگ آخرت کی تکذیب کرتے ہو' اور تم ایسی باتیں کرتے ہو۔

اِنْ هِیَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِیْنَ (۴۴:۳۵) فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۴۴:۳۶) "ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں۔ اگر تم سچے ہو تو اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو"۔ تاکہ قوم تبع کا انجام انہیں بتایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ تم ان سے کچھ اچھے لوگ نہیں ہو کہ اس برے انجام سے بچ کر نکل جاؤ۔

بعث بعد الموت کا ربط زمین و آسمان کی تخلیق کی اسکیم سے ہے۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ (۴۴:۳۸) مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۴:۳۹) "یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم

نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دیں ۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ مانتے نہیں ہیں ۔

اس کے بعد ان کو یوم الفصل کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ مِیْقَاتُھُمْ اَجْمَعِیْنَ (۴۴ : ۴۰) "یہ سب کے لیے طے شدہ ہے"۔ اور پھر اس کے بعد شجرۂ زقوم کی بابت اور بدکاروں کے رگیدنے کی بابت اور پھر ان کو رگید کر جہنم میں پھینکنے اور اوپر سے گرم پانی انڈیلنے کی بابت ایک خوفناک منظر ہے اور اس میں کفار کو خوب ذلیل و خوار کیا جاتا ہے ۔

ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ (۴۴ : ۴۹) اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ (۴۴ : ۵۰) "چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو، یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے"۔

پھر اس منظر کے ساتھ ہی ایک منظر آتا ہے جس کے اندر اللہ کی نعمتیں اسی طرح گہری ہیں جس طرح پچھلے منظر کا عذاب گہرا تھا اور یہ اس پوری سورت کی فضا کو جاری رکھتے ہوئے، جس میں نہایت ہی موثر مناظر دیئے گئے ہیں ۔

جس طرح سورت کا آغاز قرآن مجید کے موضوع سے ہوا ۔ اس طرح انجام میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے ۔

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ (۴۴ : ۵۸) "اے نبی، ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں سہل بنا دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں"۔

غرض یہ ایک ایسی سورت ہے جو انسانی دل و دماغ پر آغاز سے اختتام تک حملہ آور ہے ۔ اس کا اثر تیز اور مسلسل ہے جس طرح یہ تدبر کی تاروں کو چھیڑتی ہے ۔ نغمہ اور زمزمہ دیتی ہے ۔ اسی طرح اس کے مناظر، تصاویر اور ان کے مختلف رنگ، تیز رنگ اور مسلسل نظارے انسان کو اس جہاں کی سیر کراتے ہیں اور اسے اللہ کے نشانات ارض و سما میں دکھاتے ہیں ۔ یعنی جنت اور جہنم کے مناظر، ماضی اور حال کے مناظر علاوہ ازیں موت و حیات کے مناظر اور اس کائنات میں موثر قوانین فطرت بھی سب کے سب موجود ہیں اس لئے اپنے اختصار کے ساتھ یہ سورت بھی اس جہاں کا ایک مطالعاتی سفر ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۳۴ تشریح آیات

۱--- تا--- ۵۹

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۳﴾ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴿۴﴾ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۵﴾ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶﴾ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۷﴾ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

”ح۔م۔' قسم ہے اس کتاب مبین کی کہ ہم نے اسے ایک بڑی خیرو برکت والی رات میں نازل کیا ہے 'کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے۔ ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے 'تیرے رب کی رحمت کے طور پر' یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے 'آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اس چیز کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہے 'اگر تم لوگ واقعی یقین رکھنے والے ہو۔ کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے 'وہی زندگی عطا کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ تمہارا رب اور تمہارے ان اسلاف کا رب جو پہلے گزر چکے ہیں“۔

آغاز دو حروف سے ہوتا ہے حا۔ میم۔ اور دونوں کی قسم اٹھائی جاتی ہے اور ... مبین کی بھی قسم اٹھائی جاتی ہے جو ایسے ہی حروف تہجی سے مرکب ہے۔ ان کے بارے میں سورتوں کے آغاز میں ہم بارہا بات کر چکے ہیں۔ پھر ان حروف

کی بھی اسی طرح قسم اٹھائی گئی جس طرح کتاب مبین کی قسم اٹھائی گئی ۔ کتاب مبین کی اہمیت مسلم مگر ان حروف کی اہمیت کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر حرف بھی ایک معجزہ اور نشانی ہے اور ہر حرف انسان کی زبان کی ساخت کی نشانی ہے اور پھر کس انداز سے زبان اپنے مخرج سے اس حرف و صوت کو نکالتی ہے' پھر ان حروف کے مخارج کی ترتیب پھر ہر حرف کے نام اور اس کی آواز کے درمیان ایک رمز و اشارہ اور ان حروف اور کلمات کے ذریعہ انسان عظیم حقائق تک پہنچتا ہے ۔ اور علوم کو مرتب کرتا ہے ۔ یہ اس قدر عظیم کام ہے کہ اگر ہم اس پر سنجیدگی سے غور کریں اور اپنی عادت اور مانوسیت کو ایک طرف پھینک دیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ ایک حرف کس قدر عظیم چیز ہے اس لیے ان کی قسم اٹھائی گئی ۔ وہ چیز کیا ہے جس کے لئے یہ قسم اٹھائی گئی ہے' وہ ہے وہ عظیم حادثہ جو ایک مبارک رات میں واقع ہوا یعنی نزول قرآن

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ (٤٤ : ٣) فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ (٤٤ : ٤) اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ (٤٤ : ٥) رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (٤٤ : ٦) "ہم نے اسے ایک بڑی خیر و برکت والی رات میں نازل کیا ہے' کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے ۔ یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے ۔ ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے' تیرے رب کی رحمت کے طور پر' یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے" ۔

اور مبارک رات جس میں قرآن نازل ہوا' وہ رات ہے جس میں قرآن کریم کا نزول شروع ہوا اور یہ رمضان المبارک کی راتوں میں سے ایک رات ہے' جس کے بارے میں تصریح ہے ۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ "رمضان المبارک کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن مجید نازل ہوا" ۔ قرآن مجید سب کا سب تو نہ اس رات کو نازل ہوا ہے اور نہ سب کا سب رمضان المبارک میں نازل ہوا ہے لیکن اس زمین پر اس کے آنے کا آغاز رمضان المبارک میں ہوا اور پھر اس مبارک رات میں ہوا ۔ لیلۃ القدر یا لیلہ مبارکہ کے بارے میں یہی کافی ہے ۔ واللہ اعلم!

یہ رات فی الواقع مبارک ہے جس میں انسانیت کے لیے رحمت خداوندی کا یہ عظیم دروازہ کھلا اور جہاں اسلامی نظام زندگی انسانوں کی زندگی میں جاگزیں ہونا شروع ہوا جس کے اندر انسان روح فطرت سے شناسا ہوا' جس کی نہایت ہی خوبصورت ترجمانی قرآن مجید میں کی گئی ہے ۔ فطرت انسانی اس نظام کے لیے لبیک کہتی ہے اور خوشی خوشی اسے قبول کرتی ہے اور یوں دوامی فطرت انسانی کے مطابق ایک ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے جو فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق اور اس کائنات کے بھی عین مطابق ہوتا ہے جس میں انسان رہ رہا ہے ۔ یہ نظام اس قدر پاک و صاف اور بلا تکلف اور بغیر کسی تکلیف کے قائم ہوتا ہے اور اس نظام کے زیر سایہ انسان رہتا تو زمین پر ہے لیکن وہ ہوتا آسمانوں پر ہے ۔

صحابہ کرامؓ اور پہلے انسان جن پر یہ قرآن نازل ہوا' وہ اسی آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ایک عرصہ تک اللہ کے ساتھ مربوط اور موصول زندگی گزارتے رہے ۔ اللہ تعالیٰ ان کو فی الفور بتاتا تھا کہ تمہارے دلوں میں یہ یہ تصورات آتے

ہیں ' اور یہ کہ میں دیکھ رہا ہوں اور ان کو بھی یقین تھا کہ اللہ دیکھ رہا ہے ۔ اور اللہ ہمارا نگران ہے ' ہمارے دل کے ہر میلان اور ہر وسوسے اور پھر ہمارے جسم کی ہر حرکت کو وہ جانتا ہے ۔ یہ لوگ اپنے معاملات میں سب سے پہلے اسی کے ہاں پناہ لیتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ اللہ قریب بھی ہے اور سننے والا بھی ہے اور دعاؤں کو قبول کرنے والا بھی ہے ۔

یہ برگزیدہ گروہ چلا گیا اور اس کے بعد قرآن کریم ایک کھلی کتاب کی حیثیت سے رہ گیا' جو انسانوں کے دل کے ساتھ مربوط تھا ۔ یہ انسان پر اس طرح اثر کرتا رہا جو کسی جادوگر کے لیے بھی ممکن نہ تھا ۔ لیکن یہ اثر ان لوگوں پر ہوتا جو اس قرآن کو پڑھ کر اس لیے اپنے دل کھولتے ۔ تاہم انسان کے قلب و نظر بعض اوقات یوں بدل جاتے ہیں کہ یہ تغیر و انقلاب بعض اوقات افسانہ نظر آتے ۔ انسان ان پر یقین ہی نہیں کر سکتا ۔

یہ قرآن بطور ایک نظام زندگی باقی رہا ۔ اس کا نظام کامل ' واضح اور نہایت ہی پاکیزہ ''انسانیت'' دینے والا تھا ۔ اور قرآنی نظام زندگی جہاں بھی قائم رہا' جس معاشرے میں رہا' جس زمانے میں رہا ایک مثالی نظام رہا ۔ جہاں قرآنی نظام زندگی قائم ہوا اور جس زمانے میں قائم ہوا' اس الہٰی نظام کی روشنی میں ایک ممتاز انسانی زندگی سامنے آئی اور اس کے اندر انسانی زندگی کے تمام خصائص موجود رہے ۔ اور یہ خصوصیت صرف اسلامی نظام زندگی کی ہے کہ جہاں یہ قائم ہوتا ہے وہاں ایسی اعلیٰ معیاری زندگی اور معاشرہ وجود میں آتا ہے اور یہ ایسا معاشرہ ہوتا ہے جس کے قیام میں کسی انسانی جدوجہد کا دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ اس نظام کی برکت اور قدرت الہیہ سے وجود میں آتا ہے ۔

انسان جو ادارے بناتے ہیں وہ انہی جیسے انسانوں کے لیے مفید ہو سکتے ہیں ۔ اور مخصوص زمان و مکان میں چل سکتے ہیں لیکن اللہ نے جو ادارے اور قوانین بنائے ہیں ان کے اندر صفت دوام رکھ دی ہے ۔ ان کے اندر انتہائی حسن و کمال رکھ دیا گیا ہے اور ایسی صلاحیت رکھ دی ہے جو ہر زمان و مکان کی قید سے وراء ہے جن میں اصل حقیقت اپنی جگہ موجود ہوتی ہے ۔ اور ہر زمان و مکان کے اعتبار سے اس کی عجیب صورت پذیری ہوتی رہتی ہے ۔

اس قرآن کو اللہ نے اس مخصوص رات میں اتارا تاکہ لوگوں کو متنبہ کیا جائے ۔

اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ (٤٤ : ٣) ''کیونکہ ہم لوگوں کو متنبہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے''۔ اس لئے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ یہ انسان بڑا غافل ہے اور تنبیہہ کا محتاج ہے ۔

یہ رات جس میں قرآن کریم نازل ہوا' اس نزول قرآن کی وجہ سے فیصلے والی اور حق و باطل کے درمیان فرق کی جانے والی رات قرار پائی :

فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ (٤٤ : ٤) ''یہ وہ رات تھی جس میں ہر معاملے کا حکیمانہ فیصلہ ہمارے حکم سے صادر کیا جاتا ہے''۔ اس رات میں اس قرآن کے ذریعہ ہر معاملے کا فیصلہ کر دیا گیا ۔ ہر تنازعے کا فیصلہ ۔ اس رات کو حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کر دیا گیا' باطل مٹا دیا گیا' حدود مقرر کر دیئے گئے ۔ اور اس زمین پر انسان کے سفر کے لیے نشانات طے کر دیئے گئے اور یہ امور قیامت تک کے لیے طے ہو گئے ۔ لہٰذا ایسے تمام اصول طے کر دیئے گئے جن کے اوپر اس دنیا میں انفرادی اور اجتماعی زندگی قائم ہوتی ہے جس طرح اس کائنات کی رفتار کے لیے اللہ نے تمام اصول اس کے اندر ودیعت کر دیئے ہیں ۔

(مولانا مودودی کا جو ترجمہ میں نے دیا ہے اس سے اس مذکورہ تفسیر کا فرق واضح ہے ۔کیونکہ سید قطب "یفرق" کو فَرَّقَ کے معنوں میں لے رہے ہیں جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ (مترجم))

اور یہ فیصلے اللہ کے ارادے سے ہوئے کیونکہ اللہ کی مشیت یہ تھی اور یہ رہی ہے کہ رسولوں کو بھیجا جائے تاکہ وہ کلام الٰہی کو بیان کریں اور اس کے مطابق فیصلے کریں۔

اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ (٤٤ : ٥) "ہم ایک رسول بھیجنے والے تھے"۔اور رسول کا بھیجنا اللہ کی رحمتوں کے تقاضے سے تھا۔قیامت میں اللہ لوگوں پر رحمت کرنا چاہتا تھا۔

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ اِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (٤٤ : ٦) "تیرے رب کی رحمت کے طور پر یقیناً وہی سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے"۔قرآن کے نزول سے جس طرح اللہ کی رحمت کا ظہور ہوا' اس طرح کسی اور رحمت کا ظہور نہیں ہوا۔یہ قرآن نہایت آسانی کے ساتھ اور سرعت کے ساتھ دلوں میں بیٹھ جاتا ہے اور انسان اس کے ردعمل کے طور پر اس طرح خودکار طریقے سے عمل کرتا ہے جس طرح انسان کے جسم میں خون دوڑتا ہے اس طرح یہ بشر ایک نہایت ہی سنجیدہ اور شریف انسان بن جاتا ہے اور انسانی معاشرہ ایک خوبصورت خواب کی طرح نظر آتا ہے۔اور یہ خواب ایک عملی خواب ہوتا ہے جو آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔

یہ نظریہ حیات جو قرآن مجید نے پیش کیا' اپنی جامعیت اور ہم آہنگی کے زاویہ سے 'ایک ایسا خوبصورت عقیدہ ہے کہ انسان بے ساختہ اس کے ساتھ محبت کرنے لگتا ہے۔دل اس کے ساتھ اٹک جاتے ہیں۔یہ نظریہ نہ صرف یہ کہ خیر و صلاح پر مبنی ہے۔اس کے اندر کمال اور جامعیت بھی موجود ہے بلکہ یہ چیزیں اس میں اس قدر ترقی کرتی ہیں کہ پرکشش خوبصورتی کے مقام تک چلی جاتی ہیں۔یہ خوبصورتی اس قدر کامل اور جامع ہے کہ اس عقیدے اور نظام کا ایک ایک جزء نہایت ہی خوبصورت ہے۔پھر اس کا جزئی اور کلی حسن وکمال اس کائنات کے جزئی اور کلی حسن و کمال کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

یہ قرآن مجید رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (٤٤ : ٦) "تیرے رب کی طرف سے بطور رحمت کے نازل ہوا"۔اور اس مبارک رات میں نازل ہوا۔

اِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (٤٤ : ٦) "یقیناً وہی سننے اور جاننے والا ہے"۔وہ سنتا اور جانتا ہے۔اللہ جو کلام اور جو احکام نازل کرتا ہے وہ علم و معرفت کی بنا پر نازل کرتا ہے۔وہ لوگوں کے اقوال و افعال کو جانتا ہے اور ایسے اصول و قوانین نازل کرتا ہے جو ان کے لیے مفید ہیں اور جن کے ذریعے ان کی اصلاح ہوتی ہے۔

اللہ ہی وہ ذات ہے جو اس کائنات کا نگہبان ہے اور اس کا اور اس کے اندر تمام چیزوں کا محافظ ہے۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ (٤٤ : ٧) "آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اس چیز کا رب جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے 'اگر تم واقعی یقین رکھتے ہو"۔اس لیے وہ لوگوں

کے لیے جو کلام و نظام نازل کرتا ہے وہ ان کی تربیت کے لیے کرتا ہے جس طرح اس کائنات میں اس کی ربوبیت چلتی ہے' انسان بھی اسی کا حصہ ہے اور انسان بھی اللہ کے قوانین فطرت کا ایک حصہ ہے اور یہاں ایمان اور ایقان کی طرف جو اشارہ کیا ہے تو وہ اس لیے کہ ان کے عقائد نہایت مضطرب' اور ڈانواں ڈول تھے کیونکہ ایک طرف تو وہ آسمانوں اور زمین کو اللہ کی مخلوق سمجھتے تھے ۔ دوسری جانب انہوں نے اللہ کے سوا دوسرے ارباب بھی بنا رکھے تھے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اللہ کا تصور نہایت مجمل' غیر واضح' سطحی اور پختگی سے بہت دور تھا ۔ حالانکہ اللہ واحد الٰہ ہے جو موت و حیات کا مالک ہے اور اولین اور آخرین سب کا رب ہے ۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (۴۴ : ۸) "کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے وہی زندگی عطا کرتا ہے' وہی موت دیتا ہے' تمہارا رب اور تمہارے اسلاف کا رب جو گزر چکے ہیں"۔ زندہ کرنا اور مارنا تو دونوں ایسی باتیں ہیں جن کو تمام انسان دیکھتے ہیں اور یہ بھی ان کو معلوم ہے کہ یہ کام اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا ۔ اس کے لیے تو معمولی فکر و تدبر کی ضرورت ہے ۔ موت کا منظر اور حیات کی کہانی دونوں انسانی قلب پر بہت ہی قریب سے اثر انداز ہوتے ہیں ۔ ان سے انسان کا دل متاثر اور منفعل ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے ۔ اور پھر وہ حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا تذکرہ قرآن میں بہت ہوتا ہے ۔ اور انسانی قلب اور دماغ کو اس طرف بار بار متوجہ کیا جاتا ہے اور مومنین کے دلوں کو بار بار اس کا غسل دیا جاتا ہے ۔

--- ooo ---

اس حد تک قرآن کے مخاطبین کو متاثر کرنے اور جوش دلانے اور حق کو قبول کرنے پر آمادہ کرنے کے بعد اب روئے سخن اچانک پھرتا ہے ۔ اور تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا جاتا کہ اس عظیم کتاب کی اس سعی کے بعد ان لوگوں کی حالت کیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اسے ایسا نہیں ہونا چاہئے ۔ لیکن یہ لوگ اس قدر سنگ دل ہیں کہ اس قدر سنجیدہ کوششوں کے باوجود وہ ابھی تک اس تحریک کو مذاق ہی سمجھتے ہیں ۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۹﴾ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾ يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾

"مگر فی الواقع ان لوگوں کو یقین نہیں ہے بلکہ یہ اپنے شک میں پڑے کھیل رہے ہیں ۔ اچھا' انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا' یہ ہے دردناک سزا ۔ (اب کہتے ہیں کہ)

"پروردگار' ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے 'ہم ایمان لاتے ہیں"۔ ان کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے؟ ان کا حال تو یہ تھا کہ ان کے پاس رسول مبین آگیا۔ پھر بھی یہ اس کی طرف ملتفت نہ ہوئے اور کہا کہ "یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے"۔ ہم ذرا عذاب ہٹانے والے ہیں (اگر ہٹا دیں تو) تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے۔ جس روز ہم بڑی پکڑ دھکڑ کریں گے وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے"۔

فرماتے ہیں کہ یہ تو اس قدر حکیمانہ اور عظیم الشان نظریہ اور نظام کے مقابلے میں غیر سنجیدہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور ان نشانیوں میں شک کرتے ہیں جو ثابت شدہ ہیں لہٰذا ان کا صحیح علاج یہی ہے کہ ان کو اس دن کے لیے چھوڑ دیا جائے جو بہت ہی سخت اور اعصاب شکن ہو گا۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (٤٤: ١٠) يَّغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ (٤٤: ١١) رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ (٤٤: ١٢) "اچھا انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ ہے دردناک سزا" "پروردگار ہم پر سے عذاب ٹال دے 'ہم ایمان لاتے ہیں"۔

سلف صالحین کے درمیان آیت دخان کی تفسیر میں اختلاف رہا ہے۔ بعض نے یہ کہا کہ یہ قیامت کے دن کا دھواں ہے' یہ دھمکی جو دی گئی کہ اس کا انتظار کرو' یہ ویسی ہی ہے جس طرح قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر عذاب قیامت کے انتظار کے لئے کہا جاتا ہے اور یہ تو آنے ہی والا ہے۔ لوگ بھی انتظار کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انتظار فرمایا لیکن بعض لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یہ واقعہ عملاً گزر گیا ہے۔ جس طرح قرآن نے دھمکی دی ہے اور پھر جب آیا تو مشرکین حضورؐ کے پاس آئے۔ آپ نے دعا فرمائی اور یہ عذاب دور ہو گیا۔ یہاں ہم دونوں اقوال اور ان کی سند نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد اپنا تبصرہ کریں گے۔

سلیمان ابن مہران الاعمش نے روایت کی ہے۔ ابوالضحیٰ مسلم ابن صبیح سے انہوں نے مسروق سے 'یہ کہتے ہیں کہ میں ابواب کندہ کے پاس کوفہ کی ایک مسجد میں داخل ہوا' ایک شخص اپنے ساتھیوں کے سامنے یہ بیان کر رہا تھا۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (٤٤: ١٠) "اچھا انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا"۔ کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ دھواں کیا ہے؟ یہ ایک دھواں ہے جو قیامت کے دن آئے گا۔ اس سے منافقین اور کفار اندھے اور بہرے ہو جائیں گے۔ اور مومنین پر صرف اس قدر اثر ہو گا جس طرح زکام ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم ابن مسعودؓ کے پاس آئے۔ یہ بات ہم نے ان سے ذکر کی۔ اس وقت یہ تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے 'پریشان ہو کر اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے نبی سے کہا:

قُلْ مَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا' اور نہ ہی مجھے تمہاری ہدایت کا مکلف بنایا گیا ہے"۔ یہ بھی بہت بڑے علم کی دلیل ہے کہ اگر کسی کو کوئی بات معلوم نہ ہو تو کہے'

واللہ اعلم! اس کے بارے میں' میں تمہیں اصل بات بتاتا ہوں۔ جب قریش نے کسی صورت میں اسلام قبول نہ کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اے اللہ ان پر ایسے سال لے آیا جو یوسف علیہ السلام کے دور میں مصر میں آئے تھے۔ چنانچہ ان پر جہد و مشقت اور بھوک اور پیاس کے دن آگئے یہاں تک کہ انہوں نے ہڈیاں کھانا شروع کر دیں۔ اور مردار بھی کھانے لگے۔ ایسے حالات ہوگئے کہ وہ آسمان کی طرف نظریں اٹھاکر دیکھتے اور انہیں دھواں ہی دھواں نظر آتا اور بعض روایات میں الفاظ یہ ہیں کہ ایک شخص آسمان کی طرف نظریں اٹھاتا اور اسے فضا یوں نظر آتی جس طرح دھواں ہو' اور یہ بدحالی کی وجہ سے۔ اس کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ (۴۴:۱۰) يَّغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۴۴:۱۱) "انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ ہے دردناک سزا"۔ لوگ رسول اللہؐ کے پاس آئے اور آپ سے کہا گیا رسول خدا آپ اللہ سے مضر عربوں کے لیے دعا مانگیں' کیونکہ یہ ہلاک ہونے والے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے باران رحمت کی دعا مانگی اور بارش ہوئی۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ (۴۴:۱۵) "ہم ذرا عذاب ہٹا دیتے ہیں' تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے"۔ حضرت ابن مسعودؓ نے مزید کہا کیا یہ ہو سکتا ہے کہ قیامت کے دن ان پر سے عذاب اٹھایا جائے۔ غرض جب ان کو پھر خوشحالی ملی تو وہ اسی پرانی روش کی طرف لوٹ آئے۔ تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (۴۴:۱۶) "جس روز ہم بڑی ضرب لگائیں گے وہ دن ہوگا جب ہم تم سے انتقام لیں گے"۔ اس سے مراد یوم بدر ہے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ پانچ چیزیں گزریں: دھواں' روم' شق قمر' بطشہ الکبریٰ اور لزام۔ یہ حدیث صحیحین میں مروی ہے۔ امام احمد نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ترمذی اور نسائی نے بھی کتاب التفسیر میں دی ہے۔ ابن جریر اور ابن ابو حاتم نے اعمش سے متعدد طرق سے نقل کی ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن مسعود سے ایک جماعت نے اتفاق کیا ہے کہ دخان کا واقعہ چلا گیا ہے۔ مثلاً مجاہد' ابو العالیہ' ابراہیم نخعی' ضحاک اور عطیہ عوفی اور یہی تفسیر ابن جریر نے اختیار کی ہے۔

لیکن دوسرے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ دخان کا واقعہ گزرا نہیں ہے بلکہ یہ قیامت کی علامات میں سے ہے جس طرح ابو سریح حذیفہ ابن اسید الغفاریؓ کی حدیث میں آتا ہے۔ انہوں نے کہا ہم پر رسول اللہ آئے' عرفہ سے ہوکر آئے اور ہم قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے تو رسول اللہؐ نے فرمایا "قیامت اس وقت تک برپا نہ ہوگی جب تک دس نشانیاں نہ ظاہر ہو جائیں: (۱) سورج کا مغرب سے طلوع' (۲) دخان' (۳) دابہ' (۴) یاجوج و ماجوج کا خروج' (۵) عیسیٰ ابن مریم کا خروج' (۶) دجال' (۷) تین چاند گرہن' (۸) مشرق میں زمین کا دھنسنا' (۹) مغرب میں زمین کا دھنسنا' (۱۰)

جزیرۃ العرب میں زمین کا دھنسنا۔ایک آگ عدن کی گہرائیوں سے نکلے گی ۔ یہ لوگوں کو چلائے گی یا لوگوں کو اٹھائے گی جہاں یہ رات کو ہوں گے وہیں یہ بھی ہوگی جہاں یہ دن کو آرام کریں گے ' یہ بھی آرام کرے گی ۔ (مسلم)

علامہ ابن جریر نے روایت کی ہے ۔ محمد ابن عوف سے انہوں نے محمد ابن اسماعیل ابن عیاش سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے ضیغم ابن زرعہ سے انہوں نے سریح ابن عبید سے اورانہوں نےحضرت مالک اشعریؓ سے کہ وہ فرماتے ہیں ' فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شک تمہارے رب نے تمہیں تین باتوں سے ڈرایا ہے ۔ دھواں جو مسلمان کو زکام کی طرح متاثر کرے گا اور کافر پر اثر یہ ہو گا کہ وہ اس سے پھول جائے گا اور وہ اس کی ہر سننے کی جگہ سے نکلے گا۔ دوسری دابتہ الارض اور تیسرا دجال ۔ اس حدیث کو طبرانی نے ہاشم ابن یزید سے نقل کیا ہے ۔ اور اس نے محمد ابن اسماعیل ابن عیاش سے اسی متن کے ساتھ (ابن کثیر نے کہا یہ سند جید ہے)

ابن جریر نے روایت کی ہے ' یعقوب سے ' انہوں نے ابن علیہ سے انہوں نے ابن جریج سے انہوں نے عبداللہ ابن ابوملیکہ سے ' انہوں نے نے کہا کہ میں ایک دن سویرے حضرت ابن عباسؓ کے پاس گیا ' تو انہوں نے فرمایا کہ میں آج رات صبح تک بالکل نہیں سویا ۔ میں نے پوچھا یہ کیوں! آج ایک دمدار ستارہ طلوع ہوا تو مجھے یہ خوف لاحق ہو گیا کہ شاید دھویں کا وقت آگیا ' اس وقت سے میں صبح تک نہیں سویا ۔ ابن ابو حاتم نے اپنے باپ سے ' انہوں نے ابن عمر سے انہوں نے سفیان سے انہوں نے عبداللہ ابن ابو یزید سے ' عبداللہ ابن ابوملیکہ سے اورانہوں نےحضرت ابن عباس سے ' اسی طرح روایت کی ہے ۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں ۔ یہ سند حضرت ابن عباس تک صحیح ہے ' جو اس امت سے بڑے عالم ہیں اور ترجمان القرآن ہیں ۔ اور یہی قول اپنایا ہے ' صحابہ و تابعین میں سے ان لوگوں نے جنہوں نے ان سے اتفاق کیا ہے ۔ اور اس سلسلے میں کئی مرفوع اور حسن احادیث بھی انہوں نے پیش کی ہیں جن سے پوری تسلی ہو جاتی ہے کہ یہ دھواں جس کا یہاں ذکر ہے یہ ان نشانیوں میں سے ہے جن کا انتظار ہے اور قرآن کریم کا ظاہری مفہوم بھی یہی ہے ۔ اللہ نے فرمایا :

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ (٤٤ : ١٠) ''انتظار کرو اس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا''۔ یعنی دھواں بالکل واضح ہو گا اور اسے ہر شخص دیکھ سکے گا اور حضرت ابن مسعود نے جو روایت کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسانی تخیل تھا اور لوگ بھوک اور مشقت کی وجہ سے دھواں دیکھ رہے تھے ۔ پھر يَغْشَى النَّاسَ (٤٤ : ١١) ''وہ لوگوں پر چھا جائے گا''۔ یعنی ان کو ڈھانپ کر اندھا کر دے گا۔ اگر یہ ایک خیالی معاملہ تھا اور صرف اہل مکہ نے اسے محسوس کیا تھا تو پھر یغشی الناس کا لفظ استعمال نہ ہوتا ۔ پھر آگے ہے ۔

هٰذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ (٤٤ : ١١) ''یہ ہے دردناک عذاب''۔ یعنی ان سے یہ کہا جائے گا ' بطور سرزنش وملامت کے جس طرح دوسری جگہ ہے ۔

يَوْمَ يُدَعُّونَ إِلَىٰ نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا (٥٢ : ١٣) هٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ (٥٢ : ١٤) ''جس دن انہیں دھکے مار مار کر نار جہنم کی طرف چلایا جائے گا اس وقت ان سے کہا جائے گا ' یہ وہی

آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے"۔

ہو سکتا ہے کہ وہ خود ایک دوسرے سے یہ بات کہیں گے کہ یہ عذاب الیم ہے اور اس کے بعد آیت۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ (۴۴ : ۱۲) "پروردگار، ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں"۔ یعنی کافر یہ کہیں گے جب انہوں نے دیکھ لیا کہ عذاب الٰہی آگیا اور یہ تو سزا ہے۔ تو وہ سوال کریں گے کہ اے رب اس عذاب کو ٹال دے، جس طرح دوسری جگہ اللہ نے فرمایا:

وَلَوْ تَرٰى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۶ : ۲۷) "کاش تم اس وقت کی حالت دیکھ سکتے جب وہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے، اس وقت وہ کہیں گے کاش کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس بھیجے جائیں اور اپنے رب کی نشانیوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان لانے والوں میں شامل ہوں"۔ اور اسی طرح اس آیت میں بھی یہی مضمون ہے۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَا اَخِّرْنَا اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ

"اے نبی اس دن سے تم انہیں ڈرا دو جبکہ عذاب انہیں آلے گا۔ اس وقت یہ ظالم کہیں گے کہ اے ہمارے رب، ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت کو لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے"۔ کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جو ابھی سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آنا ہی نہیں ہے"۔ زیر بحث آیت سے اگلی آیت میں اللہ فرماتا ہے۔

اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ (۴۴ : ۱۳) ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ (۴۴ : ۱۴) "ان کی غفلت کہاں دور ہوتی ہے ان کا حال تو یہ تھا کہ ان کے پاس رسول امین آیا تھا۔ یہ اس کی طرف ملتفت نہ ہوئے اور کہا "یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کس طرح یاد دہانی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ہم نے ان کی طرف رسول بھیجا، جس نے واضح طور پر ان کے سامنے دعوت پیش کی۔ ان کو ڈرایا، اس کے باوجود انہوں نے منہ پھیر لیا۔ اور انہوں نے اس کی کوئی بات نہ مانی بلکہ تکذیب کی اور کہا کہ یہ تو سکھایا ہوا مجنون ہے۔

اس کی مثال بھی قرآن کریم میں ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى (۸۹ : ۲۳) "اس دن انسان کو سمجھ آئے گی اور اس وقت اس کے سمجھنے کا کیا حاصل"۔ اور اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے۔

وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ (۳۴ : ۵۱) وَّ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ (۳۴ : ۵۲) ”کاش تم دیکھ سکو' انہیں اس وقت جب یہ لوگ گھبرائے پھر رہے ہوں گے اور کہیں بچ کر نہ جا سکیں گے بلکہ قریب ہی سے پکڑے جائیں گے۔ اس وقت یہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لے آئے حالانکہ اب دور نکلی ہوئی چیز کہاں ہاتھ آ سکتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت نمبر ۱۴ کے بعد یہ آیت آتی ہے :

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ (۴۴ : ۱۵) ”ہم عذاب ذرا ہٹا دینے والے ہیں مگر تم پھر وہی کرو گے جو پہلے کر رہے تھے“۔ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اگر ہم عذاب کو ہٹا دیں اور تمہیں پھر دنیا میں لوٹا دیں تو تم نے پھر وہی کچھ کرنا ہے جو پہلے کیا' یعنی کفر و تکذیب اور اس کی مثال دوسری آیات میں بھی ہے۔

وَ لَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۲۳ : ۷۵)

”اگر ہم ان پر رحم کریں اور وہ تکلیف جس میں آج یہ مبتلا ہیں' دور کر دیں تو یہ اپنی سرکشی میں بالکل ہی بہک جائیں گے“۔ اور جس طرح دوسری آیت میں ہے :

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۶ : ۲۸) ”اگر انہیں سابق زندگی کی طرف بھیجا جائے تو پھر وہی سب کچھ کریں جس سے انہیں منع کیا گیا اور وہ تو ہیں ہی جھوٹے“۔ اور دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے' ہم تم سے عذاب کو عملاً روکے رکھتے ہیں یا روکے رکھنے والے ہیں حالانکہ تم سرکشی اور گمراہی میں بڑھتے چلے جاتے ہو۔ کیونکہ کشف عذاب کے لیے لازمی نہیں ہے کہ عملاً ان پر عذاب آ بھی گیا ہو۔ دوسری جگہ اللہ نے فرمایا:

اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۰ : ۹۸) ”ماسوائے قوم یونس کے کہ وہ جب ایمان لائے تو ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقعہ دے دیا تھا“۔ حالانکہ ابھی عذاب نے ان کو چھوا نہیں تھا بلکہ عذاب کے اسباب فراہم ہو گئے تھے۔ قتادہ نے تو یہ معنی لیے ہیں کہ تم عذاب الہی کی طرف لوٹنے والے ہو' آگے آیت ہے۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (۴۴ : ۱۶) ”جس روز ہم بڑی دھکڑ کریں گے وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے“۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس کی تفسیر بدر کبریٰ سے کی ہے اور یہ قول کچھ دوسرے لوگوں نے بھی اختیار کیا ہے جنہوں نے ابن مسعود کے ساتھ اتفاق رائے کیا ہے۔ اور یہی تفسیر حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے۔ ان سے یہ روایت عوفی نے نقل کی ہے اور یہی رائے حضرت ابی ابن کعب کی ہے اور اس کا احتمال

بھی ہے لیکن ظاہر بات یہی ہے کہ اس سے بھی مراد یوم القیامہ ہے ۔ اگرچہ یوم بدر کفار کے لیے بھی بڑی پکڑ کا دن تھا۔ ابن جریر نے روایت کی ہے ' یعقوب سے انہوں نے ابن علیہ سے انہوں نے خالد حذاء سے انہوں نے عکرمہ سے کہ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "ابن مسعودؓ فرماتے ہیں بطشۃ الکبریٰ سے بدر کا دن مراد ہے ۔ میری رائے یہ ہے کہ یہ قیامت کا دن ہے"۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے ۔ حسن بصری اور عکرمہ بمطابق صحیح روایت اسی کے قائل ہیں"۔ یہاں ابن کثیر کا کلام ختم ہوا۔

ہم یہاں حضرت ابن عباس کا قول اختیار کرتے ہیں کہ دخان قیامت کے دن ہو گا ۔ اور اس کی تفسیر علامہ ابن کثیر نے بہت اچھی کی ہے ۔ یہ کفار کے لیے تہدید اور ڈراوا ہے اور اس کے نظائر قرآن کریم میں بہت ہیں ۔ جن کے مطابق یہی مفہوم دوسرے مقامات پر بھی دہرایا گیا ہے ۔ اس طرح مفہوم یہ ہو گا یہ لوگ شک کرتے ہیں اور کھیل کود میں مصروف ہیں ' ان کو چھوڑ دیں اور اس دن کا خوفناک دن کا انتظار کریں ' جب آسمان سے دھواں آئے گا ' تمام لوگوں کو ڈھانپ لے گا اور یہ کہا جائے گا کہ یہ ہے عذاب الیم ۔ اور پھر ان کی فریاد کی تصویر کشی کی گئی کہ اے ہمارے رب ' اس عذاب کو ہم سے دور کر دے ہم ایمان لاتے ہیں اور ان کی اس درخواست کو رد کر دیا جاتا ہے کہ اس کی منظوری محال ہے کیونکہ وقت چلا گیا ہے ۔ اب یہ نصیحت بھی پا سکتے ہیں ' ان کے پاس تو رسول مبین آگیا تھا اور یہ اس وقت یہ کہتے ہوئے منہ موڑ گئے تھے کہ یہ سکھایا ہوا جادوگر ہے ۔ اسے یہ سب کچھ ایک عجمی غلام سکھا رہا ہے ۔ اور یہ باطل ہے ۔

اس منظر میں جہاں یہ لوگ عذاب کے ٹلنے کی درخواست کرتے ہیں ' ان سے بطور جملہ معترضہ یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھو ابھی تو تم دنیا میں ہو ۔ فرصت کے قلیل لمحات موجود ہیں اور ابھی تو عذاب سے بچے ہوئے ہو ' ایمان لے آؤ ' تمہیں ڈرایا جا رہا ہے کہ تم ہی ہو گے جو آخرت میں ایمان لانے پر آمادہ ہو گے مگر وہاں ایمان قبول نہ ہو گا ۔ ابھی تو تم امن و عافیت میں ہو اور یہ امن و عافیت دائمی نہیں ہے ۔ تم ہمارے سامنے آنے والے (عائدون) ہو ۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى (۴۴ : ۱۶) "جس دن یہ دھواں ہو گا جس کی تصویر کشی قرآن کر رہا ہے اور پکڑ دھکڑ ہو گی تو اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (۴۴ : ۱۶) "تو ہم انتقام لیں گے"۔ تمہاری اس لاپرواہی کا ' تمہاری اس بہتان طرازی کا ' جو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے ہو اور کہتے ہو ' مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ (۴۴ : ۱۴) "سکھایا پڑھایا مجنون ہے"۔ حالانکہ وہ صادق و امین ہے ۔

اس طرح تمام آیات کی تفسیر درست ہو جاتی ہے ۔ ہمارے خیال کے مطابق ۔ واللہ اعلم !

---- ooo----

اس کے بعد قرآن مجید ان کو تاریخ کی ایک وادی میں لے جاتا ہے ۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے کا ایک مختصر حصہ ہے اور اس کا خاتمہ اس زمین پر ایک عظیم پکڑ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى (۴۴ : ۱۶) کا نمونہ ہے ۔ اس سے قبل جس کا نمونہ ان کو دخان کی نقشہ کشی میں بتا دیا گیا تھا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ

كَرِيمٌ ﴿١٧﴾ أَنْ أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ ۖ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٨﴾ وَأَنْ
لَا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ ۖ إِنِّي آتِيكُمْ بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ﴿١٩﴾ وَإِنِّي عُذْتُ
بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ ﴿٢٠﴾ وَإِنْ لَمْ تُؤْمِنُوا لِي فَاعْتَزِلُونِ ﴿٢١﴾ فَدَعَا رَبَّهُ
أَنَّ هَٰؤُلَاءِ قَوْمٌ مُجْرِمُونَ ﴿٢٢﴾ فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُمْ مُتَّبَعُونَ ﴿٢٣﴾ وَاتْرُكِ
الْبَحْرَ رَهْوًا ۖ إِنَّهُمْ جُنْدٌ مُغْرَقُونَ ﴿٢٤﴾ كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿٢٥﴾ وَزُرُوعٍ
وَمَقَامٍ كَرِيمٍ ﴿٢٦﴾ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ ﴿٢٧﴾ كَذَٰلِكَ ۖ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ ﴿٢٨﴾
فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنْظَرِينَ ﴿٢٩﴾ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِي
إِسْرَائِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿٣٠﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَالِيًا مِنَ الْمُسْرِفِينَ ﴿٣١﴾
وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٢﴾ وَآتَيْنَاهُمْ مِنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَاءٌ مُبِينٌ ﴿٣٣﴾

"ہم ان سے پہلے فرعون کی قوم کو اسی آزمائش میں ڈال چکے ہیں' ان کے پاس ایک نہایت شریف رسول آیا اور اس نے کہا کہ "اللہ کے بندو! سب کچھ میرے حوالے کرو" یا "اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو' میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے (اپنی ماموریت کی) صریح سند پیش کرتا ہوں اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں' اس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو"۔ آخر کار اس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں۔ (جواب دیا گیا) "اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ۔ تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔ سمندر کو اس کے حال پر کھلا چھوڑ دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے"۔ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان' جن میں وہ مزے کر رہے تھے' ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام' اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا' نہ زمین اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔ اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت ذلت کے عذاب' فرعون سے نجات دی جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا' اور ان کی حالت جانتے ہوئے ان کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی' اور انہیں ایسی نشانیاں دکھائیں جن میں صریح آزمائش تھی"۔

اس وادی کے دروازے ہی پر یہ خوفناک اعلان لکھا ہوا ہے کہ یاد رکھو' کسی قوم کی طرف رسول کا بھیجا جانا اس کی آزمائش ہوتی ہے۔ مکذبین کو یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ وقت بہت تھوڑا ہے' اس میں تم تکذیب بھی کر سکتے ہو' تکبر اور

غرور بھی کر سکتے ہو۔ رسول کو ایذا بھی دے سکتے ہو' مومنین پر ظلم و ستم بھی ڈھا سکتے ہو لیکن آخر میں غرور کا سر نیچا ہوتا ہے اور تم جو رسول اللہ کو طیش دلاتے ہو' ان کا پیمانہ صبر لبریز کرتے ہو' لیکن آپ بدستور صبر کا پیکر بنے ہوئے ہیں اور تمہاری ہدایت ہی کے امیدوار ہیں' اس کا انجام برا بھی ہو سکتا ہے اور تم فرعون کی طرح سخت پکڑ میں بھی آ سکتے ہو۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ (۴۴ : ۱۷) "ہم اس سے قبل فرعون کی قوم کو اس آزمائش میں ڈال چکے ہیں"۔ ان کو نعمتیں دے کر اور بادشاہت دے کر اور زمین میں نہایت ہی تمکنت دے کر آزما چکے ہیں۔ اور پھر خوشحالی' دولت کے اسباب اور سربلندی میں ان کو طویل مہلت بھی دی گئی:

وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ (۴۴ : ۱۷) "اور ان کے پاس ایک نہایت ہی شریف رسول آیا"۔ اور یہ بھی آزمائش کا ایک پہلو تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم نے ان سے کیا بات تسلیم کرنے کے لیے کہا تھا۔ آپ نے ان سے کوئی بات یا کوئی چیز اپنے لیے طلب نہ کی تھی۔ آپ ان کو اللہ کی طرف بلاتے تھے اور آپ کا مطالبہ یہ تھا کہ ہر بات اللہ کے لیے ادا کرو اور کوئی چیز بخل کر کے اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے نہ رکھو۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ (۴۴ : ۱۸) وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۴۴ : ۱۹) وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ (۴۴ : ۲۰) وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ (۴۴ : ۲۱) کہ "اللہ کے بندو! سب کچھ میرے حوالے کر دو" یا "اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو' میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے (اپنی ماموریت کی) صریح سند پیش کرتا ہوں اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں' اس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو"۔ یہ ہے وہ مختصر دعوت جسے رسول کریم یعنی حضرت موسیٰ لے کر آئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تم کلی طور پر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دو' پوری ادائیگی کرو' اور سب کچھ اللہ کے لیے دے دو' جس کے تم بندے ہو' بندوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی کریں۔ یہ اللہ کی دعوت ہے اور ایک شریف رسول لے کر تمہارے پاس آیا ہے اور اس کے پاس رسول ہونے کی سند بھی ہے۔ ایک مضبوط اور قوی دلیل ہے۔ اگر کھلے دل سے غور کیا جائے تو ایسے براہین پر یقین آنا چاہئے۔ آپ ان کے تشدد کے مقابلے میں اللہ کی پناہ لیتے ہیں کہ وہ آپ کو پکڑ کر رجم کر دیں۔ اگر وہ ایمان کا انکار کرتے ہیں اور رسول سے الگ ہوتے ہیں تو آپ ان کو یہ پیشکش کرتے ہیں کہ میں بھی تم سے علیحدہ ہو جاؤں گا۔ اور یہ ایک نہایت ہی منصفانہ بات ہے کہ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو میری راہ نہ روکو۔

اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے۔

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ (۴۴ : ۱۸) "کہ اللہ کے بندوں (بنی اسرائیل) کو میرے حوالے کر دو"۔

اور ان کو تشدد اور ظلم کا نشانہ نہ بناؤ۔ دوسری جگہ تصریح آئی ہے۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ "یہ کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو"۔ لیکن سرکشوں نے کبھی بھی کسی کے معقول اور منصفانہ مطالبات نہیں مانے۔ سرکش سچائی کو آزاد دیکھنا پسند نہیں کرتے کہ وہ سہولت کے ساتھ عوام تک پہنچ جائے' چنانچہ ہر سرکش سچائی کو اپنی گرفت میں لینا پسند کرتا ہے اور کبھی اس کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا۔ کیونکہ سرکشوں اور سچائی کے درمیان اگر صلح ہو جائے تو پھر سچائی تو چھانے لگتی ہے۔ اور عوام کے دل و دماغ کو فتح کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باطل اہل حق پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ اہل حق کو رجم کرتا ہے۔ وہ حق کو الگ بھی رہنے نہیں دیتا کہ وہ صحیح سلامت اور آرام سے رہے۔

یہاں سیاق کلام میں قصے کی کئی کڑیوں کو مختصر کر کے پیش کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو جلد انجام تک پہنچایا جائے' جبکہ آزمائش انتہا کو پہنچ جائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام محسوس کر دیں کہ یہ لوگ دعوت کو ہرگز قبول کرنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ اس کے لیے تیار ہیں کہ ہمیں گوارا کر کے اپنا کام کرنے دیں۔ اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ ان کی مجرمانہ ذہنیت بہت ہی گہری اور ٹھوس ہے اور ان کی اصلاح کی کوئی امید نہیں ہے۔ اور وہ اس ذہنیت کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ یہاں آکر پھر آپ اپنے رب کے ہاں آخری پکار کرتے ہیں اور مکمل طور پر اس کی پناہ میں آجاتے ہیں۔

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ (۴۴ : ۲۲) "آخر کار انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں"۔ آخر ایک رسول اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کی پوری کمائی لے کر اپنے رب کے دربار میں پیش کر دے اور اسے اللہ کے سامنے رکھ دے اور اگلا اقدام اللہ پر چھوڑ دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے بارے میں جو تبصرہ اور رپورٹ کی تھی' اللہ نے اسے قبول کر لیا کہ یہ درست ہے کہ یہ لوگ فی الواقع مجرم ہیں۔

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (۴۴ : ۲۳) وَ اتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ (۴۴ : ۲۴) "اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑو تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔ سمندر کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے"۔ السری اس سفر کو کہتے ہیں جو رات کے وقت ہو' اس کے بعد "لیلا" کا لفظ منظر کو دوبارہ ذہن میں لاتا ہے کہ اللہ کے کچھ بندے بنی اسرائیل رات کے وقت سفر میں ہیں۔ یہ لفظ اس وقت رازداری کی فضا کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ کیونکہ ان کا یہ شبینہ سفر دراصل تھا ہی فرعون سے خفیہ اور حکومت کی لاعلمی سے تھا۔ "الرہو" کے معنی ہوتے ہیں سکون کے۔ یہاں اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اور آپ کی قوم گزر جائیں اور اپنے پیچھے سمندر کو سکون کی حالت میں چھوڑ دیں۔ ایسی ہی حالت پر جس میں آپ اس سے گزرے تاکہ فرعون اور اس کی فوج دھوکہ کھا کر تمہارا پیچھا کرے اور اس طرح اللہ کا حکم پورا ہو جائے۔

اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ (۴۴ : ۲۴) "یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے"۔ یوں اللہ کی تقدیر کا فیصلہ اسباب ظاہریہ کے مطابق پورا ہوا' اور یہ اسباب بھی درحقیقت اللہ کے فیصلے ہی کا حصہ ہوتے ہیں۔

یہاں سیاق کلام میں فرعون کی غرقابی کے واقعات کو مجمل چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ بطور فیصلہ یہ کہہ دیا گیا کہ یہ غرق ہونے والا لشکر ہے ۔ اب اس منظر کو چھوڑ کر اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے اور یہ تبصرہ بھی ایک زبردست منظر ہے جو سرکش اور متکبر فرعون اور اس کے سرداروں کی زبوں حالی کی داستان ہے ۔ یہی لوگ تھے جو اسے ظلم اور سرکشی پر آمادہ رکھتے تھے ۔ ان کا ہلاک و برباد کرنا' اللہ کے لئے کس قدر سہل رہا ۔ اپنی اس حیثیت کے ساتھ وہ غرور کرتا تھا ۔ اور اس کے یہ پیروکار اس پر نثار ہوتے تھے ۔ حالانکہ یہ سب لوگ اس قدر چھوٹے اور اس قدر معمولی تھے' اس کائنات نے ان کی غرقابی کا کوئی احساس ہی نہ کیا ۔ فرعون سے سب کچھ چھین لیا گیا اور کوئی رونے والا نہ تھا ۔ کسی نے بھی اس کی اس بربادی پر مرثیہ نہ لکھا' نہ زمین نے' نہ آسمان نے ۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ (٤٤:٢٥) وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ (٤٤:٢٦) وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ (٤٤:٢٧) كَذٰلِكَ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (٤٤:٢٨) فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (٤٤:٢٩)

"کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے ۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان' جن میں وہ مزے کر رہے تھے' ان کے پیچھے دھرے رہ گئے ۔ یہ ہوا ان کا انجام' اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا ۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا' نہ زمین اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی" ۔ اس منظر میں وہ انعامات بھی دکھائے گئے ہیں جن میں وہ داد عیش دیتے تھے ۔ باغات' چشمے' قسم قسم کی زراعت' بڑے بڑے محل' جہاں ان کو بڑا اعزاز ملا ہوا تھا ۔ ان نعمتوں میں کھاتے پیتے اور داد عیش دیتے تھے اور مسرور اور مست تھے ۔

اس کے بعد ان سے یہ سب کچھ چھین لیا جاتا ہے اور دوسری اقوام کو ان کا وارث بنا دیا جاتا ہے اور دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے ۔

كَذٰلِكَ وَ اَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ "یونہی' اور وارث بنا دیا ہم نے ان چیزوں کا بنی اسرائیل کو" ۔ بنی اسرائیل تو فرعون کی بادشاہت کے وارث نہ بنائے گئے تھے لیکن فلسطین میں ان کو زبردست عروج نصیب ہوا ۔ مطلب یہ ہے کہ اسی قسم کی نعمتوں کا ان کو وارث بنایا گیا جیسی فرعونیوں سے چھینی گئی تھیں ۔

پھر کیا ہوا' فرعون اور اس کے سردار نیست و نابود ہو گئے ۔ ایک وقت تھا کہ اس زمین پر وہ لوگوں کی آنکھ کا تارا تھا اور لوگوں کے دلوں میں ان کا بے حد رعب تھا' یا یہ وقت ہے کہ ان کے نیست و نابود ہونے پر کوئی آنکھ نہیں روئی ۔ نہ آسمان کو اس کا احساس ہوا اور نہ زمین کو' نہ ان کو مہلت ملی اور ان کے معاملے کو اٹھا کر رکھا گیا ۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (٤٤:٢٩) "نہ آسمان ان پر رویا اور نہ زمین اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی" ۔ یہ ایک ایسا انداز تعبیر ہے جو ان کی کسمپرسی اور دنیا کی بے وفائی اور آنکھیں پھیر لینے کو ظاہر کرتا ہے ۔ یہ سرکش اور مغرور لوگ اس دنیا سے چلے گئے اور ان کے لیے رونے والی آنکھ نہ

زمین و آسمان میں کوئی نہ تھا' جو ان پر تاسف کا اظہار کرتا' وہ اس طرح چلے گئے جس طرح کوئی چیونٹیوں کو روند ڈالے ۔ جبکہ وہ اس قدر جبار و قہار تھے کہ انسانوں کو چیونٹیوں کی طرح روندتے چلے جاتے تھے ۔ یہ کیوں ہوا' اس لیے کہ یہ اس کائنات سے منقطع تھے ۔ یہ پوری کائنات مسلم تھی اور یہ کافر تھے 'یہ خبیث' دھتکارے ہوئے اور شریر لوگ تھے اور یہ پوری کائنات ان سے نفرت کرتی تھی ۔ اس دنیا کے ڈکٹیٹر اگر ان باتوں کو سمجھتے اور ان ہدایات کو اپناتے جو ان آیات میں ہیں تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ وہ اس کائنات میں کتنے ہلکے ہیں اور اللہ کے ہاں وہ کس قدر ہلکے ہیں ۔ اور ان کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ اس زمین پر نہایت ہی تما' دھتکارے ہوئے اور پوری کائنات اور خالق کائنات سے کٹے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں' یہ کیوں اس لیے کہ وہ ایمانی رابطوں سے کٹے ہوئے اور مجرم ہیں ۔

اور ان کے ان برے دنوں کے مقابلے میں اہل ایمان کی عزت اور تکریم :

وَ لَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِىْ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ (٤٤ : ٣٠) مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ (٤٤ : ٣١) وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (٤٤ : ٣٢) وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ (٤٤ : ٣٣) "اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت ذلت کے عذاب' فرعون سے نجات دی جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا' اور ان کی حالت جانتے ہوئے ان کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی' اور انہیں ایسی نشانیاں دکھائیں جن میں صریح آزمائش تھی" ۔

یہاں توہین آمیز عذاب سے بنی اسرائیل کی نجات کا ذکر ہے ۔ جبکہ یہ عذاب دینے والے جباروں کو نیست و نابود کر دیا گیا ۔ جو کبر و غرور کرنے والے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والے تھے ۔

مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ (٤٤ : ٣١) "فرعون سے جو حد سے گزرنے والوں میں فی الواقع اونچے درجے کا آدمی تھا" ۔

اس کے بعد اس بات کا ذکر ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دوسری قوموں پر ترجیح دی اور ان کی حقیقت کو جانتے ہوئے دی ۔ ان کی اچھائی بھی ہماری نظروں میں تھی اور ان کا شر بھی ہماری نظروں میں تھا ۔ اس لیے ان کو اپنے دور میں تمام اقوام پر سربلند کر دیا' کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ اپنے زمانے کی اقوام میں یہ اعلیٰ و افضل اور برتر ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنی نصرت' اور امداد سے اس قوم کو بھی نوازتا ہے جو اپنے اہل زمانہ سے افضل ہوتے ہیں ۔ اگرچہ وہ لوگ ایمان و یقین میں اعلیٰ معیار تک نہ پہنچے ہوئے ہیں ۔ بشرطیکہ ان کی قیادت اچھی ہو اور ان کو ہدایت' علم اور بصیرت کے ساتھ اور ثابت قدمی کے ساتھ بلندی کی طرف لے جا رہی ہو ۔

وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ (٤٤ : ٣٣) "اور انہیں ایسی نشانیاں دیں جن میں صریح آزمائش تھی" ۔ اس طرح ان نشانیوں کے ذریعہ ان کو آزمایا گیا ۔ جب ان کا امتحان اور ان کی آزمائش پوری ہو گئی اور ان کی

خلافت اور اقوام عالم پر ترجیح کا زمانہ ختم ہو گیا تو ان کے انحراف اور گمراہی کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا گیا اور ان پر دوسری اقوام کو مسلط کر دیا گیا' پھر ان کو بار بار ملک بدری کا سامنا کرنا پڑا اور ان پر ذلت اور خواری لکھ دی گئی اور ان کو کہہ دیا گیا کہ جب بھی تم حد سے بڑھے اور سرکشی اختیار کی تو تمہیں ذلیل و خوار کیا جائے گا۔ یہ حالت تمہاری قیامت تک ہو گی۔

--- ○○○---

فرعون اور اس کے سرداروں کی ہلاکت خیز سفر کے مشاہدات کے بعد جس میں حضرت موسیٰ اور آپ کی قوم کو بات دی گئی اور اس کے بعد ان کو آزمایا گیا۔ اب دوبارہ مشرکین کے عقیدہ بعث بعد الموت کی طرف بات کا رخ ہوتا ہے۔ یہ لوگ مرنے کے بعد اٹھائے جانے میں شک کرتے تھے بلکہ انکار کرتے تھے۔ اس موضوع کو دوبارہ اس زاویہ سے لیا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد اٹھایا جانا اس کائنات کے اصل نقشے کا حصہ ہے کیونکہ یہ حق ہے اور اس کائنات کا وجود ہی حق پر ہے اور حق کا تقاضا ہے کہ موت کے بعد لوگوں کو اٹھایا جائے۔

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ﴿٣٤﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ ﴿٣٥﴾ فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٦﴾ أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ أَهْلَكْنَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٣٧﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ﴿٣٨﴾ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٠﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَن مَّوْلًى شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤١﴾ إِلَّا مَن رَّحِمَ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿٤٢﴾

۲
ع۱۳
۱۵

"یہ لوگ کہتے ہیں "ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں' اس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ اگر تم سچے ہو تو اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو"۔ یہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے ان کو اسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے۔ یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ان سب لوگوں کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے' وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی' سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے' وہ زبردست اور رحیم ہے"۔

مشرکین عرب یہ کہتے تھے' بس ہماری یہی موت ہے' جس سے ہم دوچار ہوں گے۔ اس کے بعد نہ زندگی ہے اور نہ حشر و نشر ہے اور اس کو وہ "پہلی" اس معنی میں کہتے تھے کہ حشر و نشر کا جو ڈراوا ہمیں سنایا جا رہا ہے اس سے یہ پہلی ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ یہی موت ہے اور اسی پر سب کچھ ختم ہونے والا ہے۔ کیونکہ ان کے آباء و اجداد بس ایک ہی بار مر گئے۔ اور ان میں سے کوئی بھی اس جہاں میں واپس نہیں آیا۔ نہ کبھی کوئی اٹھایا گیا اور ان کا مطالبہ ہی یہ ہوتا تھا کہ اگر

نشور حق ہے تو لاؤ ہمارے آباء کو۔

لیکن اس مسئلے پر وہ حشر و نشر کی حکمت پر غور نہ کرتے تھے اور یہ بھی محسوس نہ کرتے تھے کہ حشر اور نشر انسانی نشوونما کا ایک مرحلہ ہے۔ اس کی ایک خاص حکمت ہے اور ایک متعین مقصد ہے۔ وہ یہ کہ زندگی کے پہلے مرحلے میں کس نے کیا کیا۔ جو اچھے لوگ ہیں اور جنہوں نے دنیا کی زندگی کے اس مرحلے میں اچھا رویہ اختیار کیا ان کو اچھا بدلہ دیا جائے اور جن لوگوں نے یہاں برا رویہ اختیار کیا ان کو اس کا بدلہ دیا جائے اور نہایت ہی ناپاک اور غلیظ زندگی دی جائے' اگر اچھوں کو جزائے خیر نہ دی جائے اور بروں کو مناسب سزا نہ دی جائے تو یہ حق بات نہ ہوگی۔ اس حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس پوری زمین پر موجودہ مرحلہ حیات ختم ہونے کے بعد حشر و نشر ہو اور حساب و کتاب ہو۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ کائنات کی اس پوری سکیم کو ختم کر کے' محض چند لوگوں کے مطالبے پر چند افراد یا ایک گروہ کے حشر و نشر کا ڈراما کیا جائے اور ان کے مطالبے کو پورا کیا جائے جبکہ ان کو موت کے بعد اٹھائے جانے پر یقین بھی نہیں ہے جس کی اطلاع ان کو تمام رسولوں نے بالاتفاق دی ہے۔ اور اس زندگی پر اچھی طرح غور و فکر کرنے سے بھی عقل اس کا تقاضا کرتی ہے اس طرح اللہ کے نظام تخلیق میں بھی اگر غور کیا جائے تو انسان قیام قیامت پر یقین کر سکتا ہے۔

قبل اس کے کہ ان کو اس پوری کائنات کے اساسی نقشے پر غور و فکر کی دعوت دی جائے۔ ان کے دل و دماغ کو ایک ایسے تاریخی واقعہ کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے' جس کے وقوع سے وہ اچھی طرح باخبر تھے' یعنی قوم تبع اور ملوک حمیر کے واقعات۔ یہ تاریخ اس وقت کے لوگوں کو اچھی طرح معلوم تھی اس لیے اس کی طرف مختصر اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ ذرا ان کے دلوں کے اندر خدا کی پکڑ کا ڈر تازہ ہو جائے۔

أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَّالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ أَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ

(۴۴: ۳۷) "یہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے ان کو اسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے"۔ اس یاد دہانی کی فضا میں اور کانپتے ہوئے دلوں اور اللہ کی پکڑ کے تصور کی اس فضا میں ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ اس پوری کائنات کی تخلیق کا نقشہ کیا ہے۔ اس کائنات کے اندر بالارادہ نہایت ہی گہری سچائی رکھی گئی ہے اس کا تقاضا بھی یہ ہے کہ حشر و نشر لابدی ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِينَ (۴۴: ۳۸) مَا خَلَقْنٰهُمَآ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۴۴: ۳۹) إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقٰتُهُمْ أَجْمَعِينَ (۴۴: ۴۰) يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَن مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۴۴: ۴۱) إِلَّا مَن رَّحِمَ اللّٰهُ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۴۴: ۴۲) "یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ ان

سب کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے' وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی' سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے' وہ زبردست اور رحیم ہے"۔ یہ ایک نہایت ہی لطیف اشارہ ہے کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو مخلوقات پیدا کی گئی ہیں' اس کے اور مسئلہ حشر و نشر کے درمیان ایک لطیف ربط ہے اور انسانی فطرت اس کا ادراک اس وقت کر سکتی ہے جب وہ اس کائنات کی تخلیق پر گہرا غور و فکر کرے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا جو نقشہ اور اسکیم ہے۔ وہ نہایت پیچیدہ اور گہری ٹیکنالوجی پر مبنی ہے۔ اس کے اندر تمام باریکیاں ایک مقصد اور ارادے کے ساتھ رکھی گئی ہیں۔ یہ تخلیق بڑی مربوط ہے۔ اور اس کے اندر ہر چیز ایک مقدار مطلوب کے مطابق ہے' نہ اس میں کمی ہوتی ہے اور نہ اضافہ ہوتا ہے۔ ہر چیز اپنے ماحول کے اندر پوری طرح فٹ ہے۔ جس چیز کو جس شکل و صورت میں پیدا کیا گیا ہے' اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طرح ضروری ہے اور یہ بات بعید از امکان ہے کہ اس قدر پیچیدہ ٹیکنالوجی محض بخت و اتفاق سے پیدا ہو گئی ہو اور اس پوری کائنات میں جو ہولناک حد تک عظیم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام باتوں پر اچھی طرح غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا بھی کوئی بڑا مقصد ہے اور وہ صرف اس صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ حشر و نشر کو تسلیم کیا جائے۔ یہ کائنات حق پر قائم ہے' اس میں کوئی چیز باطل نہیں ہے' اس کا ایک انجام ہے جو ابھی واقع نہیں ہوا۔ یہ انجام اور مقصد صرف موت سے پورا نہیں ہوتا کیونکہ موت تو اس دنیا کا انجام ہے۔ اس دنیا کے مختصر سفر کا اختتام ہے۔ اور حشر و نشر تو محض منطقی حوالے سے بھی ضروری ہے کیونکہ جب تخلیق سچائی پر ہے تو نیکی اور بدی کا فیصلہ بھی سچائی پر ہونا چاہئے۔ انسان کے اندر آغاز حیات سے صلاح و فساد کی صلاحیت رکھی گئی ہے۔ اور وہ یہاں یا صلاح اختیار کرتا ہے یا فساد لہٰذا اسے صلاح کا انعام اور فساد کی سزا ملنی چاہئے۔

یہ کہ انسان کو نیکی اور بدی کی صلاحیت دی گئی ہے اور یہ کہ اللہ نے انسان کو اس طرح عبث نہیں پیدا کیا ہے' لہٰذا نیک اور بد کا متعین انجام ضروری ہے اور یہ انجام اس دنیا کی مختصر زندگی کے بعد ہونا چاہئے۔ لہٰذا حشر و نشر اس کائنات کی تخلیق کے نقشے کے اندر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہنے کے بعد کہ کائنات کو عبث نہیں پیدا کیا گیا' قیامت کا ذکر آتا ہے۔

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ (۴۴ : ۴۰) يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۴۴ : ۴۱) إِلَّا مَن رَّحِمَ اللَّهُ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۴۴ : ۴۲)

"ان سب لوگوں کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے' وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی' سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے' وہ زبردست اور رحیم ہے"۔

قیامت کی یہ بات اپنی ماقبل کی باتوں اور آیات سے نہایت مربوط طور پر یہاں لائی گئی ہے۔ حکمت اور حق کا تقاضا یہ ہے کہ ایک یوم الفصل ہو' جس میں لوگوں کے باہم فیصلے بھی چکائے جائیں اور ضلالت و ہدایت کے فیصلے بھی کیے جائیں' نیکی کو عزت بخشی جائے اور برائی اور شر کو سزا دی جائے' اور لوگ تمام ارضی سہاروں سے بے نیاز ہوں' عزیز و

، اقارب کا وہاں کوئی آسرا نہ ہو۔ وہ اکیلے اکیلے وہاں جائیں جس طرح خالق نے انہیں پیدا کیا ہے۔ خالق وہاں ان کو اس کی جزاء دے جو انہوں نے کمایا۔ کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہو، کوئی ان پر رحم کرنے والا نہ ہو، بس صرف اللہ، قادر مطلق، عزیز و رحیم ہی کا بھروسہ اور فضل ہو۔ کیونکہ اسی نے ان کو اس زمین پر لا کر کام میں لگایا اور وہی ہے جو ان کو سزا دے گا۔ اور یہاں ان کے بسائے جانے اور اٹھائے جانے کے درمیان جو مختصر زندگی ہے، یہ ابتلا اور آزمائش کی زندگی ہے۔

یوں اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کے اصلی نقشے میں اور زمین و آسمان کی ساخت کے انداز میں سچائی ودیعت کردہ ہے اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کا ایک مقصد ہے۔

--- ooo ---

ان باتوں کے بعد اب قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر، سرکشوں کی سزا اور اطاعت کیشوں کے لیے انعام، یہ ایک نہایت ہی خوفناک اور شدید منظر ہے اور اس پوری سورت کی فضا کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ﴿٤٣﴾ طَعَامُ الْأَثِيمِ ﴿٤٤﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ﴿٤٥﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ﴿٤٦﴾ خُذُوهُ فَاعْتِلُوهُ إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ﴿٤٨﴾ ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ﴿٤٩﴾ إِنَّ هَٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ ﴿٥٠﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ﴿٥١﴾ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿٥٢﴾ يَلْبَسُونَ مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَقَابِلِينَ ﴿٥٣﴾ كَذَٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ﴿٥٤﴾ يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ ﴿٥٥﴾ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۖ وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿٥٦﴾ فَضْلًا مِنْ رَبِّكَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٥٧﴾

"زقوم کا درخت گناہ گار کا کھانا ہو گا، تیل کی تلچھٹ جیسا، پیٹ میں وہ اس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔" "پکڑو اسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اور اس کو جہنم کے بیچوں بیچ اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔ چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے۔ خدا ترس لوگ امن کی جگہ میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں، حریر و دیبا کے لباس پہنے، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ ہوگی ان کی شان۔ اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں ان سے بیاہ دیں گے۔ وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں گے۔ وہاں موت کا مزہ وہ کبھی نہ چکھیں گے۔ بس دنیا میں جو موت آچکی، سو آچکی۔ اور اللہ اپنے فضل سے ان کو جہنم کے عذاب سے بچا دے گا، یہی بڑی کامیابی ہے"۔

یہ منظر زقوم کے درخت کے پیش کرنے سے شروع ہوتا ہے اور یہ بدکاروں کی خوراک ہو گا۔ اور یہ اس قدر کڑوا ہو گا جس طرح تیل کی تلچھٹ کڑوی ہوتی ہے۔ یہ جہنمیوں کی خوراک کی خوفناک تصویر کشی ہے اور یہ تلچھٹ پیٹ میں یوں جوش مارے گا جس طرح پتیلے میں پانی کھولتا ہے۔ ان بدکاروں کے پیٹ میں' جو برتری دکھاتے تھے رب پر اور اس کے رسول امین پر۔ فرمان الٰہی یوں ان "شرفاء" کے لیے صادر ہوتا ہے۔

خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰی سَوَآءِ الْجَحِیْمِ (۴۴:۴۷) ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ (۴۴:۴۸) "پکڑو اسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اس کو جہنم کے بیچوں بیچ اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب"۔ یعنی پکڑو اسے سخت بے دردی کے ساتھ۔ کس کر باندھو اسے اور پھر رگیدتے ہوئے جہنم کی طرف لے جاؤ' کوئی نرمی اور کوئی باعزت گرفتاری نہ ہو۔ اور ان کے سروں پر اس قدر سخت گرم پانی انڈیل دو کہ ان کو بھون کر رکھ دے' اس سختی' کھینچنے' دھکیلنے' رگیدنے گرم پانی سے جلانے اور داغ دینے کے ساتھ جہنم کے اندر گراؤ اور پھر یہ بھی کہہ دو:

ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ (۴۴:۴۹) "چکھ اس کا مزا' بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو"۔ جو لوگ عزت اور شرافت کے بغیر عزیز و کریم بنتے ہیں ان کی سزا ایسی ہی ہے۔ تم اللہ اور رسول اللہؐ کے مقابلے میں یہی کچھ کرتے تھے۔ تم اس دن میں شک کرتے تھے اور مذاق اڑاتے تھے اور ٹھٹھے کرتے تھے۔

اس منظر میں ایک طرف تو پکڑ دھکڑ' باندھنا اور داغنا ہے اور گرم پانی گرانا ہے اور دوسری طرف وہ حقیقی شریف و کریم لوگ ہیں جو متقین تھے' جو ہروقت اس دن سے ڈرتے تھے۔ یہ لوگ نہایت ہی امن کے مقام میں کھڑے ہیں' نہ ڈر ہے اور فریاد و فغاں ہے' نہ کھینچا تانی ہے اور نہ دھکم پیل ہے' اور نہ ان پر سختی اور گرم پانی گرانا ہے۔ بلکہ وہ نہایت ہی بہتر پوزیشن میں ہیں۔ باغات میں جہاں ہر طرف چشمے بہہ رہے ہیں۔ یہ نرم و باریک ریشم اور موٹے ریشم کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں وہ ایک دوسرے کے بالمقابل تکیوں پر بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ شریک محفل ہیں۔ پھر ان کو وہاں ایسی بیویاں دی جائیں گی جو نہایت ہی خوبصورت آنکھوں والی ہوں گی۔ یوں یہ نعمت اور فرحت تمام ہو گی اور وہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقیم ہوں گے جو بھی وہاں چاہیں گے' ملے گا۔

یَدْعُوْنَ فِیْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِیْنَ (۴۴:۵۵) "وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں گے"۔ یعنی ان کو ان نعمتوں کے ختم ہونے کا کوئی اندیشہ نہ ہو گا' نہ موت ہو گی جبکہ ایک بار وہ مر چکے۔ اور اس کے سوا کوئی اور موت ہو گی ہی نہیں۔ مشرکین تو یہ کہتے تھے کہ یہی پہلی موت ہے اور حشر و نشر نہ ہو گا' اس کے جواب میں ہے کہ ٹھیک ہے یہی پہلی موت ہے لیکن حشر و نشر ہو گیا' اب کوئی موت نہیں ہے' اگرچہ تم موت چاہتے ہو۔ اور اللہ نے اہل ایمان کو جہنم سے بچالیا' محض اپنے فضل و کرم سے کیونکہ نجات تو اللہ کے فضل و کرم پر موقوف ہے۔

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۴۴:۵۷) "اور اللہ اپنے فضل سے ان کو موت

سے بچائے گا' یہی بڑی کامیابی ہے" ۔ اور نہایت ہی عظیم کامیابی!

اس شدید منظر کے بعد اب سورت کا خاتمہ اسی بات پر ہوتا ہے جس سے اس کا آغاز ہوا تھا کہ یہ قرآن اور یہ رسالت اللہ کی طرف سے نعمت عظمیٰ ہے اور اس نعمت کا انکار اور رسول کی تکذیب کے نتائج سے متنبہ کیا جاتا ہے۔

۳

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۵۸﴾ فَارْتَقِبْ إِنَّهُم مُّرْتَقِبُونَ ﴿۵۹﴾ ۱۷ع

۱۶

"اے نبی"' ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں سہل بنا دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں ۔ اب تم بھی انتظار کرو' یہ بھی منتظر ہیں"۔

یہ اس سورت کا خاتمہ ہے' اس میں اس پوری سورت کی فضا اور اس کے موضوع بحث کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے ۔ یہ خاتمہ اس کے آغاز اور اس میں بحث کی جو لائن اختیار کی گئی ہے اس کے مطابق ہے ۔ آغاز ذکر کتاب' نزول کتاب اور غرض نزول یعنی ڈرانے اور نصیحت کرنے سے ہوا تھا ۔ اور اس کے سیاق میں اس عذاب کی تشریح کی گئی تھی ۔ جو ان مکذبین کے انتظار میں ہے ۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ (۴۴ : ۱۶) "جس دن یہ بڑی ضرب لگائیں گے' وہ دن ہو گا جب ہم تم سے انتقام لیں گے"۔ اب یہ خاتمہ یوں ہے کہ ان کو یاد دلایا جاتا ہے کہ رسول کریم کی زبانی قرآن مجید تمہارے لیے آسان کر دیا گیا ہے جو عربی زبان میں ایک عربی بولنے والے رسول پر نازل کیا گیا ہے ۔ تم اس کو سمجھ سکتے ہو' وہ آپ کو سمجھا سکتے ہیں' اگر تم نے اسے تسلیم نہ کیا تو ایک نہایت ہی خوفناک انجام تمہارے انتظار میں ہے ۔

فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ (۴۴ : ۵۹) "تم بھی انتظار کرو' یہ بھی منتظر ہیں"۔

--- ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ------ ۲۵

سورۃ الجاثیہ ۔ ۴۵

آیات ۱--- تا--- ۳۷

سورۃ الجاثیہ ایک نظر میں

یہ بھی مکی سورت ہے ۔ یہ بتاتی ہے کہ مکہ میں مشرکین نے دعوت اسلامی کا استقبال کس طرح کیا اور دعوت اسلامی کی آیات و دلائل کا مقابلہ کس انداز سے کیا ۔ دعوت اسلامی کے حقائق اور مسائل اور نظریات کے مقابلے میں ان کا ردعمل کیا رہا ۔ غرض انہوں نے بغیر کسی شرم و حیا کے اور واضح سچائی کو دیکھتے ہوئے اور بین دلائل کو سنتے ہوئے بھی پوری طرح اپنی خواہشات کی پیروی کی ۔ پھر یہ سورت تصویر بھی دکھاتی ہے کہ قرآن مجید نے ان سنگدل اور ہوا و ہوس کے پیچھے سرپٹ دوڑنے والے لوگوں کی اصلاح کے لیے کیا کیا طریقے اختیار کیے ۔ ایسے لوگوں کی اصلاح کی خاطر جن کے دل پردوں اور غلافوں میں لپٹے ہوئے تھے اور ہدایت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے ۔ ایسے لوگوں کے سامنے قرآن کریم نے نہایت ہی گہرے اثر والے دلائل اور نہایت ہی فیصلہ کن براہین پیش کیے ۔ ان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا ' ان کے سامنے جنت کی تصویر پیش کی ۔ اللہ کے سنن گنوائے اور اس کائنات میں چلنے والے نوامیس فطرت بتائے ۔

اس سورت کی آیات اور اس کے مناظر کے درمیان ہمیں اس قسم کے کردار بھی نظر آتے ہیں جن کو گمراہی پر اصرار ہے ' جو حق کے مقابلے میں ناحق ڈٹے ہوئے ہیں ' دعوت اسلامی کے ساتھ سخت عناد رکھتے ہیں ' اللہ کے حق میں اور اللہ کے کلام کے حق میں نازیبا باتیں کرتے ہیں ۔ یہ آیات ایسے لوگوں کی تصویر حقیقی رنگ میں پیش کرتی ہیں اور ان کو مناسب سرزنش کرتی ہیں ۔ اللہ کے عذاب الیم و عظیم سے ڈراتی ہیں اور نہایت ہی توہین آمیز انجام کے بارے میں بتاتی ہیں ۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (٧) يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (٨) وَإِذَا عَلِمَ مِنْ آيَاتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ (٩) مِّن وَرَائِهِمْ جَهَنَّمُ وَلَا يُغْنِي عَنْهُم مَّا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (١٠) (٤٥ : ٧ تا ١٠) " تباہی ہے ہر اس جھوٹے بداعمال شخص کے لیے جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں ' اور وہ ان کو سنتا ہے ' پھر پورے غرور کے ساتھ اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں ۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو اور ہماری آیات میں سے کوئی بات جب اس کے علم میں آتی ہے تو وہ اس کا مذاق بنا لیتا ہے ۔ ایسے سب لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے ۔ ان کے آگے جہنم ہے جو کچھ بھی انہوں نے دنیا میں کمایا ہے اس میں سے کوئی چیز ان کے کام نہ آئے گی ۔ نہ ان کے وہ سرپرست ہی ان کے کچھ کام آئیں گے جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے اپنا ولی بنا رکھا تھا ان

کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس سورت میں ہم ایک ایسے گروہ سے بھی ملتے ہیں جن کا تصور اور جن کے اندازے بالکل غلط ہیں۔ غالباً یہ اہل کتاب ہیں۔ یہ لوگ خالص ایمان کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے' نہایت بدکار لوگ ہیں یہ اور ان کے مقابلے میں اہل ایمان نہایت ہی اچھے لوگ ہیں لیکن وہ اس فرق کو نہیں سمجھتے۔ قرآن کریم انہیں سمجھاتا ہے کہ ایسے دونوں گروہوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے پیمانوں کے مطابق بہت بڑا فرق ہے اور ان کو بتایا جاتا ہے کہ ان کا نظریہ اور ان کے یہ فیصلے کس قدر غلط ہیں' اللہ کے پیمانوں کے مطابق تمام معاملے اس میزان عدل کے مطابق ہوتے ہیں جس کو اس پوری کائنات کے لیے ریڑھ کی ہڈی بنایا گیا ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۲۱) وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ

(۲۲) (۴۵ : ۲۱ تا ۲۲) "کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے' یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے گا؟ بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔ اللہ نے تو آسمان اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے' لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا"۔

ایک کردار ایسا بھی ہمارے سامنے آتا ہے جو صرف نفس کے قاضی کے فیصلے مانتا ہے۔ گویا اس کا الہ اس کے اندر ہے اور یہ اسی کا مطیع فرمان ہے۔ ایسے کرداروں کی ایک انوکھی تصویر کھینچی گئی ہے۔ یہ شخص اپنی اس روش پر خوب اتراتا ہے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۴۵ : ۲۳) "پھر کبھی تو نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے"۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ قیامت کے منکر ہیں اور وہ حشر و نشر کے بارے میں پوری طرح شک میں مبتلا ہیں۔ اور نہایت ہی ہٹ دھرمی کے ساتھ اس قسم کی دلیل طلب کرتے جس کا مظاہرہ اس دنیا میں زمین پر نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم ایسے لوگوں کے سامنے بھی ایسے دلائل پیش کرتا ہے جو موجود ہیں۔ یہ نہایت ہی دل پذیر دلائل ہیں لیکن یہ لوگ ان سے منہ موڑتے ہیں۔

وَقَالُوْا مَاهِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۲٤) وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۵) قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

(۲٦) (٤٥: ۲٤ تا ۲٦) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے۔ اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔ درحقیقت اس معاملہ میں ان کے پاس کوئی علم نہیں۔ یہ محض گمان کی بنا پر باتیں کرتے ہیں اور جب ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔ اے نبی ' ان سے کہو اللہ ہی تمہیں زندگی بخشتا ہے۔ پھر وہی موت دیتا ہے پھر وہی تم کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔

ہو سکتا ہے کہ یہ سب لوگ ایک ہی گروہ ہوں اور یہی گروہ یہ سب باتیں کرتا ہو اور قرآن کریم جگہ جگہ ' ان کی بات کرتا ہو ' لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مختلف گروہ ہوں اور مکہ میں اپنی اپنی جگہ میں کام کرتے ہوں اور ان میں بعض اہل کتاب بھی ہوں۔ اگرچہ اہل کتاب مکہ میں بہت ہی قلیل تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اشارہ انہی اہل کتاب کی طرف ہو اور اہل مکہ کو نصیحت کے لیے یہ بات کی جا رہی ہو۔ اگرچہ وہ مکہ میں موجود نہ ہوں۔

بہرحال قرآن کریم نے ان لوگوں کی یہ صفات دے کر یہاں ان کی تردید کی۔ اور اس سورت میں ان کے بارے میں مفصل بات کی۔ قرآن کریم نے ان کے سامنے آفاق اور انفس کے دلائل بھی پیش کیے اور ان کو قیامت کے دن سے ڈرایا اور یہ بھی بتایا کہ ذرا تاریخ انسانی کے جھروکوں میں سے دیکھو کہ مکذبین کس انجام سے دوچار ہوتے رہے۔

ان کے سامنے قرآن مجید نے نہایت ہی سادہ اور پرتاثیر اسلوب میں بات پیش کی :

اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۳) وَ فِيْ خَلْقِكُمْ وَ مَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (٤) وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۵) تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (٦) (٤٥: ۳ تا ٦) "حقیقت یہ ہے کہ آسمان اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ' ایمان لانے والوں کے لیے۔ اور تمہاری اپنی پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو اللہ پھیلا رہا ہے ' بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں اور شب و

روز کے فرق و اختلاف میں اور اس رزق میں جسے اللہ آسمانوں سے نازل فرماتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے اور ہواؤں کی گردش میں، بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جو ہم تمہارے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔ آخر اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے"۔

اور یہ دلائل و نشانات اللہ ان کے سامنے اپنے انعامات میں سے کسی نہ کسی شکل میں پیش فرماتا ہے، جن کو انہوں نے بھلا دیا ہے تاکہ وہ انہیں یاد کریں اور ان پر غور کریں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۲) وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۱۳) (۴۵: ۱۲ تا ۱۳) "وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو، اور شکر گزار ہو۔ اس نے زمین و آسمان کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ سب کچھ اپنے پاس سے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں"۔

پھر اللہ نے ان کے سامنے ان حالات کا خوبصورت نقشہ بھی رکھ دیا ہے اس دن کا جس کا یہ انکار کرتے ہیں اور جس میں ان کو گہرا شک ہے۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یَوْمَئِذٍ یَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ (۲۷) وَ تَرٰی كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِیَةً كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤی اِلٰی كِتٰبِهَا اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۸) هٰذَا كِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْكُمْ بِالْحَقِّ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹) فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِیْ رَحْمَتِهٖ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ (۳۰) وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اَفَلَمْ تَكُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ (۳۱) وَ اِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ (۳۲) وَ بَدَا لَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ (۳۳) وَ قِیْلَ الْیَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا

نَسِيتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۳۴) ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ (۳۵) (۴۵ : ۲۷ تا ۳۵) ”اور جس روز قیامت کی گھڑی آکھڑی ہو گی اس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے ۔ اس دن ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے ۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامہ اعمال دیکھے ۔ ان سے کہا جائے گا' آج تم لوگوں کو تمہارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کر رہے تھے ۔ یہ ہمارا تیار کیا ہوا اعمال نامہ ہے' جو تمہارے اوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے' جو کچھ بھی تم کرتے تھے' اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے ۔ پھر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تھے ۔ انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہی صریح کامیابی ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا ۔ کیا میری آیات تم کو نہیں سنائی جاتی تھیں مگر تم نے تکبر کیا اور مجرم بنے رہے اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے ۔ ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں ۔ یقین ہم کو نہیں ہے“ ۔ اس وقت ان پر ان کے اعمال کی برائیاں کھل جائیں گی اور وہ اس چیز کے پھیر میں آجائیں گے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ ”آج ہم بھی اس طرح تمہیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے تمہارا ٹھکانا اب دوزخ ہے ۔ اور کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے ۔ یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق بنا لیا تھا اور تمہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا ۔ لہٰذا آج نہ یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے کہا جائے گا کہ معافی مانگ کر اپنے رب کو راضی کرو“ ۔

اس طرح اللہ نے منصفانہ جزاء و سزا اور ہر شخص کی انفرادی ذمہ داری کے اصول میں کوئی شک نہیں رہنے دیا اس لیے یہ بتایا گیا کہ یہ اصول اس کائنات کے وجود میں بہت ہی گہرا ہے ۔ اس اصول پر یہ کائنات قائم ہے ۔ اس آیت میں کہا گیا :

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (۴۵ : ۱۵)

”جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو برائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا خمیازہ بھگتے گا ۔ پھر جانا تو سب کو رب ہی کی طرف ہے“ ۔

اور جو لوگ بدکاریاں کرتے ہیں اور پھر یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے ہاں مومنین ہی کی طرح ہوں گے جو نیک کام کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے ۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۴۵ : ۲۲) ”اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے اور لوگوں پر ظلم نہ کیا جائے“ ۔

یہ پوری سورت ایک ہی ٹکڑا ہے لیکن ہم نے تشریح کی سہولت کے لیے اسے دو شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے ۔ اس کا

آغاز حروف مقطعات حاء میم سے ہوتا ہے ـ پھر قرآن کریم کے نزول کی طرف اشارہ ہے ـ

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۴۵: ۲) ”کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے“ـ اور اس کا خاتمہ بھی حمد الہٰی اور اللہ کی عام ربوبیت سے بیان ہوتا ہے ـ نیز اللہ کی پاکی اور عظمت کے بیان پر ہوتا ہے اور یہ حمد و ثنا اور عظمت اور تمجید ان لوگوں کے خیالات کے مقابلے میں بیان کی گئی جو اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں اور ٹھٹھے مارتے ہیں ـ

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۵: ۳۶) وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۵: ۳۷) ”پس تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو زمین اور آسمانوں کا مالک ہے اور سارے جہاں والوں کا پروردگار ہے ـ زمین و آسمانوں میں بڑائی اسی کے لیے ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے“ـ

اس سورت کا انداز بیان سورت دخان کے مقابلے میں سہل ' دھیما ' واضح اور گہرا اور سنجیدہ ہے جبکہ سورۂ دخان نہایت پرشوکت اور شدید اور رعب دار انداز میں تھی ـ جس میں قلب و ضمیر اور دل و دماغ پر شدید ضربات لگائی گئی تھیں ـ اللہ تمام دلوں کا خالق ہے ـ قرآن کا نازل کرنے والا ہے ' بعض اوقات اصلاح کے لیے سخت انداز اختیار کرتا ہے اور بعض اوقات نہایت ہی نرم و نازک ' درشتی و نرمی بہم درجہ است ـ موقع و محل اور حالات کے مطابق ـ اللہ لطیف و خبیر ہے اور عزیز و حکیم ہے ـ اب تفصیلات تشریح ـ

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۳۵ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۲۳

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ح م۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لیے۔ اور تمہاری اپنی پیدائش میں' اور ان حیوانات میں جن کو اللہ (زمین میں) پھیلا رہا ہے' بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں اور شب و روز کے فرق و اختلاف میں' اور اس رزق میں جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے' پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے' اور ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔

حا۔ میم کے بعد' یہ آتا ہے کہ یہ کتاب اللہ عزیز اور حکیم کی طرف سے ہے اور اس کتاب کا مصدر اور منبع اللہ کی ذات ہے اور دوسرا اشارہ اس میں یہ ہے کہ یہ معجز کتاب انہی حروف سے بنائی گئی ہے۔ جیسا کہ حروف مقطعات کے بارے میں ہماری رائے ہے اور یہ کہ یہ چیلنج ہے ان کو کہ تم ان حروف سے ایسی کتاب نہیں بنا سکتے۔ لہٰذا حا میم دلیل ہے تنزیل الکتب پر کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ زبردست قدرت والا ہے اور اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا اور حکیم ہے جس نے اس پوری کائنات کو حکمت سے بنایا اور تمام معاملات اس ذات کے حکم سے طے ہوتے ہیں۔ یہ ایک

ایسا تبصرہ ہے جو سورت کی فضا کے ساتھ مناسب ہے 'جس میں طرح طرح کے نفوس اور ان کی ذہنیت دکھائی گئی ہے۔

قبل اس کے کہ لوگوں کے سامنے 'اس کتاب کے حوالے سے ان کا موقف رکھا جائے 'ان کو ان آیات و نشانات کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اس کائنات میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔یہ آیات اور یہ نشانیاں اس بات کے لیے کافی تھیں کہ یہ لوگ ایمان لاتے اور یہ لوگ اپنے دلوں کو اگر ان کی طرف متوجہ کرتے تو ان کے دل کھل جاتے اور اس کتاب کے نازل کرنے والے عظیم اللہ کی طرف ان کا احساس تیز ہو جاتا جو اس کائنات کا ایک عظیم خالق ہے۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۴۵ : ۳) "حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں"۔ اور وہ نشانیاں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ کسی چیز تک محدود نہیں ہیں 'کسی حال تک محدود نہیں ہیں 'اس کائنات کی جس چیز کو بھی انسان دیکھے اور مطالعہ کرے تو دل گواہی دیتا ہے کہ یہی پہلو ایک معجزہ ہے گویا "جا اینجا است"۔ سوال یہ نہیں ہے کہ نشانی کہاں ہے 'سوال یہ ہے کہ کون سی چیز نشانی نہیں ہے؟

ذرا دیکھو ان آسمانوں اور ان کے اندر تیرنے والے عظیم الجثہ اجرام فلکی کو 'پھر اس کی طویل و عریض وسعتوں کو 'یہ اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جس طرح ذرات اور رائی کے دانے 'بمقابلہ اس فضا اور خوفناک حد تک عریض و طویل فضا کے نیز یہ نہایت ہی خوبصورت ہیں۔

پھر ذرا اس بات کو دیکھو کہ ان اجرام کی گردش اپنے اپنے مدار میں کس قدر تسلسل کے ساتھ قائم ہے۔ نہایت ہی خوبصورت ہم آہنگی کے ساتھ 'انسان یہ چاہتا ہے کہ دیکھتا ہی رہ جائے اور اس کے ملاحظے سے جی بھرتا ہی نہیں۔ بعض گردشیں کروڑوں سالوں میں مکمل ہوتی ہیں اور ایک سیکنڈ کا فرق نہیں پڑتا۔

اور یہ زمین جسے انسان بہت ہی طویل و عریض سمجھتا ہے 'یہ ایک نہایت ہی چھوٹا سا ذرہ ہے 'بمقابلہ ان بڑے ستاروں کے (صرف مشتری اس سے ایک ہزار گنا زیادہ بڑا ستارہ ہے) پھر یہ ذرہ یعنی زمین 'اس وسیع فضائے کائنات کے اندر تیر رہی ہے۔ اگر اللہ کی قدرت نہ ہوتی جس نے اسے تھام رکھا ہے اور اپنے مدار میں بند کر رکھا ہے تو یہ اس فضائے بسیط میں اپنی راہ گم کر دیتی لیکن اللہ کی قدرت کا یہ کمال ہے کہ اس کائنات کا ذرہ بھی یہاں گم نہیں ہو سکتا۔

پھر وہ ساز و سامان جو اللہ نے اس زمین میں 'اس کے ایک خاص مقام اور نظام کی وجہ سے ودیعت کیا اور جس کی وجہ سے اس کے اوپر زندگی ممکن ہوئی 'اس کا تو ہر ہر پہلو ایک نشانی ہے۔ اس ساز و سامان کی ہر چیز کے اپنے اپنے خواص 'نہایت باریک بینی کے ساتھ 'بڑی کثرت اور ہم آہنگی کے ساتھ یہاں جمع کیے گئے ہیں۔ اگر کسی ایک چیز کی خاصیت و ماہیت شمہ برابر بدل جائے تو زندگی کا پورا نظام خلل پذیر ہو جائے یا سرے سے ختم ہو جائے۔ غرض اس زمین کی ہر زندہ شے ایک علیحدہ نشانی ہے۔ ہر چیز کا ایک ایک جزء اور ایک ایک عضو ایک الگ نشانی ہے۔ اس معاملے میں عظیم الجثہ اشیاء اور ذرہ برابر کی اشیاء نشانی ہیں۔ ایک عظیم درخت سے ایک چھوٹا سا پتہ اٹھا لو 'اس کائنات کی پہنائیوں میں ایک چھوٹا سا نباتاتی پودا لے لو اور تجربہ کرو 'اپنے حجم اور اپنی شکل کے اعتبار سے یہ ایک نشانی ہے۔ رنگ میں بھی اور چھوٹے پن میں بھی۔ اپنے مقاصد کے لیے بھی نشانی اور اپنے جسم میں بھی نشانی۔ انسان یا حیوان کے جسم کا ایک بال ہی لے لو 'یہ

بھی ایک نشانی ہے' اس کی ترکیب' اس کا رنگ نشانی ہے' ہر پرندے کا ہر پر ایک نشانی ہے' اس کا مادہ ترکیب' اس کے مقاصد' اور اس کی ہم آہنگی۔ اگر انسان اس زمین و آسمان میں چشم بصیرت کے ساتھ دیکھے تو اسے نشانات الٰہیہ کا اژدہام نظر آئے اور انسان اعلان کر دے کہ اس کی فکر و نظر سے یہ تمام نشانات وراء ہیں۔

لیکن یہ نشانیاں کس کے لیے ہیں؟ خود یہ آیات بتا دیتی ہیں' یہ نشانیاں کس کے سامنے پردہ افگند ہوتی ہیں۔ ان کا احساس کس کو ہو سکتا ہے لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۴۵ : ۴) "ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں"۔ جو مومن ہیں اور مومن ہی نور ربی سے دیکھتا ہے۔

پس ایمان ہی وہ قوت ہے جو دلوں کے دروازے کھولتا ہے' پھر انسان پکار سنتا ہے' کوئی روشنی دلوں کو اندر آکر منور کر سکتی ہے' کوئی تازہ باد نسیم کے جھونکے دنیائے دل پر تر و تازگی بکھیر سکتے ہیں اور ایمان ہی کی وجہ سے انسان' اس کائنات میں ہر طرف بکھری ہوئی نشانیاں دیکھ سکتا ہے' یہ ایمان ہی ہے جو دلوں کو ایسی فرحت بخش تازگی عطا کرتا ہے اور ان کے اندر رقت اور لطافت پیدا کرتا ہے' جس کے نتیجے میں یہ دل وہ اشارات وصول کرتے ہیں جو اس کائنات میں سے ہر طرف سے آ رہے ہیں' جو یہ بتاتے ہیں کہ یہ اشارے دست قدرت کی طرف سے ہیں اور دست قدرت جن جن چیزوں کو بناتی ہے ان کے اندر یہ اشارات موجود ہوتے ہیں۔ اللہ کی پیدا کردہ ہر چیز معجزہ ہے اور مخلوق اس کی نقل بھی نہیں کر سکتی۔ اب اس کائنات کی طویل اور دور دراز وادیوں سے واپس لا کر انسان کو اس کی اپنی ذات کی طرف لایا جاتا ہے' جو اس کے قریب ہے۔ اور وہ جانور جو انسان کے قریب ہیں ان پر غور و فکر کی دعوت!

وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٌ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۴۵ : ۴) "اور تمہاری اپنی پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو اللہ زمین میں پھیلا رہا ہے بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں"۔ انسان کو یہ عجیب ساخت عطا کرنا' پھر اسے ایسی عجیب خصوصیات عطا کرنا' اور نہایت ہی گہرے' لطیف اور پیچیدہ فرائض اس کے حوالے کرنا جن میں سے ہر ایک معجزانہ ہے۔ جسم انسانی کے ایسے اندرونی معجزات ہیں کہ رات اور دن دیکھتے دیکھتے وہ ہمارے لئے عجوبے ہی نہیں رہے۔ اس لیے کہ ہمارے اندر اور ہمارے قریب ہیں لیکن صرف ایک عضو کا تجزیہ کیا جائے تو انسان کا سر چکرا جاتا ہے اور انسان اس پیچیدہ ترکیب کی ہولناکیوں سے مبہوت رہ جاتا ہے۔

زندگی' چاہے وہ اپنی سادہ ترین صورت میں کیوں نہ ہو وہ تو ایک معجزہ ہے۔ امیبا جس کا ایک ہی خلیہ ہوتا ہے اور امیبا سے بھی چھوٹی زندگی بھی معجزہ ہے۔ رہا انسان تو اس کی زندگی تو بہت ہی پیچیدہ اور سخت اور عجیب و غریب ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے بھی وہ نہایت ہی پیچیدہ اور معجزاتی ہے۔ عضوی ترکیب سے اس کی نفسیات زیادہ پیچیدہ ہیں۔

اور وہ مخلوقات جو اس زمین پر ہر طرف رینگتی ہے' اور جس کی لاتعداد انواع و اقسام ہیں' بے شمار جسم اور اشکال ہیں جن کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اس زندگی میں سے چھوٹی سے چھوٹی چیز اور بڑی سے بڑی چیز سب اپنی اپنی جگہ معجزاتی ہیں' یہ اپنی عمر اور جنس کے اعتبار سے بھی معجزاتی شان رکھتی ہیں۔ اور یہ قدرتی طور پر اپنی نوع کی حفاظت کرتی ہیں اور کوئی نوع دوسری انواع کو فنا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اور دست قدرت نے ان انواع و اقسام کی تعداد اپنے پاس رکھی ہوئی ہے کسی میں کمی کرتا ہے اور کسی میں اضافہ۔ اور ہر ایک کو اس کے خصائص دیتا ہے اور قوت و صلاحیت دیتا ہے۔ اس

طرح حیوانات کے تمام انواع و اقسام کی آبادی کے اندر ایک توازن قائم رہتا ہے۔

گدھ اور باز جارح اور مضر پرندے ہیں اور ان کی عمر بھی لمبی ہے لیکن ان کی آبادی بہت کم ہے اور بہت کم انڈے دیتے ہیں۔ اگر گدھ اور باز چڑیوں کی طرح ہوتے تو ذرا سوچ لیں کہ اس دنیا میں شاید چھوٹے بڑے کسی پرندے کی نسل نہ ہوتی۔

حیوانات میں سے شیر درندہ جانور ہیں، اگر ان کی نسل ہرنوں اور بھیڑ بکریوں کی طرح زیادہ ہوتی تو وہ جنگلات میں کوئی حیوانی مواد نہ چھوڑتا۔ لیکن یہ قدرت ہے جس نے ان کی نسل کو محدود رکھا ہے اور وہ مطلوبہ تعداد ہی میں ہوتے ہیں جبکہ ہرن اور بھیڑ اور بکریاں زیادہ ہوتی ہیں کیونکہ قدرت کو معلوم ہے کہ ان کی زیادہ ضرورت ہے۔

ایک مکھی ایک ہی زندگی میں لاکھوں انڈے دیتی ہے لیکن اس کی زندگی زیادہ سے زیادہ دو ہفتے ہوتی ہے۔ اگر ایک مکھی کی عمر طبیعی کئی ماہ یا سال ہوتی تو تمام انسانی جسموں کو ڈھانپ دیتیں، آنکھوں کو کھا جاتیں لیکن دست قدرت نے ان پر ایک قدرتی بند بھی رکھا ہے اور اس کی عمر کو محدود کر دیا ہے۔

یونہی، ہر چیز اور ہر نوع کی یہ حالت ہے۔ اللہ کی تدبیر اور تقدیر انسانوں اور حیوانات میں اپنا کام کرتی ہے اور ہر چیز کے اندر ایک قسم کی نشانی ہے۔ اور یہ نشانی پکار پکار کہتی ہے کہ اللہ کی آیات میں غور و تدبر کرو اور یہ آیات لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۴۵:۴) "ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں"۔

یقین ایسی حالت ہے جو دلوں کو تیار اور مائل اور متاثر کرنے والی حالت ہے، تاکہ وہ احساس کریں، متاثر ہوں اور اللہ کی طرف مائل ہوں۔ ایمان و یقین دلوں کو ثابت، برقرار اور مطمئن کر دیتا ہے۔ ایسے دل بڑے ٹھہراؤ سے اس کائنات پر غور کرتے ہیں اور اس سے حقائق اخذ کرتے ہیں۔ ان میں سے بے چینی، پریشانی، بے ثباتی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے دلوں کو اگر اس دنیا میں کم کچھ ملے تب بھی وہ اس سے بڑے نتائج اور آثار حاصل کرتے ہیں۔

اس کے بعد اپنی ذات اور اپنے ارد گرد کے حیوانات سے انہیں اس پوری کائنات کے مظاہر کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ اس کائنات سے ان کے لیے اور دوسرے زندوں کے لیے جو اسباب حیات پیدا کیے جاتے ہیں اور فراہم کیے گئے ہیں ذرا ان پر بھی غور کرو۔

وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۴۵:۵) "اور شب و روز کے فرق و اختلاف میں اور اس رزق میں جسے اللہ آسمانوں سے نازل فرماتا ہے۔ پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں"۔ گردش لیل و نہار وہ منظر ہے جس کے بار بار کی تکرار کی وجہ سے اس کی جدت انسانوں کے ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی پہلی مرتبہ ان کو دیکھے یا پہلی مرتبہ رات کو دیکھے تو یہ ایک عجیب منظر ہے جو دل شاعرانہ احساس رکھتے ہیں وہ اس جدت کو سمجھتے ہیں اور گردش لیل و نہار کو اس کائنات کا ایک حیران کن نظام سمجھتے ہیں۔

انسانوں کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کائنات کے بعض مظاہر کے بارے میں تو اب انسانوں نے وسیع

معلومات حاصل کر لی ہیں ۔ اب انسان جانتے ہیں کہ گردش لیل و نہار دراصل زمین کی گردش محوری سے پیدا ہوتی ہے جو یہ سورج کے سامنے کرتی ہے اور یہ گردش چوبیس گھنٹوں میں مکمل ہوتی ہے لیکن اس علم کے مطابق بھی یہ انوکھا منظر اور عجوبہ ابھی ختم نہیں ہے کیونکہ یہ کرۂ زمین ہوا کے اندر معلق ہے اور ایک خاص رفتار کے ساتھ چل رہا ہے اور وہ کسی چیز کا سہارا نہیں لے رہا ہے ۔ اللہ نے اسے تھام رکھا ہے اور وہ ایک سیکنڈ بھی اپنی رفتار کم نہیں کرتا ۔ اور یہ رفتار ایسی ہے کہ تمام زندہ مخلوقات اس کے اوپر بڑے آرام سے رہ رہی ہے اور یہ مخلوق اس فضا میں معلق گولے کے اوپر ٹکی ہوئی ہے جو فضا میں گردش پر ہے ۔

اب انسان کا علم قدرے اور وسعت اختیار کرتا ہے کہ اس گردش محوری کے اثرات اس زمین کے اوپر اور تمام زندہ مخلوقات پر کیا ہیں ۔ انسان نے معلوم کیا کہ ان اوقات کو اس طرح رات اور دن میں تقسیم کرنے ہی سے اس کرۂ ارض پر زندگی ممکن بنائی گئی ہے ۔ اگر گردش لیل و نہار نہ ہوتے یا اس اندازے اور اس نظام اور رفتار سے نہ ہوتے تو اس زمین کی سطح پر موجود ہر چیز بدل جاتی اور خصوصاً انسانی زندگی ختم ہو جاتی ۔ چنانچہ یوں اس علم کے بعد معلوم ہوا کہ گردش لیل و نہار اللہ کی نشانیوں میں سے بہت اہم نشانی ہے ۔

وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۴۵ : ۵) "اور اس رزق میں جسے اللہ آسمانوں سے نازل فرماتا ہے ۔ پھر اس کے ذریعہ سے مردہ زمینوں کو جلا اٹھاتا ہے" ۔ رزق سے بھی تو پانی مراد ہوتا ہے جو آسمانوں سے آتا ہے جس طرح قدیم مفسرین نے اس سے یہی سمجھا ہے لیکن آسمانوں سے آنے والا صرف پانی بہت وسیع ہے ۔ آسمانوں سے جو شعاعیں نکلتی ہیں وہ زمین کو زندہ کرنے میں پانی سے کوئی کم موثر نہیں ہیں بلکہ ان شعاعوں ہی کے اثر سے حکم الہٰی سے پانی پیدا ہوتا ہے ۔ سورج کی حرارت ہی پانی کو بخارات میں بدلتی ہے ۔ اور یہ بخارات کثیف ہو کر بارش کی شکل اختیار کرتے ہیں اور نہریں اور چشمے بہتے ہیں ۔ اور اس سے زمین مردہ ہونے کے بعد زندہ ہو جاتی ہے ، پانی سے بھی اور حرارت سے بھی ۔

وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ (۴۵ : ۵) "اور ہواؤں کی گردش میں" ۔ یہ ہوائیں شمالاً و جنوباً چلتی ہیں ، شرقاً اور غرباً چلتی ہیں ، سیدھی اور ٹیڑھی چلتی ہیں ، گرم اور سرد چلتی ہیں ۔ اس نہایت ہی پیچیدہ نظام کے مطابق جو دست قدرت نے اس کائنات کی تخلیق کے اندر رکھ دیا ہے اور اس کی ہر چیز کو حساب و مقدار سے رکھا ہے اور اس میں کوئی چیز اتفاق اور مصادفت پر نہیں چھوڑا ، پھر ہواؤں کے چلنے کا زمین کی گردش محوری سے گہرا تعلق ہے ۔ اور ان کا تعلق گردش لیل و نہار سے بھی ہے اور اس رزق سے بھی ہے جو آسمانوں سے نازل ہوتا ہے ۔ غرض حرارت ، ہوا اور رات اور دن کا نظام سب مل کر یہاں کام کرتے ہیں اور ان میں آیات و نشانات ہیں ۔ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۴۵ : ۵) "ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں" ۔ کیونکہ اس میدان میں عقل ہی کام کر سکتی ہے ۔

--- ooo ---

یہ تو ہیں اس کائنات کی بعض نشانیاں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ۔ پھر ان لوگوں کے لیے جو یقین کرتے ہیں اور پھر ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں ۔ یہ آیات ان کی طرف اشارہ کرتی

ہیں۔ یہ اشارات دلوں کو چھوتے ہیں' ان کو جگاتے ہیں اور یہ آیات الٰہیہ انسانی فطرت سے براہ راست مخاطب ہوتی ہیں کیونکہ فطرت انسانی اور اس کائنات کے درمیان براہ راست فطری رابطہ ہے۔ اور اس رابطے کو قرآن کا طرز استدلال ہی زندہ اور تازہ کر سکتا ہے۔ جو لوگ ان آیات فطرت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان سے کوئی توقع نہیں ہے کہ وہ کسی اور چیز کو تسلیم کریں گے جن لوگوں کو قرآن کریم کے یہ اشارات اور آیات نہیں جگا سکتیں' ان کو کوئی اور آواز نہیں جگا سکتی خواہ وہ جس قدر تیز آواز ہو۔ ذرا سنئے :

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

"یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جنہیں ہم تمہارے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔ اب آخر اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے"۔

کوئی کلام' کلام الٰہی کی طرح فصیح نہیں اور کوئی تخلیق مخلوقات الٰہیہ کی طرح بدیع نہیں ہے۔ کوئی حقیقت بھی وجود باری کی طرح ثابت نہیں ہے۔ پس ان دلائل واقعیہ کے بعد وجود باری واضح اور یقینی ہے۔ لہٰذا ان دلائل کے بعد بھی اگر کوئی ایمان نہیں لاتا تو اسے دھمکی دینے اور خبردار کرنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝۷ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۸ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹ مِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاۗءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰

"تباہی ہے ہر اس جھوٹے بداعمال شخص کے لیے جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں' اور وہ ان کو سنتا ہے' پھر پورے غرور کے ساتھ اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو۔ ہماری آیات میں سے کوئی بات جب اس کے علم میں آتی ہے تو وہ ان کا مذاق بنا لیتا ہے۔ ایسے سب لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ ان کے پیچھے جہنم ہے جو کچھ بھی انہوں نے دنیا میں کمایا ہے اس میں سے کوئی چیز ان کے کسی کام نہ آئے گی' نہ ان کے وہ سرپرست ہی ان کے لیے کچھ کر سکیں گے جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے اپنا ولی بنا رکھا ہے ان کے لیے بڑا عذاب ہے"۔

جیسا کہ ہم نے اس سورت کے مقدمے میں بھی وضاحت کی کہ مکہ میں مشرکین نے جس طرح دعوت اسلامی کا استقبال کیا' اس کی تصویر کشی ان آیات میں کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنے باطل موقف پر اصرار کیا۔ ایسی سچی دعوت کا ایک لفظ بھی سننے سے انکار کیا جو حق پر مبنی تھی اور جو اپنی ذات میں واضح تھی۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب تھی۔ انہوں نے اس حقیقت کے ماننے میں اس قدر ہٹ دھرمی سے کام لیا کہ یوں نظر آتا تھا کہ گویا یہ دعوت ان کے ہاں اذہان تک پہنچی ہی نہیں ہے بلکہ الٹا وہ اللہ کے معاملے میں گستاخ ہوگئے۔ اور قرآن کی جو آیات ان تک پہنچی ان سے منہ موڑنے لگے قرآن کریم نے ان کے اس رویے کی نہایت شدید مذمت کی ہے۔ اور سخت دھمکی دی ہے ان کے لیے سخت بربادی ہے اور ان کو شدید توہین آمیز اور دردناک عذاب سے دوچار ہونا ہوگا۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (۴۵ : ۷) "تباہی ہے ہر اس جھوٹے بداعمال شخص کے لیے"۔ ویل' یعنی ہلاک ہے۔ افاک' بہت بڑا جھوٹا جو جھوٹ باندھنے میں مہارت رکھتا ہو۔ بہت زیادہ گناہ کاریاں اور بدکاریاں سمیٹنے والا۔ یہ دھمکی ہر اس شخص کے لیے ہے جس میں یہ صفات موجود ہیں۔ یہ اللہ قہار و جبار کی دھمکی ہے جو ہلاک کرنے اور برباد کرنے پر قدرت رکھتا ہے جس کی دھمکی اور ڈراوا اور تہدید بالکل سچی ہوتی ہے۔ اس لیے اس فقرے میں جو دھمکی دی گئی' وہ بہت ہی خوفناک ہے۔

ایسے افاک جھوٹے اور بداعمال اور بدکار کی صفت و علامت کیا ہے؟ یہ کہ وہ باطل پر اصرار کرتا ہے' سچائی کے مقابلے میں جھکنے کی بجائے اور اکڑتا ہے' اللہ کی نشانیوں کو تسلیم کرنے کی بجائے منہ موڑتا ہے اور شریفانہ رویہ اختیار نہیں کرتا بلکہ گستاخی کرتا ہے۔

يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا (۴۵ : ۸) "جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور وہ ان کو سنتا ہے پھر پورے غرور کے ساتھ اپنے کفر پر اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں"۔ یہ نہایت ہی قابل نفرت تصویر ہے۔ اگرچہ یہ مشرکین مکہ کے ایک گروہ کی تصویر ہے جو اس وقت ایسا تھا' مگر ہر نظام جاہلیت میں یہ تصویر اسی طرح دہرائی جاتی ہے۔ آج بھی ہے اور کل بھی ہوگی۔ اس زمین پر کتنے ہی ایسے لوگ ہیں اور نام نہاد مسلمانوں میں سے کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جن پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں اور وہ ان کو سنتے ہیں مگر اپنے موقف پر اڑ جاتے ہیں اور غرور میں منہ موڑ لیتے ہیں کیونکہ وہ ان کی خواہشات کے موافق اور ان کے مالوفات سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں اور یہ آیات باطل پر تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں اور یہ اس شر کی تائید نہیں کرتیں جس پر وہ مصر ہوتے ہیں اور یہ آیات اس سمت پر نہ خود چلتی ہیں اور نہ لوگوں کو چلاتی ہیں جس سمت پر وہ جا رہے ہیں۔

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۴۵ : ۸) "ایسے شخص کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو"۔ خوشخبری تو کسی اچھے کام پر ہوتی ہے۔ یہاں ان کے لیے بطور استہزاء خوشخبری کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اگر کوئی ڈرانے والے اور متنبہ کرنے والے کی بات نہیں مانتا تو پھر اگر ہلاکت آتی ہے تو آنے دو' وہ خود ہلاکت طلب کرتا ہے۔

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْئَا اتَّخَذَھَا ھُزُوًا (۴۵ : ۹) ”ہماری آیات میں سے جب کوئی چیز اس کے علم میں آتی ہے، تو وہ ان کا مذاق بنا لیتا ہے“۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ اللہ کی آیات اور ان کا سرچشمہ ذات باری ہے۔ یہ رویہ اس کی جانب سے شدید جسارت ہے۔ یہ تصویر بھی جس طرح جاہلیت اولیٰ میں تھی اسی طرح آج بھی موجود ہے۔ اور بے شمار لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں' ان میں سے بھی ایسے لوگ ہیں جو آیات الٰہیہ کے ساتھ مذاق کرتے ہیں اور وہ ان آیات اور ان پر ایمان لانے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو بھی جو عوام الناس کی زندگیوں کو ان آیات کے مطابق ڈھالتے ہیں۔

اُولٰئِكَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (۴۵ : ۹) ”ان سب لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے“۔ اہانت ان کے لیے موزوں سزا ہے کیونکہ یہ بھی تو اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ آیات الٰہیہ ہیں۔
یہ قیامت کا توہین آمیز عذاب حاضر ہے' اگرچہ قیامت کا برپا ہونا قدرے بعد میں ہے۔

مِنْ وَّرَآئِھِمْ جَھَنَّمُ (۴۵ : ۱۰) ”ان کے پیچھے جہنم ہے“۔ لفظ ”ان کے پیچھے جہنم ہے“ کا ایک خاص مقصد ہے یعنی یہ اسے دیکھ نہیں سکتے کہ انہوں نے قیامت کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس سے ڈرتے اور بچتے اس لیے نہیں کہ یہ غافل ہیں اور اس لیے وہ اس کے اندر گرنے والے ہیں۔

وَلَا یُغْنِیْ عَنْھُمْ مَّا كَسَبُوْا شَیْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ

(۴۵ : ۱۰) ”جو کچھ انہوں نے دنیا میں کمایا ہے اس میں سے کوئی چیز ان کے کسی کام نہ آئے گی' نہ ان کے وہ سرپرست ہی ان کے لیے کچھ کر سکیں گے جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے اپنا ولی بنا رکھا ہے“۔ یعنی دنیا میں انہوں نے جو کام کیے یا جو ان کی ملکیت تھی' وہ انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔ ان کے اعمال اگرچہ اچھے ہوں وہ تو اکارت جائیں گے۔ کیونکہ ایمان کے بغیر عمل مقبول ہی نہیں۔ اور قیامت میں ان کی ملکیت زائل ہو جائے گی کوئی نہ ان کے پاس ہو گی اور نہ فائدہ دے گی۔ اور ان کے دوست اور یار یا معبود' جو اللہ کے سوا انہوں نے بنا رکھے تھے' وہ وہاں ان کے لیے نہ نقصان پہنچا سکیں گے اور نہ نفع۔ نہ کسی کو سفارش کی اجازت ہو گی۔

وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۴۵ : ۱۰) ”ان کے لیے بڑا عذاب ہے“۔ یہ عذاب توہین آمیز بھی ہو گا جیسا کہ پہلے کہا گیا اور عظیم بھی ہو گا۔ توہین آمیز اس لیے کہ یہ آیات کا مذاق اڑاتے تھے' اور عظیم اس لیے کہ جرم بڑا ہے۔
یہ پیراگراف یہاں ختم ہوتا ہے جس میں آیات الٰہیہ کے ساتھ مذاق کرنے کی مذمت وارد ہے۔ ان کے مقابلے میں استکبار کرنے کا ذکر' ان آیات سے لوگوں کو روکنے کا ذکر ہے۔ خاتمہ پر ان آیات کی حقیقت بیان کی جاتی ہے اور ان کے منکرین کی سزا کا دوبارہ ذکر کر دیا جاتا ہے۔

ھٰذَا ھُدًى ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَھُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾ ۱۱ع ۱۷

"یہ قرآن سراسر ہدایت ہے' اور ان لوگوں کے لیے بلا کا دردناک عذاب ہے جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا"۔

اس قرآن کی حقیقت بس یہ ہے کہ یہ ایک رہنمائی ہے۔ خالص ہدایت' صاف صاف ہدایت۔ ایسی ہدایت جس میں ضلالت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اس لیے اس قسم کی آیات کا جو لوگ انکار کرتے ہیں' وہ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ ان کو دردناک عذاب سے دوچار کر دیا جائے۔ الیم کے معنی میں شدت الم اور ایذا رسانی کے معنی ظاہر ہیں۔ رجز کے معنی ہیں عذاب شدید۔ اور جس عذاب کی انہیں دھمکی دی جا رہی ہے' وہ الیم بھی ہے اور شدید بھی۔ یعنی اس کی شدت اور اس کا الم دونوں مکرر و مشدد ہیں۔ تاکید بعد تاکید ہے اور جو لوگ واضح خالص اور صریح ہدایت کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے ایسا عذاب ہی ہونا چاہئے۔

--- ○○○---

اس شدید دھمکی اور سخت ڈراوے کے بعد اب پھر ان کے دلوں کو باد نسیم کی طرح نرم بات سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور وہ انعامات دوبارہ یاد دلائے جاتے ہیں جو اس کائنات میں ان کے لیے مسخر کر دیے گئے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکرگزار ہو۔ اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا' سب کچھ اپنے پاس سے ---- اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں"۔

اللہ کی یہ چھوٹی سی مخلوق انسان پر اللہ کے بڑے کرم ہیں کہ اس نے اس کے لیے اس کائنات کی عظیم مخلوقات کو مسخر کر دیا ہے۔ اور ان مخلوقات سے یہ مختلف طریقوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ سمجھایا ہے کہ اس کائنات کا قانون فطرت کیا ہے؟ جس کے مطابق یہ کائنات چلتی ہے اور اس کے خلاف نہیں جا سکتی۔ اگر اللہ کی جانب سے انسان کو اس قدر علمی صلاحیت نہ دی گئی ہوتی تو اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ان کائناتی قوتوں کو اس طرح مسخر کر کے ان سے اس طرح استفادہ کرتا بلکہ اس کے لیے ان قوتوں کے اندر زندہ رہنا بھی مشکل ہو جاتا کیونکہ انسان ایک چھوٹا سا کیڑا ہے اور فطرت کی قوتیں نہایت ہی عظیم القوت' عظیم الجثہ اور بڑے بڑے افلاک ہیں۔

سمندر ان بڑی قوتوں میں سے ایک ہے جسے انسان نے مسخر کر لیا ہے۔ انسان کو اللہ نے اس کی ساخت اور خصوصیات کا علم دیا اور انسان نے معلوم کیا کہ کشتی اس عظیم اور سرکش سمندر کے اوپر چل سکتی ہے اور اس کی بپھری ہوئی جبار موجوں کے ساتھ ٹکرا سکتی ہے اور اسے ان سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ (۴۵ : ۱۲) "تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں"۔ اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو یہ خصوصیات دیں اور کشتی کے مواد کو تیرنے کی خصوصیات دیں۔ فضا کے دباؤ، ہواؤں کی تیزی اور زمین کی کشش کی خصوصیات پیدا کیں اور وہ دوسرے خصائص اس میں رکھے جن کی وجہ سے بحری سفر آسان ہوا اور انسان کو اس کام کا علم دیا کہ وہ سمندری مخلوق سے نفع اٹھائے اور دوسرے فوائد بھی حاصل کرے۔

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (۴۵ : ۱۲) "اور تم اس کا فضل تلاش کرو"۔ مثلاً سمندر میں شکار، زیب و زینت کا سامان، تجارت، معلوماتی سفر، تجربات، مشقیں، ورزش اور تفریح وغیرہ۔ غرض وہ سارے فوائد جو یہ چھوٹا سا انسان سمندروں سے حاصل کرتا ہے۔

غرض اللہ نے انسان کے لیے کشتی اور سمندر دونوں کو مسخر کیا کہ وہ اللہ کے فضل کی تلاش کرے۔ پھر اللہ کا شکر کرے کہ اللہ نے یہ فضل و کرم، یہ انعامات اور یہ تسخیر اور یہ علم اسے دیا۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۴۵ : ۱۲) "اور تم شکر گزار ہو"۔ اللہ تعالیٰ پھر اس قرآن کے ذریعہ انسان کو ہدایت کرتا ہے کہ اس ذات باری کی وفاداری کرو، اس سے تعلق قائم کرو، اور یہ بات معلوم کرو کہ تمہارے اور اس کائنات کے درمیان ایک تعلق ہے اور وہ یہ کہ تم اس کا حصہ ہو اور ایک ناموس فطرت کے تحت چل رہے ہو اور تم دونوں کا رخ اللہ ہی کی طرف ہے۔

سمندروں کی تسخیر کے خصوصی ذکر کے ساتھ یہ پوری کائنات بھی بالعموم تمہارے لیے مسخر کر دی گئی ہے۔ زمین اور آسمانوں کے درمیان پائے جانے والی تمام قوتیں، نعمتیں اور مفید چیزیں جو اس کے لیے فرائض منصب خلافت کی ادائیگی میں مفید و معاون ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (۴۵ : ۱۳) "اس نے زمین اور آسمان کی ساری ہی چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دیں، سب کچھ اپنے پاس سے"۔ اس کائنات میں جتنی چیزیں بھی ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہیں اور اسی کی ہیں۔ وہی ان کا پیدا کرنے والا اور مدبر ہے۔ اس نے ان کو مسخر کر رکھا ہے۔ اور ان پر اس چھوٹی سی مخلوق کو مسلط کر دیا ہے۔ انسان جسے اللہ نے اس کائنات کے مزاج اور اس کے قوانین کو سمجھنے کی قوت دی اور وہ اپنی قوت اور طاقت سے کہیں بڑی قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔ یہ سب کام اللہ کا فضل و کرم ہے۔ اس انسان پر اور جو لوگ تفکر اور تدبر سے کام لیتے ہیں ان کے لیے اس میں آیات و نشانات ہیں بشرطیکہ وہ اپنی اس عقل سے یہ فائدہ بھی اٹھائیں کہ اس کائنات اور اس انسان کا ایک پیدا کرنے والا بھی ہے جس نے اسے یہ سب کچھ دیا ہے اپنے کرم خاص سے :

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۴۵ : ۱۳) "اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں"۔ یہ فکر اور یہ تدبر اس وقت تک صحیح، جامع اور گہرا نہ ہو سکے گا جب تک وہ ان قوتوں، مسخر شدہ قوتوں کے پیچھے اس بڑی قوت کی طرف جھانکنے کی کوشش نہ کرے گا، جس نے ان تمام قوتوں کو پیدا کیا

اور جس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر انسان کو ان رازوں سے آگاہ کیا کہ ان کا راز یہ ہے اور ان کا قانون قدرت یہ ہے۔ اور فطرت کائنات اور فطرت انسان ایک ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان یہ تعلق ہے۔ اس تعلق کا یہ نتیجہ ہے کہ انسان کو علم حاصل ہوا' اسے قوت اور کنٹرول حاصل ہوا' اس نے ان قوتوں کو مسخر کر کے اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔ اگر یہ تعلق نہ ہوتا تو انسان کو ان چیزوں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔

--- ○○○---

جب بات یہاں تک پہنچی ہے اور ایک مومن اس کائنات کے قلب تک جا پہنچتا ہے۔ اسے شعور حاصل ہو جاتا ہے کہ قوت کا حقیقی سرچشمہ کیا ہے' یہ کہ اس کائنات کے اسرار و رموز کی آگاہی دراصل قوت کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ اب مومنین کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ شرافت' اخلاق عالیہ' وسعت قلبی اور رواداری اختیار کریں اور جو ضعیف' ناتواں اور جاہل لوگ اس خزانے اور اس بھرپور خزانہ علم و معرفت سے محروم ہیں' ان پر رحم کریں' ان کے ساتھ ہمدردی کریں کہ یہ لوگ ان عظیم حقائق سے محروم ہیں۔ جو اللہ کے نوامیس فطرت کو نہیں دیکھتے' جو تاریخ میں سنن الٰہیہ کو تلاش نہیں کرتے جو اس کائنات کے اسرار و رموز سے واقف نہیں اور اس لیے وہ اس خالق کی عظمت سے بھی بے خبر ہیں۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًاۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

"اے نبیؐ' ایمان لانے والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے برے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے' ان کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔ جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا' اور جو برائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ پھر جانا تو سب کو اپنے رب ہی کی طرف ہے"۔

اہل ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ جو لوگ اللہ کے عذاب سے نہیں ڈرتے' ان سے درگزر کرو اور ان کے ساتھ دشمنی کی بجائے ہمدردی کا رویہ اختیار کرو۔ اور شریفانہ اور اخلاق عالیہ کا رویہ اختیار کرو۔ درگزر کرو اور ان پر رحم کرو کہ وہ مساکین ہیں۔ وہ علم و ہدایت اور قوت اور رحمت کے اصل سرچشمے سے محروم ہیں۔ یہ ایمان ہی کا سرچشمہ ہے جو انسان کو غنی' قوی اور رحیم و کریم بنا دیتا ہے۔ انسان اسی پر بھروسہ کرتا ہے' مطمئن ہوتا ہے اور مشکل اوقات میں اس کے سامنے سربسجود ہوتا ہے اور اس کے سہارے آہ و فغاں کرتا ہے۔ پھر یہ لوگ ان قوانین فطرت اور سنن الٰہیہ سے بھی ناواقف ہیں جن کے نتیجے میں انسان کو ہر قسم کی قوت حاصل ہوتی ہے۔ اہل ایمان چونکہ ایمان کے خزانے تک رسائی حاصل کر چکے ہیں اور اس کے ذریعہ ان کو مادی اور روحانی اطمینان حاصل ہے اور وہ ایک برتر پوزیشن میں ہیں اس لیے ان کے شایان شان یہ ہے کہ وہ عفو و درگزر سے کام لیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس درگزر کے نتیجے میں اہل ایمان کا رویہ یہ ہوگا کہ وہ تمام معاملات اللہ کے حوالے کر

دیں گے جو محسن کو اس کے احسان کی جزاء دے گا اور بدکار کو اس کی بدکاریوں پر سزا دے گا۔ عفو و درگزر کی بجائے اگر اہل ایمان ان بیچاروں کے ساتھ سختی کا رویہ اختیار کرتے ہیں تو وہ اس نیکی سے محروم ہو جائیں گے بشرطیکہ اس عفو و درگزر کی پالیسی کے نتیجے میں امن داماں کو خطرہ لاحق نہیں ہوتا' اور لوگ حدود اللہ پر دست درازی میں جری نہیں ہو جاتے ہوں۔

لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا یَكْسِبُوْنَ (۱۴:۴۵) "تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے"۔ اور اس کے بعد یہ بھی تصریح کر دی جاتی ہے کہ جزاء و سزامیں ہر شخص اپنے کئے کا ذمہ دار ہے۔ لہٰذا ہر شخص کو اللہ کے سامنے حاضری دینے کے وقت کی فکر کرنی چاہئے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ

(۱۵:۴۵) "جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا اور جو برائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ پھر جانا تو سب کو اپنے رب ہی کی طرف ہے"۔ یوں ایک مومن کا سینہ فراخ ہوتا ہے۔ اس کی سوچ بلند ہوتی ہے۔ وہ انفرادی مشکلات بھی برداشت کرتا ہے اور احمقوں کی حماقتیں بھی برداشت کرتا ہے اور اندھے اور محروم لوگوں کے طرز عمل کو بھی برداشت کرتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کمزور ہوتا ہے اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں دے سکتا۔ یہ برداشت وہ تنگ دلی سے نہیں بلکہ وسعت قلبی سے کرتا ہے۔ کیونکہ وہ مضبوط کردار اور کھلے دل کا مالک ہوتا ہے۔ اور اس نے ان محروم لوگوں کے لیے بھی ہدایت کی مشعل اٹھا رکھی ہوتی ہے۔ اس نے بیماروں کے لیے شفایابی کا تریاق اٹھا رکھا ہوتا ہے۔ اور وہ اس پر اجر کا طالب صرف اللہ سے ہوتا ہے اور آخرت میں ہوتا ہے۔ اور آخر کار تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور ہدایت اور رہنمائی کا سرچشمہ بھی اللہ ہی ہے۔ اور اس کی طرف لوٹنا ہے۔

--- ○○○ ---

اب انسانیت کے لیے مومن قیادت کے کردار کے موضوع پر بات ہوتی ہے۔ یہ قیادت اب اسلامی جماعت کی شکل میں وجود میں لائی گئی ہے۔ اس سے پہلے یہ بنی اسرائیل کے ہاتھ میں تھی۔ ان کو کتاب دی گئی۔ حکومت دی گئی' نبوت دی گئی مگر انہوں نے اختلافات شروع کر دیئے۔ اور ان سے یہ قیادت اور منصب لے کر لے محمدؐ اب آپ کو دے دیا گیا ہے۔ اس وقت آپ مکہ میں تھے۔ اور دعوت اسلامی نہایت ہی مشکل دور سے گزر رہی تھی لیکن آدم علیہ السلام سے ادھر اس کا مزاج' اس کی نوعیت اور مقاصد اور مہم ایک ہی رہی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶﴾ وَاٰتَیْنٰهُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰی

شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹﴾ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًی وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

"اس سے پہلے بنی اسرائیل کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی تھی۔ ان کو ہم نے عمدہ سامان زیست سے نوازا، دنیا بھر کے لوگوں پر انہیں فضیلت عطا کی، اور دین کے معاملہ میں انہیں واضح ہدایات دے دیں۔ پھر جو اختلاف ان کے درمیان رونما ہوا، وہ (ناواقفیت کی وجہ سے نہیں بلکہ) علم آجانے کے بعد ہوا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اللہ قیامت کے روز ان معاملات کا فیصلہ فرما دے گا جن میں وہ اختلافات کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد اب اے نبیؐ، ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آ سکتے۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں، سب لوگوں کے لیے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو یقین لائیں"۔

اسلام سے قبل تحریک اسلامی کی قیادت بنی اسرائیل کے پاس تھی۔ آسمانی ہدایت اور عقیدہ کے حامل یہی تھے۔ اور اللہ نے اس دور کے لیے یہ مشن ان کے سپرد کر دیا تھا۔ کیونکہ انسانیت کے لیے ہر دور میں آسمانی رہنمائی کی ضرورت رہی ہے۔ اس لئے کہ زمین کے اندر جو بھی قائدین رہے ہیں وہ خواہشات نفسانیہ کے پیروکار، جاہل اور تقصیرات سے پر رہے ہیں اس لیے وہ انسانوں کے لیے جو قانون اور شریعت بناتے رہے ہیں۔ وہ ایسی ہی پر تقصیر رہی۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اس لیے اللہ کی شریعت ہی ایسی ہو سکتی ہے جو جہل، ہماری خواہشات اور تقصیرات سے پاک ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ سب لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ کسی کا حامی اور کسی کا مخالف نہیں ہے۔ اور اللہ جہل قصور اور خواہشات سے پاک ہے۔ وہ زیادہ جانتا ہے اور لطیف و خبیر ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّةَ (۴۵: ۱۶) "اس سے پہلے بنی اسرائیل کو ہم نے کتاب، حکم اور نبوت عطا کی تھی"۔ تورات ان کو دی گئی جس میں اللہ کی شریعت تھی۔ اور اس میں یہ احکام تھے کہ شریعت کو قائم کرو اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی نبوت اور حکومت ان میں جاری رہی کہ شریعت کو قائم کرو اور ان کے اندر دوسری اقوام کے مقابلے میں بے شمار نبی بھیجے گئے۔

وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ (۴۵: ۱۶) "ان کو ہم نے عمدہ سامان زیست سے نوازا"۔ ان کی حکومتیں اور ان کی نبوتیں ارض مقدس تک محدود رہیں۔ یہ سرزمین فرات اور نیل کے درمیان ایک پاک سرزمین تھی۔

وَ فَضَّلْنٰھُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۴۵ : ۱۶) "اور دنیا بھر کے لوگوں پر ان کو ہم نے فضیلت عطا کی"۔
اس مرکزی مقام پر ربانی ہدایت کے حامل ہونے کے ناطے اس وقت یہ تمام عالم پر برتر قوم تھے اور ان کی افضیلت کی بڑی دلیل یہ تھی کہ وہ حاملین شریعت تھے اور ان کو حکومت اور نبوت دی گئی تھی۔

وَ اٰتَیْنٰھُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ (۴۵ : ۱۷) "اور دین کے معاملے میں انہیں واضح ہدایات دے دیں"۔
جو شریعت انہیں دی گئی وہ دو ٹوک اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی تھی۔ اس میں کوئی بات ناقابل فہم' پیچیدہ' ٹیڑھی اور صحیح راہ سے منحرف نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے اس شریعت کے اندر جو اختلافات کیے اور فرقے بنے اس کا کوئی جواز نہ تھا۔ انہوں نے جو تفرقہ کیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ شریعت اور دین سمجھے نہ تھے یا یہ کہ وہ جاہل تھے اور انہیں صحیح بات اور حق معلوم نہ تھا۔

فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ (۴۵ : ۱۷) "پھر جو اختلافات ان کے درمیان واقع ہوئے وہ جانتے ہوئے کیے گئے۔ ان کے درمیان حد درجہ حسد اور بغض پیدا ہو گیا تھا۔ اور باہم نزاع اور ایک دوسرے پر مظالم ڈھاتے ہوئے یہ اختلافات کیے گئے' باوجود اس بات کے کہ وہ صحیح بات جانتے تھے"۔

بَغْیًا بَیْنَھُمْ (۴۵ : ۱۷) "اس بنا پر ہوا کہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے"۔ یوں زمین پر ان کی قیادت ختم ہو گئی اور اللہ نے ان کو جو خلافت ارضی عطا کی تھی ان سے چھین لی گئی اور اختلافات کا آخری فیصلہ تو اللہ کرے گا۔

اِنَّ رَبَّکَ یَقْضِیْ بَیْنَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ (۴۵ : ۱۷) "اللہ قیامت کے روز ان معاملات کا فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ اختلافات کرتے رہے ہیں"۔
اس کے بعد اللہ نے رسالت جدیدہ کو خلافت ارضی کا مقام عطا فرمایا' جو قوم کو اللہ کی شریعت کی طرف لوٹائے گی اور تمام معاملات میں اللہ کی قیادت اور برتری قائم کرے گی۔ اور دنیا میں اللہ کی شریعت کے مطابق نظام قائم کرے گی' بندوں کی خواہشات کے مطابق نہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْھَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ

(۴۵ : ۱۸) "اس کے بعد اب اے نبی' ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ پر قائم کیا لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو' جو علم نہیں رکھتے"۔ یوں یہ معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے یا تو اللہ کی شریعت ہو گی یا ان لوگوں کی خواہشات ہوں گی جو نہیں جانتے۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہے۔ یا تو سیدھی اور مستقیم شریعت اور شاہراہ ہے اور یا پھر لوگوں کی بدلتی ہوئی خواہشات ہیں۔ اور ان کے درمیان تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جو قوم شریعت کو چھوڑتی ہے' وہ اپنی خواہشات کی پوجا کرتی ہے کیونکہ شریعت کے سوا جو بھی ہے وہ ان لوگوں کی ہوا و ہوس ہے

جو نہیں مانتے ۔

اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے ڈراتا ہے کہ آپ ان لوگوں کی خواہشات کی اطاعت نہ کریں جو نہیں جانتے ۔اگر آپ نے یہ کام کیا تو یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں آپ کو کوئی فائدہ نہ دے سکیں گے ۔یہ لوگ تو ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کرتے ہیں ۔اگر اللہ کے دین اور شریعت کو نہ ماننے والے یہ لوگ ایک دوسرے کے جگری دوست بھی بن جائیں اور ایکا بھی کرلیں تو بھی یہ آپ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے ۔کیونکہ اے پیغمبر آپ کے مولیٰ تو اللہ ہے ۔

اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ (۴۵ : ۱۹) "اس کے بعد اے نبی ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے ۔ لہٰذا تم اس پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے ۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتے ۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے"۔

یعنی ایک طرف شریعت ہے جو علم و حکمت پر مبنی ہے اور دوسری جانب خواہشات نفسانیہ ہیں جو جہالت پر مبنی ہیں اور جاہلیت ہیں ۔ایک داعی کو چاہئے کہ وہ شریعت کا اتباع کرے اور ساری ذاتی خواہشات کو چھوڑ دے ۔ داعی کا فرض ہے کہ وہ شریعت سے ادھرادھر نہ ہو کیونکہ ذاتی خواہشات رکھنے والے لوگ اللہ کے مقابلے میں کوئی مدد نہیں دے سکتے ۔ وہ تو داعی کے مخالف ہوتے ہیں اور سب مل کر مخالفت کرتے ہیں اور وہ شریعت کی مخالفت میں ایک دوسرے کے مدد و معاون ہوتے ہیں' لہٰذا داعی کو ظالموں اور جاہلوں سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہئے ۔ پھر یہ کہ یہ ظالم کسی داعی کی مدد بھی نہیں کرسکتے کیونکہ یہ تو ان کی خواہشات کے خلاف ہے لیکن وہ اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ وہ سچے داعی کو نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے ۔کیونکہ داعی کا والی وارث اللہ ہوتا ہے اور جس کا والی وارث اللہ ہو' اس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا ۔او انسان ضعیف کمزور ہوتے ہیں' جن کی کوئی قوت نہیں ہوتی جبکہ اللہ کے دوست مسلمان ہوتے ہیں اور وہ قوی ہوتے ہیں ۔

اس فیصلہ کن بیان پر مزید تبصرہ یہ ہے کہ قرآن دوٹوک اور فیصلہ کن باتیں کرتا ہے اور قرآن کی ان دوٹوک باتوں سے یقین نصیب ہوتا ہے جو انسان کو بصیرت اور ہدایت دیتا ہے ۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۴۵ : ۲۰) "یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو یقین لائیں"۔قرآن کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ لوگوں کے لیے بصیرت ہے ۔اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کے اندر گہری بصیرت ہے اور روشنی ہے ۔ قرآن بذات خود بصیرت اور روشنی ہے جس طرح بصیرت اور روشنی انسانوں کے لیے دیکھنے اور سمجھنے کا ذریعہ ہوتے ہیں تو قرآن بذات خود بصیرت و ہدایت ہے اور یہ بذات خود رحمت ہے' لیکن قرآن کے اندر یہ صفات تب نظر آئیں گی اور اس سے یہ فوائد تب حاصل ہوں گے جب کسی کے اندر ذوق یقین پیدا ہو ۔انسان کے اندر اس قدر یقین ہو جائے جس کے اندر شک کا شبہ ہی نہ ہو ۔اس کے اندر کوئی بے چینی نہ ہو' اور دل میں کوئی خلش نہ ہو ۔جب قلب کو یقین حاصل ہو جائے اور اسے پوراوثوق حاصل ہو جائے تو اس کے اندر پھر کوئی تزلزل نہیں ہوتا ۔وہ پھر شش و پنج نہیں کرتا ۔ادھرادھر نہیں ڈولتا' اس

کی راہ پھر واضح ہو جاتی ہے ۔ اسے اپنی منزل دور افق پر بلند نظر آتی ہے ۔ اس کا مقصد متعین ہو جاتا ہے ۔ طریق کار متعین اور استوار ہو جاتا ہے ۔ اب پھر قرآن اس کے لیے نور بصیرت بن جاتا ہے ' ہدایت بن جاتا ہے اور رحمت بن جاتا ہے بشرطیکہ یقین محکم ہو ۔

اس بیان کے بعد کہ ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ متقین کے ولی ہیں ۔ اور یہ کہ قرآن مجید متقین کے لیے نور بصیرت ہے اور یقین کرنے والوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے ۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور جو لوگ نیک کام کرتے ہیں ' یعنی مومن ان کے درمیان بنیادی فرق ہے اور اللہ کے ہاں دونوں کا ایک مقام نہیں ہو سکتا ۔ نہ دونوں کا ایک جیسا فیصلہ ہو سکتا ہے ۔ اللہ کے ترازو میں دونوں کے درمیان فرق ہے ۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کے اس نظام کو حق اور عدل پر قائم کر رکھا ہے ۔ اور اس کائنات کے نقشے میں سچائی بنیادی اور اساسی عنصر ہے ۔

اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ ۲
كَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحۡیَاهُمۡ وَ مَمَاتُهُمۡ ؕ سَآءَ مَا یَحۡكُمُوۡنَ ﴿۲۱﴾ ۱۰ع
۱۸ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَ لِتُجۡزٰی كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ وَ هُمۡ
لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾

"کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کر دیں گے کہ ان کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے ؟ بہت برے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں ۔ اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے ' لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا"۔

ہو سکتا ہے کہ یہاں بدکاروں سے مراد اہل کتاب ہوں جنہوں نے اپنی کتاب سے روگردانی کی اور برائیوں کا ارتکاب کیا ۔ اور سمجھتے یہی رہے کہ وہ حقیقی مومن ہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو اہل ایمان کے برابر سمجھتے ہیں جبکہ وہ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور مومنین نیکیوں کے کام کرتے ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں گروہ اللہ کے ہاں برابر ہو سکتے ہیں ' خواہ اس دنیا کا معاملہ ہو یا آخرت کا موازنہ ہو ؟ اور اس سے مراد عام اصول بیان کرنا بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کے پیمانوں کے مطابق نیک کام کرنے والے برے کام کرنے والے آپس میں برابر نہیں ہو سکتے ' نہ اس دنیا میں نہ آخرت کے حساب و کتاب میں ۔ مومنین کا پلڑا یہاں بھی بھاری ہو گا اور آخرت میں بھی بھاری ہو گا ۔ اور یہ اصول اللہ کی اس کائنات کے نقشے میں ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتا ہے ۔ اس پوری کائنات کی تخلیق حق پر ہوتی ہے ۔ شریعت کی تشکیل بھی حق پر ہوتی ہے ۔ جس چیز کے ساتھ یہ کائنات قائم ہے ' وہ توازن اور اعتدال ہے اور اسی اصول پر انسانی زندگی بھی قائم ہے یعنی عدل و انصاف جس کا اظہار اچھے کام کرنے والوں اور برے کام کرنے والوں کے درمیان فرق کر کے کیا گیا ۔ اور ہر شخص کو اس کے کیے کی جزا و سزا دی گئی اگر وہ نیک ہوا یا گمراہ ہوا ۔ تاکہ تمام لوگوں کے ساتھ انصاف کیا جا سکے ۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۴۵ : ۲۲) ”اور لوگوں پر ہرگز ظلم نہ کیا جائے گا“۔ یہ مفہوم کہ اس کائنات کی تخلیق کے اصل نقشے میں حق بنیادی چیز ہے۔ اور یہ کہ جس طرح کائنات کے اندر حق ہے، اسی طرح شریعت کے اندر حق ہے اور یہ کہ یوم الحساب میں اسی حق پر حساب و کتاب ہوگا۔ یہ مفہوم اور مضمون قرآن میں باربار آتا ہے کیونکہ یہ اسلامی تصور حیات کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ تمام شاخیں اس اصول پر مبنی ہیں۔ انسانی نفس، آفاق کائنات اور اسلامی شریعت سب اس سچائی پر مبنی ہیں۔ یہی ہے ”کائنات، حیات اور انسان اور انسان اسلام کی نظر میں“ میری الگ کتاب کا موضوع۔ یہ ان شاء اللہ جلد پیش ہوگی۔

---○○○---

اب اس عظیم اصول کے بالمقابل اور شریعت کے بالمقابل لوگوں کی خواہشات ہوتی ہیں جو بدلتی رہتی ہیں۔ ان خواہشات کو لوگ اپنا الٰہ بنا لیتے ہیں، ایسے لوگ گمراہی میں اس قدر دور چلے جاتے ہیں کہ ان کی ہدایت کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔

أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۲۳﴾

”پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے؟“

انسان جب اسلام کا عظیم اصول اتباع شریعت ترک کر دیتا ہے تو پھر اس کی جو حالت ہوتی ہے قرآن کریم اس کی خوب تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ شخص اپنی بدلتی ہوئی خواہشات کے تابع ہے۔ یہ اپنی خواہشات کے سامنے سجدہ ریز ہے اور ان کا مطیع فرمان ہے۔ اس کے تصورات، اس کے احکام، اس کی سوچ اور اس کی حرکات، اس کی خواہشات کے زاویہ سے ہوتی ہیں۔ یہ ان کو اس طرح پوجتا ہے جس طرح کوئی کسی بت کو پوجتا ہے۔ یہ خواہشات کے اشارات کے پیچھے دوڑتا ہے۔ قرآن ایسے لوگوں کی یہ تصویر کشی بڑی ناپسندیدگی سے کرتا ہے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (۴۵ : ۲۳) ”پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا“۔ کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے؟ یہ شخص ایک ایسی عجیب مخلوق ہے جو تماشا کے قابل ہے کہ اس کا تماشا دیکھا جائے۔ یہ شخص اللہ کے سامنے اپنے آپ کو ضلالت کا مستحق ثابت کر دیتا ہے۔ اب اللہ ایسے شخص پر ہدایت کی رحمت نازل ہی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کے دل میں ہدایت کی جگہ ہی باقی نہیں رہی ہے اس لئے کہ وہ

اپنی خواہش کو ہر وقت پوجتا رہتا ہے۔

وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ (۴۵ : ۲۳) "اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا ہے"۔ اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ اللہ نے علم کے مطابق جانتے ہوئے اسے ضلالت میں پھینک دیا۔ اس لیے کہ یہ ضلالت کا مستحق ہو گیا تھا۔ یا یہ کہ وہ اپنے طور پر عالم ہونے کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا گیا۔ اور اس کے علم و معرفت نے اس کو اس بات سے نہ روکا کہ وہ اپنی خواہشات کو الٰہ بنائے۔ یوں پھر اللہ نے اسے بھی ڈھیل دے دی اور گمراہی میں پھینک دیا۔

وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (۴۵ : ۲۳) "اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا"۔ لہٰذا وہ تمام روشن دان بند ہو گئے جن سے روشنی اندر آتی تھی اور وہ مدرکات بے کار ہو گئے جن کے ذریعہ سے ہدایت کسی شخص کے دل و دماغ میں داخل ہو سکتی تھی۔ اور انسان نے خواہشات نفسانیہ کو اس طرح قبول کرنا شروع کر دیا کہ حصول ہدایت کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔

فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (۴۵ : ۲۳) "اللہ کے بعد اب اور کون ہے جو اسے ہدایت دے"۔ ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ اللہ کے سوا اور تو کوئی کسی کی ہدایت اور ضلالت کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ یہ تو اللہ کا خصوصی اختیار ہے اس میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے مختار رسولوں کو بھی یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی کو ہدایت دے دیں۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۴۵ : ۲۳) "کیا تم لوگ سبق نہیں لیتے"۔ جس نے سبق لیا وہ ہوشمند رہا اور متنبہ ہو گیا۔ اور وہ ہوائے نفس کے پھندے سے آزاد ہو گیا اور ایک واضح اور مستقل منہاج پر گامزن ہو گیا جس پر چلنے والے کبھی گمراہ نہیں ہوتے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۳۶ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری پیراگراف ہے ۔ اس میں آخرت کے حساب و کتاب اور حشر و نشر کے بارے میں مشرکین کے عقائد و خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس پر تردید کے لیے خود ان کے وجود کو پیش کیا گیا ہے کہ آخر تم موجود ہو اور کوئی تمہیں اٹھائے ہوئے ہے ۔ اس سے تو تم انکار نہیں کر سکتے ہو ۔ اس کے بعد قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ قیام قیامت کا وقت تو اگرچہ معلوم نہیں ہے لیکن وہاں تمہارے ساتھ یہ کچھ ہونے والا ہے اور یہ منظر نہایت ہی موثر کلمات میں پیش کیا جاتا ہے ۔

سورت کا خاتمہ الحمدللہ پر ہوتا ہے کہ اللہ واحد ہے ' وہ رب ہے ' تمام جہان والوں کا رب ہے ۔ اس کی عظمت اور اس کی کبریائی بہت ہی بڑی ہے اور تمام آسمانوں اور زمینوں میں وہ منفرد ہے ۔ کوئی اس کے مقابل کھڑا نہیں ہو سکتا ۔ کوئی اس کی بادشاہت میں دست درازی نہیں کر سکتا اور وہ عزیز و حکیم ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۳۶ تشریح آیات

۲۴ --- تا --- ۳۷

وَ قَالُوۡا مَا ہِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَ نَحۡیَا وَ مَا یُہۡلِکُنَاۤ اِلَّا الدَّہۡرُ ۚ وَ مَا لَہُمۡ بِذٰلِکَ مِنۡ عِلۡمٍ ۚ اِنۡ ہُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ ﴿۲۴﴾ وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا کَانَ حُجَّتَہُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوا ائۡتُوۡا بِاٰبَآئِنَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰہُ یُحۡیِیۡکُمۡ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یَجۡمَعُکُمۡ اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾

۳
ع ۵
۱۹

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ "زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے' یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو"۔ درحقیقت اس معاملہ میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں اور جب ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔ اے نبی" ان سے کہو اللہ ہی تمہیں زندگی بخشتا ہے' پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے' پھر وہی تم کو اس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔

قیامت کے بارے میں ان کا نظریہ اس قدر کوتاہ بینی پر مبنی تھا کہ ان کے نزدیک زندگی بس یہی تھی جسے وہ اس زمین پر گزرتی دیکھ سکتے تھے۔ ایک نسل ہے جو پیدا ہوتی ہے اور گزرتی چلی جاتی ہے۔ بظاہر موت کوئی چیز نہیں ہے سوائے اس کے کہ وقت گزرتا ہے اور ہم مرتے ہیں اور زمانہ لپیٹتا چلا جاتا ہے۔ گویا یہ زمانہ ہے جو تمام فیصلے کرتا ہے اور ان پر موت طاری کرتا ہے اور وہ مرجاتے ہیں۔

یہ ایک سطحی نظریہ تھا۔ صرف ظاہری حالات کو دیکھ کر اسے اختیار کیا گیا تھا' زندگی کے پیچھے جو اسرار و رموز تھے ان کو تلاش کرنے کی اس میں کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔ سوال یہ تھا کہ زندگی کہاں سے آگئی؟ اور کون ہے جو زندگی واپس لے لیتا ہے۔ موت کچھ متعین دنوں کے بعد تو نہیں آجاتی کہ انہوں نے زمانے کے ساتھ موت کو وابستہ کر دیا۔ بچے بھی بوڑھوں کی طرح مرتے ہیں اور صحت مند لوگ بھی تو مرتے ہیں۔ جس طرح بیمار لوگ مرتے ہیں۔ ضعیف لوگوں کی

طرح بچے کئے بھی مرتے ہیں۔ لہٰذا اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو زمانے کا تعلق موت و حیات سے نہیں ہے۔ بشرطیکہ کوئی موت کی حقیقت کو جاننا چاہے۔ چنانچہ کہا گیا:

وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵: ۲۴) ”درحقیقت اس معاملے میں ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض گمان کی بنا پر باتیں کرتے ہیں“۔ یہ محض ظن و تخمین کے پائے چوبین پر چل رہے ہیں۔ ان کے خیالات بجھے ہوئے ہیں اور ان کے نقوش دھندلے ہیں۔ گہرے غور و فکر پر مبنی نہیں ہیں' نہ کسی علم پر مبنی ہیں۔ اس کائنات کے حقائق کا ادراک ان کو نہیں۔ موت و حیات کے جو حالات انسان پر طاری ہوتے ہیں' یہ ان کے صرف سطحی اسباب دیکھتے ہیں۔ حقیقی اسباب نظروں سے اوجھل ہیں۔ انہوں نے صرف اس قدر معلوم کیا ہے کہ زیادہ دن گزرنے کے بعد انسان کمزور ہوتا ہے اور مرجاتا ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۵: ۲۵) ”اور جب ہماری واضح آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہوتی کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو“۔ ان کی یہ بات بھی نہایت سطحی سوچ پر مبنی ہے اور اس سے پہلے انہوں نے اس کائنات کے قوانین فطرت کا مطالعہ نہیں کیا۔ اس دنیا میں اللہ نے حیات و ممات کے لیے جو نظام تحریر کیا ہے اور ان کے جو اسرار و رموز مقررہ کیے ہیں' ان پر انہوں نے گہرے انداز میں نہیں سوچا۔ اس کے اندر گہری حکمت کارفرما ہے۔ لوگ اس جہاں میں آتے ہیں اور آتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ کے نظام میں ان کو یہاں فرصت عمل مہیا کی جا رہی ہے۔ مرنے کے بعد ان کو ایک مقرر وقت پر دوبارہ اٹھایا جائے گا اور یہاں انہوں نے جو کچھ کیا' اس پر ان کو حساب و کتاب دینا ہوگا۔ لہٰذا حشر و نشر سے پہلے اللہ کے نظام کے مطابق انہیں یہاں نہیں اٹھایا جا سکتا۔ قیامت کے مقررہ دن سے پہلے یہاں ان کا اٹھانا حکمت آزمائش کے خلاف ہے۔ بعض لوگ یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہر چہ قبل از وقت آؤٹ کر دیا جائے۔ لیکن اللہ کا اپنا کام اور نظام ہے اور اس کی اپنی حکمت اور اسکیم ہے۔ جس کے اوپر یہ پوری کائنات قائم ہے۔ لہٰذا اس احمقانہ تجویز کے مطابق اللہ کی پوری اسکیم کو نہیں بدلا جا سکتا۔ یہ قرآنی استدلال کا کوئی معقول جواب دینے کی بجائے بس یہ کہتے ہیں:

ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۵: ۲۵) ”کہ اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو“۔ سوال یہ ہے کہ اللہ وقت مقررہ سے پہلے ان کے باپ دادا کو کیوں اٹھا لائے۔ اس میعاد سے قبل جو اس نے اس پوری کائنات کے لیے مقرر کر رکھی ہے؟ محض اس لیے کہ ان کو یہ یقین آجائے کہ اللہ مردوں کو دوبارہ اٹھا سکتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ اپنی سنت کے مطابق ان کی آنکھوں کے سامنے ہر لمحہ اور ہر لحظہ زندگی کو اٹھا نہیں رہا ہے۔

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۴۵: ۲۶)

"ان سے کہو کہ اللہ تمہیں زندگی بخشتا ہے۔ پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے۔ پھر وہی تم کو اس قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے"۔ یہی تو وہ معجزہ ہے جسے وہ اپنے آباؤ اجداد کے لے آنے میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ ان کی آنکھوں کے سامنے واقع نہیں ہو رہا ہے۔ بعینہ وہی معجزہ۔ اللہ ہی تو ہے جو انسان کو پیدا کیے جا رہا ہے۔ وہی تو ہے جو مارتا ہے۔ آخر میں اس میں کیا انوکھی بات ہے کہ اللہ قیامت کے دن دوبارہ جمع کرے گا۔ اس میں آخر کیوں وہ شک میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ جس چیز سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے۔ اس کی نظیر خود ان کی زندگی ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۵: ۲۶) "مگر اکثر لوگ جانتے نہیں"۔ اللہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو کنٹرول کرنے والا ہے۔ وہ ہر چیز کو بنانے والا ہے۔ وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے 'اگر اس نے پہلے پیدا کیا ہے اور تم مانتے ہو کہ کیا ہے

لیکن اللہ ان کے سامنے منطقی دلائل کی بجائے ایک منظر پیش فرماتا ہے:

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

"زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے' اور جس روز قیامت کی گھڑی آکھڑی ہوگی اس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے۔ اس وقت تم ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامہ اعمال دیکھے۔ ان سے کہا جائے گا: "آج تم لوگوں کو ان اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے رہے تھے"۔

آیت میں پہلے تو ان کے انجام کا فیصلہ جلدی سے بتا دیا گیا کہ اس دن یہ لوگ عظیم خسارے سے دوچار ہوں گے لیکن فیصلہ سننے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عظیم اور وسیع و عریض میدان ہے۔ اس میدان میں اولین اور آخرین تمام امتیں جمع ہیں۔ جو شخص کبھی اس کرۂ ارض پر زندہ رہا ہے۔ تھوڑی عمر لی ہو یا زیادہ' یہ سب موجود ہیں۔ مجرمین گھٹنوں کے بل گرے ہیں۔ گروہ در گروہ جمع ہیں۔ اور حساب کی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ منظر بہت ہی خوفناک ہے کہ تمام انسان اگلے اور پچھلے ایک ہی میدان میں جمع ہوں گے۔ پھر یہ خوفناک اس لیے بھی ہو گا کہ لوگوں کی ہیئت کذائی خوفناک ہوگی کہ سب گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔ پھر یہ خوفناک اس لیے بھی ہو گا کہ سخت حساب و کتاب ہونے والا ہو گا۔ اور پھر یہ اس لیے بھی خوفناک ہو گا کہ اللہ جبار و قہار کا دربار ہو گا۔ جو حقیقی منعم اور فضل و کرم کرنے والا ہے۔ جس کے فضل و کرم کا شکر ادا نہیں کیا گیا اور نہ اس کے فضل و کرم کو لوگوں نے پہچانا ہے۔

اس کے بعد اس بدحال گروہ مجرمین سے کہا جائے گا جن کا منہ خشک ہوگا اور سانس ... ہی ہوگی:

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

"یہ ہمارا تیار کرایا ہوا اعمال نامہ ہے جو تمہارے اوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے' جو کچھ بھی تم کرتے تھے اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے"۔

اب ان کو معلوم ہو گا کہ اس اعمال نامے سے کوئی چھوٹی بڑی شے رہ نہیں گئی۔ اس لیے کہ ہر چیز اللہ کے علم کے مطابق لکھی گئی ہے جس سے کوئی چیز غائب نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد ان اقوام و ملل کی تقسیم ہو گی' مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کو صرف دو حصوں میں بانٹ دیا جائے گا۔ تمام اقوام و ملل کے لوگ اب دو طبقے ہوں گے۔ ایک گروہ اور طبقہ اہل ایمان کا ہو گا اور ایک اہل کفر کا ہو گا۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک صرف دو پارٹیاں ہیں اور دو جھنڈے ہیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان۔ اس کے علاوہ تمام ملتیں' تمام فرقے اور مذاہب ختم ہوں گے۔ تمام آبادی دو گروہ ہو جائے گی۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿٣٠﴾

"پھر جو لوگ ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے' انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہی صریح کامیابی ہے"۔

اب یہ گروہ اس طویل انتظار سے نجات پائے گا۔ قلق اور اضطراب دور ہو گا۔ آیت میں ان کے انجام کو جلدی سے نہایت سادہ انداز میں بیان کر دیا۔ اور یہ لوگ گئے اپنے اصل مقام کی طرف۔

لیکن ہماری نظریں اچانک کیا دیکھتی ہیں کہ ایک دوسرا گروہ ہمارے سامنے ہے اور ان کو طویل الفاظ میں سرزنش کی جاتی ہے۔ ان کو شرمندہ کیا جاتا ہے اور ان کے برے اعمال و اعال ان کو یاد دلائے جاتے ہیں۔

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا أَفَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُجْرِمِينَ ﴿٣١﴾ وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُمْ مَا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ ﴿٣٢﴾

"اور جن لوگوں نے کفر کیا (ان سے کہا جائے گا) "کیا میری آیات تم کو نہیں سنائی جاتی تھیں؟ مگر تم نے تکبر کیا اور مجرم بن کر رہے اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے' ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں' یقین ہم کو نہیں ہے"۔

اب ذرا دیکھو' کیا حال ہے؟ اور تمہیں کس قدر یقین آ رہا ہے۔ قدرے وقفے کے بعد اب ان کی ذہنی دنیا کے حالات کہ اب ان پر چودہ طبق روشن ہیں:

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۳﴾

"اس وقت ان پر ان کے اعمال کی برائیاں کھل جائیں گی اور وہ اسی چیز کے پھیر میں آ جائیں گے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے"۔

اس کے بعد دوبارہ ان کو شرمندہ کیا جاتا ہے اور یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اب ان کو پوچھنے والا کوئی بھی نہ ہو گا اور ان کا بہت ہی دردناک انجام ہو گا۔

وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ

"اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ "آج ہم بھی اسی طرح تمہیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے۔ تمہارا ٹھکانا اب دوزخ ہے اور کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ یہ تمہارا انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق بنا لیا تھا اور تمہیں دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا"۔

اب ان کے آخری انجام کے اعلان پر پردہ گرتا ہے' جہنم میں ان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے' نہ ان سے کوئی عذر طلب کیا جاتا ہے اور نہ معافی کی درخواستیں طلب کی جاتی ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۳۵﴾

"لہٰذا آج نہ یہ لوگ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے کہا جائے گا کہ معافی مانگ کر اپنے رب کو راضی کرو"۔ گویا ان الفاظ کے ساتھ ہی ہم کرخت آوازیں سنتے ہیں اور جہنم کے دروازے ان پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اب یہ منظر یہاں ختم ہوتا ہے اور اس حالت میں کوئی تغیر اور تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

اس مقام پر اللہ کی حمد و ثنا کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اس تمہید اور منظر کے بعد سورت کے آخری کلمات نہایت ہی موثر ہیں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾

۴
اا ع
۲۰

"پس تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو زمین اور آسمانوں کا مالک اور سارے جہان والوں کا پروردگار ہے۔ زمین اور

آسمانوں میں بڑائی اسی کے لیے ہے اور وہی زبردست اور دانا ہے"۔

اللہ کی بڑائی اور اللہ کی عظمت کا اعلان ہوتا ہے ۔ آسمانوں میں بھی وہ بڑا ہے اور زمین میں بھی وہی بڑا ہے ۔ انسانوں کا بھی وہ حاکم ہے اور جنوں کا بھی وہ حاکم ہے ۔ وحوش و طیور کا بھی وہی خالق ہے ' غرض جو کچھ اس کائنات میں ہے وہ اللہ کا ہے سب کے سب ایک ہی رب کی نگرانی میں ہیں ۔ اللہ ہی ہے جو مدبر کائنات ہے اور رب کائنات ہے ۔

اللہ کی ثنا اور کبریائی کی آواز بلند ہوتی ہے ۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس کائنات میں بڑائی صرف اللہ ہی کی ہے ۔ اس کے مقابلے میں ہر بڑا چھوٹا ہو جاتا ہے اور جبار یہاں گھٹنوں کے بل جھکا ہوا ہے ۔ ہر سرکش یہاں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہے ۔ رب مطلق اور اکبر مطلق کے سامنے ۔

اس کبریائی ' اس ربوبیت ' اس قدرت اور اس حکمت اور اس تدبیر کے ساتھ غالب قرار پاتا ہے ۔

وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۴۵ : ۳۷) "وہ زبردست اور دانا ہے"۔ الحمدللہ رب العلمین !

--- ooo ---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ------ ۲۶

سورۃ الاحقاف ـ ۴۶ آیات ۱--- تا--- ۳۵

سورۃ محمد ـ ۴۷ آیات ۱--- تا--- ۳۸

سورۃ الفتح ـ ۴۸ آیات ۱--- تا--- ۲۹

سورۃ الحجرات ـ ۴۹ آیات ۱--- تا--- ۱۸

سورۃ ق ـ ۵۰ آیات ۱--- تا--- ۴۵

سورۃ الذاریات ـ ۵۱ آیات ۱--- تا--- ۳۰

سورۂ احقاف ایک نظر میں

یہ سورت مکی ہے اور اس کا موضوع اسلامی عقیدہ ہے ۔ یعنی اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت پر ایمان لانا کہ وہ واحد ہے اور پروردگار ہے ۔ وہ اس پوری کائنات اور اس میں پائے جانے والی مخلوقات کا رب ہے اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور آپؐ سے پہلے بھی کئی رسول گزرے ہیں ' آپؐ پر یہ قرآن نازل ہوا ہے اور یہ ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو پہلے نازل ہوئیں ۔ اور یہ کہ مرنے کے بعد اٹھایا جائے گا اور پھر حساب و کتاب ہو گا اور یہ حساب و کتاب ان اعمال کی بنیاد پر ہو گا جو لوگوں نے اس دنیا میں کیے ' اچھے یا برے ۔

یہ وہ بنیادی تصورلت ہیں جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے ۔ اس لیے تمام کی قرآن میں اللہ نے ان پر مفصل بحث کی ہے اور مدینہ میں بھی ان ہی کی بنیاد پر مفصل ہدایات دی گئی ہیں ۔ مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تھی ' اسلامی سوسائٹی قائم تھی اور مدینہ میں بھی جو ہدایات دی گئیں ' جو قوانین بنائے گئے ' ان مباحث کے دوران بھی جابجا ان امور کی طرف اشارہ کیا جاتا رہا کیونکہ اسلام کے تمام قوانین ' اخلاق ' آداب ' اور ادارے اسلامی نظریہ حیات پر مبنی ہیں ۔ چنانچہ خالص قانونی اور دستوری مباحث کے درمیان بھی ایمان ' توحید اور رسالت کی بات ہوتی رہتی ہے ۔

چنانچہ یہ سورت ہر اسلوب اور ہر انداز سے ' یہ عقیدہ ' دلوں میں بٹھانا چاہتی ہے ۔ ہر زاویہ سے ' ہر میدان میں تکوینی ' نفسیاتی اور تاریخی دلائل سے مسلح ہو کر یہ اسلامی عقائد کی بات کرتی ہے بلکہ یہ سورت اسلامی عقائد کو اس پوری کائنات کی حقیقت بتلاتی ہے ۔ یہ عقیدہ صرف انسانوں کا نہیں ہے ' یہ جنوں کا بھی ہے ۔ ایک طرف اس عقیدے پر کائنات شاہد ہے دوسری طرف اہل کتاب میں سے بعض حق پرست بھی اس پر شہادت دیتے ہیں ۔

یہ سورت انسانوں کو آسمان اور زمین کی سیر کراتی ہے ۔ قیامت کے مناظر میں لے جاتی ہے اور انسان کو انسانی تاریخ میں قوم عاد مکہ کے اردگرد بستیاں اور ان کی ہلاکت اور زمین و آسمان کے دوسرے نشانات بتاتی ہے کہ جس طرح قرآن حق بات کی شہادت دیتا ہے اسی طرح یہ کائنات اور تاریخی واقعات بھی حقیقت کی شہادت دیتے ہیں ۔

اس سورت کے چار حصے ہیں ۔ پورہ سورت کی عمارت گویا چار ستونوں پر کھڑی ہے اور ایک ہی مربوط عمارت ہے ' پہلا سبق حروف حا ۔ میم سے شروع ہوتا ہے جس طرح اس سے پہلے کی چھ سورتوں کا آغاز انہی حروف سے ہوا ہے ۔ اور ہر جگہ ان حروف کے بعد وحی اور کتاب الہی کے نزول کی بحث ہے ۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۴۶ : ۲) "اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے"۔ اور اس کے بعد متصلا کتاب کائنات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کائنات کو حق پر پیدا کیا گیا ہے ۔ اور اللہ کی تدبیر نے اسے صحیح صحیح اندازوں سے پیدا کیا ہے ۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ اَجَلٍ مُّسَمًّى (۴۶ : ۳)
"ہم نے زمین و آسمان کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں' برحق پیدا کیا ہے اور ایک مدت خاص کے تعین کے ساتھ پیدا کیا ہے"۔ مگر یہ لوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں کہ یہ قرآن جو پڑھی جانے والی وحی و کتاب ہے اور یہ کائنات جو دیکھی جانے والی کھلی کتاب ہے' دونوں سچائی پر مشتمل ہیں۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ (۴۶ : ۳) "مگر یہ کافر لوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس سے انہیں خبردار کیا گیا ہے"۔

اس کے بعد قوم کے عقائد شرکیہ پر سخت تنقید کی جاتی ہے کہ لوگ حق آنے کے بعد دوسرے الہوں کو پکارتے ہیں جن کی الوہیت پر کوئی سند نہ کتاب کائنات میں موجود ہے اور نہ کتب سماوی میں سے کسی منقول روایت میں

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

(۴۶ : ۴) "اے نبیؐ' ان سے کہو کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا ہے کہ وہ ہستیاں ہیں کیا جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین میں انہوں نے کیا پیدا کیا ہے یا آسمانوں کی تخلیق و تدبیر میں ان کا کیا حصہ ہے اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ تمہارے پاس ہو تو وہی لے آؤ اگر تم سچے ہو"۔ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ جن کو تم پکارتے ہو' اگر قیامت تک بھی کوئی کھڑا پکارتا رہے تو وہ نہیں سن سکتے اور نہ جواب دے سکتے ہیں بلکہ قیامت میں تو جو بہت ہی اعصاب شکن دن ہو گا یہ معبود صاف منکر ہوں گے۔

اس کے بعد یہ بات آتی ہے کہ یہ لوگ دعوت اسلامی کا استقبال کس انداز سے کرتے ہیں۔

هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۴۶ : ۷) "کہ یہ کھلا جادو ہے"۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ کہتے ہیں یہ اللہ پر افترا ہے۔ رسول اللہ کو کہا جاتا ہے کہ ان کو ایسے انداز سے جواب دیں جو ایک نبی کے شایان شان ہوتا ہے' یعنی خدا خوفی اور خدا پرستی کے ساتھ تمام امور اللہ کے سپرد کر دیں' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۴۶ : ۸) قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَ مَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَ لَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَ مَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۴۶ : ۹) "کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسولؐ نے اسے خود گھڑ لیا ہے ان سے کہو کہ اگر میں

نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے ـ جو باتیں تم بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے ـ میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے ـ وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے ـ ان سے کہو "میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں' میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے اور میرے ساتھ کیا ـ میں تو صرف وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کرنے والے کے سوا کچھ نہیں ہوں" ـ

اور ان کے سامنے بعض ایسے لوگوں کی مثال بطور حجت پیش کی جاتی ہے جنہوں نے دعوت اسلامی کو قبول کیا اور وہ بنی اسرائیل میں سے تھے ـ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں وہی باتیں ہیں جو تورات میں تھیں' وہ تو ایمان لے آئے اور تم نے کفر اختیار کر لیا ـ

فَاٰمَنَ وَ اسْتَكْبَرْتُمْ (۴۶ : ۱۰) "وہ تو ایمان لے آیا اور تم گھمنڈ میں پڑے رہے" ان پر تنقید کی جاتی ہے کہ تم تکذیب پر اصرار کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہو حالانکہ اہل کتاب میں سے جو لوگ اہل علم تھے وہ ایمان لائے ـ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۴۶ : ۱۰) "اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا" ـ

اس اصرار کے لیے وہ جو وجوہات بیان کرتے تھے اور بہانہ تراشیاں کرتے تھے ان کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے ـ مثلاً وہ کہتے تھے ـ

لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ (۴۶ : ۱۱) "اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جاتے" ـ جب انہوں نے اس ہدایت کو قبول نہیں کیا اور مخالف صف میں ہیں تو یہ اور کیا کہیں گے ـ

وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ (۴۶ : ۱۱) "چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے" ـ

یہاں حضرت موسیٰ کو دی جانے والی کتاب تورات کا ذکر کر کے کہا جاتا ہے کہ قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے اور قرآن کا مشن اور دعوت یہ ہے ـ

لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ (۴۶ : ۱۲) "تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے" ـ اور اس خوشخبری کی تفصیلات پر یہ سبق ختم ہوتا ہے' ان لوگوں کے لیے جنہوں نے تصدیق کی اور پھر جم گئے ـ

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

أُولٰئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۴۶ : ۱۴) "یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے 'پھر اس پر جم گئے 'ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم 'ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں' جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے 'اپنے اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے"۔

دوسرے سبق میں عقائد کے زاویہ سے انسانی فطرت کے دو نمونے پیش کیے گئے ہیں' ایک سلیم الفطرت اور مستقیم الفطرت اور دوسرا کجی اختیار کرنے والا ابتدائے آفرینش سے ان دونوں نمونوں کو دکھایا جاتا ہے جو والدین کے زیر سایہ پلتے ہیں اور جب وہ بلوغ اور سن رشد کو پہنچتے ہیں تو پھر وہ خود مختارانہ تصرفات کرتے ہیں ۔ پہلا نمونہ تو اللہ کی نعمتوں کا شعور رکھتا ہے' والدین کے ساتھ حسن سلوک اٹھتا ہے اور اللہ کا ذکر و شکر کرنے کی طرف راغب ہوتا ہے' توبہ کرنے والا' اطاعت شعار 'خضوع و خشوع کرنے والا ۔

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْ أَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ (۴۶ : ۱۶) "اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں ۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے ۔ اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جا رہا ہے"۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو والدین کے نافرمان ہیں جس طرح وہ رب کے نافرمان ہیں اور آخرت کے منکر ہیں ۔ یہ ہیں دو اقسام کے لوگ ۔

أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْ أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ (۴۶ : ۱۸) وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۴۶ : ۱۹) "یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے ۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جو ٹولے ہو گزرے ہیں' انہی میں یہ بھی شامل ہوں گے ۔ بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں"۔

اس سبق کا خاتمہ قیامت کے مناظر میں سے ایک نہایت ہی تیزی سے گزر جانے والی جھلک سے کیا جاتا ہے جس میں ان لوگوں کا انجام دکھایا جاتا ہے ۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ (۴۶ : ۲۰) "پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا "تم اپنے حصے کی نعمتیں' اپنی دنیا کی زندگی ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھا لیا ۔ اب جو تکبر تم زمین

میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا"۔

تیسرا سبق قوم عاد کی ہلاکت کے بارے میں ہے 'جب انہوں نے اپنے پیغمبر کو رد کر دیا۔ یہاں ان کے قصے سے وہ کڑی لی جاتی ہے جن میں وہ اس ہوا سے امیدیں باندھے ہوئے ہیں جو بانجھ ہے 'جس سے وہ توقع کرتے ہیں کہ بارش لے کر آ رہی ہے اور اس کے نتیجے میں ہر طرف زندگی پھوٹ نکلے گی' حالانکہ وہ ہلاکت اور بربادی کی حامل تھی۔ اور وہ دراصل وہ عذاب تھا جس کے لیے وہ شور مچاتے تھے کہ جلدی آئے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۴۶ : ۲۴) تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (۴۶ : ۲۵) "پھر جب انہوں نے اس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے "یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا"۔۔۔ "نہیں بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے' یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آ رہا ہے۔ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا"۔ آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں"۔ قوم عاد کے اس برے انجام سے ان کے دلوں کو متاثر کر کے یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ اس بات کو وہ نوٹ کریں کہ عاد کے لوگ اہل قریش سے زیادہ مالدار اور قوت والے تھے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْئِدَةً فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَلَاۤ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶ : ۲۶) "ان کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا۔ ان کو ہم نے کان' آنکھیں اور دل سب کچھ دے رکھے تھے' مگر نہ وہ کان ان کے کام آئے' نہ آنکھیں' نہ دل' کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔ اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے"۔

آخر میں ان کو ان بستیوں کی ہلاکت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو مکہ کے ماحول میں ہیں' اور ان کے ان معبودوں کی کمزوری کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور ان کے قرآنی دلائل کی بنا پر ان خداؤں کی حقیقت کے ظاہر ہو جانے کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے 'جن کو وہ پوجتے ہیں۔

چوتھے سبق میں قرآن کے بارے میں جنات کے ردعمل کی ایک کہانی ہے۔ اللہ کے رسول نے ان کو قرآن سنایا۔ وہ متاثر ہوئے 'اور گواہی دی کہ یہ کلام سچا ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِىْۤ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۶ : ۳۰) "تصدیق

کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی۔ رہنمائی کرنے والی ہے حق اور راہ راست کی طرف"۔ جب یہ لوگ اپنی قوم کی طرف لوٹتے ہیں تو ان کو ڈراتے ہیں اور ایمان کی دعوت دیتے ہیں۔

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۴۶ : ۳۱) وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۴۶ : ۳۲) "اے ہماری قوم کے لوگو' اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو' اور اس پر ایمان لے آؤ' اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا' اور تمہیں عذاب الیم سے بچا دے گا' اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں کوئی بل بوتا رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے اور نہ اس کے کوئی حامی د سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچالیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔ اور جنوں کی اس تقریر میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس کائنات کی کتاب مفتوح میں بھی یہ حقیقت پائی جاتی ہے کہ اللہ پیدا کرنے' مارنے اور پھر دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يُّـحْيِۦ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓي اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۴۶ : ۳۳) "اور کیا ان لوگوں کو یہ سجھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین و آسمان پیدا کیے اور جن کو بناتے ہوئے وہ نہ تھکا' وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے' کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

یہاں اب کفار کا وہ منظر پیش کیا جاتا ہے جب ان کو آگ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس وقت وہ ان باتوں کا اقرار کریں گے جن کا یہاں انکار کرتے تھے۔ لیکن وہاں اقرار و یقین کا فائدہ کیا ہو گا۔

اس کے بعد رسول اللہ کو تلقین کی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں اور ان کے لیے عذاب طلب کرتے ہیں جلدی نہ فرمائیں۔ ایک مختصر سی مہلت ہے جو انہیں دی جا رہی ہے۔ یہ عذاب جلدی ان کو آلے گا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۭ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶ : ۳۵) "پس اے نبی' صبر کرو' جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے مقابلہ میں جلدی نہ کرو جس روز یہ لوگ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے تو انہیں یوں معلوم ہو گا جیسے دنیا میں ان کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی۔ اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا"۔ یہ ہے یہ سورت مختصراً۔

اب آیات کی تفصیلی تشریح۔

درس نمبر ۲۲۷ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۱۴

حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۝

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

"ح' م' اس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں 'برحق' اور ایک مدت خاص کے تعین کے ساتھ پیدا کیا ہے۔مگر یہ کافرلوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس سے ان کو خبردار کیا گیا ہے"۔

یہ اس سورت کا پہلا زمزمہ ہے کہ یہی عربی حروف تہجی ہیں جنہیں تم استعمال کرتے ہو اور انہی سے یہ کلام بنا ہے جو عربوں کے مروج اسالیب کلام سے معجزہ ممتاز ہے۔اس لیے یہ کلام الٰہی ہے اور ایک زبردست حکمت والی ذات کا کلام ہے اور اس کتاب میں جو سچائی ہے 'اس سچائی پر یہ کائنات بھی بنی ہے' جسے تم دیکھتے ہو۔یہ کلام بھی اس کا بنایا ہوا ہے اور یہ پیچیدہ کائنات بھی اس کی بنی ہوئی ہے۔یہ کائنات بھی ایک کتاب ہے جسے کھلی آنکھیں اور کھلے دل پڑھ سکتے ہیں۔

دونوں کتابوں کا کلام حق پر مبنی ہے۔یہ کتاب ایک زبردست اور حکیم ہستی الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۴۶ : ۲) کا کلام ہے۔اس لیے یہ کتاب مظہر قدرت الٰہیہ ہے اور مشتمل بر حکمت الٰہیہ ہے۔اور زمین و آسمان کی تخلیق بھی اسی حق پر ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى (۴۶ : ۳)

"ہم نے زمین و آسمان کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں 'برحق اور ایک مدت خاص کے تعین کے ساتھ

پیدا کیا ہے"۔ ۔ ں عرصے میں وہ مقصد پورا ہو گا جو اس مخلوق کے پیدا کرنے سے مطلوب ہے۔ اور اللہ نے اس کائنات اور اس کے اندر پائی جانے والی مخلوقات کے بارے میں جو اندازے رکھے تھے وہ ظاہر ہوں گے۔

یہ دونوں کتابیں کھلی ہیں۔ تمہاری نظروں کے سامنے ہیں' اللہ کی قدرتوں کی کہانیاں بتا رہی ہیں۔ اللہ کی حکمتوں پر گواہ ہیں' اور اللہ کی تدبیر اور تقدیر ان سے عیاں ہے اور یہ کائناتی کتاب اس پڑھی جانے والی وحی کی کتاب کی تائید کرتی ہے اور اس میں جو ڈراوا اور جو خوشخبری ہے اس کی بھی تائید یہ کائنات کرتی ہے لیکن۔

وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّاۤ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ (۴۶ : ۳) "مگر یہ کافرلوگ اس حقیقت سے منہ موڑ رہے ہیں جس سے ان کو خبردار رکھا گیا ہے"۔ اور ان کا یہ رویہ قابل تعجب ہے کیونکہ منزل کتاب اور نظارہ دکھانے والی کتاب دونوں کتابیں پکار پکار کر ان کو دعوت دے رہی ہیں۔

یہ کتاب جو نازل کی گئی ہے یہ بتاتی ہے کہ اللہ ایک ہے' وہ ہر چیز کا رب ہے کیونکہ وہی خالق ہے' ہر چیز کی تدبیر کرنے والا ہے' ہر چیز کو ایک اندازے سے پیدا کرنے والا ہے اور یہ کتاب کائنات ان سب چیزوں کی تصدیق کر رہی ہے۔ اس کائنات کے نظام کا پوری طرح ہم آہنگ ہونا اور اس کی حرکات کا نہایت ہی منضبط ہونا اس بات پر گواہ ہے کہ اس کا ایک ہی بنانے والا' چلانے والا اور تدبیر کرنے والا ہے۔ جس نے ہر چیز کو بنایا اور بڑی مہارت سے ہر چیز کو بنایا۔ چنانچہ ہر پیدا کردہ چیز اور اس کی ماہیت اور وجود اور اس کی رفتار کی ایک ہی ساخت اور طرز ہے۔ لوگ پھر کس بنیاد پر متعدد الہوں کے قائل ہیں؟ یہ بات حیرت انگیز ہے۔ آخر ان لوگوں کے الہوں نے کیا بنایا ہے اور وہ کیا کرتے ہیں؟ یہ کائنات جو اللہ کی بنائی ہوئی ہے یہ تو تمہارے سامنے کھلی کتاب ہے۔ اس میں تمہارے خود ساختہ معبودوں کا کیا حصہ ہے؟ اس مخلوقات میں سے اگر کوئی ایک قسم کی مخلوق بھی انہوں نے بنائی ہے تو دعویٰ کرو اور بتاؤ!

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَا ذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۴﴾ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَ هُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۵﴾ وَ اِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِیْنَ ﴿۶﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۷﴾

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ ۖ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٨﴾ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ ﴿٩﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَآمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَا سَبَقُونَا إِلَيْهِ ۚ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ﴿١١﴾ وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ وَهَٰذَا كِتَابٌ مُصَدِّقٌ لِسَانًا عَرَبِيًّا لِيُنْذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَبُشْرَىٰ لِلْمُحْسِنِينَ ﴿١٢﴾

"اے نبیؐ" ان سے کہو "کبھی تم نے آنکھیں کھول کر دیکھا بھی کہ وہ ہستیاں ہیں کیا۔ جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین میں انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں کی تخلیق و تدبیر میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ (ان عقائد کے ثبوت میں) تمہارے پاس ہو تو وہی لے آؤ اگر تم سچے ہو۔ آخر اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتے بلکہ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ پکارنے والے ان کو پکار رہے ہیں، اور جب تمام انسان جمع کیے جائیں گے اس وقت وہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن اور ان کی عبادت کے منکر ہوں گے"۔

ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں اور حق ان کے سامنے آ جاتا ہے تو یہ کافر لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسولؐ نے اسے خود گھڑ لیا ہے۔ ان سے کہو "اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے، تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے، جو باتیں تم بناتے ہو، اللہ ان کو خوب جانتا ہے، میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے، اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔

ان سے کہو "میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں، میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے

کے سوا اور کچھ نہیں ہوں''۔ اے نبیؐ ان سے کہو ''دکبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو تمہارا کیا انجام ہو گا؟) اور اس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے ـ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے ـ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا''۔

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے ـ چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے ـ حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آ چکی ہے اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی زبان عربی میں آئی تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے''۔

اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین فرماتا ہے کہ آپ اپنی قوم کے سامنے یہ کائناتی شہادت پیش کریں ـ یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے ـ اس کتاب میں تو بحث و مناظرہ نہیں کیا جا سکتا' وہ سامنے موجود ہے ـ جو انسانی فطرت کو خطاب کرتی ہے ـ اس کی منطق اور اس کا انداز گفتگو بھی فطری ہے ـ اس کتاب کائنات اور فطرت انسانی کے درمیان گہرا ربط بھی موجود ہے ـ اس کو نہ دبایا جا سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی کسی کو دھوکہ دے سکتا ہے ـ یہ فطری سوال ہے ـ

اَرُوْنِیْ مَا ذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ (۴۶ : ۴) ''ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی زمین میں انہوں نے کیا پیدا کیا ہے؟'' یہ ممکن نہ تھا اور نہ ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ ان معبودوں میں سے کسی نے خواہ وہ پتھر ہوں' درخت ہوں' جن ہوں یا فرشتے' زمین میں سے کوئی حصہ یا کوئی چیز پیدا کی ہے ـ فطری سوچ' حقیقت واقعہ' اور ہر چیز بذات خود یہ پکار پکار کہتی ہے کہ کچھ بھی نہیں ـ انہوں نے تو کچھ بھی پیدا نہیں کیا ـ

اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ (۴۶ : ۴) ''یا آسمانوں کی تخلیق و تدبیر میں ان کا کوئی حصہ ہے''۔ کوئی انسان یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ ان مذکورہ معبودوں کا آسمانوں میں کوئی حصہ یا شرکت ہے ـ آسمانوں کے اندر ایک سطحی نظر بھی بتا دیتی ہے کہ خالق کائنات کس قدر عظیم ہے اور پھر یہ کہ وہ واحد ہے ـ ایک ہی نظر میں ایک معقول انسان تمام گمراہیوں اور افسانوں کو جھٹک کر پھینک دیتا ہے ـ اللہ تو انسان کا خالق ہے ـ وہ جانتا ہے کہ اس کائنات پر ایک گہری نظر ہی انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے ـ اس لیے اللہ بار بار انسان کو متوجہ کرتا ہے ـ کائنات کی اس کھلی کتاب پر نگاہ تو ڈالو ـ اس کے نظام پر غور کرو' اور تمہارے دل و دماغ پر اس کائنات سے جو سگنل آتے ہیں' ان سے پوچھ لو کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں ـ

اس کے بعد بعض نہایت ہی گمراہ درجے کے انسانوں کی راہ بند کرنے کے لیے اور ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ایک سوال کیا جاتا ہے ـ بعض اوقات زیادہ گمراہی میں آگے بڑھ کر کوئی یہ زعم بھی کر سکتا ہے کہ ہمارے پاس شرک کی نقلی دلیل ہے یا کوئی اور بہانہ کر سکتا ہے حالانکہ دراصل اس کے پاس کوئی حجت و دلیل نہیں ہے ـ اس لیے قرآن مجید ایسے لوگوں کا ناطقہ بند کرنے کے پہلے ہی مطالبہ کر دیتا ہے کہ لاؤ اگر کوئی حجت و دلیل تمہارے پاس ہے اور پھر قرآن مجید ان کو استدلال کا طریقہ بھی بتا دیتا ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے کے لیے صحیح طریق کار کیا ہوا کرتا ہے ـ

ایْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ ھٰذَآ اَوْ اَثٰرَۃٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۴۶ : ۴) ''اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب یا علم کا کوئی بقیہ تمہارے پاس ہو تو وہی لے آؤ اگر تم سچے ہو''۔ یا تو اللہ کی کوئی سچی کتاب پیش کرو۔ یا کتب سماوی میں سے کوئی اثر تمہارے پاس باقی ہو اسے لے آؤ۔ قرآن سے قبل جس قدر کتب سماوی بھی نازل ہوئی ہیں وہ تو قرآن کی تائید میں شہادت دیتی ہیں کہ اللہ وحدہ خالق ہے اور وہی کائنات کا مدبر ہے اور اس میں تمام چیزوں کو ایک قدر اور انداز سے پیدا کرنے والا ہے۔ ان کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب بھی متعدد الٰہ کے خرافات کو تسلیم نہیں کرتی۔ یا یہ کہ زمین و آسمان میں سے کوئی چیز ان الہوں نے بنائی ہو یا وہ کسی چیز کے بنانے میں شریک ہوں کوئی علم یا اثر یا نص کتب سماوی میں نہیں ہے۔

قرآن کریم ان کے سامنے اس کائنات کی شہادت بھی پیش کرتا ہے۔ کائنات کی شہادت تو فیصلہ کن شہادت ہوتی ہے۔ یوں قرآن مجید ان کے عقائد کو حجت و دلیل سے محروم کر دیتا ہے۔ اور ان کو یہ بھی سکھا دیتا ہے کہ بحث و دلیل کا صحیح اندازہ کیا ہوتا ہے اور یہ سب باتیں ایک ہی آیت میں سکھا دی جاتی ہیں جس کے الفاظ اگرچہ بہت تھوڑے ہیں لیکن زوردار اور فیصلہ کن ہیں۔

اس کے بعد قرآن کریم ان کے سامنے یہ نکتہ پیش کرتا ہے کہ جن چیزوں کو تم الٰہ بناتے ہو' اور پھر پکارتے ہو' ان کی تو کوئی حقیقت ہی نہیں ہے' یہ تو تمہاری اس پکار کو سنتے ہی نہیں' اس دنیا میں تم اگر ساری زندگی ان کو پکارتے رہو اور قیامت میں تو بھی وہ صاف صاف انکار کر دیں گے۔ لہٰذا اپنی اس حرکت پر ذرا غور تو کرو۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَآئِھِمْ غٰفِلُوْنَ (۴۶ : ۵) وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ کَانُوْا لَھُمْ اَعْدَآءً وَّکَانُوْا بِعِبَادَتِھِمْ کٰفِرِیْنَ (۴۶ : ۶) ''آخر اس شخص سے زیادہ بھکا ہوا انسان اور کون ہو گا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتے بلکہ اس سے بھی بے خبر ہیں کہ پکارنے والے ان کو پکار رہے ہیں' اور جب تمام انسان جمع کیے جائیں گے اس وقت وہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن اور ان کی عبادت کے منکر ہوں گے''۔

بعض لوگ ایسے تھے جو بتوں کو بذات خود الٰہ مانتے تھے۔ اور بعض ان کو فرشتوں یا نیک لوگوں کی شبیہ سمجھتے ہوئے الٰہ مانتے تھے۔ بعض درختوں کو الٰہ مانتے تھے' بعض فرشتوں اور شیطان کو الٰہ مانتے۔ ان میں سے کوئی بھی پکارنے والے کی پکار کا جواب نہ دے سکتا تھا' یا اگر پکار سنتا تھا تو کوئی فائدہ نہ دے سکتا تھا' پتھر اور درخت تو نہ کچھ سن سکتے تھے اور نہ جواب دے سکتے تھے۔ فرشتے بھی مشرکین کی اس حرکت پر کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ شیاطین تو بہرحال ان کو مزید گمراہ کرنے کے لیے وسوسہ اندازیاں کرتے تھے۔ جب قیامت کا دن ہو گا اور لوگ اٹھائے جائیں گے تو یہ تمام الٰہ جو پوجے جاتے تھے' یہ اپنے گمراہ عبادت گذاروں کی عبادت کا انکار کر دیں گے۔ یہاں تک کہ شیطان جس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کرے' وہ یہ کہے گا۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۴ : ۲۲) "اور جب فیصلہ چکا دیا جائے گا تو شیطان کہے گا" حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کیے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کیے ان میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔ میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں۔ میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں، نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا، میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ ایسے ظالموں کے لیے تو دردناک سزا یقینی ہے"۔

یوں قرآن مجید ان کو خود اپنے دعویٰ اور اپنے خیالات کے سامنے پیش کرتا ہے کہ ان دعووں کا انجام دنیا اور آخرت میں کیا ہونے والا ہے۔ جبکہ اس سے قبل ان کو کائنات کی نشانیاں بتائی گئیں کہ یہ شرک کے عقائد کا انکار کرتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا الٰہ صرف ایک اللہ العالمین ہے اور خود مشرکین کی دنیا اور آخرت کی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ وہ اپنے ان خیالات پر نظر ثانی کریں۔

قرآن مجید یہاں ان بت پرستوں پر تنقید کرتا ہے جو ایسے بتوں کو پکار رہے تھے جو ان کو کوئی نفع یا نقصان نہ دے سکتے تھے۔ نزول قرآن کے وقت ایسے روایتی زندہ اور مردہ معبود موجود تھے۔ لیکن یہ آیت صرف ان بتوں تک محدود نہیں ہے، جو ایک خاص زمان و مکان میں ایک خاص شکل میں پکارے جاتے تھے اور ان سے امیدیں وابستہ کی جاتی تھیں۔ آیت بہت وسیع ہے اور اس میں وہ سب معبود شامل ہیں جو اللہ کے سوا کسی بھی زمان و مکان میں پائے جائیں گے۔ جن کو عوام پکارتے ہیں اور جن سے امید وابستہ کرتے ہیں اور جو ان کو کوئی نفع و نقصان نہیں دے سکتے۔ کیونکہ نفع و نقصان پہنچانے والا تو اللہ ہی ہے۔ غرض شرک اس سادہ صورت اور شکل تک محدود نہیں ہے جو نزول قرآن کے وقت عربوں میں پائی جاتی تھی۔ کئی ایسے لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ اصحاب اقتدار کو شریک کرتے ہیں۔ افسران کو شریک کرتے ہیں، بڑے بڑے سرمایہ داروں کو شریک کرتے ہیں، ان سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں، ان کو پکارتے ہیں، لیکن یہ سب کے سب بہت ہی عاجز اور کمزور ہیں اور یہ کوئی فائدہ نہیں دے سکتے۔ وہ تو خود اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کو پکارنا شرک ہے، ان سے امیدیں وابستہ کرنا بھی شرک ہے۔ ان سے ڈرنا بھی شرک ہے۔ لیکن یہ شرک ذرا شرک خفی ہے اور اکثر لوگ غیر شعوری طور پر اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔

--- ooo ---

اس کے بعد اس پر بحث ہوتی ہے کہ رسول اللہ اور آپ کی سچی دعوت کے بارے میں ان کا موقف کیا ہے۔ شرک کے بارے میں ان کے خیالات کا جائزہ تو خوب لیا گیا۔ اب بتایا جاتا ہے کہ وحی اور دعوت اسلامی کے بارے میں ان کا

موقف کس قدر غلط اور غیر معقول ہے ۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ (٧) أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ ۖ كَفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۖ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (٨) قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (٩) قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِن كَانَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَكَفَرْتُم بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهِ فَآمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (١٠) وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ ۚ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ (١١) وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ وَهَٰذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَبُشْرَىٰ لِلْمُحْسِنِينَ (١٢)

(٤٦ : ٧ تا ١٢) ”ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں اور حق ان کے سامنے آ جاتا ہے تو یہ کافر لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے ۔ کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسولؐ نے اسے خود گھڑ لیا ہے ۔ ان سے کہو ”اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے' تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے' جو باتیں تم بناتے ہو' اللہ ان کو خوب جانتا ہے' میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے' اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے“ ۔

ان سے کہو ”میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں' میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا' میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں“ ۔ اے نبیؐ ان سے کہو ”کبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو تمہارا کیا انجام ہو گا؟) اور اس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے ۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے ۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا“ ۔

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے ۔ چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے ۔ حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آ چکی ہے

اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی زبان عربی میں آئی تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے"۔

بات کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات اور اس کی دعوت ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ بڑی واضح، دل لگتی اور کھلی باتیں ہیں لیکن یہ لوگ اس قدر ذلیل اور ضدی اور کم بخت ہیں کہ یہ اس سچائی کے بارے میں یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ

هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۴۶ : ۷) "یہ کھلا جادو ہے"۔ حالانکہ دعوت اسلامی اور جادو کی نوعیت اور موضوع ہی مختلف ہے۔ ایک نبی اور جادوگر کے مقاصد ہی مختلف ہیں۔ یوں ان کے اس غلط موقف پر حملہ کیا جاتا ہے جس کے لیے نہ دلیل ہے اور نہ وجہ جواز ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بہت ہی واضح ہے اور آیات بینات پر مشتمل ہے۔

اس کے بعد ان کے ایک دوسرے اعتراض کو لیا جاتا ہے جو وہ کیا کرتے تھے کہ یہ قرآن اپنی طرف سے گھڑا ہوا ہے اور اللہ کی طرف منسوب ہے اور ایک افترا ہے۔ اس شبہے کو قرآن استفہام اور سوالیہ انداز میں پیش کرتا ہے کہ یہ بھی کوئی سوال ہے یا کوئی معقول انسان ایسی بات سوچ سکتا ہے؟

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ (۴۶ : ۸) "کیا ان کا کہنا یہ ہے کہ رسول نے اسے خود گھڑ لیا ہے"۔ یعنی کیا وہ اس قدر جری ہو گئے ہیں کہ ایسی بات بھی کرتے ہیں حالانکہ اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آپؐ سے کہا جاتا ہے کہ اس سوال کا جواب اس طرح دیں جس طرح ایک پیغمبر کی شان ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ سوال بہت ہی لایعنی ہے۔ اس جواب سے اظہار ہو کہ آپ کو اپنے فرائض کا اچھی طرح شعور ہے، آپ کو اپنے رب کا بھی اچھی طرح شعور ہے۔ آپ کو اس کائنات کی حقیقی قدروں اور حقیقی قوتوں کا پورا احساس ہے۔

قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (۴۶ : ۸) "ان سے کہو، اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے جو باتیں تم بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے اور وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔ ان سے کہہ دو میں کیوں افترا باندھوں؟ کس کے مفاد کے لیے یہ افترا باندھوں؟ کن مقاصد کے لیے میں ایسا کروں؟ کیا اس لیے کہ تم مجھ پر ایمان لاؤ اور میری اطاعت کرو لیکن تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟

قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا (۴۶ : ۸) "اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم مجھے خدا کی پکڑ سے کچھ بھی نہ بچا سکو گے"۔ میرے افترا کی وجہ سے وہ لازماً میرا مواخذہ کرے گا۔ لہٰذا اگر تم میرے ساتھ ہو اور مجھ پر ایمان لاؤ تو اس میں مجھے کیا فائدہ ہو گا۔ افترا پر جب اللہ مجھ سے مواخذہ کرے گا تو تم اس وقت کیا کر سکتے ہو۔ تم تو بہت ہی عاجز اور کمزور ہو۔ میری کیا مدد کرو گے۔

یہ ایک ایسا جواب ہے جو نبی کے شایان شان ہے جو اللہ سے ہدایات لیتا ہے اور جسے اللہ کے سوا اس کائنات میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اسے صرف اللہ ہی کی قوت نظر آتی ہے۔ نیز یہ ایک منطقی اور معقول تردید بھی ہے۔ اگر کوئی ذرا اپنی عقل کو کام میں لائے۔ ان کو جواب دے کر اس پر آپ یہ اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔

هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ (٦ ٤ : ٨) "جو باتیں تم بناتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے"۔ یعنی جو تم کرتے اور کہتے ہو۔ اور جن باتوں کو اللہ جانتا ہے ان پر وہ ضرور تمہیں سزا دے گا۔

كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ (٦ ٤ : ٨) "میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہی دینے کے لیے کافی ہے"۔ اللہ گواہی بھی دے گا اور فیصلہ بھی کر دے گا اور اللہ کی گواہی اور اس کا فیصلہ کافی ہیں۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (٦ ٤ : ٨) "وہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔ وہ تم پر مہربان ہوتا ہے اور اپنی مہربانی سے تمہیں ہدایت دے دیتا ہے۔ اور تم نے جو گمراہیاں کیں انہیں بخش دیتا ہے۔ کیونکہ ایمان کے بعد سابقہ اعمال معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ ایسی تردید ہے جس میں ان کے لیے دھمکی اور ڈراوا بھی ہے۔ ان کے لیے حوصلہ افزائی اور ایمان کا لالچ بھی ہے۔ غرض ہر طریقے سے اللہ کی کوشش ہے کہ انسانوں کے دل بدل جائیں۔ انسان کے جسم کی تار تار کو چھیڑا جاتا ہے کہ شاید نغمہ ایمان برآمد ہو جائے۔ سامعین کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ معاملہ بہت اہم ہے اور یہ لوگ جو احمقانہ باتیں کرتے ہیں یہ محض بچگانہ باتیں ہیں، محض دعوے کرتے چلے جا رہے ہیں۔ داعی اعظم کے دل میں جو بات ہے اور جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں وہ بہت ہی عظیم ہے۔ اس کی اہمیت اور عظمت کا ان کو کوئی شعور نہیں۔

وحی پر ان کے اعتراض کا ایک دوسرے زاویہ سے بھی جواب دیا جاتا ہے۔ یہ کہ وحی ایک ایسا واقعہ ہے جس کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ لاکھوں افراد اسے مانتے ہیں۔ آخر اس میں عجوبے کی کیا چیز ہے کہ یہ اسے جادو یا افترا کہتے ہیں۔ یہ کوئی عجیب و غریب چیز تو نہیں ہے۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (٦ ٤ : ٩) "ان سے کہو میں تو نرالا رسول تو نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کل تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں"۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی پہلے رسول نہ تھے۔ آپؐ سے پہلے کئی رسول گزرے تھے۔ آپؐ کا معاملہ بھی انہی کی طرح ہے۔ انہوں نے کوئی ایسا دعویٰ نہ کیا تھا۔ پہلے بھی کئی انسانوں کو رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اللہ کو معلوم ہوتا ہے کہ کون رسالت کے لیے اہل ہے۔ اس کو یہ منصب دے دیا جاتا ہے۔ اور وہ بے کم و کاست پھر تبلیغ شروع کر دیتا ہے۔ یہی ہے رسالت کی حقیقت اور ماہیت۔ رسول کا دل جب سرچشمہ رسالت سے مل جاتا ہے تو پھر اللہ سے رسالت کی کوئی

دلیل طلب نہیں کرتا اور نہ اپنے لیے کوئی خصوصیت طلب کرتا ہے۔ پیغام ملتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ جو بات اس تک پہنچتی ہے اس کی تبلیغ شروع کر دیتا ہے۔

وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (۴۶ : ۹) "مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ کل میرے ساتھ کیا اور تمہارے ساتھ کیا ہونا ہے۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے"۔ رسول رسالت کے کام کو اس لیے شروع نہیں کرتا کہ وہ غیب جانتا ہے یا وہ جانتا ہے کہ اس کا' اس کی قوم کا اور اس کی دعوت کا انجام کیا ہو گا۔ وہ تو اللہ کے اشاروں اور ہدایات کے مطابق کام کرتا ہے۔ اسے اللہ پر بڑا بھروسہ ہوتا ہے' وہ اللہ کے ارادوں کا تابع ہوتا ہے اور اللہ کی ہدایات پر عمل کرتا ہے۔ ایک ایک قدم اللہ کے حکم سے اٹھاتا ہے لیکن مستقبل اسے معلوم نہیں ہوتا۔ تمام راز اللہ کے ہاں ہوتے ہیں اور رسول مستقبل کے راز معلوم کرنے کے لیے بے چین بھی نہیں ہوتا کیونکہ اس کا دل مطمئن ہوتا ہے اور بارگاہ رب العزت کے آداب میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ اسی علم پر اکتفا کرے جو اسے دے دیا گیا ہو اور مستقبل کے پردوں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش نہ کرے۔ رسول تو ہمیشہ اپنے فرائض کی حدود پر کھڑا ہوتا ہے۔

وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (۴۶ : ۹) "میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا کچھ نہیں"۔ اللہ کے دربار میں پہنچنے والوں کے یہی آداب ہوتے ہیں اور عارف باللہ لوگوں کا یہی اطمینان ہوتا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ پر عمل کرتے ہیں اور دعوت دیتے چلے جاتے ہیں اس لیے نہیں کہ وہ دعوت کا انجام دیکھتے ہیں۔ اس لیے بھی نہیں کہ دعوت کا مستقبل روشن ہوتا ہے' یا وہ اس کے نتیجے میں چھوٹی یا بڑی کامیابی پاتے ہیں۔ پس وہ اس کام کو اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ان کا فرض ہوتا ہے اور بس۔ وہ اپنے رب سے کوئی دلیل بھی نہیں مانگتے کیونکہ دلیل تو ان کے دل میں ہوتی ہے۔ وہ اللہ سے کچھ مراعات بھی نہیں مانگتے۔ اس سے بڑی رعایت یا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ ان کو اس کام کے لیے چنا گیا۔ وہ اس باریک خط سے سوتر بھر آگے نہیں بڑھتے جو ان کے لیے کھینچ دیا گیا ہے اور وہ انہی نقوش پر قدم رکھتے ہیں جو ان کے لیے کھینچ دیا گیا۔

اس کے بعد ایک قریبی شہادت کی طرف ان کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہ شہادت اہل کتاب کی ہے' جو نزول وحی سے اچھی طرح واقف ہیں۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَکَفَرْتُمْ بِہٖ وَشَہِدَ شَاہِدٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی مِثْلِہٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَکْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۴۶ : ۱۰) "ان سے کہو' کبھی تم نے سوچا بھی کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور تم نے اس کا انکار کر دیا (تو تمہارا کیا انجام ہو گا؟) اور اس جیسے ایک کلام پر تو بنی اسرائیل کا ایک گواہ شہادت بھی دے چکا ہے۔ وہ ایمان لے آیا اور تم اپنے گھمنڈ میں پڑے رہے۔ ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا"

یہ ممکن ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہو کہ بنی اسرائیل میں سے کسی شخص یا کسی گروہ نے قرآنی تعلیمات کو تورات اور دوسری کتابوں کے مماثل پاتے ہوئے ایمان لے آیا ہو کیونکہ کتب سماوی پر ایمان لانے والے لوگ جانتے تھے کہ یہ کتاب وہی بات کرتی ہے جو ان کتابوں میں ہے۔ بعض روایات میں تو آتا ہے کہ یہ آیت عبداللہ ابن سلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کی راہ میں یہ مانع ہے کہ وہ مدینہ میں مسلمان ہوئے تھے اور یہ سورت مکی ہے۔ ایسی روایات بھی ہیں کہ یہ آیت مدنی ہے کیونکہ یہ عبداللہ ابن سلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے جبکہ ایسی روایات بھی ہیں کہ یہ مکی ہے اور اس کا عبداللہ ابن سلام کے واقعہ سے تعلق نہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مکہ کے کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہو، مکہ میں اہل کتاب میں سے کوئی شخص ایمان لایا ہو اگرچہ یہاں اہل کتاب بہت ہی کم تھے اور مکی حالات میں ان کے ایمان لانے کی بہت ہی اہمیت ہو کیونکہ مشرکین امی تھے اور ایسے معاشرے میں اہل کتاب کے ایمان لانے کی اہمیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل کتاب کی شہادت کی طرف قرآن نے کئی مقامات میں اشارہ کیا ہے اور مشرکین کی تردید کے لیے اسے پیش کیا جو بغیر دلیل اور ثبوت کے اور بغیر علم و ہنر کے اور بغیر کسی کتاب اور سماوی روایات کے قرآن کی تکذیب کرتے تھے۔

لیکن سمجھنے کی بات یہاں یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہاں احتمالی اسلوب استدلال پیش کیا ہے۔ "تم نے بھی سوچا کہ اگر یہ کلام اللہ ہی کی طرف سے ہو اور......" اس طرز استدلال کی غرض یہ ہے کہ مشرکین کے اصرار کے اندر تزلزل پیدا کیا جائے۔ ان کے اصرار کی شدت کو کم کیا جائے۔ ان کے عناد کو ٹھنڈا کیا جائے۔ ان کے اندر ذرا خوف اور احتیاط پیدا کی جائے کہ اس تکذیب میں اتنا آگے نہ بڑھو۔ اور یہ استدلال کیا جائے کہ تم تو نہیں مانتے لیکن اگر سچ نکلے تو پھر...... تو تمہارا انجام بہت ہی برا ہو گا۔ لہٰذا اس فرض اور احتمال ہی کو مدنظر رکھ کر احتیاط کرو کہ اگر یہ سچ نکلا تو تم پر وہ تمام عذاب آجائیں گے جن سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں ڈراتے ہیں۔ لہٰذا حضورؐ کی تکذیب کرنے میں ذرا تامل کرو۔ اور اس دعوت پر غور و فکر کرو، قبل اس کے کہ تم اس قدر خطرناک انجام سے دوچار ہو جاؤ یا احتمال پیدا ہو جائے ایسے انجام کا خصوصاً ایسے حالات میں کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص یا گروہ نے یہ شہادت بھی دے دی ہو کہ اس کتاب کی نوعیت کلام الٰہی جیسی ہے۔ اور اس طرح وہ ایمان لایا۔ اور جب یہ کتاب سب سے پہلے تمہارے لیے آئی، تمہاری زبان میں آئی، تمہارے آدمی کے ذریعہ آئی تو تم تکبر کرتے ہو اور انکار کرتے ہو، یہ واضح ظلم ہے۔ واضح حق کو چھوڑ کر آگے بڑھ جانا ہے اور اس صورت میں تمہارے سب اعمال ضائع ہوں گے اور اللہ کا عذاب آجائے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۴۶ : ۱۰) "ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا"۔ غرض قرآن لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہر طریقہ اختیار کرتا ہے۔ مختلف اسالیب کلام اختیار کرتا ہے تاکہ انسانوں کے دلوں کے شکوک دور کرے اور مختلف راستوں سے اپنی دعوت لوگوں کے دلوں تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے۔ قرآن نے جو مختلف اسالیب اختیار کیے ہیں، ان میں آنے والے داعیوں کے لیے سامان عبرت اور رہنمائی ہے۔ باوجود اس کے کہ خدا و رسولؐ دونوں کے ہاں یقیناً قرآن حق تھا، اللہ کا کلام تھا اور اس میں شک اور احتمال کی کوئی بات نہ تھی۔ لیکن لوگوں کو سمجھانے کے لیے یہ اسلوب بھی اپنایا گیا کہ ممکن ہے اسی طرح شدت مخالفت کم ہو جائے۔

آگے مضمون جاری ہے کہ قرآن کے بارے میں اور دین اسلام اور اسلامی نظام کے بارے میں وہ جو کہتے تھے ان کا جائزہ۔ وہ اپنی تکذیب اور کفر کی ایک اور وجہ جواز بھی پیش کیا کرتے تھے۔ یہ متکبر اور بزعم خود اونچے درجے کے لوگوں کی بات ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ (٤٦ : ١١) ”جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ ایمان لانے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اگر اس کتاب کو مان لینا کوئی اچھا کام ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے۔ چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے“۔

آغاز اسلام میں 'اسلام کی طرف فقرا اور غلام لپکے تھے۔ اس لیے کبرا اور مستکبرین اس کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ ان کی نظروں میں یہ بات کھٹکتی تھی اور وہ یہ کہتے تھے اگر یہ دین کوئی اچھا دین تھا تو یہ لوگ کیا ہم سے زیادہ جاننے والے اور ہشیار تھے اور نہ ہمارے مقابلہ میں یہ پہل کر سکتے تھے۔ کیونکہ ہم ان سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں' زیادہ باشعور ہیں اور ان کے مقابلے میں نیک و بد کی زیادہ تمیز رکھتے ہیں۔

لیکن یہ معاملہ ایسا نہیں تھا۔ یہ کبراء جو اسلام کو قبول نہ کرتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اس میں شک کرتے تھے یا جاہل تھے اور ان کو خبر نہ تھی کہ قرآن مجید سچائی ہی سچائی ہے۔ یا یہ کہ اس میں خیر نہیں ہے بلکہ تکبر کی وجہ سے وہ ایسا کرتے تھے اور یہ لوگ قبولیت حق کو اپنے سے فروتر کام سمجھتے تھے۔ پھر وہ یہ سمجھتے تھے کہ موجودہ اجتماعی نظام میں ان کو سوسائٹی میں جو مقام حاصل ہے یہ نہ رہے گا' جو مفادات ان کو حاصل ہیں وہ نہ رہیں گے۔ پھر یہ بھی ایک وجہ تھی کہ آباؤ اجداد کے طریق کار کے بارے میں وہ یہ خیال کرتے تھے کہ یہ ایک قابل فخر رویہ ہے لیکن جو لوگ اسلام کی طرف پہلی ہی آواز پر لپکے ان کی راہ میں یہ موانع نہ تھے جن کی وجہ سے کبراء رک گئے تھے۔

ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ بڑے لوگ حق کو قبول نہیں کرتے۔ کبر اور غرور کی وجہ سے ان کے لیے حق کے سامنے جھکنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ فطرت کی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔ اور وہ حجت کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ کبر و غرور ان کو ڈکٹیٹ کراتا ہے کہ ہٹ دھرمی کرو اور نہ مانو۔ جھوٹے عذرات تراشو۔ باطل سے باطل جھوٹا دعویٰ کرو' یہ بڑے لوگ کبھی بھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتے۔ یہ لوگ اپنی ذات کو زندگی کا محور بنانے کی فکر میں ہوتے ہیں اور جس طرح وہ اپنے موجودہ معاشرے میں محور ہوتے ہیں اسے جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ (٤٦ : ١١) ”چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے“۔ ہاں 'اگر ”ان“ لوگوں نے ہدایت قبول نہیں کی تو پھر لازماً سچائی میں کوئی نقص ہو گا۔ کیونکہ بڑے لوگوں سے تو غلطی کا صدور ممکن نہیں! لیکن یہ لوگ اپنی نظر میں اور جمہور عوام کی نظروں میں اپنے آپ کو وہ جو باور کراتے تھے کہ وہ ایک معصوم اور غلطی سے پاک قسم کی مخلوق ہیں۔

بہرحال وحی کے سلسلے میں یہ پیراگراف اور مطالعاتی سفر کتاب موسیٰ کی طرف ایک اشارے پر ختم ہوتا ہے کہ قرآن

سابقہ کتب سماوی کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے ۔ خصوصاً تورات اور قرآن کے درمیان گہری مماثلت ہے ۔کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مشن تو تورات ہی کا تکملہ تھا۔اس سے پہلے بنی اسرائیل کے ایک گواہ کی طرف بھی اشارہ ہو چکا ہے ۔

وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً وَ هٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا لِّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِیْنَ (۴۶ : ۱۲) "حالانکہ اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت بن کر آچکی ہے اور یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی زبان عربی میں آئی ہے تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے"۔ قرآن کریم نے سابقہ کتب سماوی کے ساتھ اپنے تعلق کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے خصوصاً تورات کی طرف اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب تو اس کا تکملہ تھی اور ان کا مشن تورات ہی کا تسلسل تھا۔ اصل دستور و قانون تو تورات ہی میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے امام اور رحمت کا لقب دیا گیا جب کہ ہر رسالت اس زمین اور اہل زمین کے لیے رحمت ہوتی ہے ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔

وَ هٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِیًّا (۴۶ : ۱۲) "اور یہ کتاب تصدیق کرنے والی زبان عربی میں ہے"۔ یہ تصدیق ان اصل کتابوں اور اصل تعلیمات کی کرتی ہے جن کے اوپر تمام ادیان سماوی قائم ہیں ۔ یہ کتاب اس نظام کی تصدیق کرتی ہے جس کے مطابق تمام اہل دین چلتے رہے ۔ اور یہ کتاب اس صراط مستقیم کی تصدیق کرتی ہے جو انسانوں کو اللہ تک پہنچاتا ہے ۔

اور عربی کتاب جس طرح وہ تھی' یہاں اس لیے کہا گیا کہ اہل عرب پر اس احسان کا اظہار کر دیا جائے کہ ان کی زبان میں یہ کتاب اتری ۔ اور ان کو یاد دلایا گیا کہ تم پر تو اللہ کا خصوصی کرم ہوا ہے ۔ اور خاص مہربانی اور عنایت ہوئی ہے کہ تم کو اس دعوت کا حامل بنایا اور تمہاری زبان کو یہ اعزاز بخشا کہ اس میں قرآن عظیم نازل ہوا۔ مقصد صرف زبان نہ تھی بلکہ یہ تھا۔

لِّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِیْنَ (۴۶ : ۱۲) "تاکہ ظالموں کو متنبہ کر دے اور نیک روش اختیار کرنے والوں کو بشارت دے دے"۔

اس پہلے سبق کے آخر میں محسنین کی جزا کی تصویر کھینچی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم تمہارے لیے یہ خوشخبری لاتا ہے ۔بشرطیکہ وہ توحید مطلق اور ربوبیت کا اعلان کر دیں اور پھر اس پر جم جائیں اور اس کے تقاضے پورے کریں ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

"یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے' پھر اس پر جم گئے' ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ـ ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اپنے ان اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں"۔

یہ کہ انہوں نے ربنا اللہ کہہ دیا ـ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے جو انہوں نے کہہ دی ـ یہ محض ایک عقیدہ بھی نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل نظام زندگی کا اقرار ہے ـ زندگی کی تمام سرگرمیوں کا نام ہے ربنا اللہ ـ اللہ ہی ہمارا رب' ہماری سوچ میں بھی' ہمارے نظریات میں بھی' ہمارے اعمال میں بھی اور اس دنیا میں ہمارے پورے تعلقات میں بھی ـ

اللہ ہی ہمارا رب ہے' لہٰذا ہم اسی کی بندگی کریں گے' اسی سے ڈریں گے' اسی پر بھروسہ کریں گے اور اسی کا رخ کریں گے ـ اللہ ہی ہمارا رب ہے' لہٰذا تمام وسائل و ذرائع اسی کے ہیں اور اس کے سوا کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ کسی اور سے کوئی طمع و لالچ جائز ہے ـ

اللہ ہی ہمارا رب ہے' لہٰذا ہر سرگرمی' ہر سوچ اور ہر تقدیر اسی کی طرف ہے' اور ہر چیز میں اسی کی رضا مطلوب ہے ـ اللہ ہی ہمارا رب ہے' لہٰذا فیصلے بھی وہی کرے گا' شریعت اور قانون بھی اسی کا ہو گا اور ہدایت اور رہنمائی بھی اسی کی ہو گی ـ اللہ ہی ہمارا رب ہے' لہٰذا اس کائنات میں جو لوگ ہیں جو اشیاء ہیں وہ ہمارے ساتھ مربوط ہیں اور ان کے ساتھ ہمارا رابطہ ہے ـ کیونکہ ان کا رب بھی اللہ ہی ہے ـ اللہ ہی ہمارا رب ہے تو نظام زندگی بھی اسی سے اخذ کریں گے ـ یہ محض الفاظ ہی نہ ہوں گے محض عقیدہ ہی نہ ہو گا' بلکہ ایک ربانی نظام ہو گا ـ

ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (۴۶ : ۱۳) "اور پھر اس پر جم گئے" ـ یہ دوسری شرط ہے ـ یہ اس طرح کہ وہ اسلامی نظام کو قبول کرنے کے بعد اس پر جم گئے ـ ان کا دل اور ان کا نفس اس پر مطمئن ہو گیا' ان کے خیالات اور تصورات اس پر جم گئے' ہر قسم کا اضطراب اور شک ختم ہو گیا' تمام دوسری دلچسپیاں اور تمام کشش ختم ہو گئیں' تمام میلانات اور رجحانات ختم ہو گئے ـ یہ بات یاد رہے کہ دنیا کی دلچسپیاں متنوع اور جاذب ہوتی ہیں اور کسی نظام اور طریق کار پر جم جانا بڑا ہی مشکل کام ہے' جگہ جگہ انسانوں کے لیے پھسلنے کے مقامات ہوتے ہیں اور رکاوٹیں ہوتی ہیں اور ہر طرف سے اپنی طرف کھینچنے کے لیے آوازیں اٹھتی ہیں ـ

رَبُّنَا اللّٰہ (۴۶ : ۱۳) "اللہ ہی ہمارا رب ہے" کہنے کے بعد پورا نظام زندگی اپنانا ہوتا ہے اور اس پر جم جانا ہوتا ہے اور جن لوگوں کو اللہ نے معرفت حق اور استقامت علی الحق عطا کر دی وہ بہت ہی بڑے اور مختار لوگ ہوتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے حق میں یہ فیصلہ صادر ہوا ـ

فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۴۶ : ۱۳) "ان کے لیے نہ خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے" ـ وہ کیوں ڈریں اور کیوں پریشان ہوں ـ جس نظام کو انہوں نے اپنایا ہے وہ اللہ تک پہنچانے والا ہے اور اس پر جم جانا اللہ کی طرف سے ضمانت ہے ـ

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (٤٦ : ١٤) "ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے" ۔اپنے ان اعمال کے بدلے جو دنیا میں وہ کرتے رہے"۔ یہاں یعملون کا لفظ ربنا اللہ کی توضیح کرتا ہے ۔اور نفس منہاج پر استقامت کے معنی متعین کرتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا تمہارے اعمال اور تمہاری استقامت کی وجہ سے ہے ۔یعنی "اللہ ہی ہمارا رب ہے" کے منہاج اور اس پر استقامت سے عمل اور مسلسل عمل سامنے آئے اور وہ اس پر جم جائیں ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دین میں اعتقادات اور تصورات محض الفاظ ہی نہیں ہوتے کہ کوئی صرف کلمہ طیبہ کے الفاظ کہہ دے ' بلکہ کلمہ طیبہ ایک طریق زندگی ہے ۔اگر کلمہ محض الفاظ ہی ہوں ایک طرز زندگی نہ بنے تو وہ ارکان اسلام والا کلمہ نہ ہو گا۔ آج لاکھوں لوگ کلمہ طیبہ کی شہادت محض زبانی تو دیتے ہیں مگر یہ کلمہ ان کے ہونٹوں سے آگے نہیں بڑھتا اور یہ کلمہ ان کی زندگی کے اوپر کوئی اثر نہیں ڈالتا ' نہ اس کے اندر کوئی تغیر پیدا کرتا ہے ۔کلمہ پڑھنے کے بعد وہ اسی طرح جاہلانہ زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح دوسرے بت پرست کرتے ہیں ' جبکہ اپنے ہونٹوں سے وہ دن رات یہ کلمہ پڑھتے رہتے ہیں ' یہ الفاظ ہی ہوتے ہیں ' ان کی زندگیوں میں اس کا مفہوم نہیں ہوتا۔

لا الہ الا اللہ ' یا ربنا اللہ ' اللہ ہی ہمارا رب ہے ' یا اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے ۔یہ تو دراصل زندگی گزارنے کا ایک طریقہ اور منہاج ہے ۔ یہ مفہوم ہر مسلمان کو اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھالینا چاہئے تاکہ وہ پھر اس نظام کو تلاش کرے جس کی طرف ان کلمات میں اشارہ کیا گیا ہے اور وہ اس نظام پر غور کرے اور اسے قائم کرنے کی فکر کرے ۔

--- ooo---

درس نمبر ۲۳۸ ایک نظر میں

یہ سبق انسانی فطرت کے موضوع پر ہے 'کہ جب انسان صحیح فطرت پر ہوتا ہے تو وہ کس طرح ہوتا ہے اور جب اس کی فطرت بگڑ جائے تو اس کے شب و روز کیا ہوتے ہیں۔ آغاز اس نصیحت سے کیا جاتا ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو' اسلامی اخلاق و آداب اور خصوصاً والدین کے بارے میں وصیت قرآن کریم میں اسلامی عقیدے کو اپنانے کے ساتھ متصلاً آئی ہے۔ اس لیے کہ ایمان کے تعلق کے بعد اسلام والدین اور اولاد کے اچھے تعلق کو اہمیت دیتا ہے۔ ایمان کے بعد ایک مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ اسلام لانے اور عقیدۂ توحید اپنانے کے بعد فوراً والدین کے ساتھ حسن سلوک کو کیوں لایا جاتا ہے؟ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام احترام والدین کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اسلام اور قرآن یہ بتانا چاہتے ہیں کہ باپ اور بیٹے کے درمیان جو قوی تعلق ہے۔ یہ سب سے مضبوط تعلق ہے لیکن اسلامی تعلق اور اخوت خونی رشتوں سے بھی برتر ہے۔

اس سبق میں دو نمونے دیئے گئے ہیں' ایک نمونہ یہ ہے کہ والدین اور اولاد کے درمیان خونی رشتہ بھی ہے اور اس کے بعد نظریاتی رشتہ بھی ہے تو دونوں کے درمیان یہ تعلق ہدایت یافتہ تعلق ہوگا اور دونوں اللہ تک پہنچ کر جنت کے مستحق ہوں گے۔ دوسرے نمونے میں نسب کا رشتہ ایمان کے رشتے سے جدا ہو جاتا ہے۔ یہ آپس میں نہیں ملتے۔ اس صورت میں خون کے رشتے کے باوجود اولاد جہنم کی مستحق ہوتی ہے اور پھر قیامت کے مناظر میں سے ایک منظر بھی پیش کیا جاتا ہے اور اس میں فسق اور استکبار کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۳۸ تشریح آیات

۱۵--- تا--- ۲۰

وَ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۖ حَتّٰٓى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيْٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَأَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ إِنِّيْ تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۵﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ أَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

”ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے ۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا' اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے ۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہو گیا تو اس نے کہا ”اے میرے رب' مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں' اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو' اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے' میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں۔ اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں ۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے“۔

یہ وصیت جنس انسان کے لیے ہے ۔ اور یہ انسانیت کی بنیاد پر ہے ۔ اس وصیت کے لیے انسان کے علاوہ کسی اور صفت کی ضرورت کو نہیں لایا گیا ۔ اور احسان کے ساتھ بھی کوئی قید اور شرط نہیں لگائی ۔ والد کا محض والد ہونا ہی یہ فرض کر دیتا ہے کہ اس کے ساتھ احسان کیا جائے ۔ والد ہونے کے ساتھ کوئی اور صفت ضروری نہیں ہے ۔ اور یہ وصیت اس اللہ نے فرمائی جو انسان کا خالق ہے اور یہ وصیت شاید صرف انسان ہی کو کی گئی ۔ مخلوقات کی دوسری اصناف کو شاید یہ حکم

نہیں دیا گیا۔ آج تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ دوسرے حیوانات' پرندوں اور حشرات الارض کو اس قسم کی کوئی ہدایت ہو۔ ہاں یہ بات حیوانات کی فطرت میں بھی دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش کریں۔ یوں نظر آتا ہے کہ یہ وصیت صرف انسان کو ہے اور یہ ہے بھی خاصہ انسان۔

قرآن کریم میں بھی اس حکم کا تکرار ہے جو بطور وصیت کیا گیا اور احادیث میں بھی اس کی سخت تاکید آئی ہے۔ البتہ والدین کو اپنی اولاد کے بارے میں بہت ہی کم وصیت کی جاتی ہے۔ اگر کوئی ہدایت ہے تو بعض حالات کے بارے میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی پرورش' والدین کی فطرت کے اندر ہی رکھ دی گئی ہے۔ والدین خود بچے کی پرورش کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کو اس کام کے لیے ابھارنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ والدین بچوں کے لیے اس قدر قربانیاں دیتے ہیں کہ بعض اوقات والدین بچوں پر اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔ رنج والم تو معمولی بات ہے اور اسی سلسلے میں وہ ان سے کوئی عوض طلب نہیں کرتے۔ نہ ان سے طالب شکر ہوتے ہیں۔ لیکن نوجوان نسل پیچھے کو کم ہی دیکھتی ہے۔ کیونکہ ان سے اس قسم کی قربانی کا' مطالبہ خود ان کی اولاد کرتی ہے اور یونہی زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔

لیکن اسلام نے اپنی فطری تعلیمات کی رو سے سوسائٹی کی پہلی اکائی خاندان کو مقرر کیا ہے۔ خاندان ہی وہ گہوارہ ہے جس میں ناتواں بچے پرورش پاتے ہیں اور بڑے ہوتے ہیں۔ اس گہوارے سے بچے محبت' تعاون' باہم کفالت اور خاندان کی تعمیر و تربیت حاصل کرتے ہیں۔ جس بچے کو کسی خاندان کی تربیت نہیں ملتی وہ اپنی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو سے ناقص ہوتا ہے۔ اگرچہ خاندان کے دائرہ سے باہر اس کو ضروریات زندگی وافر مقدار میں میسر ہوں۔ اور اس کی تعلیم و تربیت کا اچھا انتظام کیا گیا ہو۔ ایسے بچے میں سب سے بڑی جو کمی ہوتی ہے وہ محبت کے شعور کی کمی ہوتی ہے۔ یہ بات علمائے نفسیات کے ہاں ثابت ہو چکی ہے کہ ہر بچہ زندگی کے پہلے دو سال صرف اپنی ماں کی گود میں رہنا چاہتا ہے۔ اور وہ اس میں کسی اور کی شرکت نہیں قبول کرتا۔ دنیا میں بچوں کی پرورش کے جو مصنوعی ادارے بنائے گئے ہیں ان میں سب سے پہلے تو ماں مفقود ہوتی ہے۔ کیونکہ وہاں کام کرنے والی عورت یعنی نرس کو تو کئی بچے سنبھالنے پڑتے ہیں۔ ان بچوں کا پھر ایک دوسرے کے ساتھ حسد ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مصنوعی مشترکہ ماں پر باہم مقابل ہوتے ہیں' یوں بغض و عناد ان کی ابتدائی زندگی سے ان میں پروان چڑھتا ہے اور جس ننھے دل میں نفرت پیدا ہو جائے۔ اس میں پھر محبت پیدا نہیں ہوتی۔ پھر بچے کے اوپر ایک عرصے تک ایک ہی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کی شخصیت میں ثبات پیدا ہو جائے۔ اور یہ بات صرف ایک خاندان ہی میں پیدا ہو سکتی ہے۔ رہے بچوں کی پرورش کے مصنوعی ادارے تو ان میں بچہ ایک ہی مضبوط نگران سے محروم ہوتا ہے کیونکہ مصنوعی ماؤں کی ڈیوٹیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس لیے ان کی شخصیت کے اندر بھی انتشار ہوتا ہے۔ اور وہ مضبوط شخصیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے اداروں کے جو تجربات سامنے آ رہے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بچوں کی پرورش کے لیے خاندان کی نرسری کو جو ضروری قرار دیا ہے اس کے اندر بڑی گہری حکمت ہے اور بچوں کی تربیت کا فطری طریقہ وہی ہے جو اسلام نے تجویز کیا ہے' جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہے۔

اور قرآن یہاں اس ماں کے کردار کو قلمبند کرتا ہے۔ ماں کی مشقتیں' ماں کی محبتیں اور ماں کی جدوجہد اور نہایت ہی کریمانہ انداز اور شریفانہ برتاؤ۔ اللہ نے اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ احسان کرنے کی جو وصیت کی ہے' اس کی تعمیل میں

اولاد اگر رات دن لگی رہے تو بھی وہ ماں کے احسان کو پورا نہیں کر سکتی۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (۴۶:۱۵)

"اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا' اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے"۔

اللہ نے ماں کی مشقتوں کے لیے جن الفاظ کا انتخاب کیا ہے ان کا تلفظ ہی مشقت کا اظہار کر دیتا ہے۔ الفاظ کی آواز اور ترنم ہی سے جہد و مشقت اور تھکاوٹ ظاہر ہوتی ہے۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا (۴۶:۱۵) "ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اسے جنا"۔ جس طرح تھکا ماندہ آدمی لمبی لمبی سانس بھرتا ہے۔ مشکل سے سانس لیتا ہے' تھکا ہوا ہوتا ہے۔ یہی ہوتی ہے حمل کی تصویر خصوصاً آخری دنوں میں اور وضع حمل اور اس کی مشکلات اور اس کے آلام تو ہر کسی کو معلوم ہیں۔

آج کل علم جنین بہت آگے بڑھ گیا ہے اور حمل کے تمام مراحل اور اس کے اندر ہونے والی عملیات سے انسان واقف ہو چکا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں ان تمام عملیات میں کس قدر مشقت اٹھاتی ہے اور قربانی دیتی ہے۔۔۔ عورت کے انڈے کے ساتھ جب مادہ منویہ کا جرثومہ ملتا ہے تو یہ رحم مادر کی دیواروں سے چپکنے کی سعی کرتا ہے اور رحم کی دیوار سے چپکتے ہی اس کی دیوار کو کھانا شروع کر دیتا ہے کیونکہ اس کے اندر کھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ رحم کی دیواروں کو دیمک کی طرح چاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ جس جگہ کو یہ کھانا شروع کرتا ہے' وہاں ماں کا خون جمع ہوتا ہے اور ایک چھوٹا سا حوض بن جاتا ہے اور یہ انڈا جس کے اندر جرثومہ ہوتا ہے اور یہ جرثومہ دونوں خون کے اس حوض میں ہوتے ہیں اور خون کے اندر ماں کے جسم کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اس خون کو یہ چوستا ہے اور بڑھتا رہتا ہے اور رحم کی دیواروں کو یہ چاٹتا رہتا ہے اور خون پیتا رہتا ہے۔ اور مادۂ حیات حاصل کرتا ہے۔ یہ ماں کھانا کھاتی ہے' پانی پیتی ہے اور خوراک ہضم کر کے اس انڈے اور اس جرثومے کے لیے تازہ خون تیار کرتی ہے اور اس خونخوار جرثومے کو خوراک مہیا کرتی ہے۔ ایک ایسا وقت آتا ہے کہ بچہ کی ہڈیاں بننا شروع ہوتی ہیں اور اس وقت پھر وہ زیادہ خون چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں بعض اوقات والدہ کو کیلشیم کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس دور میں عورت ہڈیوں کا گودا اس بچے کو فراہم کرتی ہے تاکہ اس بچے کا جسمانی ڈھانچہ تیار ہو' اس عظیم جدوجہد کا یہ ایک قلیل حصہ ہے۔ پھر وضع حمل کا مرحلہ آتا ہے۔ یہ نہایت ہی پر مشقت اور کربناک عمل ہے۔ لیکن ماں کے اندر جو بے پناہ محبت ہوتی ہے اپنے بچے کے لیے' اس کی وجہ سے یہ سب کچھ وہ برداشت کرتی ہے کیونکہ یہ تقاضائے فطرت ہے۔ یوں ماں اس چھوٹے بچے کو زندگی دیتی ہے اور خود پگھلتی جاتی ہے۔ اس کے بعد دودھ پلانے اور پھر پالنے پوسنے کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے گوشت اور خون کا نچوڑ دودھ کی شکل میں اسے دیتی ہے۔ اور اپنے دل' دماغ اور اعصاب کی پوری قوت صرف کر کے اسے پالتی ہے۔ لیکن ان تمام مشقتوں کو وہ خوشی خوشی قبول کرتی ہے۔ نہایت محبت اور رحیمانہ انداز میں۔ کبھی نہیں تھکتی' کبھی بچے سے نفرت نہیں کرتی' ان تمام مشقتوں کا صلہ یہ ماں صرف یہ چاہتی ہے کہ اس کا بچہ صحیح و سالم ہو اور بڑھتا ہی چلا

جائے ۔پس یہی صلہ ہے جو وہ چاہتی ہے ۔

اس طویل جدوجہد اور مشقت اور قربانی کا صلہ کوئی ماں کو دے سکتا ہے ۔ کوئی خواہ کتنی ہی جدوجہد کرے ' ماں کی خدمت میں ' اس کا صلہ کوئی نہیں دے سکتا ۔ اگر کوئی کچھ جدوجہد بھی کرے ۔ وہ بھی قلیل ہوگی ۔

ایک شخص طواف کرتے ہوئے اپنی ماں کو اٹھائے ہوئے تھا اور وہ رسول اللہؐ کے سامنے آیا تو کہہ دیا کہ حضورؐ میں نے اس کا حق ادا کر دیا تو آپؐ نے فرمایا "نہیں صرف ایک بار سانس لینے کے برابر بھی نہیں"۔ (البزار)

اب قرآن مجید اس انسان کو والدین کے ساتھ احسان کی وصیت اور ماں کی بے مثال مشقتوں اور قربانیوں کے مرحلے سے گزار کر اسے سن رشد میں لے جاتا ہے ۔ اب یہ مضبوط ' توانا اور دانشمند ہے ۔ اور اس کی فطرت درست ہے اور اس کا دل ہدایت یافتہ ہے ' اور یہ ہے قرآن کا انسان مطلوب ۔

حَتّٰی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّہٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۴۶ : ۱۵) "یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری طاقت کو پہنچا اور چالیس سال کا ہوگیا تو اس نے کہا "اے میرے رب ' مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں ' اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو ' اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے ' میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور تابع فرمان (مسلم) بندوں میں سے ہوں"۔

انسان سن رشد کو ۳۰ اور ۴۰ کے درمیان پہنچ جاتا ہے ۔ چالیس سال رشد و ہدایت کی انتہا ہوتے ہیں اس میں انسان کی تمام قوتیں مکمل ہو جاتی ہیں اور انسان تدبر اور تفکر میں مکمل ہو جاتا ہے ۔ اب یہ تکمیل کے مراحل طے کر جاتا ہے ۔ اور اس کے اندر ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس سن میں پھر جو مستقیم الفطرت ہو ' وہ اس زندگی سے ذرا بلند ہو کر سوچتا ہے ۔ اور پھر وہ پوری انسانیت کے انجام پر بھی غور کرتا ہے ۔

قرآن مجید ایک ایسی شخصیت کی ذہنی واردات کو یہاں قلم بند کرتا ہے ' جو فطرت سلیمہ کی مالک ہو ' اس مرحلے میں جہاں انسان عمر کا ایک حصہ پیچھے چھوڑ چکا ہے اور اگلی عمر میں پھر وہ متوجہ الی اللہ ہوتا ہے اگر مستقیم الفطرت ہو ۔

رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ (۴۶ : ۱۵)

"اے میرے رب ' مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائیں"۔ یہ ایک ایسے دل کی دعا ہے جو اپنے رب کی نعمتوں کا شعور رکھتا ہے کہ یہ انعامات جو تو نے مجھ پر کیے اور مجھ سے پہلے میرے والدین پر کیے اور مسلسل اگلے وقتوں سے یہ انعامات ہو رہے ہیں ۔ ان کے مقابلے میں ہماری قوت شکر بہت کم ہے ۔ اے اللہ آپ ہی ہمیں توفیق دیں اور ضبط دیں کہ ہم یہ شکر بجالا سکیں ۔ یہ نہ ہو کہ میں ادھر ادھر ہو کر انتشار میں اپنی قوتیں ہی ضائع کر دوں اور اصل کام یعنی شکر الہی بجالانے کو ایک طرف چھوڑ دوں ۔

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ (۴۶ : ۱۵) "اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو"۔ یہ دوسری دعا ہے یہ شخص اللہ کی مدد طلب کرتا ہے کہ وہ عمل صالح کر سکے۔ وہ اپنے کمال اور احسان کو رضائے ربی کے کام میں استعمال کرے کیونکہ رضائے الٰہی اس کا بڑا مقصد ہے۔ رضائے الٰہی کے حصول ہی کے لیے تو اس کی پوری جدوجہد ہے۔

وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ (۴۶ : ۱۵) "اور میری اولاد کو بھی نیک بنا کر مجھے سکھ دے"۔ یہ تیسری دعاء ہے۔ ہر صالح آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی صالحیت اس کی اولاد میں منتقل ہو اور اس کا دل مطمئن ہو کہ اس کی اولاد میں ایسے لوگ ہیں جو اس کے بعد اللہ کی بندگی اور اس کی رضامندی کے طالب ہوں گے۔ نیک اولاد بندۂ صالح کی پہلی تمنا ہوتی ہے اور خزانوں اور دولت کے مقابلے میں وہ نیک اولاد کو ترجیح دیتا ہے۔ زندگی کی ہر آرائش و زیبائش سے زیادہ اسے نیک اولاد پسند ہوتی ہے اور یہ دعا والدین سے اولاد کی طرف جا رہی ہے کہ آنے والی نسلوں میں بھی اللہ کی بندگی ہوتی رہے۔ اور یہ جو دعائیں اور درخواستیں وہ کر رہا ہے ان کی منظوری کے لیے اس کے پاس سفارش یہ ہے کہ میں توبہ کرتا ہوں اور سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۴۶ : ۱۵) "میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور میں تابع فرمان بندوں میں سے ہوں"۔ یہ ہیں ایک معیاری بندۂ صالح کی صفات اپنے رب کے حوالے سے جس کی فطرت سیدھی اور سلیم ہو۔ ایسے بندوں کے ساتھ اللہ کا تعلق پھر کیسا ہوتا ہے اس کی وضاحت بھی قرآن نے کر دی ہے۔

---ooo---

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ (۴۶ : ۱۶) "اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال کو قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے"۔

اللہ کے ہاں جزاء اعمال حسنہ پر ہے اور گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے اور جنت کے اصل مستحقین کے ساتھ ایسے لوگ جا ملیں گے اور یہ اللہ کا وعدہ ہے جو سچا وعدہ ہے۔ یہ وعدہ دنیا میں کیا گیا تھا اور اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

---ooo---

اور اس اچھے نمونے کے بالمقابل فسق، فجور اور گمراہی کا ماڈل بھی ملاحظہ ہو۔

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ

فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَي النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝

۲ ۱۰ ارع ۲

"اور جس شخص نے اپنے والدین سے کہا: "اف! تنگ کر دیا تم نے! کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد قبر سے نکالا جاؤں گا؟ حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی نسلیں گزر چکی ہیں (ان میں سے تو کوئی اٹھ کر نہ آیا) ماں اور باپ اللہ کی دہائی دے کر کہتے ہیں "ارے بدنصیب! مان جا' اللہ کا وعدہ سچا ہے" مگر وہ کہتا ہے "یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جو ٹولے (اسی قماش کے) ہو گزرے ہیں' انہی میں یہ بھی جا شامل ہوں گے۔ بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں۔ "دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔" "پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لاکھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: "تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھا لیا' اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں' ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا"۔

والدین مومن ہیں اور لڑکا نافرمان ہے۔ وہ سب سے پہلے ان کی نیک روش کا انکار کرتا ہے۔ وہ نہایت ہی کرخت' جارح اور قابل نفرت انداز میں ان سے مخاطب ہوتا ہے۔

اُفٍّ لَّكُمَآ (۱۷:۴٦) "اف! تنگ کر دیا تم نے" اور اس کے بعد پورے دین کی بنیاد ہی کا انکار کر دیتا ہے یعنی آخرت کا۔ اور ان الفاظ میں:

اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ (۱۷:۴٦) "کیا تم مجھے یہ خوف دلاتے ہو کہ میں مرنے کے بعد قبر سے نکالا جاؤں گا' حالانکہ مجھ سے پہلے نسلیں گزر چکی ہیں"۔ یعنی وہ چلے گئے اور ان میں سے کوئی ایک بھی تو واپس نہیں آیا۔ حالانکہ قیامت کا تو وقت طے شدہ ہے اور لوگوں کا اٹھایا جانا اس طرح ہو گا کہ سب کو اکٹھا اٹھایا جائے گا' ایک ایک آدمی کو نہیں۔ یہ بات تو اس کو کسی نے بھی نہ کہی تھی کہ ایک ایک آدمی کو یا ایک ایک نسل کو اٹھایا جائے گا۔ یہ کوئی مزاح تو ہے نہیں۔ یہ تو آخری حساب ہو گا اور سب کا ہو گا۔

والدین اس کے منہ سے یہ کفر سنتے ہیں' اس کی ان باتوں سے پریشان ہو جاتے ہیں' یہ اللہ کا بھی گستاخ ہے اور ان

کے ساتھ بھی گستاخانہ رویہ رکھتا ہے ۔ وہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں ۔ مارے خوف کے کانپ اٹھتے ہیں ۔

وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (۴۶ : ۱۷) "ماں اور باپ اللہ کی دہائی دے کر کہتے ہیں "ارے بدنصیب مان جا' اللہ کا وعدہ سچا ہے"۔ ان والدین کی باتوں سے ان کا خوف اور پریشانی ٹپکتی پڑتی ہے ' جبکہ یہ نافرمان بدبخت کفر و انکار پر مصر ہے ۔

فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۴۶ : ۱۷) "مگر وہ کہتا ہے یہ سب اگلے وقتوں کی فرسودہ باتیں ہیں"۔ اور اللہ پھر ایسے لوگوں کے انجام کو جلد ہی ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے ۔

---OOO---

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ (۴۶ : ۱۸) "یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے ۔ ان سے پہلے جن ۔ اور انسانوں کے جو ٹولے (اسی قماش کے) ہو گزرے ہیں ' انہی میں یہ بھی جا شامل ہوں گے ۔ بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں"۔

ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ اللہ کی عدالت سے ان کے خلاف فیصلہ صادر ہو جائے کیونکہ یہ منکر اور جھٹلانے والے ہیں اور اس قسم کے بہت سے لوگ موجود بھی ہیں اور گزر بھی گئے ہیں ۔ انسانوں میں سے بھی ہیں اور جنوں میں سے بھی ہیں ۔ اور ان کے بارے میں اللہ نے جو فیصلہ کر دیا ہے ' وہ نافذ ہو کر رہے گا ۔ اللہ کے فیصلے نافذ ہوتے ہیں ۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ (۴۶ : ۱۸) "بے شک یہ لوگ گھاٹے میں رہ جانے والے ہیں"۔ اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو گا کہ انسان دنیا میں ایمان و یقین سے محروم ہو جائے اور آخرت میں اللہ کی رضامندی اور جنت سے محروم ہو جانے اور پھر دائمی طور پر عذاب جہنم میں گرفتار ہو جائے ۔

---OOO---

اوپر جمالاً یہ بتا دیا گیا اہل ہدایت کو جزا ملے گی اور اہل ضلالت کو سزا' اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ حساب میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو گی ۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۴۶ : ۱۹)
"دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے ۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا"۔

ہر فرد کا اپنا اپنا مقام ہے اور ہر فرد کی اپنی اپنی کمائی ہے ۔ اور ہر فرد کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ ملے گا ۔ جن دو نمونوں کا اوپر ذکر ہوا ۔ لوگوں میں بالعموم پائے جاتے ہیں ۔ لیکن یہاں قرآن مجید نے ان کا تعین دو کرداروں اور دو

افراد کی طرح کیا ہے اور یہ انداز اچھی طرح ذہن نشین ہوتا ہے۔ یوں گویا ایک متعین مثال کو بیان کیا جا رہا ہو۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ آیات بعض متعین افراد کے بارے میں وارد ہوئی ہیں لیکن ان میں سے کوئی روایت بھی صحت کے درجے میں نہیں ہے۔ مناسب یہی ہے کہ ان دونوں کو دو کرداروں کا بیان یا دو نمونے سمجھا جائے۔ دونوں نمونوں کے بیان کے بعد قرآن کریم نے جو تبصرہ دونوں پر الگ الگ کیا ہے' وہ عام ہے۔ پہلے نمونے کے بعد وہ یہ تبصرہ آیا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ (۴۶:۱۶) "اس طرح کے لوگوں سے ہم ان کے بہترین اعمال قبول کرتے ہیں اور ان کی برائیوں سے درگزر کر جاتے ہیں۔ یہ جنتی لوگوں میں شامل ہوں گے۔ اس سچے وعدے کے مطابق جو ان سے کیا جاتا رہا ہے"۔ اور دوسرے کردار پر تبصرہ یہ ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ (۴۶:۱۸) "یہ لوگ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ چسپاں ہو چکا ہے۔ ان سے پہلے جنوں اور انسانوں کے جو ٹولے (اس قماش کے) ہوگزرے ہیں۔ انہی میں یہ بھی شامل ہوں گے بے شک یہ گھاٹے میں رہ جانے والے لوگ ہیں"۔ اور پھر دونوں فرقوں پر جو عام تبصرہ ہے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا وَلِيُوَفِّيَهُمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۴۶:۱۹)
"دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے درجے ان کے اعمال کے لحاظ سے ہیں تاکہ اللہ ان کے کیے کا پورا پورا بدلہ ان کو دے۔ ان پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا"۔ ان سب سے معلوم ہوتا ہے ان آیات میں دو متعین افراد کی طرف اشارہ نہیں بلکہ دو عام کرداروں کا تذکرہ ہے جو ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں۔

--- ooo ---

اب ان کو قیامت کے ایک منظر کے سامنے کھڑا کر کے اس کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے کہ یہ ہو گا وہ دن جس کا تم انکار کرتے ہو۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ (۴۶:۲۰) "پھر جب یہ کافر [illegible] کے سامنے لاکھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا: "تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھا لیا' اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں' ان کی پاداش میں آج تم کو [illegible] کا عذاب دیا جائے گا"۔

یہ اسکرین پر سے بڑی تیزی سے گزر جانے والی ایک جھلک ہے ۔ گو ایک فیصلہ سنا دیا گیا لیکن دیکھنے والا گہرے غور وفکر میں ڈوب جاتا ہے ۔ یہ منظر اس وقت کا ہے جب آگ میں ڈالے جانے سے قبل وہ جہنم کے اوپر لائے جائیں گے ۔ اس وقت ان کو بتا دیا جائے گا جس طرح مجرم کو سزا سے قبل سنا دیا جاتا ہے ۔

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِىْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (۴۶ : ۲۰) "تم اپنے حصے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے اٹھا لیا" ۔ دنیا میں ان کو اللہ نے بہت سی پاکیزہ چیزیں دی تھیں لیکن انہوں نے دنیا کی عیش و عشرت ہی میں سب کچھ لٹا دیا اور آخرت کے لیے کچھ بھی باقی نہ چھوڑا ۔ انہوں نے آخرت کا کوئی خیال نہ رکھا ۔ اس طرح دنیا ہی میں چر چگ گئے جس طرح جانور چر چگ جاتے ہیں ۔ اور کل کا خیال نہیں کرتے ۔ نہ اللہ کا شکر ادا کیا ۔ نہ حرام سے بچے اور نہ کوئی نیک کام کیا ۔ ان کے اس رویہ کی وجہ سے اللہ نے ان کو دنیا ہی دے دی اور آخرت میں محروم کر دیا ۔ ان کی بڑی غلطی یہ تھی کہ دنیا کے ان مختصر لمحات کے عیش کے لیے انہوں نے آخرت کی نہ ختم ہونے والی طویل زندگی کو بھلا دیا جس کی طوالت کا تصور بھی انسان نہیں کر سکتا ۔

فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ (۴۶ : ۲۰) "اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا" ۔ اس دنیا میں جو شخص بھی تکبر کرتا ہے وہ ناحق ہی کرتا ہے ۔ تکبر اور کبرائی صرف اللہ کی چادر ہے ۔ بڑائی کا حق اللہ کے بندوں کو نہیں ہے ۔ نہ کم نہ زیادہ اور یہ توہین آمیز سزا اسی تکبر کے بدلے میں ہے اور جو لوگ فسق و فجور اختیار کرتے ہیں وہ بھی تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں اسی لیے ان کو بھی توہین آمیز سزا دی جائے گی کیونکہ عزت تو اللہ ، رسول اللہ اور مومنین کے لیے مخصوص ہے ۔

یہ سبق انسانوں کے یہ دو ماڈل پیش کر کے یہاں ختم ہوتا ہے ، جس میں منکرین آخرت ، بدکاروں اور مستکبرین فی الارض کے لیے توہین آمیز سزا کا اعلان کیا گیا ہے ۔ اسے پڑھ کر فطرت سلیمہ رکھنے والے لوگ خدا خوفی پر آمادہ ہو کر سیدھی اور محفوظ راہ لیتے ہیں ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۳۹ ایک نظر میں

یہ سبق گزشتہ دو اسباق سے بالکل مختلف موضوع پر ہے ۔گزشتہ اسباق میں انسانی قلب ونظر کو جن زاویوں سے لیا گیا تھا اس سبق میں ان سے مختلف بالکل ایک نیا پہلو لیا گیا ہے اس سبق میں مشرکین مکہ کو وادی احقاف کی سیر کرائی جاتی ہے کہ یہ وادی اور دوسری وادیاں جو تباہ ہوئیں وہ مکہ کے اردگرد واقع تھیں ۔اور یہ لوگ ان واقعات سے پوری طرح باخبر تھے جو قوم عاد اور ان کے رسول حضرت ہود علیہ السلام کو پیش آئے ۔انہوں نے بھی اپنے رسول سے وہی سلوک کیا تھا جو یہ حضرت نبی کریمؐ سے کر رہے ہیں ۔انہوں نے بھی یہی اعتراضات کیے تھے جو یہ کر رہے ہیں ۔اور حضرت ہود نے بھی آداب نبوت کے حدود و قیود کے اندر ان کو جوابات دیئے تھے' لیکن اہل مکہ کو معلوم ہے کہ ان پر اللہ کا کیسا سخت عذاب آیا ۔ان کی قوت اس عذاب کا مقابلہ نہ کر سکی ۔حالانکہ اہل مکہ سے وہ زیادہ قوی الجثہ تھے ۔ان کی دولت اور ثروت ان کو کوئی فائدہ نہ دے سکی ۔حالانکہ وہ ان سے زیادہ دولت مند تھے ۔وہ انہی کی طرح آنکھیں' کان اور دل و دماغ رکھتے تھے مگر انہوں نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا ۔ان کے مقابلے میں وہ ذہنی لحاظ سے بھی اونچے تھے اور انہوں نے جو الٰہ بنا رکھے تھے وہ بھی ان کی مدد کو نہ پہنچ سکے ۔

غرض مشرکین مکہ کو خود اپنے اسلاف کے انجام کے سامنے کھڑا کر کے قرآن ان کا نقشہ ان کے سامنے پیش کرتا ہے ۔اور بتاتا ہے کہ رسالت کا یہ ایک ہی سلسلہ اور شجرہ ہے' ایک ہی دعوت ہے اور سنت الٰہیہ بھی ایک ہے ۔انہوں نے انکار کیا ۔ہلاک ہوئے' تم انکار کرتے ہو' ہلاکت کے مستحق بنتے ہو ۔عقیدہَ توحید کوئی نیا گھڑا ہوا عقیدہ نہیں ہے' یہ دعوت نوح علیہ السلام سے ادھر تاریخ میں چلی آرہی ہے ۔زمان و مکان کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۳۹ تشریح آیات

۲۱--- تا--- ۲۸

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ
النُّذُرُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنِّي
أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٢١﴾ قَالُوا أَجِئْتَنَا لِتَأْفِكَنَا عَنْ آلِهَتِنَا
فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٢٢﴾ قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِندَ اللَّهِ وَ
أُبَلِّغُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿٢٣﴾ فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا
مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هَٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُم بِهِ
رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢٤﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ
إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿٢٥﴾ وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِن
مَّكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ
سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُم مِّن شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ
اللَّهِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٢٦﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُم مِّنَ

الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

”ذرا انہیں عاد کے بھائی (ہود) کا قصہ سناؤ جب کہ اس نے احقاف میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا اور ایسے خبردار کرنے والے اس سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی آتے رہے۔۔۔ کہ ”اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو' مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے کہا ”کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دے؟ اچھا تو لے آ' اپنا وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر واقعی تو سچا ہے۔ اس نے کہا ”اس کا علم تو اللہ کو ہے' میں صرف وہ پیغام تمہیں پہنچا رہا ہوں جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔ پھر جب انہوں نے اس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے ”یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا“۔۔۔ ”نہیں' بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آرہا ہے' اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا“۔ آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ ان کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے۔ ان کو ہم نے کان' آنکھیں اور دل' سب کچھ دے رکھے تھے' مگر نہ وہ کان ان کے کسی کام آئے' نہ آنکھیں' نہ دل۔ کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے' اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ تمہارے گردوپیش کے علاقوں میں بہت سی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات بھیج کر بار بار طرح طرح سے ان کو سمجھایا' شاید کہ وہ باز آجائیں۔ پھر کیوں نہ ان ہستیوں نے ان کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا؟ بلکہ وہ تو ان سے کھوئے گئے' اور یہ تھا ان کے جھوٹ اور ان بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے“۔

احقاف' حقف کی جمع ہے جس کے معنی ریت کے بلند ٹیلے کے ہیں' اہل عاد کے مکانات جزیرۃ العرب کے جنوب میں حضرموت کے علاقے میں بلند ٹیلوں پر تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی عاد کی کہانی سنائیں اور یہ بتائیں کہ ان کے بھائی ہود نے بھی اسی طرح اپنی قوم کو ڈرایا تھا۔ یہ اس لیے کہ حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں قوم عاد کا ردعمل ایسا ہی تھا جس طرح اہل قریش آپ کی دعوت کی تکذیب کر رہے ہیں جس طرح آپ ان میں سے ہیں اسی طرح حضرت ہود بھی عاد ہی میں سے تھے۔ یہ لوگ ذرا سنبھلیں کہ دعوت حق کی تکذیب کے ویسے ہی نتائج بھی ہو سکتے ہیں۔ عاد کا علاقہ قریش کے قریب تھا اور ان کے واقعات سے وہ باخبر بھی تھے۔

عاد کے بھائی ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرایا' حضرت ہود بھی رسولوں میں سے کوئی پہلے رسول نہ تھے۔ ان سے پہلے بھی کئی اقوام میں رسول آچکے تھے۔

وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ (۴۶ : ۲۱) "اور ایسے خبردار کرنے والے ان سے پہلے بھی گزر چکے تھے اور اس کے بعد بھی آتے رہے"۔ زمان و مکان کے اعتبار سے ان کے قریب بھی تھے اور ان سے دور بھی تھے۔ کیونکہ لوگوں کو انجام بد سے ڈرانے کا سلسلہ اللہ نے اپنی مخلوق کے لیے جاری رکھا، دعوت و رسالت زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ یہ کوئی عجیب و غریب اور غیر معمولی بات تو نہ تھی۔

اور ان کو اس چیز اور اس دعوت اور اسی بات سے ڈراؤ جس سے تمام رسول ڈراتے رہے۔

أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّا اللّٰهَ إِنِّيْٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۴۶ : ۲۱) "کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے"۔ اللہ کی بندگی کرو، یعنی عقیدہ بھی توحید کا رکھو اور پوری زندگی میں اطاعت بھی اللہ کے احکام کی کرو، اور اگر تم اس دعوت کی مخالفت کرو گے تو اس کے نتیجے میں دنیا و آخرت کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اشارہ یوم عظیم کے عذاب کی طرف ہے۔ یوم عظیم کا اطلاق قرآن مجید میں قیامت پر ہوتا ہے کہ قیامت کی خوفناکیاں عظیم و شدید ہیں۔

توجہ الی اللہ کی اس دعوت اور عذاب الٰہی سے ڈرانے کا انجام کیا ہوا۔

---ooo---

قَالُوْٓا أَجِئْتَنَا لِتَأْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ

(۴۶ : ۲۲) "انہوں نے کہا "کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دے؟ اچھا تو لے آ اپنا وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے اگر واقعی تو سچا ہے"۔

انہوں نے اپنے بھائی پر بدگمانی کی اور الٹا ان کو چیلنج دے دیا کہ لاؤ وہ عذاب جس سے ڈراتے ہو اور اس کے ساتھ انہوں نے ان کا مذاق بھی اڑایا۔ اور باطل پر اصرار کیا۔ حضرت ہود ایک نبی کی طرح یہ سب باتیں برداشت کرتے ہیں۔ کوئی بڑا دعویٰ نہیں کرتے اور اپنے حدود میں رہتے ہوئے کہتے ہیں۔

---ooo---

قَالَ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَأُبَلِّغُكُمْ مَّآ أُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ أَرٰكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (۴۶ : ۲۳) "اس نے کہا "اس کا علم تو اللہ کو ہے، میں صرف وہ پیغام تمہیں پہنچا رہا ہوں جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو"۔

میں تو تمہیں عذاب سے ڈراتا ہوں کیونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہیں ڈراؤں۔ مجھے کیا معلوم کہ عذاب کب آئے گا اور عذاب کیسا ہو گا۔ ان امور کا علم تو اللہ کے پاس ہے۔ میں تو اللہ کی طرف سے صرف پیغام پہنچانے والا ہوں۔ میں اللہ کے ساتھ علم اور قدرت میں شریک نہیں ہوں۔

وَلٰكِنِّيْ اَرٰكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (٤٦ : ٢٣) "مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو"۔ بہت ہی کم عقل نظر آرہے ہو' اس سے بڑی حماقت اور کیا ہوگی کہ ایک بھائی اور ناصح مشفق ڈرا رہا ہے اور جواب میں وہ چیلنج دیتے ہیں۔

حضرت ہود اور ان کی قوم کے درمیان دعوت اسلامی کے سلسلے میں طویل مکالمہ اور مجادلہ ہوا تھا۔ یہاں قرآن کریم اسے مختصر کر دیتا ہے کیونکہ یہاں جلد جلد ان کے سامنے انجام بد پیش کرنا ہے' تاکہ ان کے چیلنج اور جلد بازی کا جواب دیا جا سکے۔

---ooo---

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (٢٤) تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ (٢٥) (٤٦ : ٢٤ – ٢٥) "پھر جب انہوں نے اس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے "یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا"--- "نہیں' بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آرہا ہے' اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا"۔ آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں"۔

روایت میں آتا ہے کہ ان کو شدید گرمی نے آلیا۔ بارش رک گئی اور خشکی اور سخت گرمی کی وجہ سے علاقہ آگ اور دھواں بن گیا۔ اس کے بعد بادل کا ایک ٹکڑا آیا۔ یہ لوگ بہت خوش ہوئے اور ان لوگوں نے وادیوں میں نکل کر اس بادل کا استقبال کیا۔ سمجھتے تھے کہ بس اب بارش ہوگی۔

قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (٤٦ : ٢٤) "یہ بادل ہے جو ہم کو سیراب کر دے گا"۔
اور لسان الحال نے ان کو یہ جواب دیا۔

بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ (٤٦ : ٢٤) تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا (٤٦ : ٢٥) "نہیں بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آرہا ہے۔ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا"۔ یہ نہایت تیز چلنے والی ہوا ہے۔ اور اس قدر سخت اور بے قابو ہے جس طرح کوئی سرکش جابر ہوتا ہے۔

مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ (٥١ : ٤٢) "جس چیز پر بھی وہ گزر گئی اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا"۔ قرآن کی اس آیت میں ہوا کو ایک زندہ مخلوق کی طرح بتایا گیا ہے گویا وہ سنتی ہے اور

اسے حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو نیست و نابود کر کے رکھ دو۔

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا (۴۶ : ۲۵) "اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کرنے والی" یہ ہے وہ کائناتی حقیقت جس کا شعور قرآن کریم بار بار انسانوں کو دیتا ہے۔ یوں کہ یہ کائنات بھی اسی طرح زندہ ہے جس طرح ہم زندہ ہیں۔ اس کی تمام قوتیں شعور رکھتی ہیں۔ یہ تمام اشیاء اللہ کے احکام لیتی ہیں اور بجالاتی ہیں۔ انسان بھی ان قوتوں میں سے ایک قوت ہے۔ جب وہ ایمان لے آئے اور اس کا قلب معرفت الٰہی کے لیے کھل جائے تو پھر وہ بھی اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائناتی قوتوں سے پیغام لے سکتا ہے۔ ان کے ساتھ ہمقدم ہو کر چل سکتا ہے۔ اور یہ قوتیں بھی اس کے ساتھ چل سکتی ہیں۔ یہ چیزیں بھی مومن کے ساتھ اس طرح ہمقدم ہو کر چلتی ہیں' لیکن اس ہم آہنگی کی صورت وہ نہیں ہوتی جو زندہ انسانوں کی ہوتی ہے۔ درحقیقت گو ہر چیز زندہ ہے لیکن اس کی زندگی اس طرح نہیں جس طرح کی زندگی کے ہم عادی ہیں۔ ہم صرف زندگی کی ظاہری صورتیں ہی دیکھ سکتے ہیں اور اس ظاہر بینی کی وجہ سے باطن صورتیں ہم نہیں دیکھ سکتے۔ جن لوگوں کی چشم بصیرت کھل جاتی ہے۔ وہ دیکھ سکتے اگرچہ ہماری یہ آنکھیں ان کو نہیں دیکھ سکتیں۔

بہرحال اس ہوا کو جو حکم دیا گیا اس نے وہ پورا کر دیا۔ اس نے ہر چیز کو نیست و نابود کر دیا۔

فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ (۴۶ : ۲۵) "آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا"۔ رہے وہ' ان کے مویشی' ان کے مال و اسباب تو ان میں سے کوئی چیز نہ رہی۔ خالی خولی مکانات و محلات رہ گئے۔ کوئی زندہ شخص ان میں نہ تھا۔

كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ (۴۶ : ۲۵) "اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں"۔ یہ سنت جاریہ ہے اور مجرموں پر نافذ ہونے والی تقدیر الٰہی ہے۔

--- ○○○---

تباہی کے اس نقشے کو دیکھنے والوں کی طرف ایک نکتہ توجہ! کہ دیکھو حضرت ہود کی قوم کی طرح تم بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی سلوک کر رہے ہو۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّاهُمْ فِيمَا إِن مَّكَّنَّاكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَأَبْصَارًا وَأَفْئِدَةً فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا أَفْئِدَتُهُم مِّن شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۴۶ : ۲۶) "ان کو ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے۔ ان کو ہم نے کان' آنکھیں اور دل' سب کچھ دے رکھے تھے' مگر نہ وہ کان ان کے کسی کام آئے' نہ آنکھیں' نہ دل۔ کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے' اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آ گئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے"۔

یہ لوگ جن کو اللہ کی قوتوں میں سے ایک معمولی قوت ندھی نے نیست . . . . کر دیا' ان کو ہم نے وہ قوت دی جو

لے اہل قریش ' تم کو نہیں دی گئی ـ قوت ' مال ' علم اور سازوسامان میں وہ تم سے زیادہ تھے ـ اسی طرح سننے ' دیکھنے اور سوچنے کی قوت بھی ان میں تم سے زیادہ تھی ـ قرآن کریم قوت مدرکہ کو کبھی دل کہتا ہے ' کبھی دماغ کہتا ہے اور کبھی عقل کہتا ہے ـ سب سے مراد قوت مدرکہ ہوتی ہے ـ یعنی ان کے یہ حواس بڑے ترقی یافتہ تھے مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا ـ انہوں نے راہ ہدایت دیکھنے میں ان کو معطل کر دیا ـ

اذ کانوا یجحدون بایت اللہ (۴۶ : ۲۶) "کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے" ـ اور جب انسان آیات الہیہ کا انکار کر دے تو اس کے حواس معطل ہو جاتے ہیں اور اس کا احساس روشنی اور نور اور ادراک ختم ہو جاتا ہے ـ

وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزءون (۴۶ : ۲۶) "اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آگئے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے" ' یعنی عذاب الہی اور مصیبت ـ

اس واقعہ سے قرآن ہر صاحب سمع و بصر اور قلب کو جو سبق دینا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی قوت والا اپنی قوت پر مغرور نہ ہو ' کوئی مالدار شخص اپنے مال پر مغرور نہ ہو ' کوئی صاحب علم اپنے علم پر مغرور نہ ہو ـ اس لیے کہ اللہ کی ان کائناتی قوتوں میں سے یہ ایک ہی قوت تھی جسے اللہ نے ان زبردست قوت والے ' مال والے اور علم والے لوگوں پر مسلط کیا اور انہیں ختم کر کے رکھ دیا ـ اور وہ یوں رہ گئے کہ صرف عالیشان ' مکانات ہی رہ گئے اور بس ـ اور جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو یہی ہوتا ہے ـ

ہوا ایک ایسی قوت ہے جو مسلسل کام کرتی ہے اور یہ اللہ کے کائناتی نظام کے مطابق چلتی ہے ـ اللہ جس وقت چاہے اسے بربادی پر مامور کر دے ـ عام طور پر تو وہ تعمیر کا کام کرتی ہے لیکن جب اللہ چاہے تو وہ ہلاک کرنا شروع کر دیتی ہے ـ تمام کائناتی قوتیں جو ایک ڈگر پر کام کرتی نظر آتی ہیں ان کا سبب ان کے اندر یہی امر ربی ہے اور جب امر ربی دوسرا حکم دے تو یہ دوسرا کام کرتی ہیں جو کوتاہ نظر انسانوں کو خارق عادت نظر آتا ہے ـ نظام اسباب پیدا کرنے والا اللہ ہے ـ وہ ہر چیز کو ' ہر حرکت کو ' ہر حادثہ کو ' ہر رجحان کو ' ہر شخص کو اور ہر کام کو اپنے احکام اور اپنے نقشے کے مطابق چلاتا ہے ـ اور جس جگہ بھی وہ کام ہوتا ہے اس کی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے ـ اگرچہ ہمیں وہ کام خارق عادت نظر آئے ـ

ہوا بھی دوسری کائناتی قوتوں کی طرح اپنا مقررہ وظیفہ سرانجام دیتی ہے ـ اسی طرح انسانی قوت اور دوسری کائناتی قوتیں جو انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں وہ کائناتی نقشے کے مطابق کام کرتی ہیں ـ جونہی انسان حرکت میں آتا ہے یہ قوتیں بھی اس کے ہم قدم ہو کر حرکت کرتی ہیں ـ یوں وہ اسکیم اپنا کام کرتی ہے جو اللہ نے اس دنیا کے لیے مقرر کی ہے ـ انسان کو جو ارادے کی آزادی دی گئی ہے تو وہ اس کائناتی نظام کے فریم ورک کے اندر ہے ـ جسے اس کائنات کا ناموس کلی کہا جاتا ہے جسے نظام قضا و قدر کہا جاتا ہے ـ اور جسے سنت الہیہ کہا جاتا ہے جس کے اندر کوئی تغیر اور اضطراب نہیں ہوتا ـ

---○○○---

اب اس سبق کا خاتمہ ایک عام تبصرے پر ہوتا ہے جس میں عاد کے سوا دوسری بستیوں کا بھی ذکر ہے جو مکہ کے ارد گرد زمانہ ماقبل میں ہلاک ہوئیں ـ

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَ صَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۲۷) فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۴۶ : ۲۸) "تمہارے گردوپیش کے علاقوں میں بہت سی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات بھیج کر بار بار طرح طرح سے ان کو سمجھایا' شاید کہ وہ باز آ جائیں۔ پھر کیوں نہ ان ہستیوں نے ان کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا؟ بلکہ وہ تو ان سے کھوئے گئے' اور یہ تھا ان کے جھوٹ اور ان بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے"۔

جزیرۃ العرب میں کئی بستیوں کو ہلاک کیا گیا تھا' جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔ احقاف میں عاد ہلاک ہوئے۔ یہ جنوب میں تھے اور ثمود حجر میں ہلاک ہوئے جو شمال میں تھے اور سبا یمن میں ہلاک ہوئے اور اہل مدین شام کی راہ میں تھے۔ اسی طرح ذرا مزید شمال میں لوط کی بستیاں تھیں اور اہل عرب ان کی کہانیوں سے بھی واقف تھے اور ان بستیوں سے گزرتے رہتے تھے۔

ان آیات میں اللہ نے ان کی طرف ان کے انجام کی طرف اشارہ کیا کہ شاید مکہ کے مکذبین باز آ جائیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے ان کو بار بار سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے۔ اور اپنی گمراہی میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ تب ان پر ہمارے عذاب آئے' قسم قسم کے عذاب۔ ان کے بارے میں بعد کے آنے والے ان کی کہانیاں ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ عرب کے موجودہ مشرک بھی ان کو سنتے اور جانتے ہیں اور صبح و شام ان بستیوں میں سے گزرتے رہتے ہیں اور ان کے آثار ابھی تک قائم ہیں لیکن اے کاش کہ وہ عبرت لیتے۔

یہاں اب قرآن مجید مشرکین مکہ کو ایک حقیقت واقعہ بتاتا ہے۔ اللہ نے ان سے پہلے بھی مشرکین کو ہلاک کیا اور ان کو نیست و نابود کر دیا اور ان میں سے ایک شخص بھی زندہ نہ رہا۔ لیکن وہ جن معبودوں کو پکارتے تھے اور یہ گمان کرتے تھے کہ یہ ان کو اللہ کے قریب تر لاتے ہیں تو ان ہستیوں نے کیوں نہ اللہ کے غضب کو کم کر کے ان کو ہلاکت سے بچایا۔

فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً (۴۶ : ۲۸) "پھر کیوں نہ ان ہستیوں نے ان کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا"۔

نہ صرف یہ کہ ان ہستیوں نے ان کی مدد نہ کی بلکہ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ (۴۶ : ۲۸) "بلکہ وہ تو ان سے کھوئے گئے"۔ اور انہوں نے ان لوگوں کو اکیلا چھوڑ دیا' اور ان کو ان معبودوں تک پہنچنے کا راستہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ ان کو پکڑیں اور اللہ کے عذاب سے بچنے میں ان کی مدد لیں۔

وَ ذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۴۶ : ۲۸) "اور یہ تھا ان کا جھوٹ اور ان بنیادی عقیدوں کا انجام جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے"۔ یہ جھوٹ اور افتراء ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا یہ انجام ہے۔ اور یہ ان معبودان باطل کی حقیقت ہے۔ اور اس شرک اور عبادت کا یہ انجام ہے کہ یہ لوگ نیست و نابود کر دیے گئے۔ لہٰذا مکہ کے ان مشرکوں کو جو ان معبودوں کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ انہیں خدا کے قریب کریں گے' اپنے اس فعل کے بارے میں سوچ لینا چاہئے کہ اس کا انجام کیا ہو گا اور ایسے عقائد کا انجام تاریخ میں کیا ہوتا رہا ہے۔

درس نمبر ۲۴۰ ایک نظر میں

اس سورت کا یہ آخری سبق ہے اس سورت کے موضوع کی وضاحت کے لیے یہ ایک نئی وادی میں سفر ہے ۔ ایک واقعہ کہ جنوں نے قرآن کی دعوت کو سنا ۔ تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ خاموشی سے سنو ۔ اور سن کر یہ طے کیا کہ ہم ایمان لاتے ہیں ۔ وہ ایمان لائے اور اپنی قوم میں جاکر انہوں نے دعوت دین کے کام کا آغاز کر دیا ۔ اپنی قوم کو عذاب جہنم سے ڈرانا اور جنت کی خوشخبری دینا شروع کر دیا ۔ اور انہوں نے اپنی قوم کو متنبہ کیا کہ اگر تم نے منہ موڑا اور گمراہی اختیار کی تو نتائج اچھے نہیں ہوں گے ۔

جنوں کی خبر کو یہاں اس انداز سے پیش کرنا اور یہ دکھانا کہ قرآن مجید کا ان کے دلوں پر کس طرح اثر ہوا اور انہوں نے ایک دوسرے سے کہا خاموش ہو کر سنو' پھر جس گہرے تاثر کے ساتھ انہوں نے قرآن مجید کی تعلیمات کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا ۔ یہ سب امور انسانی دلوں کو متاثر کرنے والے ہیں کیونکہ اصل میں تو قرآن انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ جنوں کے تاثرات جس طرح قرآن نے قلم بند کیے ہیں' وہ بہت ہی پرتاثیر انداز ہے ۔ خصوصاً جبکہ جن بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ٹھیک موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ تعلیمات آرہی ہیں ۔ قرآن کا اشارہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو جنوں نے تو پالیا مگر انسان اس سے غافل ہیں کہ قرآن جو دعوت دے رہا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد پہلی دعوت ہے ۔ چنانچہ یہ بات پوری سورت کے مضمون کے ساتھ گہرا ربط اور مناسبت رکھتی ہے ۔ پھر جنوں نے بھی اس کائنات کی کھلی کتاب کی نشانیوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تعلیمات قرآنی کی تصدیق خلق سموات و ارض سے ہو سکتی ہے ۔ اور یہی تخلیق کائنات دوبارہ تخلیق پر بھی شاہد عادل ہے ۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس پر انسانوں نے ہمیشہ بحث اور جدال کیا ہے ۔

مسئلہ حشر و نشر کے حوالے ہی سے ایک منظر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ہو گی قیامت ۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ (۴۶ : ۳۴) "جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے"۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وصیت کی جاتی ہے کہ ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کریں اور ان پر عذاب لانے کے لیے جلدی نہ فرمائیں اور ان کو چھوڑ دیں ۔ قیامت کی گھڑی قریب ہے ۔ اور جس دن برپا ہو گی تو وہ کہیں گے ہم تو دنیا میں ایک گھڑی بھر ہی رہے' بس ہلاکت سے قبل تبلیغ ہی کی گئی ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۴۰ تشریح آیات

۲۹ --- تا --- ۳۵

وَ اِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا
حَضَرُوْهُ قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا یٰقَوْمَنَاۤ
اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْۤ اِلَى
الْحَقِّ وَ اِلٰى طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۳۰﴾ یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ
لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۳۱﴾ وَ مَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ
فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءُ ؕ اُولٰٓىِٕكَ فِیْ ضَلٰلٍ
مُّبِیْنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَمْ یَعْیَ
بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ یُّحْیِۧ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۳۳﴾ وَ
یَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ
قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ
مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَ مَا یُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ یَلْبَثُوْۤا
اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ الربع ع ۴

''اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔

جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انہوں نے جاکر کہا "اے ہماری قوم کے لوگو' ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے' تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی' رہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف۔ اے ہماری قوم کے لوگو' اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ' اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچا دے گا"۔ اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بوتا رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے' اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی و سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچالیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور کیا ان لوگوں کو یہ سجھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے اور ان کو بناتے ہوئے وہ نہ تھکا' وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے ؟ کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔ جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے' اس وقت ان سے پوچھا جائے گا "کیا یہ حق نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں' ہمارے رب کی قسم (یہ واقعی حق ہے)"۔ اللہ فرمائے گا "اچھا تو اب عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے رہے تھے۔ پس اے نبی' صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے' اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو۔ جس روز یہ لوگ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جا رہا ہے تو انہیں معلوم ہو گا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے۔ بات پہنچا دی گئی' اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا؟"

جنوں نے نہایت خشوع اور خضوع کے ساتھ قرآن کو سنا اور اس کے بعد انہوں نے جو تبصرہ کیا اور قرآن نے یہاں اسے نقل کیا' اس میں اسلامی نظریہ حیات کی تمام بنیادی باتیں آگئی ہیں۔ یعنی وحی الہیٰ کی تصدیق' تورات اور قرآن کے تصورات میں وحدت' یہ اعتراف کہ ہم ایمان لاتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں' اور آخرت پر ایمان اور ان اعمال کی تصدیق جو جنت کو لے جانے والے ہیں اور ان اعمال کی تصدیق جو جہنم کو لے جانے والے ہیں۔ یہ اعتراف کہ اللہ پوری کائنات کا خالق ہے' وہی مخلوقات کا ولی ہے۔ اور یہ کہ تخلیق کائنات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہی وہ مضامین ہیں جو اس پوری سورت میں لیے گئے ہیں اور سورت کے تمام اسباق کا موضوع ہیں۔ اور یہی موضوعات جنوں کی زبانی' جو انسانوں کے مقابلے میں ایک الگ مخلوق ہے' دوبارہ لائے گئے۔

ان آیات کی تشریح سے پہلے دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے' یہ کہ جن کیا ہیں اور یہ کہ یہ واقعہ کہاں اور کب ہوا۔ قرآن مجید کی طرف سے یہ ذکر کرنا کہ جنوں کے کچھ لوگوں نے قرآن کو سنا اور اس کے بعد یہ کہا اور یہ کیا' جنوں کے وجود کے لیے بس یہی کافی شافی دلیل ہے۔ اور نہ اس واقعہ کے بارے میں کچھ مزید کہنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات ثابت ہونے کے بعد کہ جن اس قابل ہیں کہ رسول خدا کی زبانی عربی قرآن کو سنیں اور عربی زبان کو سمجھیں۔ اور یہ کہ وہ ایک مخلوق ہیں جو ایمان اور کفر کے قابل ہیں' ہدایت اور ضلالت کے قابل ہیں' جنوں کی حقیقت اور انہیں ایک مخلوق ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جب اللہ ایک حقیقت کی تصدیق کر دے تو اس کے بعد اس مخلوق کی حقیقت کو مزید ثابت کرنا ایک بے معنی حرکت ہے۔ لیکن یہاں کلام کرنے کا ہمارا مقصد یہ ہے کہ انسانی تصور میں ا[illegible] وضاحت ہو جائے۔

ہمارے ارد گرد پھیلی ہوئی اس کائنات میں' رازوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اس کے اندر ایسی مخلوقات موجود ہیں جن

کی حقیقت' صفات اور اثرات سے ہم بالکل واقف نہیں۔ اور ہم جن قوتوں اور رازوں کے اندر رہتے ہیں۔ ان میں سے صرف چند رازوں اور بھیدوں سے ابھی تک ہم واقف ہوئے ہیں۔ بہرحال آئے دن ہم ان بھیدوں کے انکشافات کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ کی مخلوقات میں سے بعض مخلوق کے بارے میں دریافت کر لیتے ہیں۔ بعض کی ذات معلوم کر لیتے ہیں۔ بعض کی صفات ہمیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اور بعض چیزوں کے تو صرف ہمارے اردگرد آثار ہی پائے جاتے ہیں۔

ابھی تک ہم نے اس کائنات کی شاہراہ پر' جس کے اندر ہم رہتے ہیں' اس کے رازوں کو معلوم کرنے کے سلسلے میں چند قدم ہی لیے ہیں۔ اس کائنات میں ہمارے آباء و اجداد رہ کر چلے گئے اور ہماری اولاد ان کی اولاد آنے والی ہے۔ ان سب لوگوں کو اس کائنات کے ایک چھوٹے سے ذرے کے اوپر رہنا ہے۔ اگر اس پوری کائنات کے حجم اور وزن کا تصور کیا جائے تو اس حجم اور وزن میں اس زمین کی حیثیت ایک ذرے کے برابر بھی نہیں ہے۔

آج تک جو معلومات ہم فراہم کر سکے ہیں' اگر ان معلومات کو آج سے صرف پانچ سو سال پہلے کی حالت کے مقابلے میں دیکھا جائے تو ہم جنوں سے بھی زیادہ بڑے بڑے عجائبات دریافت کر سکے ہیں۔ آج ہم ایٹم کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں۔ اگر آج سے پانچ سو سال پہلے کوئی ایسی باتیں کرتا تو لوگ کہتے کہ یہ مجنون ہے۔ یا کم از کم اسے جنات کے مقابلے میں زیادہ عجیب و غریب بات سمجھا جاتا۔

ہمارا علم و ادراک ہمارے انسانی حدود و ادراک کے محدود دائرے کے اندر ہے اور ادراک کی یہ قوت ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس زمین پر وہ مقاصد پورے کرنے کے لیے دی گئی ہے جن کو ہم نے زمین کے اوپر منصب خلافت کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں یہاں حاصل کرنا تھا۔ صرف اس محدود دائرے میں کہ زمین کی قوتیں ہمارے لیے مسخر ہوں' ہمارے تابع ہوں تاکہ وہ فرائض ہم بحسن و خوبی ادا کر سکیں۔ ہمارے جس قدر انکشافات ہیں وہ اس دائرہ فرائض کے اندر ہیں اور ہم جس قدر بھی آگے بڑھ جائیں ہم اسی دائرے کے اندر ہی رہیں گے۔ یعنی اس دائرے کے اندر ہی رہیں گے جو اللہ نے ہمارے یہاں قیام اور خلافت ارضی کے لیے مقرر اور مقدر کر دیا ہے۔ نہ اس سے ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت ہے۔

مستقبل میں ہم مزید انکشافات کریں گے۔ ہم بہت کچھ جانیں گے' اس قدر ہمارے علوم میں اضافہ ہو گا کہ ایٹم کے راز ہمارے لیے بچوں کا کھیل بن جائے گا۔ لیکن ان انکشافات کے باوجود ہم اس محدود دائرے کے اندر ہی رہیں گے جو اللہ نے ہمارے لیے مقدر کر دیا ہے۔ انسانی دائرے کے اندر رہیں گے۔ جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا "اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے وہ بہت ہی قلیل ہے"۔ یعنی ان اسرار اور مخفیات کے مقابلے میں جو تمہارے علم سے باہر ہیں۔ صرف خالق کائنات ہی ان غائب باتوں کو جانتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا علم غیر محدود ہے۔ اور انسانوں کا علم اور اس کے ذرائع علم محدود ہیں۔

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ "اگر زمین میں جس قدر درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر کو سات اور سمندر سیاہی

بن کر مدد کے لیے آ پہنچیں تو اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں"۔

اگر بمقابلہ علم الٰہی ہماری حالت یہ ہے تو ہم صرف اپنی لاعلمی کی بنا پر بالجزم نہ کسی بات کی نفی کر سکتے ہیں اور نہ اثبات۔ نہ ان کا تصور کر سکتے ہیں اور نہ عدم تصور۔ یہ بہرحال اللہ کی کائنات کے غائب علاقوں کی باتیں ہیں اور کائنات کی ان قوتوں اور ان اسرار میں سے ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہے۔ اسی بنا پر ایسی کسی شے کے بارے میں ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں جو ہمارے علم سے باہر ہے۔ جبکہ ابھی تک ہمیں خود اپنی ذات سے متعلق مکمل اسرار و رموز کا پتہ نہیں ہے کہ ہماری روح اور ہماری قوت مدرکہ کے حالات کیا ہیں۔ حقیقت جن تو بڑی بات ہے۔ بعض ایسے راز بھی ہو سکتے ہیں جن کا ہمارے لیے انکشاف مقدر ہی نہ کیا گیا ہو۔ مثلاً وہ تمام حقائق جن کے وجود کی قرآن نے اطلاع دی ہے' یا آثار بتائے ہیں کیونکہ ان حقائق کا جاننا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے اس لئے کہ اس زمین پر انسان نے جو فریضہ ادا کرنا ہے اس کے لیے اس کی کوئی افادیت نہیں ہے۔

اگر اللہ نے اپنے کلام کے ذریعہ ہمیں کچھ اسرار بتا دیئے ہیں' اور ان تک ہم اپنے تجربات کے ذریعے نہیں پہنچے تو ہمارا فرض یہ ہے کہ جس قدر علم اللہ نے دے دیا ہے (بذریعہ اطلاع) ہم شکر اور تسلیم و رضا کے ساتھ اسے قبول کر لیں۔ ہم اس کے بارے میں اسی قدر عقیدہ رکھیں جس قدر اللہ نے بتا دیا ہے۔ نہ اس میں کمی کریں اور نہ اس میں اضافہ کریں۔ اور یہ کہیں کہ اس سلسلے میں حقیقت جاننے والے نے ہمیں اسی قدر بتایا ہے' اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں بتایا۔ دوسرا کوئی ذریعہ علم بھی نہیں ہے اور اس میدان میں ہمارا تجربہ بھی نہیں ہے۔

قرآن کریم کی ان آیات سے اور سورت جن کی آیات سے (اور راجح بات یہ ہے کہ سورت جن بھی اسی واقعہ کے بارے میں ہے) اور ان نصوص سے جو قرآن کریم میں جگہ جگہ جنوں کے بارے میں وارد ہیں اور ان احادیث سے جو جنوں کے بارے میں وارد ہیں اور صحیح ہیں۔ ہمیں جو حقائق معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مخلوق ہے جسے جن کہا جاتا ہے۔ یہ مخلوق آگ سے پیدا شدہ ہے۔ کیونکہ قرآن نے ابلیس کے بارے میں یہ کہا ہے۔

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ "میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے"۔ اور یہ بھی قرآن بتاتا ہے کہ ابلیس جنوں میں سے تھا۔

اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ "ماسوائے ابلیس کے یہ جنوں سے تھا۔ تو اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی"۔ غرض ابلیس کی ماہیت جنوں سے ہے۔

اس مخلوق کی خصوصیات انسانوں سے مختلف ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ آگ سے بنی ہے۔ یہ کہ وہ لوگوں کو دیکھتے ہیں اور لوگ انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ "بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے' جبکہ تم ان کو نہیں دیکھ رہے"۔ اور یہ کہ انسانوں کی طرح ان کی بھی سوسائٹیاں اور قبیلے ہیں۔ جس طرح آیت سابقہ میں قبیلے کا ذکر

ہوا۔ اور یہ کہ یہ جن اسی زمین پر بستے ہیں اور بس سکتے ہیں۔ لیکن ان کی آبادیاں کہاں ہیں۔ اس کا ہمیں علم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے جب آدم اور ابلیس سے کہا کہ تم جنت سے نکلو اور زمین پر جاؤ تو الفاظ یہ تھے :

اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ "اترو، تم میں سے بعض، بعض دوسروں کے دشمن ہیں اور تمہیں حق ہوگا کہ زمین میں ٹھہرو اور ایک وقت تک متاع حیات کا بھی"۔

وہ جن جو سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیئے گئے تھے، وہ آپ کے لیے کام بھی کرتے تھے، یہاں ان کو زندہ رہنے کی قدرت بھی دی گئی ہوگی تب ہی وہ کام کرتے ہوں گے۔ یہ کہ جن اس کرۂ ارض سے باہر بھی رہ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کی یہ بات نقل کی ہے۔

وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا (۸) وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (۹) (۷۲ : ۸ – ۹)

"اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہریداروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے، اور یہ کہ پہلے ہم سن گن لینے کے لیے آسمانوں میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے ایک شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے"۔

یہ کہ یہ جن انسانوں کو متاثر کر کے گمراہ کر سکتے ہیں اور مسلمانوں میں سے اللہ کے بندوں پر تو ان کا اثر نہیں ہوتا۔ البتہ گمراہ لوگوں پر وہ اثرات ڈال سکتے ہیں کیونکہ

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ "اس نے کہا بس تیری عزت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا، ماسوائے ان میں، تیرے مخلص بندوں کے"۔ اس قسم کی تمام دوسری آیات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں، البتہ یہ معلوم نہیں ہے کہ شیطانوں اور جنوں کی وسوسہ اندازی کس طرح ہوتی ہے۔ اور یہ کہ یہ جن انسانوں کی آواز سنتے ہیں۔ ان کی زبان کو سمجھتے ہیں کیونکہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآن سنا، اس کو سمجھا اور اس سے متاثر ہوئے۔

اور یہ کہ انسانوں کی طرح جن بھی ہدایت اور گمراہی کے قابل ہیں۔ کیونکہ جنوں نے خود یہ اعتراف کیا۔

وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۱۴) وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۱۴) (۷۲ : ۱۴، ۱۵) "اور یہ کہ ہم میں سے کچھ مسلم ہیں اور کچھ حق سے منحرف تو جنہوں نے اسلام اختیار کر لیا۔ انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں"۔ اور یہ کہ پھر وہ اپنی قوم کی طرف گئے اور ان کو ڈرانے لگے اور ان کو دعوت ایمان دینے لگے۔ جبکہ انہوں نے خود ایمان قبول کر لیا۔ اور ان کو معلوم ہو گیا کہ ان کی قوم دولت ایمان سے محروم ہے۔

یہ باتیں تو جنوں کے بارے میں یقینی ہیں ۔ اور یہی ان کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے کافی ہیں ۔ اور اس پر ہم جو اضافہ کریں گے اس پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی ۔ رہا وہ واقعہ جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے ۔ جس کی طرف راجح روایات کے مطابق سورت جن بھی اشارہ کر رہی ہے ۔ تو اس بارے میں متعدد روایات وارد ہیں ۔

امام بخاری نے مسدد سے ' مسلم نے شیبان ابن فرح سے انہوں نے ابو عوانہ سے اور امام احمد نے اپنی سند میں کہا : عفان سے انہوں نے ابو عوانہ سے ' ابو بکر بیہقی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں ابو الحسن علی ابن احمد ابن عبدان سے انہوں نے احمد ابن عبید الصفار سے انہوں نے اسماعیل قاضی سے ' انہوں نے مسدد سے انہوں نے ابو عوانہ سے انہوں نے ابو بشر سے انہوں نے سعید ابن جبیر سے کہ ابن عباس سے فرماتے ہیں :"رسول اللہؐ نے جنوں پر کلام الٰہی نہیں پڑھا ۔ اور نہ ان کو دیکھا ہے ۔ حضورؐ اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کے ساتھ عکاظ کی طرف جارہے تھے ۔ اس وقت شیاطین اور آسمانوں کی خبروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی اور ان پر شہاب ثاقب کی بارش کر دی گئی ۔ تو شیاطین اپنی قوم کی طرف واپس آگئے قوم نے کہا تمہیں کیا ہو گیا ہے ۔ تو انہوں نے کہا ' ہمارے اور آسمانوں کی خبروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی ہے ۔ اور ہم پر شہاب ثاقب چھوڑے گئے ۔ تو انہوں نے کہا کہ تمہارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان جو رکاوٹ ڈال دی گئی ہے اس کی کوئی وجہ ہوگی تو چاہئے کہ زمین کے مشرق اور مغرب کے درمیان پھیل جاؤ اور دیکھو کہ وہ کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ رکاوٹ ڈال دی گئی ہے ' چنانچہ یہ بھی مشرق و مغرب میں پھیل گئے یعنی اطراف عالم میں ' وہ معلوم کرنے لگے کہ وہ کیا سبب ہے جس کی وجہ سے ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان پابندی لگ گئی ۔ تو وہ گروہ جو تہامہ کی طرف جا رہا تھا ' وہ لوگ رسول اللہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس وقت آپ نخلہ میں تھے اور عکاظ کے بازار کی طرف جا رہے تھے ۔ حضورؐ اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز فجر پڑھ رہے تھے ۔ جب ان جنوں نے قرآن سنا تو متوجہ ہو کر سننے لگے ۔ تو انہوں نے کہا خدا کی قسم یہ ہے وہ حقیقی سبب جس کی وجہ سے تم پر آسمانوں کی خبریں لینے پر پابندی لگ گئی ہے ۔ جب یہ لوگ اپنی قوم کی طرف لوٹے تو انہوں نے یہ رپورٹ دی ۔ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا

قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱) یَّھْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۲) (۷۲ : ۱،

۲) "اے ہماری قوم کے لوگو ' ہم نے ایک بڑا عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔ اس لیے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے "۔ رسول اللہ کو اطلاع دی گئی ۔

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ (۷۲ : ۱) "اے نبیؐ کہو میری طرف وحی بھیجی گئی کہ جنوں کے ایک گروہ نے قرآن کو غور سے سنا "۔ حضورؐ کی طرف دراصل جنوں کے اقوال وحی کیے گئے ۔

امام مسلم ' ابو داؤد اور ترمذی نے علقمہ سے روایت کی ہے ۔ انہوں نے کہا میں نے حضرت ابن مسعود سے پوچھا کہ جنوں کی رات تم میں سے کوئی حضورؐ کے ساتھ تھا ۔ انہوں نے کہا : رات ہم میں سے کوئی بھی حضورؐ کے ساتھ نہ تھا ۔ ہوا یوں کہ ایک رات ہم حضورؐ کے ساتھ تھے کہ حضورؐ غائب ہو گئے ۔ تو ہم نے پہاڑیوں اور وادیوں میں آپؐ کو تلاش کرنا شروع کیا ۔ ہم نے کہا کہ حضورؐ کو کوئی چیز لے اڑی یا آپؐ کو اچک لیا گیا ۔ ہم نے یہ رات بہت ہی بری طرح گزاری ۔

جب صبح ہوئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضور حرا کی طرف سے چلے آرہے ہیں۔ہم نے کہا حضورؐ ہم نے رات کو آپؐ کو تلاش کیا اور آپؐ کو نہ پایا۔اس وجہ سے ہم نے یہ رات اس قدر تکلیف میں گزاری جس قدر کوئی تکلیف سے کوئی رات گزار سکتا ہے۔تو آپؐ نے فرمایا: میرے پاس جنوں کا ایک شخص دعوت لے کر آیا تھا۔میں اس کے ساتھ چلا گیا۔میں نے ان پر قرآن پڑھا تو یہ سن کر ہم نے کہا حضورؐ ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں اور ہمیں ان کے آثار بتائیں اور ان کی آگ کے آثار بتائیں۔اور جنوں نے آپؐ سے اپنی خوراک کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: "ہر وہ ہڈی جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو جو تمہارے ہاتھ آئے اور جس پر زیادہ گوشت ہو وہ تمہاری خوراک ہے۔اور ہر مینگنی یا لید تمہارے جانوروں کے لیے ہے"۔اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا "لہٰذا ان دونوں چیزوں کے ساتھ استنجا نہ کرو' کہ یہ تمہارے بھائیوں کی خوراک ہے"۔

ابن اسحاق اور ابن ہشام نے جنوں کے واقعہ کو حضورؐ کے سفر طائف کے بعد نقل کیا ہے۔حضورؐ نے طائف جا کر بنی ثقیف سے مدد چاہی۔یہ آپ کے چچا ابو طالب کی موت کے بعد کا واقعہ ہے۔اس وقت آپؐ پر اور مسلمانوں پر مکہ میں بہت ہی تشدد ہو رہا تھا۔بنی ثقیف نے آپؐ کی دعوت کو برے انداز میں رد کر دیا اور جب آپؐ واپس ہونے لگے تو بچوں اور نادانوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا۔یہاں تک کہ آپؐ کے دونوں پاؤں مبارک پتھروں سے لہولہان ہو گئے۔اور آپؐ نے اس موقعہ پر یہ گہری اور موثر دعا فرمائی۔"اے اللہ میں تجھ ہی سے اپنی قوت کی کمزوری کی شکایت کرتا ہوں' اپنی قلت تدبیر کی شکایت کرتا ہوں' اور لوگوں پر اپنی کمزوری کی شکایت کرتا ہوں' اے ارحم الراحمین' تو کمزوروں کا رب ہے' اور میرا رب ہے' تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کسی ایسے شخص کے جو مجھ پر حملہ آور ہو؟ تو نے میرا معاملہ کسی دشمن کے حوالے کر دیا ہے؟ لیکن اے اللہ' اگر تو ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔لیکن تیرا دامن تو میرے لیے بہت وسیع ہے۔میں تیرے چہرے کی روشنی میں پناہ لیتا ہوں جس نے تمام تاریکیوں کو روشن کر دیا ہے۔اور اس نور کی وجہ سے دنیا و آخرت اچھی ہو جاتی ہے۔اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غصب ہو یا مجھ پر تیرا عذاب آجائے۔تجھے اختیار ہے کہ تو مجھے مشقت میں ڈالے جب تک تو راضی نہ ہو۔تیرے سوا کوئی قوت اور جائے پناہ نہیں ہے۔

کہتے ہیں اس کے بعد رسول اللہ مکہ کی طرف لوٹنے لگے۔جب آپ بنی ثقیف کی طرف سے کسی بھلائی سے مایوس ہو گئے۔جب رات آپ نخلہ میں آئے تو رات کو آپ نماز کے لیے اٹھے تو اس وقت جنوں کا ایک گروہ آپؐ کے پاس سے گزرا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔حضورؐ نے ان کی تعداد سات بتائی جو دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔انہوں نے حضورؐ کی بات توجہ سے سنی۔جب حضورؐ نماز سے فارغ ہوئے تو یہ جن اپنی قوم کی طرف چلے گئے اور ان کو ڈرانے لگے۔یہ خود ایمان لائے تھے اور جو کچھ انہوں نے سنا' اسے قبول کر چکے تھے۔اللہ نے یہ کہانی حضورؐ پر نازل فرمائی۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (۴۶ : ۲۹) "اور جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں"۔

وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۴۶ : ۳۱) "اور تمہیں عذاب الیم سے بچائے گا"۔اور سورۃ جن میں فرمایا قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ --- الی آخرہ (۷۲ : ۱) علامہ ابن کثیر نے روایت ابن

اسحاق پر یوں تبصرہ کیا ہے "یہ تو صحیح ہے لیکن ان کا کہنا کہ جنوں کے ساتھ خطاب بھی اسی رات کو ہوا۔ یہ بات قابل بحث ہے کیونکہ جنوں کا قرآن مجید سننا آغاز وحی کے زمانے میں تھا جس طرح حضرت ابن عباس کی روایت میں ہے۔ اور حضورؐ کا سفر طائف تو اس وقت ہوا جب آپ کے چچا محترم حضرت ابو طالب فوت ہو گئے تھے۔ اور یہ وفات ہجرت سے ایک یا دو سال قبل ہوئی تھی۔ واللہ اعلم!

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس کی روایت سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ کیونکہ یہ روایت پوری طرح نصوص قرآن کے ساتھ متفق ہے۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ (۷۲ : ۱) "اے پیغمبرؐ کہہ دے کہ میری طرف یہ وحی آئی ہے کہ جنوں میں سے کچھ لوگوں نے قرآن کو غور سے سنا"۔ یہ آیت قطعاً بتاتی ہے کہ اس واقعہ کا علم حضور اکرمؐ کو اس طرح ہوا کہ آپؐ پر وحی نازل فرمائی۔ اور یہ کہ آپؐ نے جنوں کو دیکھا نہ تھا۔ اور نہ آپؐ کو یہ احساس ہوا کہ جن سن رہے ہیں۔ پھر اسناد کے اعتبار سے بھی یہ روایت سب سے قوی ہے۔ اور ابن اسحاق کی روایت بھی اس کے ساتھ متفق ہے۔ جس طرح قرآن مجید نے ہمیں جنوں کی صفات میں بتایا کہ اِنَّهُ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ "یہ اور اس کا قبیلہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے جبکہ تم انہیں نہیں دیکھ رہے"۔ میں سمجھتا ہوں اس حادثہ کی تحقیق میں اس قدر بات کافی ہے۔

---ooo---

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (۴۶ : ۲۹) "اور وہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے"۔ یہ اللہ کی ایک خاص تدبیر تھی کہ اس نے جنوں کو قرآن کی طرف موڑ دیا۔ محض کوئی اتفاقی بات نہ تھی۔ ان کی تقدیر میں یہ تھا کہ جن بھی نبی آخر الزمان کی رسالت سے اسی طرح خبردار ہو جائیں جس طرح وہ حضرت موسیٰ کی رسالت سے خبردار تھے اور ان میں سے ایک فریق آگ سے بچ جائے جسے شیطان اور جنوں کے لیے تیار کیا گیا ہے اور انسانی شیاطین کے لیے بھی۔

قرآن کریم نے ان کی تعداد کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سننے والے جنوں کی تعداد تین سے دس تک تھی اور قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ ان کے پردہ احساس پر قرآن کے کیا اثرات نیچے یعنی خوشی، اچھا تاثر، خضوع اور خشوع۔

فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا (۴۶ : ۲۹) "اب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ"۔ یوں اس پورے عرصے میں وہ بڑی خاموشی سے سنتے رہے۔

فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَى قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ (۴۶ : ۲۹) "پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے"۔ یہ اثر بھی ان پر اس لیے ہوا کہ انہوں نے قرآن کو نہایت غور سے سنا تھا۔ خاموش ہو کر سنا اور آخر تک سنتے رہے۔ جب تلاوت ختم ہوئی تو وہ فوراً اپنی قوم کے پاس گئے اور ان کے شعور نے وہ بات اپنالی تھی جو اگر کسی کے شعور میں داخل ہو جائے تو وہ خاموش نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کی تبلیغ اور لوگوں کے ڈرانے کے کام میں شف شف کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہے کہ جب کسی شخص کے احساس میں ایک نئی بات بیٹھ گئی ہو۔ اور اس کے احساسات کو ایک نہایت ہی موثر' غالب اور چھا جانے والے نظریہ نے اپنی گرفت میں لے لیا ہو' تو وہ فوراً حرکت میں آجاتا ہے' ہر جگہ اسی کی بات کرتا ہے اور بڑے اہتمام کے ساتھ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔

قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ (۴۶ : ۳۰) "اور انہوں نے جا کر کہا' اے ہمارے قوم کے لوگو' ہم نے ایک کتاب سنی ہے' جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے۔ تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی' رہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف"۔ وہ بڑی جلدی سے اپنی قوم کی طرف لوٹے' اور جاتے ہی انہوں نے ان کے سامنے تقریر شروع کر دی کہ برادران قوم ہم نے ایک نئی کتاب سنی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اور اپنے اصولوں میں یہ موسیٰ کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتب سماوی سے واقف تھے' کیونکہ قرآن آیات اور بنیادی تعلیمات سنتے ہی ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ دونوں کی تعلیمات ایک ہیں انہوں نے قرآن کا جو حصہ سنا تھا ضروری نہیں ہے کہ اس میں کتاب موسیٰ کی تعلیمات ہوں۔ البتہ انہوں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ دونوں کتابوں کا مزاج اور سرچشمہ ایک ہے۔ یہ جنوں کی شہادت جو انسانی تعصبات اور موثرات سے دور ہیں اور قرآن کا کچھ حصہ سننے پر انہوں نے یہ تبصرہ کر دیا' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ایک برحق کتاب ہے۔ اور کتب سابقہ کی مصدق ہے۔ یہ ایک اہم شہادت ہے۔

قرآن سننے کے بعد ان کے شعور میں جو بات بیٹھ گئی اور ان کے دل و دماغ نے جس حقیقت کو پالیا وہ یہ تھی کہ

يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ (۴۶ : ۳۰) "یہ حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے"۔ یہ نہایت ہی اہم بات ہے جو انہوں نے کی کیونکہ قرآن سے پہلا تاثر یہی ملتا ہے کہ یہ کتاب برحق ہے اور دوسرا یہی ملتا ہے کہ یہ سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جو شخص بھی بصیرت رکھتا ہو وہ قرآن کو پڑھ کر یہ دونوں باتیں محسوس کرتا ہے۔ اگر اس کی روح بغض و عناد' کبر اور خواہشات نفسانیہ کی رسیوں میں جکڑی ہوئی نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کریم کا ایک حصہ سنتے ہی ان لوگوں نے اس راز کو پالیا اور اپنی قوم کے سامنے پہلی تقریر میں یہی حقیقت بیان کر دی جو ان کے احساسات کی سچی تعبیر تھی۔

اس کے بعد انہوں نے جو باتیں اپنی قوم سے کہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس دعوت پر مطمئن ہو گئے ہیں اور اب ان پر فرض ہے کہ وہ ایک ایک فرد تک اس دعوت کو پہنچا دیں۔

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (٤٦ : ٣١) "اے ہماری قوم کے لوگو' اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ' اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں عذاب الیم سے بچائے گا"۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ کتاب جو نازل کی گئی ہے' اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ جن و انس دونوں کے لیے دعوت ہے اور اسے پوری زمین کے لوگوں تک پہنچنا چاہیے۔ اور اس کتاب کو سنتے ہی انہوں نے اس بات کو پالیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم داعی الی اللہ ہیں۔ اس لیے انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا "اے ہماری قوم' داعی الی اللہ کی دعوت کو قبول کرو اور ان پر بھی ایمان لاؤ" انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ ایمان اور عمل صالح کے نتیجے میں بخشش نصیب ہوتی ہے اور اللہ کے عذاب سے بچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے جو کچھ سمجھا اس کی تعلیم دے دی۔

ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ اس پر جنوں کی بات ختم ہو گئی ہے لیکن سیاق کلام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلی دو آیات بھی جنوں کے کلام کا حصہ ہیں۔ خصوصاً یہ آیت

وَ مَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (٤٦ : ٣٢) "اور جو کوئی اللہ کے داعی کی بات نہ مانے وہ نہ زمین میں خود کوئی بل بوتا رکھتا ہے کہ اللہ کو زچ کر دے اور نہ اس کے کوئی ایسے حامی اور سرپرست ہیں کہ اللہ سے اس کو بچا لیں۔ ایسے لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں"۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان جنوں کے ڈراوے کا یہ ایک قدرتی حصہ ہے جو انہوں نے اپنی قوم کو دیا کیونکہ انہوں نے ان کو دعوت ایمان اور قبولیت حق دی۔ لہٰذا ڈراوے کے بعد قوی احتمال اس کا ہے کہ وہ اپنی قوم کو اس بات سے ڈرائیں کہ اگر انہوں نے اس بات کو قبول نہ کیا تو انجام کیا ہو گا۔ اور جو قبول نہ کرے گا وہ اللہ کو عاجز نہ کر سکے گا کہ اللہ اس پر سزا و جزاء کا نظام نافذ کرے۔ اور اسے عذاب الیم دے۔ اور پھر قیامت میں ایسا شخص کوئی دوست و یار ایسا نہ پائے گا جو اس کی مدد کر سکے۔ اور یہ کہ نہ ماننے والے گمراہی کے راستے میں پھر بہت دور تک چلے جائیں گے۔

اسی طرح کی آیت میں بھی زیادہ احتمال یہ نظر آتا ہے کہ یہ بھی کلام جن ہے۔ یہ ان لوگوں پر تعجب ہے جو اللہ کی اس دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ قیامت سے بچ جائیں گے اور یہ کہ نہ قیامت ہے اور نہ جزا و سزا ہے۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٤٦ : ٣٣) "اور کیا ان لوگوں کو یہ بجھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین اور آسمان پیدا کیے اور ان کو بناتے ہوئے وہ نہ تھکا' وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے؟ کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے"۔ یہ ایک طرح توجہ دلاتا ہے اس کائنات کی کھلی کتاب کے مطالعہ کی طرف' جس کا تذکرہ سورت کے آغاز میں بھی ہوا تھا۔ بسا اوقات یوں ہوتا ہے کہ ایک نکتہ قرآن مجید

میں براہ راست بھی ہوتا ہے۔ پھر وہی بات ایک قصے میں بھی آجاتی ہے' اس طرح بتا دیا جاتا ہے کہ یہ قصہ اس لئے لایا گیا اور سیاق کلام میں مناسبت آجاتی ہے۔

یہ کتاب پہلے تو یہ بتاتی ہے کہ یہ عظیم کائنات' جس کے تصور سے سرچکرا جاتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی....... یہ آسمان اور زمین اور ان کے اندر رنگا رنگ مخلوقات جو دیکھتے ہی بتا دیتی ہیں کہ اللہ کے لیے تمام مخلوقات کو دوبارہ پیدا کر دینا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کی یہ کائناتی اسکیم یہ بتاتی ہے کہ دوبارہ حشر ہو گا۔ اور یہاں بات کو بطور استفہام لانے سے تاکید مزید ہو جاتی ہے اور استفہام کا جواب ہاں میں ہے۔ اس لیے آخر میں یہ فقرہ آتا ہے۔

اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۴۶ : ۳۳) "یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے"۔ لہٰذا اللہ دوسری قدرتوں کے ساتھ تمام مخلوقات کو دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ اور آخر میں دوبارہ اٹھائے جانے کے اصل مقصد کو نہایت ہی مشخص انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ حساب و کتاب یوں ہو گا۔

---ooo---

وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۴۶ : ۳۴) "جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے' اس وقت ان سے پوچھا جائے گا "کیا یہ حق نہیں ہے؟" یہ کہیں گے "ہاں' ہمارے رب کی قسم (یہ واقعی حق ہے)"۔ اللہ فرمائے گا "اچھا تو اب عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے رہے تھے"۔

اس منظر کو پیش کرنے کے لیے تمہیدی کلمات۔

وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ (۴۶ : ۳۴) "جس روز یہ کافر آگ کے سامنے لائے جائیں گے"۔ یہ الفاظ آتے ہی قاری سوچتا ہے کہ اگلا لفظ کیا ہو گا' کیا قصہ ہو گا' قصہ نہیں آتا اور اسکرین پر مکالمہ آجاتا ہے۔

اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ (۴۶ : ۳۴) "کیا یہ حق نہیں؟" اچانک اس سوال سے گویا ان لوگوں پر برق ناگہانی گر جاتی ہے جو قیامت کا مذاق اڑاتے تھے اور قیامت کے جلدی لانے کا مطالبہ ہر پیغمبر سے کرتے تھے۔ آج ان کی گردن حق کے سامنے جھک گئی ہے جس کا وہ انکار کرتے تھے۔ نہایت شرمندگی سے جواب دیتے ہیں۔

قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا (۴۶ : ۳۴) "ہاں' اور ہمارے رب کی قسم" اب تو وہ بڑی شرافت سے قسم رب کی اٹھاتے ہیں۔ لیکن دنیا میں اللہ کو رب ہی تو نہ مانتے تھے۔ نبیوں کو نہ مانتے تھے۔ آج تو رب کے نام کو قسم کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اس پر جواب نہیں دیا جاتا' کوئی تبصرہ نہیں ہوتا' حقارت آمیز انداز میں فیصلہ ان پر پھینک کر گفتگو ختم کر دی جاتی ہے۔

قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (٤٦ : ٣٤) اللہ فرمائے گا "اچھا تو عذاب کا مزہ چکھو اپنے اس انکار کی پاداش میں جو تم کرتے تھے"۔ اختصار کے ساتھ ۔ جیسا کہ کوئی عدالت مختصری آرڈر شیٹ لکھتی ہے ۔ "جرم ظاہر ہے ملزم معترف ہے ' جہنم میں جاوے"۔ یہاں اس منظر کو تیزی سے گزارنا بھی مقصود ہے ' کیونکہ بات فیصلہ کن ہے ۔ بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے ۔ پہلے منکر تھے اب معترف ہیں لہذا مزا چکھیں جہنم کا۔

جن لوگوں نے کفر کیا' ان کے فیصلے' دو ٹوک فیصلے کے اس منظر اور اہل ایمان' جنات کے منظر کے بعد' اور اس سورت کے آخر میں جس میں کافروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے بہت کچھ کہا' اور قرآن کریم کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا' اب حضور اکرمؐ کو آخری ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ صبر کریں' جلد بازی نہ کریں ۔ آپ نے تو اس سورت کے مناظر میں دیکھ لیا کہ ان کا کیا انجام ہونے والا ہے اور یہ بہت ہی قریب ہے ۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ

(٤٦ : ٣٥) "پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا ہے ' اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو ۔ جس روز یہ لوگ اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا انہیں خوف دلایا جارہا ہے تو انہیں معلوم ہو گا کہ جیسے دنیا میں دن کی ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں رہے تھے ۔ بات پہنچا دی گئی ' اب کیا نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا؟"

اس آیت کا ہر لفظ ہمارے لیے زاد راہ ہے ۔ ہر کلمے اور ہر لفظ کے پیچھے تصاویر' چھاؤں' معانی' اشارات اور فیصلوں اور قدروں کا ایک ذخیرہ ہے ۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (٤٦ : ٣٥) "پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملہ میں جلدی نہ کرو"۔ یہ حضور اکرمؐ کو ہدایت ہو رہی ہے اس دور میں آپ پر ظلم اور زیادتیوں کے پہاڑ توڑے جارہے تھے ۔ پوری قوم آپؐ کے اور مسلمانوں کے خلاف تشدد میں لگی ہوئی تھی ۔ آپؐ نے بطور یتیم نشوونما پائی تھی اور ابتدائی دور ہی میں ایک ایک کر کے حامیوں اور اولیاء سے محروم کر دیئے گئے تھے ۔ باپ گئے ' ماں گئیں ' دادا گئے اور آخر میں چچا گئے ۔ پھر آپؐ کی وفادار بیوی گئیں اور آپؐ اللہ اور اللہ کی دعوت کے لیے فارغ ہو گئے ۔ اس طرح اللہ کے سوا ہر سہارے سے محروم ہو گئے ۔ آپؐ کو بمقابلہ اجنبیوں کے اپنے رشتہ داروں سے زیادہ اذیت ملی ۔ آپؐ نے ایک ایک فرد سے ملاقات کی ' ایک ایک قبیلے سے ملاقات کی کہ میری مدد کرو ' لیکن ہر بار آپؐ منفی جواب کے ساتھ لوٹے ۔ بعض لوگوں نے تو مذاق اڑایا ۔ بعض نے تو آپؐ کے پیچھے اوباش لگا دیئے یہاں تک کہ آپؐ کے پاؤں لہولہان ہو گئے ۔ لیکن آپ نے مذکورہ بالا دعا سے زیادہ کچھ نہ کہا ۔ اس لیے یہاں آپؐ کو رب ذوالجلال کی طرف سے تسلی کی ضرورت تھی ۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ (۴۶ : ۳۵) "پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو"۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت ہی دشوار گزار راستہ ہے۔ دعوت اسلامی کا راستہ بہت ہی مشکل اور بہت ہی تلخ ہے۔ اس کے لیے تو ذات محمدی کی ضرورت ہے، جو ہر طرف سے کٹ جائے، دعوت کے لیے یکسو ہو جائے۔ پختگی اور ثبات میں، باطن کی صفائی اور شفافی میں رب کی ہدایت پر چلے۔ اللہ کے احکام کے مطابق صبر و ثبات کا مظاہرہ کرے اور دعوت کے مخالفین سے انتقام یا ان کے انجام بد کے لیے شتابی نہ کرے۔

لیکن راستے کی مشقتوں اور زخموں کے لیے مرہم کی بھی ضرورت ہے۔ مشکلات کے لیے صبر ایوبی چاہئے۔ تلخیوں کے لیے ایک میٹھا گھونٹ بھی چاہئے اور یہ میٹھا گھونٹ اللہ کی سربند رحمت کا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ (۴۶ : ۳۵) "پس اے نبیؐ صبر کرو جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کر"۔ وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے جس طرح ایک دن کا ایک گھنٹہ یا گھڑی بھر۔ آخرت سے پہلے تمام زمانہ بھی دراصل ایک گھڑی ہی ہے۔ اس پورے مکان و زمان کے نقوش انسانی ذہن کے پردے پر اتنے بھی نہ رہیں گے جس طرح دن کے چند لمحات کے نقوش، پھر یہ اپنے انجام کو پہنچنے والے ہیں یہ ابدی دنیا کے دروازے پر ہیں۔ صرف اس قدر وقت ہے کہ ہلاکت سے قبل ان تک پیغام پہنچ جائے۔

بَلٰغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶ : ۳۵) "بات پہنچا دی گئی! اب نافرمان لوگوں کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا"۔ نہیں، کیونکہ اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ لہٰذا ہر داعی کو صبر کرنا چاہئے اور یہ صبر ایک مختصر وقت کے لیے ہے۔ پھر اللہ کے وعدے کے مطابق ہی فیصلہ ہو گا کہ فاسق ہی ہلاک ہوں گے۔

--- ooo ---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ------ ۲۶

سورۃ محمد ۔ ۴۷

آیات ۱--- تا--- ۳۸

سورۂ محمدؐ ایک نظر میں

یہ مدنی سورت ہے اور اس کا ایک نام دوسرا بھی ہے وہ ہے "سورہ قتال" کیونکہ اس کا موضوع اور محور دراصل قتال ہے ۔ قتال کی صورتیں اور اس کے حالات اور اس کے انداز تعبیر اور صوتی اثرات سب میں قتال کا رنگ غالب ہے ۔

اس کے مضمون کا آغاز ہی ان لوگوں کے تعارف سے ہوتا ہے جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے اور ان لوگوں کے تعارف سے جو ایمان لائے ۔ کفار پر تنقید کی گئی ہے ۔ اور اہل ایمان کی تعریف کی گئی ہے ۔ اور یہ اعلان کہ اللہ اہل کفر کا دشمن ہے اور اہل ایمان کا دوست ہے ۔ اور اس بات کی اللہ کے ہاں بڑی اہمیت ہے ۔ پس گویا یہ اعلان ہے کہ اللہ اپنے اور اپنے دین کے دشمنوں کے ساتھ بر سر جنگ ہے ۔ آغاز ہی میں

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۱) وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ (۲) ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ (۳) (۴۷ : ۱ تا ۳)

"جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا' اللہ نے ان کے اعمال کو رائیگاں کر دیا ۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور اس چیز کو مان لیا جو محمد پر نازل ہوئی ہے ۔ اور ہے وہ سراسر حق ان کے رب کی طرف سے .... اللہ نے ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا ۔ یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے ۔ اس طرح اللہ لوگوں کو ان کی ٹھیک ٹھیک حیثیت بتائے دیتا ہے" ۔

کافروں کے ساتھ اس اعلان جنگ کے متصلاً بعد اہل ایمان کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان کے خلاف جنگ شروع کر دو' یہ حکم نہایت ہی زور دار اور سخت الفاظ میں ہے اور اس میں جنگ کے اندر مخالفین کو خوب کچل دینے کے بعد گرفتار کرنے اور گرفتار شدگان کے احکام بتائے گئے ہیں ۔

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰۤى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷ : ۴) "پس جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں اڑانا ہے، یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو، اس کے بعد احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرو تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے"۔

اس حکم کے بعد حکمت قتال کا بیان ہے۔ مسلمانوں کو قتال پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ شہید ہوئے وہ نہایت ہی باعزت لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کا اکرام کرے گا۔ اور جو لوگ یہ جنگ صرف اللہ کی خاطر لڑتے ہیں ان کے ساتھ اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے۔ اور اللہ کافروں کو ہلاک کر کے ان کے اعمال کو ضائع کر دیتا ہے۔

ذٰلِكَ ۛ وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۴) سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ (۴۷ : ۵) وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (۴۷ : ۶) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۴۷ : ۷) وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۸)

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۹) "یہ ہے تمہارے کرنے کا کام، اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا مگر تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے۔ اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ وہ ان کی راہنمائی فرمائے گا، ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کر دے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔ رہے وہ لوگ، جنہوں نے کفر کیا ہے، تو ان کے لیے ہلاکت ہے۔ اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے"۔

یہاں کفار کو شدید دھمکی دی جاتی ہے اور اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ مومنین کا والی و ناصر ہے۔ اور اہل کفر کا کوئی ناصر و مددگار نہیں، وہ یکہ و تنہا چھوڑ دیے گئے ہیں۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا (۴۷ : ۱۰) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۴۷ : ۱۱) "کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر الٹ دیا اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں۔ یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں"۔

اس کھلے اعلان جنگ اور زبردست دھمکی کے بعد ایمان اور کفر کے متعلق دوسرے اہم امور لیے جاتے ہیں۔ دنیا اور آخرت میں اہل ایمان کے شب و روز اور اہل کفر کے حالات بیان کیے جاتے ہیں۔ مومنین کو دنیا و آخرت میں طیب متاع حیات دیا جاتا ہے اور کافروں کو کہا جاتا ہے کہ دنیا میں تو وہ حیوانوں کی طرح کھاتے ہیں۔ کوئی اعلیٰ مقصد ان کے سامنے نہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَ النَّارُ مَثْوًی لَّہُمْ

(۴۷ : ۱۲) "ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو اللہ ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں' جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے"۔ جبکہ اہل ایمان کی جنتوں میں پسندیدہ پینے کی چیزیں ہوں گی' پانی تازہ اور صاف' تازہ دودھ' لذیذ شراب' صاف شدہ شہد بڑی مقدار میں اور کثرت سے نہروں کی شکل میں۔ پھر مختلف قسم کے پھل اور اللہ کی مغفرت اور رضامندی۔ آخر میں پوچھا جاتا ہے۔

کَمَنْ ہُوَ خَالِدٌ فِی النَّارِ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَہُمْ (۴۷ : ۱۵) "کیا یہ شخص ان لوگوں کی طرح ہے جو جہنم میں رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا"۔ جب سورت کے آغاز میں کافروں کے ساتھ یہ باتیں ہو گئیں اور مومنوں اور کافروں کا تعلق اور انجام صاف صاف بتا دیا گیا تو پھر منافقین کے ساتھ بھی چند باتیں ضروری تھیں۔ مدینہ میں یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ مل کر نئی اٹھنے والی اسلامی جماعت اور حکومت کے لیے شدید خطرہ بن رہے تھے۔ یہ لوگ ان مشرکین مکہ کے مقابلے میں زیادہ خطرناک تھے جو باہر سے اسلام کے خلاف برسر پیکار تھے۔ خصوصاً غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ احزاب سے پہلے کے دور میں جبکہ یہودیوں کی قوت کا زور توڑ دیا گیا تھا اور منافقین کی مرکزی قوت بھی کمزور ہو گئی تھی جیسا کہ ہم نے سورت احزاب میں تفصیلات دے دی ہیں۔

اس سورت میں منافقین کے ساتھ مکالمے کا خاص رنگ ہے۔ آغاز ہی سے سخت حملے اور جنگ کا انداز ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ کی مجلس میں باتوں کو غور سے نہیں سنتے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ درحقیقت یہ گمراہ ہیں۔

وَ مِنْہُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْکَ حَتّٰۤی اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِکَ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَ اتَّبَعُوْۤا اَہْوَآءَہُمْ (۴۷ : ۱۶)

"اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں اور پھر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان لوگوں سے جنہیں علم کی نعمت بخشی گئی ہے۔ پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی انہوں نے کیا کہا تھا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے اور یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں"۔

ایسے لوگوں کو دھمکی دی جاتی ہے کہ کیا یہ قیامت کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہاں تو ان کے ہوش ٹھکانے نہ ہوں گے۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰهُمْ (۱۸:۴۷) "اب کیا یہ لوگ قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ اچانک ان پر آجائے؟ اس کی علامات تو آچکی ہیں جب وہ خود آجائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقعہ رہ جائے گا"۔

اس کے بعد منافقین کی حالت کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے کہ جب قتال کا حکم آتا ہے تو ان کی پریشانی، بزدلی اور ہلکا پن واضح ہوکر سامنے آجاتا ہے کیونکہ یہ تو دکھاوے کے مسلمان ہیں۔ حکم قتال سے اصلی اور نقلی مسلمانوں کے درمیان امتیاز ہوتا ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (۲۰:۴۷) "جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی مگر جب ایک پختہ سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی، وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو"۔

ایک بار پھر ان منافقین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اطاعت اختیار کریں، معروف طریقہ اپنائیں اور جب کسی معاملے کا عزم بالجزم ہو جائے تو مناسب تو یہ ہے کہ یہ اپنے وعدوں میں سچے ہوں ورنہ ان کے خلاف بھی اعلان جنگ ہوگی۔

فَاَوْلٰى لَهُمْ (۲۰:۴۷) طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (۲۱:۴۷) فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (۲۲:۴۷) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ (۲۳:۴۷) "ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اطاعت کریں اور معروف باتیں کریں اور اب جب قطعی حکم دے دیا گیا ہے تو اس وقت یہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے تو انہی کے لیے بہتر ہوتا۔ اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ تم الٹے منہ پھر گئے تو زمین میں فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا"۔

جتایا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے شیطان کی رفاقت اختیار کر لی ہے، یہ یہودیوں کی سازشوں میں شریک ہیں اور موت کے وقت ان کے ساتھ فرشتوں کا سلوک بہت سخت ہوگا اور دنیا میں بھی ان کے راز فاش ہوں گے۔ یہ بطور سازش اسلامی معاشرے کے فرد بنے ہوئے ہیں اور مفادات حاصل کر رہے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ (۲۵:۴۷) ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ (۲۶:۴۷) فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ (۲۷:۴۷) ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللَّهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ (۲۸:۴۷) أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَن لَّن يُخْرِجَ اللَّهُ أَضْغَانَهُمْ (۲۹:۴۷) وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُم بِسِيمَاهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ (۳۰:۴۷) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَ أَخْبَارَكُمْ (۳۱:۴۷) ”حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اس سے پھر گئے' ان کے لیے شیطان نے اس روش کو سہل بنا دیا ہے۔ اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ ان کے لیے دراز کر رکھا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔ پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے اور ان کے منہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے؟ یہ اسی لیے تو ہو گا کہ انہوں نے اس طریقے کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے اور اس کی رضا کا راستہ اختیار کرنا پسند نہ کیا۔ اسی بنا پر اس نے ان سب کے اعمال ضائع کر دیے۔ کیا وہ لوگ جن کے دل میں بیماری ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کی کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا۔ ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور ان کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو گے مگر ان کے انداز کلام سے تو تم ان کو جان ہی لو گے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے۔ ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہے“۔

اس سورت کے تیسرے سبق میں روئے سخن پھر مشرکین مکہ اہل قریش اور یہودیوں کی طرف ہے اور ان پر تنقید کی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ (۳۲:۴۷) ”جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسولؐ سے جھگڑا کیا جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی۔ درحقیقت وہ اللہ کا کوئی نقصان بھی نہیں کر سکتے بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا“۔

اور اہل ایمان کو بھی ڈرایا جاتا ہے کہ یہ نہ ہو کہ نافرمانی کی وجہ سے ان کے اعمال بھی غارت ہو جائیں ۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ (۴۷ : ۳۳) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (۴۷ : ۳۴) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو' کفر کرنے والوں اور خدا سے روکنے والوں اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہنے والوں کو تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا"۔

مسلمانوں کو جنگ کے وقت ثابت قدم رہنے کی تلقین کی جاتی ہے ۔

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (۴۷ : ۳۵) "پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو' تم ہی غالب رہنے والے ہو' اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔

بتایا جاتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کا سازوسامان کچھ حقیقت بھی نہیں رکھتا اور حسب توفیق خرچ کرو' اللہ نے تم پر مہربانی کر کے یہ فرض نہیں کیا کہ اپنا پورا مال خرچ کر دو' کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ وہ انسانوں کی کنجوسی سے واقف ہے ۔ اگر اللہ سب کا سب مال طلب فرماتا تو تم دل تنگی اور کنجوسی اختیار کرتے ۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَ لَا يَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ (۴۷ : ۳۶) اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَ يُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ (۴۷ : ۳۷) "یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل تماشا ہے ۔اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلتے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا' اور وہ تمہارا مال تم سے نہ مانگے گا اور اگر وہ کہیں تمہارے مال تم سے مانگ لے اور سب کا سب تم سے طلب کر لے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ ابھار لائے گا"۔

اور سورت کا خاتمہ مسلمانوں کو سخت تنبیہ پر ہوتا ہے ۔اگر تم نے بخل کیا اور اپنے مال اللہ کی جنگ میں خرچ نہ کیا تو پھر تم معزول!

هٰۤاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷ : ۳۸) "دیکھو' تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو'

اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے۔ اللہ غنی ہے، تم ہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے"۔

---ooo---

غرض سورت کے آغاز سے آخر تک مسلسل جنگی ماحول اور حق و باطل کی کشمکش ہے۔ ہر فقرے سے یہ بات پھوٹتی ہے کہ باطل کا سر پھوڑ کر رکھ دو۔ آیات کے خاتمے پر آواز کی شوکت یہ تاثر دیتی ہے کہ گویا توپ کے گولے برس رہے ہیں۔ الفاظ بھی بھاری اور رعب دار ہیں مثلاً۔

اَعْمَالَهُمْ، بَالَهُمْ، اَمْثَالَهُمْ، اَهْوَاءَهُمْ، اَمْعَاءَهُمْ اور جب الفاظ نرم بھی ہوں تو یوں نظر آتا ہے کہ کسی میدان جنگ میں تلواریں چمک رہی ہیں مثلاً اَوْزَارَهَا، اَمْثَالُهَا اَقْفَالُهَا۔ جس طرح اس سورت کے الفاظ سخت پرشوکت اور آرمی کمانڈز جیسے ہیں اسی طرح اس کے اندر پیش کردہ مناظر بھی سخت ہیں مثلاً قتل و مقاتلہ کے بارے میں کہا گیا ہے: فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ (۴۷ : ۴) "پس جب کافروں کے ساتھ تمہارا آمنا سامنا ہو تو گردنیں اڑا دو"۔ اور خوب قتل کرنے کے بعد گرفتاری کے لیے یہ الفاظ ہیں: حَتّٰى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (۴۷ : ۴) "اور جب خوب کچل دو تم ان کو تب رہے سہے قیدیوں کو جکڑ کر باندھو"۔ اور کافروں کے لیے بددعا بھی نہایت ہی سخت الفاظ میں ہے: فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۸) "ہلاک ہو جائیں اور ان کے اعمال کو اللہ اکارت کر دے"۔ سابقہ اقوام کی ہلاکت بھی اسی طرح دھماکہ خیزی کے ساتھ بیان ہوئی۔ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا (۴۷ : ۱۰) "اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر الٹ دیا اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لئے مقدر ہیں" اور جہنم میں ان کی حالت یہ ہوگی۔ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (۴۷ : ۱۵) "اور انہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا"۔

اور منافقین کی بزدلی اور ان کے خوف و ہراس کو جبکہ انہوں نے قتال کا حکم سنا یوں بیان کیا گیا۔ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (۴۷ : ۲۰) "وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے ان پر حالت موت چھا گئی" اور اگر مسلمان بھی جہاد سے منہ موڑیں تو اللہ ان کو ان سخت الفاظ میں دھمکی دیتا ہے۔ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷ : ۳۸) "اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے"۔

یوں اس سورت کے مضامین و موضوعات، اس کے الفاظ، فوجی انداز گفتگو، سخت قسم کے مناظر اور قتال اور جنگ کے دوٹوک احکام اس سورت کی فضا اور اس کے ماحول کو سخت دوٹوک اور شدید بنا دیتے ہیں۔[1]

---

(۱) میں جب بھی سورت محمد کو پڑھتا تو اس کا منفرد انداز محسوس کرتا لیکن سید صاحب نے اس کا سبب نہایت احسن انداز میں پیش کیا۔ (مترجم)

درس نمبر ۲۴۱ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۱۵

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۱ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ اَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝۲ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝۳

"جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا' اللہ نے ان کے اعمال کو رائیگاں کر دیا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور اس چیز کو مان لیا جو محمد پر نازل ہوئی ہے۔ اور ہے وہ سراسر حق ان کے رب کی طرف سے .... اللہ نے ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا۔ یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے۔ اس طرح اللہ لوگوں کو ان کی ٹھیک ٹھیک حیثیت بتائے دیتا ہے"۔

سورت کا افتتاح یوں ہے جس طرح کوئی فوج حملہ آور ہو جاتی ہے' کوئی مقدمہ نہیں' کوئی تمہید نہیں۔ اعلان ہو جاتا ہے کہ کافر بظاہر جو اچھے کام کر رہے ہیں وہ کالعدم ہیں جنہوں نے کفر کیا ہے' اللہ کی راہ پر چلنے سے رکے ہیں اور دوسروں کو روکا ہے۔ اعلان ہوتا ہے کہ ان کے یہ اعمال کالعدم (void) ہیں۔ یہ اعلان نہایت ہی موثر' عام فہم اور مشخص انداز میں ہے۔ ان کے اعمال راستہ گم کر گئے ہیں اور اس وجہ سے ہلاک اور ضائع ہو گئے' یوں کہ گویا یہ زندہ

انسان یا حیوان ہیں اور انہوں نے راستہ گم کر دیا ہے' بہت دور نکل گئے ہیں اور ہلاک ہو گئے ہیں' یہ مفہوم اور یہ نقشہ بتاتا ہے کہ گویا یہ اعمال لوگوں سے یا مویشیوں کے گلے سے الگ ہو گئے اور لوگ ان اعمال سے الگ ہو گئے اور دونوں کا انجام ہلاکت پر ہوا۔

یہ جن اعمال کے گم ہونے کا اعلان ایک فوجی فرمان کی شکل میں ہوا ہے۔ ان سے مراد وہ اعمال خیریہ ہیں جو ایمان، جہاد کے رنگ سے محروم ہیں اور کرنے والوں کی غرض نیکی ہے لہٰذا اعمال صالحہ کی قدر و قیمت ایمان اور نظریہ جہاد کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ اس قسم کے اعمال جو بظاہر نیکی کے اعمال ہوتے ہیں لیکن ان کی تہ میں داعیہ نیکی کا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات داعیہ بھی نیکی کا ہوتا ہے لیکن ایمان پر مبنی نہیں ہوتا۔ اس طرح بغیر ایمان کے ایک عارضی' سرسری جذبہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے کچھ اعمال صادر تو ہو جاتے ہیں لیکن ثبات و دوام سے محروم ہوتے ہیں' وہ کسی مضبوط اور واضح منہاج اور نظریہ پر مبنی نہیں ہوتے۔ اور زندگی کے طویل منصوبے سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کائنات کے اندر پوشیدہ ناموس الٰہی سے مربوط نہیں ہوتے۔ اس لیے باطل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اعمال کے لیے ایمان ضروری ہے تاکہ یہ اعمال اس سے بندھے ہوئے ایک صحیح رخ پر جا رہے ہوں اور عمل کرنے والا اس ایمانی داعیہ سے عمل کر رہا ہو اور یہ عمل اس کائناتی نظام سے بھی مربوط ہو' جو انسان کو اس کائنات سے جوڑتا ہے۔ اور اس طرح اس کائنات میں ہر عمل کا ایک مقصد اور ایک اثر ہوتا ہے۔ اور وہ ایک منزل تک جاتا ہے۔

اور دوسری طرف

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (۴۷ : ۲) "اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور اس چیز کو مان لیا جو محمدؐ پر نازل ہوئی ہے۔ اور ہے وہ سراسر حق ان کے رب کی طرف سے"۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۴۷ : ۲) میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا شامل ہے لیکن یہاں اس کا ذکر علیحدہ بطور تاکید کیا گیا ہے تاکہ اس کی صفت میں یہ جملہ لایا جائے۔

وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (۴۷ : ۲) اور سابق ایمان کی تاکید مزید ہو جائے اور عمل صالح کا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ایمان زندہ ہے' موجود ہے اور فعال ہے۔

كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ (۴۷ : ۲) "اللہ نے ان کی برائیاں ان سے دور کر دیں"۔ یہ خبر ہے الذین کی۔ اور کفار کے اعمال کو ضائع کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ اعمال بظاہر خیریہ تھے۔ اور ایمان نہ ہونے اور کفر کے وجود نے ان کو ضائع کر دیا جبکہ مومنین کے سیئات کو بھی دور کر دیا گیا اور وہ بخش دیئے گئے۔ یہ مکمل مقابلہ ہے کہ کفر سے نیک اعمال ضائع ہونے اور ایمان سے برے اعمال فنا ہوتے ہیں۔ یہ ہے اہمیت ایمان کی۔

وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷ : ۲) "اور ان کا حال درست کر دیا"۔ کسی کا حال درست کر دینا' ایک بڑی نعمت

ہے جو ایمان کے نتیجے اور اثر میں کیا جاتا ہے ۔ خوشحال اور فارغ البال ہونا اطمینان ' آرام ' اللہ کی سلامتی اور رضامندی کا مظہر ہوتا ہے ۔ جب انسان اندر سے مطمئن ہو تو اس کا شعور ' اس کی سوچ اور اس کا قلب اور ضمیر اور اس کے افکار اور اعصاب اور اس کا پورا نفس نہایت اچھی طرح کام کرتے ہیں ۔ اور وہ امن و سلامتی کی زندگی بسر کرتا ہے ۔ قلبی اطمینان سے اور کوئی بڑی نعمت نہیں ہے ۔ یہ ایک افق ہے ' جو نہایت روشن ہے اور صاف و شفاف ہے اور یہاں تک رسائی صرف اہل ایمان کو حاصل ہوتی ہے ۔

یہ کہ کافروں کے اعمال ضائع کر دیئے اور مومنین کی برائیاں معاف کر دیں یہ کسی دوستی یا رشتہ داری کی بناء پر نہیں ' محض اتفاق کے طور پر بھی نہیں بلکہ ایک موثر اور متعین اصول کے مطابق ایسا کیا گیا ۔ اس ناموس فطرت کے مطابق جس کے اوپر یہ کائنات قائم ہے ۔ یہ ناموس حق ہے جو اساس تخلیق ہے اور جس کے مطابق اللہ نے زمین و آسمان بنائے ہیں ۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ (۴۷ : ۳) "اور یہ اس لیے کہ کفر کرنے والوں نے باطل کی پیروی کی اور ایمان لانے والوں نے اس حق کی پیروی کی جو ان کے رب کی طرف سے آیا" ۔ جہاں تک باطل کا تعلق ہے اس کی جڑیں اس کائنات کے اندر دور تک نہیں ہوتیں ' اس لیے وہ تباہ ہو جاتا ہے اور جو شخص بھی باطل کا پیرو ہوتا ہے یا باطل کا نتیجہ ہوتا ہے وہ ضائع ہونے والا ہوتا ہے اور کافر چونکہ باطل کے پیرو کار ہوتے ہیں اس لیے ان کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور ان میں سے کوئی مفید چیز باقی نہیں رہتی ۔ اور حق چونکہ مستقل ہوتا ہے ' آسمان و زمین بھی اس پر قائم ہیں ' اس کی جڑیں اس کائنات میں بہت دور تک چلی جاتی ہیں ۔ اس لیے وہ باقی ہوتا ہے اور مومن چونکہ اس کے پیرو کار ہوتے ہیں ۔ اس لیے ان کو بھی دوام حاصل ہوتا ہے اور اللہ ان کی کوتاہیوں کو معاف کرتا ہے اور ان کی اصلاح حال فرماتا ہے ۔

یہ ایک واضح اور طے شدہ معاملہ ہے اور متعین اصولوں پر اور متعین اسباب پر قائم ہے لہٰذا اس میں کوئی اتفاقی امر نہیں ہے یا محض تک پر مبنی نہیں ہے ۔

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ (۴۷ : ۳) "اسی طرح اللہ لوگوں کو اس کی ٹھیک ٹھیک حیثیت بتا دیتا ہے" ۔ یعنی ایسے اصول اللہ بتا دیتا ہے جس کے مطابق وہ اپنے نفس اور اعمال کو تولتے ہیں اور وہ ان معیاروں کو جانچتے ہیں جن کے مطابق وہ اپنے معاملات چلاتے ہیں اور قیاس اور پیمانوں میں خود مختار نہیں ہیں ۔

یہ اصول تو پہلی آیت میں طے کر دیا گیا ' اس کے بعد اہل ایمان کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ وہ حق کے پیروکار ہیں اور اس حق کا قیام اور غلبہ اس کرۂ ارض پر ضروری ہے ۔ حق کی فطرت میں غلبہ ہے ۔ اس نے لوگوں کی زندگی کے پیمانے طے کرنے ہیں ' لوگوں کی زندگی کو حق کے اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہے ' اور کافر چونکہ باطل پر ہیں ' اس لیے باطل اور اہل باطل دونوں کے آثار کا مٹنا ضروری ہے ۔

فَاِذَا لَقِيۡتُمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثۡخَنۡتُمُوۡهُمۡ فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الۡحَرۡبُ اَوۡزَارَهَا ۛۚ ذٰ لِكَ ؕ وَلَوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانۡتَصَرَ مِنۡهُمۡ وَلٰـكِنۡ لِّيَبۡلُوَا۟ بَعۡضَكُمۡ بِبَعۡضٍ ؕ وَالَّذِيۡنَ قُتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَلَنۡ يُّضِلَّ اَعۡمَالَهُمۡ ﴿۴﴾ سَيَهۡدِيۡهِمۡ وَيُصۡلِحُ بَالَهُمۡ ﴿۵﴾ وَيُدۡخِلُهُمُ الۡجَـنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمۡ ﴿۶﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ يَنۡصُرۡكُمۡ وَيُثَبِّتۡ اَقۡدَامَكُمۡ ﴿۷﴾ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَتَعۡسًا لَّهُمۡ وَاَضَلَّ اَعۡمَالَهُمۡ ﴿۸﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَرِهُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَهُمۡ ﴿۹﴾ اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ اَمۡثَالُهَا ﴿۱۰﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوۡلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَاَنَّ الۡكٰفِرِيۡنَ لَا مَوۡلٰى لَهُمۡ ﴿۱۱﴾

۱ ۱۱ع ۵

"پس جب ان کافروں سے تمہاری مڈ بھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے' یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو' اس کے بعد (تمہیں اختیار ہے) احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کر لو' تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے ۔ یہ ہے تمہارے کرنے کا کام ۔ اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا' مگر (یہ طریقہ اس نے اس لیے اختیار کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے ۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے ۔ اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا ۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا' ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے ۔ اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا ۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے' تو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے ۔ کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے' لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے ۔ کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر الٹ دیا' اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں ۔ یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں"۔

اس آیت میں کافروں کے ساتھ ملاقات سے مراد جنگ کا آمنا سامنا ہے ۔ محض ملاقات نہیں ہے ۔ اس سورت کے

نزول تک جزیرۃ العرب میں بعض لوگ مسلمانوں کے ساتھ بر سرجنگ تھے اور بعض کے ساتھ صلح کا معاہدہ تھا۔ سورہ برات ابھی نازل نہ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں مشرکین کے ساتھ معاہدے ختم کر دیئے گئے تھے۔ اس طرح کہ جو معاہدے متعین وقت کے لیے تھے ان کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ وہ اپنے وقت تک رہیں گے اور جن کے اندر کوئی وقت متعین نہ تھا' ان کے معاہدین کو چار ماہ کا عرصہ دے دیا گیا۔ اور یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ اس کے بعد جزیرۃ العرب میں جہاں بھی کوئی مشرک پایا جائے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ جزیرۃ العرب اسلام کا مرکز تھا اور اسے صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کرنا ضروری تھا۔ جزیرۃ العرب کے اندر مشرکین ... تو اسلام قبول کرنا تھا یا ملک بدر ہونا تھا۔ اور یہ اصول دوسرے علاقوں کے لیے نہیں ہے' دوسرے اسلامی ممالک میں مشرکین بطور اقلیت جزیہ دے کر رہ سکتے ہیں۔

نیز گردنیں مارنے کا حکم بھی اس وقت ہے جب وہ اسلام قبول نہ کریں۔ گردنیں اڑانیں کا حکم قتل کی عملی صورت ہے اور یہ اس سورت کی فضا کے ساتھ مناسب لفظ ہے۔

حَتّٰی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْھُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (۴۷ : ۴) "یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو تب قیدیوں کو مضبوط باندھو"۔ اثخان کے معنی ہیں شدید قتل یعنی کچل دینا۔ یعنی دشمن کی قوت کو ختم کر کے رکھ دینا۔ قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا کہ آئندہ اس میں حملے کی طاقت نہ رہے۔ جب وہ اس پوزیشن میں چلا جائے تب قیدیوں کو گرفتار کرنا شروع کیا جائے۔ لیکن اگر دشمن کا سرکچلا نہ گیا ہو تو دشمن کو قید کرنا شروع نہ کیا جائے۔

اس تفسیر کے مطابق اس آیت اور انفال کی اس آیت کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو گا جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو سرزنش کی گئی تھی کہ انہوں نے غزوۂ بدر میں بہت سے لوگوں کو قیدی بنا لیا حالانکہ مناسب تھا کہ انہیں قتل کر دیا جاتا' جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے۔ سورہ انفال میں کہا گیا۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۶۷) لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۶۸) (۸ : ۶۷ ، ۶۸) "کسی نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کا فائدہ چاہتے ہو' حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے لکھا نہ جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی"۔

لہذا دشمن کی قوت کو کچلنا تو سب سے پہلے ہے تاکہ دشمن آئندہ اسلامی مملکت پر حملہ نہ کر سکے اور اس کے بعد قید کا معاملہ ہو گا۔ کیونکہ جنگ کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسلامی ریاست پر حملہ آور ہونے والی قوت کو ختم کر دیا جائے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ مسلمانوں کی قوت افرادی اعتبار سے کم ہو اور مشرکین تعداد میں زیادہ ہوں۔ اس دور کے جنگی حالات میں دشمن کے سپاہی کو ختم کر دینا جنگ کی حکمت عملی میں بہت ہی اہم تھا۔ اور یہی حکم اب بھی رہے گا اگر یہ مقصد

اس پر موقوف ہو کہ دشمن کی قوت کو کچلنا قتل شدید کے بغیر ممکن نہ ہو اور اس کے بغیر اسے دوبارہ سے روکا نہ جا سکتا ہو۔ اس کے بعد لوگوں کو قید کرنے کا حکم پھر یہ ہے اور یہ واحد نص ہے جو قیدیوں کے ضابطے کا تعین کرتی ہے۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) "اس کے بعد تمہیں اختیار ہے احسان کرو یا فدیے کا معاملہ کرو"۔ یعنی بعد میں جنگی قیدیوں کا مصرف یہ ہے کہ یا تو ان قیدیوں کو بطور احسان چھوڑ دو' یا فدیے کا معاملہ کرو یعنی مسلمان قیدیوں کے بدلے میں چھوڑ دو یا کوئی مالی تاوان جنگ لے کر چھوڑ دو' یا کوئی اور اجرت عمل لے لو۔ جیسا کہ بدر کے قیدیوں سے کچھ کام لیے گئے۔

اس آیت میں قیدیوں کے مصرف کے لیے کوئی تیسری صورت نہیں۔ یعنی قیدیوں کو قتل کرنا یا غلام بنانا یعنی مشرکین کے قیدیوں کے معاملے میں۔ لیکن اس کے بعد عملاً یوں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء نے بعض قیدیوں کو غلام بنایا اور بعض کو متعین حالات میں قتل کیا۔

میں اس آیت کی تشریح کے بارے میں امام جصاص حنفی کی تشریح نقل کرتا ہوں' درمیان میں جہاں مجھے کچھ کہنا ہے لکھوں گا اور اس کے بعد وہ مطلب بیان کروں گا جو میرے خیال میں درست ہے۔ جصاص کہتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ (۴۷ : ۴) "پس جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو گردنیں مارنا ہے"۔ آیت کا ظاہری مفہوم متقاضی ہے کہ کفار کے ساتھ کوئی دوسرا معاملہ تب جائز ہے جب ان کی قوت کو اچھی طرح کچل دیا جائے اور اس کے مماثل حکم دوسری جگہ ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (۸ : ۶۷) "نبی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں حتیٰ کہ وہ زمین میں دشمن کی قوت کو کچل دے"۔ (اور یہ بات درست ہے کیونکہ دونوں آیات کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے (قطب)۔

روایت بیان کی محمد ابن جعفر ابن محمد ابن حکم نے جعفر ابن محمد ابن یمان سے انہوں نے ابو عبید سے انہوں نے عبداللہ ابن صالح سے انہوں نے معاویہ ابن صالح سے انہوں نے علی ابن طلحہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس سے کہ آیت۔

مَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (۸ : ۶۷) یوم بدر کے بارے میں ہے۔ اس وقت مسلمان قلیل تھے۔ جب وہ زیادہ ہو گئے اور ان کی قوت زیادہ ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت نازل کی۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) اللہ نے نبی اور مسلمانوں کو اختیار دے دیا کہ اگر چاہیں تو قتل کر دیں' چاہیں تو غلام بنالیں' چاہیں تو فدیہ لے لیں۔ ابو عبید نے ان الفاظ میں شک کیا ہے (اگر چاہیں تو غلام بنالیں) (غلام بنانا چونکہ خود حضرت ابن عباس سے نقل ہونے میں بھی مشکوک ہے۔ اس لیے ہم اسے ترک کرتے ہیں۔ رہا

قتل کرنا تو اس آیت سے جواز قتل معلوم نہیں ہوتا کیونکہ آیت احسان کرنے یا فدیہ لے کر چھوڑ دینے کے بارے میں منصوص ہے۔

روایت کی ہے جعفر ابن محمد نے ابو سعید سے انہوں نے ابو مہدی اور حجاج سے ' دونوں نے سفیان سے وہ کہتے ہیں کہ میں نے سدی سے سنا کہ وہ اس آیت کی تفسیر یہ بیان کرتے تھے :

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) "اس کے بعد احسان کرو یا فدیہ کا معاملہ کرو"۔ کہ یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے اور اس کو سورہ توبہ کی آیت ۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (۹ : ۵) "مشرکین کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ" نے منسوخ کر دیا ہے ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ یہ آیت ۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ (۴۷ : ۴) اور آیت ۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ (۸ : ۶۷) اور آیت ۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِى الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ (۸ : ۵۷) (۱) یہ سب احکام ثابت اور موجود ہو سکتے ہیں اور منسوخ نہ ہوں گے ۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ مشرکین کو خوب قتل کرو اور قیدی نہ بناؤ ۔ الا یہ کہ وہ خوب ذلیل ہو جائیں اور ان کی قوت ٹوٹ جائے ۔ یہ اس وقت تھا جب مسلمانوں کی تعداد کم تھی ۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ یہ حکم قائم رہے اور ایسے حالات میں اس پر عمل کیا جائے جس طرح آغاز اسلام میں مسلمانوں کی حالت تھی ۔ (میرا خیال یہ ہے کہ مشرکین جہاں ملیں ان کو قتل کرو ۔ یہ حکم صرف جزیرۃ العرب کے مشرکین کے لیے تھا' جبکہ یہ آیت عام ہے ' یعنی آیت زیر بحث ۔ جب دشمن کی قوت کو کچل دیا جائے تو پھر قیدی بنانا جائز ہو گا ۔ اس پر خلفاء نے رسول اللہؐ کے بعد عمل کیا اور سورہ برات کے نزول کے بعد بھی عمل ہوا ۔ انہوں نے بعض مخصوص حالات کے سوا کسی قیدی کو قتل نہیں کیا ۔) رہی یہ آیت

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) "اس کے بعد احسان کرو یا فدیہ لو"۔ بظاہر عبارت کا مفہوم یہی ہے کہ دو میں سے ایک چیز کر سکتے ہو یعنی یا احسان کرو اور قیدیوں کو رہا کر دو اور یا پھر فدیہ لے کر چھوڑ دو ۔ اس سے قیدیوں کے قتل کے جواز کی نفی ہوتی ہے اور سلف صالحین کے درمیان اختلاف ہوا ہے ۔ روایت ہے حجاج ابن مبارک ابن فضالہ سے انہوں نے حسن سے روایت کی کہ انہوں نے قیدی کے قتل کو مکروہ سمجھا اور کہا کہ اس پر احسان کر دیا فدیہ کا معاملہ

---

(۱) "پس یہ لوگ اگر تمہیں لڑائی میں مل جائیں تو ان کی ایسی خبر لو کہ ان کے بعد دوسرے جو لوگ ایسی روش اختیار کرنے والے ہوں ان کے حواس باختہ ہو جائیں"۔

کرو۔ حدیث بیان کی جعفر نے ابوعبید سے انہوں نے ہیثم سے انہوں نے اشعث سے 'کہ میں نے عطا سے پوچھا قیدی کے قتل کا کیا مسئلہ ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ یا احسان کر کے چھوڑ دو یا فدیہ کا معاملہ کرو۔ یہی بات میں نے حسن سے پوچھی تو انہوں نے کہا اس کے ساتھ وہی معاملہ ہو گا جو حضورؐ نے بدر کے قیدیوں سے فرمایا کہ یا تو احسان کر کے چھوڑ دیا یا فدیہ لیا۔ حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ عظمائے اصطخر کا ایک رئیس قیدی ان کے حوالے کیا گیا کہ اسے قتل کر دیں' تو انہوں نے اسے قتل کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ آیت پڑھی۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) اسی طرح مجاہد اور محمد ابن سیرین سے بھی یہی روایت ہے کہ انہوں نے قیدیوں کے قتل کو ناپسند کیا۔ سدی سے یہ روایت آئی ہے کہ یہ آیت

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) منسوخ ہے فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (۹ : ۵) نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اسی قسم کی روایت ابن جریج سے بھی منقول ہے۔ روایت کی جعفر نے 'ابوعبید سے انہوں نے حجاج سے اور انہوں نے ابن جریج سے' انہوں نے کہا کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ حضورؐ نے عقبہ ابن ابومعیط کو بدر کے دن باندھ کر قتل کیا۔ نضر ابن حارث کو بھی بدر کے دن قتل کیا گیا۔ اور احد کے دن ابوعزہ شاعر۔ قید کیے جانے کے بعد قتل ہوا اور بنو قریظہ کو قتل کیا گیا جب وہ سعد ابن معاذ کے فیصلے پر ہتھیار ڈال کر اسیر ہو گئے تو سعد ابن معاذ نے فیصلہ دیا کہ ان کو قتل کر دیا جائے اور ان کی اولاد کو غلام بنا لیا جائے۔ ان میں سے صرف زبیر ابن باطا پر احسان کیا گیا اور خیبر کا بعض علاقہ تو مصالحت سے فتح ہوا اور بعض علاقہ بزور شمشیر فتح ہوا اور ابوالحقیق کے ساتھ یہ شرط طے ہوئی کہ کچھ چھپائے گا نہیں۔ جب اس کی خیانت ظاہر ہو گئی کہ اس نے چھپایا ہے تو اسے قتل کر دیا گیا۔

حضورؐ نے مکہ کو فتح کیا اور حکم دیا کہ بلال ابن خطل 'مقیس ابن حبابہ اور عبداللہ ابن ابوالسرح اور دوسروں کو قتل کر دیا جائے۔ آپ نے فرمایا: "یہ اگر کعبہ کے پردوں کے ساتھ بھی لٹک رہے ہوں تو انہیں قتل کرو"۔ اہل مکہ پر احسان کیا۔ ان کے اموال کو مال غنیمت نہ بنایا۔ صالح ابن کیسان سے روایت ہے انہوں نے محمد ابن عبدالرحمٰن سے 'انہوں نے اپنے والد عبدالرحمٰن ابن عوف سے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر الصدیق کو یہ کہتے سنا: "کاش فجاءۃ جب میرے پاس لایا گیا تو میں اسے نہ جلاتا یا تو اسے آزادانہ قتل کر دیتا یا اسے کامیابی سے رہا کرتا" ابو موسیٰ نے السوس کے ایک زمیندار کو پناہ دینے کے بعد قتل کر دیا۔ ہوا یوں کہ اسے امان دے دی گئی کہ فلاں فلاں لوگوں کو قتل نہ کیا جائے گا لیکن اس معاہدے میں وہ اپنا نام لکھنا بھول گیا۔ یوں وہ قتل ہو گیا۔ یہ احادیث و آثار ہیں جو حضور اکرمؐ سے اور صحابہ سے تواتر کے ساتھ آئے ہیں کہ قیدیوں کو رکھا بھی جا سکتا ہے اور قتل بھی کیا جا سکتا ہے اور اس پر بڑے شہروں کے فقہاء کا اتفاق ہے۔ (اس قتل کا جواز آیت سے نہیں لیا جاتا' صرف رسول اللہؐ کے عمل اور بعض صحابہ کے عمل سے لیا جاتا ہے۔ لیکن جن حالات میں قیدیوں کو قتل کیا گیا ہے' ان کا مفصل مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ قتل ہوئے' ان کے قتل کی مخصوص وجوہات تھیں۔ یہ وجوہات جنگ اور قیدی بن جانے کے علاوہ تھیں۔ نضر ابن حارث اور عقبہ ابن ابومعیط مکہ میں حضور اکرمؐ کی ہجو کرتے تھے۔ اور آپ کو اور دعوت اسلامی کے حاملین کو اذیت دیتے تھے۔ یہی مسئلہ ابوعزہ شاعر کا تھا۔ بنو قریظہ نے تو حضرت سعد ابن معاذ کا فیصلہ پیشگی قبول کر لیا تھا۔ غرض تمام حالات میں متعین اسباب نظر آتے

ہیں۔ اس لیے ان حالات میں اس آیت سے ہٹ کر عمل کیا گیا۔ یعنی آیت من اور فداء سے)۔

اور قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنے میں بھی اختلاف ہوا۔ ہمارے ساتھیوں (احناف) سب کی رائے یہ ہے کہ قیدیوں کو مال کے بدلے نہ چھوڑا جائے گا اور نہ ہی قیدی غلاموں کو دارالحرب میں کسی کے ہاتھ فروخت کیا جائے گا کہ وہ دوبارہ اسلام کے خلاف جنگ کریں۔ امام ابوحنیفہ کی رائے تو یہ ہے کہ ایسے قیدیوں کو مسلمان قیدیوں کے بدلے بھی رہا نہ کیا جائے تاکہ وہ اسلام کے خلاف کبھی جنگ نہ کر سکیں۔ امام یوسف اور محمد فرماتے ہیں کہ مسلمان قیدیوں سے مشرکین قیدیوں کا تبادلہ ہو سکتا ہے۔ امام ثوری' امام اوزاعی کا بھی یہی قول ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے کہ عورتوں اور بچوں کو بھی اہل دارالحرب کے ہاتھوں فروخت کیا جا سکتا ہے۔ ہاں غلام مردوں کو فروخت نہ کیا جائے گا۔ امام مزنی نے امام شافعی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ بطور احسان چھوڑ دے یا فدیہ کے بدلے چھوڑ دے۔ جو لوگ مال یا مسلمان قیدیوں کے بدلے کافر قیدیوں کی رہائی کے جواز کے قائل نہیں ان کی دلیل یہ ہے۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴۷ : ۴) آیت کے ظاہری الفاظ یہی مفہوم دیتے ہیں کہ مال کے بدلے یا مسلم قیدیوں کے بدلے رہائی جائز ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدریوں کو مال کے بدلے رہا فرمایا۔ اور مال کے بدلے رہائی پر دلیل اس حدیث سے دی جاتی ہے جو ابن مبارک نے معمر سے روایت کی ہے' انہوں نے ایوب سے' انہوں نے ابوقلابہ سے' انہوں نے ابوالمہلب سے' اور انہوں نے حضرت عمران ابن حصین سے کہ قبیلہ ثقیف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ساتھیوں کو قید کر لیا تھا۔ اور مسلمانوں نے ...... بنی عامر ابن صعصعہ قبیلے سے ایک شخص کو قید کر لیا تھا۔ اس قیدی کے پاس سے حضورؐ گزرے۔ یہ بندھا ہوا تھا۔ اس نے حضورؐ کو پکارا کہ میرا قصور کیا ہے حضورؐ نے فرمایا تمہارے ساتھیوں کے جرم کی وجہ سے تم پکڑے گئے ہو۔ قیدی نے کہا کہ میں تو مسلم ہوں یہ سن کر آپؐ نے فرمایا اگر یہ بات تم اس وقت کہتے جب آزاد تھے تو تم پوری طرح کامیاب ہوتے۔ اس کے بعد حضورؐ چلے گئے۔ اس نے دوبارہ پکارا۔ حضورؐ متوجہ ہوئے۔ اس نے کہا میں بھوکا ہوں۔ تو حضورؐ نے فرمایا ہاں یہ تمہاری ضرورت ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے اس کو ان دو مسلمانوں کے بدلے رہا کر دیا۔ جن کو ثقیف نے قید کر لیا تھا۔ (ہمارے خیال میں جو لوگ فدیہ کے طور پر قیدیوں کو رہا کرنے کے قائل ہیں ان کے دلائل مضبوط ہیں' بمقابلہ ان دلائل کے جو امام جصاص نے فدیہ بالمال یا مسلمان قیدیوں کے تبادلہ کے خلاف دیئے ہیں

امام جصاص نے حنفیہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے بات ختم کی ہے۔ یہ کہ آیت زیر بحث میں احسان اور فدیے کا ذکر ہے تو یہ آیت درج ذیل آیت سے منسوخ ہے۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (۹ : ۵)

"مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ' اور انہیں پکڑو' اور گھیرو' اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو' پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو"۔ اور یہی روایات ہم نے سدی' ابن جریج سے نقل کی ہیں۔ اور اللہ

کا قول۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (۹ : ۲۹) "جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا۔ اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں"۔

دونوں آیات کا حکم یہ ہے کہ کفار سے جنگ کرو' یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اور مالی اور غیر مالی فدیہ اس کے منافی ہے۔ اہل تفسیر اور تابعین آثار اس بات پر متفق ہیں کہ سورہ توبہ سورہ محمد کے بعد نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا سورہ توبہ کا حکم اس حکم کا ناسخ ہو گا جو سورۂ محمد میں ہے۔ (اس سے قبل ہم کہہ چکے ہیں کہ مشرکین قتل ہوں گے یا اسلام لائیں گے یہ حکم صرف مشرکین مکہ کا ہے۔ یہ ان کے ساتھ مخصوص حکم ہے۔ رہے غیر مشرکین عرب تو ان سے جزیہ قبول کرنا بھی جائز ہے۔ جس طرح اہل کتاب سے' اور جزیہ قبول کرنے سے پہلے یہ لوگ مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہو سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب جزیہ قبول کرنے سے پہلے قید ہو سکتے ہیں تو ان قیدیوں کے احکام کیا ہوں گے؟ ہم کہتے ہیں ان پر امام احسان بھی کر سکتا ہے' فدیہ مال بھی لے سکتا ہے اور قیدیوں کے ساتھ تبادلہ بھی ہو سکتا ہے' اگر ان کی قوم بدستور قوی ہو اور وہ جزیہ تسلیم نہ کرے' اگر جزیہ قبول کر لیں تو پھر وہ رہا ہوں گے۔ یہ تو دوسری حالت ہے۔ لہٰذا جب تک کفار جزیہ تسلیم نہیں کرتے' اس وقت تک آیت زیر بحث کا حکم جاری رہے گا)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ واحد قرآنی آیت ہے جو قیدیوں کا حکم بتاتی ہے۔ اور دوسری آیت کا تعلق اس موضوع سے نہیں ہے۔ لہٰذا قیدیوں کے مسئلے میں اصل ماخذ قانون یہی آیت تصور ہوگی اور اس کے خلاف جو واقعات ہوئے ہیں وہ مخصوص حالات میں ہوئے' جو وقتی حالات تھے۔ بعض قیدیوں کو ان کے دیگر انفرادی جرائم کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ اور اس قسم کی صورت پیش آنے کے آئندہ بھی امکانات ہو سکتے ہیں۔ ان کو ان اعمال اور جرائم کی وجہ سے پکڑا گیا تھا جو قید سے بھی پہلے کے تھے۔ محض بر سرپیکار ہونے اور قیدی ہونے کی وجہ سے نہیں۔ مثلاً کوئی شخص جاسوسی میں پکڑا جاتا ہے تو وہ جنگی قیدی تصور نہ ہو گا' جاسوس تصور ہو گا۔ یہ قید تو مجرم کو قبضے میں رکھنے کے لیے ہے۔

رہا قیدی کو غلام بنانے کا مسئلہ تو وہ اس وقت ایک عالمی مسئلہ تھا۔ اس کے بارے میں ہم نے ظلال القرآن میں بارہا بحث کی ہے۔ یہ اس وقت کی ایک عام جنگی حکمت عملی تھی۔ اس لیے اسلام اس وقت ہر حالت میں یک طرفہ طور پر اس پر عمل نہ کر سکتا تھا۔ یعنی فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (۴۷ : ۴) پر۔ جبکہ اسلام کے دشمن مسلمانوں کو قید کر کے غلام بنا رہے تھے۔ اس لیے حضورؐ نے بعض حالات میں جنگی قیدیوں کو غلام بنایا' بعض حالات میں احسان کر کے قیدیوں کو چھوڑ دیا' بعض کو فدیہ میں تبادلہ کر دیا۔ بعض سے مالی تاوان وصول کیا اور بعض حالات میں جنگی قیدیوں کو غلام بھی بنایا گیا کیونکہ یہ فیصلے اور اقدامات اس وقت کے بین الاقوامی قانون کے مطابق ہوتے تھے اور ضروری تھے۔

اگر کہیں ایسا ہو گیا (اور ہمارے دور میں ہو گیا ہے) کہ تمام بین الاقوامی قوتوں نے قیدیوں کو غلام نہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تو اس وقت اسلام بھی اس مثبت قاعدے کی طرف رجوع کرے گا اور وہ یہ ہے۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (٤٧ : ٤) کہ یا بطور احسان قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے یا بطور فدیہ تاکہ وہ حالات ختم کر دیئے جائیں جن میں قیدیوں کو غلام بنایا جاتا تھا کیونکہ اسلام میں غلامی کا ادارہ ضروری نہیں ہے اور نہ کوئی بنیادی اصول ہے۔

یہ وہ رائے ہے جو نص قرآنی سے قطعی طور پر معلوم ہوتی ہے اور ان تمام حالات اور واقعات سے بھی یہی معلوم ہوتی ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں نمودار ہوئے۔ اور صحیح رائے وہی ہوتی ہے جس کی طرف اللہ کسی کو توفیق دے۔ لیکن یہ بات ذہن میں اچھی طرح رکھنا چاہئے کہ نصوص قرآنی سے یہ رائے بادی النظر میں ثابت ہوتی ہے اور قرون اولیٰ میں جو واقعات پیش آئے اور جو حالات تھے ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے' یہ بات نہیں ہے کہ اسلام پر ادارۂ غلامی کو جائز رکھنے کا کسی نے الزام لگایا ہے اور میں اس کی نفی کرتا ہوں اور اسلام کا دفاع کرتا ہوں۔ میں اس قسم کے دفاع کا قائل نہیں ہوں۔ اگر میرا خیال یہ ہوتا کہ اسلام غلامی کو جائز سمجھتا ہے تو میں اعلان کر دیتا کہ یہ درست ہے اور انسانیت کی بھلائی اسی میں ہے کہ غلامی کے ادارے کو جائز رکھا جائے اور کوئی انسان جو انسان ہو اور اس کے اندر اسلامی آداب کا ذرا سا شعور بھی ہو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے لیکن میری رائے یہ ہے۔ اور میری رائے قرآن سے زیادہ معقول ہے۔

یہ قوانین و ہدایات یعنی قتال' گردنیں اڑانا' سختی سے قیدیوں کو باندھنا' اور قیدیوں کے لیے یہ اصول' اس وقت تک ہیں۔

حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (٤٧ : ٤) "تاآنکہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے"۔ اور اسلام اور اس کے دشمنوں کے درمیان جنگ ختم ہو جائے۔ یہ کلی قاعدہ ہے اور جہاد قیامت تک کے لیے چلنے والا ادارہ ہے۔ جس طرح رسول اللہ نے فرمایا:

حَتّٰى تَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا جب تک اللہ کا کلمہ بلند نہیں ہو جاتا۔

---ooo---

اللہ نے یہ جہاد اس لیے نہیں فرض کیا کہ وہ لوگوں سے کافروں کے مقابلے میں کوئی مدد لینا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کفار کو تو براہ راست ہی ختم کر سکتا ہے۔ یہ نظام تو اس لیے تجویز ہوا ہے کہ اللہ اپنے بعض بندوں کو دوسروں کے مقابلے میں آزمانا چاہتا ہے۔ اس آزمائش ہی پر ان کے درجات کا آخرت میں فیصلہ ہو گا۔

ذٰلِكَ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ (٤) سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (٥) وَيُدْخِلُهُمْ

الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (۷ ٤ : ٦) ”یہ ہے تمہارے کرنے کا کام۔ اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا‘ مگر (یہ طریقہ اس نے اس لیے اختیار کیا ہے) تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے۔ اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا‘ ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے“۔

یہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکا‘ اس قسم کے لوگ ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں‘ خدا کے دین کے باغی‘ سرکش اور مفسدین جو ظلم اور تکبر کے جامہ میں سامنے آتے ہیں اور اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو بہت قوت والے دکھاتے ہیں۔ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں اور یہ لوگ اس چھوٹے سے ذرے کے اوپر رہتے ہیں جسے عرف عام میں زمین کہا جاتا ہے۔ جو اس کائنات کے عظیم کروں‘ دیو ہیکل اجسام‘ ستاروں اور سیاروں کے درمیان فی الواقع ایک ذرہ ہی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے جہاں بے شمار کہکشاں اور بلیک ہول ہیں جن کی تعداد صرف اللہ ہی جانتا ہے اور جو اس وسیع اور ہولناک کائنات میں تیرتے پھرتے ہیں اور بکھرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ زمین ایک ذرہ ایک چھوٹا سا رائی کا دانہ ہی تو ہے۔ ان تمام جہانوں کے اندر یہ ہولناک نظم و نسق اور جمع و تفریق صرف اللہ نے قائم کر رکھی ہے۔ اس لیے قوتوں کا مالک تو اللہ ہی ہے۔

دنیا کے یہ ڈکٹیٹر اور ان کے متبعین بلکہ یہ پوری زمین اور اس کی پوری آبادی‘ اس کائنات کی نسبت میں اس طرح ہیں جس طرح اہل زمین کی نسبت نہایت ہی چھوٹے قسم کی چیونٹیوں کا دس بارہ ارب کا چھتا بلکہ یہ نسبت اگر تناسب کے حسابی قاعدے سے ظاہر کی جائے تو (زمین : کائنات = زمین : ذرہ) بھی نہیں ہے۔ پوری زمین اور اس کی آبادی کائنات کے مقابلے میں ذرے سے بھی کم ہے۔ اور اللہ کی قوتیں تو کائنات سے بھی وسیع ہیں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ!

اللہ تعالیٰ مومنین کو حکم دیتا ہے کہ ان دشمنان اسلام کی گردنیں اڑاؤ اور اچھی طرح کچل کر ان کو خوب باندھو۔ یہ احکام اس لیے دیئے گئے ہیں کہ مومنین دست قدرت کے لیے آلہ بن جائیں۔ اگر اللہ چاہتا تو براہ راست اور علانیہ کافروں سے انتقام لے لیتا۔ جس طرح اللہ نے بعض اقوام کو طوفان‘ کڑک دار آواز اور نیست و نابود کر دینے والی ہواؤں وغیرہ کے ذریعہ تباہ کیا‘ بلکہ اللہ تو کن فیکون کے ذریعہ بغیر ان اسباب کے بھی انتقام لے سکتا ہے۔ لیکن اللہ اپنے مومن بندوں کے لیے بہتری چاہتا ہے۔ ان کو آزماتا ہے۔ ان کو تربیت دیتا ہے۔ ان کی اصلاح کرتا ہے۔ اور ان کے لیے نیکیوں کے اسباب فراہم کرتا ہے۔

اللہ مومنین کو آزماتا ہے اور اس آزمائش میں مومنوں کے قلوب میں بہترین جذبات کو ابھارتا ہے اور اس سے اچھا جذبہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ کسی انسان کے لیے وہ عقیدہ اس کی جان سے عزیز ہو جائے جس پہ وہ ایمان لایا ہے۔ اور انسان اپنے اس عزیز عقیدے کے لیے جہاد کرے‘ مارے اور مارا جائے۔ اور اس کی حالت یہ ہو کہ وہ دین کے معاملے میں کوئی مسالمت اور رواداری نہ کرے۔ دین کے بغیر زندہ نہ رہ سکے اور اس دین کے سوا کسی اور طریقے کے مطابق زندگی نہ گزار سکے۔

اور اللہ تعالیٰ مومنین کی تربیت یوں فرماتا ہے کہ ان کے دلوں سے اس فانی دنیا کی تمام خواہشات اور تمام رغبتیں نکال دیتا ہے‘ حالانکہ انسان کے لیے ایسی خواہشات کو دل سے نکال دینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے دلوں سے کمزوری دور ہو جاتی ہے‘ نقص کمال میں بدل جاتا ہے۔ ہر قسم کا کھوٹ نکل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان کی تمام

خواہشات ترازو کے ایک پلڑے میں ہوں اور دوسرے پلڑے میں صرف دعوت جہاد ہو اور اللہ کی رضامندی کی طلب ہو تو اللہ کی رضامندی اور جہاد کا پلڑا بھاری نکلتا ہے۔ اللہ اس بات کو ظاہر کر دیتا ہے کہ ان نفوس کو اختیار دیا گیا تو انہوں نے دین کو اختیار کیا' ان کو تربیت دی گئی تو انہوں نے حق کو جان لیا' وہ بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم نہیں اٹھاتے بلکہ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔

اور اللہ مومنین کی اصلاح کرنا چاہتا ہے' جہاد فی سبیل اللہ اللہ کی تکالیف اور موت سے بار بار آنکھیں ملانے کی وجہ سے ان کے ذہن سے موت کا خوف ہی دور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ موت کا ڈر لوگ اپنے نفوس سے اور اپنے اخلاق اور اپنی اقدار سے بڑے تکلفات کے بعد نکالتے ہیں اور بڑی مشقیں اٹھا کر وہ اپنے دل سے موت کا ڈر نکالتے ہیں لیکن جو شخص' مجاہد فی سبیل اللہ ہو وہ ہروقت موت سے آنکھیں ملاتا رہتا ہے اور وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ موت سے دوچار ہو گیا یا بچ گیا۔ اور اللہ کی راہ میں مرنے کی ہر بار فکر کرنا' ارادہ کرنا' خصوصاً شدید خطرات کے لمحات میں انسانی جسم کے اندر بجلی کی ایک لہر دوڑا دیتا ہے اور جو شخص ایسے مراحل سے بچ کر نکل آئے تو وہ بالکل ایک جدید روح اور پاک و صاف شخصیت لے کر آتا ہے۔ جہاد میں شریک ہونے والے شخص یعنی غازی کی شخصیت ہی نرالی ہوتی ہے۔

پھر یہ جہاد پوری انسانی جماعت کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ جب انسانوں کی قیادت ان مجاہدین کے ہاتھ آجاتی ہے جن کے نفوس تمام دنیاوی آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک ہوتے ہیں۔ اور جن کی نظروں میں دنیا کی سب چمک دار چیزیں ہیچ ہوتی ہیں بلکہ خود دنیا کی اس پوری زندگی کو بھی وہ حقیر سمجھتے ہیں جبکہ وہ موت کے کنوؤں میں کود جاتے ہیں۔ اور دنیا کی کوئی چیز بھی' کوئی دل فریبی بھی ان کی نظروں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی اور وہ صرف رضائے الہی کے طالب ہوتے ہیں۔ جب دنیا کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو' تو لوگوں کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے اور دنیا کی بھی۔ اور شر و فساد ختم ہو کر دنیا امن و امان کے دامن میں پناہ لیتی ہے' اس لیے کہ انہوں نے یہ بلند مقاصد اپنے خون کی قیمت پر حاصل کیے ہیں اور یہ ذاتی مفادات کے لیے نہیں بلکہ رضائے الہی کے لیے حاصل کیے ہیں۔

پھر یہ اللہ کی توفیق اور سہولت ہوتی ہے' جسے وہ جس خوش قسمت کو چاہے' مہیا کر دیتا ہے تاکہ وہ اللہ کی رحمتوں کو بغیر حساب کے لپیٹے۔ اور جو ازلی بدبخت ہوتے ہیں ان کو بھی اللہ کی طرف سے ایک راہ میسر ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں انہیں اللہ کا غضب اور عذاب ملتا ہے' ہرکسے را بہرکارے ساختند' اور جس نیک بخت کو یہ حصہ مل گیا اور اللہ اسی کو دیتا ہے جس کا اندرون اس کے لیے تیار ہو۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں مرنے مارنے والوں کا انجام کیا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۴) "جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے' اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔

سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ (۴۷ : ۵) وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (۴۷ : ۶)

"وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا ان کا حال درست کرے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے"۔ ان کے اعمال ضائع نہ کرے گا۔ یہ اس بات کے بالمقابل ہے جو کفار کے معاملے میں کہی گئی کہ ان کے اعمال ضائع ہوں گے۔ اس لیے کہ مومنین کے اعمال مضبوط اور اصلی درخت سے جڑے ہوئے ہیں اور یہ درخت ہے

سچائی کا درخت - یہ اعمال اس حق اور سچائی سے صادر ہوتے ہیں - یہ اعمال حق کی حمایت میں ہوتے ہیں - حق کی سمت میں ہوتے ہیں - اس لیے یہ باقی ہوتے ہیں اور دوام کی صفت رکھتے ہیں کیونکہ حق لازوال ہے -

شہداء کی حقیقت قابل غور ہے - اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے دوسری جگہ میں فیصلہ دے دیا ہے -

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ "اور جو اللہ کے راستے میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں" - لیکن یہاں ان کو ایک دوسرے پہلو سے پیش کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جس راستے میں متاع حیات قربان کی اس راستے میں وہ مسلسل آگے ہی بڑھ رہے ہیں - وہ ہدایت خلوص 'صفائی اور اطاعت کی راہ ہے -

سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ (۷ ٤ : ٥) "اللہ ان کی رہنمائی فرمائے گا اور ان کا حال درست کر دے گا" - وہ اپنے رب اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں' وہ اب بھی ان کی رہنمائی کر رہا ہے - یعنی شہادت کے بعد بھی وہ درجات عالیہ طے کر رہے ہیں اور ان کے حالات درست کیے جا رہے ہیں اور ان کی روح زمین کی آلودگیوں سے پاک ہو رہی ہے - ان کو ملاء اعلیٰ میں جو مقام حاصل ہے' اس مقام کی مناسبت سے ان کو مزید تربیت دی جا رہی ہے - اور وہ صاف و شفاف بنائے جا رہے ہیں - یہ ایک مسلسل زندگی ہے - صرف اہل زمین کی نظروں میں یہ منقطع ہو گئی ہے - اہل زمین شہادت کے درجات کو دیکھ نہیں پاتے اس زاویے سے اندھے ہیں 'جب کہ یہ شہداء حضرات عالم بالا میں بدستور درجات بلند کے مدارج طے کر رہے ہیں - ہدایت' صفائی' اشراق اور شفافی میں مزید انوار ربی حاصل کر رہے ہیں .... اور سب سے آخر میں!

وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (۷ ٤ : ٦) "وہ ان کو اس جنت میں داخل کر دے گا جس سے وہ ان کو واقف کر چکا ہے" - احادیث میں شہداء کے بارے میں آتا ہے کہ ان کو جنت میں ان کی جائے قیام دکھائی جاتی ہے - امام احمد نے روایت فرمائی ہے - زید ابن نمر دمشقی سے انہوں نے ابو ثوبان سے' انہوں نے اپنے والد ثوبان سے انہوں نے مکحول سے انہوں نے کثیر ابن مرہ سے انہوں نے قیس جذامی سے اور انہوں نے ایک ایسے شخص سے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت حاصل تھی وہ فرماتے ہیں کہ آپ ؐ نے فرمایا : شہید کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی اسے چھ درجات حاصل ہو جاتے ہیں' اس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں' وہ دیکھ لیتا ہے کہ جنت میں اس کی جائے قیام کیا ہے' خوبصورت آنکھوں والی حوریں اس کے نکاح میں دے دی جاتی ہیں - وہ قیامت کے عظیم خوف سے محفوظ ہو گا - عذاب قبر سے مامون ہو گا - اور اسے ایمان کا جامہ پہنایا جائے گا - یہ حدیث صرف امام احمد نے نقل کی ہے -

ایک دوسری حدیث اسی مفہوم کی بھی مروی ہے - اس میں بھی تصریح ہے کہ شہید اپنی جائے قیام کو پہلے ہی دیکھ لے گا (ترمذی) - یہ ہے اہل جنت کے لیے ان کی جائے قیام کی معرفت اور یہی ان کے لیے رہنمائی ہے اور یہی ان کا اصلاح حال ہے - اس جہاں کو چھوڑ کر وہ نہایت ہی بلند زندگی گزارتے ہیں -

--- ooo ---

جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کے اس اعزاز' ان سے اللہ کی رضامندی' ان کی اس نگہبانی اور بلند مقامات کی اس فضا میں اہل ایمان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ کے لیے یکسو ہو جائیں اور اسلامی نظام کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ ان سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ وہ تمہاری مدد کرے گا اور اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں کے لیے تو ہلاکت ہی مقدر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (٧) وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (٨) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (٩) (٤٧ : ٧ تا ٩) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے' تو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے' لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے"۔

مومن اللہ کی مدد کس طرح کرتے ہیں؟ تاکہ وہ اپنی شرط پوری کر دیں اور اللہ جواب میں ان کی نصرت کرے اور ان کو ثابت قدم کر دے۔ اللہ کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے لیے مخلص ہو جائیں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں' نہ ظاہری شرک اور نہ خفی شرک۔ اور وہ اللہ کے مقابلے میں کسی شخص پر اور کسی شے پر بھروسہ نہ کریں اور اللہ ان کے لیے ان کی ذات اور تمام محبوب چیزوں سے محبوب ہو جائے اور انسان کی خواہشات' میلانات' مرغوبات' اس کی حرکات و سکنات' اس کے خلجانات اور اس کی تمام سرگرمیوں میں اللہ حاکم ہو جائے۔ یہ ہے نفوس انسانی کی طرف سے اللہ کی نصرت۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسانی زندگی کے لیے ایک شریعت اور نظام زندگی تجویز کیا ہے اور یہ نظام اس زندگی اور اس کائنات کے لیے ایک خاص تصور پر تشکیل پایا ہے۔ اللہ کی نصرت یوں ہوتی ہے کہ اس کے نظام کی نصرت کی جائے اور پوری زندگی میں انسان اس نظام کو نافذ کر دے۔ یہ ہے اللہ کی نصرت ہماری حقیقی زندگی میں۔

یہاں دو فقرے بہت ہی اہم ہیں' ان پر غور ضروری ہے۔

وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ "جو اللہ کے راستے میں قتل ہوئے"۔ دوسرا یہ کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ "اگر تم اللہ کی مدد کرو"۔ ان دونوں حالات میں' یعنی قتل ہونے میں اور نصرت میں یہ ضروری ہے کہ یہ اللہ کی راہ میں ہو۔ یہ ایک نہایت ہی واضح قابل توجہ نکتہ ہے لیکن جب کسی نظریہ پر صدیاں گزر جاتی ہیں تو اس کی اصل صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ لوگ شہادت اور جہاد کے الفاظ تو بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں لیکن ان کا حقیقی مفہوم اور شرائط ان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔

کوئی جہاد نہیں ہے' کوئی جنت نہیں ہے' کوئی شہادت نہیں ہے۔ مگر صرف اس وقت کہ وہ صرف اللہ کے لیے ہو۔ اللہ کی راہ میں ہو۔ صرف اللہ کے لیے رکا ہو' اللہ کے نظام کی مدد کے لیے مرتا ہو' اور اس نظام کو اپنی ذات اور اپنے مناہج حیات میں نافذ کرتا ہو۔

کوئی جہاد' کوئی شہادت اور کوئی جنت نہیں' الا یہ کہ یہ سب کچھ اللہ کا کلمہ بلند کرنے سے ہو اور اس لیے ہو کہ اللہ کا نظام لوگوں کی زندگیوں میں غالب ہو۔ ان کے اخلاق و طرز عمل میں نافذ ہو' ان کے احوال اور قوانین اور دستور

میں نافذ ہو۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نمائش شجاعت کے لیے لڑتا ہے' یا حمیت جاہلیہ کے لیے لڑتا ہے یا ریا کاری کے لیے لڑتا ہے ۔کیا یہ فی سبیل اللہ ہیں ۔تو حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے جنگ کی محض اس لیے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو صرف وہ فی سبیل اللہ ہے" (شیخین و ترمذی اور نسائی)۔

اسلامی جہاد کا نہ کوئی اور جھنڈا ہے' نہ کوئی اور مقصد ہے ۔اللہ کے لیے جو لڑتا ہے وہ بس اللہ ہی کے لیے لڑتا ہے ۔اس لیے جو شہید ہوتا ہے' وہ وہی ہے جو اسی کے لیے شہید ہوتا ہے ۔صرف ایسے شہداء کے لیے جنت کا وعدہ ہے ۔صرف یہی جھنڈا اور یہی مقصد مقبول ہے ۔وہ نہیں جو صدیاں گزر جانے کے بعد کوئی نئے جھنڈے بن گئے' کچھ نئے مقاصد سامنے آگئے اور کچھ نئے نام رکھ لیے گئے!

داعیان حق کو اس واضح بات کو سمجھ لینا چاہئے اور ہمارے معاشروں کے اندر جہاد و قتال کے تصور میں جو انحراف واقع ہو گیا ہے اس کا خیال رکھنا اور اسے درست کرنا چاہئے ۔نئے بتوں اور ان کے نئے جھنڈوں کے لیے بھی جہاد کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔اس لئے وہ اپنے عقیدے اور جہاد کے مفہوم کو واضح اور شفاف رکھیں۔

میں دوبارہ کہتا ہوں کہ جہاد صرف وہی ہے جو اللہ کے کلمے کے بلند کرنے کے لیے ہو۔انسانی نفس میں کلمے کی بلندی' انسانی ضمیر میں اس کلمے کی بلندی اخلاق اور طرز عمل میں اس کلمے کی بلندی' نظم مملکت اور اداروں میں کلمے کی بلندی' تعلقات اور روابط میں اللہ کے کلمے کی بلندی اور زندگی کے ہر موڑ اور ہر رخ میں کلمتہ اللہ کی بلندی اور سربلندی ۔اس کے سوا جو نعرہ ہے وہ اللہ نہیں ہے' وہ شیطان کے لیے ہے ۔اس کے سوا کسی مقصد کے لیے نہ شہادت ہے' نہ جنت ہے' نہ اللہ کی نصرت ہے' نہ ثابت قدمی ہے ۔محض دھوکہ اور فریب ہے ۔بچئے دور جدید کی بت گری سے اور آزری سے ۔

اگر دوسرے لوگوں کے لیے جو داعی الی اللہ نہیں اس قسم کا صاف ستھرا تصور جہاد و قتال مشکل ہے' تو داعیان حق کو تو اپنے خیالات اور اپنا شعور' ان غلط تصورات سے صاف کرنا چاہئے ۔داعیان اسلام کو تو دور جدید کے نعروں سے دور رہنا چاہئے جو بد اینہ فی سبیل اللہ نہیں ہیں۔

... تو یہ تو اللہ کی طرف سے ایک شرط ہے اپنے بندوں پر' جسے اللہ کی جانب سے لازم کیا ہے' تو اس کے مقابلے میں اللہ نے اب... پر یہ لازم کیا ہے کہ وہ ایسے بندوں کی مدد کرے گا ۔وہ ان کے قدم مضبوط کر دے گا ۔یہ اللہ کا وعدہ ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتا ۔اگر کچھ عرصے کے لیے بظاہر نصرت خداوندی آتی ہوئی نظر نہ آئے تو اس کے بھی کچھ دوسرے اسباب ہوتے ہیں ۔نصرت اور قدم جمانے سے قبل ان کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے ۔(مزید دیکھئے تفسیر اِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ (سورہ حج کی تشریح) یہ اللہ نے فیصلہ کرنا ہے کہ آیا اس کے بندوں نے شرط پوری کر دی ہے یا نہیں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ ہم جواب شرط کے کلمات پر بھی غور کرلیں ۔يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ "وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا"۔سب سے پہلے تو انسان کی سوچ ادھر جاتی ہے کہ نصرت سے پہلے ہی قدم جما دیئے جاتے ہیں ۔اور قدم جمانے کے بعد ہی نصرت آتی ہے اور یہ صحیح بھی ہے ۔لیکن یہاں نصرت آنے کے بعد قدم جمانے میں ایک دوسری حالت اور ایک دوسرے مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہے ۔یعنی جب اللہ کی نصرت آجائے اور مومنین غالب ہو جائیں تو اس کے بعد قدم جمانا مطلوب ہے ۔اور یہ بہت ہی مشکل کام ہے ۔کفر و ایمان کا معرکہ اللہ کی

نصرت اور فتح آجانے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا۔ حق و باطل کی کشمکش پھر بھی جاری رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذات اور عملی زندگی میں نصرت کی الگ ذمہ داریاں ہیں۔ کبرو غرور سے اجتناب' سستی اور وھن (کمزوری) سے اجتناب بہت سے لوگ مشکلات برداشت کرتے ہیں لیکن نصرت اور فتح کے بعد کم لوگ قدم جما سکتے ہیں۔ اور یہاں شاید اسی کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم!

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَتَعۡسًا لَّہُمۡ وَ اَضَلَّ اَعۡمَالَہُمۡ (۴۷ : ۸) "وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے' تو ان کے لیے ہلاکت ہے' اور اللہ نے ان کے اعمال کو بھٹکا دیا ہے"۔ یہ نصرت اور ثابت قدمی کے بالکل متضاد حالت ہے۔ اللہ کی طرف سے بدبختی کی دعا دراصل اعلان ہلاکت ہے' اور ناکامی اور نامرادی کا اعلان ہے اور اعمال کے ضائع ہونے کا مطلب ہے' ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَرِہُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَہُمۡ (۴۷ : ۹) "کیونکہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ نے نازل کیا ہے۔ لہذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے"۔ اس سے اس بات کی بہت اچھی تصویر کشی ہوتی ہے کہ ان کے دلوں میں قرآن کریم کے بارے میں کس قدر کراہت ہے۔ اور اللہ کی شریعت اور نظام کو وہ کس قدر ناپسند کرتے ہیں اور یہی کراہت ہی ان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ کفر کریں' مسلمانوں سے دشمنی رکھیں اور جنگ و جدال اور تنازعات رکھیں۔ ۔ ۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگوں کی اسلام کے بارے میں ذہنی حالت یہی ہوتی ہے۔ وہ اسلام کو نہایت ہی مکروہ سمجھتے ہیں اور اس سے متصادم ہوتے ہیں اگرچہ یہ بہترین اور مستحکم نظام ہے' لیکن ان لوگوں کو پسند نہیں ہوتا۔ یہ اس قسم کے لوگ ہیں جو ہر زمان و مکان میں پائے جاتے ہیں۔ اور آپ ان سے مل سکتے ہیں۔ جب آپ ایسے لوگوں سے ملیں گے تو ان کے منہ اور رویہ سے اسلام کے خلاف نفرت کا لاوا پھوٹ رہا ہو گا۔ بعض لوگوں کو تو اس قدر الرجی ہوتی ہے کہ محض اسلام کے ذکر ہی سے ان کو بچھو کاٹنے شروع کر دیتے ہیں۔ اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی معاملے میں اور کسی مکالمے میں اسلام کا ذکر ہی نہ آئے۔ آج ہمارے دور میں ایسے بہت سے لوگ ملتے ہیں اور ان کا یہ طرز عمل کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

ایسے لوگوں کی سزا کیا ہے؟ یہ کہ اللہ نے ان کے تمام اعمال کو باطل کر دیا اور اعمال کے لیے حبط کے لفظ کا استعمال قرآن مجید کا مخصوص انداز ہے جس میں وہ کسی مفہوم کو نہایت ہی حسی انداز دے دیتا ہے۔ "حبوط" کا لفظی معنی ہے کسی جانور کا زہریلی گھاس کھا کر پھول جانا' اس پھولنے سے جانور گھنٹوں میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کفار کے اعمال بھی پھول جاتے ہیں' بظاہر وہ بہت ہی بڑے بڑے نظر آتے ہیں لیکن انجام ہلاکت و بربادی ہوتا ہے۔ یہ ایک تصویر ہے' ایک حرکت ہے جس میں ان لوگوں کی حالت کو بتایا گیا ہے جو اسلام سے نفرت کرتے ہیں اور اپنے بڑے بڑے کاموں پر مغرور ہوتے ہیں اور یہ اعمال پھولے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح جانور زہریلی گھاس کھا کر پھول جاتا ہے۔

--- ○○○---

اس کے بعد انہیں اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ ذرا پیچھے مڑ کر تاریخ کو پڑھیں اور غور کریں۔ یہ بات ذرا شدت سے کہی جاتی ہے۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَلِلْکٰفِرِیْنَ اَمْثَالُهَا (۴۷ : ۱۰) "کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہ تھے کہ ان لوگوں کا انجام دیکھتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ اللہ نے ان کا سب کچھ ان پر الٹ دیا' اور ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں"۔

یہ ایک خوفناک اور خشمگیں نظر ہے۔ اس میں نہایت ہی ہیجان اور شور و فغاں ہے۔ ان لوگوں کا منظر جن کو چشم زدن میں نیست و نابود کر کے رکھ دیا گیا۔ ان کے تمام آثار مٹا دیئے گئے۔ ملبے کے ڈھیر لگا دیئے گئے ہیں اور وہ ملبے کے ان ڈھیروں کے نیچے کراہ رہے ہیں۔ یہ منظر جسے اس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں اس کا اس طرح پیش کرنا ہی مقصود ہے۔ انداز بیان سے ان اقوام کی تباہی' بستیوں کا ملبہ بن جانا اور توڑ پھوڑ کا اظہار ہوتا ہے۔

اس قسم کے خوفناک منظر کو پیش کر کے اور الفاظ کے ذریعہ اسکرین پر توڑ پھوڑ دکھا کر حاضرین کو کہا جاتا ہے کہ تمہارا جو رویہ ہے اس کے نتیجے میں کچھ ایسا ہی منظر تمہارے انتظار میں ہے۔

وَلِلْکٰفِرِیْنَ اَمْثَالُهَا (۴۷ : ۱۰) "ایسے ہی نتائج ان کافروں کے لیے مقدر ہیں"۔ اس قسم کے نتائج کفار کے انتظار میں کیوں ہیں؟ اور اہل ایمان کی نصرت اس انداز میں کیوں ہے؟ یہ اللہ کا دائمی اصول ہے۔

---OOO---

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْکٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰی لَهُمْ (۴۷ : ۱۱) "یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں"۔

جس کا آقا اللہ ہو اور وہ اس کا مددگار ہو تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔ یہ شخص کسی کا محتاج نہ ہوگا' ہر کسی سے بے نیاز ہو جائے گا۔ ایسے شخص پر اگر مشکل حالات بھی آتے ہیں تو اسے سمجھنا چاہئے کہ اس کی آزمائش ہو رہی ہے۔ اور اس آزمائش کے بعد خیر ہی خیر ہے۔ یہ آزمائش اور یہ مشکلات اس لیے نہیں کہ اللہ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے بھی نہیں کہ اللہ نے اپنے بندوں کی مدد کرنے کا جو وعدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ بلکہ یہ ایک بندۂ مومن کی آزمائش ہوتی ہے۔ اور جس کا آقا اللہ نہ ہو تو اس کا کوئی آقا اور ناصر نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ تمام جنوں اور تمام انسانوں کو آقا بنا لے۔ آخر کار انسانوں پر بھروسہ کرنے والا نامراد ہوتا ہے اگرچہ دنیا کی تمام قوتیں اس کی حمایت پر مرکوز ہوں۔

---OOO---

اب ان لوگوں کے سازوسامان جنہوں نے ایمان قبول کیا اور ان لوگوں کے سازوسامان کے درمیان موازنہ کیا جاتا ہے جنہوں نے کفر کیا۔ یہ دونوں گروہ جو اس وقت باہم برسرپیکار ہیں ان کے درمیان فرق کیا ہے؟ اور ان کے سازوسامان کے درمیان فرق کیا ہے؟

اِنَّ اللّٰهَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًی لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ وَ

وَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيٓ أَخْرَجَتْكَ ۚ أَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾ أَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهِ كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوٓءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوٓا أَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَآ أَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَأَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ ۚ وَأَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِينَ ۚ وَأَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۖ وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۖ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَآءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَآءَهُمْ ﴿۱۵﴾

”ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو اللہ ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ' اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں ' جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں اور ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہے ۔ اے نبیؐ ' کتنی ہی بستیاں ایسی گزر چکی ہیں جو تمہاری اس بستی سے بہت زیادہ زور آور تھیں جس نے تمہیں نکال دیا ہے ۔ انہیں ہم نے اس طرح ہلاک کر دیا کہ کوئی ان کا بچانے والا نہ تھا ۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف و صریح ہدایت پر ہو ' وہ ان لوگوں کی طرح ہو جائے جن کے لیے ان کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کے پیرو بن گئے ہیں ۔ پرہیز گار لوگوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی ' نتھرے ہوئے پانی کی ' نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہو گا ' نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہو گی ' نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف شفاف شہد کی ۔ اس میں ان کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے بخشش ۔ (کیا وہ شخص جس کے حصہ میں یہ جنت آنے والی ہے) ان لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا؟“

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے بعض اوقات اس زمین پر بھی بہت اچھا کھاتے پیتے ہیں لیکن اللہ مومنین کے اس حصے کے درمیان جو ان کو جنت کی صورت میں ملنے والا ہے اور کافروں کے اس تمام سروسامان کے درمیان موازنہ کرتا ہے جو ان کو اس دنیا اور آخرت دونوں میں ملنے والا ہے ۔

مومنین کا حصہ رسدی یہ ہے کہ ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور ان کو یہ مقام عزت اللہ عطا کرے گا ۔ لہٰذا مومنین کا یہ سازوسامان اور یہ اکرام بہت ہی بڑا ہے ۔ یہ بارگاہ عزت میں ہے ۔ یہ اللہ کے ہاں ان کا مقام ہے اور یہ ایمان و تقویٰ اور عمل و صلاح کی بنا پر ہے ۔ یہ اونچی جنتوں میں اونچے رب تعالیٰ کی طرف سے بلند ایمان اور اعلیٰ اعمال کے بدلے ہو گا سب کچھ بلند!

اس کے مقابلے میں کافروں کا سازوسامان یوں ہے جس طرح مویشی چر چگ رہے ہیں ۔

وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷ : ۱۲) "جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں"۔ یہ ان کی بہت ہی خستہ اور گری ہوئی حالت ہے' اس کے اندر انسانیت کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں ہے۔ اس میں یوں نظر آ رہا ہے کہ کچھ حیوان ہیں جو منہ مار رہے ہیں اور حیوانی اور سخت قسم کی خوراک کھا رہے ہیں اور اس میں پاک و صاف اور اچھے اور برے کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ پس یہ ایک چارہ ہے جو یہ کھا رہے ہیں۔ اس کے لیے کوئی ضابطہ حلال و حرام نہیں۔ اس میں خدا کے خوف کی کوئی بات نہیں۔ نہ عدالت ضمیر کوئی پابندی عائد ہے۔

حیوانیت کا خاصہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کھائے اور پیئے۔ اگرچہ کھانے پینے میں حیوانوں نے نہایت ہی اعلیٰ ذوق بنا لیا ہو اور مختلف قسم کے استعمال کی اشیاء میں بہت ترقی کر لی ہو۔ جیسا کہ آج کل کے بہت سے نودولتیے اس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات مقصود نہیں ہے۔ اصل انسانی خصوصیت یہ ہے کہ انسان ایک ارادے کا مالک ہو' اس کی زندگی گزارنے کی کچھ قدریں ہوں' اللہ کے ہاں جو طیب اور پاک خوراک ہو یعنی رزق حلال وہ اسے اختیار کرے۔ وہ ایسے ارادے کا مالک ہو جس کے اوپر انسانی شہوات کا دباؤ نہ ہو۔ اور نہ ہی وہ مقصد پیش نظر ہو کہ "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"۔ اور وہ اس زندگی کو مویشیوں کی طرح صرف دستر خوان ہی نہ سمجھتا ہو۔ اور عیش و عشرت ہی اس کے نزدیک زندگی نہ ہو۔ جو جائز و ناجائز کے حدود و قیود سے پاک ہو۔ بلکہ انسان اور حیوان کے درمیان تو فرق ہی یہ ہے کہ انسان ایک صاحب ارادہ مخلوق ہے۔ اس کا اس جہاں میں ایک خاص مقصد ہے اور ایک خاص شعور حیات ہے جو غیر مبہم اصولوں پر قائم ہے اور یہ اصول اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ اگر انسان ان باتوں کو گم کر دے تو گویا اس نے مقام انسانیت کو گم کر دیا ہے۔ اور وہ صرف حیوان رہ گیا ہے۔ کیونکہ انسانی خصوصیات میں سے اعلیٰ خصوصیت اس نے گم کر دی ہے۔

---ooo---

اب ایک موازنہ ان بستیوں کے درمیان جو ہلاک ہوئیں اور اس بستی کے درمیان جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکال دیا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ

(۴۷ : ۱۳) "اے نبیؐ' کتنی ہی بستیاں ایسی گزر چکی ہیں جو تمہاری اس بستی سے بہت زیادہ زور آور تھیں جس نے تمہیں نکال دیا ہے۔ انہیں ہم نے اس طرح ہلاک کر دیا کہ کوئی ان کا بچانے والا نہ تھا"۔

یہ وہ آیت ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان اس وقت نازل ہوئی جب آپ ہجرت کا سفر فرما رہے تھے اس میں رسول اللہؐ کو تسلی دی گئی ہے۔ کیونکہ اپنا ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑنا ایک مشکل کام ہے اور اس میں تسلی دی گئی کہ بظاہر تو یہ لوگ بڑے جبار نظر آتے ہیں' دعوت اسلامی کی راہ روکے ہوئے ہیں' اہل ایمان پر تشدد کرتے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے ان کو اپنے گھروں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ دولت ایماں لے کر جا رہے ہیں لیکن دراصل یہ جبار بہت ہی کمزور ہیں۔

---ooo---

اب دونوں فریقوں کے درمیان مزید موازنہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ مومنین کو جنتیں عطا

کرے گا' جہاں نہریں بہتی ہیں' اس دنیا میں ان کو نصرت اور عزت بخشے گا' اور کفار کا کوئی آقا نہیں ہے' ان کا کوئی ناصر نہیں ہے وہ دنیا میں ہلاک ہوں گے اور آخرت میں خوار ہوں گے' اور ہمیشہ جہنم میں ہوں گے ـ یہ کیوں؟

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ

(۱۴:۴۷) "بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جو اپنے رب کی طرف سے ایک صاف و صریح ہدایت پر ہو' وہ ان لوگوں کی طرح ہو جائے جن کے لیے ان کا برا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہے اور وہ اپنی خواہشات کے پیرو بن گئے ہیں"۔

یہ ہے وہ فرق دونوں گروہوں کے درمیان' دونوں کی طرز زندگی اور مقصد زندگی دونوں میں فرق ہے ـ جو اہل ایمان ہیں وہ

عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (۱۴:۴۷) " اپنے رب کی طرف سے صاف ہدایت پر ہیں"۔ وہ حق کو جانتے ہیں اور انہوں نے اسے پہچان لیا ہے ـ وہ حق کے سرچشمے تک پہنچ گئے ہیں اور ان کے پاس جو حق آ رہا ہے وہ اس پر جمے ہوئے ہیں ـ وہ کسی دھوکے میں ہیں اور نہ گمراہی میں ـ اور کفار ایک بڑے دھوکے میں پڑے ہیں ـ شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال خوشنما بنا دیے ہیں ـ پھر ان کے اعمال کے بارے میں ان کو کوئی یقین بھی نہیں ہے کہ وہ کہاں سے ہدایات لیتے ہیں ـ

وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ (۱۴:۴۷) "وہ اپنی خواہشات کے پیروکار ہیں"۔ کوئی ضابطہ نہیں ہے ـ کوئی اصول نہیں ہے جس پر جائز و ناجائز کا تعین ہو' اور کوئی روشنی ان کے پاس نہیں جس کے ذریعہ وہ حق و باطل کی تمیز کریں ـ

---ooo---

یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ ان کے حالات' طرز زندگی اور سمت سفر سب جدا ہیں ـ اس لیے ممکن نہیں کہ وہ ایک پیمانے کے مطابق ناپے اور تولے جا سکیں ـ اور دونوں کا ایک ہی انجام ہو ـ یہی وجہ ہے کہ دونوں کے درمیان فرق و امتیاز ہے ـ دونوں کا انجام بھی مختلف ہے ـ

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَ لَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ

(۱۵:۴۷) "پرہیز گار لوگوں کے لیے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ اس میں نہریں بہہ رہی ہوں گی' نتھرے ہوئے پانی کی' نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسے دودھ کی جس کے مزے میں ذرا فرق نہ آیا ہو گا' نہریں بہہ رہی ہوں گی ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہو گی' نہریں بہہ رہی ہوں گی صاف شفاف

شہد کی ۔ اس میں ان کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے بخشش ۔ (کیا وہ شخص جس کے حصہ میں یہ جنت آنے والی ہے) ان لوگوں کی طرح ہو سکتا ہے جو جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا؟"

جنت کی خوشیوں اور جہنم کے عذاب کی یہ نہایت ہی محسوس تصویر اور منظر قرآن کریم میں بار بار آتا ہے ۔ ان کے ساتھ ساتھ کبھی معنوی اور مجرد خالص خوشیوں کا ذکر بھی آتا ہے ۔ کئی جگہ اس قسم کی خوشیوں کا ذکر بھی ہے جن کے اندر حسیات کا حصہ کم ہے ۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے ۔ وہ انسان کو خوب جانتا ہے ۔ "من خوب می شناسم پیران پارسا را" ۔ اللہ کو معلوم ہے اور سب سے زیادہ معلوم ہے کہ انسان کے دلوں پر زیادہ اثر کس چیز کا ہوتا ہے ۔ ان کی تربیت کس طرح ممکن ہے ۔ ان کے لیے کون سی نعمتیں بہتر ہیں اور ان کے لیے کون سی مناسب ہیں ۔ پھر انسانوں کے بھی کئی مدارج ہیں 'نفوس انسانی کے بھی کئی رنگ ہیں ۔ مختلف مزاج ہیں ۔ یہ سب انسان ہیں ۔ انسانیت میں برابر ہوتے ہوئے بھی رنگ ' مزاج اور خواہشات میں اختلاف ہے ۔ اس لیے اللہ نے اپنے فضل و کرم اور انعامات میں بھی تنوع رکھا ہے ۔ اور ہر کسی کو اس کی خواہش کے مطابق دیا ہے اور دے گا ۔ وہ اپنے بندوں کو خوب جانتا ہے ۔

انسانوں میں سے ایسے بھی ہیں جن کی اصلاح کے لیے نتھرے ہوئے پانی کی نہریں ' دودھ کی نہریں جن کا ذائقہ بدلا ہوا نہ ہو ۔ عسل مصفی کی نہریں ' اور لذیذ شراب کی نہریں مناسب ہیں ' یہی ان کی خواہش ہے ۔ پھر یہ لوگ اس قسم کے پھل کو پسند کرتے ہیں ' پھر رب کی مغفرت ' لہٰذا اللہ نے ایسے ہی لوگوں کی تربیت کے لیے ان کی خواہشات کے مطابق یہ انعامات رکھے ہیں ۔ اور انہی کے بارے میں ہے ۔

لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَآءُونَ یہی ان کے لیے مناسب ہیں ۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اللہ کی بندگی ان انعامات کے شکر کی وجہ سے کرتے ہیں جو لاتعداد ہیں ' بعض ایسے ہیں جو اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ کی بندگی کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کرتے ہیں ' یا پھر وہ اس بات سے شرم محسوس کرتے ہیں کہ اللہ ان کو ایسی حالت میں دیکھے جسے وہ ناپسند کرتا ہے ۔ ایسے لوگ اللہ کی بندگی پر جنت کی لالچ نہیں رکھتے ۔ اور دوزخ کے ڈر سے نہیں کرتے ۔ ایسے لوگوں کو انعامات کی پرواہ نہیں ہوتی ۔ نہ سزا کا خوف ہوتا ہے ۔ ایسے لوگوں کی تربیت اور جزاء کے لیے بھی اللہ نے ایک معیار رکھا ہے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا "جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لیے خدائے رحمٰن محبت پیدا کر دے گا" ۔ اور ان کو یہ یقین بھی ہو گا ۔

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ "یہ سچائی کے مقام پر صاحب اقتدار بادشاہ کے پاس" کرسی نشین ہوں گے ۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں مبارک سوج جاتے تھے ۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آپ اس قدر عبادت کرتے ہیں حالانکہ آپ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے گئے ہیں ۔ آپؐ نے فرمایا "عائشہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ ہوں" ۔ (مسلم)

رابعہ عدویہ فرماتی ہیں 'اگر نہ جنت ہوتی اور نہ آگ ہوتی تو کیا کوئی اللہ کی عبادت نہ کرتا اور کوئی اللہ نہ سے ڈرتا؟ انہی سے سفیان ثوری نے ان کے ایمان کی حقیقت پوچھی تو انہوں نے جواب دیا "میں نے اللہ کی بندگی اس کی آگ کی ڈر کی وجہ سے نہیں کی اور نہ اس کی جنت کی لالچ کی وجہ سے کی کہ میں ایک برے مزدور کی طرح بن جاؤں کہ محض لالچ میں کام کروں"۔

بہرحال انسانوں میں سے بعض کا یہ رنگ ہے اور بعض کا وہ رنگ۔ اور اللہ نے دونوں کے لیے مایشاؤں کے مطابق انعامات رکھے ہوئے ہیں۔ جو ان کے مزاج کے مطابق ہیں۔ اور جن سے ان کی تربیت ہوتی ہے۔

یہ بات نظر آتی ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کی جوں جوں تربیت کی' اس کی ساتھ ساتھ وسائل تربیت بھی زیادہ لطیف ہوتے گئے اور مسلمانوں کے بدلتے ہوئے ذوق کے مطابق تبدیل ہوتے رہے کیونکہ انسان اپنی تاریخ میں انسانیت کے مختلف مدارج پر رہا ہے۔

بہرحال جزاء کی بھی دو قسمیں ہیں۔ یہ نہریں قسما قسم کے پھلوں کے ساتھ اور اللہ کی مغفرت اور رضامندی کے ساتھ اور دوسری قسم :

كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَآءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَآءَهُمْ (۴۷ : ۱۵) "ان لوگوں کی طرح جو جہنم میں رہیں گے اور جنہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتیں تک کاٹ دے گا"۔ عذاب کی یہ صورت نہایت ہی حسی اور سخت ہے۔ یہ صورت اس سورت کی فضا کے ساتھ بہت ہی مناسب ہے۔ کیونکہ یہ سورہ قتال ہے۔ پھر جس قوم کی تربیت ہو رہی ہے وہ نہایت ہی سخت اور اجڈ اور ہٹ دھرم ہے۔ یہ اس دنیا میں بھی اس قدر مگن ہے کہ ماسوائے کھانے پینے کے اس کے سامنے کوئی اور اونچا نصب العین نہیں ہے۔ فضا ایسی ہے کہ سامان معیشت بھی حسی ہے۔ اس قوم کا مزاج بھی جانوروں کی طرح حسیات ہی کو دیکھتا ہے۔ اس لیے ان کے لیے سزا بھی ایسی ہی سخت ہے۔ گرم ترین پانی ان کو اس طرح پلایا جائے گا کہ نہ صرف یہ کہ منہ جل جائے گا بلکہ آنتیں تک کٹ جائیں گی اور دنیا میں یہ لوگ تھے بھی جانوروں کی طرح سخت۔

کس طرح یہ لوگ ایمان والوں کی طرح ہو سکتے جو نہایت مہذب ہیں۔ یہاں یہ پہلا مطالعہ ختم ہوتا ہے۔ جو سورت شروع ہوتے ہی ان لوگوں پر ایک تنقیدی حملے کی شکل میں شروع ہوا تھا۔ اور یہ اس طرح جاری رہا جس طرح دو کیمپوں کے درمیان جنگ جاری ہوتی ہے۔ آخر تک یہ کشکش سخت الفاظ میں ہوتی رہی ہے۔

--- ooo---

درس نمبر ۲۴۲ ایک نظر میں

یہ سبق منافقین کے بارے میں ہے' اس میں بتایا گیا ہے کہ ان کا موقف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے بارے میں کیا تھا؟ قرآن کے بارے میں کیا تھا؟ پھر مسلمانوں پر جہاد فرض ہو گیا تھا۔ اس کے بارے میں وہ کیا سوچتے تھے؟ یاد رہے کہ یہ جہاد صرف اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے تھا؟ پھر یہ کہ مدینہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے مخالف اسلام یہودی قبائل کے ساتھ ان کے خفیہ تعلقات ان مقاصد کے لیے تھے۔ یہ کہ ان خفیہ سازشوں کی وجہ سے یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔

تحریک نفاق مدینہ کی پیداوار ہے۔ مکہ میں اس کا وجود ہی نہ تھا۔ کیونکہ مکہ میں ایسے حالات ہی نہ تھے جن میں کسی کو منافق بننے کی ضرورت پیش آتی مکہ میں مسلمان دبے ہوئے تھے۔ لہذا کسی کو منافق بننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جب اللہ نے مدینہ میں اوس اور خزرج کے ذریعہ اسلام کو عزت بخشی اور مدینہ کے اکثر خاندانوں میں اسلام پھیل گیا۔ اکثر لوگ مسلمان ہو گئے تو بعض ایسے لوگ بھی دیکھا دیکھی مسلمان ہو گئے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ کرتے تھے کہ آپ اور اسلام یہاں قوت پکڑیں۔ یہ لوگ مسلمان تو ہو گئے لیکن ان کے دل اسلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی سے بھرے ہوئے تھے۔ اور وہ اس آرزو میں بیٹھ گئے تھے کہ حالات گردش میں آئیں اور اس نئی قوت پر ضرب لگائی جائے۔ ان کا سربراہ عبد بن ابی بن سول تھا۔ یہ مشہور زمانہ منافق تھا۔

مدنی دور کے آغاز میں یہودی مدینہ میں ایک زبردست فوجی' اقتصادی اور تنظیمی قوت رکھتے تھے۔ یہ لوگ بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبے کو پسند نہ کرتے تھے۔ نہ آپ کے دین اور آپ کے متبعین کو پسند کرتے تھے۔ یہودیوں کا یہاں اس پوزیشن میں موجود ہونا بھی منافقین کے لیے ایک سہارا تھا۔ اور اس مشترکہ دشمنی نے ان کو جلد ہی ایک دوسرے کا دوست بنا دیا۔ لہذا یہ دونوں قوتیں ہر موقعہ پر مسلمانوں کے خلاف سازشیں تیار کرتیں۔ اگر مسلمانوں پر مشکل حالات ہوتے تو یہ اپنی منافقت اور بغض و عداوت کا اظہار کر دیتے۔ اور اگر مسلمان اچھی حالت میں ہوتے تو یہ خفیہ اور اندھیروں میں ان کے خلاف سازشوں کا تانا بانا تیار کرتے۔ مدینہ کے دس سالہ عہد حکومت میں پانچ سالوں تک یہ اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ بنے رہے۔

مدینہ میں جس قدر سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں تواتر کے ساتھ منافقین کی سازشوں' عداوتوں اور ان کے نفاق کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی مذکور ہے کہ یہ لوگ یہودیوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اور ان سے ہدایات لیتے ہیں اور بعض سازشوں میں شریک ہیں۔ یہ سبق ان میں سے ایک ہے جس میں یہودیوں اور منافقین کے اشتراک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

--- ○○○---

درس نمبر ۲۴۲ تشریح آیات

۱۶--- تا--- ۳۱

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾ ۲ ع ۸ ۶ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴿۲۰﴾ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۣ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۣ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿۲۱﴾ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾

''ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کان لگا کر تمہاری بات سنتے ہیں اور پھر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان

لوگوں سے جنہیں علم کی نعمت بخشی گئی ہے۔ پوچھتے ہیں کہ ابھی ابھی انہوں نے کیا کہا تھا؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے اور یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ہے' اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے۔ اب کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ اچانک ان پر آ جائے؟ اس کی علامات تو آ چکی ہیں۔ جب وہ خود آ جائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقع باقی رہ جائے گا؟ پس اے نبیؐ خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے' اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی۔ اللہ تمہاری سرگرمیوں کو بھی جانتا ہے اور تمہارے ٹھکانے سے بھی واقف ہے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی جاتی (جس میں جنگ کا حکم دیا جائے) مگر جب ایک پختہ سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔ ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ اطاعت کریں اور صحیح باتیں کریں۔ مگر جب قطعی حکم دے دیا گیا اس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے تو انہی کے لیے اچھا تھا۔ اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم الٹے منہ پھر گئے تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے؟ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا۔ کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا' یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟"

مِنْهُمْ (ان میں سے) کا اشارہ کافروں کی طرف بھی ہو سکتا ہے کیونکہ درس سابق میں کافروں سے بحث تھی اور درحقیقت منافقین بھی کافر ہی تھے۔ اگرچہ چھپے ہوئے کافر تھے۔ اللہ نے یہاں ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے ان کو کافروں میں شمار کیا ہے کہ ان کافروں میں سے بعض منافقین ہیں۔

اور یہ اشارہ مسلمانوں کی طرف بھی ہو سکتا ہے یعنی مسلمانوں میں سے بعض منافقین ہیں۔ کیونکہ منافقین باقاعدہ نماز بھی پڑھتے تھے اور اسلام بظاہر ان کو مسلمان سمجھ کر ان کے ساتھ معاملہ کرتا تھا۔ لیکن دونوں صورتوں میں یہ منافق ہی تھے۔ آیت میں ان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ ان میں تھیں اور یہ پورا سبق ان کے بارے میں ہے۔

یہ لوگ مجلس میں یوں بیٹھے ہوئے کہ گویا ہمہ تن گوش ہیں اور اچھی طرح بات سن رہے ہیں لیکن درحقیقت یہ سن نہیں رہے ہوتے تھے۔ بلکہ "بر زبان تسبیح و در دل گاؤ خر" کا مصداق ہوتے اور اگر سنتے بھی تو ان کے دل کو بات لگتی ہی نہ تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اہل علم سے طنزاً پوچھتے ہوں کہ بتائیے جناب ابھی کیا کہا صاحب نے۔ یعنی ہمارے پلے تو کوئی بات پڑی نہیں ہے۔

اس سے ان کی مراد یہ اشارہ بھی تھا کہ ہم تو ان باتوں کی کوئی زیادہ پرواہ نہیں کرتے لیکن اہل علم حضرت کی باتوں کا ایک ایک لفظ یاد کرتے ہیں۔ الفاظ بھی اور معانی بھی۔ صحابہ کرام کا طریقہ بھی یہ تھا کہ وہ حضورؐ کے الفاظ اور معانی دونوں کو یاد کرتے تھے۔ اور یہ لوگ یعنی منافقین ان الفاظ اور معانی کو بطور مزاح دہراتے تھے۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ نہایت بدفطرت' اسلام کے معاند' اندھے اور اسلام کے ترقی پذیر حالات پر جل بھن گئے تھے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ (۴۷ : ۱۶) "یہ وہ لوگ

ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے ۔ یہ اپنی خواہشات کے پیرو بنے ہوئے ہیں" ۔ یہ تو تھا منافقین کا حال ۔ رہا اہل ہدایت کا حال تو وہ اس کے برعکس تھا۔

---○○○---

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ (۴۷ : ۱۷) "رہے وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا فرماتا ہے" ۔

اس آیت میں واقعات کی جو ترتیب ہے، وہ قابل توجہ ہے ۔ جو ہدایت پر ہیں وہ خود ہدایت کی راہ لیتے ہیں تو اللہ ان کو مزید ہدایت کی توفیق دیتا ہے اور ان کو ہدایت میں مزید گہرائی بخشتا ہے ۔

وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰهُمْ (۴۷ : ۱۷) "اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا کرتا ہے" ۔ تقویٰ ایک قلبی حالت کا نام ہے جس کے نتیجے میں انسان ہر وقت اللہ سے ڈرتا رہتا ہے ۔ اس کو شعور ہوتا ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے ۔ اللہ کے غضب سے انسان ڈرتا ہے ۔ اللہ کی رضا کا متلاشی ہوتا ہے ۔ اور اس بات سے وہ اپنے آپ کو بچاتا ہے کہ اللہ اسے بری حالت میں دیکھے ۔ یہ تیز احساس ہی تقویٰ ہے ۔ یہ اللہ اس شخص کو عطا کرتا ہے جس سے اللہ راضی ہو اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان راہ ہدایت لینے میں رغبت رکھتا ہے ۔ تو اللہ مزید ہدایت دے کر اسے تقویٰ کا مقام دیتا ہے غرض ہدایت کی خواہش، پھر اللہ کی طرف سے مزید ہدایت اور پھر اللہ کا تقویٰ اور ذروہ مدارج ہیں جو نفاق، غفلت اور خواہشات نفس کی پیروی کے بالمقابل ہیں ۔

---○○○---

اب بات ان لوگوں کی طرف آتی ہے جو منافق ہیں، اندھے ہیں، غافل ہیں، جو مجلس رسول سے ایسی حالت میں نکلتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے سنا اس سے کوئی نفع نہیں اٹھایا ۔ ہدایت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ۔ ان کے دلوں کے اندر خدا کا کوئی خوف پیدا نہ ہوا ۔ چنانچہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ حساب و کتاب کا دن بہت ہی جلدی آنے والا ہے ۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ (۴۷ : ۱۸) "اب کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے منتظر ہیں کہ وہ اچانک ان پر آجائے؟ اس کی علامات تو آچکی ہیں ۔ جب وہ خود آجائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقع باقی رہ جائے گا؟"

ان آیات میں منافقین کو ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ جگایا جاتا ہے اور گریبان سے پکڑ کر ان کو اس طرح جھنجھوڑا جاتا ہے جس طرح کسی نشے میں دھت شخص کو کھینچا جاتا ہے ۔ یعنی یہ غافل لوگ جو رسول اللہؐ کی مجلس میں جاتے ہیں اور وہاں سے کچھ ہدایت لیے بغیر، کچھ یاد کیے بغیر، کچھ نصیحت پکڑے بغیر، کورے کے کورے واپس ہوئے ۔ یہ بدبخت اب کس چیز کا انتظار کرتے ہیں ۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً (۴۷ : ۱۸) "کیا یہ لوگ بس قیامت ہی کے منتظر

ہیں کہ اچانک آ جائے"۔ اور ان کے حالات یہ ہوں کہ یہ غفلت اور لاپرواہی میں ' اور فسق و فجور میں غرق ہوں۔
اگر یہ لوگ قیامت ہی چاہتے ہیں تو

فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا (۴۷ : ۱۸) "اس کی علامات تو آ چکی ہیں"۔ یہ آخری رسالت قیامت کی بڑی نشانی ہے۔ یہ رسالت دراصل اعلان ہے کہ اب قیامت جلد ہی آنے والی ہے۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا: بعثت انا والساعة کہاتین "میں اور قیامت ان دو کی طرح مبعوث ہوئے ہیں"۔ آپ نے اپنی دو انگلیوں سبابہ اور درمیانی انگلی کو جوڑ کر اشارہ فرمایا (متفق علیہ)۔ حضور اکرمؐ سے ادھر اگر زمانہ لوگوں کو زیادہ طویل ہوتا ہوا نظر آتا ہے تو اللہ کے ایام ہمارے ایام کے مقابلے میں بہت ہی طویل ہوتے ہیں۔ اللہ کے حساب میں قیامت کی نشانی آگئی ہے۔ اور بڑی نشانی یہ آخری رسالت ہے۔ اور یہ کسی عقلمند شخص کی روش نہیں ہو سکتی کہ مصیبت آئے اور وہ سویا ہوا ہو۔ اور وہ پھر بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کر سکے۔

فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰهُمْ (۴۷ : ۱۸) "جب وہ آ جائے گی تو ان کے لیے نصیحت قبول کرنے کا کون سا موقعہ باقی رہ جائے گا"۔ یہ نہایت ہی قوت سے جھنجھوڑنے کے مترادف ہے کہ جاگو ' خطرہ سر پر ہے اور سختی کے ساتھ گریبان سے پکڑ کر ہلانا ' اس سورت کے سخت انداز کے بھی مناسب ہے۔

---ooo---

اب روئے سخن حضور اکرمؐ اور آپ کے ہدایت یافتہ ' متقی اور متلاشیان ہدایت ساتھیوں کی طرف پھر جاتا ہے کہ وہ ہدایت کے لیے ایک دوسری راہ بھی اپنائیں۔ علم و معرفت ' توبہ و استغفار ' اللہ کا خوف اور خشیت اختیار کریں اور آخری وقت کا انتظار کریں۔ اللہ تمہاری دنیا و آخرت کے انجام سے اچھی طرح واقف ہے۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ (۴۷ : ۱۹) "پس اے نبیؐ خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے ' اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی۔ اللہ تمہاری سرگرمیوں کو بھی جانتا ہے اور تمہارے ٹھکانے سے بھی واقف ہے"۔

یہاں آپ کو اور مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ تمہاری ملت جس نظریہ پر قائم ہے اس کو سمجھو وہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ ' معبود اور حاکم نہیں ہے۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (۴۷ : ۱۹) "پس اے نبیؐ خوب جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی اور عبادت کے مستحق نہیں"۔ اس حقیقت کو ذہن میں تازہ کرتے ہوئے پھر دوسری ہدایات یہ ہیں۔

وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ (۴۷ : ۱۹) "اپنے قصور کے لیے معافی مانگو"۔ حالانکہ حضورؐ کے تو اگلے پچھلے

گناہ معاف تھے؟ لیکن ایک باشعور، متقی اور حساس بندے کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت اپنی مساعی کو کمزور سمجھتا ہے۔ اگرچہ وہ اطاعت الہی میں بہت جدوجہد کرتا ہو۔ حضورؐ جانتے تھے کہ استغفار اور ذکر، شکر ہے اور اللہ کی مغفرت کا مزید شکر ہے۔ اور پھر آپ کے منصب و مقام پر بعد میں جو لوگ آنے والے تھے، ان کے لیے یہ ہدایت ہے اور عام مسلمانوں کے لیے یہ رہنمائی ہے کہ جب حبیب خدا کو یہ ہدایت ہے کہ مغفرت طلب کرو، جبکہ وہ بخش دیئے گئے ہیں تو دوسروں کو تو ہر وقت استغفار کرنا چاہئے۔ نیز حضورؐ اپنے لیے اور مومنین و مومنات کے لیے استغفار کرتے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کے دلوں میں محبت رسول کا شعور تازہ رہتا ہے کہ رسول کریمؐ کی وجہ سے ان پر اللہ کی رحمت ہو رہی ہے۔ اور حضور اکرمؐ مومنین اور مومنات کے لیے مغفرت طلب کر رہے ہیں۔ پھر ان ہدایات کے سلسلے کی آخری بات۔

وَ اللّٰہُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَکُمْ وَ مَثْوٰکُمْ (۴۷ : ۱۹) "اللہ تمہاری سرگرمیوں کو بھی جانتا ہے اور تمہارے ٹھکانے سے بھی واقف ہے"۔ اس سے دل مومن کو اطمینان بھی نصیب ہوتا ہے اور اس کے دل میں یہ تصور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ ہماری چلت پھرت سے بھی واقف ہے اور انجام سے بھی واقف۔ اطمینان یہ کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے اور خوف یہ کہ اللہ ہر حالت میں ہم کو جانتا ہے، اس سے چھپ کر ہم کوئی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ یہ ہے اسلامی تربیت کہ اللہ کے بارے میں تیز احساس رکھو، ہر وقت اس سے ڈرتے رہو اور ہر وقت انتظار میں رہو کہ وہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔

---○○○---

اب روئے سخن ایک نہایت ہی حساس موقف کی طرف آتا ہے۔ اس وقت تک پالیسی یہ تھی کہ جہاد و قتال سے رکو لیکن اب اللہ نے جہاد کا حکم دے دیا۔ یہ منافقین پر ایک ضرب تھی۔ وہ سخت دہشت زدہ ہو گئے کیونکہ اب تو ان کے لیے چھپ کر رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اب اگر وہ نفاق پر رہے اور اخلاص کے ساتھ اسلام قبول نہ کیا تو ان کا اندرون ظاہر ہو جائے گا۔ کیونکہ جب جہاد کا فیصلہ ہو گا تو جنگ میں جانا ہو گا یا پیچھے رہنا ہو گا۔

وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَۃٌ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَۃٌ مُّحْکَمَۃٌ وَّ ذُکِرَ فِیْھَا الْقِتَالُ رَاَیْتَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ یَّنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰی لَھُمْ (۲۰) طَاعَۃٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰہَ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ (۲۱) فَھَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَکُمْ (۲۲) اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فَاَصَمَّھُمْ وَ اَعْمٰٓی اَبْصَارَھُمْ (۲۳) اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (۲۴) (۴۷ : ۲۰ - ۲۴) "جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی جاتی (جس میں جنگ کا حکم دیا جائے) مگر جب ایک پختہ سورت نازل کر دی

گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیاری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھاگئی ہو۔ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ اطاعت کریں اور صحیح باتیں کریں ۔مگر جب قطعی حکم دے دیا گیا اس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے تو انہی کے لیے اچھا تھا۔اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم الٹے منہ پھر گئے تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے؟ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا۔کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا' یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟"

اہل ایمان 'کسی نئی سورت کے نزول کا مطالبہ کرتے تھے' یا تو اس لیے کہ ان کے دلوں میں ہروقت یہ شوق رہتا تھا کہ وہ نئی نئی ہدایات لیتے رہیں۔کیونکہ ان کو قرآن سے بے حد محبت تھی۔وہ ہرنئی سورت میں علم و انس کا ایک نیا سامان اپنے لیے پاتے تھے۔اور اس سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ نئے حالات میں مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کی ہدایات اور اجازت چاہتے تھے کہ اسلام کے لیے لڑ مرنے کی ہدایات ان کو دی جائیں۔

لَوْ لَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ (۴۷ : ۲۰) "کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی"۔

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ (۴۷ : ۲۰) "مگر جب پختہ سورت نازل کر دی گئی"۔اور اس قدر مفصل کہ اس میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور۔

وَّ ذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ (۴۷ : ۲۰) "جس میں جنگ کا ذکر کیا گیا"۔جس میں پھر کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی اور جو لوگ قتال سے پیچھے رہتے ہیں' یا جہادی کاموں میں پیچھے رہتے ہیں' ان کی مذمت بھی کر دی گئی تو بیمار دلوں والے لوگ یعنی منافقین کی حالت غیر ہونے لگی اور وہ پردے گرنے لگے جن کے پیچھے چھپ کر یہ سازشیں کرتے تھے۔ان کی جزع و فزع' شور و فغاں اور سہمے اور ڈرے ہوئے ہونا یہاں تک کہ مارے خوف کے ان پر غشی کا طاری ہونا قابل دید تھا۔قرآن کریم نے یہاں ان لوگوں کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ گویا وہ ہیں سامنے اسکرین پر۔

رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ

(۴۷ : ۲۰) "تو تم نے دیکھا کہ جن لوگوں کے دلوں میں بیاری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھاگئی ہو"۔یہ اس قدر خوبصورت انداز تعبیر ہے کہ انسان اس کی نقل نہیں اتار سکتا۔نہ کسی اور عبارت میں نہ کسی اور زبان میں اس طرز تعبیر کو اپنا سکتا ہے۔خوف و ہراس کی یہ ایسی تصویر ہے کہ کپکپی اور خوف سے بھی آگے بڑھ کر ان لوگوں پر گویا غشی کی حالت طاری ہو رہی ہے۔اور خیال میں ان لوگوں کی پھر عجیب و غریب حرکات سامنے آتی ہیں۔اور وہ تمام نفوس و شخصیات کی تصاویر ذہن میں آجاتی ہیں جن کو پختہ ایمان نصیب نہ ہو'جس کی فطرت سچی نہ ہو اور جن کے اندر اس قدر جذبہ جہاد نہ ہو جس کی وجہ سے وہ خطرے کا مقابلہ کر سکیں۔یہ لوگ مریض اور منافق ہوتے ہیں۔

یہ لوگ اس قدر ذلت 'گراوٹ اور شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں کہ دوبارہ ان کو ایمان کی دعوت از سرِنو دی

جاتی کہ ایمان ہی حقیقی زاد راہ ہے جس سے ارادے جواں ہوتے ہیں اور جس سے پاؤں مضبوط ہوتے ہیں۔

فَاَوْلٰى لَهُمْ (۴۷ : ۲۰) طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (۴۷ : ۲۱) "ان کے لیے بہتر یہ ہے کہ اطاعت کریں اور صحیح باتیں کریں۔ مگر جب قطعی حکم دے دیا گیا اس وقت وہ اللہ سے اپنے عہد میں سچے نکلتے تو انہی کے لیے اچھا تھا"۔ ہاں جس شرمندگی میں وہ مبتلا ہیں اس کے مقابلے میں ان کے لیے یہی اچھا تھا۔ وہ حیران ہیں کہ کیا کریں۔ پریشان ہیں کہ کیا ہو گا۔ اب ان کا نفاق تو چھپ نہ سکے گا۔ ان کے لیے بہتر پالیسی اب یہ ہے۔

طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ (۴۷ : ۲۱) "وہ اطاعت کریں اور سیدھا رویہ اختیار کر کے بات کریں"۔ اللہ کے احکام کو اب نفاق کے بجائے دل سے قبول کر لیں۔ اور اللہ پر یقین کر کے اس کے احکام کو مان لیں۔ اور اس قسم کی باتیں کریں جو سچی ہوں اور سچے دل سے ہوں۔ اور پختہ ضمیر کے مطابق ہوں اور یہ ان کے لیے اب نئے حالات میں زیادہ مفید ہو گا جبکہ اب احکام قطعی ہو گئے ہیں۔ اب تو انہوں نے یا جہاد میں جانا ہے یا پیچھے رہنا ہے۔ لہٰذا عزیمت اور شعور کے ساتھ جہاد کرو۔ اس طرح ان کے دل مضبوط ہوں گے' ان کا عزم پختہ ہو جائے گا۔ قدم مضبوط ہوں گے' جہاد ان کو مشقت اور بیگار نہ نظر آئے گا۔ اور جنگ ان کے لیے ایک ایسی بلائے ناگہانی نہ ہو گی جس نے منہ کھولا ہوا ہے۔ جنگ میں گئے نہیں کہ اس بلا کے منہ میں پڑے نہیں۔ اگر سچے دل سے جہاد کریں گے تو دو بھلائیوں میں ایک بھلائی تو بہرحال ملے گی۔ یا تو خطرے سے نجات اور فتح ملے گی اور یا شہادت اور جنت ملے گی۔ اور یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہو گی۔ یہ ہے وہ زاد راہ یعنی حقیقی ایمان جس کے نتیجے میں عزائم جوان اور پاؤں مضبوط اور جزع و فزع مفقود ہو جاتے ہیں اور انسان کو اطمینان اور قرار و ثبات ملتا ہے۔

اب ان کو نہایت سختی سے جہاد سے پیچھے رہنے کا انجام بتایا جاتا ہے کہ اگر انہوں نے اسلام سے منہ موڑ لیا تو انہیں معلوم ہے کہ اسلام سے قبل ان کی حالت کیا تھی۔ تم نے نفاق کے ساتھ اسلام قبول کیا ہے اس میں کتنے فائدے ہیں؟

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْآ اَرْحَامَكُمْ (۴۷ : ۲۲) "اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ تم الٹے منہ پھرو گے تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے"۔ یعنی تم سے تو یہی توقع ہے۔ ذرا سابقہ حالات کی روشنی میں دیکھو کہ اگر اسلام سے منہ موڑو گے تو سابقہ حالت کی طرف لوٹ کر ایک دوسرے کے اور اپنے ہی بھائیوں کے گلے کاٹو گے جس طرح اسلام سے قبل تھے۔ اسلام سے روگردانی سے ڈرانے کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی حقیقی صورت حال کیا ہے' اگر یہ اپنی موجودہ پوزیشن پر ہی ڈٹے رہے جس طرح کہ نظر آتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ (۴۷ : ۲۳) اَفَلَا

يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷ : ۲۴) "یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرہ بنا دیا۔ کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا' یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں؟" یہ لوگ نفاق کی بیماری میں بدستور مبتلا ہیں۔ درحقیقت وہ اس دعوت سے حقیقتاً منہ موڑ رہے ہیں جس میں وہ بظاہر داخل ہو چکے ہیں اور اس پر ان کا یقین بھی نہیں ہے۔ اس لئے

فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰى اَبْصَارَهُمْ (۴۷ : ۲۳) "اللہ نے ان کو بہرا اور اندھا بنا دیا ہے"۔ ان کی قوت سماعت تو موجود ہے اور قوت باصرہ بھی موجود ہے لیکن انہوں نے کانوں اور آنکھوں کو معطل کر دیا ہے یا سمع و بصر کے نتیجے میں جو ادراک حاصل ہوتا ہے اس کو معطل کر دیا ہے۔ گویا ان کے یہ حواس اپنا فریضہ منصبی ادا نہیں کر رہے۔

قرآن نہایت ہی سرزنش کے انداز میں پوچھتا ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (۴۷ : ۲۴) "کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے"۔ یوں کہ ان کی آنکھوں کے پردے زائل ہو جائیں کان سننے لگیں اور ان تک قرآن کے نور کی رسائی ہو' ان کے پردۂ شعور پر ارتعاش ہو' ان کے دلوں کے اندر جوش و خروش پیدا ہو' ان کا ضمیر مخلص ہو جائے اور ان کے اندر ایک ایسی زندگی آجائے جو قرآن کے نور سے منور ہو' اور وہ اس سے ہدایت اخذ کریں۔

اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷ : ۲۴) "یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں"۔ یہ قفل ان کے دلوں تک قرآن کے نور کو جانے نہیں دیتے۔ ان کے دل اس طرح بند ہیں جس طرح دروازے بند ہونے کی صورت میں انسان' ہوا یا کوئی چیز اندر نہیں جا سکتی اور نہ روشنی جا سکتی ہے۔

---000---

منافقین کے حالات ابھی جاری ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد ان کے منہ موڑنے کے اسباب کیا ہیں؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ یہودی سازش میں شریک ہو گئے ہیں اور انہوں نے ان کے ساتھ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ جو سازش تیار کریں گے یہ ان کی اطاعت کریں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَ اَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ

قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿٣٠﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَاۡ اَخْبَارَكُمْ ﴿٣١﴾

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اس سے پھر گئے ان کے لیے شیطان نے اس روش کو سہل بنا دیا ہے اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ ان کے لیے دراز کر رکھا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے۔ اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔ پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے اور ان کے منہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے؟ یہ اسی لیے تو ہو گا کہ انہوں نے اس طریقے کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے اور اس کی رضا کا راستہ اختیار کرنا پسند نہ کیا۔ اسی بنا پر اس نے ان کے سب اعمال ضائع کر دیے۔ کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے' یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور ان کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو۔ مگر ان کے انداز کلام سے تو تم ان کو جان ہی لو گے۔ اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے۔ ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں''۔

قرآن کریم نے ایمان لانے اور ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد ان کی جانب سے ایمان کو ترک کرنے کے عمل کو نہایت ہی حسی انداز میں پیش کیا ہے۔ یعنی واپسی اور الٹے پاؤں پھرنے کا عمل' اور اس کے اسباب یہ بتائے ہیں کہ شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی کی اور ان کے لیے اس برے کام کو خوبصورت بنا دیا یعنی ظاہری حرکت کہ ایک شخص الٹے پاؤں پھر رہا ہے اور معنوی حرکت اس انداز تعبیر میں دونوں نظر آتی ہیں جبکہ یہ منافق اپنی جانب سے اپنے ان اعمال کو اچھی طرح چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شیطان ان پر کس طرح مسلط ہو گیا اور کس طرح وہ ان کو مرتد بنانے میں کامیاب ہو گیا حالانکہ آغاز میں یہ لوگ ایمان لا چکے تھے' تو وجہ یہ تھی:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ (۴۷ : ۲۶) ''اسی لیے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے''۔ مدینہ میں یہودی تھے اور وہ نزول قرآن کے پہلے مخالف تھے کیونکہ ان کو توقع تھی کہ آخری رسول بھی یہودی ہو گا۔ رسالت کا خاتمہ ان پر ہو گا۔ یہ لوگ کافروں پر مکمل فتح کی توقع اس رسول کے دور میں کرتے تھے اور کافروں کو اس امر سے ڈراتے بھی تھے کہ جب نبی آخر الزمان آئے گا تو وہ پوری دنیا پر غالب ہو گا۔ اور پوری دنیا میں ان کو غلبہ حاصل ہو گا۔ اور پھر یہودیوں کی مملکت قائم ہو گی۔ لیکن اللہ نے آخری رسول ابراہیم علیہ السلام کی اس نسل سے بھیجا جو یہودی نہ تھی اور حضور اکرمؐ جب مدینہ ہجرت کر کے آئے تو انہوں نے اس ہجرت کو بھی پسند نہ کیا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کا رہا سہا اثر رسوخ بھی ختم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اول روز سے یہ لوگ رسول اللہؐ

کے خلاف جمع ہو گئے تھے اور آپؐ کے خلاف خفیہ سازشوں کی جنگ شروع کر دی تھی ـ کیونکہ بظاہر وہ میدان جنگ میں تو حضور اکرمؐ کے خلاف نہ جنگ کر سکتے تھے اور نہ اس کا کوئی جواز تھا ـ اس طرح یہودیوں کے ساتھ ہر وہ شخص شامل ہو گیا جو حضورؐ سے دشمنی رکھتا تھا ـ تمام منافقین ان سازشوں میں شریک ہو گئے اور یہ جنگ ان کے اور رسول اللہؐ کے درمیان چلتی رہی اور آخر کار حضور اکرمؐ نے ان کو جزیرۃ العرب سے جلاوطن کر دیا ـ

یہ منافقین جو ہدایت پانے کے بعد منافق ہو گئے تھے انہوں نے یہودیوں کو یہ یقین دہانی کرائی کہ ـ

سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ (۴۷ : ۲۶) "بعض معاملات میں ہم تمہاری اطاعت کریں گے" ـ اور راجح بات یہ ہے کہ یہ یقین دہانی خفیہ سازشوں کے سلسلے میں تھی جو وہ اسلام اور رسول اللہ کے خلاف تیار کرتے رہتے تھے ـ

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ (۴۷ : ۲۶) "اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے" ـ یہ نہایت ہی دھمکی آمیز تبصرہ ہے بلکہ دھمکی ہے کہ کریں یہ اپنی سازشیں ، ہم جانتے ہیں ان کا سب کچھ ـ اللہ کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں اور اللہ کی قوت کے مقابلے کی کوئی قوت نہیں ـ

---ooo---

یہ زندگی مختصر ہے اور آخر کار ہمارا لشکر جب پہنچے گا اور ان سے امانت حیات وصول کرے گا تو

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ (۴۷ : ۲۷) "پھر اس وقت کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روحیں قبض کریں گے اور ان کے منہ اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے انہیں لے جائیں گے؟"

یہ نہایت ہی خوفزدہ کرنے والا اور توہین آمیز منظر ہے ـ جب ان کی موت کا وقت ہو گا یہ بے بس ہوں گے ـ اس زمین پر سے رخصت ہو رہے ہوں گے اور دوسری حیات کا آغاز ہو رہا ہو گا ـ اور اس نئی زندگی کا آغاز یوں ہو رہا ہے کہ فرشتے ان کے منہ پر بڑی بے دردی سے تھپڑ مار رہے ہیں اور چوتڑوں پر ڈنڈے رسید کر رہے ہیں ـ حالانکہ بذات خود موت کا وقت نہایت ہی دردناک ہوتا ہے ـ خوف اور کرب کا وقت ہوتا ہے ـ لیکن یہ چونکہ الٹے پاؤں پھرے ہیں اس لیے ان کو چوتڑوں پر سزا مل رہی ہے ـ جیسی کرنی ویسی بھرنی ـ

---ooo---

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ

(۴۷ : ۲۸) "یہ اسی لیے تو ہو گا کہ انہوں نے اس طریقے کی پیروی کی جو اللہ کو ناراض کرنے والا ہے اور اس کی رضا کا راستہ اختیار کرنا پسند نہ کیا ـ اسی بنا پر اس نے ان کے سب اعمال ضائع کر دیئے" ـ

یعنی انہوں نے خود اپنے لیے یہ انجام پسند کیا ہے ـ انہوں نے خود اس طریقے کو اپنایا جو اللہ کو ناراض کرنے والا طریقہ ہے ـ یعنی نفاق ، معصیت اور اللہ کے دشمنوں اور اللہ کے دین کے دشمنوں اور اللہ کے رسول کے دشمنوں کے ساتھ مل کر سازشیں کرنا ـ انہوں نے خود اللہ کی رضامندی کو ناپسند کیا ـ اور اس کے حصول کی کوشش نہ کی بلکہ انہوں نے

وہ کام کیا جس سے اللہ ناراض ہوتا ہے اور غضب میں آتا ہے یوں اللہ نے ان کے تمام اعمال کو (حبط) کر دیا۔ جن پر وہ مست تھے اور جن کو وہ ناپسند کرتے تھے اور اپنے ان اعمال کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ ہم ان کے بہت ہی ماہر ہیں ـ یہ مومنین کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور یوں بظاہر ان کی یہ سازشیں غبارے کی طرح پھولی ہوئی ہوتیں اور طوفان کی طرح آتیں لیکن چشم زدن میں ختم ہو جاتیں۔

---ooo---

آخر میں کہا جاتا ہے کہ اللہ ستار ہے' لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو کہ اپنے اوپر اسلام کا جھوٹا لبادہ اوڑھے ہوئے ہو' اس کو اللہ اتار سکتا ہے اس لیے اب بھی باز آ جاؤ۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ (۲۹) وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ (۳۰) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِیْنَ وَ نَبْلُوَاْ اَخْبَارَكُمْ

(۳۱) (۴۷: ۲۹ تا ۳۱) "کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے' یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کے کھوٹ ظاہر نہیں کرے گا؟ ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور ان کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو۔ مگر ان کے انداز کلام سے تو تم ان کو جان ہی لو گے ـ اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے ـ ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں"۔

منافقین کو اپنی فنی مہارت پر پورا اعتماد تھا۔ اور وہ بالعموم اپنی سازشوں کو مسلمانوں سے چھپانے میں کامیاب رہتے تھے ـ قرآن مجید ان کو بتاتا ہے کہ یہ ان کی بہت ہی احمقانہ سوچ ہے ـ آخر خدا ہر چیز کو جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام بھیدوں کو کھول سکتا ہے ـ اور مسلمانوں کو بتا سکتا ہے کہ تمہارے دلوں میں ان کے خلاف کس قدر بغض بھرا ہوا ہے ـ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ـ

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ (۴۷: ۳۰) "ہم چاہیں تو انہیں تم کو آنکھوں سے دکھا دیں اور ان کے چہروں سے تم ان کو پہچان لو"۔ اگر ہم چاہیں تو ان کی ایک ایک شخصیت تم کو بتا دیں' یہاں تک کہ تم ایک ایک کو ان کی علامات سے پہچان لو۔

یہ آیت اس سے پہلے کی ہے جب اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے نام بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیئے تھے لیکن بہرحال ان کے لہجے' چالاکی' پیچ دار باتوں اور آپ کے خطاب سے غلط استدلال کرنے کی عادت کی وجہ سے آپ ان کو جانتے تھے ـ

وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ (۴۷: ۳۰) "مگر ان کے انداز کلام سے تو تم جان ہی لو گے"۔

بات اب صرف اللہ کے علم پر آکر رکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اعمال کو بھی جانتا ہے اور ان کے محرکات کو بھی جانتا ہے ۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ (۴۷ : ۳۰) ''اللہ تم سب کے اعمال سے خوب واقف ہے''۔ اس سے کوئی بات مخفی نہیں رہتی ۔ اب اللہ اسلامی سوسائٹی کو صاف کرنے کے لیے آزمائش کا اعلان فرماتا ہے ۔ یہ آزمائش پوری امت کی ہوگی ۔ اس آزمائش کے نتیجے میں صابر اور مجاہد جدا ہو کر ایک طرف آ جائیں گے اور ان کی خبریں عام ہو جائیں گی اور اسلامی صف میں کوئی مشکوک آدمی نہ رہے گا اور منافقین اپنی منافقت نہ چھپا سکیں گے ۔ وہ تو بہت ہی ضعیف لوگ ہیں ۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ نَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ

(۴۷ : ۳۱) ''ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہے''۔ اللہ تو تمام نفوس کے خفیہ خزانوں سے بھی واقف ہے ۔ اور زیر زمین معدنیات سے بھی واقف ہے ۔ اور انسانوں کی خفیہ اور چھپائی ہوئی باتوں کو بھی جاننے والا ہے ۔ اور جو معاملات ہونے والے ہیں ' ان کو اس طرح جانتا ہے جس طرح وہ عملاً ہو چکے ہوں ۔ اب اللہ مزید مجاہدین اور صابرین کو کس طرح جاننا چاہتا ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ انسانوں کے ساتھ انتہائی معاملہ کرتا ہے جس قدر ان کی قوت ' ان کی طبیعت اور ان کی استعداد کے مطابق کیا جا سکتا ہے ۔ انسان اس طرح نہیں جانتے جس طرح اللہ جانتا ہے ۔ لہٰذا یہ علم اور ظہور انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جانیں کہ مجاہدین اور صابرین کون ہیں ؟ اور پھر ان کو اس علم و ظہور سے نفع ہو ۔

آزمائش خواہ مشکلات میں ہو یا خوشحالی میں ' نعمتوں میں ہو یا مشقتوں میں ہو ' ہاتھ کھلے کرنے میں ہو یا معیشت کی تنگی میں ہو ' خوشی میں ہو یا غم میں ہو ' اس آزمائش کی وجہ سے نفوس کے اندر کی خفیہ صلاحیتیں کھل کر سامنے آ جاتی ہیں ۔ آزمائش کی وجہ سے لوگوں پر صلاحیتوں کا اظہار ہو جاتا ہے ۔ یہاں اللہ کے علم سے مراد وہ ظہور ہے جو لوگوں کو ابتلا میں ڈالنے سے ہو جاتا ہے ۔ اور لوگوں کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں ۔ (اللہ کے لیے یہ کوئی نیا علم نہیں ہوتا ' لوگوں کے لیے نیا ہوتا ہے) اور اسے لوگ بھی دیکھ لیتے ہیں ۔ ابتلا کے بعد لوگوں کی قابلیت کا معلوم ہو جانا ' جسے لوگ سمجھ سکیں ' لوگوں کے شعور اور ان کی شخصیت پر اس کا اثر ہوتا ہے اور یوں اللہ کی حکمت اپنا کام کرتی ہے ۔

لیکن اللہ کا حکم یہی ہے کہ انسان آزمائش طلب نہ کرے اور یہ دعا کرے کہ اللہ اپنی آزمائشوں سے بچائے اور عافیت اور رحمت میں رکھے ۔ لیکن اگر آزمائش آ جائے تو صبر کرے اور اس کو معلوم ہو کہ اس میں اللہ کی حکمت کام کر رہی ہے اور انسان اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی مشیت کے حوالے کر دے اور اللہ پر بھروسہ کرے کہ آزمائش کے بعد اللہ کی رحمت اور عافیت نصیب ہوگی ۔

ایک بڑے عابد اور صوفی حضرت فضیل رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب ان پر یہ آیت پڑھی جاتی تھی تو وہ روتے تھے اور یہ دعا کرتے تھے ۔ اللھم لا تبلنا فانك ان بلوتنا فضحتنا وھتکت استارنا وعذبتنا ''اے اللہ ' ہمیں آزمائش میں نہ ڈال ' اگر تو نے ہمیں آزمائش میں ڈالا تو ہمیں شرمندہ کر دے گا ' ہماری پردہ دری کر دے گا اور ہمیں عذاب میں مبتلا کر دے گا''۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۴۳ ایک نظر میں

یہ سبق اس سورت کا آخری سبق ہے ۔ اس کا آغاز ہوتا ہے اس آیت سے

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِمَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدٰی (۴۷ : ۳۲) "جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسول سے جھگڑا کیا جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی ...." یہ کون لوگ ہیں؟ زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے متعلق اس سورت کے آغاز میں بھی اسی انداز سے بات کی گئی تھی یعنی مشرکین مکہ کیونکہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے دعوت اسلامی کے مقابلے میں متکبرانہ رویہ اختیار کیا' رسول اللہؐ سے جھگڑتے ہوئے اور لوگوں کو اللہ کی راہ سے آخر تک روکتے رہے ۔ البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد عام کفار ہوں اور اس عتاب میں ہر وہ شخص آتا ہے جو کافر ہے اور یہ رویہ اپنائے ہوئے ہے' خواہ وہ مشرک ہے' یہودی ہے یا منافق ۔ ظاہراً یہ کام کر رہا ہے یا خفیہ کر رہا ہے ۔ سب کو یہ دھمکی دی گئی ہے کہ تم کچھ بھی نہ کر سکو گے لیکن پہلا مفہوم زیادہ مناسب ہے ۔

بہرحال اس دوسرے اور آخری سبق میں باقی باتوں کے مخاطب مسلمان ہیں ۔ ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کو جاری رکھیں ۔ اور اس میں کوئی دیر نہ کریں اور یہ تجویز بھی نہ دیں کہ کفار کے ساتھ امن و سالمیت کا رویہ مزید اختیار کیا جائے ۔ کیونکہ کفر نے ظلم کی انتہا کر دی ہے ۔ اور یہ مصالحت کسی بھی مصلحت کے پیش نظر نہیں ہونی چاہئے ۔ کسی کمزوری کی وجہ سے 'کسی رشتہ داری کی وجہ سے 'کسی مفاد کی وجہ سے 'کسی مالی تاوان کے ڈر کی وجہ سے ۔ جہاں تک مالی تاوان کا تعلق ہے اللہ اسی قدر مال کا مطالبہ فرماتا ہے جس قدر انسان کی استطاعت میں ہو ۔ اللہ نے انسان کے فطری بخل کو اس سلسلے میں مدنظر رکھا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ اس دعوت کی ذمہ داریاں نہ ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ اس کی ذمہ داری کسی اور پر ڈال دے گا ۔ اور کوئی دوسری جماعت اٹھا دے گا ۔ جو یہ ذمہ داریاں بحسن و خوبی ادا کریں گے ۔ اور جو اس کی اہمیت کو سمجھیں گے ۔ یہ ایک نہایت ہی خوفناک دھمکی ہے اور اس سورت کے مضامین اور فضا کے ساتھ لگا کھاتی ہے ۔ اور اس وقت مومنین کے صفوں میں جو حالات پائے جاتے تھے' یہ دھمکی ان کا بہترین علاج بھی تھی ۔ کیونکہ اس وقت منافقین کے علاوہ بھی ایسے لوگ تھے جو عافیت پسند تھے جبکہ مسلمانوں کی اکثریت فدائی' مخلص' بہادر اور مشہور تھی اس بارے میں روایات بھری پڑی ہیں ۔ اجازت قتال کے وقت چونکہ ہر قسم کے لوگ موجود تھے اور قرآن کریم ان کی تربیت کر کے ان کو اعلیٰ مراتب تک لے جا رہا تھا اس لئے یہاں یہ انداز تعبیر اختیار کیا گیا ۔

---ooo---

درس نمبر ۲۴۳ تشریح آیات

۳۲ ---تا--- ۳۸

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾ فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾ إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ إِنْ يَسْأَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوا وَيُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هَا أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْخَلُ وَمَنْ يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾

٤ ع ١٠ ٨

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسول سے جھگڑا کیا جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی' درحقیقت وہ اللہ کا کوئی نقصان بھی نہیں کر سکتے' بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا۔ اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کر لو۔ کفر کرنے والوں اور راہ خدا سے روکنے والوں اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہنے والوں کو تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا۔ پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو۔ تم ہی غالب رہنے والے ہو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔

یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشا ہے ۔ اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلتے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور وہ تمہارے مال تم سے نہ مانگے گا۔ اگر کہیں وہ تمہارے مال تم سے مانگ لے اور سب کے سب تم سے طلب کر لے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ ابھار لائے گا۔ دیکھو' تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔ اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں' حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے ۔ اللہ تو غنی ہے' تم ہی اس کے محتاج ہو۔ اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے"۔

یہ اللہ کا فیصلہ ہے ۔ نہایت ہی تاکیدی فیصلہ ۔ اللہ کا وعدہ ہے جو واقع ہونے والا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا' اسلام کی راہ روک کر کھڑے ہو گئے ۔ سچائی کے راستے میں وہ جم کر بیٹھ گئے کہ لوگوں تک یہ سچ بات پہنچنے نہ پائے ۔ اپنی قوت' اپنا مال اور اپنے تمام وسائل اس میں جھونک دیئے کہ اسلام پھیلنے نہ پائے ۔ پھر وہ ہر مقام پر رسول اللہ سے جھگڑنے لگے ۔ آپ کی زندگی میں آپ کی مخالفت کی ۔ آپ کے لائے ہوئے نظام زندگی کی مخالفت کی اور آپ کی صفوں کی مخالف صفوں میں کھڑے ہو گئے یا جنہوں نے حضورؐ کی وفات کے بعد دین اسلام کی مخالفت کی ۔ اسلامی نظام زندگی اور نظام شریعت کی مخالفت کی ۔ اور سنت نبویؐ اور دعوت اسلامی پر قائم لوگوں کی مخالفت کی ۔ اور یہ انہوں نے اس حال میں کی ۔

مِنْ بَعْدِمَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى (۴۷ : ۳۲) "جبکہ ان پر راہ راست واضح ہو چکی تھی"۔ اور ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ حق ہے ۔ لیکن یہ لوگ ہوائے نفس اور عناد کی وجہ سے اندھے ہو گئے ۔ اور مفادات اور مصلحتوں نے ان کو آخرت کے مفاد کے مقابلے میں دنیا کے مفادات کی طرف مائل کر دیا

اللہ کا تاکیدی فیصلہ ان لوگوں کے بارے میں یہ ہے اور یہ فیصلہ یقیناً نافذ ہونے والا ہے کہ ۔

لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا (۴۷ : ۳۲) "درحقیقت یہ اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے"۔ یہ لوگ اس قدر کمزور اور حقیر ہیں کہ یہ اللہ کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہی نہیں' لہٰذا مقصود اس کی نفی کرنا نہیں ہے ۔ مقصود یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کے دین' اللہ کے نظام شریعت اور اللہ کے داعیوں کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۔ وہ اللہ کے قوانین قدرت اور نظام فطرت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے ۔ اگرچہ وہ بہت ہی زور آور ہوں ۔ اگرچہ وہ ایک وقت تک بعض کمزور مسلمانوں کو ایذا دیتے رہے ہوں ۔ انجام ان کا کیا ہو گا؟

وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۳۲) "بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا"۔ یوں ان کی تمام سازشیں ختم ہو کر رہ جائیں گی اور نیست و نابود ہوں گی' جس طرح ایک ہٹا کٹا بیل زہریلی گھاس چرنے کے بعد پھول جاتا ہے اور پھر ڈھیر ہو جاتا ہے ۔

اس فضا میں جس کے اندر ان لوگوں کو دھمکی دی گئی جنہوں نے کفر کیا' اسلام کی راہ روکی اور رسول اللہؐ اور دین کے داعیوں کے ساتھ دشمنی کی' خود مسلمانوں کو بھی متنبہ کیا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت کریں اور اپنے اعمال کافروں کی طرح ضائع نہ کریں ۔

---ooo---

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ (۴۷ : ۳۳) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کر لو"۔

اس سخت ہدایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت مسلمہ کے اندر بھی ایسے لوگ تھے جو مکمل اطاعت سے گریزاں تھے یا یہ کہ ان پر مکمل اطاعت ذرا بھاری تھی اور بعض قربانیاں ان کو حد سے زیادہ لگ رہی تھیں لیکن اس وقت ایک قوی دشمن کے مقابلے میں یہ ضروری تھیں جس نے اسلام کی راہ روک رکھی تھی۔ اور یہ قوتیں اس وقت ہر طرف سے اسلام پر حملہ آور تھیں۔ اور ان مسلمانوں کے ان قوتوں کے ساتھ تجارتی' برادری اور رشتہ داری کے تعلقات بھی تھے۔ اور اس وقت ان سب تعلقات کو کاٹ دینا ان کو مشکل معلوم ہوتا تھا۔ جس طرح اسلامی دعوت اور نظریہ کا تقاضا تھا کہ اب یہ تمام تعلقات کٹ جائیں۔

سچے مسلمانوں پر ان ہدایات کا بڑا شدید اثر ہوا تھا۔ وہ ایک بار تو ان دھمکیوں کے نتیجے مین کانپ اٹھے تھے اور وہ ہر وقت ڈرتے تھے کہ شاید ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس سے ان کے اعمال ہی اکارت جائیں۔

امام احمد ابن نصر المروزی نے کتاب الصلوۃ میں روایت کی ہے۔ ابو قدامہ سے 'انہوں نے وکیع سے 'انہوں نے ابو جعفر رازی سے انہوں نے ربیع ابن انس سے 'اور انہوں نے ابو العالیہ سے' جو کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء یہ خیال کرتے تھے کہ لا الہ الا اللہ پڑھ لینے کے بعد کوئی گناہ مضر نہیں ہے جبکہ شرک کے ساتھ کوئی عمل مفید نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ (۴۷ : ۳۳) "اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو"۔ اس کے بعد وہ ڈرنے لگے کہ کوئی گناہ دوسرے اعمال کو برباد نہ کر دے۔

حضرت عبداللہ بن المبارک سے منقول ہے کہ 'بکر ابن معروف نے' مقاتل ابن حیان سے 'انہوں نے نافع سے' اور انہوں نے حضرت ابن عمر سے' روایت کی ہے' وہ کہتے ہیں: "ہم رسول اللہؐ کے ساتھی یہ خیال کرتے تھے نیکیاں سب کی سب مقبول ہوں گی' یہاں تک کہ آیت۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ (۴۷ : ۳۳) "اطاعت کرو اللہ کی' اور اطاعت کرو رسول اللہؐ کی اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو"۔ نازل ہوئی' تو ہم نے سوچا کہ وہ کیا چیز ہے جو ہمارے اعمال کو ضائع کر دے گی۔ تو ہم نے کہا کہ کبائر اور موجبات اور فواحش ہوں گے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی'۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ "اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اور اس کے سوا کسی کے جو گناہ چاہے' معاف کر دے"۔ جب یہ آیت نازل

ہوئی تو ہم نے ایسا کہنا چھوڑ دیا تاہم کبائر گناہوں کے ارتکاب کرنے والوں کے انجام سے ڈرتے تھے۔ فواحش کے مرتکبین سے ڈرتے تھے اور جو ان سے بچتا ہو' اس کے انجام کے بارے میں پرامید تھے۔

ان نصوص سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سچے مسلمان ان نصوص کو کس طرح لیتے تھے۔ وہ کس طرح مضطرب اور چوکنے ہو جاتے تھے۔ وہ کس طرح کانپ اٹھتے تھے اور ڈرتے رہتے تھے' وہ کس طرح محتاط رہتے کہ وہ کہیں ان کی زد میں نہ آ جائیں۔ وہ کس طرح ہر وقت سوچتے رہتے تھے کہ ان کی زندگی نصوص الہی کے مطابق ہو' اور وہ اس تیز احساس کے ساتھ آیات الٰہیہ کو لیتے تھے' اس لیے وہ اس انداز کے مسلمان تھے۔

---○○○---

اگلی آیت میں بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ رسول اللہؐ سے دشمنی کرتے ہیں اور آپ کی اطاعت سے دور ہو جاتے ہیں اور ایسے رویے پر اصرار کرتے ہیں اور اس دنیا سے کافر ہو کر مرجاتے ہیں ان کا انجام کیا ہو گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (۴۷ : ۳۴) "کفر کرنے والوں اور راہ خدا سے روکنے والوں اور مرتے دم تک کفر پر جمے رہنے والوں کو تو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا"۔

مغفرت کے لیے اس دنیا میں ہر کسی کو مہلت دے دی گئی ہے۔ اور توبہ کا دروازہ کافروں اور گناہگاروں پر اس وقت تک کھلا ہے جب تک سکرات موت شروع نہیں ہو جائے۔ جب روح حلقوم تک آن پہنچے تو اس وقت خالص آخری لمحات میں توبہ کا دروازہ بند ہوتا ہے اور اس وقت موقعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔

---○○○---

اس قسم کی آیات جس طرح کافروں اور منافقین کو خطاب کر رہی ہیں۔ اس طرح خود مسلمانوں کو بھی دعوت دے رہی ہیں۔ یہ آیات کافروں کو متنبہ کرتی ہیں کہ کوتاہیوں کا تدارک کرو' توبہ کرو قبل اس کے کہ سکرات شروع ہو جائیں اور مسلمانوں کو ان آیات کا خطاب یوں ہے۔ کہ تم ان اسباب اور ان راہوں سے دور رہو جو تمہیں اس انجام تک پہنچا سکتی ہیں۔ اس آیت میں مسلمانوں اور کافروں دونوں کو خطاب یوں ہے کہ اگلی آیت میں دعوت اور جہاد میں سستی کو اس آیت پر مرتب کیا گیا ہے کہ اس انجام سے بچو اور سستی نہ کرو۔

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ یَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (۴۷ : ۳۵) "پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو۔ تم ہی غالب رہنے والے ہو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔

یہ ہے وہ بات جس سے مسلمانوں کو ڈرایا جا رہا ہے۔ ان کے سامنے ان کافروں کا انجام رکھا جاتا ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑتے تھے تاکہ مسلمان اس کے تصور سے بھی ڈریں۔ اس ڈراوے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے

کہ اس وقت مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو جہاد کی مسلسل مشقتوں کو ایک بھاری حکم سمجھتے تھے۔ اور ان کے عزم میں کمزوری تھی۔ اور یہ لوگ امن و عافیت چاہتے تھے تاکہ جنگ کی مشقتوں سے آرام میں رہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں میں سے بعض کی مشرکین کے ساتھ رشتہ داریاں بھی ہوں یا ان کے ساتھ مالی معاملات میں شراکت ہو' اس زاویہ سے یہ لوگ امن اور صلح کو پسند کرتے ہوں کیونکہ انسان ہمیشہ انسان رہا ہے اور قرآن کریم ان بشری اور فطری کمزوریوں کا علاج اپنے انداز سے کر رہا ہے۔ اور قرآن مجید نے اس طرح جو تربیت جاری رکھی تو اس کے نتیجے میں دور اول میں ایک معجزانہ گروہ تیار ہو گیا۔ لیکن ان مساعی اور کامیابیوں کے باوجود اس بات کی نفی نہیں کی جا سکتی کہ جماعت مسلمہ کی صفوں میں کمزور لوگ ہوں۔ خصوصاً ایسے ابتدائی مدنی دور میں چنانچہ اس آیت میں بعض ایسی ہی کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ قرآن کریم کس طرح لوگوں کو لیتا تھا۔ ہمیں بھی چاہئے کہ قرآنی انداز کے مطابق دور جدید کے لوگوں کی تربیت کریں۔

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ

(۴۷ : ۳۵) "پس تم بودے نہ بنو' اور صلح کی درخواست نہ کرو' تم ہی غالب رہنے والے ہو' اللہ تمہارے ساتھ ہے' اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔

تم چونکہ غالب ہو اس لیے صلح کی درخواست نہ کرو' تم اعتقاد اور تصور حیات کے اعتبار سے بلند ہو' تم خدا سے تعلق کے زاویہ سے بھی بلند ہو' تمہارا آقا بلند ہے' نظام زندگی' مقاصد زندگی اور مقصود زندگی کے اعتبار سے بھی تم بلند ہو' شعور' اخلاق اور طرز عمل کے اعتبار سے تم بلند ہو۔ قوت' مرتبے اور ذریعہ نصرت کے اعتبار سے بھی تم بلند ہو۔ تمہاری پشت پر بہت بڑی قوت ہے واللہ معکم۔ تمہارے ساتھ تو اللہ ہے۔ تم اکیلے تو نہیں ہو' تم ایک نہایت ہی بلند اور جبار اللہ تعالیٰ کے زیر تربیت ہو جو قادر مطلق ہے۔ وہ تمہارا مددگار ہے اور ہر وقت حاضر و ناظر ہے اور تمہارے ساتھ ہے۔ وہ تمہاری مدافعت کرتا ہے تمہارے اعداء کی حیثیت کیا ہے' جب کہ تمہارے ساتھ اللہ ہے۔ تم جو کچھ خرچ کرتے ہو' اور جو کچھ کرتے ہو اور تمہیں جو مشقتیں پہنچتی ہیں۔ ان کا حساب رکھا جا رہا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ضائع نہیں ہوتی۔

وَ لَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (۴۷ : ۳۵) "اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔ اللہ تمہارے اعمال میں کوئی کٹوتی نہ کرے گا کہ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو اور اس کا معاوضہ تمہیں نہ ملے۔

نیز کمزوری دکھانے اور صلح چاہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اعلیٰ ہو' وہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہو گا لہٰذا تم مکرم' ماجور اور منصور ہو۔

---ooo---

یہ تو ہے پہلا ٹچ اور دوسرا یہ کہ ان کو بتا دیا جاتا ہے کہ امن و عافیت تم جس دنیا کے لیے طلب کرتے ہو' اس کی حیثیت کیا ہے؟ ٹھیک ہے اس میں تمہیں بعض قربانیاں تو دینی ہوں گی' لیکن آخرت میں کامل اجر تمہیں ملیں گے اور تم

سے تمہارے مال بھی طلب نہ کرے گا۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَ لَا يَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ (۴۷ : ۳۶) "یہ دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشا ہے۔ اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلتے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور وہ تمہارے مال تم سے نہ مانگے گا"۔

اگر ہماری اس دنیاوی زندگی کے پیچھے کوئی اعلیٰ اور ارفع مقصد نہ ہو تو وہ یقیناً لہو و لعب ہے۔ اگر اس دنیا میں اسلام کے اعلیٰ مقاصد اور اسلامی نظام کے قیام کے ارفع مقاصد نہ ہوں تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔ اسلام کا مقصد زندگی اس دنیا کو آخرت کی کھیتی بنا دیتا ہے۔ اور اس میں اللہ کی خلافت کے حقوق کو اچھی طرح ادا کرنا ہی قیامت میں اچھے نتائج پیدا کرتا ہے۔ آیت کا دوسرا فقرہ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے:

وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ (۴۷ : ۳۶) "اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا"۔ اس دنیا میں ایمان لانا اور تقویٰ اختیار کرنا ہی اس کو لہو و لعب کے دائرے سے نکال دیتا ہے۔ اور اسے ایک سنجیدہ مقام عطا کرتا ہے اور اسے حیوانی سامان تعیش سے ذرا بلند مقام دیتا ہے۔ دنیا کا نظام پھر نظام خلافت راشدہ بن جاتا ہے اور یہ عالم بالا کے ساتھ پیوستہ ہوتا ہے۔ جب اسلامی نظام اور قانون شریعت نافذ کر دیا جائے تو پھر مومن کی اس دنیا کی زندگی بھی لہو و لعب کے دائرے سے نکل کر ایک عبادت بن جاتی ہے اور مومن کو اس کی تمام سرگرمیوں پر آخرت میں اجر ملتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے اللہ لوگوں سے یہ مطالبہ نہیں فرماتا کہ وہ اپنے تمام اموال خرچ کر دیں۔ اسلام دوسرے فرائض اور واجبات میں بھی لوگوں کو مشقت میں نہیں ڈالتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ انسان فطرتاً تھڑدلا ہے۔ اس لیے اللہ نے لوگوں پر ان کی طاقت کے مطابق بوجھ ڈالا ہے۔ اس لیے اللہ نے لوگوں پر رحم کرتے ہوئے انہیں یہ حکم نہیں دیا کہ وہ سب مال خرچ کر دیں ورنہ ان کے دل کا کھوٹ ظاہر ہو جاتا۔

---ooo---

اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَ يُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ (۴۷ : ۳۷) "اگر کہیں وہ تمہارے مال تم سے مانگ لے اور سب کے سب تم سے طلب کرلے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کھوٹ ابھار لائے گا"۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ کے احکام کس قدر حکیمانہ ہیں، جس طرح اس سے اللہ کی رحمت اور مہربانیوں کا اظہار ہوتا ہے کہ دین اسلام میں جو فرائض و واجبات مقرر کیے گئے ہیں وہ فطرت کے عین مطابق ہیں اور اس میں انسانوں کی بشری کمزوریوں اور انسانی استعداد کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ اسلام ایک ربانی نظام زندگی ہے۔ اور یہ انسانوں کے لیے ایک ربانی نظام تجویز کرتا ہے۔ یہ نظام ایک ربانی نظام اس زاویہ سے ہے کہ اس کے قواعد اللہ نے بنائے ہیں اور یہ انسانی اس لحاظ سے ہے کہ اس میں انسان کی استعداد، قوت اور ماحول کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور اللہ ہی ہے جو ان کے لیے نظام تجویز کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی مخلوق سے اچھی طرح واقف ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔

---ooo---

آخر میں ان کی واقعی صورت حالات ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے کہ ان حالات میں انفاق فی سبیل اللہ کی ضرورت ہے ۔ قرآن اپنے خوبصورت انداز میں ان کے دلوں کے بخل کا علاج کرتا ہے ۔ جس طرح قرآن نے جانی قربانی کے سلسلے میں ان کی تربیت کی ۔

هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷ : ۳۸) "دیکھو' تم لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو ۔ اس پر تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو بخل کر رہے ہیں' حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے ۔ اللہ تو غنی ہے' تم ہی اس کے محتاج ہو ۔ اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے" ۔

قرآن کریم اس وقت کے معاشرے کا نقشہ نہایت ہی خوبصورتی سے کھینچتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ ہر معاشرے میں مالی انفاق کی دعوت کے سلسلے میں بعض لوگوں کا طرز عمل دوسروں سے مختلف ہوتا ہے ۔ بعض مالی اعتبار سے بخل کرتے ہیں' بعض ایسے ہوتے ہیں جو فیاض ہوتے ہیں ۔ یہی صورت حالات ابتدائی اسلامی معاشرے کی تھی جس کو روایات میں اچھی طرح قلم بند کیا گیا ہے اور قرآن کریم نے بھی دوسرے مقامات پر تفصیلات دی ہیں ۔ اسلام نے اس میدان میں معجزانہ مثالیں پیش کی ہیں ۔ لوگوں نے جو دوستی اور جوانمردی میں بے پناہ قربانیاں دیں لیکن ان مثالوں کے باوجود مالی لحاظ سے بخل پایا جاتا ہو گا' بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو جان تو دیتے ہوں گے لیکن ان کے لیے مال دینا مشکل ہو گا ۔

یہی وہ کنجوسی ہے جس کا علاج قرآن مجید اس آیت میں کر رہا ہے ۔

وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (۴۷ : ۳۸) "حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے" ۔ کیونکہ اللہ کی راہ میں جو لوگ خرچ کر رہے ہیں وہ دراصل خود انہی کے بینک میں جمع ہو رہا ہے ۔ اور یہ بچت دراصل ان کو اس وقت کام آئے گی جہاں پر کچھ بھی آمدن نہ ہو گی ۔ جب ان کو زمین سے اٹھایا جائے گا اور ان کے پاس ان کی مملوکات میں سے کچھ بھی نہ ہو گا ۔ لہٰذا وہاں یہی کمائی اور بچت ان کے کام آئے گی ۔ اس لیے آج اگر وہ اس مد میں خرچ کرنے سے بخل کرتے ہیں تو یہ بخل وہ خود اپنے خلاف کر رہے ہیں ۔ وہ اپنی بچتوں میں کمی کر رہے ہیں اور خود اپنا مال کم کر رہے ہیں اور خود اپنے آپ کو محروم کر رہے ہیں ۔

اور اللہ جو ان سے انفاق فی سبیل اللہ کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ بھی خود ان کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے ۔ یہ انہی کے لیے زیادہ بچت ہوتی ہے انہی کا خزانہ اور ذخیرہ بڑھتا ہے ۔ اللہ کو اس مال سے کچھ فائدہ نہیں ہے اور نہ اللہ کو ایسے کسی مال کی ضرورت ہے ۔

وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (۴۷ : ۳۸) "اللہ غنی ہے اور تم اس کے محتاج ہو"۔ وہی ہے' جس نے تمہیں یہ مال دیا ہے۔ اس مال سے جو تم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو اللہ اسے تمہارے ہی لیے جمع کرتا ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ تمہیں دیا ہے' اس کا وہ کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ وہ آخرت میں تمہارے جمع کیے ہوئے مال سے بھی غنی ہے۔ تم اس دنیا میں بھی فقراء اور اس کے محتاج ہو اور آخرت میں بھی فقراء اور اس کے محتاج ہو۔ اس دنیا میں جو تمہیں رزق اور نعمتیں درکار ہیں' تم ان کے محتاج ہو۔ اور اجر آخرت میں بھی محتاج ہو۔ یہ تو اللہ ہی ہے جو یہاں اور وہاں دونوں جگہ تم پر فضل کرتا ہے اور تم اس کا کوئی صلہ نہیں دے سکتے ہو' تم یہاں بھی محتاج ہو اور وہاں بھی۔

اس لیے بخل اور کنجوسی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ تمہارے پاس جو دولت ہے وہ بھی اسی کی دی ہوئی ہے اور آخرت میں وہ جو اجر دے گا وہ بھی اس کا فضل ہو گا۔ اس لیے تم جو خرچ کرتے ہو وہ بھی اللہ ہی کا فضل ہے۔

اور آخری اور دو ٹوک بات کہ اللہ نے جو تمہیں اپنی دعوت کے لیے چنا ہے۔ یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہے اور تمہارے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو اس کا اہل نہ بنایا اور اس کی ذمہ داریاں پوری نہ کیں تو اللہ تمہارے انتخاب کو واپس لے لے گا۔ اور کسی دوسری قوم کو اس کام کے لیے منتخب کر دے گا۔ اور یہ اس قوم پر اللہ کا احسان ہو گا اور وہ اس انتخاب کی قدر کریں گے!

وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (۴۷ : ۳۸) "اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے"۔ جن لوگوں نے ایمان کا مزہ چکھا ہے' ان کے لیے تو یہ بہت ہی خوفناک دھمکی ہے کہ تمہیں ہٹا کر کسی دوسری قوم کو لے آیا جائے گا۔ اس شخص کے لیے یہ بہت ہی بڑی دھمکی ہے جس کو احساس ہو کہ دعوت اسلامی اور خیر امت کی ذمہ داری سپرد کر کے اللہ نے ان کو بہت بڑا اعزاز بخشا ہے کیونکہ جو شخص اللہ کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے اسے اللہ نے عظیم امانت سپرد کی ہے۔ وہ اس زمین پر اللہ کی سند اور سہارے سے چلتا ہے۔ اس کے وجود میں اللہ کا نور ہے۔ وہ آتا ہے اور جاتا ہے اور اس پر اپنے آقا کی علامات ہیں۔

اگر کسی نے ایمان کی مٹھاس کو چکھ لیا ہو اور پھر اس سے سلب کر لیا جائے تو یہ خسارہ وہی محسوس کر سکتا ہے' یہ بے عزتی وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے دربار کبریائی میں باریابی پائی ہو' اعزاز پایا ہو اور پھر اسے دھتکار دیا جائے اور اس کے پیچھے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ بلکہ ایسے واصلین حق کی زندگی تو جہنم بن جاتی ہے جو حق تعالیٰ تک پہنچ چکے ہوں اور پھر دور ہو جائیں اور ان کے سامنے پردے حائل ہو جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان ایک بہت بڑی عطا ہے۔ اس کی قیمت کی کوئی چیز اس کائنات میں نہیں ہے۔ اور یہ پوری انسانی زندگی اور پوری زمین کی دولت اس کے مقابلے میں ہیچ ہے جب ترازو کے ایک پلڑے میں ایمان ہو اور دوسرے میں یہ پوری کائنات ہو۔

اس لیے یہ دھمکی اتنی بڑی دھمکی ہے جو مومن کو دی جا سکتی ہے اور یہ دھمکی' ذرا غور کیجئے' اللہ کی طرف سے ہے!

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ------ ۲۶

سورۃ الفتح ۔ ۴۸

آیات ۱--- تا--- ۲۹

سورۃ الفتح ایک نظر میں

یہ مدنی سورت ہے اور یہ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ ہجری کو نازل ہوئی ۔ اس میں اسی اہم واقعہ اور اس کی تفصیلات پر تبصرہ ہے ۔ اس سورت میں اس وقت جماعت مسلمہ کے جو حالات تھے وہ بیان کیے گئے ہیں ۔ قرآنی ترتیب کے مطابق اس سے پہلی سورت 'سورت محمد ہے لیکن سورت محمد اس سے تین سال پہلے نازل ہوئی تھی ۔ اور اس عرصہ میں مدینہ میں اسلامی سوسائٹی میں اور مسلمانوں کے حالات میں کافی تبدیلیاں واقع ہوگئی تھیں ۔ جماعت مسلمہ کے موقف اور اس کے مخالفین کے موقف میں بھی تبدیلیاں ہوگئی تھیں ۔ جماعت کی تربیت اور اس کی نفسیاتی اور ایمانی کیفیت میں بڑے ہی تغیرات ہوگئے تھے ۔ جماعت مسلمہ ایمانی اور اخلاقی لحاظ سے نہایت پختہ اور گہرے ادراک کی حامل ہوگئی تھی ۔

اس سے قبل کہ ہم اس سورت کے مضمون اور اس کی فضا پر بحث کریں مناسب ہے کہ اس واقعہ کی تفصیلات دے دی جائیں جس کے بارے میں یہ نازل ہوئی ہے تاکہ ہم بھی اس فضا میں زندہ رہیں جس میں مسلمان زندہ رہتے تھے اور ان پر یہ سورت نازل ہو رہی تھی ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ خانہ کعبہ میں داخل ہو رہے ہیں اور مسلمان بھی آپ کے ساتھ ہیں' سر منڈائے ہوئے یا بال کتوائے ہوئے ۔ ہجرت کے بعد مشرکین مکہ نے خانہ کعبہ میں مسلمانوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا ۔ اور یہ داخلہ حرام مہینوں میں بھی ممنوع تھا حالانکہ ان کا احترام ایام جاہلیت میں بھی سب عرب کرتے تھے ۔ ان مہینوں میں لوگ اسلحہ اتار دیتے تھے ۔ ان ایام میں جنگ اور قتال کو بہت ہی برا سمجھتے تھے' خصوصاً مسجد حرام سے کسی کو روکنا تو بہت ہی بڑا جرم تھا ۔ جن لوگوں نے ایک دوسرے سے قصاص لینا ہوتا تھا وہ بھی اس حرمت کے سائے میں اکٹھے پھرا کرتے تھے ۔ ایک شخص اپنے باپ اور بھائی کے قاتل کو بھی ملتا اور وہ اس پر تلوار نہ اٹھاتا ۔ اور نہ اسے مسجد حرام سے روکتا ۔ لیکن مسلمانوں کے معاملے میں انہوں نے اپنی نہایت ہی پختہ روایات کو بھی توڑ دیا ۔ اور رسول اللہؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو ہجرت کے بعد چھ سال تک بیت اللہ سے روکے رکھا ۔ یہ ۶ ہجری تھا کہ رسول اللہؐ نے یہ خواب دیکھا ۔ آپؐ نے اپنا خواب صحابہ کرام کے سامنے بیان کر دیا ۔ اس لیے وہ بہت خوش ہوئے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دی ۔

ہمارے لیے ابن ہشام اعلیٰ ترین ذریعہ ہیں ۔ انہوں نے جس طرح اس واقعہ کی تصویر کھینچی ہے وہ بخاری شریف کی روایت اور امام احمدؒ کی روایت سے متفق بھی ہے ۔ علامہ ابن حزم نے جوامع السیرۃ میں جو روایات دی ہیں ان سے بھی متفق ہے ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں' اس کے بعد (یعنی غزوۂ بنی المصطلق اور اس کے بعد کے واقعہ افک کے بعد) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں رمضان اور شوال کا مہینہ رہے ۔ اور ذوالقعدہ کے مہینے میں عمرہ کے لیے نکلے ۔ آپ کا ارادہ جنگ کا نہ تھا ۔ اور مدینہ کے ارد گرد تمام دیہاتی عربوں کو بھی حکم دیا کہ وہ آپ کے ساتھ عمرہ کے لیے چلیں ۔ آپؐ کو قریش

سے اندیشہ تھا کہ وہ رکاوٹ ڈالیں گے ۔ جنہوں نے اس مقصد کے لیے تیاریاں بھی کر لی تھیں کہ آپ ؐ کو بیت اللہ میں داخل نہ ہونے دیں گے ۔ اکثر دیہاتی اس سفر میں شریک نہ ہوئے' اور آپ ؐ کے ساتھ مہاجرین اور انصار ہی نکلے ۔ اور بعض وہ لوگ بھی تھے جو دوسرے عرب قبائل سے ساتھ ہو لیے تھے ۔ آپ ؐ نے ہدی کا جانور بھی لیا ۔ عمرے کا احرام باندھا تاکہ لوگ یہ یقین کر لیں کہ حملے کا ارادہ نہیں ہے اور یہ کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ بیت اللہ کا احترام کرتے ہیں اور صرف زیارت کعبہ کے لیے نکلے ہیں ۔ ابن اسحاق نے کہا کہ حضرت جابر ابن عبداللہ فرمایا کرتے تھے کہ حدیبیہ میں ہماری تعداد ۱۴۰۰ تھی ۔

زہری کہتے ہیں کہ جب یہ قافلہ عسفان کو پہنچا (یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان دو مراحل سفر پر ہے) تو حضور ؐ کو بشر ابن سفیان الکعبی ملے ۔ انہوں نے اطلاع دی کہ قریش کو آپ کے قافلے کا پتہ لگ گیا ہے ۔ اور انہوں نے اپنے ساتھ کنواریوں اور بچوں والیوں کو بھی نکال لیا ہے ۔ انہوں نے شیروں کی کھالیں پہن رکھی ہیں اور وادی ذی طوی میں خیمہ زن ہیں اور وہ اللہ کے ساتھ پختہ عہد کیے ہوئے ہیں کہ آپ کو مکہ میں داخل ہونے نہ دیں گے ۔ اور یہ ہیں خالد ابن ولید جسے انہوں نے اپنے سواروں کے ساتھ کراع الغمیم تک بھیج دیا ہے ۔ (یہ عسفان سے آٹھ میل آگے ایک بستی ہے) اس پر حضور ؐ نے فرمایا "ہلاکت ہے قریش کے لیے 'کھا گئی ان کو جنگ ان کا کیا بگڑتا اگر وہ مجھے اور دوسرے عربوں کو لڑنے کے لئے چھوڑ دیتے' اگر مجھے دوسرے عرب مار لیتے تو یہی ان کا مقصد تھا' اور اگر مجھے اللہ عربوں پر غالب کر دیتا تو یہ لوگ بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہوتے ۔ اور اگر وہ اسلام میں داخل نہ ہوتے تو اگر وہ لڑتے تو ان کے پاس "قوت" تو ہوتی ۔ قریش غلط سوچ رہے ہیں ۔ خدا کی قسم میں جہاد کرتا رہوں گا' اس نظام کے لیے جس کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے ۔ یہاں تک کہ اللہ مجھے غالب کر دے یا میری یہ گردن کٹ جائے پھر حضور ؐ نے فرمایا "کون ہے جو ہمیں اس راستے سے علیحدہ کسی دوسرے راستے پر لے جائے جس میں یہ لوگ نہ ہوں؟"

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھے عبداللہ ابن ابوبکر نے بتایا کہ قبیلہ اسلم کے ایک شخص نے کہا حضور ؐ میں لے جاؤں گا ۔ کہتے ہیں یہ ان کو سخت اور پتھریلے راستے سے لے گیا اور یہ راستہ پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتا تھا ۔ جب لوگ اس کے ساتھ چلے تو یہ راستہ لوگوں کے لیے بڑا دشوار ثابت ہوا ۔ جب یہ وادی سے گزر کر آخر میں ہموار زمین کی طرف نکلے تو رسول اللہ نے لوگوں سے کہا پڑھو ۔

نَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَنَتُوْبُ اِلَيْهِ "ہم اللہ سے معافی چاہتے ہیں اور اس کی طرف لوٹتے ہیں" ۔ تو لوگوں نے یہ دعا پڑھی تو حضور ؐ نے فرمایا "ایسا ہی ایک مرحلہ تھا کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ تم ایسی دعا پڑھو تو انہوں نے انکار کر دیا تھا" (یہاں رسول اللہ کا اشارہ اس طرف سے جو قرآن کریم میں آیا ہے ۔

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۸)

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ (۵۹) (۲ : ۵۸ ، ۵۹) "شہر بستی کے دروازے سے سجدہ ریز ہو کر داخل ہونا اور کہتے جانا حطہ حطہ ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے ۔ اور نیکو کاروں کو مزید فضل و کرم سے نوازیں گے ' مگر جو بات ان سے کہی گئی تھی' ظالموں نے اسے بدل کر کچھ اور کر دیا) ۔

ابن شہاب زہری نے کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ اب دائیں جانب سے ' حمض کے پیچھے سے ثنیۃ المرار کی راہ سے مکہ کے نچلے علاقے میں حدیبیہ کے مقام پر اترو' چنانچہ یہ لشکر اسی راہ سے چلا ۔ جب قریش کے سواروں نے لشکر اسلام کے غبار کو دیکھا کہ یہ تو دوسرے راستے سے نکل گیا ہے تو وہ قریش کی طرف تیزی سے لوٹے ۔ رسول اللہ جب ثنیۃ المرار سے گزر رہے تھے تو آپؐ کی اونٹنی بیٹھ گئی ۔ تو لوگوں نے کہا کہ "اونٹنی اڑ گئی" ۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "اڑی نہیں اور نہ اس کی ایسی عادت ہے لیکن دراصل اسے اس ذات نے روک لیا ہے جس نے ہاتھی کو مکہ سے روکا تھا ۔ آج قریش اگر مجھے کسی ایسی بات کی دعوت دیں جس میں وہ صلہ رحمی کے طالب ہوں تو میں ان کی بات مان لوں گا" ۔ اور بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ "وہ کوئی ایسی بات مجھ سے طلب کریں جس کا مقصد اللہ کی حرمتوں کو بچانا ہے تو میں ضرور ان کی بات مانوں گا" ۔
اس کے بعد لوگوں سے فرمایا کہ یہاں قیام کر لو' تو لوگوں نے کہا حضورؐ یہاں تو پانی نہیں ہے ۔ جس کے اوپر ہم قیام کریں ۔ حضورؐ نے ترکش سے ایک تیر نکالا اور اسے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو دیا ۔ وہ شخص وہاں کے حوضوں میں سے ایک حوض میں گیا اور وہ تیر وہاں گاڑ دیا اور وہاں سے صاف پانی نکل آیا ۔

جب حضورؐ اطمینان سے اتر گئے تو ان کے پاس بدیل ابن ورقہ الخزاعی آیا اور ان کے ساتھ خزاعہ کے دوسرے کچھ لوگ بھی تھے ۔ انہوں نے حضورؐ سے باتیں کیں اور آپؐ سے پوچھا کہ آپؐ کے آنے کا مقصد کیا ہے ۔ تو آپؐ نے ان کو بتایا کہ میرے آنے کا مقصد لڑنا نہیں ہے ۔ میں صرف زیارت کعبہ کے لیے آیا ہوں اور اللہ کی حرمتوں کا احترام کرتا ہوں ۔ اس کے بعد آپ نے ان سے بھی وہ بات کی جو بشر ابن سفیان سے کی تھی ۔ یہ لوگ واپس ہوئے اور قریش سے کہا' اے قوم قریش تم محمدؐ کے معاملے میں جلد بازی سے کام لے رہے ہو' محمدؐ جنگ کے لیے نہیں آئے ۔ وہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں' قریش نے ان پر الزام لگایا اور برا بھلا کہا ۔ قریش نے کہا کہ درست ہے کہ وہ جنگ کے لیے نہیں آیا لیکن ہم زبردستی مکہ میں داخل ہونے نہ دیں گے اور ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ عرب یہ کہیں کہ محمدؐ آیا اور زبردستی مکہ میں داخل ہو کر چلا گیا ۔

خزاعہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت ہی مخلصین میں سے تھے ۔ ان لوگوں نے حضورؐ سے معاہدہ امن اور دوستی بھی کر لیا تھا (بعد میں ان کے احوال آئیں گے) ان میں مسلمان تھے یا مشرک تھے' وہ مکہ میں ہونے والی کسی کارروائی کو حضورؐ سے نہ چھپاتے تھے ۔ اس کے بعد قریش نے حضورؐ کے پاس مکرز ابن حفص ابن الاخیف' بنو عامر ابن لوئی کے بھائی کو بھیجا ۔ جب رسول اللہؐ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو فرمایا : "یہ ایک غدار شخص ہے" ۔ جب یہ رسول اللہؐ کے پاس آیا تو اس کے ساتھ بھی رسول اللہؐ نے وہی باتیں کی تھیں جو بدیل اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیں ۔ یہ واپس ہوا اور اس نے بھی مشرکین کو رپورٹ دے دی ۔ اس کے بعد قریش نے حلیس ابن علقمہ یا ابن زبان کو بھیجا ۔ یہ ان دنوں حبش والوں کے سردار تھے ۔ (حبش ایک جگہ ہے جہاں بن الحارث ابن عبد مناۃ ابن کنانہ رہتے ہیں) جب اسے حضورؐ نے دیکھا تو فرمایا : "یہ ایک ایسی قوم کا فرد ہے جو عبادت گزار ہیں تو قربانی کے جانور ہی اس کے سامنے کر دو کہ یہ اچھی طرح دیکھ لے" جب اس نے دیکھا کہ قربانی کے جانور وادی میں سیلاب کی طرح آ رہے ہیں ۔ وہ بہت متاثر ہوا اور رسول اللہؐ سے ملنے سے قبل ہی واپس ہو گیا ۔ ان جانوروں کا احترام کرتے ہوئے او . . قریش کو حالات بتائے تو انہوں نے اسے کہا' بیٹھو تم دیہاتی ہو' تمہیں کیا پتہ ہے ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھے عبداللہ ابن ابوبکر نے بتایا کہ حلیس اس بات پر بہت غصہ ہوا اور کہا اے اہل قریش 'ہم نے اس پر نہ تمہارے ساتھ حلف اٹھایا ہے اور نہ معاہدہ کیا ہے کہ ہم بیت اللہ سے ایسے لوگوں کو روکیں گے جو بیت اللہ کا احترام کرتے ہوئے آئیں ۔ پھر اس نے کہا خدا کی قسم یا تو تم محمدؐ کو اس کام کے لیے چھوڑو گے جس کے لیے وہ آیا ہے یا میں حبش کے لوگوں کو اس طرح لے کر چلا جاؤں گا جس طرح ایک آدمی چلا جاتا ہے یعنی پوری طرح ۔ تو انہوں نے اسے کہا' خاموش رہو' ہمیں چھوڑو کہ ہم اپنے لیے کوئی راستہ طے کرلیں ۔

زہری کہتے ہیں اس کے بعد انہوں نے عروہ ابن مسعود ثقفی کو حضورؐ کے پاس بھیجا ۔ اس نے کہا اہل قریش ! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم حضرت محمدؐ کے پاس جس کو بھی بھیجتے ہو اور وہ واپس آکر صحیح بات کرتا ہے تو تم اسے برابر برا بھلا کہتے ہو اور گالیاں دیتے ہو ۔ تم جانتے ہو کہ تم میرے والد کی جگہ پر ہو اور میں تمہارا بیٹا ہوں ۔ (اس کی ماں عبدشمس سے تھی) تم پر جو مصیبت آئی ہوئی ہے' وہ میں نے سن لی ہے ۔ اس لیے میں نے اپنی قوم میں سے ان لوگوں کو جمع کیا جو میری بات مان رہے تھے اور تمہاری مدد کے لیے میں آیا ہوں ۔ تو انہوں نے کہا' تو نے سچ کہا اور ہمارا تجھ پر یقین ہے ۔ یہ گیا اور رسول اللہؐ کے پاس آپؐ کے سامنے بیٹھا اور کہا محمدؐ تو مختلف لوگوں کو جمع کر کے لایا ہے کہ ان سے اپنے انڈے پھوڑ دے ۔ یہ ہیں قریش جن کے ساتھ کنواریاں اور بچوں والیاں نکلی ہیں اور انہوں نے شیروں کے چمڑے پہنے ہوئے ہیں ۔ وہ حلف اٹھا رہے ہیں کہ تمہیں زبردستی شہر میں داخل ہونے نہ دیں گے ۔ اور خدا کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ لوگ کل تم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے ۔ حضرت ابوبکر حضورؐ کے سر پر کھڑے تھے ۔ انہوں نے اسے دھمکایا [1] اور کہا : کیا ہم رسول اللہؐ کو چھوڑ دیں گے ؟ اس نے کہا حضورؐ یہ کون ہے ؟ تو آپؐ نے فرمایا یہ ابن ابوقحافہ ہیں ۔ تو اس نے کہا خدا کی قسم اگر اس کا مجھ پر ایک احسان نہ ہوتا تو میں اس کو جواب دے دیتا' لیکن یہ بات اس کے بدلے رہ گئی ۔

اس کے بعد وہ رسول اللہؐ کی داڑھی مبارک پکڑ کے بات کرنے لگا اور مغیرہ ابن شعبہ رسول اللہؐ کے سر پر کھڑے تھے اور لوہے میں ڈوبے ہوئے تھے یہ شخص جب بھی حضورؐ کی داڑھی مبارک کو پکڑتا حضرت مغیرہ ابن شعبہ اس کے ہاتھ کو جھٹک دیتے اور کہتے' رسول اللہؐ کے چہرۂ مبارک سے ہاتھ روک ورنہ یہ تمہارے جسم کے ساتھ نہ ہوگا ۔ وہ کہتا تم پر تباہی ہو' تم کس قدر سخت اور کرخت ہو ۔ اس پر حضورؐ متبسم ہوئے ۔ عروہ نے کہا کہ محمدؐ یہ کون ہیں آپ نے جواب دیا یہ تمہارے بھائی مغیرہ ابن شعبہ ہیں ۔ اس پر عروہ نے کہا "اے غدار ! تمہارے چوتڑوں کو تو میں نے کل ہی دھویا ہے"۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ اس کا واقعہ یہ ہے کہ مغیرہ ابن شعبہ نے اسلام سے قبل بنی مالک ابن ثقیف کے تیرہ آدمی قتل کیے تھے ۔ اس طرح ثقیف کے دونوں قبائل کے درمیان ہیجان پیدا ہو گیا تھا ۔ بنی مالک مقتولین کی قوم تھے اور بنی احلاف مغیرہ کی قوم تھے ۔ عروہ نے مقتولین کو ۱۳ دیتیں دیں اور اسی شر کو فرو کر دیا ۔

ابن اسحاق کہتے ہیں زہری نے یہ کہا ہے کہ حضورؐ نے اس کے ساتھ بھی وہی بات کی جو دوسروں کے ساتھ کی تھی اور کہا کہ میں جنگ کے لیے نہیں آیا ۔ یہ شخص حضورؐ کے پاس سے اٹھ کر چلا گیا لیکن اس نے اندازہ کر لیا کہ صحابہ کرام

---

(۱) اصل روایت میں ایسا فقرہ ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت ابوبکر صدیق نے یہ کہا ہو گا کیونکہ آپ نہایت ہی مہذب گفتگو کرتے تھے ۔

حضورؐ سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو یہ لوگ وضو کے پانی کو اچک لیتے ہیں۔ اور اگر آپ تھوکتے ہیں تو یہ اسے بھی اچک لیتے ہیں۔ آپ کے بالوں میں سے کوئی بال اگر گرتا ہے تو یہ اس کو بھی محفوظ کر لیتے ہیں۔ یہ شخص قریش کے پاس گیا اور رپورٹ دی۔ "اہل قریش میں کسریٰ کے دربار میں بھی گیا ہوں' اور اس کی حکومت دیکھی ہے۔ اور قیصر کے پاس بھی اور اس کی حکومت بھی دیکھی ہے اور نجاشی کو بھی اس کی مملکت میں دیکھا ہے' خدا کی قسم محمد اپنی قوم میں جس طرح ہیں' اس طرح میں نے کوئی بادشاہ اپنے متعبین میں نہیں دیکھا۔ میں نے ان کے ساتھ ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ وہ کسی حال میں بھی ان کو کسی دشمن کے سپرد کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم کیا کرتے ہو"۔

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھے بعض اہل علم نے بتایا کہ رسول اللہؐ نے خراش ابن امیہ خزاعی کو بلایا اور انہیں قریش کے پاس بھیجا۔ آپ نے ان کو سواری کے لیے اونٹ دیا جسے ثعلب کہا جاتا تھا تاکہ وہ قریش کے شرفاء تک وہ بات پہنچا دیں کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ انہوں نے حضور اکرمؐ کے اونٹ کی ٹانگیں کاٹ دیں اور چاہا کہ اسے قتل کر دیں لیکن حبش کے لوگوں نے ان کو منع کر دیا۔ انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ واپس ہوئے اور رسول اللہؐ کو اطلاع دی۔

ابن اسحاق کہتے ہیں مجھے بعض ایسے لوگوں نے بتایا جن کو میں متہم نہیں کرتا' بروایت عکرمہ مولیٰ ابن عباس سے' انہوں نے حضرت ابن عباس سے کہ قریش نے چالیس ہزار افراد بھیجے یا پچاس ہزار۔ ان کو کہا کہ تم رسول اللہؐ کے لشکر کے اردگرد چکر لگاؤ اور ان کے لیے محمدؐ کے ساتھیوں میں سے کسی کو پکڑ لاؤ' یہ سب کے سب پکڑے گئے اور رسول اللہؐ کے پاس لائے گئے اور آپؐ نے سب کو معاف کر دیا اور جانے دیا۔ انہوں نے رسول اللہؐ کے لشکر پر تیر بھی برسائے اور پتھر بھی مارے۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمر ابن الخطاب کو بلایا کہ ان کو اشراف قریش کے پاس بطور سفیر بھیجیں۔ انہوں نے فرمایا حضورؐ میں یہ خطرہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ مجھے جان سے مار دیں گے اور مکہ میں اس وقت بنی عدی ابن کعب میں سے کوئی بھی نہیں ہے جو میری حفاظت کرے۔ قریش کو یہ معلوم ہے کہ میں ان کا کس قدر دشمن ہوں اور ان پر میں نے کس قدر سختیاں کی ہیں۔ ہاں' میں ایک ایسے شخص کو تجویز کرتا ہوں جو میرے مقابلے میں زیادہ موزوں ہے۔ یہ ہیں عثمان ابن عفان۔ رسول اللہؐ نے ان کو بلایا اور ان کو بھیجا کہ وہ قریش کو سمجھا دیں کہ میں لڑائی کے لیے نہیں آیا۔ اور میں صرف عمرے کے لیے آیا ہوں اور بیت اللہ کا احترام کرتا ہوں۔

ابن اسحاق نے بیان کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ گئے۔ ان کو وہاں ابان ابن سعید ابن العاص ملے۔ مکہ میں داخل ہوتے ہوئے یا پہلے' اس نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کو اس وقت تک پناہ دے دی کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دیں۔ حضرت عثمان گئے اور ابو سفیان اور قریش کے زعماء کو ملے۔ اور رسول اللہؐ کا پیغام پہنچایا کہ مجھے یہ پیغام دے کر بھیجا گیا ہے۔ جب حضرت عثمان پیغام سے فارغ ہوئے تو انہوں نے کہا کہ اگر تم طواف کرنا چاہتے ہو' تو کر لو۔ تو انہوں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کر سکتا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے طواف نہ کر لیں۔ قریش نے ان کو اپنے ہاں روک لیا۔ رسول اللہؐ اور مسلمانوں تک یہ اطلاع پہنچ گئی کہ حضرت عثمان کو قتل کر دیا گیا ہے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن ابی بکر نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ خبر سنی تو فرمایا ہم اس وقت

تک یہاں سے نہ ہلیں گے جب تک ان سے لڑ نہیں لیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا یہ بیعت الرضوان تھی' ایک درخت کے نیچے۔ لوگ کہتے تھے کہ رسول اللہؐ نے ان سے موت پر بیعت لی اور جابر ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ہم سے موت پر بیعت نہیں لی تھی بلکہ یہ بیعت لی تھی کہ ہم بھاگیں گے نہیں۔ رسول اللہ نے لوگوں سے بیعت لی۔ ان میں سے ایک شخص بھی نہ رہا۔ سوائے ایک شخص جد ابن قیس کے جو بنو سلمہ سے تھا۔ حضرت جابر ابن عبداللہ فرماتے تھے کہ میں اسے اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنی اونٹنی کے پہلو کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ یوں کہ لوگوں کو نظر نہ آئے۔ اس کے بعد رسول اللہ کے پاس خبر آئی کہ حضرت عثمان کے بارے میں جو اطلاع آئی تھی وہ غلط تھی۔

ابن ہشام کہتے ہیں اور مجھے ایک میرے معتمد ذریعہ نے بتایا ہے اور انہوں نے اس شخص سے جس کے پاس سند تھی یہ بات نقل کی۔ انہوں نے ابن الوملیکہ سے' اور انہوں نے ابن عمر سے روایت کی کہ رسول اللہؐ نے حضرت عثمان کے لیے بیعت کی اور اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے پر مارا اور کہا یہ عثمان کے لیے ہے۔

ابن اسحاق نے کہا' زہری کہتے ہیں کہ اس کے بعد قریش نے قبیلہ بنو عامر کے سہیل ابن عمرو کو بھیجا کہ تم جاؤ اور محمد ﷺ سے مصالحت کر لو اور صلح میں یہ شرط ضرور ہو کہ وہ اس سال چلا جائے تاکہ عرب یہ باتیں نہ کریں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زبردستی مکہ میں داخل ہو گیا۔ سہیل آئے' جب رسول اللہؐ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو آپؐ نے کہہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ صلح چاہتے ہیں کیونکہ انہوں نے سہیل کو بھیجا ہے۔ جب سہیل ابن عمرو رسول اللہؐ کے پاس پہنچے تو اس نے رسول اللہؐ سے گفتگو کی اور بہت طویل بات کی' ایک دوسرے کے ساتھ مذاکرات ہوئے اور صلح کی بات ہونے لگی۔

جب تمام معاملات طے ہو گئے اور ماسوائے لکھے جانے کے اور کوئی بات باقی نہ رہی تو عمر ابن الخطاب کود کر اٹھے' حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا "ابوبکر کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول خدا نہیں"۔ انہوں نے کہا: ہاں۔ کیا ہم مسلمان نہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ آخر ہمارے دین میں ہم پر ذلت کیوں مسلط کی جا رہی ہے؟ تو حضرت ابوبکر نے فرمایا: عمر! تم آپؐ کے طریقے پر قدم رکھو۔ بس حضورؐ کے نقش قدم پر چلو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ رسول خدا ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ رسول اللہؐ ہیں۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ کے پاس آئے اور کہا: رسول خدا کیا آپ رسول اللہؐ نہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا "ہاں"۔ اور کہا: کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ تو فرمایا: "ہاں"۔ کیا وہ مشرکین نہیں ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا: "ہاں"۔ تو انہوں نے کہا کہ پھر ہمارے دین میں ہمیں اس ذلت سے کیوں دوچار کیا جاتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: "میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں۔ میں اللہ کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کر رہا۔ اس لیے اللہ مجھے کبھی بھی ضائع اور برباد نہیں کرے گا"۔ حضرت عمر کہا کرتے تھے کہ میں نے اس دن جو حرکت کی' اس کی معافی کے لیے میں آج تک روزے بھی رکھتا ہوں۔ صدقہ بھی دیتا ہوں' نمازیں بھی پڑھتا ہوں' غلاموں کو بھی آزاد کرتا ہوں' ان باتوں کی ڈر کی وجہ سے جو میں نے کیں' جبکہ یہ باتیں کرتے وقت میں یہ خیال کرتا تھا کہ میں درست کر رہا ہوں۔

اس کے بعد حضورؐ نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو بلایا۔ اور فرمایا' لکھو "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"' تو سہیل نے کہا ہمیں اس کی خبر نہیں البتہ لکھو بسمك اللهم تو حضورؐ نے فرمایا اچھا لکھو بسمك اللهم اس کے بعد فرمایا لکھو "یہ وہ ہے جس پر محمد رسول اللہ اور سہیل ابن عمر کے درمیان مصالحت ہوئی"۔ اس پر سہیل نے کہا کہ اگر میں یہ شہادت دیتا کہ آپ رسول اللہ ہیں تو میں آپ کے ساتھ لڑتا کیوں؟" آپ اپنا نام اور اپنے والد کا نام لکھیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ

لکھو "یہ وہ صلح ہے جو محمد ابن عبداللہ اور سہیل ابن عمر کے درمیان طے ہوئی کہ لوگوں کے درمیان دس سال تک جنگ نہ ہوگی' لوگ ان سالوں میں امن سے رہیں گے' ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گے' یہ کہ قریش میں سے کوئی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد کے پاس آئے گا تو وہ اسے واپس کر دے گا۔ اور جو شخص محمد سے قریش کی طرف آئے گا وہ اسے واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ اور ہمارے درمیان ایک "مقفل برتن" ہے یعنی ایک دوسرے پر حملہ نہ ہو گا اور اس میں کوئی خفیہ چوری نہ ہوگی اور نہ خیانت ہوگی' یہ کہ قبائل میں جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ معاہدہ کرے' کر سکے گا' اور جو قریش کے ساتھ معاہدہ کرے' کر سکے گا۔ (اس پر خزاعہ کے لوگ اٹھے اور کہا ہم محمدؐ کے ساتھ ہیں اور بنوبکر اٹھے اور انہوں نے کہا ہم قریش کے عہد میں ہیں)۔ اور اس سال تم واپس ہو گے اور مکہ میں داخل نہ ہو گے اور جب اگلا سال ہو گا تو ہم مکہ سے نکل آئیں گے اور تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں داخل ہو گے اور تین دنوں تک رہ سکو گے۔ اور تمہارے پاس وہی اسلحہ ہو گا جو ایک عام سوار کے پاس ہوتا ہے۔ تلواریں نیام میں ہوں گی اور اس کے سوا کوئی اور ہتھیار نہ ہو گا۔

رسول اللہ اور سہیل ابن عمر دستاویز تیار کر رہے تھے کہ ابو جندل ابن سہیل ابن عمر زنجیروں میں بندھے ہوئے پہنچ گئے۔ یہ مشرکین کے ہاتھ سے حضور اکرمؐ سے ملنے کے لیے نکل آئے تھے۔ حضورؐ کے ساتھی جب اس مہم پر نکلے تھے تو انہیں فتح کا پورا پورا یقین تھا کیونکہ رسول اللہؐ کی خواب سے انہوں نے یہی سمجھا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ صلح طے ہو گئی اور اب ہم نے عمرے کے بغیر واپس ہونا ہے اور رسول اللہؐ نے صلح کی جو شرائط تسلیم کی ہیں وہ یہ ہیں تو لوگوں پر غم کے پہاڑ ٹوٹ گئے اور قریب تھا کہ لوگ مرجاتے۔ جب سہیل نے ابو جندل کو دیکھا تو اٹھے اور اس کے منہ پر مارا اور گریبان سے پکڑ لیا اور پھر کہا: محمد اس کے آنے سے قبل یہ معاہدہ ہمارے درمیان طے نہ ہو گیا تھا؟ حضورؐ نے فرمایا ٹھیک ہے' طے ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ اسے گریبان سے پکڑ کر باندھ رہا تھا تاکہ اسے قریش کی طرف واپس بھیج دے اور ابو جندل چیخ رہا تھا' اے مسلمانو' کیا مجھے مشرکین کی طرف لوٹا دیا جائے گا کہ وہ مجھے اذیت دیں۔ اس پر مسلمانوں کی صفوں میں جو غم اور غصہ تھا وہ اور زیادہ ہو گیا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا "ابو جندل صبر کرو اور برداشت کرو' ان شاء اللہ تمہارے لیے اور تمہارے ساتھ جو دوسرے ضعیف مسلمان ہیں ان کے لیے اللہ کوئی نہ کوئی راہ نکال لے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آپس میں صلح کر لی ہے۔ ہم نے بھی منظوری دے دی ہے اور انہوں نے بھی دے دی ہے۔ اور ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ ہم غداری کریں"۔ حضرت عمر ابن الخطاب اٹھے اور ابو جندل کے پاس کھڑے ہو گئے اور کہا "ابو جندل صبر کرو' یہ مشرک ہیں اور مشرکین کا خون کتے کے خون کے برابر ہے"۔ حضرت عمرؓ اپنی تلوار کا دستہ اس کے قریب کر رہے تھے۔ کہتے ہیں حضرت عمرؓ کی خواہش یہ تھی کہ ابو جندل یہ تلوار مجھ سے چھین لیں اور اپنے باپ کا کام ختم کر دیں۔ لیکن انہوں نے اپنے باپ کو ترجیح دی اور معاملہ نافذ ہو گیا۔ اور ابو جندل سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کا کوئی خیال نہیں کیا البتہ حضورؐ کے عہد کا احترام کیا۔

جب یہ دستاویز تیار ہوئی تو اس پر مشرکین اور مومنین میں سے کئی لوگوں نے گواہ کے طور پر دستخط کیے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ' عمر ابن الخطابؓ' عبدالرحمٰن ابن عوف' عبداللہ ابن سہیل ابن عمر' سعد ابن ابو وقاص' محمد ابن مسلمہ' مکرز ابن حفص' (یہ اس وقت مشرک تھے) اور علی ابن ابی طالب اس دستاویز کے کاتب حضرت علی تھے۔

زہری کہتے ہیں کہ جب معاہدے کا معاملہ ختم ہوا تو حضورؐ نے حکم دیا کہ قربانیاں کرو اور بال کٹواؤ۔ کہتے ہیں خدا کی قسم کوئی شخص نہ اٹھا۔ یہاں تک کہ حضورؐ نے تین بار یہ احکام صادر کیے۔ جب کوئی نہ اٹھا تو حضورؐ ام سلمہ کے کمرے میں آئے اور ان کے سامنے یہ بات کی کہ لوگوں کی حالت تو یہ ہو گئی ہے۔ حضرت ام سلمہ نے کہا اے اللہ کے نبیؐ آپؐ اس کو پسند کرتے ہیں؟ آپؐ نکلیں، کسی سے بات نہ کریں، یہاں تک اپنے ہدیہ کو قربان کر دیں، اور اپنے حجام کو بلائیں کہ وہ بال مونڈ دے۔ رسول اللہؐ نکلے، کسی سے کوئی بات نہ کی، آپؐ نے اپنے ہاتھ سے جانور کو ذبح کیا اور اپنے حجام کو بلایا اور اس نے آپؐ کے بال کاٹے۔ جب انہوں نے دیکھا تو سب اٹھے اور قربانیاں کرنے لگے اور ایک دوسرے کے سر مونڈنے لگے۔ حالت یہ تھی کہ کہیں وہ ایک دوسرے کے سر کاٹ کر قتل نہ کر دیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن نجیح نے بیان کیا مجاہد سے، ابن عباس ابن عباس سے کہ حدیبیہ کے دن بعض لوگوں نے سر منڈوالیے اور بعض نے بال چھوٹے کر دیئے تو رسول اللہ نے فرمایا منڈوانے والوں پر اللہ رحم کرے اس پر لوگوں نے کہا کہ بال چھوٹے کرنے والوں کو یارسول اللہ؟" تو آپؐ نے دوبارہ کہا اللہ منڈوانے والوں پر رحم کرے۔ انہوں نے پھر پوچھا کہ بال چھوٹے کرنے والوں پر، تو رسول اللہؐ نے فرمایا اور بال چھوٹے کرنے والوں پر۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا حضورؐ آپ نے صرف منڈوانے والوں کے لیے کیوں رحم کی درخواست کی تو حضورؐ نے فرمایا انہوں نے کوئی شک نہیں چھوڑا۔

زہری کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں سے قافلہ کو واپس ہونے کا حکم دیا یہاں تک کہ آپ مکہ اور مدینہ کے درمیان تھے کہ سورت الفتح نازل ہوئی۔

امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی سند سے روایت کی ہے مجمع ابن حارثہ انصاری سے۔ یہ قرآن کریم کے قاریوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے کہا ہم حدیبیہ کے موقعہ پر حاضر تھے۔ جب ہم حدیبیہ سے لوٹے تو اچانک دیکھتے ہیں کہ لوگ اونٹ دوڑا رہے ہیں۔ لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہؐ پر وحی آگئی ہے، ہم بھی لوگوں کے ساتھ گھوڑے تیز دوڑا کر آگے بڑھے۔ کراع الغمیم کے پاس رسول اللہؐ اپنی سواری پر تھے اور لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے تو آپؐ نے ان پر یہ سورت پڑھی۔

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا (۴۸ : ۱) "اے نبی، ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی"۔ رسول اللہ کے ساتھیوں میں سے ایک شخص نے کہا رسول خدا کیا یہ فتح ہے؟ آپؐ نے فرمایا "ہاں، اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، یہ البتہ فتح ہے"۔

امام احمد نے، اپنی سند کے ساتھ، عمر ابن الخطابؓ سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا کہ ہم رسول اللہؐ کے ساتھ ایک سفر میں تھے، میں نے حضور سے کسی چیز کے بارے میں تین بار پوچھا تو آپ نے جواب نہ دیا۔ تو میں نے کہا تجھے تیری ماں روئے اے ابن خطاب، تو نے رسول اللہ پر اصرار کیا اور بار بار دہرایا۔ تین بار اور آپ نے جواب نہ دیا۔ کہتے ہیں میں اپنی سواری پر چڑھ گیا اور اپنے اونٹ کو حرکت دی۔ تو میں ڈر کی وجہ سے آگے چلا گیا۔ اس ڈر کی وجہ سے کہ شاید میرے بارے میں کوئی آیت نہ نازل ہو جائے۔ اچانک ایک شخص پکار رہا تھا اے عمر، تو میں واپس ہوا اور مجھے یقین تھا کہ میرے بارے میں کوئی آیت نازل ہو گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آج رات مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی

ہے جو مجھے دنیا اور مافیہا سے زیادہ محبوب ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (۴۸ : ۱) لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ

(۴۸ : ۲) "اے نبیؐ ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تا کہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرما دے"۔ (امام بخاری، ترمذی، نسائی)۔

--- ooo---

یہ تھی وہ فضا جس میں یہ سورت نازل ہوئی، اس فضا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی ہدایات اور الہامات پر مطمئن تھے۔اس لیے آپ نے تمام فیصلے اور ارادے ترک فرما کر عالم بالا کی ہدایات پر عمل کیا اور ہر قدم اور ہر مرحلہ پر آپ عالم بالا کی ہدایات کے مطابق فیصلے فرماتے رہے اور یہ الہام آپ کو قدم قدم پر ہوتا رہا اور کوئی جدا کرنے والا آپ کو اس سے جدا نہ کر سکا، خواہ وہ مشرکین میں سے ہو یا آپ کے ساتھیوں میں سے ہو جو آغاز میں اس صلح پر راضی نہ تھے۔کیونکہ اس میں مشرکین کی ضد اور ہٹ دھرمی کو قبول کیا گیا تھا۔اس کے بعد اللہ نے ان کے دلوں کو اطمینان عطا کر دیا تو وہ رضامندی، یقین اور قبولیت اور گہری اور عمیق قبولیت کی طرف لوٹ آئے جبکہ بعض صحابہ کرام تو آغاز ہی میں ایسے ہی مقام پر تھے۔مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ۔آپ کی روح نے کسی بھی وقت روح رسولؐ سے جدائی اختیار نہیں کی۔آپ کو ہمیشہ ہر معاملے میں مکمل اطمینان رہا۔اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ اطمینان آپ سے جدا نہیں ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ سورت کا آغاز رسول اللہ کے لیے بشارت کے ساتھ ہوا اور اس بشارت کی وجہ سے حضورؐ بہت خوش تھے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (۴۸ : ۱) لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَ يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (۴۸ : ۲) وَّ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا

(۴۸ : ۳) "اے نبیؐ ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تا کہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دے۔اور تمہیں سیدھا راستہ دکھائے اور تم کو زبردست نصرت بخشے"۔

اور اس آغاز کے بعد مومنین کے لیے اللہ کے اس احسان کا ذکر کیا، کہ ان پر بھی اطمینان کا نزول ہوا۔ان کے ایمان کا اعتراف کیا گیا اور ان کو بھی مغفرت اور ثواب کی بشارت دی گئی اور یہ کہ آسمانوں کے لشکر اللہ کے اختیار میں ہیں اور وہ تحریک اسلامی کی پشت پر ہیں۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۴۸ : ۴) لِّيُدْخِلَ

الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا (۴۸ : ۵) ”وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھالیں ۔ زمین و آسمان کے سب لشکر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ علیم و حلیم ہے ۔ تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے ۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے“ ۔ اور منافقین اور منافقات اور مشرکین اور مشرکات کے لیے اللہ کا عذاب اور غضب تیار ہے ۔

وَّ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا (۴۸ : ۶) ”اور ان منافق مردوں اور عورتوں ' اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں ۔ برائی کے پھیر میں وہ خود ہی آگئے ' اللہ کا غضب ان پر ہو ' اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم مہیا کر دی جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے“ ۔

اس کے بعد رسول اللہؐ کی بیعت کی طرف اشارہ ہے کہ جو آپؐ کی بیعت کریں گے وہ اللہ کی بیعت ہوگی ۔ اور ان کے دل اس راہ سے براہ راست اللہ سے مربوط ہو گئے ہیں ۔ اور اب وہ اَللّٰهُ حَيٌّ وَّلَايَمُوْتُ کے ساتھ متعلق ہیں ۔ گویا انہوں نے اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا (۴۸ : ۸) لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ وَ تُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (۴۸ : ۹) اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸ : ۱۰) ”اے نبیؐ ہم نے تمہیں شہادت دینے والا ' بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ ' اے لوگو ' تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ ' اور اس کا ساتھ دو ' اس کی تعظیم اور توقیر کرو ' اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو ۔ اے نبی جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ' ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا ' اب جو اس عہد کو توڑے گا تو اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہو گا اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا“ ۔

اس بیعت اور اس سے پیچھے رہنے کے بارے میں اور حدیبیہ میں مومنین پر تبصرے سے بھی ان دیہاتیوں پہ تبصرہ

سخت ہے جو سرے سے اس سفر میں اہل ایمان کے ساتھ ہی نہ نکلے ۔ اللہ تعالیٰ ان کے عذرات کو پیش کرنے سے پہلے ہی رد کر دیتا ہے ۔ اور یہ بھی فرماتا ہے کہ ان کے دلوں میں تو بہت کچھ بدگمانیاں تھیں کہ رسول اللہؐ اور مومنین تو واپس آنے والے ہی نہیں ۔ اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مستقبل میں ان کے ساتھ رویہ کیا ہونا چاہئے نیز یہ کہ عنقریب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوں گی اور بہت کچھ غنائم ملیں گے اور پھر ان کے منہ سے رال ٹپکے گی جو پیچھے رہ گئے تھے ۔

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ أَمْوَٰلُنَا وَأَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ قُلْ فَمَن يَمْلِكُ لَكُم مِّنَ اللَّهِ شَيْـًٔا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (۴۸ : ۱۱) بَلْ ظَنَنتُمْ أَن لَّن يَنقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰٓ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنتُمْ قَوْمًا بُورًا (۴۸ : ۱۲) وَمَن لَّمْ يُؤْمِن بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ سَعِيرًا (۴۸ : ۱۳) وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ يَغْفِرُ لِمَن يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَآءُ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا (۴۸ : ۱۴) سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كَلَٰمَ اللَّهِ قُل لَّن تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِن قَبْلُ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا (۴۸ : ۱۵) قُل لِّلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَٰتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ فَإِن تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا وَإِن تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُم مِّن قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (۴۸ : ۱۶) "اے نبیؐ' بدوی عربوں میں سے جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے اب وہ آکر ضرور تم سے کہیں گے کہ ہمیں اپنے اموال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا' آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں' یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ بات کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی' ان سے کہنا' اچھا یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملے میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ اختیار رکھتا ہے ۔ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے' بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اللہ اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آسکیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم سخت

بد باطن لوگ ہو"۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے، جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے۔ اور وہ غفور و رحیم ہے۔ جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو، یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں، ان سے صاف کہہ دینا کہ "تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔ اللہ پہلے ہی فرما چکا ہے"۔ یہ کہیں گے کہ "نہیں بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو"۔ بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔ ان پیچھے چھوڑ جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لئے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا۔ اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا"۔

یہاں ضروری تھا کہ پیچھے رہنے والوں میں معذور لوگوں کی بات بھی سامنے آ جائے۔ اور ان لوگوں کی بات بھی آ جائے جن پر جہاد فرض ہی نہ تھا یعنی وہ عاجز تھے اور یہ بھی عذر تھا۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيْمًا (۴۸:۱۷) "ہاں اگر اندھا، لنگڑا اور مریض جہاد کے لیے نہ آئے تو کوئی حرج نہیں، جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا، اللہ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور جو منہ پھیرے گا اسے وہ دردناک عذاب دے گا"۔

مخلفین اور معذورین پر تبصرے کے بعد اب مومنین، ان کے موقف، ان کے خلجانات پر بحث ہے۔ ان کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی کی گئی ہے۔ ان بشارتیں دی گئی ہیں۔ یہ لوگ جن کا ایمان قوی تھا اور جنہوں نے اپنا سب کچھ اللہ پر فروخت کر دیا تھا۔ اس پیراگراف میں اللہ تعالیٰ ان نفوس قدسیہ کی اصل حقیقت روشن فرماتا ہے۔ اعلان فرماتا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہے، ان پر احسان کرنے والا ہے اور ان کو ثابت قدم کرنے والا ہے۔ اور اللہ ان کو متعین طور پر بتاتا ہے کہ ان لوگوں سے اللہ راضی ہو گیا ہے۔ وہ سب جو ایک درخت کے نیچے بیعت رضوان میں شریک ہوئے، ان کے دلوں میں جو کچھ تھا، وہ بھی بتا دیا۔ اور ان سے راضی ہو گیا۔ اور یہ فیصلہ کر دیا کہ عنقریب تم پر فتوحات کھلنے والی ہیں، اور اموال غنیمت کے دروازے کھلنے والے ہیں۔ اور یہ ایک کائناتی فیصلہ ہے، یہ ایک عظیم حادثہ ہے جس پر یہ پوری کائناتی قوتیں گواہ ہیں۔ اس واقعہ سے دنیا متاثر ہوئی ہے اور انتظار میں ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا (۴۸:۱۸) وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّأْخُذُوْنَهَا

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۴۸ : ۱۹) وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (۴۸ : ۲۰) وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (۴۸ : ۲۱) وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا (۴۸ : ۲۲) سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۴۸ : ۲۳)

"اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے' ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا۔ اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی' ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی اور بہت سے مال غنیمت انہیں بخش دیا' جسے وہ عنقریب حاصل کریں گے ۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے ۔ اللہ تم سے کثرت اموال کا وعدہ کرتا ہے ۔ جنہیں تم حاصل کرو گے ۔ فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمہیں عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیا تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے ۔ اس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے ۔ جس پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے ہو' اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے' اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ یہ کافر لوگ اس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے' یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے ۔ اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے"۔

مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ جو افراد مسلمانوں کو اذیت دینے آئے تھے' اللہ نے ان کو گرفتار کرا دیا اور یہ بھی بتایا کہ جن لوگوں نے مسجد حرام سے لوگوں کو روکا ہے' ان کا عمل بادی النظر میں غلط تھا۔ انہوں نے قربانی کے جانوروں کو اپنی جگہ تک پہنچنے نہ دیا۔ یہ بھی ان کی غلطی تھی' پھر اس سال مسلمانوں کو لڑائی سے روک دینے میں حکمت ہے ۔ اور یہ مصالحت جو مسلمانوں کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی ۔ اس پر اللہ نے ان کو راضی کر دیا اور ان کے دلوں پر سکینت نازل کر دی ۔ اور یہ سب ان حکمتوں کی وجہ سے تھا جن کو اللہ تو دیکھ رہا تھا مگر ان کو نظر نہ آئی تھیں ۔ اور یہ حکمتیں فتح مکہ اور غلبہ دین تھا اور یہ عمل اللہ کی تدابیر سے ممکن ہوا۔

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا (۴۸ : ۲۴) هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ

رَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَآءُ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴۸: ۲۵) اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۴۸: ۲۶) لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا (۴۸: ۲۷) هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا

(۴۸: ۲۸) "وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے' حالانکہ وہ ان پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا' اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا۔ اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا' (تو جنگ نہ روکی جاتی' روکی وہ اس لئے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر دے۔ وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں سے) جو کافر تھے' ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے۔ جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کا زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ فی الواقعہ اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا' جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا' ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے اور اپنے سر منڈاؤ گے اور بال ترشواؤ گے اور تمہیں کوئی خوف نہ ہو گا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے' اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرما دی۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے"۔

اور سورت کا خاتمہ ہوتا ہے انسانوں کے اس مجموعے کی تعریف پر جسے اس مقصد کے لیے اٹھایا گیا ہے جس کی مخصوص صفات ہیں اور ان صفات کی طرف توریت اور انجیل میں بھی اشارہ موجود ہے کہ اس جماعت کو کامیابی اور مغفرت نصیب ہو گی۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا

سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸: ۲۹) "محمد اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب میں پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں۔ جن سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی۔ پھر اس کو تقویت دی پھر وہ گدرائی پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تا کہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے"۔

یوں اس سورت کے نصوص کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور یہ سورت اس فضا میں زندہ نظر آتی ہے جس میں یہ نازل ہوئی۔ اور اس طرح واقعات کی صحیح تصویر بھی سامنے آتی ہے۔ قرآن کا انداز بیان دراصل تاریخی تسلسل کا نہیں ہے بلکہ وہ تربیتی ہدایات کے انداز میں بات کرتا ہے۔ ایک انفرادی واقع کے حوالے سے اصولی بات کی جاتی ہے اور ایک خاص پالیسی کو عالمگیر اصول میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا منفرد طریقہ ہے۔

اس سورت کی فضا، مضامین اور اس سے ماقبل ترتیب مصحف میں پائے جانے والی سورت محمد کی فضا اور مضامین پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سورت محمد کے نزول کے بعد تین سالوں میں جماعت اسلامی کے شب و روز میں کس قدر تبدیلی واقع ہوگئی تھی۔ یاد رہے کہ راجح رائے یہی ہے کہ سورت محمد اور سورت فتح کے نزول میں تین سال کا فاصلہ ہے۔ ان تین سالوں میں قرآن کریم نے اس جماعت کی جو تربیت کی اور جس طرح وہ قرآن کے زیر سایہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے گزری، اس کے نتیجے میں یہ جماعت اس مقام تک پہنچ گئی جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ہے۔

سورت فتح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم ایک نہایت ہی پختہ کار اور پختہ سوچ والی جماعت کو دیکھ رہے ہیں۔ اس نے اسلامی عقیدے کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ اس کا ایمانی معیار بہت اونچا ہو گیا ہے۔ اس جماعت کے افراد اب اسلامی دعوت اور اسلامی نظام کے غلبے کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔ اور اب وہ فضا نہیں ہے جو سورت محمد کی تھی کہ اسے جہاد بالمال اور جہاد بالنفس میں حصہ لینے کے لیے اکسایا جا رہا تھا۔ بلکہ اب یہ جماعت غلبہ اسلام کے لیے یہ سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہے۔ اور اس کی تیزی اور جذبے کو کنٹرول کرنے کے لیے اسے لگام دی جا رہی ہے، ٹھنڈا کیا جا رہا ہے کہ ذرا رکو، صلح کر لو، اس میں مصلحت ہے۔

اب یہاں اسے ایسی آیت کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ سورت محمد میں تھی۔

فَلَا تَهِنُوْا وَ تَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ

(۴۷ : ۳۵) "پس بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو، تم ہی غالب رہنے والے ہو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا"۔ اور پھر ایسی ہدایات کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

هٰاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ وَ مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (۴۷ : ۳۸) "دیکھو تم لوگوں کو دعوت دی جارہی ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو، پس تم میں سے بعض لوگ بخل کر رہے ہیں حالانکہ جو بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے۔ اللہ تو غنی ہے۔ تم ہی اس کے محتاج ہو، اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے۔

نیز یہاں اب اس جماعت کو جہاد پر ابھارنے کی بھی اس طرح ضرورت نہ تھی جس طرح سورت محمد میں ضرورت تھی، وہاں ان کو آمادہ کیا گیا تھا کہ جہاد میں تمہارے لیے بڑا اعزاز ہے اور نہ ہی یہ کہنے کی ضرورت تھی کہ جہاد میں تمہاری آزمائش ہو رہی ہے۔

ذٰلِكَ وَ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَاۡ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷ : ۴) سَيَهْدِيْهِمْ وَ يُصْلِحُ بَالَهُمْ (۴۷ : ۵) وَ يُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (۴۷ : ۶) "اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا مگر تاکہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے، اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے، اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا، ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کر دے گا جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے"۔

اب یہاں کا نقشہ بالکل مختلف ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دل میں سکون کی ایک کیفیت نازل فرمائی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر حدیبیہ کے موقعہ پر کفار سے ٹکرا جانے کا جو جوش تھا، اسے فی الحال ٹھنڈا کیا جائے۔ اب ان کے جوش انتقام اور غیرت کو ٹھنڈا کیا جا رہا تھا اور اللہ کے احکام اور رسول اللہؐ کی حکیمانہ پالیسی پر انہیں مطمئن کیا جا رہا تھا کیونکہ اس وقت صلح اور نرمی ہی میں مصلحت تھی۔ یہاں اب لوگوں نے جوش و خروش سے بیعت رضوان کی، اس کی تعریف ہو رہی ہے۔ اور یہاں اب مسلمانوں کی جماعت کی وہ تعریف ہے جو اس سورت کے آخر میں ہے۔

ہاں ایک بات اس اصول کے خلاف نظر آئے گی کہ بیعت رضوان کی تعریف کی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ وَ مَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸ : ۱۰)

"اے نبیؐ جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے' ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا' اس کی عہد شکنی کا وبال ان کی اپنی ذات پر ہو گا۔ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا' جو اس نے اللہ سے کیا ہے' اللہ عنقریب اس کو اجر عطا کرے گا"۔ اس میں دراصل جہاد پر ابھارنے سے زیادہ مجاہدین کی تکریم اور بلند مرتبے کا اظہار ہے کہ یہ عہد انہوں نے دراصل اللہ سے کیا تھا۔ اور اس عہد کو توڑنے کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو مدینہ کے گرد جہاد سے رہ گئے تھے۔

اسی طرح منافقین اور منافقات کی مذمت بھی ایک عمومی بات ہے جو اس دور کے ہر سورت میں ہے لیکن یہاں سورت محمد کی طرح مستقل نہیں ہے۔ سورت محمد کے دور میں یہ منافقین اور یہودی گٹھ جوڑ رکھتے تھے تو جس طرح مسلمانوں کے نفوس کے اندر تبدیلی آگئی تھی' اسی طرح خارجی حالات میں بھی کافی تبدیلی آگئی تھی۔

اسی طرح اس سورت کی فضا سے معلوم ہوتا ہے کہ اب مسلمانوں کی قوت بمقابلہ مشرکین بہت زیادہ ہے۔ یہاں آنے والی فتوحات کی طرف صریح اشارات ہیں۔ پھر یہ پیش گوئیاں ہیں کہ آئندہ جو فتوحات اور اموال غنیمت آنے والے ہیں' حدیبیہ کی مہم سے پیچھے رہنے والے ان کے اندر بہت دلچسپی لیں گے اور معذرتیں کریں گے' لیکن وہ اب محروم ہیں اور یہ کہ یہ دین ہی غالب ہو گا۔ ان سب امور سے معلوم ہوتا ہے کہ سورت محمد کی فضا سے یہاں سورت فتح کی فضا بہت ہی مختلف ہے۔

لوگوں کی نفسیاتی تربیت' جماعت مسلمہ کے شب و روز اور مدینہ کے ماحول کی مجموعی حالت میں اب ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ جو لوگ قرآنی آیات و نصوص سے سیرت نبویؐ کا مطالعہ کرتے ہیں' ان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے۔ یہ تبدیلی قرآنی منہاج تربیت اور نبوی تربیت کا نتیجہ ہے۔ قرآن و سنت کی تربیت کے نتیجے میں یہ جماعت اب اس پوری دنیا کی منفرد جماعت ہے۔ اس تبدیلی میں ان انسانی جماعتوں کی لیڈر شپ کے لیے بھی اشارات ہیں کہ اس کو تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے کہ اگر کارکنوں میں نقص' ضعف' ماضی کے اثرات' جس دور میں کارکن ہوں' اس دور کی کمزوریاں ہوں' یا اس دنیا کے مفادات' گوشت و پوست کی ضروریات سے وہ متاثر ہوں تو انہیں برداشت کرنا چاہئے۔ یہ سب باتیں اس منفرد جماعت کے اندر بھی ابتدائی دور میں تھیں لیکن برداشت' حکمت' صبر اور تربیت نے لوگوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ یاد رہے کہ مختلف ادوار کے مختلف تجربات بھی تبدیلی اور تربیت میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ مختلف واقعات میں تربیت کے مختلف مواقع ہوتے ہیں۔ یوں اخلاقی' تربیتی اور انضباطی معیار بتدرج نہایت بڑھ جاتا ہے اور مادی خواہشات شفاف ہوتی چلی جاتی ہیں' اسی طرح خاندانی اور روایاتی کمزوریاں دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ماضی سے انسان اپنے ساتھ جو کمزوریاں لاتا ہے' وہ بھی دور ہو جاتی ہیں۔ اور دلوں کا افق وسیع اور اعلیٰ ہوتا جاتا ہے۔ یوں نصب العین بلند ہوتا ہے اور نیچے دیکھنے والے دور افق میں' بلندیوں پر روشنیاں دیکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارے لیے رسول اللہ کی سیرت میں بہترین نمونہ ہے۔ اور قرآن کا منہاج تربیت ہمارے لیے ایک صراط مستقیم ہے۔

---ooo---

درس نمبر ۲۴۴ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۱۷

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴿١﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿٢﴾ وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ﴿٣﴾

"اے نبی ؐ ہم نے تم کو کھلی فتح عطا کر دی تا کہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دے اور تمہیں سیدھا راستہ دکھائے اور تم کو زبردست نصرت بخشے"۔

اس سورت کا آغاز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایک فضل و کرم کے ذکر سے ہوتا ہے۔ کہ آپ ؐ کو فتح مبین بھی عطا کر دیا گیا ہے اور آپ کے اگلے اور پچھلے سب ذنوب معاف کر دیئے گئے۔ آپ ؐ پر اپنی نعمتیں تمام ہو گئیں' آپ ؐ کو مستقل ہدایت نامہ دے دیا گیا اور ایک زبردست نصرت اور فتح بھی دے دی گئی۔ اور یہ ہے صلہ اس گہرے اطمینان اور صبر کا جن کے ساتھ آپ نے ہدایات الٰہیہ پر عمل کیا۔ اور اس بات کا کہ آپ نے اللہ کی جانب سے وحی اور الہامات و ہدایات پر پورا پورا عمل کیا۔ اپنی تمام خواہشات اور ارادوں کو ترک کر دیا اور اللہ کی نگرانی پر پورا پورا بھروسہ کیا۔ آپ نے ایک خواب دیکھا' اس کے مطابق آپ حرکت میں آگئے۔ آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی اور لوگ چیخے کہ "قصواء" نے چلنے سے انکار کر دیا۔ اڑ گئی۔ لیکن آپ ؐ نے اس سے کوئی اور اشارہ لیا۔ "قصواء اڑ نہیں گئی اور نہ اس کی یہ عادت ہے لیکن اسے اس ذات نے روک لیا ہے جس نے مکہ سے ہاتھی کو روکا تھا۔ اگر قریش آج کوئی بھی ایسا منصوبہ مجھے دیں جس میں صلہ رحمی کی درخواست ہو تو میں منظور کر دوں گا"۔ حضرت عمر ابن الخطاب آپ سے نہایت ہی جوش میں پوچھتے ہیں "کیا ہمیں اپنے دین میں ذلت نہیں دی جا رہی ہے؟" آپ ؐ جواب دیتے ہیں "میں اللہ کا بندہ ہوں' رسول ہوں' میں اس کے حکم کی مخالفت نہیں کر سکتا اور ان شاء اللہ وہ مجھے ضائع نہیں کرے گا"۔ یہ تو رہی صلح کی بات لیکن جب اطلاع

آتی ہے کہ حضرت عثمانؓ قتل ہو گئے ہیں تو آپؐ فرماتے ہیں "ہم اس وقت تک ڈٹے رہیں گے جب تک قوم سے انتقام نہ لے لیں"۔ لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا جاتا ہے۔ یہ بیعت 'بیعت الرضوان قرار پاتی ہے اور اس سے ان لوگوں کو بھلائی نصیب ہوتی ہے اور یہ ان کے لیے رتبہ بلند تھا جنھوں نے اس میں حصہ لیا۔

یہ سورت دراصل فتح عظیم تھی۔ اور صلح حدیبیہ بھی دراصل فتح عظیم تھی 'کیونکہ اس کے نتیجے میں بے شمار فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ یہ دعوت اسلامی کے زاویہ سے بھی فتح تھی۔ امام زہری کہتے ہیں اس سے قبل اسلام کو جو فتوحات ملی تھیں یہ ان سے بڑی فتح تھی۔ اس سے قبل یہ تھا کہ لوگ جہاں بھی ملتے جنگ ہوتی۔ جب صلح ہو گئی اور حالت جنگ ختم ہو گئی اور لوگوں کو ایک دوسرے کی جانب سے امن نصیب ہو گیا' ملنا جلنا آزاد ہو گیا تو انہوں نے اسلام کے موضوع پر بحث و مکالمہ شروع کر دیا۔ اسلام کے بارے میں جس شخص نے معقول گفتگو کی وہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ صلح حدیبیہ اور فتح کے درمیان دو سالوں میں اس قدر لوگ مسلمان ہو گئے کہ ان کی تعداد سابقہ تمام عرصے کے مسلمانوں کے برابر تھی یا زیادہ تھی۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ زہری کی بات پر دلیل یہ ہے کہ جابر بن عبداللہ کے قول کے مطابق حضور اکرمؐ حدیبیہ کی مہم پر چودہ سو افراد لے کر نکلے تھے لیکن ٹھیک دو سال بعد جب مکہ پر حملہ ہوا تو آپ کے ہم رکاب دس ہزار زائد افراد تھے۔ اور اس عرصہ میں خالد ابن ولید اور عمر ابن العاص رضی اللہ عنہما مسلمان ہوئے۔

زمین پر یہ فتح یوں تھی کہ مسلمان قریش کے شر سے محفوظ ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موقعہ مل گیا کہ جزیرۃ العرب کو یہودیوں کے باقی خطرات سے پاک فرمادیں۔ بنی قینقاع' بنی النضیر اور بنو قریظہ کو اس سے قبل ختم کر دیا گیا تھا۔ یہ خطرہ اب خیبر کے محفوظ قلعوں میں موجود تھا۔ کیونکہ خیبر کے یہ قلعے شام کے راستے میں واقع تھے۔ چنانچہ حدیبیہ کے بعد اللہ نے خیبر کا علاقہ بھی مسلمانوں کو دے دیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے علاقے اور غنائم کو صرف ان لوگوں میں تقسیم کیا جو حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے ان کے علاوہ کسی کو کچھ نہ دیا۔

یہ مدینہ کے مسلمانوں اور مکہ کے قریش کی طویل جنگ میں مسلمانوں کی فتح تھی۔ استاذ محمد دروزہ اپنی کتاب سیرۃ الرسول میں فرماتے ہیں :

"اس میں شک نہیں کہ یہ صلح جسے قرآن کریم نے فتح قرار دیا اسے ہر مفہوم میں مسلمانوں کی فتح سمجھنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے سیرۃ النبی کے فیصلہ کن واقعات میں شمار کرنا چاہئے۔ یہ واقعہ اسلام کی تاریخ میں اسلام کی قوت اور استحکام کا سبب بنا۔ ایک بڑا مفید واقعہ تو وہ بہرحال تھا ہی۔ اس صلح کے ذریعہ قریش نے پہلی مرتبہ اسلامی حکومت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو تسلیم کیا اور مسلمانوں کو انہوں نے اپنے برابر کی قوت تسلیم کیا بلکہ قریش نے اسلامی حکومت کا دفاع کیا۔ اس سے پہلے دو سالوں میں قریش نے دو مرتبہ مدینہ پر حملہ کیا اور جنگ احزاب تو حدیبیہ سے ایک سال قبل ہوتی تھی جس میں قریش بے شمار احزاب کو لے کر مدینہ پر چڑھ آئے تھے تاکہ مومنین اور اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اور غزوۂ احزاب کے درمیان اہل ایمان کی صفوں میں بے حد اضطراب پیدا ہو گیا تھا اور ایک عام بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ مدینہ پر حملہ کرنے والوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی اور جنگ احزاب کا پورے عالم عرب پر اثر تھا کیونکہ تمام عرب اہل قریش کی پیروی کرتے تھے اور وہ قریش کے سخت موقف سے متاثر ہوتے تھے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ مدینہ کے اردگرد کے دیہاتی اور منافق یہ پیشن گوئیاں کرتے تھے کہ اس جنگ سے مسلمان کسی صورت میں صحیح سالم واپس نہ آ سکیں

گے اور وہ ہر قسم کا سوئے ظن رکھتے تھے ۔ تو اس صورت میں اس فتح کی اہمیت اور ظاہر ہو جاتی ہے اور اس کے اثرات دور رس ثابت ہوتے ہیں"۔

"بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو الہام تھا' وہ درست تھا اور یہ کہ قرآن کریم نے بھی اس کی تائید کر دی ۔ اور اس صلح کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت ہی عظیم مادی معنوی اور دعوتی فوائد حاصل ہوئے ۔ نیز جنگی اور سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی پوزیشن بہت ہی مضبوط ہو گئی ۔ قبائل کی نظروں میں مسلمان ایک مضبوط قوت بن گئے اور واپس ہوتے ہی مدینہ کے گرد کے جو قبائل پیچھے رہ گئے تھے وہ آ کر عذرات پیش کرنے لگے ۔ مدینہ کے اندر منافقین کی آواز دبنے لگی اور وہ کمزور ہو گئے ۔ اور ہر طرف سے عرب وفود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنا شروع ہو گئے اور یہودیوں کی قوت کو خیبر اور اس کے آس پاس کے علاقوں سے ہٹا دیا گیا ۔ یہ لوگ شام کے راستے پر پھیلے ہوئے تھے ۔ حضور اکرمؐ کے لیے ممکن ہو گیا کہ آپ نجد' یمن اور بلقا جیسے دور دراز علاقوں میں فوجی مہمات ارسال کریں ۔ اور ٹھیک دو سال بعد حضورؐ نے مکہ کو دس ہزار کے لشکر کے ساتھ فتح کیا ۔ یہ فیصلہ کن فتح تھی کہ جب اللہ کی مدد آئی اور فتح مکمل ہوئی اور لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگے"۔

میں یہ کہتا ہوں کہ ان تمام پہلوؤں کے سوا ایک دوسرا پہلو ہے جس کے زاویہ سے یہ فتح عظیم تھی ۔ اس سے اسلام کے لئے لوگوں کے دل و دماغ فتح ہو گئے ۔ اس کے نتیجے میں بیعت الرضوان کا واقعہ پیش آیا جس میں مسلمانوں نے موت اور عدم فرار پر بیعت کی اور اللہ نے اعلان کر دیا کہ درخت کے نیچے جن لوگوں نے بیعت کی ان سے اللہ راضی ہو گیا ہے ۔ اور قرآن میں اس اعلان کا اندراج ہو گیا اور پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی لیڈر شپ اور انقلابی جماعت کے خدوخال اور اوصاف کو اس سورت میں اس فتح کے نتیجے میں قلم بند کر دیا گیا ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸ : ۲۹) "محمد' اللہ کے رسول ہیں' اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں ۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب میں پاؤ گے ۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں ۔ جن سے الگ پہچانے جاتے ہیں ۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی ۔ پھر اس کو تقویت دی پھر وہ گدرائی پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوئی ۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں ۔ اس گروہ کے لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں' اللہ نے ان سے مغفرت اور

بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے"۔

میں کہتا ہوں اسلامی دعوت کی تاریخ میں یہ بہت ہی بڑی فتح ہے جو کسی جماعت کو حاصل ہوئی۔ اس کے آثار کافی دیر تک اسلامی تاریخ میں نکلتے رہے۔

پھر اس کے نتیجے میں سورت فتح نازل ہوئی۔ جس پر حضور اکرمؐ بہت ہی خوش تھے۔ حضورؐ پر اللہ کی رحمتوں کی بارش یوں ہوئی کہ اگلے پچھلے قصور معاف ہوئے اور آپؐ کے ساتھی مومنین پر یہ فیض ہوا کہ اللہ ان سے راضی ہوا۔ حضورؐ کو مکمل ہدایت دی گئی اور عظیم نصرت دی گئی اور پھر جماعت اہل ایمان کو تورات ' انجیل اور قرآن کا سرٹیفکیٹ دیا گیا۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا "گزشتہ رات مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی جو اس تمام دولت سے زیادہ قیمتی ہے جس پر کبھی سورج طلوع ہوا ہے"۔

اور آپ نے رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ ان نعمتوں پر آپؐ اور طویل ترین نمازیں پڑھتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ نماز پڑھنے کے لیے اٹھتے تو آپ کے پاؤں سوج جاتے۔ حضرت عائشہؓ نے آپؐ سے عرض کیا کہ اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے ہیں تو آپؐ کیوں اس قدر تکلیف کرتے ہیں اس پر حضورؐ نے فرمایا: "اے عائشہ! کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں"۔

یہ افتتاح تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ تھا۔ اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ اس فتح کے ذریعے مسلمانوں پر کس قدر انعامات کیے گئے اور اللہ نے اپنے دست قدرت سے کس طرح ان کے دلوں پر سکینہ اتارا۔ اور آخرت میں ان کے لیے یہ بخشش اور فوز عظیم کے انعامات ہوں گے۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ فِيۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِيۡمَانًا مَّعَ اِيۡمَانِهِمۡ ؕ وَلِلّٰهِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۙ﴿۴﴾ لِّيُدۡخِلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا وَيُكَفِّرَ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنۡدَ اللّٰهِ فَوۡزًا عَظِيۡمًا ۙ﴿۵﴾ وَّيُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ وَالۡمُشۡرِكٰتِ الظَّآنِّيۡنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوۡءِ ؕ عَلَيۡهِمۡ دَآئِرَةُ السَّوۡءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ وَلَعَنَهُمۡ وَاَعَدَّ لَهُمۡ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ﴿۶﴾ وَلِلّٰهِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا ﴿۷﴾

وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھا لیں۔ زمین اور آسمانوں کے سب لشکر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ علیم و حکیم ہے۔ (اس نے یہ کام اس لیے کیا ہے) تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے..... اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور ان منافق مردوں اور عورتوں اور

مشرک مرد و عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں۔ برائی کے پھیر میں وہ خود ہی آ گئے ' اللہ کا غضب ان پر ہوا اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم مہیا کر دی جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ زمین اور آسمان کے لشکر اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

سکینہ کا لفظ ایک معنوی تعبیر اور تصویر اور پرتو پر دلالت کرتا ہے۔ جب کسی قلب پر سکینہ نازل ہو تو وہ مطمئن ' خوش اور پروقار ہوتا ہے۔ اسے یقین ' بھروسہ اور ثبات حاصل ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اور اللہ کے ہر حکم پر راضی ہوتا ہے۔ اور ایسا شخص پھر نہایت باوقار ہوتا ہے۔

اس واقعہ پر مسلمانوں کے دل کئی وجوہات سے جوش میں آ جاتے تھے اور ان پر مختلف قسم کے تاثرات کا دباؤ تھا۔ ایک تو لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی تعبیر یہ کر رکھی تھی کہ آپ مسجد حرام میں اسی سال داخل ہوں گے۔ پھر یہ کہ قریش نے یہ شرط رکھ دی کہ آپؐ اس سال واپس ہو جائیں اور اگلے سال عمرہ کریں اور حضورؐ نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ حالانکہ انہوں نے احرام باندھ لیا تھا اور ہدی کے جانوروں کے گلے میں شعار باندھ لیا تھا۔ اور یہ امور ایسے تھے جو بعض جذباتی لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ' حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہ اس وقت سخت جوش میں تھے کہ آیا ہمیں یہ نہ بتایا گیا تھا کہ ہم بیت اللہ کو جائیں گے اور طواف کریں گے۔ ابوبکرؓ جن کا دل حضور اکرمؐ کے ساتھ دھڑکتا تھا ' نے فرمایا کیا آپؐ نے یہ فرمایا تھا کہ اسی سال تم عمرہ کرو گے؟ تو انہوں نے کہا اس سال کا تو نہیں کہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "پس تم آؤ گے اور طواف کرو گے"۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو چھوڑا اور حضور اکرمؐ کے پاس پہنچے اور حضورؐ سے کہا: "کیا آپ نے نہ بتایا تھا کہ ہم بیت اللہ کو جائیں گے اور طواف کریں گے؟" حضورؐ نے فرمایا "درست ' لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ تم اسی سال عمرہ کرو گے؟" تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "نہیں"۔ حضورؐ نے فرمایا "بے شک تم آؤ گے اور طواف کرو گے"۔ یہ باتیں تھیں جو دلوں میں لاوے کی طرح ابل رہی تھیں۔

پھر مومنین قریش کی شرائط پر بھی سخت برہم تھے۔ یہ کہ اگر کوئی مسلمان اپنے ولی کی اجازت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ جاتا ہے تو اسے تو واپس کر دیا جائے گا لیکن اگر کوئی مسلمان ' مسلمانوں کی اجازت کے بغیر مکہ چلا جاتا ہے تو اسے واپس نہ کیا جائے گا۔ پھر انہوں نے اپنی جاہلیت کی وجہ سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا نام کٹوا کر بسمک اللھم کر دیا۔ پھر انہوں نے آپ کے نام سے رسول اللہ کا لفظ کٹوا دیا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت علیؓ نے سہیل کے کہنے کے مطابق (رسول اللہ) کا لفظ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ نے اسے خود محو کر دیا اور کہا "اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں رسول ہوں"۔

مسلمانوں کی بہادری ' دینی حمیت اور جذبہ جہاد اور مشرکین کے ساتھ لڑنے کا جذبہ تو اس اجتماعی بیعت سے ظاہر ہے جو انہوں نے کی۔ لیکن معاملہ چونکہ اچانک صلح ' امن اور واپسی پر منتج ہو گیا اس لیے مسلمان اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کی طرف سے جذبات کا اظہار ہوا۔ اس طرح رسول اللہؐ کے فرمان کے باوجود انہوں نے قربانیاں نہ کیں ' سر نہ منڈوائے ' باوجود اس کے کہ حضورؐ نے تین مرتبہ احکام صادر فرمائے۔ حالانکہ وہ حضورؐ کے احکام پر مرمٹنے والے تھے۔ عروہ ابن مسعود ثقفی نے قریش کو جو رپورٹ دی اس سے مسلمانوں کی حالت ظاہر تھی اور اب حالت یہ ہے کہ جب حضورؐ نے قربانی ذبح کر دی اور سر منڈوا لیا تب جا کر انہوں نے جانور ذبح کیے اور سر منڈوائے۔

غرض ان کو اس واقعہ نے سخت ہلا مارا تھا۔ اب جب کہ وہ اطاعت کی طرف آگئے تو پھر بھی دہشت زدہ تھے۔

یہ لوگ مدینہ سے عمرہ کی نیت سے نکلے تھے۔ جنگ لڑنے کا تو ارادہ ہی نہ تھا۔ نہ نفسیاتی لحاظ سے اور نہ مادی لحاظ سے وہ جنگ کے لیے تیار تھے۔ لیکن جب قریش نے سخت موقف اختیار کیا' پھر یہ خبر آئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ پھر قریش نے کچھ لوگ بھیجے جنہوں نے مسلمانوں کے لشکر پر تیر اور پتھر پھینکے۔ جب رسول اللہؐ نے جنگ پر بیعت چاہی تو وہ تہ دل سے تیار ہو گئے۔ لیکن اس بیعت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کے اندر جنگی حالت اچانک نہ آئی تھی۔ یہ جنگی حالت بالکل اچانک تھی یہ لوگ جنگ کے لیے نکلے نہ تھے۔ اس وجہ سے بھی مسلمانوں کے دلوں کے اندر جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا۔ یہ چودہ سو تھے۔ اور قریش اپنے گھروں میں تھے اور ان کے ساتھ اطراف مکہ کے مشرکین بھی معاون و مددگار تھے۔

جب انسان ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر اس آیت پر غور کرتا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۴۸ : ۴) "وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی" تو انسان لفظ اور مفہوم دونوں کی خوبصورتی اور مٹھاس کو محسوس کرتا ہے اور اس وقت جو صورت حالات تھی وہ بھی پوری طرح ذہن میں بیٹھ جاتی ہے اور اچھی طرح محسوس ہوتی ہے کہ اس سکینت کی ٹھنڈک نے کس طرح جلنے والے دلوں کو فوراً سکون بخشا ہو گا اور کس طرح ان کو بحال کر دیا ہو گا۔

چونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کے دلوں کی حالت کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ جو جوش ہے وہ جوش ایمان ہے' جو محبت اور غیرت ہے وہ حمیت اسلامی اور غیرت ایمانی ہے۔ کسی مفاد یا جاہلیت کے لیے نہیں ہے۔ اس لیے اللہ نے یہ سکینت نازل کی۔

لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ (۴۸ : ۴) "تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھا لیں"۔ طمانیت وہ درجہ ہے جو ایمان کے جوش و خروش کے بعد آتا ہے۔ اس میں بھرپور اعتماد ہوتا ہے۔ کوئی بے چینی نہیں ہوتی' ایسی رضامندی ہوتی ہے جو اعتماد و یقین پر مبنی ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس بات کو نمایاں کیا جاتا ہے کہ نصرت اور غلبہ نہ تو ناممکن ہے۔ اور نہ ہی مشکل ہے۔ اگر اللہ کی حکمت کا تقاضا ہوتا تو یہ اللہ کے لیے بہت ہی آسان ہے۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے' یہی اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے۔ اللہ کی افواج لاتعداد ہیں' ان پر کوئی قوت غالب نہیں آسکتی۔ لیکن اللہ نے غلبے کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَکَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا (۴۸ : ۴) "زمین اور آسمانوں کے لشکر اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے"۔ یہ اللہ کی حکمت ہے اور اس کا علم ہے جو معاملات کو اپنی مرضی سے چلاتے ہیں۔

اور اس علم اور حکمت ہی کا تقاضا تھا کہ۔

اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ (٤٨:٤) لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ (٤٨:٤)
"جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ وہ ایک ایمان اور بڑھالیں"۔ تاکہ ان کے لیے اللہ نے جو بڑی کامیابی مقدر رکھی ہے' وہ پوری ہو جائے۔

لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ يُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا (٤٨:٥) "تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور ان کی برائیاں ان سے دور کر دے۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑی کامیابی ہے"۔

اگر اس بات کو اللہ فوز عظیم قرار دیتا ہے تو یہ فی الواقع فوز عظیم ہے۔ اپنی حقیقت میں فوز عظیم ہے۔ یہ ایک عظیم کامیابی ہے' ان لوگوں کے خیال میں جن کو وہ ملی ہے' اللہ کی تقدیر کے مطابق اور اللہ کے پیمانوں کے مطابق۔ اس وقت مسلمان بہت خوش تھے ان فتوحات پر جو اللہ نے ان کے لیے لکھ دی تھیں۔ جب انہوں نے اس سورت کا یہ آغاز سنا تو وہ ان فتوحات کی امید کرتے تھے۔ ان کے انتظار میں تھے اور ان کو علم ہو گیا تھا کہ اللہ رسول اللہؐ پر کیا کیا مہربانیاں کرنے والا ہے۔ اور اس میں ان کا جو حصہ ہے اس کے لیے وہ انتظار میں تھے۔ اور آپ سے پوچھتے رہتے تھے اور جب انہوں نے سنا اور جانا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

---ooo---

اس کے بعد اللہ کی حکمت کا ایک دوسرا پہلو سامنے آتا ہے' جو اللہ نے اس واقعہ میں رکھا ہوا تھا یہ کہ منافقین اور منافقات کو سزا دے اور مشرکین اور مشرکات سے ایسے کاموں کا صدور ہو اور وہ سزاؤں کے مستحق ہو جائیں۔

وَّ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا (٦) وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (٤٨:٧) "اور ان منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے جو اللہ کے متعلق برے گمان رکھتے ہیں۔ برائی کے پھیر میں وہ خود ہی آ گئے' اللہ کا غضب ان پر ہو اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم مہیا کر دی جو بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ زمین اور آسمان کے لشکر اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست اور حکیم ہے"۔

اس آیت میں اللہ نے مشرکین اور مشرکات' منافقات اور منافقین کو صفت سوء ظن میں شریک کیا ہے اور اس صفت میں کہ ان کو یقین نہ تھا کہ اللہ مومنین کی امداد کرے گا۔ اس لیے اللہ نے ان کو اس سزا میں بھی شریک رکھا کہ ان پر برائی کا پھیر آگیا اور یہ خود ہی گھیرے گئے۔ اور یہ برائی ان پر پڑنے والی ہے۔ اور ان سب پر اللہ کا غضب ہے اور سب پر اللہ کی لعنت ہے اور ان سب کا انجام بھی برا ہے اور یہ اس میں شریک ہیں۔ یہ اس لیے کہ نفاق ایک بہت ہی ذلیل حرکت ہے۔ یہ شرک

کے برابر ہے بلکہ شرک سے بھی بری ہے اور گری ہوئی حرکت ہے۔ اور مسلمانوں کو اذیت دینے میں ان منافقین اور منافقات کا کردار مشرکین اور مشرکات سے کم نہیں ہے۔ اگرچہ دونوں کی اذیتوں کا دائرہ اور نوعیت مختلف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کی اہم صفت یہ قرار دی ہے کہ یہ اللہ کے بارے میں بدگمانیاں کرتے ہیں۔ ایک مومن اپنے رب کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہے اور ہمیشہ اللہ سے خیر چاہتا ہے۔ اور خیر کی توقع کرتا ہے خواہ اس کے حالات اچھے ہوں یا وہ مشکلات میں ہو۔ وہ اپنے ایمان کو مضبوط کرتا ہے کہ دونوں حالات میں اللہ سے بھلائی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا دل اللہ کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اور اللہ بھلائی کے چشمہ کو کبھی بند نہیں فرماتا۔ جب انسان کا قلب واصل باللہ ہو تو وہ اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے اور براہ راست اس کا ذائقہ محسوس کرتا ہے۔ رہے منافق اور مشرک تو ان کو تعلق باللہ کی نعمت حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ اس حقیقت کو محسوس نہیں کرتے اور نہ اسے اپنے اندر پاتے ہیں۔ پس وہ اللہ کے ساتھ سوء ظن کرتے ہیں اور صرف ظاہری امور کو دیکھ کر فیصلے کرتے ہیں اور اپنے احکام کو ظاہری امور پر مبنی کرتے ہیں۔ جب کوئی ظاہری علامات ان کو نظر آتی ہیں تو وہ توقع کرتے ہیں کہ ان پر بھی مصیبت آگئی اور مسلمانوں پر بھی۔ ان کو اللہ کی تقدیر اور تدبیر پر کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ اللہ کی تقدیر اور تدبیر بعض اوقات نظروں سے اوجھل ہو کر کام کرتی ہیں۔

اس آیت میں اللہ نے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کی مختلف انواع و اقسام کو جمع کیا، ان کا حال بیان کیا اور یہ بتایا کہ ان کے لیے کس قدر برا انجام ہے اور آخر میں بتایا کہ ان کا سوء ظن غلط ہے۔ اللہ کی قدرت وسیع اور حکمت دور رس ہے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (۴۸ : ۷) "زمین و آسمان کے لشکر اللہ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں اور وہ زبردست و حکیم ہے"۔ لہٰذا ان دشمنان اسلام کی کوئی بات اللہ کو عاجز نہیں کر سکتی، ان کی کوئی سرگرمی اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ تو زمین و آسمان کی قوتوں کا مالک ہے اور عزیز و حکیم ہے۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رخ کیا جاتا ہے کہ آپ کا فرض منصبی کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں اہل ایمان کے فرائض کیا ہیں۔ آپ نے ان تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا۔ وہ ایمان لا چکے، بیعت الرضوان میں براہ راست اللہ سے بیعت بھی کر چکے۔ یہ عہد انہوں نے براہ راست اللہ سے کیا ہے۔ اس لیے یہ نہایت ہی عظیم مقام ہے جس تک وہ پہنچ گئے ہیں۔ یاد رکھیں کہ اس بیعت اور عقد کی ذمہ داریاں بھی عظیم ہیں۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ

۱ ع۱۰ ۹

مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۗ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۱﴾ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚۖ وَ كُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾ سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶﴾

اے نبیؐ، ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت دینے والا اور خبردار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ اے لوگو، تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کا (یعنی رسول کا) ساتھ دو، اس کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے رہو۔ اے نبیؐ بدوی عربوں میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے اب وہ آکر ضرور تم سے کہیں گے کہ "ہمیں اپنے اموال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا، آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں"۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ ان سے کہنا "اچھا، یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے۔ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے۔ (مگر اصل بات وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو) بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آسکیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم

سخت بدباطن لوگ ہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے' جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے' اور وہ غفور و رحیم ہے۔ جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔ ان سے صاف کہہ دینا کہ ''تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے' اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے''۔ یہ کہیں گے کہ ''نہیں' بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو''۔ (حالانکہ بات حسد کی نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔ ان پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ ''عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا' اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا''۔

اے نبیؐ' جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہو گا' اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے' اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا''۔

رسول اللہؐ ان تمام لوگوں پر گواہ ہیں جن کی طرف آپ کو بھیجا گیا ہے۔ آپ شہادت دیں گے کہ جو پیغام آپ کو دے کر بھیجا گیا تھا آپ نے وہ لوگوں تک پہنچا دیا ہے اور یہ کہ لوگوں کا ردعمل یہ رہا ہے۔ اور ان میں سے بعض مومن ہوئے۔ بعض نے کفر اختیار کیا اور بعض نے منافقت کا رویہ اختیار کیا۔ بعض لوگوں نے اصلاح قبول کی اور بعض بدستور مفسد رہے تو حضورؐ نے جس طرح رسالت کا حق ادا کیا اور پیغام پہنچایا اسی طرح حضورؐ شہادت بھی دیں گے کیونکہ حضورؐ مبشر ہیں' خوش خبری دینے والے ہیں' اچھے انجام اور اللہ کی مغفرت کی اور اچھے انجام کی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے اطاعت کی اور ڈرانے والے ہیں کافروں' منافقوں اور مفسد نافرمانوں کو کہ ان کا انجام برا ہو گا۔ ان پر اللہ کا غضب ہو گا' لعنت ہوگی اور سخت سزا ہو گی۔

یہ تو ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی۔ اس کے بعد مومنین سے خطاب ہے کہ رسالت کے حوالے سے تمہارے فرائض کیا ہیں؟ یہ کہ اللہ اور رسول اللہؐ پر ایمان لاؤ' اس کے بعد ایمان کے تقاضے پورے کرو' اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں اللہ اور رسولؐ کی مدد کرو' رسول اللہ کا غایت درجہ احترام کرو' اور صبح و شام اللہ کی تسبیح و تمجید کرو' یعنی پورے دن اللہ کی بندگی کرو کیونکہ دن کے دونوں اطراف کا ذکر کر کے اس سے مراد پورا دن لیا گیا ہے۔ یعنی ہر وقت اللہ سے جڑے رہو۔ یہ ہے ایمان کا ثمرہ اور پھل جس کی ہر مومن سے توقع کی جاتی ہے اور رسول کو شاہد' مبشر اور نذیر اسی لیے بنا کر بھیجا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ آپ لوگوں کے اور اللہ کے درمیان رابطہ قائم کر کے ایسی بیعت اور ایسا معاہدہ کرا دیں کہ آپؐ کے چلے جانے کے بعد بھی یہ رابطہ قائم رہے۔ جب لوگ رسول اللہؐ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کریں تو گویا انہوں نے اللہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (۴۸ : ۱۰) "اے نبی! جو تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے 'ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا"۔ یہ بات مسلمانوں اور رسول اللہؐ کے درمیان ہونے والی بیعت کو بہت ہی نازک اور ذمہ دارانہ بناتی ہے کہ لوگوں کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے اس عقد میں اللہ کا بھی ہاتھ تھا۔ اللہ یہ بیعت لینے والا تھا اور بیعت کرنے والوں کے ہاتھ کے اوپر اللہ کا ہاتھ تھا اور اللہ کی ذات! کس قدر عظیم ذات ہے اللہ' اللہ جو صاحب جلال و اکرام ہے! اس کا ہاتھ!

اس شعور اور تصور سے انسان کے دل سے اس عہد کو توڑنے کا خیال ہی نکل جاتا ہے۔ چاہے رسول اللہ اس دنیا سے اٹھ ہی کیوں نہ جائیں۔ اللہ تو بہرحال حاضر ہے۔ وہی تو اس عہد کا اصلی فریق ہے اور وہی نگران ہے۔

فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ (۴۸ : ۱۰) "جو شخص اس عہد کو توڑے گا' اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ذات پر ہو گا"۔ اسی کو خسارہ ہو گا۔ اس کے درمیان اور اللہ کے درمیان جو سودا ہوا ہے۔ اس میں فائدے میں رہنے والی پارٹی تو وہ خود ہے۔ اللہ تو دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے۔ لہٰذا اگر یہ عہد توڑے گا تو نقصان اسی کو ہو گا۔ یہ اللہ کے غضب اور اللہ کی سزا کا مستحق ہو گا۔ کیونکہ اللہ نقض عہد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا' اللہ تو وفائے عہد کرنے والوں اور وفاداروں کو پسند کرتا ہے۔

وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا (۴۸ : ۱۰) "اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا"۔ علی الاطلاق اجر عظیم ہو گا۔ تفصیلات کے سوا ہی۔ کیونکہ اللہ عظیم ہے جو یہ عہد کر رہا ہے۔ لہٰذا اس کا اجر بھی عظیم ہے۔ یہ اللہ کے حساب سے عظیم ہے۔ انسان تو اس اجر اور اس اجر کے عطا کرنے والے کی عظمت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ انسان نہ اللہ کی عظمت کا تصور کر سکتا ہے نہ اللہ کے عظیم پیمانوں کا تصور کر سکتا ہے کیونکہ انسان خود بھی چھوٹا ہے اور اس کا تصور بھی چھوٹا ہے۔

جب بات بیعت کی حقیقت پر ہو رہی تھی اور وفاداری اور بے وفائی تک پہنچی تو ان لوگوں کا ذکر شروع ہوا' جنہوں نے اس موقعہ پر بے وفائی کی۔ یعنی مدینہ کے اردگرد دیہات میں رہنے والے لوگ۔ جنہوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ سفر حدیبیہ میں نکلنے سے اس لیے انکار کیا کہ ان کو اللہ کے ساتھ بدظنی تھی اور اس موقعہ پر جو مومنین جا رہے تھے ان کے بارے میں ان کو توقع تھی کہ وہ مصیبت میں گرفتار ہوں گے اور نقصان اٹھائیں گے جو قریش کے پاس ان کے گھروں کو جا رہے تھے۔ اس سے قبل یہ قریش مسلسل دو سال مدینہ میں جا کر مسلمانوں کے ساتھ لڑتے رہے تھے۔ ان کے بارے میں اس سورت میں حضورؐ کو پیشگی اطلاع کر دی گئی ہے کہ جب آپ اور آپ کے رفقاء صحیح سلامت مدینہ پہنچیں گے تو ان لوگوں کے عذرات کیا ہوں گے۔ ان کا خیال تو یہ تھا کہ مسلمان واپس ہی نہ ہوں گے حالانکہ قریش نے مسلمانوں کے ساتھ دس سالہ صلح کر لی۔ اگرچہ شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف تھیں۔ لیکن دراصل قریش نے اپنے موقف سے پسپائی اختیار کی۔ انہوں نے حضور اکرمؐ اور مسلمانوں کو اپنے مساوی تسلیم کیا' صلح کر کے دشمنی سے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ بہرحال یہاں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے عدم خروج کے اصل اسباب بھی بتا دیتا ہے اور ان لوگوں کو حضور اکرمؐ اور مسلمانوں کے سامنے عریاں کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس جنگ میں آپ کے ساتھ' جو نکلے ہیں' ان کے لیے اچھا

مستقبل ہے ۔ وہ یہ کہ مستقبل میں ان کو نہایت ہی وافر مقدار میں اموال غنیمت ' فتوحات اور کامیابیاں ملیں گی اور یہ لوگ جو اس مہم سے پیچھے رہ گئے تھے یہ ان سے محروم ہوں گے ۔ مستقبل کی آسان مہمات میں یہ اعراب چاہیں گے کہ آپ کے ساتھ جنگ کے لیے نکلیں تاکہ اموال غنیمت میں اپنا حصہ پائیں ۔ آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ آسان مہمات میں اب ان کی پیشکش کو قبول نہ فرمائیں ۔ اور ان آنے والی مہمات میں صرف ان لوگوں کو لے جائیں جو حدیبیہ میں شریک تھے ۔ یہاں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اگر تم سچے طور پر جہاد کرنے والے ہو تو تمہیں سخت طاقتور دشمن کے ساتھ لڑنے کے لیے موقعہ دیا جائے گا اگر فی الواقع تم جنگ کرنا چاہتے ہو اس وقت پھر نکلنا ۔ وہاں اللہ تمہارا جو حصہ ہو گا ' دے گا ۔ اگر انہوں نے اس وقت اطاعت کی تو اجر عظیم کے مستحق ہوں گے ۔

---ooo---

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْلَنَا يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًآ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۱۱) بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا (۱۲) وَ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا (۱۳) وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۱۴) سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۵) قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۱۶) (۴۸ : ۱۱ تا ۱۶) "اے نبی ؐ بدوی عربوں میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے اب وہ آکر ضرور تم سے کہیں گے کہ "ہمیں اپنے اموال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول کر رکھا تھا ' آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا

فرمائیں"۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ ان سے کہنا "اچھا' یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے۔ اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے۔ (مگر اصل بات وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو) بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آ سکیں گے اور یہ خیال تمہارے دلوں کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم سخت بدباطن لوگ ہو۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے' جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے' اور وہ غفور و رحیم ہے۔ جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔ ان سے صاف کہہ دینا کہ "تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے' اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے"۔ یہ کہیں گے کہ "نہیں' بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو"۔ (حالانکہ بات حسد کی نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں۔ ان پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ "عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہوگی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا' اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا"۔

قرآن کریم نے یہاں صرف ان لوگوں کے اقوال نقل کر کے ان کی تردید پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس بہترین موقعہ پر ان کی گہری نفسیات کو لیا ہے۔ ان کے دلوں کے اندر اٹھنے والے وساوس اور خیالات کو لیا ہے۔ اور پھر اس کے لیے علاج تجویز کیا ہے۔ ان کے اندر جو اخلاقی بیماریاں تھیں' یہاں ان کی تشخیص کی گئی تاکہ ان کا مناسب علاج کیا جائے۔ جو حقائق ہیں وہ باقی رہیں اور اسلامی تصور حیات کے اصل الاصول واضح کر کے باقی رکھے جائیں۔

مدینہ کے اردگرد کے جو دیہاتی' باوجود دعوت کے 'حدیبیہ کے موقعہ پر رہ گئے تھے وہ قبائل غفار' مزینہ' اشجع اور اسلم وغیرہ تھے۔ قرآن کہتا ہے ان کا عذر یہ ہو گا۔

شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا (۴۸ : ۱۱) "ہمیں اپنے اموال اور بال بچوں کی فکر نے مشغول رکھا"۔ اور یہ تو کوئی عذر نہیں ہے۔ ہمیشہ ہر کسی کا مال اور اولاد اور اہل و عیال تو ہوتے ہی ہیں' اگر ایسے عذرات مقبول ہوں تو پھر کوئی شخص بھی نظریاتی کام اور اپنے عقیدے اور دعوت اسلامی کی ذمہ داریوں کے لیے کوئی وقت نہ پائے گا۔ اور دوسری بات وہ یہ کہیں گے۔

فَاسْتَغْفِرْ لَنَا (۴۸ : ۱۱) "آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں"۔ لیکن پھر اس میں بھی سچ نہیں ہے۔ بتایا جاتا ہے۔

يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ (۴۸ : ۱۱) "یہ لوگ اپنی زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں

جو دلوں میں نہیں ہوتیں"۔

اس موقعہ پر ان کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا ایک نظام قضا و قدر ہے اور اسے کوئی بھی روک نہیں سکتا۔جنگ سے پیچھے رہ جانا تقدیر کو نہیں روک سکتا۔ نہ کسی اقدام کو روکا جا سکتا ہے۔اللہ کی قدرت کے اندر تم لوگ گھرے ہوئے ہو۔وہ جس طرح چاہتا ہے 'تصرف کرتا ہے اور وہ ہر چیز سے خبردار ہے۔وہ علم کے مطابق تصرفات کرتا ہے۔

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (۴۸ : ۱۱) "ان سے کہنا "اچھا' یہی بات ہے تو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلے کو روک دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے۔اگر وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟ تمہارے اعمال سے تو اللہ ہی باخبر ہے"۔

اس سوال ہی میں بتا دیا کہ ایک سچے مومن کا رویہ کیا ہونا چاہئے' اسے چاہئے کہ وہ اللہ کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔اللہ کے احکام کی فوراً تعمیل کرے اور اس میں لیت و لعل نہ کرے۔کیونکہ توقف کرنے اور لیت و لعل کرنے سے نہ کوئی نقصان رفع ہو سکتا ہے اور نہ نفع موخر ہو سکتا ہے۔اور عذرات گھڑنا اس سے مخفی نہیں ہے۔اللہ جزاء و سزا اپنے علم کے مطابق دیتا ہے۔اس لیے عذرات گھڑنے سے اس کے ہاں کوئی اثر نہیں ہوتا۔یہ نہایت ہی بروقت ہدایت ہے۔مناسب فضا میں ہے اور یہی قرآن کا طریقہ ہے کہ وہ نہایت ہی مناسب وقت پر ٹوک دیتا ہے۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّ زُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ ظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا (۴۸ : ۱۲) "بلکہ تم نے یوں سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں ہرگز پلٹ کر نہ آ سکیں گے اور یہ خیال تمہارے دل کو بہت بھلا لگا اور تم نے بہت برے گمان کیے اور تم سخت بدباطن لوگ ہو"۔ یوں اللہ ان لوگوں کو عریاں کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ان کی نیت اور دلوں کا حال ان کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔انہوں نے جو اندازے لگا رکھے تھے وہ بھی ان کو بتا دیے گئے۔اللہ کے بارے میں ان کے دلوں میں جو سوئے ظن تھا وہ بھی بتا دیا۔ان کا خیال یہ تھا کہ رسول اللہ اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ میں دھکیل رہے ہیں۔لہٰذا مدینہ کو واپس آنے والے نہیں ہیں۔کیونکہ یہ لوگ ان لوگوں کے منہ میں جا رہے ہیں جنہوں نے ان کے گھر میں آکر ان سے جنگ کی ہے اور انہوں نے مدینہ میں آکر رسول اللہؐ کے ساتھیوں کو قتل کیا ہے۔ان کا اشارہ احد اور احزاب کی طرف تھا۔ان لوگوں نے اللہ کی قوتوں اور اللہ کی مہربانیوں کا حساب نہ لگایا تھا کہ اللہ اپنے مخلص بندوں پر کیا کیا کرم کرتا ہے۔نیز انہوں نے معاملات کو سیکولر طریقے سے سوچا تھا اور ان کے دل اسلامی نظریہ حیات سے خالی تھے' ان کے نزدیک فرض اور ڈیوٹی تو کوئی چیز ہی نہ تھی۔حالانکہ اسلامی نظریہ کے کچھ تقاضے تھے اور ان کے لیے ہر قربانی ہیچ سمجھی جانی چاہئے تھی۔پھر رسول اللہؐ کی اطاعت اور آپ کی معیت کو نفع و ضرر' نفع و نقصان کے حساب و کتاب سے برتر ہونا چاہئے تھا۔یہ تو وہ فریضہ تھا جسے نتائج کی پرواہ کیے بغیر ان کو ادا کرنا چاہیے تھا۔

بہرحال انہوں نے بدگمانیاں کیں اور بدظنی اور بدگمانی ان کے لیے خوشنما بنا دی گئی۔ ان کو اس بدگمانی کے علاوہ کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ انہوں نے اس بدظنی کے سوا کسی دوسرے واقعہ یا کسی دوسرے رخ کے بارے میں سوچا ہی نہیں اور نہ ان کی جانب سے سوء ظن تھا۔ یہ اس لیے پیدا ہوا تھا کہ ان کے دل برے تھے۔ ان کو یہاں ''قوم بور'' کہا گیا ہے۔ یہ عجیب انداز تعبیر ہے۔ ''بور'' اس زمین کو کہتے ہیں جو بنجر ہو اور اس میں کوئی روئیدگی نہ ہو۔ نہ کوئی درخت اور پھل ہوں، نہ کوئی سنہری فصل ہو۔ جس دل میں حسن ظن کی سرسبزی نہ ہو، پھر اللہ کے بارے میں پر امید نہ ہو اور اس کے اندر کوئی حسن ظن نہ ہو، تو وہ بنجر ہے، وہ مردہ ہے اور آخر کار اس نے برباد اور تباہ ہونا ہے۔

جماعت مومنہ کے بارے میں آج بھی بعض لوگ اس انداز سے سوچتے ہیں' اس قسم کے لوگ جس طرح مدینہ کے ارد گرد بستے تھے، جن کے دل خشک تھے اور ان میں زندگی کی روح نہ تھی۔ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ باطل پرستوں کا پلڑا بھاری ہے اور دنیا کی زیادہ قوتیں اہل شر اور اہل باطل کے ساتھ ہیں۔ نیک لوگ تعداد میں بہت کم ہیں' یا وسائل کے لحاظ سے غریب ہیں' یا مرتبہ اور مال و دولت کے اعتبار سے کم ہیں۔ یہ دیہاتی' بدوی اور اس قسم کے لوگ ہر زمان و مکان میں یہی کچھ سوچتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی سوچ کچھ یوں ہوتی ہے کہ اہل ایمان یا اسلام کے چاہنے والوں کا مقابلہ چونکہ بڑی قوتوں سے ہے اور یہ قوتیں بظاہر بہت ہی پھولی ہوئی ہیں لہٰذا ان مٹھی بھر اسلام والوں کی خیر نہیں ہے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ان سے دور رہا جائے۔ ایسے لوگ ہر وقت یہ توقع رکھتے ہیں کہ آج یا کل ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے گا۔ اور یہ دعوت ہی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے وہ بطور احتیاط اس راہ سے جدا دوسرے راستے پر چلتے ہیں۔ لیکن اللہ اس قسم کے لوگوں کے سوء ظن کو ہمیشہ ناکام بنا دیتا ہے اور اللہ اپنے فضل و کرم کے حالات کو تبدیل فرماتا ہے اور اپنی تدابیر سے اپنے بندوں کے لیے راہ ہموار کر دیتا ہے۔ اللہ اپنے پیمانوں سے ناپتا ہے' جو حقیقی پیمانے ہیں۔ اور جو اللہ کے قوی ہاتھ میں ہیں۔ وہ بعض لوگوں کو گراتا ہے اور بعض کو اٹھاتا ہے اور کافرین' منافقین اور اللہ کے بارے میں سوئے ظن رکھنے والوں کو اس کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ اور اس قسم کے لوگ ہر دور اور ہر زمانے میں ہوتے ہیں۔

اصل ترازو ایمان کا ترازو ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بدوی مسلمانوں کو کہتا ہے کہ اس ترازو سے تولو' اور اس ترازو کے مطابق ہی اعمال کی جزاء تجویز فرماتا ہے' اللہ کی رحمت اس ترازو کے ساتھ ہے۔ فرصت کے لمحات قلیل ہیں' اللہ کی رحمت اور مغفرت کو حاصل کرو اور فائدہ اٹھاؤ!

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا (۱۳:۴۸) وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۱۴:۴۸) ''اللہ اور اس کے رسولؐ پر جو لوگ ایمان نہ رکھتے ہوں ایسے کافروں کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک اللہ ہی ہے' جسے چاہے معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے' اور وہ غفور و رحیم ہے''۔ یہ لوگ اپنے اموال اور اہل و اولاد کا عذر پیش کرتے تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ جہنم جو کافروں کے لیے تیار رکھی ہوئی ہے' اس میں مال و اولاد کیا فائدہ دیں گے' اگر وہ اللہ اور رسول اللہؐ پر ایمان نہ

لائے۔ غرض ترازو کے دو پلڑے ہیں۔ایک ایمان کا دوسرا کفر و نفاق اور سوء ظن کا' ان میں ان کو ایک کو قبول کر لینا چاہئے۔ اللہ جو تمہیں ڈراتا ہے وہ آسمانوں اور زمین کی قوتوں کا مالک ہے۔وہ عذاب بھی دے سکتا ہے اور معاف بھی کر سکتا ہے۔

اللہ لوگوں کو جزا یا سزا ان کے اعمال پر دیتا ہے۔لیکن اس کی مشیت مطلق و آزاد ہے۔اس پر کوئی قید نہیں ہے۔ یہ بات یہاں اس لیے بتا دی گئی کہ لوگوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اللہ ہرچیز پر قادر ہے اور اعمال پر جزاء بھی اسی نے طے کی ہے۔اللہ کی رحمت اور مغفرت سب کے لیے قریب ہے۔ مناسب ہے کہ لوگ اسے طلب کریں۔قبل اس کے کہ اللہ کے عذاب کا فیصلہ صادر ہو جائے' اور یہ فیصلہ ظاہر ہے انہی لوگوں کے لیے ہو گا جو اللہ اور رسول اللہؐ پر ایمان نہ لائیں گے۔

اس کے بعد اللہ ان اموال غنیمت کی طرف اشارہ فرماتا ہے جو مومنین کے لیے مقدر ہو چکے ہیں۔اور یہ ان لوگوں کی بدگمانیوں کے بالکل متضاد صورت حالات ہوگی اور انداز کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات بہت ہی قریب وقت میں رونما ہونے والے ہیں۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (۴۸ : ۱۵) "جب تم مال غنیمت حاصل کرنے کے لیے جانے لگو گے تو یہ پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ تم سے ضرور کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے فرمان کو بدل دیں۔ان سے صاف کہہ دینا کہ "تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے' اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے"۔یہ کہیں گے کہ "نہیں' بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو"۔ (حالانکہ بات حسد کی نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ صحیح بات کو کم ہی سمجھتے ہیں"۔اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد فتح خیبر ہے۔ممکن ہے فتح خیبر ہی ہو۔اگر مراد خیبر نہ بھی ہو لیکن مراد یہی ہے کہ عنقریب مسلمان کسی مہم پر جائیں گے اور یہ لوگ کہیں گے کہ ہمیں بھی جانے دو۔

مفسرین نے خیبر کا نام اس لیے لیا ہے کہ خیبر کا واقعہ صلح حدیبیہ کے متصلا بعد میں ہوا۔کیونکہ فتح خیبر محرم ۷ ہجری میں ہوا۔یعنی صلح حدیبیہ کے دو ماہ بعد۔اور اس میں اموال غنیمت بھی بہت ملے تھے اور خیبر کے قلعے جزیرۃ العرب میں یہودیوں کی آخری پناہ گاہ تھے۔ بعض بنو نضیر اور بنو قریظہ بھی یہاں آکر پناہ گیر ہو گئے تھے حالانکہ ان کو جزیرۃ العرب سے خارج کر دیا گیا تھا۔

مفسرین نے یہ بات تواتر سے کہی ہے کہ حدیبیہ کی مہم پر جانے والوں کے ساتھ اللہ کا عہد تھا کہ خیبر کے اموال غنیمت میں ان کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو گا۔لیکن اس بارے میں کوئی نص وارد نہیں ہے۔شاید وہ عملی واقعات سے یہ اصول اخذ کر رہے ہیں۔حضور اکرمؐ نے ان کو اہل حدیبیہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔اور اس مہم میں آپ نے کسی اور کو ساتھ نہ لیا تھا۔

بہرحال اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا کہ آپؐ پیچھے رہنے والے اعراب کی اس پیشکش کو رد کر دیں جب وہ آپؐ کے ساتھ قریب کے آسان اموال غنیمت کے لیے جانا چاہیں۔ اور یہ فیصلہ دے دیا کہ ان کا نکلنا اللہ کے حکم کے خلاف ہے اور پیشگی اطلاع دے دی کہ جب آپؐ ان کی پیشکش کو رد کریں گے تو وہ الزام لگائیں گے کہ تم ہمارے ساتھ حسد کرتے ہو۔ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا "بلکہ تم حسد کرتے ہو"۔ تم اس مہم میں اس لیے نہیں لے جاتے کہ تم ہمیں اموال غنیمت نہیں دینا چاہتے۔ ساتھ ہی پھر فوراً یہ کہہ دیا کہ یہ لوگ اللہ کی حکمت کو نہیں جانتے' یہ کم فہم ہیں۔ اللہ کی حکمت یہ ہے کہ پیچھے رہنے والوں کو ذرا محرومیت سے دوچار کیا جائے اور مطیع فرمان بندوں کو ذرا انعامات دیئے جائیں تاکہ ان کی اطاعت شعاری کا انعام انہیں ملے۔ کیونکہ انہوں نے ایسے حالات میں اطاعت کی جب سامنے موت ہی موت نظر آ رہی تھی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے کہتا ہے کہ ان پیچھے رہ جانے والوں سے کہہ دیں کہ تمہارے لیے ایک اور امتحان کا مقام ابھی باقی ہے۔ عنقریب ایک مہم ایک زبردست قوم کے خلاف بھیجی جائے گی اور تمہیں اس میں بلایا جائے گا۔ اور یہ لوگ اسلام کی وجہ سے تمہارے ساتھ لڑیں گے۔ اگر اس امتحان میں تم کامیاب ہو گئے تو تمہارے لیے بھی اجر ہو گا۔ اگر اس آخری امتحان میں بھی تم معصیت پر جمے رہے تو پھر تم ہمیشہ کے لئے عذاب الیم کے مستحق ہو جاؤ گے۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْيُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴۸ : ۱۶) "ان پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں سے کہنا کہ "عنقریب تمہیں ایسے لوگوں سے لڑنے کے لیے بلایا جائے گا جو بڑے زور آور ہیں۔ تم کو ان سے جنگ کرنی ہو گی یا وہ مطیع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر تم نے حکم جہاد کی اطاعت کی تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا' اور اگر تم پھر اسی طرح منہ موڑ گئے جس طرح پہلے موڑ چکے ہو تو اللہ تم کو دردناک سزا دے گا"۔

اس کی تفسیر میں بھی اختلاف ہے کہ یہ لوگ کون ہیں جن کو اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ "بڑے زور آور ہیں" کہا گیا ہے کہ یہ لوگ رسول اللہؐ کے زمانے میں تھے یا خلفاء راشدین کے زمانے میں تھے۔ قریب بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ہی کے دور میں تھے اور مقصد یہ تھا کہ مدینہ کے ماحول میں جو بدوی عرب تھے' ان کے ایمان کو آزمایا جائے۔

اہم بات یہ نہیں ہے کہ یہ کون تھے اہم یہ ہے کہ قرآن کا انداز تربیت کیا ہے؟ قرآن بیمار دلوں کا علاج کس طرح کرتا ہے۔ کس طرح قرآن ہدایات دیتا ہے' کس طرح عملاً آزماتا ہے۔ یہ بات اس سے معلوم ہوتی ہے کہ پکے مسلمانوں کے سامنے ان بدوی لوگوں کی فکری حالت کو ظاہر کیا جاتا ہے کہ خود ان پر بھی اور مسلمانوں پر ان کی حالت کھل جائے۔ اور پھر ان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ایمان اور عمل میں ٹھوس رویہ اختیار کرو' اور اعلیٰ قدروں کو اپناؤ۔

چونکہ معاملہ آزمائش کا تھا اس لیے اللہ نے تمام مسلمانوں کے لیے خروج لازمی کر دیا۔ اور ان لوگوں کو متعین کر کے بتا دیا کہ حقیقی عذر کیا ہے۔ اگر اس کے مطابق کوئی جہاد سے رہ گیا تو اسے کوئی سزا نہ ہو گی نہ گناہ ہو گا۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ

لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾

النصف ۲ ع ۱۰

"ہاں اگر اندھا اور لنگڑا اور مریض جہاد کے لیے نہ آئے تو کوئی حرج نہیں۔ جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے گا اللہ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور جو منہ پھیرے گا اسے وہ دردناک عذاب دے گا"۔

اندھا اور لنگڑا تو دائمی اعتبار سے معذور ہیں اور وہ جہاد کے لیے نہیں نکل سکتے اور بیار وقتی طور پر معذور ہوتا ہے۔ جب تک کہ وہ تندرست نہیں ہوتا' وہ معذور رہتا ہے۔

اصل بات تو اطاعت اور معصیت کی ہے اور جذبہ اطاعت اور نیت معصیت ایسے امور ہیں جن کا تعلق دل اور نفسیات سے ہے۔ ظاہری اشکال اور ظاہری عذرات سے نہیں ہے۔ جو شخص اللہ اور رسول اللہؐ کی اطاعت کرتا ہے اس کی جزاء جنت ہے اور جو منہ پھیرے گا اسے یاد رکھنا چاہئے کہ عذاب الیم اس کے انتظار میں ہے۔ ہر کسی کو چاہئے کہ وہ جہاد اور اس کی مشقتوں کو' جہاد کے اجر کو پیچھے بیٹھے رہنے کو اور اس کی راحتوں کو تولے' ان کا باہم موازنہ کرے اور اسے ان میں سے جو بات پسند ہو' اسے اختیار کرے۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۴۵ ایک نظر میں

یہ پورا سبق مومنین کی باتوں پر مشتمل ہے ۔ مومنین کے ساتھ مکالمہ ہے ۔ اس مجموعے کے ساتھ مکالمہ جس نے درخت کے نیچے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی ' اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ اللہ حاضر تھا اور اس کا گواہ تھا ' اور اس بیعت کی تصدیق و توثیق کرنے والا تھا اور بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ تھا ۔ صحابہ کرامؓ کا وہ گروہ جنہوں نے اپنے کانوں سے سنا کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو یہ فرما رہا ہے :

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا (۴۸ : ۱۸) "اللہ ان مومنوں سے خوش ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے ۔ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا ' اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی" ۔ یہ ان مومنین کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہے اور ان کے ساتھ مکالمہ ہے ۔ اور ان کو خوشخبری ہے کہ اللہ نے ان کے لیے بہت ہی قیمتی غنائم جمع کر رکھے ہیں ۔ بہت سی فتوحات ان کو نصیب ہونے والی ہیں اور اس سفر میں بھی اللہ ان کا حامی و مددگار رہا اور آئندہ بھی رہے گا ۔ اور اللہ نے اپنی سنت کے مطابق ان کے لیے مسلسل فتوحات رکھی ہوئی ہیں اور اللہ کی سنت کبھی بدلتی نہیں ہے ۔ اس میں کفار پر تنقید بھی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے کیوں اس موقعہ پر صلح کو ترجیح دی اور یہ کہ رسولؐ نے جو خواب دیکھا تھا وہ سچا تھا کہ مسلمان مسجد حرام میں داخل ہوں گے ۔ اور یہ نہایت ہی پرامن انداز میں داخل ہوں گے اور ان کا دین بہرحال غالب ہوکر رہے گا ۔

یہ سبق اور یہ سورت اس ممتاز اور منفرد جماعت صحابہ کے خدوخال پر ختم ہوتی ہے ۔ جنہوں نے رسول اللہ کے ہمرکاب انقلابی کام کیا ۔ اور تورات اور انجیل کے حوالے سے ان کے اوصاف بیان ہوئے اور آخر میں اعلان ہوا کہ وہ مغفرت اور اجر کریم کے مستحق ہوگئے ہیں ۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۴۵ تشریح آیات

۱۸ --- تا --- ۲۹

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ﴿١٨﴾ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿١٩﴾

"اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی' ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی اور بہت سا مال غنیمت انہیں عطا کر دیا جسے وہ (عنقریب) حاصل کریں گے۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے"۔

میں آج چودہ سو سال بعد اسلامی تاریخ کے افق پر' ان مقدس لمحات کو دیکھ رہا ہوں جن میں یہ پوری کائنات دیکھ رہی ہے کہ عالم بالا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ اطلاع آ رہی ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ باتیں بتائی جا رہی ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس کائنات کے ان صفحات کو پڑھ سکوں اور اس کائنات کے ضمیر میں ان لمحات کے اندر جو کچھ پوشیدہ تھا اسے دیکھ سکوں۔ کیونکہ یہ پوری کائنات اس وقت اللہ کے اس قول کے ساتھ ہم قدم تھی کہ یہ متعین لوگ جو اس وقت زمین کے اس متعین ٹکڑے پر موجود ہیں اور درخت کے نیچے بیعت کر رہے ہیں' یہ زمین کا نمک ہیں۔

میں اپنی چشم بصیرت کے ساتھ ان سعادت مند ان زمین کے حالات کو دیکھنا چاہتا ہوں' جنہوں نے اپنے کانوں کے ساتھ اور ذاتی طور پر اپنی شخصیت کے ساتھ' یہ بات سنی کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتا ہے کہ "میں ان سے راضی ہو گیا"۔ پھر اس مقام کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے جہاں وہ تھے' درخت کے نیچے اور اس بیعت کا بھی تعین کر دیا جاتا ہے۔

اِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (۴۸ : ۱۸) "جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے"۔ یہ آیات انہوں نے اپنے سچے نبی کی زبان سے خود سنیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو مژدہ سنایا گیا۔

یا اللہ! ان مقدس ہستیوں نے ان لمحات کو کس طرح گزارا' اور ان ارشادات کو کس طرح سنا' جن میں ذات باری بذات خود ہر شخص کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اے فلاں اے فلاں' تم سے میں راضی ہوں' تم ہو جس نے درخت

کے نیچے بیعت کی۔ تمہارے دل کی بات میں جانتا تھا۔میں نے تم پر پھر سکینت نازل کی۔
ہم میں سے ایک شخص یہ آیت پڑھتا ہے۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا "اللہ ولی اور دوست ہے' ان لوگوں کا جو ایمان لائے"۔ تو وہ اپنے آپ کو سعادت مند سمجھتا ہے۔ وہ اپنے دل میں امید کرتا ہے کہ میں بھی ان شاء اللہ اس آیت کے عمومی مفہوم میں شامل ہوں یا پھر کوئی پڑھتا ہے یا سنتا ہے۔

انَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ "بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔ اس لیے وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور اپنے دل میں کہتا ہے۔ ان شاء اللہ میں بھی ان صبر کرنے والوں میں سے ہوں' لیکن وہ لوگ خود سن رہے ہیں اور خدا کے پیغمبر انہیں سنا رہے ہیں' ایک ایک سن رہا ہے کہ اللہ کی مراد اس سے ہے' اور وہ اس سے بات کر رہا ہے۔ اس تک پیغام بھیج رہا ہے کہ وہ اس سے راضی ہو گیا ہے۔ اس کے نفس میں جو کچھ تھا' اسے جانتے ہوئے بھی اس سے راضی ہو گیا۔
یا اللہ کس قدر عظیم اعزاز ہے یہ!

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ وَ اَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا (۴۸ : ۱۸) "اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا' جب وہ درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے' ان کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم تھا' اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی۔ ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی"۔ اللہ نے جان لیا کہ ان کے دل میں' اس کے دین کے لیے جوش و خروش ہے' اپنی ذات کے لیے نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سچے دل سے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ جانتا تھا کہ ان کے دلوں کے اندر جنگ کے سلسلے میں جو خیالات اٹھتے ہیں وہ ان کو پی رہے ہیں اور ضبط کر کے رسول اللہ کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں کہ رسول اللہ کے پیچھے ایک مطیع فرمان مسلم کی طرح کھڑے ہوں گے۔

فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ (۴۸ : ۱۸) "اللہ نے ان پر سکینت نازل کر دی"۔ یہ ایک عجیب لفظ اور انداز ہے۔ سکینہ نازل ہو رہا ہے۔ سکون' ٹھہراؤ' وقار اور ثابت قدمی یہ ان پر نازل ہو رہے تھے۔ اس وقت ایسے حالات میں دوڑ دھوپ' گرمی' غیرت اور دوسرے تاثرات کی وجہ سے لوگوں کے اندر بے چینی ہو گی' جسے ٹھنڈک' اطمینان اور مسرت سے بدل دیا گیا۔

وَ اَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا (۴۸ : ۱۸) "اور ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی"۔ یہ صلح بذات خود فتح تھی' اس سے کئی دوسری فتوحات کا آغاز ہوا۔ فتح خیبر تو فوراً ہی ہوئی اور مفسرین کی یہ اغلب رائے ہے کہ اس سے مراد فتح خیبر ہے۔

وَّ مَغَانِمَ کَثِیْرَۃً یَّاْخُذُوْنَھَا (۴۸ : ۱۹) "اور بہت سا مال غنیمت انہیں عطا کر دیا جسے وہ عنقریب

حاصل کریں گے''یا تو فتح کے ساتھ یہ اموال ملے اگر مراد فتح خیبر ہو' یا فتح کے بعد ملنے والے اموال غنیمت ۔ اگر ہم خود اس صلح ہی کو فتح قرار دیں کیونکہ اس مصالحت کی وجہ سے مسلمان کئی دوسری فتوحات کے لیے فارغ ہوگئے ۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا (۴۸ : ۱۹) ''اور اللہ زبردست اور حکیم ہے''۔ یہ تمام آیات کا نتیجہ ہے یعنی اللہ کی رضا' فتح اور بے شمار اموال غنیمت کے وعدے میں اللہ کی قوت' قدرت اور حکمت وتدبیر کارفرما ہے ۔ اور قوت اور حکمت ہی سے اللہ اپنے وعدے پورے کرتا ہے ۔

اس اعلان کے بعد کہ اللہ کی ذات ان بیعت کرنے والوں سے راضی ہوگئی ہے' اب بات کا رخ خود مومنین کی طرف مڑ جاتا ہے' اب وہ مخاطب ہیں ۔ صلح' فتح' ہدایت اور غنیمت ہر بات کی جاتی ہے جو انہیں دی جارہی ہے :

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُونَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿٢٠﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿٢١﴾ وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيرًا ﴿٢٢﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ﴿٢٣﴾

''اللہ تم سے بکثرت اموال غنیمت کا وعدہ کرتا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے ۔ فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمہیں عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تمہارے خلاف اٹھنے سے روک دیئے' تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے ۔ اس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے' اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔ یہ کافر لوگ اگر اس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے ۔ یہ اللہ کی سنت ہے ۔ جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے''۔

یہ ایک صریح خوشخبری ہے اللہ کی طرف سے' اس کو مومنین نے سنا' اس پر انہوں نے خوب یقین کیا اور انہوں نے جان لیا کہ ان کے لیے بہت کچھ تیار کر لیا گیا ہے اور اس کے بعد وہ زندہ رہے اور ان آیات کا مصداق بچشم سر دیکھتے رہے ۔ کیونکہ یہ اللہ کا وعدہ تھا اور اللہ کے وعدے کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی ۔ یہاں اللہ فرماتا ہے کہ فوری طور پر تو یہ فتح تمہیں عطا کر دی ۔ اس سے مراد صلح حدیبیہ ہو سکتی ہے' جیسا کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حدیبیہ ہی فتح اور غنیمت تھی اور جیسا کہ پہلے ہم نے بیان کیا صلح حدیبیہ درحقیقت فتح تھی اور جن حالات میں یہ فتح ہوئی' انہوں نے بھی

اس کو مسلمانوں ہی کی فتح بنایا اور اس سے مراد فتح خیبر بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ مجاہد سے مروی ہے کیونکہ حدیبیہ کے بعد یہ قریب ترین مال غنیمت تھا جو مسلمانوں کو ملا۔ زیادہ راجح بات یہ ہے کہ خود صلح حدیبیہ کو فتح کہا گیا ہے۔

اللہ نے بتایا کہ تم پر اللہ کا یہ بہت ہی بڑا احسان ہے کہ اس نے لوگوں کو روک دیا کہ وہ تم پر ہاتھ ڈالیں۔ ان میں مشرکین مکہ بھی تھے اور دوسرے لوگ بھی تھے جو بر وقت اس انتظار میں تھے کہ مسلمان کسی چکر میں پھنس جائیں اور ہم بھی حملہ کر دیں۔ اس وقت بہرحال مسلمان قلیل تعداد میں تھے۔ اور دوسرے لوگ بہت زیادہ تھے لیکن انہوں نے اپنی بیعت کو پورا کر دیا اور اپنی ذمہ داریوں کو ادا کیا۔ اس لیے اللہ نے ان سے لوگوں کے ہاتھ روکے اور انہیں امن میں رکھا۔

وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۴۸ : ۲۰) ''اور تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے''۔ یہ واقعہ جسے آغاز میں انہوں نے بہت ہی ناپسند کیا تھا اور ان کے دلوں پر وہ بھاری پتھر کی طرح تھا' اللہ بتاتا ہے کہ یہ ان کے لیے ایک معجزہ ہو گا۔ آنے والے دنوں میں وہ اس کے نتائج دیکھیں گے اور ان لوگوں نے جو رسول اللہ ؐ کی اطاعت کی اور سر تسلیم خم کیا' ناپسند کرتے ہوئے بھی' تو اس کی انہیں جزاء ملے گی وہ جان لیں گے کہ یہ تو بہت ہی عظیم واقعہ تھا۔ اور جو جزاء ملے گی وہ بہت ہی بڑی ہو گی اور ان کے دلوں میں سکون' اطمینان اور یقین انڈیل دیا جائے گا۔

وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (۴۸ : ۲۰) ''اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمہیں ہدایت بخشے گا''۔ تمہاری اطاعت' تمہاری فرمانبرداری اور تمہارے صدق نیت کی وجہ سے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جامع انعام کا اعلان کر دیا۔ انہیں مال غنیمت بھی ملے گا اور انہیں ہدایت بھی نصیب ہو گی۔ لہٰذا ہر طرف سے ان کے لیے خیر ہی خیر ہو گی۔ اور یہ بھلائی اور خیر اس معاملے میں ہو گی جسے وہ پسند ہی نہ کرتے تھے۔ اور ایک بھاری پتھر سمجھتے تھے۔ یوں ان کو پیشگی اطلاع دی جاتی ہے کہ اللہ نے ان کے لیے جو پسند کیا ہے وہی اصل پسند ہے۔ اس طرح ان کو تربیت دی جاتی ہے کہ ہر حال میں اطاعت اور حکم کی بجا آوری کرو۔

ان انعامات و مفادات کے علاوہ کچھ دوسرے مفادات کا بھی یہاں اعلان کیا جاتا ہے اور یہ مفادات وہ اپنے قوت بازو سے حاصل نہ کر سکے تھے لیکن اللہ نے اپنی قدرت اور تدبیر سے وہ چیزیں انہیں عطا کر دیں۔

وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا

(۴۸ : ۲۱) ''اس کے علاوہ دوسری اور غنیمتوں کا بھی وہ تم سے وعدہ کرتا ہے جن پر تم ابھی قادر نہیں ہوئے۔ اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔ اس کے ''علاوہ'' کے بارے میں روایات میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہے؟ یا فتح خیبر ہے؟ یا قیصر و کسریٰ کی مملکتوں کی فتوحات ہیں؟ یا اس سے وہ تمام فتوحات مراد ہیں جو صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کو نصیب ہوتی رہیں؟

زیادہ مناسب یہی ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہو کیونکہ یہ صلح حدیبیہ کے بعد ہوا اور اس فتح کے اسباب صلح حدیبیہ ہی نے فراہم کیے۔ یہ صلح صرف دو سال تک جاری رہ سکی۔ اس کے بعد مشرکین مکہ نے اس عہد کو توڑ دیا۔ اس طرح

اللہ نے اس فتح کی راہ ہموار کر دی اور مکہ مکرمہ بغیر جنگ کے فتح ہو گیا ۔ یہ مکہ ہی تھا جو مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی کیا کرتا تھا اور مسلمانوں کے گھر کے اندر آکر لڑتا تھا اور حدیبیہ کے وقت بھی اسی نے مسلمانوں کو بغیر عمرہ واپس کر دیا ۔ اللہ نے اسے گھیر لیا اور بغیر جنگ کے یہ قبضے میں آگیا ۔

وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا (۴۸ : ۲۱) "اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے" ۔ یہ بھی دراصل ایک درپردہ خوشخبری تھی ۔ اس وقت اللہ نے اسے ظاہر نہیں کیا تھا اور ان غیبی امور میں سے تھا جو ابھی ظاہر نہیں ہوئے تھے ۔ یہاں اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا تاکہ لوگ مطمئن اور پرامید ہوں اور خوش ہوں ۔

---ooo---

یہاں تک اللہ نے ان کو موجودہ غنیمت کے لیے بھی خوشخبری دے دی اور اس کے بعد کی آنے والی غنیمتوں کی خوشخبری بھی دے دی گئی اور مسلمان ان کا انتظار کرنے لگے' ان خوشخبریوں کے ساتھ ساتھ ایک بڑی خوشخبری یہ بھی دے دی گئی کہ اب ان شاء اللہ مسلمان فتح مند اور کامران رہیں گے ۔ اس سال جو صلح طے کرائی گئی 'وہ اس لئے نہیں کرائی گئی کہ مسلمان کمزور تھے یا یہ کہ مشرکین بہت قوی تھے لیکن بعض حکمتوں کی وجہ سے یہ صلح طے کرائی گئی اگر اس بار بھی اہل مکہ سے جھڑپ ہو جاتی تو بھی یہ ہزیمت اٹھاتے 'کیونکہ اللہ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ جب مسلم اور کافر کا کسی فیصلہ کن مقام پر مقابلہ ہو جائے تو مسلم فتح یاب ہوں ۔

وَ لَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا (۲۲) سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۲۳) (۴۸ : ۲۲ تا ۲۳) "یہ کافر لوگ اگر اس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے ۔ یہ اللہ کی سنت ہے ۔ جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے" ۔

یوں مومنین کی فتح اور کفار کی شکست کو اللہ اس سنت کے مربوط فرماتا ہے جو اس کائنات میں جاری ہے جس کے اندر کوئی تغیر نہیں ہوا کرتا ۔ کس قدر عظیم سکینت ہے یہ؟ کس قدر عظیم بھروسہ ہے یہ؟ کس قدر ثابت قدمی ان مومنین کو دی جارہی تھی کہ وہ اللہ کے کلام میں اس کے نبی کی زبانی اپنی فتح اور کفار کی شکست کی خوشخبریاں سن رہے ہیں ۔

اللہ کی سنت تو کبھی تبدیل نہیں ہوتی ۔ ہاں اس کی سنت کے مطابق فتح میں دیر ضرور ہو سکتی ہے ۔ کیونکہ فتح کے اسباب کا تعلق مومنین کی تیاری اور تربیت سے ہوتا ہے اور ان کی تیاری اور اچھی طرح تربیت کا علم اللہ ہی کو ہوتا ہے ۔ یا ان حالات کی آمد پر ہوتا ہے جن میں مومنین کے لیے نصرت اور فتح کے اسباب و حالات فراہم ہو جائیں اور کافروں کی ہزیمت یقینی ہو جائے تاکہ فتح کی اہمیت اور اثر وسیع ہو جائے' یا دوسری وجوہات بھی ہو سکتی ہیں جن کو اللہ جانتا ہے ۔ بہرحال سنت الٰہیہ کے مطابق فتح حق کی ہوتی ہے اور اللہ کی سنت کبھی بدلتی نہیں ۔

وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۴۸ : ۲۳) "اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے" اب اللہ

فرماتا ہے کہ یہی حکمت تھی کہ وادی مکہ میں اللہ نے کافروں کو توفیق نہ دی کہ وہ مسلمانوں پر ہاتھ ڈالیں اور مسلمانوں کو بھی توفیق نہ دی کہ وہ مشرکین مکہ پر اس وقت ہاتھ ڈالیں جب وہ ان کے قابو میں آگئے تھے ۔ یہ ان چالیس آدمیوں کی طرف اشارہ ہے ۔ چالیس ہوں یا کم و بیش ۔ جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے آئے تھے ۔ یہ پکڑے گئے اور رسول اللہ نے معاف کر دیا۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿٢٤﴾ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَن يَبْلُغَ مَحِلَّهُ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَن تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِّيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿٢٥﴾ إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٢٦﴾

"وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے' حالانکہ وہ ان پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے اللہ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا۔ اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے' اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی۔ روکی وہ اس لیے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کر لے ۔ وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے ۔ (یہی وجہ ہے کہ) جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے ۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

یہ ایک واقعہ تھا جو ہو چکا تھا اور سامعین اسے خوب جانتے تھے ۔ اللہ اس انداز میں اس کا ذکر فرما رہا ہے کہ بتائیں کہ جو واقعات بھی ہوئے ان میں اللہ کی تدبیر اور تقدیر کام کر رہی تھی' اور اس سے قرآن مجید ان کے دلوں میں اس احساس

کو گھرا کر رہا تھا کہ اللہ کا ہاتھ ان کے لیے تدبیر کر رہا ہے' ان کی قیادت اللہ کے رسول کے ذریعہ اللہ کے ہاتھ میں ہے' اور اللہ ان کے میلانات کو بھی کنٹرول کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کے لیے ہو جائیں ۔ اپنے نفوس کو اللہ کے سپرد کر دیں اور انہیں احکام الٰہی میں کوئی تردد نہ رہے ۔ بالکل ادھر ادھر نہ دیکھیں اور پوری طرح اسلام میں داخل ہو جائیں ۔ اپنے احساسات' اپنے جذبات' اپنا رخ اور اپنی تمام سرگرمیاں اللہ کے حوالے کر دیں اور یہ یقین کر لیں کہ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور یہ کہ خیر وہی ہے جسے اللہ اختیار کرے اور یہ کہ وہ اللہ کی قدرت اور مشیت کے مطابق چل رہے ہیں ۔ چاہے وہ کوئی بات اختیار کریں یا اسے رد کر دیں اور اللہ بہرحال مسلمانوں کی بھلائی چاہتا ہے' تو اب اگر وہ اللہ کے احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں تو یہ بھلائی بڑی آسانی کے ساتھ حاصل ہو جائے گی ۔ اللہ علیم و بصیر ہے ۔ ظاہر اور پوشیدہ سب کو جانتا ہے وہ علم و بصیرت کے ساتھ ان کے لیے راہ تجویز کرتا ہے ۔ وہ ان کو ہرگز برباد ہونے نہیں دیتا ۔ نہ اللہ کسی ایسی چیز کو ان سے روکتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں ۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا (۴۸ : ۲۴) "اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اللہ اسے دیکھ رہا ہے"۔

---ooo---

اب اللہ مسلمانوں کے مخالف کیمپ پر تبصرہ فرماتا ہے کہ اللہ کے پیمانے کے مطابق ان کے شب و روز کیا ہیں؟ اور اللہ ان کی کارروائیوں کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے؟ وہ مومنین کو مسجد حرام سے روک رہے ہیں اور یہ کہ اللہ مسلمانوں کو کس نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور ان کے دشمنوں کو کس نگاہ سے!

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۲۵) اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۲۶) (۴۸ : ۲۵ تا ۲۶) "وہی لوگ تو ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا ۔ اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت موجود نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے' اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی ۔ روکی وہ اس لیے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے

داخل کر لے۔ وہ مومن الگ ہو گئے ہوتے تو (اہل مکہ میں) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے۔ (یہی وجہ ہے کہ) جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی تو اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر سکینت نازل فرمائی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

اللہ کے پیمانوں کے مطابق وہ بلا شک کافر ہیں' اس لیے وہ اس مکروہ لقب کے مستحق ہیں۔

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۴۸ : ۲۵) "وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا"۔ اللہ تعالیٰ یہ لقب ان کو عطا کرتا ہے کہ گویا کافر ہی اہل مکہ ہیں۔ چونکہ یہ صفت کفر میں کانوں تک غرق ہیں' اس لیے یہ لوگ اللہ کے ہاں مکروہ ترین مخلوق ہیں' اس لیے کہ اللہ کفر کو نہایت ہی مکروہ سمجھتا ہے۔ پھر دوسرا برا فعل جو یہ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ اہل ایمان کو مسجد حرام سے روک رہے ہیں اور قربانی کے جانوروں کو بھی روک رہے ہیں کہ ان کو اپنے محل ذبح تک لے جایا جائے۔

وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ الْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ (۴۸ : ۲۵)

"تم کو مسجد حرام سے روکا اور ہدی کے اونٹوں کو ان کی قربانی کی جگہ نہ پہنچنے دیا"۔ یہ کام اسلام میں بھی گناہ کبیرہ ہے اور جاہلیت میں بھی گناہ تھا۔ اور ابراہیم علیہ السلام سے ادھر جزیرۃ العرب میں جس قدر ادیان بھی گزرے ان سب میں یہ گناہ کبیرہ افعال تھے۔ ان کے عرف' ان کے عقیدہ اور مسلمانوں کے دین کے مطابق یہ مکروہ کام تھے۔ اس لیے اللہ نے مسلمانوں کو ان پر حملہ کرنے سے اس لیے نہیں روکا کہ ان کے یہ جرائم کہیں چھوٹے تھے' ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کی کوئی اور حکمت تھی۔ اللہ مہربانی فرماتے ہوئے اس حکمت کا انکشاف فرماتا ہے۔

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۴۸ : ۲۵) "اگر (مکہ میں) ایسے مومن مرد و عورت نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے اور یہ خطرہ نہ ہوتا کہ نادانستگی میں تم انہیں پامال کر دو گے اور اس سے تم پر حرف آئے گا (تو جنگ نہ روکی جاتی) مکہ میں بعض ضعیف اور کمزور مسلمان رہ گئے تھے جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہ کی تھی۔ اور انہوں نے مشرکین کے درمیان رہتے ہوئے اپنے اسلام کو خوف کے مارے چھپا رکھا تھا۔ اگر جنگ شروع ہو جاتی اور مسلمان مکہ پر حملہ آور ہو جاتے اور وہ نہ جانتے کہ کون مسلم ہے اور کون کافر ہے' ممکن تھا کہ یہ مسلمان ان ضعیف مسلمانوں کو روند کر قتل کر دیتے۔ اور پھر کافر یہ کہتے کہ مسلمانوں نے مسلمانوں کو بھی معاف نہ کیا۔ یوں مسلمانوں کو ان مسلمانوں کی دیت دینا پڑتی جن کو انہوں نے خطا کے طور پر قتل کر دیا تھا۔ پھر ایک حکمت یہ بھی تھی کہ آج جو کافر مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے اور ہدی کے جانوروں کو جائے ذبح سے روک رہے ہیں' انہی میں سے بعض لوگ عظیم مسلمان بننے والے ہیں۔ اور اللہ کی رحمتوں میں داخل ہونے والے ہیں اور اللہ ان سب کو جانتا تھا۔ اگر اس وقت یہ لوگ جدا ہوتے تو اللہ ضرور اجازت دے دیتا لیکن ابھی تک اللہ نے ان کو جدا نہ کیا تھا۔ اس لیے اللہ نے اس موقعہ پر کافروں کو اس مار سے بچا لیا۔

لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَآءُ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (۴۸ : ۲۵) "جنگ (روکی اس لیے گئی) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرلے۔ وہ مومن الگ ہوگئے ہوتے تو (اہل مکہ سے) جو کافر تھے ان کو ہم ضرور سخت سزا دیتے"۔ یوں اللہ اس منفرد جماعت مسلمہ کو اپنی حکمتوں کے بعض پہلو بتاتا ہے' جو اللہ کی تدبیر' تقدیر اور ہدایات کی پشت پر ہیں۔

ان لوگوں کی ظاہری حالت جنہوں نے کفر کیا' اور ان کے ظاہری اعمال بتانے کے بعد اب ان کے نفوس کی اندرونی حالت کا تذکرہ۔

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ (۴۸ : ۲۶) "یہی وجہ ہے کہ جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی"۔ وہ کسی نظریہ یا کسی نظام کے لیے نہیں لڑ رہے تھے بلکہ یہ کبر' فخر' سرکشی اور ہٹ دھرمی کے پرجوش حامی تھے۔ اس حمیت ہی کی وجہ سے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر رہے تھے۔ آپ کو مسجد حرام کی زیارت سے بھی روک رہے تھے اور قربانی کے جانوروں کو بھی انہوں نے روک رکھا جن کو آپ اس مقصد کے لیے لائے تھے تاکہ وہ قربانی کی جگہ تک جائیں اور وہاں قربانی کیے جائیں اور یہ حرکت کرکے یہ لوگ ہر عقیدے اور ہر رواج کو پامال کر رہے تھے۔ محض اس لیے کہ عرب یہ نہ کہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم زبردستی مکہ میں داخل ہوگئے۔ محض اس جاہلی غرور کی خاطر وہ اس قدر مکروہ فعل کا ارتکاب کر رہے تھے جو خود ان کے ہاں بھی نہایت ہی مکروہ فعل تھے۔ پھر یہ خود بیت اللہ کی حرمت کو پامال کر رہے تھے اور جس پر ان کی پوری معیشت کا دارومدار تھا۔ نیز ان لوگوں نے اشہر الحرام کا احترام بھی توڑ دیا جو ان کے ہاں بھی محترم تھے اور اسلام میں بھی محترم تھے۔ یہی حمیت تھی جس کی وجہ سے یہ لوگ ان تمام لوگوں کو برا بھلا کہتے رہے جنہوں نے ان کو مشورہ دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عمرہ کرنے سے نہ روکو۔ پھر اسی حمیت جاہلیہ کی وجہ سے سہیل ابن عمر نے کہا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ بسمک اللھم لکھو۔ اور پھر اس نے لفظ رسول اللہ" کٹواکر محمد ابن عبداللہ لکھوایا۔ یہ سب امور اسی سرکش اور پرغرور جاہلیت کے سرچشمے سے نکل رہے تھے۔

اللہ نے ان کے نفوس کے اندر یہ جاہلی حمیت اس لیے رکھ دی تھی کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ بہت ہی کرخت اور سرکش ہیں۔ مسلمانوں کو اللہ نے اس حمیت جاہلیت سے بچایا اور اس کی جگہ سکینہ اور خداخوفی نے لے لی۔

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا (۴۸ : ۲۶) "اور مومنوں پر سکینت نازل کی اور مومنوں کو تقویٰ کی بات کا پابند رکھا کہ وہی اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے"۔ سکینہ وقار اور ٹھہراؤ کی حالت کو کہا جاتا ہے جس طرح تقویٰ کے معنی محتاط اور متواضع انداز کے ہیں۔ اور یہ دونوں صفات اس مومن میں پائی جاتی ہیں جو اپنے رب سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اور اس تعلق پر مطمئن ہوتا ہے اور وہ اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور اپنی ہر حرکت میں اللہ سے ڈرتا ہے۔ اس لیے وہ تکبر اور سرکشی سے دور رہتا ہے۔ اور جب اللہ حکم دے کہ ذرا رک جاؤ' ٹھنڈے ہوجاؤ تو وہ اطاعت کرتا ہے۔ نہایت

رضامندی اور اطمینان کے ساتھ۔

یہی وجہ ہے کہ مومنین اس بات کے مستحق تھے کہ وہ اہل تقویٰ کی بات کریں۔ اور وہ اس کے مستحق بھی تھے اور یہ مومنین کی ایک نئی تعریف ہے جبکہ اس سے قبل جو کہا گیا کہ ان پر سکینت نازل کی گئی 'یہ بھی ان کے لیے ایک اعزاز تھا۔ کیونکہ سکینت کے اندر وقار اور تقویٰ دونوں شامل ہیں۔ تو یہ اس لیے نازل ہوا کہ وہ اللہ کے پیمانوں کے مطابق اس کے وہ اہل تھے۔ اور اس کی شہادت خود اللہ دیتا ہے۔ مسلمانوں پر اللہ کی طرف سے گواہی کہ وہ اس بات کے مستحق ہیں ایک دوسرا اعزاز ہے اور یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (٤٨ : ٢٦) "اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

--- ○○○---

یہ بات پہلے گزر گئی ہے کہ بعض مومنین جو مدینہ سے رسول اللہ کا خواب سن کر نکلے تھے ان پر اس امر کا بہت برا اثر ہوا تھا کہ وہ اس سال مسجد حرام میں داخل نہ ہو سکے۔ اور انہیں مسجد حرام سے لوٹا دیا گیا۔ یہاں اس خواب کی صداقت کی تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ خواب اللہ کی طرف سے تھا اور یہ سچا تھا۔ اور یہ واقع ہونے والا ہے بلکہ اس سے بڑا واقعہ پیش آنے والا ہے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿٢٧﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿٢٨﴾ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ

۴

اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ ۴ ع ۳

۱۲

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھا دیا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے' اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے' اور تمہیں کوئی خوف نہ ہو گا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرما دی۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں' اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود' اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی' پھر اس کو تقویت دی' پھر وہ گدرائی' پر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے"۔

رہی یہ بشارت کہ یہ مسجد حرام میں پرامن داخل ہوں گے اور سر منڈوائیں گے اور بال ترشوائیں گے اور بے خوف و خطر عمرہ ادا کریں گے تو یہ ایک سال بعد ہو گیا تھا۔ اور صلح حدیبیہ کے دو سال بعد تو بطریق اکمل ہو گیا تھا جب مکہ ہی فتح ہو گیا اور پورے مکے پر اللہ کا دین اور اسلامی نظام نافذ ہو گیا۔ لیکن اللہ اہل ایمان کو اسلامی آداب بھی سکھاتا ہے اور یوں فرماتا ہے کہ

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ (۴۸:۲۷) "کہ ان شاء اللہ تم مسجد حرام میں داخل ہو گے"۔ مسجد حرام میں داخل ہونا تو حتمی ہے کیونکہ اللہ نے اطلاع دے دی ہے لیکن مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اللہ کی مشیت کو اپنے شعور کا حصہ بنا لیں اور اسے بے قید سمجھیں تاکہ یہ بات ان کے دلوں میں بیٹھ جائے کہ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اور اسے اہل ایمان اپنی سوچ کا حصہ بنا دیں۔ قرآن بھی بار بار اس کا ذکر کرتا ہے اور تمام فیصلوں کو اللہ کی مشیت کے تابع قرار دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جہاں اللہ کے وعدے مذکور ہیں وہاں بھی وہ مشیت الہیہ کے ساتھ مشروط ہیں۔ حالانکہ اللہ کبھی اپنے وعدوں کے خلاف نہیں کرتا لیکن اللہ کی مشیت ہر قید سے آزاد ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے دل میں اس حقیقت کو بٹھا لیں تاکہ ان کی فکر کی اساس ان شاء اللہ پر ہو۔

اب یہ وعدہ کس طرح حقیقت بنا۔ روایات میں آتا ہے کہ جب سن سات ہجری میں ذوالقعدہ کا مہینہ آیا یعنی صلح حدیبیہ کے بعد تو حضور اکرمؐ مکہ کی طرف عمرے کے لیے نکلے۔ آپ کے ساتھ سب اہل حدیبیہ تھے۔ ذوالحلیفہ سے آپ نے احرام باندھا۔ ہدی کے جانور ساتھ لیے۔ جس طرح پہلے سال یہاں سے ہی آپ نے احرام باندھا تھا اور جانور ساتھ لیے تھے اور آپ اور آپ کے صحابہ کرام تلبیہ کرتے ہوئے چل پڑے۔ جب حضور اکرمؐ مر الظہران کے قریب ہوئے تو محمد ابن مسلمہ کو گھوڑوں اور اسلحہ کے ساتھ آگے بھیج دیا۔ جب مشرکین نے انہیں دیکھا تو وہ بہت ہی مرعوب ہو گئے۔ ان

کا خیال یہ ہوا کہ شاید رسول اللہؐ ان سے لڑنا چاہتے ہیں ۔ اور آپ نے ان کے درمیان ہونے والے عہد کو توڑ دیا جو یہ تھا کہ دس سال تک جنگ نہ ہوگی ۔ یہ لوگ گئے اور اہل مکہ کو خبردار کر دیا جب رسول اللہؐ تشریف لائے اور مرالظہران میں اترے ۔ تو تمام اسلحہ' تیر' نیزے بطن ماجج کی طرف بھیج دیئے اور وہاں سے مکہ کی طرف اس حال میں روانہ ہوئے کہ تلواریں نیام میں تھیں ۔ جس طرح ان کے ساتھ طے ہوا تھا ۔ جب آپ راستے میں تھے تو قریش نے مکرز ابن حفص کو بھیجا اس نے آکر حضورؐ سے کہا کہ ہم نے تو آپ کے بارے میں یہ نہیں سنا کہ آپ نے کبھی عہد توڑا ہے ۔ تو آپؐ نے فرمایا' آپ کا مطلب کیا ہے ۔ تو اس نے کہا کہ آپ اسلحہ لے کر آئے ہیں ۔ نیزے' تیر وغیرہ تو آپ نے فرمایا یہ بات نہیں ہے وہ تو ہم نے ماجج کی طرف بھیج دیئے ہیں تو اس نے کہا درست ہے آپ کے بارے میں ہماری معلومات یہی ہیں کہ آپ نیک اور متقی ہیں نیز وفائے عہد کرنے والے ہیں ۔

کفار کے روساء مکہ سے نکل گئے تاکہ ان کی نظریں رسول اللہؐ پر نہ پڑیں ۔ وہ آپ کو دیکھنا بھی گوارا نہ کر سکتے تھے ۔ رہے عام اہل مکہ مرد اور عورتیں اور بچے تو وہ راستوں اور کوٹھوں پر بیٹھ گئے اور رسول اللہ اور آپ کے ساتھیوں کو دیکھتے رہے ۔ حضورؐ مکہ میں داخل ہوئے' آپ کے رفقاء آپ کے آگے آگے تھے' سب تلبیہ پڑھ رہے تھے' جس قدر جانور تھے ان کو ذی طوی بھیج دیا گیا ۔ حضورؐ اپنی ناقہ قصواء پر سوار تھے جس پر آپؐ حدیبیہ کے دن بھی سوار تھے ۔ عبداللہ ابن رواحہ انصاری نے زمام تھام رکھی تھی اور ناقہ کو چلا رہے تھے ۔

یوں آپؐ کی خواب سچی ہوئی ۔ اللہ کا وعدہ پورا ہوا اور اگلے سال فتح مکہ بھی ہو گیا اور اللہ کا دین مکہ پر بھی غالب ہو گیا ۔ اور اس کے بعد پورے جزیرۃ العرب میں غالب ہو گیا اور اب آخری خوشخبری یوں پوری ہوئی :

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (۴۸ : ۲۸) "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے"۔ دین اسلام صرف جزیرۃ العرب ہی میں غالب نہ ہوا بلکہ پوری دنیا میں غالب ہوا ۔ اور یہ عمل صرف نصف صدی کے اندر اندر پورا ہو گیا ۔ یہ دین کسریٰ کی پوری مملکت پر غالب ہو گیا اور قیصر کی مملکت کے بھی بڑے حصے کو فتح کر لیا ۔ ہند اور چین میں بھی غالب ہو گیا ۔ پھر جنوبی ایشیا اور ملایا میں غالب ہوا اور انڈونیشیا میں غالب ہوا اور یہی دنیا تھی جو اس دور میں آباد تھی ۔ یعنی چھٹی صدی اور ساتویں صدی عیسوی میں ۔ لیکن اللہ کا دین آج تک تمام ادیان پر غالب ہے ۔ اگرچہ دنیا کے ان حصوں میں جہاں مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل تھا' مسلمان پسپا ہو گئے ۔ خصوصاً یورپ اور بحر ابیض کے جزائر سے ۔ اور مسلمان مشرق و مغرب میں اٹھنے والی نئی قوتوں کے مقابلے میں پسپا ہو گئے ۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ دین حق یعنی دین اسلام بحیثیت دین آج بھی تمام ادیان پر غالب ہے ۔ یہ دین اپنی ذات' اپنی ماہیت اور اپنی ذاتی صلاحیتوں اور خوبیوں کی وجہ اپنے ماننے والوں کی مدافعت بغیر تلوار کے کرتا ہے اور بغیر کسی سیاسی قوت کی پشت پناہی کے یہ دین آگے بڑھ رہا ہے ۔ کیونکہ اس دین کی فطرت میں نوامیس فطرت کے ساتھ ہم رنگی ہے اور قوانین فطرت اس کائنات میں اللہ کے ودیعت کردہ حقیقی اصول ہیں ۔ پھر اس دین میں عقل' روح اور جسم سب کی

ضروریات کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ انسانی تعمیر و ترقی' سوسائٹی کی ضروریات' فرد کی ضروریات سب کو مد نظر رکھا گیا ہے ۔ ایک جھونپڑی کے باشندے اور ایک محل اور کوٹھی کے باشندے سب کی ضروریات کو اس دین میں پورا کیا گیا ہے ۔

دوسرے مذاہب کے پیروکار اگر اس دین پر تعصب سے پاک نظروں کے ساتھ غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ بہت بڑی قوت والا دین ہے ۔ اور یہ آج بھی انسانیت کی صحیح رہنمائی کر سکتا ہے اور اس ترقی یافتہ دور میں کسی بھی ترقی یافتہ سوسائٹی کی ضروریات کو یہ دین نہایت ہی استقامت کے ساتھ پوری کر سکتا ہے ۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (۴۸ : ۲۸) "اور اس پر اللہ کی گواہی کافی ہے"۔ غرض بعثت نبی کی بعد ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اللہ کا یہ وعدہ سیاسی لحاظ سے سچا ثابت ہو گیا اور یہ دین تمام دنیا پر غالب ہو گیا اور اپنی ذات کے اعتبار سے یہ اب بھی تمام ادیان پر غالب ہے ۔ بلکہ تمام دوسرے ادیان دنیا سے ختم ہو گئے اور یہی ایک دین ہے جو اپنی ذاتی صلاحیت کی وجہ سے قائم و دائم ہے اور اپنی عملیت کے لحاظ سے یہ ہر وقت قابل عمل ہے ۔

آج صرف اس دین کے ماننے والے اس حقیقت کے ادراک سے محروم ہیں کہ یہ دین اسلام اپنی ذات کے اعتبار سے غالب ہے ۔ جبکہ اس دین کے دشمن اس بات کو جانتے ہیں اور اس سے بہت ڈرتے ہیں اور اپنی سیاسی پالیسی میں دین اسلام کی اس خطرناکی کو پیش نظر رکھتے ہیں ۔

---ooo---

اب ہم اس سورت کے خاتمہ کی طرف آرہے ہیں ۔ اس میں قرآن نے صحابہ کرام کی وہ تصویر کشی کی ہے جو اس وقت عملاً موجود تھی اور یہ جماعت محترمہ جس کے بارے میں پہلے آ چکا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور اس جماعت کے ایک ایک فرد تک اللہ کی خوشنودی کی اطلاع کر دی گئی' یہ کون لوگ تھے ؟ تو سنئے !

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴۸ : ۲۹) "محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں' اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں ۔ تم جب دیکھو گے انہیں رکوع و سجود' اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے ۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں ۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی' پھر اس کو تقویت دی' پھر وہ گدرائی' پر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی ۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تا

کہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے"۔

یہ ایک زبردست تصویر ہے۔قرآن کریم نہایت ہی انوکھے انداز میں یہ تصویر کشی کرتا ہے۔اس جماعت کی نمایاں جھلکیاں یہاں دی گئی ہیں۔ان کے ظاہری حالات ' ان کے پوشیدہ روحانی حالات ' ان کے باہم تعلقات ' ان کے کفار کے ساتھ تعلقات '۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۲۹:۴۸) "کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں"۔اور اللہ کی بندگی اور پرستش کرتے ہوئے۔

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (۲۹:۴۸) "تم دیکھو گے انہیں رکوع و سجود میں"۔اور ان کی قلبی حالت اور خواہش اور فکر کیسی ہے۔ان کی دلچسپیاں کیا ہیں۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا (۲۹:۴۸) "اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول ہیں"۔اور ان کے ظاہری خدوخال اور نشانات کیا ہیں 'چہرے مہرے کیسے ہیں۔

سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (۲۹:۴۸) "سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں"۔ اور تورات و انجیل میں بھی ان کی یہی صفات بتائی گئی ہیں۔ (۱) كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ (۲۹:۴۸) "ایک کھیتی کی طرح جس نے پہلے کونپل نکالی"۔ (۲) فَاٰزَرَهٗ (۲۹:۴۸) "پھر اسے تقویت دی"۔ (۳) فَاسْتَغْلَظَ (۲۹:۴۸) "پھر وہ گدرائی"۔ (۴) فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ (۲۹:۴۸) "پھر اپنے تنے پر کھڑی ہوگئی"۔ (۵) يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (۲۹:۴۸) "کاشت کرنے والے کو وہ خوش کرتی ہے"۔ (۶) لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۲۹:۴۸) "تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں"۔

یہاں سب سے پہلے اس صفت محمدی کو ثابت اور موکد کیا جاتا ہے جس کا انکار سہیل ابن عمرو نے کیا تھا کہ آپؐ کے نام کے ساتھ رسول اللہ کا لفظ نہ لکھیں یعنی محمد رسول اللہؐ (محمد اللہ کے رسول ہیں) اور اس کے بعد صحابہ کرام کی یہ انوکھی اور عجیب تصویر شروع ہو جاتی ہے 'نہایت ہی انوکھے انداز میں۔

مومنین کے حالات تو مختلف ہوتے ہیں لیکن ان جھلکیوں میں جو صفات دی گئی ہیں یہ تمام مومنین کی زندگی میں ہوتی ہیں اور یہ ان کی زندگی کے بنیادی نکات ہیں۔انہی نکات سے اس تصویر کے خطوط ابھرتے ہیں جو نہایت ہی خوبصورت اور چمک دار ہیں ۔یہاں اللہ نے جو جھلکیاں دی ہیں 'ان میں ان باتوں کو بہت نمایاں کیا گیا ہے جن سے اس جماعت کی عزت افزائی ہو۔لہٰذا وہ نکات اور وہ خطوط یہاں نمایاں ہیں جن کے ذریعہ عالم بالا میں انہیں اعزاز ملا ہے۔

ان کے معزز اور مکرم ہونے کی پہلی جھلکی اور رنگ یہ ہے کہ یہ لوگ۔

أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (۴۸ : ۲۹) "کافروں پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں"۔
یہ کافروں پر بہت ہی سخت ہیں حالانکہ اس وقت کافروں میں ان کے آباء' بھائی' قریبی رشتہ دار اور دوست موجود تھے۔ لیکن انہوں نے ایسے تمام رشتوں کو یکلخت کاٹ کر رکھ دیا۔ اور وہ آپس میں رحم دل ہیں حالانکہ ان کے درمیان صرف دینی اخوت ہے۔ لہٰذا ان کی شدت بھی اللہ کے لیے ہے اور ان کی نرمی بھی اللہ کے لیے ہے۔ یہ ہے نظریاتی حمیت' اسلامی حمیت' دینی غیرت۔ لہٰذا وہ اپنے نفس کے لیے کچھ نہیں چاہتے۔ اور نہ ان کے نفوس کے لیے اس دین میں کچھ ہے۔ یوں وہ اپنے جذبات اور اپنی محبتوں کو اپنے تعلقات اور طرز عمل کو اپنے نظریات اور عقائد کی اساس پر استوار اور تعمیر کر رہے ہیں۔ وہ نظریاتی دشمنوں پر سخت اور نظریاتی دوستوں کے لیے ریشم کی طرح نرم ہیں۔ وہ انانیت اور خواہشات نفسانیہ سے مجرد ہو گئے ہیں۔ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے کسی اور تعلق کے لیے وہ مشتعل ہی نہیں ہوتے۔

اب دوسری جھلکی' ان کے تکریم اور ان کا شرف ان کی رکوع و سجود میں ہے۔ جب وہ عبادت کرتے ہیں تو رکوع و سجود میں ہوتے ہیں اور تم انہیں ہمیشہ اس حالت میں پاؤ گے "گویا یہ صفت ان کی دائمی صفت ہے اور عبادت میں رکوع و سجود مکمل حالت ہے' اور ان کے ذہنوں میں بھی یہی حالت ہے اور ان کے جسم بھی بروقت رکوع و سجود میں ہیں گویا ان کی پوری زندگی اور پورا وقت اسی کام میں گزرتا ہے۔

ان کی جو تیسری جھلکی دکھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی باطنی' ان کی روحانی اور ان کی نفسیات کی حالت کیا ہے۔

يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللهِ وَرِضْوَانًا (۴۸ : ۲۹) "تم ان کو اللہ کے فضل اور خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے"۔ یہ ان کے شعور کی دائمی حالت ہے۔ ان کا دل جن باتوں میں ہروقت مشغول رہتا ہے' ان کے اندر ہروقت جو شوق اٹھتے ہیں وہ یہی ہیں کہ کسی طرح اللہ راضی ہو جائے' اللہ کی رضا اور اس کے فضل کی طلب کے سوا ان کا اور کوئی مشغلہ اور دلچسپی ہی نہیں ہے۔

اور چوتھی خوبی یہ کہ ان کی عبادات ان کے فیچرز اور ان کے خدوخال میں ظاہری طور پر نظر آتی ہیں۔

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (۴۸ : ۲۹) "ان کے سجود کے اثرات ان کے چہروں میں موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں"۔ یعنی ان کے چہرے میں نور' روشنی اور چمک نظر آئے گی۔ اور ان کا چہرا صاف و شفاف ہو گا۔ اور یہ ان کی صاف' زندہ اور روح پرور عبادت کی وجہ سے۔ اس سیماھم سے مراد وہ معروف نشان (محراب) نہیں ہے جو بعض لوگوں کے ماتھے پر پڑ جاتا ہے (جب وہ سجدے میں ماتھا رگڑتے ہیں) مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (۴۸ : ۲۹) کے لفظ سے ذہن میں یہ نشانی آجاتی ہے۔ اثر السجود سے مراد اثر العبادہ ہے۔ کیونکہ سجدہ عبادت اور بندگی اور اطاعت کا درجہ کمال ہوتا ہے اور اس میں انسان عاجزی اور اطاعت کی کمال حالت میں ہوتا ہے۔ اس حالت کا اثر انسان کے چہرے پر بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عبادت گزاروں کے چہروں پر سے کبر و غرور اور مستی دور ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ شریفانہ تواضع' صاف و شفاف طرز عمل' پروقار نور اور تقویٰ کا دھیما پن آجاتا ہے جس سے مومن کا چہرہ نہایت ہی خوبصورت نظر آتا ہے جبکہ اس کے چہرے پر مایوسی بالکل نہیں ہوتی اور وہ خوش اور مطمئن نظر آتا ہے۔

یہ روشن تصویر جو ان جھلکیوں میں نظر آتی ہے یہ کوئی نئی تصویر نہیں ہے۔ یہ ان کے لیے نظام قضا و قدر میں لکھی

ہوئی ہے ۔لوح محفوظ میں درج ہے ۔اور اسی وجہ سے اس کا تذکرہ توریت میں بھی آیا ہے اور انسانوں کو ان کے بارے میں خوشخبری دی گئی ہے ۔قبل اس کے وہ اس زمین پر پیدا ہوں ۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ (۴۸ : ۲۹) "یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے"

اللہ نے ان دو سابقہ کتابوں میں حضرت محمدؐ اور آپؐ کے رفقاء کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ (۴۸ : ۲۹) "ایک کھیتی کی طرح ہیں جس نے پہلے کونپل نکالی"۔ وہ اس طرح بڑھے جس طرح فصل ابتداء میں کونپلیں نکالتی ہے' تروتازہ ہوتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑھتی اور قوی ہوتی ہے ۔

فَاٰزَرَهٗ (۴۸ : ۲۹) "پھر اس کو تقویت دی"۔ یعنی اس کونپل نے اسے مضبوط کیا۔ یا نال نے اس کو مضبوط کیا۔

فَاسْتَغْلَظَ (۴۸ : ۲۹) "پھر وہ مضبوط سے مضبوط ہوگئی" یعنی وہ نال اور فصل۔

فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ (۴۸ : ۲۹) "پھر وہ تنے پر کھڑی ہوگئی"۔ یعنی وہ فصل اپنی نال' تنے یا ڈنڈی پر کھڑی ہوگئی' اب اس میں نہ کمزوری ہے اور نہ جھکاؤ' مضبوط ہے اور سیدھی ہے ۔

یہ تو ہے فصل کی ذاتی صورت حالات ۔ لیکن کسان کے نفس پر اس کے کیا اثرات ہیں ۔ ماہرین پر اس کے کیا اثرات ہیں جو بڑھنے والے کو بھی جانتے ہیں اور مرجھانے والے کو بھی جانتے ہیں ۔ پھلدار کو بھی جانتے اور بے پھل کو بھی ۔ تو ایسے لوگوں کے دل میں مسرت دوڑ جاتی ہے ۔

يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (۴۸ : ۲۹) "کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے"۔ اور بعض قراتوں میں الزراع کی جگہ الزارع (بونے والا) آیا ہے ۔ اور مراد ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اس بڑھنے والی' قوی' تروتازہ اور فرحت بخش فصل کے کسان ہیں ۔ پھر کفار کے دلوں پر اس کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟ وہ غصہ اور جھنجلاہٹ ۔

لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۴۸ : ۲۹) "تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں"۔ آخر میں کفار کے غصے کا ذکر کر کے قرآن نے اشارہ کر دیا کہ کہیں اس کو لوگوں کی فصل پر ہی چسپاں نہ کرو ۔ اس سے مراد اللہ والوں کی فصل ہے ۔ اور رسول اللہ کی فصل ہے اور یہ ان لوگوں کی فصل ہے جو دست قدرت کے آلات ہیں اور کفار کے لیے پریشانی کا باعث ۔

یہ مثال بھی کوئی نئی مثال نہیں ہے کہ کتاب تقدیر کے صفحات میں درج ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ذکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمین پر آنے اور مبعوث کیے جانے سے بھی پہلے اس کا ذکر تورات اور انجیل میں موجود ہے ۔ اور انجیل میں تو اس کی تصریح موجود ہے کہ محمد اور اس کے ساتھی آئیں گے ۔

یوں اللہ اپنی لازوال کتاب میں اس جماعت کی صفات کو قلم بند فرماتا ہے ۔ یعنی جماعت صحابہ کی ۔ یوں اس کائنات

کے مرکز میں یہ جماعت قائم ہوتی ہے ۔ پوری کائنات اس کے ساتھ چلتی ہے اور یہ جماعت باری تعالیٰ سے اپنی یہ تعریف سنتی ہے ۔ اور پھر آنے والی نسلوں کے لیے ان کی صفت بطور نمونہ ریکارڈ کر دی جاتی ہے تاکہ آئندہ کی نسلیں بھی اس معیار کو قائم کرنے کی سعی کریں تاکہ ایمان اپنے اعلیٰ درجات میں قائم ہو ۔

جماعت صحابہ کی اس صفت اور تکریم کے بعد پھر اعلان ہوتا ہے کہ ان کے لیے اجر عظیم ہے ۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا

(۴۸ : ۲۹) ''اس گروہ کے لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور اجر کا وعدہ فرمایا ہے'' ۔ اس جماعت کی صفات کے بعد اب یہ ایک عمومی اعلان ہے اور اس اعلان کے مستفید ہونے والوں میں ظاہر ہے کہ وہ سب سے پہلے داخل ہیں ۔ مغفرت اور اجر عظیم ۔ یہی ایک اعلان ہی ان کے لیے بڑا اعزاز ہے اور ان کے لیے تو اللہ کی رضامندی ہی بڑا اجر ہے لیکن اللہ کا فضل و کرم بلاقیود اور بلاحدود ہے اور اللہ کی بخشش بے انتہا و لامحدود ہے ۔

میں ایک بار پھر چشم خیال کو کھول کر اس جماعت مکرمہ کو دیکھ رہا ہوں جس کے دل سعید ہیں ۔ جو اللہ کے یہ فیوض رحمت اور اعزاز و اکرام اور عظیم اجر کے وعدے پا رہے ہیں ۔ ان کو سنایا جا رہا ہے ۔ یہ اعلان کہ اللہ کی کتابوں میں ' اللہ کے بیانوں میں ' اور اللہ کے ایوانوں میں ان کے لیے یہ ہے ' یہ ہے ۔ حدیبیہ سے یہ واپس ہو رہے ہیں اونٹوں کی رفتار کے گردوغبار میں یہ سورت سنتے ہیں ' اب یہ ان کی روح اور ان کی زندگی ہے ۔ ان کے کانوں اور ارواح میں یہ اتر رہی ہے ۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور مسکراتے ہیں اور ان کا وجود ہی اللہ کا مجسم فضل و کرم ہے ...... میں چشم تصور سے ان کو دیکھ کر ذرا ان کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں ۔ ذرا مجھے بھی ان کے ساتھ چند قدم چلنے دو ' لیکن جو شخص ان کی راہ پر نہیں چلا وہ اس جشن فتح میں کیا شریک ہو سکتا ہے ؟ نہیں وہ دور ہی سے دیکھتا رہے گا ...... اللہ ! تو ہی کسی کو یہ اعزاز بخش سکتا ہے کہ وہ دور سے نجات کو نہ دیکھے بلکہ اس جشن میں کود پڑے ۔ اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں اس جشن میں کودنے کے لیے بے تاب ہوں !

---ooo---

فی ظلال القرآن

جلد ----- پنجم

پارہ ----- ۲۶

سورۃ الحجرات ـ ۴۹

آیات ۱--- تا--- ۱۸

سورۃ الحجرات ایک نظر میں

یہ سورت صرف اٹھارہ آیات پر مشتمل ہے ۔ لیکن اپنے مضامین کے اعتبار سے ایک عظیم سورت ہے ۔ اس میں نظریات ' دستور و قانون اور انسانی وجود کے بارے میں نہایت ہی اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے ۔ یہ وہ حقائق ہیں جو انسان کے دل و دماغ کے لیے نہایت ہی وسیع آفاق اور وسیع دنیا کے دروازے کھولتے ہیں ۔ نہایت گہرے تصورات اور نہایت عظیم معانی اس کا موضوع ہیں ۔ اس کے ان موضوعات میں تخلیق و تنظیم ' تربیت و تہذیب ' دستور و قانون اور ہدایات و رہنمائی کے مسائل لیے گئے ہیں ۔ یہ مسائل اس قدر گہرے ' وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ ان کے بیان کے لیے موجودہ آیات کے مقابلے میں سیکڑوں آیات درکار ہیں ۔ لیکن یہاں دریا کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے یا دریا بحباب اندر ۔

یہ سورت دو باتوں کو نہایت کھول کر بیان کرتی ہے اور یہ دو باتیں نہایت اہم 'بہت عظیم اور غور و فکر کے لائق ہیں :

پہلی بات یہ کہ سورت ایک بلند 'پاکیزہ اور سلیم الفطرت ماحول اور اونچے معاشرے کے نشانات وضع کرتی ہی ۔ یہ وہ اصول اور قوانین بیان کرتی ہے اور وہ طرز زندگی متعین کرتی ہے جس کے اوپر یہ ماحول اور یہ معاشرہ قائم کیا جانا مطلوب ہے ۔ وہ اصول و مبادی جس کے اوپر اس سوسائٹی نے قائم ہونا ہے اور پھر جن کے مطابق اس ماحول اور اس سوسائٹی کی حفاظت کی جاتی ہے ۔ ایک ایسی سوسائٹی جو اللہ کی بنائی ہوئی ہو ' جو اللہ کی طرف رخ کیے ہوئے ہو اور جسے صحیح معنوں میں ایک الٰہی سوسائٹی کہا جا سکتا ہو ۔ ایک ایسی سوسائٹی جس کا دل صاف ہو 'جس کے تصورات پاکیزہ ہوں 'جس کی زبان پاک ہو اور جس کی سیرت اور جس کا اندرون پاک ہو 'ایک ایسی دنیا اور سوسائٹی جو اللہ کے ساتھ کچھ آداب کو ملحوظ رکھے ' جو رسول اللہؐ کے ساتھ بھی کچھ آداب قائم رکھی ہو 'اپنی ذات کے ساتھ بھی اس کے آداب ہوں اور دوسروں کے ساتھ بھی آداب ہوں جس کے ضمیر میں بھی آداب ہوں 'جس کے اعضا بھی مودب ہوں ۔ پھر اس سوسائٹی نے اپنے حالات کے لیے منظم قوانین بنا رکھے ہوں ' اور اس کا نظم و نسق ایسا ہو جو اسے بچاتا ہو ' اور یہ قوانین اور یہ تنظیمی ادارے انہی آداب پر مبنی ہوں ' انہی آداب سے پھوٹتے ہوں ' ان آداب کے ساتھ ہم آہنگ ہوں ' وہ اس سوسائٹی کی روحانی دنیا اور ظاہری دنیا کے لیے کافی ہوں ۔ اس کا شعور اور اس کے قوانین ہم آہنگ ہوں ۔ اسے آگے جانے اور ترقی کرنے اور اس کے دائرہ ممنوعات کے درمیان بھی توازن ہو؟ اس کے احساسات اور اقدامات متوازن ہوں اور یہ پوری کی پوری اللہ کی طرف متوجہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی اعلیٰ 'ارفع اور پاک و صاف سوسائٹی کا قیام نہ تو فقط روحانی تطہیر پر چھوڑا گیا ہے اور نہ ہی فقط قانون سازی اور انتظامی اداروں کے حوالے کیا گیا ہے ' بلکہ اس کی روحانی تطہیر ' اس کا قانون و دستور اور اس کے انتظامی ادارے سب مل کر کام کرتے ہیں ۔ یہ سوسائٹی نہ تو ایک فرد کی سوچ کے تابع ہے اور نہ ہی حکومت کے اداروں کی سوچ کے حوالے ہے ۔ بلکہ اس میں افراد ' حکومت دونوں مل کر اپنے اپنے فرائض باہم تعاون سے ادا کرتے ہیں ربانی ہدایات کی روشنی میں ۔

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس کے اندر اللہ اور رسول اللہ کے بارے میں کچھ لازمی آداب ہیں ۔ بندے کو اللہ کے سامنے اور اللہ کے رسول کے سامنے کچھ آداب بھی ملحوظ رکھنے ہوتے ہیں ۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۴۹ : ۱) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو' اور اللہ سے ڈرو' اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔ کوئی انسان امرونہی میں اللہ سے آگے نہ بڑھے ۔ اللہ پر کوئی فیصلہ اور ڈگری نافذ نہ کرے ۔ اور اللہ جو حکم دے اور جس سے روکے اس سے تجاوز نہ کرے ' وہ اپنے خالق کے مقابلے میں اپنی رائے اور اپنے ارادے پر زور نہ دے ۔ اس سے ڈرے ' اور اس سے حیا کرے اور نہایت ہی ادب سے اس کی بارگاہ میں رہے ۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بھی وہ کچھ ظاہری آداب بھی ملحوظ رکھے ۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۴۹ : ۲) اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ (۴۹ : ۳) اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (۴۹ : ۴) وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۴۹ : ۵) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو' جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو ۔ جو لوگ رسول خداؐ کے ہاں بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں ' وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے ۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم ہے ۔ اے نبیؐ جو لوگ تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں ۔ اگر وہ تمہارے برآمد ہونے تک صبر کرتے تو انہی کے لیے بہتر تھا ۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس میں افعال اور اقوال کو اچھی طرح جانچا جاتا ہے ' کوئی بات اگر سنی جائے تو اس کی تحقیق کی جاتی ہے ' سنتے ہی فیصلہ نہیں کر دیا جاتا اور یہ بات خدا سے ڈرنے پر رکھی گئی ہے ۔ اور کسی حکم سے پہلے رسول اللہؐ سے مشورہ ضروری ہے ۔ اور رسول اللہ سے مشورہ بھی اس وقت کیا جائے جب آپ مشورے طلب فرمائیں ' خواہ مخواہ مفت مشورے نہ دیا کریں ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (۴۹ : ۶) وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ (۴۹ : ۷) فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۴۹ : ۸) ”اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو' خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کرے تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ۔ مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل اور احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے“۔

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جو اپنے وجود کی حفاظت کے لیے ایک انتظامی مشینری رکھتی ہے۔ اس کے ذریعہ اس کے اندر واقع ہونے والے اختلافات کو دور کیا جاتا ہے' فتنوں کو فرو کیا جاتا' بے چینیاں دور کی جاتی ہیں اور لوگوں کی خواہشات کو کنٹرول کیا جاتا ہے کہ اگر ان کا علاج نہ کیا جائے تو سوسائٹی تباہ ہو جائے۔ ایسے مواقع پر یہ سوسائٹی اسلامی اخوت کے اصولوں کے مطابق اپنے مسائل حل کرتی ہے اور خالص عدل و اصلاح کے نقطہ نظر سے کام کرتی ہے۔ خدا خوفی اور اللہ کی رحمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (۴۹ : ۹) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۴۹ : ۱۰) ”اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو' کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو' امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے“۔

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس کے افراد ایک دوسرے کے بارے میں نیک جذبات اور خواہشات اور شعور رکھتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ ایک بہترین طرز عمل اختیار کرنے کے بھی کچھ آداب ہیں جن کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۴۹ : ۱۱) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو' نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں''۔

اس سوسائٹی کا شعور پاک' اس کے اندر لوگوں کی عزت محفوظ' لوگوں کی خلوتیں محفوظ' کسی پر شک کرنا گناہ' کسی کے خلاف تجسس کرنا گناہ' لوگوں کا امن' عزت' شرافت مکمل طور پر محفوظ' ان معاملات میں کوئی کسی کو چھیڑ نہیں سکتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ (۴۹ : ۱۲) ''اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو' اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو' اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے اور رحیم ہے''۔

یہ ایک ایسی سوسائٹی ہے جس کی اساس مطلق انسانیت پر ہے۔ جس میں اقوام اور اجناس محض تعارف کے لیے ہیں اور وہ یہ تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں۔ یہ سوسائٹی باقی تمام خواہشات اور رنگ و نسل کے شوائب سے پاک ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۴۹ : ۱۳) ''اے لوگو' ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں' تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو' درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا باخبر ہے''۔

یہ سورت اسلامی سوسائٹی کے نشانات اور اس کے خدوخال کے تعین کے ساتھ مخصوص ہو جاتی اگر اسلام اور ایمان کے حدود کے تعین کو بھی نہ لیا جاتا۔ کیونکہ اس سوسائٹی کے قیام کی دعوت لوگوں کو ایمان کے عنوان سے دی گئی۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا...... ایمان کے حوالے ہی ان کو پکارا گیا تاکہ جواب دیں اور لبیک کہتے ہوئے اس سوسائٹی کو

قائم کریں۔ اس لئے کہ کون بدبخت ایسا ہو گا جو اللہ کی جانب سے یہ میٹھی آواز سنے گا۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا...... اور لبیک نہ کہے گا۔اس آواز کو سن کر حیاء آجاتی ہے اور پھر اس پیاری آواز کے بعد اس راہ میں ہر مشقت آسان ہو جاتی ہے۔ ہر دل سننے کے لیے دوڑتا ہے اور عمل کے لیے اٹھتا ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۴۹:۱۴) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۴۹:۱۵) قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِکُمْ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ

(۴۹:۱۶) "یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے' ان سے کہو' تم ایمان نہیں لائے' بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے" ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری اختیار کرو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔ اے نبیؐ ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے رہو حالانکہ اللہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔

اور سب سے آخر میں یہ سورت جتاتی ہے کہ دین اسلام لوگوں کے لیے اللہ کا بہت ہی بڑا انعام ہے اور ایمان تو جسے مل جائے اس کے لیے اللہ کی نعمت ہے۔ لیکن یہ نعمت اللہ صرف ان کو دیتا ہے جو اس کے مستحق ہوں۔

یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ هَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۴۹:۱۷) اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۴۹:۱۸) "یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان سے کہو' اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی طرف ہدایت دی' اگر تم واقعی سچے ہو۔ اللہ زمین و آسمان کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب کچھ اس کی نگاہ میں ہے"۔

دوسری بڑی بات جو اس پوری سورت سے ظاہر ہوتی ہے اور ان حالات سے معلوم ہوتی ہے جن میں یہ سورت

اور اس کی آیات نازل ہوئیں یہ ہے کہ قرآن کریم نے اسلامی جماعت کی تربیت کے لیے کس قدر عظیم جدوجہد کی۔ اور یہ جدوجہد مسلسل کی جاتی رہی اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ہر مرحلے میں کس قدر عظیم حکمت کے ساتھ اس جماعت کے نک سک درست کیے۔ جس کے نتیجے میں اس کرۂ ارض پر اس قدر پاکیزہ سوسائٹی وجود میں آئی جو نہایت ہی باوقار' پاکباز اور صحت مند سوسائٹی تھی۔ اور ایسی سوسائٹی انسانی تاریخ میں ایک ہی بار اس کرۂ ارض پر وجود میں آئی۔ اس کے بعد اس قسم کی سوسائٹی کا تصور بھی کسی نے پیش نہیں کیا یا نہ کوئی ایسی سوسائٹی کا ناول بھی لکھ سکا ہے۔

لیکن یہ سوسائٹی پاک صاف' صحت مند' نظریاتی' ایماندار اور خالص انسانی بنیادوں پر' انسانی تاریخ کے ایک دور میں' زمین کے ایک خطے میں وجود میں آئی۔ یہ اچانک وجود میں نہیں آئی تھی۔ نہ یہ بطور اتفاق وجود میں آئی تھی۔ یہ نہ راتوں رات وجود میں آئی تھی' نہ یہ کسی طبعی حالات کی وجہ سے اچانک مشروم (ایک قسم کی خودرو گھاس) کی طرح وجود میں آگئی تھی بلکہ یہ نہایت ہی تدریجی طور پر اور ایک پودے کی طرح نمودار ہوئی اور بڑھتے بڑھتے تدریج کے ساتھ وہ پودا درخت بن گیا جس کی شاخیں بلند اور جڑیں زمین میں گہری تھیں اور اس نے اپنی نشوونما کے لیے ضروری وقت بھی لیا اور اس کے لیے نہایت ہی گہری اور مسلسل جدوجہد بھی کرنا پڑی۔ اور اس سلسلے میں راتوں کی نیند حرام کی گئی' طویل صبر کیا گیا' بصیرت افروز محنت کی گئی۔ لوگوں کے اخلاق کو سنوارا گیا۔ لوگوں کو ہدایات دی گئیں اور وہ آگے بڑھائے گئے۔ ان کو قوت دی گئی اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی گئی۔ عملی تجربات کیے گئے۔ کڑے سے کڑے امتحانات سے گذارے گئے۔ اور آزمائشوں اور مشکلات سے انہیں گزارا گیا۔ اور تجربوں اور آزمائشوں سے عبرت لی گئی۔ اور اس پورے عرصے میں یہ سوسائٹی اللہ کی مسلسل نگرانی میں رہی جو علیم و خبیر ہے۔ اور اسے اس عظیم امانت کے اٹھانے کے لیے تیار کیا گیا اور زمین پر اللہ کی مشیت کو روبعمل لانے کے لیے تیار کیا گیا اور پھر یہ کہ ان حضرات کے اندر کچھ مخصوص خصوصیات بھی تھیں جن کی وجہ سے تاریخ انسانیت میں انہوں نے یہ مقام حاصل کیا۔ اور یہ حقیقت وجود میں آئی۔ آج شاہراہ تاریخ انسانی پر ہمیں یہ سوسائٹی دور سے نظر تو آئی ہے' مگر ایک خواب کی طرح!!

---ooo---

درس نمبر ۲۴۶ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۱۸

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿٢﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ۚ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٤﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٥﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ ﴿٦﴾

اے لوگو ' جو ایمان لائے ہو ' اللہ اور اس کے رسولؐ کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو ' اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے ۔ اے لوگو ' جو ایمان لائے ہو ' اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو ' اور نہ نبیؐ کے ساتھ اونچی آواز سے بات کرو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو ۔ جو لوگ رسولؐ خدا کے حضور بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں وہ در حقیقت وہی لوگ

ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے' ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم۔ اے نبیؐ' جو لوگ تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ تمہارے برآمد ہونے تک صبر کرتے تو انہی کے لیے بہتر تھا' اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

سورت کا آغاز ہی نہایت ہی محبوب آواز سے ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۴۹ : ۱) "اے ایمان والو" یہ اللہ کی طرف سے پکار ہے' ان لوگوں کو جو اللہ پر ایمان بالغیب لانے والے ہیں اور یہ پکار کر اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے دلوں کے اندر جوش و خروش پیدا فرماتا ہے' کیونکہ اللہ سے مومنین کا تعلق' تعلق ایمان ہے۔ اہل ایمان کے اندر یہ شعور ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے ہیں۔ انہوں نے اللہ کے جھنڈے اٹھا رکھے ہیں اور اس چھوٹے سے سیارے پر یہ لوگ اللہ کے بندے' اللہ کے کارکن اور اس کی فوج ہیں اور ان کو اللہ نے یہاں کسی مقصد کے لیے بھیجا ہے اور اسی لیے اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان کی محبت پیدا کر دی ہے اور ایمان کو ان کے لیے محبوب بنا دیا ہے اور اس فوج میں اللہ نے ان کو بھرتی کر کے ان پر احسان کیا ہے۔ لہٰذا ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اس موقف پر کھڑے رہیں جہاں اللہ نے ان کے کھڑے کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ کے سامنے وہ یوں کھڑے ہوں جس طرح عدالت میں ایک شخص فیصلے کے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے یا ایک ماتحت فوجی اپنے افسر سے ہدایات کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔ وہی کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے اور اس کام کے لیے تیار ہوتا ہے جس کا اسے حکم دیا جاتا ہے۔ پوری طرح سر تسلیم خم کرتے ہوئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۴۹ : ۱) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو' اور اللہ سے ڈرو' اور وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے"۔ اے ایمان والو' اللہ اور رسول اللہ کے سامنے اپنی مرضی کی تجاویز نہ پیش کرو' نہ اپنے نفوس کے بارے میں نہ اپنے ماحول کی زندگی کے بارے میں اور اللہ اور رسولؐ کا فیصلہ کرنے سے قبل کسی معاملہ پر اپنا فیصلہ خود صادر نہ کرو' اور کسی معاملے میں اللہ اور رسولؐ کا فیصلہ ہو تو اس میں اپنے فیصلے صادر نہ کرو۔

قتادہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ اپنی ان خواہشات اور تجاویز کا اظہار کرتے تھے کہ کیا ہی اچھا ہو کہ فلاں فلاں معاملے میں احکام آجائیں۔ اگر اس طرح ہو جائے تو بہت بہتر ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی ان تجاویز کو ناپسند فرمایا۔ عوفی کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ اور رسول اللہؐ کے سامنے باتیں کرنے سے روک دیا گیا۔ مجاہد کہتے ہیں کہ رسول اللہ سے خواہ مخواہ فتویٰ نہ مانگا کرو' خود اللہ جو چاہے نازل فرما دے۔ ضحاک کہتے ہیں 'اللہ اور رسول اللہؐ' اور اصول دین اور قوانین شریعت کو چھوڑ کر اپنے فیصلے نہ کرو' اور علی ابن طلحہ نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف نہ کہو۔

یہ اللہ اور رسول اللہؐ کے معاملے میں فکری اور نظریاتی آداب ہیں۔ اللہ سے ہدایات اخذ کرنے اور نافذ کرنے کے یہ آداب ہیں کہ جو حکم آئے اس کی تعمیل کرو اور باقی کے بارے میں خاموش رہو۔ یہی اصول دین اور شریعت کا بہترین

روّیہ ہے۔یہ خدا خوفی اور اس کی اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اللہ تو سب کچھ دیکھ رہا ہے اور یہ سب باتیں اس مختصر سی آیت میں بتا دی گئی ہیں۔

یوں مسلمانوں کا اللہ اور رسول اللہؐ کے ساتھ تعلق تھا۔کوئی شخص اللہ اور رسول اللہؐ کے سامنے اپنی تجویز نہ دیتا تھا۔کوئی رسول اللہؐ کے سامنے کسی رائے کا اظہار نہ کرتا تھا۔جب تک آپؐ رائے طلب نہ فرمائے۔کوئی بھی کسی معاملے یا حکم میں فیصلہ اس وقت تک نہ کرتا تھا جب تک وہ اللہ اور رسول اللہؐ کے اقوال کی طرف رجوع نہ کر لیتا۔

امام احمد'ابو داؤد'اور ترمذی نیز ابن ماجہ نے نقل کیا ہے کہ حضورؐ جب حضرت معاذ ابن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیج رہے تھے تو ان سے پوچھا کہ تم فیصلہ کس طرح کرو گے انہوں نے عرض کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ تو فرمایا کہ اگر اللہ کی کتاب میں حکم نہ ہو تو عرض کیا کہ سنت رسول اللہ کے ساتھ' آپؐ نے فرمایا اگر سنت میں بھی کوئی ہدایت نہ پاؤ تو انہوں نے کہا میں اپنی رائے کے مطابق اجتہادی فیصلہ کروں گا۔یہ سن کر حضورؐ نے ان کے سینے پر ضرب لگائی اور فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اللہ نے رسول خدا کے نمائندے کو وہ توفیق دی جو رسول اللہؐ کی خواہش تھی۔

اور دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ ان سے پوچھ رہے تھے کہ آج کون سا دن ہے جس میں تم ہو۔اور وہ جگہ کون سی ہے جہاں تم ہو۔وہ سب جانتے تھے لیکن وہ سب جواب دیتے ہیں کہ اللہ اور رسول اللہ بہت زیادہ جانتے ہیں اور یہ وہ اس لیے کہتے تھے کہ کہیں ان کا قول اللہ اور رسولؐ سے پیش قدمی نہ ہو جائے۔

ابو بکرہ نفیع ابن الحارث رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آتا ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:یہ کون سا مہینہ ہے؟ ہم نے کہا اللہ اور رسول اللہ زیادہ جانتے ہیں۔حضورؐ خاموش ہوگئے اور ہم نے یہ خیال کیا شاید مہینے کا نام بدل گیا ہے اور حضورؐ کوئی دوسرا نام لیں گے۔تو حضورؐ نے فرمایا کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے ہم نے کہا ہاں' رسول خداؐ یہ ذوالحجہ ہے۔آپؐ نے فرمایا یہ کون سا شہر ہے؟ ہم نے کہا اللہ اور رسول خدا زیادہ جانتے ہیں تو حضورؐ خاموش ہو گئے اور ہمارا خیال ہوا کہ شاید حضور بلد حرام کا نام بدل دیں گے۔آپ نے فرمایا کیا یہ بلد حرام نہیں ہے؟ تو ہم نے کہا کہ ہاں۔تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ کون سا دن ہے؟ تو ہم نے کہا اللہ اور رسول اللہؐ زیادہ جانتے ہیں۔آپ خاموش ہوگئے اور ہم نے کہا کہ شاید حضورؐ اس کا نام بدل دیں گے آپ نے فرمایا کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے کہا ہاں...

یہ تھی صورت حال جناب نبویؐ میں صحابہ کرامؓ کے ادب اور احترام کی۔نہایت احتیاط'تقویٰ' خشیت۔یہ آیات نازل ہونے کے بعد ان کے اندر یہ ادب اور احترام پیدا ہوا تھا۔کیونکہ ان آیات میں کہا گیا کہ اللہ سے ڈرو اور اللہ سمیع وعلیم ہے۔

دوسرا ادب و احترام یہ تھا کہ حضور اکرمؐ کے ساتھ گفتگو میں آداب نبوت کو ملحوظ رکھو۔نہایت احترام سے اور دلی احترام سے بات کرو۔تمہاری حرکات اور تمہاری آواز سے احترام ظاہر ہو۔آپ کی شخصیت نور آپ کی مجلس اور گفتگو نہایت ہی ممتاز ہو۔اللہ تعالیٰ نہایت ہی پسندیدہ انداز میں ان کو ڈراتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۹ ۴ : ۲) "اے لوگو جو

ایمان لائے ہو' اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو' جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو" ۔ ایمان لانے والوں سے خطاب کر کے اس بات کا اظہار کر دیا کہ تمہارا اقرار ایمان سے ہے اور ایمان تمہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے ۔ نبی کی بارگاہ میں ذرا بھی بے احتیاطی سے اعمال غارت ہو جائیں گے اور تمہارے اعمال اسی طرح بے اثر ہو جائیں جس طرح ہٹا کٹا جانور زہریلی گھاس سے آناً فاناً ختم ہو جاتا ہے ۔ تمہیں پتہ بھی نہ ہو گا اور اعمال ضائع ہو چکے ہوں گے ۔

صحابہ کرامؓ کے دلوں کے اندر اس محبوب اور پیاری آواز نے وہ اثر کر لیا تھا جس کی مثال نہیں ملتی ۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں : بشر ابن صفوان سے 'انہوں نے نافع ابن عمر سے انہوں نے 'ابن ابو ملیکہ سے وہ کہتے ہیں کہ قریب تھا کہ صحابہ میں سے دو بر تر مقام کے لوگ ابوبکر اور عمر ہلاک ہو جائیں ۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے باہم تکرار کی جب بنو تمیم کا وفد آیا تھا ۔ یہ نویں ہجری کی بات ہے ایک نے کہا کہ اقرع ابن حابس کو امیر بنائیں یہ اشجع کے موالی میں سے تھا' دوسرے صاحب نے ایک دوسرے شخص کے بارے میں کہا' مجھے نام یاد نہیں ہے (دوسری روایت میں 'قعقاع ابن معبد آیا ہے) حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا' تم تو میرے خلاف ہی کرتے ہو ۔ حضرت عمرؓ نے کہا میرا ارادہ آپ کی مخالفت کا نہ تھا ۔ اس معاملے میں ان کی آوازیں بلند ہو گئیں ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (۴۹ : ۲) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنی آواز نبی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو' جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو" ۔ ابن الزبیرؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت عمرؓ حضورؐ سے اس قدر آہستہ بات کرتے کہ آپ کو پوری طرح نہ سناتے اور حضورؐ ان سے دوبارہ پوچھتے ۔ اور حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے کہا اے رسول خدا میں آپ سے صرف کانا پھوسی میں بات کروں گا ۔

امام احمد روایت کرتے ہیں سلیمان ابن مغیرہ سے انہوں نے ثابت سے انہوں نے حضرت انس ابن مالک سے وہ کہتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی ۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ [illegible] عْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (۴۹ : ۲) "اے لوگو جو یمان لائے ہو' اپنی [illegible] بی کی آواز سے بلند نہ کرو' اور نہ نبی سے اونچی آواز سے بات کرو' جس طرح تم آپس میں ایک [illegible] سے کرتے ہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو" ۔ تو ثابت ابن قیس [illegible]ن الشماس نہایت اونچی آواز والے تھے وہ کہنے لگے "میں ہی تھا جو رسول اللہؐ پر اپنی آواز بلند کرتا تھا ۔ میں ہی جہنمی ہوں اور

میرے ہی اعمال گئے" وہ گھر میں نہایت ہی مغموم ہوکر بیٹھ گئے ۔ تو رسول اللہؐ نے محسوس کیا کہ یہ شخص نہیں آرہے ہیں ۔ بعض لوگ ان کے پاس ہوگئے کہ آپ کی غیر حاضری کو رسول اللہ نے محسوس کیا ہے ۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ کی آواز سے تو میری آواز بلند ہوتی ہے اور میں ہی اونچی آواز سے باتیں کیا کرتا تھا ۔ میرے تو اعمال ہی ضائع ہو گئے ۔ لازماً میں جہنمی ہوں ۔ یہ لوگ حضورؐ کے پاس آئے ۔ آپؐ کو اطلاع دی کہ وہ تو یہ کہتے ہیں ۔ تو حضورؐ نے فرمایا نہیں "وہ تو اہل جنت میں سے ہیں" ۔ حضرت انس فرماتے ہیں وہ ہم میں پھرتے اور ہم یہ سمجھتے کہ یہ جا رہا ہے جنتی!

غرض "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو" کے محبت آمیز انداز گفتگو کے ساتھ مومنین کو جو کال دی گئی اس سے وہ کانپ اٹھے اور آیندہ کے لیے جناب رسالت میں نہایت خاموشی سے سہم کر بیٹھتے کہ کہیں ان کے اعمال ضائع نہ ہو جائیں ۔ اور ان کو اس کا شعور ہی نہ ہو کیونکہ شعوری طور پر تو وہ بہت محتاط تھے لیکن ان کو زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ غیر شعوری حالت میں ان کا نقصان نہ ہو جائے ۔ اس لیے وہ بہت ڈر گئے تھے ۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی خدا خوفی اور رسول اللہؐ کے ہاں ان کے ان آداب کا اظہار نہایت ہی عجیب پیرائے میں کیا ہے ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ (۴۹ : ۳) "جو لوگ رسول خداؐ کے ہاں بات کرتے ہوئے اپنی آواز کو پست رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے ۔ ان کے لیے مغفرت ہے اور اجر عظیم ہے" ۔

تقویٰ اور خدا خوفی اللہ کی ایک عظیم بخشش ہے ۔ اللہ ہی اس اعزاز اور نعمت کے لیے دلوں کا انتخاب کرتا ہے ۔ اس امتحان اور اختیار اور خلوص اور طہارت قلبی کے بعد پھر ان دلوں کو تقویٰ دیا جاتا ہے' لہٰذا یہ نعمت انہی دلوں کو دی جاتی ہے جو اس کے لیے تیار ہوں اور یہ ثابت ہو جائے کہ یہ دل تقویٰ کے مستحق ہیں اور جو لوگ اپنی آوازیں رسول اللہؐ کے ہاں نیچی رکھتے ہیں ایسے لوگوں کو تقویٰ کے لیے منتخب کیا گیا اور اس انعام کے ساتھ یعنی تقویٰ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو مغفرت بھی دی جاتی ہے ۔

انتہائی ڈراوے کے بعد یہ ایک گہری ترغیب ہے ۔ اس طرح اللہ اپنے مختار بندوں کے دلوں کو تربیت فرماتا ہے اور ان کو اس عظیم کام کے لیے تیار کرتا ہے اور اسی انداز تربیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے آغاز میں جماعت صحابہ کو تیار فرمایا تھا ۔ یہ لوگ ہدایت پر تھے اور روشنی کے حامل تھے ۔

امیر المومنین عمر ابن الخطابؓ سے روایت ہے کہ آپ نے مسجد نبویؐ میں دو آدمیوں کی آواز سنی' ان کی آوازیں بلند ہو گئیں ۔ وہ آئے اور انہوں نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کہاں ہو؟ اس کے بعد ان سے کہا تم کہاں سے آئے ہو' انہوں نے کہا ہم اہل طائف سے ہیں ۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر تم اہل مدینہ سے ہوتے تو میں تمہاری خوب خبر لیتا ۔

علمائے امت نے اس بات کو سمجھا اور فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بلند آواز سے بات کرنا منع ہے جبکہ آپ کی زندگی میں مسجد نبوی میں اونچی آواز سے بات کرنا ممنوع تھی ۔ ہر حال میں ممنوع تھا بوجہ احترام ۔

اس کے بعد ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا جو ۹ ہجری کو پیش آیا۔ فتح مکہ کے بعد ہر طرف سے وفود آرہے تھے۔ بنی تمیم کا ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا۔ یہ لوگ خالص خشک دیہاتی تھے۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرات کے سامنے جن میں ازواج مطہرات بھی تھیں' کھڑے ہو کر پکارا' محمد ذرا باہر آیئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس طریقے کو ناپسند فرمایا کیونکہ یہ طریقہ نہایت اجڈ اور پریشان کن تھا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (۴۹ : ۴) وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۴۹ : ۵)

"اے نبیؐ جو لوگ تمہیں حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ تمہارے برآمد ہونے تک صبر کرتے تو انہی کے لیے بہتر تھا۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے"۔ اللہ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان میں سے اکثر عقلمند نہیں ہیں۔ اور ان کی اس حرکت کو ان کے لیے مکروہ کر دیا کیونکہ وہ اسلامی آداب کے خلاف تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے مقام کے ساتھ جس قدر احترام کا تعلق ہونا چاہیے تھا' یہ اس کے خلاف تھا۔ آپ مسلمانوں کے قائد اور مربی تھے اور خدا کے نبی تھے۔ اس لیے ان سے کہا گیا کہ ان کے لیے مناسب تھا کہ صبر کرتے اور انتظار کرتے تا آنکہ حضورؐ اپنے معمول کے مطابق باہر نکل آتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ و استغفار کرنے اور اللہ کی طرف رجوع کی ترغیب دی۔

مسلمانوں نے ان آداب کو خوب سمجھا۔ انہوں نے رسول اللہ کی شخصیت سے آگے بڑھ کر ہر استاد اور ہر عالم دین کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا۔ ایسی شخصیات کو انہوں نے گھروں کے اندر پریشان نہ کیا۔ اور ان کے نکلنے کا انتظار کیا۔ کبھی اساتذہ کے گھروں کے اندر گھسنے کی کوشش نہ کی۔ ایک اور مشہور راوی اور عالم ابو عبید کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ کہتے تھے کہ میں نے کسی عالم کا دروازہ کبھی نہیں کھٹکھٹایا۔ ہمیشہ انتظار کیا کہ وہ نکل آئیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ (۴۹ : ۶) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو"۔

اہل ایمان کو پہلی پکار یہ تھی کہ تم نے رہنمائی کہاں سے لینی ہے اور تمہاری قیادت کہاں ہے۔ دوسری پکار۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ یہ تھی کہ اس قیادت کے حقوق اور ملنے کے آداب یہ ہیں۔ یہ دونوں باتیں تو اس سورت کی بیشتر ہدایات اور آداب اور قوانین کی بنیاد تھیں۔ کیونکہ مسلمانوں کو یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ ہدایت و ارشاد کا سرچشمہ کہاں ہے۔ اور یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ مرشد اور قائد کا احترام اور مقام کیا ہے تاکہ قائد کا بھی احترام ہو اور جو ہدایات وہ دیتا ہے ان کو بھی سنجیدگی سے لیا جائے۔ یہ تیسری پکار اور ہدایت اس لیے ہے کہ اس جدید سوسائٹی میں خبروں کے سلسلے میں پالیسی کیا ہو گی اور خبر سن کر ایک عام آدمی کا ردعمل کیا ہونا چاہیے؟ تو یہ کہا گیا کہ یہ خبر بھی قائد کے

پاس جانی چاہئے اور ہر خبر کی تفتیش اور تحقیق ہونی چاہئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا

عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (۴۹ : ۶) "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو"۔ یہاں فاسق کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ فاسق پر بدگمانی کی جا سکتی ہے اور یہ تخصیص اس لیے کر دی گئی کہ لوگ اسلامی جماعت میں قابل اعتماد لوگوں کے تصرفات و اقدامات پر بھی شک نہ کریں۔ اور معلومات کے سلسلے میں اعتبار کے بجائے شک ایک اصول نہ بن جائے کیونکہ ایک اسلامی جماعت میں اصول تو یہی ہو گا کہ اس کے ارکان کی خبروں پر اعتبار کیا جائے گا اور ان پر عمل ہو گا۔ رہا وہ شخص جو فاسق ہے تو اس کی خبروں کی تصدیق ضروری ہو گی کیونکہ اس پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ یوں ایک اسلامی جماعت میں خبروں کے اعتبار اور عدم اعتبار لینے یا نہ لینے کے بارے میں ایک معتدل قاعدہ بن جائے گا۔ کسی فاسق کی خبر پر فوراً عمل نہ ہو گا۔ یہ نہ ہو کہ کسی پر کوئی زیادتی ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جلد بازی کی وجہ سے ہو جائے گی۔ اور بعد میں اسلامی سوسائٹی کو نادم ہونا پڑے۔ ایسا کام کر لیا جائے جس سے اللہ ناراض ہو' کیونکہ یہ ایک ایسے فعل کا مصدر ہو جائے گا جو حق اور عدل کے پیمانوں پر پورا نہ اترتا ہو۔

ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ولید ابن عقبہ ابن ابو معیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان کو رسول اللہ نے بنی المصطلق کے پاس زکوۃ کی وصولی کے لیے بھیجا۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ مجاہد اور قتادہ نے یوں کہا ہے کہ رسول اللہؐ نے ولید ابن عقبہ کو بنی المصطلق کی طرف بھیجا کہ ان کو صدقہ دیں۔ انہوں نے اسے قبول کیا۔ وہ واپس آئے اور کہا کہ بنی المصطلق جمع ہو رہے ہیں کہ آپؐ سے جنگ کریں اور بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ اسلام سے بھی مرتد ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ نے خالد ابن ولیدؓ کو بھیجا اور حکم دیا کہ معاملے کی تحقیق کریں اور جلد بازی نہ کریں۔ وہ گئے اور ان کی آبادی کے قریب رات کو پہنچے۔ انہوں نے اپنے جاسوس بھیجے جب وہ واپس آئے تو انہوں نے اطلاع دے دی کہ یہ لوگ تو پختہ مسلمان ہیں اور انہوں نے اذان دی اور نماز پڑھی۔ صبح کے وقت ان کے پاس حضرت خالد بن ولیدؓ آئے تو خوشنودہ بات دیکھی جس پر انہیں تعجب ہوا۔ حضرت خالد واپس ہوئے اور رسول اللہؐ کو اطلاع دی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قتادہ کہتے ہیں حضور اکرمؐ فرماتے ہیں "تحقیق اللہ کی طرف سے ہے اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے"۔ نیز دوسرے سلف صالحین نے بھی یہ لکھا ہے' مثلاً ابن ابولیلیٰ' یزید ابن رومان' ضحاک' مقاتل ابن حیان وغیرہ نے کہ یہ آیت ولید ابن عقبہ کے بارے نازل ہوئی' واللہ اعلم! (اختتام اقتباس از ابن کثیر)

لیکن آیت کا مفہوم عام ہے۔ اصول یہ ہے کہ فاسق آدمی کی بات کی تحقیق و تفتیش کی جائے گی۔ رہے صالح لوگ تو ان کی باتوں پر عمل ہو گا کیونکہ ایک مومن جماعت کے اندر یہ اصول ہے کہ ہر شخص کی بات پر اعتبار ہو گا ماسوائے فاسق کے۔ اور صالح آدمی کی بات پر اعتبار ہی تفتیش و تحقیق کا ذریعہ ہے۔ رہی یہ بات کہ ہر معاملے میں شک کیا جائے اور ہر خبر کو جھوٹا تصور کیا جائے الا یہ کہ وہ ثابت ہو جائے تو یہ اسلامی سوسائٹی کا اصول نہیں ہے ورنہ کسی بھی سوسائٹی میں کوئی اجتماعی کام چل ہی نہ سکے گا۔ اسلام زندگی کو معمول کے مطابق چلنے دیتا ہے۔ وہ احتیاطی تدابیر بے شک اختیار کرتا ہے مگر

اس لیے کہ زندگی کا معمول چلتا رہے ۔ اس لیے نہیں کہ زندگی معطل ہو کر رہ جائے ۔ یہ ہے نمونہ اسلامی اصول کا کہ خبروں کے اخذ ورد میں اس کا اصول کیا ہے ۔

یہ ممکن ہے کہ ولید ابن عقبہ نے ابتدا میں جو اطلاعات فراہم کیں' ان کے نتیجے میں بعض لوگوں نے بنی المصطلق کو سخت سزا دینے کی تجویز کی ہوگی ۔ یہ اس لیے کہ اس وقت دین اسلام کے لیے بے حد جوش اور جذبہ پایا جاتا تھا اور اس لیے بھی کہ زکوٰۃ کا انکار کر دینا بہت بڑا جرم تھا ۔ چنانچہ اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ تمہارے اندر رسول اللہ ابھی موجود ہیں اور رسول اللہ کی موجودگی کو ذرا سمجھنے کی کوشش کرو کیونکہ آپ کا تو خدا سے رابطہ قائم ہے ۔

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَ اِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَ اَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

۱ ۱۰ع ۱۳

خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے ۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کرے تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ ۔ مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا اور کفر و فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا ۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے ۔ اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے ۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں' لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو' امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا" ۔

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ (۴۹ : ۷) "خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے" ۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضور اس وقت موجود تھے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ

ایک عظیم حقیقت ہے ۔ کیا کوئی یہ بات تصور کر سکتا ہے کہ آسمان کا زمین کے ساتھ دائمی رابطہ ہو جائے اور یہ رابطہ ہر وقت بحال رہے اور لوگوں کو نظر آئے ۔ اور ہم یہ کہیں کہ ارادۂ الٰہی اہل زمین کے لیے متوجہ ہے ۔ لوگوں کو ان کے حالات بتائے جا رہے ہیں ۔ ان کی خفیہ باتیں ان کو بتائی جا رہی ہیں ۔ ان کی ظاہری باتوں تک ان کو خبردار کیا جا رہا ہے اور ان کی غلطیوں کو فوراً درست کیا جاتا ہے ۔ ان میں سے کوئی اپنے دل کی بات چھپاتا ہو لیکن آسمان سے اطلاع آ جاتی ہے کہ یہ سوچا جا رہا ہے ۔ اللہ رسول اللہ ؐ کو فوراً بتا دیتا ہے اور ہدایت کر دیتا ہے کہ یہ ہدایات میرے بندوں کو دے دو ' حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی بات ہے ۔ یہ ایک بہت بڑی خبر ہے اور یہ ایک عظیم حقیقت ہے ۔ بعض اوقات ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ کو اپنے درمیان چلتا پھرتا پاکر ' بعض لوگ اس طرف متوجہ نہ ہوں ۔ اس لیے ان کو متوجہ کیا جا رہا ہے ۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِیْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ (۴۹ : ۷) ''خوب جان رکھو کہ تمہارے درمیان رسول اللہ موجود ہیں'' ۔ اس کو جانو ' اور اس کی قدر کرو ' یہ تو ایک عظیم معاملہ ہے ۔

اور رسول اللہ ؐ کی موجودگی کو جانو ' اس کے تقاضے یہ ہیں کہ رسول اللہ ؐ کی جانب سے کوئی فیصلہ آنے سے پہلے ہی فیصلے نہ کرتے پھرو ۔ کیونکہ رسول اللہ کے فیصلے وحی و الہام پر مبنی ہیں ۔ اور اللہ کی ہدایات پر رسول اللہ ؐ جو فیصلے فرماتے ہیں انہی میں خیر و برکت ہے ۔ اور اگر رسول اللہ ؐ تمہاری ہی باتوں کے پیچھے چلیں تو تم اپنی نادانی سے اپنے آپ کو مشکلات میں مبتلا کر دو گے کیونکہ رسول اللہ کے فیصلے اللہ کے الہام پر مبنی ہیں ۔ اور اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ بندوں کی بہتری کس میں ہے ۔ رسول اللہ کی موجودگی تو بڑی رحمت ہے ۔ آپ ؐ کی تدبیر اللہ کی تدبیر ہے اور آپ ؐ کا کہا ' اللہ کا کہا ہے ۔

لَوْ یُطِیْعُكُمْ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ (۴۹ : ۷) ''اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لیا کریں تو تم خود ہی مشکلات میں مبتلا ہو جاؤ گے'' ۔ اس معاملے میں تمہارے لیے مشورہ ہے کہ اپنے امور کو اللہ اور رسول ؐ اللہ کے حوالے کر دو اور پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ ۔ اور اللہ کی تقدیر کے آگے اور اللہ کی تدبیر کے سامنے سر تسلیم خم کر دو ' اللہ کے احکام کو مانو اور اللہ کے سامنے اپنی تجاویز مت رکھو ۔

اس کے بعد ان کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم کو ایمان کی جو نعمت دی گئی ہے ' اس کی قدر کرو ' یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب بنایا ' تمہارے دلوں میں ایمان کو خوبصورت بنا دیا ' تم نے اسے قیمتی جانا ' تمہارے دل اس سے لگ گئے ' اور کفر کو تمہارے دلوں کے لیے مکروہ بنا دیا ۔ فسق و معصیت کو تم ناپسند کرنے لگے ۔ یہ اللہ کی بڑی ہی رحمت اور کرم تھا ۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَیْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْیَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ (۴۹ : ۷) فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (۴۹ : ۸) ''مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا ۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے'' ۔

اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے دلوں کو ایمان کے لیے کھول دینا' ان کے دلوں کو ایمان کے ساتھ متحرک کر دینا' ان کے دلوں کے لیے ایمان کو حسین بنا دینا کہ وہ اس کی طرف لپکیں' اور ایمان کے کمالات و جمالات دیکھ سکیں' یہ دراصل ان بندوں پر بہت ہی بڑا فضل و کرم ہے اور بہت ہی بڑی نعمت ہے۔ اس کے مقابلے میں ہر نعمت ہیچ ہے۔ یہاں تک کہ انسان کی زندگی اور اس کا وجود بھی ہیچ ہے۔ انسان کا وجود اور اس کی پوری زندگی بھی ایمان کے مقابلے میں کم قیمت ہے اور ادنیٰ ہے۔ عنقریب یہ آیت آنے والی ہے۔

بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ (۴۹ : ۱۷) "بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ تمہیں اس نے ایمان کی طرف ہدایت کی"۔ مفصل بات وہاں آئے گی' ان شاء اللہ!

جو بات یہاں فکر و نظر کے لیے دامن کش ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو یاد دلا رہا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے اس بھلائی کا ارادہ کیا۔ اور یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے دلوں سے یہ شر نکالا۔ یعنی کفر' فسق اور معصیت کا شر۔ اور یہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے فضل و کرم سے تمہیں راہ راست پر لگایا ہے۔ اور یہ سب کام اللہ نے اپنے علم و حکمت کی بنا پر کیا اور یہ اطمینان دلایا کہ اس کے نتیجے میں تمہارے لیے خیر اور برکت ہوگی۔ اس لیے تم جلد بازی نہ کرو' اللہ اور رسول اللہؐ کے سامنے تجاویز نہ رکھو اور حکم سے پہلے جوش و خروش نہ دکھاؤ کیونکہ اللہ ہی تمہارے لیے بہتر فیصلے کرتا ہے۔ اور ابھی تک تو رسول تمہارے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا اپنے معاملات ان کی موجودگی میں اپنے ہاتھ میں نہ لو۔ یہی مقصد ہے اس تبصرے سے جو اس حکم پر کیا گیا کہ تم اپنے لیے مشکلات پیدا کر لوگے۔

انسان بہت ہی جلد بازی کرتا ہے۔ اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اقدامات سے آگے کیا ہے۔ انسان اپنے نفس اور دوسروں کی بھلائی کے لیے تجاویز مرتب کرتا رہتا ہے لیکن اس کا علم اس قدر محدود ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاۤءَهٗ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا "اور انسان شر کی دعا اس طرح کرتا ہے جس طرح کہ خیر کی دعا کی جاتی ہے اور انسان بہت بڑا جلد باز ہے"۔ اگر انسان اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اسلام میں پورا پورا داخل ہو جائے' اللہ کی پسند کو اپنی پسند بنالے اور اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ اس کے لیے اللہ جس چیز کو پسند کرتا ہے وہ اس کی اپنی پسند سے افضل ہے۔ وہ اس کے لیے زیادہ مفید اور خیر و برکت لانے والی ہے' تو انسان راحت اور سکون محسوس کرے۔ اور اس زمین پر اس کی یہ مختصر زندگی نہایت ہی اطمینان اور خوشی سے گزرے۔ لیکن یہ اللہ کا ایک عظیم احسان ہوتا ہے۔ اور وہ جس پر چاہتا ہے یہ احسان کرتا ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْۤءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۹) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ

اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (۱۰) (۴۹ : ۹ تا

۱۰) ''اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں' لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو' امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا''۔

یہ ایک عملی قانون ہے اور یہ خود اسلامی معاشرے کو جھگڑوں' خصومات اور خانہ جنگی سے بچانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ نہ ہو کہ لوگ ذاتی مفادات اور محض جذبات کے تحت لڑائیاں شروع کر دیں۔ اور یہ قانون اس مناسبت سے بنایا گیا ہے کہ اس سے قبل ایک فاسق کی خبر کے نتیجے میں خود مومنین میں سے ایک گروہ کے خلاف جنگ کے مواقع پیدا کیے گئے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ تنازعات سے قبل بھی تفتیش کی جائے کہ غلط خبروں پر تنازعہ نہ شروع ہو اور اگر ہو جائے تو پھر یہ قانون ہے۔

بعض روایات میں اس آیت کے نزول کا سبب بھی متعین حادثہ بتایا جاتا ہے یا یہ کہ بغیر کسی مخصوص واقعہ کے اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات کے لیے قانون بنا دیا ہو۔ بہرحال اسلامی سوسائٹی کو بچانے کے لیے یہ نہایت ہی مضبوط قانون ہے۔ اس کے ذریعہ اسلامی سوسائٹی اور اسلامی حکومت انتشار اور فرقہ بندی اور خانہ جنگی سے محفوظ رہتی ہے اور اجتماعی تصادم کے وقت عدل و انصاف کے قیام کی راہ تجویز کی گئی ہے کہ اصلاح اور انصاف کے ذریعہ اس قسم کے مسائل کو حل کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔ اور اس میں بھی خدا خوفی' اللہ کی رحمت کی طلب کو اصل مقصد بنایا گیا ہے۔

ہر آیت کسی مخصوص واقعہ کے سبب نازل ہوئی ہے۔ یا محض فرضی حالت کے لیے یہ قانون بنایا گیا ہو' بہرحال دونوں فریقوں کے بر سرپیکار ہونے کے باوجود دونوں کو مومن کہا گیا ہے اور اس احتمال کے باوجود یہ کہا گیا ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے پر دست درازی کرنے والا ہو۔ بلکہ اس احتمال کے باوجود کہ بعض اوقات دونوں دست درازی کرنے والے ہوں۔

اس صورت میں جو لوگ غیر جانبدار ہوں ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ دونوں کے درمیان اصلاح کریں۔ اگر اصلاح کے بعد بھی زیادتی کرنے والا گروہ باز نہ آئے اور حق بات یا حق کے فیصلے کے آگے نہ جھکے یا دونوں کی زیادتی کا تعین ہونے کے باوجود دونوں حکم تسلیم نہ کریں یا صلح کو رد کریں تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ باغی اور نافرمان گروہ کے خلاف یا دونوں کے خلاف لڑیں اور ان کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھیں جب تک کہ دونوں اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر دیتے۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ اہل ایمان کے درمیان کسی صورت میں بھی جھگڑا نہ ہو۔ اور جن باتوں میں ان کا اختلاف ہو اور جن کی وجہ سے جنگ شروع ہوئی ہو ان میں وہ اللہ کے احکام کے سامنے جھکیں۔ اگر باغی اللہ کے حکم کو قبول کریں' اور مومنین دونوں کے درمیان مصالحت کرا لیں اور یہ عدل اور انصاف پر مبنی ہو اور اللہ کی اطاعت کی طلب' رضا کے حصول کے لیے ہو تو

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (۹ : ۴۹ : ۹) "اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔ اور اس قانون کے بعد یہ نصیحت و تبصرہ کہ سب مومن بھائی ہیں کہ اہل ایمان کے درمیان اخوت اور رابطہ قائم ہونا چاہئے۔ یہ اسلامی اخوت ہی ہے جس نے تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا کیا ہے اور صدیوں کی لڑائیوں کے بعد تمہیں باہم الفت بخشی ہے۔ اس لیے اللہ سے ڈرو۔ اس وجہ سے تم رحمت خداوندی کے سزاوار ہو سکتے ہو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (۹ ۴ : ۱۰) "مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو، اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا"۔ اس اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ جماعت مسلمہ کے درمیان محبت، سلامتی، تعاون اور اتحاد اصل الاصول ہو اور خلاف و اختلافات اور جنگ و جدال شاذ و نادر ہی ہوں اور اس اصول کے قیام کے لیے دوسرے مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے والے مومنین کے خلاف لڑیں یہاں تک کہ وہ انصاف کے فیصلے کے سامنے سرتسلیم خم کر دیں۔ یہ اسلامی سوسائٹی کا اصل الاصول ہے۔ یہ ایک نہایت ہی اہم اقدام ہے اور فیصلہ کن انداز میں ہے۔

اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ جب مسلمان باغیوں کے خلاف جنگ کریں گے تو کسی زخمی کو قتل نہ کریں گے، کسی قیدی کو قتل نہ کریں گے۔ اور معرکہ ترک کیے جانے اور اسلحہ پھینک دینے کے بعد کسی کو سزا نہ دی جائے گی۔ اور باغیوں کے اموال غنیمت میں نہ لئے جائیں گے۔ کیونکہ باغی فریق کے خلاف جنگ کا مقصد یہ ہے کہ انہیں انصاف کے اصولوں پر کیے جانے والے فیصلوں کا پابند کرنا اور اخوت اسلامی کا قیام بحال کرنا ہے۔

اسلامی دستور کا اصل الاصول تو یہ ہے کہ تمام اسلامی علاقوں میں ایک ہی امامت یا خلافت ہو، اور اگر کسی ایک امام کی بیعت ہو جائے تو دوسرے کو قتل کرنا لازمی ہے۔ اور دوسرے امام اور اس کے ساتھیوں کو باغی تصور کیا جانا چاہئے۔ اور تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ پہلے امام کی طرف سے لڑیں گے۔ اس اصول پر حضرت علیؓ نے واقعہ جمل میں اور واقعہ صفین میں باغیوں کے ساتھ جنگ کی اور آپ کے ساتھ صحابہ میں سے جلیل القدر صحابیوں نے حصہ لیا۔ بعض صحابہ کرامؓ نے اس معرکہ میں شرکت نہ کی۔ مثلاً سعد، محمد ابن سلمہ، اسامہ ابن زید اور ابن عمرؓ یا تو اس لیے کہ ان کے ذہنوں میں حق واضح نہ تھا۔ یعنی اس واقعہ میں خود ان کا اپنا ذہن صاف نہ تھا کہ حق کدھر ہے۔ اس لیے انہوں نے اسے فتنہ سمجھا یا اس لیے جس طرح امام جصاص فرماتے ہیں "یا اس لیے کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ امام کے ساتھ جو فوج ہے، وہ کافی ہے۔ اس کو ان کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے جائز سمجھا کہ وہ بیٹھ جائیں"۔ پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور اس پر ان کے وہ اقوال بھی دلالت کرتے ہیں، جو ان سے مروی ہیں، جیسا کہ بعد میں حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت بتاتی ہے کہ وہ سخت نادم تھے کہ انہوں نے امام کے ساتھ مل کر جنگ نہ کی۔

اس اصول کے اپنی جگہ ہوتے ہوئے بھی ہر قسم کے حالات میں اس قرآنی قاعدے پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایسے استثنائی حالات جن میں عالم اسلام کے مختلف دور دراز علاقوں میں مختلف امامتیں قائم ہوں۔ ایسے حالات استثنائی ہوتے ہیں اور عدم کے قانون ضرورت کے تحت متعدد امامتیں تصور ہوتی ہیں تو مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر ایک امام کے

ساتھ مل کر باغیوں کے خلاف لڑیں اگر یہ باغی امام کے خلاف بغاوت کریں یا اگر کوئی ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ ایک حکومت کے اندر لڑے اور حکومت کو دونوں تسلیم کرتے ہوں۔ اسی طرح مسلمانوں کا یہ بھی فرض ہے کہ اگر باغیوں نے اپنی امامت قائم کر لی ہو جبکہ متعدد امامتیں برائے ضرورت موجود ہوں تو وہ امام کے ساتھ مل کر ان کے خلاف لڑیں۔ اور اس باغی گروہ کے خلاف سب اکٹھے ہو جائیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے جھک جائے۔ اس طرح یہ آیت ہر قسم کے حالات میں اپنا فیصلہ دیتی ہے۔

یہ بھی واضح ہے کہ یہ نظام جو یہاں تجویز کیا گیا ہے تحکیم اور ثالثی کا نظام ہے اور یہ اس لیے ہے کہ فریقین حکم الٰہی کے سامنے جھک جائیں۔ یہ نظام قرآن نے اس قسم کے تمام انسانی نظاموں سے پہلے تجویز کیا ہے۔ اور یہ ایک مکمل نظام ہے اور یہ ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک ہے۔ اور اس سلسلے میں انسانوں نے جو نظام بھی بنائے ہیں ان سب میں کئی قسم کے عیب اور غلطیاں ہیں۔ اسلام نے جو نظام تجویز کیا ہے' وہ پاکیزہ' منصفانہ اور نہایت اصولی ہے کیونکہ اس نظام کے تحت فیصلے اللہ کے قانون کے مطابق کئے جاتے ہیں۔ اس میں کسی کی غرض یا کوئی ذاتی خواہش کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی نقص اور قصور ہے۔ لیکن بدبخت انسانیت اب بھی ٹھوکریں کھاتی گرتی پڑتی غلط راہوں پر جا رہی ہے حالانکہ اس کے سامنے شاہراہ موجود ہے۔

---○○○---

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُونُوا۟ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰٓ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا۟ بِٱلْأَلْقَٰبِ ۖ بِئْسَ ٱلِٱسْمُ ٱلْفُسُوقُ بَعْدَ ٱلْإِيمَٰنِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿١١﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱجْتَنِبُوا۟ كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا۟ وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾

"اے لوگو' جو ایمان لائے ہو' نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ

عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں ۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو ۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے ۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں"۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں ۔ تجسس نہ کرو ۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے ۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو' تم خود اس سے گھن کھاتے ہو ۔ اللہ سے ڈرو' اللہ بڑا توبہ کرنے والا اور رحیم ہے ۔ لوگو' ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو ۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے ۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے"۔

قرآن کریم اسلامی نظام حیات کے ذریعہ جو فاضلانہ سوسائٹی قائم کرنا چاہتا ہے اس کے اندر بہت ہی بلند معیار کے آداب و اخلاق ہوتے ہیں ۔ اس میں ہر فرد کو عزت نفس حاصل ہوتی ہے اور کوئی فرد کسی فرد کی ہتک عزت نہیں کر سکتا ۔ فرد کی یہ عزت سوسائٹی کی عزت کی وجہ سے ہے ۔ کیونکہ ایک فرد کی ہتک عزت پوری انسانی سوسائٹی کی ہتک عزت ہے ۔ اس لئے کہ انسانی جماعت نفس واحد ہے اور اس کی عزت ایک ہی عزت ہے ۔ ایک انسان کی تذلیل پوری انسانیت کی تذلیل ہے ۔

اس آیت میں قرآن کریم' انہی میٹھے بولوں سے' مسلمانوں کو پکارتا ہے ۔ "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو" ۔ پھر ان کو اس بات سے منع کرتا ہے کہ کوئی گروہ دوسرے گروہ سے مزاح کرے ۔ نہ مرد دوسرے مردوں سے مزاح کریں ۔ ہو سکتا ہے جن سے مزاح کیا جاتا ہے وہ دوسروں سے اچھے ہوں ۔ نہ عورتیں دوسری عورتوں سے مزاح کریں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ جن سے مزاح کیا جارہا ہے' اللہ کے پیمانوں میں وہ مزاح کرنے والیوں سے بہتر ہوں ۔

اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا کی ظاہری قدریں اور بھلائیاں اور برتریاں جو بعض مرد یا بعض عورتیں اپنے اندر رکھتے ہیں ۔ یہ دراصل حقیقی برتریاں نہیں ہیں جن کے ساتھ اللہ کے ہاں لوگوں کو تولا جاتا ہے ۔ اللہ کے ہاں کچھ اور قدریں ہیں اور ہو سکتا ہے کہ مزاح کرنے والوں کی نظروں سے وہ اوجھل ہوں' صرف اللہ انہیں جانتا ہو اور ان کے ساتھ اللہ ان بندوں کا وزن مقرر کرتا ہو ۔ بعض اوقات امراء فقراء سے مزاح کرتے ہیں' ایک قوی ضعیف سے' ایک مضبوط نوجوان ایک ضعیف سے' ایک ذہین ایک غبی سے' ایک صاحب اولاد بے اولاد سے' ایک مضبوط یتیم سے' ایک خوبصورت عورت بدصورت سے' ایک جوان عورت بوڑھی سے' ایک معتدل عورت بگڑی ہوئی شکل والی سے' ایک امیر عورت غریب سے' لیکن یہ چیزیں تو اس عارضی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں کیونکہ اللہ کے ترازو میں یہ چیزیں بالکل بے وزن ہیں ۔

لیکن قرآن کریم صرف ان ہدایات و اشارات پر ہی اکتفاء نہیں کرتا ۔ بلکہ ایمانی اخوت کے جذبہ کو بھی ابھارتا ہے کہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں وہ ایک ہی جسم و جان ہیں' ان میں سے کوئی دوسرے پر طعن کرتا ہے تو وہ خود اپنے اوپر طعن کرتا ہے ۔

وَ لَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَکُمْ (۴۹ : ۱۱) "اور اپنے ہی نفوس پر طعن نہ کرو" ۔ لمز عیب جوئی کو کہتے ہیں لیکن لمز کے

تلفظ میں ایک ترنم اور ایک رنگ ہے ۔ یہ معنوی عیب جوئی نہیں بلکہ جسمانی مار ہے اور آنکھوں سے بھی اشارہ ہے ۔

لوگوں کو ایسے ناموں سے پکارنا جن کو وہ پسند نہیں کرتے اور ان ناموں کے ساتھ پکارے جانے کو مزاح سمجھتے ہیں ۔ اس سے بھی اسلام منع کرتا ہے ۔ مومن کا مومن پر یہ حق ہے کہ وہ اسے اس نام سے نہ پکارے جسے وہ پسند نہ کرے یا اسے ہتک سمجھے ۔ مومنین کے آداب میں یہ شامل ہے کہ وہ دوسرے مومنین کو ایسے ناموں سے نہ پکاریں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے زمانے کے کئی نام اور لقب بدل دیئے تھے ۔ حضورؐ نے اپنے تیز احساس سے اور اپنے مہربان دل سے محسوس کیا کہ یہ لوگ ان ناموں کو پسند نہیں کرتے جن کے معنی خراب تھے یا جن سے مذمت نکلتی تھی ۔

اس آیت نے پہلے تو یہ اشارہ کیا کہ اللہ کے ترازو میں حقیقی وزن کن باتوں کا ہے ۔ اس کے بعد اسلامی اخوت کے شعور کو اجاگر کیا بلکہ اسلامی وحدت کے شعور کو جوش دلایا ۔ اس کے بعد اب ایمانی شعور کو ابھارا گیا اور مومنین کو ڈرایا گیا کہ تم سے کہیں ایمانی شعور گم نہ ہو جائے ۔ مزاح ' طعن و تشنیع اور برے ناموں سے ایک دوسرے کو پکارنے سے تم فاسق نہ بن جاؤ ۔

بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ (۴۹ : ۱۱) "ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے" ۔ ان آداب کو ملحوظ نہ رکھنا ایک قسم کا ارتداد ہے اور یہ ظلم ہے اور ظلم شرک ایک ہی چیز ہوتے ہیں ۔

وَ مَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۴۹ : ۱۱) "اور جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں" ۔ یہ ہیں اسلام کے فاضلانہ معاشرے کے آداب و اخلاق اور اس کے خدوخال ۔

---ooo---

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (۴۹ : ۱۲) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو' بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں ۔ تجسس نہ کرو ۔ اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے ۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو' تم خود اس سے گھن کھاتے ہو ۔ اللہ سے ڈرو' اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے" ۔

یہ آیت اس فاضلانہ معاشرہ کی حفاظت کے لیے ایک دوسری باڑ ہے ۔ جس میں ایک فرد کی آزادی اور اس کی عزت محفوظ ہوتی ہے ' اسی طرح ان کو یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے شعور اور اپنے ضمیر کا اظہار کس طرح کریں گے ۔ اور دوسروں کے بارے ان کی سوچ آئندہ کیا ہوگی ۔ یہ نہایت ہی موثر انداز میں بیان ہوا ہے ۔

اس کا آغاز بھی اس پیاری آواز سے ہوتا ہے "اے لوگو' جو ایمان لائے ہو" ۔ اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ دوسروں کے بارے میں بہت زیادہ گمان اور برے گمان کرنے سے باز رہو ۔ کسی کے بارے میں اپنے فیصلے شکوک و شبہات پر نہ کرو ۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے ۔

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (۴۹ : ۱۲) "کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں"۔ زیادہ زور بعض الظن پر ہے۔ یعنی بعض گمان گناہ ہوتے ہیں یعنی بدگمانی گناہ ہے۔ کیونکہ کوئی یہ معلوم تو نہیں کر سکتا کہ میرا کون سا ظن صحیح اور کون سا غلط ہے لہٰذا کسی پر کوئی بدگمانی نہیں کرنا چاہئے۔

لہٰذا مسلمانوں کو ایک دوسرے کے بارے میں اچھا گمان ہی رکھنا چاہئے اور ہر قسم کے شکوک و شبہات سے دلوں کو صاف رکھنا چاہئے۔ اور جس سوسائٹی میں ایک دوسرے کے خلاف شکوک و شبہات نہ ہوں اس میں لوگوں کے دل ایک دوسرے سے صاف ہوتے ہیں۔ کوئی کسی پر شک نہیں کرتا۔ ہر شخص دوسرے سے مطمئن ہوتا ہے اور ایسے معاشرے میں زندگی کس قدر خوشی سے گزرتی ہے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن اسلام کے روشن معاشرے میں یہ اصول صرف انفرادی تعامل ہی میں مروج نہیں ہے ' بلکہ یہ اجتماعی معاملات میں بھی ایک اہم اصول ہے۔ اور اس سے لوگوں کے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے۔ اسلام کے پاکیزہ معاشرے میں کسی کو محض شک اور شبے کی بنیاد پر نہیں پکڑا جاتا' نہ شبہات کی بنیاد پر مقدمے قائم کیے جاتے ہیں۔ شک کی بنا پر لوگوں کو جیلوں میں نہیں ٹھونسا جاتا۔ بلکہ شک کی بنیاد پر کسی کو دائرہ تفتیش میں لانا بھی جرم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم نے بدگمانی شروع کر دی تو پھر کوئی تفتیش نہیں ہے"۔ (طبرانی) یعنی اگر کوئی تفتیش بھی کرتا ہے تو لوگوں کو بے گناہ سمجھ کر تفتیش شروع کرو' ان کی آزادی بحال ہو' ان کے حقوق محفوظ ہوں۔ ان کا اعتبار و وقار بحال ہو۔ کسی کو اس وقت پکڑا جائے جب اچھی طرح معلوم ہو کہ اس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ محض تفتیش اور شک کے لیے کسی کو ہراساں نہیں کیا جا سکتا۔

سبحان اللہ' کیا مقام بلند ہے جہاں تک یہ آیت انسانی آزادیوں' انسانی حقوق' انسانی اعتماد و اعتبار' اور انسانی وقار کو پہنچاتی ہے۔ اس مقام تک آج کے نام نہاد مہذب اور جمہوری معاشرے بھی نہیں پہنچ سکتے جہاں تک اسلام نے عملاً ایک سوسائٹی کے ضمیر کو پہنچایا' پھر یہ معیار عملاً ایک سوسائٹی میں قائم کیا اور آج سے چودہ سو سال قبل۔ اسی اصول کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے شک کے دائرے کو اور محدود کیا جاتا ہے۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا (۴۹ : ۱۲) "تجسس نہ کرو"۔ بسا اوقات تجسس بدگمانی ہی کے نتیجے میں ہوتا ہے اور بعض اوقات لوگوں کے راز معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور لوگوں کی کمزوریاں معلوم کرنے کے لیے۔ قرآن کریم اس گھٹیا حرکت کو اخلاقی نقطہ نظر سے لیتا ہے۔ اور لوگوں کے دلوں کو اس قسم کے برے خیالات سے پاک کرتا ہے کہ کوئی کسی کے خفیہ حالات معلوم کرے اور اس کی کمزوریوں کے ٹوہ میں لگا رہے کیونکہ اخلاقی تطہیر میں اس کے مقاصد یہی ہیں کہ لوگوں کی پوشیدہ کمزوریوں کو نہ اچھالا جائے۔

لیکن یہ اصول محض اخلاقی ضابطے سے بھی آگے جاتا ہے۔ اس کا تعلق اجتماعی پاکیزگی اور قانونی اور انتظامی معاملات سے بھی ہے۔ اسلام میں لوگوں کی بعض آزادیاں' بعض عزتیں اور بعض شرافتیں ایسی ہیں کہ ان پر کسی صورت میں دست درازی جائز نہیں ہے۔

اسلام کے فاضلانہ معاشرے میں لوگوں کی جان' ان کی چار دیواری' ان کے راز' ان کی خفیہ کمزوریاں محفوظ ہوتے

ہیں ۔ کسی وجہ سے بھی کوئی کسی کی جان، کسی کے گھر، کسی کے رازوں اور کسی کی کمزوریوں پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا ۔ یہاں تک کہ اسلام میں ادارۂ تحقیق و تفتیش جرائم کو بھی یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ تجسس کرے ۔ اسلام لوگوں کے ساتھ ان کے ظاہری حالات کے مطابق برتاؤ کرتا ہے اور کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کے گھر کے اندر گھس کر اندرونی حالت معلوم کرے ۔ اسلام ظاہری جرائم اور خلاف ورزیوں ہی پر پکڑتا ہے ۔ کسی کو ظن یا توقع پر نہیں پکڑا جاتا کہ ان لوگوں نے جرم کیا ہے یا کرنے والے ہیں ۔ اسلام میں پکڑ دھکڑ، ارتکاب جرم کے بعد ہے ۔ اس طرح گرفتاری کے لیے دوسرے تحفظات ہیں جو ہر جرم کے لیے علیحدہ ہیں ۔

امام ابو داؤد نے روایت کی ہے، ابوبکر ابن شیبہ سے انہوں نے ابو معاویہ سے انہوں نے اعمش سے انہوں نے زید ابن وہب سے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود آئے ۔ ان سے کہا گیا یہ فلاں ہے اور اس کی داڑھی سے شراب کے قطرے گر رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہمیں تو تجسس سے منع کیا گیا ہے ۔ ہاں اگر کوئی چیز ہم پر ظاہر ہو گئی کہ اس کا ارتکاب کیا گیا ہے تو ہم پکڑتے ہیں ۔ اور مجاہد نے کہا کہ تجسس نہ کرو، لوگوں کو ان کے ظاہری افعال پر پکڑو ۔ جو بات اللہ نے چھپا دی ہے اسے چھپا رہنے دو ۔

امام احمد نے دجین کاتب عقبہ سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عقبہ سے کہا کہ ہمارے بعض پڑوسی شراب پیتے ہیں ۔ میں ان کے خلاف پولیس کو بلانے والا ہوں کہ ان کو پکڑ لیں تو حضرت عقبہ نے کہا کہ ایسا نہ کرو، بلکہ ان کو نصیحت کرو اور دھمکی دو ۔ کہتے ہیں انہوں نے ایسا کیا، وہ باز نہ آئے تو دجین پھر ان کے پاس آئے کہ میں نے تو انہیں روکا وہ نہ رکے ۔ اب تو میں ان کے لیے پولیس بلانے ہی والا ہوں ۔ اس کو عقبہ نے کہا، تم ہلاک ہو جاؤ! ایسا نہ کرو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے ”جس نے ایک مومن کی پردہ پوشی کی اس نے گویا ایک زندہ درگور کی ہوئی لڑکی کو قبر سے نکال لیا“ ۔ (ابو داؤد سجستانی)

سفیان ثوری نے راشد ابن سعد سے، انہوں نے حضرت معاویہ ابن ابو سفیان سے، روایت کی ہے وہ کہتے ہیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ”تم اگر لوگوں کی خفیہ باتوں کی ٹوہ میں لگو گے تو ان کو برباد کر دو گے یا قریب ہے کہ ان کو برباد کر دو“ ۔ اس پر حضرت ابو الدرداء نے کہا یہ ایک بات ہے جو حضرت معاویہؓ نے حضورؐ سے سنی، اللہ اسے اس کے ذریعہ نفع دے ۔ (ابو داؤد)

اس طرح قرآن کریم کی یہ آیت اسلام کے سیاسی نظام کی ایک دستوری دفعہ بن گئی اور محض اخلاقی اور روحانی اصلاح پر مشتمل ایک وعظ ہی نہ رہی بلکہ یہ لوگوں کے بنیادی حقوق اور ان کی شخصی آزادیوں کے لیے ایک تحفظ بن گئی اور اسلامی قانون اور دستور میں ان کے حقوق کا ایسا تحفظ کیا گیا کہ دور اور قریب سے اور کسی بھی بہانے سے ان پر دست درازی ممکن ہی نہ رہی ۔

یہ دور رس حقوق کہاں؟ یہ بلند افق کہاں؟ اور وہ حقوق کہاں جن پر آج کی مغربی جمہوری حکومتیں بغلیں بجاتی ہیں ۔ وہ کہاں؟ اور وہ بھی چودہ سو سال کے بعد ۔ اس کے بعد ایک عجیب انداز گفتگو میں اور نہایت ہی انسانی اور اخلاقی اسلوب میں قرآن کریم غیبت اور بدگوئی کی ممانعت کرتا ہے ۔

وَ لَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ

(۴۹ : ۱۲) ”اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے ۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو، تم خود اس سے گھن کھاتے ہو“۔ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو ۔ اس کے بعد ایک ایسا منظر پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے نہایت سنگدل آدمی بھی متاثر ہو جاتا ہے ۔ ایک بھائی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھا رہا ہے ۔ یہ منظر دکھا کر کہا جاتا ہے ۔ اگر تم نے اس منظر کو ناپسند کیا ہے تو پھر تم نے غیبت کو بھی ناپسند کیا ۔

اس آیت میں جو جو چیزیں ممنوع قرار دی گئیں ان پر ایک جامع تبصرہ ۔ یعنی بدگمانی، تجسس اور غیبت کہ خدا سے ڈرو اور اشارہ اس طرف کہ اگر کسی نے ایسی غلطی کی ہے تو معافی مانگو اور طلب مغفرت کرو ۔

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (۴۹ : ۱۲) ”اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے“۔ یہ آیت جماعت مسلمہ کی زندگی میں خون کی طرح دوڑتی ہے اور اس سوسائٹی میں تمام بنیادی حقوق کی محافظ بن جاتی ہے ۔ اور انسانی خیالات و تصورات کے لیے ایک انداز فکر بن جاتی ہے ۔ اور اسلامی اخلاق کے لیے طرز عمل بن جاتی ہے اور قرآن ہی کے انداز میں حضور اکرمؐ بدظنی، تجسس اور غیبت کے تصور اور تخیل ہی سے لوگوں کو ڈراتے ہیں ۔

امام ابو داؤد نے روایت کی ہے قعنبی سے انہوں نے عبدالعزیز ابن محمد سے انہوں نے عبد سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے، وہ کہتے ہیں، کہ حضورؐ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ غیبت کی حقیقت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ”تم اپنے بھائی کا تذکرہ اس طرح کرو کہ وہ اسے ناپسند کرے“ تو کہا گیا کہ اگر میں ایسی بات کروں جو اس میں فی الواقعہ ہو، تو آپؐ نے فرمایا اگر اس میں وہ بات ہے جو تم کرتے ہو تو تم نے غیبت کی اور اگر اس میں وہ بات نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان باندھا (ترمذی، احمد)

امام ابو داؤد نے روایت کی، مسدد سے، انہوں نے یحییٰ سے، انہوں نے سفیان سے، انہوں نے علی ابن اقمر سے، انہوں نے ابو حذیفہ سے، اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے، وہ کہتی ہیں، میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، آپ کے لیے صفیہ کی یہ یہ باتیں کافی ہیں (مسدد نے کہا ان کا مقصد ان کی کوتاہیوں سے تھا) اس پر حضورؐ نے فرمایا: ”تم نے ایسی بات کی ہے اگر تم اسے سمندر میں ملاؤ تو اس کا رنگ بدل جائے“۔ حضرت عائشہؓ نے کہا ”اور میں نے ان کے سامنے ایک انسان کی باتیں کیں تو آپؐ نے فرمایا“ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میں کسی انسان کی حکایت کروں اور مجھے یہ، یہ ملے“۔

امام ابو داؤد نے حضرت انس ابن مالک سے روایت کی ہے، کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: ”جب مجھے معراج کا سفر کرایا گیا تو میں کچھ لوگوں کے پاس سے گزرا، ان کے ناخن تانبے کے ہیں جن سے وہ اپنے منہ اور سینے نوچ رہے ہیں ۔ میں نے کہا: ”یہ کون لوگ ہیں جبرائیل! فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی بے عزتی کرتے ہیں“۔

جب ماعز اور غامدیہ نے زنا کا اعتراف کر لیا اور رسول اللہؐ نے ان دونوں کے رجم کے احکام دے دیئے، کیونکہ انہوں نے اقرار کیا، پھر اقرار پر اصرار کیا اور کہا کہ ہمیں پاک کر دیں ۔ حضورؐ نے ایک شخص کو سنا جو دوسرے سے کہہ رہا تھا ۔ کیا تو نے ان دونوں کو نہیں دیکھا کہ ان دونوں کے گناہ کو اللہ نے چھپایا لیکن ان کے نفوس نے ان کو تب چھوڑا کہ

کتوں کی طرح پتھروں سے ہلاک کر دیئے گئے ۔ اس کے بعد حضورؐ آگے گئے ۔ راستے میں ایک گدھے کی لاش پڑی ہوئی تھی آپ نے فرمایا کہ ”فلاں فلاں کہاں ہیں؟“ ان دونوں سے کہا اترو ' اور اس مردار گوشت کھاؤ“ ۔ تو انہوں نے کہا ' رسول خدا اللہ آپ کو معاف کرے کیا مردار گدھے کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے؟ تو رسول اللہؐ نے فرمایا ” یہ تم نے جو اپنے بھائی کا گوشت کھایا ' ابھی ' یہ تو اس سے مشکل کام تھا ۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ' یہ شخص تو اس وقت جنت کی نہروں میں ڈبکیاں لے رہا ہے“ ۔ (ابن کثیر)

اس قسم کی مسلسل تربیت کے ذریعے ہی اسلامی سوسائٹی کی تطہیر کی جاتی رہی اور وہ پاک ہو کر ایک بلند مقام تک پہنچی ۔ یہ ایک انسانی خواب تھا جو اسلامی تاریخ ہی میں حقیقت بنا ۔

--- ○○○ ---

اہل ایمان کو اس میٹھی آواز سے بار بار پکارنے کے بعد ' اے لوگو جو ایمان لائے ہو ' ان کو انسانیت کے روشن افق پر ' انسان کے نفسیاتی آداب کے زاویہ سے ' اجتماعی آداب کے حوالے سے بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے انسانی عزت ' آبرو ' آزادی کی ضمانتوں اور گارنٹی کے حوالے سے نہایت ہی بلندیوں تک پہنچا کر ' ان کی حساسیت کو نہایت تیز کر کے اور خدا خوفی اور خشیت الہی کے ہتھیاروں سے لیس کرنے کے بعد اب روئے سخن پوری انسانیت کی طرف ہے ۔ پوری انسانیت ' مختلف رنگوں ' مختلف نسلوں ' مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں کے لوگوں کی طرف دیکھو تمہاری اصل تو ایک ہے ' تمہاری اصل قدریں بھی ایک ہیں ۔ اور انہی قدروں کی بدولت صحابہ کرامؓ کی یہ جماعت ان بلندیوں تک پہنچی ۔

--- ○○○ ---

يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۴۹ : ۱۳) ”لوگو ' ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو ۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے ۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے“ ۔

اے لوگو ' مختلف اقوام اور مختلف رنگ کے لوگو! مختلف اقوام و قبائل کے لوگو! تمہاری اصلیت تو ایک ہے ۔ لہٰذا آپس میں اختلافات نہ کرو ' آپس میں جھگڑے نہ کرو اور الگ الگ راہوں پر نہ چلو ۔ اے لوگو ' تمہیں جو پکار رہا ہے وہ تو وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے ۔ تمہیں اس نے ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے ۔ وہ تمہیں بتاتا ہے کہ اس نے کیوں تم کو اقوام و قبائل میں تقسیم کیا ہے؟ یہ اس لیے نہیں کہ تم ایک دوسرے کے گلے کاٹو اور جنگیں لڑو ' یہ تو محض تعارف اور جوڑ کے لیے ہے ' رہا زبان اور رنگ کا اختلاف ' طبیعت اور مزاج کا اختلاف ' قابلیت اور استعداد کا اختلاف تو یہ ایسے اختلافات اور ایسی رنگا رنگی ہے جنکی وجہ سے نزاع اور جنگ بلاجواز ہے بلکہ ان چیزوں کو باہم ذمہ داریاں سرانجام دینے کے لیے موجب تعاون ہونا چاہیے ۔ نیز ان اختلافات کے ذریعہ سوسائٹی کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں ۔ اللہ کے ترازو میں تو رنگ و نسل ' زبان اور وطن کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے ۔ اسلام میں تو واحد میزان میں تمام قدروں کو لایا جاتا ہے

اور اسی کے مطابق حسن و قبح کے اصولوں کا تعین کیا جاتا ہے وہ یہ ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۴۹ : ۱۳) ”تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے“۔ اور معزز در حقیقت ہے ہی وہی شخص جو اللہ کے نزدیک معزز ہے۔ اللہ اپنے علم اور خبرداری کی بنا پر تمہارا وزن کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۴۹ : ۱۳) ”بے شک اللہ علیم و خبیر ہے“۔

یوں تمام امتیازات ختم کر دیئے جاتے ہیں' تمام جھوٹی قدریں ختم کر دی جاتی ہیں۔ ایک ہی پیمانہ ایک ہی قدر کے ساتھ رہ جاتا ہے کہ انسانیت کی میزان اور خدا خوفی کی قدر اور ان کے سواسب کچھ ہیچ۔

یوں اس کرۂ ارض پر یہ سب نزاع اور جھگڑے مٹ جاتے ہیں اور وہ تمام گھٹیا مقاصد اور اہداف ختم کر دیئے جاتے ہیں جن کے اوپر لوگ اس طرح جھپٹتے ہیں جس طرح کتے ہڈی پر۔ اس طرح لوگوں کے درمیان الفت و محبت کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اللہ سب کا الٰہ قرار پاتا ہے۔ تمام ایک ہی اصل سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک ہی انسانی جھنڈا رہ جاتا ہے۔ جس کے نیچے تمام لوگ کھڑے رہ جاتے ہیں یعنی اللہ جل شانہ میں اور اسلام نے یہ جھنڈا واحد انسانی جھنڈا' آج سے چودہ سو سال قبل اس لیے بلند کیا ہے تاکہ انسانیت کو رنگ' نسل' قوم اور وطن کے شیطانی جھنڈوں سے نجات دی جا سکے۔ رنگ کی عصبیت' نسل کی عصبیت' زمین کی عصبیت' قبیلے کی عصبیت اور خاندان کی عصبیت سے نجات دی جائے۔ یہ سب عصبیتیں جاہلیت سے نکلی ہیں اور جاہلیت کے فروغ کے لیے ہیں۔ یہ مختلف رنگوں اور لباسوں میں آتی ہیں اور یہ مختلف ناموں سے آتی ہیں لیکن یہ سب ننگی جاہلیت کی اقسام ہیں۔ ان پر کوئی اسلامی لباس نہیں ہے۔

اسلام نے عصبیت جاہلیت کی تمام اقسام کے خلاف جہاد کیا تاکہ وہ اپنا عالمی انسانی نظام رب العالمین کے جھنڈے کے نیچے' نہ نسل کے جھنڈ کے نیچے قائم کرے۔ یہ سب کھوٹے جھنڈے ہیں اسلام ان کو نہیں پہچانتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے' جو لوگ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اس حرکت سے باز آجائیں ورنہ اللہ کے لیے یہ بات بہت آسان ہے کہ تمہیں گبریلے سے ہلکا کر دے۔ (البزار) اور عصبیت جاہلیہ کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا ”اسے چھوڑ دو یہ گندہ ہے“۔ (مسلم)

یہ ہے وہ اصول جس پر اسلامی نظام قائم ہے جو ایک عالمی انسانی نظام ہے اور جو عالمی انسانی سوسائٹی بناتا ہے۔ اسلام نے یہ سوسائٹی اور نظام آج سے چودہ سو سال قبل قائم کیا جبکہ انسانیت ابھی تک اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتی ہے کیونکہ انسانیت نے ابھی تک اس معاشرے کی طرف اسلام کے صراط مستقیم سے چلنا نہیں شروع کیا۔ یعنی اللہ رب العالمین کے جھنڈے کے نیچے کھڑی ہو کر۔ یہی وہ واحد جھنڈا ہے عقیدۂ توحید کا جھنڈا جس کے نیچے پوری انسانیت کھڑی ہو سکتی ہے۔

---ooo---

اب اس سورت کے آخر میں ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت بیان کی جاتی ہے اور یہ ان اعراب کی تردید میں بیان کی جاتی ہے جو ایمان کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان جتلاتے تھے کہ ہم مسلمان ہوئے ہیں اور اس احسان کے بارے میں نہ سوچتے تھے کہ اللہ نے دعوت ایمان بھیج کر لوگوں پر کس قدر احسان کیا۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

۲ ع ۸

۱۴ ”یہ بدوی کہتے ہیں کہ ”ہم ایمان لائے“۔ ان سے کہو‘ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ”ہم مطیع ہو گئے“۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری اختیار کر لو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا‘ یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ حقیقت میں تو مومن وہ ہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا۔ اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔ اے نبیؐ ان (مدعیان ایمان) سے کہو‘ کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان سے کہو‘ اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو‘ بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر تم واقعی اپنے (دعوائے ایمان میں) سچے ہو۔ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب اس کی نگاہ میں ہے“۔

یہ آیات بنو اسد کے دیہاتی مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم ”ایمان لائے“ ہیں۔ یہ انہوں نے اس وقت کہا جب وہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے رسول اللہؐ سے یہ بات بھی کہی کہ حضورؐ ہم نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن آپؐ کے ساتھ ہم کبھی نہیں لڑے جبکہ دوسرے عربوں نے آپ کے ساتھ لڑائیاں لڑیں تو اللہ نے ان کو بتایا کہ تمہارے ذہنوں کے اندر جو بات بیٹھی ہوئی ہے‘ وہ غلط ہے کہ تم نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلامی حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے‘ لیکن ابھی تمہارے دل مرتبہ ایمان تک نہیں پہنچے۔ اس سے معلوم ہوا کہ

حقیقت ایمان ابھی ان کے دلوں میں نہیں بیٹھی تھی ۔ اور ان کی ارواح نے ابھی جام ایمان نوش نہیں کیا تھا ۔

قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۹ : ۴۹ : ۱۴)

"ان سے کہو ، تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے ۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے" ۔

لیکن اس کے باوجود اللہ نے فرمایا کہ تمہارے اعمال پر تمہیں پوری پوری جزا دی جائے گی اور تمہارے اعمال کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو گا ۔ یہ اسلام جو ابھی تک دلوں کے اندر داخل ہو کر قلوب کے اندر نہیں پہنچا کہ وہ پختہ اور قابل اطمینان ایمان بن جائے ' یہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ ان اچھے اعمال پر انہیں جزائے خیر دی جائے اور وہ کفار کے اعمال کی طرح ضائع نہ ہوں ۔ اور اللہ کے ہاں ایسے مسلمانوں کے اجر میں کمی نہ ہو گی جب تک وہ مطیع فرمان اور سر تسلیم خم کرنے والے رہتے ہیں ۔

وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا (۹ : ۴۹ : ۱۴) "اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرمان برداری اختیار کر لو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے" ۔ کیونکہ اللہ بہت ہی رحیم و کریم ہے ۔ وہ اپنے بندوں سے اسلام اور ایمان کی راہ میں پہلا قدم ہی قبول کرتا ہے ۔ اطاعت اور تسلیم ہی سے راضی ہو جاتا ہے اور اس کے بعد دل میں خود بخود ایمان اور اطمینان آ جاتا ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹ : ۴۹ : ۱۴) "بے شک اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے" ۔ اس کے بعد حقیقی ایمان بتا دیا ۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۹ : ۴۹ : ۱۵) "حقیقت میں مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے ۔ پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ' وہی سچے لوگ ہیں" ۔

ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور رسول پر دل سے یقین ہو جائے ۔ ایسا یقین جس کے ساتھ دل میں کوئی شک اور خلجان باقی نہ رہے ۔ ایسا یقین جو مستحکم ہو ' جس کے اندر کوئی تزلزل اور اضطراب نہ ہو ' جس کے اندر کوئی خلش یا شک نہ ہو ۔ جس میں قلب و شعور میں کوئی تزلزل نہ ہو ' اور جس کے نتیجے میں جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کے اعمال پیدا ہوں ' دل جب ایمان کی شیرینی کو چکھ لے اور اس پر مطمئن اور پختہ ہو جائے ' تو اس کا اخراج اعمال و جوارح سے ہوتا ہے ۔ عملی دنیا میں اس کا ظہور ہوتا ہے ۔ مومن کی سعی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایمان جو اس کے احساس و شعور کے اندر اور اس کے باطن میں بیٹھا ہے وہ انسان کے اردگرد ماحول کے معاملات میں بھی ظاہر ہو ۔ ایمان کی جو حسی تصویر انسان کے قلب میں ہوتی ہے اور اس کی عملی صورت جو مومن کے ماحول میں ہوتی ہے ان کے درمیان تو فرق و امتیاز نہیں کیا جا سکتا ۔ اگر ایسی صورت ہو تو پھر ایک شخص کے مومن کو ہروقت اذیت ہوتی رہتی ہے ۔ اس لیے وہ جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کے لیے میدان میں آ جاتا ہے اور یہ مومن کے انفرادی ایمان کا ظہور اور طوفان ہے جو عملی شکل اختیار کرتا ہے اس لیے کہ مومن اس طرح اپنے دین کی تصویر کو

عمل میں لانا چاہتا ہے تاکہ یہ تصویر واقعی تصویر بن جائے۔اس لیے مومن کی جنگ اس کے ماحول سے ایک مومن کا خالص ذاتی معاملہ ہے۔یہ نہ۔ مومن کے دین میں کچھ اور ہو اور اس کے ماحول میں کچھ اور ہو' یہ دہری زندگی وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا ہے کہ ایمان کو دل سے نکال دے اور جدھر ہوا چلتی ہے ادھر چلنے لگے اس لئے ایک شخص کے مومن ہوتے ہی اس کی اس کے ماحول کے ساتھ جنگ شروع ہو جاتی ہے جسے جہاد کہا جاتا ہے۔اور یہ جہاد اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک مومن کے گرد پھیلی ہوئی اس جاہلیت کو ختم نہیں کر دیا جاتا۔

اُولٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۴۹ : ۱۵) "ایسے ہی لوگ سچے ہیں"۔یہ اپنے عقیدے اور نظریہ میں سچے ہیں اگر وہ کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں لیکن ان کے دل کا ایمان مسلح ہو کر ان کے ماحول کے ساتھ نہیں ٹکراتا جو زندگی کی عملی صورت میں ایمان سے متضاد ہے تو سمجھو کہ ایمان نہیں ہے۔ عقیدے اور نظریات میں ایسا شخص سچا نہیں ہے۔

اس آیت میں لفظ انما کے ساتھ حصر قابل ملاحظہ ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا (۴۹ : ۱۵) "حقیقت میں تو مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا"۔ غرض ایمان صرف عبارت ہی نہیں ہے۔ایمان مجرد شعوری حالت کا نام بھی نہیں ہے اور یہ اس حالت کے اندر کوئی ردوبدل بھی نہیں ہے جو نفس کے اندر ہوتی ہے۔ایمان کے بعد لَمْ یَرْتَابُوْا (۴۹ : ۱۵) "پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا"۔اور اس کے ساتھ اس آیت کی حصر بھی درج ذیل آیت کے مشابہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا "وہ لوگ جنہوں نے کہا' ہمارا رب اللہ ہے اور اس کے بعد انہوں نے استقامت اختیار کی"۔یہ کہنے کے بعد کہ اللہ ہمارا رب ہے 'کوئی شک نہ کرنا اور استقامت اختیار کرنا' اس طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات نفس مومن پر' مختلف تجربات اور مختلف مشکلات کے نتیجے میں اور بعض شدید آزمائشوں کے نتیجے میں' شکوک و اضطرابات پیدا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز میں بعض اوقات انسانوں پر سخت شدائد آتے ہیں لیکن ایک سچے مومن کے دل میں کوئی اضطراب اور کوئی شک پیدا نہیں ہوتا۔وہ ثابت قدم رہتا ہے۔اور اس کے اندر کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوتا۔اس کا اپنے خدا پر پورا پورا بھروسہ ہوتا ہے اور وہ سیدھی راہ پر پوری استقامت کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور وہ آگے ہی بڑھتا رہتا ہے۔

اس انداز میں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اہل ایمان کو اس بات پر متنبہ کر دیا جائے کہ اس راہ میں بہت سی مشکلات' مقامات لغزش اور مقامات خطرہ موجود ہیں تاکہ ایک مومن اپنے عزم کو پختہ کر لے 'اپنی تیاری خوب کرے اور سیدھا سیدھا چلے۔اور جب افق پر دھند چھا جائے تو اسے شک نہ ہونے لگے اور وہ طوفانوں اور آندھیوں کی نذر نہ ہو جائے۔

اس کے بعد یہی بیان جاری رکھتے ہوئے ان کو بتایا جاتا ہے کہ اللہ تو تمہارے دلوں اور نیتوں سے بھی واقف ہے۔ یہ تو اللہ ہی ہے جو تمہیں تمہارے دلوں کی باتیں بتاتا ہے اور اللہ تم سے علم حاصل نہیں کرتا

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِكُمْ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۴۹ : ۱۶) "اے نبی ان سے کہو کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ انسان اپنے علم کے بارے میں لمبے چوڑے دعوے کرتا ہے حالانکہ وہ خود اپنے نفس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ اپنے آپ کی شعوری دنیا کے بارے میں بھی پوری معلومات نہیں رکھتا۔ اور نہ اسے اپنے نفس کی پوری حقیقت معلوم ہے اور نہ شعور اور لاشعور کی۔ انسان یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی عقل کس طرح کام کرتی ہے۔ کیونکہ انسان جب کوئی کام کرتا ہے تو اس وقت وہ خود اپنے دماغ کا ملاحظہ (observation) نہیں کر سکتا۔ اور جب وہ اپنے نفس کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کا وہ کام رک جاتا ہے جو وہ کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا ملاحظہ کے لیے کوئی چیز ہی نہیں رہتی۔ اور جب انسان کسی کام میں لگا ہوتا ہے اس وقت وہ نگرانی نہیں کر سکتا۔ اس لیے انسان خود اپنی ذات کی حقیقی معرفت سے بھی عاجز ہے۔ اور اس کے معلوم کرنے سے بھی عاجز ہے کہ انسانی دماغ کس طرح کام کرتے ہیں۔ حالانکہ یہی تو وہ چیز ہے جس پر انسان نازاں ہے۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۴۹ : ۱۶) "حالانکہ اللہ زمین اور آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے"۔ حقیقی علم اللہ کے پاس ہے ہم تو صرف ظاہری علم جانتے ہیں' جبکہ اللہ ہر چیز کی ماہیت اور حقیقت سے واقف ہے۔ اور اللہ کا علم شامل' محیط اور لا محدود ہے اور ازلی اور ابدی ہے۔

وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۴۹ : ۱۶) "اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے"۔ یعنی ہر چیز جس پر چیز کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ علم محیط رکھتا ہے۔ یہ بیان کرنے کے بعد کہ تم ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکے ہو اور نہ تم نے اس کی حقیقت کا ادراک کیا ہے' روئے سخن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھر جاتا ہے کہ یہ لوگ آپ پر اپنے اسلام کا احسان رکھتے ہیں ان کا احسان جتلانا ہی اس بات کی شہادت ہے کہ وہ حقیقت ایمان کا ادراک نہیں کر سکے۔ اور انہوں نے ابھی تک ایمان کی مٹھاس کو چکھا نہیں ہے۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۹ : ۱۷) "یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے' ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر واقعی تم سچے ہو"۔

انہوں نے یہ احسان جتلایا تھا کہ وہ اسلام لائے ہیں اور ان کا زعم یہ تھا کہ وہ مومن ہیں' جواب یہ آیا کہ اپنے اسلام کا احسان نہ جتلاؤ۔ اگر تم دعوائے اسلام و ایمان میں سچے ہو تو احسان اللہ کی جانب سے ہے۔

یہ جو اللہ نے ان کی تردید میں آیت نازل کی ہے یہ ایک عظیم حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ جس سے بڑے بڑے لوگ غافل ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس پر قدرے غور کریں۔ بعض اہل ایمان بھی اس سے غافل ہوتے ہیں۔

اہل زمین پر اللہ نے [illegible] ات کیے ہیں ان میں سے ایمان سب سے بڑا احسان ہے۔ سب سے بڑا احسان تو خود انسان کا وجود اور اس [illegible] و سمجھا جا سکتا ہے۔ نیز انسان کی زندگی کے لوازمات اور مقدمات اور ضروریات کو سمجھا جا

سکتا ہے مثلاً صحت' سازو سامان اور زندگی لیکن ایمان ان میں سب سے بڑی نعمت ہے۔

یہ وہ احسان ہے جو انسان کی پوری زندگی کو بامقصد' بامعنی اور ممتاز بنا دیتا ہے اور ایمان کی وجہ سے انسان کا کردار اس زمین میں بہت ہی حقیقی اور ممتاز ہو جاتا ہے۔

ایمان کی وجہ سے انسان کے اندر پہلی تبدیلی یہ واقع ہوتی ہے' بشرطیکہ ایمان کی حقیقت انسان کے ذہن میں بیٹھ جائے کہ ایک مومن انسان کا تصور کائنات بہت ہی وسیع ہو جاتا ہے کیونکہ اس تصور کی وجہ سے انسان اس کائنات کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے اور اس کے اندر انسان کا ایک کردار متعین ہو جاتا ہے اور اس کے ماحول میں جو بھی چیزیں ہیں' انسان اشخاص واقعات ان سب کی قدریں اس کے ہاں متعین ہو جاتی ہیں اور وہ اس سیارۂ زمین پر اپنے اس مختصر سے سفر کو نہایت ہی اطمینان سے طے کرتا ہے اور اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات سے مایوس ہوتا ہے اور اپنے خالق کے ساتھ مانوس ہوتا ہے' جو اس کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی خالق ہے' اسے اپنی اہمیت اور عظمت کا بھی شعور ہوتا ہے اور یہ کہ وہ اپنا کردار اس طرح ادا کر سکتا ہے کہ اللہ اس سے راضی ہو' اور وہ اس کائنات کی مخلوقات اور انسانوں کے لیے باعث خیر و برکت بن سکتا ہے۔

انسان کے تصور میں ایک دوسرے پہلو سے بھی وسعت آتی ہے کہ وہ زمان و مکان کے حدود سے باہر نکل جاتا ہے۔ اپنی چھوٹی سی ذات کے حدود سے بھی باہر آ جاتا ہے اور اس کائنات کی وسعتوں میں چلا جاتا ہے۔ جس کے اندر اللہ نے بے پناہ قوتیں رکھی ہوئی ہیں۔ اور بے حد اسرار چھپے ہوئے ہیں اور انسان اس قدر آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ بھی ایک طرح لامحدود ہو جاتا ہے۔

چونکہ انسان اپنی جنس کے اعتبار سے انسانیت کا ایک فرد ہوتا ہے' وہ ایک ہی اصل کی طرف لوٹتا ہے اس لئے انسان نے ابتداء میں اپنی انسانیت اللہ کی روح سے لی ہے اور یہ اسے خدا نے اپنی روح ایک مٹی کے ڈھانچے میں پھونک کر عطا کی ہے اور اسی نفخ روح کی وجہ سے یہ انسان عالم بالا کے نور کے ساتھ جڑ جاتا ہے اور یہ نور زمین و آسمان کے حدود کے اندر محدود نہیں ہے۔ یہ ان سے بھی وراء ہے جس کی نہ انتہا ہے اور نہ ابتدا ہے اور مکان و زمان کے حدود میں مقید نہیں ہے۔ یہی نور اور روح ہے جس کی وجہ سے انسان' انسان ہے۔ جب ایک انسان کے نفس کے اندر یہ بات بیٹھ جاتی ہے تو سب سے پہلے کوئی انسان خود اپنی ہی نظر میں بلند ہو جاتا ہے۔ یہ تصور انسان کو خود اس کے اپنے احساسات کے اندر مکرم بناتا ہے اور اسے نہایت ہی روشنی اور آفاقیت کا شعور دیتا ہے۔ اس کے قدم تو زمین پر چلتے ہیں لیکن اس کی روح' اس کے سرچشمے سے جا ملنے کے لیے پھڑپھڑاتی ہے جس نے اسے ابتدا میں روح اور نور سے نوازا اور جس نے اسے یہ عجیب رنگ حیات دیا۔

اور یہ شخص اپنی امت اور گروہ کے اعتبار سے امت مسلمہ کا ایک فرد ہوتا ہے۔ یہی وہ واحد امت ہے جو تاریخ کے نشیب و فراز میں' زمانوں سے ایک معزز قافلے کی صورت میں جادہ پیما ہے۔ اس کی قیادت کبھی نوح' کبھی ابراہیم' کبھی موسیٰ' کبھی عیسیٰ اور کبھی محمد علیہم السلام کے ہاتھ میں رہی۔ انسان کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ اس پاک شجر کی ایک شاخ ہے جس کی جڑیں تاریخ کی گہرائیوں میں دور تک چلی گئی ہیں اور جس کی شاخیں آسمانوں کے اندر بہت دور تک جا چکی ہیں۔ یہی تصور ہی انسان کو ایک بلند ذوق حیات عطا کرنے کے لیے کافی

ہے ' جسے یہ مل جائے وہ زندگی کے نئے احساسات لے لیتا ہے اور اس کی اس زندگی کے اندر ایک دوسری زندگی پیدا ہو جاتی ہے ' اور اس کو یہ زندگی اس کے اس نظریاتی نسب نامہ سے ملتی ہے ۔

نہیں ' ابھی انسانی تصور رک نہیں گیا ' یہ اپنی ذات ' اپنی امت ' اپنی انسانیت سے بھی آگے بڑھ کر اپنی روح کے اندر اس پوری کائنات کو بھی سمیٹ لیتا ہے کہ یہ تو اس ذات نے تخلیق کی ہے جس نے انسان کو بنایا ہے ' جس نے اسے روح بخشی ہے ۔ اور جس کی وجہ سے وہ کائنات کا دولہا بن گیا ہے ۔ پھر اس کا ایمان اسے بتاتا ہے کہ یہ کائنات بھی ایک زندہ وجود رکھتی ہے ۔ یہ زندہ ایٹم سے پیدا شدہ ہے ۔ اس کی ہر چیز میں ایک روح ہے ۔ اس پوری کائنات کی بھی روح ہے ۔ اور انسانوں کی ارواح اور اس کائنات کی عظیم روح دراصل دونوں باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں ۔ یہ سب کی سب اللہ کو پکارتی ہیں ۔ اس کی تسبیح کرتی ہیں ' اللہ کی حمد و ثنا اور اس کی اطاعت میں لگی ہوئی ہیں اور پوری طرح اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں ' یوں انسان اس عظیم کائنات کے کل کا ایک جزو بن جاتا ہے ۔ یہ نہ اس سے جدا ہے اور نہ اس سے الگ ہے ۔ یہ اللہ سے صادر ہے اور اپنی روح سے اس کی طرف متوجہ ہے ۔ اور آخرت میں بھی اس نے اسی کی طرف جانا ہے ۔ لہٰذا یہ انسان اپنی محدود ذات سے بڑا ہے ۔ وہ اس قدر بڑا ہے جس قدر وہ اس کائنات کی بڑائی کا تصور ذہن میں جما سکتا ہے ۔ وہ اپنے ماحول کی تمام ارواح سے مانوس ہے ۔ اور پھر وہ اس روح سے مانوس ہے جو اللہ نے اس کے اندر پھونکی ہے اس نکتے پر آکر وہ سوچتا ہے کہ وہ اس پوری کائنات سے متحد ہو سکتا ہے خواہ وہ کائنات کس قدر طویل و عریض کیوں نہ ہو اور اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس میں کارہائے نمایاں سرانجام دے ۔ اور بڑے بڑے واقعات کا سبب بنے اور ہر چیز کو متاثر کرے اور اس سے متاثر ہو ۔ پھر اس کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اس قوت سے استفادہ کرے جس نے اس کی تخلیق کی ' اور اس کے پورے ماحول میں پھیلی ہوئی کائنات کی تخلیق کی ۔ وہ عظیم قوت جو نہ کمزور ہوتی ہے ' نہ کم ہوتی ہے اور نہ غائب ہوتی ہے ۔ یعنی اللہ الکبیر المتعال ۔

اسی وسیع تصور کے پیمانے میں ' پھر یہ انسان تمام اشیاء ' تمام واقعات ' تمام اشخاص ' تمام اقدار ' تمام اہتمامات ' تمام مقاصد ' اور تمام منازل کو ایک بالکل جدید پیمانے کے ساتھ تولتا ہے ' اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں اس کا حقیقی کردار کیا ہے ۔ اس کائنات میں اس کا مقصد وجود کیا ہے ؟ اور اس کائنات میں وہ اللہ کی اقدار میں سے ایک قدر ہے ۔ اس لیے اللہ جس طرف چاہے اسے موڑ دے جس طرح چاہے اسے استعمال کرے ۔ یوں وہ پھر اسی سفر زندگی کو ' اس سارے پر طے کرتا ہے ' ثابت قدمی کے ساتھ ' واضح بصیرت کے ساتھ اور مانوس ضمیر کے ساتھ ۔

جب انسان اس زاویہ سے اپنے ماحول میں پائے جانے والی اس کائنات کی حقیقت کو پا لیتا ہے ۔ پھر وہ یہ بات متعین کر لیتا ہے کہ اس دنیا میں اس کا کردار کیا ہے ؟ اور اس کردار کو ادا کرنے کے لیے اسے یہاں کیا کیا قوتیں دی گئی ہیں تو اس علم و معرفت سے اسے اطمینان ' سکون اور خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ کہ اس کے ماحول میں جو کچھ ہو رہا ہے ' اور اسے جو کچھ پیش کر رہا ہے ' اس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ اس کا محرک کون ہے یا خود وہ کہاں سے آ رہا ہے ؟ اور کیوں آیا ہے ؟ کہاں جا رہا ہے ؟ ... وہاں اسے کیا ملنے والا ہے ۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا مقصد زندگی کیا ہے ' اور اسے جو کچھ پیش آ رہا ہے وہ اس کا مقدر ہے ۔ اور ہو کر رہنا ہے ۔ اور یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۔ اور یہ کہ چھوٹے بڑے کاموں پر اسے جزا ملے گی ۔ وہ عبث نہیں پیدا کیا گیا ۔ نہ وہ شتر بے مہار ہے ' نہ وہ اکیلا جائے گا ۔

اس تصور اور شعور سے انسانی زندگی قلق ' بے چینی ' حیرت ' استعجاب اور لاعلمی (بابت آغاز و انجام) کی پریشانی سے نجات پالیتی ہے ۔ نہ اسے راستے کی بے چینی ہوتی ہے اور نہ وہ اپنے آنے اور جانے سے پریشان ہوتا ہے ۔ ذرا عمر خیام کو سنئے وہ پریشان ہے :

" مجھے جامہ حیات ' میرے پوچھے بغیر پہنا دیا گیا ' اس حیات کے دوران میں مختلف باتیں سوچتا رہا ' عنقریب جامہ حیات مجھ سے اتار لیا جائے گا اور مجھے معلوم نہیں ہے کہ میں کیوں آیا اور مجھے جانا کہاں ہے ؟ "

پس ایک مومن نہایت ہی قلبی اطمینان سے یہ یقین رکھتا ہے اور بڑی خوش دلی سے یہ اطمینان رکھتا ہے اور ایک ہشاش و بشاش چہرے کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ اسے عمر کا جامہ دست قدرت نے پہنایا ہے ۔ وہ دست قدرت علیم و قدیر کے طور پر اس کائنات میں متصرف ہے ۔ اور وہ ہاتھ جس نے اسے جامہ حیات پہنایا ہے وہ زیادہ محکم اور رحیم و کریم ہے ۔ لہٰذا اس کے ساتھ کسی مشورے کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ کیونکہ انسان وہ سوچ پیش نہیں کر سکتا جس قدر علیم و قدیر سوچ سکتا ہے اور انسان کو علیم و قدیر نے جامہ حیات اس مقصد کے لیے پہنایا ہے کہ اس نے اس کائنات میں ایک کردار ادا کرنا ہے ۔ یہ اس کائنات کے اندر موجود چیزوں سے متاثر ہو گا اور ان کو متاثر کرے گا اور اس نے جو کردار ادا کرنا ہے وہ اس کردار سے ہم آہنگ ہے جو اس دنیا میں تمام اشیاء ادا کر رہی ہیں ۔ زندہ ہوں یا غیر زندہ ' ابتداء سے انتہا تک ۔

پس ایک مومن جانتا ہے کہ وہ کیوں آیا ہے ' اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے جانا کہاں ہے ؟ اور وہ کسی فکری انتشار میں گرفتار نہیں ہوتا ۔ بلکہ وہ اپنا یہ سفر اور اپنا یہ کردار نہایت اطمینان سے ادا کرتا ہے ۔ نہایت یقین کے ساتھ ' نہایت وثوق کے ساتھ ۔ کبھی تو یہ مومن درجہ ایمان میں اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اپنا یہ کردار اس قدر خوشی اور انبساط کے ساتھ ادا کرتا ہے کہ اس تحفہ حیات کی خوبصورتی کا شعور رکھتا ہے ' اور اسے ایک عظیم عطیہ سمجھتا ہے ۔ اور اس عمر اور جامہ عمر کو خلعت شاہی سمجھتا ہے ۔ وہ بادشاہ جو لطیف و خبیر اور جو جمیل اور ودود و رحیم ہے اور جو کردار یہاں ادا کرنا ہے ' چاہے جس قدر مشقت کا باعث بن جائے وہ اسے ادا کر کے رب ذوالجلال کے ہاں پہنچ سکتا ہے ۔

اور اس قسم کا پریشان کن شعور صرف ایمان کی وجہ سے غائب ہو جاتا ہے ' اس قسم کے شعور کے اندر میں بھی ایک عرصے تک گرفتار رہا ہوں ۔ نہایت ہی کربناک پریشانیوں میں ' اس زمانے میں جب مجھے قرآن کے سایہ عاطفت میں آنے کی توفیق نہ ملی تھی ۔ اور اس زمانے میں کہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر ابھی اپنے سایہ عاطفت کے اندر مجھے داخل نہ کر دیا تھا ۔ یہ شعور میری روح میں موجود تھا اور میں نے " آزردہ دل ' آزردہ کند انجمن را " کے بموجب یہ شعور پوری کائنات کو اڑھا دیا تھا ۔

وقف الکون حائرا این یمضی
ولماذا وکیف لو شاء یمضی
عبث ضائع وجهد غبین
ومصیر مقنع لیس یرضی

(یہ پوری کائنات انگشت بدنداں ہے کہ یہ کہاں جارہی ہے ' کیوں جارہی ہے اور کس طرح جارہی ہے ' اگر وہ جانا چاہے تو عبث جدوجہد ہے اور فانی دنیا ہے اور جب موت کا نقارہ بج جائے تو چاہے نہ چاہے ' جانا ہے) ۔

آج میں جانتا ہوں 'اور اللہ کے فضل و کرم سے جانتا ہوں کہ کوئی جدوجہد ضائع نہیں ہے 'یہ کیے کی جزاو سزا ہے۔ کوئی جدوجہد اکارت نہیں جاتی ہے ۔ اور انجام مرضی کے مطابق ہے اور عادل اللہ اور شفیق و رحیم رب کے پاس جانا ہے ۔ اور یہ کہ یہ کائنات یہاں رکی نہیں رہے گی ۔ اس کائنات کی روح رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے اور اس کی حمد و ثناء کر رہی ہے اور یہ اس کی مرضی کے مطابق چل رہی ہے ۔ اور اس کے اس قانون کے مطابق چل رہی ہے جو اس کے لیے اس نے تیار کیا ہے اور نہایت ہی تسلیم و رضا اور اطاعت امر کے ساتھ جا رہی ہے ۔

میں سمجھتا ہوں فکر و شعور کی دنیا میں بھی انسان کے لیے یہ بہت بڑی دولت ہے اور جسمانی اور اعصابی لحاظ سے بھی اور حسن کارکردگی 'جدوجہد اور تاثیر اور تاثر اس کے علاوہ ہیں۔

ایمان جس طرح انسانی جسم و روح کے لیے ایک قوت مجتمعہ ہے 'اسی طرح وہ ایک اقدامی قوت بھی ہے ۔ جونہی کسی دل میں ایمان جاگزیں ہوتا ہے وہ عملی جدوجہد کی شکل میں پھر جسم سے باہر آتا ہے ایمان کی جو صورت ذہن میں ہوتی ہے ۔ وہ ایمان کی اس صورت کے ساتھ ہمقدم ہوتی ہے جو خارج میں عملی دنیا میں ہوتی ہے اور انسان کی قوائے متحرکہ پر ایمان قابض ہو جاتا ہے اور اسے ایمانی راستے کی طرف بڑھاتا ہے ۔

"یہ ہے وہ راز جس کی وجہ سے نفس کے اندر عقیدے کی قوت مضمر ہے اسی طرح ایک مومن ہونے کی وجہ سے نفسیاتی قوتوں میں اضافے کا راز بھی یہی ہے ۔ نظریہ کی وجہ سے دنیا میں جو عجائبات و معجزات صادر ہوتے ہیں اور ہوتے رہے ہیں ان کا راز یہی ہے ان معجزات کی وجہ آئے دن زندگی کا چہرہ بدل جاتا ہے ۔ یہ ایمان اور نظریہ ہی ہے جس کے لیے لوگ یہ فانی زندگی بھی قربان کر دیتے ہیں اور اس زندگی میں قدم رکھتے ہیں جو کبھی فانی نہیں ہوتی اور ایک نہایت ہی ضعیف اور چھوٹا شخص بھی ایک بادشاہ 'ایک ڈکیٹر کے سامنے سر اٹھا کر چلتا ہے اور آگ اور لوہے کی قوتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اور پھر وہ وقت آتا ہے کہ ایمان کے سامنے بار و شکست کھا جاتی ہے ۔ یہ صرف ایک انسان نہیں ہوتا جو ان عظیم قوتوں کو شکست دے دیتا ہے بلکہ وہ ایک عقیدہ ہوتا ہے جو ان قوتوں کو پاش پاش کر دیتا ہے بلکہ یہ وہ عظیم ایمانی قوت کا سرچشمہ ہے جس سے انسانی روح قوت حاصل کرتی ہے ۔ یہ سرچشمہ کبھی خشک نہیں ہوتا 'کبھی اس میں کمی نہیں آتی 'یہ کبھی کمزور نہیں ہوتا" ۔ (۱)

"یہ معجزانہ تغیرات جو ایک نظریہ 'ایک فرد اور ایک سوسائٹی کے اندر رونما کرتا ہے 'کوئی ایسا نظریہ نہیں کر سکتا جو خرافات اور افسانوں پر قائم ہوتا ہے 'جو ناقابل فہم ہو یا محض خوف اور حیرانگی اور تخیلاتی ہو بلکہ وہ عقیدہ کر سکتا ہے جو قابل فہم اور مضبوط اصولوں پر مبنی ہو ۔ حقیقی دینی عقیدہ وہ ہوتا ہے جو انسان کو اس کائنات کی ظاہری اور باطنی قوتوں کے ساتھ یکجا کر دے اور انسان کی روح کے اندر اعتماد اور اطمینان پیدا کر دے ۔ اور اس کے اندر ایک ایسی قوت پیدا کر دے جس کے ساتھ وہ تمام ناپائیدار اور زائل ہونے والی باطل قوتوں کا مقابلہ کرے ۔ اور اسے یقین ہو کہ آخرکار وہ فتح یاب ہو گا ۔ یہ اعتماد اسے اللہ کی ذات سے حاصل ہو ۔ اور یہ عقیدہ ایسا ہو جو انسان کو یہ بتاتا ہو کہ وہ اپنے ماحول کے واقعات سے 'ماحول کی تمام چیزوں اور تمام لوگوں کے ساتھ متعلق ہے ۔ یہ عقیدہ انسان کو اس کی منزل بھی دکھائے اور اس کا

(۱) کتاب عالمی سلامتی کا باب عقیدہ اور زندگی

انجام بھی بتائے ـ اس کی پوری قوتوں کو مجتمع کرے اور ایک رخ پر ڈال دے ـ یہ ہے عقیدے کی قوت کا راز ـ کہ وہ تمام قوتوں کو مجتمع کر کے ایک محور کے گرد گھما دیتا ہے ـ ان کو ایک سمت عطا کرتا ہے ـ انسانوں کو ان کا ہدف معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنے اس نصب العین کی طرف نہایت قوت' یقین اور اعتماد سے بڑھتے ہیں ـ(۱)

غرض عقیدے اور نظریات کی قوت میں یوں بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ یہ اس طرف جاتے ہیں جس طرف یہ پوری کائنات جاتی ہے ـ پوری کائناتی قوتیں جاتی ہیں' ظاہری یا باطنی ہوں ـ کیونکہ کائنات کے اندر جتنی بھی قوتیں ہیں وہ ایمان کے راستے پر چل رہی ہیں ـ یوں ایک مومن کے لیے یہ کائناتی قوتیں رفیق سفر ہوتی ہیں اور اس طرح یہ ایمانی قوت اور کائناتی قوتیں مل کر باطل پر حملہ آور ہوتی ہیں' اگرچہ باطل بظاہر بڑی قوت نظر آئے اور آنکھوں کی چکاچوند کر دینے والی ہو لیکن ایمانی قوت سے وہ پاش پاش ہو کر رہے گی ـ

اللہ نے ہم سے کہا: يَمُنُّونَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۹ : ۱۷) "یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ـ ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت کی' اگر تم واقعی سچے ہو" ـ یہ ہے وہ عظیم دولت جس کا مالک بھی اللہ ہے اور جس کا بخشنے والا بھی اللہ ہے ـ اور اللہ دولت ایمان اسی کے حوالے کرتا ہے جس کے بارے میں اسے علم ہوتا ہے کہ یہ اس فضل عظیم کا مستحق ہے ـ

اللہ نے سچ کہا' جو شخص ان حقائق و علوم کے ساتھ دوستی کرلے اور یہ معانی اور یہ شعور اسے حاصل ہو جائے اور ان کے اندر وہ زندہ ہو اور وہ اس کے اندر اس چھوٹے سے سیارے پر معمولی حالات میں مختصر زندگی گزار رہا ہو اس نے گویا کچھ بھی نہیں کھویا اور جو شخص اس دولت سے محروم ہو گیا' وہ اگر ناز و نعم کی زندگی بھی بسر کرے' اس طرح زیادہ کھائے پیئے جس طرح مویشی بہت سا کھاتے اور پیتے ہیں' تو وہ جان لے کہ اس سے یہ مویشی اچھے ہیں جو اپنی فطرت کے اعتبار سے خالق کریم کے مطیع فرمان ہیں ـ

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۴۹ : ۱۸)
"اللہ زمین و آسمان کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو' وہ اس کی نگاہ میں ہے" ـ جو اللہ زمین و آسمانوں کے غیب سے واقف ہے' جو ضمیروں کی بات جانتا ہے' جو انسانی شعور سے بھی واقف ہے' جو دیکھ رہا ہے کہ لوگ کرتے کیا ہیں ـ وہ صرف وہ باتیں ہی نہیں جانتا جو لوگوں کی زبان سے نکلتی ہیں بلکہ ان شعوری جذبات سے بھی واقف ہے جو دلوں میں جوش مارتے ہیں' ان اعمال سے بھی واقف ہے جو ان دلی جذبات کے نتیجے میں عمل میں آتے ہیں ـ

یہ ہے گیارہ آیات پر مشتمل یہ عظیم سورت' یہ مومنین کے لیے نہایت ہی اہم نشانات راہ تجویز کرتی ہے اور نہایت ہی اعلیٰ اور پاکیزہ نشانات نیز انسانی شعور و ضمیر کی گہرائیوں میں نہایت ہی عظیم اصول اور حقائق کی نشاندہی کرتی ہے ـ

--- ○○○---

(۱) کتاب عالمی سلامتی کا باب عقیدہ اور زندگی

فی ظلال القرآن

جلد ---- پنجم

پارہ ----- ۲۶

سورۃ ق ۔ ۵۰

آیات ۱--- تا--- ۴۵

سورۂ ق ایک نظر میں

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کو عید اور جمعہ کے خطبات میں پڑھا کرتے تھے اور یہ سورت اکثر خطبہ جمعہ کا موضوع ہوا کرتی تھی ۔ جبکہ بہت بڑے مجمے ہوا کرتے تھے اور نہایت ہی شاندار اجتماعات ۔

یہ سورت نہایت ہی ڈرانے والی سورت ہے ۔ معنوی اعتبار سے بھی نہایت موثر ہے اور انداز تعبیر کے اعتبار سے بھی بہت زور دار ہے ۔ اس کے سائے گہرے ' تصاویر کے رنگ تیز اور آیات کے فواصل واضح ہیں ۔ یہ سورت نفس انسانی کے نشیب و فراز میں دور دراز تک اتر جاتی ہے ۔ نفس انسانی حالت خطرہ میں مضطرب ہو اور بے ساختہ حرکات کر رہا ہو یا پوشیدگی اور تنہائی کی حالت میں ہو ' یا زینت محفل ہو یا باطن میں متفکر ہو' ہر حال میں یہ سورت اس کی نگرانی کرتی ہے ۔ انسان کی ولادت سے اس کی وفات تک ' بعث و حشر تک اور یوم الحساب سے آخری انجام تک یہ اس کا تعاقب کرتی ہے ۔ غرض نہایت ہی سخت نگرانی کی کیفیت ہے اور یہ نگرانی بہت ہی تفصیلی اور ڈراونی اور ہمہ جہت ہے ۔ اور اس ضعیف انسانی مخلوق پر پوری طرح چھائی ہوئی ہے ۔ یہ انسان ہروقت اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور اس نگرانی کے دائرہ سے اس کا کوئی چھوٹا بڑا معاملہ خارج نہیں ہے ۔ اس کی حرکات و سکنات پوری طرح نوٹ ہو رہی ہیں ' نہ کم نہ زیادہ۔ اس کا ہر وسوسہ ریکارڈ ہو رہا ہے اور اس کی ایک ایک سانس کا حساب ہو رہا ہے ' ہر لفظ ٹیپ ہوتا ہے اور ہر حرکت کا حساب لگایا جاتا ہے ۔ پھر یہ نگرانی اس قدر کامل ' شامل اور جامع ہے کہ اس کا دائرہ دلوں کے وسوسوں تک وسیع ہو جاتا ہے ۔ تمام اعضاء پر یہ نافذ ہے ۔ بغیر حجاب اور بغیر پردے کے ۔ کوئی پردہ جس قدر بھی دبیز ہو ' اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتا۔ غرض تنہائی اور محفل میں عمل اور حرکت میں نیت اور وساوس میں یہ انسان اللہ کی نگرانی اور رقابت کے تحت ہے ۔ ہر وقت اور ہر حال میں ۔

یہ پورا قرآن ان حقائق کی تعلیم دیتا ہے اور یہ ہر مسلمان کو معلوم ہیں لیکن اس سورت کو پڑھ کر یوں نظر آتا ہے کہ شاید یہ سب مضامین پہلی بار آرہے ہیں ۔ انسانی احساس اچانک چونک اٹھتا ہے ۔ نفس انسانی لرز اٹھتا ہے ۔ اور یہ سورت اسے اس قدر جھنجھوڑتی ہے کہ اس پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے ۔ اور انسان تعجب کے ساتھ ساتھ خائف بھی ہو جاتا ہے ۔ اور یوں لگتا ہے کہ انسان سویا ہوا تھا اور جاگ اٹھا اور گہری غفلت سے ہوش میں آگیا۔

ان امور کے علاوہ اس میں زندگی کی متنوع صورتیں ' موت کی مختلف شکلیں ' گل سڑ جانا ' دوبارہ اٹھایا جانا ' حشر کی حشر سامانیاں ' قیام قیامت کو دل میں بٹھانا ' احساس کو اس کے لیے ہروقت تیار کرنا ' غرض وہ عظیم حقائق لائے ہیں جو آسمان و زمین میں درخشاں ہیں ۔ بارشیں اور زمین کی سرسبزیاں ' کھجوریں اور پھل غرض تمام اہم مناظر و حقائق اس سورت میں ہیں جو:

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (۵۰ : ۸) ”آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اس بندے کے لیے جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہو“۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا سورت کی تلخیص ۔ اور پھر اس پر تبصرہ بہت ہی مشکل ہوتا ہے ۔ اس قسم کی زوردار اسلوب بیان رکھنے والی سورت کے حقائق ' معانی ' تصاویر اور رنگوں کے شیڈز (Shades) کو بیان کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے ۔ اور انسان کے لیے ممکن نہیں کہ خود قرآنی انداز اور اسلوب میں اس پر کچھ کہہ سکے جبکہ قرآنی عبارات خود ان باتوں کو بطریق احسن بتا رہی ہوں اور ایسے حالات میں کسی تبصرے اور تعریف اور دیباچے کے مقابلے میں براہ راست سورت کا اثر انسانی فطرت ' ضمیر اور احساس پر زیادہ ہوتا ہے ۔ مناسب یہی ہے کہ ہم براہ راست تفسیر آیات شروع کر دیں ۔ اللہ معاون و مددگار ہے ۔

--- ○○○---

درس نمبر ۲۴۷ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا پہلا سبق ہے ۔ اس کا موضوع مسئلہ بعث بعد الموت ہے ۔ مشرکین مکہ اس کا انکار کرتے تھے بلکہ جو لوگ بعث بعد الموت کے قائل تھے وہ ان کی جانب سے یہ عقیدہ رکھنے پر تعجب کرتے تھے ۔ لیکن قرآن صرف ان کے اس غلط خیال ہی کو موضوع بحث نہیں بناتا ۔ بعد ۔ ۔ نط انکار پر بحیثیت مجموعی تنقید کرتا ہے اور ان کی اصلاح کر کے اور ان کی کج فکری کو درست کر کے ان کو سچائی کی راہ کی طرف لوٹانے کی کوشش کرتا ہے ۔ قرآن کریم کی سعی یہ ہے کہ ان کے غافل دلوں کو جھنجھوڑے اور خوب جگائے تاکہ وہ اس کائنات کے اندر جو عظیم حقائق ہیں ' ان کو سمجھنے کے لیے اپنے دل کے دروازے کھولیں ۔ اس لیے قرآن کریم محض منطقی انداز مناظرہ میں ان کے ساتھ موضوع بعث بعد الموت پر کوئی مباحثہ نہیں کرتا ۔ وہ صرف ان کے مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے ۔ ان کے زنگ آلود دماغ کو صیقل کرتا ہے کہ وہ غور و فکر سے کام لیں ۔ وہ ان کے وجدان کو چھوتا ہے تاکہ اس کے اندر احساس تیز ہو اور وہ اپنے ماحول کے اندر پائے جانے والے حقائق سے براہ راست متاثر ہو سکے ۔ یہ ایک ایسا سبق ہے جس سے وہ لوگ خوب استفادہ کر سکتے ہیں جن کا کام دلوں کی اصلاح کرنا ہو ۔

--- ○○○ ---

درس نمبر ۲۴۷ تشریح آیات

۱ --- تا --- ۱۵

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۚ﴿۱﴾ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۚ﴿۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴿۳﴾ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴿۴﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ﴿۵﴾ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ﴿۶﴾ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۙ﴿۷﴾ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿۸﴾

”ق‘ قسم ہے قرآن مجید کی ۔ بلکہ ان لوگوں کو تعجب اس بات پر ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود انہی میں سے ان کے پاس آگیا ۔ پھر منکرین کہنے لگے :”یہ تو عجیب بات ہے ‘کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے)؟ یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے ۔ (حالانکہ) زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے ۔ بلکہ ان لوگوں نے تو جس وقت حق ان کے پاس آیا اسی وقت اسے صاف جھٹلا دیا ۔ اسی وجہ سے اب یہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں ۔ اچھا‘ تو کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا‘ اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے ۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اگا دیں ۔ یہ ساری چیزیں

آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اس بندے کے لیے جو (حق کی طرف) رجوع کرنے والا ہو"۔

سورت کا آغاز حرف ق اور قرآن مجید کی قسم سے ہوتا ہے' مطلب یہ کہ یہ قرآن مجید تو ایسے ہی حروف سے مرکب ہے اور لفظ قرآن کا پہلا حرف ہی قاف ہے۔

---ooo---

یہاں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ کس بات پر قسم اٹھائی جا رہی ہے۔ یہ قسم کلام کے آغاز میں ہے۔ اس کا پہلا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے کلام کا آغاز قسم سے کر رہا ہے' لہٰذا بیدار ہو جاؤ' معاملہ غیر معمولی ہے۔ اللہ اور قسم' لہٰذا معاملہ خطرناک ہے۔ شاید اس آغاز کا مقصد یہی ہے کیونکہ بجائے اس کے کہ بعد میں وہ بات ذکر کی جائے جس کے لیے قسم اٹھائی جا رہی ہے' حرف اضراب "بل" کو لایا گیا ہے۔ کیونکہ قسم نے مخاطب پر خوب اثر ڈال دیا۔ اس لیے اب ان کے تعجب اور بعث بعد موت کو ایک "انہونی بات سمجھنے" کے موضوع کو لیا جاتا ہے' اس انداز میں کہ گویا مشرکین کے سامنے جب رسول اللہ ؐ نے دوبارہ اٹھائے جانے کی بات کی تو انہوں نے اس کا یوں انکار کر دیا گویا کفار کے نزدیک یہ ایک نئی بات ہے۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ (۲) ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ (۵۰: ۲ تا ۳) "بلکہ ان لوگوں کو تعجب اس بات پر ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود انہی میں سے ان کے پاس آ گیا۔ پھر منکرین کہنے لگے: "یہ تو عجیب بات ہے' کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے)؟ یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے"۔

کیا یہ بات قابل تعجب ہو سکتی ہے کہ ایک ڈرانے والا ان میں سے آ گیا۔ اس میں تو کوئی تعجب نہیں بلکہ یہ تو بالکل ایک قدرتی بات ہے اور فطرت سلیمہ اسے بڑی سادگی اور خوشی خوشی قبول کرتی ہے۔ یہ نہایت ہی معقول بات ہے کہ لوگوں کا مصلح اپنی قوم میں سے ہو' لوگوں کے احساسات میں' ان کے ساتھ شریک ہو' انہی جیسا شعور رکھتا ہو' ان کی زبان بولتا ہو' ان کی زندگی اور ان کی دوڑ دھوپ اور غم درد میں شریک ہو' ان کے میلانات اور جذبات کو جانتا ہو' ان کی طاقت اور حد برداشت سے واقف ہو تاکہ وہ انہیں بتلائے کہ جس شرک' ظلم اور بدعملی میں وہ مبتلا ہیں' اس کے نتیجے میں بت ہی برا انجام ان کے انتظار میں ہے اور تاکہ ان کو سکھائے کہ انہوں نے کس طرح سیدھا راستہ اختیار کرنا ہے۔ اور جدید دعوت کو اگر وہ قبول کر لیں تو انہیں اپنے اندر کیا کیا تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ اور ان تبدیلیوں اور فرائض اور ذمہ داریوں میں وہ پہلا شخص ہو گا اور ان کے ساتھ شامل ہو گا۔

ان کو خود رسالت پر تعجب تھا۔ پھر جو رسول آیا اس نے اپنی دعوت میں سے عقیدہ بعث بعد الموت پر زیادہ زور دینا شروع کر دیا۔ کیونکہ اسلامی نظام کا دارومدار ہی آخرت کی جوابدہی کے عقیدے پر ہے۔ آخرت کی جوابدہی کے عقیدے ہی کے تمام مطلوبہ اعمال تقاضے ہیں۔ مسلم کا پہلا فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ حق پر قائم ہو اور باطل کو نیچا دکھائے۔ وہ خیر کو لے کر اٹھے اور شر کا خاتمہ کر دے۔ اس کی پوری سرگرمی اللہ کی بندگی ہو۔ وہ ہر حرکت میں اللہ کی طرف متوجہ ہو' اور تمام اعمال پر اس کے لیے جزاء ضروری ہے۔ کبھی تو یہ جزاء دنیا ہی میں ملتی ہے لیکن پوری جزاء صرف آخرت ہی میں مل سکتی ہے۔ ہر انسان کا آخری حساب و کتاب آخرت میں ہو گا۔ لہٰذا عالم آخرت نہایت منطقی اور ضروری

ہے ۔ لوگوں کو اٹھایا جانا ضروری ہے کہ وہ زندگی کا حساب دیں ۔ جب کسی کے ذہن سے آخرت کی جوابدہی کا احساس ہی ختم ہو جائے تو اس شخص کی زندگی سے وہ تمام اعمال و اخلاق ناپید ہو جاتے ہیں جو اس عقیدے پر مبنی ہوں ۔ ایسا شخص کم از کم ایک مسلمان ہرگز نہیں ہو سکتا۔

لیکن ان لوگوں نے اس مسئلے کو اس زاویہ سے نہیں دیکھا۔ انہوں نے بالکل ایک دوسرے زاویہ سے اور بالکل ایک سادہ نقطہ نظر سے دیکھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے موت و حیات کی حقیقت پر بالکل غور نہیں کیا اور نہ انہوں نے اللہ کے نظام قضا و قدر کے کسی پہلو پر غور کیا۔ اس لیے وہ اس کے قائل ہوئے ۔

ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ (۵۰ : ۳) "کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے ! یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے"۔ ان کی نظروں میں مسئلہ یہ ہے کہ مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد زندگی کا دوبارہ پیدا ہونا مستبعد ہے اور یہ ایک نہایت ہی سادہ نظریہ ہے ۔ کیونکہ ایک دفعہ جب مردہ مٹی میں زندگی ڈال دی گئی ہے تو دوبارہ مٹی میں اسی طرح زندگی ڈالنا کیا مشکل کام ہے جبکہ یہ معجزہ ان کے سامنے ہر لحظہ روبعمل ہوتا رہتا ہے ۔ اور اس کائنات کے ہر پہلو میں ہو رہا ہے ۔ اس سورت میں قرآن کریم نے ان کو اس نکتے کی طرف متوجہ کیا ہے ۔

لیکن قبل اس کے کہ زندگی کی اس نمائش گاہ کے بارے میں ہم قرآن مجید کے اشارات اور تکوینی دلائل پر کوئی بات کریں ۔ مناسب ہے کہ مرنے اور مٹی ہونے کی طرف انہوں نے جو اشارہ کیا اور جسے قرآن نے نقل کر کے اس پر تبصرہ کیا' اس پر ذرا غور کریں ۔

ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا (۵۰ : ۳) "کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہو جائیں گے"۔ ہاں ہم مر جائیں اور مٹی بھی ہو جائیں گے جو بھی قرآن کے ان الفاظ کو پڑھتا ہے جو قرآن نے کفار کے منہ سے لیے ہیں' وہ اپنی ذات پر نگاہ ڈالتا ہے اپنے اردگرد دوسرے زندہ اشیاء کو دیکھتا ہے ۔ اور وہ موت اور مٹی ہونے کے عمل پر ضرور غور کرتا ہے بلکہ جب وہ زندہ ہوتا ہے اور پھر رہا ہوتا ہے تو بھی وہ محسوس کرتا ہے کہ شاید مٹی ہونے کا عمل اس کے جسم میں جاری ہو چکا ہے ۔ غرض موت کے سوا اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا تصور انسان کا دل ہلا نہ دیتا ہو اور پھر قبر میں مٹی ہو جانے کے تصور ہی سے انسان کانپنے لگتا ہے ۔

---ooo---

اس پر جو تبصرہ قرآن کرتا ہے وہ اس اثر کو مزید گہرا کر دیتا ہے ۔ وہ سوچتا ہے کہ زمین اس جسم کو آہستہ آہستہ کھاتی ہے ۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (۵۰ : ۴) "(حالانکہ) زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے"۔

انداز تعبیر ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ زمین کو زندہ اور متحرک کر دیا گیا ہے اور وہ ان اجسام کو کھا رہی ہے جو اس کے منہ میں آہستہ آہستہ غائب ہو رہے ہیں ۔ اور یہ زمین ان اجسام کو کھا رہی ہے' نہایت آہستگی کے ساتھ ۔ اور پھر ان کے اجسام کو یوں دکھایا گیا ہے کہ وہ تسلسل کے ساتھ کھائے جا رہے ہیں ۔ زمین ان کے جسم کے جس حصے کو کھاتی ہے' اسے اللہ جانتا

ہے اور وہ لکھا جا رہا ہے کہ وہ حصہ کہاں ہے۔ اس لیے ان کے جسم کے ذرے ' مرنے کے بعد کہیں گم نہیں ہو جاتے۔ رہی یہ بات کہ اس مٹی میں روح کس طرح ڈال دی جائے گی تو یہ بات تو ایک بار ہو چکی ہے۔ اور ان کے ارد گرد جو لاتعداد زندہ اشیاء پیدا کی جا رہی ہیں اور جن کی کوئی انتہا نہیں ہے ان کو تو وہ دیکھ رہے ہیں۔

یوں دلوں کو اس قدر تیز احساس دلایا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ دل پگھل جاتے ہیں اور نرم ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر احساس کو اس قدر تیز کر دیا جاتا ہے کہ وہ بات کو جلدی مانتے ہیں۔ یہ بطور تمہید اصل مقصود بالذات بات کہنے سے پہلے کیا جاتا ہے۔

---ooo---

اس کے بعد ان کی شخصیت کا تجزیہ کر کے بتایا جاتا ہے اور وہ اصل سبب بتایا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ واہی اعتراضات وہ کرتے ہیں یہ کہ انہوں نے سچائی کا مضبوط پلیٹ فارم چھوڑ دیا ہے ' ان کے پاؤں کے نیچے زمین ہی نہیں ہے۔ اس لیے یہ کسی موقف پر جم ہی نہیں سکتے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَّرِيجٍ (۵۰ : ۵) "بلکہ ان لوگوں نے تو جس وقت حق ان کے پاس آیا اسی وقت اسے صاف جھٹلا دیا۔ اسی وجہ سے اب یہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں"۔

یہ بھی ایک نہایت منفرد انداز تعبیر ہے۔ جو لوگ مستقل سچائی کو ترک کرتے ہیں تو پھر ان کے قدم کسی جگہ نہیں جم سکتے۔

سچائی ایک ایسا نقطہ ہے جس پر وہ شخص قائم ہوتا ہے جو سچائی پر ایمان لاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے قدموں میں کوئی لغزش نہیں ہوتی۔ اس روش میں اضطراب نہیں ہوتا کیونکہ اس کے قدموں کے نیچے زمین مضبوط ہوتی ہے۔ اس میں کوئی زلزلہ نہیں آتا اور نہ اس کا کوئی حصہ زمین میں دھنستا ہے جبکہ اس کے ماحول کے دوسرے افراد ڈانواں ڈول ' مضطرب ' بے ثبات اور دولت یقین سے محروم ہوتے ہیں۔ نہ ان میں کوئی مضبوط کردار ہوتا ہے اور نہ وہ مشکلات برداشت کر سکتے ہیں۔ جس نے بھی حق سے تجاوز کر لیا اور ادھر ادھر ہو گیا ' وہ پھسل گیا۔ اور ثبات و قرار سے محروم ہو گیا۔ اور اسے کبھی اطمینان نہ ہو گا۔ وہ ہر وقت شک ' پریشانی اور بے چینی میں مبتلا رہے گا۔

پھر جو شخص سچائی کو چھوڑ دے تو ہر طرف سے خواہشات نفس کی آندھیاں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ میلانات و خواہشات ' بدلتی ہوئی خواہشات ' اسے کسی ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتیں۔ حیران و پریشان ' افتاں و خیزاں کبھی ادھر دوڑتا ہے ' کبھی ادھر بھاگتا ہے۔ جہاں کھڑا ہوتا ہے وہاں مطمئن نہیں ہوتا۔ پاگلوں کی طرح کبھی دائیں ' کبھی بائیں ' کبھی آگے کبھی پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ اس کے لیے کوئی جائے امن و قرار نہیں ہوتی۔

یہ ایک عجیب انداز بیان ہے کہ وہ "امر مریج" میں پھنسا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں جس میں الجھن ہو اور وہ فیصلہ نہ کر سکتا ہو اور دائمی خلجان میں گرفتار ہو۔ انداز بیان ایسا ہے کہ ایسے شخص کی اندرونی کیفیات کو اس کی حرکات ظاہر کر رہی ہیں اور لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔

---ooo---

مضمون یہ چل رہا تھا کہ یہ لوگ بعث بعد الموت اور حشرونشر کے قائل نہ تھے ۔ اس کے لیے بتایا گیا تھا کہ اس کے لیے یہی ثبوت کافی ہے کہ اس کائنات کی بنیاد حق پر ہے جو اس کے اندر جما ہوا ہے اور پہاڑ کی طرح بلند نظر آتا ہے ۔ لہٰذا اب یہاں اس کائنات کے اندر پائے جانے والے حق کے بعض مناظر پیش کیے جاتے ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ ذرا آسمانوں اور زمین پر غور کرو' زمین کے اندر جمے ہوئے پہاڑوں کو دیکھو ۔ آسمانوں سے برسنے والی بارشوں کو دیکھو' بلندیوں تک بڑھنے والے کھجور کے درختوں کو دیکھو' باغات و نباتات کو دیکھو' یہ سب حق کی علامات ہیں ۔ جس طرح یہ چیزیں مستقل ہیں' حق بھی مستقل ہے ۔ نہایت ہی خوبصورت انداز تعبیر میں سچائی کی یہ مثالیں ۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ (۵۰ : ۶) "اچھا' تو کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا' اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے"۔

یہ آسمان اس کائنات کی کتاب کا ایک صفحہ ہے ۔ یہ کتاب اس سچائی پر گواہ ہے جس کا یہ لوگ انکار کرتے ہیں ۔ یہ دیکھتے نہیں کہ اس کائنات میں کس قدر بلندی' ثبات اور قرار ہے ۔ اور پھر ان آسمانوں میں زیب و زینت اور کمال و جمال ہے اور ان کے نظام میں کوئی خلل اور کوئی اضطراب نہیں ہے ۔ ثبات اور کمال و جمال آسمان کی صفت ہے اور یہ صفات یہاں انداز بیان کے اندر بھی ایک ہم آہنگی پیدا کرتی ہیں کیونکہ حق میں بھی کمال و جمال اور ثبات و قرار ہوتا ہے ۔ چنانچہ آسمانوں کے لیے جمعیت' خوبصورتی' دوام اور سوراخوں اور دراڑوں سے پاک ہونے کی صفات لائی گئی ہیں ۔

---ooo---

ایسی ہی صفات زمین کے لیے استعمال ہوئی ہیں کیونکہ زمین بھی اس کائنات کی کتاب کا ایک ورق ہے ۔ اور اسے بھی ثبات اور کمال و جمال اور قرار حاصل ہے ۔ زمین کو آسمان کے بالمقابل لایا گیا ہے ۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ (۵۰ : ۷) "اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اگا دیں"۔

زمین کا بچھایا ہوا ہونا' پہاڑوں کا جما ہوا ہونا اور نباتات کا خوبصورت ہونا' تمام صفات کمال و جمال دکھانے والی چیزیں ہیں اور بادی النظر میں یہ صفات نظر آتی ہیں ۔ آسمان کی خوبصورت اور طویل و عریض تعبیر' اور بچھی ہوئی زمین اور بلند و بالا پہاڑوں کے مناظر دکھا کر ان لوگوں کے دل و دماغ کو ایک نکتے کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے ۔

تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (۵۰ : ۸) "یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اس بندے کے لیے جو (حق کی طرف) رجوع کرنے والا ہو"۔

یہ بصیرت عطا کرنے والی باتیں ہیں ۔ بصارت دینے والی باتیں ہیں اور دلوں کو قبولیت حق کے لیے کھولنے والی باتیں

ہیں ۔ اس مطالعہ سے انسانی دل و دماغ اور انسانی روح اس کائنات کے ساتھ جڑ جاتی ہے اور اس حکمت ' ترتیب اور کمال تخلیق کو پالیتی ہے جو اس کے اندر موجود ہے اور پھر جن لوگوں کا دل اپنے معبود کی طرف مائل ہوتا ہے وہ اپنے رب کے کمالات کو دیکھ کر لوٹ جاتا ہے ۔

یوں انسانی دل اور اس عظیم اور خوبصورت کائنات کے درمیان اتحاد و اتصال پیدا ہو جاتا ہے ۔ انسان کتاب کائنات کا مطالعہ کرتا ہے اور اس کائنات سے متعارف ہوتا ہے اور انسانی دل اور انسانی سوچ پر اس کا اثر ہوتا ہے ۔ اور انسانی زندگی پر یہ تعلق اور رابطہ اثر انداز ہوتا ہے اور یہ وہ رابطہ ہے جو قرآن سائنس اور معرفت الٰہی کے درمیان پیدا کرتا ہے ۔ یعنی اس معرفت کے درمیان جو انسان رکھتا ہے اور اس حقیقت کے درمیان جو سائنسی علم رکھتا ہے اور ہمارے دور میں علم کا جو سائنسی منہاج مروج ہے اس میں یہ حقیقت نہیں ہے یہ رابطہ نہیں ہے ۔ یوں اللہ نے انسانوں اور اس کائنات کے درمیان جس کے اندر وہ رہتے ہیں ایک تعلق پیدا کیا تھا اور جدید دور کے اہل علم اور سائنس دانوں نے یہ تعلق کاٹ دیا ہے ۔ انسان اس کائنات کا حصہ ہے اور جب تک وہ اس کائنات کا ہمدم نہیں ہو گا اس وقت تک اس کی زندگی نہ مستحکم ہو سکتی ہے نہ مستقیم ۔ اور جب تک اس کے دل کی دھڑکن اور اس کائنات کی حرکت کے اندر ہم آہنگی نہ ہوگی ' وہ کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ ستاروں اور سیاروں ' آسمانوں اور فضاؤں ' نباتات اور حیوانات اس کائنات اور اس کی وسعتوں کے اندر انسان جس قدر بھی نئی دریافت کرے ۔ وہ دریافت دل سے ہم آہنگ ہو ۔ اور انسان اس نئی دریافت کردہ دنیا کا دوست ہو اور اس طرح وہ اس نتیجے تک پہنچے کہ انسان اور اس کائنات کا آخری خالق اور سب اللہ تعالیٰ ہے ۔ جب تک علم ' دریافت اور معرفت کی آخری منزل ' خالق کی منزل تک نہ پہنچ سکے اسے سمجھا جائے کہ وہ علم ناقص ہے ۔ ایسی ہر تحقیق اور ایسی ہر تحقیق کا ہر نتیجہ بانجھ ہے ' بے مقصد ہے اور انسان کے لیے غیر مفید ہے ۔

یہ کائنات سچائی کی کھلی کتاب ہے جسے ہر زبان میں پڑھا جاتا ہے اور ہر ذریعہ سے اس کا ادراک کیا جاتا ہے ۔ اسے ایک خیمے اور جھونپڑی کا باشندہ بھی پڑھ سکتا ہے اور نہایت ہی تعلیم یافتہ اور محلات میں رہنے والا بھی پڑھ سکتا ہے ۔ ہر شخص اپنے قوت ادراک کے مطابق اسے پڑھتا ہے ۔ " ہر کسے از ظن خود شد یار من " اسے اپنی صلاحیت کے مطابق اس کے اندر حق نظر آتا ہے ۔ بشرطیکہ وہ اسے اس نیت سے پڑھ رہا ہو کہ وہ حق اور سچائی تک پہنچ جائے ۔ یہ کتاب ہر حال میں قائم ہے اور ہر کسی کے سامنے کھلی ہے ۔

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (۵۰ : ۸) " یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور نصیحت دینے والی ہیں ہر اس شخص کے لیے جو سچائی کا متلاشی ہو " ۔ لیکن جدید سائنسی علوم کو اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ ان سے یہ تبصرہ اور آنکھیں کھول دینے کی صلاحیت کو ختم کر دیا گیا ہے ۔ انسان کے دل اور اس کی روح کا تعلق اس کائنات سے کاٹ دیا گیا ہے ۔ کیونکہ یہ علم ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کے دل اندھے ہیں ۔ اور ان کے سروں پر نام نہاد سائنسی انداز فکر سوار ہے ۔ اور یہ سائنسی انداز یہ ہے کہ کائنات کا تعلق انسان کی روح سے کاٹ دیا جائے ۔

لیکن کائنات کا ایمانی مطالعہ ان لوگوں کے نام نہاد سائنسی انداز میں بہرحال کوئی کمی نہیں کرتا بلکہ وہ اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ یہ کائناتی حقائق ایک دوسرے سے بھی مربوط ہیں اور پھر یہ حقائق ایک حقیقت کبریٰ سے بھی مربوط ہیں اور ان حقائق کو

اس حقیقت کبریٰ سے مربوط کر کے پھر تمام حقائق کو انسانی ادراک اور انسانی شعور اور انسانی روح کے ساتھ یوں پیوست کرتا ہے کہ یہ انسان کو متاثر کریں۔ انسان کی زندگی کو متاثر کریں۔ یہ محض خشک معلومات ہی نہ ہوں جو ذہنوں میں دفن ہوں اور عملی زندگی میں ان کا کوئی مقصد نہ ہو بلکہ ان کو عملی زندگی پر ایمان کے راستے سے اثر انداز ہونا چاہئے اور ہماری تمام تحقیقات اور انکشافات کو ایمان کے راستے سے حقیقت کبریٰ سے جڑ کر انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز ہونا چاہئے۔

اس طرح اس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانے کے بعد اب بحث اس کتاب کائنات کے اندر آگے بڑھتی ہے۔ پیش نظر یہی مضمون ہے کہ موت کے بعد حشر و نشر ہو گا اور حساب و کتاب ہو گا۔

وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّ حَبَّ الْحَصِيْدِ ﴿۹﴾ وَ النَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ﴿۱۰﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ﴿۱۲﴾ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ﴿۱۳﴾ وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۵﴾ ع ۱
۱۵
۱۵

اور آسمان سے ہم نے برکت والا پانی نازل کیا، پھر اس سے باغ اور فصل کے غلے اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیئے جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بہ تہ لگتے ہیں۔ یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا۔ اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں۔ (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے) نکلنا بھی اسی طرح ہو گا۔ ان سے پہلے نوح کی قوم، اور اصحاب الرس اور ثمود اور عاد، اور فرعون، اور لوط کے بھائی، اور ایکہ والے اور تبع کی قوم کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہو گئی۔ کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔

آسمانوں سے جو پانی نازل ہوتا ہے وہ مردہ زمین کو زندہ کرنے سے بھی پہلے مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے اور اس کا نزول ہی دلوں پر بہت ہی اچھا اثر ڈالتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ چھوٹے بچے ہی بارش سے خوش ہوتے ہیں اور اس کے لیے دوڑتے ہیں اس میں اچھلتے کودتے ہیں بلکہ معمر لوگ جن کے اندر احساس جمال ہو وہ بھی بارش کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور ان کے دل بھی بارش میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بچے تو ہوتے ہی چھوٹے ہیں۔

یہاں بارش کے پانی کو ماء مبارک کہا گیا ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مختلف قسم کے پھلوں کے باغات اور کٹنے والی کھیتیاں تیار فرماتا ہے اور اسی کے ذریعہ کھجوروں کے اونچے درخت اور ان کے پختہ پھلوں اور خوبصورت درختوں کو اگایا جاتا ہے۔

وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ (۵۰ : ۱۰) "بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیے ہیں جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بہ تہ لگتے ہیں"۔ خوشوں کے لیے تہ بہ تہ کی صفت لائی گئی ۔ اس سے بلند و بالا درخت کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے ۔ جس کے اوپر تہ بہ تہ خوشے لگے ہوئے نظر آئیں ۔ مضمون اور معنی کے اعتبار سے بھی یہ الفاظ مناسب ہیں کیونکہ بات حق و سچائی کی ہو رہی ہے ۔ حق بلند و بالا بھی ہوتا ہے اور خوبصورت بھی اور اس کا بول بھی بالا ہونا چاہئے ۔

• اور انسان پر یہ مہربانیاں کر کے ' انسانی دل کے اندر ممنونیت پیدا کی جا رہی ہے کہ دیکھو یہ شفاف پانی ' یہ باغ و راغ ' یہ کھیت اور حیوانات اور یہ آسمانوں سے باتیں کرنے والے پھلوں سے لدے کھجور کے درخت ' یہ سب کچھ ۔

رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ (۵۰ : ۱۱) "یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا"۔ اس رزق کے اسباب اللہ کہاں سے چلا کر لاتا ہے ۔ پھر نباتات اگاتا ہے ' پھر ثمرات لگاتا ہے ' یہ سب کچھ بندوں کے لیے ۔ اور اللہ ہی صحیح آقا ہے اور اس کا پورا پورا شکر ادا کرنے کی قدرت ہی یہ بندے نہیں رکھتے ۔

اور اب یہ کہ یہ پوری کائنات اس ہدف کی طرف بڑھ رہی ہے ۔

وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ (۵۰ : ۱۱) "اور اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں (مرے ہوئے انسانوں کا زمین سے نکلنا بھی اسی طرح ہو گا"۔ یہ عمل تمہارے ماحول میں رات دن دہرایا جا رہا ہے ' تم اس کے عادی ہو گئے ہو ۔ دیکھتے ہو لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے اور پھر بھی تم اعتراض کرتے ہو ۔ اگر تم غور کرتے تو تمہیں اپنا اعتراض عجیب لگتا ۔ جس طرح موجودہ زمین پر لوگ پیدا ہو رہے ہیں ۔ اسی سہولت سے دوبارہ اٹھا لیے جائیں گے ۔ قرآن کا انداز کیا ہی شاندار ہے ۔ پہلے دلائل دے کر بعد دعویٰ ' کہ کائنات سے مختلف قسم کے دلائل اور موثرات کی ایک طویل فہرست دے کر آخر میں کہتا ہے کہ "یوں"۔ اور اس انداز سے انسان بہت متاثر ہوتا ہے ۔

--- ooo---

اب انسانی تاریخ کے طویل ریکارڈ سے کچھ عبرتیں اور نصیحتیں ' اس سے قبل پورے دلائل دیے گئے تھے وہ اس کائنات کی کھلی کتاب سے تھے ۔ اب کتاب تاریخ کے اوراق الٹئے ! اور دیکھئے کہ جن لوگوں نے آخرت کی جوابدہی کا انکار کیا ان کا انجام کیا ہوا ۔ اپنے رویے پر ذرا غور کرو ۔ انہوں نے بھی اسی طرح تکذیب کی جس طرح تم کر رہے ہو اور ان پر جو عذاب آیا کیا تم پر ایسا عذاب نہیں آ سکتا ؟

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ (۱۲) وَعَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ (۱۳) وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ (۱٤) اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (۵۰ : ۱۲تا۱٤)

"ان سے پہلے نوح کی قوم' اور اصحاب الرس اور ثمود اور عاد' اور فرعون' اور لوط کے بھائی' اور ایکہ والے اور تبع کی قوم کے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں۔ ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہوگئی۔ کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں"۔

رس کے معنی ہیں کنواں' وہ کنواں جس کا من پتھروں سے بنا ہوا ہو' اور ایکہ کے معنی ہیں درختوں کا جھنڈ۔ اصحاب الایکہ غالباً قوم شعیب ہے۔ اصحاب الرس کی تفصیلات قرآن میں وارد نہیں ہیں۔ تبع حمیری بادشاہوں کا لقب ہے۔ اور باقی اقوام جن کی طرف اشارہ کیا ہے وہ مشہور ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں اس سرسری اشارے سے مقصد ان اقوام کی تفصیلات دینا نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ بیان کرنا ہے کہ ان کو ہلاک کیا گیا۔ جب انہوں نے رب العالمین کے رسولوں کی تکذیب کی۔ قابل توجہ یہ فقرہ ہے۔

كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ (۵۰ : ۱۴) "ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہوگئی"۔ اس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ رسول بھی ایک ہیں۔ ان کے منصب کی نوعیت بھی ایک ہے اور ان کا مقصد بھی ایک رہا ہے حالانکہ سب کے سب نے رسولوں کو نہ جھٹلایا تھا۔ بلکہ ایک رسول کو جھٹلایا لیکن ایک رسول کو جھٹلانا بھی دراصل سب کو جھٹلانا ہے۔ رسول سب بھائی ہیں اور رسالت ایک ہی شجرۂ نسب ہے جس کی جڑیں دور تک تاریخ میں چلی گئی ہیں اور اس شجرے کی ہر شاخ دراصل اس کی خصوصیات کی تلخیص ہے۔ اور اس کی ایک صورت ہے اور جس نے ایک شاخ کو چھوا گویا اس نے پورے سلسلے کو پکڑ لیا۔ فَحَقَّ وَعِيدِ (۵۰ : ۱۴) "پس ان پر میری وعید چسپاں ہوگئی"۔ جس کی تفصیلات سامعین کو معلوم ہیں۔

ان اقوام پر عذاب الٰہی تکذیب کی وجہ سے آیا اور تکذیب انہوں نے قیامت کی ہی کی تھی۔ تو اللہ کا سوال۔

اَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (۵۰ : ۱۵) "کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے"۔ یعنی ان کے سامنے کیا یہ شہادت موجود نہ تھی تخلیق چونکہ موجود تھی اس لیے جواب نہ دیا۔

بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ (۵۰ : ۱۵) "بلکہ ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے تھے"۔ یہ دیکھتے نہ تھے کہ ان کے سامنے یہ عمل موجود ہے۔ شہادت موجود ہے لہٰذا ان کا علاج یہی تھا جو ہوا۔

---○○○---

درس نمبر ۲۴۸ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا دوسرا سبق ہے ۔ اس میں بھی بعث بعد الموت کی بحث ہے جس طرح پہلے حصے کا موضوع بھی یہی تھا ۔ تکذیب کرنے والوں کے سامنے کچھ مزید موثر دلائل رکھے گئے ہیں ۔ لیکن یہ دلائل ذرا دھمکی آمیز انداز میں ہیں اور خوفناک مناظر پر مشتمل ہیں ۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے جس طرح سورت کے آغاز میں تھا ۔ پھر سکرات موت کا ذکر ہے ' پھر حساب و کتاب اور ہر کسی کے اعمال نامے کی پیشی کا ذکر ہے اور پھر جہنم کا منہ کھلا ہو گا اور جب بھی اس میں اس کی انسانی خوراک کی کوئی قسط پھینکی جائے گی تو وہ منہ چاٹ کر اور اسے چکھ کر کہے گی ۔

هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ (۵۰ : ۳۰) "کیا اور بھی ہے"۔ غرض یہ ایک ہی سفر ہے ' پیدائش سے شروع ہوتا ہے ۔ موت کے سکرات سے گزرتا ہے اور حساب و کتاب پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے ۔ یہ زندگی کا طویل سفر ہے ' باہم متصل اور مربوط ۔ اور اس منظر میں اسے مسلسل کڑیوں کی شکل میں قلم بند کیا گیا ہے جس کے اندر کوئی کڑی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہے ۔ نہ کوئی کسی کڑی یا مرحلے سے بچ کر نکل سکتا ہے ۔ اور انسان اس سفر کے آغاز سے انتہا تک اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے ۔ کسی جگہ یا مرحلے میں وہ اللہ سے آزاد نہیں ہے ۔ ہر وقت اللہ کی نگرانی میں ہے ۔ اس سورت میں اس سفر کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ خوفناک بھی ہے اور حیران کن بھی کہ ایک انسان اللہ قہار و جبار کے قبضہ قدرت میں سفر کے مراحل طے کر رہا ہے ' وہ اللہ جو دلوں کے تمام بھیدوں کو جاننے والا ہے ۔ انسان کیا کر سکتا ہے جب اسے بلانے والا وحدہ لاشریک ہے ' نہ بھولتا ہے ' نہ سوتا ہے اور نہ کسی چیز سے غافل رہتا ہے ۔ انسان تو اس وقت بھی بے حد ہراساں ہو جاتا ہے جب اسے احساس ہو کہ اس کے پیچھے کسی ارضی حکومت کی سی آئی ڈی لگی ہوئی ہے ۔ زمین والوں کی حکومت کیا ہو گی اور ان کے جاسوس کیا ہوں گے ۔ اگر کوئی خفیہ پولیس نگری کر بھی رہی ہے تو انسان کی ظاہری حرکت کی نگرانی کر رہی ہے ۔ وہ اس پولیس سے گھر میں چھپ جاتا ہے جب وہ اپنے گھر کے اندر آکر اپنے پیچھے دروازہ بند کرے یا وہ اپنا منہ بند کر دے اور منہ سے لفظ تک نہ نکالے ۔ لیکن اللہ جبار و قہار کی نگرانی بڑی سخت ہے ۔ انسان جہاں بھی ہو ' جس حال میں بھی ہو اس کے کارندے ہر وقت لکھ رہے ہیں اور وہ دلوں کے بھیدوں تک کو جانتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی نگرانی کڑی نگرانی ہے ۔

--- ٥٥٥ ---

درس نمبر ۲۴۸ تشریح آیات

۱۶ --- تا --- ۳۵

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿۱۷﴾ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾ وَ جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾

''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں' (اور ہمارے اس براہ راست علم کے علاوہ) دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔پھر دیکھو' وہ موت کی جان کنی حق لے کر آپہنچی' یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا''۔

آیت کے آغاز میں ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ (۵۰ : ۱۶) ''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے''۔یہاں اس عبارت کے ایک ضمنی مفہوم کی طرف اشارہ مقصود ہے۔یہ کہ کسی بھی چیز مشینری یا آلے کا بنانے والا اس کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔حالانکہ وہ اس کا خالق نہیں ہوتا کیونکہ آلات اور مشینری کا مادہ تو اس نے نہیں بنایا اور اس کی تشکیل اور ترکیب میں بھی کوئی اضافہ نہیں کیا۔جبکہ اللہ خالق بھی ہے موجد بھی اور انسان کو جوڑنے والا بھی ہے۔یہ آغاز سے انتہا تک اللہ کے دست قدرت سے نکلا ہوا ہے۔اس لیے اللہ اس کی حقیقت اور اس کے اسرار و رموز سے خوب واقف ہے۔اس کے ماضی' حال اور مآل سے وہ آگاہ ہے۔

وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (۵۰ : ۱۶) ''اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں''۔یوں انسان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر چیز اللہ کے سامنے ظاہر ہے۔اس کے اور خالق کے درمیان پردہ نہیں ہے۔اس کے دل کی خفیہ ترین امنگوں سے بھی خالق واقف ہے۔اور یوم الحساب کے لیے تو ہر طرح کی تیاری

ہو رہی ہے جس کا وہ منکر ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (۵۰:۱۶) "اور ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"۔ اس شہ رگ سے جس میں اس کا خون دوڑ رہا ہے۔ یہ اللہ کے قبضہ ملکیت کی ایک تصویر ہے۔ اور اللہ کی براہ راست نگرانی ہے۔ جب انسان اس حقیقت کا تصور کرتا ہے تو اس کا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے۔ اگر انسان صرف اسی آیت کے مفہوم کو مستحضر رکھے تو وہ کبھی ایسی بات نہ کرے جس سے اللہ ناراض ہو بلکہ انسان غیر پسندیدہ خیالات کو اپنے دل ہی میں نہ لائے۔ صرف یہی آیت اس بات کے لیے کافی ہے کہ انسان ہروقت محتاط رہے' ہر وقت خائف رہے اور ہروقت حساب و کتاب کے لیے بیدار رہے۔ قرآن کریم مزید اس نگرانی کی تشریح یوں کرتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی' ہر حرکت 'سونا' کھانا' پینا' خاموش رہنا' بات کرنا' غرض سفر زندگی پورے کا پورا دو فرشتوں کے درمیان کٹ رہا ہے۔ یہ فرشتے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ اس کے ہر لفظ کو اس کے منہ سے نکلتے ہی ریکارڈ کر لیتے ہیں۔

اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ (۵۰:۱۷) مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (۵۰:۱۸) "دو کاتب اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں۔ ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو"۔ یعنی جو نگران ہے وہ حاضر باش ہے۔ یعنی عتید رقیب کی صفت ہے۔ یہ مفہوم نہیں ہے جس طرح ذہن میں آتا ہے کہ دو نگرانوں میں سے ایک کا نام رقیب ہے اور دوسرے کا عتید ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح ریکارڈ کرتے ہیں؟ اس سلسلے میں انسان کو اپنے تخیلات پیش نہ کرنا چاہئے۔ یہ غیبی امور ہیں اور ان کو اسی طرح قبول کرنا چاہئے جس طرح قرآن میں مذکور ہیں۔ مفہوم پر ہمارا ایمان ہے اور کیفیت کا ہمیں پتہ نہیں ہے۔ اگر کیفیت کا پتہ لگ بھی جائے تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ پھر بعض کیفیات ہمارے تجربات کے دائرے ہی میں نہیں ہوتیں اور ہم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

آج دور جدید میں ریکارڈنگ کے وہ طریقے ہم نے دیکھ لیے ہیں جن کا تصور بھی ہمارے آباء و اجداد نہ کر سکتے تھے۔ ان طریقوں سے انسان کی ہر حرکت اور ہر لفظ ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ آڈیو' وڈیو' ٹیپ' سینما کی ریل' اور ٹیلی ویژن کے ٹیپ (اور اب کمپیوٹر اور اس کا نیٹ ورک) یہ تو وسعت آگئی ہے انسانی دائرہ ریکارڈ میں۔ جہاں اللہ اور اس کے عملے کا تعلق ہے تو ان کے پاس ایسے ذرائع اور ایسے طریقے ہو سکتے ہیں جن کا ہم ابھی تک تصور ہی نہیں کر سکتے۔ بس اللہ نے جو اطلاع کر دی ہے اس پر یقین کرو۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اس حقیقت کے دائرے کے اندر زندہ رہیں جس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔ اور اس شعور کو تازہ کریں کہ ہم جو بات بھی کرتے ہیں جس فعل کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ ہمارے دائیں بائیں اللہ کے کارندے بیٹھے ہوئے ہیں اور لکھ رہے ہیں تاکہ یہ ریکارڈ قیامت میں ہمارے خلاف پیش ہو یا ہمارے حق میں پیش ہو۔ اور یہ حساب ایسا ہے کہ اس سے کوئی بات نہیں چھوٹتی۔

اور ہمیں چاہئے کہ اس حقیقت کو ذہن میں تازہ رکھتے ہوئے زندگی بسر کریں ۔ بس یہی ہمارے لیے کافی ہے اس کی کیفیت ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو ۔ جس شکل و صورت میں بھی ہو یہ ریکارڈ تیار ہو رہا ہے ۔ اور ہم کسی طرح اس سے بچ کر نہیں نکل سکتے ۔ اللہ نے پیشگی اطلاع ہمیں دے دی ہے تاکہ ہم اس کا خیال رکھیں ۔ رہی یہ بات کہ اس کی کیفیت کیا ہے تو یہ ایک عبث جدوجہد ہوگی ۔ جن لوگوں نے اس قرآن اور اس کے حقائق اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات سے فائدہ اٹھایا' ان کا انداز اور طریقہ یہی تھا کہ شعور کو پختہ کرو اور عمل کرو فقط ۔

امام احمد نے روایت کی' ابو معاویہ سے' انہوں نے محمد ابن عمر ابن علقمہ لیثی سے انہوں نے اپنے والد سے' انہوں نے ان کے دادا سے اور انہوں نے حضرت بلال ابن حارث مزنی سے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک آدمی ایک لفظ بولتا ہے جو اللہ کی رضامندی کا لفظ ہوتا ہے ۔ اسے یہ یقین نہیں ہوتا کہ اس لفظ پر اللہ اس سے اپنی رضامندی لکھ دیتا ہے تاقیامت ۔ اور ایک دوسرا شخص ایک لفظ بولتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب ہوتا ہے اور اس کو یقین نہیں ہوتا کہ یہ لفظ کہاں تک پہنچ گیا ۔ اللہ قیامت تک اس شخص سے ناراضگی لکھ دیتا ہے" کہتے ہیں کہ علقمہ کہا کرتے تھے کہ کتنی ایسی باتیں ہیں جن کے کہنے سے میں بلال ابن حارث کی حدیث کی وجہ سے رک گیا ۔ (ترمذی' نسائی' ابن ماجہ) ۔

امام احمد سے روایت ہے کہ وہ سکرات الموت میں فریاد کر رہے تھے انہوں نے سنا کہ یہ فریاد بھی لکھی جا رہی ہے تو خاموش ہوگئے اور ان کی روح پرواز کر گئی ۔ یوں یہ حضرات قرآنی ہدایات کو لیتے تھے ۔ اور یوں تھی ان کی زندگی ۔

---ooo---

یہ تو ہیں کتاب زندگی کے صفحات اور آخری صفحہ اس دنیا کی زندگی کا الٹایا جا رہا ہے ۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (۵۰ : ۱۹) "پھر دیکھو' وہ موت کی جان کنی حق لے کر آپہنچی' یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا" ۔

موت وہ حقیقت ہے جس سے اللہ کی تمام مخلوقات ڈرتی ہے ۔ اور ہر شخص موت کا تصور اپنے ذہن سے محو کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہے ۔ موت ایک ایسا طلبگار ہے جو مطالبے سے تھکتا نہیں ۔ یہ اپنی رفتار سے انسان کے قریب ہوتی رہتی ہے ۔ اور اس کے قدموں کی رفتار کبھی سست نہیں پڑتی ۔ اور اس کے مقررہ وقت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی ۔ موت کے آخری لمحات جنہیں سکرات الموت کہا جاتا ہے ۔ اس کے تصور ہی سے انسان کے اعضا کانپ اٹھتے ہیں ۔ یہ موت کا منظر اسکرین پر ابھی پیش ہو رہا ہے کہ سوال ہوتا ہے ۔

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (۵۰ : ۱۹) "یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا" ۔ انسان ابھی تک تو زندہ ہے اس دنیا میں ہے لیکن وہ اس سوال کو سن رہا ہے ۔ لیکن جب وہ حقیقتاً جان کنی کے لمحات میں ہوگا اور اس وقت وہ یہ سوال سنے گا تو حالت کیا ہوگی ۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آپ پر سکرات الموت طاری ہوئے تو آپ اپنے چہرۂ مبارک سے پسینہ پونچھ رہے تھے اور فرماتے تھے ۔

"سبحان اللہ فی الواقعہ جان کنی کے لمحات ہوتے ہیں" ۔ آپ یہ کہہ رہے تھے حالانکہ آپ الرفیق الاعلیٰ کی طرف

رواں تھے اور اللہ کے لقاء کے مشتاق تھے دوسروں کی حالت کیا ہوگی؟

یہاں آیت میں ایک لفظ قابل توجہ ہے۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ (۵۰ : ۱۹) "اور موت کی جان کنی حق لے کر آ پہنچی"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب آخری لمحات میں ہوتا ہے تو اسے عالم آخرت نظر آ جاتا ہے۔ تمام حجابات ہٹ جاتے ہیں' اب یہ جن باتوں سے جاہل تھا وہ اسے معلوم ہو جاتی ہیں۔ وہ بھی اس کے سامنے آ جاتی ہیں جن کا وہ انکار کیا کرتا تھا۔ لیکن اب تو وقت گزر جاتا ہے۔ اب دیکھنا تو مفید نہیں رہتا۔ اب علم و فضل اور حقائق کا ادراک کس کام کا! کیونکہ اب توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ ایمان لانا اب مفید نہیں ہے۔ یہ وہ سچائی تھی جس کی وہ تکذیب کرتے تھے اور اس کے بارے میں سخت خلجان میں تھے۔ اب جبکہ انہوں نے اسے پا لیا ہے اور تصدیق کر رہے ہیں تو یہ ادراک اور تصدیق ان کے کسی کام کی نہیں ہے۔

--- ○○○---

اب سکرات الموت سے ذرا آگے میدان حشر میں، حساب و کتاب کی ہولناکیاں!

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿٢٠﴾ وَجَاۗءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَاۗىِٕقٌ وَّ شَهِيْدٌ ﴿٢١﴾ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاۗءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿٢٢﴾ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿٢٣﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿٢٤﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِۨ ﴿٢٥﴾ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰــهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿٢٦﴾ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿٢٧﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿٢٨﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿٢٩﴾ ۲ ۱۴ ع

۱۶ "اور پھر صور پھونکا گیا' یہ ہے وہ دن جس کا تجھے خوف دلایا جاتا تھا۔ ہر شخص اس حال میں آ گیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا۔ اس چیز کی طرف تو غفلت میں تھا' ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے۔ اس کے ساتھی نے عرض کیا یہ جو میری سپردگی میں تھا' حاضر ہے۔ حکم دیا گیا پھینک دو جہنم میں ہر کٹے کافر کو جو حق سے عناد رکھتا تھا' خیر کو روکنے والا اور حد سے تجاوز کرنے والا تھا' شک میں پڑا ہوا تھا اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا بنائے بیٹھا تھا۔ ڈال دو اسے سخت عذاب میں۔ اس کے ساتھی نے عرض کیا "خداوندا' میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔ جواب میں ارشاد ہوا

"میرے حضور جھگڑا نہ کرو' میں تم کو پہلے ہی انجام بد سے خبردار کر چکا تھا۔ میرے ہاں بات پلٹی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں ہوں"۔

یہ ایک ایسا منظر ہے کہ اس کا ذہن میں تازہ کرنا ہی کافی ہے۔ اگر یہ تازہ کر لیا جائے تو اس زمین کی پوری زندگی احتیاط' ڈر اور انتظار میں کٹ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کس طرح عیش کر سکتا ہوں جب کہ سینگ والے نے سینگ منہ کے ساتھ لگایا ہوا ہے اور اپنے ماتھے کو جھکایا ہوا اور انتظار میں ہے کہ اسے حکم دیا جائے۔ صحابہ کرامؓ نے فرمایا پس ہم کیا کہیں؟ آپؐ نے فرمایا 'کہو۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل لوگوں نے کہنا شروع کر دیا حسبنا اللہ ونعم الوکیل (ترمذی)

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ (۵۰ : ۲۱) "ہر شخص اس حال میں آگیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا"۔ وہ آیا' وہ جس کا حساب کیا جا رہا ہے' جسے سزا ہونے والی ہے۔ ایک چلا کر لانے والا ہے اور ایک شہادت دینے والا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں لکھنے والے اور دنیا میں اس کی حفاظت کرنے والے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اور فرشتے ہوں۔ لیکن پہلی تفسیر راجح ہے۔ عدالت میں پیشی کا یہ بہترین طریقہ ہے لیکن یہ اللہ جبار کی عدالت ہے۔ ایسے مشکل وقت میں اسے یہ کہا جائے گا۔

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۵۰ : ۲۲) "اس چیز کی طرف سے تو غفلت میں تھا۔ ہم نے وہ پردہ ہٹا دیا جو تیرے آگے پڑا ہوا تھا' اور آج تیری نگاہ خوب تیز ہے"۔ آج تیری نظر بڑی تیز ہے اور پردوں کو پار کر کے بھی دیکھ رہی ہے۔ کام کرنے کی جگہ میں تو نے غفلت برتی۔ تو نے اس وقت کا خیال ہی نہ رکھا۔ یہ ہے وہ انجام جس کی تو توقع ہی نہ رکھتا تھا۔ آج دیکھا جاتا۔ آج تیری نظر تیز ہے۔

اب اس کا ساتھی آگے بڑھتا ہے۔ راجح یہ ہے کہ یہ وہ گواہ ہے جس کے پاس اس کا اعمال نامہ ہے۔

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ (۵۰ : ۲۳) "اس کے ساتھی نے عرض کیا' یہ جو میری سپردگی میں تھا حاضر ہے تیار"۔ عتید کے معنی ہیں حاضر' تیار۔ یعنی اب کوئی نئی چیز تیار نہیں کرنی ہے پہلے سے تیار ہے۔

یہاں اب اس ریکارڈ کو پڑھا نہیں جاتا ہے پس عدالت سے جلدی کے ساتھ ڈگری صادر ہوتی ہے اور نافذ ہوتی ہے۔ فوراً بارگاہ رب العزت سے اس سابق اور شہید کو حکم دیا جاتا ہے۔

اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ (۵۰ : ۲۴) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ (۵۰ : ۲۵) الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ۔ (۵۰ : ۲۶)

دو حکم دیا گیا' پھینک دو جہنم میں ہر کٹے کافر کو جو حق سے عناد رکھتا تھا۔ خیر کو روکنے والا اور حد سے تجاوز کرنے والا' شک میں پڑا ہوا تھا اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو خدا بنائے بیٹھا تھا' ڈال دو اسے سخت عذاب میں"۔

ان صفات کے ذکر سے' اس مشکل وقت کی مشکلات میں گرفتار لوگوں کے خوف و ہراس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے سے مشکل میں گرفتار مجرموں پر اللہ جبار و قہار کے غضب کا ذریعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام صفات اس بات کی مستحق ہیں کہ مجرم کو زیادہ سے زیادہ سزا دی جائے۔ سخت کافر' عناد رکھنے والا ہر بھلائی سے روکنے والا' ہر معاملے میں حد سے گزرنے والا اور غایت درجے کا شکی جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ بنا رکھے ہیں اور ان صفات کو گنوانے کے بعد پھر تاکید امر فَاَلْقِیٰهُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ (۵۰ : ۲۶) "ڈال دو اسے سخت عذاب میں" یعنی جہنم کے عذاب میں جو شدید ہی ہو گا۔

اس مقام پر اس شخص کے ساتھی بھی خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور کانپ اٹھتے ہیں اور جلدی سے اپنے بارے میں کسی الزام کے سائے کو رد کرتے ہیں' محض اس بنا پر کہ یہ اس جہنمی کا ساتھی تھا۔

قَالَ قَرِیْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَیْتُهٗ وَلٰکِنْ کَانَ فِیْ ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ (۵۰ : ۲۷) "اس کے ساتھی نے عرض کیا خداوندا' میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا"۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ساتھی وہ نہ ہو جس کا ذکر پہلے ہوا۔ جس نے اس مجرم کے کاغذات پیش کیے۔ بلکہ اس سے مراد وہ شیطان ہو جو اس کے ساتھ اسے گمراہ کرنے کے لیے لگا ہوا تھا۔ اور اب وہ یہاں اپنے آپ کو بری الذمہ کرنے میں لگا ہوا ہے اور پورے قرآن مجید میں ایسے مشاہد اور مکالمے موجود ہیں جن میں گمراہ کرنے والے شیاطین اپنی برات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسا کہ یہاں ہے لہٰذا یہ بھی بعید از امکان نہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ قرین سے مراد اعمال نامہ تیار کرنے والا فرشتہ ہو اور اس ہولناک احکام الٰہی سے ڈر گیا ہو اور اپنی برات کا اظہار کر رہا ہو اور یہ بیان کر رہا ہو کہ بے شک میں تو اس بدبخت کا ساتھی تھا' لیکن اس کی گمراہی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے' اس طرح اس بری الذمہ شخص کا اپنی برات ظاہر کرنا اس بات پر دلالت ہو گی کہ اس خوفناک اور کربناک منظر کو دیکھ کر فرشتے ساتھی نے یہ کہا۔[1]

غرض اب آخری حکم آجاتا ہے اور بات ختم ہو جاتی ہے:

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمْ بِالْوَعِیْدِ (۵۰ : ۲۸) مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (۵۰ : ۲۹) "ارشاد ہو گا' میرے حضور جھگڑا نہ کرو میں تم کو پہلے ہی انجام بد سے خبردار کر چکا تھا"۔ میرے ہاں بات پلٹی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں ہوں"۔ لہٰذا یہ جھگڑنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس سے قبل تمہیں بار بار خبردار کر دیا گیا تھا کہ ہر عمل پر جزاء و سزا ملے گی' تمام اعمال لکھ دیئے

---

(1) اس دوسری توجیہہ سے اگلا فقرہ مانع ہے' "میرے حضور جھگڑا نہ کرو" نیز فرشتہ کس طرح یہ سوچ سکتا ہے کہ میں غلطی میں نہ پکڑا جاؤں۔ (مترجم)

گئے ہیں۔اب ان کے اندر کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ ہر کسی کو اس کے اعمال نامے کے مطابق بدلہ ملے گا۔کسی پر ظلم نہ ہو گا کیونکہ جزا دینے والا حاکم عادل ہے۔

اس پر حساب و کتاب کا یہ منظر اپنی تمام ہولناکیوں اور شدت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن ابھی یہ بحث ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کا ایک خوفناک پہلو ابھی باقی ہے۔

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ ﴿٣٠﴾ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴿٣١﴾ هَٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴿٣٢﴾ مَّنْ خَشِيَ الرَّحْمَٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ﴿٣٣﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ ۖ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ﴿٣٤﴾ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴿٣٥﴾

”وہ دن جبکہ ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ ہے؟ اور جنت متقین کے قریب لے آئی جائے گی 'کچھ بھی دور نہ ہو گی۔ارشاد ہو گا ”یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا' ہر اس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا' اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا' جو بے دیکھے رحمن سے ڈرتا تھا' اور جو دل گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے۔ داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ“۔وہ دن حیات ابدی کا دن ہو گا۔وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ان کے لیے ہے“۔

یہ پورا منظر ہی سوال و جواب کا منظر ہے' یہاں مکالمے کے لیے جہنم کو پیش کیا جاتا' یوں یہ عجیب و غریب اور خوفناک منظر ہے۔تمام کفار معاند' بھلائی سے روکنے والے' حد سے گزرنے والے اور قیامت میں شک کرنے والے موجود ہیں۔یہ سب جہنم میں کثرت سے پھینکے جا رہے ہیں اور جہنم میں ان کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔اس کے بعد جہنم سے کہا جاتا ہے کہ کیا تم بھر گئی ہو اور کیا یہ لوگ تمہارے لیے کافی ہیں لیکن وہ بڑی سختی سے جوش میں آکر اور جلتے ہوئے کہے گی۔

هَلْ مِنْ مَّزِيْد (۵۰ : ۳۰) (کیا اور کچھ ہے؟) اس طرح جس طرح بھوکا خونخوار منہ کھولے ہوئے کوئی درندہ ہوتا ہے۔کیا ہی خوفناک منظر ہے یہ!

---ooo---

اور دوسری طرف ایک دوسرا خوبصورت منظر ہے' پر محبت' جس میں ہر کوئی راضی ہے' سب متقی ایک جگہ جمع ہیں' جنت ان کے قریب کر دی گئی ہے اور ہر طرف سے مرحبا مرحبا کی صدائیں ہیں۔

وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْد (۳۱) هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيْظٍ (۳۲) مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ (۳۳) اِدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ

ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ (٣٤) لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (٥٠: ٣١ تا ٣٥) "اور جنت متقین کے قریب لے آئی جائے گی' کچھ بھی دور نہ ہوگی۔ ارشاد ہوگا "یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا' ہر اس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا' اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا' جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا' اور جو دل گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے۔ داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ"۔ وہ دن حیات ابدی کا دن ہوگا۔ وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ان کے لیے ہے"۔

اس منظر کے مکالمات میں ہر کلمے میں تکریم اور عزت افزائی ہے۔ جنت کو اہل ایمان کے قریب کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس تک پہنچنے کے لیے ان کو کوئی سفر نہیں کرنا پڑتا بلکہ جنت ۔۔ چل کر آتی ہے ان کے قدموں میں۔

غَيْرَ بَعِيْدٍ (٥٠: ٣١) "کچھ دور نہ ہوگی"۔ اور دوسری نعمتوں کے علاوہ اللہ کی رضامندی ہوگی اور کہا جائے گا۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ (٥٠: ٣٢) مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ (٥٠: ٣٣) "یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہر اس شخص کے لیے جو رجوع کرنے والا اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا' جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا اور جو دل گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے"۔ تو عالم بالا سے ان کی یہ تعریف کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اللہ کے پیمانے کے مطابق یہ اس کی طرف رجوع کرنے والے ہیں اور اپنے نفس کی پوری طرح حفاظت کرتے ہیں' یہ رحمان سے ڈرنے والے ہیں اور انہوں نے اسے کبھی دیکھا نہ تھا۔ اللہ کی طرف ان کے دل لگے ہوئے ہیں اور وہ اس کے مطیع فرمان ہیں۔

اس کے بعد اعلان ہوتا ہے کہ سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ اور کبھی بھی اس سے تم نے نکلنا نہیں ہے۔

ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ (٥٠: ٣٤) "داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ"۔ وہ دن حیات ابدی کا دن ہوگا۔

پھر عالم بالا میں ان کی عزت افزائی کے لیے اعلان ہوگا کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کے لیے ان کے رب کے نزدیک اور بہت کچھ ہے اور وہ غیر محدود ہے۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (٥٠: ٣٥) "وہاں ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ہے ان کے لیے"۔ وہ جس قدر چاہیں اللہ کے انعامات کی انتہا تک نہیں جا سکتے اور اللہ کے ہاں جو مزید ہے وہ لامحدود ہے۔

---OOO---

درس نمبر ۲۴۹ ایک نظر میں

یہ اس سورت کا آخری سبق ہے ۔ گویا یہ آخری زمزمہ ہے اور نہایت ہی زوردار آواز میں بتایا جاتا ہے کہ سنو انسانی تاریخ میں امم سابقہ کے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے ۔ اس میں کائنات کی ایک جھلک بھی ہے اور حشر و نشر کے بارے میں بھی ایک منظر پیش کیا گیا ہے اور قرآن کے بارے میں بھی ہدایت ہے کہ آپ کام جاری رکھیں ۔ قلب و نظر کے لیے بھی کئی ہدایات ہیں ' اس سبق میں ۔

یہ تمام جھلکیاں اس پوری سورت میں بھی گزری ہیں لیکن آخر میں یہ ایک نئے رنگ کے ساتھ دہرائی گئی ہیں ۔ نہایت تیزی کے ساتھ نکتہ وار ' انہی باتوں کو دہرایا گیا ہے لیکن ایک نئے ذوق اور نئے انداز میں اور یہی قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ ایک ہی بات کو جب ایک ہی سورت میں دہراتا ہے تو وہ نئی معلوم ہوتی ہے ۔ پہلے کہا گیا ۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّ أَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُودُ (۵۰ : ۱۲) وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ (۵۰ : ۱۳) وَّ أَصْحٰبُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ (۵۰ : ۱۴) "ان سے پہلے نوح کی قوم ' اصحاب الرس اور ثمود ' اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائی اور ایکہ والے اور تبع کی قوم کے لوگ جھٹلا چکے ہیں ' ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور آخر کار میری وعید ان پر چسپاں ہو گئی"
اور یہاں کہا گیا

--- ooo---

درس نمبر ۲۴۹ تشریح آیات

۳۶ --- تا --- ۴۵

وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ ۖ هَلْ مِنْ مَّحِيصٍ ﴿٣٦﴾

"ہم ان سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو انسے بہت زیادہ طاقتور تھیں اور دنیا کے ملکوں کو انہوں نے چھان مارا تھا۔ پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پا سکے ؟"

جس حقیقت کی طرف اشارہ مطلوب تھا وہ یہ ہے لیکن یہاں بالکل جدید انداز میں ہے اور پہلی آیت میں جو انداز ہے ' اس سے بالکل مختلف۔ یہاں اقوام کی ایک صفت کا اضافہ کر دیا گیا کہ انہوں نے پوری دنیا میں نقب لگا کر اسے چھان مارا تھا۔ وہ ہر طرف دوڑتے پھرتے تھے۔ اسباب حیات تلاش کرتے تھے لیکن جب ان کو پکڑ لیا گیا تو پھر کیا کوئی جائے فرار تھی ؟

هَلْ مِنْ مَّحِيصٍ (۵۰ : ۳۶) "پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پا سکے"۔ نہیں! پیش ہے ایک اضافہ اور جس سے بات اور جاندار ہو جاتی ہے :

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوبٍ ﴿٣٨﴾ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ﴿٣٩﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ ﴿٤٠﴾ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿٤١﴾ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ ﴿٤٢﴾ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ ﴿٤٣﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۚ ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ﴿٤٤﴾ نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا

۳

۱۶ع يَقُولُونَ وَمَآ أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْءَانِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ ۱۷

"اس تاریخ میں اس بات کا سبق ہے ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو' یا جو توجہ سے بات کو سنے۔ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی۔پس اے نبی' جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو' اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی۔اور سنو' جس دن منادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پکارے گا' جس دن سب لوگ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سن رہے ہوں گے' وہ زمین سے مردوں کے نکلنے کا دن ہو گا۔ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی اس دن سب کو پلٹنا ہے جب زمین پھٹے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہوں گے۔یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے۔اے نبیؐ جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں' اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے۔بس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہہ سے ڈرے۔

امم سابقہ کے عروج و زوال میں بہت بڑی نصیحت ہے لیکن یہ صرف اس شخص کے لیے ہے جو دل و دماغ رکھتا ہو' تاریخ امم جس دل کو حرکت نہیں دے سکتی وہ مردہ ہے' یا وہ شخص دل و دماغ رکھتا ہی نہیں ہے۔بلکہ نصیحت حاصل کرنے اور عبرت لینے کے لیے تو یہ بھی کافی ہے کہ انسان خاموشی سے داستان عروج و زوال امم سن لے۔یہ داستان خود ہی بتا دے گی۔سچ یہ ہے کہ یہ ایک عظیم حقیقت ہے۔نفس انسانی پر امم ماضیہ کے قصص کا بہت ہی بڑا اثر ہوتا ہے۔اس سلسلے میں معمولی سی بیداری اور معمولی سی قلبی کشادگی ہی یادوں اور تصورات سے اثر لیتی ہے اور انسان پر بہت اثر ہوتا ہے اور اس میں بہت سی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔

اس سے قبل اس کائنات کی کتاب سے یہ صفحہ الٹا گیا تھا۔

أَفَلَمْ يَنظُرُوٓا۟ إِلَى ٱلسَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَٰهَا وَزَيَّنَّٰهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ (۵۰:۶) وَٱلْأَرْضَ مَدَدْنَٰهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَٰسِىَ وَأَنۢبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ (۵۰:۷) "کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے۔اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے اور اس کے اندر ہر طرح کے خوش منظر نباتات اگا دیں"۔اور یہاں یوں ہے۔

---ooo---

وَلَقَدْ خَلَقْنَا ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِى سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ (۵۰:۳۸) "ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا

اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی"۔

تو پہلی بات پر یہاں ایک مزید حقیقت کا اضافہ کر دیا گیا۔

وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (۰ ۵ : ۳۸) "اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہیں ہوئی"۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ اللہ نے اس عظیم کائنات کو نہایت آسانی کے ساتھ پیدا کر دیا۔ مردوں کا زندہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ان ہولناک آسمانوں کے مقابلے میں تو یہ ایک بہت چھوٹا کام ہے۔ ایک مزید ہدایت بطور سبق آموزی۔

---ooo---

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (۳۹) وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۰ ۵ : ۳۹ تا ۴۰) "پس اے نبی، جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اور رات کے وقت پھر اس کی تسبیح کرو اور سجدہ ریزیوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی"۔

سورج کا طلوع و غروب اور غروب کے بعد رات کا منظر، یہ سب آسمان اور زمین کے مناظر اور حرکات کے ساتھ منسلک ہیں۔ تسبیح و ثنا اور رکوع و سجود کو ان کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے اور تلقین یہ کی گئی ہے کہ ان لوگوں کی باتوں پر صبر کرو، کیونکہ یہ ناحق حشر و نشر اور دوبارہ زندہ کرنے کو جھٹلاتے ہیں۔ یہاں گویا رات اور دن کے تکرار میں ایک نئی بات داخل کی گئی۔ حمد و ثنا اور رکوع اور سجود کو بھی اس کائنات کے مناظر سے منسلک کیا گیا ہے۔ یوں جب بھی رکوع و سجود ہو گا یہ کائناتی مناظر بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔ سورج کے طلوع و غروب اور رات آنے کے مناظر۔

---ooo---

ایک دوسرا ٹچ جو اس کائنات کے صفحات کے ساتھ مربوط ہے۔ یعنی صبر کرو، تسبیح کرو اور سجدے کرو اس حال میں کہ آپ ایک عظیم حادثہ اور ایک عظیم واقعہ کے انتظار میں ہوں۔ جو گردش لیل و نہار کے کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ اور اس سے غافل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کے دل غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور یہ وہ بات ہے جو اس سورت کا عمود اور محور ہے اور اصلی موضوع۔

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ (۴۱) يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ (۴۲) اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ (۴۳) يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ (۰ ۵ : ۴۱ تا ۴۴) "اور سنو، جس دن منادی کرنے والا (ہر شخص کے) قریب ہی سے پکارے گا، جس دن سب لوگ آوازۂ حشر کو ٹھیک ٹھیک سن رہے ہوں گے، وہ زمین سے مردوں کے نکلنے کا دن ہو گا۔ ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی اس دن

سب کو پلٹنا ہے جب زمین پھٹے گی اور لوگ اس کے اندر سے نکل کر تیز تیز بھاگے جا رہے ہوں گے ۔ یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے"۔

یہ ایک نیا اور پر تاثیر منظر ہے ۔ اس دن کا منظر جو بہت ہی مشکل دن ہو گا ۔ ایک دوسری جگہ اس منظر کی تعبیر ایک دوسرے انداز میں کی گئی ۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ (٥٠: ٢٠) وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ (٥٠: ٢١) "اور پھر صور پھونکا گیا یہ ہے وہ دن جس کا تجھے خوف دلایا جاتا تھا ۔ ہر شخص اس حال میں آ گیا کہ اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا اور ایک گواہی دینے والا ہے"۔

اور یہاں نفخ صور کے ساتھ ایک چیخ کا ذکر بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی خروج کا منظر سامنے آتا ہے ۔ اور پھر زمین پھٹ رہی ہے اور لوگ اس سے نکلے چلے آ رہے ہیں ۔ یہ تمام مخلوقات جو آغاز حیات سے اس سفر کے انتہا تک اس زمین میں دفن ہوئے تھے ۔ یہ سب قبریں پھٹ پڑیں گی اور جن میں جو بھی جس قدر لوگ بھی دفن ہوئے تھے ' نکلے چلے آئیں گے ۔ معری کہتا ہے :

رب قبر صار قبرا مرارا
ضاحك من تزاحم الاضداد
دفين على بقايا دفين
في طويل الآجال والآماد

(کتنی ہی قبریں ہیں ' جو بار بار قبریں بنی ہیں ان کے اندر جو متضاد قسم کے لوگ دفن ہوتے چلے آ رہے ہیں ان پر وہ مسکرا رہی ہیں ۔ ایک مردے کو دوسرے کے جسم کے بقایا جات پر دفن کیا جاتا ہے ' طویل زمانوں سے اور قدیم زمانوں سے"۔

تمام چیزیں زمین کے پھٹنے کے بعد خود بخود نکلتی چلی آئیں گی ۔ ٹوٹے ہوئے جسم ' ہڈیاں ' ذرات جو زمین کی فضاؤں میں ہوں یا زمین کی وادیوں میں بہہ کر جہاں بھی ٹھہرے ہوں جن کی جگہ اللہ ہی جانتا ہے ' جمع ہوتے چلے آئیں گے ' یہ ایک ایسا منظر ہے کہ ہمارے خیال کی گرفت سے برتر ہے ۔

اس پر تاثیر منظر کے سایہ ہی میں اس حقیقت کو سامنے لایا جا رہا ہے جس کا وہ انکار کرتے تھے ۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ (٥٠: ٤٣) "ہم ہی زندگی بخشتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری طرف ہی ان سب کو پلٹنا ہے"۔ اور

ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ (٥٠: ٤٤) "اور یہ حشر ہمارے لیے بہت آسان ہے"۔ اور اس حقیقت کے اظہار کا یہ بہترین وقت و مقام تھا۔

---ooo---

اسی منظر کے زیر سایہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ آپ ثابت قدمی سے اپنے کام کو جاری رکھیں ۔ ان کے جدال اور جھگڑوں' ہٹ دھرمی اور جھٹلانے کی پرواہ نہ کریں ۔ جو حقیقت ان کے سامنے پیش کی جارہی ہے' وہ واضح ہے اور اگر چشم بصیرت ہو تو دیکھی جا سکتی ہے ۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ (۵۰: ۴۵) "اے نبیؐ جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں' اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے ۔ بس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہہ سے ڈرے"۔

جو باتیں یہ بنا رہے ہیں ہم ان کو خوب جانتے ہیں اور تمہاری تسلی کے لیے بس یہی کافی ہے کہ ہم جانتے ہیں اور ہمارے جاننے کے کچھ نتائج بھی ہوں گے ۔ یہ بہت ہی خوفناک دھمکی ہے ۔

وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ (۵۰: ۴۵) "تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے"۔ کہ آپ ایمان اور تصدیق پر کسی کو مجبور کریں ۔ اس میں آپ کا کوئی اختیار نہیں ہے"۔ اختیارات ہمارے پاس ہیں ۔ ہم نگرانی کر رہے ہیں اور ان کے ذمہ دار ہیں ۔

فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ (۵۰: ۴۵) "بس تم اس قرآن کے ذریعے ہر اس شخص کو نصیحت کرو' جو میری تنبیہہ سے ڈرے"۔ قرآن بذات خود ایک عظیم قوت ہے ۔ یہ دلوں کو ہلا مارتا ہے ۔ ذہنی دنیا میں زلزلہ برپا کر دیتا ہے ۔ اس کے سامنے سنگ دل سے سنگدل شخص نہیں ٹھہر سکتا۔ قرآن کے حقائق کا سامنا کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے ۔ قرآن عجیب انداز میں اثر انداز ہوتا ہے ۔

جب ایسی سورتیں لوگوں پر پڑھنے کے لیے اور پیش کرنے کے لیے موجود ہیں تو کسی جبار کی کیا ضرورت ہے جو لوگوں کی گردنیں مروڑ کر مسلمان بنائے ۔ قرآن کے اندر وہ قوت ہے جو بڑے بڑے جباروں کے اندر نہیں ہے ۔ اس کے ذریعہ دلوں پر وہ ضربات لگ سکتی ہیں' جو ڈکٹیٹروں اور جباروں کے کوڑوں کے ذریعہ نہیں لگائی جا سکتی (صدق اللہ العظیم)

نوٹ : ۔ پارہ ۲۶ کی نظر ثانی رہ گئی تھی ۔ یہ نظر ثانی آج مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۹۶ء بوقت ۵۲ ۔ ۲ شب ختم ہوئی' اس طرح تقریباً بتیس سال کے عرصے میں یہ کام ختم ہوا ۔ اے اللہ اسے اپنے دین کی سربلندی کے لیے مفید بنا دے اور میرے لیے موجب اجر بنا دے ۔ آمین ۔ سید معروف شاہ شیرازی

---ooo---

تفسیر فی ظلال القرآن

سید قطب شہیدؒ

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

جلد اول	پارہ	۱ تا ۴	۲۵۰ روپے
جلد دوم	پارہ	۵ تا ۸	۳۷۵ روپے
جلد سوم	پارہ	۹ تا ۱۲	۳۲۵ روپے
جلد چہارم	پارہ	۱۳ تا ۱۹	۳۲۵ روپے
جلد پنجم	پارہ	۲۰ تا ۲۶	۳۷۵ روپے
جلد ششم	پارہ	۲۷ تا ۳۰	زیر طبع